لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

محمد رسول اللہ

تخریج شدہ ایڈیشن

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب



سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

تالیف

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ اسلامیہ

ختم نبوت ﷺ زندہ باد **عظمت صحابہ زندہ باد**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- ❖ گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈ من کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی و غیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- ❖ گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- ❖ کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ❖ ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- ❖ اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈ من سے رابطہ کیجئے۔
- ❖ سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخِ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- ❖ تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- ❖ عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- ❖ **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- ❖ اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈ من سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد **پاکستان پائندہ باد**

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

حصہ اول

تخریج شدہ ایڈیشن

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب

اس میں ولادت مبارکہ، آپ کی جہادی زندگی اور اسلام سے پہلے عرب کی تاریخ کے بارے میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے، نیز سیرت نگاری کے فن پر مشتمل بہترین مقدمہ اس حصے کا خاصہ ہے۔

تالیف

علامہ شبلی نعمانی

علامہ سید سلیمان ندوی

مکتبہ اسلامیہ

کتاب ---------------------- سیرۃ النبی ﷺ

تالیف -------------- علامہ شبلی نعمانی ، علامہ سید سلیمان ندوی

ناشر ---------------------------- محمد سرور عاصم

اشاعت --------------------- اکتوبر 2012ء

قیمت -------------------------

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون: 37244973-042 فیکس: 37232369-042
بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد-پاکستان فون: 2631204, 2034256-041
E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

فہرست مضامین سیرۃ النبی ﷺ حصہ اول

فہرست مضامین سیرۃ النبی ﷺ حصہ دوم

عرض ناشر

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الأمین أمابعد:

نبی کریم ﷺ سے محبت وعقیدت کا فطری تقاضا ہے کہ آپ کی حیاتِ مقدسہ، آپ کے شمائل و خصائل، آپ کے اخلاق واحوال اوراقوال وافعال بیان کیے جائیں اورانہیں قلم بند کرکے ہر سو عام کیا جائے، کیونکہ آپ صورت اور سیرت کے لحاظ سے کامل ترین اورامت کے لیے اسوۂ بہترین ہیں۔ ارشادباری تعالیٰ ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۲۱)

''تمہارے لیے رسول اللہ (ﷺ کی زندگی) میں اسوۂ حسنہ ہے۔''

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیرت نویسی کا آغاز عہد نزول وحی میں ہی ہوگیا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیاء:۱۰۷)

''اورہم نے آپ کوتمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۵۹)

''اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کے ذریعے سے آپ (اپنے ساتھیوں کے لیے) بہت نرم ہیں۔ اگر آپ تُند خو، سخت دل ہوتے تو وہ آپ کے پاس سے ضرور منتشر ہو جاتے۔''

رسول اللہ ﷺ کس قدر عظمت وفضیلت کے حامل تھے کہ اللہ رب العزت نے آپ کی حیاتِ طیبہ کی قسم کھائی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِىْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۝ ﴾ (۱۵/ الحجر:۷۲)

''آپ کی حیاتِ مقدسہ کی قسم! یہ لوگ اپنی مدہوشی میں سرگرداں ہیں۔''

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اس میں رسول اللہ ﷺ کی بہت زیادہ تکریم وتعظیم ہے۔''

(تفسیر ابن کثیر ۳/ ۱۲۲)

یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان میں سے ہر ایک سیرت النبی ﷺ جیسے عظیم موضوع پر لکھنا اوراسے شائع کرنا سعادت اوراپنی نجات کا ساماں سمجھتا ہے۔ اس موضوع پر چند اہم کتابیں درج ذیل ہیں:

① کتاب السیر والمغازی از محمد بن اسحاق بن یسار رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۵۱ھ)

② السیر لأبی اسحاق الفزاری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۸۸ھ)

③ سیرت ابن ہشام از عبدالملک بن ہشام بن ایوب المعافری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۱۳ھ)

④ الشمائل المحمدیۃ از امام محمد بن عیسیٰ الترمذی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۷۹)

⑤ السیرۃ النبویۃ وأخبار الخلفاء لابن حبان رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۵۴ھ)

⑥ جامع الآثار فی السیر ومولد المختار لابن ناصر الدین الدمشقی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۸۴۲ھ)

مکتبہ اسلامیہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ قرآن، تفسیر، حدیث، تاریخ اور علمی و تحقیقی کتب کے ساتھ ساتھ نبی رحمت کی سیرت پر اردو کی قدیم اور معتبر ترین کتاب ''رحمۃ للعالمین'' بھی شائع کر چکا ہے۔ اب اسی موضوع سے متعلق برصغیر پاک و ہند کی معروف و مشہور کتاب سیرت النبی ﷺ از علامہ شبلی نعمانی و علامہ سید سلیمان ندوی رحمہما اللہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، جو ایک منفرد اسلوب کی حامل ہے۔ ہم نے اس کتاب کی اشاعت میں درج ذیل امور کا خاص خیال رکھا ہے:

☆ قدیم نسخوں سے تقابل و موازنہ۔

☆ تقابل کے بعد تسامح کی تصحیح۔

☆ آیات قرآنیہ، احادیث اور روایات کی مکمل تخریج۔

☆ آیات و احادیث کی عبارت کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔

☆ جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب کی اضافی توضیحات و تشریحات کے آخر میں (ض) لکھ کر واضح کر دیا ہے، تاکہ قاری کو کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

☆ ظاہری و باطنی حسن کا اعلیٰ شاہکار بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

کتاب کی تخریج و تصحیح محترم ڈاکٹر محمد طیب، پروفیسر حافظ محمد اصغر، فضیلۃ الشیخ عمر دراز اور فضیلۃ الشیخ محمد ارشد کمال حفظہم اللہ نے بڑی محنت سے کی ہے، جس کے لیے میں ان قابل قدر احباب و شیوخ کا ممنون ہوں۔ کمپیوٹر سیکشن کے محمد شہزاد، نعیم طارق اور حافظ محمد کلیم حفظہم اللہ کو بھی اللہ تعالیٰ جزائے خیر سے نوازے جنھوں نے بڑی مہارت سے کمپوزنگ و ڈیزائننگ کے فرائض سرانجام دیے ہیں۔ سرورق کی خطاطی معروف خطاط حافظ انجم محمود صاحب نے بڑے ذوق سے کی ہے جو یقیناً لائق تحسین ہے۔ ناسپاسی ہو گی اگر میں حافظ محمد عباد حفظہ اللہ کا شکریہ ادا نہ کروں جن کی جہد مسلسل سے کتاب کی اشاعت ممکن ہوئی۔ جزاہ اللہ خیراً

اللہ تعالیٰ ہم سب کی محنت کو قبول فرمائے اور اسے ہماری نجات کا ذریعہ بنائے۔ (آمین)

محمد سرور عاصم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع چہارم سیرۃ النبی ﷺ جلد اول

سیرت النبی ﷺ کے سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت بخشی وہ مصنف اور جامع دونوں کے لیے بڑی نعمت ہے، جس پر اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے۔

نومبر ۱۹۱۴ء میں مصنف کی وفات کے بعد جب سیرۃ کا مسودہ مصنف کی وصیت کے مطابق اس ہیچ مداں کے ہاتھ آیا تو اس عقیدت کی بنا پر جو ایک شاگرد کو اپنے استاد سے ہونی چاہیے، استاد کے مسودہ پر انگلی رکھتے ہوئے بھی ڈر معلوم ہوتا تھا، اگر کبھی بہ ضرورت ایسی گستاخی کرنی پڑتی تھی تو خواب میں بھی ڈر جاتا تھا، مسودہ کا مبیضہ مصنف کے سامنے ہو چکا تھا، اس لیے اس مبیضہ کا مقابلہ مسودہ سے اور نہ مسودہ کا مقابلہ اصل ماخذوں سے میں نے کیا، بلکہ مصنف کی امانت جوں کی توں ناظرین کے سپرد کر دی، بہ جز اس کے کہ بعض مقامات پر مصنف کے اشاروں کے مطابق بعض چیزوں کا اضافہ ہلالین میں کر دیا جس کی تصریح دیباچہ میں موجود ہے۔

اس کے بعد اس نسخہ کی نقل در نقل چھپتی رہی اور مقابلہ اور تصحیح ماخذ کی ضرورت نہیں سمجھی، لیکن اس اثنا میں کبھی کبھی مراجعت کے وقت بعض مقاموں پر تصحیح اور اضافہ کی نئی ضرورت محسوس ہوتی رہی اور اس کے مطابق ایک نسخہ پر یہ تصحیحات اور اضافے وقتاً فوقتاً کرتا رہا۔

اس دفعہ جب نئے نسخے کے چھاپنے کی ضرورت ہوئی تو خیال آیا کہ اس کتاب کے مسودہ کو اصل ماخذوں سے ملا کر دیکھا جائے اور مقابلہ اور مطابقت کی جائے، یہ بڑا مشکل کام تھا، بیسوں کتابوں کو پھر سے دیکھنا اور ہزاروں صفحوں کو الٹنا، متعدد مختلف روایتوں کو پرکھنا اور ضرورت کے مقام پر حاشیے لکھنا، خود ایک مستقل تصنیف کے برابر محنت تھی، مجھے یہ لکھنے میں بڑی خوشی ہے کہ لائق عزیز مولانا محمد اویس نگرامی ندوی اس کام میں میرے دست و بازو ثابت ہوئے، واقعات کی تلاش اور جانچ، روایتوں کی چھان بین اصل عبارتوں سے مسودہ کی تطبیق اور حدیث اور سیرت کی کتابوں کی طرف از سرِ نو مراجعت میں ان سے بڑی مدد ملی۔

کچھ مقام ایسے بھی تھے جہاں اس ہیچ مداں جامع کو مصنف کے نظریہ سے اختلاف تھا، اس دفعہ وہاں حاشیے بڑھا کر اختلاف کو ظاہر کر دیا، کہیں کسی واقعہ کے اجمال کی تفصیل یا دفعِ شبہہ کی ضرورت تھی، وہاں اس ضرورت کو پورا کیا گیا، بعض مسامحات پر تنبیہہ مناسب تھی وہ کی گئی، کہیں فروتر ماخذ کا حوالہ تھا اور اثنائے مطالعہ میں اس سے بالاتر ماخذ ملا تو اس کا حوالہ دے دیا گیا۔

یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ دو چار مقام میں عدد کی غلطی جو اردو ہندسوں میں اکثر ہو جاتی ہے اصل مبیضہ میں بھی موجود تھی، مراجعت کے وقت ان کی غلطی معلوم ہوئی اور اب ان کی تصحیح کر دی گئی، مثلاً حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی کے سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ کی قیمت سوا روپے چھپ گئی تھی، حالانکہ وہ سوا سو ہے، اسی طرح غزوۂ احزاب میں کفار کے لشکر کی تعداد ۲۴ ہزار درج ہوئی تھی، حالانکہ وہ بعض روایات میں ۱۴ ہزار لیکن صحیح روایات میں ۱۰ ہزار ہے۔

مولانا کی زندگی میں اس کی تصنیف کے وقت ان کو بعض کتابیں قلمی ملی تھیں، جیسے روض الانف جس سے پورا استفادہ وقت طلب تھا، اب وہ چھپ گئی ہے، بعض کتابوں کی ان کو تلاش ہی رہی، مگر ان کو مل نہ سکی، جیسے کتاب البدایہ والنہایہ ابن کثیر، مصنف سے اکثر حسرت کے ساتھ سنا کہ افسوس تاریخ ابن کثیر نہیں ملتی، وہ مل جاتی تو ساری مشکلیں حل ہو جاتیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب وہ چھپ کر عام ہو گئی، مستدرک حاکم اس وقت تک ناپید تھی، اب طبع ہو کر گھر گھر پھیل گئی، غرض ان کتابوں کے ہاتھ آ جانے سے بہت سے نئے معلومات بڑھ گئے، چنانچہ اس نسخہ کی تصحیح واضافہ میں ان سے کام لیا گیا۔

اس نسخہ کی تیاری میں جن خاص باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ پوری کتاب کے واقعات کو از سرِ نو حدیث وسیر کی کتابوں سے ملا کر دیکھا گیا ہے اور اس میں جہاں نقص نظر آیا دور کیا گیا ہے۔

۲۔ تصحیحِ بیان، دفعِ شبہہ، رفعِ ابہام اور تشریح کے لیے بہت سے توضیحی حواشی بڑھائے گئے ہیں۔

۳۔ مصنف کا کوئی بیان اگر نقد اور تنبیہ کے قابل معلوم ہوا تو اس پر نقد اور تنبیہ کی گئی ہے۔

۴۔ کہیں کہیں حوالے چھوٹ گئے تھے، اس نسخہ میں ان کو بڑھا دیا گیا ہے، کہیں صرف کتابوں کے نام تھے، اس دفعہ ان کے صفحے یا باب بھی لکھ دیئے گئے۔

۵۔ جہاں صرف صفحوں کے حوالے تھے، ابواب اور فصول کے حوالے بھی دیئے گئے، تاکہ جس کے پاس ماخذ کی کتاب کا جو ایڈیشن ہو اس میں نکال کر دیکھ لیا جا سکے۔

۶۔ طبع اول کے بعد سے سیرت یا حدیث کی جو نئی کتابیں چھپی تھیں، ان سے استفادہ کر کے اگر کوئی نئی بات ان میں ملی ہے تو اس کا اضافہ کیا گیا۔

۷۔ اگر کوئی حوالہ پہلے کسی نیچے درجہ کا تھا اور بعد کو اس سے اعلیٰ درجہ کا حوالہ ملا تو بڑھایا گیا۔

۸۔ حضور انور ﷺ کے نام مبارک کے ساتھ صلعم کے اختصار کے بجائے پورا ﷺ لکھنے کا اہتمام کیا گیا تاکہ اس تساہل سے درود پڑھنے کی برکت سے ناظرین کو محرومی نہ ہو۔

غزوۂ بدر کی روایتوں کی تنقید کے سلسلے میں ایک مقام پر اس نافہم ہیچ مداں کے خطا کار قلم سے حضرت

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ صحابی کی روایت پر نامناسب تنقید نکل گئی تھی، جس سے ایک گونہ ایک جلیل القدر صحابی کی شان میں سوءِ ظن کا پہلو پیدا ہوتا تھا، جس پر مجھے شرمندگی ہے اور اب میں اپنی غلطی و نادانی کو مان کر اس عبارت کو قلم زد کرکے صحابیِ رسول ﷺ کی برأت کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے عفو کا خواستگار ہوں۔

بندہ ہماں بہ کہ زتقصیرِ خویش　عذر بہ درگاہ خدا آورد

جن لوگوں کے پاس اس سے پہلے کے نسخے ہوں وہ اپنے نسخہ سے [1] ان سطروں کو کاٹ دیں تو بڑی مہربانی ہو، اب یہ موجودہ نسخہ طبع اول سے بہت سی باتوں میں بہتر ہوگیا ہے، اس موجودہ نسخہ میں انسانی استطاعت کے مطابق پوری طرح تصحیح کی بھی کوشش کی گئی ہے، تاہم انسان انسان ہے، خطا و نسیان اس کا خمیر ہے، کسی ناظرِ کتاب کو اب بھی کوئی غلطی معلوم ہو تو وہ ضرور مطلع فرما کر ممنونِ کرم کریں۔

آخر میں پاک پروردگار کی بارگاہ عالی میں دعا ہے کہ وہ میری خطا و نسیان سے درگزر فرما کر اس خدمت کو قبول کا شرف بخشے اور مسلمانوں کو اس سے بیش از بیش مستفید فرما کر اس گنہ گار کے لیے بخشائش کا ذریعہ بنائے، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ہیچ مداں
سید سلیمان ندوی
یکم جمادی الثانیہ ۱۳۶۴ھ

---

[1] یہ عبارت سیرۃ النبی ﷺ جلد اول طبع اول کے صفحہ ۲۵۵ کی سطر ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ اور طبع مابعد کے صفحہ ۳۲۳ کی سطر ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷ میں ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع دوم

سیرتِ نبوی ﷺ جلد اول طبع اول کو شائع ہوئے آج چار برس ہوئے، اس اثنا میں خداوند تبارک و تعالیٰ نے اس کو جو مقبولیت عطا فرمائی وہ ہم خاکسارانِ دارالمصنفین کے لئے فخر و نازش کا سرمایہ ہے، نہ صرف یہ کہ عام قدردانوں نے اس کو دل و جان سے خریدا اور امراء اور والیانِ ممالک نے اس کی خدمت کو سعادتِ دارین سمجھا بلکہ خواص اور علما کے طبقہ نے بھی اس کی قدرشناسی کی۔

ہندوستان میں اہل علم کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس نے اپنے اپنے فن کی میزان نقد میں سیرت کے مضامین و تحقیقات کو نہ تولا، حفاظ نے اس کی آیات قرآنی کو پڑھا، محدثین نے اس کی حدیثیں جانچیں، ادیبوں نے اس کے عربی اشعار اور ترجموں پر نقد کیا، علمائے انساب نے اسماء کی تنقیح کی، منجموں اور حساب دانوں نے اس کے زائچوں اور تاریخوں پر نظر ثانی کی، اہل تاریخ و سیر نے واقعات کی جانچ پڑتال کی اور ہم ممنون ہیں کہ نہایت خلوص و محبت سے انہوں نے اپنے نتائج افکار سے ہم کو مطلع کیا اور ہم نے ان سے فائدہ اٹھایا۔

طبع اول میں جیسا کہ خاتمہ میں ہم نے اقرار کیا تھا، چھاپہ کے اغلاط اور سہو کے چند مسامحات رہ گئے تھے، اس طبع میں جہاں تک امکانِ انسانی ہے تصحیح کی انتہائی کوشش کی گئی ہے اور یقین ہے کہ ان شاءاللہ یہ اغلاط اور مسامحات سے پاک ہوگا، جو لوگ سیرت پر نقد کرنا چاہتے ہوں، ان کو یہی نسخہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔

طبع اول بڑی تقطیع پر شائع ہوئی تھی، لوگوں کا اصرار تھا کہ طبع ثانی کتابی تقطیع پر شائع ہو، تاکہ وہ بہ آسانی ہر وقت استعمال میں آسکے، یہ ان کی تعمیل ہے، ان شاءاللہ ہر جلد کے طبع اول کی بڑی تقطیع کے بعد طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر شائع ہوتی رہے گی۔

سید سلیمان ندوی

۲۸۔ ذیقعدہ ۱۳۴۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع اوّل

سیرت نبوی ﷺ جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے، آج ۷ سال کے بعد اس کی پہلی جلد شائقین کے ہاتھ میں جاتی ہے، میں اپنا دل اس وقت مسرت آمیز اطمینان سے لبریز پاتا ہوں کہ استاد محترم نے اپنی زندگی کے آخری لمحہ میں جو فرض میرے سپرد کیا تھا، الحمدللہ کہ اس کے ایک حصہ سے آج سبکدوش ہوتا ہوں۔ع

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

لیکن اس مسرت اور اطمینان کے ساتھ یہ حسرتناک منظر بھی سامنے ہے کہ مصنف اپنی چار سال کی جانکاہ محنت کا ثمرہ خود اپنے ہاتھ سے قوم کی نذر نہ کر سکا اور حسن عقیدت کے جو پھول سینکڑوں چمن کدوں سے چن کر ان کے ہاتھ آئے تھے، ان کو آستانۂ نبوت پر وہ خود نہ چڑھا سکا۔

مصنف مرحوم کو سیرت نبوی ﷺ کے لکھنے کا خیال الفاروق کے بعد ہی پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ ۱۳۲۳ھ میں اس کا ایک مختصر سا حصہ یعنی غزوۂ اُحد تک وہ لکھ بھی چکے تھے [1] کہ بعض مشکلات کی بنا پر رک گئے، لیکن ملک کا تقاضائے شوق برابر جاری رہا، بالآخر انہوں نے ۱۳۳۰ھ میں اس بار امانت کے اٹھانے کا آخری فیصلہ کر لیا، چنانچہ پچاس ہزار روپے کے سرمایہ کے لئے انہوں نے قوم میں مرافعہ پیش کیا، سینکڑوں مسلمان اس خدمت کے لئے آگے بڑھے، ان میں فقرائے امت بھی تھے اور امرائے ملت بھی، لیکن یہ سعادت اخروی ازل ہی سے خادمة الملة النبوية مخدومة الامة المحمدية نواب سلطان جہاں بیگم تاج الہند فرمان روائے بھوپال متع اللہ المسلمين بطول بقائها و دوام ملكها کے لئے مقدر تھی، اس لئے وہ سب سے آگے بڑھیں اور سوانح نگار نبوت کو دوسرے آستانوں سے بے نیاز کر کے اس سرمایہ سعادت کو اپنے خزانہ عامرہ میں شامل کر لیا، فرمانروا خواتین اسلام نے جو مذہبی کارنامے اب تک انجام دیے ہیں، آئندہ مؤرخ غالباً اس کارنامہ کو ان میں سب سے بڑا قرار دے گا کہ اس کا تعلق اس ذاتِ اقدس ﷺ سے ہے، جو اسلام کی تاریخ میں کائنات کی سب سے بڑی ہستی ہے۔

مصنف مرحوم کی وفات کے بعد شاید دوبارہ اس خدمت گزاری کیلئے مسلمانوں میں قرعہ اندازی ہوتی، لیکن فرمان روائے بھوپال نے مصنف کے جانشینوں کے لئے بھی سلسلۂ فیض کو برابر جاری رکھا، مصنف مرحوم کے منشا کے مطابق [2] اس موقع پر منشی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ بھوپال کا نام لینا بھی ضروری ہے جن کی

[1] یہ مسودہ اب تک موجود ہے۔ [2] مکاتیب شبلی جلد اول، صفحہ:۲۶۱۔

مروحہ جنبانی سے نسیم سعادت کے یہ جھونکے اس باغ قدس میں دوبارہ آئے۔

مصنف مرحوم نے جو مسودہ چھوڑا تھا، اس میں اس حصہ تک مبیضہ صاف تھا، البتہ تین چار مقامات پر اضافہ کی علامت بنی تھی اور مطالب کا اشارہ تھا، ان کو بڑھا دیا گیا، معلوم ہوتا ہے کہ اس حصہ کی تکمیل کے بعد ان کو خیال آیا کہ قدیم مؤرخین کی طرح سنہ وار واقعات کی ترتیب رکھ کر ہر سنہ کے آخر میں جزئی حالات ''واقعات متفرقہ'' کے عنوان سے لکھ دیے جائیں، چنانچہ مبیضہ پر ۴ھ تک اپنے قلم سے وہ لکھ سکے، یہ امانت جب میرے سپرد ہوئی تو میں نے بقیہ سنین کے آخر میں اسی قسم کے جزئیات متفرقہ کا اضافہ کر دیا، حواشی یا حوالے کہیں کہیں چھوٹ گئے تھے، وہ ڈھونڈ کر لکھے، لیکن اس کی کامل احتیاط کی گئی کہ جامع کا کوئی لفظ بلکہ کوئی حرف مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں نہ ملنے پائے، چنانچہ ان تمام جزئی اضافوں کو قوسین کے اندر جگہ دی گئی ہے، اس بنا پر لفظ ''ﷺ'' یا جملہ ہائے معترضہ کے علاوہ جو چند فقرے اور علامتیں قوسین میں ہیں وہ اضافہ ہیں۔

یہ پہلے خیال تھا کہ جلد اول کو وفات تک وسعت دی جائے لیکن جب کتابت شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ ضخامت ۸۰۰ صفحات کو پہنچ جائے گی اور اس سے جلد کی نفاست کو صدمہ پہنچے گا، سامانِ طبع کی گرانی سے جو تعویق پیدا ہو رہی تھی، اس نے مجبور کیا کہ اس کو دو جلدوں میں تقسیم کر دیا جائے، چنانچہ پہلی جلد سلسلۂ جنگ و غزوات پر ختم کر دی گئی اور دوسری جلد اسلام کی امن کی زندگی، تنظیم و تنسیق، اشاعت اسلام، وفات اور اخلاق کی الگ کر دی گئی، خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کی طبع و اشاعت کی توفیق عطا فرمائے۔ ﴿حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ﴾

مصنف مرحوم کتاب کا سرنامہ لکھنے نہ پائے تھے، ان کے مسودات میں اتفاقاً یہ تحریر قلم زدہ مل گئی، اسی کو غنیمت سمجھ کر تبرکاً داخل کتاب کیا جاتا ہے۔

جامع

سید سلیمان ندوی

۲۰/ ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔

سر نامہ

ایک گدائے بے نوا، شہنشاہِ کونین کے دربار
میں، اخلاص و عقیدت کی نذر لے کر آیا ہے،

زچشمم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

"شبلی"
شوال ۱۳۳۰ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مقدمہ

(فن روایت)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

سیرت نبوی کی تالیف کی ضرورت

عالم کائنات کا سب سے مقدم فرض اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوس انسانی کے اخلاق وتربیت کی اصلاح وتکمیل کی جائے، یعنی پہلے ہر قسم کے فضائل اخلاق، زہد وتقویٰ، عصمت وعفاف، احسان و کرم، حلم وعفو، عزم وثبات، ایثار ولطف، غیرت واستغنا کے اصول وفروع نہایت صحیح طریقہ سے قائم کئے جائیں اور پھر تمام عالم میں ان کی عملی تعلیم رائج کی جائے۔

اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ وپند ہے، اس سے زیادہ متمدن طریقہ یہ ہے کہ فنِ اخلاق میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھ کر تمام ملک میں پھیلائی جائیں اور لوگوں کو ان کی تعلیم دلائی جائے، ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بہ جبر محاسن اخلاق کی تعمیل کرائی جائے اور رذائل سے روکے جائیں۔

یہی طریقے ہیں جو ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں جاری ہیں اور آج اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا، لیکن سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے، نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں، نہ جبر وزور سے کام لیا جائے، بلکہ فضائل اخلاق کا ایک پیکر مجسم سامنے آ جائے جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو، جس کی ہر جنبش لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے اور جس کا ایک ایک اشارہ، اوامر سلطانی بن جائے، دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے، سب انہی نفوس قدسیہ کا پرتو ہے، دیگر اور اسباب صرف ایوان تمدن کے نقش ونگار ہیں۔

پیغمبروں پر آنحضرت ﷺ کی تاریخی فضیلت

لیکن اس وقت تک دنیا کی جس قدر تاریخ معلوم ہے، اس نے اس قسم کے نفوسِ قدسیہ جو پیش کئے ہیں، وہ فضائلِ اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے، مثلاً: جناب مسیح علیہ السلام کے مکتب درس میں صرف حلم وتحمل، صلح وعفو، قناعت وتواضع کی تعلیم ہوتی تھی، حکومت وفرمانروائی کے لئے جو فضائل واخلاق درکار ہیں، مسیحی تعلیم کی بیاض میں ان سطروں کی جگہ سادی ہے، حضرت موسیٰ اور نوح علیہما السلام کے اوراق تعلیم میں عفو عام کے صفحے خالی ہیں، اس بنا پر ہر ہر قدم پر نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی اور اس لئے عالمِ انسانی اپنی تکمیل کے لئے ہمیشہ ایسے جامعِ کامل [1]

[1] یہاں پر کتاب کی اس عبارت بالا کے مخاطب اہل کتاب ہیں جن کے موجودہ صحیفوں میں ان انبیا علیہم السلام کے جو احوال مذکور ہیں، وہ اسی صورت میں ہیں، اس لئے مصنف نے ان کے بیان کردہ تمام احوال کو مان کر ایک باکمال اور ہمہ کمال ہستی کی ضرورت (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کا محتاج رہا جو صاحب شمشیر و نگین بھی ہو اور گوشہ نشین بھی، بادشاہ کشور کشا بھی ہو اور گدا بھی، فرمان روائے جہاں بھی ہو اور سُبحہ گرداں بھی، مفلس قانع بھی ہو اور غنی دریا دل بھی، یہ برزخ کامل، یہ ہستی جامع، یہ صحیفۂ یزدانی، عالم کون کی آخری معراج ہے۔﴿ اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۳) ''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا۔''

عالم فانی کی کوئی چیز ابدی نہیں، اس لئے یہ ہستی جامع، دنیا میں آ کر ہمیشہ نہیں رہ سکتی، اس لئے ضرور

(گزشتہ سے پیوستہ) پر ان کے سامنے حجت قائم کی ہے۔ لیکن چونکہ از روئے اسلام ایک طرف تمام انبیا علیہم السلام کی صداقت پر یکساں ایمان لانا اور ان کو تمام پیغمبرانہ کمالات سے متصف جاننا ضروری ہے جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:﴿ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۳۶) ''ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔'' اس لئے یہ ضروری ہے کہ تمام انبیا علیہم السلام کو یکساں صادق اور کمالاتِ نبوت سے متصف مانا جائے، دوسری طرف ارشاد ہے:

﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۵۳)

''یہ حضرات مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے اُن میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے (مثلاً) بعضے ان میں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے ہیں (یعنی موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں سے بہت سے درجوں پر سرفراز کیا اور ہم نے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو کھلے کھلے دلائل عطا فرمائے اور ہم نے ان کی تائید روح القدس (یعنی جبرائیل علیہ السلام) سے فرمائی۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے مراتب کمالیہ میں جزئی تفاوت بھی ہے ان دونوں صداقتوں کے درمیان تطبیق کے لئے تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام تمام کمالات نبوت و فضائل اخلاق سے یکساں سرفراز تھے مگر زمانہ اور ماحول کے ضروریات اور مصالح الٰہی کی بنا پر ان تمام کمالات کا عملی ظہور تمام انبیا میں یکساں نہیں ہوا بلکہ بعض کے بعض کمالات اور دوسروں کے دوسرے کمالات زیادہ نمایاں ہوئے، یعنی جس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے جس کمال کے اظہار کی ضرورت ہوئی وہ پوری شدت سے ظاہر ہوا اور دوسرے کمال کا جس کی اس وقت ضرورت پیش نہیں آئی، بہ مصلحت یہ کمال ظہور نہیں ہوا۔

حاصل یہ ہے کہ ہر کمال کے ظہور کے لئے مناسب موقع و محل کی ضرورت ہوتی ہے، اگر کسی عارض کی وجہ سے کسی کمال کا ظہور نہ ہو تو اس سے نفس کمال کے وجود کی نفی نہیں ہوتی ہے، اس لئے اگر بوجہ عدم ضرورتِ حال ان انبیائے کرام علیہم السلام کے بعض کمالات کا عملی ظہور کسی وقت میں نہیں ہوا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ حضرات (نعوذ باللہ) ان کمالات و فضائل سے متصف نہ تھے۔

غزوۂ بدر کے قیدیوں کے باب میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینے کا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے قتل کا مشورہ دیا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے شدت و رحمت میں لوگوں کے قلوب مختلف بنائے ہیں۔ اے ابوبکر! تمہاری مثال ابراہیم و عیسیٰ علیہما السلام کی اور اے عمر! تمہاری مثال نوح و موسیٰ علیہما السلام کی ہے یعنی ایک فریق سے رحم و کرم کا اور دوسرے سے شدت کا اظہار ہوا۔'' (تفصیل کے لئے دیکھئے: مسند احمد، ج ۱، ص: ۳۸۳)

اس حدیث میں اسی نقطہ اختلاف کی طرف اشارہ ہے جو انبیا علیہم السلام کے مختلف احوال مبارکہ میں رونما رہا ہے لیکن حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت چونکہ آخری اور عمومی ہے، اس لئے بہ ضرورت احوال آپ کے تمام کمالات نبوت آپ کی زندگی میں عملاً پوری طرح جلوہ گر ہوئے اور آپ کی نبوت کے آفتاب عالم تاب کی ہر کرن دنیا کے لئے مشعل ہدایت بنی اور ظلمت کدہ عالم کا ہر گوشہ آپ کے ہر قسم کے کمالات کے ظہور سے پُرنور ہوا۔ (ﷺ)، اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان جزئی کمالات کے اظہار میں ایسا پہلو نعوذ باللہ پیدا نہ ہونے پائے جس سے دوسرے انبیا علیہم السلام کی توہین یا کسر شان پیدا ہو کہ اس سے ایمان کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہے۔

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے (معارف محرم و صفر ۱۳۵۶ھ/۹/ مطابق مارچ و اپریل: ۱۹۳۷ء) میں مضمون ''خلیل کی بشریت'') س۔

ہے کہ اس کی زبان کا ایک ایک حرف، اس کی حرکات وسکنات کی ایک ایک ادا، اس کے حلیۂ وجود کے ایک ایک خط وخال کا عکس لے لیا جائے کہ مراحل زندگی میں جہاں ضرورت پیش آئے رہنمائی کے کام آئے، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح دیگر تمام داعیان مذہب جامعیت کبریٰ کے وصف سے خالی تھے، ان کے کارنامہ زندگی کی تصویریں بھی ناتمام لی گئیں، جناب مسیح علیہ السلام کی ۳۳ سالہ زندگی میں سے صرف ۳ برس کے حالات معلوم ہیں، فارس کے مصلحان دین صرف شاہنامہ کے ذریعہ سے روشناس ہیں، ہندوستان کے پیغمبر، افسانوں کے حجاب میں گم ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت آج جو کچھ معلوم ہے اس کا ذریعہ صرف موجودہ تورات ہے، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ۳۰۰ برس بعد عالم وجود میں آئی، یہ قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ ان کے کارنامے اور اصول تعلیم ابدی نہ تھے، اس لئے نقل و روایت کے آئینہ میں جس قدر ان کا ناتمام عکس اترا اس سے زیادہ ضروری بھی نہ تھا۔ قدرت، خود ضرورت کی اندازہ داں ہے اور جب جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ خود مہیا کر دیتی ہے۔

تمام اربابِ مذاہب میں سے ہر ایک کو اپنا مذہب اسی قدر عزیز ہے جس قدر دوسرے کو ہے، اس لئے اگر بے پردہ یہ سوال کیا جائے کہ دنیا میں کون ہستی تھی جس میں جامعیت کبریٰ کا وصف نمایاں تھا؟ تو ہر طرف سے مختلف صدائیں آئیں گی، لیکن اگر یہی سوال اس پیرایہ میں بدل دیا جائے کہ دنیا میں وہ کون شخص گزرا ہے جس کا کارنامۂ زندگی، اس طرح قلمبند ہوا کہ ایک طرف توصحت کا یہ انتظام تھا کہ کسی صحیفۂ آسمانی کے لئے بھی نہ ہوسکا اور دوسری طرف وسعت اور تفصیل کے لحاظ سے یہ حالت ہے کہ اقوال وافعال، وضع وقطع، شکل و شباہت، رفتار وگفتار، مذاق طبیعت، انداز گفتگو، طرزِ زندگی، طریقِ معاشرت، کھانے پینے، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، ہنسنے بولنے کی ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی، تو اس سوال کے جواب میں صرف ایک صدا بلند ہوسکتی ہے (محمد عربی فدیتہ بابی و امی)

سیرت کی ضرورت علمی حیثیت سے

یہ جو کچھ کہا گیا، مقصد تصنیف کا مذہبی پہلو تھا، اسی مسئلہ کو علمی حیثیت سے دیکھو، علوم وفنون کی صف میں سیرت (بائیوگرافی) کا ایک خاص درجہ ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے حالاتِ زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لئے دلیل راہ ہیں، چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہشیں رکھتا ہے، کیا کیا منصوبے باندھتا ہے، اپنے چھوٹے سے دائرۂ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے، کیونکر ترقی کے زینوں پر چڑھتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے، کیا کیا مزاحمتیں اٹھاتا ہے، تھک کر بیٹھ جاتا ہے، سستاتا ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے، غرض سعی وعمل، جدوجہد، ہمت وغیرت کی جو عجیب وغریب نیرنگیاں سکندر اعظم کے کارنامۂ زندگی میں موجود ہیں، بعینہٖ یہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصۂ حیات

میں بھی نظر آتا ہے۔

اس بنا پر اگر سیرت اور سوانح کا فن عبرت پذیری اور نتیجہ رسی کی غرض سے درکار ہے تو ''شخص'' کا سوال نظر انداز ہو جاتا ہے، صرف یہ دیکھنا رہ جاتا ہے کہ حالات اور واقعات جو ہاتھ آتے ہیں، وہ کس وسعت اور استقصا و تفصیل کے ساتھ ہاتھ آتے ہیں، تاکہ مراحل زندگی کی تمام راہیں اور ان کے پیچ و خم ایک ایک کر کے نظر کے سامنے آ جائیں، لیکن اگر خوش قسمتی سے فرد کامل اور استقصائے واقعات دونوں باتیں جمع ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر اس فن کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔

وجوہِ مذکورۂ بالا کی بنا پر کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ صرف ہم مسلمانوں کو نہیں، بلکہ تمام عالم کو اس وجود مقدس کی سوانح عمری کی ضرورت ہے، جس کا نام مبارک ''محمد'' (رسول اللہ) ﷺ ہے۔ (اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْهِ وَسَلِّمْ صَلٰوۃً کَثِیْرًا کَثِیْرًا) یہ ضرورت، صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک علمی ضرورت ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے اور مختصر یہ ہے کہ مجموعۂ ضروریات دینی و دنیوی ہے۔

میں اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ اسلام کی حیثیت سے میرا فرضِ اولین یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے میں سیرت نبوی ﷺ کی خدمت انجام دیتا، لیکن یہ ایک ایسا اہم اور نازک فرض تھا کہ میں مدت تک اس کے ادا کرنے کی جراءت نہ کر سکا، تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس فرض کے ادا کرنے کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں۔

علمِ کلام کی حیثیت سے سیرت کی ضرورت

اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت، صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضینِ حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب، صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے، لیکن جب اقرار نبوت بھی جز و مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی اور سفیرِ الٰہی تھا، اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے؟

یورپ کے مؤرخین، آنحضرت ﷺ کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں، وہ (نعوذ باللہ) ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے، آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے، اس لئے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر اسلام ﷺ کے حالات اور سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے تو انہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح یہ زہر آلود معلومات آہستہ آہستہ اثر کرتی جاتی ہیں اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی، یہاں تک کہ ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو پیغمبر ﷺ کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے جس نے اگر مجمع انسانی میں کوئی اصلاح کر دی تو اس کا فرض ادا ہو گیا، اس بات سے اس کے منصبِ نبوت میں فرق نہیں آتا کہ اس کے دامن اخلاق پر معصیت کے دھبے بھی ہیں۔

یہ واقعات تھے جنہوں نے مجھ کو بالآخر مجبور کیا اور میں نے سیرت نبوی ﷺ پر ایک مبسوط کتاب لکھنے

کا ارادہ کرلیا، یہ کام بظاہر نہایت آسان تھا، عربی زبان میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، ان کو سامنے رکھ کر ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھ دینا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کا کام تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیر طلب اور جامع مشکلات نہیں ہوسکتی۔

سیرت اور حدیث کا فرق

آگے چل کر ہم تفصیل سے بیان کریں گے کہ خاص سیرت [1] پر آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی

---

[1] (اس موقع پر ایک نہایت ضروری بحث طے کر دینے کے قابل ہے، جو آج کل کی قلت علم اور ناآشنائی فن نے پیدا کر دی ہے، بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ سیرت فن حدیث ہی کی ایک خاص قسم کا نام ہے، یعنی احادیث میں سے وہ واقعات الگ لکھ دیے گئے جو آنحضرت ﷺ کے اخلاق و عادات سے متعلق ہیں، تو یہ سیرت بن گئی اور چونکہ حدیث میں متعدد کتابیں ایسی موجود ہیں جن میں ایک حدیث بھی ضعیف نہیں، مثلاً: صحیح بخاری و مسلم، تو یہ کہنا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ ''سیرت میں کوئی کتاب آج تک صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی''۔ اس بحث کے ذہن نشین کرنے کے لئے امور ذیل پیش نظر رکھنے چاہئیں:

(1) پہلی بحث یہ ہے کہ سیرت کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے؟ محدثین اور ارباب رجال کی اصطلاح قدیم یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے خاص غزوات کو مغازی اور سیرت کہتے تھے، چنانچہ ابن اسحاق کی کتاب کو مغازی بھی کہتے ہیں اور سیرت بھی، حافظ ابن حجر فتح الباری کتاب المغازی میں یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ فقہ کی بھی یہی اصطلاح ہے، فقہ میں جو باب کتاب الجہاد والسیر باندھتے ہیں، اس میں سیرت کے لفظ سے غزوات اور جہاد کے احکام مراد ہوتے ہیں۔

کئی صدی تک یہی طریقہ رہا۔ چنانچہ تیسری صدی تک جو کتابیں سیرت کے نام سے مشہور ہوئیں، مثلاً: سیرت ابن ہشام، سیرت ابن عائذ، سیرت اموی وغیرہ، ان میں زیادہ تر غزوات ہی کے حالات ہیں، البتہ زمانہ مابعد میں، مغازی کے سوا اور چیزیں بھی داخل کر لی گئیں، مثلاً: مواہب لدنیہ میں غزوات کے علاوہ سب کچھ ہے۔

اس بنا پر محدثین کی اصطلاح میں مغازی اور سیرت عام فن حدیث سے ایک الگ چیز ہے، یہاں تک کہ بعض موقعوں پر ارباب سیر اور محدثین، دو مقابل کے گروہ سمجھے جاتے ہیں، بعض واقعات کے متعلق یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ تمام ارباب سیر ایک طرف ہوتے ہیں اور امام بخاری و مسلم ایک طرف، ایسے موقع پر بعض لوگ امام بخاری کی روایت کو اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے کہ تمام ارباب سیر کے خلاف ہے، لیکن محققین کہتے ہیں کہ حدیث صحیح تمام ارباب سیر کی متفقہ روایت کے مقابلہ میں بھی قابل ترجیح ہے، ہم اس موقع پر ایک دو واقعہ مثال کے طور پر لکھتے ہیں:

☆ غزوات میں ایک غزوہ ذوقرد کے نام سے مشہور ہے، اس کی نسبت ارباب سیر متفق ہیں کہ صلح حدیبیہ سے قبل واقع ہوا تھا، لیکن صحیح مسلم میں سلمہ بن الاکوع سے جو روایت ہے [مسلم، کتاب الجهاد، رقم: ۱۸۰۷] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد اور خیبر سے تین دن قبل کا واقعہ ہے، اس حدیث کی شرح میں علامہ قرطبی نے لکھا ہے:

لا یختلف اهل السیر ان غزوة ذی قرد کانت قبل الحدیبیة فیکون ما وقع فی حدیث سلمة من وهم بعض الرواة۔

''اہل سیر میں سے کسی کو اس امر میں اختلاف نہیں ہے کہ غزوۂ ذی قرد، حدیبیہ سے پہلے واقع ہوا تھا تو سلمہ کی حدیث میں جو مذکور ہے، وہ کسی راوی کا وہم ہوگا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری (ذکر غزوۂ ذی قرد) میں قرطبی کے اس قول پر بحث کر کے لکھتے ہیں:

فعلی هذا ما فی الصحیح من التاریخ لغزوة ذی قرد صح مما ذکره اهل السیر۔

''تو اس بنا پر صحیح (مسلم) میں غزوۂ ذی قرد کی جو تاریخ مذکور ہے وہ اس سے زیادہ صحیح ہے جو مصنفین سیرت نے بیان کی ہے۔''

☆ دمیاطی ایک مشہور محدث ہیں، انہوں نے سیرت میں ایک کتاب لکھی ہے جو آج بھی موجود ہے، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

گئی، جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا، حافظ زین الدین عراقی جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے، سیرت نبوی میں لکھتے ہیں:

ولیعلم الطالب ان السیرا تجمع ماصح وما قد انکرا

''یعنی طالب فن کو جاننا چاہیے کہ سیرت میں ہر قسم کی روایتیں نقل کی جاتی ہیں، صحیح بھی اور قابل انکار بھی۔''

یہی سبب ہے کہ مستند اور مسلم الثبوت تصنیفات میں بھی بہت سی ضعیف روایتیں شامل ہو گئیں، اس بنا پر ضروری تھا کہ نہایت کثرت سے حدیث ورجال کی کتابیں بہم پہنچائی جائیں اور پھر نہایت تحقیق اور تنقید سے

(گزشتہ سے پیوستہ) اس میں انہوں نے اکثر موقعوں پر ارباب سیر کی روایت کو ترجیح دی تھی لیکن جب زیادہ تتبع کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ احادیث صحیحہ کو سیرت کی روایتوں پر ترجیح ہے، چنانچہ اپنی کتاب میں ترمیم کرنی چاہی لیکن اس کے نسخے کثرت سے شائع ہو گئے تھے، اس لئے نہ کر سکے۔ حافظ ابن حجر خود دمیاطی کا قول نقل کر کے لکھتے ہیں:

ودل ھذا علی انہ کان یعتقد الرجوع عن کثیر مما وافق فیہ اھل السیر و خالف الاحادیث الصحیحۃ وان ذلک کان بہ قبل تضلعہ منھا ولخروج نسخ کتابہ و انتشارہ لم یتمکن من تغییرہ۔
(زرقانی برمواہب، جلد ۳، صفحہ: ۱۱)

''اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ (یعنی دمیاطی) قصد کر چکے تھے کہ جن موقعوں پر انہوں نے ارباب سیر سے اتفاق کر کے احادیث صحیحہ کی مخالفت کی ہے، ان سے رجوع کریں گے اور یہ کہ یہ امر ان سے مہارت فن سے قبل صادر ہوا، لیکن چونکہ کتاب کے نسخے شائع ہو چکے تھے اس لئے وہ اپنی کتاب کی اصلاح نہ کر سکے۔''

2 ایک غزوہ ذات الرقاع کے نام سے مشہور ہے، اس کی نسبت اکثر ارباب سیر کا اتفاق ہے کہ جنگ خیبر کے قبل واقع ہوا تھا، لیکن امام بخاری نے تصریح کی ہے کہ خیبر کے بعد واقع ہوا، بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ ذات الرقاع اس پر علامہ دمیاطی نے بخاری کی روایت سے اختلاف کیا، حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں:

و اما شیخہ الدمیاطی فادعی غلط الحدیث الصحیح و ان جمیع اھل السیر علی خلافہ۔
(فتح الباری، جزء ہفتم، صفحہ: ۳۲۲)

''باقی ان کے شیخ دمیاطی تو انہوں نے حدیث صحیح کی نسبت اس بنا پر غلطی کا دعویٰ کیا ہے کہ تمام اہل سیر بالاتفاق اس کے خلاف ہیں۔'' حافظ ابن حجر نے اس قول کو نقل کر کے اس کا رد بھی کیا ہے۔

اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ سیرت ایک جداگانہ فن ہے اور بعینہٖ فن حدیث نہیں ہے اور اس بنا پر اس کی روایتوں میں اس درجہ کی شدت احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی جو فن صحاح ستہ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ فقہ کا فن قرآن اور حدیث ہی سے ماخوذ ہے، لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بعینہٖ قرآن یا حدیث ہے یا ان دونوں کے ہم پلہ ہے۔

3 مغازی اور سیرت میں جس قسم کی جزئی تفصیلیں مقصود ہوتی ہیں، وہ فن حدیث کے اصلی بلند معیار کے موافق نہیں مل سکتیں، اس لئے ارباب سیر کو تنقید اور تحقیق کا معیار کم کرنا پڑتا ہے، اس بنا پر سیرت و مغازی کا رتبہ فن حدیث سے کم رہا۔

4 جس طرح امام بخاری و مسلم نے یہ التزام کیا کہ کوئی ضعیف حدیث بھی اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے، اس طرح سیرت کی تصنیفات میں کسی نے یہ التزام نہیں کیا، آج بیسیوں کتابیں قدما سے لے کر متاخرین تک کی موجود ہیں۔ مثلاً: سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، سیرت ابن سید الناس، سیرت دمیاطی، حلبی، مواہب لدنیہ، کسی میں یہ التزام نہیں۔

تفصیل مذکورۂ بالا سے ظاہر ہوا ہوگا کہ ہماری اس عبارت کا کہ ''سیرت میں آج تک کوئی کتاب صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی'' اس کا کیا مطلب ہے اور کہاں تک صحیح ہے۔

ایک مستند تصنیف تیار کی جائے، لیکن سینکڑوں کتابوں کا استقصا کے ساتھ دیکھنا اور ان سے معلومات کا اقتباس کرنا، ایک شخص کا کام نہ تھا، اس کے ساتھ ایک ضرورت یہ بھی تھی کہ یورپ میں آنحضرت ﷺ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے واقفیت حاصل کی جائے۔ میں بدقسمتی سے یورپ کی کوئی زبان نہیں جانتا، اس لئے ایک محکمۂ تصنیف کی ضرورت تھی، جس میں قابل عربی دان اور مغربی زبانوں کے جاننے والے شامل ہوں، خدا نے جب یہ سامان پیدا کر دیئے تو اب مجھ کو کیا عذر ہو سکتا تھا، اب بھی اگر اس فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہتا تو اس سے بڑھ کر کیا بدقسمتی ہو سکتی تھی۔

مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے پیغمبر ﷺ کے حالات اور واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصا کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلمبند نہیں ہو سکے اور نہ آیندہ توقع کی جا سکتی ہے، اس سے زیادہ کیا عجیب بات ہو سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے افعال اور اقوال کی تحقیق کی غرض سے آپ ﷺ کو دیکھنے والوں اور ملنے والوں میں سے تقریباً تیرہ ہزار شخصوں کے نام اور حالات قلمبند کئے گئے اور اس زمانہ میں کئے گئے جب تصنیف و تالیف کا آغاز تھا۔ طبقات ابن سعد، کتاب الصحابۃ لابن السکن، کتاب لعبد اللہ بن علی بن جارود، کتاب العقیلی فی الصحابۃ، کتاب ابن ابی حاتم الرازی، کتاب الارزق، کتاب الدولابی، کتاب البغوی [1] طبقات ابن ماکولا، اسد الغابۃ، استیعاب، اصابہ فی احوال الصحابۃ، صرف انہی بزرگوں کے حالات میں ہیں۔ کیا دنیا میں کسی شخص کے رفقا میں سے اتنے لوگوں کے نام اور حالات درج تحریر ہو سکتے ہیں؟

سیرت نبوی ﷺ کے متعلق قدما نے جو ذخیرہ [2] مہیا کیا، اس کی مختصر تاریخ اور کیفیت ہم اس غرض سے اس موقع پر درج کر دیتے ہیں کہ ایک کامل اور مستند کتاب کے مرتب کرنے کے لئے اس ذخیرہ سے کیونکر کام لیا جا سکتا ہے اور کہاں تک تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے۔

فن سیرت کی ابتدا اور تحریری سرمایہ

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ چونکہ عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا اور اسلام میں تدوین و تالیف کا آغاز خلیفہ منصور عباسی کے زمانہ سے (تقریباً ۱۴۳ھ میں) ہوا۔ اس لئے اس زمانہ تک سیرت اور روایات کا جو کچھ ذخیرہ تھا۔ زبانی تھا۔ تحریری نہ تھا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج (گو کم سہی) مدت سے چلا آتا ہے، بہت قدیم زمانہ میں حمیری اور نبطی خط تھا۔ جس کے کتبے آج نہایت کثرت

---

[1] ان کتابوں کا ذکر استیعاب کے دیباچہ میں ہے۔

[2] ملحوظ رکھنا چاہیے کہ حدیث کی کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے حالات اور اخلاق و عادات کے متعلق نہایت کثرت سے واقعات مذکور ہیں جو سیرت میں کافی مدد دے سکتے ہیں، تاہم تنہا ان سے ایک تاریخی تصنیف تیار نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ ان میں تاریخی ترتیب نہیں ہے، یہاں ہم نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے، حدیث کی کتابیں ان کے علاوہ ہیں۔

سے یورپ کی بدولت مہیا ہو گئے ہیں۔ اسلام سے کچھ پہلے وہ خط ایجاد ہوا جو عربی خط کہلاتا ہے اور جس نے بہت سی صورتیں بدل کر آج یہ صورت اختیار کر لی ہے۔

اس خط کی تاریخ اور اس کی ابتدا کے متعلق جو قدیم روایتیں کتابوں میں مذکور ہیں اکثر افسانہ ہیں، مثلاً: ابن الندیم نے کلبی سے نقل کیا ہے کہ اول اول جن لوگوں نے عربی خط ایجاد کیا ان کے نام یہ تھے ابو جاد، ہواز، حطی، کلمون، سعفص، قریشیا (یہی نام ہیں جن کو ہم آج ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت کہتے ہیں) اسی طرح کعب کا یہ قول کہ تمام خطوط حضرت آدم علیہ السلام نے ایجاد کیے تھے، ابن الندیم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جس نے عربی خط لکھا وہ تین شخص قبیلہ بولان (قبیلہ طے کی ایک شاخ) کے تھے، جو انبار میں آباد تھے، ان کے نام مرامر بن مرہ، اسلم بن سدرہ، عامر بن جدرہ تھے۔

ان تمام روایتوں میں جو قرین قیاس ہے، وہ روایت ہے جو ابن الندیم نے عمرو بن شعبہ کی کتاب مکہ سے نقل کی ہے، یعنی سب سے پہلے عربی خط ایک شخص نے ایجاد کیا جو بنو مخلد بن نضر بن کنانہ کے خاندان سے تھا اور غالباً یہ وہ زمانہ ہے جب قریش نے عروج حاصل کر لیا تھا اور تجارت کے ذریعہ سے بیرونی ممالک میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ ابن الندیم نے لکھا ہے کہ میں نے مامون الرشید کے کتب خانہ میں ایک دستاویز دیکھی تھی جو عبدالمطلب بن ہاشم (آنحضرت ﷺ کے جد امجد) کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی، اس کے الفاظ یہ تھے:

حق عبدالمطلب بن هاشم من اهل مكة على فلان بن فلان الحميری من اهل وزل صنعاء عليه الف درهم فضة كيلا بالحديدة و متى دعاه بها اجابه شهد الله و الملكان. [1]

''یہ عبدالمطلب بن ہاشم (جو مکہ کا باشندہ ہے) کا قرضہ فلاں شخص پر ہے جو صنعا کا رہنے والا ہے، یہ چاندی کے ہزار درہم ہیں، جب طلب کیا جائے گا وہ ادا کرے گا، خدا اور دو فرشتے اس کے گواہ ہیں۔''

اس دستاویز سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالمطلب نے کسی حمیری شخص کو ہزار درہم قرض دیئے تھے، خاتمہ میں دو فرشتوں کی گواہی لکھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں فرشتوں کا (اور شاید کراماً کاتبین کا) اعتقاد موجود تھا۔

ابن الندیم نے لکھا ہے کہ اس دستاویز کا خط ایسا تھا جیسا عورتوں کا خط ہوتا ہے۔

علامہ بلاذری نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی جب بعثت ہوئی تو قریش میں ۷ اشخص لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ یعنی حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت ابو عبیدہ، طلحہ، یزید بن ابی سفیان، ابو حذیفہ بن عتبہ، ابو سفیان، شفاء بنت عبداللہ رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ [2]

---

[1] الفهرست ابن نديم، ص: ۷، ۸، مطبع رحمانيه مصر۔ (س)

[2] فتوح البلدان ذكر خط، ص: ۴۷۱، ۴۷۲، مطبعه بريل ليڈن يورپ: ۱۸۶۶۔

بدر کی لڑائی جو ۲ھ میں ہوئی، اس میں قریش کے جو لوگ گرفتار ہوئے، ان سے فدیہ لیا گیا، لیکن بعض ایسے بھی تھے جو ناداری کی وجہ سے فدیہ نہیں ادا کر سکے، آنحضرت ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ ہر شخص دس دس بچوں کو اپنے ذمہ لے کر ان کو لکھنا سکھا دے، چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جو کاتب وحی ہیں، اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔ [1]

ان واقعات سے معلوم ہوگا کہ عرب اور خصوصاً مکہ و مدینہ میں آنحضرت ﷺ کے زمانہ ہی میں لکھنے پڑھنے کا کافی رواج ہو چکا تھا، البتہ یہ تحقیق طلب ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں روایتیں اور حدیثیں بھی قلمبند ہوئی تھیں یا نہیں اور اس بنا پر سیرت کا کوئی تحریری سرمایہ بھی موجود تھا یا نہیں، بعض حدیثوں میں جن میں سے بعض صحیح مسلم میں مذکور ہیں، تصریح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حدیثوں کے قلمبند کرنے سے منع فرمایا تھا، مسلم کے یہ الفاظ ہیں:

((لَا تَكْتُبُوا عَنِّي وَمَنْ كَتَبَ عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ فَلْيَمْحُهُ)) [2]

''مجھ سے جو سنو، اس کو قلمبند نہ کرو بجز قرآن کے اور کسی نے قلمبند کیا ہو تو اس کو مٹا ڈالنا چاہیے۔''

آنحضرت ﷺ کے زمانہ کی تحریریں

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی زمانہ کا ارشاد ہے کیونکہ متعدد صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ ہی کے زمانہ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم آنحضرت ﷺ کی اجازت سے آپ کے ارشادات قلمبند کر لیا کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ صحابہ میں مجھ سے زیادہ کسی کو حدیثیں محفوظ نہیں، البتہ عبداللہ بن عمرو مستثنیٰ ہیں، کیونکہ وہ آنحضرت ﷺ کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا''۔ [3]

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ آنحضرت ﷺ سے جو سنتے تھے، لکھ لیا کرتے تھے، قریش نے ان کو منع کیا کہ آنحضرت ﷺ کبھی غیظ کی حالت میں ہوتے ہیں، کبھی خوشی میں اور تم سب کچھ لکھتے جاتے ہو، عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا اور آنحضرت ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا، آپ نے دہان مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ''تم لکھ لیا کرو، اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے۔'' [4] خطیب بغدادی نے اپنے رسالہ تقیید العلم میں روایت کی ہے کہ اس بیاض کا نام جس میں عبداللہ آنحضرت ﷺ کی حدیثیں قلمبند کر لیا کرتے تھے ''صادقہ'' تھا۔ [5]

---

[1] طبقات ابن سعد، غزوۂ بدر جزء۲، ق اول، صفحہ: ۱٤۔ [2] مسلم، کتاب الزھد، باب التثبت فی الحدیث: ۷۵۱۰۔ [3] بخاری، کتاب العلم، باب کتابة العلم: ۱۱۳۔

[4] ابو داود، کتاب العلم، باب فی کتابة العلم: ٣٦٤٦۔

[5] جامع بیان العلم للقاضی ابن عبدالبر، مطبوعہ مصر، صفحہ: ۷۷ میں صادقہ کا ذکر ہے۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ جو لوگ اس وقت تک اسلام لا چکے ہیں، ان کے نام قلمبند کیے جائیں، چنانچہ پندرہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم کے نام دفتر میں درج کیے گئے۔ [1]

خطیب بغدادی نے تقیید العلم میں روایت کی ہے کہ ''جب لوگ کثرت سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس حدیثوں کے سننے کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔ تو وہ ایک جنگ نکال لاتے تھے، کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں نے آنحضرت ﷺ سے سن کر لکھ لی تھیں۔''

متعدد قبائل کو آپ نے جو صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بھیجے وہ تحریری تھے اور کتب احادیث میں بعینہٖ منقول ہیں، اسی طرح سلاطین کو دعوت اسلام کے جو پیغام بھیجے گئے وہ بھی تحریری تھے۔

صحیح بخاری (باب کتابۃ العلم: ۱۱۲) میں ہے کہ فتح مکہ کے سال جب ایک خزاعی نے حرم میں ایک شخص کو قتل کر دیا تو آنحضرت ﷺ نے ناقہ پر سوار ہو کر خطبہ دیا، یمن کے ایک شخص نے آ کر درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھ کو تحریر کرا دیا جائے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ اس شخص کے لئے وہ خطبہ قلمبند کرا دیا جائے۔

غرض اس طرح آنحضرت ﷺ کی وفات تک حسب ذیل تحریری سرمایہ مہیا ہو گیا تھا۔

① جو حدیثیں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، یا حضرت علی و حضرت انس رضی اللہ عنہم وغیرہ نے قلمبند کیں۔ [2]

② تحریری احکام اور معاہدات (حدیبیہ وغیرہ) اور فرامین جو آنحضرت ﷺ نے قبائل کے نام بھیجے۔ [3]

③ خطوط جو آنحضرت ﷺ نے سلاطین اور امراء کے نام ارسال فرمائے۔ [4]

④ پندرہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم کے نام۔

آنحضرت ﷺ کے بعد اس تحریری ذخیرہ کو اس قدر ترقی ہوتی گئی کہ (بنو العباس سے پہلے) ولید بن یزید کے قتل کے بعد جب احادیث و روایت کا دفتر ولید کے کتب خانہ سے منتقل ہوا تو صرف امام زہری کی مرویات اور تالیفات گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں۔ [5]

مغازی

عرب میں علوم و فنون نہ تھے، صرف خاندانی معرکے اور لڑائیوں کے واقعات محفوظ رکھتے تھے، اس لحاظ سے قیاس یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کے واقعات اور افعال و اقوال میں سب سے پہلے مغازی کی روایتیں پھیلتیں اور سب سے پہلے اسی فن کی بنیاد پڑتی، لیکن روایات کے تمام انواع میں مغازی کا درجہ سب سے متاخر

---

[1] بخاری، کتاب الجهاد، باب کتابة الامام الناس: ۳۰۶۰۔

[2] بخاری، کتاب العلم، باب کتابة العلم: ۱۱۱ تا ۱۱۴؛ ابوداود، کتاب العلم: ۳۶۴۹۔

[3] سنن ابن ماجه، کتاب الزکوٰة، باب صدقة الابل: ۱۷۹۸؛ ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی صلح العدو: ۲۷۶۵۔

[4] بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول الله ﷺ: ۷، باب ما یذکر فی المناولة: ۶۴، ۶۵۔

[5] تذکرة الحفاظ علامه ذهبی، تذکرة امام زهری، ص: ۱۰۰۔

رہا، خلفائے راشدین اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے زیادہ تر آنحضرت ﷺ کے ان اقوال و افعال پر توجہ کی، جن کو شریعت سے تعلق تھا اور جن سے فقہی احکام مستنبط ہوتے تھے۔

امام بخاری نے غزوۂ اُحد کے ذکر میں سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے:

صحبت عبدالرحمن بن عوف وطلحة بن عبيد الله والمقداد وسعدًا فما سمعت احدًا منهم يحدث عن النبي ﷺ الا انى سمعت طلحة يحدث عن يوم أُحدٍ. [1]

''میں عبدالرحمن بن عوف اور طلحہ بن عبیداللہ اور مقداد اور سعد رضی اللہ عنہم کی صحبت میں رہا، لیکن میں نے ان کو کبھی آنحضرت ﷺ کے متعلق حدیث بیان کرتے نہیں سنا بجز اس کے کہ طلحہ رضی اللہ عنہ غزوۂ احد کا واقعہ بیان کرتے تھے۔''

حضرت عبدالرحمن بن عوف اور طلحہ و مقداد اور سعد بن ابی وقاص، اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہیں اور ان سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں، اس لئے اس عبارت کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ غزوات کے واقعات نہیں بیان کرتے تھے، بجز اس کے کہ طلحہ رضی اللہ عنہ جنگ اُحد کے واقعات بیان کیا کرتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ علما میں جن لوگوں نے مغازی کو اپنا فن بنا لیا تھا وہ عوام میں جس قدر مقبول ہوتے تھے خواص میں اس قدر مستند نہیں خیال کئے جاتے تھے، اس فن کے اساطین اور ارکان ابن اسحاق اور واقدی ہیں، واقدی کو تو محدثین علانیہ کذاب کہتے ہیں، ابن اسحاق کو ایک گروہ ثقہ کہتا ہے، لیکن اسی درجہ کا دوسرا گروہ ان کو بے اعتبار سمجھتا ہے، تفصیل آگے آئے گی۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا قول ہے:

ثلاثة كتب ليس لها اصول المغازى و الملاحم والتفسير. [2]

''تین قسم کی کتابیں ہیں، جن کی کوئی اصل نہیں، مغازی اور ملاحم اور تفسیر۔''

خطیب بغدادی نے اس قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ امام ابن حنبل رحمہ اللہ کی مراد ان خاص کتابوں سے ہوگی جو بے اصل ہیں، پھر لکھا ہے: اما كتب التفسير فمن اشهرها كتابا الكلبى ومقاتل بن سليمان و قد قال احمد فى تفسير الكلبى من اوله الى اخره كذب.

''باقی تفسیر کی کتابیں، تو ان میں سے کلبی اور مقاتل کی کتابیں بہت مشہور ہیں، امام احمد بن حنبل نے کہا ہے کہ کلبی کی تفسیر اول سے اخیر تک جھوٹ ہے۔'' پھر لکھتے ہیں:

واما المغازى فمن اشهرها كتاب محمد بن اسحاق وكان يأخذ من اهل الكتاب و قد قال الشافعى كتب الواقدى كذب.

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب ﴿إِذْ هَمَّت طَّائِفَتَانِ مِنكُمْ﴾ : ٤٠٦٢۔

[2] موضوعات ملا علی قاری، ص:٨٥ طبع مجتبائی؛ لسان المیزان، ١/ ٢٠۔

"باقی مغازی تو اس فن کی مشہور کتاب محمد بن اسحاق کی کتاب ہے اور وہ عیسائیوں اور یہودیوں سے روایت کرتے تھے اور امام شافعی نے کہا ہے کہ واقدی کی کتابیں جھوٹ ہیں۔"

باوجود ان باتوں کے یہ ناممکن تھا کہ یہ حصہ نظر انداز کر دیا جاتا، اس لئے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم اور محدثین نہایت احتیاط کے ساتھ جو واقعات جہاں تک خوب محفوظ ہوتے تھے، روایت کرتے تھے۔

تصنیف و تالیف کی ابتدا سلطنت کی وجہ سے ہوئی

صحابہ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں اگرچہ فقہ و حدیث کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی، بہت سے درس کے حلقے قائم ہوئے، لیکن جو کچھ تھا زیادہ تر زبانی تھا، لیکن بنو امیہ نے حکماً علما سے تصنیفیں لکھوائیں، قاضی ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے:

كنانكره كتاب العلم حتى اكرهنا عليه هؤلاء الامراء. ❶

"ہم لوگ علم کا قلمبند کرنا پسند نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ امراء نے ہم کو مجبور کیا۔"

سب سے پہلے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبید بن شریہ کو یمن سے بلا کر قدما کی تاریخ مرتب کرائی، جس کا نام اخبار الماضیین ہے۔ ❷ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد عبدالملک بن مروان نے جو ۶۵ھ میں تخت نشین ہوا، ہر فن میں علما سے تصنیفیں لکھوائیں، سعید بن جبیر جو اعلم العلماء تھے، ان کو حکم بھیجا کہ قرآن مجید کی تفسیر لکھیں، چنانچہ امام موصوف نے تفسیر لکھ کر بھیجی، جو کتب خانہ شاہی میں رکھی گئی، عطاء بن دینار کے نام سے جو تفسیر مشہور ہے انہی کی تفسیر ہے، عطاء کو خزانہ شاہی سے یہ نسخہ ہاتھ آ گیا تھا۔ ❸

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا زمانہ آیا تو انہوں نے تصنیف و تالیف کو زیادہ ترقی دی۔ تمام ممالک میں حکم بھیجا کہ احادیث نبوی ﷺ مدون اور قلمبند کی جائیں، سعد بن ابراہیم جو بہت بڑے محدث اور مدینہ منورہ کے قاضی تھے ان سے دفتر کے دفتر حدیثوں کے قلمبند کرائے اور تمام ممالک مقبوضہ میں بھیجے، علامہ ابن عبدالبر جامع بیان العلم میں لکھتے ہیں:

عن سعد بن ابراهيم قال امرنا عمر بن عبدالعزيز بجمع السنن فكتبنا ها دفترًا دفترًا فبعث الى كل ارض له عليها سلطان دفترًا. ❹

"سعد بن ابراہیم کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے ہم کو احادیث کے جمع کرنے کا حکم دیا، ہم نے دفتر کے دفتر لکھے، عمر نے جہاں جہاں ان کی حکومت تھی، ایک ایک دفتر بھیج دیا۔"

ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری جو اس زمانہ کے بہت بڑے محدث اور امام زہری کے استاد اور مدینہ کے قاضی تھے، ان کو بھی خاص طور پر احادیث کے جمع کرنے کا حکم بھیجا۔ ❺

---

❶ مطبوعه مصر، صفحه: ١٣٦۔ ❷ فهرست ابن النديم، صفحه: ٢٤٤۔ ❸ ميزان الاعتدال، ترجمة عطاء بن دينار، ج ٢، ص: ١٩٧، مطبوعه مصر: ١٣٢٥ھ۔ ❹ مطبوعه مصر، صفحه: ٣٦۔

❺ طبقات ابن سعد، جز ثاني، قسم ثاني، صفحه: ١٣٤۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایتیں

حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرویات کی ایک خاص حیثیت ہے یعنی ان سے اکثر وہ حدیثیں مروی ہیں، جو عقائد یا فقہ کے مہمات مسائل ہیں، اس لئے عمر بن عبدالعزیز نے ان کی روایتوں کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا، عمرہ بنت عبدالرحمن ایک خاتون تھیں، ان کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خاص اپنے آغوش تربیت میں پالا تھا، وہ بہت بڑی محدثہ اور عالمہ تھیں، تمام علما کا اتفاق ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرویات کا ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا، عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن محمد کو خط لکھا کہ عمرہ کے مسائل اور روایات قلمبند کر کے بھیج دیں۔ ❶

مغازی پر خاص توجہ

اب تک مغازی و سیر کے ساتھ اعتنا نہیں کیا گیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس فن کی طرف خاص توجہ کی اور حکم دیا کہ غزوات نبوی ﷺ کا خاص حلقہ درس قائم کیا جائے۔ عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری المتوفی ۱۲۱ھ اس فن میں خاص کمال رکھتے تھے۔ ان کو حکم دیا کہ جامع مسجد دمشق میں بیٹھ کر لوگوں کو مغازی اور مناقب کا درس دیں۔ ❷

امام زہری اور فن سیرت

اسی زمانہ میں امام زہری نے مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی اور جیسا کہ امام سہیلی نے روض الانف میں تصریح کی ہے، یہ اس فن کی پہلی تصنیف تھی، امام زہری اس زمانہ کے اعلم العلماء تھے، فقہ اور حدیث میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا، امام بخاری کے شیخ الشیوخ ہیں، انہوں نے حدیث و روایات کے حاصل کرنے میں یہ محنتیں اٹھائیں کہ مدینہ منورہ میں ایک ایک انصاری کے گھر پر جاتے۔ جوان، بڈھے، عورت، مرد، جو مل جاتا یہاں تک کہ پردہ نشین ❸ عورتوں سے جا کر آنحضرت ﷺ کے اقوال اور حالات پوچھتے اور قلمبند کرتے، وہ نسباً قریشی تھے، ۵۰ھ میں پیدا ہوئے، بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا تھا، ۸۰ھ میں عبدالملک بن مروان کے دربار میں گئے، اس نے بہت قدر و منزلت کی، کتاب المغازی غالباً حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ہدایت کے موافق لکھی، یہ بات خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے کہ امام موصوف سلاطین کے دربار سے تعلق رکھتے تھے اور مقربین خاص میں داخل تھے۔ ہشام بن عبدالملک نے اپنے بچوں کی تعلیم ان کے سپرد کی تھی۔ ۱۲۴ھ میں وفات پائی۔

امام زہری کے تلامذہ

امام زہری کی وجہ سے مغازی و سیرت کا عام مذاق پیدا ہو گیا، ان کے حلقہ درس سے اکثر ایسے لوگ نکلے جو خاص اس فن میں کمال رکھتے تھے ان میں سے یعقوب بن ابراہیم، محمد بن صالح تمار، عبدالرحمن بن

---

❶ تهذيب التهذيب، ترجمة ابي بكر بن محمد، و عمرة بنت عبدالرحمن، ج ١٢، ص: ٤٣٩ وطبقات ابن سعد جزء دوم حصه دوم، صفحه: ١٣٤۔ ❷ تهذيب التهذيب، ترجمة عاصم بن عمر بن قتادة، ج ٥، ص: ٥٤۔ ❸ تهذيب التهذيب، ترجمة امام زهري (محمد بن مسلم، ج ٩، ص: ٤٤٩)۔

عبدالعزیز، فن مغازی میں خاص شہرت رکھتے تھے، چنانچہ تہذیب التہذیب وغیرہ میں ان لوگوں کا امتیازی وصف ''صاحبِ مغازی'' لکھا جاتا ہے۔

موسیٰ بن عقبہ اور سیرت

زہری کے تلامذہ میں سے دو شخصوں نے اس فن میں نہایت شہرت حاصل کی اور یہی دو شخص ہیں جن پر اس فن کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ خاندانِ زبیر کے غلام تھے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا تھا، فن حدیث میں امام مالک ان کے شاگرد ہیں۔ امام مالک ان کے نہایت مداح تھے اور لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ فن مغازی سیکھنا ہو تو موسیٰ سے سیکھو، ان کے مغازی کے جو خصوصیات ہیں، یہ ہیں۔

① مصنفین، اب تک روایات میں صحت کا التزام نہیں کرتے تھے، انہوں نے زیادہ تر اس کا التزام کیا۔

② عام مصنفین کا یہ مذاق تھا کہ کثرت سے واقعات نقل کئے جائیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں آ جاتی تھیں، موسیٰ نے احتیاط کی اور صرف وہی روایتیں لیں جو ان کے نزدیک صحیح ثابت ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب بہ نسبت اور کتب مغازی کے مختصر ہے۔

③ چونکہ روایت حدیث کے لئے کسی عمر کی قید نہ تھی، اس لئے اکثر لوگ بچپن اور آغازِ شباب ہی سے حلقہ درس میں شامل ہو جاتے تھے اور حدیثیں سن کر لوگوں سے روایت کرتے تھے، لیکن چونکہ اس عمر تک واقعات کا صحیح طور سے سمجھنا اور محفوظ رکھنا ممکن نہ تھا، اس لئے اکثر روایتوں میں تغیر اور اختلاط ہو جاتا تھا، موسیٰ نے بخلاف اور لوگوں کے کبر سن میں اس فن کو سیکھا تھا، [1] ۱۴۱ ہجری میں وفات پائی۔

موسیٰ کی کتاب آج موجود نہیں، لیکن ایک مدت تک شائع و ذائع رہی اور سیرت کی تمام قدیم کتابوں میں کثرت سے اس کے حوالے آتے ہیں۔

محمد بن اسحاق اور سیرت

محمد بن اسحاق نے فن مغازی میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، وہ امام فنِ مغازی کے نام سے مشہور ہیں، شہرت عام میں اگرچہ واقدی ان سے کم نہیں، لیکن واقدی کی لغو بیانی مسلمۂ عام ہے اور اس لئے ان کی شہرت، بدنامی کی شہرت ہے، محمد بن اسحاق تابعی ہیں، ایک صحابی (حضرت انس رضی اللہ عنہ) کو دیکھا تھا، علم حدیث میں کمال تھا، امام زہری کے دروازہ پر دربان مقرر تھا کہ کوئی شخص بغیر اطلاع کے نہ آئے، لیکن محمد بن اسحاق کو عام اجازت تھی کہ جب چاہیں چلے آئیں۔ ان کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کی نسبت محدثین میں اختلاف ہے، امام مالک ان کے سخت مخالف ہیں۔ لیکن محدثین کا عام فیصلہ یہ ہے کہ مغازی اور سیر میں ان کی روایتیں

[1] تهذيب التهذيب، ترجمة موسى بن عقبة، ج ١٠، ص: ٣٦١۔

استناد کے قابل ہیں، امام بخاری نے صحیح بخاری میں ان کی روایت نہیں لی، لیکن جزء القراءۃ میں ان سے روایت کی ہے، تاریخ میں تو اکثر واقعات انہی سے لیتے ہیں۔

فنِ مغازی کو انہوں نے اس قدر ترقی دی اور اس قدر دلچسپ بنا دیا کہ خلفائے عباسیہ جو زیادہ تر اس قسم کا مذاق رکھتے تھے، ان میں مغازی کا مذاق پیدا ہو گیا، چنانچہ ابن عدی نے اس احسان کا خاص طرح پر ذکر کیا ہے، ابن عدی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس فن میں کوئی تصنیف ان کی تصنیف کے رتبہ کو نہیں پہنچی۔ [1]

ابن حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے کہ محدثین کو محمد بن اسحاق کی کتاب پر اعتراض تھا تو یہ تھا کہ خیبر وغیرہ کے واقعات وہ ان یہودیوں سے دریافت کر کے داخل کتاب کرتے تھے جو مسلمان ہو گئے تھے اور چونکہ یہ واقعات انہوں نے یہودیوں سے سنے ہوں گے، اس لئے ان پر پورا اعتماد نہیں ہو سکتا، علامہ ذہبی کی تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد بن اسحاق، یہود و نصاریٰ سے روایت کرتے تھے اور ان کو ثقہ سمجھتے تھے، ۱۵۱ھ میں وفات پائی۔

محمد بن اسحاق کی کتاب المغازی کا ترجمہ شیخ سعدی کے زمانہ میں ابوبکر سعد زنگی کے حکم سے فارسی میں ہوا، اس کا قلمی نسخہ الہٰ آباد میں ہماری نظر سے گزرا ہے۔

محمد بن اسحاق کی کتاب کثرت سے پھیلی اور بڑے بڑے مشہور محدثوں نے اس کے نسخے مرتب کئے، اسی کتاب کو ابن ہشام نے زیادہ منقح اور اضافہ کر کے مرتب کیا، جو سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور ہے، چونکہ اصل کتاب آج کم ملتی ہے، اس لئے آج اس کی جو یادگار موجود ہے۔ وہ یہی ابن ہشام کی کتاب ہے۔

ابن ہشام اور سیرت

ابن ہشام کا نام عبدالملک ہے، وہ نہایت ثقہ اور نامور محدث اور مؤرخ تھے، حمیر کے قبیلہ سے تھے اور غالباً اسی تعلق سے سلاطین حمیر کی تاریخ لکھی، جو آج بھی موجود ہے، انہوں نے سیرت میں یہ اضافہ کیا کہ سیرت میں جو مشکل الفاظ آتے ہیں، ان کی تفسیر بھی لکھی، ۲۱۳ھ یا ۲۱۸ھ میں وفات پائی۔

سیرت ابن اسحاق کی مقبولیت کی بنا پر لوگوں نے اس کو نظم کیا، چنانچہ ابونصر فتح بن موسیٰ خضراوی المتوفی ۶۶۳ھ و عبدالعزیز بن احمد المعروف بہ سعدویری، المتوفی فی حدود ۶۰۷ھ و ابواسحاق انصاری تلمسانی، و فتح الدین محمد بن ابراہیم معروف بہ ابن الشہید المتوفی ۷۹۳ھ نے منظوم کیا، اخیر کتاب میں قریباً دس ہزار شعر ہیں اور اس کا نام "فتح الغریب فی سیرۃ الحبیب" ہے۔

ابن سعد اور سیرت

واقدی خود تو قابل ذکر نہیں، لیکن ان کے تلامذۂ خاص میں سے ابن سعد نے آنحضرت ﷺ اور

---

[1] تهذيب التهذيب، ج ٩، ص ٣٩ تا ٤٦۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات میں ایسی جامع اور مفصل کتاب لکھی کہ آج تک اس کا جواب نہ ہو سکا۔

ابن سعد مشہور محدث ہیں، محدثین نے عموماً لکھا ہے کہ گو ان کے استاد (واقدی) قابل اعتبار نہیں، لیکن وہ خود قابل سند ہیں، خطیب بغدادی نے ان کی نسبت یہ الفاظ لکھے ہیں:

كان من اهل العلم والفضل والفهم والعدالة صنف كتابًا كبيرًا فى طبقات الصحابة والتابعين الى وقته فاجادفيه واحسن. [1]

یہ موالی بنی ہاشم سے تھے، بصرہ میں پیدا ہوئے لیکن بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی، بلاذری جو مشہور مؤرخ ہیں، انہی کے شاگرد ہیں، ۲۳۰ھ میں ۶۲ برس کی عمر میں وفات پائی۔

ان کی کتاب کا نام طبقات ہے، ۱۲ جلدوں میں ہے، دو جلدیں خاص آنحضرت ﷺ کے حالات میں ہیں اور یہ حصہ دراصل سیرت نبوی ہے، باقی جلدیں صحابہ رضی اللہ عنہم (و تابعین) کے حالات میں ہیں اور چونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات میں ہر جگہ آنحضرت ﷺ کا ذکر آتا ہے، اس لئے ان حصوں میں بھی سیرت کا بڑا سرمایہ موجود ہے۔

یہ کتاب تقریباً ناپید ہو چکی تھی، یعنی دنیا کے کسی کتب خانہ میں اس کا پورا نسخہ موجود نہ تھا، شہنشاہ جرمن کو اس کی طبع و اشاعت کا خیال ہوا، چنانچہ لاکھ روپے جیب خاص سے دیے اور پروفیسر ساخو کو اس کام پر مامور کیا کہ ہر جگہ سے اس کے اجزا فراہم کر کے لائیں، پروفیسر موصوف نے قسطنطنیہ، مصر اور یورپ جا کر جابجا سے تمام جلدیں بہم پہنچائیں، یورپ کے بارہ پروفیسروں نے الگ الگ جلدوں کی تصحیح اپنے ذمہ لی، چنانچہ نہایت اہتمام اور صحت کے ساتھ یہ نسخہ لیڈن (ہالینڈ) میں چھپ کر شائع ہوا۔

اس کتاب کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے، لیکن چونکہ تمام روایتیں بہ سند مذکور ہیں، اس لئے واقدی کی روایتیں بہ آسانی الگ کر لی جا سکتی ہیں۔

اس زمانہ میں سیرت پر اور بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں، چنانچہ کشف الظنون وغیرہ میں ان کے نام مذکور ہیں لیکن چونکہ نام کے سوا ان کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں، نہ ان کا آج وجود ہے، اس لئے ہم ان کے نام نظر انداز کرتے ہیں۔

امام بخاری اور سیرت

سیرت کے سلسلہ سے الگ تاریخی تصنیفات ہیں، ان میں سے جو محدثانہ طریقہ پر لکھی گئیں یعنی جن میں روایتیں بہ سند مذکور ہیں، ان میں آنحضرت ﷺ کے حالات اور واقعات کا جو حصہ ہے وہ بھی دراصل سیرت نبوی ﷺ ہے۔ ان میں سب سے مقدم اور قابل استناد امام بخاری کی دونوں تاریخیں ہیں لیکن دونوں نہایت مختصر ہیں، تاریخ صغیر چھپ گئی ہے، اس میں سیرت نبوی ﷺ کا حصہ کتاب کا دسواں حصہ بھی نہیں،

[1] تهذيب التهذيب، ترجمة محمد بن سعد، ج ۹، ص: ۱۸۲۔

یعنی صرف ۱۵ صفحے ہیں اور ان میں بھی کوئی ترتیب نہیں، کبیر البتہ بڑی ہے، میں نے اس کا نسخہ جامع اباصوفیہ میں دیکھا تھا، لیکن سوانح نبوی اس میں بہت کم ہیں اور جستہ جستہ واقعات بلاترتیب مذکور ہیں۔

امام طبری اور سیرت

تاریخی سلسلہ میں سب سے جامع اور مفصل کتاب امام طبری کی تاریخ کبیر ہے، طبری اس درجہ کے شخص ہیں کہ تمام محدثین ان کے فضل وکمال، وثوق اور وسعت علم کے معترف ہیں، ان کی تفسیر احسن التفاسیر خیال کی جاتی ہے، محدث ابن خزیمہ کا قول ہے کہ ''دنیا میں میں کسی کو ان سے بڑھ کر عالم نہیں جانتا۔'' ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔

بعض محدثین (سلیمانی) نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ ''یہ شیعوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔'' لیکن علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال (ج ۳، ص: ۳۵) میں لکھا ہے:

هذا رجم بالظن الكاذب بل ابن جرير من كبار ائمة الاسلام المعتمدين .

''یہ جھوٹی بدگمانی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ابن جریر، اسلام کے معتمد اماموں میں سے ایک بڑے امام ہیں۔''

علامہ ذہبی نے اسی موقع پر لکھا ہے کہ ''ان میں فی الجملہ تشیع تھا، لیکن مضر نہیں'' تمام مستند اور مفصل تاریخیں، مثلاً: تاریخ کامل ابن الاثیر، ابن خلدون، ابوالفداء وغیرہ انہی کی کتاب سے ماخوذ اور اسی کتاب کے مختصرات ہیں، یہ کتاب بھی ناپید تھی اور یورپ کی بدولت شائع ہوئی۔

فہرست متقدمین علمائے سیرت

جو لوگ خاص فن سیرت کے ارکان اور معتمد ہیں، ان کا اور ان کی تصنیفات کا ایک مختصر نقشہ ہم اس مقام پر درج کرتے ہیں۔

نام مصنف	سنہ وفات	حالات
عروہ بن زبیر [1]	۹۴ھ	حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نواسے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے آغوش تربیت میں پلے تھے، سیرت و مغازی میں کثرت سے ان کی روایتیں ہیں، ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے متعلق لکھا ہے کان عالماً بالسیرۃ صاحب کشف الظنون نے مغازی کے بیان میں لکھا ہے کہ بعضوں کی رائے ہے کہ فن مغازی کی سب سے پہلی کتاب انہوں نے تدوین کی۔

[1] ان مصنفین کی تصنیفات اکثر ناپید ہیں (یہ فہرست تہذیب التہذیب وغیرہ سے مرتب کی گئی ہے) ان کے نام لکھنے سے یہ غرض ہے کہ آج جو تصنیفیں ملتی ہیں ان میں اکثر ان کے حوالے آتے ہیں۔ اس لیے ناظرین کو ان حوالوں کی صحت وعدم صحت یا قوت وضعف کے فیصلہ کرنے کا کچھ موقع حاصل ہوگا۔

شعبی	۱۰۹ھ	مشہور محدث ہیں، اکثر فنون میں کمال رکھتے تھے، خلافت دمشق کی طرف سے سفیر بن کر قسطنطنیہ گئے تھے، فن مغازی و سیر میں ان کو اس درجہ واقفیت تھی کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ ''گو میں ان غزوات میں بذات خود شریک تھا، مگر یہ مجھ سے زیادہ ان حالات کو جانتے ہیں۔''
وہب بن منبہ	۱۱۴ھ	یمن کے عجمی خاندان سے تھے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کچھ حدیثیں سنی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق کتب عہد قدیم کی بشارت اور پیشین گوئیاں کثرت سے انہی سے مروی ہیں۔
عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری	۱۲۱ھ	مشہور تابعی ہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ اور اپنے باپ اور اپنی دادی رمیثہ سے روایت کرتے ہیں۔ مغازی اور سیر میں نہایت وسیع المعلومات تھے، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے مسجد دمشق میں بیٹھ کر اس فن کی تعلیم دیتے تھے۔
محمد بن مسلم بن شہاب زہری	۱۲۴ھ	ان کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔
یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ بن الاخنس بن شریق الثقفی	۱۲۸ھ	نہایت ثقہ تھے، عمال اور گورنر انتظام ملکی میں ان سے مدد لیتے تھے، فقہائے مدینہ میں ان کا شمار تھا، سیرت نبوی ﷺ کے عالم تھے، ان کا دادا اخنس بن شریق وہی شخص ہے، جو رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔
موسیٰ بن عقبہ الاسدی	۱۴۱ھ	ان کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔
ہشام بن عروہ بن زبیر	۱۴۶ھ	زیادہ تر اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، زہری کے بھی شاگرد ہیں، علمائے مدینہ میں ان کا شمار ہے، بغداد میں جو روایتیں انہوں نے لیں، محدثین کا بیان ہے کہ ان میں تساہل سے کام لیا ہے، سیرت کے ذخیرہ روایات میں ان کا بہت بڑا حصہ شامل ہے جن کو وہ اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ فن سیرت میں ان کے متعدد نامور تلامذہ ہیں۔
محمد بن اسحاق بن یسار المطلبی	۱۵۱ھ	ان کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

عمر بن راشد الازدی	۱۵۲ھ	امام زہری کے تلامذہ میں امام مالک کے بعد ان کا دوسرا درجہ ہے۔ اساطین علم حدیث میں تھے، مغازی میں ایک کتاب ان کی تصنیف ہے، جس کا نام ابن ندیم نے کتاب المغازی لکھا ہے۔
عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز الاوسی	۱۶۲ھ	زہری کے شاگرد تھے، مسلم نے ان سے ایک روایت کی ہے، محدثین کے نزدیک ضعیف الروایت ہیں، فنِ سیرت کے عالم تھے۔ ابن سعد نے ان کے متعلق لکھا ہے "کان عالماً بالسیرة"۔
محمد بن صالح بن دینار التمار	۱۶۸ھ	زہری کے شاگرد اور واقدی کے استاد ہیں، ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ سیرت و مغازی کے عالم تھے، اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، ابو الزناد جو بڑے پایہ کے محدث ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر صحیح مغازی سیکھنا ہو تو محمد بن صالح سے سیکھو۔
ابو معشر نجیح المدنی	۱۷۰ھ	ہشام بن عروہ کے شاگرد تھے۔ ثوری اور واقدی نے ان سے روایت کی ہے، گو محدثین نے روایت حدیث میں ان کی تضعیف کی ہے لیکن سیرت و مغازی میں ان کی جلالتِ شان کا اعتراف کیا ہے۔ امام ابن حنبل کہتے ہیں کہ وہ اس فن میں صاحب نظر ہیں۔ ابن ندیم نے ان کی کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے، کتب سیرت میں ان کا نام کثرت سے آتا ہے۔
عبداللہ بن جعفر بن عبدالرحمٰن المخزومی	۱۷۰ھ	مشہور صحابی مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہما کے پڑپوتے تھے، فن حدیث میں خاص پایہ رکھتے تھے۔ سیرت نبوی ﷺ کے اکابر علما میں تھے۔ ابن سعد نے ان کی شان میں یہ الفاظ لکھے ہیں "من رجال اهل المدينة عالماً بالمغازی"۔
عبدالملک بن محمد بن ابی بکر بن عمرو بن حزم الانصاری	۱۷۶ھ	فن حدیث و سیر میں ان کا خاندان ہمیشہ نامور رہا، ان کے دادا وہ شخص ہیں جنہوں نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے سب سے پہلے فن حدیث کی تدوین کی، ان کے رشتہ کی دادی عمرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تربیت یافتہ تھیں، یہ خود سیر و مغازی کے عالم تھے، اپنے باپ اور چچا سے تعلیم پائی تھی، خلیفہ ہارون الرشید نے ان کو

		قاضی مقرر کیا تھا، لوگ ان سے مغازی سیکھتے تھے، اس فن میں ان کی ایک تصنیف کتاب المغازی بھی ہے۔
علی بن مجاہد الرازی الکندی	بعد ۱۸۰ھ	ابو معشر نجیح کے تلامذہ میں تھے، امام ابن حنبل نے ان سے روایت کی ہے، مغازی کے جامع اور مصنف ہیں، لیکن ارباب نقد کے نزدیک ان کی تصنیف اعتبار کے قابل نہیں۔
زیاد بن عبداللہ بن الطفیل البکائی	۱۸۳ھ	ابن اسحاق کے شاگرد اور ابن ہشام کے استاد تھے، ان دونوں بزرگواروں کے واسطۃ العقد یہی ہیں، سیرت کے عشق میں گھربار بیچ کر استاد کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے تھے اور مدت تک سفر و حضر میں ان کے شریک رہے، محدثین کی بارگاہ میں گو ان کا اعزاز کم ہے، لیکن کتاب السیرۃ کے سب سے معتبر راوی یہی سمجھے جاتے ہیں۔
سلمہ بن الفضل الابرش الانصاری	۱۹۱ھ	ابن اسحاق کے شاگرد اور ان کی سیرت کے راوی ہیں، ارے کے قاضی تھے، اہل نقد کے نزدیک قابل احتجاج نہیں، لیکن ابن معین جو اسمائے رجال کے بڑے ماہر ہیں، مغازی میں ان کی توثیق کرتے ہیں اور ان کی سیرت کو بہترین سیرت ہائے نبوی کہتے ہیں، طبری میں ان کے واسطہ سے اکثر روایتیں مروی ہیں۔
ابو محمد یحییٰ بن سعید بن ابان الاموی	۱۹۴ھ	ہشام بن عروہ اور ابن جریج سے تلمذ تھا، ابن سعد نے لکھا ہے کہ گو قلیل الروایت ہیں لیکن ثقہ ہیں، صاحب کشف الظنون نے مصنفین مغازی میں ان کا نام بھی لیا ہے۔
ولید بن مسلم القرشی	۱۹۵ھ	شام کے مشہور محدث اور نہایت قوی الحافظہ تھے۔ شام میں ان کے زمانہ میں ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا، تاریخ و مغازی میں وکیع سے ان کا درجہ بڑا سمجھا جاتا تھا۔ ان کی تصنیفات کی تعداد ستر ہے۔ جن میں ایک کتاب المغازی ہے، کتاب الفہرست میں اس کا ذکر موجود ہے۔

یونس بن بکیر	۱۹۹ھ	ہشام بن عروہ اور ابن اسحاق کے شاگرد ہیں، فن روایت و حدیث میں ان کا متوسط درجہ ہے، اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، علامہ ذہبی نے تذکرہ میں ان کا نام بہ لقب صاحب المغازی لیا ہے۔ انہوں نے مغازی ابن اسحاق کا ذیل لکھا ہے (زرقانی مواہب جلد۳ صفحہ ۱۰)
محمد بن عمر الواقدی الاسلمی	۲۰۷ھ	سیرت نبوی کے متعلق ان کی دو کتابیں ہیں، کتاب السیرۃ اور کتاب التاریخ و المغازی والمبعث، امام شافعی فرماتے ہیں کہ واقدی کی تمام تصانیف جھوٹ کا انبار ہے، کتب سیرت کی اکثر بیہودہ روایتوں کا سرچشمہ انہیں کی تصانیف ہیں، ایک ظریف محدث نے خوب کہا ہے کہ اگر واقدی سچا ہے تو دنیا میں کوئی اس کا ثانی نہیں اور اگر جھوٹا ہے، تب بھی دنیا میں اس کا جواب نہیں۔
یعقوب بن ابراہیم الزہری	۲۰۸ھ	حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی اولاد میں تھے، زہری اور ان کے تلامذہ کے شاگرد ہیں، مغازی میں ان کا یہ رتبہ تھا کہ ابن معین جیسا ناقدِ رجال ان سے اس فن کی تحصیل کرتا تھا۔
عبدالرزاق بن ہمام بن نافع الحمیری	۲۱۱ھ	ثقات محدثین میں ان کا شمار ہے، مزاج میں کسی قدر تشیع تھا، ابن معین کہتے ہیں کہ اگر عبدالرزاق مرتد بھی ہو جائیں تب بھی ہم ان سے روایت حدیث ترک نہیں کر سکتے۔ آخر عمر میں بصارت جاتی رہی تھی، اس لئے اس زمانہ کی حدیثیں ناقابل سند ہیں، فن مغازی میں ان کی ایک تالیف ہے۔
عبدالملک بن ہشام الحمیری	۲۱۳ھ یا ۲۱۸ھ	ان کا ذکر گزر چکا ہے۔
علی بن محمد المدائنی	۲۲۵ھ	ابومعشر نجیح اور سلمہ بن الفضل وغیرہ کے شاگرد تھے تاریخ و انساب عرب میں نہایت وسیع المعلومات تھے، محدثین میں ان کا شمار نہیں لیکن مورخین کے امام ہیں، اغانی کے دفتر بے پایاں کا مخزن یہی ہیں، تاریخ و انساب میں ان کی کثرت سے تصنیفات ہیں،

		آنحضرت ﷺ کے حالات میں ان کی کتاب نہایت مبسوط ہے، اور ابن الندیم کے بیان کے مطابق ہر قسم کے متعدد اور متنوع عنوان قائم کیے ہیں۔
عمر بن شبۃ البصری	۲۶۲ھ	حدیث، تاریخ، ادب، لغت، شاعری اور نحو کے امام ہیں، مکہ مبارکہ، مدینہ طیبہ اور بصرہ کی تاریخیں لکھی ہیں، علم سیر میں نہایت بلند پایہ تھے، حدیث میں ابن ماجہ اور تاریخ میں بلاذری اور ابونعیم ان کے شاگرد تھے۔
محمد بن عیسیٰ ترمذی	۲۷۹ھ	مشہور محدث ہیں جن کی کتاب صحاح ستہ میں تیسرا درجہ رکھتی ہے، سیرت نبوی میں ان کا خاص رسالہ ہے جس کا موضوع گزشتہ تصانیف سے الگ ہے، اس رسالہ کا نام کتاب الشمائل ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ کے ذاتی حالات وعادات واخلاق کا ذکر ہے، اس بات کا التزام کیا ہے کہ تمام روایتیں معتبر اور صحیح ہوں، اس رسالہ پر متعدد علمانے شروح وحواشی لکھے۔
ابراہیم بن اسحاق بن ابراہیم	۲۸۵ھ	محدثین کبار میں شمار ہے، مسند صحابہ رضی اللہ عنہم ان کی تالیف ہے، جس کے آخر میں کتاب المغازی شامل ہے۔
ابوبکر احمد بن ابی خیثمۃ البغدادی	۲۹۹ھ	حدیث میں ابن حنبل اور ابن معین کے شاگرد اور تاریخ وسیر کے جلیل القدر عالم تھے، تاریخ کبیر ان کی تصنیف ہے، جس میں سیرتِ نبوی ﷺ کا حصہ بھی شامل ہے۔
محمد بن عائذ دمشقی		ان کی مغازی معتبر خیال کی جاتی ہے، حافظ ابن حجر وغیرہ اکثر اس کے حوالے دیتے ہیں۔

فہرست متاخرین علمائے سیرت

یہ قدما کی تصنیفات تھیں، مابعد کی تصنیفات کا ہم ایک مختصر نقشہ ذیل میں درج کرتے ہیں، یہ تصنیفات قدیم تصنیفات اور احادیث کی کتابوں سے ماخوذ ہیں، اس نقشہ میں ان کتابوں کا ذکر بھی ہے، جو قدما کی تصنیفات کے متعلق شرح کے طور پر لکھی گئی ہیں، ان کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ یہ فی نفسہ مستقل تصنیفات

تھیں اور ان میں جس قدر ذخیرۂ معلومات ہے، خود اصل کتابوں میں نہیں۔

روض الانف

سیرت ابن اسحاق کی شرح ہے، مصنف کا نام عبدالرحمن سہیلی ہے، جنہوں نے ۵۸۱ھ میں وفات پائی، یہ اکابر محدثین میں سے ہیں اور تمام مصنفین مابعد، سیرت نبوی ﷺ کی تحقیقات اور معلومات کے متعلق ان کے خوشہ چیں ہیں، مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب ۱۲۰ کتابوں کی مدد سے لکھی، اس کا قلمی نسخہ ہمارے استعمال میں ہے۔

سیرت دمیاطی

حافظ عبدالمؤمن دمیاطی المتوفی ۷۰۵ھ کی تصنیف ہے، اکثر کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں، اس کتاب کا نام المختصر فی سیرۃ سید البشر ہے۔ قریباً سو صفحوں میں ہے۔ پٹنہ کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

سیرت خلاطی

علاء الدین علی بن محمد خلاطی حنفی کی تصنیف ہے، ۷۰۸ھ میں وفات پائی۔

سیرت گازرونی

شیخ ظہیر الدین علی بن محمد گازرونی المتوفی ۶۹۴ھ کی تصنیف ہے۔ [1]

سیرت ابن ابی طے

مصنف کا نام یحییٰ بن حمیدہ المتوفی ۶۳۰ھ ہے، یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔

سیرت مغلطائی [2]

مشہور کتاب ہے اور مصر میں چھپ گئی ہے۔ علامہ عینی نے اسکے ایک حصہ کی شرح لکھی ہے جس کا نام کشف اللثام ہے۔

شرف المصطفیٰ

حافظ ابوسعید عبدالملک نیشاپوری کی تصنیف ہے، آٹھ جلدوں میں ہے، حافظ ابن حجر اصابہ میں اکثر اس کا حوالہ دیتے ہیں، لیکن جو روایتیں حافظ موصوف نے نقل کی ہیں، ان میں بعض نہایت مہمل اور لغو روایتیں ہیں، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ مصنف نے رطب و یابس کی کوئی تمیز نہیں رکھی ہے۔

شرف المصطفیٰ

للحافظ ابن الجوزی۔

---

[1] بمبئی کے کتب خانہ جامع مسجد میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ [2] ان تمام کتابوں کا ذکر کشف الظنون میں سیرت کے عنوان سے ہے۔

اکتفاء فی مغازی المصطفیٰ والخلفاء الثلاثۃ

حافظ ابوالربیع سلیمان بن موسیٰ الکلاعی المتوفی ۶۳۴ھ کی تصنیف ہے، اکثر کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں۔

سیرت ابن عبدالبر

ابن عبدالبر مشہور محدث اور امام ہیں، اس کتاب کے حوالے اکثر آتے ہیں۔

عیون الاثر

ابن سیدالناس کی تصنیف ہے، ابن سیدالناس اندلس کے مشہور عالم ہیں، ۷۳۴ھ میں وفات پائی۔ یہ کتاب نہایت متین اور جامع ہے، معتبر کتابوں کو ماخذ قرار دیا ہے اور جس سے جو کچھ نقل کیا ہے، سند بھی نقل کی ہے، اس کا قلمی نسخہ (جلد دوم) کلکتہ کے کتب خانہ میں ہے اور ہمارے پیش نظر ہے۔

نور النبراس فی سیرت ابن سیدالناس

عیون الاثر کی شرح ہے، مصنف کا نام ابراہیم بن محمد ہے یہ کتاب نہایت محققانہ لکھی گئی ہے، اور بے شمار معلومات کا گنجینہ ہے، دو ضخیم جلدوں میں ہے اور ندوہ کے کتب خانہ میں اس کا نہایت عمدہ نسخہ موجود ہے۔

سیرت منظوم

حافظ زین الدین عراقی نے جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے، نظم میں لکھی ہے لیکن دیباچہ میں خود لکھ دیا ہے کہ اس میں رطب ویابس سب کچھ ہے۔

مواہب لدنیہ

مشہور کتاب ہے اور متاخرین کا یہی ماخذ ہے، اس کے مصنف قسطلانی ہیں جو بخاری کے مشہور شارح ہیں، حافظ ابن حجر کے ہم مرتبہ تھے، یہ کتاب اگرچہ نہایت مفصل ہے لیکن ہزاروں موضوع اور غلط روایتیں بھی موجود ہیں۔

زرقانی علی المواہب

یہ مواہب لدنیہ کی شرح ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سہیلی کے بعد کوئی کتاب اس جامعیت اور تحقیق سے نہیں لکھی گئی، آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے اور مصر میں چھپ گئی ہے۔

سیرت حلبی

مشہور اور متداول ہے۔

صحت ماخذ

سیرت نبوی کے واقعات جو قلمبند کئے گئے وہ تقریباً نبوت کے سو برس کے بعد قلمبند ہوئے، اس لئے

مصنفین کا ماخذ کوئی کتاب نہ تھی، بلکہ اکثر زبانی روایتیں تھیں۔

اس قسم کا موقع جب دوسری قوموں کو پیش آتا ہے یعنی کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلمبند کئے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کر لی جاتی ہیں جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا، ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کر لئے جاتے ہیں، جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں، یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں۔

اسلامی فن تاریخ کا پہلا اصول، فن روایت

لیکن مسلمانوں نے اس فن سیرت کا جو معیار قائم کیا، وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا، اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے، اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کیا جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت میں آئے، کون لوگ تھے؟ کیسے تھے؟ کیا مشاغل تھے؟ چال چلن کیسا تھا؟ حافظہ کیسا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ سطحی الذہن تھے؟ یا دقیقہ بین؟ عالم تھے یا جاہل؟ ان جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل بلکہ ناممکن تھا، سینکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کر دیں، ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کے معلومات بہم پہنچائے، جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے، ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کئے۔

اسماء الرجال کی تدوین

ان تحقیقات کے ذریعے سے اسماء الرجال (بائیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہو گیا، جس کی بدولت آج کم از کم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں اور اگر ڈاکٹر اسپرنگر [1] کے حسن ظن کا اعتبار کیا جائے تو یہ تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔

محدثین نے حالات کے بہم پہنچانے میں کسی شخص کے رتبہ اور حیثیت کی پروا نہ کی، بادشاہوں سے لے کر بڑے بڑے مقتداؤں تک کی اخلاقی سراغ رسانیاں کیں اور ایک ایک کی پردہ دری کی۔

اس سلسلہ میں سینکڑوں تصنیفات تیار ہوئیں جن کی اجمالی کیفیت یہ ہے:

سب سے پہلے اس فن یعنی راویوں کی جرح و تعدیل میں یحییٰ بن سعید القطان نے ایک کتاب لکھی، وہ

[1] ڈاکٹر اسپرنگر جرمن کے مشہور عربی دان فاضل ہیں، مدت تک ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں کام کیا، اصابہ کا نسخہ انہیں کی تصحیح سے کلکتہ میں چھپا، اسی کتاب کے دیباچہ میں صاحب موصوف نے لکھا ہے، کہ "نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری، نہ آج موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے"۔

اس رتبہ کے شخص تھے کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ "میری آنکھوں نے ان کا نظیر نہیں دیکھا۔" ان کے بعد اس فن کو زیادہ رواج ہوا اور کثرت سے کتابیں لکھی گئیں جن میں سے چند ممتاز تصنیفات حسب ذیل ہیں:

نام کتاب	کیفیت
رجال عقیلی	خاص ضعیف الروایۃ لوگوں کے حال میں ہے۔
رجال احمد بن عبداللہ العجلی المتوفی ۲۶۱ھ	اس کتاب کا نام کتاب الجرح والتعدیل ہے۔
رجال امام عبدالرحمان بن حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ	بہت ضخیم کتاب ہے۔
رجال امام دارقطنی	مشہور محدث ہیں، یہ کتاب خاص ضعیف الروایۃ اشخاص کے حال میں ہے۔
کامل ابن عدی	اس فن کی سب سے مشہور کتاب ہے، اور تمام محدثین متاخرین نے اس کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔

یہ کتابیں قریباً آج ناپید ہیں، لیکن بعد کی تصنیفات جو انہی سے ماخوذ ہیں، آج بھی موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جامع اور مستند کتاب "تہذیب الکمال" ہے جو علامہ مزّی (یوسف بن الزکی) کی تصنیف ہے جنہوں نے ۷۴۲ھ میں وفات پائی، علاء الدین مغلطائی المتوفی ۷۶۲ھ نے تیرہ جلدوں میں اس کا تکملہ لکھا۔

علامہ ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ نے اس کا اختصار کیا اور بہت سے محدثین نے اس کے خلاصے اور ذیل لکھے اور بالآخر حافظ ابن حجر نے ان تمام تصنیفات سے ایک نہایت ضخیم کتاب "تہذیب التہذیب" لکھی جو بارہ جلدوں میں ہے اور آجکل حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے۔ مصنف نے کتاب کے خاتمہ میں لکھا ہے کہ اس کی تصنیف میں آٹھ برس صرف ہوئے ہیں، اس سلسلہ کی ایک اور سب سے زیادہ متداول اور مستند کتاب "میزان الاعتدال" ہے، جو علامہ ذہبی کی تصنیف ہے، حافظ ابن حجر نے اس کتاب پر اضافہ کیا جس کا نام "لسان المیزان" ہے۔

اسماء الرجال کی پیش نظر کتابیں

اسماء الرجال کی کتابوں میں سے تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب، لسان المیزان، تقریب، تاریخ کبیر بخاری، تاریخ صغیر بخاری، ثقات ابن حبان، تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی، مشتبۃ النسبۃ ذہبی، انساب

سمعانی، تہذیب الاسماء ہماری نظر سے گزری ہیں۔

تحقیق روایت کا اصول، قرآن وحدیث میں

اس اصول تحقیق کی بنیاد خود قرآن مجید نے قائم کر دی تھی:

﴿ يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا ﴾ (۴۹/ الحجرات:۶)

''مسلمانو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو تم اچھی طرح اس کی تحقیق کر لو۔''

حدیث ذیل بھی اسی کی مؤید ہے:

((كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ)) [1]

''آدمی کے جھوٹے ہونے کی یہ کافی دلیل ہے کہ جو کچھ سنے روایت کر دے۔''

دوسرا اصول، درایت

تحقیقِ واقعات کا دوسرا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ عقلی شہادت کے مطابق بھی ہے، یا نہیں؟

درایت کی ابتدا

یہ اصول بھی درحقیقت قرآن مجید ہی نے قائم کر دیا تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جب منافقین نے تہمت لگائی تو اس طرح اس خبر کو مشہور کیا کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم تک مغالطہ میں آ گئے، چنانچہ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ بھی قاذفین میں شریک تھے اور اسی بنا پر حد قذف جاری کی گئی۔ قرآن مجید میں بھی اس کی تصریح ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۭ ﴾ [۲۴/ النور:۱۱]

''جن لوگوں نے تہمت لگائی وہ تمہارے گروہ میں سے ہیں۔''

تفسیر جلالین میں مِنکُم کی تفسیر حسب ذیل کی ہے:

جماعة من المؤمنين.

''یعنی یہ تہمت لگانے والے، مسلمانوں کا ایک گروہ ہے۔''

قرآن مجید کی آیتیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت اور طہارت کے متعلق جو نازل ہوئیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

﴿وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ڰ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۝﴾

(۲۴/ النور:۱۶)

''اور جب تم نے سنا تو یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ ہم کو ایسی بات بولنا مناسب نہیں، سبحان اللہ! یہ بڑا

[1] صحیح مسلم، باب النهي عن الحديث بكل ما سمع:۷؛ ابوداود، كتاب الأدب، باب التشديد في الكذب:۴۹۹۲۔

بہتان ہے۔"

عام اصول کی بنا پر اس خبر کی تحقیق کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے راویوں کے نام دریافت کیے جاتے پھر دیکھا جاتا کہ وہ ثقہ اور صحیح الروایت ہیں یا نہیں؟ پھر ان کی شہادت لی جاتی، لیکن خدا نے اس آیت میں فرمایا کہ سننے کے ساتھ تم نے کیوں نہیں کہہ دیا کہ یہ بہتان ہے۔

اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کا خلاف قیاس جو واقعہ بیان کیا جائے قطعاً سمجھ لینا چاہیے کہ غلط ہے۔

اس طرز تحقیق یعنی درایت کی ابتدا خود صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد میں ہو چکی تھی۔

فقہا میں بعض اس بات کے قائل ہیں کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے جب اس مسئلہ کو آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کیا تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اگر یہ صحیح ہو تو اس پانی کے پینے سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا جو آگ پر گرم کیا گیا ہو۔ [1] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ضعیف الروایۃ نہیں سمجھتے تھے لیکن چونکہ ان کے نزدیک یہ روایت درایت کے خلاف تھی، اس لئے انہوں نے تسلیم نہیں کی اور یہ خیال کیا کہ سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہوگی۔

محدثین کے اصولِ درایت

جب حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی تو محدثین نے درایت کے اصول بھی منضبط کئے جن میں سے بعض یہ ہیں:

قال [2] ابن الجوزی و کل حدیث رأیته یخالف العقول اوینا قض الاصول فاعلم انه موضوع فلایتکلف اعتباره ای لا تعتبر روایته و لا تنظر فی جرحهم او یکون مما یدفعه الحس والمشاهدة او مباینا لنص الکتاب والسنة المتواترة او الاجماع القطعی حیث لا یقبل شيء من ذلك التاویل اویتضمن الافراط بالوعید الشدید علی الامر الیسیر و با لوعد العظیم علی الفعل الیسیر وهذا الاخیر کثیر موجود فی حدیث القصاص والطرقیة ومن رکة المعنی لا تا کلوا القرعة حتی تذبحوها ولذا جعل بعضهم ذلك دلیلا علی کذب راویه و کل هذا من القرائن فی المروی وقدتکون فی الراوی کقصة غیاث مع المهدی...... او انفراده عمن لم یدرکه بمالم یوجد عند غیرهما

[1] جامع ترمذی، ابواب الطهارة، باب ما جاء فی الوضوء مما غیرت النار: ۷۹۔

[2] فتح المغیث، مطبوعه لکهنؤ صفحه: ۱۱٤، افسوس یہ ہے کہ یہ کتاب نہایت غلط چھپی ہے، اس لئے بعض عبارتیں ہم نے اسی نسخہ کے موافق غلط نقل کی ہیں، یہ اصول خود ابن جوزی کے قائم کردہ نہیں ہیں، بلکہ ابن جوزی نے محدثین کے اصول کو نقل کر دیا ہے۔

او انفرده بشيء مع كونه فيما يلزم المكلفين علمه وقطع العذر فيه كما قرره الخطيب في اول الكفاية او بامر جسيم يتوفر الدواعي على نقله كحصر العدو للحاج عن البيت۔

''ابن جوزی نے کہا ہے کہ جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا اصول مسلمہ کے خلاف ہے تو جان لو کہ وہ مصنوعی ہے، اس کی نسبت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر، اسی طرح سے وہ حدیث قابل اعتبار نہیں جو محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو، یا نص کتاب اور سنت متواترہ اور اجماع قطعی کے خلاف ہو اور تاویل کی گنجائش نہ رکھتی ہو، یا وہ حدیث جس میں ذرا سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو، یا معمولی کام پر بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہو، (اس قسم کی حدیثیں واعظوں اور صوفیوں کے ہاں بہت پائی جاتی ہیں) یا وہ حدیث جس میں لغویت پائی جائے، مثلاً: یہ حدیث کہ کدو کو بغیر ذبح کئے نہ کھاؤ، اس لئے بعض محدثین نے لغویت کو راوی کے کذب کی دلیل قرار دیا ہے۔ یہ تمام قرینے خود روایت سے متعلق ہیں اور کبھی یہ قرائن راوی کے متعلق ہوتے ہیں، مثلاً: غیاث کا واقعہ خلیفہ مہدی کے ساتھ، یا جب کہ راوی کوئی ایسی حدیث بیان کرے جو اور کسی نے نہ بیان کی ہو اور خود راوی جس سے روایت کرتا ہے اس سے ملا تک نہ ہو، یا وہ حدیث جس کو ایک ہی راوی بیان کرتا ہے حالانکہ بات ایسی ہے کہ اس سے اوروں کو بھی مطلع ہونا ضروری تھا جیسا کہ خطیب بغدادی نے کتاب الکفایہ کے شروع میں اس کی تصریح کی ہے، یا وہ روایت جس میں کسی عظیم الشان واقعہ کا ذکر ہے کہ اگر وہ واقع ہوا ہوتا تو سینکڑوں آدمی اس کو بیان کرتے، مثلاً: یہ واقعہ کہ کسی دشمن نے حاجیوں کو کعبہ کے حج سے روک دیا۔''

روایت کے اصول

اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت اعتبار کے قابل نہ ہو گی اور اس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں:

① جو روایت عقل کے مخالف ہو۔

② جو روایت اصولِ مسلمہ کے خلاف ہو۔

③ محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔

④ قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی کچھ گنجائش نہ ہو۔

⑤ جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔

⑥ معمولی کام پر بڑے انعام کا وعدہ ہو۔

⑦ وہ روایت رکیک المعنی ہو مثلاً: کدو کو بغیر ذبح کئے نہ کھاؤ۔

⑧ جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے کہ کسی اور نے نہیں کی اور یہ راوی اس شخص سے نہ ملا ہو۔

⑨ جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو، بایں ہمہ ایک راوی کے سوا کسی اور نے اس کی روایت نہ کی ہو۔

⑩ جس روایت میں ایسا قابل اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو، کہ اگر وقوع میں آتا تو سینکڑوں آدمی اس کو روایت کرتے، باوجود اس کے صرف ایک ہی راوی نے اس کی روایت کی ہو۔

موضوع حدیثوں کی شناخت کے اصول

ملا علی قاری، نے جو موضوعات (نسخہ مطبوعہ مجتبائی دہلی، صفحہ ۹۲ تا خاتمۂ کتاب) کے خاتمہ میں حدیثوں کے نامعتبر ہونے کے چند اصول تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کی مثالیں نقل کی ہیں، ہم اس کا خلاصہ اس موقع پر نقل کرتے ہیں:

① جس حدیث میں فضول باتیں ہوں جو رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نہیں نکل سکتیں، مثلاً: یہ کہ ''جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے خدا اس کلمہ سے ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کی ستر زبانیں ہوتی ہیں، ہر زبان میں ستر ہزار لغت ہوتے ہیں'' الخ ۔

② وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو، مثلاً: یہ حدیث کہ ''بینگن کھانا ہر مرض کی دوا ہے۔''

③ وہ حدیث جو صریح حدیثوں کے مخالف ہو۔

④ جو حدیث واقع کے خلاف ہو مثلاً: یہ کہ ''دھوپ میں رکھے ہوئے پانی سے غسل نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے''۔

⑤ وہ حدیث جو انبیاء علیہم السلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو، مثلاً: یہ حدیث کہ ''تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں، سبزہ زار، آب رواں، خوبصورت چہرہ کا دیکھنا''۔

⑥ وہ حدیثیں جن میں آئندہ واقعات کی پیشین گوئی بقید تاریخ مذکور ہوتی ہے۔ مثلاً: یہ کہ ''فلاں سنہ اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا۔''

⑦ وہ حدیثیں جو طبیبوں کے کلام سے مشابہ ہیں مثلاً: یہ کہ ''ہریسہ کے کھانے سے قوت آتی ہے'' یا یہ کہ ''مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی پسند کرتا ہے۔''

⑧ وہ حدیث جس کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں، مثلاً: عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز کا تھا۔

⑨ وہ حدیث جو صریح قرآن کے خلاف ہو، مثلاً: دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہے، کیونکہ اگر یہ روایت صحیح

ہوتو ہر شخص بتادے گا کہ قیامت کے آنے میں اس قدر دیر ہے، حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔

⑩ وہ حدیثیں جو خضر علیہ السلام کے متعلق ہیں۔

⑪ جس حدیث کے الفاظ رکیک ہوں۔

⑫ وہ حدیثیں جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد ہیں، حالانکہ یہ حدیثیں تفسیر بیضاوی اور کشاف وغیرہ میں منقول ہیں۔

ان اصول سے محدثین نے اکثر جگہ کام لیا اور ان کی بنا پر بہت سی روایتیں رد کر دیں، مثلاً: ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ''آنحضرت ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کو جزیہ سے معاف کر دیا تھا اور معافی کی دستاویز لکھوادی تھی'' ملا علی قاری اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ روایت مختلف وجوہ سے باطل ہے۔

① اس معاہدہ پر سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی گواہی بیان کی جاتی ہے حالانکہ وہ غزوۂ خندق میں وفات پا چکے تھے۔

② دستاویز میں کاتب کا نام معاویہ ہے، حالانکہ وہ فتح مکہ میں اسلام لائے۔

③ اس وقت تک جزیہ کا حکم ہی نہیں آیا تھا، جزیہ کا حکم قرآن مجید میں جنگ تبوک کے بعد نازل ہوا ہے۔

④ دستاویز میں تحریر ہے کہ ''یہودیوں سے بیگار نہیں لی جائے گی''۔ حالانکہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بیگار کا رواج ہی نہ تھا۔

⑤ خیبر والوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی تھی، ان سے جزیہ کیوں معاف کیا جاتا۔

⑥ عرب کے دور دراز حصوں میں جب جزیہ معاف نہیں ہوا، حالانکہ ان لوگوں نے چنداں مخالفت اور دشمنی نہیں کی تھی۔ تو خیبر والے کیونکر معاف ہو سکتے تھے۔

⑦ اگر جزیہ ان کو معاف کر دیا گیا ہوتا تو یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اسلام کے خیر خواہ اور دوست اور واجب الرعایت ہیں، حالانکہ چند روز کے بعد خارج البلد کر دیے گئے۔

تبصرہ

(فن سیرت پر)

سیرت کی یہ ایک اجمالی اور سادہ تاریخ تھی، اب ہم اس پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

امہات کتبِ سیرت

① سیرت پر اگرچہ آج بھی سینکڑوں تصنیفیں موجود ہیں، لیکن سب کا سلسلہ جا کر صرف تین چار کتابوں پر منتہی ہوتا ہے، سیرت ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد، طبری، ان کے علاوہ جو کتابیں ہیں، وہ ان سے متاخر ہیں، اور ان میں جو واقعات مذکور ہیں، زیادہ تر انہی کتابوں سے لئے گئے ہیں۔ (کتب حدیث کا جو ٹکڑا ہے اس سے اس مقام پر بحث نہیں) اس بنا پر ہم کو مذکورہ بالا کتابوں پر زیادہ تفصیل اور تدقیق سے نظر ڈالنی چاہیے۔

ان میں سے واقدی تو بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل ہے، محدثین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ وہ خود اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے اور حقیقت میں واقدی کی تصنیف خود اس بات کی شہادت ہے، ایک ایک جزئی واقعہ کے متعلق جس قسم کی گوناگوں اور دلچسپ تفصیلیں وہ بیان کرتا ہے، آج کوئی بڑے سے بڑا واقعہ نگار چشم دید واقعات اس طرح قلمبند نہیں کر سکتا۔

واقدی کے سوا، باقی اور تینوں مصنفین، اعتبار کے قابل ہیں، ابن اسحاق کی نسبت اگرچہ امام مالک اور بعض محدثین نے جرح کی ہے، تاہم ان کا یہ رتبہ ہے کہ امام بخاری اپنے رسالہ ''جزء القراءۃ'' میں ان کی سند سے روایتیں نقل کرتے ہیں اور ان کو صحیح سمجھتے ہیں، ابن سعد اور طبری میں کسی کو کلام نہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا، ان کی تصنیفات کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا، یہ لوگ خود شریک واقعہ نہیں، اس لئے جو کچھ بیان کرتے ہیں اور راویوں کے ذریعہ سے بیان کرتے ہیں، لیکن ان کے بہت سے رواۃ، ضعیف الروایۃ اور غیر مستند ہیں، اس کے علاوہ ابن اسحاق کی اصلی کتاب (ہندوستان میں) موجود نہیں، ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کو ترتیب اور تہذیب کے بعد جس صورت میں بدل دیا وہی آج موجود ہے، لیکن ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کو، زیاد بکائی کے واسطہ سے روایت کیا ہے، بکائی اگرچہ رتبہ کے شخص ہیں، تاہم محدثین کے اعلیٰ معیار سے فروتر ہیں، ابن مدینی (امام بخاری کے استاد) کہتے ہیں کہ ''وہ ضعیف ہے اور میں نے اس کو ترک کر دیا''۔ ابوحاتم کہتے ہیں: ''وہ استناد کے قابل نہیں''۔ نسائی کہتے ہیں: ''وہ ضعیف ہے۔''

ابن سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں، واقدی کے ذریعہ سے ہیں، اس لئے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے، باقی رواۃ میں سے بعض ثقہ ہیں اور بعض غیر ثقہ۔

طبری کے بڑے بڑے شیوخ روایت مثلاً: سلمہ ابرش، ابن سلمہ وغیرہ ضعیف الروایۃ ہیں۔

اس بنا پر مجموعی حیثیت سے سیرت کا ذخیرہ، کتبِ حدیث کا ہم پلہ نہیں، البتہ ان میں سے تحقیق و تنقید کے معیار پر جو اتر جائے وہ حجت اور استناد کے قابل ہے۔

کتب حدیث وسیرت میں فرقِ مراتب

سیرت کی کتابوں کی کم پائیگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تحقیق اور تنقید کی ضرورت احادیث احکام کے ساتھ مخصوص کر دی گئی، یعنی وہ روایتیں تنقید کی زیادہ محتاج ہیں جن سے شرعی احکام ثابت ہوتے ہیں، باقی جو روایتیں سیرت اور فضائل وغیرہ سے متعلق ہیں، ان میں تشدد اور احتیاط کی چنداں حاجت نہیں، حافظ زین الدین عراقی جو بہت بڑے پایہ کے محدث ہیں، سیرتِ منظوم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

ولیعلم الطالب ان السیرا   تجمع ماصح وما قد انکرا

''طالب کو جاننا چاہیے کہ سیرت میں سبھی طرح کی روایتیں ہوتی ہیں، صحیح بھی اور غلط بھی۔''

فن سیرت میں محدثین کی مسامحت

یہی وجہ ہے کہ مناقب اور فضائل اعمال میں کثرت سے ضعیف روایتیں شائع ہوگئیں اور بڑے بڑے علما نے اپنی کتابوں میں ان روایتوں کا درج کرنا جائز رکھا، علامہ ابن تیمیہ کتاب التوسل (مطبوعہ مطبع المنار، صفحہ ۹۹) میں لکھتے ہیں۔

قد رواہ من صنف فی عمل یوم ولیلۃ کابن السنی وابی نعیم وفی مثل ھذہ الکتب احادیث کثیرۃ موضوعۃ لایجوز الاعتماد علیھا فی الشریعۃ باتفاق العلماء۔

''اس حدیث کو ان لوگوں نے روایت کیا ہے، جنہوں نے رات دن کے اعمال میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مثلاً: ابن السنی اور ابونعیم اور اس قسم کی کتابوں میں کثرت سے جھوٹی حدیثیں موجود ہیں، جن پر اعتماد کرنا ناجائز ہے اور اس پر تمام علما کا اتفاق ہے۔''

حاکم نے مستدرک میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے خطا سرزد ہوئی تو انہوں نے کہا: ''اے خدا! میں تجھ کو محمد ﷺ کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری خطا معاف کر دے'' خدا نے کہا: ''تم نے محمد ﷺ کو کیونکر جانا'' حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: ''میں نے سر اٹھا کر عرش کے پایوں پر نظر ڈالی تو یہ الفاظ لکھے ہوئے دیکھے ((**لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ**)) اس سے میں نے قیاس کیا کہ تو نے اپنے نام کے ساتھ جس شخص کا نام ملایا ہے وہ ضرور تجھ کو محبوب ترین خلق ہوگا'' خدا نے کہا: ''آدم! تم نے سچ کہا اور محمد ﷺ نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا بھی نہ کرتا۔'' حاکم نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں:

واما تصحیح الحاکم لمثل ھذا الحدیث وامثالہ فھذا مما انکرہ علیہ ائمۃ العلم بالحدیث وقالوا ان الحاکم یصحح احادیث وھی موضوعۃ مکذوبۃ

عند اهل المعرفة بالحديث ۔ وكذلك احاديث كثيرة في مستدركه يصححها وهي عند ائمة اهل العلم بالحديث موضوعة۔ [1]

’’حاکم کا اس قسم کی حدیثوں کو صحیح کہنا ائمہ حدیث نے اس پر انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ حاکم بہت سی جھوٹی اور موضوع حدیثوں کو صحیح کہتے ہیں ۔ اسی طرح حاکم کی مستدرک میں، بہت سی حدیثیں ہیں جن کو حاکم نے صحیح کہا ہے، حالانکہ وہ ائمہ حدیث کے نزدیک موضوع ہیں۔‘‘

علامہ موصوف ایک اور موقع پر ابوالشیخ اصفہانی کی کتاب کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں: (صفحہ ۱۰۵، ۱۰۶)

وفيها احاديث كثيرة قوية صحيحة وحسنة واحاديث كثيرة ضعيفة موضوعة واهية و كذالك مايرويه خيثمة بن سليمان في فضائل الصحابة وما يرويه ابو نعيم الاصبهاني في فضائل الخلفاء في كتاب مفرد و في اول حلية الاولياء وما يرويه ابوبكر الخطيب وابو الفضل بن ناصر وابو موسى المديني وابو القاسم بن عساكر والحافظ عبدالغني وامثالهم ممن له معرفة بالحديث ۔

’’اور اس میں بہت سی حدیثیں ہیں جو قوی ہیں اور حسن ہیں اور بہت سی ضعیف اور موضوع اور مہمل ہیں اور اسی طرح وہ حدیثیں جو خیثمہ بن سلیمان، صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل میں روایت کرتے ہیں اور وہ حدیثیں جو ابونعیم اصفہانی نے ایک مستقل کتاب میں خلفا کے فضائل میں روایت کی ہیں اور حلیۃ الاولیاء کے اول میں اور اسی طرح وہ روایتیں جو ابوبکر خطیب اور ابو الفضل اور ابوموسیٰ مدینی اور ابن عساکر اور حافظ عبدالغنی وغیرہ اور ان کے پایہ کے لوگ روایت کرتے ہیں۔‘‘

غور کرو، ابونعیم، خطیب بغدادی، ابن عساکر، حافظ عبدالغنی وغیرہ حدیث اور روایت کے امام تھے، باوجود اس کے یہ لوگ خلفا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف روایت کرتے تھے، اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ صرف حلال وحرام کی حدیثوں میں احتیاط اور تشدد کی ضرورت ہے، ان کے سوا اور روایتوں میں سلسلۂ سند نقل کر دینا کافی ہے۔ تنقید اور تحقیق کی ضرورت نہیں۔

موضوعاتِ ملا علی قاری میں لکھا ہے کہ بغداد میں ایک واعظ نے یہ حدیث بیان کی کہ ’’قیامت میں خدا آنحضرت ﷺ کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا۔‘‘ امام ابن جریر طبری نے سنا تو بہت برہم ہوئے اور اپنے دروازہ پر یہ فقرہ لکھ کر لگا دیا کہ ’’خدا کا کوئی ہم نشین نہیں۔‘‘ اس پر بغداد کے عوام سخت برافروختہ ہوئے اور امام

[1] كتاب التوسل مطبوعه المنار، ص: ۱۰۱ (نيز تذكرة الحفاظ ذهبى ترجمة حاكم)

موصوف کے گھر پر اس قدر پتھر برسائے کہ دیواریں ڈھک گئیں۔ 1

اس موقع پر ایک خاص نکتہ لحاظ کے قابل ہے، یہ مسلّم ہے کہ حدیث و روایت میں امام بخاری اور مسلم سے بڑھ کر کوئی شخص کامل فن نہیں پیدا ہوا، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کو جو عقیدت اور خلوص اور شیفتگی تھی اس کے لحاظ سے بھی وہ تمام محدثین پر ممتاز تھے، باوجود اس کے فضائل و مناقب کے متعلق جس قسم کی مبالغہ آمیز روایتیں بیہقی، ابونعیم، بزار، طبرانی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، بخاری اور مسلم میں ان کا پتہ نہیں لگتا، بلکہ اس قسم کی حدیثیں، جو نسائی، ابن ماجہ، ترمذی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، صحیحین میں وہ بھی مذکور نہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر تحقیق و تنقید کا درجہ بڑھتا جاتا ہے مبالغہ آمیز روایتیں گھٹتی جاتی ہیں، مثلاً: یہ روایت کہ جب آنحضرت ﷺ عالم وجود میں آئے تو ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر پڑے، آتش فارس بجھ گئی، بحیرۂ طبریہ خشک ہو گیا۔ بیہقی، ابونعیم، خرائطی، ابن عساکر اور ابن جریر نے روایت کی ہے، لیکن صحیح بخاری اور صحیح مسلم بلکہ صحاح ستہ کی کسی کتاب میں اس کا پتہ نہیں۔

سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر اسی قسم کی کتابوں (طبرانی، بیہقی، ابونعیم وغیرہ سے) ماخوذ ہیں، اس لئے ان میں کثرت سے کمزور روایتیں درج ہو گئیں اور اسی بنا پر محدثین کو کہنا پڑا کہ سیر میں ہر قسم کی روایتیں ہوتی ہیں۔

محدثین نے جو اصول قرار دیے تھے، سیرت کی روایتوں میں لوگوں نے اکثر نظر انداز کر دیے، محدثین کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ روایت کا سلسلہ اصل واقعہ تک کہیں منقطع نہ ہونے پائے، لیکن آنحضرت ﷺ کے حالات ولادت کے متعلق جس قدر روایتیں مذکور ہیں، اکثر منقطع ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس کی عمر آنحضرت ﷺ کی ولادت کے وقت روایت کے قابل ہو، سب سے معمر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں وہ آنحضرت ﷺ سے عمر میں دو برس کم تھے، اسی بنا پر میلاد کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں ان میں سے اکثر متصل نہیں اور اسی بنا پر بہت دور از کار روایتیں پھیل گئیں، مثلاً ابونعیم نے آنحضرت ﷺ کی والدہ ماجدہ کی زبانی روایت کی ہے کہ "جب آنحضرت ﷺ پیدا ہوئے تو بہت سے پرندے آکر مکان میں بھر گئے جن کی زمرد کی منقار اور یاقوت کے پر تھے، پھر ایک سفید بادل آیا اور آنحضرت ﷺ کو اٹھا لے گیا اور ندا آئی کہ اس بچہ کو مشرق و مغرب اور تمام دریاؤں کی سیر کراؤ، کہ سب لوگ پہچان لیں۔" 2

مغازی کا بڑا حصہ امام زہری سے منقول ہے، لیکن ان کی اکثر روایتیں جو سیرت ابن ہشام اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں مذکور ہیں، منقطع ہیں یعنی اوپر کے راویوں کے نام مذکور نہیں۔

---

1 موضوعات ملا علي قاري، ص: ١٣، مطبوعه دهلي۔

2 مواہب لدنیہ میں یہ روایت نقل کی ہے اس میں بے انتہا مبالغہ آمیز باتیں ہیں، میں نے معمولی ٹکڑا نقل کر دیا ہے۔

تصانیفِ سیرت میں کتبِ احادیث کی طرف سے بے اعتنائی

② نہایت تعجب انگیز بات یہ ہے کہ جن بڑے بڑے نامور مصنفین، مثلاً: امام طبری وغیرہ نے سیرت پر جو کچھ لکھا اس میں اکثر جگہ مستند احادیث کی کتابوں سے کام نہیں لیا۔

بعض واقعات نہایت اہم ہیں ان کے متعلق حدیث کی کتابوں میں ایسی مفید معلومات موجود ہیں جن سے تمام مشکل حل ہو جاتی ہے، لیکن سیرت اور تاریخ میں ان معلومات کا ذکر نہیں۔ مثلاً: یہ امر کہ جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو لڑائی کی سلسلہ جنبانی کس کی طرف سے شروع ہوئی؟ ایک بحث طلب واقعہ ہے، تمام اربابِ سیر اور مؤرخین کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے ابتدا کی، لیکن سنن ابی داؤد میں صاف اور صریح حدیث موجود ہے کہ جنگ بدر سے پہلے کفارِ مکہ نے عبداللہ بن ابی کو یہ خط لکھا کہ "تم نے محمد ﷺ کو اپنے شہر میں پناہ دی ہے ان کو نکال دو، ورنہ ہم خود مدینہ آ کر تمہارا اور محمد (ﷺ) دونوں کا استیصال کر دیں گے۔" [1] سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں یہ واقعہ سرے سے منقول نہیں۔

مصنفینِ سیرت میں سے بعض لوگوں نے اس نکتہ کو سمجھا اور جب احادیث کی زیادہ چھان بین کی تو ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ سیرت کی کتابوں میں بہت سی روایتیں، صحیح حدیثوں کے خلاف درج ہو گئی ہیں، لیکن چونکہ ان کی تصنیف پھیل چکی تھی، اس لئے اس کی اصلاح نہ ہو سکی، حافظ ابن حجر ایک موقع پر دمیاطی کا ایک قول نقل کر کے لکھتے ہیں:

> ودلّ هذا على انه كان يعتقد الرجوع عن كثير مما وافق فيه اهل السير وخالف الاحاديث الصحيحة وان ذلك كان منه قبل تضلعه منها ولخروج نسخ كتابه وانتشاره لم يتمكن من تغييره۔ [2]

> "یہ قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اکثر واقعات جن میں دمیاطی نے اہل سیر کی موافقت اور صحیح حدیثوں کی مخالفت کی تھی، اپنی رائے سے رجوع کیا، لیکن چونکہ کتاب کے نسخے پھیل گئے تھے، اس لئے اس کی اصلاح نہ کر سکے۔"

مصنفینِ سیرت کی تدلیس

③ سیرت میں اگلوں نے جو کتابیں لکھیں، ان سے مابعد کے لوگوں نے جو روایتیں نقل کیں انہی کے نام سے کیں، ان کے مستند ہونے کی بنا پر، لوگوں نے ان تمام روایتوں کو معتبر سمجھ لیا اور چونکہ اصل کتابیں ہر شخص کو ہاتھ نہیں آ سکتی تھیں، اس لئے لوگ راویوں کا پتہ نہ لگا سکے اور رفتہ رفتہ یہ روایتیں تمام کتابوں میں داخل ہو

[1] غزوۂ بدر کے موقع پر ہم اس حدیث کے اصلی الفاظ نقل کریں گے۔

[2] زرقانی، ج ۳، ص: ۱۱۔

گئیں، اس تدلیس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مثلاً: جو روایتیں واقدی کی کتاب میں مذکور ہیں، ان کو لوگ عموماً غلط سمجھتے ہیں، لیکن انہیں روایتوں کو جب ابن سعد کے نام سے نقل کر دیا جاتا ہے تو لوگ ان کو معتبر سمجھتے ہیں، حالانکہ ابن سعد کی اصلی کتاب ہاتھ آئی تو پتہ لگا کہ ابن سعد نے اکثر روایتیں واقدی ہی سے لی ہیں۔

اصولِ روایت سے ہر جگہ کام نہیں لیا گیا

④ روایت کے متعلق جو اصول منضبط ہوئے صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق ان سے بعض بعض موقعوں پر کام نہیں لیا گیا، مثلاً: اصول روایت کی رو سے رواۃ کے مختلف مدارج ہیں، کوئی راوی نہایت ضابط، نہایت معنی فہم، نہایت دقیقہ رس ہوتا ہے، کسی میں یہ اوصاف کم ہوتے ہیں، کسی میں اور بھی کم ہوتے ہیں، یہ فرق مراتب جس طرح فطرۃً عام راویوں میں پایا جاتا ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت پر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت پر جو تنقیدیں کیں اور جن کا ذکر اوپر گزر چکا، اسی بنا پر کیں۔

رواۃ میں اختلافِ مراتب

اختلافِ مراتب کی بنیاد پر بڑے بڑے معرکۃ الآراء مسائل کی بنیاد قائم ہے، مثلاً: دو روایتوں میں تعارض پیش آ جائے تو اس بحث کے فیصلہ میں صحیح طریقہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک روایت کے راویوں کا دوسری روایت کے راویوں سے عالی رتبہ ہونا ثابت کر دیا جائے (گو دونوں راوی ثقہ ہیں) اور یہ اس روایت کی ترجیح کا قطعی ذریعہ ہوگا۔

تمام صحابہ کے عدول ہونے کی بحث

لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم میں آ کر یہ اصول بیکار ہو جاتا ہے۔ فرض کرو ایک روایت صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور دوسری کسی بدوی عرب سے مروی ہے، جس نے عمر بھر میں صرف ایک دفعہ اتفاقاً آنحضرت ﷺ کو دیکھ لیا تھا، تو اب دونوں روایتوں کا رتبہ برابر ہو جاتا ہے، علامہ مازری مشہور محدث ہیں، علامہ نووی شرح صحیح مسلم میں اکثر ان سے استناد کرتے ہیں، انہوں نے اس تعمیم کی مخالفت کی تھی، چنانچہ حافظ ابن حجر نے اصابہ کے دیباچہ (صفحہ ۱۰، ۱۱) میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

لسنا نعنی بقولنا الصحابة عدول كل من راه (ﷺ) يوماً ما اوزاره لماماً او اجتمع به لغرض وانصرف عن كتب وانما نعنی به الذين لا زموه و عزروه ونصروه واتبعوا النور الذي انزل معه اولئك هم المفلحون۔

"یہ مقولہ کہ صحابہ سب عادل ہیں، ہم اس سے، ہر ایسے شخص کو مراد نہیں لیتے جس نے آنحضرت ﷺ کو اتفاقاً دیکھ لیا یا آنحضرت ﷺ سے کسی غرض کے لئے ملا اور پھر فوراً واپس چلا گیا، بلکہ ہم ان لوگوں کو مراد

لیتے ہیں جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بہ التزام رہے اور آپ کی اعانت و مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوا، یہی لوگ کامیاب ہیں۔''

لیکن محدثین نے مازری کے اس قول سے عام مخالفت کی، علامہ مازری نے بے شبہ یہ غلطی کی کہ عدالت کے وصف کو مطلقاً مقربین صحابہ رضی اللہ عنہم سے مخصوص کر دیا، اس بنا پر محدثین کی مخالفت ان سے بیجا نہیں لیکن اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر و علی رضی اللہ عنہم کی روایتیں، ایک عام بدوی کی روایت کے برابر نہیں ہو سکتیں، خصوصاً ان روایتوں کے متعلق یہ فرق ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے جو فقہی مسائل یا دقیق مطالب سے تعلق رکھتی ہیں۔

واقعات میں سلسلۂ علت و معلول نہیں قائم کیا گیا

⑤ ارباب سیر اکثر واقعات کے اسباب و علل سے بحث نہیں کرتے، نہ ان کی تلاش و تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ اس باب میں یورپ کا طریقہ نہایت غیر معتدل ہے، یورپین مؤرخ ہر واقعہ کی علت تلاش کرتا ہے اور نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلۂ معلومات پیدا کرتا ہے، اس میں بہت کچھ اس کی خود غرضی اور خاص مطمح نظر کو دخل ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کو ایک محور بنا لیتا ہے، تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں، بخلاف اس کے اسلامی مؤرخ نہایت سچائی اور انصاف اور خالص بے طرف داری سے واقعات کو ڈھونڈتا ہے، اس کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ واقعات کا اثر اس کے مذہب پر، معتقدات پر اور تاریخ پر کیا پڑے گا، اس کا قبلۂ مقصد صرف واقعیت ہوتی ہے، وہ اس پر اپنے معتقدات اور قومیت کو بھی قربان کر دیتا ہے۔

لیکن اس میں حد سے زیادہ تفریط ہوگئی، اس بات سے بچنے کے لئے کہ واقعات، رائے سے مخلوط نہ ہو جائیں، وہ پاس پاس کے ظاہری اسباب پر بھی نظر نہیں ڈالتا اور ہر واقعہ کو خشک اور ادھورا چھوڑ دیتا ہے، مثلاً: اکثر لڑائیوں کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فلاں قبیلہ پر فلاں وقت فوجیں بھیج دیں، لیکن اس کے اسباب کا ذکر مطلق نہیں کرتے جس سے عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے لئے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں، صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں، اسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے، حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے کہ جن قبائل پر فوجیں گئیں وہ پہلے سے آمادۂ جنگ اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔

نوعیتِ واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار نہیں قائم کیا گیا

⑥ یہ لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ واقعہ کی نوعیت کے بدلنے سے شہادت اور روایت کی حیثیت کہاں تک بدل جاتی ہے، مثلاً: ایک راوی جو ثقہ ہے، ایک ایسا معمولی واقعہ بیان کرتا ہے جو عموماً پیش آتا ہے اور پیش آ سکتا ہے تو بے تکلف یہ روایت تسلیم کر لی جائے گی، لیکن فرض کرو، وہی راوی ایسا واقعہ بیان کرتا ہے جو غیر معمولی

ہے، تجربہ عام کے خلاف ہے، گردوپیش کے واقعات سے مناسبت نہیں رکھتا، تو واقعہ چونکہ زیادہ محتاج ثبوت ہے، اس لئے اب راوی کا معمولی درجہ وثوق کافی نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کو معمولی درجہ سے زیادہ عادل، زیادہ محتاط، زیادہ نکتہ دان ہونا چاہیے۔

کم سن راویوں کی روایت

مثلاً: ایک بحث یہ ہے کہ روایت کرنے کے لئے کسی عمر کی قید ہے یا نہیں؟ اکثر محدثین کا مذہب ہے کہ ۵ برس کا لڑکا حدیث کی روایت کرسکتا ہے، یا مثلاً: اگر کسی صحابی نے ۵ برس کی عمر میں آنحضرت ﷺ کے کسی قول یا فعل کی روایت کی تو قابل اعتبار ہوگی، محدثین کا اس پر استدلال ہے کہ محمود بن الربیع رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے، آنحضرت ﷺ کے وفات فرمانے کے وقت وہ پانچ برس کے بچے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ اظہار محبت کے طور پر ان کے منہ پر کلی کا پانی ڈال دیا تھا۔ اس واقعہ کو انہوں نے جوان ہو کر لوگوں سے بیان کیا اور سب نے یہ روایت قبول کی، اس سے ثابت ہوا کہ ۵ برس کی عمر کی روایت قبول ہوسکتی ہے۔ [1]

اس کے برخلاف بعض محدثین کی رائے ہے کہ کمسن کی روایت قابل حجت نہیں، فتح المغیث میں ہے:

ولكن قد منع قوم القبول هنا اى فى مسئلة الصبى خاصة فلم يقبلوا من تحمل قبل البلوغ لان الصبيى مظنة عدم الضبط وهو وجه للشافعية......

وكذا كان ابن المبارك يتوقف فى تحديث الصبى. [2]

”لیکن ایک جماعت یہاں قبول روایت سے منع کرتی ہے، خصوصاً بچوں کی روایت کے مسئلہ میں بلوغ سے پہلے جو روایت کسی بچہ نے سنی ہو، اس کو وہ قبول نہیں کرتی، شوافع کی یہی رائے ہے، اسی طرح عبداللہ بن مبارک بھی بچہ کی حدیث روایت کرنے میں توقف کرتے ہیں۔“

لیکن اثبات ونفی، دونوں پہلو بحث طلب ہیں، بے شبہ پانچ برس کا بچہ اگر یہ واقعہ بیان کرے کہ میں نے فلاں شخص کو دیکھا تھا، اس کے سر پر بال تھے، یا وہ بوڑھا تھا، یا اس نے مجھ کو گودیوں میں کھلایا تھا، تو اس روایت میں شبہ کرنے کی وجہ نہیں، لیکن فرض کرو وہی بچہ یہ بیان کرتا ہے کہ فلاں شخص نے فقہ کا یہ دقیق مسئلہ بتایا تھا، تو شبہ ہوگا کہ بچہ نے صحیح طور سے مسئلہ کو سمجھا بھی تھا یا نہیں؟

فقہا نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے، فتح المغیث میں شرح مہذب سے نقل کیا ہے:

قبول اخبار الصبى المميز فيما طريقه المشاهدة بخلاف ما طريقه النقل كالافتاء ورواية الاخبار ونحوه. [3]

”باتمیز لڑکے کی روایت ان واقعات کے متعلق جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں مقبول ہے،

---

[1] یہ پوری بحث فتح المغیث، صفحہ:۱۶۶ تا صفحہ ۱۶۸ میں ہے۔ [2] ایضاً: ۱٦٤۔ [3] ایضا، ص: ۲۲۱۔

لیکن جو باتیں نقلیات میں داخل ہیں، مثلاً: فتویٰ یا حدیث کی روایت ان میں ان کی روایت مقبول نہیں ۔"

لیکن عام طور سے یہ اصول تسلیم نہیں کیا گیا، فتح المغیث میں ہے:

ثم الضبط نوعان ظاهر وباطن فالظاهر ضبط معناه من حيث اللغة والباطن ضبط معناه من حيث تعلق الحكم الشرعي به وهو الفقه ومطلق الضبط الذي هو شرط في الراوي هو الضبط ظاهرا عند الا كثر لانه يجوز نقل الخبر بالمعنى فيلحقه تهمة تبديل المعنى بروايته قبل الحفظ او قبل العلم حين سمع و لهذا المعنى قلت الرواية عن اكثر الصحابة لتعذر هذا المعنى قال وهذا الشرط وان كان على مابيّنا فان اصحاب الحديث قل مايعتبرونه في حق الطفل دون المغفل فانه متى صح عندهم سماع الطفل او حضوره اجازوا روايته۔ [1]

"پھر ضبط [2] کی دو قسمیں ہیں، ظاہری اور باطنی، ظاہری کے یہ معنی ہیں کہ لفظ کے لغوی معنی کا لحاظ رکھا جائے، باطنی کے یہ معنی کہ شرعی حکم جس بنا پر متعلق ہیں اس کا لحاظ رکھا جائے اس کو فقہ کہتے ہیں، لیکن مطلقاً جو ضبط راوی کے لئے مشروط ہے، اکثر کے نزدیک وہ صرف ظاہری ضبط ہے، کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک روایت بالمعنی جائز ہے، اسی بنا پر سنتے وقت قلتِ حفظ، یا قلتِ علم کے سبب سے روایت کے ادا کرنے میں راوی پر مفہوم کے بدل دینے کا شبہ ہوسکتا ہے، یہ وجہ ہے کہ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بہت کم حدیثیں روایت کیں، کیونکہ مفہوم کا بعینہ روایت میں قائم رکھنا مشکل ہے، لیکن محدثین، بچہ کے حق میں (بے عقل کے حق میں نہیں) اس کا اعتبار کرتے بلکہ بچہ ان کے نزدیک جب سننے اور مجلس میں شریک ہونے کے قابل ہوگیا تو اس کی روایت کو جائز سمجھتے ہیں۔"

راویوں میں فقاہت کی شرط

ایک یہ بحث ہے کہ جو صحابہ رضی اللہ عنہم فقیہ نہ تھے، ان کی روایت اگر قیاس شرعی کے خلاف ہو تو واجب العمل ہوگی یا نہیں؟ اس کے متعلق بحر العلوم، امام فخر الاسلام کا مذہب نقل کر کے لکھتے ہیں:

ووجه قول الامام فخر الاسلام ان النقل بالمعنى شائع وقلما يوجد النقل باللفظ فان حادثة واحدة قد رويت بعباراتٍ مختلفة ثم ان تلك العبارات

[1] ایضاً، ص:۱۲۱۔

[2] ضبط کا لفظ محدثین کی ایک اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں کسی روایت کے الفاظ اور مطلب کو اچھی طرح سمجھنا اور ادا کرنا۔

ليست مترادفة بل قدروى ذلك المعنى بعبارات مجازية فاذا كان الراوى غير فقيه احتمل الخطأ فى فهم المعنى المرادى الشرعى...... ولا يلزم منه نسبة الكذب متعمدا الى الصحابى معاذ الله عن ذالك۔ [1]

''امام فخر الاسلام کے قول کی وجہ یہ ہے کہ روایت بالمعنی عام طور پر شائع ہے اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ روایت باللفظ کی جائے کیونکہ ایک ہی واقعہ مختلف الفاظ میں ادا کیا گیا ہے اور یہ الفاظ باہم مترادف بھی نہیں، بلکہ اکثر مجازی عبارتوں میں مطالب ادا کئے گئے ہیں، اس بنا پر جب راوی فقیہ نہ ہوگا تو احتمال ہوگا کہ اس نے مطلب مقصود شرعی کے سمجھنے میں غلطی کی ہو، اس سے معاذ اللہ یہ لازم نہیں آتا کہ صحابی کی طرف جھوٹ کی نسبت کی جائے۔''

محدثین اس اصول سے کہ ''واقعہ جس درجہ کا اہم ہو، شہادت بھی اسی درجہ کی اہم ہونی چاہیے۔'' بے خبر نہ تھے۔ امام بیہقی کتاب المدخل میں ابن مہدی کا قول نقل کرتے ہیں:

روينا عن النبى ﷺ فى الحلال والحرام والاحكام شددنا فى الاسانيد وانتقدنا فى الرجال واذا روينا فى الفضائل والثواب والعقاب سهلنا فى الاسانيد وتسامحنا فى الرجال۔ [2]

''جب ہم آنحضرت ﷺ سے حلال وحرام اور احکام کے متعلق حدیث روایت کرتے ہیں تو سند میں نہایت تشدد کرتے ہیں اور راویوں کو پرکھ لیتے ہیں، لیکن جب فضائل اور ثواب وعقاب کی حدیثیں آتی ہیں تو ہم سندوں میں سہل انگاری کرتے اور راویوں کے متعلق چشم پوشی کرتے ہیں۔''

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

ابن اسحاق رجل تكتب عنه هذه الاحاديث يعنى المغازى ونحوها واذا جاء الحلال والحرام اردنا قومًا هكذا وقبض اصابع يديه الاربع۔ [3]

''ابن اسحاق اس درجہ کے آدمی ہیں کہ مغازی وغیرہ کی حدیثیں ان سے روایت کی جاسکتی ہیں، لیکن جب حلال وحرام کے مسائل آئیں تو ہم کو ایسے لوگ درکار ہیں یہ کہہ کر انہوں نے چار انگلیاں بند کر کے دبالیں۔''

اس سے ثابت ہوا کہ محدثین واقعہ کی اہمیت کی بنا پر راوی کے درجہ کا لحاظ رکھتے تھے۔ اس بنا پر ابن اسحاق کی نسبت امام ابن حنبل نے یہ تفریق کی کہ ''حلال وحرام میں ان کی شہادت معتبر نہیں، لیکن مغازی میں

[1] شرح مسلم، مطبوعہ لکھنو، ص: ٤٣٢۔

[2] فتح المغيث، ص: ١٢٠۔ [3] فتح المغيث، ص: ١٢٠۔

ان کا اعتبار ہے۔'' یہ وہی اصول ہے کہ جس درجہ کا واقعہ ہو، اسی درجہ کی شہادت ہونی چاہیے اور یہ کہ واقعہ کے بدلنے سے شہادت کی اہمیت بدل جاتی ہے، لیکن واقعہ کی اہمیت احکام فقہیہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔

نوعیت واقعہ کی اہمیت کا خیال، فقہائے حنفیہ نے ملحوظ رکھا، اسی بنا پر ان کا مذہب ہے کہ جو روایت قیاس کے خلاف ہو اس کی نسبت یہ دیکھنا چاہیے کہ راوی، فقیہ اور مجتہد بھی ہے یا نہیں، منار میں ہے:

والراوی ان اعرف بالفقه والتقدم فی الاجتهاد كالخلفاء الراشدين والعبادلة كان حديثه حجة يترك به القياس خلافًا لمالك وان عرف بالعدالة والضبط دون الفقه كانس وابی هريرة ان وافق حديثه القياس عمل به وان خالفه لم يترك الا بالضرورة۔ [1]

''راوی اگر تفقہ اور اجتہاد میں مشہور ہے جیسے کہ خلفائے راشدین یا عبادلہ رضی اللہ عنہم تھے تو اس کی حدیث حجت ہوگی اور اس کے مقابلہ میں قیاس چھوڑ دیا جائے گا (بخلاف امام مالک کے) اور اگر راوی ثقہ اور عادل ہے لیکن فقیہ نہیں جیسے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں تو اگر وہ روایت قیاس کے موافق ہوگی تو اس پر عمل ہوگا ورنہ قیاس کو بغیر ضرورت ترک نہ کیا جائے گا۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مثال اگرچہ قابل بحث ہے کیونکہ اکثر علما کے نزدیک حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فقیہ اور مجتہد تھے، لیکن یہ جزوی بحث ہے، گفتگو اصل مسئلہ میں ہے۔

روایت میں قیاس کا کس قدر حصہ شامل ہے

⑦ سب سے اہم اور سب سے زیادہ قابل بحث یہ بات ہے کہ راوی جو واقعہ بیان کرتا ہے، اس میں کس قدر حصہ اصل واقعہ ہے اور کس قدر راوی کا قیاس ہے، تفحص اور استقرا سے بعض جگہ یہ نظر آتا ہے کہ راوی جس چیز کو واقعہ کی حیثیت سے بیان کرتا ہے وہ اس کا قیاس ہے، واقعہ نہیں، اس کی بہت سی مثالیں سیرت میں موجود ہیں، یہاں ہم صرف ایک دو واقعہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ جب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے ناراض ہو کر تنہا نشین ہو گئے تھے تو یہ مشہور ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے ازواج کو طلاق دے دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خبر سنی تو مسجد نبوی ﷺ میں آئے، یہاں لوگ کہہ رہے تھے۔ [2] کہ آنحضرت ﷺ نے ازواج کو طلاق دے دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''نہیں میں نے طلاق نہیں دی۔''

یہ حدیث بخاری میں کئی جگہ بہ اختلاف الفاظ مذکور ہے، کتاب النکاح میں جو روایت ہے اس کی شرح

[1] نور الانوار، ص: ۱۷۴، ۱۴۸، مطبع علی بخش خاں۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب فی الایلاء: ۳۶۹۵۔

میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وان الاخبار التی تشاع و لو کثرنا قلوھا ان لم یکن مرجعھا الی امر حسی من مشاھدۃ او سماع لا تستلزم الصدق فان جزم الانصاری فی روایۃ بوقوع التطلیق وکذا جزم الناس الذی رآھم عمر عند المنبر بذالک محمول علی انھم شاع بینھم ذلک من شخص بناہ علی التوھم الذی توھمہ من اعتزال النبی ﷺ نساءہ فظن لکونہ لم تجر عادتہ بذالک انہ طلقھن فاشاع انہ طلقھن فشاع ذلک فتحدث الناس بہ واخلق بھذا الذی ابتداء باشاعۃ ذلک ان یکون من المنافقین کما تقدم۔ [1]

''جو خبریں شائع ہو جاتی ہیں گو ان کے راوی کثرت سے ہوں لیکن اگر ان خبروں کی بنیاد امر حسی یعنی مشاہدہ یا استماع نہ ہو تو ان کا سچا ہونا ضروری نہیں۔ چنانچہ انصاری نے اور ان صحابہ رضی اللہ عنہم نے جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر کے پاس دیکھا تھا، طلاق کا جو یقین کر لیا وہ یوں ہوا ہوگا کہ کسی شخص نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور چونکہ آنحضرت ﷺ کی یہ عادت نہ تھی، اس لئے اس نے یہ قیاس کیا کہ آنحضرت ﷺ نے طلاق دے دی، اس نے یہ خبر پھیلا دی اور لوگ ایک دوسرے سے اس کو بیان کرنے لگے اور قیاس یہ ہے کہ اول جس شخص نے یہ خبر پھیلائی وہ منافق ہوگا۔''

غور کرو، مسجد نبوی ﷺ میں تمام صحابہ رضی اللہ عنہم جمع ہیں اور سب بیان کر رہے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے طلاق دے دی، صحابہ رضی اللہ عنہم عموماً ثقہ اور عادل ہیں اور ان کی تعداد کثیر اس واقعہ کو بیان کر رہی ہے، باوجود اس کے جب تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعہ نہیں بلکہ قیاس تھا۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی جرأت کر کے یہ خیال ظاہر کیا کہ راوی اول منافقین میں سے ہوگا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی نسبت بہت سے ایسے واقعات روایتوں میں مذکور ہیں جن میں سے ایک واقعۂ افک ہے، ان کی نسبت بھی وہی قیاس ہونا چاہیے جو حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ظاہر کیا یعنی یہ کہ منافقین نے ان کی طرف منسوب کر دیے ہوں گے، پھر تمام مسلمانوں میں پھیل گئے۔

فن تاریخ و روایت پر خارجی اسباب کا اثر

⑧ فن تاریخ و روایت پر جو خارجی اسباب اثر کرتے ہیں، ان میں سب سے بڑا قوی اثر حکومت کا ہوتا ہے، لیکن مسلمانوں کو ہمیشہ اس پر فخر کا موقع حاصل رہے گا کہ ان کا قلم تلوار سے نہیں دبا، حدیثوں کی تدوین بنو

[1] فتح الباری، ج۹، ص:۲۵۷ طبع اول مصر۔

امیہ کے زمانہ میں ہوئی جنہوں نے پورے ۹۰ برس تک سندھ سے ایشیائے کوچک اور اندلس تک مساجد جامع میں آلِ فاطمہ کی توہین کی اور جمعہ میں سر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر لعن کہلوایا، سینکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں، عباسیوں کے زمانہ میں ایک ایک خلیفہ کے نام بنام پیشین گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں، لیکن نتیجہ کیا ہوا، عین اسی زمانہ میں محدثین نے علانیہ منادی کر دی کہ یہ سب جھوٹی روایتیں ہیں، آج حدیث کا فن اس خس وخاشاک سے پاک ہے اور بنوامیہ اور عباسیہ جو ظل اللہ اور جانشین پیغمبر تھے، اسی مقام پر نظر آتے ہیں، جہاں ان کو ہونا چاہیے تھا۔

ایک دفعہ ایک شاعر نے مامون الرشید کے دربار میں قصیدہ پڑھا کہ ''امیر المؤمنین! اگر تو آنحضرت ﷺ کے انتقال کے وقت موجود ہوتا تو خلافت کا جھگڑا سرے سے نہ پیدا ہوتا، دونوں فریق تیرے ہاتھ پر بیعت کر لیتے''۔ وہیں سر دربار ایک شخص نے اٹھ کر کہا ''تو جھوٹ کہتا ہے، امیر المؤمنین کا باپ (حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو عباسیوں کے مورثِ اعلیٰ ہیں) وہاں موجود تھا، اس کو کس نے پوچھا؟'' مامون الرشید کو بھی اس گستاخانہ لیکن سچ جواب کی تحسین کرنی پڑی۔

تاہم یہ عالمگیر مؤثر بالکل بے اثر نہیں رہ سکتا تھا، اس لئے مغازی میں اس کے نشانات پائے جاتے ہیں، تاریخ نگاری کا قدیم طریقہ یہ تھا کہ فتوحات اور رزمیہ کارناموں کو نہایت تفصیل سے لکھتے تھے، ملکی نظم ونسق اور تمدن ومعاشرت کے واقعات یا تو بالکل قلم انداز کر جاتے تھے، یا اس طرح پراگندہ اور بے اثر لکھتے تھے کہ ان پر نگاہ نہیں پڑتی تھی، اسلام میں جب تالیف وتصنیف کی ابتدا ہوئی تو یہی نمونے پیش نظر تھے، اس کا پہلا نتیجہ یہ تھا کہ سیرت کا نام مغازی رکھا گیا۔ جس طرح سلاطین کی تاریخیں جنگ نامہ وشاہنامہ کے نام سے لکھی جاتی ہیں، چنانچہ سیرت کی ابتدائی تصنیف مثلاً: سیرت موسیٰ بن عقبہ اور سیرت ابن اسحاق مغازی ہی کے نام سے مشہور ہیں، ان کتابوں کی ترتیب یہ ہے کہ سلاطین کی تاریخ کی طرح، سنین کو عنوان بناتے ہیں اور اسی ترتیب سے حالات لکھتے ہیں، یہ حالات تمام تر جنگی معرکے ہوتے ہیں اور غزوات ہی کے عنوان سے داستانیں شروع کی جاتی ہیں۔

یہ طریقہ اگرچہ سلطنت وحکومت کی تاریخ کے لئے بھی صحیح نہ تھا، لیکن نبوت کی سوانح نگاری کیلئے تو ناموزوں ہے، پیغمبر کو ناگزیر طور پر جنگی واقعات پیش آتے ہیں، اس خاص حالت میں وہ بظاہر ایک فاتح یا سپہ سالار کے رنگ میں نظر آتا ہے، لیکن یہ پیغمبر کی اصلی صورت نہیں ہے، پیغمبر کی زندگی کا ایک ایک خط وخال، تقدس، نزاہت، حلم وکرم، ہمدردی عام اور ایثار ہوتا ہے بلکہ عین اس وقت جبکہ اس پر سکندر اعظم کا دھوکا ہوتا ہے، ژرف بین نگاہ فوراً پہچان لیتی ہے کہ سکندر نہیں بلکہ فرشتۂ یزدانی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مغازی کا انداز حدیث کی کتابوں میں سیرت کی تصنیفات سے بالکل الگ ہے۔

تمام ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے جب بنونضیر کا محاصرہ کیا تو حکم دیا کہ ان کے نخلستان کاٹ ڈالے جائیں (قرآن مجید میں بھی اس کا اجمالی ذکر ہے) ارباب سیر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہودیوں نے اس حکم کی نسبت یہ اعتراض کیا کہ "یہ انصاف اور انسانیت کے خلاف ہے" لیکن مؤرخین یہ اعتراض نقل کر کے اس کا جواب نہیں دیتے اور یوں ہی گزر جاتے ہیں۔

قیاس و درایت

⑨ نہایت مہتم بالشان بحث یہ ہے کہ کوئی روایت اگر عقل یا مسلمات یا دیگر قرائن صحیحہ کے خلاف ہو تو آیا صرف اس بنا پر واجب التسلیم ہوگی یا نہیں کہ رواۃ ثقہ ہیں اور سلسلۂ سند متصل ہے؟ علامہ ابن جوزی نے اگرچہ لکھا ہے (جیسا کہ اوپر گزر چکا) کہ جو حدیث عقل کے خلاف ہو، اس کے رواۃ کی جرح و تعدیل کی ضرورت نہیں، لیکن اس سے اصل بحث کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ عقل کا لفظ ایک غیر مشخص لفظ ہے، حامیان روایت لکھتے ہیں کہ اگر اس لفظ کو وسعت دے دی گئی تو ہر شخص جس روایت سے چاہے گا انکار کر دے گا کہ یہ میرے نزدیک عقل کے خلاف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بحث کا قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے، عام خیال یہ ہے کہ جس روایت کے رواۃ ثقہ اور مستند ہوں اور سلسلہ روایت کہیں سے منقطع نہ ہو، وہ باوجود خلاف عقل ہونے کے انکار کے قابل نہیں، ذیل کی مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا۔

① ((تلك الغرانيق العلى)) کی حدیث کو، جس میں بیان ہے کہ شیطان نے آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے وہ الفاظ نکلوا دیے جن میں بتوں کی تعریف ہے، بعض محدثین نے ضعیف اور ناقابل اعتبار کہا تھا، اس کے باطل ہونے کی ایک عقلی دلیل یہ بیان کی تھی۔

لو وقع لارتد كثير ممن اسلم ولم ينقل ذالك۔

"اگر ایسا ہوتا تو بہت سے مسلمان اسلام سے پھر جاتے حالانکہ ایسا ہونا مذکور نہیں۔"

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

وجميع ذالك لا يتمشّى على القواعد فان الطرق اذا كثرت وتباينت مخارجها دلّ ذالك على ان لها اصلاً۔ [1]

"یہ تمام اعتراضات اصول کے موافق چل نہیں سکتے، اس لئے کہ روایت کے طریقے جب متعدد ہوتے ہیں اور ان کے ماخذ مختلف ہوتے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ روایت کی کچھ اصل ہے۔"

[1] فتح الباری، ج ۸، ص: ۳۳۳، مطبوعہ مصر۔

② صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین دفعہ جھوٹ بولا تھا۔ [1] امام رازی نے اس حدیث سے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ ''اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جھوٹ بولنا لازم آتا ہے، اس لئے زیادہ آسان صورت یہ ہے کہ ہم حدیث کے کسی راوی کا جھوٹا ہونا مان لیں۔'' علامہ قسطلانی امام رازی کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں:

فليس بشيء اذالحديث صحيح ثابت و ليس فيه نسبة محض الكذب الى الخليل وكيف السبيل الى تخطية الراوى مع قوله انى سقيم و بل فعله كبيرهم هذا وعن سارة اختى اذ ظاهر هذه الثلاثة بلاريب غير مراد۔ [2]

''امام رازی کا قول بالکل ہیچ ہے اس لئے کہ حدیث صحیح و ثابت ہے اور اس میں محض کذب کی نسبت حضرت خلیل علیہ السلام کی طرف نہیں ہے اور راوی کا تخطیہ کیونکر ہو سکتا ہے جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول موجود ہے انى سقيم اور بل فعله كبيرهم هذا اور سارة اختى کیونکہ ان تینوں جملوں میں ظاہر لفظ قطعاً مراد نہیں۔''

اس قسم کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں، ہم نے اختصار کے لحاظ سے صرف دو مثالیں نقل کیں۔

صحابہ میں دو گروہ

ان کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ ہے جو دلائل عقلی اور قرائن حالی کی بنا پر بعض حدیث کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا ہے اور یہ طریقہ خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد میں شروع ہو گیا تھا اور محدثین کے اخیر دور تک قائم رہا، چونکہ یہ رائے عام خیال کے خلاف ہے اس لئے ہم اس کی متعدد مثالیں نقل کرتے ہیں:

① حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث بیان کی کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''جس چیز کو آگ چھوئے، اس کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ''اس کی بنا پر تو لازم آتا ہے کہ ہم گرم پانی (کے استعمال) سے بھی وضو نہ کریں''۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''بھتیجے! جب تم آنحضرت ﷺ کی کوئی حدیث سنو، تو کہاوتیں نہ کہا کرو۔'' [3]

② صحیح مسلم کے مقدمہ میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قضایا (یعنی مقدمات کے فیصلے) پیش کئے گئے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کی نقل لیتے جاتے تھے اور بعض بعض فیصلے چھوڑتے جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ:

---

[1] صحيح بخارى، كتاب احاديث الانبياء: ٣٣٥٧، ٣٣٥٨۔

[2] قسطلانى، ج ٥ ص: ٣٨٩، مطبع مصريه بولاق۔

[3] ابن ماجه، ابواب الطهارة، باب الوضوء مما غيرت النار: ٤٨٥ وترمذى، ابواب الطهارة، باب ما جاء فى الوضوء مما غيرت النار: ٧٩۔

واللہ! ما قضی بھذا علیٌّ الا ان یکون ضلّ۔ ❶

''خدا کی قسم! علی رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ کیا ہے تو گمراہ ہو کر کیا ہے۔'' (لیکن چونکہ وہ گمراہ نہ تھے، اس لئے یہ فیصلہ بھی نہ کیا ہوگا)

اسی روایت کے بعد صحیح مسلم (ایضاً) میں یہ روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس لوگ ایک کتاب لائے، جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلے قلمبند تھے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک گز کے بقدر چھوڑ کر باقی کتاب مٹادی۔ ❷ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے صرف ان فیصلوں کے مضمون سے یہ قیاس کرلیا کہ وہ صحیح نہیں ہو سکتے، اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ رواۃ اور سند کا پتہ لگائیں۔

③ صحیح بخاری میں ہے کہ محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ نے ایک جلسہ میں یہ حدیث بیان کی کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو شخص خالصتاً خدا کے لئے ((لا الہ الا اللہ)) کہے گا، خدا اس پر آگ حرام کر دے گا'' اس جلسہ میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ جن کے مکان میں آنحضرت ﷺ نے ۷ مہینے تک قیام فرمایا تھا، حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سن کر کہا:

واللہ! ما اظن رسول اللہ ﷺ قال ما قلت قط۔ ❸

''خدا کی قسم! میں کبھی یہ خیال نہیں کرسکتا کہ جو تم کہتے ہو آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہوگا۔''

محمود بن الربیع رضی اللہ عنہ صحابی تھے اور حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کو ان کے ثقہ ہونے میں کلام نہ تھا، چونکہ یہ حدیث ان کے نزدیک قرائن کے خلاف تھی، حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ اس پر یقین نہ لا سکے اور کہا کہ ''آنحضرت ﷺ نے ایسا نہ فرمایا ہوگا۔'' اگرچہ صحیح بخاری میں ہے کہ محمود بن الربیع رضی اللہ عنہ نے مدینہ آکر اس حدیث کی تصدیق اپنے راوی (عتبان) سے کرلی، لیکن اس سے اصل مسئلہ پر اثر نہیں پڑتا، حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کو جن اسباب کی بنا پر، محمود بن الربیع رضی اللہ عنہ کی روایت میں شبہ پیدا ہوا، عتبان پر بھی وہی شبہ پیدا ہوسکتا تھا، حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ خدانخواستہ، محمود کو غلط گو نہیں سمجھتے تھے بلکہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے روایت کے مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہوگی، یہ احتمال بعینہ راوی اول کی نسبت بھی ہوسکتا ہے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے کہا تھا، کہ ''تم لوگ سچے لوگوں سے روایت کرتے ہو، لیکن سامعہ غلطی کر جاتا ہے۔'' ❹

④ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے تیمّم کی روایت بیان کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یقین نہیں آیا، بلکہ جیسا کہ صحیح مسلم باب التیمم میں ہے، یہ الفاظ کہے اتق اللہ یاعمار ''یعنی اے عمار! خدا سے ڈرو۔'' چنانچہ اسی بنا پر جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے سامنے، حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس روایت سے

---

❶ صحیح مسلم، باب النھی عن الروایۃ عن الضعفاء: ۲۲۔

❷ نووی شرح صحیح مسلم (ج۱، ص:۳۸) میں لکھا ہے' کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب' ملا طفہ کی شکل میں لکھی تھی (جس طرح اگلے زمانہ میں خطوط کو لمبان میں جوڑ کر جمع کرتے تھے اور لپیٹ کر رکھتے تھے)۔

❸ صحیح بخاری، کتاب التھجد، باب صلوٰۃ النوافل جماعۃ: ۱۱۸۶۔

❹ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب المیت یعذب ببکاء اھلہ: ۲۱۴۹۔

استدلال کیا تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں، لیکن عمر رضی اللہ عنہ کو عمار رضی اللہ عنہ کی روایت سے تسکین نہیں ہوئی۔ ❶

⑤ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے جب یہ حدیث بیان کی گئی کہ لوگوں کے نوحہ کرنے سے مردہ پر عذاب ہوتا ہے تو انہوں نے اس بنا پر انکار کیا کہ یہ قرآن مجید کی اس آیت کے خلاف ہے:

﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ ۚ ﴾ (۱۷/ الاسرآء:۱۵)

''اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔''

⑥ اسی طرح جب ان کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی کہ آنحضرت (ﷺ) نے کشتگان بدر کی نسبت فرمایا کہ میں جو کہتا ہوں یہ سنتے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ''کہ ابن عمر نے غلطی کی۔'' ❷ اس روایت کے راوی اگرچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ تھے، جو مشہور صحابی ہیں، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس بنا پر روایت کی صحت سے انکار کیا کہ ان کے نزدیک وہ روایت قرآن مجید کے خلاف تھی۔

اکثر محدثین نے ان مباحث میں ثابت کیا ہے کہ روایت صحیح ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اجتہاد جس کی بنا پر انہوں نے روایت سے انکار کیا، صحیح نہیں، ہم کو اس سے بحث نہیں، اس موقع پر صرف یہ بحث ہے کہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں ایسے لوگ بھی تھے جو روایت کو باوجود راوی کے ثقہ ہونے کے اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے تھے کہ وہ دلائل عقلی یا نقلی کے خلاف ہے۔

⑦ ایک مختلف فیہ مسئلہ یہ ہے کہ عورت کو جب طلاق دے دی جائے تو عدت کے زمانہ تک شوہر پر اس کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام، واجب ہے یا نہیں؟ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ تھیں جن کو ان کے شوہر نے طلاق دے دی تھی، ان کا بیان ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کے پاس گئیں تو آپ نے ان کو نفقہ اور مکان نہیں دلوایا، انہوں نے یہ حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے بیان کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کہ ہم خدا کی کتاب اور آنحضرت ﷺ کی سنت کو ایک عورت کے بیان پر چھوڑ نہیں سکتے، جس کی نسبت ہم کو معلوم نہیں کہ اس نے یاد رکھا یا بھول گئی۔'' امام شعبی نے ایک مجلس میں فاطمہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت بیان کی تو اسود بن یزید نے ان کو کنکریاں ماریں کہ تم ایسی حدیث بیان کرتے ہو! پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مذکورۂ بالا قول نقل کیا۔ ❸

محدثین اور درایتِ حدیث

صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد بھی محدثین میں ایک ایسا گروہ موجود رہا جو عقلی یا نقلی وجوہ کی بنا پر بعض روایات کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا تھا، گو ان کے رواۃ ثقہ اور مستند ہوتے تھے۔

① ایک ضعیف حدیث ہے کہ ''جس شخص نے عشق کیا اور پاک دامن رہا اور وفات پائی، وہ شہید ہوا۔'' حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ زاد المعاد میں، اس حدیث کو دلائل عقلی سے باطل ثابت کر کے لکھتے ہیں:

❶ صحیح بخاری، کتاب التیمم: ۳۴۵ و صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب التیمم: ۸۲۰۔

❷ صحیح مسلم، کتاب الجنائز: ۲۱۵۴ میں یہ روایتیں متعدد طریقوں سے مذکور ہیں۔

❸ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب المطلقة البائن لا نفقة لها: ۳۷۱۰۔

فلو کان اسناد هذا الحديث كالشمس كان غلطا و وهما۔ ❶

''اگر اس حدیث کی سند آفتاب کی طرح بھی ہوتی تب بھی وہ غلط اور وہم ہوتی۔''

② صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب الفئی میں روایت ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ

اقض بيني وبين هذا الكاذب الآثم الغادر الخائن۔ ❷

''میرے اور اس جھوٹے، مجرم، دھوکہ باز، خائن کے درمیان فیصلہ کیجئے۔''

چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں یہ الفاظ کسی مسلمان کی زبان سے نہیں نکل سکتے، اس لئے بعض محدثین نے اپنے نسخہ سے یہ الفاظ نکال دیے۔ ❸ علامہ مازری، اس حدیث کی نسبت لکھتے ہیں:

اذا انسدت طرق تاويلها نسبنا الكذب الى رواتها۔ ❹

''جب اس حدیث کی تاویل کے سب رستے رک جائیں گے تو ہم راویوں کو جھوٹا کہیں گے۔''

③ بخاری میں روایت ہے کہ خدا نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ گز کا تھا، ❺ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

ويشكل على هذا ما يوجد الآن من آثار الامم السالفة كديار ثمودهم، فان مساكنهم تدل على ان قاماتهم لم تكن مفرطة الطول على حسبمايقتضيه الترتيب السابق...... ولم يظهر الآن مايزيل هذا الاشكال۔ ❻

''اور اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ قدیم قوموں کے جو آثار اس وقت موجود ہیں، مثلاً: قوم ثمود کے مکانات، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے قد اس قدر بڑے نہ تھے، جیسا کہ ترتیب سابق سے ثابت ہوتا ہے...... اور اس وقت تک مجھ کو اس اشکال کا جواب نہیں معلوم ہوا۔''

④ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا سے کہیں گے کہ ''اے خدا! تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ قیامت میں مجھ کو رسوا نہ کرے گا۔'' ❼ اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وقد استشكل الاسماعيلي هذا الحديث من اصله وطعن في صحته۔ ❽

---

❶ زادالمعاد، جزء ثانی، فصل فی هديه فی علاج العشق فصل وان كان لا سبيل للعاشق الى وصال معشوقه قدرا وشرعا مطبوعہ نظامی کانپور صفحہ ۹۶۔ ❷ صحيح مسلم، كتاب الجهاد، باب الفيء: ۴۵۷۷۔

❸ نووی شرح صحیح مسلم، ذکر حدیث مذکور، ج ۱۲، ص: ۷۲ مطبع مصريه ازهر: ۱۹۳۰۔

❹ نووی شرح صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب حكم الفيء ايضًا۔

❺ صحیح بخاری، کتاب احاديث الانبياء: ۳۳۲۶۔ ❻ فتح الباری، مطبوعه مصر، ج ۶، ص: ۲۶۰، كتاب بدء الخلق۔ ❼ صحیح بخاری، ايضًا: ۳۳۵۰۔

❽ فتح الباری، مطبوعه مصر ج ۸، ص: ۳۸۴، كتاب التفسير، سورة الشعرآء۔

”اور اسماعیلی نے اس حدیث پر اشکال وارد کیا ہے اور اس کی صحت پر طعن کیا ہے۔“

اسماعیلی کے اعتراض کا حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا ہے، لیکن اسماعیلی کا درجہ فن حدیث میں حافظ ابن حجر سے زیادہ ہے، اس لئے گو اسماعیلی کا اعتراض غلط ہے لیکن قابل لحاظ ہوسکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث استدلال کے خلاف ہے۔

⑤ عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندر کو دیکھا جس نے زنا کیا تھا، اس پر اور بندروں نے جمع ہو کر اس کو سنگسار کیا، ❶ حافظ ابن عبدالبر نے جو مشہور محدث ہیں، اس بنا پر اس حدیث کی صحت میں تامل کیا کہ جانور مکلف نہیں، اس لئے ان کے فعل پر نہ زنا کا اطلاق ہوسکتا، نہ اس بنا پر ان کو سزا دی جاسکتی، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وقد استنكر ابن عبدالبر قصة عمرو بن ميمون هذه وقال: فيها اضافة الزنا الى غير مكلف واقامة الحد على البهائم۔ ❷

”ابن عبدالبر نے عمرو بن میمون کے اس قصہ سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں غیر مکلّف کی طرف، زنا کی نسبت ہے اور جانوروں پر حد قائم کرنا بیان کیا گیا ہے۔“

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ ”اعتراض کا یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے، اگر سند صحیح ہے تو غالباً یہ بندر جن رہے ہوں گے۔“

⑥ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک ❸ دفعہ عبداللہ بن ابی کے طرفداروں اور آنحضرت ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں جھگڑا ہو گیا، اس پر یہ آیت اتری:

﴿ وَإِن طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ﴾ (٤٩/ الحجرات:٩)

”اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں، تو ان میں صلح کرادو۔“

روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک عبداللہ بن ابی اور اس کا گروہ ظاہر میں بھی اسلام نہیں لایا تھا، اس بنا پر ابن بطال نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے کہ آیت قرآنی، اس واقعہ کے متعلق نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ آیت میں تصریح ہے کہ جب دونوں گروہ مؤمن ہوں اور یہاں عبداللہ بن ابی کا گروہ علانیہ کافر تھا“۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب دیا ہے کہ تغلیباً ایسا کہا گیا۔ ❹

اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے محدثین سلسلہ سند کے ساتھ یہ بھی دیکھتے تھے کہ دوسرے شواہد اور قرائن بھی اس کے موافق ہیں یا نہیں۔

❶ صحيح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب القسامة فی الجاهلية: ٣٨٤٩۔ ❷ فتح الباری، مطبوعه مصر ج٧، صفحه: ١٢٢، باب ايام الجاهلية۔ ❸ صحيح بخاری، کتاب العلم، روایت میں جھگڑے کی تفصیل ہے ہم نے محض خلاصہ ذکر کردیا ہے۔ (کتاب العلم سہواً یا کتابت کی غلطی ہے یہ روایت کتاب الصلح، باب ماجآء فی الاصلاح بين الناس: ٢٦٩١ کی ہے) ❹ فتح الباری، ج٥، ص: ٢١٩۔

روایت بالمعنی

⑩ ایک بڑا مرحلہ روایت بالمعنی کا ہے، یعنی آنحضرت ﷺ نے یا صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو الفاظ فرمائے تھے بعینہٖ وہی ادا کرنے چاہئیں، یا ان کا مطلب ادا کر دینا کافی ہے، محدثین اس باب میں مختلف الرائے ہیں اور اکثروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر راوی اپنے الفاظ میں اس طرح مطلب ادا کرتا ہے کہ اصل حقیقت میں فرق نہیں پیدا ہوتا، تو الفاظ کی پابندی ضروری نہیں۔ لیکن اس کا فیصلہ کرنا کہ اصل مطلب ادا ہوا یا بدل گیا، ایک اجتہادی بات ہے، اسی بنا پر بعض محدثین مثلاً: عبدالملک بن عمر، ابوزرعہ، سالم بن جعد، قتادہ، امام مالک، ایک ایک لفظ کی پابندی کرتے تھے ❶ لیکن یہ ظاہر ہے کہ سینکڑوں راویوں میں صرف دو چار اشخاص ایسی پابندی کر سکتے تھے اور وہ بھی اس زمانہ میں کہ تحریر کا رواج ہو چکا تھا، عام حالت یہی تھی کہ راویوں کے مطلب کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے تھے، جامع ترمذی، کتاب العلل میں سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل ہے:

ان قلت لکم انی احدثکم کما سمعت فلا تصدقو نی انما ھو المعنی۔ ❷

''اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں جو سنتا ہوں بعینہٖ وہی ادا کر دیتا ہوں، تو تم میری بات نہ مانو میں صرف مطلب ادا کرتا ہوں۔''

ترمذی نے اسی مضمون کے اور اقوال، واثلہ بن الاسقع، محمد بن سیرین، ابراہیم نخعی، حسن بصری، امام شعبی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ سے نقل کیے ہیں۔

جو صحابہ رضی اللہ عنہم بہت محتاط تھے، حدیث کی روایت کے وقت ان کی حالت متغیر ہو جاتی تھی۔

سنن ابن ماجہ کے دیباچہ میں عمرو بن میمون کا قول نقل کیا ہے کہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ہمیشہ جمعرات کی رات کو حاضر ہوتا، میں نے کبھی ان کو یہ کہتے نہیں سنا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا۔ ایک دن ان کی زبان سے یہ لفظ نکل گیا تو دفعۃً سر جھکا لیا، پھر میری نظر ان پر پڑی تو دیکھا کہ کھڑے ہیں قمیص کی گھنڈیاں کھلی ہیں، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ہیں، گلے کی رگیں پھول گئی ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ''آنحضرت ﷺ نے یوں کہا، یا یوں، یا اس سے کچھ زیادہ، یا اس سے کچھ کم، یا اس کے مشابہ۔'' ❸

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ حال تھا کہ جب حدیث روایت کرتے تھے تو خوف زدہ ہو جاتے اور کہتے کہ ''آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا تھا، یا یوں فرمایا تھا۔'' ❹ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں سال بھر حاضر رہا، لیکن میں نے ان کو کبھی حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا۔'' ❺ سائب بن یزید کہتے ہیں کہ ''میں نے سعد بن مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ مبارکہ سے مدینہ طیبہ تک سفر کیا، لیکن اس تمام راہ میں انہوں نے ایک حدیث بھی آنحضرت ﷺ سے روایت نہیں کی۔ (حالانکہ وہ صحابی تھے) ❻

---

❶ ترمذی، کتاب العلل، ج ۲، ص: ۲۳۶ میں ان لوگوں کے متعلق یہ تصریح مذکور ہے۔ ❷ ترمذی، کتاب العلل، ج ۲، ص: ۲۳۵۔ ❸ سنن ابن ماجہ، کتاب السنۃ، باب التوقی فی الحدیث عن رسول اللہ ﷺ: ۲۳۔
❹ ایضاً: ۲۴۔ ابن ماجہ میں یہ قول حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ ❺ ایضاً: ۲۶۔ ❻ ایضاً: ۲۹۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے والد سے پوچھا کہ ”میں نے آپ کو دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا، انہوں نے کہا: ”میں جب سے اسلام لایا، میں نے کبھی آنحضرت ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑا، لیکن میں نے آنحضرت (ﷺ) سے سنا ہے کہ جو شخص میری نسبت کوئی جھوٹی روایت بیان کرے تو چاہیے کہ اپنا گھر آگ میں بنائے۔ [1]

ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے منبر پر یہ ارشاد فرمایا تھا:

((ایاکم و کثرۃ الحدیث عنی)) [2]

”خبردار! مجھ سے زیادہ حدیثیں نہ روایت کرو۔“

اس موقع پر یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ اس قسم کی حدیثوں کے قبول کرنے میں جو تامل کیا جاتا ہے اس کو راوی کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے سے تعلق نہیں، مستند اور ثقہ راویوں کی دروغ گوئی کا خیال نہیں ہو سکتا، لیکن ثقہ راوی سے بھی مطلب روایت کے سمجھنے یا ادا کرنے میں غلطی کا ہو جانا ممکن ہے اور ثقات کی روایت سے جب کسی موقع پر انکار کیا جاتا ہے تو اسی بنا پر کیا جاتا ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بیان کی گئی:

((ان المیت لیعذب ببکاء الحی))

”مردوں پر نوحہ کیا جائے تو ان پر عذاب کیا جاتا ہے۔“

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

انکم لتحدثونی عن غیر کاذبین ولا مکذبین ولکن السمع یُخطیء۔ [3]

”تم لوگ نہ خود جھوٹے ہو، نہ تمہارے راوی جھوٹے ہیں، لیکن کان غلطی کر جاتا ہے۔“

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا:

اما انه لم یکذب ولکنه نسی او اخطأ۔ [4]

”ہاں وہ جھوٹ نہیں بولے لیکن بھول گئے یا خطا کی۔“

روایتِ آحاد

⑪ ایک اور بحث روایت آحاد کی ہے، روایت آحاد وہ ہے، جس کے سلسلہ اسناد میں کہیں صرف ایک راوی پر مدار روایت ہو، یعنی کوئی دوسرا راوی اس کا مؤید نہ ہو، اس قسم کی روایت کے تسلیم و انکار اور یقینی و ظنی ہونے کے متعلق اہل فن کا اختلاف ہے۔ معتزلہ روایات آحاد کی تسلیم سے قطعاً منکر ہیں، لیکن یہ درحقیقت انکار بداہت ہے، ہم روزمرہ واقعات زندگی میں اس قسم کی روایات پر اکثر بلا حجت و اصرار فوراً یقین کر لیتے ہیں، ہم سے

[1] ایضًا، باب التغلیظ فی تعمد الکذب علی رسول اللہ ﷺ: ۳۶۔ [2] ایضًا: ۳۵۔
[3] صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب المیت یعذب ببکاء أهله علیه: ۲۱۴۹۔
[4] صحیح مسلم، کتاب الجنائز، ایضًا: ۲۱۵۶۔

ایک شخص آ کر کہتا ہے کہ ''زید تم کو بلاتا ہے'' اور ہم فوراً اٹھ کر چلے جاتے ہیں، یہ نہیں کہتے کہ یہ خبر آحاد ہے اور ہم اسے تسلیم نہیں کرتے، معتزلہ کے مقابل میں اکثر محدثین اس کی صحت اور قطعیت کے قائل ہیں، لیکن یہ درحقیقت تفریط ہے، خود صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرز عمل اس کے مخالف ہے۔

ایک دفعہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں گئے اور تین دفعہ اجازت طلبی کی، چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی کام میں مشغول تھے، کچھ جواب نہ ملا، وہ واپس چلے گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کام سے فارغ ہو کر ان کو بلوا بھیجا اور واپسی کا سبب پوچھا، انہوں نے کہا: ''میں نے رسول اللہ (ﷺ) سے سنا ہے کہ تین دفعہ اجازت طلبی کے بعد، جواب نہ ملے تو واپس جاؤ۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اس روایت پر گواہ لاؤ، ورنہ میں تم کو سزا دوں گا۔'' ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اس پر شہادت پیش کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تسلیم کیا، [1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ خدانخواستہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو غلط گو نہیں جانتے تھے، لیکن چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بارگاہ نبوت میں برسوں رہے تھے اور انہوں نے یہ حدیث آنحضرت ﷺ سے نہیں سنی تھی، حالانکہ حدیث ایسے امر کے متعلق تھی جو عموماً پیش آتا ہے، اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واقعہ کی اہمیت کے لحاظ سے صرف ایک شخص کی شہادت کافی نہیں سمجھی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک عورت نے جو میت کی دادی ہوتی تھی، میراث کا دعویٰ کیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''قرآن میں دادی کی میراث مذکور نہیں اور نہ آنحضرت ﷺ سے اس باب میں کوئی روایت مجھ کو معلوم ہے''۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے شہادت دی کہ آنحضرت ﷺ دادی کو چھٹا حصہ دلایا کرتے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی تنہا شہادت ایسے واقعہ کے متعلق کافی نہیں سمجھی اور جب ایک اور صحابی محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے شہادت دی، تب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو میراث دلائی۔ [2]

اسی طرح جنین کی دیت کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مغیرہ رضی اللہ عنہ کی تنہا شہادت کافی نہیں سمجھی اس قسم کی اور بیسیوں مثالیں ہیں۔ [3]

(اسی بنا پر روایتِ آحاد کے متعلق فقہائے احناف کا اصول ایک حد تک صحیح ہے کہ یہ ظنی الثبوت ہیں، ان سے قطعیت نہیں ثابت ہوتی ہے، اصل یہ ہے کہ روایاتِ آحاد کی صحت اور عدم صحت یا ظن وقطعیت رواۃ کے ثقہ اور معتبر ہونے کے بعد، خود اصل روایت کی اہمیت اور عدم اہمیت پر مبنی ہے، ایک شخص جب ہم سے کہتا ہے کہ ''زید نے تم کو بلایا ہے۔'' تو راوی کی ثقاہت واعتبار کے مسلم ہونے کے بعد، ہم کو بھی اس واقعہ کے تسلیم سے انکار نہیں ہوتا، لیکن اگر یہی شخص یہ کہتا ہے کہ ''تم کو بادشاہ نے آج دربار میں بلایا ہے''۔ تو ہم اس واقعہ کی تسلیم میں پس وپیش کرتے ہیں اور اس کے ثبوت کے لئے دوسروں کی شہادت تلاش کرتے ہیں:

آنحضرت ﷺ کے متعلق اگر کوئی تنہا راوی یہ بیان کرتا ہے کہ ''آپ ﷺ ایک بار سفید کرتہ پہن

[1] صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب التسلیم والاستئذان ثلاثا: ٦٢٤٥۔ [2] ابوداود، کتاب الفرائض، باب فی الجدۃ: ٢٨٩٤۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الدیات، باب جنین المراۃ: ٦٩٠٦ تا ٦٩٠٨۔

کر باہر تشریف لائے۔'' تو ہم کو اس کی تسلیم میں عذر نہیں، لیکن وہی راوی اگر یہ کہتا ہے کہ ''ایک بار آپ برہنہ تن باہر نکل آئے'' (اس قسم کی ایک روایت ہے) تو قطعاً ہم تنہا شہادت اس کے ثبوت کے لئے کافی نہیں سمجھیں گے۔

نتائج مباحث مذکورہ

گزشتہ صفحات میں ہم نے روایت وحدیث کے متعلق صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کا جو طرز عمل پیش کیا ہے اور علمائے نقد وحدیث کے جن قواعد واصول کی تفصیل کی ہے، ذیل میں بہ ترتیب نتائج کے طور پر ہم ان کا اعادہ کرتے ہیں:

① سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں، پھر احادیث صحیحہ میں، پھر عام احادیث میں کرنی چاہیے، اگر نہ ملے تو روایات سیرت کی طرف توجہ کی جائے۔

② کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں، اور ان کے روایات واسناد کی تنقید لازم ہے۔

③ سیرت کی روایتیں باعتبار پایہ صحت، احادیث کی روایتوں سے فروتر ہیں، اس لئے بصورت اختلاف احادیث کی روایات کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی۔

④ بصورتِ اختلافِ روایاتِ احادیث، رواۃ ارباب فقہ وہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح ہوگی۔

⑤ سیرت کے واقعات میں سلسلہ علت ومعلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔

⑥ نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہیے۔

⑦ روایات میں اصل واقعہ کس قدر ہے؟ اور راوی کی ذاتی رائے وفہم کا کس قدر جزو شامل ہے۔

⑧ اسباب خارجی کا کس قدر اثر ہے؟

⑨ جو روایات عام وجوہ عقلی، مشاہدۂ عام، اصولِ مسلمہ اور قرائنِ حال کے خلاف ہوگی، لائق حجت نہ ہوگی۔

⑩ اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق وجمع سے اس کی تسلی کر لینی چاہیے کہ راوی سے ادائے مفہوم میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے۔

⑪ روایات آحاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائن حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کر لینا چاہیے۔

ان اصول کے تقرر وتفصیل کے بعد نظر آ سکتا ہے کہ اسلامی فن روایت، عقل ودرایت کی نگاہ سے کس قدر بلند پایہ ہے؟ علمائے حدیث نے تصحیح روایت کے لئے کتنی محنت، کتنی جانفشانی، کتنی دیدہ ریزی اور کتنی دقت رسی صرف کی ہے، کیا اس اہتمام واعتنا کا دنیا کی دیگر قوموں کے سرمایۂ تاریخ وروایت میں ایک ذرہ نشان بھی موجود ہے؟ کیا سیرت کے سیرت نگاران پیغمبر اسلام میں سے کسی نے بھی اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی لائف کے لئے قلم اٹھایا ہے؟ اور کیا ایک غیر مسلم ان قواعد واصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا بھی سکتا ہے؟) [1]

[1] زیادت از صفحہ: ۷۷ تا ۷۸ (س)۔

یورپین تصنیفات

آنحضرت ﷺ کی سیرت مبارک پر جو یورپین تصنیفات ہیں، ان پر پوری بحث تو کسی اور حصہ میں آئے گی جس میں نہایت تفصیل سے بتایا جائے گا کہ یورپ میں اسلام کے متعلق سب سے پہلے یورپین مصنف ہلدی برٹ سے لے کر جو ۱۱۳۹ء میں موجود تھا۔ آج تک کیا سرمایہ مہیا ہوا ہے؟ ان کا کیا عام انداز ہے؟ ان کی مشترک اور عامۃ الورود غلطیاں کیا ہیں؟ ان کے وسائل معلومات کس درجہ کے ہیں؟ اغلاط کے مشترک اسباب کیا ہیں؟ تعصب اور سوئے ظن کا کہاں تک اثر ہے؟ یہاں ہم ان تصنیفات پر صرف ایک اجمالی گفتگو کرتے ہیں کیونکہ اس حصہ میں بھی ہم کو جابجا ان تصنیفات سے کام لینا، یا ان سے تعرض کرنا پڑتا ہے۔

یورپ کی پیغمبرِ اسلام ﷺ سے ابتدائی واقفیت

یورپ ایک مدت تک اسلام کے متعلق مطلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے جاننا چاہا تو مدت دراز تک عجب حیرت انگیز مفتریانہ خیالات اور توہمات میں مبتلا رہا، ایک یورپین مصنف لکھتا ہے:

> ''عیسائیت، اسلام کی چند ابتدائی صدیوں تک اسلام پر نہ تو نکتہ چینی کر سکی اور نہ سمجھ سکی، وہ صرف تھراتی اور حکم بجالاتی تھی، لیکن جب قلب فرانس میں عرب پہلے پہل روکے گئے تو ان قوموں نے جو ان کے سامنے سے بھاگ رہی تھیں منہ پھیر کر دیکھا جس طرح کہ مویشیوں کا گلہ جب کہ اس کا بھگا دینے والا کتا دور نکل جاتا ہے۔'' [1]

یورپ نے مسلمانوں کو جس طرح جانا، اس کو فرانس کا مشہور مصنف ہنری دی کاستری جس کی تصنیف عربی زبان میں ترجمہ ہو گیا ہے، یوں بیان کرتا ہے:

> ''وہ تمام قصص اور گیت جو اسلام کے متعلق یورپ میں قرون وسطی میں رائج تھے، ہم نہیں سمجھتے کہ مسلمان ان کو سن کر کیا کہیں گے؟ یہ تمام داستانیں اور نظمیں مسلمانوں کے مذہب کی ناواقفیت کی وجہ سے بغض و عداوت سے بھری ہوئی ہیں، جو غلطیاں اور بدگمانیاں اسلام کے متعلق آج تک قائم ہیں، ان کا باعث وہی قدیم معلومات ہیں، ہر مسیحی شاعر، مسلمانوں کو مشرک اور بت پرست سمجھتا تھا اور حسب ترتیب درجات ان کے تین خدا تسلیم کئے جاتے تھے، ماہوم، یا ماہون، یا مافومیڈ (یعنی محامٔد) اور اپلین اور تیسرا ٹرماگان، ان کا خیال تھا کہ محمد ﷺ نے اپنے مذہب کی بنیاد، دعوائے الوہیت پر قائم کی اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ محمد ﷺ (وہ محمد ﷺ جو بت شکن اور دشمن اصنام تھا) لوگوں کو اپنے طلائی بت کی پرستش کی دعوت دیتا تھا۔

---

[1] محمڈ اینڈ محمڈنزم۔ از باسورتھ اسمتھ صاحب، ایم اے صفحہ ۶۳۔

Bosworth Smith: (Mohammad & Mohammadanism,P.63)

اسپین میں جب عیسائی، مسلمانوں پر غالب آئے اور ان کو سرقوسطہ کی دیواروں تک ہٹا دیا، تو مسلمان لوٹ کر آئے اور اپنے بتوں کو انہوں نے توڑ ڈالا، اس عہد کا ایک شاعر کہتا ہے:

''اپلین مسلمانوں کا دیوتا وہاں ایک غار میں تھا، اس پر وہ پل پڑے اور اس کو نہایت سخت سست کہا اور اس کو گالیاں دیں اور اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر ایک ستون پر اس کو سولی دی اور اس کو پاؤں سے روندا اور لاٹھیوں سے مار مار کر اس کے ٹکڑے کر ڈالے اور ماہوم کو (جو ان کا دوسرا دیوتا تھا) ایک گڑھے میں ڈال دیا، اس کو سوروں اور کتوں نے نوچ ڈالا، اس سے زیادہ اس سے پہلے کسی دیوتا کی تحقیر نہیں ہوئی، اس کے بعد ہی مسلمانوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اپنے دیوتاؤں سے معافی مانگی اور از سرِ نو تلف شدہ بتوں کو بنایا، اسی بنا پر جب شہنشاہ چارلس سرقوسطہ میں داخل ہوا تو اس نے اپنے ہمراہیوں کو حکم دے دیا کہ تمام شہر کا چکر لگائیں، وہ مسجدوں میں گھس گئے اور لوہے کے ہتھوڑوں سے ماہومیڈ اور تمام بتوں کو توڑ ڈالا۔''

ایک دوسرا شاعر رچر خدا سے دعا کرتا ہے کہ ''وہ ماہوم کے بُت کے پجاریوں کو شکست نصیب کرے''۔ اس کے بعد وہ امراء کو جنگ صلیبی کے لئے ان الفاظ میں آمادہ کرتا ہے۔ ''اٹھو اور ماہومیڈ اور ٹرماگان کے بتوں کو اوندھا کر دو اور ان کو آگ میں ڈال دو اور ان کو اپنے خداوند کی نذر کر دو۔'' [1]

اس قسم کے خیالات ایک مدت تک قائم رہے۔ (چوتھے حصہ میں ہم اس کو مفصل لکھیں گے)

سترہویں اور اٹھارہویں صدی

سترھویں صدی کے سنین وسطی، یورپ کے عصر جدید کا مطلع ہے، یورپ کی جدوجہد، سعی وکوشش اور حریت و آزادی کا دور، اسی عہد سے شروع ہوتا ہے۔ ہمارے مقصد کی جو چیز اس دور میں پیدا ہوئی، وہ مستشرقین یورپ کا وجود ہے، جن کی کوشش سے نادر الوجود عربی کتابیں ترجمہ اور شائع ہوئیں، عربی زبان کے مدارس، علمی و سیاسی اغراض سے جابجا ملک میں قائم ہوئے اور اس طرح وہ زمانہ قریب آتا گیا کہ یورپ اسلام کے متعلق خود اسلام کی زبان سے کچھ سن سکا۔

اس دور کی خصوصیت اول یہ ہے کہ سنے سنائے عامیانہ خیالات کے بجائے، کسی قدر تاریخ اسلام و سیرت پیغمبر ﷺ کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی، گو موقع بموقع معلومات سابقہ کے مصالح کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔

اس دور سے چونکہ یورپ نے مذہبی اشخاص کے شکنجہ سے نجات پائی اور اس کے مذہبی اور سیاسی امور، الگ الگ ہوگئے، اس بنا پر اسلام کے متعلق مصنفین کی دو جماعتیں الگ ہوگئیں، عوام اور مذہبی اشخاص اور محقق و

[1] ترجمہ کتاب ہنری دی کاستری بزبان عربی مطبوعہ مصر از صفحہ: ۸ تا ۱۰۔

غیر متعصب گروہ، اسلام کے متعلق ان دونوں جماعتوں نے جو کوششیں کیں، وہ آج ہمارے سامنے ہیں۔

اس عہد میں عربی زبان کی تاریخی تصنیفات کا ترجمہ ہو گیا تھا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے ارپی نیوس (Arp) مارگولیتھ (MAR Goliouth) ایڈورڈ پوکاک (E-Pococke) اور ہاٹنجر (Hattinger) ذکر کے قابل ہیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اتفاقاً یا قصداً ان مستشرقین نے ابتدا میں جن عربی تاریخوں کا ترجمہ کیا، وہ اکثر ان مسیحی مصنفین کی تصنیفات تھیں جو قرون ماضیہ میں اسلامی ممالک کے باشندے تھے۔ یعنی سعید بن بطریق اوٹیکوس المتوفی ۹۳۹ء جو اسکندریہ کا پیٹریارک تھا اور ابن العمید المکین المتوفی ۱۲۷۳ء جو سلاطین مصر کا ایک درباری تھا اور ابوالفرج بن العبری الملطی المتوفی ۱۲۸۶ء مصنف تاریخ الدول۔

ابن العمید المکین کی تاریخ طبری اور ذیل طبری کا خلاصہ ہے، ارپی نیوس نے جو ہولینڈ کا ایک مستشرق تھا، لاطینی ترجمہ کے ساتھ، لیڈن سے اس کا ایک ٹکڑا شائع کیا، جو ابتدائے رسالت سے دولتِ اتابکیہ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، المکین کے نام سے اس کتاب کے حوالے، یورپ کی ابتدائی اسلامی تصنیفات میں نہایت کثرت سے آتے ہیں۔

اخیر اٹھارہویں صدی

یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کی قوت سیاسی، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہوگئی، جس نے ''اورینٹلسٹ'' کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کر دی جنہوں نے حکومت کے اشارہ سے السنۂ مشرقیہ کے مدارس کھولے، مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع و اشاعت کے سامان پیدا کیے اور ینٹل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا۔

سب سے پہلے ہولینڈ نے اپنے مقبوضہ جزائر مشرقی میں ۱۷۷۸ء میں ایک ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی اس کی تقلید میں انگریزوں نے بمقام کلکتہ ۱۷۸۴ء میں جنرل ایشیاٹک سوسائٹی اور ۱۷۸۸ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، اس کے بعد ۱۷۹۵ء میں فرانس نے مشرقی زندہ زبانوں (عربی، فارسی، ترکی) کا دارالعلوم قائم کیا اور آخر کار ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درسگاہیں اور انجمنیں جاری ہوگئیں، عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا۔

مسلمانوں کے ہاں عربی زبان میں سیرت و مغازی کی جو کتابیں محفوظ تھیں، وہ ایک ایک کر کے باستثنائے چند، اٹھارہویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں چھپ گئیں اور ان میں اکثر کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہو گیا، سب سے پہلے رسک (Reiske) المتوفی ۱۷۷۴ء نے تاریخ ابو الفداء مع ترجمہ لاطینی و حواشی پانچ جلدوں میں شائع کی۔ ۱۸۰۹ء میں کیپٹن اے میتھوس

(A-N-Mathews) نے کلکتہ سے مشکوٰۃ المصابیح کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا، ۱۸۵۶ء میں وان کریمر (Kremer) نے کلکتہ میں محمد بن عمر واقدی کی کتاب المغازی طبع کرائی، ۱۸۶۰ء میں ابن ہشام کی مشہور تصنیف سیرت الرسول کی کوٹنگن (Cottingen) سے اشاعت کی، اس کے علاوہ اسی مستشرق نے سمہودی کی تاریخ مدینہ اور ابن قتیبہ کی تاریخ معارف طبع کرائی۔ ۱۸۶۴ء میں ڈاکٹر ویل (G-Weil) نے ابن ہشام کا جرمنی میں ترجمہ کیا، ۱۸۷۷ء میں پیرس سے مسعودی کی تاریخ مروج الذہب مع ترجمہ فرانسیسی پروفیسر ڈی مانیارڈ نے شائع کی، ولہوسن (Wellhausen) نے ۱۸۸۲ء میں واقدی کا جرمن ترجمہ بعنوان ''محمد بہ مدینہ'' برلن سے شائع کیا، ۱۸۸۳ء میں لیڈن سے ہاؤتسما (Houtasma) کے اہتمام سے یعقوبی کی تاریخ دو جلدوں میں چھپی۔ ۱۸۷۹ء سے ۱۸۹۲ء تک چودہ برس کی محنت میں طبری کی مشہور اور نادر الوجود تاریخ بارتھ (J. Barth) اور نولدیکی (Noldeke) وغیرہ نے شائع کی اور سب سے آخر میں مشہور جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ (Sachau) کی خاص کوشش اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور نادر الوجود طبقات جس سے زیادہ مبسوط سیرت نبوی میں کوئی تصنیف نہیں، تقریباً ۱۹۰۰ء سے گزشتہ سال تک ایک ایک جلد کر کے لیڈن سے شائع ہوتی رہی۔

ان اصل تاریخی تصنیفات اور ان کے تراجم کی اشاعت ممالک اسلامیہ اور یورپ کے تعلقات، مذہبی منافرت کی کمی اور آزادانہ تحقیقات کی خواہش، ان تمام چیزوں نے یورپ میں مصنفین تاریخ اسلام اور سوانح نگاران پیغمبر عرب ﷺ کا ایک کثیر التعداد گروہ پیدا کر دیا۔

اوکسفورڈ کا ایک عالم اس غیر مختتم سلسلہ کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے:

''محمد ﷺ کے سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے۔ جس کا ختم ہونا غیر ممکن ہے، لیکن اس میں جگہ پانا قابل فخر چیز ہے۔'' [1]

ہم اس موقع پر صرف ان تصنیفات کا مختصر سا نقشہ درج کرتے ہیں، جو بہ تخصیص آنحضرت ﷺ کے حالات میں، یا اسلام کے اصول عقائد پر لکھی گئیں اور جن میں سے اکثر ہمارے دفتر تصنیف میں موجود ہیں، یا ہم ان سے متمتع ہو چکے ہیں۔

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانہ تصنیف
۱	ڈاکٹر جی، پی، (آر)	انگلستان	سیرت محمد خادع (نعوذ باللہ)	۱۸۱۵ء
۲	ڈاکٹر وایٹ (واعظ اوکسفورڈ) DTI White	انگلستان	بیمفٹن سرمنز (اسلام اور پیغمبر اسلام)	اوائل ۱۸۰۰ء

[1] مارگولیتھ ''محمد'' (ﷺ) دیباچہ صفحہ ا۔

۳	گارڈ فری ھگنس ایم، آر، اے، ایس GodFreyHiggins	انگلستان	اپالوجی	۱۸۲۹ء
۴	ڈاکٹر جے،اے،مولر J.A.Muller	جرمن	اسلامزم	۱۸۳۰ء
۵	گارسن ڈی ٹاسی Garcindetossy	فرانس	اسلام وقرآن	۱۸۳۱ء تا ۱۸۷۴ء
۶	ایڈورڈلین Edwardlane	انگلستان	انتخابات القرآن	۱۸۴۳ء
۷	ڈاکٹر ویل Weil	جرمن	ترجمہ وتحشیہ ابن ہشام وکتاب محمد پیغمبر ﷺ	۱۸۴۵ تا ۱۸۴۶ء
۸	کارلائل Corlyle	انگلستان	ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ	۱۸۴۶ء
۹	کوسن ڈی برسیوال Caussindeperseval	فرانس	تاریخ عرب	۱۸۴۷ء
۱۰	واشنگٹن ارونگ W.Irving	انگلستان	سیرت محمد ﷺ	۱۸۴۹ء
۱۱	ڈاکٹر اسپرنگر Springer	جرمن	سیرت محمد ﷺ	۱۸۵۱ء
۱۲	وان کریمر Vonkreme	جرمن	ترجمہ وتحشیہ واقدی	۱۸۵۶ء
۱۳	مضمون نگار نیشنل ریویو	انگلستان	مضمون ”محمد ﷺ“	۱۸۵۸ء
۱۴	ڈوزی Dozy	ہولینڈ	تاریخ اسلام	۱۸۶۱ء
۱۵	مضمون نگار نیشنل ریویو	انگلستان	بزرگ ترین عرب	۱۸۶۱ء
۱۶	ڈی لین Delane	انگلستان	سیرت محمد ﷺ	۱۸۶۱ء
۱۷	میور Muir	انگلستان	سیرت محمد ﷺ	۱۸۶۱ء
۱۸	برتھالمی سینٹ ہلیر St.Hilaire	فرانس	محمد ﷺ وقرآن	۱۸۶۵ء
۱۹	نولدیکی Nolde ky	جرمن	مضامین قرآن واسلام	۱۸۶۹ء
۲۰	دوشیف مضمون نگار کوارٹرلی ریویو	انگلستان	اسلام	۱۸۶۹ء
۲۱	مضمون نگار برٹش کوارٹرلی ریویو	انگلستان	محمد ﷺ	۱۸۷۲ء
۲۲	جولیس چارلس JuliusCharles	فرانس	تاریخ بانی اسلام	۱۸۷۴ء
۲۳	مضمون نگار کانٹمپریری ریویو	انگلستان	محمد (ﷺ) اوراسلام	۱۸۷۵ء

۲۴	باسورتھ اسمتھ Bosworthsmith	انگلستان	محمد (ﷺ) اور اسلام	۱۸۷۵ء
۲۵	سیدیو Sedillot	فرانس	تاریخ عرب	۱۸۷۷ء
۲۶	ولہوسن Wellhausen	جرمن	تبصرہ بر واقدی	۱۸۸۲ء
۲۷	اہل کراہل Krehl	جرمن	سیرت محمد ﷺ	۱۸۸۴ء
۲۸	گولڈ زیہر Goldziher	جرمن	مطالعۂ اسلام	۱۸۹۰ء
۲۹	رینان Renan	فرانس	تاریخ مذاہب	۱۸۹۲ء
۳۰	ایچ گریم H.Grimme	ہولینڈ	سیرت محمد ﷺ	۱۸۹۴ء
۳۱	ہنری دی کاستری HenrydeCasteri	فرانس	اسلام پر خیالات	۱۸۹۶ء
۳۲	ایف بوہل Buhl	ہولینڈ	سیرت محمد ﷺ	۱۹۰۳ء
۳۳	والسٹن Wallaston	انگلینڈ	آدھ گھنٹہ محمد (ﷺ) کے ساتھ	۱۹۰۵ء
۳۴	مارگولیتھ Margoliouth	انگلینڈ	محمد (ﷺ)	۱۹۰۵ء
۳۵	کوئل Koell	انگلینڈ	محمد (ﷺ) اور اسلام	۱۸۹۴ء
۳۶	پرنس کاتانی Prince Caetani	اٹالیہ	تاریخ کبیر محمد (ﷺ) و اسلام و سلاطین اسلام	جاری
۳۷	میجر لیونارڈ MajorLeonard	انگلینڈ	اسلام کا روحانی و اخلاقی پایہ	۱۹۰۹ء

مصنفین یورپ کی تین قسمیں

مصنفین یورپ تین قسموں میں منقسم کیے جا سکتے ہیں:

① جو عربی زبان اور اصلی ماخذوں سے واقف نہیں، ان لوگوں کا سرمایہ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں، ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس مشتبہ اور ناکامل مواد کو قیاس اور میلان طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ ان میں بعض (مثلاً گبن صاحب) ایسے صائب الرائے اور انصاف پرست ہیں کہ راکھ کے ڈھیر میں سے بھی سونے کے ذرے نکال سکتے ہیں۔ لیکن قلیل ماھم۔

② عربی زبان اور علم ادب و تاریخ و فلسفۂ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں، ان لوگوں نے سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں اسلام، یا شارع اسلام ﷺ کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں، مثلاً: جرمن کا مشہور فاضل ساخو جس نے طبقات ابن سعد شائع کی ہے، اس کی وسعت معلومات اور عربی دانی

سے کون انکار کرسکتا ہے۔ بیرونی کی کتاب الہند کا دیباچہ اس نے جس تحقیق سے لکھا ہے رشک کے قابل ہے لیکن اسی دیباچہ میں اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جس کو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ یہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے دیکھا تھا۔ نولدیکی (جرمنی) نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے لیکن انسائیکلوپیڈیا (جلد ۱۶) میں قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے جا بجا نہ صرف اس کے تعصب، بلکہ اس کی جہالت کے راز پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔

③ وہ مستشرقین جنہوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے۔ مثلاً پامر صاحب یا مارگولیتھ صاحب، ان سے ہم بہت کچھ امید کر سکتے تھے۔ لیکن باوجود عربی دانی، کثرت مطالعہ، تفحص کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ ؏

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

مارگولیتھ نے مسند امام احمد بن حنبل کی ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہوسکتا، لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے دنیا کی تاریخ، اس سے زیادہ کوئی کتاب، کذب وافترا اور تاویل وتعصب کی مثال کے لئے پیش نہیں کرسکتی، اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہوسکتا صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر جرمنی کے مشہور عربی دان ہیں، کئی سال مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے۔ لکھنؤ میں آ کر شاہی کتب خانہ کی رپورٹ لکھی جو ہماری نظر سے گزری ہے، حافظ ابن حجر کی کتاب الاصابہ فی احوال الصحابہ، اول اول انہی نے تصحیح کر کے کلکتہ میں چھپوائی۔ لیکن جب آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری پر ایک مستقل ضخیم کتاب ۳ جلدوں میں لکھی تو ہم حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔ [1]

یورپین مصنفین کی غلط کاریوں کے اسباب

یورپین مصنفوں کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ تو وہی ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں جن کی بنا پر ہم ان کو معذور رکھ سکتے ہیں۔

① سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایہ استناد صرف سیرت وتاریخ کی کتابیں ہیں، مثلاً: مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحاق، تاریخ طبری وغیرہ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم شخص اگر آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری مرتب کرنا چاہے گا تو عام قیاس یہی رہبری کرے گا کہ اس کو تصنیفات سیرت

[1] یہ کتاب جرمن زبان میں ہے، میں جرمن نہیں جانتا، لیکن اس کے اقوال اکثر اور مصنفین نے نقل کئے ہیں اور وہ ہماری نظر سے گزرے ہیں۔

کی طرف رجوع کرنا چاہیے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو، چنانچہ اس کی بحث اوپر گزر چکی، مصنفینِ سیرت سے قطع نظر، سیرت کی روایتیں زیادہ تر جن لوگوں سے مروی ہیں۔ مثلاً: سیف، سری، ابن سلمہ، ابن نجیح عموماً ضعیف الروایۃ ہیں، اس لئے عام اور معمولی واقعات میں ان کی شہادت کافی ہوسکتی ہے، لیکن وہ واقعات جن پر مہتم بالشان مسائل کی بنیاد قائم ہے ان کے لئے یہ سرمایہ بیکار ہے۔

آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بہ روایاتِ صحیحہ منقول ہیں، یورپین مصنفین اس سرمایہ سے بالکل بے خبر ہیں اور ایک آدھ کوئی ہے (مثلاً مارگولیتھ) تو اولاً وہ اس فن کا ماہر نہیں اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سینکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لئے کافی ہے۔

② دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصول تنقیح شہادت اور ہمارے اصول تنقیح میں سخت اختلاف ہے۔ یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب؟ اس کے اخلاق و عادات کیا ہیں؟ حافظہ کیسا ہے؟ اس کے نزدیک یہ تحقیق و تدقیق نہ تو ممکن ہے، نہ ہی ضروری ہے، وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان بجائے خود، قرائن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے، یا نہیں؟ فرض کرو، ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائن موجودہ اور گردوپیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اکھڑتا، تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صورت تسلیم کر لی جائے گی۔

بخلاف اس کے مسلمان مؤرخ اور خصوصاً محدثین اس کی پروا نہیں کرتے کہ خود روایت کی کیا حالت ہے، بلکہ سب سے پہلے وہ دیکھتے ہیں کہ ''اسمائے رجال'' کے دفتر تحقیقات میں اس شخص کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں درج ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے تو ان کے نزدیک اس کا بیان بالکل ناقابل اعتنا ہے، بخلاف اس کے اگر ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا، تو گو قرائن اور قیاسات کے خلاف ہو اور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہ ہو، لیکن اس کی روایت قبول کر لی جائے گی۔

اس اختلاف اصول نے یورپین تصنیفات پر بہت بڑا اثر پیدا کیا ہے، مثلاً: اہل یورپ واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ واقدی کا بیان نہایت مسلسل اور مربوط ہوتا ہے، جزئیات کی تمام کڑیاں باہم ملتی چلی جاتی ہیں، واقعات میں کہیں خلا نہیں ہوتا، جو چیزیں کسی واقعہ کو دلچسپ بنا سکتی ہیں۔ سب موجود ہوتی ہیں۔

لیکن سچ یہ ہے کہ یہی باتیں اصلی راز کی پردہ دری کرتی ہیں، جو روایتیں سو برس سے زیادہ زمانہ تک محض زبانوں پر رہیں، ان میں اس قدر استقصائے جزئیات ممکن نہیں، یہ البتہ ہوسکتا ہے کہ جس طرح تاریخی افسانے لکھے جاتے ہیں، چند واقعات کا ذخیرہ سامنے رکھ کر قیاس و قرائن اور معلومات عامہ کے ذریعہ سے ایک سادہ

خاکہ کو نقش و نگار سے کامل کر دیا جائے، لیکن یہ جرأت صرف واقدی کر سکتا ہے، محدثین اس سے معذور ہیں۔

تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر موقع پر محض راوی کا ثقہ ہونا کافی نہیں۔ ثقات بھی غلطی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ درایت کے جو اصول محدثین نے قائم کئے ہیں اور جن کو بعض جگہ وہ بھول جاتے ہیں، ان کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔

یورپین تصنیفات کے اصولِ مشترکہ

یورپین مصنفین، آنحضرت ﷺ کے اخلاق کے متعلق جو نکتہ چینیاں کرتے ہیں، یا ان کی تصنیفات سے جو نکتہ چینیاں خود بخود ناظرین کے دل میں پیدا ہوتی ہیں، حسب ذیل ہیں:

① آنحضرت ﷺ کی زندگی مکہ معظمہ تک پیغمبرانہ زندگی ہے، لیکن مدینہ جا کر جب زور و قوت حاصل ہوتی ہے تو دفعتاً پیغمبری بادشاہی سے بدل جاتی ہے اور اس کے جو لوازم ہیں، یعنی لشکر کشی، قتل، انتقام، خونریزی، خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

② کثرتِ ازدواج اور مَیل الی النساء۔

③ مذہب کی اشاعت، جبر اور زور سے۔

④ لونڈی غلام بنانے کی اجازت اور اس پر عمل۔

⑤ دنیاداروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی۔

اس بنا پر، ہماری کتاب کے ناظرین کو، تمام واقعات میں اس نکتہ پر نظر رکھنی چاہیے، کہ یہ اعتراضات تاریخی تحقیقات کے معیار میں بھی ٹھیک اُتر سکتے ہیں یا نہیں۔

اس کتاب کی تصنیف و ترتیب کے اصول

ہم نے اس کتاب میں جو اصول اختیار کئے ہیں، اب ان کے بتانے کا وقت آ گیا ہے۔

① سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے، ان کو سب پر مقدم رکھا ہے، یہ قطعاً ثابت ہے کہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے، لیکن لوگوں نے آیات قرآنی پر اچھی طرح نظر نہیں ڈالی، اس لئے وہ مباحث غیر منفصل رہ گئے۔

② قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے، احادیث صحیحہ کے سامنے سیرت کی روایتیں نظر انداز کر دی ہیں، جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں، ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں، ارباب سیر کو ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ وہ واقعات کو کتب حدیث میں، ان موقعوں پر ڈھونڈتے ہیں، جہاں عنوان اور مضمون کے لحاظ سے اس کو درج ہونا چاہیے اور جب ان کو، ان موقعوں پر کوئی روایت نہیں

ملتی تو وہ کم درجہ کی روایتوں کو لے لیتے ہیں، لیکن کتب حدیث میں ہر قسم کے نہایت تفصیلی واقعات ضمنی موقعوں پر روایت میں آ جاتے ہیں، اس لئے اگر عام استقرا اور تفحص سے کام لیا جائے تو تمام اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں، ہماری اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اکثر تفصیلی واقعات ہم نے حدیث ہی کی کتابوں سے ڈھونڈ کر مہیا کئے، جو اہل سیر کی نظر سے بالکل اوجھل رہ گئے تھے۔

(۳) روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کی ہیں، لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں، ان کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لیا ہے اور تاامکان کدوکاوش کی ہے، اس خاص ضرورت کے لئے ہم نے پہلا کام یہ کیا ہے کہ ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے تمام رواۃ کے نام الگ انتخاب کر لئے، جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے، پھر اسماء الرجال کی کتابوں سے ان کی جرح و تعدیل کا نقشہ تیار کیا، تاکہ جس سلسلہ روایت کی تحقیق مقصود ہو، بہ آسانی ہو جائے۔

(۴) جن فروگزاشتوں کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، جہاں تک ممکن تھا، ان کی اصلاح اور تلافی کی ہے۔

کتاب کے حصے

اس کتاب کے پانچ حصے ہیں۔ [1]

پہلے حصہ

میں عرب کے مختصر حالات، کعبہ کی تاریخ اور آنحضرت ﷺ کی ولادت سے لے کر وفات تک عام حالات اور واقعات و غزوات ہیں، اسی حصہ کے دوسرے باب میں آنحضرت ﷺ کے ذاتی اخلاق و عادات کی تفصیل ہے، آل و اولاد اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے حالات بھی اسی باب میں ہیں۔

دوسرا حصہ

منصب نبوت سے متعلق ہے، نبوت کا فرض، تعلیم عقائد، اوامر و نواہی، اصلاح اعمال اور اخلاق ہے، اس بنا پر منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے، اس حصہ میں فرائض خمسہ اور تمام اوامر و نواہی کی ابتدا اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے، اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے، کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا اور کیونکر وہ تمام عالم کے لئے اور ہر زمانہ کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔

تیسرے حصہ

میں قرآن مجید کی تاریخ، وجوہ اعجاز اور حقائق و اسرار سے بحث ہے۔

---

[1] اب یہ کتاب سات حصوں میں مرتب ہوگئی ہے اور ترتیب بھی بدل گئی ہے۔

چوتھے حصہ

میں معجزات کی تفصیل ہے، قدیم سیرت کی کتابوں میں معجزات کا الگ باب باندھتے ہیں، لیکن آجکل تو اس کو بالکل مستقل حیثیت سے لکھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ معجزات کے ساتھ اصل معجزہ کی حقیقت اور امکان سے بحث کرنے کی ضرورت بھی پیش آ گئی ہے، البتہ جن معجزات کی تاریخ اور سنہ متعین ہے، مثلاً: معراج، یا تکثیر طعام وغیرہ ان کو اس سنہ کے واقعات میں لکھ دیا ہے۔

پانچواں حصہ

خاص یورپین تصنیفات کے متعلق ہے، یعنی یورپ نے آنحضرت ﷺ اور مذہب اسلام کے متعلق کیا لکھا ہے؟ ان کا سرمایۂ معلومات کیا ہے؟ تاریخی واقعات میں وہ کیونکر غلطیاں کرتے ہیں؟ مسائل اسلام کے سمجھنے میں ان سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں؟ آنحضرت ﷺ کے اخلاق و عادات یا مسائل اسلام پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں، ان کے جوابات۔

یہ ضروری نہیں کہ یہ حصے اسی ترتیب سے شائع ہوں، بلکہ جس حصہ کی تیاری کے سامان فراہم ہو جائیں گے اور مرتب ہو جائے گا، وہ شائع کر دیا جائے گا۔

استناد اور حوالے

تاریخ اور روایت میں، حوالہ اور استناد، سب سے مقدم چیز ہے، اس لئے اس کے متعلق چند ضروری امور بیان کر دینے ضروری ہیں۔

① صرف انہیں کتابوں کا حوالہ دیا ہے جو خود میری نظر سے گزری ہیں۔

② جو واقعات کسی قدر اہم ہیں، ان کے متعلق صرف صحیح حدیثوں یا مستند تاریخی روایتوں کا حوالہ دیا ہے لیکن عام واقعات یا غزوات کے متعلق جزئیات کی تفصیل میں محدثانہ کدوکاوش نہیں کی ہے۔

③ مطبوعہ کتابوں کے حوالہ میں مطبع کا نام بتا دیا گیا ہے، قلمی کتابوں کے متعلق تصانیف سیرت کی فہرست جو اوپر گزر چکی ہے، اس میں بتا دیا ہے کہ ہمارے استعمال میں کونسا نسخہ تھا۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ

عرب

وجہ تسمیہ

عرب کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف رائیں ہیں، اہل لغت کہتے ہیں کہ عرب اور اعراب کے معنی فصاحت اور زبان آوری کے ہیں اور چونکہ اہل عرب اپنی زبان آوری کے سامنے تمام دنیا کو ہیچ سمجھتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنے آپ کو "عرب" اور دنیا کی اور تمام قوموں کو عجم (ژولیدہ بیان) کہہ کر پکارا۔

بعض کی رائے ہے کہ عرب اصل میں عربۃ تھا، قدیم اشعار میں عرب کے بجائے عربۃ آیا ہے۔

ورجّت باحة العربات رجّا ترقرق فی مناکبها الدماءُ
وعربةُ ارض جدّ فی الشر اهلها کما جدّ فی شرب النقاخ ظماءُ
وعربةُ ارض ما یحِل حرامهَا من الناس الا اللوذعی الحُلاحل [1]

عربۃ کے معنی سامی زبانوں میں دشت اور صحرا کے ہیں اور چونکہ عرب کا بڑا حصہ دشت وصحرا ہے، اسلئے تمام ملک کو عرب کہنے لگے۔

جغرافیہ

عرب کے حدود اربعہ یہ ہیں۔

مغرب

بحیرۂ قلزم۔

مشرق

خلیج فارس اور بحر عمان۔

جنوب

بحر ہند۔

شمال

کی حدود بہت مختلف فیہ ہیں، بعض مملکت حلب اور فرات تک اس کی حدود کو وسعت دیتے ہیں۔

سینا کا جزیرہ نما، جس کا نام التیہ ہے، اکثر مصنفین عرب اور یورپ اس کو مصر میں شمار کرتے ہیں، لیکن جیالوجی کی رو سے وہ عرب سے متعلق ہے۔

عرب کی پیمائش باقاعدہ اب تک نہیں ہوئی، تاہم اس قدر یقینی ہے کہ وہ جرمن اور فرانس سے چوگنا زیادہ وسیع ہے، طول تقریباً پندرہ سو، عرض چھ سو میل اور مجموعی رقبہ بارہ لاکھ میل مربع ہے۔

[1] معجم البلدان، ج٦، لفظ عربة وعربات، ص: ١٣٧ تا ١٤٠، مصر: ١٣٢٤ھ/١٩٠٦ء

ملک کا بڑا حصہ ریگستان ہے، پہاڑوں کا جال تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے، سب سے بڑا طویل السلسلہ پہاڑ جبل السّراۃ ہے، جو جنوب میں یمن سے شروع ہو کر شمال میں شام تک چلا گیا ہے، اس کی سب سے اونچی چوٹی آٹھ ہزار فٹ بلند ہے، بعض حصے زرخیز اور شاداب بھی ہیں۔

چاندی اور سونے کی کانیں کثرت سے ہیں، علامہ ہمدانی نے "صفة جزيرة العرب" میں ایک ایک کان کا نشان دیا ہے، قریش جو تجارت کیا کرتے تھے، مؤرخین نے لکھا ہے، زیادہ تر ان کا مال تجارت، چاندی ہوتی تھی، برٹن صاحب نے مدین کی طلائی معادن پر خاص ایک کتاب لکھی ہے۔ [1]

قدیم تاریخ کے ماخذ

اسلام سے قبل عرب کی تاریخ کے ماخذ حسب ذیل ہیں:

① زمانہ جاہلیت کی بعض تصنیفات، جو سلاطین حیرۃ کے کتب خانہ میں محفوظ تھیں اور جو ابن ہشام کو ہاتھ آئی تھیں اور جن کا ذکر علامہ موصوف نے کتاب التیجان میں کیا ہے۔

② زبانی روایتیں جو قدیم سے چلی آتی تھیں، عرب کا حافظہ نہایت قوی تھا، یہاں تک کہ آج اشعار جاہلیت کا جو وسیع ذخیرہ موجود ہے، اسلام کے زمانہ تک زبانی ہی روایت ہوتا چلا آتا تھا، اس بنا پر عرب کی قدیم تاریخ کا کافی سرمایہ محفوظ تھا، عرب کی جو قومیں معدوم ہو چکیں، مثلاً: طسم، جدیس، عاد، ثمود، ان کے متعلق بھی اس قدر تاریخی روایتیں محفوظ تھیں کہ ان کے ذریعہ سے مؤرخین اسلام، عرب کی تاریخ قدیم پر، معتدبہ تصنیفات مرتب کر سکے، مثلاً: ہشام کلبی نے طسم، جدیس، تبابعۂ یمن اور دیگر سلاطین عرب پر متعدد کتابیں لکھیں، جن کا ذکر ابن الندیم نے فہرست صفحہ ۹۶ میں کیا ہے۔

③ اشعار جاہلیت، جن میں سے اکثر سلاطین اور اقوام اور عماراتِ عرب کا ذکر ہے، یہ اشعار صفۃ جزیرۃ العرب اور معجم البلدان میں کثرت سے موجود ہیں، انہی قدیم ماخذوں سے علامہ ہمدانی نے اپنی کتاب "اکلیل" [2] مرتب کی ہے، جس کا آٹھواں باب خاص سلاطین حمیر کے آثارِ قدیمہ اور حمیری کتبات پر مشتمل ہے۔

④ یورپ کی قدیم تصنیفات، مثلاً مصنفین یونان نے تھیوفراسٹس (جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چار سو برس قبل تھا) سے لے کر بطلیموس تک بہت سے قبائل عرب کے نام لکھے ہیں اور ان کی آبادیوں کے نام بھی بتائے ہیں، رومن مؤرخ پلینی نے بھی عرب کے متعلق لکھا ہے، گو نہایت مختصر ہے۔

⑤ عرب کی قدیم ویران شدہ عمارتوں کے کتبات، جو قدمائے اسلام نے دریافت کئے تھے اور جو آجکل یورپ نے نہایت کثرت سے مہیا کئے ہیں۔

---

[1] Gold Mines Of Medion.

[2] اس کتاب کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ طبقات الامم (مطبوعہ بیروت: ۱۹۱۲ء) میں ہے۔ (دیکھیے ص: ۱۸، ۴۲، ۵۸)

عرب کے اقوام وقبائل

مؤرخین عرب [1] نے اقوام وقبائل عرب کو تین حصوں پر منقسم کیا ہے۔

عرب بائدہ

یعنی عرب کے قدیم ترین قبائل جو اسلام سے بہت پہلے فنا ہو چکے تھے۔

عرب عاربہ

بنوقحطان جو عرب بائدہ کے بعد عرب کے اصلی باشندے تھے اور جن کا اصل مسکن ملک یمن تھا۔

عرب مستعربہ

بنواسماعیل یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد جو حجاز میں آباد تھی۔

ظہور اسلام کے وقت بنوقحطان اور بنو اسماعیل جن کو عدنانی قبائل بھی کہتے ہیں، ملک کے اصلی باشندے تھے اور ان کے علاوہ خال خال یہودیوں کی آبادی تھی، اس بنا پر درحقیقت ملک عرب اس وقت تین مختلف عناصر سے مرکب تھا، ہر عنصر کا قوام بے شمار قبائل وفروع سے تھا، جو یمن سے شام تک ہر قطعہ زمین میں پھیلے ہوئے تھے، ان کی پھر مختلف چھوٹی چھوٹی شاخیں تھیں، چونکہ اس کتاب میں اکثر ان کے نام آئیں گے، اس بنا پر ان کا ایک مختصر خاکہ درج ذیل ہے۔

بنوقحطان

اس خاندان کی تین بڑی شاخیں ہیں:

① قضاعہ ② کہلان ③ ازد، حمیر بھی اسی کی شاخ ہے، جو یمن کے فرمانروا تھے، لیکن واقعات کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔

① قبائل قضاعہ، عام علمائے انساب قضاعہ کو بنوقحطان میں داخل کرتے ہیں اور ہم بھی یہاں ان کی پیروی کرتے ہیں، ورنہ از روئے تحقیق وہ بنواسماعیل ہیں، بہرحال ان کی حسب ذیل شاخیں ہیں:

بنوکلب، بنوتنوخ، بنوجرم، بنوجہینہ، بنونہد، بنوعذرہ، بنواسلم، بلی، تیخ، ضجعم، تغلب، نمر، اسد، تیم اللات، کلب

② کہلان

بجیلہ، خثعم، ہمدان، کندہ، مذحج، طے، لخم، جذام، عاملہ۔

③ ازد، انصار اسی کی شاخ تھے۔

اوس، خزرج، خزاعہ، غسان، دوس۔

مشہور عدنانی قبائل جن کا آخری مقسم مضر ہے، حسب ذیل ہیں: قبائل مضر اولاً بنی خندف اور بنوقیس دو

---

[1] یہاں سے ''عرب کی قدیم حکومتیں'' سے پہلے تک زیادت ہے (س)

خاندانوں پر منقسم ہیں۔

① خندف: ہذیل، کنانہ، اسد، ضبہ، مزینہ، رباب، تیم، ہون۔

ان میں سے ہر ایک کے متعدد فروع ہیں۔

اصول	فروع۔
کنانہ	قریش، دول۔
ہون	قارہ۔
رباب	عدی، تیم، عکل، ثور۔
تمیم	مقاعس، قریع، بہدلہ، یربوع، ریاح، ثعلبہ، کلیب۔

② قیس: عدوان، غطفان، اعصر، سلیم، ہوازن۔

اصول	ان میں بعض کے فروع یہ ہیں۔
غطفان	عبس، ذبیان، فزارہ، مرہ۔
اعصر	غنی، باہلہ۔
ہوازن	سعد، نصر، جثیم، ثقیف، سلول، بنو عامر (عامر کی شاخیں بنو ہلال، بنو نمیر، بنو کعب ہیں)۔

یہود

بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ

بنو قحطان و آلِ اسماعیل نے اسلام سے پہلے متعدد حکومتیں قائم کی تھیں، جن کے جستہ جستہ واقعات کہیں ملتے ہیں۔

عرب کی قدیم حکومتیں

کتبوں اور دیگر مؤرخین کی تصریحوں سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں پانچ متمدن سلطنتیں گزریں۔

① معینی — معین یمن میں ایک مقام کا نام ہے جو کسی زمانہ میں سلطنت کا پایۂ تخت تھا۔

② سبائی — یعنی قوم سبا

③ حضرموتی — حضرموت، یمن کا مشہور مقام ہے۔

④ قتبانی — قتبان، عدن میں ایک مقام ہے جو آج کل گمنام ہے۔

⑤ نابتی — حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام نابت تھا۔ یہ سلسلہ انہی کی طرف منسوب ہے۔

معینی سلطنت، جنوبی عربستان میں تھی، اس کے صدر مقامات قرن اور معین تھے، کتبوں سے تقریباً پچیس

حکمرانوں کا پتہ چلتا ہے، محققین یورپ میں اختلاف ہے کہ معینی اور سبائی حکومتیں ہم زمان تھیں یا متقدم و متاخر گلازر کا خیال ہے کہ معینی حکومت بہت متقدم ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پندرہ سو برس قبل موجود تھی، لیکن مولر کا بیان ہے کہ کوئی معینی کتبہ آٹھ سو برس قبل مسیح سے پہلے کا نہیں ملتا، اس بنا پر سبائی اور معینی دونوں ہم عصر ہیں۔

سبائی دور، جیسا کہ کتبوں سے ثابت ہوتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سات سو برس قبل ہے، اس سلطنت کا پایہ تخت مآرب تھا، اس زمانہ کے سنگی کتبے بہ کثرت موجود ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک سو پندرہ برس قبل تک اس حکومت کا پتہ چلتا ہے، اس دور کے بعد حمیر کا زمانہ ہے، حمیر نے مآرب پر قبضہ کر کے اس کو پایہ تخت بنالیا۔

قریباً ۱۱۵ قبل مسیح میں حمیر نے سبائی حکومت پر قبضہ کرلیا، کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حمیر میں چھبیس فرمان روا گزرے، حمیر کے بعض کتبوں میں سنہ وسال بھی کندہ ہے، ان کے عہد حکومت میں، رومی سلطنت نے عرب میں مداخلت کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن یہ کوشش پہلی بھی تھی اور آخری بھی، اے لیس گالس، جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ۱۸ برس قبل، عرب پر چڑھائی کی تھی، بالکل ناکامیاب رہا، اس کے رہبر دغابازی سے اس کو صحرا میں لے گئے اور ریگستان میں پہنچ کر اس کا سارا لشکر تباہ ہوگیا۔ ❶

حمیر نے یہودی مذہب قبول کرلیا تھا، اسی زمانہ کے قریب حبشیوں نے عرب کے جنوب میں حکومت قائم کرنی شروع کی اور ایک زمانہ میں حمیریوں کو شکست دے کر اپنی مستقل حکومت قائم کرلی، اس عہد کا ایک کتبہ جو آجکل ہاتھ آیا ہے، اس پر یہ الفاظ ہیں:

> ”رحمان، مسیح اور روح القدس کی قدرت وفضل ورحمت سے اس یادگاری پتھر پر ابرہہ نے کتبہ لکھا جو کہ بادشاہ جبش ارا حمیس ذبی مان کا نائب الحکومۃ ہے۔“

سبا اور حمیر کی عظمت اور اقتدار اور وسعت فتوحات کی روایتیں، عرب میں اس قدر متواتر ہیں کہ ان کے قدر مشترک سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اشعار میں بھی کثرت سے واقعات مذکور ہیں۔ عربوں کے خیال کے موافق سلاطین حمیر نے ایران کے انتہائی مقامات فتح کر لئے تھے، ذوالقرنین جس کو عوام سکندر کہتے ہیں، اہل عرب کے نزدیک اسی حمیری خاندان کا فرماں روا تھا۔ شاہ نامہ میں مذکور ہے، کہ کیکاؤس کو شاہ ہاماوران نے گرفتار کرلیا تھا، علامہ ثعلبی نے تاریخ ایران میں (جواب یورپ میں چھپ کر شائع ہوگئی ہے) لکھا ہے کہ یہ ہاماوران، حمیر کا بادشاہ تھا اور ہاماوران دراصل وہی عربی حمیر ہے، علامہ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ سودابہ جو کیکاؤس کی زوجہ تھی اور فردوسی کے بیان کے موافق، سیاؤش پر عاشق ہوگئی تھی اسی حمیری بادشاہ کی بیٹی تھی اور اس کا اصلی نام سعدیٰ تھا، ایرانیوں نے اپنے تلفظ میں اس کو سودابہ کرلیا تھا۔

یورپ کی تحقیقات حال سے بھی سبا اور حمیر کے اعلیٰ درجہ کے تمدن کا ثبوت ملتا ہے، پروفیسر نولدیکی جرمنی کا مشہور مستشرق لکھتا ہے:

---

❶ یہ تمام تفصیل انسائیکلو پیڈیا کے اس آرٹیکل سے ماخوذ ہے جو جی ڈبلو تھیاچر صاحب نے عرب پر لکھا ہے، نیز لٹریری ہسٹری آف دی عربس مؤلفہ رینالڈ نکلسن پروفیسر کیمبرج صفحہ ۴ تا ۶۔

''ولادت مسیح سے ہزار سال قبل، جنوبی و غربی عرب یعنی یمن جو حمیر اور سبا کا ملک تھا اور جو اپنی بارشِ گرما کے باعث زراعت کے لئے نہایت موزوں تھا، تمدن کے اس رتبہ تک پہنچ چکا تھا کہ اس کے کثیر التعداد کتبات اور شاندار عمارات کے آثار سے آج بھی ہمارے جذباتِ مدح و ستائش کو تحریک ہوتی ہے اور اہل یونان و روم نے اس کو ''دولت مند عرب'' کا جو لقب دیا تھا وہ بیجا نہ تھا۔۔۔۔۔۔تورات میں متعدد عبارتیں ہیں جو سبا کی عظمت و شوکت کی شہادت دیتی ہیں، چنانچہ ملکہ سبا کا سلیمان علیہ السلام سے ملاقات کا قصہ خاص طرح پر قابل ذکر ہے۔ (ا۔سلاطین۔۱۰ آیت ۱تا۱۰)

قوم ثمود، جن کی عمارات سے ڈاوٹی اور یوٹنگ کی محنتوں نے ہم کو روشناس کر دیا ہے، نیز قوم نابت نے جو ثمود سے بہت ملتی جلتی ہے، اپنے تمدن کی ابتدائی تعلیم غالباً انہی سے حاصل کی ہے۔ کتابت کا فن، جو سبائیوں نے بہت ابتدائی زمانہ میں شمال سے لیا تھا، اب اس کو خود انہوں نے عرب کے اکثر حصوں میں ہر طرح کے کاروبار میں جاری کر دیا یہاں تک کہ ایک طرف دمشق اور دوسری جانب ابی سینیا تک اس کو پھیلا دیا۔'' ❶

نابتی حکومت، جو شام کے حدود سے متصل تھی اور جو قوم ثمود کی مرادف، یا ان کی قائم مقام تھی، اس کی نسبت فارسٹر صاحب اپنے جغرافیہ میں لکھتے ہیں:

> ''ان مختصر بیانات سے معلوم ہوا ہوگا کہ زمانہ قدیم میں نابت کا نام اور اثر نہ صرف ریگستانی اور صحرائی عرب پر مستولی تھا، بلکہ حجاز و نجد کے صوبہائے عظیمہ پر بھی حاوی تھا۔ نابتی جہاں ایک طرف منافع تجارت سے بہرہ اندوز ہونے میں کمال رکھتے تھے، وہاں دوسری طرف بطور سچے بنو اسماعیل کے خطرات جنگ کے لئے بالکل مستعد رہتے تھے، فلسطین و شام میں ان کی غارتگریوں اور خلیج عرب میں مصری جہازات پر ان کی رہزنی نے بارہا تاجداران مقدونیہ کو ان کی دشمنی پر آمادہ کر دیا لیکن روما کی مجموعی قوت سے پیشتر کوئی شے انہیں روک نہ سکی اور روما کی اطاعت بھی انہوں نے اسٹرابو کے زمانہ میں بالکل مجبورانہ اور مشتبہ انداز سے قبول کی۔'' ❷

یہ قدیم سلطنتوں کا حال تھا، اسلام کے قبل یہ تمام سلطنتیں برباد ہو چکی تھیں، ان کے بجائے یمن میں صرف بڑے بڑے سردار رہ گئے تھے، جن کو قَیل، یا مقول کہتے تھے، عراق میں آل منذر کا خاندان قائم تھا، جو فارس کے زیر اثر تھے، خورنق اور سدیر عرب کی مشہور عمارتیں اسی سلسلہ کی یادگار ہیں، شام کے حدود میں غسانی خاندان فرمانروا تھا، جو قیصرانِ روم کا ماتحت تھا اور جس کا اخیر فرمان روا، جبلہ بن الایہم غسانی تھا۔

تہذیب و تمدن

تہذیب و تمدن کے لحاظ سے عرب کے مختلف حصے بالکل مختلف حالت رکھتے تھے۔ مانسیو لیبان ❸

---

❶ مؤرخین کی تاریخ عالم جلد ۸۔ یعنی ہسٹورینس ہسٹری آف ورلڈ، تمہیدی آرٹیکل نوشتہ پروفیسر نولدکی صفحہ ۵۔

❷ تاریخی جغرافیہ عرب از ریورنڈ فارسٹر جلد اول از صفحہ ۲۲۰ تا ۲۲۸۔ ❸ تمدن عرب (کتاب اول، باب و فصل سوم ص: ۸۳ تا ۸۸)۔

فرنساوی نے اصولِ عمران کی بنا پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کا تمدن کسی زمانہ میں اوج کمال تک پہنچ چکا تھا، کیونکہ اصول ارتقا کی رو سے کوئی قوم، محض وحشت کی حالت سے دفعتاً اعلیٰ درجہ کی تہذیب و تمدن تک نہیں پہنچ سکتی۔

یہ ایک قیاسی استدلال ہے، تاریخ سے بھی اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے بعض حصے، مثلاً: یمن کسی زمانہ میں انتہا درجہ کی ترقی تک پہنچ چکے تھے، یورپ کے محققینِ آثارقدیمہ، جنھوں نے یمن کے آثار قدیمہ کی تحقیقات کی ہے اور پرانے کتبوں کو پڑھا ہے، وہ یمن کی قدیم تہذیب وتمدن کا اعتراف کرتے ہیں۔

صنعاء اور قلیس کے ذکر میں، یاقوت حموی نے معجم میں قدیم آثاراتِ عجیبہ کا تذکرہ کیا ہے اور گو اس میں بہت کچھ مبالغہ بھی ہے، تاہم اصلیت کا حصہ بھی کچھ کم نہیں۔

اسی طرح عرب کے وہ مقامات، جو ایران اور شام سے متصل تھے، مثلاً: حیرہ جو آلِ نعمان کا پایۂ تخت تھا اور حوران جو خاندان غسان کا صدر مقام تھا، تہذیب وتمدن سے خالی نہ تھے۔

مؤرخین عرب کا دعویٰ ہے کہ یمن نے ایک زمانہ میں اس حد تک ترقی کی تھی کہ وہاں کے سلاطین نے تمام ایران فتح کر لیا تھا، چنانچہ سمرقند کی وجہ تسمیہ یہ بتاتے ہیں کہ یمن کا ایک بادشاہ جس کا نام شمر تھا، اس نے سمرقند کو کھدوا کر برباد کر دیا تھا، اس بنا پر ایرانی اس مقام کو شمر کند کہنے لگے، پھر معرب ہو کر سمرقند ہو گیا۔

عظیم الشان قلعوں اور عمارتوں کے آثار، جو اب بھی کچھ کچھ باقی ہیں، اس بات کی قطعی شہادت ہیں کہ اس ملک میں کبھی اعلیٰ درجہ کا تمدن موجود تھا، علامہ ہمدانی نے اکلیل میں تمام آثار قدیمہ کا ذکر کیا ہے، چنانچہ صفۃ جزیرۃ العرب [1] میں لکھتے ہیں:

> المشهور من محافد اليمن وقصورها القديمة التى ذكرتها العرب فى الشعر والمثل .... كثيرة الذى فيها من الشعر باب واسع وقد جمع ذلك كله الكتاب الثامن من الاكليل ۔
>
> ”یمن کے مشہور، قدیم قصر اور ایوان جن کا ذکر، اہل عرب نے اشعار اور امثال میں کیا ہے ۔۔۔۔ کثرت سے ہیں اور ان کے متعلق اشعار کا ایک دفتر ہے، اکلیل کے آٹھویں باب نے ان سب کو جمع کر دیا ہے۔“

اس کے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ میں اس موقع پر صرف ان کے نام گنا دیتا ہوں اور وہ یہ ہیں:

> ”غمدان، تلفم، ناعط، صِرواح، سلحين، ظفار، هكر، ضهر، شبام، غيمان، بينون، ريام، براقش، معين، روثان، ارياب، هند، هنيده، عمران، نجير۔“

---

[1] صفة جزيرة العرب، (ج ا، ص: ۲۰۳) (س)

ان میں سے غمدان اور ناعط کا حال، معجم البلدان میں تفصیل سے مذکور ہے اور اس کی عظمت و رفعت کے متعلق ایسی باتیں نقل کی ہیں جن پر ایشیائی مبالغہ کا دھوکا ہوتا ہے، سلحین کی نسبت لکھا ہے کہ ستر برس میں تعمیر ہوا، [1] شبام کے حال میں لکھا ہے:

لهم فيه حصون عجيبة هائلة۔ [2]

''ان میں ان کے متعدد ہیبت انگیز قلعے ہیں۔''

قلعۂ ناعط، وہب بن منبہ کے زمانہ تک موجود تھا، اس کے ایک کتبہ کو محدث موصوف نے پڑھا، تو معلوم ہوا کہ سولہ سو برس کی تعمیر ہے، آجکل یورپ کے محققین نے ان مقامات میں جا کر جو تحقیقات کی ہیں اس سے بھی حیرت انگیز تمدن کی تصدیق ہوتی ہے، تھیاچر صاحب اپنے آرٹیکل میں لکھتے ہیں: [3]

''جنوبی عربستان میں، جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے صدیوں پہلے، ایک ترقی یافتہ تمدن موجود تھا۔ قلعوں اور شہر پناہوں کے آثار اب تک موجود ہیں اور ان کا ذکر متعدد سیاحوں نے کیا ہے...... یمن اور حضرموت میں، یہ آثار کثرت سے ہیں اور اکثر پر اب تک کتبے موجود ہیں...... صنعاء کے قریب ایک قلعہ تھا جس کو قزوینی نے آثار البلاد میں دنیا کے عجائب ہفت گانہ میں سے ایک قرار دیا ہے۔ (دیگر قلعوں کے لئے دیکھو جنرل جرمن اورینٹل سوسائٹی جلد ۱۰ صفحہ ۲۰ سے آگے)

مآرب جو قدیم سبائی دار السلطنت تھا، اس کے آثار قدیمہ کو ارنو، ہالیوے اور گلازر نے دیکھا ہے۔

''مآرب کے مشہور آثار میں سے ایک بڑی خندق کے آثار باقی ہیں، ان کو دیکھ کر عدن کے دوبارہ تعمیر شدہ حوض یاد آتے ہیں، ان کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوئی جب گلازر نے وہ دو طویل الذیل کتبے شائع کئے جن میں ان کے عیسوی قرن پنجم و ششم میں دوبارہ تعمیر کا ذکر ہے، یمن میں بمقام حران ایک اور خندق ہے جس کا طول تقریباً چار سو پچاس فٹ ہے''۔

لیکن عرب کے اصلی اور اندرونی مقامات میں تہذیب و تمدن کی یہ حالت نہ تھی، عربی زبان نہایت وسیع ہے، باوجود اس کے جن چیزوں کو تمدن اور اسباب معاشرت سے تعلق ہے، ان کے لئے خاص عربی زبان میں الفاظ نہیں ملتے، بلکہ ایران یا روم سے مستعار آئے ہیں، سکہ کے لئے ایک لفظ بھی موجود نہیں، درہم اور دینار دونوں غیر زبان کے الفاظ ہیں۔ درہم یونانی لفظ درخم ہے۔ اور یہ وہی لفظ ہے جو انگریزی میں ڈرام ہو گیا ہے، چراغ معمولی چیز ہے، تاہم اس کے لئے عربی میں کوئی لفظ نہ تھا، چراغ کو لے کر سراج کر لیا، پھر ایک مصنوع لفظ بنایا، مصباح، یعنی ایک آلہ جس سے صبح بنالی جاتی ہے، کوزہ کے لئے کوئی لفظ نہیں، کوزہ کو کوز کر لیا ہے،

[1] ج ۵، ص: ۱۰۵۔ [2] ایضا، ص: ۲۲۶۔ [3] دیکھو انسائیکلو پیڈیا مضمون ''عرب''۔

لوٹے کو ابریق کہتے ہیں، جو آب ریز کا معرب ہے، تشت فارسی لفظ تھا، اسی کو عربی میں طست کرلیا ہے، پیالہ کو کاس کہتے ہیں، وہی کاسہ، فارسی لفظ ہے، کرتہ کو عربی میں قرطق کہتے ہیں، یہ بھی فارسی ہے، پاجامہ کو سروال کہتے ہیں، جو شلوار کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

جب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے لفظ نہ تھے تو تمدن کے بڑے بڑے سامان کے لئے کہاں سے لفظ آتے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب نے کسی زمانہ میں جو ترقی کی تھی آس پاس کے ممالک کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہو کر کی تھی، اس لئے جو مقامات ان ممالک سے دور تھے، اسی اصلی حالت پر رہ گئے۔

احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ تک عیش و نعمت کے سامان بہت کم تھے، مسئلہ حجاب کے شان نزول میں بخاری وغیرہ میں مذکور ہے کہ اس زمانہ تک گھروں میں جائے ضرور ❶ نہ تھی، مستورات رفع حاجت کے لئے باہر جایا کرتی تھیں، ❷ ترمذی باب الفقر میں ہے کہ اس وقت تک چھلنیاں نہ تھیں، بھوسے کو پھونک کر اڑاتے تھے، جو رہ جاتا تھا، وہی آٹا ہوتا تھا، ❸ بخاری کی ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ راتوں کو گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے، ❹ ابو داؤد میں ایک صحابی کی روایت ہے کہ میں آنحضرت ﷺ کی صحبت میں تھا لیکن میں نے آپ سے حشرات الارض ❺ کا حرام ہونا نہیں سنا، ❻ اگرچہ اس حدیث کی شرح میں محدثین لکھتے ہیں کہ ایک راوی کے نہ سننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقع میں آنحضرت ﷺ نے حشرات الارض کی حرمت نہیں بیان کی، لیکن اس سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب حشرات الارض کھاتے تھے، تاریخ اور ادب کی کتابوں میں یہ تصریح موجود ہے کہ عرب کن کھجورا، گوہ، گرگٹ، سہی اور جانوروں کا چمڑا کھاتے تھے۔

عرب کے مذاہب

عرب میں اسلام سے پہلے مختلف مذاہب تھے، بعضوں کا خیال تھا کہ جو کچھ ہے زمانہ یا فطرت (قانون قدرت) ہے، خدا کوئی چیز نہیں، انہی لوگوں کی نسبت قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ﴾ (٤٥/ الجاثية: ٢٤)

''اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہم کو مارتا ہے تو زمانہ مارتا ہے۔''

بعض خدا کے قائل تھے، لیکن قیامت اور جزا و سزا کے منکر تھے، ان کے مقابلہ میں قرآن مجید نے قیامت کے ثبوت پر اس طرح استدلال کیا ہے:

❶ بیت الخلاء، لیٹرین۔ ❷ بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورة نور: ٤٧٥٠۔ ❸ ترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء في معيشة النبي ﷺ وأهله: ٢٣٦٤۔ ❹ بخاری، كتاب الصلاة، باب الصلاة على الفراش: ٣٨٢۔ ❺ حشرات الارض کیڑے مکوڑے کو کہتے ہیں۔ ❻ ابو داود، كتاب الاطعمة، باب في اكل حشرات الارض: ٣٧٩٨۔

﴿قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (۳۶/ یٰس: ۷۹)

''کہہ دو کہ (ہڈیوں کو) وہی دوبارہ زندہ کرے گا جس نے پہلی دفعہ پیدا کیا تھا۔''

بعض خدا اور جزا و سزا کے بھی قائل تھے، لیکن نبوت کے منکر تھے، ان کا ذکر اس آیت میں ہے:

﴿وَقَالُوا مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ﴾ (۲۵/ الفرقان: ۷)

''اور کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے کہ کھاتا پیتا ہے اور بازار میں چلتا پھرتا ہے۔''

﴿قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَّسُولًا﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۹۴)

''کہتے ہیں کہ خدا نے آدمی پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔''

ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی پیغمبر ہو سکتا ہے تو اس کو فرشتہ ہونا چاہیے، جو حاجات انسانی سے منزہ ہو۔ لیکن عموماً لوگ بت پرست تھے، وہ بتوں کو خدا نہیں سمجھتے تھے بلکہ کہتے تھے کہ خدا تک پہنچنے کے وسیلے ہیں۔ [1]

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ﴾ (۳۹/ الزمر: ۳)

''ہم ان بتوں کو صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ ہم کو خدا سے قریب کر دیں۔''

قبیلہ حمیر جو یمن میں رہتا تھا آفتاب پرست تھا، کنانہ چاند کو پوجتے تھے، قبیلہ بنی تمیم، دبران کی عبادت کرتا تھا، اسی طرح قیس، شعریٰ کی، قبیلہ اسد، عطارد کی اور لخم و جذام، مشتری کی پرستش کرتے تھے۔ [2]

مشہور بتوں اور ان کے پوجنے والوں کے نام حسب ذیل ہیں: [3]

نام بت	مقام	قبیلہ جو اس بت کو پوجتا تھا۔
لات	طائف	ثقیف
عزّیٰ	مکہ معظمہ	قریش و کنانہ
منات	مدینہ منورہ	اوس، خزرج اور غسہ
ود	دومۃ الجندل	کلب
سواع		ہذیل
یغوث		مذحج اور قبائل یمن
یعوق		ہمدان

سب سے بڑا بت ہبل تھا، جو کعبہ کی چھت پر منصوب تھا، قریش لڑائیوں میں اس کی جے پکارتے تھے۔

[1] یہ تمام تفصیل ''ملل و نحل''، شہرستانی، مذاہب عرب کے ذکر میں ہے (برحاشیہ الفصل فی الملل والنحل ابن حزم باب آراء العرب فی الجاهلیة، ج۳، ص: ۲۲۰) [2] طبقات الامم لابن صاعد الاندلسی مطبوعه بیروت: ۱۹۱۲ء، ص: ۴۳۔ [3] بتوں کی تفصیل ''ملل و نحل'' میں ہے۔ (ج ۳ ص: ۲۲۲ برحاشیہ ملل و نحل ابن حزم)۔

عرب میں بت پرستی کا بانی ایک شخص عمرو بن لحی تھا، اس کا اصلی نام ربیعہ بن حارثہ تھا، عرب کا مشہور قبیلہ خزاعہ اسی کی نسل سے ہے، عمرو سے پہلے جرہم کعبہ کے متولی تھے، عمرو نے لڑ کر جرہم کو مکہ سے نکال دیا اور خود حرم کا متولی ہوگیا، وہ ایک دفعہ شام کے کسی شہر میں گیا، وہاں کے لوگوں کو بت پوجتے دیکھا تو پوچھا کہ ان کو کیوں پوجتے ہو، انہوں نے کہا یہ حاجت روا ہیں، لڑائیوں میں فتح دلاتے ہیں، قحط پڑتا ہے تو پانی برساتے ہیں، عمرو نے چند بت ان سے لے لئے اور لا کر کعبہ کے آس پاس قائم کئے، کعبہ چونکہ عرب کا مرکز تھا، اس لئے تمام قبائل میں بت پرستی کا رواج ہوگیا، ان میں سب سے قدیم بت مناۃ تھا۔ یہ سمندر کے کنارے قدید کے قریب نصب تھا، اوس اور خزرج یعنی مدینہ کے لوگ اسی پر قربانی چڑھاتے تھے اور جب کعبہ کا حج کر کے آتے تھے، تو احرام یہیں اتارتے تھے، ہذیل اور خزاعہ بھی اس کی پرستش کرتے تھے۔ [1]

یاقوت حموی نے معجم البلدان (ذکر مکہ) میں لکھا ہے کہ عرب میں بت پرستی کی عام اشاعت کی وجہ یہ ہوئی کہ قبائل عرب جو تمام اطراف سے حج کو آتے تھے واپس جاتے ہوئے حرم کے پتھروں کو اٹھا لیتے تھے اور ان کو اصنام کعبہ کی صورت پر تراش کر ان کی عبادت کرتے تھے۔

اللہ کا اعتقاد

عرب، گو قریباً سب کے سب بت پرست تھے، لیکن اس کے ساتھ یہ اعتقاد ان کے دل سے کبھی نہیں گیا کہ اصلی خدائے برتر اور چیز ہے اور وہی تمام عالم کا خالق ہے، اس خالق اکبر کو وہ ''اللہ'' کہتے تھے، قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ ﴾

(۲۹/ العنکبوت: ۶۱)

''اور اگر ان لوگوں (کافروں) سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور چاند اور سورج کو کس نے تابعدار بنا رکھا ہے تو بول اٹھیں گے کہ اللہ، پھر کدھر بھٹکے جا رہے ہیں۔''

﴿ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ۝ ﴾

(۲۹/ العنکبوت: ۶۵)

''پھر جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خدا ہی کو خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں، پھر جب خدا، ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف پہنچا دیتا ہے تو شرک کرنے لگتے ہیں۔''

قرآن مجید نے تیرہ سو برس پہلے جس حقیقت کا اظہار کیا، آج تحقیقات آثار قدیمہ بھی اس کی تصدیق کرتی ہے، مذاہب واخلاق کی انسائیکلوپیڈیا [2] میں مشہور مستشرق نولدیکی کا جو قول نقل کیا ہے اس کے اقتباسات حسب ذیل ہیں:

''اللہ'' جو صفا کے کتبوں میں ''ھلہ'' لکھا ہوا ہے، نباتی اور دیگر قدیم باشندگان عرب شمالی کے

[1] یہ تمام تفصیل معجم البلدان ذکر منات میں ہے (دیکھئے، ج۸ص: ۱۶۷، ۱۶۸)۔ [2] ج ا ص: ۶۶۴۔

نام کا ایک جزو تھا، مثلاً ''زید اللہی ۔۔۔۔'' نباتی کتبات میں اللہ کا نام بطور ایک علیحدہ معبود کے نہیں ملتا۔ لیکن صفا کے کتبات میں ملتا ہے، متاخرین مشرکین میں اللہ کا نام نہایت عام ہے، ولہاسن نے عرب قدیم کے لٹریچر میں بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں جن میں اللہ کا لفظ بطور ایک معبود اعظم کے مستعمل ہوا ہے، نباتی کتبات میں ہم بار بار کسی دیوتا کا نام پاتے ہیں جس کے ساتھ اللہ کا لقب شامل ہے، اس سے ولہاسن نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ کا لقب جو پہلے مختلف معبودوں کے لئے استعمال ہوتا تھا، رفتہ رفتہ زمانہ مابعد میں صرف ایک عظیم ترین معبود کے لئے بطور علم کے مخصوص ہو گیا۔''

نصرانیت اور یہودیت اور مجوسیت

اگرچہ زمانہ اور مدت کا تعین مشکل ہے لیکن یہ تینوں مذہب ایک مدت دراز سے عرب میں رائج ہو چکے تھے، علامہ ابن قتیبہ نے معارف میں لکھا ہے، کہ قبائل ربیعہ وغسان نصرانی تھے، قضاعہ میں بھی اس مذہب کا اثر پایا جاتا تھا، نصرانیت کو اس قدر ترقی ہو چکی تھی کہ خود مکہ معظمہ میں ایسے لوگ موجود تھے (مثلاً ورقہ بن نوفل) جو عبرانی زبان میں انجیل کو پڑھ سکتے تھے، متعدد ایسے لوگ تھے جنہوں نے شام میں جا کر تعلیم پائی تھی۔

حمیر، بنو کنانہ، بنو حرث بن کعب، کندہ، یہ قبائل یہودی تھے، مدینہ منورہ میں یہود نے پورا غلبہ پا لیا تھا اور تورات کی تعلیم کے لئے متعدد درسگاہیں قائم تھیں، جن کو بیت المدارس کہتے تھے، حدیث کی کتابوں میں اسی نام سے ان کا ذکر آتا ہے، قلعہ خیبر کی تمام آبادی یہودی تھی، امراء القیس کا ہم عصر مشہور شاعر سموئیل بن عادیا جس کی وفاداری آج تک عرب میں ضرب المثل ہے، یہودی تھا۔

اہل کتاب کی روایتیں، مکہ معظمہ میں اس قدر رواج پا چکی تھیں کہ آنحضرت ﷺ پر جب قرآن نازل ہوتا تھا اور اس میں بنی اسرائیل کے واقعات مذکور ہوتے تھے تو کفار بدگمانی کرتے تھے کہ کوئی یہودی یا عیسائی آپ کو سکھاتا ہے، خود قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ ﴾ (١٦/ النحل: ١٠٣)

''اور ہم جانتے ہیں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ محمد (ﷺ) کو کوئی آدمی سکھاتا ہے۔''

قرآن مجید میں اس خیال کا ابطال بھی کر دیا ہے، جس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی۔

قبیلہ تمیم مجوسی تھا، زرارہ تمیمی نے، جو اس قبیلہ کا رئیس تھا، اسی بنا پر اپنی بیٹی سے شادی کر لی تھی، گو اس پر اس کو ندامت ہوئی، اقرع بن حابس بھی مجوسی تھا۔ [1]

مذہب حنیفی

دین ابراہیمی کا ام الاصول توحید خالص تھی، زمانہ کے امتداد اور جہالت کے شیوع سے یہ اصول اگرچہ

[1] معارف ابن قتیبہ۔ (ادیان العرب فی الجاهلية، ص: ٢٦٦ المطبعة الاسلامية، مصر: ١٣٥٣هـ/ ١٩٣٤ء)۔

شرک آلود ہو گیا تھا، یہاں تک کہ خود خانہ خدا میں بتوں کی پرستش ہوتی تھی، تاہم بالکل فنا نہیں ہو سکتا تھا، عرب میں کہیں کہیں اس کا دھندلا سا نشان نظر آتا تھا، جو لوگ صاحب بصیرت تھے ان کو یہ منظر نہایت نفرت انگیز معلوم ہوتا تھا، کہ انسان عاقل، جماد لایعقل کے سامنے سر جھکائے، اس بنا پر بت پرستی کی برائی کا خیال بہتوں کے دل میں آیا، لیکن اس کا تاریخی زمانہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے کچھ ہی پہلے شروع ہوتا ہے، ابن اسحاق [1] نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ کسی بت کے سالانہ میلہ میں ورقہ بن نوفل، عبداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث، زید بن عمرو بن نُفیل شریک تھے، ان لوگوں کے دل میں دفعتہً یہ خیال آیا کہ یہ کیا بیہودہ پن ہے کہ ہم ایک پتھر کے سامنے سر جھکاتے ہیں جو نہ سنتا ہے، نہ دیکھتا ہے، نہ کسی کا نقصان کر سکتا ہے، نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، یہ چاروں قریش کے خاندان سے تھے، ورقہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے برادر عم زاد تھے، زید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چچا تھے، عبداللہ بن جحش حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے بھانجے تھے، عثمان عبدالعزیٰ کے پوتے تھے۔

زید، دین ابراہیمی کی تلاش میں شام گئے، وہاں یہودی اور عیسائی پادریوں سے ملے، لیکن کسی سے تسلی نہیں ہوئی، اس لئے اس اجمالی اعتقاد پر اکتفا کیا کہ ”میں ابراہیم علیہ السلام کا مذہب قبول کرتا ہوں۔“ صحیح بخاری میں (باب بنیان الکعبہ سے پہلے) حضرت اسماء رضی اللہ عنہا (دختر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ ”میں نے زید کو اس حالت میں دیکھا کہ کعبہ سے پیٹھ لگائے لوگوں سے کہتے تھے، اے اہل قریش! تم میں سے کوئی شخص بجز میرے ابراہیم علیہ السلام کے دین پر نہیں ہے“۔ [2]

عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے، زید ہی پہلے شخص ہیں جس نے اس رسم کی ممانعت کی، جب کوئی شخص ایسا ارادہ کرتا تو وہ جا کر اس لڑکی کو مانگ لیتے اور خود اس کی پرورش کرتے۔ [3]

صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نبوت سے پہلے زید کو دیکھا تھا اور ان سے صحبت رہی تھی، [4] ورقہ اور عبداللہ بن جحش اور عثمان بت پرستی چھوڑ کر عیسائی ہو گئے تھے۔

اسی زمانہ کے قریب امیہ بن ابی صلت نے جو طائف کا رئیس اور مشہور شاعر تھا، بت پرستی کی مخالفت کی، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اصابہ میں زبیر بن بکار کی سند سے لکھا ہے کہ امیہ نے زمانۂ جاہلیت میں آسمانی کتابیں پڑھی تھیں اور بت پرستی کو چھوڑ کر دین ابراہیمی اختیار کر لیا تھا۔

امیہ کا دیوان آج بھی موجود ہے، اگرچہ اس کا بڑا حصہ جعلی ہے تاہم اصلی کلام بھی اس میں پایا جاتا ہے۔ وہ غزوۂ بدر تک زندہ رہا، عتبہ جو رئیس مکہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا نانا تھا، امیہ کا ماموں زاد بھائی تھا، امیہ نے اس کے قتل ہونے کی خبر سنی تو اس کو سخت صدمہ ہوا اور نہایت پردرد مرثیہ لکھا، غالباً اسی کا اثر تھا کہ اسلام قبول نہ کر سکا۔

---

[1] سیرت ابن هشام، مطبوعه مصر، ج ۱، ص: ۷۶۔ [2] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل: ۳۸۲۸۔ [3] ایضاً۔ [4] ایضاً: ۳۸۲۶۔

شمائل میں ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی آنحضرت ﷺ کے ہم ردیف تھے، انہوں نے امیہ کا ایک شعر پڑھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''اور'' انہوں نے سو شعر پڑھے، ہر شعر کے ختم ہونے پر آپ فرماتے جاتے تھے کہ ''اور'' اخیر میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''امیہ مسلمان ہوتے ہوتے رہ گیا۔'' [1]

ابن ہشام نے بت پرستی کی مخالفت کرنے والوں میں انہی چاروں کا نام لکھا ہے، لیکن اور تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں اور متعدد اہل نظر پیدا ہوگئے تھے جنہوں نے بت پرستی سے توبہ کی تھی، ان میں سب سے زیادہ مشہور شخص، عرب کا نامور خطیب قیس بن ساعدہ الایادی ہے، اس کا تذکرہ آگے آتا ہے، ایک شخص قیس بن نشبہ تھا، جس کی نسبت حافظ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں خدا پرست ہو چکا تھا اور آنحضرت ﷺ کی بعثت پر مشرف بہ اسلام ہوا۔

یہ تحقیق نہیں کہ دین ابراہیمی کو دین حنیفی کیوں کہتے ہیں، قرآن مجید میں یہ لفظ موجود ہے، لیکن اس کے معنی میں اختلاف ہے، مفسرین لکھتے ہیں کہ ''چونکہ اس دین میں بت پرستی سے انحراف تھا، اس لئے اس کو حنیفی کہتے ہیں، کیونکہ حنف کے معنی انحراف کے ہیں، عبرانی اور سریانی [2] زبان میں حنیف کے معنی منافق اور کافر کے ہیں، ممکن ہے کہ بت پرستوں نے یہ لقب دیا ہو اور موحدین نے فخر یہ قبول کرلیا ہو۔

یہ امر اکثر روایتوں سے ثابت ہے کہ عرب اور خصوصاً مکہ اور مدینہ میں متعدد اشخاص بت پرستی کے منکر ہو گئے تھے اور ملت ابراہیمی کی جستجو میں تھے، یہ اس لئے کہ مجدد ملت ابراہیمی کے ظہور کا وقت قریب آ گیا تھا۔

ان چند راہ طلب اور حقیقت جو اشخاص کے وجود کی بنا پر مصنفین یورپ کہتے ہیں کہ مذہب صحیح اور توحید خالص کا رواج عام عرب میں اسلام سے پہلے بھی موجود تھا، لیکن اگر یہ صحیح ہے تو یہ حیرت انگیز بات ہے کہ اسلام کے ظہور پر اس قدر ہنگامہ کیوں برپا ہوا؟

کیا عرب میں ان مذاہب نے کچھ اصلاح کی؟

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، عرب میں تمام مشہور مذاہب موجود تھے، یہودیت بھی، نصرانیت بھی، مجوسیت بھی، حنیفیت بھی اور عقلی بلند پروازی کی معراج الحادبھی، لیکن ان سب کا نتیجہ کیا تھا؟ عقائد کے لحاظ سے یا تو خداؤں کی وہ کثرت، جس کو نصرانیت نے بہت گھٹایا، تاہم تین کی تعداد سے کم نہ کرسکی، اس کے ساتھ یہ اعتقاد کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود سولی پر چڑھ کر تمام بنی آدم کے گناہوں کا کفارہ بن گئے، یا توحید تھی، لیکن خدا اس قسم کا تھا جو آدمیوں سے کشتی لڑتا تھا۔ [3]

بتوں پر آدمیوں کی قربانی چڑھائی جاتی تھی، باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی، حقیقی بہنوں سے

---

[1] شمائل ترمذی، باب ماجاء فی صفۃ کلام رسول اللہ ﷺ فی الشعر: ۲۴۸۔ [2] یہ مارگولیوس کا بیان ہے۔

[3] تورات' تکوین، باب:۳۲ آیت ۲۲ تا ۲۹ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے خدا سے کشتی لڑنے کا واقعہ تفصیل سے مذکور ہے۔

ایک ساتھ شادی جائز تھی، ازدواج کی کوئی حد نہ تھی، قمار بازی، شراب خوری، زنا کاری کا رواج عام تھا، بے حیائی کی یہ حالت تھی کہ سب سے بڑا نامور شاعر، امراء القیس، جو شہزادہ بھی تھا، قصیدہ میں اپنی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ اپنی بدکاری کا قصہ، مزے لے لے کر بیان کرتا ہے اور یہ قصیدہ کعبہ پر آویزاں کیا جاتا ہے۔

لڑائیوں میں لوگوں کو زندہ جلا دینا، مستورات کے پیٹ چاک کر ڈالنا، معصوم بچوں کو تہ تیغ کرنا، عموماً جائز تھا، عیسائیوں کے بیان کے مطابق عرب قبل اسلام، تمام مذاہب میں سب سے زیادہ عیسائیت سے متاثر تھا، تاہم اس اثر کا کیا نتیجہ تھا؟ اس کو خود عیسائی مؤرخین کی زبان سے سننا چاہیے! ایک عیسائی مؤرخ لکھتا ہے:

''عیسائیوں نے عرب کو پانچ سو برس، تعلیم وتلقین کی، اس پر بھی خال خال عیسائی نظر آتے تھے یعنی بنو حارث نجران میں، بنو حنیف یمامہ میں اور کچھ بنی طے میں عیسائی تھے، باقی خیریت...... بالآخر عرب کو من حیث المذہب دیکھیے تو اس کی سطح پر عیسائیوں کی ضعیف کوششوں کی کچھ خفیف سی موجیں لہراتی نظر آتی تھیں اور یہود کی قوت بھی کبھی بڑی شدت سے طغیانی کرتی نظر آتی تھی، لیکن بت پرستی اور بنو اسماعیل کے بے ہودہ اعتقادات کا دریا ہر سمت سے جوش مارتا ہوا کعبہ سے آ کر ٹکراتا تھا۔'' [1]

یہ حالت صرف عرب کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ تمام دنیا میں یہی تاریکی چھائی ہوئی تھی (اس کی تفصیل کتاب کے دوسرے حصہ میں آئے گی)۔ کیا اس عام ظلمت، اس عالمگیر تیرگی اس وسیع اور ہمہ گیر تاریکی میں ایک آفتاب عالم تاب کی حاجت نہ تھی؟

[1] میور صاحب کی لائف آف محمد (ﷺ) جلد ا، دیباچہ۔

سلسلۂ اسماعیلی

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ مؤرخین عرب نے عرب کی تین قسمیں کی ہیں۔
عرب کی وہ قدیم قومیں جو بالکل برباد ہوگئیں، مثلاً: طسم وجدیس وغیرہ۔
خالص عرب جو قحطان کی اولاد ہیں، مثلاً: اہل یمن اور انصار (اور تیسرا سلسلۂ اسماعیلی)

حضرت اسماعیل علیہ السلام جب مکہ میں آباد ہوئے، تو حوالی مکہ میں بنو جرہم آباد تھے، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس خاندان میں شادی کی، ❶ اس سے جو اولاد ہوئی وہ عرب مستعربہ کہلاتی ہے، اب عرب کا بڑا حصہ اسی خاندان سے ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ اور خود اسلام کی تاریخ تمام تر اسی اخیر سلسلہ سے وابستہ ہے کہ آنحضرت ﷺ حضرت اسماعیل کے خاندان سے ہیں اور جو شریعت آنحضرت ﷺ کو عنایت ہوئی وہی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا ہوئی تھی، قرآن مجید میں ہے:

﴿ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا ﴾ (۲۲/ الحج: ۷۸)

''تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب، اسی ❷ نے پہلے پہل تمہارا نام مسلم رکھا اور اس قرآن میں بھی۔''

لیکن یورپ کے بہت سے متعصب مؤرخ سرے سے ان حقائق کے منکر ہیں، یعنی نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام عرب میں آئے نہ انہوں نے کعبہ کی بنیاد ڈالی، نہ آنحضرت ﷺ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔

چونکہ ان مباحث نے مذہبی تعصب کی صورت اختیار کر لی ہے، اس لئے یہ توقع مشکل ہے کہ ہم اس بحث کو اس طرح طے کر سکیں گے کہ استدلال کی بنیاد، یورپ کے مسلمات پر رکھی جائے۔

جو واقعات مختلف فیہ ہیں بہت ہیں، لیکن اصولی امور صرف دو ہیں، جن میں دونوں فریق کا کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتا، یہ اصول جس فریق کے موافق طے ہوں اس کے فرعی جزئیات بھی اسی کے موافق تسلیم کر لینے چاہئیں، اصول مذکورہ حسب ذیل ہیں:

① حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام عرب میں آ کر آباد ہوئے یا نہیں؟
② حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسحاق علیہ السلام کو قربانی کرنا چاہا تھا، یا حضرت اسماعیل علیہ السلام کو؟

حضرت اسماعیل علیہ السلام کہاں آباد ہوئے؟

یہود مدعی ہیں کہ حضرت اسحاق علیہ السلام ذبیح ہیں۔ اس بنا پر وہ قربانی گاہ کا موقع شام بتاتے ہیں۔ لیکن اگر

---

❶ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء: ۳۳۶۴۔
❷ اس کا مرجع بعض مفسرین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتایا ہے اور بعض نے اللہ تعالیٰ کو اور یہی صحیح ہے جیسا کہ آیات سے صاف ظاہر ہے۔

یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام نہیں بلکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے، تو قربانی گاہ کے موقع کی نسبت عرب ہی کی روایتیں تسلیم کرنی پڑیں گی اور اس حالت میں تاریخ کی تمام کڑیاں متصل ہو جائیں گی۔

تورات میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی اولاد حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے بطن سے ہوئی جس کا نام اسماعیل رکھا گیا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے، حضرت اسماعیل علیہ السلام جب بڑے ہوئے تو حضرت سارہ نے یہ دیکھ کر کہ وہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے ساتھ گستاخی کرتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ ہاجرہ اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکال دو ان واقعات کے بعد تورات کے خاص الفاظ یہ ہیں:

''تب ابراہیم علیہ السلام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہ علیہا السلام کے کاندھے پر رکھا اور اس لڑکے کو بھی رخصت کیا، وہ روانہ ہوئی، بیرسبع کے بیابان میں بھٹکتی پھرتی تھی اور جب مشک کا پانی چک گیا تب اس نے اس لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا اور آپ اس کے سامنے ایک تیر کے ٹپے پر دور جا کر بیٹھی کیونکہ اس نے کہا میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں، سو وہ سامنے بیٹھی اور چلا چلا کر روئی، تب خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہ! تجھ کو کیا ہوا، مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے خدا نے سنی، اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا، پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر اپنی مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا اور تیر انداز ہو گیا اور وہ فاران کے بیابان میں رہا اور اس کی ماں نے ملک مصر سے ایک عورت بیاہنے کو لی''۔ (تورات، سفر پیدائش باب ۲۱ آیت: ۱۴ تا ۲۱)

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام جب گھر سے نکالے گئے تو بالکل بچہ تھے، چنانچہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے مشک کو اور ان کو کاندھے پر اٹھایا، عربی تورات میں صاف یہ الفاظ ہیں:

واضعًا ایاھا علی کتفھا والولد۔

''حضرت ابراہیم نے مشک اور بچہ دونوں کو ہاجرہ کے کندھے پر رکھا۔''

لیکن تورات میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ۸۶ برس کی تھی [1] اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ختنہ کیا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر ۱۳ برس کی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ننانوے برس کی تھی۔ [2]

---

[1] پیدائش، باب: ۱۶۔ ۱۶۔ [2] پیدائش۔ باب: ۱۷۔ ۲۴ و ۲۵۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے گھر سے نکالے جانے کا واقعہ، ختنہ کے بعد کا ہوگا، اس لئے اس وقت قطعاً ان کی عمر ۱۳ برس سے زیادہ تھی اور اس سن کا لڑکا اتنا چھوٹا نہیں ہوتا کہ ماں اسے کندھے پر اٹھائے پھرے، اس واقعہ سے غرض یہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر اس وقت اتنی ہو چکی تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو اور ان کی والدہ کو اصلی مقام سکونت سے کسی دور مقام پر لا کر آباد کر سکتے تھے۔

تورات کی عبارت مذکورہ میں تصریح ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام فاران میں رہے اور تیر اندازی کرتے رہے، عیسائی کہتے ہیں کہ فاران اس صحرا کا نام ہے جو فلسطین کے جنوب میں واقع ہے، اس لئے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا عرب میں آنا خلاف واقعہ ہے۔

جغرافیہ دانان عرب عموماً متفق ہیں کہ فاران، حجاز کے پہاڑ کا نام ہے، چنانچہ معجم البلدان میں صاف تصریح ہے، لیکن عیسائی مصنفین اس سے اتفاق نہیں کر سکتے، اس کا فیصلہ ایک بڑی طول طویل بحث پر مبنی ہے جو مباحثہ اور مناظرہ کی حد تک پہنچ جاتی ہے، اس لئے ہم اس کو نظر انداز کرتے ہیں، البتہ اس قدر بتانا ضروری ہے کہ عرب کی حد شمالی کسی زمانہ میں کس حد تک وسیع تھی۔

موسیو لیبان، تمدنِ عرب میں لکھتے ہیں:

''اس جزیرے کی حد شمالی اس قدر صاف اور آسان نہیں ہے، یعنی یہ حد اس طرح پر قائم ہوتی ہے کہ غزہ سے جو فلسطین کا ایک شہر اور بحر متوسط پر واقع ہے، ایک خط جنوب بحر لوط تک کھینچا جائے اور وہاں سے دمشق اور دمشق سے دریائے فرات تک اور دریائے فرات کے کنارے کنارے لا کر خلیج فارس میں ملا دیا جائے، پس اس خط کو عربستان کی حدِ شمالی کہہ سکتے ہیں۔''

اس بنا پر عرب کے حجازی حصہ کا فاران میں محسوب ہونا خلاف قیاس نہیں، تورات [1] میں جہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جائے سکونت کا بیان ہے، وہاں یہ الفاظ ہیں:

''اور وہ حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے جس سے سور کو جاتے ہیں، بستے تھے''۔

اس تحدید میں مصر کے سامنے جو زمین پڑتی ہے وہ عرب ہی ہو سکتا ہے۔ نصاریٰ کی مقدس کتابوں میں جس قدر اعتنا ہے، بنو اسرائیل کے ساتھ ہے۔ بنی اسماعیل کا ذکر محض ضمنی طور پر آ جاتا ہے اور اس وجہ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا عرب میں آباد ہونا بہ تصریح نہیں ملتا۔ لیکن مختلف تلمیحات سے مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کا عرب میں آباد ہونا ایک مسلمہ امر تھا۔ عہد جدید میں جس کو عیسائی وحی الٰہی سمجھتے ہیں پولوس کا ایک خطہ گلیتون کے نام ہے، اس میں یہ عبارت ہے: [2]

''ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی سے، دوسرا آزاد سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا جسم

---

[1] سفر تکوین، باب: ۲۵۔ آیت: ۱۸، ص: ۳۹ آکسفورڈ۔ [2] باب ۴۔ آیت: ۲۲ تا ۲۵، ص: ۳۰۹۔

کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد سے تھا، سو وعدے کے طور پر، یہ بات تمثیلی بھی مانی جاتی ہے، اس لئے کہ یہ عورتیں دو عہد ہیں، ایک تو سینا پہاڑ سے جو ہوا وہ نرے غلام جنتی ہے، یہ ہاجرہ ہے کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم کا جواب ہے۔''

اگرچہ معلوم نہیں کہ اصلی عبارت کیا تھی۔ اردو اور عربی دونوں ترجمے ناصاف ہیں، تاہم اس قدر واضح ہیں کہ پولوس جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سب سے بڑے جانشین ہیں، حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو عرب کا کوہ سینا کہتے تھے۔ اگر حضرت ہاجرہ علیہا السلام عرب میں آباد نہ ہوئی ہوتیں، تو ان کو عرب کا کوہِ سینا کہنا کیا معنی رکھتا ہے، آگے چل کر بکۃ کے ذکر میں، یہ بحث زیادہ مؤید ہو جائے گی۔

ذبیح کون ہے؟

تورات اگرچہ یہودیوں کی عدم احتیاط، اغراض ذاتی اور زمانہ کے انقلابات سے سرتاپا مسخ ہو گئی ہے اور خصوصاً پیغمبر خاتم ﷺ کے متعلق اس میں جو تصریحات اور تلمیحات تھیں یہود کے دست تصرف نے ان کو بالکل برباد کر دیا ہے۔ تاہم حقائق کے عناصر اب بھی ہر جگہ موجود ہیں، تورات میں گو تصریحاً حضرت اسحٰق علیہ السلام کا ذبیح ہونا لکھا ہے لیکن مطاویٔ کلام میں اس بات کے قطعی دلائل موجود ہیں کہ وہ ہرگز ذبیح نہ تھے اور نہ ہو سکتے تھے، امور ذیل کو پیش نظر رکھنا چاہیے:

① شریعت سابقہ کے رو سے قربانی صرف اس جانور یا آدمی کی ہو سکتی تھی جو پہلوٹا بچہ ہو، اسی بنا پر ہابیل نے جن مینڈھوں کی قربانی کی تھی وہ پہلوٹے بچے تھے۔

خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جہاں لاویوں کے متعلق احکام ارشاد فرمائے، وہاں فرمایا ہے:

لان لی کل بکر فی بنی اسرائیل من الناس والبهائم (۸/ عدد:۱۷)

''کیونکہ بنی اسرائیل میں آدمی اور جانور کا ہر پہلوٹا بچہ میرے لئے ہے۔''

② پہلوٹے بچے کی افضلیت کسی حالت میں زائل نہیں ہو سکتی، تورات میں ہے کہ اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں، ایک محبوبہ ہو اور دوسری غیر مرغوبہ، تو فضیلت اسی اولاد کو ہو گی جو پہلوٹی ہو، گو وہ غیر مرغوبہ سے ہو۔

فانه اول قدرته وله حق البكورية۔ (سفر تثنیه، اصحاح۔ ۲۱، آیت: ۱۷)

''کیونکہ وہ اس کی پہلی قدرت ہے اور اسی کو اولاد اولین ہونے کا حق ہے۔''

③ جو اولاد خدا کو نذر کر دی جاتی تھی اس کو باپ کا ترکہ نہیں ملتا تھا۔ تورات میں ہے:

فی ذلك الوقت افرز الرب سبط لاوی ليحملوا تابوت عهد الرب ولكی يقفوا امام الرب ليخدموه ويباركوا باسمه الی هذا اليوم لاجل ذلك لم يكن للاوی قسم ولا نصيب مع اخوته الرب هو نصيبه۔

(تورات، تثنیہ اصحاح ۱۰، آیت ۸، ۹)

''تب خدا نے لاوی کی اولاد کو اس لئے مخصوص کر لیا کہ خدا کے عہد کا تابوت اٹھائے اور، تا کہ خدا کے آگے کھڑا ہو، تا کہ وہ خدا کی خدمت کریں اور اس کے نام سے آج تک برکت لیں، یہی وجہ ہے کہ لاویوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ کوئی حصہ اور ترکہ نہیں ملا، کیونکہ ان کا حصہ خدا ہے۔''

④ جو شخص خدا کی نذر کر دیا جاتا تھا، وہ سر کے بال چھوڑ دیتا تھا اور معبد کے پاس جا کر منڈاتا تھا، جس طرح آج حج میں احرام کھولنے کے وقت بال منڈاتے ہیں، تورات میں ہے:

فها انك تحملين وتلدين ابنا ولا يعل موسیٰ رأسه لان الصبی يكون نذرًا لله۔

''اب تو حاملہ ہوگی اور بچہ جنے گی اور اس کے سر پر اُسترا نہ پھیرا جائے کیونکہ یہ بچہ خدا کے لئے نذر کیا جائے گا۔'' (تورات، قضاۃ، اصحاح ۱۳۔۴)

⑤ جو شخص خدا کا خادم بنایا جاتا تھا اس کے لئے ''خدا کے سامنے'' کا لفظ استعمال کرتے تھے۔

(تورات سفر عدد ٦۔١٦ و ٢٠ و سفر تکوین۔ ۲۷۔۷، و تثنیہ ۱۰۔۸)

⑥ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس میں قید تھی کہ وہ بیٹا قربانی کیا جائے، جو اکلوتا ہو اور محبوب ہو۔ (تورات، تکوین، اصحاح ۲۲۔آیت ۲)

اب اصل مسئلہ پر غور کرو لیکن پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں قربانی کرنا اور خدا پر نذر چڑھانا، ایک بات تھی، یعنی دونوں کے لئے ایک ہی لفظ استعمال کرتے تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ بچہ کو فلاں معبد میں قربانی چڑھا دو، تو اس کے یہ معنی تھے کہ وہ اس معبد کی خدمت اور مجاورت کے لئے گھر سے الگ کر دیا جائے، لیکن یہ لفظ جب جانوروں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، تو حقیقی قربانی کے معنی مراد ہوتے تھے، تورات میں خدا کی زبان سے مذکور ہے:

لان لی کل بکر فی بنی اسرائیل من الناس والبهائم۔ (عدد، اصحاح:۸۔۱۷)

''کیونکہ بنی اسرائیل میں آدمی اور جانور کا ہر پہلوٹھا بچہ میرے لئے ہے۔''

اسی اصحاح میں تصریح کے ساتھ مذکور ہے کہ ''خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم بنی اسرائیل میں سے لاویوں کو لو اور ان کو خدا کے سامنے پیش کرو، کہ خدا کے لئے خاص کر دیے جائیں اور یہ لوگ دوگایوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیں جو قربانی کی جائیں۔'' (اختصاراً)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس سے بھی یہی مراد تھی کہ بیٹے کو معبد کی خدمت کے لئے نذر چڑھا دیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے اس خواب کو عینی اور حقیقی سمجھا اور اس لئے بعینہٖ اس کی تعمیل کرنی چاہی، لیکن بعد میں ظاہر ہوا کہ وہ تمثیلی خواب تھا۔ اس بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے

کو خانہ خدا کی خدمت کے لئے خاص کر دیا اور جو شرطیں قربانی کی تھیں، قائم رکھیں۔

بیان مذکورۂ بالا کے ذہن نشین کرنے کے بعد دلائل ذیل پیش نظر رکھنے چاہئیں:

① حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد ہے، اس بنا پر حضرت اسحاق علیہ السلام اکلوتے بیٹے نہیں اور چونکہ قربانی کے لئے اکلوتے بیٹے کی شرط ہے، اس لئے حضرت اسحاق علیہ السلام کی قربانی کا حکم نہیں ہوسکتا تھا۔

② حضرت اسحاق علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا تمام ترکہ دیا، بخلاف اس کے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو صرف پانی کی ایک مشک دے کر رخصت کیا، یہ اس بات کا قطعی قرینہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسحاق علیہ السلام کو قربانی یعنی معبد پر نذر نہیں چڑھایا تھا۔

③ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے خاندان میں مدت تک یہ رسم قائم رہی کہ لوگ سر کے بال نہیں منڈاتے تھے، حج میں احرام کے زمانہ تک جو بال نہیں منڈاتے، یہ اسی سنت اسماعیلی کی یادگار ہے۔

④ جو الفاظ قربانی اور نذر چڑھانے کے لئے ملت ابراہیمی میں استعمال کیے جاتے تھے، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے لئے استعمال کیے، نہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے لئے، تورات میں ہے کہ جب خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا:

لیت اسمٰعیل یعیش امامك۔ (تکوین، باب:۱۷، آیت:۱۸)

''کاش اسماعیل تیرے سامنے زندہ رہتا۔''

تورات میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے (سامنے زندہ رہنا) اسی معنوں میں ہوا ہے۔

⑤ حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی محبوب ترین اولاد تھے، تورات جو تمام تر حضرت اسحاق علیہ السلام کی یک طرفہ داستان ہے، اس میں حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے جو امتیازی خصائص بیان کیے ہیں، یہ ہیں کہ حضرت اسحاق علیہ السلام خدا کے وعدہ اور عہد کا مظہر ہیں [1] اور حضرت اسماعیل علیہ السلام دعوت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور خواہش سے پیدا ہوئے [2] اسی بنا پر خدا نے ان کا نام اسماعیل رکھا، کیونکہ اسماعیل علیہ السلام دو لفظوں سے مرکب ہے، سمع اور ایل۔ ''سمع'' کے معنی ''سننے'' کے اور ''ایل'' کے معنی ''خدا'' کے ہیں [3] یعنی خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سن لی۔ تورات میں ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ ''اسماعیل کے بارے میں، میں نے تیری سن لی۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب خدا نے حضرت اسحاق علیہ السلام کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس موقع پر بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یاد کیا، غرض چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس میں قید تھی کہ محبوب ترین بیٹا ہو، اس

[1] تورات تکوین، ۱۷، ۱۹ اور ۲۱۔ [2] تکوین اصحاح ۱۵، (۱۷۔۲۰)۔ [3] تکوین اصحاح، ۱۷، ۱۸۔

لئے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ذبیح ہو سکتے ہیں نہ کہ حضرت اسحاق علیہ السلام۔

⑥ حضرت اسحاق علیہ السلام کی جب خدا نے بشارت دی تو ساتھ ہی یہ بھی بشارت دی کہ میں اس کی نسل سے ابدی عہد باندھوں گا، تورات میں ہے:

''پھر خدا نے کہا بلکہ تیری بیوی سارہ تیرے لئے ایک بیٹا جنے گی اور تو اس کا نام اسحاق رکھے گا اور میں ابدی عہد اس کی نسل سے قائم کروں گا۔'' (تورات، تکوین، اصحاح ۱۷ آیت ۷ و ۱۹)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تورات میں مذکور ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کو قربان کرنا چاہا اور فرشتہ نے ندا دی کہ ہاتھ کو روک لو، تو فرشتہ نے یہ الفاظ کہے:

''خدا کہتا ہے کہ چونکہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو بچا نہیں رکھا، میں تجھ کو برکت دوں گا اور تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور ساحل بحر کی ریتی کی طرح پھیلا دوں گا''۔

(تورات، تکوین، اصحاح ۲۲۔ آیت ۱۶۔۱۷)

اب غور کرو، کہ خدا نے جب حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت ہی کے وقت یہ کہہ دیا تھا کہ میں اس کی نسل قائم رکھوں گا، تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ جس وقت تک حضرت اسحاق علیہ السلام [1] کی اولاد نہیں پیدا ہوئی تھی۔ ان کی قربانی کا حکم ہوتا، لیکن حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبیح تسلیم کیا جائے تو تمام نصوص منطبق ہو جاتے ہیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام اکبر اولاد تھے۔ محبوب تر تھے، قربانی کے وقت بالغ یا قریب البلوغ تھے، قربانی سے پہلے ان کی کثرت نسل کی بشارت نہیں دی گئی، تورات میں تصریح ہے کہ چونکہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کرنا چاہا، اس لئے اس بیٹے کی کثرت نسل کا وعدہ کیا گیا، یعنی یہ کثرت نسل، اسی قربانی کے صلہ میں تھی، اس لئے ذبیح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں، کیونکہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی تکثیر نسل کا وعدہ تو ان کی ولادت ہی کے وقت ہو چکا تھا، جو کسی انعام وصلہ کے معاوضہ میں نہ تھا۔

مقام قربانی

⑦ تورات میں قربانی گاہ کا جو موقع بتایا ہے وہ ''مریا'' ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہیکل تھا، عیسائی کہتے ہیں کہ یہ اس جگہ کا نام ہے جہاں حضرت عیسٰی علیہ السلام کو سولی دی گئی۔ لیکن یورپ کے محققوں نے ان دونوں دعووں کی تغلیط کی ہے۔ سر اسٹانلی لکھتے ہیں:

''حضرت ابراہیم علیہ السلام صبح کے وقت اپنے خیمہ سے نکل کر اس مقام پر گئے، جہاں ان کو خدا نے حکم دیا تھا لیکن یہ موریا کا پہاڑ نہیں ہے جیسا کہ یہود کا دعویٰ ہے، نہ عیسائیوں کے خیال کے موافق قبر مقدس کے گرجا کے پاس ہے، یہ قیاس تو یہودیوں کے قیاس سے بھی زیادہ بعید ہے

[1] یہ مسلّم ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات کے بعد پیدا ہوئی۔ (تکوین۔ اصحاح ۲۵۔ آیت: ۱۱)

اور اس سے بھی زیادہ البعد مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ وہ جبل عرفات [1] ہے، غالباً یہ مقام جریزیم کے پہاڑ پر ہے اور وہی قربان گاہ سے مشابہ مقام ہے۔''

اس سے تو اتنا ثابت ہوا کہ موریا کے تعینمیں یہودیوں اور عیسائیوں کے دعوے غلط ہیں۔ باقی یہ امر کہ مسلمانوں کا دعویٰ بھی غلط ہے، اس کی تحقیق آگے آتی ہے۔

موریا کی تعیین میں جو اختلاف پیدا ہوا، اس نے ایک اور اختلاف پیدا کر دیا، یعنی یہ کہ یہ لفظ کسی مقام کا نام ہے، یا وصفی معنی رکھتا ہے، بہت سے مترجموں نے اس کو ایک مشتق لفظ سمجھا اور اس لئے اس کا ترجمہ تورات کے بعض نسخوں میں بلوطاتِ عالیہ اور بعض میں ''زمین بلند'' اور بعض میں مقام الرویا کیا، لیکن زیادہ صائب الرائے لوگوں نے اس کو مقام کا نام سمجھا اور اس لئے لفظ کا ترجمہ نہیں کیا، بلکہ بہ حالِ خود رہنے دیا، لیکن امتداد زمانہ اور بے پروائی سے لفظ کی ہیئت بدل گئی یعنی ''مریا'' کا ''مورہ'' ہو گیا، خصوصاً اس وجہ سے کہ عبرانی زبان میں دونوں لفظوں کا املا قریب قریب ہے۔

مورہ کی نسبت توراۃ میں تصریح ہے کہ عرب میں واقع ہے، تورات میں ہے:

وكان جيش المديانيين شماليهم عند تل مورة في الوادي۔(قضاۃ، اصحاح ۷۔ آیت ۲)

''اور مدیانیوں [2] کی فوج، شمال کی جانب مورہ کی پہاڑی پر وادی میں تھی'' (مدیان عرب میں واقع ہے)

تمام واقعات اور قرائن کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ لفظ مورہ نہیں بلکہ مروہ ہے جو مکہ معظمہ کی پہاڑی ہے اور جہاں اب سعی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

عرب کی روایات، قرآن مجید کی تصریح، احادیث کی تعیین، تمام چیزیں اس قیاس سے اس قدر مطابق ہوتی جاتی ہیں کہ اس قسم کا تطابق بغیر صحت واقعہ کے ممکن نہیں، تفصیل اس کی یہ ہے:

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مروہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''قربانی گاہ یہ ہے اور مکہ کی تمام پہاڑیاں اور گھاٹیاں قربانی گاہ ہیں۔'' [3]

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں مروہ میں قربانی نہیں ہوتی تھی، بلکہ منیٰ میں ہوتی تھی، جو مکہ سے تین میل پر ہے، تاہم آنحضرت ﷺ نے مروہ ہی کو قربانی گاہ فرمایا، یہ اسی بنا پر تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہیں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کرنی چاہی تھی۔

قرآن مجید میں ہے:

---

[1] یہ غلط ہے، مسلمان عرفات کو نہیں، بلکہ منیٰ کو قربانی گاہ سمجھتے ہیں۔ [2] مدین عرب کی زمین ہے اور عرب کو اکثر مدیانیون کہتے ہیں، اور مدین کی زمین شام کے جنوب سے یمن کے شمال تک ہے اور یہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں جو قطورا سے تھے۔ (ضمیمہ بائبل، صفحہ:۱۱۴) [3] مؤطا امام مالك، كتاب الحج، باب ماجاء في النحر في الحج:۸۹۵؛ ابوداود، كتاب المناسك، باب الصلاة بجمع: ۱۹۳۷؛ ابن ماجه:۳۰۴۸۔

﴿ ثُمَّ مَحِلُّهَآ إِلَى ٱلْبَيْتِ ٱلْعَتِيقِ ﴾ (۲۲/ الحج:۳۳)

''پھر قربانی کے جانوروں کی جگہ کعبہ ہے۔''

﴿ هَدْيًۢا بَٰلِغَ ٱلْكَعْبَةِ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۹۵)

''قربانی جو کہ کعبہ میں پہنچے۔''

مروہ بالکل کعبہ کے مقابل اور اس کے قریب ہے، ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قربانی کی اصلی جگہ کعبہ ہے، منیٰ نہیں لیکن جب حجاج کی کثرت ہوئی تو کعبہ کے حدود کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی۔

قربانی کی یادگار

یہودی حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد ہیں، اس لئے اگر حضرت اسحاق علیہ السلام ذبیح ہوتے تو اس کی کوئی یادگار ان کے ہاں موجود ہوتی، بخلاف اس کے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے خاندان، بلکہ تمام مسلمانوں میں جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی روحانی اولاد ہیں، قربانی کی تمام رسمیں آج تک موجود ہیں۔

اولاد اسمٰعیل میں قربانی کی تمام یادگاریں موجود ہیں اور حج جو کہ ایک بڑا فریضۂ اسلام ہے، تمام تر اسی قربانی کی یادگار ہے، چنانچہ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب خدا نے بیٹے کی قربانی کا حکم دینا چاہا، تو پکارا، اے ابراہیم! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ''میں حاضر ہوں۔'' [1]

حج کے وقت مسلمان جو ہر قدم پر لبیک کہتے چلتے ہیں، یہ وہی ابراہیمی الفاظ ہیں، جس کا لفظی ترجمہ وہی ہے ''میں حاضر ہوں۔'' [2]

② شریعت ابراہیمی میں دستور تھا کہ جس کو قربان گاہ پر چڑھاتے تھے، یا خدا کے لئے نذر دیتے تھے، وہ بار بار معبد یا قربان گاہ کے پھیرے کرتا تھا۔

حج میں صفا و مروہ کے درمیان جو سات بار سعی کرتے ہیں، یہ اسی کی یادگار ہے۔

③ نذر کے فرائض میں ایک یہ تھا کہ ایام نذر تک بال نہیں کترواتے تھے، حج میں بھی یہی دستور ہے، جب احرام اتارتے ہیں تب بال کترواتے یا منڈواتے ہیں، خود قرآن مجید میں اس شعار کا ذکر ہے:

﴿ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ ﴾ (۴۸/ الفتح:۲۷)

''سروں کو منڈائے ہوئے۔''

④ حج کا ایک ضروری رکن، قربانی ہے، یہ وہی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی یادگار ہے، اسی بنا پر قرآن مجید میں فرمایا ہے:

﴿ وَفَدَيْنَٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ﴾ (۳۷/ الصآفات:۱۰۷)

---

[1] تورات تکوین، اصحاح:۲۲۔ آیت۱۔ [2] تورات لاویین اصحاح ۸۔ آیت:۲۷۔

''اور حضرت اسماعیل کی قربانی کے بدلے ہم نے ایک بڑی قربانی قائم کی۔''

یہ دلائل تورات کی تصریحات و کنایات کی بنا پر تھے، قرآن مجید کے رو سے قطعاً حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذبیح ہونا ثابت ہے، اگرچہ بہت سے مفسرین نے غلطی سے یہودیوں ہی کی روایت کی تائید کی ہے، قرآن مجید میں قربانی کا واقعہ ان الفاظ میں مذکور ہے:

﴿ وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ۝ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۝ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ ﴾

(۳۷/ الصآفات: ۹۹-۱۰۲)

''اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا میں اپنے خدا کی طرف جاؤں گا، وہ مجھ کو راستہ دکھائے گا، خدایا! مجھ کو وہ اولاد دے کہ جو نیک چلن ہو، تو ہم نے اس کو ایک بردبار لڑکے کی خوشخبری دی، پھر جب وہ لڑکا اس کے ساتھ چلنے لگا تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تیری کیا رائے ہے؟''

آیت بالا میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اولاد کے لئے دعا مانگی اور خدا نے قبول کی اور وہی لڑکا قربانی کے لئے پیش کیا گیا۔

تورات سے ثابت ہے کہ جو لڑکا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سے پیدا ہوا، وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اور اسی لئے ان کا نام اسماعیل علیہ السلام رکھا گیا کہ خدا نے ان کے بارہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا سنی، اس بنا پر اس آیت میں جس کا ذکر ہے، وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں، اسحاق علیہ السلام نہیں۔

قربانی کے واقعہ کی تفصیل اور اختتام کے بعد حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کا ذکر ہے، اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ جس کا ذکر اوپر ہوا، وہ حضرت اسحاق علیہ السلام نہیں ہیں، بلکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں۔

مسلمانوں کا نام جو مسلم رکھا گیا، یہ وہ نام ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایجاد کیا تھا۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ ...... ﴾ (۲۲/ الحج: ۷۸)

''تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب، اسی [1] نے پہلے تمہارا نام مسلمان رکھا تھا۔''

اس تسمیہ کی تاریخ قربانی سے شروع ہوتی ہے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو

[1] ابھی گزشتہ صفحات کے حاشیہ میں گزر چکا ہے کہ بعض مفسرین نے قرب لفظ کی وجہ سے سمّٰی کا فاعل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قرار دیا ہے تابعین میں حضرت ابن زید اور حضرت حسن بصری کا یہی مسلک ہے اور ابوحیان نے اسی کی تائید کی ہے (البحر المحیط، جزء سادس، ص: ۳۹۱) لیکن صحابہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور تابعین میں مجاہد، ضحاک، قتادہ اور سفیان رحمہم اللہ نے اللہ کی طرف ضمیر پھیری ہے اور یہ معنی لئے ہیں کہ تمہارا نام مسلم قرآن کے نزول سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے رکھا اور اس قرآن میں بھی اس نے تمہارا یہ نام رکھا۔ تفسیر ابن جریر، جزء سابع عشر، ص: ۱۳۰ (س)۔

قربان کرنا چاہا اور ان سے کہا کہ "مجھ کو خدا کا یہ حکم ہوا ہے، تمہاری کیا رائے ہے؟" تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے نہایت استقلال کے ساتھ گردن جھکا دی کہ یہ سر حاضر ہے، اس موقع پر خدا نے "اسلما" کا لفظ استعمال کیا جو اسلام سے ماخوذ ہے اور جس کے معنی "تسلیم" اور "حوالے کر دینے" کے ہیں۔

﴿فَلَمَّآ اَسْلَمَا﴾ (۳۷/ الصافات:۱۰۳)

"پھر جب دونوں نے اپنے آپ کو (ہمارے) حوالہ کر دیا۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا سب سے بڑا عظیم الشان کارنامہ تسلیم ورضا ہے، یعنی جب قربانی کا حکم ہوا تو باپ بیٹے دونوں نے بے عذر گردنیں جھکا دیں، یہ وصف مقبول بارگاہ ہوا اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا یہی شعار مذہبی قرار پایا، اسی بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پیروان ملت کا نام مسلم رکھا۔

قربانی، ایثار اور اسلام درحقیقت یہ سب مترادف الفاظ ہیں، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی نے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا تھا، اگر حضرت اسحاق علیہ السلام قربانی ہوتے تو یہ لقب ان کی اولاد یا ان کی امت کو ملتا۔

قربانی کی حقیقت

اس مسئلہ کی حقیقت اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے، جب اس پر غور کیا جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا، اس سے اصل مقصود کیا تھا؟ قدیم زمانہ میں بت پرست قومیں اپنے معبودوں پر اپنی اولاد کو بھینٹ چڑھا دیا کرتی تھیں، یہ رسم ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ سے پہلے موجود تھی، مخالفین اسلام کا خیال ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی بھی اسی قسم کا حکم تھا، لیکن یہ سخت غلطی ہے۔

اکابر [1] صوفیہ نے لکھا ہے کہ انبیا علیہم السلام کو جو خواب دکھائے جاتے ہیں، دو قسم کے ہوتے ہیں، عینی اور تمثیلی، عینی میں بعینہ وہی چیز مقصود ہوتی ہے جو خواب میں نظر آتی ہے، تمثیلی میں تشبیہ اور تمثیل کے پیرایہ میں

[1] (اس مقام پر مصنف کی یہ عبارت مزید تشریح کی محتاج ہے، مصنف نے جیسا کہ لکھا ہے کہ رؤیا دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک عینی جس میں صورت واقعہ بعینہ دکھائی جاتی ہے اور دوسری تمثیلی جس میں صورت واقعہ کسی مثالی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، اس کو بہت سے علما نے تسلیم کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ خواب کی اس دوسری قسم میں اصلی مقصود رؤیا کی دوسری مثالی صورت ہوتی ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے ماں باپ کو آفتاب و ماہتاب اور بھائیوں کو ستاروں کی شکل میں دیکھنا یا حضور انور کا مدینہ کی وبا کو ایک بڑھیا کی شکل میں دیکھنا اور احد میں مسلمان شہدا کو مذبوح گایوں کے رنگ میں دیکھنا، محدث خطابی معالم السنن میں لکھتے ہیں:

وبعض الرؤیا مثل یضرب لیتأول علی الوجه الذی یجب ان یصرف الیه معنی التعبیر فی مثله و بعض الرؤیا لایحتاج الی ذلك بل یأتی كالمشاهدة.

(فتح الباری، ج۱۳، ص: ٤٠٢)

"بعض خواب تمثیلی ہوتے ہیں جس کو اس مثالی صورت میں اس لئے بیان کیا جاتا ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کسی مطلب کو پورا ادا کرنا ہوتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو خواب دکھایا گیا تھا۔ اس سے یہ مراد تھی کہ بیٹے کو کعبہ کی خدمت کے لئے نذر چڑھا دیں، یعنی وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں، بلکہ کعبہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیئے جائیں، تورات میں جا بجا قربانی کا لفظ ان معنوں میں آیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خواب کو عینی خیال کیا اور بعینہٖ اس کی تعمیل کرنی چاہی، گو یہ خیال اجتہادی غلطی تھی جو انبیا سے ہو سکتی تھی (گو یہ غلطی قائم نہیں رہتی، بلکہ خدا اس پر متنبہ کر دیتا ہے) اس بنا پر گو حضرت

(❁❁ گزشتہ سے پیوستہ) کہ اس طریقہ پر اس کی تعبیر کی جائے جس طریقہ پر ایسے خواب کی تعبیر کی جاتی ہے اور بعض خواب اس کے محتاج نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہ مشاہدہ بن کر سامنے آتے ہیں۔''

امام ابوبکر ابن العربی مالکی احکام القرآن میں اسی حقیقت کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس رؤیا کے ضمن میں یوں فرماتے ہیں کہ ''بعض رؤیا نام کی طرح ہوتے ہیں (یعنی عینی وتصریحی جو بالکل لفظاً واقعہ کے عین مطابق ہوتے ہیں) اور بعض مثل کنیتوں کی طرح ہوتے ہیں یعنی کسی مناسبت معنوی کے سبب سے وہ کسی دوسرے ہم شکل واقعہ کی صورت میں دکھائے جاتے ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ خواب اسی دوسری قسم کا تھا۔'' (احکام القرآن، جلد۲، صفحہ:۱۹۶؛ مطبع سعادت، مصر: ۱۳۳۱ھ)

مصنف سیرت نے اس مقام پر ان ہی بعض علما کی تقلید کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس خواب کو تمثیلی کہا ہے اور اسی بنا پر ان کو یہ کہنے کی ضرورت ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اس خواب کو جو تمثیلی تھا، اپنی خطائے اجتہادی سے عینی وحقیقی سمجھے اور اس کی بعینہٖ تعمیل پر آمادہ ہو گئے، لیکن عین وقت پر ان کو وحی الٰہی نے ان کی اس اجتہادی خطا پر متنبہ کر دیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بعینہٖ قربانی سے روک کر ان کی جگہ جانور کی قربانی پیش کی۔

ہیچ مداں جامع کا ذوق اس مقام پر اس واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اجتہادی غلطی ماننے سے ابا کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو محبت الٰہی سے سرشار تھے، خطائے اجتہادی سے نہیں بلکہ غلبۂ شوق اطاعت ومحبت میں اس حکم الٰہی کی تعمیل اپنی طرف سے بالکل بعینہٖ وبلفظہٖ کرنے پر آمادہ ہو گئے، تا کہ اس ابتلا میں وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پورے اتریں اور اپنی طرف سے بیٹے کی جان کی قربانی کی جگہ اس کی خدمت توحید وتولیت کعبہ کے لئے وقف کر دینے کی تاویل کا سہارا لے کر نفس کی متابعت کے شبہ اور دھوکے سے بھی پاک رہیں، تا آنکہ اللہ تعالیٰ خود اس حقیقت کو اپنے لفظوں میں واضح فرما دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی، آواز آئی:

﴿ يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ ٱلرُّءْيَآ ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِى ٱلْمُحْسِنِينَ ۝ ﴾ (۳۷/ الصافات: ۱۰۴، ۱۰۵)

''ابراہیم! تم نے خواب سچ کر دکھایا ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔''

﴿ وَفَدَيْنَٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ۝ ﴾ (۳۷/ الصافات: ۱۰۷) ''اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کی عوض میں دیا۔''

اور امت پر یہ قربانی اسی تمثیلی رنگ میں واجب ٹھہرائی گئی، یعنی جسمانی اطاعت وقربانی کی تمثیل، جانور کی قربانی کی شکل میں۔ یہ تشریح ان بعض علما کی متابعت میں ہے جو بعض دینی وعلمی اسباب کی بنا پر اس رؤیائے کو تمثیلی سمجھتے ہیں ورنہ جمہور علما اس رؤیا کو عینی ہی سمجھتے ہیں، لیکن عین اس وقت جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پر عمل کر کے اپنی طرف سے فرزند کے ذبح کی پوری عزیمت کر کے اپنے کام کو پورا کر چکے تھے اور تعمیل حکم میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں رہی تھی کہ وحی الٰہی نے آواز دی، اے ابراہیم! تم نے اپنا کام پورا کر دیا اور اپنے خواب کو سچ کر دکھایا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی، اب اس کی جگہ ملت ابراہیم کی یہ سنت عظیم جانور کی قربانی کی شکل میں ظاہر ہوگی۔ ظاہر ہے کہ بہر دو صورت یہ جانور کی قربانی جیسا کہ بعض ائمہ محققین نے لکھا ہے نفس کی قربانی کی تمثیل ہے اور اس قربانی کا گوشت اس روز عید میں قربانی کنندہ کے لئے برکت، احباب کے لئے تحفہ اور فقرا کے لئے سامان دعوت بنا۔

مزید تفصیل کے لئے معارف ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ مطابق مارچ: ۱۹۳۷ء مضمون ''ذبح عظیم'' اور معارف صفر ۱۳۵۶ھ مطابق مئی: ۱۹۳۷ء کے شذرات ملاحظہ ہوں۔ (س)

ابراہیم علیہ السلام اس فعل سے روک دیئے گئے، لیکن خدا نے ان کی حسن نیت کی قدر کی اور فرمایا:

﴿ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴾ (۳۷/ الصآفات:۱۰۵)

''تو نے خواب کو سچا کیا، ہم اسی طرح نیکو کاروں کو جزا دیتے ہیں۔''

بہر حال یہاں اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ قربانی سے مقصود خدمت کعبہ کے لئے نذر چڑھانا تھا، نذر چڑھانے کے لئے شریعت سابقہ میں جو لفظ مستعمل تھا وہ ''خدا کے سامنے'' تھا۔ تورات میں یہ محاورہ نہایت کثرت سے آیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حق میں خدا سے جو دعا کی وہ ان لفظوں میں تھی:

ليت اسمعيل يعيش امامك۔ (تورات، تکوین اصحاح ۱۷۔ آیت ۱۸)

''کاش اسماعیل تیرے سامنے زندگی کرتا۔''

اسی خواہش کے مطابق ان کو خواب میں تمثیلی پیرایہ میں حکم دیا گیا کہ وہ بیٹے کی قربانی کریں، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں حضرت اسحاق علیہ السلام کی قربانی کا نہیں، بلکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔

مکہ معظّمہ

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بحث مسکن میں گزر چکا کہ وہ عرب تھا، مقام ذبح کی تعیین میں یہ ثابت ہو چکا کہ وادی ''مکہ'' تھا، اس بنا پر مکہ کی نسبت ایک بحث نہایت قدیم زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔

متعصب عیسائی مؤرخ لکھتے ہیں کہ اس شہر کی قدامت کا دعویٰ، مسلمانوں کا خاص دعویٰ ہے، قدیم تاریخوں میں اس کا نشان نہیں ملتا، ❶ اس بنا پر ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں۔

مکہ کا قدیم اور اصلی نام بَکَّۃ ہے، قرآن مجید میں یہی نام ہے:

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا ﴾ (۳/ آل عمران:۹۶)

''پہلا متبرک گھر جو آدمیوں کے لئے بنایا گیا، وہ بکہ میں تھا۔''

کتاب زبور۸۴۔ ۶ ص:۶۱ میں ہے:

''بکہ کی وادی میں گزرتے ہوئے، اسے ایک کنواں بتاتے، برکتوں سے مورۃ کو ڈھانک لیتے، قوت سے قوت تک ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔''

اس عبارت میں بکہ کا جو لفظ ہے، یہ وہی مکہ معظّمہ ہے، لیکن اگر اس لفظ کو اسم علم کے بجائے مشتق قرار دیں، تو اس کے معنی ''رونے'' کے ہوں گے اور یہ وہی عربی لفظ بکاء ہے، چونکہ یہود و نصاریٰ ہمیشہ مکہ کی وقعت مٹانے کے درپے رہتے آئے، اس لئے بہت سے مترجمین نے عبارت مذکور میں بکہ کا ترجمہ رونا کر دیا ہے، لیکن ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ اس حالت میں وادی بکا کے کیا معنی ہوں گے؟ زبور کی عبارت مذکورہ کی اوپر کی آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نشید میں حضرت داؤد علیہ السلام نے مکہ معظّمہ اور مروہ اور قربان گاہ اسماعیلی کی نسبت اپنا شوق اور حسرت ظاہر کی ہے۔ اوپر کی عبارت یہ ہے (حضرت داؤد علیہ السلام خدا سے کہتے ہیں) اے فوجوں کے خدا! تیرے مسکن کس قدر شیریں ہیں، میرا نفس خدا کے گھر کا مشتاق بلکہ عاشق ہے...... اے خدا! تیرے قربان گاہ میرے مالک اور میرے خدا ہیں، مبارکی ہو، ان لوگوں کو جو تیرے گھر میں ہمیشہ رہتے ہیں اور تیری تسبیح پڑھتے ہیں۔'' ❷ اس کے بعد بکہ والی آیتیں ہیں، اب غور کرو حضرت داؤد علیہ السلام جس مقام کے پہنچنے کا شوق ظاہر کرتے ہیں، وہ اس مقام پر صادق آ سکتا ہے جس میں حسب ذیل باتیں پائی جائیں۔

① قربانی گاہ ہو۔

② حضرت داؤد علیہ السلام کے وطن سے دور ہو کہ وہاں تک سفر کر کے جائیں۔

---

❶ مارگولیتھ اپنی کتاب میں لکھتا ہے: ''اگرچہ مذہبی خیال کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنے مذہبی مرکز کو نہایت قدیم البناء قرار دیا ہے، لیکن صحیح روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مکہ کی سب سے قدیم عمارت محمد ﷺ کے صرف چند پشت قبل تعمیر ہوئی تھی''۔ مارگولیتھ نے اس کے ثبوت میں اصابہ کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اور ہم کو بھی اس کی صحت سے انکار نہیں لیکن اس کل بیان میں مغالطہ ہے جس کو ہم نے اصل کتاب میں ظاہر کر دیا ہے۔ ❷ زبور، نشید:۸۴۔۱تا۵۔

③ وہ وادی بکہ کہلاتا ہو۔

④ وہاں مقام مورۃ بھی ہو۔

ان باتوں کو پیش نظر رکھو تو قطعاً یقین ہو جائے گا کہ بکہ وہی مکہ معظمہ اور مورۃ وہی مروۃ ہے۔اس کے ساتھ یہ بھی اندازہ ہوگا کہ یہودی کس طرح تعصب سے الفاظ کو ادل بدل کر دیتے ہیں۔

﴿ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ﴾ (٤/ النسآء: ٤٦)

ڈاکٹر ہسٹنگس نے ''ڈکشنری آف دی بائبل'' میں وادی بکا پر جو آرٹیکل لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

اس لفظ سے اگر کوئی وادی مراد ہے، تو وہ حسب ذیل ہو سکتی ہے:

1 ایک وادی ہے جس میں ہو کر زائرین بیت المقدس جاتے ہیں۔

2 وادی اخور ہے، جو یشوعا باب ۷۔ آیات ۲۴۔ ۲۶ ص: ۳۴۸ وغیرہ میں مذکور ہے۔

3 وادی رفایون ہے، جو سامویل دوم باب ۵ آیات ۱۸۔۲۲ وغیرہ میں مذکور ہے۔

4 کوہ سینا کی ایک وادی ہے۔

5 بیت المقدس تک جو کاروانی راستہ شمال سے آتا ہے، اس راستے کی آخری منزل ہے۔ (دیکھو رینان کی کتاب ''حیاتِ عیسیٰ'' باب ۴)

لیکن کیا عجیب بات ہے، ڈاکٹر ہسٹنگس کو اتنے احتمالات کثیرہ میں کہیں مکہ معظمہ کا پتہ نہیں لگتا، مصرع

ہما ورق کہ سیہ گشتہ مدعا اینجاست

حیرت پر حیرت یہ ہے کہ جن جن وادیوں کا نام لیا ہے ان میں ایک کو بھی بکا کے لفظ سے کسی قسم کی مناسبت نہیں۔ یہاں تک کہ ایک حرف بھی مشترک نہیں، بخلاف اس کے بکا اور بکہ بالکل ایک لفظ ہیں۔ فرق اسی قدر ہے جس قدر ایک ہی لفظ کے تلفظ میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

''جدید انسائیکلوپیڈیا ❶ '' میں محمد ﷺ کے عنوان سے جو مضمون ہے وہ مارگولیتھ کا ہے، اس میں مکہ معظمہ کی نسبت لکھا ہے:

قدیم تاریخوں میں اس شہر کا نام نہیں ملتا، بجز اس کے کہ زبور (۸۴۔۶) میں ''وادی بکہ'' کا لفظ ہے لیکن مارگولیتھ صاحب اس تاریخی شہادت کو ضعیف سمجھتے ہیں۔

پروفیسر دوزی، جو فرانس کا مشہور محقق اور عربی دان عالم ہے، وہ لکھتا ہے: ❷

''بکہ وہی مقام ہے جس کو یونانی جغرافیہ دان ماکروبہ لکھتے ہیں۔''

لیکن مارگولیتھ کو پروفیسر دوزی کے بیان پر بھی اعتماد نہیں۔

کارلائل صاحب نے اپنی کتاب ''ہیروز اینڈ ہیرو وورشپ'' میں لکھا ہے:

❶ انسائیکلوپیڈیا طبع اخیر جلد ۱۰ صفحہ: ۳۹۹۔ ❷ ایضاً۔

''رومن مؤرخ سیسلس نے کعبہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''وہ دنیا کے تمام معبدوں سے قدیم اور اشرف ہے اور یہ ولادت مسیح علیہ السلام سے پچاس برس پہلے کا ذکر ہے۔''

اگر کعبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے موجود تھا۔ تو مکہ بھی تقریباً اسی زمانہ کا شہر ہوگا کیونکہ جہاں کہیں کوئی مشہور معبد ہوتا ہے اس کے آس پاس ضرور کوئی نہ کوئی شہر یا گاؤں آباد ہو جاتا ہے۔

یاقوت حموی نے معجم البلدان (ج ۸، ص: ۱۳۲) میں لکھا ہے کہ مکہ معظمہ کا عرض اور طول بلد بطلیموس [1] کے جغرافیہ میں حسب ذیل ہے:

''طول ۷۸ درجہ عرض ۲۳ درجہ۔''

بطلیموس نہایت قدیم زمانہ کا مصنف ہے۔ اگر اس نے اپنے جغرافیہ میں مکہ کا ذکر کیا ہے تو اس سے زیادہ قدامت کی کیا سند درکار ہے۔

مارگولیتھ نے جس بنا پر مکہ معظمہ کی قدامت سے انکار کیا ہے وہ یہ ہے کہ اصابہ میں تصریح ہے کہ ''مکہ میں سب سے پہلی عمارت جو تعمیر ہوئی وہ سعید یا سعد بن عمرو نے تعمیر کی'' لیکن مارگیولوس کو یہ معلوم نہیں کہ مؤرخین نے جابجا یہ بھی تصریح کی ہے کہ چونکہ اہل عرب کعبہ کے مقابل یا آس پاس عمارات بنانے کو کعبہ کی بے ادبی سمجھتے تھے اس لئے عمارتیں نہیں بنوائیں، بلکہ خیموں اور شامیانوں میں رہتے تھے اور اس طرح مکہ ہمیشہ سے خیموں کا ایک وسیع شہر تھا۔

خانہ کعبہ کی تعمیر

دنیا میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ایران، ہند، مصر، یورپ میں عالمگیر اندھیرا تھا۔ قبول حق ایک طرف اس وسیع خطہ خاک میں گز بھر زمین نہیں ملتی تھی جہاں کوئی شخص خالص خدائے واحد کا نام لے سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب کلدان میں یہ صدا بلند کرنی چاہی تو آگ کے شعلوں سے کام پڑا، مصر آئے، ناموس کو خطرہ کا سامنا ہوا، فلسطین پہنچے، کسی نے بات تک نہ پوچھی، خدا کا جہاں نام لیتے تھے، شرک اور بت پرستی کے غلغلہ میں آواز دب دب کر رہ جاتی تھی۔ معمورۂ عالم کے صفحے، نقشہائے باطل سے ڈھک چکے تھے۔ اب ایک سادہ، بے رنگ، ہر قسم کے نقش و نگار سے معرا، ورق درکار تھا، جس پر طغرائے حق لکھا جائے، یہ صرف حجاز کا صحرائے ویران تھا جو تمدن اور عمران کے داغ سے کبھی داغدار نہیں ہوا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو عرب میں لائے اور ان کو یہیں آباد کیا۔ حضرت سارہ علیہا السلام نے (جیسا کہ تورات میں ہے) کچھ عرصہ کے بعد انتقال کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ میں چلے آئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان ہو چکے تھے، اعلان حق میں ایک ہم آواز ہاتھ آیا، دونوں نے مل کر

[1] بطلیموس کے جغرافیہ کا ترجمہ عباسیوں کے زمانہ میں ہو گیا تھا، مسعودی اور ابن الندیم نے اکثر اس کے حوالے دیے ہیں۔

ایک چھوٹے سے چوکھونٹے گھر کی بنیاد ڈالی۔ ❶

﴿ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ ﴾. (۲/ البقرۃ: ۱۲۷)

''اور جبکہ ابراہیم اور اسماعیل خانۂ خدا کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔''

گھر بن چکا تو وحی الٰہی نے آواز دی:

﴿ وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ ﴾ (۲۲/ الحج: ۲۶، ۲۷)

''ہمارا گھر طواف کرنے والوں (نماز میں قیام کرنے والوں) رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کیلئے پاک کر اور تمام لوگوں کو پکار دے کہ حج کو آئیں پیدل بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی، ہر دور دراز گوشہ سے آئیں گے۔''

اس وقت اعلان و اشتہار کے وسائل نہیں تھے، ویران جگہ تھی اور آدمی کا کوسوں تک پتہ نہ تھا۔ ابراہیم علیہ السلام کی آواز حدود حرم سے باہر نہیں جا سکتی تھی لیکن وہی معمولی آواز کہاں کہاں پہنچی، مشرق سے مغرب تک شمال سے جنوب تک اور زمین سے آسمان تک۔

علامہ ازرقی نے تاریخ مکہ میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو تعمیر کی اس کا عرض وطول حسب ذیل تھا:

بلندی.........زمین سے چھت تک ۹ گز

طول.........حجر اسود سے رکن شامی تک ۳۲ گز

عرض.........رکن شامی سے غربی تک ۲۲ گز

عمارت بن چکی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے کہا کہ ایک پتھر لاؤ، تاکہ ایسے مقام پر لگا دوں جہاں سے طواف شروع کیا جائے، تاریخ مکہ موسوم بہ، اعلام باعلام بیت الحرام میں ہے:

فقال ابراهيم لاسمعيل عليهما الصلوة والسلام يااسمعيل ايتنى بحجر اضعه حتى يكون علما للناس يبتدون منه الطواف۔

''پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے کہا کہ ایک پتھر لاؤ، تاکہ میں ایسی جگہ نصب کردوں جہاں سے لوگ طواف شروع کریں۔''

خدا کا یہ گھر ایسا سادہ تعمیر ہوا تھا کہ نہ چھت تھی نہ کواڑ اور نہ چوکھٹ بازو تھے۔ جب قصی بن کلاب کو کعبہ کی تولیت حاصل ہوئی تو انہوں نے قدیم عمارت گرا کر نئے سرے سے تعمیر کی اور کھجور کے تختوں کی چھت

❶ محققین کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی منہدم و بے نشان عمارت کی دوبارہ بنیاد اٹھا کر بلند کی۔ مزید توضیح کے لیے سیرۃ النبی جلد پنجم باب حج عنوان مکہ اور کعبہ میں دیکھیے۔ (س)

ڈالی۔ [1]

کعبہ کی برکت اور کشش سے لوگ آس پاس آباد ہونے لگے چنانچہ سب سے پہلے قبیلہ جرہم آ کر آباد ہوا، اس قبیلہ میں مضاض بن عمرو جرہمی ایک ممتاز شخص تھے، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ان کی لڑکی سے شادی کی، ان سے بارہ اولاد ہوئی، جن کے نام تورات میں مذکور ہیں۔ ان میں سے اکثر اہل عرب قیدار کی اولاد میں ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے نابت کعبہ کے متولی ہوئے، ان کے مرنے کے بعد ان کے نانا مضاض نے یہ منصب حاصل کیا اور کعبہ کی تولیت خاندان اسماعیل سے نکل کر جرہم کے خاندان میں آ گئی۔ لیکن پھر ایک اور قبیلہ خزاعۃ نے کعبہ پر قبضہ کر لیا اور مدت تک اسی خاندان میں یہ منصب رہا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا خاندان موجود تھا۔ لیکن اس نے کچھ مزاحمت نہیں کی۔ قصی بن کلاب کا زمانہ آیا تو انہوں نے اپنا آبائی حق حاصل کیا، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

حرم کعبہ پر سب سے پہلے جس نے پردہ چڑھایا وہ یمن کا حمیری بادشاہ اسعد تبّع تھا۔ یمن میں خاص قسم کی چادریں بُنی جاتی ہیں جن کو بردیمانی کہتے ہیں۔ یہ پردہ انہی چادروں سے تیار کیا گیا تھا۔ قصی بن کلاب کے زمانہ سے تمام قبائل پر ایک محصول لگا دیا گیا جس سے پردہ تیار کیا جاتا تھا۔ علامہ ازرقی نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بھی یمنی پردہ چڑھایا تھا لیکن اس روایت کے سلسلہ کا ایک راوی واقدی ہے۔ [2]

خدا کا گھر سیم وزر کی نقش آرائیوں کا محتاج نہ تھا لیکن دولت اور ملک کی ترقی کے یہ لوازم ہیں اس لئے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو انہوں نے کعبہ کے ستونوں پر سونے کے پتر چڑھائے۔ عبدالملک بن مروان نے اپنے زمانہ میں ۳۶ ہزار اشرفیاں اس کام کے لئے بھیجیں۔ امین الرشید نے ۱۸ ہزار اشرفیاں نذر کیں کہ دروازہ کی چوکھٹ وغیرہ طلائی بنوا دی جائے۔ اعلام (تاریخ مکہ) میں عہد بہ عہد کی طلاکاریوں کی تفصیل لکھی ہے۔ لیکن یہ واقعات عہد نبوت کے بعد کے ہیں جو ہماری کتاب کا موضوع نہیں اور سچ یہ ہے کہ آفتاب پر سونا چڑھانا ضروری بھی نہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی

خدا کا گھر بن چکا تو ضرورت تھی کہ اس کی تولیت اور خدمت کے لئے کوئی نفس قدسی تمام مشاغل سے

---

[1] اعلام بہ حوالہ کتاب النسب از ابن بکار وابن الماوردی۔ [2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں قباطی کا پردہ چڑھایا تھا جو مصر میں بنا جاتا ہے، ان کے بعد معمول ہو گیا کہ ہر خلیفہ اپنے عہد خلافت میں پردہ چڑھاتا تھا، بنوامیہ نے دیبا کا پردہ چڑھایا تھا، مامون الرشید ہر سال تین پردے چڑھاتا تھا، حج کے زمانہ میں دیبائے احمر کا، رجب میں قباطی کا، عیدالفطر میں دیبائے سفید کا، مصر میں جب سلطان صالح بن سلطان قلادون بادشاہ ہوا تو مصر کے دو گاؤں پردہ کے مصارف کے لئے وقف کر دیے، جب ترکی خاندان قسطنطنیہ میں حکمران ہوا تو سلطان سلیمان نے چند گاؤں اور اضافہ کر دیے، (اعلام باعلام بیت اللہ الحرام) برحاشیہ خلاصۃ الکلام فی بیان امراء البلد الحرام: ٤٦، ٤٧ مطبع خیریہ مصر: ١٣٠٥ء خانہ کعبہ پر پردہ چڑھانے کی تاریخ بہ تفصیل فتوح البلدان بلاذری اور تاریخ مکہ ازرقی اور معجم البلدان وغیرہ میں ہے، ہم نے اخیر تصنیف یعنی اعلام کو لیا ہے کہ وہ ان سب کے بعد کی تصنیف اور جامع ہے۔

الگ ہوکر اپنی زندگی اس پر نذر چڑھا دے۔ اس قسم کی نذر کو ابراہیمی شریعت میں قربانی سے تعبیر کرتے تھے۔ تورات میں یہ محاورہ بہ کثرت آتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، انبیا علیہم السلام پر جو وحی آتی ہے، اس کے مختلف انواع ہیں جن میں سے ایک خواب بھی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری باب بدء الوحی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ پر وحی کی جو ابتدا ہوئی خواب سے ہوئی۔ [1] یہ خواب کبھی تمثیلی ہوتا ہے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو سجدہ کرتے دیکھا تھا بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب دکھلایا گیا کہ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس خواب کو عینی سمجھا اور بعینہٖ اس کی تعمیل پر آمادہ ہوئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے استقلال اور جان نثاری پر اعتماد تھا۔ لیکن یہ تحقیق طلب تھا کہ پانزدہ سالہ نوجوان بھی اپنی گردن پر چھری چلتے دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟ بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا:

﴿ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ ﴾. (۳۷/ الصّٰفّٰت:۱۰۲)

"بیٹا! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تو بتا تیری کیا رائے ہے۔"

بیٹے نے نہایت استقلال سے جواب دیا:

﴿ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾.

(۳۷/ الصّٰفّٰت:۱۰۲)

"ابا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے وہ کر گزریئے، خدا نے چاہا تو میں ثابت قدم رہوں گا۔"

اب ایک طرف نوّے سالہ پیر ضعیف ہے جس کو دعاہائے سحر کے بعد، خاندان نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جس کو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا، اب اسی محبوب کے قتل کے لئے اس کی آستینیں چڑھ چکی ہیں اور ہاتھ میں چھری ہے۔

دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے، جس نے بچپن سے آج تک، باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے اور اب باپ ہی کا مہر پرور ہاتھ اس کا قاتل نظر آتا ہے، ملائکہ قدسی، فضائے آسمانی، عالم کائنات، یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں اور انگشت بدنداں ہیں کہ دفعتاً عالم قدس سے آواز آتی ہے:

﴿ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾ (۳۷/ الصّٰفّٰت:۱۰۵)

"ابراہیم! تو نے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم نیک بندوں کو اسی طرح اچھا بدلہ دیا کرتے ہیں۔"

طغیانِ نازبیں کہ جگر گوشۂ خلیل در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

بیٹے نے جس استقلال، جس عزم اور جس حیرت خیز ایثار سے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا، اس کا صلہ یہی تھا کہ یہ رسم (قربانی) قیامت تک دنیا میں اس کی یادگار رہ جائے۔

[1] صحیح بخاری، باب بدء الوحی:۳۔

محمد رسول اللہ ﷺ

سلسلۂ نسب

سلسلۂ نسب یہ ہے، محمد (ﷺ) بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

صحیح بخاری (باب مبعث النبی ﷺ) میں یہیں تک ہے۔ [1] لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں عدنان سے حضرت ابراہیم علیہ السلام تک نام گنائے ہیں۔ یعنی عدنان بن عدد بن المقوم ابن تارح بن یشجب بن یعرب بن نابت بن اسمٰعیل بن ابراہیم علیہ السلام۔

سلسلۂ نسب

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے، جن کا ذکر توارات میں بھی ہے، ان میں سے قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی اور بہت پھیلی۔ انہی کی اولاد میں عدنان ہیں اور آنحضرت ﷺ انہی کے خاندان سے ہیں۔

عرب کے نسب دان تمام پشتوں کو محفوظ نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ اکثر نسب ناموں میں عدنان سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک صرف آٹھ نو پشتیں بیان کی ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں۔ عدنان سے لے کر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک اگر صرف نو دس پشتیں ہوں تو یہ زمانہ تین سو برس سے زیادہ نہ ہوگا اور یہ امر بالکل تاریخی شہادتوں کے خلاف ہے، علامہ سہیلی روض الانف (ص ۸) میں لکھتے ہیں:

ویستحیل فی العادۃ ان یکون بینھما اربعۃ آباء او سبعۃ کما ذکر ابن اسحاق او عشرۃ او عشرون فان المدۃ اطول من ذلک کلہ۔

''اور یہ عادۃً محال ہے کہ دونوں میں ۴ یا ۷ پشتوں کا فاصلہ ہو جیسا کہ ابن اسحاق نے ذکر کیا یا ۱۰، ۲۰ پشتیں ہوں کیونکہ زمانہ اس سے بہت زیادہ ہے۔''

علامہ موصوف نے بہت سے تاریخی حوالوں اور شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ عدنان سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک ۴۰ پشتوں کا فاصلہ ہے۔ اس غلطی نے بعض عیسائی مؤرخوں کو اس بات کا موقع دیا ہے کہ سرے سے اس بات کے منکر ہو گئے کہ آنحضرت ﷺ خاندان ابراہیم سے ہیں۔ [2]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب مبعث النبی ﷺ، رقم الباب: ۲۸۔

[2] سر ولیم صاحب نے صریحاً یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت ﷺ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے خاندان سے نہ تھے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں ''یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبر ﷺ کو اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے خیال کیا جائے۔ اور غالباً یہ کوشش کی کہ وہ اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل میں سے ثابت کئے جائیں، ان کی حین حیات میں پیدا ہوئی تھی اور اس طرح پر محمد ﷺ کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے تھے اور اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچہ میں ڈھالے گئے تھے۔'' (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس غلطی کی زیادہ وجہ یہ ہوئی کہ اہل عرب زیادہ تر مشہور آدمیوں کے نام پر اکتفا کرتے تھے اور بیچ کی پیڑھیوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ اہل عرب کے نزدیک چونکہ عدنان کا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے خاندان سے ہونا قطعی اور یقینی تھا۔ اس لئے وہ صرف اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ عدنان تک سلسلہ نسب صحیح طور سے نام بنام پہنچ جائے۔ اوپر کے اشخاص کا نام لینا غیر ضروری سمجھتے تھے، اس لئے چند مشہور آدمیوں کا نام لے کر چھوڑ دیتے تھے، تاہم عرب میں ایسے محققین بھی تھے جو فروگزاشت سے واقف تھے، علامہ طبری نے تاریخ میں لکھا ہے کہ ''مجھ سے بعض نسب دانوں نے بیان کیا کہ میں نے عرب میں ایسے علما دیکھے جو معد سے لے کر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک ۴۰ پشتوں کے نام لیتے تھے اور اس شہادت میں عرب کے اشعار پیش کرتے تھے اس شخص کا یہ بھی بیان تھا کہ میں نے اس سلسلہ کو اہل کتاب کی تحقیقات سے ملایا تو پشتوں کی تعداد برابر تھی البتہ ناموں میں فرق تھا، ❶ اسی مؤرخ نے ایک اور موقع پر لکھا ہے کہ ''شہر تدمر میں ایک یہودی تھا، جس کا نام ابو یعقوب تھا، وہ مسلمان ہو گیا تھا، اس کا بیان تھا کہ ارمیا پیغمبر کے منشی نے عدنان کا جو نسب نامہ لکھا تھا، وہ میرے پاس موجود ہے، ❷ اس شجرے میں بھی عدنان سے لے کر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک چالیس نام ہیں، بہرحال یہ واقعہ یقینی ہے کہ عدنان حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہے اور آنحضرت ﷺ عدنان کے خاندان سے ہیں۔

بنائے خاندان قریش

آنحضرت ﷺ کا خاندان اگرچہ اباً عن جدٍ ❸ معزز اور ممتاز چلا آتا تھا، لیکن جس شخص نے اس

(❀❀ گزشتہ سے پیوستہ) (لیکن ایک طرف سرولیم میور صاحب کا تنہا شبہ ہے، دوسری طرف بیسیوں یورپین اور یہودی مؤرخین ہیں جو نہ صرف خاندان قریش کو بلکہ تمام شمالی عرب وحجاز کو ابراہیمی النسل تسلیم کرتے ہیں۔ (دیکھو فارسٹر صاحب کا جغرافیہ تاریخ عرب)

❶ تاریخ طبری، مطبوعہ یورپ، ج ۳، ص: ۱۱۱۸۔

❷ تاریخ طبری، مطبوعہ یورپ، ج ۳، ص: ۱۱۱۵، ۱۱۱۶۔

❸ تاریخ عرب کا ایک ایک حرف اس کا شاہد ہے لیکن مارگولوس نے نہایت کوشش کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے خاندان کو متبذل ثابت کیا جائے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں ''یہ بالکل ظاہر ہے کہ محمد ﷺ ایک غریب اور ادنیٰ خاندان سے تھے۔'' اس کے بعد صاحب موصوف نے حسب ذیل استدلال پیش کئے ہیں۔ ''(۱) قرآن مجید میں ہے کہ قریش کو حیرت تھی کہ ان میں ایسا پیغمبر کیوں نہ بھیجا گیا جو شریف خاندان سے ہوتا۔ (۲) پیغمبر کے عروج کے زمانہ میں قریش نے آنحضرت کو اس درخت سے تشبیہ دی جو گھورے پر جمتا ہے (۳) رسول اللہ ﷺ کو جب ایک شخص نے مولیٰ کے لفظ سے خطاب کیا تو آپ نے اس لقب سے انکار کیا۔ (۴) فتح مکہ کے دن آپ نے فرمایا کہ ''آج شرفائے کفار کا خاتمہ ہو گیا۔'' قرآن شریف کے الفاظ یہ ہیں: ﴿ وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ ۝ ﴾ (۴۳/ الزخرف: ۳۱) یعنی کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن دو شہروں (مکہ وطائف) کے کسی رئیس پر کیوں نہ اترا ''عظیم اور شریف دو الگ لفظ ہیں، قرآن میں عظیم کا لفظ ہے، اہل عرب دولت اور اقتدار والے کو عظیم کہتے تھے ان کو آنحضرت ﷺ کی شرافت سے نہیں بلکہ جاہ و دولت سے انکار تھا۔ دوسرا استدلال اگر صحیح ہو تو دشمن کی ہر بات کو صحیح ماننا چاہیے۔ کفار نے تو آنحضرت ﷺ کو دیوانہ، جادوزدہ، شاعر سب کچھ کہا، ان میں سے کون سی بات صحیح ہے؟ بلاشبہ آنحضرت ﷺ نے مولیٰ اور سید کے لفظ سے انکار کیا، لیکن متعدد حدیثوں میں صاف تصریح ہے کہ آپ نے فرمایا مجھ کو سید اور مولا نہ کہو مولا اور سید خدا ہے۔ قرآن میں ہر جگہ خدا ہی کو مولا کہا ہے، اس سے آنحضرت ﷺ کی خاندانی شرافت کا ابطال کیونکر ہوتا ہے؟ اخیر استدلال بھی حیرت انگیز ہے، اس سے آنحضرت ﷺ کی کم نسبی کیونکر ثابت ہوتی ہے؟ کہ شرفائے مکہ سے یہاں مراد جبارین ومتکبرین مکہ ہیں۔ مارگیولوس صاحب نے یہ دلائل نولدیکی سے نقل کئے ہیں جو مشہور جرمنی مستشرق ہے؎ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔

خاندان کو قریش کے لقب سے ممتاز کیا وہ نضر بن کنانہ تھے۔ بعض محققین کے نزدیک قریش کا لقب سب سے پہلے فہر کو ملا اور انہی کی اولاد قریشی ہے، حافظ عراقی سیرت منظوم میں لکھتے ہیں:

اما قریش فالاصح فهر جماعها والاکثرون النضر ❶

قصی

نضر کے بعد فہر اور فہر کے بعد قصی بن کلاب نے نہایت عزت اور اقتدار حاصل کیا، اس زمانہ میں حرم کے متولی خلیل خزاعی تھے، قصی نے خلیل کی صاحبزادی سے جن کا نام حُبّی تھا شادی کی تھی، اس تعلق سے خلیل نے مرتے وقت وصیت کی کہ حرم کی خدمت قصی کو سپرد کی جائے، اس طرح یہ منصب بھی ان کو حاصل ہو گیا، قصی نے ایک دارالمشورہ قائم کیا جس کا نام دارالندوہ رکھا، قریش جب کوئی جلسہ یا جنگ کی تیاری کرتے تو اسی عمارت میں کرتے، قافلے باہر جاتے تو یہیں سے تیار ہو کر جاتے، نکاح اور دیگر تقریبات کے مراسم بھی یہیں ادا ہوتے۔

قصی نے بڑے بڑے نمایاں کام کیے، جو ایک مدت تک یادگار رہے، مثلاً سقایہ اور رفادہ ❷ جو خدام حرم کا سب سے بڑا منصب تھا، انہی نے قائم کیا، تمام قریش کو جمع کر کے تقریر کی کہ سینکڑوں ہزاروں کوس سے لوگ حرم کی زیارت کو آتے ہیں، ان کی میزبانی قریش کا فرض ہے، چنانچہ قریش نے ایک سالانہ رقم مقرر کی جس سے منیٰ اور مکہ معظمہ میں حجاج کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا، اس کے ساتھ چرمی حوض بنوائے جن میں ایام حج میں پانی بھر دیا جاتا تھا کہ حجاج کے کام آئے، مشعر حرام بھی انہی کی ایجاد ہے، جس پر ایام حج میں چراغ جلاتے تھے، چنانچہ عقد الفرید میں تصریح کی ہے، قصی نے اس قدر شہرت اور اعتبار حاصل کیا کہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ قریش کا لقب اول انہی کو ملا۔ ❸ چنانچہ علامہ ابن عبدربہ نے عقد الفرید میں بھی لکھا ہے اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ قصی نے چونکہ خاندان کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس بسایا، اس لئے ان کو قریش کہتے ہیں کیونکہ تقریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں، اسی بنا پر ان کو مجمع بھی کہتے تھے، چنانچہ شاعر کہتا ہے:

قصی ابوکم من یسمی مجمعا به جمع الله القبائل من فهر

قصی کی چھ اولاد تھی، عبدالدار، عبدمناف، عبدالعزیٰ، عبد بن قصی، تخمر، برہ۔ قصی نے مرتے وقت حرم

---

❶ زرقانی، جلد اول، صفحہ: ۹۰۔ ۱۲۹۱ھ ❷ سقایہ یعنی حاجیوں کو آب زمزم پلانا اور رفادہ حاجیوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا۔

❸ قصی بن کلاب کا مفصل تذکرہ طبقات ابن سعد جزء اول مطبوعہ لیڈن ۱۳۲۲ھ صفحہ ۳۶ سے لے کر ۴۲ تک ہے، قریش کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ قریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ قصی نے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کیا۔ اس لئے قریش کہلائے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایک مچھلی کا نام ہے جو تمام مچھلیوں کو کھا جاتی ہے چونکہ قصی بہت بڑے سردار تھے، اس لئے ان کو اس مچھلی سے تشبیہ دی، عام خیال یہ ہے کہ قریش قصی یا کسی اور شخص کا نام ہے لیکن امام سہیلی کی تحقیق یہ ہے کہ یہ قبیلہ کا نام ہے (ج ۱ ص: ۷۰، ۷۱ مطبع جمالیہ مصر: ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء) جس طرح قبائل عرب جانوروں کے نام پر نام رکھتے تھے، مثلاً: اسد، نمر وغیرہ۔ مؤرخین یورپ کا خیال ہے کہ قبائل جانوروں کی پرستش کرتے تھے اور انہی جانوروں کے نام سے مشہور ہو جاتے تھے۔ لیکن عربی تاریخوں میں اس کا پتہ نہیں چلتا۔

محترم کے تمام مناصب سب سے بڑے بیٹے عبدالدار کو دیے، [1] اگرچہ وہ سب بھائیوں میں ناقابل تھے لیکن قصی کے بعد قریش کی ریاست عبد مناف نے حاصل کی۔ اور انہیں کا خاندان رسول اللہ ﷺ کا خاص خاندان ہے۔ عبد مناف کے چھ بیٹے تھے، ان میں سے ہاشم نہایت صاحب صولت اور بااثر تھے، انہوں نے بھائیوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ حرم کے مناصب جو عبدالدار کو دیے گئے، واپس لے لئے جائیں، وہ لوگ اس منصب عظیم کے قابل نہیں۔ عبدالدار کے خاندان نے انکار کیا اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں، بالآخر اس پر صلح ہوگئی کہ عبدالدار سے سقایہ اور رفادہ واپس لے کر ہاشم کو دے دیا۔

ہاشم

ہاشم نے اپنے فرض کو نہایت خوبی سے انجام دیا، حجاج کو نہایت سیرچشمی سے کھانا کھلاتے تھے، چرمی حوضوں میں پانی بھروا کر زمزم اور منیٰ کے پاس سبیل رکھتے تھے، تجارت کو نہایت ترقی دی، قیصر روم سے خط و کتابت کر کے فرمان لکھوایا کہ ''قریش جب اس کے ملک میں اسباب تجارت لے کر جائیں تو ان سے کوئی ٹیکس نہ لیا جائے۔'' حبش کے بادشاہ نجاشی سے بھی اسی قسم کا فرمان حاصل کیا۔ چنانچہ اہل عرب جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام اور ایشیائے کوچک تک تجارت کے لئے جایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں انگوریہ (انقرہ) جو ایشیائے کوچک کا مشہور شہر ہے۔ قیصر کا پایہ تخت تھا، تجار قریش، انگوریہ میں جاتے تو قیصر نہایت عزت اور حرمت سے خیر مقدم کرتا تھا۔

عرب میں راستے محفوظ نہ تھے۔ ہاشم نے مختلف قبائل میں دورہ کر کے قبائل سے یہ معاہدہ کیا کہ قریش کے کاروان تجارت کو ضرر نہ پہنچائیں گے، جس کے صلہ میں کاروان قریش ان قبائل میں ان کی ضرورت کی چیزیں خود لے کر جائے گا اور ان سے خرید و فروخت کرے گا۔ یہ سبب تھا کہ عرب میں باوجود عام لوٹ مار کے قریش کا قافلہ تجارت ہمیشہ محفوظ رہتا تھا۔ [2]

ایک [3] دفعہ مکہ میں قحط پڑا، ہاشم نے اس قحط میں شوربہ میں روٹیاں چورا کر کے لوگوں کو کھلائیں، اس وقت سے ان کا نام ہاشم مشہور ہوگیا، عربی زبان میں چورہ کرنے کو ہشم کہتے ہیں، جس کا اسم فاعل ہاشم ہے۔

ایک بار تجارت کی غرض سے شام گئے، راستہ میں مدینہ میں ٹھہرے، وہاں سال کے سال بازار لگتا تھا، بازار میں گئے تو ایک عورت کو دیکھا جس کی حرکات و سکنات سے شرافت اور فراست کا اظہار ہوتا تھا، اس کے ساتھ حسین اور جمیل بھی تھی، دریافت سے معلوم ہوا کہ خاندان بنی نجار سے ہے اور سلمیٰ نام ہے۔ ہاشم نے اس سے شادی کی درخواست کی اور اس نے قبول کر لی، غرض نکاح ہوگیا۔ شادی کے بعد یہ شام کو چلے گئے اور غزہ میں جا کر انتقال کیا سلمیٰ کو حمل رہ گیا تھا، لڑکا پیدا ہوا، اس کا نام شیبہ رکھا گیا، اس نے قریباً ۸ برس تک مدینہ میں

[1] طبقات ابن سعد، ج۱، ص: ۳۹۔ [2] امالی ابو علی قالی۔ (ذیل) ص: ۲۰۴، مطلب خروج بنی عبدالمناف الی الشام الخ، مطبوعہ بولاق مصر: ۱۳۲۴ھ۔ [3] طبری، ج ۳، ص: ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، (س)

پرورش پائی، ہاشم کے بھائی جن کا نام مطلب تھا، ان کو یہ حالات معلوم ہوئے تو فوراً مدینہ روانہ ہوئے، وہاں پہنچ کر بھتیجے کی جستجو کی، سلمیٰ نے ان کے آنے کا حال سنا تو بلوا بھیجا۔ تین دن مہمان رہے، چوتھے دن شیبہ کو ساتھ لے کر مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ ان کی عمر ۸ برس کی تھی یہاں آ کر ان کا نام عبدالمطلب پڑ گیا۔

عبدالمطلب

عبدالمطلب کے لفظی معنی ''مطلب کا غلام'' ہیں۔ اس لئے ارباب سیر نے وجہ تسمیہ میں بہت سے اقوال نقل کئے ہیں جن میں صحیح تر یہ ہے کہ چونکہ مطلب نے ان کی پرورش کی تھی اور یہ یتیم تھے، اس لئے عرب کے محاورہ کے مطابق غلام مطلب مشہور ہو گئے۔ [1] عبدالمطلب کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ چاہ زمزم جو ایک مدت سے اٹ کر گم ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس کا پتہ لگایا اور کھدوا کر نئے سرے سے درست کروایا۔

عبداللہ

انہوں نے منت مانی تھی کہ دس بیٹوں کو اپنے سامنے جوان دیکھ لیں گے تو ایک کو خدا کی راہ میں قربان کر دیں گے۔ خدا نے یہ آرزو پوری کی، دسوں بیٹوں کو لے کر کعبہ میں آئے اور پجاری سے کہا کہ ان دسوں پر قرعہ ڈالو، دیکھو کس کے نام پر نکلتا ہے، اتفاق سے عبداللہ کا نام نکلا یہ ان کو لے کر قربان گاہ کو چلے، عبداللہ کی بہنیں جو ساتھ تھیں رونے لگیں اور کہا کہ ان کے بدلے دس اونٹ قربانی کیجئے، ان کو چھوڑ دیجئے، عبدالمطلب نے پجاری سے کہا کہ عبداللہ پر اور دس اونٹوں پر قرعہ ڈالو، اتفاق یہ کہ عبداللہ ہی کے نام پر قرعہ نکلا، عبدالمطلب نے اب دس کے بجائے بیس اونٹ کر دیے، یہاں تک کہ بڑھاتے بڑھاتے سو تک نوبت پہنچی تو اونٹوں پر قرعہ آیا، عبدالمطلب نے سو اونٹ قربانی کئے اور عبداللہ بچ گئے۔ یہ واقدی کی روایت ہے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اونٹوں کے معاوضہ کی تدبیر رؤسائے قریش نے تجویز کی تھی۔

عبدالمطلب کے دس یا بارہ بیٹوں میں سے پانچ شخصوں نے اسلام یا کفر کی خصوصیت کی وجہ سے شہرت عام حاصل کی۔ یعنی ابولہب، ابوطالب، عبداللہ، حمزہ رضی اللہ عنہ عباس عام طور پر مشہور ہیں، کہ ابولہب کا اصلی نام اور ہے۔ خطاب آنحضرت ﷺ نے یا صحابہ رضی اللہ عنہم نے دیا لیکن یہ غلطی ہے۔ ابن سعد نے طبقات میں تصریح کی کہ یہ لقب خود عبدالمطلب نے دیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ ابولہب نہایت حسین اور جمیل تھا اور عرب میں گورے چہرے کو شعلہ آتش کہتے ہیں، فارسی میں بھی آتشیں رخسار ہے۔

آمنہ

عبداللہ قربانی سے بچ گئے تو عبدالمطلب کو ان کی شادی کی فکر ہوئی، قبیلہ زہرہ میں وہب بن عبدمناف کی صاحبزادی جن کا نام آمنہ تھا، قریش کے تمام خاندانوں میں ممتاز تھیں [2] وہ اس وقت اپنے چچا وہیب کے پاس رہتی تھیں، عبدالمطلب وہیب کے پاس گئے اور عبداللہ کی شادی کا پیغام دیا، انہوں نے منظور کیا اور

[1] دیکھو زرقانی، جلد اول، ص:۸۶۔ [2] سیرۃ ابن ہشام، (برحاشیہ زاد المعاد مصر، ج۱ص:۸۵) (س)

عقد ہو گیا۔ اسی موقع پر خود عبدالمطلب نے بھی وہیب کی صاحبزادی سے جن کا نام ہالہ تھا، شادی کی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ انہی ہالہ کے بطن سے ہیں۔ ہالہ رشتہ سے آنحضرت ﷺ کی خالہ ہوئیں اور اس بنا پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے خالہ زاد بھائی بھی ہیں۔ دستور تھا کہ نوشاہ شادی کے بعد تین دن تک سسرال میں رہتا تھا، عبداللہ تین دن سسرال میں رہے اور پھر گھر چلے آئے اس وقت ان کی عمر تقریبا سترہ برس سے کچھ زیادہ تھی۔ 1 عبداللہ تجارت کے لئے شام کو گئے واپس آتے ہوئے مدینہ میں ٹھہرے اور بیمار ہو کر یہیں رہ گئے، عبدالمطلب کو یہ حال معلوم ہوا تو اپنے بڑے بیٹے حارث کو خبر لانے کے لئے بھیجا۔ وہ مدینہ میں پہنچے تو عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ چونکہ یہ خاندان میں سب سے زیادہ محبوب تھے، تمام خاندان کو سخت صدمہ ہوا۔ عبداللہ نے ترکہ میں اونٹ، بکریاں اور ایک لونڈی چھوڑی تھی جس کا نام ام ایمن رضی اللہ عنہا تھا، یہ سب چیزیں رسول اللہ ﷺ کو ترکہ میں ملیں' 'ام ایمن رضی اللہ عنہا کا اصلی نام برکہ تھا۔ 2

---

1 زرقانی، جلد اول، صفحہ: ۱۲۲ سطر ۷۔

2 طبقات ابن سعد، جزء اول، قسم اول، صفحہ: ۶۲، (س)

ظہورِ قدسی

چمنستانِ دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آ چکی ہیں۔ چرخِ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

ولادت

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے۔ سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جان نواز کے لئے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنان قضا وقدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں، ابروباد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاسِ پاک، توحید ابراہیم، جمال یوسف، معجز طرازی موسیٰ، جان نوازی مسیح علیہم السلام سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں اور شہنشاہِ کونین ﷺ کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبح جان نواز، وہی ساعتِ ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے، اربابِ سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ ”آج کی رات ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا“ لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں، بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے، آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتش کدۂ کفر، آذر کدۂ گمراہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آ گئی، آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا۔

یعنی یتیم عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرمان روائے عالم، شہنشاہِ کونین ﷺ

شمسۂ نہ مسند، ہفت اختران　　ختم رُسل خاتم پیغمبران
احمد ﷺ مرسل کہ خرد خاکِ اوست　　ہر دو جہان بستۂ فتراکِ اوست
اُمی و گویا بہ زبان فصیح　　از الف آدم ﷺ ومیم مسیح
رسمِ ترنج است کہ در روزگار　　پیش دہد میوہ پس آرد بہار

عالم قدس سے عالم امکان میں تشریف فرمائے عزت واجلال ہوئے، اللھم صل علیه وعلی اله واصحابه وسلم۔

تاریخ ولادت

تاریخ ولادت کے متعلق مصر کے مشہور ہیئت دان عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ لکھا ہے، جس میں

انہوں نے دلائل ریاضی سے ثابت کیا ہے کہ آپ کی ولادت ۹ ربیع الاول روز دوشنبہ مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء میں ہوئی تھی۔ ❶

آپ کا نام "محمد ﷺ" رکھا گیا اور عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ عبدالمطلب نے یہ نام رکھا تھا۔

رضاعت

سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کو آپ کی والدہ نے اور دو تین روز کے بعد ثویبہ نے دودھ پلایا۔ (جو ابولہب کی لونڈی تھی)۔ ❷

حلیمہ سعدیہ

ثویبہ کے بعد حضرت حلیمہ سعدیہ نے آپ کو دودھ پلایا، اس زمانہ میں دستور تھا کہ شہر کے رؤسا اور شرفا شیر خوار بچوں کو اطراف کے قصبات اور دیہات میں بھیج دیتے تھے، یہ رواج اس غرض سے تھا کہ بچے بدوؤں میں پل کر فصاحت کا جوہر پیدا کرتے تھے ❸ اور عرب کی خالص خصوصیات محفوظ رہتی تھیں۔

شرفائے عرب نے مدت تک اس رسم کو محفوظ رکھا، یہاں تک کہ بنو امیہ نے دمشق میں پایۂ تخت قائم کیا اور شاہانہ شان و شوکت میں کسریٰ و قیصر کی ہمسری کی، تاہم ان کے بچے صحراؤں میں بدوؤں کے گھر میں پلتے تھے۔ ولید بن عبدالملک خاص اسباب سے نہ جا سکا اور حرم شاہی میں پلا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندان بنی امیہ میں صرف ولید ہی ایک شخص تھا جو عربی صحیح نہیں بول سکتا تھا۔ ❹

غرض دستورِ مذکور کی بنا پر سال میں دو مرتبہ دیہات سے شہر میں عورتیں آیا کرتی تھیں اور شرفائے شہر اپنے شیر خوار بچوں کو ان کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ اس دستور کے موافق آنحضرت ﷺ کی ولادت کے

---

❶ محمود فلکی نے جو استدلال کیا ہے وہ کئی صفحوں میں آیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے۔ (۱) صحیح بخاری میں ہے کہ ابراہیم رضی اللہ عنہ (آنحضرت ﷺ کے صغیر السن صاحبزادے) کے انتقال کے وقت آفتاب میں گہن لگا تھا، (ابواب الکسوف، باب الصلوۃ فی کسوف الشمس: ۱۰٤۳) اور ۱۰ھ تھا۔ (اور اس وقت آپ کی عمر کا تریسٹھواں سال تھا۔) (۲) ریاضی کے قاعدے سے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱۰ھ کا) گرہن ۷ جنوری ۶۳۲ء ۸ بج کر ۳۰ منٹ پر لگا تھا۔ (۳) اس حساب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر قمری ۶۳ برس پیچھے ہٹیں تو آپ کی پیدائش کا سال ۵۷۱ء جس میں ازروئے قواعد ہیئت ربیع الاول کی پہلی تاریخ ۱۲ اپریل ۵۷۱ء کے مطابق تھی۔ (۴) تاریخِ ولادت میں اختلاف ہے لیکن اس قدر متفق علیہ ہے کہ وہ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا اور تاریخ ۸ سے لے کر ۱۲ تک میں منحصر ہے۔ (۵) ربیع الاول مذکور کی ان تاریخوں میں دوشنبہ کا دن نویں تاریخ کو پڑتا ہے، ان وجوہ کی بنا پر تاریخ ولادت قطعاً ۲۰ اپریل ۵۷۱ء تھی۔

❷ بخاری، کتاب النکاح، باب یحرم من الرضاعۃ مایحرم من النسب: ۵۱۰۱۔ (س) ❸ امام سہیلی نے بہ تفصیل یہ واقعات لکھے ہیں اور یہ حدیث بھی نقل کی ہے، کہ آنحضرت ﷺ فرماتے تھے کہ "میں اس لئے فصیح ہوں کہ قبیلہ بنی سعد میں پلا ہوں۔" (الروض الانف جلد اول، ص ۱۰۹ (س) سر ولیم میور صاحب لائف آف محمد ص ۷ مطبوعہ ایڈنبرا ۱۹۱۲ء میں لکھتے ہیں کہ "محمد ﷺ کی جسمانی حالت بہت اچھی تھی، ان کے اخلاق آزاد اور مستغنی عن الغیر تھے جس کی وجہ ان کا پانچ سال تک بنی سعد میں بسر کرنا تھا اور اسی وجہ سے ان کی تقریر جزیرہ نمائے عرب کے خالص نمونہ کے موافق تھی۔ ❹ ابن اثیر، ج ۵، ص: ٦ طبع لیڈن، ۱۸۷۰ء (س)

چندروز بعد قبیلہ ہوازن کی چند عورتیں بچوں کی تلاش میں آئیں، ان میں حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں ❶ اتفاق سے ان کو کوئی بچہ ہاتھ نہیں آیا۔

آنحضرت ﷺ کی والدہ نے ان کو مقرر کرنا چاہا تو ان کو خیال آیا کہ یتیم بچے کو لے کر کیا کروں گی۔ لیکن خالی ہاتھ بھی نہ جا سکتی تھیں، اس لئے حضرت آمنہ کی درخواست قبول کی اور آنحضرت ﷺ کو لے کر گئیں، ان کی ایک صاحبزادی تھی، جن کا نام شیما تھا، ان کو آنحضرت ﷺ سے بہت انس تھا، وہی آپ کو کھلایا کرتی تھیں، دو برس کے بعد حلیمہ آپ کو مکہ میں لائیں اور آپ کی والدہ ماجدہ کے سپرد کیا۔ چونکہ اس زمانہ میں مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی، آپ کی والدہ نے فرمایا کہ واپس لے جاؤ۔ چنانچہ دوبارہ گھر میں لائیں، اس میں اختلاف ہے کہ آپ حضرت حلیمہ کے یہاں کتنے برس تک رہے، ابن اسحاق نے وثوق کے ساتھ ۶ برس لکھا ہے۔ ❷

ہوازن کا قبیلہ فصاحت و بلاغت میں مشہور ہے، ابن سعد نے طبقات میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ”میں تم سب میں فصیح تر ہوں، کیونکہ میں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنی سعد کی زبان ہے۔“ ❸ بنی سعد ہوازن ہی کے قبیلہ کو کہتے ہیں۔

حضرت حلیمہ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو بے انتہا محبت تھی، عہد نبوت میں جب وہ آپ کے پاس آئیں تو آپ ”میری ماں، میری ماں“ کہہ کر لپٹ گئے، یہ دلچسپ واقعات آگے آئیں گے۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت حلیمہ آنحضرت ﷺ کی نبوت سے پہلے وفات پا گئیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، ابن ابی خیثمہ نے ”تاریخ“ میں، ابن جوزی نے ”حداء“ میں، منذری نے ”مختصر سنن ابی داؤد“ میں، ابن حجر نے ”اصابہ“ میں ان کے اسلام لانے کی تصریح کی ہے، حافظ مغلطائی نے ان کے اسلام پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، جس کا نام ”التحفة الجسيمة في اثبات اسلام حليمة“ ہے۔“ ❹

آنحضرت ﷺ کے رضاعی باپ حضرت حارث

حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر یعنی آنحضرت ﷺ کے رضاعی باپ کا نام حارث بن عبدالعزیٰ ہے، وہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد مکہ میں آئے اور اسلام لائے۔ ❺

حارث آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ یہ تم کیا کہتے ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں وہ دن آئے گا کہ میں آپ کو دکھا دوں گا کہ میں سچ کہتا تھا۔“ حارث مسلمان ہو گئے۔

❶ سہیلی نے لکھا ہے کہ عرب میں دودھ پلانا اور اس کی اجرت لینا شریفانہ کام نہیں خیال کیا جاتا تھا، اسی بنا پر عرب میں مثل ہے: الحرة لا تاكل بثدييها اس بنا پر سہیلی نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ اس سال قحط پڑا تھا، اس لئے مجبوراً حضرت حلیمہ اور ان کے قبیلہ نے یہ خدمت گوارا کی تھی، (الروض الانف، ج۱ص:۱۰۹) لیکن تمام تاریخوں میں ہے کہ مکہ میں ہر سال باہر سے عورتیں اس کام کے لئے آیا کرتی تھیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کام کو معیوب سمجھنا عرب کا عام خیال نہ تھا، یہ خیال اہل شہر اور امراء کے ساتھ مخصوص ہوگا۔

❷ علامہ زرقانی نے اموی کا یہی قول بتایا ہے۔ ❸ طبقات ابن سعد، ج ۱ ص: ۷۱۔

❹ زرقانی، ج ۱، ص: ۱۶۶۔ ❺ اصابہ فی تمییز الصحابة، ج۱، ص: ۲۸۳، مطبوعہ مصر مطبع سعادت۔

رضاعی بھائی بہن

آنحضرت ﷺ کے چار رضاعی بھائی بہن تھے، جن کے نام یہ ہیں، عبداللہ، انیسہ، حذیفہ اور حذافہ جو شیما کے لقب سے مشہور تھیں، ان میں سے عبداللہ اور شیما کا اسلام لانا ثابت ہے، باقیوں کا حال معلوم نہیں۔

مدینہ کا سفر اور حضرت آمنہ کی وفات

آنحضرت ﷺ کی عمر جب چھ برس کی ہوئی تو آپ کی والدہ آپ کو لے کر مدینہ گئیں، چونکہ آنحضرت ﷺ کے دادا کی ننہال خاندانِ نجار میں تھیں، وہیں ٹھہریں، اس سفر میں ام ایمن رضی اللہ عنہا بھی ساتھ تھیں جو آنحضرت ﷺ کی دایہ تھیں۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ آپ کی والدہ اس ننہالی رشتہ کی وجہ سے مدینہ گئیں، لیکن یہ رشتہ دور کا رشتہ تھا، قیاس میں نہیں آتا کہ صرف اتنے سے تعلق سے اتنا بڑا سفر کیا جائے۔ میرے نزدیک بعض مؤرخین کا یہ بیان صحیح ہے کہ حضرت آمنہ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کے لئے گئی تھیں جو مدینہ میں مدفون تھے، بہرحال ایک مہینہ تک مدینہ میں مقیم رہیں، واپس آتے ہوئے جب مقام ابواء [1] میں پہنچیں تو ان کا انتقال ہو گیا اور یہیں مدفون ہوئیں، ام ایمن رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کو لے کر مکہ میں آئیں۔

رسول اللہ ﷺ کو قیام مدینہ کی بہت سی باتیں یاد رہ گئی تھیں، جب آپ قیام مدینہ کے زمانہ میں ایک دفعہ بنوعدی کے منازل پر گزرے تو فرمایا کہ اسی مکان میں میری والدہ ٹھہری تھیں، یہی وہ تالاب ہے جس میں میں نے تیرنا سیکھا تھا، اسی میدان میں، میں انیسہ ایک لڑکی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ [2]

عبدالمطلب کی کفالت

والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد عبدالمطلب نے آنحضرت ﷺ کو اپنے دامن تربیت میں لیا، ہمیشہ آپ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ [3]

عبدالمطلب نے بیاسی برس کی عمر میں وفات پائی اور حجون میں مدفون ہوئے، اس وقت آنحضرت ﷺ کی عمر آٹھ برس کی تھی، عبدالمطلب کا جنازہ اٹھا تو آنحضرت ﷺ بھی ساتھ تھے اور فرط محبت سے روتے

---

[1] ایک گاؤں کا نام ہے جو جحفہ سے ۲۳ میل پر واقع ہے۔ (معجم البلدان، ج ۱، ص: ۹۲) [2] طبقات ابن سعد قسم اول، ذکر وفات آمنہ ام رسول اللہ ﷺ جلد ۱ صفحہ ۷۳۔ [3] عبدالمطلب کا آنحضرت ﷺ کو عزیز رکھنا ایک مسلّم واقعہ ہے، لیکن مارگولیتھ صاحب کو دادا کا پوتے پر مہربان ہونا بھی گوارا نہیں، فرماتے ہیں کہ "یتیم لڑکے کی حالت کچھ اچھی نہ تھی اور اخیر زندگی میں ان کے چچا حمزہ نے نشہ کی حالت میں محمد ﷺ کو طنزاً اپنے باپ کا غلام کہا تھا۔" (لائف آف محمد ﷺ از مارگولیتھ، صفحہ: ۴۵ تا ۴۹) حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے جس قول سے استدلال کیا ہے، مارگولیتھ خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ نشہ کی حالت تھی، اس کی تفصیل جیسا کہ بخاری، کتاب المغازی، باب شهود الملائكة بدراً: ۴۰۰۳ میں ہے کہ بدر کے مال غنیمت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دو اونٹ ملے تھے اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شراب میں مخمور ادھر سے گزرے اور اونٹ کا پیٹ پھاڑ کر دل اور جگر کا کباب بنایا، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان کو ملامت کی، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سخت مخمور تھے، اس حالت میں وہ الفاظ ان کی زبان سے نکلے تھے، کیا اس حالت کا کوئی بیان شہادت میں پیش کیا جا سکتا ہے؟

جاتے تھے، عبدالمطلب نے مرنے کے وقت اپنے بیٹے ابو طالب کو آنحضرت ﷺ کی تربیت سپرد کی، ابو طالب نے اس فرض کو جس خوبی سے ادا کیا اس کی تفصیل آگے آتی ہے، یہ واقعہ خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عبدالمطلب کی موت نے بنو ہاشم کے رتبہ امتیاز کو دفعتہً گھٹا دیا اور یہ پہلا دن تھا کہ دنیوی اقتدار کے لحاظ سے بنو امیہ کا خاندان بنو ہاشم پر غالب آ گیا، عبدالمطلب کی مسند ریاست پر اب حرب متمکن ہوا، جو امیہ کا نامور فرزند تھا، مناصب ریاست میں سے صرف سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانا عباس کے ہاتھ میں رہا، جو عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔

ابو طالب کی کفالت

عبدالمطلب کے دس بیٹے مختلف ازواج سے تھے، ان میں سے آنحضرت ﷺ کے والد عبداللہ اور ابو طالب ماں جائے بھائی تھے، اس لئے عبدالمطلب نے آنحضرت ﷺ کو ابو طالب ہی کے آغوش تربیت میں دیا، ابو طالب آنحضرت ﷺ سے اس قدر محبت رکھتے تھے کہ آپ کے مقابلہ میں اپنے بچوں کی پروا نہیں کرتے تھے، سوتے تو آنحضرت ﷺ کو ساتھ لے کر سوتے اور باہر جاتے تو ساتھ لے کر جاتے۔

غالباً جب آپ کی عمر دس بارہ برس کی ہوئی تو آپ نے بکریاں چرائیں۔ فرانس کے ایک نامور مورخ نے لکھا ہے کہ ''ابو طالب چونکہ محمد ﷺ کو ذلیل رکھتے تھے، اس لئے ان سے بکریاں چرانے کا کام لیتے تھے''۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عرب میں بکریاں چرانا معیوب کام نہ تھا، بڑے بڑے شرفا اور اُمرا کے بچے بکریاں چراتے تھے، خود قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ۝ ﴾ (١٦/ النحل:٦) اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عالم کی گلہ بانی کا دیباچہ تھا، زمانہ رسالت میں آپ اس سادہ اور پر لطف مشغلہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے، ایک دفعہ آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ جنگل میں تشریف لے گئے، صحابہ رضی اللہ عنہم ''جھڑ بیریاں'' توڑ توڑ کر کھانے لگے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو خوب سیاہ ہو جاتے ہیں زیادہ مزے کے ہوتے ہیں، یہ میرا اس زمانہ کا تجربہ ہے جب میں بچپن میں یہاں بکریاں چرایا کرتا تھا۔'' [1]

شام کا سفر

ابو طالب تجارت کا کاروبار کرتے تھے۔ قریش کا دستور تھا، سال میں ایک دفعہ تجارت کی غرض سے

---

[1] طبقات ابن سعد۔ جلد اول، صفحہ:٨٠؛ بخاری نے کتاب الاجارۃ، باب رعی الغنم علی قراریط: ٢٢٦٢ میں آنحضرت ﷺ کا قول نقل کیا ہے کہ ''میں قراریط پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا''۔ قراریط کے معنی میں اختلاف ہے، ابن ماجہ کے شیخ یعنی سوید بن سعید کی رائے ہے کہ قراریط قیراط کی جمع ہے اور قیراط درہم یا دینار کے ٹکڑے کا نام ہے، اس بنا پر ان کے نزدیک حدیث کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرت ﷺ اجرت پر لوگوں کی بکریاں چراتے تھے، اسی بنا پر بخاری نے اس حدیث کو باب الاجارۃ میں نقل کیا ہے، لیکن ابراہیم حربی کا قول ہے کہ قراریط ایک مقام کا نام ہے جو اجیاد کے قریب ہے۔ ابن جوزی نے اس قول کو ترجیح دی ہے۔ علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں یہ بحث تفصیل سے لکھی ہے اور قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ابن جوزی کی رائے صحیح ہے۔ (عینی، جلد ۴، صفحہ:٦٣١) نور النبراس میں یہ بحث اور زیادہ تفصیل سے ہے اور اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔

شام کو جایا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی عمر تقریباً بارہ برس کی ہوگی کہ ابو طالب نے حسب دستور شام کا ارادہ کیا، سفر کی تکلیف یا کسی اور وجہ سے وہ آنحضرت ﷺ کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے، لیکن آنحضرت ﷺ کو ابو طالب سے اس قدر محبت تھی کہ جب ابو طالب چلنے لگے تو آپ ان سے لپٹ گئے، ابو طالب نے آپ کی دل شکنی گوارا نہ کی اور ساتھ لے لیا، عام مؤرخین کے بیان کے موافق بحیرا کا مشہور واقعہ اسی سفر میں پیش آیا، اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے، کہ جب ابو طالب بُصریٰ میں پہنچے تو ایک عیسائی راہب کی خانقاہ میں اترے جس کا نام بحیرا تھا، اس نے آنحضرت ﷺ کو دیکھ کر کہا کہ ''یہ سید المرسلین ہیں۔'' لوگوں نے پوچھا: تم نے کیونکر جانا؟ اس نے کہا: جب تم لوگ پہاڑ سے اترے تو جس قدر درخت اور پتھر تھے سب سجدے کے لئے جھک گئے۔

بحیرا راہب کا قصہ

یہ روایت مختلف پیرایوں میں بیان کی گئی ہے، تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جس قدر عام مسلمانوں کو شغف ہے اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے، سر ولیم میور، ڈریپر، مرگولوس وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتحِ عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے اور جو نکتے اس نے بتا دیے تھے انہی پر آنحضرت ﷺ نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اسلام کے تمام عمدہ اصول انہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں۔ [1]

عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہیے جس طرح روایت میں مذکور ہے، اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں، قیاس میں بھی نہیں آ سکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام دقائق سکھا دیے جائیں اور اگر یہ کوئی خرق عادت تھا، تو بحیرا کے تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت نا قابل اعتبار ہے۔ اس روایت کے جس قدر طریق ہیں، سب مرسل ہیں، یعنی راوی اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا جو شریک واقعہ تھا۔

اس روایت کا سب سے زیادہ مستند طریقہ یہ ہے جو ترمذی میں مذکور ہے، اس کے متعلق تین باتیں قابلِ لحاظ ہیں:

[1] ڈریپر صاحب ''معرکہ علم و مذہب'' (تیسرا باب، ص: ۱۰۷ اردو ترجمہ) میں لکھتے ہیں، ''بحیرا راہب نے بصریٰ کی خانقاہ میں محمد کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی...... آپ کے ناتربیت یافتہ لیکن اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا...... بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں (عیسائیوں کے ایک مذہبی فرقہ کا نام ہے) کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا۔'' سر ولیم میور صاحب نے بھی نہایت آب و رنگ سے ثابت کرنا چاہا ہے، کہ آنحضرت ﷺ کو بت پرستی سے جو نفرت پیدا ہوئی اور ایک مذہب جدید کا جو خاکہ آپ نے قائم کیا، وہ سب اسی سفر اور اس کے مختلف تجارب اور مشاہدات کے نتائج تھے، لیکن ظاہر ہے کہ اگر شارع اسلام بالفرض ان عیسائی اساتذہ کا تعلیم یافتہ ہوتا، تو ناممکن تھا کہ توحید خالص کا وہ ولولہ اور تثلیث سے نفرت کا وہ جوش اس کے سینہ میں پیدا ہو سکتا جو قرآن کے ہر صفحہ میں نظر آتا ہے۔

① ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ ''حسن اور غریب ہے اور ہم اس حدیث کو اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ سے نہیں جانتے۔'' [1] حسن کا مرتبہ صحیح حدیث سے کم ہوتا ہے اور جب غریب ہو تو اس کا رتبہ اس سے بھی گھٹ جاتا ہے۔

② اس حدیث کا ایک راوی عبدالرحمان بن غزوان ہے، اس کو بہت سے لوگوں نے اگرچہ ثقہ بھی کہا ہے، لیکن اکثر اہل فن نے اس کی نسبت بے اعتباری ظاہر کی ہے، علامہ ذہبی، میزان الاعتدال (ج ۲، ص: ۱۱۳) میں لکھتے ہیں کہ ''عبدالرحمٰن منکر حدیثیں بیان کرتا ہے، جن میں سب سے بڑھ کر منکر وہ روایت ہے جس میں بحیرا کا واقعہ مذکور ہے۔''

③ حاکم نے مستدرک میں اس روایت کی نسبت لکھا ہے کہ ''یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق ہے۔'' علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ ''میں اس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع، جھوٹا اور بنایا ہوا خیال کرتا ہوں۔'' [2]

④ اس روایت میں مذکور ہے کہ حضرت بلال اور ابوبکر رضی اللہ عنہما بھی اس سفر میں شریک تھے، حالانکہ اس وقت بلال کا وجود بھی نہ تھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بچے تھے۔

⑤ اس حدیث کے اخیر راوی ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہیں، وہ شریک واقعہ نہ تھے اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے، ترمذی کے علاوہ طبقات ابن سعد [3] میں جو سلسلۂ سند مذکور ہے، وہ مرسل یا معضل ہے یعنی جو روایت مرسل ہے اس میں راوی جو ظاہر ہے کہ شریک واقعہ نہیں ہے، کسی صحابی کا نام نہیں لیتا ہے اور جو روایت معضل ہے اس میں راوی اپنے اوپر کے دو راوی جو تابعی اور صحابی ہیں دونوں کا نام نہیں لیتا ہے۔

⑥ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ رواۃ پرستی کی بنا پر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں، لیکن چونکہ حضرت ابوبکر اور بلال رضی اللہ عنہما کی شرکت بداہتہً غلط ہے۔ اس لئے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہو گیا ہے، لیکن حافظ ابن حجر کا یہ ادعا بھی صحیح نہیں کہ اس روایت کے تمام رواۃ قابل سند ہیں، عبدالرحمان بن غزوان کی نسبت خود انہی حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب (ج ۲، ص: ۴۲۸) میں لکھا ہے کہ ''وہ خطا کرتا تھا، اس کی طرف سے اس وجہ سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ممالیک کی روایت نقل کی ہے۔'' ممالیک کی ایک روایت ہے جس کو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں۔ [4]

---

[1] جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب ما جاء فی بدء نبوة النبی ﷺ: ۳٦۲۰۔

[2] نبراس فی شرح عیون السیر لابن سیدالناس اور زرقانی، ج۱، ص:۲۲۷ اور میزان الاعتدال، ج۲، ص: ۱۱۳ اور اصابہ (تذکرۂ عبدالرحمٰن بن غزوان) مستدرک حاکم مع تلخیص، ج۲، ص:۵۱۶ (س)

[3] جزء اول، قسم اول، ص: ۷۵ (س)

[4] جامع نے بحیرا راہب کے قصہ کی مکمل تنقید سیرت النبی ﷺ جلد سوم باب ''مشہور عام دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت'' (ص: ۶۵۸ تا ۶۶۰ طبع جدید [طبع ہذا ۲۰۱۲ء، ج ۳، ص: ۴۸۵ تا ۴۸۷]) میں کی ہے اس کو ملاحظہ فرمایا جائے۔ (س)

حرب فجار کی شرکت

عرب میں اسلام کے آغاز تک لڑائیوں کا جو متواتر سلسلہ چلا آتا ہے، ان میں یہ جنگ سب سے زیادہ مشہور اور خطرناک ہے۔

یہ لڑائی قریش اور قیس قبیلہ میں ہوئی تھی۔ قریش کے تمام خاندانوں نے اس معرکہ میں اپنی اپنی الگ فوجیں قائم کی تھیں، آل ہاشم کے علم بردار زبیر بن عبدالمطلب تھے اور اسی صف میں جناب رسول اللہ ﷺ بھی شریک تھے، بڑے زور کا معرکہ ہوا، اول قیس، پھر قریش غالب آئے اور بالآخر صلح پر خاتمہ ہوگیا، اس لڑائی میں قریش کا رئیس اور سپہ سالار اعظم حرب بن امیہ تھا، جو ابوسفیان کا باپ اور امیر معاویہ کا دادا تھا۔

چونکہ قریش اس جنگ میں برسرِ حق تھے اور خاندان کے ننگ و نام کا معاملہ تھا، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے بھی شرکت فرمائی، لیکن جیسا کہ ابن ہشام نے لکھا ہے آپ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا، [1] امام سہیلی نے صاف تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خود جنگ نہیں کی، ان کے الفاظ یہ ہیں:

وانما لم یقاتل رسول اللّٰه ﷺ مع اعمامه فی الفجار وقد کان بلغ سن القتال لانها کانت حرب فجار وکانوا ایضًا کلهم کفارًا ولم یاذن اللّٰه تعالٰی لمؤمن ان یقاتل الا لتکون کلمة اللّٰه هی العلیا۔ [2]

''اور آپ نے اس لڑائی میں جنگ نہیں کی، حالانکہ آپ لڑائی کی عمر کو پہنچ چکے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لڑائی ایام الحرام میں پیش آئی تھی نیز یہ وجہ تھی کہ فریقین کافر تھے اور مسلمانوں کو لڑائی کا حکم صرف اس لئے خدا نے دیا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔''

اس لڑائی کو فجار اس لئے کہتے ہیں کہ ایام الحرام میں یعنی ان مہینوں میں پیش آئی تھی جن میں لڑنا ناجائز تھا۔

حلف الفضول

لڑائیوں کے متواتر سلسلہ نے سینکڑوں گھرانے برباد کر دیے تھے اور قتل اور سفا کی موروثی اخلاق بن گئے تھے۔ یہ دیکھ کر بعض طبیعتوں میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی، جنگ فجار سے لوگ واپس پھرے تو زبیر بن عبدالمطلب نے جو رسول اللہ ﷺ کے چچا اور خاندان کے سرکردہ تھے یہ تجویز پیش کی چنانچہ خاندان ہاشم، زہرہ اور تیم عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے اور معاہدہ ہوا کہ ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا۔ [3]

آنحضرت ﷺ اس معاہدہ میں شریک تھے اور عہدِ نبوت میں فرمایا کرتے تھے کہ ''معاہدہ کے مقابلہ میں اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیے جاتے تو میں نہ بدلتا [4] اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لئے کوئی

[1] ابن هشام، ج ۱، ص:۱۲٤۔ [2] الروض الانف، ج ۱، ص:۵۲۱۔
[3] طبقات، ج ۱، ص:۸۲۔ [4] مستدرك، ج ۲، ص: ۲۲۰ (س)۔

بلائے تو میں حاضر ہوں''۔

اس معاہدہ کو حلف الفضول اس لئے کہتے ہیں کہ اول اول اس معاہدہ کا خیال جن لوگوں کو آیا، ان کے نام میں لفظ ''فضیلت'' کا مادہ داخل تھا۔ ❶ یعنی فضیل بن حرث، فضیل بن وداعہ اور مفضل، یہ لوگ جرہم اور قطورا کے قبیلہ کے تھے۔ اگرچہ یہ معاہدہ بے کار گیا اور کسی کو یاد بھی نہ رہا، چنانچہ قریش نے نئے سرے سے بنیاد ڈالی، تاہم بانی اول کو نیک نیتی کا یہ ثمرہ ملا کہ ان کے نام کی یادگار اب تک باقی ہے۔

تعمیر کعبہ

کعبہ کی عمارت صرف قد آدم اونچی تھی اور دیواروں پر چھت نہ تھی جس طرح ہمارے ملک میں عیدگاہیں ہوتی ہیں، چونکہ عمارت نشیب میں تھی، بارش کے زمانہ میں شہر کا پانی حرم میں آتا تھا، اس کی روک کے لئے بالائی حصہ پر بند بنوادیا گیا تھا، لیکن وہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا اور عمارت کو بار بار نقصان پہنچتا تھا، بالآخر یہ رائے قرار پائی کہ موجودہ عمارت ڈھا کر نئے سرے سے زیادہ مستحکم بنائی جائے، حسن اتفاق یہ کہ جدہ کی بندرگاہ پر ایک تجارتی جہاز کنارہ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا قریش کو خبر لگی تو ولید بن مغیرہ نے جدہ پہنچ کر جہاز کے تختے مول لے لئے، جہاز میں ایک رومی معمار تھا جس کا نام باقوم تھا، ولید اس کو ساتھ لایا اور تمام قریش نے مل کر تعمیر شروع کی مختلف قبائل نے عمارت کے مختلف حصے آپس میں تقسیم کر لئے تھے کہ کوئی اس شرف سے محروم نہ رہ جائے، لیکن جب حجر اسود کے نصب کرنے کا موقع آیا تو سخت جھگڑا پیدا ہوا، ہر شخص چاہتا تھا کہ یہ خدمت اسی کے ہاتھ سے انجام پائے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ تلواریں کھنچ گئیں۔

عرب میں دستور تھا کہ جب کوئی شخص جان دینے کی قسم کھاتا تھا تو پیالہ میں خون بھر کر اس میں انگلیاں ڈبولیتا تھا۔ اس موقع پر بھی بعض دعویداروں نے یہ رسم ادا کی، چار دن تک یہ جھگڑا برپا رہا، پانچویں دن ابوامیہ بن مغیرہ نے جو قریش میں سب سے زیادہ معمر تھا رائے دی کہ کل صبح کو سب سے پہلے جو شخص آئے وہی ثالث قرار دے دیا جائے، سب نے یہ رائے تسلیم کی۔ دوسرے دن تمام قبائل کے معزز آدمی موقع پر پہنچے، کرشمۂ ربانی دیکھو کہ صبح کو سب سے پہلے لوگوں کی نظریں جس پر پڑیں وہ جمال جہاں تاب چہرۂ محمدی ﷺ تھا، لیکن رحمت عالم نے قبول نہ کیا کہ اس شرف سے تنہا بہرہ ور ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو قبائل دعویدار ہیں سب کا ایک ایک سردار انتخاب کر لیا جائے۔'' آنحضرت ﷺ نے ایک چادر بچھا کر حجر اسود کو اس میں رکھ دیا اور سرداروں سے کہا کہ چادر کے چاروں کونے تھام لیں اور اوپر کو اٹھائیں، جب چادر موقع کے برابر آ گئی تو آپ نے حجرِ اسود کو اٹھا کر نصب فرما دیا۔ ❷ یہ گویا اشارہ تھا کہ دینِ الٰہی کی عمارت کا آخری تکمیلی پتھر بھی

---

❶ لیکن امام سہیلی نے مسند حارث بن اسامہ سے ایک حدیث نقل کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ اس معاہدہ میں یہ الفاظ تھے: (تردا لفضول علی اهلها) (الروض الانف، ج۱ص:۹۱)۔

❷ مسند طیالسی، ج۱ص:۱۸ و مستدرک حاکم، ج۱ص:۴۵۸۔ (س)

انہیں ہاتھوں سے نصب ہوگا۔ [1]

اسی طرح ایک سخت لڑائی آپ کے حسنِ تدبیر سے رک گئی، کعبہ کی عمارت اب مسقف کر دی گئی، لیکن چونکہ سامان تعمیر کافی نہ تھا، ایک طرف زمین کا کچھ حصہ چھوڑ کر بنیادیں قائم کی گئیں اور اس حصہ کے گرد چار دیواری کھینچ دی گئی کہ پھر موقع ہوگا تو کعبہ کے اندر لے لیں گے، یہی حصہ ہے جس کو آج حطیم کہتے ہیں اور جس کی نسبت آنحضرت ﷺ نے بعد نبوت ارادہ فرمایا تھا کہ دیوار ڈھا کر نئے سرے سے عمارت بنائی جائے لیکن پھر خیال ہوا کہ نئے نئے مسلمان ہیں، دیوار کعبہ کے ڈھانے سے بدگمان ہو جائیں گے۔ [2]

شغل تجارت [3]

عرب، خصوصاً قریش یعنی بنی اسمٰعیل، ظہور اسلام کے ہزاروں برس پہلے سے تجارت پیشہ تھے۔ [4] آنحضرت ﷺ کے جد اعلیٰ ''ہاشم'' نے قبائل عرب سے تجارتی معاہدے کر کے اس خاندانی طریقہ اکتساب کو اور زیادہ مستحکم اور باقاعدہ کر دیا تھا، آنحضرت ﷺ کے چچا ابو طالب بھی تاجر تھے، اس بنا پر سن رشد کو پہنچنے کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو جب فکر معاش کی طرف توجہ ہوئی تو تجارت سے بہتر کوئی پیشہ نظر نہ آیا۔

ابو طالب کے ساتھ آپ بچپن میں بھی بعض تجارتی سفر کر چکے تھے، جس سے ہر قسم کا تجربہ حاصل ہو چکا تھا اور آپ کے حسن معاملہ کی شہرت ہر طرف پھیل چکی تھی، لوگ عموماً اپنا سرمایہ کسی تجربہ کار اور امین شخص کے ہاتھ میں دے کر اس کے منافع میں شرکت کر لیتے تھے۔ آنحضرت ﷺ بھی خوشی کے ساتھ اس شرکت کو گوارا فرماتے تھے۔

آنحضرت ﷺ کے شرکائے تجارت کی شہادتوں سے جو احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کس دیانت اور راست بازی کے ساتھ اس کام کو انجام دیتے تھے۔

تاجر کے محاسن اخلاق میں سب سے زیادہ نادر مثال ایفائے عہد اور اتمام وعدہ کی ہو سکتی ہے، لیکن منصب نبوت سے پہلے مکہ کا تاجر امین اس اخلاقی نظیر کا بہترین نمونہ تھا، حضرت عبداللہ بن ابی الحمساء رضی اللہ عنہ ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ بعثت سے پہلے میں نے آنحضرت ﷺ سے خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کیا تھا، کچھ معاملہ ہو چکا تھا، کچھ باقی تھا، میں نے وعدہ کیا کہ پھر آؤں گا، اتفاق سے تین دن تک مجھ کو اپنا وعدہ یاد نہ

---

[1] یہ ایک حدیث کی طرف تلمیح ہے، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''میں نبوت کی عمارت کا آخری پتھر ہوں''۔ یعنی مکمل مذہب اور خاتم الرسل ہوں۔ (س) دیکھئے صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین: ٣٥٣٤۔٣٥٣٥ وسنن ترمذی، ابواب الامثال، باب ما جآء فی مثل النبی والانبیاء: ٢٨٦٢۔ [2] یہ واقعات ابن ہشام، طبقات، طبری میں منفرد اور زرقانی جلد اول، صفحہ: ٢٣٦ تا ٢٤٠ میں مجتمعاً مذکور ہیں، اخیر کا واقعہ صحیح بخاری (کتاب الحج، باب فضل مكة وبنيانها: ١٥٨٣) میں بھی ہے، بخاری میں یہ بھی ہے کہ قریش جب کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے تو آنحضرت ﷺ بھی شریک تھے اور دوش مبارک پر پتھر ڈھو ڈھو کر لاتے تھے۔ یہاں تک کہ شانے چھل گئے تھے۔ ایضاً: ١٥٨٢۔ [3] اضافہ وزیادہ۔

[4] توراۃ تکوین قصہ یوسف علیہ السلام (باب: ٣٤ آیت: ١١، ص: ٥٦ مدرسہ آکسفورڈ ١٩٨٠ء)۔

آیا، تیسرے دن جب وعدہ گاہ پر پہنچا، تو آنحضرت ﷺ کو اسی جگہ منتظر پایا۔ لیکن اس خلاف وعدہ سے آپ کی پیشانی پر بل تک نہ آیا، صرف اس قدر فرمایا کہ ''تم نے مجھے زحمت دی، میں اسی مقام پر تین دن سے موجود ہوں۔'' ❶

کاروبار تجارت میں ہمیشہ آپ اپنا معاملہ صاف رکھتے تھے۔ نبوت سے پہلے بھی جن لوگوں سے تجارت میں آپ کا سابقہ تھا وہ بھی اس کی شہادت دیتے تھے۔ سائب نامی ایک صحابی جب مسلمان ہو کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ تو لوگوں نے ان کی تعریف کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔'' سائب نے کہا، آپ پر میرے ماں باپ قربان، آپ میرے شریک تجارت تھے، لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا۔ فکنت لا تداری ولا تماری ❷ قیس بن سائب مخزومی رضی اللہ عنہ ایک اور صحابی بھی آپ کے شریک تجارت تھے، وہ بھی انہی الفاظ کے ساتھ آپ کے حسن معاملہ کی شہادت دیتے ہیں۔ ❸

تجارت کی غرض سے آپ ﷺ نے شام و بصریٰ اور یمن کے متعدد سفر کئے تھے۔

تزویج خدیجہ

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایک معزز خاتون تھیں۔ ان کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں آنحضرت ﷺ کے خاندان سے ملتا ہے اور اس رشتہ کے لحاظ سے وہ آپ کی چچیری بہن تھیں۔ ان کی دو شادیاں پہلے ہو چکی تھیں، اب وہ بیوہ تھیں، چونکہ نہایت شریف النفس اور پاکیزہ اخلاق تھیں، جاہلیت میں لوگ ان کو طاہرہ کے نام سے پکارتے تھے، نہایت دولت مند تھیں، طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ جب اہل مکہ کا قافلہ تجارت کو روانہ ہوتا تھا تو اکیلا ان کا سامان تمام قریش کے برابر ہوتا تھا۔ ❹

جناب رسول اللہ ﷺ کی عمر اب پچیس برس کی ہو چکی تھی، متعدد قومی کاموں میں آپ ﷺ شریک ہو چکے تھے، تجارت کے کاروبار کے ذریعہ سے لوگوں کے ساتھ معاملات پیش آتے تھے، اس بنا پر آپ ﷺ کے حسن معاملہ، راست بازی، صدق و دیانت اور پاکیزہ اخلاقی کی عام شہرت ہو چکی تھی، یہاں تک زبانِ خلق نے آپ کو امین کا لقب دے دیا تھا، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان اسباب کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ ''آپ میرا مال تجارت لے کر شام کو جائیں، جو معاوضہ میں اوروں کو دیتی ہوں آپ کو اس کا مضاعف دوں گی۔'' آنحضرت ﷺ نے قبول فرمایا اور مال تجارت لے کر بصریٰ تشریف لے گئے۔

واپس آنے کے تقریباً تین مہینہ کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کے پاس شادی کا پیغام بھیجا، ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن ان کے چچا عمرو بن اسد زندہ تھے، عرب میں عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ

❶ سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی العدۃ: ٤٩٩٦۔ ❷ ابو داود، کتاب الادب، باب فی کراھیۃ المراء: ٤٨٣٦۔ ❸ اصابہ، (ج ٥، ص: ٣٥٣) ترجمۃ قیس بن سائب۔
❹ زرقانی، ج ١، ص: ٢٣١ پر اس کا ذکر ہے۔

شادی بیاہ کے متعلق خود گفتگو کر سکتی تھیں اور اس میں بالغہ نابالغہ کی قید نہ تھی، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے چچا کے ہوتے ہوئے خود براہ راست تمام مراتب طے کیے۔ تاریخ معین پر ابوطالب اور تمام رؤسائے خاندان جن میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر آئے، ابوطالب نے خطبہ نکاح پڑھا اور پانچ سو طلائی درہم مہر قرار پایا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے والد زندہ تھے اور ان کی موجودگی میں نکاح ہوا، لیکن شراب میں مخمور تھے، جب ہوش میں آئے تو نکاح کا حال سن کے برہم ہوئے کہ یہ برابر کا جوڑ نہیں۔

لیکن یہ روایت صحیح نہیں، امام سہیلی نے بہ تصریح اور بدلیل ثابت کیا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے والد جنگ فجار سے قبل انتقال کر چکے تھے۔ [1]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جس مکان میں رہتی تھیں، وہ آج بھی (حسب بیان مؤرخ طبری) انہیں کے نام سے مشہور ہے، امیر معاویہ نے اس مکان کو خرید کر مسجد بنا دیا۔ [2]

شادی کے وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس برس کی تھی اور پہلے دو شوہروں سے دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں، ان کے نام اور مفصل حالات آگے آئیں گے۔ [3]

آنحضرت ﷺ کی جس قدر اولاد ہوئی، بجز حضرت ابراہیم کے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہی کے بطن سے ہوئی، ان کے حالات آگے تفصیل سے آئیں گے۔

جستہ جستہ واقعات

یہ واقعات تھے جن میں تاریخی ترتیب معلوم ہے، اس لئے مسلسل لکھے گئے، ان امور کے سوا جستہ جستہ واقعات کا بھی پتہ لگتا ہے، چونکہ ان کے سنین اور تاریخیں غیر معلوم ہیں، اس لئے ان کو عام سلسلہ سے الگ یکجا لکھنا زیادہ موزوں ہوگا۔

حدودِ سفر

اہلِ مکہ عموماً تجارت کی غرض سے سفر کرنے کے عادی تھے، آنحضرت ﷺ نے بھی اس تقریب سے متعدد سفر کیے، شام اور بصریٰ کے سفر کا حال پہلے گزر چکا ہے، اس کے علاوہ اور مقامات تجارت میں بھی آپ کا تشریف لے جانا ثابت ہے۔ عرب میں مختلف مقامات میں جو بازار قائم تھے ان میں سے حباشہ کا ذکر ابن سید الناس نے کیا ہے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جہاں جہاں آپ کو تجارت کی غرض سے بھیجا تھا، ان میں جرش بھی

---

[1] الروض الانف، ج۱، ص:۱۲۲ وطبقات ابن سعد، الجزء الاول، القسم الاول، ص:۸۵۔

[2] تاریخ طبری، ج۳، ص:۱۱۳۰۔ [3] حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے واقعات ابن ہشام، ابن سعد وطبری میں باختلاف اجمال وتفصیل واثبات ونفی مذکور ہیں، میں نے قرائن سے جو روایت زیادہ قابل اعتبار پائی نقل کی ہے، یکجا تمام حالات دیکھنے ہوں تو زرقانی جلد اول صفحہ ۲۳۲ سے ۲۳۶ تک دیکھنا چاہیے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مکان کا ذکر صرف طبری، (ج ۳، ص:۱۱۳۰) نے کیا ہے، ابن حنبل، (مسند ابن عباس، ج ۱، ص:۳۱۲) میں بھی واقعات مذکور ہیں۔

ہے، جو یمن میں ہے، حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے اور علامہ ذہبی نے بھی تصدیق کی ہے کہ جرش میں آپ ﷺ دو دفعہ تشریف لے گئے اور ہر دفعہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے معاوضہ میں ایک اونٹ دیا۔ ❶

نبوت کے بعد جس سال آپ ﷺ کی خدمت میں عرب کے تمام دور دراز مقامات سے وفود آئے۔ ان میں جب بحرین سے عبدالقیس کا وفد آیا تو آپ ﷺ نے بحرین کے ایک ایک مقام کا نام لے کر وہاں کا حال پوچھا، لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ آپ ہمارے ملک کا حال ہم سے زیادہ جانتے ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے تمہارے ملک کی خوب سیر کی۔'' ❷ مؤرخین یورپ نے جو علوم غیبی کے منکر ہیں اور جو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ ﷺ کے تمام معارف و معلومات سیر و سفر سے ماخوذ ہیں، قیاسات کے ذریعہ سے اس دائرہ کو اور وسعت دی ہے۔ ایک مؤرخ نے لکھا ہے کہ ''آپ نے بحری سفر بھی کیا تھا جس کی دلیل یہ ہے، کہ قرآن مجید میں جہازوں کی رفتار اور طوفان کی کیفیت کی ایسی صحیح تصویر ہے جس سے (نعوذ باللہ) ذاتی تجربہ کی بو آتی ہے۔'' ❸ مؤرخ مذکور کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ آپ مصر بھی تشریف لے گئے تھے اور ڈیڈسی (بحرمیت) کا بھی معائنہ کیا تھا، لیکن تاریخی دفتر ان واقعات سے خالی ہے۔ ❹

مراسم شرک سے اجتناب

یہ قطعاً ثابت ہے کہ آپ بچپن اور شباب میں بھی جب کہ منصب پیغمبری سے ممتاز نہیں ہوئے تھے، مراسم شرک سے ہمیشہ مجتنب رہے۔

ایک دفعہ قریش نے آپ ﷺ کے سامنے کھانا لا کر رکھا، یہ کھانا بتوں کے چڑھاوے کا تھا، جانور جو ذبح کیا گیا تھا کسی بت کے نام پر ذبح کیا گیا تھا، آپ ﷺ نے کھانے سے انکار کیا۔ ❺

نصاریٰ نے دعویٰ کیا ہے کہ آپ کے اعتقادات میں جو تغیر ہوا ہے وہ عہد نبوت سے ہوا ہے، ورنہ اس سے پہلے آپ ﷺ کا طرز عمل وہی تھا، جو آپ کے خاندان اور اہل شہر کا تھا، چنانچہ آپ نے اپنے پہلے صاحبزادہ کا نام عبدالعزیٰ ❻ رکھا تھا اور یہ روایت خود امام بخاری کی تاریخ صغیر میں موجود ہے، ❼ لیکن یہ

---

❶ نور النبراس فی شرح ابن سید الناس۔ ❷ مسند امام احمد بن حنبل، ج ٤، ص: ٢٠٦ (س)

❸ مارگولیتھ، صفحہ ۵۷۔ ❹ یورپین مؤرخین جن کی بنیاد صرف قیاس ورائے پر ہوتی ہے، اگر اس قسم کے واقعات بیان کریں تو کوئی تعجب نہیں ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کا مصر جانا درحقیقت یورپ کے عہد مظلم کی مضحکہ انگیز روایت ہے۔ بحری سفر آپ نے یقیناً نہیں کیا، لیکن اگر بحرین تشریف لے جانے کی روایت صحیح ہے تو خلیج فارس آپ نے دیکھا ہوگا، بحرمیت کا مشاہدہ بھی ممکن ہے کیونکہ اس کا موقع عرب وشام کے درمیان میں ہے، جہاں سے آپ کئی بار تجارت کے ساتھ گزرے ہوں گے۔ (س) ❺ صحیح بخاری، کتاب المناقب الانصار، حدیث زید بن عمرو بن نفیل: ٣٨٢٦ یہ حدیث امام بخاری نے اور ابواب میں بھی نقل کی ہے، اس کے الفاظ میں اجمال رہ گیا ہے، جو اس روایت میں صاف ہوگیا ہے، مسند امام ابن حنبل، ١٩٠ میں ایک روایت ہے، جس میں بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے زید کو اس کھانے پر بلایا اور زید نے انکار کیا اور پھر آنحضرت ﷺ نے اس تاریخ سے کبھی بتوں پر ذبح کیا ہوا کھانا نہیں کھایا، لیکن اس روایت کے راویوں کا حال نہیں ملتا اور یوں بھی بخاری کے سامنے اس روایت کی کیا وقعت ہے۔ ❻ عزیٰ ایک بت کا نام تھا۔ ❼ ص: ۳۔

روایت اگر صحیح بھی ہو تو اس سے آنحضرت ﷺ کی نسبت کیونکر استدلال ہو سکتا ہے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اسلام سے پہلے بت پرست تھیں، انہوں نے یہ نام رکھا ہوگا، آنحضرت ﷺ ابھی تک منصب ارشاد پر مامور نہیں ہوئے تھے، اس لئے آپ ﷺ نے تعرض نہ فرمایا ہوگا اور اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت فی نفسہٖ بھی ثابت نہیں، اس روایت کا سب سے زیادہ صحیح سلسلہ وہ ہے جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ صغیر میں روایت کیا ہے، اس کا پہلا راوی اسمٰعیل ہے، جس کا پورا نام اسمٰعیل بن ابی اویس ہے، اگرچہ بعض محدثین نے اس کی توثیق کی ہے، لیکن گروہ کثیر کی رائے حسب ذیل ہے: (ماخوذ از تہذیب التہذیب، ج ا، ص: ۳۱۰ تا ۳۱۲)

معاویہ بن صالح	اسماعیل اور اس کا باپ دونوں ضعیف ہیں۔
یحییٰ بن مخلط	وہ جھوٹ بولتا ہے اور محض ہیچ ہے۔
امام نسائی	ضعیف اور غیر ثقہ ہے۔
نصر بن سلمہ مروزی	وہ کذاب ہے۔
دار قطنی	میں اس کو صحیح روایت کے لئے پسند نہیں کرتا۔
سیف بن محمد	وہ جھوٹی حدیثیں بناتا ہے۔
سلمہ بن شیب	مجھ سے اس نے خود اقرار کیا کہ جب کبھی کسی بات میں اختلاف ہوتا تھا تو میں ایک حدیث بنا لیتا تھا

یہ امر واقعی طور پر ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نبوت سے پہلے بت پرستی کی برائی شروع کر دی تھی اور جن لوگوں پر آپ کو اعتماد تھا، ان کو اس بات سے منع فرماتے تھے۔ [1]

[1] (مستدرک حاکم، ج ۳، ص: ۲۱۶-۲۱۷ ذکر زید رضی اللہ عنہ بن حارثہ) (س) مسٹر مارگولیتھ نے اس کے برخلاف ایک حیرت انگیز دعویٰ کیا ہے اور اس کے ثبوت میں دعویٰ سے زیادہ تر حیرت انگیز فریب کاری کی ہے کہ "آنحضرت ﷺ اور خدیجہ رضی اللہ عنہا دونوں سونے سے پہلے ایک بت کی پرستش کر لیا کرتے تھے جس کا نام عزیٰ تھا۔"

مصنف موصوف نے اس کی سند میں امام احمد بن حنبل کی روایت (جلد ۴ صفحہ ۲۲۲) پیش کی ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

حدثنی جار لخدیجة بنت خویلد انه سمع النبی ﷺ وهو یقول لخدیجة ای خدیجة والله لا اعبد اللات والعزی والله لا اعبد ابدا قال فتقول خدیجة خل اللات خل العزی قال كانت صنمهم التی كانوا یعبدون ثم یضطجعون۔

"مجھ سے خدیجہ (بنت خویلد) کے ایک ہمسایہ نے بیان کیا کہ میں نے پیغمبر صاحب ﷺ کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے یہ کہتے سنا کہ اے خدیجہ! بخدا میں کبھی لات اور عزیٰ کی پرستش نہ کروں گا، خدیجہ کہتی تھی کہ لات کو جانے دیجئے، عزیٰ کو جانے دیجئے (یعنی ان کا ذکر بھی نہ کیجئے) اس نے کہا کہ لات و عزیٰ وہ بت تھے جس کی پرستش اہل عرب سونے سے پیشتر کر لیا کرتے تھے۔"

ایک معمولی عربی دان بھی سمجھ سکتا ہے کہ عبارت مذکور میں "كانوا" کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اہل عرب لات، عزیٰ کی پرستش کیا کرتے تھے، اگر آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہوتا تو تثنیہ کا صیغہ ہوتا نہ کہ جمع کا، اس کے علاوہ وہ خود اسی روایت میں لات و عزیٰ کی پرستش سے آنحضرت ﷺ کا سخت انکار کرنا مذکور ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

موحدین کی ملاقات

اس میں شبہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے فیض الٰہی کی خفیف شعاعیں عرب میں پھیلنی شروع ہو گئی تھیں، چنانچہ قس بن ساعدہ، ورقہ بن نوفل، عبید اللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث، زید بن عمرو بن نفیل نے بت پرستی سے انکار کر دیا تھا [1] ان میں سے آنحضرت ﷺ نے زید سے ملاقات کی تھی، جس کا ذکر صحیح بخاری میں بھی ہے، ورقہ عیسائی ہو گئے تھے اور چونکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے برادر عم زاد تھے اور مکہ ہی میں رہتے تھے، اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ آپ ان سے بھی ملے ہوں گے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ ان سے آپ کی دوستی تھی۔

ادب ومحاضرات کی کتابوں میں عموماً اور بعض تاریخوں میں بھی مذکور ہے کہ قس بن ساعدہ نے عکاظ میں جو مشہور خطبہ دیا تھا، آنحضرت ﷺ اس خطبہ میں شریک تھے، اس خطبہ کا بڑا حصہ اکثر اہل ادب نے نقل کیا ہے اور چونکہ اس کے فقرے بظاہر قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں کی طرح چھوٹے چھوٹے اور مقفٰی ہیں اس لئے عیسائی مؤرخین نے دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ طرز انہی سے لیا ہے، چنانچہ بعض فقرے یہ ہیں:

ایھا الناس اسمعوا ووعوا واذا وعیتم فانتفعوا۔ انه من عاش مات۔ ومن مات فات وکل ماھواٰت اٰت۔ مطر ونبات۔ وارزاق واقوات۔ و آباء وامھات۔ واحیاء واموات، وجمیع واشتات ان فی السماء لخبرا۔ وان فی الارض لعبرا، لیل داج۔ و سماء ذات ابراج وبحار ذات امواج۔ ما لی اری الناس یذھبون فلا یرجعون۔ ارضوا بالمقام فاقاموا۔ ام ترکوا ھناك فناموا۔ این من بنی وشید۔ وزخرف ونجد وعد المال والولد۔ این من بغی وطغی۔

قس بن ساعدہ کی روایت اور اس کا خطبہ مختصر ومطول بہ عبارات مختلفہ۔ بغوی، ازدی، بیہقی، جاحظ وغیرہ نے نقل کیا ہے، لیکن وہ سرتاپا مصنوعی اور موضوع ہے، اس کے رواۃ عموماً ناقابل سند بلکہ کذاب ہیں، چنانچہ سیوطی نے موضوعات میں اس روایت کے تمام طریقوں کو نقل کر کے ان کے رواۃ سے بحث کی ہے اور علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر وغیرہ کے اقوال تفصیل سے نقل کئے ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ یہ روایت مختلف طریقوں

(گزشتہ سے پیوستہ) مارگولیتھ صاحب نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عزیٰ کے نام پر ایک خاکی رنگ کی بھیڑ ذبح کی تھی، لیکن صاحب موصوف نے اسکی سند میں کوئی عربی ماخذ پیش نہیں کیا بلکہ ولہوسن کا حوالہ دیا ہے (دیکھو مارگولیتھ کی کتاب صفحہ: ۶۸ تا ۷۰) معجم البلدان (ایک جغرافیہ کی کتاب) میں ایک روایت اس مضمون کی موجود ہے (لیکن اولاً تو اس موضوع خاص میں یہ کتاب خود بے سند ہے، ثانیاً یہ روایت) کلبی سے ہے، جو مشہور دروغ گو ہے۔

[1] ابن ہشام، ج ا، ص: ۱۴۳ تا ۱۴۸ (نسخہ محمد علی صبیح) میں قس بن ساعدۃ کے سوا باقی سب لوگوں کے نام اور حالات مذکور ہیں، زید کا ذکر بخاری [کتاب المناقب، باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل، ج ا، ص: ۵۴۰] میں بھی ہے۔ قس کا ذکر نہایت کثرت سے تمام تاریخوں اور ادب کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

سے مروی ہے، لیکن ہر طریقہ میں کوئی نہ کوئی راوی ایسا ہے جو موضوع حدیثیں بنایا کرتا تھا، اس کا ایک مشترک راوی محمد بن حجاج ہے، اس کی نسبت ابن معین کا قول ہے کہ ''کذاب اور خبیث ہے۔'' ابن عدی نے لکھا ہے کہ ''ہریسہ کی حدیث اسی نے وضع کی ہے۔'' ایک طریقہ کا راوی سعید بن ہبیرہ ہے، اس کی نسبت ابن حبان نے لکھا ہے کہ ''ثقہ لوگوں کی زبانی جھوٹی حدیثیں روایت کرتا تھا، یا تو وہ خود یہ حدیثیں تصنیف کرتا تھا، یا اور لوگ اس کے لئے بنا دیا کرتے۔'' ایک طریقہ کے راوی قاسم بن عبداللہ اور احمد بن سعید ہیں اور یہ دونوں حدیث بنانے میں بدنام ہیں، بیہقی نے اس روایت کے متعلق ایک بڑا قصہ نقل کیا ہے جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قس بن ساعدہ کا پورا خطبہ اپنی یاد سے بیان کیا ہے، یہ روایت پوری کی پوری موضوع ہے۔ ❶ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے اور طریقے بھی نقل کئے ہیں اور ان کی تضعیف کی ہے۔ ❷

---

❶ یہ پوری تفصیل اللآلی المصنوعة، مطبوعہ مصر، صفحہ: ۹۵ تا صفحہ: ۱۰۰ میں ہے۔

❷ ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے بنو امیہ اور عباسیہ کے زمانہ میں یہ مذاق پیدا ہو گیا تھا کہ اپنے زمانہ کے شعرا اور فصحا سے اشعار اور خطبے تصنیف کراتے تھے اور جاہلیت یا ابتدائے اسلام کے شعرا اور خطبا کے نام سے مشہور کرتے تھے۔ محمد بن اسحاق اس رتبہ کے شخص ہیں کہ امام بخاری نے جزء القراءۃ میں ان سے روایت کی ہے، تاہم ان کا یہ عام طریقہ تھا، علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال، (مطبوعہ مصر، صفحہ: ۹۲) میں خطیب بغدادی سے روایت کی ہے کہ محمد بن اسحاق شعرائے وقت کو مغازی کے واقعات دے دیتے تھے۔ ان کے بارے میں اشعار کہہ دو ان اشعار کو وہ اپنی کتاب میں شامل کر دیتے تھے۔ ابن ہشام میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، ابوبکر، امیہ بن ابی الصلت، ابوطالب کے سینکڑوں اشعار نقل کئے ہیں، جن کی زبان اور انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی زبان نہیں ہے، ایک لطیف بات یہ ہے کہ ابن ہشام ان اشعار کو نقل کر کے اکثر موقعوں پر لکھ دیتے ہیں کہ فن شعر کے ماہران اشعار کی نسبت انکار کرتے ہیں، مثلاً سریہ عبیدۃ بن الحرث میں (ابن ہشام، جلد اول، صفحہ: ۳۶۰ مطبوعہ مصر) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے اور لکھا ہے:

واکثر اھل العلم والشعر ینکر بھذہ القصیدۃ لا بی بکر۔

''اور اکثر اہل علم اور فن شعر والے اس بات کے منکر ہیں کہ یہ قصیدہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہے۔''

یہ وضاعی مختلف اغراض سے کی جاتی تھی، زیادہ اس وجہ سے کہ ان جلسوں یا شعروں میں آنحضرت ﷺ کے مبعوث ہونے کی پیشین گوئی یا اور کوئی بات اسلام کی تصدیق کی شامل کر دیتے تھے، مثلاً یہی قس بن ساعدہ کا خطبہ اس میں یہ فقرے بھی ہیں۔

نبیا قدحان حینہ واظلکم اوانہ فطو بی لمن امن بہ فھداہ وویل لمن خالفہ وعصاہ (اللآلی المصنوعة، صفحہ: ۲۸)

ایک پیغمبر کا زمانہ قریب آ گیا ہے سو اس کو مبارکی ہے جو اس پر ایمان لائے گا اور وہ اس کو ہدایت کرے گا اور تباہی ہے اس کے لئے جو اس کی مخالفت اور نافرمانی کرے گا۔''

ابوطالب کے نام سے جو لامیہ قصیدہ ابن ہشام وغیرہ نے نقل کیا ہے (ابن ہشام، جلد ۱، صفحہ: ۱۶۷، ۱۷۷) سرتاپا موضوع ہے اس کے خاتمہ کے اشعار یہ ہیں:

فاصبح فینا احمد فی ارومہ　　تقصر عنہ سورۃ المتطاول

فایدہ رب العباد بنصرہ　　واظھر دینا حقہ غیر باطل

(اس قصیدہ کو سرتاپا موضوع کہنے کے بجائے جیسا کہ مصنف نے کہا ہے اکثر کہنا صحیح ہے کیونکہ اس کے دو شعر صحاح میں بھی مذکور ہیں مثلاً صحیح بخاری وصحیح مسلم باب الاستسقاء (مگر صحیح بخاری: ۱۰۰۸، وسنن ابن ماجہ، باب الاستسقاء: ۱۲۷۲، اور مسند احمد، ج ۱، ص: ۷ و ج ۲، ص: ۹۳ میں ایک ہی شعر مذکور ہے اور صحیح مسلم میں وہ بھی نہیں ہے) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

احباب خاص

نبوت سے پہلے جو لوگ آپ کے احباب خاص تھے۔ سب نہایت پاکیزہ اخلاق، بلند رتبہ اور عالی منزلت تھے، ان میں سب سے مقدم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے، جو برسوں آپ کے شریک صحبت رہے۔ ❶ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچیرے بھائی حکیم بن حزام جو قریش کے نہایت معزز رئیس تھے۔ وہ بھی احباب خاص میں تھے، حرم کا منصب رفادہ انہی کے ہاتھ میں تھا، دارالندوہ کے بھی یہی مالک تھے۔ چنانچہ اسلام کے بعد امیر معاویہ کے ہاتھ ایک لاکھ درہم پر بیچ ڈالا۔ لیکن یہ کل رقم خیرات کر دی، آنحضرت ﷺ سے عمر میں ۵ برس بڑے تھے۔ ❷

اگرچہ یہ مدت تک یعنی ہجرت کے آٹھویں سال تک ایمان نہیں لائے، لیکن اس حالت میں بھی آنحضرت ﷺ سے نہایت محبت رکھتے تھے۔ ایک دفعہ کعبہ میں ذویزن کا اسباب نیلام ہوا تھا، اس میں ایک عمدہ حلہ تھا، انہوں نے پچاس اشرفیوں میں اس کو خریدا اور مدینہ لے کر آئے کہ آنحضرت ﷺ کو نذر کریں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں مشرکوں کا ہدیہ قبول نہیں کرتا، البتہ قیمت لو تو لے سکتا ہوں۔'' مجبور ہو کر انہوں نے قیمت لینی گوارا کی اور آنحضرت ﷺ نے اس کو لے لیا۔ ❸

حضرت ضماد بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ جواز د کے قبیلہ سے تھے، جاہلیت میں طبابت اور جراحی کا پیشہ کرتے تھے، یہ

(گزشتہ سے پیوستہ) خود ابن اسحاق نے اس قصیدہ کو نقل کر کے لکھا ہے وبعض اهل العلم بالشعر ینکر اکثرها، یعنی بعض ماہرین شعر اس کے اکثر اشعار کی صحت سے انکار کرتے ہیں (س)۔ اکثر لوگ یہ کرتے تھے کہ قرآن مجید میں توحید اور معاد کے متعلق جو باتیں ہیں، ان کے مطابق اشعار تصنیف کراتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے اسلام کی تائید ہوگی۔ امیہ بن ابی الصلت کے نام سے جو اشعار منقول ہیں ان کو دیکھ کر صاف یقین ہو جاتا ہے کہ کسی نے قرآن مجید کو سامنے رکھ کر یہ اشعار کہے ہیں، مثلاً:

فقلت له اذهب بهارون فادعوا ۔۔۔ الى الله فرعون الذى كان طاغيا

وقولا لها انت رفعت هذه ۔۔۔ بلا عمد ارفق اذابك بانيا

وقولا لها انت سويت وسطها ۔۔۔ منيرًا اذا ما جنه الليل هاديا

ایک عجیب بات یہ ہے کہ مسٹر مارگولیتھ نے بھی ایک موقع پر اس کی تصدیق کی ہے، چنانچہ کہتے ہیں: ''قدیم شاعری کا اکثر حصہ قرآن کے اسلوب پر موزوں کیا گیا ہے۔'' (صفحہ ۲۷ تا صفحہ ۶۳) ان لوگوں نے اپنی دانست میں اسلام کی خیر خواہی کی غرض سے یہ کام کیا تھا، آج یورپ والے اسی سے یہ کام لیتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ پیغمبر نہ تھے بلکہ جاہلیت کے خطبا اور شعراء سے معتقدات اور خیالات بلکہ طرز ادا تک اخذ کرتے تھے، لیکن ادب کا نکتہ شناس یا فن روایت کا ماہر بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ تمام اشعار اور خطبے مصنوعی ہیں، یورپ کو فن ادب اور روایت میں مہارت کے لئے ابھی ایک زمانہ درکار ہے اور جب وہ زمانہ آئے گا تو یورپ کو اپنی بدمذاقی پر خود شرم آئے گی۔

❶ اصابه ذکر ابی بکر رضی اللہ عنہ (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام عبداللہ تھا، اصابہ میں اسی نام کے ذیل میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حال لکھا ہے (جلد ۲، ص: ۳۴۱) (س)

❷ اصابه ذكر حكيم بن حزام، (ج ۱، ص: ۳۴۹)، (س)

❸ مسند امام ابن حنبل، ج ۳، ص: ۴۰۳۔

بھی احباب خاص میں سے تھے۔ نبوت کے زمانہ میں یہ مکہ آئے، آنحضرت ﷺ کو اس حالت میں دیکھا کہ راستہ میں جا رہے ہیں اور پیچھے لونڈوں کا غول ہے، مکہ کے کفار آنحضرت ﷺ کو مجنوں کہتے تھے، لونڈوں کا غول دیکھ کر ضماد نے یہی قیاس کیا اور آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور کہا، محمد (ﷺ)! میں جنون کا علاج کر سکتا ہوں، آپ نے حمد و ثنا کے بعد چند مؤثر جملے ادا کیے، ضماد مسلمان ہو گئے۔ اس واقعہ کو مختصراً مسلم و نسائی [1] نے بھی لکھا ہے، لیکن زیادہ تفصیل مسند امام احمد بن حنبل (جلد ۱۔ صفحہ ۳۰۲) میں ہے۔

جو لوگ آنحضرت ﷺ کے ساتھ تجارت کے کاروبار میں شریک تھے، ان میں سے ایک صاحب قیس بن سائب مخزومی تھے۔ مجاہد بن جبیر جو مشہور مفسر گزرے ہیں، انہی کے غلام تھے، ان کا بیان ہے کہ شرکا کے ساتھ آپ کا معاملہ نہایت صاف رہتا تھا اور کبھی کوئی جھگڑا یا مناقشہ پیش نہیں آتا تھا۔ [2]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفیف الصلاة والخطبة:۲۰۰۸؛ سنن النسائی، کتاب النکاح، ما یستحب من الکلام عند النکاح:۳۲۸۰۔

[2] استیعاب، ج ۲، ص: ۵۳۷ واصابہ (س) (ج ۵، ص:۲۵۳)

آفتاب رسالت ﷺ کا طلوع

رسول اللہ ﷺ جس زمانہ میں پیدا ہوئے مکہ بت پرستی کا مرکز اعظم تھا، خود کعبہ میں تین سو ساٹھ بت تھے، رسول اللہ ﷺ کے خاندان کا تمغۂ امتیاز صرف اس قدر تھا کہ اس صنم کدہ کے متولی اور کلید بردار تھے، بااین ہمہ آنحضرت ﷺ نے کبھی بتوں کے آگے سر نہیں جھکایا، دیگر رسوم جاہلیت میں بھی کبھی شرکت نہیں کی، قریش نے اس بنا پر کہ ان کو عام لوگوں سے ہر بات میں ممتاز رہنا چاہیے یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ ایام حج میں قریش کے لئے عرفات جانا ضروری نہیں اور یہ کہ جو لوگ باہر سے آئیں، وہ قریش کا لباس اختیار کریں، ورنہ ان کو عریاں ہو کر کعبہ کا طواف کرنا ہوگا۔ [1] چنانچہ اسی بنا پر طواف عریاں کا عام رواج ہو گیا تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان باتوں میں کبھی اپنے خاندان کا ساتھ نہ دیا۔ [2]

عرب میں افسانہ گوئی کا عام رواج تھا۔ راتوں کو لوگ تمام اشغال سے فارغ ہو کر کسی مقام میں جمع ہوتے تھے، ایک شخص جس کو اس فن میں کمال ہوتا تھا، داستان شروع کرتا تھا، لوگ بڑے ذوق وشوق سے رات رات بھر سنتے تھے، بچپن میں ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے بھی اس جلسہ میں شریک ہونا چاہا تھا، لیکن اتفاق سے راہ میں شادی کا کوئی جلسہ تھا، دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے، وہیں نیند آ گئی، اٹھے تو صبح ہو چکی تھی۔ [3] ایک دفعہ اور ایسا ہی اتفاق ہوا، اس دن بھی یہی اتفاق پیش آیا، چالیس برس کی مدت میں صرف دو دفعہ اس قسم کا ارادہ کیا لیکن دونوں دفعہ توفیق الٰہی نے بچالیا کہ ''تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے۔'' [4]

یہ فطرت سلیم اور نیک سرشتی کا اقتضا تھا، لیکن ایک شریعت کبریٰ کی تاسیس، ایک مذہب کامل کی تشیید اور راہنمائی کونین کے منصب عظیم کے لئے کچھ اور درکار تھا، اسی زمانہ کے قریب میں اور حق پرستوں (ورقہ، زید، عثمان بن حویرث) کے دل میں خیال آیا کہ جماد لایعقل کے آگے سر جھکانا حماقت ہے، چنانچہ سب مذہب حق کی تلاش کے لئے نکلے، لیکن ناکامی کی دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر رہ گئے۔ ورقہ اور عثمان عیسائی ہو گئے اور زید یہ کہتے کہتے مر گئے ''اے خدا! اگر مجھ کو یہ معلوم ہوتا کہ تجھ کو کس طریقہ سے پوجنا چاہیے تو میں اسی طریقہ سے تجھ کو پوجتا۔'' [5]

آنحضرت ﷺ کے بہت سے دنیاوی تعلقات تھے، تجارت کا کاروبار تھا، متعدد اولادیں تھیں، تجارت کی ضرورت سے اکثر سفر کرنا پڑتا تھا، لیکن دست قدرت کو جو کام لینا تھا، وہ ان تمام مشاغل سے بالاتر تھا۔ دنیا اور دنیا کے تمام کام آپ کو ہیچ نظر آتے تھے، تاہم مطلوب حقیقی کا اب تک پتہ نہ تھا۔

---

[1] ابن هشام، مطبوعه مصر ۱۲۹۵ھ جلد۱، ص: ٦٧۔ [2] ابن هشام، ص: ٦٩۔ [3] بزار ومستدرك بحواله نسيم الرياض، ج ۱، ص: ٦٠٩ وخصائص الكبرىٰ سيوطى، ج ۱، ص: ٨٨ حيدر آباد: ١٣١٩ھ (س)۔

[4] سر ولیم میور صاحب ''لائف آف محمد ﷺ'' میں لکھتے ہیں: ہماری تمام تصنیفات محمد ﷺ کے بارہ میں ان کے چال چلن کی عصمت اور ان کے اطوار کی پاکیزگی پر جو اہل مکہ میں کمیاب تھی، متفق ہیں۔

[5] سيرت ابن هشام، ج ۱، ص: ١٤٤، مطبعه محمد على صبيح مصر۔

مکہ معظمہ سے تین میل پر ایک غار تھا، جس کو حرا کہتے ہیں، آپ مہینوں وہاں جا کر قیام فرماتے اور مراقبہ کرتے، کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے، وہ ختم ہو چکتا تو پھر گھر پر تشریف لاتے اور پھر واپس جا کر مراقبہ میں مصروف ہوتے۔

صحیح بخاری ❶ میں ہے کہ غار حرا میں آپ ﷺ تحنث یعنی عبادت کیا کرتے تھے، یہ عبادت کیا تھی؟

عینی شرح بخاری (ج ا ص:۷۲) میں ہے:

قیل ماكان صفة تعبده اجیب بان ذلك كان بالتفكر والاعتبار۔

''یہ سوال کیا گیا کہ آپ ﷺ کی عبادت کیا تھی؟ جواب یہ ہے کہ غور و فکر اور عبرت پذیری۔''

یہ وہی عبادت تھی جو آپ ﷺ کے دادا ابراہیم علیہ السلام نے نبوت سے پہلے کی تھی۔ ستاروں کو دیکھا تو چونکہ تجلی کی جھلک تھی، دھوکا ہوا، چاند نکلا تو اور بھی شبہ ہوا، آفتاب پر اس سے زیادہ، لیکن جب سب نظروں سے غائب ہو گئے تو بے ساختہ پکار اٹھے:

﴿ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ...... اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ﴾.

(٦/ الانعام:٧٧ تا ٨٠)

''میں فانی چیزوں کو نہیں چاہتا...... میں اپنا منہ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے زمین و آسمان پیدا کیا۔''

ایک مغربی مؤرخ نے آنحضرت ﷺ کی اس عبادت کی کیفیت اس طرح ادا کی ہے:

''سفر و حضر میں ہر جگہ محمد ﷺ کے دل میں ہزاروں سوال پیدا ہوتے تھے، میں کیا ہوں؟ یہ غیر متناہی عالم کیا ہے؟ نبوت کیا شے ہے؟ میں کن چیزوں کا اعتقاد کروں؟ کیا کوہ حرا کی چٹانیں، کوہ طور کی سر بفلک چوٹیاں، کھنڈر اور میدان، کسی نے ان سوالوں کا جواب دیا، نہیں ہرگز نہیں! بلکہ گنبد گرداں، گردش لیل و نہار، چمکتے ہوئے ستارے، برستے ہوئے بادل، کوئی ان سوالوں کا جواب نہ دے سکا۔'' ❷

نبوت کا دیباچہ یہ تھا کہ خواب میں آپ پر اسرار منکشف ہونے شروع ہوئے، جو کچھ آپ ﷺ خواب میں دیکھتے تھے بعینہٖ وہی پیش آتا تھا، ❸ ایک دن جب کہ آپ حسب معمول غار حرا میں مراقبہ میں مصروف تھے، فرشتۂ غیب نظر آیا کہ آپ سے کہہ رہا ہے:

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْؕ ﴾. (٩٦/ العلق:١ تا ٥)

---

❶ باب كيف كان بدء الوحى:٣۔ ❷ کارلائل ہیروز، تذکرہ رسول اللہ ﷺ۔ ❸ وحی کے انواع میں سے ایک خواب بھی ہے، صحیح بخاری کے شروع میں ہے: اول ما بدء به رسول الله ﷺ من الوحی الرؤیا الصالحة فی النوم (٣) و کتاب التعبیر، باب اول مابدئ به رسول الله ﷺ من الوحی:٦٩٨٢۔ میں زیادہ صاف طریقہ پر یہ مسئلہ ادا کیا گیا ہے۔

”پڑھ اس خدا کا نام جس نے کائنات کو پیدا کیا، جس نے آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھ تیرا خدا کریم ہے، وہ جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا، وہ جس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اسے معلوم نہ تھیں۔“

آپ گھر تشریف لائے تو جلالِ الٰہی سے لبریز تھے۔ [1]

آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے تمام واقعہ بیان کیا، وہ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، جو عبری زبان جانتے تھے اور توریت و انجیل کے ماہر تھے، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے واقعہ کی کیفیت سنی تو کہا یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر اترا تھا۔

روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ڈر پیدا ہوا! حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ ”آپ متردد نہ ہوں، خدا آپ کا ساتھ نہ چھوڑے گا“ پھر وہ آپ کو ورقہ کے پاس لے گئیں، انہوں نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی۔

آنحضرت ﷺ کی زبان سے بے شبہ یہ الفاظ نکلے ”مجھ کو ڈر ہے“ لیکن یہ تردد، یہ ہیبت، یہ اضطراب، جلالِ الٰہی کا تاثر (اور نبوت کے بارگراں کی عظمت کا تخیل تھا) آپ نے کیا دیکھا؟ ناموسِ اعظم نے کیا کہا؟ کیا کیا مشاہدات ہوئے؟ یہ وہ نازک باتیں ہیں جو الفاظ کا تحمل نہیں کر سکتیں۔

صحیح بخاری، کتاب التعبیر [2] میں ہے کہ چند روز تک جب وحی رک گئی تو آنحضرت ﷺ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے تھے کہ اپنے آپ کو گرا دیں، دفعتہً حضرت جبریل علیہ السلام نظر آتے تھے اور کہتے تھے: ”اے محمد (ﷺ) تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو۔“ اس سے آپ ﷺ کو اس وقت تسکین ہو جاتی تھی لیکن جب پھر وحی کچھ دنوں کے لئے رک جاتی تھی تو پھر آپ ﷺ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینا چاہتے تھے اور پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نمایاں ہو کر تسکین دیتے کہ آپ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے حصہ اول کی شرح میں معترضین کا یہ اعتراض نقل کیا ہے کہ ”ایک پیغمبر کو نبوت میں کیونکر شک ہو سکتا ہے اور ہو تو کسی عیسائی کے تسکین دینے سے کیا تسکین ہو سکتی ہے“۔ پھر ایک مشہور محدث کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ ”نبوت ایک امر عظیم ہے، اس کا تحمل دفعتہً نہیں ہو سکتا۔ اس لئے پہلے آنحضرت ﷺ کو خواب کے ذریعہ سے مانوس کیا گیا، پھر جب دفعتہً فرشتہ نظر آیا تو آپ اقتضائے بشریت سے خوف زدہ ہو گئے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو تسکین دی، پھر جب ورقہ نے تصدیق کی تو

---

[1] صحیح بخاری، باب بدء الوحی:۳۔

[2] صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب اول مابدئ به رسول الله ﷺ من الوحی: ٦٩٨٢، یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس وقت تک پیدا نہیں ہوئی تھیں، محدثین کی اصطلاح میں ایسی روایت کو مرسل کہتے ہیں، لیکن صحابہ کا مرسل محدثین کے نزدیک قابل حجت ہے کیونکہ متروک راوی بھی صحابہ ہی ہوں گے۔ (رضی اللہ عنہم)

آپ کو پورا یقین ہو گیا، محدث مذکور کے الفاظ یہ ہیں:

فلما سمع کلامه ایقن بالحق واعترف به.

''جب آپ ﷺ نے ورقہ کا کلام سنا تو آپ کو حق کا یقین آ گیا اور آپ نے اس کا اعتراف کیا۔''

محدث مذکور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ''وحی بار بار اس لئے رک جاتی تھی کہ آپ رفتہ رفتہ اس کے برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں۔'' ❶

لیکن جب کہ ترمذی میں یہ حدیث موجود ہے کہ ''نبوت سے پہلے سفر شام میں (بمقام بصریٰ) جس درخت کے نیچے آپ بیٹھے تھے اس کی تمام شاخیں آپ پر جھک آئیں جس سے بحیرا نے آپ کے نبی ہونے کا یقین کیا۔'' ❷ جبکہ صحیح مسلم میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ ''میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو نبوت سے پہلے مجھ کو سلام کیا کرتا تھا۔'' ❸ جب کہ صحاح میں موجود ہے کہ ''نبوت سے پہلے فرشتوں نے آپ کا سینہ چاک کیا اور جسمانی آلائش نکال کر پھینک دی۔'' ❹ تو خود ان روایتوں کے روایت کرنے والے کیونکر یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرشتہ کا نظر آنا ایسا واقعہ تھا جس سے آپ اس قدر خوفزدہ ہو جاتے تھے کہ ایک دفعہ تسکین ہو کر بھی بار بار اضطراب ہوتا تھا اور آپ اپنے آپ کو پہاڑ پر سے گرا دینے کا ارادہ کرتے تھے اور بار بار حضرت جبرائیل علیہ السلام کو اطمینان دلانے کی ضرورت ہوتی تھی، کیا اور کسی پیغمبر کو بھی ابتدائے وحی میں کبھی شک ہوا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخت سے آواز سنی ''کہ میں خدا ہوں'' تو کیا ان کو کوئی شبہ پیدا ہوا؟

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی پیروی کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں، ہم کو پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ خود اصل روایت بہ سند مرفوع متصل ہے، یا نہیں، یہ روایت امام زہری کے بلاغات میں سے ہے، یعنی سند کا سلسلہ زہری تک ختم ہو جاتا ہے اور آگے نہیں بڑھتا، چنانچہ خود شارحین بخاری نے تصریح کر دی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے عظیم الشان واقعہ کے لئے سند مقطوع کافی نہیں۔

آنحضرت ﷺ نے جب فرض نبوت ادا کرنا چاہا تو سخت مشکلیں پیش نظر تھیں، اگر آپ کا فرض اسی قدر ہوتا کہ مسیح علیہ السلام کی طرح صرف تبلیغِ دعوت پر اکتفا فرمائیں، یا حضرت کلیم علیہ السلام کی طرح اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل جائیں، تو مشکل نہ تھی۔ لیکن خاتمِ انبیا ﷺ کا کام خود سلامت رہ کر عرب اور نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کو فروغِ اسلام سے منور کر دینا تھا اس لئے نہایت تدبیر اور تدریج سے کام لینا پڑا، سب سے پہلا

❶ فتح الباری، شرح صحیح بخاری، کتاب التعبیر، جلد ۱۲، صفحہ: ۳۱۷۔ مطبوعہ مصر۔
❷ ابواب المناقب، باب ماجاء فی بدء نبوۃ النبی ﷺ: ۳۶۲۰۔
❸ کتاب الفضائل، باب فضل نسب النبی ﷺ وتسلیم الحجر علیه قبل النبوۃ: ۵۹۳۹۔
❹ ترمذی، ابواب التفسیر، سورۃ الم نشرح: ۳۳۴۶۔

مرحلہ یہ تھا کہ یہ پرخطر راز پہلے کس کے سامنے پیش کیا جائے، اس کے لئے صرف وہ لوگ انتخاب کئے جا سکتے تھے جو فیض یابِ صحبت رہ چکے تھے، جن کو آپ ﷺ کے اخلاق و عادات کی تمام حرکات و سکنات کا تجربہ ہو چکا تھا، جو پچھلے تجربوں کی بنا پر آپ کے صدق دعویٰ کا قطعی فیصلہ کر سکتے تھے، یہ لوگ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کی حرم محترم تھیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، جو آپ کی آغوش تربیت میں پلے تھے، زید رضی اللہ عنہ تھے، جو آپ کے آزاد کردہ غلام اور بندۂ خاص تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ [1] تھے جو برسوں سے فیضیابِ خدمت تھے۔ سب سے پہلے آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو یہ پیغام سنایا وہ سننے سے پہلے مومن تھیں، پھر اور بزرگوں کی باری آئی اور سب ہمہ تن اعتقاد تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دولت مند، ماہر انساب، صاحب الرائے اور فیاض تھے، ابن سعد نے لکھا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے، [2] غرض ان اوصاف کی وجہ سے مکہ میں ان کا عام اثر تھا اور معززین شہر ان سے ہر بات میں مشورہ لیتے تھے، ارباب روایت کا بیان ہے کہ کبار صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عثمان، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص فاتح ایران، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم سب انہی کی ترغیب اور ہدایت سے اسلام لائے۔ [3] ان کی وجہ سے یہ چرچا چپکے چپکے اور لوگوں میں بھی پھیلا اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، ان سابقین اولین میں عمار، خباب بن الارت، حضرت عثمان، عبدالرحمن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، طلحہ، ارقم، سعید بن زید، عبداللہ بن مسعود، عثمان بن مظعون، عبیدہ اور صہیب رومی رضی اللہ عنہم زیادہ ممتاز ہیں۔

لیکن جو کچھ ہوا پوشیدہ طور پر ہوا۔ نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ محرمان خاص کے سوا کسی کو خبر نہ ہونے پائے، جب نماز کا وقت آتا تو آنحضرت ﷺ کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور وہاں نماز ادا کرتے۔ ابن الاثیر کا بیان ہے کہ چاشت کی نماز آپ حرم ہی میں ادا کرتے تھے، کیونکہ یہ نماز قریش کے مذہب میں بھی جائز تھی۔ [4] ایک دفعہ آپ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کسی درہ میں نماز پڑھ رہے تھے، اتفاق سے آپ کے چچا ابوطالب آ نکلے، ان کو اس جدید طریقہ عبادت پر تعجب ہوا، کھڑے ہو گئے اور بغور دیکھتے رہے، نماز کے بعد پوچھا کہ یہ کون سا دین ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: "ہمارے دادا ابراہیم علیہ السلام کا یہی دین تھا۔" ابوطالب نے کہا: میں اس کو اختیار تو نہیں کر سکتا لیکن تم کو اجازت ہے اور کوئی شخص تمہارا مزاحم نہ ہو سکے گا۔ [5]

یہ تاریخِ اسلام کا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے کہ اسلام کیونکر پھیلا؟ مخالفین نے اس کا ذریعہ تلوار بتایا ہے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گی، لیکن ایک خاص پہلو پر یہیں نگاہ ڈال لینی

---

[1] اصابہ فی تمییز الصحابہ میں بزرگانِ موصوف کا تذکرہ ملاحظہ کرنا چاہیے۔ [2] الجزء الثالث، القسم الاول فی البدریین من المہاجرین، ص:۱۲۲۔ [3] دیکھو ریاض النضرۃ لمحب الطبری، مطبوعہ مصر، ص:۱۵۷۔

[4] کامل ابن اثیر، ج ۲، ص: ۲۱ مطبوعہ مصر ذکر الاختلاف فی اول من اسلم (س)

[5] مسند احمد، ج ۱، ص:۹۹ واصابہ، ج ۷، ص:۱۱۲۔

چاہیے، یعنی یہ کہ اوائل اسلام میں جب کہ اسلام لانا جان و مال سے ہاتھ دھونا تھا، کون لوگ اور کس قسم کے لوگ ایمان لائے؟

اس زمانہ میں جو لوگ اسلام لائے، ان میں چند خصائص مشترک تھے، اسی قسم کے (لیکن بالعکس) مشترک خصائص ان لوگوں میں بھی پائے جاتے تھے، جنہوں نے شدت سے مخالفت کی، چنانچہ تفصیل آگے آتی ہے:

① اکثر وہ لوگ اسلام لائے جو پہلے سے تلاشِ حق میں سرگرداں اور فطرۃً نیک طبع اور پاکیزہ اخلاق تھے۔ مثلاً: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جاہلیت میں بھی عفیف، پارسا اور صدق و دیانت میں مشہور تھے۔ عثمان بن مظعون صوفی مزاج تھے اور اسلام سے پہلے شراب چھوڑ چکے تھے۔ اسلام کے بعد چاہتے تھے کہ راہب بن جائیں لیکن آنحضرت ﷺ نے روکا۔ صہیب رضی اللہ عنہ عبداللہ بن جدعان کے تربیت یافتہ تھے جو اسلام سے پہلے تارکِ شراب ہو کر وفات پا چکے تھے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ جن کا اسلام لانے والوں میں چھٹا یا ساتواں نمبر تھا، ان کے اسلام لانے کا واقعہ یہ ہے کہ وہ پہلے سے بت پرستی چھوڑ چکے تھے اور غیر متعین طریقہ سے جس طرح ان کے ذہن میں آتا تھا، خدا کا نام لیتے تھے اور نماز پڑھتے تھے، جب آنحضرت ﷺ کا حال سنا تو اپنے بھائی کو بھیجا کہ صحیح خبر لائیں، وہ مکہ میں آئے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآن مجید کی سورتیں سنیں واپس جا کر ابوذر سے کہا کہ ''میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کو لوگ مرتد کہتے ہیں۔ وہ مکارم اخلاق سکھاتا ہے اور جو کلام سناتا ہے وہ شعر نہیں کوئی اور چیز ہے، تمہارا طریقہ اس سے بہت ملتا جلتا ہے۔'' ابوذر رضی اللہ عنہ کو تسکین نہیں ہوئی اور خود مکہ آئے زبان مبارک سے آپ ﷺ کا کلام سنا اور اسلام قبول کیا۔ وہ تمام عمر دنیاوی تعلقات سے الگ رہے، ان کا عقیدہ تھا کہ جو شخص زر و مال جمع کرتا ہے وہ مسلمان نہیں۔ چنانچہ اس بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں ان کو مدینہ سے دور بھیج دیا تھا۔ [1]

② بعض صحابہ رضی اللہ عنہم ایسے تھے جو احناف کے تربیت یافتہ تھے، یعنی وہ لوگ جو زمانۂ اسلام سے پہلے بت پرستی ترک کر چکے تھے اور اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیرو کہتے تھے، لیکن اس اجمالی اعتقاد کے سوا اور کچھ نہیں جانتے تھے اور اس لئے تلاشِ حق میں سرگرداں تھے۔ انہی میں زید بھی تھے، جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، انہوں نے تو آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پانچ برس پہلے وفات پائی، لیکن ان کے صاحبزادے سعید موجود تھے۔ وہ باپ کے ارشادات سن چکے تھے، آنحضرت ﷺ سے ملے تو ان کو وہ راہنما ہاتھ آ گیا جس کی

[1] حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ بخاری و مسلم دونوں میں مذکور ہے لیکن باہم اختلاف ہے، میں نے دونوں سے کچھ کچھ لیا ہے لیکن اختصار کے لحاظ سے بہت سی باتیں چھوڑ دیں۔ (بخاری میں دو جگہ کتاب المناقب، باب قصة زمزم: ۳۵۲۲ اور باب بنیان الکعبة، باب اسلام ابی ذر: ۳۸۶۱ اور صحیح مسلم، باب من فضائل ابی ذر: ۶۳۵۹-۶۳۶۲)

جستجو میں ان کے باپ دنیا سے چلے گئے اور وہ اب تک سرگشتہ تھے۔

③ یہ امر سب میں مشترک تھا کہ یہ لوگ قریش کے مناصب اعظم میں سے کوئی منصب نہیں رکھتے تھے، بلکہ اکثر ایسے تھے، مثلاً: عمار، خباب، ابوفکیہ، صہیب رضی اللہ عنہم وغیرہ جن کو دولت و جاہ کے دربار میں جگہ بھی نہیں مل سکتی تھی، چنانچہ آنحضرت ﷺ ان لوگوں کو لے کر حرم میں جاتے تو رؤسائے قریش ہنس کر کہتے:

﴿ أَهَٰؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا ﴾ (٦/ الانعام:٥٣)

''یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم لوگوں کو چھوڑ کر احسان کیا ہے۔''

کفار کے نزدیک ان کا افلاس ان کی تحقیر کا سبب تھا، لیکن یہی چیز تھی جس کی وجہ سے ایمان کی دولت سب سے پہلے ان ہی کے ہاتھ آ سکتی تھی، دولت و مال ان کے دلوں کو سیاہ نہیں کر چکا تھا۔ فخر وغرور ان کو انقیاد حق سے روک نہیں سکتا تھا۔ ان کو یہ ڈر نہ تھا کہ اگر بت پرستی چھوڑ دیں گے تو کعبہ کا کوئی منصب عظیم ہاتھ سے جاتا رہے گا، غرض ان کے دل ہر قسم کے زنگ سے پاک تھے اور حق کی شعاعیں ان پر دفعۃً پرتو افگن ہو سکتی تھیں، یہی سبب ہے کہ انبیا کے ابتدائی پیرو کار ہمیشہ نادار اور مفلس لوگ ہوتے تھے۔ عیسائیت کے ارکان اولین ماہی گیر تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے مقربین خاص کی نسبت کفار کو علانیہ کہنا پڑا:

﴿ وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ ﴾. (١١/ هود:٢٧)

''اور ہم تو بظاہر یہ دیکھتے ہیں کہ تیری پیروی انہی لوگوں نے کی جو رذیل ہیں اور ہم تو تم میں کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ تم سب جھوٹے ہو۔''

یہ سابقین اسلام جس قسم کا راسخ ایمان لائے تھے اس کی تفصیل آگے آتی ہے جس سے ظاہر ہوگا کہ قریش کی سخت خونخواریاں، جور وظلم کے شدائد، دولت و مال کی انتہائی ترغیبیں، کوئی چیز ان کو متزلزل نہ کر سکی اور آخر انہی کمزور ہاتھوں نے قیصر و کسریٰ کا تخت الٹ دیا۔

تین برس تک آنحضرت ﷺ نے نہایت رازداری کے ساتھ فرض تبلیغ ادا کیا، لیکن اب آفتاب رسالت بلند ہو چکا تھا، صاف حکم آیا:

﴿ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ ﴾ (١٥/ الحجر:٩٤) ''اور تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے واشگاف کہہ دے۔''

اور نیز حکم آیا: ﴿ وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴾ (٢٦/ الشعرآء:٢١٤)

''اور اپنے نزدیک کے خاندان والوں کو خدا سے ڈرا۔''

آنحضرت ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر پکارا: یا معشر القریش! لوگ جمع ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آ رہا ہے، تو تم کو یقین آئے گا؟'' سب نے

کہا: ''ہاں۔ کیونکہ تم کو ہمیشہ سے ہم نے سچ بولتے دیکھا ہے'' ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذاب شدید نازل ہوگا'' ۔ یہ سن کر سب لوگ جن میں ابولہب آپ کا چچا بھی تھا سخت برہم ہوکر واپس چلے گئے۔ ❶

چند روز کے بعد آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ دعوت کا سامان کرو۔ یہ درحقیقت تبلیغ اسلام کا پہلا موقعہ تھا، تمام خاندان عبدالمطلب مدعو کیا گیا، حمزہ، ابو طالب، عباس سب شریک تھے، آنحضرت ﷺ نے کھانے کے بعد کھڑے ہوکر فرمایا کہ ''میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کی کفیل ہے، اس بارگراں کے اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا۔'' تمام مجلس میں سناٹا تھا، دفعتہً حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر کہا: ''گو مجھ کو آشوب چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں اور گو میں سب سے نوعمر ہوں، تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا۔'' ❷

قریش کے لئے یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا کہ دو شخص (جن میں ایک سیزدہ سالہ نوجوان ہے) دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں، حاضرین کو بے ساختہ ہنسی آگئی لیکن آگے چل کر زمانے نے بتایا کہ یہ سراپا سچ تھا۔

اب مسلمانوں کی ایک معتدبہ جماعت تیار ہوگئی تھی جن کی تعداد چالیس سے زیادہ تھی، آپ نے حرم کعبہ میں جا کر توحید کا اعلان کیا۔ کفار کے نزدیک یہ حرم کی سب سے بڑی توہین تھی، اس لئے دفعتہً ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور ہر طرف سے لوگ آپ پر ٹوٹ پڑے، آنحضرت ﷺ کے ربیب حضرت حارث بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ گھر میں تھے، ان کو خبر ہوئی، دوڑے ہوئے آئے اور آنحضرت ﷺ کو بچانا چاہا، لیکن ہر طرف سے ان پر تلواریں پڑیں اور وہ شہید ہوگئے، اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا جس سے زمین رنگین ہوئی۔ ❸

قریش کی مخالفت اور اس کے اسباب

مکہ کی جو عزت تھی کعبہ کی وجہ سے تھی۔ قریش کا خاندان جو تمام عرب پر مذہبی حکومت رکھتا تھا اور جس کی وجہ سے وہ ہمسائگان خدا بلکہ آل اللہ یعنی خاندانِ الٰہی کہلاتے تھے۔ اس کی صرف یہ وجہ تھی کہ وہ کعبہ کے مجاور اور کلید بردار تھے، اس تعلق سے قریش کا کاروبار زیادہ پھیلتا گیا۔ یہاں تک کہ متعدد محکمے اور بڑے بڑے مناصب قائم کئے گئے۔ جن کی تفصیل یہ ہے: ❹

❶ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب وانذر عشیرتك الاقربین: ٤٧٧٠۔

❷ طبری نے تاریخ جلد ۳، ص: ۱۱۷۱ اور تفسیر جلد ۱۹، ص: ۶۸ میں عبدالغفار بن قاسم اور منہال بن عمرو کے واسطہ سے اس کو روایت کیا ہے۔ پہلا شیعی اور متروک ہے اور دوسرا بدمذہب۔ اس روایت میں اور بھی وجوہِ ضعف بلکہ وجوہِ وضع ہیں (س)

❸ اصابه فی تمییز الصحابة ذکر حارث بن ابی هالة، (ج ۱، ص: ۳۰٦)۔

❹ یہ تمام تفصیل عقد الفرید، جلد دوم، صفحہ: ۳۱ میں ہے۔ (س)

منصب	منصب کی تفصیل	کس خاندان کو کون سا منصب حاصل تھا	آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں کون لوگ ان مناصب پر فائز تھے
حجابہ	کعبہ کی کلید برداری اور تولیت		عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ
رفادہ	غریب حجاج کی خبر گیری	خاندان نوفل	حارث بن عامر رضی اللہ عنہ
سقایہ	حجاج کے پانی پلانے کا انتظام	خاندان ہاشم	حضرت عباس رضی اللہ عنہ
مشورہ		خاندان اسد	یزید بن ربیعہ الاسود
دیات ومغارم	خون بہا کا فیصلہ کرنا	خاندان تیم	حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ
عقاب	علم برداری	خاندان امیہ	ابوسفیان رضی اللہ عنہ
قبہ	خیمہ وخرگاہ کا انتظام اور سواروں کی افسری	خاندان مخزوم	ولید بن مغیرہ رضی اللہ عنہ
سفارت ومنافرت	سفیر ہو کر جانا اور جن قبیلوں میں یہ نزاع پیش آئے کہ شریف تر کون ہے؟ اس کا فیصلہ کرنا۔	خاندان عدی	حضرت عمر رضی اللہ عنہ
ازلام وایسار	محکمہ فال کا انتظام	خاندان جمح	صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ
اموال	مہتمم خزانہ	خاندان سہم	حارث بن قیس

آغازِ اسلام میں جو لوگ قریش کے رؤسائے اعظم تھے اور جن کی عظمت واقتدار کا اثر تمام مکہ پر تھا ان کے نام یہ ہیں:

ابوسفیان بن حرب (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے باپ)	حرب فجار میں انہی کا باپ قریش کا سپہ سالار تھا۔
ابولہب (آنحضرت ﷺ کا چچا)	
ابوجہل	ولید بن مغیرہ کا بھتیجا اور اپنے قبیلہ کا سردار۔
ولید بن مغیرہ (حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا باپ)	قریش کا رئیس اعظم تھا۔
عاص بن وائل سہمی (حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا باپ)	نہایت دولت مند، کثیر الاولاد اور صاحب اثر تھا۔
عتبہ بن ربیعہ (امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا نانا)	نہایت شریف الطبع اور صاحب ریاست تھا۔

ان کے علاوہ، اسود بن مطلب، اسود بن عبد یغوث، نضر بن الحرث بن کلدہ، اخنس بن شریق ثقفی، ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط، صاحب اثر تسلیم کیے جاتے تھے۔

اس موقعہ پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ خاندان ہاشم اور بنو امیہ برابر کے حریف تھے اور دونوں میں مدت سے رشک ورقابت چلی آتی تھی۔

پہلا سبب

ناتربیت یافتہ اور تندخو قوموں کا خاصہ ہے کہ کوئی تحریک جو ان کے آبائی رسم وعقائد کے خلاف ہو، ان کو سخت برہم کر دیتی ہے۔ ان کے ساتھ ان کی مخالفت محض زبانی مخالفت نہیں ہوتی اور ان کی تشنگی انتقام کو، خون کے سوا کوئی چیز بجھا نہیں سکتی۔ آج ہندوستان اس قدر مہذب ہو گیا ہے لیکن اب بھی کسی عام مسئلہ مذہبی کی مخالفت کی جائے تو ایک حشر برپا ہو جاتا ہے اور حکومت موجودہ اگر منتظم اور صاحب جبروت نہ ہوتی تو اس زمین پر بارہا خون کا بادل برس چکا تھا۔

عرب ایک مدت سے بت پرستی میں مبتلا تھا۔ خلیلِ بت شکن کی یادگار (کعبہ) تین سو ساٹھ معبودوں سے مزین تھی، جن میں ''ہبل'' خدائے اعظم تھا، یہی بت ہر قسم کے خیر وشر کے مالک تھے، پانی برساتے تھے، اولادیں دیتے تھے، معرکہ ہائے جنگ میں فتحیں دلاتے تھے، خدا، یا تو سرے سے نہ تھا، یا تھا تو وجودِ معطل تھا۔

دوسرا سبب

اسلام کا اصل فرض اس طلسم کو دفعتہً برباد کر دینا تھا، لیکن اس کے ساتھ قریش کی عظمت واقتدار اور عالمگیر اثر کا بھی خاتمہ تھا۔ اس لئے قریش نے شدت سے مخالفت کی اور ان میں جن لوگوں کو جس قدر زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، اسی قدر مخالفت میں زیادہ سرگرم تھے۔

قریش کا رئیس اعظم حرب بن امیہ تھا، چنانچہ حرب فجار میں وہی سپہ سالار اعظم تھا۔ لیکن حرب کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ابوسفیان اس منصبِ عظیم کے حاصل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا، اس لئے ولید بن مغیرہ نے اپنی لیاقت اور اثر سے ریاست حاصل کی، ابوجہل اس کا بھتیجا تھا اور وہ بھی قریش میں امتیاز رکھتا تھا۔

ابوسفیان گو اپنے باپ کا منصب نہ حاصل کر سکا لیکن بنو امیہ کے خاندان کا سردار وہی تھا۔ خاندان ہاشم میں سب سے زیادہ کبیر السن ابولہب تھا، جو رسول اللہ ﷺ کا حقیقی چچا تھا۔

قبیلہ سہم میں سب سے زیادہ بااثر عاص بن وائل تھا۔ جو نہایت دولت مند اور کثیر الاولاد تھا۔

قریش کی عنان حکومت انہی رؤسا کے ہاتھ میں تھی اور یہی لوگ تھے جنہوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی، قریش کے اور اکابر مثلاً: اسود بن مطلب، اسود بن عبد یغوث، نضر بن الحرث، امیہ بن خلف، عقبہ بن ابی معیط انہیں لوگوں کے زیر اثر تھے اور اس وجہ سے اعدائے اسلام میں ان کے نام ہر جگہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

قریش کا یہ خیال تھا کہ نبوت کا منصب اعظم اگر کسی کو ملتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو ملتا۔

﴿وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾. (۴۳/ الزخرف:۳۱)

''وہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کو اترنا تھا، تو ان دو شہروں (مکہ وطائف) میں سے کسی رئیس اعظم

پر اترتا تھا" (یعنی ولید بن ربیعہ یا ابو مسعود ثقفی)

عرب میں ریاست کے لئے دولت اور اولاد سب سے پہلی اور سب سے ضروری شرط تھی، اولاد کی نسبت اکثر وحشی قوموں میں (ہندوستان میں بھی) یہ خیال رہا ہے کہ جو شخص صاحب اولاد نہ ہو، وہ عالم آخرت کی برکات سے محروم رہتا ہے۔

ہندوؤں میں بھی یہ خیال ہے کہ اولاد کے بغیر انسان کو پوری نجات نہیں مل سکتی۔

قریش میں اوصاف مذکورہ کے لحاظ سے جو لوگ ریاست کا استحقاق رکھتے تھے۔ وہ ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف، عاص بن وائل سہمی اور ابو مسعود ثقفی تھے۔ رسول اللہ ﷺ ان اوصاف سے بالکل خالی تھے، دولت کے غبار سے آپ کا دامن پاک تھا اور اولاد ذکور سال دو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہی۔

تیسرا سبب

قریش کو عیسائیوں سے بالطبع نفرت تھی جس کی وجہ یہ تھی ابراہۃ الاشرم (بادشاہ حبش) جو کعبہ کے ڈھانے کو آیا تھا، عیسائی تھا، یہی وجہ تھی کہ قریش عیسائیوں کے مقابلہ میں پارسیوں کو زیادہ پسند کرتے تھے، ایران اور روم کی جنگ میں ایرانیوں کو فتح ہوئی تو قریش نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور مسلمان شکستہ ہوئے، چنانچہ یہ آیات اتریں:

﴿الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۙ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ﴾

(۳۰/ الروم: ۱ تا ۵)

"قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہو گئے، لیکن یہ لوگ مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں پھر غالب آ جائیں گے، خدا ہی کو اختیار ہے پہلے بھی اور پیچھے بھی اور تب مسلمان اللہ کی مدد سے خوشی منائیں گے۔"

اسلام اور نصرانیت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانہ میں اسلام کا قبلہ بیت المقدس تھا اور مدینہ منورہ میں بھی ایک مدت تک یہی قبلہ رہا، ان اسباب سے قریش کو خیال ہوا کہ آنحضرت ﷺ عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

چوتھا سبب

ایک بڑا سبب قبائل کی خاندانی رقابت تھی۔ قریش میں دو قبیلے نہایت ممتاز اور حریف یک دگر تھے، بنو ہاشم و بنو امیہ، عبدالمطلب نے اپنے زور اور اثر سے بنو ہاشم کا پلہ بھاری کر دیا تھا۔ لیکن ان کے بعد اس خاندان میں کوئی صاحب اثر پیدا نہیں ہوا، ابو طالب دولت مند نہ تھے، عباس دولتمند تھے۔ لیکن فیاض نہ تھے، ابولہب

بدچلن تھا، اس پر بنو امیہ کا اقتدار بڑھتا جاتا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی نبوت کو خاندان بنو امیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا، اس لئے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرت ﷺ کی مخالفت کی، بدر کے سوا باقی تمام لڑائیاں ابوسفیان ہی نے برپا کیں اور وہی ان لڑائیوں میں رئیس لشکر رہا۔

عقبہ بن ابی معیط جو سب سے زیادہ آنحضرت ﷺ کا دشمن تھا اور جس نے نماز پڑھنے کی حالت میں آپ کے دوش مبارک پر اونٹ کی اوجھ لا کر ڈالی تھی (اموی تھا) بنوامیہ کے بعد جس قبیلہ کو بنو ہاشم کی برابری کا دعویٰ تھا، وہ بنو مخزوم تھے، ولید بن المغیرہ اسی خاندان کا رئیس تھا، اس لئے اس قبیلہ نے بھی آنحضرت ﷺ کی سخت مخالفت کی۔ ابوجہل کی ایک تقریر سے اس بیان کی پوری تصدیق ہوتی ہے، ایک دفعہ اخنس بن شریق، ابوجہل کے پاس گیا اور کہا کہ "محمد ﷺ کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟" ابوجہل نے کہا: ہم اور بنو عبد مناف (یعنی آل ہاشم) ہمیشہ حریفِ مقابل رہے، انہوں نے مہمانداریاں کیں تو ہم نے بھی کیں۔ انہوں نے خون بہا دیئے تو ہم نے بھی دیے، انہوں نے فیاضیاں کیں تو ہم نے ان سے بڑھ کر کیں، یہاں تک کہ جب ہم نے ان کے کاندھے سے کاندھا ملا دیا، تو اب بنو ہاشم پیغمبری کے دعویدار ہیں، خدا کی قسم! ہم اس پیغمبر پر کبھی ایمان نہیں لا سکتے۔ [1]

پانچواں سبب

ایک بڑا سبب یہ تھا کہ قریش میں سخت بداخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں، بڑے بڑے ارباب اقتدار نہایت ذلیل بداخلاقیوں کے مرتکب تھے، ابولہب جو خاندان ہاشم میں سب سے زیادہ ممتاز تھے، اس نے حرم محترم کے خزانہ سے غزال زریں چرا کر بیچ ڈالا تھا، [2] اخنس بن شریق جو بنو زہرہ کا حلیف اور روٴسائے عرب میں شمار کیا جاتا تھا، نمام اور کذاب تھا، نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی، اسی طرح اکثر اربابِ جاہ مختلف قسم کے اعمال شنیعہ میں گرفتار تھے۔ آنحضرت ﷺ ایک طرف بت پرستی کی برائیاں بیان فرماتے تھے، دوسری طرف ان بداخلاقیوں میں سخت دارو گیر کرتے تھے جس سے ان کی عظمت و اقتدار کی شہنشاہی متزلزل ہوتی جاتی تھی، قرآن مجید میں پیہم علانیہ ان بدکاروں کی شان میں آیتیں نازل ہوتی تھیں اور گو طریقہ بیان عام ہوتا تھا۔ لیکن لوگ جانتے تھے کہ روئے سخن کس کی طرف ہے۔

﴿ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۝ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ ۝ أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ۝ ﴾. (٦٨/ القلم: ١٠ تا ١٤)

"اور اس شخص کے کہنے میں نہ آنا جو بات بات میں قسم کھاتا ہے، آبرو باختہ ہے، طاعن ہے،

[1] ابن هشام، ج ۱، ص: ۱۹۳ مطبوعه مصر۔

[2] حرم میں ایک سونے کا ہرن مدت سے خزانہ میں محفوظ تھا، ابولہب نے چرا کر فروخت کر دیا۔ یہ واقعہ عموماً تاریخوں میں مذکور ہے، ابن قتیبہ نے بھی معارف (ص ۵۵ مطبوعہ مصر) میں اس کا ذکر کیا ہے۔ (تاریخ طبری، ج ۳، ص: ۱۱۳۵)

چغلیاں کھاتا ہے، لوگوں کو اچھے کاموں سے روکتا ہے، حد سے بڑھ گیا ہے، بد ہے، تندخو ہے اوران سب باتوں کے ساتھ جھوٹا نسب بناتا ہے، اس لئے کہ وہ مالدار اور لڑکوں والا ہے۔"

﴿كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۝ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝﴾.

(۹۶/ العلق:۱۵، ۱۶)

"وہ سن رکھے کہ اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے جو کہ جھوٹی اور خطا کار ہے۔"

ممکن تھا کہ وعظ و پند کا نرم طریقہ اختیار کیا جاتا، لیکن مدت کی عربی نخوت، دولت و اقتدار کا فخر، ریاست کا زعم ان چیزوں کے ہوتے ہوئے جب تک ضرب نہایت سخت نہ ہوگی وہ خبردار نہ ہوتے، اس لئے بڑے بڑے جبار اس طرح مخاطب کئے جاتے تھے:

﴿ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ۝ وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا ۝ وَبَنِينَ شُهُودًا ۝ وَمَهَّدتُّ لَهُ تَمْهِيدًا ۝ ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ۝ كَلَّا ۖ إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا ۝﴾. (۷۴/ المدثر:۱۱تا۱۶)

"ہم کو اور اس کو تنہا چھوڑ دو۔ میں نے اس کو اکیلا پیدا کیا، پھر بہت سا مال دیا۔ بیٹے دیے سامان دیا۔ پھر چاہتا ہے کہ ہم اس کو اور دیں، ہرگز نہیں، وہ ہماری آیتوں کا دشمن ہے۔"

یہ خطاب ولید بن مغیرہ کے ساتھ ہے جو قریش کا سرتاج تھا اور یہ الفاظ اس شخص کی زبان سے ادا ہوتے تھے جس کو ظاہری جاہ واقتدار حاصل نہ تھا۔

لیکن مخالفت کی جو سب سے بڑی وجہ تھی اور جس کا اثر تمام قریش بلکہ تمام عرب پر یکساں تھا یہ تھا کہ جو معبود سینکڑوں برس سے عرب کے حاجت روائے عام تھے اور جن کے آگے وہ ہر روز پیشانی رگڑتے تھے، اسلام ان کا نام ونشان مٹاتا تھا اور ان کی شان میں کہتا تھا:

﴿إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۹۸)

"بلاشبہ تم اور جن چیزوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو۔ سب دوزخ کے ایندھن ہوں گے۔"

قریش کے تحمل کے اسباب

ان اسباب کے ساتھ جن میں سے ہر ایک قریش کو سخت مشتعل کر دینے کے لئے کافی تھا، توقع یہ تھی کہ اعلانِ دعوت کے ساتھ سخت خونریزیاں شروع ہو جاتیں، لیکن قریش نے تحمل سے کام لیا اور اس کے ناگزیر اسباب تھے۔ قریش خانہ جنگیوں میں تباہ ہو چکے تھے اور حرب فجار کے بعد اس قدر عاجز آ گئے تھے کہ لڑائی کے نام سے ڈرتے تھے۔ قبیلہ پرستی کی وجہ سے لڑائی صرف اتنی سی بات پر شروع ہو جاتی تھی کہ کسی قبیلہ کا کوئی آدمی قتل کر دیا جائے، مقتول کا قبیلہ بغیر کسی تحقیق کے انتقام کے لئے کھڑا ہو جاتا تھا اور جب تک بدلہ نہ لے لیا

جائے، یہ آگ بجھ نہیں سکتی تھی، رسول اللہ ﷺ کے قتل پر آمادہ ہونا قریش کے لئے نہایت آسان تھا، لیکن وہ جانتے تھے کہ بنو ہاشم خون کا انتقام نہ چھوڑیں گے اور پھر سلسلہ بہ سلسلہ تمام مکہ جنگ میں مبتلا ہو جائے گا، بہت سے لوگ اسلام لا چکے تھے اور قریباً کوئی قبیلہ ایسا باقی نہ تھا جس میں دو ایک شخص اسلام نہ لا چکے ہوں، اس لئے اسلام اگر جرم تھا تو صرف ایک شخص اس کا مجرم نہ تھا، بلکہ سینکڑوں تھے اور سب کا استیصال کرنا ممکن نہ تھا۔

رؤسائے قریش میں متعدد ایسے تھے جو شریف النفس تھے، وہ بدنفسی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے خیال میں نیک نیتی کی بنا پر مخالفت کرتے تھے، اس بنا پر وہ چاہتے تھے کہ معاملہ صلح و آشتی سے طے ہو جائے۔ [1]

غرض جب آنحضرت ﷺ نے اعلان دعوت کیا اور بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع کی تو قریش کے چند معززوں نے ابوطالب سے آ کر شکایت کی، ابوطالب نے نرمی سے سمجھا کر رخصت کر دیا۔ لیکن چونکہ بنائے نزاع قائم تھی یعنی آنحضرت ﷺ ادائے فرض سے باز نہ آ سکتے تھے، اس لئے یہ سفارت دوبارہ ابوطالب کے پاس آئی، اس میں تمام رؤسائے قریش یعنی عتبہ بن ربیعہ، شیبہ، ابوسفیان، عاص بن ہشام، ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ شریک تھے، ان لوگوں نے ابوطالب سے کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے، ہمارے آباء و اجداد کو گمراہ کہتا ہے، ہم کو احمق ٹھہراتا ہے، اس لئے یا تو تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ یا تم بھی میدان میں آؤ کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے۔ ابوطالب نے دیکھا کہ اب حالت نازک ہو گئی ہے۔ قریش اب تحمل نہیں کر سکتے اور میں تنہا قریش کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آنحضرت ﷺ سے مختصر لفظوں میں کہا کہ ”جانِ عم! میرے اوپر اتنا بار نہ ڈال کہ میں اٹھا نہ سکوں“۔ رسول اللہ ﷺ کی ظاہری پشت و پناہ جو کچھ تھے ابوطالب تھے، آنحضرت ﷺ نے دیکھا کہ اب ان کے پائے ثبات میں بھی لغزش ہے، آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا: ”خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لا کر دے دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا، خدا، اس کام کو پورا کرے گا، یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا“۔ آپ کی پر اثر آواز نے ابوطالب کو سخت متاثر کیا، رسول اللہ ﷺ سے کہا: ”جا! کوئی شخص تیرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔“ [2]

آنحضرت ﷺ بدستور دعوتِ اسلام میں مصروف ہوئے، قریش اگرچہ آنحضرت ﷺ کے قتل کا ارادہ نہ کر سکے لیکن طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، راہ میں کانٹے بچھاتے تھے، نماز پڑھنے میں جسم مبارک پر نجاست ڈال دیتے تھے، بدزبانیاں کرتے تھے، ایک دفعہ آپ ﷺ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ بن ابی معیط نے آپ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے، قریش متحیر تھے کہ آپ یہ سب سختیاں کیوں جھیلتے ہیں۔ انسانی دماغ ایسی سخت نفس کشی اور جانبازی کا مقصد جاہ و دولت

---

[1] یہ آیت غالباً انہیں لوگوں کی شان میں ہے: ﴿ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْأَوْنَ عَنْهُ ﴾ (٦/ الانعام:٢٦) یعنی آنحضرت ﷺ کی ایذا رسانی سے تو لوگوں کو منع کرتے تھے، لیکن آپ کے دعوائے نبوت سے دور ہٹتے تھے۔“ اصابہ ذکر ابی طالب بحوالہ عبدالرزاق، ج٧، ص:١١٣۔ (س) [2] ابن ہشام، ج١، ص:١٦٤ مطبوعہ مصر۔

اور نام و نمود کی خواہش کے سوا اور کیا کر سکتا ہے، قریش نے بھی یہی خیال کیا، اس بنا پر عتبہ بن ربیعہ قریش کی طرف سے آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور کہا: ''محمد (ﷺ)! کیا چاہتے ہو؟ کیا مکہ کی ریاست؟ کیا کسی بڑے گھرانے میں شادی؟ کیا دولت کا ذخیرہ؟ ہم یہ سب کچھ مہیا کر سکتے ہیں اور اس پر بھی راضی ہیں کہ کل مکہ تمہارا زیر فرمان ہو جائے لیکن ان باتوں سے باز آ ؤ''۔

عتبہ کو اس درخواست کی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ لیکن ان سب ترغیبات کے جواب میں آپ ﷺ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ﴾.

(٤١/ حٰمٓ السجدة:٦)

''اے محمد کہہ دے کہ میں تمہیں جیسا آدمی ہوں، مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک خدا ہے، بس سیدھے اس کی طرف جاؤ اور اسی سے معافی مانگو۔''

﴿قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾. (٤١/ حٰمٓ السجدة:٩)

''اے محمد (ﷺ)! کہہ دے کہ کیا تم لوگ خدا کا انکار کرتے ہو جس نے دو دن میں یہ زمین پیدا کی اور تم خدا کے شریک قرار دیتے ہو، یہی سارے جہان کا پروردگار ہے۔''

عتبہ واپس گیا تو وہ عتبہ نہ تھا، اس نے قریش سے جا کر کہہ دیا کہ محمد (ﷺ) جو کلام پیش کرتے ہیں وہ شاعری نہیں کوئی اور چیز ہے، میری رائے یہ ہے کہ تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آ جائیں گے تو یہ تمہاری ہی عزت ہے، ورنہ عرب ان کو خود فنا کر دے گا''۔ لیکن قریش نے یہ رائے نامنظور کی۔ [1]

حضرت حمزہ اور عمر رضی اللہ عنہما کا اسلام، ٦ نبوی

آنحضرت ﷺ کے اعمام میں سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو آپ سے خاص محبت تھی، وہ آپ سے صرف دو تین برس بڑے تھے اور ساتھ کے کھیلے تھے، دونوں نے ثویبہ کا دودھ پیا تھا اور اس رشتہ سے بھائی بھائی تھے، وہ ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے لیکن آپ کی ہر ادا کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے، ان کا مذاق طبیعت سپاہ گری اور شکار افگنی تھا، معمول تھا کہ منہ اندھیرے تیر کمان لے کر نکل جاتے، دن بھر شکار میں مصروف رہتے، شام کو واپس آتے تو پہلے حرم میں جاتے، طواف کرتے، قریش کے رؤسا صحن حرم میں الگ الگ دربار جما کر بیٹھا کرتے تھے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ان لوگوں سے صاحب سلامت کرتے، کبھی کبھی کسی کے پاس بیٹھ جاتے، اس طریقہ سے سب سے یارانہ تھا اور سب لوگ ان کی قدر و منزلت کرتے تھے۔

[1] ابن هشام، ج ١، ص:١٧٩، ١٨٠ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی تاريخ الكبير، ج ٧، ص:٥١ میں یہ واقعہ اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخالفین جس بے رحمی سے پیش آتے تھے، بیگانوں سے بھی دیکھا نہ جا سکتا تھا۔ ایک دن ابوجہل نے رودررو آپ کے ساتھ نہایت سخت گستاخیاں کیں، ایک کنیز دیکھ رہی تھی، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شکار سے آئے تو اس نے تمام ماجرا کہا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ غصہ سے بے تاب ہو گئے، تیر و کمان ہاتھ میں لئے حرم میں آئے اور ابوجہل سے کہا ''میں مسلمان ہو گیا ہوں۔''

آنحضرت ﷺ کے جوشِ حمایت میں انہوں نے اسلام کا اظہار تو کر دیا، لیکن گھر پر آئے تو متردد تھے کہ آبائی دین کو دفعتہً کیونکر چھوڑ دوں، تمام دن سوچتے رہے، بالآخر غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ دین حق یہی ہے [1] دو ہی چار روز کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اسلام لائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ستائیسواں [2] سال تھا کہ آفتابِ رسالت طلوع ہوا۔ یعنی رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھرانے میں زید کی وجہ سے توحید کی آواز نامانوس نہیں رہی تھی چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعید رضی اللہ عنہ اسلام لائے۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ہوا تھا، اس تعلق سے فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی مسلمان ہو گئیں، اسی خاندان میں ایک اور معزز شخص نعیم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابھی تک اسلام سے بیگانہ تھے، ان کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو سخت برہم ہوئے، یہاں تک کہ قبیلہ میں جو لوگ اسلام لا چکے تھے ان کے دشمن بن گئے، لُبینہ رضی اللہ عنہا ان کے خاندان کی کنیز تھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کو بے تحاشا مارتے اور مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ ''دم لے لوں تو پھر ماروں گا، لبینہ کے سوا اور جس جس پر قابو چلتا تھا زدوکوب سے دریغ نہیں کرتے تھے، لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس کو چڑھ جاتا تھا اترتا نہ تھا، ان تمام سختیوں پر ایک شخص کو بھی وہ اسلام سے بددل نہ کر سکے۔ آخر مجبور ہو کر (نعوذ باللہ) خود ذاتِ نبوی ﷺ کے قتل کا ارادہ کیا، تلوار کمر سے لگا کر سیدھے رسول اللہ ﷺ کی طرف چلے، کارکنانِ قضا نے کہا:

ع آمد آں یارے کہ مامی خواستیم

راہ میں اتفاقاً نعیم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ مل گئے، ان کے تیور دیکھ کر پوچھا: خیر ہے؟ بولے کہ محمد ﷺ کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں، انہوں نے کہا: ''پہلے اپنے گھر کی خبر لو، خود تمہارے بہن اور بہنوئی اسلام لا چکے ہیں۔'' فوراً پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے، وہ قرآن پڑھ رہی تھیں، ان کی آہٹ پا کر چپ ہو گئیں اور قرآن کے اجزا چھپا لئے، لیکن آواز ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی، بہن سے پوچھا: یہ کیا آواز تھی؟ بولیں: کچھ نہیں، انہوں نے کہا: میں سن چکا ہوں تم دونوں مرتد ہو گئے ہو، یہ کہہ کر بہنوئی سے دست و گریباں ہوئے اور جب ان کی بہن

[1] حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے اسلام کا واقعہ عموماً سب نے لکھا ہے لیکن یہ اخیر واقعہ میں نے صرف ''روض الانف'' میں دیکھا ہے (ج ۱، ص: ۱۸۶)۔ [2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام میں الفاروق میں مفصل لکھ چکا ہوں، اسی کو بعینہٖ یہاں نقل کر دیا ہے، کہیں کہیں بعض الفاظ یا جملے بدل دیے ہیں (جامع نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کے واقعہ کی دوسری روایتیں سیرۃ النبی ﷺ جلد سوم باب استجابت دعا (ص: ۵۳۷ تا ۵۴۱ طبع جدید) میں مفصل درج کر دی ہیں۔ وہاں دیکھی جائیں)۔ (س)

بچانے کو آئیں تو ان کی بھی خبر لی۔ یہاں تک کہ ان کا جسم لہولہان ہو گیا۔ لیکن اسلام کی محبت اس سے بالاتر تھی، بولیں کہ "عمر جو بن آئے کرو۔ لیکن اسلام اب دل سے نکل نہیں سکتا۔" ان الفاظ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل پر خاص اثر کیا، بہن کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھا، ان کے جسم سے خون جاری تھا، دیکھ کر اور بھی رقت ہوئی، فرمایا تم لوگ جو پڑھ رہے تھے مجھ کو بھی سناؤ، فاطمہ رضی اللہ عنہا نے قرآن کے اجزاء لا کر سامنے رکھ دیے، اٹھا کر دیکھا تو یہ سورہ تھی:

﴿ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ﴾. (۵۷/ الحديد:۱)

"زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے خدا کی تسبیح پڑھتا ہے اور خدا ہی غالب اور حکمت والا ہے۔"

ایک ایک لفظ پر ان کا دل مرعوب ہوتا جاتا تھا، یہاں تک کہ جب اس آیت پر پہنچے:

﴿ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ (۵۷/ الحديد:۷) "خدا پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔"

تو بے اختیار پکار اٹھے کہ: (اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ).

"میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور یہ کہ محمد خدا کے پیغمبر ہیں۔"

یہ وہ زمانہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے مکان میں جو کوہِ صفا کی تلی میں واقع تھا، پناہ گزین تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آستانہ مبارک پر پہنچ کر دستک دی، چونکہ شمشیر بکف گئے تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم کو تردد ہوا، لیکن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے کہا: "آنے دو، مخلصانہ آیا ہے تو بہتر ہے، ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اندر قدم رکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود آگے بڑھے اور ان کا دامن پکڑ کے فرمایا: "کیوں عمر! کس ارادے سے آیا ہے؟" نبوت کی پرجلال آواز نے ان کو کپکپا دیا، نہایت خضوع کے ساتھ عرض کیا کہ "ایمان لانے کے لئے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بے ساختہ اللہ اکبر پکار اٹھے اور ساتھ ہی تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے مل کر اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اٹھیں۔ [1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے نے اسلام کی تاریخ میں نیا دور پیدا کر دیا، اس وقت تک اگرچہ چالیس پچاس آدمی اسلام لا چکے تھے، عرب کے مشہور بہادر حضرت حمزہ سید الشہداء رضی اللہ عنہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، تاہم مسلمان اپنے فرائض مذہبی علانیہ نہیں ادا کر سکتے تھے اور کعبہ میں نماز پڑھنا تو بالکل ناممکن تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کے ساتھ دفعتہً یہ حالت بدل گئی، انہوں نے علانیہ اسلام ظاہر کیا، کافروں نے اول اول بڑی شدت کی، لیکن وہ ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ کعبہ میں جا کر نماز ادا کی، ابن ہشام نے اس واقعہ کو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زبانی ان الفاظ میں روایت کیا ہے:

---

[1] انساب الاشراف بلاذری وطبقات ابن سعد الجزء الثالث، القسم الاول فی البدریین من المهاجرین، ص:۱۹۲ واسد الغابه، ج٤، ص:۵۳، ۵٤ وابن عساکر وکامل ابن الاثیر، ج۲، ص: ٦٤ تا ٦٦ مطبوعه لیڈن۔

فلما اسلم عمر قاتل قریشًا حتّٰی صلّٰی عند الکعبۃ و صلّینا معہ۔

"جب عمر اسلام لائے تو قریش سے لڑے یہاں تک کعبہ میں نماز پڑھی اور ان کے ساتھ ہم لوگوں نے بھی پڑھی۔"

صحیح بخاری میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، اتفاق سے عاص بن وائل آ نکلا، اس نے پوچھا: کیا ہنگامہ ہے، لوگوں نے کہا: عمر مرتد ہو گئے، عاص بن وائل نے کہا: "تو کیا ہوا، میں نے عمر کو پناہ دی۔" [1]

تعذیب مسلمین

رسوخِ عزم، قوتِ ارادہ، شدتِ عمل، انسان کے اصلی جوہر ہیں اور داد کے قابل ہیں، لیکن انہی اوصاف کا رخ جب بدل جاتا ہے تو وہ سخت دلی، بے رحمی، درندہ طبعی اور سفا کی کا مہیب قالب اختیار کر لیتے ہیں۔ اسلام جب آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوا اور رسول اللہ ﷺ اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان کے قبیلوں نے اپنے حصارِ حفاظت میں لے لیا تو قریش کا طیش وغضب ہر طرف سے سمٹ کر ان غریبوں پر ٹوٹا جن کا کوئی یار و مددگار نہ تھا، ان میں کچھ غلام اور کنیزیں تھیں، کچھ غریب الوطن تھے، جو دو ایک پشت سے مکہ میں آ رہے تھے اور کچھ کمزور قبیلوں کے آدمی تھے، جو کسی قسم کی عظمت و اقتدار نہیں رکھتے تھے، قریش نے ان کو اس طرح ستانا شروع کیا کہ جور و ستم کی تاریخ میں اس کی مثال پیدا کرنا قریش کی یکتائی کی تحقیر ہے۔

یہ آسان تھا کہ مسلمانوں کے خس و خاشاک سے سرزمین عرب دفعتہً پاک کر دی جاتی، لیکن قریش کا نشہ انتقام اس سے نہیں اتر سکتا تھا، مسلمان اگر اپنے مذہب پر ثابت قدم رہ کر پیوند خاک کر دیے جاتے تو اس میں جس قدر قریش کی تعریف نکلتی، اس سے زیادہ ان بیکسوں کا صبر و استقلال دادطلب ہوتا، قریش کی شان اس وقت قائم رہ سکتی تھی جب یہ لوگ جادۂ اسلام سے پھر کر پھر قریش کے مذہب میں آ جاتے، یا شاید ان کو مسلمانوں کی سخت جانی کا امتحان لینا اور اس کی داد دینا منظور تھا۔

قریش میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا دل واقعی اس حالت پر جلتا تھا کہ ان کا مدتوں کا بنا بنایا کارخانہ درہم برہم ہوا جاتا ہے، ان کے آباء و اجداد کی تحقیر کی جاتی ہے، قابل احترام معبودوں کی عظمت مٹی جاتی ہے، یہ لوگ صرف حسرت و افسوس کر کے رہ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ چند خام طبقوں کے دماغ میں خلل آ گیا ہے۔ عتبہ، عاص بن وائل وغیرہ اسی قسم کے لوگ تھے۔ لیکن ابوجہل، امیہ بن خلف وغیرہ کا معیار اس سے زیادہ بلند تھا۔

مسلمانوں پر ظلم کے طریقے

بہرحال قریش نے جور و ظلم کے عبرت ناک کارنامے شروع کئے، جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو وہ غریب مسلمانوں کو پکڑتے، عرب کی تیز دھوپ، ریتلی زمین کو دوپہر کے وقت جلتا توا بنا دیتی ہے، وہ ان غریبوں کو

[1] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اسلام عمر بن الخطاب: ٣٨٦٤، ٣٨٦٥۔

اسی توے پر لٹاتے، چھاتی پر بھاری پتھر رکھ دیتے کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، بدن پر گرم بالو بچھاتے، لوہے کو آگ پر گرم کر کے اس سے داغتے، پانی میں ڈبکیاں دیتے۔ ❶ یہ مصیبتیں اگرچہ تمام بیکس مسلمانوں پر عام تھیں لیکن ان میں جن لوگوں پر قریش زیادہ مہربان تھے، ان کے نام یہ ہیں:

حضرت خباب بن الارت، رضی اللہ عنہ تمیم کے قبیلہ سے تھے، جاہلیت میں غلام بنا کر فروخت کر دیے گئے تھے۔ ام انمار نے خرید لیا تھا، یہ اس زمانہ میں اسلام لائے جب آنحضرت ﷺ حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے گھر میں مقیم تھے اور صرف چھ سات شخص اسلام لا چکے تھے۔ قریش نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں، ایک دن کوئلے جلا کر زمین پر بچھائے، اس پر چت لٹایا، ایک شخص چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ بدلنے نہ پائیں، یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے، خباب رضی اللہ عنہ نے مدتوں کے بعد جب یہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے بیان کیا تو پیٹھ کھول کر دکھائی کہ برص کے داغ کی طرح بالکل سپید تھی ❷ [حضرت خباب رضی اللہ عنہ جاہلیت میں لوہاری کا کام کرتے تھے، اسلام لائے تو بعض لوگوں کے ذمہ ان کا بقایا تھا، مانگتے تو جواب ملتا جب تک محمد کا انکار نہ کرو گے، ایک کوڑی نہ ملے گی، یہ کہتے کہ نہیں جب تک تم مر کر پھر جیو نہیں۔] ❸

حضرت بلال رضی اللہ عنہ یہ وہی حضرت بلال ہیں جو مؤذن کے لقب سے مشہور ہیں۔ حبشی النسل اور امیہ بن خلف کے غلام تھے، جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو امیہ ان کو جلتی بالو پر لٹاتا اور پتھر کی چٹان سینہ پر رکھ دیتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں، ان سے کہتا کہ اسلام سے باز آ، ورنہ یوں ہی گھٹ گھٹ کر مر جائے گا، لیکن اس وقت بھی ان کی زبان سے "احد" کا لفظ نکلتا، جب یہ کسی طرح متزلزل نہ ہوئے تو گلے میں رسی باندھی اور لونڈوں کے حوالہ کیا، وہ ان کو شہر کے اس سرے سے اس سرے تک گھسیٹتے پھرتے تھے، لیکن اب بھی وہی رٹ تھی اَحَدْ اَحَدْ ❹۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ یمن کے رہنے والے تھے، ان کے والد "یاسر" مکہ میں آئے، ابوحذیفہ مخزومی نے اپنی کنیز سے جس کا نام سمیہ رضی اللہ عنہا تھا، شادی کر دی تھی۔ عمار رضی اللہ عنہ اسی کے پیٹ سے پیدا ہوئے، یہ جب اسلام لائے تو ان سے پہلے صرف تین شخص ❺ اسلام لا چکے تھے۔ قریش ان کو جلتی ہوئی زمین پر لٹاتے اور اس قدر مارتے کہ بیہوش ہو جاتے، ان کے والد اور والدہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا تھا۔

حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں، ان کو ابوجہل نے اسلام لانے کے جرم میں برچھی ماری اور وہ ہلاک ہو گئیں۔ ❻

یاسر رضی اللہ عنہ، حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے والد تھے، یہ بھی کافروں کے ہاتھ سے اذیت اٹھاتے اٹھاتے ہلاک

---

❶ یہ واقعات ابن سعد نے بلال وصہیب رضی اللہ عنہما کے حال میں بہ تفصیل لکھے ہیں۔ دیکھو کتاب مذکور۔ جلد ثالث تذکرۂ صحابہ بدر (بلال رضی اللہ عنہ کا تذکرہ ص:۱۶۵تا۱۷۰ اور صہیب رضی اللہ عنہ کا تذکرہ ص:۱۶۱تا۱۶۴ میں ہے)۔ ❷ طبقات ابن سعد، ج۳، تذکرۃ خباب، ص: ۱۱۶ تا ۱۱۸۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ مریم: ۴۷۳۲ تا ۴۷۳۵۔(س) ❹ طبقات ابن سعد، ج سوم، ص:۱۶۵، ۱۶۶۔ ❺ [تین شخص کتابت کی غلطی ہے صحیح تیس (۳۰) شخص سے زیادہ ہے۔ دیکھئے حاشیہ نمبر (۲) وطبقات ابن سعد، ج سوم، ص:۱۷۷ تذکرہ عمار رضی اللہ عنہ] ❻ کامل ابن اثیر ج ۲، ص: ۵۰۔

ہو گئے ۔ ❶

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ یہ رومی مشہور ہیں ۔لیکن درحقیقت رومی نہ تھے،ان کے والد سنان کسریٰ کی طرف سے ابلہ کے حاکم تھے اوران کا خاندان موصل میں آباد تھا،ایک دفعہ رومیوں نے اس نواح پر حملہ کیا اور جن لوگوں کو قید کر کے لے گئے ان میں صہیب رضی اللہ عنہ بھی تھے ۔ یہ روم میں پلے ۔اس لئے عربی زبان اچھی طرح بول نہ سکتے تھے،ایک عرب نے ان کو خریدا اور مکہ میں لایا یہاں عبداللہ بن جدعان نے ان کو خرید کر کے آزاد کر دیا۔

آنحضرت ﷺ نے جب دعوت اسلام شروع کی تو یہ اور عمار بن یاسر ایک ساتھ آنحضرت ﷺ کے پاس آئے، آپ نے اسلام کی ترغیب دی اور یہ مسلمان ہو گئے ۔ ❷ قریش ان کو اس قدر اذیت دیتے تھے کہ ان کے حواس مختل ہو جاتے تھے ۔ جب انہوں نے مدینہ کو ہجرت کرنی چاہی تو قریش نے کہا: اپنا سارا مال و متاع چھوڑ جاؤ تو جا سکتے ہو،انہوں نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔ ❸

حضرت ابو فکیہ رضی اللہ عنہ صفوان بن امیہ کے غلام تھے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ اسلام لائے امیہ کو جب یہ معلوم ہوا تو ان کے پاؤں میں رسی باندھی اور آدمیوں سے کہا کہ گھسیٹتے ہوئے لے جائیں اور تپتی ہوئی زمین پر لٹائیں،ایک ''گبریلا'' راہ میں جا رہا تھا،امیہ نے ان سے کہا،''تیرا خدا یہی تو نہیں ہے''۔انہوں نے کہا''میرا اور تیرا دونوں کا خدا اللہ تعالیٰ ہے''۔اس پر امیہ نے اس زور سے ان کا گلا گھونٹا کہ لوگ سمجھے دم نکل گیا،ایک دفعہ ان کے سینہ پر اتنا بھاری بوجھل پتھر رکھ دیا کہ ان کی زبان نکل پڑی۔

لبینہ رضی اللہ عنہا یہ بیچاری ایک کنیز تھیں،حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس ❹ بے کس کو مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے تھے کہ''میں نے تجھ کو رحم کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ تھک گیا ہوں۔''وہ نہایت استقلال سے جواب دیتیں کہ''اگر تم اسلام نہ لاؤ گے تو خدا اس کا انتقام لے گا۔''

حضرت زنیرہ رضی اللہ عنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھرانے کی کنیز تھیں اور اس وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ (اسلام سے پہلے) ان کو جی کھول کر ستاتے ، ابو جہل نے ان کو اس قدر مارا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔

حضرت نہدیہ اور ام عبیس رضی اللہ عنہما یہ دونوں بھی کنیزیں تھیں اور اسلام لانے کے جرم میں سخت سے سخت مصیبتیں جھیلتی تھیں۔ ❺

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دفتر فضائل کا یہ پہلا باب ہے کہ انہوں نے ان مظلوموں میں سے اکثروں کی جان بچائی۔ حضرت بلال، عامر بن فہیرہ، لبینہ، زنیرہ، نہدیہ، ام عبیس رضی اللہ عنہم سب کو بھاری بھاری داموں پر

❶ کامل ابن اثیر، ج۲، ص:۵۰۔ ❷ طبقات ابن سعد، ج۳، ص: ۱۷۷ تذکرۃ عمار بن یاسر، ص: ۱۶۲، ابن الاثیر "ذکر تعذیب المستضعفین"، ج۲، ص:۴۹ تا ۵۲ ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ عمار رضی اللہ عنہ اس وقت ایمان لائے جب آنحضرت ﷺ ارقم رضی اللہ عنہ کے مکان میں چلے آئے تھے اور جبکہ تیس شخص سے زیادہ اسلام لا چکے تھے۔

❸ طبقات ابن سعد، ج۳، ص:۱۶۲۔ ❹ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔

❺ (کامل ابن اثیر، ج۲، ص:۵۱، ۵۲ اور انساب الاشراف، ج۱) میں ان مستضعفین کا ذکر ہے۔

خریدا اور آزاد کردیا۔ ❶ یہ لوگ وہ تھے جن کو قریش نے نہایت سخت جسمانی اذیتیں پہنچائیں، ان سے کم درجہ پر وہ لوگ تھے جن کو طرح طرح سے ستاتے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جو کبیر السن اور صاحبِ جاہ و اعزاز تھے، جب اسلام لائے تو دوسروں نے نہیں بلکہ خود ان کے چچا نے رسی سے باندھ کر مارا ❷ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ جو ساتویں مسلمان ہیں جب مسلمان ہوئے اور کعبہ میں اپنے اسلام کا اعلان کیا تو قریش نے مارتے مارتے ان کو لٹا دیا، ❸ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ جن کا مسلمان ہونے والوں میں پانچواں نمبر تھا، جب اسلام لائے تو ان کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیتے تھے، ❹ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی سعید بن زید رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو رسیوں سے باندھ دیا۔ ❺

لیکن یہ تمام مظالم، یہ جلادانہ بے رحمیاں، یہ عبرت خیز سفاکیاں ایک مسلمان کو بھی راہِ حق سے متزلزل نہ کرسکیں۔ ایک نصرانی مؤرخ نے نہایت سچ لکھا ہے:

''عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد ﷺ کے خصائل نے وہ درجہ نشۂ دینی کا آپ کے پیروؤں میں پیدا کیا۔ جس کو عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے...... جب عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے، ان کا نشۂ دینی جاتا رہا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیے...... برعکس اس کے محمد ﷺ کے پیرو، اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپ ﷺ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا۔'' ❻

ہجرت حبش ۵ نبوی

قریش کے ظلم و تعدی کا بادل جب پیہم برس کر نہ کھلا تو رحمتِ عالم نے جان نثارانِ اسلام کو ہدایت کی کہ حبش کو ہجرت کر جائیں، حبش قریش کا قدیم تجارت گاہ تھا، وہاں کے حالات پہلے سے معلوم تھے، اہل عرب حبش کے فرمان روا کو نجاشی ❼ کہتے تھے اور اس کے عدل و انصاف کی عام شہرت تھی۔

جان نثارانِ اسلام ہر قسم کی تکلیف جھیل سکتے تھے اور ان کا پیمانۂ صبر لبریز نہیں ہوسکتا تھا، لیکن مکہ میں رہ

---

❶ (کامل ابن اثیر، ج۲، ص: ۵۰ تا ۵۲)۔ ❷ طبقات ترجمه عثمان بن عفان، ج۳، ص: ۳۸۔

❸ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اسلام ابی ذر: ۳۸۶۱۔ ❹ ریاض النضرة لمحب الطبری، الباب السادس فی مناقب الزبیر الفصل الرابع، ج۲، ص: ۲۶۳ آستانه مصر طبع اول۔

❺ بخاری، کتاب الاکراه، باب من اختار الضرب والقتل والهوان علی الکفر: ۶۹۴۲۔ اس وقت تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام نہیں لائے تھے۔ (س) ❻ اپالوجی گاڈفری ہیگنس، ترجمہ اردو صفحہ: ۶۶ و ۶۷ مطبوعہ بریلی ۱۸۷۳ء۔

❼ نجاشی۔ حبشی لفظ نجوش کی تعریب ہے جس کے معنی حبشی میں بادشاہ کے ہیں۔ نجاشی کا نام ''اصحمہ'' تھا۔ بخاری باب موت النجاشی: ۳۸۷۹۔ (س)

کر فرائضِ اسلام کا آزادی سے بجالانا ممکن نہ تھا، اس وقت تک حرم کعبہ میں کوئی شخص بلند آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے تو انہوں نے کہا میں اس فرض کو ضرور ادا کروں گا۔ لوگوں نے منع کیا۔ لیکن وہ باز نہ آئے، حرم میں گئے اور مقام ابراہیم کے پاس کھڑے ہو کر سورۃ الرحمٰن پڑھنا شروع کی، کفار ہر طرف ٹوٹ پڑے اور ان کے منہ پر طمانچے مارنے شروع کیے، اگرچہ انہوں نے جہاں تک پڑھنا تھا پڑھ کر دم لیا، لیکن واپس گئے تو چہرہ پر زخم کے نشان لے کر گئے۔ ❶ (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جاہ و اقتدار میں دیگر رؤسائے قریش سے کم نہ تھے، لیکن آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے اور اسی بنا پر ایک بار ہجرت کے لئے آمادہ ہو گئے)۔ ❷

اس کے علاوہ ہجرت سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ جو شخص اسلام لے کر جہاں جاتا وہاں اسلام کی شعاعیں خود بخود پھیلتی تھیں:

غرض آنحضرت ﷺ کے ایما سے اول اول گیارہ مرد اور چار عورتوں نے ہجرت کی جن کے نام حسب ذیل ہیں:

① حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان	مع اپنی زوجہ محترمہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے جو رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی تھیں۔
② حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ مع اپنی زوجہ کے جن کا نام حضرت سہلہ رضی اللہ عنہا (بنت سہیل) تھا	ان کا باپ عتبہ قریش کا مشہور سردار تھا، لیکن چونکہ سخت کافر تھا، اس لئے ان کو گھر چھوڑنا پڑا۔
③ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ	رسول اللہ ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی اور مشہور صحابی تھے۔
④ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	ہاشم کے پوتے تھے۔
⑤ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ	مشہور صحابی اور عشرۂ مبشرہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ قبیلہ زہرہ سے تھے اور اس بنا پر آنحضرت ﷺ کے ننہالی رشتہ دار تھے۔
⑥ حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ (بن عبدالاسد) مخزومی مع اپنی زوجہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا (بنت ابی امیہ) کے۔	یہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا وہی ہیں جو ابو سلمہ کے مرنے کے بعد آنحضرت ﷺ کے عقد میں آئیں۔
⑦ حضرت عثمان بن مظعون جمحی رضی اللہ عنہ	مشہور صحابی ہیں۔
⑧ حضرت عامر بن ربیعہ مع اپنی زوجہ کے جن کا نام حضرت لیلیٰ رضی اللہ عنہا (بنت ابی حشمہ) تھا۔	سابقین اولین میں ہیں۔ بدر میں بھی شریک تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سفر حج میں ان کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا تھا ❸

❶ طبری، ص: ۱۱۸۸۔ ج ۳۔(س)

❷ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرت مدینه: ۳۹۰۵۔(س)

❸ اصابه، ج ٤، ص: ۸ مطبع شرفیه مصر: ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء۔

۹۔حضرت ابوسبرہ بن ابی رہم [1] یا [2]	ان کی ماں برہ آنحضرت ﷺ کی پھوپھی تھیں، یہ سابقین فی الاسلام میں ہیں، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ ہجرت ثانیہ میں گئے تھے۔
حضرت ابوحاطب رضی اللہ عنہ [3] بن عمرو ۱۰ سہیل بن بیضاء	بدر میں شریک تھے، امام زہری کا بیان ہے کہ سب سے پہلے ان ہی نے ہجرت کی ہے۔ [4]
۱۱ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ	مشہور صحابی اور مجتہدین صحابہ میں داخل ہیں۔

ان لوگوں نے ۵ نبوی ماہ رجب میں سفر کیا۔حسن اتفاق یہ کہ جب یہ بندرگاہ پر پہنچے تو دو تجارتی جہاز حبش کو جارہے تھے، جہاز والوں نے سستے کرایہ پر ان کو بٹھالیا، ہر شخص کو صرف ۵ درہم دینے پڑے۔قریش کو خبر ہوئی تو بندرگاہ تک تعاقب میں آئے۔لیکن موقعہ نکل چکا تھا۔ [5]

عام مؤرخین کا خیال ہے کہ ہجرت انہی لوگوں نے کی جن کا کوئی حامی اور مددگار نہ تھا لیکن فہرست مہاجرین میں ہر درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنوامیہ سے تھے جو سب سے زیادہ صاحب اقتدار خاندان تھا۔متعدد بزرگ مثلاً: زبیر اور مصعب رضی اللہ عنہما خود آنحضرت ﷺ کے خاندان سے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور ابوسبرہ رضی اللہ عنہ معمولی لوگ نہ تھے، اس بنا پر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ قریش کا ظلم و ستم بے کسوں پر محدود نہ تھا، بلکہ بڑے بڑے خاندان والے بھی ان کے ظلم وستم سے محفوظ نہ تھے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ سب سے زیادہ مظلوم تھے اور جن کو انگاروں کے بستر پر سونا پڑا تھا، یعنی حضرت بلال، عمار، یاسر رضی اللہ عنہم وغیرہ ان لوگوں کا نام مہاجرین حبش کی فہرست میں نظر نہیں آتا۔اس لئے یا

---

[1] طبری، ج ۳، ص: ۱۱۸۳ وابن سعد، ج ۱، ص: ۱۳۶ مگر ابن ہشام نے سیرۃ لکھا ہے۔

[2] حبشہ کے مہاجرینِ اول کی تعداد اور ان کے تعین میں کسی قدر اختلاف ہے۔ابن اسحاق (ابن ہشام، ج ۱، ص: ۱۷۹ و ۱۹۸) نے مردوں میں ان ہی دس آدمیوں کا نام لیا ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے متعلق وہ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ ہجرت اولیٰ میں نہیں بلکہ ہجرت ثانیہ میں تھے (ابن ہشام ج ۱، ص: ۲۰۰ فتح الباری، جلد ۷ صفحہ ۱۴۳) واقدی نے مردوں میں گیارہ صاحبوں کی ہجرت کا ذکر کیا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے حضرت ابوسبرہ اور حضرت ابوحاطب رضی اللہ عنہما دونوں کو مہاجرین میں شمار کیا ہے اور ابن اسحاق ان میں سے ایک کو تسلیم کرتے ہیں۔اس سلسلے میں واقدی سے ایک بڑی فروگزاشت یہ ہوئی کہ انہوں نے گیارہ مردوں کو مہاجرین حبش بتلایا لیکن جب مہاجرین کی فہرست گنائی تو اس میں بارہ آدمیوں کا نام لیا، یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بھی اضافہ کیا (زرقانی علی المواہب، جلد اول، صفحہ: ۳۱۴) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے واقدی کی اس فروگزاشت پر گرفت کی ہے۔(فتح الباری، جلد ۷، ص: ۱۴۳) ابن سعد نے انہی تمام مہاجرین کا نام لیا ہے جس کا ذکر واقدی نے کیا ہے۔(ابن سعد، جلد اول، صفحہ: ۱۳۶) ابن سید الناس نے بھی بہ روایت زہری بارہ آدمیوں کا ذکر کیا ہے مگر انہوں نے حضرت زبیر کے بجائے حضرت سلیط بن عمرو رضی اللہ عنہ کا نام لیا ہے (عیون الاثر، اول، صفحہ: ۱۱۵) بعض دوسرے سیرت نگار جو بارہ مرد مہاجرین کو تسلیم کرتے ہیں وہ حضرت حاطب بن عمرو اور حضرت سہیل بن بیضاء کے بجائے حضرت حاطب بن حارث رضی اللہ عنہ اور حضرت ہاشم بن عمرو رضی اللہ عنہ کا نام لیتے ہیں۔(زرقانی، اول، ص: ۳۱۴) اسی طرح ہجرت کرنے والی خواتین میں بعض لوگ حضرت ابوسبرہ رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت ام کلثوم بنت سہیل اور حضور ﷺ کی دایہ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کا اضافہ کرتے ہیں (س)

[3] ابوحاطب حسب روایت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۱۹۸ لیکن طبری، ج ۳، ص: ۱۱۸۳ اور ابن سعد، ج ۱، ص: ۱۳۷ نے حاطب ہی لکھا ہے۔

[4] اصابہ، ج ۷، ص: ۴۰۔ [5] یہ تمام تفصیل طبری، ج ۳، ص: ۱۱۸۲، ۱۱۸۳ میں ہے مہاجرین حبشہ کے نام طبقات ابن سعد جزء اول قسم اول، ص: ۱۳۶ اور ۱۳۷ میں بھی ہیں۔

تو ان کی بے سروسامانی اس حد تک پہنچی تھی کہ سفر کرنا بھی ناممکن تھا یا یہ کہ درد کے لذت آشنا تھے اور اس لطف کو چھوڑ نہ سکتے تھے۔

دلم زجور تو آسودہ است ومی نالم کہ غیر پے نہ برد لذت خدنگِ ترا

نجاشی کی بدولت مسلمان حبش میں امن وامان سے زندگی بسر کرنے لگے لیکن قریش یہ خبریں سن سن کر پیچ وتاب کھاتے تھے، آخر یہ رائے ٹھہری کہ نجاشی کے پاس سفارت بھیجی جائے کہ ہمارے مجرموں کو اپنے ملک سے نکال دو، عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص (فاتح مصر) اس کام کے لئے منتخب ہوئے [1] نجاشی اور اس کے درباریوں میں سے ایک ایک کے لئے گراں بہا تحفے مہیا کئے گئے [2] اور نہایت سروسامان سے یہ سفارت حبش کو روانہ ہوئی، یہ سفراء نجاشی سے پہلے درباری پادریوں سے ملے اور ان کی خدمت میں نذریں پیش کیں اور کہا کہ ہمارے شہر کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے، ہم نے ان کو نکال دیا تو آپ کے ملک میں بھاگ آئے۔ کل ہم بادشاہ کے دربار میں ان کے متعلق جو درخواست پیش کریں، آپ بھی ہماری تائید فرمائیں۔ دوسرے دن سفراء دربار میں گئے اور نجاشی سے درخواست کی کہ ہمارے مجرم ہم کو حوالہ کر دیے جائیں۔ درباریوں نے بھی تائید کی۔ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا اور کہا: ''تم نے یہ کون سا دین ایجاد کیا ہے جو نصرانیت اور بت پرستی دونوں کے مخالف ہے؟''

مسلمانوں نے اپنی گفتگو کرنے کے لئے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی) کو انتخاب کیا۔ انہوں نے اس طرح تقریر شروع کی:

''أَیُّهَا الْمَلِكُ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے۔ بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے، اس اثنا میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا جس کی شرافت اور صدق ودیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے، اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھلایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں۔ نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوۃ دیں، ہم اس پر ایمان لائے۔ شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمال بد سے باز آئے۔ اس جرم پر ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہوگئی اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ اسی گمراہی میں واپس آ جائیں''۔

نجاشی نے کہا: ''جو کلامِ الٰہی تمہارے پیغمبر پر اترا ہے کہیں سے پڑھو''۔ جعفر رضی اللہ عنہ نے سورۂ مریم کی چند

---

[1] مسند احمد، ج ۱، ص: ۲۰۲ (س) [2] ابن ہشام، ج ۱، ص: ۲۰۵ نے لکھا ہے کہ مکہ کا بڑا تحفہ چمڑا تھا۔ اور کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل مکہ اور شام وغیرہ کو جو مال تجارت لے جاتے تھے، وہ بھی چمڑا ہوتا تھا۔ (مسند امام ابن حنبل میں تصریح ہے کہ یہ تحفہ چمڑا ہی تھا۔ مسند اہل البیت) بلکہ مسند امام احمد، ج ۴، ص: ۱۹۸ میں خود حضرت عمرو بن عاص کے یہ الفاظ موجود ہیں: ''وکان احب ما یهدی الیه من ارضنا الادم فجمعناه له ادما کثیرا''۔

آیتیں پڑھیں۔ نجاشی پر رقت طاری ہوئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، پھر کہا: ’’خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔‘‘ یہ کہہ کر سفرائے قریش سے کہا: تم واپس جاؤ میں ان مظلوموں کو ہرگز واپس نہ دوں گا۔‘‘

دوسرے دن عمرو بن العاص نے پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا، حضور! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے ہیں، نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا کہ اس سوال کا جواب دیں، ان لوگوں کو تردد ہوا کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہیں تو نجاشی عیسائی ہے ناراض ہو جائے گا، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: کچھ ہو، ہم کو سچ بولنا چاہیے۔

غرض یہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے، نجاشی نے کہا: تم لوگ عیسیٰ بن مریم کے متعلق کیا اعتقاد رکھتے ہو؟ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: ’’ہمارے پیغمبر نے بتایا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کا بندہ اور پیغمبر اور کلمۃ اللہ ہے‘‘۔ نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھالیا اور کہا: واللہ! جو تم نے کہا، عیسیٰ علیہ السلام اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں۔‘‘ [1] بطریق جو دربار میں موجود تھے نہایت برہم ہوئے، نتھنوں سے خرخراہٹ کی آواز آنے لگی، نجاشی نے ان کے غصہ کی کچھ پروا نہ کی اور قریش کے سفیر بالکل ناکامیاب آئے۔ [2]

اسی اثنا میں کسی دشمن نے نجاشی کے ملک پر حملہ کیا، نجاشی اس کے مقابلہ کے لئے خود گیا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے مشورہ کیا کہ ہم میں سے ایک شخص جائے اور خبر بھیجتا رہے کہ اگر ضرورت ہو تو ہم بھی نجاشی کی مدد کے لئے آئیں۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اگرچہ سب سے زیادہ کمسن تھے، لیکن انہوں نے اس خدمت کے لئے اپنے کو پیش کیا، مشک کے سہارے دریائے نیل تیر کر رزمگاہ میں پہنچے، ادھر صحابہ رضی اللہ عنہم نجاشی کی فتح کے لئے خدا سے دعا مانگتے تھے، چند روز کے بعد زبیر واپس آئے اور خوشخبری سنائی کہ نجاشی کو خدا نے فتح دی۔ [3]

---

[1] مستدرك حاكم، ج ٢، ص: ٣١٠ كتاب التفسير (س) [2] مارگولیتھ صاحب نے ہجرت حبش کی بھی بڑی نازک اور دور از نظر وجہ تلاش کر کے پیدا کی ہے، فرماتے ہیں کہ ’’جب محمد ﷺ نے دیکھا کہ قریش سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے اور یہ پہلے سنا تھا کہ کعبہ کے گرانے کے لئے ابرہۃ الاشرم جو آیا تھا وہ حبش ہی کا تھا، اس لئے انہوں نے چاہا کہ بادشاہ حبش سے سازش کر کے اس کو مکہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دیں تاکہ قریش کا زور ٹوٹ جائے، اسی غرض سے ہجرت کا بہانہ کر کے اپنے اصحاب کو حبش بھیجا۔ لیکن پھر سمجھے کہ نجاشی اگر مکہ میں آیا تو خود مکہ پر قابض ہو جائے گا، مجھ کو کیا ہاتھ آئے گا۔ اس بنا پر اس ارادے سے باز رہے۔‘‘ یہ بالکل بے ثبوت بات ہے۔ صاحب موصوف کو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر و مکالمت میں اس بنا پر شک ہے کہ نجاشی عربی زبان سے ناواقف تھا۔ حالانکہ اس زمانہ میں (اولاً تو) عربی زبان عام طور سے حبش میں بے تکلف لوگ سمجھ سکتے تھے (کہ یہ دونوں زبانیں باہم نہایت قریب ہیں، ثانیاً درباروں میں ترجمان ہوتے تھے۔ جیسا کہ ابوسفیان اور قیصر روم کے باہمی مکالمہ میں مذکور ہے۔ بخاري، كتاب بدء الوحي باب بدء الوحي: ٧۔ (س) [3] یہ تمام واقعات مسند ابن حنبل جلد ا صفحہ ۲۰۲ میں مذکور ہیں، ابن ہشام (ج ا ص: ۲۰۴ تا ۲۰۸) نے بھی تفصیل سے لکھے ہیں۔ لیکن طبری اور ابن سعد نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور نجاشی کی تقریر کا ذکر نہیں کیا۔ امام ابن حنبل اور ابن ہشام کا سلسلہ روایت یہ ہے، محمد بن اسحاق، زہری، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحرث بن ہشام مخزومی، ام سلمہ رضی اللہ عنہا یہ سب رواۃ ثقہ ہیں اور سب سے اخیر راوی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا جو رسول اللہ ﷺ کی زوجۂ محترمہ اور خود اس واقعہ میں شریک تھیں، وہ اس وقت تک آنحضرت ﷺ کے عقد میں نہیں آئی تھیں، بلکہ اپنے پہلے شوہر ابوسلمہ بن عبدالاسد کے ساتھ حبش میں ہجرت کر کے گئی تھیں، مورخ یعقوبی نے بھی بہ تفصیل یہ واقعہ لکھا ہے۔ (ج ۲ ص: ۲۸، ۲۹) مطبوعہ لیڈن: ۱۸۸۳)

حبش میں کم وبیش ۸۳ مسلمان ہجرت کر کے گئے، ❶ چند روز آرام سے گزرنے پائے تھے کہ یہ خبر مشہور ہوئی کہ کفار نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ سن کر اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم نے مکہ معظمہ کا رخ کیا۔ لیکن شہر کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے۔ اس لئے بعض لوگ واپس چلے گئے اور اکثر چھپ چھپ کر مکہ میں آ گئے۔

یہ روایت طبری (ج ۳ ص: ۱۱۹۳، ۱۱۹۴) اور اکثر تاریخوں میں مذکور ہے اور ممکن ہے کہ صحیح ہو۔ لیکن ان کتابوں میں اس خبر کے مشہور ہونے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حرم میں ایک دفعہ نماز ادا کی، کفار بھی موجود تھے جب آپ نے یہ آیت پڑھی:

﴿ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرٰى ﴾ (۵۳/ النجم: ۲۰) تو شیطان نے آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیے۔

تلك الغرانيق العلى وان شفاعتهن لترتجیٰ۔

''یعنی (یہ بت) معظم ومحترم ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہے۔''

اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے سجدہ کیا اور تمام کفار نے آپ کی متابعت کی (اس روایت کا یہ آخری حصہ کہ چند کافروں کے سوا تمام جن وانس نے حضور ﷺ کے ساتھ ایک دفعہ سجدہ کیا، صحیح ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے باب قوله: ﴿ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴾ (۵۳/ النجم: ٦٢) مذکور ہے، ❷ مگر باقی حصہ بے ہودہ اور ناقابل ذکر ہے اور اکثر کبار محدثین مثلاً: بیہقی، قاضی عیاض، علامہ عینی، حافظ منذری، علامہ نووی ❸ نے اس کو باطل اور موضوع لکھا ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ بہت سے محدثین نے اس روایت کو بہ سند نقل کیا ہے، ان میں طبری، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مردویہ، ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، ابو معشر ❹ شہرت عام رکھتے ہیں، اس سے بڑھ کر تعجب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر کو جن کے کمال فن حدیث پر زمانہ کا اتفاق ہے، اس روایت کی صحت پر اصرار ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: ❺

وقد ذكرنا ان ثلاثة اسانيد منها على شرط الصحيح وهي مراسيل يحتج بمثلها من يحتج بالمراسيل۔

''ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس روایت کی تین سندیں صحیح کی شرط کے موافق ہیں اور یہ روایتیں مرسل ہیں اور ان سے وہ لوگ استدلال کر سکتے ہیں جو مرسل روایتوں کے قائل ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ کفار کی عادت تھی کہ جب آنحضرت ﷺ قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو شور مچاتے

❶ ابن هشام، ج ۲، ص: ۲۰۳۔ ❷ صحيح بخاری، كتاب التفسير، سورة نجم: ٤٨٦٢۔ (س)
❸ دیکھو زرقانی بر مواہب لدنیہ (ج ۱ ص: ۳۲۶ وبعد) وشفائے قاضی عیاض (مع شرح شہاب خفاجی، ج ۴ ص: ۹۵ وبعد) وعینی شرح بخاری تفسیر سورۂ نجم، (ج ۹ ص: ۱۸۱) ونور النبراس۔ علامہ نووی کے یہ الفاظ ہیں: لا يصح فيه شيء لا من جهة النقل ولا من جهة العقل شرح مسلم (باب سجود التلاوة، ج ۵، ص: ۷۵) اور علامہ عینی لکھتے ہیں: فلا صحة له نقلا وعقلا (ج ۹، ص: ۱۸۱)۔ ❹ دیکھو مواہب لدنیہ اور زرقانی واقعہ ہجرت حبشہ، (ج ۱ ص: ۳۲۶ وبعد)۔ ❺ زرقانی بر مواہب، جلد اول، صفحہ: ۳۳۰۔

اور اپنے فقرے ملا دیتے، قرآن مجید کی آیت ذیل میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے:

﴿لَا تَسْمَعُوا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ﴾ (٤١/ حٰمٓ السجدة:٢٦)

''اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں گڑ بڑ کر دو شاید تم غالب آؤ۔''

قریش کا معمول تھا کہ جب کعبہ کا طواف کرتے تو یہ فقرے کہتے جاتے: [1]

واللات والعزى ومناة الثالثة الاخرىٰ فانهن الغرانيق العلى وان شفاعتهن لترتجى۔

''لات اور عزیٰ اور تیسرے بت مناۃ کی قسم یہ بلند و بزرگ ہیں اور ان کی شفاعت کی امید ہے۔''

آنحضرت ﷺ نے جب سورۂ والنجم کی وہ آیتیں پڑھیں تو کسی شیطان (کافر) نے یہی فقرے آپ کی آواز میں ملا کر پڑھ دیئے ہوں گے، دور کے لوگوں کو (کفار میں سے) شبہ ہوا ہوگا کہ آنحضرت ﷺ ہی نے وہ الفاظ ادا کئے، اس واقعہ کا چرچا جب مسلمانوں میں ہوا ہوگا، تو لوگوں نے کہا ہوگا کہ کسی شیطان نے آپ کی طرف سے وہ فقرے کہہ دیئے ہوں گے، اس واقعہ نے روایتوں میں صورت بدل بدل کر یہ صورت اختیار کر لی کہ شیطان نے آنحضرت ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے اور چونکہ عام مسلمان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شیطان دوسرے شخص کی زبان سے بول سکتا ہے اس لئے راویوں نے اس روایت کو تسلیم کر لیا۔ یہ صرف قیاس نہیں بلکہ اگلے محققین نے بھی تصریح کی ہے، مواہب [2] میں ہے:

قيل انه لما وصل الى قوله ومناة الثالثة الاخرى خشي المشركون ان يأتي بعدها بشيء يذم الهتهم فبادروا الى ذالك الكلام فخلطوه في تلاوة النبى ﷺ على عادتهم في قولهم لا تسمعوا لهذا القرآن والغوا فيه او المراد بالشيطان شيطان الانس۔

''بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ اس آیت پر پہنچے ﴿وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى﴾ تو مشرکوں کو یہ ڈر پیدا ہوا کہ اب ان کے معبودوں کی کچھ برائی کا بیان ہوگا، اس بنا پر انہوں نے جھٹ سے آنحضرت ﷺ کی تلاوت میں یہ فقرے غلط کر کے پڑھ دیے جیسا کہ ان کی عادت تھی کہ کہتے کہ قرآن پر کان نہ لگاؤ اور اس میں گڑ بڑ مچا دو۔ یا شیطان سے شیطان آدمی مراد ہے۔''

جو لوگ حبش سے واپس آ گئے تھے، اہل مکہ نے اب ان کو اور زیادہ ستانا شروع کیا اور اس قدر اذیت

[1] معجم البلدان لفظ عزى۔ (ج ٦، ص:١٦٦ طبع اول: ١٣٢٤ھ/ ١٩٠٦ء مصر)
[2] الزرقانی علی المواهب، ج ١، ص: ٣٣١، ٣٣٢۔

دی کہ وہ دوبارہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ لیکن اب کی ہجرت کچھ آسان نہ تھی۔ کفار نے سخت مزاحمت کی تاہم جس طرح ہوسکا بہت سے صحابہ جن کی تعداد قریباً سو تک پہنچتی ہے مکہ سے نکل گئے اور حبش میں اقامت اختیار کی۔ جب آنحضرت ﷺ نے مدینہ منورہ کو ہجرت کی تو کچھ لوگ فوراً واپس چلے آئے اور جو لوگ رہ گئے تھے، آنحضرت ﷺ نے ۷ھ میں ان کو بلالیا۔ [1]

کفار کی ایذا و تعدی اب کمزوروں اور بیکسوں پر محدود نہ تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قبیلہ معزز اور طاقتور قبیلہ تھا، ان کے یاور اور انصار بھی کم نہ تھے، تاہم وہ بھی کفار کے ظلم سے تنگ آ گئے اور بالآخر حبش کی ہجرت کا ارادہ کیا۔ برک الغماد جو مکہ معظمہ سے یمن کی سمت پانچ دن کی راہ ہے، [2] وہاں تک پہنچے تھے کہ ابن الدغنہ سے ملاقات ہوگئی جو قبیلہ قارہ کا رئیس تھا، اس نے پوچھا: کہاں؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا ''میری قوم مجھ کو رہنے نہیں دیتی، چاہتا ہوں کہ کہیں الگ جا کر خدا کی عبادت کروں'' ابن الدغنہ نے کہا: ''یہ نہیں ہوسکتا کہ تم جیسا شخص مکہ سے نکل جائے، میں تم کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں'' تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کے ساتھ واپس آئے، ابن الدغنہ مکہ پہنچ کر تمام سرداران قریش سے ملا اور کہا کہ ''ایسے شخص کو نکالتے ہو جو مہمان نواز ہے، مفلسوں کا مددگار ہے، رشتہ داروں کو پالتا ہے، مصیبتوں میں کام آتا ہے''۔ قریش نے کہا لیکن شرط یہ ہے کہ ابوبکر نمازوں میں چپکے جو چاہیں پڑھیں، آواز سے قرآن پڑھتے ہیں تو ہماری عورتوں اور بچوں پر اثر پڑتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چند روز یہ پابندی اختیار کی لیکن آخر انہوں نے گھر کے پاس ایک مسجد بنالی اور اس میں خضوع و خشوع کے ساتھ بہ آواز قرآن پڑھتے تھے، وہ نہایت رقیق القلب تھے، قرآن پڑھتے تو بے اختیار روتے، عورتیں اور بچے ان کو دیکھتے اور متاثر ہوتے۔ قریش نے ابن الدغنہ سے شکایت کی، اس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اب میں تمہاری حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوسکتا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''مجھ کو خدا کی حفاظت بس ہے، میں تمہاری جوار سے استعفیٰ دیتا ہوں۔'' [3]

محرم ۷ نبوی شعب ابوطالب میں محصور ہونا

قریش دیکھتے تھے کہ اس روک ٹوک پر بھی اسلام کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے، عمر اور حمزہ رضی اللہ عنہما جیسے لوگ ایمان لاچکے، نجاشی نے مسلمانوں کو پناہ دی، سفراء بے نیل مرام واپس آئے، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے اب یہ تدبیر سوچی کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے خاندان کو محصور کر کے تباہ کر دیا جائے۔ چنانچہ تمام قبائل نے ایک معاہدہ مرتب کیا کہ ''کوئی شخص نہ خاندان بنی ہاشم سے قربت کرے گا نہ ان کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا، نہ ان سے ملے گا، نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا۔ جب تک وہ

[1] یہ تمام تفصیل طبقات ابن سعد (ج۱، قسم اول ص: ۱۳۸، ۱۳۹) میں ہے، بعض مؤرخوں نے اس ہجرت ثانیہ کا ذکر نہیں کیا اور بعض نے نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ [2] زرقانی بر مواہب، جلد اول، صفحہ: ۳۴۴ ذکر ہجرت ثانیہ حبش۔ [3] یہ پوری تفصیل صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الی المدینة: ۳۹۰۵ میں ہے۔

محمد ﷺ کو قتل کے لئے حوالہ نہ کر دیں [1] یہ معاہدہ منصور بن عکرمہ نے لکھا اور کعبہ پر آویزاں کیا گیا۔

ابو طالب مجبور ہو کر تمام خاندان بنی ہاشم کے ساتھ شعب ابو طالب [2] میں پناہ گزیں ہوئے۔ تین سال تک بنو ہاشم نے اس حصار میں بسر کی۔ یہ زمانہ ایسا سخت گزرا کہ طلح کے پتے کھا کھا کر رہتے تھے، حدیثوں میں جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی زبان سے مذکور ہے کہ ہم طلح کی پتیاں کھا کھا کر بسر کرتے تھے۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے، چنانچہ سہیلی نے روض الانف میں تصریح کی ہے، حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ آ گیا۔ میں نے اس کو پانی سے دھویا۔ پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔ [3]

ابن سعد نے روایت کی ہے کہ بچے جب بھوک سے روتے تھے تو باہر آواز آتی تھی، قریش سن سن کر خوش ہوتے تھے۔ لیکن بعض رحمدلوں کو ترس بھی آتا تھا۔ ایک دن حکیم بن حزام نے جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا بھتیجا تھا۔ تھوڑے سے گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجے۔ راہ میں ابو جہل نے دیکھ لیا اور چھین لینا چاہا۔ اتفاق سے ابو البختری کہیں سے آ گیا، وہ اگرچہ کافر تھا، لیکن اس کو رحم آیا اور کہا کہ ایک شخص اپنی پھوپھی کو کچھ کھانے کے لئے بھیجتا ہے تو کیوں روکتا ہے۔ [4]

مسلسل تین برس تک آنحضرت ﷺ اور تمام آل ہاشم نے یہ مصیبتیں جھیلیں، بالآخر دشمنوں ہی کو رحم آیا اور خود انہی کی طرف سے اس معاہدہ کے توڑنے کی تحریک ہوئی، ہشام عامری خاندانِ بنو ہاشم کا قریبی رشتہ دار اور اپنے قبیلہ میں ممتاز تھا، وہ چوری چھپے بنو ہاشم کو غلہ وغیرہ بھیجتا رہتا تھا، ایک دن وہ زہیر کے پاس جو عبدالمطلب کے نواسے تھے، گیا اور کہا: ''کیوں زہیر! تم کو یہ پسند ہے کہ تم کھاؤ پیو ہر قسم کا لطف اٹھاؤ اور تمہارے ماموں کو ایک دانہ تک نصیب نہ ہو؟'' زہیر نے کہا: ''کیا کروں تنہا ہوں، ایک شخص بھی میرا ساتھ دے تو میں اس ظالمانہ معاہدہ کو پھاڑ کر پھینک دوں۔'' ہشام نے کہا: میں موجود ہوں۔ دونوں مل کر مطعم بن عدی کے پاس گئے، ابو البختری، ابن ہشام، زمعہ بن الاسود نے بھی ساتھ دیا۔ دوسرے دن سب مل کر حرم میں گئے۔ زہیر نے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا ''اے اہل مکہ! یہ کیا انصاف ہے! ہم لوگ آرام سے بسر کریں اور بنو ہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو، خدا کی قسم! جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا میں باز نہ آؤں گا۔'' ابو جہل برابر سے بولا: ''ہرگز اس معاہدہ کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔'' زمعہ نے کہا ''تو جھوٹ کہتا ہے۔ جب یہ لکھا گیا تھا اس وقت بھی ہم راضی نہ تھے۔'' غرض مطعم نے ہاتھ بڑھا کر دستاویز چاک کر دی، مطعم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن الاسود، ابو البختری، زہیر سب ہتھیار باندھ باندھ کر بنو ہاشم کے پاس گئے اور ان کو درہ سے نکال لائے [5] بقول ابن سعد یہ ۱۰ نبوی کا واقعہ ہے، اسی زمانہ میں معراج واقع ہوئی، جس کی تفصیل

---

[1] اس معاہدہ کا ذکر طبری (ج ۳، ص:۱۱۸۹) نے اور ابن سعد (ج ۱، ص:۱۳۹ وابن هشام، ج ۱، ص:۲۱۵) وغیرہ نے تفصیل سے کیا ہے، لیکن یہ الفاظ کہ وہ محمد ﷺ کو قتل کے لئے حوالہ کر دیں صرف مواہب لدنیہ میں مذکور ہیں۔

[2] یہ پہاڑ کا ایک درہ تھا۔ جو خاندان بنو ہاشم کا موروثی تھا۔ [3] روض الانف، ج ۱، ص:۲۳۲۔

[4] ابن هشام، ج ۱، ص:۲۱۶۔ [5] یہ تفصیل ابـن هشام، (ج ۱، ص:۲۲۸، ۲۲۹) طبری، (ج ۳، ص:۱۱۹۶ تا ۱۱۹۸) وغیرہ میں مذکور ہے، اخیر واقعہ صرف ابن سعد نے بیان کیا ہے۔

تیسرے حصہ میں آئے گی۔ اسی زمانہ میں نماز پنجگانہ فرض ہوئی۔

۱۰ نبوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ابو طالب کی وفات

آنحضرت ﷺ اب شعب ابی طالب سے نکلے تھے اور چند روز قریش کے جور و ظلم سے امان ملی تھی کہ ابو طالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا۔

ابو طالب کی وفات کے وقت آنحضرت ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے، ابو جہل اور عبداللہ بن ابی امیہ پہلے سے موجود تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مرتے مرتے (**لا الہ الا اللہ**) کہہ لیجئے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں۔'' ابو جہل اور ابن ابی امیہ نے کہا: ''ابو طالب! کیا تم عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے۔'' بالآخر ابو طالب نے کہا: ''میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں۔'' پھر آنحضرت ﷺ کی طرف خطاب کر کے کہا: ''میں وہ کلمہ کہہ دیتا لیکن قریش کہیں گے کہ موت سے ڈر گیا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں آپ کے لئے دعائے مغفرت کروں گا جب تک کہ خدا مجھ کو اس سے منع نہ کر دے۔'' [1]

یہ بخاری اور مسلم کی روایت ہے، ابن اسحاق کی روایت ہے کہ مرتے وقت ابو طالب کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے (جو اس وقت تک کافر تھے) کان لگا کر سنا تو آنحضرت ﷺ سے کہا کہ تم نے جس کلمہ کے لئے کہا تھا ابو طالب وہی کہہ رہے ہیں۔ [2] اس بنا پر ابو طالب کے اسلام کے متعلق اختلاف ہے، لیکن چونکہ بخاری کی روایت عموماً صحیح مانی جاتی ہے۔ اس لئے محدثین زیادہ تر ان کے کفر ہی کے قائل ہیں۔

لیکن محدثانہ حیثیت سے بخاری کی یہ روایت چنداں قابل حجت نہیں کہ اخیر راوی مسیب ہیں۔ جو فتح مکہ میں اسلام لائے اور ابو طالب کی وفات کے وقت موجود نہ تھے۔ اسی بنا پر علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ ''روایت مرسل ہے۔'' [3] ابن اسحاق کے سلسلہ روایت میں عباس بن عبداللہ بن معبد اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں۔ یہ دونوں ثقہ ہیں۔ لیکن بیچ کا ایک راوی یہاں بھی رہ گیا ہے، اس بنا پر دونوں روایتوں کے درجہ استناد میں چنداں فرق نہیں۔ [4]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا قال المشرك عند الموت لا اله الا الله: ١٣٦٠ وباب قصة ابی طالب: ٣٨٨٤ اور مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی صحة اسلام من حضره الموت: ١٣٢ ابو طالب کا اخیر فقرہ مسلم میں ہے بخاری میں نہیں۔ [2] ابن ہشام مطبوعہ مصر، صفحہ ۱۴۶۔ نوٹ: یہ روایت درست نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے سیر اعلام النبلاء، ج ۱، ص: ۱۲۳ ملاحظہ فرمائیں۔ [3] عینی، کتاب الجنائز، جلد ۴، صفحہ: ۲۰۰ (س) [4] مصنف کے اس نظریہ سے مجھے اتفاق نہیں ہے اس لئے کہ بخاری کی روایت کے آخر راوی حضرت مسیب رضی اللہ عنہ ہیں جو صحابی ہیں۔ ظاہر ہے کہ صحابی کی روایت کسی صحابی ہی سے ہو گی اس لئے مراسیل صحابہ حجت ہیں اور ابن اسحاق کی روایت منقطع ہے اور چھوٹا ہوا راوی صحابی نہیں ہے، خود ابن اسحاق بھی استناد کا اعلیٰ درجہ نہیں رکھتے اس لئے دونوں روایتوں کو یکساں نہیں قرار دیا جا سکتا۔ علاوہ بریں حضرت مسیب رضی اللہ عنہ کی اس روایت کی تائید میں خود حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جو اسی مسیب والی روایت سے اوپر صحیح بخاری، باب قصه ابی طالب: ٣٨٨٣ میں موجود ہے جس میں ذکر ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ آپ کے چچا (ابو طالب) کو آپ ﷺ سے کیا فائدہ پہنچا کہ وہ آپ کی حفاظت کرتے تھے اور آپ کے لئے آپ کے دشمنوں سے برسر پرخاش رہتے تھے۔ فرمایا: ''وہ دوزخ کی آگ میں صرف ٹخنے تک ہیں مگر اس کا اثر بھی دماغ تک پہنچ جاتا ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ابو طالب نے آنحضرت ﷺ کے لئے جو جان نثاریاں کیں، اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔ وہ اپنے جگر گوشوں تک کو آپ ﷺ پر نثار کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی محبت میں تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لیا۔ آپ ﷺ کی خاطر محصور ہوئے، فاقے اٹھائے، شہر سے نکالے گئے، تین تین برس تک آب و دانہ بند رہا، کیا یہ محبت، یہ جوش، یہ جان نثاریاں سب ضائع جائیں گی؟

ابو طالب، آنحضرت ﷺ سے ۳۵ برس عمر میں بڑے تھے، رسول اللہ ﷺ کو ان سے نہایت محبت تھی، ایک دفعہ وہ بیمار پڑے، آنحضرت ﷺ ان کی عیادت کے لئے گئے تو انہوں نے کہا: ''بھتیجے! جس خدا نے تجھ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اس سے دعا نہیں مانگتا کہ مجھ کو اچھا کردے''۔ آپ نے دعا کی اور وہ اچھے ہو گئے، آنحضرت ﷺ سے کہا: خدا تیرا کہنا مانتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''آپ بھی اگر خدا کا کہنا مانیں تو وہ بھی آپ کا کہنا مانے۔'' ❶

ابو طالب کی وفات کے چند ہی روز بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بھی وفات پائی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے ابو طالب سے پہلے انتقال کیا۔ اب آپ کے مددگار اور غمگسار دونوں اٹھ گئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم خود اپنی حالت میں مبتلا تھے، یہی زمانہ ہے جو اسلام کا سخت ترین زمانہ ہے اور خود آنحضرت ﷺ اس سال کو عام الحزن (سالِ غم) فرمایا کرتے تھے ❷ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رمضان ۱۰ نبوی میں وفات کی، ان کی عمر ۶۵ برس کی تھی، مقام حجون میں دفن کی گئیں، آنحضرت ﷺ خود ان کی قبر میں اترے۔ اس وقت تک نماز جنازہ مشروع نہیں ہوئی تھی۔ ❸

ابو طالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے اٹھ جانے کے بعد قریش کو کس کا پاس تھا، اب وہ نہایت بے رحمی و بیباکی سے آنحضرت ﷺ کو ستاتے تھے، ایک دفعہ آپ ﷺ راہ میں جا رہے تھے، ایک شقی نے آکر فرق مبارک پر خاک ڈال دی۔ اسی حالت میں آپ ﷺ گھر میں تشریف لائے، آپ کی صاحبزادی نے دیکھا تو پانی لے کر آئیں۔ آپ کا سر دھوتی تھیں اور جوشِ محبت سے روتی جاتی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جانِ پدر! رو نہیں، خدا تیرے باپ کو بچا لے گا۔'' ❹

اہل مکہ سے تو قطعی ناامیدی تھی۔ اس لئے آپ نے ارادہ فرمایا کہ طائف تشریف لے جائیں اور وہاں دعوت اسلام فرمائیں۔ طائف میں بڑے بڑے امراء اور ارباب اثر رہتے تھے۔ ان میں عمیر کا خاندان رئیس

(❁❁ گزشتہ سے پیوستہ) اگر میں نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے سب سے نیچے طبقہ میں ہوتے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ خود حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے علم میں تھا کہ ان کا خاتمہ توحید کے اقرار پر نہیں ہوا، اسی مضمون کی روایت حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی ہے جو صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب قصة ابی طالب: ۳۸۸۳ میں اسی موقع پر موجود ہے۔ (س)

❶ اصابہ فی تمییز الصحابہ ذکر ابی طالب، ۷، ص:۱۱۳۔

❷ زرقانی بر مواہب لدنیہ، ج ۱، ص:۲۹۴۔ ❸ یہ تفصیل ابن سعد میں ہے، ج۸، فی النسآء، ص:۱۱۔

❹ طبری، ج ۳، ص:۱۱۹۹ اور ابن ہشام، ج ۱، ص:۲۵۲ ذکر وفاۃ خدیجۃ۔

القبائل تھا۔ یہ تین بھائی تھے عبد یا لیل، مسعود، حبیب، آنحضرت ﷺ ان کے پاس گئے اور اسلام کی دعوت دی۔ ان تینوں نے جو جواب دیے وہ نہایت عبرت انگیز تھے۔ ایک نے کہا: ''اگر تجھ کو خدا نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تو کعبہ کا پردہ چاک کر رہا ہے۔'' دوسرے نے کہا: ''کیا خدا کو تیرے سوا اور کوئی نہیں ملتا تھا''۔ تیسرے نے کہا: ''میں بہر حال تجھ سے بات نہیں کر سکتا تو اگر سچا ہے تو تجھ سے گفتگو کرنا خلاف ادب ہے اور جھوٹا ہے تو گفتگو کے قابل نہیں۔''

ان بدبختوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، طائف کے بازاریوں کو ابھار دیا کہ آپ ﷺ کی ہنسی اڑائیں شہر کے اوباش ہر طرف سے ٹوٹ پڑے، یہ مجمع دو رویہ صف باندھ کر کھڑا ہوا، جب آپ ادھر سے گزرے تو آپ کے پاؤں پر پتھر مارنے شروع کر دیے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں، جب آپ زخموں سے چور ہو کر بیٹھ جاتے تو بازو تھام کر کھڑا کر دیتے، جب آپ پھر چلنے لگتے تو پتھر برساتے، ساتھ ساتھ گالیاں دیتے اور تالیاں بجاتے جاتے۔ [1] آخر آپ ﷺ نے ایک باغ میں انگور کی ٹٹیوں میں پناہ لی۔ یہ باغ عتبہ بن ربیعہ کا تھا جو باوجود کفر کے شریف الطبع اور نیک نفس تھا، اس نے آپ ﷺ کو اس حالت میں دیکھا تو اپنے غلام کے ہاتھ جس کا نام عداس تھا انگور کا خوشہ ایک کشتی میں رکھ کر بھیجا۔ اس سفر میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔ [2]

رسول اللہ ﷺ نے طائف سے پھر کر چند روز نخلہ میں قیام کیا، پھر حراء میں تشریف لائے اور مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا کہ مجھ کو اپنی حمایت میں لے سکتے ہو، عرب کا شعار تھا کہ جب کوئی ان سے طالب حمایت ہوتا تو گو دشمن ہوتا انکار نہیں کر سکتے تھے، مطعم نے یہ درخواست منظور کی، بیٹوں کو بلا کر کہا کہ ''ہتھیار لگا کر حرم میں جاؤ'' رسول اللہ ﷺ مکہ میں تشریف لائے، مطعم اونٹ پر سوار ساتھ تھا، حرم کے پاس آیا تو پکارا کہ میں نے محمد ﷺ کو پناہ دی ہے۔'' آنحضرت ﷺ حرم میں آئے نماز ادا کی اور دولت خانہ کو واپس گئے، مطعم اور اس کے بیٹے آپ ﷺ کو تلواروں کے سایہ میں لائے۔ [3]

مطعم نے کفر کی حالت میں غزوۂ بدر سے پہلے وفات کی، حضرت حسان رضی اللہ عنہ جو دربار رسالت کے

---

[1] یہ پوری تفصیل مواہب لدنیہ بحوالہ موسیٰ بن عقبہ (ج۱،ص: ۳۴۵) اور طبری (ج۳،ص: ۱۱۹۹ تا ۱۲۰۱) و ابن ہشام، (ج۱،ص: ۲۵۳، ۲۵۴) میں ہے۔ [2] (طبقات ابن سعد، ج۱،ص: ۱۴۲) کیا عجیب بات ہے کہ ایک ہی واقعہ دو مختلف نگاہوں کو کس طرح مختلف نظر آتا ہے مارگولیتھ نے (نعوذ باللہ) آنحضرت ﷺ کے اس سفر کو سوئے تدبیر میں داخل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ طائف مکہ سے بالکل قریب اور ان کے زیر اثر تھا اور وہاں رؤسائے مکہ کے باغ تھے جس کی وجہ سے ان کی آمد و رفت رہتی تھی اس لئے جب مکہ کے تمام رؤسا آنحضرت ﷺ کے خلاف تھے تو طائف کے لوگوں سے کیا اُمید ہو سکتی تھی؟ لیکن سر ولیم میور صاحب لکھتے ہیں کہ محمد ﷺ کا زور اعتقاد اور اعتماد النفس تھا کہ باوجود تمام ناکامیوں کے وہ تنہا ایک مخالف شہر میں آ گئے اور تبلیغ اسلام کا فرض ادا کیا ع والفضل ماشهدت به الاعداء۔

[3] ابن سعد، ج۱، صفحہ: ۱۴۲ کسی قدر تفصیل مواہب لدنیہ سے اضافہ کی گئی ہے جو ابن اسحاق کی روایت ہے۔ تعجب ہے کہ ابن ہشام نے یہ حالات قلم انداز کئے ہیں۔

شاعر تھے، انہوں نے مرثیہ لکھا، زرقانی نے یہ مرثیہ بدر میں نقل کیا ہے [1] اور لکھا ہے کہ اس میں کچھ مضائقہ نہیں، مطعم کا یہ کام بے شبہ مدح کا مستحق تھا، لیکن آجکل کے مسلمان حضرت حسان رضی اللہ عنہ اور زرقانی سے زیادہ شیفتہ اسلام ہیں، اس لئے معلوم نہیں حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا یہ فعل آج بھی پسند کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

قبائل کا دورہ

آنحضرت ﷺ کا معمول تھا، جب حج کا زمانہ آتا تھا اور عرب کے قبائل ہر طرف سے آکر مکہ کے آس پاس اترتے تو آپ ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور تبلیغ اسلام فرماتے، عرب میں مختلف مقامات پر میلے لگتے تھے، جن میں دور دور کے قبائل آتے تھے، آپ ان میلوں میں جاتے اور اسلام کی تبلیغ فرماتے۔

ان میلوں میں سے عکاظ جو اہل عرب کا قومی اور علمی دنگل تھا اور مجنہ اور ذوالمجاز کا نام مؤرخین نے خاص طور پر لیا ہے، قبائلِ عرب میں سے بنو عامر، محارب، فزارہ، غسان، مرہ، حنیفہ، سلیم، عبس، بنونصر، کندہ، کلب، حارث بن کعب، عذرہ، حضارمہ، مشہور قبائل ہیں۔ [2] ان سب قبائل کے پاس آپ ﷺ تشریف لے گئے، لیکن ابولہب ہر جگہ ساتھ ساتھ جاتا اور جب آپ کسی مجمع میں تقریر کرتے تو برابر سے کہتا کہ ”دین سے پھر گیا ہے اور جھوٹ کہتا ہے۔“ [3]

بنی حنیفہ یمامہ میں آباد تھے، ان لوگوں نے نہایت تلخی کے ساتھ جواب دیا۔ [4] مسیلمہ کذاب جس نے آگے چل کر نبوت کا دعویٰ کیا، اسی قبیلہ کا رئیس تھا۔

قبیلہ بنو ذہل بن شیبان کے پاس جب آپ ﷺ گئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مفروق سے کہا: ”تم نے کسی پیغمبر کا تذکرہ سنا ہے؟ وہ یہی ہیں۔“ مفروق نے آنحضرت ﷺ کی طرف رخ کر کے کہا: ”برادر قریش! تم کیا تلقین کرتے ہو؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”خدا ایک ہے اور میں اس کا پیغمبر ہوں“ اور یہ آیتیں پڑھیں:

﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾

(٦/ الانعام:١٥٢)

”کہہ دو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں کہ خدا نے کیا چیزیں حرام کی ہیں، یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور والدین کا حق خدمت بجالاؤ اور اپنے بچوں کو افلاس کے خیال سے قتل نہ کرو،

[1] زرقانی، ج ١، ص: ٥١٦۔ [2] ابن سعد، (ج ١، ص: ١٤٥) نے ان تمام قبائل کا ذکر کیا ہے۔
[3] (ابن سعد، ج ١، ص: ١٤٥) ومستدرك حاكم، ج ١، ص: ١٥، حیدرآباد، (س)۔
[4] ابن هشام، ج ١، ص: ٢٥٦۔

ہم تم کو اور ان کو دونوں کو روزی دیں گے۔ فحش باتوں کے پاس نہ جاؤ۔ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور آدمی کی جان جس کو خدا نے حرام کیا ہے، ناحق ہلاک نہ کرو۔"

اس قبیلہ کے رؤساء، مفروق، مثنیٰ اور ہانی بن قبصیہ تھے اور وہ سب اس موقع پر موجود تھے۔ ان لوگوں نے کلام کی تحسین کی لیکن کہا کہ "مدتوں کا خاندانی دین دفعتہً چھوڑ دینا زود اعتقادی ہے"۔ اس کے علاوہ ہم کسریٰ کے زیر اثر ہیں اور معاہدہ ہو چکا ہے کہ ہم اور کسی کے اثر میں نہ آئیں گے"۔ آپ نے اس کی راست گوئی کی تحسین کی اور فرمایا کہ "خدا اپنے دین کی آپ مدد کرے گا۔" ❶

قبیلہ بنو عامر کے پاس گئے تو ایک شخص نے جس کا نام (بحیرہ بن) فراس تھا۔ آپ ﷺ کی تقریر سن کر کہا: "یہ شخص مجھ کو ہاتھ آ جائے تو میں تمام عرب کو مسخر کر لوں۔" پھر آپ ﷺ سے پوچھا کہ "اگر ہم تمہارا ساتھ دیں اور تم اپنے مخالفوں پر غالب آ جاؤ تو تمہارے بعد ریاست ہم کو ملے گی؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ خدا کے ہاتھ ہے۔" اس نے کہا: "ہم اپنا سینہ عرب کی آماج گاہ بنائیں اور حکومت غیروں کے ہاتھ آئے، ہم کو یہ غرض نہیں۔" ❷

قریش کی آپ ﷺ کو ایذا رسانی

اسباب مذکورۂ بالا کی بنا پر قریش نے آنحضرت ﷺ کی سخت مخالفت کی اور چاہا کہ آپ ﷺ کو اس قدر ستائیں کہ آپ مجبور ہو کر تبلیغ اسلام سے دست بردار ہو جائیں، سوئے اتفاق یہ کہ جو کفار آپ کے ہمسایہ تھے یعنی ابوجہل، ابولہب، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف، نضر بن حارث، منبہ بن حجاج، عقبہ بن ابی معیط، حکم بن ابی العاص سب قریش کے سر برآوردہ رؤسا تھے اور یہی سب سے بڑھ کر آپ کے دشمن تھے، ❸ یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی راہ میں کانٹے بچھاتے، نماز پڑھتے وقت ہنسی اڑاتے، سجدہ میں آپ کی گردن پر اوجھڑی لا کر ڈال دیتے، گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچتے کہ گردن مبارک میں بدھیاں پڑ جاتیں۔ آپ کی روحانی قوت اثر کو دیکھ کر لوگ جادوگر کہتے، دعوائے نبوت کو سن کر مجنوں کہتے، باہر نکلتے تو شریر لڑکے پیچھے پیچھے غول باندھ کر چلتے ❹ نماز جماعت میں قرآن زور سے پڑھتے، تو قرآن، قرآن کے لانے والے (رسول اللہ ﷺ) اور قرآن کے اتارنے والے (خدا) کو گالیاں دیتے۔ ❺

ایک دفعہ آپ ﷺ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، رؤسائے قریش بھی موجود تھے، ابوجہل نے کہا "کاش اس وقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھا لاتا کہ جب محمد ﷺ سجدہ میں جاتے تو ان کی گردن پر ڈال دیتا۔" عقبہ نے کہا: "یہ خدمت میں انجام دیتا ہوں۔" چنانچہ اوجھ لا کر آپ کی گردن پر ڈال

❶ روض الانف، بحوالہ قاسم بن ثابت، ج۱، ص:۲۶۴، ۲۶۵۔ ❷ طبری، ج ۳، ص: ۱۲۰۵ (س) و ابن ہشام، ج۱، ص:۲۵۶۔ ❸ ابن سعد، ج۱، ص: ۱۳۴۔ ❹ مسند امام ابن حنبل، ج۱، ص: ۳۰۲۔
❺ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ بنی اسرائیل، باب لا تجھر بصلاتك الخ:۴۷۲۲۔

دی، قریش مارے خوشی کے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے، کسی نے جا کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خبر کی، وہ اگرچہ اس وقت صرف پانچ چھ برس کی تھیں لیکن جوشِ محبت سے دوڑی آئیں اور اوجھ ہٹا کر عقبہ کو برا بھلا کہا اور بددعائیں دیں۔ ❶

آنحضرت ﷺ جب کہیں کسی مجمعِ عام میں دعوتِ اسلام کا وعظ فرماتے تو ابولہب جو آپ کے ساتھ ساتھ رہتا تھا برابر سے کہتا جاتا کہ ''یہ جھوٹ کہتا ہے۔'' ایک صحابی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ جب کہ میں اسلام نہیں لایا تھا آنحضرت ﷺ بازار ذوالمجاز میں گئے اور مجمع میں گھس کر لوگوں سے کہا کہ ''لا الہ الا اللہ کہو۔'' ابوجہل آپ پر خاک پھینکتا جاتا تھا اور کہتا کہ ''اس کے فریب میں نہ آنا، یہ چاہتا ہے کہ تم لات وعزیٰ کی پرستش چھوڑ دو۔'' ❷ طائف میں کفار نے آپ ﷺ کو جو اذیتیں پہنچائیں ان کا بیان پیچھے گزر چکا۔

ایک دفعہ آپ ﷺ حرم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ نے آپ کی گردن میں چادر لپیٹ کر نہایت زور سے کھینچی، اتفاقاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آ گئے اور آپ کا شانہ پکڑ کر عقبہ کے ہاتھ سے چھڑایا اور کہا کہ ''اس شخص کو قتل کرتے ہو جو صرف یہ کہتا ہے کہ خدا ایک ہے۔'' ❸

جو لوگ آنحضرت ﷺ کی دشمنی میں نہایت سرگرم تھے اور رات دن اسی شغل میں رہتے تھے ان کے نام جیسا کہ ابن سعد نے طبقات میں لکھے ہیں حسب ذیل ہیں:

''ابوجہل، ابولہب، اسود بن عبدیغوث، حارث بن قیس بن عدی، ولید بن مغیرہ، امیہ، ابی بن خلف، ابوقیس بن فاکہہ بن مغیرہ، عاص بن وائل، نضر بن حارث، منبہ بن حجاج، زہیر بن ابی امیہ، سائب بن سیفی، اسود بن عبدالاسد، عاص بن سعید بن العاص، عاص بن ہاشم، عقبہ بن ابی معیط، ابن الاصدی ہذلی، حکم بن ابی العاص، عدی بن حمراء۔'' ❹

یہ سب کے سب آنحضرت ﷺ کے ہمسایہ اور ان میں سے اکثر صاحب جاہ واقتدار تھے۔ یہ جو کچھ ہوا، گو نہایت دردانگیز اور حسرت خیز تھا۔ لیکن تعجب انگیز نہ تھا، دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ہے کہ نامانوس اور اجنبی صدائیں بہ رغبت سن لی گئی ہوں، حضرت نوح علیہ السلام کو سینکڑوں برس تک قوم کی نفرت اور وحشت کا سامنا رہا، یونان دنیا کی شائستگی کا معلم اول ہے۔ تاہم اسی حکمت کدہ میں سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دار ورسن کا منظر پیش آیا۔ اس بنا پر عرب اور قریش نے جو کچھ کیا وہ سلسلہ واقعات کی

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب اذا القی علی ظهر المصلی قذرا او جیفة الخ: ۲۴۰، کتاب الصلاة: ۵۲۰ وکتاب الجهاد، باب الدعاء علی المشرکین بالهزیمة: ۲۹۳۴ وصحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب مالقی النبی ﷺ من اذی المشرکین: ۴۶۴۹۔ ❷ مسند امام ابن حنبل، ج ۴، ص: ۶۳۔

❸ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ما لقی النبی ﷺ واصحابه من المشرکین بمکة: ۳۸۵۶۔

❹ طبقات ابن سعد، ج ۱، ص: ۱۳۳، ۱۳۴۔

غیر معمولی کڑی نہ تھی۔ لیکن غور طلب یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں سرور عالم ﷺ نے کیا کیا؟

مسلمانوں کا گھبرانا اور آپ ﷺ کا تسلی دینا

سقراط (زہر کا) پیالہ پی کر فنا ہو گیا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے مخالفت سے تنگ آ کر ایک قیامت خیز طوفان کی استدعا کی اور دنیا کا ایک بڑا حصہ برباد ہو گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تیس چالیس شخصوں کی مختصر جماعت پیدا کر کے بروایت نصاریٰ سولی پر چڑھ گئے، [1] لیکن سرور کائنات ﷺ کا فرض ان سب سے بالاتر تھا، حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ نے جب قریش کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ آپ ان کے حق میں بددعا کیوں نہیں فرماتے تو آپ ﷺ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ ”تم سے پہلے وہ لوگ گزرے ہیں جن کے سر پر آرے چلائے جاتے اور چیر ڈالے جاتے تھے، تاہم وہ اپنے فرض سے باز نہ آئے، خدا اس کام کو پورا کرے گا یہاں تک کہ شتر سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔“ [2]

کیا یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری نہیں ہوئی؟

---

[1] حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی دینے کا قصہ موجودہ چاروں انجیلوں میں موجود ہے لیکن قرآن کریم نے اس کی بڑی سختی سے تردید کی ہے اور کہا ہے کہ درحقیقت یہ غلط فہمی ہے ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے تھے، انسانی معلومات کی ترقی کے ساتھ قرآن کریم کی صداقت خود بخود واضح ہوتی ہے چند سو سال پہلے انجیل برناباس کا نسخہ دریافت ہوا تھا اس میں برناباس نے نہایت صراحت و وضاحت کے ساتھ یہ حقیقت بیان کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی نہیں دی گئی تھی بلکہ ان کی جگہ یہوداہ اسکریوتی مصلوب ہوا تھا، حال ہی میں انجیل کا ایک اور نسخہ دریافت ہوا ہے جو پطرس حواری کی طرف منسوب ہے اس میں بالکل صاف الفاظ میں یہ لکھا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی دینے سے کچھ پہلے آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا۔ (ملخص حاشیہ بائبل سے قرآن تک کا مقدمہ صفحہ: ٦٦، ٦٧، ١٢) منجانب: مصحح محمد محی الدین سواتی)۔

[2] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ما لقی النبی ﷺ واصحابہ من المشرکین بمکۃ: ٣٨٥٢، باب علامات النبوۃ: ٣٦١٢، وکتاب الاکراہ، باب من اختار الضرب الخ: ٦٩٤٣۔

مدینہ منورہ اور انصار رضی اللہ عنہم

آفتاب کی روشنی دور پہنچ کر تیز ہوتی ہے، شمیمِ گل باغ سے نکل کر عطر فشاں بنتی ہے، آفتاب اسلام مکہ میں طلوع ہوا لیکن کرنیں مدینہ کے افق پر چمکیں۔

مدینہ کا اصلی نام یثرب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب یہاں آ کر قیام کیا تو اس کا نام مدینۃ النبی یعنی "پیغمبر ﷺ کا شہر" پڑ گیا اور پھر مختصر ہو کر مدینہ مشہور ہو گیا۔

یہ شہر مدتوں سے آباد ہے، بہت قدیم زمانہ میں یہودی یہاں آ کر آباد ہوئے۔ ان کی نسلیں کثرت سے پھیلیں اور مدینہ کے اطراف ان کے قبضہ میں آ گئے۔ انہوں نے مدینہ اور اس کے حوالی میں چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لئے تھے اور ان میں سکونت رکھتے تھے (یہود کے متعلق زائد تحقیق آگے آئے گی)۔

انصار اصل میں یمن کے رہنے والے اور قحطان کے خاندان سے تھے، یمن میں جب مشہور سیلاب آیا جس کو "سیلِ عرم" کہتے ہیں۔ یہ لوگ یمن سے نکل کر مدینہ میں آباد ہوئے، یہ دو بھائی تھے، اوس اور خزرج تمام انصار انہی دو کے خاندان سے ہیں۔ [1] یہ خاندان جب یثرب میں آیا تو یہود نہایت اقتدار اور اثر رکھتے تھے۔ آس پاس کے مقامات ان کے قبضہ میں تھے اور دولت و مال سے مالا مال تھے، چونکہ آل و اولاد کی کثرت سے بیس اکیس قبیلے بن گئے تھے اس لئے دور دور تک بستیاں بسا لی تھیں، انصار کچھ زمانہ تک ان سے الگ رہے، لیکن ان کا زور اور اثر دیکھ کر بالآخر ان کے حلیف۔ [2] بن گئے، ایک مدت تک یہ حالت قائم رہی، لیکن اب انصار کا خاندان پھیلتا جاتا تھا اور اقتدار حاصل کرتا جاتا تھا، یہود نے پیش بینی کے لحاظ سے ان سے معاہدہ توڑ دیا۔

یہودیوں میں ایک رئیس فطیون پیدا ہوا جو نہایت عیاش اور بدکار تھا، اس نے یہ حکم دیا کہ جو دوشیزہ لڑکی بیاہی جائے، پہلے اس کے شبستان عیش میں آئے، یہود نے اس کو گوارا کر لیا تھا، لیکن جب انصار کی نوبت آئی تو انہوں نے سرتابی کی، اس زمانہ میں انصار کا سردار ایک شخص مالک بن عجلان تھا، اس کی بہن کی شادی ہوئی تو وہ عین شادی کے دن گھر سے نکلی اور اپنے بھائی مالک بن عجلان کے سامنے سے بے پردہ گزری، مالک کو غیرت آئی، اٹھ کر گھر میں آیا اور بہن کو سخت ملامت کی، اس نے کہا: "ہاں! لیکن کل جو کچھ ہو گا اس سے بھی بڑھ کر ہے"۔ دوسرے دن حسبِ دستور جب مالک کی بہن دلہن بن کر فطیون کی خلوت گاہ میں گئی تو مالک بھی زنانے کپڑے پہن کر سہیلیوں کے ساتھ گیا اور فطیون کو قتل کر کے شام کو بھاگ گیا، یہاں غسانیوں کی حکومت تھی اور ابو جبلہ حکمران تھا اس نے یہ حالات سنے تو ایک فوج گراں لے کر آیا اور اوس اور خزرج کے رؤسا کو بلا کر ان کو خلعت اور صلے دیے، پھر رؤسائے یہود کی دعوت کی اور ایک ایک کو دھوکے سے قتل کرا دیا، یہود کا زور

---

[1] انصار کے نسب اور مدینہ میں آباد ہونے کی پوری تفصیل وفاء الوفاء، جلد اول، صفحہ: ۱۱۶ تا ۱۵۲ میں مذکور ہے۔

[2] جو قبیلے آپس میں ایک دوسرے کی اعانت و شرکت کا (بحلف) معاہدہ کرتے تھے وہ باہم حلیف کہلاتے تھے۔

اب ٹوٹ گیا اور انصار نے نئے سرے سے قوت حاصل کی۔ [1]

انصار نے مدینہ اور حوالی مدینہ میں کثرت سے چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لئے۔ اوس اور خزرج ایک مدت تک باہم متحد رہے لیکن پھر عرب کی فطرت کے موافق خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں اور سخت خونریز لڑائیاں ہوئیں، سب سے اخیر لڑائی جس کو بعاث کہتے ہیں میں ایسے زور کا معرکہ ہوا کہ دونوں خاندانوں کے تمام نامور لڑ لڑ کر مر گئے، انصار اب اس قدر ضعیف ہو گئے کہ انہوں نے قریش کے پاس سفارت بھیجی کہ ہم کو حلیف بنا لیجئے۔ لیکن ابوجہل نے معاملہ درہم برہم کر دیا۔

انصار گو بت پرست تھے، تاہم چونکہ یہود سے میل جول تھا، اس لئے نبوت اور کتب آسمانی سے گوش آشنا تھے، یہود سے گو انصار اک گونہ رقابت رکھتے تھے۔ لیکن ان کے علمی فضل و کمال کے معترف تھے، یہود نے مدینہ میں جو علمی مدارس قائم کئے تھے اور جن کو بیت المدارس کہتے تھے (بخاری وغیرہ میں نام مذکور ہے) [2] ان میں توراۃ کی تعلیم ہوتی تھی، انصار جاہل تھے، اس لئے ان پر یہود کے علمی تفوق کا خواہ مخواہ اثر پڑتا تھا، یہاں تک کہ انصار میں سے جس کے اولاد زندہ نہیں رہتی تھی، وہ منت مانتا تھا کہ بچہ زندہ رہے گا تو یہودی بنا دیا جائے گا۔ [3]

یہودی عموماً یہ یقین رکھتے تھے کہ ایک پیغمبر ابھی اور آنے والا ہے، اس بنا پر انصار بھی ایک پیغمبر موعود کے نام سے آشنا تھے۔

انصار میں ایک شخص، سوید بن صامت جو شاعری اور جنگ آوری میں ممتاز تھا، اس کو امثال لقمان کا نسخہ ہاتھ آ گیا تھا جس کو وہ کتاب آسمانی سمجھتا تھا، وہ ایک دفعہ حج کو گیا، آنحضرت ﷺ نے اس کے حالات سنے تو خود اس کے پاس تشریف لے گئے، اس نے امثال لقمان پڑھ کر سنایا، آپ نے فرمایا: "میرے پاس اس سے بھی بہتر چیز ہے۔" یہ کہہ کر قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں، سوید نے تحسین کی، [4] اگرچہ وہ مدینہ واپس آ کر جنگ بعاث میں مارا گیا، لیکن اسلام کا معتقد ہو چکا تھا۔

سوید شجاعت اور شاعری دونوں میں کمال رکھتا تھا، ایسے شخص کو اہل عرب "کامل" کہتے تھے اور اسی بنا پر سوید اسی لقب سے پکارا جاتا تھا، [5] سوید کے میلان اسلام کا اثر انصار پر پڑ چکا تھا۔

اوس اور خزرج کے معرکوں میں اوس کو جب شکست ہوئی تو اوس کے عمائد قریش کے پاس گئے کہ خزرج کے مقابلہ میں ان کو حلیف بنائیں، اس سفارت میں ایاس بن معاذ بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو ان لوگوں کا

[1] وفاء الوفا، ج۱، ص:۱۲۶ یہ واقعہ مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے اور وفاء الوفاء میں یہ تمام روایتیں مذکور ہیں۔ (اس کا ذکر معجم البلدان، ج۷، ص:۴۲۸ و ۴۲۹ میں بھی ہے) [2] بخاری، کتاب الاکراہ، باب فی بیع المکرہ ونحوہ فی الحق وغیرہ:۶۹۴۴۔(س) [3] کتب تفسیر میں ﴿لا اکراہ فی الدین﴾ کی تفسیر دیکھو (ابن جریر، ج۳، ص:۹ مصر وابن کثیر، ج۱، ص:۳۱۰، ۳۱۱۔ مطبوعہ مصر: ۱۳۵۶ھ، ۱۹۳۷ء)۔

[4] البدایہ والنہایہ ابن کثیر، ج۳، ص:۱۴۷(س) [5] سوید کا ذکر ابن ہشام (ج۱، ص:۲۵۷) میں ہے لیکن روض الانف (ج۱، ص:۲۶۵، ۲۶۶) میں زیادہ تفصیل ہے، اصابہ میں بھی اس کا حال ہے، لیکن نسب میں اختلاف ہے اور امثال لقمان کا ذکر نہیں ہے، طبری میں بھی سوید کا پورا واقعہ مع اس کے اشعار کے مذکور ہے، دیکھو، ج۳، صفحہ:۱۲۰۷۔

آنا معلوم ہوا تو آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں، ایاس نے ساتھیوں سے کہا کہ ”خدا کی قسم! تم جس غرض کے لئے آئے ہو یہ کام اس سے بھی بہتر ہے“ لیکن قافلہ سالار یعنی ابوالحیسں نے کنکریاں اٹھا کر ان کے منہ پر ماریں اور کہا کہ ”ہم اس کام کے لئے نہیں آئے“ اس کے بعد بعاث کا معرکہ پیش آ گیا اور ایاس آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ مرتے وقت ایاس کی زبان پر تکبیر جاری تھی۔ [1]

انصار کے اسلام لانے کی ابتدا ۱۰ نبوی

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ حج کے زمانہ میں رؤسائے قبائل کے پاس جا کر تبلیغ اسلام فرمایا کرتے تھے، اس سال (رجب ۱۰ نبوی) میں بھی آپ متعدد قبائل کے پاس تشریف لے گئے، عقبہ کے پاس جہاں اب مسجد العقبہ ہے، خزرج کے چند اشخاص آپ کو نظر آئے، آپ نے ان سے نام و نسب پوچھا، انہوں نے کہا: ”خزرج“ آپ نے دعوت اسلام دی اور قرآن مجید کی آیتیں سنائیں، ان لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا: ”دیکھو، یہود ہم سے اس اولیت میں بازی نہ لے جائیں“۔ یہ کہہ کر سب نے ایک ساتھ اسلام قبول کیا، [2] یہ چھ شخص تھے جن کے نام حسب ذیل ہیں: [3]

---

[1] طبری اور اصابہ میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور ہے، اصابہ میں لکھا ہے کہ ایاس کا حال امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ابن کثیر، ج ۳، ص: ۱۴۸)۔ (س)۔ [2] مدینہ منورہ کے یہ حضرات جو پہلے پہل اسلام لائے۔ بعض مصنفین سیرت نے ان کے اس قبولِ اسلام کے واقعہ کا تذکرہ بیعت عقبہ اولیٰ کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ عنوان کتب سیرت کے ناظرین کے لئے اس وقت پریشانی کا موجب بن جاتا ہے جب وہ دوسری کتابوں (مثلاً مستدرک حاکم، ج ۲، ص: ۶۲۴، ابن کثیر علیٰ حاشیہ فتح البیان، ج ۹، ص: ۴۴۳) میں دیکھتے ہیں کہ بیعت عقبہ اولیٰ میں بارہ آدمی تھے۔ اسی اختلافِ روایت کے سبب سے بعض مصنفین سیرت بیعتِ عقبۂ ثانیہ میں بارہ آدمی اور بعض ۷۳ آدمی بتلاتے ہیں حالانکہ اصل صورت یہ ہے کہ چھ یا آٹھ آدمی جو شروع شروع میں اسلام لائے، ان کے واقعہ قبول اسلام کا عنوان بیعت عقبہ اولیٰ نہیں بلکہ ابتدائے اسلامِ انصار ہونا چاہیے اور دوسرے سال جبکہ گیارہ بارہ آدمی حاضر خدمت ہوئے ہیں یہ بیعت عقبہ اولیٰ ہے (سیرت حلبیہ، ج ۲، ص: ۸) حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ نے بصراحت فرمایا ہے کہ کنا احد عشر فی العقبۃ الاولیٰ من العام المقبل (مستدرک، ج ۲، صفحہ: ۶۲۴ حیدرآباد دکن) اس روایت میں حضرت عبادہ العام المقبل میں بیعتِ عقبہ اولیٰ کا ہونا فرماتے ہیں اور اس میں گیارہ آدمیوں کے ہونے کی صراحت فرماتے ہیں اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سے پہلے جو لوگ آ کر اسلام قبول کر چکے تھے ان کا تعلق بیعت عقبہ اولیٰ سے نہیں ہے۔

جن لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کا نام بیعت عقبہ اولیٰ رکھا ہے وہ تین بیعت عقبہ کا عنوان دیتے ہیں۔ یعنی ایک یہ بیعت عقبہ اولیٰ، دوسری وہ بیعت عقبہ جس میں گیارہ یا بارہ آدمی اسلام لائے اور تیسری وہ بیعت عقبہ جس میں ۷۳ افراد مشرف بہ اسلام ہوئے اور یہ تینوں واقعے ایک ایک سال کے فصل سے حج کے موسم میں پیش آئے اور جن لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کو صرف ابتدائے اسلامِ انصار کے عنوان سے ذکر کیا ہے انہوں نے گیارہ آدمیوں والی بیعت کو بیعت عقبہ اولیٰ اور ۷۳ آدمیوں والی بیعت کو بیعتِ عقبہ ثانیہ کے عنوان سے ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو تاریخ خمیس اول، صفحہ: ۳۰۶، ۳۱۶، ۳۱۷ و زرقانی علی المواہب، ج ۱، ص: ۳۶۲، ۳۶۷ (س)

[3] یہ واقعات تمام تاریخوں میں مذکور ہیں ہم نے زرقانی کو پیش نظر رکھا ہے، کیونکہ اس نے تمام مختلف روایتیں جمع کر دی ہیں ان لوگوں کی تعداد بعضوں نے آٹھ بیان کی ہے اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ، اور ابوالہیثم کا پہلے سے موجود ہونا ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے۔ دیکھو کتاب مذکور، جزء ثالث، انصار بدریین، صفحہ: ۲۲۔

واقدی کا بیان ہے کہ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ اس واقعہ سے پہلے مکہ میں جا کر آنحضرت ﷺ پر ایمان لا چکے تھے۔ (بعضوں نے ابوالہیثم بن تیہان کی جگہ عقبہ بن عامر بن نابی کا نام لیا ہے اور بعض نے جابر بن ریاب کے بجائے عبادہ بن صامت کو جگہ دی ہے۔ (س)

۱۔ ابوالہیثم بن تیہان	
۲۔ ابوامامہ اسعد بن زرارہ	صحابہ میں سب سے پہلے ان ہی نے ۱ھ میں وفات پائی۔
۳۔ عوف بن حارث	بدر میں شہادت پائی۔
۴۔ رافع بن مالک بن عجلان	اس وقت تک جس قدر قرآن اتر چکا تھا، آنحضرت ﷺ نے ان کو عنایت فرمایا، جنگ احد میں شہید ہوئے۔
۵۔ قطبہ بن عامر بن حدیدہ	تینوں عقبات میں شریک رہے۔
۶۔ جابر بن عبداللہ (بن ریاب)	(یہ مشہور صحابی حضرت جابر بن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے علاوہ تھے بدر وغیرہ میں شریک تھے)۔

بیعتِ عقبہ اولیٰ ۱۱ نبوی

دوسرے سال بارہ شخص مدینہ منورہ سے آئے اور بیعت کی، اس کے ساتھ اس بات کی بھی خواہش کی کہ احکام اسلام کے سکھانے کے لئے کوئی معلم ان کے ساتھ کر دیا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو اس خدمت پر مامور فرمایا۔ مصعب رضی اللہ عنہ ہاشم بن عبد مناف کے پوتے اور سابقین اسلام میں سے تھے، غزوۂ بدر میں لشکر کی علمبرداری کا منصب انہی کو ملا تھا، وہ مدینہ میں آکر اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے مکان پر ٹھہرے جو مدینہ کے نہایت معزز رئیس تھے، روزانہ معمول تھا کہ انصار کے ایک ایک گھر کا دورہ کرتے، لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے اور قرآن مجید پڑھ کر سناتے، روزانہ ایک دو نئے آدمی اسلام قبول کرتے، رفتہ رفتہ مدینہ سے قبا تک گھر گھر اسلام پھیل گیا۔ صرف خطمہ، وائل، واقف کے چند گھرانے باقی رہ گئے۔ ابن سعد نے طبقات [1] میں یہ واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔

قبیلۂ اوس کے سردار، حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تھے۔ قبیلہ پر ان کا یہ اثر تھا کہ ہر کام میں ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ مصعب رضی اللہ عنہ نے جب ان کے پاس جا کر اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے پہلے نفرت ظاہر کی۔ لیکن جب مصعب رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں تو پھر موم تھا، ان کا اسلام لانا تمام قبیلۂ اوس کا اسلام قبول کر لینا تھا۔

بیعتِ عقبہ ثانیہ ۱۲ نبوی

اگلے سال بہتر (۷۲) شخص حج کے زمانہ میں آئے اور اپنے ساتھیوں سے (جو بت پرست تھے) چھپ کر بمقام منیٰ (عقبہ) آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی، اس موقع پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے، انہوں نے انصار سے خطاب کر کے کہا: ''گروہ خزرج! محمد ﷺ اپنے خاندان میں معزز اور محترم ہیں۔ دشمنوں کے مقابلہ میں ہم ہمیشہ ان کے سینہ سپر

[1] طبقات ابن سعد، ج ۱، قسم اول، ص: ۱۴۸۔

رہے، اب وہ تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں۔ اگر مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر ورنہ ابھی سے جواب دے دو۔'' ❶

حضرت براء رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی طرف خطاب کر کے کہا: ''ہم لوگ تلواروں کی گود میں پلے ہیں۔'' وہ اسی قدر کہنے پائے تھے کہ ابوالہیثم رضی اللہ عنہ نے بات کاٹ کر کہا، ''یا رسول اللہ! ہمارے یہود سے تعلقات ہیں، بیعت کے بعد یہ تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ جب آپ کو قوت اور اقتدار حاصل ہو جائے تو آپ ہم کو چھوڑ کر اپنے وطن چلے جائیں۔'' آپ ﷺ نے مسکرا کر فرمایا: ''نہیں تمہارا خون میرا خون ہے، تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں۔''

آپ نے اس گروہ میں سے بارہ شخص نقیب انتخاب کیے، جن کے نام خود انصار نے پیش کیے تھے، ان میں نو خزرج کے اور تین اوس کے تھے۔ ان کے نام حسب روایت ابن سعد ❷ حسب ذیل ہیں:

۱۔ اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ	جنگ بعاث میں انہی کے باپ اوس کے سردار تھے۔
۲۔ ابوالہیثم بن تیہان رضی اللہ عنہ	
۳۔ سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ	جنگِ بدر میں شہید ہوئے۔
۴۔ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ	ان کا ذکر اوپر گزر چکا، یہ امام نماز تھے۔
۵۔ سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ	جنگِ اُحد میں شہید ہوئے۔
۶۔ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ	مشہور شاعر ہیں۔ جنگِ موتہ میں شہید ہوئے۔
۷۔ سعد بن عبادۃ رضی اللہ عنہ	معزز اور مشہور صحابی ہیں۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں انہوں نے ہی پہلے خلافت کا دعویٰ کیا تھا۔
۸۔ منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ	بیر معونہ میں شہید ہوئے۔
۹۔ براء بن معرور رضی اللہ عنہ	بیعت عقبہ میں انہوں نے انصار کی طرف تقریر کی تھی، آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے۔
۱۰۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ	جنگِ اُحد میں شہید ہوئے۔
عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ	مشہور صحابی ہیں، ان سے اکثر حدیثیں مروی ہیں۔
۱۲۔ رافع بن مالک رضی اللہ عنہ	جنگِ اُحد میں شہید ہوئے۔

آنحضرت ﷺ نے جن باتوں پر انصار سے بیعت لی یہ تھیں: ''شرک، چوری، زنا، قتلِ اولاد اور افترا کے مرتکب نہ ہوں گے اور رسول اللہ ﷺ ان سے جو اچھی بات کہیں گے اس سے سرتابی نہ کریں گے۔'' ❸

❶ یہ اور بعد کی تفصیل بھی طبقات، ج ۱، ص: ۱۴۹، ۱۵۰ پر ہے۔ ❷ یہ نام ابن ہشام نے بھی لکھے ہیں، ج ۱، ص: ۲۶۷، ۲۶۸۔

❸ یہ صحیح بخاری کی روایت ہے۔ (كتاب مناقب الانصار باب وفود الانصار الى النبي ﷺ بمكة وبيعة العقبة: ۳۸۹۲۔ ۳۸۹۳) سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ یہ عقبۂ اولیٰ کی شرائط ہیں، اخیر بیعت اس بات پر لی گئی تھی کہ انصار آپ ﷺ کی جان کی حفاظت کریں گے۔

جب انصار بیعت کر رہے تھے تو سعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا ''بھائیو! یہ بھی خبر ہے کہ کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب وعجم اور جن وانس سے اعلانِ جنگ ہے۔'' سب نے کہا: ''ہاں ہم اسی پر بیعت کر رہے ہیں۔''

بارہ شخص جو نقیب انتخاب کیے گئے رئیس القبائل تھے، ان کا اسلام قبول کرنا تمام انصار کا اسلام قبول کرنا تھا، صبح کو اس بیعت کی اڑتی سی خبر پھیلی، قریش انصار کے پاس آئے اور شکایت کی، انصار کے ساتھ جو بت پرست تھے ان کو اس بیعت کی خبر نہ تھی، انہوں نے تکذیب کی کہ ''ایسا ہوتا تو ہم سے کیونکر چھپ سکتا تھا۔'' [1]

مدینہ میں اسلام کو پناہ حاصل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اجازت دی کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں۔ قریش کو معلوم ہوا تو انہوں نے روک ٹوک شروع کی۔ لیکن چوری چھپے لوگوں نے ہجرت شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ اکثر صحابہ چلے گئے، صرف آنحضرت ﷺ، حضرت ابوبکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما رہ گئے، جو لوگ مفلسی سے مجبور تھے، وہ مدت تک نہ جا سکے، یہ آیت انہی کی شان میں ہے:

﴿ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ﴾. (٤/ النسآء:٧٥)

''کمزور مرد، عورتیں اور بچے جو یہ کہتے ہیں کہ اے خدا! ہم کو اس شہر سے نکال کہ یہاں کے لوگ ظالم ہیں۔''

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے۔ مسند احمد، ج ٣، ص: ٣٣٩۔٣٤٠، زاد المعاد، ج ٣، ص: ٤٧۔٤٩، سیر اعلام النبلاء، ج ١، ص: ١٥٥، ١٥٦؛ المغازی والسیر: ١٢٥، ١٢٦؛ ابن ہشام، ج ٢، ص: ٦٥۔٦٦۔

۱ ھ
ہجرت

(اس وقت جبکہ دعوت حق کے جواب میں ہر طرف سے تلوار کی جھنکاریں سنائی دے رہی تھیں، حافظِ عالم نے مسلمانوں کو دارالامان مدینہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا۔ لیکن خود وجود اقدس ﷺ جو ان ستم گاروں کا حقیقی ہدف تھا، اپنے لئے حکم خدا کا منتظر تھا، مکہ کے باہر اطراف میں جو صاحبِ اثر مسلمان ہو چکے تھے وہ جان نثارانہ اپنی حفاظت کی خدمت پیش کرتے تھے۔ قبیلۂ دوس ایک محفوظ قلعہ کا مالک تھا، اس کے رئیس طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اپنا قلعہ پیش کیا کہ آپ یہاں ہجرت کر آئیں لیکن آپ ﷺ نے انکار فرمایا۔ [1] اسی طرح بنی ہمدان کے ایک شخص نے بھی یہی خواہش کی تھی۔ بعد میں اس نے کہا کہ وہ اپنے اہلِ قبیلہ کو مطلع کر کے آئندہ سال آئے گا۔ [2] لیکن کارسازِ قضا وقدر نے یہ شرف صرف انصار کے لئے مخصوص کیا تھا۔ چنانچہ قبلِ ہجرت آنحضرت ﷺ نے خواب دیکھا کہ دارالہجرہ ایک پر باغ و بہار مقام ہے۔ خیال تھا کہ وہ یمامہ یا ہجر کا شہر ہوگا لیکن وہ شہر مدینہ نکلا)۔ [3]

نبوت کا تیرھواں سال شروع ہوا اور اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم مدینہ پہنچ چکے تو وحی الٰہی کے مطابق آنحضرت ﷺ نے بھی مدینہ کا عزم فرمایا۔ یہ داستان نہایت پُر اثر ہے اور اسی وجہ سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باوجود اختصار پسندی کے اس کو خوب پھیلا کر لکھا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی لکھا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا گو اس وقت سات آٹھ برس کی تھیں، لیکن ان کا بیان درحقیقت خود رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ انہی سے سن کر کہا ہوگا اور ابتدائے واقعہ میں وہ خود بھی موجود تھیں۔

قریش نے دیکھا کہ اب مسلمان مدینہ میں جا کر طاقت پکڑتے جاتے ہیں اور وہاں اسلام پھیلتا جاتا ہے۔ اس بنا پر انہوں نے دارالندوہ میں، جو دارالشوریٰ تھا، اجلاس عام کیا، ہر قبیلہ کے رؤسا یعنی عتبہ، ابوسفیان، جبیر بن مطعم، نضر بن حارث بن کلدہ ابوالبختری، ابن ہشام، زمعہ بن اسود بن مطلب، حکیم بن حزام، ابوجہل، نبیہ ومنبہ، امیہ بن خلف وغیرہ وغیرہ، یہ سب شریک تھے، لوگوں نے مختلف رائیں پیش کیں، ایک نے کہا: ”محمد ﷺ کے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈال کر مکان میں بند کر دیا جائے۔“ دوسرے نے کہا: ”جلاوطن کر دینا کافی ہے“۔ ابوجہل نے کہا: ”ہر قبیلہ سے ایک شخص کا انتخاب ہو اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر تلواروں سے ان کا خاتمہ کر دے، اس صورت میں ان کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا اور آل ہاشم اکیلے تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے“۔ اس اخیر رائے پر اتفاق ہو گیا اور جھٹ پٹے سے آ کر رسول اللہ ﷺ کے آستانہ مبارک کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ عرب زنانہ مکان کے اندر گھسنا معیوب سمجھتے تھے۔ اس لئے باہر ٹھہرے

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان قاتل نفسه لا یکفر: ۳۱۱۔
[2] مستدرک، ج ۲، ص: ۶۱۳ وزرقانی علی المواهب، ج ۱، ص: ۳۵۹۔
[3] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الی المدینة:۔(س)

رہے کہ آنحضرت ﷺ نکلیں تو یہ فرض ادا کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ سے قریش کو اس درجہ عداوت تھی، تاہم آپ ﷺ کی دیانت پر یہ اعتماد تھا کہ جس شخص کو کچھ مال یا اسباب امانت رکھنا ہوتا تھا آپ ہی کے پاس لا کر رکھتا تھا اس وقت بھی آپ کے پاس بہت سی امانتیں جمع تھیں، آپ کو قریش کے ارادہ کی پہلے سے خبر ہو چکی تھی، اس بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ ''مجھ کو ہجرت کا حکم ہو چکا ہے۔ میں آج مدینہ روانہ ہو جاؤں گا۔ تم میرے پلنگ پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو، صبح کو سب کی امانتیں جا کر واپس دے آنا۔'' یہ سخت خطرے کا موقعہ تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں اور آج رسول اللہ ﷺ کا بسترِ خواب، قتل گاہ کی زمین ہے لیکن فاتح خیبر کے لئے قتل گاہ، فرشِ گل تھا۔

ہجرت سے دو تین دن پہلے رسول اللہ ﷺ دوپہر کے وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر پر گئے، دستور کے موافق دروازہ پر دستک دی، اجازت کے بعد گھر میں تشریف لے گئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''کچھ مشورہ کرنا ہے، سب کو ہٹا دو۔'' بولے کہ ''یہاں آپ کی حرم کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔'' (اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے شادی ہو چکی تھی) آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ کو ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نہایت بیتابی سے کہا: ''میرا باپ آپ پر فدا ہو، کیا مجھ کو بھی ہمراہی کا شرف حاصل ہو گا؟'' ارشاد ہوا ''ہاں۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے لئے چار مہینہ سے دو اونٹنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر تیار کی تھیں، عرض کی کہ ان میں سے ایک آپ پسند فرمائیں، محسن عالم کو کسی کا احسان گوارا نہیں ہو سکتا تھا، ارشاد ہوا ''اچھا، مگر بہ قیمت۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجبوراً قبول کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس وقت کمسن تھیں، ان کی بڑی بہن اسماء رضی اللہ عنہا نے جو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ماں تھیں، سفر کا سامان کیا، دو تین دن کا کھانا ناشتہ دان میں رکھا، نطاق، جس کو عورتیں کمر سے لپیٹتی ہیں، پھاڑ کر اس سے ناشتہ دان کا منہ باندھا۔ یہ وہ شرف تھا جس کی بنا پر آج تک ان کو ''ذات النطاقین'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ [1]

کفار نے جب آپ کے گھر کا محاصرہ کیا اور رات زیادہ گزر گئی تو قدرت نے ان کو بے خبر کر دیا، آنحضرت ﷺ ان کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے، کعبہ کو دیکھا اور فرمایا: ''مکہ! تو مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پہلے سے قرارداد ہو چکی تھی، دونوں صاحب پہلے جبل ثور کے غار میں جا کر پوشیدہ ہوئے، یہ غار آج بھی موجود ہے اور بوسہ گاہ خلائق ہے۔ [2]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ جو نوخیز جوان تھے، شب کو غار میں ساتھ سوتے، صبح منہ اندھیرے شہر چلے جاتے اور پتہ لگاتے کہ قریش کیا مشورے کر رہے ہیں۔ جو کچھ خبر ملتی شام کو آ کر آنحضرت ﷺ

[1] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب الهجرة: ۳۹۰۵۔ (س) [2] یہ غار مکہ سے تین میل داہنی جانب ہے، پہاڑ کی چوٹی قریباً ایک میل بلند ہے، سمندر یہاں سے دکھائی دیتا ہے، دیکھو زرقانی، جلد ا، صفحہ: ۳۳۸۔ (س)

سے عرض کرتے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لاتا اور آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کا دودھ پی لیتے، تین دن تک صرف یہی غذا تھی، لیکن ابن ہشام نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو اسماء گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں، اسی طرح تین راتیں غار میں گزریں۔ ❶

صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت ﷺ کے بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، ظالموں نے آپ کو پکڑا اور حرم میں لے جا کر تھوڑی دیر محبوس رکھا اور چھوڑ دیا۔ ❷ پھر آنحضرت ﷺ کی تلاش میں نکلے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانہ تک آ گئے، آہٹ پا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غمزدہ ہوئے اور آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ ''اب دشمن اس قدر قریب آ گئے ہیں کہ اگر اپنے قدم پر ان کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں گے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ❸

﴿ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ ﴾ (۹/ التوبۃ: ۴۰) ''گھبراؤ نہیں، خدا ہمارے ساتھ ہے۔''

مشہور ہے کہ جب کفار غار کے قریب آ گئے تو خدا نے حکم دیا۔ دفعتہً ببول کا درخت اگا اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر آنحضرت ﷺ کو چھپالیا، ساتھ ہی دو کبوتر آئے اور گھونسلہ بنا کر انڈے دیے، حرم کے کبوتر انہی کبوتروں کی نسل سے ہیں۔ اس روایت کو مواہب لدنیہ ❹ میں تفصیل سے نقل کیا ہے اور زرقانی ❺ نے بزاز وغیرہ سے اس کے ماخذ بتائے ہیں، لیکن یہ تمام روایتیں غلط ہیں اس روایت کا اصل راوی عون بن عمرو ہے، اس کی نسبت امام فن رجال یحییٰ بن معین رحمہ اللہ کا قول ہے ''لا شيء'' یعنی ہیچ ہے، امام بخاری نے کہا ہے کہ ''وہ منکر الحدیث اور مجہول ہے''۔ اس روایت کا ایک اور راوی ابومصعب مکی ہے، وہ مجہول الحال ہے، چنانچہ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال ❻ میں عون بن عمرو کے حال میں یہ تمام اقوال نقل کئے ہیں اور خود اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے۔ ❼

بہر حال چوتھے دن آپ غار سے نکلے، عبداللہ بن اریقط ایک کافر جس پر اعتماد تھا، راہنمائی کے لئے اجرت پر مقرر کر لیا گیا۔ وہ آگے آگے راستہ بتاتا جاتا تھا، ایک رات دن برابر چلے گئے دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ سخت ہوگئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ رسول اللہ ﷺ سایہ میں آرام فرمالیں، چاروں طرف نظر ڈالی، ایک چٹان کے نیچے سایہ نظر آیا، سواری سے اتر کر زمین جھاڑی، پھر اپنی چادر بچھا دی، آنحضرت ﷺ نے آرام فرمایا، تو تلاش میں نکلے کہ کہیں کچھ کھانے کو مل جائے تو لائیں، پاس ہی ایک چرواہا

---

❶ ابن هشام ج ۱، ص: ۲۹۲ یہ پوری تفصیل صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب الهجرة: ۳۹۰۵ وبعد میں ہے، باب مناقب المهاجرین: ۳۶۵۲ میں بعض مزید حالات ہیں وہ بھی ہم نے شامل کر لئے ہیں۔ ❷ تاریخ طبری، ج ۳، ص: ۱۲۳۴۔ (س) ❸ صحیح بخاری، باب مناقب المهاجرين وفضلهم منهم ابو بكر: ۳۶۵۲۔
❹ مواهب لدنیه، ج ۱، ص: ۳۸۴، ۳۸۵۔ ❺ زرقانی، ج ۱، ص: ۳۸۴۔ ❻ میزان الاعتدال، ج ۲، ص: ۳۰۹۔ ❼ (سیرت النبی، ج ۳، ص: ۶۶۳ تا ۶۶۹ طبع جدید: ۱۹۹۸ء [وطبع هذا ۲۰۱۲ء، ج ۳، ص: ۴۸۹ تا ۴۹۰] میں بہ ضمن ''مشہور عام دلائل ومعجزات کی روایتی حیثیت'' ان روایات پر مفصل تنقید کی گئی ہے۔) (س)

بکریاں چرا رہا تھا، اس سے کہا ایک بکری کا تھن گرد و غبار سے صاف کر دے، پھر اس کے ہاتھ صاف کرائے اور دودھ دوہا، برتن کے منہ پر کپڑا لپیٹ دیا کہ گرد نہ پڑنے پائے، دودھ لے کر آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور تھوڑا سا پانی ملا کر پیش کیا، آپ ﷺ نے پی کر فرمایا کہ ''کیا ابھی چلنے کا وقت نہیں آیا؟'' آفتاب اب ڈھل چکا تھا، اس لئے آپ وہاں سے روانہ ہوئے۔ ❶

قریش نے اشتہار دیا تھا کہ جو شخص محمد ﷺ یا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر کے لائے گا، اس کو ایک خون بہا کے برابر (یعنی سو اونٹ) انعام دیا جائے گا، سراقہ بن جعشم ❷ نے سنا تو انعام کے لالچ میں نکلا، عین اس حالت میں کہ آپ روانہ ہو رہے تھے، اس نے آپ ﷺ کو دیکھ لیا اور گھوڑا دوڑا کر قریب آ گیا، لیکن گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، وہ گر پڑا، ترکش سے فال کے تیر نکالے کہ حملہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ جواب میں ''نہیں'' نکلا لیکن سو اونٹوں کا گراں بہا معاوضہ ایسا نہ تھا کہ تیر کی بات مان لی جاتی، دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور آگے بڑھا اب کی بار گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے، گھوڑے سے اتر پڑا اور پھر فال دیکھی، اب بھی وہی جواب تھا، لیکن مکرر تجربہ نے اس کی ہمت پست کر دی اور یقین ہو گیا کہ یہ کچھ اور آثار ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے پاس آ کر قریش کے اشتہار کا واقعہ سنایا اور درخواست کی کہ مجھ کو امن کی تحریر لکھ دیجئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے غلام عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر فرمان امن لکھ دیا۔ ❸

حسن اتفاق یہ کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ شام سے تجارت کا سامان لے کر آ رہے تھے، انہوں نے آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں چند بیش قیمت کپڑے پیش کئے جو اس بے سروسامانی میں غنیمت تھے۔ ❹

ابن سعد نے طبقات ❺ میں اس مقدس سفر کی تمام منزلیں گنائی ہیں۔ اگرچہ عرب کے نقشوں میں آج ان کا نشان نہیں ملتا، تاہم عقیدت مند صرف نام سے لذت یاب ہو سکتے ہیں، خرار، ثنیۃ المرۃ، لقف، مدلجہ، مرجح، حدائد، اذاخر، رابغ (یہ مقام آج بھی حجاج کے رستہ میں آتا ہے، یہاں آپ ﷺ نے مغرب کی نماز پڑھی) ذاسلم، عثانیہ، قاحہ، عرج، جدوات، رکوبہ، عقیق، جثجاثہ۔

تشریف آوری کی خبر مدینہ میں پہلے پہنچ چکی تھی، تمام شہر ہمہ تن چشم انتظار تھا، معصوم بچے فخر اور جوش میں کہتے تھے کہ ''پیغمبر ﷺ آ رہے ہیں۔'' لوگ ہر روز تڑکے سے نکل نکل کر شہر کے باہر جمع ہوتے اور دوپہر تک انتظار کر کے حسرت کے ساتھ واپس چلے جاتے، ایک دن انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے

❶ یہ پوری تفصیل حرف بہ حرف صحیح بخاری، باب مناقب المہاجرین: ٣٦٥٢ میں ہے، ہم نے تمام جزئیات اس لئے نقل کیں کہ اس سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صفائی پسندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ❷ سراقہ بعد میں اسلام لائے اور جب ایران فتح ہوا اور کسریٰ کے زیورات لوٹ میں آئے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہی کو وہ زیورات پہنا کر عالم کی نیرنگی کا تماشا دیکھا۔

❸ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ھجرۃ النبی ﷺ: ٣٩٠٦ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پریشانی میں بھی دوات قلم ساتھ رہتا تھا۔ ❹ ایضاً۔ ❺ طبقات ابن سعد، ج ١، ص: ١٥٧۔

قلعہ سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر پکارا کہ ''اہل عرب! لو تم جس کا انتظار کرتے تھے وہ آ گیا۔'' [1] تمام شہر تکبیر کی آواز سے گونج اٹھا، انصار ہتھیار سجا سجا کر بیتابانہ گھروں سے نکل آئے۔

مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلہ پر جو بالائی آبادی ہے اس کو عالیہ اور قباء کہتے ہیں۔ یہاں انصار کے بہت سے خاندان آباد تھے، ان میں سب سے زیادہ ممتاز عمرو بن عوف کا خاندان تھا اور کلثوم بن الہدم خاندان کے افسر تھے۔ آنحضرت ﷺ یہاں پہنچے تو تمام خاندان نے جوش مسرت میں اللہ اکبر کا نعرہ مارا، یہ فخر ان کی قسمت میں تھا کہ میزبان دوعالم ﷺ نے انہی کی مہمانی قبول کی، انصار ہر طرف سے جوق در جوق آتے اور جوش عقیدت کے ساتھ سلام عرض کرتے۔ [2]

اکثر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم جو آنحضرت ﷺ سے پہلے مدینہ میں آ چکے تھے، وہ بھی انہی کے گھر میں اترے تھے، چنانچہ حضرت ابوعبیدہ، مقداد، خباب، سہیل، صفوان، عیاض، عبداللہ بن مخرمہ، وہب بن سعد، معمر بن ابی سرح، عمیر بن عوف رضی اللہ عنہم، اب تک انہی کے مہمان تھے۔ [3]

جناب امیر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے روانہ ہونے کے تین دن بعد مکہ سے چلے تھے، وہ بھی آ گئے اور یہیں ٹھہرے۔ تمام مؤرخین اور ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یہاں صرف چار دن قیام فرمایا، لیکن صحیح بخاری میں چودہ دن ہے [4] اور یہی قرین قیاس ہے۔

یہاں آپ ﷺ کا پہلا کام مسجد کا تعمیر کرانا تھا، حضرت کلثوم رضی اللہ عنہ کی ایک افتادہ زمین تھی، جہاں کھجوریں سکھائی جاتی تھیں، یہیں دست مبارک سے مسجد کی بنیاد ڈالی، یہی مسجد ہے جس کی شان میں قرآن مجید میں ہے:

﴿ لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۭ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴾. (۹/ التوبة:۱۰۸)

''وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تم اس میں کھڑے رہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جن کو صفائی بہت پسند ہے اور خدا صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

مسجد کی تعمیر میں مزدوروں کے ساتھ آپ ﷺ خود بھی کام کرتے تھے، بھاری بھاری پتھروں کے اٹھاتے وقت جسم مبارک خم ہو جاتا تھا، عقیدت مند آتے اور عرض کرتے: ''ہمارے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، آپ چھوڑ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الی المدینة: ۳۹۰۶۔ [2] صحیح بخاری، باب هجرة النبی ﷺ: ۳۹۰۵ میں ابن شہاب نے عروہ بن زبیر کے حوالے سے بنی عمرو بن عوف کے یہاں رسول اللہ ﷺ کے قیام فرمانے کا ذکر کیا ہے اور اسی باب میں انس بن مالک کی روایت: ۳۹۱۱ سے انصار کے سلام عرض کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ طبقات ابن سعد سیرت نبوی، صفحہ: ۱۵۸۔ [3] ابن سعد، تذکرة کلثوم بن هدم، جزء ثالث، القسم الثانی فی البدریین من الانصار، ص: ۱٤۹، ۱۵۰۔ [4] کتاب مناقب الانصار، باب مقدم النبی ﷺ واصحابه الی المدینة: ۳۹۳۲۔

دیں ہم اٹھالیں گے'' آپ ان کی درخواست قبول فرماتے لیکن پھر اسی وزن کا دوسرا پتھر اٹھا لیتے۔ ❶

عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ شاعر تھے، وہ بھی مزدوروں کے ساتھ شریک تھے اور جس طرح مزدور کام کرنے کے وقت تھکن مٹانے کو گاتے جاتے ہیں، وہ یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے:

اَفْلَحَ مَنْ يُّعَالِجُ الْمَسَاجِدَا	''وہ کامیاب ہے جو مسجد تعمیر کرتا ہے
وَيَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ قَائِمًا وَقَاعِدًا	اور اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھتا ہے۔
وَلَا يَبِيْتُ اللَّيْلَ عَنْهُ رَاقِدًا	اور رات کو جاگتا رہتا ہے۔''

آنحضرت ﷺ بھی ہر ہر قافیہ کے ساتھ آواز ملاتے جاتے تھے۔ ❷

قباء میں آپ کا داخلہ اسلام کے دور خاص کی ابتدا ہے، اس لئے مؤرخین نے اس تاریخ کو زیادہ اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا ہے، اکثر مؤرخین کا اتفاق ہے کہ یہ آٹھ ربیع الاول ۱۳ نبوی (مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء تھی (محمد بن) موسیٰ خوارزمی نے لکھا ہے کہ جمعرات کا دن اور فارسی ماہ تیر کی چوتھی تاریخ اور رومی ماہ ایلول ۹۳۳ سکندری کی دسویں تاریخ تھی ❸ مؤرخ یعقوبی نے ہیئت دانوں سے یہ زائچہ نقل کیا ہے۔ ❹

آفتاب	برج سرطان میں	۲۳ درجہ ۲ دقیقہ پر
زحل	برج اسد میں	۲ درجہ
مشتری	برج حوت میں	۶ درجہ
زہرہ	برج اسد میں	۱۳ درجہ
عطارد	برج اسد میں	۱۵ درجہ

چودہ دن کے بعد (جمعہ کو) ❺ آپ شہر کی طرف تشریف فرما ہوئے۔ (راہ میں بنی سالم کے محلّہ میں نماز کا وقت آ گیا، جمعہ کی نماز یہیں ادا فرمائی، نماز سے پہلے خطبہ دیا، یہ آنحضرت ﷺ کی سب سے پہلی نماز جمعہ اور سب سے پہلا خطبہ نماز تھا۔ لوگوں کو جب تشریف آوری کی خبر معلوم ہوئی تو ہر طرف لوگ جوش مسرت سے پیش قدمی کے لئے دوڑے) آپ کے ننہالی رشتہ دار بنونجار ہتھیار سجا سجا کر آئے ❻ قباء سے مدینہ تک دورویہ جان نثاروں کی صفیں تھیں، راہ میں انصار کے خاندان آتے تھے، ہر قبیلہ سامنے آ کر عرض کرتا ''حضور!

---

❶ وفاء الوفاء، بحوالہ طبرانی کبیر، ج ۱، ص: ۱۸۰۔ ❷ وفاء الوفاء، بحوالہ ابن ابی شیبہ، ج ۱، ص: ۱۸۱ مصر۔ ❸ عینی شرح بخاری، جلد دوم، صفحہ: ۳۵۴۔ (عینی مطبوعہ قسطنطنیہ میں مطبع کی غلطی سے ۳۳ سبعمائۃ لکھا گیا ہے، اس کو تسعمائۃ پڑھنا چاہیے، رومی ماہ ایلول کی دسویں کے بجائے جدید طریقہ حساب سے بیسویں ثابت ہوتی ہے، خوارزمی نے جمعہ کا دن بتایا ہے، لیکن جدید حساب سے دوشنبہ کا دن آتا ہے)۔ ❹ ج ۲، ص: ۴۱۔ ❺ خوارزمی کے حساب کے مطابق روز ورود (جمعرات) نہ لیا جائے تو ۱۴ دن کے بعد جمعہ ہوگا۔ ❻ یہ واقعہ بخاری کے متعدد ابواب مسجد، ہجرت وغیرہ میں مذکور ہے۔ ہتھیار سجا سجا کر آنے کا ذکر باب ھجرۃ النبی: ۳۹۰۶ پر ہے اور یہ روایت صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب ابتناء مسجد النبی ﷺ: ۱۱۷۳ میں بھی ہے۔ طبقات ابن سعد، ج ۱، ص: ۱۶۰ اور ابن ھشام، ج ۱، ص: ۲۹۷ پر ہے۔

یہ گھر ہے، یہ مال ہے، یہ جان ہے" آپ منت کا اظہار فرماتے اور دعائے خیر دیتے، شہر قریب آ گیا تو جوش کا یہ عالم تھا کہ پردہ نشین خاتونیں چھتوں پر نکل آئیں اور گانے لگیں: [1]

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا — چاند نکل آیا ہے۔
مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاع — کوہ وداع کی گھاٹیوں سے۔
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا — ہم سب پر خدا کا شکر واجب ہے۔
مَا دَعٰى لِلّٰهِ دَاع — جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں"

معصوم لڑکیاں دف بجا بجا کر گاتی تھیں:

نَحْنُ جَوَارٍ مِنْ بَنِي النَّجَّارِ — ہم خاندان نجار کی لڑکیاں ہیں۔
يَا حَبَّذَا مُحَمَّدًا مِنْ جَارِ — محمد ﷺ کیا اچھا ہمسایہ ہے۔

آپ ﷺ نے ان لڑکیوں کی طرف خطاب کر کے فرمایا: "کیا تم مجھ کو چاہتی ہو؟" بولیں "ہاں" فرمایا کہ "میں بھی تم کو چاہتا ہوں"

جہاں اب مسجد نبوی ﷺ ہے، اس سے متصل حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا گھر تھا، کوکبۂ نبوی ﷺ یہاں پہنچا سخت کشمکش تھی کہ آپ ﷺ کی میزبانی کا شرف کس کو حاصل ہو؟ قرعہ ڈالا گیا اور آخر یہ دولت حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی۔ [2]

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کا مکان دو منزلہ تھا، انہوں نے بالائی منزل پیش کی، لیکن آپ ﷺ نے

---

[1] وفاء الوفاء، ج۱، ص: ۱۸۷، پہلے اشعار کے متعلق زرقانی، (ج۱ص:۴۱۶،۴۱۸) میں نہایت محققانہ، محدثانہ بحث کی ہے اور ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ ثنیۃ الوداع شام کی طرف ہے، نہ کہ مکہ کی طرف، مواہب میں لکھا ہے کہ یہ اشعار حلوانی نے شیخین کی شرط پر روایت کئے ہیں، بخاری میں بھی یہ اشعار منقول ہیں، مگر غزوۂ تبوک کے موقع پر، (غزوۂ تبوک کے بعد کتاب المغازی، باب کتاب النبی ﷺ الی کسریٰ وقیصر کے باب (حدیث نمبر: ٤٤٢٧) میں امام بخاری نے حضرت سائب بن یزید کا یہ قول نقل کیا ہے: "اذ کرانی خرجت مع الصبیان نتلقی النبی ﷺ الی ثنیۃ الوداع مقدمه من غزوة تبوك" اس کی مزید تفصیل فتح الباری، ج۸، ص:۹۸ پر ملاحظہ ہو۔ لیکن ان دونوں روایتوں میں کچھ تناقض نہیں، ممکن ہے دونوں موقعوں پر یہ اشعار پڑھے گئے ہوں۔ [2] ابو ایوب رضی اللہ عنہ کا نام خالد ہے، اصابہ فی تمییز الصحابہ میں اسی نام سے ان کا ذکر کیا ہے اور وہیں یہ واقعہ لکھا ہے، (ج۲، ص:۹ مطبعہ سعادۃ مصر) اکثر سیر اور تواریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ چونکہ ہر شخص اپنے گھر میں اتارنے کی درخواست کرتا تھا، آپ نے فرمایا کہ "میرے ناقہ کو چھوڑ دو، وہ خدا کی طرف سے مامور ہے۔" چنانچہ ناقہ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے گھر کے سامنے جا کر بیٹھ گیا، اس لئے آپ نے انہی کے گھر پر قیام فرمایا۔ (وفاء الوفاء، ج۱، ص:۱۸۷) لیکن صحیح مسلم، کتاب الزهد، باب فی حدیث الهجرة، الخ: ۷۵۲۲ میں ہے کہ جب لوگوں میں آپ ﷺ کی میزبانی کے متعلق جھگڑا ہوا تو آپ نے کہا کہ "میں بنو نجار کے ہاں اتروں گا، جو عبدالمطلب کے ماموں ہیں۔" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عمداً ایسا کیا تھا، حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ اسی خاندان سے تھے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ صغیر میں تصریح کی ہے کہ ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے گھر اترنا اسی قرابت کی وجہ سے تھا۔ (وفاء الوفاء، ج۱، ص:۱۸۷)۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: عن ابی بکر مضی النبی وانا معه حتی اتینا المدینة لیلا فنازعه القوم ایهم ینزل علیه فقال النبی ﷺ انی انزل اللیلة علی بنی النجار اکرمهم بذلك الخ، ص:١٤، ١٥۔

زائرین کی آسانی کے لئے نیچے کا حصہ پسند فرمایا۔ ابوایوب رضی اللہ عنہ دو وقت آپ کی خدمت میں کھانا بھیجتے اور آپ ﷺ جو چھوڑ دیتے، ابوایوب رضی اللہ عنہ اور ان کی زوجہ کے حصہ میں آتا، کھانے میں جہاں آنحضرت ﷺ کی انگلیوں کا نشان پڑا ہوتا، ابوایوب رضی اللہ عنہ تبرکاً وہیں انگلیاں ڈالتے۔

ایک دن اتفاق سے بالائی منزل میں پانی کا برتن ٹوٹ گیا، اندیشہ ہوا کہ پانی بہہ کر نیچے جائے اور آنحضرت ﷺ کو تکلیف ہو، گھر میں اوڑھنے کا صرف ایک لحاف تھا، حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نے اس کو ڈال دیا کہ پانی جذب ہو کر رہ جائے۔ ❶

آنحضرت ﷺ نے سات مہینہ تک یہیں قیام فرمایا۔ اس اثنا میں جب مسجد نبوی ﷺ اور آس پاس کے حجرے تیار ہو گئے تو آپ نے نقل مکان فرمایا، تفصیل آگے آتی ہے۔

مدینہ میں آ کر آپ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ (اور اپنے غلام ابورافع) کو دو اونٹ اور پانچ سو درہم دے کر بھیجا کہ مکہ جا کر صاحبزادیوں اور حرم نبوی کو لے آئیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ وہ بھی اپنی ماں اور بہنوں کو لے کر چلے آئیں آنحضرت ﷺ کی صاحبزادیوں میں سے رقیہ رضی اللہ عنہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ حبش میں تھیں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو ان کے شوہر نے آنے نہ دیا۔ زید رضی اللہ عنہ صرف حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا (اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا) اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہا (زوجہ محترم نبوی) کو لے کر آئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائی عبداللہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ آئیں۔ ❷

مسجد نبوی ﷺ اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے حجروں کی تعمیر

مدینہ میں قیام کے بعد سب سے پہلا کام ایک خانہ خدا کی تعمیر تھی، اب تک یہ معمول تھا کہ مویشی خانہ میں آپ ﷺ نماز پڑھا کرتے تھے، ❸ دولت کدہ کے قریب خاندان نجار کی زمین تھی جس میں کچھ قبریں تھیں، کچھ کھجور کے درخت تھے، آپ ﷺ نے ان لوگوں کو بلا کر فرمایا: ''میں یہ زمین بہ قیمت لینا چاہتا ہوں۔'' وہ بولے کہ ''ہم قیمت لیں گے لیکن آپ ﷺ سے نہیں بلکہ خدا سے۔'' چونکہ اصل میں وہ زمین دو یتیم بچوں کی تھی آپ ﷺ نے خود ان یتیموں کو بلا بھیجا۔ ان یتیم بچوں نے بھی اپنی کائنات نذر کرنی چاہی لیکن آپ ﷺ نے گوارا نہ کیا۔ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نے قیمت ادا کی، قبریں اکھڑوا کر زمین ہموار کر دی گئی اور مسجد کی تعمیر شروع ہوئی، شہنشاہ دو عالم پھر مزدوروں کے لباس میں تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے اور یہ رجز پڑھتے جاتے تھے، آنحضرت ﷺ بھی ان کے ساتھ آواز ملاتے اور فرماتے۔ ❹

---

❶ اصابہ، ذکر ابو ایوب، ج۲، ص:۹۰ مطبع سعادۃ مصر اورزرقانی بحوالہ قاضی ابو یوسف وحاکم، ج۳، ص:۴۶۱، و وفاء الوفاء، ج۱، ص: ۱۸۸ وابن ہشام، ج۱، ص: ۲۹۹۔ ❷ ابن سعد، جزء نساء، ص: ۴۳۔

❸ ابوداود، کتاب الصلوۃ، باب فی بناء المسجد:۴۵۳۔ ❹ بخاری، کتاب الصلوۃ، باب ھل ینبش قبور مشرکی الجاھلیۃ ویتخذ مکانھا مساجد: ۴۲۸؛ کتاب المناقب، باب دعاء النبی ﷺ اصلح الانصار والمھاجرۃ:۳۷۹۵و باب الھجرۃ:۳۹۰۶وحج، وباب البیوع، وعینی شرح بخاری، جلد۲ صفحہ:۳۵۷ وزرقانی (ج۱، ص: ۴۲۲ وما بعد)۔

اللھم لا خیرا لا خیرا لاخرۃ فاغفر الا نصار والمھاجرۃ

”اے خدا! کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے۔ اے خدا! مہاجرین اور انصار کو بخش دے۔“

یہ مسجد ہر قسم کے تکلفات سے بری اور اسلام کی سادگی کی تصویر تھی، یعنی کچی اینٹوں کی دیواریں، برگ خرما کا چھپر اور کھجور کے ستون تھے۔ قبلہ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا، لیکن جب قبلہ بدل کر کعبہ کی طرف ہو گیا تو شمالی جانب ایک نیا دروازہ قائم کر دیا گیا، فرش چونکہ بالکل خام تھا، بارش میں کیچڑ ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم نماز کے لئے آئے تو کنکریاں لیتے آئے اور اپنی اپنی نشست گاہ پر بچھالیں، آنحضرت ﷺ نے پسند فرمایا اور سنگریزوں کا فرش بنوا دیا۔

مسجد کے ایک سرے پر ایک مسقّف چبوترہ تھا جو صفہ کہلاتا تھا۔ یہ ان لوگوں کے لئے تھا جو اسلام لاتے تھے اور گھر بار نہیں رکھتے تھے۔ [1]

مسجد نبوی ﷺ جب تعمیر ہو چکی تو مسجد سے متصل ہی آپ نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کیلئے مکان بنوائے۔ اس وقت تک حضرت سودہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نکاح میں آ چکی تھیں، اس لئے دو ہی حجرے بنے جب اور ازواج رضی اللہ عنہن آتی گئیں تو اور مکانات بنتے گئے۔ یہ مکانات کچی اینٹوں کے تھے، ان میں سے پانچ کھجور کی ٹٹیوں سے بنے تھے، جو حجرے اینٹوں کے تھے ان کے اندرونی حجرے بھی ٹٹیوں کے تھے۔ ترتیب یہ تھی کہ حضرت ام سلمہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت زینب، حضرت جویریہ، حضرت میمونہ، حضرت زینب رضی اللہ عنہن بنت جحش کے مکانات شامی جانب تھے اور حضرت عائشہ، حضرت صفیہ، حضرت سودہ رضی اللہ عنہن مقابل جانب تھیں۔ [2] یہ مکانات مسجد سے اس قدر متصل تھے کہ جب آپ مسجد میں اعتکاف میں ہوتے تو مسجد سے سر نکال دیتے اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن گھر میں بیٹھے بیٹھے آپ کے بال دھو دیتی تھیں۔

یہ مکانات چھ چھ، سات سات ہاتھ چوڑے اور دس دس ہاتھ لمبے تھے۔ چھت اتنی اونچی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو چھو لیتا تھا، دروازوں پر کمبل کا پردہ پڑا رہتا تھا۔ [3] راتوں کو چراغ نہیں جلتے تھے۔ [4]

آنحضرت ﷺ کے ہمسایہ میں جو انصار رہتے تھے ان میں حضرت سعد بن عبادہ، حضرت سعد بن معاذ، حضرت عمارہ بن حزم اور حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہم رئیس اور دولت مند تھے۔ یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں دودھ بھیج دیا کرتے تھے اور اسی پر آپ بسر فرماتے تھے۔ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے التزام کر لیا تھا کہ رات کے کھانے پر ہمیشہ اپنے ہاں سے ایک بڑا بادیہ بھیجا کرتے تھے جس میں کبھی سالن، کبھی دودھ، کبھی گھی ہوتا تھا۔ [5] حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ماں، اُمِ انس رضی اللہ عنہا نے اپنی جائیداد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش

---

[1] زرقانی، ج ۱، ص:۴۲۹، ۴۳۰۔ [2] طبقات ابن سعد، سیرت نبوی ﷺ ص:۱۶۱۔

[3] منازل نبوی ﷺ کا حال طبقات ابن سعد، جزء ۸، ص:۱۱۷ اور وفاء الوفاء، (ج ۱، ص:۳۲۵ وبعد) میں تفصیلاً ہے۔

[4] بخاری، کتاب الصلاۃ، باب الصلوٰۃ علی الفراش:۳۸۲۔ [5] طبقات ابن سعد، جلد کتاب النساء، ص:۱۱۶۔

کی۔ آنحضرت ﷺ نے قبول فرما کر اپنی دایہ ام ایمن کو دیدی [1] اور خود فقر و فاقہ اختیار فرمایا۔

اذان کی ابتدا

اسلام کے تمام عبادات کا اصلی مرکز وحدت و اجتماع ہے۔ اس وقت تک کسی خاص علامت کے نہ ہونے کی وجہ سے نماز باجماعت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ لوگ وقت کا اندازہ کر کے آتے تھے اور نماز پڑھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو یہ پسند نہ تھا، آپ نے ارادہ فرمایا کہ کچھ لوگ مقرر کر دیے جائیں جو وقت پر لوگوں کو گھروں سے بلا لائیں، لیکن اس میں زحمت تھی، صحابہ رضی اللہ عنہم کو بلا کر مشورہ کیا، لوگوں نے مختلف رائیں دیں، کسی نے کہا نماز کے وقت مسجد پر ایک علم کھڑا کر دیا جائے، لوگ دیکھ دیکھ کر آتے جائیں گے، آپ نے یہ طریقہ ناپسند فرمایا، عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاں اعلان نماز کے جو طریقے ہیں وہ بھی آپ کی خدمت میں عرض کئے گئے، لیکن آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے پسند کی اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اذان دیں [2] اس سے ایک طرف تو نماز کی اطلاع عام ہو جاتی تھی، دوسری طرف دن میں پانچ دفعہ دعوت اسلام کا اعلان ہو جاتا تھا۔

صحاح ستہ کی بعض کتابوں میں ہے کہ اذان کی تجویز عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے پیش کی تھی جو انہوں نے خواب میں دیکھی تھی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی خواب میں توارد ہوا، لیکن صحیح بخاری کی روایت کے مقابلہ میں کسی اور روایت کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ [3]

بخاری میں صاف تصریح ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے بوق اور ناقوس کی تجویزیں پیش کی گئیں، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اذان کی تجویز پیش کی اور آپ ﷺ نے اس کے موافق حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بلا کر اذان کا حکم دیا، خواب کا ذکر نہیں۔

مواخات

مہاجرین مکہ معظمہ سے بالکل بے سروسامان آئے تھے۔ گو ان میں دولت مند اور خوشحال بھی تھے، لیکن کافروں سے چھپ کر نکلے تھے، اس لئے کچھ ساتھ نہ لا سکے تھے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الهبة، باب فضل المنیحة: ۲۶۳۰۔ [2] ابو داود، کتاب الصلوۃ، باب بدء الاذان: ٤٩٨، ٤٩٩ و بخاری، کتاب الاذان، باب بدء الاذان: ٦٠٤، بخاری میں زید کے واقعہ کا ذکر نہیں۔ [3] یہ روایت صحیح بخاری (٦٠٦) کے علاوہ، صحیح مسلم (٨٣٧)، نسائی، کتاب الاذان، باب بدء الاذان: ٦٢٧) اور ترمذی، ابواب الصلوۃ، باب ماجاء فی بدء الاذان، ١٩٠ میں بھی ہے۔ لیکن تمام روایات کو اور علما کی تحقیقات کو سامنے رکھنے سے مسئلہ کی صحیح صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوسرے لوگوں کی راؤں کے مقابلے میں اپنی رائے یہ پیش کی تھی۔ جیسا کہ بخاری والی روایت (٦٠٤) میں ہے: اولا تبعثون رجلا ینادی بالصلوٰۃ کہ ایک آدمی بھیجا جائے جو پکار کر نماز کا اعلان کر دے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور الصلوٰۃ جامعة کے لفظ سے اس کا اعلان کر دیا اسکے بعد آنحضرت ﷺ نے خود بھی اور بعض دوسرے صحابہ نے بھی خواب میں اذان کے مروجہ الفاظ کے ساتھ اذان کو خواب میں دیکھا اور آنحضرت ﷺ نے اس کو منجانب اللہ سمجھ کر قبول فرمایا اور اسی کے مطابق اذانِ مروجہ جاری فرمائی گئی فتح الباری (ج ٢، ص: ٦٢ وبعد) ونووی وزرقانی (ج ١، ص: ٤٣٤ وبعد) وروض الانف باب بدء الاذان ج ٢، ص: ١١٩۔١٢١) میں یہ تفصیلات بحوالہ وسند مذکور ہیں۔ (س)

اگرچہ مہاجرین کے لئے انصار کا گھر مہمان خانۂ عام تھا تاہم ایک مستقل انتظام کی ضرورت تھی۔ مہاجرین نذر اور خیرات پر بسر کرنا پسند نہیں کرتے تھے، وہ دست و بازو سے کام لینے کے خوگر تھے، چونکہ بالکل نکھرے تھے اور ایک حبہ تک پاس نہ تھا۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے خیال فرمایا کہ انصار اور ان میں رشتہ اخوت قائم کر دیا جائے۔ جب مسجد کی تعمیر قریب ختم ہوئی تو آپ ﷺ نے انصار کو طلب فرمایا، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جو اس وقت دہ سالہ تھے، ان کے مکان میں لوگ جمع ہوئے، مہاجرین کی تعداد پینتالیس تھی، آنحضرت ﷺ نے انصار کی طرف خطاب کر کے فرمایا: ''یہ تمہارے بھائی ہیں۔'' پھر مہاجرین اور انصار میں سے دو دو شخص کو بلا کر فرماتے گئے کہ یہ اور تم بھائی بھائی ہو اور اب وہ درحقیقت بھائی بھائی تھے۔ انصار نے مہاجرین کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ دے دیا کہ آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے، سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ جو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بھائی قرار پائے، ان کی دو بیویاں تھیں، عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ایک کو میں طلاق دیتا ہوں آپ اس سے نکاح کر لیجئے۔ لیکن انہوں نے احسان مندی کے ساتھ انکار کیا۔ [1]

انصار کا مال و دولت، جو کچھ تھا نخلستان تھے، روپے پیسے تو اس زمانہ میں تھے نہیں [2] انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ یہ باغ ہمارے بھائیوں میں برابر تقسیم کر دیے جائیں، مہاجرین تجارت پیشہ تھے اور اس وجہ سے کھیتی کے فن سے بالکل ناآشنا تھے۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے ان کی طرف سے انکار کیا، انصار نے کہا سب کاروبار ہم خود انجام دے لیں گے جو کچھ پیداوار ہوگی اس میں نصف حصہ مہاجرین کا ہوگا، مہاجرین نے اس کو منظور کیا۔ [3]

یہ رشتہ بالکل حقیقی رشتہ بن گیا، کوئی انصاری مرتا تھا تو اس کی جائداد اور مال مہاجر کو ملتا تھا [4] اور بھائی بند محروم رہتے، یہ اس فرمان الٰہی کی تعمیل تھی:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ ﴾ (۸/ الانفال:۷۲)

''جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور خدا کی راہ میں مال و جان سے جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے ان لوگوں کو پناہ دی اور ان کی مدد کی، یہ لوگ باہم بھائی بھائی ہیں۔''

جنگ بدر کے بعد جب مہاجرین کو اعانت کی ضرورت نہ رہی تو یہ آیت اتری:

---

[1] مواخات کا ذکر اور ایک ایک کا نام، ابـن هشـام ج ۱ ، ص: ۳۰۴ ، ۳۰۵ میں ہے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا واقعہ صحیح بخاری ، کتاب المناقب ، باب اخاء النبی ﷺ: ۳۷۸۰ ، ۳۷۸۱ اور باب کیف آخی النبی ﷺ بین اصحابه: ۳۹۳۷ میں ہے۔ [2] صحیح بخاری ، کتاب مناقب الانصار ، باب اخاء النبی ﷺ بین......: ۳۷۸۲۔

[3] ایضًا۔ [4] صحیح بخاری ، کتاب التفسیر ، تفسیر سورۃ نساء ، باب ﴿ولکل جعلنا موالی مما ترک الوالدان......﴾: ۴۵۸۰۔

﴿ وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ ﴾ (۸/ الانفال:۷۵)

''ارباب قرابت، ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔''

اُس وقت سے یہ قاعدہ جاتا رہا۔ چنانچہ کتب تفسیر وحدیث میں یہ تصریح مذکور ہے۔

سنہ ۴ ھ میں بنونضیر جب جلاوطن ہوئے اور ان کی زمین اور نخلستان قبضہ میں آئے تو آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر فرمایا ''کہ مہاجرین نادار ہیں، اگر تمہاری مرضی ہو تو نئے مقبوضات تنہا ان کو دے دیے جائیں اور تم اپنے نخلستان واپس لے لو۔'' انصار نے عرض کی کہ نہیں ہمارے نخلستان بھائیوں ہی کے قبضہ میں رہنے دیجئے اور نئے بھی انہی کو عنایت فرمائیے۔ ❶

دنیا انصار کے اس ایثار پر ہمیشہ ناز کرے گی، لیکن یہ بھی دیکھو کہ مہاجرین نے کیا کیا؟ حضرت سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو ایک ایک چیز کا جائزہ دے کر نصف لے لینے کی درخواست کی تو انہوں نے کہا: ''خدا یہ سب آپ کو مبارک کرے، مجھ کو صرف بازار کا راستہ بتا دیجئے۔'' انہوں نے قینقاع کا، جو مشہور بازار تھا جا کر راستہ بتا دیا، انہوں نے کچھ گھی، کچھ پنیر خریدا اور شام تک خرید وفروخت کی چندروز میں اتنا سرمایہ ہو گیا کہ شادی کر لی۔ ❷ رفتہ رفتہ ان کی تجارت کو یہ ترقی ہوئی کہ خود ان کا قول تھا کہ خاک پر ہاتھ ڈالتا ہوں تو سونا بن جاتی ہے، ان کا اسباب تجارت سات سات سو اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جس دن مدینہ میں پہنچتا تمام شہر میں دھوم مچ جاتی تھی۔ ❸

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے دکانیں کھول لیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کارخانہ مقام سخ میں تھا جہاں وہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے ❹ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنوقینقاع کے بازار میں کھجور کی خرید وفروخت کرتے تھے ❺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی تجارت میں مشغول ہو گئے تھے ❻ اور شاید ان کی اس تجارت کی وسعت ایران تک پہنچ گئی تھی ❼ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اسی قسم کی چھوٹی بڑی تجارت شروع کر دی تھی۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر لوگوں نے جب کثرت روایت کی بنا پر اعتراض کیا کہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم تو اس قدر روایت نہیں کرتے تو انہوں نے کہا: ''اس میں میرا کیا قصور ہے، دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم بازار میں تجارت کرتے تھے اور میں رات دن بارگاہ نبوت میں حاضر رہتا تھا۔'' ❽ پھر جب خیبر فتح ہوا تو تمام مہاجرین نے یہ نخلستان انصار کو واپس کر دیے۔ صحیح مسلم باب الجہاد میں ہے:

---

❶ فتوح البلدان، مطبوعہ یورپ، ص:۲۰۔ ❷ صحیح بخاری میں دو مختلف موقعوں پر یہ واقعہ مذکور ہے۔ کتاب البیوع، باب ماجاء فی قول اللہ ﴿فاذا قضیت الصلوۃ﴾ الخ:۲۰۴۹ وباب اخاء النبی ﷺ بین المهاجرین والانصار: ۳۷۸۰ وباب کیف اخی النبی ﷺ بین اصحابه: ۳۹۳۷ وباب الولیمة ولو بشاة:۵۱۶۷۔(س)

❸ اسد الغابة، ج۳، ص:۳۱۴ وص: ۳۱۵، وغیرہ میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ ❹ ابن سعد، ج۳، ص: ۱۳۱۔

❺ مسند امام ابن حنبل، ج۱، ص:۶۲۔ ❻ مسند ابن حنبل، ج ٤، ص: ٤۰۰۔

❼ مسند ابن حنبلؒ، ج۳، ص:۳٤۷۔ ❽ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب حفظ العلم:۱۱۸۔

ان رسول اللہ ﷺ لما فرغ من قتال اھل خیبر وانصرف الی المدینۃ رد المھاجرون الی الانصار منائحھم التی کانوا منحوھم من ثمارھم۔ [1]

''آنحضرت ﷺ جب جنگ خیبر سے فارغ ہوئے اور مدینہ واپس آئے تو مہاجرین نے انصار کے عطیے جو نخلستان کی صورت میں تھے واپس کر دیے۔''

مہاجرین کے لئے مکانات کا یہ انتظام ہوا کہ انصار نے اپنے گھروں کے آس پاس جو افتادہ زمینیں تھیں ان کو دے دیں اور جن کے پاس زمین نہ تھی انہوں نے اپنے مسکونہ مکانات دے دیے، سب سے پہلے حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ نے اپنی زمین پیش کی، بنوزہرہ مسجد نبوی ﷺ کے عقب میں آباد ہوئے، عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے یہاں ایک قلعہ (جس کو گڑھی کہنا زیادہ موزوں ہوگا) بنوایا، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو ایک وسیع زمین ہاتھ آئی، حضرت عثمان، مقداد، حضرت عبید رضی اللہ عنہم کو انصار نے اپنے مکانات کے پہلو میں زمینیں دیں۔ [2] مواخات کے رشتہ سے، جو لوگ آپس میں بھائی بھائی بنے، ان میں سے بعض حضرات کے نام یہ ہیں: [3]

مہاجرین	انصار
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ	حضرت خارجہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ [4]
حضرت عمر رضی اللہ عنہ	حضرت عتبان بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ	حضرت اوس بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ
حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ	حضرت سعد بن معاذ انصاری رضی اللہ عنہ
حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ	حضرت سلامہ بن وقش رضی اللہ عنہ
حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ
حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما	حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ
حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ	حضرت منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ
حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ	حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ
حضرت بلال رضی اللہ عنہ	حضرت ابورویحہ رضی اللہ عنہ
حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ	حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ

[1] صحیح مسلم، کتاب الجھاد والسیر، باب رد المھاجرین الی الانصار ...: ٤٦٠٣۔

[2] یہ پوری تفصیل معجم البلدان مدینہ منورہ کے ذکر میں ہے (ج ۷، ص: ۴۳۰)۔

[3] یہ تفصیل ابن ہشام، ج ۱، ص: ۳۰۴، ۳۰۵ میں (اور ناموں کے اضافہ کے ساتھ) ہے۔

[4] ابن ہشام نے خارجہ بن زہیر لکھا ہے۔

حضرت سعید رضی اللہ عنہ بن زید بن عمرو بن نفیل — حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ

مواخات کا رشتہ بظاہر ایک عارضی ضرورت کے لئے قائم کیا گیا کہ بے خانماں مہاجرین کا چند روزہ انتظام ہو جائے، لیکن درحقیقت یہ عظیم الشان اغراض اسلامی کی تکمیل کا سامان تھا۔

اسلام، تہذیب اخلاق و تکمیلِ فضائل کی شہنشاہی ہے۔ اس سلطنت الٰہی کے لئے وزراء، ارباب تدبیر، سپہ سالاران لشکر، ہر قابلیت کے لوگ درکار ہیں، شرف صحبت کی برکت سے مہاجرین میں ان قابلیتوں کا ایک گروہ تیار ہو چکا تھا اور ان میں یہ وصف پیدا ہو چکا تھا کہ ان کی درسگاہِ تربیت سے اور اربابِ استعداد بھی تربیت پا کر نکلیں، اس بنا پر جن لوگوں میں رشتۂ اخوت قائم کیا گیا ان میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ استاد اور شاگرد میں وہ اتحاد مذاق موجود ہو جو تربیت پذیری کے لئے ضروری ہے، تفحص اور استقصا سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص جس کا بھائی بنایا گیا۔ دونوں میں یہ اتحاد مذاق ملحوظ رکھا گیا اور جب اس بات پر لحاظ کیا جائے کہ اتنی کم مدت میں سینکڑوں اشخاص کی طبیعت اور فطرت اور مذاق کا صحیح اور پورا اندازہ کرنا قریباً ناممکن ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ شانِ نبوت کی خصوصیات میں سے ہے۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ عشرۂ مبشرہ میں ہیں، ان کے والد زید آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے ملتِ ابراہیمی کے پیرو ہو چکے تھے اور گویا اسلام کے مقدمۃ الجیش تھے۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے ان ہی کے دامن تربیت میں پرورش پائی تھی، اس لئے اسلام کا نام سننے کے ساتھ ہی انہوں نے لبیک کہا۔ ان کی ماں بھی ان کے ساتھ یا ان سے پہلے اسلام لائیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہی کے گھر میں اور ان ہی کی ترغیب سے اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے۔ علم و فضل کے لحاظ سے فضلائے صحابہ میں تھے۔ ان کی اخوت حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے قائم کی گئی جنہوں نے یہ مرتبہ حاصل کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو سید المسلمین کہتے تھے، بارگاہِ نبوت میں منصبِ انشا پر سب سے پہلے وہی ممتاز ہوئے، فن قراءت کے وہ امام تسلیم کئے جاتے ہیں۔ [1]

حضرت ابو حذیفہ عتبہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کے فرزند تھے، جو قریش کا رئیس اعظم تھا۔ اس مناسبت سے ان کو حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا گیا جو قبیلۂ اشہل کے سردار تھے۔

حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ جن کو رسول اللہ ﷺ نے امین الامۃ کا خطاب دیا تھا، ایک طرف تو فاتحِ شام ہونے کی قابلیت رکھتے تھے، دوسری طرف اسلام کے مقابلہ میں پدری اور فرزندی کے جذبات ان پر کچھ اثر نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ غزوۂ بدر میں جب ان کے باپ ان کے مقابلہ میں آئے تو انہوں نے پہلے حقوق ابوت کی مراعات کی لیکن بالآخر اسلام پر باپ کو نثار کر دینا پڑا۔ ان کی تربیت میں حضرت سعد بن

[1] اصابہ ذکر ابی بن کعب، ج ۱، ص:۱٦۔

معاذ رضی اللہ عنہ دیے گئے، جو قبیلہ اوس کے رئیس اعظم تھے، ان میں بھی ایثار کا یہ وصف نمایاں طور پر نظر آتا ہے، بنوقریظہ ان کے حلیف تھے اور عرب میں حلیف کا رشتہ اخوت اور ابوت کے برابر ہوتا تھا۔ تاہم غزوۂ بنی قریظہ میں جب اسلام کا مقابلہ پیش آیا تو انہوں نے اپنے چار سو حلیفوں کو اسلام پر نثار کر دیا۔

حضرت بلال اور حضرت ابورویحہ، حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابودرداء، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت مصعب اور حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہم میں وہ وحدت موجود تھی جس کی بدولت نہ صرف شاگرد، بلکہ استاد بھی شاگرد سے اثر پذیر ہوسکتا تھا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ مدینہ میں آئے تو پنیر سر پر رکھ کر بیچتے تھے، حضرت سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ کی صحبت میں جو امیر الامراء تھے دولت اور امارت کے جس درجہ پر پہنچے ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔

انصار نے مہاجرین کی مہمانی اور ہمدردی کا جو حق ادا کیا دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ ''میں اس کو انصار میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے عرض کی کہ ''پہلے ہمارے بھائی مہاجروں کو اتنی ہی زمین عنایت فرمالیجئے تب ہم لینا منظور کریں گے۔'' [1]

ایک دفعہ ایک فاقہ زدہ شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا کہ سخت بھوکا ہوں، آپ نے گھر میں دریافت فرمایا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ جواب آیا کہ ''صرف پانی'' آپ نے حاضرین کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا: ''کوئی ہے؟ جو ان کو آج اپنا مہمان بنائے۔'' ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی ''میں حاضر ہوں۔'' غرض وہ اپنے گھر لے گئے۔ لیکن وہاں بھی برکت تھی، بیوی نے کہا: صرف بچوں کا کھانا موجود ہے۔ انہوں نے بیوی سے کہا: چراغ بجھا دو اور وہی کھانا مہمان کے سامنے لا کر رکھ دو، تینوں ساتھ کھانے پر بیٹھے۔ میاں بیوی بھوکے بیٹھے رہے اور اس طرح ہاتھ چلاتے رہے کہ گویا کھا رہے ہیں، اسی واقعہ [2] کے بارہ میں یہ آیت اتری ہے:

﴿ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ (۵۹/ الحشر :۹)

''اور گوان کو خود تنگی ہو، تاہم اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔''

صفہ اور اصحاب صفہ

اصحابِ صُفّہ اسلامی لغت کا ایک متداول لفظ ہے، گو اس کی حقیقت سے لوگ اچھی طرح واقف نہیں ''صفہ'' سائبان کو کہتے ہیں۔ یہ ایک سائبان تھا جو مسجد نبوی کے ایک کنارے پر مسجد سے ملا ہوا تیار کیا گیا تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے اکثر تو مشاغل دینی کے ساتھ ہر قسم کے کاروبار یعنی تجارت یا زراعت وغیرہ بھی کرتے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المساقاۃ، باب القطائع: ۲۳۷۶، ۲۳۷۷، ۳۱۶۳۔ [2] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب قول اللہ عزوجل [[وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ......]]: ۳۷۹۸، ۴۸۸۹۔

تھے لیکن چند لوگوں نے اپنی زندگی صرف عبادت اور آنحضرت ﷺ کی تربیت پذیری پر نذر کر دی تھی۔ان لوگوں کے بال بچے نہ تھے اور جب شادی کر لیتے تھے تو اس حلقہ سے نکل آتے تھے۔ان میں ایک ٹولی دن کو جنگل سے لکڑیاں چن لاتی اور بیچ کر اپنے بھائیوں کے لئے کچھ کھانا مہیا کرتی۔

یہ لوگ دن کو بارگاہ نبوت میں حاضر رہتے اور حدیثیں سنتے اور رات کو اسی چبوترہ (صفہ) پر پڑے رہتے۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی انہی لوگوں میں تھے۔ان میں سے کسی کے پاس چادر اور تہبند دونوں چیزیں کبھی ایک ساتھ مہیا نہ ہو سکیں، چادر کو گلے سے اس طرح باندھ لیتے کہ رانوں تک لٹک آتی اکثر انصار کھجور کی پھلی ہوئی شاخیں توڑ کر لاتے اور چھت میں لگا دیتے، کھجوریں جو ٹپک ٹپک کر گرتیں یہ اٹھا کر کھا لیتے۔کبھی دو دو دن کھانے کو نہیں ملتا تھا۔اکثر ایسا ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لاتے اور نماز پڑھاتے۔یہ لوگ آ کر شریک نماز ہوتے لیکن بھوک اور ضعف سے عین نماز کی حالت میں گر پڑتے، باہر کے لوگ آتے اور ان کو دیکھتے تو سمجھتے کہ دیوانے ہیں ❶ آنحضرت ﷺ کے پاس جب کہیں سے صدقہ کا کھانا آتا تو مسلم ان کے پاس بھیج دیتے اور جب دعوت کا کھانا آتا تو ان کو بلا لیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے، اکثر ایسا ہوتا کہ راتوں کو آنحضرت ﷺ ان کو مہاجرین اور انصار پر تقسیم کر دیتے۔یعنی اپنے مقدور کے موافق ہر شخص ایک ایک دو دو کو اپنے ساتھ لے جائے اور ان کو کھانا کھلائے۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نہایت فیاض اور دولتمند تھے، وہ کبھی کبھی اسّی (۸۰) مہمانوں کو اپنے ساتھ لے کر جاتے، ❷ آنحضرت ﷺ ان لوگوں کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ جب ایک دفعہ آنحضرت ﷺ سے فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے درخواست کی کہ میرے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے نیل پڑ گئے ہیں، مجھ کو ایک کنیز عنایت ہو، تو فرمایا کہ "یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تم کو دوں اور صفہ والے بھوکے رہیں۔" ❸ راتوں کو عموماً یہ لوگ عبادت کرتے اور قرآن مجید پڑھا کرتے، ان کے لئے ایک معلم مقرر تھا اس کے پاس جا کر پڑھتے ❹ اسی بنا پر ان میں سے اکثر "قاری" کہلاتے تھے، دعوت اسلام کے لئے کہیں بھیجنا ہوتا تو یہ لوگ بھیجے جاتے تھے، غزوہ معونہ میں انہی میں سے ستر آدمی اسلام سکھانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔

اُن کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی رہتی تھی۔مجموعی تعداد ۴۰۰ تک پہنچی تھی۔لیکن کبھی ایک زمانہ میں اس قدر تعداد نہیں ہوئی۔نہ صفہ میں اس قدر گنجائش تھی، ان لوگوں کا مفصل ❺ حال ابن الاعرابی احمد بن محمد البصری المتوفی ۳۰۴ھ (جو ابن مندہ کے استاد تھے) نے ایک الگ تصنیف میں لکھا ہے۔سلمی نے بھی ان کے حالات

---

❶ ترمذی، ابواب الزھد، باب ما جاء فی معیشة اصحاب النبی ﷺ: ۲۳۶۸۔

❷ زرقانی، ج۱، ص: ۴۴۷ مصر ذکر اصحاب صفة و مسجد نبوی ﷺ۔

❸ زرقانی، ج۱، ص: ۴۴۷، مصر، ذکر اصحاب صفہ۔ ❹ مسند ابن حنبل، ج۳، ص: ۱۳۷۔

❺ حافظ سیوطی نے دو صفحہ کا ایک رسالہ اصحاب صفہ کے نام سے لکھا ہے اس رسالہ میں سو آدمیوں کے نام بہ ترتیب ہجا مذکور ہیں۔

میں ایک الگ کتاب لکھی ہے۔ [1]

مدینہ کے یہود اور ان سے معاہدہ

مؤرخین عرب کا بیان ہے کہ مدینہ کے یہود نسلاً یہودی تھے اور اس تقریب سے عرب میں آئے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو عمالقہ کے مقابلہ کیلئے بھیجا تھا۔ لیکن تاریخی قرائن سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ یہود گو تمام دنیا میں پھیلے لیکن انہوں نے اپنے نام کہیں نہیں بدلے، آج بھی وہ جہاں ہیں اسرائیلی نام رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے عرب کے یہودیوں کے نام، نضیر، قینقاع، مرحب، حارث وغیرہ ہوتے تھے جو خالص عربی نام ہیں، یہود عموماً بزدل اور دنی الطبع ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے لڑنے کے لئے کہا تو بولے:

﴿ فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ﴾ (٥/ المآئدة: ٢٤)

''تم مع اپنے خدا کے جاؤ اور لڑو۔ ہم یہاں بیٹھے رہیں گے۔''

بخلاف [2] اس کے مدینہ کے یہود نہایت دلیر، شجاع اور بہادر تھے۔ ان قرائن عقلی کے علاوہ ایک بڑے مؤرخ (یعقوبی) نے صاف تصریح کی ہے کہ قریظہ اور نضیر عرب تھے جو یہودی بن گئے تھے۔

ثم كانت وقعة بني النضير، وهم فخذ من جذام الا انهم تهودوا......
وكذلك قريظة [3]

''پھر بنو نضیر کا معرکہ ہوا۔ یہ قبیلہ جذام کا ایک خاندان تھا، لیکن یہودی ہو گیا تھا اور اسی طرح قریظہ بھی۔''

مؤرخ مسعودی نے بھی ''كتاب الاشراف والتنبيه'' [4] میں ایک روایت لکھی ہے کہ ''یہ جذام کے قبیلہ سے تھے کسی زمانہ میں عمالقہ سے اور ان کی بت پرستی سے بیزار ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور شام سے نقلِ مکان کر کے حجاز چلے آئے۔''

یہ تین قبیلے تھے، بنو قینقاع، بنو نضیر اور قریظہ، مدینہ کے اطراف میں آباد تھے اور مضبوط برج اور قلعے بنا لئے تھے۔

---

[1] اصحابِ صفہ کا حال بخاری، كتاب الصلوة، (رقم الباب: ٥٨ ورقم الحديث: ٤٤٢) كتاب مواقيت الصلاة، (رقم الحديث: ٦٠٢) كتاب المناقب (رقم الحديث: ٣٥٨١) اور كتاب البيوع، (رقم الحديث: ٢٠٤٧) میں اور جلد دوم كتاب الخمس (رقم الباب: ٦) كتاب الاستئذان، (رقم الحديث: ٦٢٤٦) كتاب الرقاق وغيره (رقم الحديث: ٦٤٥٢ نیز دیکھیں كتاب الحدود، رقم الحديث: ٦٨٠٤) اور صحيح مسلم، كتاب الاماره (رقم الحديث: ٤٩١٧) میں جستہ جستہ مذکور ہیں۔ زرقانی نے اور کتابوں سے لے کر اضافہ کیا ہے۔ (ج۱، ص:۴۲۹ تا ۴۳۲) میں نے یہ واقعات بخاری و مسلم کے علاوہ زرقانی ہی کے حوالہ سے لکھے ہیں۔ (نیز مسند ابن حنبل جلد ۳، صفحہ: ۱۳۷، میں بھی ہیں)

[2] مسٹر مارگولیتھ نے یہود کے متعلق تفصیل سے محققانہ بحث کی ہے، ان کا میلان رائے یہ ہے اور غالباً صحیح ہے کہ یہودیوں کی اس بڑی آبادی میں ایک دو خاندان اصلی یہود بھی تھے۔ عرب جو یہودی ہوتے گئے وہ بھی ان میں شامل ہوتے گئے۔

[3] یعقوبی، ج۲، ص:۴۹۔ [4] مطبوعہ یورپ ص:۲۴۷۔

انصار کے جو دو قبیلے تھے، یعنی اوس اور خزرج، ان میں باہم جو اخیر معرکہ ہوا تھا، (جنگ بعاث) اس نے انصار کا زور بالکل توڑ دیا تھا۔ یہود اس مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے کہ انصار باہم کبھی متحد نہ ہونے پائیں۔

ان اسباب کی بنا پر جب آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو پہلا کام یہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات واضح اور منضبط ہو جائیں، آپ نے انصار اور یہود کو بلا کر حسب ذیل شرائط پر ایک معاہدہ لکھوایا جس کو فریقین نے منظور کیا، یہ معاہدہ ابن ہشام میں پورا مذکور ہے، خلاصہ یہ ہے:

① خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا اب بھی قائم رہے گا۔

② یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی امور سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

③ یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔

④ یہود یا مسلمانوں کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔

⑤ کوئی فریق قریش کو امان نہ دے گا۔

⑥ مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تو دونوں فریق شریک یک دگر ہوں گے۔

⑦ کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی شریک صلح ہوگا لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہوگی۔ [1]

واقعات متفرقہ

اس سال انصار میں سے دو نہایت معزز شخصوں نے جو مقربین خاص میں تھے، وفات پائی، حضرت کلثوم بن ہدم رضی اللہ عنہ اور اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ۔ کلثوم وہ شخص ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب قباء میں تشریف لائے تو انہی کے مکان میں ٹھہرے، اکثر بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی انہی کے گھر اترے تھے۔ حضرت اسعد رضی اللہ عنہ بن زرارہ ان چھ شخصوں میں ہیں جنہوں نے سب سے پہلے مکہ میں جا کر آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ابن سعد کی روایت کے موافق ان چھ شخصوں میں جس نے سب سے پہلے بیعت کے لئے ہاتھ بڑھایا یہی اسعد تھے، [2] یہ فخر بھی انہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے انہی نے مدینہ میں آ کر جمعہ کی نماز قائم کی۔ [3]

چونکہ یہ قبیلۂ بنی نجار کے نقیب تھے، اس لئے ان کی وفات کے بعد اس قبیلہ نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ ان کے بجائے کوئی شخص اس منصب پر مقرر کیا جائے، چونکہ یہ احتمال تھا کہ کوئی شخص مقرر ہوگا تو اوروں کو رشک ہوگا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”میں خود تمہارا نقیب ہوں۔“ [4] چونکہ آپ کی نہال اسی قبیلہ میں تھی، اس لئے اور قبائل کو رشک اور منافست کا موقع نہ ملا۔

---

[1] ابن هشام، ج۱، ص:۳۰۱ تا۳۰۳۔ [2] طبقات، ج۱، ص:۱٤٦۔
[3] طبقات، ابن سعد، ج۱، ص:۱٤۸۔ [4] طبری، ج۳، ص: ۱۲٦۱، ۱۲٦۲۔

حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کی وفات کا آنحضرت ﷺ کو نہایت صدمہ ہوا۔ منافقین اور یہود نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ "محمد ﷺ اگر پیغمبر ہوتے تو ان کو یہ صدمہ کیوں پہنچتا" آپ ﷺ نے سنا تو فرمایا:

((لا املك لنفسي ولا لصاحبي من الله شيئا)) [1]

"میں اپنے لئے اور اپنے ساتھیوں کے لئے خدا کے ہاں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔"

یہ عجیب اتفاق ہے کہ عین اسی زمانہ میں دو بڑے رئیسانِ کفر نے بھی وفات پائی، یعنی ولید بن المغیرہ جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا باپ تھا اور عاص بن وائل سہمی جن کے بیٹے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ہیں۔ جو فاتح مصر اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے وزیر اعظم تھے۔

اسی زمانہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی، ان کے والد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور ان کی والدہ (اسماء رضی اللہ عنہا) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بے مات بہن تھیں۔ اب تک مہاجرین میں سے کسی کے اولاد نہیں ہوئی تھی اس لئے یہ مشہور ہو گیا تھا کہ یہودیوں نے جادو کر دیا ہے، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو مہاجرین نے خوشی کا نعرہ مارا۔

اب تک نمازوں میں صرف دو رکعتیں تھیں۔ اب ظہر و عصر و عشاء میں چار چار ہو گئیں لیکن سفر کے لئے اب بھی وہی دو رکعتیں قائم رہیں۔

---

[1] طبری، ج ۱، ص: ۱۲۶۰۔

۲ھ

تحویلِ قبلہ وآغازِ غزوات

(اس سال سے اسلام کی زندگی میں دو عظیم الشان واقعات پیدا ہوتے ہیں، ایک یہ کہ اسلام اپنے لئے ایک خاص قبلہ قرار دیتا ہے جو اب ۴۵ کروڑ قلوب کا مرکز ہے، [1] دوسرا یہ کہ دشمنانِ اسلام اب مخالفت کے لئے تلوار اٹھاتے ہیں اور مسلمان اس کی مدافعت کے لئے تیار ہوتے ہیں۔

تحویل قبلہ، شعبان ۲ھ

ہر گروہ، ہر قوم اور ہر مذہب کے لئے ایک خاص امتیازی شعار ہوتا ہے جس کے بغیر اس قوم کی مستقل ہستی قائم نہیں ہوسکتی۔ اسلام نے یہ شعار قبلۂ نماز قرار دیا جو اصل مقصد کے علاوہ اور بہت سے حکم و اسرار کا جامع ہے۔ اسلام کا خاص اور نمایاں وصف مساواتِ عام، جمہوریت اور عمل توحید ہے۔ یعنی تمام مسلمان یکساں اور متحد الجہتہ نظر آئیں۔ مذہب اسلام کا رکنِ اعظم نماز ہے، جس سے ہر روز پانچ وقت کام پڑتا ہے۔ نماز کی اصلی صورت یہ ہے کہ جمعیت اور افراد کثیر کے ساتھ ادا کی جائے، لیکن اس طرح کہ ہزاروں لاکھوں اشخاص کی منفرد ہستیاں مٹ کر ایک ہستی بن جائے۔ اسی بنا پر نماز با جماعت میں ایک امام ہوتا ہے کہ مقتدیوں کی ایک ایک حرکت اس کے اشاروں سے وابستہ ہوتی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ سب کا مرجع عمل بھی ایک نظر آئے، یہی اصول ہے جس کی بنا پر نماز کے لئے ایک قبلہ قرار پایا اور اس شعار کا دائرہ اس قدر وسیع کیا گیا کہ اس قبلہ کی طرف رخ کرنا ہی کفر کے دائرہ سے نکل آنا ہے، اب صرف یہ بحث باقی تھی کہ قبلہ کس سمت قرار دیا جائے۔ یہودی اور عیسائی بیت المقدس کو قبلہ سمجھتے تھے، کیونکہ ان کی قومی اور مذہبی ہستی بیت المقدس سے وابستہ تھی۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام بت شکن کے جانشین کے لئے صرف کعبہ قبلہ ہوسکتا تھا جو اس موحدِ اعظم کی یادگار اور توحید خالص کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب تک مکہ میں تھے دو ضرورتیں ایک ساتھ درپیش تھیں۔ ملتِ ابراہیمی کی تاسیس و تجدید کے لحاظ سے کعبہ کی طرف رخ کرنے کی ضرورت تھی، لیکن یہ مشکل تھی کہ قبلہ کی جو اصلی غرض ہے یعنی امتیاز اور اختصاص وہ نہیں حاصل ہوتی تھی۔ کیونکہ مشرکین اور کفار بھی کعبہ ہی کو اپنا قبلہ سمجھتے تھے۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ مقام ابراہیم کے سامنے نماز ادا کرتے تھے۔ جس کا رخ بیت المقدس کی طرف تھا، اس طرح دونوں قبلے سامنے آجاتے تھے، مدینہ میں دو گروہ آباد تھے، مشرکین جن کا قبلہ کعبہ تھا اور اہل کتاب جو بیت المقدس کی سمت نماز ادا کرتے تھے۔ شرک کے مقابلہ میں یہودیت اور نصرانیت دونوں کو ترجیح تھی، اس لئے

---

[1] اب یہ تعداد ایک ارب سے زیادہ ہوگئی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ایک مدت یعنی تقریباً ۱۶ مہینے تک بیت المقدس کی طرف نماز ادا کی۔ لیکن جب مدینہ میں اسلام زیادہ پھیل گیا تو اب کوئی ضرورت نہ تھی کہ اصل قبلہ کو چھوڑ کر دوسری طرف رخ کیا جاتا۔ اس بنا پر یہ آیت اتری اور دفعتاً قبلہ بدل گیا: [1]

﴿ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۴۴)

''تو اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف پھیر دو اور جہاں کہیں رہو اسی طرف منہ پھیرو۔''

تحویل قبلہ نے یہودیوں کو سخت برہم کر دیا، ان کو مشرکین کے مقابلہ میں مذہبی تفوق کا دعویٰ تھا اور اسلام سے پہلے مشرکین بھی ان کے مذہبی امتیاز کے معترف تھے۔ یہاں تک کہ (جیسا ابوداود [2] میں روایت ہے) ''جن لوگوں کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی وہ منتیں مانتے تھے کہ بچہ زندہ رہے گا تو ہم اس کو یہودی بنائیں گے۔'' اسلام نے ان کے اس مذہبی اعزاز کو صدمہ پہنچایا۔ تاہم چونکہ اب تک اسلام کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا اس لئے وہ فخر کرتے تھے کہ اسلام بھی انہی کے قبلہ کی طرف رخ کرتا ہے۔ جب اسلام نے قبلہ بھی بدل دیا تو ان کی ناراضی اور برہمی کا پیالہ بالکل لبریز ہو گیا۔ انہوں نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ محمد ﷺ چونکہ ہر بات میں ہماری مخالفت کرنا چاہتے ہیں، اس لئے قبلہ بھی مخالفت کے ارادہ سے بدل دیا ہے۔ دودلے اور ضعیف الایمان مسلمانوں کو یہ بات کھٹکتی تھی کہ قبلہ بدلنے کی چیز نہیں اور اس سے بے استقلالی اور تزلزل اعتقاد کا اظہار ہوتا ہے۔ اس بنا پر قبلہ کی اصلیت اور ضرورت اور تحویل قبلہ کے مصالح کے متعلق چند آیتیں اتریں جن سے یہ مشکلیں حل ہو جاتی ہیں:

﴿ سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۗ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ ﴾. (۲/ البقرۃ: ۱۴۲۔۱۴۳)

''سفہا یہ اعتراض کریں گے کہ مسلمانوں کا جو قبلہ تھا اس سے ان کو کس نے پھیر دیا۔ کہہ دو کہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کا ہے۔ وہ جسے چاہے سیدھی رہ کی ہدایت کر دے۔ ہم نے اسی

---

[1] اس مضمون میں جس قدر واقعات ہیں وہ صحیح بخاری (حدیث قبلہ نماز) کتاب الصلوۃ، باب التوجه نحو القبلة:۳۹۹ وفتح الباری شرح صحیح بخاری، ج۱، ص: ۴۲۱، ۴۲۲ وصحیح بخاری، کتاب التفسیر قبلہ سے متعلق ابواب:۴۴۸۶ تا ۴۴۹۴ وفتح الباری، ج۸، ص:۱۳۱، ۱۳۲ سے ماخوذ ہیں۔

[2] ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی الاسیر یکره علی الاسلام: ۲۶۸۲۔

طرح تمہیں عادل امت بنایا ہے، تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول (ﷺ) تم پر گواہ ہو جائیں۔ تیرا جو پہلے قبلہ تھا (کعبہ) اس کو جو ہم نے پھر قبلہ کر دیا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ پیغمبر کا پیرو کون ہے اور پیچھے پھر جانے والا کون ہے اور بے شبہ یہ قبلہ نہایت گراں اور ناگوار ہے، بجز ان لوگوں کے جن کو اللہ نے ہدایت کی ہے۔''

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

''پورب پچھم رخ کرنا یہی کوئی ثواب کی بات نہیں، ثواب تو یہ ہے کہ آدمی اللہ پر، قیامت پر، ملائکہ پر، اللہ کی کتابوں پر، پیغمبروں پر ایمان لائے اور اللہ کی محبت میں عزیزوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور غلاموں کو (آزاد کرانے میں) اپنی دولت دے۔''

ان آیتوں میں اللہ نے پہلے یہ بتایا کہ قبلہ خود کوئی مقصود بالذات چیز نہیں، اللہ کی عبادت کے لئے پورب پچھم سب برابر ہیں، اللہ ہر جگہ ہے، ہر سمت، ہر طرف ہے، پھر قبلہ کے تعین کی ضرورت بتائی کہ وہ اختصاصی شعار ہے، اصلی اور نمائشی مسلمانوں کو الگ کر دیتا ہے۔ بہت سے یہودی تھے جو منافقانہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ نماز میں بھی شرکت کرتے تھے۔ یہ اسلام کے لئے مار آستین تھے۔ لیکن جب قبلہ بیت المقدس کے بجائے کعبہ سے بدل گیا تو نفاق کا راز بالکل فاش ہو گیا۔ کوئی یہودی کسی طرح یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ جو چیز اس کی قومیت، مذہب بلکہ اس کی ہستی کی بنیاد ہے، (یعنی بیت المقدس) اسی سے اس کا رشتہ ٹوٹ جائے۔ پھر دوبارہ اللہ نے اس نکتہ کو زیادہ واضح کر دیا کہ کسی خاص قبلہ کی طرف رخ کرنا اصلی ثواب نہیں، بلکہ ثواب درحقیقت ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نام ہے۔

سلسلۂ غزوات ❶

کیا عجیب بات ہے کہ ارباب سیر، مغازی کی داستان جس قدر زیادہ دراز نفسی اور بلند آہنگی سے بیان کرتے ہیں، یورپ اسی قدر اس کو زیادہ شوق سے جی لگا کر سنتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ داستان اور پھیلتی جائے کیونکہ اس کو اسلام کے جور وستم کا جو مرقع آراستہ کرنا ہے اس کے نقش ونگار کے لئے لہو کے چند قطرے نہیں بلکہ چشمہ ہائے خون درکار ہیں۔ یورپ کے تمام مؤرخوں نے سیرت نبوی کو اس انداز میں لکھا ہے کہ وہ لڑائیوں کا ایک مسلسل سلسلہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ زبردستی مسلمان بنائے جائیں۔ لیکن یہ خیال چونکہ واقع میں غلط بلکہ سرتاپا غلط ہے اس لئے مغازی کی ابتدا سے پہلے ضروری ہے کہ اس بحث کا فیصلہ کیا جائے۔ عام خیال یہ ہے کہ اسلام جب تک مکہ میں تھا، مصائب گونا گوں کی آماجگاہ تھا۔ مدینہ میں آکر اس کی کلفتیں دور ہوئیں۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ مکہ میں جو مصیبت تھی گو سخت تھی لیکن تنہا اور منفرد تھی۔ مدینہ میں آکر وہ متعدد اور گوناگوں بن گئی۔ مکہ کل ایک قوم تھا۔ مدینہ میں انصار کے ساتھ یہود بھی تھے۔ جو عادات، خصائل، مذہب اور دیانت میں انصار سے بالکل مختلف اور ان کے حریف مقابل تھے۔ اس پر ایک تیسری قسم (منافقین) کا اضافہ ہوا، جو مار آستین ہونے کی وجہ سے دونوں سے زیادہ خطرناک تھے۔ مکہ اگر قابو میں آجاتا تو حرم کی وسعتِ اثر کی وجہ سے تمام عرب کی گردنیں خم ہو جاتیں، لیکن مدینہ کا اثر چار دیواری تک محدود تھا۔ مدینہ اب تک بیرونی خطرات سے بالکل مطمئن تھا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی قیام گاہ ہونے نے اس کو قریش کے غیظ و غضب کا تاراج گاہ بنا دیا۔ آنحضرت ﷺ جب مکہ سے چلے آئے تو چند ہی روز کے بعد قریش نے عبداللہ بن ابی کو جو واقعہ ہجرت کے قبل رئیس الانصار تھا اور انصار نے اس کی تاجپوشی کی شاہانہ رسم ادا کرنے کے لئے تیاری کر لی تھی۔ ❷ خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے:

انکم آویتم صاحبنا وانانقسم باللّٰہ لتقاتلنہ اولتخرجنہ اولنسیرن الیکم باجمعنا حتی نقتل مقاتلتکم ونستبیح نسائکم ❸

''تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے، ہم اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم لوگ ان کو قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو۔ ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کریں گے اور تم کو گرفتار کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کریں گے۔''

جب آنحضرت ﷺ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو آپ عبداللہ کے پاس تشریف لے گئے۔ اس کو سمجھایا کہ

---

❶ غزوات کا سلسلہ جن اسباب سے پیدا ہوا اور جس قسم کے واقعات غزوات میں پیش آئے ان کے لئے ہم نے ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے کیونکہ ضمنی طریقے سے وہ ادا نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن یہ عنوان اچھی طرح سے اسی وقت ذہن نشین ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ تمام غزوات سرسری نظر سے گزر جائیں اس لئے ہم نے اس کو تمام غزوات کے بعد لکھا ہے۔ ناظرین ابھی سے اس کا خیال رکھیں۔

❷ بخاری، کتاب الاستئذان، باب التسلیم فی مجلس فیه اخلاط من المسلمین والمشركین: ٦٢٥٤۔ (س)

❸ سنن ابو داود، کتاب الخراج، باب خبر النضير: ٣٠٠٤۔

''کیا تم خود اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے''۔ چونکہ انصار اکثر مسلمان ہو چکے تھے، اس لئے عبداللہ اس نکتہ کو سمجھا اور قریش کے حکم کی تعمیل نہ کر سکا۔ بدر کے بعد پھر قریش نے اسی مضمون کا خط لکھا، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ (تاہم قریش کی شہ سے منافقین و یہود مدینہ کا سر پھر چکا تھا۔ اسی زمانہ میں یعنی بدر سے پہلے آنحضرت ﷺ بنو الحارث بن خزرج کے محلّہ میں سوار ہو کر تشریف لے گئے، ایک جگہ مشرکین و منافقین مدینہ، یہود اور بعض مسلمان بیٹھے تھے۔ گدھے کے چلنے سے گرد اڑی تو عبداللہ بن ابی نے منہ پر کپڑا ڈال دیا اور حقارت سے بولا: ''گرد نہ اڑاؤ''۔ آنحضرت ﷺ نے مجمع کو سلام کیا اور کچھ قرآن کی آیتیں سنائیں، عبداللہ نے کہا: ❶ ''اے شخص! مجھ کو یہ پسند نہیں، اگر تمہاری بات سچ بھی ہو تو ہماری مجلس میں آ کر ہم کو نہ ستایا کرو۔ جو تمہارے پاس جائے اس سے بیان کیا کرو۔'' مسلمان اس تحقیر سے برافروختہ ہو گئے اور قریب تھا کہ کشت و خون ہو جائے، آخر آنحضرت ﷺ نے دونوں کو ٹھنڈا کیا)۔

اسی زمانہ کے قریب سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو قبیلہ اوس کے رئیس الاعظم تھے۔ عمرہ کرنے کے لئے مکہ معظّمہ گئے، امیہ بن خلف سے اور ان سے مدت کا یارانہ تھا اور یہ تعلق اسلام کے بعد بھی قائم رہا۔ اس تعلق سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ اب بھی امیہ ہی کے مہمان ہوئے۔ ایک دن وہ امیہ کو لے کر کعبہ کے طواف کو نکلے، اتفاق سے ابوجہل سامنے سے آ گیا۔ امیہ سے اس نے پوچھا کہ یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ امیہ نے کہا: ''سعد رضی اللہ عنہ ہیں۔'' ابوجہل نے کہا: ''تم لوگوں نے صابیوں (کفار آنحضرت ﷺ اور اہل اسلام کو صابی یعنی مرتد کہتے تھے) کو پناہ دی ہے، میں کبھی یہ نہیں دیکھ سکتا کہ تم کعبہ میں آ سکو۔ اللہ کی قسم! اگر تم امیہ کے ساتھ نہ ہوتے تو بچ کر واپس نہیں جا سکتے تھے۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اگر تم نے ہم کو حج سے روکا تو ہم تمہارا مدینہ کا راستہ روک دیں گے۔'' ❷ (یعنی شام کی تجارت کا راستہ)

حرم کی تولیت اور مجاورت کی وجہ سے تمام عرب قریش کا احترام کرتا تھا اور مکہ سے مدینہ تک جو قبائل پھیلے ہوئے تھے سب قریش کے زیر اثر تھے، ❸ اس بنا پر قریش نے تمام قبائل کو اسلام کا مخالف بنا دیا۔ ہجرت کے چھٹے سال تک یمن وغیرہ کے لوگ آنحضرت ﷺ کے پاس نہیں پہنچ سکتے تھے۔ چنانچہ ۶ ھ میں جب بحرین سے عبدالقیس کی سفارت آئی تو لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ مضر کے قبائل ہم کو آپ تک پہنچنے نہیں دیتے۔ اس لئے ہم صرف ایام حج میں جب کہ لڑائی عموماً موقوف ہو جاتی ہے، آپ ﷺ کی خدمت میں آ سکتے ہیں۔ ❹

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب فی دعاء النبی ﷺ وصبره علی اذی المنافقین:٤٦٥٩، وبخاری باب مذکور (رقم الحدیث:۲۲۵۴)۔ ❷ یہ پورا واقعہ مزید تفصیل کے ساتھ صحیح بخاری، کتاب المغازی:٣٩٥٠ کی ابتدا میں مذکور ہے۔ ❸ ابن ہشام واقعات وفود میں ہے: وذلك ان قريشا كانوا امام الناس...... وقادة العرب لاينكرون ذلك وكانت قريش هي التي نصبت الحرب لرسول الله ﷺ (ج ٢، ص:٣٦٢)

❹ وفد بنی عبدالقیس کے ذکر میں صحیح بخاری:٥٣، ٤٣٦٨ اور دیگر تمام کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

قریش نے انہی باتوں پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ جیسا کہ انہوں نے عبداللہ بن ابی کو لکھا تھا، اس کی تیاریاں کر رہے تھے کہ مدینہ پر حملہ کر کے اسلام کا استیصال کر دیں۔ مدت تک یہ حال رہا کہ آنحضرت ﷺ راتوں کو جاگ جاگ کر بسر کرتے تھے۔ سنن نسائی میں ہے:

كان رسول الله ﷺ اول ما قدم المدينة يسهر من الليل۔ [1]

''آنحضرت ﷺ اول جب مدینہ میں آئے تو راتوں کو جاگا کرتے تھے۔''

صحیح بخاری باب الجہاد میں ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''آج کوئی اچھا آدمی پہرہ دیتا۔'' چنانچہ سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ نے ہتھیار لگا کر رات بھر پہرہ دیا، تب آپ ﷺ نے آرام فرمایا۔ [2] اس سے بڑھ کر حاکم کی روایت ہے جس کے یہ الفاظ ہیں:

عن ابی بن كعب قال لما قدم رسول الله ﷺ واصحابه المدينة وآوتهم الانصار رمتهم العرب عن قوس واحدة وكانوا لايبيتون الا بالسلاح ولايصبحون الا فيه۔ [3]

''آنحضرت ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم جب مدینہ آئے اور انصار نے ان کو پناہ دی تو تمام عرب ایک ساتھ ان سے لڑنے کو آمادہ ہو گئے، صحابہ صبح تک ہتھیار باندھ کر سوتے تھے۔''

مؤرخین مغازی کی ابتدا انہی واقعات سے کرتے ہیں کہ اسی سال اللہ نے جہاد کی اجازت دی لیکن ایک دقیقہ بین انہی کی تصریحات سے پتہ لگا سکتا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا، مواہب لدنیہ اور زرقانی میں لکھا ہے کہ اللہ نے ۱۲ صفر ۲ھ میں جہاد کی اجازت دی اس کی سند میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے: [4]

اول آية نزلت في الاذن بالقتال ﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ؀﴾

''پہلی آیت جو قتال کی اجازت میں نازل ہوئی وہ یہ ہے، ﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ﴾ الخ یعنی جن سے لڑائی کی جاتی ہے (مسلمان) ان کو بھی اب لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم کیا جا رہا ہے اور اللہ ان کی مدد پر یقیناً قادر ہے۔''

تفسیر ابن جریر میں ہے کہ قتال کے متعلق سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی وہ یہ ہے: [5]

﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۰)

---

[1] فتح الباری، ج ۲، ص: ٦٠ میں ابواسحٰق الفزاری کے واسطے سے نسائی کی یہ روایت مذکور ہے۔ (سنن الکبری، کتاب المناقب: ۸۱٦۰) [2] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب الحراسة في الغزو في سبيل الله: ۲۸۸۵۔

[3] لباب فی اسباب النزول للسیوطی، سورۃ نور آیت ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ﴾ (۲٤/ النور:۵۵) الخ مسند دارمی میں بھی یہ روایت مذکور ہے۔ [4] زرقانی، ۱، ص:٤٤۸ بحوالہ سنن نسائی، کتاب الجہاد، باب وجوب الجہاد: ۳۰۸۷، (علامہ محمد بن عبدالباقی نے اس روایت کو مرفوع بتایا ہے) [5] ج ۲، ص: ۱۰٦ تفسیر آیت مذکور۔

''اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔''

لیکن غور سے دیکھو کہ دونوں آیتوں میں انہی لوگوں سے لڑنے کی اجازت ہے جو پہلے مسلمانوں سے لڑنے آتے ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان درحقیقت لڑنے پر مجبور کیے جاتے تھے۔

بہر حال واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں آ کر آنحضرت ﷺ کا سب سے پہلا کام حفاظت خود اختیاری کی تدبیر تھی، نہ صرف اپنی اور مہاجرین کی بلکہ انصار کی بھی۔ کیونکہ اس جرم میں کہ انصار نے مسلمانوں کو پناہ دی ہے، قریش نے مدینہ کی بربادی کا فیصلہ کر لیا اور اپنے تمام قبائل متحدہ میں یہ آگ بھڑکا دی تھی۔ اس بنا پر آپ نے دو تدبیریں اختیار کیں۔ اول یہ کہ قریش کی شامی تجارت جو ان کا مایۂ غرور تھی بند کر دی جائے، تاکہ وہ صلح پر مجبور ہو جائیں اور یاد ہوگا کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے مکہ میں ابو جہل کو اسی کی دھمکی دی تھی۔ دوسرے یہ کہ مدینہ کے قرب و جوار کے جو قبائل ہیں، ان سے امن و امان کا معاہدہ ہو جائے۔

بدر سے پہلے کی مہمیں

(غرض ان حالات کی بنا پر غزوۂ بدر سے پہلے سو سو پچاس پچاس کی ٹکڑیاں مکہ کی طرف روانہ کی جانے لگیں۔ ابواء کی مہم سے پہلے جو صفر ۲ ھ میں واقع ہوئی اور جس میں آپ ﷺ نے خود شرکت فرمائی تھی، ارباب سیر نے تین مہموں کا ذکر کیا ہے جن کو ان کی زبان میں ''سریہ'' کہتے ہیں، سریہ حمزہ، سریہ عبیدہ بن حارث، سریہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم لیکن ان میں سے کسی مہم میں کوئی کشت و خون نہیں ہوا۔ یا بیچ بچاؤ ہو گیا۔ یا بچ کر نکل گئے۔ ارباب سیر نے ان سرایا کا مقصد یہ بتایا ہے کہ یہ قریش کے تجارتی قافلہ کو چھیڑنے کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ یعنی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی تہدید کے مطابق ان کی شامی تجارت کو بند کرنا مقصود تھا۔ مخالفین کہتے ہیں کہ صحابہ کو غارت گری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن یہ الزام کس قدر جہالت پر مبنی ہے کہ اول تو اسلام کی شریعت میں یہ سخت تر گناہ ہے، ثانیاً واقعہ کیا بتاتا ہے؟ کیا ان میں سے کسی مہم میں بھی یہ مذکور ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے قافلہ کا مال لوٹ لیا؟ ثالثاً اگر ان سرایا کا مقصد لوٹنا اور ڈاکہ ڈالنا ہی ہوتا تو قریش کے قافلۂ تجارت کے سوا یہ مقصد کہیں اور نہیں حاصل ہو سکتا تھا؟)

جہینہ

اطراف کے جن قبائل کے پاس معاہدہ کے لئے مہم بھیجی گئی، ان میں سب سے پہلے جہینہ کا قبیلہ ہے۔ جہینہ کا قبیلہ مدینہ سے تین منزل پر آباد تھا اور ان کا کوہستان دور تک پھیلا ہوا تھا، ان سے معاہدہ ہوا کہ وہ فریقین سے یکساں [1] تعلقات رکھیں گے، یعنی دونوں سے الگ رہیں گے۔

صفر ۲ ھ میں آپ ﷺ ساٹھ مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور ابواء تک گئے، (جس کے قریب

[1] اس واقعہ کا ذکر مورخین نے مستقل طور پر نہیں کیا بلکہ جہاں سب سے پہلے سریہ ضمرہ کا ذکر کیا ہے وہاں مجدی جہینی (رئیس قبیلہ) کی نسبت لکھا ہے، کان موادعا للفریقین یعنی اس نے دونوں فریقوں سے صلح کر رکھی تھی۔

ہی غزوۂ ابوایا غزوۂ ودّان واقع ہوا) اور جہاں آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ کا مزار ہے، ابواء کا صدر مقام فرع ہے جو ایک وسیع قصبہ ہے اور جہاں قبیلہ مزینہ آباد ہے اور جو مدینہ سے تقریباً ۸ منزل (۸۰ میل) ہے، یہ مدینہ کی اخیر سرحد ہے۔ ان اطراف میں قبیلہ بنو ضمرہ آباد تھا اور یہ نواح ان کی حدود حکومت میں داخل تھے۔ یہاں آپ نے چند روز قیام کر کے بنو ضمرہ سے معاہدہ کیا، جن کا سردار مخشی بن عمرو ضمری تھا۔ معاہدہ کے یہ الفاظ تھے:

هذا كتاب من محمد رسول الله ﷺ لبني ضمرة فانهم آمنون على اموالهم وانفسهم وان لهم النصر على من رامهم الا ان يحاربوا في دين الله مابل بحر صوفة وان النبي اذا دعاهم لنصره اجابوه. الخ [1]

''یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تحریر ہے بنو ضمرہ کے لئے ان لوگوں کا جان اور مال محفوظ رہے گا اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا اس کے مقابلہ میں ان کی مدد کی جائے گی بجز اس صورت کے کہ یہ لوگ مذہب کے مقابلہ میں لڑیں اور پیغمبر ﷺ جب ان کو مدد کے لئے بلائیں گے تو یہ مدد کو آئیں گے۔''

تمام محدثین، مغازی کی ابتدا اسی واقعہ سے کرتے ہیں، صحیح بخاری میں بھی اسی کو اول الغزوات قرار دیا ہے۔ [2]

قریباً ایک مہینہ کے بعد کرز بن جابر فہری نے جو مکہ کے رؤسا میں تھا، [3] مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور آنحضرت ﷺ کے مویشی لوٹ لئے۔ اس کا تعاقب کیا گیا، لیکن وہ بچ کر نکل گیا تھا۔ (کرز بعد کو مسلمان ہوئے اور فتح مکہ میں تنہا راہ چلتے شہید ہوئے۔)

جمادی الثانی یعنی اس واقعہ کے تیسرے مہینہ آپ دوسو مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور مقام ذوالعشیرہ پہنچ کر بنو مدلج سے معاہدہ کیا۔ یہ مقام مدینہ سے ۹ منزل پر ینبوع کے نواح میں ہے۔ بنو مدلج، بنو ضمرہ کے حلیف تھے اور چونکہ بنو ضمرہ پہلے اسلام کے معاہدہ میں داخل ہو چکے تھے، اس لئے انہوں نے آسانی سے یہ شرائط منظور کر لیں۔ [4]

چند روز کے بعد یعنی رجب ۲ ھ میں آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو بارہ آدمیوں کے ساتھ بطن نخلہ کی طرف بھیجا۔ یہ مقام مکہ اور طائف کے بیچ میں مکہ سے ایک شبانہ روز کی مسافت پر ہے۔

[1] روض الانف، ج ۲، ص: ۵۸، زرقانی، ج ۱، ص: ۴۵۹۔ [2] کتاب المغازی، باب غزوة العشيرة (ترجمة الباب) (امام بخاری رحمہ اللہ نے ابن اسحٰق رحمہ اللہ کا قول نقل فرمایا ہے) [3] اصابه ذكر كرز فهری، ج ۳، ص: ۲۹۰۔ [4] میں تسلیم کرتا ہوں کہ مؤرخین نے دونوں پہلے واقعوں کی نسبت لکھا ہے کہ ان کا مقصد قریش کے کارواں کا لوٹنا تھا لیکن اتفاق سے کارواں ہاتھ نہ آیا اور بچ کر نکل گیا۔ لیکن میں واقعات کا پابند ہوں، رائے اور قیاس سے غرض نہیں، اس قدر واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ان مقامات تک گئے اور وہاں کے قبائل سے معاہدہ کیا۔ اس سے آگے مؤرخین کا قیاس ہے کہ قریش کے کارواں پر حملہ کرنا مقصود تھا، گو یہ مقصود نہ حاصل ہو سکا۔ اگر خدانخواستہ کارواں کا لوٹنا ہی مقصود ہوتا تو آنحضرت ﷺ کو العیاذ باللہ اس قدر بے تدبیر فرض کرنا پڑے گا کہ ہر مرتبہ ناکامیابی ہوتی تھی اور قافلہ بچ کر نکل جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بار بار تجربہ کے بعد بھی بدر میں اسی قسم کی ناکامی ہوئی اور قافلہ صحیح وسلامت نکل گیا۔

آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو ایک خط دے کر فرمایا تھا کہ ''دو دن کے بعد اس کو کھولنا۔'' حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے خط کھولا تو لکھا تھا کہ ''مقام نخلہ میں قیام کرو اور قریش کے حالات کا پتہ لگاؤ اور اطلاع دو۔'' اتفاق یہ کہ قریش کے چند آدمی جو شام سے تجارت کا مال لئے آتے تھے سامنے سے نکلے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ان پر حملہ کیا، ان میں سے ایک شخص عمرو بن الحضرمی مارا گیا۔ دو گرفتار ہوئے اور مال غنیمت ہاتھ آیا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں آ کر یہ واقعہ بیان کیا اور غنیمت کی چیزیں پیش کیں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''میں نے تم کو یہ اجازت نہیں دی تھی۔'' غنیمت کے قبول کرنے سے بھی آپ ﷺ نے انکار فرمایا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے نہایت برہم ہو کر کہا:

صنعتم مالم تؤمروا به وقاتلتم في الشهر الحرام ولم تؤمروا بقتال [1]

''تم نے وہ کام کیا (قافلہ لوٹا) جس کا تم کو حکم نہیں دیا گیا تھا اور ماہ حرام میں لڑے حالانکہ اس مہینہ میں تم کو لڑنے کا حکم نہ تھا۔''

جو لوگ گرفتار اور قتل ہوئے وہ بڑے معزز خاندان کے لوگ تھے، عمرو بن الحضرمی جو مقتول ہوا عبداللہ حضرمی کا بیٹا تھا، جو حرب بن امیہ (امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دادا) کا حلیف تھا۔ [2] حرب قریش کا رئیس اعظم تھا اور عبدالمطلب کے بعد ریاست عام اسی کو حاصل ہوئی تھی۔ جو لوگ گرفتار ہوئے یعنی عثمان ونوفل دونوں مغیرہ کے پوتے تھے۔ [3] مغیرہ ولید کا باپ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا دادا اور حرب کے بعد دوسرے درجے کا رئیس تھا اس بنا پر اس واقعہ نے تمام قریش کو مشتعل کر دیا اور ثار یعنی انتقام خون کی بنیاد قائم ہو گئی۔ معرکۂ بدر کا سلسلہ اسی واقعہ سے وابستہ ہے، حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے۔ انہوں نے تصریح کی ہے کہ غزوۂ بدر اور تمام لڑائیاں جو قریش سے پیش آئیں سب کا سبب یہی حضرمی کا قتل ہے، علامہ طبری لکھتے ہیں: [4]

وكان الذي هاج وقعة بدر وسائر الحروب التي كانت بين رسول الله ﷺ وبين مشركي قريش فيما قال عروة بن الزبير ماكان من قتل واقد بن عبدالله السهمي عمرو بن الحضرمي.

''اور جس چیز نے بدر کے واقعہ کو ابھارا اور وہ تمام لڑائیاں چھیڑ دیں جو آنحضرت ﷺ اور مشرکین قریش میں پیش آئیں سب کا سبب یہی تھا کہ واقد سہمی نے حضرمی کو قتل کر دیا تھا۔''

چونکہ غزوۂ بدر تمام غزوات کی اصلی بنیاد ہے، اس لئے ہم پہلے اس واقعہ کو سادہ صورت میں لکھ کر پھر تفصیل سے اس کے متعلق گفتگو کریں گے۔

[1] طبری، ج۳، ص: ۱۲۷۵۔ [2] اصابہ، ترجمہ علاء حضرمی، ج۲، ص: ۴۹۷۔
[3] طبری، ج۳، ص: ۱۲۷٤۔(س) [4] طبری، ج۳، ص: ۱۲۸٤۔(س)

غزوۂ بدر

﴿ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۲۳)

رمضان ۲ھ

بدر ایک گاؤں کا نام ہے، جہاں سال کے سال میلہ لگتا ہے۔ یہ مقام اسی نقطہ کے قریب ہے جہاں شام سے مدینہ جانے کا راستہ دشوار گزار گھاٹیوں میں سے ہو کر گزرتا ہے، مدینہ منورہ سے قریباً ۸۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ قریش نے ہجرت کے ساتھ ہی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں، عبداللہ بن ابی کو انہوں نے خط لکھ بھیجا کہ یا محمد (ﷺ) کو قتل کر دو، یا ہم آ کر ان کے ساتھ تمہارا بھی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ قریش کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں مدینہ کی طرف گشت لگاتی رہتی تھیں، کرز فہری مدینہ کی چراگاہوں تک آ کر غارت گری کرتا تھا۔

حملہ کے لئے سب سے بڑی ضروری چیز مصارف جنگ کا بندوبست تھا۔ اس لئے اب کے موسم میں قریش کا جو کاروانِ تجارت شام کو روانہ ہوا، اس سروسامان سے روانہ ہوا کہ مکہ کی تمام آبادی نے جس کے پاس جو رقم تھی کل کی کل دے دی۔ [1]

نہ صرف مرد بلکہ عورتیں جو کاروبار تجارت میں بہت کم حصہ لیتی ہیں، ان کا بھی ایک ایک فرد اس میں شریک تھا، قافلہ ابھی شام سے روانہ نہیں ہوا تھا کہ حضرمی کے قتل کا اتفاقیہ واقعہ پیش آ گیا، جس نے قریش کی آتشِ غضب کو اور بھڑکا دیا۔

اسی اثنا میں یہ غلط خبر مکہ معظمہ میں پھیل گئی کہ مسلمان قافلہ لوٹنے کو آ رہے ہیں، قریش کے غیظ و غضب کا بادل بڑے زور شور سے اٹھا اور تمام عرب پر چھا گیا۔

آنحضرت ﷺ کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کیا اور واقعہ کا اظہار فرمایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے جان نثارانہ تقریریں کیں، لیکن رسول اللہ ﷺ انصار کی طرف دیکھتے تھے، کیونکہ انصار نے بیعت کے وقت صرف یہ اقرار کیا تھا کہ وہ اس وقت تلوار اٹھائیں گے جب دشمن مدینہ پر چڑھ آئیں۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ (سردار خزرج) نے اٹھ کر کہا: ''کیا حضور کا اشارہ ہماری طرف ہے؟ اللہ کی قسم! آپ فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں۔''

---

[1] ابن سعد، جزء ثانی قسم اول، ص: ۷ میں ابوسفیان سردار قافلہ کا قول لکھا ہے: واللّٰه مابمكة من قرشي ولا قرشية له نشّ وصاعدا الابعث به معنا ہمارے مؤرخین کو اسباب و نتائج کی جستجو نہیں ہوتی، اس لئے انہوں نے اس واقعہ کو محض ایک واقعہ کی حیثیت سے لکھ دیا۔ لیکن ان کو احساس نہیں کہ مکہ کو تمام سرمایہ کے اگل دینے کی ضرورت کیا تھی؟

یہ صحیح مسلم ❶ کی روایت ہے، بخاری میں ہے کہ مقداد نے کہا کہ ''ہم موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر لڑیں، ہم لوگ آپ کے داہنے سے، بائیں سے، سامنے سے، پیچھے سے، لڑیں گے۔'' ان کی اس تقریر سے رسول اللہ ﷺ کا چہرہ دمک اٹھا۔ ❷

غرض ۱۲ رمضان ۲ھ کو آپ تقریباً تین سو جان نثاروں کے ساتھ شہر سے نکلے، ایک میل چل کر فوج کا جائزہ لیا، جو کم عمر تھے واپس کر دیے گئے ❸ کہ ایسے پرخطر موقع پر بچوں کا کام نہیں۔ عمیر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ایک کمسن بچہ تھے جب ان سے واپسی کو کہا گیا تو رو پڑے، آخر آنحضرت ﷺ نے اجازت دے دی۔ عمیر کے بھائی سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کمسن سپاہی کے گلے میں تلوار حمائل کی، ❹ اب فوج کی کل تعداد ۳۱۳ تھی جس میں ساٹھ مہاجر اور باقی انصار تھے۔ چونکہ غیبت کی حالت میں منافقین اور یہود کی طرف سے اطمینان نہ تھا، اس لئے ابولبابہ بن عبدالمنذر کو مدینہ کا حاکم مقرر فرمایا اور حکم دیا کہ مدینہ کو واپس جائیں۔ عالیہ (مدینہ کی بالائی آبادی) پر عاصم بن عدی کو مقرر فرمایا، ان انتظامات کے بعد آپ بدر کی طرف بڑھے، جدھر سے اہل مکہ کی آمد کی خبر تھی۔ دو خبر رساں بسبس اور عدی آگے روانہ کر دیے گئے تھے کہ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لائیں، روحاء، منصرف، ذات اجذال، معلات، اثیل سے گزرتے ہوئے ۱۷ رمضان کو بدر کے قریب پہنچے۔ خبر رسانوں نے خبر دی کہ قریش وادی کے دوسرے سرے تک آ گئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ یہیں رک گئے اور فوجیں اُتر پڑیں۔

مکہ معظمہ سے قریش بڑے سروسامان سے نکلے تھے۔ ہزار آدمی کی جمعیت تھی، سو سواروں کا رسالہ تھا۔ رؤسائے قریش سب شریک تھے۔ ابولہب مجبوری کی وجہ سے نہ آ سکا تھا اس لئے اپنی طرف سے اس نے قائم مقام بھیج دیا تھا۔ رسد کا یہ انتظام تھا کہ امرائے قریش یعنی عباس بن مطلب، عتبہ بن ربیعہ، حارث بن عامر، نضر بن الحارث، ابوجہل، امیہ وغیرہ وغیرہ باری باری ہر روز دس دس اونٹ ذبح کرتے اور لوگوں کو کھلاتے تھے۔ ❺ عتبہ بن ربیعہ جو قریش کا سب سے معزز رئیس تھا فوج کا سپہ سالار تھا۔

قریش کو بدر کے قریب پہنچ کر جب معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا قافلہ خطرہ کی زد سے نکل گیا ہے تو قبیلہ زہرہ اور عدی کے سرداروں نے کہا ''اب لڑنا ضروری نہیں۔'' لیکن ابوجہل نے نہ مانا زہرہ اور عدی کے لوگ واپس چلے گئے، باقی فوج آگے بڑھی۔ قریش چونکہ پہلے پہنچ گئے تھے انہوں نے مناسب موقعوں پر قبضہ کر لیا تھا، بخلاف اس کے مسلمانوں کی طرف چشمہ یا کنواں تک نہ تھا۔ زمین ایسی ریتلی تھی کہ اونٹوں کے پاؤں ریت میں دھنس دھنس جاتے تھے۔ حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ جو

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب غزوة بدر: ٤٦٢١۔ ❷ کتاب المغازی، باب قول الله تعالیٰ: اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم...... ٣٩٥٢۔ ❸ ابن سعد، جزء مغازی، ص: ٦۔

❹ منتخب کنز العمال برحاشیه مسند احمد، ج ٤، ص: ١٠٥ به روایت ابن عساکر، بدر۔

❺ معارف ابن قتیبه، باب اسماء المطعمین من قریش فی غزوة بدر و سیرت ابن اسحاق به روایت ابن هشام غزوة بدر، ج ١، ص: ٤٠٦۔

مقام انتخاب کیا گیا ہے وحی کی رو سے ہے؟ یا فوجی تدبیر ہے؟ ارشاد ہوا کہ "وحی نہیں ہے۔" حضرت حباب رضی اللہ عنہ نے کہا: "تو بہتر ہوگا کہ آگے بڑھ کر چشمہ پر قبضہ کرلیا جائے اور آس پاس کے کنوئیں بیکار کر دیئے جائیں" ❶ آپ ﷺ نے یہ رائے پسند فرمائی اور اسی پر عمل کیا گیا۔ تائید ایزدی اور حسن اتفاق سے مینہ برس گیا جس سے گرد جم گئی اور جابجا پانی کو روک کر چھوٹے چھوٹے حوض بنا لئے گئے کہ وضو اور غسل کے کام آئیں۔ اس قدرتی احسان کا اللہ نے قرآن مجید میں بھی ذکر کیا ہے:

﴿ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ ﴾ (۸/ الانفال:۱۱)

"اور جبکہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا کہ تم کو پاک کرے۔"

پانی پر اگرچہ قبضہ کرلیا گیا لیکن ساقی کوثر کا فیض عام تھا۔ اس لئے دشمنوں کو بھی پانی لینے کی عام اجازت تھی۔ ❷ یہ رات کا وقت تھا۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے کمر کھول کھول کر رات بھر آرام کیا۔ لیکن صرف ایک ذات تھی (ذاتِ نبوی ﷺ) جو صبح تک بیدار اور مصروف دعا رہی۔ صبح ہوئی تو لوگوں کو نماز کے لئے آواز دی، بعد نماز جہاد پر وعظ فرمایا۔ ❸

قریش جنگ کے لئے بیتاب تھے، تاہم کچھ نیک دل بھی تھے جن کے دل خونریزی سے لرزتے تھے۔ ان میں حکیم بن حزام (جو آگے چل کر اسلام لائے) نے سردار فوج عتبہ سے جا کر کہا: "آپ چاہیں تو آج کا دن آپ کی نیک نامی کی ابدی یادگار رہ جائے۔" عتبہ نے کہا: کیونکر؟ حکیم نے کہا: "قریش کا جو کچھ مطالبہ ہے وہ صرف حضرمی کا خون ہے۔ وہ آپ کا حلیف تھا، آپ اس کا خون بہا ادا کر دیجئے۔" عتبہ نیک نفس آدمی تھا۔ اس نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔ لیکن چونکہ ابوجہل کا اتفاق رائے ضروری تھا پس حکیم عتبہ کا پیغام لے کر گئے۔ ابوجہل ترکش سے تیر نکال کر پھیلا رہا تھا۔ عتبہ کا پیغام سن کر بولا: "ہاں عتبہ کی ہمت نے جواب دے دیا۔" عتبہ کے فرزند ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ اسلام لا چکے تھے اور اس معرکہ میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ آئے تھے اس بنا پر ابوجہل نے یہ بدگمانی کی کہ عتبہ اس لئے لڑائی سے جی چراتا ہے، کہ اس کے بیٹے پر آنچ نہ آئے۔

ابوجہل نے حضرمی کے بھائی ابوعامر کو بلا کر کہا، دیکھتے ہو! تمہارا خون بہا تمہاری آنکھ کے سامنے آ کر نکلا جاتا ہے۔ عامر نے عرب کے دستور کے مطابق کپڑے پھاڑ ڈالے اور گرد اڑا کر واعمراہ واعمراہ کا نعرہ مارنا شروع کیا، اس واقعہ نے تمام فوج میں آگ لگا دی۔ عتبہ نے ابوجہل کا طعنہ سنا تو غیرت سے سخت برہم ہوا اور کہا: میدان جنگ بتا دے گا کہ نامردی کا داغ کون اٹھاتا ہے۔ یہ کہہ کر مغفر مانگا۔ لیکن اس کا سر اس قدر بڑا تھا کہ کوئی مغفر اس کے سر پر ٹھیک نہ اترا۔ مجبوراً سر سے کپڑا لپیٹا اور لڑائی کے ہتھیار سجے۔

چونکہ آنحضرت ﷺ اپنے ہاتھ کو خون سے آلودہ کرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے میدان

❶ ابن هشام، ج ۱، ص:۳۷۸۔ ❷ ابن هشام، جلد ۲، ص:۱٦۔
❸ منتخب کنز العمال غزوة بدر، ج ٤، ص: ۹۸ به روایت مسند ابن حنبل وابن ابی شیبه۔

کے کنارے ایک چھپر کا سائبان تیار کیا کہ آپ ﷺ اس میں تشریف رکھیں۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ دروازہ پر تیغ بکف کھڑے ہوئے کہ کوئی ادھر نہ بڑھنے پائے۔ اگرچہ بارگاہ الٰہی سے فتح و نصرت کا وعدہ ہو چکا تھا، عناصر عالم آمادۂ مدد تھے، ملائکہ کی فوجیں ہمرکاب تھیں، تاہم عالم اسباب کے لحاظ سے آپ نے اصول جنگ کے مطابق فوجیں مرتب کیں، مہاجرین کا علم مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو عنایت فرمایا، خزرج کے علمبردار حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ اور اوس کے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ مقرر ہوئے۔

صبح ہوتے ہوتے آپ نے صف آرائی شروع کی، دست مبارک میں ایک تیر تھا اس کے اشارہ سے صفیں قائم کرتے تھے۔ کہ کوئی شخص تل بھر آگے یا پیچھے نہ رہنے پائے۔ لڑائی میں شور و غل عام بات ہے لیکن منع کر دیا گیا کہ کسی کے منہ سے آواز تک نہ نکلنے پائے۔ اس موقع پر بھی جبکہ دشمن کی عظیم الشان تعداد مقابل تھی اور مسلمانوں کی طرف ایک آدمی بھی آ کر بڑھ جاتا تو کچھ نہ کچھ مسرت ہوتی۔ آنحضرت ﷺ ہمہ تن وفا تھے۔ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ اور حضرت حُسیل رضی اللہ عنہ دو صحابی کہیں سے آ رہے تھے، راہ میں کفار نے روکا کہ محمد ﷺ کی مدد کو جا رہے ہو؟ انہوں نے انکار کیا اور عدم شرکت کا وعدہ کیا۔ آنحضرت ﷺ کے پاس آئے تو صورت حال عرض کی، فرمایا: ''ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے، ہم کو صرف اللہ کی مدد درکار ہے۔'' [1]

اب دو صفیں آمنے سامنے مقابل تھیں۔ حق و باطل، نور و ظلمت، کفر و اسلام۔

﴿ قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۖ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۳)

''جو لوگ باہم لڑے ان میں تمہارے لئے عبرت کی نشانیاں ہیں۔ ایک اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا اللہ کا منکر تھا۔''

یہ عجیب منظر تھا، اتنی بڑی وسیع دنیا میں توحید کی قسمت صرف چند جانوں پر منحصر تھی، صحیحین میں ہے کہ آنحضرت ﷺ پر سخت خضوع کی حالت طاری تھی، دونوں ہاتھ پھیلا کر فرماتے تھے:

''خدایا تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے آج پورا کر'' محویت اور بے خودی کے عالم میں چادر کندھے پر سے گر گر پڑتی تھی اور آپ کو خبر تک نہ ہوتی تھی، کبھی سجدہ میں گرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ''خدایا! اگر یہ چند نفوس آج مٹ گئے تو پھر قیامت تک تو نہ پوجا جائے گا۔'' [2] اس بے قراری پر بندگان خاص کو رقت آ گئی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''حضور اللہ اپنا وعدہ وفا کرے گا۔'' آخر روحانی تسکین کے ساتھ:

﴿ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ۝ ﴾. (٥٤/ القمر:٤٥)

''فوج کو شکست دی جائے گی اور وہ پشت پھیر دیں گے۔''

پڑھتے ہوئے لب مبارک فتح کی پیشین گوئی سے آشنا ہوئے۔ [3]

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسير، باب الوفاء بالعهد: ٤٦٣٩۔ (س)

[2] مسلم، کتاب الجهاد، باب الامداد بالملائكة في غزوة بدر: ٤٥٨٨۔

[3] بخاری، کتاب المغازی، باب قول الله تعالىٰ: اذ تستغيثون ربكم فاستجاب لكم ...: ٣٩٥٣۔

قریش کی فوجیں اب بالکل قریب آ گئیں۔ تاہم آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو پیش قدمی سے روکا اور فرمایا: ''جب دشمن پاس آ جائیں تو تیر سے روکو۔'' یہ معرکہ، ایثار اور جان بازی کا سب سے بڑا حیرت انگیز منظر تھا۔ دونوں فوجیں سامنے آئیں تو لوگوں کو نظر آیا کہ خود ان کے جگر کے ٹکڑے تلوار کے سامنے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بیٹے (جواب تک کافر تھے) میدان جنگ میں بڑھے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تلوار کھینچ کر نکلے، [1] عتبہ میدان میں آیا تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ (عتبہ کے فرزند تھے) اس کے مقابلہ کو نکلے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تلوار ماموں کے خون سے رنگین تھی۔ [2]

لڑائی کا آغاز یوں ہوا کہ سب سے پہلے عامر حضرمی جس کو بھائی کے خون کا دعویٰ تھا۔ آگے بڑھا، مہجع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غلام اس کے مقابلہ کو نکلا اور مارا گیا۔

عتبہ جو سردار لشکر تھا، ابوجہل کے طعنہ سے سخت برہم تھا۔ سب سے پہلے وہی بھائی اور بیٹے کو لے کر میدان میں نکلا اور مبارز طلبی کی۔ عرب میں دستور تھا کہ نامور لوگ کوئی امتیازی نشان لگا کر میدان جنگ میں جاتے تھے۔ عتبہ کے سینہ پر شتر مرغ کے پر تھے۔ حضرت عوف، حضرت معاذ، حضرت عبداللہ بن رواحۃ رضی اللہ عنہم مقابلہ کو نکلے۔ عتبہ نے نام و نسب پوچھا اور جب یہ معلوم ہوا کہ انصار ہیں تو عتبہ نے کہا ہم کو تم سے غرض نہیں۔ پھر آنحضرت ﷺ کی طرف خطاب کر کے پکارا کہ محمد (ﷺ)! یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں۔ [3] آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق انصار ہٹ آئے اور حضرت حمزہ، حضرت علی، حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہم میدان میں آئے، چونکہ (یہ لوگ خود پہنے تھے جس سے چہرے چھپ گئے تھے) [4] ان لوگوں کے چہروں پر نقاب تھی، عتبہ نے پوچھا تم کون ہو، سب نے نام و نسب بتائے۔ عتبہ نے کہا ''ہاں اب ہمارا جوڑ ہے۔''

عتبہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سے اور ولید حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مقابل ہوا، اور دونوں مارے گئے، لیکن عتبہ کے بھائی شیبہ نے حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کو زخمی کیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑھ کر شیبہ کو قتل کر دیا اور عبیدہ رضی اللہ عنہ کو کندھے پر اٹھا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائے۔ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ کیا میں دولت شہادت سے محروم رہا؟ آپ نے فرمایا ''نہیں تم نے شہادت پائی۔'' حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا آج ابوطالب زندہ ہوتے تو تسلیم کرتے کہ ان کے اس شعر کا مستحق میں ہوں: [5]

---

[1] استیعاب، ذکر عبدالرحمن بن ابی بکر، ج ۲، ص: ٤٠٤ حیدرآباد، ۱۳۱۹ھ۔

[2] سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۳۸۸ مطبع محمد علی مصر۔

[3] کتب حدیث میں جو الفاظ ہیں مختلف ہیں، ابوداود (کتاب الجهاد، باب فی المبارزة: ٢٦٦٥) میں ہے کہ عتبہ نے کہا کہ ہم کو اپنے برادران عم زاد سے غرض ہے، تم سے کام نہیں، انصاری محدثین نے اس کا مطلب یہ قرار دیا ہے کہ ''اس سے انصار کی توہین منظور نہ تھی بلکہ یہ غرض تھی کہ انتقام خون کا مطالبہ قریش سے ہے انصار سے نہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مکہ والے انصار کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتے تھے۔ صحیح روایتوں میں مذکور ہے کہ جب ابوجہل انصار کے ہاتھ سے مارا گیا تو مرتے وقت اس نے کہا: کاش! مجھ کو فلاحوں (کاشتکاروں) کے سوا کسی اور نے مارا ہوتا، انصار کھیتی کا پیشہ کرتے تھے جو قریش کے نزدیک معیوب تھا۔ [4] ابن سعد، غزوة بدر والبداية والنهاية ابن كثير ج ۳، ص: ۲۷۳ مطبوعه مصر۔ [5] زرقانی، ج ۱، ص: ٤٨٤ ان واقعات میں روایتیں مختلف ہیں اور قریباً سب ہم مرتبہ ہیں، اس لئے جو روایت اختیار کر لی جائے قابلِ الزام نہیں۔

ونسلمه حتى نصرّع حوله ونذهل عن ابنائنا والحلائل۔

''ہم محمد ﷺ کو اس وقت دشمنوں کے حوالہ کریں گے جب ان کے گرد لڑ کر مر جائیں اور ہم اپنے بیٹوں اور بیبیوں سے بھلا نہ دیے جائیں۔''

سعید بن العاص کا بیٹا (عبیدہ) سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبا ہوا صف سے نکلا اور پکارا کہ میں ابو کرش ہوں۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اس کے مقابلہ کو نکلے، چونکہ صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں، تاک کر آنکھ میں برچھی ماری وہ زمین پر گرا اور مر گیا۔ ❶ برچھی اس طرح پیوست ہوگئی تھی کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اس کی لاش پر پاؤں اڑا کر کھینچا تو بڑی مشکل سے نکلی، لیکن دونوں سرے خم ہو گئے، یہ برچھی یادگار رہی یعنی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے آنحضرت ﷺ نے مانگ لی۔ پھر چاروں خلفا کے پاس منتقل ہوتی رہی پھر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس آئی۔ ❷

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اس معرکہ میں کئی کاری زخم اٹھائے، شانہ پر جو زخم تھا اتنا گہرا تھا کہ اچھے ہو جانے پر اس میں انگلی چلی جاتی تھی، چنانچہ ان کے بیٹے (عروہ) بچپن میں ان زخموں سے کھیلا کرتے تھے، جس تلوار سے لڑے تھے وہ لڑتے لڑتے گر گئی تھی۔ چنانچہ جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو عبدالملک نے عروہ سے کہا: تم زبیر کی تلوار پہچان لو گے؟ انہوں نے کہا: ہاں، عبدالملک نے پوچھا: کیونکر؟ بولے کہ بدر کے معرکہ میں اس میں دندانے پڑ گئے تھے، عبدالملک نے تصدیق کی اور یہ مصرع پڑھا، بهن فلول من قراع الكتائب، عبدالملک نے تلوار عروہ کو دے دی، انہوں نے اس کی قیمت لگوائی تو تین ہزار ٹھہری، اس کے قبضہ پر چاندی کا کام تھا۔ ❸

اب عام حملہ شروع ہو گیا، مشرکین اپنے بل بوتے پر لڑ رہے تھے۔ لیکن ادھر سرور عالم ﷺ سربسجدہ صرف اللہ کی قوت کا سہارا ڈھونڈ رہے تھے۔

ابوجہل کی شرارت اور دشمنی اسلام کا عام چرچا تھا۔ اس بنا پر انصار میں سے معوذ اور معاذ دو بھائیوں نے عہد کیا تھا کہ یہ شقی جہاں نظر آ جائے گا یا اس کو مٹا دیں گے یا خود مٹ جائیں گے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں صف میں تھا کہ دفعتہً مجھ کو داہنے بائیں دونو جوان نظر آئے۔ ایک نے مجھ سے کان میں پوچھا کہ ابوجہل کہاں ہے؟ میں نے کہا: برادر زادے! ابوجہل کو پوچھ کر کیا کرے گا؟ بولا کہ ''میں نے اللہ سے عہد کیا ہے کہ ابوجہل کو جہاں دیکھ لوں گا یا اسے قتل کر دوں گا یا خود لڑ کر مارا جاؤں گا؟'' میں جواب نہیں دینے پایا تھا کہ دوسرے نوجوان نے بھی مجھ سے کانوں میں یہی باتیں کہیں۔ میں نے دونوں کو اشارہ سے بتایا کہ ابوجہل وہ ہے، بتانا تھا کہ دونوں باز کی طرح جھپٹے اور ابوجہل خاک پر تھا۔ یہ دونوں جوان عفراء

❶ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب......: ۳۹۹۸ میں پورا واقعہ منقول ہے۔ ❷ ایضاً۔

❸ یہ پوری تفصیل صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل ابی جهل: ۳۹۷۳ کے ذکر میں ہے۔

کے بیٹے تھے ''معوذ و معاذ رضی اللہ عنہما'' [1] ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے عقب سے آ کر معاذ کے بائیں شانہ پر تلوار ماری، جس سے بازو کٹ گیا، لیکن تسمہ باقی لگا رہا، معاذ نے عکرمہ کا تعاقب کیا وہ بچ کر نکل گیا، معاذ رضی اللہ عنہ اسی حالت میں لڑ رہے تھے لیکن ہاتھ کے لٹکنے سے زحمت ہوتی تھی، ہاتھ کو پاؤں کے نیچے دبا کر کھینچا کہ تسمہ بھی الگ ہو گیا، اور اب وہ آزاد تھے۔ [2]

آنحضرت ﷺ نے لڑائی سے پہلے ارشاد فرمایا تھا کہ ''کفار کے ساتھ جو لوگ آئے ہیں ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو خوشی سے نہیں بلکہ قریش کے جبر سے آئے ہیں۔'' ان لوگوں کے نام بھی آپ نے بتا دیے تھے، ان میں ابوالبختری بھی تھا، مجذر انصاری کی نظر ابوالبختری پر پڑی، مجذر نے کہا چونکہ رسول اللہ ﷺ نے تیرے قتل سے منع فرمایا ہے، اس لئے تجھ کو چھوڑ دیتا ہوں، ابوالبختری کے ساتھ اس کا ایک رفیق بھی تھا۔ ابوالبختری نے کہا اس کو بھی؟ مجذر نے کہا ''نہیں'' ابوالبختری نے کہا تو میں خاتونانِ عرب کا یہ طعنہ نہیں سن سکتا کہ ابوالبختری نے اپنی جان بچانے کے لئے رفیق کا ساتھ چھوڑ دیا۔ [3] یہ کہہ کر ابوالبختری یہ رجز پڑھتا ہوا مجذر پر حملہ آور ہوا اور مارا گیا۔ [4]

لن یسلم ابن حُرۃٍ زمیلہ حتیّٰ یموت اویرٰی سبیلہ

''شریف زادہ اپنے رفیق کو چھوڑ نہیں سکتا جب تک کہ مر نہ جائے یا وہ اپنا راستہ نہ دیکھ لے۔''

عتبہ اور ابوجہل کے مارے جانے سے قریش کا پائے ثبات اکھڑ گیا اور فوج میں بے دلی چھا گئی۔

آنحضرت ﷺ کا شدید دشمن امیہ بن خلف بھی جنگ بدر میں شریک تھا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس سے کسی زمانہ میں معاہدہ کیا تھا کہ وہ مدینہ میں آئے گا تو یہ اس کی جان کے ضامن ہوں گے۔ بدر میں اس اللہ کے دشمن سے انتقام لینے کا خوب موقع تھا۔ لیکن عہد کی پابندی اسلام کا شعار ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ وہ بچ کر نکل جائے، اس کو لے کر ایک پہاڑ پر چلے گئے۔ اتفاق یہ کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے دیکھ لیا، انصار کو خبر کر دی۔ دفعتہً لوگ ٹوٹ پڑے، انہوں نے امیہ کے بیٹے کو آگے کر دیا لوگوں نے اس کو قتل کر دیا، لیکن اس پر بھی قناعت نہ کی اور امیہ کی طرف بڑھے، انہوں نے امیہ سے کہا کہ تم زمین پر لیٹ جاؤ، یہ لیٹ گیا تو وہ اس پر چھا گئے کہ لوگ اس کو مارنے نہ پائیں۔ لیکن لوگوں نے ان کی ٹانگوں کے اندر سے ہاتھ ڈال کر اس کو قتل کر دیا۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی بھی ایک ٹانگ زخمی ہوئی اور زخم کا نشان مدتوں تک قائم رہا۔ [5]

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب...... ۳۹۸۸ بعض روایتوں میں ان دونوں نوجوانوں کا نام معاذ بن عمرو بن جموح اور معاذ بن عفراء ہے۔ زرقانی میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور روایتوں کے درمیان تطبیق کی صورت بھی مذکور ہے۔ دیکھو زرقانی، ج ۱، ص: ٤٩٦۔

[2] تاریخ طبری، ج ۳، ص: ۱۳۲۹، ۱۳۳۰۔ [3] عیون الاثر، ج ۱، ص: ۲۵۸، مکتبہ قدسی: ۱۳۵٦ھ۔

[4] طبری، ج ۳، ص: ۲٤۳۵۔ [5] یہ پورا واقعہ صحیح بخاری میں ہے لیکن چونکہ کتاب المغازی میں نہیں بلکہ کتاب الوکالۃ، باب اذا وکل المسلم حربیًا: ۲۳۰۱ میں ہے، اس لئے ارباب سیر کی نظر نہیں پڑی۔

ابوجہل اور عتبہ وغیرہ کے قتل کے بعد قریش نے سپر ڈال دی اور مسلمانوں نے ان کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ حضرت عباس، حضرت عقیل (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی) نوفل، اسود بن عامر، عبداللہ بن زمعہ اور بہت سے بڑے بڑے معزز لوگ گرفتار ہوئے۔

آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ کوئی شخص جا کر خبر لائے، ابوجہل کا کیا انجام ہوا؟ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جا کر لاشوں میں دیکھا تو زخمی پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا، بولے: تو ابوجہل ہے؟ اس نے کہا: ''ایک شخص کو اس کی قوم ❶ نے قتل کر، یا تو یہ فخر کی کیا بات ہے'' ابوجہل نے ایک دفعہ ان کو تھپڑ مارا تھا، انہوں نے اس کے انتقام میں اس کی گردن پر پاؤں رکھا، ابوجہل نے کہا: او بکری چرانے والے! دیکھ تو کہاں پاؤں رکھتا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کا سر کاٹ لائے اور آنحضرت ﷺ کے قدموں پر ڈال دیا۔ ❷

مغربی مؤرخین کو جن کے نزدیک عالم اسباب میں جو کچھ ہے صرف اسباب ظاہری کے نتائج ہیں۔ حیرت ہے کہ تین سو پیدل آدمیوں نے ایک ہزار جن میں سو سواروں کا رسالہ تھا کیونکر فتح ہوئی، لیکن تائید آسمانی نے بارہا ایسے حیرت انگیز مناظر دکھائے ہیں۔ تاہم اس واقعہ میں ظاہر بینوں کے اطمینان کے سامان بھی موجود ہیں، اوّل تو قریش میں باہم اتفاق نہ تھا۔ عتبہ سردار لشکر لڑنے پر راضی نہ تھا، قبیلہ زہرہ کے لوگ بدر تک آ کر واپس چلے گئے، پانی برسنے سے موقع جنگ کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ قریش جہاں صف آرا تھے وہاں کیچڑ اور دلدل کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل تھا، قریش مرعوب ہو کر اسلامی فوج کا تخمینہ غلط کر رہے تھے، یعنی اپنی تعداد سے دوگنا، چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

﴿ يَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ ﴾. (۳/ آل عمران:۱۳)

''وہ اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کو اپنے آپ سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔''

کفار کی فوج میں کوئی ترتیب اور صف بندی نہ تھی، بخلاف اس کے آنحضرت ﷺ نے خود دست مبارک میں تیر لے کر نہایت ترتیب سے صفیں درست کی تھیں۔ مسلمان رات کو اطمینان سے سوئے، صبح اٹھے تو تازہ دم تھے۔ بخلاف اس کے کفار، بے اطمینانی کی وجہ سے رات کو سو نہ سکے تھے۔

تاہم یہ اسباب ہیں، ان کا اجتماع اور تہیہ یہی تائید الٰہی ہے۔ پھر قریش اور مسلمانوں کی فوج کا باہم مقابلہ کرو تو نظر آئے گا کہ عام فوجی نظر کیا مسلمانوں کی فتح کی مقتضی تھی۔ قریش کی فوج میں بڑے بڑے دولتمند تھے، جو تنہا تمام فوج کی رسد کا سامان کرتے تھے، مسلمانوں کے پاس کچھ نہ تھا، قریش کی تعداد ایک ہزار تھی، مسلمان صرف ۳۰۰ تھے، قریش میں سو سوار تھے، مسلمانوں کی فوج میں صرف دو گھوڑے تھے، مسلمانوں میں بہت کم سپاہی تمام ہتھیاروں سے لیس تھے اور ادھر قریش کا ہر سپاہی لوہے میں غرق تھا۔

بااین ہمہ خاتمہ جنگ پر معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں سے صرف ۱۴ شخصوں نے شہادت پائی۔ جن میں ۶

❶ بخاري، كتاب المغازي، باب قتل ابى جهل: ۳۹٦۲، ۳۹٦۳۔

❷ زرقاني، ج۱، ص:٤٩٦ بروايت ابن اسحاق وحاكم۔

مہاجر اور باقی انصار تھے، لیکن دوسری طرف قریش کی اصلی طاقت ٹوٹ گئی، رؤسائے قریش جو شجاعت میں نامور اور قبائل کے سپہ سالار تھے، ایک ایک کر کے مارے گئے، ان میں شیبہ، عتبہ، ابوجہل، ابوالبختری، زمعہ بن الاسود، عاص بن ہشام، امیہ بن خلف، منبہ بن الحجاج، قریش کے سرتاج تھے، قریباً ۷۰ آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے، اسیرانِ جنگ میں سے عقبہ اور نضر بن حارث قتل کر دیے گئے۔ باقی گرفتار ہو کر مدینہ میں آئے۔ ان میں حضرت عباس، حضرت عقیل، (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی) ابوالعاص (آنحضرت ﷺ کے داماد) بھی تھے۔

لڑائیوں میں آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ جہاں کوئی لاش نظر آتی تھی، آپ اس کو زمین میں دفن [1] کرا دیتے، لیکن اس موقع پر کشتوں کی تعداد زیادہ تھی، اس لئے ایک ایک کا الگ الگ دفن کرانا مشکل تھا۔ ایک وسیع کنواں تھا، تمام لاشیں آپ نے اس میں ڈلوا دیں، لیکن امیہ کی لاش پھول کر اس قابل نہیں رہی تھی کہ جگہ سے ہٹائی جائے، اس لئے وہیں خاک میں دبا دی گئی۔ [2]

اسیرانِ جنگ جب مدینہ میں آنحضرت ﷺ کے سامنے آئے تو حضرت سودہ (آنحضرت ﷺ کی زوجہ محترمہ) بھی تشریف رکھتی تھیں۔ ان قیدیوں میں ان کے عزیز سہیل بن عمرو بھی تھے، ان پر نگاہ پڑی تو بے ساختہ بول اٹھیں کہ تم نے عورتوں کی طرح خود بیڑیاں پہن لیں، یہ نہ ہو سکا کہ لڑ کر مر جاتے۔ [3] اسیرانِ جنگ دو دو، چار چار صحابہ کو تقسیم کر دیے گئے۔ اور ارشاد ہوا کہ آرام کے ساتھ رکھے جائیں، صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا کہ ان کو کھانا کھلاتے تھے اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے تھے۔ ان قیدیوں میں ابوعزیز بھی تھے جو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے۔ ان کا بیان ہے کہ مجھ کو جن انصاریوں نے اپنے گھر میں قید کر رکھا تھا جب صبح یا شام کا کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوریں اٹھا لیتے۔ مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا، لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھ کو واپس دیتے اور یہ اس بنا پر تھا کہ آنحضرت ﷺ نے تاکید کی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ [4]

(قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا، جو نہایت فصیح اللسان تھا اور عام مجمعوں میں آنحضرت ﷺ کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! اس کے دو نچلے دانت اکھڑوا دیجئے کہ پھر اچھا نہ بول سکے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "کہ میں اگر اس کے عضو بگاڑوں گا (مثلہ) تو گو نبی ہوں لیکن اللہ اس کی جزا میں میرے اعضاء بھی بگاڑ دے گا۔") [5]

اسیرانِ جنگ کے پاس کپڑے نہ تھے، آنحضرت ﷺ نے سب کو کپڑے دلوائے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بدن پر کرتہ نہ تھا لیکن حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا قد اس قدر اونچا تھا کہ کسی کا کرتہ ان کے بدن پر ٹھیک نہیں

[1] روض الانف، ج ۲، ص: ۷۵ مطبعہ مصر: ۱۹۱۴ء۔ [2] ابن ہشام، ج ۲، ص: ۷۴ بر حاشیہ روض الانف۔ [3] ایضاً، ص: ۷۷، ۷۸۔ [4] طبری، ج ۳، ص: ۱۳۳۸۔ [5] طبری، ج ۳، ص: ۱۳۴۴۔

اترتا تھا۔ عبداللہ بن ابی (رئیس المنافقین) نے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا ہم قد تھا، اپنا کرتہ منگوا کر دیا، صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عبداللہ کے کفن کے لئے جو اپنا کرتہ عنایت فرمایا تھا، وہ اسی احسان کا معاوضہ تھا۔ [1] عام روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں آ کر صحابہ سے مشورہ کیا کہ اسیران جنگ کے معاملہ میں کیا کیا جائے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ سب اپنے ہی عزیز وا قارب ہیں، فدیہ لے کر چھوڑ دیے جائیں۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اسلام کے مسئلہ میں دوست دشمن، عزیز واقارب، قریب وبعید کی تمیز نہ تھی، اس لئے انہوں نے یہ رائے دی کہ سب قتل کر دیے جائیں اور ہم میں سے ہر شخص اپنے عزیز کو آپ قتل کرے۔ مگر یہاں آنحضرت ﷺ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے پسند کی اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا اس پر اللہ کا عتاب آیا اور یہ آیت اتری:

﴿ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ (۸/ الانفال:۶۸)

''اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا، اس پر بڑا عذاب نازل ہوتا۔''

آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ عتاب ربانی سن کر رو پڑے۔ [2]

یہ روایت تمام تاریخوں میں مذکور اور احادیث میں بھی موجود ہے لیکن سبب عتاب کے بیان میں اختلاف ہے۔ ترمذی میں جو روایت ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اس وقت تک مالِ غنیمت کے متعلق احکام نہیں آئے تھے۔ عرب کے عام دستور کے موافق صحابہ رضی اللہ عنہم غنیمت میں مصروف ہو گئے۔ اس پر عتاب آیا، چونکہ اس کے متعلق پہلے کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا، اس لئے یہ جرم معاف کر دیا گیا اور حکم آیا کہ مال غنیمت جو ہاتھ آ چکا حلال ہے۔ قرآن مجید میں عتاب کے بعد یہ الفاظ ہیں:

﴿ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ﴾. (۸/ الانفال:۶۹)

''تو جو تم نے لوٹا ہے اب کھاؤ کہ حلال، طیب ہے۔'' [3]

اس آیت میں صاف تصریح ہے کہ مال جو ہاتھ آیا تھا وہ حلال کر دیا گیا اور وہ مال غنیمت تھا، غرض صحیح مسلم اور ترمذی دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عتاب فدیہ لینے یا مال غنیمت کے لوٹنے پر تھا۔ صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں کہ جب عتاب کی آیت نازل ہوئی تو آپ رونے لگے اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ((ابکی الذی عرض علی اصحابك من اخذهم الفداء)) یعنی ''تمہارے ساتھیوں نے جو فدیہ لیا اس پر، جو اللہ کی طرف سے پیش کیا گیا اس پر، رو رہا ہوں۔'' عموماً لوگوں نے غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ عتاب اس پر آیا کہ اسیران جنگ کو قتل کیوں نہیں کر ڈالا۔ چنانچہ لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب الكسوة للاساری:۳۰۰۸۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب الامداد بالملائكة فی غزوة بدر:۴۵۸۸۔ [3] جامع ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، تفسیر سورة الانفال: ۳۰۸۵۔

﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ﴾ (۸/ الانفال:٦٨)

''کسی نبی کو یہ مناسب نہیں کہ بغیر اچھی طرح خونریزی کرنے کے لوگوں کو قیدی بنائے۔''

لیکن اس آیت کا صرف یہ ماحصل ہے کہ میدان جنگ میں جب تک کافی خونریزی نہ ہو چکے، قیدی بنانا مناسب نہیں، اس سے یہ کیونکر ثابت ہوسکتا ہے کہ اگر خونریزی سے پہلے لوگ گرفتار کر لئے گئے تو لڑائی کے بعد بھی وہ قتل کئے جاسکتے ہیں؟

بہر حال اسیران جنگ سے چار چار ہزار درہم فدیہ لیا گیا، لیکن جو لوگ ناداری کی وجہ سے فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے، وہ چھوڑ دیے گئے، ان میں سے جو پڑھنا لکھنا جانتے تھے ان کو حکم ہوا کہ دس دس بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھادیں ❶ تو چھوڑ دیے جائیں گے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اسی طرح پڑھنا لکھنا سیکھا تھا۔ ❷

انصار نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ ہمارے بھانجے ہیں۔ ہم ان کا فدیہ چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے مساوات کی بنا پر گوارا نہیں فرمایا ❸ اور ان کو بھی فدیہ ادا کرنا پڑا۔ فدیہ کی عام مقدار ۴، ۴ ہزار درہم تھی، لیکن امراء سے زیادہ لیا گیا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ دولتمند تھے، اس لئے ان سے بھی زیادہ رقم وصول کی گئی، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی، لیکن ان کو کیا معلوم تھا کہ اسلام نے جو مساوات قائم کی، اس میں قریب و بعید، عزیز و بیگانہ، عام و خاص کے تمام تفرقے مٹ چکے تھے، (لیکن ایک طرف تو ادائے فرض کی یہ مساوات تھی، دوسری طرف محبت کا یہ تقاضا تھا کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی کراہ سن کر رات کو آپ آرام نہ فرما سکے۔ لوگوں نے ان کی گرہ کھولی تو آپ ﷺ نے آرام فرمایا)۔

آنحضرت ﷺ کے داماد ابو العاص بھی اسیران جنگ میں آئے تھے، ان کے پاس فدیہ کی رقم نہ تھی آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی زینب رضی اللہ عنہا کو (جو ان کی زوجہ تھیں اور مکہ میں تھیں) کہلا بھیجا کہ فدیہ کی رقم بھیج دیں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا جب نکاح ہوا تھا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جہیز میں ان کو ایک قیمتی ہار دیا تھا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے زر فدیہ کے ساتھ وہ ہار بھی گلے سے اتار کر بھیج دیا۔ آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو ۲۵ برس کا محبت انگیز واقعہ یاد آ گیا۔ آپ بے اختیار رو پڑے اور صحابہ سے فرمایا: ''تمہاری مرضی ہو تو بیٹی کو ماں کی یادگار واپس کردو۔'' سب نے تسلیم کی گردنیں جھکا دیں اور وہ ہار واپس کر دیا۔ ❹

(ابو العاص رہا ہو کر مکہ آئے اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو مدینہ بھیج دیا، ابو العاص بہت بڑے تاجر تھے۔ چند سال کے بعد بڑے سرو سامان سے شام کی تجارت لے کر نکلے، واپسی میں مسلمان دستوں نے ان کو مع تمام مال و اسباب گرفتار کر لیا، اسباب ایک ایک سپاہی پر تقسیم ہو گیا، یہ چھپ کر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے

---

❶ مسند ابن حنبل، ج ۱، ص: ۲٤۷۔ ❷ طبقات ابن سعد، جزء مغازی، قسم اول، ص: ١٤۔

❸ بخاری، کتاب المغازی، باب ...: ٤٠١٨۔

❹ تاریخ طبری، ج ۳، ص: ۱۳٤۸ وابو داود، کتاب الجہاد، باب فی فداء الاسیر بالمال: ۲٦۹۲۔

پاس پہنچے، انہوں نے پناہ دی۔ آنحضرت ﷺ نے لوگوں سے فرمایا کہ ''اگر مناسب سمجھو تو ابوالعاص کا اسباب واپس کر دو۔'' پھر تسلیم کی گردنیں جھک گئیں اور سپاہیوں نے ایک ایک دھاگا تک لا لا کر واپس کر دیا اب یہ وار ایسا نہ تھا جو خالی جاتا۔ ابوالعاص مکہ آئے اور تمام شرکا کو حساب سمجھا کر دولت اسلام سے فائز ہوئے اور کہہ دیا کہ میں اس لئے یہاں آ کر اور حساب سمجھا کر جاتا ہوں، تا کہ یہ نہ کہو کہ ابوالعاص ہمارا روپیہ کھا کر تقاضے کے ڈر سے مسلمان ہو گیا)۔ [1]

بدر کی خبر مکہ میں پہنچی تو گھر گھر ماتم تھا لیکن غیرت کی وجہ سے قریش نے منادی کرا دی کہ کوئی شخص رونے نہ پائے۔ اس لڑائی میں اسود کے تین لڑکے مارے گئے، اس کا دل امنڈ آتا لیکن قومی عزت کے خیال سے رو نہیں سکتا تھا۔ اتفاق یہ کہ ایک دن کسی طرف سے رونے کی آواز آئی، سمجھا کہ قریش نے رونے کی اجازت دے دی ہے، نوکر سے کہا: دیکھنا کون روتا ہے؟ کیا رونے کی اجازت ہو گئی؟ میرے سینہ میں آگ لگ رہی ہے جی کھول کر رو لوں تو تسکین ہو جائے۔ آدمی نے آ کر کہا ایک عورت کا اونٹ گم ہو گیا ہے اس کے لئے رو رہی ہے، اسود کی زبان سے بے اختیار یہ شعر نکلے:

اتبكى ان يضل لها بعير	''اونٹ کے گم ہونے پر روتی ہے
ويمنعها من النوم السهود	اور اسکو نیند نہیں آتی (اونٹ پر)
فلا تبكى على بكر ولكن	مت رو، بدر پر آنسو بہا، جہاں
على بدر تقاصرت الجدود	قسمت نے کمی کی، تجھ کو رونا ہے
فبكى ان بكيت على عقيل	تو عقیل پر رو، اور حارث پر رو جو
وبكى حارثا اسد الاسود	شیروں کا شیر تھا۔''

(عمیر بن وہب قریش میں اسلام کا سخت دشمن تھا۔ وہ اور صفوان بن امیہ حجر میں بیٹھے ہوئے مقتولین بدر کا ماتم کر رہے تھے۔ صفوان نے کہا: ''اللہ کی قسم! اب جینے کا مزہ نہیں۔'' عمیر نے کہا: سچ کہتے ہو، اگر مجھ پر قرض نہ ہوتا اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں سوار ہو کر جاتا اور محمد ﷺ کو قتل کر آتا، میرا بیٹا بھی وہاں قید ہے۔ صفوان نے کہا: تم قرض کی اور بچوں کی فکر نہ کرو، ان کا میں ذمہ دار ہوں، عمیر نے گھر آ کر تلوار زہر میں بجھائی اور مدینہ پہنچا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے تیور دیکھ لئے، گلا دبائے اس کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لائے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''عمر! چھوڑ دو، عمیر قریب آ جاؤ۔'' پوچھا: ''کس ارادہ سے آئے۔'' جواب دیا کہ بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں۔ فرمایا: ''پھر تلوار کیوں حمائل ہے؟'' عمیر نے کہا آخر تلواریں بدر میں کس کام آئیں، فرمایا: ''کیوں نہیں، تم نے اور صفوان نے حجر میں بیٹھ کر میرے قتل کی سازش نہیں کی۔'' عمیر آپ ﷺ کی بات سن کر سناٹے میں آ گیا۔ بے اختیار ہو کر بولا: محمد (ﷺ)! بیشک تم پیغمبر ہو، باللہ میرے اور صفوان کے سوا اس

[1] تاریخ طبری، ج۳، ص: ۱۳۵۱۔

معاملہ کی کسی کو خبر نہ تھی۔ قریش جو آنحضرت ﷺ کے قتل کی خبر سننے کے منتظر تھے انہوں نے عمیر کے مسلمان ہونے کی خبر سنی۔

حضرت عمیر رضی اللہ عنہ مسلمان ہو کر بہادرانہ مکہ میں آئے جہاں کا ہر ذرہ اس وقت مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا۔ ان کو اسلام کے دوستوں سے جس شدت کے ساتھ عداوت تھی، اسی شدت سے وہ اب دشمنان اسلام کے دشمن تھے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے اسلام کی دعوت کو پھیلایا اور ایک مجمع کثیر کو اس روشنی سے منور کر دیا)۔ [1]

غزوۂ بدر کا بیان قرآن میں

اس غزوہ کو دیگر غزوات پر جو امتیازات حاصل ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ خود اللہ نے اپنے کلام پاک میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے اور ایک خاص سورۂ (انفال) بدر کے احسانات ونعم کی تفصیل اور بعض مسائل متعلقہ بدر کی توضیح کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ واقعہ کی اصل حقیقت جاننے کے لئے آسمان کے نیچے اس سے زیادہ کوئی صحیح ماخذ موجود نہیں:

(۱) ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّاۗىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَىِٕنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰي قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۝ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰۗىِٕكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا

[1] یہ تمام واقعات تاریخ طبری میں بحوالہ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مذکور ہیں، ج ۳، ص: ۱۳۵۴۔

مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ
الْمَصِيْرُ ۞ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ
وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۞ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ
الْكٰفِرِيْنَ ۞ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا
نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۞

(۸/ الانفال ۲ تا ۱۹)

''مومن وہ ہیں کہ جب اللہ کا نام لیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں، جو نماز بہ پابندی پڑھتے ہیں اور اللہ نے جو ان کو روزی دی ہے۔ اس سے راہ الٰہی میں بھی کچھ دیتے ہیں، یہ ہیں سچے مومن، ان کے لئے اللہ کے پاس رتبے ہیں، بخشش ہے اور اچھی روزی ہے، جس طرح اے پیغمبر! تیرا اللہ تجھ کو حق پر تیرے گھر سے (بدر تک) نکال لایا، حالانکہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس سے ناخوش تھا۔ وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے پیچھے بھی جھگڑتا ہے، گویا کہ وہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں اور وہ موت کو دیکھ رہے ہیں اور جب اللہ تم سے قریش کے قافلہ اور قریش کی فوج میں سے ایک کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ تمہارے لئے ہے، تم چاہتے ہو کہ بے خرخشہ والا گروہ تم کو مل جائے (یعنی قافلہ) اور اللہ یہ چاہتا ہے کہ حق کو اپنے حکم سے ثابت کرے اور باطل کو مٹائے۔ گو گناہگار اس سے رنجیدہ ہوں۔ یاد کرو، جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے، اس نے تمہاری سنی (اور کہا) میں تمہاری لگاتار ہزار فرشتوں سے مدد کروں گا۔ اللہ نے یہ صرف مسلمانوں کی خوشی اور اطمینان قلب کے لئے کہا اور فتح تو صرف اللہ کے پاس ہے، اللہ غالب ودانا ہے۔ یاد کرو، جب تمہاری تسکین کے لئے اپنی طرف سے اونگھ تم پر طاری کر رہا تھا اور آسمان سے پانی برسا رہا تھا کہ تم کو پاک کرے اور شیطان کی ناپاکی تم سے دور کرے اور تمہارے دل مضبوط کرے اور ثابت قدم رکھے۔ یاد کرو، جب اللہ فرشتوں کو حکم دے رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنا، میں کافروں کے دل میں رعب ڈال دوں گا۔ کافروں کی گردنیں مارو اور ہر جوڑ پر مارو، یہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول سے دشمنی کی ہے اور جو اللہ اور اللہ کے رسول سے دشمنی کرے گا اللہ اس کو سخت عذاب دینے والا ہے، یہ ہے عذاب اس کا مزہ چکھو، کافروں کے لئے عذاب دوزخ ہے۔ مسلمانو! جب میدان جنگ میں کافروں کے مقابل آؤ تو پشت نہ پھیرو اور بجز اس

کے کہ لڑنے کیلئے مڑے یا کسی دستہ کی طرف پھرے جو کوئی پشت پھیرے وہ اللہ کا غضب لائے گا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ کیا برا ٹھکانا ہے۔ مسلمانو! ان کافروں کو تم نے نہیں مارا لیکن اللہ نے مارا اور اے محمد ﷺ! تم نے نہیں پھینکا جب تم نے پھینکا، لیکن اللہ نے پھینکا، تا کہ اپنی طرف سے اہل ایمان کو اچھا انعام دے، اللہ دانا اور بینا ہے اور کافروں کے داؤ پیچ کو کمزور کرنے والا ہے، اگر فتح چاہتے تھے تو فتح آ چکی، اب اگر رک جاؤ تو بہتر ہے اور اگر تم پھر مخالفت پر آمادہ ہوگے تو ہم پھر مسلمانوں کی مدد کریں گے، یاد رکھو کہ تمہاری جمعیت کچھ مفید نہیں گو وہ کتنی ہی کثیر ہے اور اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔''

(۲) ﴿ وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰی وَالرَّکْبُ اَسْفَلَ مِنْکُمْ ۭ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعٰدِ ۙ وَلٰکِنْ لِّیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا کَانَ مَفْعُوْلًا ۬ۙ لِّیَهْلِکَ مَنْ هَلَکَ عَنْۢ بَیِّنَةٍ وَّیَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْۢ بَیِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝ اِذْ یُرِیْکَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِکَ قَلِیْلًا ۭ وَلَوْ اَرٰىکَهُمْ کَثِیْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۭ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ وَاِذْ یُرِیْکُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَیْتُمْ فِیْٓ اَعْیُنِکُمْ قَلِیْلًا وَّیُقَلِّلُکُمْ فِیْٓ اَعْیُنِهِمْ لِیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا کَانَ مَفْعُوْلًا ۭ وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْکُرُوا اللّٰهَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ۝ ﴾ (۸/ الانفال:۴۱ تا ۴۷)

''اور جان لو کہ جو مال غنیمت ملے تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے اور اس کے رسول کے لئے، اہل قرابت کے لئے، یتیموں کے لئے، مسکینوں کے لئے اور مسافروں کے لئے ہے۔ اگر اللہ پر تم ایمان لا چکے ہو اور حق و باطل میں فرق کر دینے والے دن میں (یعنی بدر میں) اللہ نے اپنے بندہ پر جو (فتح) اتاری، اس کو مان چکے، جب دونوں فوجیں آمنے سامنے آ گئیں اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، جب تم قریب کے میدان میں اور قریش کی فوج دور کے میدان میں اور قافلہ تم سے نیچے تھا۔ اگر تم ایک دوسرے سے وقت مقرر کر کے آتے تو وقت میں اختلاف ہو جاتا، لیکن (اللہ نے یہ اس لئے کر دیا) تا کہ جو ہونے والا تھا، اللہ اس کو کر دے،

تاکہ جس کو مرنا ہو وہ بھی دلیل دیکھ کے مرے اور جس کو زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل دیکھ کے زندہ رہے اور بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ یاد کرو جب اللہ تم کو جنگ کی حالت میں ان کو تھوڑا دکھا رہا تھا، اگر زیادہ کر کے دکھاتا تو تم سست پڑ جاتے اور باہم جھگڑ پڑتے، لیکن اللہ نے محفوظ رکھا وہ سینوں کے بھید سے واقف ہے، جب تمہاری نظر میں اللہ ان کو تھوڑا دکھا رہا تھا اور تم کو ان کی نگاہ میں، تاکہ جو ہونے والا ہے اللہ اس کو پورا کرے اور اسی کی طرف تمام معاملے پھرتے ہیں۔ مسلمانو! جب کسی دستۂ فوج سے مقابلہ آ پڑے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو اکثر یاد کیا کرو، تاکہ کامیاب ہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جھگڑا نہ کرو، ورنہ سست پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ مستقل رہو، اللہ مستقل لوگوں کے ساتھ ہے اور ان لوگوں (یعنی قریش) کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے مغرورانہ، نمائش اور دکھاوے کے ساتھ اور اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے اور اللہ ان کے تمام کاموں کو گھیرے ہوئے ہے۔"

(۳) ﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖۗ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖؗ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ ﴾ (۸/ الانفال:٦٧ تا ٧١)

"پیغمبر ﷺ کے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ اس کے پاس قیدی ہوں، تا آنکہ خوب زمین میں لڑ نہ لے، تم دنیا کی دولت چاہتے ہو (قیدی ہوں گے تو فدیہ ہاتھ آئے گا) اور اللہ آخرت چاہتا ہے، اللہ دانا اور توانا ہے۔ اگر اللہ کی تقدیر پہلے نہ ہو چکی ہوتی تو تم نے جو قیدیوں سے لے لیا، اس پر تم کو دردناک عذاب پہنچتا، اب جو کچھ تم کو غنیمت میں ملا، کھاؤ، وہ حلال وطیب ہے اور اللہ سے ڈرا کرو، اللہ آمرزگار اور مہربان ہے۔ اے پیغمبر! تمہارے ہاتھ میں جو قیدی ہیں ان سے کہو کہ اللہ اگر تمہارے دلوں میں کچھ نیکی دیکھے گا تو تم سے جو لیا گیا ہے اس کے بدلہ وہ نیکی عطا کرے گا۔ اور تمہیں معاف کرے گا، وہ بخشش اور مہربانی والا ہے اور اگر یہ قیدی تجھ سے خیانت کرنا چاہتے ہیں تو اس سے پہلے وہ اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں، اس لئے تو اللہ نے ان کو تمہارے قابو میں کر دیا، اللہ دانا اور باخبر ہے۔"

اللہ نے اسی احسان کو احد کے موقع پر یاد دلایا ہے:

﴿ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۲۳)

''یقیناً اللہ نے تمہاری بدر میں مدد کی جب تم کمزور تھے، تو اللہ سے ڈرو، تاکہ تم شکرگزار بن جاؤ۔''

غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر

سادہ واقعات بیان کرنے کے بعد اب وقت آیا ہے کہ محققانہ طور سے اس بات پر بحث کی جائے کہ غزوۂ بدر کا مقصد جیسا کہ عام مؤرخین نے بیان کیا ہے، کاروانِ تجارت کو لوٹنا تھا یا قریش کے حملہ کا دفاع تھا۔

میں اس بات سے خوب واقف ہوں کہ تاریخ اور محکمۂ عدالت میں فرق ہے۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ تاریخ کا انداز بیان مقدمۂ دیوانی یا فوجداری کے فیصلہ لکھنے سے بالکل مختلف ہے۔ میں اس کو بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میرا منصب واقعہ نگاری ہے، فیصلہ نویسی نہیں۔ لیکن موقع ایسا آ پڑا ہے کہ ایک تاریخی واقعہ نے مقدمہ عدالت کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اس لئے مجھ کو اپنے منصب سے ہٹ کر فصل مقدمہ کا قلم ہاتھ میں لینا پڑتا ہے۔

اس بات کا مجھ کو مطلق خوف نہیں کہ اس فیصلہ میں عام مؤرخین اور ارباب سیر میرے حریف مقابل ہیں۔ نہایت جلد نظر آ جائے گا کہ حق اکیلا تمام دنیا پر فتح پا سکتا ہے۔ سلسلۂ کلام کے اچھی طرح پیش نظر رکھنے کے لئے سب سے پہلے ہم کو بتا دینا چاہیے کہ (ہماری تحقیقات کی رو سے) واقعہ کی اصلی صورت کیا تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرمی کے قتل نے تمام مکہ کو جوشِ انتقام سے لبریز کر دیا تھا اور اس سلسلہ میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی پیش آ گئیں۔ دونوں فریق ایک دوسرے سے پُر حذر رہتے اور جیسا کہ ایسی حالتوں میں عام قاعدہ ہے غلط خبریں خود بخود مشہور ہو کر پھیل جاتی ہیں، اسی اثنا میں ابوسفیان قافلۂ تجارت کے ساتھ شام گیا اور ابھی وہ شام میں تھا کہ یہ خبر وہاں مشہور ہوگئی کہ مسلمان قافلے پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ ابوسفیان نے وہیں سے مکہ کو آدمی دوڑایا کہ قریش کو خبر ہو جائے قریش نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مدینہ میں یہ مشہور ہوا کہ قریش ایک جمعیت عظیم لے کر مدینہ آ رہے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے مدافعت کا قصد کیا اور بدر کا معرکہ پیش آیا۔

اس بحث کے فیصلہ کے لئے سب سے پہلے ان واقعات کو یک جا لکھ دینا چاہیے جن پر دونوں فریق کا اتفاق ہے، تاکہ وہ انفصال بحث میں اصول موضوعہ کے طور پر کام آئیں، وہ یہ ہیں:

① قرآن مجید میں اگر کسی واقعہ کا صاف ذکر ہے تو اس کے مقابلہ میں کسی روایت اور تاریخ کا اعتبار نہ کیا جائے گا؟

② کتبِ حدیث میں صحت کے لحاظ سے باہم جو فرق مراتب ہے اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اس قدر عموماً مسلّم ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ قریش بڑی تیاری کے ساتھ مکہ سے نکلے ہیں، تو آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر ان کا استمزاج کیا۔ مہاجرین نے نہایت جوش کے ساتھ آمادگی ظاہر کی، لیکن آنحضرت ﷺ انصار کی مرضی دریافت کرنا چاہتے تھے۔ یہ دیکھ کر سعد یا اور کوئی معزز انصاری اٹھے اور کہا: یارسول اللہ! کیا آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟ ہم وہ لوگ نہیں ہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ تم اور تمہارا اللہ دونوں جا کر لڑو ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔ اللہ کی قسم! اگر آپ حکم

دیں تو ہم آگ اور سمندر میں کود پڑیں۔ ❶

یہ بھی مسلّم ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو شرکت سے ہچکچاتے تھے۔ چنانچہ خود قرآن مجید میں تصریح ہے:

﴿ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ ﴾ (۸/ الانفال:۵)

''اور مسلمانوں کا ایک گروہ قطعاً ناخوش تھا۔''

عموماً ارباب سیر اور محدثین نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انصار کی رضامندی جو خاص طور پر دریافت کی اس کی وجہ یہ تھی کہ انصار نے مکہ میں جب آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تو صرف یہ اقرار کیا تھا کہ ''جب کوئی دشمن خود مدینہ پر حملہ آور ہوگا تو انصار مقابلہ کریں گے''۔ یہ اقرار نہ تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر بھی لڑیں گے۔ ان واقعات کے بعد اب مرکز بحث یہ ہے کہ ''یہ واقعات کہاں پیش آئے؟'' اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ جب آپ مدینہ سے نکلے تو صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود تھا، دو چار منزل چل کر معلوم ہوا کہ قریش فوجیں لئے چلے آتے ہیں۔ اس وقت آپ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا کہ ان کا عندیہ دریافت فرمائیں، آگے کے واقعات یہیں پیش آئے ۔لیکن کتب سیر، تاریخ اور تمام دیگر شہادتوں سے بالاتر ایک اور چیز ہمارے پاس موجود ہے (قرآن) جس کے آگے ہم سب کو گردن جھکا دینی چاہیے:

﴿ كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾ (۸/ الانفال: ۵ تا ۷)

''جس طرح تجھ کو تیرے اللہ نے تیرے گھر سے حق پر نکالا درآنحالیکہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس کو پسند نہیں کرتا تھا، یہ لوگ حق کے ظاہر ہوئے پیچھے تجھ سے حق بات میں جھگڑا کرتے تھے گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جارہے ہیں اور موت کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جبکہ اللہ تم سے یہ وعدہ کرتا تھا کہ دو جماعتوں میں کوئی جماعت تم کو ہاتھ آئے گی۔ اور تم یہ چاہتے تھے کہ بے کھٹکے والی جماعت تم کو ہاتھ آجائے اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ حق کو اپنی باتوں سے قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔''

① ترکیب نحوی کے رو سے وَاِنَّ میں جو واؤ ہے، حالیہ ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جو لڑائی سے جی چراتا ہے، یہ موقع عین وہ موقع تھا جب آپ مدینہ سے نکل رہے تھے، نہ کہ مدینہ سے نکل کر جب آپ آگے بڑھے، کیونکہ واؤ حالیہ کے لحاظ سے خروج من البیت اور اس گروہ کے جی چرانے کا وقت اور

❶ طبری، ج۳، ص:۱۳۰۲؛ ابن هشام، ج۱، ص:۳۷۵۔

زمانہ ایک ہی ہونا چاہیے۔

② آیت مذکورہ میں بہ تصریح مذکور ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے اس وقت دو گروہ سامنے تھے۔ ایک کاروان تجارت اور ایک قریش کی فوج جو مکہ سے آ رہی تھی۔ ارباب سیر کہتے ہیں کہ آیتِ قرآنی میں یہ اس وقت کا واقعہ مذکور ہے جب آنحضرت ﷺ بدر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ لیکن بدر کے قریب پہنچ کر تو کاروانِ تجارت صحیح سلامت بچ کر نکل گیا تھا اس وقت یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ ''دونوں میں سے ایک کا وعدہ ہے۔'' اس لئے یہ بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی نص کے مطابق یہ واقعہ اس وقت کا ہونا چاہیے جب دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا احتمال ہو سکتا ہو اور یہ صرف وہ وقت ہو سکتا ہے جب آنحضرت ﷺ مدینہ میں تھے اور دونوں طرف کی خبریں آ گئی تھیں کہ ادھر ابوسفیان کاروانِ تجارت لے کر چلا ہے اور ادھر قریش جنگ کے سروسامان کے ساتھ مکہ سے نکل چکے ہیں۔

③ سب سے زیادہ قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ قرآن مجید کی آیت مذکورہ بالا میں کفار کے دو فریق کا اللہ نے بیان کیا ہے، ایک قافلۂ تجارت اور دوسرا صاحب شوکت یعنی کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لئے آ رہے تھے۔ آیت میں تصریح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تھی جو چاہتی تھی کہ کاروان تجارت پر حملہ کیا جائے۔ اللہ نے ان لوگوں پر ناراضی ظاہر کی اور فرمایا:

﴿ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾. (۸/ الانفال:۷)

''اور تم چاہتے ہو کہ بے خرخشہ والا گروہ تم کو ہاتھ آ جائے اور اللہ یہ چاہتا ہے کہ اپنی باتوں سے حق کو قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔''

ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، دوسری طرف اللہ ہے۔ جو چاہتا ہے کہ حق کو قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔ اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان دو میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہوگا، میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں۔

④ اب واقعہ کی نوعیت پر غور کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ سے اس سروسامان کے ساتھ نکل رہے ہیں کہ تین سو سے زیادہ جانباز مہاجر و انصار ساتھ ہیں۔ ان میں فاتح خیبر اور حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ سید الشہداء بھی ہیں، جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک لشکر ہے۔ باوجود اس کے (جیسا کہ قرآن مجید میں بہ تصریح مذکور ہے) ڈر کے مارے کچھ صحابہ کا دل بیٹھا جاتا ہے اور ان کو نظر آتا ہے کہ کوئی ان کو موت کے منہ میں لئے جاتا ہے:

﴿ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ

﴿اِلَى الْمَوْتِ﴾ (۸/ الانفال:۵، ۶)

''اور مسلمانوں کی ایک جماعت کارہ تھی، وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے پیچھے بھی جھگڑا کرتی تھی، گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جارہے ہیں۔''

اگر صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو یہ خوف، یہ اضطراب، یہ پہلو تہی کس بنا پر تھی، اس سے پہلے بارہا (بقول ارباب سیر) قافلۂ قریش پر حملہ کرنے کے لئے تھوڑے تھوڑے آدمی بھیج دیے گئے تھے اور کبھی ان کو ضرر نہیں پہنچا تھا۔ اس دفعہ اسی قافلہ کا اتنا ڈر ہے کہ تین سو چیدہ اور منتخب فوج ہے اور پھر لوگ ڈر کے مارے سہمے جاتے ہیں۔ یہ قطعی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں خبر آ گئی تھی کہ قریش مکہ سے جمعیت عظیم لے کر مدینہ پر آرہے ہیں۔

⑤ قرآن مجید میں ایک اور آیت اسی بدر کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے اور اس وقت جب آپ مدینہ ہی میں تشریف رکھتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری تفسیر سورۂ نساء میں تصریحاً مذکور ہے۔ آیت یہ ہے:

﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ﴾

(٤/ النسآء:٩٥)

''بجز معذوروں کے، وہ لوگ جو بیٹھ رہے اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں، برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ نے مجاہدین کو جو مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں، درجہ میں فضیلت دی ہے۔''

صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے، کہ وہ لوگ جو بدر میں نہیں شریک ہوئے اور وہ جو شریک ہوئے، دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ [1] صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پہلے غیرُ اولی الضَّرر کا جملہ نہ تھا، یہ آیت سن کر عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے اندھے پن کا عذر کیا۔ اس پر وحی میں یہ جملہ نازل ہوا ''غیرُ اُولی الضَّرر'' [2] یعنی ''معذوروں کے سوا'' یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے۔

⑥ کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لئے بدر میں آئے ان کی نسبت قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاۗءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ﴾

(٨/ الانفال:٤٧)

''اور (ان لوگوں کی طرح نہ بنو) جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائش اور اللہ کی راہ سے روکتے

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب لا یستوی القعدون من المؤمنین:٤٥٩٥۔ [2] ایضا: ٤٥٩٢ تا٤٥٩٤۔

ہوئے نکلے۔"

اگر قریش صرف قافلۂ تجارت کے بچانے کے لئے نکلتے تو اللہ یہ کیوں کہتا کہ وہ اظہارِ شان اور دکھاوے کے لئے اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے؟ اس میں اظہارشان اور دکھاوے کی کیا بات تھی اور اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکنا کیا تھا؟ چونکہ حقیقت میں وہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے نکلے تھے، جس سے مقصود اپنے زور اور قوت کا اعلان ونمائش اور اسلام کی ترقی کا انسداد تھا۔ اس لئے اللہ نے اس کو غرور ونمائش اور صدعن سبیل اللہ کہا۔

قرآن مجید کے بعد احادیث نبوی کا درجہ ہے۔ احادیث کی متعدد کتابوں میں غزوۂ بدر کا مفصل ومجمل ذکر ہے، لیکن حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ والی حدیث کے سوا اور کسی حدیث میں یہ واقعہ میری نظر سے نہیں گزرا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں قریش کے قافلۂ تجارت کے لوٹنے کے لئے نکلے تھے۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث متعدد وجوہ سے قابل بحث ہے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی حدیث یہ ہے:

عن عبداللّٰه بن كعب قال كعب لم اتخلف عن رسول اللّٰه ﷺ فى غزوة غزاها الا غزوة تبوك غير انى كنت تخلفت فى غزوة بدر ولم يعاتب احد تخلف عنها ، انما خرج النبى ﷺ يريد عير قريش ، حتى جمع اللّٰه بينه وبينهم على غير ميعاد۔ [1]

"حضرت کعب کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہا، بجز غزوۂ تبوک کے اور ہاں غزوۂ بدر میں بھی شریک نہ تھا اور جو اس میں شریک نہ ہوا اس پر کچھ عتاب نہیں ہوا، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے قافلہ کے لئے نکلے تھے کہ اللہ نے دونوں فریق کو اچانک مقابل کردیا۔"

اس کے برخلاف حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ جو صحیح مسلم میں ہے:

(۱) عن انس ان رسول اللّٰه ﷺ شاور حين بلغه اقبال ابى سفيان قال فتكلم ابوبكر فاعرض عنه ، ثُمَّ تكلم عمر فاعرض عنه فقام سعد بن عبادة فقال ايانا تريد يارسول اللّٰه والذى نفسى بيده لو امرتنا ان نخيضها البحر لاخضناها ولو امرتنا ان نضرب اكبادها الى برك الغماد لفعلنا قال فندب رسول اللّٰه ﷺ الناس فانطلقوا حتى نزلوا بدرا۔

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر

[1] بخاری ، کتاب المغازی ، باب قصة غزوة بدر: ۳۹۵۱۔

معلوم ہوئی تو آپ نے مشورہ طلب کیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بولے تو آپ نے توجہ نہ فرمائی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بولے آپ نے ان کی طرف بھی توجہ نہ کی، پھر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہا یارسول اللہ! کیا آپ کا روئے خطاب ہم انصار کی طرف ہے، اللہ کی قسم! اگر دریا میں سواری ڈالنے کا آپ حکم دیں تو ہم ڈال دیں گے اور اگر برک الغماد تک جانے کا حکم دیں گے تو ہم کریں گے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپ نے لوگوں کو شرکت جنگ کی دعوت دی، لوگ چل پڑے اور بدر پر اترے۔"

(۲) ووردت علیهم روایا قریش وفیهم غلام اسود لبنی الحجاج فاخذوه فکان اصحاب رسول اللّٰه ﷺ یسألونه عن ابی سفیان واصحابه فیقول مالی علم بابی سفیان ولکن هذا ابوجهل وعتبة وشیبة وامیة بن خلف فاذا قال ذلك ضربوه فقال نعم انا اخبرکم هذا ابوسفیان فاذا ترکوه فقال مالی بابی سفیان من علم ولکن هذا ابوجهل وعتبة وشیبة وامیة بن خلف فی الناس فاذا قال هذا ایضا ضربوه ورسول اللّٰه ﷺ قائم یصلی فلما رای ذلك انصرف قال والذی نفسی بیده لتضربوه اذا صدقکم وتترکوه اذا کذبکم۔ [1]

"اور (پہلے) قریش کا ہراول دستہ آ کر اُترا، اس میں بنی حجاج کا ایک حبشی غلام تھا۔ مسلمانوں نے اس کو گرفتار کرلیا اور اس سے ابوسفیان کا حال پوچھنے لگے، وہ کہتا تھا مجھے ابوسفیان کی خبر نہیں لیکن یہ ابوجہل، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف آ رہے ہیں۔ جب وہ یہ کہتا تو لوگ اس کو مارتے، وہ کہتا اچھا ابوسفیان کا بتاتا ہوں۔ تب اس کو چھوڑ دیتے۔ تو پھر پوچھتے تو وہ کہتا مجھ کو ابوسفیان کی خبر نہیں لیکن ابوجہل، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف رؤسائے قریش آ رہے ہیں، لیکن جب وہ یہ کہتا تب بھی اس کو مارتے، آنحضرت ﷺ نماز میں مشغول تھے، آپ ﷺ نے یہ دیکھ کر فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ جب وہ سچ کہتا ہے تو تم اس کو مارتے ہو اور جب جھوٹ بولتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو۔"

حدیث کے پہلے ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا، اسی وقت آپ نے مہاجرین وانصار سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش کی اور یہ مطلقاً ثابت ہے کہ ابوسفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا۔ اس بنا پر یہ محقق طور پر ثابت ہوگیا کہ اس غزوہ کی شرکت کے لئے آپ ﷺ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی، ورنہ اگر باہر نکل کر یہ معاملہ پیش آتا جیسا کہ کتب سیرت میں مذکور ہے تو اس وقت انصار وہاں کہاں ہوتے؟ اور نیز اسی ٹکڑے میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، غزوة بدر: ٤٦٢١۔

نے مشورہ کے بعد لوگوں کو شرکت کی دعوت دی، حالانکہ ارباب سیرت کے مطابق واقع یہ ہونا چاہیے کہ انصار معاہدہ اور معمول سابق کے خلاف شرکت کے لئے نکلے۔ آنحضرت ﷺ نے پھر ان کا عندیہ دریافت فرمایا اور اس کے بعد شرکت کے لئے آمادہ کیا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک مجنونانہ بات ہے۔

حدیث کے دوسرے ٹکڑے سے بہ وضاحت تمام محقق ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو وحی کے ذریعہ سے یا کسی اور طریقے سے یہ پہلے ہی سے معلوم تھا کہ تجارتی قافلہ کا نہیں بلکہ جنگی فوج کا مقابلہ ہے۔ گو عام لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو۔ اس حدیث میں ایک گرہ اور کھولنا ہے کہ اگر پہلے صرف ابوسفیان کا آنا معلوم ہوا تھا اور قریش کے حملہ کی خبر نہ تھی تو آنحضرت ﷺ اس اصرار اور سروسامان سے کیوں اجتماع کا اہتمام فرماتے؟ اس لئے ابوسفیان کی آمد کے بجائے موقع کا اقتضا یہ ہے کہ یہ ہو کہ ''جب مشرکین مکہ کی آمد کی خبر معلوم ہوئی۔'' چنانچہ اسی واقعہ کو انہیں الفاظ کے ساتھ امام احمد بن حنبل نے مسند میں، ❶ ابن ابی شیبہ نے مصنف میں، ❷ ابن جریر نے تاریخ میں ❸ اور بیہقی نے دلائل میں روایت کیا ہے اور اس کو ''صحیح'' کہا ہے اور اس کے راوی معرکۂ بدر کے ہیرو اسد اللہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں:

عن علي قال لما قدمنا المدينة اصبنا من ثمارها فاجتويناها واصابنا بها وعك وكان النبي ﷺ يتخبر عن بدر فلما بلغنا ان المشركين قد اقبلوا سار رسول الله ﷺ الى بدر وبدر بئر فسبقنا المشركين اليها۔

(اس کے بعد بدر کے تمام واقعات و جزئیات مذکور ہیں)

''حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے تو وہاں پھل کھانے کو ملے جو ہمارے ناموافق مزاج تھے، اس لئے ہم لوگ بیمار ہو گئے، آنحضرت ﷺ بدر کو پوچھا کرتے تھے جب ہم کو خبر ملی کہ مشرکین آ رہے ہیں تو رسول اللہ ﷺ بدر کو چلے، بدر ایک کنواں کا نام ہے، جہاں ہم مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔''

(اس میں صاف تصریح ہے کہ مشرکین مکہ کے حملہ کی خبر سن کر آپ نکلے تھے اور بدر آ کر قیام فرمایا تھا۔ اس پوری حدیث میں ابوسفیان کے قافلۂ تجارت کا ذکر تک نہیں ہے)۔ ان قطعی نصوص کے بعد اگرچہ کسی اور استدلال کی ضرورت نہیں لیکن لیطمئن قلبی کے طور پر واقعات ذیل پر لحاظ کرنا چاہیے۔

① آنحضرت ﷺ نے اس سے پہلے قریش کے قافلوں پر حملہ کرنے کے لئے جس قدر سرایا بھیجے اور جن میں بیس تیس آدمی سے لے کر سو سو، دو دو سو تک کی جمعیت تھی، ان میں کبھی کسی انصاری کو نہیں بھیجا، ارباب سیر اس خاص امر کو بہ تصریح لکھتے ہیں اور اس تصریح کی اس لئے ضرورت سمجھتے ہیں کہ انصار نے بیعت کے وقت مدینہ سے باہر نکلنے کا اقرار نہیں کیا تھا اس بنا پر اگر اس دفعہ بھی مدینہ سے نکلنے کے وقت صرف قافلۂ تجارت پر

❶ ج ۱، ص: ۱۱۷۔ ❷ منتخب كنز العمال، غزوه بدر، ج ٤، ص: ٩٧، برحاشيه مسند احمد بن حنبل۔
❸ ج ۳، ص: ۱۲۸۹۔

حملہ کرنا مقصود ہوتا تو انصار ساتھ ساتھ نہ ہوتے، حالانکہ اس واقعہ میں انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ تھی، یعنی کل فوج ۳۰۵ تھی، جن میں ۷۴ مہاجرین اور باقی سب انصار تھے۔

یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ جس وقت مدینہ سے آپ ﷺ نکلے یہ خبر آ چکی تھی کہ قریش مدینہ پر آ رہے ہیں، اسی بنا پر آپ ﷺ نے انصار کو مخاطب کیا کیونکہ معاہدۂ بیعت کے موافق اب انصار سے کام لینے کا وقت آ چکا تھا۔

② مکہ سے جو قافلہ تجارت کے لئے شام کو جایا کرتا تھا، مدینہ کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا مدینہ سے مکہ تک جس قدر قبائل آباد تھے عموماً قریش کے زیر اثر تھے، بخلاف اس کے مدینہ سے شام تک کے حدود تک قریش کا اثر نہ تھا اس بنا پر اگر کاروان تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو شام کی طرف بڑھنا تھا، یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ کاروان تجارت شام سے آ رہا ہے، آنحضرت ﷺ کو خبر ہو چکی ہے اور آپ بجائے اس کے کہ شام کی طرف بڑھیں، مکہ کی طرف جاتے ہیں اور پانچ منزل مکہ کی طرف جا کر خبر آتی ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا اور قریش سے جنگ پیش آ جاتی ہے۔

③ واقعات کی ترتیب یہ ہے:

① قریش نے عبداللہ بن ابی کو خط لکھا کہ ''محمد (ﷺ) اور ان کے رفقا کو مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم مدینہ آ کر تم کو بھی برباد کر دیں گے۔'' (بحوالہ سنن ابی داؤد اوپر گزر چکا)

② ابوجہل نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم نے ہمارے مجرموں کو پناہ دی ہے، اگر امیہ کی ضمانت نہ ہوتی تو میں تم کو قتل کر دیتا۔

③ کرز بن جابر نے جمادی الثانی ۲ ھ میں مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور آنحضرت ﷺ کے اونٹ لوٹ لئے۔

④ اس کے بعد ہی رجب ۲ ھ میں آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن جحش کو تجسس کے لئے بھیجا کہ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لائیں۔

⑤ عبداللہ بن جحش نے (آنحضرت ﷺ کی مرضی کے خلاف) قریش کا ایک مختصر سا قافلہ لوٹ لیا اور ایک آدمی قتل اور دو اسیر کئے۔

قریش نے مکہ میں جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا اس کو پیش نظر رکھو پھر یہ خیال کرو کہ ان کا جوشِ انتقام کسی طرح کم نہیں ہوتا اور وہ عبداللہ بن ابی کو لکھتے ہیں کہ ہم مدینہ آ کر تم کو اور محمد (ﷺ) دونوں کو فنا کر دیں گے، کرز فہری مدینہ میں چھاپہ مارتا ہے، اسی اثنا میں قریش کا اشتعال اس سے اور بڑھ جاتا ہے کہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے ان کا قافلہ لوٹ لیا اور ان کے دو معزز خاندان کے ممبر اسیر کر لئے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ قریش صبر کرتے ہیں اور کسی قسم کے انتقام کا ارادہ نہیں کرتے، جب آنحضرت ﷺ ان کے قافلہ کو جس

میں مکہ کی کل کائنات تھی لوٹنے کے لئے نکلتے ہیں، تب مجبوراً ان کو مدافعت کیلئے نکلنا پڑتا ہے، اس پر بھی بدر کے قریب پہنچ کر جب ان کو معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا تو ان کے بڑے بڑے سردار اور خود عتبہ جو سالارِ لشکر تھا، رائے دیتا ہے کہ اب لڑنے کی ضرورت نہیں واپس چلنا چاہئے، کیا واقعات کا یہ نقشہ قریش کے جوشِ عداوت اور رسول اللہ ﷺ کی شانِ نبوت کے موافق ہے؟

④ اربابِ سیر عموماً لکھتے ہیں کہ ''جب آنحضرت ﷺ نے مدینہ منورہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو کاروان تجارت پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو لوگوں نے چنداں مستعدی ظاہر نہیں کی۔ کیونکہ لوگ سمجھے کہ کوئی مہم اور معرکہ و جہاد نہیں ہے بلکہ صرف تحصیل غنیمت ہے، اس لئے جن لوگوں کو مال کی حاجت تھی وہ گئے'' لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انصار میں جس قدر راعیان قوم اور سرلشکر تھے، سب کے زر و مال کے محتاج اگر تھے تو مہاجرین تھے، لیکن جانے والوں میں انصار کی تعداد مہاجرین سے دگنی تگنی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے استمزاج کے جواب میں جن لوگوں نے جان نثارانہ فقرے کہے تھے، مہاجرین میں حضرت ابوبکر و عمر و مقداد رضی اللہ عنہم تھے اور انصار میں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ [1] تھے۔ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے اور مدینہ سے باہر نہیں جا سکتے تھے اس لئے قطعاً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سعد رضی اللہ عنہ نے یہ جواب مدینہ ہی میں دیا تھا اور وہیں قریش کے حملہ کا حال معلوم ہو گیا تھا اور اس لئے یہ قطعی ہے کہ مدینہ ہی میں اس بات کی ضرورت پیش آئی تھی کہ انصار کا استمزاج لیا جائے۔

⑤ عام اربابِ سیر، بلکہ احادیث کی کتابوں میں بھی منقول ہے کہ غزوۂ بدر میں جب آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو چلنے کی ترغیب دی تو بہت سے لوگ آمادہ نہ ہوئے اور کسمسائے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ جہاد یا غزوہ نہیں ہے، صرف قافلہ کا مال لوٹنا ہے، اس لئے یہ اپنی مرضی پر موقوف ہے جس کا جی چاہے جائے، جس کا جی نہ چاہے نہ جائے، طبری میں ہے:

> قالوا لما سمع رسول اللّٰه بابی سفیان مقبلا من الشام ندب المسلمین الیهم و قال هذه عیر قریش فیها اموالهم فاخرجوا الیها لعل اللّٰه ان ینفلکموها فانتدب الناس فخف بعضهم و ثقل بعضهم و ذالك انهم لم یظنوا ان رسول اللّٰه یلقی حربا. [2]

''لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے ابوسفیان کا شام سے روانہ ہونا سنا تو مسلمانوں کو بلایا اور فرمایا کہ یہ قریش کا قافلہ آ رہا ہے جس میں ان کا مال ہے چلو شاید اللہ تم کو اس میں سے مال غنیمت دلوا دے، لوگ آمادہ ہوئے لیکن بعضوں نے پہلو تہی کی، کیونکہ وہ

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب غزوة بدر: ٤٦٢١ وصحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قصة غزوة بدر: ٣٩٥٢۔ [2] طبری، ج ٣، ص: ١٢٩٣۔

سمجھے کہ آنحضرت ﷺ کو کوئی لڑائی تو پیش نہیں آئے گی۔''

لیکن یہ واقعات صریح آیات قرآنی کے خلاف ہیں، قرآن مجید میں بہ تصریح موجود ہے کہ جو لوگ مدینہ سے نکلتے ہوئے کسمساتے تھے، وہ عدم ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کو یہ نظر آتا تھا کہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں:

﴿ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ ﴾ (۸/ الانفال:۵، ۶)

''اور مسلمانوں کا ایک فریق نکلنے سے ناراض تھا وہ تجھ سے حق کے متعلق جھگڑتا تھا بعد اس کے کہ حق ظاہر ہو گیا تھا، وہ گویا موت کی طرف ہنکارے جا رہے ہیں۔''

⑥ تمام کتب احادیث اور سیر میں تصریح ہے کہ مدینہ منورہ سے ایک میل چل کر (مقام بیر ابی عنبہ میں) آپ نے فوج کا جائزہ لیا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ اس بنا پر واپس بھیج دیے گئے کہ ان کی عمریں پندرہ برس سے کم تھیں، یا یہ کہ سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے۔ اگر صرف قافلہ کا لوٹنا مقصود ہوتا تو یہ کام نوخیز نوجوان زیادہ خوبی سے انجام دے سکتے تھے لیکن چونکہ واقع میں جہاد مقصود تھا جو ایک فریضۂ الٰہی ہے اور اس کے لئے بلوغ کی قید ہے اس لئے نابالغ لوگ واپس کر دیے گئے کہ ابھی اس کے اہل نہیں۔

⑦ حافظ ابن عبدالبر نے استیعاب [1] میں روایت کی ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو قافلۂ قریش پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو خیثمہ رضی اللہ عنہ نے جو ایک انصاری تھے، اپنے بیٹے سعد رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے جانے دو اور تم یہاں مستورات کی خبر گیری کرو۔ سعد رضی اللہ عنہ نے کہا ''حضور! اگر کوئی اور موقع ہوتا تو ضرور میں آپ کو اپنے اوپر ترجیح دیتا، لیکن یہ شہادت کا درجہ ہے میں اس کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں۔'' چنانچہ قرعہ اندازی ہوئی اور سعد رضی اللہ عنہ کے نام قرعہ نکلا، سعد رضی اللہ عنہ شریک جنگ ہو کر شہید ہوئے۔

اس سے صاف ثابت ہے کہ قافلہ لوٹنا نہیں بلکہ جہاد پیش نظر تھا اور لوگوں کو دولت شہادت کے حاصل ہونے کی آرزو ہے۔

غزوۂ بدر کا اصلی سبب

عرب کا خاصۂ قومی تھا کہ جب کسی قبیلہ کا کوئی آدمی کسی طریقہ سے کسی کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا تھا تو ایک سخت ہنگامۂ کارزار قائم ہو جاتا تھا۔ دونوں طرف ٹڈی دل امنڈ آتا تھا اور خون کی ندیاں بہہ جاتی تھیں، یہ لڑائیاں مدتوں تک قائم رہتی تھیں، قبیلے کے قبیلے کٹ جاتے تھے، تاہم یہ سلسلہ بند نہیں ہوتا تھا۔ عرب لکھے پڑھے نہ تھے تاہم مقتول کا نام کاغذ پر درج ہو کر، خاندان میں وراثتاً چلا آتا تھا، بچوں کو یہ نام یاد کرایا جاتا تھا

[1] استیعاب تذکرۃ سعد بن خیثمۃ، ج۲، ص:۵۶۱ مطبوعۃ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن، ۱۳۱۹ھ؛ اصابہ، ج۲، ص:۲۵ اور طبقات ذکر خیثمہ، ج۶، ص:۲۰۰ میں یہ واقعہ بہ اختلاف الفاظ منقول ہے۔

کہ بڑے ہو کر اس خون کا انتقام لینا ہے، واحس اور بسوس کی قیامت خیز لڑائیاں جو چالیس چالیس برس قائم رہیں اور جن میں ہزاروں لاکھوں جانیں برباد ہو گئیں، اسی بنا پر ہوئیں۔ عربی زبان میں اس انتقام کو ثار کہتے ہیں اور یہ عرب کی قومی تاریخ کا سب سے اہم لفظ ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں عمرو بن حضرمی قتل کر دیا گیا تھا۔ حضرمی، عتبہ بن ربیعہ کا حلیف تھا جو تمام قریش کا سردار تھا، بدر اور تمام غزوات کا سلسلہ اسی خون کا انتقام تھا، عروہ بن زبیر (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے) نے اس واقعہ کو بہ تصریح بیان کیا ہے:

وكان الذي هاج وقعة بدر وسائر الحروب التي كانت بين رسول الله ﷺ وبين مشركي قريش فيما قال عروة بن الزبير ماكان من قتل واقد بن [1] عبدالله التميمي عمرو بن الحضرمي. [2]

''جس چیز نے غزوۂ بدر اور دیگر وہ تمام لڑائیاں برپا کیں جو آنحضرت ﷺ اور مشرکین عرب کے درمیان واقع ہوئیں، وہ جیسا کہ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے عمرو بن حضرمی کا قتل کیا جانا ہے جس کو واقد بن عبداللہ تمیمی نے قتل کر دیا تھا۔''

ایک عام غلطی جس نے واقعۂ بحث طلب میں غلطی پیدا کر دی ہے یہ ہے کہ سب سے پہلے جو لڑائی کفار سے ہوئی وہ بدر تھی۔ حالانکہ بدر سے پہلے لڑائیاں شروع ہو چکی تھیں، عروہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر کے متعلق عبدالملک کو جو خط لکھا تھا، اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:

ان اباسفيان بن حرب اقبل من الشام في قريب من سبعين راكبامن قبائل قريش فذكروا لرسول الله ﷺ واصحابه وقد كانت الحرب بينهم فقتلت قتلٰى وقتل ابن الحضرمي في اناس بنخلة واسرت اسارٰى من قريش. وكانت تلك الوقعة هاجت الحرب بين رسول الله ﷺ وبين قريش واول ما اصاب به بعضهم بعضًا من الحرب وذلك قبل مخرج ابي سفيان واصحابه الى الشام. [3]

''ابوسفیان بن حرب تقریباً ستر سوار کے ساتھ شام سے آ رہا تھا، جو کل کے کل قریشی تھے۔ آنحضرت ﷺ اور صحابہ سے اس کا تذکرہ ہوا اور دونوں فریق میں لڑائی شروع ہو چکی تھی اور ادھر کے چند لوگ جن میں ابن حضرمی بھی تھا، مارے جا چکے تھے اور کچھ قید بھی ہو چکے تھے اور

[1] عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ جن کی سرداری میں یہ قتل واقع ہوا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے بھانجے اور آنحضرت ﷺ کے ماموں زاد بھائی تھے، قاتل یعنی واقد بن عبداللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خاندان کے حلیف تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آغاز خلافت تک زندہ رہے۔ دیکھو طبقات ابن سعد ذکر عبدالله بن جحش، ج ۳، قسم اول، ص: ٦٤ و واقد بن عبدالله، ج ۳، قسم اول، ص: ٢٨٤۔

[2] تاریخ طبری، ج ۳، ص: ١٢٨٤۔ [3] طبری، ج ۳، ص: ١٢٨٥۔

اسی واقعہ نے آنحضرت ﷺ اور قریش میں جنگ برپا کر دی تھی اور یہی سب سے پہلا واقعہ تھا جس میں دونوں فریق نے ایک دوسرے کو صدمہ پہنچایا اور یہ لڑائی ابوسفیان کی روانگی شام سے پہلے وقوع میں آ چکی تھی۔"

اس میں تصریح ہے کہ ابوسفیان جب شام کو روانہ بھی نہیں ہوا تھا اسی وقت لڑائی شروع ہو چکی تھی۔غزوۂ بدر ابوسفیان کی واپسی شام کے بعد واقع ہوا ہے۔اصل واقعہ کی تحقیق کا سب سے بڑا اصلی ذریعہ یہ ہے کہ خود حریفان جنگ کی شہادت بہم پہنچائی جائے۔اس قسم کی شہادتیں بہت کم ہاتھ آ سکتی ہیں لیکن خوش قسمتی سے یہاں اس قسم کی شہادت موجود ہے۔حکیم بن حزام (حضرت خدیجہ ؓ کے بھتیجے) غزوۂ بدر میں شریک تھے اور اس وقت تک کافر تھے، وہ عمر میں آنحضرت ﷺ سے پانچ برس بڑے تھے۔گو زمانہ جاہلیت میں آنحضرت ﷺ سے نہایت محبت رکھتے تھے اور نبوت کے بعد بھی یہ محبت قائم رہی تاہم فتح مکہ تک ایمان نہیں لائے۔وہ روٴسائے قریش میں سے تھے، حرم کا ایک بڑا منصب یعنی رفادہ انہی کے ہاتھ میں تھا، دارالندوہ کے مہتمم اور مالک بھی وہی تھے ❶ اور مروان بن حکم کے زمانۂ خلافت تک زندہ رہے۔ایک دفعہ وہ مروان سے ملنے گئے۔مروان نے نہایت تعظیم و تکریم کی، صدر مجلس سے اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھا اور کہا بدر کا واقعہ بیان کیجئے۔انہوں نے واقعہ کے ابتدائی حالات بیان کر کے کہا کہ جب ہماری فوجیں میدان میں اتریں تو میں عتبہ کے پاس گیا اور میں نے اس سے یہ کہا:

یا ابا الولید هل لك ان تذهب بشرف هذا الیوم مابقیت ، قال افعل ماذا؟ قلت انکم لاتطلبون من محمد الادم ابن الحضرمی وهو حلیفك فتحمل دیته فترجع بالناس۔ ❷

"اے ابوالولید! کیا تم چاہتے ہو کہ تمام عمر کے لئے ساری نیک نامی تم ہی کو ہاتھ آئے؟ عتبہ نے کہا کیونکر؟ میں نے کہا، تم (یعنی قریش) محمد ﷺ سے ابن حضرمی کے خون کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے اور وہ تمہارا حلیف تھا، اس لئے تم اس کا خون بہا ادا کر دو کہ سب لوگ واپس چلے جائیں۔"

عتبہ نے یہ تجویز پسند کی، لیکن ابوجہل نے نہ مانا اور حضرمی کے بھائی عامر حضرمی کو بلا کر کہا، خون کا بدلا سامنے ہے، کھڑے ہو کر قوم سے دہائی دو، عامر عرب کے دستور کے موافق ننگا ہو گیا اور پکارا، ❸

واعمراہ! واعمراہ! "ہائے عمر (حضرمی) ہائے عمر!"

آغاز جنگ کے وقت سب سے پہلے جو شخص میدان جنگ میں نکلا، وہ یہی عامر حضرمی تھا۔

---

❶ اصابہ تذکرہ حکیم بن حزام، ج ۱، ص ۳۴۹۔ ❷ طبری، ج ۳، ص: ۱۳۱۴ وسیرت ابن هشام بمعناہ ذکر غزوہ بدر، ج ۱، ص: ۳۸۰ (س) ❸ پوری تفصیل طبری، ج ۳، ص ۱۳۱۴ تا ۱۳۱۶ میں ہے۔

حکیم بن حزام اور عامر حضرمی غزوۂ بدر تک کافر تھے۔عتبہ وابوجہل جو سرداران قریش تھے کفر پر تادم مرگ قائم رہے۔اگر چہ اس درجہ کے لوگ غزوۂ بدر کو حضرمی کے خون کا انتقام سمجھتے تھے اور سمجھتے رہے، تو ہم کو کچھ پروانہیں کرنی چاہیے کہ اوروں نے جو اس کے سینکڑوں برس بعد پیدا ہوئے اس کا سبب قافلۂ تجارت کا بچانا سمجھا۔وشتان بینھما۔

ایک ضروری نکتہ

گو یہ امر اب قطعی طور پر ثابت ہوگیا کہ غزوۂ بدر کا سبب کاروانِ تجارت پر حملہ کرنا نہ تھا تاہم اس گرہ کا کھولنا ضرور ہے کہ ایسے صاف اور صریح واقعہ کے متعلق تمام اربابِ سیر نے متفقاً کیوں غلطی کی؟ اور صحیح بخاری وغیرہ میں یہ تصریحات کیوں پائی جاتی ہیں کہ بدر کی ابتدا قافلہ ہی پر حملہ کرنے کی غرض سے ہوئی تھی۔

اصل یہ ہے کہ اصول جنگ کے موافق اکثر غزوات میں یہ ظاہر نہیں کیا جاتا تھا کہ کدھر جانا اور کس غرض سے جانا مقصود ہے؟ صحیح بخاری (غزوۂ تبوک) میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ جو مشہور صحابی ہیں، ان کا قول نقل کیا ہے:

ولم یکن رسول اللّٰہ ﷺ یرید غزوۃ الا ورّی بغیرھا۔

''اور آنحضرت ﷺ جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تھے تو کسی اور موقع کا توریہ فرماتے تھے۔'' [1]

''توریہ'' کے معنی شارحین بخاری [2] نے یہ لکھے ہیں کہ ''آپ ایسے موقع پر مبہم اور متحمل المعنیین الفاظ استعمال فرماتے تھے''۔گو میرے نزدیک یہ کلیہ اس معنی میں صحیح نہیں، تاہم واقعات کے استقصا سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ بعض موقعوں پر واقعہ اس طرح مبہم رکھا جاتا تھا کہ لوگ مختلف قیاس پیدا کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ جنگ بدر میں حضرت سعد بن خثیمہ رضی اللہ عنہ کو پہلے ہی یہ معلوم ہوگیا تھا کہ قافلہ نہیں بلکہ فوج کا مقابلہ ہے، بخلاف اس کے صحیح بخاری میں انہی کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا قول منقول ہے کہ بدر میں صرف قافلہ سے تعرض کرنا مقصود تھا۔

دیباچہ میں ہم لکھ آئے ہیں کہ راوی (جس میں صحابہ رضی اللہ عنہم بھی داخل ہیں) بہت سے موقعوں پر جو واقعہ بیان کرتا ہے، وہ حقیقت میں واقعہ نہیں بلکہ اس کا استنباط ہوتا ہے، یعنی اس نے اس کو یوں ہی سمجھا، بدر میں بھی یہی صورت پیش آئی اور اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے مختلف قیاس کئے اور جو قیاس مذاقِ عام کے مناسب تھا وہی پھیل گیا۔

بدر کے نتائج

(بدر کے معرکہ نے مذہبی اور ملکی حالت پر گوناگوں اثرات پیدا کئے اور حقیقت میں یہ اسلام کی ترقی کا

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث کعب بن مالک: ٤٤١٨۔ [2] فتح الباری، باب غزوۃ تبوک، ج٨، ص:٨٧۔

قدم اولین تھا۔قریش کے تمام بڑے بڑے رؤسا جن میں سے ایک ایک اسلام کی ترقی کی راہ میں سدِ آہن تھا فنا ہو گئے۔عتبہ اور ابوجہل کی موت نے قریش کی ریاست عامہ کا تاج ابوسفیان کے سر پر رکھا، جس سے دولتِ اموی کا آغاز ہوا، لیکن قریش کے اصلی زور و طاقت کا معیار گھٹ گیا۔

مدینہ میں اب تک عبداللہ بن ابی بن سلول علانیہ کافر تھا، لیکن اب بظاہر وہ اسلام کے دائرہ میں آ گیا۔ گو تمام عمر منافق رہا۔ اور اسی حالت میں جان دی، قبائل عرب جو سلسلہ واقعات کا رخ دیکھتے تھے اگرچہ رام نہیں ہوئے لیکن سہم گئے۔

ان موافق حالات کے ساتھ مخالف اسباب میں بھی انقلاب شروع ہو گیا، یہود سے معاہدہ ہو چکا تھا کہ وہ ہر معاملہ میں یکسو رہیں گے لیکن اس فتح نمایاں نے ان میں حسد کی آگ بھڑکا دی اور وہ اس کو ضبط نہ کر سکے۔ چنانچہ اس کی تفصیل یہودیوں کے واقعات میں بالتفصیل آتی ہے۔

قریش کو پہلے صرف حضرمی کا رونا تھا۔ بدر کے بعد ہر گھر ماتم کدہ تھا۔ اور مقتولین بدر کے انتقام کے لئے مکہ کا بچہ بچہ مضطر تھا۔ چنانچہ سویق کا واقعہ اور اُحد کا معرکہ اسی جوش کا مظہر تھا)۔

غزوۂ سویق، ذی الحجہ ۲ھ

ابوسفیان اب قریش کا رئیس تھا اور اس منصب کا سب سے بڑا فرض غزوۂ بدر کا انتقام تھا۔ اس نے بدر سے مشرکین کی واپسی پر منت مانی تھی کہ جب تک مقتولان بدر کا انتقام نہ لے گا نہ غسل جنابت کرے گا نہ سر میں تیل ڈالے گا۔ چنانچہ دو سو شتر سواروں کے ساتھ مدینہ پر بڑھا، یہود کی نسبت معلوم تھا کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مدد دیں گے۔ اس لئے پہلے حی بن اخطب کے پاس گیا، لیکن اس نے دروازہ نہ کھولا، مایوس ہو کر سلام بن مشکم کے پاس آیا، وہ یہود بنو نضیر کا سردار تھا اور تجارتی خزانہ اسی کے زیر اہتمام رہتا تھا۔ اس نے بڑے جوش سے استقبال کیا، خوشگوار کھانے کھلائے، شراب پلوائی، مدینہ کے مخفی راز بتائے، صبح کو ابوسفیان عریض پر حملہ آور ہوا، جو مدینہ سے ۳ میل کے فاصلہ پر ہے، ایک انصاری کو جن کا نام سعد بن عمرو رضی اللہ عنہ تھا قتل کیا۔ چند مکانات اور گھاس کے انبار جلا دیئے، ان باتوں سے اس کے نزدیک قسم پوری ہو گئی۔ آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ نے تعاقب کیا، ابوسفیان کے پاس رسد کا سامان صرف ستو تھا، گھبراہٹ میں ستو کے بورے پھینکتا گیا جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے، عربی میں ستو کو سویق کہتے ہیں۔ اس لئے یہ واقعہ غزوۂ سویق کے نام سے مشہور ہے۔ (طبری، ج ۳، ص: ۱۳۶۷)

حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی شادی ذی الحجہ ۲ھ

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جو آنحضرت ﷺ کی صاحبزادیوں میں سب سے کمسن تھیں، اب ان کی عمر ۱۸ برس کی ہو چکی تھی اور شادی کے پیغام آنے لگے تھے۔ ابن سعد نے روایت کی ہے کہ سب سے پہلے حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ جو اللہ کا حکم ہوگا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جرأت کی، ان کو بھی آپ نے کچھ جواب نہیں دیا، بلکہ وہی الفاظ فرمائے ❶ لیکن بظاہر یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اصابہ میں ابن سعد رضی اللہ عنہ کی اکثر روایتیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حال میں روایت کی ہیں لیکن اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔

بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب درخواست کی تو آپ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی مرضی دریافت کی وہ چپ رہیں، یہ ایک طرح کا اظہار رضا تھا آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ "تمہارے پاس مہر میں دینے کے لئے کیا ہے؟" بولے کچھ نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا "اور وہ حطیمہ زرہ کیا ہوئی؟" (جنگ بدر میں ہاتھ آئی تھی) عرض کی وہ تو موجود ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: "بس وہ کافی ہے۔"

ناظرین کو خیال ہوگا کہ بڑی قیمتی چیز ہوگی لیکن اگر وہ اس کی مقدار جاننا چاہتے ہیں تو جواب یہ ہے کہ صرف سوا سو روپے ❷ زرہ کے سوا اور جو کچھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سرمایہ تھا وہ ایک بھیڑ کی کھال اور ایک بوسیدہ یمنی چادر تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ سب سرمایہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی نذر کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اب تک آنحضرت ﷺ ہی کے پاس رہتے تھے، شادی کے بعد ضرورت ہوئی کہ الگ گھر لیں۔ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ بن نعمان انصاری کے متعدد مکانات تھے، جن میں سے وہ کئی آنحضرت ﷺ کو نذر کر چکے تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ انہی سے کوئی اور مکان دلوا دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "کہاں تک؟ اب ان سے کہتے شرم آتی ہے۔" حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ نے سنا تو دوڑے آئے کہ حضور میں اور میرے پاس جو کچھ ہے، سب آپ کا ہے۔ اللہ کی قسم! میرا جو مکان آپ لے لیتے ہیں مجھ کو اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ میرے پاس رہ جائے۔ غرض انہوں نے اپنا ایک مکان خالی کر دیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس میں اٹھ گئیں۔ ❸

شہنشاہ کونین ﷺ نے سیدۂ عالم کو جو جہیز دیا، وہ بان کی چارپائی، چمڑے کا گدا جس کے اندر، روئی کے بجائے کھجور کے پتے تھے، ایک چھاگل، ایک مشک، دو چکیاں اور دو مٹی کے گھڑے تھے۔ ❹

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جب نئے گھر میں جا لیں تو آنحضرت ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے۔ دروازہ پر کھڑے ہو کر اذن مانگا، پھر اندر آئے۔ ایک برتن میں پانی منگوایا، دونوں ہاتھ اس میں ڈالے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سینہ اور بازوؤں پر پانی چھڑکا، پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا، وہ شرم سے لڑکھڑاتی آئیں، ان پر بھی پانی چھڑکا اور فرمایا: "میں نے اپنے خاندان میں سب سے افضل ترشخص سے تمہارا نکاح کیا ہے۔" ❺

❶ طبقات ابن سعد، ج۸، ص:۱۱۔ ❷ غلطی سے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں سوا روپے چھپ گیا ہے اس کی تصحیح کر لی جائے۔ (س) ❸ اصابہ، ج۸، قسم اول، ص:۱۵۸۔ ❹ ایضاً، ص:۱۵۹۔ ❺ یہ پوری تفصیل طبقات ابن سعد ذکر فاطمۃ، ج۸، ص: ۱۵ اور اصابہ ذکر فاطمۃ، ج۸، قسم اول، ص:۱۵۷ سے ماخوذ ہے۔

واقعاتِ متفرقہ ۲ھ

(مؤرخین کے بیان کے مطابق اسی سال رمضانِ مبارک کے روزے فرض ہوئے، ❶ صدقہ عید الفطر کا حکم بھی اسی سال سے جاری ہوا۔ پہلے آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں اس صدقہ کے فضائل بیان فرمائے، پھر صدقہ کا حکم دیا۔ ❷

عید الفطر کی نماز باجماعت عید گاہ میں بھی اسی سال ادا فرمائی، اس سے پہلے عید کی نماز نہیں ہوتی تھی۔ ❸

اربابِ سیر کی ترتیب کے مطابق غزوۂ بنی قینقاع کا ذکر بھی اسی سال کے واقعات میں ہونا چاہیے تھا، لیکن اتصال و تسلسل واقعہ کی بنا پر وہ آیندہ مذکور ہوگا۔

❶ تاریخ طبری، ج۳، واقعہ:۲ھ، ص:۱۲۸۱۔ ❷ ایضًا۔ ❸ ایضًا۔

۳ھ

غزوۂ احد [1]

﴿ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴾ [2]

(۳/ آل عمران:۱۳۹)

عرب میں صرف ایک شخص کا قتل لڑائی کا ایک سلسلہ چھیڑ دیتا تھا جو سینکڑوں برس تک ختم نہیں ہوسکتا تھا۔ طرفین میں سے جس کو شکست ہوتی تھی وہ انتقام کو ایسا فرض موبد جانتا تھا جس کے ادا کئے بغیر اس کی ہستی قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ بدر میں قریش کے ستر آدمی مارے گئے تھے جن میں اکثر وہ تھے جو قریش کے تاج وافسر تھے، اس بنا پر تمام مکہ جوش انتقام سے لبریز تھا۔

قریش کا کاروانِ تجارت جو جنگ بدر کے زمانے میں نفعِ کثیر کے ساتھ شام سے واپس آ رہا تھا، اس کا رأس المال حصہ داروں کو تقسیم کر دیا گیا تھا لیکن زرِ منافع امانت کے طور پر محفوظ تھا۔

قریش کو کشتگان بدر کے ماتم سے فرصت ملی تو اس فرض کے ادا کا خیال آیا۔ چند سردارانِ قریش جن میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا، ان لوگوں کو جن کے عزیز واقارب جنگ بدر میں قتل ہو چکے تھے، ساتھ لے کر ابوسفیان کے پاس گئے اور کہا کہ محمد (ﷺ) نے ہماری قوم کا خاتمہ کر دیا، اب انتقام کا وقت ہے، ہم چاہتے ہیں کہ مال تجارت کا جو نفع اب تک جمع ہے، وہ اس کام میں صرف کیا جائے۔ یہ ایک ایسی درخواست تھی جو پیش ہونے سے پہلے قبول کر لی گئی تھی، لیکن قریش کو اب مسلمانوں کی قوت وزور کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جنگ بدر میں جس سامان سے وہ گئے تھے اس سے اب کچھ زیادہ درکار ہے۔ عرب میں جوش پھیلانے اور دلوں کے گرمانے کا سب سے بڑا آلہ شعر تھا۔ قریش میں دو شاعر، شاعری میں مشہور تھے۔ عمرو جمحی اور مسافع۔ عمرو جمحی غزوۂ بدر میں گرفتار ہو گیا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اقتضائے رحم سے اس کو رہا کر دیا تھا۔ قریش کی درخواست پر وہ اور مسافع مکہ سے نکلے اور تمام قبائل قریش میں اپنی آتش بیانی سے آگ لگا آئے۔

لڑائیوں میں ثابت قدمی اور جوشِ جنگ کا بڑا ذریعہ خاتونانِ حرم تھیں، جس لڑائی میں خاتونیں ساتھ ہوتی تھیں عرب جانوں پر کھیل جاتے تھے کہ شکست ہوگی تو عورتیں بے حرمت ہوں گی۔ بہت سی عورتیں ایسی تھیں جن کی اولاد جنگ بدر میں قتل ہو چکی تھی اس لئے وہ خود جوش انتقام سے لبریز تھیں اور انہوں نے منتیں مانی تھیں کہ اولاد کے قاتلوں کا خون پی کر دم لیں گی۔ غرض جب فوجیں تیار ہوئیں تو بڑے بڑے معزز گھرانوں کی عورتیں بھی فوج میں شامل ہوئیں۔ ان میں سے بعض کے نام حسب ذیل ہیں: [3]

---

[1] مدینہ منورہ سے شمالی جانب قریباً ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ کا نام ہے۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ اُحد (رقم الباب: ۱۷) سے پتا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت غزوۂ اُحد میں نازل ہوئی۔ [3] طبری، ج ۳، ص: ۱۳۸٦؛ زرقانی، ج ۲، ص: ۳۰ نے ان چھ خواتین کے سوا سلافہ بنت سعد، عمیرہ بنت علقمہ دو اور خاتونوں کا ذکر کیا ہے ان میں خناس وعمیرہ کے سوا باقی خواتین بعد کو مسلمان ہوگئیں۔ خناس اور عمیرہ کے اسلام کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ (زرقانی علی المواہب) (س)

① ہند — عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ماں۔
② اُم حکیم — عکرمہ (فرزند ابوجہل) کی بیوی۔
③ فاطمہ (بنت ولید) — حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی بہن۔
④ برزہ — مسعود ثقفی جو طائف کا رئیس تھا اس کی بیٹی۔
⑤ ریطہ — عمرو بن العاص کی زوجہ۔
⑥ خناس — حضرت مصعب بن عمیر کی ماں رضی اللہ عنہا

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے ہند کے باپ عتبہ کو بدر میں قتل کیا تھا جبیر بن مطعم کا چچا بھی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔ اس بنا پر ہند نے وحشی کو جو جبیر کا غلام اور حربہ اندازی میں کمال رکھتا تھا، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قتل پر آمادہ کیا اور یہ اقرار ہوا کہ اس کارگزاری کے صلہ میں وہ آزاد کر دیا جائے گا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے چچا گو اسلام لا چکے تھے۔ لیکن اب تک مکہ ہی میں مقیم تھے، انہوں نے تمام حالات لکھ کر ایک تیز رو قاصد کے ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجے اور قاصد کو تاکید کی کہ تین رات دن میں مدینہ پہنچ جائے۔

آنحضرت ﷺ کو یہ خبریں پہنچیں تو آپ نے پانچویں شوال ۳ھ کو دو خبر رساں جن کے نام انس اور مونس تھے، خبر لانے کے لئے بھیجے۔ انہوں نے آ کر اطلاع دی کہ قریش کا لشکر مدینہ کے قریب آ گیا اور مدینہ کی چراگاہ (عریض) کو ان کے گھوڑوں نے صاف کر دیا۔ آپ نے حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ فوج کی تعداد کی خبر لائیں۔ انہوں نے آ کر صحیح تخمینہ سے اطلاع دی، چونکہ شہر پر حملہ کا اندیشہ تھا، ہر طرف پہرے بٹھا دیے گئے۔ حضرت سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما ہتھیار لگا کر تمام رات مسجد نبوی کے دروازہ پر پہرہ دیتے رہے۔

صبح کو آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا، مہاجرین نے عموماً اور انصار میں سے اکابر نے رائے دی کہ عورتیں باہر قلعوں میں بھیج دی جائیں اور شہر میں پناہ گزین ہو کر مقابلہ کیا جائے، عبداللہ بن ابی سلول جو اب تک کبھی شریک مشورہ ❶ نہیں کیا گیا تھا، اس نے بھی یہی رائے دی۔ لیکن ان نوخیز صحابہ رضی اللہ عنہم ❷ نے جو جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے، اس بات پر اصرار کیا کہ شہر سے نکل کر حملہ کیا جائے۔ آنحضرت ﷺ گھر میں تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر باہر تشریف لائے۔ اب لوگوں کو ندامت ہوئی کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو خلاف مرضی نکلنے پر مجبور کیا۔ سب نے عرض کی کہ ہم اپنی رائے سے باز آتے ہیں، ارشاد ہوا کہ پیغمبر کو زیبا نہیں کہ ہتھیار پہن کر اتار دے۔

قریش بدھ کے دن مدینہ کے قریب پہنچے اور کوہ احد پر پڑاؤ ڈالا۔ آنحضرت ﷺ جمعہ کے دن نماز جمعہ پڑھ کر ایک ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ شہر سے نکلے، عبداللہ بن ابی، تین سو کی جمعیت لے کر آیا تھا، لیکن یہ

❶ طبری، ج ۳، ص: ۱۳۸۹ مطبوعہ یورپ (س)
❷ زرقانی، ج ۲، ص: ۲۵ (س)

کہہ کر واپس چلا گیا کہ ''محمد (ﷺ) نے میری رائے نہ مانی۔'' آنحضرت ﷺ کے ساتھ اب صرف سات سو صحابہ رضی اللہ عنہم رہ گئے، ان میں ایک سو زرہ پوش تھے، مدینہ سے نکل کر فوج کا جائزہ لیا گیا اور جو لوگ کمسن تھے، واپس کر دیے گئے، ان میں حضرت زید بن ثابت، حضرت براء بن عازب، حضرت ابوسعید خدری، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عرابہ اوسی رضی اللہ عنہم بھی تھے، لیکن جاں نثاری کا یہ ذوق تھا کہ نوجوانوں میں سے جب رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ تم عمر میں چھوٹے ہو واپس جاؤ۔ تو وہ انگوٹھوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد اونچا نظر آئے، چنانچہ ان کی یہ ترکیب چل گئی اور وہ لے لئے گئے۔ 1 حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ ایک نوجوان، جو ان کے ہم سن تھے، انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ میں رافع کو لڑائی میں پچھاڑ لیتا ہوں اس لئے اگر ان کو اجازت ملتی ہے تو مجھ کو بھی ملنی چاہیے۔ دونوں کا مقابلہ کرایا گیا اور سمرہ رضی اللہ عنہ نے رافع رضی اللہ عنہ کو زمین پر دے مارا، اس بنا پر ان کو اجازت مل گئی۔

آنحضرت ﷺ نے احد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو علم عنایت کیا، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ رسالے کے افسر مقرر ہوئے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اس حصۂ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے۔ 2 پشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن ادھر سے آئیں، اس لئے پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین فرمایا اور حکم دیا کہ گو لڑائی فتح ہو جائے، تاہم وہ جگہ سے نہ ہٹیں۔ 3 حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ ان تیر اندازوں کے افسر مقرر ہوئے۔

قریش کو بدر میں تجربہ ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے نہایت ترتیب سے صف آرائی کی۔ میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا، میسرہ عکرمہ کو دیا جو ابوجہل کے فرزند تھے، سواروں کا دستہ صفوان بن امیہ کی کمان میں تھا جو قریش کا مشہور رئیس تھا۔ تیر اندازوں کے دستے الگ تھے جن کا افسر عبداللہ بن ابی ربیعہ تھا، طلحہ علمبردار تھا، دو سو گھوڑے کوتل رکاب میں تھے کہ ضرورت کے وقت کام آئیں۔

سب سے پہلے طبل جنگ کے بجائے خاتونان قریش دف پر اشعار پڑھتی ہوئی بڑھیں، جن میں کشتگانِ بدر کا ماتم اور انتقام خون کے رجز تھے، ہند (ابوسفیان کی بیوی) آگے آگے اور چودہ عورتیں ساتھ ساتھ تھیں، اشعار یہ تھے:

نحن بنات طارق	''ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں۔
نمشی علی النمارق	ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں۔
ان تقبلوا نعانق	اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گی۔

---

1 طبری، جلد ۳، ص: ۱۳۹۱ (یہ طبری کی روایت ہے لیکن بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رافع رضی اللہ عنہ کو اجازت مل جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس نوجوانی ہی میں تیر اندازی میں کمال رکھتے تھے۔ حضور ﷺ کو جب ان کا حال معلوم ہوا تو ان کو شرکت کی اجازت دے دی۔ ابن ہشام ذکر غزوہ اُحد، ج ۲، ص: ۶۸ و زرقانی ج ۲، ص: ۲۹ والبدایۃ والنہایۃ ابن کثیر، ج ٤، ص: ١٥) (س) 2 طبری، ج ۳، ص: ۱۳۹٤۔ 3 ابن ہشام، ج ۲، ص: ۶۸۔

او تـدبـر وانـفـارق — اور پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گی۔'' ❶

لڑائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ابو عامر جو مدینہ منورہ کا ایک مقبول عام شخص تھا اور مدینہ چھوڑ کر مکہ میں آباد ہو گیا تھا، ڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ میدان میں آیا، اسلام سے پہلے زہد اور پارسائی کی بنا پر تمام مدینہ اس کی عزت کرتا تھا۔ چونکہ اس کو خیال تھا کہ انصار جب اس کو دیکھیں گے تو رسول اللہ ﷺ کا ساتھ چھوڑ دیں گے، میدان میں آ کر پکارا ''مجھ کو پہچانتے ہو؟ میں ابو عامر ہوں'' انصار نے کہا ''ہاں او بدکار! ہم تجھ کو پہچانتے ہیں، اللہ تیری آرزو بر نہ لائے۔'' ❷

قریش کا علمبردار طلحہ صف سے نکل کر پکارا ''کیوں مسلمانو! تم میں کوئی ہے؟ کہ یا مجھ کو جلد دوزخ میں پہنچا دے یا خود میرے ہاتھوں بہشت میں پہنچ جائے، ❸ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے صف سے نکل کر کہا: ''میں ہوں'' ❹ یہ کہہ کر تلوار ماری اور طلحہ کی لاش زمین پر تھی، طلحہ کے بعد اس کے بھائی عثمان نے جس کے پیچھے پیچھے عورتیں اشعار پڑھتی آتی تھیں، علم ہاتھ میں لیا اور رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا:

انَّ علی اهل اللواء حقا — ان تخضب الصعدة او تندقا

''علم بردار کا فرض ہے کہ نیزہ کو خون میں رنگ دے یا وہ ٹکرا کر ٹوٹ جائے۔''

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مقابلہ کو نکلے اور شانہ پر تلوار ماری کہ کمر تک اتر آئی، ساتھ ہی ان کی زبان سے نکلا کہ ''میں ساقی حجاج کا بیٹا ہوں۔'' ❺

اب عام جنگ شروع ہو گئی، حضرت حمزہ، حضرت علی، حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہم فوجوں کے دل میں گھسے اور صفیں کی صفیں صاف کر دیں۔ حضرت ابو دجانہ عرب کے مشہور پہلوان تھے، آنحضرت ﷺ نے دست مبارک میں تلوار لے کر فرمایا: ''کون اس کا حق ادا کرتا ہے؟'' اس سعادت کے لئے دفعتہً بہت سے ہاتھ بڑھے، لیکن یہ فخر حضرت ابو دجانہ کے نصیب میں تھا، اس غیر متوقع عزت نے ان کو بادشاہت سے مست کر دیا، سر پر سرخ رومال باندھا اور اکڑتے تنتے ہوئے فوج سے نکلے، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''یہ چال اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ لیکن اس وقت پسند ہے۔'' ❻ حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ فوجوں کو چیرتے لاشوں پر لاشے گراتے بڑھتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ ہند سامنے آ گئی، اس کے سر پر تلوار رکھ کر اٹھا لی کہ رسول اللہ ﷺ کی تلوار اس قابل نہیں کہ عورت پر آزمائی جائے۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ دودستی تلوار مارتے جاتے تھے اور جس طرف بڑھتے تھے صفیں کی صفیں صاف ہو جاتی تھیں۔ اسی حالت میں سباع غبشانی سامنے آ گیا، پکارے کہ ''او ختانۃ النساء کے بچے، کہاں جاتا ہے'' ❼ یہ

---

❶ ایضاً، ص:٦٩۔ ❷ طبری، ج٣، ص:١٣٩٩؛ وابن هشام، ج٢، ص:٦٩۔
❸ یہ اس بات پر طنز تھا کہ مسلمان ایسا سمجھتے ہیں۔ ❹ ابن هشام، ج٢، ص:٧٣۔ ❺ ابن هشام، ج٢، ص:٧٤۔
❻ ابن هشام، ج٢، ص:٦٩۔ ❼ ابن هشام، ج٢، ص:٧٠۔

کہہ کر تلوار ماری وہ خاک پر ڈھیر تھا۔

وحشی جو ایک حبشی غلام تھا اور جس سے جبیر بن مطعم اس کے آقا نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کر دے تو آزاد کر دیا جائے گا۔ وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی تاک میں تھا، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ برابر آئے تو اس نے چھوٹا سا نیزہ جس کو حربہ کہتے ہیں اور جو حبشیوں کا خاص ہتھیار ہے، پھینک کر مارا جو ناف میں لگا اور پار ہو گیا۔ 1 حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اس پر حملہ کرنا چاہا، لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے اور روح پرواز کر گئی۔

کفار کے علمبردار لڑلڑ کر قتل ہو جاتے تھے، تاہم علم گرنے نہیں پاتا تھا، ایک کے گرنے سے پہلے دوسرا جانباز بڑھ کر علم کو ہاتھ میں لے لیتا تھا۔ ایک شخص نے جس کا نام صواب تھا جب علم ہاتھ میں لیا تو کسی نے بڑھ کر اس زور سے تلوار ماری کہ دونوں ہاتھ ساتھ کٹ کر گر پڑے، لیکن وہ قومی علم کو اپنی آنکھوں سے خاک پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ علم کے گرنے کے ساتھ سینہ کے بل زمین پر گرا اور علم کو سینہ سے دبا لیا۔ اسی حالت میں یہ کہتا ہوا مارا گیا کہ "میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔" 2 علم دیر تک خاک پر پڑا رہا آخر ایک بہادر خاتون (عمرہ بنت علقمہ) دلیرانہ بڑھی اور علم کو ہاتھ میں لے کر بلند کیا۔ یہ دیکھ کر ہر طرف سے قریش سمٹ آئے اور اکھڑے ہوئے پاؤں پھر جم گئے۔

ابو عامر کفار کی طرف سے لڑ رہا تھا، لیکن اس کے صاحبزادے حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ اسلام لا چکے تھے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے باپ کے مقابلہ میں لڑنے کی اجازت مانگی۔ لیکن رحمت عالم نے یہ گوارا نہ کیا کہ بیٹا باپ پر تلوار اٹھائے۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے کفار کے سپہ سالار (ابوسفیان) پر حملہ کیا اور قریب تھا کہ ان کی تلوار ابوسفیان کا فیصلہ کر دے، دفعتہً پہلو سے شداد بن الاسود نے جھپٹ کر ان کے وار کو روکا اور ان کو شہید کر دیا۔ تاہم لڑائی کا پلہ مسلمانوں ہی کی طرف تھا۔ علمبرداروں کے قتل اور حضرت علی اور حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہما کے بے پناہ حملوں سے فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بہادر نازنینیں جو رجز سے دلوں کو ابھار رہی تھیں، بدحواسی کے ساتھ پیچھے ہٹیں اور مطلع صاف ہو گیا، لیکن ساتھ ہی مسلمانوں نے لوٹ شروع کر دی یہ دیکھ کر تیر انداز جو پشت پر مقرر کیے گئے تھے، وہ بھی غنیمت کی طرف جھکے۔

حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بہت روکا لیکن وہ رک 3 نہ سکے۔ تیر اندازوں کی جگہ خالی دیکھ کر خالد نے عقب سے حملہ کیا، عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ چند جانبازوں کے ساتھ جم کر لڑے لیکن سب کے سب شہید ہوئے۔ اب راستہ صاف تھا۔ خالد نے سواروں کے دستہ کے ساتھ نہایت بے جگری سے حملہ کیا۔ لوگ لوٹنے میں مصروف تھے، مڑ کر دیکھا تو تلواریں برس رہی ہیں، بدحواسی میں دونوں فوجیں اس طرح باہم مل گئیں کہ خود مسلمان مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ جو آنحضرت ﷺ سے صورت

1 صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل حمزہ رضی اللہ عنہ: ۴۰۷۲۔ 2 ابن ہشام، ج ۲، ص: ۷۵، ۷۶ وطبری، ج ۳، ص: ۱۴۰۱۔ (س) 3 صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ احد: ۴۰۴۳۔

میں مشابہ اور علم بردار تھے، ابن قمیہ نے ان کو شہید کر دیا اور غل مچ گیا کہ آنحضرت ﷺ نے شہادت پائی۔ اس آواز سے عام بدحواسی چھا گئی۔ بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اکھڑ گئے، بدحواسی میں اگلی صفیں پچھلی صفوں پر ٹوٹ پڑیں اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے والد (یمان) اس کشمکش میں آ گئے اور ان پر تلواریں برس پڑیں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ چلاتے رہے کہ میرے باپ ہیں لیکن کون سنتا تھا۔ غرض وہ شہید ہو گئے اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایثار کے لہجہ میں کہا: ''مسلمانو! اللہ تم کو بخش دے۔'' 1 رسول اللہ ﷺ نے مڑ کر دیکھا تو صرف گیارہ جان نثار پہلو میں ہیں جن میں جناب علی مرتضی، حضرت ابوبکر، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت زبیر بن العوام، حضرت ابودجانہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم کا نام بہ تخصیص معلوم ہے۔ صحیح بخاری میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف حضرت طلحہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہما رہ گئے تھے۔ اس ہلچل اور اضطراب میں اکثروں نے تو بالکل ہمت ہار دی لیکن جانبازوں کا بھی زور نہیں چلتا تھا، جو جہاں تھا وہیں گھر کر رہ گیا تھا آنحضرت ﷺ کی کسی کو خبر نہ تھی حضرت علی رضی اللہ عنہ تلوار چلاتے اور دشمنوں کی صفیں الٹتے جاتے تھے۔ لیکن کعبۂ مقصود (رسول اللہ ﷺ) کا پتہ نہ تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چچا حضرت ابن نضر لڑتے بھڑتے موقع سے آگے نکل گئے، دیکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مایوس ہو کر ہتھیار پھینک دیا ہے 2 پوچھا یہاں کیا کرتے ہو؟ بولے: ''اب لڑ کر کیا کریں! رسول اللہ ﷺ نے تو شہادت پائی۔'' حضرت ابن نضر نے کہا: ''ان کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے۔'' یہ کہہ کر فوج میں گھس گئے اور لڑ کر شہادت پائی۔ لڑائی کے بعد جب ان کی لاش دیکھی گئی تو اسی (۸۰) سے زیادہ تیر، تلوار اور نیزے کے زخم تھے، کوئی شخص پہچان تک نہ سکا، ان کی بہن نے انگوٹھی دیکھ کر پہچانا۔ 3

جان نثاران خاص برابر لڑتے جاتے تھے لیکن نگاہیں سرور عالم ﷺ کو ڈھونڈھتی تھیں۔ سب سے پہلے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی نظر پڑی، چہرۂ مبارک پر مغفر تھا، لیکن آنکھیں نظر آتی تھیں۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے پہچان کر پکارا: ''مسلمانو! رسول اللہ ﷺ یہ ہیں۔'' یہ سن کر ہر طرف سے جان نثار ٹوٹ پڑے۔ کفار نے اب ہر طرف سے ہٹ کر اسی رخ پر زور دیا، دل کا دل ہجوم کر کے بڑھتا تھا، لیکن ذوالفقار کی بجلی سے یہ بادل پھٹ پھٹ کر رہ جاتا تھا۔ ایک دفعہ ہجوم ہوا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''کون مجھ پر جان دیتا ہے؟'' حضرت زیاد بن سکن رضی اللہ عنہ پانچ انصاری لے کر اس خدمت کے ادا کرنے کے لئے بڑھے اور ایک ایک نے جانبازی سے لڑ کر جانیں فدا کر دیں۔ 4 حضرت زیاد رضی اللہ عنہ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ ان کا لاشہ قریب لاؤ، لوگ اٹھا کر لائے، کچھ کچھ جان باقی تھی، قدموں پر منہ

1 صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب اذ همت طائفتان منكم ان تفشلا...... : ٤٠٦٥۔ 2 یہ عام ارباب سیر کی روایت ہے۔ صحیح بخاری میں یہ واقعہ مذکور ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام نہیں۔ 3 صحیح بخاری، کتاب المغازی، غزوۃ احد: ٤٠٤٨ وصحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب ثبوت الجنة للشهيد: ٤٩١٨ (س)۔ 4 صحیح مسلم، کتاب المغازی، غزوة احد: ٤٦٤١ میں ہے کہ سات انصاری تھے اور ساتوں نے باری باری اپنی جانیں فدا کیں۔

رکھ دیا اور اسی حالت میں جان دی۔

بچہ ناز رفته باشد زجہاں نیازمندے　　که بوقت جاں سپردن بسرش رسیده باشی

(ایک بہادر مسلمان اس عالم میں بھی بے پروائی کے ساتھ کھڑا کھجوریں کھا رہا تھا اس نے بڑھ کر پوچھا کہ ''یارسول اللہ! اگر میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جنت میں۔'' اس بشارت سے بے خود ہو کر وہ اس طرح کفار پر ٹوٹ پڑا کہ مارا گیا)۔ ❶

عبداللہ بن قمیہ جو قریش کا مشہور بہادر تھا صفوں کو چیرتا پھاڑتا آنحضرت ﷺ کے قریب آ گیا اور چہرۂ مبارک پر تلوار ماری۔ اس کے صدمہ سے مغفر کی دو کڑیاں چہرۂ مبارک میں چبھ کر رہ گئیں۔ چاروں طرف سے تلواریں اور تیر برس رہے تھے، یہ دیکھ کر جان نثاروں نے آپ کو دائرہ میں لے لیا، حضرت ابودجانہ جھک کر سپر بن گئے، اب جو تیر آتے تھے ان کی پیٹھ پر آتے تھے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے تلواروں کو ہاتھ پر روکا، ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑا، بے درد رحمت عالم پر تیر برسا رہے تھے اور آپ ﷺ کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

((رب اغفر لقومي فانهم لايعلمون)) ❷

''اے اللہ! میری قوم کو بخش دے وہ جانتے نہیں۔''

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے علاتی باپ تھے، مشہور تیرانداز تھے۔ انہوں نے اس قدر تیر برسائے کہ دو تین کمانیں ان کے ہاتھ میں ٹوٹ ٹوٹ کر رہ گئیں۔ انہوں نے سپر سے آنحضرت ﷺ کے چہرہ پر اوٹ کر لیا تھا کہ آپ پر کوئی وار نہ آنے پائے، آپ کبھی گردن اٹھا کر دشمنوں کی فوج کی طرف دیکھتے تو عرض کرتے کہ آپ گردن نہ اٹھائیں ایسا نہ ہو کہ کوئی تیر لگ جائے۔ یہ میرا سینہ سامنے ہے۔ ❸ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی مشہور تیرانداز تھے اور اس وقت آپ کے رکاب میں حاضر تھے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنا ترکش اُن کے آگے ڈال دیا اور فرمایا: ''تم پر میرے ماں باپ قربان! تیر مارتے جاؤ۔'' ❹

اسی حالت میں آپ کی زبان سے عبرت کے لہجہ میں یہ لفظ نکلا: ''وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جو اپنے پیغمبر کو زخمی کرتی ہے۔'' بارگاہ خداوندی میں یہ الفاظ پسند نہ آئے اور یہ آیت اتری۔

﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۲۸)

''تم کو اس معاملہ میں کچھ اختیار نہیں۔''

چنانچہ صحیح بخاری غزوۂ احد میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ ❺

رسول اللہ ﷺ ثابت قدموں کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے کہ دشمن ادھر نہیں آ سکتے تھے۔ ابوسفیان نے دیکھ لیا، فوج لے کر پہاڑی پر چڑھا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور چند صحابہ رضی اللہ عنہم نے پتھر برسائے

❶ بخاري، كتاب المغازي، باب غزوة احد:٤٠٤٦۔(س)۔ ❷ صحيح مسلم، كتاب الجهاد، باب غزوة احد: ٤٦٤٦۔ ❸ صحيح بخاري، كتاب المغازي، باب اذ همت طائفتان:٤٠٦٤۔

❹ ايضًا:٤٠٥٦ تا ٤٠٦٠۔ ❺ ايضًا: ٤٠٦٩۔

جس سے وہ آگے نہ بڑھ سکا۔ ❶

آپ کی وفات کی خبر مدینہ میں پہنچی تو اخلاص شعار نہایت بے تابی کے ساتھ دوڑے۔ جناب فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے آ کر دیکھا تو ابھی تک چہرۂ مبارک سے خون جاری ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سپر میں بھر کر پانی لائے۔ جناب سیدہ دھوتی تھیں لیکن خون نہیں تھمتا تھا، بالآخر چٹائی کا ایک ٹکڑا جلایا اور زخم پر رکھ دیا خون فوراً تھم گیا۔ ❷

ابوسفیان سامنے کی پہاڑی پر چڑھ کر پکارا کہ "یہاں محمد (ﷺ) ہیں؟" آپ نے حکم دیا کوئی جواب نہ دے، ابوسفیان نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا نام لے کر پکارا اور جب کچھ آواز نہ آئی تو پکار کر بولا سب مارے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ بول اٹھے "او اللہ کے دشمن! ہم سب زندہ ہیں۔"

ابوسفیان نے کہا:

اعل ھبل ❸ "اے ہبل تو اونچا رہ"۔ صحابہ نے آنحضرت ﷺ کے حکم سے کہا

اللہ اعلی و اجل "اللہ اونچا اور بڑا ہے۔"

ابوسفیان نے کہا: لَنَا الْعُزّٰی و لاعزّی لکم "ہمارے پاس عزیٰ ❹ ہے، تمہارے پاس نہیں۔"

صحابہ نے کہا: اَللّٰہُ مولانا و لا مولی لَکُمْ "اللہ ہمارا آقا ہے اور تمہارا کوئی آقا نہیں۔"

ابوسفیان نے کہا: "آج کا دن بدر کے دن کا جواب ہے۔ فوج کے لوگوں نے مردوں کے ناک کان کاٹ لئے ہیں، میں نے یہ حکم نہیں دیا تھا، لیکن مجھ کو معلوم ہوا تو کچھ رنج بھی نہیں۔ ❺

آنحضرت ﷺ نے مستورات اور بچوں کو حضرت یمان اور حضرت ثابت رضی اللہ عنہما کی حفاظت میں مدینہ کے پاس کے قلعوں میں بھیج دیا تھا، ان لوگوں کو شکست کی خبر معلوم ہوئی تو سب کو چھوڑ کر اُحد کی طرف بڑھے۔ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ مشرکوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ حضرت یمان رضی اللہ عنہ کو مسلمان ہجوم عام میں پہچان نہ سکے، ان پر تلواریں برس پڑیں۔ ان کے صاحبزادے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ہر چند "ہاں ہاں" کہا اور بتایا کہ "میرے باپ ہیں۔" لیکن ہنگامہ میں کون سنتا تھا، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ یہ کہہ کر رہ گئے کہ "مسلمانو! اللہ تمہارے اس گناہ کو بخش دے۔" ❻ آنحضرت ﷺ نے حضرت یمان رضی اللہ عنہ کا خون بہا مسلمانوں کی طرف سے ادا کرنا چاہا۔ لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے معاف کر دیا، ابن ہشام میں یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے۔ صحیح بخاری میں بھی ہے، لیکن مختصر ہے۔

خاتونانِ قریش نے انتقام بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بھی بدلہ لیا، ان کے ناک، کان کاٹ لئے۔ ہند (امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ماں) نے ان پھولوں کا ہار بنایا اور اپنے گلے میں ڈالا، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ

---

❶ طبری، ج ۳، ص: ۱۴۱۰ و ۱۴۱۱۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب ما اصاب النبی ﷺ من الجراح..... : ۴۰۷۵۔ ❸ بت کا نام۔ ❹ بت کا نام ہے لفظی معنی عزت کے ہیں۔

❺ یہ تمام تفصیل بخاری غزوۂ احد کے ذکر میں ہے: ۴۰۴۳ و مابعد۔ ❻ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب اذ همت طائفتان ... : ۴۰۶۵؛ مسلم، ابن هشام، ج ۲، ص: ۸۱۔

کی لاش پر گئی اوران کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا گئی۔ لیکن گلے سے اتر نہ سکا، اس لئے اگل دینا پڑا۔ تاریخوں میں ہند کا لقب جو جگر خوار لکھا جاتا ہے اسی بنا پر لکھا جاتا ہے، ہند فتح مکہ میں ایمان لائی لیکن جس طرح ایمان لائی وہ عبرت خیز ہے، تفصیل آگے آئے گی۔

اس غزوہ میں اکثر خاتونانِ اسلام نے بھی شرکت کی۔ حضرت عائشہ اور حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ماں تھیں زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ میں نے حضرت عائشہ اور حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ پائنچے چڑھائے ہوئے مشک بھر بھر کر لاتیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ مشک خالی ہو جاتی تھی تو پھر جا کر بھر لاتی تھیں۔ ❶ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ام سلیط رضی اللہ عنہا نے بھی جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی ماں تھیں یہی خدمت انجام دی۔ ❷

عین اس وقت جبکہ کافروں نے عام حملہ کر دیا تھا اور آپ کے ساتھ صرف چند جان نثار رہ گئے تھے۔ ام عمارہ رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچیں اور اپنا سینہ سپر کر دیا، کفار جب آپ پر بڑھتے تھے تو تیر اور تلوار سے روکتی تھیں۔ ابن قمیہ جب درّاتا ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گیا تو حضرت اُم عمارہ رضی اللہ عنہا نے بڑھ کر روکا چنانچہ کندھے پر زخم آیا اور غار پڑ گیا انہوں نے بھی تلوار ماری، لیکن وہ دوہری زرہ پہنے ہوئے تھا اس لئے کارگر نہ ہوئی۔ ❸

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا (حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بہن) شکست کی خبر سن کر مدینہ سے نکلیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے صاحبزادے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو بلا کر ارشاد کیا کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش نہ دیکھنے پائیں۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا، بولیں کہ میں اپنے بھائی کا ماجرا سن چکی ہوں لیکن اللہ کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی، لاش پر گئیں، خون کا جوش تھا اور عزیز بھائی کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہوئے تھے۔ لیکن انا للّٰہ و انا الیہ راجعون کہہ کر چپ ہو رہیں اور مغفرت کی دعا مانگی۔ ❹

انصار میں سے ایک عفیفہ کے باپ، بھائی، شوہر سب اس معرکہ میں مارے گئے۔ باری باری تین سخت حادثوں کی صدا اس کے کانوں میں پڑتی جاتی تھی لیکن وہ ہر بار صرف یہی پوچھتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟ لوگوں نے کہا بخیر ہیں، اس نے پاس آ کر چہرۂ مبارک دیکھا اور بے اختیار پکار اٹھی۔ ❺

كل مصيبة بعدك جلل ''تیرے ہوتے ہوئے سب مصیبتیں ہیچ ہیں۔''

میں بھی اور باپ بھی، شوہر بھی، برادر بھی فدا — اے شہِ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

(مسلمانوں کی طرف سے ستر آدمی مارے گئے۔ جن میں زیادہ تر انصار تھے لیکن مسلمانوں کے افلاس کا یہ حال تھا کہ اتنا کپڑا بھی نہ تھا کہ شہدا کی پردہ پوشی ہو سکتی۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے کہ ان کا

❶ صحيح بخاري، كتاب المغازي، باب اذ همت طائفتان: ٤٠٦٤۔ ❷ صحيح بخاري، كتاب المغازي، ذكر ام سليط: ٤٠٧١۔ ❸ ابن ہشام، ج ٢، ص: ٨٤، ٧٨ مطبع محمد على مصر۔
❹ طبری، ج ٣، ص: ١٤٢١۔ ❺ طبری، ج ٣، ص: ١٤٢٥۔

پاؤں چھپایا جاتا تو سر کھل جاتا اور سر ڈھانکا جاتا تو پاؤں کھل جاتے۔ آخر پاؤں اذخر کی گھاس سے چھپا دیے گئے۔ یہ وہ حیرت انگیز منظر تھا کہ بعد کو بھی یہ واقعہ مسلمانوں کو یاد آ جاتا تو آنکھیں تر ہو جاتیں۔ شہدا بے غسل اسی طرح خون میں لتھڑے ہوئے دو دو ملا کر ایک ایک قبر میں دفن کیے گئے۔ جس کو قرآن زیادہ یاد ہوتا اس کو مقدم کیا جاتا۔ ان شہدا پر نماز جنازہ بھی اس وقت نہیں پڑھی گئی۔ [1] آٹھ برس کے بعد وفات سے ایک دو برس پہلے جب آپ ادھر سے گزرے تو بے اختیار آپ پر رقت طاری ہوئی اور اس طرح آپ ﷺ نے پردرد کلمات فرمائے جیسے کوئی زندوں اور مردوں سے رخصت ہو رہا ہو اور اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک خطبہ دیا کہ ''مسلمانو! تم سے یہ خوف نہیں کہ پھر مشرک بن جاؤ گے، لیکن یہ ڈر ہے کہ دنیا میں نہ پھنس جاؤ۔'') [2]

دونوں فوجیں جب میدان سے الگ ہوئیں تو مسلمان زخم سے چور تھے تاہم یہ خیال کر کے کہ ابوسفیان مسلمانوں کو مغلوب سمجھ کر دوبارہ حملہ آور نہ ہو۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کی طرف روئے خطاب کر کے فرمایا کہ ''کون ان کا تعاقب کرے گا'' فوراً ستر آدمیوں کی ایک جماعت اس مہم کے لئے تیار ہو گئی جن میں حضرت ابوبکر و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔ [3] ابوسفیان، اُحد سے روانہ ہو کر جب مقامِ روحاء پہنچا۔ یہاں خیال آیا کہ کام ناتمام رہ گیا۔ آنحضرت ﷺ کو پہلے ہی سے گمان تھا۔ دوسرے ہی دن آپ ﷺ نے اعلان کرا دیا کہ کوئی واپس نہ جائے۔ چنانچہ حمراء الاسد تک جو مدینہ سے ۸ میل ہے تشریف لے گئے، قبیلہ خزاعہ اس وقت تک ایمان نہیں لایا تھا لیکن در پردہ اسلام کا طرفدار تھا اس کا رئیس معبد خزاعی شکست کی خبر سن کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور واپس جا کر ابوسفیان سے ملا۔ ابوسفیان نے اپنا ارادہ ظاہر کیا معبد نے کہا: ''میں دیکھتا آتا ہوں محمد ﷺ اس سروسامان سے آ رہے ہیں کہ ان کا مقابلہ ناممکن ہے''۔ غرض ابوسفیان واپس گیا [4]

یہی واقعہ ہے جس کو مؤرخین نے تکثیر غزوات کے شوق میں ایک نیا غزوہ بنا لیا ہے اور حمراء الاسد کا ایک نیا عنوان قائم کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو تمام مدینہ ماتم کدہ تھا۔ آپ جس طرف سے گزرتے گھروں سے ماتم کی آوازیں آتی تھیں۔ آپ کو عبرت ہوئی کہ سب کے عزیز و اقارب ماتم داری کا فرض ادا کر

---

[1] یہ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب من قتل من المسلمین یوم احد: ۴۰۷۹ کی روایت ہے لیکن دوسری کتابوں میں بعض ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر تو خصوصیت کے ساتھ اور دوسرے شہدا پر بھی نماز جنازہ پڑھی۔ یہ شہدا ایک ایک کر کے اور بعض میں ہے کہ دس دس کر کے لائے جاتے تھے اور آپ ﷺ ان پر نماز جنازہ پڑھتے تھے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش مبارک پر ہر جماعت کے ساتھ گویا ستر دفعہ یا سات دفعہ نماز ادا کی گئی۔ (شرح معانی الآثار طحاوی، باب الصلوٰۃ علی الشہداء، ج ۱، ص: ۲۹۰ ونصب الرایہ زیلعی، باب احادیث الصلوٰۃ علی الشہید، ص: ۱۵۰ ومغازی واقدی، ص: ۳۰۰ مطبوعہ کلکتہ، (س)) [2] یہ تمام واقعات صحیح بخاری، غزوۃ احد: ۴۰۴۲ کے متفرق ابواب میں ہیں۔ [3] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب (الذین استجابوا اللہ والرسول): ۴۰۷۷۔ (س) [4] طبری، ج ۳، ص: ۱۴۲۸، ۱۴۲۹۔

رہے ہیں لیکن حضرت حمزہ کا کوئی نوحہ خواں نہیں ہے، رقت کے جوش میں آپ کی زبان سے بے اختیار نکلا:

اما حمزة فلا بواكي له ❶ ''لیکن حضرت حمزہ کا کوئی رونے والا نہیں۔''

انصار نے یہ الفاظ سنے تو تڑپ اٹھے، سب نے جا کر اپنی بیویوں کو حکم دیا کہ دولت کدہ پر جا کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا ماتم کرو۔ آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو دروازہ پر پردہ نشینان انصار کی بھیڑ تھی اور حمزہ کا ماتم بلند تھا، ان کے حق میں دعائے خیر کی اور فرمایا: ''میں تمہاری ہمدردی کا شکر گزار ہوں، لیکن مردوں پر نوحہ کرنا جائز نہیں۔'' (عرب میں دستور تھا کہ مردوں پر عورتیں زور زور سے نوحہ اور بین کرتی تھیں، کپڑے پھاڑ لیتی تھیں، گال نوچتی، گالوں پر تھپڑ مارتی تھیں اور چیختی چلاتی تھیں۔ یہ رسم بد اسی دن سے بند کر دی گئی اور فرمایا گیا کہ آج سے کسی مردہ پر نوحہ ❷ نہ کیا جائے یہ بھی بعد کو ارشاد ہوا کہ ''اس طرح ماتم کرنا مسلمان کی شان نہیں۔'') ❸ (قرآن مجید میں سورۂ آل عمران میں غزوۂ احد کا مفصل ذکر موجود ہے)۔

واقعات متفرقہ ۳ھ

اس سال یعنی ۳ھ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی۔ رمضان کی پندرھویں تاریخ تھی۔ اسی سال آنحضرت ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں اور غزوۂ بدر کے زمانہ میں بیوہ ہو گئی تھیں نکاح کیا۔ اسی سال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے شادی کی۔ وراثت کا قانون بھی اسی سال نازل ہوا۔ اب تک وراثت میں ذوی الارحام (وہ حصہ دار جو ماں، بیٹی، بہن یا لڑکیوں کی طرف سے منسوب ہو) کا کوئی حصہ نہ تھا، ان کے حقوق کی بھی تفصیل کی گئی، مشرکہ کا نکاح مسلمان سے اب تک جائز تھا، اس سال اس کی بھی تحریم نازل ہوئی۔

---

❶ مسند احمد، ج ۲، ص: ۸٤، (س) ❷ ابن هشام، غزوة احد، ج ۲، ص: ۸۸؛ مسند احمد، جلد ۲، ص: ۸٤۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب ماینهی عن النوح والبكاء: ۱۳۰۵۔۱۳۰٦۔(س)

سنہ ۴ھ

سلسلہ [1] غزوات وسرایا

تمام قبائلِ عرب بجز ایک دو کے، اسلام کے دشمن تھے۔ دشمنی زیادہ تر اس بنا پر تھی کہ ہر قبیلہ بت پرستی کو اپنا دین وآئین سمجھتا تھا جبکہ اسلام اسی کو مٹاتا تھا۔ اس کے ساتھ قریش کا اثر تمام عرب پر تھا۔ حج کے زمانہ میں تمام قبائل مکہ میں جمع ہوتے تھے اور قریش ان کو اسلام کی دشمنی پر ابھارتے۔ ایک اور بڑا سبب یہ تھا کہ تمام قبائل کی وجۂ معاش لوٹ اور غارت گری تھا۔ جبکہ اسلام اس سے نہ صرف قولاً بلکہ عملاً بھی روکتا تھا۔ اس لئے وہ جانتے تھے کہ اگر اسلام قائم ہو گیا تو ہمارے ذرائع معاش بند ہو جائیں گے۔ تاہم بدر کی فتح نے ایک عام رعب بٹھا دیا تھا جس کی وجہ سے تمام قبیلے اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھ گئے۔ لیکن احد کی شکست نے حالت بدل دی اور دوبارہ تمام قبائل دفعتاً اٹھ کھڑے ہوئے۔ سیرت نبوی میں سرایا (چھوٹی چھوٹی لڑائیاں) کا جو ایک وسیع سلسلہ پھیلا ہوا نظر آتا ہے، اسی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ عام مؤرخوں نے اگرچہ اپنی عادت کے موافق ان لڑائیوں کے ذکر میں ان کے اسباب سے بحث نہیں کی۔ لیکن ابن سعد نے طبقات میں اور ائمۂ فن نے قریباً ہر واقعہ کا سبب لکھ دیا ہے یعنی کسی خاص قبیلہ نے مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا اور آنحضرت ﷺ نے مدافعت کے لئے فوجیں بھیجیں۔

سریہ ابی سلمہ رضی اللہ عنہ

سب سے پہلے (یکم) محرم ۴ھ میں طلحہ اور خویلد نے اپنے قبیلہ کو جو فید کے کوہستانی علاقہ قطن میں رہتا تھا، مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ نے حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کو ایک سو پچاس مہاجرین اور انصار کے ساتھ اس طرف روانہ کیا۔ یہ خبر سن کر ان کی جماعت منتشر ہو گئی۔ [2]

سریہ ابن انیس

اس کے بعد محرم ۴ھ میں سفیان بن خالد جو قبیلہ لحیان کا تھا اور جو کوہستان عُرنہ کا رئیس تھا، مدینہ پر حملہ کا قصد کیا۔ اس کے مقابلہ کے لئے آپ ﷺ نے عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کو بھیجا جنہوں نے لطائف الحیل سے موقع حاصل کیا اور سفیان کو قتل کر دیا۔ [3]

---

[1] غزوہ اور سریہ میں جو فرق ہے اس کی نسبت علمائے سیرت مختلف الرائے ہیں۔ زیادہ مقبول یہ رائے ہے کہ جس واقعہ میں آنحضرت ﷺ خود شریک ہوئے وہ غزوہ کے نام سے موسوم ہے اور جس میں صحابہ افسر مقرر کر کے بھیج دیے جاتے تھے وہ سریہ کہلاتا تھا۔

[2] ابن سعد، ص: ۳۵ (جلد ۲ قسم اول)، اصل عبارت یہ ہے: بلغ رسول اللّٰہ ان طلیحة ومسلمة ابنی خویلد قد سارا فی قومهما ومن اطاعهما یدعونهم الی حرب رسول اللّٰہ ﷺ۔ [3] طبقات ابن سعد، قسم اول، ج ۲، ص: ۳۶، اصل عبارت یہ ہے: وذالك انه بلغ رسول اللّٰہ ﷺ ان سفیان بن خالد الهذ لی قد جمع الجموع لرسول اللّٰہ ﷺ۔

صفر ۴ھ میں ابو براء کلابی ❶ جو قبیلہ کلاب کا رئیس تھا، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ چند لوگوں کو میرے ساتھ کر دیجئے کہ میری قوم کو اسلام کی دعوت دیں، آپ نے فرمایا: ''مجھ کو نجد کی طرف سے ڈر ہے۔'' ❷ ابو براء نے کہا: ''ان کا میں ضامن ہوں۔'' آپ ﷺ نے منظور فرمایا اور ستر انصار ساتھ کر دیے، یہ لوگ نہایت مقدس اور درویش تھے اور اکثر اصحابِ صفہ میں سے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ دن بھر لکڑیاں چنتے شام کو فروخت کر کے کچھ اصحاب صفہ کی نذر کرتے، کچھ اپنے لئے رکھتے۔

سریہ بیر معونہ

ان لوگوں نے بیر معونہ پہنچ کر قیام کیا اور حرام بن ملحان کو آنحضرت ﷺ کا خط دے کر عامر بن طفیل بن مالک (بن جعفر کلابی عامری) کے پاس بھیجا جو قبیلہ کا رئیس تھا۔ عامر نے حرام کو قتل کر دیا اور آس پاس کے جو قبائل تھے یعنی عصیہ، رعل، ذکوان، سب کے پاس آدمی دوڑا دیے کہ تیار ہو کر آئیں۔ ایک بڑا لشکر تیار ہو گیا اور عامر کی سرداری میں آگے بڑھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم حرام کی واپسی کے منتظر تھے۔ جب دیر لگی تو خود روانہ ہوئے۔ راستہ میں عامر کی فوج کا سامنا ہوا۔ کفار نے ان کو گھیر لیا اور سب کو قتل کر دیا ❸ صرف عمرو بن امیہ ❹ کو عامر نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ ''میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی میں تجھ کو آزاد کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ان کی چوٹی کاٹی اور چھوڑ دیا۔ آنحضرت ﷺ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اس قدر صدمہ ہوا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا۔ مہینہ بھر نماز فجر میں ان ظالموں کے حق میں بددعا کی۔ حضرت عمرو بن امیہ نے (واپسی میں راستہ میں بنی عامر کے) دو آدمیوں کو قتل کر دیا تھا جن کو رسول اللہ ﷺ امان دے چکے تھے، مگر حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو اس کا علم نہ تھا۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ ہم نے بنی عامر سے ان کی اس بے وفائی کا بدلہ لے لیا جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ کیا ہے ❺ (جب آنحضرت ﷺ نے یہ سنا تو) آپ ﷺ نے اس پر ناراضی ظاہر فرمائی اور دونوں کا خون بہا ادا کر دینے کا اعلان فرمایا۔

واقعہ رجیع

انہی دنوں عضل اور قارہ جو دو مشہور قبیلے ہیں، ان کے چند آدمی آنحضرت ﷺ کے پاس آئے کہ

❶ ابو براء بعد کو اسلام لائے یا نہیں؟ اس میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ ذہبی کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ یہ اسلام نہیں لائے۔ اصابہ میں ہے کہ ان کے قبول اسلام کی کوئی روایت نہیں ہے تاہم بعض روایات کی بنا پر ایک جماعت کا خیال ہے کہ اسلام لائے تھے۔ زرقانی، ج ۳، ص: ۸۶۔

❷ اور یہ کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ عامر بن طفیل جو ان اطراف کا رئیس تھا اس نے آنحضرت ﷺ سے کہا تھا کہ ''میرے تمہارے درمیان تین باتیں ہیں، بادیہ کے مالک تم بنو اور شہروں کا میں بنوں یا اپنے بعد مجھ کو اپنا جانشین بناؤ، ورنہ غطفان کو لے کر میں چڑھ آؤں گا۔ آنحضرت ﷺ نے منظور نہیں فرمایا تھا، اس لیے اس کی طرف سے ڈر تھا۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، غزوۃ الرجیع ورعل وذکوان: ۴۰۹۱۔

❸ صحابہ کی اس جماعت میں حضرت کعب بن زید رضی اللہ عنہ بھی تھے، کفار نے یہ سمجھا کہ یہ بھی شہید ہو گئے ہیں، لیکن ان میں جان باقی تھی اور بعد کو زندہ بچ رہے اور غزوۂ خندق میں شہید ہوئے۔ زرقانی، ج ۲، ص: ۸۸۔ (س) ❹ حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ اور حضرت منذر بن محمد عقبہ انصاری رضی اللہ عنہ پیچھے تھے۔ جب یہ مقام حادثہ پر پہنچے تو حضرت منذر رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا اور حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو قید کر لیا گیا اور بعد کو وہ چھوڑ دیے گئے، زرقانی ج ۲ ص ۸۹۔ (س) ❺ البدایہ والنہایہ ابن کثیر، ج ۴، ص: ۷۳ زرقانی، ج ۲، ص: ۹۲۔

ہمارے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا ہے، چند لوگوں کو ہمارے ہاں بھیجئے کہ اسلام کے احکام اور عقائد سکھائیں۔ آپ نے دس اشخاص ساتھ کر دیے جن کے سردار عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے، یہ لوگ جب مقام رجیع پر پہنچے جو عُسفان اور مکہ کے وسط میں ہے۔ تو ان غداروں نے بدعہدی کی اور قبیلہ بنولحیان کو اشارہ کیا کہ ان کا کام تمام کر دیں۔ بنولحیان دو سو آدمی لے کر جن میں ایک سو تیر انداز تھے، ان لوگوں کے تعاقب میں چلے اور ان کے قریب آ گئے۔ ان لوگوں نے بڑھ کر ایک ٹیکرے پر پناہ لی۔ تیراندازوں نے ان سے کہا کہ ''اتر آؤ ہم تم کو امان دیتے ہیں۔'' حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں کافر کی پناہ میں نہیں آتا۔'' یہ کہہ کر اللہ سے خطاب کیا کہ ''اپنے پیغمبر کو خبر پہنچا دے۔'' غرض وہ مع سات آدمیوں کے لڑ کر تیر اندازوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ (قریش نے چند آدمیوں کو بھیجا کہ عاصم کے بدن سے گوشت کا ایک لوتھڑا کاٹ لائیں کہ ان کی شناخت ہو، قدرت خداوندی نے شہید مسلم کی یہ تحقیر گوارا نہ کی، شہد کی مکھیوں نے لاش پر پہرہ ڈال دیا، قریش ناکام لوٹ گئے) لیکن تین شخصوں [1] نے جن میں سے دو کے نام حضرت خبیب اور حضرت زید (بن الدثنہ) تھے کافروں کے وعدہ پر اعتماد کیا اور ٹیکرے سے اتر آئے کافروں نے بدعہدی کر کے ان کی مشکیں کس لیں اور مکہ میں لے جا کر بیچ ڈالا۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے جنگ احد میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا اس لئے ان کو حارث کے لڑکوں نے خریدا کہ باپ کے بدلہ میں قتل کریں گے [2] چند روز انہی کے گھر میں رہے، ایک دن حارث کی نواسی کو کھلا رہے تھے، اتفاق سے ہاتھ میں چھری تھی۔ [3] بچی کی ماں اتفاقاً کہیں سے آ گئی۔ دیکھا کہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ننگی چھری ہے، کانپ اٹھی۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا تو یہ سمجھی کہ میں اس کو قتل کر دوں گا؟ ہمارا یہ کام نہیں۔'' خاندان حارث ان کو حرم کے حدود سے باہر لے گیا اور قتل کرنا چاہا۔ انہوں نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مانگی۔ قاتلوں نے اجازت دی، انہوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر کہا: ''دیر تک نماز پڑھنے کو جی چاہتا تھا لیکن تم کو خیال ہو گا کہ موت سے ڈرتا ہوں۔'' پھر یہ اشعار پڑھے۔

و ما ان ابالی حین اقتل مسلما	جب میں اسلام کے لئے قتل کیا جا رہا ہوں
علی ای شق کان للہ مصرعی	تو مجھ کو اس کی پروا نہیں کہ کس پہلو پر قتل کیا جاؤں گا
و ذلك فی ذات الالہ وان یشاء	یہ جو کچھ ہے خالصتاً اللہ کے لئے ہے، اگر وہ چاہے گا تو
یبارك علی اوصال شلو ممزع	جسم کے ان پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکت نازل کرے گا

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ الرجیع ورعل ......: ٤٠٨٦ نے اس موقع پر جن تیسرے بزرگ کا ذکر کیا ہے ان کا نام نہیں لکھا ہے۔ ابن اسحاق نے ان کا نام حضرت عبداللہ بن طارق بتلایا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ اسی موقع پر شہید کر دیے گئے لیکن دوسری روایتوں میں ہے کہ یہاں سے آگے چل کر مکہ کے راستے میں بمقام ظہران ان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، زرقانی، جلد ۲ ص: ۷۸۔ [2] حارث کے بیٹے ابوسروعہ جنہوں نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا، بعد کو مسلمان ہوئے اور شرف صحابیت سے سرفراز ہوئے زرقانی، جلد ۲ ص: ۷۸۔ (س)

[3] صحیح بخاری، (کتاب المغازی: ٤٠٨٦) میں اُسترا لکھا ہے۔ (س)

اسی زمانہ سے دستور ہے کہ کسی کو قتل کرتے ہیں تو مقتول پہلے دو رکعت نماز ادا کر لیتا ہے [1] (اور یہ مستحب سمجھا جاتا ہے) [2] دوسرے صاحب حضرت زید رضی اللہ عنہ تھے، ان کو صفوان بن امیہ نے قتل کے ارادہ سے خریدا تھا ان کے قتل کے وقت قریش کے معزز سردار تماشا دیکھنے آئے، جن میں ابوسفیان بھی تھا جب قاتل نے تلوار ہاتھ میں لی تو ابوسفیان نے کہا: ''سچ کہنا اس وقت تمہارے بدلے محمد ﷺ قتل کیے جاتے تو کیا تم اس کو اپنی خوش قسمتی نہ سمجھتے؟'' بولے: ''اللہ کی قسم! میں تو اپنی جان کو اس کے برابر بھی عزیز نہیں رکھتا کہ رسول اللہ ﷺ کے تلووں میں کانٹا چبھ جائے۔'' صفوان کے غلام نسطاس [3] نے ان کی گردن مار دی۔

ان لڑائیوں کا سلسلہ یہود کی لڑائیوں سے مل جاتا ہے اور چونکہ یہود کے واقعات اور ان کی سرگزشت تاریخ اسلام سے گوناگوں تعلقات رکھتی ہے، اس لئے ہم ان کے واقعات مستقل حیثیت سے لکھتے ہیں اور اس غرض کے لئے کسی قدر ہم کو پچھلے زمانہ کی طرف واپس آنا پڑے گا۔

واقعات متفرقہ ۴ھ

اسی سال شعبان میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی۔ اسی سال ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنت خزیمہ نے انتقال فرمایا، جن سے اسی سال نکاح بھی ہوا تھا۔

اسی سال آنحضرت ﷺ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ عبرانی زبان لکھنا پڑھنا سیکھ لیں اور فرمایا کہ مجھ کو یہود پر اطمینان نہیں۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے صرف پندرہ دن میں عبرانی زبان سیکھ لی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں عبری زبان سے لوگ بہت کچھ آشنا تھے۔ اسی سال شوال میں آنحضرت ﷺ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا۔

اسی سال یہودیوں نے آپ ﷺ کے سامنے ایک یہودی کا مقدمہ پیش کیا اور آپ نے تورات کے مطابق رجم کا حکم دیا (تفصیل ان واقعات کی دوسرے حصوں میں آئے گی)۔ بعض مؤرخین کے نزدیک شراب کی حرمت کا حکم بھی اسی سال نازل ہوا، لیکن اس میں روایتیں نہایت مختلف ہیں۔ پوری تحقیق احکام شرعیہ کے ذکر میں آئے گی۔

---

[1] طبری، ج۳، ص: ۱۴۳۵ و طبقات ابن سعد، قسم اول، جزء ثانی، ص: ۴۰ اشعار اور اکثر جزئیات واقعہ صحیح بخاری، کتاب المغازی، غزوۃ الرجیع: ۴۰۸۶ سے لئے گئے ہیں، نیز صحیح بخاری، کتاب الجهاد، هل يستاسر الرجل ومن لم يستاسر وصلى ركعتين عند القتل: ۳۰۴۵۔ [2] اس نماز کے استحباب کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے اس فعل کی اطلاع ملی تو آپ نے اس کو پسند فرمایا (شرح سیر کبیر سرخسی، اول ص: ۱۵) آنحضرت ﷺ کے اس استحسان نے اس نماز کو استحباب کا درجہ عطا فرمایا (الروض الانف، ج ۲، ص: ۱۷۱) محدثین کی اصطلاح میں اس صورت حال کو تقریر رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں یعنی حضور ﷺ کے سامنے کوئی فعل کیا گیا ہو یا حضور ﷺ کی عدم موجودگی میں کیا گیا ہو اور حضور ﷺ کو اس کی اطلاع ملی ہو، مگر آپ نے اس پر انکار نہ فرمایا ہو تو اس سے بھی اس فعل کا مسنون و مستحب یا جائز ہونا سمجھا جائے گا۔ (س) [3] نسطاس نے بعد کو اسلام قبول کیا۔ زرقانی، ج ۲، ص: ۸۲، (س)

یہودیوں کے ساتھ معاہدہ اور جنگ

۲ھ، ۳ھ، ۴ھ

اوپر گزر چکا ہے کہ یہود مدت دراز سے مدینہ پر فرماں روا تھے۔ انصار نے آ کر ان کے ساتھ تعلقات پیدا کئے اور رفتہ رفتہ حریفانہ اقتدار حاصل کیا لیکن جنگ بعاث نے ان کی قومی طاقت توڑ دی اور اب وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ یہود سے ہمسری کا دعویٰ کر سکتے۔

یہود کے تین قبیلے تھے، قینقاع، نضیر، قریظہ، یہ سب مدینہ کے اطراف اور حوالی میں آباد تھے اور عموماً زمیندار، دولت مند، تجارت پیشہ اور صناع تھے۔ قینقاع زرگری کا پیشہ کرتے تھے چونکہ سب میں زیادہ بہادر اور شجاع تھے اس لئے ہمیشہ ان کے پاس اسلحہ جنگ کے ذخیرے تیار رہتے تھے۔ انصار عموماً ان کے مقروض اور زیر بار تھے۔ ملکی اور تجارتی افسری کے ساتھ ان لوگوں کا مذہبی اور علمی اثر بھی تھا، انصار عموماً بت پرست اور جاہل تھے۔ اس بنا پر وہ یہود کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کو اپنے سے زیادہ مہذب اور شائستہ سمجھتے، جن لوگوں کے بچے زندہ نہیں رہتے تھے۔ وہ منت مانتے کہ ہمارا بیٹا زندہ رہے گا تو ہم اس کو یہودی بنا دیں گے۔ چنانچہ مدینہ میں اسی قسم کے بہت سے جدید الیہودیہ [1] موجود تھے۔

یہود میں امتدادِ زمانہ سے نہایت اخلاق ذمیمہ پیدا ہو گئے تھے۔ ان کے امتیازی خصائص زندگی یہ تھے کہ ہر طرف لین دین کا کاروبار پھیلا رکھا تھا اور تمام آبادی ان کے قرضوں میں زیر بار تھی۔ چونکہ تنہا وہی صاحب دولت تھے اس لئے نہایت بے رحمی سے سود کی بڑی شرحیں مقرر کرتے اور قرضہ کی کفالت میں لوگوں کے بال بچے۔ یہاں تک کہ مستورات کو رہن رکھواتے تھے۔ کعب بن اشرف نے خود اپنے انصاری دوستوں سے یہی درخواست کی تھی [2] اور مختلف طریقوں سے لوگوں کے مال اور جائیداد پر تصرف کرتے تھے۔

طمّاعی اور حرص کی شدت سے یہ حالت تھی کہ معصوم بچوں کو دو چار روپے کے زیور کے لئے پتھر سے مار ڈالتے تھے۔ [3] دولت کی بہتات سے زنا اور بدکاری کا عام رواج تھا اور چونکہ زیادہ تر امرا اس کے مرتکب ہوتے تھے اس لئے ان کو سزا نہیں دے سکتے تھے۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک یہودی سے دریافت فرمایا کہ ''کیا تمہاری شریعت میں زنا کی سزا صرف درّہ مارنا ہے؟'' اس نے کہا نہیں بلکہ سنگسار کرنا ہے، لیکن ہمارے شرفا میں زنا کی کثرت ہو گئی اور جب کوئی شریف اس جرم میں پکڑا جاتا تو ہم اس کو چھوڑ دیتے تھے۔ البتہ عام آدمیوں کو یہ سزا دیتے تھے۔ بالآخر یہ قرار پایا کہ سنگسار کرنے کی سزا درّہ سے بدل دی جائے، تاکہ شریف اور رذیل سب کو یکساں سزا دی جا سکے۔ [4]

---

[1] ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی الاسیر یکره علی الاسلام:۲٦٨٢۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل کعب بن الاشرف:٤٠٣٧ ومسلم، کتاب الجهاد، باب قتل کعب بن اشرف: ٤٦٦٤۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الدیات، باب اذا قتل بحجر أو بعصًا:٦٨٧٧۔(س) [4] اسباب النزول، واحدی ص: ١٤٥ مصر۔ (وصحیح مسلم، کتاب الحدود، باب ذکر رجم الیهود:٤٤٤٠) (س)

اسلام مدینہ میں آیا تو یہود کو نظر آیا کہ اب ان کا جابرانہ اور خود غرضانہ اقتدار قائم نہیں رہ سکتا۔ اسلام جس قدر روز بروز مدینہ میں پھیلتا جاتا تھا اسی قدر یہودیوں کا مذہبی وقار جوان کو مدتوں سے حاصل تھا، زوال پذیر ہوتا جاتا تھا۔ مدینہ کے مشرکین میں یہودیت جو تدریجاً پھیل رہی تھی دفعتہً رک گئی۔ نئی نئی فتوحات کی بدولت انصار جس قدر دولت مند ہوتے جاتے تھے، یہودیوں کے قرض کے شکنجوں سے آزاد ہوتے جاتے تھے۔ یہودیوں میں جو اخلاقِ بد عموماً پھیلے ہوئے تھے اور جن پر دولتمندی اور مذہبی پیشوائی نے پردہ ڈال رکھا تھا، اب ان کا راز فاش ہونے لگا۔

آنحضرت ﷺ نے اگرچہ ان سے معاہدہ کیا تھا کہ ان کے جان و مال سے کچھ تعرض نہیں کیا جائے گا اور ان کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہوگی، لیکن منصب نبوت کی حیثیت سے ذمائم اخلاق پر وعظ اور تذکیر آپ کا فرض نبوت تھا۔ قرآن مجید میں ان کے اخلاق کی پردہ دری پر صاف صاف آیتیں نازل ہوتی تھیں:

﴿ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۭ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٤٢)

''وہ جھوٹ باتوں کے سننے والے اور مال حرام کے بڑے کھانے والے ہیں۔''

﴿ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٦٢)

''اور تو ان میں سے اکثروں کو دیکھے گا کہ گناہ اور تعدی کی طرف بڑی تیزی سے بڑھتے ہیں۔''

﴿ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭ ﴾ (٤/ النسآء:١٦١)

''اور چونکہ یہ سود خوری کرتے ہیں حالانکہ ان کو سود سے منع کر دیا گیا تھا اور چونکہ یہ لوگوں کا مال خورد برد کر جاتے ہیں۔''

ان اسباب نے تمام یہود میں اسلام کی طرف سے سخت ناراضی پھیلا دی اور اب انہوں نے طرح طرح سے آنحضرت ﷺ کو اذیتیں دینی اور اسلام کے خلاف کوششیں کرنی شروع کیں لیکن آنحضرت ﷺ کو حکم تھا کہ ان کی ہر طرح کی ایذا رسانیوں کو برداشت کریں:

﴿ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ (٣/ آل عمران:١٨٦)

''اور اہل کتاب اور مشرکوں سے تم بہت سی ایذا (کی باتیں) سنو گے اور اگر صبر کیے رہو اور پرہیزگاری پر قائم رہو تو یہ ہمت کے کام ہیں۔''

یہودیوں نے معمول کر لیا تھا کہ آنحضرت ﷺ سے سلام علیکم کرتے تو بجائے السلام علیک کے السام علیک کہتے تھے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ''تجھ کو موت آئے۔'' ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی موجود تھیں۔ انہوں نے سنا تو ان کو سخت غصہ آیا اور بے اختیار ہو کر بول اٹھیں کہ ''کم بختو! تم کو موت آئے۔'' آنحضرت ﷺ

نے فرمایا کہ "نرمی سے کام لو۔" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: "آپ نے کچھ سنا بھی کہ ان لوگوں نے کیا کہا؟" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "ہاں، لیکن یہ کافی ہے کہ میں نے علیك کہہ دیا۔" ❶

آنحضرت ﷺ صرف مجاملت اور درگزر ہی پر اکتفانہیں فرماتے تھے بلکہ اکثر معاشرت کی باتوں میں یہود کے ساتھ اتفاق فرماتے اور ان کی مذہبی توقیر قائم رکھنا چاہتے تھے۔ اہلِ عرب کی عادت تھی کہ بالوں میں مانگ نکالتے تھے بخلاف اس کے یہودی بالوں کو یوں ہی چھوڑ دیتے تھے۔ آنحضرت ﷺ بھی یہودیوں ہی کی موافقت کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے:

وکان یحب موافقة اهل الكتاب فيما لم يؤمر بشيء۔ ❷

"اور آنحضرت ﷺ ان چیزوں میں جن میں کوئی خاص حکم الٰہی نہیں ہوتا تھا اہل کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے۔"

آنحضرت ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی عاشورہ کے دن روزہ رکھتے ہیں، آپ نے بھی حکم دیا کہ لوگ عاشورہ کا روزہ رکھیں۔ ❸ کسی یہودی کا جنازہ گزرتا تو آپ تعظیماً کھڑے ہو جاتے۔ ❹

ایک دفعہ ایک یہودی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت اس طرح بیان کی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ سے بھی افضل ہیں۔ اس پر ایک انصاری کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے اس کو تھپڑ مارا۔ یہودی نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "مجھ کو اور پیغمبروں پر (ایسی) فضیلت نہ دو، (جس سے ان کا نقص لازم آئے)۔ قیامت کے دن لوگ بیہوش ہو جائیں گے اور سب سے پہلے مجھ کو ہوش آئے گا، اس وقت میں دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام عرش کا پایہ تھامے کھڑے ہیں۔" ❺

احکامِ الٰہی جو قرآن مجید میں نازل ہو رہے تھے، سرتاپا اہل کتاب کے ساتھ مدارات اور معاشرت کی ترغیب میں تھے:

﴿ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ ﴾ (۵/ المآئدة:۵)

"اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے۔"

عموماً ان کی قدر و منزلت کا خیال دلایا جاتا تھا:

﴿ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴾ (۲/ البقرة:۱۲۲)

❶ یہ واقعہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب (۲۹۳۵، ۶۰۲۴، ۶۰۳۰، ۶۲۵۶، ۶۳۹۵، ۶۴۰۱، ۶۹۲۷) میں مذکور ہے۔
❷ بخاری، کتاب اللباس، باب الفرق: ۵۹۱۷۔
❸ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اتیان الیهود النبی ﷺ حین قدم المدينة: ۳۹۴۲۔ (س)
❹ بخاری، کتاب الجنائز، باب من قام الجنازة يهودي: ۱۳۱۱۔۱۳۱۲۔ (س)
❺ بخاری، کتاب احاديث الانبياء، باب قول الله تعالیٰ: وان يونس لمن المرسلين...... : ۳۴۱۴۔

’’اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کا خیال کرو جو میں نے تم کو دیں اور یہ کہ میں نے تم کو تمام عالم پر فضیلت دی ہے۔‘‘

تبلیغ اسلام کی حیثیت سے جو کچھ اس وقت ان کے سامنے پیش کیا جاتا تھا صرف اس قدر تھا:

﴿ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:٦٤)

’’کہہ دو کہ اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جس کو ہم تم دونوں یکساں مانتے ہیں۔ وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجیں اور اس کا کسی کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کو چھوڑ کر کسی کو اپنا رب نہ بنائے تو اگر وہ منہ پھیر لیں تو تم کہہ دو کہ اچھا تم گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔‘‘

ان باتوں میں سے ایک بھی ان کے معتقدات اور مزعومات کے خلاف نہ تھی۔ لیکن ان تمام مہربانیوں اور اظہار لطف و مدارات کا جو صلہ تھا یہ تھا کہ انہوں نے ہر طرح سے اسلام کی خانہ براندازی کا عزم کر لیا۔ اسلام کی عظمت اور وقار کم کرنے کے لیے مشرکوں سے کہتے تھے کہ مذہب میں مسلمانوں سے تو تم ہی اچھے ہو:

﴿ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا۝ ﴾ (٤/ النسآء:٥١)

’’اور کافروں کی نسبت کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے یہ زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔‘‘

مذہب اسلام کی بے اعتباری پھیلانے کے لئے یہاں تک آمادہ ہوئے کہ مسلمان ہو کر پھر مرتد ہو جائیں، تاکہ لوگوں کو خیال ہو کہ اگر یہ مذہب سچا ہوتا تو اس کو قبول کر کے کوئی کیوں چھوڑ دیتا۔

﴿ وَقَالَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّھُمْ يَرْجِعُوْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۷۲)

’’اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو اترا ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس سے پھر جاؤ، شاید کہ وہ لوگ (مسلمان) بھی پھر جائیں۔‘‘

ان باتوں کے علاوہ اسلام کی بربادی کی ملکی تدبیریں اختیار کیں۔ وہ یہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کو جو قوت ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ انصار کے دو قبیلے ’’اوس‘‘ اور ’’خزرج‘‘ جو باہم لڑتے بھڑتے رہتے تھے، اسلام نے ان کو باہم متحد کر دیا ہے۔ ان دونوں کو اگر پھر لڑا دیا جائے تو اسلام خود بخود فنا ہو جائے گا۔ عرب میں پچھلی کینہ آوریوں کو تازہ کر دینا نہایت آسان کام تھا۔ ایک دفعہ دونوں قبیلوں کے بہت سے آدمی جلسہ میں بیٹھ کر بات چیت کر رہے تھے۔ چند یہودیوں نے اس صحبت میں جا کر جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑا۔ یہ وہ لڑائی تھی جس میں انصار کے یہ دونوں قبیلے آپس میں لڑے تھے اور اسی لڑائی نے ان کی تمام قوت برباد کر دی تھی۔ اس لڑائی

کے تذکرہ نے دونوں کو پرانے واقعے یاد دلائے اور دفعتاً عداوت کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔ لعن وطعن سے گزر کر تلواریں کھنچ گئیں، حسن اتفاق سے آنحضرت ﷺ کو خبر ہوگئی۔ آپ نے فوراً موقع پر پہنچ کر وعظ و پند سے دونوں فریق کو ٹھنڈا کیا۔ اس پر یہ آیت اتری: [1]

﴿ يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِن تُطِيعُوا فَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَٰبَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَٰنِكُمْ كَٰفِرِينَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۰۰)

''مسلمانو! اگر تم اہل کتاب کے بعض لوگوں کا کہا مانو گے تو وہ تم کو ایمان لانے کے بعد پھر کافر بنادیں گے۔''

منافقین کا ایک گروہ پہلے سے موجود تھا جو اگر چہ بظاہر مسلمان ہوگیا تھا لیکن درحقیقت اسلام کا سخت دشمن تھا۔ اس گروہ کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ یہودیوں نے اس کو نہایت آسانی سے درپردہ ملالیا اور ان کے ساتھ مل کر سازش شروع کی۔ اتفاق یہ کہ عبداللہ بن ابی پہلے سے بھی بنی نضیر کا حلیف اور ہم پیمان تھا۔

قریش نے بدر سے پہلے عبداللہ بن ابی کو لکھا تھا کہ ''مسلمانوں کو نکال دو ورنہ ہم آکر تمہارا استیصال کر دیں گے۔ لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی، جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے تو بدر کے بعد انہوں نے یہود کو خط لکھا:

انکم اهل الحلقة والحصون وانكم تقاتلن صاحبنا او لنفعلن كذا وكذا ولا يحول بيننا وبين خدم نسائكم شيء۔ [2]

''تم لوگوں کے پاس اسلحۂ جنگ اور قلعہ جات ہیں، تم ہمارے حریف (محمد ﷺ) سے لڑو ورنہ ہم تمہارے ساتھ یہ یہ کریں گے اور کوئی چیز ہم کو تمہاری عورتوں کے کڑوں تک پہنچنے سے روک نہ سکے گی۔''

ابوداؤد نے چونکہ بنونضیر کے ذکر میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے صرف بنونضیر کا نام لیا ہے، ورنہ قریش کا خط عام یہود کے نام تھا اور نتیجہ بھی عام تھا، اسی بنا پر محدث حاکم نے بنونضیر اور قینقاع دونوں کے واقعہ کو ایک ہی واقعہ خیال کیا ہے۔ غرض اب حالت یہ ہوگئی تھی کہ آنحضرت ﷺ راتوں کو گھر سے نکلتے تو یہودیوں کی وجہ سے جان کا خطرہ رہتا تھا۔ طلحہ بن براء ایک صحابی تھے، (انہوں نے انتقال کے وقت) وصیت کی کہ اگر میں رات کے وقت مروں تو آنحضرت ﷺ کو خبر نہ کرنا اس لئے کہ یہود کی طرف سے ڈر ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے آپ پر حادثہ گزر جائے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اصابہ میں ابوداؤد وغیرہ کی سند سے پورا واقعہ نقل کیا ہے۔ [3]

---

[1] اصابه فی تمییز الصحابة للحافظ ابن حجر العسقلانی، مطبوعه مصر، ج۱، ص:۸۸۔ [2] سنن ابی داود، کتاب الخراج باب فی خبر النضیر: ۳۰۰۴۔ (س) [3] دیکھواصابہ ترجمۃ طلحة بن براء قسم اول، ج۳، ص:۲۸۸۔

شوال ۲ھ غزوۂ بنی قینقاع

بدر کی فتح نے یہود کو زیادہ اندیشہ ناک کر دیا، ان کو علانیہ نظر آیا کہ اسلام اب ایک طاقت بنا جاتا ہے اور چونکہ قبائل یہود میں سب سے زیادہ جری اور بہادر بنو قینقاع تھے، [1] اس لئے سب سے پہلے انہی نے اعلان جنگ کی جرأت کی۔ آنحضرت ﷺ سے جو معاہدہ کیا تھا سب سے پہلے انہی نے اس کی عہد شکنی کی۔ ابن ہشام وطبری نے ابن اسحاق کی روایت سے عاصم بن قتادہ انصاری کی روایت نقل کی ہے:

ان بني قينقاع كانوا اول يهود نقضوا مابينهم وبين رسول الله وحاربوا فيما بين بدر واحدٍ۔ [2]

''بنو قینقاع پہلے یہود تھے جنہوں نے اس معاہدہ کو جوان میں اور آنحضرت ﷺ میں تھا توڑ ڈالا اور بدر اور احد کے درمیانی زمانہ میں مسلمانوں سے لڑائی کی۔''

ابن سعد نے غزوۂ بنو قینقاع کے ذکر میں لکھا ہے:

فلما كانت وقعة بدر اظهروا البغي والحسدو نبذوا العهد والمرة۔

''واقعہ بدر میں یہودیوں نے شورش اور حسد ظاہر کیا اور عہد کو توڑ ڈالا۔'' [3]

ایک اتفاقیہ سبب پیش آ گیا جس نے اس آگ کو اور بھڑکا دیا۔ ایک انصاری (کی بیوی) مدینہ کے بازار میں ایک یہودی کی دکان میں نقاب پوش آئی۔ یہودیوں نے اس کی بے حرمتی کی۔ ایک مسلمان یہ دیکھ کر غیرت سے بیتاب ہو گیا اور اس نے یہودی کو مار ڈالا اور یہودیوں نے مسلمان کو قتل کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ ''اللہ سے ڈرو، ایسا نہ ہو تم پر بھی بدر والوں کی طرح عذاب آئے۔'' بولے کہ ''ہم قریش نہیں ہیں، ہم سے معاملہ پڑے گا تو ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی اس کا نام ہے۔'' چونکہ ان کی طرف سے نقضِ عہد اور اعلان جنگ ہو گیا تھا مجبور ہو کر آنحضرت ﷺ نے لڑائی کی، وہ قلعہ بند ہوئے پندرہ دن تک محاصرہ رہا بالآخر اس پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ جو فیصلہ کریں گے، ان کو منظور ہو گا۔ عبداللہ بن ابی ان کا حلیف تھا اس نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ وہ جلاوطن کر دیے جائیں، [4] غرض وہ اذرعات میں جو شام کے علاقہ میں ہے، جلاوطن کر دیے گئے، یہ سات سو شخص تھے جن میں تین سو زرہ پوش تھے، یہ شوال ۲ھ کا واقعہ ہے۔

قتل کعب بن اشرف ربیع الاول ۳ھ

یہودیوں میں کعب بن اشرف ایک مشہور شاعر تھا، اس کا باپ اشرف جو قبیلہ طے سے تھا۔ مدینہ میں

---

[1] طبقات ابن سعد، ج۲، قسم اول، ص: ۱۹، (س) [2] ابن ہشام، ج۲، ص: ۵۶۔

[3] زرقانی، ج۲، ص: ۵۲۹۔ [4] عام ارباب سیر کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ان کو قتل کر دینا چاہتے تھے۔ عبداللہ بن ابی کے اصرار سے مجبور ہو گئے، لیکن سنن ابی داود، کتاب الخراج، باب في خبر النضير: ۳۰۰۴ میں جس طرح یہ واقعہ مذکور ہے، اس سے اس قیاس کی غلطی ثابت ہوتی ہے۔

بنونضیر کا حلیف ہو کر اس نے اس قدر عزت اور اعتبار پیدا کیا کہ ابورافع بن ابی الحقیق جو یہود کا مقتدا اور تاجر الحجاز جس کا خطاب تھا ❶ اس کی لڑکی سے شادی کی۔ کعب ❷ اس کے بطن سے پیدا ہوا، اس دوطرفہ رشتہ داری کی بنا پر کعب یہود اور عرب سے برابر کا تعلق رکھتا تھا اور شاعری کی وجہ سے قوم پر اس کا عام اثر تھا۔ رفتہ رفتہ دولت مندی کی وجہ سے تمام یہودیان عرب کا رئیس بن گیا، یہودی علما اور پیشوایان مذہب کی تنخواہیں مقرر کیں، آنحضرت ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے اور علمائے یہود اس سے ماہواریں لینے آئے تو اس نے ان لوگوں سے آنحضرت ﷺ کے متعلق رائے دریافت کی اور جب اپنا ہم خیال بنا لیا، تب ان کے مقررہ روزینے جاری کیے۔ ❸

اس کو اسلام سے سخت عداوت تھی۔ بدر کی لڑائی میں سرداران قریش مارے گئے تو اس کو نہایت صدمہ ہوا۔ تعزیت کے لئے مکہ گیا۔ کشتگانِ بدر کے پردرد مرثیے جن میں انتقام کی ترغیب تھی لوگوں کو جمع کر کے نہایت درد سے پڑھتا اور روتا اور رلاتا تھا۔ ابن ہشام نے ان واقعات کے ساتھ اشعار بھی نقل کیے ہیں اگرچہ اس قسم کے اشعار اکثر مصنوعی ہیں تاہم جہاں تک اس زمانہ کی زبان معلوم ہوتی ہے ہم ایک دو شعر نقل کرتے ہیں۔

طحنت رحی بدر لمهلك اهله	جنگ بدر کی چکی نے اہل بدر کو پیس ڈالا
و لمثل بدر تستهل وتدمع ،	بدر جیسے واقعات کے لئے رونا پیٹنا چاہیے
كم قد اصيب به من ابيض ماجد	کتنے شریف سپید و بارونق چہرے جن کے
ذی بهجة تأوی اليه الضُيَّع ،	یہاں اہل حاجت پناہ لیتے تھے مارے گئے

مدینہ میں واپس آیا تو آنحضرت ﷺ کی ہجو میں اشعار کہنا اور لوگوں کو آنحضرت ﷺ کے برخلاف برانگیختہ کرنا شروع کیا۔ ❹ عرب میں شاعری کا وہ اثر تھا جو آج یورپ میں بڑے بڑے ملکی مدبروں کی پرجوش تقریروں اور نامور اخبارات کی تحریروں کا ہوتا ہے۔ تنہا ایک شاعر قبیلہ کے قبیلہ میں شعر کے اثر سے آگ لگا دیتا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ مکہ میں چالیس آدمی لے کر گیا، وہاں ابوسفیان سے ملا اور اس کو بدر کے انتقام پر برانگیختہ کیا اور ابوسفیان سب کو لے کر حرم میں آیا۔ سب نے حرم کا پردہ تھام کر معاہدہ کیا کہ بدر کا انتقام لیں گے۔ ❺

❶ صحيح بخاری ، كتاب الجهاد ، باب قتل المشرك النائم: ۳۰۲۲۔ ❷ الخميس ، ص: ٤٦٤۔
❸ زرقانی، (جلد۲،ص:۹) بہ حوالہ ابن اسحاق وغیرہ۔ ❹ ابوداؤد میں ہے وكان كعب بن الاشرف يهجو النبی ﷺ ويحرض عليه كفار قريش (ابوداود ، كتاب الخراج ، باب كيف كان اخراج اليهود: ۳۰۰۰) (س) ابن سعد میں ہے: كان رجلا شاعرا يهجوا النبی ﷺ واصحابه ويحرض عليه۔ (تفسير ابن جرير طبری ، ج ٥ ، ص: ٧٩ میں ہے) ان كعب بن الاشرف انطلق الی المشركين من كفار قريش فاستجا شهم علی النبی ﷺ وامرهم ان يغزوه (س)
❺ خمیس ص: ۵۱۷ غالباً یہ وہی پہلا واقعہ ہے، ابن خمیس نے اس کے متعلق مزید تفصیل بیان کی ہے۔

اس پر اکتفا نہ کر کے قصد کیا کہ چپکے سے آنحضرت ﷺ کو قتل کرا دے۔ علامہ یعقوبی اپنی تاریخ میں بنونضیر کے واقعہ میں لکھتے ہیں: كعب بن الاشرف اليهودي الذي اراد ان يمكر رسول الله ﷺ۔

''کعب بن اشرف یہودی جس نے آنحضرت ﷺ کو دھوکے سے قتل کر دینا چاہا۔''

اس روایت کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو حافظ ابن حجر نے فتح الباری ❶ میں (ذکر کعب بن اشرف) میں عکرمہ کی سند سے نقل کی ہے کہ کعب نے آنحضرت ﷺ کو دعوت میں بلایا اور لوگوں کو متعین کر دیا کہ جب آپ ﷺ تشریف لائیں تو دھوکے سے آپ کو ہلاک کر دیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے گو لکھا ہے کہ اس روایت کی سند میں ضعف ہے لیکن جب قرائن اور دیگر شواہد موجود ہیں تو یہ ضعف رفع ہو جاتا ہے۔

فتنہ انگیزی کا زیادہ اندیشہ ہوا تو آپ نے بعض صحابہ سے شکایت کی اور آپ کی مرضی سے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے بمشورۂ رؤسائے اوس ❷ جا کر اس کو ربیع الاول ۳ ھ میں قتل کر دیا۔ اربابِ روایت نے لکھا ہے کہ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی خدمت میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ ''ہم کو کچھ کہنے کی اجازت دی جائے۔'' اربابِ سیر نے اس کے معنی یہ لگائے ہیں کہ انہوں نے جھوٹ باتیں کہنے کی اجازت مانگی اور آنحضرت ﷺ نے اجازت دے دی کیونکہ ''الحرب خدعة'' یعنی لڑائی میں دھوکا دینا جائز ہے۔ لیکن بخاری کی روایت میں صرف یہ لفظ ہے:

فاذن لی ان اقول ''ہم کو اجازت دی جائے کہ ہم گفتگو کریں۔''

اس سے غلط گوئی کی اجازت کہاں نکلتی ہے؟ (لیکن جو گفتگو ہوئی اس سے کعب اور عموماً یہود کے اخلاق اور دلی خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہم نے محمد ﷺ کو پناہ دے کر تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لیا اور ہم سے بار بار صدقہ مانگا جاتا ہے اب تمہیں سے کچھ رکھ کر قرض لینا ہے۔'' کعب نے کہا: ''تم خود محمد ﷺ سے اکتا جاؤ گے، اچھا قرض کے لئے اپنی بیویوں کو رہن رکھو۔'' حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تمہارے اس حسن و جمال کے سبب سے ہم کو اپنی بیویوں پر وفاداری کا یقین نہیں۔'' اس نے کہا: ''اچھا اپنے بچوں کو گروی رکھو۔'' انہوں نے کہا: ''اس سے تو تمام عرب میں ہماری بدنامی ہوگی ہم اپنے ہتھیار گروی رکھیں گے اور تم جانتے ہو آج کل ان کی جیسی ضرورت ہے۔'' ❸

صحیح بخاری میں جو روایت ہے اس میں قتل کا واقعہ اس طرح منقول ہے کہ ان لوگوں نے دوستانہ طریقہ سے اس کو گھر سے باہر بلایا پھر بال سونگھنے کے بہانہ سے اس کی چوٹی پکڑ لی اور قتل کر ڈالا۔ ❹ لیکن روایت میں یہ مذکور نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ان باتوں کی اجازت دی تھی۔ اس وقت تک عرب میں ان طریقوں سے قتل کرنا معیوب بات نہ تھی، آگے چل کر نہایت مفصل طور سے ایک مستقل عنوان میں یہ بحث آئے گی کہ

---

❶ ج۷، ص: ۲۵۹، (س) ❷ ابن سعد، مغازی، ص: ۲۱۔

❸ زرقانی، ج۲، ص: ۱۳ وصحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل کعب بن الاشرف: ۴۰۳۷ (س)

❹ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل کعب بن الاشرف: ۴۰۳۷۔ (س)

آنحضرت ﷺ نے کس طرح تدریج کے ساتھ عرب کے ان طریقوں کی اصلاح کی۔

غزوۂ بنو نضیر ربیع الاول ۴ھ

حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ نے قبیلہ عامر کے (جو) دو آدمی قتل کر دیے تھے اور ان کا خون بہا اب تک واجب الادا تھا اور جس کا ایک حصہ معاہدہ کی رو سے یہود بنی نضیر پر واجب الادا تھا۔ اس کے مطالبہ [1] کے لیے آنحضرت ﷺ بنو نضیر کے پاس تشریف لے گئے۔ انہوں نے قبول کیا۔ لیکن در پردہ یہ سازش کی کہ ایک شخص چپکے سے بالا خانہ پر چڑھ کر آنحضرت ﷺ پر پتھر گرا دے۔ اتفاق سے اس وقت آپ ﷺ بالا خانہ کی دیوار کے سایہ میں کھڑے تھے۔

عمرو بن حجاش ایک یہودی اس ارادہ سے کوٹھے پر چڑھا۔ آپ ﷺ کو اس کے ارادہ کا حال معلوم ہو گیا اور آپ فوراً مدینہ واپس چلے آئے۔ [2]

اوپر گزر چکا ہے کہ قریش نے بنو نضیر کو کہلا بھیجا تھا کہ محمد ﷺ کو قتل کر دو ورنہ ہم خود آ کر تمہارا بھی استیصال کر دیں گے۔ بنو نضیر پہلے سے اسلام کے دشمن تھے۔ قریش کے پیغام نے ان کو اور زیادہ آمادہ کیا۔ بنو نضیر نے آنحضرت ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ تیس آدمیوں کو لے کر آئیں، ہم بھی اپنے احبار کو لے کر آئیں گے۔ آپ کا کلام سن کر اگر ہمارے احبار آپ کی تصدیق کریں گے تو ہم کو بھی کچھ عذر نہ ہوگا۔ چونکہ وہ بغاوت کی تیاری کر چکے تھے، آپ ﷺ نے کہلا بھیجا کہ جب تک تم ایک معاہدہ نہ لکھ دو میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ آپ یہود بنی قریظہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے تجدید معاہدہ کی درخواست کی، انہوں نے تعمیل کی۔ بنو نضیر کے لئے یہ نظیر موجود تھی کہ ان کے برادرانِ دینی نے معاہدہ لکھ دیا ہے۔ لیکن وہ کسی طرح معاہدہ کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ [3] بالآخر انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپ تین آدمی لے کر آئیں، ہم بھی تین عالم ساتھ لے کر آتے ہیں یہ علما اگر آپ پر ایمان لائیں گے تو ہم بھی لائیں گے۔ آپ نے منظور فرمایا لیکن راہ میں آپ کو ایک صحیح ذریعہ سے معلوم ہوا کہ یہود تلواریں باندھ کر تیار ہیں کہ جب آپ تشریف لائیں تو آپ کو قتل کر دیں۔ [4]

---

[1] بنو نضیر سے آنحضرت ﷺ نے دیت کے متعلق جو گفتگو کی اس کی دو تشریحیں کی گئی ہیں۔ ایک تشریح تو وہ ہے جس کو مصنف نے اختیار فرمایا ہے۔ دوسری تشریح یہ ہے کہ حضور ﷺ نے بنو نضیر سے جو گفتگو فرمائی تھی اس کا ماحصل یہ ہے کہ قبیلہ عامر کو دیت کس طرح ادا کی جائے اور ان کے یہاں دیت کا دستور کیا ہے؟ بنو نضیر اور قبیلۂ عامر کے باہم تعلقات اچھے تھے اس لئے ان سے اس مسئلہ میں گفتگو قرینِ قیاس بھی ہے۔ (سیرت حلبیہ، جلد۲، ص: ۲۷۷) (س) [2] یہ روایت ابن ہشام، (ج ۲، ص: ۱۴۶) وغیرہ میں مذکور ہے، زرقانی نے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے جو صحیح ترین مغازی ہے، یہ عبارت نقل کی ہے، وکانوا قد دسّوا الی قریش فی قتالہ ﷺ فحضوھم علی القتال ودلوھم علی العورۃ (زرقانی، ج ۲، ص: ۹۳) ''یعنی ان لوگوں نے قریش سے درپردہ سازش کر کے ان کو آمادۂ جنگ کیا اور ان کو مخفی مواقع بتائے۔''

[3] یہ تمام تفصیل سنن ابی داؤد، (کتاب الخراج والامارۃ، باب فی خبر النضیر: ۳۰۰۴۔ (س)) میں ہے، تعجب ہے کہ ارباب سیرت ابوداؤد کی اس روایت سے بالکل بے خبر ہیں۔ (ابوداؤد میں تیس آدمیوں کا ذکر ہے۔)

[4] فتح الباری واقعہ غزوۃ بنو نضیر، ج ۷، ص: ۲۵۵۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بنونضیر کی سرکشی کے مختلف اسباب تھے۔ وہ نہایت مضبوط قلعوں میں پناہ گزین تھے۔ جن کا فتح کرنا آسان نہ تھا، اس کے ساتھ عبداللہ بن ابی نے کہلا بھیجا تھا کہ ''تم اطاعت نہ کرنا بنوقریظہ تمہارا ساتھ دیں گے اور میں دو ہزار آدمی لے کر تمہاری اعانت کروں گا۔'' قرآن مجید میں ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۭ ﴾

(۵۹/ الحشر:۱۱)

''تم نے دیکھا! منافق اپنے کافر بھائیوں سے کہتے ہیں کہ تم نکلو گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے اور ہم تمہارے باب میں کسی کا کہنا نہ مانیں گے اور اگر تم سے کوئی لڑا تو ہم بھی تمہاری مدد کو آئیں گے۔''

لیکن بنونضیر کے تمام خیالات غلط نکلے، بنوقریظہ نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور منافق علانیہ اسلام کے مقابلہ میں نہیں آ سکتے تھے۔

آنحضرت ﷺ نے پندرہ دن تک ان کا محاصرہ کیا، قلعہ کے گرد جو ان کے نخلستان تھے ان کے چند درخت کٹوا دیے، سہیلی نے روض الانف میں لکھا ہے کہ سب نخلستان نہیں کاٹا گیا بلکہ صرف ''لیـــنة'' جو ایک خاص قسم کی کھجور ہے اور عرب کی عام خوراک نہیں ہے اس کے درخت کٹوا دیے گئے تھے، قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر ہے:

﴿ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَاۗىِٕمَةً عَلٰٓي اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ ﴾

(۵۹/ الحشر:۵)

''تم نے لینۃ کے جو درخت کٹوائے اور جس قدر قائم رہنے دیئے سب اللہ کے حکم سے تھا۔ تاکہ اللہ فاسقوں کو رسوا کرے۔''

ممکن ہے کہ درختوں کے جھنڈ سے کمین گاہ کا کام لیا جاتا ہو، اس لئے وہ صاف کرا دیے گئے کہ محاصرہ میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ ❶

(گزشتہ سے پیوستہ) فتح الباری میں یہ روایت ابن مردویہ سے نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ صحیح بخاری سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنونضیر نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ اس قسم کی عیاری کا ارادہ کیا تھا بخاری، کتاب المغازی میں ترجمۃ الباب یہ ہے (بـــاب حـديـث بني النضير ومخرج رسول اللهﷺ اليهم في دية الرجلين وما ارادوا من الغدر برسول اللهﷺ، ج ۲، ص:۵۷۴۔

❶ مصنف کے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک درخت وغیرہ میدان جنگ میں اسی وقت کاٹے جاتے ہیں، جب کہ کاٹے بغیر چارہ کار نہ ہو۔ محدثین نے امام احمد رحمہ اللہ کا یہ قول اسی واقعہ کے ضمن میں لکھا ہے۔ نیز اس موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ اسحاق کا قول ہے اگر دشمن درختوں کی آڑ میں ہو تو ان میں آگ لگا دینا سنت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان ائمہ کے نزدیک اس موقع پر درخت کا کاٹنا جنگی ضرورت کا اقتضا تھا۔ عمدۃ القاری، جلد ۸، ص:۱۹۱، (س)

بالآخر بنونضیر اس شرط پر راضی ہوئے کہ جس قدر مال واسباب اونٹوں پر لے جاسکیں لے جائیں اور مدینہ سے باہر نکل جائیں۔ چنانچہ سب گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر نکل گئے، ان میں سے معزز رؤسا، مثلاً: سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن الربیع، حیی بن اخطب خیبر چلے گئے، وہاں لوگوں نے ان کا اس قدر احترام کیا کہ خیبر کا رئیس تسلیم کر لیا [1] اس واقعہ کو اس غرض سے یاد رکھنا چاہیے کہ یہ غزوۂ خیبر کی داستان کا دیباچہ ہے۔ بنونضیر اگرچہ وطن چھوڑ کر نکلے لیکن اس شان سے نکلے کہ جشن کا دھوکا ہوتا تھا، اونٹوں پر سوار تھے، ساتھ ساتھ باجا بجتا جاتا تھا، مطربہ عورتیں دف بجاتی اور گاتی تھیں۔ عروہ بن الورد عبسی مشہور شاعر کی بیوی کو یہود نے خرید لیا تھا۔ وہ بھی ساتھ ساتھ تھی۔ اہل مدینہ کا بیان ہے کہ اس سروسامان کی سواری کبھی ان کی نظر سے نہیں گزری تھی [2] ہتھیاروں کا ذخیرہ جوان لوگوں نے چھوڑا، اس میں پچاس زرہیں، پچاس خود اور تین سو چالیس تلواریں تھیں۔

ان کے جانے کے بعد یہ جھگڑا پیش آیا کہ انصار کی اولاد جنہوں نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا اور یہودی ان کو اتحاد مذہب کی وجہ سے ساتھ لئے جاتے تھے، انصار نے ان کو روک لیا کہ ہم ان کو نہ جانے دیں گے اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری:

﴿لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۵٦)

''یعنی مذہب میں زبردستی نہیں ہے۔''

ابوداؤد نے کتاب الجہاد ''باب فی الاسیر یکرہ علی الاسلام'' کے عنوان کے نیچے اس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے نقل کیا ہے۔ [3]

[1] طبری، ج ۳، ص: ۱٤٥۲۔ [2] یہ تفصیل طبری میں ہے۔ ج ۳، ص:۱۴۵۲ (س)

[3] ابو داود: ٢٦٨٢۔

۵ھ

غزوۂ مریسیع، واقعۂ افک وغزوۂ احزاب

قریش اور یہود کی متفقہ سازش نے اب مکہ سے لے کر مدینہ تک آگ لگادی، جس قدر قبائل تھے سب نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے انمار اور ثعلبہ نے یہ ارادہ کیا۔ لیکن آنحضرت ﷺ کو خبر ہوگئی۔ ۱۰ محرم ۵ ھ کو آپ مدینہ سے چار سو صحابہ کو لے کر نکلے اور ذات الرقاع تک تشریف لے گئے۔ لیکن آپ کی آمد سن کر وہ پہاڑوں میں بھاگ گئے۔ [1] ربیع الاول ۵ ھ میں یہ خبر آئی کہ دومتہ الجندل میں کفار کی ایک عظیم الشان فوج جمع ہو رہی ہے۔ آنحضرت ﷺ ایک ہزار کی جمعیت لے کر مدینہ سے نکلے، ان کو خبر ہوئی تو وہ بھاگ گئے۔

غزوۂ مریسیع [2] یا بنی مصطلق شعبان ۵ ھ

خزاعہ ایک قبیلہ تھا جو قریش کا حلیف اور ہم عہد تھا۔ قریش کو ایک زمانہ میں یہ خیال آیا کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں، اس لئے ہم کو اوروں سے ہر باب میں ممتاز ہونا چاہیے۔ حج کا ایک بڑا رکن عرفات کے میدان میں قیام کرنا ہے لیکن چونکہ یہ میدان حرم کی حدود سے باہر ہے۔ سو قریش نے یہ قاعدہ قرار دیا کہ لوگ عرفات جائیں، لیکن ہم کو عرفات کے بجائے مزدلفہ میں ٹھہرنا چاہیے جو حدود حرم کے اندر ہے۔ اسی قسم کی اور امتیازی باتیں قائم کیں، ان خصائص کی بنا پر اپنا لقب احمس رکھا، لیکن اس قدر فیاضی کی کہ جو لوگ ان پابندیوں کو قبول کر لیتے تھے، ان کو بھی یہ لقب دے دیتے اور ان سے رشتہ ناتہ کرتے تھے۔ قبیلہ خزاعہ [3] کو بھی یہ شرف عطا کیا تھا۔

خزاعہ کا ایک خاندان بنو المصطلق کہلاتا تھا، وہ مقام مریسیع میں جو مدینہ منورہ سے ۹ منزل ہے آباد تھا۔ اس خاندان کا رئیس حارث بن ابی ضرار تھا، اس نے قریش کے اشارہ سے یا خود مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں، آنحضرت ﷺ کو یہ خبر ہوئی تو مزید تحقیقات کے لئے زید بن خصیب کو بھیجا۔ انہوں نے واپس آکر خبر کی تصدیق کی۔ آپ نے صحابہ کو تیاری کا حکم دیا۔ ۲ شعبان کو فوجیں مدینہ سے روانہ ہوئیں۔ مریسیع میں خبر پہنچی تو حارث کی جمعیت منتشر ہوگئی اور وہ خود بھی کسی طرف نکل گیا۔ لیکن مریسیع میں جو لوگ آباد تھے۔ انہوں نے صف آرائی کی اور دیر تک جم کر تیر برساتے رہے۔ مسلمانوں نے دفعتاً ایک ساتھ حملہ کیا تو ان کے

---

[1] ابن سعد، غزوۃ ذات الرقاع، ص: ٤٣ (صحیح بخاری سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع خندق کے بعد واقع ہوا، صلوٰۃ الخوف سب سے پہلے اسی غزوہ میں ادا کی گئی) دیکھیں صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۂ ذات الرقاع: ۴۱۲۵، ۴۱۲۷۔

[2] ابن اسحاق نے جس کی پیروی طبری اور ابن ہشام نے کی ہے اس غزوہ کو ٦ ھ میں ذکر کیا ہے، موسیٰ بن عقبہ کی روایت ہے کہ ۵ ھ میں واقع ہوا۔ امام بخاری نے بھی صحیح میں اس اختلاف کا ذکر کیا ہے، لیکن غلطی سے ۵ ھ کے بجائے ابن عقبہ کی طرف ۴ ھ کی نسبت کی ہے۔ علامہ ابن حجر نے فتح الباری، (ج ۷، ص: ۳۳۲) میں بیہقی، حاکم، موسیٰ بن عقبہ اور ابو معشر کی روایتوں سے ۵ ھ کو ترجیح دی ہے، ابن سعد نے بھی ۵ ھ ہی لکھا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھو فتح الباری۔ [3] یہ واقعات ابن ہشام نے تفصیل سے لکھے ہیں۔ (ج ۱، ص: ٦٧)

پاؤں اکھڑ گئے۔ (۱۰ آدمی مارے گئے اور باقی گرفتار ہو گئے جن کی تعداد تقریباً ۶۰۰ تھی، غنیمت میں دو ہزار اونٹ اور چار پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں)۔

یہ ابن سعد کی روایت ہے، صحیح بخاری [1] اور صحیح مسلم [2] میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بنوالمصطلق پر اس حالت میں حملہ کیا کہ وہ بالکل بے خبر اور غافل تھے اور اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے۔ ابن سعد [3] نے اس روایت کو بھی نقل کیا ہے لیکن لکھا ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے۔ اس پر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا کہ صحیحین کی روایت پر سیرت کی روایتوں کو ترجیح نہیں ہو سکتی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ صحیحین کی روایت بھی اصولِ حدیث کی رو سے قابل حجت نہیں ہے کہ اس روایت کا سلسلہ نافع تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور جنگ میں شریک ہونا تو ایک طرف، نافع نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا بھی نہ تھا۔ اس لئے یہ روایت اصطلاحِ محدثین میں منقطع ہے۔ [4]

یہ لڑائی ایک معمولی لڑائی تھی لیکن اتفاق سے بعض شہرت پذیر واقعات ایسے پیش آئے جن کی وجہ سے اس لڑائی کا خاص عنوان قائم کیا جاتا ہے۔ اس جنگ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ غنیمت کے لالچ سے بہت سے منافقین بھی فوج میں داخل ہو گئے تھے۔ یہ بد باطن ہر موقع پر فتنہ گری کی کوشش کرتے۔ ایک دن چشمہ سے پانی لینے پر ایک مہاجر اور انصاری میں جھگڑا ہو گیا۔ انصاری نے عرب کے قدیم طریقہ پر ''یاللانصار'' کا نعرہ مارا (انصار کی جے)۔ مہاجر نے بھی ''یا معاشر المہاجرین'' کے نعرہ سے جواب دیا، نعرے سن کر قریش و انصار نے تلواریں کھینچ لیں اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے۔ لیکن چند لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ عبداللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا۔ اس کو موقع ہاتھ آیا۔ انصار سے مخاطب ہو کر کہا: ''تم نے یہ بلا خود مول لی، مہاجرین کو تم نے بلا کر اتنا کر دیا کہ اب وہ خود تم سے برابر کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وقت اب بھی ہاتھ سے نہیں گیا ہے تم دستگیری سے ہاتھ اٹھا لو تو وہ خود یہاں سے نکل جائیں گے۔''

یہ واقعہ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے آ کر کہا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ غصہ سے بیتاب ہو گئے اور عرض کی کہ کسی کو ارشاد ہو اس منافق کی گردن اڑا دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ کیا تم یہ چرچا پسند کرتے ہو کہ محمد ﷺ اپنے ساتھ والوں کو قتل کر دیا کرتے ہیں۔'' [5]

---

[1] کتاب العتق، باب من ملك من العرب: ۲۵٤۱۔ [2] کتاب الجهاد والسير، باب جواز الاغارة على الكفار: ٤٥١٩۔ [3] طبقات ابن سعد، ج۲، مغازی ص: ٤٥ و ٤٦۔ [4] معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے صرف آغاز سند کو ملاحظہ فرما کر اس روایت کو منقطع قرار دیا ہے ورنہ متن حدیث کے بعد تصریح ہے کہ حدثني هذا الحديث عبدالله بن عمر وكان في ذالك الجيش یعنی نافع نے اس روایت کو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سنا جو اس لڑائی میں شریک تھے (مسلم، کتاب الجهاد: ٤٥١٩ وبخاری، کتاب العتق: ۲۵٤۱) اس تصریح کے بعد یہ روایت منقطع نہیں باقی رہتی ہے۔ (س)۔ [5] دیکھو صحیح بخاری، کتاب التفسير، تفسير سورة منافقين، باب قوله: سواء عليهم استغفرت لهم : ٤٩٠٥۔

یہ عجیب بات ہے کہ عبداللہ بن اُبی جس درجہ کا منافق اور دشمنِ اسلام تھا، اس کے صاحبزادے کہ ان کا نام بھی عبداللہ تھا، اسی قدر اسلام کے جان نثار تھے۔ آنحضرت ﷺ کی ناراضی کی بناپر یہ خبر پھیل گئی تھی کہ آپ عبداللہ بن ابی کے قتل کا حکم دینے والے ہیں۔ یہ سن کر وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ دنیا جانتی ہے کہ میں باپ کا کس قدر خدمت گزار ہوں لیکن اگر یہ مرضی ہے تو مجھ ہی کو حکم ہو میں ابھی اس کا سر کاٹ لاتا ہوں ایسا نہ ہو کہ آپ کسی اور کو حکم دیں اور میں غیرت ومحبت کے جوش میں آ کر قاتل کو قتل کر دوں۔'' آپ ﷺ نے اطمینان دلایا کہ قتل کی بجائے میں اس پر مہربانی کروں گا۔ [1] یہ ارشاد اس طرح پورا ہوا کہ جب وہ مرا تو کفن کے لئے آپ نے خود پیراہن مبارک عنایت فرما کر، جنازہ کی نماز پڑھائی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دامن تھام لیا کہ منافق کے جنازہ کی نماز پڑھتے ہیں لیکن دریائے کرم کا بہاؤ کون روک سکتا تھا۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ

لڑائی میں جو لوگ گرفتار ہوئے ان میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں، جو حارث بن ابی ضرار کی صاحبزادی تھیں۔ ابن اسحاق کی روایت ہے جو بعض حدیث کی کتابوں میں بھی ہے کہ تمام اسیرانِ جنگ لونڈی غلام بنا کر تقسیم کر دیے گئے۔ حضرت جویریہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئیں انہوں نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ ''مکاتبت کرلو، یعنی مجھ سے کچھ روپیہ لے کر چھوڑ دو۔'' حضرت ثابت نے منظور کیا، حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے پاس روپیہ نہ تھا چاہا کہ لوگوں سے چندہ مانگ کر یہ رقم ادا کر دیں۔ آنحضرت ﷺ کے پاس بھی آئیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی وہاں موجود تھیں۔

ابن اسحاق نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی روایت کی ہے جو یقیناً ان کی ذاتی رائے ہے کہ چونکہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نہایت شیریں ادا تھیں۔ میں نے ان کو آنحضرت ﷺ کے پاس جاتے دیکھا تو سمجھی کہ آنحضرت ﷺ پر بھی ان کے حسن وجمال کا وہی اثر ہوگا جو مجھ پر ہوا۔ غرض وہ آنحضرت ﷺ کے پاس گئیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر اس سے بہتر برتاؤ تمہارے ساتھ کیا جائے تو قبول کروگی۔'' انہوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہاری طرف سے میں روپیہ ادا کر دوں اور تم کو اپنی زوجیت میں لے لوں۔'' جویریہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''میں نے منظور کیا۔'' [2] آپ ﷺ نے تنہا وہ تمام رقم ادا کر دی اور ان سے شادی کرلی۔

یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جو ابن ہشام اور ابوداؤد دونوں میں موجود ہے۔ لیکن دوسرے طریق روایت میں اس سے زیادہ واضح بیان مذکور ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا باپ (حارث) رئیس عرب تھا۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا جب گرفتار ہوئیں تو حارث آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میری بیٹی کنیز نہیں بن سکتی، میری شان

---

[1] یہ تمام واقعات نہایت تفصیل سے ابن سعد (ج ۲ ص: ۴۵ و مابعد اور طبری (ج ۳ ص: ۱۵۱۵) نے لکھے ہیں اور صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں بھی مذکور ہیں۔ [2] ابو داود، کتاب العتق، باب فی بیع المکاتب الخ: ۳۹۳۱۔

اس سے بالاتر ہے، آپ اس کو آزاد کر دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ خود حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔'' حارث نے جا کر حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ محمد ﷺ نے تیری مرضی پر رکھا، دیکھنا مجھ کو رسوا نہ کرنا۔ انہوں نے کہا: ''میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہنا پسند کرتی ہوں''۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان سے شادی کر لی۔

یہ روایت حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اصابہ میں ابن مندہ [1] سے نقل کر کے لکھا ہے کہ ''اس کی سند صحیح ہے'' ابن سعد میں بھی یہ روایت مذکور ہے ابن سعد نے طبقات میں یہ روایت بھی کی ہے کہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے والد نے ان کا زرفدیہ ادا کیا اور جب وہ آزاد ہو گئیں تو آنحضرت ﷺ نے ان سے نکاح کیا۔

اس نکاح کا اثر

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے جب آپ ﷺ نے نکاح کیا تو تمام اسیران جنگ جو اہل فوج کے حصہ میں آ گئے تھے، دفعتاً رہا کر دیے گئے۔ فوج نے کہا کہ جس خاندان میں رسول اللہ ﷺ نے شادی کر لی وہ غلام نہیں ہو سکتا۔ [2]

واقعۂ افک

واقعہ افک یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر منافقین نے جو تہمت لگائی تھی وہ اسی لڑائی سے واپسی میں پیش آیا تھا۔ احادیث اور سیر کی کتابوں میں اس واقعہ کو نہایت تفصیل سے نقل کیا ہے۔ لیکن جس واقعہ کی نسبت قرآن مجید میں صاف مذکور ہے کہ سننے کے ساتھ لوگوں نے یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ ''بالکل افترا ہے'' اس کو تفصیل کے ساتھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ البتہ اس واقعہ سے یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ محض جھوٹ اور بیہودہ خبر بھی کس طرح پھیل جاتی ہے۔ یہ خبر اصل میں منافقین نے مشہور کی تھی۔ لیکن بعض مسلمان بھی دھوکے میں آ گئے جن کو تہمت لگانے کی سزا دی گئی۔ جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔

آج کل کے عیسائی مؤرخوں نے بھی قدیم منافقوں کی طرح اس واقعہ کو اس جوش مسرت سے لکھا ہے کہ خود بخود ان کے قلم میں روانی آ گئی ہے۔ لیکن ہم ان سے توقع بھی یہی کر سکتے تھے۔ یہ تمام لڑائیاں اس عام جنگ کا پیش خیمہ تھیں جو تمام عرب اور یہود متفقہ قوت سے کرنا چاہتے تھے۔ اور جس کو جنگ احزاب کہتے ہیں۔

غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق یعنی تمام عرب کی متحدہ جنگ ذوالقعدہ ۵ ھ

بنونضیر [3] مدینہ سے نکل کر خیبر پہنچے تو انہوں نے ایک نہایت عظیم الشان سازش شروع کی۔ ان کے

---

[1] یہ ابوقلابہ کی مرسل روایت ہے ابن مندہ کی روایت دوسرے مفہوم کی اس سے قبل متصلاً مذکور ہے غالباً۔ مصنف کو اشتباہ اسی لیے ہوا۔

[2] سنن ابی داود، کتاب العتق (باب فی بیع المکاتب اذا فسخت المکاتبة:۳۹۳۱) (س) [3] طبری میں ہے، کان الذی جر غزوة رسول اللّٰہ الخندق فیما قیل ماکان من اجلاء رسول اللّٰہ بنی النضیر عن دیارھم (ج۳،ص:۱۴۶۳) مغازی کی سب سے زیادہ معتبر کتاب مغازی موسیٰ بن عقبہ ہے، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری (ج۷،ص:۳۰۱) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رؤسا میں سے سلام بن ابی الحقیق، حُیَی بن اخطب، کنانہ بن الربیع وغیرہ مکہ معظمہ گئے اور قریش سے مل کر کہا ''اگر ہمارا ساتھ دو تو اسلام کا استیصال کیا جا سکتا ہے''۔ قریش اس کے لئے ہمیشہ تیار تھے، قریش کو آمادہ کر کے یہ لوگ قبیلہ غطفان کے پاس گئے اور ان کو لالچ دیا کہ خیبر کا نصف محاصل ان کو ہمیشہ دیا کریں گے۔ (اور یہ پہلے سے بھی تیار تھے، قصہ غزوہ معونہ میں یاد ہوگا کہ عامر رئیس قبیلہ نے اسی غطفان کے حملہ کی دھمکی دی تھی، ❶ اس لئے یہ فوراً تیار ہو گئے)۔ بنو اسد غطفان کے حلیف تھے، غطفان نے ان کو لکھ بھیجا کہ تم بھی فوجیں لے کر آؤ۔ قبیلہ بنو سلیم سے قریش کی قرابت تھی، اس تعلق سے انہوں نے بھی ساتھ دیا۔ بنو سعد کا قبیلہ یہود کا حلیف تھا، اس بنا پر یہود نے ان کو بھی آمادہ کیا۔ غرض تمام قبائلِ عرب سے لشکر گراں تیار ہو کر مدینہ کی طرف بڑھا۔ فتح الباری میں تصریح ہے کہ ان کی تعداد (دس ہزار) تھی۔ ❷

یہ لشکر تین مستقل فوجوں ❸ میں تقسیم کیا گیا۔ غطفان کی فوجیں ❹ عیینہ بن حصن فزاری کی کمان میں تھیں جو عرب کا مشہور سردار تھا۔ بنو اسد طلیحہ کی افسری میں تھے اور ابوسفیان بن حرب سپہ سالارِ کل تھا۔ ❺

آنحضرت ﷺ نے یہ خبریں سنیں تو صحابہ سے مشورہ کیا، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایرانی ہونے کی وجہ سے خندق کے طریقہ سے واقف تھے۔ انہوں نے رائے دی کہ کھلے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنا مصلحت نہیں۔ ایک محفوظ مقام میں لشکر جمع کیا جائے اور گرد خندق کھود لی جائے۔ خندق دراصل فارسی لفظ کندہ کا معرب ہے جس کے معنی کھودے گئے کے ہیں، کاف، ''خ'' سے اور ہائے ہوز قاف سے بدل گئی ہے جس طرح پیادہ سے بیدق ہو گیا ہے۔

تمام لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور خندق کھودنے کے آلات مہیا کیے گئے۔

مدینہ میں تین جانب مکانات اور نخلستان کا سلسلہ تھا، جو شہر پناہ کا کام دیتا تھا، صرف شامی رخ کھلا ہوا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے تین ہزار صحابہ کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر اسی مقام میں خندق کی تیاریاں شروع کیں۔ یہ ذوقعدہ ۵ھ کی ۸ تاریخ تھی۔

(گزشتہ سے پیوستہ) غزوۂ احزاب کے ذکر میں اس کی یہ عبارت نقل کی ہے: خرج حیی بن اخطب بعد قتل بنی النضیر الی مکة یحرض قریشا علی حرب رسول اللہ ﷺ وخرج کنانة بن الربیع بن ابی الحقیق یسعی فی بنی غطفان ویحضهم علی قتال رسول اللہ ﷺ علی ان لهم نصف تمر خیبر فاجابه عیینة بن حصن بن حذیفة بن بدر الفزاری الی ذلك وکتبوا الی حلفائهم من بنی اسد فا قبل الیهم طلحة بن خویلد فیمن اطاعه۔ الخ

❶ صحیح بخاری، کتاب المغازی، غزوة الرجیع: ۴۰۹۱۔ ❷ طبقات ابن سعد، ج ۲، قسم اول، ص: ۴۷، و فتح الباری، ج ۷، ص: ۳۰۱ (س) ❸ طبقات ابن سعد، ج ۲، قسم اول، ص: ۴۷۔ (س) ❹ افسروں کی یہ تفصیل پورے لشکر کی نہیں ہے بلکہ مصنف نے صرف مشہور قبائل کے فوجی افسروں کا تذکرہ کر دیا ہے اس سلسلہ میں مؤرخین نے دوسرے قبائل کے فوجی افسروں کے نام بھی بتائے ہیں چنانچہ بنو سلیم سفیان بن عبد شمس کی افسری میں تھے، قبیلہ اشجع کا سردار مسعود بن رخیلہ تھا بنو مرہ حارث بن عوف کے ماتحت تھے، حارث اور طلیحہ بعد کو مسلمان ہو گئے تھے، زرقانی، ج ۲، ص: ۱۲۱؛ طبقات ابن سعد، ج ۲، قسم اول، ص: ۴۷ وفتح الباری، ج ۷، ص: ۳۰۱ (س) ❺ طبقات ابن سعد، ج ۲، قسم اول، ص: ۴۷۔ (س)

آنحضرت ﷺ نے حدود خود قائم کیے۔ داغ بیل ڈال کر دس دس آدمیوں پر دس دس گز زمین تقسیم کی، خندق کا عمق پانچ گز رکھا گیا، بیس دن میں ۳ ہزار متبرک ہاتھوں سے انجام پائی۔

یاد ہوگا کہ جب مسجد نبوی بن رہی تھی تو سرورِ دو جہان ﷺ مزدوروں کی صورت میں تھے، آج بھی وہی عبرت انگیز منظر ہے۔ جاڑے کی راتیں ہیں، تین تین دن کا فاقہ ہے، مہاجرین اور انصار اپنی پیٹھوں پر مٹی لا دلا د کر پھینکتے ہیں اور جوش محبت میں ہم آواز ہو کر کہتے ہیں:

نحن الذی بایعوا محمدا علی الجهاد ما بقینا ابدا

سرور عالم بھی مٹی پھینک رہے ہیں، شکم مبارک پر گرد اٹ گئی ہے، اسی حالت میں زبان پر ہے:

واللّٰه لو لا اللّٰه ما اهتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا

فانزلن سکینة علینا و ثبت الا قدام ان لاقینا

ان الاُلی قد بغوا علینا اذا ارادوا فتنة ابینا

اَبَینا کا لفظ جب آتا تھا تو آواز زیادہ بلند ہو جاتی تھی اور مکرر کہتے [1] اس کے ساتھ انصار کے حق میں دعا بھی دیتے جاتے تھے اور یہ موزوں الفاظ زبان پر آتے تھے:

اللهم انه لاخیرا لا خیرا لاخرة فبارك فی الانصار والمهاجرة

پتھر کھودتے کھودتے اتفاقاً ایک سخت چٹان آ گئی، کسی کی ضرب کام نہیں دیتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، تین دن کا فاقہ تھا اور پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے دست مبارک سے پھاوڑا مارا تو چٹان ایک تودہ خاک تھی۔ [2]

سلع کی پہاڑی کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی گئی، مستورات شہر کے محفوظ قلعوں میں بھیج دی گئیں، چونکہ بنوقریظہ کے حملہ کا اندیشہ تھا، اس لئے حضرت سلمہ بن اسلم رضی اللہ عنہ ۲۰۰ آدمیوں کے ساتھ متعین کئے گئے کہ ادھر سے حملہ نہ ہونے پائے۔

بنوقریظہ کے یہود اب تک الگ تھے لیکن بنونضیر نے ان کے ملا لینے کی کوشش کی۔ حیی بن اخطب (حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا باپ) خود قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس گیا، اس نے ملنے سے انکار کیا، حیی نے کہا: ''میں فوجوں کا دریائے بیکراں لایا ہوں، قریش اور تمام عرب امنڈ آیا ہے اور ہر ایک محمد ﷺ کے خون کا پیاسا ہے۔ یہ موقع ہاتھ سے دیے جانے کے قابل نہیں، اب اسلام کا خاتمہ ہے'' کعب اب بھی راضی نہ تھا، اس نے کہا: میں نے محمد ﷺ کو ہمیشہ صادق الوعد پایا، ان سے عہد شکنی کرنا خلاف مروت ہے لیکن حیی کا جادو رائیگاں نہیں جا سکتا تھا۔

آنحضرت ﷺ کو یہ حال معلوم ہوا تو تحقیق اور اتمام حجت کے لئے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الخندق وهی الاحزاب: ٤١٠٤، ٤١٠٦۔

[2] ایضا: ٤١٠٠، ٤١٠١۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور فرمایا کہ اگر درحقیقت بنوقریظہ نے معاہدہ توڑ دیا ہو، تو وہاں سے آ کر اس خبر کو مبہم لفظوں میں بیان کرنا کہ لوگوں میں بے دلی نہ پھیلنے پائے، دونوں صاحبوں نے بنوقریظہ کو معاہدہ یاد دلایا، تو انہوں نے کہا: ''ہم نہیں جانتے محمد ﷺ کون ہیں اور معاہدہ کیا چیز ہے۔''

غرض بنوقریظہ نے اس بے شمار فوج میں اور اضافہ کر دیا۔ قریش، یہود اور قبائل عرب کی ۲۴ ہزار فوجیں تین حصوں میں تقسیم ہو کر مدینہ کے تین طرف اس زور وشور سے حملہ آور ہوئیں کہ مدینہ کی زمین دہل گئی۔

اس معرکہ کی تصویر خود اللہ تعالیٰ نے کھینچی ہے:

﴿ إِذْ جَآءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ ٱلْأَبْصَٰرُ وَبَلَغَتِ ٱلْقُلُوبُ ٱلْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِٱللَّهِ ٱلظُّنُونَا۠ ۝ هُنَالِكَ ٱبْتُلِىَ ٱلْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا۟ زِلْزَالًا شَدِيدًا ۝ ﴾

(۳۳/ الاحزاب: ۱۰۔۱۱)

''جب دشمن اوپر کی طرف اور نشیب کی طرف سے آ پڑے اور جب آنکھیں ڈگنے لگیں اور کلیجے منہ میں آ گئے اور تم اللہ کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے تب مسلمانوں کی جانچ کا وقت آیا اور وہ بڑے زور کے زلزلے میں ڈال دیئے گئے۔''

فوج اسلام میں منافقوں کی تعداد بھی شامل تھی، جو بظاہر مسلمانوں کے ساتھ تھے، لیکن موسم کی سختی، رسد کی قلت، متواتر فاقے، راتوں کی بے خوابی، بیشمار فوجوں کا ہجوم، ایسے واقعات تھے جنہوں نے ان کا پردہ فاش کر دیا۔ آ آ کر آنحضرت ﷺ سے اجازت مانگنی شروع کی کہ ہمارے گھر محفوظ نہیں، ہم کو شہر میں واپس چلے جانے کی اجازت دی جائے:

﴿ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِىَ بِعَوْرَةٍ ۖ إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا ۝ ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۱۳)

''کہتے ہیں کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں اور وہ کھلے نہیں بلکہ ان کو بھاگنا مقصود ہے۔''

لیکن جان نثاران اسلام کا طلائے اخلاص اسی کسوٹی پر آزمانے کے قابل تھا:

﴿ وَلَمَّا رَءَا ٱلْمُؤْمِنُونَ ٱلْأَحْزَابَ قَالُوا۟ هَٰذَا مَا وَعَدَنَا ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥ وَصَدَقَ ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥ ۚ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّآ إِيمَٰنًا وَتَسْلِيمًا ۝ ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۲۲)

''جب مسلمانوں نے قبائل کی فوجیں دیکھیں تو بول اٹھے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ اللہ نے اور اس کے رسول ﷺ نے کیا تھا اور اللہ اور اس کا رسول دونوں سچے تھے اور اس بات نے ان کے یقین اور اطاعت کو اور بھی بڑھا دیا۔''

تقریباً ایک مہینہ تک اس سختی سے محاصرہ قائم رہا کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ پر تین تین فاقے گزر گئے۔ ایک دن صحابہ رضی اللہ عنہم نے بے تاب ہو کر آنحضرت ﷺ کے سامنے اپنے شکم کھول کر دکھائے کہ پتھر

بندھے ہیں۔ لیکن جب آپ نے شکم مبارک کھولا تو ایک کے بجائے دو پتھر تھے۔ ❶ محاصرہ اس قدر شدید اور پرخطر ہو گیا تھا کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا: ''کہ کوئی ہے، جو باہر نکل کر محاصرین کی خبر لائے۔'' تین دفعہ آپ نے یہ الفاظ فرمائے، لیکن حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے سوا اور کوئی صدا نہیں آئی، آنحضرت ﷺ نے اسی موقع پر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو ''حواری'' کا لقب دیا۔ ❷

محاصرین نے ادھر تو خندق کا محاصرہ کر رکھا تھا، ادھر دوسری سمت اس غرض سے مدینہ پر حملہ کرنا چاہا کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے اہل و عیال یہیں قلعوں میں پناہ گزین تھے۔

محاصرین خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے اس لئے دور سے تیر اور پتھر برساتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے خندق کے مختلف حصوں پر فوجیں تقسیم کر دی تھیں جو محاصرین کے حملوں کا مقابلہ کرتیں اور ایک حصہ خود آپ کے اہتمام میں تھا۔

محاصرہ کی سختی دیکھ کر آپ کو خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو انصار ہمت ہار جائیں اس لئے آپ نے غطفان سے اس شرط پر معاہدہ کرنا چاہا کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث ان کو دے دیا جائے۔ سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما کو جو روٴسائے انصار تھے بلا کر مشورہ کیا۔ دونوں نے عرض کی کہ اگر یہ اللہ کا حکم ہے تو انکار کی مجال نہیں لیکن اگر رائے ہے تو یہ عرض ہے کہ کفر کی حالت میں بھی کوئی شخص ہم سے خراج مانگنے کی جرات نہ کر سکا اور اب تو اسلام نے ہمارا پایہ بہت بلند کر دیا ہے۔ یہ استقلال دیکھ کر آپ کو اطمینان ہوا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے معاہدہ کا کاغذ ہاتھ میں لے کر تمام عبارت مٹا دی ❸ اور کہا ان لوگوں سے جو بن آئے کر دکھائیں۔

اب مشرکوں کی طرف سے حملہ کا یہ انتظام کیا گیا کہ قریش کے مشہور جنرل یعنی ابوسفیان، خالد بن ولید، عمرو بن العاص، ضرار بن الخطاب اور جبیرہ کا ایک ایک دن مقرر ہوا۔ ہر جنرل اپنی باری کے دن پوری فوج کو لے کر لڑتا تھا۔ خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے، لیکن خندق کا عرض چونکہ زیادہ نہ تھا اس لئے باہر سے پتھر اور تیر برساتے تھے۔ چونکہ اس طریقہ میں کامیابی نہیں ہوئی اس لئے قرار پایا کہ اب عام حملہ کیا جائے۔ تمام فوجیں یکجا ہوئیں، قبائل کے تمام سردار آگے آگے تھے۔ خندق ایک جگہ سے اتفاقاً کم عریض تھی، یہ موقع حملہ کے لئے انتخاب کیا گیا۔ عرب کے مشہور بہادروں یعنی ضرار، جبیرہ، نوفل اور عمرو بن عبدِ ود نے خندق کے اس

---

❶ سنن ترمذی، ابواب الزھد، باب ماجاء فی معیشۃ اصحاب النبی ﷺ: ۲۳۷۱، عرب کی عادت تھی کہ سخت بھوک میں پیٹ پر پتھر باندھتے تھے جس سے کمر نہیں جھکنے پاتی تھی۔ ترمذی: ۲۳۷۲۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق: ۴۱۱۳ وصحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل طلحۃ والزبیر: ۶۲۴۳۔ لیکن ابن ہشام میں اس موقع پر حضرت حذیفہ بن یمان کا نام ہے، اس لئے محدثین میں ان دونوں ناموں کے واقعوں کی تطبیق میں اختلاف ہے۔ حافظ ابن حجر اور زرقانی نے بہ دلائل یہ ثابت کیا ہے کہ محاصرین میں سے قریش کی تحقیق حال کے لئے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور بنو قریظہ کی تحقیقِ خبر کے لئے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ گئے تھے۔ یہ تفصیل واقدی اور نسائی نے اپنی روایتوں میں کی ہے، فتح الباری، ج ۷، ص: ۳۱۲؛ زرقانی، ج ۲، ص: ۱۳۸، (س) ❸ طبری، ج ۳، ص: ۱۴۷۴۔

کنارے سے گھوڑوں کو مہمیز کیا تو اس پار تھے، ان میں سب سے زیادہ مشہور بہادر عمرو بن عبدود تھا، وہ ایک ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا۔ جنگ بدر میں زخمی ہو کر واپس چلا گیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ جب تک انتقام نہ لوں گا بالوں میں تیل نہ ڈالوں گا۔ اس وقت اس کی عمر ۹۰ برس کی تھی، تاہم سب سے پہلے وہی آگے بڑھا اور عرب کے دستور کے موافق پکارا کہ مقابلہ کو کون آتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر کہا: ''میں۔'' لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا کہ یہ عمرو بن عبدود ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ بیٹھ گئے۔ لیکن عمرو کی آواز کا اور کسی طرف سے جواب نہیں آتا تھا، عمرو نے دوبارہ پکارا اور پھر وہی صرف ایک صدا جواب میں تھی۔ تیسری دفعہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ یہ عمرو ہے۔'' تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ہاں میں جانتا ہوں کہ یہ عمرو ہے۔ غرض آپ نے اجازت دی خود دست مبارک سے تلوار عنایت کی، سر پر عمامہ باندھا۔

عمرو کا قول تھا کہ کوئی شخص دنیا میں اگر مجھ سے تین باتوں کی درخواست کرے تو ایک ضرور قبول کروں گا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمرو سے پوچھا کہ کیا واقعی یہ تیرا قول ہے۔ پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ	میں درخواست کرتا ہوں کہ تو اسلام لا۔
عمرو	یہ نہیں ہو سکتا۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ	لڑائی سے واپس چلا جا۔
عمرو	میں خاتونانِ قریش کا طعنہ نہیں سن سکتا۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ	مجھ سے معرکہ آرا ہو۔

عمرو ہنسا اور کہا: مجھ کو امید نہ تھی کہ آسمان کے نیچے یہ درخواست بھی میرے سامنے پیش کی جائے گی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پیادہ تھے۔ عمرو کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا۔ گھوڑے سے اتر آیا اور پہلی تلوار گھوڑے کے پاؤں پر ماری کہ کونچیں کٹ گئیں۔ پھر پوچھا کہ تم کون ہو؟ آپ نے نام بتایا، اس نے کہا: میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ آپ نے فرمایا: ''ہاں، لیکن میں چاہتا ہوں۔'' عمرو اب غصہ سے بیتاب تھا۔ پرتلے سے تلوار نکالی اور آگے بڑھ کر وار کیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سپر پر روکا لیکن تلوار سپر میں ڈوب کر نکل آئی اور پیشانی پر لگی، گو زخم کاری نہ تھا۔ تاہم یہ طغرا آپ کی پیشانی پر یادگار رہ گیا۔ قاموس میں لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ذوالقرنین بھی کہتے تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی پیشانی پر دو زخموں کے نشان تھے، ایک عمرو کے ہاتھ کا اور ایک ابن ملجم کا۔ دشمن کا وار ہو چکا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وار کیا، ان کی تلوار شانہ کاٹ کر نیچے اتر آئی، ساتھ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور فتح کا اعلان ہو گیا۔ عمرو کے بعد ضرار اور جبیرہ نے حملہ کیا لیکن جب ذوالفقار کا ہاتھ بڑھا تو پیچھے ہٹنا پڑا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ضرار کا تعاقب کیا، ضرار نے مڑ کر برچھے کا وار کرنا چاہا لیکن روک لیا اور کہا ''عمر! اس احسان کو یاد رکھنا۔''

نوفل بھاگتے ہوئے خندق میں گرا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے تیر مارنے شروع کیے۔ اس نے کہا: ''مسلمانو! میں شریفانہ موت چاہتا ہوں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی درخواست منظور کی اور خندق میں اتر کر مارا کہ شریفوں کے شایان تھا۔'' ❶

حملہ کا یہ دن بہت سخت تھا تمام دن لڑائی رہی کفار ہر طرف سے تیر اور پتھروں کا مینہ برسا رہے تھے اور ایک دم کے لئے یہ بارش تھمنے نہ پاتی تھی۔ یہی دن ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کی متصل ❷ چار نمازیں قضا ہوئیں، متصل تیراندازی اور سنگ باری سے جگہ سے ہٹنا ناممکن تھا۔

مستورات جس قلعہ میں تھیں بنوقریظہ کی آبادی سے متصل تھا۔ یہودیوں نے یہ دیکھ کر کہ تمام جمعیت آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہے قلعہ پر حملہ کیا۔ ایک یہودی قلعہ کے پھاٹک تک پہنچ گیا اور قلعہ پر حملہ کرنے کا موقع ڈھونڈھ رہا تھا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا (آنحضرت ﷺ کی پھوپھی) نے دیکھ لیا۔ مستورات کی حفاظت کے لئے حضرت حسان رضی اللہ عنہ (شاعر) متعین کر دیے گئے تھے، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا کہ اتر کر اس کو قتل کر دو، ورنہ یہ جا کر دشمنوں کو پتہ دے گا۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو ایک عارضہ ہو گیا تھا جس نے ان میں اس قدر جبن پیدا کر دیا تھا کہ وہ لڑائی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس بنا پر اپنی معذوری ظاہر کی اور کہا کہ میں اس کام کا ہوتا تو یہاں کیوں ہوتا؟ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے خیمہ کی ایک چوب اکھاڑ لی اور اتر کر یہودی کے سر پر اس زور سے ماری کہ سر پھٹ گیا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا چلی آئیں اور حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ہتھیار اور کپڑے چھین لاؤ۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا جانے بھی دیجئے مجھ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے کہا اچھا جاؤ اس کا سر کاٹ کر قلعہ کے نیچے پھینک دو کہ یہودی مرعوب ہو جائیں۔ لیکن یہ خدمت بھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ہی کو انجام دینا پڑی۔ یہودیوں کو یقین ہوا کہ قلعہ میں بھی کچھ فوج متعین ہے اس خیال سے پھر انہوں نے حملہ کی جرأت نہ کی۔ ❸

محاصرہ جس قدر طویل ہوتا جاتا تھا محاصرہ کرنے والے ہمت ہارتے جاتے تھے۔ دس ہزار آدمیوں کو رسد پہنچانا آسان کام نہ تھا، پھر کہ باوجود سردی کے موسم کے اس زور کی ہوا چلی کہ طوفان آ گیا، خیموں کی طنابیں اکھڑ اکھڑ گئیں، کھانے کے دیگچے چولہوں پر الٹ الٹ جاتے تھے۔ اس واقعہ نے فوجوں سے بڑھ کر کام دیا۔ اسی بنا پر قرآن مجید نے اس بادصرصر کو عسکر الٰہی سے تعبیر کیا ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا

---

❶ یہ حالات اگرچہ اجمالاً تمام کتابوں میں ہیں لیکن ہم نے جو تفصیل لکھی ہے ابن سعد، قسم اول، ج ۲، ص: ۴۹ وما بعد اور خمیس غزوۃ خندق مبارزۃ علی، ج ۱، ص: ۴۸۷ سے ماخوذ ہے۔ ❷ اس امر میں محدثین میں سخت اختلاف ہے کہ چار نمازیں قضا ہوئیں یا ایک اور چار قضا ہوئیں تو ایک ہی دن یا کئی دن، یا کئی دن کی ملا کر، زرقانی میں یہ بحث مفصل ہے۔

❸ زرقانی بحوالہ طبرانی وبزار ابویعلیٰ بسند (حسن) دیکھو ص: ۱۲۹ ج ۲ وابن ہشام، ج ۲، ص: ۱۶۴۔

وَّجُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۹)

''مسلمانو! اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جب کہ تم پر فوجیں آ پڑیں تو ہم نے ان پر آندھی بھیجی اور فوجیں بھیجیں جو تم کو دکھائی نہیں دیتی تھیں۔''

نعیم بن مسعود اشجعی رضی اللہ عنہ ایک غطفانی رئیس تھے۔ قریش اور یہود دونوں ان کو مانتے تھے۔ وہ اسلام لا چکے تھے لیکن کفار کو ابھی اس کا علم نہ تھا۔ انہوں نے قریش اور یہود سے الگ الگ جا کر اس قسم کی باتیں کیں جس سے دونوں میں پھوٹ پڑ گئی۔

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ نعیم رضی اللہ عنہ نے اس تفرقہ اندازی میں دونوں سے ایسی باتیں کہیں جن سے دونوں ایک دوسرے سے بدگمان ہو جائیں اور اس بنا پر کہیں کہ خود آنحضرت ﷺ نے ''الحرب خدعة'' کی تعلیم کی تھی۔ لیکن ابن اسحاق نے روایت کی سند نہیں نقل کی اور اگر کرتے بھی تو ابن اسحاق کا یہ پایہ نہیں کہ ایسا واقعہ محض ان کی سند سے قبول کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ واقعات اس قسم کے جمع تھے کہ دونوں فریقوں کا اتحاد بغیر اس کے توڑ دیا جا سکتا تھا کہ کوئی غلط بات بیان کی جائے۔ ابن اسحاق کی روایت میں بھی اس قدر مذکور ہے کہ نعیم نے یہود سے کہا کہ قریش تو چار دن کے بعد یہاں سے چلے جائیں گے۔ تمہارا اور مسلمانوں کا ہم وطنی کا ساتھ ہے۔ اس لئے تم کیوں بیچ میں پڑ کر ہمیشہ کے لئے لڑائی مول لیتے ہو اور اگر اس پر آمادہ ہی ہو تو قریش سے کہو کہ وہ کچھ معزز آدمی ضمانت کے طور پر تمہارے ہاں بھجوا دیں کہ اگر قریش لڑائی کا فیصلہ کئے بغیر جانا چاہیں تو تم ان لوگوں کو روک لینا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ یہود بنو قریظہ اول اول نقض عہد پر راضی نہ تھے اور کہتے تھے کہ ہم محمد ﷺ سے معاہدہ کیوں توڑیں لیکن حیی بن اخطب نے اسی شرط پر ان کو راضی کیا تھا کہ ''قریش چلے گئے تو میں خیبر چھوڑ کر تمہارے پاس آ جاؤں گا۔'' قریش اس قسم کی ضمانت نہیں منظور کر سکتے تھے اس لئے جب انہوں نے انکار کیا ہوگا تو دونوں میں خود پھوٹ پڑ گئی ہوگی۔ اس کے لئے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو دروغ بیانی کی کیا ضرورت تھی؟ [1]

بہر حال موسم کی سختی، محاصرہ کا امتداد، آندھی کا زور، رسد کی قلت اور یہود کی علیحدگی، یہ تمام اسباب

---

[1] مصنف کے اس قیاس کی تائید مغازی موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے ہوتی ہے (کتاب المغازی، ص:۳۶۲) جس کو مختصراً مصنف ابن ابی شیبہ میں اور تفصیل کے ساتھ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ اس روایت کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو قریظہ نے اس جنگ میں شرکت اسی شرط کے ساتھ کی تھی کہ قریش ضمانت کے طور پر اپنے کچھ معزز آدمی بنو قریظہ کے سپرد کریں گے لیکن انہوں نے اپنی یہ شرط پوری نہیں کی اور اس لئے ان کے دل میں قریش کی طرف سے بے اطمینانی پیدا ہوئی اور انہوں نے خفیہ رسول اللہ ﷺ کو اس شرط کے ساتھ مصالحت کا پیغام بھیجا کہ بنو نضیر کو جو خیبر کو جلا وطن کر دیے گئے تھے پھر مدینہ آنے کی اجازت دے دی جائے۔ نعیم بن مسعود ثقفی جو اسی موقع پر مسلمان ہونے آئے تھے ایک ایسے آدمی تھے جو پیٹ کے ہلکے تھے۔ حضور انور ﷺ نے ان سے دانستہ راز کے طور پر بنو قریظہ کے اس مخفی پیغام کا ذکر فرما دیا انہوں نے جا کر یہ قریش تک پہنچایا۔ اس سے قریش کو بنو قریظہ سے بدگمانی پیدا ہوگئی اور اس طرح قریش اور بنو قریظہ کے اتفاق کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب المغازی، باب غزوة الخندق: ۳۷۹۶۵، والبدایه والنهایه ابن کثیر، ج ٤، ص: ۱۱۳، مصر۔ (س)۔

ایسے جمع ہو گئے تھے کہ قریش کے پائے ثبات اب ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ ابوسفیان نے فوج سے کہا، رسد ختم ہو چکی، موسم کا یہ حال ہے، یہود نے ساتھ چھوڑ دیا، اب محاصرہ بے کار ہے، یہ کہہ کر طبل رحیل بجنے کا حکم دیا۔ غطفان بھی اس کے ساتھ روانہ ہو گئے، بنوقریظہ محاصرہ چھوڑ کر اپنے قلعوں میں چلے آئے اور مدینہ کا افق ۲۰۔۲۲ دن تک غبار آلود رہ کر صاف ہو گیا۔

﴿ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۲۵)

''اور اللہ نے کافروں کو غصہ میں بھرا ہوا ہٹا دیا کہ ان کو کچھ ہاتھ نہ آیا اور مسلمانوں (کو لڑنے کی نوبت نہ آنے دی۔''

اس معرکہ میں فوج اسلام کا جانی نقصان کم ہوا، لیکن انصار کا سب سے بڑا بازو ٹوٹ گیا، یعنی حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو قبیلہ اوس کے سردار تھے زخمی ہوئے اور پھر جان بر نہ ہو سکے ان کے زخم کھانے کا واقعہ مؤثر اور عبرت انگیز ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جس قلعہ میں پناہ گزین تھیں، سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی ماں بھی وہیں ان کے ساتھ تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں قلعہ سے نکل کر باہر پھر رہی تھی، عقب سے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی، مڑ کر دیکھا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ ہاتھ میں حربہ لئے جوش کی حالت میں بڑی تیزی سے بڑھے جا رہے ہیں اور یہ شعر زبان پر ہے:

لبث قليلا يشهد الهيجا جمل [1]   لا بأس بالموت اذا لموت نزل

''ذرا ٹھہر جانا کہ لڑائی میں ایک اور شخص پہنچ جائے   وقت جب آ گیا تو موت سے کیا ڈر ہے۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی ماں نے سنا تو پکاریں بیٹا دوڑ کر جا تو نے دیر لگا دی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی زرہ اس قدر چھوٹی تھی کہ ان کے دونوں ہاتھ باہر تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سعد رضی اللہ عنہ کی ماں سے کہا: کاش سعد رضی اللہ عنہ کی زرہ لمبی ہوتی، اتفاق یہ کہ ابن العرقہ نے تاک کر کھلے ہوئے ہاتھ پر تیر مارا جس سے اکحل کی رگ کٹ گئی خندق کا معرکہ ہو چکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے مسجد کے صحن میں ایک خیمہ کھڑا کرایا اور ان کی تیمارداری شروع کی۔ [2] اس لڑائی میں رفیدہ ایک خاتون شریک تھیں جو اپنے پاس دوائیں رکھتی تھیں

---

[1] ابن هشام، ج ۲، ص:۱٦۳ وطبری، ج ۳، ص: ۱٤۷۷ وخميس، ج ۱، ص:٤۸۸۔ مگر تینوں کتابوں میں دوسرا مصرعہ اس طرح ہے، ع ...... لا بأس بالموت اذا حان الاجل۔ ''ک ،ص''۔

[2] یہ خمیس کا بیان ہے، ج ۱، ص:٤۹۹ حافظ ابن حجر نے اصابہ (ذکر رفیدہ) میں امام بخاری کی ادب المفرد (باب كيف اصبحت: ۱۱۲۹) سے نقل کیا ہے کہ رفیدہ ایک خاتون تھیں جو زخمیوں کا علاج کرتی تھیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ انہیں کے پاس علاج کے لئے رکھے گئے تھے۔ ابن سعد نے رفیدہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کا ایک خیمہ مسجد نبوی کے پاس تھا، اسی میں وہ بیماروں اور زخمیوں کا علاج کرتی تھیں۔ صحیح بخاری میں بھی رفیدہ کے خیمہ اور ان کے جراح خانہ کا ذکر ہے، ج ۸، ص:۸۱۔

اورزخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ یہ خیمہ انہی کا تھا اور وہ علاج کی نگران تھیں آنحضرت ﷺ نے خود دست مبارک میں مشقص [1] لے کر داغا، لیکن پھر ورم کر آیا۔ دوبارہ داغا لیکن پھر فائدہ نہ ہوا۔ کئی دن کے بعد یعنی بنوقریظہ کی ہلاکت کے بعد زخم کھل گیا اور انہوں نے وفات پائی۔

بنوقریظہ کا خاتمہ

اوپر گزر چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے آغازِ قیام میں یہود کے ساتھ معاہدہ کیا تھا اور ان کو جان و مال و مذہب ہر چیز میں امن و آزادی بخشی۔ لیکن جب قریش نے ان کو تحریض و تہدید کا خط لکھا تو وہ آمادۂ بغاوت ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں سے تجدید معاہدہ کرنی چاہی تو بنونضیر نے انکار کیا اور وہ جلاوطن کر دیے گئے، لیکن بنوقریظہ نے نئے سرے سے معاہدہ کر لیا۔ [2] چنانچہ ان کو امن دے دیا گیا۔ صحیح مسلم میں ان واقعات کو اختصار کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

عن ابن عمران یهود بنی النضیر وقریظة حاربوا رسول اللهﷺ فاجلی رسول اللهﷺ بنی النضیر واقرّ قریظة ومنّ علیهم۔ [3]

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بنونضیر اور قریظہ کے یہود نے آنحضرت ﷺ سے لڑائی کی تو آپ نے بنونضیر کو جلاوطن کر دیا اور قریظہ کو رہنے دیا اور ان پر احسان کیا۔''

بنونضیر جب جلاوطن ہوئے تو ان کے رئیس الاعظم حیی بن اخطب، ابورافع سلام، ابن ابی الحقیق خیبر میں جا کر آباد ہوئے اور وہاں ریاست عام حاصل کر لی۔ جنگ احزاب ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ قبائل عرب میں دورہ کر کے تمام ملک میں آگ لگا دی اور قریش کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے، اس وقت تک قریظہ معاہدہ پر قائم تھے، لیکن حیی بن اخطب نے ان کو بہکا کر توڑ لیا اور ان سے وعدہ کیا کہ خدانخواستہ اگر قریش حملہ سے دست بردار ہو کر چلے گئے تو میں خیبر چھوڑ کر یہیں آ رہوں گا۔ چنانچہ اس نے یہ عہد وفا کیا۔

قریظہ نے احزاب میں علانیہ شرکت کی [4] اور شکست کھا کر ہٹ آئے تو اسلام کے سب سے بڑے دشمن حیی بن اخطب کو ساتھ لائے۔ [5]

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کا آخری فیصلہ کیا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے احزاب سے

---

[1] مسلم، کتاب السلام، باب لکل داء دواء: ۵۷٤۸۔ [2] واقدی نے حیی بن اخطب کی زبانی بنوقریظہ کے اس معاہدہ سے ٹھہر جانے کے واقعہ کو ان کی سازشی چال ظاہر کیا ہے حیی بن اخطب نے کہا کہ وہ اس لئے ٹھہر گئے ہیں، تاکہ موقع پا کر کفار سے مل کر مسلمانوں پر حملہ کر سکیں۔ مغازی واقدی، ص: ۳٦۲ کلکتہ (س) [3] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب اجلاء الیهود من الحجاز: ٤۵۹۲۔ [4] سر ولیم میور صاحب اربابِ سیر کی یہ روایت تسلیم نہیں کرتے کہ بنوقریظہ نے اس جنگ میں کوئی عملی حصہ لیا تھا۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو قرآن مجید میں جہاں احزاب کا ذکر ہے وہاں اس کا ذکر ضرور ہوتا لیکن قرآن میں صاف یہ الفاظ ہیں: ﴿وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ﴾ مظاهرة (امداد) سے بڑھ کر اور کون سا لفظ درکار ہے۔

[5] طبری، (ج ۳، ص: ۱٤۸۷ س) وابن هشام، ص: ۱٤٦، ج ۲۔

فارغ ہو کر حکم دیا کہ ابھی لوگ ہتھیار نہ کھولیں اور قریظہ کی طرف بڑھیں۔ قریظہ اگر صلح و آشتی سے پیش آتے تو قابلِ اطمینان تصفیہ کے بعد ان کو امن دیا جاتا، لیکن وہ مقابلہ کا فیصلہ کر چکے تھے۔ فوج سے آگے بڑھ کر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے قلعوں کے پاس پہنچے تو انہوں نے علانیہ آنحضرت ﷺ کو (نعوذ باللہ) گالیاں دیں۔ 1 غرض ان کا محاصرہ کیا گیا اور تقریباً ایک مہینے محاصرہ رہا۔ بالآخر انہوں نے درخواست پیش کی کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو فیصلہ کریں ہم کو منظور ہے۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور ان کا قبیلہ (اوس) قریظہ کا حلیف اور ہم عہد تھا۔ عرب میں یہ تعلق ہم نسبی سے بڑھ کر تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی درخواست منظور کی۔

قرآن مجید میں جب تک کوئی خاص حکم نہیں آتا تھا۔ آنحضرت ﷺ تورات کے احکام کی پابندی فرماتے تھے۔ چنانچہ اکثر مسائل مثلاً: قبلۂ نماز، رجم، قصاص بالمثل وغیرہ وغیرہ میں جب تک خاص وحی نہیں آئی، آنحضرت ﷺ نے تورات ہی کی پابندی فرمائی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جو فیصلہ کیا یعنی یہ کہ لڑنے والے قتل کئے جائیں، عورتیں اور بچے قید ہوں، مال و اسباب غنیمت قرار دیا جائے 2 ۔ تورات کے مطابق تھا۔ تورات کتاب تثنیہ، اصحاح ۲۰ آیت ۱۰ میں ہے۔

”جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لئے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے، اگر وہ صلح تسلیم کر لیں اور تیرے لئے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے، لیکن اگر صلح نہ کریں تو تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا اللہ تجھ کو ان پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کر دے باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں، سب تیرے لئے مالِ غنیمت ہوں گی۔“

احادیث میں مذکور ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جب یہ فیصلہ کیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”کہ تم نے یہ آسمانی فیصلہ کیا۔ یہ اسی تورات کے حکم کی طرف اشارہ تھا۔ یہودیوں کو جب یہ حکم سنایا گیا تو جو فقرے ان کی زبان سے نکلے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اسی فیصلہ کو حکمِ الٰہی کے موافق سمجھتے تھے۔

حیی بن اخطب جو ان تمام فتن کا بانی تھا، مقتل میں لایا گیا تو آنحضرت ﷺ کی طرف اس نے نظر اٹھا کر دیکھا اور یہ فقرے کہے:

---

1 طبری، ج ۳، ص: ۱٤۸٥، (س) میں ہے: حتی اذادنامن الحصون سمع منها مقالة قبيحة لرسول الله ﷺ منهم۔

2 صحیح مسلم، باب جواز قتال من نقض العهد......الخ: ٤٥۹۹۔ (س) نیز بخاری، کتاب المغازی، باب مرجع النبی ﷺ من الاحزاب: ٤١١٧ تا ٤١٢٢۔ (س) میں یہ واقعہ مفصل مذکور ہے۔ مسٹر مارگولیتھ صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو اس جنگ میں ایک قریظی نے تیر سے زخمی کیا تھا جس سے وہ بالآخر ہلاک ہو گئے اس لیے انہوں نے بنو قریظہ کی نسبت ایسا بے رحمانہ فیصلہ کیا لیکن وہ تیر انداز ابن العرقہ قریشی تھا قریظی نہ تھا۔ صحیح بخاری و مسلم میں صاف تصریح ہے۔

اما واللہ ما لُمت نفسی فی عداوتك ولكنه من يخذل الله يخذل۔

''ہاں اللہ کی قسم! مجھ کو اس کا افسوس نہیں کہ میں نے کیوں تیری عداوت کی لیکن بات یہ ہے کہ جو شخص اللہ کو چھوڑ دیتا ہے، اللہ بھی اس کو چھوڑ دیتا ہے۔''

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

ايها الناس انه لا باس بامر الله كتاب وقدر وملحمة كتبها الله على بنی اسرائيل۔ [1]

''لوگو! اللہ کے حکم کی تعمیل میں کچھ مضائقہ نہیں، یہ ایک حکم الٰہی تھا، یہ لکھا ہوا تھا، ایک سزا تھی، جو اللہ نے بنو اسرائیل پر لکھی تھی۔''

حیی بن اخطب کی نسبت یہ بات خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ جب وہ جلا وطن ہو کر خیبر جا رہا تھا تو اس نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی مخالفت پر کسی کو مدد نہ دے گا۔ [2] اس معاہدہ پر اس نے اللہ کو ضامن کیا تھا لیکن احزاب میں اس نے اس معاہدہ کی جس طرح تعمیل کی اس کا حال ابھی گزر چکا۔

بنو قریظہ کے متعلق مخالفین اسلام نے بڑے زور کے ساتھ ظلم و بے رحمی کا اعتراض کیا ہے لیکن واقعات حسب ذیل ہیں:

① آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں آ کر ان کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کیا جس میں ان کے مذہب کو پوری آزادی دی گئی اور جان و مال کی حفاظت کا اقرار کیا گیا۔

② بنو قریظہ رتبہ میں بنو نضیر سے کم تھے، یعنی بنو نضیر کا کوئی آدمی قریظہ کے کسی آدمی کو قتل کر دیتا تو اس کو صرف آدھا خون بہا دینا پڑتا بخلاف اس کے بنو قریظہ پورا خون بہا ادا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے قریظہ پر یہ احسان کیا کہ ان کا درجہ بنو نضیر کے برابر کر دیا۔ [3]

③ آنحضرت ﷺ نے بنو نضیر کی جلا وطنی کے وقت بنو قریظہ سے دوبارہ تجدید معاہدہ کی۔

④ باوجود ان باتوں کے عہد شکنی کی اور جنگ احزاب میں شریک ہوئے۔

⑤ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن قلعہ میں حفاظت کے لئے بھیج دی گئی تھیں، ان پر حملہ کرنا چاہا۔

⑥ حیی بن اخطب جو بغاوت کے جرم میں جلا وطن کر دیا گیا تھا جس نے تمام عرب کو برانگیختہ کر کے جنگ احزاب قائم کر دی تھی، اس کو اپنے ساتھ لائے جو آتشِ جنگ کے اشتعال کا دیباچہ تھا۔

---

[1] یہ دونوں عبارتیں ابن ہشام (غزوہ بنی قریظہ، ج ۲، ص: ۱۷۱) میں ہیں، طبری، ج ۳، ص: ۱۴۹۴ میں بھی قریباً یہی الفاظ ہیں۔

[2] بلاذری مطبوعہ یورپ ص: ۲۲ (یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب المغازی، باب بنی قریظة میں بھی مذکور ہے،'' ج ۱۴، ص: ۴۲۵، دار السلفیہ بھنڈی بازار (س)

[3] ابو داود، کتاب الدیات، باب النفس بالنفس: ۴۴۹۴۔ (س)

ان حالات کے ساتھ بنو قریظہ کے ساتھ اور کیا سلوک کیا جا سکتا تھا۔

یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ عرب میں محالفت کا معاہدہ اخوت حقیقی کے برابر تھا۔ بنو قریظہ انصار کے حلیف تھے اور اسی بنا پر تمام انصار (اوس) نے ان کی نہایت الحاح کے ساتھ سفارش کی۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اوس کے سردار تھے اور دراصل معاہدہ کے وہی ذمہ دار تھے۔ وہ سخت کشمکش میں تھے۔ ان کے حلیفوں کی موت و حیات کا مسئلہ تھا جن کی حمایت پر کل انصار (اوس) مصر تھے۔ لیکن حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اس فیصلہ کے سوا اور کیا کر سکتے تھے؟

مقتولین کی تعداد دیگر ارباب سیر نے ۶۰۰ سے زائد بیان کی ہے لیکن صحاح میں ۴۰۰ ہے۔ ان میں صرف ایک عورت تھی اور وہ اس قصاص میں ماری گئی تھی کہ اس نے قلعہ پر سے ایک پتھر گرا کر ایک مسلمان ❶ (خلاد) کو قتل کر دیا تھا۔ اس عورت نے جس جرأت اور دلیری سے جان دی سنن ابی داؤد میں حسب ذیل ❷ حیرت انگیز طریقہ سے مذکور ہے:

اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ مقتولین کی فہرست میں اس کا نام بھی ہے۔ قتل گاہ میں مجرم آتے اور عدم کو روانہ ہوتے جاتے تھے۔ ایک ایک کا نام پکارا جا رہا تھا اور یہ ہوش ربا صدا بار بار اس کے کانوں میں آتی تھی لیکن وہ بے تکلف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے باتیں کرتی جاتی اور بات بات پر ہنستی جاتی تھی۔ دفعتاً قاتل نے اس کا نام پکارا۔ وہ بے تکلف اٹھ کھڑی ہوئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: کہاں؟ بولی: میں نے ایک جرم کیا تھا اس کی سزا اٹھانے جاتی ہوں، خوشی خوشی قتل گاہ میں آئی اور تلوار کے نیچے سر رکھ دیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب اس واقعہ کو بیان کرتی تھیں تو نہایت حیرت کے لہجہ میں بیان کرتی تھیں۔

ریحانہ کا غلط واقعہ

متعدد ارباب سیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قریظہ کے قیدیوں میں سے ایک یہودی عورت جس کا نام ریحانہ تھا، اس کی نسبت حکم دیا کہ الگ کر لی جائے اور پھر چند روز کے بعد اس کو اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ چنانچہ جن مؤرخین نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ لونڈیوں سے بھی متمتع ہوتے تھے۔ انہوں نے دو مثالیں پیش کی ہیں، ایک یہی ریحانہ اور دوسری ماریہ قبطیہ۔ عیسائی مؤرخوں نے اس واقعہ کو صحیح قرار دے کر نہایت ناگوار صورت میں دکھایا ہے۔ ایک مؤرخ نہایت طعن آمیز الفاظ میں لکھتا ہے کہ ''بانی اسلام جب سات سو مقتولین کی لاشوں کے تڑپنے کا تماشا دیکھ چکا تو گھر پر آ کر تفریح خاطر کے لئے ...... لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرے سے یہ واقعہ ہی غلط ہے۔

ریحانہ کے حرم میں داخل ہونے کی جس قدر روایتیں ہیں سب واقدی یا ابن اسحاق سے ماخوذ ہیں۔ لیکن واقدی نے بتصریح بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے نکاح کیا تھا، ابن سعد نے واقدی

❶ ابن هشام، غزوة بني قريظة، ج۲، ص:۱۷۲۔ ❷ ابوداود، كتاب الجهاد، باب في قتل النساء: ۲۶۷۱۔ (س)۔

کی جو روایت نقل کی ہے، اس میں خود ریحانہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

فاعتقنی وتزوج بی. ''پھر آنحضرت ﷺ نے مجھ کو آزاد کر دیا اور مجھ سے نکاح کر لیا۔''

حافظ ابن حجر نے اصابہ میں محمد بن الحسن کی تاریخ مدینہ سے جو روایت نقل کی ہے، اس کے یہ الفاظ ہیں:

وكانت ريحانة القرظية زوج النبی ﷺ تسكنه۔

''اور ریحانہ قرظیہ جو آنحضرت ﷺ کی زوجہ (محترم) تھیں اس مکان میں رہتی تھیں۔''

حافظ ابن مندہ کی کتاب (طبقات الصحابہ) تمام محدثین مابعد کا ماخذ ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں: [1]

واستسرٰی ريحانة من بنی قريظة ثم اعتقها فلحقت باهلها واحتجبت وهی عند اهلها۔

''ریحانہ کو گرفتار کیا اور پھر آزاد کر دیا تو وہ اپنے خاندان میں چلی گئیں اور وہیں پردہ نشین ہو کر رہیں۔''

حافظ ابن حجر اس عبارت کو نقل کر کے لکھتے ہیں: وهذه فائدة جليلة اغفلها ابن الاثير۔

حافظ ابن مندہ کی عبارت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا اور وہ اپنے خاندان میں جا کر بیویوں کی طرح پردہ نشین ہو کر رہیں۔

ہمارے نزدیک محقق واقعہ یہی ہے اور اگر یہی مان لیا جائے کہ وہ حرم نبوی میں آئیں، تب بھی قطعاً وہ منکوحات میں تھیں، کنیز نہ تھیں۔ [2]

حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح ۵ھ

اس سال آنحضرت ﷺ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ نکاح ایک معمولی بات ہے اور اس کی تفصیل کا موقع ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا عنوان ہے لیکن اس واقعہ میں ایسے حالات جمع ہو گئے جنہوں نے مخالفین کے نزدیک اس کو ایک مہتم بالشان مسئلہ بنا دیا۔ عیسائی مؤرخوں نے اس واقعہ کو نہایت آب و رنگ سے لکھا ہے اور آنحضرت ﷺ کی تنقیص و نکتہ چینی (العياذ بالله) کے لئے ان کے نزدیک اور کوئی واقعہ بکار

---

[1] دیکھو اصابہ فی تمییز الصحابہ ذکر ریحانة، ج ۸، ص: ۸۸۔ (س) [2] حضرت ریحانہ کے متعلق کتب سیر میں تین قسم کی روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا اور وہ اپنے خاندان والوں کے پاس جا کر پردہ نشین ہو کر رہیں۔ یہ روایت ابن مندہ کی ہے۔ مگر اس کی تائید میں کوئی دوسری روایت نہیں۔ دوسری قسم کی روایت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو آزاد کر کے مثل دیگر امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے رکھنا چاہا مگر انہوں نے اس کی غیر معمولی ذمہ داری محسوس کر کے باندی بن کر حضور انور کی خدمت میں رہنا قبول کیا، یہ روایت ابن اسحاق کی ہے۔ تیسری قسم کی روایت یہ ہے کہ حضور انور ﷺ نے ان کو مختار بنا دیا تو انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو آپ ﷺ نے ان کو آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ یہ روایت واقدی کی ہے۔ ابن سعد نے واقدی سے مختلف سلسلوں سے اسی روایت کو ذکر کیا ہے اور واقدی نے اسی کو اثبت کہا ہے۔ دیکھئے کتاب البدایہ ابن کثیر، ج ۵، ص: ۳۰۵ اور امام زہری نے بھی زوجیت ہی کی تائید کی ہے بحوالہ سابق۔ تفصیل کے لئے دیکھئے اصابہ ذکر ریحانة، ج ۸، ص: ۸۸۔ (س)۔

آمد نہیں ہوسکتا۔ ہم اس واقعہ کو تفصیل سے لکھتے ہیں جس سے اس نکتہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق وعادات پر نکتہ چینی کا موقع جو دشمنوں کو ہاتھ آتا ہے اس کا اصلی مخرج کیا ہے؟

آنحضرت ﷺ نے زید رضی اللہ عنہ کو جو آپ کے آزاد کردہ غلام تھے متبنیٰ بنالیا تھا۔ جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو آپ نے ان کی شادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے کرنی چاہی جو آنحضرت ﷺ کی حقیقی پھوپھی زاد بہن تھیں، (ان کی ماں امیمہ۔ عبدالمطلب کی بیٹی تھیں) لیکن چونکہ وہ غلام رہ چکے تھے اس لئے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو یہ نسبت گوارا نہ تھی:

وكان رسول الله ﷺ اراد ان يزوجها زيد بن حارثة مولاه فكرهت ذلك۔ ❶

''آنحضرت ﷺ نے ان کا نکاح اپنے غلام زید سے کردینا چاہا تو انہوں نے ناپسند کیا۔''

لیکن بالآخر آنحضرت ﷺ کی تعمیل ارشاد کے لحاظ سے راضی ہوگئیں، قریباً ایک سال تک حضرت زید رضی اللہ عنہ کے نکاح میں رہیں لیکن دونوں میں ہمیشہ شکررنجی (معمولی رنجش) رہتی تھی یہاں تک کہ زید نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آکر شکایت کی اور ان کو طلاق دینی چاہی۔

جاء زيد بن حارثة فقال يارسول الله ان زينب اشتد على لسانها، وانا اريد ان اطلقها۔ ❷

''زید آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ زینب رضی اللہ عنہا مجھ سے زبان درازی کرتی ہیں اور میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔''

لیکن آنحضرت ﷺ بار بار ان کو سمجھاتے تھے کہ طلاق نہ دیں، قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ ﴾۔

(۳۳/ الاحزاب:۳۷)

''اور جبکہ تم اس شخص سے جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا یہ کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو نکاح میں لئے رہو اور اللہ سے خوف کرو۔''

لیکن کسی طرح صحبت برآ نہ ہوسکے اور آخر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے ان کو طلاق دے دی، حضرت زینب رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کی (پھوپھی زاد) بہن تھیں اور آپ ہی کی تربیت میں پلی تھیں۔ آپ کے فرمانے سے انہوں نے یہ رشتہ منظور کرلیا تھا جو ان کے نزدیک ان کے خلاف شان تھا۔ لیکن آنحضرت ﷺ جو مساواتِ اسلامی قائم کرنا چاہتے تھے اس میں آزاد و غلام کی کوئی تمیز نہ تھی۔ بہرحال جب وہ مطلقہ ہوگئیں تو آپ نے ان کی دلجوئی کے لئے خود ان سے نکاح کرلینا چاہا۔ لیکن عرب میں اس وقت تک متبنیٰ اصلی بیٹے کے

❶ فتح الباری، تفسیر سورۃ احزاب، بحوالہ ابن ابی حاتم، ج۸، ص:۴۰۳۔
❷ فتح الباری، تفسیر سورۃ احزاب، بحوالہ روایت عبدالرزاق از معمر ازقتادۃ، ج۸، ص:۴۰۳۔

برابر سمجھا جاتا تھا۔اس لئے عام لوگوں کے خیال سے آپ تامل فرماتے تھے۔ چونکہ یہ محض جاہلیت کی رسم تھی اوراس کا مٹانا مقصود تھا،اس لئے یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۳۷)

''اورتم اپنے دل میں وہ بات چھپاتے ہو جس کو اللہ ظاہر کر دینے والا ہے اورتم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ ڈرنا اللہ سے چاہیے۔''

غرض آپ ﷺ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کرلیا اور جاہلیت کی ایک قدیم رسم کہ متبنیٰ اصلی بیٹے کا حکم رکھتا ہے مٹ گئی۔اس پر منافقوں اور بدگویوں نے بہت طعنے دیئے،لیکن امرحق کے اجرا میں مطاعن کا آماج گاہ بننا لازمی ہے۔

واقعہ کی اصلی اورسادہ حقیقت یہ تھی،مخالفوں نے اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا ہے گو سرتاپا کذب وافترا ہے لیکن ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے رنگ آرائی کے لئے سیاہی ہمارے ہی ہاں سے مستعار لی ہے۔

تاریخ طبری میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ زید رضی اللہ عنہ سے ملنے کے لئے ان کے گھر گئے۔ زید رضی اللہ عنہ نہ تھے،زینب رضی اللہ عنہا کپڑے پہن رہی تھیں،اسی حالت میں آنحضرت ﷺ نے ان کو دیکھ لیا اور یہ الفاظ کہتے ہوئے باہر نکل آئے:

سبحان اللّٰه العظيم سبحان اللّٰه مصرف القلوب۔ [1]

''پاک ہے اللہ برتر،پاک ہے وہ اللہ جو دلوں کو پھیر دیتا ہے۔''

حضرت زید کو یہ حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ زینب رضی اللہ عنہا اگر آپ کو پسند آگئی ہوں تو میں ان کو طلاق دے دوں۔

میں نے یہ بیہودہ روایت اپنے دل پر سخت جبر کرکے نقل کی ہے۔''نقل کفر کفر نہ باشد۔'' یہی روایت ہے جو عیسائی مؤرخوں کا مایۂ استناد ہے۔لیکن ان غریبوں کو یہ معلوم نہیں کہ اصولِ فن کے لحاظ سے یہ روایت کس پایہ کی ہے۔مؤرخ طبری نے یہ روایت واقدی کے ذریعہ سے نقل کی ہے جو مشہور کذاب اور دروغ گو ہے اور جس کا مقصد اس قسم کی بیہودہ روایتوں سے یہ تھا کہ عباسیوں کی عیش پرستی کے لئے سند ہاتھ آئے۔

طبری کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اس قسم کی بیہودہ روایتیں نقل کی ہیں۔لیکن محدثین نے ان کو اس قابل نہیں سمجھا کہ ان سے تعرض کیا جائے۔حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ سخت روایت پرست ہیں،تاہم فتح الباری (ج۸،ص:۴۰۳)(سورۂ احزاب کی تفسیر) میں جہاں اس واقعہ سے بحث کی ہے لکھتے ہیں:

ووردت آثار اُخرٰی اخرجها ابن ابی حاتم والطبری ونقلها کثیرًا من

[1] تاریخ طبری،آغاز واقعات ۵ھ ج ۳،ص:۱۴۶۱۔

المفسرين لا ينبغي التشاغل بها۔

''اور بہت سی روایتیں آئی ہیں جن کو ابن ابی حاتم اور طبری نے روایت کیا ہے اور اکثر مفسرین نے ان کو نقل کر دیا ہے، ان روایتوں میں مشغول نہ ہونا چاہیے۔''

حافظ ابن کثیر جو مشہور محدثین میں ہیں، اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ذكر ابن ابی حاتم وابن جرير ههنا آثارًا عن بعض السلف احببنا ان نضرب عنها صفحا لعدم صحتها فلا نوردها وقدروى الامام احمدههنا ايضًا من رواية حماد بن زيد عن ثابت عن انس فيه غرابة تركنا سياقه ايضًا۔ [1]

''ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے اس موقع پر بعض اسلاف سے چند روایتیں نقل کی ہیں جن کو ہم اس لئے نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ غلط ہیں اور امام احمد نے بھی اس واقعہ کے متعلق انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے جو غریب ہے، ہم نے اس کا ذکر بھی چھوڑ دیا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت منافقوں کا بہت زور تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر لوگوں نے جو تہمت لگائی، وہ بھی اسی سال کا واقعہ ہے۔ منافقین ان خبروں کو اس طرح پھیلاتے تھے کہ بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ جاتی تھیں، یہاں تک کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تہمت میں خود چند مسلمان بھی آلودہ ہو گئے جن کو شریعت کے موافق قذف کی سزا دی گئی۔ یہی روایتیں ہیں جو بچی کھچی غیر محتاط کتابوں میں باقی رہ گئیں۔ لیکن وہ محدثین جن کا معیارِ تحقیق بلند ہے اور عدالتِ روایت کے حاکمانِ مجاز ہیں، مثلاً: امام بخاری، امام مسلم وغیرہ، ان کے ہاں ان روایتوں کا ذکر تک نہیں آتا۔

واقعات متفرقہ ۵ھ

(اس سال کی تاریخ مذہبی میں سب سے اہم واقعات عورتوں کے متعلق متعدد احکام اصلاحی کا نزول ہے۔ اب تک مسلمان عورتیں عام جاہلانہ طریق سے چلتی پھرتی تھیں اور اسی قسم کے لباس و زیور پہنتی تھیں۔ اب حکم ہوا کہ شریف عورتیں گھر سے نکلیں تو ایک بڑی چادر اوڑھ کر گھونگھٹ نکال لیا کریں جس سے منہ بھی چھپ جائے، آنچل سینہ پر ڈال کر چلیں، پاؤں جھٹک جھٹک کر نہ چلیں، پردہ کی اوٹ سے بولیں۔ تصنع اور بناؤ کی بولی نہ بولیں، ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے لئے غیر مردوں کے سامنے آنا قطعاً ممنوع ہوا۔

منہ بولے لڑکے کی بیوی سے جاہلیت میں بیاہ ناجائز تھا۔ اس رسم کی اصلاح بھی اسی سال ہوئی۔ زنا کی سزا سو کوڑے بھی اسی سال نازل ہوئی، عفیف عورتوں پر الزام لگانا جاہلیت کا ایک معمولی فعل تھا اور ان کمزوروں کے پاس اس حملہ کے روکنے کے لئے کوئی قانونی سپر نہ تھی۔ اس سال ''حدِ قذف'' نازل ہوئی جس

[1] تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورۃ احزاب، ج ۳، ص: ۴۹۱، مصر، ۱۹۳۷ء۔

کی رو سے بغیر شہادت کے تنہا اتہام جرم قرار دیا گیا، بصورتِ عدم وجودِ شہادت لعان کا طریقہ بتایا گیا، یعنی زن وشو دونوں اپنی سچائی اور فریق ثانی کی دروغ گوئی کا بحلف اظہار کریں اور اس کے بعد ان میں تفرقہ کر دیا جائے۔ [1]

عرب میں ایک قسم کی طلاق جاری تھی، جس کو ''ظہار'' کہتے ہیں۔ اس سال اس قسم کی طلاق غیر مؤثر قرار دی گئی اور اس کے لئے کفارہ مقرر کیا گیا۔ پانی نہ ملنے کی حالت میں تیمّم کی مشروعیت بھی اسی سال کا حکم ہے۔ بروایت صحیحہ نمازِ خوف کا حکم قرآن مجید میں اسی سال نازل ہوا، جس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی)۔

[1] بخاری، کتاب الطلاق، باب من جوز الطلاق الثلاث:٥٢٥٩ وسیرت گازرونی قلمی، ابوداود، کتاب الطلاق، باب فی اللعان:٢٢٥٣، ٢٢٥٧۔ نیز فتح الباری، ج ٢، ص: ١٠٦ دیکھنا چاہیے، یہ تمام احکام سورۂ نور میں بتقریب واقعۂ افک ۵ھ میں نازل ہوئے۔

۶ھ

صلح حدیبیہ وبیعتِ رضوان

ذوقعدہ ۶ھ

مکہ معظمہ سے ایک میل کے فاصلہ پر ایک کنواں ہے جس کو حدیبیہ کہتے ہیں۔ گاؤں بھی اسی کنوئیں کے نام سے مشہور ہو گیا۔ چونکہ معاہدۂ صلح یہیں لکھا گیا، اس لئے اس واقعہ کو صلح حدیبیہ کہتے ہیں۔

تاریخِ اسلام میں یہ واقعہ نہایت اہم یعنی اسلام کی تمام آیندہ کامیابیوں کا دیباچہ ہے اور اسی بنا پر باوجود اس کے کہ وہ صرف ایک صلح کا معاہدہ تھا اور صلح بھی بظاہر مغلوبانہ تھی، تاہم اللہ نے قرآن مجید میں اس کو فتح کا لقب دیا ہے۔

کعبہ اسلام کا اصلی مرکز تھا۔ اسلام کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قائم کی تھی اور یہ لقب اسلام بھی انہی کی ایجاد ہے:

﴿ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ (۲۲/ الحج: ۷۸)

''ابراہیم (علیہ السلام) ہی ہیں جس نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔''

رسول اللہ ﷺ کو جو شریعت ملی تھی وہ کوئی نئی شریعت نہ تھی بلکہ وہی ابراہیمی شریعت تھی۔

﴿ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ﴾ (۲۲/ الحج۔۷۸)

''تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا مذہب۔''

زمانہ کے امتداد سے گو انہی کی اولاد بت پرست بن گئی تھی تاہم کعبہ جو ابراہیمی یادگار تھا عرب کا قبلہ گاہِ عام تھا۔ تمام عرب اس کو اپنا مشترک ورثۂ آبائی سمجھتا تھا۔ نہ صرف وہ لوگ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان سے تھے، بلکہ وہ بھی جو قحطانی تھے اور جن کا سلسلۂ نسب اس خاندان سے الگ تھا۔ عرب کے قبائل سال بھر آپس میں لڑتے رہتے تھے اور یہی غارت گریاں ان کی بقائے زندگی کا ذریعہ تھیں۔ کیونکہ ان کی معاش بھی اسی پر منحصر تھی۔ تاہم چار مہینے تک جو اشہرِ حُرم کہلاتے تھے تمام لڑائیں بند ہو جاتیں اور قبائل عرب دور دور سے سفر کر کے آتے اور اس قبلہ گاہِ عام میں عبادت اور عقیدت کے رسوم بجالاتے تھے۔ وہ قبائل جن میں سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے، یکجا جمع نظر آتے تھے اور شیر وشکر ہو کر ملتے تھے، گویا بھائی بھائی ہیں۔ مسلمان بہ جبر مکہ سے نکالے گئے تھے۔ لیکن یہ خیال ان کے دل سے نہیں گیا اور نہ جا سکتا تھا کہ کعبہ پر ان کا بھی کم از کم اسی قدر حق ہے جس قدر اور قبائل کا ہے۔ اس کے ساتھ مکہ سے مسلمانوں کو گونا گوں تعلقات تھے اور وہ ان کا قدیم اور محبوب وطن تھا۔ مکہ کی یاد ایک پھانس تھی جو ہر وقت ان کے کلیجے میں کھٹکتی رہتی تھی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ مکہ میں اس

قدر ستائے گئے تھے تاہم ان کو جب مکہ یاد آتا تو روتے تھے اور پکار کر یہ اشعار پڑھتے تھے: ❶

الا لیت شعری هل ابیتن لیلة — ''آہ! کیا پھر کبھی وہ دن آ سکتا ہے کہ میں مکہ کی وادی میں
بواد وحولی اذخر وجلیل — ایک رات بسر کروں اور میرے پاس اذخر اور جلیل ہوں،
وهل اردن یوما میاه مجنة — اور کیا وہ دن بھی ہوگا کہ میں مجنۃ کے چشمہ پر اتروں
وهل یبدون لی شامة وطفیل — اور شامہ وطفیل مجھ کو دکھائی دیں۔''

اکثر مہاجرین جان بچا کر نکل آئے لیکن خاندان اور بال بچے وہیں رہ گئے تھے۔

اسلام کے فرائضِ چہارگانہ میں حجِ کعبہ ایک رکن اعظم ہے۔ غرض مختلف اسباب سے آنحضرت ﷺ نے مکہ معظمہ کا ارادہ کیا اور اس غرض سے کہ قریش کو کوئی اور احتمال نہ ہو۔ عمرہ ❷ کا احرام باندھا اور قربانی کے اونٹ ساتھ لئے۔ یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ آئے، صرف تلوار جو عرب میں سفر کا ضروری آلہ سمجھی جاتی تھی پاس رکھ لی جائے، اس میں بھی یہ شرط ہے کہ نیام میں بند ہو۔

چونکہ مہاجرین عموماً اور اکثر انصار اس سعادت کے منتظر تھے۔ ۱۴۰۰ شخص اس سفر میں ہمرکاب ہوئے، مقام ذوالحلیفہ پہنچ کر قربانی کی ابتدائی رسمیں ادا ہو گئیں یعنی قربانی کے اونٹ ساتھ تھے۔ ان کی گردنوں میں قربانی کی علامت کے طور پر لوہے کے نعل لگا دیے گئے۔

احتیاط کے لئے قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص جس کے اسلام لانے کا حال قریش کو معلوم نہ تھا پہلے بھیج دیا گیا کہ قریش کے ارادہ کی خبر لائے۔ جب قافلہ عُسفان کے قریب پہنچا اس نے آ کر خبر دی کہ قریش نے تمام قبائل (احابیش) کو یکجا کر کے کہہ دیا ہے کہ محمد ﷺ مکہ میں کبھی نہیں آ سکتے۔

غرض قریش نے بڑے زور وشور سے مقابلہ کی تیاری کی۔ قبائلِ متحدہ کے پاس پیغام بھیجا اور جمعیت عظیم لیکر آئے۔ مکہ سے باہر بلدح ایک مقام پر فوجیں فراہم ہوئیں، خالد بن ولید جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے دو سو سوار لیکر جن میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے بڑھے اور غمیم تک پہنچ گئے جو رابغ اور جحفہ کے درمیان ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''قریش نے خالد کو طلیعہ بنا کر بھیجا ہے اور وہ مقام غمیم تک آ گئے ہیں، اس لئے کترا کر داہنی طرف سے چلو۔'' فوجِ اسلام جب غمیم کے قریب پہنچ گئی تو خالد کو گھوڑوں کی گرد اڑتی نظر آئی، وہ گھوڑا اڑاتے ہوئے گئے اور قریش کو خبر کی کہ لشکرِ اسلام غمیم تک آ گیا۔ آنحضرت ﷺ آگے بڑھے اور حدیبیہ میں پہنچ کر مقام کیا یہاں پانی کی قلت تھی۔ ایک کنواں تھا وہ پہلے ہی آمد میں خالی ہو گیا لیکن اعجاز نبوی سے اس میں اس قدر پانی آ گیا کہ سب سیراب ہو گئے۔

---

❶ یہ اشعار صحیح بخاری میں بھی مذکور ہیں، کتاب مناقب الانصار، باب مقدم النبی ﷺ واصحابه المدینة: ۳۹۲۶۔ (س)

❷ وساق معه الهدی واحرم بالعمرة لیأمن الناس من حربه (ابن هشام، ج ۲، ص: ۲۱۰)

قبیلۂ خزاعہ نے اب تک اسلام نہیں قبول کیا تھا لیکن اسلام کے حلیف اور راز دار تھے۔ قریش اور عام کفار اسلام کے خلاف جو منصوبے بناتے وہ ہمیشہ آنحضرت ﷺ کو اس سے مطلع کر دیا کرتے تھے۔ اس قبیلہ کے رئیس اعظم بدیل بن ورقا تھے (فتح مکہ میں اسلام لائے) ان کو آنحضرت ﷺ کا تشریف لانا معلوم ہوا تو چند آدمی ساتھ لے کر بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ قریش کی فوجوں کا سیلاب آ رہا ہے، وہ آپ ﷺ کو کعبہ میں نہ جانے دیں گے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''قریش سے جا کر کہہ دو کہ ہم عمرہ [1] کی غرض سے آئے ہیں لڑنا مقصود نہیں۔ جنگ نے قریش کی حالت زار کر دی ہے۔ اور ان کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ ان کے لئے بہتر ہوگا کہ ایک مدت معین کے لئے صلح کر لیں اور مجھ کو عرب کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ اس پر بھی اگر وہ راضی نہیں تو اس اللہ کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں یہاں تک لڑوں گا کہ میری گردن الگ ہو جائے اور اللہ کو جو فیصلہ کرنا ہو کر دے۔'' بدیل نے جا کر قریش سے کہا کہ میں محمد ﷺ کے پاس سے پیغام لے کر آیا ہوں اجازت دو تو کہوں۔ چند شریر بول اٹھے کہ ہم کو محمد ﷺ کے پیغام سننے کی ضرورت نہیں لیکن سنجیدہ لوگوں نے اجازت دی۔ بدیل نے آنحضرت ﷺ کی شرطیں پیش کیں۔ عروہ بن مسعود ثقفی نے اٹھ کر کہا۔ کیوں قریش! کیا میں تمہارا باپ اور تم میرے بچے نہیں۔'' بولے ہاں۔ عروہ نے کہا میری نسبت تم کو کوئی بدگمانی تو نہیں، سب نے کہا نہیں، عروہ نے کہا: ''اچھا تو مجھ کو اجازت دو میں خود جا کر معاملہ طے کروں محمد (ﷺ) نے معقول شرطیں پیش کی ہیں۔'' غرض آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے قریش کا پیغام سنایا اور کہا، محمد (ﷺ) فرض کرو کہ تم نے قریش کا استیصال کر دیا تو کیا اس کی اور بھی کوئی مثال ہے کہ کسی نے اپنی قوم کو خود برباد کر دیا ہو؟ اس کے سوا اگر لڑائی کا رخ بدلا تو تمہارے ساتھ جو یہ بھیڑ ہے گرد کی طرح اڑ جائے گی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس بدگمانی پر اس قدر غصہ آیا کہ گالی دے کر کہا کہ کیا ہم محمد ﷺ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟ عروہ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا: یہ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''ابوبکر۔'' عروہ نے کہا: میں ان کی سخت کلامی کا جواب دیتا، لیکن ان کا ایک احسان میری گردن پر ہے جس کا بدلا ابھی تک میں انہیں ادا نہیں کر سکا۔

عروہ آنحضرت ﷺ سے بے تکلفانہ طریقہ سے گفتگو کر رہا تھا اور جیسا کہ عرب کا قاعدہ ہے کہ بات کرتے کرتے مخاطب کی ڈاڑھی پکڑ لیتے ہیں۔ وہ ریش مبارک پر بار بار ہاتھ ڈالتا تھا۔ مغیرہ بن شعبہ جو ہتھیار لگائے آنحضرت ﷺ کی پشت پر کھڑے تھے اس جرأت کو گوارا نہ کر سکے، عروہ سے کہا: ''اپنا ہاتھ ہٹا لے ورنہ یہ ہاتھ بڑھ کر واپس نہ جا سکے گا۔'' عروہ نے حضرت مغیرہ کو پہچانا اور کہا: ''او دغا باز! کیا میں تیری دغا بازی کے معاملہ میں تیرا کام نہیں کر رہا ہوں۔'' (حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے چند آدمی قتل کر دیے تھے جن کا خون بہا عروہ

---

[1] عمرہ گویا ایک چھوٹا سا حج ہے جس میں حج کی اکثر رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ یعنی اس میں حرم کے باہر میقات سے احرام باندھ کر صرف صفا اور مروہ کے درمیان سعی اور کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے اور بال منڈوائے یا کتروائے جاتے ہیں۔ (س)

نے اپنے پاس سے ادا کیا تھا)۔

عروہ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صحابہ کی حیرت انگیز عقیدت کا جو منظر دیکھا اس نے اس کے دل پر عجب اثر کیا۔ قریش سے جا کر کہا کہ میں نے قیصر و کسریٰ و نجاشی کے دربار دیکھے ہیں۔ یہ عقیدت اور وارفتگی کہیں نہیں دیکھی۔ محمد ﷺ بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے، کوئی شخص ان کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا، وہ وضو کرتے ہیں تو پانی جو گرتا ہے اس پر خلقت ٹوٹ پڑتی ہے، بلغم یا تھوک گرتا ہے تو عقیدت کیش ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور چہرہ اور ہاتھوں میں مل لیتے ہیں۔ ❶

چونکہ معاملہ ناتمام رہ گیا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت خراش بن امیہ رضی اللہ عنہ کو قریش کے پاس بھیجا لیکن قریش نے ان کی سواری کے اونٹ کو جو خاص رسول اللہ ﷺ کی سواری کا تھا مار ڈالا اور خود ان پر بھی یہی گزرنے والی تھی لیکن قبائل متحدہ کے لوگوں نے بچا لیا اور وہ کسی طرح جان بچا کر چلے آئے۔

اب قریش نے ایک دستہ بھیجا کہ مسلمانوں پر حملہ آور ہو لیکن یہ لوگ گرفتار کر لئے گئے۔ گو یہ سخت شرارت تھی لیکن رحمت عالم کا دامن عفو اس سے زیادہ وسیع تھا۔ آپ نے سب کو چھوڑ دیا اور معافی دے دی، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے: ❷

﴿ وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ ﴾ (٤٨/ الفتح: ٢٤)

''وہ وہی اللہ ہے جس نے مکہ میں ان لوگوں کا ہاتھ تم سے اور تمھارا ہاتھ ان سے روک دیا، بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو دے دیا تھا۔''

بیعت رضوان

بالآخر آپ ﷺ نے گفتگوئے صلح کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو انتخاب کیا لیکن انہوں نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں اور مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک شخص بھی نہیں کہ مجھ کو بچا سکے۔ آپ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا وہ اپنے ایک عزیز (ابان بن سعید) کی حمایت میں مکہ گئے اور آنحضرت ﷺ کا پیغام سنایا۔ قریش نے ان کو نظر بند کر لیا۔ لیکن عام طور پر یہ خبر مشہور ہوگئی کہ وہ قتل کر ڈالے گئے۔ یہ خبر آنحضرت ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''عثمان کے خون کا قصاص لینا فرض ہے۔'' یہ کہہ کر آپ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہ رضی اللہ عنہم سے جان نثاری کی بیعت لی۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے جن میں زن و مرد دونوں شامل تھے ولولہ انگیز جوش کے ساتھ دستِ مبارک پر جان نثاری کا عہد کیا۔ یہ تاریخِ اسلام کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے۔ اس بیعت کا نام بیعت الرضوان ہے۔ سورۂ فتح میں اس واقعہ کا اور درخت کا ذکر ہے۔

❶ بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد والمصالحة مع اهل الحرب: ٢٧٣١، ٢٧٣٢ (س)۔

❷ ان آیتوں کی شان نزول میں سخت اختلاف ہے لیکن زیادہ معتبر یہی روایت ہے۔

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴾ (٤٨/ الفتح:١٨)

''اللہ مسلمانوں سے راضی تھا جبکہ وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ سو اللہ نے جان لیا جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں تھا۔ تو اللہ نے ان پر تسلی نازل کی اور عاجلانہ فتح دی۔''

لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی۔

قریش نے سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا۔ وہ نہایت فصیح و بلیغ مقرر تھے۔ چنانچہ لوگوں نے ان کو ''خطیبِ قریش'' [1] کا خطاب دیا تھا۔ قریش نے ان سے کہہ دیا صلح صرف اس شرط ہو سکتی ہے کہ محمد ﷺ اس سال واپس چلے جائیں۔

سہیل آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیر تک صلح کے شرائط پر گفتگو رہی۔ بالآخر چند شرطوں پر اتفاق ہوا اور آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلا کر حکم دیا کہ معاہدہ کے الفاظ قلم بند کریں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عنوان پر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھا۔

عرب کا قدیم طریقہ تھا کہ خطوط کی ابتدا میں ''بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ'' لکھتے تھے۔ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' سے وہ آشنا نہ تھے، اس بنا پر سہیل بن عمرو نے کہا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بجائے وہی قدیم الفاظ لکھے جائیں آنحضرت ﷺ نے منظور فرمایا آگے کا فقرہ تھا ''هذا ما قاضى عليه محمد رسول الله'' یعنی ''وہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے تسلیم کیا۔'' سہیل نے کہا: ''اگر ہم آپ کو پیغمبر ہی تسلیم کرتے تو پھر جھگڑا کیا تھا۔ آپ صرف اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں۔'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''گو تم تکذیب کرتے ہو لیکن اللہ کی قسم میں اللہ کا پیغمبر ہوں۔'' یہ کہہ کر آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اچھا خالی میرا نام لکھو، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ کون فرمان گزار ہو سکتا تھا لیکن عالم محبت میں ایسے مقام بھی پیش آتے ہیں جہاں فرمانبرداری سے انکار کرنا پڑتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں ہرگز آپ کا نام نہ مٹاؤں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اچھا مجھ کو دکھاؤ، میرا نام کہاں ہے۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس جگہ پر انگلی رکھ دی۔ آپ نے رسول اللہ کا لفظ مٹا دیا۔ [2]

آنحضرت ﷺ کو لکھنا نہیں آتا تھا۔ اسی بنا پر آپ کو ''امی'' کہتے ہیں۔ یہ واقعہ مسلم میں جہاں منقول ہے لکھا ہے کہ آپ نے رسول اللہ کا لفظ مٹا کر ابن عبداللہ لکھ دیا۔ بخاری میں چونکہ یہ واقعہ عام روایت کے خلاف ہے، اس لئے ایک معرکۃ الآراء مباحثہ بن گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کا کام روزمرہ جب نظر

[1] زرقانی، ج ۲، ص: ۲۲۳ (س)۔ [2] صحیح بخاری کی اس روایت میں جو صلح حدیبیہ میں ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام اور ان کی گفتگو مذکور نہیں، یہ تصریح بخاری کی اس روایت میں ہے جو کہ کتاب المغازی، باب عمرة القضاء: ٤٢٥١ میں مذکور ہے: صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب صلح حدیبیه: ٤٦٢٩ تا ٤٦٣١ میں بھی یہ واقعہ منقول ہے۔

سے گزرتا رہتا ہے تو ناخواندہ شخص بھی اپنے نام کے حرف سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اس سے امیت میں فرق نہیں آتا۔ بے شبہ امی ہونا آپ کا فخر ہے اور خود قرآن مجید میں یہ وصف شرف وعزت کے موقع پر استعمال ہوا ہے۔ ﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ ﴾ (۷/ الاعراف: ۱۵۷)

شرائط صلح یہ تھیں

① مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔

② اگلے سال آئیں اور صرف تین دن قیام کر کے چلے جائیں۔

③ ہتھیار لگا کر نہ آئیں، صرف تلوار ساتھ لائیں، وہ بھی نیام میں اور نیام بھی جلبان (تھیلا وغیرہ) میں۔

④ مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے کوئی مکہ میں رہ جانا چاہے تو اس کو نہ روکیں۔

⑤ کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں جائے [1] تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

⑥ قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔

یہ شرطیں بظاہر مسلمانوں کے سخت خلاف تھیں، اتفاق یہ کہ عین اس وقت جبکہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا۔ سہیل کے صاحبزادے (ابو جندل رضی اللہ عنہ) جو اسلام لا چکے تھے اور مکہ میں کافروں نے ان کو قید کر رکھا تھا اور طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے کسی طرح بھاگ کر پاؤں میں بیڑیاں پہنے ہوئے آئے اور سب کے سامنے گر پڑے۔ سہیل نے کہا "محمد (ﷺ)! صلح کی تعمیل کا یہ پہلا موقع ہے اس (ابو جندل رضی اللہ عنہ) کو شرائط صلح کے مطابق مجھ کو واپس دیدو۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "ابھی معاہدہ قلم بند نہیں ہو چکا۔" سہیل نے کہا: "تو ہم کو صلح بھی منظور نہیں۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "اچھا ان کو یہیں رہنے دو۔" سہیل نے نامنظور کیا آپ ﷺ نے چند دفعہ اصرار کیا۔ لیکن سہیل کسی طرح راضی نہ ہوا۔ مجبوراً آنحضرت ﷺ کو تسلیم کرنا پڑا۔ ابو جندل رضی اللہ عنہ کو کافروں نے اس طرح مارا تھا کہ ان کے جسم پر نشان تھے۔ مجمع کے سامنے تمام زخم دکھائے اور کہا، برادرانِ اسلام! کیا پھر مجھ کو اسی حالت میں دیکھنا چاہتے ہو؟ میں اسلام لا چکا ہوں، کیا پھر مجھ کو کافروں کے ہاتھ میں دیتے ہو؟ تمام مسلمان تڑپ اٹھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ضبط نہ کر سکے۔ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ پیغمبر برحق نہیں ہیں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ہاں ہوں۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا ہم حق پر نہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ہاں ہم حق پر ہیں۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تو ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "میں اللہ کا پیغمبر ہوں اور اللہ کے حکم

[1] یہ تمام شرائط کتب سیر کے علاوہ صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسير، باب صلح الحديبية: ٤٦٢٩ تا ٤٦٣٢ میں بھی ہیں۔

کی نافرمانی نہیں کرسکتا اللہ میری مدد کریگا۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال کریں گے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ اٹھ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور وہی گفتگو کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: "وہ اللہ کے پیغمبر ہیں جو کچھ کرتے ہیں اللہ کے حکم سے کرتے ہیں۔" ❶ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی ان گستاخانہ معروضات کا جو بے اختیاری میں ان سے سرزد ہوئیں تمام عمر سخت رنج رہا اور اس کے کفارہ کے لئے انہوں نے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، خیرات کی، غلام آزاد کئے، بخاری میں اگرچہ ان اعمال کا ذکر اجمالاً ہے لیکن ابن اسحاق نے تفصیل سے یہ تمام باتیں گنائی ہیں۔ ❷

اس حالت کو گوارا کرنا گو صحابہ رضی اللہ عنہم کی اطاعت شعاری کا سخت خطرناک امتحان تھا۔ ایک طرف (ظاہر میں) اسلام کی توہین ہے۔ ابوجندل بیڑیاں پہنے ۱۴سو جان نثاران اسلام سے استغاثہ کرتے ہیں۔ سب کے دل جوش سے لبریز ہیں اور اگر رسول اللہ ﷺ کا ذرا ایما ہو جائے تو تلوار فیصلۂ قاطع کے لئے موجود ہے، دوسری طرف معاہدہ پر دستخط ہو چکے ہیں اور ایفائے عہد کی ذمہ داری ہے، رسول اللہ ﷺ نے ابوجندل رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا اور فرمایا:

يا ابا جندل اصبر واحتسب فان الله جاعل لك ولمن معك من المستضعفين فرجا ومخرجًا انا قد عقدنا بيننا وبين القوم صلحا وانا لا نغدربهم۔ ❸

"ابوجندل! صبر اور ضبط سے کام لو اللہ تمہارے لئے اور مظلوموں کے لئے کوئی راہ نکالے گا صلح اب ہو چکی اور ہم ان لوگوں سے بدعہدی نہیں کرسکتے۔"

غرض ابوجندل رضی اللہ عنہ کو اسی طرح پابہ زنجیر واپس جانا پڑا۔

آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ لوگ یہیں قربانی کریں لیکن لوگ اس قدر دل شکستہ تھے کہ ایک شخص بھی نہ اٹھا یہاں تک کہ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے، تین دفعہ بار بار کہنے پر بھی ایک شخص آمادہ نہ ہوا۔ آنحضرت ﷺ خیمہ میں تشریف لے گئے اور ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے شکایت کی۔ انہوں نے کہا: آپ ﷺ کسی سے کچھ نہ فرمائیں۔ بلکہ باہر نکل کر خود قربانی کریں اور احرام اتارنے کے لئے بال منڈوائیں۔ آپ نے باہر آکر خود قربانی کی اور بال منڈوائے۔ اب جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اس فیصلہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تو سب نے قربانیاں کیں اور احرام اتارا۔ ❹

صلح کے بعد تین دن تک آپ ﷺ نے حدیبیہ میں قیام فرمایا، پھر روانہ ہوئے تو راہ میں یہ سورۃ اتری۔

﴿ إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝ ﴾ (٤٨/ الفتح:١)

❶ صحيح بخاري، كتاب الشروط، باب الشروط في الجهاد: ٢٧٣١، ٢٧٣٢۔(س)۔ ❷ سيرت ابن هشام، ج ٢، ص:٢١٦۔ ❸ سيرت ابن هشام، ج ٢، ص:٢١٧۔ ❹ كتاب الشروط: ٢٧٣١، ٢٧٣٢ (س)

''ہم نے تجھ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔''

تمام مسلمان جس چیز کو شکست سمجھتے تھے۔ اللہ نے اس کو فتح کہا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا: ''یہ آیت نازل ہوئی ہے۔'' انہوں نے تعجب سے پوچھا کہ کیا یہ فتح ہے؟ ارشاد ہوا کہ ''ہاں۔'' صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تسکین ہوگئی اور مطمئن ہو گئے۔ [1] نتائج مابعد نے اس راز سربستہ کی عقدہ کشائی کی۔ اب تک مسلمان اور کفار ملتے جلتے نہ تھے۔ اب صلح کی وجہ سے آمد و رفت شروع ہوئی، خاندانی اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے کفار مدینہ میں آتے، مہینوں قیام کرتے اور مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے، باتوں باتوں میں اسلامی مسائل کا تذکرہ آتا رہتا تھا، اس کے ساتھ ہر مسلمان اخلاص، حسن عمل، نیکو کاری، پاکیزہ اخلاقی کی ایک زندہ تصویر تھا۔ جو مسلمان مکہ جاتے تھے ان کی صورتیں یہی مناظر پیش کرتی تھیں۔ اس سے خود بخود کفار کے دل اسلام کی طرف کھنچے آتے تھے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اس معاہدہ صلح سے لے کر فتح مکہ تک اس قدر کثرت سے لوگ اسلام لائے کہ کبھی نہیں لائے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ (فاتح شام) اور عمرو بن عاص (فاتح مصر) کا اسلام بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ معاہدۂ صلح میں یہ جو شرط تھی کہ جو مسلمان مکہ سے چلا آئے گا وہ پھر مکہ کو واپس کر دیا جائے گا اس میں صرف مرد داخل تھے عورتیں نہ تھیں عورتوں کے متعلق خاص یہ آیت اتری:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا جَآءَكُمُ ٱلْمُؤْمِنَٰتُ مُهَٰجِرَٰتٍ فَٱمْتَحِنُوهُنَّ ۖ ٱللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَٰنِهِنَّ ۖ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى ٱلْكُفَّارِ ۖ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۖ وَءَاتُوهُم مَّآ أَنفَقُواْ ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَن تَنكِحُوهُنَّ إِذَآ ءَاتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۚ وَلَا تُمْسِكُواْ بِعِصَمِ ٱلْكَوَافِرِ ﴾ . (٦٠/ الممتحنة:١٠)

''مسلمانو! جب تمہارے پاس عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کو جانچ لو، اللہ ان کے ایمان کو اچھی طرح جانتا ہے، اب اگر تم کو معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہیں تو ان کو کافروں کے ہاں واپس نہ بھیجو نہ وہ عورتیں کافروں کے قابل ہیں۔ اور نہ کافران عورتوں کے قابل ہیں اور ان عورتوں پر ان لوگوں نے جو خرچ کیا ہو وہ تم ان کو دے دو اور تم ان سے شادی کر سکتے ہو بشرطیکہ ان کے مہر ادا کر دو اور کافرہ عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ رکھو۔''

جو مسلمان مکہ میں مجبوری سے رہ گئے تھے چونکہ کفار ان کو سخت تکلیفیں دیتے تھے اس لئے وہ بھاگ بھاگ کر مدینہ آتے تھے۔ سب سے پہلے عتبہ بن اُسید رضی اللہ عنہ (ابوبصیر) بھاگ کر مدینہ آئے۔ قریش نے آنحضرت ﷺ کے پاس دو شخص بھیجے کہ ہمارا آدمی واپس کر دیجئے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب صلح الحديبية: ٤٦٣٣ صلح حدیبیہ کے واقعات صحیح بخاری میں نہایت تفصیل سے مذکور ہیں لیکن اصل موقع یعنی غزوات کے ذکر میں نہیں بلکہ کتاب الشروط میں، اس بنا پر ارباب سیر کی نگاہ سے یہ واقعات رہ گئے۔ غزوات میں جستہ جستہ واقعات ہیں ہم نے ان کو بھی لیا ہے، باقی جزئیات صحیح مسلم اور ابن ہشام سے ماخوذ ہیں۔

سے فرمایا: ''کہ واپس جاؤ۔'' حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ کیا آپ مجھ کو کافروں کے پاس بھیجتے ہیں کہ مجھ کو کفر پر مجبور کریں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ اس کی کوئی تدبیر نکالے گا۔'' حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ مجبوراً دو کافروں کی حراست میں واپس گئے۔ لیکن مقام ذوالحلیفہ پہنچ کر انہوں نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا۔ دوسرا شخص جو بچ رہا اس نے مدینہ آ کر آنحضرت ﷺ سے شکایت کی۔ ساتھ ہی ابوبصیر بھی پہنچے اور عرض کی کہ آپ نے عہد کے موافق اپنی طرف سے مجھ کو واپس کر دیا اب آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ یہ کہہ کر مدینہ سے چلے گئے اور مقام عیص میں جو سمندر کے کنارے ذو مروہ کے پاس ہے رہنا اختیار کیا۔ مکہ کے بیکس اور ستم رسیدہ لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ جان بچانے کا ایک ٹھکانا پیدا ہو گیا ہے تو چوری چھپے بھاگ بھاگ کر یہاں آنے لگے۔ چند روز کے بعد اچھی خاصی جمعیت ہو گئی اور اب ان لوگوں نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ قریش کا کاروانِ تجارت جو شام کو جایا کرتا تھا اس کو روک لیتے تھے۔ ان حملوں میں جو مال غنیمت مل جاتا تھا وہ ان کی معاش کا سہارا تھا۔

قریش نے مجبور ہو کر آنحضرت ﷺ کو لکھ بھیجا کہ معاہدہ کی اس شرط سے ہم باز آتے ہیں اب جو مسلمان چاہے مدینہ جا کر آباد ہو سکتا ہے۔ اس سے تعرض نہ کریں گے آپ نے آوارۂ وطن مسلمانوں کو لکھ بھیجا کہ یہاں چلے آؤ۔ چنانچہ ابو جندل اور ان کے ساتھی مدینہ میں آ کر آباد ہو گئے اور کاروانِ قریش کا راستہ بدستور کھل گیا۔

مستورات میں سے ام کلثوم جو رئیس مکہ (عقبہ بن ابی معیط) کی صاحبزادی تھیں اور مسلمان ہو چکی تھیں مدینہ ہجرت کر کے آئیں، ان کے ساتھ ان کے دونوں بھائی عمارہ اور ولید بھی آئے اور آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ ان کو واپس دے دیجئے۔ آپ نے منظور نہیں فرمایا۔ صحابہ میں سے جن لوگوں کی ازواج مکہ میں رہ گئی تھیں اور اب تک کافر تھیں صحابہ نے ان کو طلاق دے دی۔ [1]

[1] یہ تفصیل اکتفاء کلاعی سے خمیس (ج ۲، ص: ۲۳ تا ۲۵ مطبوعہ وہبیہ مصر: ۱۲۸۳ھ) نے نقل کی ہے۔

سلاطین کو اسلام کی دعوت

(آخر) ٦ھ یا (شروع) ٧ھ

﴿ أُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾ (١٦/ النحل:١٢٥)

حدیبیہ کی صلح سے کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو وقت آیا کہ اسلام کا پیغام تمام دنیا کے کانوں میں پہنچا دیا جائے۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے (ایک دن تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کیا اور خطبہ دیا۔ ''ایھا الناس! اللہ نے مجھ کو تمام دنیا کے لئے رحمت اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ دیکھو حوارین عیسٰی کی طرح اختلاف نہ کرنا، جاؤ میری طرف سے پیغام حق ادا کرو۔'' [1] اس کے بعد آپ نے) قیصر روم، شہنشاہ عجم، عزیز مصر اور رؤسائے عرب کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط ارسال فرمائے۔ جو لوگ خطوط لیکر گئے اور جن کے نام لے کر گئے، ان کی تفصیل یہ ہے: [2]

حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ	قیصر روم
حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ	خسرو پرویز کج کلاہ ایران
حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ	عزیز مصر
حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ	نجاشی بادشاہ حبش
حضرت سلیط بن عمر بن عبد شمس رضی اللہ عنہ	رؤسائے یمامہ
حضرت شجاع بن وہب الاسدی رضی اللہ عنہ	رئیس حدود شام حارث غسانی

ایرانیوں نے چند برس پہلے بلادِ شام پر حملہ کر کے رومیوں کو شکست دی تھی جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت ﴿غُلِبَتِ الرُّوْمُ﴾ میں ہے۔ ہرقل نے اس کے انتقام کے لئے بڑے سروسامان سے فوجیں تیار کیں اور ایرانیوں پر حملہ کر کے ان کو سخت شکست دی تھی۔ اس کا شکرانہ ادا کرنے کے لئے وہ حمص سے بیت المقدس آیا تھا اور اس شان سے آیا تھا کہ جہاں چلتا تھا زمین پر فرش اور فرش پر پھول بچھائے جاتے تھے۔ [3]

شام میں عرب کا جو خاندان قیصر کے زیر حکومت رہا کرتا تھا وہ غسانی خاندان تھا اور اس کا پایۂ تخت بُصریٰ تھا جو دمشق کے علاقہ میں ہے اور آج کل حوران کہلاتا ہے۔ اس زمانہ میں اس خاندان کا تخت نشین حارث غسانی تھا۔ دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کا نامۂ مبارک یہیں بصریٰ میں حارث غسانی کو لا کر دیا۔ اس نے قیصر کے پاس بیت المقدس میں بھیج دیا۔ قیصر کو خط ملا تو اس نے حکم دیا کہ عرب کا کوئی شخص مل سکے

---

[1] سیرت ابن ھشام، ج٢، ص:٣٩٢، ٢٩٣ و (تاریخ الخمیس بحواله اکتفاء کلاعی، ج٢، ص:٢٩، ٣٠)۔

[2] طبری، ج ٣، ص: ١٥٥٩ ''س'' اور ابن ہشام (باب خروج رسول اللہ ﷺ الی الملوك، ج٢، ص:٣٩٢، ٣٩٣ (س)۔ [3] ہرقل کا پورا واقعہ فتح الباری، (ج١ص:٣١، (س) شرح صحیح بخاری سے لیا گیا ہے۔ اصل صحیح بخاری (کتاب بدء الوحی کیف کان بدء الوحی:٧ وکتاب الجهاد، باب دعاء النبی ﷺ الی الاسلام والنبوة: ٢٩٤١ (س)۔ میں مجمل واقعہ ہے۔ زائد تفصیلیں حافظ ابن حجر نے اور کتابوں سے بڑھائی ہیں۔

تو لاؤ۔ اتفاق یہ کہ ابوسفیان تجارِ عرب کے ساتھ غزہ میں مقیم تھے۔ قیصر کے آدمی ان کو غزہ سے جا کر لائے۔

قیصر نے بڑے سامان سے دربار منعقد کیا، خود تاج شاہی پہن کر تخت پر بیٹھا تخت کے چاروں طرف بطارقہ قسیس اور رہبان کی صفیں قائم کیں، اہل عرب کی طرف مخاطب ہو کر کہا، تم میں سے اس مدعی نبوت کا رشتہ دار کون ہے؟ ابوسفیان نے کہا "میں۔" پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی:

قیصر	مدعیٔ نبوت کا خاندان کیسا ہے؟
ابوسفیان	شریف ہے۔
قیصر	اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا؟
ابوسفیان	نہیں۔
قیصر	اس خاندان میں کوئی بادشاہ بھی گزرا ہے؟
ابوسفیان	نہیں۔
قیصر	جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے وہ کمزور لوگ ہیں یا صاحبِ اثر؟
ابوسفیان	کمزور لوگ ہیں۔
قیصر	اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟
ابوسفیان	بڑھتے جاتے ہیں۔
قیصر	کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہے؟
ابوسفیان	نہیں۔
قیصر	وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟
ابوسفیان	ابھی تک تو نہیں کی لیکن اب جو نیا معاہدۂ صلح ہوا ہے اس میں دیکھیں وہ عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں؟
قیصر	تم لوگوں نے اس سے کبھی جنگ بھی کی؟
ابوسفیان	ہاں۔
قیصر	نتیجۂ جنگ کیا رہا؟
ابوسفیان	کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ۔
قیصر	وہ کیا سکھاتا ہے؟
ابوسفیان	کہتا ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو، کسی اور کو اللہ کا شریک نہ بناؤ نماز پڑھو، پاک دامنی اختیار کرو، سچ بولو، صلۂ رحمی کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے مترجم کے ذریعہ سے کہا کہ "تم نے اس کو شریف النسب بتایا، پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندانوں سے پیدا ہوتے ہیں تم نے کہا کہ اس کے خاندان سے کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا، وہ اللہ پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے پیروی کی ہے، پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں۔ تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے، سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اُس نے کبھی فریب نہیں کیا، پیغمبر کبھی فریب نہیں کرتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز اور تقویٰ وعفاف کی ہدایت کرتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو میری قدم گاہ تک اس کا قبضہ ہو جائے گا مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ میں اگر وہاں جا سکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا۔"

اس گفتگو کے بعد حکم دیا کہ رسول اللہ ﷺ کا خط پڑھا جائے۔ [1]

فرمانِ رسالت کے یہ الفاظ تھے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم من محمد عبداللہ و رسولہ الی ہرقل عظیم الروم سلام علی من اتبع الھدیٰ، اما بعد! فانی ادعوك بدعایة الاسلام اسلم تسلم یؤتك اللّٰہ اجرك مرتین فان تولیت فعلیك اثم الاریسیین ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝﴾

(٣/ آل عمران:٦٤)

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، محمد ﷺ کی طرف سے جو اللہ کا بندہ اور رسول ہے۔ یہ خط ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیس اعظم ہے۔ اس کو سلامتی ہے جو ہدایت کا پیرو ہے اس کے بعد میں تجھ کو اسلام کی دعوت کی طرف بلاتا ہوں۔ سلام لا، تو سلامتی میں رہے گا۔ اللہ تجھ کو دگنا اجر دے گا اور اگر تو نے نہ مانا تو اہل ملک کا گناہ تیرے اوپر ہوگا اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو (اللہ کو چھوڑ کر) خدا نہ بنائے اور تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں۔"

قیصر نے ابوسفیان سے جو گفتگو کی تھی اس سے بطارقہ اور اہل دربار سخت برہم ہو چکے تھے۔ نامہ مبارک

[1] یہ پوری گفتگو صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں منقول ہے، ابتدائے کتاب میں بھی اور باب الجہاد میں بھی۔

کے پڑھے جانے پر اور بھی برہم ہوئے۔ یہ حالت دیکھ کر قیصر نے اہلِ عرب کو دربار سے اٹھا دیا۔ اور گو اس کے دل میں نورِ اسلام آ چکا تھا لیکن تاج و تخت کی تاریکی میں وہ روشنی بجھ کر رہ گئی، [1]

خسرو پرویز (شہنشاہ ایران) کے نام جو نامۂ مبارک عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ لے کر گئے تھے یہ تھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم من محمد رسول اللّٰہ الی کسریٰ عظیم فارس سلام علی من اتبع الھدیٰ واٰمن باللّٰہ ورسولہ واشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وانی رسول اللّٰہ اِلی الناس کافۃ لینذر من کان حیا اسلم تسلم فان ابیت فعلیك اثم المجوس۔ [2]

''اللہ رحمٰن رحیم کے نام سے محمد ﷺ پیغمبر کی طرف سے کسریٰ (رئیسِ فارس) کے نام، سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت کا پیرو ہو اور اللہ اور پیغمبر پر ایمان لائے اور یہ گواہی دے کہ اللہ صرف ایک اللہ ہے اور یہ کہ اللہ نے مجھ کو تمام دنیا کا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، تاکہ وہ ہر زندہ شخص کو اللہ کا خوف دلائے تو اسلام قبول کر تو سلامت رہے گا۔ ورنہ مجوسیوں کا وبال بھی تیری گردن پر ہوگا۔''

خسرو پرویز بڑی شوکت و شان کا بادشاہ تھا، اس کی سلطنت میں دربار کو جو عظمت و جلال حاصل ہوا کبھی نہیں ہوا تھا عجم کا طریقہ یہ تھا کہ سلاطین کو جو خطوط لکھتے تھے ان میں عنوان پر پہلے بادشاہ کا نام ہوتا تھا۔ نامہ مبارک میں پہلے اللہ کا نام اور پھر عرب کے دستور کے موافق رسول اللہ ﷺ کا نام تھا۔ خسرو نے اس کو اپنی تحقیر سمجھا اور بولا کہ میرا غلام ہو کر مجھ کو یوں لکھتا ہے۔'' [3] پھر نامۂ مبارک کو چاک کر ڈالا لیکن چند روز کے بعد خود سلطنت عجم کے پرزے اڑ گئے۔

نظامی نے شیریں خسرو میں داستان مفصل لکھی ہے اور اسلامی جوش سے لکھی ہے ہم اس کے چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں:

دراں دوراں کہ گیتی رامِ اُوبود [4] ز مشرق تابہ مغرب نامِ اُوبود

رسولِ مابہ حجت ہائے قاہر نبوت درجہاں مے کرد ظاہر

---

[1] مسند ابن حنبل، ص: ۷۵، ج ۴ میں ہے کہ حضرت دِحیہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ قیصر نے اپنا ایک سفیر خط کا جواب دے کر خدمت نبوی ﷺ میں بھیجا تھا اور سفیر کو نبوت کے چند سوالات بتا دیے تھے۔ اس نے سوالات پوچھے آپ ﷺ نے جوابات دیے اور آخر بغیر اسلام لائے وہ واپس گیا، لیکن یہ حدیث صحیح نہیں، اس میں ہے کہ قیصر کا خط پڑھنے کے لئے آنحضرت ﷺ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور انہوں نے پڑھ کر سنایا حالانکہ وہ اس وقت اسلام بھی نہیں لائے تھے، (جامع کے نزدیک حسب تحقیق ابن حجر فتح الباری ج ۸ ص: ۹۷ و زرقانی ج ۳ ص: ۸۸ و ۸۹ یہ واقعہ دوسرا ہے اور اس کے بعد کا ہے اور خود اس حدیث میں تصریح ہے کہ یہ تبوک کا واقعہ ہے اور غزوۂ تبوک، فتح مکہ کے بعد رجب ۹ھ میں پیش آیا ہے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس سے ایک یا دو سال پہلے حدیبیہ یا فتح مکہ میں مسلمان ہو چکے تھے مگر تبوک میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شرکت کہیں مذکور نہیں یہ روایت اسی سند کے ساتھ کتاب الاموال ابوعبید القاسم بن سلام ص: ۲۵۵ مصر، میں بھی موجود ہے۔'' س''

[2] تاریخ طبری، ج ۳، ص: ۱۵۷۱۔ [3] تاریخ الخمیس، ج ۲، ص: ۳۴، ۳۵۔ [4] اس سے خسرو مراد ہے۔

گہے باسنگ خارا رازمی گفت | گہے ریگش حکایت بازمی گفت
خلائق راز دعوت جام در داد | بہ ہر کشور صلائے عام درداد
بفرمود از عطا عطرے سرشتند | بہ نام ہریکے، سطرے نوشتند
چو از نام نجاشی باز پرداخت | زبہر نامِ خسرونامۂ ساخت
چوقاصد عرضہ کرد آن نامۂ نو | بجو شید از غضب اندام خسرو
زتیزی گشت ہر مویش سنانی | زگرمئ ہر رگش آتش فشانی
سوادے دید روشن ہیبت انگیز | نوشتۂ از محمد ﷺ سوئے پرویز
چوعنوان گاہ عالم تاب رادید | تو گفتی سگ گزیدہ آب رادید
غرورِ بادشاہی بردش ازراہ | کہ گستاخی کہ یارد . باچومن شاہ
کرا زہرہ کہ باایں احترامم | نویسد نام خود بالائے نامم
رخ از گرمی چو آتش گاہ خود کرد | بخود اندیشۂ بد کرد، و بد کرد
درید آن نامۂ گردن شکن را | نہ نامہ بلکہ نامِ خویشتن را
فرستادہ چودید آں خشم ناکی | بہ رجعت پائے خود راکرد خاکی
ازاں آتش کہ آں دود تہی داشت | چراغ آگہاں ❶ را آگہی داشت
زگرمی آن چراغ گردن افراز | دعا را داد چوں پروانہ پرواز
عجم رازآن دعا کسریٰ درافتاد | کلاہ ازتارکِ کسریٰ درافتاد
زہے شاہنشہے کز بیم وامید | قلم راندہ برافریدون جمشید

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نامۂ مبارک پہنچنے کے بعد خسرو پرویز نے گورنر یمن کو جس کا نام ''باذان'' تھا، فرمان بھیجا کہ کسی شخص کو حجاز بھیجو کہ اس نئے مدعیٔ نبوت کو پکڑ کر میرے دربار میں لائے۔ باذان نے دو شخصوں کو جن میں سے ایک کا نام بابویہ اور دوسرے کا خرخسرہ تھا، مدینہ روانہ کیا۔ ان دونوں نے بارگاہ رسالت میں آ کر عرض کی کہ شہنشاہ عالم (کسریٰ) نے تم کو بلایا ہے، اگر تعمیل حکم نہ کرو گے تو وہ تم کو اور تمہارے ملک کو برباد کردے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم واپس جاؤ اور کہہ دینا کہ اسلام کی حکومت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچے گی۔'' ❷ پیغام پہنچا کر یمن میں آئے تو خبر آئی کہ شیرویہ (خسرو پرویز کا بیٹا) نے خسرو پرویز کو قتل کر ڈالا۔

نجاشی (بادشاہ حبش) کو آپ ﷺ نے دعوت اسلام کا جو خط بھیجا تھا، اس کے جواب میں اس نے عریضہ بھیجا کہ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں۔'' حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ جو ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے یہیں موجود تھے۔ نجاشی نے ان کے ہاتھ پر بیعتِ اسلام کی، ابن اسحاق نے روایت

❶ آگہان یعنی ارباب علم چراغ آگہاں سے آنحضرت ﷺ مراد ہیں ''آگہی داشت'' یعنی خبر کی۔
❷ طبری، ج ۳، ص: ۱۵۷۲، ۱۵۷٤۔

کی ہے کہ نجاشی نے اپنے بیٹے کو ساٹھ مصاحبوں کے ساتھ بارگاہ رسالت میں عرض نیاز کے لئے بھیجا، لیکن جہاز سمندر میں ڈوب گیا اور یہ سفارت ہلاک ہوگئی۔ ❶

عام ارباب سیر لکھتے ہیں کہ نجاشی نے ۹ ھ میں وفات پائی۔ ❷ آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف رکھتے تھے اور یہ خبر سن کر آپ نے غائبانہ اس کے جنازہ کی نماز پڑھائی، ❸ لیکن یہ غلط ہے۔ صحیح مسلم میں تصریح ہے کہ جس نجاشی کی نمازِ جنازہ آپ ﷺ نے پڑھی وہ یہ نہ تھا ❹ (لیکن ابن قیم نے ارباب سیر کی روایت کی تائید کی ہے اور مسلم کی روایت کے اس ٹکڑا کو راوی کا وہم بتایا ہے)۔ ❺

جو لوگ ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے ان میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا (امیر معاویہ کی بہن) بھی تھیں، ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے نجاشی کو لکھ بھیجا کہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو شادی کا پیغام سنا دو اور میرے پاس بھیج دو، نجاشی نے خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا، انہوں نے آنحضرت ﷺ کی طرف سے ایجاب وقبول ادا کیا، نجاشی نے آنحضرت ﷺ کی طرف سے مہر ادا کیا جس کی تعداد چار سو اشرفیاں تھیں۔ نکاح کے بعد حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا جہاز میں بیٹھ کر روانہ ہوئیں اور مدینہ کی بندرگاہ میں اتریں، آنحضرت ﷺ اس وقت خیبر میں تشریف رکھتے تھے، آنحضرت ﷺ اکثر نجاشی کے حالات ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کرتے تھے۔ ❻

عزیز مصر (مقوقس) کو آپ ﷺ نے جو خط لکھا تھا اس کے جواب میں اس نے عربی زبان میں یہ خط لکھا:

لمحمد بن عبداللّٰه من المقوقس عظيم القبط سلام عليك اما بعد فقد قرأت كتابك وفهمت ما ذكرت فيه وما تدعو اليه وقد علمت ان نبيًا بقى وكنت اظن انه يخرج بالشام وقد اكرمت رسولك وبعثته اليك بجاريتين لهما مكان فى القبط عظيم وكسوة واهديت اليك بغلةً لتركبها والسلام عليك۔ ❼

---

❶ طبری، ج۳، ص: ۱۵۶۹۔ ❷ تاریخ طبری، ج٤، ص: ۱۷۲۰۔ ❸ صحیح مسلم، كتاب الجنائز، باب فى التكبير على الجنازة: ۲۲۰٤۔ ❹ صحیح مسلم، كتاب الجهاد، باب كتب النبى ﷺ الى ملوك الكفار: ٤٦۰۹۔ ❺ زادالمعاد (س) (حضرت جامع سیرت سے اس موقع پر تسامح ہوا ہے، علامہ ابن قیم نے بعینہ وہی بات کہی ہے جو مؤلفِ سیرت کا مقصود ہے ان کے الفاظ یہ ہیں: وتوفى النجاشى سنة تسع واخبر رسول اللّٰه ﷺ بموته ذالك اليوم، فخرج بالناس الى المصلى فصلى عليه وكبر اربعا، قلت وهذا وهم۔ واللّٰه اعلم۔ وقد خلط راويه ولم يميز بين النجاشى الذى صلى عليه وهو الذى آمن به واكرم اصحابه وبين النجاشى الذى كتب اليه يدعوه، فهما اثنان وقد جاء ذلك مبينا فى صحيح مسلم ان رسول اللّٰه ﷺ كتب الى النجاشى وليس بالذى صلى عليه) زاد المعاد، ج۲، ص: ٥٦ ذكر هديه فى مكاتباته الى الملوك وغيرهم۔ مطبعہ میمنیہ مصر: ۱۳۲۴ھ)۔
❻ تاریخ طبری، ج۳، ص: ۱۵۷۰۔ ❼ زاد المعاد، ج۲، ص: ٥٧۔

’’محمد بن عبداللہ کے نام مقوقس رئیس قبط کی طرف سے سلام علیک کے بعد میں نے آپ ﷺ کا خط پڑھا اور اس کا مضمون اور مطلب سمجھا مجھ کو اس قدر معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آنے والے ہیں، لیکن میں یہ سمجھا تھا کہ وہ شام میں ظہور کریں گے، میں نے آپ کے قاصد کی عزت کی اور دو لڑکیاں [1] بھیجتا ہوں جن کی قبطیوں (مصری قوم) میں بہت عزت کی جاتی ہے اور میں آپ ﷺ کے لئے کپڑا اور سواری کا ایک خچر بھیجتا ہوں۔‘‘

بااین ہمہ عزیز مصر اسلام نہیں لایا، دولڑکیاں جو بھیجی تھیں ان میں ایک ماریہ قبطیہ تھیں جو حرم نبوی میں داخل ہوئیں دوسری سیرین تھیں جو حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے ملک میں آئیں، خچر کا نام دلدل تھا جس کا ذکر اکثر حدیث کی کتابوں میں آتا ہے، جنگ حنین میں آپ اسی پر سوار تھے، [2] طبری نے لکھا ہے کہ ماریہ اور سیرین حقیقی بہنیں تھیں اور حضرت حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ جن کو آنحضرت ﷺ نے مقوقس کے پاس خط لے کر بھیجا تھا ان کی تعلیم سے دونوں خاتونیں خدمت نبوی میں پہنچنے سے پہلے اسلام قبول کر چکی تھیں، [3] اس واقعہ کو اس حیثیت سے دیکھنا چاہیے کہ یہ خاتونیں لونڈیاں نہ تھیں اور اسلام قبول کر چکی تھیں، اس لئے آنحضرت ﷺ نے ماریہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا ہوگا نہ کہ لونڈی کی حیثیت سے وہ آپ ﷺ کے حرم میں آئیں۔

(رؤسائے عرب کو جو خط لکھے گئے تھے ان کے بھی جواب مختلف آئے، ہوذہ بن علی رئیس یمامہ نے لکھا، تم جو باتیں کہتے ہو وہ نہایت اچھی ہیں اگر حکومت میں کچھ میرا بھی حصہ ہو تو میں تمہاری اقتدا کے لئے تیار ہوں، اسلام ہوسِ ملک کے لئے نہیں آیا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: ’’زمین کا ایک ٹکڑا بھی ہو تو میں نہ دوں گا۔‘‘ [4]

حارث غسانی جو حدود شام کا رئیس تھا اور رومیوں کے ماتحت اطراف کے عربوں میں حکومت کرتا تھا خط پڑھ کر برہم ہوا اور فوج کو تیاری کا حکم دیا، مسلمان اس جرم کی پاداش میں ہر وقت اس کے حملہ کے منتظر رہتے تھے اور آخر موتہ اور تبوک وغیرہ کی لڑائیاں پیش آئیں)۔ [5]

واقعات متفرقہ ۶ ھ خالد بن ولید اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کا اسلام

(حدیبیہ کی صلح کو اللہ نے فتح کہا ہے، لیکن اجسام کی نہیں قلوب کی، اسلام کو اپنی اشاعت کے لئے امن درکار تھا اور وہ اس صلح سے حاصل ہو گیا، اس صلح کو خود دشمن فتح سمجھتے تھے، قریش اور مسلمانوں میں اب تک جو معرکے ہوئے فوجی حیثیت سے قریش کی صف میں ہر جگہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا نام ممتاز نظر آتا ہے، جاہلیت

---

[1] ہم نے جاریہ کا ترجمہ لڑکی کیا ہے، عربی میں جاریہ لڑکی کو بھی کہتے ہیں اور لونڈی کو بھی، ارباب سیرت ماریہ قبطیہ کو لونڈی کہتے ہیں، لیکن مقوقس نے جو لفظ ان کی نسبت لکھا ہے، یعنی کہ ’’مصریوں میں بڑی عزت ہے‘‘ یہ لونڈیوں کی شان میں استعمال نہیں کئے جا سکتے۔

[2] صحیح بخاری، ج ۲، کتاب المغازی، غزوۃ حنین: ۴۳۱۷۔ [3] تاریخ طبری، ج ۳، ص: ۱۵۹۱۔

[4] زاد المعاد، ج ۲، ص: ۵۸۔ [5] اور جن رؤسائے قبائل اور امرائے عرب کو دعوتی خطوط لکھے گئے تھے ان کی تفصیل دوسری جلد کے تبلیغی واقعات میں آئے گی۔ (س)

میں رسالہ کی افسری انہیں کے سپرد تھی، احد میں قریش کے اکھڑے ہوئے پاؤں انہیں کی کوشش سے سنبھلے تھے، حدیبیہ کے موقع پر بھی قریش کا طلایہ انہی کی زیر افسری نظر آیا تھا، لیکن قریش کا یہ سپہ سالار اعظم بھی آخر اسلام کے حملۂ کاری سے نہ بچ سکا۔

صلح حدیبیہ کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے مکہ سے نکل کر مدینہ کا رخ کیا۔ راستہ میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ملے پوچھا: کدھر کا قصد ہے؟ بولے: اسلام لانے جاتا ہوں، آخر کب تک؟ عمرو بن العاص نے کہا: ہمارا بھی یہی ارادہ ہے۔ دونوں صاحب ایک ساتھ بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر اسلام سے مشرف ہوئے [1] اور اب وہ جوہر جو اسلام کی مخالفت میں صرف ہو رہا تھا اسلام کی محبت میں صرف ہونے لگا۔

فتح مکہ میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ جب ایک مسلمان دستہ کے افسر بن کر آنحضرت ﷺ کے سامنے سے گزرے تو آپ ﷺ نے پوچھا: ''کون ہے؟'' لوگوں نے کہا: خالد ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی تلوار ہے۔'' [2]

غزوۂ موتہ میں جب حضرت جعفر زید بن حارثہ اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے علم اپنے ہاتھ میں لیا تو مسلمان خطرہ سے باہر تھے،

عہدِ خلافت میں ایک (خالد رضی اللہ عنہ) نے شام کا ملک قیصر سے چھین لیا اور دوسرا (عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ) مصر کا فاتح ہوا۔

---

[1] اصابہ ابن حجر بہ روایت ابن اسحاق ج ۱، ص: ۴۱۳، (س)۔ [2] ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب خالد بن الولید: ۳۸۴٦۔ مگر اس روایت میں فتح مکہ کے موقع کی تصریح نہیں ہے۔

۷ھ خیبر

آخر ۶ھ یا اوائل ۷ھ

خیبر غالباً عبرانی لفظ ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں یہ مقام مدینہ منورہ سے آٹھ منزل پر ہے۔ یورپین سیاحوں میں ڈاوٹی کئی مہینہ تک یہاں ۱۸۷۷ء میں مقیم رہا، اس نے مدینہ سے اس مقام کا فاصلہ ۲۰۰ میل لکھا [1] ہے۔ وہ نخلستان جس کے کنارہ پر خیبر ہے، نہایت زرخیز ہے، یہاں یہود نے نہایت مضبوط متعدد قلعے بنائے تھے، جن میں سے بعض کے آثار اب تک باقی ہیں۔

عرب میں یہودی قوت کا یہ سب سے بڑا مرکز تھا، مدینہ سے جب رؤسائے بنونضیر جلاوطن ہو کر خیبر میں آباد ہوئے تو انہوں نے تمام عرب کو اسلام کی مخالفت پر برانگیختہ کر دیا۔ جس کا پہلا مظہر احزاب کا معرکہ تھا، ان رؤسا میں سے حیی بن اخطب جنگ قریظہ میں قتل ہوا، جس کے بعد ابورافع سلام بن ابی الحقیق اس کا جانشین ہوا، یہ بہت بڑا تاجر اور صاحب اثر تھا۔ قبیلۂ غطفان جو عرب کا بہت بڑا صاحب اثر قبیلہ تھا، ان کی آبادی خیبر سے متصل تھی اور ہمیشہ سے یہود خیبر کے حلیف اور ہم عہد تھے، [2] ۶ھ میں سلام نے خود جا کر قبیلۂ غطفان اور ان کے آس پاس کے قبیلوں کو اسلام کے مقابلہ کے لئے آمادہ کیا، یہاں تک کہ ایک عظیم الشان فوج لے کر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کیں۔ [3] آنحضرت ﷺ کو یہ خبریں معلوم ہوئیں تو آپ ﷺ کے ایماء سے (رمضان ۶ ہجری میں حضرت عبداللہ بن عتیک ایک خزرجی انصاری کے ہاتھ سے اپنے قلعہ خیبر میں سوتا ہوا مارا گیا) سلام کے بعد یہودیوں نے اُسیر بن رزام کو مسند ریاست پر بٹھایا، اس نے قبائل یہود کو جمع کر کے تقریر کی اور کہا کہ ”میرے پیشروؤں نے محمد (ﷺ) کے مقابلہ میں جو تدبیریں اختیار کیں وہ غلط تھیں صحیح تدبیر یہ ہے کہ خود محمد ﷺ کی دارالریاست پر حملہ کیا جائے اور میں یہی طریقہ اختیار کروں گا۔“ [4] اس غرض سے اُسیر نے غطفان اور دیگر قبائل میں دورہ کیا اور ایک فوج گراں تیار کی، آنحضرت ﷺ کو یہ خبریں پہنچیں تو آپ نے اس افواہ پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ خود خیبر جا کر اصل واقعہ کی تحقیق کریں، چنانچہ وہ چند آدمیوں کو لے کر خیبر گئے اور چھپ کر خود اُسیر کی زبانی اس کے مشورے اور تدبیریں سنیں۔ یہ حالات آ کر آنحضرت ﷺ

---

[1] مارگولیتھ، ص: ۳۵۶۔ [2] ابن خلدون، ج ۲، ذکر قبائل عرب (وتاریخ خمیس، ج ۲، ص: ۴۳ باب غزوۃ خیبر) (س) [3] ابن سعد (ج ۲ ق اول) ص: ۶۶، اصلی الفاظ یہ ہیں ”کان ابو رافع بن ابی الحقیق قد اجلب فی غطفان ومن حوله من مشركی العرب وجعل لهم الحفل العظیم لحرب رسول الله ﷺ“ (ابورافع نے غطفان اور آس پاس کے مشرکین عرب کو جنگ پر آمادہ کیا تھا اور ایک بہت بڑی بھیڑ کو آنحضرت ﷺ سے لڑنے کے لئے جمع کیا) صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل ابی رافع: ۴۰۳۹ میں ہے وكان ابو رافع يؤذی رسول الله ﷺ ويعين عليه۔ یعنی ابو رافع آنحضرت ﷺ کو ایذا پہنچایا کرتا تھا اور آپ کے دشمنوں کو مقابلہ میں مدد دیا کرتا تھا، اس امداد واعانت کی تفصیل بروایت عروہ فتح الباری میں ج ۷ ص ۲۶۳ میں مفصل مذکور ہے۔ (س) [4] زرقانی علی المواهب، ج ۲، ص: ۱۹۶ مصر (س)۔

کی خدمت میں عرض کیے، آپ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو ۳۰ آدمی دیکر خیبر کو روانہ کیا، ان لوگوں نے اسیر سے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو اس لئے بھیجا ہے کہ تم اگر حاضر ہو جاؤ تو خیبر کی حکومت تم کو دے دی جائے، چنانچہ وہ ۳۰ آدمی لے کر خیبر سے نکلا اور احتیاط کی بنا پر مخلوط قافلہ اس طرح چلا کہ دو دو شخص ہمرکاب چلتے تھے جن میں ایک یہودی اور دوسرا مسلمان ہوتا تھا، قرقرہ پہنچ کر اسیر کے دل میں بدگمانی پیدا ہوئی اس نے ہاتھ بڑھا کر حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کی تلوار چھیننی چاہی، انہوں نے کہا: اللہ کے دشمن! بدعہدی کرنا چاہتا ہے، یہ کہہ کر سواری بڑھائی اور جب اُسیر زد پر آ گیا تو تلوار ماری کہ اس کی ران کٹ گئی، وہ گھوڑے سے گرا، گرتے گرتے اس نے عبداللہ کو زخمی کیا، اب مسلمان پیش دستی کر کے یہود پر ٹوٹ پڑے نتیجۂ جنگ یہ تھا کہ یہود میں ایک کے سوا کوئی نہیں بچا، [1] یہ اخیر ۶ھ یا محرم ۷ھ کا واقعہ ہے۔

خیبر اب اسلام کا سب سے بڑا حریف اور اسلام کے لئے سب سے زیادہ خطرناک تھا، ان لوگوں نے مکہ جا کر قریش کے ذریعہ سے تمام عرب میں بغاوت کی ایک عالمگیر جنبش پیدا کر دی، جس نے واقعۂ احزاب میں مرکز اسلام (مدینہ منورہ) کو متزلزل کر دیا تھا، یہ کوشش اگرچہ ناکام رہی لیکن جو دست و بازو کام کر رہے تھے اب بھی موجود تھے۔ جن لوگوں نے جنگ احزاب برپا کرائی تھی ان میں زیادہ با اثر ابن ابی الحقیق کا خاندان تھا جو قبیلہ بنی نضیر سے تھا اور مدینہ سے جلا وطن ہو کر آیا تھا اس نے خیبر کے مشہور قلعہ قموص پر قبضہ کیا تھا، سلام بن ابی الحقیق جس کا ذکر ابھی اوپر گزر چکا ہے اسی خاندان کا رئیس تھا، اس کے قتل کے بعد اس کا بھتیجا کنانہ بن الربیع بن ابی الحقیق خاندان کی ریاست پر ممتاز ہوا۔ خیبر کے یہود ادھر تو غطفان سے اسلام کے مقابلہ کے لئے سازش کر رہے تھے، ادھر مدینہ کے منافقین ان کو مسلمانوں کی خبریں پہنچاتے رہتے تھے اور ان کو ہمت دلاتے تھے کہ مسلمان تم سے سر بر نہیں ہو سکتے۔

رسول اللہ ﷺ نے چاہا کہ ان لوگوں سے معاہدہ ہو جائے، اس بنا پر آپ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا لیکن ادھر تو یہود خود سخت دل اور ایک بدگمان قوم تھی ادھر منافقین ان کو ابھارتے تھے، اسی زمانہ میں رأس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول نے اہل خیبر کے پاس کہلا بھیجا کہ محمد ﷺ تم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں لیکن تم ان سے نہ ڈرنا ان کی ہستی کیا ہے مٹھی بھر آدمی ہیں جن کے پاس ہتھیار تک نہیں۔ یہود نے یہ سن کر کنانہ اور ہوذہ بن قیس کو غطفان کے پاس بھیجا کہ ہمارے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کرو تو ہم نخلستان کی نصف پیداوار تم کو دیں گے (ایک روایت میں ہے) غطفان نے اس کو منظور کیا۔ [2]

غطفان کا ایک قوت ور قبیلہ بنو فزارہ تھا ان کو جب یہ معلوم ہوا کہ خیبر والے آنحضرت ﷺ پر حملہ کرنا

[1] یہ تمام واقعات ابن سعد، ج ۲، قسم اول، ص: ۶۶، ۶۷ سے منقول ہیں، بہت سی کتابوں میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن انیس نے خود ابتدا کی اور اسیر بن رزام کو قتل کر ڈالا لیکن صحیح واقعہ وہی ہے جو ابن سعد سے منقول ہے اور وہی اس معرکہ کی وجہ ہو سکتا ہے۔

[2] تاریخ خمیس، (ج ۲، ص: ۴۳) عام روایتوں میں گو یہ ہے کہ غطفان نے مسلمانوں کے خوف سے اس کو منظور نہیں کیا تاہم یہ ظاہر ہے کہ ان کی اس ناطرفداری پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ (س)

چاہتے ہیں تو وہ خود خیبر میں آئے کہ ہم تمہارے ساتھ شریک ہو کر لڑیں گے، آنحضرت ﷺ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے بنو فزارہ کو خط لکھا کہ ''تم خیبر والوں کی مدد سے باز آؤ، خیبر فتح ہو جائے گا تو تم کو بھی حصہ دیا جائے گا۔'' لیکن بنو فزارہ نے انکار کیا۔ [1]

ذی قرد محرم ۷ھ

غطفان کی شرکتِ جنگ کا دیباچہ یہ تھا کہ ذی قرد کی چراگاہ پر جو آنحضرت ﷺ کی اونٹنیوں کی چراگاہ تھی۔ (اس قبیلہ کے چند آدمیوں نے بہ سرداری عبدالرحمن بن عیینہ) چھاپہ مارا اور ۲۰ اونٹنیاں پکڑ کر لے گئے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے کو جو اونٹنیوں کی حفاظت پر متعین تھے قتل کر دیا اور ان کی بیوی کو گرفتار کر کے لے گئے (مسلمانوں نے جب تعاقب کیا تو وہ درہ میں گھس گئے، وہاں) عیینہ بن حصن جو قبائل غطفان کا سپہ سالار تھا (ان کی امداد کو موجود تھا)۔ مسلمانوں میں حضرت سلمہ بن الاکوع ایک مشہور قدر انداز صحابی تھے سب سے پہلے ان کو اس غارت گری کا علم ہوا۔ انہوں نے واصباحاہ کا نعرہ مارا اور دوڑ کر حملہ آوروں کو جا لیا وہ اونٹوں کو پانی پلا رہے تھے، حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ نے تیر برسانے شروع کئے، حملہ آور بھاگ نکلے، انہوں نے تعاقب کیا اور لڑ بھڑ کر تمام اونٹنیاں چھڑا لائے۔ دربارِ نبوت میں آ کر عرض کی کہ میں دشمنوں کو پیاسا چھوڑ آیا ہوں اگر ۱۰۰ آدمی مل جائیں تو ایک ایک کو گرفتار کر کے لاتا ہوں، آپ نے رحمت عام کے لحاظ سے فرمایا: [2]

((اذا ملکت فاسجع)) ''قابو پا جاؤ تو عفو سے کام لو''

اس واقعہ کے تین دن [3] بعد خیبر کی جنگ پیش آئی۔

خیبر کا آغاز اور غزوات کی بہ نسبت ایک امتیاز خاص رکھتا ہے اور اگرچہ ارباب سیر کی نظر اس نکتہ پر نہیں پڑی کہ اس امتیاز کے اسباب کیا تھے؟ تاہم واقعہ کی حیثیت سے امتیازی امور ان کی زبان سے بھی بلاقصد نکل

---

[1] یہ واقعہ معجم البلدان لفظ جفاء کی ذیل میں موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے بالفاظہا نقل کیا ہے اصل الفاظ یہ ہیں: روی موسیٰ بن عقبۃ عن ابن شهاب قال كانت بنو فزارة ممن قدم على اهل خيبر ليعينوهم فراسلهم رسول الله ﷺ ان لا يعينوهم وساء لهم ان يخرجوا عنهم ولكم من خيبر كذا وكذا فأبوا (ج ۳، ص: ۱۵۲ مصر)۔

[2] یہ واقعہ بخاری و مسلم میں بھی منقول ہے لیکن زیادہ تفصیل ابن سعد (ج ۲ قسم اول، ص: ۵۸) و ابن اسحاق سے لی گئی ہے۔

[3] ارباب سیر نے متفقاً اس واقعہ کو خیبر کے واقعہ سے ایک سال ماقبل بیان کیا ہے، لیکن (طبری نے بہ روایت سلمہ (ج ۳، ص: ۱۵۰۲) جو اس غزوہ کے ہیرو تھے اور نیز) امام بخاری نے صاف تصریح کی ہے کہ خیبر سے تین دن پہلے کا واقعہ ہے۔ حافظ ابن حجر نے ارباب سیر کا بیان لکھ کر لکھا ہے: فعلى هذا ما في الصحيح من التاريخ لغزوة ذي قرد اصح مما ذكره اهل السير ''تو اس بنا پر جو کچھ صحیح بخاری میں غزوہ ذی قرد: ۴۱۹۴ کے متعلق مذکور ہے وہ ارباب سیر کی روایت سے زیادہ صحیح ہے۔'' حافظ ابن حجر نے دونوں روایتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ عیینہ بن حصن نے ذو قرد پر دو دفعہ حملہ کیا تھا۔ عام ارباب سیر جس کا تذکرہ کرتے ہیں وہ پہلا حملہ تھا اور یہ بالکل قرین قیاس ہے (فتح الباری، ج ۷، ص: ۳۵۲ باب غزوة ذي قرد) (س) عام ارباب سیر کو غزوۂ خیبر بلکہ غزوات کے متعلق چونکہ کسی سبب کی تلاش و جستجو نہیں اس لئے ان کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ واقعات کا تسلسل اور غزوات کے اسباب کیا ہیں۔ لیکن زیادہ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب واقعات ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

گئے ہیں، سب سے مقدم یہ کہ جب آپ نے خیبر کا قصد کیا تو اعلان عام کر دیا:

((لا یخرجن معنا الا راغب فی الجھاد)) ❶

''ہمارے ساتھ صرف وہ لوگ آئیں جو طالب جہاد ہوں۔''

اب تک جو لڑائیاں وقوع میں آئیں محض دفاعی تھیں۔ یہ پہلا غزوہ ہے جس میں غیر مسلم رعایا بنائے گئے طرز حکومت کی بنیاد قائم ہوئی۔ اسلام کا اصلی مقصد تبلیغ دعوت ہے۔ اب اگر کوئی قوم اس دعوت کی سدراہ نہ ہو تو اسلام کو نہ تو اس سے جنگ ہے، نہ اس کے رعایا بنانے کی ضرورت ہے، صرف معاہدہ صلح کافی ہے جس کی بہت سی مثالیں اسلام میں موجود ہیں لیکن جب کوئی قوم خود اسلام کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اس کو مٹا دینا چاہے تو اسلام کو مدافعت کے لئے تلوار ہاتھ میں لینا پڑتی ہے اور اس کو اپنے زیر اثر رکھنا پڑتا ہے۔ خیبر اس قاعدے کے موافق اسلام کا پہلا مفتوحہ ملک تھا۔

غزوات کے خاتمہ کے بعد یہ بحث بہ تفصیل آئے گی کہ ایک مدت تک لوگ ❷ جہاد کو عرب کے قدیم طریقہ کے موافق معاش کا ذریعہ سمجھتے رہے اس لڑائی (خیبر) تک بھی یہ غلط فہمی رہی۔ یہ پہلا غزوہ ہے جس میں یہ پردہ اٹھا دیا گیا اور اس لئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس لڑائی میں صرف وہ لوگ شریک ہوں جن کا مقصد محض جہاد اور اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔

غرض آپ غطفان اور یہود کے حملہ کی مدافعت کے لئے مدینہ سے محرم ۷ھ ❸ میں سباع بن عرفطہ غفاری رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا افسر مقرر کر کے مدینہ سے روانہ ہوئے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ساتھ تھیں۔ فوج کی تعداد ۱۶۰۰ تھی جن میں ۲۰۰ سوسوار اور باقی پیدل تھے اس وقت تک لڑائیوں میں علم کا رواج نہ تھا، چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں ہوتی تھیں، یہ پہلی مرتبہ تھا کہ آپ نے تین علم تیار کرائے دو حضرت حباب بن منذر اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما کو عنایت ہوئے اور خاص علم نبوی جس کا پھریرا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی چادر سے تیار ہوا تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مرحمت ہوا، فوج روانہ ہوئی تو حضرت عامر بن الاکوع مشہور شاعر تھے یہ رجز پڑھتے ہوئے آگے چلے:

اللھم لو لا انت ما اھتدینا	''اے اللہ! اگر تو ہدایت نہ کرتا تو ہم ہدایت نہ پاتے
ولا تصدقنا ولا صلینا	نہ خیرات کرتے، نہ روزے رکھتے،

❶ طبقات ابن سعد، ج ۲، قسم اول، ص: ۷۷۔

❷ یہاں ''لوگ'' سے مراد منافقین ہیں، یہ لوگ غزوات میں محض غنیمت کے لالچ میں شریک ہوتے تھے۔ جہاں سخت مقابلہ پیش آنے اور مال غنیمت کے نہ ملنے کا گمان ہوتا وہاں غزوات کی شرکت سے کتراتے تھے، چنانچہ ان ہی دو وجوہ سے وہ حدیبیہ میں شریک نہیں ہوئے اور اس پر سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی ناراضگی ظاہر فرمائی اور یہ ارشاد فرمایا کہ آئندہ غنیمت والے غزوہ میں بھی وہ شریک نہ کئے جائیں۔ اسی لئے حضور انور ﷺ نے اس موقع پر اعلان فرمایا کہ اس غزوہ میں بھی وہی شرکت کا ارادہ کریں جن کی غرض محض جہاد و اعلائے کلمۃ اللہ ہو، دنیاوی مال و متاع نہ ہو (زرقانی وابن سعد، باب غزوۂ خیبر) (س)

❸ ابن سعد جزء مغازی، ج ۲، ق اول، ص: ۷۷ میں جمادی الاولیٰ ۷ھ ہے جو بہ تحقیق مذکورہ بالا صحیح نہیں (س)

فاغفر فداء لك ما اتقينا	ہم تجھ پر فدا ہوں، ہم جو احکام نہیں بجالائے
والقين سكينة علينا	ان کو معاف کر دے اور ہم پر تسلی نازل کر
انا اذا صيح بنا اتينا	ہم جب فریاد میں پکارے جاتے ہیں تو پہنچ
و ثبت الاقدام ان لا قينا	جاتے ہیں اور جب مڈبھیڑ ہو تو ہم کو ثابت قدم
وبالصياح عولوا علينا	رکھ، لوگوں نے پکار کر ہم سے استغاثہ چاہا ہے۔''

یہ اشعار صحیح مسلم ❶ و بخاری ❷ میں نقل کیے ہیں۔ مسند ابن حنبل میں بعض اشعار ❸ زیادہ ہیں، (پہلے دو مصرع کسی قدر اختلاف کے ساتھ صحیح مسلم ❹ (خیبر) میں بھی ہیں۔

ان الذين قد بغوا علينا	جن لوگوں نے ہم پر دست درازی کی ہے جب
اذا ارادوا فتنة ابينا	وہ کوئی فتنہ برپا کرنا چاہتے ہیں تو ہم ان
ونحن عن فضلك ماستغنينا ❺	سے دبتے نہیں اور اے اللہ! ہم تیری عنایت سے بے نیاز نہیں۔

راہ میں ایک میدان آیا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے تکبیر کے نعرے بلند کیے۔ چونکہ تعلیم و تلقین کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا تھا اور بات بات میں نکات شریعت کی تعلیم ہوتی رہتی تھی۔ ارشاد ہوا کہ آہستہ، کیونکہ کسی بہرے اور دور از نظر کو نہیں پکار رہے ہو، تم جس کو پکارتے ہو وہ تمہارے پاس ہی ہے۔ ❻

اس غزوہ میں چند خواتین بھی اپنی خواہش سے فوج کے ساتھ ہو لی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ نے ان کو بلا بھیجا اور غضب کے لہجہ میں فرمایا: ''تم کس کے ساتھ آئیں اور کس کے حکم سے آئیں۔'' بولیں کہ یا رسول اللہ! ہم اس لیے آئے ہیں کہ چرخہ کات کر کچھ پیدا کریں گے اور اس کام میں مدد دیں گے، ہمارے پاس زخمیوں کے لیے دوائیں بھی ہیں، اس کے علاوہ ہم تیر اٹھا کر لائیں گی؟ آنحضرت ﷺ نے فتح کے بعد جب مال غنیمت تقسیم کیا تو ان کا بھی حصہ لگایا لیکن یہ حصہ کیا تھا؟ زر و جواہر نہ تھے، مال و اسباب نہ تھا اور درہم و دینار نہ تھے بلکہ صرف کھجوریں تھیں، تمام مجاہدین کو یہی ملا تھا اور ان پردہ نشینوں نے بھی یہی پایا تھا۔

یہ واقعہ ابوداود ❼ میں مذکور ہے۔ حدیث اور سیرت کی تمام کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر غزوات میں مستورات ساتھ رہتی تھیں۔ جو زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی اور پیاسوں کو پانی پلاتی تھیں۔ جنگ احد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مشک میں پانی بھر بھر کر لانا اور زخمیوں کو پلانا اوپر گزر چکا ہے، لیکن یہ امر کہ عورتیں میدان جنگ سے تیر اٹھا اٹھا کر بھی لاتیں اور مجاہدین کو دیتی تھیں، صرف ابوداود نے ذکر کیا ہے لیکن سند صحیح متصل سے ذکر کیا ہے اس لیے شک کی گنجائش نہیں۔ یوں بھی عرب کی مستورات سے کم سے کم یہی توقع کی جا سکتی ہے۔

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب غزوة خيبر: ٤٦٦٨۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة خيبر: ٤١٩٦۔ ❸ ان اشعار میں صاف تصریح ہے کہ تعدی اور حملہ کی ابتدا دشمنوں کی طرف سے تھی، اشعار کے بعض بعض الفاظ میں روایات کا اختلاف ہے۔ ❹ صحیح مسلم، ج ۲، ص: ۹۷۔ ❺ مسند احمد بن حنبل، ج ٤، ص: ٥٢۔

❻ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة خيبر: ٤٢٠٢۔

❼ ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی المرأة والعبد يحذيان من الغنيمة: ٢٧٢٩۔

چونکہ معلوم تھا کہ غطفان اہل خیبر کی مدد کو آئیں گے آنحضرت ﷺ نے مقام رجیع میں فوجیں اتاریں جو غطفان اور خیبر کے بیچ میں ہے، اسباب بار برداری خیمہ وخرگاہ اور مستورات یہاں چھوڑ دی گئیں [1] اور فوجیں خیبر کی طرف بڑھیں، غطفان یہ سن کر کہ اسلامی فوجیں خیبر کی طرف بڑھ رہی ہیں، ہتھیار سجا کر نکلے لیکن آگے بڑھ کر جب ان کو معلوم ہوا کہ خود ان کا گھر خطرہ میں ہے تو واپس چلے گئے۔ [2]

خیبر میں چھ قلعے تھے، سالم، قموص، نطاۃ، قصارۃ، شق، مربطہ۔ اور جیسا کہ یعقوبی نے تصریح کی ہے ان میں بیس ہزار سپاہی موجود تھے، ان سب میں قموص نہایت مضبوط اور محفوظ قلعہ تھا۔ مرحب عرب کا مشہور پہلوان جو ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا اسی قلعہ کا رئیس [3] تھا، ابن ابی الحقیق کا خاندان جس نے مدینہ سے جلاوطن ہو کر خیبر کی ریاست حاصل کر لی تھی یہیں رہتا تھا۔

لشکر اسلام جب خیبر کے قریب یعنی مقام صہباء میں پہنچا تو نماز عصر کا وقت آ چکا تھا، آنحضرت ﷺ نے یہاں ٹھہر کر نماز عصر ادا کی، پھر کھانا طلب فرمایا، رسد کا ذخیرہ صرف ستو تھا وہی آپ نے بھی پانی میں گھول کر نوش فرمایا۔ [4] رات ہوتے ہوتے فوج اسلام خیبر کے سواد میں پہنچ گئی، عمارتیں نظر آئیں تو آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا کہ ٹھہر جاؤ، پھر اللہ کا نام لے کر یہ دعا مانگی:

((انا نسئلك خير هذه القرية وخير اهلها وخير ما فيها ونعوذ بك من شرها وشر اهلها وشر ما فيها)) [5]

''اے اللہ! ہم تجھ سے اس گاؤں کی اور گاؤں والوں کی اور گاؤں کی چیزوں کی بھلائی چاہتے ہیں اور ان سب کی برائیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔''

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ یہ آپ ﷺ کا معمول عام تھا یعنی جب کسی مقام میں داخل ہوتے تھے تو پہلے یہ دعا مانگ لیتے تھے۔ چونکہ سنت نبوی یہ تھی کہ رات کو کسی مقام [6] پر حملہ نہیں کیا جاتا تھا اس لئے رات یہیں بسر کی۔ صبح کو خیبر میں داخلہ ہوا۔ یہودیوں نے مستورات کو ایک محفوظ مقام میں پہنچا دیا، رسد اور غلہ قلعہ ناعم میں یکجا کیا اور فوجیں قلعہ نطاۃ اور قموص میں فراہم کیں سلام بن مشکم بیمار تھا تاہم اس نے سب سے زیادہ حصہ لیا اور خود قلعہ نطاۃ میں آ کر فوج میں شرکت کی۔

آنحضرت ﷺ کا مقصود جنگ نہ تھا لیکن جب یہود نے بڑے سروسامان کے ساتھ جنگ کی تیاری کی تو آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو مخاطب کر کے وعظ فرمایا اور جہاد کی ترغیب دی۔ تاریخ خمیس میں اس

[1] یہ تفصیل معجم البلدان (ج ٤، ص: ٢٢٩) ذکر رجیع میں ہے۔ [2] طبری، ج ٣، ص: ١٥٧٥، اصل عبارت یہ ہے، فبلغني ان غطفان لما سمعت بمنزل رسول اللہ ﷺ خيبر جمعوا له ثم خرجوا ليظاهروا يهود عليه حتى اذا ساروا منقلة سمعوا خلفهم في اموالهم واهاليهم حسا ظنوا ان القوم قد خالفوا اليهم فرجعوا على اعقابهم۔
[3] تاریخ یعقوبی، ج ٢، ص: ٥٦۔ [4] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر: ٤١٩٥۔
[5] سیرت ابن ہشام، ج ٢، ص: ٢٢٣۔ [6] صحیح بخاری میں اصل عبارت یہ ہے: ((اذا اتى قوما بليل لم يغربهم حتى يصبح)) باب غزوۃ خیبر: ٤١٩٧۔

موقع پر لکھا ہے:

ولما تيقن النبى ﷺ ان اليهود تحارب وعظ اصحابه ونصحهم وحرضهم على الجهاد۔

''اور جب آنحضرت ﷺ کو یقین ہو گیا کہ یہود لڑنے پر آمادہ ہیں تو آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو نصیحت کی اور جہاد کی ترغیب دی۔''

سب سے پہلے قلعہ ناعم پر فوجیں بڑھیں، حضرت محمود بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے بڑی دلیری سے حملہ کیا اور دیر تک لڑتے رہے چونکہ سخت گرمی تھی، تھک کر دم لینے کے لئے قلعہ کی دیوار کے سایہ میں بیٹھ گئے۔ کنانہ بن الربیع نے قلعہ کی فصیل سے چکی کا پاٹ ان کے سر پر گرایا جس کے صدمہ سے وفات پائی، لیکن قلعہ بہت جلد فتح ہو گیا۔ [1]

ناعم کے بعد اور قلعے بہ آسانی فتح ہوتے گئے لیکن قلعہ قموص مرحب کا تخت گاہ تھا، اس مہم پر آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو بھیجا لیکن دونوں ناکام واپس آئے، طبری میں روایت ہے کہ جب خیبری قلعہ سے نکلے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاؤں نہ جم سکے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ فوج نے نامردی کی لیکن فوج نے ان کی نسبت خود یہی شکایت کی۔ [2]

اس روایت کو طبری نے جس سلسلۂ سند سے نقل کیا ہے اس کے راوی عوف ہیں۔ ان کو بہت سے لوگوں نے ثقہ کہا ہے لیکن بندار جب ان کی روایت بیان کرتے تھے تو کہتے تھے کہ ''وہ رافضی اور شیطان تھا'' یہ لفظ بہت سخت ہے لیکن ان کی شیعیت سب کو تسلیم ہے [3] اور گو شیعہ ہونا بے اعتباری کی دلیل نہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بھاگنے کا واقعہ بیان کیا جائے شیعہ کی زبان سے اس روایت کا رتبہ کیا رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اوپر کے راوی عبداللہ بن بریدہ ہیں جو اپنے والد سے روایت کرتے ہیں لیکن محدثین کو اس بات میں شبہ ہے کہ ان کی جو روایتیں باپ کے سلسلہ میں منقول ہیں صحیح بھی ہیں یا نہیں؟ [4]

تاہم اس قدر ضرور صحیح ہے کہ اس مہم پر پہلے اور بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم بھیجے گئے تھے لیکن فتح کا فخر کسی اور کی قسمت میں تھا۔ جب مہم میں زیادہ دیر ہوئی تو ایک دن شام کو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''کل میں اس شخص کو علم دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ فتح دے گا اور جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو چاہتا ہے اور اللہ اور اللہ کا رسول بھی اس کو چاہتے ہیں۔'' [5] یہ رات نہایت امید اور انتظار کی رات تھی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے تمام رات اس بے قراری میں کاٹی کہ دیکھئے یہ تاجِ فخر کس کے ہاتھ آتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قناعت پسندی اور بلند نظری کی بنا پر کبھی حکومت اور سروری کی تمنا نہیں کی لیکن جیسا کہ صحیح مسلم باب فضائل علی رضی اللہ عنہ میں مذکور ہے

[1] ابن ہشام نے دو موقعوں پر اس واقعہ کا الگ ٹکڑا لکھا ہے یہ تفصیل خمیس (ج ۲، ص:۴۶) سے لی گئی ہے۔

[2] تاريخ طبري، ج۳، ص:۱۵۷۹۔ [3] ميزان الاعتدال، ج۲، ص:۳۰۹۔

[4] ایضاً، ص:۲٤۔ [5] یہ صحيح بخاري، كتاب المغازي، باب غزوة خيبر: (٤٢٠٩) کے الفاظ ہیں۔

ان کو خود اعتراف ہے کہ اس موقع کی تمنا میں ان کی خودداری بھی قائم نہ رہ سکی۔ صبح کو دفعتاً یہ آواز کانوں میں آئی کہ علی رضی اللہ عنہ کہاں ہیں؟ یہ بالکل غیر متوقع آواز تھی کیونکہ جناب موصوف کی آنکھوں میں آشوب تھا اور سب کو معلوم تھا کہ وہ جنگ سے معذور ہیں، غرض حسب طلب وہ حاضر ہوئے، آنحضرت ﷺ نے ان کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگایا اور دعا فرمائی جب ان کو علم عنایت ہوا تو انہوں نے عرض کیا کہ ''کیا یہود کو لڑ کر مسلمان بنالیں۔'' ارشاد ہوا کہ ''بہ نرمی ان پر اسلام پیش کرو، اگر ایک شخص بھی تمہاری ہدایت سے اسلام لائے تو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔'' ❶ لیکن یہود اسلام یا صلح کے قبول کرنے پر راضی نہیں ہو سکتے تھے، مرحب قلعہ سے یہ رجز پڑھتا ہوا باہر نکلا:

قد علمت خیبر انی مرحب شاکی السلاح بطل مجرب۔

''خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں، دلیر ہوں تجربہ کار ہوں، سلاح پوش ہوں۔''

مرحب کے سر پر یمنی زرد رنگ کا مغفر اور اس کے اوپر سنگی خود تھا، قدیم زمانہ میں گول پتھر بیچ سے خالی کر لیتے تھے یہی خود کہلاتا تھا۔ مرحب کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ رجز پڑھا:

انا الذی سمتنی امی حیدرہ کلیث غابات کریہ المنظرہ۔

''میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام شیر رکھا تھا، میں شیر نیستان کی طرح مہیب و بدمنظر ہوں۔''

مرحب بڑے طمطراق سے آیا لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس زور سے تلوار ماری کہ سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی اور ضربت کی آواز فوج تک پہنچی ❷ پہلوان کا مارا جانا عظیم الشان واقعہ تھا، اس لئے عجائب پسندی نے اس کے متعلق نہایت مبالغہ آمیز افواہیں پھیلا دیں۔ معالم التنزیل میں ہے کہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب تلوار ماری تو مرحب نے سپر پر روکا لیکن ذوالفقار خود اور سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی، مرحب کے مارے جانے پر یہود نے جب عام حملہ کیا تو اتفاق سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے سپر چھوٹ کر گر پڑی، آپ نے قلعہ کا در جو سرتاپا پارہ سنگ تھا اکھاڑ کر اس سے سپر کا کام لیا، اس واقعہ کے بعد ابورافع نے سات آدمیوں کے ساتھ مل کر اس کو اٹھانا چاہا تو جگہ سے بھی نہ ہل سکا۔'' ❸ یہ روایتیں ابن اسحاق اور حاکم نے روایت کی ہیں لیکن بازاری قصے ہیں۔ علامہ سخاوی نے مقاصد حسنہ میں تصریح کی ہے:

کلھا واھیۃ۔ ❹ ''سب لغو روایتیں ہیں۔''

علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں علی بن احمد فروخ کے حال میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ

❶ یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور صحیح بخاری، (کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر: ٤٢١٠) میں منقول ہے۔ ❷ طبری، ج۳، ص: ١٥٧٩، (یہ اشعار اور مختصر واقعات صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب غزوۃ ذی القرد وغیرہ: ٤٦٧٨ میں بھی ہیں)۔
❸ سیرت ابن هشام، ج۲، ص: ۲۲۷ اور طبری، ج۳، ص: ١٥٨١۔ ❹ المقاصد الحسنة، ص ۹۲ مطبع علوی۔

''یہ روایت منکر ہے۔'' (1) ابن ہشام نے جن سلسلوں سے یہ روایتیں نقل کی ہیں ان میں سے ایک روایت میں تو بیچ کے ایک راوی کا نام سرے سے چھوڑ دیا ہے اور دوسرے میں اس مشترک نقص کے ساتھ بریدہ بن سفیان بھی ایک راوی ہیں، جن کو امام بخاری اور ابوداؤد اور دارقطنی قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ (2)

ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ اور واقدی کا بیان ہے کہ مرحب کو محمد بن مسلمہ نے مارا تھا۔ مسند ابن حنبل اور نووی شرح صحیح مسلم میں بھی ایک روایت ہے، (3) لیکن صحیح مسلم (اور حاکم ج ۲ ص ۳۹) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کو مرحب کا قاتل اور فاتحِ خیبر لکھا ہے اور یہی اصح الروایت ہے۔ (4)

غرض یہ قلعہ (قموص) ۲۰ دن کے محاصرہ کے بعد فتح ہو گیا۔ ان معرکوں میں ۹۳ یہودی مارے گئے، جن میں حارث، مرحب، اسیر، یاسر اور عامر زیادہ مشہور ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ۱۵ بزرگوں نے شہادت حاصل کی جن کے نام ابن سعد نے بہ تفصیل لکھے ہیں۔

فتح کے بعد زمین مفتوحہ پر قبضہ کر لیا گیا لیکن یہود نے درخواست کی کہ زمین ہمارے قبضہ میں رہنے دی جائے ہم پیداوار کا نصف حصہ ادا کریں گے، یہ درخواست منظور ہوئی، بٹائی کا وقت آتا تو آنحضرت ﷺ عبداللہ بن رواحہ کو بھیجتے تھے، وہ غلہ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے یہود سے کہتے تھے کہ اس میں سے جو حصہ چاہو لے لو، یہود اس عدل پر متحیر ہو کر کہتے تھے کہ ''زمین اور آسمان ایسے ہی عدل سے قائم ہیں۔'' (5) خیبر کی زمین تمام مجاہدین پر جو اس جنگ میں شریک تھے تقسیم کر دی گئی، اسی میں آنحضرت ﷺ کا خمس بھی تھا۔

عام روایت ہے کہ مال غنیمت میں سے خمس کے علاوہ ایک حصہ رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص طور پر علیحدہ کر لیا جاتا تھا جس کو صفی کہتے ہیں اس بنا پر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا (زوجہ کنانہ بن الربیع) کو آپ ﷺ نے لے لیا اور آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ کی تحقیق

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی نسبت بعض کتب حدیث وسیر میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پہلے ان کو دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو دیا تھا، پھر کسی نے ان کے حسن کی تعریف کی تو ان سے مانگ لیا اور اس کے معاوضہ میں ان کو سات لونڈیاں دیں۔ مخالفین نے اس روایت کو نہایت بدنما پیرایہ میں ادا کیا ہے اور جب اصل روایت میں اتنی بات موجود ہے تو ظاہر ہے کہ مخالف اس سے کہاں تک کام لے سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا یہ واقعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، لیکن خود حضرت

(1) میزان الاعتدال، ج۲، ص:۲۱۸۔ (2) میزان الاعتدال، ترجمة بريدة بن سفيان، ج۱، ص:۱٤۲۔
(3) ج۲، ص:۱۱۵ مع شرح النووی مگر اس کو امام نووی نے مرجوح قول کی حیثیت سے نقل کیا ہے۔
(4) صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں۔((فضرب براس مرحب فقتله ثم كان الفتح على يديه)) كتاب الجهاد، باب غزوة ذی قرد: ٤٦٧٨)۔ (5) فتوح البلدان بلاذری، ص:۲۷؛ فتح خیبر وطبری، ج۳، ص:۱۵۸۹ (اصل روایت ابو داود، کتاب البیوع، باب المساقاة: ۳٤۱۰ میں موجود ہے)۔

انس رضی اللہ عنہ سے متعدد روایتیں ہیں اور وہ باہم مختلف ہیں۔ بخاری کی جو روایت غزوۂ خیبر کے ذکر میں ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ جب قلعہ خیبر فتح ہوا تو لوگوں نے آپ کے سامنے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے حسن کا ذکر کیا، آپ نے ان کو اپنے لئے لے لیا۔ اصلی الفاظ یہ ہیں:

فلما فتح اللّٰہ علیه الحصن ذکر له جمال صفیة بنت حیی بن اخطب و قد قتل زوجها و کانت عروسًا فاصطفاها النبی ﷺ لنفسه۔ ❶

''جب اللہ نے قلعہ فتح کرا دیا تو لوگوں نے آپ سے صفیہ بنت حیی کے حسن و جمال کی تعریف کی۔ اس کا شوہر اس جنگ میں مارا گیا تھا، آنحضرت ﷺ نے اس کو اپنے لئے پسند کر لیا۔''

لیکن بخاری کتاب الصلوٰۃ ❷ صحیح مسلم ❸ میں خود حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہی روایت اس طریقہ سے منقول ہے کہ جب لڑائی کے بعد قیدی جمع کیے گئے تو حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ ان میں سے ایک لونڈی مجھ کو عنایت ہو۔ آپ نے ان کو اختیار دیا کہ خود جا کر کوئی لونڈی لے لو، انہوں نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو انتخاب کیا لیکن لوگوں کو اعتراض ہوا، ایک شخص نے آ کر آنحضرت ﷺ سے کہا:

یا نبی اللّٰہ اعطیت دحیة صفیة بنت حیی سیدة قریظة و النضیر لا تصلح الا لك۔

''اے اللہ کے پیغمبر! آپ نے صفیہ رضی اللہ عنہا کو دحیہ کے حوالہ کیا، وہ قریظہ اور نضیر کی رئیسہ ہے اور آپ کے سوا اور کوئی اس کے لائق نہیں۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ ابوداؤد ❹ میں یہ دونوں روایتیں ہیں اور دونوں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں، ابوداؤد کی شرح میں مازری (مشہور محدث) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو اس لئے دحیہ رضی اللہ عنہ سے لے کر ان سے عقد کیا کہ

لما فیه من انتها کها مع مرتبتها و کونها بنت سیدهم۔ ❺

''چونکہ وہ عالی رتبہ اور رئیس یہود کی صاحبزادی تھیں اس لئے ان کا کسی دوسرے کے پاس جانا ان کی توہین تھی۔''

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فتح الباری میں اس کے قریب قریب لکھا ہے۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر: ۴۲۱۱۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب مایذکر فی الفخذ: ۳۷۱۔ ❸ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب فضیلة اعتاقه امته ثم یتزوجها: ۳۴۹۷۔
❹ ابو داود، کتاب الخراج، باب ما جاء فی سهم الصفی: ۲۹۹۸۔ ❺ حاشیه ابوداود، ج۱، ص:۴۲۱۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا خاندان کے تباہ ہونے کے بعد خاندان سے باہر بیوی یا کنیز بن کر رہتیں، وہ رئیس خیبر کی بیٹی تھیں ان کا شوہر بھی قبیلہ نضیر کا رئیس تھا، باپ اور شوہر دونوں قتل کیے جا چکے تھے اس حالت میں ان کے پاسِ خاطر، حفظِ مراتب اور رفعِ غم کے لئے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ آنحضرت ﷺ ان کو اپنے عقد میں لے لیں۔ وہ کنیز ہو کر بھی رہ سکتی تھیں لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کی خاندانی عزت کے لحاظ سے ان کو آزاد کر دیا اور پھر نکاح پڑھایا۔ (بلکہ مسند ابن حنبل میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو اختیار دیا کہ وہ آزاد ہو کر اپنے گھر چلی جائیں یا آپ ﷺ کے نکاح میں آنا قبول کریں۔ انہوں نے دوسری صورت پسند کی یعنی یہ کہ وہ آنحضرت ﷺ کے نکاح میں آ جائیں [1] حسن خلق، رحم اور مصیبت زدہ کی چارہ نوازی کے علاوہ سیاسی اور مذہبی حیثیت سے بھی یہ کارروائی نہایت موزوں اور بجا تھی۔ اس قسم کے طرزِ عمل سے عرب کو اسلام کی طرف رغبت اور کشش ہوتی تھی کہ اسلام اپنے دشمنوں کے ورثہ کے ساتھ بھی کس قسم کا محسنانہ اور ہمدردانہ سلوک کرتا ہے۔

غزوۂ بنی المصطلق میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا اور اس سلوک کا جو اثر ہوا وہ اوپر گزر چکا ہے۔

فتح کے بعد آنحضرت ﷺ نے چند روز خیبر میں قیام کیا اگرچہ یہود کو کامل امن و امان دیا گیا اور ان کے ساتھ ہر طرح کی مراعات کی گئی تاہم ان کا طرزِ عمل مفسدانہ اور باغیانہ رہا۔ پہلا دیباچہ یہ تھا کہ ایک دن زینب نے جو سلام بن مشکم کی بیوی اور مرحب کی بھاوج تھی آنحضرت ﷺ کی چند صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ دعوت کی، آپ نے فرطِ کرم سے قبول فرمایا۔ زینب نے کھانے میں زہر ملا دیا تھا آپ نے ایک لقمہ کھا کر ہاتھ کھینچ لیا لیکن بشر بن براء نے پیٹ بھر کر کھایا اور زہر کے اثر سے بالآخر ہلاک ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ نے زینب کو بلا کر پوچھا، اس نے جرم کا اقبال کیا، یہود نے کہا: ہم نے اس لئے زہر دیا کہ اگر آپ ﷺ پیغمبر ہیں تو زہر خود اثر نہ کرے گا اور پیغمبر نہیں ہیں تو ہم کو آپ کے ہاتھ سے نجات مل جائے گی۔'' [2]

آنحضرت ﷺ کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیتے تھے۔ اس بنا پر آپ نے زینب سے تعرض نہیں فرمایا لیکن جب دو تین دن کے بعد بشر زہر کے اثر سے انتقال کر گئے تو وہ قصاص میں قتل کر دی گئی۔ [3]

ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عبداللہ بن سہیل اور حضرت محیصہ رضی اللہ عنہما قحط سالی کے زمانہ میں خیبر گئے یہود نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو دھوکے سے قتل کر کے ایک نہر میں ڈال دیا، حضرت محیصہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر واقعہ بیان کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے قتل کیا؟'' عرض کیا کہ حضور وہ تو پچاس مسلمانوں کو قتل کر کے بھی جھوٹی قسم کھا لیں گے، غرض

---

[1] مسند ابن حنبل، ج ۳، ص: ۱۳۸، ۱۳۹ مصر، (س) [2] مسند احمد، ج ۲، ص: ٤٥١ وتاریخ طبری، ج ۳، ص: ۱۵۸۳، ۱۵۸٤۔ [3] زاد المعاد، ج ۱، ص: ۳۹۸۔

آنحضرت ﷺ نے یہود سے تعرض نہیں کیا اور بیت المال سے مقتول کا خون بہا دلا دیا۔ ❶
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں یہود نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو سوتے میں کوٹھے پر سے گرا دیا کہ ان کا ہاتھ اور پاؤں ٹوٹ گیا۔ اس طرح ہمیشہ فساد انگیزیاں کرتے رہتے تھے مجبور ہو کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو شام کے اضلاع میں جلاوطن ❷ کر دیا (یہ جملہ معترضہ سلسلہ کلام میں آ گیا تھا)

خیبر کے واقعات میں ارباب سیر نے ایک سخت غلط روایت نقل کی ہے اور وہ اکثر کتابوں میں منقول ہو کر متداول ہو گئی ہے، یعنی یہ کہ اول آپ نے یہود کو اس شرط پر امن عام دیا تھا کہ کوئی چیز نہ چھپائیں گے۔ لیکن جب کنانہ بن ابی الحقیق نے خزانہ کے بتانے سے انکار کیا تو آپ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ سختی کر کے اس سے خزانہ کا پتہ لگائیں، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ چقماق جلا کر اس کے سینے کو داغتے تھے یہاں تک کہ اس کی جان نکلنے کے قریب ہو گئی۔ ❸ بالآخر آپ نے کنانہ کو قتل کرا دیا اور تمام یہودی لونڈی غلام بنا لئے گئے۔ ❹

اس روایت کا اس قدر حصہ صحیح ہے کہ کنانہ قتل کر دیا گیا، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ خزانہ کے بتانے سے انکار کرتا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کنانہ نے محمود بن مسلمہ کو قتل کیا تھا، طبری میں تصریح ہے:

ثم دفعه رسول الله الى محمد بن مسلمة فضرب عنقه باخيه محمود بن مسلمة۔ ❺

''پھر آنحضرت ﷺ نے کنانہ کو محمد بن مسلمہ کے حوالہ کیا، انہوں نے اپنے بھائی محمود بن مسلمہ کے قصاص میں اس کو قتل کر دیا۔''

باقی روایت کا یہ حال ہے کہ یہ روایت طبری اور ابن ہشام دونوں نے ابن اسحاق سے روایت کی ہے لیکن ابن اسحاق نے اوپر کے کسی راوی کا نام نہیں بتایا، محدثین نے رجال کی کتابوں میں تصریح کی ہے کہ ابن اسحاق یہودیوں سے مغازیٔ نبوی کے واقعات روایت کرتے تھے۔ ❻ اس روایت کو بھی انہی روایتوں میں سمجھنا چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ ابن اسحاق ان راویوں کا نام نہیں لیتے۔

کسی شخص پر خزانہ بتانے کے لئے اس قدر سختی کرنا کہ اس کے سینہ پر چقماق سے آگ جھاڑی جائے رحمۃ للعالمین کی شان اس سے بہت ارفع ہے۔ وہی شخص جو اپنے زہر دینے والے سے مطلق تعرض نہیں کرتا کیا

❶ صحيح بخاری، كتاب الاحكام، باب كتاب الحاكم الى عماله: ٧١٩٢ وصحيح مسلم، كتاب القسامة: ٤٣٤٢ـ٤٣٤٩ـ ❷ فتوح البلدان بلاذری، (ص: ٣١، مطبعه موسوعات مصر: ١٣١٩ ھ) اور صحیح بخاری، (كتاب الشروط، باب اذا اشترط فی المزارعة اذا شئت اخرجتك: ٢٧٣٠)
❸ یہ پوری تفصیل تاریخ طبری، (ج٣، ص: ١٥٨٢) میں مذکور ہے ابن ہشام میں بھی اس کے قریب قریب ہے۔
❹ فتوح البلدان بلاذری، ص: ٢٤ لائیڈن ١٨٦٦ء۔ ❺ تاریخ طبری، ج٣، ص: ١٥٨٢ و سیرت ابن ہشام، ج٢، ص: ٢٢٩۔ ❻ میزان الاعتدال، ج٣، ص: ٢١۔ ابن اسحاق کی منقطع روایتوں کو محدثین نے بھی منکر قرار دیا ہے۔ امام ذہبی نے لکھا ہے۔ وهو صالح الحديث ماله عندى ذنب الاما قد حشا فى السيرة من الاشياء المنكرة المنقطعة۔

چند سکوں کے لئے کسی کو آگ سے جلانے کا حکم دے سکتا ہے؟

اصل واقعہ اس قدر تھا کہ کنانہ ابی الحقیق کو اس شرط پر امان دی گئی تھی کہ کسی قسم کی بدعہدی اور خلاف بیانی نہ کرے گا۔ ❶ اس نے یہ بھی منظور کیا تھا (بلکہ ایک روایت میں ہے) کہ اگر اس کے خلاف اس نے کچھ کیا تو وہ قتل کا مستحق ہوگا۔ ❷

کنانہ نے بدعہدی کی اور جو امن اس کو دیا گیا تھا ٹوٹ گیا۔ کنانہ نے محمود بن مسلمہ کو قتل کیا تھا اب اس کے قصاص میں وہ قتل کر دیا گیا۔ جیسا کہ ابھی ہم نے طبری کی روایت سے نقل کیا ہے۔

اب دیکھو اس روایت میں کیا کیا واقعات اضافہ ہو گئے۔

① قتل کا واقعہ کنانہ کے ساتھ خاص تھا، خزانہ کے چھپانے کا وہی مجرم تھا، محمود بن مسلمہ کو اسی نے قتل کیا تھا اس لئے وہی قتل بھی کیا جا سکتا تھا، اضافہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ ابن سعد نے بکر بن عبدالرحمن سے جو روایت متصل نقل کی ہے اس میں کنانہ کے ساتھ اس کے بھائی کا بھی نام بڑھا دیا ہے، یعنی دونوں قتل کئے گئے۔

فضرب اعناقهما وسبى اهليهما۔ ❸

''تو آنحضرت ﷺ نے دونوں کو قتل کرا دیا، ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنایا۔''

② یہاں تک بھی خیریت تھی لیکن ابن سعد نے عفان بن مسلم سے جو روایت نقل کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہوگئی ہے، یعنی دونوں بھائیوں کے ساتھ تمام یہودی گرفتار اور لونڈی غلام بنا لئے گئے۔

فلما وجد المال الذى غيبوه فى مسك الجمل سبى نساء هم۔ ❹

''تو جب وہ خزانہ مل گیا جس کو انہوں نے اونٹ کی کھال میں چھپا رکھا تھا تو ان کی عورتیں گرفتار کیں اور لونڈیاں بنالیں۔''

لیکن جب یہ روایتیں محدثانہ اصول تنقید سے جانچی جاتی ہیں تو چھلکے اترتے جاتے ہیں اور اصل حقیقت رہ جاتی ہے، یہود کا قتل اور زن و بچہ کا گرفتار ہونا ایک طرف خود صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ کنانہ کا بھائی تک قتل نہیں کیا گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت تک موجود تھا۔ صحیح بخاری میں ہے:

فلما اجمع عمر على ذالك اتاه احد بنى ابى الحقيق فقال يا امير المؤمنين! اتخرجنا وقد اقرنا محمد وعاملنا على الاموال۔ ❺

''پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ ارادہ کر لیا تو ابوالحقیق کا ایک بیٹا ان کے پاس آیا اور کہا کہ امیر المومنین! آپ ہم کو نکالتے ہیں حالانکہ ہم کو محمد ﷺ نے رہنے دیا تھا اور خراج پر معاملہ کیا تھا۔''

❶ ابو داود، كتاب الخراج، باب ما جاء فى حكم ارض خيبر: ٣٠٠٦۔ ❷ طبقات ابن سعد، غزوة خيبر، ج ٢، ق اول ص: ٨١، سطر: ٢٤۔ ❸ طبقات ابن سعد، غزوة خيبر، ص: ٨١، سطر: ٢٧۔

❹ طبقات ابن سعد، جزء ثانى، قسم اول، غزوة خيبر، ص: ٨٠، سطر: ٥۔

❺ صحيح بخارى، كتاب الشروط، باب اذا اشترط فى المزارعة اذا شئت اخرجتك: ٢٧٣٠۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ نے فتح الباری میں تصریح کی ہے کہ یہ وہی کنانہ بن ابی الحقیق کا بھائی تھا۔ ❶
حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ نے زاد المعاد میں عام روایتوں کی وسعت کو گھٹا کر اس حد تک پہنچایا کہ

ولم يقتل رسول الله ﷺ بعد الصلح الا ابنی ابی الحقیق۔ ❷

''آنحضرت ﷺ نے صلح کے بعد ابن ابی الحقیق کے دونوں بیٹوں کے سوا اور کسی کو قتل نہیں کیا۔''

لیکن حافظ موصوف کو اگر صحیح بخاری کی عبارتِ مذکورہ بالا پیش نظر ہوتی تو غالباً یہ تعداد اور بھی گھٹ جاتی۔

ابوداؤد میں جہاں ارض خیبر کا عنوان باندھا ہے، صرف ابن اَبی الحقیق کا قتل کیا جانا لکھا ہے۔ یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ابوداؤد میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سعیۃ (حیی بن اخطب کے چچا) سے پوچھا تھا کہ وہ خزانہ کیا ہوا؟ اس نے کہا لڑائیوں میں صرف ہو گیا۔ باوجود اس کے آنحضرت ﷺ نے صرف کنانہ کے قتل کا حکم دیا، ❸ یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ کنانہ کا قتل محمود بن مسلمہ کے قصاص میں ہوا تھا ورنہ اگر خزانہ کے چھپانے کا جرم قتل کا سبب ہوتا تو اس جرم کے مجرم اور بھی تھے۔

مؤرخین نے پہلی غلطی یہ کی کہ کنانہ کے قتل کا سبب اخفائے خزانہ سمجھے اور چونکہ اس جرم میں اور لوگ بھی شریک تھے اس لئے یہ تعمیم خود بخود پیدا ہوگئی کہ کنانہ کا تمام خاندان قتل کر دیا گیا۔

ایک اور نکتہ

اس قدر عموماً مسلّم ہے کہ خیبر کا واقعہ محرم میں پیش آیا، یعنی آنحضرت ﷺ جب اس ارادہ سے مدینہ سے نکلے تو محرم کی اخیر تاریخیں تھیں محرم میں لڑائی شرعاً ممنوع ہے، اس لئے محدثین اور فقہا میں اس کی توجیہ کے متعلق اختلاف پیدا ہوا۔ بہت سے فقہا کا یہ مذہب ہے کہ اوائل میں البتہ ان مہینوں میں لڑائی شرعاً ممنوع تھی لیکن پھر وہ حکم منسوخ ہو گیا۔ علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ حرمت کا پہلا حکم جو نازل ہوا تھا وہ اس آیت کی رو سے تھا:

﴿ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ﴾. (۲/ البقرۃ:۲۱۷)

''کہہ دو کہ اس مہینے میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور اللہ کی راہ سے روکنا ہے۔''

پھر سورۂ مائدہ میں یہ آیت اتری:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ ﴾. (۵/ المآئدۃ:۲)

''مسلمانو! اللہ کی حد بندیوں کی اور ماہ حرام کی بے حرمتی نہ کرو۔''

یہ پچھلی آیت پہلی آیت کے آٹھ برس بعد نازل ہوئی۔ اس وسیع زمانہ تک تو حرمت کا حکم باقی رہا۔ اب وہ کونسی آیت یا حدیث ہے جس سے یہ حکم منسوخ ہو گیا؟

❶ فتح الباری، ج۵، ص: ۲۴۰۔ ❷ زاد المعاد، ج ۱، ص: ۳۹۵۔
❸ ابوداود، کتاب الخراج، باب ما جاء فی حکم ارض خیبر: ۳۰۰۶۔

وليس في كتاب الله ولا سنة رسوله ناسخ لحكمها.

''اور اللہ کی کتاب اور حدیث میں ان آیتوں کے حکم کا کوئی ناسخ نہیں۔''

مجوزین نے یہ استدلال کیا ہے کہ فتح حرم، طائف کا محاصرہ، بیعت رضوان، یہ سب ماہ حرام میں ہوئے تھے۔ اس لئے اگر ماہ حرام میں لڑائی جائز نہ ہوتی تو آنحضرت ﷺ ان کو کیونکر جائز رکھتے۔ حافظ ابن القیم نے جواب دیا ہے کہ ماہ حرام میں ابتداءً جنگ کرنا حرام ہے لیکن اگر دشمن کا مدافعہ مقصود ہے تو بالاتفاق جائز ہے، وہ سب واقعات دفاعی تھے۔ آنحضرت ﷺ نے پیش دستی نہیں کی تھی بلکہ دفاع کیا گیا تھا۔ بیعت رضوان اس لئے لی گئی تھی کہ یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ کفار نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو (جو سفیر ہو کر گئے تھے) قتل کر دیا۔ طائف کا محاصرہ کوئی مستقل جنگ نہ تھی بلکہ غزوۂ حنین کا بقیہ تھا جس میں خود کفار ہر طرف سے جمع ہو کر حملہ آور ہوئے تھے۔ فتح حرم کا واقعہ حدیبیہ کی شکست کا نتیجہ تھا جس کی ابتدا قریش نے کی تھی۔ [1]

حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت صحیح جواب دیا لیکن خاص خیبر کے معاملہ میں وہ اس گرہ کو نہ کھول سکے اور بحث نامفصل رہ گئی۔ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کے استاد علامہ ابن تیمیہ کو بھی اس موقع پر اشتباہ ہوا، انہوں نے "الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح" میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جس قدر لڑائیاں کیں سب دفاعی تھیں، صرف بدر اور خیبر اس سے مستثنیٰ ہیں۔ لیکن اگر علامہ موصوف زیادہ استقصا کرتے تو ثابت ہوتا کہ بدر اور خیبر بھی مستثنیٰ نہیں، بدر کا بیان اوپر گزر چکا ہے، خیبر کے ماسبق واقعات کو ترتیب دیکر دیکھو تو صاف نظر آئے گا کہ یہود اور غطفان مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔

تقسیم زمین

خیبر کی زمین دو برابر حصوں میں تقسیم کی گئی، نصف بیت المال، مہمانی اور سفارت وغیرہ کے مصارف کے لئے خاص کر لیا گیا۔ باقی نصف مجاہدین پر جو اس غزوہ میں شریک تھے، مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا، کل فوج کی تعداد چودہ سو تھی، دو سو سوار تھے، سواروں کو گھوڑوں کے مصارف کے لئے پیدل سے دوگنا ملتا تھا، اس بنا پر یہ تعداد اٹھارہ سو کے برابر تھے، اس حساب سے کل جائداد کے اٹھارہ سو حصے کئے گئے اور ہر مجاہد کے حصہ میں ایک حصہ آیا، جناب سرور کائنات ﷺ کو بھی عام مجاہدین کے برابر ایک ہی حصہ ملا۔

ولرسول الله ﷺ مثل سهم واحدهم۔ [2]

''اور آنحضرت ﷺ کا بھی عام لوگوں کی طرح ایک حصہ تھا۔''

ملکی حالت اور احکام فقہی

خیبر کی فتح سے اسلام کی ملکی اور سیاسی حالت کا نیا دور شروع ہوتا ہے، اسلام کے حقیقی دشمن صرف دو

---

[1] زادالمعاد، ذکر غزوة خيبر، ج۱، ص: ۴۰۰۔ [2] فتوح البلدان بلاذری، ذکر غزوة خيبر (ابو داود، کتاب الخراج، باب ماجاء فی حکم ارض خيبر: ۳۰۱۴ میں ہے: النبی ﷺ معهم له سهم كسهم احدهم)۔ (س)

تھے، مشرکین اور یہود اگرچہ مذہباً باہم مختلف تھے لیکن سیاسی اسباب کی بنا پر ان میں اتحاد پیدا ہو گیا تھا۔ مدینہ کے یہود عموماً انصار کے حلیف تھے اسی طرح خیبر کے یہود غطفان کے حلیف تھے، اب آنحضرت ﷺ کے مقابلہ کے لئے مکہ اور مدینہ کے مشرکین اور منافقین سب مل کر کنفس واحدۃ ہو گئے، خیبر کی فتح کے بعد یہود کی قوت بالکل ٹوٹ گئی اور مشرکین کا ایک بازو جاتا رہا۔

اب تک اسلام چاروں طرف سے نرغہ کی حالت میں تھا، اس بنا پر بجز عقائد اور ضروری عبادت کے شریعت کے اور احکام کی تاسیس و تعلیم کا موقع نہ تھا، شریعت کے احکام جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہے حالات کے اقتضا سے بتدریج آئے ہیں، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ خیبر کی فتح سے ادھر تو یہود کی فتنہ انگیزیوں سے نجات ملی ادھر حدیبیہ کی صلح سے مشرکین کی طرف سے فی الجملہ اطمینان حاصل ہوا، اس بنا پر اب مسلمان جدید فقہی احکام کی تعمیل کے قابل ہو چکے تھے۔

ارباب سیر نے غزوۂ خیبر کے تذکرہ میں عموماً ذکر کیا ہے کہ اس موقع پر متعدد جدید فقہی احکام نازل ہوئے [1] اور آنحضرت ﷺ نے ان کی تبلیغ کی، ان کی تفصیل یہ ہے:

1. پنجہ سے شکار کرنے والے پرند حرام ہوئے۔
2. درندہ جانور حرام کر دیے گئے۔
3. گدھا اور خچر حرام کر دیا گیا۔
4. اب تک معمول تھا کہ لونڈیوں سے فوراً تمتع جائز سمجھا جاتا تھا، اب استبراء کی قید ہو گئی، یعنی اگر وہ حاملہ ہے تو وضع حمل تک، ورنہ ایک مہینہ تک تمتع جائز نہیں۔
5. چاندی سونے کا بہ تفاضل خریدنا حرام ہوا۔
6. بعض روایتوں میں ہے کہ متعہ بھی اسی غزوہ میں حرام ہوا۔

وادی القریٰ اور فدک

تیماء اور خیبر کے درمیان ایک وادی ہے جس میں بہت سی بستیاں آباد ہیں، اس کو وادی القریٰ کہتے ہیں قدیم زمانہ میں عاد و ثمود یہاں آباد تھے۔ یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ عاد و ثمود کے آثارات اب بھی باقی ہیں۔ اسلام سے پہلے ان بستیوں میں یہود آ کر آباد ہوئے اور زراعت اور آب رسانی کو بہت ترقی دی اور اب یہود کا مخصوص مرکز بن گیا تھا۔ [2]

خیبر کے بعد آنحضرت ﷺ نے وادی القریٰ کا رخ کیا، لیکن لڑنا مقصود نہ تھا، مگر یہود پہلے سے تیار تھے، انہوں نے فوراً تیراندازی شروع کر دی، آنحضرت ﷺ کا محمل آپ کے غلام حضرت مدعم رضی اللہ عنہ اتار

---

[1] یہاں نزول سے وحی متلو یعنی قرآن مراد نہیں ہے۔ [2] معجم البلدان لفظ قری، ج ۷، ص: ۷۳، (س)۔

رہے تھے کہ ایک تیر آیا اور وہ جاں بحق ہوئے۔ عام مؤرخین نے یہود کی تیاری کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن امام بیہقی نے صاف تصریح کی ہے۔

وقد استقبلتنا یہود بالرمی ولم نکن علی تعبیة [1]

''یہود ہمارے مقابلہ کو تیرے چلاتے ہوئے نکلے اور ہم تیار نہ تھے۔''

بہرحال جنگ شروع ہوگئی لیکن تھوڑے سے مقابلہ کے بعد یہود نے سپر ڈال دی اور خیبر کے شرائط کے موافق صلح ہوگئی۔

ادائے عمرہ

صلح حدیبیہ میں قریش سے معاہدہ ہوا تھا کہ اگلے سال آنحضرت ﷺ مکہ میں آ کر عمرہ ادا کریں گے اور تین دن قیام کر کے واپس چلے جائیں گے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے اس سال عمرہ ادا کرنا چاہا اور اعلان کرا دیا کہ جو لوگ واقعہ حدیبیہ میں شریک تھے ان میں سے کوئی رہ نہ جائے چنانچہ بجز ان لوگوں کے جو اس اثنا میں مر چکے تھے، سب نے یہ سعادت حاصل کی۔ معاہدہ میں شرط تھی کہ مسلمان مکہ میں آئیں تو ہتھیار ساتھ نہ لائیں، اس لئے اسلحہ جنگ بطن یاجج میں جو مکہ سے آٹھ میل ادھر ہے چھوڑ دیے گئے اور دو سو سواروں کا ایک دستہ اسلحہ کی حفاظت کے لئے متعین کر دیا گیا۔

آنحضرت ﷺ لبیک کہتے ہوئے حرم کی طرف بڑھے، حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ اونٹ کی مہار تھامے ہوئے آگے آگے یہ رجز پڑھتے جاتے تھے: [2]

خلوابنی الکفار عن سبیله	''کافرو! سامنے سے ہٹ جاؤ
الیوم نضربکم علی تنزیله	آج جو تم نے اترنے سے روکا تو ہم تلوار کا وار کریں گے
ضربًا یزیل الهام عن مقیله	وہ وار جو سر کو خوابگاہ سر سے الگ کر دے
ویذهل الخلیل عن خلیله	اور دوست کے دل سے دوست کی یاد بھلا دے۔''

صحابہ کا جم غفیر ساتھ تھا۔ برسوں کی دیرینہ تمنا اور فرض مذہبی بڑے جوش کے ساتھ ادا کر رہا تھا، اہل مکہ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ کی آب و ہوا نے کمزور کر دیا ہے، اس بنا پر آپ نے حکم دیا کہ لوگ طواف کے تین پہلے پھیروں میں اکڑتے ہوئے چلیں۔ عربی زبان میں اس کو ''رمل'' کہتے ہیں، چنانچہ آج تک یہ سنت باقی ہے۔

اہل مکہ نے اگرچہ چار و ناچار عمرہ کی اجازت دے دی تھی تاہم ان کی آنکھیں اس منظر کے دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتی تھیں، رؤسائے قریش نے عموماً شہر خالی کر دیا اور پہاڑوں پر چلے گئے۔ تین دن کے بعد

[1] زرقانی، برمؤطا بہ حوالہ بیہقی، باب الجهاد ذکر غلول، ص: ۳۱۳، (س)۔

[2] یہ اشعار اور یہ واقعہ ترمذی نے شمائل (باب صفة کلام رسول الله ﷺ فی الشعر: ۲۴۵) میں نقل کیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا: ''محمد ﷺ سے کہہ دو کہ شرط پوری ہو چکی، اب مکہ سے نکل جائیں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے عرض کی آپ ﷺ اسی وقت روانہ ہو گئے، چلتے وقت حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی صغیر السن صاحبزادی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھیں، آنحضرت ﷺ کے پاس ''چچا چچا'' 1 کہتی دوڑی آئیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہاتھوں میں اٹھا لیا، لیکن حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دعوے پیش کئے، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ، کہتے تھے کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے، زید کہتے تھے کہ حمزہ رضی اللہ عنہ میرے مذہبی بھائی تھے، اس رشتہ سے یہ میری بھتیجی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دعویٰ تھا کہ میری ہمشیرہ بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے، آنحضرت ﷺ نے سب کے دعوے مساوی الدرجہ دیکھ کر ان کو اسماء کی گود میں دیا، وہ امامہ کی خالہ تھیں، پھر فرمایا کہ ''خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔'' 2

---

1 آنحضرت ﷺ رشتہ میں ان کے بھائی تھے لیکن انہوں نے تعظیماً کہا (یا اس لئے کہ آنحضرت ﷺ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ دونوں رضاعی بھائی تھے)۔ 2 اس واقعہ کا بڑا حصہ صحیح بخاری (کتاب المغازی، باب عمرة القضاء:٤٢٥١) سے ماخوذ ہے، بعض زائد تفصیلیں زرقانی سے لی گئی ہیں جو کتب حدیث کے حوالہ سے زرقانی نے نقل کی ہیں۔

۸ھ غزوۂ موتہ

جمادی الاولیٰ ۸ھ

موتہ شام میں ایک مقام کا نام ہے جو بلقا سے اس طرف ہے۔عرب میں جو مشرقی تلواریں مشہور ہیں وہ یہیں بنتی تھیں۔ ❶ کثیر مشہور شاعر کہتا ہے:

صوارم یجلوھا بموتۃ صیقل۔

''وہ تلواریں جن کو موتہ میں صیقل گر جلا دیتا ہے۔''

آنحضرت ﷺ نے شاہ بُصریٰ یا قیصر روم کے نام ایک خط لکھا تھا،عرب اور شام کے سرحدی علاقوں میں جو عرب رؤسا حکمران تھے ان میں ایک شرحبیل بن عمرو بھی تھا جو اسی علاقہ بلقا کا رئیس اور قیصر کا ماتحت تھا۔یہ عربی خاندان ایک مدت سے عیسائی تھا اور شام کے سرحدی مقامات میں حکمران تھا،یہ خط حارث بن عمیر لے کر گئے تھے،شرحبیل نے ان کو قتل کر دیا،اس کے قصاص کے لئے آنحضرت ﷺ نے تین ہزار فوج تیار کر کے شام کی طرف روانہ کی۔زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو جو آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے،سپہ سالاری ملی اور ارشاد ہوا کہ اگر ان کو دولت شہادت نصیب ہو تو جعفر طیار رضی اللہ عنہ اور وہ شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ فوج کے سردار ہوں ❷ حضرت زید رضی اللہ عنہ غلام تھے گو آزاد ہو چکے تھے،حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ،حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھائی اور آنحضرت ﷺ کے مقرب خاص تھے،عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ معزز انصاری اور مشہور شاعر تھے، اس بنا پر لوگوں کو تعجب ہوا کہ جعفر و عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہما کے ہوتے زید کو افسر کرنا کس بنا پر ہے،چنانچہ لوگوں میں چرچے ہوئے ❸ لیکن اسلام جس مساوات کے قائم کرنے کے لئے آیا تھا اس کے لئے اسی قسم کا ایثار درکار تھا۔حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی مہم میں جس میں تمام مہاجرین کو شرکت کا حکم ہوا تھا آنحضرت ﷺ نے انہی زید رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو فوج کا افسر مقرر کیا تھا،اس وقت بھی لوگوں میں چرچے ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے سنا تو خطبہ دیا اور فرمایا کہ ''تم لوگوں نے ان کے باپ کی افسری پر بھی اعتراض کیا تھا حالانکہ یقیناً وہ افسری کے قابل تھے۔'' چنانچہ صحیح بخاری ❹ میں بہ تفصیل یہ واقعہ منقول ہے۔گو یہ مہم قصاص لینے کی غرض سے تھی۔لیکن چونکہ تمام مہمات کا اصلی محور تبلیغ اسلام تھا،ارشاد ہوا کہ پہلے ان کو دعوت اسلام دی جائے،اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو جنگ کی ضرورت نہیں،یہ بھی حکم ہوا کہ اظہار ہمدردی کے لئے اس مقام پر جانا جہاں حارث بن عمیر نے ادائے فرض میں جان دی ہے،ثنیۃ الوداع تک آنحضرت ﷺ خود فوج کی

---

❶ معجم البلدان لفظ موته، ج ۸، ص: ۱۹۰۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ موته: ۴۲۶۱۔ ❸ فتح الباری، ج ۷، ص: ۳۹۳۔ (س)۔

❹ کتاب المغازی، باب بعث النبی ﷺ اسامة بن زید فی مرضه الذی تو فی فیه: ۴۴۶۹۔

مشایعت کے لئے تشریف لے گئے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے پکار کر دعا کی کہ اللہ سلامت اور کامیاب لائے۔ 1

فوج مدینہ سے روانہ ہوئی تو جاسوسوں نے شرحبیل کو خبر دی جس نے مقابلہ کے لئے کم وبیش ایک لاکھ فوج تیار کی۔ ادھر خود قیصر روم (ہرقل) قبائلِ عرب کی بے شمار فوج لے کر مآب میں خیمہ زن ہوا جو بلقاء کے اضلاع میں ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے یہ حالات سن کر چاہا کہ ان واقعات کی دربار رسالت میں اطلاع دی جائے اور حکم کا انتظار کیا جائے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہمارا اصل مقصد فتح نہیں بلکہ دولت شہادت 2 ہے جو ہر وقت حاصل ہوسکتی ہے۔

غرض یہ مختصر گروہ آگے بڑھا اور ایک لاکھ فوج پر حملہ آور ہوا، حضرت زید رضی اللہ عنہ برچھیاں کھا کر شہید ہوئے، ان کے بعد حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے علم ہاتھ میں لیا، گھوڑے سے اتر کر پہلے خود اپنے گھوڑے کے پاؤں پر تلوار ماری کہ اس کی کونچیں کٹ گئیں پھر اس بے جگری سے لڑے کہ تلواروں سے چور ہو کر گر پڑے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ میں نے ان کی لاش دیکھی تھی، تلواروں اور برچھیوں 3 کے ۹۰ (سے زائد) زخم تھے لیکن سب کے سب سامنے کی جانب تھے، پشت نے یہ داغ نہیں اٹھایا تھا، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے علم ہاتھ میں لیا اور وہ بھی داد شجاعت دے کر شہید ہوئے۔

اب حضرت خالد رضی اللہ عنہ سردار بنے اور نہایت بہادری سے لڑے صحیح بخاری میں ہے کہ آٹھ تلواریں ان کے ہاتھ سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر گریں 4 لیکن ایک لاکھ سے تین ہزار کا مقابلہ کیا تھا، بڑی کامیابی یہی تھی کہ فوجوں کو دشمن کی زد سے بچا لائے۔ جب یہ شکست 5 خوردہ فوج مدینہ کے قریب پہنچی اور اہل شہر ان کی مشایعت کو نکلے تو لوگ غم خواری کے بجائے ان کے چہروں پر خاک پھینکتے تھے کہ او فرار یو! تم اللہ کی راہ سے بھاگ آئے۔

---

1 طبقات ابن سعد، جزء مغازی، ص: ۹۳ (س)۔ 2 ابن هشام، غزوة موتة، ج ۲، ص: ۲۵۲۔ (س)

3 صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة موتة: ۴۲۶۰، ۴۲۶۱۔ 4 ایضا: ۴۲۶۵، ۴۲۶۶۔ (س)

5 مصنف نے یہاں ابن اسحاق کی روایت پر اعتماد کر کے اس فوج کو شکست خوردہ لکھا ہے اور ان کی واپسی پر ان سب کو بلا امتیاز فراری ہونے کا مستحق ظاہر کیا ہے لیکن جیسا کہ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة موتة: ۴۲۶۲ میں ہے کہ حضور انور ﷺ نے از روئے وحی فرمایا کہ پھر اللہ کی ایک تلوار یعنی خالد سیف اللہ نے مسلمانوں کے علم کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے دشمن پر غلبہ دیا ((فتح اللّٰه عليهم)) ارباب سیر اور اہل روایت اور شراح حدیث اس غلبہ یا فتح کی تشریح میں مختلف ہیں۔ ایک فریق کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو پوری فتح حاصل ہوئی۔ دوسرے کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا غلبہ اور فتح یہ ہے کہ مسلمان اس قلت تعداد اور کفار اپنی کثرت کے باوجود تھک کر غیر منفصل جنگ کی صورت میں ایک دوسرے کے مقابلہ سے ہٹ آئے۔ تیسرا فریق یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں کو فتح کفار کے ایک خاص دستہ کے مقابلہ میں حاصل ہوئی اور اس سے مال غنیمت بھی حاصل کیا۔ چوتھا بیان یہ ہے کہ مسلمانوں کا غلبہ یہ ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی قیادت میں اتنے بڑے لشکر کے حملوں کو روک دیا اور بہ سلامت پیچھے ہٹ آئے۔ اس مقام پر فتح الباری، روض الانف سہیلی اور البدایہ ابن کثیر ملاحظہ کرنی چاہیے۔ اسی طرح مسلمانوں کی جس فوج کو اپنے اوپر فراری ہونے کا گمان تھا یا مسلمانوں نے ان کو فراری کہا اور حضور ﷺ نے ان کو تسلی دی کہ نہیں تم فراری نہیں بلکہ پھر دوبارہ حملہ کرنے کی نیت سے پیچھے ہٹ آنے والے ہو، اس کی مخاطب پوری اسلامی فوج نہیں بلکہ ان کی فوج کا ایک خاص دستہ تھا جو جلدی کر کے پہلے مدینہ چلا آیا تھا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری، روض الانف سهيلي، والبدايه ابن كثير، باب غزوة موتة، (س)۔

رسول اللہ ﷺ کو اس واقعہ کا سخت صدمہ ہوا۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے آپ کو خاص محبت تھی ان کی شہادت کا نہایت قلق تھا۔ آپ مسجد میں جا کر غمزدہ بیٹھے۔ اسی حالت میں ایک شخص نے آ کر کہا کہ جعفر رضی اللہ عنہ کی مستورات رو رہی ہیں، اور ماتم کر رہی ہیں آپ ﷺ نے منع کرا بھیجا، وہ گئے اور واپس آ کر کہا کہ میں نے منع کیا لیکن وہ باز نہیں آتیں، آپ نے دوبارہ بھیجا، وہ پھر گئے اور واپس آ کر عرض کی کہ ہم لوگوں کی نہیں چلتی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''تو ان کے منہ میں خاک بھر دو''۔ یہ واقعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیح بخاری میں منقول ہے، صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس شخص سے کہا کہ اللہ کی قسم! تم یہ نہ کرو گے (منہ میں خاک ڈالنا) اور آنحضرت ﷺ کو تکلیف سے نجات نہ ملے گی۔ [1]

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ موتۃ من أرض الشام: ٤٢٦٣۔

فتح مکہ

رمضان ۸ھ مطابق جنوری ۶۳۰ء

﴿اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا﴾ (۴۸/ الفتح:۱)

جانشین ابراہیم (علیہ السلام) کا سب سے مقدم فرض توحید خالص کا احیا اور حرم کعبہ کا آلائش سے پاک کرنا تھا۔ لیکن قریش کے پے در پے حملوں اور عرب کی مخالفت عام نے پورے اکیس برس تک اس فرض کو روک رکھا۔ صلح حدیبیہ کی بدولت اتنا ہوا کہ چند روز کے لئے امن و امان قائم ہو گیا اور دلدادگان حرم ایک دفعہ یادگار ابراہیمی کو غلط انداز نظر سے دیکھ آئے، لیکن معاہدۂ حدیبیہ بھی قریش سے نہ نبھ سکا۔ حلم و عفو وتحمل کی حد ہو چکی، اب وقت آ گیا کہ آفتاب حق حجاب ہائے حائل کو چاک کر کے باہر نکل آئے۔

صلح حدیبیہ کی بنا پر قبائل عرب میں خزاعہ آنحضرت ﷺ کے حلیف ہو گئے تھے اور ان کے حریف بنوبکر نے قریش سے مخالفت کا معاہدہ کر لیا تھا، ان دونوں حریفوں میں مدت سے لڑائیاں چلی آتی تھیں۔ اسلام کے ظہور نے عرب کو ادھر متوجہ کیا تو وہ لڑائیاں رک گئیں اور اب تک رکی رہیں، کیونکہ قریش اور عرب کا سارا زور اسلام کے مقابلہ میں صرف ہو رہا تھا، صلح حدیبیہ نے لوگوں کو مطمئن کیا تو بنوبکر سمجھے کہ اب انتقام کا وقت آ گیا دفعتہً وہ خزاعہ پر حملہ آور ہوئے اور رؤسائے قریش نے علانیہ ان کو مدد دی عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ اور سہیل بن عمرو وغیرہ نے راتوں کو صورتیں بدل کر [1] بنوبکر کے ساتھ تلواریں چلائیں، خزاعہ نے مجبور ہو کر حرم میں پناہ لی، بنوبکر رک گئے کہ حرم کا احترام ضروری ہے، لیکن ان کے رئیس اعظم نوفل نے کہا: یہ موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آ سکتا۔ غرض عین حدود حرم میں خزاعہ کا خون بہایا گیا۔

آنحضرت ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ دفعتہً یہ صدا بلند ہوئی،

لا هم انی ناشد محمدا — حلف ابينا و ابيه الا تلدا
فانصر رسول الله نصرا اعتدا — ادع عباد الله يا توا مددا

''اے اللہ! میں محمد ﷺ کو وہ معاہدہ یاد دلاؤں گا جو ہمارے اور ان کے قدیم خاندان میں ہوا ہے، اے اللہ کے پیغمبر! ہماری اعانت کر، اور اللہ کے بندوں کو بلا، سب اعانت کے لئے حاضر ہوں گے۔''

معلوم ہوا کہ خزاعہ کے چالیس ناقہ [2] سوار جن کا پیش رو عمرو بن سالم ہے، فریاد لے کر آئے ہیں آنحضرت ﷺ نے واقعات سنے تو آپ کو سخت رنج ہوا۔ تاہم آپ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین

[1] طبری، ج ۳، ص: ۱۶۲۰، (ابن سعد جزء مغازی، ص: ۹۷ میں کچھ اور نام بھی ہیں)۔ (س)
[2] طبقات ابن سعد، جزء مغازی، ص: ۹۷، (س)

شرطیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی منظور کی جائے:

① مقتولوں کا خون بہادیا جائے۔

② قریش، بنوبکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

③ اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

قرطہ بن عمرو نے قریش کی زبان سے کہا کہ ”صرف تیسری شرط منظور ہے۔“ ❶ لیکن قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش کو ندامت ہوئی۔ انہوں نے ابوسفیان کو سفیر بنا کر بھیجا کہ حدیبیہ کے معاہدہ کی تجدید کرا لائیں، ابوسفیان نے مدینہ آ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں درخواست کی، بارگاہ رسالت سے کچھ جواب نہ ملا، ابوسفیان نے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو بیچ میں ڈالنا چاہا، لیکن سب نے کانوں پر ہاتھ رکھا، ہر طرف سے مجبور ہو کر جناب فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے پاس آیا، امام حسن رضی اللہ عنہ پانچ برس کے بچے تھے، ابوسفیان نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا: ”اگر یہ بچہ اتنا زبان سے کہہ دے کہ میں نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرا دیا، تو آج سے عرب کا سردار پکارا جائے گا، جناب سیدہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ”بچوں کو ان معاملات میں کیا دخل۔“ بالآخر ابوسفیان نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایما سے مسجد نبوی میں جا کر اعلان کر دیا کہ ”میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی۔“ ❷

ابوسفیان نے مکہ میں جا کر لوگوں سے یہ واقعہ بیان کیا تو سب نے کہا کہ یہ نہ صلح ہے کہ ہم اطمینان سے بیٹھ جائیں اور نہ جنگ ہے کہ لڑائی کا سامان کیا جائے۔

آنحضرت ﷺ نے مکہ کی تیاریاں کیں، اتحادی قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ تیار ہو کر آئیں، احتیاط کی گئی کہ اہل مکہ کو خبر نہ ہونے پائے۔

حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ ایک معزز صحابی تھے، انہوں نے قریش کو مخفی خط لکھ بھیجا کہ رسول اللہ ﷺ مکہ کی تیاریاں کر رہے ہیں، آنحضرت ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوگئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ (اور حضرت زبیر، حضرت مقداد اور حضرت ابومرثد غنوی رضی اللہ عنہم) کو بھیجا ❸ کہ قاصد سے خط چھین لائیں، خط آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا، تو تمام لوگوں کو حاطب کے افشائے راز پر حیرت ہوئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیتاب ہو گئے اور عرض کی کہ ”حکم ہو تو ان کی گردن اڑا دوں؟“ لیکن جبین رحمت پر شکن نہ تھی۔ ارشاد ہوا: ”عمر! تم کو کیا معلوم ہے کہ اللہ نے اہل بدر کو مخاطب کر کے کہہ دیا ہو کہ تم سے مؤاخذہ نہیں ہے۔“

حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کے عزیز واقارب اب تک مکہ میں تھے اور ان کا کوئی حامی نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے قریش پر احسان رکھنا چاہا کہ اس کے صلہ میں ان کے عزیزوں کو ضرر نہ پہنچائیں گے، انہوں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے یہی عذر پیش کیا اور آنحضرت ﷺ نے قبول فرمایا۔ ❹

---

❶ زرقانی، (ج ۲، ص: ۳۳۶) نے یہ واقعہ مغازی ابن عائذ سے نقل کیا ہے تعجب ہے کہ دوسرے مؤرخین اور ارباب سیر ایسے ضروری واقعہ کو قلم انداز کر گئے۔ ❷ زرقانی علی المواهب، ج ۲، ص: ۳۳۷، (س) ❸ زرقانی علی المواهب، ج ۲، ص: ۳۳۹، (س) ❹ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الفتح: ٤٢٧٤۔

غرض ۱۰ رمضان، ۸ ہجری کو کوکبۂ نبوی ﷺ نہایت عظمت و شان سے مکہ معظمہ کی طرف بڑھا، دس ہزار آراستہ فوجیں رکاب میں تھیں، قبائل عرب راہ میں آ کر ملتے جاتے تھے، مرالظہران پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ ڈالا اور فوجیں دور دور تک پھیل گئیں، یہ مقام مکہ معظمہ سے ایک منزل یا اس سے بھی کم فاصلہ پر ہے۔

آنحضرت ﷺ کے حکم سے تمام فوج نے الگ الگ آگ روشن کی جس سے تمام صحرا وادی ایمن بن گیا، فوج کی آمد کی بھنک قریش کے کانوں میں پڑ چکی تھی، تحقیق کے لئے انہوں نے حکیم بن حزام (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے) ابوسفیان اور بدیل بن ورقاء کو بھیجا، خیمہ نبوی کی دربانی پر جو دستہ متعین تھا اس نے ابو سفیان کو دیکھ لیا [1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ جذبۂ انتقام کو ضبط نہ کر سکے تیز قدمی سے آگے بڑھے اور بارگاہ رسالت میں آ کر عرض کیا کہ کفر کے استیصال کا وقت آ گیا لیکن حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جان بخشی کی درخواست کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ عرض کیا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''عمر! اگر یہ شخص تمہارے قبیلہ کا آدمی ہوتا تو تم اس قدر سخت دلی نہ کرتے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ یہ نہ فرمائیں آپ جس دن اسلام لائے تھے مجھ کو جو مسرت ہوئی تھی، خود میرا باپ خطاب اسلام لاتا تو مجھ کو اس قدر خوشی نہ ہوتی۔ [2]

ابوسفیان کے تمام پچھلے کارنامے اب سب کے سامنے تھے اور ایک ایک چیز اس کے قتل کی دعویدار تھی۔ اسلام کی عداوت، مدینہ پر بار بار حملہ، قبائل عرب کا اشتعال اور آنحضرت ﷺ کے خفیہ قتل کرانے کی سازش، ان میں سے ہر چیز اس کے خون کی قیمت ہو سکتی تھی لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز (عفو نبوی) تھی، اس نے ابوسفیان کے کان میں آہستہ سے کہا کہ ''خوف کا مقام نہیں۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ گرفتار ہونے کے ساتھ ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا، [3] لیکن طبری وغیرہ میں اس اجمال کی تفصیل میں حسب ذیل مکالمہ لکھا ہے:

رسول اللہ ﷺ	کیوں ابوسفیان کیا اب بھی تم کو یقین نہیں آیا کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں؟
ابوسفیان	کوئی اور اللہ ہوتا تو آج ہمارے کام آتا۔
رسول اللہ ﷺ	کیا اس میں کوئی شبہ ہے کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں؟
ابوسفیان	اس میں تو ذرا شبہ ہے۔

بہر حال، ابوسفیان نے اسلام کا اظہار کیا اور اس وقت گو ان کا ایمان متزلزل تھا لیکن مؤرخین لکھتے ہیں کہ بالآخر وہ سچے مسلمان بن گئے چنانچہ غزوۂ طائف میں ان کی ایک آنکھ زخمی ہوئی اور یرموک میں وہ بھی جاتی رہی۔

---

[1] اصل واقعہ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب این رکز النبی ﷺ الرایة یوم الفتح: ٤٢٨٠ میں کافی تفصیل کے ساتھ موجود ہے لیکن مزید تفصیل اور جزئیات حافظ ابن حجر نے بخاری کی شرح میں موسیٰ بن عقبہ اور ابن عائذ وغیرہ سے نقل کئے ہیں میں نے ان کو بھی لے لیا ہے، بعض واقعات طبری سے ماخوذ ہیں۔ [2] طبری، ج ۳، ص: ۱۶۳۲، (س) [3] بخاری ایضًا۔

لشکر اسلام جب مکہ کی طرف بڑھا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ ابو سفیان کو پہاڑی کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو کہ افواج الٰہی کا جلال آنکھوں سے دیکھیں۔ کچھ دیر کے بعد دریائے اسلام میں تلاطم شروع ہوا، قبائل عرب کی موجیں جوش مارتی ہوئی بڑھیں، سب سے پہلے غفار کا پرچم نظر آیا، پھر جہینہ، (سعد بن) ہذیم، سلیم ہتھیاروں میں ڈوبے ہوئے تکبیر کے نعرے مارتے ہوئے نکل گئے، ابوسفیان ہر دفعہ مرعوب ہو ہو جاتے تھے، سب کے بعد انصار کا قبیلہ اس سروسامان سے آیا کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں، ابوسفیان نے متحیر ہو کر پوچھا: یہ کون لشکر ہے؟ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے نام بتایا، دفعتاً سردار فوج حضرت سعد بن عبادہ ہاتھ میں علم لئے ہوئے برابر سے گزرے اور ابوسفیان کو دیکھ کر پکار اٹھے،

الیوم یوم الملحمة ، الیوم تستحل الکعبة۔

''آج گھمسان کا دن ہے، آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔''

سب سے اخیر کو کبۂ نبوی نمایاں ہوا جس کے پرتو سے سطح خاک پر نور کا فرش بچھتا جاتا تھا۔ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ علمبردار تھے۔ ابوسفیان کی نظر جمال مبارک پر پڑی تو پکار اٹھے کہ ''حضور ﷺ نے سنا؟ عبادہ رضی اللہ عنہ کیا کہتے ہوئے گئے؟'' ارشاد ہوا کہ ''عبادہ نے غلط کہا آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے۔'' 1 یہ کہہ کر حکم دیا کہ فوج کا علم سعید بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے لے کر ان کے بیٹے کو دے دیا جائے۔ 2 مکہ پہنچ کر آپ نے حکم دیا کہ علم نبوی ﷺ مقام حجون پر نصب کیا جائے، حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو حکم ہوا کہ فوجوں کے ساتھ بالائی حصہ کی طرف آئیں۔ 3

اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا، یا ابوسفیان کے ہاں پناہ لے گا یا دروازہ بند کر لے گا، یا خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے گا اس کو امن دیا جائے گا، تاہم قریش کے ایک گروہ نے مقابلہ کا قصد کیا اور خالد رضی اللہ عنہ کی فوج پر تیر برسائے، چنانچہ تین صاحب (یعنی حضرت کرز بن جابر فہری اور حضرت خُبیش بن اشعر 4 اور حضرت سلمہ بن المیلا رضی اللہ عنہم 5 نے شہادت پائی، حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے مجبور ہو کر حملہ کیا، یہ لوگ ۱۳ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے، آنحضرت ﷺ نے تلواروں کا چمکنا دیکھا تو خالد رضی اللہ عنہ سے باز پرس کی لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ ابتدا مخالفین نے کی تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قضائے الٰہی یہی تھی۔'' 6

لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ حضور ﷺ قیام کہاں فرمائیں گے؟ کیا اپنے قدیم مکان میں؟ شریعت میں مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا، ابو طالب (آنحضرت ﷺ کے عم) نے جب انتقال کیا تھا تو ان کے صاحبزادے عقیل اس وقت کافر تھے، اس لئے وہی وارث ہوئے، انہوں نے یہ

---

1 یہ خاص صحیح بخاری: ٤٢٨٠ کی روایت ہے۔ 2 ابن سعد، جزء مغازی، ص: ۹۸۔ 3 مصنف نے یہاں حضرت عروہ کی روایت لی ہے جو گو صحیح بخاری میں ہے مگر مرسل ہے، صحیح و مرفوع روایات جو صحیح بخاری میں ہیں ان کے مطابق صورت حال یہ ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ مکہ کے زیریں حصہ سے اور حضور انور ﷺ بالائی حصہ سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ فتح الباری، ج ۸، ص: ۸۔

4 ان (دونوں بزرگوں) کی شہادت کا ذکر صحیح بخاری: ٤٢٨٠ میں بھی ہے۔

5 سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص: ۲۷۱۔ 6 ابن سعد، جزء مغازی، ص: ۹۸۔

مکانات ابوسفیان کے ہاتھ بیچ ڈالے تھے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''عقیل نے گھر کہاں چھوڑا کہ اس میں اتروں۔ ❶ اس لئے مقام خیف میں ٹھہروں گا جہاں قریش نے (ہمارے خلاف) کفر کی تائید پر باہم عہد و پیمان کیا تھا۔''

اللہ کی شان، حرم محترم، جو خلیل بت شکن کی یادگار تھا اس کے آغوش میں ۳۶۰ بت جاگزین تھے، آنحضرت ﷺ ایک ایک کو لکڑی کی نوک سے ٹھوکے دیتے جاتے اور یہ پڑھتے جاتے تھے:

﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾ ❷ (۱۷/ الاسراء: ۸۱)

''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا اور باطل مٹنے ہی کی چیز تھی۔''

عین کعبہ کے اندر بہت سے بت تھے جن کو قریش خدا مانتے تھے، آنحضرت ﷺ نے کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے حکم دیا کہ سب نکلوا دیئے جائیں۔ ❸ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اندر جا کر جس قدر تصویریں تھیں وہ بھی مٹا دیں ❹ حرم ان آلائشوں سے پاک ہو چکا تو آپ نے عثمان بن طلحہ سے جو کعبہ کے کلید بردار تھے، کنجی طلب کی اور دروازہ کھلوایا، آپ ﷺ حضرت بلال اور طلحہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور نماز ادا کی۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے کعبہ کے اندر تکبیریں کہیں لیکن نماز نہیں ادا کی۔

خطبہ فتح

شاہنشاہی، اسلام کا یہ پہلا دربار عام تھا، خطبۂ سلطنت یعنی بارگاہِ احدیت کی تقریر خلافت الٰہی کے منصب سے رسول اللہ ﷺ نے ادا کی، جس کا خطاب صرف اہل مکہ سے نہیں، بلکہ تمام عالم سے تھا:

((لا اله الا الله وحده لا شريك له صدق وعده ونصر عبده وهزم الاحزاب وحده الا كل مأثرة اودم اومال يدعىٰ فهو تحت قدمي هاتين الا سدانة البيت وسقاية الحاج...... يا معشر قريش ان الله قد اذهب عنكم نخوة الجاهلية وتعظمها بالاباء، الناس من ادم وادم من تراب))

''ایک اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اس نے اپنا وعدہ سچا کیا،

❶ صحیح بخاری، ایضا: ٤٢٨٢ (صحیح بخاری فتح مکہ میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے جو روایت (۴۲۸۲) ہے اس میں تصریح ہے کہ حضور ﷺ نے یہ ارشاد فتح مکہ کے موقع پر کیا لیکن اس میں خیف کے قیام کا ذکر نہیں لیکن جو روایت (٤٢٨٤، ٤٢٨٥) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ یہ حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا اور اس میں خیف کی تصریح ہے ابن حجر نے یہ تطبیق کی ہے کہ ممکن ہے کہ دونوں موقعوں پر لوگوں کے سوال پر یہ ارشاد فرمایا ہو، فتح الباری، ج ۸، ص: ۱۳ و ج ۲، ص: ۳٦٠، (س)۔

❷ اس موقع پر اس پوری آیت کے پڑھنے کا ذکر ابن سعد فتح مکہ (ص:۹۹) میں ہے۔ صحیح بخاری فتح مکہ (۴۲۸۷) میں الفاظ آئے ہیں ﴿جاء الحق وزهق الباطل﴾ ﴿جاء الحق وما يبدئ الباطل وما يعيد﴾ یعنی ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا اور اب باطل پھر نہ آئے گا۔'' (س)۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب این رکز النبی ﷺ الرایة: ٤٢٨٨۔

❹ ابن سعد، جزء مغازی، ص: ۱۰۲۔

اس نے اپنے بندہ کی مدد کی اور تمام جتھوں کو تنہا توڑ دیا، ہاں تمام مفاخر تمام انتقامات خون ہائے قدیم، تمام خون بہا، سب میرے قدموں کے نیچے ہیں، صرف حرم کعبہ کی تولیت اور حجاج کی آب رسانی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اے قوم قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار اللہ نے مٹا دیا تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔''

پھر قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی: [1]

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾ (٤٩/ الحجرات:٢٠)

''لوگو! میں نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے کہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لئے جاؤ، لیکن اللہ کے نزدیک شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہو، اللہ دانا اور واقف کار ہے۔''

بخاری میں ہے کہ اس موقع پر آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ)) [2]

''اللہ اور اس کے رسول نے شراب کی خرید و فروخت حرام کر دی۔''

تمام عقائد اور اعمال کا اصل الاصول اور دعوت اسلام کا اصلی پیغام توحید ہے، اس لئے سب سے پہلے اسی سے ابتدا کی گئی۔

خطبہ کے اصولی مطالب

عرب میں دستور تھا کہ کوئی شخص کسی کو قتل کر دیتا تھا تو اس کے خون کا انتقام لینا خاندانی فرض قرار پا جاتا تھا، یعنی اگر اس وقت قاتل نہ ہاتھ آ سکا تو خاندانی دفتر میں مقتول کا نام لکھا جاتا اور سینکڑوں برس گزرنے کے بعد بھی انتقام کا فرض ادا کیا جاتا تھا، قاتل اگر مر چکا ہو تو اس کے خاندان یا قبیلے کے آدمی کو قتل کرتے تھے، اسی طرح خون بہا کا مطالبہ بھی اَبًا عَنْ جَدٍّ چلا آتا تھا، یہ خون کا انتقام عرب میں سب سے بڑے فخر کی بات تھی، اس طرح اور بہت سی لغو باتیں مفاخر قومی میں داخل ہو گئی تھیں، اسلام ان سب کے مٹانے کے لئے آیا تھا اور اس بنا پر آپ ﷺ نے (اس طریق) انتقام اور خون بہا اور نیز تمام غلط مفاخر کی نسبت فرمایا کہ ''میں نے ان کو پاؤں سے کچل دیا۔''

عرب اور تمام دنیا میں نسل اور قوم و خاندان کے امتیاز کی بنا پر ہر قوم میں فرق مراتب قائم کئے گئے تھے، جس طرح ہندوؤں نے چار ذاتیں قائم کیں اور شودر کو وہ درجہ دیا جو جانوروں کا درجہ ہے اور اس کے ساتھ یہ

---

[1] سیرت ابن ہشام، ج ٢، ص:٢٧٣۔ [2] کتاب المغازی، باب...: ٤٢٩٦۔

بندش کردی کہ وہ کبھی اپنے رتبہ سے ایک ذرہ آگے نہ بڑھنے پائیں۔ اسلام کا سب سے بڑا احسان جو اس نے تمام دنیا پر کیا، مساوات عام کا قائم کرنا تھا، یعنی عرب وعجم، شریف رزیل، شاہ وگدا، سب برابر ہیں۔ ہر شخص ترقی کر کے ہر انتہائی درجہ پر پہنچ سکتا ہے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے قرآن مجید کی آیت پڑھی اور پھر توضیح فرمائی کہ ''تم سب اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔''

خطبہ کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جباران قریش سامنے تھے، ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب سے پیشرو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ ﷺ پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ وسنان نے پیکر قدسی ﷺ کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت ﷺ کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی چیز سے بھی بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریت پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔

رحمت عالم ﷺ نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا: ''تم کو کچھ معلوم ہے، میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟''

یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے، لیکن مزاج شناس تھے، پکار اٹھے:

اخ کریم وابن اخ کریم۔

''تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے۔''

ارشاد ہوا:

((لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء)) ❶

''تم پر کچھ الزام نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔''

کفار مکہ نے تمام مہاجرین کے مکانات پر قبضہ کر لیا تھا، اب وہ وقت تھا کہ ان کو ان کے حقوق دلائے جاتے، لیکن آپ نے مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ بھی اپنی مملوکات سے دست بردار ہو جائیں۔

نماز کا وقت آیا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بام کعبہ پر چڑھ کر اذان دی، وہی سرکش جو ابھی رام ہو چکے تھے ان کی آتش غیرت پھر مشتعل تھی، عتاب بن اسید نے کہا: ''اللہ نے میرے باپ کی عزت رکھ لی کہ اس آواز کے سننے سے پہلے اس کو دنیا سے اٹھا لیا۔'' ❷ ایک اور سردار قریش نے کہا: ''اب جینا بے کار ہے۔'' ❸

مقامِ صفا میں آپ ایک بلند مقام پر بیٹھے، جو لوگ اسلام قبول کرنے آتے تھے آپ کے ہاتھ پر بیعت

❶ زرقانی، ج ۲، ص: ۳۹۱۔ ❷ ابن هشام، ج ۲، ص: ۲۷٤ (حضرت عتاب رضی اللہ عنہ بعد کو مسلمان ہوئے) (س)

❸ اصابہ تذکرۃ عتاب بن اسید، ج ۲، ص: ٤٥١۔

کرتے تھے، مردوں کی باری ہو چکی تو مستورات آئیں، عورتوں سے بیعت لینے کا یہ طریقہ تھا کہ ان سے ارکان اسلام اور محاسن اخلاق کا اقرار لیا جاتا تھا، پھر پانی کے ایک لبریز پیالہ میں آنحضرت ﷺ دست مبارک ڈبو کر نکال لیتے تھے ❶ آپ کے بعد عورتیں اسی پیالہ میں ہاتھ ڈالتی تھیں اور بیعت کا معاہدہ پختہ ہو جاتا تھا۔

ان مستورات میں ہند بھی آئی یہ وہی ہند ہے جو رئیس العرب عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہ کی ماں تھی، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اسی نے قتل کرایا تھا اور ان کا سینہ چاک کر کے کلیجہ چبا گئی تھی وہ نقاب پہن کر آئی، شریف عورتیں عموماً نقاب پہنتی تھیں لیکن اس وقت یہ غرض بھی تھی کہ کوئی اس کو پہچاننے نہ پائے، بیعت کے وقت اس نے (نہایت دلیری بلکہ گستاخی سے) باتیں کیں، جو حسب ذیل ہیں: ❷

رسول اللہ ﷺ	اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔
ہند	یہ اقرار آپ نے مردوں سے تو نہیں لیا لیکن بہر حال ہم کو منظور ہے۔
رسول اللہ ﷺ	چوری نہ کرنا۔
ہند	میں اپنے شوہر (ابوسفیان) کے مال میں سے دو چار آنے کبھی لے لیا کرتی ہوں معلوم نہیں یہ بھی جائز ہے یا نہیں؟
رسول اللہ ﷺ	اولاد کو قتل نہ کرنا۔
ہند	ربیناهم صغارًا وقتلتم کبارًا فانت وهم اعلم۔ ''ہم نے تو اپنے بچوں کو پالا تھا، بڑے ہوئے تو جنگ ❸ بدر میں آپ نے ان کو مار ڈالا، اب آپ اور وہ باہم سمجھ لیں۔''

رؤسائے عرب میں دس شخص تھے جو قریش کے سرتاج تھے، ان میں صفوان بن امیہ جدہ بھاگ گئے، عمیر بن وہب نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ رئیس عرب مکہ سے جلاوطن ہو جاتا ہے، آپ نے علامت امان کے طور پر اپنا عمامہ عنایت کیا، عمیر جدہ پہنچ کر ان کو واپس لائے حنین کے معرکہ تک یہ اسلام نہیں لائے ❹ (بعد کو مسلمان ہو گئے)۔

عبداللہ بن زبعریٰ عرب کے مشہور شاعر جو (پہلے) آنحضرت ﷺ کی ہجویں کہا کرتے تھے اور قرآن مجید پر نکتہ چینیاں کرتے تھے، نجران بھاگ گیا لیکن پھر آ کر اسلام لائے۔ ❺

ابوجہل کا بیٹا عکرمہ یمن چلا گیا لیکن اس کی حرم (ام حکیم) نے آنحضرت ﷺ سے امان لی اور جا کر یمن سے لائیں ❻ یہ واقعہ ابوجہل سے کہنے کے قابل نہیں کہ اس کا جگر بند کفر کی گود سے نکل کر اسلام کے

❶ طبری، ج ۳، ص: ١٦٤٤۔(س) ❷ طبری، ج۳، ص: ١٦٤٣ مختصراً (س)
❸ جنگ بدر میں ہند کے لڑکے کافروں کے ساتھ شریک ہو کر لڑے تھے اور لڑ کر مارے گئے تھے۔
❹ طبری، ج ۳، ص: ١٦٤٥ (س) واصابہ ذکر صفوان بن امیۃ، ج ۲، ص: ١٨٧۔(س)
❺ ابن ہشام، ج ۲، ص: ٢٧٧ (س) ❻ طبری، ج ۳، ص: ١٦٤٦، (س)

آغوش میں آ گیا اور اب ہم اس کو حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔

اشتہاریان قتل

ارباب سیر کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گو اہل مکہ کو امن عطا کیا تھا تاہم دس اشخاص [1] کی نسبت حکم دیا کہ جہاں ملیں قتل کر دیے جائیں، ان میں سے بعض مثلاً عبداللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ، خونی مجرم تھے اور قصاص میں قتل کئے گئے، لیکن متعدد ایسے تھے کہ ان کا صرف یہ جرم تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کو مکہ میں ستایا کرتے تھے یا آپ کی ہجو میں اشعار کہا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک عورت اس جرم پر قتل کی گئی کہ وہ آپ کے ہجو یہ اشعار گایا کرتی تھی۔

لیکن محدثانہ تنقید کی رو سے یہ بیان صحیح نہیں، اس جرم کا مجرم تو سارا مکہ تھا، کفار قریش میں سے (بجز دو چار کے) کون تھا جس نے آنحضرت ﷺ کو سخت سے سخت ایذائیں نہیں دیں بایں ہمہ انہیں لوگوں کو یہ مژدہ سنا دیا گیا کہ انتم الطلقاء جن لوگوں کا قتل بیان کیا جاتا ہے وہ تو نسبتاً کم درجہ کے مجرم تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت صحاح ستہ میں موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا، خیبر میں جس یہودی عورت نے آپ کو زہر دیا۔ اس کی نسبت لوگوں نے دریافت بھی کیا کہ اس کے قتل کا حکم ہو گا، ارشاد ہوا کہ ”نہیں“ خیبر کے کفرستان میں اک یہودیہ، زہر دے کر رحمت عالم کے طفیل سے جانبر ہو سکتی ہے، اس سے کم درجہ کے مجرم عفو نبوی سے کیونکر محروم رہ سکتے ہیں۔

اگر درایت پر قناعت نہ کی جائے تو روایت کے لحاظ سے بھی یہ واقعہ بالکل ناقابل اعتبار رہ جاتا ہے، صحیح بخاری میں صرف ابن خطل کا قتل مذکور ہے [2] اور یہ عموماً مسلّم ہے کہ وہ قصاص میں قتل کیا گیا۔ مقیس کا قتل بھی شرعی قصاص تھا۔ باقی جن لوگوں کی نسبت حکم قتل کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ کسی زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو ستایا کرتے تھے وہ روایتیں صرف ابن اسحاق تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں، یعنی اصول حدیث کی رو سے وہ روایت

---

[1] حافظ مغلطائی نے پندرہ نام مختلف حوالوں سے جمع کئے ہیں، جو خود محدثین کے نزدیک غیر محتاطانہ ہیں۔ عام ارباب سیرت نے دس شخصوں کے نام لیے ہیں، ابن اسحاق نے آٹھ نام گنائے ہیں، ابوداؤد اور دار قطنی کی روایت میں صرف چھ ہیں، بخاری میں صرف ابن خطل کا واقعہ مذکور ہے، اس سے ظاہر ہو گا کہ تحقیق کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا جاتا ہے اسی قدر تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔ عام روایت کی رو سے جن دس شخصوں کی سزائے موت کا اعلان کیا گیا تھا ان کا حال یہ ہے کہ وہ شدید مجرم تھے تاہم سات اشخاص خلوص سے ایمان لائے اور ان کو معافی دے دی گئی، صرف چار شخص قتل ہوئے تین مرد اور ایک عورت عبداللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ، حویرث بن نقیر اور قریبہ، ابن خطل کی لونڈی، ابن خطل اور ابن صبابہ دونوں خونی مجرم تھے، ابن خطل نے جو اسلام لا چکا تھا اپنے ایک مسلمان خادم کو قتل کر کے مرتد ہو گیا تھا، مقیس بن صبابہ کا واقعہ یہ ہے کہ اس کا ایک بھائی ایک انصاری کے ہاتھ سے غلطی سے مارا گیا، آنحضرت ﷺ نے اس کی دیت ادا کرا دی تھی، تاہم مقیس منافقانہ اسلام لایا اور غدر سے اس انصاری کو قتل کر دیا اور حویرث نے آنحضرت ﷺ کی دو صاحبزادیوں کے ساتھ جب وہ ہجرت کر رہی تھیں شرارت کی تھی اور ان دونوں کو اونٹوں سے گرا دینا چاہتا تھا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اس کو قتل کر دیا۔ قریبہ جو ابن خطل کی لونڈی تھی، مکہ کی ایک مغنیہ تھی جو آنحضرت ﷺ کی ہجو میں گیت گایا کرتی تھی۔ دیکھو زرقانی، ج ۲، ص: ۳٦۱ تا ۳٦٤ اور ابن هشام ذکر فتح مکه، ج ۲، ص: ۲۷۲۔ (س)

[2] بخاری، کتاب المغازی، باب این رکز النبی ﷺ الرایة ..... ٤٢٨٦۔ (س)۔

منقطع ہے جو قابل اعتبار نہیں، ابن اسحاق کا فی نفسہٖ جو درجہ ہے وہ ہم کتاب کے دیباچہ میں لکھ آئے ہیں۔

سب سے زیادہ معتبر روایت جو اس بارے میں پیش کی جاسکتی ہے ابوداؤد کی وہ روایت ہے جس میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا: ''چار اشخاص کو کہیں امن نہیں دیا جاسکتا۔'' ❶ لیکن ابوداؤد نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ اس روایت کی سند جیسی چاہیے مجھ کو نہیں ملی۔ ❷ پھر اس کے بعد ابن خطل کی روایت نقل کی ہے، (اور شروع میں جو روایت ہے) اس کا ایک راوی احمد بن المفضل ہے جس کو ازدی نے منکر الحدیث لکھا ہے اور ایک راوی اسباط بن نصر ہے جس کی نسبت نسائی کا قول ہے کہ ''قوی نہیں ہے۔'' اگرچہ اس قدر جرح کسی روایت کے نامعتبر ہونے کے لئے کافی نہیں لیکن واقع جس قدر اہم ہے۔ اس کے لحاظ سے راوی کی اس قدر جرح بھی روایت کے مشکوک ہونے کے لئے کافی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ بعض سرداران قریش جو مخالفین اسلام کے پیشرو تھے، آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کی خبر سن کر مکہ سے بھاگ گئے۔ لیکن یہ صرف ابن اسحاق کا قیاس ہے کہ وہ اس وجہ سے بھاگے تھے کہ ان کے قتل کا حکم دیا گیا تھا، ان اشتہاری مفرورین میں ابن اسحاق نے عکرمہ کو بھی شمار کیا ہے جو ابوجہل کے فرزند تھے۔ لیکن مؤطا امام مالک میں جس کی نسبت امام شافعی کا قول ہے کہ آسمان کے نیچے (قرآن کے

---

❶ ابو داود، كتاب الجهاد، باب قتل الاسير: ٢٦٨٤۔ ❷ ابوداؤد نے باب قتل الاسير میں اس معنی کی تین روایتیں درج کی ہیں۔ پہلی وہ روایت ہے جس کا ذکر مصنف نے اخیر میں کیا ہے۔ یہ روایت احمد بن المفضل، اسباط بن نصر، سدی کبیر، مصعب بن سعد اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ہے، اس میں چار مرد اور دو عورتوں کے قتل کا حکم مذکور ہے، جن میں سے ایک ابن ابی سرح ہے جس کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضور انور ﷺ کی رضا کے بغیر آپ کی خدمت میں لا کر پیش کیا اور اس کو کچھ دیر کے تامل کے بعد پناہ دی اور وہ مسلمان ہوا۔ (ابو داود، كتاب الجهاد، باب قتل الاسير: ٢٦٨٣) اس روایت میں احمد بن مفضل اور اسباط بن نصر اور سدی کبیر تینوں پر علمائے رجال نے جرحیں کی ہیں اور خصوصاً اسباط بن نصر پر اور زیادہ جرحیں ہیں، یہ روایت اسی سلسلہ سے نسائی نے باب قتل المرتد (۴۰۷۲) میں اور حاکم نے مستدرک کتاب المغازی (۴۶/۳) میں اس کو نقل کیا ہے۔ اس سلسلہ کے یہ تینوں راوی شیعہ ہیں اور حاکم نے مستدرک میں اس پہلو سے اپنا اظہار خیال کر دیا ہے۔ ابوداؤد کی دوسری روایت عمرو بن عثمان بن عبدالرحمان بن سعید مخزومی سے ہے کہ انہوں نے اپنے دادا سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے چار مردوں اور دو عورتوں کے بارہ میں فرمایا کہ ان کو پناہ نہیں دی جاسکتی۔ ان دو عورتوں میں سے جو دونوں مغنیہ لونڈیاں تھیں ایک مسلمان ہوگئی اور ایک قتل کی گئی۔ (رقم الحدیث: ۲۶۸۴) اس روایت کے متعلق ابوداؤد نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے شیخ ابوالعلاء سے اس کی سند اچھی طرح سمجھی نہیں، یہی روایت اسی سلسلہ سے دارقطنی اواخر کتاب الحج (۳۰۰/۲) میں ہے۔ اس میں سند کے آخر میں یوں ہے۔ عمرو بن عثمان نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے یہ روایت سنی۔ اس سے ظاہر ہے کہ سند کے اسی حصہ میں ابوداؤد کو شک ہے۔ ابوداؤد کی تیسری روایت (۲۶۸۵) میں صرف ابن خطل کے قتل کا ذکر ہے جو صحیح بخاری کی روایت سے بھی ثابت ہے، بیہقی نے حکم بن عبدالملک، قتادہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ایک روایت کی ہے جس میں تین مرد اور ایک عورت یعنی چار اشخاص کے قتل کا حکم ہے، تین مرد یہ ہیں، ابن خطل، مقیس بن صبابہ اور عبداللہ بن سعد، ابن ابی سرح اور عورت کا نام ام سارہ تھا۔ عبداللہ بن سعد کے قتل کی ایک انصاری نے نذر مانی تھی مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سفارش سے ان کی جان بخشی ہوئی اور ام سارہ وہی عورت ہے جو فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں کے مکہ پر حملہ کرنے کا خط خفیہ لے کر چلی تھی۔ اس روایت میں حکم بن عبدالملک مطلقاً ناقابل اعتبار ہے اور اس کی اس روایت کو عقیلی نے لکھا ہے کہ کوئی تاکید اس کے رفقا میں سے کسی نے نہیں کی ہے۔ تہذیب ابن حجر، ج ۲، ص: ۴۳۱، ۴۳۲، (س)

علاوہ) کوئی کتاب اس سے زیادہ صحیح نہیں۔ یہ واقعہ جس طرح منقول ہے اس کا لفظی ترجمہ حسب ذیل ہے:

''حارث بن ہشام کی صاحبزادی ام حکیم عکرمہ بن ابی جہل کی زوجہ تھیں، وہ فتح مکہ کے دن اسلام لائیں۔ لیکن ان کے شوہر عکرمہ بن ابو جہل اسلام سے بھاگ کر یمن چلے گئے، ام حکیم یمن گئیں اور ان کو اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گئے اور مکہ میں آئے، آنحضرت ﷺ نے جب ان کو دیکھا تو فرط مسرت سے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اس تیزی سے ان کی طرف بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی پھر ان سے بیعت لی۔'' [1]

یہ بات بھی اس موقع پر خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ جن لوگوں کو امن دیا جاتا تھا وہ اسلام پر مجبور نہیں کیے جاتے تھے۔ تمام مؤرخین اور ارباب سیر نے تصریح کی ہے کہ حنین کی لڑائی میں جو فتح مکہ کے بعد پیش آئی لشکر اسلام میں مکہ کے بہت سے کفار بھی شامل تھے جو اس وقت تک کافر تھے اور شکست بھی زیادہ تر اسی وجہ سے ہوئی کہ پہلے حملے میں انہی کافروں کے قدم اکھڑے اور اس ابتری کی وجہ سے مسلمانوں کے قدم بھی نہ ٹھہر سکے۔ [2]

خزائن حرم

حرم میں نذور اور ہدایا کا خزانہ ایک مدت سے جمع ہوتا چلا آتا تھا وہ محفوظ رکھا گیا، لیکن مجسمہ جات اور تصویریں برباد کر دی گئیں، ان میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے مجسمے بھی تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر بھی تھی [3] جس سے لوگوں نے قیاس کیا کہ کسی زمانہ میں عیسائیت کا اثر زیادہ غالب ہو گیا تھا، رنگین تصویریں جو دیواروں پر تھیں مٹانے پر بھی ان کے دھندلے نشان رہ گئے تھے اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی تعمیر تک باقی رہے۔ [4]

مکہ معظمہ میں آنحضرت ﷺ کا قیام پندرہ دن تک رہا، جب یہاں سے روانہ ہوئے تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اس خدمت پر مقرر کرتے گئے کہ لوگوں کو اسلام کے مسائل اور احکام سکھائیں۔

فتح مکہ اور بت شکنی

فتح مکہ کا اصلی مقصد اشاعتِ توحید اور اعلائے کلمۃ اللہ تھا، کعبہ میں سینکڑوں بت تھے جن میں ہبل بھی تھا جو بت پرستوں کا خدائے اعظم تھا، یہ انسان کی صورت کا تھا اور یاقوت احمر سے بنا تھا۔ سب سے پہلے جس نے

---

[1] مؤطا امام مالك، كتاب النكاح باب نكاح المشرك اذا اسلمت زوجته قبله، رقم الأثر: ١١٥٦۔

[2] مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحقیق عام اور مشہور روایت کے برعکس ہے۔ مؤرخین کی تصریح یہ ہے کہ مکہ کے جو لوگ حنین کے موقع پر لشکرِ اسلام میں شامل ہوئے تھے وہ مسلم تھے البتہ ابھی ان میں پختگی نہیں پیدا ہوئی تھی۔

[3] فتح الباری، ذكر فتح مكة۔

[4] فتح الباری، ذكر فتح مكہ (اخبار مکہ ازرقی میں بہ تفصیل یہ واقعات مذکور ہیں)۔

اس کو کعبہ میں لا کر رکھا تھا، خزیمہ بن مدرکہ تھا جو مضر کا پوتا اور عدنان کا پڑپوتا تھا، ہبل کے سامنے سات تیر رہتے تھے جن پر ''لا'' ، ''و نعم'' لکھا ہوا تھا، عرب جب کوئی کام کرنا چاہتے تھے تو ان تیروں پر قرعہ ڈالتے اور ''ہاں'' یا ''ناں'' جو کچھ نکلتا اس پر عمل کرتے [1] جنگ احد میں ابوسفیان نے اسی ہبل کی جے پکاری، وہ عین کعبہ کے اندر تھا چنانچہ جب آنحضرت ﷺ کعبہ میں داخل ہوئے تو اور بتوں کے ساتھ وہ بھی برباد کر دیا گیا۔ مکہ کے اطراف میں اور بہت سے بڑے بڑے بت تھے جن کے لئے حج کی رسمیں ادا کی جاتی تھیں، ان میں سے سب سے بڑا لات، مناۃ اور عزیٰ تھے، عزیٰ قریش کا اور لات اہل طائف کا معبود تھا، مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر نخلہ ایک مقام ہے، عزیٰ یہیں منصوب تھا، بنوشیبان اس کے متولی تھے، اہل عرب کا اعتقاد تھا کہ اللہ جاڑوں میں ''لات'' کے ہاں اور گرمیوں میں ''عزیٰ'' کے ہاں بسر کرتا ہے، عزیٰ کے سامنے عرب وہ تمام مناسک اور رسوم بجالاتے تھے جو کعبہ میں بجالاتے تھے، اس کا طواف کرتے اور اس پر قربانیاں چڑھاتے۔ [2]

مناۃ کا تخت گاہ مشلل تھا، جو قدید کے پاس مدینہ منورہ سے سات میل ادھر ہے، وہ ایک بن گھڑا پتھر تھا، ازد، غسان، اوس اور خزرج اس کا حج کرتے تھے، عمرو بن لحی نے جو اصنام قائم کئے تھے یہ ان سب میں بالاتر تھا اوس اور خزرج جب کعبہ کا حج کرتے تو احرام اتارنے کی رسم (بال منڈانا) اسی کے پاس آ کر ادا کرتے تھے۔ [3]

قبیلہ ہذیل کا بت سواع تھا، جو ینبع کے اطراف رہاط میں تھا، یہ ایک پتھر تھا، اس کے متولی بنولحیان تھے۔

بت پرستی کے یہ وہ طلسم تھے جن میں سارا عرب گرفتار تھا، اب ان کی بربادی کا وقت آ چکا تھا اور دفعتہ ہر جگہ خاک اڑنے لگی۔

---

[1] معجم البلدان، ذکر ہبل بحوالہ ہشام بن محمد کلبی۔

[2] یہ تمام تفصیل زرقانی، ج ۲، ص: ۴۰۰ میں ہے۔ [3] معجم البلدان، ذکر مناۃ۔

ہوازن وثقیف

غزوۂ حنین، اوطاس طائف

شوال ۸ھ

﴿ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ ﴾ (۹/ التوبة:۲۵)

حنین

حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے۔ ذوالمجاز عرب کا مشہور بازار اور عرفہ سے تین میل ہے [1] اور یہ اس کے دامن میں ہے۔ اس مقام کو اوطاس [2] بھی کہتے ہیں، ہوازن ایک بڑے قبیلہ کا نام ہے جس کی بہت سی شاخیں ہیں۔

اسلام کی فتوحات کا دائرہ گو وسیع ہوتا جاتا تھا لیکن اہل عرب یہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا قبلۂ اعظم یعنی مکہ اب تک محفوظ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ محمد ﷺ اگر قریش پر غالب آ گئے اور مکہ فتح ہو گیا تو بے شبہ وہ سچے پیغمبر ہیں، مکہ جب فتح ہوا تو تمام قبائل نے خود پیش قدمی کی اور اسلام قبول کرنا شروع کیا [3] لیکن ہوازن اور ثقیف پر اس کا الٹا اثر پڑا، یہ قبیلے نہایت جنگجو اور فنون جنگ سے واقف تھے، اسلام کو جس قدر غلبہ ہوتا جاتا تھا، یہ زیادہ مضطرب ہوتے تھے۔ [4] کہ ان کی ریاست اور امتیاز کا خاتمہ ہوا جاتا ہے۔ اس بنا پر فتح مکہ (کے بعد) ہوازن اور ثقیف کے روسا نے یہ سمجھ لیا کہ اب ان کی باری ہے اس لئے انہوں نے ایک دوسرے سے مل کر مشورہ کیا اور تمام قبائل عرب سے قرارداد ہو گئی کہ مسلمانوں کے خلاف جو اس وقت مکہ میں جمع ہیں ایک عام حملہ کیا جائے، مکہ فتح ہوا تو ان کو یقین ہو گیا کہ اب جلد تدارک نہ کیا گیا تو پھر کوئی طاقت اسلام کو زیر نہ کر سکے گی۔

آنحضرت ﷺ کی روانگی کے وقت ان کو یہ غلط خبر پہنچی تھی کہ حملہ کا رخ انہی کی طرف ہے اس لئے اب انتظار کی حاجت بھی نہ تھی، دفعتاً بڑے زور وشور کے ساتھ خود حملہ کے لئے بڑھے، جوش کا یہ عالم تھا کہ ہر قبیلہ تمام اہل وعیال لیکر آیا تھا کہ بچے اور عورتیں ساتھ ہونگی تو ان کی حفاظت کی غرض سے لوگ جانیں دے دیں گے۔

اس معرکہ میں اگرچہ ثقیف اور ہوازن کی تمام شاخیں شریک تھیں تاہم کعب اور کلاب الگ رہے، فوج

---

[1] (یہاں مصنف کی عبارت میں کچھ اغلاق ہے، مطلب یہ ہے کہ حنین زرقانی کی تصریح کے مطابق مکہ اور طائف کے درمیان عرب کے مشہور بازار ذوالمجاز کے پاس ہے جو عرفہ سے تین میل ہے۔ لیکن ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ یہ مکہ سے تین دن کے سفر کی مسافت پر واقع ہے)۔ (س) [2] قاضی عیاض کی یہی رائے ہے لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن اسحاق کی تصریح کے مطابق یہ حنین کے علاوہ دیار ہوازن میں دوسری وادی کا نام ہے۔ فتح الباری وزرقانی ذکر غزوة هوازن واوطاس ، (س)۔

[3] صحيح بخاری ، كتاب المغازی: ۴۳۰۲۔ [4] مارگولیتھ صاحب لکھتے ہیں: ''حکومت اسلامی کی وسعت اور استحکام سے بدوی قبائل جن کو ریگستان کی آزادی بہت عزیز تھی نہایت خائف تھے۔''

کی سرداری کے لئے انتخاب تو مالک بن عوف ❶ کا کیا گیا جو قبیلۂ ہوازن کا رئیس اعظم تھا۔ (لیکن مشیر کی حیثیت سے) درید بن الصمہ (کو بھی ساتھ لے لیا گیا جو) عرب کا مشہور شاعر اور قبیلہ جشم کا سردار تھا اس کی شاعری اور بہادری کے معرکے اب تک عرب کی تاریخ میں یادگار ہیں لیکن اس کی عمر سو برس سے زیادہ ہو چکی تھی اور صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا، چونکہ پورا عرب اس کو مانتا تھا اسے اور اس کی رائے و تدبیر پر تمام ملک کو اعتماد تھا، خود مالک بن عوف نے اس سے شرکت کی درخواست کی، پلنگ پر اٹھا کر اس کو میدان جنگ میں لائے، اس نے پوچھا کہ یہ کونسا مقام ہے، لوگوں نے کہا: اوطاس بولا "ہاں یہ مقام جنگ کے لئے موزوں ہے، اس کی زمین نہ بہت سخت ہے، نہ اس قدر نرم کہ پاؤں دھنس جائیں۔" پھر پوچھا کہ "یہ بچوں کے رونے کی آوازیں کیسی آ رہی ہیں۔" لوگوں نے کہا کہ بچے اور عورتیں ساتھ آئی ہیں کہ کوئی شخص پاؤں پیچھے نہ ہٹائے۔ بولا کہ "جب پاؤں اکھڑ جاتے ہیں تو کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ میدان جنگ میں صرف تلوار کام دیتی ہے۔ بدقسمتی سے اگر شکست ہوئی تو عورتوں کی وجہ سے اور بھی ذلت ہوگی۔" پھر پوچھا کہ "کعب اور کلاب بھی شریک ہیں یا نہیں؟" اور جب یہ معلوم ہوا کہ ان معزز قبیلوں کا ایک شخص بھی میدان جنگ میں نہیں تو کہا: "اگر آج کا دن عزت و شرف کا دن ہوتا تو کعب و کلاب غیر حاضر نہ ہوتے۔" اس کی رائے تھی کہ میدان سے ہٹ کر کسی محفوظ مقام میں فوجیں جمع کی جائیں اور وہیں اعلان جنگ کیا جائے۔ لیکن مالک بن عوف نے جو تیس سالہ نوجوان تھا جوش شباب میں اس رائے کو قبول کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ آپ خرف ہو چکے، آپ کی عقل بے کار ہو چکی۔ ❷

رسول اللہ ﷺ کو (مکہ میں) ان واقعات کی خبر پہنچی تو آپ نے تصدیق کے لئے حضرت عبداللہ بن ابی حدرد رضی اللہ عنہ کو بھیجا، وہ جاسوس بن کر حنین میں آئے اور کئی دن تک فوج میں رہ کر تمام حالات تحقیق کئے۔ آنحضرت ﷺ نے مجبوراً مقابلہ کی تیاریاں کیں، رسد اور سامان جنگ کے لئے قرض کی ضرورت پیش آئی، عبداللہ بن ربیعہ، جو ابوجہل کے بے مات بھائی تھے، نہایت دولت مند تھے، ان سے تیس ہزار درہم قرض لئے، ❸ صفوان بن امیہ جو مکہ کا رئیس اعظم اور مہمان نوازی میں مشہور تھا، لیکن اب تک اسلام نہیں لایا تھا، اس سے آنحضرت ﷺ نے اسلحہ جنگ مستعار مانگے، اس نے سو زرہیں اور ان کے لوازمات پیش کئے۔ ❹

شوال ۸ ہجری مطابق جنوری و فروری ۶۳۰ء اسلامی فوجیں جن کی تعداد بارہ ہزار تھی، اس سر و سامان سے حنین پر بڑھیں کہ (بعض) صحابہ رضی اللہ عنہم کی زبان سے بے اختیار یہ لفظ نکل گیا کہ "آج ہم پر کون غالب

❶ مالک بن عوف رضی اللہ عنہ غزوہ طائف کے بعد مسلمان ہو گئے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جنگ قادسیہ میں شریک اور دمشق کے حاکم ہوئے (زرقانی، ج ۳، ص: ۶) (س)۔ ❷ یہ تمام تفصیل طبری میں ہے، ج ۳، ص: ۱۶۵۵ تا ۱۶۷۰۔ (س)

❸ مسند ابن حنبل، ج ۴، ص: ۳۶، اصابہ میں امام بخاری سے بھی یہ روایت نقل کی ہے، لیکن اس میں دس ہزار کی تعداد ہے۔

❹ موطا، کتاب النكاح، باب نكاح المشرك اذا اسلمت زوجته قبله: ١١٥٤۔ میں ہے کہ جب آپ نے اس سے ہتھیار مانگے تو اس نے کہا جبراً یا طوعاً (یعنی جبراً مانگتے ہو تو میں نہیں دیتا) آپ ﷺ نے فرمایا: "جبراً نہیں طوعاً۔" (ابو داود، باب الضمانة: ٣٥٦٢ میں بھی اسی قسم کی روایت ہے)

آ سکتا ہے؟'' لیکن بارگاہِ ایزدی میں یہ نازش پسند نہ تھی۔

﴿ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ۝ ثُمَّ أَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۲۵)

''اور حنین کا دن یاد کرو، جب تم اپنی کثرت پر نازاں تھے، لیکن وہ کچھ کام نہ آئی اور زمین باوجود وسعت کے تنگی کرنے لگی، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے، پھر اللہ نے اپنے رسول (ﷺ) پر اور مسلمانوں پر تسلی نازل کی اور ایسی فوجیں بھیجیں جو تم نے نہیں دیکھیں اور کافروں کو عذاب دیا اور کافروں کی یہی سزا ہے۔''

فتح کے بجائے وہلۂ اول میں مطلع صاف تھا رسول اللہ ﷺ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو رفقائے خاص میں سے بھی کوئی پہلو میں نہ تھا۔ ❶ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ جو شریک جنگ تھے ان کا بیان ہے کہ جب لوگ بھاگ

---

❶ لیکن اور روایتوں میں چند اصحاب کا ثابت قدم رہنا مذکور ہے۔ ان دونوں روایتوں کی تطبیق یہ ہے کہ یہ دو مختلف وقفوں کے حالات ہیں، راوی نے اپنا مشاہدہ لکھا ہے، تفصیل آگے آئے گی مصنف نے آیندہ تفصیل کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہیں ہو سکا ہے اس لئے تفصیل کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں چند باتیں قابل تشریح ہیں:

(ا) پہلی یہ کہ مصنف نے اول وہلہ میں مسلمانوں کی شکست تسلیم کی ہے، یہ ابن اسحاق وغیرہ اہل سیر کی رائے ہے لیکن صحیح حدیث کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو پہلے کامیابی ہوئی لوگ غنیمت پر ٹوٹ پڑے دشمن کے تیر اندازوں نے موقع پا کر تیر اندازی شروع کر دی جس سے مسلمانوں کی صفوں میں بے ترتیبی، انتشار اور پراگندگی پیدا ہوگئی۔ بخاری میں حضرت براء رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں:

وانا لما حملنا عليهم انكشفوا فاكببنا على الغنائم فاستقبلنا بالسهام۔ (بخاری، کتاب المغازی، باب قول الله تعالى ويوم حنين اذ :۴۳۱۷)

''اور ہم نے جب ان پر حملہ کیا تو وہ شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے تو ہم لوگ مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے تو انہوں نے ہم کو تیروں پر دھر لیا۔''

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ شکست کے ظاہری اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس جنگ میں کچھ لوگ محض اس غرض ہی سے شریک ہوئے تھے کہ مسلمانوں کو عین جنگ میں دھوکہ دیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے جو اس جنگ میں شریک تھیں حضور انور ﷺ سے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! ان طلقاء کو قتل کر دیجئے انہی کی وجہ سے شکست ہوئی ہے الفاظ یہ ہیں:

اقتل من بعد نا من الطلقاء انهزموا بك۔ (کتاب الجهاد، باب غزوة النساء مع الرجال:۴۶۸۰)

''ہمارے سوا ان طلقاء کو قتل کر دیجئے ان ہی نے آپ ﷺ کو شکست دلوائی۔''

امام نووی رحمہ اللہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

لم يحصل الفرار من جميعهم وانما فتحه عليهم من فى قلبه مرض من مسلمى اهل مكة المؤلفة ومشركيها الذين لم يكونوا اسلموا وانما كانت هزيمتهم فجاءة لا نصبابهم عليهم دفعة واحدة ورشقهم بالسهام ولا ختلاط اهل مكة معهم ممن لم يستقر الايمان فى قلبه وممن يتربص بالمسلمين الدوائر وفيهم نساء وصبيان خرجوا للغنيمة۔ (غزوة حنين)

''سب لوگ نہیں بھاگے تھے بلکہ مکہ کے مؤلفۃ القلوب میں جو منافق تھے اور مکہ کے مشرکین (جو اس جنگ میں شریک ہو گئے تھے اور جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) انہوں نے بھاگنا شروع کیا تھا اور یہ ناگہانی ہزیمت اس وجہ سے ہوئی کہ دشمنوں نے ایک ساتھ تیروں کی بارش شروع کر دی تھی اور فوج میں ایسے اہل مکہ بھی تھے جن کے دلوں میں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نکلے تو میں نے ایک کافر کو دیکھا کہ ایک مسلمان کے سینہ پر سوار ہے، میں نے عقب سے اس کے شانہ پر تلوار

(۞۞ گزشتہ سے پیوستہ) ایمان راسخ نہیں ہوا تھا اور مسلمانوں پر مصائب کے منتظر تھے، اس میں عورتیں اور بچے بھی تھے جو غنیمت کے لئے آئے تھے۔''

مؤرخ طبری نے اس موقع پر مکہ کے ان طلقاء کی زبان سے جو فقرے نقل کئے ہیں وہ بھی اسی راز کی پردہ کشائی کرتے ہیں کہ اہل مکہ اس جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ دل سے نہ تھے (ج ۳ ص: ۱۶۶۰ لائیڈن) متقدم مفسروں میں سے ابن جریر طبری نے لکھا ہے: ان الطلقاء انجفلوا یومئذ بالناس وجلوا عن النبی ﷺ۔ (ابن جریر، طبری، ج ۱۰، ص: ٦٢) عہد متوسط کے مفسروں میں سے ابوحیان اندلسی کے الفاظ یہ ہیں:

يقال ان الطلقاء من اهل مكة فروا وقصدوا القاء الهزيمة فى المسلمين۔ (بحر المحيط، ج ٥، ص: ٢٤)

''کہا جاتا ہے کہ مکہ کے طلقاء بھاگ گئے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو شکست ہو جائے۔''

متاخر مفسروں میں سے صاحب روح المعانی نے تفسیر سورۂ توبہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں:

وكان اول من انهزم الطلقاء مكرًا منهم وكان ذلك سببًا لوقوع الخلل وهزيمة غيرهم۔ (ج ١٠، ص:٦٦)

''سب سے پہلے طلقاء مکروفریب سے شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے اس سے مسلمانوں میں بے ترتیبی اور پسپائی کی صورت پیدا ہوئی۔''

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ پسپائی کے وقت آنحضرت ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت ثابت قدم رہی۔

اس سلسلہ میں بنائے اشتباہ بخاری (۴۳۳۷) کی حضرت انس رضی اللہ عنہ والی روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

فادبروا عنه حتى بقى وحده۔ ''لوگ پیچھے ہٹ گئے یہاں تک کہ آپ ﷺ تنہا رہ گئے۔''

مصنف نے ان الفاظ کو اپنے پیش نظر رکھا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جس جگہ رسول اللہ ﷺ تھے وہاں کوئی نہ تھا، اسی روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب حضرت رسول کریم ﷺ نے انصار کو آواز دی تو انصار نے یہ الفاظ کہے: لبيك يا رسول الله ابشر نحن معك۔ ''ہم حاضر ہیں یا رسول اللہ ﷺ آپ خوش ہیں کہ ہم آپ ﷺ کے پاس رہیں۔'' اسی باب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت اس سے پہلے ہے جس میں انصار کے الفاظ یہ ہیں:

لبيك يا رسول الله وسعديك نحن بين يديك۔ (بخاری، غزوة طائف: ٤٣٣٣)

''ہم حاضر ہیں یا رسول اللہ ﷺ! آپ خوش ہیں کہ ہم آپ ﷺ کے سامنے ہیں۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حضور ﷺ کی تنہائی اور رفقائے خاص کے پاس رہنے کی تطبیق ان الفاظ میں کی ہے:

ويجمع بين قوله حتى بقى وحده وبين الاخبار الدالة على انه بقى معه جماعة بان المراد بقى وحده متقدما مقبلا على العدو والذين ثبتوا معه كانوا وراءه۔ (ج ٨ ص: ٢٤ مصر)

''اور اس قول میں کہ حضور ﷺ تنہا رہ گئے اور ان واقعات میں جو اس پر دال ہیں کہ حضور کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت تھی تطبیق یہ ہے کہ حضور ﷺ دشمن کے سامنے سب سے آگے مقام میں تھے اور جو آپ ﷺ کے ساتھ ثابت قدم تھے وہ آپ ﷺ کے پیچھے تھے۔''

دوسرے یہ کہ بخاری ہی میں حضرت براء رضی اللہ عنہ کی جو روایت ہے اس میں حضرت براء رضی اللہ عنہ تصریح کرتے ہیں ابوسفیان بن حارث اس وقت حضرت رسول اللہ ﷺ کے پاس موجود تھے اور آپ کی سواری کی لگام تھامے تھے۔ (غزوۂ حنین، بخاری: ۴۳۱۵)

مسلم میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے پرزور الفاظ یہ ہیں کہ ''میں نے اور ابوسفیان بن حارث نے حضور ﷺ سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔

فلزمت انا وابو سفيان بن الحارث بن عبدالمطلب رسول الله ﷺ فلم نفارقه۔ (مسلم، كتاب الجهاد، باب غزوة حنين: ٤٦١٢)

صحیحین کی ان روایات کے سوا روایات ذیل بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے:

(۱) ابن ابی شیبہ کی ایک مرسل روایت میں جو حکم بن عتیبہ سے مروی ہے، چار آدمیوں کا حضور ﷺ کی خدمت میں باقی رہنا بتایا گیا ہے۔ (فتح الباری ج ۸ ص: ۲۳) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ۞۞)

دے ماری جو زرہ کو کاٹ کر اندر اتر گئی۔ اس نے مڑ کر مجھ کو اس زور سے دبوچا کہ میری جان پر بن گئی، لیکن پھر وہ ٹھنڈا ہو کر گر پڑا، اسی اثنا میں میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا، پوچھا کہ مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ بولے کہ قضائے الٰہی یہی تھی۔ ❶

شکست کے مختلف اسباب تھے، مقدمۃ الجیش میں جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی افسری میں تھا زیادہ تر فتح مکہ کے جدید الاسلام نوجوان تھے۔ وہ جوانی کے غرور میں اسلحہ جنگ پہن کر بھی نہیں آئے تھے۔ ❷ فوج میں دو ہزار طلقاء یعنی وہ لوگ تھے جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے۔ ❸ ہوازن قدر اندازی میں تمام عرب میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، میدان جنگ میں ان کا ایک تیر بھی خالی نہیں جاتا تھا۔ ❹ کفار نے معرکہ گاہ میں پہلے پہنچ کر مناسب مقامات پر قبضہ کر لیا تھا اور تیر اندازوں کے دستے پہاڑ کی گھاٹیوں، کھوؤں اور دروں میں جا بجا جما دیے تھے، فوج اسلام نے صبح کے وقت جب خوب اجالا بھی نہیں ہوا تھا حملہ کیا، میدان جنگ اس قدر نشیب میں تھا کہ پاؤں جم نہیں سکتے تھے، حملہ آوروں کا بڑھنا تھا کہ سامنے سے ہزاروں فوجیں ٹوٹ پڑیں، ادھر کمین گاہوں سے قدر اندازوں کے دستے نکل آئے اور تیروں کا مینہ برسا دیا، مقدمۃ الجیش ابتری کے ساتھ بے قابو ہو کر پیچھے ہٹا اور پھر تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ (فادبروا عنه حتى بقي

(۞۞ گزشتہ سے پیوستہ) (۲) ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس دن حضور ﷺ کے ہمراہ سو آدمی نہیں باقی رہ گئے تھے۔ (ترمذی، ابواب الجهاد، باب ما جاء فی الثبات عند القتال: ١٦٨٩)

(۳) مسند احمد، (ج ۱ ص: ۴۵۳) و حاکم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس دن حضور ﷺ کے ہمراہ اسی آدمی باقی رہ گئے تھے۔ (فتح الباری، ج ۸ ص: ۲۳)

(۴) بیہقی نے حارثہ بن نعمان سے روایت کیا ہے کہ سو آدمی باقی رہ گئے تھے۔ (زرقانی، ج ۳ ص: ۲۲) ابونعیم نے دلائل میں سو کی تفصیل بتائی ہے کہ تیس سے کچھ زائد مہاجرین تھے بقیہ انصار تھے۔ (فتح الباری، ج ۸ ص: ۲۳)۔

(۵) ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حضور ﷺ کے پاس اس وقت مہاجرین انصار اور اہل بیت میں سے حسب ذیل اصحاب رضی اللہ عنہم موجود تھے: حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عباس بن عبد المطلب، حضرت ابوسفیان بن حارث، حضرت جعفر بن ابی سفیان بن حارث، حضرت فضل بن عباس، حضرت ربیعہ بن حارث، حضرت اسامہ بن زید، حضرت ایمن بن ام ایمن رضی اللہ عنہم۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے الفاظ بقی وحدہ اپنے ظاہری معنی پر باقی نہیں رہ سکتے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ آگے اور بقیہ لوگ پیچھے تھے لیکن اس کی صاف توجیہ یہ ہے کہ ان الفاظ سے ثابت قدم رہنے والوں کی کمی کا ظاہر کرنا مقصود ہے ورنہ حقیقت یہ نہ تھی۔ دوسری روایت میں ثابت قدم رہنے والوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں۔ (ملاحظہ ہو زرقانی، ج ۳ ص: ۲۲) لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ حضرت سرور کونین ﷺ کے آس پاس تھے اور تھوڑی تھوڑی تعداد میں حضور ﷺ کے پاس پہنچنے لگے یہاں تک کہ خاصی جماعت حضور ﷺ کے گرد جمع ہو گئی اسی وجہ سے مختلف لوگوں نے مختلف تعداد بتلائی ہے۔ (س) ❶ صحيح بخاري، كتاب المغازي، باب قول الله تعالىٰ ويوم حنين اذ...: ٤٣٢١، ٤٣٢٢۔ (س) ❷ بخاري، كتاب الجهاد، باب من صف اصحابه عندالهزيمة و نزل عن دابته: ٢٩٣٠ (س)۔ ❸ مصنف کا یہ فقرہ واضح نہیں ہے مقصود یہ ہے کہ گو وہ کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو چکے تھے جیسا کہ عمدة القاري، ج٨، ص: ٣٥٩ مصر اور شرح مسلم نووي غزوة النساء مع الرجال (٤٦٨٠) میں ہے لیکن ہنوز وہ تازہ مسلمان تھے راسخ الاسلام نہیں ہوئے تھے اس لئے مہاجرین و انصار جیسا استقلال و ثبات ان میں اس وقت تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ (س)۔ ❹ بخاري، كتاب الجهاد، باب من صف اصحابه...: ٢٩٣٠ (س)

وحدہ) ❶ یعنی ’’سب لوگ ٹل گئے اور آنحضرت ﷺ اکیلے رہ گئے۔‘‘

تیروں کا مینہ برس رہا تھا۔ بارہ ہزار فوجیں ہوا ہو گئی تھیں لیکن ایک پیکر مقدس پابرجا تھا جو تنہا ایک فوج، ایک ملک، ایک اقلیم، ایک عالم، بلکہ مجموعۂ کائنات تھا۔

آنحضرت ﷺ نے داہنی جانب دیکھا اور پکارا: ((یا معشر الانصار!)) آواز کے ساتھ صدا آئی ’’ہم حاضر ہیں‘‘ پھر آپ نے بائیں جانب مڑ کر پکارا، اب بھی وہی آواز آئی، آپ سواری سے اتر پڑے اور جلال نبوت کے لہجہ میں فرمایا: ’’میں اللہ کا نبی اور اس کا پیغمبر ہوں۔‘‘ ❷

بخاری کی دوسری روایت میں ہے: ❸

انــــا الــنـبـــی لا کــذب	انــا ابــن عبــدالــمـطـلـب
’’میں پیغمبر ہوں، یہ جھوٹ نہیں ہے۔	میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔‘‘

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نہایت بلند آواز تھے، آپ نے ان کو حکم دیا کہ مہاجرین اور انصار کو آواز دو، انہوں نے نعرہ مارا: ❹

یامعشر الانصار	’’او گروہِ انصار!‘‘
یااصحاب الشجرۃ	اے اصحاب الشجرۃ! (بیعت رضوان والے)

اس پر اثر آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ تمام فوج دفعتہً پلٹ پڑی، جن لوگوں کے گھوڑے کشمکش اور گھمسان کی وجہ سے مڑ نہ سکے انہوں نے زرہیں پھینک دیں اور گھوڑوں سے کود پڑے، دفعتہً لڑائی کا رنگ بدل گیا، کفار بھاگ نکلے اور جو رہ گئے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں، بنو مالک (ثقیف کی ایک شاخ تھی) جم کر لڑے لیکن ان کے ستر آدمی مارے گئے اور جب ان کا علمبردار عثمان بن عبداللہ مارا گیا تو وہ بھی ثابت قدم نہ رہ سکے۔

شکست خوردہ فوج ٹوٹ پھوٹ کر کچھ اوطاس میں جمع ہوئی اور کچھ طائف میں جا کر پناہ گزین ہوئی جس کے ساتھ سپہ سالار لشکر مالک بن عوف بھی تھا۔ ❺

اوطاس

درید بن الصمۃ کئی ہزار کی جمعیت لیکر اوطاس میں آیا۔ آنحضرت ﷺ نے (ابو عامر اشعری کے ماتحت) تھوڑی سی فوج اس کے استیصال کے لئے بھیج دی (حضرت ابو عامر رضی اللہ عنہ، درید کے بیٹے کے ہاتھ سے مارے گئے اور علم اسلام اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر حملہ کیا، دشمن کو قتل کر کے علم اس کے ہاتھ سے چھین لیا) ❻ درید ایک شتر پر ہودج میں سوار تھا، ربیعہ رضی اللہ عنہ

❶ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الطائف: ٤٣٣٧۔

❷ ایضًا۔ ❸ ایضًا، باب قول اللہ تعالیٰ: ٤٣١٥، ٤٣١٦۔

❹ ابن سعد، جلد مغازی، ص: ١٠٩، ١١٢۔ ❺ ایضًا۔ ❻ مسند ابن حنبل، ج ٤، ص: ٣٩٩۔

بن رفیع نے اس پر تلوار کا وار کیا لیکن اچٹ کر رہ گئی، اس نے کہا: "تیری ماں نے تجھ کو اچھے ہتھیار نہیں دیے۔" پھر کہا کہ "میرے محمل میں تلوار ہے نکال لو اور جب اپنی ماں کے پاس واپس جانا تو کہنا کہ میں نے درید کو قتل کر دیا۔" ربیعہ رضی اللہ عنہ نے جا کر ماں کو اس کے قتل کی خبر دی تو اس نے کہا: "اللہ کی قسم! درید نے تیری تین ماؤں کو آزاد کرایا تھا۔" ❶

اسیران جنگ کی تعداد ہزاروں سے زیادہ تھی، ان میں حضرت شیما رضی اللہ عنہا بھی تھیں جو رسول اللہ ﷺ کی رضاعی بہن تھیں، لوگوں نے جب ان کو گرفتار کیا تو انہوں نے کہا: "میں تمہارے پیغمبر کی بہن ہوں۔" لوگ تصدیق کے لئے آنحضرت ﷺ کے پاس لائے انہوں نے پیٹھ کھول کر دکھائی کہ ایک دفعہ بچپن میں آپ ﷺ نے دانت سے کاٹا تھا، یہ اس کا نشان ہے۔ فرطِ محبت سے آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ان کے بیٹھنے کے لئے خود ردائے مبارک بچھائی، محبت کی باتیں کیں، چند شتر اور بکریاں عنایت فرمائیں اور ارشاد کیا کہ "جی چاہے تو میرے گھر چل کر رہو اور گھر جانا چاہو تو وہاں پہنچا دیا جائے۔" انہوں نے خاندان کی محبت سے وطن جانا چاہا، چنانچہ عزت اور احترام کے ساتھ پہنچا دی گئیں۔ ❷

محاصرہ طائف

حنین کی بقیہ شکست خوردہ فوج طائف میں جا کر پناہ گزین ہوئی اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں۔ طائف نہایت محفوظ مقام تھا، طائف اس کو اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے گرد شہر پناہ کے طور پر چار دیواری تھی، یہاں ثقیف کا جو قبیلہ آباد تھا نہایت شجاع، تمام عرب میں ممتاز اور قریش کا گویا ہمسر تھا، عروہ بن مسعود جو یہاں کا رئیس تھا، ابوسفیان (امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے باپ) کی لڑکی اس کو بیاہی تھی، کفار مکہ کہتے تھے کہ قرآن اگر اترتا تو مکہ یا طائف کے رؤسا پر اترتا، یہاں کے لوگ فن جنگ سے بھی واقف تھے، طبری اور ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ عروہ بن مسعود اور غیلان بن سلمہ نے جرش (یمن کا ایک ضلع) میں جا کر قلعہ شکن آلات یعنی صنبور اور منجنیق کے بنانے اور استعمال کرنے کا فن سیکھا تھا۔ ❸

یہاں ایک محفوظ قلعہ تھا، اہل شہر اور حنین کی شکست خوردہ فوج نے اس کی مرمت کی سال بھر کا رسد کا سامان جمع کیا، چاروں طرف منجنیقیں اور جا بجا قدر انداز متعین کئے۔ ❹

آنحضرت ﷺ نے حنین کے مال غنیمت اور اسیران جنگ کے متعلق حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں اور خود طائف کا عزم کیا، حضرت خالد رضی اللہ عنہ مقدمۃ الجیش کے طور پر پہلے روانہ کر دیئے گئے تھے، غرض محاصرہ ہوا اور اسلام میں یہ پہلا موقع تھا، کہ قلعہ شکن آلات یعنی دبابہ اور منجنیقیں استعمال کئے گئے، دبابہ پر اہل

---

❶ طبری، ج ۳، ص: ۱۶۶۶ مطبوعہ یورپ۔ ❷ طبقات ابن سعد، واصابہ، کتاب النسآء، ج ۸، ص: ۱۲۳ وطبری، (ج ۳، ص: ۱۶۶۸) ❸ طبری، ج ۳، ص: ۱۶۶۹ مطبوعہ یورپ وسیرت ابن ہشام، ج ۲، ص: ۳۱۲۔ ❹ تاریخ خمیس، ج ۲، ص: ۱۲۲ وابن سعد، جزء مغازی، ص: ۱۱۰۔

قلعہ نے لوہے کی گرم سلاخیں برسائیں اور اس شدت کی تیر باری کی کہ حملہ آوروں کو ہٹنا پڑا، بہت سے لوگ زخمی ہوئے، بیس دن تک محاصرہ رہا، لیکن شہر فتح نہ ہوسکا، آنحضرت ﷺ نے نوفل بن معاویہ کو بلا کر پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا کہ لومڑی بھٹ میں گھس گئی ہے اگر کوشش جاری رہی تو پکڑ لی جائے گی، لیکن چھوڑ دی جائے تب بھی کچھ اندیشہ نہیں، چونکہ صرف مدافعت مقصود تھی، آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ محاصرہ اٹھالیا جائے۔ [1] صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ آپ ﷺ ان کو بددعا دیں، آپ نے یہ دعا دی، [2]

((اللّٰھم! اھد ثقیفا و ائت بھم))

''اے اللہ! ثقیف کو ہدایت کر اور توفیق دے کہ میرے پاس حاضر ہو جائیں۔''

تقسیم غنائم

محاصرہ چھوڑ کر آپ جعرانہ تشریف لائے غنیمت کا بیشمار ذخیرہ تھا۔ چھ ہزار اسیرانِ جنگ، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار (سے زیادہ) بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی، [3] اسیران جنگ کے متعلق آپ نے انتظار کیا ان کے عزیز واقارب آئیں تو ان سے گفتگو کی جائے، لیکن کئی دن گزرنے پر کوئی نہ آیا، مال غنیمت کے پانچ حصے کئے گئے، چار حصے حسب قاعدہ اس فوج کو تقسیم کئے گئے خمس بیت المال اور غربا و مساکین کے لئے رکھا گیا۔

مکہ کے اکثر رؤسا جنھوں نے حال میں اسلام قبول کیا تھا، ابھی تک مذبذب الاعتقاد تھے انہی کو قرآن مجید میں مؤلفۃ القلوب کہا ہے، قرآن مجید میں جہاں زکوۃ کے مصارف بیان کئے ہیں، ان لوگوں کا نام بھی ہے، آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کو نہایت فیاضانہ انعامات دیے جن کی تفصیل یہ ہے:

ابوسفیان، مع اولاد،	۳۰۰ اونٹ اور ۱۲۰ اوقیہ چاندی
حکیم بن حزام	۲۰۰ اونٹ
نضیر بن حارث بن کلدہ ثقفی	۱۰۰ اونٹ
صفوان بن امیہ	۱۰۰ اونٹ
قیس بن عدی	۱۰۰ اونٹ
سہیل بن عمرو	۱۰۰ اونٹ
حویطب بن عبدالعزیٰ	۱۰۰ اونٹ

(ان کے علاوہ تین غیر مکی نومسلم رئیس بھی ان انعامات کے مستحق ٹھہرے)

اقرع بن حابس (تمیمی)	۱۰۰ اونٹ

---

[1] ابن سعد، جزء مغازی، ص: ۱۱٤، ۱۱۵۔ [2] ابن سعد، (جزء مغازی، ص: ۱۱۵) (س)۔

[3] طبقات ابن سعد، جزء مغازی، ص: ۱۱۰، (س)

عیینہ بن حصن (فزاری) ۱۰۰ اونٹ

مالک بن عوف (نصری) ۱۰۰ اونٹ

ان کے سوا بہت سے لوگوں کو پچاس پچاس اونٹ عطا فرمائے، عام تقسیم کی رو سے فوج کے حصہ میں جو آیا وہ فی کس چار اونٹ اور چالیس بکریاں تھیں چونکہ سواروں کو تگنا حصہ ملتا تھا۔ اس لئے ہر سوار کے حصہ میں بارہ اونٹ اور ایک سو بیس بکریاں آئیں۔ ❶

جن لوگوں پر انعام کی بارش ہوئی عموماً اہل مکہ اور اکثر جدید الاسلام تھے۔ اس پر انصار کو رنج ہوا، بعضوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے قریش کو انعام دیا اور ہم کو محروم رکھا، حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک قریش کے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ ❷ بعض بولے کہ مشکلات میں ہماری یاد ہوتی ہے اور غنیمت اوروں کو ملتی ہے۔ ❸

آنحضرت ﷺ نے یہ چرچے سنے تو انصار کو طلب فرمایا، ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا جس میں لوگ جمع ہوئے، آپ ﷺ نے انصار کی طرف خطاب کیا: ''کہ تم نے ایسا کہا؟'' لوگوں نے عرض کی کہ ''حضور! ہمارے سر برآوردہ لوگوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا، نوخیز نوجوانوں نے یہ فقرے کہے تھے۔'' ❹ صحیح بخاری باب مناقب الانصار (۳۷۸۷) میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا واقعہ ہے؟ تو چونکہ انصار جھوٹ نہیں بولتے تھے، انہوں نے کہا: ''آپ نے جو سنا صحیح ہے۔''

آپ نے ایک خطبہ دیا جس کی نظیر فن بلاغت میں نہیں مل سکتی، انصار کی طرف خطاب فرما کر کہا:

''کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے، اللہ نے میرے ذریعہ سے تم کو ہدایت کی، تم منتشر اور پراگندہ تھے، اللہ نے میرے ذریعہ سے تم میں اتفاق پیدا کیا، تم مفلس تھے، اللہ نے میرے ذریعہ سے تم کو دولت مند کیا۔''

آپ ﷺ یہ فرماتے جاتے تھے اور ہر فقرہ پر انصار کہتے جاتے تھے کہ ''اللہ اور رسول ﷺ کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔'' ❺

آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمد (ﷺ!) تجھ کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی۔ تجھ کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی، تو مفلس آیا تھا ہم نے ہر طرح کی مدد کی۔''

یہ کہہ کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو، لیکن اے انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم محمد ﷺ کو لے کر اپنے گھر آؤ۔''

---

❶ طبقات ابن سعد، جزء مغازی، ص: ۱۱۰ وزرقانی علی المواهب، ج ۳، ص: ۴۲ (س)۔
❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی، غزوة الطائف: ۴۳۳۱۔
❸ ایضًا: ۴۳۳۷۔ ❹ ایضًا: ۴۳۳۱۔ (س)
❺ ایضًا: ۴۳۳۰ وفتح الباری، ج ۸، ص: ۴۱ (س)۔

انصار بے اختیار چیخ اٹھے کہ ”ہم کو صرف محمد ﷺ درکار ہے۔“ اکثروں کا یہ حال ہوا کہ روتے روتے ڈاڑھیاں تر ہو گئیں، آپ نے انصار کو سمجھایا کہ مکہ کے لوگ جدید الاسلام ہیں، میں نے ان کو جو کچھ دیا حق کی بنا پر نہیں دیا بلکہ تالیف قلب کے لئے دیا۔ ❶

حنین کے اسیران جنگ اب تک جعرانہ میں محفوظ تھے، ایک معزز سفارت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ اسیران جنگ رہا کر دیئے جائیں، یہ وہ قبیلہ تھا کہ آپ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا اسی قبیلہ سے تھیں، رئیس قبیلہ (زہیر بن صرد) نے کھڑے ہو کر تقریر کی اور آنحضرت ﷺ کی طرف مخاطب ہو کر کہا: ”جو عورتیں چھپروں میں محبوس ہیں، انہی میں تیری پھوپھیاں اور تیری خالائیں ہیں، اللہ کی قسم! اگر سلاطین عرب میں سے کسی نے ہمارے خاندان کا دودھ پیا ہوتا تو ان سے بہت کچھ امیدیں ہوتیں اور تجھ سے تو اور بھی زیادہ توقعات ہیں۔“ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”خاندان عبدالمطلب کا جس قدر حصہ ہے وہ تمہارا ہے لیکن عام رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے بعد مجمع ہو تو سب کے سامنے یہ درخواست پیش کرو۔“ نماز ظہر کے بعد ان لوگوں نے یہ درخواست مجمع کے سامنے پیش کی، آپ نے فرمایا: ”مجھ کو صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے، لیکن میں تمام مسلمانوں سے ان کے لئے سفارش کرتا ہوں۔“ مہاجرین اور انصار بول اٹھے، ہمارا حصہ بھی حاضر ہے، اس طرح چھ ہزار دفعتاً آزاد تھے۔ ❷

واقعات متفرقہ

حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے اسی سال ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام آنحضرت ﷺ نے ابراہیم رکھا، آنحضرت ﷺ کو اس بچہ سے نہایت محبت تھی، ڈیڑھ سال (۱۷ یا اٹھارہ مہینے) زندہ رہا۔ جس دن ابراہیم نے وفات پائی سورج گرہن ہوا، عرب کا عقیدہ تھا کہ سورج گرہن عظیم الشان انسان کی موت کی علامت ہے، لوگوں نے سمجھا کہ یہ ابراہیم کی موت کا نتیجہ ہے، آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کہ ”سورج اور چاند اللہ کی قدرت ہیں، کسی کے مرنے اور جینے سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔“ اس کے بعد آپ ﷺ نے کسوف کی نماز باجماعت ادا فرمائی۔ ❸

آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا بھی اسی سال انتقال ہوا۔ ❹

---

❶ ایضاً: ۴۳۳۰ وفتح الباری، پوری تفصیل فتح الباری میں ہے۔

❷ طبری، ج ۳، ص: ۱۶۷۲ (س) وطبقات ابن سعد، جلد مغازی، ص: ۱۱۱۔

❸ بخاری، کتاب الکسوف، باب الصلوۃ فی کسوف الشمس: ۱۰۴۰، و باب الصدقۃ فی الکسوف: ۱۰۴۴۔

❹ طبقات ابن سعد، ذکر نساء، ج۸، ص: ۲۲ واصابۃ، ج۸، ص: ۹۲۔

۹ھ
واقعہ ایلاء وتخییر وغزوۂ تبوک

ایلاء اور تخییر ۹ ھ [1]

رسول اللہ ﷺ زاہدانہ اور تمام زخارف دنیوی سے بیگانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ دو دو مہینے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، آئے دن فاقے ہوتے رہتے تھے، مدت العمر دو وقت برابر سیر ہو کر کھانا نصیب نہیں ہوا۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اس جنس لطیف میں شامل تھیں جن کی مرغوب ترین چیز عموماً زیب و زینت اور ناز و نعمت ہے اور گو شرف صحبت نے ان کو تمام ابنائے جنس سے ممتاز کر دیا تھا تاہم بشریت بالکل معدوم نہیں ہو سکتی تھی خصوصاً وہ دیکھتی تھیں کہ فتوحات اسلام کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے اور غنیمت کا سرمایہ اس قدر پہنچ گیا ہے کہ اس کا ادنیٰ حصہ بھی ان کی راحت و آرام کے لئے کافی ہو سکتا ہے، ان واقعات کا اقتضا تھا کہ ان کے صبر و قناعت کا جام لبریز ہو جاتا تھا۔

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں بڑے بڑے گھرانوں کی خواتین تھیں، حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا تھیں جو رئیس قریش کی صاحبزادی تھیں، حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا جو قبیلہ بنی المصطلق کے رئیس کی بیٹی تھیں، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا تھیں جن کا باپ خیبر کا رئیس اعظم تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا تھیں جن کے والد فاروق اعظم تھے، بشریت کے اقتضا سے ان میں منافست بھی تھی اور حریف کے مقابلہ میں اپنے رتبہ اور شان کا خیال رہتا تھا، آنحضرت ﷺ سے ہر ایک کو جو شدید محبت تھی وہ ع با سایہ ترا نمی پسندم، کی حد تک تھی۔

ایک دفعہ کئی دن تک آنحضرت ﷺ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس معمول سے زیادہ بیٹھے جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس کہیں سے شہد آ گیا تھا انہوں نے آپ ﷺ کے سامنے پیش کیا، آپ کو شہد بہت مرغوب تھا، آپ نے نوش فرمایا، اس میں وقت مقررہ سے دیر ہو گئی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو رشک ہوا، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ جب ہمارے یا تمہارے گھر میں آئیں تو کہنا چاہیے کہ آپ کے منہ سے مغافیر کی بو آتی ہے، (مغافیر کے پھولوں سے شہد کی مکھیاں رس چوستی ہیں) آنحضرت ﷺ نے

---

[1] بعض محدثین کی رائے ہے کہ یہ ذوالحجہ ۵ ھ کا واقعہ ہے، اس اشتباہ کا سبب یہ ہے کہ بعض روایتوں میں یہ مذکور ہوا ہے کہ یہ نزول حجاب سے پہلے کا واقعہ ہے لیکن آگے چل کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں مذکور ہے کہ جب اس حادثہ کی مبہم خبر سے مسلمانوں میں اضطراب دیکھا تو سمجھے کہ غسان کا بادشاہ حملہ آور ہوا، جس کی اطلاع پہلے معلوم ہو چکی تھی، غسان کا حملہ ۹ ھ میں ہونے والا تھا، حافظ ابن حجر اور محدث دمیاطی نے بدلائل ثابت کیا کہ یہ اوائل ۹ ھ کا واقعہ ہے (دیکھو فتح الباری، جلد ۹، صفحہ: ۲۵۰) (س)

قسم کھائی کہ میں شہد نہ کھاؤں گا، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری: ❶

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ ﴾ (٦٦/ التحریم: ١)

''اے پیغمبر! اپنی بیویوں کی خوشی کے لئے تم اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام کیوں کرتے ہو؟''

علامہ عینی نے بخاری کی شرح میں لکھا ہے:

فان قلت كيف جاز لعائشة وحفصة الكذب والمواطاة التي فيها ايذاء رسول الله ﷺ قلت كانت عائشة صغيرة مع انها وقعت منها من غير قصد الا يذاء بل على ماهو من جبلة النساء في الغيرة على الضرائر۔ ❷

''اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کو جھوٹ بولنا اور آنحضرت ﷺ کے خلاف سازش کرنا کیونکر جائز تھا؟ تو جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ کمسن تھیں، اس کے علاوہ ان کا مقصود آنحضرت ﷺ کو ایذا دینا نہیں تھا بلکہ جیسا کہ عورتیں اپنی سوکنوں کے مقابلہ میں رشک سے تدبیریں اختیار کرتی ہیں، اس طرح کی ایک تدبیر تھی۔''

لیکن علامہ موصوف کا جواب تسلیم کرنا مشکل ہے، اول تو یہ واقعہ ایلاء کے واقعہ کے سلسلہ میں ہے جو ۹ھ میں واقع ہوا تھا، اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سترہ برس کی ہو چکی تھیں، دوسرے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کمسن تھیں لیکن اور ازواج مطہرات جو اس میں شریک ہوئیں وہ تو پوری عمر کی تھیں، خود حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی عمر آنحضرت ﷺ کی شادی کے وقت ۲۱ برس کی تھی۔

ہمارے نزدیک مغافیر کی بو کا اظہار کرنا کوئی جھوٹ بات نہ تھی، تمام روایتوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ لطیف المزاج تھے اور رائحہ کی ذرا سی ناگواری کو برداشت نہیں فرما سکتے تھے ❸ مغافیر کے پھولوں میں اگر کسی قسم کی کرختگی ہو تو تعجب کی بات نہیں ❹ البتہ ازواج مطہرات کا ایکا کرنا بظاہر محل اعتراض ہو سکتا ہے لیکن یہ کسی کا اعتقاد نہیں کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن معصوم تھیں یا اپنے انجاحِ مقصد کے لئے جائز وسائل نہیں اختیار کرتی تھیں، اسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ آنحضرت ﷺ نے کوئی راز کی بات حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے فرمائی اور تاکید کر دی کہ کسی سے نہ کہنا لیکن انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہہ دیا اس پر یہ آیت اتری:

﴿ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴾

(٦٦/ التحریم: ٣)

❶ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ التحریم: ٤٩١٢ اس واقعہ کو بخاری، کتاب الطلاق، (باب لم تحرم ما احل اللہ لك: ٥٢٦٧، ٥٢٦٨) میں زیادہ تفصیل سے لکھا ہے جس میں یہ بھی ہے کہ اس تدبیر میں اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن بھی شریک کر لی گئیں اور جس نے اول اس کا اظہار کیا وہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ ❷ تفسیر سورۃ تحریم، ج ٩، ص: ٢٢٦۔

❸ مسند احمد، ج ٦، ص: ٢٤٩، (س) ❹ عمدۃ القاری، ج ٩، ص: ٢٢٦، (س)

”اور جب کہ پیغمبر ﷺ نے اپنی بعض بیویوں سے راز کی بات کہی اور انہوں نے فاش کر دی اور اللہ نے پیغمبر کو اس کی خبر کر دی تو پیغمبر نے اس کا کچھ حصہ ان سے کہا اور کچھ چھوڑ دیا، پھر جب ان سے کہا تو انہوں نے کہا کہ آپ کو کس نے خبر دی، پیغمبر نے کہا مجھ کو خدائے عالم خبیر نے خبر دی۔“

شکر رنجیاں بڑھتی گئیں اور حضرت عائشہ وحفصہ رضی اللہ عنہما نے باہم مظاہرہ کیا، یعنی دونوں نے اس پر اتفاق کیا کہ دونوں مل کر زور ڈالیں، اس پر حضرت عائشہ وحضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کی شان میں یہ آیتیں اتریں:

﴿ إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا ۖ وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ ﴾ (٦٦/ التحریم: ٤)

”اگر تم دونوں اللہ کی طرف رجوع کرو تو تمہارے دل مائل ہو چکے ہیں اور اگر ان کے (یعنی رسول اللہ) کے مقابلہ میں ایکا کرو تو اللہ اور جبریل اور نیک مسلمان اور سب کے بعد فرشتے رسول اللہ کے مددگار ہیں۔“

حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے جن معاملات کی وجہ سے ایکا کیا تھا وہ خاص تھے لیکن توسیع نفقہ کے تقاضے میں تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن شریک تھیں، آنحضرت ﷺ کے سکون خاطر میں یہ تنگ طلبی اس قدر خلل انداز ہوئی کہ آپ نے عہد فرمایا کہ ایک مہینہ تک ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے نہ ملیں گے، اتفاق یہ کہ اسی زمانہ میں آپ گھوڑے سے گر پڑے اور ساق مبارک پر زخم آیا آپ نے بالا خانہ ❶ پر تنہا نشینی اختیار کی، واقعات کے قرینہ سے لوگوں نے خیال کیا کہ آپ نے تمام ازواج کو طلاق دی، اس کے بعد جو واقعات پیش آئے ان کو ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے دلچسپ اور پراثر تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کیا ہے، اس بیان میں کچھ ابتدائی واقعات بھی آ گئے ہیں جن سے اصل معاملہ پر زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ ❷

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”میں اور ایک انصاری (اوس بن خولی یا عتبان بن مالک) ہمسایہ تھے اور معمول تھا کہ باری باری سے ایک دن بیچ دے کر ہم دونوں خدمت اقدس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

❶ بالا خانہ کے لئے احادیث میں مشربہ کا لفظ آیا ہے، مشربہ کے نام سے زیادہ تر مشربۂ ام ابراہیم (ماریہ) مشہور ہے، اسی لئے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ یہ وہی بالا خانہ تھا، لیکن یہ قطعاً غلط ہے، مشربۂ ام ابراہیم مدینہ سے باہر واقع تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جو روایت تمام صحاح میں موجود ہے اور جس کو مصنف نے آگے نقل کیا ہے اس سے بھی متبادر ہوتا ہے کہ یہ وہ مقام تھا جو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر اور مسجد نبوی سے بالکل متصل تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دوڑ دوڑ کر کبھی ادھر کبھی ادھر جاتے تھے، ابو داود میں تصریح ہے کہ یہ مشربہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کا بالا خانہ تھا جو مسجد نبوی ہی سے متصل دیگر ازواج مطہرات کے حجروں کے برابر تھا (ابو داود، کتاب الصلوۃ، باب الامام یصلی من قعود: ٦٠٢۔ (س)۔

❷ یہ واقعہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب یعنی کتاب النکاح، باب موعظة الرجل ابنته لحال زوجها: ٥١٩١، وکتاب الطلاق، باب قوله تعالیٰ: ﴿للذين يؤلون من نسائهم﴾: ٥٢٨٩، وکتاب العلم، باب التناوب فی العلم: ٨٩ میں باختلاف عبارت منقول ہے، صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب فی الایلاء واعتزال النساء، الخ: ٣٦٩١تا٣٦٩٦ میں بھی کئی طریق سے مذکور ہے، ان روایتوں میں باہم جزئیات میں اختلاف ہے ہم نے تاامکان سب روایتوں کو جمع کیا ہے۔

قریش کے لوگ عورتوں پر قابو رکھتے اور ان پر غالب رہتے تھے۔ لیکن جب مدینہ میں آئے تو یہاں انصار کی عورتیں مردوں پر غالب تھیں ان کا انداز دیکھ کر ہماری عورتوں نے بھی ان کی تقلید شروع کی، ایک دن میں نے کسی بات پر اپنی بیوی کو ڈانٹا، انہوں نے الٹ جواب دیا، میں نے کہا: تم میری بات کا جواب دیتی ہو، بولیں تم کیا ہو؟، رسول اللہ ﷺ کی بیویاں ان کو برابر کا جواب دیتی ہیں، یہاں تک کہ دن بھر آنحضرت ﷺ سے روٹھی رہتی ہیں، میں نے دل میں کہا، غضب ہوگیا، اٹھ کر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ) کے پاس آیا اور پوچھا کہ کیا تو واقعی آنحضرت ﷺ سے رات بھر روٹھی رہتی ہے، حفصہ نے اقرار کیا، میں نے کہا تجھ کو یہ خیال نہیں کہ رسول کی ناراضی اللہ کی ناراضی ہے، بخدا رسول اللہ ﷺ میرا خیال فرماتے ہیں ورنہ تجھ کو طلاق دے چکے ہوتے، پھر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا اور ان سے بھی یہی شکایت کی، بولیں کہ عمر! تم ہر معاملہ میں دخل دینے لگے، یہاں تک کہ اب رسول اللہ ﷺ اور ان کی ازواج کے معاملات میں بھی دخل دیتے ہو، میں چپ رہ گیا اور اٹھ کر چلا آیا۔

کچھ رات گئی، میرے ہمسایہ انصاری باہر سے آئے اور بڑے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا، میں گھبرا کر اٹھا اور دروازہ کھول کر پوچھا خیر ہے؟ انہوں نے کہا: غضب ہوگیا، میں نے کہا: کیا غسانی [1] مدینہ پر چڑھ آئے؟ بولے کہ نہیں، اس سے بھی بڑھ کر یعنی رسول اللہ ﷺ نے ازواج کو طلاق دے دی، میں صبح کو مدینہ میں آیا، آنحضرت ﷺ کے ساتھ نماز فجر ادا کی، آنحضرت ﷺ نماز سے فارغ ہوکر بالا خانہ میں تنہا جا کر بیٹھ گئے، میں حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا تو دیکھا وہ بیٹھی رو رہی ہے، میں نے کہا: ”میں نے تجھ سے پہلے ہی کہا تھا۔“ حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے اٹھ کر مسجد نبوی میں آیا، دیکھا تو صحابہ منبر کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں، میں ان کے پاس بیٹھ گیا، لیکن طبیعت کو سکون نہیں ہوتا تھا، اٹھ کر بالا خانہ کے پاس آیا اور رباح (خادم خاص) سے کہا اطلاع کرو، لیکن آنحضرت ﷺ نے کچھ جواب نہیں دیا، میں اٹھ کر پھر مسجد میں آیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بیتاب ہوکر بالا خانہ کے نیچے آیا اور دربان سے دوبارہ اذن طلبی کی درخواست کی، جب کچھ جواب نہیں ملا تو میں نے پکار کر کہا، رباح! میرے لئے اذن مانگ شاید رسول اللہ ﷺ کو یہ خیال ہے کہ حفصہ رضی اللہ عنہا کی سفارش کرنے آیا ہوں، اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ فرمائیں تو حفصہ رضی اللہ عنہا کی گردن اڑا دوں، آنحضرت ﷺ نے اجازت دی، اندر گیا تو دیکھا کہ آپ کھرّی چارپائی [2] پر لیٹے ہیں اور جسم مبارک پر بانوں کے نشان پڑ گئے ادھر ادھر نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہوئے تھے ایک کونے میں کسی جانور کی کھال کھونٹی پر لٹک رہی تھی، میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، آنحضرت ﷺ نے سبب پوچھا: میں نے عرض کی: اس سے

---

[1] غسانی عرب کا ایک خاندان تھا، جو شام میں رومیوں کے ماتحت بادشاہی کرتا تھا، وہ رومیوں کی تحریک سے مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کررہا تھا۔ [2] بعض روایتوں میں حصیر (چٹائی) کا لفظ آیا ہے اور بعض میں سریر (چارپائی) ابن حجر نے یہ تطبیق دی ہے کہ وہ تھی چارپائی لیکن چٹائی جس سے بنی جاتی ہے اس سے بنی ہوئی تھی (فتح الباری، جلد ۹ صفحہ: ۲۵۱)۔

بڑھ کر رونے کا اور کیا موقع ہوگا، قیصر و کسریٰ تو باغ و بہار کے مزے لوٹ رہے ہیں اور آپ پیغمبر ہو کر، آپ کی یہ حالت ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''تم اس پر راضی نہیں کہ قیصر و کسریٰ دنیا لیں اور ہم آخرت۔''

میں نے عرض کی کیا آپ نے ازواج کو طلاق دے دی؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''نہیں۔'' میں اللہ اکبر پکار اٹھا، پھر عرض کی، کہ مسجد میں تمام صحابہ مغموم بیٹھے ہیں اجازت ہو تو جا کر خبر کر دوں کہ واقعہ غلط ہے، چونکہ ایلاء کی مدت یعنی ایک مہینہ گزر چکا تھا، آپ ﷺ بالا خانہ سے اتر آئے [1] اور عام باریابی کی اجازت ہو گئی۔ اس کے بعد آیت تخییر نازل ہوئی:

﴿ يَأَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَوٰةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۝ وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَٰتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۲۸۔۲۹)

''اے پیغمبر (ﷺ)! اپنی بیویوں سے کہہ دے کہ اگر تم کو دنیاوی زندگی اور دنیا کا زیب و آرائش مطلوب ہے تو آؤ میں تم کو رخصتی جوڑے دے کر بطریق احسن رخصت کر دوں اور اگر اللہ، اللہ کا رسول اور آخرت مطلوب ہے تو اللہ نے تم میں سے نیکو کاروں کے لئے بڑا ثواب مہیا کر رکھا ہے۔''

اس آیت کی رو سے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو مطلع فرما دیں کہ دو چیزیں تمہارے سامنے ہیں، دنیا اور آخرت، اگر تم چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو رخصتی جوڑے دے کر عزت و احترام کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور رسول اور زندگانی ابدی کی طلبگار رہو تو اللہ نے نیکو کاروں کے لئے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔

مہینہ ختم ہو چکا تھا، آپ ﷺ بالا خانہ سے اُترے، چونکہ ان تمام معاملات میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پیش پیش تھیں ان کے پاس تشریف لے گئے اور مطلع فرمایا، انہوں نے کہا: میں سب کچھ چھوڑ کر اللہ اور رسول کو

---

[1] (آنحضرت ﷺ بالاتفاق ۲۹ روز بالا خانہ پر تشریف فرما رہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ مکالمہ پہلے روز کا واقعہ ہے یا آخری روز کا اس روایت کے جتنے طرق ہیں ان کا ابتدائی ٹکڑا ظاہر کرتا ہے کہ پہلے ہی دن کا واقعہ ہے اور آخرت کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ انتیسویں روز کا واقعہ ہے مصنف مرحوم نے آخری فقروں کا لحاظ کیا ہے اور بظاہر اس کو انتیسویں روز کا واقعہ سمجھا ہے، لیکن اس بنا پر لازم آتا ہے کہ ۲۸ دن تک گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہ کو واقعۂ ایلاء کی اطلاع ہی نہ تھی، حالانکہ اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا، اس بنا پر محدثین نے یہ تاویل کی ہے کہ اس مکالمہ کا اکثر حصہ پہلے روز کا واقعہ ہے لیکن صرف اترنے کا بیان آخر روز کا واقعہ ہے، راوی نے بیچ کا سلسلہ چھوڑ دیا، بخاری کی اس روایت سے جو کتاب النکاح، باب موعظة الرجل ابنته لحال زوجها (۵۱۹۱) اور کتاب اللباس باب ماكان يتجوز رسول الله ﷺ من اللباس والبسط (۵۸٤۳) میں مذکور ہے یہ صاف تصریح موجود ہے، اس بنا پر اس فقرہ کو یوں پڑھنا چاہیے کہ جب ایلاء کی مدت یعنی ایک مہینہ گزر چکا۔ (س)

لیتی ہوں، تمام ازواج مطہرات نے بھی یہی جواب دیا۔

ایلاء، تخییر، مظاہرہ حفصہ وعائشہ رضی اللہ عنہا، یہ واقعات عام طور پر اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ گویا مختلف زمانوں کے واقعات ہیں اور ان سے ایک ظاہر بیں یہ دھوکا کھا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ ہمیشہ ناگواری کے ساتھ بسر کرتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تینوں واقعے ہم زمان اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، صحیح بخاری [1] میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی زبانی جو نہایت تفصیلی روایت ہے اس میں صاف تصریح ہے کہ مظاہرۂ ازواج مطہرات سے انعزال، افشائے راز، آیت تخییر کا نزول سب ایک ہی سلسلہ کے واقعات ہیں۔

حافظ ابن حجر انعزال کے متعدد اسباب لکھ کر لکھتے ہیں:

وهذا هو اللائق بمكارم اخلاقه ﷺ وسعة صدره وكثرة صفحه وان ذلك لم يقع منه حتى تكرر موجبه منهن۔ [2]

''آنحضرت ﷺ کے مکارم اخلاق، کشادہ دلی اور کثرت عفو کے یہی مناسب ہے اور آپ نے اس وقت تک ایسا نہیں کیا ہوگا جب تک ان سے اس قسم کی حرکتیں متعدد بار ظہور پذیر نہ ہوئیں۔''

مظاہرہ کے متعلق جو آیت نازل ہوئی اس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑی ضرر رساں سازش تھی جس کا اثر بہت پرخطر تھا۔ آیت مذکور یہ ہے:

﴿ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝ ﴾ (٦٦/ التحريم:٤)

''اور اگر تم دونوں (حضرت عائشہ وحفصہ رضی اللہ عنہما) رسول اللہ ﷺ کے برخلاف ایکا کرو تو اللہ اس کا مولا ہے اور جبریل اور نیک مسلمان اور ان سب کے ساتھ فرشتے بھی مددگار ہیں۔''

اس آیت میں تصریح ہے کہ اگر ان دونوں کا ایکا قائم رہا تو رسول اللہ ﷺ کی مدد کو اللہ اور جبریل اور نیک مسلمان موجود ہیں اور اسی پر بس نہیں بلکہ فرشتے بھی اعانت کے لئے تیار ہیں۔

روایتوں سے مظاہرہ کا جو سبب معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہی کہ اس کے ذریعہ سے وہ نفقہ کی توسیع چاہتی تھیں اور اگر ماریہ قبطیہ کی روایت تسلیم کر لی جائے تو صرف یہ کہ وہ الگ کر دی جائیں لیکن یہ ایسی کیا اہم باتیں ہیں اور حضرت عائشہ وحضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کی کسی قسم کی سازش ایسی کیا پرخطر ہو سکتی ہے جس کی مدافعت کے لئے ملائے اعلیٰ کی اعانت کی ضرورت ہو۔

اس بنا پر بعضوں نے قیاس کیا ہے کہ یہ مظاہرہ کوئی معمولی معاملہ نہ تھا، مدینہ منورہ میں منافقین کا ایک

[1] صحيح بخاري، باب النكاح (باب موعظة الرجل ابنته: ٥١٩١)۔

[2] فتح الباري، ج٩، ص: ٢٥٤۔

گروہ کثیر موجود تھا جن کی تعداد (۴۰۰) تک بیان کی گئی ہے، یہ شریر النفس ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ کسی تدبیر سے خود آنحضرت ﷺ کے خاندان اور رفقائے خاص میں پھوٹ ڈلوا دیں (ابن حجر نے اصابہ میں ام جلندح کے حال میں لکھا ہے: وكانت تحرش بين ازواج النبي ﷺ [1] ''وہ ازواج مطہرات کو باہم بھڑکایا کرتی تھیں۔'') افک کے واقعہ میں ان کو کامیابی کی جھلک نظر آ چکی تھی، رسول اللہ ﷺ پندرہ دن تک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کبیدہ خاطر رہے، حضرت حسان رضی اللہ عنہ افک میں شریک ہو گئے تھے، آنحضرت ﷺ کی سالی حمنہ جو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی بہن تھیں سازش میں آ گئی تھیں، چنانچہ اس روایت کو علانیہ شہرت دیتی تھیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک قریبی عزیز (مسطح) کو جو شریک تہمت تھے مالی اعانت سے محروم کر دیا تھا، غرض اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت پر وحی نہ آ جاتی تو ایک فتنۂ عظیم برپا ہو چکا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی کششِ خاطر اور کبیدگی اور تنگ طلبی کا حال منافقوں کو معلوم ہوا تو ان بدنفسوں نے اشتعال دیکر بھڑکانا چاہا ہوگا، چونکہ مظاہرہ کے ارکان اعظم حضرت عائشہ و حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما تھیں، ان کو خیال ہوا ہوگا کہ ان کے ذریعہ سے ان کے والدین (حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما) کو اس سازش میں شریک کر لینا ممکن ہے لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کو رسول اللہ ﷺ کی خاک پر قربان کر سکتے تھے، چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اذن نہ ملا تو انہوں نے پکار کر کہا کہ ''ارشاد ہو تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا سر لے کر آؤں۔''

آیت میں روئے سخن منافقین کی طرف ہے یعنی اگر عائشہ وحفصہ رضی اللہ عنہما سازش بھی کریں گی اور منافقین اس سے کام لیں گے تو اللہ پیغمبر کی اعانت کے لئے موجود ہے اور اللہ کے ساتھ جبریل و ملائکہ بلکہ تمام عالم ہے۔

روایات کاذبہ

ان واقعات میں کذابین رواۃ نے اس قدر تلبیسات اور خداعیاں کی ہیں کہ بڑے بڑے مؤرخین و ارباب سیر نے یہ روایتیں اپنی تصانیف میں سند کے طور پر درج کر دیں، اس لئے ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں۔

اس قدر عموماً مسلّم ہے اور خود قرآن مجید میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی خاطر سے کوئی چیز اپنے اوپر حرام کر لی تھی، اختلاف اس میں ہے کہ وہ کیا چیز تھی؟ بہت سی روایتوں میں ہے کہ وہ ماریہ قبطیہ ایک کنیز تھیں جن کو عزیز مصر نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں تحفۃً بھیجا تھا، ماریہ قبطیہ کی روایت تفصیل کے ساتھ مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے جن میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا راز جو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے فاش کر دیا تھا، ان ہی ماریہ قبطیہ کا راز تھا اگرچہ یہ روایتیں بالکل موضوع اور ناقابل ذکر ہیں، لیکن یورپ کے اکثر مؤرخوں نے آنحضرت ﷺ کے معیار اخلاق پر جو حرف گیریاں کی ہیں ان کی گل

[1] الاصابة لابن حجر: ج۸، ص:۲۱۸۔

سر سبد یہی ہیں، اس لئے ان سے تعرض کرنا ضروری ہے۔ ان روایتوں میں واقعہ کی تفصیل کے متعلق اگرچہ نہایت اختلاف ہے، لیکن اس قدر سب کی قدر مشترک ہے کہ ماریہ قبطیہ آنحضرت ﷺ کی موطوءہ کنیزوں میں تھیں اور آنحضرت ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی ناراضی کی وجہ سے ان کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔

حافظ ابن حجر شرح صحیح بخاری تفسیر سورۂ تحریم میں لکھتے ہیں:

ووقع عند سعيد بن منصور باسناد صحيح الى مسروق قال حلف رسول الله ﷺ لحفصة لا يقرب امته الخ۔ ❶

''اور سعید بن منصور نے سند صحیح کے ساتھ جو مسروق تک منتہی ہوتی ہے، یہ روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے سامنے قسم کھائی کہ اپنی کنیز سے مقاربت نہ کریں گے۔''

اس کے بعد حافظ موصوف نے مسند، (ہیثم بن کلیب) اور طبرانی سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے:

وللطبراني من طريق الضحاك عن ابن عباس قال دخلت حفصة بيتها فوجده يطأ مارية فعاتبته۔ ❷

''اور طبرانی نے ضحاک کے سلسلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر میں گئیں تو آنحضرت ﷺ کو حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہم بستر دیکھا، اس پر انہوں نے آنحضرت ﷺ کو معاتب کیا۔''

ابن سعد اور واقدی نے اس روایت کو زیادہ بدنما پیرایوں میں نقل کیا ہے، ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام روایتیں محض افترا اور بہتان ہیں۔

علامہ عینی شرح صحیح بخاری باب النکاح جلد ۹ صفحہ ۵۴۸ میں لکھتے ہیں:

والصحيح في سبب نزول الآية انه في قصة العسل لا في قصة مارية المروى في غير الصحيحين وقال النووي ولم تأت قصة مارية من طريق صحيح۔

''اور آیت کی شان نزول کے باب میں صحیح روایت یہ ہے کہ وہ شہد کے واقعہ میں ہے ماریہ رضی اللہ عنہا کے قصہ کے باب میں نہیں ہے جو صحیحین کے سوا اور کتابوں میں مذکور ہے، نووی نے کہا ہے کہ ماریہ کا واقعہ کسی صحیح طریقہ سے مروی نہیں ہے۔''

یہ حدیث تفسیر ابن جریر، طبرانی، مسند ہیثم میں مختلف طریقوں سے مروی ہے، ان کتابوں میں عموماً جس قسم کی رطب و یابس روایتیں مذکور ہیں اس کے لحاظ سے جب تک ان کی صحت کے متعلق کوئی خاص تصریح نہ ہو

❶ ج ۸، ص: ۵۰۳۔ ❷ فتح الباری، ج ۸، ص: ۵۰۳ مطبوعہ مصر۔

تو لائق التفات نہیں، حافظ ابن حجر نے ان میں ایک طریقہ کی توثیق کی ہے، یعنی وہ روایت جس کے راوی اخیر مسروق ہیں۔ [1] لیکن اولاً تو اس روایت میں ماریہ قبطیہ کا نام مطلق نہیں، صرف اس قدر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے سامنے قسم کھائی تھی کہ میں اپنی کنیز کے پاس نہ جاؤں گا اور وہ مجھ پر حرام ہے۔ اس کے علاوہ مسروق تابعی ہیں، یعنی آنحضرت ﷺ کو نہیں دیکھا اس لئے یہ روایت اصول حدیث کی رو سے منقطع ہے۔ یعنی اس کا سلسلۂ سند صحابی تک نہیں پہنچتا۔ اس حدیث کے ایک اور طریقہ کو حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں صحیح کہا ہے۔ [2] لیکن اس طریقہ کے ایک اور راوی عبدالملک رقاشی ہیں جن کی نسبت دارقطنی نے لکھا ہے:

كثير الخطأ في الاسانيد والمتون يحدث من حفظه۔ [3]

''سندوں میں اور اصل الفاظِ حدیث میں بہت خطا کرتے ہیں اور اپنے حافظہ کی بنیاد پر حدیث بیان کرتے ہیں۔''

یہ امر مسلم ہے کہ ماریہ کی روایت صحاح ستہ کی کسی کتاب میں مذکور نہیں ہے۔ [4] یہ بھی تسلیم ہے کہ سورۂ تحریم کا شان نزول جو صحیح بخاری اور مسلم میں مذکور ہے، (یعنی شہد کا واقعہ) قطعی طریقہ سے ثابت ہے، امام نووی نے جو ائمہ محدثین میں سے ہیں صاف تصریح کی ہے کہ ماریہ رضی اللہ عنہا کے باب میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں، حافظ ابن حجر اور ابن کثیر نے جن طریقوں کو صحیح کہا ان میں سے ایک منقطع اور دوسرے کا راوی کثیر الخطا ہے ان واقعات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہ روایت استناد کے قابل ہے۔ یہ بحث اصول روایت کی بنا پر تھی، درایت کا لحاظ کیا جائے تو مطلق کدوکاوش کی حاجت نہیں، جو رکیک واقعہ ان روایتوں میں بیان کیا گیا ہے اور خصوصاً طبری وغیرہ میں جو جزئیات مذکور ہیں وہ ایک معمولی آدمی کی طرف منسوب نہیں کیے جاسکتے، نہ کہ اس ذات پاک کی طرف جو تقدس ونزاہت کا پیکر تھا۔ (ﷺ)

[1] فتح الباری، تفسیر سورۃ تحریم، ج۸، ص:۵۰۳۔

[2] ج ٤، ص:٣٨٦۔ [3] تهذيب التهذيب، ج٦، ص:٤٢٠۔

[4] (یعنی ماریہ کے نام سے اور مشہور لغو واقعات کے شمول کے ساتھ نہیں ورنہ نسائی، کتاب عشرة النساء، باب الغيرة: ٣٤١١ میں اس قدر مذکور ہے کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کے اصرار سے، آنحضرت ﷺ نے ایک لونڈی کو اپنے اوپر حرام کرلیا تھا، لیکن اس کا ایک راوی مجروح ہے)۔ (س)۔

غزوۂ تبوک

رجب ☆ ۹ھ مطابق نومبر ۶۳۰ء

تبوک ایک مشہور مقام ہے جو مدینہ اور دمشق کے وسط میں نصف راہ پر مدینہ سے چودہ منزل ہے۔

جنگ موتہ کے بعد سے رومی سلطنت نے عرب پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ غسانی خاندان جو شام میں رومیوں کے زیر اثر حکومت کر رہا تھا، مذہبًا عیسائی تھا، اس لئے قیصر روم نے اسی کو اس مہم پر متعین کیا۔ مدینہ میں یہ خبریں اکثر مشہور ہوتی رہتی تھیں کہ آنحضرت ﷺ کے ایلاء کے واقعہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جب عتبان بن مالک نے دفعتًہ آ کر یہ کہا کہ غضب ہو گیا۔ تو انھوں نے کہا کیوں خیر ہے؟ کیا غسانی آ گئے؟ ❶

شام کے نبطی سوداگر مدینہ میں روغن زیتون بیچنے آیا کرتے تھے، انہوں نے خبر دی ❷ کہ رومیوں نے شام میں لشکر گراں جمع کیا ہے اور فوج کو سال بھر کی تنخواہیں جمع کر دی ہیں، اس فوج میں لخم، جذام اور غسان کے تمام عرب شامل ہیں اور مقدمۃ الجیش بلقاء تک آ گیا ہے ❸ مواہب لدنیہ میں طبرانی سے روایت نقل کی ہے کہ عرب کے عیسائیوں نے ہرقل کو لکھ بھیجا کہ "محمد ﷺ نے انتقال کیا اور عرب سخت قحط کی وجہ سے بھوکوں مر رہے ہیں۔" اس بنا پر ہرقل نے چالیس ہزار فوجیں روانہ کیں۔

بہر حال یہ خبریں تمام عرب میں پھیل گئیں اور قرائن اس قدر قوی تھے کہ غلط ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ سوئے اتفاق یہ کہ سخت قحط اور شدت کی گرمیاں تھیں۔ ان اسباب سے لوگوں کو گھر سے نکلنا نہایت شاق تھا۔ ❹ منافقین جو بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے ان کا پردہ فاش ہو چلا، وہ خود بھی جی چراتے تھے ❺ اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے:

﴿لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ﴾ (۹/ التوبۃ:۸۱) "گرمی میں نہ نکلو۔"

سویلم ایک یہودی تھا۔ اس کے گھر پر منافقین جمع ہوتے اور لوگوں کو لڑائی پر جانے سے روکتے چونکہ ملک پر رومیوں کے حملہ کا اندیشہ تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے تمام قبائل عرب سے فوجیں اور مالی اعانت طلب کی۔ ❻ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دو سو اوقیہ چاندی اور دو سو اونٹ پیش کئے۔ ❼

☆ ماہ رجب، ارباب سیر کا متفقہ قول ہے جو ۹ھ میں اکتوبر، نومبر میں پڑا تھا لیکن قرآن مجید میں غزوہ کا شدید گرمی میں ہونا مذکور ہے، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ غزوہ سفر طائف کے چھ ماہ بعد پیش آیا (زرقانی، ج ۳، ص: ۷۱ بحوالہ ابن حجر) اس لحاظ سے اس سفر کا گرمی کے موسم میں امکان ہے۔ ❶ (بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ التحریم، باب تبتغی مرضات ازواجك: ۴۹۱۳ وكتاب النكاح، باب موعظة الرجل ابنته لحال زوجها: ۵۱۹۱)

❷ مواهب لدنيه (مع زرقانی ج ۳، ص: ۷۲) ❸ طبقات ابن سعد، غزوات، ص: ۱۱۹۔

❹ مارگولیتھ صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ حنین میں انصار مال غنیمت سے محروم رہے تھے اس لئے وہ بے دل ہو گئے تھے کہ ہم کیا لڑیں۔ جب فوائد جنگ دوسروں کو حاصل ہوں گے لیکن یہ مارگولیتھ صاحب کا حسن ظن ہے (قرآن نے خود بتا دیا ہے تو قیاس کی کیا حاجت ہے) (س)

❺ ابن هشام، ج ۲، ص: ۳۳۲۔ ❻ ابن سعد، جزء المغازی، ص: ۱۱۹ (س) وابن هشام، ج ۲، ص: ۳۳۲، ۳۳۳۔ ❼ زرقانی، ج ۳، ص: ۷۲ (س)۔

اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بڑی بڑی رقمیں لا کر حاضر کیں تاہم بہت سے مسلمان اس بنا پر جانے سے رہ گئے کہ سفر کا سامان نہیں رکھتے تھے۔ یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور اس درد سے روئے کہ آنحضرت ﷺ کو اُن پر رحم آیا، تاہم اُن کے چلنے کا کچھ سامان نہ ہو سکا، انہی کی شان میں سورۂ توبہ کی یہ آیتیں اُتری ہیں: ❶

﴿ وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنفِقُونَ ﴾. (۹/ التوبة:۹۲)

''اور نہ ان لوگوں پر کچھ اعتراض ہے کہ جب تمہارے پاس آئے کہ ہم کو سواری دیجئے اور تم نے کہا کہ میرے پاس سواری کہاں ہے جس پر تم کو سوار کر سکوں تو وہ واپس گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ افسوس ہمارے پاس خرچ نہیں ہے۔''

آنحضرت ﷺ کا معمول تھا جب آپ ﷺ مدینہ سے تشریف لے جاتے تو کسی کو شہر کا حاکم مقرر فرما کر جاتے چونکہ اس غزوہ میں بخلاف اور معرکوں کے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن ساتھ نہیں گئی تھیں، اہل حرم کی حفاظت کے لئے کسی عزیز خاص کا رہنا ضروری تھا، اس لئے اب کے یہ منصب جناب امیر کو ملا لیکن انہوں نے شکایت کی کہ آپ ﷺ مجھ کو بچوں اور عورتوں میں چھوڑے جاتے ہیں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہ نسبت ہو جو ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھی۔'' ❷

غرض آپ ﷺ تیس ہزار فوج کے ساتھ مدینہ سے نکلے جس میں دس ہزار گھوڑے تھے۔ ❸ راہ میں وہ عبرتناک مقامات تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، یعنی قوم ثمود کے مکانات جو پہاڑوں میں تراش کر بنائے گئے تھے، چونکہ اس مقام پر عذاب الٰہی نازل ہو چکا تھا۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ کوئی شخص یہاں قیام نہ کرے، نہ پانی پئے اور نہ کسی کام میں لائے۔ ❹

تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی لیکن اصلیت سے بالکل خالی بھی نہ تھی، غسانی رئیس عرب میں ریشہ دوانیاں کر رہا تھا۔ صحیح بخاری (غزوۂ تبوک) میں جہاں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکور ہے لکھا ہے کہ شام سے ایک قاصد آیا اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو رئیس غسان کا ایک خط دیا جس میں لکھا تھا کہ میں نے سُنا ہے کہ محمد (ﷺ) نے تمہاری قدر نہ کی، اس لئے تم میرے پاس چلے آؤ، میں تمہاری شان کے موافق تم سے برتاؤ کروں گا، حضرت کعب رضی اللہ عنہ معتوب نبوی ﷺ تھے لیکن انہوں نے اس خط کو تنور میں ڈال دیا۔ ❺

❶ سیرت ابن هشام، ج ۲، ص: ۳۳۳۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی، غزوة تبوك: ٤٤١٦ وسیرت ابن هشام، ج ۲، ص: ۳۳٤۔ ❸ طبقات ابن سعد، جزء مغازی، ص: ۱۱۹۔ (س)۔

❹ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب نزول النبی ﷺ الحجر: ٤٤١٩، ٤٤٢٠؛ سیرت ابن هشام، ج ۲، ص: ۳۳٥۔ ❺ بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث کعب بن مالك: ٤٤١٨۔

تبوک پہنچ کر آنحضرت ﷺ نے بیس دن تک قیام کیا۔ ❶ ایلہ ❷ کا سردار جس کا نام یوحنا تھا، حاضر خدمت ہوکر جزیہ دینا منظور کیا۔ ❸ ایک سفید خچر بھی نذر میں پیش کیا۔ جس کے صلہ میں آنحضرت ﷺ نے اس کو ردائے مبارک عنایت فرمائی ❹ جربا اوراذرح کے عیسائی بھی حاضر ہوئے اور جزیہ پر رضامندی ظاہر کی ❺ دومۃ الجندل جو دمشق سے پانچ منزل پر ہے وہاں ایک عربی سردار جس کا نام اکیدر تھا، قیصر کے زیر اثر تھا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو چار سو (بیس) کی جمعیت کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس کو گرفتار کیا اور اس شرط پر رہائی دی کہ خود دربارِ رسالت میں حاضر ہوکر شرائط صلح پیش کرے، چنانچہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ مدینہ میں آیا۔ آپ ﷺ نے اس کو امان دی۔ ❻

تبوک سے جب آپ ﷺ واپس پھرے اور مدینہ کے قریب پہنچے تو لوگ عالم شوق میں استقبال کو نکلے یہاں تک کہ پردہ نشینانِ حرم بھی جوش میں گھروں سے نکل پڑیں اور لڑکیاں یہ اشعار گاتی نکلیں: ❼

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع

”وداع کی گھاٹیوں سے ہم پر چاند طلوع ہوا۔ جب تک خدا کا پکارنے والا کوئی دنیا میں باقی ہے ہم پر خدا کا شکر فرض ہے۔“

مسجدِ ضرار

منافقین ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ مسلمانوں میں کسی طرح پھوٹ ڈال دو، ایک مدت سے وہ اس خیال میں تھے کہ مسجد قبا کے توڑ پر وہیں ایک مسجد اس حیلہ سے بنائیں کہ جو لوگ ضعف یا کسی اور وجہ سے مسجد نبوی ﷺ میں نہ پہنچ سکیں، یہاں آ کر نماز ادا کرلیا کریں۔ ابو عامر جو انصار میں سے عیسائی ہوگیا تھا، اس نے منافقین سے کہا کہ تم سامان کرو، میں قیصر کے پاس جا کر وہاں سے فوجیں لاتا ہوں کہ اس ملک کو اسلام سے پاک کردوں۔ ❽

آنحضرت ﷺ جب تبوک تشریف لے جانے لگے تو منافقین نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ ہم نے بیماروں اور معذوروں کے لئے ایک مسجد تیار کی ہے آپ ﷺ چل کر اس میں ایک دفعہ نماز پڑھادیں تو مقبول ہوجائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس وقت میں مہم پر جارہا ہوں جب تبوک سے

---

❶ طبقات ابن سعد، ج غزوات: ۱۱۹۔ ❷ یہ مقام خلیج عقبہ کے پاس ہے۔ (مارگولیتھ)۔
❸ سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص: ۳۳۸۔ ❹ زرقانی بحوالہ ابن ابی شیبہ، ج ۳، ص: ۸۶۔ (س)۔
❺ سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص: ۳۳۸۔ ❻ طبقات ابن سعد، ج مغازی، ص: ۱۲۰۔
❼ زرقانی بحوالہ ابن جریر، (ج ۳، ص: ۹۲) (س)۔ ❽ زرقانی بحوالہ ابن جریر، (ج ۳، ص: ۹۱) (س)۔

واپس پھرے تو مالک اور معن بن عدی کو حکم دیا کہ جا کر مسجد میں آگ لگا دیں۔ 1 اسی مسجد کی شان میں یہ آیتیں اتری ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۝ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۰۷۔۱۰۸)

''اور وہ لوگ جنھوں نے ایک مسجد ضرار اور پھوٹ ڈالنے اور کفر کی غرض سے تیار کی اور اس غرض سے کہ جو لوگ پہلے سے خدا اور رسول ﷺ سے لڑتے ہیں ان کو ایک کمین گاہ ہاتھ آئے اور وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم نے صرف بھلائی کے لحاظ سے ایسا کیا اور خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹ کہتے ہیں۔ محمد (ﷺ)! تو کبھی اس مسجد میں جا کر نہ کھڑا ہو وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن سے پرہیز گاری پر رکھی گئی ہے وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تو اس میں نماز پڑھے، وہاں ایسے لوگ ہیں جن کو صفائی محبوب ہے اور خدا صفائی پسند کرنے والوں کو چاہتا ہے۔''

حج اسلام اور اعلان براءت

مکہ ۸ ھ میں فتح ہوا لیکن چونکہ ابھی تک ملک میں اچھی طرح امن وامان قائم نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اس سال مشرکین ہی کے اہتمام سے ارکان حج انجام پائے، مسلمانوں نے حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو مکہ کے امیر مقرر ہوئے تھے۔ فریضۂ حج ادا کیا، اب ۹ ھ پہلا موقع ہے کہ کعبہ کفر و شرک کی ظلمت سے پاک ہو کر عبادت ابراہیمی کا مرکز قرار پاتا ہے۔ غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد ذیقعدہ یا ذوالحجہ ۹ ھ میں آنحضرت ﷺ نے تین سو مسلمانوں کا ایک قافلہ مدینہ منورہ سے حج کے لئے روانہ فرمایا، ان میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ قافلہ سالار، حضرت علی رضی اللہ عنہ نقیبِ اسلام اور حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت جابر اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم 2 وغیرہم معلم تھے۔ قربانی کے لئے (آنحضرت ﷺ کی طرف سے) بیس اونٹ ساتھ تھے۔

قرآن نے اس حج کو حج اکبر کہا ہے 3 کہ یہ پہلا موقع تھا کہ رسم حج ابراہیمی سنت میں جلوہ گر ہوئی۔

---

1 سیرت ابن هشام، ج ۲، ص: ۳۴۱، زیادہ تفصیل زرقانی علی المواهب، ج ۳، ص: ۹۰، ۹۱ پر ہے۔

2 بخاری، کتاب الحج، باب لایطوف بالبیت عریان: ۱۶۲۲ کتاب المغازی، باب حج ابی بکر بالناس: ۴۳۶۳ وکتاب التفسیر تفسیر سورة براءة، باب قوله: ﴿فسيحوا في الارض﴾ الخ: ۴۶۵۵ و باب قوله: ﴿واذان من الله﴾ الخ: ۴۶۵۶ وباب قوله: ﴿الا الذين عاهدتم﴾: ۴۶۵۷ وصحیح مسلم، کتاب الحج، باب لا یحج البیت مشرك الخ: ۳۲۸۷۔

3 سورۂ توبہ میں ہے کہ ﴿يوم الحج الاكبر﴾ مصنف نے اس حج کو حج اکبر کہنے کی جو توجیہ لکھی ہے اس کو بھی گو بعض علما نے اختیار کیا ہے لیکن عام خیال یہ ہے کہ خاص اسی سال کے حج کو حج اکبر نہیں کہا گیا ہے بلکہ ہر حج عمرہ کے مقابلہ میں حج اکبر ہے اور عمرہ حج اصغر ہے، ملاحظہ ہو روح المعانی، ج ۱۰، ص: ۴۲ (س)۔

اس حج کا مقصد یہ تھا کہ خانۂ خلیل میں عہد جاہلیت کے اختتام اور حکومت اسلام کی ابتدا کا اعلان کیا جائے۔ مناسک ورسوم حج کی عام طور سے تعلیم دی جائے۔ زمانہ جاہلیت کے رسوم و عادات کا ابطال کیا جائے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مناسک حج کی لوگوں کو تعلیم دی، یوم النحر میں خطبہ دیا جس میں حج کے مسائل بیان کئے، اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے۔ سورۂ براءت کی ۴۰ آیتیں پڑھ کر سنائیں اور اعلان کردیا کہ اب کوئی مشرک خانہ کعبہ میں داخل نہ ہو سکے گا۔ نہ کوئی برہنہ اب حج کرنے پائے گا اور وہ تمام معاہدے جو مشرکین سے تھے، ان کے نقض عہد کے سبب سے آج سے چار مہینے کے بعد ٹوٹ جائیں گے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ نے اس اعلان کی اس زور زور سے منادی کی کہ گلا پڑ گیا [1] سورۂ براءت کی ابتدائی آیتیں جس میں اللہ نے اس کا حکم فرمایا وہ یہ ہیں: [2]

﴿ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـــًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۔۴)

''اے مسلمانو! جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا تھا (اور انہوں نے اپنا معاہدہ توڑ دیا) ان کی خدا اور، خدا کے رسول کی طرف سے کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اب (اے معاہدہ شکن مشرکو!) چار مہینے کی تم کو مہلت ہے اس میں تم ملک میں چلو پھرو اور جان لو کہ تم خدا کو عاجز نہ کرسکو گے حج اکبر کے دن لوگوں کو اعلان عام ہے کہ خدا اور اس کا رسول ان مشرکین کا اب ذمہ دار نہیں اگر (تم نے اے مشرکین!) توبہ کرلی تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر اب بھی پھرے رہو تو یقین کرو کہ تم خدا کو ہرا نہ سکو گے اے پیغمبر! تو کافروں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دے لیکن وہ مشرکین جن سے تم نے معاہدہ کیا اور انہوں نے اس کے ایفا میں تمہارے ساتھ کچھ کمی نہ کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں انہوں نے تمہارے دشمنوں کی مدد کی تو زمانہ معاہدہ کو تم پورا کرو۔

[1] مسند ابن حنبل، ج ۲، ص: ۲۹۹۔ عام تفصیل زرقانی، ج ۳، ص: ۱۰۲ وغیرہ میں موجود ہے (س)

[2] ان آیات میں یہ بیان ہے کہ مسجد حرام کے پاس (صلح حدیبیہ میں) جو معاہدے ہوئے تھے، وہ ٹوٹ گئے لیکن یہ معاہدے تو فتح مکہ سے پہلے ہی ٹوٹ گئے تھے اور اس کے بعد کفار سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا۔ مصنف نے اس بنا پر اپنے ایک مکتوب ۔مکاتیب شبلی، حصہ دوم مکتوب نمبر ۳۷، ص: ۵۱، ۵۲) میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ آیتیں ۸ھ میں فتح مکہ کے وقت نازل ہوئی ہوں گی اور شاید اسی لئے مصنف نے یہ واقعات قلم انداز کردیے ہیں لیکن خاکسار جامع کا خیال یہ ہے کہ ممکن ہے کہ معاہدہ کے متعلق یہ آیتیں گو ۸ھ میں نازل ہوئی ہوں لیکن ان کا عام اعلان مع دیگر ضروری احکام کے جیسا کہ صحاح ستہ کی مستند روایات میں مذکور ہے ۹ھ کے موسم حج میں ہوا ہو۔ (س)۔

خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔“

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ ﴾

(۹/ التوبة:۲۸)

”اے مسلمانو! مشرکین تو ناپاک ہیں اب وہ اس سال کے بعد کعبہ کے قریب نہ آئیں۔“

(طبری نے بواسطہ سدی روایت کی ہے کہ اس اعلان کے بعد کفار عام طور سے مسلمان ہو گئے ❶)

واقعات متفرقہ

(نو سال کے بعد اب ملک میں امن وامان کا دور شروع ہوا۔ اب حصولِ دولت کے مواقع حاصل تھے۔ اس بنا پر زکوٰۃ کا حکم اس سال نازل ہوا اور تحصیل زکوٰۃ کے لئے عمال قبائل میں مقرر ہوئے۔ ❷

اسلام کے سایہ میں بعض غیر مسلم قومیں بھی داخل ہو چکی تھیں، ان کے جزیہ کی یہ آیت اتری:

﴿ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبة:۲۹)

”تا آنکہ چھوٹے بن کر وہ جزیہ نہ ادا کریں۔“

سود کی تحریم بھی اسی سال نازل ہوئی اور اس کے ایک سال بعد ۱۰ھ میں حجۃ الوداع میں آنحضرت ﷺ نے اس کا اعلان عام فرمایا۔

نجاشی ❸ جس کے ظل حمایت میں مسلمانوں نے چند سال حبشہ میں بسر کئے، اس نے امسال انتقال کیا، آنحضرت ﷺ نے اس کی وفات کا خود اعلان فرمایا کہ مسلمانو! آج تمہارے برادر صالح اصحمہ نے وفات پائی، اس کے لئے دعائے مغفرت مانگو۔ اس کے بعد نجاشی کے لئے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی)۔

❶ ج ٤، ص: ۱۷۲۱۔(س) ❷ طبری، ج ٤، ص: ۱۷۲۲۔(س)۔

❸ تاریخ طبری، ج ٤، ص: ۱۷۲۰۔ غائبانہ نماز جنازہ کا ذکر صحیح بخاری اور دوسری کتب حدیث میں ہے۔

غزوات پر دوبارہ نظر

کتاب کا یہ حصہ سادہ سوانح زندگی پر محدود ہے۔ بحث و تدقیقات اور رفع شکوک کے لئے دوسرے حصے ہیں، اس بنا پر مناسب یہ تھا کہ غزوات کے متعلق جو مباحث ہیں، انہی حصوں میں لکھے جاتے لیکن کتب سیر میں کثرت اور اہمیت دونوں حیثیتوں سے جو واقعات زیادہ تر نمایاں ہیں، صرف غزوات ہیں، اگر صرف تصانیف سیرت کو پیش نظر رکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تمام تر سوانح عمری غزوات ہی کا نام ہے، چنانچہ پہلے سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ سیرت نہیں بلکہ مغازی ہی کے نام سے مشہور ہیں، مثلاً: مغازی ابن عقبہ، مغازی ابن اسحاق، مغازی واقدی یہ انداز تحریر آج تک چلا آیا، اس لئے اگر یہ طرز بالکل بدل دی جائے تو جو شخص کوئی قدیم تصنیف پہلے پڑھ چکا ہوگا وہ اس جدید تصنیف کو پڑھ کر سمجھے گا کہ سیرت کے بجائے کوئی اور چیز پڑھ رہا ہے۔ ان اسباب سے ہم کو بھی غزوات کو تفصیل سے لکھنا پڑا، لیکن غزوات کو پڑھ کر جو سوالات دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں ان کو دوسرے موقع کے لئے اٹھا رکھنا ناظرین کے اضطراب کا باعث ہوگا۔

غیر مذہب والوں نے غزوات کے مقاصد اور اسباب کے سمجھنے میں سخت غلطیاں کی ہیں، نہ صرف بدنیتوں نے، بلکہ نیک دلوں نے بھی۔ لیکن یہ تعجب کی بات نہیں، اسباب ایسے جمع ہیں کہ اس قسم کی غلطیوں پر نہ صرف دوستوں کو بلکہ دشمنوں کو بھی معذور رکھ سکتے ہیں۔

عرب اور جنگ و غارت گری

اس باب میں سب سے مقدم اور سب سے اہم اس حقیقت کا معلوم کرنا ہے کہ عرب کی قومیت کو "جنگ و غارت گری" سے کیا تعلق ہے؟ ہر قوم کے اخلاق و عادات، رسوم و معاملات، محاسن و اوصاف، معائب و مثالب، غرض اس کی کل قومی زندگی کا ایک خاص اساس الامر ہوتا ہے کہ سب چیزیں اسی سے بنتی اور اسی سے نشو و نما پاتی ہیں، عرب میں یہ چیز جنگ و غارت گری تھی، اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ عرب ایک ویران ملک تھا، کسی قسم کی پیداوار وہاں نہیں ہوتی تھی لوگ ان پڑھ اور جاہل تھے، خورش اور پوشش کا قدرتی سامان صرف بھیڑ بکریاں اور اونٹ تھے کہ ان کا دودھ اور گوشت کھاتے اور بالوں کو بن کر کمبل بناتے تھے لیکن یہ جائیداد بھی ہر شخص کو نصیب نہ تھی، یا تھی تو بقدر ضرورت نہ تھی، اس لئے حملہ اور غارت گری شروع ہوئی اور معاش کا سب سے بڑا بلکہ تنہا ذریعہ غارت گری قرار پایا، ابو علی قالی نے کتاب الامالی میں لکھا ہے: [1]

وذلك انهم كانوا يكرهون ان تتوالى عليهم ثلاثة اشهر لا تمكنهم الا غارة فيها لان معاشهم كان من الاغارة۔

"یہ اس لئے کہ وہ ناپسند کرتے تھے کہ ان پر تین ماہ متواتر اس طرح گزر جائیں کہ ان میں وہ

---

[1] کتاب الامالی، ج ۱، ص ٦ مطبوعہ مصر۔

غارت گری نہ کرسکیں کیونکہ ان کا ذریعہ معاش یہی تھا۔''

چونکہ لوٹ میں زیادہ تر بکریاں ہاتھ آتی تھیں اور بکری کو عربی میں ''غنم'' کہتے ہیں اس لئے لوٹ کے مال کو عربی میں ''غنیمت'' کہنے لگے۔ ❶ اس لفظ نے پھر یہ وسعت حاصل کی کہ قیصر و کسریٰ کا تاج و تخت لٹ کر آیا تو اسی نام سے پکارا گیا۔

رفتہ رفتہ یہی لفظ عربی قوم، عربی زبان اور عربی تاریخ کا سب سے زیادہ محبوب، سب سے زیادہ نمایاں اور سب سے زیادہ وسیع الاثر لفظ بن گیا آج بھی ایک سلطان، ایک رئیس، ایک شیخ القبائل اپنے عزیز و اقارب کو سفر کے وقت رخصت کرتا ہے تو کہتا ہے، سالما غانما ''یعنی سلامت آنا اور لوٹ کر لانا۔'' ہماری زبان میں سب سے عزیز چیز کو جو ''غنیمت'' کہتے ہیں، (مثلاً آپ کا تشریف لانا نہایت غنیمت ہے) یہ وہی لفظ ہے اور عربی زبان سے آیا ہے۔

ضرورت معاش کی وجہ سے تمام عرب میں غارت گری اور جنگ عام ہوگئی تھی، تمام قبائل ایک دوسرے پر ڈاکہ ڈالتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے، صرف حج کے زمانہ میں مذہبی خیال سے چار مہینے مخصوص کر دیے تھے، جن کو ''اشہر حرم'' کہتے تھے، ان مہینوں میں لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں لیکن متصل تین تین مہینہ تک معاش کا معطل رہنا سخت گراں تھا، اس لئے ''نسی'' ایک رسم ایجاد کرلی تھی، یعنی ان مہینوں کو حسب ضرورت دوسرے مہینوں سے بدل لیتے تھے۔

حافظ ابن حجر، صحیح بخاری کی شرح (تفسیر سورۂ توبہ) میں لکھتے ہیں:

كانوا يجعلون المحرم صفرا و يجعلون صفرا المحرم لئلا يتوالى عليهم ثلاثة اشهر لا يتعاطون فيها القتال۔ الخ ❷

''وہ محرم کو صفر اور صفر کو محرم کر دیا کرتے تھے، تاکہ پے در پے تین مہینے تک لڑائی سے محروم نہ ہو جائیں۔''

ثار کا عقیدہ

لڑائی کا اصلی ابتدائی سبب یہ تھا لیکن جب یہ سلسلہ چھڑا تو اور اور اسباب بھی پیدا ہو گئے اور یہ اسباب اہمیت اور وسعت کے لحاظ سے اصلی سبب سے کم نہ تھے، ان میں سب سے مقدم اور شدید الاثر ثار کا قانون تھا، یعنی جب کسی قبیلہ کا کوئی شخص کسی موقع پر قتل ہو جاتا تھا تو مقتول کے قبیلہ کو اس کا انتقام لینا فرض ہو جاتا تھا، گو سینکڑوں برس گزر جاتے تھے اور قاتل بلکہ اس کے خاندان کا نام و نشان مٹ جاتا تھا تاہم جب تک قاتل کے قبیلے کے ایک آدمی کو قتل نہیں کر لیتا تھا قومی فرض سے ادا نہیں ہو سکتا تھا، اسی کو ثار کہتے ہیں اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک معمولی قتل پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس تک مسلسل لڑائیاں قائم ہو جاتی تھیں، اسی طریقہ کے ابطال کا

❶ یہ مصنف کی ذاتی تحقیق ہے جس کی تائید کتب لغت سے ہاتھ نہیں آئی۔ (س) ❷ (ج ۸، ص: ۲٤٤)

آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع میں اعلان کیا تھا اور اپنے قبیلہ کے قاتلوں کا خون معاف کر دیا تھا، لیکن صحرا نشین عربوں میں آج تک یہ طریقہ قائم اور ان کے قومی خصائص کا جزو اعظم ہے۔

ثار کے متعلق عجیب عجیب قسم کے معتقدات پیدا ہو گئے تھے، مثلاً: یہ کہ مقتول جب مرجاتا ہے تو اس کی روح پرند بن جاتی ہے اور جب تک اس کا انتقام نہیں لیا جاتا، مقام قتل پر شور کرتی رہتی ہے کہ ''مجھ کو پلاؤ میں پیاسی ہوں'' اس پرند کو صدیٰ یا ہامہ کہتے تھے۔

ابودواد ایادی کہتا ہے:

سلط الموت والمنون علیهم فلهم فی صدی المقابر هام ❶

''ان پر موت مسلط ہوگئی اور مقبروں کے ''صدیٰ'' میں ان کے لئے ''ہام'' ہے۔''

ذوالاصبع العدوانی کا شعر ہے:

یا عمرو ان لا تدع شتمی و منقصتی اضربك حیث تقول الهامة اسقونی ❷

''اے عمرو! اگر تو مجھ کو گالی دینا اور میری تحقیر کرنا نہ چھوڑے گا تو میں تجھ کو اس طرح ماروں گا کہ ہامہ کہے گی کہ مجھ کو سیراب کرو۔''

ایک یہ خیال تھا کہ جس مقتول کا انتقام نہیں لیا جاتا اس کی قبر میں ہمیشہ اندھیرا رہتا ہے، عمرو بن معدی کرب کی بہن مقتول کی زبان سے کہتی ہے:

واترك فی قبر بصعدة مظلم ❸ خون بہا لوگے تو میں اندھیری قبر میں پڑا رہوں گا۔

اسی بنا پر خون بہا لینے کو عیب سمجھتے تھے، اسی شاعرہ کا مصرع ہے:

و مشوا باذان النعام المثلم ❹ اور خون بہا لینا ہے تو بوچے شتر مرغ کا کان پکڑ کر لے جاؤ۔''

غیرت اور حمیت کی بنا پر اس بات کو عیب سمجھتے تھے کہ مقتول پر نوحہ کیا جائے:

ولا تراهم وان جلت مصیبتهم مع البكاة علی من مات یبكونا ❺

''گو کتنی ہی بڑی مصیبت ہو لیکن ان کو مرنے والے پر روتا ہوا نہ دیکھو گے۔''

عمرو بن کلثوم

معاذ الا له ان ینوح نساء نا علی هالك اوان نضجّ من القتل ❻

❶ لسان العرب، ج۳، ص:۸٤٦ لفظ هام دار لسان العرب بیروت۔ ❷ کتاب الاغانی ذکر ذی الاصبع العدوانی، الخ، ج۳، ص:۹۔ ❸ دیوان الحماسة، باب الحماسة جزء اول، ص:۷۱ شاعرہ کا نام کبشہ ہے۔
❹ ایضا، ص:۷۲۔ ❺ دیوان الحماسة، باب الحماسة جزء اول، ص:۷۲، مطبع سعادة مصر: ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء یہ شعر بنی قیس بن ثعلبہ کے کسی شخص کا ہے۔
❻ شعراء النصرانية، القسم الثانی فی شعراء نجد والحجاز، ص: ۲۰٤ بیروت: ۱۸۹۰ء۔

''اللہ نہ کرے کہ ہماری عورتیں مقتول پر نوحہ کریں یا ہم قتل سے گھبرا جائیں۔''

مقتول پر نوحہ کرتے تھے تو اس وقت کرتے تھے جب خون کا انتقام لے لیتے تھے:

من كان مسرورا بمقتل مالكٍ فليات نسو تنا بوجه نهار

''جو شخص مالک کے قتل سے خوش تھا وہ دن کو ہماری عورتوں کے پاس آئے۔''

يجد النساء حوا سراً يندبنه يلطمن اوجههن بالاسحار [1]

''وہ دیکھے گا کہ عورتیں ننگے سر نوحہ کر رہی ہیں اور صبح کو اپنے چہروں پر دوہتر مار رہی ہیں۔''

ایک خیال یہ تھا کہ جو شخص زخم کھا کر مرتا ہے اس کی روح زخم کی راہ سے نکلتی ہے، ورنہ ناک کی راہ سے نکلتی ہے اور یہ نہایت عیب سمجھا جاتا تھا، اسی بنا پر بیماری سے مرنے کو ''حتف انف'' کہتے تھے، یعنی ''ناک کی موت'' اور ایسے مرنے کو نہایت عار سمجھتے تھے:

وما مات منا سيد حتف انفه ولا طل مناحيث كان قتيل [2]

''ہمارا کوئی سردار ناک کی راہ سے نہیں مرا اور نہ ہمارے کسی مقتول کا خون ہدر ہوا۔''

رفتہ رفتہ عرب کے تمام قومی مفاخر اور اخلاق و عادات کا اصلی محور جنگ بن گیا۔ یعنی ان کے اوصاف و اخلاق میں جس چیز کا اصلی سبب تلاش کیا جائے یہی چیز نکلتی تھی، یہی چیز تھی جس نے ایک مدت تک قبائل عرب کو اسلام لانے سے باز رکھا۔ حضرت عمرو بن مالک رضی اللہ عنہ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: ''بنو عقیل پر ہمارا اثار باقی ہے وہ لے لیں تو اسلام لائیں۔'' چنانچہ اسی وقت بنو عقیل پر جو اسلام لا چکے تھے حملہ آور ہوئے اور خود حضرت عمرو بن مالک رضی اللہ عنہ نے اس میں شرکت کی گو پھر ان کو بہت ندامت ہوئی کہ ان کے ہاتھ سے ایک مسلمان مارا گیا۔ [3]

لوٹ کا مال

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، لڑائیوں کی اصل بنیاد ضرورت معاش سے شروع ہوئی تھی، اس لئے عرب کے نزدیک مال غنیمت سے زیادہ کوئی شے محبوب نہ تھی اور ذرائع معاش میں سب سے زیادہ حلال وطیب اسی کو سمجھتے تھے، یہ خیال اس قدر دلوں میں راسخ اور رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا کہ اسلام کے بعد بھی ایک مدت تک قائم رہا اور جس طرح شارع نے ممنوعات شرعیہ کو بتدریج حرام اور ممنوع کیا تھا غنیمت کے متعلق نہایت تدریج اور آہستگی سے کام لینا پڑا۔

شراب کو جب شارع نے حرام کرنا چاہا تو پہلے یہ آیت اتری:

---

[1] ديوان الحماسة ، جزء اول ، باب المراثي ، ص: ٤١٣ یہ دونوں شعر ربیع بن زیاد کے ہیں۔

[2] ديوان الحماسة ، جزء اول ، باب الحماسة ، ص: ٢٩ یہ شعر سموال بن عادیا کا ہے۔

[3] اصابه في تمييز الصحابه ، ذكر عمرو بن مالك ، ج٣ ، ص: ١٣ ، (س)۔

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ ﴾. (۲/ البقرۃ:۲۱۹)

''لوگ تجھ سے شراب اور قمار کی بابت پوچھتے ہیں کہہ دے کہ دونوں میں بڑا گناہ ہے۔''

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

اللھم بین لنافی الخمر بیانا شافیا۔ ❶ ''اے اللہ شراب کے متعلق ہم کو صاف احکام بتا۔''

پھر یہ آیت اتری: ﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى ﴾ (٤/ النسآء:٤٣) ''نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔''

چنانچہ نماز کا وقت آتا تو آنحضرت ﷺ کے حکم سے ایک شخص منادی پکارتا کہ کوئی شخص نشہ میں نماز کو نہ آئے۔

پھر یہ آیت اتری:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ ﴾

(٥/ المآئدۃ:٩٠۔٩١)

''مسلمانو! شراب، جوا، انصاب، فال کے تیر، یہ سب ناپاک اور شیطان کے کام ہیں، تو ان سے بچو کہ غالباً تم فلاح پاؤ گے، شیطان تو صرف یہ چاہتا ہے کہ شراب اور قمار کے ذریعہ سے تم لوگوں میں عداوت اور بغض ڈالے اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روکے تو تم باز آؤ گے؟'' ❷

باوجود اس کے آنحضرت ﷺ نے شراب کی حرمت کے متعلق اس قدر تاکید وتصریح کی ضرورت خیال کی کہ جس قسم کے برتنوں میں شراب پیتے تھے تڑوا دیے۔ لوگوں نے عرض کی کہ شراب کا سرکہ بنالیں، اس سے بھی منع فرمایا، ❸ ان سب باتوں پر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بعض لوگوں نے شرابیں پیں اور جب ان سے بازپرس کی گئی تو انہوں نے نیک نیتی سے کہا کہ نیک اور اچھے آدمیوں کے لئے شراب کہاں حرام ہے؟ قرآن مجید میں خود شراب کی حرمت کے بعد یہ تصریح موجود ہے:

﴿ لَيْسَ عَلَي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا ﴾ (٥/ المآئدۃ:٩٣)

---

❶ ابوداود، کتاب الاشربة، باب تحریم الخمر: ٣٦٧٠۔ ❷ مسند امام احمد بن حنبل، مطبوعہ مصر ج۱ ص: ۵۳ وابو داود، کتاب الاشربة، باب تحریم الخمر ٣٦٧٠۔ (س)۔ ❸ برتنوں کے استعمال کی ممانعت آپ نے قبیلہ عبدالقیس کے وفد کو کی تھی جس کا ذکر صحیح بخاری ومسلم کے مختلف ابواب میں مذکور ہے۔ دیکھو بخاری، کتاب الایمان، باب اداء الخمس من الایمان:۵۳ ومسلم، کتاب الایمان، باب الامر بالایمان باللّٰہ ورسولہ الخ: ١١٥، ١١٦ برتنوں کے توڑنے کا ذکر صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب تحریم الخمر: ٥١٣٨ پر اور شراب کے سرکہ بنانے کی حرمت بھی مسلم کی اسی کتاب کے باب تحریم تخلیل الخمر (٥١٤٠) میں وارد ہے۔

''جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے انہوں نے جو کچھ کھایا (یعنی شراب پی) ان پر کچھ الزام نہیں۔''

اس موقع پر بہت سے صحابہ موجود تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف دیکھا کہ اس آیت سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ ان صحابہ کی نسبت ہے جو شراب کی حرمت نازل ہونے سے پہلے مر گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تصدیق کی اور ان لوگوں کو سزا دی۔ چنانچہ یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ تاریخ طبری میں مذکور ہے۔ [1]

اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ جب کوئی چیز زمانۂ دراز سے رسم و عادت میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کے آثار اور مخفی نتائج مدتوں تک قائم رہتے ہیں اور غنیمت کا بھی یہی حال ہے۔

سب سے پہلے جنگ بدر میں قبل اس کے کہ مالِ غنیمت یکجا جمع کیا جاتا لوگ غنیمت میں مصروف ہو گئے۔ اس پر یہ آیت اتری:

﴿ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۝﴾ (۸/ الانفال:۶۸)

''اگر اللہ کی طرف سے پہلے سے حکم نہ ہو چکا ہوتا تو جو کچھ کیا اس پر تم کو عذاب ہوتا۔''

چنانچہ صحیح ترمذی تفسیر انفال میں یہ واقعہ بہ تصریح مذکور ہے آنحضرت ﷺ نے اعلان فرمایا تھا کہ ''جو شخص کسی کافر کو قتل کرے گا اس کا مال و اسباب قاتل کو ملے گا۔'' اس بنا پر لوگوں نے مسلوبہ مال کا دعویٰ کیا، جو صحابہ رضی اللہ عنہم خود لڑے نہ تھے بلکہ علم اور رایت کے محافظ تھے ان کا دعویٰ تھا کہ اس میں ہمارا بھی حق ہے اس پر یہ آیت اتری:

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ﴾ (۸/ الانفال:۱)

''لوگ تجھ سے غنیمت کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دے غنیمت اللہ اور رسول کی ہے۔'' [2]

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ مجاہدین مالِ غنیمت کا خود دعویٰ نہیں کر سکتے اس کی تقسیم آنحضرت ﷺ کے اختیار میں ہے جس طرح آپ چاہیں تقسیم فرمائیں۔ اس سے اتنا ہوا کہ لڑائیوں میں ہر شخص خود لوٹ کر جو چیز چاہتا تھا، لیتا تھا، بند ہو گیا لیکن میدان جنگ کے علاوہ اور موقعوں پر لوٹنا مدتوں موقوف نہیں ہوا۔ سنن ابی داؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں شریک تھے، بھوک کی سخت تکلیف ہوئی، اتفاقاً سامنے بکریاں نظر پڑیں، ان کو لوٹ لائے اور ذبح کر کے ہانڈیاں چڑھا دیں آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ تشریف لائے اور کمان جو ہاتھ میں تھی اس سے دیگچیاں الٹ دیں اور فرمایا کہ ''لوٹ کی چیز مردہ سے بڑھ کر حلال نہیں۔'' [3]

[1] ازالۃ الخفاء مقصد دوم، ص: ۲۱۳ پر بھی بہ روایت حاکم مذکور ہے۔ [2] سنن ابی داود، کتاب الجھاد، باب النفل: ۲۷۳۸، ۲۷۴۰۔ [3] کتاب الجھاد، باب فی النھی عن النھبی: ۲۷۰۵۔

خیبر کی لڑائی ۷ ھ میں ہوئی اس وقت تک یہ حال تھا کہ امن کے بعد لوگوں نے یہودیوں کے جانور اور پھل لوٹ لئے اس پر آنحضرت ﷺ کو نہایت غصہ آیا، آپ نے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کیا اور فرمایا:

((ان اللّٰہ تعالٰی لم یحل لکم ان تدخلوا بیوت اھل الکتاب الا باذن ولا ضرب نسائھم ولا اکل ثمارھم اذا اعطوکم الذی علیھم)). [1]

''اللہ نے تم لوگوں کے لئے یہ جائز نہیں کیا کہ اہل کتاب کے گھروں میں گھس جاؤ (مگر یہ اجازت) اور نہ یہ کہ ان کی عورتوں کو مارو، نہ یہ کہ ان کے پھل کھا جاؤ، جب کہ وہ تم کو وہ ادا کریں جو ان پر فرض ہے۔''

آنحضرت ﷺ چاہتے تھے کہ غنیمت کے ساتھ لوگوں کا جو شغف ہے کم ہو جائے لیکن مدت تک غنیمت کی محبت اور وارفتگی نہ گئی۔ غزوۂ احد میں صرف اس وجہ سے شکست ہوئی کہ آنحضرت ﷺ نے اگرچہ تیراندازوں کو سخت تاکید فرما دی تھی کہ گو لڑائی کی کچھ حالت ہو تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا۔ تاہم جو فتح ہوئی تو لوگ بے اختیار لوٹ میں مصروف ہو گئے، ان کا ہٹنا تھا کہ دشمن نے موقع پا کر پشت کی طرف سے حملہ کر دیا حنین میں بھی شکست کی اصلی وجہ یہی تھی کہ قبل از وقت لوگوں نے غنیمت لوٹنی شروع کر دی تھی۔

''غنیمت'' اس قدر محبوب تھی کہ بعض صاحبوں کو کسی کافر کے مسلمان ہونے پر اس بنا پر رنج ہوا کہ اسلام لانے کی وجہ سے اس کا مال نہ مل سکا۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے ایک سریہ میں حملہ کرنا چاہا، قبیلہ والے روتے ہوئے آئے، انہوں نے کہا لا الہ الا اللہ کہو تو تمہاری جان اور مال بچ جائے گا، انہوں نے لا الہ الا اللہ کہا اور ان کو امن دے دیا گیا۔ جب یہ اپنے ساتھیوں میں آئے تو لوگوں نے ان کو ملامت کی کہ

احرمتنا الغنیمۃ [2] ''تم نے ہم کو غنیمت سے محروم کر دیا۔''

آنحضرت ﷺ کے پاس جب یہ لوگ گئے تو آپ ﷺ نے ان صحابی کی تحسین کی اور فرمایا: ''تم کو ایک ایک آدمی کے بدلے (جس کو تم نے چھوڑ دیا) اس، اس قدر ثواب ملے گا۔''

سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ تھی کہ مدت تک لوگ یہ سمجھے کہ غنیمت حاصل کرنا ثواب کا کام ہے۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ایک شخص جہاد پر جانا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کچھ مال ہاتھ آئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔'' یہ جواب انہوں نے آ کر لوگوں سے بیان کیا تو لوگوں کو بہت تعجب ہوا اور ان سے کہا کہ تم نے آنحضرت ﷺ کا مطلب نہیں سمجھا پھر جا کر پوچھو۔ انہوں نے دوبارہ پوچھا اور وہی جواب ملا، لوگوں نے پھر ان کو بھیجا اور پھر

---

[1] سنن ابی داود، کتاب الخراج، باب فی تعشیر اھل الذمۃ اذا اختلفوا بالتجارۃ: ۳۰۵۰۔

[2] ابو داود، کتاب الادب، باب ما یقول اذا اصبح: ۵۰۸۰۔

آنحضرت ﷺ نے یہی فرمایا کہ اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔ ❶

اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں۔

جنگ میں وحشیانہ افعال

عرب میں لڑائیوں کی شدت اور وسعت نے نہایت وحشیانہ رسمیں قائم کر دی تھیں جن میں سے چند کی تفصیل یہ ہے:

① اسیران جنگ کو جب قتل کرتے تھے تو چھوٹے چھوٹے بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کرتے تھے بلکہ آگ میں جلا دیتے تھے۔

② غفلت یا نیند کی حالت میں دفعتہً دشمن پر جا پڑتے تھے اور قتل و غارت گری شروع کر دیتے تھے، یہ طریقہ عام اور کثرت سے رائج تھا۔ بہت سے بہادر اس خاص طریقہ میں زیادہ ممتاز تھے۔ اور ان کو فاتک یا فتاک کہتے تھے، تابط شرا، سلیک، ابن السلکہ اسی قسم کے لوگ تھے۔

③ زندوں کو آگ میں جلا دیتے تھے۔ عمرو بن ہند (عرب کا ایک بادشاہ تھا) کے بھائی کو جب بنوتمیم نے قتل کر دیا تو اس نے منت مانی کہ ایک کے بدلے سو آدمیوں کو قتل کروں گا۔ چنانچہ بنوتمیم پر حملہ کیا، وہ لوگ بھاگ گئے، صرف ایک بڑھیا رہ گئی تھی جس کا نام حمرا تھا، اس کو گرفتار کر کے زندہ آگ میں ڈال دیا، اتفاق یہ کہ ایک سوار جس کا نام عمار تھا آ نکلا، عمرو نے پوچھا: تو کیوں آیا؟، اس نے کہا: میں کئی دن کا بھوکا تھا، دھواں اٹھتے دیکھا تو سمجھا کھانا ہوگا، عمرو نے حکم دیا کہ وہ بھی آگ میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ جریر نے اپنے شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے: ❷

واخزاکم عمرو کما قد خزیتھم　　　وادرك عمار اشقی البراجم

④ بچوں کو نشانہ بنا کر تیروں سے مارتے تھے، داحس اور غبراء کی لڑائیوں میں قیس نے بنوذبیان کے پاس اپنے بچے ضمانت کے طور پر رکھے تھے، حذیفہ نے جو بنوذبیان کا رئیس تھا۔ ان بچوں کو لیجا کر ایک وادی میں کھڑا کیا اور ان کو نشانہ بنا کر قدر اندازی کرتا تھا، اتفاق سے کوئی لڑکا نہ مرا تو دوسرے دن پر اٹھا رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ دوسرے دن یہ تفریح انگیز چاند ماری پھر شروع ہوتی تھی ❸ اور لوگ یہ تماشہ دیکھتے تھے۔

⑤ قتل کا ایک یہ طریقہ تھا کہ ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء کاٹ کر چھوڑ دیتے تھے کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتا۔ غطفان اور عامر کی لڑائی میں اسی خوف سے حکم بن الطفیل نے اپنے آپ کو خود گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔ جیسا کہ عقد الفرید میں بہ تفصیل مذکور ہے۔ ❹

عرینہ کے لوگ جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بظاہر اسلام لا کر آنحضرت ﷺ کے غلام کو پکڑ

---

❶ ابو داود، كتاب الجهاد، باب فى من يغزو و يلتمس الدنيا: ٢٥١٦۔ ❷ مجمع الامثال كرمانى، مطبوعہ آقائے میر محمد باقر طہرانی، ایران: ۱۲۹۰ھ، ص: ۲۴۳۔ ❸ مجمع الامثال، ص: ٤٧٧۔ ❹ ج ٣، ص: ٥٢، ٥٣۔

لے گئے تو اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے، پھر ان کی آنکھوں اور زبان میں کانٹے چبھوئے یہاں تک کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ ❶

⑥ مرنے کے بعد بھی انتقام کا جوش طرح طرح کی نفرت انگیز صورتوں میں ظاہر ہوتا تھا، مردوں کے ہاتھ، پاؤں، کان اور ناک وغیرہ کاٹ لیتے تھے، ہند نے جنگ احد میں اسی رسم کے موافق حضرت حمزہ اور دیگر شہداء رضی اللہ عنہم کے اعضاء کاٹ کر ہار بنایا اور گلے میں پہنا تھا۔ ❷

⑦ منت مانتے تھے کہ دشمن پر قابو ہاتھ آئے گا تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔ سلافہ کے دو بیٹے جنگ احد میں عاصم کے ہاتھ سے مارے گئے تھے، اس بنا پر سلافہ نے منت مانی کہ عاصم کی کھوپڑی میں شراب ڈال کر پئے گی۔ ❸ یہ بھی معمول تھا کہ مقتول کا کلیجہ نکال کر کھا جاتے تھے، ہند نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ جو نکال کر چبا لیا تھا، اس کا حال اوپر گزر چکا ہے۔

⑧ حاملہ عورتوں کا پیٹ چاک کر ڈالتے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ عامر بن طفیل عرب کا مشہور بہادر اور رئیس ہوازن کہتا ہے:

بقرنا الحبالی من شنوء ۃ بعد ما خبطن بفیف الریح نھدا و خثعما ❹

غزوات نبوی ﷺ کے اسباب اور انواع ❺

تفصیل مذکورہ بالا کے بعد اب ہم اس واقعہ کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ غزوات نبوی کن اسباب سے وجود میں آئے اور شارع علیہ السلام نے طریقہ قدیم میں کیا اصلاحیں فرمائیں۔ مؤرخین نے ''غزوہ'' کے لفظ کو اس قدر وسعت دی ہے کہ امن وامان قائم رکھنے کے لئے دو چار آدمی بھی کہیں بھیج دیے گئے تو اس کو بھی انہوں نے غزوہ میں شمار کر لیا۔ غزوہ کے علاوہ ایک اور لفظ ہے یعنی ''سریہ'' غزوہ اور سریہ میں لوگوں کے نزدیک یہ فرق ہے کہ غزوہ میں کم سے کم آدمیوں کی ایک خاص تعداد ضروری ہے، سریہ میں کوئی قید نہیں۔ ایک آدمی بھی کہیں لڑائی کی دیکھ بھال کو بھیج دیا گیا تو یہ بھی سریہ ہے، بعضوں کے نزدیک غزوہ کے لئے یہ شرط ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بہ نفس نفیس اس میں شرکت کی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جن واقعات کو مؤرخین سریہ کہتے ہیں وہ چند قسموں پر منقسم ہے:

① محکمہ تفتیش یعنی دشمنوں کی نقل وحرکت کی خبر رسانی۔

❶ یہ واقعہ تمام کتب حدیث میں مذکور ہے لیکن یہ تفصیل طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اول ص ۶۷ سے ماخوذ ہے۔ مسلم، کتاب القسامۃ والمحاربین، باب حکم المحاربین والمرتدین: ۴۳۵۳، ۴۳۵۴؛ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قصۃ عکل وعرینۃ: ۴۱۹۲۔ ❷ زرقانی، ج ۲، ص: ۵۴۔

❸ طبقات ابن سعد، ج ۲، قسم اول، ص: ۳۹ (سریۃ مرثد بن ابی مرثد) (س)

❹ کتاب دیوان عبید وعامر ذکر عامر بن طفیل، ص: ۱۲۱ مطبع بریل لیڈن: ۱۹۱۳ء

❺ یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ بحث تمام تر تاریخی حیثیت سے ہے، جہاد کی اصل حقیقت پر بحث کتاب کی دوسری جلدوں میں آئے گی۔

② دشمنوں کے حملہ کی خبر سن کر مدافعت کے لئے پیش قدمی کرنا۔
③ قریش کی تجارت کی روک ٹوک، تاکہ وہ مجبور ہو کر مسلمانوں کو حج وعمرہ کی اجازت دیں۔
④ امن وامان قائم کرنے کے لئے تعزیری فوجیں بھیجنا۔
⑤ اشاعتِ اسلام کے لئے لوگ بھیجے گئے اور حفاظت کے خیال سے کچھ فوج ساتھ کر دی گئی اس صورت میں تاکید کر دی جاتی تھی کہ تلوار سے کام نہ لیا جائے۔

غزوہ کی صرف دو صورتیں تھیں:

1 دشمنوں نے دارالاسلام پر حملہ کیا اور ان کا مقابلہ کیا گیا۔
2 یہ معلوم ہوا کہ دشمن مدینہ پر حملہ کی تیاری کر رہے ہیں اور پیش قدمی کی گئی۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جو لڑائیاں واقع ہوئیں یا اس قسم کے جو واقعات پیش آئے انہی مختلف اغراض سے تھے۔

آنحضرت ﷺ جب مکہ سے چلے آئے تو قریش نے فیصلہ کر لیا کہ اسلام کو مٹا دیا جائے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر اسلامی تحریک قائم رہی تو ایک طرف ان کے مذہب کو صدمہ پہنچے گا دوسری طرف تمام عرب میں ان کا جو تفوق اور اثر اور مرجعیت عام ہے سب جاتا رہے گا۔ اس بنا پر ایک طرف تو قریش نے خود مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں، دوسری طرف تمام قبائل عرب کو بھڑکایا کہ یہ نیا گروہ اگر کامیاب ہو گیا تو تمہاری آزادی بلکہ ہستی بھی فنا ہو جائے گی۔

بیعتِ عقبہ میں جب انصار آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے تو ایک انصاری نے کہا ”برادران من! جانتے ہو کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب وعجم سے اعلان جنگ ہے۔“ اوپر ہم مسند دارمی وغیرہ کے حوالہ سے نقل کر آئے ہیں کہ آنحضرت ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو تمام عرب مدینہ پر حملہ کے لئے تیار ہو گیا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ مدینہ میں مہاجرین اور انصار رات کو سوتے تو ہتھیار باندھ کر سوتے تھے۔ اوپر گزر چکا ہے (بحوالہ ابوداؤد) کہ قریش نے عبداللہ بن ابی کو پیغام بھیجا تھا کہ ”محمد (ﷺ) کو وہاں سے نکال دو ورنہ ہم خود مدینہ آ کر تمہارا اور محمد (ﷺ) دونوں کا فیصلہ کر دیں گے۔“ [1]

محکمہ تفتیش

ان واقعات کی بنا پر ضروری تھا کہ اسلام اور دارالاسلام کی حفاظت کے لئے ضروری تدبیریں اختیار کی جائیں، اس سلسلہ کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ خبر رسانی اور جاسوسی کا انتظام وسیع پیمانہ پر کیا جائے چنانچہ ابتدا ہی سے آنحضرت ﷺ نے اس انتظام پر توجہ کی، وقتاً فوقتاً کثرت سے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنا کر مختلف مقامات پر بھیجتے رہتے تھے یہ ٹکڑیاں گو محض خبر رسانی کے لئے جاتی تھیں، لیکن حفاظت کی غرض سے مسلح اور

[1] ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی خبر النضیر: ٣٠٠٤۔

جمعیت کی صورت میں جاتی تھیں۔

یہی واقعات ہیں جن کو مؤرخین ''سرایا'' سے تعبیر کرتے ہیں اوران کے نزدیک اس کا مقصد کسی قافلہ کا لوٹنا یا کسی جماعت پر بے خبری کی حالت میں جاپڑنا ہوتا تھا۔ایک بڑا قرینہ اس بات کا یہ کہ ان دستوں کے بھیجنے سے حملہ کرنا مقصود نہیں ہوتا تھا یہ ہے کہ دستے اکثر دس دس بارہ بارہ آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ اتنے تھوڑے سے آدمی لڑنے کے لئے نہیں بھیجے جاسکتے تھے،مثلاً:

سریہ ابن جحش

۲ھ میں آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ مکہ کی طرف بھیجا اور ایک سربہ مہر تحریر دی کہ دو دن کے بعد اس خط کو کھولنا دو دن کے بعد انہوں نے کھولا تو اس میں یہ الفاظ تھے:

فَسِر حتّٰی تنزل نخلة بين مكة والطائف فترصد بها قريشا وتعلم من اخبارهم۔ ❶

''برابر چلے جاؤ یہاں تک کہ نخلہ میں جا کر ٹھہرو جو مکہ اور طائف کے بیچ میں ہے اور قریش کی دیکھ بھال کرتے رہو اوران کی خبریں دریافت کرو۔''

مدافعت

اس انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ جب کوئی مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کرتا تو فوراً خبر ہو جاتی اور پیش دستی کر کے فوجیں بھیج دی جاتیں۔اکثر سرایا اسی قسم کے تھے اور چونکہ ہم سرایا کا ذکر زیادہ تر قلم انداز کر آئے ہیں،اس لئے مثال کے طور پر چند سرایا کا ذکر کرتے ہیں اور قدمائے اہل سیر کی تصریحات سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ مہمات مدافعت کی غرض سے تھیں:

سریہ غطفان ۲ھ

وذلك انه بلغ رسول الله ﷺ ان جمعا من بنی ثعلبة ومحارب بذی امر قد تجمعوا يريدون ان يصيبوا من اطراف رسول الله ﷺ جمعهم رجل منهم يقال له دعثور بن الحارث۔ الخ ❷

''اس غزوہ کا سبب یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کو خبر پہنچی کہ قبیلہ بنو ثعلبہ اور محارب کی ایک فوج ذوامر میں اس غرض سے جمع ہوئی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف حملہ کرے،اس فوج کو ایک شخص نے فراہم کیا جس کا نام دعثور ہے۔''

سریہ ابو سلمہ، ۳ھ

وذلك انهٔ بلغ رسول الله ﷺ ان طليحة وسلمة ابنی خويلد قد سارا فی

❶ طبری، ج۳، ص:۱۲۷۴۔ ❷ طبقات، ابن سعد، جزء ثانی قسم اول، جلد مغازی: ۲۳۔

قومها ومن اطاعهما يدعو نهم الى حرب رسول الله......الخ ❶

''اس سریہ کی یہ وجہ تھی کہ آنحضرت ﷺ کو خبر لگی کہ طلحہ اور سلمہ (پسران خویلد) دونوں اپنی قوم اور اپنے پیروں کو لے کر آنحضرت ﷺ سے لڑنے کے لئے روانہ ہوئے ہیں۔''

سریہ عبداللہ بن انیس بغرض قتل سفیان بن خالد ۳ھ

وذلك انه بلغ رسول الله ﷺ ان سفيان بن خالد الهذلى ثم اللحيانى وكان ينزل عرنة وما والاهافى ناس من قومه وغيرهم قد جمع الجموع لرسول الله ﷺ۔ ❷

''ابن انیس اس لئے بھیجے گئے تھے کہ آنحضرت ﷺ کو خبر لگی کہ سفیان بن خالد اپنے قبیلہ کو اور باہر کے لوگوں کو آنحضرت ﷺ سے لڑنے کے لئے جمع کر رہا ہے۔''

غزوۂ ذات الرقاع ۵ھ

فاخبر اصحاب رسول الله ﷺ ان انمار او ثعلبة قد جمعوا الهم الجموع۔ ---فمضى۔ ❸

''ایک جاسوس نے آکر صحابہ ؓ کو اطلاع کی کہ انمار اور ثعلبہ وغیرہ مسلمانوں سے لڑنے کے لیے فوجیں جمع کر رہے ہیں آپ چل کھڑے ہوئے۔''

غزوۂ دومۃ الجندل ۵ھ

قالوا بلغ رسول الله ﷺ ان بدومة الجندل جمعًا كثيرًا و انهم يريدون ان يدنوا من المدينة۔ ❹

''رواۃ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو خبر لگی کہ دومۃ الجندل میں ایک گروہ کثیر جمع ہے اور مدینہ پر بڑھنا چاہتا ہے۔''

غزوۂ مریسیع ۵ھ

انَّ بنى المصطلق من خزاعة وهم من حلفاء بنى مدلج وكان رأسهم وسيدهم الحارث بن ابى ضرار فسار فى قومه ومن قدر عليه من العرب فدعاهم الى حرب رسول الله ﷺ فاجابوه۔ ❺

---

❶ ابن سعد، جزء ثانی، قسم اول، جلد مغازی: ۲۳۔ ❷ ایضًا، ص:۳۶۔
❸ ابن سعد، جلد مغازی، ص:۴۳۔ ❹ ابن سعد، جلد مغازی، ص:۴۴۔
❺ ابن سعد، جزء ثانی، قسم اول، ذکر مغازی، ص:۴۵۔

''قبیلہ بنو مصطلق خزاعہ کی شاخ ہے اور یہ لوگ بنو مدلج کے حلیف ہیں اور ان کا سردار حارث بن ابی ضرار تھا، وہ اپنی قوم کو نیز اور لوگوں کو جو اس کے قابو میں تھے لیکر چلا اور لوگوں کو رسول اللہ ﷺ سے لڑنے کی دعوت دی اور لوگوں نے منظور کی۔''

سریہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، بطرف فدک، ۶ھ

بلغ رسول اللّٰہ ﷺ ان لھم جمعا یریدون ان یمدوا یھود خیبر۔

''آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا کہ بنو سعد فدک میں یہود خیبر کی کمک کے لئے فوج جمع کر رہے ہیں۔'' ❶

سریہ بشیر بن سعد، شوّال ۷ھ

بلغ رسول اللّٰہ ﷺ ان جمعا من غطفان بالجناب قد واعد ھم عیینۃ بن حصن لیکون معھم لیزحفوا الی رسول اللّٰہ ﷺ۔ ❷

''آنحضرت ﷺ کو خبر پہنچی کہ غطفان کا ایک گروہ مقام جناب میں جمع ہے اور ان سے عیینہ بن حصن نے وعدہ کیا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر رسول اللہ ﷺ پر حملہ آور ہوگا۔''

سریہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ذات سلاسل ۸ھ

یہ مقام مدینہ سے ۸ منزل ہے۔

بلغ رسول اللّٰہ ﷺ ان جمعا من قضاعۃ قد تجمعوا یریدون ان یدنوا من اطراف رسول اللّٰہ ﷺ۔ ❸

''آنحضرت ﷺ کو خبر پہنچی کہ قضاعہ کا ایک گروہ جمع ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف بڑھے۔''

قریش کی تجارت کی روک ٹوک

بخاری کے حوالہ سے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں کہ (قریش اور مسلمانوں میں جنگ چھڑنے سے پہلے) ابوجہل نے حضرت معاذ انصاری رضی اللہ عنہ سے کعبہ میں یہ کہا تھا کہ ''اگر تم لوگ محمد (ﷺ) کو نکال نہ دو گے تو تم کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے۔'' انہوں نے جواب دیا تھا کہ ''تم نے اگر ہم کو کعبہ میں آنے سے روکا تو ہم تمہاری شام کی تجارت روک دیں گے۔'' ❹ (مکہ سے شام کو جو قافلہ جاتا تھا مدینہ اس کی راہ میں پڑتا تھا) کعبہ

❶ ابن سعد، جزء ثانی، قسم اول ذکر مغازی، ص: ٦٥۔

❷ ایضا، ص: ٨٧۔ ❸ ایضا، ص: ٩٥۔

❹ بخاری، کتاب المغازی، باب ذکر النبی ﷺ من یقتل ببدر: ٣٩٥٠۔

مسلمانوں کی خاص چیز تھی کیونکہ جس نے تعمیر کیا تھا مسلمان اسی کے دین (ابراہیمی) کے پیرو تھے باوجود اس کے قریش نے مسلمانوں کو عموماً حج اور عمرہ سے روک دیا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کا کاروانِ تجارت روک دیا جائے کہ وہ مجبور ہو کر مسلمانوں کو کعبہ کے اندر جانے کی اجازت دے دیں۔

بعض سرایا قبل حدیبیہ

سرایا کے ذکر میں اکثر جگہ اہل سیر لکھتے ہیں کہ '' یتعرض لعیر قریش ''یعنی'' اس لئے فوجیں بھیجی گئیں یا خود آنحضرت ﷺ تشریف لے گئے کہ کاروانِ قریش کی روک ٹوک کی جائے۔'' یہ تمام مہمات اسی غرض کے لئے تھیں چونکہ قریش تجارت کے لئے بھی ہتھیار بند ہو کر نکلتے تھے اور کم از کم سو دو سو کی جمعیت ساتھ لے کر جاتے تھے، اس لئے روک ٹوک میں کبھی کبھی مقابلہ پیش آ جاتا تھا اور جب قریش شکست کھا کر بھاگ جاتے تھے تو مال تجارت غنیمت میں ہاتھ آ تا تھا۔ اہل سیر غلطی سے ان واقعات کو اس پیرایہ میں لکھتے ہیں کہ قافلہ کا لوٹنا ہی اصلی مقصد تھا۔

یہی روک ٹوک جس کی بنا پر قریش نے بالآخر حدیبیہ کی صلح کر لی جس کی رو سے مسلمانوں کو چند خاص پابندیوں کے ساتھ حج کی اجازت مل گئی، قریش پر کاروان تجارت کی روک ٹوک کا اس قدر اثر پڑتا تھا کہ (حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے مکہ میں جب اپنے اسلام کا اعلان کیا اور قریش نے اس جرم میں ان کو مارنا پیٹنا شروع کیا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ غفار کا قبیلہ تمہارے کاروانِ تجارت کے سرِ راہ واقع ہے، تمہاری اس حرکت سے برہم ہو کر وہ راستہ نہ روک دے، تو یہ تدبیر پوری کارگر ہوئی اور انہوں نے ڈر کر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا) صلح حدیبیہ کے بعد قریش کی خواہش کے مطابق جب یہ طے ہوا کہ آنحضرت ﷺ مکہ کے نومسلموں کو واپس دیدیں گے اور ان نومسلموں نے مکہ سے بھاگ کر شام کی راہ میں اپنا ایک مستقر قائم کر لیا (اور قریش کی تجارت کی راہ کو غیر مامون کر دیا) تو قریش نے بالآخر اجازت دے دی کہ جو مسلمان چاہے مکہ سے مدینہ چلا جائے، ان کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہ ہوگی (پھر آیندہ سال انہوں نے مسلمانوں کو حج وعمرہ کی بھی اجازت دیدی، اس کے بعد پھر کبھی مسلمانوں نے قریش کے کاروانِ تجارت سے تعرض نہیں کیا، بلکہ خود اس کی حفاظت کے لئے فوج بھیجتے تھے۔) [1]

امن وامان قائم کرنا

اوپر گزر چکا ہے کہ عرب میں اس سرے سے اس سرے تک مطلق امن وامان نہ تھا، تمام قبائل باہم لڑتے رہتے تھے، یہاں تک کہ محترم مہینوں میں بھی بہانے نکال کر مہینوں کے نام بدل دیتے تھے اور لڑتے تھے، تجارت بالکل غیر محفوظ تھی، قافلوں کا لوٹ لینا عام بات تھی۔ جیسا کہ بدقسمتی سے آج بھی بدو قافلوں کو

---

[1] فتح الباری، ج ۸، ص: ۶۱۔

لوٹتے رہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے اس لئے بھیجا تھا کہ نہ صرف وعظ و پند بلکہ دست و بازو سے بھی تمام عرب بلکہ تمام دنیا میں امن وامان قائم کریں، کیونکہ خونریزی اور قتل سے زیادہ کوئی چیز اللہ کو ناپسند نہیں۔

﴿ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۳۲)

''اسی لئے ہم نے بنی اسرائیل کو لکھ دیا تھا کہ جس شخص نے ایک جان کو بغیر معاوضہ (یا زمین میں فساد) کے قتل کر دیا، اس نے تمام عالم کو قتل کر دیا۔''

﴿ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۰۵)

''اور جب وہ پھر کر جاتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد برپا کرے اور کھیتی اور نسل کو برباد کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔''

﴿ اِنَّمَا جَزٰۗؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُـقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۳۳)

''جو لوگ اللہ اور رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کر دیے جائیں یا پھانسی دیے جائیں یا ان کا ایک ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کاٹ ڈالا جائے یا جلاوطن کر دیے جائیں۔''

احادیث میں ہے کہ جب عدی رضی اللہ عنہ (حاتم طائی کے بیٹے) اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ ''اللہ اس کام کو اس طرح پورا کرے گا کہ ایک شتر سوار صنعاء سے لیکر حضر موت تک سفر کرے گا اور اس کو اللہ کے سوا یا بھیڑیئے کے سوا (کہ اس کی بکریاں نہ اٹھا لے جائے) اور کسی کا ڈر نہ ہوگا'' یہ ابوداود کے الفاظ ہیں، ❶ صحیح بخاری میں ہے کہ ''اللہ اس کام کو اس طرح پورا کرے گا کہ ایک عورت حیرہ سے چلے گی اور آ کر کعبہ کی زیارت کرے گی اور اس کو اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔'' حضرت عدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ایک عورت حیرہ سے سفر کر کے حرم تک آتی ہے اور اس کو کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔ ❷

---

❶ كتاب الجهاد، باب في الأسير يكره على الكفر: ۲٦٤٩۔

❷ كتاب المناقب، باب علامات النبوة في الاسلام: ۳۵۹۵ (صحیح بخاری میں یہ حدیث کئی طرح سے آئی ہے حضرت خباب بن ارت سے جو روایت ہے اس میں بعینہٖ وہی الفاظ ہیں جو ابوداود (ج ا ص: ۵۱۰) کے ہیں اور عدی بن حاتم کی روایت میں وہ الفاظ ہیں جو آگے مصنف نے نقل کیے ہیں لیکن اس میں مزید تفصیل بھی ہے یعنی خزائن کسریٰ کی فتح وغیرہ کا ذکر ہے۔

بہت سے واقعات ہیں جن کو اہل سیر سرایا میں شمار کرتے ہیں وہ محض تجارت کی آزادی اور عام امن و امان قائم کرنے کی غرض سے تھے۔ دو تین مثالیں ہم درج کرتے ہیں:

سریہ زید بن حارثہ

۶ھ میں حضرت زید رضی اللہ عنہ مال تجارت لے کر شام گئے۔ واپس آتے ہوئے جب وادی قریٰ کے قریب پہنچے تو بنو فزارہ کے لوگوں نے آ کر ان کو مارا پیٹا اور تمام مال و اسباب چھین لے گئے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے تدارک کے لئے تھوڑی سی فوج بھیجی جس نے ان لوگوں کو سزا دی۔ [1]

اسی سال میں اس سے پہلے حضرت دِحیہ کلبی رضی اللہ عنہ جن کو آنحضرت ﷺ نے خط دے کر قیصر کے پاس بھیجا تھا، شام سے واپس آ رہے تھے جب حُسمیٰ پہنچے تو ہُنید نے چند آدمیوں کے ساتھ ان پر ڈاکہ ڈالا اور جو کچھ ان کے پاس تھا سب چھین لیا صرف بدن کے کپڑے (وہ بھی جو پرانے اور پھٹے تھے) چھوڑ دیے آنحضرت ﷺ نے اس کے تدارک کے لئے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ [2]

سریہ دومۃ الجندل

۴ھ میں آنحضرت ﷺ کو خبر لگی کہ دومۃ الجندل میں جو مدینہ منورہ سے شام کی جانب پندرہ منزل پر ہے ایک بڑا گروہ جمع ہو گیا ہے جو تاجروں کو ستاتا ہے۔ اس کے تدارک کے لئے آپ خود تشریف لے گئے مجمع منتشر ہو چکا تھا لیکن آپ ﷺ نے چند روز تک وہاں قیام کیا اور انتظام کے لئے تمام اطراف میں فوج کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بھیج دیں۔ [3]

(یہ حالت کچھ مسلمان تاجروں کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد کفار قریش کے کاروان تجارت کی بھی اسی طرح حفاظت کی جاتی تھی۔)

سریہ خبط یا سیف البحر

(۸ھ میں قریش کا کاروان تجارت شام سے واپس آ رہا تھا، قبیلہ جہینہ کی طرف سے اطمینان نہ تھا، آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کی سرداری میں تین سو مسلمانوں کی جمعیت جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی داخل تھے، مدینہ سے ۵ دن کی مسافت پر روانہ فرمایا۔ مسلمانوں نے اس فرض کو اس طرح انجام دیا کہ کھانے کو کچھ نہ رہا تو ایک ایک چھوہارے پر تمام دن بھر گزارا دیا۔ [4]

صحیح مسلم [5] میں یہ واقعہ مفصل مذکور ہے لیکن اس سریہ کی غرض مختلف راویوں نے مختلف بیان کی ہے،

---

[1] طبقات ابن سعد، جزء ثانی، قسم اول، ص: ٦٥، جلد غزوات۔ [2] ابن سعد، جلد غزوات، ص: ٦٣۔

[3] ابن سعد، ص: ٤٤ جلد غزوات۔ [4] ابن سعد، جزء مغازی سریہ خبط، ص: ٩٥۔

[5] صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب اباحۃ میتۃ البحر: ٥٠٠٢؛ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ سیف البحر: ٤٣٦٠ تا ٤٣٦٢ میں بھی یہ روایتیں ہیں۔

اصل راوی حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہیں جو اس واقعہ میں شریک تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ جہینہ سے لڑنے کو یہ مہم بھیجی گئی تھی کتب مغازی میں بھی یہی مذکور ہے، دوسری روایتوں کے الفاظ یہ ہیں:

(۱) نتلقی عیر قریش "قافلۂ قریش سے ملنے کے لئے۔"

(۲) نرصد عیر قریش "قافلۂ قریش کی دیکھ بھال کے لئے۔"

اس سے مقصود عام طور سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ قافلۂ قریش کے لوٹنے کے لئے، لیکن یہ صریح غلطی ہے کیونکہ یہ زمانہ تو صلح حدیبیہ کا تھا، اس بنا پر ان الفاظ کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ مہم قافلۂ قریش کی حفاظت اور جہینہ کو روکنے کے لئے بھیجی گئی تھی۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی تحقیق ہے۔ [1]

غزوۂ غابہ

عرب کی جسارت اور رہزنی کی عادت کا یہ حال تھا کہ اگرچہ ہر دفعہ ان کو سخت سے سخت سزائیں ملتی تھیں تاہم وہ کسی طرح جرائم سے باز نہیں آتے تھے۔ یہاں تک کہ غابہ پر جو مدینہ کا چراگاہ تھا، ڈاکے ڈالتے تھے۔ ۶ھ میں قبیلہ فزارہ کی آبادی میں قحط پڑا، عیینہ بن حصن جو یہاں کا رئیس تھا، آنحضرت ﷺ نے فرط کرم سے اس کو اجازت دی کہ اسلامی حدود میں جو سیراب تھے مویشی چرائے، لیکن ۶ھ میں اسی عیینہ نے غابہ پر جو مدینہ کا چراگاہ تھا حملہ کیا اور آنحضرت ﷺ کی بیس اونٹنیاں لوٹ لیں، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے بیٹے جو چراگاہ کے محافظ تھے ان کو قتل کر دیا، [2] چنانچہ ارباب سیر اس واقعہ کو غزوۂ غابہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

عرب کا تمام ملک جو اسلام کا دشمن ہو گیا اور اخیر فتح مکہ تک کفار سے جو لڑائیاں جاری رہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ عرب کی معاش کا بڑا ذریعہ رہزنی، قطاع الطریقی اور قتل و تاراج تھا اسلام ان چیزوں کو مٹاتا تھا، اس لئے عرب اسلام سے بڑھ کر کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھ سکتے تھے۔

بے خبری میں حملہ کرنے کا سبب

عرب کے قبائل دو قسم کے تھے ایک وہ جو کسی خاص مقام پر مستقل سکونت رکھتے تھے، دوسرے وہ جو خیمہ نشین اور بادیہ گرد تھے، ان کا کوئی خاص مستقر نہ تھا، جہاں چشمہ یا سبزہ زار دیکھا خیمے ڈال دیے۔ جب وہاں بھی پانی نہ رہا تو خبر رساں کسی اور مقام کی خبر لائے اور وہاں چل دیے ان قبائل کو عربی میں اصحاب الوبر کہتے ہیں۔ زیادہ تر جو قبائل ڈاکے ڈالا کرتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ اسی قسم کے قبائل تھے، ان کا انتظام اور ان کی روک ٹوک سخت مشکل تھی ان کی تعزیر کے لئے فوجیں جاتی تھیں تو یہ پہاڑوں پر بھاگ جاتے تھے اور قابو میں نہیں آتے تھے، اس لئے مجبوراً جو فوجیں ان پر بھیجی جاتی تھیں، غفلت میں بھیجی جاتی تھیں کہ وہ بھاگ نہ جانے پائیں۔

اکثر سرایا کے بیان میں اہل سیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کچھ فوجیں بھیجیں جو راتوں کو چلتی

[1] فتح الباری، ج۸، ص: ٦١، ٦٢۔ [2] طبقات ابن سعد، ذکر مغازی، ص:٥٨۔

تھیں اور بے خبری کی حالت میں موقع پر پہنچ کر حملہ کرتی تھیں اور قبائل کو لوٹ لیتی تھیں۔ اس قسم کے واقعات تمام کتابوں میں کثرت سے منقول ہیں اور انہی واقعات سے یورپ کے لوگوں نے یہ خیال قائم کیا ہے کہ اسلام نے دشمن پر ڈاکہ ڈالنا اور لوٹ مار کرنا جائز رکھا ہے، اسی بنا پر مارگولیتھ نے یہ استدلال کیا ہے کہ ''چونکہ بہت دنوں تک مسلمانوں کے پاس معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ قبائل پر بے خبری میں حملہ کر کے مال و اسباب لوٹ لایا کرتے تھے۔''

لیکن جب زیادہ تفحص اور استقرا اور کدوکاوش سے تمام واقعات بہم پہنچائے جائیں تو ثابت ہوگا کہ اچانک حملہ انہی قوموں پر کیا جاتا تھا جن کی نسبت یہ احتمال ہوتا تھا کہ ان کو خبر ہوگی تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا کسی اور مقام پر بھاگ جائیں گے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ ان لوگوں کو خبر ہوئی اور وہ کسی طرف چل دیے۔ اس قسم کے چند واقعات ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں ان میں سے بعض میں آپ خود تشریف لے گئے اور بعض میں کچھ دستے بھیج دیے۔

غزوۂ بنو سلیم ۳ھ

واغذ السير ...... فوجد هم قد تفرقوا في مياههم فرجع. [1]

''اور بہت تیزی سے بگ ٹٹ گئے لیکن وہ لوگ اپنے چشموں کی طرف چل دیئے تھے۔'' (اس لئے لوٹ آئے)

غزوۂ ذات الرقاع ۴ھ

وهربت الاعراب الى رؤس الجبال. [2]

''اور اعراب پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھاگ گئے۔''

سریہ عکاشہ، ۶ھ

وجه رسول الله ﷺ عكاشة بن محصن الى الغمر في اربعين رجلا فخرج سريعا يغذالسير فهربوا. [3]

''آنحضرت ﷺ نے عکاشہ بن محصن کو ۴۰ آدمیوں کے ساتھ بھیجا، وہ بگ ٹٹ گئے لیکن وہ لوگ بھاگ گئے۔''

سریہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، الی بنی سعد ۶ھ

فبعث اليهم علی بن ابی طالب في مائة رجل فسار الليل وكمن النهار حتى انتهى الى الهمج فاغاروا عليهم فاخذوا خمس مائة بعير والفى شاة

[1] ابن سعد، مغازی، ص: ٢٤۔ [2] ایضا، ص:٤٣۔ [3] ایضا، ص: ٦١۔

وھربت بنو سعد بالظعن۔ ❶

''آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سو آدمیوں کے ساتھ بھیجا، وہ راتوں کو چلتے تھے اور دن کو چھپ رہتے تھے یہاں تک کہ مقام ہج پہنچ گئے، پھر ان لوگوں پر حملہ کیا اور پانچ سو اونٹ اور دو ہزار بکریاں لوٹیں اور بنو سعد مستورات کو لے کر بھاگ گئے۔''

غزوۂ بنولحیان، ۶ ھ

فسمعت بھم بنو لحیان فھربوا فی رؤوس الجبال۔ ❷

''بنولحیان نے ان کی آمد کی خبر سنی تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھاگ گئے۔''

سریہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بطرف تربہ، ۷ ھ

فکان یسیر اللیل و یکمن النھار فاتی الخبر ھوازن فھربوا وجاء عمر بن الخطاب محالھم فلم یلق منھم احدًا۔ ❸

''راتوں کو چلتے تھے اور دن کو چھپ جاتے تھے، ہوازن کو خبر لگ گئی تو وہ فرار ہو گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے پڑاؤ پر پہنچے تو کسی کو نہ پایا۔''

سریہ کعب بن عمیر، ربیع الاول ۸ ھ

اس سریہ کا یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پندرہ اشخاص کو شام کی طرف بھیجا، ذات اطلاح پہنچ کر ان لوگوں کو ایک بڑی جماعت نظر آئی، ان لوگوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی، انہوں نے انکار کر دیا اور ان پر تیراندازی شروع کی، مجبور ہو کر یہ لوگ بھی لڑے اور بالآخر سب شہید ہوئے۔ صرف ایک صاحب بچے، انہوں نے آکر خبر دی۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے انتقام لینا چاہا لیکن وہ لوگ یہ مقام چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے۔ ابن سعد میں یہ الفاظ ہیں:

وھَمَّ بالبعث الیھم فبلغه انھم قد ساروا الی موضع آخر۔ ❹

''ان پر فوج بھیجنے کا ارادہ کیا، پھر معلوم ہوا کہ وہ اور کہیں چلے گئے۔''

اشاعت اسلام

(ان اغراض کے علاوہ جو سرایا بھیجے گئے، ان کی غرض اشاعت اسلام ہوتی تھی، لیکن چونکہ ملک میں امن وامان نہ تھا اور نیز دشمنوں نے اس سرے سے اس سرے تک آگ لگا رکھی تھی لیکن دعوت اسلام کے لئے جو سرایا جاتے تھے ان کی زندگی ہمیشہ معرض خطر میں رہتی تھی۔

❶ ایضًا، ص:۶۵۔ ❷ ایضًا، ص:۵۷۔
❸ ایضًا، ص:۸۵۔ ❹ ایضًا، ص:۹۲۔

سریہ بیر معونہ

صفر ۴ھ میں ستر (۷۰) داعیان اسلام کی جماعت قبیلۂ کلاب میں رئیس قبیلہ کی دعوت پر اشاعت اسلام کی غرض سے بھیجی گئی لیکن بیر معونہ کے قریب قبائل رعل و ذکوان کے ہاتھ سے کل کی کل شہید ہوئی۔صرف ایک صاحب بچ گئے تھے جنہوں نے مدینہ میں آ کر خبر کی۔ ❶

سریہ مرثد

اسی زمانہ میں یعنی صفر ۳ھ میں قبیلہ عضل وقارہ نے تعلیم وارشاد کے لئے دعاۃ اسلام کے بھیجنے کی درخواست کی۔آنحضرت ﷺ نے حضرت عاصم، حضرت خبیب، حضرت مرثد بن ابی مرثد رضی اللہ عنہم وغیرہ دس صاحبوں کو اس غرض کے لئے روانہ فرمایا، مقام رجیع میں پہنچ کر بنولحیان نے ان پر حملہ کیا اور ایک کے سوا کل صاحب شہید کر دیے گئے۔ ❷

غزوہ بنی لحیان

۶ھ میں بنولحیان کی تعزیر کے لئے مہم گئی لیکن کامیابی نہ ہوئی، وہ سن گن پا کر بھاگ گئے تھے)۔ ❸

سریہ ابن ابی العوجاء

۷ھ میں آنحضرت ﷺ نے داعیوں کی ایک جماعت جس میں پچاس آدمی شامل تھے قبیلہ بنی سلیم کے پاس بھیجی۔اس گروہ کے سردار ابن ابی العوجاء تھے، انہوں نے بنوسلیم کو دعوت دی لیکن ان لوگوں نے انکار کیا اور تیراندازی شروع کی یہ لوگ بھی لڑے لیکن پچاس آدمی قبیلہ کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ رئیس فوج یعنی ابن ابی العوجاء کے سوا سب شہید ہوئے۔ ❹

سریہ کعب بن عمیر

ربیع الاول ۸ھ میں آنحضرت ﷺ نے کعب بن عمیر رضی اللہ عنہ غفاری کو پندرہ آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ دعوت اسلام کے لئے ذات اطلاح کی طرف روانہ کیا، یہ مقام شام کے حدود میں وادی القریٰ سے اس طرف ہے، ان لوگوں نے اسلام کی تبلیغ کی لیکن جواب وہی تیغ وسنان تھا، یہاں تک کہ یہ جماعت بھی کل کی کل شہید ہوئی صرف ایک صاحب بچ گئے جنہوں نے آ کر مدینہ میں خبر کی۔ ❺

(اس بنا پر اکثر دعوتِ اسلام کے لئے جو سرایا بھیجے جاتے تھے ان کے ساتھ حفاظت کی غرض سے کچھ فوج بھی ساتھ کر دی جاتی تھی لیکن اس صورت میں بہ تصریح افسروں کو کہہ دیا جاتا تھا کہ صرف اشاعت اسلام مقصود ہے لڑائی بھڑائی کی اجازت نہیں، مثلاً: فتح مکہ کے بعد جب آنحضرت ﷺ نے حضرت خالد بن

❶ طبقات ابن سعد، ذکر مغازی، ص:۳۷۔ ❷ ایضًا، ص:۳۹، ۴۰۔ ❸ ایضًا، ص:۵۷۔
❹ ایضًا، ص:۸۹۔ ❺ طبقات ابن سعد، جلد مغازی، ص:۹۲۔

ولید رضی اللہ عنہ کو بنو جذیمہ کی طرف بھیجا اور ۳۰ آدمیوں کی جمعیت ساتھ کر دی تو صاف فرما دیا کہ صرف دعوت اسلام مقصود ہے لڑائی مقصود نہیں۔ چنانچہ ابن سعد لکھتے ہیں:

بعثه الى بنى جزيمة داعيًا الى الاسلام ولم يبعثه مقاتلا۔ ❶

آنحضرت ﷺ نے خالد رضی اللہ عنہ کو بنو جزیمہ کی طرف بھیجا، دعوت اسلام کے لئے، نہ کہ لڑنے کے لئے۔

علامہ طبری اس موقع پر لکھتے ہیں:

قد كان رسول الله ﷺ بعث فيما حول مكة السرايا تدعو الى الله عز وجل ولم يامرهم بقتال۔ ❷

آنحضرت ﷺ نے مکہ کے اطراف میں سرایا بھیجے، دعوت اسلام کے لئے اور ان کو لڑائی کا حکم نہیں دیا۔

باوجود اس کے بھی حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے تلوار سے کام لیا اور آنحضرت ﷺ نے سنا تو آپ کھڑے ہو گئے اور قبلہ رو ہو کر کہا: ''اے اللہ! خالد نے جو کچھ کیا میں اس سے بری ہوں۔'' تین دفعہ اسی طرح یہ الفاظ فرمائے، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ جنہوں نے ایک ایک بچہ کا یہاں تک کہ کتوں کا خون بہا ادا کیا اور اس پر مزید رقم دی ❸ یہ واقعہ باختلاف الفاظ حدیث کی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔

اسی طرح ۱۰ھ میں آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب ۳۰۰ سواروں کے ساتھ یمن بھیجا تو آپ نے فرمایا:

((فاذا نزلت بساحتهم فلا تقاتلهم حتى يقاتلوك))۔ ❹

''جب تم وہاں پہنچ جاؤ تو جب تک تم پر کوئی حملہ نہ کرے تم نہ لڑنا۔''

اسی سلسلہ میں وہ سرایا بھی داخل ہیں جو فتح مکہ کے بعد بت شکنی کے لئے اطراف ملک میں روانہ کئے گئے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام عرب میں مختلف قبیلوں کے الگ الگ بت خانے تھے فتح مکہ کے بعد جب عام طور سے قبائل نے اسلام قبول کر لیا تو بتوں کی عظمت اور جباری کا جاہلانہ اور وہم پرستانہ تخیل بعض قبائل سے دفعتاً نہ مٹ سکا۔ اب گو وہ ان کو لائق پرستش نہیں سمجھتے تھے تاہم ان کے دلوں پر ان اصنام کی وراثتاً ایک مدت سے جو ہیبت بیٹھی ہوئی تھی اس سے یہ ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان باطل پرستیوں کے مرکز کو خود اپنے ہاتھ سے مٹا دیں۔ جاہلوں کو یقین تھا کہ ان مقدس پتھروں کا ایک ریزہ بھی اپنی جگہ سے ہٹا تو آسمان ٹوٹ پڑے گا، زمین پھٹ جائے گی، مصائب اور بلاؤں کا ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔

❶ طبقات ابن سعد، جلد مغازی، ص:۱۰۶۔ ❷ تاریخ طبری، ج۳، ص:۱۶۴۹۔
❸ تاریخ طبری، ج ۳، ص: ۱۶۵۱۔ ❹ ابن سعد، مغازی، ص:۱۲۲۔

اہل طائف نے بیعت کرتے ہوئے شرط پیش کی تھی کہ ان کا بت خانہ ایک سال تک ڈھایا نہ جائے گا اور جب آنحضرت ﷺ نے یہ منظور نہ فرمایا تو دوسری شرط پیش کی ہم ان کو اپنے ہاتھ سے نہ توڑیں گے۔ بعض اور نومسلم قبائل بھی اس ادائے فرض میں جھجکتے تھے، اس بنا پر ان مقامات میں چند راسخ العقیدہ اور صحیح الفہم مسلمان بھیجے گئے کہ وہ ان کی طرف سے اس فرض کو انجام دیں۔ چنانچہ سریہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بت خانہ عزیٰ، سریہ عمرو بن العاص بت خانہ سواع، سریہ سعد بن زید اشہلی بت خانہ منات، سریہ ابوسفیان و مغیرہ بن شعبہ بت خانہ لات، سریہ جریر بت خانہ ذی الخلصہ [1] سریہ طفیل بن عمرو دوسی بت خانہ ذی الکفین اور سریہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، بت خانہ فلس کے توڑنے کو روانہ کئے گئے۔ [2]

جنگی اصلاحات

جنگ افعال انسانی کا بدترین منظر ہے اور عرب کی جنگ تو ظلم، توحش، قساوت، سفاکی، بے دردی اور درندہ پن کا تماشا گاہ تھی۔ لیکن اعجاز نبوت سے یہی چیز تمام نقائص سے پاک ہو کر ایک مقدس فرضِ انسانی بن گئی۔ کسی ملک میں جب ہزاروں برس سے ظلم و غارت گری متوارث چلی آتی ہے تو شروع شروع میں مہذب سے مہذب حکومت کو بھی چند روز قدیم اصول اور طرز عمل کو اختیار کرنا پڑتا ہے جس کو طبعی اصطلاح میں علاج بالمثل کہہ سکتے ہیں، آغاز اسلام میں حملہ آور جنگ کے وقت بعض واقعات اس قسم کے ملتے ہیں جو پہلے سے رائج تھے، مثلاً جاہلیت میں دستور تھا کہ دشمن پر بے خبری کی حالت میں جا پڑتے تھے اور قتل و قید کرتے تھے اسلام نے اس طریقہ کو مٹایا لیکن ابتدا ہی میں اگر اس پر عمل کیا جاتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ دشمن ہمیشہ دفعتہً حملہ آور ہو کر مسلمانوں کو قتل کیا کرتے اور مسلمان اس کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکتے یا کرتے تو پہلے ان کو خبر کرتے جس کے بعد وہ کہیں ٹل جاتے یا اپنی حفاظت کا سامان کر لیتے لیکن جس قدر اسلام کو زور و قوت حاصل ہوتی گئی اسی قدر وہ قدیم طریقے مٹتے گئے، یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سب کا خاتمہ ہو گیا۔ اسلام سے پہلے جنگ کا جو طریقہ تھا اور جس قسم کے وحشیانہ افعال عمل میں آتے تھے ان کو ہم تفصیل سے اوپر لکھ آئے ہیں، ان صفحات کو دوبارہ سامنے رکھ لو اور اس کے مقابلہ میں دیکھو اسلام نے کیا کیا اصلاحیں کیں؟ اس بات کو قطعاً روک دیا کہ عورتیں، بوڑھے، بچے، صغیر السن، نوکر، خادم لڑائیوں میں قتل کیے جائیں، آنحضرت ﷺ کا دستور تھا کہ جب کسی مہم پر فوج بھیجی جاتی تو سردار فوج کو جو احکام دیے جاتے ان میں ایک یہ لازمی حکم بھی ہوتا [3] ابوداؤد میں یہ حکم ان الفاظ میں مذکور ہے:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ ذی الخلصۃ: ٢٣٥٥، ٢٣٥٦۔

[2] اس باب میں تمام تر واقعات ابن سعد جزء مغازی سے ماخوذ ہیں۔ (زرقانی، ج ٢ کے آخر میں ٢٠٠ تا ٢٠٢ پر بھی بعض سرایا اور بت خانوں کا ذکر ہے۔

[3] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب تأمير الامام الامراء على البعوث ... الخ: ٤٥٢٢۔

((لا تقتلوا شیخا فانیا و لا طفلا و لا صغیرا و لا امرأۃ))۔ ❶

’’کسی کہن سال کو، بچے کو کمسن کو، عورت کو قتل نہ کرو۔‘‘

غزوات میں بھی کسی عورت کی لاش آپ کی نظر سے گزرتی تو آپ نہایت سختی سے منع فرماتے، صحیح مسلم میں متعدد حدیثیں اس کے متعلق مذکور ہیں۔ ❷

اسلام سے پہلے معمول تھا کہ دشمنوں کو گرفتار کر لیتے تو کسی چیز سے باندھ کر اس کو تیروں کا نشانہ بناتے یا تلوار سے قتل کرتے، عربی میں اس طریقہ کو ’’صبر‘‘ کہتے تھے، آنحضرت ﷺ نے نہایت سختی سے اس کو روک دیا۔

ایک دفعہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے (عبدالرحمٰن) نے ایک لڑائی میں چند آدمیوں کو گرفتار کر کے اسی طرح قتل کرایا تھا، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے سنا تو کہا: ’’میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا وہ اس سے منع فرماتے تھے، خدا کی قسم! میں مرغ کو بھی اس طرح مارنا جائز نہیں رکھتا۔‘‘ عبدالرحمٰن نے اسی وقت کفارۂ گناہ کے طور پر چار غلام آزاد کیے۔ ❸

لڑائیوں میں عہد کی کچھ پابندی نہ تھی جنگِ معونہ وغیرہ میں کفار نے مسلمانوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا یعنی قول وقسم لے کر مسلمانوں کو ساتھ لے گئے اور گھر لے جا کر قتل کر ڈالا، قرآن مجید میں انہی واقعات کی طرف اشارہ ہے:

﴿ لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ ﴾۔ (۹/ التوبۃ:۱۰)

’’کسی مسلمان کے متعلق وہ نہ کسی قسم کا لحاظ رکھتے ہیں نہ ذمہ داری کا اور یہ لوگ حد سے بڑھ جانے والے ہیں۔‘‘

آنحضرت ﷺ نے سخت تاکید کی کہ جو عہد کیا جائے ہر حال میں اس کی پابندی کی جائے۔ قرآن مجید میں اس کے متعلق جابجا تاکیدی اور صاف احکام ہیں، عہد نبوت اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں پابندیٔ عہد کی حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں۔

آنحضرت ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تھے تو بہت سے صحابہ مجبوریوں کی وجہ سے مکہ ہی میں رہ گئے تھے، ان میں خدیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اور ان کے والد بھی تھے، جنگ بدر کے موقعہ پر حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اور ان کے والد کہیں سے آ رہے تھے، کفار نے ان کو پکڑ لیا کہ تم مدینہ جا کر پھر ہمارے مقابلہ کو آؤ گے، انہوں نے کہا: ہمارا مقصد صرف مدینہ جانا ہے، کفار نے ان سے عہد لے کر چھوڑ دیا، یہ لوگ مقام بدر میں

---

❶ کتاب الجهاد، باب فی دعاء المشرکین: ۲٦۱٤ ابوداؤد میں یہ باب کتاب الجہاد میں مکرر (۳۵۱ اور ۳۵۴) پر ہے یہاں پہلا باب مراد ہے)۔ (س) ج۱، ص:۳۵۲۔ ❷ کتاب الجهاد، باب تحریم قتل النساء والصبیان فی الحرب: ٤٥٤٧، ٤٥٤٨؛ ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی قتل النساء: ۲٦٦۸ تا ۲٦۷۲ میں بھی اس مفہوم کی کئی روایتیں ہیں۔

❸ ابو داود، باب قتل الاسیر بالنبل: ۲٦۸۷۔

آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور یہ دیکھ کر کہ رسول اللہ ﷺ کفار سے مصروف جنگ ہیں، خود بھی اس سعادت کی آرزو کی، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کو باز رکھا کہ تم معاہدہ کر چکے ہو۔ ❶

ابو رافع کو قریش نے قاصد بنا کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا بارگاہِ نبوت میں آ کر ان پر یہ اثر ہوا کہ مسلمان ہو گئے اور عرض کہ اب میں کافروں میں واپس نہ جاؤں گا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم قاصد ہو اور قاصد کو روک لینا عہد کے خلاف ہے اس وقت واپس جاؤ پھر آ جانا۔'' ❷

صلح حدیبیہ میں جب حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ پابہ زنجیر آئے اور بدن کے داغ دکھائے کہ قریش مجھ کو قید کر کے اس طرح ستاتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں لیکن قریش سے معاہدہ ہو چکا ہے کہ کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ آئے گا تو ہم قریش کے پاس بھیج دیں گے۔'' اس پر حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ نے رو کر تمام مسلمانوں کو مخاطب کیا، لوگ جوش رقت سے بے قرار ہو گئے اور قریب تھا کہ قابو سے باہر ہو جائیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے تاب ہو گئے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بار بار جاتے تھے، یہ سب کچھ تھا لیکن پابندی عہد کی قیمت ان سب خطرات سے زیادہ تھی، حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کو پابہ زنجیر واپس جانا پڑا۔ ❸

اسلام سے پہلے قاصدوں کا قتل کر دینا ممنوع نہ تھا۔ صلح حدیبیہ سے پہلے آنحضرت ﷺ نے قریش کے پاس جو قاصد بھیجا تھا قریش نے اس کی سواری کے اونٹ کو مار ڈالا اور قاصد کو بھی قتل کر دینا چاہا لیکن باہر والوں نے بچا لیا۔

آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ قاصد کبھی قتل نہ کیے جائیں، مسیلمہ نے جب قاصد بھیجا اور اس نے گستاخانہ گفتگو کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''قاصد کا قتل کرنا دستور نہیں ورنہ تو قتل کر دیا جاتا۔'' ❹ مؤرخین اس واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ اس دن سے یہ ایک قاعدہ بن گیا کہ قاصد قتل نہیں کیے جاتے تھے۔

اسیران جنگ کے ساتھ عرب نہایت برا سلوک کرتے تھے اور تمام قوموں میں بھی یہی طریقہ جاری تھا جنگِ صلیبی میں یورپین سلطنتیں جب مسلمانوں کو لڑائیوں میں گرفتار کرتی تھیں تو ان سے جانوروں کی طرح کام لیتی تھیں۔

علامہ ابن جبیر جب حروب صلیبیہ کے زمانہ میں سسلی سے گزرے ہیں تو یہ حالت دیکھ کر تڑپ گئے چنانچہ لکھتے ہیں:

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب الوفاء بالعهد: ٤٦٣٩ واسد الغابة، ج ١، ص: ٣٩١۔

❷ ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی الامام یستجن به فی العهود: ٢٧٥٨۔ (س)

❸ ابوجندل کے واقعہ کا ذکر اجمالاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الحدیبیة: ٤١٨٠، ٤١٨١ پر ہے۔ نیز دیکھیں کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد: ٢٧٣١، ٢٧٣٢ اور اجمالاً ہی صحیح مسلم، باب صلح الحدیبیة: ٤٦٣١، ٤٦٣٢ پر بھی ہے لیکن تفصیل اسد الغابة، ج ٥، ص: ١٦١ اور اصابه، ج ٧، ص: ٣٣ پر ملاحظہ ہو۔

❹ ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی الرسل: ٢٧٦١۔

ومن الفجائع التی یعاینها من حل بلادهم اسری المسلمین یر سفون فی القیود ویصرفون فی الخدمة الشاقة والاسیرات المسلمات کذالك فی اسواقهن خلاخیل الحدید فتنفطر لهم الافئدة۔ [1]

''اور منجملہ ان درد انگیز حالات کے جوان شہروں میں نظر آتے ہیں، اسیران اسلام ہیں جو بیڑیاں پہنے نظر آتے ہیں اور جن سے سخت محنت شاقہ لی جاتی ہے اور اسی طرح مسلمان عورتیں پنڈلیوں میں لوہے کے کڑے پہنے، سخت محنت شاقہ سے کام کرتی ہیں جن کو دیکھ کر دل پھٹا جاتا ہے۔''

آنحضرت ﷺ نے اسیرانِ جنگ کی نسبت تاکید کی کہ ان کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچنے پائے، اسیرانِ بدر کو جب آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے حوالہ کیا تو تاکید کی کہ کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے، چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم خود کھجور وغیرہ کھا کر بسر کر لیتے تھے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے [2] غزوۂ حنین میں چھ ہزار اسیر تھے، سب چھوڑ دیے گئے اور آپ نے ان کے پہننے کے لئے چھ ہزار جوڑے (مصر کے کپڑے کے) عنایت فرمائے [3] چنانچہ ابن سعد نے اس واقعہ کی تصریح کی ہے۔

حاتم طائی کی بیٹی جب گرفتار ہو کر آئی تو آپ نے عزت وحرمت سے مسجد کے ایک گوشہ میں اس کو مقیم کیا اور فرمایا کہ کوئی تمہارے شہر کا آ جائے تو میں اس کے ساتھ تم کو رخصت کردوں، چنانچہ چند روز کے بعد سفر کا سامان کر کے ایک شخص کے ساتھ یمن بھجوا دیا۔ [4]

قرآن مجید میں جہاں خدا نے بندگان خاص کے اوصاف بتائے ہیں، وہاں فرمایا ہے:

﴿ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ﴾. (٧٦/ الدهر:٨)

''اور یہ لوگ خدا کی محبت میں مسکین کو، یتیم کو اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔''

معمول تھا کہ جب کسی قوم پر حملہ ہوتا تو اہل فوج چاروں طرف دور دور پھیل جاتے، جس سے راستے بند ہو جاتے، گھروں میں آنا جانا مشکل ہو جاتا، راہ گیروں کا مال ومتاع لٹ جاتا، یہ طریقہ ایک مدت سے چلا آتا تھا، ایک لڑائی میں قدیم دستور کے مطابق یہی حرکتیں لوگوں سے سرزد ہوئیں، آپ نے منادی کرادی کہ جو شخص ایسا کرے گا اس کا جہاد جہاد نہیں۔

ابوداؤد میں (حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے:

غزوت مع نبی اللہ ﷺ غزوة کذا وکذا فضیق الناس المنازل وقطعوا الطریق

[1] رحله ابن جبیر مطبوعه لیڈن، ۱۹۰۷ء صفحه: ۳۰۷۔ [2] ابن هشام، ج ۱، ص:۳۹٤۔
[3] طبقات ابن سعد فی ذکر مغازی، قسم اول، جزء ثانی، ص:۱۱۰ تا ۱۱۲۔
[4] تاریخ طبری، ج ٤، ص:۱۷۰۸۔

فبعث نبی اللّٰه منادیا ینادی فی الناس ان من ضیق منزلا و قطع طریقا فلا جھاد لہ۔ ❶

’’میں فلاں غزوہ میں آپ کے ساتھ تھا لوگوں نے دوسروں کے پڑاؤ پر جا کران کو تنگ کیا، لوٹا مارا، آپ ﷺ نے ایک شخص کو بھیجا جس نے منادی کی کہ جو دوسروں کو گھروں میں تنگ کرے یا لوٹے مارے اس کا جہاد قبول نہیں۔‘‘

ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب یہ حکم دیا کہ لوگ ادھر ادھر پھیل نہ جایا کریں تو لوگ اس طرح سمٹ کر پڑاؤ ڈالتے تھے کہ ایک چادر تان دی جاتی تو سب اس کے نیچے آ جاتے۔ ❷

سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مال غنیمت کے ساتھ لوگوں کو اس قدر شغف تھا کہ لڑائیوں کا بہت بڑا سبب یہی ہوتا تھا، اس کی اصلاح میں نہایت تدریج سے کام لینا پڑا، جاہلیت میں تو غنیمت محبوب ترین چیز تھی، تعجب یہ ہے کہ اسلام میں بھی ایک مدت تک اس کو ثواب کی چیز سمجھتے تھے، ابوداؤد میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا:

رجل یرید الجھاد فی سبیل اللّٰه وھو یبتغی عرضا من عرض الدنیا فقال النبی ﷺ ((لا اجر لہ)) فاعظم ذالک الناس وقالوا: للرجل عد لرسول اللّٰه ﷺ فلعلک لم تفھمہ۔ ❸

’’ایک شخص خدا کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے لیکن کچھ دنیاوی فائدہ بھی چاہتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔‘‘ یہ امر لوگوں کو بہت عجب معلوم ہوا اور لوگوں نے اس شخص سے کہا کہ پھر جا کر پوچھ، غالباً تم نے آنحضرت ﷺ کا مطلب نہیں سمجھا۔‘‘

بار بار لوگ دوبارہ دریافت کرنے کے لئے بھیجتے تھے اور ان کو یقین نہیں آتا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے ایسا فرمایا ہوگا، بالآخر جب آپ نے تیسری دفعہ بھی یہی فرمایا کہ ((لا اجر لہ)) یعنی ’’اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔‘‘ تب لوگوں کو یقین آیا۔

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے چند صحابہ کو ایک قبیلہ کے مقابلہ کے لئے بھیجا، ان میں سے ایک صاحب صف سے آگے نکل گئے، قبیلہ والے روتے ہوئے آئے، انہوں نے کہا: لا الہ الا اللّٰہ کہو تو بچ جاؤ گے، لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور حملہ سے بچ گئے، اس پر ساتھیوں نے ان کو ملامت کی کہ تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم کر دیا۔ ابوداؤد میں صحابی کا قول ان الفاظ میں مذکور ہے:

---

❶ ابو داود، کتاب الجھاد، باب ما یؤمر من انضمام العسکر: ۲۶۲۹۔ (س)

❷ ابو داود، کتاب الجھاد، باب ما یؤمر من انضمام العسکر: ۲۶۲۸۔ (س)

❸ ابو داود، باب فی من یغزو و یلتمس الدنیا: ۲۵۱۶۔ (س)

فلامنی اصحابی وقالوا احرمتنا الغنیمۃ۔

''مجھ کو میرے ساتھیوں نے ملامت کی، تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم کر دیا۔''

جب لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے آ کر ان کی شکایت کی تو آپ نے اس کی تحسین کی اور فرمایا: ''تم کو ایک ایک آدمی (جو چھوڑ دیے گئے) کے بدلے اتنا اتنا ثواب ملے گا۔'' ❶

قرآن مجید میں غنیمت کی نسبت ''متاع دنیوی'' کا لفظ آتا تھا اور اس کی طرف انہماک اور وارفتگی پر ملامت کی جاتی تھی۔ جنگ احد میں جب اس بنا پر شکست ہوئی کہ کچھ لوگ کفار کا مقابلہ چھوڑ کر غنیمت میں مصروف ہو گئے تو یہ آیت اتری:

﴿ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۲)

''تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طلبگار تھے اور کچھ آخرت کے۔''

جنگ بدر میں لوگوں نے جب اجازت سے پہلے غنیمت لوٹنی شروع کر دی، (یا) بقول بعض مفسرین فدیہ کی خواہش سے لوگوں کو گرفتار کیا تو یہ آیت اتری:

﴿ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ﴾ (۸/ الانفال:۶۷)

''تم لوگ دنیا کی پونجی چاہتے ہو اور خدا آخرت چاہتا ہے۔''

باوجود ان تمام تصریحات اور بار بار کی تاکید کے غزوۂ حنین میں جو ۸ ھ میں واقع ہوا تھا، اس وجہ سے شکست ہوئی کہ لوگ غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہو گئے، صحیح بخاری غزوۂ حنین کے ذکر میں ہے:

فاقبل المسلمون علی الغنائم واستقبلونا بالسھام۔ ❷

''تو مسلمان غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور کافروں نے ہم کو تیروں پر رکھ لیا۔''

اس بنا پر موقع بہ موقع آنحضرت ﷺ اس مسئلہ کو زیادہ تصریح سے بیان فرماتے تھے، ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ''کوئی شخص غنیمت کے لئے، کوئی نام کے لئے، کوئی اظہار شجاعت کے لئے جہاد کرتا ہے، کس کا جہاد خدا کی راہ میں سمجھا جائے گا؟'' آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا)) ❸

''جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔''

بالآخر آپ ﷺ نے یہ فرما دیا کہ ''گو جہاد کسی نیت سے کیا جائے لیکن اگر مجاہد مال غنیمت قبول کرتا

---

❶ ابوداود، کتاب الادب، باب ما یقول اذا اصبح:۵۰۸۰۔

❷ بخاری نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: فاکببنا علی الغنائم فاستقبلنا بالسھام۔ کتاب المغازی، باب قول اللہ تعالی:﴿ یوم حنین﴾:۴۳۱۷۔

❸ بخاری، کتاب الجھاد، باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا :۲۸۱۰ وصحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ تعالی:۴۹۱۹ تا ۴۹۲۰۔ (س)۔

ہے تو دو تہائی ثواب کم ہو جاتا ہے، پورا ثواب اسی وقت ملتا ہے جب غنیمت کو مطلق ہاتھ نہ لگائے۔'' صحیح مسلم میں آنحضرت ﷺ کے خاص الفاظ یہ ہیں:

((ما من غازية تغزو فی سبیل اللّٰہ فیصیبون الغنیمة الا تعجلوا ثلثی اجرهم من الاخرة ویبقی لهم الثلث وان لم یصیبوا غنیمة تم لهم اجرهم)) [1]

''جو غازی خدا کی راہ میں لڑتا ہے اور مال غنیمت لیتا ہے وہ آخرت کے ثواب کا دو ثلث یہیں لے لیتا ہے اور آخرت میں اس کا حصہ صرف ایک تہائی رہ جاتا ہے، البتہ اگر غنیمت مطلق نہ لے تو اس کو آخرت میں پورا اجر ملے گا۔''

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ غنیمت جو سب سے محبوب چیز تھی دلوں سے اُتر گئی اور جہاد صرف اعلائے کلمۃ اللہ مقصود رہ گیا، واقعۂ ذیل سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے، آنحضرت ﷺ جب تبوک کی مہم پر روانہ ہوئے تو ان کے پاس سامان نہ تھا، مدینہ میں آواز دیتے پھرے کہ ''کوئی ہے جو ایسے شخص کو سواری دے کہ جو کچھ مال غنیمت ہاتھ آئے گا اس میں برابر کا شریک ہوگا۔ ایک انصاری نے سواری اور خوراک سب اپنے ذمہ لی، اس مہم میں کئی اونٹ ہاتھ آئے، حضرت واثلہ رضی اللہ عنہ واپس آ کر سب اونٹ انصاری کے پاس لے گئے اور کہا: یہ وہ اونٹ ہیں جن کی نسبت میں نے شرط کی تھی کہ آپ بھی اس میں حصہ دار ہوں گے، انہوں نے کہا: ''ان کو تم ہی لو، میرا شرکت سے کچھ اور ارادہ تھا۔'' (یعنی اونٹ میں نہیں، بلکہ جہاد کے ثواب میں شرکت مقصود تھی) [2]

دوران جنگ میں دشمن کے مال اور جائیداد کا لوٹنا بھی عام رواج تھا، خصوصاً جب کہ رسد تھڑ جاتی تھی اور کھانے پینے کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا تو ہر حال میں یہ فعل جائز سمجھا جاتا تھا، آنحضرت ﷺ نے اس کی سخت ممانعت کی اور سرے سے اس طریقہ کو روک دیا، ابوداؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم لوگ ایک مہم پر گئے اور غایت تنگ حالی اور مصیبت پیش آئی، اتفاق سے بکریوں کا ریوڑ نظر آیا، سب ٹوٹ پڑے اور بکریاں لوٹ لیں، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی آپ ﷺ موقعہ پر تشریف لائے تو گوشت پک رہا تھا اور ہانڈیاں ابال کھا رہی تھیں، آپ کے ہاتھ میں کمان تھی، آپ نے اس سے ہانڈیاں الٹ دیں اور سارا گوشت خاک میں مل گیا، پھر فرمایا: ''لوٹ کا مال مردار گوشت کے برابر ہے۔'' [3]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب بیان قدر ثواب من غزا فغنم، الخ: ٤٩٢٥ وابو داود، کتاب الجهاد، باب فی السریة تخفق: ٢٤٩٧۔(س)

[2] ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی الرجل یکری دابته علی النصف او السهم: ٢٦٧٦، (س)

[3] ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی النهی عن النهبی اذا کان فی الطعام قلة: ٢٧٠٥ (س)

لڑائی عبادت بن گئی

اسلام نے جہاد کو جو بظاہر ایک ظالمانہ کام ہے اس قدر پاک اور منزہ کر دیا کہ وہ افضل ترین عبادت بن گئی، جہاد کا مقصد یہ قرار دیا کہ مظلوموں کو ظلم سے بچائے، جابر اور ظالم، کمزور آدمیوں پر دست ستم دراز نہ کرنے پائیں:

﴿ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ ﴾ (۲۲/ الحج:۳۹، ۴۰)

''جن لوگوں سے لوگ لڑائی کرتے ہیں ان کو اس بنا پر لڑنے کی اجازت دی گئی کہ ان پر ظلم کیا گیا اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے، وہ لوگ جو اپنے گھروں سے صرف اس بنا پر نکال دیے گئے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔''

ملک میں جو ہمیشہ فتنہ وفساد برپا رہتا تھا اور لوگ امن وامان سے بسر نہیں کر سکتے تھے، جہاد اس غرض سے تھا کہ فساد کو مٹا دے اور امن قائم کر دے:

﴿ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ ﴾. (۸/ الانفال:۳۹)

''اور ان سے لڑو، تاکہ فتنہ نہ رہے۔''

جو لوگ خدا پر اور جزا وسزا پر اعتقاد نہیں رکھتے اور اس وجہ سے ان کے نزدیک ہر قسم کے ظلم وستم جائز تھے اور ان کو جائز وناجائز کی کچھ تمیز نہ تھی، جہاد سے ان کا زیر کرنا اور ان لوگوں کو ان کے ظلم سے بچانا مقصود قرار دیا گیا:

﴿ قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ﴾.

(۹/ التوبۃ:۲۹)

''ان لوگوں سے لڑو جو نہ اللہ پر اعتقاد رکھتے ہیں نہ قیامت پر اور جن کاموں کو اللہ اور رسول نے حرام قرار دیا ہے اس کو حرام نہیں سمجھتے۔''

جہاد میں فتح پانے اور زمین پر قبضہ حاصل کرنے کا مقصد یہ نہیں قرار دیا گیا کہ فاتح مال ودولت اور حکومت کا لطف اٹھائیں بلکہ یہ غرض قرار دی گئی کہ لوگوں کو عبادت، وریاضت اور فقرا کی دستگیری کی تلقین کریں اور اچھی باتیں پھیلائیں اور برے کاموں سے لوگوں کو روک دیں:

﴿ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ ﴾. (۲۲/ الحج:۴۱)

''وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین پر قبضہ دیں تو وہ نماز کے پابند ہوں گے، زکوۃ ادا کریں گے، اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور بری باتوں سے روکیں گے۔''

کسی ملک کی فتح سے جو مال و دولت ہاتھ آتا تھا وہ فاتح کا خاص حصہ ہوتا تھا جس کو وہ اپنے مصارف عیش میں استعمال کرتا تھا اور دربار کے امراء درجہ بدرجہ اس سے مستفید ہوتے تھے لیکن اس کا مصرف یہ قرار دیا:

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ﴾ (٨/ الانفال:٤١)

''اور جان لو کہ تم کو جو کچھ مال غنیمت ملے تو اس کا پانچواں [1] حصہ اللہ کا ہے اور رسول کا اور رشتہ داروں کا اور یتیموں کا اور غریبوں کا اور مسافروں کا۔''

جہاد نہ صرف حقیقت کے لحاظ سے بلکہ صورتاً بھی عبادت بنا دیا گیا، مجاہدین کو تاکید تھی کہ عین جنگ کے وقت بھی خدا کا نام لیتے رہیں:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾۔

(٨/ الانفال:٤٥)

''مسلمانو! جب کسی گروہ سے مڈبھیڑ ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور بار بار خدا کا نام لیتے جاؤ تم کامیاب ہو گے۔''

نماز میں جس طرح اٹھتے بیٹھتے تکبیر و تسبیح یعنی اللہ اکبر اور سبحان ربی الاعلیٰ کہتے ہیں جہاد میں بھی یہی حکم تھا، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ہم جب کسی بلندی پر چڑھتے تھے تو اللہ اکبر کہتے تھے اور جب نیچے اترتے تو سبحان اللہ کہتے تھے، بخاری میں روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ جہاد میں جب کسی ٹیکرے پر چڑھتے تو تین دفعہ اللہ اکبر کہتے تھے، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ جہاد پر جا رہے تھے، صحابہ زور زور سے تہلیل کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اس قدر شور سے نہیں کہنا چاہیے کیونکہ خدا جس کو تم پکارتے ہو وہ بہرا نہیں ہے۔'' [2] بعینہ اسی طرح ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نماز میں پکار کر قرآن پڑھنے سے منع فرمایا تھا۔ [3]

نکتہ

ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جہاد، میں دستور تھا کہ چڑھائیاں آتی تھیں تو تکبیر کہتے تھے اور اتار آتا تو تسبیح پڑھتے تھے، [4] نماز بھی اسی اصول پر قائم کی گئی یعنی سر اٹھاتے ہیں تو اللہ اکبر اور سجدہ میں جاتے ہیں تو سبحان اللہ کہتے ہیں اس روایت میں ادائے مطلب میں ذرا فرق آ گیا ہے، جہاد کے اصول پر نماز نہیں قائم کی گئی، بلکہ جہاد میں نماز کا طریقہ ملحوظ رکھا گیا ہے، کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ نماز ابتدائے

---

[1] اس پانچویں حصہ کے سوا باقی تمام مال غنیمت مجاہدین کا حق ہے۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب مایکره من رفع الصوت فی التکبیر: ۲۹۹۲۔

[3] مسند احمد، ج ۱، ص: ۹۷ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور جلد دوم میں کئی جگہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اس مفہوم کی روایتیں ہیں۔ [4] ابوداود، کتاب الجهاد، باب مایقول اذا سافر: ۲۵۹۹ اصل عبارت یہ ہے: وکان النبی ﷺ وجیوشه اذا علوا الثنایا کبروا واذا هبطو سبحوا فوضعت الصلوٰة علی ذلك۔

اسلام سے وجود میں آئی اور جہاد کی تاریخ ہجرت کے بعد سے شروع ہوتی ہے، بہر حال اس روایت سے اس قدر قطعی ثابت ہوتا ہے کہ نماز اور جہاد دونوں میں ایسی مشابہت تھی کہ ایک کو اصل اور دوسرے کو اس کی نقل سمجھتے تھے۔ غرض وہی جنگ جو ہر طرح کے ظلم وستم اور جہالت ووحشت کا مجموعہ تھی اسلام کی تعلیم ربانی نے اس کو اعلائے کلمۃ اللہ، قیام امن، رفع مفاسد، نصرت مظلوم اور تسبیح وتہلیل کی صورت میں بدل دیا۔

فاتح اور پیغمبر کا امتیاز

جہاد کے معرکوں میں آپ ﷺ کے ہاتھ میں گو تیغ وسپر اور جسم مبارک پر خود ومغفر ہوتا تھا لیکن اس وقت بھی پیغمبر اور سپہ سالار کا فرق صاف نظر آتا تھا۔ عین اس وقت جب کہ معرکۂ کارزار گرم ہے، تیروں کا مینہ برس رہا ہے، تمام میدان لالہ زار بن گیا ہے، ہاتھ اور پاؤں اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں جس طرح موسم خزاں میں پتے جھڑتے ہیں، دشمن کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھی آرہی ہیں، عین اس حالت میں آنحضرت ﷺ کا دستِ دعا آسمان کی طرف بلند ہے، جنگ آور باہم نبرد آزما ہیں اور سر مبارک سجدہ نیاز میں ہے، معرکۂ بدر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ عین شدت جنگ میں تین بار خبر لینے آئے اور ہر دفعہ دیکھا کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے۔ [1] فوجیں تیروں کا مینہ برسا رہی ہیں اور لڑائی کا فیصلہ نہیں ہوتا، فاتح بے سلاح زمین سے مٹھی بھر خاک اٹھالیتا ہے اور دشمن کی طرف پھینکتا ہے، دفعتاً فوجوں کا بادل پھٹ کر مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ [2] حنین میں دشمن نے دفعتاً اس زور سے حملہ کیا کہ تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے ۱۲۰۰۰ ہزار آدمیوں میں سے ایک [3] بھی پہلو میں نہیں سامنے سے دس ہزار قدر انداز تیر برساتے آرہے ہیں لیکن مرکزِ حق اپنی جگہ پر قائم ہے اور ایک پر جلال آواز آرہی ہے:

انا النبی لا کذب [4] ''میں پیغمبر ہوں اور جھوٹا پیغمبر نہیں ہوں۔''

عین اس وقت جبکہ صفیں باہم معرکہ آرا ہیں، ہر طرف تلواریں برس رہی ہیں، ہاتھ پاؤں کٹ کٹ کر زمین پر بچھے جاتے ہیں، موت کی تصویریں ہر طرف نظر آرہی ہیں، اتفاق سے نماز کا وقت آجاتا ہے، دفعتاً نماز کی صفیں قائم ہو جاتی ہیں، سپہ سالار، امام نماز ہے، فوجیں صفوف نماز میں، رجز کے بجائے اللہ اکبر کی صدائیں بلند کر رہی ہیں، جوش وخروش، تہور وجانبازی، غیظ وغضب، اب عجز ونیاز، تضرع وزاری اور خضوع وخشوع بن جاتا ہے، صفیں دو دو رکعت ادا کر کے دشمن کے مقابلہ پر چلی جاتی ہیں، ان کے بجائے لڑنے والے نماز میں شامل ہو جاتے ہیں، یہ دو رکعت ادا کر کے پھر اپنی پہلی خدمت پر واپس چلے جاتے ہیں اور مشغولین جنگ آکر بقیہ نماز پوری کر لیتے ہیں، لیکن یہ تبدیلیاں فوجوں میں ہوتی ہیں، امام (رسول) اول سے آخر تک عبادتِ الٰہی

---

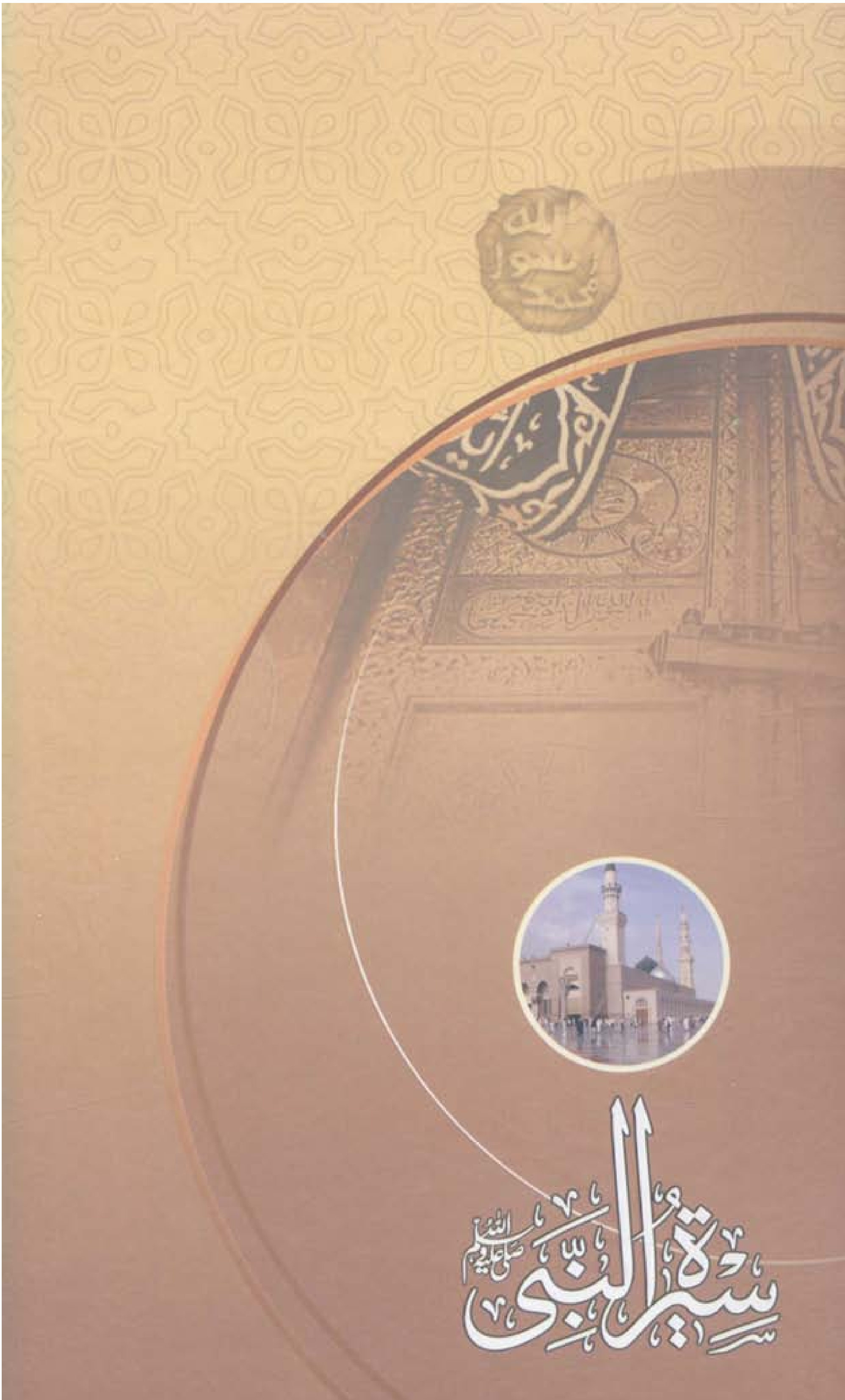
[1] طبقات ابن سعد، ذکر مغازی، ص:۱۷۔ [2] طبقات ابن سعد، جلد غزوات، ص:۱۰۹، ۱۱۳۔
[3] چند خاص رفقا کے سوا (س) [4] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب غزوة حنين:٤٦١٧ وصحيح بخاری، کتاب المغازی، باب قول الله: ﴿ويوم حنين﴾ الخ:٤٣١٧۔

میں مصروف ہے۔

تعلیم وارشاد، ہدایت وتلقین، تہذیب وتزکیہ کا کام ہروقت جاری ہے، عین فتح کے وقت جب کہ مجاہدین فتح کے نشہ میں چور ہیں، مال غنیمت فروخت ہورہا ہے، ایک ایک کو ہزاروں کی رقمیں وصول ہورہی ہیں، ایک صحابی خوش خوش آتے ہیں اور جوش مسرت میں کہتے ہیں: ''یارسول اللہ ﷺ! آج میں نے مال غنیمت سے جس قدر نفع اٹھایا، کبھی نہیں اٹھایا تھا، پورے تین سواوقیہ ہاتھ آئے۔'' (اوقیہ دس روپیہ کے برابر ہوتا ہے) آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ ''میں اس سے بھی زیادہ نفع بتاؤں؟'' وہ بڑے شوق سے پوچھتے ہیں کیا؟ ارشاد ہوتا ہے: ''نماز فرض کے بعد دورکعتیں۔'' [1]

تَمَّ الْمُجَلَّدُ الْاَوَّلُ مِنَ السِّیْرَةِ النَّبَوِیَّةِ عَلٰی صَاحِبِهَا الصَّلٰوةُ وَالتَّحِیَّةُ.

[1] ابوداود، کتاب الجهاد، باب التجارة فی الغزو: ۲۷۸۵۔


سیرۃ النبی ﷺ

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

محمد رسول اللہ

تخریج شدہ ایڈیشن

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب



سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

تالیف

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ اسلامیہ

حصہ دوم

تخریج شدہ ایڈیشن

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب

اس حصے میں ۹ ہجری سے ۱۱ ہجری تک کے حالات و واقعات اور کیفیات منقول ہیں۔ مثلاً شمائل و خصائل، معمولات و عادات، حسن اخلاق، حجۃ الوداع، تکمیل دین، اولاد و ازواج مطہرات کا بیان اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا تذکرہ ہے۔

تالیف

علامہ شبلی نعمانی

علامہ سید سلیمان ندوی

مکتبہ اسلامیہ

کتاب ---------------------- سیرۃ النبی ﷺ

تالیف ------------ علامہ شبلی نعمانی ، علامہ سید سلیمان ندوی

ناشر ---------------------------- محمد سرور عاصم

اشاعت ---------------------- اکتوبر 2012ء

قیمت --------------------------

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون: 37244973-042 فیکس: 37232369-042

بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد۔ پاکستان فون: 2631204, 2034256-041

E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

سیرت نبوی ﷺ مجلد دوم

سیرت نبوی ﷺ مجلد اول ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۸ء) میں شائع ہوئی۔ اب مجلد دوم ۱۳۳۸ھ (۱۹۲۰ء) کے اوسط میں شائع ہوتی ہے۔ شائقین کا تقاضا ہے کہ جلد سے جلد اس کی جلدیں شائع ہوتی رہیں، لیکن شاید اُن مشکلات کا اُن کو علم نہیں جو عالمگیر جنگ نے زندگی کے ہر شعبہ میں پیدا کر دی ہیں، گو ایک سال سے زیادہ ہوا کہ جنگ کا عملاً خاتمہ ہو گیا، لیکن بایں ہمہ حقیقت یہ ہے کہ صلح کا آغاز نہیں ہوا اور اس خاتمہ جنگ سے زندگی کی مشکلات میں ذرا کمی نہیں ہوئی۔ جلد اول کے تکلیف دہ تجربہ کے بعد یہ طے کر لیا گیا تھا کہ دوسری جلد خود مطبع معارف میں چھپے گی لیکن مشکل یہ تھی کہ ہمارے پاس مشین نہ تھی۔ بڑی تلاش و جستجو سے مشین ہاتھ میں آئی تو کاغذ کا قحط نظر آیا۔ جلد اول میں جن اصناف کے کاغذ لگ چکے تھے ان کا ملنا دشوار ہو گیا، دیسی کاغذ کے ۲۰۰ رم بھی بیک وقت نہ مل سکے۔ یہ دقت کسی طرح ختم ہوئی تو لوح (ٹائیٹل پیج) کے کاغذ کی مشکل پڑی، لکھنؤ سے لے کر کلکتہ اور بمبئی تک کے کارخانے چھان مارے گئے، مگر خاطر خواہ کاغذ دستیاب نہ ہوا، آخر جو بھی مل سکا اور جس طرح بھی بنا یہ جلد اختتام کو پہنچی۔ والحمدُ للّٰہ علی ذلك۔

پہلی جلد نبوت کے پُر آشوب عہدِ غزوات پر مشتمل تھی اور دوسری جلد نبوت کی سہ سالہ امن کی زندگی کی تاریخ ہے۔ نبوت کی بست و سہ سالہ زندگی میں پہلی جلد بیس سال کے کارناموں کا مجموعہ تھی اور یہ جلد بقیہ آخری تین سال کے واقعات کا ذخیرہ ہے اور اس کے بعد اخلاق و شمائل شریفہ اور ازواجِ مطہرات و اولادِ کرام کا تذکرہ ہے۔

مصنف مرحوم کی وفات کے بعد جب اس جلد کا تمام قلمی سرمایہ میرے ہاتھ میں آیا تو مجھے اس میں بہت سے ابواب کی کمی محسوس ہوئی جن کے اضافہ کے بغیر یہ جلد ناتمام نظر آتی تھی، لیکن مصنف کے مسودہ میں اضافہ کی ہمت نہیں ہوتی تھی، آخر کار مدت کے حیص بیص کے بعد میں نے طے کر لیا کہ اُن کو لکھنا ہی چاہیے، چند روز کے بعد مجھے اتفاقاً مولانا کے ہاتھ کی ایک یادداشت ملی، جو وفات سے پانچ ماہ پیشتر ایک سفینہ میں لکھی تھی۔ اس کا عنوان ''یادداشت اخیر'' تھا، اس یادداشت کو پڑھ کر میری مسرت کی انتہا نہ رہی، جب میں نے یہ دیکھا کہ جن ابواب کو میں ضروری سمجھتا تھا، مصنف مرحوم نے بھی اپنی آخری یادداشت میں ان کا اضافہ ضروری قرار دیا تھا اور گویا وہ ایک وصیت نامہ تھا، جس کو فرشتۂ غیب نے اُن کے دست و قلم سے میری تسلی کے لیے پہلے ہی لکھوا دیا تھا۔

ع حل ایں عقدہ ہم از روئے نگار آخر شد

اخلاق کے باب کو مصنف مرحوم نے تکمیل کو نہیں پہنچایا تھا، بہت سے عنوانات سادہ تھے، بہت سے عنوانات کو شروع کر کے آیندہ اضافہ کے لیے ناتمام بصورت بیاض چھوڑ دیا تھا، جامع نے ان کو لکھ کر بطور تکملہ کتاب میں شامل کر دیا، بہت سے ضروری حواشی بھی جا بہ جا بڑھائے گئے ہیں، چنانچہ جیسا کہ جلد اول کے دیباچہ میں ذکر کیا گیا ہے، اضافہ اور تکملہ اور حواشی کی تمام عبارتیں ہلالین کے اندر کر دی گئی ہیں، تا کہ مصنف اور جامع کی عبارتیں باہم مختلط نہ ہونے پائیں۔

جامع
سید سلیمان ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کی امن کی زندگی

سنہ ۹ھ، سنہ ۱۰ھ اور سنہ ۱۱ھ

قیامِ امن، اشاعتِ اسلام، تاسیسِ خلافت، تکمیلِ شریعت

قیامِ امن

گزشتہ ابواب (1) پڑھ لینے کے بعد یہ حقیقت محتاج بیان نہیں رہتی کہ اس وقت گو فطری صلاحیت و استعداد کی رُو سے عرب کا ذرہ ذرہ ستارہ تھا لیکن وہ کسی ایک نظام شمسی کے تابع نہ تھا۔ یوں تو تمام جزیرۂ عرب ایک واحد ملک اور ایک متحد قوم تھا، تاہم نہ تو کبھی تاریخ نے اس کی ملکی وقومی اتحاد کا نشان دیا اور نہ سیاسی حیثیت سے کسی زمانہ میں تمام عرب ایک پرچم کے نیچے جمع ہوا، جس طرح گھر گھر کا الگ الگ خدا تھا، اسی طرح قبیلہ قبیلہ کے جدا رئیس تھے، جنوبی عرب میں حمیری اذواء، اور اقیال کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ شمالی عرب میں بکر، تغلب، شیبان، ازد، قضاعہ، کندہ، لخم، جذام، بنوحنیفہ، طے، اسد، ہوازن، غطفان، اوس، خزرج، ثقیف، اور قریش وغیرہ کی الگ الگ ٹولیاں تھیں، جو دن رات خانہ جنگیوں میں مبتلا رہتی تھیں۔ بکر وتغلب کی چہل سالہ جنگ کا ابھی ابھی خاتمہ ہوا تھا، کندہ اور حضر موت کے قبائل کٹ کٹ کر فنا ہو چکے تھے، اوس وخزرج لڑ لڑ کر اپنے ایک ایک سردار کو کھو چکے تھے، خاص حرم اور اشہر حرم میں بنوقیس اور قریش کے درمیان حرب فجار کا سلسلہ جاری تھا اور اس طرح تمام ملک معرکۂ کارزار بنا ہوا تھا۔ پہاڑوں اور صحراؤں میں خودمختار جرائم پیشہ قبائل آباد تھے، تمام ملک قتل و غارت گری، سفاکی، خونریزی کے خطرات میں گھرا تھا، تمام قبائل غیر مختتم سلسلۂ جنگ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ انتقام، ثار، اور خون بہا کی پیاس سینکڑوں اور ہزاروں اشخاص کے قتل کے بعد بھی نہیں بجھتی تھی۔ ملک کا ذریعہ معاش غارت گری کے بعد فقط تجارت تھی لیکن تجارت کے قافلوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تک گزرنا محال تھا۔ حیرہ کے عرب بادشاہ اگرچہ شمالی عربستان میں اثر اور اقتدار رکھتے تھے، تاہم ان کا تجارتی سامان بھی عکاظ کے بازاروں میں بآسانی پہنچ سکتا تھا۔ شہور حج عملاً عرب کے مقدس مہینے تھے، بایں ہمہ لڑائیوں کے جواز کے لئے وہ کبھی بڑھا اور کبھی گھٹا دیے جاتے تھے، ابوعلی قالی نے کتاب الامالی میں لکھا ہے:

وذالك لانهم كانوا يكرهون ان تتوالى عليهم ثلاثة اشهر لا تمكنهم الاغارة فيها لان معاشهم كان من الاغارة۔ (2)

''یہ اس لئے کہ وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ تین مہینے متصل ان پر غارت گری کے بغیر گزر جائیں،

(1) پورا باب اضافہ از صفحہ: ۱ تا ۱۰۱۔ (2) جلد ا، ص: ۶۔

کیونکہ غارت گری ہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔"

بہت سے جرائم پیشہ قبائل کے ذریعہ معاش کے لیے یہی موسم بہار تھا۔ مکہ کے آس پاس اسلم وغفار وغیرہ قبائل آباد تھے، جو حاجیوں کا اسباب چُرانے میں بدنام تھے، ❶ طے، نہایت ممتاز اور نامور قبیلہ تھا، لیکن دزدان طے بھی اپنی شہرت میں اُن سے کم نہ تھے ❷ سلیک ابن السلکہ اور تابط شراعرب کے مشہور شاعر تھے لیکن ان کی شاعری کا تمام تر سرمایہ صرف اپنی چوری اور حیلہ گری کے پُرفخر کارنامے تھے۔ ملک میں اضطراب اور بدامنی کا یہ حال تھا کہ عبدالقیس جو بحرین کا ایک طاقت ور قبیلہ تھا، ۵ھ تک مصری قبائل کے ڈر سے اشہر حرم کے سوا اور مہینوں میں حجاز کا رُخ نہیں کر سکتا تھا۔ ❸ فتح مکہ کے بعد بھی جب ملک میں سکون شروع ہو چکا تھا، مدینہ سے مکہ تک سفر خطرناک تھا اور اب بھی لوگ ڈاکے ڈالتے رہتے تھے۔ ❹ ہجرت کے پانچ چھ برس کے بعد بھی شام کے تجارتی قافلے دن دہاڑے لوٹ لئے جاتے تھے۔ ❺ یہاں تک کہ کبھی کبھی خود دارالاسلام کے چراگاہوں میں بھی چھاپے مارے جاتے تھے ❻ آنحضرت ﷺ جب لوگوں کو ملک کے امن وامان کی بشارت دیتے تھے کہ ایک زمانہ آئے گا جب حیرہ سے ایک خاتون محمل نشین تنہا سفر کرے گی اور اللہ کے سوا کسی کا اس کو خوف نہ ہوگا ❼ تو لوگوں کو تعجب آتا تھا۔ ۹ھ میں ایک شخص نے آ کر شکایت کی کہ میرا مال ڈاکوؤں نے لوٹ لیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب مکہ کو قافلہ بے نگہبان جایا کرے گا۔" ❽ اتنے بڑے ملک میں صرف حرم کی سرزمین ایسی تھی جہاں لوگوں کو اطمینان میسر آ سکتا تھا۔ خدا نے قرآن مجید میں اہل مکہ پر اپنا سب سے بڑا احسان یہی جتایا ہے:

﴿ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ ۝ ﴾

(۱۰۶/ قریش:۳۔۴)

"ان کو چاہیے کہ اُس گھر کے اس مالک کو پوجیں جس نے اُن کو بھوک میں کھانا دیا اور بدامنی کو دور کر کے ان کو امن بخشا۔"

﴿ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ ﴾

(۲۹/ العنکبوت:۶۷)

"کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے ایک امن والا حرم ان کے لیے بنایا اس کے باہر بدامنی کا یہ عالم ہے کہ اس کے چاروں طرف سے آدمی اچک لئے جاتے ہیں۔"

---

❶ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب ذکر اسلم وغفار: ۳۵۱۶۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ: ۳۵۹۵۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب اداء الخمس من الایمان: ۵۳۔ ❹ ابوداود، کتاب الادب، باب فی الحذر من الناس: ۴۸۶۱۔ ❺ طبقات ابن سعد، جزء مغازی، ص: ۶۳، ۶۴، ۶۵۔ ❻ دیکھو سیرۃ النبی ﷺ، ج ۱، ص: ۲۵۹ غزوۂ سویق وغزوۂ غابہ۔ ❼ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ: ۳۵۹۵۔ ❽ بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب الصدقۃ قبل الرد: ۱۴۱۳۔

خود اسلام کا کیا حال تھا؟ آنحضرت ﷺ عام الحزن کے بعد تین برس تک متصل تمام قبائل کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرتے رہے کہ مجھے امان میں لے کر صرف اتنا موقعہ دلا دو کہ اللہ کی آواز لوگوں تک پہنچا سکوں لیکن کوئی حامی نہیں بھرتا تھا، [1] تمام مسلمان عرب کی فضا میں سانس تک نہیں لے سکتے تھے۔ تلاشِ امن کے لئے افریقہ وحبش کے ریگستانوں میں مارے مارے پھرتے تھے جو عرب میں رہ گئے وہ ہدفِ مظالمِ گوناگوں تھے۔ قرآن مجید مسلمانوں کی اسی حالت کا ذکر ان آیتوں میں کرتا ہے:

﴿ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ ﴾

(۸/ الانفال:۲۶)

''یاد کرو جب تم ملک میں تھوڑے اور کمزور تھے، ڈرتے تھے کہ لوگ تم کو اُچک نہ لیں۔''

اسی ملکی شورش اور بدامنی کا یہ نتیجہ تھا کہ ملک میں کوئی تحریک بھی بغیر خود حفاظتی فوجی تدبیر کے کامیاب نہیں ہو سکتی تھی، سرورِ عالم ﷺ کا اصلی فرض اسلام کی دعوت تھی، اس کے لئے تیغ وخنجر اور فوج ولشکر کی حاجت نہ تھی لیکن ایک طرف تو دشمن پر حملہ کرتے چلے آتے تھے اور دوسری طرف ہر جگہ دعاۃ اسلام کی جانیں معرضِ خطر میں رہتی تھیں، تجارت کے قافلے جن پر اصل میں ملک کی معاش کا دارو مدار تھا غیر مامون تھے۔ چنانچہ اس قسم کے تفصیلی واقعات غزواتِ نبوی ﷺ کے اسباب وانواع میں گزر چکے ہیں۔

بیرونی خطرات

بہر حال یہ تو ملک کی اندرونی حالت تھی، بیرونی خطرات بھی کچھ کم نہ تھے، مُلک کے تمام سرسبز وزرخیز صوبے روم وفارس دو عظیم الشان طاقتوں کے پنجہ میں تھے، تقریباً ساٹھ برس سے ایرانی یمن، عمان اور بحرین کے مالک بن بیٹھے تھے اور اُن کے زیرِ اقتدار برائے نام عرب رؤسا حکمران تھے۔ حدودِ عراق میں آلِ منذر کی حکومت کو مٹا کر ایرانیوں نے اندرونِ ملک میں بھی پیش قدمی شروع کر دی تھی، حجاز میں اسلام کی جو تحریک پھیل رہی تھی اس کو بھی وہ اپنے ہی حدود میں سمجھتے تھے چنانچہ ۶ ھ میں شاہ ایران نے یمن کے ایرانی گورنر کو فرمان بھیجا کہ ''میرے غلام کو جو حجاز میں مدعی نبوت بنا ہے، گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو۔'' رُومیوں نے حدودِ شام میں قبضہ کر لیا تھا۔ آلِ غسان اور چھوٹے چھوٹے عرب رؤسا نے جنھوں نے مدت سے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا اُن کی ماتحتی قبول کر لی تھی۔ ۸ ھ کے بعد رومی ان عیسائی رؤسائے عرب کی مدد سے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے تھے جس کا ظہور واقعۂ تبوک اور موتہ وغیرہ کی صورت میں ہوا۔

یہودیوں کی قوت

رومیوں نے دوسری صدی عیسوی میں یہودیوں سے شام وفلسطین کی برائے نام حکومت بھی چھین لی تھی

[1] سیرت ابن ہشام، عرض رسول اللہ ﷺ نفسہ علی القبائل، ج۱، ص:۲۵۵۔

اور وہ مجبوراً حدودِ شام سے قلبِ حجاز تک پیچھے ہٹ آئے تھے اور اپنے لئے مدینہ سے شام تک متصل قلعے قائم کر لیے تھے یہ مقامات اُن کے جنگی استحکامات بھی تھے اور تجارتی گودام بھی قریظہ، نضیر، قینقاع، ❶ خیبر، فدک، تیما، وادی القریٰ وغیرہ اُن کی بڑی بڑی چھاؤنیاں تھیں ❷ قرآن مجید میں حسب ذیل آیات میں یہودیوں کے انہی قلعوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

﴿ لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرًى مُّحَصَّنَةٍ أَوْ مِن وَرَاءِ جُدُرٍ ﴾ (۵۹/ الحشر:۱۴)

''یہ کبھی اکٹھے ہوکر (کھلے میدان میں) تمہارا مقابلہ نہ کریں گے لڑیں گے بھی تو قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر۔''

﴿ وَأَنزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُم مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِن صَيَاصِيهِمْ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۲۶)

''اللہ نے ان یہودیوں کو جنھوں نے ان کی مدد کی تھی اُن کے قلعوں سے اتارا۔''

زمانۂ قدیم میں مالی کاروبار کی وسعت نے اسپین اور دیگر ممالکِ یورپ میں اُن کو جس طرح ملک کی پالیٹکس کا خطرناک عنصر بنا دیا تھا بعینہٖ یہی حال اُن کا عرب میں بھی تھا ان چند قلعوں کے برتے پر وہ اسلام کی قوت کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو متعدد لڑائیاں صرف اُن کی شرارت سے لڑنی پڑیں۔ بدر میں جب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تو یہ فخریہ کہتے تھے ''بے چارے مکہ کے قریش لڑنا کیا جانیں؟ مسلمانوں کو ہمارے قلعوں سے مقابلہ پڑے تو معلوم ہو۔'' ❸ غرض عرب کا مُلک اس قدر متعدد اور مختلف اندرونی اور بیرونی خطرات میں مبتلا تھا کہ اس کی اصلاح وتدبیر کے لیے عام انسانی دست و بازو بے کار تھے خدا کا غیر مرئی ہاتھ محمد رسول اللہ ﷺ کی آستین میں پوشیدہ تھا﴿ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ﴾ ہجرت کے بعد آٹھ برس کی متواتر کوششوں اور پیہم اصلاحات کا یہ نتیجہ ہوا کہ محال نے امکان بلکہ واقعہ کی صورت اختیار کر لی۔ عرب کے سیاسی ضعف کا تمام تر راز نااتفاقی اور باہمی جنگ وجدال میں مضمر تھا اور اس نااتفاقی اور خانہ جنگی کا سبب صرف یہ تھا کہ تمام عرب مختلف خاندانوں اور نسلوں میں منقسم تھا۔ تمام مُلک کے اجتماع اور اتحاد کے لئے ان میں کوئی مستحکم رشتہ موجود نہ تھا، محمد رسول اللہ ﷺ نے تمام عرب کی شیرازہ بندی کے لیے اسلام کا رشتہ قائم کیا﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ ﴾ (۴۹/ الحجرات:۱۰) اور دفعتہً اس روحانی رشتہ نے خون، قرابت اور نسل کے تار و پود ادھیڑ دیے اور صرف ایک کلمہ لآ الٰہ الّا اللّٰہ محمدٌ رسول اللّٰہ کی برقی رَو اب تمام عرب کی اتحادی روح کو حرکت دے رہی ہے۔ خدائے پاک نے قرآن مجید میں اس اجتماع اور اتحاد کے وجود کو اپنی مخصوص نعمت فرمایا:

❶ کتب مغازی وسیر میں ان کے حالات پڑھو۔ ❷ معجم البلدان، یاقوت میں ان مقامات کے حالات دیکھو، بخاری، کتاب المغازی، باب قتل ابی رافع:۴۰۳۸۔ ❸ طبقات ابن سعد، ذکر مغازی، جزء ثانی، قسم اوّل، ص:۹۲؛ سیرت ابن ہشام ''امر بنی قینقاع'' ج ۲، ص:۵۶۔

﴿ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۰۳)

''خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے، خدا نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا پھر اس کے لطف و محبت سے بھائی بھائی بن گئے۔''

خدا نے خود آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ محمد (ﷺ)! یہ تیرا کام نہ تھا اس میں خود خدا وند مقلب القلوب کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔

﴿ هُوَ الَّذِيْۤ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ ﴾

(۸/ الانفال:۶۳)

''وہ خدا ہی ہے جس نے اے محمد (ﷺ)! اپنی نصرت اور مسلمانوں کے ذریعہ سے تجھ کو قوت بخشی اور اسی نے مسلمانوں کے دل باہم جوڑ دیئے اگر تم تمام دنیا کے خزانے بھی لوٹا دیتے تو بھی ان کے دلوں کو نہ جوڑ سکتے لیکن خدا نے ان کے دل باہم جوڑ دیے، وہ زبردست، حکمت والا ہے۔''

ہجرت کے بعد آنحضرت ﷺ نے مہاجرین و انصار کے درمیان جو مواخاۃ اور برادری قائم کرائی تھی وہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی تھی اور اس کی آخری کڑی وہ خطبہ تھا جو فتح مکہ کے موقع پر دیا گیا۔ قرآن مجید نے اپنے متواتر ارشادات میں فتنہ و فساد فی الارض کو مکروہ ترین فعلِ انسانی قرار دیا اور اس فعل کے مرتکب کے لئے سخت سزائیں مقرر کیں۔ چوری کے لئے قطع ید کی سزا متعین کی، رہزنی کے لئے قتل، پھانسی، قطع ید اور جلا وطنی کی تعزیریں جاری کیں۔ سورۂ مائدہ میں خون ریزی اور قتل و سفا کی کے انسداد کے لئے قصاص کا قانون نازل ہوا عملاً ملک میں قیام امن کے لئے آنحضرت ﷺ نے متعدد بار فوجیں بھیجیں، رہزن قبائل پر چھاپے مارے [1] حجاز میں جن قبائل کا پیشہ چوری تھا وہ تائب ہو کر مسلمان ہو گئے۔ [2] فوجداری اور دیوانی کے مقدمات کے فیصلے کے لئے قوانین وضع ہوئے اور جا بجا عمال کا تقرر ہوا۔

لیکن یہ سب جو کچھ ہوا وہ انسان کی ظاہری فطرت کی پابندی تھی، ورنہ ایک پیغمبر کا فرض ایک مقنن اور ایک عام مدبر کے فرائض سے بدرجہا بلند ہے۔ اسلام کے قانون تعزیرات نے جو کچھ کام کیا قرآن کا روحانی اثر اور خاتم الانبیا ﷺ کا فیض تلقین اس سے پہلے فرد قرارداد جرم کی دفعات کو بالکل مٹا دیتا تھا۔ قانون و خوف تعزیر صرف بازاروں میں اور انسانوں کے عام مجمعوں میں جرائم سے باز رکھ سکتا ہے لیکن دعوت اسلام کے فیض اثر نے دلوں کو بالکل خدا کے سامنے کر دیا جو رات کی تاریکیوں میں بھی دیکھتا تھا اور مقفل دروازوں کی

[1] سیرت النبی ﷺ ج ۱، دیکھو غزوات نبوی پر دوبارہ نظر۔

[2] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب ذکر اسلم وغفار: ۳۵۱۶۔

کھڑکیوں سے بھی جھانکتا تھا اور اب تک تمام ملک میں امن وامان تھا اور یہ عدی بن حاتم نے شہادت دی کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق لوگ صنعاء سے حجاز تک تن تنہا سفر کرتے تھے اور خشیت الٰہی کے سوا کوئی اور خوف راستہ میں نہ تھا۔ [1] ایک یورپین مؤرخ نے جس کے قلم نے پیغمبر اسلام ﷺ کی مدح کے لئے بہت کم جنبش کی ہے (مارگولیتھ) وہ بھی ان الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے:

''محمد ﷺ کی وفات کے وقت اُن کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہ گیا تھا۔ آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر کیا گیا تھا بنیاد ڈال چکے تھے۔ آپ ﷺ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا۔ آپ ﷺ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔'' [2]

بیرونی خطرات کے انسداد کے لئے خدا نے عجیب وغریب سامان پیدا کر دیئے قریش اور منافقین مدینہ کے اشتعال سے یہودیوں نے اسلام کو پامال کرنا چاہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود چور چور ہو گئے۔ ۳ھ سے لے کر ۷ھ تک متواتر لڑائیاں پیش آئیں اور آخر فتح خیبر پر ان کی سیاسی قوت کا خاتمہ ہو گیا۔ رومیوں نے اور حدودِ شام کے عیسائی عربوں نے اسلام کے استیصال کا بیڑہ اٹھایا۔ عیسائی رؤسائے عرب میں سب سے زیادہ طاقت ور اور پرزور غسانی تھے جو رومیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح کام کرتے تھے۔ بہراء، وائل، بکر، لخم، جذام اور عاملہ وغیرہا عرب قبائل ان کے ماتحت تھے۔ ان کے علاوہ دومۃ الجندل، ایلہ، جرباء، اذرح، تبالہ اور جرش وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے عیسائی اور یہودی رئیس تھے۔ غسانیوں کے حملہ کی ابتدا جس طرح ہوئی وہ اوپر گزر چکا ہے۔ حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ جو شاہ بصریٰ کے دربار میں دعوتِ اسلام کا خط لے کر گئے تھے ان کو غسانیوں نے راستہ میں قتل کر دیا۔ [3] آنحضرت ﷺ نے تین ہزار مسلمانوں کا ایک دستہ تادیب وانتقام کے لئے روانہ فرمایا غسانی ایک لاکھ کا ٹڈی دل لے کر میدان میں آئے اور خبر تھی کہ رومی بھی اس قدر فوج لئے ہوئے موتہ سے قریب مواب میں پڑے ہیں۔ تاہم مٹھی بھر مسلمان آدمیوں کے اس جنگل سے نہ ڈرے اور کچھ عزیز جانیں کھو کر فوج کو میدان جنگ سے ہٹا لائے۔ اس جنگ کا نام غزوۂ موتہ ہے۔

اس کے بعد ۹ھ میں غزوۂ تبوک پیش آیا۔ دم بدم خبریں آتی رہتی تھیں کہ رومی حملہ آوری کے لئے عیسائی عربوں کی ایک فوج گراں ترتیب دے رہے ہیں اور ایک سال کی پیشگی تنخواہ بھی فوج کو تقسیم کر چکے ہیں۔ یہ بھی خبر تھی کہ غسانی فوج کی آراستگی میں مصروف ہیں اور گھوڑوں کی نعل بندی بھی کر رہے ہیں۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے تیس ہزار صحابہ کے ساتھ پیش قدمی فرمائی اور بیس دن تک دشمنوں کی آمد کا انتظار کرتے

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ قبل الاسلام: ۳۵۹۵۔

[2] لائف آف محمد ﷺ مارگولیتھ، ص: ۴۷۱۔ [3] زرقانی، باب غزوۃ موتۃ، ج ۲، ص: ۳۰۹۔

رہے لیکن کوئی مقابل نہ آیا تاہم اس پیش قدمی کا فائدہ یہ ہوا کہ غسانیوں کے علاوہ تمام رؤ سانے رومیوں کو چھوڑ کر اسلام کی حمایت قبول کر لی [1] ۱۱ھ میں زمانۂ مرض الموت میں آنحضرت ﷺ نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے زیر افسری رومیوں کے مقابلہ کے لئے پھر فوجیں روانہ فرمائیں لیکن اس مہم کا اختتام عہدِ صدیقی میں ہوا۔ ایرانیوں کی حکومت زندگی کے آخری دور کو پہنچ چکی تھی۔ ۱۰ھ میں دعاۃ اسلام کے پہنچنے کے ساتھ ہی بے مقابلہ و جنگ یمن، عمان اور بحرین میں اُن کی قبائے حکومت کا تار تار الگ ہو گیا۔

غرض نو دس برس کی متواتر اور پیہم کوششوں سے اور مافوق طاقت بشری، تائیدات کے سبب سے اب تمام ملک میں امن وامان قائم ہو گیا۔ قریش اور یہود کی سازشوں کا طلسم ٹوٹ گیا۔ قبائل کی خانہ جنگیاں مٹ گئیں۔ تمام رہزن اور ڈاکو جتھے رام ہو گئے۔ بیرونی خطرات کا انسداد ہو گیا اب موقع ملا کہ صلح وآشتی کے ساتھ حسبِ فرمانِ الٰہی اصل مقصود کی طرف توجہ کی جائے۔

---

[1] اوپر کے تمام واقعات کی تفصیل اور حوالے غزوۂ موتہ اور تبوک کے ذکر میں گزر چکے ہیں۔

تبلیغ واشاعت اسلام

سرورِ کائنات ﷺ کا اصلی کام تمام عالم میں دعوتِ اسلام کا اعلان کرنا تھا اور نہ صرف اعلان بلکہ ہر قسم کے جائز اور صحیح وسائل سے تمام عالم کو حلقۂ اسلام میں لانا تھا، اس کے لئے تیغ وخنجر اور فوج وعسکر کی ضرورت نہ تھی، بلکہ صرف اس قدر کافی تھا کہ دعوتِ حق کی صدا اطرافِ عالم میں پہنچ جانے پائے۔ لیکن مکہ میں تیرہ برس تک اعدائے اسلام اسی کے سدراہ رہے۔ حج کے موقع پر عرب کے تمام قبائل دور دراز مقامات سے آتے تھے۔ آنحضرت ﷺ ایک ایک کے پاس جاتے اور صرف یہ درخواست کرتے کہ قریش مجھ کو پیغام پہنچانے سے روکتے ہیں تم اس کا موقع دلا دو اور خود دو لیکن قریش کے اثر سے ہزاروں لاکھوں میں سے ایک بھی اس کی حامی نہیں بھرتا تھا۔ تاہم آفتابِ حق کی کرنیں ان کثیف بادلوں میں سے بھی چھن چھن کر سطح قلوب پر پڑتی تھیں اور اکناف وحوالی کو روشن کرتی جاتی تھیں۔ اسلام کو صرف اشتہار اور اعلان کی ضرورت تھی اور یہ کام خود اعدائے اسلام نے انجام دیا جب حج کا زمانہ آتا تو رؤسائے قریش عام گزرگاہوں پر خیمے لگاتے باہر کے لوگ ان سے ملنے آتے، اور چونکہ بعثتِ نبوی ﷺ کا چرچا پھیل چکا تھا، لوگ اس کی حقیقت دریافت کرتے اور نہ کرتے تو قریش خود حفظ ماتقدم کے لئے ان سے کہتے کہ ہمارے شہر میں ایک بدعقیدہ پیدا ہوا ہے جو ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے یہاں تک کہ لات وعزیٰ تک کو برا کہتا ہے۔

بدعقیدہ کو عربی میں ''صابی'' کہتے ہیں، اسی مناسبت سے یا اس وجہ سے کہ اسلام کے بعض فرائض مثلاً: نماز کی صورت، صائبین کے اعمال سے ملتے جلتے ہیں قریش نے آنحضرت ﷺ کو صابی کا لقب دیا تھا اور بالآخر اس لقب سے تمام عرب میں آپ ﷺ کا نام مشہور ہوگیا۔ [1] صحیح بخاری کتاب المغازی میں ایک صحابی سے روایت ہے کہ میں جب چھوٹا تھا تو مکہ کے آنے جانے والوں سے سنا کرتا تھا کہ مکہ میں ایک مدعی نبوت پیدا ہوا ہے۔ [2] ملک میں جب آپ ﷺ کا نام مشہور ہوا تو اگرچہ جمہور عام پر مخالف اثر پڑا اور ان میں سے کسی شخص نے آپ ﷺ کی طرف رخ نہیں کیا لیکن اتنا بڑا وسیع ملک ان لوگوں سے خالی نہیں ہوسکتا تھا جن کو یہ شوق پیدا ہوا کہ اصل واقعہ کیا ہے؟ عرب میں ایسے لوگوں کی خاصی جماعت پیدا ہوگئی تھی جو بت پرستی سے متنفر ہو چکے تھے اور حق کے متجسس تھے۔ بعض لوگ اس حد سے ترقی کر کے حنفی بن گئے تھے جن کا تذکرہ آغازِ کتاب میں گزر چکا ہے حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے اصابہ میں متعدد ایسے صحابہ کا ذکر کیا ہے جو یمن وغیرہ دور دراز مقامات سے آنحضرت ﷺ کی تحقیقِ حال کے لئے مکہ میں آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور مخفی طور سے اسلام لا کر واپس گئے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ یمنی (اور طفیل بن عمرو دوسی یمنی رضی اللہ عنہ) کے خاندان میں جو اسلام پھیلا اس کی ابتدا قیام مکہ ہی کے زمانہ میں ہوئی تھی۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التیمم، باب الصعید الطیب وضوء المسلم: ٣٤٤۔

[2] صحیح بخاری، کتاب المغازی: ٤٣٠٢۔

مضل له و من یضلله فلا هادی له و اشهدان لا اله الا الله وحده لاشریك له و اشهد ان محمدا عبده ورسوله))۔ ان فقروں نے ضماد پر غیر معمولی اثر کیا۔ عرض کی دوبارہ ارشاد فرمائیے۔ آپ ﷺ نے پھر اعادہ فرمایا۔ ضماد نے پھر تیسری بار پڑھوایا، اب وہ بالکل مسحور تھے، بولے کہ ''میں نے کاہنوں کی باتیں، جادوگروں کے منتر اور شاعروں کے قصائد سُنے ہیں لیکن ایسا کلام میں نے نہیں سُنا، یہ تو دریا کی تہہ تک میں بھی اثر کر جائے گا، لائیے ہاتھ لائیے، میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے اُن سے بیعت لی۔

قبیلہ ازد کا اسلام

پھر فرمایا: ''اپنے پورے قبیلہ کی طرف سے بھی بیعت کرلو۔'' چنانچہ انھوں نے پورے قبیلہ کی طرف سے بیعت کرلی اور وہ ان کی دعوت سے مسلمان ہوگیا۔ ایک دفعہ ایک لڑائی میں مسلمان سپاہیوں کا ادھر سے گزر ہوا تو افسر نے پوچھا کہ کسی نے اس قبیلہ کی کوئی چیز لی ہے۔ ایک سپاہی نے کہا: ایک لوٹا میرے پاس ہے۔ اس نے حکم دیا کہ واپس کردو۔ [1]

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا اسلام

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا واقعہ اس موقع پر خاص طرح پر ذکر کے قابل ہے۔

غفار کا قبیلہ جو قریش کی شامی تجارت کے راستہ میں آباد تھا، جب وہاں یہ چرچا پھیلا تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ جو بت پرستی سے متنفر ہو چکے تھے اور حق کی تلاش میں تھے، انہوں نے اپنے بھائی (انیس) سے کہا کہ تم مکہ جاؤ اور دیکھو یہ شخص جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اس کی تعلیم اور تلقین کیا ہے؟ انیس مکہ آئے واپس جا کر بیان کیا کہ وہ مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور جو کلام پیش کرتا ہے وہ شاعری سے الگ ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو اس مختصر سے جواب سے تسکین نہیں ہوئی، خود گئے، زادِ سفر کے لئے مشک میں پانی اور کچھ کھانے کو لے لیا۔ مکہ میں آئے تو ڈر کے مارے کسی سے آنحضرت ﷺ کا نام پوچھ نہیں سکے تھے۔ حرم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوگئی انہوں نے گھر پر لا کر مہمان رکھا لیکن تین دن تک اُن سے بھی کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بالآخر خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ ''یہاں آنے کی کیا غرض ہے؟'' انہوں نے ڈرتے ڈرتے بتایا لیکن پھر قول واقرار لے لیا کہ کسی پر راز ظاہر نہ ہونے پائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لائے اور آپ ﷺ نے اسلام کی تلقین کی اور فرمایا کہ اس وقت گھر واپس جاؤ۔ پھر میں جو کچھ کہلا بھیجوں گا اس کی تعمیل کرنا لیکن ان کو اسلام کا جوش تھا، عرض کی کہ میں تو اسلام کا اعلان کر کے رہوں گا۔ غرض حرم میں آئے اور زور سے پکارے کہ اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدًا رسول الله اس آواز کا سننا تھا کہ لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑے اور اُن کو مارنا شروع کیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آکر بچایا اور لوگوں سے کہا کہ تم یہ نہیں سمجھتے کہ تمہاری تجارت کا راستہ غفار کی آبادی سے ہو کر گزرتا ہے اور یہ

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفیف الصلوة والخطبة: ۲۰۰۸۔

اسی قبیلہ کے آدمی ہیں۔ اس وقت لوگوں نے چھوڑ دیا، لیکن دوسرے دن حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے حرم میں جا کر پھر اسی طریقہ سے اسلام کا اعلان کیا اور نتیجہ بھی وہی ہوا جو کل ہو چکا تھا، آج بھی اتفاق سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ آ گئے اور انہوں نے جان بچائی۔ ❶

قبیلہ غفار کا اسلام

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ مکہ سے جب واپس گئے اور اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دی تو آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہو گیا۔ بقیہ آدمیوں نے کہا کہ ہم اس وقت تک اسلام کا اظہار نہیں کریں گے جب آنحضرت ﷺ مدینہ میں آ جائیں چنانچہ جب آپ ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو باقی آبادی بھی مسلمان ہو گئی۔ ❷

قبیلہ اسلم کا اسلام

غفار سے قریب اسلم کا قبیلہ آباد تھا اور دونوں قبیلوں میں قدیم تعلقات تھے۔ غفار کے اثر سے انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا ❸ (حالانکہ یہ دونوں قبیلے اسلام سے پہلے چوری میں بدنام تھے ❹ اور ان کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعل شنیع کا دشمن ہے)

اوس وخزرج کا اسلام

موسمِ حج میں عرب کے اکثر قبائل کا اجتماع ہو جاتا تھا۔ آپ ﷺ اس موقع پر ایک ایک قبیلہ کے قیام گاہ پر جاتے اور اسلام کی دعوت دیتے تھے چنانچہ مدینہ کے قبائل اوس وخزرج کی معتد بہ جماعت نے اسی موقع پر اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد جب حضرت معصب بن عمیر رضی اللہ عنہ داعیٔ اسلام بنا کر مدینہ منورہ بھیجے گئے تو اُن کے فیضِ تلقین سے چند ہی مہینوں میں دو گھرانوں کے سوا بقیہ تمام گھرانے مسلمان ہو گئے۔

قیامِ مدینہ میں اشاعتِ اسلام

ہجرت کے بعد جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آس پاس کے قبائل میں جیسا کہ اوپر گزرا، غفار واسلم نے اسلام قبول کر لیا۔

بدر کے بعض قریشیوں کا اسلام

کچھ ہی دنوں کے بعد بدر کا معرکہ پیش آیا جس میں قریش کو شکست ہوئی اور ستر اشخاص مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہوئے۔ ان قیدیوں کی رہائی کے لئے قریش نے مدینہ میں آمد ورفت شروع کی۔ اس تقریب سے لوگوں کو مسلمانوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا اور اس اثر سے متعدد اشخاص مسلمان ہو گئے۔

❶ یہ روایت بتمامہ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب قصة اسلام ابی ذر: ۳۵۲۲ سے ماخوذ ہے، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل ابی ذر: ۶۳۵۹ میں یہ واقعہ جس طرح منقول ہے اس میں بہت سی باتیں اس سے زائد اور مختلف ہیں۔ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ فتح الباری، ج ۷، ص: ۱۳۲ میں لکھتے ہیں کہ ان دونوں روایتوں میں تطبیق ممکن ہے۔

❷ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی ذر: ۶۳۵۹۔

❸ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب ذکر اسلم وغفار: ۳۵۱۴، ۳۵۱۵۔ ❹ (بحوالہ سابق)۔

(ان میں) بہت سے لوگ ایسے تھے کہ اتفاقیہ اُن کے کانوں میں قرآن مجید کی آواز پڑگئی اور باوجود سخت عداوت کے اُن کا دل پتھر سے موم بن گیا۔ جبیر بن مطعم بدر کے قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانے کے لئے آئے تھے اور قیدیوں کے ساتھ اسیر تھے، ایک دن آنحضرت ﷺ یہ آیتیں پڑھ رہے تھے:

﴿ أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ۝ أَمْ خَلَقُوا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ۚ بَل لَّا يُوقِنُونَ ۝ ﴾ (۵۲/ الطور: ۳۵، ۳۶)

”کیا یہ یوں ہی آپ سے آپ پیدا ہو گئے یا ان لوگوں نے خود اپنے آپ کو پیدا کیا، یا ان لوگوں نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا بلکہ یہ بات ہے کہ ان کو یقین نہیں ہے۔“

جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کا اسلام

جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے یہ آیتیں سُن لیں تو ان کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل پرواز کر گیا۔ صحیح بخاری سورۂ طور میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ [1]

(مکہ میں روم وفارس کی جنگ کے متعلق آنحضرت ﷺ نے جو پیشین گوئی فرمائی تھی وہ ٹھیک فتح بدر کے موقع پر پوری اتری اور قرآن مجید کی پیشین گوئی کے مطابق سات برس کے بعد رومیوں نے فارس پر فتح کلی پائی۔ اس عظیم الشان معجزہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک خلق کثیر نے اسلام کی صداقت کا اقرار کیا)

پیشین گوئی روم کا اثر

غرض اس طرح آپ ہی آپ لیکن نہایت آہستگی اور تدریج کے ساتھ اسلام پھیلتا جاتا تھا۔ ۵ھ میں قریش، کنانہ، غطفان، اسد اور دیگر قبائل نے متحد ہو کر مدینہ پر حملہ کیا اور شکست کھائی اس معرکہ کا نام احزاب ہے۔ جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے اس شکست نے قریش کا عالمگیر اثر کسی قدر کم کیا اور وہ قبائل جو قبولِ اسلام کے لئے آمادہ تھے لیکن قریش کے ڈر سے ان کو اظہارِ اسلام کی ہمت نہیں ہوتی تھی، انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں وفود بھیجنے شروع کئے۔

قبیلہ مزینہ کا اسلام

سب سے پہلی جو سفارت آئی وہ قبیلہ مزینہ کی تھی، جس میں چار سو آدمی شریک تھے، انہوں نے یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ اگر ارشاد ہو تو ہجرت کر کے مدینہ میں آجائیں لیکن آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”کہ تم جہاں رہو، مہاجر ہو“ [2]

قبیلہ اشجع کا اسلام

اسی زمانہ میں قبیلۂ اشجع کے سفراء جن کی تعداد سو (۱۰۰) تھی، مدینہ میں آئے اور آنحضرت ﷺ سے

---

[1] بخاری، کتاب الجهاد، باب فداء المشرکین: ۳۰۵۰۔

[2] جزء طبقات ابن سعد متعلق وفود، جزء اول، قسم ثانی، ص: ۳۸۔

کہا کہ ہم آپ ﷺ سے لڑنا نہیں چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ صلح کا معاہدہ ہو جائے آنحضرت ﷺ نے قبول فرمایا، اس وقت تک یہ لوگ کافر رہے، لیکن جب صلح ہو چکی تو انہوں نے خود بخود اسلام قبول کرلیا۔ ❶

قبیلہ جہینہ کا اسلام

جہینہ بھی انہی قبائل کے آس پاس آباد تھے، آنحضرت ﷺ نے اُن کو اسلام کی دعوت دی اور وہ فوراً ایک ہزار کی جمعیت لے کر مدینہ آئے اور مسلمان ہوگئے اور اس کے بعد وہ اکثر غزوات میں مسلمانوں کے شریکِ حال رہے ❷ (غفار، اسلم، مزینہ، اشجع اور جہینہ کی یہی اطاعت اور مسابقتِ اسلام تھی جس کی بنا پر آپ ﷺ نے اُن کے حق میں دعائے خیر فرمائی) ❸

صلح حدیبیہ کا اثر

صلحِ حدیبیہ کے زمانہ میں جیسا کہ ہم حدیبیہ کے ذکر میں لکھ آئے ہیں، کفار اور مسلمان نہایت آزادی کے ساتھ آپس میں ملتے جلتے اور اس لئے منکروں کو خلوت وجلوت میں مسلمانوں کی تلقینات کے سننے کا موقع ملا۔ اس کا نتیجہ ❹ یہ ہوا کہ اس سے پہلے باوجود غزوات اور محاربات کے جس قدر لوگ اسلام لائے تھے صرف دو برس میں یہ تعداد اس سے اضعافاً مضاعفہ بڑھ گئی چنانچہ جب آنحضرت ﷺ حدیبیہ کے سال ادائے عمرہ کے ارادہ سے مدینہ طیبہ سے نکلے تو صرف ڈیڑھ ہزار شخص ساتھ تھے اب دو برس کے بعد فتح مکہ کو چلے تو دس ۱۰ ہزار مسلمانوں کا لشکر جرار ساتھ تھا۔ صلح حدیبیہ کا اثر اگرچہ تمام عرب پر محیط نہ تھا، کیونکہ اس معاہدہ میں صرف قریش اور کنانہ شریک تھے اس لئے جو لوگ براہ راست قریش کے زیر اثر یا اُن کے حلیف اور ہم عہد نہ تھے وہ اب بھی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کرتے رہتے تھے اور ان کے دفاع کے لئے آنحضرت ﷺ کو کچھ کچھ فوجیں بھیجنی پڑتی تھیں، تاہم جن موقعوں پر امن کا گمان ہوتا تھا وہاں داعیان اسلام بھیجے جانے لگے کہ لوگوں کو اسلام کی طرف بلائیں لیکن چونکہ حفاظتِ خود اختیاری کی غرض سے ان داعیوں کے ساتھ تھوڑی بہت جمعیت بھی ہوتی تھی، اس لئے ارباب سیران تبلیغی جماعتوں کو بھی سرایا سے تعبیر کرتے تھے۔

فتح مکہ کا اثر

تمام عرب تولیتِ کعبہ کی وجہ سے قریش کو مذہبی رہبر سمجھتا تھا اس لئے وہ انتظار کر رہے تھے کہ قریش کا کیا

---

❶ جزء طبقات ابن سعد مذکور، ص:٤٨۔ ❷ اصابہ تذکرۃ بشیر بن عرفطۃ، ج١، ص١٥٣ مطبع السعادۃ مصر: ١٣٢٨ھ۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب ذکر غفار و سلم وجھینۃ: ٣٥١٣، ٣٥١٤۔
❹ طبری میں امام زہری کا قول ہے: فلمّا کانت الھدنۃ ووضعت الحرب اوزارھا وأمِنَ الناس کلھم بعضھم بعضا فالتقوا وتفاوضوا فی الحدیث والمنازعۃ فلو یکلم احدٌ بالاسلام یعقل شیئا الادخل فیہ فلقد دخل فی تینک السنتین فی الاسلام مثل ماکان فی الاسلام واکثر۔ (ج٣،ص:١٥٥١ مطبع بریل لیڈن: ١٨٨١، ١٨٨٢ء) ''جب صلح ہوگئی اور جنگ موقوف ہوگئی' ایک دوسرے سے لوگ بے خوف ہوگئے' باہم ملے جلے' باتیں چیتیں ہوئیں تو کوئی عقلمند ایسا نہیں تھا جس سے اسلام کے متعلق گفتگو ہوئی اور اس نے قبول نہ کرلیا چنانچہ جتنے لوگ ابتدا سے اس وقت تک مسلمان ہوئے تھے صرف ان دو برسوں میں ان کے برابر بلکہ ان سے زیادہ تعداد میں لوگ مسلمان ہوگئے۔''

انجام ہوتا ہے۔ عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے جو مدینہ سے دور ایک گزر گاہِ عام پر رہتے تھے، اُن کے یہ الفاظ صحیح بخاری میں منقول ہیں:

كانت العرب تلوّم باسلامهم الفتح فيقولون اتركوه وقومهٗ فانه ان ظهر عليهم فهو نبي صادق فلما كانت وقعة اهل الفتح بادر كل قوم باسلامهم۔ [1]

''عرب قریش کے اسلام کا انتظار کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ محمد ﷺ کو ان کی قوم (قریش) پر چھوڑ دو، اگر محمد ﷺ ان پر غالب آ گئے تو بے شبہ وہ سچے پیغمبر ہیں۔ پس جب مکہ فتح ہوا تو ہر قبیلہ نے اسلام کی طرف پیش دستی کی۔''

ابن ہشام نے زیادہ صاف لکھا ہے:

وانما [2] كانت العرب تربص بالا سلام امر هذا الحي من قريش وامر رسول الله ﷺ وذلك ان قريشا كانوا امام الناس وهاديهم واهل البيت والحرم وصريح ولد اسمٰعيل بن ابراهيم عليهما السلام وقادة العرب لا ينكرون ذلك وكانت قريش هي التي نصبت لحرب رسول الله ﷺ وخلافه فلما افتتحت مكة ودانت له قريش ودخلها الا سلام عرفت العرب انه لا طاقة لهم بحرب رسول الله ﷺ ولا عداوته فدخلوا في دين الله كما قال الله عزوجل افواجًا۔ (الخ)

''اور عرب اسلام کے باب میں صرف قریش کا انتظار کر رہے تھے اور وہ یوں کہ قریش تمام ملک کے سردار اور پیشوا اور کعبہ وحرم کے متولی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی خاص اولاد اور عرب کے قائد تھے اور صرف قریش نے آنحضرت ﷺ کی مخالفت کے لئے جنگ برپا کی تھی تو جب مکہ فتح ہو گیا اور قریش نے سپر ڈال دی اور اسلام مکہ میں چھا گیا تو عرب کو یقین ہو گیا کہ ان کو آنحضرت ﷺ کی جنگ اور عداوت کی طاقت نہیں ہے تو وہ خدا کے دین میں داخل ہو گئے جیسا کہ اللہ عزوجل نے قرآن میں کہا ہے یعنی ﴿ إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ ﴾''

غرض اسلام کی سچائی اور سادگی اور عرب کی تیز فہمی اور ذہانت کے لحاظ سے اسلام کے پھیلنے میں جو دیر لگی، وہ زیادہ تر قومی اور خاندانی مخالفت کی وجہ سے تھی اب جبکہ باطل کا سنگ راہ ہٹ گیا تو حق کے آگے بڑھنے میں دیر نہ تھی۔

فتح مکہ کے بعد اب اسلام کے لئے یہ خطرہ نہیں رہا کہ اس کے دعاۃ جہاں جائیں بے دریغ قتل کر دیے جائیں، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے تمام اطرافِ عرب میں دعاۃ بھیج دیے کہ لوگوں کو اسلام کے فضائل و

[1] صحيح بخاري، كتاب المغازي، فتح مكه: ٤٣٠٢۔

[2] سيرت ابن هشام، ذكر واقعات ۹ھ و وفود، ج ۲، ص: ۳٦۲ مطبع محمد على صبيح: ۱۳٤٦ھ۔

محاسن بتا کر اُن کو اسلام کی ترغیب دلائیں دعاۃ حسب ذیل طریقہ سے مقرر کیے گئے۔

1 حفاظت خود اختیاری کی غرض سے کسی قدر فوج ساتھ کر دی جاتی تھی کہ ان کو کوئی شخص ضرر نہ پہنچانے پائے اور وہ آزادی سے تبلیغِ اسلام کر سکیں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو آنحضرت ﷺ نے یمن بھیجا تو فوج بھی ساتھ کر دی، لیکن تاکید تھی کہ بہ جبر پیش نہ آئیں۔ چنانچہ پورے چھ مہینے تک ان کی دعوت اسلام پر کسی نے توجہ نہیں کی اور وہ کچھ نہ کر سکے حضرت خالد رضی اللہ عنہ سپہ سالار اور فاتح تھے، واعظ اور صاحب ارشاد نہ تھے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا، انہوں نے قبائل کے سامنے جب اسلام کی تبلیغ کی تو دفعتہً ملک کا ملک مسلمان تھا۔

یہی وہ دعاۃ ہیں جن کو علامہ طبری نے ان لفظوں سے تعبیر کیا ہے:

قدکان رسول اللّٰہ ﷺ بعث فیھا حول مکۃ السرایا تدعوالی اللّٰہ عزوجل ولم یأمرھم لقتال۔ 1

''آنحضرت ﷺ نے مکہ کے اطراف میں کچھ ٹکڑیاں بھیجی تھیں کہ لوگوں کو خدا کی طرف بلائیں لیکن ان کو لڑنے کا حکم نہیں دیا تھا۔''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو قبیلہ بنی جذیمہ کے پاس بھی اسی طرح دعوت اسلام کے لئے بھیجا تھا لیکن جب انہوں نے کشت وخون کیا اور آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ کھڑے ہو گئے اور قبلہ رخ دونوں ہاتھ اُٹھا کر کہا کہ ''خدایا! میں خالد کے فعل سے بری ہوں۔'' 2 پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا، انہوں نے ایک ایک مقتول کا خون بہا ادا کیا، یہاں تک کہ کتوں کا بھی۔ 3

(اشاعتِ اسلام کی غرض سے جو مسلح جماعت اطرافِ ملک میں بھیجی جاتی تھی، اس میں کبھی کبھی آپ ﷺ ایک ایک فرد کا امتحان لیتے تھے، ان میں جو صاحب سب سے زیادہ حافظِ قرآن ہوتے تھے ان کو اس کا امیر مقرر فرماتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے ایک بار اسی قسم کی فوج روانہ کرنا چاہی 4 تو ایک ایک شخص سے قرآن پڑھوا کر سنا، ان لوگوں میں ایک کم سن نوجوان تھے آنحضرت ﷺ اُن کے پاس آئے پوچھا: ''تمہیں کیا یاد ہے؟'' انہوں نے کہا: مجھ کو سورۂ بقرہ اور فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو تم ہی اب سب کے امیر ہو۔'' 5)

2 جو ممالک زیر اثر آتے تھے اور وہاں زکوۃ اور جزیہ کے وصول کرنے کے لئے عمال بھیجے جاتے تھے وہ

1 تاریخ طبری، ج ۳، ص: ۱۶۴۹۔ 2 بخاری، کتاب المغازی، باب بعث النبی ﷺ خالد بن الولید: ۴۳۳۹۔
3 تاریخ، طبری ج ۳، ص: ۱۶۵۰، ۱۶۵۱۔ 4 اس روایت میں اگرچہ یہ تصریح نہیں ہے کہ یہ فوج اشاعتِ اسلام کے لئے بھیجی گئی تھی صرف یہ الفاظ ہیں: بعث بعثا وھم ذوعدد یعنی آپ ﷺ نے ایک بہت بڑی جماعت بھیجی۔ تاہم قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد صرف اشاعتِ اسلام تھا کیونکہ اگر لڑائی مقصود ہوتی تو پھر حفظِ قرآن کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ آپ ﷺ ہر ایک سے قرآن پڑھوا کر سنتے۔ 5 ترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ما جاء فی سورۃ البقرۃ، آیت الکرسی: ۲۸۷۶۔

اکثر اس درجہ کے لوگ ہوتے تھے جن کا تقدس، زہد اور پاکیزگی مسلّم ہوتی تھی اس کے ساتھ عالم اور واعظ بھی ہوتے تھے اور اس لئے وہ تحصیلِ مال کے ساتھ تبلیغِ اسلام کی خدمت بھی انجام دے سکتے تھے ان میں سے بعضوں کے نام حسب ذیل ہیں:

نام	مقام	کیفیت
مہاجر بن ابی اُمیہ رضی اللہ عنہ	صنعاء یمن	حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا (زوجۂ نبوی) کے بھائی تھے
زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ	حضرموت	یہ اُن اصحاب میں ہیں جو غزوۂ بدر میں شریک تھے۔
خالد بن سعید رضی اللہ عنہ	صنعاء یمن	سابقینِ اولین اور مہاجرینِ حبش میں ہیں' سب سے پہلے انہی نے کاغذات پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا۔
عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ	قبیلہ طے (یمن)	مشہور صحابی ہیں حاتم طائی انہی کا باپ تھا۔
علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ	بحرین	
حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ	زبید و عدن	ان کی دعوت اسلام سے قریباً تمام لوگ مسلمان ہو گئے، مشہور صاحب علم صحابی ہیں۔
حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ	جند	مشہور صاحب علم صحابی ہیں۔
جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بجلی [1]	ذوالکلاع حمیری	جریر مشہور صحابی ہیں، ذوالکلاع حمیری یمن کے سلاطین کے خاندان سے تھے ایک موقع پر لاکھ آدمیوں نے ان کو سجدہ کیا تھا۔ جریر رضی اللہ عنہ کی دعوت پر یہ اسلام لائے تو اس کی خوشی میں چار ہزار غلام آزاد کئے۔

3 بعض [2] لوگ خاص اشاعتِ اسلام کی غرض سے بھیجے جاتے تھے، تفحص سے اس قسم کے دعاۃ کے نام حسب ذیل ہیں:

نام	مقام دعوت	نام	مقام دعوت
علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ	قبیلہ ہمدان و جذیمہ و مذحج	خالد بن ولید رضی اللہ عنہ	اطراف مکہ
مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ	نجران	عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ	عمان
وبر بن یحنس رضی اللہ عنہ	ابنائے فارس	مہاجر بن ابو اُمیہ	بطرف حارث بن عبد کلال شہزادۂ یمن
محیصہ بن مسعود رضی اللہ عنہ	فدک		
احنف	قبیلہ سلیم [3]		

4 رؤسائے قبائل بارگاہِ نبوت میں آ کر مسلمان ہو جاتے تھے اور کچھ روز یہاں قیام کر کے اپنے اپنے قبائل میں دعوت اسلام کی غرض سے واپس جاتے تھے ان اشخاص کے نام یہ ہیں:

[1] یہ اور آگے کی فہرست حدیث، سیر اور طبقات کی کتابوں سے مرتب و ماخوذ ہے۔

[2] اضافہ ذکر اسلام ابنائے یمن۔ [3] مسند احمد، ج ۵، ص: ۳۷۲۔

نام	مقام	کیفیت
طفیل بن عمرو دوسی	قبیلہ دوس	
عروہ بن مسعود	ثقیف	
عامر بن شہر	ہمدان	
ضمام بن ثعلبہ	بنو سعد	
منقذ بن حبان	بحرین	
ثمامہ بن اثال	اطراف نجد	

ان مبلغین اور دعاۃ کے اثر سے اسلام ہر جگہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا، فتح مکہ کے بعد جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، دعاۃ اطرافِ مکہ میں بھیج دیے گئے تھے اور لوگ خوشی خوشی مسلمان ہوتے جاتے تھے۔ قرآن پاک کی یہ آیتیں اسی موقع کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۙ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ ﴾

(۱۱۰/ النصر: ۱، ۲)

''جب خدا کی فتح و نصرت آئی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج خدا کے مذہب میں داخل ہو رہے ہیں۔''

فتح مکہ کے تین مہینے کے بعد ذوالحجہ ۹ھ کے موسمِ حج میں اعلان براءت ہوا، اس واقعہ کے بعد بلا استثنا حجاز نے عام طور سے اسلام قبول کر لیا۔ [1]

حجاز سے باہر نبوت کے اکیس برس میں صرف قریش اور یہود کی مزاحمت سے اسلام آگے نہ بڑھ سکا اور خال خال مسلمان اِدھر اُدھر نظر آتے تھے، لیکن ان دیواروں کا ہٹنا تھا کہ صرف تین برس میں ۸، ۹، ۱۰ھ میں اسلام کا اثر ایک طرف یمن، بحرین، یمامہ، عمان اور دوسری طرف عراق و شام کی حدود تک وسیع ہو گیا۔ یہ عرب کے وہ صوبے ہیں جہاں اسلام سے پہلے عربوں کی بڑی بڑی حکومتیں قائم تھیں اور اس وقت بھی وہ روم و فارس دنیا کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیر سایہ تھیں تاہم اسلام بغیر تلوار کی رفاقت کے صلح و امن کے سایہ میں اپنی آواز بلند کرتا چلا گیا اور ہر گوشہ سے لبیک کی صدائیں خود بخود آنے لگیں۔

یمن

ملکِ عرب کے تمام صوبوں میں یمن سب سے زیادہ زرخیز اور سیر حاصل ہے اور نہایت قدیم زمانے سے تمدن و تجارت کا مرکز ہے۔ سبا اور حمیر کی عظیم الشان حکومتیں یہیں قائم ہوئی تھیں۔ ولادتِ نبوی سے تقریباً پچاس برس پہلے ۵۲۵ء میں حبشی عیسائیوں نے یمن پر قبضہ کر لیا تھا۔ ولادتِ نبوی ﷺ کے چند سال بعد اہلِ ایران یہاں کے مالک بن گئے تھے۔ ان کی طرف سے یہاں ایک گورنر ہوتا تھا جو یمن پر حکومت کرتا تھا یمن

[1] طبری واقعات ۹ھ ج ٤، ص: ۱۷۰٦ وما بعد۔

میں اسلام کی تحریک کے لئے متعدد عوائق موجود تھے، مثلاً اختلافِ جنسیت کہ اہل یمن قحطانی تھے، داعیٔ اسلام اسماعیلی۔ اہل یمن کو اپنے قدیم جاہ وجلال اور تمدن وحکومت پر ناز تھا اور تمام عرب بجا طور سے ان کی پیش روی کو تسلیم کرتا تھا اور تمام عرب میں وہی حکومت کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ ملک میں جہاں کہیں باقاعدہ حکومت تھی وہ نسلاً اسی خاندان سے شمار ہوتی تھی چنانچہ جب یمن سے قبیلہ کندہ کا وفد آیا ہے جو یمن کا ایک شاہی خاندان تھا تو آنحضرت ﷺ کو ایک عرب فرمانروا سمجھ کر رئیس وفد نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ ﷺ اور ہم، ہم خاندان نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہم نضر بن کنانہ کے خاندان سے ہیں، نہ اپنی ماں پر تہمت رکھ سکتے ہیں اور نہ اپنے باپ سے انکار کر سکتے ہیں۔'' [1]

یمن میں اشاعت اسلام کا سب سے بڑا عائق یہ ہو سکتا تھا کہ وہ پولیٹیکل حیثیت سے ایرانیوں کے ماتحت تھے اور باشندے مذہباً علی العموم یہودی یا عیسائی تھے، لیکن قبول حق کے لئے کوئی چیز ان میں سے مانع نہ آئی یمن میں اسلام کی دعوت ہجرت سے بہت پہلے پہنچ چکی تھی یمن میں دوس ایک ممتاز قبیلہ تھا۔ اس قبیلہ کا رئیس طفیل رضی اللہ عنہ بن عمرو اتفاق سے مکہ آیا اور مسلمان ہو گیا اسی زمانہ میں کندہ کا قبیلہ حج کے لئے مکہ آیا تھا آنحضرت ﷺ نے ان کو اسلام کی دعوت دی لیکن انہوں نے انکار کیا۔ [2] ۷ھ میں آنحضرت ﷺ خیبر میں تشریف فرما تھے۔ دوس کا قبیلہ مسلمان ہو کر دار الاسلام میں منتقل ہو گیا یمن کا ایک مشہور قبیلہ اشعر تھا وہ بھی مہاجرین حبشہ کی معیت میں اس زمانہ میں بلاتحریک خود بخود اسلام لایا اور آستانہ نبوت پر حاضر ہوا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ دوسی اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ان ہی قبائل کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔

یمن میں ہمدان سب سے بڑا کثیر التعداد اور صاحبِ اثر خاندان تھا۔ آنحضرت ﷺ نے (۸ھ کے آخر میں) اُن کو دعوت اسلام دینے کے لئے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ خالد رضی اللہ عنہ چھ مہینے تک ان کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، لیکن ان لوگوں نے قبول نہیں کیا بالآخر آنحضرت ﷺ نے خالد کو بلا لیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو جمع کر کے رسول اللہ ﷺ کا نامہ مبارک پڑھ کر سنایا اور ساتھ ہی سارے کا سارا قبیلہ مسلمان تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب اس واقعہ کی اطلاع بارگاہِ رسالت میں دی تو آنحضرت ﷺ نے سجدہ کیا اور سر اٹھا کر دو دفعہ فرمایا: ((السّلام علی همدان)) [3]

---

[1] مسند احمد بن حنبل، حدیث اشعث بن قیس، ج ۵، ص: ۲۱۱ وزاد المعاد، ج۲، ص: ۳۲ مطبع میمنہ مصر۔

[2] ابن ہشام ذکر عرض الاسلام علی القبائل، ج۱، ص:۲۵۶۔

[3] زرقانی بسند صحیح از بیہقی الوفد الحادی عشر (وفد همدان) ج ٤، ص:٤١۔ اصل واقعہ بخاری جزء غزوات :٤٣٤٩۔ میں موجود ہے لیکن ہمدان کی اس میں تخصیص نہیں اور نہ ان کے اسلام کا اس میں ذکر ہے اس واقعہ کے متعلق اور بھی روایتیں ہیں لیکن وہ صحیح نہیں چنانچہ وہ خود مواہب لدنیہ نے تسلیم کیا ہے۔ ان روایتوں کا یہ مفہوم ہے کہ ہمدان کے لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ڈر سے اسلام قبول کر لیا لیکن یہ راویوں کا حسنِ ظن ہے واقعہ نہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ہمدان کو حکم دیا کہ وہ ثقیف سے ہمیشہ لڑا کریں اور ان پر غارت گری کیا کریں لیکن حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح کی ہے کہ یہ روایت بالکل غلط ہے۔ ہمدان یمن کا قبیلہ تھا اور ثقیف مکہ کے پاس طائف میں تھے، یہ حکم تو دو ہمسایہ قبیلوں کو دیا جا سکتا تھا (زاد المعاد، جزء ثانی، ص:۳)

بعض روایتوں میں ہے کہ ہمدان نے جب اسلام کا غلغلہ سنا تو عامر بن شہر کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجا کہ یہ مذہب اگر تم کو پسند آئے تو ہم سب اُس کے قبول کے لئے تیار ہیں اور اگر ناپسندیدہ ٹھہرے تب بھی ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ عامر بن شہر جب دربارِ رسالت سے واپس آیا تو اس کا دل نورِ اسلام سے معمور تھا اور ساتھ ہی سارا قبیلہ بھی مسلمان تھا ممکن ہے کہ یہ دونوں واقعے ہوں اور دونوں کی کوشش سے یہ کامیابی حاصل ہوئی ہو۔ یمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لوگ مانوس ہو گئے تھے۔ ربیع الاول ۱۰ھ میں تین سو سواروں کی حفاظت میں آنحضرت ﷺ نے پھر ان کو یمن کے قبیلہ مذحج میں تبلیغِ اسلام کے لئے نامزد فرمایا اور ساتھ ہی یہ تاکید فرما دی کہ جب تک وہ حملہ آور نہ ہوں پیش دستی نہ کرنا، حضرت علی رضی اللہ عنہ جب مذحج کی سر زمین میں پہنچے تو مال گزاری وصول کرنے کے لئے ادھر ادھر لوگوں کو متعین کیا۔ اسی اثنا میں قبیلہ مذحج کی ایک جمعیت نظر آئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُن کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی، لیکن ادھر سے اس احسان کا جواب تیر اور پتھروں کی زبان سے ملا۔ یہ دیکھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے ساتھیوں کی صف آرائی کی۔ مذحج اپنے بیس آدمی مقتول چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب نہ کیا کہ ان کا مقصود صرف مدافعت تھا، اس کے بعد رؤسائے قبیلہ خود حاضر ہوئے اور انہوں نے اسلام قبول کیا اور دوسروں کی طرف سے نیابتہً اسلام کا اعلان کیا۔ [1]

یمن میں فارس کے جو رؤسا قیام پذیر ہو گئے تھے ان کو ابنا کہتے تھے آنحضرت ﷺ نے ۱۰ھ میں وبر بن یحنس رضی اللہ عنہ کو اُن کے پاس دعوت اسلام کے لئے بھیجا، وہ نعمان بن بزرج (بزرگ) کے گھر ان کے مہمان ہوئے اور فیروز دیلمی، مرکبود، وہب بن منبہ کے پاس دعوت اسلام کے خطوط بھیجے، سب نے اسلام قبول کیا۔ صنعاء میں سب سے پہلے جس نے قرآن مجید حفظ کیا وہ مرکبود کے صاحبزادے عطاء اور وہب بن منبہ تھے۔ [2]

عام یمن [3] میں تبلیغ اسلام کے لئے آنحضرت ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو نامزد فرمایا۔ دونوں صاحب یمن کے ایک ایک ضلع میں بھیجے گئے تھے۔ چلتے وقت آپ ﷺ نے ان لوگوں کو جو باتیں تعلیم فرمائیں، وہ درحقیقت اسلامی تبلیغ کے اصول ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سہولت سے کام کرنا، سخت گیری نہ کرنا، لوگوں کو خوش خبری سنانا، نفرت نہ دلانا، دونوں مل کر کام کرنا تم کو ایسے لوگ ملیں گے جو پہلے سے کوئی مذہب رکھتے ہیں جب ان کے ہاں پہنچنا تو پہلے ان کو توحید اور رسالت کی دعوت دینا، جب وہ اس کو تسلیم کر لیں تو کہنا کہ خدا نے تم پر روز و شب میں پانچ وقت کی نماز بھی فرض کی ہے، جب یہ بھی مان لیں تو ان کو سمجھانا کہ تم پر زکوۃ بھی واجب ہے، تم میں جو امیر ہوں ان سے لے کر جو غریب ہیں ان کو دے دی جائے گی دیکھو جب وہ زکوۃ دینا منظور کر لیں تو چن کر اچھی اچھی چیزیں نہ لے لینا، مظلوموں کی بددعا سے ڈرتے

---

[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مہم یمن کا واقعہ تمام حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے لیکن یہ تفصیل ابن سعد، جزء ثانی، قسم اول، ذکر مغازی، ص:۱۲۲ سے ماخوذ ہے۔ [2] طبری، واقعات سنۃ: ۱۰ ھ ج ٤، ص: ۱۷٦٣۔ [3] اضافہ تابحرین۔

رہنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں۔'' حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یا نبی اللہ! ہمارے ملک یمن میں جو اور شہد کی شراب بنتی ہے، کیا یہ بھی حرام ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر شے جونشہ پیدا کرے حرام ہے۔'' ❶

نجران

یمن کے پاس ہی نجران کا ضلع ہے، نجران عرب میں عیسائیت کا خاص مرکز تھا۔ آنحضرت ﷺ نے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو جو صلح حدیبیہ ۶ھ سے پہلے اسلام لا چکے تھے، دعوت اسلام کے لئے نجران بھیجا۔ عیسائیوں نے قرآن پر اعتراضات شروع کیے۔ یہ جواب نہ دے سکے اور واپس چلے آئے۔ ❷ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے دعوتِ اسلام کا ان کو خط لکھا جس میں تحریر تھا۔ اگر اسلام قبول نہ ہو تو اسلام کی سیاسی اطاعت قبول کرو اور جزیہ دو۔ ❸ اہل نجران نے راہبوں اور مذہبی پیشواؤں کی ایک جماعت کو دریافت حال کے لئے مدینہ بھیجا اس وفد کا تفصیلی بیان آگے آئے گا۔ نصاریٰ کے علاوہ نجران میں مشرکین کی بھی کچھ آبادی تھی، ان میں ایک قبیلہ بنو حارث بن زیاد تھا جو مدان نام ایک بت کو پوجتا تھا اور اس لئے عبدالمدان کے نام سے مشہور تھا۔ ربیع الآخر ۱۰ھ میں آنحضرت ﷺ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو وہاں دعوتِ اسلام کے لئے بھیجا، حضرت خالد رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے یہاں تھوڑے دن قیام کیا اور قرآن اور احکامِ اسلام کی تعلیم دی۔ ❹

اہل یمن کے لیے دعائے خیر

اہلِ یمن کا بغیر کسی ترہیب وترغیب کے خلوصِ دل سے قبول اسلام کوئی ایسا واقعہ نہ تھا جو خاص رحمت الٰہی کا مستوجب نہ ہو جب اشعریوں کی آمد کی خبر ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو بشارت دی کہ کل اہل یمن آتے ہیں جو رقیق القلب اور نرم دل ہیں۔ ❺ جب ہمدان مسلمان ہوا تو آپ ﷺ نے سجدۂ شکر ادا کیا اور اُن کو سلامتی کی دُعا دی۔ حمیر اور تمیم کا وفد آیا تو آپ ﷺ نے پہلے تمیم کی طرف خطاب کیا، تمیم بشارت قبول کرو۔ بنو تمیم نے کہا کہ یارسول اللہ! ہم نے بشارت تو قبول کر لی، کچھ عطا بھی فرمائیے۔ آپ ﷺ نے منہ پھیر لیا کہ بشارت سے بڑھ کر کیا چیز ہو سکتی تھی؟ ❻ پھر اہل یمن کی طرف رُخ کر کے فرمایا: ''اے اہل یمن! تمیم نے بشارت قبول نہ کی تم قبول کرلو۔'' اہل یمن بے اختیار بول اُٹھے: اے خدا کے رسول! ہم نے قبول کیا۔ ❼ پھر آپ ﷺ نے عام طور سے فرمایا: ''ایمان یمن کا ایمان ہے اور دانائی یمن کی دانائی ہے۔'' ❽ مبلغینِ یمن میں سے حضرت علی اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہما حجۃ الوداع کے موقع پر یمن سے واپس آئے اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ

---

❶ یہ پورا واقعہ بخاری جزء غزوات: ٤٣٤١ تا ٤٣٤٤ میں مذکور ہے ہم نے بخاری کی مختلف روایتوں کو یکجا کر لیا ہے۔

❷ ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ مریم: ٣١٥٥۔ ❸ زرقانی بحوالہ بیهقی، ج ٤، ص: ٤٩۔

❹ زرقانی، ج ٣، ص: ١١٦۔ ❺ بخاری، کتاب المغازی، باب قدوم الاشعریین واهل الیمن: ٤٣٩٠۔

❻ زرقانی بحوالہ بیهقی، ج ٤، ص: ٤١۔ ❼ بخاری، کتاب المغازی، باب قدوم الاشعریین: ٤٣٨٦۔

❽ ایضًا: ٤٣٨٨۔

حج کیا۔ ان مبلغین کے ساتھ یمن کے بہت سے نومسلم بھی حج وزیارت کو آئے۔

بحرین میں اسلام ۸ھ

بحرین ایران کی حدودِ حکومت میں داخل تھا، عرب کے قبائل وادیوں میں آباد تھے جن میں مشہور اور باا ثر خاندان عبدالقیس، بکر بن وائل اور تمیم تھے، ان میں سے عبدالقیس کے قبیلہ میں سے منقذ بن حبان تجارت کے لئے نکلے، راہ میں مدینہ پڑتا تھا وہاں ٹھہرے، آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو ان کے پاس تشریف لے گئے اور اسلام کی دعوت دی۔ انہوں نے اسلام قبول کیا اور سورۂ فاتحہ اور اقرأ سیکھی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو ایک فرمان عنایت کیا، وہ سفر سے واپس گئے تو چند روز تک کسی سے اس کا اظہار نہیں کیا لیکن اُن کی بیوی نے ان کو نماز پڑھتے دیکھا تو اپنے باپ منذر بن عائذ سے شکایت کی۔ انہوں نے منقذ سے دریافت کیا بحث مباحثہ کے بعد منذر بھی مسلمان ہو گئے اور آنحضرت ﷺ کا نامۂ مبارک لوگوں کو سنایا سب نے اسلام قبول کر لیا۔ ❶

صحیح بخاری (کتاب الجمعہ) میں روایت ہے کہ مسجد نبوی ﷺ کے بعد سب سے پہلا جمعہ جس مسجد میں ادا کیا گیا وہ بحرین کی مسجد تھی جو جواثی میں واقع ہے ❷ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بحرین میں ابتدائی زمانہ میں اسلام کی اشاعت ہو چکی تھی اسلام قبول کرنے کے بعد ان لوگوں نے چودہ شخصوں کی ایک سفارت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجی جس کے افسر منذر بن الحارث تھے، ان کا قافلہ کاشانہ نبوت کے قریب آیا تو یہ لوگ اس قدر بے تاب ہوئے کہ سواریوں سے کود پڑے اور آنحضرت ﷺ کے ہاتھ چومے لیکن منذر کو پاسِ ادب ملحوظ تھا انہوں نے قیام گاہ پر جا کر کپڑے بدلے پھر خدمت میں حاضر ہو کر دست بوسی کی۔ ❸

۸ھ میں آنحضرت ﷺ نے علاء حضرمی رضی اللہ عنہ کو تبلیغ اسلام کے لئے بحرین بھیجا اس زمانہ میں یہاں ایران کی طرف سے منذر بن ساوی گورنر تھا اس نے اسلام قبول کیا اور اس کے ساتھ تمام عرب اور کچھ عجم جو یہاں مقیم تھے مسلمان ہو گئے۔ ❹

بحرین کے علاقہ میں ''ہجر'' ایک مقام ہے یہاں ایران کی طرف سے سیبخت حاکم تھا، آنحضرت ﷺ نے اس کے نام بھی خط بھیجا اور اس نے بھی اسلام قبول کیا۔ ❺

عمان میں اسلام ۸ھ

اس شہر پر قبیلہ ازد کا قبضہ تھا اور عبید و جعفر یہاں کے رئیس تھے ۸ھ میں آنحضرت ﷺ نے ابوزید

❶ زرقانی بحوالہ کرمانی، ج۴، ص:۱۷۔ قبیلہ عبدالقیس کی ایک سفارت کا ذکر صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب اداء الخمس من الایمان: ۵۳، میں ہے اور وہ اس زمانہ کے بعد کی ہے۔ بخاری کی روایت سے بھی اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ عبدالقیس اس سفارت سے پہلے ایمان لا چکے تھے۔ اصابہ (ج۶، ص:۲۲۵) میں ابن شاہین سے جو روایت ہے وہ گو زرقانی کی روایت سے مختلف ہے اور رئیس سفارت کے نام میں اختلاف ہے، تاہم اس قدر روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلی سفارت ۶ھ سے پہلے کی ہے۔ ❷ بخاری، کتاب الجمعۃ، باب الجمعۃ فی القری والمدن: ۸۹۲، وکتاب المغازی، باب وفد عبدالقیس: ۴۳۷۱۔ ❸ زرقانی بروایت بیہقی بسند جید، ج۴، ص:۱۸۔ ❹ فتوح البلدان، ذکر بحرین، ص: ۸۵ مطبع موسوعات مصر۔ ❺ ایضاً ذکر بحرین۔

انصاری رضی اللہ عنہ کو جو حافظ قرآن تھے اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو دعوت اسلام کا خط دے کر بھیجا۔ دونوں رئیسوں نے اسلام قبول کیا اور وہاں کے تمام عرب اُن کی ترغیب سے اسلام لائے۔ ❶

حدودِ شام میں اسلام ۹ھ

شام کے اطراف میں جو عرب آباد تھے اُن میں متعدد ریاستیں تھیں ان میں سے معان اور اس کے اضلاع فروہ بن عمرو کے زیرِ حکومت تھے لیکن خود فروہ رضی اللہ عنہ رومی سلطنت کی طرف سے گویا گورنر تھے۔ انہوں نے اسلام سے واقفیت پیدا کی تو مسلمان ہو گئے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اظہارِ اسلام کے ساتھ ایک خچر ہدیہ کے طور پر بھیجا (عیسائی) رومیوں کو اُن کے اسلام کا حال معلوم ہوا تو اُن کو گرفتار کر کے سُولی دے دی اس وقت یہ شعر ان کی زبان پر تھا: ❷

بلغ سراۃ المسلمین باننی مسلم لربی اعظمی ومقامی

''مسلمان سرداروں کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ میرا جسم اور میری عزت سب اپنے پروردگار کے نام پر نثار ہے۔''

(شام اور عرب کے درمیان عذرہ، بلّی، جذام، وغیرہ قبائل آباد تھے، قبیلہ بلی میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا ننھیال تھا، اس لئے ایک جماعت کے ساتھ وہ ان اطراف میں بھیجے گئے۔ ❸ جب وہ جذام کے تالاب پر پہنچے تو اُن کو حملہ کا خوف ہوا۔ دربار نبوت میں اطلاع کی، وہاں سے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں بغرض حفاظت کچھ فوج بھیج دی گئی۔ اس کو اہل سیر کی اصطلاح میں غزوہ ذات السلاسل کہتے ہیں)

❶ ایضاً ذکر فتح عمان، ص: ۸۳۔ ❷ ابن ہشام اسلام فروۃ، ذکر وفود: ج ٦، ص: ۳۸۲۔
❸ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ السلاسل: ٤٣٥٨، آگے کی تفصیل فتح الباری، کتاب المغازی، غزوہ ذات السلاسل، ج ۸، ص: ۵۸، ۵۹ میں ہے، نیز دیکھیے طبقات ابن سعد، ذکر مغازی، قسم اوّل جزء ثانی، ص: ۹۵۔

وفودِ عرب

(جن لوگوں نے مبلغین اسلام کی دعوت قبول کر لینے کے بعد خود بارگاہِ نبوت میں جا کر اپنے اسلام کا اعلان کرنا چاہا۔ ارباب سیر ''وفود'' کے عنوان سے ان کا ذکر کرتے ہیں اس قسم کے وفود کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ابن اسحاق نے صرف پندرہ وفود کا، حال لکھا ہے، ابن سعد میں ۷۰ وفود کا تذکرہ ہے۔ دمیاطی، مغلطائی، زین الدین عراقی بھی یہی تعداد بیان کرتے ہیں، لیکن مصنف سیرتِ شامی نے زیادہ استقصا کیا ہے اور ایک سو چار وفود کے حالات بہم پہنچائے ہیں، اگرچہ ان میں کہیں کہیں ضعیف روایتوں سے استناد کیا گیا ہے اور اکثر وفود کے نام مبہم ہیں، تاہم یہ مسلم ہے کہ اصل تعداد ابن اسحاق کی روایت سے کہیں زیادہ ہے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اور قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت تحقیق اور احتیاط کے ساتھ ان میں سے صرف ۳۴ وفود کی تفصیل کی ہے)۔

اصل یہ ہے کہ تمام عرب مکہ کے فیصلہ اخیر کا انتظار کر رہا تھا۔ مکہ فتح ہو چکا تو یہ انتظار جاتا رہا، اب ہر قبیلہ نے چاہا کہ خود دارالاسلام میں جا کر کوئی فیصلہ کرے، اہل عرب کو یہ بات تو معلوم ہو چکی تھی کہ اب وہ اسلام کے مقابلہ میں سرکشی نہیں کر سکتے، لیکن خیبر وغیرہ کی نظیروں سے یہ بھی جانتے تھے کہ اسلام لانے پر وہ مجبور نہیں ہیں، بلکہ جزیہ یا کسی اور طریقہ سے صلح کر کے ان کی سابق حالت قائم رہ سکتی ہے۔

فتح مکہ کے ساتھ ہی ہر طرف سے سفارتیں آنی شروع ہو گئیں اور بجز چند کے باقی جس قدر سفارتیں آئیں انہوں نے بارگاہ نبوت میں پہنچ کر وہ کچھ دیکھا کہ واپس آئے تو ایمان کی دولت سے مالا مال آئے۔

عرب کے سب سے طاقتور قبیلے جن کا اثر دور تک پھیلا ہوا تھا، بنوتمیم، بنوسعد، بنوحنیفہ، بنواسد، کندہ، سلاطین حمیر، ہمدان، ازد اور طے تھے۔ ان تمام قبائل کی سفارتیں دربارِ نبوت میں آئیں۔ ان میں سے بعض ملکی حیثیت رکھتی تھیں یعنی جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ بہ حیثیت فاتح کے آنحضرت ﷺ کے ساتھ معاہدہ کر لیں لیکن اکثر اس غرض سے آئیں کہ اسلام کی حقیقت سے مطلع ہو کر اس کے حلقہ میں آ جائیں۔ یہ وفود زیادہ تر فتح مکہ کے بعد ۸ھ ۹ھ اور ۱۰ھ میں آئے لیکن تسلسلِ بیان کے لیے اس سے پہلے کے چند وفود کا ذکر کرنا بھی موزوں ہوگا۔

مزینہ

یہ ایک بڑا قبیلہ تھا جو مضر تک پہنچ کر قریش کے خاندان سے مل جاتا ہے۔ نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ مشہور صحابی جو فتح مکہ میں قبیلہ مزینہ کے علم بردار تھے، اسی قبیلہ سے تھے، اصفہان انہی نے فتح کیا تھا۔ ۵ھ میں اس قبیلہ کے چار سو شخص قبیلہ کے سفیر بن کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور اسلام لائے۔ عراقی نے سیرت منظوم میں لکھا ہے۔ [1]

---

[1] اصابہ فی تمییز الصحابۃ، ترجمۃ نعمان بن مقرن جزء ثالث، ص: ۵۶۵ مطبع سعادت مصر: ۱۳۲۸ھ وابن سعد جزء اوّل، قسم ثانی ذکر وفود، ص: ۳۸۔

اول وفد وفد المدينة	سنة خمس وفدوا مزينة
سب سے پہلا وفد جو مدینہ میں آیا	وہ مزینہ کا قبیلہ تھا جو ۵ ھ میں آیا

بنوتمیم

بنوتمیم کے وفود بڑی شوکت وشان سے آئے ،قبیلہ کے تمام بڑے بڑے رؤسا مثلاً: اقرع بن حابس، زبرقان ،عمرو بن الاہتم ،نعیم بن یزید، ❶ سب اس سفارت میں شامل تھے۔عیینہ بن حصن فزاری جو مدینہ کے حدود تک حملہ آور ہوا کرتا تھا وہ بھی ساتھ تھا۔ یہ لوگ اگر چہ اسلام قبول کرنے کی غرض سے آئے تھے، تاہم عربی فخر وغرور کا نشہ سر میں اب بھی باقی تھا۔ دربارِ نبوت یعنی مسجد نبوی میں پہنچے تو آنحضرت ﷺ گھر میں تشریف رکھتے تھے، آستانۂ اقدس پر جا کر پکارے کہ محمد (ﷺ)! باہر آؤ، آنحضرت ﷺ باہر تشریف لائے ،تو بولے کہ محمد (ﷺ)! ہم اس لیے آئے ہیں کہ تم سے مفاخرہ کریں، آپ نے اجازت دی، عطارد بن حاجب جو مشہور خطیب تھا اور جس نے نوشیرواں کے دربار سے حسنِ تقریر کے صلہ میں کمخواب ❷ کا خلعت حاصل کیا تھا، اٹھا اور اپنی قوم کے مفاخر پر ایک پرزور تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا:

”خدا کا شکر ہے جس کے الطاف کی بدولت ہم صاحب تاج وتخت، خزانہ ہائے گراں بہا کے مالک اور مشرق میں تمام قوموں سے معزز ترین ہیں، ہماری برابری آج کون کرسکتا ہے، ہماری ہم رتبگی کا جس کو دعویٰ ہو وہ یہ خصائص اور اوصاف گنائے جو ہم نے گنائے ہیں۔“

عطارد خطبہ دے کر بیٹھ گیا تو آنحضرت ﷺ نے ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کو جواب دینے کا اشارہ کیا، انہوں نے جو تقریر کی اس کا ماحصل یہ تھا:

”اس خدا کی تعریف جس نے زمین اور آسمان بنائے، اس نے ہم کو بادشاہت دی اور اپنے بندوں میں سے بہترین شخص کو انتخاب کیا جو سب سے زیادہ شریف النسب، سب سے زیادہ راست گفتار، سب سے زیادہ شریف الاخلاق تھا، وہ تمام عالم کا انتخاب تھا، اس لیے خدا نے اس پر کتاب نازل کی، اس نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو سب سے پہلے مہاجرین اور اس کے بعد ہم (انصار) نے دعوت اسلام پر لبیک کہا، ہم لوگ انصار الٰہی اور وزرائے رسالت ہیں۔“

تقریریں ہوچکیں تو اشعار کی باری آئی، سفارت کی طرف سے تمیم کے مشہور شاعر زبرقان بن بدر نے قصیدہ پڑھا:

نحن الكرام فلا حي يعادلنا	منا الملوك وفينا تنصب البيع ❸

”ہم شرفائے قوم ہیں، کوئی قبیلہ ہمارا ہمسر نہیں ہوسکتا۔ ہم میں تخت نشین ہیں اور ہم کلیساؤں کے بانی ہیں۔“

❶ تاریخ طبری، ج ٤، ص: ١٧١١ مگر طبقات ابن سعد، ج ١، قسم ثانی، ص: ٤٠ پر یزید کے بجائے زید لکھا۔
❷ اصابہ فی تمییز الصحابۃ جزء رابع، ص: ٢٤٥۔ ❸ طبری، واقعات، ٩ ھ ج ٤، ص: ١٧١٤؛ سیرت ابن ہشام، ج ٢، ص: ٣٦٤؛ طبقات ابن سعد، جزء اوّل، قسم ثانی، ص: ٤٠۔

روایتوں میں آیا ہے کہ ایک شخص نے مدینہ میں آ کر خطبہ دیا تو اس کی خوبی تقریر نے تمام حاضرین کو حیرت زدہ کر دیا۔ اس وقت آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((إن من البيان لسحرا)) "یعنی بعض بعض تقریروں میں جادو ہوتا ہے۔" اصابہ فی احوال الصحابہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے زبرقان ہی کی تقریر پر یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔ غرض جب زبرقان تقریر کر چکے، آنحضرت ﷺ نے دربار رسالت کے شاعر یعنی حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا، انہوں نے برجستہ کہا:

ان الذوائب من فهر واخوتهم   قد بيّنوا سنة للناس تتبع [1]

"شرفائے قبیلہ فہر و برادران فہر نے لوگوں کو وہ راستہ بتا دیا ہے جس کی وہ پیروی کرتے ہیں۔"

ارکان سفارت میں اقرع بن حابس عرب کا مشہور حاکم تھا، یعنی قومی مقدمات کا مرافعہ اس کے پاس جاتا تھا اور اس کے فیصلوں پر لوگ گردن جھکا دیتے تھے، وہ اسلام لانے سے پہلے مجوسی تھا، اس کو یہ دعویٰ تھا کہ جب سفارت کے ساتھ دربار رسالت میں آیا تو آنحضرت ﷺ سے کہا: [2]

ان حمدي لزين وان ذمي لشين۔ "میں جس کی تعریف کر دوں وہ چمک جاتا ہے اور جس کو برا کہہ دوں اس کو داغ لگ جاتا ہے۔"

نظم و نثر کی معرکہ آرائی ہو چکی تو سفارت نے اعتراف کیا کہ دربار رسالت کے خطیب اور شاعر دونوں ہمارے شاعر اور خطیب سے افضل ہیں۔ پھر سب نے اسلام قبول کیا۔

بنو سعد

بنو سعد نے ضمام بن ثعلبہ کو سفیر بنا کر بھیجا، وہ جس طرح آنحضرت ﷺ کے دربار میں آئے اور جس طریقے سے سفارت ادا کی اس سے عرب کی اصلی ادائیگی اور آزادروی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ صحیح بخاری میں متعدد موقعوں پر اس کا ذکر ہے۔ کتاب العلم کی روایت حسب ذیل ہے:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ دربار رسالت میں حاضر تھے، ایک شخص ناقہ پر سوار آیا اور صحن مسجد میں آ کر ناقہ سے اترا پھر حاضرین سے پوچھا: "محمد (ﷺ) کس کا نام ہے؟" لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "یہ گورے رنگ کے جو تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔" پاس آ کر کہا "اے عبدالمطلب کے بیٹے"! آپ ﷺ نے فرمایا کہ "میں جواب دے چکا۔" بولا کہ "میں تم سے کچھ باتیں پوچھوں گا، لیکن سختی سے پوچھوں گا، اس پر ناراض نہ ہونا" ارشاد ہوا کہ "جو پوچھنا ہو پوچھو" بولا کہ "اپنے خدا کی قسم کھا کر کہو، کیا تم کو خدا نے تمام دنیا کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے" آپ نے فرمایا: "ہاں۔" پھر قسم دلا کر پوچھا کہ "کیا تم کو خدا نے پنج وقتہ نماز کا حکم دیا ہے؟" اسی طرح زکوٰۃ، روزہ، حج کی نسبت پوچھا اور آپ برابر "ہاں" فرماتے جاتے تھے، جب سب احکام سن لیے تو کہا کہ "میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے اور مجھ کو میری قوم نے

[1] ایضًا، زاد المعاد، ج۳، ص: ۵۱۳، ۵۱۴۔ [2] اصابہ، تذکرۃ اقرع بن حابس، جزء اوّل، ص: ۵۸۔

بھیجا ہے، میں جاتا ہوں اور جو تم نے بتایا ہے میں اس سے ایک ذرہ نہ زیادہ کروں گا نہ کم۔'' وہ جا چکا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اگر یہ سچ کہتا ہے تو اس نے فلاح پائی۔'' ❶

ضمام نے واپس جا کر اپنی قوم سے کہا کہ ''لات وعزیٰ کوئی چیز نہیں'' لوگوں نے کہا ''کیا کہتے ہو، تم کو جنون یا جذام نہ ہو جائے۔'' انہوں نے کہا: ''خدا کی قسم! وہ نہ کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر، میں تو خدا اور محمد ﷺ پر ایمان لاتا ہوں۔'' ان کی مختصر تقریر کا یہ اثر تھا کہ شام نہیں ہونے پائی تھی کہ قبیلہ کا قبیلہ زن و مرد و بچے سب مسلمان تھے۔ ❷

اشعریین ۷ ھ

یمن کا ایک نہایت معزز قبیلہ اشعریین کا تھا۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اسی قبیلہ سے ہیں۔ ان لوگوں نے جب آنحضرت ﷺ کی بعثت کی خبر سنی تو ترپن شخصوں نے مدینہ کی ہجرت کا قصد کیا، اسی قافلہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ یہ لوگ جہاز میں سوار ہو کر چلے، لیکن ہوائے مخالف نے جہاز کو حبش میں پہنچا دیا، وہاں حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ موجود تھے، وہ اپنے ساتھ لے کر عرب کو روانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں خیبر فتح ہو چکا تھا اور آنحضرت ﷺ یہیں تشریف فرما تھے، چنانچہ یہیں لوگوں نے شرفِ باریابی حاصل کیا۔

یہ صحیح مسلم (فضائل اشعریین ❸) کی روایت ہے۔ ❹ صحیح بخاری میں ہے کہ جب اشعریوں کا وفد آیا تو آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: ''تمہارے ہاں یمن کے لوگ آتے ہیں جو نہایت رقیق القلب اور نرم دل ہیں۔'' ❺ مسند احمد بن حنبل ❻ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب اشاعرہ کا وفد آیا تو یہ لوگ جوشِ مسرت سے یہ رجز پڑھتے تھے:

غدا نلقى الاحبة　　　محمدا وحزبه

''کل ہم دوستوں سے ملیں گے　　　یعنی محمد ﷺ اور پیروانِ محمد سے''

(بارگاہ نبوت میں پہنچے تو عرض کی ''یارسول اللہ! ہم اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ اپنے مذہب کے کچھ احکام سیکھیں اور ابتدائے کائنات کے کچھ حالات پوچھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''پہلے خدا تھا اور کچھ نہ تھا، اس کا تخت پانی پر تھا۔'' ❼

دوس ۷ ھ

دوس عرب کا ایک مشہور قبیلہ ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اسی قبیلہ سے ہیں اس قبیلہ کے مشہور شاعر اور

---

❶ یہ روایت صحیح بخاری میں مختلف ابواب میں منقول ہے دیکھو: كتاب العلم، باب القراءة والعرض على المحدث: ٦٣۔

❷ ابن هشام، قدوم ضمام بن ثعلبة وافدا عن بنى سعد بن بكر، ج ٤، ص: ٢١٠، سير اعلام النبلاء، ج ٢، ص: ٩٨۔ ❸ فضائل اشعریین کے بجائے اس کے بعد من فضائل جعفر بن ابی طالب کی روایت میں ہے۔

❹ صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل جعفر بن ابى طالب الخ: ٦٤١٠۔

❺ صحيح بخارى، كتاب المغازى، باب قدوم الاشعريين واهل اليمن: ٤٣٩٠۔ ❻ نیز دیکھیے زاد المعاد، ج ٢، ص: ٣٢۔ ❼ صحيح بخارى، كتاب بدء الخلق، باب ما جاء فى قول الله الخ: ٣١٩٠، ٣١٩١۔

رئیس طفیل بن عمرو تھے، وہ ہجرت سے پہلے مکہ گئے قریش نے ان کو منع کیا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس نہ جائیں، لیکن اتفاق سے ایک دفعہ یہ حرم میں گئے، آنحضرت ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ قرآن مجید سن کر متاثر ہوئے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ آپ مجھ کو اسلام کی حقیقت سمجھائیں، آپ نے اسلام کی تبلیغ کی اور قرآن مجید کی آیتیں سنائیں، وہ نہایت خلوص سے اسلام لائے، وطن جا کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دی، لیکن ان کے قبیلہ میں زنا کا بہت رواج تھا لوگ سمجھے کہ اسلام کے بعد اس آزادی سے محروم ہو جائیں گے، اس لیے لوگوں نے تامل کیا طفیل رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر یہ حقیقت بیان کی، آپ نے دعا فرمائی کہ ''خدایا! دوس کو ہدایت دے۔'' پھر طفیل رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ ''جا کر نرمی اور ملاطفت سے لوگوں کو اسلام کی دعوت دو۔'' غرض (دعائے نبوی کی برکت اور طفیل رضی اللہ عنہ کی) ترغیب اور ہدایت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا اور اسی خاندان جن میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، ہجرت کر کے مدینہ میں چلے آئے۔ [1]

بنو حارث بن کعب ۹ھ

یہ نجران کا ایک نہایت معزز خاندان تھا آنحضرت ﷺ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ان کے پاس دعوت اسلام کے لیے بھیجا، یہ لوگ نہایت خلوص کے ساتھ اسلام لائے۔ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کو مدینہ میں بلا بھیجا، چنانچہ قیس بن الحصین و یزید بن عبد المدان وغیرہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، چونکہ اکثر معرکوں میں قبائلِ عرب پر غالب رہے تھے، آپ نے ان سے پوچھا: ''تمہارے غلبہ کے کیا اسباب تھے۔'' بولے کہ ہمیشہ متفق ہو کر لڑتے تھے، اور کسی پر ظلم نہیں کرتے تھے، آپ نے قیس کو ان کا رئیس مقرر کیا۔ [2]

قبیلہ طے ۹ھ

یمن میں طے نہایت نامور قبیلہ تھا۔ اس قبیلہ کے رؤسا زید الخیل و عدی بن حاتم طائی تھے اور ان کے حدود حکومت الگ تھے۔ زید۔ زمانۂ جاہلیت کے مشہور شاعر، خطیب، خوش جمال، فیاض، بہادر تھے۔ ۹ھ میں یہ چند معزز اشخاص کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی، انہوں نے مع اپنے ساتھیوں کے نہایت صدق دل سے اسلام قبول کیا۔ شہسواری کی وجہ سے یہ زید الخیل کے لقب سے مشہور تھے۔ آنحضرت ﷺ نے اس لقب کو زید الخیر سے بدل دیا۔ [3]

عدی بن حاتم ۹ھ

عدی، مشہور حاتم طائی کے بیٹے اور قبیلہ طے کے (سردار اور مذہباً عیسائی تھے) سلاطین عرب کی طرح

---

[1] اصابہ، جزء ثالث، ص: ۲۸۷ اور زاد المعاد جزء ثانی، ص: ۳٤ اور ابن سعد جزء ثانی ذکر وفود، ص: ۸۱، ۸۲۔ [2] اصابہ، جزء سادس، ص: ۳٤٥ تذکرۃ یزید بن عبد المدان و زاد المعاد، جزء ثانی، ص: ۳۳۔

[3] ایضاً، ص: ۳۱۔

ان کو بھی آمدنی کا چوتھا حصہ ملتا تھا، جس زمانہ میں اسلامی فوجیں یمن گئیں، یہ بھاگ کر شام چلے گئے، ان کی بہن گرفتار ہو کر مدینہ میں آئیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو بڑی عزت وحرمت سے رخصت کیا۔ وہ اپنے بھائی کے پاس چلی گئیں اور کہا کہ جس قدر جلد ہو سکے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو۔ وہ پیغمبر ہوں یا بادشاہ ہر حال میں ان کے پاس جانا مفید ہے۔ غرض عدی مدینہ آئے، آنحضرت ﷺ مسجد میں تھے۔ عدی نے مسجد میں جا کر سلام کیا۔ آپ نے جواب سلام کے بعد نام پوچھا، پھر ان کو لے کر گھر کی طرف چلے، اسی اثنا میں ایک بڑھیا آ گئی، اس نے آپ کو روک لیا، اور دیر تک آپ سے کسی کام کے متعلق باتیں کرتی رہی، عدی خود رئیس تھے، شام میں رومیوں کا دربار دیکھا تھا، ان کو حیرت ہوئی کہ شہنشاہِ عرب ایک بڑھیا کے ساتھ اس مساوات سے پیش آتا ہے، اسی وقت ان کو خیال ہوا کہ یہ شخص بادشاہ نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ گھر میں تشریف لائے، چمڑے کا ایک گدا تھا۔ اس کو عدی کی طرف بڑھایا، یہ اصرار کے بعد اس پر بیٹھے، پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''کیوں عدی! تم اپنی قوم سے مرباع لیتے تھے، لیکن یہ تو تمہارے مذہب (نصرانیت) میں جائز نہیں ہے۔'' [1] پھر فرمایا: ''خدا کے سوا کوئی اور خدا ہے؟'' بولے کہ نہیں! پھر پوچھا: ''خدا سے کوئی بڑا ہے؟'' بولے کہ نہیں، آپ نے فرمایا کہ ''یہودیوں پر خدا کا غضب نازل ہوا ہے اور عیسائی گمراہ ہو گئے ہیں۔'' [2]

غرض عدی نے اسلام قبول کیا اور اس قدر ثابت قدم رہے کہ ردّہ کے زمانہ میں بھی ان پر کچھ اثر نہیں پڑا باپ کی سخاوت کا اثر ان پر بھی تھا، ایک دفعہ ایک شخص نے ان سے سو روپے طلب کئے، بولے کہ تم حاتم کے بیٹے سے اس قدر حقیر رقم مانگتے ہو، بخدا! ہرگز نہ دوں گا۔ [3]

وفد ثقیف

(یاد ہوگا کہ) جب آنحضرت ﷺ طائف کا محاصرہ چھوڑ کر روانہ ہونے لگے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی تھی کہ آپ ان کے حق میں بددعا فرمائیں، آپ نے جن لفظوں میں دعا فرمائی تھی یہ تھی:

((اللّٰهم اهد ثقيفا وائتِ بهم)) ''اے خدا! ثقیف کو ہدایت دے اور ان کو میرے پاس بھیج۔''

(یہ دعائے نبوی کا اعجاز تھا کہ وہ قبیلہ جو تلوار سے زیر نہ ہو سکا تھا، دفعتہً جلال نبوت نے آستانہ اسلام پر اس کی گردن جھکا دی اور پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا)۔

طائف دو رئیسوں کے قبضہ میں تھا، جن میں ایک عروہ بن مسعود تھے۔ جن کی نسبت کفار مکہ کہا کرتے تھے کہ کلام الٰہی مکہ میں اترتا تو ان پر اترتا۔ عروہ اگرچہ اب تک اسلام نہیں لائے تھے لیکن مادۂ قابل رکھتے تھے۔ حدیبیہ کی صلح بھی ان ہی کی سفارت سے انجام پائی تھی۔ آنحضرت ﷺ جب طائف سے واپس چلے تو خدا نے ان کو اسلام کی توفیق دی۔ آنحضرت ﷺ مدینہ نہیں پہنچنے پائے تھے کہ وہ خدمتِ اقدس میں حاضر

[1] ابن هشام "اسلام عدى بن حاتم، ج ٢، ص: ٣٧٤، ٣٧٥۔

[2] ترمذى، ابواب تفسير القرآن، ومن سورة فاتحة الكتاب: ٢٩٥٣۔"

[3] مسند احمد، ج ٤، ص: ٢٥٨؛ اصابه فى تمييز الصحابه ذكر عدى، جزء رابع، ص: ٢٢٩۔

ہوئے اور اسلام لا کر واپس گئے۔ واپس جا کر انہوں نے اسلام کا اظہار کیا اور لوگوں کو اسلام کی ترغیب دی، لوگوں نے ان کو بہت برا بھلا کہا۔ صبح کو جب اپنے بالا خانہ پر اذان دی تو ہر طرف سے تیروں کا مینہ برسا، یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے۔ مرتے وقت وصیت کی کہ محاصرۂ طائف میں جو مسلمان شہید ہو چکے ہیں انہی کے پہلو میں دفن کیے جائیں۔

(عروہ کا خون رائیگاں نہیں جا سکتا تھا، صخر بن عیلہ رئیس احمس یہ سن کر کہ آنحضرت ﷺ طائف کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں، کچھ سوار لے کر چل کھڑا ہوا تھا، اتفاق سے اس وقت پہنچا جب آپ طائف چھوڑ کر مدینہ کی طرف مراجعت فرما چکے تھے، صخر نے عہد کیا کہ جب تک اہلِ طائف آنحضرت ﷺ کی اطاعت قبول نہ کر لیں گے، میں قلعہ کا محاصرہ نہ چھوڑوں گا، آخر اہل طائف نے اطاعت قبول کر لی۔ صخر نے خدمت نبوی ﷺ میں اطلاع کی تو آپ نے مسجد نبوی میں تمام لوگوں کو جمع کیا، اور احمس کے لیے دس بار دعا فرمائی) [1] چند روز کے بعد اہلِ طائف نے باہم مشورہ کیا کہ تمام عرب اسلام لا چکا، اب ہم اکیلے کیا کر سکتے ہیں۔ غرض یہ رائے قرار پائی کہ چند سفیر مقرر کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجے جائیں۔

ان کی سفارت نے مدینہ کا رخ کیا تو مسلمانوں کو اس قدر مسرت ہوئی کہ سب سے پہلے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ دوڑے کہ آنحضرت ﷺ کو جا کر خبر کریں، راہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مل گئے ان کو معلوم ہوا تو مغیرہ رضی اللہ عنہ کو قسم دلائی کہ یہ خوش خبری مجھ کو پہنچانے دو۔ مغیرہ نے ان لوگوں کو تعلیم دی کہ دربار رسالت میں جانا تو اس طریقہ سے سلام عرض کرنا، لیکن یہ لوگ اسی قدیم دستور کے موافق آداب بجا لائے۔

عبد یالیل، طائف کا مشہور رئیس امیر الوفد تھا، آنحضرت ﷺ نے اس کو (حالانکہ اب تک وہ کافر تھا) مسجد نبوی میں اتارا (کہ مسلمانوں کی محویت و استغراق کو دیکھ کر متاثر ہو) یہ لوگ صحن مسجد میں خیمے نصب کرا کر ٹھہرائے گئے۔ [2] نماز اور خطبہ کے وقت یہ لوگ موجود رہتے تھے، گو خود شریک نہیں ہوتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ خطبوں میں اپنا نام نہیں لیتے تھے۔ ان لوگوں نے آپس میں تذکرہ کیا کہ محمد ﷺ ہم سے تو اپنی پیغمبری کا اقرار لیتے ہیں، لیکن خطبہ میں خود اپنی پیغمبری کا اقرار نہیں کرتے۔ آنحضرت ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ "میں سب سے پہلے شہادت دیتا ہوں کہ میں فرستادۂ الٰہی ہوں۔"

جماعت سفراء میں عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سب سے کم عمر تھے۔ سفراء دربارِ نبوی میں آتے تو ان کو بچہ سمجھ کر قیام گاہ میں چھوڑ آتے۔ عثمان گو کمسن تھے لیکن سب سے زیادہ تیز فہم اور مائل تحقیق تھے، ان کا معمول تھا کہ جب سفراء دن کو قیلولہ کرتے تو یہ چپکے سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور قرآن مجید اور مسائل اسلام سیکھتے، یہاں تک کہ اکثر ضروری مسائل سیکھ لیے۔ [3]

[1] ابو داود، کتاب الخراج، باب اقطاع الارضین: ٣٠٦٧۔

[2] ابو داود، کتاب الخراج باب ماجاء فی خبر الطائف: ٣٠٢٦؛ مسند احمد، ج ٤، ص: ٢١٨۔

[3] سیرت ابن ھشام، ذکر امر وفد ثقیف واسلامھم، ج ٢، ص: ٣٤٩۔

آنحضرت ﷺ ہمیشہ ان لوگوں کو اسلام کی تبلیغ کرتے (نمازِ عشاء کے بعد ان کے پاس تشریف لے جاتے اور کھڑے کھڑے ان سے باتیں کرتے۔ زیادہ تر مکہ میں قریش کے ہاتھ سے جو اذیتیں اٹھائی تھیں ان کو بیان فرماتے۔ ❶ مدینہ میں آکر جو لڑائیاں پیش آئیں ان کا بھی تذکرہ فرماتے) بالآخر ان لوگوں نے اسلام پر آمادگی ظاہر کی، لیکن یہ شرطیں پیش کیں:

① زنا ہمارے لیے جائز رکھا جائے کیونکہ ہم میں سے اکثر مجرد رہتے ہیں اور اس لیے ان کو اس سے چارہ نہیں۔

② ہماری قوم کا تمام کاروبار اور ذریعہ معاش سود ہے اس لیے سودخواری جائز رکھی جائے۔

③ شراب سے نہ روکا جائے، ہمارے شہر میں کثرت سے انگور پیدا ہوتا ہے اور یہ ہماری بڑی تجارت ہے۔

لیکن یہ تینوں درخواستیں نامنظور ہوئیں، بالآخر ان لوگوں نے کہا: اچھا ہم یہ شرطیں واپس لیتے ہیں، لیکن ہمارے معبود (طائف کا سب سے بڑا بت، جس کا نام لات تھا) کی نسبت کیا ارشاد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ توڑ دیا جائے گا۔'' یہ سن کر ان کو سخت حیرت ہوئی کہ کیا کوئی شخص ان کے خدائے اعظم کو ہاتھ بھی لگا سکتا ہے! بولے کہ اگر ہمارے معبود کو معلوم ہو جائے کہ آپ کا یہ ارادہ ہے تو وہ تمام شہر کو تباہ کر دے گا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ضبط نہ ہو سکا، بولے کہ تم لوگ کس قدر جاہل ہو، منات صرف ایک پتھر ہے، ان لوگوں نے کہا: عمر! ہم تمہارے پاس نہیں آئے، یہ کہہ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ ہم منات کو ہاتھ نہیں لگا سکتے، آپ جو چاہیں کریں، لیکن ہم کو اس جرأت سے معاف رکھا جائے، آپ ﷺ نے یہ درخواست منظور کر لی۔ ❷

ان لوگوں نے نماز، زکوٰۃ اور جہاد سے مستثنیٰ ہونے کی بھی درخواست کی۔ نماز سے معافی تو کسی حالت میں ممکن نہ تھی، وہ ہر روز پانچ دفعہ ادا کرنے کی چیز ہے! لیکن زکوٰۃ سال بھر کے بعد واجب ہوتی ہے، اور جہاد فرض کفایہ ہے، ہر شخص پر واجب نہیں ہے اور واجب بھی ہو تو اس کے خاص مواقع ہیں روز کا کام نہیں، اس بنا پر اس وقت ان دونوں باتوں پر ان کو مجبور نہیں کیا گیا کیونکہ یہ معلوم تھا کہ جب وہ اسلام قبول کر لیں گے تو رفتہ رفتہ خود ان میں صلاحیت آجائے گی، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اس واقعہ کے بعد آنحضرت ﷺ کو یہ کہتے سنا کہ ''جب یہ ایمان لا چکیں گے تو زکوٰۃ بھی دینے لگیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔'' ❸ (چنانچہ دو ہی برس کے بعد حجۃ الوداع کا موقع آیا تو کوئی ثقفی ایسا نہ تھا جس نے اسلام نہ قبول کر لیا ہو۔) ❹

سفارت جب واپس چلی تو آنحضرت ﷺ نے ابوسفیان اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما کو بھیجا کہ شرط کے موافق طائف کے صنم اعظم (لات) کو جا کر توڑ آئیں۔ مغیرہ نے طائف پہنچ کر بت کدہ کو ڈھانا چاہا تو مستورات روتی ہوئی ننگے سر گھروں سے نکل آئیں اور یہ اشعار پڑھتی جاتی تھیں۔ ❺

❶ ابو داود، کتاب الصلوٰۃ، باب تحزیب القرآن:۱۳۹۳۔ ❷ زادالمعاد، ج۲، ص:۲۴، ۲۵، ۲۶، بحوالہ مغازی موسیٰ بن عقبہ؛ سیرت ابن ہشام، ج۲، ص:۳۴۷ تا ۳۵۰۔

❸ ابو داود، کتاب الخراج والامارۃ، باب ماجاء فی خبر الطائف:۳۰۲۵۔

❹ اصابہ ترجمۃ جبیر بن حیۃ ثقفی جز اوّل، ص:۲۳۵۔ ❺ تاریخ طبری، ج۴، ص:۱۶۹۲۔

الا ابکین [1] دفاع　　اسلمها الرضاع　　لم یحنوا المصاع

"لوگوں پر روؤ کہ پست ہمتوں نے اپنے بتوں کو دشمنوں کے سپرد کر دیا اور معرکہ آرائی نہ کر سکے۔"

(عربوں میں کثیر الازدواجی کی عام عادت تھی، قبیلہ ثقیف کے ایک نامور سردار غیلان بن سلمہ کی دس بیویاں تھیں، جب وہ مسلمان ہوا، احکام اسلام کے مطابق چار کے سوا تمام بیویوں سے اُس کو مفارقت کرنی پڑی) [2]

وفد نجران ۹ھ

نجران مکہ معظمہ سے یمن کی طرف سات منزل پر وسیع ضلع کا نام ہے، جہاں عیسائی عرب آباد تھے، یہاں عیسائیوں کا ایک عظیم الشان کلیسا تھا جس کو وہ کعبہ کہتے تھے اور حرم کعبہ کا جواب سمجھتے تھے، اس میں بڑے بڑے مذہبی پیشوار ہتے تھے، جن کا لقب سید اور عاقب تھا، عرب میں عیسائیوں کا کوئی مذہبی مرکز اس کا ہمسر نہ تھا، اعشیٰ اسی کی شان میں کہتا ہے:

وکعبة نجران حتم علیك　　حتّی تناخی بابوابها

نزور یزید او عبدالمسیح　　وقیساهم خیر اربابها

یہ کعبہ تین سو کھالوں سے گنبد کی شکل میں بنایا گیا تھا، جو شخص اس کے حدود میں آ جاتا تھا، وہ مامون ہو جاتا تھا۔ اس کعبہ کے اوقاف کی آمدنی دو لاکھ سالانہ تھی۔ [3]

آنحضرت ﷺ نے ان کو دعوتِ اسلام کا خط لکھا تو اس کعبہ کے محافظ اور ائمہ مذہب ساٹھ آدمیوں کے ساتھ مدینہ میں آئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو مسجد میں اتارا، تھوڑی دیر کے بعد نماز کا وقت آیا تو ان لوگوں نے نماز پڑھنی چاہی، صحابہ نے روکا، لیکن آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "پڑھنے دو۔" چنانچہ ان لوگوں نے مشرق کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی۔ ابو حارثہ جو لارڈ بشپ تھا، نہایت محترم اور فاضل شخص تھا، قیصرِ روم نے اس کو یہ منصب عطا کیا تھا اور اس کے لیے گرجے اور معبد بنوائے تھے۔ [4]

ان لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے مختلف مذہبی مسائل پوچھے اور آپ نے وحی کی رُو سے ان کا جواب دیا۔ ان کے زمانہ قیام میں سورۂ آل عمران کی ابتدا کی اسّی آیتیں اتریں، ان آیتوں میں ان کے سوالات کا جواب تھا۔ جس آیت میں دعوت اسلام کی تشریح تھی وہ یہ ہے:

﴿قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾

---

[1] یہ تفصیل طبری سے ماخوذ ہے دیکھو ج۴، ص:۱۶۹۲ و ما قبل؛ سیرت ابن هشام میں لتبکین ہے:۲۲، ص:۳۵۰۔

[2] جامع ترمذی، ابواب النکاح، باب ماجاء فی الرجل یسلم الخ: ۱۱۲۸۔

[3] یہ تمام تفصیل معجم البلدان ذکر نجران، ج۸، ص: ۲۵۹ وما بعد میں ہے، پہلا فقرہ فتح الباری، ج۸، ص:۷۳، سے ماخوذ ہے، جہاں وفدِ نجران کا ذکر ہے۔　[4] زادالمعاد ابن قیم، جز ثانی، ص:۳۵۔

(۳/ آل عمران:٦٤)

”کہہ دے کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کو مان لیں جو ہم تم دونوں میں مشترک ہے، وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو خدا کا شریک نہ بنائیں اور ہم میں کوئی کسی کو خدا کے سوا رب نہ قرار دے، پھر اگر یہ لوگ نہ مانیں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔“

آنحضرت ﷺ نے جب اُن کو اسلام کی دعوت دی تو ان لوگوں نے کہا ہم تو پہلے سے مسلمان ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”جب تک تم صلیب پوجتے ہو، عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے ہو کیونکر مسلمان ہو سکتے ہو؟“ جب یہ لوگ اسی پر راضی نہ ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے وحی کے مطابق ان سے کہہ دیا کہ اچھا مباہلہ کرو، یعنی ہم تم دونوں اپنے اہل وعیال کو لے کر آئیں اور دعا کریں کہ جو شخص جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔

﴿ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ۝﴾

(۳/ آل عمران:٦١)

”تو جو شخص تجھ سے علم آئے پیچھے جھگڑا کرتا ہے اس سے کہہ دے کہ آؤ اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کو اور خود اپنے آپ کو بلائیں، پھر مباہلہ کریں اور خدا سے دعا کریں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو، اس پر خدا کی لعنت ہو۔“

لیکن جب آنحضرت ﷺ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اور امام حسن وحسین علیہما السلام کو لے کر مباہلہ کے لیے نکلے تو خود ان کی جماعت میں سے ایک شخص نے رائے دی کہ مباہلہ نہیں کرنا چاہیے، اگر یہ شخص واقعی پیغمبر ہے تو ہم لوگ ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جائیں گے۔ [1] غرض ان لوگوں نے کچھ سالانہ خراج قبول کر کے صلح کر لی۔

بنو اسد ۹ھ

یہ وہ قبیلہ ہے جو لڑائیوں میں قریش کا دست و بازو تھا۔ طلیحہ بن خویلد جس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اسی قبیلہ سے تھا۔ ۹ھ میں یہ لوگ بھی اسلام لائے اور سفارت بھیجی لیکن اب تک ان کے دماغ میں فخر کا نشہ باقی تھا۔ سفرا دربارِ رسالت میں آئے تو احسان کے لہجہ میں کہا کہ آپ نے ہمارے پاس کوئی مہم نہیں بھیجی بلکہ ہم نے خود اسلام قبول کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: [2]

﴿ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝﴾ (٤٩/ الحجرات:١٧)

”یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ ہم اسلام لائے، کہہ دو کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو، بلکہ خدا تم پر احسان رکھتا ہے کہ تم کو ایمان لانے کی ہدایت کی، اگر تم سچے ہو۔“

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قصة اهل نجران: ٤٣٨٠۔ [2] زاد المعاد، ج٢، ص:٤٥۔

بنوفزارہ ۹ھ

یہ نہایت سرکش اور زور آور قبیلہ تھا، عیینہ بن حصن اسی قبیلہ سے تھے اسی قبیلہ نے رمضان ۹ھ میں جب آنحضرت ﷺ تبوک سے واپس تشریف لائے اپنا وفد بھیجا اور اسلام قبول کیا۔ ❶

کندہ ۱۰ھ

یہ حضر موت (یمن) کے اضلاع میں سے ایک شہر تھا۔ یہاں کندی خاندان کی سلطنت تھی اس زمانہ میں اس خاندان کے حاکم اشعث بن قیس تھے۔ یہ ۱۰ھ میں اسی سواروں کے ساتھ بڑی شان وشوکت سے، حیرہ کی چادریں جن کے سنجاف حریر کے تھے کاندھوں پر ڈالے بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے، یہ پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کو دیکھ کر فرمایا: ''کیا تم اسلام نہیں لا چکے ہو؟'' بولے ''ہاں'' آپ نے فرمایا کہ ''پھر یہ حریر کیسا؟'' ان لوگوں نے فوراً چادریں پھاڑ پھاڑ کر زمین پر ڈال دیں۔ ❷

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں اپنی بہن (امّ فروہ) سے ان کی شادی کر دی تھی، نکاح ہو چکا تو فوراً اٹھ کر اونٹوں کے بازار میں پہنچے اور جو اونٹ سامنے آیا تلوار سے اس کی کوچیں اڑا دیں، تھوڑی دیر میں بیسیوں اونٹ زمین پر پڑے تھے، لوگوں کو حیرت ہوئی، انہوں نے کہا: میں اپنی دارالریاست میں ہوتا تو اور ہی سروسامان ہوتا، یہ کہہ کر اونٹوں کے دام دے دیے اور لوگوں سے کہا: یہ آپ کی دعوت ہے۔ ❸ یہ جنگِ قادسیہ ویرموک میں شریک تھے اور صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔

عبدالقیس

یہ قبیلہ جیسا کہ اوپر گزر چکا، بحرین کا باشندہ تھا، یہاں اسلام کا اثر بہت پہلے پہنچ چکا تھا، سب سے پہلے اس قبیلہ کے تیرہ آدمی ۵ھ میں یا اس سے آگے پیچھے زمانہ میں خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے پوچھا: ''تم کون لوگ ہو؟'' عرض کی، یا رسول اللہ! ہم خاندان ربیعہ سے ہیں، فرمایا: ''مرحبا لاخزایا و لاندامی'' پھر ان لوگوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہمارا ملک بہت دور ہے (بحرین) اور بیچ میں کفار مضر کی آبادیاں ہیں، ہم اشہر حرم کے سوا اور مہینوں میں نہیں آ سکتے، چند ایسی باتیں تلقین فرمایئے جن پر ہمیشہ عمل کریں، اور اپنے اہل وطن کو بھی ان کی تعلیم دیں، ارشاد ہوا کہ میں تم کو چار باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ خدا کو ایک جانو، نماز پڑھو، روزہ رکھو اور خمس دو اور چار چیزوں سے منع کرتا ہوں، دباء، حنتم، نقیر، مزفت۔

دُباء، حنتم، نقیر، مزفت، یہ عرب میں چار قسم کے برتن ہوتے تھے، جن میں رکھ کر شراب بنائی جاتی تھی، آنحضرت ﷺ کی عادت شریف یہ جاری تھی کہ جس قبیلہ میں جو مخصوص عیوب ہوتے تھے، ان کے پند و موعظت میں انہیں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرماتے تھے، لوگوں کو تعجب تھا کہ حضور ﷺ نے ان ظروف کا

---

❶ زرقانی، ج ٤، ص:٥٩۔ ❷ ابن هشام وفد كندة، ج ٢، ص:٣٧٨۔ ❸ اصابه، جز اول، ص:٥١۔

کیوں مخصوص طور سے ذکر فرمایا، چنانچہ انہوں نے پوچھا کہ یارسول اللہ! نقیر کے متعلق آپ کو کیا معلوم ہے؟ ارشاد فرمایا: ''ہاں کھجور کی موٹی لکڑی کو اندر سے کھود کر تم اس میں پانی ڈالتے ہو جب ابال کم ہو جاتا ہے تو اُس کو پی کر اپنے بھائیوں پر تلوار چلاتے ہو۔'' اتفاق یہ کہ وفد میں ایک صاحب ایسے تھے جن پر یہی واقعہ گزرا تھا، اُن کی پیشانی پر تلوار کا داغ بھی تھا، اور اس کو وہ شرم سے چھپاتے تھے۔ ❶

بعض روایتوں میں ہے کہ عبدالقیس نے خود پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! ہم کو کیا پینا چاہیے؟ اس کے جواب میں آپ نے ان چاروں چیزوں کا ذکر فرمایا۔ ❷

بنو عامر ۹ھ

بنو عامر ❸ کا قبیلہ عرب کے مشہور قبیلہ قیس بن عیلان کی شاخ تھا، بنو عامر میں اس وقت تین رئیس تھے، عامر بن طفیل، اربد بن قیس اور جبار بن سلمیٰ۔ عامر اور اربد صرف حصول جاہ کے خواہاں تھے، یہ عامر وہی شخص تھا جو اس سے پہلے متعدد فتنوں کا باعث ہو چکا تھا اور اس وقت بھی شر کی نیت سے آیا تھا، جبار اور قبیلہ کے عام لوگ البتہ خلوصِ قلب سے صداقت کے طالب تھے۔

عامر مدینہ پہنچ کر خاندان سلول کی ایک خاتون کا مہمان ہوا، جبار اور مشہور صحابی کعب بن مالک رضی اللہ عنہ میں پہلے کے مراسم تھے، اس لئے وہ تیرہ آدمیوں کے ساتھ انہیں کے گھر مہمان اُترے اور اسی تقریب سے کعب رضی اللہ عنہ ان کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ بنو عامر نے سلسلۂ کلام میں آنحضرت ﷺ سے خطاب کر کے کہا ''أَنْتَ سَيِّدُنَا۔'' ''حضور ﷺ ہمارے آقا ہیں'' آپ ﷺ نے فرمایا: "السيد الله" ''آقا خدا ہے'' انہوں نے پھر عرض کی، حضور ﷺ! ہم میں سب سے افضل اور سب سے بڑھ کر فیاض ہیں، ارشاد ہوا، بات بولو تو اس کا لحاظ رہے کہ شیطان تم کو بہکا نہ لے جائے یعنی یہ تکلف اور تملق بھی ایک قسم کا جھوٹ ہے۔ ❹

عامر بن طفیل نے کہا، ''محمد ﷺ! تین باتیں ہیں، اہلِ بادیہ پر تم حکومت کرو، اور شہر میرے قبضہ میں ہوں، اگر یہ نہیں تو اپنے بعد مجھے اپنا جانشین بنا جاؤ، اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو میں غطفان کو لے کر چڑھ آؤں گا۔'' عامر نے اربد کو یہ سمجھا دیا تھا کہ میں ادھر محمد ﷺ کو باتوں میں لگاؤں گا، ادھر تم ان کا کام تمام کر دینا، اب عامر نے جو دیکھا تو اربد میں جنبش تک نہ تھی، نبوت کے غیر مرئی جاہ وجلال نے اس کی آنکھیں خیرہ کر دی

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب اداء الخمس من الایمان: ۵۳، ۸۷ وصحیح مسلم باب الایمان، باب الامر بالایمان: ۱۱۶ تا ۱۲۰۔ (نقیر کے متعلق سوال کا ذکر بخاری کے بجائے مسلم ہی میں ہے)''ض''

❷ مسلم اور دیگر کتب صحاح میں عبدالقیس کے اسی وفد کا ذکر ہے، ابن مندہ و دولابی وغیرہ نے اس قبیلہ کے ایک اور وفد کا ذکر کیا ہے جس میں ۴۰ آدمی شریک تھے اس بنا پر علامہ قسطلانی نے اسی قبیلہ کے دو وفد قرار دیے ہیں (ارشاد الساری، ج۱، ص: ۱۶۹؛ دار الطباعۃ مصر: ۱۲۸۸ھ) پہلا تقریباً ۵ھ میں اور دوسرا ۱۰ھ میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کتاب المغازی میں بعینہ یہی تحقیق کی ہے (ج۸، ص: ۶۷) لیکن کتاب الایمان کی شرح میں دونوں روایتوں کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ (ج۱، ص: ۱۲۱) ❸ اضافہ۔

❹ مشکوٰۃ، باب المفاخرۃ بحوالہ ابو داود، کتاب الادب، باب فی کراھیۃ التماد، ح: ۴۸۰۶۔

تھیں، دونوں اٹھ کر چلے آئے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''خدایا ان کے شر سے بچانا۔'' عامر کو طاعون ہو گیا۔ عرب میں صاحب فراش ہونا شرم کی بات تھی، عامر نے کہا: مجھے گھوڑے پر بٹھا دو، گھوڑے پر بٹھا دیا گیا اور اسی پر اس نے دم توڑا۔ جبار اور عام اشخاص ایمان کی دولت سے مالا مال ہو کر دار السلام سے واپس آئے۔ [1]

حمیر وغیرہ کی سفارت

حمیر میں مستقل سلطنت نہیں رہی تھی، سلاطین حمیر کی اولاد نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لی تھیں اور برائے نام بادشاہ کہلاتے تھے۔ عربی میں ان کا لقب قیل تھا، یہ لوگ خود نہیں آئے لیکن قاصد بھیجے کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے۔

اسی زمانہ میں بہرا، بنو بکا وغیرہ کی سفارتیں بھی آئیں۔ [2]

---

[1] عام واقعات ابن اسحاق و زرقانی سے ماخوذ ہیں، عامر کی تقریر اور اس کی موت کا واقعہ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ الرجیع: ۴۰۹۱ میں مذکور ہے۔

[2] تاریخ طبری، ج ٤، ص: ١٧٢٠، واقعات ۹ھ۔

تاسیسِ حکومتِ الٰہی

استخلاف فی الارض

﴿ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ (٢٤/ النور:٥٥)

(تیرہ [1] وتار راتوں کے بعد سپیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے۔ گھنگھور گھٹائیں جب چھٹ جاتی ہیں تو خورشید تاباں ضیا گستری کرتا ہے۔ دنیا گناہ گاریوں اور ظلم وستم کی تاریکیوں سے گھری ہوئی تھی کہ دفعتاً صبحِ سعادت نے ظہور کیا، اور حق وصداقت کا آفتاب پرتو افگن ہوا، عرب جس طرح ایک خدا کو پوجنے لگا تھا اب وہ صرف ایک ہی حکومت کے ماتحت تھا۔

خدائے پاک نے وعدہ فرمایا تھا:

﴿ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ۚ ﴾ (٢٤/ النور:٥٥)

''خدا نے تم میں سے ایمانداروں اور نیکوکاروں سے وعدہ کیا ہے کہ ان کو بے شبہ زمین میں اپنی خلافت اسی طرح عطا کرے گا جس طرح کہ گزشتہ امتوں کو اس نے اپنی خلافت عطا کی تھی اور ان کے اس مذہب کو جس کو اس نے ان کے لیے پسند کیا تھا، یقیناً قوت بخشے گا اور ان کی بے امنی کو امن سے بدل دے گا، کہ مجھ کو پوجیں اور کسی کو میرا شریک نہ بنائیں۔''

حکومتِ الٰہی واستخلاف فی الارض نبوت کے ضروری لوازم نہیں، لیکن جب دعوتِ الٰہی سیاست ملکی کی دیواروں سے آ کر ٹکراتی ہے، یا جب اصلاحات کا دامن ملک کی بدامنی وانتشار حال کے کانٹوں میں الجھ جاتا ہے تو پیغمبر ابراہیم [2] وموسیٰ علیہما السلام کے قالب میں آگے بڑھتا ہے اور قوم وملک کو نمرود وفراعنہ کی غلامی سے آزادی دلاتا ہے۔ پیغمبروں میں عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام بھی گزرے ہیں جن کو حکومت کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا اور موسیٰ اور داؤد وسلیمان علیہم السلام بھی جو قوموں اور ملکوں کی قسمت کے مالک تھے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ عیسیٰ ویحییٰ علیہما السلام بھی تھے اور موسیٰ وداؤد علیہما السلام بھی۔ عرب کے خزانے دست تصرف میں تھے لیکن کاشانۂ نبوت میں نہ کوئی نرم بستر تھا، نہ غذائے لطیف، نہ جسم مبارک پر خلعتِ شاہانہ تھا، نہ جیب وآستین میں درہم ودینار، عین اس وقت جب اس پر کسریٰ وقیصر کا دھوکا ہوتا تھا وہ گلیم پوش، مکہ کا یتیم اور آسمان کا معصوم فرشتہ نظر آتا تھا۔

اسلام کی حکومت کی غرض وغایت جس کو خدا نے خود اپنے الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے یہ تھی:

---

[1] یہ پورا باب اضافہ ہے۔''س''

[2] حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے قبیلہ کے شیخ تھے۔ چار سو غلاموں کی فوج ساتھ رہتی تھی۔ شام واطرافِ بابل کے کئی بادشاہوں سے ان کو لڑنا پڑا اور خدا نے ان سے وعدہ کیا کہ ان کی اولاد کو ارضِ مقدس کی حکومت عطا کرے گا۔ (توراۃ سفرِ تکوین اصحاح ١٢، ص: ١٨، ١٩ مطبوعہ مدرسہ آکسفورڈ ١٨٩٠ء)

﴿ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقٰتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۚ وَإِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ ﴾ (۲۲/ الحج:۳۹ تا ۴۱)

''مسلمان جن سے (بلاسبب) جنگ کی جاتی ہے، اب ان کو بھی جنگ کی اجازت دی گئی کہ وہ مظلوم ہیں اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے۔ وہ جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیے گئے سوا اس کے ان کا اور کوئی قصور نہ تھا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار ہی ہمارا خدا ہے۔ اگر دنیا میں ایک قوم کو دوسری قوم سے بچایا نہ جائے تو بہت سی خانقاہیں، کلیسے، عبادت گاہیں مسجدیں جن میں اکثر خدا کا نام لیا جاتا ہے، برباد کر دی جائیں، جو خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس کی مدد کرتا ہے۔ خدا طاقتور اور غالب ہے۔ (مسلمان وہ ہیں) جن کو اگر خدا زمین میں قوت عطا کرے تو عبادت الٰہی کریں، مستحقین کی مالی اعانت کریں، (زکوٰۃ دیں) لوگوں کو نیکیوں کی تاکید کریں، برائیوں سے روکیں، انجام کار خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔''

ان آیتوں میں بالا جمال یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں غزوات کی ابتدا کیوں اور کیونکر ہوئی؟ اسلام کی حکومت کے کیا اغراض و مقاصد تھے اور استخلاف فی الارض کے کیا فرائض ہیں اور دنیا کی عام حکومتوں سے وہ کن امور میں ممتاز ہے؟ ان مباحث کا اصولی اور مفصل بیان کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گا۔ یہاں عرب کے نظم و نسق کے متعلق عام اور جزئی باتیں بیان کرنی مقصود ہیں۔

صفحات بالا سے معلوم ہو چکا ہے کہ اب تمام عرب میں امن و امان قائم ہے۔ سیاسی مشکلات کا خاتمہ ہو چکا ہے ملک کے ہر گوشہ میں دعاۃِ اسلام پھیلے ہوئے ہیں، قبائل دور دراز صوبوں سے بارگاہِ نبوت کا رخ کر رہے ہیں فتح مکہ اسلام کی شہنشاہی کا پہلا دن تھا، جو رمضان ۸ ھ کا واقعہ ہے، اسی کے بعد آنحضرت ﷺ نے قبائل میں محصلینِ زکوٰۃ کا تقرر فرمایا لیکن اصل خلافتِ الٰہی کے تمام اجزا اواخر ۱۰ ھ میں زمانہ حجۃ الوداع کے قریب مکمل ہوئے۔

یورپ کی ناآشنا نگاہ میں اگرچہ آپ ﷺ کی زندگی کا یہ دور جدید ایشیائی شاہانہ زندگی کا ایک طرب انگیز مظہر تھا لیکن آشنایانِ حقیقت کو شہنشاہِ عرب پھٹے پرانے کپڑوں میں، مدینہ کی گلیوں کے اندر غلاموں اور مسکینوں کے کام کرتا ہوا نظر آتا ہے، وہ تاج و تخت سے بے نیاز قصر و ایوان سے مستغنی، حاجب و دربان سے بے پروا، مال و زر سے خالی، خدم و حشم کے بغیر دلوں پر حکومت کر رہا تھا، نہ اس کی حکومت میں پولیس تھی، نہ بڑے بڑے انتظامی دفاتر، نہ کثیر التعداد اربابِ مناصب، نہ وزرائے شوریٰ، نہ امرائے سیاست، نہ الگ

الگ حکام وقضاۃ، وہ ایک ہی ذات تھی جو ہر فرض وخدمت کی خود ذمہ دار تھی لیکن بایں ہمہ وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے اونٹ کے ایک بال کے برابر بھی زیادہ مستحق نہیں سمجھتا تھا، [1] اس کے عدل وانصاف کے آگے فاطمہ رضی اللہ عنہا جگر گوشۂ نبوت اور عام مجرم برابر تھے۔ [2]

آنحضرت ﷺ کی اصل بعثت کا مقصد دعوت مذہب، اصلاح اخلاق، اور تزکیۂ نفوس تھا، اس کے علاوہ اور تمام فرائض محض ضمنی تھے۔ اس بنا پر انتظامات ملکی آپ نے اسی حد تک قائم کیے جہاں تک ملکی بدامنی کے باعث دعوت توحید کے لیے عوائق پیش آتے تھے، تاہم یہ کام بھی کچھ اہم نہ تھا۔

انتظام ملکی

عمر شریف اس وقت ساٹھ برس کی تھی لیکن اس عمر میں بھی اس حکومت کے تمام کام خود انجام دیتے تھے، ولاۃ اور عمال کا تقرر مؤذنین اور ائمہ کا تعین، محصلینِ زکوٰۃ وجزیہ کی نامزدگی، غیر قوموں سے مصالحت، مسلمان قبائل میں جائیدادوں کی تقسیم، فوجوں کی آراستگی، مقدمات کا فیصلہ، قبائل کی خانہ جنگیوں کا انسداد، وفود کے لیے تعینِ وظائف، اجرائے فرامین، نومسلموں کے انتظامات، مسائل شرعیہ میں افتا، جرائم کے لیے اجرائے تعزیر، ملک کے بڑے بڑے سیاسی انتظامات، عہدہ داروں کی خبر گیری اور احتساب، دور کے صوبوں میں متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم گورنر اور والی بنا کر بھیج دیے گئے تھے، لیکن خود مدینہ اور اطرافِ مدینہ کے فرائض آپ ﷺ خود انجام دیتے تھے۔

خلافتِ الٰہی کے ان فرائض واعمال نے آپ ﷺ کے دل ودماغ پر جو بارِ عظیم ڈالا، اس نے آپ کے نظامِ جسمانی کو چور چور کر دیا۔ عام روایتوں سے ثابت ہے کہ آپ آخر زندگی میں تہجد کی نماز بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے جو ضعف جسمانی کا اقتضا تھا لیکن یہ ضعف جسمانی خود کس چیز کا نتیجہ تھا، اس کا جواب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبان سے سننا چاہیے جن سے بڑھ کر آپ ﷺ کے اعمال زندگی کا کوئی ترجمان نہیں ہو سکتا:

عن عبد اللہ بن شقیق قال سالت عائشۃ...... فکان یصلی قاعداً؟ قالت حین حطمہ الناس۔ [3]

"عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ کیا آنحضرت ﷺ بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے، انہوں نے کہا، ہاں لیکن اس وقت جب لوگوں نے آپ کو چور چور کر دیا تھا۔"

امیر العسکری

چھوٹے چھوٹے غزوات وسرایا کے امیر الجیش اگرچہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم ہوتے تھے، لیکن جو بڑے بڑے معرکے پیش آتے تھے ان کی قیادت خود آپ ﷺ بہ نفس نفیس فرماتے تھے، چنانچہ بدر، احد، خیبر، فتح

[1] ابو داود، کتاب الصلوٰۃ، باب الامام یصلی من قعود: ۶۰۲۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب اقامۃ الحدود علی الشریف والوضیع: ۶۷۸۷۔ [3] ابو داود، کتاب الصلوٰۃ، باب فی صلوٰۃ القاعد: ۹۵۶۔

مکہ، تبوک، میں خود آپ ﷺ ہی امیر العسکر تھے۔اس کا مقصد صرف فوج کا لڑانا اور آخری فتح وظفر حاصل کرنا نہ تھا بلکہ فوج کی عام اخلاقی اور روحانی نگرانی کرنا تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے مجاہدین اسلام کی جن جزئی سے جزئی بے اعتدالیوں پر گرفت فرمائی ہے وہ احادیث میں بہ تصریح مذکور ہیں اور اسلام کا قانون جنگ اسی دارو گیر کے ذریعہ سے وجود میں آیا ہے۔

افتا

آپ کے عہد مبارک میں اگر چہ متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم بھی بطور خود فتویٰ دیتے تھے لیکن زیادہ تر آپ ﷺ ہی اس فرض کو بھی ادا کرتے تھے۔فتویٰ دینے کے لیے آپ ﷺ نے کوئی خاص وقت مقرر نہیں فرمایا تھا۔ بلکہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، غرض جس وقت لوگ آپ سے احکامِ اسلام کے متعلق سوالات کرتے تھے آپ ان کا جواب دیتے تھے، چنانچہ امام بخاری نے کتاب العلم میں ان فتاویٰ کو اس قسم کے متعدد ابواب میں تقسیم کر دیا ہے۔خلافت کا یہی فرض تھا جس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں نہایت ترقی دی اور اس کا ایک مستقل شعبہ قائم کر دیا۔

فصل قضایا

اگر چہ آپ ﷺ کے عہد مبارک میں عہدۂ قضاۃ قائم ہو چکا تھا اور حضرت علی اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کو آپ ﷺ نے خود یمن کا قاضی مقرر فرما کے بھیجا تھا، تاہم مدینہ اور اس کے حوالی ومضافات کے تمام مقدمات کا آپ خود فیصلہ کرتے تھے، اس کے لیے کسی قسم کی روک ٹوک اور پابندی نہ تھی۔امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خاص باب باندھا ہے، جس کا عنوان یہ ہے:

باب ماذكر ان النبی ﷺ لم يكن له بوّاب۔ [1]

''یعنی آنحضرت ﷺ کے دروازہ پر دربان نہ تھا۔''

اس بنا پر گھر کے اندر بھی آپ ﷺ اطمینان وسکون کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے تھے۔عورتوں کے معاملات عموماً زنان خانہ ہی میں پیش ہوتے تھے۔احادیث کی کتابوں میں آپ کے فیصلوں کا اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ اگر ان کا استقصا کیا جائے تو ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے۔عموماً احادیث کی کتاب البیوع میں دیوانی کے مقدمات اور کتاب القصاص والدیات وغیرہ میں فوجداری کے مقدمات مذکور ہیں۔

توقیعات وفرامین

یہ اس قدر اہم کام تھا کہ عہد مبارک میں اگر چہ ادر صیغوں کا کوئی مستقل دفتر نہیں قائم ہوا تھا تاہم توقیعات وفرامین کے لیے اس کی ابتدائی شکل قائم ہو چکی تھی، چنانچہ اس خدمت پر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور آخر میں معاویہ رضی اللہ عنہ بھی مامور ہوئے ان کے علاوہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی وقتاً فوقتاً یہ خدمت انجام

[1] بخاری، کتاب الاحکام، رقم الباب:١١۔

دیتے تھے آپ نے سلاطین وملوک کو دعوتِ اسلام کے جو خطوط روانہ فرمائے غیر قوموں کے ساتھ جو معاہدے کیے، مسلمان قبائل کو جو احکام بھیجے، عمال ومحصلین کو جو تحریری فرامین عنایت کئے، فوج کا جو رجسٹر مرتب کرایا، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو جو حدیثیں لکھوائیں، وہ سب اسی سلسلہ میں داخل ہیں۔ زرقانی وغیرہ نے آپ کے احکام و فرامین تحریری کا ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ ❶

مہمان داری

منصبِ نبوت کے بعد آپ ﷺ کی ذاتی حیثیت تقریباً فنا ہوگئی تھی اس لیے آپ کی خدمت میں جو لوگ حاضر ہوتے تھے ان کا تعلق بھی خلافتِ الٰہی یا نبوت ہی کے ساتھ ہوتا تھا اور آپ اسی حیثیت سے ان کی مہمان داری فرماتے تھے۔ مہمانوں کی زیادہ تر تعداد قبولِ اسلام کے لیے آتی تھی جن کی مہمان داری کے لیے آپ نے ابتدائے نبوت ہی سے خاص طور پر حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) کو مامور فرما دیا تھا چنانچہ جب کوئی تنگ دست مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ اس کو برہنہ تن دیکھتے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیتے اور وہ قرض لے کر اس کے کھانے اور کپڑے کا انتظام کرتے جب آپ کے پاس کہیں سے کچھ مال آتا تو اس کے ذریعے سے وہ قرض ادا کیا جاتا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص آپ کو ذاتی طور پر ہدیہ دیتا تو وہ بھی اسی صیغہ میں صرف کیا جاتا ❷ کبھی کبھی اس غرض کے لیے آپ تمام صحابہ کو صدقہ وخیرات کی ترغیب دیتے اور جو رقم وصول ہوتی وہ ان مفلوک الحال مہاجرین کی اعانت میں صرف ہوتی۔ چنانچہ ایک بار مہاجرین کی ایک برہنہ پا برہنہ سر جماعت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ ہر شخص کے بدن پر صرف ایک چادر اور گلے میں ایک تلوار حمائل تھی۔ آپ نے ان کی پریشان حالی کو دیکھا تو چہرے کا رنگ بدل گیا، فوراً حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کا حکم دیا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایک خطبہ میں تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان لوگوں کی اعانت کی ترغیب دی، اس کا یہ اثر ہوا کہ ایک انصاری اٹھے اور ایک توڑا جو اس قدر وزنی تھا کہ ان سے بہ مشکل اٹھ سکتا تھا، لا کر آپ کے آگے ڈال دیا۔ اس سے تمام لوگوں میں اور بھی جوش پیدا ہوا۔ تھوڑی دیر میں ان بے سروسامان مہاجرین کے آگے غلہ اور کپڑے کا ڈھیر لگ گیا۔ ❸

فتح مکہ کے بعد تمام اطراف ملک سے بکثرت ملکی ومذہبی وفود آنے لگے۔ آپ بہ نفس نفیس ان کی خاطر مدارات کرتے تھے اور ان کے لیے حسب حاجت وظائف اور سفر کے مصارف ادا فرماتے تھے، قبائل پر اس کا بہت اچھا اثر پڑتا تھا۔ آپ اس کا اس قدر لحاظ فرماتے تھے کہ وفات کے وقت آپ نے جو آخری وصیتیں فرمائی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی:

((اجیزوا الوفود بنحو ما کنت اجیزهم)) ❹

---

❶ الفصل السادس فی امرائه ورسله وکتابه وکتبه الخ، ج۳، ص: ۳۵۶۔ ❷ ابو داود، کتاب الخراج والامارة، باب فی الامام یقبل هدایا المشرکین: ۳۰۵۵۔ ❸ مسند احمد، ج۴، ص: ۳۵۸، ۳۵۹۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الجزیة والموادعة، باب اخراج الیهود من جزیرة العرب: ۳۱۶۸۔

''جس طرح میں وفود کو عطیہ دیا کرتا تھا تم بھی اسی طرح دیا کرو۔''

وفود کے حالات آگے آتے ہیں۔

عیادتِ مرضیٰ

مریضوں کی عیادت اور ان کی تجہیز و تکفین میں شریک ہونا اگرچہ ایک مذہبی فرض تھا اور مذہبی حیثیت سے اس کی ابتدا بھی ہوئی چنانچہ جب آپ ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو یہ عام دستور ہو گیا کہ دمِ نزع، میت کے اعزہ آپ کو اطلاع دیتے۔ آپ ﷺ ان کے پاس آ کر اُن کے لیے دعائے مغفرت کرتے [1] لیکن بعض حیثیتوں سے اس کا تعلق خلافت کے ساتھ بھی ہو گیا تھا کیونکہ بعض صحابہ اس حالت میں اپنی جائداد کو وقف یا صدقہ کرنا چاہتے تھے اور آنحضرت ﷺ اس موقع پر ان کا صحیح طریقہ بتاتے تھے۔ جن لوگوں پر قرض آتا تھا آپ اُن کے جنازہ میں شریک نہیں ہوتے تھے اس لیے اُن کے ورثہ یا دوسرے صحابہ کو مجبوراً یہ قرض ادا کرنا پڑتا تھا۔ اور اس طرح بعض معاملات و نزاعات کا فیصلہ ہو جاتا تھا، چنانچہ احادیث میں اس قسم کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

احتساب

تمدنِ اسلام کے دورِ ترقی میں محکمۂ احتساب ایک مستقل محکمہ تھا جو نہایت وسیع پیمانہ پر تمام قوم کے اخلاق و عادات، بیع و شراء، اور معاملاتِ داد وستد کی نگرانی کرتا تھا لیکن آنحضرت ﷺ کے عہدِ مبارک میں یہ محکمہ قائم نہیں ہوا تھا، بلکہ خود ہی آپ اس فرض کو ادا فرماتے تھے۔ ہر شخص کے جزئیاتِ اخلاق اور فرائضِ مذہبی کے متعلق آپ وقتاً فوقتاً دار و گیر فرماتے رہتے تھے۔ تجارتی معاملات کی بھی نگرانی فرماتے تھے۔ عرب میں تجارتی معاملات کی حالت نہایت قابلِ اصلاح تھی اور مدینہ میں آنے کے ساتھ ہی آپ نے ان اصلاحات کو جاری کر دیا، لیکن تمام لوگوں سے اصلاحات پر عمل کرانا صیغہ احتساب سے تعلق رکھتا تھا چنانچہ آپ نہایت سختی کے ساتھ ان معاملات کی نگرانی فرماتے تھے اور تمام لوگوں سے ان پر عمل کراتے تھے اور جو لوگ باز نہیں آتے تھے ان کو سزائیں دلاتے تھے۔ صحیح بخاری کتاب البیوع میں ہے:

لقد رأیت الناس فی عهد النبی ﷺ یبتاعون جزافا یعنی الطعام یضربون ان یبیعوه فی مکانهم حتی یؤوه الی رحالهم۔ [2]

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کے عہد میں دیکھا کہ جو لوگ تخمیناً غلہ خریدتے تھے ان کو اس بات پر سزا دی جاتی تھی کہ اپنے گھروں میں منتقل کرنے سے پہلے اس کو خود اسی جگہ بیچ ڈالیں جہاں اس کو خریدا تھا۔''

---

[1] مسند احمد، ج۳، ص: ٦٦۔ [2] صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب من رای اذا اشتری طعاما جزافا: ۲۱۳۷۔

کبھی کبھی تحقیق حال کے لیے آپ ﷺ خود بازار تشریف لے جاتے، ایک بار آپ بازار میں گزر رہے تو غلہ کا ایک انبار نظر آیا۔ اس کے اندر ہاتھ ڈالا تو نمی محسوس ہوئی۔ دوکاندار سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بارش سے بھیگ گیا ہے۔ ارشاد ہوا کہ ''پھر اس کو اوپر کیوں نہیں کر لیا، تاکہ ہر شخص کو نظر آئے جو لوگ فریب دیتے ہیں وہ ہم میں سے نہیں ہیں۔'' ❶

فرائض احتساب میں آپ کا سب سے بڑا فرض عمال کا محاسبہ تھا۔ یعنی جب عمال زکوۃ اور صدقہ وصول کر کے آتے تھے تو آپ اس غرض سے ان کا جائزہ لیتے تھے کہ انہوں نے کوئی ناجائز طریقہ تو نہیں اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ایک بار آپ نے ابن اللتبیہ کو صدقہ وصول کرنے کے لیے مامور فرمایا۔ وہ اپنی خدمت انجام دے کر واپس آئے اور آپ نے ان کا جائزہ لیا، تو انہوں نے کہا: یہ مال مسلمانوں کا ہے اور یہ مجھ کو ہدیۃً ملا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''گھر بیٹھے بیٹھے تم کو یہ ہدیہ کیوں نہیں ملا۔'' اس کے بعد آپ نے ایک عام خطبہ دیا، جس میں اس کی سخت ممانعت فرمائی۔ ❷

اصلاح بین الناس

اسلام تمام دنیا کے تفرقوں کو عموماً اور عرب کے اختلافات کو خصوصاً مٹانے کے لیے آیا تھا اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے اس کو اپنا ایک ضروری فرض قرار دیا تھا اور جب آپ کو اس قسم کے منازعات کی خبر ہوتی تھی، تو آپ اصلاح کو تمام مذہبی فرائض پر مقدم رکھتے تھے، چنانچہ ایک بار قبیلہ بنو عمرو بن عوف کے چند اشخاص کے درمیان نزاع پیدا ہوئی، آپ کو معلوم ہوا تو چند صحابہ کے ساتھ ان میں مصالحت کرانے کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ کو اس معاملہ میں دیر ہوئی اور نماز کا وقت آ گیا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی، لیکن اذان کے بعد بھی آپ تشریف نہیں لائے تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امام بنا کر نماز شروع کر دی آپ اسی حالت میں تشریف لائے اور صفوں کو چیرتے ہوئے اگلی صف میں جا کھڑے ہوئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اگرچہ نماز میں ادھر ادھر نہیں دیکھتے تھے لیکن جب لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجانی شروع کیں تو انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ آنحضرت ﷺ کھڑے ہیں۔ آپ نے اگرچہ ہاتھ سے اشارہ کیا کہ کھڑے رہیں لیکن آپ کی موجودگی میں انہوں نے امامت کرنا سوئے ادب خیال کیا اس لیے پیچھے ہٹ آئے، اور آنحضرت ﷺ آگے بڑھ کر ان کی جگہ کھڑے ہو گئے۔ ❸

ایک بار اہل قبا کے درمیان نزاع قائم ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگوں نے باہم سنگ اندازی کی۔ آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ مصالحت کرانے کی غرض سے تشریف لے گئے ❹

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ من غشنا فلیس منا: ٢٨٤۔ ❷ بخاری، کتاب الاحکام، باب ھدایا العمال: ٧١٧٤۔ ❸ بخاری، کتاب الصلح، باب ما جاء فی اصلاح بین الناس: ٢٦٩٠۔
❹ بخاری، کتاب الصلح، باب قول الامام لاصحابہ: اذھبوا بنا نصلح: ٢٦٩٣۔

(یہ دونوں واقعات گو امام بخاری نے الگ لکھے ہیں، لیکن شراح حدیث کی تحقیق میں یہ ایک ہی واقعہ کے دو حصے ہیں) بخاری کی دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ اتنی دور پیدل گئے تھے۔

ابن ابی حدرد پر حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا کچھ قرض تھا انہوں نے مسجد میں تقاضا کیا، حدرد قرض کا ایک حصہ معاف کرانا چاہتے تھے لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوتے تھے، بات زیادہ بڑھی اور شور وغل ہوا تو آپ گھر کے اندر سے نکل آئے اور کعب رضی اللہ عنہ کو پکارا، کعب رضی اللہ عنہ نے لبیک کہا تو آپ نے فرمایا کہ ''نصف معاف کر دو۔'' وہ راضی ہو گئے تو آپ ﷺ نے حدرد سے کہا کہ ''جاؤ اور بقیہ حصہ ادا کر دو۔'' ❶ اس قسم کے سینکڑوں جزئی واقعات روزانہ پیش آیا کرتے تھے۔

مدینہ میں اور مدینہ سے باہر دیگر فرائض کی انجام دہی کے لیے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم اور ارباب استعداد کو مختلف عہدوں پر نصب فرمایا۔ کتابت وحی، نامہ و پیام، اجرائے احکام وفرامین کے لیے سب سے پہلی ضرورت عہدۂ انشا اور کتابت کی تھی، اسلام سے پہلے عرب میں عام طور پر لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا لیکن اسلام عرب کے لیے رحمتوں کا جو خزانہ لایا تھا، اس میں ایک یہ شے بھی تھی۔ اسیران بدر میں نادار لوگوں کا فدیہ صرف یہ قرار دیا گیا کہ وہ مدینہ کے بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔ ❷ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جن کے متعلق کتابت وحی کی مقدس خدمت تھی، اسی طریقہ پر تعلیم پائی تھی۔ ابوداؤد کی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کو جو تعلیم دی جاتی تھی اس کا ایک جزو کتابت کی تعلیم بھی تھی۔ ❸

کتاب

عہدۂ قضا گویا آنحضرت ﷺ کی ایک حیثیت سے نیابت تھی۔ اس لیے مختلف اوقات میں بڑے بڑے صحابہ اس خدمت پر مامور کئے گئے۔ جن میں شرحبیل بن حسنہ کندی رضی اللہ عنہ سب سے پہلے اس شرف سے ممتاز ہوئے۔ یہ نہایت قدیم الاسلام تھے، مکہ میں انہی نے سب سے پہلے کتابت وحی کا فرض انجام دیا۔ قریش میں سب سے پہلے کاتب عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ تھے، مدینہ میں اس کی اولیت کا شرف حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت زبیر، حضرت عامر بن فہیرہ، حضرت عمرو بن العاص، حضرت عبداللہ بن ارقم، حضرت ثابت بن قیس بن شماس، حضرت حنظلہ بن الربیع الاسدی، حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت عبداللہ بن رواحہ، حضرت خالد بن ولید، حضرت خالد بن سعید بن العاص، حضرت علاء بن حضرمی، حضرت حذیفہ بن الیمان، حضرت معاویہ بن ابی سفیان، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم مختلف اوقات میں اس منصب پر مامور ہوئے۔ اگرچہ تمام بزرگوں کو کبھی کبھی یہ خدمت ادا کرنی پڑتی تھی، چنانچہ صلح نامہ حدیبیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا، امرا اور سلاطین کے نام خطوط حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ لکھتے تھے اور امرائے عمان کے نام آپ نے جو مکتوب بھیجا تھا وہ حضرت ابی بن

❶ بخاری، کتاب الصلح، باب الصلح بالدین والعین: ۲۷۱۰۔ ❷ مسند امام احمد، ج۱، ص:۲۴۷۔
❸ ابو داود، کتاب الاجارة، باب فی کسب المعلم: ۳۴۱٦۔

کعب رضی اللہ عنہ کا لکھا تھا۔ قطن بن حارثہ کو جو خط بارگاہِ نبوت سے بھیجا گیا تھا وہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ نے لکھا تھا لیکن عام طور پر یہ خدمت حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے متعلق تھی اور صحابہ کے گروہ میں ان کا نام اسی حیثیت سے زیادہ نمایاں ہے۔ ❶

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ان تمام بزرگوں پر ایک خاص امتیاز حاصل کیا کہ عبرانی زبان سیکھی جس کی ضرورت یہ پیش آئی کہ مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ تر یہود سے تعلق رہتا تھا جن کی مذہبی زبان عبرانی تھی۔ اس بنا پر آپ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا، اور انہوں نے پندرہ دن میں اس میں مہارت حاصل کر لی۔

حکام اور ولاۃ

فصل قضایا، اقامتِ عدل، بسطِ امن، رفعِ نزاع کے لیے متعدد ولاۃ حکام کی ضرورت تھی، اس غرض سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم کو مختلف مقامات کا حکام و والی مقرر فرما دیا، چنانچہ ان کے ناموں کی تفصیل حسب ذیل ہے: ❷

باذان بن ساسان رضی اللہ عنہ	بہرام گور کے خاندان سے تھے اور سلاطین عجم میں سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کا والی مقرر فرما دیا۔
شہر بن باذان رضی اللہ عنہ	باذان بن ساسان رضی اللہ عنہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صنعاء کا والی مقرر فرمایا۔
خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ	شہر بن باذان رضی اللہ عنہ مارے گئے تو ان کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صنعاء کا عامل مقرر فرمایا۔
مہاجر بن امیۃ المخزومی رضی اللہ عنہ	آپ نے ان کو کندہ و صدف کا والی مقرر فرمایا تھا لیکن وہ ابھی روانہ بھی نہ ہوئے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا
زیاد بن لبید الانصاری رضی اللہ عنہ	حضر موت کے والی تھے۔
ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ	زبید، عدن، زمعہ، وغیرہ کے والی تھے۔
معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ	والی جند۔
عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ	والی نجران۔
یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ	والی تیما۔
عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ	والی مکہ۔
علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ	متولی اخماسِ یمن۔
عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ	والی عمان۔

❶ ان بزرگوں کے نام اور تفصیلی حالات زرقانی، ج ۳، ص: ۳۷۳ میں مذکور ہیں۔

❷ دیکھو زرقانی، ج ۳، ص: ۴۳۳ وما بعد۔

علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ	والی بحرین۔

ان ولاۃ یعنی گورنروں کا تقرر ملک کی وسعت اور ضروریات کے لحاظ سے ہوتا تھا، آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں عرب کے جو حصے اسلام کے زیر اثر آئے ان میں یمن سب سے زیادہ وسیع اور متمدن تھا اور مدت تک ایک باقاعدہ سلطنت کے زیر سایہ رہ چکا تھا اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے اس کو پانچ حصوں میں منقسم فرمایا اور ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ گورنر مقرر فرمائے۔ خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کو صنعاء پر، مہاجر بن ابی امیہ رضی اللہ عنہ کو کندہ پر، زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ کو حضر موت پر معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جند، پر ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو زبید، زمعہ، عدن اور سواحل پر۔ ❶

عموماً جب کسی مہاجر کو کہیں کا عامل مقرر فرماتے تھے تو اسی کے ساتھ ایک انصاری کا تقرر بھی فرماتے تھے۔ ❷ ملکی انتظام، فصل مقدمات اور تحصیلِ خراج وغیرہ کے علاوہ ان عمال کا سب سے مقدم فرض اشاعتِ اسلام اور سنن وفرائض کی تعلیم تھی اس لحاظ سے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، یہ لوگ حاکم ملک اور والی صوبہ ہونے کے ساتھ مبلغِ دین اور معلمِ اخلاق کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ استیعاب، تذکرہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ میں ہے۔

وبعثه رسول اللهﷺ قاضيًا الى الجند من اليمن يعلم الناس القرآن وشرائع الاسلام ويقضي بينهم وجعل اليه قبض الصدقات من العمال الذين باليمن۔ ❸

''آنحضرت ﷺ نے ان کو یمن کے ایک حصہ یعنی جند کا قاضی بنا کر روانہ فرمایا کہ لوگوں کو قرآن اور شرائع اسلام کی تعلیم دیں اور جو عمال یمن میں تھے ان کے صدقات کے جمع کرنے کی خدمت بھی ان کے متعلق تھی۔''

چنانچہ جب یہ لوگ روانہ ہوتے تھے تو آنحضرت ﷺ ان فرائض کی تعیین فرما دیتے تھے۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا تو یہ وصیت کی:

((انك تأتي قوما من اهل كتاب فادعهم الي شهادة ان لا اله الا الله واني رسول الله فان هم اطاعوا لذلك فاعلمهم ان الله افترض عليهم خمس صلوت في اليوم والليلة فان هم اطاعوا لذلك فاعلمهم ان الله افترض عليهم صدقة اموالهم تؤخذ من اغنياء هم وترد الى فقرائهم فان هم اطاعوا لذلك فاياك وكرائم اموالهم واتق دعوة المظلوم فانها ليس بينها وبين الله حجاب))۔ ❹

''تم اہل کتاب کے پاس جاتے ہو پہلے ان کو کلمۂ توحید کی دعوت دو، اگر وہ اس کو قبول کرلیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے رات اور دن میں ان پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اگر وہ اس کو بھی مان

❶ استيعاب تذكرة معاذ بن جبل، جزء اول، ص: ٢٤٦ دائرة المعارف حيدرآباد: ١٣١٨ھ۔

❷ مسند ابن حنبل، ج٥، ص: ١٨٦۔ ❸ استيعاب ابن عبدالبر، جزء اول، ص: ٢٤٦۔

❹ ترمذی، كتاب الزكوة، باب ماجاء في كراهية اخذ خيار المال في الصدقة: ٦٢٥۔

لیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے امرا سے لے کر ان کے غربا پر تقسیم کر دیا جائے گا اگر وہ اس کو بھی تسلیم کر لیں تو ان کے بہترین مال سے احتراز کرنا اور مظلوم کی بد دعا سے بچنا کیوں کہ اس میں اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔''

ان فرائض کے ادا کرنے کے لیے سب سے زیادہ ضرورت تبحر علمی، وسعت نظر اور اجتہاد کی تھی، اس بنا پر آپ ان لوگوں کے تبحرِ علمی اور طرزِ عمل کا امتحان لیتے تھے، چنانچہ جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا تو پہلے ان کی اجتہادی قابلیت کے متعلق اطمینان فرمالیا۔ ترمذی میں ہے:

قال رسول اللّٰه ﷺ لمعاذ بن جبل حين وجهه الى اليمن ((بم تقضى)) قال بما في كتاب اللّٰه قال: ((فان لم تجد في كتاب اللّٰه)) قال بما في سنة رسول اللّٰه قال: ((فان لم تجد في سنة رسول اللّٰه)) قال اجتهد برائي فقال رسول اللّٰه ﷺ: ((الحمد للّٰه الذي وفق رسول رسول اللّٰه لما يحب رسول اللّٰه))۔ ❶

''رسول اللہ ﷺ نے جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا: ''کس چیز سے مقدمات کا فیصلہ کرو گے۔'' انہوں نے کہا: قرآن مجید سے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر اس میں وہ فیصلہ تم کو نہ ملے۔'' انہوں نے کہا: احادیث سے پھر آپ نے فرمایا: ''اگر احادیث میں بھی اس کے متعلق ہدایت نہ ملے؟'' تو انہوں نے کہا: میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس خدا کا شکر ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے رسول کو اس چیز کی توفیق دی جس کو خود اس کا رسول محبوب رکھتا ہے۔''

لیکن اہلِ عرب کے دلوں کے مسخر کرنے کے لیے ان تمام چیزوں سے زیادہ رفق و ملاطفت نرمی اور خوش خوئی کی ضرورت تھی جن کی آمیزش سیاست اور حکومت کے اقتدار کے ساتھ تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے اس لیے آنحضرت ﷺ گورنروں کو بار بار اس کی طرف متوجہ فرماتے رہتے تھے چنانچہ جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ایک صحابی کے ساتھ یمن کی گورنری پر روانہ فرمایا تو پہلے دونوں کو عام طور سے وصیت فرمائی:

((يسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا وتطاوعا ولا تختلفا))۔ ❷

''آسانی پیدا کرنا، دشواری نہ پیدا کرنا لوگوں کو بشارت دینا اور ان کو وحشت زدہ نہ کرنا باہم اتفاق رکھنا اور اختلاف نہ کرنا۔''

اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جب رکاب میں پاؤں ڈال چکے تو ان سے خاص طور پر یہ الفاظ فرمائے:

((احسن خلقك للناس))۔ ❸

❶ ترمذی، ابواب الاحکام، باب ما جاء فی القاضی کیف یقضی: ۱۳۲۷؛ ابوداود، کتاب القضاء، باب اجتهاد الرای فی القضاء: ۳۵۹۲؛ مسند احمد، ج ۵، ص: ۲۳۰، ۲۳۶، ۲۴۲۔ ❷ مسلم، کتاب الجهاد، باب فی الامر بالتیسیر...... ۴۵۲۶۔ ❸ ابن سعد تذکرہ معاذ بن جبل، جزء ثالث، قسم ثانی ص: ۱۲۱۔

’’لوگوں کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ برتاؤ کرنا۔‘‘

اگر یہ اصول صحیح ہے کہ کوئی حکومت کتنی ہی رحم دل کیوں نہ ہو لیکن ابتدا میں جب وہ کسی ملک کو اپنے قبضہ اقتدار میں لاتی ہے تو سرکش لوگوں کے مطیع کرنے کے لیے اس کو مجبوراً سختیاں کرنی پڑتی ہیں، تو عرب سب سے زیادہ اس کا مستحق تھا، لیکن آنحضرت ﷺ کی اسی مقدس تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ ریگستانِ عرب کا ایک ذرہ بھی ولاۃ کے مظالم کے سنگِ گراں سے نہ دبا یہاں تک کہ اخیر زمانہ میں جب صحابہ رضی اللہ عنہم عمال حکومت کے مظالم کو دیکھتے تھے تو ان کو سخت استعجاب ہوتا تھا اور وہ آنحضرت ﷺ کی تلقینات کے ذریعہ سے ان کو روکتے تھے چنانچہ ایک بار ہشام بن حکیم بن حزام نے دیکھا کہ شام کے کچھ نبطی دھوپ میں کھڑے کئے گئے ہیں انہوں نے لوگوں سے اس کی وجہ پوچھی: لوگوں نے کہا کہ جزیہ وصول کرنے کے لیے ان لوگوں کے ساتھ یہ سختی کی جا رہی ہے۔ انہوں نے یہ سن کر کہا:

اشهد لسمعت رسول اللهﷺ يقول: ((**ان الله يعذب الذين يعذبون الناس في الدنيا**))۔ [1]

’’میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔‘‘

محصلین زکوٰۃ وجزیہ

عرب کا خلوص اور جوشِ ایمان اگرچہ خود اُن کو صدقہ وزکوٰۃ کے ادا کرنے پر آمادہ کر دیتا تھا چنانچہ اسلام لانے کے ساتھ ہی ہر قبیلہ اپنی قوم کا صدقہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں خود پیش کرتا اور آپ ﷺ کی دعا سے برکت اندوز ہوتا تھا، لیکن ایک وسیع ملک اور ایک وسیع حکومت کے لیے یہ طریقہ کافی نہ تھا اس لیے ولاۃ کے علاوہ یکم محرم ۹ ھ کو آنحضرت ﷺ نے صدقہ وزکوٰۃ کے وصول کرنے کے لیے ہر قبیلہ کے لیے الگ الگ محصلین مقرر فرمائے جو قبائل کا دورہ کر کے لوگوں سے زکوٰۃ اور خراج وصول کر کے آپ کی خدمت مبارک میں پیش کرتے تھے۔ عموماً خود رؤسائے قبائل اپنے اپنے قبیلوں کے محصل ہوتے تھے اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً ان کا تقرر وقتی ہوتا تھا۔

بہر حال آپ نے اس فرض کی انجام دہی کے لیے حسب ذیل اشخاص کو مختلف قبائل اور شہروں میں متعین فرمایا: [2]

---

[1] صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب الوعيد الشديد لمن عذب الناس بغير حق: ٦٦٥٨۔

[2] اس فہرست کے اکثر نام ابن سعد، جزء ثانی، قسم اول، ذکر مغازی، ص: ۱۱۵ میں مذکور ہیں۔ عمر فاروق، محمیہ اور ابوعبیدہ بن جراح کا ذکر بخاری، كتاب الزكاة: (١٤٧٣)؛ كتاب الجزية: ٣١٥٨ نوٹ: ابن الاتبیہ کا ذکر بھی كتاب الاحكام: ٧١٧٤ میں ہے۔ تاہم محمیہ کا ذکر بخاری کے بجائے مسلم، كتاب الزكاة: ٢٤٨٢ میں ہے۔ اور بعض کا ابو داود، كتاب الخراج، میں ہے بقیہ کے لیے زاد المعاد ذکر مصدقین وامرائے نبوی ﷺ (ج ا، ص: ۶۲ مطبوعہ مصر) اور فتوح البلدان بلاذری دیکھو۔

نام	مقام تقرر	نام	مقام تقرر
عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ	طے و بنی اسد	ابوجہم بن حذیفہ رضی اللہ عنہ	بنولیث
صفوان بن صفوان رضی اللہ عنہ 1	بنی عمرو	ایک ہذیلی رضی اللہ عنہ	بنو ہذیم
مالک بن نویرہ رضی اللہ عنہ	بنوحنظلہ	عمر فاروق رضی اللہ عنہ	شہر مدینہ
بریدہ بن حصیب الاسلمی رضی اللہ عنہ	غفار و اسلم	ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ	شہر نجران
عباد بن بشر الاشہلی رضی اللہ عنہ	سلیم و مزینہ	عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ	شہر خیبر
رافع بن مکیث جہنی رضی اللہ عنہ	جہینہ	زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ	حضر موت
زبرقان بن بدر رضی اللہ عنہ	بنوسعد	ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ	صوبہ یمن
قیس بن عاصم رضی اللہ عنہ	//	خالد رضی اللہ عنہ	صوبہ یمن
عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ	بنوفزارہ	ابان بن سعید رضی اللہ عنہ	بحرین
ضحاک بن سفیان کلابی رضی اللہ عنہ	بنوکلاب	محمیہ بن جزء الزبیدی رضی اللہ عنہ 2	تحصیل خمس
بسر بن سفیان کلابی رضی اللہ عنہ	بنوکعب	عمرو بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ	تیماء
عبداللہ بن اللتبیہ رضی اللہ عنہ	بنوذبیان	عیینہ بن حصن فزاری رضی اللہ عنہ	بنوتمیم

ان محصلین کے تقرر میں آپ ﷺ حسب ذیل امور کی پابندی فرماتے تھے:

1 ان کو ایک فرمان عطا ہوتا تھا جس میں بہ تصریح بتایا جاتا تھا کہ کس قسم کے مال کی کتنی تعداد میں زکوٰۃ کی کیا مقدار ہے؟ چھانٹ کر مال لینے کی یا حق سے زیادہ لینے کی اجازت نہ تھی۔ عام حکم تھا کہ ((ایاك وكرائم اموالهم)) یہ عمال نہایت شدت کے ساتھ اس فرمان پر عمل کرتے تھے اور اس سے سرمو تجاوز جائز نہیں رکھتے تھے۔ بعض لوگوں نے بخوشی حق سے زیادہ دینا چاہا لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا۔ سوید بن غفلہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہمارے پاس آنحضرت ﷺ کا محصل آیا، میں جا کر اس کے پاس بیٹھا، تو اس نے پہلے جانوروں کے ان اقسام کو بیان کیا جن کے لینے کی فرمان میں اجازت نہ تھی، چنانچہ اسی وقت ایک شخص ایک نہایت عمدہ کوہان دار اونٹنی لے کر حاضر ہوا اور اس کی خدمت میں پیش کی، لیکن اس نے انکار کر دیا 3 اسی طرح جب ایک شخص نے ایک محصل کو بچے والی بکری دی تو اس نے کہا کہ مجھ کو اس کے لینے کی ممانعت کی گئی ہے۔ 4

2 عرب کے مال و دولت کی کل کائنات بکریوں کے ریوڑ اور اونٹوں کے گلے تک محدود تھی، جو جنگلوں میں، بیابانوں میں، پہاڑوں کے دامنوں میں چرتے رہتے تھے لیکن بجائے اس کے کہ دنیوی حکومتوں کی طرح

1 اصابہ باب صفوان۔ 2 صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب ترك استعمال آل النبی ﷺ علی الصدقة ۲٤۸۲۔ یہ غزوہ بنی مصطلق میں مال غنیمت کی تحصیل پر مامور کیے گئے تھے۔ (طبقات ابن سعد، جزء رابع، قسم اول، ص: ۱٤٦۔

3 نسائی، کتاب الزکوٰۃ، باب الجمع بین المتفرق: ۲٤٥۹۔

4 نسائی، کتاب الزکوٰۃ باب اعطاء السید المال: ۲٤٦٤۔

جابرانہ احکام کے ساتھ لوگ خود زکوٰۃ کے جانور لا کر مصلین کے سامنے پیش کرتے، مصلوں کو خود ان دروں میں جا کر زکوٰۃ وصول کرنا پڑتی تھی۔ ایک صحابی کا بیان ہے کہ میں پہاڑ کے ایک درہ میں بکریاں چرا رہا تھا کہ دو شخص اونٹ پر سوار ہو کر آئے اور کہا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے قاصد ہیں، یہاں تمہاری بکریوں کا صدقہ وصول کرنے آئے ہیں۔ میں نے ایک بچہ والی شیر دار بکری پیش کی لیکن انہوں نے کہا کہ ہم کو اس کے لینے کا حکم نہیں۔ میں نے ایک دوسرا بچہ دیا تو انہوں نے اس کو اپنے اونٹ پر لاد لیا اور چلتے ہوئے۔ [1]

[3] اگرچہ صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے تقدس اور پاک باطنی کی بنا پر ہر قسم کے ناجائز مال کے لینے سے خود احتراز کرتے تھے، چنانچہ جب آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو خیبر کے یہودیوں کے پاس بھیجا کہ وہاں کی زراعت کی نصف پیداوار حسب معاہدہ تقسیم کرا کے لائیں تو انہوں نے ان کو رشوت دینی چاہی تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ''اے خدا کے دشمنو! کیا مجھے حرام مال کھلانا چاہتے ہو۔'' [2] لیکن بایں ہمہ زہد و تقدس جب محصل اپنے دورہ سے واپس آتے تھے تو رسول اللہ ﷺ خود ان کا محاسبہ فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک بار آپ نے ابن اللتبیۃ کو صدقہ وصول کرنے کے لیے روانہ فرمایا، جب وہ واپس آئے اور آپ نے ان کا محاسبہ کیا تو انہوں نے کہا یہ آپ کا مال ہے اور یہ مجھے ہدیۃً ملا ہے۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم کو گھر بیٹھے بیٹھے ہدیہ کیوں نہیں ملا؟'' اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو ایک عام خطبہ دیا اور تمام لوگوں کو اس قسم کے مال لینے سے سختی کے ساتھ ممانعت فرمائی۔ [3]

[4] چونکہ آنحضرت ﷺ نے اپنے خاندان پر صدقہ وزکوٰۃ کا مال حرام کر دیا تھا اس لیے خاندان نبوت کا کوئی شخص صدقہ کا محصل مقرر نہیں ہوا۔ ایک بار عبدالمطلب بن زمعہ بن حارث اور فضل بن عباس نے کہ عم زاد بھائی اور بھتیجے تھے، آپ کی خدمت میں درخواست کی کہ اب ہمارا سن نکاح کے قابل ہو گیا ہے تمام لوگوں کی طرح ہم کو بھی صدقہ کا عامل مقرر فرما دیجئے، تا کہ اس کے معاوضہ سے کچھ مال جمع کر کے نکاح کے لیے سرمایہ مہیا کریں، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: ''صدقہ آلِ محمد کے لیے جائز نہیں ہے، وہ لوگوں کا میل ہے۔'' [4]

[5] عمّال کا انتخاب خود رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے اور جو لوگ اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے خود پیش کرتے تھے۔ ان کی درخواست نامنظور ہوتی تھی چنانچہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے ساتھ دو شخص آئے اور عامل بننے کی درخواست کی۔ آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ ''تم کیا کہتے ہو'' انہوں نے کہا کہ مجھ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ لوگ اس غرض سے آئے ہیں، آپ ﷺ نے ان دونوں کی درخواست نامنظور کی اور فرمایا: ''جو لوگ خود خواہش کرتے ہیں ہم ان کو عامل مقرر نہیں کرتے۔'' لیکن اسی وقت حضرت ابوموسیٰ کو بلا درخواست یمن کا عامل مقرر کر کے روانہ فرمایا۔ [5]

[1] نسائی، کتاب الزکوۃ، باب اعطاء السید المال: ۲۴۶۴۔ [2] فتوح البلدان، ص: ۳۱۔
[3] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب تحریم ہدایا العمال: ۴۷۳۸۔ [4] صحاح کتاب الصدقات دیکھئے صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب ترك استعمال آل النبی ﷺ علی الصدقۃ: ۲۴۸۱، ۲۴۸۲۔
[5] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب النہی عن طلب الامارۃ: ۴۷۱۷، ۴۷۱۸۔

6 عمال کو صرف بقدر ضرورت معاوضہ ملتا تھا۔آپ نے عام منادی فرمادی تھی کہ جو شخص ہماری مقررہ شرح سے زیادہ لے گا وہ خیانت مالی ہے، مقدارِ ضرورت کی تصریح خود آپ ﷺ نے فرمادی تھی: 1

((من كان لنا عاملا فليكتسب زوجة فان لم يكن له خادم فليكتسب خادما فإن لم يكن له مسكن فليكتسب مسكنا من اتخذ غير ذلك فهو غال))۔

''جو شخص ہمارا عامل ہو اس کو ایک بیوی کا خرچ لینا چاہیے۔اگر اس کے پاس نوکر نہ ہو تو نوکر کا، اگر مکان نہ ہو تو گھر کا، لیکن اگر کوئی اس سے زیادہ لے گا تو وہ خائن ہوگا۔''

آپ ﷺ کے زمانہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھی اس قسم کا معاوضہ ملا تھا، چنانچہ ان کے عہدِ خلافت میں جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے زہد وتقدس کی بنا پر معاوضہ لینے سے انکار کیا تو انہوں نے آنحضرت ﷺ کے اسی طرز عمل سے استدلال کیا۔

قضاۃ

ان مناصب کے علاوہ بعض اور عہدے بھی سادہ طور سے قائم ہو گئے تھے مثلاً فصلِ مقدمات کا کام اگر چہ زیادہ تر آپ خود انجام دیتے تھے لیکن کبھی کبھی آپ ﷺ کے حکم سے حسب ذیل صحابہ نے بھی اس فرض کو انجام دیا ہے، حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، عبدالرحمٰن بن عوف، ابی بن کعب، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم۔

پولیس

اگر چہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی باضابطہ طور پر پولیس کا محکمہ قائم نہیں ہوا اور اس کی ابتدا بنو امیہ کی سلطنت میں ہوئی 2 تاہم آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں بھی اس کا ابتدائی نمونہ قائم ہو چکا تھا چنانچہ آپ کے عہد مبارک میں قیس بن سعد رضی اللہ عنہ اس خدمت کو انجام دیتے تھے اور اس غرض سے ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ 3

جلاد

مجرموں کی گردن مارنے کی خدمت حضرت زبیر، حضرت علی، مقداد بن الاسود، محمد بن مسلمہ، عاصم بن ثابت، ضحاک بن سفیان کلابی رضی اللہ عنہم کے سپرد تھی۔ 4

غیر قوموں سے معاہدے

عرب میں اب کفر اور شرک کا بالکل وجود نہ تھا، کہیں کہیں صرف مجوس، نصاریٰ اور یہود کی آبادیاں

1 ابو داود، كتاب الخراج والفيء والامارة، باب ارزاق العمال: ۲۹۴۳، ۲۹۴۵ میں دونوں حدیثیں شامل ہیں۔
2 فتح الباري، ج ۱۳، ص: ۶۱۰۔ 3 بخاري، كتاب الاحكام، باب الحاكم يحكم بالقتل: ۷۱۵۵۔
4 زادالمعاد ابن قیم، ج ۱، ص: ۳۲ مطبوعہ مصر۔

تھیں، ان میں سے معتد بہ افراد نے گو نورِ ایمان سے قلوب کو روشن کر لیا تھا لیکن مجموعی حیثیت سے وہ اب تک تاریکی میں تھے۔ تاہم خلافتِ الٰہی کی ہمہ گیر قوت سے وہ سرتابی نہ کر سکے۔ حجاز کے یہودیوں کے سوا عرب کی تمام قوموں نے بخوشی اسلام کی اطاعت قبول کی۔ اس لیے اسلام نے بھی ان کی جان و مال، عزت و آبرو اور مذہب کی حفاظت کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے لی اور اس کے مقابلہ میں جزیہ کی ایک خفیف رقم (یعنی ہر مستطیع، عاقل، بالغ مرد پر ایک دینار سالانہ) ان پر مقرر کی، اس رقم کا نقد روپیہ کی صورت میں ادا ہونا ضروری نہ تھا بلکہ عموماً جہاں جس چیز کی پیداوار ہوتی تھی یا جو چیز بنتی تھی وہی چیز جزیہ قرار پائی۔ ❶ غیر قوموں میں سب سے پہلے آنحضرت ﷺ نے ۷ھ میں خیبر، فدک، وادی القریٰ اور تیماء کے یہودیوں سے مصالحت فرمائی۔ اس وقت تک آیت جزیہ کا نزول نہیں ہوا تھا، اس بنا پر باہمی رضامندی سے جو شرائط قرار پا گئے تھے۔ وہ آیت جزیہ کے نزول کے بعد بھی قائم رہے ❷ اصل شرط یہ تھی کہ وہ رعایا کی حیثیت سے کام کریں گے اور پیداوار کا نصف حصہ خود لیں گے اور نصف مالکوں کو ادا کریں گے۔ ❸

۹ ہجری میں جزیہ کی آیت نازل ہوئی۔ اس کے بعد تمام معاہدے اسی کی رو سے قرار پائے۔ نجران کے عیسائیوں نے مدینہ میں آ کر مصالحت کی درخواست کی جس کو آپ نے منظور فرمایا۔ شرائطِ صلح یہ تھے کہ ''وہ مسلمانوں کو سالانہ دو ہزار کپڑے دیں گے اور ان کو دو قسط میں یعنی آدھا ماہ صفر اور آدھا ماہ رجب میں ادا کریں گے، اگر یمن میں کبھی بغاوت یا شورش ہوگی تو وہ عاریۃً تیس زر ہیں، تیس گھوڑے، تیس اونٹ اور تیس عدد ہر قسم کے ہتھیار دیں گے، اور مسلمان ان کی واپسی کے ضامن ہوں گے، اس کے معاوضہ میں جب تک وہ سودی لین دین یا بغاوت نہ کریں گے نہ ان کے گرجے ڈھائے جائیں گے نہ ان کے پادری نکالے جائیں گے، نہ ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ کیا جائے گا۔'' ❹

حدودِ شام میں بہت سے عیسائی اور یہودی گاؤں میں آباد تھے۔ رجب ۹ھ میں غزوۂ تبوک کے موقع پر دومۃ الجندل، ایلہ، مقنا، جرباء، اذرح، تبالہ اور جرش کے جو عیسائی اور یہودی زمیندار اسلام نہیں لائے بلکہ جزیہ دینا قبول کیا ان میں سے ہر بالغ مرد پر ایک دینار سالانہ مقرر ہوا اور مسلمان جب ادھر سے گزریں تو ان کی ضیافت بھی ان پر لازمی قرار دی گئی ❺ ایک آسانی یہ بھی دی گئی کہ اگر نقد نہ ادا کر سکیں تو اسی کے برابر معافری کپڑے دیا کریں ❻ بحرین کے مجوسیوں سے بھی جزیہ کی اسی شرحِ مقدار پر مصالحت کی گئی۔ ❼

❶ زاد المعاد ابن قیم، ج ۱، فصل جزیه، ص:۳۳۷۔ ❷ زاد المعاد ابن قیم، ج ۱، ص:۳۳۸۔

❸ بخاری، کتاب المغازی، باب معاملة النبی ﷺ اهل خیبر: ۴۲۴۸ ومسلم، کتاب المساقاة والمزارعة، باب المساقاة والمعاملة: ۳۹۶۲تا۳۹۶۷ وابو داود، کتاب الخراج، باب ما جاء فی حکم ارض خیبر: ۳۰۰۸ وفتوح البلدان بلاذری ذکر فدك ووادی القریٰ وتیماء، ص:۳۶۔ ❹ ابو داود، کتاب الخراج، باب فی اخذالجزیة: ۳۰۴۱۔ ❺ فتوح البلدان، بلاذری، ذکر تبوك وایلة الخ، ص:۶۶۔

❻ ابوداود، کتاب الخراج، باب فی اخذ الجزیة: ۳۰۳۸ وتاریخ بلا ذری ذکر بحرین، ص:۸۶۔

❼ ابو داود، کتاب الخراج، باب فی اخذ الجزیة من المجوس: ۳۰۴۴۔

اصناف محاصل ومخارج

مختلف اغراض ومصالح کی بنا پر اسلام میں آمدنی کے صرف پانچ ذرائع تھے۔غنیمت، فے، زکوٰۃ، جزیہ، خراج، اول ودوم کے سوابقیہ ذرائع آمدنی سالانہ تھے۔غنیمت کا مال صرف فتوحات کے موقع پر آتا تھا، عرب میں قاعدہ تھا کہ رئیس فوج غنیمت کا چوتھا حصہ خود لیتا تھا، جس کو اصطلاح میں مرباع کہتے تھے، اور بقیہ جو جس کے ہاتھ لگ جاتا تھا لے لیتا تھا، تقسیم کا کوئی نظام نہ تھا۔غزوۂ بدر کے بعد خدا نے غنیمت کو خود اپنی ملک قرار دیا، جس میں خمس یعنی پانچواں حصہ خدا اور رسول کے نام سے حکومتِ الٰہی کے مصالح واغراض کے لیے مخصوص فرمایا:

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ ﴾ (۸/ الانفال:۱)

''اے پیغمبر! لوگ تجھ سے مال غنیمت کی نسبت پوچھتے ہیں کہہ دے کہ وہ خدا اور رسول کی ملک ہے۔''

خدا اور رسول کی ملکیت سے مقصود یہ ہے کہ وہ سپاہیوں کی شخصی ملکیت نہیں ہے بلکہ مصالح کی بنا پر صاحبِ خلافت جس طرح مناسب سمجھے اس کو صرف کرسکتا ہے۔اسی طرح خمس کی نسبت ارشاد ہوا ہے:

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ ﴾ (۸/ الانفال:٤١)

''مسلمانو! جان لو کہ تم کو جو مال غنیمت ہاتھ آئے اس کا پانچواں حصہ خدا، رسول، اہل قرابت اور یتیموں اور مسکینوں کا ہے۔''

ایک دو استثنائی واقعہ کے سوا جس میں آنحضرت ﷺ نے مالِ غنیمت مخصوص مہاجرین کو یا مکہ کے نومسلموں کو عنایت فرمایا، ہمیشہ آپ کا یہ طرز عمل رہا کہ خمس کے بعد ایک ایک حبہ سپاہیوں پر برابر برابر تقسیم فرما دیتے تھے، سواروں کو تین حصے اور پیادہ کو ایک حصہ بعض روایتوں میں ہے کہ سواروں کو صرف دو حصے ملتے تھے۔ [1] خمس کا بھی عموماً بہت کم حصہ ذاتی مصرف میں آتا تھا، آیت بالا میں جن ارباب استحقاق کا ذکر ہے زیادہ تر ان ہی پر صرف کر دیا جاتا تھا۔

زکوٰۃ

صرف مسلمانوں پر فرض تھی اور وہ چار مدوں سے وصول ہوتی تھی۔نقد روپیہ، پھل اور پیداوار، مویشی، (بجز گھوڑا) اسبابِ تجارت [2] دوسو درہم چاندی، بیس مثقال سونے اور پانچ اونٹ سے کم پر زکوٰۃ نہ تھی۔پیداوار سے جو زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی اس کے لیے ضروری تھا کہ اس کی مقدار ۵ وسق (۳۰۰ صاع بہ

[1] ابو داود، كتاب الخراج، باب ماجاء في حكم ارض خيبر: ٣٠١٥ بروايت ابو يعقوب بن مجمع۔

[2] ابو داود، كتاب الزكوٰة، باب العروض اذا كانت للتجارة: ١٥٦٢۔

تحقیق امام ترمذی) ❶ یا پانچ وسق سے زیادہ ہو۔ سونا اور چاندی کا چالیسواں حصہ وصول کیا جاتا تھا، مویشیوں کا نرخ زکوۃ بھی مختلف جنس کی مختلف تعداد پر مقرر تھا جو حدیث اور فقہ کی تمام کتابوں میں مفصل مذکور ہے۔ اراضی کی دو قسمیں کی گئیں ایک وہ جس کی سیرابی صرف بارش یا بہتے پانی سے ہوتی ہے ❷ اس قسم کی اراضی کی پیداوار میں دسواں حصہ (عشر) وصول ہوتا تھا، اور جس کو آب پاشی کے ذریعہ سے سیراب کیا جاتا تھا، اس میں نصف عشر یعنی بیسواں حصہ لیا جاتا تھا۔ ❸ سبزی پر کوئی زکوۃ نہ تھی۔ ❹

زکوۃ کے آٹھ مصرف تھے جن کی تفصیل خود قرآن مجید نے کر دی تھی، فقراء، مساکین، نومسلم، غلام جن کو خرید کر آزاد کرانا ہے، مقروض، مسافر، محصلین زکوۃ کی تنخواہ، دیگر کار خیر عموماً جہاں سے زکوۃ کی رقم وصول کی جاتی تھی، وہیں کے مستحقین پر صرف کی جاتی تھی۔ صحابہ اس حکم کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ ایک صحابی کو زیاد نے عامل بنا کر ایک مقام میں بھیجا۔ جب وہ واپس آئے تو زیاد نے اُن سے رقم کا مطالبہ کیا، انہوں نے جواب میں کہا کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے جس طرح ہم کرتے آئے تھے وہی ہم نے کیا۔ ❺ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جب عامل بنا کر یمن بھیجے گئے تو زکوۃ کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((وصدقة توخذ من اغنیائهم وترد علی فقرائهم))۔ ❻

جزیہ غیر مسلم رعایا سے ان کی حفاظت اور ذمہ داری کے معاوضہ میں لیا جاتا تھا اس کی مقدار متعین نہ تھی۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانے میں ہر مستطیع، بالغ مرد سے ایک دینار وصول کرنے کا حکم دیا تھا، بچے اور عورتیں اس میں داخل نہ تھیں۔ ایلہ کے جزیہ کی مقدار ۳۰۰ دینار تھی۔ عہد نبوی میں جزیہ کی سب سے بڑی مقدار بحرین سے وصول کی جاتی تھی۔

خراج غیر مسلم کاشت کاروں سے حق مالکانہ کے معاوضہ میں زمین کی پیداوار کا جو مخصوص حصہ باہمی مصالحت سے طے ہو گیا ہو اس کا نام خراج ہے۔ خیبر، فدک، وادی القریٰ، تیماء وغیرہ سے خراج ہی وصول ہوتا تھا، پھل یا پیداوار کے تیار ہونے کا جب وقت آتا تھا، آنحضرت ﷺ کسی صحابی کو بھیج دیتے تھے، وہ باغوں اور کھیتوں کو دیکھ کر تخمینہ لگاتے تھے۔ رفع اشتباہ کے لئے تخمینہ میں سے ثلث کم کر دیا جاتا تھا ❼ بقیہ پر حسب شرائط خراج وصول کیا جاتا۔ خیبر وغیرہ میں آدھی پیداوار پر صلح ہوئی تھی۔ جزیہ اور خراج کی رقم سپاہیوں کی تنخواہ اور جنگی مصارف میں صرف ہوتی تھی۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم ضرورت کے وقت والنٹیر سپاہی تھے، جو کچھ وصول ہو کر آتا، آنحضرت ﷺ سب کو اسی وقت تقسیم فرما دیتے، اول آپ ان لوگوں کو عطا فرماتے تھے جو پہلے غلام

---

❶ ترمذی، ابواب الزکوۃ، باب ما جاء فی صدقة الزرع والثمر والحبوب: ٦٢٧۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الزکوۃ، باب العشر فیما یسقی من ماء...: ١٤٨٣۔ ❸ ترمذی، ابواب الزکوۃ، باب ماجاء فی الصدقة فیما یسقی بالانهار: ٦٣٩۔ ❹ ایضا، باب ما جاء فی زکوۃ الخضراوات: ٦٣٨۔

❺ ابو داود، کتاب الزکوۃ، باب فی الزکاۃ هل تحمل من بلد الی بلد: ١٦٢٥۔ ❻ بخاری، کتاب الزکوۃ، باب وجوب الزکوۃ: ١٣٩٥۔ ❼ ابوداود، کتاب الزکوۃ، باب فی الخرص: ١٦٠٥۔

رہ چکے تھے۔ایک رجسٹر پرلوگوں کے نام لکھے ہوتے تھے،اسی ترتیب سے نام پکارے جاتے تھے جولوگ صاحب اہل وعیال ہوتے تھے ان کو دو حصے اور مجرد لوگوں کو ایک حصہ ملتا تھا۔ ❶

جاگیریں اورافتادہ زمینوں کی آبادی

ملکِ عرب کا اکثر حصہ ریگستانی، پتھریلا،شوراور بنجر تھا۔جو سر سبز قطعات تھے،ان پر بیرونی قومیں قابض تھیں۔بقیہ افتادہ زمینیں تھیں۔مدینہ اور طائف میں البتہ کاشتکاری ہوتی تھی، بقیہ عام عرب تجارت یا لوٹ مار پرزندگی بسر کرتے تھے۔عربوں کی غیر مامون زندگی کا راز یہی تھا کہ وہ مستقل پیشہ ور نہ تھے۔اس بنا پر قیامِ امن کے لیے بھی ضروری تھا کہ زمین کا نئے سرے سے بندوبست کیا جائے۔حجاز یمن میں غیر قوموں کے انخلا کے سبب سے یوں بھی بہت سی زمینیں خالی ہوگئی تھیں جن کا انتظام ضروری تھا۔

آنحضرت ﷺ نے عام طور پر صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کی ترغیب دی۔

((من احیا ارضا مَیْتة فهی له ❷ من احاط حائطا علی ارض فهی له))۔ ❸

”جس شخص نے افتادہ زمینوں کو آباد کیا وہ اس کی ملک ہے،جس شخص نے کسی زمین کو گھیر لیا وہ اس کی ملک ہے۔“

ترغیبِ عام کے ساتھ خاص خاص انتظامات بھی فرمائے۔بنونضیر اور قریظہ کے نخلستان اور کھیت خاص بارگاہِ نبوت کی ملک قرار پائے اور آپ ﷺ نے اپنی طرف سے ان کو مہاجرین اور بعض انصار میں تقسیم فرما دیا۔خیبر کی زمین کچھ خالصہ رہی اور بقیہ ان مہاجرین اور انصار میں تقسیم فرما دی جو حدیبیہ میں شریک تھے لیکن عملاً یہودیوں کے ساتھ ان کا بندوبست رہا۔پیداوار کا نصف حصہ وہ خود لیتے تھے اور نصف مالکوں کو ادا کرتے تھے ❹ اور جو زمینیں آباد تھیں ان کو بعض شرائط پر اصل مالک کے ہاتھ میں رہنے دیا، چنانچہ عک،ذوخیوان اور ایلہ،اذرح،نجران وغیرہ میں اسی طرح معاملات طے پائے۔افتادہ زمینیں بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کو بطور جاگیر عطا فرما دیں۔حضرت وائل رضی اللہ عنہ کو حضر موت میں ایک قطعۂ زمین عنایت فرمایا، بلال بن حارث رضی اللہ عنہ مزنی کو قابل زراعت زمین کا ایک بہت بڑا ٹکڑا اور کانیں مرحمت فرمائیں، ❺ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو مدینہ کے پاس اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر میں جاگیریں عطا کیں۔بنو رفاعہ کو دومۃ الجندل کے پاس زمین عنایت کی۔

یہ جاگیریں اس فیاضی اور وسعت کے ساتھ دی جاتی تھیں کہ ہر شخص حسب استطاعت ان کا انتخاب اور ان کے رقبہ کی تحدید کرسکتا تھا۔ایک بار آپ ﷺ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ جہاں تک ان کا

---

❶ ابوداود، کتاب الخراج، باب فی قسم الفيء: ۲۹۵۳۔

❷ ابوداود، باب فی احیاء الموات: ۳۰۷۳۔ ❸ ایضا: ۳۰۷۷۔

❹ ابوداود، کتاب الخراج، باب ما جاء فی حکم ارض خیبر: ۳۰۰۶۔

❺ ابوداود، کتاب الخراج، باب فی اقطاع الارضین: ۳۰۶۱ تا ۳۰۶۳۔

گھوڑا دوڑ سکے وہ زمین ان کی جاگیر میں داخل ہوگی، چنانچہ انہوں نے گھوڑا دوڑایا۔ جب گھوڑا ایک خاص حد تک پہنچ کر رک گیا تو انہوں نے اپنا کوڑا پھینکا اور وہ جس نقطے پر گرا وہی ان کی جاگیر کا رقبہ قرار پایا۔ ❶ عرب کی خشک زمین میں سب سے زیادہ ضرورت چشمۂ آب کی تھی، چنانچہ ایک بار جب آپ نے حکم عام دیا: ((من سبق الی ما لم یسبقه الیه مسلم فهو له)) ❷ یعنی ''جو شخص ایسے چشمہ پر قبضہ کرلے جس پر کسی مسلمان نے قبضہ نہیں کیا ہے تو وہ اس کا ہے۔'' تو تمام لوگوں نے دوڑ دوڑ کر اپنے اپنے چشموں کے حدود مقرر کر لیے۔

اس فیاضی کی اس قدر شہرت ہوئی کہ لوگوں نے دور دور سے آ کر آنحضرت ﷺ سے جاگیروں کی درخواست کرنا شروع کی، ابیض بن حمال یمن سے خدمت مبارک میں حاضر ہوئے اور ایک نمک کی کان کی درخواست کی جس کو آپ ﷺ نے منظور فرما لیا، لیکن ایک صحابی نے کہا کہ آپ ﷺ نے ان کو جو کچھ جاگیر میں عطا فرمایا ہے وہ پانی کا ایک بہت بڑا چشمہ ہے، چونکہ وہ ایک پبلک چیز تھی اس بنا پر آپ ﷺ نے اس کو واپس لے لیا۔ ❸

یہ تمام فیاضیاں صرف انہیں چیزوں کے ساتھ مخصوص تھیں جن کا تعلق پبلک کے ساتھ نہیں ہوسکتا تھا لیکن جو چیزیں رفاہ عام کے کام میں آسکتی تھیں ان کو آپ ﷺ نے اسی قدیم حالت پر چھوڑ دیا۔ عرب کا قدیم دستور تھا کہ اپنے مویشیوں کے لیے چراگاہیں متعین کر لیتے تھے، جن کو حمی کہتے تھے، عرب میں پیلو کا درخت اونٹوں کی عام غذا تھی اور اس کے متعلق کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی، لیکن ابیض بن حمال رضی اللہ عنہ نے جب اس کو اپنے حمی میں داخل کرنا چاہا تو آپ ﷺ نے منع فرمایا ((لا حمی فی الاراك))۔ ❹ عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ مویشیوں کے چرانے کے لیے رؤسا اور ارباب اقتدار اپنے لیے چراگاہ مخصوص کر لیتے تھے اور وہاں کسی دوسرے کو نہیں آنے دیتے تھے چونکہ اس سے عام لوگوں کو تکلیف ہوتی تھی اس لیے اس طریقہ کو بھی روک دیا۔ ❺

اسی طرح عرب میں ایک مقام دہنا ہے جس کے ایک طرف بکر بن وائل رضی اللہ عنہ کا قبیلہ تھا اور دوسری طرف بنو تمیم رہتے تھے۔ حریث بن حسان رضی اللہ عنہ نے بکر بن وائل رضی اللہ عنہ کے لیے اس زمین کی درخواست کی آپ نے فرمان لکھنے کا حکم دیا، اتفاق سے اس وقت ایک تمیمیہ موجود تھی۔ آپ نے اس کی طرف دیکھا، اس نے عرض کی یا رسول اللہ! وہ اونٹوں اور بکریوں کی چراگاہ ہے، اور اسی کے پاس بنو تمیم کی عورتیں اور بچے رہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بے چاری سچ کہتی ہے، فرمان نہ لکھو، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، ایک چشمہ اور ایک چراگاہ سب کو کافی ہوسکتا ہے۔'' ❻

❶ ابوداود، کتاب الخراج، باب فی اقطاع الارضین: ۳۰۷۲۔ ❷ ابو داود، کتاب الخراج، باب فی اقطاع الارضیین: ۳۰۷۱۔ ❸ ابوداود، باب فی اقطاع الارضین: ۳۰٦٤۔ ❹ ابو داود، کتاب الخراج، باب فی إقطاع الأرضین: ۳۰٦٦۔ ❺ ایضا: ۳۰٦٤، ۳۰٦٥۔ ❻ ایضا: ۳۰۷۰۔

مذہبی انتظامات

(ملک میں امن و امان قائم رکھنے کی غرض سے جو بعض ضروری ملکی انتظامات سرانجام پائے تھے، ان سے زیادہ ضروری مسلمانوں کے مذہبی امور کے انتظامات کا مسئلہ تھا۔ یہودیوں میں مذہبی فرائض کے ادا کرنے کے لیے ایک مخصوص خاندان مقرر تھا۔ اس کے علاوہ کسی اور کو ان خدمات کی بجا آوری کا حق حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ عیسائیوں میں گو خاندان کی تخصیص نہ تھی لیکن ان میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس نے ان خدمات کو اپنا حق قرار دے لیا تھا۔ ہندوؤں میں غیر برہمن کسی مذہبی خدمت کا مستحق نہیں، دنیا کی دوسری قوموں کا بھی یہی حال تھا لیکن جو شریعت محمد رسول اللہ ﷺ نے دنیا میں قائم کی اس میں مخصوص اشخاص، مخصوص خاندان اور مخصوص طبقہ کی حاجت نہ تھی، بلکہ ہر شخص جو اسلام کا کلمہ گو تھا اس رتبہ کا مستحق ہوسکتا تھا)۔

دعاۃ اور مبلغین اسلام

ایک مشہور مغربی مؤرخ نے لکھا ہے کہ ''مدینہ میں آ کر اسلام نبوت کا منصب چھوڑ کر سلطنت بن گیا تھا اور اب اسلام کے معنی بجائے اس کے کہ خدا پر ایمان لایا جائے، یہ رہ گئے تھے کہ محمد ﷺ کی حکومت تسلیم کر لی جائے۔'' [1] اسلام کا مقصد وہ تھا جو خدا نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے:

﴿ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (۲۲/ الحج:٤١)

''وہ لوگ جن کو ہم زمین میں اگر طاقت دیں تو نماز قائم کریں، زکوۃ دیں، اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں۔''

اس بنا پر ہر مسلمان، واعظ بھی ہوتا تھا اور محتسب بھی، داعی بھی اور ماہر شریعت بھی، یہی وجہ ہے کہ یا تو اسلام سے پہلے عرب میں اس قدر جہالت پائی جاتی تھی کہ شرفا میں لکھنا پڑھنا عیب خیال کیا جاتا تھا یا ایک ایک گھر فقہ، حدیث اور تفسیر کا دارالعلم بن گیا تاہم چونکہ ہر شخص کو تفقہ وتدریس کا کافی وقت نہیں مل سکتا تھا، اس لیے یہ ضروری قرار پایا کہ ہر جماعت اور ہر قبیلہ میں کچھ ایسے لوگ موجود رہیں جو تعلیم و ارشاد کا فرض انجام دے سکیں، اسی بنا پر قرآن مجید میں حکم آیا:

﴿ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ وَلِیُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْۤا اِلَیْهِمْ لَعَلَّهُمْ یَحْذَرُوْنَ ﴾ (۹/ التوبة:۱۲۲)

''اور سب کے سب مسلمان تو سفر کر کے (مدینہ) نہیں آ سکتے، اس لیے ہر قبیلہ سے ایک گروہ کو آنا چاہیے، تاکہ وہ شریعت میں تفقہ حاصل کریں اور تاکہ واپس جا کر اپنی قوم کو ڈرائیں شاید لوگ بری باتوں سے بچیں۔''

[1] دیکھو ولہوسن صاحب کا آرٹیکل اسلام پر، انسائیکلو پیڈیا۔

اُن کی تعلیم وتربیت

چونکہ مقصد یہ تھا کہ ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو نہ صرف شریعت کے اوامر ونواہی سے واقف ہو بلکہ شب وروز آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہنے سے تمام تر اسلامی رنگ میں ڈوب جائے۔ جس کی گفتار، کردار، بات چیت، نشست وبرخاست، قول وعمل ایک ایک چیز تعلیم نبوی ﷺ کے پرتو سے منور ہو جائے، تاکہ وہ تمام ملک کے لیے اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل بن سکے۔ اس لیے عرب کے ہر قبیلہ سے ایک جماعت آتی تھی اور آپ کی خدمت میں رہ کر تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

كان ينطلق من كل حي من العرب عصابة فيأتون النبي ﷺ فيسألونه عما يريدون من امر دينهم ويتفقهوا في دينهم۔ [1]

''عرب کے ہر قبیلہ کا ایک گروہ آنحضرت ﷺ کے پاس جاتا تھا اور آپ ﷺ سے مذہبی امور دریافت کرتا تھا اور دین میں تفقہ حاصل کرتا تھا۔''

داعیان اسلام جو اطراف عرب میں بھیجے جاتے تھے ان کو ہدایت کی جاتی تھی کہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وطن چھوڑ کر مدینہ میں آ جائیں اور یہیں بود وباش اختیار کریں، اس کا نام ہجرت تھا، اس بنا پر بیعت کی دو قسمیں کر دی گئی تھیں، بیعتِ اعرابی اور بیعت ہجرت۔ بیعت اعرابی، صرف ان بدوؤں کے لیے تھی جن کو کچھ دنوں مدینہ منورہ میں رکھ کر تعلیم دینا مقصود تھا۔ مختصر مشکل الآثار میں روایت ہے کہ عقبہ جہنی جب اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ بیعتِ اعرابی کرتے ہو یا بیعتِ ہجرت۔ اس کے بعد مصنف لکھتا ہے:

ان البيعة من المهاجر توجب عليه الاقامة بدار الهجرة عند رسول الله ﷺ ليصرف فيما يصرفه فيه رسول الله ﷺ من امور الاسلام وان البيعة اعرابية بخلافها۔ [2]

''ہجرت کی بیعت کرنے سے لازم ہو جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس قیام کرے تاکہ آنحضرت ﷺ ان کو اسلامی امور میں لگائیں اور بیعت اعرابی میں یہ ضروری نہیں۔''

اسی بنا پر عرب کے بہت سے خاندان اپنے گھروں سے ہجرت کر کے مدینہ میں چلے آئے تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ آئے تو اَسّی شخصوں کو لے کر آئے [3] اور مدینہ میں آباد ہوئے۔ خلاصۃ الوفاء سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں جہینہ وغیرہ قبائل کی الگ الگ مسجدیں تھیں۔ [4] یہ وہی قبائل تھے جو ہجرت کر

---

[1] تفسیر خازن سورۃ توبۃ آیت ﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً﴾ ج ۳، ص: ۱۳۶ مطبع التقدم العلمی مصر: ۱۳۳۱ھ۔ [2] مشکل الآثار الامام طحاوی، ج ۲، ص: ۲۹۶ دائرۃ المعارف حیدرآباد: ۱۳۳۳ھ۔

[3] آنے والوں کی تعداد میں اختلاف ہے، صحیح بخاری میں ۵۳ اشخاص کا ذکر ہے، دیکھئے کتاب المغازی، غزوۃ خیبر: ۴۲۳۰ اور خود اس کتاب میں بھی وفود کے ذکر میں یہی تعداد لکھی ہوئی ہے ذکر اشعریین سے ہے۔

[4] خلاصۃ الوفاء سمہودی، ص: ۲۰۶ دار الطباعۃ مصر: ۱۲۸۵ھ۔

کے مدینہ میں آ گئے تھے اور چونکہ مسجدِ نبوی سب کے لیے کافی نہ تھی اس لیے الگ الگ مسجدیں بن گئی تھیں۔

تعلیم وارشاد کے مختلف طریقے تھے۔

ایک یہ کہ دس بیس دن یا مہینہ دو مہینہ رہ کر عقائد اور فقہ کے ضروری مسائل سیکھ لیتے تھے اور اپنے قبائل میں واپس جاتے تھے اور ان کو تعلیم دیتے تھے۔ مثلاً مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ جب سفارت لے کر آئے تو بیس دن تک قیام کیا اور ضروری مسائل کی تعلیم حاصل کی۔ جب چلنے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((ارجعوا الی اھلیکم فعلّموھم ومروھم وصلوا کما رأیتمونی اصلی)) [1]

''اپنے خاندان میں واپس جاؤ ان میں رہ کر ان کو اوامر شریعت کی تعلیم دو اور جس طرح مجھ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے اسی طرح نماز پڑھو۔''

دوسرا مستقل طریقہ درس کا تھا یعنی لوگ مستقل طریقہ سے مدینہ میں رہتے تھے اور عقائد شریعت اور اخلاق کی تعلیم پاتے تھے۔ ان کے لیے صفہ خاص درس گاہ تھی اور اس میں زیادہ تر وہ لوگ قیام کرتے تھے جو تمام دنیاوی تعلقات سے آزاد ہو کر شب وروز، زہد وعبادت اور زیادہ تر خدمت علم میں مصروف رہتے تھے۔

مشکوٰۃ کتاب العلم میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے اس وقت مسجد میں دو حلقے تھے۔ حلقہ ذکر اور حلقہ درس، آنحضرت ﷺ حلقۂ درس میں جا کر بیٹھ گئے۔ [2] اس وقت کی اصطلاح میں ان طالبان علم کو قراء کہتے تھے چنانچہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہر جگہ یہی نام آتا ہے۔ [3] عرینہ میں جو لوگ تعلیم وارشاد کے لیے گئے تھے اور کفار نے ان کو دھوکے سے شہید کر دیا تھا وہ اسی درس گاہ کے تربیت یافتہ تھے اور کتبِ حدیث میں ان کا نام اسی لقب (قراء) کے ساتھ آیا ہے۔ اربابِ سیر نے لکھا ہے کہ ان لوگوں میں سے جب کوئی شادی کر لیتا تھا تو اس جماعت سے نکل جاتا تھا اور ان کے بجائے دوسرے لوگ داخل ہوتے تھے۔

اصحابِ صفہ، اگرچہ اس قدر مفلس اور نادار تھے کہ کسی کے پاس ایک کپڑے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا جس کو گردن سے باندھ کر گھٹنوں تک چھوڑ دیتے تھے کہ چادر اور تہبند دونوں کا کام دیتا تھا، تاہم یہ لوگ پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھتے تھے بلکہ جنگل میں جا کر لکڑیاں چن لاتے تھے [4] اور ان کو بیچ کر آدھا خیرات کر دیتے اور آدھا اخوانِ طریقت میں تقسیم ہوتا تھا۔ اس بنا پر تعلیم اور درس کا وقت رات کو مقرر کیا گیا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس درس گاہ کے معلمین میں سے حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ جو مشہور صاحب علم تھے اور جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زمانۂ خلافت میں تعلیم فقہ وقرآن کے لیے فلسطین بھیجا تھا۔ ابوداؤد میں حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ٦٠٠٨۔ [2] دارمی، المقدمة، باب فی فضل العلم والعالم: ٣٤٩۔ [3] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الرجیع: ٤٠٨٨، ٤٠٩٠۔
[4] ایضاً: ٤٠٩٠۔

علمت ناسا من اهل الصفة القرآن والكتاب فاهدى الیّ رجل منهم قوسًا۔ ❶

''میں نے اصحاب صفہ میں سے چند لوگوں کو قرآن مجید اور لکھنے کی تعلیم دی اس کے صلہ میں مجھ کو ایک شخص نے ایک کمان تحفہ میں دی۔''

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عبادہ رضی اللہ عنہ کو اس تحفہ کے قبول کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ❷ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ درس گاہ صفہ کے علاوہ اور بھی کوئی جگہ تھی جہاں اصحاب صفہ رات کو تعلیم پاتے تھے۔ مسند امام ابن حنبل میں ہے۔

عن انس كانوا سبعين فكانوا اذا جنهم الليل انطلقوا الى معلم لهم بالمدينة فيدرسون الليل حتى يصبحوا۔ ❸

''حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اصحاب صفہ میں سے ستر شخص رات کو ایک معلم کے پاس جاتے تھے اور صبح تک درس میں مشغول رہتے تھے۔''

عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا لیکن اسلام آیا تو تحریر و کتابت کا فن بھی گویا ساتھ لے کر آیا۔ سب سے بڑی ضرورت قرآن مجید کے ضبط و تدوین کی تھی، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے شروع ہی سے کتابت کی ترویج کی طرف توجہ فرمائی۔ جنگِ بدر کے ذکر میں گزر چکا ہے کہ اسیران جنگ میں سے جو لوگ فدیہ نہیں ادا کر سکے ان کو اس شرط پر رہا کیا گیا کہ مدینہ میں رہ کر لوگوں کو لکھنا سکھا دیں۔ ابوداؤد کی مذکورہ بالا حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اصحابِ صفہ کو جو تعلیم دی جاتی تھی اس میں لکھنا بھی داخل تھا، چنانچہ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ قرآن مجید کے ساتھ لکھنے کی بھی تعلیم دیتے تھے۔

مساجد کی تعمیر

آنحضرت ﷺ ❹ اگرچہ ترقی و جاہ پرستی سے طبعاً نفور تھے اور اس لیے اینٹ اور مٹی پر صرف زر ناپسند فرماتے تھے، تاہم چونکہ اسلام کی تمام تحریکات کا مقصد صرف رفع ذکر اور تسبیح و تقدیسِ الٰہی تھا، اس بنا پر ہر قبیلہ کو مسلمان ہونے کے ساتھ سب سے پہلے مسجد کی ضرورت پیش آتی تھی۔ ایک سبب اس کا یہ بھی تھا کہ یہ مسجدیں صرف نماز ہی پڑھنے کے کام میں نہیں آتی تھیں بلکہ درحقیقت یہ تمام اہل قریہ یا اہلِ محلّہ کو دن رات میں پانچ بار ایک جگہ جمع کر کے ان کی اجتماعی اور اتحادی قوت کو روز بروز اور زیادہ ترقی دینے کا ذریعہ بھی بنتی تھیں، اس لیے آپ ﷺ باجماعت نماز پڑھنے کی سخت تاکید فرماتے تھے۔ خود مدینہ کے اندر بہت سے قبائل آباد تھے۔ ہر قبیلہ کا الگ الگ محلّہ تھا اور ہر محلّہ میں ایک ایک مسجد تھی۔

❶ ابوداود، کتاب البیوع، باب فی کسب المعلم: ٣٤١٦۔ ❸ ایضًا۔

❷ مسند امام احمد، ج ٣، ص: ١٣٧۔ ❹ اضافہ تاختتم باب مؤذنین۔

ابوداؤد نے کتاب المراسیل میں بسند لکھا ہے کہ صرف مدینہ کے اندر آپ ﷺ کے زمانہ میں ۹ مسجدیں تھیں جہاں الگ الگ جماعتیں ہوتی تھیں، ان کے نام یہ ہیں: مسجد بنی عمر، مسجد بنی ساعدہ، مسجد بنی عبید، مسجد بنی سلمہ، مسجد بنی راتج، مسجد بنی زریق، مسجد غفار، مسجد اسلم، مسجد جہینہ [1] ان کے علاوہ متفرق روایات میں مختلف قبائل کی حسب ذیل مسجدوں کا اور پتہ لگتا ہے، مسجد بنی خدارہ، مسجد بنی امیہ (انصار کا ایک قبیلہ تھا) مسجد بنی بیاضہ، مسجد بنی الحبلی، مسجد بنی عصیہ، مسجد ابی فیصلی، مسجد بنی دینار، مسجد ابی بن کعب، مسجد النابغہ، مسجد ابن عدی، مسجد بلحارث بن خزرج، مسجد بنی حطمہ، مسجد الفضیخ، مسجد بنی حارثہ، مسجد بنی ظفر، مسجد بنی عبدالاشہل، مسجد واقم، مسجد بنی معاویہ، مسجد عاتکہ، مسجد بنی قریظہ، مسجد بنی وایل، مسجد الشجرہ۔ [2]

روایتوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ اشاعت اسلام کے ساتھ ہی مدینہ سے باہر عرب کے گوشہ گوشہ میں مسجدیں بنتی جاتی تھیں جہاں دن میں پانچ بار خدا کا نام پکارا جاتا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے غزوات میں معمول کر لیا تھا کہ رات بھر انتظار فرماتے تھے، صبح کو جہاں سے اذان کی آواز آتی وہاں حملہ نہ فرماتے، چنانچہ ایک سفرِ جہاد میں آپ ﷺ کے کانوں میں ایک طرف سے اللہ اکبر کی آواز آئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ تو فطری شہادت ہے۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ کی آواز سنی تو فرمایا: ''آگ سے نجات ہوگی۔'' صحابہ نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو معلوم ہوا کہ بکرے کے چرواہے کی آواز ہے۔ [3] تمام مجاہدین اسلام کو بھی یہی حکم تھا، چنانچہ ایک بار آپ ﷺ نے ایک سریہ کو روانہ کیا تو یہ وصیت فرمائی:

((اذا رایتم مسجدًا او سمعتم موذنا فلا تقتلوا احدًا)) [4]

''اگر کہیں مسجد دیکھو یا اذان کی آواز سنو تو وہاں کسی شخص کو قتل نہ کرنا۔''

ان روایتوں سے ایک طرف تو عہد نبوت میں اشاعتِ اسلام کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، اور دوسری طرف سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو قبائل اسلام لائے تھے انہوں نے الگ الگ مسجدیں تعمیر کر لی تھیں اور ان میں پنج وقتہ غلغلہ تکبیر و اذان بلند ہوا کرتا تھا۔

اگرچہ اس وقت کی عام غربت اور سادگی کی وجہ سے جو مسجدیں تعمیر ہوئی تھی وہ ایک زمانہ ممتد تک قائم نہیں رہ سکتی تھیں، اس لیے ان باقیات صالحات کا بہت بڑا حصہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا، اور ان کے ساتھ ان کا نام اور ان کی تاریخ بھی مٹ گئی۔ تاہم جو مسجدیں مدتوں قائم رہیں ان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کا کوئی گوشہ ان مذہبی یادگاروں سے خالی نہ تھا۔

---

[1] مراسیل ابی داود، کتاب الطھارۃ، باب ما جاء فی الصلوۃ، ص: ۵۔
[2] یہ تمام تفصیل عینی شرح بخاری، ج۲، ص: ٤٦٨ سے ماخوذ ہے۔
[3] صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب الامساك عن الاغارۃ علی قوم فی دارالکفر: ۸٤۷۔
[4] ابو داود، کتاب الجھاد، باب فی دعاء المشرکین: ۲٦۳۵۔

ابوداؤد نے کتاب المراسیل میں بسند لکھا ہے کہ صرف مدینہ کے اندر آپ ﷺ کے زمانہ میں ۹ مسجدیں تھیں جہاں الگ الگ جماعتیں ہوتی تھیں، ان کے نام یہ ہیں: مسجد بنی عمر، مسجد بنی ساعدہ، مسجد بنی عبید، مسجد بنی سلمہ، مسجد بنی رائح، مسجد بنی زریق، مسجد غفار، مسجد اسلم، مسجد جہینہ 1 ان کے علاوہ متفرق روایات میں مختلف قبائل کی حسب ذیل مسجدوں کا اور پتہ لگتا ہے، مسجد بنی خدارہ، مسجد بنی امیہ (انصار کا ایک قبیلہ تھا) مسجد بنی بیاضہ، مسجد بنی الحبلی، مسجد بنی عصیہ، مسجد ابی فیصلیٰ، مسجد بنی دینار، مسجد ابی بن کعب، مسجد النابغہ، مسجد ابن عدی، مسجد بلحارث بن خزرج، مسجد بنی حطمہ، مسجد الفضیح، مسجد بنی حارثہ، مسجد بنی ظفر، مسجد بنی عبدالاشہل، مسجد واقم، مسجد بنی معاویہ، مسجد عاتکہ، مسجد بنی قریظہ، مسجد بنی وایل، مسجد الشجرہ۔ 2

روایتوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ اشاعت اسلام کے ساتھ ہی مدینہ سے باہر عرب کے گوشہ گوشہ میں مسجدیں بنتی جاتی تھیں جہاں دن میں پانچ بار خدا کا نام پکارا جاتا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے غزوات میں معمول کرلیا تھا کہ رات بھر انتظار فرماتے تھے، صبح کو جہاں سے اذان کی آواز آتی وہاں حملہ نہ فرماتے، چنانچہ ایک سفرِ جہاد میں آپ ﷺ کے کانوں میں ایک طرف سے اللہ اکبر کی آواز آئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ تو فطری شہادت ہے۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے اشهد ان لا اله الا الله کی آواز سنی تو فرمایا: ''آگ سے نجات ہوگی۔'' صحابہ نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو معلوم ہوا کہ بکرے کے چرواہے کی آواز ہے۔ 3 تمام مجاہدین اسلام کو بھی یہی حکم تھا، چنانچہ ایک بار آپ ﷺ نے ایک سریہ کو روانہ کیا تو یہ وصیت فرمائی:

((اذا رایتم مسجدًا او سمعتم موذنا فلا تقتلوا احدًا)) 4

''اگر کہیں مسجد دیکھو یا اذان کی آواز سنو تو وہاں کسی شخص کو قتل نہ کرنا۔''

ان روایتوں سے ایک طرف تو عہد نبوت میں اشاعتِ اسلام کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، اور دوسری طرف سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو قبائل اسلام لائے تھے انہوں نے الگ الگ مسجدیں تعمیر کرلی تھیں اور ان میں پنج وقتہ غلغلہ تکبیر واذان بلند ہوا کرتا تھا۔

اگرچہ اس وقت کی عام غربت اور سادگی کی وجہ سے جو مسجدیں تعمیر ہوئی تھی وہ ایک زمانہ ممتد تک قائم نہیں رہ سکتی تھیں، اس لیے ان باقیات صالحات کا بہت بڑا حصہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا، اور ان کے ساتھ ان کا نام اور ان کی تاریخ بھی مٹ گئی۔ تاہم جو مسجدیں مدتوں قائم رہیں ان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کا کوئی گوشہ ان مذہبی یادگاروں سے خالی نہ تھا۔

---

1 مراسیل ابی داود، کتاب الطهارة، باب ما جاء في الصلوة، ص: ٥۔

2 یہ تمام تفصیل عینی شرح بخاری، ج ٢، ص: ٤٦٨ سے ماخوذ ہے۔

3 صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب الامساك عن الاغارة على قوم في دارالكفر : ٨٤٧۔

4 ابو داود، كتاب الجهاد، باب في دعاء المشركين: ٢٦٣٥۔

عرب کے عام قبائل سے۔ بحرین کا ایک قبیلہ عبدالقیس اسلام لا چکا تھا۔ اس قبیلہ نے ایک مسجد تعمیر کی تھی، چنانچہ اسلام میں مسجد نبوی ﷺ کے بعد سب سے پہلے جمعہ کی نماز اسی مسجد میں ادا کی گئی۔ بخاری کتاب الجمعہ میں ہے۔

عن ابن عباس انه قال ان اوّل جمعة جمعت بعد جمعة فی مسجد رسول الله ﷺ فی مسجد عبدالقیس بجواثی من البحرین۔ [1]

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ مسجد نبوی کے بعد پہلا جمعہ قبیلہ عبدالقیس کی مسجد میں پڑھا گیا جو بحرین کے ایک گاؤں میں جواثی نامی میں واقع تھی۔''

اہلِ طائف جب اسلام لائے تو آپ نے ہدایت فرمائی کہ خاص اس جگہ مسجد تعمیر کرائیں، جہاں ان کا بت نصب تھا [2] حضرت طلق بن علی سے روایت ہے کہ جب ہماری قوم کے لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے عرض کی کہ ہمارے ملک میں ایک گرجا ہے تو آپ نے اپنے وضو کا پانی عنایت فرمایا اور ہدایت کی کہ گرجے کو توڑ ڈالو اور وہاں یہ پانی چھڑک کر مسجد بنالو۔ چنانچہ جب وہ لوگ واپس آئے تو حسب ارشاد مسجد تعمیر کر لی۔ [3]

اس قسم کی مسجدیں اگرچہ عرب کے گوشہ گوشہ میں تعمیر ہوئی ہوں گی لیکن عموماً احادیث کی کتابوں سے صرف ان مسجدوں کا حال معلوم ہوسکتا ہے جو مدینہ اور حوالی مدینہ میں تعمیر ہوئیں۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حوالی مدینہ میں انصار کے جو گاؤں آباد تھے، عاشورا کے دن آنحضرت ﷺ نے ایک دن ان میں منادی کرادی کہ جو لوگ روزہ دار ہیں وہ اپنے روزے کو پورا کرلیں اور جو لوگ افطار کر چکے ہیں وہ بقیہ دن روزہ رکھیں۔ اس اعلان کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس پر اس شدت کے ساتھ عمل کیا کہ خود روزے رکھتے تھے اور اپنے بچوں سے روزے رکھواتے تھے، یہاں تک کہ ان کو گھر سے باہر مسجد میں لے جا کر رکھتے تھے اور جب وہ کھانے کے لیے روتے تھے تو اُن کو اُن کے بنے ہوئے کھلونوں سے بہلاتے تھے۔ [4]

امام بخاری نے صحیح بخاری میں ایک مستقل باب باندھا ہے کہ ''مساجد کو اشخاص کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟'' اور اس باب کے تحت میں جو حدیث لائے ہیں اس میں بہ تصریح مسجد بنی زریق کا نام لیا ہے۔ [5] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ عصر کی نماز پڑھ کر اپنے محلّہ میں آتے تھے۔ یہاں لوگ مسجد میں منتظر رہتے تھے وہ آ کر کہتے تھے کہ مسجد نبوی میں نماز ہو چکی تب لوگ یہاں نماز پڑھتے تھے۔ [6] ان روایتوں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ان قبائل کی مسجدیں الگ الگ تھیں۔ صحاح کی

[1] صحیح بخاری، کتاب الجمعة، باب الجمعة فی القری والمدن: ۸۹۲۔
[2] زاد المعاد، جلد ۱، ص: ۴۸۵، بروایت ابو داود الطیالسی مطبع نظامی کانپور: ۱۲۹۸ھ ج ۲، ص: ۲٦۔
[3] سنن نسائی، کتاب المساجد، باب اتخاذ البیع مساجد: ۷۰۲۔ [4] صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب من اکل فی عاشوراء فلیکف بقیة یومه: ۲٦٦۹۔ [5] صحیح بخاری، کتاب الصلوة، باب هل یقال مسجد بنی زریق: ۴۲۰۔ [6] مسند ابن حنبل، ج ۳، ص: ۲۳۲۔

روایتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض لوگ آنحضرت ﷺ کے ساتھ شریک جماعت ہوتے تھے اور پھر اپنے محلہ کی مسجد میں جا کر اپنی قوم کی امامت کرتے تھے چنانچہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا اسی پر عمل تھا۔ مدینہ میں جو قبائل آباد تھے ان کے علاوہ جو قبائل ہجرت کر کے آئے تھے وہ بھی اپنی مسجد تعمیر کر لیتے تھے، چنانچہ طبقات ابن سعد میں ہے:

ولجهينة مسجد بالمدينة ❶ ''مدینہ میں جہینہ کی ایک مسجد ہے۔''

قبائل کی ضروریات کے علاوہ مسجدوں کی تعمیر کا ایک بڑا سبب یہ ہوتا تھا کہ آنحضرت ﷺ راہ میں جہاں کہیں نماز پڑھتے تھے وہاں صحابہ تبرکاً مسجد تعمیر کر لیتے تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں مستقل باب باندھا ہے، جس کا عنوان یہ ہے: باب المساجد التي على طرق المدينة والمواضع التي صلى فيها النبي ﷺ۔ ❷ یعنی وہ مسجدیں جو مدینہ کے راستوں اور ان مقامات میں واقع ہیں جہاں آپ ﷺ نے نماز پڑھی ہے اور اس کے تحت میں اس قسم کی متعدد مسجدوں کا نام لیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے حسب ذیل نام گنائے ہیں:

مسجد قباء، مسجد الفضیح، مسجد بنی قریظہ، مشربہ ام ابراہیم، مسجد بنی ظفر یا مسجد بغلہ، مسجد بنی معاویہ، مسجد فتح، مسجد قبلتین، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی لکھا ہے ❸ کہ مدینہ اور اطراف مدینہ میں جو مسجدیں منقش پتھروں سے تعمیر ہوئی ہیں ان سب میں آنحضرت ﷺ نے نماز ادا فرمائی ہے، ❹ کیونکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے جب ان مساجد کی تجدید کی تھی تو اہل مدینہ سے اس کی تحقیق کر لی تھی۔ ❺

ائمہ نماز کا تقرر

مساجد کی تعمیر کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ مختلف قبائل کے لیے الگ الگ امام مقرر کر دیے جائیں عموماً عادتِ شریف یہ جاری تھی کہ جو قبیلہ مسلمان ہو جاتا اس میں جو شخص سب سے زیادہ حافظِ قرآن ہوتا وہی امام مقرر کر دیا جاتا اور اس شرف میں چھوٹے بڑے، غلام آقا سب برابر تھے۔ آپ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے مدینہ میں جو مہاجرین آ چکے تھے ان کے امام حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام سالم رضی اللہ عنہ تھے۔ ❻ جرم کا قبیلہ جب اسلام لایا، تو عمرو بن سلمہ جرمی اس وقت سات یا آٹھ برس کے کم سن بچے تھے لیکن چونکہ اپنے قبیلہ میں قرآن کے سب سے بڑے حافظ وہی تھے اس لیے وہی امام قرار پائے۔ ❼

امامت کے انتخاب کے لیے آنحضرت ﷺ نے چند اصول مقرر فرما دیے تھے۔

عن ابی مسعود الانصاری قال قال رسول الله ﷺ: ((يؤم القوم اقرأهم

❶ طبقات ابن سعد، جزء رابع، ص: ۱۷۔ ❷ بخاری، کتاب الصلاۃ، رقم الباب: ۸۹۔
❸ فتح الباری، جلد ۱، ص: ۴۷۲۔ ❹ ایضاً، ص: ۴۷۱۔
❺ ایضاً، ص: ۴۷۲۔ ❻ طبقات ابن سعد، جزء ثالث قسم اول فی البدریین، ص: ۶۱۔
❼ طبقات ابن سعد، جزء اوّل وقسم ثانی وفد جرم، ص: ۶۹، ۷۰۔

لکتاب اللہ فان کانوا فی القراءۃ سواء فاعلمھم بالسنۃ فان کانوا فی السنۃ سواء فاقدمھم ھجرۃ فان کانوا فی الھجرۃ سواء فاقدمھم سنا))۔ 1

ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جماعت کی امامت وہ کرے جو سب سے زیادہ کلام اللہ پڑھا ہو، اگر اس میں سب برابر ہوں تو جو سنت سے سب سے زیادہ واقف ہو، اگر اس میں بھی مساوات ہو تو جس نے سب سے پہلے ہجرت کی تھی اور اس میں بھی سب برابر ہوں تو جس کی عمر زیادہ ہو۔''

جب کوئی ایسا قبیلہ خدمت اقدس میں حاضر ہوتا تو آپ ﷺ پوچھتے کہ تم میں سب سے زیادہ حافظِ قرآن کون ہے؟ اگر کوئی ایسا شخص ہوتا تو لوگ اس کا نام لیتے اور آپ اس کو اس عہدہ پر خود ممتاز فرماتے، چنانچہ اہلِ طائف کے امام عثمان بن ابی العاص اسی طرح مقرر ہوئے تھے اور سب مساوی الحیثیت ہوتے تو ارشاد ہوتا، تم میں جو بڑا ہو وہ جماعت کی امامت کرے۔ مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ جب اپنی قوم کی طرف سے بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے یہی ارشاد فرمایا۔

مدینہ میں، مدینہ سے باہر اطراف میں، عرب کے مختلف صوبوں میں جہاں جہاں مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں ظاہر ہے کہ وہاں ہر جگہ الگ الگ امام مقرر ہوئے ہوں گے۔ جن قبائل میں عمال مقرر ہوتے تھے وہی ان کے امام بھی ہوتے تھے 2 بڑے بڑے مقامات میں یہ دونوں عہدے الگ الگ ہوتے تھے۔ عمان میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ عامل تھے اور ابوزید انصاری امام، 3 لیکن افسوس ہے کہ احادیث وسیر کی کتابوں میں نام بنام ان کی یکجا تفصیل مذکور نہیں۔ ضمنی واقعات میں جہاں تک اس کا سراغ لگ سکا ہے۔ وہ حسب ذیل ہے:

نام	مقام تقرر	کیفیت
مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	مدینہ منورہ	ہجرتِ نبوی ﷺ سے پہلے انصار کی امامت کرتے تھے (ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ)
سالم مولی ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ		آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے مہاجرین کے امام تھے۔ (بخاری، کتاب الاذان: ۶۹۲؛ ابوداود، کتاب الصلاۃ: ۵۸۸)
ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ	مدینہ منورہ	جب آپ ﷺ مدینہ سے باہر غزوات میں تشریف فرما ہوتے تو اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ہمرکاب ہوتے، لیکن چونکہ یہ آنکھوں سے معذور تھے اس لئے مدینہ ہی میں رہتے تھے اس سبب سے اس موقع پر انہی کو آپ امام مقرر فرما جاتے۔ (ابوداود، کتاب الصلاۃ: ۵۹۵)
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	//	آنحضرت ﷺ کی عدم تشریف آوری پر مسجد نبوی میں امام ہوتے تھے (بخاری، کتاب العمل فی الصلاۃ: ۱۲۱۵)

1 صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب من احق بالامامۃ: ۱۵۳۳۔

2 مسند ابن حنبل، جلد ٤، ص: ۲۱۸۔ 3 فتوح البلدان بلاذری ذکر عمان، ص: ۸۳۔

عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ	بنو سالم	اپنے قبیلہ کے امام تھے (نسائی، کتاب الامامۃ: ۷۸۹)
معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ	بنو سلمہ	اپنے قبیلہ کے امام تھے (بخاری، کتاب الاذان: ۷۰۰)
ایک انصاری رضی اللہ عنہ	مسجد قباء	اپنے قبیلہ کے امام تھے (بخاری، کتاب الاذان: ۷۷۴)
عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ	بنو جرم	اپنے قبیلہ کے امام تھے (ابو داود، کتاب الصلاۃ: ۵۸۵تا۵۸۷؛ نسائی، کتاب الامامۃ: ۷۹۰؛ کتاب القبلۃ: ۷۶۸)
اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ	بنو جرم	اپنے قبیلہ کے امام تھے (ابوداود، کتاب الصلاۃ: ۶۰۷)
انس بن مالک رضی اللہ عنہ یا کوئی	بنو نجار	اپنے قبیلہ کے امام تھے۔ (امام کا نام مشکوک ہے)
دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ	بنو نجار	اپنے قبیلے کے امام تھے۔ (مسند جلد ۳ صفحہ ۲۳۲)
مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ	بنو نجار	اپنے قبیلہ کے امام تھے۔ (ابوداؤد)
عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ	مکہ معظمہ	اپنے قبیلہ کے امام تھے۔ (نسائی) ❶
عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ	طائف	اپنے قبیلہ کے امام تھے۔ ❷ (ذکر وفد طائف)
ابوزید انصاری رضی اللہ عنہ	عمان	اپنے قبیلہ کے امام تھے۔ (بلاذری ذکرِ عمان)

موذنین

عام طور پر اذان کے لئے کوئی خاص شخص منتخب نہیں کیا جاتا تھا تاہم چند مثالوں سے قیاس ہوتا ہے کہ بڑی بڑی مسجدوں میں یہ عہدہ الگ آپ ﷺ نے قائم فرمایا تھا، چنانچہ مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں اس عہدہ پر آنحضرت ﷺ نے ان صاحبوں کو ممتاز فرمایا تھا:

نام	مقام	مسجد
بلال بن رباح رضی اللہ عنہ	مدینہ منورہ	موذن مسجد نبوی
عمرو بن ام مکتوم قرشی رضی اللہ عنہ	مدینہ منورہ	موذن مسجد نبوی
سعد القرظ رضی اللہ عنہ	عوالی مدینہ	موذن مسجد قباء
ابو محذورہ رضی اللہ عنہ ❸ جمحی قرشی	مکہ مکرمہ	موذن مسجد حرام

❶ کتب مذکورہ کی کتاب الاذان، باب کیف الآذان: ۶۳۳ سے یہ نام ملتقط ہیں۔

❷ زاد المعاد، ج ۲، ص: ۲۵ مطبوعہ مصر۔ ❸ نسائی، ایضاً: ۶۳۳۔

تاسیس و تکمیل شریعت

﴿ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۭ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ ﴾ [٥/ المآئدة:٣]

''آج ہم نے تمہارا مذہب کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور اسلام کو تمہارے لیے مذہب پسند کیا۔''

(یہ تمام انتظامات اور نظم ونسق اسلام کا حقیقی نصب العین نہ تھا بلکہ جیسا کہ بہ تفصیل اوپر بیان کیا جا چکا ہے، یہ اس لیے تھا کہ ملک میں امن وامان پیدا ہو اور ایک منظم اور باقاعدہ حکومت کا وجود ہو، تاکہ مسلمان بے روک ٹوک اور بلا مزاحمت اپنے مذہبی فرائض انجام دے سکیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کسی نے اس آیت کے معنی پوچھے:

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ ﴾ (٨/ الانفال:٣٩)

''ان کافروں سے جہاد کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور مذہب تمام تر خدا کے لیے ہو جائے۔''

انہوں نے فرمایا کہ ''یہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں تھا جب اسلام کم تھا آدمی اپنے مذہب کی بنا پر فتنہ میں مبتلا ہو جاتا تھا، لوگ اس کو قتل کر دیتے تھے، اب جب اسلام ترقی کر گیا تو کوئی فتنہ نہیں رہا۔'') [1]

ہجرت سے آٹھ برس تک کا زمانہ تمام تر (انہیں فتنوں کی دار و گیر) مخالفین کی شورشوں اور ہنگاموں کی مدافعت اور ملک میں امن وامان قائم کرنے میں گزرا، اسی لیے) آٹھ برس کی وسیع مدت میں فرائض اسلام سے جو چیز ہر جگہ اور ہر موقع پر نمایاں نظر آتی ہے وہ صرف جہاد ہے یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں ایک ایک غزوہ کی تفصیل سینکڑوں صفحات میں ہے، لیکن نماز، روزہ، زکوٰۃ کے متعلق دو دو چار چار سطروں سے زیادہ واقعات نہیں ہیں، وہ بھی اس طرح کہ جب کوئی سنہ ختم ہوتا ہے تو اس قدر لکھ دیتے ہیں کہ اسی سال فرض نماز کی رکعتیں دو سے چار ہو گئیں۔

اس کی وجہ یہ نہیں کہ خدانخواستہ ارباب سیر دیگر فرائض کی اہمیت اور عظمت پیش نظر نہیں رکھتے تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ غزوات کی مصروفیت (اور ملک کی بدامنی) کی وجہ سے اکثر فرائض دیر میں فرض ہوئے اور جو پہلے فرض ہو چکے تھے ان کی تکمیل بھی بتدریج اسی زمانہ میں ہوتی رہی جس کے لیل ونہار زیادہ تر مخالفین کے تیر باراں کے روکنے میں بسر ہو گئے۔

جن احکام کا تعلق قانون ملکی سے تھا وہ اس وجہ سے نازل نہ ہو سکے کہ اب تک اسلام کوئی حکمران طاقت نہ تھا، خالص مذہبی فرائض اور احکام بھی رفتہ رفتہ اسی زمانہ میں نازل ہوتے رہے اور بتدریج جیسے جیسے ان کے

[1] بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الانفال، باب وقٰتلوھم حتی لا تکون فتنۃ: ٤٦٥٠۔

مناسب حالات پیدا ہوتے جاتے تھے وہ تکمیل کو پہنچ رہے تھے سب سے بڑا نکتہ احکام کے تدریجی نزول میں یہ تھا کہ ان سے مقصود محض عربوں کو ان کا بتا دینا نہیں تھا بلکہ عملاً ان کی زندگی کو ان پر کاربند بنا دینا تھا اس لیے نہایت آہستہ آہستہ بتدریج ترتیب کے ساتھ ان کو آگے بڑھایا گیا۔ اسی نکتہ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نہایت خوبی سے بیان فرمایا ہے کہ ''پہلے عذاب وثواب کی آیتیں نازل ہوئیں، جب دلوں میں استعداد اور رقت پیدا ہوگئی تو احکام نازل ہوئے ورنہ اگر پہلے ہی دن یہ حکم ہوتا کہ شراب نہ پیو، تو کون مانتا؟'' ❶

الغرض ان مختلف اسباب کی بنا پر اسلام کے اکثر فرائض اور احکام اس وقت تکمیل کو پہنچے جب تمام ملک میں امن وامان قائم ہوگیا، مکہ معظمہ کے قیام تک روزہ سرے سے فرض نہیں ہوا، مدینہ منورہ میں روزے فرض ہوئے لیکن زکوٰۃ کی فرضیت سات آٹھ سال کے بعد ہوئی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ رات دن کی معرکہ آرائیوں سے مالی حالت اس حد تک پہنچنے کہاں پائی تھی کہ زکوٰۃ کی فرضیت کا موقع آئے۔ فتح مکہ سے پہلے مسلمان اس سرزمینِ مقدس میں قدم نہیں رکھ سکتے تھے اس لیے اس وقت تک حج بھی فرض نہ ہوا۔ نماز روزانہ کا فرض ہے۔ اور یہ فرض اسلام کے وجود کے ساتھ آیا لیکن اس کی تکمیل بتدریج ہجرت کے چھ سات برس کے بعد ہوئی۔ 5 ہجری تک نماز میں بات چیت کرنا جائز تھا اور کوئی باہر کا آدمی سلام کرتا تو نمازی عین نماز میں جواب دیتے تھے جیسا کہ ابوداؤد وغیرہ میں متعدد روایتیں مذکور ہیں۔ ❷

غرض فتح مکہ کے بعد جب کفر کا زور ٹوٹ گیا اور تمام ملک میں امن وامان قائم ہوگیا تو مذہبی احکام کی تفصیل اور نظامِ شریعت کی تکمیل کا موقع آیا۔ احکام بہت سے ایسے تھے جو سرے سے ابھی شروع نہیں ہوئے تھے۔ مثلاً: زکوٰۃ، حج، حرمتِ ربا، وغیرہ بہت سے ایسے تھے کہ ابتدائی ارکان قائم ہوگئے تھے لیکن تکمیل نہیں ہوئی تھی۔ ❸

---

❶ صحیح بخاری، فضائل القرآن، باب تالیف القرآن: ٤٩٩٣۔

❷ ابو داود، کتاب الصلاۃ، باب رد السلام فی الصلوٰۃ: ٩٢٣، ٩٢٤، ٩٢٥۔

❸ اسلام کے بعض احکام کے نزول اور تدریجی تکمیل کی تاریخ جلد اول کے واقعات متفرقہ کے تحت میں بھی ضمناً گزر چکی ہے، ناظرین ایک دو جگہ احکام کی تاریخ اور سنین میں یہاں سے اختلاف پائیں گے، اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ جلد اول میں عام مؤرخین اور ارباب سیر کی تقلید کی گئی ہے اور یہاں احادیث اور کتب شانِ نزول سے استقرا کر کے جو امر محقق نظر آیا ہے اس کی تفصیل کی گئی ہے اور اصل یہ ہے کہ احکام کے سنین اور تاریخیں کتب حدیث میں بالتصریح مذکور نہیں ہیں۔ محدثین اور ارباب روایت کے قیاسات اور استنباطات ہیں اور اسی بنا پر باہم ان میں اختلافات ہیں ہم نے کوشش کی ہے کہ صحیح اور معتبر دلائل کی راہنمائی سے اس راستہ کو طے کریں۔ (والعصمۃ بید اللّٰہ) ''س''۔

عقائد اور اسلام کے اصولِ اولین ❶

(اسلام کے فرائض اولین عقائد ہیں یعنی توحید، رسالت، ملائکہ، قیامت، حشر ونشر وغیرہ پر ایمان لانا۔
آنحضرت ﷺ پر اول جو وحی نازل ہوئی یعنی ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ اس میں خدا کی بڑائی کے سوا کسی مخصوص عقیدہ کی تعلیم نہ تھی لیکن دوسری بار جو وحی نازل ہوئی وہ یہ تھی: ❷

﴿ یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُۙ قُمْ فَاَنْذِرْ۪ۙ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ۪ۙ وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ۪ۙ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ۪ۙ ﴾

(۷۴/ المدثر:۱۔۵)

''اے چادر اوڑھنے والے اٹھ، لوگوں کو ڈرا، اپنے پروردگار کی بڑائی کر اور بتوں کو چھوڑ دے۔''

اس کے بعد مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں جس قدر آیتیں نازل ہوئیں وہ بیشتر عقائد کے متعلق تھیں، شرک اور بت پرستی کی برائی، خدا کی عظمت وجلال کا اظہار، قیامت کے ہولناک سماں اور جنت و دوزخ کا پراثر بیان، رسالت کے خواص اور اس کی ضرورت کے دلائل، مکہ میں تیرہ برس تک زیادہ تر یہی مطالب ادا ہوتے رہے۔ غرض عقائد کے تمام اجزا اگرچہ آغازِ اسلام ہی میں لوگوں کو سنائے جا چکے تھے لیکن مکی آیتوں کے استقصا سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ایک کا بیان الگ الگ ہوتا تھا۔ عقائد کا مسلسل بیان سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء میں ہے اور یہ دونوں سورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں۔ مکی سورتوں میں زیادہ تر زور توحید، قیامت کے اعتقاد اور رسول کی صداقت پر صرف ہوا ہے، لیکن مدینہ آ کر اسلام کے تمام عقائد اور اصولِ اولین کی مجموعی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔

ایمان اور اسلام کے اولین اصول کے متعلق سورۃ بقرہ کی سب سے پہلی آیت یہ ہے:

﴿ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَۙ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَؕ ﴾ (۲/ البقرہ:۳۔۴)

''جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں، نماز کھڑی کرتے ہیں، ہم نے جو روزی دی ہے اس سے خرچ کرتے ہیں اور جو ان باتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو (اے محمد ﷺ) تجھ پر اتاری گئیں اور جو تجھ سے پہلے نازل ہوئیں اور ان کو آخرت پر بھی یقین ہے۔''

وسطِ سورہ میں یہ اصول دوبارہ ادا ہوتے ہیں:

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ ﴾

(۲/ البقرہ:۱۷۷)

''لیکن نیکی یہ ہے کہ کوئی خدا پر، روز قیامت پر، فرشتوں پر، کتابوں پر، پیغمبروں پر ایمان لائے۔''

---

❶ اضافہ تاختم باب "تیمم"۔

❷ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ مدثر:۴۹۲۲۔

اس کے بعد نماز، روزہ، زکوٰۃ اور بعض اخلاقی احکام گنائے گئے ہیں۔ یہ آیتیں تحویل قبلہ کی آیت کے ساتھ ۲ھ میں نازل ہوئیں۔ اسی کی تفصیل سورہ کے آخر میں کی گئی ہے یہ آیتیں ہجرت کے چند سال بعد غالباً نازل ہوئی ہیں، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا [1] اور ابن عباس رضی اللہ عنہما [2] کی روایتوں سے ثابت ہے۔

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۵)

"پیغمبر اس پر ایمان لایا جو اس پر اس کے رب کی طرف سے اترا اور تمام مسلمان خدا پر، خدا کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر سب پر ایمان لائے۔"

سورۂ نساء کی آیت یہ ہے جس میں بالتفصیل بتایا گیا ہے کہ جو لوگ مسلمان ہو چکے ان کے کیا عقائد ہونے چاہئیں۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴾ (٤/ النسآء:١٣٦)

"اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو، ایمان لاؤ خدا پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری اور جو شخص خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا، اس کے پیغمبروں کا اور روز آخرت کا انکار کرے گا وہ سخت گمراہ ہوا۔"

احادیث کتاب الایمان میں بہت سے ایسے واقعات مذکور ہیں، جن میں لوگوں نے آپ ﷺ سے اسلام اور ایمان کے معنی دریافت کیے ہیں اور آپ ﷺ نے سائل کی یا وقت کی مناسبت سے مختلف جوابات دیے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لڑوں جب تک لوگ یہ گواہی نہ دیں کہ خدا ایک ہے، محمد ﷺ خدا کا پیغمبر ہے، نمازیں پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔" [3]

ایک دفعہ کسی دیہات سے ایک مسلمان حاضر خدمت ہوا اور دریافت کیا کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے تین چیزیں بتائیں: "رات دن میں پانچ وقت کی نماز، رمضان کے روزے اور زکوٰۃ۔ [4] عبدالقیس کے وفد نے ۵ھ میں حاضر ہو کر عرض کی کہ ہم دشمنوں کی مزاحمت کے سبب سے ہمیشہ نہیں حاضر ہو سکتے اس لئے ایسے احکام بتا دیے جائیں جو ان لوگوں کو بھی سنا دیے جائیں جو شرف حضوری حاصل نہیں کر سکتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((شهادة ان لا اله الا اللّٰه وان محمدا رسول اللّٰه واقام الصلوٰة وايتاء الزكوٰة

[1] صحیح بخاری، تفسیر یمحق اللہ الربوا: ٤٥٤١۔ [2] اسباب النزول للسیوطی برحاشیہ جلالین ج١، ص: ٥١۔ [3] بخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبریل النبی ﷺ عن الایمان والاسلام.....: ٥٠۔
[4] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب الزکوٰۃ من الاسلام، ٤٦۔

و صیام رمضان و ان تعطوا من المغنم الخمس)) ❶

''اس بات کی شہادت کہ خدا ایک ہے، محمد ﷺ خدا کے پیغمبر ہیں، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ دینا۔''

ایک دفعہ آپ صحابہ کے مجمع میں تشریف فرما تھے اس اثنا میں ایک شخص نے آ کر سوال کیا کہ ایمان کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایمان یہ ہے کہ خدا پر، فرشتوں پر، خدا کی ملاقات پر، اس کے پیغمبروں پر اور مرنے کے بعد جی اٹھنے پر یقین ہو۔'' اس نے پوچھا اور اسلام کیا ہے؟ فرمایا: ''اسلام یہ ہے کہ صرف خدا کو پوجو کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، فرض زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو۔'' اس نے پھر دریافت کیا کہ احسان کس کو کہتے ہیں؟ ارشاد ہوا کہ ''خدا کی اس طرح عبادت کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔'' ❷ یہ اصولِ اسلام کا تقریباً کامل نقشہ ہے، غالباً یہ سوال و جواب فتح مکہ یعنی ۸ھ سے پہلے کا واقعہ ہے کیونکہ اس میں حج کا ذکر نہیں ہے تاہم اس قدر اطمینان حاصل ہو چکا تھا کہ تکمیلِ عبادت کے لیے خضوع و خشوع کی قید بھی اضافہ کی جا سکے، اصول اسلام کا آخری اعلان یہ ہے:

((بنی الاسلام علی خمس شهادة ان لا اله الا اللّٰه و ان محمدا رسول اللّٰه و اقام الصلوة و ایتاء الزکوٰة و الحج و صوم رمضان))۔ ❸

''اسلام کی بنا پانچ باتوں پر ہے، اس بات کی گواہی کہ خدا کے سوا کوئی اور خدا نہیں، محمد ﷺ اس کا پیغمبر ہے، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا، رمضان کے روزے رکھنا۔''

رفتہ رفتہ ایمان اور اسلام کے اصولِ کلیہ کی جب تکمیل ہو چکی تو اس کے جزئیات اور دیگر لوازم کی بھی تعلیم دی گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں، جن میں ایک شاخ حیا ہے''۔ ❹ ایک دفعہ فرمایا کہ ''بہترین اسلام یہ ہے کہ مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہے۔'' ❺ ایک اور صاحب کے جواب میں فرمایا کہ ''بہترین اسلام یہ ہے کہ محتاجوں کو کھانا کھلاؤ اور کسی سے جان پہچان ہو یا نہ ہو مگر اس کو سلام کرو۔'' یہ بھی فرمایا کہ ''اس وقت تک تم مومن نہیں جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔'' ❻

غرض اسلام کے تمام اصول و فروع کی تعلیم اسی طرح بتدریج تکمیل کو پہنچتی گئی اور آخری ۹ھ ذی الحجہ ۱۰ھ جمعہ کے روز وہ ساعت آئی جب خدا نے فرمایا: ❼

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب اداء الخمس من الایمان:۵۳۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبریل ...: ۵۰۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب دعاؤکم ایمانکم:۸۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب امور الایمان:۹۔ ❺ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب أی الاسلام افضل:۱۱۔ ❻ بخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیه......:۱۳۔ یہ تمام حدیثیں صحیح بخاری، کتاب الایمان میں ہیں۔ ❼ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قوله: الیوم اکملت لکم......: ۴۶۰۶۔

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٣)

''آج ہم نے تمہارا مذہب مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔''

عبادات

اوپر یہ حدیث گزر چکی ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم کی گئی ہے۔ان میں سے توحید ورسالت کے علاوہ بقیہ چار چیزیں یعنی نماز، روزہ، حج، زکوۃ عبادات میں داخل ہیں۔ان میں سب سے اول شے نماز ہے۔نماز کی صحت کے لیے متعدد شرطیں ہیں، سب سے اول اور ضروری شرط طہارت ہے۔

طہارت

طہارت کے معنی یہ ہیں کہ جسم اور لباس، ظاہری اور معنوی ہر قسم کی نجاستوں سے پاک ہو۔طہارت کو اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے کرو کہ دوسری ہی دفعہ کی وحی سے جب احکام اور فرائض کا آغاز ہوا تو توحید کے بعد دوسرا حکم طہارت ہی کا دیا گیا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ ﴾

(٧٤/ المدثر:١۔٥)

''اے چادر اوڑھنے والے اٹھ اور ڈرا اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر اور اپنے کپڑے پاک کر اور ناپاکی کو چھوڑ دے۔''

اگرچہ مفسرین نے عموماً کپڑے کی طہارت سے ''دل کی طہارت'' اور ''ناپاکی'' سے ''بت پرستی'' مراد لی ہے، تاہم اس سے ظاہری طہارت اور پاکیزگی کی اہمیت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔نماز سے پہلے وضو کرنا فرض ہے۔اس فرضیت کا ثبوت ابتدائے اسلام سے ثابت ہوتا ہے۔تاریخ وسیر اور بعض روایات حدیث میں ہے کہ وضو کا طریقہ آغاز وحی ہی میں حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ کو سکھایا تھا [1] حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہجرت سے پہلے بھی وضو فرماتے تھے [2] لیکن قرآن میں وضو کا حکم باتفاق محدثین مدینہ میں نازل ہوا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٦)

''مسلمانو! جب نماز کے لیے کھڑے ہو تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لو، سر پر مسح کر لو اور گھٹنوں تک پاؤں دو ڈالو۔''

---

[1] ابن هشام، ج ١، ص: ١٥٥ وفتح الباری، ج ١، ص: ٢٠٥ بحواله مغازی ابن لهيعة ومسند امام احمد، ج ٤، ص: ١٦١ وابن ماجه، ابواب الطهارة وسننها، باب ماجاء فی النضح بعد الوضوء: ٤٦٢۔

[2] مستدرك حاكم، ١/ ١٦٣۔

یہ آیت سورۂ مائدہ میں ہے اور اس سورہ کی اکثر آیتیں ہجرت کے چار پانچ سال بعد کی ہیں۔ اس آیت کے متعلق بخاری میں تصریح یہ ہے کہ وہ آیت تیمّم کے ساتھ اتری ہے۔ ❶ آیت تیمّم ۵ ھ میں نازل ہوئی اسی بنا پر اکثر علما کی رائے یہ ہے کہ وضو پر عمل تو پہلے سے تھا لیکن قرآن میں اس کی فرضیت ہجرت کے چار پانچ سال کے بعد نازل ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابتداءً لوگ نہایت جلدی جلدی وضو کر لیتے تھے کچھ حصہ بھیگتا تھا کچھ نہیں بھیگتا تھا۔ ٦ ھ میں یا اس کے بعد کے کسی سفر میں آپ ﷺ مکہ سے واپس آ رہے تھے، کچھ لوگ جھپٹ کر تالاب کے پاس پہنچے اور جلدی جلدی ہاتھ منہ دھو لیا، ایڑیاں کچھ بھیگیں کچھ خشک رہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((وَيْلٌ لِلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ اَسْبِغُوا الْوَضُوْءَ))۔ ❷ ''ان ایڑیوں پر دوزخ کی پھٹکار ہے، وضو کو کامل کرو۔''

اس وقت سے ''اسباغِ وضو'' یعنی سکون وطمانیت کے ساتھ وضو کے تمام فرائض ادا کرنا لازم قرار پا گیا۔ اسباغِ وضو کے تمام فضائل آپ ﷺ نے بیان فرمائے۔ ابتداءً وضو ٹوٹے یا نہ ٹوٹے، ہر نماز کے وقت تازہ وضو کرتے تھے، لیکن آخر عام مسلمانوں پر جبر ہونے کے خیال سے ہر وقت ضروری نہ رہا ❸ اور اس کا اعلان آپ ﷺ نے عملاً فتح مکہ کے وقت فرمایا۔ ❹

تیمّم

وضو کے لیے پانی کی ضرورت ہے لیکن ہر وقت سفر میں اس کا ملنا مشکل ہے، نیز بیماری کی حالت میں پانی کا استعمال کبھی مضر ہے، اس لیے ۵ ھ میں تیمّم کی آیت نازل ہوئی:

﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ۭ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ ﴾

(٥/ المآئدۃ:٦)

''اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے، یا تم نے عورتوں سے مقاربت کی ہو اور پانی میسر نہ آئے تو طاہر مٹی لے کر اس سے تیمّم یعنی منہ اور ہاتھوں کا اس سے مسح کر لو، اللہ تم پر کسی طرح تنگی کرنا نہیں چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک وصاف کر دے، اور اپنا احسان تم پر پورا کر دے، تاکہ تم شکر گزار بنو۔''

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ غزوۂ بنی مصطلق ۵ ھ سے آپ واپس آ رہے تھے، ام المؤمنین

❶ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قوله: فلم تجدوا ماء...... ٤٦٠٧، ٤٦٠٨۔
❷ صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب وجوب غسل الرجلين بكمالهما: ٥٦٦ تا ٥٧٥۔
❸ فتح الباري، ج١، ص:٢٠٤؛ ابوداود، كتاب الطهارة، باب السواك: ٨٤؛ احمد، ٥/ ٥٢٢۔
❹ صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب جواز الصلوات كلها بوضوء واحد: ٦٤٢۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ساتھ تھیں ۔ مدینہ کے قریب جب قافلہ پہنچا تو اتفاقاً ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا ہار کہیں گر گیا، سارا قافلہ وہیں اتر پڑا، نماز کا وقت آیا تو پانی نہ ملا، تمام صحابہ پریشان خاطر تھے، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی، اتنے میں یہ آیت نازل ہوئی، مسلمانوں کو اس اجازت سے بڑی خوشی ہوئی، اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ ایک صحابی نے کہا: ''اے آلِ ابی بکر! تم لوگوں کے لیے سرمایہ برکت ہو۔'' ❶

نماز

نماز آنحضرت ﷺ کی بعثت کے ساتھ فرض ہوئی، ❷ چنانچہ دوسری ہی وحی میں حکم ہوا:

﴿ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴾ (۷٤/ مدثر:۳) ''اپنے پروردگار کی بڑائی (تکبیر) بیان کر۔''

اس تکبیر سے مقصود بجز نماز کے اور کیا ہوسکتا ہے؟ لیکن چونکہ تین برس تک دعوت اسلام مخفی رہی اور کفار کے ڈر سے اعلانیہ نماز پڑھنا ممکن نہ تھا، اس لیے صرف رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا، دن میں کوئی نماز فرض نہیں ہوئی، چنانچہ سورۂ مزمل میں جو ابتدائی سورتوں میں سے ہے یہ حکم بتصریح مذکور ہے:

﴿ يَآيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۗ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۗ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۗ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝ ﴾

(۷۳/ المزمل:۱، ۸)

''اے کملی اوڑھ کر سونے والے! رات کو کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات اس نصف سے کسی قدر کم کردو یا نصف سے کچھ بڑھا دو اور قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر عنقریب ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں، رات کا اٹھنا نفس کو خوب زیر کرتا ہے اور یہ وقت دعا کے لیے مناسب بھی زیادہ ہے، دن کو تجھ کو زیادہ شغل رہتا ہے اپنے پروردگار کا نام لے، اور سب سے ٹوٹ کر اسی کا ہورہ۔''

اس کے بعد صبح و شام کی دو دو رکعتیں اور فرض ہوئیں۔

﴿ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۚ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ۝ ﴾

(۷٦/ الدھر:۲۵۔۲٦)

❶ صحیح بخاری، کتاب التیمم، باب قول اللہ عزوجل: فلم تجدوا مآء: ٤٦٠٧۔

❷ نماز کے بیان تاریخ میں محدثین مختلف الرائے ہیں، ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری جلد ۱، ص: ۳۹۳ میں جو خلاصہ مباحث نقل کیا ہے اس کا لفظی ترجمہ حسب ذیل ہے: ''ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ معراج سے پہلے رات کی غیر موقت نماز کے علاوہ کوئی اور نماز فرض نہ تھی، حربی کی رائے ہے کہ صبح و شام دو دو رکعتیں فرض تھیں، امام شافعی نے بعض اہل علم سے روایت کی ہے کہ پہلے رات کی (دیر تک) نماز فرض تھی بعد ازیں ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ کی آیت سے یہ حکم منسوخ ہوگیا اور صرف تھوڑی رات تک نماز فرض رہ گئی اس کے بعد نماز پنجگانہ نے اس حکم کو بھی منسوخ کردیا۔'' ہم نے نماز کی تاریخ بیان کی ہے وہ انہی چند سطروں کی تفصیل ہے جس کی تطبیق قرآن مجید کی چند آیتوں سے کردی گئی ہے۔ اس تفصیل سے یہ گرہ بھی کھل جاتی ہے کہ قرآن مجید میں اوقات نماز کے مختلف بیانات کیوں ہیں۔'' ''س''۔

''صبح وشام خدا کا نام لیا کر اور رات کے وقت دیر تک اللہ کے آگے سجدہ کیا کر اور اس کی تسبیح بیان کر۔''

رات کو دیر تک نماز پڑھنے کا جو حکم تھا ایک سال تک قائم رہا، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ آپ ﷺ کا اور اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایک سال تک اسی پر عمل رہا۔ نماز پڑھتے پڑھتے ان کے پاؤں سوج جاتے تھے ایک سال کے بعد فرضیت منسوخ ہوگئی [1] اور حکم ہوا:

﴿ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآىِٕفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۭ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۭ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ڮ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ ﴾

(۷۳/ المزمل: ۲۰)

''تیرا پروردگار جانتا ہے کہ تو دو تہائی رات سے کم اور آدھی رات اور تہائی رات تک نماز پڑھا کرتا ہے اور کچھ لوگ اور تیرے ساتھ، خدا ہی رات اور دن کا اندازہ کرتا ہے۔ اس نے جان لیا کہ تم اس کو گن نہیں سکتے، تم پر اس نے مہربانی کی، اب جتنا ہو سکے اتنا ہی قرآن، نماز میں پڑھو، اس نے جان لیا کہ تم میں بیمار بھی ہوں گے، مسافر بھی ہونگے اور جو خدا کی روزی ڈھونڈھنے کو سفر کریں گے اور لوگ خدا کی راہ میں سفر جہاد کریں گے پس اب جتنا ہو سکے اتنا ہی پڑھو۔''

رات کی اس نفل نماز کا نام تہجد ہے نماز نفل کے تہجد ہو جانے کے بعد، فجر، مغرب اور عشاء تین وقت کی نمازیں فرض ہوئیں۔

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۭ ﴾ (۱۱/ ہود: ۱۱٤)

''دن کے دونوں (ابتدائی اور انتہائی) کناروں میں (یعنی فجر و مغرب) اور تھوڑی رات گزرنے کے بعد نماز پڑھا کرو۔''

معراج میں جو نبوت کے پانچویں سال ہوئی [2] پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئیں [3] اور سورۂ اسراء میں جو معراج کے بیان پر مشتمل ہے یہ آیت اتری:

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ڰ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۷۸، ۷۹)

[1] ابو داود، کتاب الصلوۃ، باب فی صلوۃ اللیل: ۱۳٤۲ ومسند احمد، ج ٦، ص: ٥٤۔

[2] ہماری تحقیق میں معراج نبوت کے نویں سال ہوئی۔ ''س''۔ [3] فتح الباری، ج ۷، ص: ۱٥٥۔

"نماز کے اوقات زوالِ آفتاب سے لے کر ظلمت شب تک ہیں۔ (ظہر، عصر، مغرب، عشاء) اور صبح کی نماز کہ صبح کی نماز میں سب جمع ہوتے ہیں اور رات کو تہجد پڑھ یہ تیرے لیے مزید ہے۔"

لیکن رکعتیں دو ہی رہیں، مدینہ منورہ میں آ کر جب نسبتاً کسی قدر اطمینان ہوا تو اس فرض نے وسعت حاصل کی اور دو کے بجائے چار رکعتیں فرض ہو گئیں۔ ❶

بااین ہمہ نماز میں خضوع و خشوع اور تمکین و وقار کے جو ارکان ضروری ہیں ان کے لیے جس اطمینان کی ضرورت تھی وہ مدت تک نصیب نہیں ہوا، اس لیے فوراً وہ ارکان اور آداب لازمی نہیں قرار پائے بلکہ رفتہ رفتہ ان کی تکمیل کی گئی، پہلے لوگ نماز میں آنکھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ لیا کرتے تھے، بالآخر آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((مَا بَالُ اَقْوَامٍ يَرْفَعُوْنَ اَبْصَارَهُمْ اِلَى السَّمَاءِ فِيْ صَلٰوتِهِمْ)) ❷

"یہ کیسے لوگ ہیں کہ نماز میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا کرتے ہیں۔"

ایک مدت تک یہ حالت تھی کہ نماز پڑھنے میں کوئی کام یاد آ جاتا تو کسی سے کہہ دیتے یا کوئی سلام کرتا تو نماز ہی میں جواب دیتے، پاس پاس کے آدمی نماز میں باہم باتیں کیا کرتے، جب مہاجرین حبش ۲ھ میں واپس آ کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو آنحضرت ﷺ نماز میں مشغول تھے، معمول کے موافق لوگوں نے سلام کیا، لیکن جواب نہیں ملا، نماز کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "خدا نے اب حکم دیا ہے کہ نماز میں باتیں نہ کرو۔" ❸ اس وقت سے بات چیت کرنا یا سلام کا جواب دینا بالکل منع ہو گیا۔

معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی، ایک صاحب کو چھینک آئی میں نے "یرحمك الله" کہا، لوگوں نے تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا، میں نے کہا "آپ لوگ کیا دیکھتے ہیں؟" لوگوں نے زانو پر ہاتھ مارے، اس وقت میں سمجھا کہ بات کرنے سے روکنا چاہتے ہیں، میں چپ ہو گیا، آنحضرت ﷺ نے نماز سے فارغ ہو کر (خلق احمدی سے) مجھ کو نہ سزا دی نہ ڈانٹا، نہ برا کہا، صرف یہ فرمایا کہ "نماز تسبیح و تکبیر اور قراءت کا نام ہے۔ اس میں بات چیت جائز نہیں۔" ❹

تشہد کا جو طریقہ اب ہے، پہلے نہ تھا، بلکہ مختلف اشخاص کے نام لے کر کہتے تھے "السلام علی فلان و فلان" بالآخر التحیات کے خاص الفاظ سکھائے گئے جواب نماز میں معمول بہا ہیں۔ ❺

حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ چھوٹے بچوں کو نماز میں کندھے پر چڑھا لیتے، سجدہ میں جاتے وقت اتار دیتے، دوسری رکعت میں کھڑے ہوتے تو پھر چڑھا لیتے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا باہر سے آتیں

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ، باب کیف فرضت الصلاۃ فی الاسراء: ۳۵۰، ۱۰۹۰، ۳۹۳۵۔

❷ بخاری، کتاب الاذان، باب رفع البصر الی السماء فی الصلوٰۃ: ۷۵۰۔

❸ ابو داود، کتاب الصلوٰۃ، باب رد السلام فی الصلوۃ: ۹۲۳۔ ❹ ابو داود، کتاب الصلوٰۃ، باب تشمیت العاطس: ۹۳۰۔ ❺ ابو داود، کتاب الصلوٰۃ، باب التشہد: ۹۶۸۔

اور دروازہ کھٹکھٹاتیں، آنحضرت ﷺ نماز پڑھتے ہوئے عین اسی حالت میں جا کر دروازہ کھول دیتے [1]

ان حدیثوں کی بنا پر بہت سے فقہا کی یہ رائے ہے کہ یہ سب افعال نماز نفل میں جائز ہیں۔ نفل کی تخصیص اس لیے کہ جن نمازوں میں آنحضرت ﷺ نے افعال کیے وہ فرض نہ تھیں بلکہ نفل تھیں، لیکن ہمارے نزدیک یہ تاویل صحیح نہیں۔ ایک حدیث میں صاف موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ امامہ بنت ابو العاص کو کندھے پر چڑھائے مسجد میں آئے اور نماز ادا کی۔ [2] ہمارے نزدیک یہ تمام روایتیں اسی زمانہ کی ہیں جب کہ نماز میں بات چیت اور اس قسم کے حرکات ممنوع نہیں قرار پائیں تھے۔ رفتہ رفتہ نماز تکمیل کی اس حد کو پہنچی کہ وہ تمام تر خضوع وخشوع ومراقبہ ومحویت بن گئی۔

قرآن مجید میں آیت اتری: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ ﴾ (۲۳/ المؤمنون: ۱، ۲) ''فلاح پانے والے مسلمان، وہ مسلمان ہیں جو خشوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔'' اس بنا پر نماز میں ادھر ادھر دیکھنا یا کوئی حرکت خضوع وخشوع کے خلاف کرنا منع ہو گیا۔ نماز کے تمام ارکان کا نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ ادا کرنا لازمی قرار پایا۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کے سامنے نماز ادا کی اور تمام ارکان ٹھہر ٹھہر کر اچھی طرح نہیں ادا کئے تو آپ نے اس سے فرمایا کہ ''تم نے نماز نہیں پڑھی، جا کر پھر پڑھو۔'' اس نے دوبارہ اسی طرح ادا کی، آپ نے فرمایا کہ ''نماز نہیں ہوئی۔'' تیسری دفعہ اس نے پوچھا کہ کیوں کر پڑھوں، آپ نے رکوع، سجدہ، قیام سب کی نسبت ہدایت کی کہ نہایت اطمینان کے ساتھ ادا کئے جائیں، چنانچہ صحیح بخاری وغیرہ میں یہ روایت تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ [3]

غرض یا تو یہ حالت تھی کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھ رہے تھے، اتفاقاً شام سے تجارت کا قافلہ آیا۔ بارہ آدمیوں کے سوا جس قدر لوگ نماز میں شریک تھے اٹھ کر قافلہ کی طرف دوڑے۔ اس پر یہ آیت اتری: [4]

﴿ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآىِٕمًا ۭ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۭ ﴾ (٦٢/ الجمعة: ١١)

''اور جب لوگ تجارت، یا کھیل تماشا دیکھ پاتے ہیں تو ٹوٹ کر اس پر گرتے ہیں اور تجھ کو کھڑا چھوڑ دیتے ہیں، کہہ دے کہ جو کچھ خدا کے ہاں ہے وہ تجارت اور کھیل تماشہ سے بہتر ہے۔''

اور یا آنحضرت ﷺ کی تربیت وتعلیم سے یہ حالت ہوئی کہ (ایک انصاری نماز کی حالت میں تین

---

[1] ابو داود، کتاب الصلوۃ، باب العمل فی الصلوٰۃ: ۹۲۲۔ [2] ابو داود، کتاب الصلوٰۃ، باب العمل فی الصلوٰۃ: ۹۱۷۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب وجوب القراۃ للامام والماموم ...: ۷۵۷۔

[4] صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ، باب اذا نفر الناس عن الامام فی صلاۃ ...: ۹۳۶۔

دفعہ تیر کا زخم کھاتے ہیں، لیکن نماز نہیں توڑتے کہ جو سورہ انہوں نے شروع کیا تھا، اس کی لذت معنوی اس درد زخم سے زیادہ تھی، ❶ اس سے بڑھ کر یہ کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نماز میں زخم کھا کر گرتے اور تڑپتے ہیں، ❷ یہ قیامت خیز منظر سب کے سامنے ہے لیکن ایک شخص مڑ کر نہیں دیکھتا کیونکہ خشیتِ الٰہی اور محویت کا عالم جو دلوں پر طاری ہے وہ اور کسی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا۔

نماز جمعہ اور عیدین

مکہ میں چار شخصوں کا یکجا ہو کر نماز ادا کرنا ناممکن تھا، اس لیے جمعہ کی نماز فرض نہ تھی (کیونکہ) جمعہ کی پہلی شرط جماعت ہے، لیکن مدینہ منورہ میں انصار کی ایک بڑی جماعت اسلام لا چکی تھی اور کوئی شخص ادائے نماز میں خلل انداز نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے قبل جو مسلمان مدینہ آ چکے تھے، اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کی تحریک سے بنی بیاضہ کے محلّہ میں انہوں نے جمعہ کی سب سے پہلی نماز ادا کی ❸ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ امام تھے، ❹ کل چالیس مسلمان نمازی تھے۔ ❺ اس کے بعد آنحضرت ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو پہلے قبا میں قیام فرمایا، یہاں سے روانگی کے لیے آپ نے قصداً جمعہ کا دن متعین فرمایا۔ بنی سالم کے محلّہ میں پہنچے تو نماز کا وقت آ گیا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے سب سے پہلے نماز جمعہ یہیں ادا فرمائی یہ اواخر ربیع الاول ۱ھ کا واقعہ ہے ❻ مدینہ سے باہر عرب کے دوسرے حصوں میں مسلمانوں کی یک جا تعداد سب سے زیادہ جواثی میں تھی، جو بحرین میں واقع تھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ مسجد نبوی ﷺ کے بعد سب سے پہلے نماز جمعہ یہیں قائم ہوئی۔ ❼ لیکن بظاہر نمازِ جمعہ کا اہتمام مسلمانوں میں پہلے اتنا نہ تھا جتنا کہ ہونا چاہیے۔ ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھا رہے تھے اور ایک روایت میں ہے کہ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ اتفاقاً شام سے غلہ کے بیوپاری آ گئے، سب لوگ اٹھ کر ادھر چلے گئے، جماعت میں صرف بارہ آدمی ❽ اور دوسری روایت کی رو سے چالیس آدمی ❾ رہ گئے۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا

❶ بخاری، کتاب الوضوء، باب من لم یر الوضوء: رقم الباب (۳۴)؛ ابن هشام، ج۲، ص:۱۵۳۔

❷ طبری، ج۵، ص: ۲۷۲۳۔ ❸ ابوداود: ۱۰۶۹؛ ابن ماجه: ۱۰۸۲؛ دار قطنی: ۱۵۶۹؛ ابن خزیمه: ۱۷۲۴۔ ❹ ابن اسحاق بحواله سیرت ابن هشام، ج۱، ص: ۲۶۲۔

❺ ابو داود، کتاب الجمعة: ۱۰۶۹؛ ابن ماجه، کتاب الجمعة، باب فی فرض الجمعة: ۱۰۸۲۔

❻ طبری، ج۳، ص: ۱۲۵۶۔ ❼ صحیح بخاری، کتاب الجمعة، باب الجمعة فی القری والمدن: ۸۹۲۔

❽ صحیح بخاری، کتاب الجمعة، باب اذا نفر الناس عن الامام: ۹۳۶۔

❾ دار قطنی، کتاب الجمعه، باب ذکر العدد فی الجمعة: ۱۵۶۷، ۱۵۶۸۔

وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ۚ قُلْ مَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۚ وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴾

(٦٢/ الجمعه:٩ تا ١١)

''ایمان والو! جب نماز جمعہ کے لیے پکارا جائے تو یاد الٰہی کی طرف دوڑو، اور خرید وفروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم کو علم ہو، جب نماز سے فراغت ہو جائے تو زمین میں چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو اور خدا کو اکثر یاد کیا کرو، تاکہ فلاح پاؤ جب لوگ تجارت اور کھیل تماشا دیکھ پاتے ہیں تو ٹوٹ کر اس پر گرتے ہیں، اور تجھ کو اے پیغمبر! کھڑا چھوڑ دیتے ہیں کہہ دے کہ جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ تجارت اور کھیل تماشہ سے بہتر ہے اور خدا بہتر روزی دینے والا ہے۔''

اس کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ نماز کے سامنے تمام دنیا کی دولت کا خزانہ بھی ان کے آگے ہیچ ہو گیا۔ خدا نے ان کی مدح فرمائی:

﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ ﴾ (٢٤/ النور:٣٧)

''یہ وہ لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید وفروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔''

عید کی نماز بھی مدینہ ہی میں آ کر قائم ہوئی، لیکن جس سال آپ تشریف لائے اس سال عید کی نماز نہیں ہوئی بلکہ ۲ھ میں مسنون ہوئی [1] جس کی وجہ یہ ہے کہ عید کی نماز، روزہ رمضان کے تابع ہے، اور رمضان کے روزے دوسرے سال فرض ہوئے۔

صلوٰۃ خوف

نماز کسی حالت میں قضا نہیں کی جا سکتی، خوف کی حالت میں مثلاً: جنگ میں یہ حکم ہے کہ تمام فوج کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں، پہلے ایک جماعت تمام ہتھیاروں سے مسلح ہو کر امام کے پیچھے کھڑی ہو اور قصر نماز ادا کرے، پھر بہ ترتیب یہ آگے بڑھے اور دوسری جماعت جو دشمن کے مقابلہ میں تھی، وہ پیچھے ہٹے اور وہ بھی قصر نماز ادا کرے، امام اپنی جگہ پر قیام کرے، روایتوں میں ہے کہ ہر جماعت دو دو رکعت امام کے ساتھ ادا کرے یا ایک ایک رکعت امام کے ساتھ اور دوسری رکعت علیحدہ علیحدہ پڑھے، یا صرف ایک ہی رکعت اس حالت میں فرض ہے، ابوداؤد نے صلوٰۃ الخوف کی تمام صورتیں بروایت صحابہ الگ الگ لکھ دی ہیں۔ [2] ہمارے نزدیک ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے، یہ جنگ کی حالت پر موقوف ہے، امام جس وقت جو مناسب سمجھے کرائے، اگر لڑائی پورے زور اور شدت پر ہو، تو ہر سپاہی اپنی اپنی جگہ پر اشارات سے نماز ادا کرے گا۔ سورۂ نساء میں صلوٰۃ الخوف کی صورت بتفصیل مذکور ہے۔ [3] صلوٰۃ الخوف کا حکم غزوۂ ذات الرقاع ۵ھ میں نازل ہوا، اسی غزوہ کا نام بعض راویوں نے غزوہ نجد بتایا ہے۔ ابوداؤد میں ابوعیاش زرقی کی ایک روایت ہے جس سے

---

[1] طبری، ج۳، ص: ۱۲۸۱، یورپ۔ [2] ابو داود، کتاب صلاة السفر، باب صلوٰة الخوف: ۱۲۳۶۔
[3] دیکھو آیات: ۱۰۱ تا ۱۰۳۔

معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ الخوف کی آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر مقام عسفان میں نازل ہوئی، یعنی ۶ھ میں، لیکن زیادہ تر رواۃِ حدیث اور اہلِ سیر غزوہ ذات الرقاع ہی کو اس حکم کا زمانہ سمجھتے ہیں۔ ❶

روزہ

اسلام سے پہلے قریش عاشورا کے دن روزہ رکھتے تھے۔(اس دن خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا جاتا تھا ❷ آنحضرت ﷺ بھی اس دن روزہ رکھتے تھے اور عجب نہیں کہ آپ ﷺ کی تبعیت میں دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی روزہ رکھتے ہوں۔ ۵ نبوی میں یعنی ہجرت سے آٹھ برس پہلے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے حبش کے نجاشی کے سامنے اسلام پر جو تقریر کی تھی اس میں روزہ کا ذکر بھی موجود ہے وہ غالباً اسی دن کا روزہ ہوگا، اس کے بعد) جب آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہود بھی اس دن روزہ رکھتے ہیں، آپ نے لوگوں سے وجہ پوچھی لوگوں نے بیان کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی روز فرعون کے ہاتھ سے نجات پائی تھی آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقلید کا زیادہ حق ہے۔'' چنانچہ آپ ﷺ نے (یہاں بھی) عاشورا کا روزہ رکھا (اور صحابہ کو رکھنے کا حکم دیا۔) پھر ۲ھ میں رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورا کا روزہ مستحب ہوگیا، یعنی جس کا جی چاہتا تھا رکھتا تھا اور جو نہیں چاہتا تھا نہیں رکھتا تھا، ❸ لیکن آپ ﷺ نے بہ نفس نفیس اس دن کا روزہ برابر رکھا۔ ۱۱ھ میں لوگوں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! یہود تو اس دن کی بڑی عزت کرتے ہیں، فرمایا کہ آیندہ سال ۱۰ کے بجائے ۹ کو روزہ رکھوں گا لیکن افسوس کہ آپ ﷺ نے اسی سال وفات پائی۔ ❹

یہود اس طرح روزہ رکھتے تھے کہ نماز عشاء کے بعد پھر نہیں کھاتے تھے اور اس کو حرام سمجھتے تھے، عورت کے ساتھ ہم بستری بھی منع تھی۔ ابتدائے اسلام میں مسلمان بھی اسی طریقہ کے موافق مامور ہوئے اسلام کے تمام احکام میں سب سے مقدم یہ اصول ملحوظ رہتے تھے۔

﴿ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۸۵)

''خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا۔''

((لاصرورة في الاسلام))۔ ❺ ''اسلام میں جوگی پن نہیں ہے۔''

اسی بنا پر یہ آیت نازل ہوئی:

---

❶ دیکھو ابوداود، کتاب صلاۃ السفر صلوۃ الخوف: ۱۲۳۶؛ طبری، ج۳، ص: ۱۴۵۴ واقعات: ٤ ھ؛ ابن سعد، ج۲، ص: ٤۳۔ ❷ مسند ابن حنبل، ج ٦، ص: ٢٤٤۔

❸ ابو داود، کتاب الصیام، باب فی صوم یوم عاشوراء: ٢٤٤٢۔ ❹ یہ تمام واقعات صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب صیام یوم عاشوراء: ٢٠٠٢ تا ٢٠٠٤؛ صحیح مسلم، کتاب الصوم: ٢٦٣٧ تا ٢٦٦٦ اور ابوداود، کتاب الصوم، باب ما روی ان عاشوراء الیوم التاسع: ٢٤٤٥ میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔

❺ ابوداود، کتاب المناسك، باب لا صرورة فی الاسلام: ١٧٢٩؛ مسند احمد، ج ١، ص: ٣١٢۔

﴿ أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ ❶ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۸۷)

''روزے کی راتوں میں تمہارے لیے عورتوں سے لطف اٹھانا حلال کر دیا گیا ہے، جب تک صبح کی سپید لکیر (رات کی) سیاہ لکیر سے الگ نہ ہو جائے تم کھاتے پیتے رہو۔''

اہل عرب روزہ کے بہت کم خوگر تھے۔ اول اول روزہ ان پر شاق ہوا، ❷ اس لیے نہایت تدریج کے ساتھ روزہ کی تکمیل کی گئی۔ اول اول آنحضرت ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو سال میں تین روزے رکھنے کا حکم دیا، پھر روزے میں فرضیت نازل ہوئی تو یہ اختیار رہا کہ جو شخص چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے روزہ کے بدلے ایک غریب کو کھانا کھلا دے۔ رفتہ رفتہ جب لوگ روزے کے خوگر ہو چلے تو یہ آیت اتری۔

﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۸۵)

''جو رمضان کا مہینہ پائے، وہ ضرور روزہ رکھے۔''

اب بالیقین روزہ فرض ہو گیا اور فدیہ کی اجازت جاتی رہی البتہ جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو اس کے لیے یہ حکم ہوا کہ اس وقت روزہ چھوڑ دے اور ان کے بدلے کسی اور وقت قضا کر دے چونکہ اور تمام قوموں میں خصوصاً عیسائیوں میں رہبانیت بڑی فضیلت کی بات سمجھی جاتی تھی، اس لیے جو لوگ زیادہ خدا پرست تھے وہ روزہ میں زیادہ سختی برداشت کرتے تھے لیکن آنحضرت ﷺ وقتاً فوقتاً اس سے روکتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ سفر میں تھے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے گرد بھیڑ لگی ہوئی ہے اور اس پر لوگوں نے سایہ کر رکھا ہے، سبب پوچھا، معلوم ہوا سخت گرمی میں اس شخص نے روزہ رکھا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''سفر میں روزہ رکھنا کچھ ثواب کی بات نہیں۔'' ❸ بعض لوگوں نے صوم وصال رکھنا چاہا یعنی رات دن روزہ رکھیں بیچ میں افطار نہ کریں آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ ❹

روزہ کا مقصد عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا ثواب کی بات ہے، اس لیے آنحضرت ﷺ نے ہر طرح کی آسانیوں کا حکم دیا، سفر میں اور بیماری میں روزہ رکھنا فرض نہ تھا۔ راتوں کو صبح صادق تک کھانے پینے اور تمام اشغال کی اجازت تھی، سحر کھانے کی فضیلت بیان کی اور یہ بھی فرمایا کہ صبح کے قریب کھائی جائے تاکہ دن بھر قوت باقی رہے۔ ❺

روزہ کا مقصد صرف معاصی سے کفِ نفس تھا اور روزہ اس کا معین تھا اس لیے آنحضرت ﷺ نے

---

❶ ابو داود، کتاب الصیام، باب مبدء فرض الصیام: ۲۳۱۳، ۲۳۱۴ واسباب النزول للسیوطی، ص: ۲۷۔

❷ صحیح بخاری، میں ہے نزل رمضان فشق علیھم، کتاب الصوم، رقم الباب: ۳۹۔

❸ صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب قول النبی ﷺ لمن ظلل علیه: ۱۹۴۶۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب الوصال: ۱۹۶۲۔ ❺ بخاری کی شرح فتح الباری میں تاخیر سحر کی وجہ یہی بتائی گئی ہے۔ کتاب الصوم، باب قدر کم بین السحور، ج ٤، ص: ۱۱۹۔

فرمایا کہ ''جو شخص روزہ میں جھوٹ فریب نہیں چھوڑتا خدا کو اس کی فاقہ کشی کی کوئی حاجت نہیں۔'' ❶

زکوٰۃ

خیرات اور زکوٰۃ کی ترغیب اور تحریص اسلام میں ابتدا ہی سے معمول بہ تھی۔ مکہ میں جو سورتیں اتریں ان میں زکوٰۃ کا لفظ تصریحاً مذکور ہے اور خیرات نہ دینے والے پر نہایت عتاب ہے:

﴿ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ ﴾ (١٠٧/ الماعون: ١، ٣)

''تم نے اس شخص کو دیکھا جو قیامت کو جھٹلاتا ہے، یہی وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کے کھانا کھلانے کی لوگوں کو ترغیب نہیں کرتا۔''

مدینہ منورہ میں زیادہ تاکیدی آیتیں نازل ہوئیں۔ ۲ھ میں عید کے دن صدقہ فطر دینا واجب قرار پایا ❷ ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں عام مسلمان اور خصوصاً مہاجرین سخت فقر و فاقہ میں مبتلا تھے۔ حدیثوں میں صحابہ کے فقر و تنگ دستی کے جو واقعات کثرت کے ساتھ مذکور ہیں، اسی زمانہ کے ہیں، اس بنا پر یہ حکم ہوا کہ جس شخص کے پاس ضروری مصارف سے جو کچھ بچے سب کو خیرات کر دینا چاہیے، ورنہ عذاب ہوگا، چنانچہ خاص آیت نازل ہوئی: ❸

﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ (٩/ التوبة: ٣٤)

''جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں خیرات نہیں کرتے۔''

اس آیت کا بھی یہی مطلب ہے:

﴿ وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۝ قُلِ الْعَفْوَ ﴾ (٢/ البقرة: ٢١٩)

''لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات دیں کہہ دو کہ جو کچھ مصارفِ ضروری سے بچ رہے۔''

بہت سے لوگ خیرات کرتے تھے لیکن عمدہ مال کو محفوظ رکھتے تھے، بے کار، یا ردی چیزیں خیرات میں دیتے تھے، اس پر حکم ہوا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ﴾ (٢/ البقرة: ٢٦٧)

''مسلمانو! اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین میں پیدا کیا، اچھا حصہ خیرات دو۔''

مزید تاکید کے لیے یہ حکم ہوا کہ جو شخص اپنی محبوب چیز نہ دے گا، اس کو ثواب نہ ملے گا۔

❶ بخاری، کتاب الصوم، باب من لم یدع قول الزور: ١٩٠٣۔ ❷ طبری، ج٣، ص: ١٢٨١۔
❸ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قوله عزوجل: ﴿یوم یحمی علیها فی نار......﴾: ٤٦٦١۔

﴿ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۚ﴾ (۳/ آل عمران:۹۲)

''تم لوگ ثواب نہیں پا سکتے جب تک کہ وہ چیز خیرات نہ کرو جو تم کو عزیز ہے۔''

اب صدقہ اور خیرات کی طرف یہ عام رغبت پیدا ہوئی کہ جو لوگ نادار تھے وہ صرف اس لیے بازار میں جا کر مزدوری کرتے اور کندھوں پر بوجھ لاد کر لوگوں کے پاس پہنچاتے تھے کہ مزدوری ملے تو خیرات کریں۔ ❶ بااین ہمہ ۸ھ تک زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی۔ فتح مکہ کے بعد اس کی فرضیت ہوئی تو اس کے مصارف بیان کیے گئے اور آنحضرت ﷺ نے تمام ممالک مقبوضہ میں زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لیے (محرم ۹ھ میں) محصلین مقرر کیے ❷ زکوٰۃ کے مصارف حسب ذیل تھے:

﴿ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

(۹/ التوبۃ:۶۰)

''زکوٰۃ ان مصارف کے لیے ہے، فقراء، مساکین، زکوٰۃ کے وصول کرنے والے، مؤلفۃ القلوب، غلام، جن کو آزاد کرانا ہے، مقروض، مسافر اور خدا کی راہ میں، یہ خدا کا فرض ہے اور خدا علیم و حکیم ہے۔''

زکوٰۃ کی شرح نہایت تفصیل سے فرامین نبوی ﷺ میں منقول ہے فقہ میں کتاب الزکوٰۃ انہیں فرامین سے ماخوذ ہے۔

حج

دنیا میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا پرستی کے لیے عبادت گاہ عام بنایا اور تمام دنیا کو وہاں آ کر عبادت کرنے کی دعوت دی:

﴿ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْقَاۗىِٕمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰي كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ﴾

(۲۲/ الحج:۲۶۔۲۸)

''اور جب کہ ہم نے ابراہیم کے لیے کعبہ کی جگہ مقرر کر دی کہ ہمارے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ہمارے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع اور سجود کرنے والوں کے لیے پاک و صاف رکھ اور حج کی منادی کر دے تو لوگ ہر طرف سے دوڑے آئیں گے، کچھ پیدل اور کچھ

❶ بخاري، كتاب الزكوٰة، باب اتقوا النار ولو بشق تمرة: ١٤١٦۔

❷ طبری، مطبوعہ یورپ، ج ٤، ص: ١٧٢٢؛ ابن سعد، قسم اول، جزء ثاني مغازي، ص: ١١٥۔

اونٹنیوں پر سوار، تاکہ فائدہ اٹھائیں اور تاکہ ایام مقررہ میں خدا کا ذکر کریں۔‘‘

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت عام پر دنیا نے لبیک کہا اور ہر سال عرب کے دور دراز اطراف سے لوگ حج کو آتے تھے لیکن ایک طرف تو یہ افسوسناک انقلاب ہوا کہ جو گھر خالص توحید کے لیے تعمیر ہوا تھا، وہ تین سو ساٹھ بتوں کا تماشا گاہ بن گیا، دوسری طرف اس گھر کی تولیت کا سب سے زیادہ جس کو حق تھا وہ یہاں سے نکلنے پر مجبور ہوا اور پورے آٹھ برس تک ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکا۔ بالآخر ظہورِ حق کا وقت آیا، مکہ فتح ہوا اور جانشینِ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے متبعین کو موقع ملا کہ شعارِ ابراہیمی کو پھر زندہ کیا جائے، چنانچہ ۹ھ میں حج فرض ہوا، [1] تاہم آنحضرت ﷺ نے اس سال یہ فرض ادا نہیں کیا کہ عرب ننگے ہو کر طوافِ کعبہ کرتے تھے اور آنحضرت ﷺ ایسی بے حیائی کا منظر آنکھ سے دیکھنا گوارا نہیں فرما سکتے تھے، اس لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ایامِ حج میں روانہ کیے گئے کہ کعبہ میں جا کر منادی کر دیں کہ ’’آئندہ سے کوئی شخص عریاں ہو کر کعبہ کا طواف نہ کرنے پائے گا۔‘‘ [2]

ایک اور وجہ یہ تھی کہ نسی کے قاعدہ سے حج کا مہینہ ہٹتے ہٹتے ذوقعدہ میں آ گیا تھا، چنانچہ ۹ھ کا حج اسی مہینہ میں ادا ہوا، لیکن حج کا اصلی مہینہ ذوالحجہ تھا، اس لیے آنحضرت ﷺ نے ایک سال کا انتظار فرمایا اور اس وقت حج ادا کیا جب وہ اپنے اصلی مرکز پر آ گیا۔ [3]

حج کے اصلاحات

حج کی رسم اگرچہ کفار نے قائم رکھی تھی لیکن اس کی صورت بالکل بدل دی تھی اور اس میں اس قدر بدعات اضافہ کر دیئے تھے کہ وہ ثواب کے بجائے عذاب کا کام بن گیا تھا۔ سب سے مقدم یہ کہ حج اور تمام عبادات کا مقصد خدا کا ذکر اور توجہ الی اللہ ہے لیکن اہل عرب جب حج میں جمع ہوتے تھے تو خدا کے بجائے اپنے باپ دادا کے مفاخر اور کارنامے بیان کرتے تھے اس بنا پر یہ آیت اتری:

﴿فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾ [4]

(۲/ البقرۃ:۲۰۰)

’’پھر جب حج کے ارکان پورے کر لو تو خدا کا ذکر کرو، جس طرح اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر۔‘‘

---

[1] زاد المعاد، ج ۱، ص:۱۸۰۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب لا یحج البیت مشرك ولا یطوف بالبیت عریان:۳۲۸۷۔ [3] آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ الفاظ فرمائے تھے الزمان قد استدار کھیئته یوم خلق السموات والارض، السنة اثنا عشر شهرا، منها اربعة حرم ثلاثة متواليات ذوالقعدة وذوالحجة والمحرم ورجب مضر الذی بين جمادى وشعبان‘‘ اس سے اسی طرف اشارہ تھا۔ بخاری، کتاب المغازی، باب حجة الوداع:۴۴۰۶۔ [4] اسباب النزول للواحدی۔

خاص اہل مدینہ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ منات جو بت تھا، اس کا طواف کرتے تھے اور اس بنا پر جب کعبہ کا حج کرتے تھے تب بھی صفا و مروہ کا طواف نہیں کرتے تھے حالانکہ حج کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگاریں قائم رکھی جائیں اور صفا و مروہ کا طواف اسی عہد کی یادگار ہے، اسی بنا پر یہ آیت اتری:

﴿ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ ﴾ (۲/ البقرة:۱۵۸)

''صفا اور مروہ خدا کی یادگار ہیں، اس لیے جو شخص حج یا عمرہ کرے تو اس کو ان دونوں مقاموں کا بھی طواف کرنا چاہیے۔'' ❶

ایک طریقہ یہ جاری ہو گیا تھا کہ اکثر لوگ (آج کل کی طرح) جن کے پاس زادِ سفر نہیں ہوتا تھا، یوں ہی چل کھڑے ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل ہیں، ان لوگوں کو اکثر راہ میں گداگری اور دوستوں کی دستگیری کا محتاج ہونا پڑتا تھا، اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ﴾ ❷ (۲/ البقرة:۱۹۷)

''اور گھر سے زادِ سفر لے کر چلو، کیونکہ اچھا زادِ سفر تقویٰ ہے۔''

احرام حج میں سر کے بالوں کا منڈوانا یا ترشوانا منع ہے لیکن اس میں اہل جاہلیت نے بہت سختی کر دی تھی یہاں تک کہ بعض صاحبوں کے بالوں میں اس قدر جوئیں پڑ گئیں کہ بینائی جاتے رہنے کا خوف ہو گیا، تاہم وہ بال نہ ترشوا سکے۔ اسلام میں چونکہ سب سے مقدم یہ امر پیش نظر ہے کہ اس کی عبادات اور احکام تکلیف مالا یطاق نہ بن جائیں، اس لیے یہ حکم ہوا:

﴿ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ ﴾

(۲/ البقرة:۱۹۶)

''تو جو شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ عارضہ ہو تو وہ (اگر بال منڈا لے) تو فدیہ ادا کر دے یعنی یا روزہ یا خیرات یا قربانی۔''

قربانی جو کرتے تھے اس کا خون لے کر کعبہ کے در و دیوار پر ملتے تھے اور اس کو ثواب سمجھتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ❸

﴿ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۭ ﴾ (۲۲/ الحج:۳۷)

❶ قرآن مجید میں جناح کا جو لفظ ہے اس کا عام ترجمہ ''حرج'' یا ''نقصان'' ہے اس بنا پر ترجمہ یہ ہونا چاہیے کہ صفا اور مروہ کے طواف میں کچھ حرج نہیں لیکن لاجناح کا لفظ واجب اور مستحب کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ (بخاری: ۱۶۴۳)۔

❷ بخاری، کتاب الحج، باب قول الله تعالیٰ: وتزودوا فان خير الزاد التقوىٰ:۱۵۲۳۔ ❸ تفسیر بیضاوی، ج۲، ص: ۵۲ مطبع نول کشور ۱۲۸۲ھ (یہ رسم یہودیوں سے آئی تھی، لاویین ۱۷۔۶۔ تاریخ دوم ۲۹۔۲۲)

''خدا کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہاری پرہیز گاری اس تک پہنچتی ہے۔''

اس آیت میں صرف اس فعل سے نہیں روکا گیا بلکہ یہ بھی بتادیا گیا کہ قربانی خود کوئی مقصود بالذات چیز نہیں بلکہ اصل چیز جس کو خدا قبول کرتا ہے وہ تقویٰ اور پرہیز گاری ہے۔

رسومِ حج میں ایک بڑی چیز جو قریش نے اصولِ اسلام کے خلاف قائم کردی تھی، یہ تھی کہ وہ عرفات جو حج کا اصلی عبادت گاہ عام تھا، نہیں جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اہل حرم ہیں ہم حدودِ حرم سے باہر نہیں جاسکتے، یہ ہمارے خاندان کی توہین ہے، اس لئے وہ صرف مزدلفہ تک جا کر ٹھہر جاتے تھے، باقی تمام عرب عرفات میں جمع ہوتے تھے اور وہاں سے چل کر مزدلفہ اور منیٰ میں آتے تھے چونکہ اسلام کا اصول اصلی، مساوات عامہ ہے اور عبادت میں سب یکساں ہیں اس لیے حکم آیا کہ ❶

﴿ فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَٰتٍ فَٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ عِندَ ٱلْمَشْعَرِ ٱلْحَرَامِ ۖ وَٱذْكُرُوهُ كَمَا هَدَىٰكُمْ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِۦ لَمِنَ ٱلضَّآلِّينَ ۝ ثُمَّ أَفِيضُوا۟ مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ ٱلنَّاسُ وَٱسْتَغْفِرُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ ﴾ (۲/ البقرہ:۱۹۸۔۱۹۹)

''پھر جب عرفات سے لوٹو تو مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس خدا کا ذکر کرو، جس طریقہ سے اس نے تم کو ہدایت کی ہے اور اس سے پہلے بیشک تم گمراہ تھے، پھر وہیں سے چلو جہاں سے اور لوگ چلتے ہیں اور خدا سے معافی مانگو، وہ غفور اور رحیم ہے۔''

قربانی کے جانور کو چونکہ سمجھتے تھے کہ خدا پر چڑھا دیا گیا ہے، اس لیے اس پر سوار نہیں ہوتے تھے اور پیدل چلنے کی تکلیف گوارا کرتے تھے۔ یہ رسم اسلام کے آنے تک قائم رہی ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک صاحب کو سفر حج میں دیکھا کہ قربانی کے اونٹ کے ساتھ ہیں لیکن خود پیدل جارہے تھے، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ''سوار ہولو۔'' بولے، یہ قربانی کے اونٹ ہیں۔ آپ ﷺ نے دوبارہ فرمایا، انہوں نے دوبارہ وہی عذر کیا، آپ ﷺ نے زجر کے ساتھ حکم دیا کہ ''بیٹھ لو۔'' ❷

ایک قسم کا حج ایجاد کرلیا تھا، جس کو حج مُصْمِتْ کہتے تھے یعنی جو شخص حج کرتا تھا، وہ آغازِ حج سے اخیر تک منہ سے کچھ بولتا نہ تھا، اسلام نے اس تکلیف مالا یطاق سے منع کیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے احمس کی ایک عورت کو جس کا نام زینب تھا، دیکھا کہ کسی سے بات چیت نہیں کرتی، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ حج مُصْمِتْ کی نیت کی ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''یہ جائز نہیں، یہ زمانہ جاہلیت کی بات ہے۔'' ❸

(سب سے بڑی بے حیائی کی بات یہ تھی کہ قریش (حمس) کے سوا عام عرب مرد و زن کعبہ کا برہنہ

❶ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب ثم افیضوا من حیث افاض الناس: ۴۵۲۰۔ ❷ بخاری، کتاب الحج، باب رکوب البدن: ۱۶۸۹، ۱۶۹۰۔ ❸ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ایام الجاھلیۃ: ۳۸۳۴۔

طواف کرتے تھے۔ حدود حرم میں آ کر تمام لوگ اپنے اپنے کپڑے اتار ڈالتے تھے، اور عاریتاً کسی قریش سے کپڑے مانگ لیتے تھے، اگر نہ ملتے تو ننگے کعبہ کے گرد گھومتے تھے۔ عورتیں بھی اسی طرح ننگی طواف کرتی تھیں اور یہ شعر گاتی جاتی تھیں:

اَلْیَوْمَ یَبْدُوْ بَعْضُہٗ اَوْ کُلُّہٗ   وَمَا بَدَا مِنْہُ فَلَا اُحِلُّہٗ

''آج کچھ حصہ اس کا یا پورا کھلے گا   اور جو کھلا ہے اس کو میں حلال نہیں کرتی۔''

اس پر یہ آیت نازل ہوئی: [1]

﴿ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ (۷/ الاعراف:۳۱)

''اے آدم کے بیٹو! مسجدوں میں کپڑے پہن لیا کرو۔''

اس بنا پر ۹ھ میں آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیق کو بھیجا، انہوں نے عین موسمِ حج میں اعلان کیا کہ آئندہ کوئی برہنہ حج نہ کرنے پائے گا)۔ [2]

معاملات

شریعت کی تکمیل میں جو تدریج ملحوظ رہی، اس کے لحاظ سے وارثت، نکاح وطلاق وقصاص وتعزیرات (وغیرہ) کے احکام، بعثت سے بہت بعد آئے (سبب یہ ہے کہ ان احکام کے اجرا کے لیے ایک نافذ الامر قوت کی ضرورت تھی جو اب تک اسلام کو حاصل نہیں ہوئی تھی، غزوۂ بدر کے بعد سے اسلام کی سیاسی طاقت کا نشوونما شروع ہوا) ہجرت کے پہلے اور دوسرے سال میں جو احکام نازل ہوئے وہ تحویلِ قبلہ، فرضیتِ روزہ، زکوٰۃ فطر، نمازِ عید اور قربانی تھی، تیسرے سال سے جب اسلام کے کاروبار زیادہ پھیلنے شروع ہوئے تو سب سے پہلے توریث کا قانون قرآن مجید میں نازل ہوا۔

وراثت

(مسلمان جب ابتداءً مدینہ آئے ہیں تو اس وقت یہ حالت تھی کہ باپ مسلمان ہے تو بیٹا کافر ہے ایک بھائی کافر ہے تو دوسرا بھائی مسلمان ہے اس حالت میں اقربا اور اعزہ کی وراثت کا قانون کیونکر نافذ ہوسکتا تھا، اس لیے آنحضرت ﷺ جب مدینہ تشریف لائے، تو آپ نے مہاجرین اور انصار میں مواخاۃ (برادری) قائم کردی، جس کی رو سے یہ قاعدہ مقرر ہوگیا کہ کوئی انصاری مرتا تو اس کی وراثت مہاجرین کو ملتی [3] عرب

[1] یہ پورا واقعہ اور شانِ نزول نسائی، کتاب مناسك الحج، باب قوله عزوجل خذوا زينتكم عند كل مسجد: ۲۹۵۹ میں ہے۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الحج: باب لا يحج البيت مشرك: ۳۲۸۷ وصحیح بخاری، کتاب الحج، باب لا يطوف بالبيت عريانا: ۱۶۲۲ اور تمام حدیث کی کتابوں میں باب لا يطوف بالبيت عريانا میں مذکور ہے۔

[3] یہ مفسرین کا بیان ہے لیکن صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ حکم حسب ذیل آیت کریمہ سے منسوخ ہوا ﴿ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ ﴾ (۴/ النسآء: ۳۳) دیکھو صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر آیت مذکور: ۴۵۸۰۔

میں پہلے بھی دستور تھا کہ دو آدمی آپس میں عہد کر لیتے کہ ہم دونوں آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، ان میں سے جب کوئی مرتا تو دوسرا وارث ہوتا لیکن ۳ھ میں قرآن کی اس آیت نے اس قاعدہ کو منسوخ کر دیا:

﴿ وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ ﴾ (۸/ الانفال:۷۵)

''قرابت مند ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں۔''

اس کی رو سے مواخاۃ کی بنا پر وراثت موقوف ہوگئی اور خاندان اور ذوی الارحام میں وراثت محدود ہوگئی۔

(آیتِ توریث کے نزول سے پہلے قرآن نے وصیت کا قاعدہ جاری کیا تھا، یعنی مرنے والا اپنے مال و جائیداد کی نسبت یہ وصیت کر جاتا کہ اس میں سے اتنا اس کو دیا جائے اور اتنا اس کو ملے) مرنے کے بعد اسی طریقہ سے اس کی جائیداد تقسیم کر دی جاتی، مرنے سے پہلے ہر مسلمان پر اس وصیت کا مکمل کر جانا فرض تھا۔

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴾ (۲/ البقرہ:۱۸۰)

''مسلمانو! تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے اور وہ کچھ مال چھوڑنے والا ہو تو ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے بطریقِ مناسب وصیت کر جائے، متقی لوگوں پر یہ فرض ہے۔''

جو لوگ حالت مسافرت میں مر جاتے، ان کے لیے گواہی اور شہادت کا قانون قرآن میں مقرر کیا گیا۔ گواہی کو چھپانا یا بدل دینا قانوناً جرم تھا، چنانچہ سورۂ بقرہ اور مائدہ میں اس کی پوری تفصیل ہے۔ غزوۂ بدر کے بعد مسلمانوں کی تعداد میں کافی ترقی ہوتی گئی، خاندان کے خاندان مسلمان ہو گئے، اس لیے وراثت کے مخصوص قانون کی ضرورت ہوئی، پھر وصیت کے قاعدہ میں بڑی دقت یہ تھی کہ ناگہانی موت کے موقع پر تقسیم جائیداد کا کوئی اصول جاری کرنا ممکن نہ تھا، مثلاً: جہاد میں سینکڑوں مسلمان شریک ہوئے اب کس کو معلوم ہے کہ کس کو شہادت ہوگی اس حالت میں وصیت نہ کر جانے سے رشتہ داروں میں جس کا قابو چل جاتا وہ جائیداد پر قبضہ کر لیتا، چنانچہ غزوۂ احد میں یہی موقع پیش آیا۔ سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ جو بہت دولت مند صحابی تھے، (اس جنگ میں) شہید ہوئے ان کی بیوی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئیں کہ سعد رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں شہید ہوئے، انہوں نے دو لڑکیاں چھوڑیں ہیں، لیکن سعد کے بھائی نے سعد کی ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا

''خدا فیصلہ کرے گا'' (پھر غالباً ۴ھ میں) یہ آیت نازل ہوئی [1] جس میں وراثت کے تمام احکام مذکور ہیں:

﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ ﴾ (٤/ النسآء:١١)

''خدا تم کو تمہاری اولاد کی نسبت حکم دیتا ہے کہ لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ ملے (آخر تک)۔''

آنحضرت ﷺ نے سعد کے بھائی کو بلا کر فرمایا کہ سعد کے متروکہ میں سے دو تہائی ان کی بیٹیوں اور آٹھواں حصہ ان کی بیوی کو دو، اس کے بعد جو بچ رہے وہ تمہارا حق ہے۔ [2]

اہلِ عرب عورتوں کو وراثت سے محروم رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ وراثت اس کا حق ہے جو تلوار چلائے، دنیا کی اور اکثر قوموں میں بھی یہی دستور تھا۔ یہ پہلا دن ہے کہ اس صنفِ ضعیف کی دادرسی کی گئی۔

وصیت

احکامِ وراثت کے بعد بھی وصیت کی اجازت باقی رہی لیکن چونکہ اس سے مستحقین وراثت کی حق تلفی کا اندیشہ تھا، اس لیے وصیت کی تحدید کی ضرورت تھی ۱۰ھ میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ (عامر کے والد) بیمار ہوئے، آنحضرت ﷺ ان کی عیادت کو گئے، انہوں نے عرض کی کہ میں مر رہا ہوں اور میرے صرف ایک ہی لڑکی ہے، چاہتا ہوں کہ دو تہائی مال خیرات کر دوں، آنحضرت ﷺ نے اجازت نہیں دی، انہوں نے کہا تو نصف، آپ نے اس کو بھی قبول نہیں کیا، انہوں نے کہا: ایک تہائی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ بھی بہت ہے وارثوں کو غنی چھوڑ کر مرنا اس سے اچھا ہے کہ وہ بھیک مانگتے پھریں۔'' [3] تاہم یہ مقدار آپ نے جائز رکھی اس وقت سے وصیت ایک ثلث سے زیادہ ممنوع ہوگئی۔

وقف

وقف، شریعت کا بہت بڑا مسئلہ ہے، اسلام نے اس مسئلہ کو جس حد تک صاف کیا اس کا دوسرے مذاہب کے قوانین میں شائبہ تک موجود نہیں ہے۔ اسی بنا پر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں دعویٰ کیا

---

[1] آیت میراث کے شانِ نزول میں احادیث میں تین واقعے مروی ہیں۔ اول یہ کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ ۱۰ھ میں بیمار پڑے تو آیت اتری۔ یہ روایت تمام صحاح ستہ میں ہے، لیکن درحقیقت اس روایت میں راویوں سے کسی قدر مسامحت ہوئی ہے، کیونکہ وراثت ۱۰ھ سے پہلے جاری ہو چکی تھی اور دوسرے یہ کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اس وقت تک لاولد تھے، اس لیے صحیح یہ ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا واقعہ وراثت کی ایک خاص صورت لاولدیت یعنی (کلالہ) سے متعلق ہے جیسا کہ مسلم کی دوسری روایتوں (کتاب الفرائض، باب میراث الکلالۃ: ٤١٤٥ تا ٤١٤٨) میں اس کی تصریح ہے دوسرا شانِ نزول یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے بھائی عبدالرحمن کی وفات کے بعد ان کی بیوی ام کحہ کی فریاد پر یہ آیت اتری: یہ روایت طبری وغیرہ کی ہے (تفسیر ابن جریر، ج ۴، ص: ۱۷۱ مطبع میمنیہ مصر) جو گو ضعیف ہے لیکن بالکل ممکن ہے کہ سعد بن ربیع کے علاوہ اور واقعے بھی اس قسم کے پیش آئے ہوں ... شانِ نزول یہی سعد بن ربیع کا واقعہ ہے جو ابو داود، کتاب الوصایا، باب ماجاء فی میراث الصلب: ٢٨٩١؛ ترمذی، (٢٠٩٢)؛ حاکم، (٤/ ٣٣٣) اور مسند احمد (٣/ ٣٥٢) میں مذکور ہے۔ ''س''

[2] اسد الغابۃ، ج ٢، ص: ٢٧٨۔

[3] بخاری، کتاب الوصایا، باب ان یترك ورثته اغنیاء: ٢٧٤٢۔

ہے کہ اسلام طریقۂ وقف کا موجد ہے۔ ❶ اسلام میں وقف کی تاریخ نہایت قدیم ہے، آنحضرت ﷺ نے ہجرت کے پہلے ہی سال مدینہ میں مسجد نبوی کی بنیاد جس زمین میں رکھی تھی وہ دو یتیموں کی ملکیت تھی، آپ ﷺ نے قیمت دینی چاہی لیکن انہوں نے کہا:

لا واللہ لا نطلب ثمنہ الا الی اللہ۔ ❷ ''نہیں ہم خدا کی قسم! قیمت نہ لیں گے ہم اس کی قیمت خدا ہی سے لیں گے۔''

یہ اسلام کا پہلا وقف تھا اور نہایت سادہ صورت میں تھا، چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو وقف مشاع (مشترکہ جائیداد کا وقف) کے ثبوت میں لائے ہیں، اس کے بعد ۴ھ یا ۵ھ میں جب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ (۳/ آل عمران: ۹۲)

''تم نیکی اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک وہ خدا کی راہ میں نہ دے دو جو تم کو سب سے محبوب ہے۔''

تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ صحابی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! بیرحا ❸ مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے، میں اس کو خدا کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں اور اس کا ثواب اور اجر خدا سے چاہتا ہوں، آپ جس مصرف میں چاہیں اس کو رکھیں۔ چنانچہ آپ کے مشورہ سے انہوں نے اس کا منافع اپنے اعزہ پر وقف کیا۔ ❹

اب تک وقف کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے تھے وہ صرف یہ تھے کہ ''وہ ذاتی تصرف سے نکال کر خدا کی ملکیت میں دیا گیا'' لیکن ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے بعد اس کی حقیقت بالکل واضح کر دی گئی۔ خیبر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک زمین ملی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو وقف کرنا چاہا، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے فرمایا:

((ان شئت حبست اصلها وتصدق بها)) ❺ ''اگر چاہو اصل جائیداد باقی رکھو اور منافع صدقہ کرو۔''

یہ ان شرائط کے ساتھ وہ جائیداد وقف ہوئی:

انہ لا یباع اصلها ولا یوهب ولا یورث۔

''اصل جائیداد نہ بیچی جائے نہ ہبہ کی جائے اور نہ وراثت میں بانٹی جائے۔''

نکاح وطلاق

نکاح کے متعلق جو اصلاحی احکام آئے ان کی تفصیلات اصلاحات کے عنوان کے نیچے آئے گی، یہاں

❶ حجۃ اللہ البالغۃ، الوصیۃ والوقف، ص: ۳۰۴۔ ❷ بخاری، کتاب الوصایا، باب وقف الارض للمسجد: ۲۷۷٤۔ ❸ ایک زمین کا نام ہے جو مدینہ میں واقع تھی۔ ❹ بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب الزکوٰۃ علی الاقارب: ۱٤٦۱؛ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ والصدقۃ علی الأقربین ...: ۲۳۱۵۔

❺ یہ تمام حدیثیں بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الوقف: ۲۷۳۷ میں ہیں۔

صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں کئی قسم کے نکاح کے طریقہ جاری تھے، جن میں سے ایک کے سوا، سب زنا کے مشابہ تھے۔ سب سے پہلے اسلام نے ان کو ناجائز ٹھہرایا۔ متعہ (محدودالوقت نکاح) جو زمانۂ جاہلیت سے چلا آتا تھا، بار بار حرام اور حلال ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ۷ھ غزوۂ خیبر میں قطعاً حرام ہو گیا ❶ اگرچہ اس پر بھی اس کی ضرورت پیش آئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں منبر پر کہا کہ ''میں متعہ کو حرام کرتا ہوں۔'' یعنی متعہ کی حرمت جو اچھی طرح اب بھی ملک میں شائع نہیں ہوسکی میں آج اس کا اعلان کرتا ہوں۔ ❷

نکاح اور طلاق کے دیگر احکام مثلاً: محرماتِ شرعی کا بیان، منہ بولے بیٹے کی بیوی کا حرام نہ ہونا، کثرتِ ازواج کی تحدید، تعدادِ طلاق کی تعیین، زمانۂ عدت کا بیان، مہر کا ضروری ہونا، ظہار یعنی ایک طریقہ طلاق جس میں اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دیتے تھے اور لعان یعنی شوہر کا اپنی بیوی کی عصمت پر شبہ کرنا اور باہم اپنی سچائی اور دوسرے کی دروغ گوئی کا دعویٰ کرنا، یہ تمام تفصیلیں اصلاحات کے تحت میں آئیں گی، یہاں صرف اس قدر بتادینا کافی ہے کہ یہ تمام احکام قرآن مجید میں مذکور ہیں، اور ان کے نزول کا زمانہ ۴ھ اور ۵ھ ہجری ہے۔

حدود وتعزیرات

دنیا ❸ کے مادی خزانہ میں انسان کی جان سے زیادہ کوئی قیمتی شے نہیں۔ حدود اور تعزیرات کے اکثر قوانین، ہجرت کے چند برس بعد نازل ہوئے لیکن انسان کی جان کی حرمت کا حکم مکہ ہی میں اتر چکا تھا۔ معراج کے سلسلہ میں جو اخلاقی احکام بارگاہ الٰہی سے عطا ہوئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۖ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل:۳۳)

''خدا نے جس جان کو حرام کیا ہے اس کو ناحق نہ مارو، اور جو ناحق مارا جائے تو اس کے وارث کو ہم نے اختیار دیا، چاہیے کہ وہ قصاص میں زیادتی نہ کرے، اس کی مدد کی جائے۔''

عرب میں اسلام سے پہلے بھی قتل وقصاص کے کچھ قوانین موجود تھے۔ یہود جو اس ملک میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، تورات کے حدود وتعزیرات کا مجموعہ ان کے پاس بھی موجود تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عرب میں چونکہ منتظم حاکمانہ طاقت اور اخلاقی روح نہ تھی، اس لیے وہ ان احکام کا نفاذ نہیں کر سکتے تھے۔ مدینہ پہنچنے کے ساتھ ہی یہود نے فصلِ مقدمات کے لیے بارگاہِ نبوت کی طرف رجوع کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مقدمات عموماً تورات کے احکام کے مطابق فیصل کردیتے تھے۔

---

❶ بخاری، کتاب النکاح، باب نھی النبی ﷺ عن نکاح المتعة اخیرا: ۵۱۱۵؛ مسلم، کتاب النکاح، باب نکاح المتعة: ۳۴۳۳؛ ترمذی، ابواب النکاح، باب فی تحریم المتعة: ۱۱۲۱۔

❷ ابن ماجه، کتاب النکاح :۱۹۶۳؛ مسلم: ۳۴۱۶ (میں اس مفہوم کی روایات ہیں) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ تلخیص الحبیر:۳/ ۱۵۴۔ ❸ اضافہ تا ختم باب حلال وحرام۔

عرب میں ایک شخص کا قتل صدہا قبائل کی خانہ جنگی کا سلسلہ چھیڑ دیتا تھا، اس لیے غزوۂ بدر کے بعد جب اسلام کے بازوؤں میں حاکمانہ زور آ چلا تھا قصاص کا حکم نازل ہوا۔ یاد ہوگا کہ اطراف مدینہ میں بنوقریظہ اور بنونضیر دو یہودی قبائل رہتے تھے۔ ان دونوں میں بنونضیر معزز سمجھے جاتے تھے اس لیے کوئی قریظی اگر کسی نضیری کو قتل کر ڈالتا تو اس کو بنونضیر مار ڈالتے تھے اور اگر کسی نضیری کے ہاتھ سے کوئی قریظی قتل ہو جاتا تو چھوہاروں کے سو وسق خون بہا دے دیتے۔ مدینہ میں آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کے بعد اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، لوگوں نے اس کا مرافعہ آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا، اس پر سورۂ مائدہ کی چند آیتیں اتریں، ان میں سے ایک آیت یہ ہے: [1]

﴿ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ﴾ (٥/ المآئدة:٤٥)

''ہم نے ان کو تورات میں حکم دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور زخموں کے بدلے ویسے ہی زخم۔''

یہ حکم گو یہودیوں کے لیے تھا لیکن ایک اور آیت نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا:

﴿ يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ﴾ (٢/ البقرة: ١٧٨)

''مسلمانو! تم پر مقتولین میں مساوات اور برابری کا حکم دیا جاتا ہے۔''

اس حکم نے مساوات اور عدل کے پلے کو دنیا میں ہمیشہ کے لیے برابر کر دیا۔ یہودیوں میں خون بہا (دیت) کا قانون نہ تھا [2] لیکن عرب میں یہ قانون تھا اور اسلام نے چند اصلاحات کے ساتھ اس کو باقی رکھا:

﴿ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَآءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ﴾

(٢/ البقرة:١٧٨)

''اس کے بھائی (یعنی اولیائے مقتول) کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے، تو اس کی پابندی خوبی کے ساتھ کرنا اور بطور احسن اس کو ادا کر دینا چاہیے۔''

اب تک قتل عمد اور قتل شبہ (یعنی غلطی سے قتل) میں کوئی تفریق نہ تھی ۶ھ میں ایک مسلمان غلطی سے ایک مسلمان کے ہاتھوں مارا گیا، ایک اور مسلمان انصاری کے ہاتھ سے ایک قریشی قتل ہوا، آنحضرت ﷺ نے مقتول کے بھائی کو خون بہا دے کر راضی کر لیا، اس کے بعد وہ منافقانہ اسلام لایا اور غداری سے انصاری کو قتل کر کے قریش میں جا کر مل گیا۔ ان واقعات کی بنا پر قتل شبہ کے متعلق متعدد احکام نازل ہوئے:

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ

---

[1] ابو داود، کتاب الديات، باب النفس بالنفس: ٤٤٩٤۔

[2] صحيح بخاري، كتاب التفسير، باب: يايها الذين امنوا كتب عليكم القصاص: ٤٤٩٨۔

وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَھُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَھْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِــيْمًا حَكِـيْمًا ۝ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَــزَاۗؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْھَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:٩٢، ٩٣)

’’کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ کسی دوسرے مسلمان کو مار ڈالے لیکن غلطی سے، اگر کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کیا تو ایک مسلمان غلام آزاد اور خون بہا اس کے وارثوں کو ادا کرنا چاہیے لیکن یہ کہ وہ معاف کریں تو خیر، اگر مقتول خود مسلمان ہو، وہ کسی دشمن قوم سے تو صرف ایک غلام آزاد کرو اور اگر ایسی قوم سے ہو جس سے تم نے معاہدہ کیا ہو تو خون بہا دینا اور ایک غلام آزاد کرنا چاہیے، اگر قاتل کو یہ مقدور نہ ہو تو پے در پے دو مہینے کے روزے رکھنے چاہیں کہ خدا اس کی طرف رجوع ہو خدا علم اور حکمت والا ہے اور جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا دوزخ ہے، ہمیشہ اس میں رہے گا خدا اس پر اپنا غضب اور لعنت بھیجے گا اور اس کے لیے بڑا عذاب اس نے مہیا کیا ہے۔‘‘

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ قصاص وقتل کے متعلق یہ سب سے آخری حکم ہے۔ حفاظتِ جان کا اعلان فتح مکہ کے موقع پر ہوا، جب آپ نے ارشاد فرمایا کہ ’’زمانۂ جاہلیت کے تمام خون میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں۔‘‘ اس کے بعد قتل خطا مشابہ بہ قتل عمد کے خون بہا کی تحدید فرمائی [1] قتل خطا کا خون بہا اہل قریہ کے لیے ۴۰۰ دینار مقرر کیا۔ [2]

۶ھ تک رہزنوں کے لیے کوئی حد مقرر نہ تھی ۔ ۶ھ میں عکل وعرینہ کے قبیلہ کے کچھ لوگ مدینہ آ کر مسلمان ہوئے، یہاں کی آب وہوا ان کو راس نہ آئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر سے باہر چراگاہ میں ان کو قیام کی اجازت دی۔ ایک موقع پر مسلمان چرواہوں کو طرح طرح سے عذاب دے کر بڑی بے رحمی سے مار ڈالا اور مویشی لوٹ کر لے گئے، وہ گرفتار ہو کر آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو اسی طرح عذاب کے ساتھ قتل کا حکم دیا، گو یہ برابر کا انتقام تھا، تاہم اس میں کسی قدر بے رحمی تھی، اس لیے خدائے پاک کی طرف سے عتاب ہوا اور ڈاکوؤں کے لیے علیحدہ احکام نازل ہوئے: [3]

﴿ اِنَّمَا جَزٰۗؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُـقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ﴾

(٥/ المآئدة:٣٣)

[1] ابو داود، کتاب الدیات، باب فی دیة الخطأ شبه العمد: ٤٥٤٧۔ [2] ابو داود، دیات الاعضاء: ٤٥٦٤۔

[3] ابو داود، کتاب الحدود، باب ما جاء فی المحاربة ٤٣٦٤؛ بخاری: ٢٣٣۔

''ان لوگوں کی سزا جو خدا اور اس کے رسول سے لڑائی لڑتے ہیں اور ملک میں فساد مچاتے ہیں یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا پھانسی دیے جائیں یا ان کے ادھر کے ہاتھ اور ادھر کے پاؤں کاٹ ڈالے جائیں یا ملک سے الگ کر دیے جائیں (یعنی قید ہوں یا جلاوطن کیے جائیں)۔''

جان کے بعد مال کا درجہ ہے، اسلام سے پہلے عرب میں چوروں کے لیے قطع ید کی سزا جاری تھی، اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا ﴿اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا﴾ ۸ھ میں فتح مکہ کے موقع پر قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے اس جرم کا ارتکاب کیا، چونکہ وہ ایک شریف خاندان سے تھی اس لیے مسلمانوں میں بڑا اضطراب پیدا ہوا، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما آنحضرت ﷺ کے بہت چہیتے تھے، ان سے سفارش کرائی گئی، آپ ﷺ بہت برہم ہوئے اور لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا، جس میں فرمایا کہ ''تم سے پہلے لوگوں کی ہلاکت کا یہی سبب ہوا کہ وہ نیچے طبقہ کے لوگوں پر تو احکام جاری کرتے لیکن اوپر درجہ کے لوگ جب جرم کا ارتکاب کرتے تو ان سے درگزر کرتے، خدا کی قسم! اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا۔'' اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں نے بے چون و چرا اس حکم کی تعمیل کی۔ [1]

عربوں میں زنا کی کوئی سزا مقرر نہ تھی، یہودیوں میں تورات کی رو سے زانی کی سزا ''رجم'' یعنی (سنگسار کرنا) مقرر تھی لیکن اخلاقی کمزوری کی بنا پر اس قانون کو جاری نہیں رکھ سکے تھے۔ اطراف مدینہ میں جو یہودی آباد تھے، رجم کے بجائے انہوں نے یہ سزا مقرر کی تھی کہ مجرم کے منہ میں کالک لگا کر کوچہ و بازار میں اس کی تشہیر کرتے تھے۔ جب آنحضرت ﷺ مدینہ تشریف لائے تو انہوں نے ایک مجرم کا مقدمہ آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا، غالباً یہ ۳ھ کے اندر کا واقعہ ہے۔ آپ ﷺ نے استفسار فرمایا کہ تمہاری شریعت میں اس جرم کی کیا سزا ہے؟ انہوں نے اپنا رواج بتایا، آپ ﷺ نے تورات منگوا کر ان سے پڑھوایا، انہوں نے رجم کی آیت پر انگلی رکھ کر چھپا دی، آخر ایک مسلمان یہودی نے نکال کر وہ آیت سنائی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''خداوندا! یہ تیرا حکم ہے جس کو ان لوگوں نے مردہ کر دیا ہے، میں سب سے پہلا شخص ہوں جو تیرے اس حکم کو زندہ کروں گا۔'' [2] چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے سنگسار کرنے کا حکم دیا اور وہ سنگسار کیا گیا۔

۵ھ میں سورۂ نور نازل ہوئی جس میں زنا کی سزا سو (۱۰۰) درے قرار دی گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رجم کی سزا بھی قرآن نے باقی رکھی تھی اس کی تلاوت منسوخ ہو گئی [3] بہر حال احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بن بیاہے کے سو (۱۰۰) درے اور بیاہوں کے لیے رجم کا حکم ہے۔ [4] چنانچہ ۷ھ میں ایک مسلمان نے اس جرم کا ارتکاب کیا اور گو لوگوں کو اس کا علم نہ تھا لیکن دنیا کی سزا کو آخرت کے عذاب پر اس نے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء: ۳۴۷۵۔ [2] ابو داود، کتاب الحدود، باب فی رجم الیھودیین: ۴۴۴۷، ۴۴۴۶۔ [3] صحیح بخاری، کتاب المحاربین، باب رجم الحبلی فی الزنا اذا احصنت: ۶۸۳۰۔
[4] تمام کتب حدیث میں یہ مذکور ہے۔

ترجیح دی اور مجمع عام میں آ کر بارگاہِ نبوت ﷺ میں عرض پرداز ہوا کہ ''یارسول اللہ! میں گناہ گار ہوں! مجھے پاک کیجئے۔'' آپ ﷺ نے تحقیق فرمائی اور اس کے رجم کا حکم دیا۔ ❶

شراب ۵ھ میں حرام ہوئی، آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں شراب خوری کی کوئی خاص سزا مقرر نہ تھی، چالیس درے تک لوگوں کو اس جرم میں مارے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں اسی (۸۰) درے کردیے تھے۔ ❷ قذف یعنی پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے کی سزا ۵ ھ میں نازل ہوئی: ❸

﴿ وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا ﴾ (۲۴/ النور: ۴)

''جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں پھر چار گواہ نہ لاسکیں تو ان کو اسی درے مارو اور پھر کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔''

دنیا میں تین چیزیں ہیں، جان، مال اور آبرو، جن حدود وتعزیرات کا اوپر ذکر ہوا، وہ انہی تین چیزوں کے تحفظ کے لیے ہیں، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ان قوانین کے نزول کے بعد، ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر حرم کے اندر ماہِ حرام کی تاریخوں میں فرمایا۔

''مسلمانو! ہر مسلمان کی جان، مال اور آبرو اسی طرح قابلِ حرمت ہے جس طرح اس محترم شہر میں اس احاطہ حرم کے اندر، یہ مقدس دن قابل حرمت ہے۔'' ❹

حلال وحرام

ماکولات میں حلال وحرام

عرب میں کھانے پینے میں کسی چیز کا پرہیز نہ تھا اور نہ کوئی شے حلال یا حرام تھی، مردار اور حشرات الارض تک کھاتے تھے البتہ بعض بعض جانور جن کو بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے ان کا ذبح کرنا گناہ سمجھتے تھے بعض جانوروں میں یہ نذر مانتے تھے کہ مرد کھاسکتے ہیں، عورتیں نہیں، اگر بچہ مردہ پیدا ہوا تو مرد وعورت دونوں کھاسکتے ہیں اور زندہ ہو تو صرف مرد کھائیں، اسی قسم کے اور بعض بت پرستانہ رسوم تھے سورۂ انعام میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی ان رسوم کا بہ تفصیل ذکر ہے، اسلام کے اکثر احکام گو مدینہ میں اترے لیکن ماکولات کی حلت وحرمت کے احکام مکہ ہی میں اترنے شروع ہوچکے تھے، چنانچہ سورۂ انعام میں مشرکین کے ان رسوم کی

---

❶ بخاری، کتاب المحاربین، باب رجم المحصن: ۶۸۱۴۔ ۵ھ کی تحدید میں کہیں بہ تفصیل مذکور نہیں ہے یہ سنہ اس قیاس سے شارحینِ حدیث نے اختیار کیا ہے کہ اس وقت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مدینہ میں موجود تھے اور یہ ثابت ہے کہ وہ اسی سال بزمانہ فتح خیبر مدینہ میں آئے تھے۔ ❷ ابو داود، کتاب الحدود، باب اذا تتابع فی شرب الخمر: ۴۴۸۸، ۴۴۸۹۔

❸ واقعہ افک اسی سال ہوا تھا اور یہ آیت اسی تعلق سے نازل ہوئی ہے اس لیے اس کے لیے ۵ھ کا زمانہ متعین کیا گیا۔

❹ بخاری، کتاب المغازی، باب حجۃ الوداع: ۴۴۰۶۔

تردید کے بعد یہ حکم آیا:

﴿ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ . (٦/ الانعام:١٤٥)

''کہہ دے کہ مجھ پر جو وحی اتری ہے، اس میں کسی کھانے والے پر کوئی شے حرام نہیں ہے۔ ہاں اگر حرام ہے تو مردار یا بہتا ہوا خون یا سور کا گوشت کیونکہ یہ چیزیں ناپاک ہیں یا وہ گناہ کا جانور جو غیر خدا کے نام پر چڑھایا جائے وہ بھی حرام ہے لیکن جو بھوک سے لاچار ہو کر، نافرمانی اور گناہ کے ارادہ سے نہیں، ان میں سے کچھ کھا لے تو تیرا پروردگار معاف کرنے والا اور رحم والا ہے۔''

مشرکین کو سب سے زیادہ تعجب اس پر ہوا کہ جو آپ سے مر جائے اس کو حرام کہتے ہیں اور جس کو خود اپنے ہاتھ سے ماریں اس کو حلال جانتے ہیں حالانکہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس پر یہ آیت اتری:

﴿ فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ ﴾ (٦/ الانعام:١١٨، ١١٩)

''جو جانور خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو وہ کھاؤ، اگر تم اس کے احکام پر ایمان لاتے ہو۔ جو خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا وہ کیوں نہ کھاؤ، خدا نے تم پر جو حرام کیا ہے اس کو تو وہ بیان ہی کر چکا۔''

اس کے بعد مکہ معظمہ ہی میں سورۂ نحل کی آیت ﴿ فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ﴾ (١٦/ النحل:١١٤) نازل ہوئی جس میں اسی حکم سابق کا اعادہ کیا گیا اور یہی چار چیزیں مردار، خون، سور اور بتوں پر چڑھاوے حرام بیان کی گئیں۔ مدینہ طیبہ آ کر پہلے سورۂ بقرہ میں ﴿ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ ﴾ (٢/ البقرۃ:١٧٣) تیسری بار یہ محرمات اربعہ بیان کیے گئے۔ عرب میں حلال و حرام کی تمیز کم تھی، وحشت و جہالت کے علاوہ اس کا ایک سبب عام غربت اور افلاس تھی، اس لیے مسلمانوں کی مالی حالت جیسے جیسے درست ہوتی جاتی تھی حلال و حرام کی تفریق بڑھتی جاتی تھی، لوگ عموماً مردار اسی کو سمجھتے تھے جو بیمار ہو کر اپنی موت سے مر جائے، اس لیے اگر اور کسی سبب سے جانور مر جاتا تو اس کو حرام نہ سمجھتے، ہجرت کے چار پانچ سال کے بعد سورہ مائدہ میں مردار (میتہ) کی تفصیل بیان کی گئی، یعنی یہ کہ یا وہ گلا گھٹنے سے مرا ہو ''والمنخنقة'' یا گردن ٹوٹنے سے مرا ہو، ''الموقوذة'' یا اوپر سے گر کے مرا ہو، ''والمتردية'' یا کسی جانور کا سینگ لگ کر مر گیا ہو، ''والنطيحة'' ۔ یا کسی جانور نے اس کو پھاڑ ڈالا ہو ''وما اكل السبع'' صرف وہ جانور حلال ہے جس کو تم نے ذبح کیا الا ماذكيتم۔

۷ھ میں جب مسلمانوں کو خیبر کی فتوحات اور جاگیریں ہاتھ آئیں تو جانوروں میں بھی حلال و حرام کی تفریق کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ آج سے گدھا، درندہ جانور اور پنجہ دار پرند حرام ہیں۔ ۸ھ میں فتح مکہ

کے بعد طے کے قبیلہ نے جو عیسائی تھا، اسلام قبول کیا اور شام کے بعض عیسائی مسلمان ہوئے یہ لوگ شکاری کتے پالتے تھے اور ان سے شکار کرتے تھے۔ اسلام لانے پر ان کو معلوم ہوا کہ مردہ جانور حرام ہیں، انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اپنا حال عرض کیا، اس پر یہ آیت اتری: ❶

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ ﴾ (۵/ المآئدة:۴)

''تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا کہہ دے کہ تمام ستھری چیزیں۔''

اس کے بعد یہ تفصیل ہے کہ شکاری جانور اگر سدھے ہوئے ہوں اور خدا کا نام لے کر چھوڑے جائیں تو ان کا شکار کیا ہوا کھانا حلال ہے۔ ❷

شراب کی حرمت

مخالفین کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے اکثر احکام (مثلاً: تعداد ازواج وغیرہ) نفس پرستی کے مؤید تھے اس لیے عرب کو اس کے قبول کرنے میں کوئی ایثار درکار نہ تھا، بلکہ اسلام وہی کہتا تھا جو وہ خود چاہتے تھے، اس بحث کی تحقیق آگے آئے گی، یہاں صرف تاریخی حیثیت سے شراب کی حرمت کا واقعہ ذکر کرنا مقصود ہے۔

عرب کو شراب سے بڑھ کر کوئی چیز محبوب نہ تھی، تمام ملک اس مرض میں مبتلا تھا، عرب کی شاعری کا موضوع اعظم شراب ہے، مصلحت کے لحاظ سے اسلام کے تمام احکام بتدریج آئے ہیں، اس لیے شراب بھی بتدریج حرام کی گئی۔

مدینہ میں شراب خوری کا رواج کسی قدر زیادہ تھا، بڑے بڑے شرفا اعلانیہ شراب پیتے تھے، عرب میں ایسے بھی نیک لوگ تھے جنہوں نے شراب پینی چھوڑ دی تھی اور اس کو خلاف اتقا سمجھتے تھے ابھی تک اسلام نے اس کے متعلق کوئی اپنا فیصلہ نہ سنایا تھا۔ لوگوں نے پوچھنا شروع کیا کہ شراب کے متعلق کیا حکم ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

اللّٰهم بين لنا في الخمر بيانا شافيا۔ ❸

''اے خدا! شراب کے بارے میں ہمارے لیے شافی بیان کر دے۔''

اس پر یہ آیت اتری:

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ ﴾ (۲/ البقرہ:۲۱۹)

---

❶ یہ واقعہ لباب النقول فی اسباب النزول علامہ جلال الدین سیوطی، برحاشیہ تفسیر القرآن العظیم، ج۱ص:۱۰۰ پر درج ہے۔
❷ حوالوں کے لیے ان آیتوں کے شان نزول تفسیروں میں دیکھو تفسیر ابن كثير، تفسير سورة المائدة: ٤۔
❸ فتح الباري، ج٨، ص:٢١٠۔

''لوگ تم سے شراب اور جوئے کی بابت پوچھتے ہیں کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدے بھی ہیں لیکن فائدہ سے گناہ بڑھ کر ہے۔''

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے رہے۔ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علی اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما کی دعوت کی جس میں شراب بھی تھی کھانے کے بعد مغرب کا وقت آ گیا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی لیکن نشہ کے خمار میں کچھ کا کچھ پڑھ گئے۔(حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر دعا کی کہ خدایا شراب کے بارے میں صاف صاف بیان کردے) اس پر یہ آیت اتری:

﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ (٤/ النسآء:٤٣)

''نشہ کی حالت میں تم نماز نہ پڑھو، یہاں تک کہ جو تم کہو اس کو سمجھ بھی سکو۔''

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب نماز کا وقت آتا تھا، تو آنحضرت ﷺ کے حکم سے ایک منادی اعلان کرتا تھا کہ ''کوئی مخمور نماز میں شامل نہ ہونے پائے'' لیکن چونکہ عام حکم نہ تھا، اس لیے نماز کے سوا باقی اوقات میں لوگ بے تکلف پیتے پلاتے تھے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر وہی دعا کی۔ [1] اسی زمانہ میں کچھ لوگ شراب پی کر اس قدر بدمست ہوئے کہ آپس میں مار پیٹ تک نوبت پہنچ گئی، [2] اس پر یہ آیت اتری: [3]

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۝ ﴾(٥/ المائدۃ:٩٠، ٩١)

''مسلمانو! بے شبہ شراب اور جوا اور بت اور قمار کے تیر ناپاک ہیں اور شیطان کے کام ہیں، تو تم اس سے باز آؤ کہ تم کو فلاح حاصل ہو، شیطان تو صرف یہ چاہتا ہے کہ تم لوگوں میں شراب اور جوئے کے ذریعہ سے دشمنی اور بغض ڈال دے اور تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو بولو! تم باز آتے ہو؟''

(ان آیتوں کے نزول کے بعد شراب قطعاً حرام ہوگئی) اسی وقت آنحضرت ﷺ نے مدینہ کی گلی کوچوں میں منادی کرادی کہ آج سے شراب حرام ہے، لیکن بایں ہمہ شراب کی تجارت اور خرید و فروخت جاری تھی ۸ھ میں یہ بھی حرام ہوگئی۔آپ ﷺ نے مسجد نبوی میں لوگوں کو جمع کر کے اس کا اسی وقت اعلان کیا۔ [4] اس کے بعد اسی سال فتح مکہ کے زمانہ میں آپ نے علی الاعلان ان چیزوں کی تجارت کی ممانعت

[1] یہ پورا واقعہ ابو داود، کتاب الاشربۃ، باب تحریم الخمر: ٣٦٧٠ میں مذکور ہے۔ [2] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب فی فضل سعد بن وقاص: ٦٢٣٨۔ [3] ابوداؤد میں پوری آیتیں مذکور نہیں ہیں بلکہ چند الفاظ نقل کر کے پوری آیت کی طرف اشارہ کردیا ہے (رقم الحدیث: ٣٦٧٢)۔ [4] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب یمحق اللہ الربو: ٤٥٤١ وصحیح مسلم، کتاب البیوع، باب تحریم بیع الخمر: ٤٠٤٧ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اواخر سورۂ بقرہ کے نزول کے بعد جس میں حرمت ربوا کا حکم ہے یہ اعلان فرمایا، یہ آیتیں ۸ھ میں نازل ہوئی ہیں۔''س''

فرمائی جن کا کھانا یا رکھنا ناجائز ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

((ان الله ورسوله حرم بيع الخمر والميتة والخنزير والاصنام)) ❶

''خدا اور اس کے رسول نے شراب، مردہ، سور اور بتوں کی خرید و فروخت حرام کر دی۔''

غور کرو! شراب کی حرمت کس طرح اعلان عام کے ساتھ عمل میں آئی، بایں ہمہ ابھی تک یہ نہیں متعین ہوا کہ یہ کس سال کا واقعہ ہے۔ محدثین اور ارباب روایت اس امر میں نہایت مختلف الآراء ہیں۔ ❷

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ، فتح الباری، کتاب التفسیر، سورۃ مائدۃ باب لیس علی الذین امنوا میں لکھتے ہیں:

والذي يظهر ان تحريمها كان عام الفتح سنة ثمان كماروى احمد من طريق عبدالرحمن بن وعلة قال سالت ابن عباس عن بيع الخمر فقال كان لرسول الله ﷺ صديق من ثقيف اودوس فلقيه يوم الفتح براوية خمر يهد يها اليه فقال: ((يا فلان اما علمت ان الله حرمها)). (الخ)

''اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شراب کی حرمت فتح مکہ کے زمانہ ۸ ھ میں ہوئی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے عبدالرحمن بن وعلہ کی سند سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ شراب کا بیچنا کیسا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ کے ایک دوست تھے جو ثقیف یا دوس کے قبیلہ سے تھے، وہ آنحضرت ﷺ سے فتح مکہ میں ملے اور ایک مشک شراب تحفہ میں پیش کی آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم کو معلوم نہیں کہ خدا نے شراب کو حرام کر دیا ہے۔''

ہماری رائے میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا خیال اور ان کا استدلال صحیح نہیں، اس روایت سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ان صاحب کو شراب کی حرمت کا حال فتح مکہ تک نہیں معلوم ہوا تھا۔ ❸ یہ کہاں ثابت ہوتا

---

❶ صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب بیع المیتة والاصنام: ۲۲۳۶، ومسلم، کتاب المساقاة، باب تحریم بیع الخمر والمیتة: ۴۰۴۸۔ ❷ سیرت النبی ﷺ جلد اول میں حرمت شراب کی دو تاریخیں دو مختلف مقامات پر لکھی گئی ہیں ۴ھ اور ۸ھ۔ پہلا بیان عام ارباب سیر کا ہے دوسرا علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق ہے لیکن مصنفین سیرت النبی ﷺ کی اصلی تحقیق یہاں مذکور ہوتی ہے اور وہ اس باب میں عام محدثین کے ساتھ ہیں جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔'' س''

❸ مصنف کا یہ قیاس بالکل درست ہے جن صاحب کا یہ واقعہ ہے وہ قبیلہ ثقیف یا دوس سے تھے، ثقیف کا قبیلہ ۸ھ میں مسلمان ہوا اور دوس گو بہت پہلے اسلام لا چکے تھے لیکن وہ مدینہ سے بہت دور آباد تھے، اس کے علاوہ ایک اور نکتہ بھی ہے جس کی طرف ہمارے محدثین نے توجہ نہیں کی ہے وہ یہ ہے جیسا کہ ہم متن میں پہلے لکھ آئے ہیں کہ شراب کا پینا گو ۴ھ میں حرام ہو چکا تھا لیکن شراب کی تجارت بند نہیں ہوئی تھی چنانچہ یہ صاحب بھی مے فروش تھے، شراب کی خرید و فروخت ممانعت ربا کی حرمت کے ساتھ عمل میں آئی ہے اور ربا کی حرمت سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے یعنی ۸ ھ میں، شراب فروشی کی ممانعت مدینہ میں اسی وقت کر دی گئی لیکن اس کا عام اعلان آپ نے فتح مکہ کے زمانہ میں فرمایا جیسا کہ احادیث صحیح میں بتصریح مذکور ہے (دیکھو صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب بیع المیتة والاصنام: ۲۲۳۶ اور صحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب تحریم بیع الخمر: ۴۰۴۸) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہے کہ اس وقت تک حرمت نازل بھی نہیں ہوئی تھی، بہت سے احکام ہیں جن کی خبر دور کے رہنے والوں کو بہت دیر کے بعد ہوئی۔ علاوہ اس کے خود بعض روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے شراب کی حرمت نازل ہوچکی تھی یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ شراب جیسی ناپاک چیز ۸ ھ تک حلال رہتی اور آنحضرت ﷺ کی وفات سے صرف دو برس پہلے حرام ہوتی، حقیقت میں شراب ہجرت کے تیسرے یا چوتھے برس حرام ہوچکی تھی۔ ❶

سود خواری کی حرمت

سود خواری ❷ بھی ان اخلاق ذمیمہ میں سے ہے جو اہل عرب کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئے تھے اسی لیے نہایت تدریج کے ساتھ اس کی حرمت کے احکام بھی اترے۔ قریش عموماً تجارت پیشہ تھے، ان میں جو امیر اور دولت مند سوداگر تھے، وہ غریبوں اور کاشتکاروں کو بھی شرح سود پر روپیہ قرض دیتے اور جب تک قرض وصول نہ ہوجاتا، اصل سرمایہ کو ہر سال بڑھاتے جاتے ❸ خود آنحضرت ﷺ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ (اسلام سے پہلے) بہت بڑے سودی کاروبار کے مالک تھے ❹ آنحضرت ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہودی تاجروں کے سبب سے یہاں مختلف قسم کے سود کا رواج دیکھا، سب سے پہلے آپ ﷺ نے چاندی اور سونے کے ادھار خرید و فروخت کو سود قرار دیا ❺ پھر دو گنے اور چوگنے سود لینے کی ممانعت آئی اور یہ آیت اتری:

(گزشتہ سے پیوستہ) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ جو اس بات کے قائل ہیں کہ شراب کی حرمت ۸ ھ میں نازل ہوئی وہ خود جدا اص: ۱۴۱ میں قاضی عیاض رحمہ اللہ کے جواب میں لکھتے ہیں: قلت ويحتمل ان يكون تحريم التجارة فيها تاخر عن وقت تحريمها والله اعلم یعنی "ممکن ہے کہ شراب پینے کی حرمت کے بعد شراب کی تجارت کی حرمت نازل ہوئی ہو" صحیح مسلم میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (باب تحريم بيع الخمر: ٤٠٤٣) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب پینے اور اس کی خرید و فروخت کی ممانعت ایک ساتھ نازل ہوئی لیکن اس کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے جو روایتیں ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلی روایت میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ یا ان کے بعد کے راویوں سے کسی قدر تسامح ہوا ہے وهذا هو الحق علاوہ ازیں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام احمد رحمہ اللہ کی جس حدیث سے فتح مکہ میں شراب نوشی کی حرمت کے نزول پر استدلال کیا ہے وہ حدیث صحیح مسلم (باب تحريم بيع الخمر: ٤٠٤٤) میں بھی ہے لیکن اس میں فتح مکہ کی تعیین نہیں)

❶ سب سے بڑی دلیل اس کی یہ ہے کہ "جب شراب کی حرمت نازل ہوئی تو لوگوں نے کہا کہ ہمارے مسلمان بھائی جو شراب پی کر جنگ احد میں شریک ہوئے اور اسی حالت میں مارے گئے ان کا کیا حال ہوگا، اس پر یہ آیت ﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا﴾ نازل ہوئی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب کی حرمت کا واقعہ جنگ احد سے بالکل متصل تھا اور جنگ احد کا زمانہ یہی ہے، بخاری کتاب التفسیر، تفسیر آیت مذکورہ: ۴۶۱۸ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

صبح اناس غداة احد الخمر فقتلوا من يومهم جميعا شهداء وذالك قبل تحريمها۔

"غزوہ احد کی صبح کو کچھ لوگوں نے شراب پی اور یہ سب اسی دن شہید ہوئے یہ شراب کی حرمت سے پہلے ہوا۔"

اس روایت کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس روایت ایضا: ۴۶۲۰ کو ملاؤ جو اس کے بعد ہی واقع ہے:

فقال بعض القوم قتل قوم وهي في بطونهم قال فانزل الله ﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا﴾ الخ

"حرمت شراب کی آیت نازل ہوئی تو بعض لوگوں نے کہا کہ کچھ لوگ اس حال میں مارے گئے ہیں کہ شراب ان کے پیٹ میں تھی اس پر یہ آیت اتری کہ مومن پر کچھ حرج نہیں" س۔

❷ اضافہ تا ختم سود۔ ❸ مؤطا امام مالك، كتاب البيوع، باب ما جاء في الربوا في الدين: ١٣٧٨۔

❹ ابن جرير تفسير آيت ربوٰ: ج ٣، ص: ٦٥۔

❺ صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب الصرف، بيع الذهب بالورق نقدا: ٤٠٥٩ تا ٤٠٧٠۔

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۳۰)

''مسلمانو! دگنا چوگنا سود نہ کھایا کرو، اور خدا سے ڈرا کرو، تا کہ فلاح پاؤ۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے ہم جنس اشیاء کا باہم گھٹ بڑھ کے مبادلہ منع فرمایا [1] ۷ ھ میں غزوۂ خیبر کے موقع پر مسلمانوں نے یہودی سوداگروں سے لین دین شروع کیا۔ اس وقت آپ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ ''سونے کو اشرفی کے بھاؤ گھٹا بڑھا کر بیچنا بھی سود ہے۔'' [2] سود کی حرمت کے متعلق تفصیلی احکام ۸ ھ میں نازل ہوئے۔ آل عمران کے بعد سورۂ بقرہ میں سب سے پہلے یہ آیت اتری:

﴿ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا ۗ وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ۚ فَمَن جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَانتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ ﴾۔ (۲/ البقرۃ: ۲۷۵)

''جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ اس طرح کھڑے ہوں گے جس طرح شیطان کسی کو چھو کر مخبوط بنا دیتا ہے اس لیے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ بیع اور سود کا معاملہ ایک ہی ہے۔ خدا نے بیع کو تو حلال کیا اور سود کو حرام کر دیا، پس جس کے پاس خدا کی طرف سے نصیحت کی بات پہنچی اور وہ باز آ گیا تو اس کو وہی لینا چاہیے جو پہلے دیا۔''

لوگوں کو یہ اعتراض تھا کہ سود بھی ایک قسم کی تجارت ہے، جب تجارت جائز ہے تو سود کیوں حرام ہے؟ اس سوال کا جواب تو کتاب کی دوسری جلدوں میں آئے گا۔ یہاں صرف سود کی تاریخ حرمت سے بحث ہے، بہرحال اس آیت میں بھی سود کی قطعی حرمت کا فیصلہ نہ ہوا۔ آخر تھوڑے ہی وقفہ کے بعد غالباً ۸ ھ میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۷۸-۲۷۹)

''مسلمانو! خدا سے ڈرو اور سود جو باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو، اگر تم سچے مومن ہو، اگر یہ نہ کرو تو خدا اور رسول سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ، اگر باز آ جاؤ تو تم کو اپنے راس المال کا حق ہے نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر کوئی ظلم کرے۔''

یہ آیت جب اتری تو آپ ﷺ نے مسجد میں تمام مسلمانوں کو جمع کر کے یہ حکم سنایا [3] ۹ ھ میں اہل

---

[1] صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب بیع الطعام مثلا بمثل: ۴۰۸۱۔

[2] صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب بیع القلادۃ فیها خرز: ۴۰۷۶۔ [3] صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب تحریم التجارۃ فی الخمر: ۲۲۲۶؛ مسلم، کتاب المساقاۃ، باب تحریم بیع الخمر: ۴۰۴۶۔

نجران سے جو معاہدات صلح ہوئے ان میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ''سود نہ لیں گے ❶ ذی الحجہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر اس آیت کے نزول سے پہلے تمام ملکِ عرب میں جس قدر سودی معاملات تھے آپ ﷺ نے سب کو کالعدم قرار دیا۔ ❷

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سود کی حرمت کا حکم اسلام کے سلسلہ احکام کی سب سے آخری کڑی ہے۔ ❸

---

❶ ابو داود، کتاب الخراج والامارة، باب فی اخذ الجزیة: ۳۰۴۱۔

❷ ابن هشام، ج۲، ص:۳۹۰۔

❸ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب واتقوا یوما...... : ٤٥٤٤۔

سال اخیر، حجۃ الوداع، اختتامِ فرضِ نبوت
ذی الحجہ ۱۰ھ مطابق فروری ۶۳۲ء

﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ ﴾ (۱۱۰/ النصر: ۱، ۳)

''جب خدا کی مدد آ گئی اور مکہ فتح ہو چکا اور تو نے دیکھ لیا کہ لوگ خدا کے دین میں فوج کی فوج داخل ہو رہے ہیں، تو خدا کی حمد کی تسبیح پڑھ اور استغفار کر، خدا توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ نصرت اور فتح کے مقابلہ میں شکر کی ہدایت ہونی چاہیے تھی، تسبیح اور استغفار کو فتح سے کیا مناسبت ہے؟ اسی بنا پر ایک صحبت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس آیت کے معنی پوچھے، لوگوں نے مختلف معنی بتائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف دیکھا، وہ کمسن تھے اور جواب دیتے جھجھکتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی ڈھارس بندھائی تو انہوں نے کہا کہ ''آیت آنحضرت ﷺ کے قرب وفات کا اعلان ہے، ❶ کہ استغفار موت کے لیے مخصوص ہے۔''

اس سورہ کے نازل ہونے کے بعد آپ ﷺ کو معلوم ہو گیا تھا ❷ کہ رحلت کا زمانہ قریب آ گیا ہے اس لیے اب ضرورت تھی کہ تمام دنیا کے سامنے شریعت اور اخلاق کے تمام اصول اساسی کا مجمع عام میں اعلان کر دیا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے ہجرت ❸ کے زمانہ سے اب تک فریضہ حج ادا نہیں فرمایا تھا۔ ایک مدت تک تو قریش سدِ راہ رہے، صلح حدیبیہ کے بعد موقع ملا، لیکن مصالح اس کے مقتضی تھے کہ یہ فرض سب سے آخر میں ادا کیا جائے۔

بہر حال ❹ ذوقعدہ میں اعلان ہوا کہ آنحضرت ﷺ حج کے ارادہ سے مکہ تشریف لے جا رہے

❶ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ نصر: ۴۹۷۰۔ ❷ واحدی نے اسباب النزول میں لکھا ہے کہ یہ سورۃ آنحضرت ﷺ کی وفات سے دو برس پہلے اتری لیکن ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ ۱۰ھ میں اور عین ایام تشریق میں اتری' (یہ دوسری روایت اصل میں بیہقی کی ہے ابن حجر اور زرقانی نے تصریح کی ہے کہ ''اس کی سند ضعیف ہے'' ج ۳ ص: ۱۱۹۔ اس لئے واحدی کی روایت صحیح ہے سیوطی نے بھی اسباب النزول میں مصنف عبدالرزاق کے حوالہ سے یہی روایت نقل کی ہے کہ یہ سورۂ فتح مکہ کے بعد ہی فوراً نازل ہوئی، تصریحات ائمہ اور اشاراتِ حدیث کے علاوہ خود اس سورہ کے طرز بیان نے ظاہر کر دیا ہے کہ وہ فتح مکہ کے متصل ہی اتری ہے۔ یعنی حجۃ الوداع سے تقریباً دو پونے دو برس پہلے جن روایتوں میں وفات سے چند روز پہلے اس سورۂ کا نازل ہونا بیان ہوا ہے وہ روایت اور درایت دونوں حیثیتوں سے ضعیف ہیں۔''س'' ❸ سنن ابن ماجہ میں ہے (کتاب المناسك باب حجة رسول الله ﷺ: ۳۰۷۶) کہ ہجرت سے پہلے آپ ﷺ نے دو حج فرمائے بعض حدیثوں میں جو یہ ہے کہ آپ نے ایک ہی حج کیا تھا (ترمذی، ابواب الحج، باب کم حج النبی ﷺ: ۸۱۵ اور ابو داود، کتاب المناسك، باب وقت الاحرام: ۱۷۷۰) اس سے مقصود بعد ہجرت ہے۔
❹ ابو داود، کتاب المناسك، باب صفة حجة النبی ﷺ: ۱۹۰۵، اور صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی: ۲۹۵۰ میں حجۃ الوداع کا واقعہ نہایت تفصیل سے مذکور ہے جس کا شان نزول یہ ہے کہ حضرت امام باقر رحمہ اللہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے جب وہ نابینا ہو گئے تھے آنحضرت ﷺ کے حج کا حال پوچھا، حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آلِ رسول کی محبت سے امام باقر رحمہ اللہ کے گریبان کے تکمے کھولے اور ان کے سینہ پر محبت سے ہاتھ رکھ کر کہا: بھتیجے! پوچھو! کیا پوچھتے ہو؟ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہیں۔ یہ خبر دفعتہً پھیل گئی اور شرف ہمرکابی کے لیے تمام عرب اُمنڈ آیا۔ (سنیچر کے دن) ذوقعدہ کی ۲۶ تاریخ کو آپ ﷺ نے غسل فرمایا، ❶ اور چادر اور تہبند باندھی، نماز ظہر کے بعد مدینہ سے باہر نکلے اور تمام ازواج مطہرات کو ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ مدینہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ذوالحلیفہ ایک مقام ہے، جو مدینہ کی میقات ہے، یہاں پہنچ کر (شب بھر) اقامت فرمائی اور دوسرے دن دوبارہ غسل فرمایا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ہاتھ سے آپ ﷺ کے جسم مبارک میں عطر ملا ❷ اس کے بعد آپ ﷺ نے دو رکعت نماز ادا کی، پھر قصواء پر سوار ہو کر احرام باندھا اور بلند آواز سے یہ الفاظ کہے:

لبيك اللّٰهم لبيك لا شريك لك لبيك ان الحمد و النعمة لك و الملك لك لا شريك لك۔

''اے خدا! ہم تیرے سامنے حاضر ہیں، اے خدا! تیرا کوئی شریک نہیں، ہم حاضر ہیں، تعریف اور نعمت سب تیری ہی ہے اور سلطنت میں تیرا کوئی شریک نہیں۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ جو اس حدیث کے راوی ہیں، ان کا بیان ہے کہ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو آگے پیچھے، دائیں بائیں جہاں تک نظر کام کرتی، آدمیوں کا جنگل نظر آتا تھا۔ ❸ آنحضرت ﷺ جب لبیک فرماتے تھے تو ہر طرف سے اسی صدائے غلغلہ انگیز کی آواز بازگشت آتی تھی اور تمام دشت وجبل گونج اٹھتے تھے۔

فتح مکہ میں آپ ﷺ نے جن منازل میں نماز ادا کی تھی، وہاں برکت کے خیال سے لوگوں نے مسجدیں بنالی تھیں، آنحضرت ﷺ ان مساجد میں نماز ادا کرتے جاتے تھے۔ سرف پہنچ کر غسل فرمایا، دوسرے دن (اتوار کے روز ذوالحجہ کی چار تاریخ کو صبح کے وقت) مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ مدینہ سے مکہ تک کا یہ سفر نو دن میں طے ہوا۔ خاندان ہاشم کے لڑکوں نے آمد آمد کی خبر سنی تو خوشی سے باہر نکل آئے، آپ ﷺ نے فرط محبت سے اونٹ پر کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے بٹھالیا ❹ کعبہ نظر پڑا تو فرمایا کہ ''اے خدا! اس گھر کو اور زیادہ عزت اور شرف دے۔''

پھر کعبہ کا طواف کیا، طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم میں دوگانہ ادا کیا اور یہ آیت پڑھی:

﴿ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ﴾ (۲/ البقرة:۱۲۵)

''اور مقام ابراہیم کو سجدہ گاہ بناؤ۔''

صفا پر پہنچے تو یہ آیت پڑھی:

(۞۞ گزشتہ سے پیوستہ) پھر نہایت تفصیل سے حج نبوی کے تمام حالات بیان کئے، اوقات کی تعیین بھی بخاری ومسلم میں حضرت ابن عباس، انس رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایتوں میں ہے اور امام نسائی نے کتاب المناسک میں آنحضرت ﷺ کے اوقات وتاریخ کے لیے خاص باب باندھا ہے۔ باب الوقت الذی خرج فيه النبی ﷺ: ۲٦٥١۔ ❶ غسل کا ذکر طبقات ابن سعد ذکر حجة الوداع میں ہے (جز ثانی قسم اول ص:۱۲۴) ❷ بخاری، کتاب الحج، باب الطيب عند الاحرام: ۱۵۳۹ وصحيح مسلم، كتاب الحج، باب استحباب الطيب قبيل الاحرام: ۲۸۲٤۔

❸ کم وبیش ایک لاکھ مسلمان شریک حج تھے۔ ❹ نسائی، كتاب المناسك الحج، باب استقبال الحج: ۲۸۹۷۔

﴿ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۵۸)

''صفا اور مروہ خدا کی نشانیاں ہیں۔''

(یہاں سے) کعبہ نظر آیا تو یہ الفاظ فرمائے:

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ اَنْجَزَ وَعْدَهٗ نَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ)) [1]

''خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، اس کے لیے سلطنت اور ملک اور حمد ہے، وہ مارتا اور جلاتا ہے اور وہ تمام چیزوں پر قادر ہے، کوئی خدا نہیں مگر وہ اکیلا خدا، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندہ کی مدد کی اور اکیلے تمام قبائل کو شکست دی۔''

صفا سے اتر کر کوہ مروہ پر تشریف لائے، یہاں بھی دعا و تہلیل کی۔ اہل عرب ایام حج میں عمرہ ناجائز سمجھتے تھے، صفا و مروہ کے طواف و سعی سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے ان لوگوں کو جن کے ساتھ قربانی کے جانور نہیں تھے، عمرہ تمام کر کے احرام اتارنے کا حکم دیا، بعض صحابہ نے گزشتہ رسوم مالوفہ کی بنا پر اس حکم کی بجا آوری میں معذرت کی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اگر میرے ساتھ قربانی کے اونٹ نہ ہوتے تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔'' [2] حضرت علی رضی اللہ عنہ کچھ پہلے یمن بھیجے گئے تھے، اسی وقت وہ یمنی حاجیوں کا قافلہ لے کر مکہ میں وارد ہوئے چونکہ ان کے ساتھ قربانی کے جانور تھے اس لیے انہوں نے احرام نہیں اتارا، جمعرات کے روز آٹھویں تاریخ کو آپ ﷺ نے تمام مسلمانوں کے ساتھ منیٰ میں قیام فرمایا، دوسرے دن نویں ذی الحجہ کو جمعہ کے روز صبح کی نماز پڑھ کر منیٰ سے روانہ ہوئے۔ [3] قریش کا معمول تھا کہ جب مکہ سے حج کے لیے نکلتے تھے تو عرفات کے بجائے مزدلفہ میں قیام کرتے تھے جو حرم کے حدود میں تھا، ان کا خیال تھا کہ قریش نے اگر حرم کے سوا کسی اور مقام میں مناسک حج ادا کیے تو ان کی شان یکتائی میں فرق آ جائے گا لیکن اسلام کو جو مساوات عام قائم کرنی تھی، اس کے لحاظ سے یہ تخصیص روا نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ اس لیے (خدا نے حکم دیا) ﴿ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ ﴾ (۲/ البقرہ:۱۹۹) آپ ﷺ بھی عام مسلمانوں کے ساتھ عرفات میں آئے [4] اور یہ اعلان کرا دیا۔ [5]

((قفوا على مشاعر كم فانكم على ارث من ارث ابيكم ابراهيم))

''اپنے مقدس مقامات میں ٹھہرے رہو کہ تم اپنے باپ ابراہیم کی وراثت ہو۔''

یعنی عرفہ میں حاجیوں کا قیام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگار ہے اور ان ہی نے اس مقام کو اس غرضِ خاص

---

[1] ابوداود، کتاب المناسك، باب صفة حجة النبي ﷺ: ۱۹۰۵ وسنن ابن ماجه، ابواب المناسك، باب حجة رسول الله ﷺ: ۳۰۷۴۔ [2] صحيح بخاری، کتاب الحج، باب من اهل فی زمن النبی ﷺ: ۱۵۵۸۔

[3] ابو داود، حواله سابق۔ [4] صحيح بخاری، کتاب الحج، باب الوقوف بعرفة: ۱۶۶۵۔

[5] ابو داود، کتاب المناسك، موضع الوقوف بعرفة: ۱۹۱۹۔

کے لیے متعین کیا ہے۔ عرفات میں ایک مقام نمرہ ہے وہاں آپ ﷺ نے ایک کمل کے خیمہ میں قیام فرمایا، دوپہر ڈھل گئی تو ناقہ پر (جس کا نام قصواء تھا) سوار ہوکر میدان میں آئے اور ناقہ کے اوپر ہی سے خطبہ پڑھا۔

آج پہلا دن تھا کہ اسلام اپنے جاہ وجلال کے ساتھ نمودار ہوا اور جاہلیت کے تمام بے ہودہ مراسم کو مٹا دیا، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا:

((الا کل شیء من امر الجاهلية تحت قدمي موضوع)) ❶

"ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں۔"

تکمیل انسانی کی منزل میں سب سے بڑا سنگ راہ امتیاز مراتب تھا، جو دنیا کی تمام قوموں نے تمام مذاہب نے، تمام ممالک نے مختلف صورتوں میں قائم کر رکھا تھا، سلاطین سایۂ یزدانی تھے، جن کے آگے کسی کو چون و چرا کی مجال نہ تھی، آئمہ مذہب کے ساتھ کوئی شخص مسائل مذہبی میں گفتگو کا مجاز نہ تھا، شرفاء، رذیلوں سے ایک بالاتر مخلوق تھی، غلام آقا کے ہمسر نہیں ہو سکتے تھے۔ آج یہ تمام فرقے، یہ تمام امتیازات، یہ تمام حد بندیاں دفعتاً ٹوٹ گئیں۔ ❷

((ايها الناس !الاان ربكم واحد وان اباكم واحد الا لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي ولا لاحمر على اسود ولا لا سود على احمر الا بالتقوى)) ❸

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی ﷺ: ۲۹۵۰؛ ابوداود، کتاب المناسك، باب صفة حج النبی ﷺ: ۱۹۰۵۔ یہ اور اس کے بعد کے تمام عربی جملے آنحضرت ﷺ کے خطبہ کے ٹکڑے ہیں یہ جملے کسی حدیث میں یکجا بیان نہیں ہوئے ہیں اس لیے ان کو مختلف ماخذوں سے جمع کرنا پڑا ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم (باب حجة النبی ﷺ وباب الديات) اور ابو داود (باب الاشهر الحرم وحجة النبی ﷺ) وغیرہ میں یہ خطبہ حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت ابوامامہ باہلی، حضرت جابر، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہم وغیرہ صحابہ کی روایتوں سے مذکور ہے ان روایتوں میں بعض باتیں مشترک ہیں مثلاً ((ان دمائكم واموالكم حرام عليكم كحرمة)) الخ اور بعض باتیں الگ ہیں، مغازی وسیر کی کتابوں میں کچھ اور باتیں بھی مذکور ہیں، اصل یہ ہے کہ یہ ایک طویل خطبہ تھا، ہر ایک شخص کو جو فقرہ یاد رہ گیا اسی کی اس نے روایت کر دی، اس بنا پر مختلف ماخذوں سے ان ٹکڑوں کو جمع کر لیا گیا ہے اور اس کے جا بجا حوالے دیے گئے ہیں، خطبہ کے بعض ضمنی الفاظ مصنف نے چھوڑ دیے ہیں، روایتوں میں ایک اور اختلاف ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ اپنی روایت میں اور ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما خطبہ کا دن یوم عرفہ یعنی ۹ ذی الحجہ اور حضرت ابوبکر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما دوسری روایتوں میں یوم النحر یعنی ۱۰ ذی الحجہ بتاتے ہیں، بعض روایتیں ایام التشریق کے خطبہ کی ہیں۔ ابن اسحاق نے اس کو مسلسل خطبہ کے طور پر نقل کیا ہے۔ ابن ماجہ، ترمذی اور مسند احمد میں خطبہ حجۃ الوداع کے چند فقرے منقول ہیں جن میں یہ تصریح نہیں کہ کس تاریخ کے خطبہ میں آپ نے یہ فرمایا بہر حال صحاح ستہ اور مسانید کی تمام روایات کو یکجا کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے اس حج میں تین دفعہ خطبہ دیا۔ ۹ ذی الحجہ یوم عرفہ کو، ۱۰ ذی الحجہ کو اور تیسرا خطبہ ایام التشریق میں ۱۱ یا ۱۲ ذی الحجہ کو، ان خطبوں میں اصولی طور پر بعض باتیں مشترک ہیں اور بعض مختص المقام ہیں، یہ بہت ممکن ہے جیسا کہ بعض محدثین نے تصریح کی ہے کہ چونکہ مجمع بہت بڑا تھا اور آپ جو پیغام اپنی امت کو پہنچانا چاہتے تھے وہ نہایت اہم تھا اس لیے آپ نے اپنی تقریر کے بعض فقرے مکرر اعادہ فرمائے" س۔

❷ امام احمد نے مسند میں ابونضرہ تابعی کے واسطہ سے اور تابعی مذکور نے ایک صحابی سے جنہوں نے آنحضرت ﷺ کو حجۃ الوداع کا خطبہ دیتے سنا تھا یہ فقرہ نقل کیا ہے، (بحواله منتقى الاخبار ابن تيمية، ج ۲، ص: ۲۸٦ مطبع حجازی، ۱۳۵۱ھ، ۱۹۳۲ء)

❸ مسند احمد، ج ۵، ص: ٤١١۔

''لوگو! بیشک تمہارا رب ایک ہے اور بیشک تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے سبب سے۔''

((ان کل مسلم اخو المسلم وان المسلمین اخوۃ)) ❶

''ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور مسلمان مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔''

((ارقاء کم ارقاء کم اطعموھم مما تاکلون واکسوھم مما تلبسون)) ❷

''تمہارے غلام! تمہارے غلام!! جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔''

عرب میں کسی خاندان کا کوئی شخص کسی کے ہاتھ سے قتل ہوتا، تو اس کا انتقام لینا خاندانی فرض ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ سینکڑوں برس گزر جانے پر بھی فرض باقی رہتا تھا اور اسی بنا پر لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جاتا تھا اور عرب کی زمین ہمیشہ خون سے رنگین رہتی تھی۔ آج یہ سب سے قدیم رسم، عرب کا سب سے مقدم فخر، خاندان کا پر فخر مشغلہ برباد کر دیا جاتا ہے، (اور اس کے لیے نبوت کا منادی سب سے پہلے اپنا نمونہ آپ پیش کرتا ہے):

ودماء الجاھلیة موضوعة وان اول دم أضع من دمائنا دم ابن ربیعة بن الحارث۔ ❸

''جاہلیت کے تمام خون (یعنی انتقام خون) باطل کر دیے گئے اور سب سے پہلے میں (اپنے خاندان کا خون) ربیعہ بن الحارث کے بیٹے کا خون باطل کر دیتا ہوں۔''

تمام عرب میں سودی کاروبار کا ایک جال پھیلا ہوا تھا جس سے غربا کا ریشہ ریشہ جکڑا ہوا تھا اور ہمیشہ کے لئے وہ اپنے قرض خواہوں کے غلام بن گئے تھے، آج وہ دن ہے کہ اس جال کا تار تار الگ ہوتا ہے، اس فرض کی تکمیل کے لیے بھی معلم حق سب سے پہلے اپنے خاندان کو پیش کرتا ہے۔

((وربا الجاھلیة موضوع واوّل ربا اضع ربانا ربا عباس بن عبدالمطلب)) ❹

''جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیے گئے اور سب سے پہلے اپنے خاندان کا سود، عباس ❺ بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں۔''

آج تک عورتیں ایک جائیداد منقولہ تھیں، جو قمار بازیوں میں داؤں پر چڑھا دی جا سکتی تھیں، آج پہلا دن ہے کہ یہ گروہ مظلوم، یہ صنف لطیف، یہ جوہر نازک، قدر دانی کا تاج پہنتا ہے:

---

❶ مستدرك حاكم، ج ۱، ص: ۹۳ وطبری ج ٤، ص: ۷۵٤ وابن اسحاق۔ ❷ ابن سعد بسند زید بن خطاب، قسم اول جزء ثانی، ص: ۱۳۳۔ ❸ ربیعہ قریش کے خاندان سے تھے اور ان کے خون کا انتقام لینا میراث کے طور پر ایک فرض خاندانی چلا آتا تھا (ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب آنحضرت ﷺ کے چچازاد بھائی تھے اور بعض روایتوں میں خود ان کے قتل کا ذکر ہے لیکن یہ صحیح نہیں، ربیعہ خلافت فاروقی تک زندہ رہے اور ۲۳ھ میں وفات پائی، صحیح یہ ہے کہ ربیعہ کا ایاس نام ایک بیٹا تھا وہ قبیلہ بنو سعد میں پرورش پا رہا تھا کہ ہذیل نے اس کو قتل کر ڈالا، دیکھو ابو داود: ۱۹۰۵، وصحیح مسلم باب حجة النبی ﷺ: ۲۹۵۰ اور زرقانی، ج ۸، ص: ۲۰۱)
❹ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی ﷺ: ۲۹۵۰؛ ابوداود: ۱۹۰۵۔ ❺ آنحضرت ﷺ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ اسلام سے پہلے سود کا کاروبار کرتے تھے، بہت سے لوگوں کے ذمہ ان کا سود باقی تھا، دیکھو تفسیر آیت ربوٰ۔

((فاتقوا اللّٰہ فی النساء)) [1]

''عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو۔''

((ان لکم علی نسائکم حقا ولھن علیکم حقا)) [2]

''تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔''

عرب میں جان و مال کی کچھ قیمت نہ تھی جو شخص چاہتا تھا قتل کر دیتا تھا اور جس کا مال چاہتا تھا چھین لیتا تھا آج امن و سلامتی کا بادشاہ تمام دنیا کو صلح کا پیغام سناتا ہے:

((ان دمائکم واموالکم علیکم حرام کحرمة یومکم هذا فی شهر کم هذا فی بلدکم هذا الی یوم تلقون ربکم)) [3]

''تمہارا خون اور تمہارا مال تا قیامت اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں حرام ہے۔''

اسلام سے پہلے بڑے بڑے مذاہب دنیا میں پیدا ہوئے لیکن ان کی بنیاد خود صاحب شریعت کے تحریری اصول پر نہ تھی، ان کو خدا کی طرف سے جو ہدایتیں ملی تھیں، بندوں کی ہوس پرستیوں نے ان کی حقیقت گم کر دی تھی، ابدی مذہب کا پیغمبر اپنی زندگی کے بعد ہدایات ربانی کا مجموعہ تھی، خود اپنے ہاتھ سے اپنی امت کو سپرد کرتا ہے اور تاکید کرتا ہے:

((وانی قد ترکت فیکم مالن تضلوا بعده ان اعتصمتم به کتاب اللّٰہ)) [4]

''میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہو گے، وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ!''

اس کے بعد آپ ﷺ نے چند اصولی احکام کا اعلان فرمایا: [5]

((ان اللّٰہ عزوجل قد اعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث))

''خدا نے ہر حق دار کو (از روئے وراثت) اس کا حق دے دیا، اب کسی کو وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں۔''

---

[1] صحیح مسلم: ۲۹۵۰ وابو داود: ۱۹۰۵۔ اس کے بعد آپ نے زن وشوہر کے فرائض کی تفصیل فرمائی۔

[2] طبری، ج ٤، ص: ۱۷۵٤؛ ابن ھشام، ج ۲، ص: ۳۹۰ وغیرہ۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الحج، باب الخطبة ایام منی: ۱۷٤۱ ومسلم: ۲۹۵۰ وابوداود: ۱۹۰۵ وغیرہ۔

[4] مسلم، ایضًا، ابوداود، ایضًا۔

[5] سنن ابن ماجه، باب الوصایا، باب من لا وصیة لوارث: ۲۷۱۳ ومسند ابو داود طیالسی: ۱۳۱۳؛ ابوداود کتاب الوصایا، باب ماجاء فی الوصیلة للوارث: ۲۸۷۰ میں مختصراً ہے، ابن سعد، جز ۲، قسم ۱، ص: ۱۳۱ اور ابن اسحاق نے بھی اس کی بسند روایت کی ہے کہ یہ عرفہ کے خطبہ میں آپ ﷺ نے فرمایا۔

((الولد للفراش وللعاھر الحجر وحسابھم علی اللّٰہ)) ❶

''لڑکا اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا، زنا کار کے لیے پتھر ہے اور ان کا حساب خدا کے ذمہ ہے۔''

((من ادعی الی غیر ابیہ وانتمی الی غیر موالیہ فعلیہ لعنۃ اللّٰہ)) ❷

''جو لڑکا اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کے نسب سے ہونے کا دعویٰ کرے اور جو غلام اپنے مولیٰ کے سوا کسی اور طرف اپنی نسبت کرے اس پر خدا کی لعنت ہے۔''

((الا لا یحل لامرأۃ ان تعطی من مال زوجھا شیئا الا باذنہ الدین مقضی والعاریۃ موداۃ والمنحۃ مردودۃ والزعیم غارم)) ❸

''ہاں عورت کو اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر کچھ دینا جائز نہیں، قرض ادا کیا جائے، عاریت واپس کی جائے عطیہ لوٹایا جائے ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔''

یہ فرما کر آپ ﷺ نے مجمع عام کی طرف خطاب کیا:

((انتم مسؤلون عنی فما انتم قائلون)) ❹

''تم سے خدا کے ہاں میری نسبت پوچھا جائے گا تم کیا جواب دو گے۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: ''ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔''

آپ ﷺ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا:

((اللّٰھم اشھد))۔ ❺ ''اے خدا تو گواہ رہنا۔''

عین اس وقت جب آپ ﷺ یہ فرض نبوت ادا کر رہے تھے، یہ آیت اتری: ❻

﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ﴾

''آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے مذہب اسلام کو انتخاب کر لیا۔'' (۵/المآئدۃ:۳)

نہایت حیرت انگیز اور عبرت خیز منظر یہ تھا کہ شہنشاہ عالم جس وقت لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں فرمان ربانی کا اعلان کر رہا تھا، اس کے تختِ شہنشاہی کا مسند و بالین (کجاوہ اور عرق گیر) ایک روپیہ سے زیادہ قیمت کا نہ تھا۔ ❼

خطبہ سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کا حکم دیا اور ظہر اور عصر کی نماز ایک ساتھ ادا کی، پھر ناقہ پر سوار ہو کر موقف تشریف لائے اور وہاں کھڑے ہو کر دیر تک قبلہ رو دعا میں مصروف

❶ بخاری: ٦٧٤٩؛ مسلم: ٣٦١٣؛ ابوداود: ٢٢٧٤۔ ❷ ابن ماجہ: ٢٦٠٩؛ ابن حبان: ٤١٨۔

❸ مسند ابوداود الطیالسی، ص: ١٥٤۔ ❹ صحیح مسلم: ٢٩٥٠ وابو داود: ١٩٠٥۔

❺ صحیح بخاری: ١٧٤١؛ مسلم: ٢٩٥٠؛ ابوداود: ١٩٠٥۔

❻ صحیح بخاری: ٤٥؛ صحیح مسلم: ٧٥٢٥ تا ٧٥٢٧ وابو داود حوالہ سابق وغیرہ، طبقات ابن سعد جز ٢ قسم اول، ص: ١٣٥، میں تصریح خاص ہے۔ ❼ طبقات ابن سعد، جز ٢، قسم: ١، ص: ١٢٧۔

رہے، جب آفتاب ڈوبنے لگا تو آپ ﷺ نے وہاں سے چلنے کی تیاری کی۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو اونٹ پر پیچھے بٹھالیا، آپ ﷺ ناقہ کی زمام کھینچے ہوئے تھے، یہاں تک کہ اس کی گردن کجاوے میں آ کر لگتی تھی، لوگوں کے ہجوم سے ایک اضطراب سا پیدا ہو گیا تھا، لوگوں کو دست راست سے اور بخاری میں ہے کہ کوڑہ سے آپ ﷺ اشارہ کرتے جاتے تھے کہ ''آہستہ آہستہ'' اور زبان مبارک سے ارشاد فرمار ہے تھے:

((السكينة ياايها الناس السكينة يا ايها الناس)) [1]

''لوگوں! سکون کے ساتھ، لوگو! سکون کے ساتھ۔''

اثنائے راہ میں ایک جگہ اتر کر طہارت کی، اسامہ رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے، فرمایا نماز کا موقع آگے آتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ ﷺ تمام قافلہ کے ساتھ مزدلفہ پہنچے، یہاں پہلے مغرب کی نماز پڑھی، اس کے بعد لوگوں نے اپنے اپنے پڑاؤ پر جا کر سواریوں کو بٹھایا، ابھی سامان کھولنے بھی نہ پائے تھے کہ فوراً ہی عشاء کی تکبیر ہوئی۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ لیٹ گئے اور صبح تک آرام فرمایا۔ بیچ میں روزانہ دستور کے خلاف عبادت شبانہ کے لیے بیدار نہ ہوئے۔ [2] محدثین نے لکھا ہے کہ یہی ایک شب ہے جس میں آپ ﷺ نے نماز تہجد ادا نہیں فرمائی، صبح سویرے اٹھ کر باجماعت فجر کی نماز پڑھی۔ کفارِ قریش مزدلفہ سے اس وقت کوچ کرتے تھے جب آفتاب پورا نکل آتا تھا اور آس پاس کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر دھوپ چمکنے لگتی تھی، اس وقت بآواز بلند کہتے تھے: ''کوہ ثبیر! دھوپ سے چمک جا۔'' آنحضرت ﷺ نے اس رسم کے ابطال کے لیے سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے کوچ فرمایا یہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ اور سنیچر کا دن تھا۔

فضل بن عباس رضی اللہ عنہما آپ کے برادرِ عم زاد ناقہ پر ساتھ تھے۔ اہل حاجت داہنے بائیں حج کے مسائل دریافت کرنے کے لیے آرہے تھے، آپ ﷺ جواب دیتے تھے اور زور زور سے مناسک حج کی تعلیم دیتے جاتے تھے [3] وادی محسّر کے راستہ سے آپ جمرہ کے پاس آئے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو اس وقت کمسن تھے فرمایا: ''مجھے کنکریاں چن کر دو۔'' آپ ﷺ نے کنکریاں پھینکیں اور لوگوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا: [4]

((اياكم و الغلو فى الدين فانما اهلك من كان قبلكم الغلو فى الدين))

''مذہب میں غلو اور مبالغہ سے بچو کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی سے برباد ہوئیں۔''

اسی اثنا میں آپ ﷺ یہ بھی فرماتے:

---

[1] بخاری، كتاب الحج، باب امر النبی ﷺ بالسكينة: ۱۶۷۱ ومسلم، كتاب الحج، باب حجة النبی ﷺ: ۲۹۵۰؛ ابوداود: ۱۹۰۵؛ ابن ماجه: ۳۰۷۴۔ نوٹ: مذکورہ کتب میں ''یا'' کے بغیر ہے۔

[2] ابو داود، كتاب المناسك، باب صفة حجة النبی ﷺ: ۱۹۰۵؛ بخاری: ۱۳۹؛ مسلم: ۲۹۵۰۔

[3] ابن ماجہ میں ہے کہ آپ نے مزدلفہ میں مغرب وعشاء کی نماز ایک اذان اور اقامت میں ادا کی اور لیٹ گئے اور طلوع فجر تک بیدار نہ ہوئے۔ (كتاب المناسك، باب حجة رسول الله ﷺ: ۳۰۷۴۔ [4] سنن نسائی، كتاب المناسك، باب التقاط الحصى: ۳۰۵۹؛ ابن ماجه، ابواب المناسك، باب قدر حصى الرمى: ۳۰۲۹۔

((لتاخذوا مناسككم فاني لا ادري لعلي لا احج بعد حجتي هذه)) ❶

''حج کے مسائل سیکھ لو، میں نہیں جانتا، شاید کہ اس کے بعد مجھے دوسرے حج کی نوبت نہ آئے۔''

یہاں سے فارغ ہو کر منیٰ کے میدان میں تشریف لائے اور داہنے بائیں آگے پیچھے تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کا مجمع تھا۔ مہاجرین قبلہ کے داہنے، انصار بائیں اور بیچ میں عام مسلمانوں کی صفیں تھیں۔ آنحضرت ﷺ ناقہ پر سوار تھے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ناقہ کی مہار تھی، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ پیچھے پیچھے کپڑا تان کر سایہ کیے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے نظر اٹھا کر اس عظیم الشان مجمع کی طرف دیکھا تو فرائضِ نبوت کے ۲۳ سالہ نتائج نگاہوں کے سامنے تھے۔ زمین سے آسمان تک قبول و اعتراف حق کا نور ضوفشاں تھا۔ دیوانِ قضا میں انبیائے سابقین کے فرائضِ تبلیغ کے کارناموں پر ختمِ رسالت کی مہر ثبت ہو رہی تھی اور دنیا اپنی تخلیق کے لاکھوں برس کے بعد دینِ فطرت کی تکمیل کا مژدہ کائنات کے ذرہ ذرہ کی زبان سے سن رہی تھی۔ عین اسی عالم میں زبانِ حق محمد رسول اللہ ﷺ کے کام و دہن میں زمزمہ پرداز ہوئی۔

اب ایک نئی شریعت ایک نئے نظام اور ایک نئے عالم کا آغاز تھا۔ اس بنا پر ارشاد فرمایا:

((ان الزمان قد استدار كهيئته يوم خلق الله السموات و الارض)) ❷

''ابتدا میں خدا نے جب آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا، زمانہ پھر پھرا کے آج پھر اسی نقطہ پر آ گیا۔''

ابراہیم خلیل کے طریق عبادت (حج) کا موسم اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا، اس کا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں کسی قسم کی خونریزی جائز نہیں تھی۔ ❸ اس لیے عربوں کے خون آشام جذبات حیلہ جنگ کے لیے اس کو کبھی گھٹا کبھی بڑھا دیتے تھے۔ آج وہ دن آیا کہ اس اجتماع عظیم کے اشہر حرم کی تعیین کر دی جائے، آپ نے فرمایا:

((السنة اثنا عشر شهرا منها اربعة حرم ثلاثة متواليات ذو القعدة و ذو الحجة و محرم و رجب شهر مضر الذي بين جمادى و شعبان)) ❹

''سال کے بارہ مہینے ہیں جن میں چار مہینے قابل احترام ہیں، تین تو متواتر مہینے ہیں، ذوقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور چوتھا رجب مضر کا مہینہ جو جمادی الثانی اور شعبان کے بیچ میں ہے۔''

---

❶ مسلم، کتاب الحج، باب استحباب رمی جمرة العقبة: ۳۱۳۷؛ ابوداود، کتاب المناسك، باب في رمي الجمار: ۱۹۷۰۔ ❷ ابوداود، کتاب المناسك، باب الاشهر الحرم: ۱۹۴۷۔

❸ حج کے ان مہینوں کے احترام اور بزرگی کا تخیل عرب میں نہایت قدیم زمانہ سے چلا آتا تھا اور عرب کے تمام فرقے خواہ یہودی یا عیسائی یا کسی اور مذہب کے پیرو ہوں سب برابر ان کی عزت کرتے تھے، ان مہینوں میں جنگ و جدال اور لڑائی بھڑائی حرام جانتے تھے، قدیم اشعارِ عرب میں اس کا بیان نہایت کثرت سے ہے، رومیوں کی تاریخ میں بھی عربوں کے اس عقیدہ کا ذکر ہے۔ ۵۴۱ء میں رومیوں کو شام اور فلسطین میں کوئی جنگی کارروائی کرنی تھی اور ساتھ ہی عربوں کے حملہ کا خوف لگا تھا، سپہ سالار روم جو عربوں کے اندرونی حالات سے واقف تھا، اس نے جواب دیا کہ اس زمانہ میں عربوں سے کوئی خوف نہیں کیونکہ عنقریب وہ دو مہینے آ رہے ہیں جن میں اہل عرب عبادتوں میں مشغول رہتے ہیں اور کسی قسم کا ہتھیار نہیں لگاتے۔ نتائج الافہام محمود پاشا فلکی ص: ۳۵ بحوالہ فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی جنرل اپریل ۱۸۴۳ء ''س۔''

❹ ابو داود، کتاب المناسك، باب الاشهر الحرم: ۱۹۴۷ بروایت ابوبکرہ۔

دنیا میں عدل وانصاف اور جور وستم کا محور صرف تین چیزیں ہیں، جان، مال اور آبرو۔ آنحضرت ﷺ کل کے خطبہ میں گو ان کے متعلق ارشاد فرما چکے تھے لیکن عرب کے صدیوں کے زنگ دور کرنے کے لیے مکرر تاکید کی ضرورت تھی، آج آپ ﷺ نے اس کے لیے عجیب بلیغ انداز اختیار فرمایا۔

لوگوں سے مخاطب ہو کر پوچھا: ''کچھ معلوم ہے آج کون سا دن ہے؟'' لوگوں نے عرض کی کہ خدا اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ آپ دیر تک چپ رہے لوگ سمجھے کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھیں گے، دیر تک سکوت کے بعد فرمایا: ''کیا آج قربانی کا دن نہیں ہے؟'' لوگوں نے کہا: ہاں بے شک ہے۔ پھر ارشاد ہوا: ''یہ کون سا مہینہ ہے؟'' لوگوں نے پھر اسی طریقہ سے جواب دیا، آپ نے پھر دیر تک سکوت کیا اور فرمایا: ''کیا یہ ذوالحجہ کا مہینہ نہیں ہے؟'' لوگوں نے کہا! ہاں بے شک ہے۔ پھر پوچھا: ''یہ کون سا شہر ہے؟'' لوگوں نے بدستور جواب دیا، آپ نے اسی طرح دیر تک سکوت کے بعد فرمایا: ''کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے؟'' لوگوں نے عرض کی ہاں بے شک ہے۔ جب سامعین کے دل میں یہ خیال پوری طرح جاگزیں ہو چکا کہ آج کا دن بھی، مہینہ بھی اور خود شہر بھی محترم ہے یعنی اس دن، اس مقام میں جنگ اور خونریزی جائز نہیں، تب فرمایا:

((فان دماء کم واموالکم واعراضکم علیکم حرام کحرمة یومکم هذا فی شهر کم هذا فی بلد کم هذا))۔ [1]

''تو تمہارا خون، تمہارا مال، اور تمہاری آبرو، (تا قیامت) اسی طرح محترم ہے جس طرح یہ دن، اس مہینہ میں اور اس شہر میں محترم ہے۔''

قوموں کی بربادی ہمیشہ آپس کے جنگ وجدال اور باہمی خونریزیوں کا نتیجہ رہی ہے، وہ پیغمبر جو ایک لازوال قومیت کا بانی بن کر آیا تھا، اس نے اپنے پیروؤں سے بآواز بلند کہا:

((وستلقون ربکم فیسألکم عن اعمالکم الا فلا ترجعوا بعدی ضلالا یضرب بعضکم رقاب بعض))۔ [2]

''ہاں! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ خود ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو تم کو خدا کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس کرے گا۔''

ظلم وستم کا ایک عالمگیر پہلو یہ تھا کہ اگر خاندان میں کسی ایک شخص سے کوئی گناہ سرزد ہوتا تو اس خاندان کا ہر شخص اس جرم کا قانونی مجرم سمجھا جاتا تھا اور اکثر اصلی مجرم کے روپوش یا فرار ہو جانے کی صورت میں بادشاہ کا اس خاندان میں سے جس پر قابو چلتا تھا اس کو سزا دیتا تھا، باپ کے جرم میں بیٹے کو سولی دی جاتی تھی، اور بیٹے کے جرم کا خمیازہ باپ کو اٹھانا پڑتا تھا، یہ سخت ظالمانہ قانون تھا، جو مدت سے دنیا میں حکمراں تھا، اگرچہ قرآن مجید نے ﴿لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی﴾ کے وسیع قانون کی رو سے اس ظلم کی ہمیشہ کے لیے بیخ کنی کر دی تھی لیکن

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الحج، باب الخطبة ایام منی: ۱۷۴۱۔ بروایت ابوبکرہ

[2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب حجة الوداع: ٤٤٠٦۔ بروایت ابوبکرہ

اس وقت جب دنیا کا آخری پیغمبر ایک نیا نظامِ سیاست ترتیب دے رہا تھا، اس اصول کو فراموش نہیں کر سکتا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا:

((الا لا یجنی جان الا علی نفسه الا لا یجنی جان علی ولده ولا مولود علی والده)) ❶

''ہاں! مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے، ہاں باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں اور بیٹے کے جرم کا جواب دہ باپ نہیں۔''

عرب کی بدامنی اور نظام ملک کی بے ترتیبی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ ہر شخص اپنی خداوندی کا آپ مدعی تھا، اور دوسرے کی ماتحتی اور فرمانبرداری کو اپنے لیے ننگ اور عار جانتا تھا، ارشاد ہوا:

((ان امر علیکم عبد مجدع اسود یقودکم بکتاب اللّٰه فاسمعوا له واطیعوا)) ❷

''اگر کوئی حبشی بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تم کو خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔''

ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ اس وقت اسلام کے نور سے منور ہو چکا تھا اور خانہ کعبہ ہمیشہ کے لیے ملت ابراہیم کا مرکز بن چکا تھا اور فتنہ پردازانہ قوتیں پامال ہو چکیں تھیں، اس بنا پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((الا ان الشیطان قد أیس ان یعبد فی بلدکم هذا ابدا ولکن سیکون له طاعة فیما تحقرون من اعمالکم فیرضی به)) ❸

''ہاں، شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا کہ اب تمہارے اس شہر میں اس کی پرستش قیامت تک نہ کی جائے گی، لیکن البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس کی پیروی کرو گے اور وہ اس پر خوش ہوگا۔''

سب سے آخر میں آپ ﷺ نے اسلام کے فرائض اولین یاد دلائے:

((اعبدوا ربکم فصلوا خمسکم وصوموا شهرکم واطیعوا اذا آمرکم تدخلوا جنة ربکم)) ❹

''اپنے پروردگار کو پوجو، پانچوں وقت کی نماز پڑھو، مہینہ کے روزے رکھا کرو، اور میرے احکام کی اطاعت کرو، خدا کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔''

یہ فرما کر آپ ﷺ نے مجمع کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا:

---

❶ ابن ماجه، ابواب المناسك، باب الخطبة یوم النحر: ٣٠٥٥۔ (معناه)

❷ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب استحباب رمی جمرة العقبة: ٣١٣٨۔

❸ ابن ماجه، ابواب المناسك، باب الخطبة یوم النحر: ٣٠٥٥۔(معناه)

❹ مسند احمد، ج ٥، ص: ٢٥١ ومستدرك حاكم، ج ١، ص: ٤٧٣؛ ترمذی:٦١٦۔

((الا ھل بلغت؟)) ''کیوں میں نے پیغام خداوندی سنا دیا؟'' سب بول اٹھے ہاں، فرمایا: ((اللھم اشھد)) ''اے خدا! تو گواہ رہنا۔'' پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: ((فلیبلغ الشاھد الغائب)) ''جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ ان کو سنا دیں جو موجود نہیں۔'' خطبہ ❶ کے اختتام پر آپ ﷺ نے تمام مسلمانوں کو الوداع ❷ کہا۔

اس کے بعد آپ قربان گاہ کی طرف تشریف لے گئے، اور فرمایا کہ ''قربانی کے لیے منیٰ کی کچھ تخصیص نہیں ہے بلکہ منیٰ اور مکہ کی ایک ایک گلی میں قربانی ہو سکتی ہے۔'' آپ ﷺ کے ساتھ قربانی کے سو اونٹ تھے، کچھ تو آپ ﷺ نے خود اپنے ہاتھ سے ذبح کیے اور باقی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیے کہ وہ ذبح کریں، اور حکم دیا کہ گوشت پوست جو کچھ ہو، سب خیرات کر دیا جائے، یہاں تک کہ قصاب کی مزدوری بھی اس سے ادا نہ کی جائے، ❸ بلکہ الگ سے دی جائے۔

قربانی سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے معمر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور سر کے بال منڈوائے اور فرطِ محبت سے کچھ بال خود اپنے دست مبارک سے ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی ام سلیم رضی اللہ عنہا اور بعض ان لوگوں کو جو پاس بیٹھے تھے، ❹ عنایت فرمائے اور باقی ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ سے تمام مسلمانوں میں ایک ایک دو دو کر کے تقسیم کر دیے اس کے بعد آپ مکہ معظمہ تشریف لائے، خانہ کعبہ کا طواف کیا اس سے فارغ ہو کر چاہ زمزم کے پاس آئے۔

چاہ زمزم سے حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت خاندان عبدالمطلب سے متعلق تھی، چنانچہ اس وقت اسی خاندان کے لوگ پانی نکال نکال کر لوگوں کو پلا رہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یا بنی عبدالمطلب! اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ مجھ کو ایسا کرتے دیکھ کر اور لوگ بھی تمہارے ہاتھ سے ڈول چھین کر خود اپنے ہاتھ سے پانی نکال کر پئیں گے تو میں خود اپنے ہاتھ سے پانی نکال کر پیتا۔'' ❺

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ڈول میں پانی نکال کر پیش کیا، آپ ﷺ نے قبلہ رخ ہو کر کھڑے کھڑے پانی پیا۔ پھر یہاں سے منیٰ واپس تشریف لے گئے اور وہیں نماز ظہر ادا فرمائی۔ ❻

---

❶ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطبہ بہت بڑا تھا۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب استحباب رمی جمرۃ العقبۃ: ۳۱۳۸ میں روایت ہے کہ قال قولا کثیرا ''آپ نے بہت سی باتیں فرمائیں'' صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب حجۃ الوداع: ۴۴۰۲ میں ہے کہ آپ نے اس میں دجال کا بھی ذکر فرمایا تھا لیکن یہ تعیین نہیں کہ کس دن کے خطبہ میں یہ فرمایا۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب الخطبۃ ایام منی: ۱۷۴۲۔ ❸ بخاری، کتاب الحج، باب لا یعطی الجزار...: ۱۷۱٦۔

❹ مسلم، کتاب الحج، باب بیان ان السنۃ یوم النحر أن یرمی: ۳۱۵۲ تا ۳۱۵۵؛ ابوداود، کتاب المناسك، باب الحلق والتقصیر: ۱۹۸۱، ۱۹۸۲۔ ❺ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبی ﷺ: ۲۹۵۰۔

❻ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بخاری، باب این یصلی الظھر: ۱٦۵۳؛ مسلم: ۳۱٦٦، دونوں میں ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز حسب دستور اس دن بھی منیٰ میں پڑھی لیکن حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی جو طویل حدیث قصہ حجۃ الوداع میں ہے اس میں تعیین ہے کہ آپ نے مکہ میں نماز ظہر پڑھی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے اس بنا پر محدثین میں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بقیہ ایام التشریق یعنی ۱۲ ذی الحجہ تک آپ ﷺ نے مستقل اقامت منیٰ ہی میں فرمائی، ہر روز زوال کے بعد رمی جمار کی غرض سے تشریف لے جاتے اور پھر واپس آ جاتے۔ (ابوداؤد باب الخطبۃ بمنیٰ) میں ایک حدیث ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ۱۲ ذی الحجہ کو بھی منیٰ میں ایک خطبہ دیا تھا، جس کے الفاظ مختصراً وہی ہیں جو پہلے خطبوں میں گزر چکے ہیں۔ ۱۳ ذی الحجہ کو سہ شنبہ کے دن زوال کے بعد آپ نے یہاں سے نکل کر وادی محصب ❶ میں قیام کیا اور شب کو اسی مقام پر آرام فرمایا، پچھلے پہر اٹھ کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور خانہ کعبہ کا آخری طواف کر کے وہیں صبح کی نماز ادا کی، اس کے بعد قافلہ اسی وقت اپنے اپنے مقام کو روانہ ہو گیا، اور آپ نے مہاجرین وانصار کے ساتھ مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی، راہ میں ایک مقام خُم پڑا، جو جحفہ سے تین میل پر ہے، یہاں ایک تالاب ہے عربی میں تالاب کو غدیر کہتے ہیں اور اس لیے اس مقام کا نام عام روایتوں میں غدیر خم آتا ہے، آپ نے یہاں تمام صحابہ کو جمع کر کے ایک مختصر سا خطبہ دیا:

((اما بعد! الا ایها الناس! فانما انا بشر یوشك ان یاتی رسول ربی فاجیب وانا تارك فیكم الثقلین اولهما كتاب اللّٰه فیه الهدی والنور فخذوا بكتاب اللّٰه واستمسكوا به واهل بیتی اذكركم اللّٰه فی اهل بیتی)) ❷

''حمد و ثنا کے بعد، اے لوگو! میں بھی بشر ہوں ممکن ہے کہ خدا کا فرشتہ جلد آ جائے اور مجھے قبول کرنا پڑے (یعنی موت)۔ میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں، ایک خدا کی کتاب جس کے اندر ہدایت اور روشنی ہے، خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو اور دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں خدا کو یاد دلاتا ہوں۔''

آخری جملہ کو آپ نے تین دفعہ مکرر فرمایا، یہ صحیح مسلم (مناقبِ حضرت علی رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے۔ نسائی مسند امام احمد، ترمذی، طبرانی، طبری، حاکم، وغیرہ میں کچھ اور فقرے بھی ہیں جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت ظاہر کی گئی ہے ان روایتوں میں ایک فقرہ اکثر مشترک ہے:

((من كنت مولاه فعلي مولاه اللّٰهم وال من والاه وعاد من عاداه)) ❸

''جس کو میں محبوب ہوں علی بھی اس کو محبوب ہونا چاہیے، الٰہی جو علی سے محبت رکھے اس سے تو بھی محبت رکھ، اور جو علی سے عداوت رکھے اس سے تو بھی عداوت رکھ۔''

(گزشتہ سے پیوستہ) ان دونوں قولوں کی باہمی ترجیح اور وجوہ ترجیح میں اختلاف ہے، علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری روایت کو ترجیح دی ہے اور علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد میں پہلے قول کو مرجح ثابت کیا ہے، فریقین کے موازنہ دلائل کے بعد ہم نے ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ قبول کیا ہے ''س''۔ ❶ اسی کا دوسرا نام ابطح اور خیف بنی کنانہ ہے۔

❷ صحیح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن ابی طالب: ٦٢٢٥۔

❸ مسند احمد: ٤/ ٣٧٠؛ ترمذی: ٣٧١٣؛ ابن حبان: ٦٨٩٢؛ مستدرك حاكم: ٣/ ١١٠۔

احادیث میں خاص یہ تصریح نہیں کہ ان الفاظ کے کہنے کی ضرورت کیا پیش آئی۔ بخاری میں ہے کہ اسی زمانہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن بھیجے گئے تھے، جہاں سے واپس آ کر وہ حج میں شامل ہوئے تھے۔ یمن میں انہوں نے اپنے اختیار سے ایک ایسا واقعہ کیا تھا جس کو ان کے بعض ہمراہیوں نے پسند نہیں کیا، ان میں سے ایک صاحب نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''علی کو اس سے زیادہ کا حق تھا'' ❶ عجب نہیں کہ اسی قسم کے شکوک رفع کرنے کے لیے اس موقع پر آپ ﷺ نے یہ الفاظ فرمائے۔

مدینہ کے قریب پہنچ کر ذوالحلیفہ میں شب بسر کی، صبح کے وقت ایک طرف سے آفتاب نکلا اور دوسری طرف کو کبۂ نبوی مدینہ منورہ میں داخل ہوا، سوادِ مدینہ پر نظر پڑی تو یہ الفاظ فرمائے: ❷

((اللّٰہ اکبر لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملك ولہ الحمد وھو علی کل شیء قدیر، ائبون تائبون عابدون ساجدون لربنا حامدون، صدق اللّٰہ وعدہ و نصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ)) ❸

''خدا بزرگ و برتر ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں، کوئی اس کا شریک نہیں، بس اسی کی سلطنت ہے، اسی کے لیے مدح اور ستائش ہے، وہ ہر بات پر قادر ہے، لوٹے آ رہے ہیں توبہ کرتے ہوئے، فرمانبردارانہ، زمین پر پیشانی رکھ کر، اپنے پروردگار کی مدح و ستائش میں مصروف ہو کر، خدا نے اپنا وعدہ سچا کیا، اپنے بندہ کی نصرت کی اور تمام قبائل کو تنہا شکست دی۔''

---

❶ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب بعث علی الی الیمن: ٤٣٥٠۔

❷ حجۃ الوداع کے واقعات تمام تر صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد اور نسائی سے لیے گئے ہیں، ہر واقعہ کے لیے ان کتابوں میں کتاب الحج کے مختلف ابواب دیکھو۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب العمرۃ، باب مایقول اذا رجع من الحج: ١٧٩٧؛ صحیح مسلم ٣٢٧٨؛ ابوداود: ٢٧٧٠؛ ترمذی: ٩٥٠۔

وفات

﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴾ (۳۹/ الزمر:۳۰)*

ربیع الاوّل ۱۱ھ مطابق مئی ۶۳۳ء

روح قدسی کو عالم جسمانی میں اسی وقت تک رہنے کی ضرورت تھی کہ تکمیل شریعت اور تزکیۂ نفوس کا عظیم الشان کام درجۂ کمال تک پہنچ جائے۔ حجۃ الوداع میں یہ فرضِ اہم ادا ہو چکا، توحید کامل اور مکارمِ اخلاق کے اصول عملاً قائم کر کے عرفات کے مجمع عام میں اعلان کر دیا گیا کہ

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۳)

''آج کے دن میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں پوری کر دیں۔''

سورۂ فتح کا نزول خاص خاص صحابہ رضی اللہ عنہم کو آنحضرت ﷺ کے قرب وفات کی اطلاع دے چکا تھا، ❶ اور آپ ﷺ حکم ربانی ﴿ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ﴾ (۱۱۰/ النصر:۳) کے مطابق زیادہ تر اوقات تسبیح وتہلیل میں بسر فرماتے تھے، ❷ آپ عموماً ہر سال رمضان مبارک میں دس دن اعتکاف میں بیٹھتے تھے لیکن رمضان ۱۰ھ میں بیس دن اعتکاف میں بیٹھے۔ سال میں ایک دفعہ ماہ رمضان میں آپ ﷺ پورا قرآن ناموس اکبر (حضرت جبریل علیہ السلام) کی زبانی سنتے تھے لیکن وفات کے سال دو دفعہ یہ شرف حاصل ہوا ❸ حجۃ الوداع کے موقع پر مناسک حج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے یہ اعلان بھی فرمایا کہ ''مجھے امید نہیں کہ آیندہ سال تم سے مل سکوں۔'' بعض روایتوں میں یہ الفاظ اس طرح وارد ہوئے ہیں: ''شاید میں اس کے بعد حج نہ کر سکوں۔'' ❹ غدیر خم کے خطبہ میں بھی اسی قسم کے الفاظ ادا ہوئے۔

غزوۂ اُحد کے بیان میں گزر چکا ہے کہ شہدائے احد کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی گئی تھی، تمام غزوات میں صرف غزوۂ احد ہی ایک ایسا غزوہ ہے جس میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ بے کسی کے ساتھ جان دی، اس لیے ان کی یاد آپ ﷺ کے دل میں اس وقت بھی موجود تھی۔

حجۃ الوداع کے موقع پر تمام مسلمانوں کو اپنے فیض دیدار سے مشرف فرمایا اور ان کو حسرت کے ساتھ الوداع کیا۔ شہدائے اُحد جو ﴿ بَلْ هُمْ اَحْيَآءٌ ﴾ کے مژدۂ جاں فزا سے فیض یاب تھے، آٹھ برس کے بعد آخری دفعہ آپ ﷺ نے ان کو بھی اپنی زیارت سے مشرف کرنا ضروری سمجھا، چنانچہ اسی زمانہ میں ان کی قبر پر تشریف لے گئے اور ان کے لیے دعائے خیر فرمائی اور اس رقت انگیز طریقہ سے ان کو الوداع کیا کہ ''جس

❶ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قوله: فسبح بحمد ربك: ۴۹۷۰۔ ❷ اس قسم کی روایتیں گو طبری، ابن خزیمہ اور ابن مردویہ میں ہیں لیکن مختصراً صحیح بخاری، تفسیر اذا جاء: ۴۹۶۸ میں بھی مذکور ہیں۔ ❸ صحیح بخاری، باب الاعتکاف فی العشر الاوسط من رمضان: ۲۰۴۴ وکتاب فضائل القرآن، باب کان جبریل یعرض القرآن: ۴۹۹۸۔

❹ نسائی، کتاب مناسك الحج، باب الرکوب الی الجمار: ۳۰۶۴۔

طرح ایک مرنے والا اپنے زندہ اعزہ کو وداع کرتا ہے۔'' ❶ اس کے بعد ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا: ''میں تم سے پہلے حوض پر جا رہا ہوں، اس کی وسعت اتنی ہے جتنی ایلہ سے جحفہ تک، مجھ کو تمام دنیا کے خزانوں کی کنجی دی گئی ہے، مجھے خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم شرک کرو گے لیکن اس سے ڈرتا ہوں کہ دنیا میں نہ مبتلا ہو جاؤ اور اس کے لیے آپس میں کشت وخون نہ کرو، تو پھر اسی طرح ہلاک ہو جاؤ جس طرح تم سے پہلی قومیں ہلاک ہوئیں۔'' راوی کا بیان ہے کہ یہ آخری دفعہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو خطبہ دیتے ہوئے سنا۔

غزوات میں گزر چکا ہے کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو حدود شام کے عربوں نے شہید کر ڈالا تھا، آنحضرت ﷺ ان سے اس کا قصاص لینا چاہتے تھے، آغاز علالت سے ایک روز پہلے آپ ﷺ نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو مامور کیا کہ وہ فوج لے کر جائیں اور ان شریروں سے اپنے باپ کا انتقام لیں۔ ❷ (۱۸ یا ۱۹) صفر ۱۱ھ ❸ میں آدھی رات کو آپ ﷺ جنت البقیع میں جو عام مسلمانوں کا قبرستان تھا تشریف لے

❶ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الصلوۃ علی الشهید: ۱۳٤٤، ۳٥۹٦ و صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب اثبات حوض نبینا: ٥۹٦٦۔ ❷ واقدی اور ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اس غزوہ میں آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو بھی جانے کا حکم دیا تھا لیکن یہ روایتیں بے سند ہیں، اس لئے علامہ ابن تیمیہ نے اس سے شدت کے ساتھ انکار کیا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق تو نہیں کہا جا سکتا لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے ایام علالت میں امام نماز مقرر فرمایا، اور یہ صحیح روایت سے ثابت ہے اس بنا پر اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جانے کا حکم ہوا تھا تو معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو آپ ﷺ نے مستثنیٰ کر لیا۔

❸ آنحضرت ﷺ کی ابتدائے مرض کے دن، مدت علالت اور تاریخ وفات کی تعیین میں روایات مختلف ہیں امر مختلف فیہ سے پہلے ان امور کو بتا دینا چاہیے جن پر تمام روایات کا اتفاق ہے اور جن پر گویا محدثین اور ارباب سیر کا اجماع عام ہے اور وہ یہ ہیں (۱) سال وفات ۱۱ھ ہے۔ (۲) مہینہ ربیع الاول کا تھا (۳) یکم سے ۱۲ تک کوئی تاریخ تھی (۴) دوشنبہ کا دن تھا (صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب موت یوم الاثنین: ۱۳۸۷) زیادہ تر روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کل ۱۳ دن بیمار رہے اس بنا پر اگر یہ تحقیقی طور سے متعین ہو جائے کہ آپ نے کس تاریخ کو وفات فرمائی تو تاریخ آغاز مرض بھی متعین کی جا سکتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر بروایت صحیح ۸ روز (ایک دوشنبہ سے دوسرے دوشنبہ تک) بیمار رہے اور یہیں وفات فرمائی اس لیے ایام علالت کی مدت آٹھ روز تو یقینی ہے عام روایات کی رو سے پانچ دن اور چاہئیں اور یہ قرائن سے بھی معلوم ہوتا ہے اس لیے ۱۳ دن مدت علالت صحیح ہے۔ علالت کے ۵ دن آپ نے دوسری ازواج کے حجروں میں بسر فرمائے۔ اس حساب سے علالت کا آغاز چہارشنبہ سے ہوتا ہے۔

تاریخ وفات کی تعیین میں راویوں کا اختلاف ہے، کتب حدیث کا تمام تر دفتر چھان ڈالنے کے بعد بھی تاریخ وفات کی مجھ کو کوئی روایت احادیث میں نہیں مل سکی، ارباب سیر کے ہاں تین روایتیں ہیں، یکم ربیع الاول، دوم ربیع الاول اور ۱۲ ربیع الاول۔ ان تینوں روایتوں میں باہم ترجیح دینے کے لیے اصول روایت و درایت دونوں سے کام لینا ہے اور روایت دوم ربیع الاول کی روایت ہشام بن محمد بن سائب کلبی اور ابو مخنف کے واسطہ سے مروی ہے۔ (طبری ج ۴، ص: ۱۸۱۵) اس روایت کو گو اکثر قدیم مؤرخوں (مثلاً یعقوبی و مسعودی وغیرہ) نے قبول کیا ہے لیکن محدثین کے نزدیک یہ دونوں مشہور دروغ گو اور غیر معتبر ہیں، یہ روایت واقدی سے بھی ابن سعد و طبری نے نقل کی ہے (طبقات ابن سعد، جز ۲، ص: ۵۷ جز وفات) لیکن واقدی کی مشہور ترین روایت جس کو اس نے متعدد اشخاص سے نقل کیا ہے وہ ۱۲ ربیع الاول کی ہے (ایضاً ص: ۵۸) البتہ بیہقی نے دلائل میں بسند صحیح سلیمان التیمی سے دوم ربیع الاول کی روایت نقل کی ہے (نور النبراس ابن سید الناس ذکر وفات) لیکن یکم ربیع الاول کی روایت ثقہ ترین ارباب سیر موسیٰ بن عقبہ سے اور مشہور محدث امام لیث مصری سے مروی ہے۔ (فتح الباری، ج ۸، ص: ۹۸) امام سہیلی نے روض الانف میں اسی روایت کو اقرب الی الحق لکھا ہے (ج ۲، ص: ۳۷۲ ذکر وفات مطبع جمالیہ مصر: ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء) اور سب سے پہلے امام مذکور ہی نے درایۃً اس نکتہ کو دریافت کیا کہ ۱۲ ربیع الاول کی روایت قطعاً ناقابل تسلیم ہے کیونکہ دو باتیں یقینی طور پر ثابت ہیں، روز وفات دوشنبہ کا دن تھا (صحیح بخاری: ۱۳۸۷ و صحیح مسلم: ٦۹٤٥ ...) ... تقریباً تین مہینے پہلے ذی الحجہ ۱۰ھ کی نویں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

گئے۔ وہاں سے واپس تشریف لائے تو مزاج ناساز ہوا، یہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ❶ کی باری کا دن تھا اور روز چہار شنبہ تھا، پانچ دن تک آپ ﷺ اس حالت میں بھی از راہِ عدل و کرم باری باری ایک ایک بیوی کے حجرہ میں تشریف لے جاتے رہے، دوشنبہ کے دن، مرض میں شدت ہوئی تو ازواج مطہرات سے اجازت لی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر قیام فرمائیں۔ خلق عمیم کی بنا پر اجازت بھی صاف اور علانیہ نہیں طلب کی، بلکہ پوچھا کہ کل میں کس کے گھر رہوں گا۔ دوسرا دن (دوشنبہ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہاں قیام فرمانے کا تھا ازواجِ مطہرات نے مرضیٔ اقدس سمجھ کر عرض کی کہ آپ ﷺ جہاں چاہیں قیام فرمائیں ❷ ضعف اس قدر ہو گیا تھا کہ چلا نہیں

(۞۞ گزشتہ سے پیوستہ) تاریخ کو جمعہ کا دن تھا (صحیح بخاری تفسیر ﴿الیوم اکملت لکم دینکم: ٤٦٠٦﴾ ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ روز جمعہ سے ۱۲ ربیع الاول ذی الحجہ تک حساب لگاؤ، ذی الحجہ، محرم، صفر، ان تینوں مہینوں کو خواہ ۲۹-۲۹ خواہ ۳۰-۳۰۔ بعض ۳۰ کسی حالت اور کسی شکل سے ۱۲ ربیع الاول کو دوشنبہ کا دن نہیں پڑ سکتا۔ اس لئے درایۃً بھی یہ تاریخ قطعاً غلط ہے، دوم ربیع الاول کے حساب سے اس وقت دوشنبہ پڑ سکتا ہے جب تینوں مہینے ۲۹ کے ہوں۔ جب دو پہلی صورتیں صحیح نہیں ہیں تو اب صرف تیسری صورت رہ گئی ہے جو کثیر الوقوع ہے یعنی یہ کہ دو مہینے ۲۹ کے اور ایک مہینہ ۳۰ کا لیا جائے، اس حالت میں یکم ربیع الاول کو دوشنبہ کا روز واقع ہوگا اور یہی ثقہ اشخاص کی روایت ہے۔ ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا کہ اگر ۹ ذی الحجہ کو جمعہ ہو تو اوائل ربیع الاول میں اس حساب سے دوشنبہ کس کس دن واقع ہو سکتا ہے۔

نمبر شمار	صورت مفروضہ	دوشنبہ	دوشنبہ	دوشنبہ
۱	ذی الحجہ، محرم اور صفر سب ۳۰ دن کے ہوں۔	۶	۱۳	
۲	ذی الحجہ، محرم اور صفر سب ۲۹ دن کے ہوں۔	۲	۹	۱۶
۳	ذی الحجہ ۲۹، محرم ۲۹ اور صفر ۳۰ کا ہو۔	۱	۸	۱۵
۴	ذی الحجہ ۳۰، محرم ۲۹ اور صفر ۲۹ کا ہو۔	۱	۸	۱۵
۵	ذی الحجہ ۲۹، محرم ۳۰ اور صفر ۲۹ کا ہو۔	۱	۸	۱۵
۶	ذی الحجہ ۳۰، محرم ۲۹ اور صفر ۳۰ کا ہو۔	۷	۱۴	
۷	ذی الحجہ ۳۰، محرم ۳۰ اور صفر ۲۹ کا ہو۔	۷	۱۴	
۸	ذی الحجہ ۲۹ کا اور محرم و صفر ۳۰ کے ہوں۔	۷	۱۴	

ان مفروضہ تاریخوں میں سے ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵ خارج از بحث ہیں کہ علاوہ اور وجوہ کے ان کی تائید میں کوئی روایت نہیں، رہ گئیں یکم اور دوم تاریخیں، دوم تاریخ صرف ایک صورت میں پڑ سکتی ہے جو خلاف اصول ہے یکم تاریخ تین صورتوں میں واقع ہو سکتی ہے اور تینوں کثیر الوقوع ہیں اور روایت ثقات ان کی تائید میں ہیں اس لئے وفات نبوی کی صحیح تاریخ ہمارے نزدیک یکم ربیع الاول ۱۱ھ ہے اس حساب میں فقط رویت ہلال کا اعتبار کیا گیا ہے جس پر اسلامی قمری مہینوں کی بنیاد ہے اصول فلکی سے ممکن ہے کہ اس پر خدشات وارد ہو سکتے ہوں۔ کتب تفسیر میں آیت ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس آیت کے یوم نزول (۹ ذی الحجہ ۱۰ ہجری) سے روز وفات تک کے ۸۱ دن ہیں۔ (دیکھو ابن جریر، ج ۶، ص: ۴۴ و ابن کثیر، ج ۲، ص: ۱۳ و بغوی وغیرہ) ہمارے حساب سے ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ سے لے کر یکم ربیع الاول تک دو ۲۹ اور ایک مہینہ ۳۰ لے کر جو ہماری مفروضہ صورت ہے پورے ۸۱ دن ہوتے ہیں ابو نعیم نے بھی دلائل میں بسند یکم ربیع الاول تک تاریخ وفات نقل کی ہے۔ صفحہ ١٤٦۔ "س" ❶ ابن سعد وعبدالرزاق بسند صحیح وصحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب استخلاف الامام: ۹۳۷۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاته: ٤٤٥٠۔ ابن سعد نے بروایاتِ صحیحہ نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ۞۞)

جاتا تھا، حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما دونوں بازو تھام کر بمشکل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں لائے۔

آمد و رفت کی قوت جب تک رہی آپ ﷺ مسجد میں نماز پڑھانے کی غرض سے تشریف لاتے رہے، سب سے آخری نماز جو آپ ﷺ نے پڑھائی وہ مغرب ❶ کی نماز تھی، سر میں درد تھا، اس لیے سر میں رومال باندھ کر آپ ﷺ تشریف لائے اور نماز ادا کی جس میں سورۂ والمرسلات عرفاً قراءت فرمائی۔ عشاء کی نماز کا وقت آیا ❷ تو دریافت فرمایا کہ نماز ہو چکی؟ لوگوں نے عرض کی کہ سب کو حضور کا انتظار ہے، لگن میں پانی بھروا کر غسل فرمایا، پھر اٹھنا چاہا تو غش آ گیا، افاقہ کے بعد پھر فرمایا کہ نماز ہو چکی؟ لوگوں نے پھر وہی جواب دیا آپ ﷺ نے پھر غسل فرمایا اور پھر جب اٹھنا چاہا تو غش آ گیا، افاقہ ہوا تو پھر دریافت فرمایا اور لوگوں نے وہی جواب دیا، تیسری دفعہ جسم مبارک پر پانی ڈالا پھر جب اٹھنے کا ارادہ کیا تو پھر غشی طاری ہو گئی جب افاقہ ہوا تو ارشاد ہوا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز پڑھائیں۔ (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے معذرت کی کہ یا رسول اللہ! ابوبکر نہایت رقیق القلب ہیں آپ ﷺ کی جگہ ان سے کھڑا نہ ہوا جائے گا آپ نے پھر یہی حکم دیا کہ ابوبکر نماز پڑھائیں چنانچہ کئی دن ❸ تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی۔

وفات سے چار دن پہلے (جمعرات کو) آپ ﷺ نے فرمایا کہ دوات کاغذ لاؤ ❹ میں تمہارے لیے

(۞۞ گزشتہ سے پیوستہ) حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے اجازت طلب کی تھی[طبقات ابن سعد، جز۲، رقم:۲،ص:۲۹]

❶ یہ حدیث بخاری: ٧٦٣، ٤٤٢٩ ومسلم: ١٠٣٣؛ ابو داود: ٨١٠؛ ترمذی: ٣٠٨ اور نسائی: ٩٨٦ میں مذکور ہے آیندہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت آئے گی، جس میں مذکور ہوگا کہ آخری نماز مسجد میں ظہر کی آپ ﷺ نے پڑھائی۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ان دونوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ مغرب کا واقعہ اندرون حجرۂ نبوی کا واقعہ ہے جیسا کہ نسائی میں ہے (رقم: ٩٨٦) لیکن آگے چل کر حافظ موصوف کی نظر ترمذی کی روایت پر پڑی جس میں مذکور ہے کہ ''آنحضرت ﷺ نے باہر نکل کر نماز پڑھائی'' اس کی تاویل ان کو یہ کرنی پڑی کہ ''اس سے مقصود ہے کہ خوابگاہ سے باہر آ کر'' (جلد ۴ صفحہ ۲۰۴) لیکن ہمارے نزدیک یہ تاویل صحیح نہیں کہ اولاً حجرۂ نبوی ﷺ میں اتنی جگہ نہ تھی کہ کوئی بڑی جماعت ہو سکے دوسرے یہ کہ خوابگاہ کے علاوہ حجرۂ نبوی ﷺ میں اور جگہ کہاں تھی علاوہ ازیں احادیث میں صلی بنا کے یہی معنی ہر جگہ آئے ہیں کہ تمام مسلمانوں کے امام بن کر نماز پڑھائی گھر کی نماز پر یہ لفظ صادق نہیں آتا۔ اس لئے صحیح یہ ہے کہ نماز مسجد نبوی میں پڑھی گئی جیسا کہ عام روایات کا اشارہ ہے۔ آخری نماز مغرب تھی یا ظہر، اس کی تطبیق یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی مسلسل امامت کا انقطاع مغرب کی نماز مذکورہ پر ہوا جیسا کہ آگے عشاء کی نماز کے ذکر میں آئے گا ظہر کی نماز جو آنحضرت ﷺ نے مسجد میں آ کر ادا فرمائی وہ اتفاقی تھی اصل میں امام پہلے سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے، آنحضرت ﷺ آ کر بعد کو شریک ہو گئے تھے، یہ نماز مسجد میں آپ کی آخری نماز تھی۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ مذکور ہے کہ آخری نماز صبح کی تھی، یہ درحقیقت ان کا اپنا واقعہ ہے یعنی ان کو آخری بار یہی موقع ملا۔ ''س'' ❷ صحیح بخاری، كتاب الاذان، باب انما جعل الامام ليؤتم به: ٦٨٧ ومسلم، كتاب الصلوة، باب استخلاف الامام: ٩٣٦ میں بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ تخصیص ہے)۔ ❸ بخاری، كتاب الصلوة، باب اهل العلم والفضل احق بالامامة (٦٨١) میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تین دن آنحضرت ﷺ نے نماز نہیں پڑھائی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کی قائم مقامی کی، اس قائم مقامی کا آغاز شب جمعہ کی نمازِ عشاء سے ہے اور اختتام دوشنبہ کی صبح کی نماز پر ہوا (بخاری، كتاب الصلوة، باب من رجع القهقرى فى الصلوة: ١٢٠٥) کل یہ ۳ دن میں ۱۷ وقت کی نمازیں ہوئیں۔ ابن سعد نے واقدی سے بعینہ یہی روایتیں کی ہیں، ایک میں ہے کہ ۳ دن امامت کی دوسری میں ہے کہ ۱۷ وقت کی جز۲، قسم ثانی ص: ۲۳ ''س''۔ ❹ یہ روایت صحیح بخاری، كتاب المغازى، باب مرض النبى ووفاته: ٤٤٣١، ٤٤٣٢، موقع وفات کی ہے صحیح بخاری میں یہ حدیث مختلف ابواب میں مذکور اور ہر جگہ الفاظ میں کچھ نہ کچھ اختلاف ہے (صحيح مسلم، كتاب الوصية (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ۞۞)

ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ "رسول اللہ ﷺ کو مرض کی شدت ہے (غلبه الوجع) اور تمہارے پاس قرآن مجید موجود ہے جو ہمارے لیے کافی ہے" اس پر حاضرین میں اختلاف پیدا ہوا، بعض کہتے تھے کہ تعمیل ارشاد کی جائے، بعض کچھ اور کہتے تھے، اختلاف اور شوروغل زیادہ ہوا تو بعض نے کہا "اهجر استفهموه" خود آپ سے دریافت کرلو، لوگ جب پوچھنے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا: "مجھے چھوڑ دو میں جس مقام میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو۔"

(اس کے بعد آپ ﷺ نے تین) وصیتیں فرمائیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ کوئی مشرک عرب میں رہنے نہ پائے، دوسری یہ کہ سفراء کا اسی طرح احترام کیا جائے جس طرح آپ کے زمانہ میں دستور تھا، تیسری وصیت راوی کو یاد نہیں رہی۔ ❶ اسی دن ❷ ظہر کی نماز کے وقت آپ کی طبیعت کچھ سکون پذیر ہوئی) آپ نے حکم دیا کہ پانی کی سات مشکیں آپ پر ڈالی جائیں، غسل فرما چکے تو حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما تھام

(گزشتہ سے پیوستہ) میں یہ روایتیں یکجا ہیں) جن صحابی نے قلم دوات لانے میں گفتگو کی بخاری میں ان کا نام نہیں لیکن حدیث کی اور کتابوں میں (مثلاً صحیح مسلم) بہ تصریح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام ہے۔صحیح مسلم، کتاب الوصية، باب ترك الوصية: ٤٢٣٤ میں (ان کے) یہ الفاظ ہیں: قد غلب عليه الوجع وعندكم القران وحسبنا كتاب الله "آپ ﷺ کو مرض کی شدت ہے ہمارے پاس قرآن موجود ہے خدا کی کتاب ہمارے لئے کافی ہے۔" صحیح مسلم کی دوسری روایتوں کے یہ الفاظ ہیں

(۱) فقالوا ان رسول اللہ ﷺ يهجر (ایضاً: ٤٢٣٣)۔ "تو لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ بے حواس (ہجر) کی باتیں کرتے ہیں۔"

(۲) فقالوا اهجر استفهموه. (ایضاً: ٤٢٣٢؛ بخاری: ٤٤٣١) "تو لوگوں نے کہا: کیا آپ بے حواسی کی باتیں کرتے ہیں، آپ سے خود پوچھو تو۔"

اس بنا پر یہ روایت شیعہ وسنی کا بڑا معرکہ آرا میدان بن گئی ہے، شیعہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے۔ سنی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو واقعی تکلیف تھی اور یہ معلوم تھا کہ شریعت کے متعلق کوئی نکتہ باقی نہیں رہا خود قرآن مجید میں آیت ﴿اليوم اكملت لكم﴾ نازل ہو چکی تھی اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا اگر کوئی ضروری حکم ہوتا تو آنحضرت ﷺ کسی کے روکنے سے کیونکر رک سکتے تھے، اس واقعہ کے بعد چار دن تک آپ زندہ رہے اس وقت نہ سہی بعد کو لکھوا دیا ہوتا (اور یہ کیونکر معلوم ہوا کہ آپ کیا لکھوانا چاہتے تھے، بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو بلا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے، پھر آپ نے ضروری نہیں سمجھا اور فرمایا کہ "خود خدا اور اہل اسلام ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی اور کو پسند نہ کریں گے۔" اس اختلاف کے بعد آپ ﷺ نے لوگوں کو زبانی تین وصیتیں فرمائیں جو ضروری بات آپ ﷺ کاغذ پر لکھوانا چاہتے تھے ممکن ہے کہ وہ یہی ہوں یا اگر وہ ان کے علاوہ تھی تو آپ اس کو ان عام وصیتوں کے ساتھ زبانی بھی فرما سکتے تھے اس کے بعد مجمع عام میں جو خطبہ دیا اس میں اس کا اظہار فرما سکتے تھے)" س" مجھ کو احتیاط کرنی چاہیے کہ کتاب تاریخ کی حیثیت سے نکل کر علم کلام کے دائرہ میں نہ آجائے تاہم جو میری ذاتی تحقیق ہے میں الفاروق میں لکھ چکا ہوں)۔

❶ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ: ٤٤٣١؛ (صحیح مسلم: ٤٢٣٢)

❷ روایتوں میں بالتصریح یہ مذکور نہیں ہے کہ یہ کس دن کے ظہر کا واقعہ ہے لیکن صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النهی عن بناء المساجد علی القبور: ١١٨٨ میں حضرت جندب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ "حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں جو الفاظ آپ نے فرمائے تھے جن کا بیان آگے آتا ہے وہ وفات سے پانچ روز پیشتر فرمائے تھے" اور چونکہ مرض (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کر مسجد میں لائے جماعت کھڑی ہو چکی تھی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے آہٹ پا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹے، آپ نے اشارہ سے روکا اور ان کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھائی، یعنی آپ ﷺ کو دیکھ کر حضرت ابوبکر اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر اور لوگ ارکان ادا کرتے جاتے تھے۔

نماز کے بعد آنحضرت ﷺ نے ایک خطبہ دیا جو آپ کی زندگی کا سب سے آخری خطبہ تھا، آپ ﷺ نے فرمایا:

''خدا نے اپنے ایک بندہ کو اختیار عطا فرمایا ہے کہ خواہ وہ دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے، یا خدا کے پاس (آخرت میں جو کچھ ہے اس کو قبول کرے، لیکن اس نے خدا ہی کے پاس کی چیزیں قبول کیں۔'' یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رو پڑے، لوگوں نے ان کی طرف تعجب سے دیکھا کہ آپ تو ایک شخص کا واقعہ بیان کرتے ہیں، یہ رونے کی کون سی بات ہے لیکن راز دار نبوت سمجھ چکا تھا کہ وہ بندہ خود محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، آپ نے اپنی تقریر کا سلسلہ آگے بڑھایا، اور فرمایا:

''سب سے زیادہ میں جس کی دولت اور صحبت کا ممنون ہوں، وہ ابوبکر ہیں، (رضی اللہ عنہ) [1] اگر میں دنیا میں کسی کو اپنی امت میں سے اپنا دوست بنا سکتا تو میں ابوبکر کو بناتا، لیکن اسلام کا رشتہ دوستی کے لیے کافی ہے۔ مسجد کے رخ کوئی دریچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دریچہ کے سوا باقی نہ رکھا جائے، ہاں تم سے پہلی قوموں نے اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا ہے دیکھو تم ایسا نہ کرنا میں منع کر جاتا ہوں۔''

زمانہ علالت میں انصار آپ کی عنایات اور مہربانیوں کو یاد کر کے روتے تھے، ایک دفعہ اسی حالت میں حضرت ابوبکر اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا گزر ہوا، انہوں نے انصار کو روتے دیکھا تو وجہ دریافت کی، انہوں نے بیان کی کہ ''حضور ﷺ کی صحبتیں یاد آتی ہیں۔'' ان میں سے ایک صاحب نے جا کر آنحضرت ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ آج اس کی تلافی کا موقع تھا، اس لیے اس کے بعد آپ نے انصار کی نسبت لوگوں کی طرف خطاب کر کے فرمایا: ''یا ایھا الناس! میں انصار کے معاملہ میں تم کو وصیت کرتا ہوں، عام مسلمان بڑھتے جائیں گے لیکن انصار اس طرح کم ہو کر رہ جائیں گے جیسے کھانے میں نمک وہ اپنی طرف سے اپنا فرض ادا کر چکے، اب تمہیں ان کا فرض ادا کرنا ہے، وہ میرے جسم میں (بمنزلہ) معدہ کے ہیں، جو تمہارے نفع و نقصان کا متولی ہو (یعنی جو خلیفہ ہو) اس کو چاہیے کہ ان میں جو نیکوکار ہوں ان کو قبول کرے اور جن سے خطا ہوئی ہو ان کو

(گزشتہ سے پیوستہ) الموت کا خطبہ اسی نماز ظہر کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا تھا جیسا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے اس لیے یہ وفات سے پانچ روز پہلے جمعرات کا واقعہ تھا، حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں یہی فیصلہ کیا ہے۔

[1] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی ﷺ واصحابه: ٣٩٠٤ ومسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر: ٦١٧٠ اخیر ٹکڑہ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النهی عن بناء المساجد علی القبور: ١١٨٨ میں ہے۔

معاف کرے۔" [1]

اوپر گزر چکا ہے کہ رومیوں کی طرف جس فوج کا بھیجنا آنحضرت ﷺ نے تجویز کیا تھا اس کی سرداری اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو تفویض فرمائی تھی، اس پر لوگوں نے (ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ وہ منافقین تھے) شکایت کی کہ بڑے بوڑھوں کے ہوتے ہوئے نوجوان کو یہ منصب کیوں عطا ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے اس مسئلہ کی نسبت ارشاد فرمایا:

"اگر اسامہ کی سرداری پر تم کو اعتراض ہے تو اس کے باپ (زید) کی سرداری پر بھی تم معترض تھے۔ خدا کی قسم وہ اس منصب کا مستحق تھا اور وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب تھا اور اب اس کے بعد یہ سب سے زیادہ محبوب ہے۔" [2]

اسلام اور دیگر مذاہب میں ایک نہایت دقیق فرق یہ ہے کہ اسلام شریعت کے تمام احکام کا واضع اور حاکم براہ راست خدائے پاک کو قرار دیتا ہے، پیغمبر کا صرف اسی قدر فرض ہے کہ احکام الٰہی کو اپنے قول و عمل کے ذریعہ سے بندوں تک پہنچا دے، چونکہ دوسرے مذاہب میں یہ غلط فہمی شرک و کفر تک منجر ہو چکی تھی اور اس کے نتائج پیش نظر تھے، اس لیے ارشاد فرمایا:

"حلال و حرام کی نسبت میری طرف نہ کی جائے، میں نے وہی چیز حلال کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے اور وہی چیز حرام کی ہے جو خدا نے حرام کی ہے۔"

انسان کی جزا و سزا کی بنیاد خود اس کے ذاتی عمل پر ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

"اے پیغمبر خدا کی بیٹی فاطمہ! اور اے پیغمبر خدا کی پھوپھی صفیہ! خدا کے ہاں کیلئے کچھ کرلو، میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔" [3]

خطبہ سے فارغ ہو کر آپ ﷺ حجرہ عائشہ رضی اللہ عنہا میں واپس تشریف لائے۔

آپ ﷺ کو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے بے حد محبت تھی (اثنائے علالت میں) ان کو بلا بھیجا، تشریف لائیں تو ان سے کچھ کان میں باتیں کیں، وہ رونے لگیں پھر بلا کر کچھ کان میں کہا تو ہنس پڑیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا تو کہا پہلی دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "میں اسی مرض میں انتقال کروں

---

[1] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، قول النبی ﷺ: اقبلو من محسنهم: ۳۸۰۰۔

[2] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب زید بن حارثة: ۳۷۳۰، ۴۴۶۹۔

[3] (یہ اور اس کے اوپر کی حدیث مسند امام شافعی، باب استقبال القبلة، ص: ۱۶؛ کتاب الام امام شافعی اور ابن سعد جزء الوفات، جز ۲ قسم ثانی، ص: ۴۲ میں بسند حسن مروی ہے لیکن ان روایتوں میں مذکور ہے کہ صبح کی نماز کے بعد آپ ﷺ نے یہ فرمایا لیکن بخاری کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز میں شرکت فرمائی تھی اور اس کے بعد خطبہ دیا تھا، دوسری غلطی مسند اور ابن سعد کی روایتوں میں یہ ہے کہ وہ دوشنبہ کی صبح یعنی روز وفات کا واقعہ اس کو بیان کرتے ہیں حالانکہ بروایات صحیحہ ثابت ہے کہ دوشنبہ کی صبح کو آپ ﷺ نے صرف پردہ اٹھا کر جھانکا تھا، نہ باہر تشریف لائے اور نہ نماز میں شرکت فرمائی "س")

گا۔ جب میں رونے لگی تو فرمایا کہ میرے خاندان میں سے پہلے تمہیں مجھ سے آ کر ملو گی'' ❶ تو ہنسنے لگی۔

یہود و نصاریٰ نے انبیا کے مزارات اور یادگاروں کی تعظیم میں جو افراط کی تھی وہ بت پرستی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اسلام کا فرض اولین بت پرستی کی رگ و ریشہ کا استیصال کرنا تھا، اس لیے حالت مرض میں جو چیز سب سے زیادہ آپ ﷺ کے پیش نظر تھی یہی تھی (اتفاق سے بعض ازواج مطہرات نے جو حبشہ ہو آئی تھیں، اسی حالت میں وہاں کے عیسائی معبدوں ❷ کا اور ان کے مجسموں اور تصویروں کا تذکرہ کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی ❸ مر جاتا ہے تو اس کے مقبرہ کو عبادت گاہ بنا لیتے ہیں اور اس کا بت بنا کر اس میں کھڑا کرتے ہیں، قیامت کے روز اللہ عزوجل کی نگاہ میں یہ لوگ بدترین مخلوق ہوں گے۔'') ❹
عین کرب کی شدت میں جبکہ چادر کبھی منہ پر ڈال لیتے تھے اور کبھی گرمی سے گھبرا کر الٹ دیتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے زبان مبارک سے یہ الفاظ سنے:

((لعنة الله على اليهود و النصارى اتخذوا قبور انبيائهم مساجد)) ❺

''یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو، انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔''

اسی کرب اور بے چینی میں یاد آیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں۔ دریافت فرمایا:
''عائشہ! وہ اشرفیاں کہاں ہیں؟ محمد خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا؟ جاؤ ان کو خدا کی راہ میں خیرات کر دو۔'' ❻

(وفات سے ایک دن ❼ پہلے اتوار کو) لوگوں نے دوا پلانی چاہی چونکہ گوارا نہ تھی آپ ﷺ نے انکار فرمایا۔ اسی حالت میں غشی طاری ہو گئی، لوگوں نے منہ کھول کر پلا دی، افاقہ کے بعد آپ ﷺ کو احساس ہوا تو فرمایا: ''سب کو دوا پلائی جائے۔'' معلوم ہوا جن لوگوں نے زبردستی دوا پلائی تھی ان میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ شامل نہ تھے اس لیے وہ اس حکم سے مستثنیٰ رہے۔ ❽ محدثین اس واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ یہ بشریت کا اقتضا تھا، یعنی جس طرح بیماروں میں نازک مزاجی آ جاتی ہے آپ ﷺ نے بھی اسی طرح یہ حکم دیا تھا، لیکن ہمارے نزدیک تو یہ تنگ مزاجی نہیں بلکہ لطف طبع تھا۔ مرض میں اشتداد اور تخفیف ہوتی رہتی تھی جس دن وفات ہوئی یعنی (دوشنبہ کے روز) بظاہر طبیعت کو سکون تھا۔ حجرۂ مبارک مسجد سے ملا ہوا تھا، آپ نے (صبح کے وقت) پردہ اٹھا کر دیکھا تو لوگ (فجر کی) نماز میں مشغول تھے، دیکھ کر مسرت سے ہنس پڑے، لوگوں نے آہٹ پا کر خیال کیا

---

❶ صحيح بخاري، كتاب المغازي، باب مرض النبي ﷺ ووفاته: ٤٤٣٣، ٤٤٣٤۔
❷ کوئی رومن کیتھولک گرجا ہوگا، جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام اور ولیوں اور شہیدوں کے مجسمے اور تصویریں ہوتی ہیں۔
❸ جس کو عیسائی سینٹ کہتے ہیں۔ ❹ صحيح بخاري، كتاب الصلوة، باب الصلوة فى البيعة: ٤٣٤ وصحيح مسلم، كتاب المساجد، باب النهى عن بناء المساجد على القبور: ١١٨١۔ ❺ صحيح بخاري، كتاب احاديث الانبياء، باب ما ذكر عن بنى اسرائيل: ٣٤٥٤، ٤٤٤٤ وصحيح مسلم: ١١٨٧۔ ❻ مسند ابن حنبل، ج٦، ص: ٤٩ وابن سعد جزء الوفات بروايت متعدده جزء ثانى، قسم ثانى، ص:٣٢۔
❼ ابن سعد، جزء ثانى قسم ثانى، ص:٣١۔ ❽ صحيح بخاري، كتاب المغازي، باب مرض النبى ﷺ: ٤٤٥٨ وصحيح مسلم، كتاب السلام، باب (كراهة التداوى باللدود: ٥٧٦١)

کہ آپ ﷺ باہر آنا چاہتے ہیں فرط مسرت سے تمام لوگ بے قابو ہو گئے اور قریب تھا کہ نمازیں ٹوٹ جائیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو امام تھے، چاہا کہ پیچھے ہٹ جائیں، آپ ﷺ نے اشارہ سے روکا اور حجرۂ شریف میں داخل ہو کر پردے ڈال دیئے ❶ (صحیح مسلم میں ہے کہ اس قدر ضعف تھا کہ آپ ﷺ پردے بھی اچھی طرح نہ ڈال سکے۔ ❷ یہ سب سے آخری موقع تھا کہ صحابہ نے جمال اقدس کی زیارت کی۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کا چہرہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ مصحف کا کوئی ورق ❸ ہے یعنی سپید ہو گیا تھا۔)

دن جیسے جیسے چڑھتا جاتا تھا آپ ﷺ پر بار بار غشی طاری ہوتی تھی اور پھر افاقہ ہو جاتا تھا۔ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا یہ دیکھ کر بولیں: ❹ "واکرب اباہ" ہائے میرے باپ کی بے چینی! آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارا باپ آج کے بعد بے چین نہ ہوگا۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: آپ جب تندرست تھے تو فرمایا کرتے تھے کہ ''پیغمبروں کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خواہ موت کو قبول کریں یا حیاتِ دنیا کو ترجیح دیں۔'' اس حالت میں اکثر آپ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوتے رہے:

﴿ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ﴾ (٤/ النساء: ٦٩) ''ان لوگوں کے ساتھ جن پر خدا نے انعام کیا۔''

اور کبھی یہ فرماتے:

((اَللّٰهُمَّ فِی الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰی))۔ ''خداوند! بڑے رفیق ہیں۔'' ❺

وہ سمجھ گئیں کہ اب صرف رفاقت الٰہی مطلوب ہے۔

وفات سے ذرا پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ خدمت اقدس میں آئے آپ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سینہ پر سر ٹیک کر لیٹے تھے۔ عبدالرحمان کے ہاتھ میں مسواک تھی، مسواک کی طرف نظر جما کر دیکھا، حضرت عائشہ سمجھیں کہ آپ مسواک کرنا چاہتے ہیں، عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے مسواک لے کر دانتوں سے نرم کی اور خدمت اقدس میں پیش کی، آپ ﷺ نے بالکل تندرستوں کی طرح مسواک کی۔ اب وفات کا وقت قریب آ رہا تھا، سہ پہر تھی، ❻ سینہ میں سانس کی گھڑگھڑاہٹ محسوس ہوتی تھی، اتنے

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب اهل العلم والفضل احق بالامامة: ٦٨٠، ٦٨١ وکتب صحاح، کتاب الصلوٰۃ۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ: ٩٤٧۔

❸ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں جو صحیح مسلم (کتاب الصلوٰۃ: ٩٤٤۔٩٤٧) میں ہے، بیان ہے کہ تین دن کے بعد آپ اس وقت صبح کی نماز کے وقت برآمد ہوئے تھے لیکن جماعت میں شریک نہ ہو سکے اور واپس گئے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب الام میں اور ابن سعد نے جزء الوفات میں ابن ابی سبرہ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ اس نماز میں شریک جماعت ہوئے لیکن یہ درحقیقت راوی کا سہو ہے۔ صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں یہ تصریح مذکور ہے کہ آپ ﷺ شریک جماعت نہ ہو سکے اور واپس گئے، راوی کو گزشتہ نماز ظہر کی شرکت کا التباس ہوا، تین دن کے بعد سے مراد جمعرات کے روز جس دن آپ ﷺ نے خطبہ دیا تھا اس کے بعد سے جمعہ، سنیچر اور اتوار کے دن ہیں۔ ❹ بخاری: ٤٤٦٢۔ ❺ بخاری: ٤٤٣٦ تا ٤٤٣٨۔

❻ ابن اسحاق نے سیرت میں لکھا ہے کہ وفات دوپہر کو ہوئی لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک سے بخاری، کتاب الاذان، باب هل يلتفت لامر...... : ٧٥٤ اور مسلم میں روایت ہے کہ آخر یوم یعنی دوشنبہ کے آخر وقت وفات فرمائی۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے دونوں روایتوں میں اسی طرح تطبیق دی ہے کہ دوپہر ڈھل چکی تھی اور سہ پہر کا وقت تھا۔ فتح الباری، ج ٨، ص: ١١٠۔

میں لب مبارک ہلے تو لوگوں نے یہ الفاظ سنے:

((الصلوۃ وما ملکت ایمانکم)) ❶ ”نماز اور غلام۔“

پاس پانی کی لگن تھی، اس میں بار بار ہاتھ ڈالتے اور چہرے پر ملتے (چادر کبھی منہ پر ڈال لیتے اور کبھی ہٹا دیتے، اتنے میں) ہاتھ اٹھا کر (انگلی سے اشارہ کیا اور تین دفعہ) فرمایا:

((بل الرفیق الاعلٰی)) ”اب اور کوئی نہیں بلکہ وہ بڑا رفیق درکار ہے۔“

یہی کہتے کہتے ہاتھ لٹک آئے آنکھیں پھٹ کر چھت سے لگ گئیں اور روح پاک عالم قدس میں پہنچ گئی۔ ❷

اللھم صل علیه وعلی اله واصحابه صلوۃً کثیرًا کثیرًا

تجہیز و تکفین

تجہیز و تکفین کا کام دوسرے دن سہ شنبہ دو ربیع الاول کو شروع ہوا، اس تاخیر کے متعدد اسباب تھے:

① عقیدت مندوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ حضور ﷺ نے اس دنیا کو الوداع کہا، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تلوار کھینچ لی کہ جو یہ کہے گا کہ آنحضرت ﷺ نے وفات پائی، اس کا سر اڑا دوں گا۔ ❸

لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے خطبہ دیا کہ حضور ﷺ کا اس جہان سے تشریف لے جانا یقینی تھا اور قرآن مجید کی آیتیں پڑھ کر سنائیں تو لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور اس ناگزیر واقعہ کا یقین آیا۔ ❹

② اس کے بعد اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ غروب آفتاب سے پہلے تجہیز و تکفین سے فراغت ہو سکے۔

③ قبر کنی کا کام غسل و کفن کے بعد شروع ہوا، اس لیے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔

④ جس حجرہ میں آپ ﷺ نے وفات پائی تھی وہیں لوگ علی الترتیب تھوڑے تھوڑے کر کے جاتے اور نماز جنازہ ادا کرتے تھے اس لیے بھی بڑی دیر لگی اور سہ شنبہ کا دن گزر کر رات کو فراغت ملی۔ ❺

تجہیز و تکفین کی خدمت خاص اعزہ و اقارب نے انجام دی۔ فضل بن عباس اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے پردہ کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غسل دیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی موقع پر موجود تھے اور بعض روایتوں میں ہے

---

❶ ابوداود، کتاب الادب، باب فی حق المملوك: ٥١٥٦؛ الادب المفرد امام بخاری: ١٥٨؛ سنن ابن ماجه، کتاب الوصایا: ٢٦٩٨ اور ابن سعد جزء الوفات بسند صحیح، ص: ٤٤۔

❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب اخر ما تکلم به النبی ﷺ: ٤٤٦٣۔

❸ طبری، ج ٤، ص:١٨١٧۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاته: ٤٤٥٤۔

❺ ابن سعد وغیرہ کی بعض روایتوں میں ہے کہ چہار شنبہ کو تدفین ہوئی لیکن یہ تمام تر کذب اور جھوٹ ہے، خود ابن سعد میں صحیح روایتیں یہ ہیں کہ سہ شنبہ کو تدفین ہوئی البتہ چہار شنبہ کی شام شروع ہوگئی تھی، ابن ماجه، (کتاب الجنائز، باب ذکر وفاته ودفنه: ١٦٢٨) کی روایت ہے فلما فرغوا من جهازه یوم الثلثاء ”جب سہ شنبہ کے دن تجہیز و تکفین سے فرصت ہوئی۔“

کہ ان ہی نے پردہ بھی کیا تھا چونکہ اس شرف میں ہر شخص شریک ہونا چاہتا تھا اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اندر سے کواڑ بند کر لیے تھے انصار نے دروازہ پر آواز دی کہ خدا کے لیے ہمارے حقوق کا بھی خیال رکھیے، رسول اللہ ﷺ کی خدمت گزاری میں ہمارا بھی حصہ ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جیسا کہ واقدی کا بیان ہے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ میں کسی کا حق نہیں ہے، اس لیے اگر سب کو اجازت دے دی گئی تو کام رہ جائے گا لیکن (انصار کے اصرار پر) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اوس بن خولی انصاری رضی اللہ عنہ کو جو اصحاب بدر میں تھے اندر بلا لیا وہ پانی کا گھڑا بھر بھر کر لاتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جسم مبارک کو سینہ سے لگا رکھا تھا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے دونوں صاحبزادے قثم اور فضل رضی اللہ عنہما جسم مبارک کی کروٹیں بدلتے تھے اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ اوپر سے پانی ڈالتے تھے۔ ❶

(کفن کے لیے پہلے جو کپڑا انتخاب کیا گیا تھا وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبداللہ کی یمن کی بنی ہوئی ایک چادر تھی لیکن بعد کو اتار لی گئی) ❷ اور تین سوتی سفید کپڑے جو سحول کے بنے ہوئے تھے کفن میں دیئے گئے ان میں قمیص اور عمامہ نہ تھا۔ ❸

(غسل و کفن کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ آپ کو دفن کہاں کیا جائے؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''نبی جس مقام پر وفات پاتا ہے وہیں دفن بھی ہوتا ہے۔'' چنانچہ نعش مبارک اٹھا کر اور بستر الٹ کر حجرہ عائشہ رضی اللہ عنہا میں اسی مقام پر قبر کھودنا تجویز ہوا ❹ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ آپ ﷺ کو کسی میدان میں اس لیے دفن نہیں کیا گیا کہ آخری لمحوں میں آپ ﷺ کو یہ خیال تھا کہ لوگ فرط عقیدت سے میری قبر کو بھی عبادت گاہ نہ بنالیں، میدان میں اس کی دار و گیر مشکل تھی ❺ اس لیے حجرہ کے اندر دفن کیا گیا۔)

مدینہ میں دو صاحب قبر کھودنے میں ماہر تھے، حضرت ابوعبیدہ بن جراح اور ابوطلحہ رضی اللہ عنہما حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اہل مکہ کے دستور کے مطابق صندوقی قبر کھودتے تھے اور ابوطلحہ رضی اللہ عنہ مدینہ کے رواج کے مطابق لحدی۔ لوگوں میں اختلاف پیش آیا کہ کس قسم کی قبر کھودی جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اختلاف مناسب نہیں دونوں صاحبوں کے پاس آدمی بھیجا جائے جو پہلے آجائے'' ❻ لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا، چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے دونوں صاحبوں کے پاس آدمی بھیجے، اتفاق یہ کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ گھر پر موجود نہ

---

❶ طبقات ابن سعد، ص: ٦٢، ٦٣ جزء الوفات؛ طبری، ج ٤، ص: ٢١٣٠؛ مختصراً ابو داود، کتاب الجنائز، باب کم یدخل القبر: ٣٢٠٩ میں بھی ان صاحبوں کے نام ہیں نیز ابن ماجه، کتاب الجنائز: ١٦٢٨۔

❷ صحیح مسلم، کتاب الجنائز فی کفن المیت: ٢١٨٠۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الکفن بغیر قمیص: ١٢٧١ ومسلم: ٢١٨٠ وابوداود: ٣١٥١۔ ❹ ابن سعد جزء الوفات، ص: ٧٠ بروایات صحیحه وابن ماجه، کتاب الجنائز ذکر وفاته: ١٦٢٨۔ ❺ صحیح بخاری، کتاب الجنائز ما یکره من اتخاذ المساجد ...: ١٣٣٠۔ ❻ ابن ماجه، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی الشق: ١٥٥٨۔

تھے، ابوطلحہ رضی اللہ عنہ آئے اور ان ہی نے مدینہ کے رواج کے مطابق قبر کھودی، جو لحدی یعنی بغلی تھی، زمین چونکہ نم تھی اس لیے جس بستر پر آپ نے وفات پائی تھی وہ قبر میں بچھا دیا گیا۔ ❶

جنازہ تیار ہو گیا تو لوگ نماز کے لیے ٹوٹے (جنازہ حجرہ کے اندر تھا، باری باری سے لوگ تھوڑے تھوڑے کر کے جاتے تھے) پہلے مردوں نے، پھر عورتوں نے، پھر بچوں نے نماز پڑھی لیکن کوئی امام نہ تھا۔ ❷

جسم مبارک کو حضرت علی، فضل بن عباس (اسامہ بن زید اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم) نے قبر میں اتارا۔ ❸

---

❶ ابن سعد، جز ثانی، قسم ثانی، ص:۷۵۔ ❷ ابن ماجه، كتاب الجنائز، باب ذكر وفاته: ۱٦۲۸؛ ابن سعد بروایت صحیح جزء الوفات، ص:۷۰۔ ❸ ابو داود، كتاب الجنائز، باب كم يدخل القبر: ۳۲۰۹؛ ابن ماجه: ۱٦۲۸ اور ابن سعد، ص:۷۷ میں اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بجائے قثم بن عباس اور شقران (غلام خاص) کے نام ہیں، ارباب نظر جانتے ہیں کہ ان دو روایتوں میں ترجیح کس کو ہو سکتی ہے۔

متروکات

(آنحضرت ﷺ نے جب انتقال فرمایا تو اپنے مقبوضات و جائیداد میں سے کیا کیا چیزیں ترکہ میں چھوڑیں؟ اس سوال کا اصل جواب تو یہ ہے کہ آپ ﷺ خود اپنی زندگی میں اپنے پاس کیا رکھتے تھے، جو مرنے کے بعد چھوڑ جاتے اور اگر کچھ تھا بھی تو اس کے متعلق عام اعلان فرما چکے تھے:

((لا نورث ماتر کنا صدقة)) ❶

''ہم (انبیا کا) کوئی وارث نہیں ہوتا جو چھوڑا وہ عام مسلمانوں کا حق ہے۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''میرے وارث اشرفی بانٹ کر نہیں پائیں گے۔'' ❷ یعنی نہ ہوگی نہ پائیں گے، چنانچہ یاد ہوگا کہ وفات کے وقت چند دینار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس امانت تھے، آپ نے اسی وقت نکلوا کر خیرات کرا دیے۔

عمرو بن حویرث رضی اللہ عنہ سے جو ام المؤمنین جویریہ رضی اللہ عنہا کے بھائی تھے، بخاری میں روایت ہے:

ما ترك رسول الله ﷺ عند موته درهمًا ولا دينارًا ولا عبدًا ولا امة ولا شيئًا الا بغلة البيضاء وسلاحه وارضًا جعلها صدقة۔ ❸

''آنحضرت ﷺ نے مرتے وقت کچھ نہ چھوڑا، نہ درہم، نہ دینار، نہ غلام، نہ لونڈی اور نہ اور کچھ صرف اپنا خچر اور ہتھیار اور کچھ زمین جو عام مسلمانوں پر صدقہ کر گئے۔''

ابوداؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے:

ماترك رسول الله ﷺ دينارًا ولا درهمًا ولا بعيرًا ولا شاةً۔ ❹

''آنحضرت ﷺ نے نہ دینار چھوڑا نہ درہم نہ اونٹ نہ بکری۔''

بہر حال متروکات میں اگر تھیں تو یہی تین چیزیں تھیں کچھ زمین سواری کے جانور اور ہتھیار۔)

زمین

(حضرت عمرو بن حویرث رضی اللہ عنہ نے جس زمین کا ذکر کیا ہے وہ مدینہ، خیبر اور فدک کے چند باغ تھے۔ مدینہ کی جائیداد سے بنونضیر کی جائیداد مراد ہے۔ یا مخیریق نام ایک یہودی نے ۳ھ میں (غزوۂ احد کے موقع پر) آنحضرت ﷺ کو چند باغ وصیۃً ہبہ کیے تھے، وہ مراد ہیں لیکن صحیح روایتوں سے ثابت ہے کہ

❶ یہ فقرہ تمام حدیث کی کتابوں میں ہے، بخاری میں متعدد مقامات میں ہے، کتاب الفرائض، باب قول النبی ﷺ: لا نورث...... ٦٧٣٠؛ مسلم: ٤٥٧٧؛ ابوداود: ٢٩٦٣؛ ترمذی: ١٦١٠۔

❷ بخاری، کتاب الوصایا، باب نفقة القیم...... ٢٧٧٦۔

❸ صحیح بخاری، کتاب الوصایا: ٢٧٣٩، ٢٨٧٣۔

❹ ابوداود، کتاب الوصایا، باب ما یؤمر به من الوصیة: ٢٨٦٣؛ مسلم: ٤٢٢٩۔

آنحضرت ﷺ نے یہ باغ اسی وقت مستحقین کو تقسیم کر دیئے تھے۔ 1

فدک اور خیبر کی نسبت ابتدا ہی سے شیعہ اور اہلسنت میں اختلاف ہے۔شیعہ کہتے ہیں کہ یہ آپ کی ذاتی جائیداد تھی اور وراثت کے طور پر اہل بیت میں تقسیم ہونی چاہیے تھی، اہلسنت کہتے ہیں کہ یہ بطور ولایت اسلامی آپ کے قبضے میں تھی اور ذاتی ہو بھی تو آپ ﷺ نے خود فرما دیا تھا کہ ''ہمارا جو ترکہ ہو وہ صدقہ ہے۔''

اصل یہ ہے کہ یہ اختلاف خود صحابہ کے وقت میں پیدا ہو چکا تھا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ (آپ کے چچا) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا (صاحبزادی) اور اکثر ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن 2 مدعی تھیں کہ اس جائیداد کو بطور وراثت تقسیم ہونا چاہیے۔حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما اور دیگر اکابر صحابہ نے کہا کہ یہ وقف عام ہے، آنحضرت ﷺ خود اپنی زندگی میں جس طرح اور جن مصارف میں ان کی آمدنی صرف کرتے تھے، اس میں تغیر نہ ہوگا 3 آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانہ حیات میں ان تینوں جائیدادوں کی آمدنی مختلف مدوں میں متعین کر دی تھی۔ بنو نضیر کی جائیداد کی آمدنی ناگہانی ضروریات کے لیے مخصوص تھی، فدک کی آمدنی مسافروں کے لیے وقف تھی، خیبر کی آمدنی کو آپ تین حصوں میں تقسیم فرماتے تھے، دو حصے عام مسلمانوں کے لیے تھے اور ایک حصہ ازواج مطہرات کو سالانہ مصارف کے لیے ملتا تھا، 4 اس میں سے بھی جو بچ جاتا وہ غریب مہاجرین کی اعانت میں کام آتا آخر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے اصرار پر مدینہ کی جائیداد ان دونوں کی تولیت میں دے دی تھی لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔خیبر اور فدک بدستور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ تک خلفا کے ہاتھ میں رہے۔ 5

جانور

ارباب سیر نے آپ ﷺ کے اسپ خاصہ اور مویشی اور دواب کی تفصیل اس طرح لکھی ہے۔جس سے ایک والیِ ملک کے اصطبل اور دواب خانہ کا دھوکا ہوتا ہے۔طبری نے ان تمام جانوروں کے نام اور حالات تفصیل سے لکھے ہیں اور اگر وہ قابل اعتبار ہوتے تو حقیقت میں نہایت دلچسپ تھے لیکن اس کے متعلق طبری کی جس قدر روایتیں ہیں سب بلا استثنا واقدی سے ماخوذ ہیں۔پچھلے مصنفین جن میں بڑے بڑے محدثین ہیں مثلاً: یعمری، مغلطائی، حافظ عراقی، وغیرہ نے بھی یہ تفصیل لکھی ہے اور چونکہ یہ مصنفین اکثر سلسلہ سند نہیں لکھتے اس لیے اکثر لوگ ان کے مستند ہونے کی بنا پر اس واقعہ کو صحیح خیال کرتے ہیں لیکن جب تفتیش کی

1 بخاری، کتاب فرض الخمس، باب فرض الخمس: ۳۰۹۳ میں ہے وصدقته بالمدینة یہ انہیں باغوں کے متعلق ہے تفصیل کے لیے فتح الباری، ج ٦، ص: ١٤٠ دیکھو، نیز صحیح بخاری میں کتاب المغازی، حدیث بنی النضیر: ۴۰۳۳۔

2 صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب قول النبی ﷺ لا نورث ماترکنا صدقة: ٦٧٢٥، ٦٧٣٠۔

3 صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں مذکور ہے، دیکھو کتاب الفرائض: ٢٩٠٤، ٦٧٢٨۔

4 سنن ابی داود، کتاب الخراج والامارة، باب فی صفایا رسول اللہ ﷺ: ٢٩٦٥۔

5 حوالہ مذکورہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے باغ فدک سادات کو دے دیا تھا۔

جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تمام روایتوں کا سلسلۂ سند واقدی سے آگے نہیں بڑھتا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت اوپر گزر چکی ہے:

ماترك رسول اللہ ﷺ ديناراً ولا درهمًا ولا بعيرًا ولا شاةً۔ ❶

''آنحضرت ﷺ نے نہ دینار چھوڑا نہ درہم نہ اونٹ نہ بکری۔''

صحیح بخاری میں عمرو بن حویرث (ام المومنین جویریہ رضی اللہ عنہا کے بھائی تھے) سے روایت ہے:

ماترك النبي ﷺ الا بغلته البيضاء وسلاحه وارضا تركها صدقة۔ ❷

''آنحضرت ﷺ نے کچھ نہیں چھوڑا، بجز اپنے سفید خچر اور ہتھیار اور ایک زمین کے جو وقف عام ہوگئی۔''

ان روایتوں سے معلوم ہوگا کہ متروکاتِ خاصہ میں صرف ایک جانور تھا، ان صحیح اور مسلّم روایات کے ہوتے آنحضرت ﷺ کے اسباب اور دواب کی اتنی بڑی فہرست جو طبری وغیرہ نے درج کی ہے اور جو ایک تاجدارِ سلطنت کے شایانِ حال ہے، کیونکر تسلیم کی جاسکتی ہے۔

احادیث صحیحہ کے استقرا سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عمرو بن حویرث رضی اللہ عنہ کی مختصر فہرست سے زائد چیزیں بھی آپ ﷺ کے قبضہ میں آئیں لیکن اس سے عمرو کی روایت پر اثر نہیں پڑ سکتا، کیونکہ عمرو صرف اس بات کے مدعی ہیں کہ وفات کے وقت یہی سرمایہ تھا۔ ممکن ہے کہ یہ چیزیں وفات سے پہلے آپ ﷺ نے حسب عادت ہبہ یا خیرات کردی ہوں، بہر حال (از روئے روایتِ صحیح مختلف اوقات میں) حسب ذیل جانور آپ ﷺ کے دائرۂ ملک میں آئے:

لخیف ایک گھوڑا تھا جو ابی بن عباس کے باغ میں بندھتا تھا، بخاری نے کتاب الجہاد میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ❸

عفیر ایک گدھا تھا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو اپنے ساتھ اس پر بٹھایا تھا ❹

عضباء وقصواء نہایت تیز اونٹنی تھی۔ قصواء بھی اسی کا نام ہے۔ ❺ اسی کو آپ نے ہجرت کے وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے خریدا تھا اور اسی پر سوار ہو کر آپ نے ہجرت فرمائی تھی اور مدینہ پہنچ کر حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے مکان کے پاس جا کر بیٹھ گئی تھی ❻ حجۃ الوداع کا خطبہ بھی آپ ﷺ نے اسی کی پشت پر دیا تھا)۔ ❼ یہ ہر معرکہ میں بازی لے جاتی تھی ایک دفعہ ایک بدو باہر سے آیا، اس کی سواری میں ایک اونٹ تھا، جو ابھی جوان بھی نہیں ہوا تھا۔ عضباء کا اس سے مقابلہ ہوا، اور وہ آگے نکل گیا۔ صحابہ کو ملال ہوا، آپ ﷺ

❶ مسلم، كتاب الوصية، باب ترك الوصية: ٤٢٢٩؛ ابوداود: ٢٨٦٣؛ ابن ماجه: ٢٦٩٥۔

❷ صحيح بخاري، كتاب الجهاد، باب بغلة النبي ﷺ: ٢٨٧٣۔ ❸ بخاري، كتاب الجهاد، باب اسم الفرس والحمار: ٢٨٥٥۔ ❹ ايضًا: ٢٨٥٦۔ ❺ طبري، ج ٤، ص: ١٧٨٤۔ آپ کی اونٹنی قصواء عضباء کا ذکر بخاری، كتاب الشروط، باب الشروط في الجهاد: ٢٧٣١، ٢٧٣٢ اور كتاب الجهاد: ٢٨٧١ میں بھی ہے۔

❻ صحيح بخاري، كتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبي ﷺ: ٣٩٠٦۔

❼ صحيح مسلم، كتاب الحج، باب حجة النبي: ٢٩٥٠ وابو داود: ١٩٠٥۔

نے فرمایا کہ ''یہ خدا کا فرض ہے کہ دنیا کی کوئی چیز جب سر اٹھائے تو اس کو پست کر دے۔'' ❶

دُلدُل جس کا ذکر اکثر روایتوں میں ہے اسی خچر کا نام ہے جس کا ذکر عمرو بن حویرث رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے چنانچہ بخاری کے شارحین نے تصریح کی ہے یہ خچر مقوقس مصری نے آپ کو تحفہ میں بھیجا تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ابن العلما (رئیس ایلہ) نے بھی آپ ﷺ کو ایک سفید خچر (غزوۂ تبوک کے موقع پر تحفۃً بھیجا تھا)۔ ❷

غزوۂ حنین میں جس سپید خچر پر آپ ﷺ سوار تھے وہ فروہ بن نفاثہ جذامی نے ہدیۃً بھیجا تھا، ارباب سیر نے اس خچر کو دلدل سمجھا ہے لیکن یہ غلط ہے ❸ صحیح مسلم میں اس کی تصریح موجود ہے۔ ❹

اسلحہ

اس زہد و قناعت کے ساتھ جہاد کی ضرورت سے توشہ خانہ مبارک میں حسب ذیل سامان تھا، نو عدد تلواریں تھیں جن کے یہ نام ہیں، ماثور، عصب، ذو الفقار، قلعی، بتار، حتف، مخذم، قضیت۔

ماثور والد ماجد سے میراث میں ملی تھی، ذو الفقار بدر میں ہاتھ آئی تھی، تلوار کا قبضہ چاندی کا تھا۔ فتح مکہ میں جو تلوار آپ کے ہاتھ میں تھی اس کا قبضہ زریں تھا، سات زرہیں تھیں ذات الفضول ذات الوشاح، ذات الحواشی، سعدیہ، فضہ، تبرا، خرنق۔ ذات الفضول وہی زرہ تھی جو تیس صاع پر ایک یہودی کے ہاں سال بھر کے لیے آپ ﷺ نے رہن رکھی تھی۔ ❺ زرہیں سب لوہے کی تھیں اگرچہ عرب میں چمڑے کی زرہیں بھی ہوتی تھیں۔

چھ کمانیں تھیں، زوراء، روحاء، صفراء، بیضاء، کتوم، شداد۔ کتوم وہ کمان تھی جو غزوۂ احد میں ٹوٹ گئی تھی اور آپ ﷺ نے قتادہ رضی اللہ عنہ کو دے دی تھی۔ ایک ترکش تھا جس کو کافور کہتے تھے، چمڑے کی ایک پیٹی تھی، جس میں چاندی کے تین حلقے تھے، لیکن ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کسی حدیث سے مجھ کو یہ نہیں پتہ لگا کہ آپ ﷺ نے کبھی پیٹی لگائی بھی تھی، ایک ڈھال تھی جس کا نام زلوق تھا۔ پانچ برچھیاں تھیں، لوہے کا ایک مغفر تھا، جس کا نام موشح تھا، ایک اور مغفر تھا جس کو سبوغ کہتے تھے۔ تین جبے تھے جن کو آپ ﷺ لڑائی میں پہنتے تھے، کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک دیبائے سبز کا تھا، ایک سیاہ علم تھا جس کا نام عقاب تھا اور بھی زرد و سفید علم تھے۔ ❻

آثار متبرکہ

ان متروکات کے علاوہ بعض یادگاریں بھی تھیں جو لوگوں نے تبرکاً اپنے پاس رکھ چھوڑی تھیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے عقیدت مندوں کو موئے مبارک عطا فرمائے تھے، جو زیادہ تر حضرت ابو

---

❶ بخاری، کتاب الجهاد، باب ناقة النبی ﷺ: ۲۸۷۲۔ ❷ صحيح بخاری، کتاب الجهاد، رقم الباب: ٦١ رئیس ایلہ ابن العلما کا نام یوحنا بن روبہ تھا (عمدة القاری، کتاب الزکوة، باب خرص التمر، ج ٤، ص: ٤١٦)۔

❸ فتح الباری ذکر غزوة حنین، ج ۸، ص: ۲٤۔ ❹ صحيح مسلم، کتاب الجهاد، باب غزوة حنین: ٤٦١٢۔ ❺ صحيح بخاری، کتاب البیوع، باب شراء النبی ﷺ بالنسيئة: ۲۰٦۸ وکتاب فی الرهن، باب من رهن درعه: ۲۵۰۹۔ ❻ زاد المعاد، ج ۱، ص: ۳۳۔

طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کے ہاتھ آئے تھے۔ (1) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس بھی موئے مبارک تھے، (2) اُن کے پاس دو چیزیں اور تھیں، نعلین مبارک اور ایک لکڑی کا ٹوٹا ہوا پیالہ، جو چاندی کے تاروں سے جوڑ دیا گیا تھا۔ (3) ذوالفقار جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس تھی ان کے بعد ان کے خاندان میں یادگار رہی۔ حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد وہ حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ کے ہاتھ آئی، بعض صحابہ نے آ کر ان کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ یادگار آپ سے چھن نہ جائے اگر مجھے عنایت ہو تو یہ میری جان کے ساتھ رہے لیکن انہوں نے یہ ایثار گوارا نہ کیا۔ (4)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آپ ﷺ کے وہ کپڑے تھے جن میں آپ نے انتقال فرمایا تھا۔ (5) استحقاق خلافت کی بنا پر خاتم (مہر) اور عصائے مبارک جن کا احادیث میں ذکر ہے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پھر حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے قبضہ میں آئے لیکن انہیں کے عہد میں یہ دونوں چیزیں ضائع ہوگئیں۔ انگوٹھی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے ایک کنوئیں میں گر گئی اور عصائے مبارک کو جہجاہ غفاری (6) نے توڑ ڈالا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان آثارِ مبارکہ کے ذکر کے لیے ایک خاص باب باندھا ہے۔ (7)

مسکن مبارک

آنحضرت ﷺ کمسن تھے کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اپنے دادا اور چچا کے گھروں میں پرورش پائی اور یہیں سن رُشد کو پہنچے۔ پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی، یہ متیقن طور پر نہیں معلوم کہ اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے موروثی مکان میں اقامت فرمائی یا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہی کے گھر رہے، لیکن آپ کے حصہ کا ایک پدری مکان مکہ میں موجود تھا، جس پر عقیل رضی اللہ عنہ نے جو آنحضرت ﷺ کے چچازاد اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھائی تھے اور اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، قبضہ کر لیا تھا چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر جب آپ مکہ تشریف لائے تو لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپ کہاں قیام فرمائیں گے؟ کیا اپنے دولت خانہ پر ٹھہریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''عقیل نے ہمارے لیے گھر کہاں چھوڑا؟'' (8)

مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے بعد چھ مہینے آنحضرت ﷺ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر

---

(1) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب بیان ان السنة یوم النحر ان یرمی: ۳۱۵۲ تا ۳۱۵۵۔

(2) صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب الماء الذی یغسل به شعر الانسان: ۱۷۰۔

(3) بخاری، کتاب فرض الخمس: ۳۱۰۷؛ شمائل ترمذی، باب ما جاء فی قدح رسول اللہ ﷺ ۱۹٤۔

(4) بخاری کی تصریح کے مطابق یہ مطالبہ حضرت مسور بن مخرمہ نے کیا تھا۔ (بخاری: ۳۱۱۰) ''س''

(5) ان تمام آثار مذکورۂ بالا کا ذکر صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب ذکر من درع النبی ﷺ و عصاه وسیفه وقدحه وخاتمه: ۳۱۰٦ تا ۳۱۱۲۔ میں ہے۔ (6) خاتم کا ذکر کتاب الجهاد کے علاوہ بخاری، کتاب اللباس، باب خاتم الفضة: ٥٨٦٦ میں ہے، عصائے مبارک کا حال فتح الباری، ج ٦، ص: ١٤٨ سے ماخوذ ہے ''س''۔

(7) بخاری، کتاب الجهاد، باب ماذکر من درع النبی ﷺ وعصاه وسیفه وقدمه وخاتمه۔

(8) بخاری، کتاب المغازی: ٤٢٨٢۔

قیام فرما رہے۔ اس اثنا میں آپ ﷺ تنہا تھے اہل وعیال مکہ ہی میں تھے جب آپ نے مسجد نبوی کی بنیاد ڈالی تو اسی کے اطراف میں چھوٹے چھوٹے حجرے تیار فرمائے اور اس وقت آپ ﷺ نے آدمی بھیج کر مکہ سے اہل وعیال کو بلوایا اور ان ہی حجروں میں اتارا۔ ❶

آخر ایام میں آنحضرت ﷺ کی نو بیویاں تھیں اور الگ الگ حجروں میں رہتی تھیں جن میں نہ صحن تھا نہ دالان تھے نہ ضرورت کے الگ الگ کمرے تھے ہر حجرہ کی وسعت عموماً چھ سات ہاتھ سے زیادہ نہ تھی، دیواریں مٹی کی تھیں جو اس قدر کمزور تھیں کہ ان میں شگاف پڑ گیا تھا اور ان سے اندر دھوپ آتی تھی، چھت کھجور کی شاخوں اور پتوں سے چھائی تھی۔ بارش سے بچنے کے لیے بال کے کمل لپیٹ دیئے جاتے تھے بلندی اتنی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو ہاتھ سے چھو سکتا تھا۔ گھر کے دروازوں پر پردہ یا ایک پٹ کا کواڑ ہوتا تھا۔ ❷ آنحضرت ﷺ ہمیشہ باری باری سے ایک ایک شب ایک ایک حجرے میں بسر فرماتے تھے، دن کو عموماً اصحاب رضی اللہ عنہم کی مجلس میں مسجد میں تشریف رکھتے، جو گویا ان حجروں کا صحن یا گھر کی مردانہ نشست گاہ تھی۔ ان حجروں کے علاوہ ایک بالا خانہ بھی تھا، جس کو احادیث میں "مشربہ" کہا گیا ہے، ۹ھ میں جب آپ نے ایلاء کیا تھا اور نیز گھوڑے پر سے گر کے چوٹ کھائی تھی ایک مہینہ اسی پر اقامت فرمائی تھی ❸ اس بالا خانہ پر سامان آرائش کیا تھا ایک چٹائی کا بستر، چمڑے کا ایک تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، اور ادھر ادھر چند کھالیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ❹

کاشانہ نبوت گو انوار الٰہی کا مظہر تھا تاہم اس میں رات کو چراغ تک نہیں ہوتا تھا۔ ❺ گھر کی دنیاوی اور ظاہری آرائش بھی پسند خاطر نہ تھی۔ ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیواروں پر دھاری دار رنگین کپڑے منڈھے، تو آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا: "اینٹ اور پتھر کو لباس پہنانے کے لیے مال نہیں دیا گیا ہے۔" ❻ یہ حجرہ ہائے مبارک آپ کی وفات کے بعد ازواج مطہرات کے قبضہ میں رہے۔ ان میں جب کسی کا انتقال ہو جاتا، تو وہ حجرہ ان کے اعزہ کی ملکیت میں چلا جاتا۔ جن سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں اکثر حجروں کو خرید لیا تھا۔ ❼ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد تک یہ تمام حجرے اپنے حال پر قائم رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بعض حجرے توڑ کر مسجد نبوی میں داخل کر لیے گئے، تاہم ولید بن عبدالملک کے زمانہ تک بہت سے حجرے باقی تھے۔ ۸۸ھ میں جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ مدینہ کے والی تھے، تمام

---

❶ ابن سعد جزء اول، قسم اول، ص:۱٦۱۔ ❷ یہ پوری تفصیل الادب المفرد بخاری، باب التطاول فی البنیان: ٤٥٠، ٤٥١ میں ہے۔ ❸ ابو داود، کتاب الصلاۃ، باب الامام یصلی من قعود: ٦٠٢۔

❹ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب ماکان النبی ﷺ یتجوز من اللباس والبسط: ٥٨٤٣۔

❺ صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ، باب التطوع خلف المرأۃ: ۳۸۲، ٥١۳۔

❻ ابو داود، کتاب اللباس، باب فی الصور: ٤١٥۳۔

❼ ابن سعد جزء نساء جزء ۸، ص: ۱۱۸۔

حجرے، بجز حجرۂ عائشہ رضی اللہ عنہا کے کہ وہ مدفن نبوی ﷺ ہے، توڑ کر مسجد نبوی میں ملا دیے گئے۔ جس دن یہ حجرے ٹوٹے ہیں تمام مدینہ میں کہرام مچا ہوا تھا، کہ حضور انور ﷺ کی ایک اور یادگار مٹ گئی۔ ❶

دایہ

آنحضرت ﷺ کو جو ترکہ والد سے ملا تھا اس میں ایک حبشیہ کنیز بھی تھیں جن کا نام ام ایمن تھا، آنحضرت ﷺ کی اصلی انا یا دایہ وہی تھیں۔ ❷ آنحضرت ﷺ کی وفات تک زندہ رہیں۔ آنحضرت ﷺ ہمیشہ ان کو ماں کہہ کر پکارتے تھے، اور جب ان کو دیکھتے تو فرمایا کرتے کہ ''اب یہی میرے خاندان کی یادگار رہ گئی ہیں۔'' جب آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے عقد کیا تو اُن کو آزاد کر کے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے جو آپ کے متبنی اور محبوب خاص اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے غلام تھے، شادی کر دی۔ اسامہ رضی اللہ عنہ انہی کے بطن سے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے مزاح کا یہ واقعہ جو کتابوں میں منقول ہے کہ ایک عورت نے آنحضرت ﷺ سے ایک اونٹ مانگا آپ نے فرمایا میں اونٹ کا بچہ دوں گا، بولی کہ بچہ لے کر میں کیا کروں گی، آپ نے فرمایا کہ ''جتنے اونٹ ہیں اونٹ کے بچے ہی ہوتے ہیں۔'' انہی کا واقعہ ہے۔

یہ اکثر غزوات میں شریک رہیں۔ جنگ احد میں سپاہیوں کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں، جنگ خیبر میں بھی شریک تھیں۔ ❸

خدّامِ خاص

صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض عقیدت مند ایسے تھے، جو دنیا کے سب کام کاج چھوڑ کر ہمہ وقت خدمت اقدس میں حاضر رہتے اور خاص خاص کام انجام دیتے، ان کے نام حسب ذیل ہیں:

❶ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں، فقہ حنفی کے بانی اول گویا وہی ہیں، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ کا سلسلہ انہی کی روایت اور استنباطات پر منتہی ہوتا ہے۔ مکۂ معظمہ میں قرآنِ مجید کی اشاعت آنحضرت ﷺ کے ابتدائی زمانے میں ان ہی نے کی۔ ستر (۷۰) سورتیں خود آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے سن کر یاد کی تھیں۔

یہ آنحضرت ﷺ کے راز دار بھی تھے اور جب آنحضرت ﷺ سفر میں جاتے تو خواب گاہ، وضو اور مسواک کا اہتمام انہی کے متعلق ہوتا جب آپ مجلس سے اٹھتے تو جوتے پہناتے۔ راہ میں آگے آگے عصا لے کر چلتے۔ جب آپ کہیں کسی مجلس میں جا کر بیٹھتے تو نعلین مبارک اتار کر بغل میں رکھ لیتے پھر اٹھنے کے وقت سامنے لا کر رکھ دیتے، جلوت وخلوت میں ساتھ رہتے تھے، آنحضرت ﷺ کے اخلاق و عادات کا نمونہ بن

---

❶ ایضًا، ص: ۱۲۰۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب ردالمهاجرين الى الانصار منائحهم: ۴۶۰۳۔
❸ یہ تمام حالات طبقات ابن سعد جزء ۸، تذکرة ام ایمن، ص: ۱۶۲ سے ماخوذ ہیں۔

گئے تھے۔ ❶

❸ حضرت بلال رضی اللہ عنہ دنیا ان کو مؤذن کے لقب سے جانتی ہے (یہ حبشی نژاد غلام تھے مکہ میں ایمان لائے تھے اور جس جوش وخروش سے ایمان لائے تھے، اس کا مختصر ذکر آغاز کتاب میں گزر چکا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کو خرید کر آزاد کرا دیا تھا، اس وقت سے برابر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہے،) آپ کا خانگی انتظام انہی کے سپرد تھا، بازار سے سودا سلف لانا، قرض دام لینا، پھر ادا کرنا، مہمانوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا یہ تمام باتیں ان ہی سے متعلق تھیں۔ ❷

❹ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بھی آپ کے خادم خاص تھے، آنحضرت ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو وہ نہایت کمسن تھے ان کی ماں خدمتِ اقدس میں ان کو لائیں اور عرض کی ''یا رسول اللہ! یہ میرا بیٹا ہے، لائی ہوں کہ خدمت گزاری کرے۔'' ❸

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے دس برس تک آپ کی خدمت کی۔ لوگوں کے پاس آنا جانا، چھوٹے چھوٹے کام کرنا، وضو کا پانی لانا، ان کے فرائض تھے چونکہ ابھی کمسن تھے ان سے کام بن نہیں آتے تھے لیکن آپ نے ان سے کبھی باز پرس نہ فرمائی۔ ❹

---

❶ یہ پوری تفصیل طبقات ابن سعد، جزء ۳، قسم اول، ص: ۱۰۸ میں ہے۔ مجملاً صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ باب مناقب عبداللہ بن مسعود: ۳۷۶۷ میں بھی یہ مذکور ہے۔ ❷ ابو داود، کتاب الخراج، باب فی الامام یقبل هدایا المشرکین: ۳۰۵۵۔ ❸ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل انس: ۶۳۷۲ تا ۶۳۷۶۔
❹ ابو داود، کتاب الادب، باب فی الحلم واخلاق النبی ﷺ: ۴۷۷۳، ۴۷۷۴۔

شمائل

شکل ولباس وطعام ومذاق طبیعت

حلیہ اقدس

آپ ﷺ میانہ قد اور موزوں اندام تھے، رنگ سفید سرخ تھا، پیشانی چوڑی اور ابرو پیوستہ تھے، بنی مبارک درازی مائل تھی، چہرہ ہلکا یعنی بہت پر گوشت نہ تھا، دہانہ کشادہ تھا، دندان مبارک بہت پیوستہ نہ تھے، گردن اونچی، سر بڑا اور سینہ کشادہ تھا اور فراخ تھا، سر کے بال نہ بہت پیچیدہ تھے، نہ بالکل سیدھے تھے، ریش مبارک گھنی تھی، چہرہ کھڑا کھڑا تھا، آنکھیں سیاہ وسرمگیں اور پلکیں بڑی بڑی تھیں، شانے پر گوشت اور مونڈھوں کی ہڈیاں بڑی تھیں، سینہ مبارک میں ناف تک بالوں کی ہلکی تحریر تھی، شانوں اور کلائیوں پر بال تھے، ہتھیلیاں پر گوشت اور چوڑی، کلائیاں لمبی اور پاؤں کی ایڑیاں نازک اور ہلکی تھیں، پاؤں کے تلوے بیچ سے ذرا خالی تھے، نیچے سے پانی نکل جاتا تھا۔ ❶

صحابہ رضی اللہ عنہم پر آپ کے حسن وخوبروئی کا بہت اثر پڑتا تھا، حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو پہلے یہودی تھے، پہلے پہل جب چہرۂ اقدس پر ان کی نظر پڑی ہے تو بولے: ''خدا کی قسم یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں۔'' ❷ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں ان سے کسی نے پوچھا آپ کا چہرہ تلوار سا چمکتا تھا؟ بولے: ''نہیں ماہ وخورشید کی طرح۔'' ❸ یہی صحابی روایت کرتے ہیں کہ ایک شب کو جب مطلق ابر نہ تھا اور چاند نکلا تھا، میں کبھی آپ کو دیکھتا تھا کبھی چاند کو دیکھتا تھا تو آپ مجھے چاند سے زیادہ خوبرو معلوم ہوتے تھے۔ ❹ حضرت براء رضی اللہ عنہ صحابی کہتے ہیں، میں نے کسی جوڑے والے کو سرخ (خط کے) لباس میں آپ سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھا۔ ❺

آپ کے پسینہ میں ایک قسم کی خوشبو تھی ❻ چہرۂ مبارک پر پسینہ کے قطرے موتی کی طرح ڈھلکتے تھے، ❼ جسم مبارک کی جلد نہایت نرم تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ کا رنگ نہایت کھلتا تھا آپ کا پسینہ موتی معلوم ہوتا تھا میں نے دیبا اور حریر بھی آپ کی جلد سے زیادہ نرم نہیں دیکھے اور مشک وعنبر میں آپ کے بدن سے زیادہ خوشبو نہ تھی۔ ❽

---

❶ یہ حلیہ بہ تفصیل شمائل ترمذی، باب ما جاء فی خلق رسول اللہ ﷺ: ۱، مسند احمد بن حنبل، ج۱، ص: ۱۱۶، ۱۱۷ میں اور مختصراً بخاری، کتاب الفضائل، باب صفة النبی ﷺ: ۳۵۵۱، ۵۸٤۸، مسلم، باب صفة النبی ﷺ: ٦۰٦٤ تا ٦۰٦٦ میں ہے۔ ❷ ترمذی، ابواب صفة القیامة، باب حدیث أفشوا السلام: ۲٤۸۵۔

❸ مسلم، کتاب الفضائل، باب اثبات خاتم النبوة: ٦۰۸٤۔

❹ ترمذی: ۲۸۱۱؛ سنن الکبریٰ للنسائی: ۹۵٦۲۔ ❺ صحیح مسلم: ٦۰٦۵۔

❻ مسلم، باب طیب عرقه ﷺ: ٦۰۵۵ تا ٦۰۵۷۔

❼ بخاری، کتاب المغازی، حدیث الافك: ٤۱٤۱۔ ❽ بخاری: ۳۵٦۱ ومسلم: ٦۰۵۲۔

عام طور سے مشہور ہے کہ آپ ﷺ کے سایہ نہ تھا لیکن اس کی کوئی سند نہیں ہے۔

مہر نبوت

شانوں کے بیچ میں کبوتر کے انڈے کے برابر خاتم نبوت تھی، یہ بظاہر سرخ ابھرا ہوا گوشت سا تھا (صحیح مسلم اور) شمائل ترمذی میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

رایت الخاتم بین کتفی رسول اللہ ﷺ غدۃ حمراء مثل بیضۃ الحمامۃ۔ ❶

''میں نے آنحضرت ﷺ کے دونوں شانوں کے بیچ میں خاتم کو دیکھا تھا جو کبوتر کے انڈے کے برابر سرخ غدہ تھا۔''

لیکن ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیں شانہ کے پاس چند مہاسوں کی مجموعی ترکیب سے ایک مستدیر شکل پیدا ہوگئی تھی، اسی کو مہر نبوت کہتے تھے ❷ تمام صحیح روایات کی تطبیق سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ دونوں شانوں کے درمیان ایک ذرا ابھرا ہوا گوشت کا حصہ تھا، جس پر تل تھے اور بال اگے ہوئے تھے۔

موئے مبارک

سر کے بال اکثر شانے تک لٹکے رہتے تھے، فتح مکہ میں لوگوں نے دیکھا تو شانوں پر چار گیسو پڑے تھے۔ ❸ مشرکین عرب بالوں میں مانگ نکالتے تھے۔ آنحضرت ﷺ چونکہ کفار کے مقابلہ میں اہل کتاب کی موافقت پسند کرتے تھے، ابتدا میں آپ ﷺ بھی اہل کتاب کی طرح بال چھوٹے ہوئے رکھتے تھے پھر مانگ نکالنے لگے یہ شمائل ترمذی کی روایت ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جب مشرکین کا وجود نہ رہا تو ان کی مشابہت کا احتمال بھی جاتا رہا اخیر زمانہ میں مانگ نکالنے لگے۔ ❹

(بالوں میں اکثر تیل ڈالتے تھے اور ایک دن بیچ کنگھی کرتے تھے ریش مبارک میں گنتی کے چند بال سفید ہونے پائے تھے)۔ ❺

رفتار بہت تیز تھی، چلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ڈھلوان زمین پر اُتر رہے ہیں۔ ❻ ضعیف روایتوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سایہ نہ تھا یعنی زمین پر جسم اقدس کا سایہ نہیں پڑتا تھا، لیکن محدثین کے نزدیک یہ روایتیں صحت سے خالی اور ناقابل اعتبار ہیں۔

---

❶ شمائل ترمذی: ۱۷؛ مسلم: ۶۰۸۴۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب اثبات خاتم النبوۃ: ۶۰۸۸ مشہور ہے کہ پشت پر جو خاتم نبوت تھی اس میں گویا قدرتی طور پر کلمہ طیبہ تحریر تھا۔ یہ بالکل بے سند بات ہے، احادیث سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، محدثین نے تصریح کردی ہے کہ ان میں سے بعض روایتیں باطل اور بعض بہت ہی ضعیف ہیں، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں لم یثبت منها شیٔ (زرقانی بر مواھب، ج ۱، ص: ۱۸۴) البتہ کلمہ اس نقرئی خاتم میں منقوش تھا جو انگشت مبارک میں خطوط پر مہر کرنے کی غرض سے آپ ﷺ پہنا کرتے تھے، لوگوں نے غلطی سے اس کو خاتم نبوت کی طرف منسوب کردیا۔ ''س''۔

❸ شمائل ترمذی: ۲۸۔ ❹ بخاری: ۳۵۵۸، ۳۹۴۴؛ مسلم: ۶۰۶۲؛ شمائل ترمذی: ۳۰۔

❺ شمائل ترمذی: ۳۳، ۳۴۔ ❻ شمائل ترمذی: ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴۔

گفتگو اور خندہ و تبسم

گفتگو نہایت شیریں اور دلآویز تھی، بہت ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے تھے، ایک ایک فقرہ الگ ہوتا کہ سننے والوں کو یاد رہ جاتا معمول تھا کہ ایک ایک بات کو تین تین دفعہ فرماتے ❶ جس بات پر زور دینا ہوتا بار بار اس کا اعادہ فرماتے، حالت گفتگو میں اکثر نگاہ آسمان کی طرف ہوتی تھی، آواز بلند تھی ❷ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کعبہ میں قرآن مجید پڑھتے تھے اور ہم لوگ گھروں میں پلنگوں پر لیٹے لیٹے سنتے تھے۔ ❸

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہر سے ایک صاحبزادے تھے جن کا نام ہند تھا، وہ نہایت خوش تقریر تھے، جس چیز کا بیان کرتے اس کی تصویر کھینچ دیتے، حضرت امام حسن علیہ السلام نے ان سے پوچھا: ''آنحضرت ﷺ کیونکر تقریر فرماتے تھے۔'' انہوں نے کہا: ''آپ ہمیشہ متفکر رہتے تھے، اکثر چپ رہتے اور بے ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے ایک ایک فقرہ الگ اور صاف اور واضح ہوتا تھا، ہاتھ سے اشارہ کرتے تو پورا ہاتھ اٹھاتے، کسی بات پر تعجب کرتے تو ہتھیلی کا رخ پلٹ دیتے، تقریر میں کبھی ہاتھ پر ہاتھ مارتے، بات کرتے کرتے جب کبھی مسرت کی کیفیت طاری ہوتی تو آنکھیں نیچی ہو جاتیں ہنستے بہت کم تھے، ہنسی آتی تو مسکرا دیتے اور یہی آپ کی ہنسی تھی۔'' ❹ جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو دیکھا ہو اور مسکرا نہ دیا ہو۔ روایتوں میں آیا ہے کہ کبھی کبھی جب آپ کو زیادہ ہنسی آتی تو داڑھ کے دانت (نواجذ) نظر آنے لگتے ❺ لیکن ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ طرز ادا کا مبالغہ ہے ورنہ کبھی آپ اس زور سے نہیں ہنسے کہ نواجذ نظر آئیں۔ ❻

لباس

لباس کے متعلق کسی قسم کا التزام نہ تھا، عام لباس چادر، قمیض اور تہبند تھی، پاجامہ کبھی استعمال نہیں فرمایا لیکن امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے منیٰ کے بازار میں پاجامہ خریدا تھا۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ استعمال بھی فرمایا ہوگا۔ ❼ موزوں کی عادت نہ تھی لیکن نجاشی نے جو سیاہ موزے بھیجے تھے آپ ﷺ نے استعمال فرمائے۔ ❽ بظاہر روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چرمی تھے۔ عمامہ کا شملہ کبھی دوشِ مبارک پر کبھی دونوں شانوں کے بیچ میں پڑا رہتا تھا، کبھی تحت الحنک کی طور لپیٹ لیتے تھے عمامہ اکثر سیاہ رنگ کا ہوتا تھا، ❾ عمامہ کے نیچے سر سے لپٹی ہوئی ٹوپی ہوتی تھی اونچی ٹوپی کبھی استعمال نہیں فرمائی۔ (عمامہ کے نیچے ٹوپی کا التزام تھا، فرماتے تھے کہ ہم میں اور مشرکین

---

❶ شمائل:۲۲۳۔ ❷ شرح زرقانی، ج ٤، ص:١٠٤۔ ❸ ابن ماجه، باب اقامة الصلاة، باب ماجاء في القراءة في صلوٰة الليل: ١٣٤٩۔ (کعبہ کا ذکر نہیں) ❹ شمائل ترمذی:٢٢٤۔ ❺ شمائل ترمذی: ٢٢٩، ٢٣٠۔ ❻ یہ بحث تفصیل سے شرح زرقانی، ج ٤، ص:٢١٦ میں امام سیوطی کی نسبت سے بیان کی گئی ہے۔

❼ شرح زرقانی، ج ٥، ص:٥٢۔ ❽ شرح زرقانی، ج ٥، ص:٥٣۔ ❾ ایضًا، ص:٤۔

میں یہی امتیاز ہے کہ ہم ٹوپیوں پر عمامہ باندھتے ہیں)۔ ❶

چادر

لباس میں سب سے زیادہ یمن کی دھاری دار چادریں ❷ پسند تھیں جن کو عربی میں حبرہ کہتے ہیں۔

عبا

بعض اوقات شامی عبا استعمال کی ہے جس کی آستین اس قدر تنگ تھی کہ جب وضو کرنا چاہا تو چڑھ نہ سکی، اور ہاتھ کو آستین سے نکالنا پڑا۔ نوشیروانی قبا بھی جس کی جیب اور آستینوں پر دیبا کی سنجاف تھی، استعمال کی ہے۔ ❸

کمبل

جب انتقال ہوا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کمبل جس میں پیوند لگے ہوئے تھے اور گاڑھے کی ایک تہبند نکال کر دکھائی کہ انہی کپڑوں میں آپ ﷺ نے وفات پائی۔ ❹

حلۂ حمراء

روایتوں میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے حلۂ حمراء بھی استعمال کیا ہے، حمراء کے معنی سرخ کے ہیں اس لیے اکثر محدثین نے وہی عام معنی لیے ہیں لیکن ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے اصرار کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ سرخ لباس آپ ﷺ نے کبھی نہیں پہنا اور نہ آپ ﷺ مردوں کے لیے اس کو جائز رکھتے تھے، حلۂ حمراء ایک قسم کی یمنی چادر تھی، جس میں سرخ دھاریاں بھی ہوتی تھیں، اس بنا پر اس کو حمراء کہتے تھے اور یہی کبھی کبھی استعمال کرتے تھے، عام محدثین کہتے ہیں کہ اس تخصیص کا کوئی ثبوت نہیں، زرقانی (ج ۵، ص:۲۷) میں یہ بحث نہایت تفصیل سے مذکور ہے۔ مختلف روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے سیاہ، سرخ، سبز، زعفرانی ہر رنگ کے کپڑے پہنے ہیں لیکن سفید رنگ بہت مرغوب تھا ❺ (بعض اوقات اس قسم کی چادر بھی استعمال فرمائی ہے جس پر کجاوے کی شکل بنی ہوئی تھی) ❻

نعلین

نعلین مبارک اس طرز کے تھے جس کو اس ملک میں چپل کہتے ہیں، یہ صرف ایک تلا ہوتا تھا جس میں تسمے لگے ہوتے تھے۔ بچھونا چمڑے کا گدا ہوتا تھا جس میں روئی کے بجائے کھجور کے پتے ہوتے تھے چارپائی بان کی بنی ہوتی تھی، جس سے اکثر جسم پر بدھیاں پڑ جاتی تھیں۔ ❼

---

❶ ابو داود کتاب اللباس، باب فی العمائم:۴۰۷۸۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب البرود والحبر والشملة: ۵۸۱۲ تا ۵۸۱۴۔ ❸ بخاری: ۵۷۹۸۔

❹ بخاری، کتاب اللباس، باب الاکسیة:۵۸۱۸۔

❺ ابو داود، کتاب اللباس، باب فی البیاض:۴۰۶۱؛ مسند ابن حنبل، ج ۱، ص: ۲۴۷۔

❻ ابو داود، کتاب اللباس، باب لبس الصوف والشعر:۴۰۳۲۔

❼ شرح زرقانی، ج۵، ص: ۵۴، ۶۲۔

انگوٹھی

جب آپ ﷺ نے نجاشی اور قیصرِ روم کو خط لکھنا چاہا تو لوگوں نے عرض کی کہ سلاطین مہر کے بغیر کوئی تحریر قبول نہیں کرتے، اس بنا پر چاندی کی انگوٹھی بنوائی، جس میں اوپر تلے تین سطروں میں محمد رسول اللہ (ﷺ) لکھا ہوا تھا۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ آپ ﷺ صرف مہر لگانے کے وقت اس کا استعمال فرماتے تھے اور داہنے ہاتھ کی انگلی میں پہنتے تھے۔ ❶

خود و زرہ

لڑائیوں میں زرہ اور مغفر بھی پہنتے تھے۔ اُحد کے معرکہ میں جسم مبارک پر دو زرہیں تھیں۔ تلوار کا قبضہ کبھی چاندی کا بھی ہوتا تھا۔ ❷

غذا اور طریقۂ طعام

اگرچہ ایثار اور قناعت کی وجہ سے لذیذ اور پر تکلف کھانے کبھی نصیب نہ ہوتے، یہاں تک کہ (جیسا کہ صحیح بخاری کتاب الاطعمة باب الخبز المرقق: ۵۳۸۵ میں ہے) تمام عمر آپ ﷺ نے چپاتی کی صورت تک نہیں دیکھی، تاہم بعض کھانے آپ کو نہایت مرغوب تھے۔

مرغوب کھانے

سرکہ، شہد، حلوہ، روغن زیتون، کدو، خصوصیت کے ساتھ پسند تھے سالن میں کدو ہوتا تو پیالہ میں اس کی قاشیں انگلیوں سے ڈھونڈتے۔ ❸ ایک دفعہ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے اور پوچھا کہ کچھ کھانے کو ہے، بولیں کہ سرکہ ہے، فرمایا کہ جس گھر میں سرکہ ہو اس کو نادار نہیں کہہ سکتے۔ عرب میں ایک کھانا ہوتا ہے جس کو حیس کہتے ہیں، یہ گھی میں پنیر اور کھجور ڈال کر پکایا جاتا ہے آپ کو یہ بہت مرغوب تھا۔

ایک دفعہ حضرت امام حسن علیہ السلام اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سلمٰی کے پاس گئے اور کہا کہ آج ہم کو وہ کھانا پکا کر کھلاؤ جو آنحضرت ﷺ کو بہت مرغوب تھا، بولیں تم کو وہ کیا پسند آئے گا؟ لوگوں نے اصرار کیا تو انہوں نے جو کا آٹا پیس کر ہانڈی میں چڑھا دیا اوپر سے روغن زیتون اور زیرہ اور کالی مرچیں ڈال دیں، پک گیا تو لوگوں کے سامنے رکھا اور کہا کہ یہ آپ ﷺ کی محبوب ترین غذا تھی۔ گوشت کے اقسام میں سے آپ ﷺ نے دنبہ، مرغ، بٹیر، (حباری) اونٹ، بکری، بھیڑ، گورخر، خرگوش، مچھلی کا گوشت کھایا ہے۔ دست کا گوشت بہت پسند تھا شمائلِ ترمذی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول نقل کیا ہے کہ دست کا گوشت فی نفسہٖ آپ ﷺ کو چنداں مرغوب نہ تھا، بات یہ تھی کہ کئی کئی دن تک گوشت نصیب نہیں ہوتا تھا، اس لیے جب کبھی مل جاتا تو آپ ﷺ چاہتے تھے کہ جلد پک کر تیار ہو جائے۔ دست کا گوشت جلدی گل جاتا ہے، اس لیے آپ ﷺ اسی کی فرمائش

---

❶ بخاری: ۶۵، ۲۹۳۸، ۵۸۷۳؛ مسلم: ۵۴۷۸ تا ۵۴۸۸؛ ابو داود: ۴۲۱۴۔

❷ شرح زرقانی، ج ۵، ص: ۴۳۵۔ ❸ بخاری، کتاب الاطعمة، باب من تتبع حوالی القصعة: ۵۳۷۹۔

کرتے لیکن متعدد روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یوں بھی آپ ﷺ کو یہ گوشت پسند تھا۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے نکاح میں جب آپ ﷺ نے ولیمہ کا کھانا کھلایا تھا، تو صرف کھجور اور ستو تھا، تربوز کو کھجور کے ساتھ ملا کر کھاتے تھے، پتلی ککڑیاں پسند تھیں، ایک دفعہ معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی نے کھجور اور پتلی ککڑیاں خدمت میں پیش کیں، (بعض اوقات روٹی کے ساتھ بھی کھجور تناول فرمائی ہے)۔

پانی، دودھ، شربت

ٹھنڈا پانی نہایت مرغوب تھا، دودھ کبھی خالص نوش فرماتے، کبھی اس میں پانی ملا دیتے، کشمش، کھجور، انگور پانی میں بھگو دیا جاتا، کچھ دیر کے بعد وہ پانی نوش جان فرماتے، کھانے کے ظروف میں ایک لکڑی کا پیالہ تھا جو لوہے کے تاروں سے بندھا ہوا تھا، روایت میں اسی قدر ہے قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹوٹ گیا ہوگا اس لیے تاروں سے جوڑ دیا ہوگا۔

معمولاتِ طعام

دستر خوان پر جو کھانا آتا اگر ناپسند ہوتا تو اس میں ہاتھ نہ ڈالتے لیکن اس کو برا نہ کہتے، جو سالن سامنے ہوتا اسی میں ہاتھ ڈالتے ادھر ادھر ہاتھ نہ بڑھاتے اور اس سے اوروں کو بھی منع فرماتے، کھانا کبھی مسند یا تکیہ پر ٹیک لگا کر نہ کھاتے اور اس کو ناپسند فرماتے میز یا خوان پر کبھی نہیں کھایا۔ خوان زمین سے کسی قدر اونچی میز ہوتی تھی، عجم اسی پر کھانا رکھ کر کھاتے تھے چونکہ یہ بھی فخر اور امتیاز کی علامت تھی یعنی امرا اور اہل جاہ کے ساتھ مخصوص تھی، اس لیے آپ ﷺ نے اس پر کھانا پسند نہیں فرمایا، کھانا صرف تین انگلیوں سے کھاتے [1] گوشت کو کبھی کبھی چھری سے کاٹ کر بھی کھاتے۔ صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے۔ [2] ابوداؤد میں ایک حدیث ہے کہ گوشت چھری سے نہ کاٹو کیونکہ یہ اہل عجم کا شعار ہے لیکن ابوداؤد نے خود اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اس حدیث کے ایک راوی ابو معشر نجیح ہیں جن کی نسبت بخاری نے لکھا ہے کہ وہ منکر الحدیث ہیں اور انہی منکرات میں حدیث مذکور بھی ہے۔ [3]

خوش لباسی

گو تکلف اور جاہ پسندی سے آپ ﷺ کو نفرت تھی لیکن کبھی کبھی آپ ﷺ نہایت قیمتی اور خوش نما لباس بھی زیب تن فرماتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جب حروریہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجے گئے تو وہ یمن کے نہایت قیمتی کپڑے پہن کر گئے۔ حروریہ نے کہا: کیوں ابن عباس! یہ کیا لباس ہے؟ بولے کہ تم اس پر

---

[1] غذا کے متعلق زیادہ تر واقعات شمائل ترمذی باب ماجاء فی صفة اکل رسول اللہ ﷺ: ۱۳۶ تا ۱۴۱ وباب ما جاء فی صفة خبز رسول اللہ: ۱۴۲ تا ۱۴۹ وباب ماجاء فی ادام رسول اللہ ﷺ: ۱۵۰ تا ۱۸۳: ۱۳۶ تا ۱۸۳ اور زادالمعاد ابن قیم، ج ۱، ص: ۳۷ فصل طعام سے ماخوذ ہیں۔ [2] بخاری، کتاب الاطعمة، باب قطع اللحم بالسکین: ۵۴۰۸۔ [3] قسطلانی شرح صحیح بخاری، ج ۸، ص: ۲۵۲ مصر۔

معترض ہو، میں نے آنحضرت ﷺ کو بہتر سے بہتر کپڑوں میں دیکھا ہے۔ ❶

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نہایت متقشف تھے ایک دفعہ بازار سے ایک شامی حلہ مول لیا، گھر پر آ کر دیکھا تو اس میں سرخ دھاریاں تھیں، جا کر واپس کر آئے، کسی نے یہ واقعہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بہن سے کہا، انہوں نے آنحضرت ﷺ کا جبہ منگوا کر لوگوں کو دکھایا جس کی جیبوں اور آستینوں اور دامن پر دیبا کی سنجاف تھی۔ ❷ (بعض امراو سلاطین نے آنحضرت ﷺ کو بیش قیمت کپڑے ہدیہ بھیجے، آپ ﷺ نے قبول فرمایا، اور کبھی زیب تن کیے)۔

مرغوب رنگ

رنگوں میں زرد رنگ بہت پسند تھا۔ حدیثوں میں ہے کہ کبھی کبھی آپ تمام کپڑے یہاں تک کہ عمامہ بھی اسی رنگ کا رنگوا کر پہنتے تھے۔ ❸ (سفید رنگ بھی بہت پسند تھا، فرماتے تھے کہ یہ رنگ سب رنگوں میں اچھا ہے؟)

نامرغوب رنگ

سرخ لباس ناپسند فرماتے تھے، ایک دفعہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سرخ کپڑے پہن کر آئے، تو فرمایا: ''یہ کیا لباس ہے۔'' عبداللہ رضی اللہ عنہ نے جا کر آگ میں ڈال دیا، آپ ﷺ نے سنا تو فرمایا: ''جلانے کی ضرورت نہ تھی کسی عورت کو دے دیا ہوتا۔'' ❹

عرب میں سرخ رنگ کی مٹی ہوتی ہے جس کو ''مغرہ'' کہتے ہیں، اس سے کپڑے رنگا کرتے تھے، یہ رنگ آپ ﷺ کو نہایت ناپسند تھا۔ ایک دفعہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اس سے کپڑے رنگ رہی تھیں، آپ ﷺ گھر میں آئے اور دیکھا تو واپس چلے گئے، حضرت زینب سمجھ گئیں، کپڑے دھو ڈالے، آنحضرت ﷺ دوبارہ تشریف لائے اور جب دیکھ لیا کہ اس رنگ کی کوئی چیز نہیں تب گھر میں قدم رکھا۔ ❺

ایک دن ایک شخص سرخ پوشاک پہن کر آیا، تو آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ ایک دفعہ صحابہ نے سواری کے اونٹوں پر سرخ رنگ کی چادریں ڈال دی تھیں آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں یہ دیکھنا نہیں چاہتا کہ یہ رنگ تم پر چھا جائے۔'' فوراً صحابہ نہایت تیزی سے دوڑے اور چادریں اتار کر پھینک دیں۔ ❻

خوشبو کا استعمال

خوشبو آپ ﷺ کو بہت پسند تھی، کوئی شخص خوشبو کی چیز ہدیۃً بھیجتا تو کبھی رد نہ فرماتے۔ ایک خاص قسم کی خوشبو یا عطر ہوتا ہے جس کو سکّہ کہتے ہیں، یہ ہمیشہ آپ ﷺ کے استعمال میں رہتا تھا، صحابہ کہتے ہیں کہ

---

❶ ابوداود، کتاب اللباس، باب لباس الغلیظ: ٤٠٣٧۔ ❷ ابو داود، کتاب اللباس، باب الرخصة فی العلم وخیط الحریر: ٤٠٥٤۔ ❸ ابو داود، کتاب اللباس، باب فی المصبوغ: ٤٠٦٤۔

❹ ابو داود، کتاب اللباس، باب فی الحمرة: ٤٠٦٦، ٤٠٦٨۔

❺ ایضا: ٤٠٧١۔ ❻ ایضا: ٤٠٧٠۔

جس گلی کوچہ سے آپ ﷺ نکل جاتے وہ معطر ہو جاتا، اکثر فرمایا کرتے: ''مردوں کی خوشبو ایسی ہونی چاہیے کہ خوشبو پھیلے اور رنگ نظر نہ آئے اور عورتوں کی ایسی کہ خوشبو نہ پھیلے اور رنگ نظر آئے۔'' 1

لطافت اور نفاست

مزاج میں لطافت تھی، ایک شخص کو میلے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہوتا کہ کپڑے دھولیا کرے۔ 2 ایک دفعہ ایک شخص خراب کپڑے پہنے ہوئے خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے پوچھا: ''تم کو کچھ مقدور ہے؟'' بولا ہاں ارشاد ہوا کہ ''خدا نے نعمت دی ہے تو صورت سے بھی اس کا اظہار ہونا چاہیے۔'' 3 عرب تہذیب وتمدن سے کم آشنا تھے، مسجد میں آتے تو عین نماز میں دیواروں پر یا سامنے زمین پر تھوک دیتے، آپ ﷺ اس کو نہایت ناپسند فرماتے، دیواروں پر تھوک کے دھبوں کو خود چھڑی کی نوک سے کھرچ کر مٹاتے۔ ایک دفعہ تھوک کا دھبہ دیوار پر دیکھا تو اس قدر غصہ آیا کہ چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا، ایک انصاری عورت نے دھبہ کو مٹایا اور اس جگہ خوشبو لا کر ملی، آپ ﷺ نہایت خوش ہوئے اور اس کی تحسین کی۔ 4

کبھی کبھی مجلس عالی میں خوشبو کی انگیٹھیاں جلائی جاتیں جن میں اگر اور کبھی کبھی کافور ہوتا 5 ایک دفعہ ایک عورت نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ خضاب لگانا کیسا ہے؟ بولیں کچھ مضائقہ نہیں لیکن میں اس لیے ناپسند کرتی ہوں کہ میرے حبیب (رسول اللہ ﷺ) کو حنا کی بو ناگوار تھی۔ 6

اکثر مشک اور عنبر کا استعمال فرماتے۔

ایک شخص کے بال پریشان دیکھے تو فرمایا: ''اس سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ بالوں کو درست کر لے۔'' 7 ایک دفعہ اون کی چادر اوڑھی، پسینہ آیا تو اتار کر رکھ دی۔ 8 ایک دن لوگ مسجد نبوی میں آئے چونکہ مسجد تنگ تھی اور کاروباری لوگ میلے کپڑوں میں چلے آتے تھے، پسینہ آیا تو تمام مسجد میں بو پھیل گئی، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نہا کر آتے تو اچھا ہوتا۔'' 9 اسی دن سے غسلِ جمعہ ایک شرعی حکم بن گیا۔

مسجد نبوی میں جھاڑو دینے کا التزام تھا، ام محجن نامی ایک عورت جھاڑو دیا کرتی تھی۔ ابن ماجہ میں روایت ہے کہ آپ نے حکم دیا کہ مساجد میں بچے اور مجنوں نہ جانے پائیں اور خرید وفروخت نہ ہونے پائے، یہ بھی حکم دیا کہ مساجد میں جمعہ کے دن خوشبو کی انگیٹھیاں جلائی جائیں۔ 10 اہل عرب بدویت کے اثر سے

---

1 شمائل ترمذی، باب ما جاء فی تعطر رسول اللہ ﷺ: ۲۱۵ تا ۲۱۸؛ ترمذی: ۲۷۸۸؛ ابو داود: ۴۱۷۲۔

2 ابو داود، کتاب اللباس، باب فی الخلقان: ۴۰۶۲۔ 3 ایضًا: ۴۰۶۳۔ 4 نسائی، کتاب المساجد، باب تخلیق المساجد: ۷۲۹۔ 5 نسائی، کتاب الزینۃ، باب البخور: ۵۱۳۸۔ 6 نسائی، کتاب الزینۃ، باب کراھیۃ ریح الحنا: ۵۰۹۳۔ 7 ابو داود، کتاب اللباس، باب فی الخلقان: ۴۰۶۲۔

8 ابو داود، کتاب اللباس، باب فی السواد: ۴۰۷۴۔ 9 اس مضمون کی متعدد حدیثیں بخاری شریف (غسلِ جمعہ) میں باختلاف الفاظ وواقعات مذکور ہیں۔ 10 ابن ماجہ، ابواب المساجد، باب مایکرہ فی المساجد: ۷۵۰۔

لطافت اور صفائی کا نام نہیں جانتے تھے، اس بنا پر اس خاص باب میں آپ کو نہایت اہتمام کرنا پڑا تھا۔

عرب کی عادت تھی (اور آج بھی بدویوں میں عموماً پائی جاتی ہے) کہ راستہ میں بول و براز کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ اس کو نہایت ناپسند فرماتے اور اس سے منع کرتے تھے۔ احادیث میں کثرت سے روایتیں موجود ہیں کہ آپ ﷺ نے ان لوگوں پر لعنت کی ہے جو راستہ میں یا درختوں کے سایہ میں بول و براز کرتے ہیں۔ امرا کا دستور ہے کہ کاہلی کی وجہ سے کسی برتن میں پیشاب کرلیا کرتے ہیں، اس سے بھی منع فرماتے تھے۔ ❶

عرب میں پیشاب کے بعد استنجا کرنے یا پیشاب سے کپڑوں کے بچانے کا مطلق دستور نہ تھا، آپ ﷺ ایک دفعہ راہ میں جا رہے تھے دو قبریں نظر آئیں، فرمایا: ''ان میں سے ایک پر اس لیے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ اپنے کپڑوں کو پیشاب سے محفوظ نہیں رکھتا تھا۔'' ❷

ایک دفعہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف لائے دیواروں پر جا بجا تھوک کے دھبے تھے، آپ کے ہاتھ میں کھجور کی ٹہنی تھی اس سے کھرچ کر تمام دھبے مٹائے پھر لوگوں کی طرف خطاب کر کے غصہ کے لہجہ میں فرمایا: ''کیا تم پسند کرتے ہو کہ کوئی شخص تمہارے سامنے آ کر تمہارے منہ پر تھوک دے۔ جب کوئی شخص نماز پڑھتا ہے تو خدا اس کے سامنے اور فرشتے اس کے داہنی جانب ہوتے ہیں اس لیے انسان کو سامنے یا دائیں جانب تھوکنا نہیں چاہیے۔'' ❸

ایک صحابی نے عین نماز میں (جبکہ وہ امام نماز تھے) تھوک دیا، آنحضرت ﷺ دیکھ رہے تھے، فرمایا: ''یہ شخص اب نماز نہ پڑھائے۔'' نماز کے بعد یہ صاحب خدمت اقدس میں آئے اور پوچھا کہ کیا آپ ﷺ نے یہ حکم دیا ہے فرمایا: ''ہاں تم نے خدا اور پیغمبر کو اذیت دی۔'' ❹

بودار چیزوں مثلاً: پیاز، لہسن اور مولی سے نفرت تھی، حکم تھا کہ یہ چیزیں کھا کر لوگ مسجد میں نہ آئیں۔ بخاری میں حدیث ہے کہ ''جو شخص پیاز لہسن کھائے وہ ہمارے پاس نہ آئے اور ہمارے ساتھ نماز نہ پڑھے۔'' ❺ اپنے زمانۂ خلافت میں ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں کہا کہ تم لوگ پیاز اور لہسن کھا کر مسجد میں آتے ہو حالانکہ میں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا تھا کہ کوئی شخص یہ چیزیں کھا کر مسجد میں آتا تو آپ حکم دیتے کہ مسجد سے نکال کر بقیع پہنچا دیا جائے۔ ❻

---

❶ الترغیب والترھیب للمنذری، کتاب الطھارۃ، باب الترھیب من البول فی المآء...: ۲۵۳۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب عذاب القبر من الغیبۃ والبول: ۱۳۶۱۔

❸ کتاب الصلاۃ، باب الترھیب من البصاق فی المسجد: ۴۳۱۔ ❹ ابوداود، کتاب الصلاۃ، باب فی کراھیۃ البزاق...: ۴۸۱۔ ❺ بخاری، کتاب الاذان، باب ماجاء فی الثوم: ۸۵۳، ۸۵۴۔

❻ مسلم، کتاب المساجد، باب نھی من اکل الثوم: ۱۲۵۸ وابن ماجہ، ابواب اقامۃ الصلاۃ، باب من اکل الثوم: ۱۰۱۴۔

سواری کا شوق

گھوڑے کی سواری آپ ﷺ کو نہایت مرغوب تھی (آپ ﷺ فرمایا کرتے: ((**الخیل معقود فی نواصیھا الخیر**)) [1] گھوڑوں کے علاوہ گدھے، خچر، اونٹ پر آپ ﷺ نے سواری فرمائی ہے۔ آپ ﷺ کے خاص سواری کے گھوڑے کا نام لحیف تھا۔ گدھے کا نام عفیر اور خچر کا نام دُلدُل اور تیہ اور اونٹنیوں کا نام قصواء اور عضباء تھا)۔

اسپ دوانی

مدینہ سے باہر ایک میدان تھا جس کی سرحد حصباء سے ثنیۃ الوداع تک ۶ میل تھی، یہاں گھڑ دوڑ کی مشق کرائی جاتی تھی۔ گھوڑے جو مشق کے لیے تیار کرائے جاتے تھے ان کی تیاری کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے ان کو خوب دانہ گھاس کھلاتے تھے، جب وہ موٹے تازے ہو جاتے تو ان کی غذا کم کرنی شروع کرتے اور گھر میں باندھ کر چار جامہ کستے۔ پسینہ آتا اور خشک ہوتا روزانہ یہ عمل جاری رہتا، رفتہ رفتہ جس قدر گوشت چڑھ گیا تھا، خشک ہو کر ہلکا پھلکا، چھریرا بدن نکل آتا، یہ مشق چالیس دن میں ختم ہوتی۔

آنحضرت ﷺ کی سواری کا ایک گھوڑا تھا جس کا نام سبحہ تھا، ایک دفعہ اس کو آپ ﷺ نے بازی میں دوڑایا، اس نے بازی جیتی تو آپ ﷺ کو خاص مسرت ہوئی۔ [2]

گھوڑ دوڑ کا اہتمام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد تھا، انہوں نے اپنی طرف سے سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کو یہ خدمت سپرد کی اور اس کے چند قاعدے مقرر کیے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے: [3]

① گھوڑوں کی صفیں قائم کی جائیں اور تین دفعہ پکار دیا جائے کہ جس کو لگام درست کرنی یا بچہ کو ساتھ رکھنا یا زین الگ کر دینی ہو الگ کر لے۔

② جب کوئی آواز نہ دے تو تین دفعہ تکبیریں کہی جائیں، تیسری تکبیر پر گھوڑے میدان میں ڈال دیے جائیں۔

③ گھوڑے کے کان آگے نکل جائیں تو سمجھ لیا جائے گا کہ وہ آگے نکل گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ خود میدان کے انتہائی سرے پر بیٹھ جاتے اور ایک خط کھینچ کر دو آدمیوں کو دونوں کناروں پر کھڑا کر دیتے۔ گھوڑے انہی دونوں کے درمیان سے ہو کر نکلتے۔

اونٹوں کی دوڑ بھی ہوتی۔ آنحضرت ﷺ کی خاص سواری کا ناقہ عضباء ہمیشہ بازی لے جاتا۔ ایک دفعہ ایک بدو اونٹ پر سوار آیا اور مسابقت میں عضباء سے آگے نکل گیا تمام مسلمانوں کو سخت صدمہ ہوا۔

---

[1] نسائي، كتاب الخيل والسبق، باب الخيل معقود في...: ٣٥٩١۔

[2] دار قطني، كتاب السبق بين الخيل: ٤٧٧٨؛ مسند احمد: ٣/ ١٦٠ اور بیہقی میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے۔

[3] یہ پوری تفصیل دار قطني، كتاب السبق بين الخيل: ٤٧٩٠ میں ہے لیکن محدثانہ حیثیت سے یہ روایت ضعیف ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''خدا پر حق ہے کہ دنیا کی جو چیز گردن اٹھائے اس کو نیچا دکھائے۔'' ❶ رنگوں میں صندلی، مشکی اور کمیت بہت پسند تھا ❷ گھوڑوں کی دم کاٹنے سے منع فرمایا، کہ مکھی ہانکنے کا مورچھل ہے۔ ❸

❶ صحیح بخاری:۲۸۷۲ونسائی:۳۶۲۲ ودار قطنی، ج ٤، ص:۳۰۱۔

❷ نسائی، کتاب الخیل والسبق، باب مایستحب من شیة الخیل: ۳۵۹۵۔ ❸ کتب سنن کتاب الادب۔

معمولات

(ترمذی نے شمائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے اوقات کے تین حصے کر دیے تھے، ایک عبادت الٰہی کے لیے، دوسرا عام خلق کے لیے اور تیسرا اپنی ذات کے لیے)۔ 1

صبح سے شام تک کے معمولات

معمول تھا کہ نماز فجر پڑھ کر (جانماز پر) آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے، یہاں تک کہ آفتاب اچھی طرح نکل آتا 2 (اور یہی وقت دربار نبوت کا ہوتا۔ لوگ پاس آ کر بیٹھتے اور آپ ﷺ ان کو مواعظ و نصائح تلقین فرماتے) 3

اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھتے کہ کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے، کسی نے دیکھا ہوتا تو عرض کرتے آپ ﷺ اس کی تعبیر بیان فرماتے، 4 کبھی خود اپنا خواب بیان فرماتے، 5 اس کے بعد ہر قسم کی گفتگو ہوتی لوگ جاہلیت کے قصے بیان کرتے، شعر پڑھتے ہنسی خوشی کی باتیں کرتے۔ آنحضرت ﷺ صرف مسکرا دیتے، 6 اکثر اسی وقت مال غنیمت اور وظائف وخراج وغیرہ کی تقسیم فرماتے۔ 7

بعض روایتوں میں ہے کہ جب دن کچھ چڑھ جاتا تو چاشت کی کبھی چار، کبھی آٹھ رکعت نماز ادا فرماتے۔ گھر جا کر گھر کے دھندے میں مشغول رہتے، 8 پھٹے کپڑوں کو سیتے، جوتا ٹوٹ جاتا تو اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیتے، دودھ دو ہتے۔

نماز عصر پڑھ کر ازواج مطہرات میں سے ایک ایک کے پاس جاتے اور ذرا ذرا دیر ٹھہرتے، پھر جس کی باری ہوتی وہیں رات بسر فرماتے۔ تمام ازواج مطہرات وہیں جمع ہو جاتیں۔ عشاء تک صحبت رہتی 9 پھر نماز عشاء کے لیے مسجد میں تشریف لے جاتے اور واپس آ کر سو رہتے، ازواج رخصت ہو جاتیں، نماز عشاء کے بعد بات چیت کرنی ناپسند فرماتے۔ 10

خواب

عام معمول یہ تھا کہ آپ ﷺ اول وقت نماز عشاء پڑھ کر آرام فرماتے تھے۔ سوتے وقت التزاما

---

1 شمائل ترمذی، ص:۲۵۹ لم اقف علیه۔ 2 صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب تبسمه ﷺ:۶۰۳۵۔

3 جامع ترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی الاخذ بالسنة:۲۶۷۶۔ 4 صحیح مسلم، کتاب الرؤیا، باب فی تأویل الرؤیا:۵۹۳۱۔ 5 صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب القصر فی المنام:۷۰۲۳۔

6 نسائی، کتاب السهو، باب قعود الامام فی مصلاه:۱۳۵۹۔

7 بخاری اور حدیث کی کتابوں میں متعدد جزئی واقعات مذکور ہیں۔ 8 صحیح بخاری، کتاب الادب، باب کیف یکون الرجل فی اهله:۶۰۳۹۔ 9 صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب القسم بین الزوجات:۳۶۲۸۔

10 بخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب مایکره من السمر بعد صلوٰۃ العشاء:۵۹۹۔

قرآن مجید کی کوئی سورۃ (بنی اسرائیل، زمر، حدید، حشر، صف، تغابن، جمعہ) پڑھ کر سوتے۔ شمائل ترمذی میں ہے کہ آرام فرماتے وقت یہ الفاظ فرماتے:

((اَللّٰھُمَّ بِاسْمِكَ اَمُوْتُ وَاَحْیٰی))۔ ''خدایا تیرا نام لے کر مرتا ہوں اور زندہ رہتا ہوں۔''

جاگتے تو فرماتے:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرِ)) ❶

''اس خدا کا شکر جس نے موت کے بعد زندہ کیا، اور اسی کی طرف حشر ہوگا۔''

آدھی رات یا پہر رات رہے جاگ اٹھتے، مسواک ہمیشہ سرہانے رہتی تھی، اٹھ کر پہلے مسواک فرماتے، پھر وضو کرتے اور عبادت میں مشغول ہوتے، آپ ﷺ کی سجدہ گاہ ❷ آپ ﷺ کے سرہانے ہوتی تھی۔ ہمیشہ داہنی کروٹ اور دایاں ہاتھ رخسار کے نیچے رکھ کر سوتے لیکن جب کبھی سفر میں پچھلے پہر منزل پر اتر کر آرام فرماتے تو معمول تھا کہ دایاں ہاتھ اونچا کر کے چہرہ اس پر ٹیک کر سوتے کہ گہری نیند آ جائے، ❸ نیند میں کسی قدر خراٹے کی آواز آتی تھی۔

بچھونے میں کوئی التزام نہ تھا، کبھی معمولی بستر پر، کبھی کھال پر، کبھی چٹائی پر اور کبھی خالی زمین پر آرام فرماتے۔ ❹

عبادتِ شبانہ

آنحضرت ﷺ کے خانگی معمولات اور اوراد سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے برابر کوئی واقف نہ تھا۔ ان سے مروی ہے کہ جب سورۂ مزمل کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں تو آپ ﷺ نے اس قدر نمازیں پڑھیں کہ پاؤں پر ورم آ گیا، بارہ مہینے تک باقی آیتیں رکی رہیں، سال بھر کے بعد جب بقیہ آیتیں اتریں تو قیامِ لیل جو اب تک فرض تھا نفل رہ گیا۔

شب کو آٹھ رکعت متصل پڑھتے، جن میں صرف آٹھویں رکعت میں قعدہ کرتے، پھر ایک اور رکعت پڑھتے اور اس میں بھی جلسہ کرتے، پھر دو رکعتیں اور ادا کرتے اس طرح گیارہ رکعتیں ہو جاتیں۔ لیکن جب عمر زیادہ ہو گئی اور جسم ذرا بھاری ہو گیا تو سات رکعتیں پڑھتے، جن کے بعد دو رکعتیں اور ادا کرتے، کبھی کبھی رات کو اتفاقاً نیند کا غلبہ ہوتا اور اس معمول میں فرق آ تا تو دن میں بارہ رکعتیں پڑھ لیتے تھے۔ ❺

ابوداؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

''عشاء کی نماز جماعت سے پڑھ کر گھر میں چلے آتے اور یہاں چار رکعتیں پڑھ کر خواب راحت

❶ بخاری: ٦٣١٢؛ شمائل ترمذی: ٢٥٥۔ ❷ یعنی سجدہ کا مقام جہاں بحالتِ نماز آپ ﷺ سجدہ کرتے تھے''س''۔
❸ ترمذی: ٣٣٩٨؛ شمائل ترمذی: ٢٥٣۔ ❹ یہ پوری تفصیل زرقانی، ج ٥، ص: ٧٩، ٨٠ میں حدیث کی متعدد کتابوں کے حوالے سے مذکور ہے۔ ❺ سنن ابو داود، کتاب التطوع، باب فی صلوٰۃ اللیل: ١٣٤٢۔

فرماتے، وضو کا پانی اور مسواک سرہانے رکھ دی جاتی، سو کر اٹھتے پہلے مسواک فرماتے، پھر وضو کرتے اور جائے نماز پر آ کر آٹھ رکعتیں ادا کرتے۔'' ❶

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک دن میں اپنی خالہ میمونہ (آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات میں تھیں) کے یہاں خاص اس غرض سے رہا کہ دیکھوں آپ رات کو کس طرح نماز پڑھتے ہیں، زمین پر فرش بچھا ہوا تھا، آپ نے اس پر آرام فرمایا، میں سامنے آڑا سویا، قریباً رات ڈھلے آپ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ آل عمران کی اخیر دس آیتیں پڑھیں، پانی کی مشک لٹکی ہوئی تھی، اس سے وضو کیا، پھر نماز شروع کی، میں بھی وضو کر کے بائیں پہلو میں کھڑا ہو گیا، آپ نے ہاتھ پکڑ کر داہنی جانب پھیر دیا۔ تیرہ (۱۳) رکعتیں پڑھ کر آپ سو رہے، یہاں تک کہ سانس کی آواز آنے لگی، صبح ہوتے حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی، آپ ﷺ اٹھے فجر کی سنتیں ادا کیں، پھر مسجد میں تشریف لے گئے۔ ❷

معمولاتِ نماز

ابتدا میں آپ ﷺ ہر نماز کے لیے نیا وضو کرتے تھے لیکن جب یہ گراں گزرنے لگا، تو صرف پنج وقتہ مسواک رہ گئی۔ فتح مکہ میں آپ نے سب سے پہلے ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھیں ❸ تاہم عادتاً آپ اکثر نئے وضو کے ساتھ نماز ادا فرماتے تھے۔ وضو میں عام معمول یہ تھا کہ پہلے تین بار ہاتھ دھوتے پھر کلی کرتے اور ناک میں پانی ڈالتے، اس کے بعد تین تین بار منہ ہاتھ دھوتے، سر کا مسح کرتے اور تین بار پاؤں کو دھوتے ❹ بعض اوقات کسی عضو کو تین بار اور کسی عضو کو دو بار اور کسی عضو کو ایک بار دھوتے۔ ❺

سنن و نوافل زیادہ تر گھر ہی میں ادا فرماتے، اذان صبح ہی کے ساتھ اٹھتے اور فجر کی دو رکعت سنت نہایت اختصار کے ساتھ ادا کرتے، یہاں تک کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ مجھے بعض اوقات یہ خیال ہوتا تھا کہ آپ نے سورۂ فاتحہ پڑھی یا نہیں، ❻ لیکن فرض کی دو رکعتوں میں عموماً طویل سورتیں پڑھتے۔ حضرت عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک بار آپ نے مکہ میں نماز فجر میں سورۂ مؤمنون پڑھی اسی طرح کبھی واللیل اذا عسعس اور کبھی سورۂ ق پڑھتے۔ صحابہ کا اندازہ ہے کہ آپ صبح کی نماز میں ساٹھ سے لے کر سو آیتوں تک پڑھتے تھے۔ ❼

ظہر و عصر میں اگرچہ بہ نسبت فجر کے تخفیف فرماتے تھے تاہم ابتدا کی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ اتنی بڑی سورہ پڑھتے کہ آدمی بقیع تک جاتا تھا اور وہاں اپنا کام کرتا تھا پھر پلٹ کر گھر آتا تھا اور وضو کرتا تھا اور پہلی رکعت میں جا کر شامل ہو جاتا تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اندازہ کیا، تو معلوم ہوا کہ ظہر کی اول دو رکعتوں

---

❶ ابوداود، ایضاً:۱۳۴٦۔ ❷ ابوداود، ایضاً:۱۳۵۳۔ ❸ مسلم، کتاب الطهارة، باب جواز الصلوات كلها بوضوء واحد:٦٤٢۔ ❹ مسلم، کتاب الطهارة، باب صفة الوضوء:٥٣٨۔
❺ مسلم، کتاب الطهارة، باب آخر فی صفة الوضوء:٥٥٥، ٥٥٨۔ ❻ مسلم، کتاب صلاة المسافرين، باب استحباب ركعتی سنة الفجر والحث عليها:١٦٨٤، ١٦٨٥۔ ❼ مسلم:١٠٢٢، تا١٠٢٥۔

میں آپ ﷺ اس قدر قیام فرماتے ہیں، جس میں الٓمٓ تنزیل السجدۃ کے برابر سورہ پڑھی جاسکتی ہے۔ اخیر کی دو رکعتوں میں یہ مقدار نصف رہ جاتی تھی۔ عصر کی دونوں پہلی رکعتوں میں ظہر کی آخری رکعتوں کے برابر قیام فرماتے تھے اور اخیر کی دو رکعتوں میں پہلی رکعتوں کی نصف مقدار رہ جاتی تھی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ ظہر کی پہلی رکعت میں تیس آیتوں کے برابر اور دوسری رکعت میں پندرہ آیتوں کے یا اس کے نصف کے برابر، اور عصر میں پندرہ آیتوں کے برابر پڑھا کرتے تھے۔ ❶ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ظہر میں آپ ﷺ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝﴾ پڑھتے تھے۔ ایضاً: ۱۰۳۰۔

مغرب کی نماز میں والمرسلات اور سورۂ طور پڑھتے تھے۔ ❷

عشاء کی نماز میں ﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝﴾ اور اسی کے برابر کی سورتیں پڑھتے تھے۔ تہجد کی نماز میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے تھے، مثلاً: سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران اور نساء۔ جمعہ کی پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ﴾ اور دوسری رکعت میں ﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ﴾ اور کبھی ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝﴾ اور ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝﴾ عیدین میں بھی دو پچھلی سورتیں یعنی ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝﴾ اور ﴿هَلْ اَتٰىكَ﴾ پڑھتے تھے اور اتفاق سے اگر عید اور جمعہ ایک ساتھ پڑ جاتا تو دونوں نمازوں میں یہی سورتیں پڑھا کرتے تھے، جمعہ کے دن کی نماز صبح میں الٓمٓ تنزیل السجدۃ اور ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ﴾ پڑھنے کا معمول تھا۔ ❸

معمولاتِ خطبہ

وعظ و پند اور ارشاد و ہدایت کے لیے آپ ﷺ اکثر خطبہ دیا کرتے تھے، بالخصوص جمعہ کے لیے تو خطبہ لازمی تھا، جمعہ کے خطبات میں معمول یہ تھا کہ جب لوگ جمع ہو جاتے تو آپ ﷺ نہایت سادگی کے ساتھ گھر سے نکلتے مسجد میں داخل ہوتے تو لوگوں کو سلام کرتے پھر منبر پر تشریف لے جاتے تو لوگوں کی طرف رخ کر کے سلام کرتے اور اذان کے بعد فوراً خطبہ شروع کر دیتے، پہلے ہاتھ میں ایک عصا ہوتا تھا لیکن جب منبر بن گیا تو ہاتھ میں عصا لینا چھوڑ دیا۔ خطبہ ہمیشہ نہایت مختصر اور جامع ہوتا تھا، فرمایا کرتے تھے: ''نماز کا طول اور خطبہ کا اختصار آدمی کے تفقہ کی دلیل ہے۔'' جمعہ کے خطبہ میں عموماً سورہ ''ق'' پڑھتے تھے ❹ اس میں قیامت اور حشر ونشر کا بہ تفصیل ذکر ہے۔

خطبہ ہمیشہ حمد خداوندی کے ساتھ شروع کرتے تھے، اگر اثنائے خطبہ میں کوئی کام پیش آ جاتا تو منبر سے اتر کر اس کو کر لیتے، پھر منبر پر جا کر خطبہ کو پورا فرماتے۔ ایک بار آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے، اسی

---

❶ مسلم، کتاب الصلاۃ، باب القراءۃ فی الظہر والعصر: ۱۰۱۴ تا ۱۰۲۱۔ ❷ ایضاً: ۱۰۳۳۔

❸ یہ تمام روایتیں صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، کتاب الجمعۃ، والعیدین میں مذکور ہیں۔

❹ صحیح مسلم، کتاب الجمعۃ، باب تخفیف الصلوۃ والخطبۃ: ۲۰۱۲ تا ۲۰۱۵۔

حالت میں ایک آدمی نے آ کر کہا: ''یا رسول اللہ! میں مسافر آدمی ہوں اپنے دین کی حقیقت سے ناواقف ہوں اس کے متعلق پوچھنے آیا ہوں۔'' آپ ﷺ منبر سے اتر آئے، ایک کرسی رکھ دی گئی، اس پر بیٹھ گئے اور اس کو تعلیم و تلقین کی، پھر جا کر خطبہ کو پورا کیا ❶ ایک بار آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سرخ کپڑے پہنے ہوئے مسجد میں آ گئے، چونکہ بچپن کی وجہ سے لڑکھڑاتے آتے تھے، آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو ضبط نہ ہو سکا، منبر سے اتر آئے اور گود میں اٹھا لیا اور یہ آیت پڑھی: ❷

﴿ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ ﴾ (٦٤/ التغابن: ١٥)

خطبہ کی حالت میں لوگوں کو بیٹھنے اور نماز پڑھنے کا بھی حکم دیتے تھے، چنانچہ عین خطبہ کی حالت میں ایک شخص مسجد میں آیا آپ نے پوچھا: ''کیا تم نے نماز پڑھی؟'' اس نے کہا: نہیں آپ ﷺ نے فرمایا: ''اٹھو اور پڑھو۔'' ❸

میدان جہاد میں جب خطبہ دیتے تھے تو کمان پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے تھے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ﷺ ہاتھ میں تلوار لے کر کھڑے ہوتے تھے لیکن ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے خطبہ کی حالت میں کبھی تلوار ہاتھ میں نہیں لی۔ ❹ وعظ وارشاد کے لیے عموماً ناغہ دے کر خطبہ دیا کرتے تھے، تاکہ لوگ گھبرا نہ جائیں۔ ❺

معمولات سفر

حج، عمرہ اور زیادہ تر جہاد کی وجہ سے آپ ﷺ کو اکثر سفر کی ضرورت پیش آیا کرتی تھی، سفر میں معمول یہ تھا کہ پہلے ازواج مطہرات میں قرعہ ڈالتے، جس کے نام قرعہ پڑتا وہ ہمسفر ہوتیں ❻ جمعرات کے دن سفر کرنا پسند فرماتے تھے ❼ اور صبح کے تڑکے روانہ ہو جاتے تھے، افواج کو بھی جب کسی مہم پر روانہ فرماتے تو اسی وقت روانہ فرماتے جب سواری سامنے آتی اور رکاب میں قدم مبارک رکھتے تو بسم اللہ کہتے اور جب زین پر سوار ہو جاتے تو تین بار تکبیر کہتے اس کے بعد یہ آیت پڑھتے:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۙ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴾ ❽

''سب تعریف اس خدا کی جس نے اس جانور کو ہمارا فرمانبردار بنا دیا حالانکہ ہم خود اس کو مطیع نہیں کر سکتے تھے اور ہم اپنے خدا کی طرف پلٹنے والے ہیں۔'' (۴۳/ الزخرف: ۱۳، ۱۴)

❶ ادب المفرد للبخاری، باب الجلوس علی السریر: ١١٦٤۔ ❷ جامع ترمذی، کتاب المناقب: ٣٧٧٤۔

❸ بخاری، کتاب الجمعة، باب اذا رای الامام رجلا جاء وهو یخطب امره ان یصلی رکعتین: ٩٣٠، ٩٣١۔

❹ زادالمعاد، ج ١، ص: ١٢٠ فصل فی هدیه فی خطبه۔ ❺ بخاری، کتاب العلم، باب ماكان النبی ﷺ یتخولهم بالموعظة: ٦٨۔ ❻ بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافك: ٤١٤١۔

❼ ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی ای یوم یستحب السفر: ٢٦٠٥ وباب فی الابتكار فی السفر: ٢٦٠٦۔

❽ ابوداود کی ایک روایت میں ہے کہ سوار ہو جانے کے بعد تین تین بار تکبیر و تحمید کرتے، پھر یہ دعا پڑھتے (سُبْحَانَكَ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِی فَاغْفِرْلِیْ اِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ) ابو داود، کتاب الجهاد، باب مایقول الرجل اذا رکب: ٢٦٠٢۔

پھر یہ دعا فرماتے:

((اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ فِیْ سَفَرِ نَا ھٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰیْ وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰی اَللّٰھُمَّ ھَوِّنْ عَلَیْنَا سَفَرَنَا وَاطْوِ عَنَّا بُعْدَہٗ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ وَالْخَلِیْفَةُ فِی الْاَھْلِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ وَّعْثَاءِ السَّفَرِ وَکَآبَةِ الْمُنْقَلَبِ وَسُوْءِ الْمَنْظَرِ فِی الْاَھْلِ وَالْمَالِ)) ❶

''خداوندا! اس سفر میں ہم تجھ سے نیکی، پرہیز گاری اور عمل پسندیدہ کی درخواست کرتے ہیں، خداوندا! ہمارے اس سفر کو آسان اور اس کی مسافت کو طے کر دے۔ خداوندا! سفر میں تو رفیق ہے، بال بچوں کے لیے تو ہمارا قائم مقام ہے۔ خداوندا! میں سفر اور واپسی کے آلام، مصائب اور گھر بار کے مناظر قبیحہ سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

جب واپس ہوتے تو اس میں اس قدر اضافہ کر دیتے ((اٰئِبُوْنَ، تَآئِبُوْنَ، عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ))۔ راستے میں جب کسی چوٹی پر چڑھتے تو تکبیر کہتے اور جب اس سے نیچے اترتے تو ترنم ریز تسبیح ہوتے، صحابہ بھی آپ کے ہم آواز ہو کر تکبیر و تسبیح کا غلغلہ بلند کرتے۔ جب کسی منزل پر اترتے تو یہ دعا فرماتے: ❷

((یَا اَرْضِ! رَبِّیْ وَرَبُّكِ اللّٰہُ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شَرِّكِ وَشَرِّ مَا فِیْكِ وَشَرِّ مَا خَلَقَ فِیْكِ وَشَرِّ مَا یَدُبُّ عَلَیْكِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ اَسَدٍ وَاَسْوَدٍ وَمِنَ الْحَیَّةِ وَالْعَقْرَبِ وَمِنْ سَاکِنِی الْبَلَدِ وَمِنْ وَالِدٍ وَمَا وَلَدَ)) ❸

''اے زمین! میرا اور تیرا پروردگار خدا ہے، میں تیری برائی سے اور اس چیز کی برائی سے جو تیرے اندر ہے اور اس چیز کی برائی سے جو تیرے اندر پیدا کی گئی ہے اور اس چیز کی برائی سے جو تجھ پر چلتی ہے پناہ مانگتا ہوں، خداوند تجھ سے شیر، سانپ، بچھو اور اس گاؤں کے رہنے والوں اور آدمیوں سے پناہ مانگتا ہوں۔''

جب کسی آبادی میں داخل ہونا چاہتے تو یہ دعا پڑھتے:

((اَللّٰھُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَمَا اَظْلَلْنَ وَرَبَّ الْاَرْضِیْنَ السَّبْعِ وَمَا اَقْلَلْنَ وَرَبَّ الشَّیَاطِیْنِ وَمَا اَضْلَلْنَ وَرَبَّ الرِّیَاحِ وَمَا ذَرَیْنَ اَسْاَلُكَ خَیْرَ ھٰذِہِ الْقَرْیَةِ وَخَیْرَ اَھْلِھَا وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّھَا وَشَرِّ اَھْلِھَا وَشَرِّ مَا فِیْھَا))۔ ❹

''خداوندا! اے ساتوں آسمان اور ان تمام چیزوں کے پروردگار جن پر وہ سایہ افگن ہیں، اے ساتوں زمینوں اور ان تمام مخلوقات کے پروردگار جو ان پر موجود ہیں، اے شیاطین اور ان تمام

❶ ابوداود:۲۵۹۹؛ زاد المعاد، ج۱ ص:۱۳۰۔ ❷ ایضًا۔

❸ ابو داود، کتاب الجهاد، باب مایقول الرجل اذا نزل المنزل: ۲۶۰۳۔

❹ زادالمعاد، فصل فی هدیه فی السفر، ج۱، ص: ۱۳۱؛ حاکم، ۱/ ٤٤٦۔

نفوس کے پروردگار جن کو وہ گمراہ کرتے ہیں، اے ہوا اور ان تمام اشیاء کے پروردگار جن کو وہ اڑاتی ہیں میں تجھ سے اس گاؤں اور اس گاؤں کے رہنے والوں کی بھلائی کی درخواست کرتا ہوں اور اس گاؤں اور اس گاؤں کے رہنے والوں کی برائی سے پناہ مانگتا ہوں۔''

مدینہ پہنچتے تو پہلے مسجد میں جا کر دو رکعت نماز ادا فرماتے ❶ پھر مکان کے اندر تشریف لے جاتے۔ تمام لوگوں کو حکم تھا کہ سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر کے اندر نہ چلے جائیں، تاکہ عورتیں اطمینان کے ساتھ سامان درست کر لیں۔ ❷

معمولاتِ جہاد

جہاد میں معمول یہ تھا کہ جب فوج کو کسی مہم پر روانہ فرماتے تو امیر العسکر کو خاص طور پر پرہیز گاری اختیار کرنے اور اپنے رفقا کے ساتھ نیکی کرنے کی ہدایت فرماتے، پھر تمام فوج کی طرف مخاطب ہو کر فرماتے:

((اُغْزُوْا بِاسْمِ اللّٰهِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ قَاتِلُوْا مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ اُغْزُوْا وَلَا تَغُلُّوْا وَلَا تَغْدِرُوْا وَلَا تُمَثِّلُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا وَلِيْدًا))

''خدا کے نام پر خدا کی راہ میں کفار سے لڑو۔ خیانت اور بدعہدی نہ کرنا، مردوں کے ناک کان نہ کاٹنا بچوں کو قتل نہ کرنا۔''

اس کے بعد شرائط جہاد کی تلقین کرتے۔ ❸

جب فوج کو رخصت کرتے تو یہ الفاظ فرماتے:

((اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِیْنَكُمْ وَاَمَانَتَكُمْ وَخَوَاتِیْمَ اَعْمَالِكُمْ)) ❹

''میں تمہارے دین کو امانت کو اور تمہارے اعمال کے نتائج کو اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔''

جب خود شریک جہاد ہوتے اور حملہ کے مقام پر شب کو پہنچتے تو صبح کا انتظار کرتے صبح ہو جاتی تو حملہ کرتے، ❺ اگر صبح کے وقت حملہ کرنے کا اتفاق نہ ہوتا تو دو پہر ڈھلے حملہ کرتے ❻ جب کوئی مقام فتح ہو جاتا تو اقامت عدل وانصاف کے لیے وہاں تین دن تک قیام فرماتے ❼ جب فتح وظفر کی خبر آتی تو سجدۂ شکرانہ بجالاتے۔ ❽ جب میدان جہاد میں شریک کارزار ہوتے تو یہ دعا فرماتے:

((اَللّٰهُمَّ اَنْتَ عَضُدِیْ وَنَصِیْرِیْ بِكَ اَحُوْلُ وَبِكَ اُصُوْلُ وَبِكَ اُقَاتِلُ)) ❾

❶ ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی اعطاء البشير: ۲۷۷۳۔ ❷ ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی الطروق: ۲۷۷۸۔ ❸ صحيح مسلم، کتاب الجهاد، باب تامير الامام الامراء على البعوث: ۴۵۲۲۔
❹ ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی الدعاء عند الوداع: ۲۶۰۰، ۲۶۰۱۔ ❺ بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة خيبر: ۴۲۰۰۔ ❻ ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی ای وقت يستحب اللقاء: ۲۶۵۵۔
❼ ابو داود، کتاب الجهاد باب فی الامام يقيم عند الظهور على العدو بار ضهم: ۲۶۹۵۔ ❽ ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی سجود الشكر: ۲۷۷۴، ۲۷۷۵۔ ❾ ابو داود، کتاب الجهاد، باب ما يدعى عند اللقاء: ۲۶۳۲۔

''خداوندا! تو میرا دست و بازو ہے، تو میرا مددگار ہے تیرے سہارے پر میں مدافعت کرتا ہوں، حملہ کرتا ہوں اور لڑتا ہوں۔''

معمولاتِ عیادت وعزا

بیماروں کی عیادت وغم خواری آپ ﷺ ضرور فرماتے تھے اور صحابہ کو ارشاد ہوتا تھا کہ ''عیادت بھی ایک مسلمان کا فرض ہے۔'' ❶ ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں معمول شریف یہ تھا کہ جب کسی شخص کی موت کا وقت قریب آ جاتا تو صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کو اس کی اطلاع دیتے آپ اس کے مرنے سے پہلے تشریف لاتے، اس کے لیے دعائے مغفرت فرماتے اور اخیر دم تک اس کے پاس بیٹھے رہتے، یہاں تک دم واپسیں کے انتظار میں آپ کو اس قدر دیر ہو جاتی کہ آپ کو تکلیف ہونے لگتی۔ صحابہ نے تکلیف کا احساس کیا اور اب ان کا یہ معمول ہو گیا کہ جب کوئی شخص مر چکتا تو آپ کو اس کی موت کی خبر دیتے، آپ اس کے مکان پر تشریف لے جاتے اس کے لیے استغفار فرماتے، جنازہ کی نماز پڑھتے اس کے بعد اگر مٹی دینا چاہتے تو ٹھہر جاتے ورنہ واپس چلے آتے لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم کو آخر آپ کی یہ تکلیف بھی گوارا نہ ہوئی، اس لیے خود جنازہ آپ ﷺ کے مکان تک لانے لگے اور یہی عام معمول ہو گیا۔ ❷

عیادت کے لیے جب کسی بیمار کے پاس تشریف لے جاتے تو اس کو تسکین دیتے، پیشانی اور نبض پر ہاتھ رکھتے اس کی صحت کے لیے دعا فرماتے ❸ اور کہتے: ''اِنْ شَاءَ اللّٰهُ طَهُوْرٌ'' ''خدا نے چاہا تو خیریت ہے۔'' کوئی بدفالی کے فقرے کہتا تو ناپسند فرماتے۔ ایک بار ایک اعرابی مدینہ میں آ کر بیمار پڑ گیا، آپ ﷺ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے اور کلمات تسکین ادا فرمائے، اس نے کہا: ''تم نے خیریت کہا، شدید تپ ہے، جو قبر ہی میں ملا کر چھوڑے گی۔'' آپ ﷺ نے فرمایا ''ہاں اب یہی ہو۔'' ❹

معمولاتِ ملاقات

معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام اور مصافحہ کرتے، کوئی شخص اگر جھک کر آپ ﷺ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اس کی طرف سے رخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منہ نہ ہٹا لے۔ مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا، یعنی کسی سے ہاتھ ملاتے، تو جب تک کہ وہ خود نہ چھوڑ دے، اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے۔ مجلس میں بیٹھتے تو آپ کے زانو کبھی ہم نشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے۔ ❺

جو شخص حاضر ہونا چاہتا دروازے پر کھڑے ہو کر پہلے ''السلام علیکم'' کہتا پھر پوچھتا کہ کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟ (خود بھی آپ ﷺ کسی سے ملنے جاتے تو اسی طرح اجازت مانگتے) کوئی شخص اس طریقے کے خلاف

---

❶ صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب وجوب عیادۃ المریض: ٥٦٤٩ میں مریض کی عیادت کا حکم ہے۔
❷ مسند ابن حنبل، ج ٣، ص: ٦٦۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب وضع الید علی المریض: ٥٦٥٩۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب عیادۃ الاعراب: ٥٦٥٦۔
❺ ترمذی، ابواب صفة القیامة، باب تواضعه مع جلیسه: ٢٤٩٠؛ ابن ماجه: ٣٧١٦۔

کرتا، تو آپ اس کو واپس کر دیتے ایک دفعہ بنو عامر کا ایک شخص آیا اور دروازہ پر کھڑا ہو کر پکارا کہ اندر آ سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جا کر ان کو اجازت طلبی کا طریقہ سکھا دو۔“ یعنی پہلے سلام کرلے تب اجازت مانگے۔

ایک دفعہ صفوان بن اُمیہ نے جو قریش کے رئیس اعظم تھے، آنحضرت ﷺ کے پاس اپنے بھائی کلدہ کے ہاتھ، دودھ ہرن کا بچہ اور لکڑیاں بھیجیں، کلدہ یوں ہی بے اجازت چلے آئے آپ ﷺ نے فرمایا: ”واپس جاؤ اور سلام کر کے اندر آؤ۔“ [1]

ایک دفعہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ زیارت کو آئے اور دروازہ پر دستک دی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ”کون ہے؟“ بولے ”میں“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں، میں“ یعنی یہ کیا طریقہ ہے؟ نام بتانا چاہیے۔ [2] جب آپ خود کسی کے گھر پر جاتے تو دروازہ کے دائیں یا بائیں جانب کھڑے ہو جاتے اور السلام علیکم کہہ کر اذن طلب فرماتے (راوی کا بیان ہے کہ آپ عین دروازہ کے سامنے اس وجہ سے نہ کھڑے ہوتے کہ اس وقت تک دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا) اگر صاحب خانہ اذن نہ دیتا تو پلٹ آتے، چنانچہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ سعد رضی اللہ عنہ بن عبادہ کے گھر تشریف لائے اور باہر کھڑے ہو کر اذن طلبی کے لیے ”السلام علیکم ورحمۃ اللہ“ کہا: سعد نے اس طرح آہستہ سلام کا جواب دیا کہ آنحضرت ﷺ نے نہیں سنا۔ حضرت سعد کے فرزند قیس بن سعد نے کہا کہ آپ رسول اللہ کو اندر آنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے، حضرت سعد نے کہا: چپ رہو، رسول ﷺ اللہ بار بار سلام کریں گے جو ہمارے لیے برکت کا سبب ہوگا۔ آنحضرت ﷺ نے دوبارہ السلام علیکم کہا اور سعد نے پھر اسی طرح جواب دیا۔ آنحضرت ﷺ نے تیسری دفعہ پھر اسی طریقہ سے اذن طلب کیا اور جب کوئی جواب نہ ملا تو آپ واپس چلے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جب آپ کو جاتے دیکھا تو دوڑ کر گئے اور عرض کی کہ میں آپ کا سلام سن رہا تھا لیکن آہستہ جواب دیتا تھا (کہ آپ ﷺ بار بار سلام فرما دیں)۔ [3]

(کسی کے گھر تشریف لے جاتے تو ممتاز مقام پر بیٹھنے سے پرہیز فرماتے، ایک بار آپ ﷺ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے مکان پر تشریف لے گئے، انہوں نے آپ کے بیٹھنے کے لیے چمڑے کا ایک گدا ڈال دیا، لیکن آپ ﷺ زمین پر بیٹھ گئے اور گدا آنحضرت ﷺ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان آ گیا۔) [4]

---

[1] یہ دونوں روایتیں ابو داود، کتاب الادب، باب کیف الاستئذان: ٥١٧٧، ٥١٧٦ میں ہیں۔

[2] ابو داود، کتاب الادب، باب الرجل یستاذن بالدق: ٥١٨٧۔

[3] ابو داود، کتاب الادب، باب کم مرّۃ یسلم الرجل: ٥١٨٥۔

[4] ادب المفرد: ١١٧٦۔

معمولات عامہ

(تیمن یعنی داہنی طرف سے یا داہنے ہاتھ سے کام کرنا آپ ﷺ کو محبوب تھا، [1] جوتا پہلے داہنے پاؤں میں پہنتے، مسجد میں پہلے داہنا پاؤں رکھتے، مجلس میں کوئی چیز تقسیم فرماتے تو داہنی طرف سے، اسی طرح کسی کام کو شروع کرنا چاہتے تو پہلے بسم اللہ کہہ لیتے)۔

[1] بخاری، کتاب الوضوء، باب التیمن فی الوضوء: ۱۶۸۔

مجالسِ نبوی ﷺ

دربارِ نبوت

شہنشاہِ کونین ﷺ کا دربار نقیب و چاؤش اور خیل و حشم کا دربار نہ تھا، دروازہ پر دربان بھی نہیں ہوتے تھے، تاہم نبوت کے جلال سے ہر شخص پیکرِ تصویر نظر آتا تھا۔ حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی مجلس میں لوگ بیٹھتے تو یہ معلوم ہوتا کہ ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں، یعنی کوئی شخص ذرا جنبش بھی نہیں کرتا تھا گفتگو کی اجازت میں ترتیب کالحاظ رہتا تھا لیکن یہ امتیازِ مراتب نسب و نام یا دولت و مال کی بنا پر نہیں بلکہ فضل و استحقاق کی بنا پر ہوتا تھا سب سے پہلے آپ ﷺ اہل حاجت کی طرف متوجہ ہوتے اور ان کے معروضات کو سن کر ان کی حاجت براری فرماتے۔

تمام حاضرین ادب سے سر جھکائے رہتے خود بھی آپ ﷺ مؤدب ہو کر بیٹھتے، جب کچھ فرماتے تو تمام مجلس پر سناٹا چھا جاتا، کوئی شخص بولتا تو جب تک وہ چپ نہ ہو جائے دوسرا شخص بول نہیں سکتا تھا، اہل حاجت عرضِ مدعا میں ادب کی حد سے بڑھ جائے تو آپ کمال حلم کے ساتھ برداشت فرماتے۔ آپ کسی کی بات کاٹ کر گفتگو نہ فرماتے جو بات ناپسند ہوتی اس سے تغافل فرماتے اور ٹال جاتے، کوئی شخص شکریہ ادا کرتا تو اگر آپ نے واقعی اس کا کوئی کام انجام دیا ہے تو شکریہ قبول فرماتے۔ مجلس میں جس قسم کا ذکر چھڑ جاتا آپ بھی اس میں شامل ہو جاتے، ہنسی اور مہذب ظرافت میں بھی شریک ہوتے خود بھی مذاقیہ باتیں فرماتے۔ کبھی کسی قبیلہ کا کوئی معزز شخص آ جاتا تو حسب مرتبہ اس کی تعظیم فرماتے، اور فرماتے: ((اکرموا کریم کل قوم))۔ مزاج پرسی کے ساتھ ہر شخص سے دریافت فرماتے کہ کوئی ضرورت اور حاجت تو نہیں ہے، یہ بھی فرماتے: ''جو لوگ اپنے مطالب مجھ تک نہیں پہنچا سکتے مجھ کو ان کے حالات اور ضروریات کی خبر دو۔''

ایران میں معمول تھا کہ جب مجلس میں کوئی معزز شخص آ جاتا تھا تو سب تعظیم کو کھڑے ہو جاتے۔ یہ بھی قاعدہ تھا کہ رؤسا اور امرا جب دربار جماتے تو لوگ سینوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے رہتے۔ آپ ﷺ نے ان باتوں سے منع فرمایا اور ارشاد کیا کہ ''جس کو یہ پسند آتا ہے کہ لوگ اس کے سامنے تعظیم سے کھڑے رہیں، اس کو اپنی جگہ دوزخ میں ڈھونڈھنی چاہیے۔'' [1] البتہ جوشِ محبت میں آپ کسی کسی کے لیے کھڑے ہو جاتے، چنانچہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا جب کبھی آ جاتیں تو اکثر کھڑے ہو جاتے اور فرطِ محبت سے ان کی پیشانی چومتے۔ (حضرت حلیمہ سعدیہ کے لیے بھی آپ ﷺ نے اٹھ کر چادر بچھا دی تھی، اسی طرح ایک دفعہ آپ کے رضاعی بھائی آئے تو ان کے لیے بھی محبت سے کھڑے ہو گئے اور ان کو اپنے سامنے بٹھایا)۔ [2]

ہر شخص کو اس کے رتبہ کے مناسب جگہ ملتی، کسی شخص کے دل میں یہ خیال نہیں آنے پاتا کہ دوسرا شخص

[1] ابوداود، کتاب الادب، باب الرجل یقوم للرجل: ۵۲۲۹۔

[2] ابو داود، کتاب الادب، باب فی برالوالدین: ۵۱۴۵۔

اس سے زیادہ عزت یاب ہے، جب کوئی شخص اچھی بات کہتا تو آپ ﷺ تحسین فرماتے اور نامناسب گفتگو کرتا تو اس کو مطلع فرما دیتے۔ [1]

ایک دفعہ دو شخص مجلسِ اقدس میں حاضر تھے، ان میں ایک معزز اور دوسرا کم رتبہ تھا، معزز صاحب کو چھینک آئی لیکن انہوں نے اسلامی شعائر کے موافق الحمدللہ نہیں کہا، دوسرے صاحب کو بھی چھینک آئی انہوں نے الحمدللہ کہا آنحضرت ﷺ نے حسب معمول یرحمک اللہ کہا، معزز صاحب نے شکایت کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''انہوں نے خدا کو یاد کیا تو میں نے بھی کیا، تم نے خدا کو بھلا دیا تو میں نے بھی تم کو بھلا دیا۔'' [2]

صحابہ کو اس بات کی سخت تاکید تھی کہ کسی کی شکایت یا عیوب آپ تک نہ پہنچائیں، آپ ﷺ فرماتے تھے کہ ''میں چاہتا ہوں کہ دنیا سے جاؤں تو سب کی طرف سے صاف جاؤں۔'' [3]

مجالسِ ارشاد

آنحضرت ﷺ [4] کی تعلیم و تلقین کا فیض اگرچہ سفر، حضر، جلوت، خلوت، نشست، برخاست غرض ہر وقت جاری رہتا تھا تاہم اس سے وہی لوگ مستفیض ہو سکتے تھے جو اتفاق سے موقع پر ہوتے تھے۔ اس بنا پر آپ ﷺ نے تعلیم و ارشاد کے لیے بعض اوقات خاص کر دیے تھے کہ لوگ پہلے سے مطلع رہیں اور جن کو استفادہ منظور ہو وہ آ سکیں۔

یہ صحبتیں عموماً مسجد نبوی میں منعقد ہوتی تھیں، مسجد نبوی میں ایک چھوٹا سا صحن تھا، کبھی آپ وہاں نشست فرماتے، ابتداءً آنحضرت ﷺ کی نشست کے لیے کوئی ممتاز جگہ نہ تھی، باہر سے اجنبی لوگ آتے تو آپ ﷺ کو پہچاننے میں دقت ہوتی، صحابہ نے ایک چھوٹا سا مٹی کا چبوترہ بنا دیا۔ آپ اس پر تشریف رکھتے، باقی دونوں طرف صحابہ حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے۔ [5]

آدابِ مجلس

ان مجالس میں آنے والوں کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی، عموماً بدو اپنے اسی وحشت نما طریقہ سے آتے اور بے باکانہ سوال و جواب کرتے۔ خلق نبوی کا منظر ان مجالس میں زیادہ حیرت انگیز بن جاتا ہے آپ ﷺ پیغمبر خاتم کی حیثیت سے رونق افروز ہیں، صحابہ عقیدت کیش غلاموں کی طرح خدمتِ اقدس میں حاضر ہیں، ایک شخص آتا ہے اور اس کو آنحضرت ﷺ میں اور حاشیہ نشینوں میں کوئی ظاہری امتیاز نظر نہیں آتا۔ لوگوں سے پوچھتا ہے ''محمد ﷺ کون ہے؟'' صحابہ بتاتے ہیں کہ ''یہی گورے سے آدمی جو ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہیں'' وہ کہتا ہے: ''اے ابن عبدالمطلب! میں تم سے نہایت سختی سے سوال کروں گا خفا نہ

---

[1] یہ تمام تفصیل شمائل ترمذی، باب ماجاء فی تواضع رسول الله ﷺ: ۳۳۱، ۳۳۵ کی دو مفصل روایتوں سے ماخوذ ہے جن میں آنحضرت ﷺ کے عام اخلاق کا ذکر ہے۔ [2] الادب المفرد، باب اذا لم یحمد الله لا یشمت: ۹۳۲۔ [3] ابو داود، کتاب الادب، باب فی رفع الحدیث: ۴۸۶۰۔

[4] اضافہ از مجالس ارشاد تا قبل اوقات مجلس۔ [5] ابو داود، کتاب السنة، باب القدر: ۴۶۹۸۔

ہونا'' آپ ﷺ بخوشی سوال کی اجازت دیتے ہیں۔ ❶

باایں ہمہ سادگی و تواضع، یہ مجالس رعب و وقار اور آداب نبوت کے اثر سے لبریز ہوتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کی تعلیمات و تلقینات کا دائرہ، اخلاق، مذہب، اور تزکیۂ نفوس تک محدود تھا، اس کے علاوہ اور باتیں منصب نبوت سے خارج تھیں، لیکن بعض لوگ نہایت معمولی اور خفیف باتیں پوچھتے تھے، مثلاً: یارسول اللہ! میرے باپ کا نام کیا ہے؟'' میرا اونٹ کھو گیا ہے وہ کہاں ہے؟ آپ اس قسم کے سوالات کو ناپسند فرماتے تھے۔ ایک بار اسی قسم کے لغو سوالات کیے گئے تو آپ ﷺ نے برہم ہو کر فرمایا کہ ''جو پوچھنا ہو پوچھو، میں سب کا جواب دوں گا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کے چہرے کا رنگ دیکھا تو نہایت الحاح کے ساتھ کہا۔ رضیت الخ۔ ❷

کوئی شخص کھڑے کھڑے سوال نہیں کرتا تھا، ایک شخص نے اس طرح سوال کیا تو آپ ﷺ نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا، اسی طرح یہ بھی معمول تھا کہ جب ایک مسئلہ طے ہو جاتا تو دوسرا مسئلہ پیش کیا جاتا۔ بعض اوقات آپ گفتگو کرتے ہوتے کوئی صحرا نشین بدو جو آداب مجلس سے ناواقف ہوتا، دفعتاً آجاتا، اور عین سلسلہ تقریر میں کوئی بات پوچھ بیٹھتا آپ سلسلۂ تقریر قائم رکھتے اور فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوتے اور جواب دیتے، ایک دفعہ آپ تقریر فرما رہے تھے ایک بدو آیا اور آنے کے ساتھ اس نے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ ﷺ تقریر کرتے رہے، حاضرین سمجھے کہ آپ ﷺ نے نہیں سنا کسی نے کہا ''سنا'' لیکن آپ کو ناگوار ہوا، آپ گفتگو سے فارغ ہو چکے تو دریافت فرمایا: ''پوچھنے والا کہاں ہے؟'' بدو نے کہا ''میں یہ حاضر ہوں'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب لوگ امانت کو ضائع کرنے لگیں گے۔'' بولا کہ امانت کیونکر ضائع ہو گی؟ فرمایا: ''جب نااہلوں کے ہاتھ میں کام آئے گا۔'' ❸

اوقاتِ مجلس

اس قسم کی مجالس کے لیے جو خاص وقت مقرر تھا وہ صبح کا تھا، نماز فجر کے بعد آپ بیٹھ جاتے اور فیوضِ روحانی کا سرچشمہ جاری ہو جاتا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کے بعد آپ ٹھہر جاتے اور مجلس قائم ہو جاتی، چنانچہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ پر جب غزوۂ تبوک کی غیر حاضری کی وجہ سے عتاب نازل ہوا تو وہ انہی مجالس میں آکر آنحضرت ﷺ کی خوشنودی مزاج کا پتہ لگاتے، خود ان کے الفاظ یہ ہیں:

واتی رسول اللہ ﷺ فاسلم علیه وهو فی مجلسه بعد الصلوٰة فاقول فی نفسی هل حرك شفتيه برد السلام علی ام لا۔ ❹

---

❶ بخاری، کتاب العلم، باب القراءة والعرض: ٦٣۔ ❷ بخاری، کتاب العلم، باب الغضب فی الموعظة: ٩٢۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب من سئل علما ...: ٥٩، ٦٤٩٦۔

❹ بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث کعب بن مالک: ٤٤١٨۔

''میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آتا تھا اور سلام کرتا تھا اور آپ بعد نماز کے اپنی مجلس میں ہوتے تھے تو میں اپنے جی میں کہتا تھا کہ آپ نے جواب سلام میں اپنے لب ہلائے یا نہیں۔''

صبح کی مجلسوں میں کبھی کبھی آپ ﷺ وعظ فرماتے۔ ترمذی اور ابوداؤد میں عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

وعظنا رسول اللہ ﷺ یومًا بعد صلوة الغداة موعظة بلیغة ذرفت منها العیون ووجلت منها القلوب۔ ❶

''رسول اللہ ﷺ نے ایک دن صبح کی نماز کے بعد ایک بلیغ وعظ کہا، جس سے آنکھیں اشک ریز ہو گئیں اور دل کانپ اٹھے۔''

نماز کے بعد جو مجلس منعقد ہوتی، اس میں وعظ ونصیحت اور اس قسم کی جزئی باتوں پر گفتگو ہوتی تھی، لیکن ان اوقات کے علاوہ آپ ﷺ خاص طور پر حقائق ومعارف کے اظہار کے لیے مجالس منعقد فرماتے تھے، یہی مجالس ہیں، جن کی نسبت احادیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:

کان یومًا بارزًا للناس۔ ❷

''آنحضرت ﷺ ایک دن عام طور پر لوگوں کے لیے باہر نکلے تھے۔''

چونکہ افادۂ عام ہوتا تھا، اس لیے آپ ﷺ چاہتے تھے کہ کوئی شخص فیض سے محروم نہ رہنے پائے، اس بنا پر جو لوگ ان مجالس میں آ کر واپس چلے جاتے، ان پر آپ نہایت ناراض ہوتے، آپ ایک مرتبہ صحابہ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ تین شخص آئے ایک صاحب نے حلقہ میں تھوڑی سی جگہ خالی پائی وہیں بیٹھ گئے، دوسرے صاحب کو درمیان میں موقع نہیں ملا، اس لیے سب کے پیچھے بیٹھے، لیکن تیسرے صاحب واپس چلے گئے، آنحضرت ﷺ جب فارغ ہوئے تو فرمایا: ''ان میں سے ایک نے خدا کی طرف پناہ لی، خدا نے اس کو بھی پناہ دی، ایک نے حیا کی، خدا بھی اس سے شرمایا، ایک نے خدا سے منہ پھیرا خدا نے اس سے بھی منہ پھیر لیا۔'' ❸

پندونصائح کتنے ہی مؤثر طریقہ سے بیان کیے جائیں لیکن ہمیشہ سنتے سنتے آدمی اکتا جاتا ہے اور نصائح بے اثر ہو جاتے ہیں، اس بنا پر آنحضرت ﷺ وعظ ونصائح کی مجالس ناغہ دے کر منعقد فرماتے تھے۔ بخاری میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

کان النبی ﷺ یتخولنا بالموعظة فی الایام کراهة السآمة علینا۔ ❹

❶ ترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی الاخذ بالسنة: ۲۶۷٦؛ ابوداود: ٤٦٠٧۔ ❷ سنن ابن ماجه، باب فی الایمان: ٦٤۔ ❸ بخاری، کتاب العلم، باب من قعد حیث ینتهی به المجلس: ٦٦، ٤٧٤۔
❹ بخاری، کتاب العلم، باب ما کان النبی ﷺ یتخولهم بالموعظة: ٦٨۔

''آنحضرت ﷺ ہم لوگوں کو ناغہ دے کر نصیحت فرماتے تھے کہ ہم لوگ اکتا نہ جائیں۔''

عورتوں کے لیے مخصوص مجالس

ان مجالس کا فیض زیادہ تر مردوں تک محدود تھا اور عورتوں کو موقع کم ملتا تھا، اس بنا پر عورتوں نے درخواست کی کہ ہمارے لیے خاص دن مقرر فرمایا جائے، آنحضرت ﷺ نے یہ درخواست منظور کی اور ان کے وعظ وارشاد کے لیے ایک خاص دن مقرر ہو گیا۔ [1]

اگرچہ مسائل شرعیہ کے متعلق ہر قسم کے سوالات کی اجازت تھی اور خاتونانِ حرم وہ مسائل دریافت کرتی تھیں جو خاص پردہ نشینوں سے تعلق رکھتے ہیں تاہم جب کوئی پردہ کا واقعہ مجلس عام میں سوال کی غرض سے پیش کیا جاتا تو فرط حیا سے آپ ﷺ کو ناگوار ہوتا اس قسم کے پردے کی بات مرد بھی مجمع عام میں پوچھتے تو آپ ﷺ کو تکدر ہوتا، ایک دفعہ ایک انصاری نے (جن کا نام عاصم تھا) مجلس عام میں پوچھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو غیر کے ساتھ دیکھ لے تو کیا حکم ہے؟ آنحضرت ﷺ کو ناگوار ہوا اور آپ نے ان کو ملامت کی۔ [2]

طریقۂ ارشاد

کبھی کبھی آپ ﷺ خود امتحان کے طور پر حاضرین سے کوئی سوال کرتے، اس سے لوگوں کی جودت فکر اور اصابت رائے کا اندازہ ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے پوچھا: ''وہ کونسا درخت ہے جس کے پتے جھڑتے نہیں اور جو مسلمانوں سے مشابہت رکھتا ہے؟'' لوگوں کا خیال جنگلی درختوں کی طرف گیا، میرے ذہن میں آیا کہ کھجور کا درخت ہوگا، لیکن میں کمسن تھا اس لیے جرأت نہ کر سکا، بالآخر لوگوں نے عرض کی حضور بتائیں، ارشاد فرمایا: ''کھجور۔'' عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو تمام عمر حسرت رہی کہ کاش میں نے جرأت کر کے اپنا خیال ظاہر کر دیا ہوتا۔ [3]

ایک روز آپ ﷺ مسجد میں تشریف لائے، صحابہ رضی اللہ عنہم کے دو حلقے قائم تھے، ایک قرآن خوانی اور ذکر و دعا میں مشغول تھا اور دوسرے حلقہ میں علمی باتیں ہو رہی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''دونوں عمل خیر کر رہے ہیں، لیکن خدا نے مجھ کو صرف معلم بنا کر مبعوث کیا ہے۔'' یہ کہہ کر علمی حلقہ میں بیٹھ گئے۔ [4]

ان مجالس میں دقیق مباحث کو جن کی تہ تک عوام نہیں پہنچ سکتے ناپسند فرماتے تھے، چنانچہ ایک روز صحابہ کی مجلس میں مسئلہ تقدیر پر گفتگو ہو رہی تھی آپ ﷺ نے سنا تو حجرے سے نکل آئے، آپ کا چہرہ اس قدر سرخ ہو گیا تھا گویا عارض مبارک پر کسی نے انار کے دانے نچوڑ دیے ہیں۔ آپ نے صحابہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: ''کیا تم اسی لیے پیدا کیے گئے ہو؟ قرآن کو باہم ٹکرا رہے ہو، گزشتہ امتیں انہی باتوں سے برباد ہوئیں۔'' [5]

---

[1] بخاری، کتاب العلم، باب هل یجعل للنساء یوم ...: ۱۰۱، ۱۲۴۹۔ [2] بخاری، کتاب الطلاق، باب اللعان ومن طلق......: ۵۳۰۸۔ [3] بخاری، کتاب العلم: ۱۳۱۔ [4] سنن ابن ماجه، کتاب السنة، باب فضل العلماء: ۲۲۹۔ [5] ایضًا، باب فی القدر: ۸۵۔

ان مجالس کا مقصد یہ بھی تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم جن مسائل میں باہم اختلاف کرتے آنحضرت ﷺ ان کا صحیح فیصلہ کردیتے، مثلاً: شہرت طلبی اور جاہ پرستی خلوصِ عمل کے منافی سمجھی جاتی ہے اور خود صحابہ کے زمانہ میں بھی سمجھی جاتی تھی، چنانچہ آنحضرت ﷺ کی مجلس میں دو شخصوں نے اس مسئلہ میں گفتگو کی، ایک نے کہا: ''اگر ہم نے دشمن سے مقابلہ کیا اور ایک شخص نے فخر یہ یہ کہہ کے نیزہ مارا کہ ''میرا وار لینا میں غفاری جوان ہوں'' تو اس میں تمہاری کیا رائے ہے؟ مخاطب نے جواب دیا میری رائے میں کچھ ثواب نہ ملے گا، تیسرے آدمی نے یہ گفتگو سن کر کہا میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں، اس پر دونوں میں اختلاف ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی گفتگو سنی تو فرمایا: ''ثواب اور شہرت دونوں میں کوئی مخالفت نہیں۔'' [1]

عام خیال یہ تھا کہ قوائے عملیہ کے بیکار کردینے کا نام تقدیر ہے، تقدیر میں جو کچھ لکھا ہوگا اس کو کوئی عملی طاقت مٹا نہیں سکتی لیکن آنحضرت ﷺ نے ایک مجلس میں جو اتفاقاً منعقد ہوگئی تھی، اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ ''اعمال تو خود تقدیر ہیں، انسان کو خدا جن اعمال کی توفیق دیتا ہے وہی اس کا نوشتۂ تقدیر ہیں، اس لیے توکل قوت عمل کے بیکار کردینے کا نام نہیں۔'' چنانچہ صحابہ ایک جنازہ میں شریک تھے، آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور صحابہ رضی اللہ عنہم جمع ہوگئے، آپ ﷺ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی، اس سے زمین کریدنے لگے، پھر فرمایا: ''تم میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کی جگہ جنت یا دوزخ میں لکھی نہ جاچکی ہو۔'' ایک شخص نے کہا: ''تو ہم اپنی تقدیر پر توکل کر کے عمل کیوں نہ چھوڑ دیں، جو شخص سعادت مند ہوگا وہ خود بخود سعادت مندوں میں داخل ہوجائے گا اور جو شخص بدبخت ہوگا وہ بدبختوں سے مل جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''سعادت مند وہ لوگ ہیں جن کو سعادت مندوں کے عمل کی توفیق دی جاتی ہے اور بدبخت وہ ہیں جن کے لیے شقاوت کے کام کے اسباب جمع ہوجاتے ہیں۔'' [2]

مجالس میں شگفتہ مزاجی

باوجود اس کے کہ ان مجالس میں صرف ہدایت، ارشاد، اخلاق اور تزکیۂ نفوس کی باتیں ہوتی تھیں اور صحابہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس طرح بیٹھتے تھے کأن الطير فوق رؤوسهم۔ تاہم یہ مجلسیں شگفتہ مزاجی کے اثر سے خالی نہ تھیں۔ ایک دن آپ ﷺ نے ایک مجلس میں بیان فرمایا: ''جنت میں خدا سے ایک شخص نے کھیتی کرنے کی خواہش کی، خدا نے کہا: کیا تمہاری خواہش پوری نہیں ہوئی ہے؟ اس نے کہا: ہاں لیکن میں چاہتا ہوں کہ فوراً بوؤں اور ساتھ ہی تیار ہوجائے، چنانچہ اس نے بیج ڈالے، فوراً دانہ اگا، بڑھا اور کٹنے کے قابل ہوگیا۔'' ایک بدو بیٹھا ہوا تھا اس نے کہا: یہ سعادت صرف قریشی یا انصاری کو نصیب ہوگی جو

[1] ابو داود، كتاب اللباس، باب ما جآء في اسبال الازار: ٤٠٨٩۔
[2] بخاري، كتاب التفسير، باب وكذب بالحسنى: ٤٩٤٨۔

زراعت پیشہ ہیں لیکن ہم لوگ تو کاشتکار نہیں، آپ ﷺ ہنس پڑے۔ ❶

ایک دفعہ ایک صاحب خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میں تباہ ہو گیا، ارشاد ہوا: ''کیوں؟'' بولے میں نے رمضان میں بیوی سے ہم بستری کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک غلام آزاد کرو۔'' بولے غریب ہوں، غلام کہاں سے لاؤں، ارشاد ہوا: ''دو مہینے کے روزے رکھو۔'' بولے یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا، فرمایا: ''ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔'' بولے اتنا مقدور نہیں، اتفاق سے کہیں سے زنبیل بھر کر کھجوریں آ گئیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''لو غریبوں کو خیرات کر آؤ۔'' عرض کی اس خدا کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنایا سارے مدینہ میں مجھ سے بڑھ کر کوئی غریب نہیں، آپ ﷺ بے ساختہ ہنس پڑے اور فرمایا: ''اچھا تم خود ہی کھا لو۔'' ❷

فیض صحبت

(ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ ہم جب خدمت اقدس میں حاضر ہوتے ہیں تو دنیا ہیچ معلوم ہوتی ہے لیکن جب گھر میں بال بچوں میں بیٹھتے ہیں تو حالت بدل جاتی ہے آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر ایک سا حال رہتا تو فرشتے تمہاری زیارت کو آتے۔'') ❸

ایک دفعہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ خدمتِ اقدس میں آئے اور کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میں منافق ہو گیا ہوں، میں جب خدمت اقدس میں حاضر ہوتا ہوں اور آپ ﷺ دوزخ و جنت کا ذکر فرماتے ہیں تو یہ چیزیں آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں لیکن بال بچوں میں آ کر سب بھول جاتا ہوں ارشاد ہوا: ''اگر باہر نکل کر بھی وہی حالت رہتی تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے۔'' ❹

---

❶ بخاري، كتاب التوحيد، باب كلام الرب مع أهل الجنة: ٧٥١٩۔

❷ بخاري، كتاب الصوم، باب اذا جامع في رمضان: ١٩٣٦۔ ❸ ترمذي، ابواب صفة الجنة، باب ماجاء في صفة الجنة ونعيمها: ٢٥٢٦، امام ترمذی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ حدیث قوی نہیں۔

❹ ترمذي، ابواب الزهد: ٢٤٥٢ وصحيح مسلم، كتاب التوبة، باب فضل دوام الذكر: ٦٩٦٦۔

خطابتِ نبوی ﷺ

خطابت ❶ اور تقریر نبوت کا نہایت ضروری عنصر ہے، اسی بنا پر جب خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس پیغمبر بنا کر بھیجا، تو ان کو یہ دعا مانگنی پڑی:

﴿ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۙ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۠ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۲۷، ۲۸)

''خداوند میری زبان کی گرہ کھول کہ لوگ میری بات سمجھیں۔''

لیکن سید الانبیا ﷺ کو خود بارگاہِ الٰہی سے یہ وصف کامل عطا کیا گیا تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے تحدیثِ نعمت کے طور پر فرمایا:

((انا افصح العرب، بعثت بجوا مع الکلم)) ❷

''میں فصیح ترین عرب ہوں، میں کلمات جامعہ لے کر مبعوث ہوا ہوں۔''

عرب میں اگرچہ ہر قبیلہ فصاحت و بلاغت کا مدعی تھا، تاہم تمام عرب میں دو قبیلے اس وصف میں نمایاں امتیاز رکھتے تھے، قریش اور بنو ہوازن، قریش خود آنحضرت ﷺ کا قبیلہ تھا اور بنو ہوازن کے قبیلہ میں آپ نے پرورش پائی تھی، اس لیے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

((انا اعربکم انا من قریش ولسانی لسان بنی سعد بن بکر)) ❸

''میں تم میں فصیح تر ہوں، قریشی ہوں اور میری زبان بنو سعد ❹ کی زبان ہے۔''

طرزِ بیان

آنحضرت ﷺ نہایت سادہ طریقہ پر خطبہ دیتے تھے، آپ ﷺ جب اپنے حجرے سے خطبہ دینے کے لیے نکلتے تھے تو سلاطین کی طرح نہ آپ ﷺ کے ساتھ چاؤش ہوتے تھے، نہ آپ خطبا کا لباس پہنتے تھے، ہاتھ میں صرف ایک عصا ہوتا تھا اور کبھی کبھی کمان پر ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے ❺ ابن ماجہ میں ہے کہ مسجد میں جب آپ ﷺ خطبہ دیتے تو دست مبارک میں عصا ہوتا تھا اور میدان جنگ میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوتے تو کمان پر ٹیک لگاتے تھے۔ ❻ جمعہ اور عید کا خطبہ تو متعین تھا، لیکن اس کے علاوہ خطبہ کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ جب ضرورت پیش آتی آپ ﷺ فی البدیہ خطبہ کے لیے تیار ہو جاتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے زمین پر، منبر پر، اونٹ پر جس جگہ جیسا موقع پیش آیا ہے خطبہ دیا ہے، ضرورت کے لحاظ سے اگرچہ آپ کو کبھی کبھی طویل خطبہ بھی دینا پڑتا تھا تاہم آپ کے خطبے عموماً مختصر ہوتے تھے۔

---

❶ اضافہ تا ختم باب۔ ❷ بخاری، کتاب الاعتصام، باب قول النبی ﷺ: بعثت بجوامع الکلم: ۷۲۷۳۔
❸ طبقات ابن سعد ج۱ قسم اول ص: ۷۱۔ ❹ بنو سعد قبیلہ ہوازن کی ایک شاخ ہے۔ ❺ ابو داود، کتاب الصلوۃ الرجل یخطب علیٰ قوس: ۱۰۹۶۔ ❻ ابن ماجہ، باب ما جاء فی الخطبۃ یوم الجمعۃ: ۱۱۰۷۔

عام نصائح اور پند کی باتیں گو آپ ﷺ اخباری فقروں میں بیان فرماتے لیکن جب کلام کو خاص طور پر مؤثر بنانا ہوتا تھا، تو خطبہ کو عموماً سوال کی صورت میں شروع فرماتے تھے، غزوۂ حنین میں آپ ﷺ نے انصار کے سامنے جو خطبہ دیا وہ اول سے آخر تک سوال و جواب ہے، حجۃ الوداع وغیرہ اور تمام خطبات میں جیسا کہ آگے آتا ہے یہ خصوصیت نمایاں ہے۔ جوش بیان کا یہ حال تھا کہ آنکھیں سرخ اور آواز نہایت بلند ہو جاتی تھی، غصہ بڑھ جاتا تھا، انگلیاں اٹھتی جاتی تھیں، گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ ﷺ کسی فوج کو جنگ کے لیے ابھار رہے ہیں 1 جوش بیان میں جسد مبارک جھوم جھوم جاتا تھا، 2 ہاتھوں کو حرکت دینے سے پٹھوں کے چٹخنے کی آواز آتی تھی 3 کبھی مٹھی بند کر لیتے تھے کبھی کھول دیتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس قسم کی پر جوش حالت کی نہایت صحیح تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:

سمعت رسول الله ﷺ على المنبر يقول يأخذ الجبار سمٰواته وارضيه بيده وقبض يده فجعل يقبضها ويبسطها ...... قال و يتمائل رسول الله ﷺ عن يـمينه وعن شماله حتى نظرت الى المنبر يتحرك من اسفل شيء منه حتى انى لا قول اساقط هو برسول الله ﷺ۔ 4

''آنحضرت ﷺ کو منبر پر خطبہ دیتے سنا فرما رہے تھے کہ خداوند صاحب جبروت آسمان و زمین کو اپنے ہاتھ میں لے لے گا، یہ بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ مٹھی بند کر لیتے تھے اور پھر کھول دیتے تھے..... آپ ﷺ کا جسم مبارک کبھی دائیں، کبھی بائیں جھکتا جاتا تھا یہاں تک کہ میں نے منبر کو دیکھا تو اس کا سب سے نچلا حصہ بھی اس قدر ہل رہا تھا، میں نے خیال کیا کہ آپ ﷺ کو لے کر گر تو نہیں پڑے گا۔''

آنحضرت ﷺ کے خطبات کی نوعیت

احادیث کی کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے خطبات اور ان کے جستہ جستہ فقرے بغیر کسی خاص ترتیب کے جمع کر دیے گئے ہیں لیکن آنحضرت ﷺ کی مختلف حیثیتیں تھیں اور اس کا اثر آپ کے طرز بیان پر پڑتا تھا۔ آپ داعی مذہب تھے، فاتح تھے، واعظ تھے، امیر الجیش تھے، قاضی تھے، پیغمبر تھے، اس اختلاف حیثیت نے آپ کے خطابت اور زور بیان میں نہایت اختلاف پیدا کر دیا ہے اور بلاغت کا اقتضا بھی یہی ہے آپ بحیثیت داعی مذہب ہونے کے جو خطبہ دیتے تھے اس میں نہایت زور اور جوش پیدا ہو جاتا تھا اور اس وقت آپ کی حیثیت بالکل ایک امیر الجیش کی ہوتی تھی، چنانچہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ (۲٦/ الشعراء: ۲۱٤)۔ ''اپنے اقربا کو ڈراؤ۔'' آپ ﷺ نے تمام قریش کو جمع کر کے ایک خطبہ دینا چاہا ابولہب

1 صحيح مسلم، باب تخفيف الصلوٰة والخطبة: ۲۰۰۵۔ 2 ابن ماجه، ابواب الزهد، ذكر البعث: ٤٢٧٥۔
3 مسند احمد بن حنبل، ج ٦، ص: ٤٠٢۔ 4 ابن ماجه، ابواب الزهد، باب ذكر البعث: ٤٢٧٥۔

کی شقاوت نے اگرچہ اس خطبہ کو پورا نہیں ہونے دیا تاہم آپ ﷺ کی زبان سے اس موقع پر جو چند جملے نکل گئے، اس سے آپ کے زور بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ آپ نے صفا پر چڑھ کر پہلے پکارا ((یا صباحاہ!)) یہ وہ لفظ ہے، جو عرب میں اس وقت بولا جاتا ہے جب صبح کے وقت کوئی قبیلہ کسی قبیلہ پر دفعۃً غارت گری کے لیے ٹوٹ پڑتا ہے، تمام لوگ یہ لفظ سن کر چونک اٹھے اور آپ ﷺ کے گرد جمع ہو گئے آپ ﷺ نے فرمایا:

((ارأیتم ان اخبرتکم ان خیلا تخرج من سفح هذا الجبل اکنتم مصدقیّ))

''بتاؤ اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کے دامن سے ایک فوج نکلا چاہتی ہے، تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟''

سب نے جواب دیا، اب تک آپ ﷺ کی نسبت ہم کو کسی قسم کی دروغ گوئی کا تجربہ نہیں ہوا ہے، جب آپ ﷺ نے یہ اقرار لے لیا تو فرمایا:

((انی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید))

''میں تمہیں ایک ایسے عذاب سے ڈراتا ہوں جو تمہارے سامنے ہے۔''

ابولہب نے نہایت استخفاف کے ساتھ کہا، کیا ہم سبھوں کو اسی لیے جمع کیا تھا یہ کہہ کر چل کھڑا ہوا۔ [1]

غزوۂ حنین میں آپ ﷺ نے تمام مال غنیمت مؤلفۃ القلوب کو دے دیا اور انصار بالکل محروم رہ گئے تو چند نوجوانوں کو یہ نہایت ناگوار ہوا اور انہوں نے کہا: خدا پیغمبر کی مغفرت کرے، قریش کو دیتا ہے اور ہم کو چھوڑ دیتا ہے، حالانکہ ہماری تلواروں سے خون ٹپک رہا ہے، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو تمام انصار کو ایک خیمہ میں جمع کر کے اصل حقیقت دریافت فرمائی۔ لوگوں نے کہا: چند نوجوانوں نے یہ کہا ہے، لیکن ہم میں جو لوگ صاحب الرائے اور سردار ہیں، انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اب آپ ﷺ نے اس موقع پر کھڑے ہو کر ایک خطبہ دیا:

((یا معشر الانصار! لم اجدکم ضلالا فهداکم اللّٰه بی و کنتم متفرقین فالفکم اللّٰه بی و عالة فاغناکم اللّٰه بی))

''اے گروہِ انصار! کیا میں نے تم کو گمراہ نہیں پایا پس خدا نے میری وجہ سے تمہیں ہدایت دی، تم متفرق تھے خدا نے میری وجہ سے تم کو مجتمع کر دیا، تم محتاج تھے خدا نے میری وجہ سے تم کو غنی کر دیا۔''

انصار ہر بات پر کہتے جاتے تھے: خدا اور اس کا رسول بہت امین ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کیوں نہیں کہتے کہ اے محمد ﷺ! تم اس حالت میں آئے تھے کہ لوگ تمہاری تکذیب کرتے تھے ہم نے تمہاری

[1] بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ تبت: ٤٩٧٢۔

تصدیق کی، تمہارا کوئی مددگار نہ تھا، ہم نے تمہاری مدد کی، تم گھر سے نکالے ہوئے تھے ہم نے تم کو گھر دیا، تم محتاج تھے ہم نے تمہاری غم خواری کی۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے اصل اعتراض کا جواب دیا:

((اترضون ان یذهب الناس بالشاة والبعیر وتذهبون بالنبی الی رحالکم فواللّٰه لما تنقلبون به خیر مما ینقلبون))

''کیا تم یہ نہیں پسند کرتے کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کے جائیں اور تم اپنے گھروں میں خود پیغمبر کو لے کر جاؤ، خدا کی قسم! تم لوگ جو لے کر واپس جاتے ہو وہ اس سے بہتر ہے، جس کو تمام لوگ لے کر جاتے ہیں۔''

اس پر تمام انصار پکار اٹھے ''رضینا'' یعنی ہم سب راضی ہیں۔ [1] اس خطبہ کے وجوہِ بلاغت پر اگر غور کیا جائے تو ایک مختصر سا رسالہ تیار ہو سکتا ہے۔ فاتحانہ حیثیت سے آپ ﷺ نے صرف فتح مکہ کے موقع پر ایک تقریر کی تھی جس کے جستہ جستہ فقرے احادیث کی کتابوں میں مذکور ہیں، مکہ عرب کے نزدیک نہایت مقدس شہر تھا، حرم ایک دارالامان تھا، جس میں کبھی خونریزی نہیں ہو سکتی تھی فتح مکہ میں سب سے پہلے اس کے دامنِ عظمت پر خون کا دھبہ لگایا گیا اور چونکہ مذہب کے ہاتھ سے لگایا گیا تھا اس لیے خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ ہمیشہ کے لیے اس کا یہ احترام نہ مٹ جائے۔ آنحضرت ﷺ کو انہی دونوں پہلوؤں پر اپنی تقریر میں زور دینا تھا، چنانچہ آپ نے بہ ترتیب ان ہی کی طرف توجہ کی، سب سے پہلے آپ ﷺ نے صحابہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

((ان اللّٰه حرّم مكّة یوم خلق السموات والارض فهی حرام بحرام اللّٰه الی یوم القیامة لم تحل لا حد قبلی ولا تحل لا حد بعدی ولم تحلل لی قط الا ساعة من الدهر لا ینفر صیدها ولا یعضد شوكها ولا یختلی خلاها ولا تحل لقتطها الا لمنشد)) [2]

''خدا نے جس دن آسمان اور زمین کو پیدا کیا اسی دن مکہ کو حرام کر دیا، پس وہ بحرمت خدا حرام ہے وہ میرے پہلے نہ کسی پر حلال ہوا اور نہ میرے بعد حلال ہوگا اور میرے لیے بھی بجز چند گھنٹوں کے ہرگز حلال نہیں ہوا، نہ اس کے شکاروں کو بدکایا جا سکتا، نہ اس کا کانٹا کاٹا جا سکتا ہے، نہ اس کی گھاس کاٹی جا سکتی، نہ اس کی گم شدہ چیز حلال ہو سکتی ہے، بجز اس شخص کے جو اس کو ڈھونڈ رہا ہے۔''

آنحضرت ﷺ کا سب سے مہتم بالشان خطبہ وہ ہے جو آپ ﷺ نے حجۃ الوداع میں دیا تھا۔ یہ خطبہ صرف احکام کا ایک سادہ مجموعہ ہے جس کو قدرتاً خشک اور روکھا پھیکا ہونا چاہیے تاہم سلاست، روانی، اور

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الطائف: ٤٣٣٠، ٧٢٤٥۔

[2] اس کے ہم معنی روایات صحاح میں موجود ہیں۔ بخاری، کتاب جزاء الصید، باب لایحل القتال بمكة: ١٨٣٤؛ مسلم، کتاب الحج، باب تحریم مكة: ٣٣٠٢۔

شستگی الفاظ کے لحاظ سے یہ خطبہ بھی اور خطبوں سے کم نہیں آپ ﷺ نے حمد ونعت کے بعد اس خطبہ کی اہمیت اس طرح ظاہر کی:

((ایھا الناس! اسمعوا فانی لا ادری لعلی لا القاکم بعد عامی ھذا فی موقفی ھذا فی شھر کم ھذا فی بلد کم ھذا)) ❶

''لوگو! سنو! کیونکہ شاید میں اس سال کے بعد اس جگہ، اس مہینہ میں، اس شہر میں تم سے نہ مل سکوں۔''

سادہ سا جملہ یہ تھا کہ ''غالباً یہ میری عمر کا آخری سال ہے۔'' لیکن اس تفصیل اور اس پیرایۂ بیان نے اس مفہوم کو اور بھی زوردار بنا دیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی عزت، آبرو، جان مال، سب مسلمانوں پر حرام ہے اس مطلب کو اس بلیغ طریقہ سے ادا کیا ہے:

((اتدرون ای یوم ھذا؟)) قالوا: اللّٰہ ورسولہ اعلم قال: ((فان ھذا یوم حرام افتدرون ای بلد ھذا؟)) قالوا: اللّٰہ ورسولہ اعلم قال: ((بلد حرام)) قال: ((اتدرون ای شھر ھذا؟)) قالوا: اللّٰہ ورسولہ اعلم قال: ((شھر حرام)) ❷

''کیا جانتے ہو کہ یہ کون سا دن ہے؟'' لوگوں نے کہا: خدا اور رسول کو اس کا علم ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ یوم الحرام ہے، کیا جانتے ہو کہ یہ کونسا شہر ہے؟'' لوگوں نے کہا: خدا اور رسول کو اس کا علم ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''بلد الحرام ہے، کیا جانتے ہو یہ کونسا مہینہ ہے؟'' لوگوں نے کہا: خدا اور رسول کو اس کا علم ہے آپ ﷺ نے فرمایا: ''شہر حرام ہے۔''

اس طرح جب لوگوں کے دل میں اس دن اس مہینہ اور اس شہر کی حرمت کا خیال تازہ ہوگیا تو آپ ﷺ نے اصل مقصود کو بیان فرمایا:

((ان اللّٰہ حرم علیکم دماء کم واموالکم واعراضکم کحرمۃ یومکم ھذا فی شھر کم ھذا فی بلد کم ھذا لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض)) ❸

''خدا نے تمہارا خون، تمہارا مال، تمہاری آبرو، تم پر اس مہینہ میں، اس شہر میں، اس دن کی حرمت کی طرح حرام کیا، میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ تم میں ہر ایک دوسرے کی گردن مارے۔''

آپ ﷺ نے ان الفاظ میں مساوات کی تعلیم دی ہے:

((ان ربکم واحد وان اباء کم واحد کلکم من آدم وآدم من تراب ان

---

❶ اس مفہوم کی روایت کنز العمال: ۱۲۹۲۳ میں ہے۔

❷ بخاری، کتاب الحج، باب الخطبۃ ایام منی: ۱۷۴۲۔ ❸ ایضاً: ۱۷۳۹، ۱۷۴۱۔

اکرمکم عنداللّٰہ اتقاکم)) جامع ترمذی ، کتاب المناقب: ۳۹۵۵، ۳۹۵٦

اورابو داود ، کتاب الادب: ۵۱۱٦ میں اس کے ہم معنی حدیث موجود ہے۔

''تمہارا خدا ایک، تمہارا باپ ایک، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی کے تھے، خدا کے نزدیک تم میں شریف تر وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔''

عرب کا عام ذریعہ معاش غارت گری تھی، لیکن شہر حرم کے چار مہینے تک وہ لوگ بیکار نہیں رہ سکتے تھے اس لیے ان مہینوں کو ادل بدل لیا کرتے تھے جس کو نسیٔ کہتے ہیں، قرآن مجید نے اس کی ممانعت کی:

﴿ اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ ﴾ (۹/ التوبۃ:۳۷)

''نسیٔ کفر میں اضافہ کرتا ہے۔''

آپ ﷺ نے اپنے خطبہ میں اس کا اعلان ان الفاظ میں فرمایا:

((ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللّٰہ السموات والارض)) [1]

''زمانہ ہیر پھیر کے پھر اسی مرکز پر آ گیا جیسا کہ اس دن تھا جب خدا نے آسمان وزمین کو پیدا کیا تھا۔''

ان حیثیتوں کے علاوہ آپ ﷺ کی حیثیت ایک معلم اور واعظ کی تھی، آپ نے اس حیثیت سے جو خطبے دیے ہیں وہ اگرچہ نہایت سادہ ہیں تاہم ان میں بھی بلاغت کا اسلوب موجود ہے۔ ایک اخلاقی واعظ کے لیے پیچیدہ ترکیب، شاندار الفاظ اور تشبیہ واستعارہ کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کو صرف سادہ الفاظ، واضح جملے اور مختصر ترکیبوں سے مطالب کو ذہن نشین کرنا پڑتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس حیثیت سے جو خطبے دیے ہیں وہ تمام تر اسی قسم کے ہیں، مدینہ آ کر سب سے پہلا فقرہ جو زبان مبارک سے نکلا یہ تھا:

((یاایھا الناس، افشوا السلام ، واطعموا الطعام، وصلوا والناس نیام، تدخلوا الجنۃ بسلام)) [2]

''لوگو! سلام پھیلاؤ، کھانا کھلایا کرو، نماز پڑھا کرو، جب اور لوگ سوتے ہوں، جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔''

مدینہ میں جو سب سے پہلا جمعہ آپ ﷺ نے پڑھا ہے۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق حمد وثنا کے بعد اس میں آپ ﷺ نے یہ خطبہ دیا تھا:

((امابعد! ایھا الناس! فقدموا لانفسکم تعلمن واللّٰہ لیصعقن احدکم ثم لیدعن غنمہ لیس لھا راع ثم لیقولن لہ ربہ لیس لہ ترجمان ولا حاجب یحجبہ

[1] بخاری: ٤٦٦٢۔ [2] طبقات ابن سعد، جزء اوّل، قسم اول، ص:۱۵۹۔ یہ روایت ترمذی: ۲٤۸۵؛ ابن ماجہ: ۱۳۳٤؛ مسند احمد، ج۵، ص: ٤۵۱۔ اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی الفاظ سے تھوڑے فرق کے ساتھ موجود ہے۔

دونہ الم یاتك رسولی فبلغك واتیتك مالا فافضلت علیك فما قدمت لنفسك، فلینظرن یمیناً وشمالا فلا یری شیئاً ثم لینظرن قدامه فلا یری غیر جهنم فمن استطاع ان یتقی بوجهه من النار ولو بشق من تمرة فلیفعل ومن لم یجد فبکلمة طیبة فانها تجزی الحسنة بعشر امثالها الی سبع مائة ضعف والسلام علیکم ورحمة اللّٰه وبرکاته)) ❶

''حمد وثنا کے بعد اے لوگو! اپنے لیے پہلے سے سامان کرلو، تم کو معلوم ہو جائے گا کہ خدا کی قسم! تم میں سے ایک جب اپنے ہوش وحواس کھو چکے گا اور اپنی بکریوں (مال و دولت) کو چھوڑ جائے گا، جن کا کوئی نگہبان نہ ہوگا، پھر خدا، اس کے لیے بیچ میں نہ کوئی ترجمان ہے نہ دربان ہے جو روکے گا، اس سے کہے گا کہ کیا تیرے پاس میرا فرستادہ نہیں آیا اور میرا پیغام نہیں پہنچایا اور میں نے تجھ کو دولت نہیں دی اور حاجت سے زیادہ نہیں عطا کیا، تو، تو نے اپنے لیے پہلے سے کیا سامان کیا، اس وقت وہ بندہ داہنے بائیں دیکھے گا تو اس کو کچھ نظر نہیں آئے گا، اپنے سامنے دیکھے گا تو جہنم کے سوا اس کو کوئی چیز نظر نہیں آئے گی، پس جس کو قدرت ہو وہ اپنے کو اس آگ سے بچائے گو چھوہارے کے ایک ٹکڑے ہی سے کیوں نہ ہو، کسی کے پاس یہ بھی نہ ہو تو ایک اچھی اور خوش اخلاقی کی بات ہی سے کیونکہ ایک نیکی کا بدلہ دس گنا بلکہ ہفت صد گنا دیا جائے گا، تم پر خدا کی سلامتی اور اس کی رحمت وبرکت نازل ہو۔''

اس کے بعد دوسری دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((الحمد للّٰه احمده واستعینه ونعوذ باللّٰه من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یهدی اللّٰه فلا مضل له ومن یضلل فلا هادی له، واشهد ان لا اله الا اللّٰه وحده لا شریك له، ان احسن الحدیث کتاب اللّٰه قد افلح من زینه اللّٰه فی قلبه وادخله فی الاسلام بعد الکفر فاختاره علی ماسواه من احادیث الناس انه احسن الحدیث وابلغه، احبوا ما احب اللّٰه احبوا اللّٰه من کل قلوبکم ولا تملوا کلام اللّٰه وذکره ولا تقس عنه قلوبکم فاعبدوا اللّٰه ولا تشرکوا به شیئاً واتقوه حق تقاته وصدقوا اللّٰه صالح ماتقولون بافواهکم وتحابوا بروح اللّٰه بینکم ان اللّٰه یغضب ان ینکث عهده، والسلام علیکم ورحمة اللّٰه وبرکاته)) ❷

❶ ابن ھشام، ج ۱، ص: ۳۰۰۔ ❷ ابن ھشام، ج ۱، ص: ۳۰۱۔

''خدا کی حمد ہو، میں خدا کی حمد کرتا ہوں اور اس کے دامن میں ہم اپنے نفس کی برائیوں اور اپنے اعمال کی خرابیوں سے پناہ چاہتے ہیں، جس کو خدا ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو وہ ہدایت نہ کرے، اس کی کوئی راہنمائی کرنے والا نہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی اور معبود نہیں، وہی تنہا ہے کوئی اس کا شریک نہیں، بہترین کلام خدا کی کتاب ہے۔ کامیاب ہوا وہ جس کے دل کو خدا نے اس سے آراستہ کیا اور اس کو کفر کے بعد اسلام میں داخل کیا، انسانوں کی باتوں کو چھوڑ کر خدا کے کلام کو پسند کیا، کیونکہ خدا کا کلام سب سے زیادہ بہتر اور سب سے زیادہ پر اثر ہے۔ جس کو خدا دوست رکھتا ہے تم بھی دوست رکھو اور خدا کو دل سے پیار کرو اور اس کے کلام وذکر سے کبھی نہ تھکو اور تمہارے دل اس کی طرف سے سخت نہ ہوں پس خدا ہی کو پوجو اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ اور اس سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور خدا سے سچی بات کہو اور آپس میں ایک دوسرے کو ذاتِ الٰہی کے واسطہ سے پیار کرو خدا اس سے ناراض ہوتا ہے کہ کوئی اپنے عہد کو پورا نہ کرے، تم پر خدا کی سلامتی اور رحمت اور برکت نازل ہو۔''

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے خطبہ دیا جس میں صرف پانچ باتیں بیان کیں:

((ان اللّٰہ لا ینام ولا ینبغی لہ ان ینام یخفض القسط ویرفعہ الیہ عمل اللیل قبل عمل النھار، وعمل النھار قبل عمل اللیل، حجابہ النور)) [1]

''ہاں خدا سوتا نہیں اور نہ سونا اس کی ذات کے شایانِ شان ہے، وہی قسمت کو پست و بلند کرتا ہے، رات کے اعمال اس کو دن سے پہلے پہنچ جاتے ہیں اور دن کے اعمال رات سے پہلے، خدا کا پردہ نور ہے۔''

جمعہ کے خطبہ میں عموماً زہد ورقاق، حسن اخلاق، خوفِ قیامت، عذابِ قبر، توحید وصفاتِ الٰہی بیان کرتے تھے۔ ہفتہ میں کوئی مہتم بالشان واقعہ پیش آتا تھا تو اس کے متعلق ہدایات فرماتے تھے۔ اکثر ایسا بھی کرتے کہ نئے خطبہ کے بجائے قرآن مجید کی کوئی انہیں مضامین کی مؤثر سورت ق وغیرہ پڑھ دیا کرتے، یہ سورہ آپ ﷺ جمعہ کے خطبہ میں اکثر وبیشتر پڑھا کرتے تھے۔ عید کے خطبہ میں ان مضامین کے علاوہ صدقہ پر خاص طور پر زور دیتے تھے۔ اتفاقی خطبے ضرورت کے موقعوں پر دیا کرتے تھے اور ان میں مقتضائے وقت کے مناسب مطالب بیان فرماتے تھے، ایک دفعہ آفتاب میں گہن لگا، اتفاق سے اسی دن آپ کے کمسن فرزند حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ نے وفات پائی تھی۔ مزعومات عرب کے مطابق لوگوں نے کہا کہ یہ گہن اسی لیے لگا ہے، آپ ﷺ نے اس موقع پر حسب ذیل خطبہ دیا:

[1] مسلم، کتاب الایمان، باب فی قولہ علیہ السلام، ان اللّٰہ لا ینام: ٤٤٥۔

((اما بعد!یا ایها الناس!انما الشمس و القمر اٰیتان من اٰیات اللّٰہ وانهما لا ینکسفان لموت احد من الناس ، ما من شیء لم اکن رایته الا قد رأیت من مقامی هذا حتی الجنة والنار وانه قد اوحی الی انکم تفتنون فی القبور مثل فتنة الدجال فیؤتی احدکم فیقال ما علمك بهذا الرجل فاما الموقن فیقول هو محمد هو رسول اللّٰہ جاء بالبینات والهدی فاجبنا واطعنا، اما المرتاب فیقول لا ادری سمعت الناس یقولون شیئًا فقلت۔ انه عُرِضَ عَلَیَّ کل شیء تولجونه فعرضت علی الجنة حتی لوتنا ولت منها قطفا اخذته فقصرت یدی عنه وَعُرِضَتْ علی النار فرأیت فیها امرأة تعذب فی هرة لها ربطتها فلم تطعمها ولم تدعها تأکل من حشاش الارض ورأیت ابا ثمامة عمرو بن مالك یجر قصبه فی النار وانهم کانوا یقولون ان الشمس و القمر لا یخسفان الا لموت عظیم وانه اٰیتان من ایات اللّٰہ یریکموهما فاذا خسفا فصلوا حتی تنجلی)) [1]

''حمد وثنا کے بعد،لوگو! آفتاب و ماہتاب خدا کی دونشانیاں ہیں،وہ کسی کے مرنے سے تاریک نہیں ہوتے۔جس چیز کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا اس کو یہیں دیکھ لیا یہاں تک کہ جنت و دوزخ کو بھی اور ہاں مجھے وحی کی گئی ہے کہ تم قبروں میں آزمائے جاؤ گے،جس طرح دجال سے آزمائے جاؤ گے،تم میں سے ہر شخص کے پاس ایک آنے والا آئے گا اور پوچھے گا کہ اس شخص (یعنی خود آنحضرت ﷺ) کی نسبت کیا جانتے ہو،یقین والے کہیں گے یہ محمد ﷺ ہیں،یہ خدا کے رسول ہیں،جونشانیاں اور ہدایتیں لے کر آئے ،تو ہم نے ان کو قبول کیا اور ان کی پیروی کی اور متشکک کہیں گے میں نہیں جانتا لوگوں کو جو کہتے سنا وہ کہہ دیا۔میرے سامنے وہ تمام مقامات پیش ہوئے جن میں تم داخل ہو گے تا آنکہ اگر میں چاہتا تو اس کا پھل توڑ لیتا لیکن میرے ہاتھ رک گئے،دوزخ میرے سامنے رونما کی گئی،میں نے اس میں ایک عورت کو دیکھا جس کو صرف اس لیے سزا دی جارہی تھی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا،نہ اس کو خود کچھ کھانے کو دیتی تھی اور نہ چھوڑتی تھی کہ وہ زمین کی گری پڑی کوئی چیز کھائے،میں نے دوزخ میں ابوثمامہ عمرو بن مالک کو دیکھا،یہ وہ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ آفتاب و ماہتاب میں کسی بڑے آدمی کی موت سے گہن لگتا ہے حالانکہ وہ تو خدا کی دونشانیاں ہیں،جب تم گہن دیکھوتو نماز کے لیے کھڑے ہوجاؤ تا آنکہ وہ صاف ہوجائے۔''

رد بدعت اور اعتصام بالسنہ میں آپ ﷺ کا یہ مختصر خطبہ بتغیر الفاظ حدیث کی اکثر کتابوں میں منقول ہے:

[1] صحیح مسلم بروایات مختلفه ، کتاب الکسوف ، باب صلوۃ الکسوف ومابعده: ۲۱۰۰ تا۲۱۲۲۔

((انما هما اثنتان الكلام والهدى فاحسن الكلام كلام الله فاحسن الهدى هدى محمد الا واياكم ومحدثات الامور فان شر الامور محدثاتها وكل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة الا لا يطولن عليكم الامد فيقسوا قلوبكم الا ان ماهوات قريب وان البعيد ماليس بآت الا انما الشقي من شقي في بطن امه والسعيد من وعظ بغيره الا ان قتال المؤمن كفر وسبابه فسوق ولا يحل لمسلم ان يهجر اخاه فوق ثلاث الا واياكم والكذب)) ❶

''صرف دو باتیں ہیں قول اور عملی طریقہ، تو عمدہ کلام خدا کا کلام ہے اور عمدہ طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے، خبردار (مذہب میں) نئی باتوں سے بچو، نئی باتیں بدترین چیزیں ہیں، ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے تم کو درازی عمر کا خیال نہ پیدا ہو کہ تمہارے دل سخت ہو جائیں، جو چیز آنے والی ہے وہ قریب ہے، دور وہ چیز ہے جو آنے والی نہیں ہے، بدبخت اپنی ماں کے پیٹ میں بدبخت ہوتا ہے، خوش نصیب وہ ہے جو غیر سے موعظت حاصل کرے، خبردار مسلمان سے لڑنا کفر اور اس سے گالی گلوچ کرنا فسق ہے، مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی سے رنجیدہ رہے، ہاں خبردار جھوٹ سے پرہیز کرنا۔''

اثر انگیزی

خطباتِ نبوی ﷺ تاثیر اور رقت انگیزی میں درحقیقت معجزہ الٰہی تھے، پتھر سے پتھر دل بھی ان کو سن کر چند لمحوں میں موم ہو جاتے تھے، مکہ میں ایک دفعہ آپ ﷺ نے سورۂ والنجم کی آیتیں تلاوت کر کے سنائیں تو یہ اثر ہوا کہ آپ ﷺ کے ساتھ مسلمان تو مسلمان، بڑے بڑے کفار بھی سجدہ میں گر پڑے۔ ❷

آنحضرت ﷺ کے زمانۂ جاہلیت کے ایک دوست جو جھاڑ پھونک کرنا جانتے تھے یہ سن کر کہ نعوذ باللہ آپ کو جنون ہے بغرض علاج آئے، آپ ﷺ نے ان کے سامنے مختصر سی تقریر کی، انہوں نے کہا کہ محمد ﷺ ذرا اس کو پھر تو دہرانا، غرض آپ نے کئی بار تقریر دہرائی تو اخیر میں انہوں نے کہا: ''میں نے شاعروں کے قصیدے اور کاہنوں کے کلام سنے ہیں لیکن یہ تو چیز ہی اور ہے۔'' ❸

ایک دفعہ ایک نو مسلم قبیلہ ہجرت کر کے مدینہ آیا آپ ﷺ نے ان کی امداد کی ضرورت سمجھی، مسجد نبوی میں تمام مسلمان جمع ہوئے تو آپ ﷺ نے ایک خطبہ دیا جس میں قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی کہ تمام انسان ایک ہی نسل سے ہیں یعنی:

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ﴾ (٤/ النسآء:١)

---

❶ ابن ماجه، باب اجتناب البدع:٤٦۔ ❷ صحيح بخاری، كتاب التفسير، باب فاسجدوالله واعبدوا: ٤٨٦٢۔ ❸ صحيح مسلم، كتاب الجمعة، باب تخفيف الصلوة الخطبة: ٢٠٠٨۔

''اے لوگو! اس خدا سے ڈرو جس نے ایک ذات سے تم سب کو پیدا کیا۔''

پھر سورۂ حشر کی یہ آیت تلاوت کی:

﴿ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ﴾ (۵۹/ الحشر:۱۸)

اس کے بعد فرمایا ''درہم، کپڑا، غلہ، بلکہ چھوہارے کا ایک ٹکڑا، جو ہو، راہ خدا میں دو، مدینہ کے مسلمانوں کی مالی حالت جیسی کچھ تھی وہ سیرت کے ہر صفحہ سے ظاہر ہے لیکن بایں ہمہ آپ ﷺ کی رقت انگیز اور موثر تقریر سے یہ عالم پیدا ہو گیا کہ ہر صحابی کے پاس جو کچھ تھا اس نے سامنے رکھ دیا۔ بعضوں نے اپنے کپڑے اتار دیے، کسی نے گھر کا غلہ لا کر دے دیا، ایک انصاری گئے اور گھر سے اشرفیوں کا ایک توڑا اٹھا لائے جو اس قدر بھاری تھا کہ بمشکل ان سے اٹھ سکتا تھا، راوی کا بیان ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد آپ کے سامنے غلہ اور کپڑے کے دو بڑے بڑے ڈھیر لگ گئے اور خوشی سے آپ کا چہرہ کندن کی طرح دمکنے لگا۔ ❶

سخت سے سخت اشتعال انگیز اوقات میں آپ ﷺ کے چند فقرے معاملہ کو رفع دفع کر کے جوشِ محبت کا دریا بہا دیتے تھے۔ اوس وخزرج کی سالہا سال کی عداوتیں اس اعجاز کی بدولت مبدل بہ محبت ہو گئیں۔ غزوۂ بدر سے پہلے ایک دفعہ آپ ﷺ سوار ہو کر نکلے۔ مسلمان اور منافقین یکجا بیٹھے ہوئے تھے، مسلمانوں نے تو ادب سے سلام کیا، لیکن منافقین نے ایک گستاخانہ فقرہ استعمال کیا، یہ چنگاری تھی جس نے خرمن میں آگ لگا دی، قریب تھا کہ جنگ وجدل برپا ہو جائے لیکن آپ ﷺ کے چند فقروں نے آگ پر پانی ڈال دیا۔ ❷

غزوۂ مصطلق سے واپسی میں ایک واقعہ پر بعض منافقین نے اشتعال پیدا کیا اور بہت ممکن تھا کہ مہاجرین و انصار باہم دست وگریبان ہو جائیں کہ عین وقت پر آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی، آپ تشریف لائے تو اس طرح تقریر فرمائی کہ چند لمحوں میں مہاجرین وانصار پھر شیر وشکر تھے۔ ❸ واقعۂ افک میں اوس وخزرج میں اس قدر اختلاف پیدا ہوا کہ خاص مسجد نبوی میں شاید تلواریں نیام سے نکل پڑتیں، آپ منبر پر تشریف فرما تھے، آپ ﷺ نے سلسلۂ تقریر کو جاری رکھا اور اثر یہ تھا کہ برادرانہ محبت کی لہریں پھر جاری ہو گئیں۔ ❹

غزوۂ حنین میں مال غنیمت کی تقسیم پر جب انصار میں آزردگی پیدا ہو گئی تھی، اس وقت آپ ﷺ نے جس بلیغانہ انداز میں تقریر فرمائی ہے اس کا مختصر ساذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اس تقریر کا کیا اثر ہوا؟ یہ ہوا کہ وہی انصار جو چند لمحے پہلے کبیدہ خاطر ہو رہے تھے اس قدر روئے کہ ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں اور دل کا سارا غبار آبِ کوثر کے ان قطروں سے دفعۃً دھل گیا۔ ❺

فتح مکہ کے موقع پر انصار کی توقع کے خلاف جب آپ نے رؤسائے قریش کی جان بخشی فرمائی تو ان

❶ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب الحث علی الصدقة:۲۳۵۱۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب السلام فی مجلس فیه اخلاط...... :۶۲۵۴۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الفسیر، تفسیر سورۃ منافقین: ۴۹۰۰ وابن سعد غزوۂ مذکور۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافك: ۴۱۴۱۔
❺ صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب فتح مكة: ۴۶۲۲۔

میں سے وہ لوگ جن کی آنکھوں میں خُلقِ نبوی ﷺ کا جلوہ نہ تھا، معترض ہوئے کہ ’’آخر آپ کو اپنے وطن و خاندان کی محبت آ ہی گئی۔‘‘ آپ کو یہ معلوم ہوا تو تمام انصار کو جمع کر کے دریافت کیا کہ ’’کیا یہ سچ ہے کہ تم نے ایسا کہا ہے؟‘‘ عرض کی ہاں یا رسول اللہ! فرمایا: ’’وطن و خاندان کی پاس داری میرے پیش نظر نہ تھی، میں خدا کا بندہ اور اس کا فرستادہ ہوں، میں نے اللہ کی طرف ہجرت کی اور تمہاری طرف، اب میرا جینا تمہارا جینا ہے اور میرا مرنا تمہارا مرنا ہے۔‘‘ یہ سن کر انصار پر رقت طاری ہو گئی اور رونے لگے۔ وعظ و نصیحت میں جو خطبات آپ ارشاد فرماتے تھے، وہ بھی اسی قدر مؤثر ہوتے تھے۔ ایک صحابی موقع کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

وعظنا رسول اللّٰہ ﷺ یومًا بعد الصلوۃ الغداۃ موعظۃ بلیغۃ ذرفت منها العیون و وجلت منها القلوب۔ ❶

’’صبح کی نماز کے بعد آنحضرت ﷺ نے ایک دن ایسا مؤثر وعظ کہا کہ آنکھیں اشک ریز ہو گئیں اور دل کانپ اٹھے۔‘‘

ایک اور مجلس وعظ کے تاثیر کی کیفیت حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

قام رسول اللّٰہ ﷺ خطیبًا فذکر فتنۃ القبر التی یفتتن بها المرء فلما ذکر ذلك ضج المسلمون ضجَّۃً۔ ❷

’’آنحضرت ﷺ خطبہ دینے کو کھڑے ہوئے اور اس میں فتنہ قبر کو بیان کیا جس میں انسان کی آزمائش کی جائے گی، جب یہ بیان کیا تو مسلمان چیخ اٹھے۔‘‘

حضرت ابو ہریرہ اور ابو سعید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے کہ آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے: ((والذی نفسی بیدہ)) ’’قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے۔‘‘ یہ الفاظ آپ نے تین دفعہ فرمائے اور پھر جھک گئے۔ لوگوں پر یہ اثر ہوا کہ جو جہاں تھا وہیں سر جھکا کر رونے لگا۔ راوی کہتے ہیں کہ ہم کو بھی ہوش نہ رہا کہ آپ قسم کس بات پر کھا رہے ہیں۔ ❸

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن آپ نے خطبہ دیا۔ یہ خطبہ اس قدر مؤثر تھا کہ میں نے ایسا خطبہ نہیں سنا۔ اثنائے تقریر میں آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اے لوگو! جو میں جانتا ہوں اگر تم وہ جانتے تو ہنستے کم اور روتے زیادہ۔‘‘ اس فقرہ کا ادا ہونا تھا کہ لوگوں کی یہ حالت ہو گئی کہ منہ پر کپڑے ڈال کر بے اختیار رونے لگے۔ ❹

❶ ابوداود، کتاب السنة، باب لزوم السنة: ٤٦٠٧؛ ترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی الاخذ بالسنة واجتناب البدعة: ٢٦٧٦۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی عذاب القبر: ١٣٧٣۔

❸ سنن نسائی، کتاب الزکوٰة، باب وجوب الزکوٰة: ٢٤٤٠۔

❹ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۂ مائدة، باب قوله لا تسئلوا عن اشیاء...... : ٤٦٢١۔

عبادات نبوی ﷺ

﴿ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝﴾ (۹۴/ الانشراح:۷،۸)

''اے محمد ﷺ! جب تجھے فرصت ملے عبادت کے لیے کھڑے ہوجاؤ اور اپنے رب سے دل لگاؤ۔''

(دنیا ❶ میں آنحضرت ﷺ کے سوا اور کوئی پیغمبر ایسا نہیں گزرا جس کے متعلق صحیح طور پر معلوم ہو سکے کہ اس کا طریقہ عبادت کیا تھا؟ اس کے کون کون سے اوقات اس کے لیے مخصوص تھے؟ اور اس کی عبادتوں کی نوعیت کیا تھی؟ گزشتہ انبیا میں حضرت نوح علیہ السلام، بلکہ آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک جن کے حالات تورات میں مذکور ہیں، ان کی زندگی کا یہ باب صحائف بنی اسرائیل سے قطعاً مفقود ہے۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہیں کہیں صرف اس قدر ملتا ہے کہ وہ کبھی کبھی دعائیں مانگا کرتے تھے لیکن جب کہ ان مذاہب کے پیرووں نے اپنے پیغمبروں کے ساتھ اس قدر بے اعتنائی برتی ہے کہ یہ ضروری امور بھی، جن پر دین وشریعت کا دارومدار ہے، وہ محفوظ نہیں رکھ سکے۔ پیروان اسلام کو یہ فخر ہے کہ انہوں نے اول سے آخر تک اپنے پیغمبر کے اوقات عبادات، اس کے طریقے، اس کے انواع، اس کی کیفیات غرض اس کے ایک ایک جزئیات کو محفوظ رکھا ہے)۔

دعا اور نماز

آنحضرت ﷺ نبوت سے پہلے بھی عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے اور غار حرا میں جا کر مہینوں قیام اور مراقبہ کرتے تھے۔ ❷ نبوت کے ساتھ آپ کو نماز کا طریقہ بھی بتایا گیا لیکن چونکہ کفار قریش کا ڈر تھا اس لیے چھپ کر نماز ادا کرتے تھے، نماز کا وقت جب آتا، کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور وہاں نماز پڑھ لیتے، ایک دفعہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کسی درہ میں نماز پڑھ رہے تھے، اتفاق سے ابوطالب آ نکلے انہوں نے دیکھا تو پوچھا ''بھتیجے! یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی۔ ❸

چاشت کی نماز آپ سب کے سامنے حرم ہی میں ادا کرتے تھے کیونکہ یہ نماز قریش کے مذہب ❹ میں بھی جائز تھی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دن آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے اور روسائے قریش بیٹھے تمسخر اڑا رہے تھے ابوجہل نے کہا ''کاش اس وقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھا لاتا اور محمد (ﷺ) جب سجدہ میں جاتے تو وہ ان کی گردن پر ڈال دیتا۔'' چنانچہ اس تجویز کے مطابق یہ فرض عقبہ نے انجام دیا، ❺ نماز میں جب آپ جہر سے قراءت فرماتے تو کفار برا بھلا کہتے۔ ❻ ایک دفعہ آپ حرم میں نماز ادا کر رہے

❶ اضافہ تاختم باب۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی: ۳، ۳۳۹۲۔ ❸ مسند احمد، ج ۱، ص: ۹۹۔

❹ ابن اثیر ذکر الاختلاف فی اوّل من اسلم، ج ۲، ص: ۴۳ مطبوعہ لیڈن: ۱۸۶۷ء۔

❺ صحیح بخاری، کتاب الوضوء باب اذا القی علی ظھر المصلی قذر...... ۲۴۰ وکتاب الصلوۃ، باب المرأۃ تطرح عن المصلی شیئا من الاذی...... ۵۲۰۔

❻ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ بنی اسرائیل، باب قولہ ولاتجھر بصلوتک: ۴۷۲۲۔

تھے، بعض اشقیانے چاہا کہ آپ کے ساتھ گستاخی سے پیش آئیں، ❶ ایک دفعہ ایک شقی نے گلے میں پھانسی ڈال دی ❷ لیکن بااین ہمہ مزاحمت، لذت شناسِ یادالٰہی اپنے فرض سے باز نہیں آتا تھا۔

راتوں کو اٹھ اٹھ کر آپ ﷺ نمازیں پڑھا کرتے تھے، اس عبادتِ شبانہ کے متعلق مختلف صحابہ سے مختلف روایتیں ہیں۔ ایک راوی کا بیان ہے کہ آپ ﷺ رات بھر نماز میں کھڑے رہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ آپ کچھ دیر سوتے پھر کچھ دیر اٹھ کر نماز میں مصروف ہوتے پھر سو جاتے پھر اٹھ بیٹھتے اور نماز ادا کرتے، غرض صبح تک یہی حالت قائم رہتی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ آدھی رات کے بعد آپ اٹھتے تھے اور ۱۳ رکعتیں ادا کرتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ۹ رکعت کی ہے، محدثین نے ان سب میں تطبیق دی ہے کہ آپ ﷺ ان طریقوں میں سے ہر ایک طریقہ سے نماز ادا کرتے تھے، ہر راوی نے اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے ❸ عام طور پر آخر میں آپ کا طرزِ عمل وہی تھا جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی زبانی عبادت شبانہ کے عنوان میں گزر چکا ہے۔

فرائض پنجگانہ کے علاوہ آپ ﷺ کم از کم سنن ونوافل کی ۳۹ رکعتیں روزانہ معمولاً ادا کرتے تھے دو صبح، چار چاشت، چھ ظہر، چھ عصر، چار پہلے اور دو بعد نماز (حسب روایتِ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) دو مغرب چھ عشاء، تیرہ تہجد ووتر، ان کے علاوہ صلوٰۃ الاوابین سنت تحیۃ مسجد۔ وغیرہ الگ تھیں، تمام سنن میں سب سے زیادہ صبح کی دو رکعتوں کے آپ ﷺ سختی سے پابند تھے ❹ کسی وقت کی سنت خلاف معمول اگر چھوٹ جاتی تو اس کی قضا پڑھتے، حالانکہ اصل شریعت کی رو سے اس کی ضرورت عام امت کے لئے نہیں ایسا واقعہ حضر میں صرف ایک ہی دفعہ پیش آیا ہے، ظہر وعصر کے درمیان ایک وفد خدمت اقدس میں باریاب ہوا جس کی وجہ سے آپ ﷺ ظہر کے بعد کی دو رکعت نہ پڑھ سکے، نماز عصر کے بعد آپ ﷺ نے بعض ازواج مطہرات کے حجروں میں جا کر دو رکعت نماز ادا کی، چونکہ یہ نماز بالکل خلاف معمول تھی اس لئے ازواج مطہرات نے استفسار کیا، آپ ﷺ نے واقعہ بیان فرمایا، عام امت کے لئے ایک نماز کی قضا ایک دفعہ کافی ہے لیکن چونکہ آپ جس چیز کو شروع کرتے تھے پھر اس کو ترک کرنا پسند نہیں فرماتے تھے، اس لئے ام المؤمنین حضرت عائشہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ آپ نے اس قضا کو تمام عمر ادا کیا۔ ❺

رمضان کا مہینہ آپ ﷺ کی عبادتوں کے لئے سب سے زیادہ ذوق افزا تھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ''آپ ﷺ فیاض تو تھے ہی لیکن جب رمضان کا مہینہ آتا اور جبریل علیہ السلام

---

❶ ابن هشام ذكر ذكر اسلام حمزه، ج ۱، ص: ۱۸۲۔ ❷ صحيح بخاري، كتاب مناقب الانصار، باب ما لقى النبي ﷺ واصحابه من المشركين بمكة: ۳۸۵٦۔ ❸ اس بحث کو زرقانی نے شرح مواہب، جلد ۷، صفحہ ۴۵۵ میں بالتفصیل لکھا ہے۔ ❹ صحيح بخاري، كتاب التهجد، باب تعاهد ركعتي الفجر: ۱۱٦۹۔

❺ بخاري: ۱۲۳۳ وابو داود، كتاب الصلوٰة، باب الصلوة بعد العصر: ۱۲۷۳ وصحيح مسلم، كتاب الصلوة، باب معرفة الركعتين اللتين كان يصليهما...... : ۱۹۳۳، ۱۹۳٤۔

قرآن سنانے آتے تو آپ کی فیاضی کی کوئی حد نہ رہتی' آپ کی فیاضی ہوا سے بھی آگے نکل جاتی ❶ رمضان کے آخری عشرہ میں آپ اور زیادہ عبادت گزار ہو جاتے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تو آپ رات رات بھر بیدار رہتے تھے، ازواج سے بے تعلق ہو جاتے تھے، اہل بیت کو نماز کے لئے جگاتے تھے، ❷ اس اخیر عشرہ میں آپ عموماً اعتکاف میں بیٹھا کرتے تھے ❸ یعنی ہمہ وقت مسجد میں بیٹھ کر یاد الٰہی اور عبادت گزاری میں مصروف رہتے تھے۔

قرآن مجید کی تلاوت روزانہ فرماتے تھے ابوداؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت کا وقت نماز عشاء کے بعد تھا۔ ❹ روزانہ سورتوں کی تعداد مقرر تھی اسی تعداد کے موافق آپ ﷺ تلاوت کر لیا کرتے تھے۔ رمضان میں پورے قرآن کا دورہ کرتے تھے ❺ پچھلی رات کو اٹھ کر کوئی موثر سورہ یا چند آیات تلاوت کرتے تھے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے تھے کہ ایک دفعہ رات کو میں نے دیکھا کہ آپ پچھلے پہر بیدار ہوئے، آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے رات کے سناٹے میں تارے جھلملا رہے تھے، آپ نے نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور یہ آیتیں پڑھیں: ❻

﴿ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۚۙ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیۡ لِلۡاِیۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ فَاٰمَنَّا ٭ۖ رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَ کَفِّرۡ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ ۚ﴿﴾ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدۡتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَ لَا تُخۡزِنَا یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ ؕ اِنَّکَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ ﴿﴾ فَاسۡتَجَابَ لَهُمۡ رَبُّهُمۡ اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی ۚ بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا وَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ وَ اُوۡذُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَ قٰتَلُوۡا وَ قُتِلُوۡا لَاُکَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَیِّاٰتِهِمۡ وَ لَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ ﴿﴾ ﴾

(۳/ ال عمران ۱۹۰ تا ۱۹۵)

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب اجود ما کان النبی ﷺ یکون فی رمضان: ۱۹۰۲۔
❷ بخاری، کتاب الصوم، باب العمل فی العشر الاواخر من رمضان: ۲۰۲٤۔
❸ صحیح بخاری، کتاب الاعتکاف، باب الاعتکاف فی العشر الاواخر: ۲۰۲۵، ۲۰۲٦۔
❹ ابو داود، ابواب شهر رمضان، باب تحزیب القرآن: ۱۳۹۳۔
❺ صحیح بخاری، بدء الوحی: ٦، ۱۹۰۲۔
❻ صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب قراۃ القران بعد الوضوء: ۱۸۳ وصحیح مسلم: ۱۷۸۹، بخاری و مسلم کی روایت میں صرف آل عمران کی آخری دس آیات پڑھنے کا ذکر ہے، آیتیں درج نہیں کی ہیں۔

''آسمان اور زمین کی پیدائش اور شب و روز کے انقلاب میں ان دانش مندوں کے لیے نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور پہلو پر لیٹے ہوئے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین میں غور کرتے ہیں کہ خدایا! تو نے یہ (نظامِ عالم) بے نتیجہ نہیں پیدا کیا تو پاک ہے پس ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، خدایا! جس کو تو دوزخ میں داخل کرے اس کو تو نے رسوا کر دیا، گناہ گاروں کا کوئی مدد گار نہیں، خداوندا! ہم نے ایک پکارنے والے کی آواز سنی، جو پکار کر یہ کہہ رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لائے، خداوندا! تو ہمارے گناہ بخش دے، ہماری برائیوں پر پردہ ڈال اور نیکوں کے ساتھ دنیا سے اٹھا، خداوندا! تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ ہم سے جس چیز کا وعدہ کیا ہے وہ ہم کو عنایت کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا، تو اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا، پروردگار نے پکار سن لی اور دعا قبول کر لی کہ میں کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا مرد ہو یا عورت تم ایک دوسرے سے ہو، جنہوں نے ہجرت کی یا اپنے گھروں سے نکالے اور میری راہ میں ستائے گئے ہیں اور وہ لڑے ہیں اور مارے گئے ہیں میں ان سب کے گناہوں کو مٹادوں گا اور ان کو جنت میں جگہ دوں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اللہ کی طرف سے ان کو یہ جزا ملے گی اور اللہ ہی کے پاس اچھی جزا ہے۔''

اسی موقع پر آپ یہ الفاظ بھی کہا کرتے تھے جو سرتاپا اثر اور روحانیت میں ڈوبے ہوئے ہیں:

((اللھم لك الحمد انت نور السمٰوات والارض ولك الحمد انت قيام السموات والارض ولك الحمد انت رب السمٰوات والارض ومن فيهن انت الحق ووعدك الحق وقولك الحق ولقاء ك حق والجنة حق والنار حق والساعة حق اللھم لك اسلمت وبك امنت وعليك توكلت واليك انبت وبك خاصمت واليك حاكمت فاغفرلي ماقدمت واخرت واسررت واعلنت انت الٰهي لآ اله الا انت)) [1]

''خداوندا! تیری حمد ہو، تو آسمان و زمین کا نور ہے۔ تیری حمد ہو تو آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کا پروردگار ہے۔ تو حق ہے تیرا وعدہ حق ہے، تیری بات حق ہے، تجھے ملنا حق ہے، جنت حق ہے، دوزخ حق ہے، قیامت حق ہے۔ خداوندا! میں نے تیرے ہی آستانے پر سر جھکایا ہے، تجھی پر ایمان لایا ہوں، تجھی پر میں نے بھروسہ کیا ہے، تیرے ہی زور سے جھگڑتا ہوں، تجھی سے فیصلہ چاہتا ہوں، تو میرا اگلا اور پچھلا، کھلا اور چھپا، ہر ایک گناہ معاف کر۔ تو ہی میرا معبود ہے، تیرے سوا کوئی اور معبود نہیں۔''

[1] صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب صلاۃ النبی ﷺ ودعائه بالليل: ۱۸۰۸۔

کبھی گھر کے لوگ جب سو جاتے آپ ﷺ چپ چاپ بستر سے اٹھتے اور دعا و مناجاتِ الٰہی میں مصروف ہو جاتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک رات میری آنکھ کھلی تو آپ کو بستر پر نہ پایا سمجھی کہ آپ کسی اور بیوی کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ اندھیرے میں ہاتھ سے ادھر ادھر ٹٹولا تو دیکھا کہ پیشانی اقدس خاک پر ہے اور آپ سربسجود دعا میں مصروف ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ مجھ کو اپنے شبہ پر ندامت ہوئی اور دل میں کہا: سبحان اللہ! ہم کس خیال میں ہیں اور آپ کس عالم میں۔ ❶ کبھی کبھی راتوں کو اٹھ کر آپ تن تنہا قبرستان میں تشریف لے جاتے تھے اور دعا و زاری کرتے تھے ایک دفعہ آپ کے پیچھے پیچھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا گئیں تو دیکھا کہ آپ جنت البقیع میں داخل ہوئے اور دعا مانگی۔ ❷

دعا اور نماز کے بعد آپ ﷺ سو جاتے یہاں تک کہ خراٹے کی آواز سنائی دیتی کہ دفعتہً سپیدہ صبح نمودار ہوتا، آپ بیدار ہوتے، صبح کی سنت ادا کر کے مسجد کو تشریف لے جاتے اور اس وقت یہ الفاظ زبان مبارک پر ہوتے:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ نُوْرًا وَّ فِيْ لِسَانِيْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ فِيْ سَمْعِيْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ فِيْ بَصَرِيْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ فِيْ خَلْفِيْ نُوْرًا وَّ مِنْ اَمَامِيْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ مِنْ فَوْقِيْ نُوْرًا وَّ تَحْتِيْ نُوْرًا وَّ اَعْطِنِيْ نُوْرًا)) ❸

''خدایا میرے دل میں نور پیدا کر اور میری زبان میں اور میری قوت سامعہ میں نور پیدا کر، آنکھوں میں نور پیدا کر اور میرے پیچھے اور میرے آگے نور پیدا کر، میرے اوپر اور میرے نیچے نور پیدا کر اور مجھے نور عطا کر۔''

ارکانِ نماز میں سب سے کم وقفہ رکوع کے بعد قیام میں ہوتا ہے لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ رکوع کے بعد اتنی دیر تک کھڑے رہتے تھے کہ ہم لوگ سمجھتے تھے آپ سجدہ میں جانا بھول گئے۔ ❹ جو چیز نماز کی حضوری میں خلل ڈالتی تھی اس سے احتراز فرماتے تھے، ایک دفعہ چادر اوڑھ کر نماز ادا فرمائی جس میں دونوں طرف حاشیے تھے، نماز میں اتفاق سے حاشیوں پر نظر پڑ گئی نماز سے فارغ ہو کر فرمایا: ''یہ لے جا کر فلاں شخص (ابوجہم) کو دے آؤ اور ان سے انجانی مانگ لاؤ۔'' حاشیوں نے نماز کی حضوری میں خلل ڈالا۔ ❺

❶ سنن نسائی، کتاب عشرة النسآء، باب الغيرة: ۳٤۱۳، ۳٤۱٤۔

❷ سنن نسائی، کتاب الجنائز، باب بالاستغفار للمؤمنين: ۲۰۳۹۔ ❸ صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرين، باب صلاة النبي ﷺ ...: ۱۷۹۹۔ ❹ مسند ابن حنبل، ج ۳، ص: ۱۷۲۔

❺ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰة، باب اذا صلی فی ثوب له اعلام: ۳۷۳۔ انجانی ایک کپڑے کا نام ہے۔

ایک دفعہ دروازے پر منقش پردہ پڑا ہوا تھا، نماز میں اس پر نگاہ پڑی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:
''اس کو ہٹادو، اس کے نقش ونگار حضور قلب میں خلل انداز ہوئے۔'' ❶

روزہ

انبیا اور داعیان مذہب نے تکمیلِ روحانیت کے لیے تقلیلِ غذا، بلکہ ترک غذا (روزہ) کو اسباب ضروری میں شمار کیا ہے، ہندوستان کے ریاضت کش اور مرتاض داعیانِ مذاہب تو اس راہ میں حدِ افراط سے بھی آگے نکل گئے ہیں لیکن داعیٔ اسلام کا طرز عمل اس باب میں افراط اور تفریط کے بیچ میں تھا۔ اسلام سے پہلے اہلِ عرب عاشورا کے دن روزہ رکھا کرتے تھے، آنحضرت ﷺ بھی معمولاً اس دن روزہ رکھتے تھے، بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کے قیام کے زمانہ میں آپ ﷺ متواتر کئی کئی مہینوں تک روزہ رکھتے تھے لیکن مدینہ آکر اس معمول میں فرق آگیا، مدینہ میں یہود بھی عاشورا کا روزہ رکھتے تھے آپ ﷺ نے بھی رکھا بلکہ تمام مسلمانوں کو اس دن روزہ رکھنے کی تاکید فرمائی ❷ لیکن جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورا کا روزہ نفل رہ گیا۔

رمضان کے علاوہ پورے مہینہ کا روزہ مدینہ میں آپ ﷺ نے کبھی نہیں رکھا، صرف ایک شعبان مستثنیٰ ہے، اس میں قریب قریب پورے مہینہ بھر آپ ﷺ روزہ سے رہتے، اس طرح سال میں دو مہینے شعبان اور رمضان تو پورے روزوں میں گزرتے تھے، ❸ سال کے بقیہ مہینوں میں یہ کیفیت رہتی تھی کہ روزہ رکھنے پر آتے تھے تو معلوم ہوتا تھا، کہ اب آپ کبھی روزہ نہ توڑیں گے، پھر روزہ توڑ دیتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی روزہ نہ رکھیں گے، ❹ مہینہ کے نصف اول میں جن کو ایام بیض کہتے ہیں آپ اکثر روزوں سے رہتے تھے، مہینہ میں تین دن دو دو شنبہ اور ایک جمعرات کو آپ معمولاً روزے رکھا کرتے تھے بعض روایتوں میں ہے کہ جمعہ کا روزہ بھی معمولات میں سے تھا ان کے علاوہ محرم کے دس دن یکم سے عاشورا تک اور شوال کے آغاز میں چھ دن دوسری سے ساتویں تک آپ روزوں میں گزارتے تھے۔ ❺

اتفاقی روزے ان کے علاوہ تھے، آپ کبھی گھر میں تشریف لا کر پوچھتے تھے کہ کچھ کھانے کو ہے جواب ملتا کچھ نہیں آپ ﷺ فرماتے: ''تو میں آج روزہ سے ہوں۔'' ❻ کبھی کبھی آپ صوم وصال بھی رکھتے تھے یعنی متواتر کئی کئی دن تک ایک روزہ رکھتے تھے بیچ میں مطلق افطار نہیں کرتے تھے یا برائے نام کچھ کھا

---

❶ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب کراهیة الصلوة فی التصویر، ٥٩٥٩، وکتاب الصلوة، باب ان صلی فی ثوب مصلب: ٣٧٤۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب صوم عاشوراء: ٢٦٣٧۔

❸ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب صیام النبی ﷺ: ٢٧٢١۔ ❹ ایضا۔

❺ روزہ کے متعلق یہ حدیثیں تمام کتب حدیث میں ہیں اس وقت ابو داود، صحیح مسلم، کتاب الصوم پیش نظر ہیں۔

❻ ابو داود، کتاب الصیام، باب فی الرخصة فیه: ٢٤٥٥۔

لیتے تھے لیکن جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس میں آپ کی تقلید کرنی چاہی تو آپ نے منع فرمایا، بعض لوگوں نے اس ممانعت کو صرف اس معنی پر محمول کیا کہ آپ ﷺ حکماً نہیں بلکہ شفقت سے منع فرماتے ہیں، اس لئے اس ممانعت کے باوجود آپ کے ساتھ انہوں نے بھی اس قسم کے روزے رکھنے شروع کئے، آپ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو دو دن متصل روزہ رکھا تیسرے دن اتفاق سے چاند ہو گیا آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر مہینہ بڑھ سکتا تو میں اتنے دن تک افطار نہ کرتا کہ ان مذہب میں غلو کرنے والوں کا سارا غلو جاتا رہتا۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! پھر حضور کیوں کئی کئی دن تک افطار نہیں کرتے؟ ارشاد ہوا: ''تم میں مجھ سا کون ہے؟ مجھ کو تو ایک کھلانے والا ہے جو کھلاتا ہے اور ایک پلانے والا ہے جو پلاتا ہے۔'' بعض روایتوں میں یہ الفاظ اس طرح وارد ہوئے ہیں: ''تم میں مجھ جیسا کون ہے؟ میں شب بسر کرتا ہوں تو میرا خدا مجھ کو کھلاتا اور پلاتا ہے۔'' [1]

عام مسلمانوں کے لئے آپ اس قسم کی مذہبی سختیوں کو ناپسند فرماتے تھے اور عام طور پر خود بھی ان چیزوں سے احتراز کرتے تھے تفصیلی واقعات آگے آتے ہیں۔

زکوٰۃ

آنحضرت ﷺ اسلام سے پہلے بھی بہت کچھ خیرات اور مبرّات کیا کرتے تھے، جیسا کہ آغاز اسلام میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے شہادت دی ہے۔ [2] اسلام کے بعد آپ کی یہ کیفیت تھی کہ کوئی چیز نقدا اپنے پاس رہنے نہیں دیتے تھے جو کچھ آتا مستحقین میں تقسیم فرما دیتے لیکن بااین ہمہ زکوٰۃ کا ادا کرنا آپ سے ثابت نہیں اس سے بعض فقہا نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی لیکن اصل یہ ہے کہ زکوٰۃ کے دو مفہوم ہیں ایک مطلق صدقہ و خیرات اور اس باب میں جو آپ کی کیفیت تھی وہ کس سے مخفی ہے؟ دوسرا یہ کہ چاندی سونے یا جانور وغیرہ کی مخصوص مقدار و تعداد پر جو حاجت اصلیہ سے زیادہ ہو اور سال بھر تک مالک کے قبضہ میں رہی ہو، ایک خاص شرح رقم ادا کی جائے۔ یہ مصطلحہ زکوٰۃ کبھی آپ پر فرض ہی نہیں ہوئی۔ کاشانہ نبوت میں کوئی قابل زکوٰۃ چیز سال بھر تک تو کیا رہتی یہ بھی پسند خاطر نہ تھا کہ شب گزر جائے اور مال و دولت کا کوئی نشان گھر کے اندر رہ جائے ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ خراج کی رقم اس قدر زیادہ آگئی کہ وہ شام تک ختم نہ ہو سکی، آپ نے رات بھر مسجد میں آرام فرمایا اور کاشانہ اقدس میں اس وقت تک قدم نہیں رکھا جب تک حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آکر یہ اطلاع نہ دی کہ ''یا رسول اللہ! خدا نے آپ کو سبکدوش کیا۔'' [3]

---

[1] صومِ وصال کی یہ حدیثیں صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب النہی عن الوصال فی الصوم: ۲۵۶۳ تا ۲۵۷۲ سے لی گئی ہیں۔ [2] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی: ۳۔

[3] ابو داود، کتاب الخراج، باب فی الامام یقبل ھدایا المشرکین: ۳۰۵۵۔

حج

اسلام سے پہلے آپ ﷺ نے جس قدر حج کیے ان کی صحیح تعداد متعین نہیں کی جا سکتی۔ ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ چونکہ قریش معمولاً ہر سال حج کیا کرتے تھے [1] اس لیے قرینہ غالب یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ بھی ہر سال حج ادا کرتے ہوں گے۔ ترمذی میں ہے کہ قیام مکہ کے زمانہ میں آپ نے دو حج کیے تھے [2] اور ابن ماجہ اور حاکم میں ہے کہ تین حج کیے تھے لیکن یہ سب روایتیں مرسل ہیں۔ [3] مدینہ کے زمانۂ قیام میں متفقہ ثابت ہے کہ صرف ایک حج ۱۰ھ میں کیا، [4] یہ وہی حجۃ الوداع ہے، جس کا ذکر بہ تفصیل پہلے گزر چکا ہے۔

حج کے علاوہ آپ نے عمرے بھی ادا کیے ہیں، ہجرت کے بعد چار عمرے ثابت ہیں۔ ایک عمرہ ذیقعدہ کے مہینہ میں ایک حدیبیہ کے سال، ایک غزوۂ حنین کے بعد اور چوتھا حجۃ الوداع [5] کے ساتھ۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع والے عمرہ کے سوا تمام عمرے آپ نے ذیقعدہ کے مہینہ میں ادا کیے۔ ایک دفعہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کسی نے پوچھا کہ آنحضرت ﷺ نے کتنے عمرے کیے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ''چار عمرے، ان میں سے ایک ماہ رجب میں'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سنا تو کہا: ''خدا ابو عبدالرحمٰن (ابن عمر کی کنیت) پر رحم فرمائے آپ نے کوئی عمرہ ایسا نہیں کیا جس میں وہ شریک نہ ہوں، آنحضرت ﷺ نے رجب میں کوئی عمرہ نہیں کیا۔'' [6]

سال حدیبیہ میں سب سے پہلی دفعہ جب آپ عمرہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہوئے تھے تو کفار قریش نے قدم قدم پر روکنے کی کوشش کی، صحابہ رضی اللہ عنہم ان کی مدافعت میں آپ سے بچھڑ گئے، لیکن آپ ﷺ کو خانہ کعبہ کی زیارت کا یہ ذوق وشوق تھا کہ اپنے ہمراہیوں کا انتظار کیے بغیر بے خطر آپ سب سے آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ آخر جان نثاروں نے ابو قتادہ انصاری کو بھیجا کہ وہ جا کر ہماری جانب سے سلام عرض کریں اور یہ درخواست کریں کہ ''آپ ذرا توقف فرمائیں ہمیں یہ ڈر ہے کہ دشمن کہیں ہمارے اور آپ کے درمیان حائل نہ ہو جائیں۔'' آپ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی۔ [7]

دوامِ ذکرِ الٰہی

قرآن مجید نے اہل ایمان کا یہ وصف خاص بیان کیا ہے:

---

[1] الكامل في التاريخ، واقعات ٩ھ ذكر حج ابي بكر، ج ٢، ص: ٢٢٢۔

[2] ترمذی، ابواب الحج، باب كم حج النبي ﷺ: ٨١٥۔

[3] زرقانی، ج ٨، ص: ١٦٤۔ [4] صحيح مسلم، كتاب الحج، باب حجة النبي ﷺ: ٢٩٥٠ وابوداود، كتاب المناسك، باب صفة حجة النبي ﷺ: ١٩٠٦ وترمذي باب كم حج النبي ﷺ: ٨١٥۔

[5] جامع ترمذي، ابواب الحج، باب كم حج النبي ﷺ: ٨١٥۔

[6] بخاری، كتاب العمرة، باب كم اعتمر النبي ﷺ: ١٧٧٦؛ مسلم، كتاب الحج، باب بيان عدد عمر النبي ﷺ وزمانهن: ٣٠٣٧؛ ترمذي: ٩٣٦۔

[7] صحيح بخاری، كتاب جزاء الصيد، باب اذا راى المحرمون: ١٨٢٢۔

﴿ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۹۱)

''جو خدا کو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے یاد کرتے ہیں۔''

﴿ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ (۲٤/ النور:۳۷)

''جن کو اشغالِ دنیوی خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔''

اور قرآن کا مبلغ ان اوصاف کا خود بہترین مظہر تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: آنحضرت ﷺ ہر لحظہ اور ہر لمحہ خدا کی یاد میں مصروف رہتے تھے ❶ ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ رات کو آپ ﷺ کے آستانہ پر پہرہ دیتے تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کی تسبیح وتہلیل کی آواز سنتے سنتے میں تھک جاتا تھا، اور مجھے نیند آجاتی تھی۔ ❷ اٹھتے، بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، وضو کرتے، نئے کپڑے پہنتے، سوار ہوتے، سفر میں جاتے، واپس آتے، گھر میں داخل ہوتے، مسجد میں قدم رکھتے، غرض ہر حالت میں دل و زبان ذکر الٰہی میں مصروف رہتے۔ چنانچہ اسی بنا پر احادیث میں مختلف اوقات و حالات کے لیے کثرت سے ادعیہ ماثور منقول ہیں۔ اخیر زندگی میں جب سورۂ اذا جـــاء اتری جس میں تحمید وتسبیح کا حکم ہے تو امہات المؤمنین کا بیان ہے کہ ہر وقت اور ہر حالت میں زبان مبارک پر تسبیح وتہلیل جاری رہتی تھی۔ ❸

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ''آپ ﷺ اکثر یہ دعا ((رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ)) تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد پڑھا کرتے تھے۔ ہم نے گنا تو ایک ایک نشست میں سو سو دفعہ یہ الفاظ آپ ﷺ کی زبان سے ادا ہوئے۔ ❹ سفر اور کوچ کی بے اطمینانی میں بھی آپ ﷺ یادِ الٰہی سے غافل نہیں رہتے تھے سواری پر بیٹھے بیٹھے نفل ادا کرتے تھے، اور اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ قبلہ کی طرف رخ ہے یا نہیں۔ سواری کا جانور جدھر چل رہا ہوتا آپ ﷺ ادھر ہی منہ کئے نماز کی نیت کر لیتے ❺ کہ ﴿ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۱۵) ''جدھر رخ کرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے۔''

ذوق وشوق

آپ ﷺ اصحاب رضی اللہ عنہم کی محفل میں یا امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے حجروں میں بات چیت میں مشغول ہوتے کہ دفعتاً اذان کی آواز آتی آپ اٹھ کھڑے ہوتے ❻ رات کا ایک معتد بہ حصہ گو شب بیداری میں گزرتا تھا تاہم صبح کے وقت ادھر مؤذن نے اللہ اکبر کہا ادھر آپ ﷺ بستر سے اٹھ بیٹھے ❼ شب کے وقت

---

❶ ابو داود، کتاب الطهارة، باب فی الرجل یذکر الله علی غیر طهر:۱۸۔ ❷ مسند احمد، ج ٤ ص: ٥٩۔

❸ ابن سعد، قسم ثانی جز ثانی جزء الوفاة، ص:۱۔ ❹ ترمذی، کتاب الدعوات، باب ما یقول اذا قام من مجلسه:۳٤۳٤ وابن ماجه، ابواب الادب، باب الاستغفار:۳۸۱٤؛ مسند عبد بن حمید:۷۸٦۔

❺ صحیح بخاری، کتاب الصلوة، باب التوجه نحو القبلة: ٤٠٠ وصحیح مسلم: ۱۲۰۷۔

❻ صحیح بخاری، کتاب النفقات، باب خدمة الرجل فی اهله:۵۳٦۳۔

❼ صحیح بخاری، کتاب الصلوة، باب من انتظر الاقامة:٦۲٦۔

جس ذوق وشوق اور وجد کی حالت میں نماز پڑھتے اس کا نقشہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان الفاظ میں کھینچا ہے ''کبھی پوری پوری رات آنحضرت ﷺ کھڑے رہتے، سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ نساء (قرآن کی سب سے بڑی سورتیں ہیں) پڑھتے، جب کوئی خوف اور خشیت کی آیت آتی، خدا سے دعا مانگتے اور پناہ طلب کرتے کوئی رحمت اور بشارت کی آیت آتی تو اس کے حصول کی دعا مانگتے ❶ قراءت اتنی زور سے فرماتے کہ دور دور تک آواز جاتی اور لوگ اپنے بستروں پر پڑے پڑے آپ ﷺ کی آواز سنتے ❷ کبھی کبھی کوئی ایسی آیت آجاتی کہ آپ ﷺ اس کے ذوق وشوق میں محو ہو جاتے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے نماز میں یہ آیت پڑھی:

﴿ إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ ﴾

(۵/ المآئدۃ:۱۱۸)

''اگر تو سزا دے تو تیرے بندے ہیں اور اگر معاف کر دے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔''

تو یہ اثر ہوا کہ صبح تک آپ ﷺ یہی آیت پڑھتے رہ گئے۔ ❸

زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ ارادہ کیا کہ آج شب میں آپ کو نماز پڑھتے دیکھوں گا، (غالباً یہ کسی سفر کا واقعہ ہے) نماز کا وقت آیا تو آپ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوئے پہلے دو رکعتیں معمولی ادا کیں پھر دو رکعتیں بہت ہی لمبی اور بڑی دیر تک پڑھیں، پھر دو دو رکعتیں کر کے آٹھ رکعتیں بتدریج چھوٹی چھوٹی پڑھیں اور سب کے آخر میں وتر ادا کی۔ ❹ خباب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے ایک شب آپ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو صبح تک مصروف رہے۔ ❺

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شب مجھ کو آنحضرت ﷺ کے ساتھ نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، آپ نے سورۂ بقرہ شروع کی (قرآن کی یہ سب سے بڑی سورہ ہے) میں سمجھا آپ ﷺ سو آیتوں تک پڑھیں گے لیکن آپ ان کو پڑھ کر اور آگے بڑھے، میں نے دل میں کہا شاید پوری سورہ آپ ایک ہی رکعت میں ختم کرنا چاہتے ہیں چنانچہ آپ نے جب اس سورہ کو ختم کیا تو میں نے خیال کیا کہ اب آپ رکوع کریں گے لیکن آپ نے فوراً ہی سورۂ آل عمران شروع کر دی، یہ بھی ختم ہو چکی تو سورۂ نساء شروع کی (یہ تینوں سورتیں مل کر سوا پانچ پاروں کے قریب ہیں) بہت ٹھہر ٹھہر کر نہایت سکون اور اطمینان سے آپ قراءت کر رہے تھے اور ہر آیت کے مضمون کے مطابق بیچ بیچ میں تسبیح اور دعا کرتے جاتے تھے، اس کے بعد آپ نے رکوع کیا،

---

❶ ابن ماجہ: ۱۳۵۱ تا ۱۳۵۲؛ مسند احمد، ج ٦، ص: ۹۲۔ ❷ ابن ماجہ، ابواب الصلوۃ، باب ماجاء فی القراءۃ صلوۃ اللیل: ۱۳٤۹۔ ❸ ایضاً: ۱۳۵۰۔ ❹ صحیح مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین: ۱۸۰٤؛ ابوداود، کتاب التطوع، باب فی صلوۃ اللیل: ۱۳٦٦؛ موطا، باب صلوۃ النبی ﷺ فی الوتر: ۲٦۸۔

❺ نسائی، کتاب قیام اللیل، باب تسویۃ القیام والرکوع: ۱٦٦٦۔

رکوع میں قیام ہی کے برابر توقف فرمایا پھر کھڑے ہوئے اور اتنی ہی دیر تک کھڑے رہے سجدہ کیا اور سجدہ میں بھی اسی قدر تاخیر فرمائی۔ ❶

میدان جنگ میں یاد الٰہی

عین اس وقت جب دونوں طرف سے فوجیں برسرِ پیکار ہوتیں، تیر و سنان اور تیغ و خنجر کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی ہوتیں اور ہر طرف سے شور دار و گیر برپا ہوتا، آپ ﷺ نہایت خضوع و خشوع اور اطمینان قلب کے ساتھ دعا و زاری اور ذکر الٰہی میں مصروف ہوتے۔ سپاہی شجاعت کے فخر و غرور سے پیشانیوں پر بل ڈالے ہوئے دشمنوں کے مقابلہ میں ہوتے لیکن خود سپہ سالار کی پیشانی زمین نیاز پر ہوتی۔ بدر، احد، خندق، خیبر، تبوک تمام بڑے بڑے معرکوں میں آپ کی یہی کیفیت تھی۔ معرکہ ہائے جنگ میں سپہ سالاروں کو اپنے بہادر سپاہیوں کی قوت پر ناز ہوتا ہے لیکن اسلام کے قائد اعظم کو صرف خدائے ذوالجلال کی قوت پر ناز تھا۔ عالم اسباب کے لحاظ سے گو آپ ﷺ نے اصول جنگ کے مطابق ہر میدان میں اپنی فوجیں مرتب کیں لیکن اصلی اعتماد اور بھروسہ اسبابِ کائنات سے ماورا قادر مطلق کی ذات پر تھا۔ بدر میں دو صحابی حاضر ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! ہم کو کافروں نے اس شرط پر رہا کیا ہے کہ ہم جنگ میں شرکت نہ کریں، ارشاد ہوتا ہے کہ ''ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے۔'' ❷ بدر کا میدان خون سے لالہ زار ہو رہا ہے اور آپ خشوع و خضوع سے دونوں ہاتھ پھیلا کر بارگاہِ ایزدی میں عرض کر رہے ہیں کہ ''خدایا! اپنا وعدۂ نصرت پورا کر۔'' محویت اور بے خودی میں ردائے مبارک کندھے سے گر پڑتی ہے اور آپ ﷺ کو خبر نہیں ہوتی کبھی سجدے میں گر پڑتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ ''خدایا! اگر آج یہ چند نفوس مٹ گئے تو پھر تو قیامت تک نہ پوجا جائے گا۔'' ❸ اسی اثنا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ تین دفعہ میدان جنگ سے حاضر خدمت ہوتے ہیں اور ہر دفعہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے۔ ❹

غزوۂ احد کے خاتمہ پر ابوسفیان مسرت سے ہبل کی جے پکارتا ہے لیکن آپ ﷺ اس دل شکستگی کے عالم میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حکم دیتے ہیں کہ تم بھی کہو:

((اللّٰہ مولانا ولا مولی لکم، اللّٰہ اعلٰی واجل)) ❺

''خدا ہمارا آقا ہے تمہارا کوئی آقا نہیں، خدا بڑا اور بلند ہے۔''

---

❶ صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب استحباب تطویل القراء ۃ فی صلوۃ اللیل: ۱۸۱٤ ونسائی، کتاب قیام اللیل، باب تسویۃ القیام والرکوع: ١٦٦٥۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب الوفاء بالعهد: ٤٦٣٩۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قول اللّٰہ: اذتستغیثون: ۳۹۵۳ یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں دیکھئے صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب الامداد بالملائکة: ٤٥٨٨۔ ❹ سیرۃ جلد ۱، ص: ٤٣٤ طبع جدید۔ ❺ بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ احد: ٤٠٤٣۔

غزوۂ احزاب میں آپ ﷺ خود اپنے دست مبارک سے خندق کھودنے میں مصروف تھے اور لب مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے:

((اَللّٰهُمَّ لَا خَيْرَ اِلَّا خَيْرُ الْاٰخِرَةِ فَبَارِكْ فِي الْاَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَةِ)) ❶

''خدایا! بھلائی صرف آخرت کی بھلائی ہے انصار اور مہاجرین کو برکت عطا کر۔''

دشمن اس شدت سے حملہ پر حملہ کر رہے تھے کہ کسی مسلمان کا اپنی جگہ سے ہٹنا ممکن نہ تھا اور یہ محاصرہ ۲۰، ۲۲ دن تک قائم رہا، لیکن اس مدت میں صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ چار وقت کی نمازیں قضا ہوئیں۔ایک دن عصر کے وقت دشمنوں نے اس زور کا حملہ کیا کہ ایک لمحہ کے لیے بھی مہلت نہ مل سکی، آخر عصر کا وقت ختم ہو گیا، آپ کو سخت رنج ہوا حملہ رکنے پر سب سے پہلے باجماعت نماز ادا کی۔ ❷

غزوۂ خیبر میں جب آپ ﷺ شہر کے قریب پہنچے تو زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے:((اللّٰہ اکبر خربت خیبر))۔اللہ اکبر! خیبر ویران ہو چکا۔ ❸ عمارتیں نظر آئیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم سے ارشاد کیا کہ ٹھہر جاؤ پھر یہ دعا مانگی:

((اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ وَخَيْرَ اَهْلِهَا وَخَيْرَ مَا فِيْهَا وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ اَهْلِهَا وَشَرِّ مَا فِيْهَا)) ❹

''اے اللہ! ہم تجھ سے اس آبادی کی اس آبادی والوں کی اس آبادی کی چیزوں کی بھلائی چاہتے ہیں اور ان سب کی برائیوں سے تیری پناہ کے طلب گار ہیں۔''

حنین کے معرکہ میں بارہ ہزار فوج آپ کے ساتھ تھی لیکن اوّل ہی حملہ میں اس کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اس فوج کا سالار اگر انہی آدمیوں کے بھروسہ پر میدان جنگ میں اترتا تو شاید وہ سب سے پہلے بھاگ کر اپنی جان بچاتا، لیکن آپ ﷺ کو جس قوت پر اعتماد تھا آپ اس کو اس تنہائی میں بھی اسی طرح ناصر و مددگار سمجھتے تھے۔ جس طرح فوج ولشکر کے ساتھ، عین اس وقت جب دس ہزار قدر انداز تیروں کا مینہ برساتے ہوئے سیلاب کی طرح بڑھتے چلے آتے تھے اور آپ ﷺ کے پہلو میں چند جاں نثاروں کے سوا کوئی اور باقی نہیں رہا تھا آپ سواری سے اتر آئے اور فرمایا: ''میں خدا کا بندہ اور پیغمبر ہوں۔'' پھر بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہو کر نصرتِ موعودہ کی درخواست کی، دفعتہً ہوا کا رخ پلٹ گیا اور نسیم فتح علم اسلام کو لہرانے لگی۔ ❺ دس ہزار دشمن کے بے پناہ تیروں کو یکہ وتنہا مناجات وزاری کی سپر پر روکنے کی جرأت پیغمبروں کے سوا اور کس سے ظاہر ہو سکتی ہے۔

اس مرقع کا سب سے مؤثر منظر غزوۂ بنی مصطلق میں نظر آتا ہے سامنے دشمن پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں

---

❶ بخاری، باب غزوۃ خندق: ٤١٠٠۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق: ٤١١٢۔

❸ بخاری: ٣٧١؛ مسلم: ٤٦٦٥۔ ❹ ابن ھشام، ج ٢، ص: ٢٢٣۔

❺ صحیح بخاری، کتاب الجھاد، باب من صف اصحابہ عند...: ٢٩٣٠ ومسلم، کتاب الجھاد، باب غزوۃ حنین: ٤٦١٥۔

اورغفلت کے منتظر ہیں کہ دفعۃً نماز کا وقت آ جاتا ہے اور آپ امام بن کر آگے کھڑے ہو جاتے ہیں۔صحابہ کی ایک جماعت مقتدی ہو کر نماز میں مصروف ہو جاتی ہے اور دوسری دشمنوں کا سامنا روک لیتی ہے۔صلح حدیبیہ کے زمانہ میں اس سے بھی زیادہ خطرناک موقع پیش آیا۔آنحضرت ﷺ مکہ کے پاس عسفان میں خیمہ زن تھے۔قریش کے مشہور جنرل خالد بن ولید آس پاس کی پہاڑیوں میں دشمنوں کی فوج کا ایک دستہ لیے ہوئے موقع کی تاک میں تھے آخر قریش کی یہ رائے قرار پائی کہ مسلمان جب نماز کے لیے کھڑے ہوں تو عین اس وقت ان پر بے خبری میں حملہ کیا جائے۔خداوند کارساز کی بارگاہ میں قصرِ صلوٰۃ کی ایک عمدہ تقریب پیدا ہوگئی چنانچہ قصر کی آیتیں نازل ہوئیں عصر کا وقت آیا تو آپ ﷺ نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے،دشمن اپنی فوج کا پرا لیے آپ کے سامنے تھے،صحابہ دو حصوں میں منقسم ہو گئے،ایک حصہ نے آپ کے پیچھے آ کر نماز کی صفیں قائم کرلیں اور دوسرا حصہ دشمنوں کے مقابل کھڑا ہو گیا۔پہلی جماعت فارغ ہو کر بتدریج دشمنوں کے مقابل آ گئی اور دوسری ترتیب کے ساتھ پیچھے ہٹ کر آپ کے ساتھ نماز میں جا ملی۔یہ تمام تبدیلیاں مقتدیوں کی صفوں میں ہو رہی ہیں لیکن خود سپہ سالار خون آشام تلواروں کے سایہ میں تمام خطرات سے بے پروا عبادتِ الٰہی میں مصروف ہے اور اس کو ذرہ برابر جنبش نہیں ہوتی۔ [1]

ان واقعات کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ اس حکم الٰہی کی کہاں تک تعمیل ہوئی:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴾

(۸/ الانفال:۴۵)

''مسلمانو! جب کسی گروہ سے مڈبھیڑ ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور بار بار خدا کا نام لیتے جاؤ تم کامیاب ہو گے۔''

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ جہاد میں جب کسی ٹیکرے پر چڑھتے تو تین بار اللہ اکبر کہتے۔ [2]

خشیتِ الٰہی

آپ ﷺ خاتم الانبیا تھے افضل رسل تھے،محبوب خاص تھے،تاہم خشیۃ الٰہی کا یہ اثر تھا کہ فرمایا کرتے کہ ''مجھ کو کچھ نہیں معلوم کہ میرے اوپر کیا گزرے گی؟'' حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے جب وفات پائی تو آپ ﷺ تعزیت کو گئے لاش دھری تھی ایک عورت نے لاش کی طرف مخاطب ہو کر کہا: ''خدا گواہ ہے کہ خدا نے تجھ کو نوازا۔'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''تم کو کیونکر معلوم ہوا۔'' بولیں: ''خدا نے ان کو نہیں نوازا تو اور کس کو نوازے گا'' ارشاد ہوا کہ ''ہاں مجھ کو بھی ان کی نسبت بھلائی کی توقع ہے لیکن میں پیغمبر ہو کر بھی یہ نہیں

[1] ابو داود، کتاب صلاۃ السفر، باب من قال یقوم صف...... ۱۲۳۷۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب التکبیر اذا علا شرفا: ۲۹۹٤۔

جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔'' ❶

جب کبھی زور سے ہوا چلتی آپ ﷺ سہم جاتے کسی ضروری کام میں ہوتے اس کو چھوڑ کر قبلہ رخ ہو جاتے اور فرماتے: ''خدایا تیری بھیجی ہوئی مصیبت سے پناہ مانگتا ہوں۔'' جب مطلع صاف ہو جاتا یا پانی برس جاتا تو مسرور ہوتے اور خدا کا شکر ادا فرماتے۔ ❷ ایک دن اس قسم کا واقعہ پیش آیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا ''یارسول اللہ! آپ کیوں مضطرب ہو جاتے ہیں؟'' ارشاد ہوا: ''عائشہ! تجھے کیا معلوم کہ قوم ہود کا واقعہ نہ پیش آئے جس نے بادل دیکھ کر کہا کہ یہ ہمارے کھیتوں کو سیراب کرنے والا ہے حالانکہ وہ عذاب الٰہی تھا۔'' ❸

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ یارسول اللہ! آپ ﷺ کے بال پکنے لگے، فرمایا: مجھے سورۂ ہود و واقعہ والمرسلات اور عم یتساءلون نے بوڑھا کر دیا۔'' ❹ (ان سورتوں میں قیامت وغیرہ کے واقعات مذکور ہیں) ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب دو ثلث شب گزر چکتی، بآواز یہ الفاظ ادا فرماتے: ''لوگو! خدا کو یاد کرو، زلزلہ آرہا ہے اس کے پیچھے آنے والا آرہا ہے۔ موت اپنے سامان کے ساتھ آپہنچی، موت اپنے سامان کے ساتھ آپہنچی۔'' ❺

فرمایا کرتے تھے: ''لوگو! جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے ہوتے تو تم کو ہنسی کم اور رونا زیادہ آتا۔'' ❻

ایک دفعہ آپ ﷺ نے نہایت مؤثر طرز سے خطبہ میں فرمایا: ''اے معشر قریش! اپنی آپ خبر لو میں تم کو خدا سے نہیں بچا سکتا، اے بنی عبدالمناف! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا، اے عباس بن عبدالمطلب! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا، اے صفیہ! رسولِ خدا کی پھوپھی! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا، اے محمد کی بیٹی فاطمہ! میں تجھ کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا۔'' ❼

ایک دفعہ اعراب بادیہ کا مسجد نبوی میں اتنا ہجوم ہوا کہ آپ ﷺ پسینے کے قریب ہو گئے، مہاجرین نے اٹھ کر لوگوں کو ہٹایا، آپ نکل کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں داخل ہو گئے اور تقاضائے بشری سے بددعا زبان سے نکل گئی، فوراً قبلہ رخ ہو کر دونوں ہاتھ خدا کی بارگاہ میں اٹھائے اور دعا کی: ''خدایا! میں ایک انسان ہوں اگر تیرے کسی بندہ کو مجھ سے تکلیف پہنچے تو مجھے سزا نہ دینا۔'' ❽

گریہ وبکا

(خشیت الٰہی) کی وجہ سے اکثر آپ ﷺ پر رقت طاری ہوتی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الدخول علی المیت: ۱۲۴۳۔ ❷ سنن ابن ماجه، کتاب الدعاء، باب ما یدعو به الرجل اذا رأی السحاب والمطر: ۳۸۸۹۔ ❸ یہ واقعہ بخاری: ۴۸۲۹ و مسلم: ۲۰۸۴ تا ۲۰۸۷ اور دیگر حدیث کی کتابوں میں بھی مذکور ہے، اخیر فقرہ قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے۔ ❹ شمائل ترمذی، باب ما جاء فی شیبه ﷺ: ۴۱۔ ❺ ترمذی: ۲۴۵۷۔ ❻ بخاری، کتاب التفسیر: ۴۶۲۱ ومسلم، کتاب الکسوف، باب صلوة الکسوف: ۲۰۸۹۔ ❼ صحیح بخاری، کتاب الوصایا، باب هل یدخل النسآء والولد فی الاقارب: ۲۷۵۳؛ مسلم: ۵۰۱۔ ❽ مسند احمد، ج ۶، ص: ۱۰۷ و ۱۲۳ دونوں صفحوں میں دو روایتیں ہیں مگر غالباً ایک ہی واقعہ ہے۔

تھے۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جب آپ ﷺ کے سامنے یہ آیت پڑھی: ﴿ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴾ (٤/ النسآء:٤١) تو بے اختیار چشم مبارک سے آنسو جاری ہو گئے ❶ اکثر نماز میں رقت طاری ہوتی اور آنسو جاری ہو جاتے۔ایک دفعہ جب سورج گرہن پڑا تو نماز کسوف میں آپ ٹھنڈی سانسیں بھرتے اور فرماتے تھے: ''خدایا! تو نے وعدہ کیا ہے کہ تو لوگوں پر میرے ہوتے عذاب نہیں نازل کرے گا۔'' ❷

عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ ایک بار خدمت نبوی میں حاضر ہوا دیکھا تو آپ نماز میں مشغول ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، روتے روتے اس قدر ہچکیاں بندھ گئیں تھیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ چکی چل رہی ہے یا ہانڈی ابل رہی ہے۔ ❸

ایک بار آپ ﷺ ایک جنازہ میں شریک تھے قبر کھودی جا رہی تھی آپ قبر کے کنارے بیٹھ گئے یہ منظر دیکھ کر آپ پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ آنسوؤں سے زمین نم ہو گئی پھر فرمایا: ''بھائیو! اس دن کے لیے سامان کر رکھو۔'' ❹

ایک دفعہ کسی غزوہ سے واپس تشریف لا رہے تھے راہ میں ایک پڑاؤ ملا، کچھ لوگ بیٹھے تھے، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''تم کون ہو؟'' بولے ہم مسلمان ہیں، ایک عورت بیٹھی چولھا سلگا رہی تھی پاس ہی اس کا لڑکا تھا، آگ خوب روشن ہوگئی اور بھڑک گئی تو وہ بچہ کو لے کر آپ کی خدمت میں آئی اور بولی آپ رسول اللہ ہیں؟ ارشاد ہوا: ''ہاں بیشک۔'' پھر اس نے پوچھا: کیا ایک ماں اپنے بچہ پر جس قدر مہربان ہے، خدا اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان نہیں ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا: ''بیشک۔'' اس نے کہا: تو ماں اپنے بچہ کو آگ میں نہیں ڈالتی، آپ ﷺ پر گریہ طاری ہو گیا پھر سر اٹھا کر فرمایا: ''خدا اس بندہ کو عذاب دیگا جو سرکش اور متمرد ہے، خدا سے سرکشی کرتا ہے اور اس کو ایک نہیں کہتا۔'' ❺

ایک دفعہ آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا:

﴿ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ ۖ فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ ﴾ (١٤/ ابراهيم:٣٦)

''پروردگار، ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ان میں سے جس نے میری پیروی کی وہی میری جماعت میں ہے۔''

اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام والی دعا پڑھی:

﴿ إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ (٥/ المآئدة:١١٨)

---

❶ صحيح بخاري، كتاب التفسير، آيت مذكور:٤٥٨٢۔ ❷ ابو داود، كتاب صلاة الاستسقاء، باب من قال يركع ركعتين: ١١٩٤۔ ❸ ابوداود، كتاب الصلوٰة، باب البكاء في الصلوٰة: ٩٠٤؛ شمائل ترمذي: ٣٢١؛ مسند أحمد، ج٤، ص:٢٥۔ ❹ سنن ابن ماجه، ابواب الزهد، باب الحزن والبكاء:٤١٩٥۔
❺ سنن ابن ماجه، ابواب الزهد، باب ما يرجى من رحمة الله: ٤٢٩٧۔

''اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر معاف کر دے تو تو غالب و دانا ہے۔''

دونوں ہاتھ اٹھا کر ((اَللّٰهُمَّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ)) فرماتے جاتے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ [1]

محبت الٰہی

دنیا میں دو قسم کے پیغمبر آئے ہیں ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ تھا اور اس لیے وہ صرف خدا کے خوف و خشیت کی تعلیم دیتے تھے مثلاً: حضرت نوح و حضرت موسیٰ علیہما السلام دوسرے وہ جو محبت الٰہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی خم خانۂ عشق کی طرف بلاتے تھے مثلاً: حضرت یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام لیکن یہ دونوں افراط و تفریط کے راستے تھے۔ پہلی راہ اخلاص و محبت کی منزل تک پہنچاتی اور دوسری عبودیت اور آداب و احترام کی منزل سے دور پھینک دیتی ہے جیسا کہ عیسائی تعلیم اور موجودہ انجیل کی سیرت مسیح میں ہر شخص کو نظر آ سکتا ہے لیکن اسلام دونوں جلوؤں کو یکساں نمایاں کرنا چاہتا ہے یہی سبب ہے کہ حامل شریعت اسلامیہ کی ذات مبارک میں یہ دونوں پہلو بہ یک دفعہ نظر آتے ہیں قرآن مجید نے کمال ایمان کا وصف یہ بیان کیا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۶۵)

''جو ایمان لائے ہیں ان کو سب سے زیادہ خدا پیارا ہے۔''

صحیح روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ راتوں کو اتنی دیر تک نماز میں کھڑے رہتے تھے کہ پائے مبارک پر ورم آ جاتا تھا یہ دیکھ کر بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی ''یارسول اللہ! آپ کی مغفرت تو خدا کر چکا ہے آپ یہ زحمت کیوں اٹھاتے ہیں؟'' ارشاد ہوا کہ ''کیا میں عبد شکور نہ بنوں؟'' [2] اربابِ باطن کہتے ہیں کہ لوگ سمجھتے تھے کہ آپ ﷺ کی یہ عبادت خشیتِ الٰہی سے ہے اور چونکہ آپ گناہوں سے پاک کر دیے گئے تھے اس لیے آپ کو ریاضات شاقہ کی ضرورت نہ تھی آپ نے اپنے جواب میں اسی شبہ کو دفع فرمایا اور بتایا کہ ان کا مقتضا محبت الٰہی ہے خشیتِ الٰہی نہیں، اسی لیے آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

((وجعلت لی قرة عینی فی الصلوٰة)) ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔'' [3]

راتوں کے سناٹے میں اٹھ کر آپ ﷺ کبھی دعا و زاری میں مصروف ہوتے کبھی قبرستان کی طرف نکل جاتے اور فرمایا کرتے تھے: ''نصف شب کے سکوت میں خدا سمائے دنیا پر نزول فرماتا ہے۔'' [4] عبادت شبانہ کا خاتمہ صبح کی دو رکعتوں پر ہوتا تھا جن کی نسبت آپ ﷺ کا ارشاد تھا کہ ''ان کے معاوضہ میں دنیا اور مافیہا کی نعمتیں بھی میرے سامنے ہیچ ہیں۔'' [5]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب دعا النبی ﷺ لامة: ۴۹۹۔ [2] صحیح بخاری، کتاب التهجد، باب قیام النبی ﷺ اللیل: ۱۱۳۰۔ [3] مسند احمد بن حنبل، ج۳، ص: ۱۲۸، ۲۸۵۔

[4] بخاری، کتاب التهجد، باب الدعا والصلوة من آخر اللیل: ۱۱۴۵۔

[5] صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین، باب استحباب رکعتی سنة الفجر: ۱۶۸۸۔

ایک دفعہ ایک غزوہ میں کوئی عورت گرفتار ہو کر آئی اس کا بچہ گم ہو گیا تھا، محبت کا یہ جوش تھا کہ کوئی بچہ مل جاتا تو وہ سینہ سے لگا لیتی اور اس کو دودھ پلاتی آپ ﷺ نے دیکھا تو حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ''کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو آگ میں ڈال دے۔'' لوگوں نے عرض کی ''ہرگز نہیں'' فرمایا: ''تو خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ محبت ہے جتنی اس کو اپنے بچہ سے ہے۔'' ❶

اسی طرح ایک اور واقعہ اوپر گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ ایک غزوہ سے واپس آ رہے تھے ایک عورت اپنے بچے کو گود میں لے کر خدمت اقدس میں آئی اور عرض کی ''یا رسول اللہ! ایک ماں کو اپنے بچہ سے جس قدر محبت ہوتی ہے کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟'' فرمایا: ''ہاں بیشک ہے۔'' اس نے کہا: کوئی ماں تو اپنے بچے کو آگ میں ڈالنا گوارا نہیں کرتی۔ یہ سن کر فرط اثر سے آپ ﷺ پر گریہ طاری ہو گیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا: ''خدا صرف اس بندہ کو عذاب دے گا جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے۔'' ❷

ایک دفعہ آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کی مجلس میں تشریف فرما تھے ایک صاحب ایک چادر میں ایک پرند کو مع اس کے بچوں کے لپیٹے ہوئے لائے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا اس کی ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی میں نے ذرا سا کپڑے کو کھول دیا تو وہ فوراً بچوں پر گر پڑی ارشاد ہوا: ''کیا اپنے بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے خدا کو اپنے بندوں سے بدرجہا زیادہ ہے۔'' ❸

آپ ﷺ محبت الٰہی کے سامنے دنیا کی تمام محبتوں کو ہیچ سمجھتے تھے وفات سے پانچ دن پہلے آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے مجمع میں ایک خطبہ دیا اس میں فرمایا: ''میں خدا کے سامنے اس بات سے براءت کرتا ہوں کہ تم میں سے (یعنی انسانوں میں سے) کوئی میرا ''دوست'' ہو کیونکہ خدا نے مجھے اپنا دوست بنا لیا، جس طرح ابراہیم کو اس نے اپنا دوست بنا لیا تھا، اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو دوست بنا سکتا تو ابوبکر کو بناتا۔'' ❹

وفات کے وقت زبان مبارک سے جو فقرہ بار بار ادا ہو رہا تھا یہ تھا:

((اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقَ الْاَعْلٰی)) ''خدایا! صرف رفیق اعلیٰ مطلوب ہے۔''

یہ الفاظ سن کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ ''اب آپ ﷺ ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے۔'' ❺

اس ''رفاقت علوی'' کے راز سے جو کسی قدر آشنا ہیں وہ اس فقرہ کی یہ تشریح کرتے ہیں:

''انبیا علیہم السلام چوں از مقام دعوت فارغ می گردند ومتوجہ عالم بقا می

❶ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الولد: ۵۹۹۹۔ ❷ سنن ابن ماجہ، ابواب الزھد، باب ما یرجی من رحمۃ اللّٰہ: ۴۲۹۷۔ ❸ ابوداود، کتاب الجنائز، باب الامراض المکفرۃ للذنوب: ۳۰۸۹۔
❹ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النھی عن بناء المساجد علی القبور: ۱۱۸۸۔
❺ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاتہ: ۴۴۳۶، ۴۴۶۳۔

شوند و مصلحت رجوع (الی الخلق) تمام می شوو بشوق تمام
ندائے الرفیق الا علیٰ برآوردہ بہ کلیت متوجہ حق جل شانہ
میگردند و درمراتب قرب سیر می نمایند۔'' ❶

توکل علی اللہ

توکل کے یہ معنی ہیں کہ انسان کوششوں کے نتائج اور واقعات عالم کے فیصلے کو خدا کے سپرد کر دے۔ اسباب وعلل کے پردے اس کے سامنے سے اٹھ جائیں اور وہ براہ راست ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں نظر آئے، بظاہر اسباب وعلل گونا موافق ہوں مگر یہ غیر متزلزل یقین پیدا ہو کہ یہ ناموافق حالات ہمارے کام میں ذرہ بھر مؤثر نہیں ہو سکتے بلکہ اصلی قوت وقدرت عالم اسباب سے ماوراہستی کے ہاتھ میں ہے، انسان کا استقلال، عزم، جرأت و بیباکی یہ تمام باتیں اسی ایک اصل کی پرتو ہیں اس کی بدولت مشکل سے مشکل اوقات میں بھی زمام صبر اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتی، پرخطر سے پرخطر راستوں میں بھی جبن اور ضعفِ ہمت اس کے قلب میں راہ نہیں پاتا، شدید سے شدید حالات میں بھی اس کے دل پر مایوسی کا بادل نہیں چھاتا۔

آنحضرت ﷺ کے سوانح زندگی کا ایک ایک حرف پڑھ جاؤ تم کو صاف نظر آئے گا کہ اس آسمان کے نیچے شدائد اور مصیبتوں کی کوئی ایسی صنف نہ ہوگی جو آپ کی راہ میں حائل نہ ہوئی ہو، لیکن آپ ﷺ کا دل کبھی اضطراب وانتشار، مایوسی و ناامیدی اور خوف وبیم سے آشنا نہ ہوا۔ نہ مکہ کی تنہائیوں میں، مصائب کے ہجوم میں دشمنوں کے نرغہ میں، حنین واُحد کے خون ریز معرکوں میں ہر جگہ توکل واعتماد علی اللہ کا ایک ہی جلوہ نظر آتا ہے۔ ابوطالب سمجھاتے ہیں کہ ''جانِ پدر! اس کام سے ہاتھ اٹھاؤ'' آپ ﷺ فرماتے ہیں: ''عم محترم! میری تنہائی کا خیال نہ کیجیے حق زیادہ دیر تک تنہا نہیں رہے گا، عجم وعرب ایک دن اس کے ساتھ ہوگا۔'' ایک دوسرے جواب میں آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ ''خدا مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا۔'' ❷ مکہ میں ایک مصیبت زدہ مایوس صحابی سے ارشاد ہوتا ہے: ''خدا کی قسم! عنقریب وہ وقت آتا ہے جب یہ دین مرتبۂ کمال کو پہنچ جائے گا، اور خدا کے سوا کسی اور کا ڈر نہیں رہے گا۔'' ❸

ایک دفعہ حرم میں بیٹھ کر کفار نے باہم مشورہ کیا کہ محمد ﷺ اب جیسے ہی یہاں قدم رکھیں ان کی بوٹی بوٹی اڑا دی جائے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ان کی یہ تقریریں سن رہی تھیں، وہ روتی ہوئی آپ ﷺ کے پاس آئیں اور واقعہ عرض کیا، آپ ﷺ نے ان کو تسکین دی اور وضو کے لیے پانی مانگا، وضو کر کے آپ ﷺ بے خطر حرم کی سمت روانہ ہو گئے جب خاص صحن حرم میں پہنچے اور کفار کی نظر آپ پر پڑی، خود بخود نگاہیں جھک گئیں۔ ❹

❶ مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ مکتوب ۲۷۲ ج۱، ص: ۳٤۱ نول کشور پریس۔
❷ یہ دونوں واقع ابن ہشام میں ہیں۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ..... ۳۵۹۵۔ ❹ مسند احمد، ج۱، ص: ۳٦۸۔

جلد اول میں پڑھ چکے ہو کہ شب ہجرت میں قریش کے بہادر خون آشام ارادوں کے ساتھ کاشانہ اقدس کا محاصرہ کیے ہوئے تھے لیکن آپ ﷺ نے نہایت سکون واطمینان کے ساتھ اپنے عزیز قوت بازو علی مرتضی رضی اللہ عنہ کو اپنی جگہ بستر پر لٹا دیا، حالانکہ اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ قتل گاہ ہے، بستر خواب نہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی معلوم تھا کہ ایک اور قادر کل ہستی ہے جو تختہ مقتل کو فرش گل بنا سکتی ہے، ان کو لٹاتے ہوئے نہایت بے پروائی سے فرمایا: ''تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔'' ❶

گھر کے چاروں طرف دشمنانِ قریش محاصرہ کئے ہوئے تھے اور خیال ہو سکتا تھا کہ صبح امید کے انتظار میں مکہ کے برنا و پیر عجب نہیں کوچوں اور گلیوں میں مشتاق خبر چل پھر رہے ہوں لیکن آپ ﷺ نے اذنِ الٰہی کے اعتماد پر ان تمام ناموافق حالات کی موجودگی میں گھر سے باہر قدم نکالا۔ اس وقت سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیتیں زبان مبارک پر تھیں جن میں نبوت کی اور اپنے راہ راست پر ہونے کی تصدیق ہے۔ آخری آیت یہ تھی:

﴿ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ ﴾ (۳۶/ يٰسٓ:۹)

''ہم نے ان کے آگے اور ان کے پیچھے دیواریں کھڑی کر دی ہیں، ہم نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے کہ وہ نہیں دیکھتے ہیں۔''

مکہ سے نکل کر آپ ﷺ نے مع حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے غار ثور میں پناہ لی۔ قریش میں خون آشامی کے ساتھ اب اپنی ناکامی کا غصہ بھی تھا، اور اس لیے اس وقت ان کے انتقام کے جذبات میں غیر معمولی تلاطم ہو گا وہ آپ ﷺ کے تعاقب میں نشان قدم کو دیکھتے ہوئے ٹھیک اسی غار کے پاس پہنچ گئے کون کہہ سکتا ہے کہ اس پر خطر حالت میں کسی کے حواس برجا رہ سکتے ہیں، چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گھبرا کر عرض کی کہ ''یا رسول اللہ! دشمن اس قدر قریب ہیں کہ اگر ذرا نیچے جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھیں گے تو ہم پر نظر پڑ جائے گی۔'' لیکن آپ ﷺ نے روحانیت کی پرسکون آواز میں فرمایا: ''ان دو کو کیا غم ہے جن کے ساتھ تیسرا خدا ہو۔'' ❷ پھر جیسا کہ قرآن مجید میں ہے، فرمایا:

﴿ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ ﴾ (۹/ التوبۃ:۴۰) ''غم نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔''

سینۂ نبوت کے سوا اس روحانی سکون کا جلوہ اور کہاں نظر آ سکتا ہے۔

قریش کے اس اعلان کے بعد کہ جو محمد ﷺ کو زندہ، یا ان کا سر کاٹ کر لائے گا، اس کو سو اونٹ ملیں گے، سراقہ بن جعشم نے آپ ﷺ کا تعاقب کیا، اور اس قدر قریب پہنچ گیا، کہ وہ آپ ﷺ کو پا سکتا تھا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بار بار گھبرا کر ادھر دیکھ رہے تھے، لیکن آپ ﷺ نے ایک دفعہ بھی مڑ کر نہیں دیکھا کہ

❶ ابن هشام، ج ۱، ص: ۲۸۹ وطبری ج ۳، ص: ۱۲۳۲؛ دلائل النبوة للبيهقي، ج ۲، ص: ۴۶۸۔
❷ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ: ۳۶۵۳، ۳۹۲۲؛ مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل ابی بکر: ۶۱۶۹۔

سراقہ کس ارادہ سے آ رہا ہے، یہاں دل پر وہی سکینت ربانی طاری تھی اور لب ہائے مبارک تلاوت قرآن میں مصروف تھے۔ ❶

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مدینہ آ کر آپ ﷺ کی زندگی ہر قسم کے خطروں سے محفوظ ہو گئی تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ گو اسلام کو یہاں اعوان وانصار کی ایک معتدبہ تعداد مل گئی تھی، لیکن اسی کے ساتھ ان دشمنوں کا سامنا بھی تھا جو دشمنان مکہ سے زیادہ خطرناک تھے مکہ میں قریش گو آپ ﷺ کے دشمن تھے، لیکن ان میں اور رسول اللہ ﷺ میں نسبی تعلقات تھے جو کبھی کبھی کسی کو غمخواری اور مواسات پر بھی مائل کر دیتے تھے، لیکن مدینہ کے منافقین اور یہود کو مواسات و ہمدردی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی، علاوہ بریں یہود و منافقین مدینہ اور قریش مکہ میں باہم آنحضرت ﷺ کے قتل وجلاوطنی کی سازشیں شروع ہو گئی تھیں، ❷ اس بنا پر صحابہ رضی اللہ عنہم جان نثاری کی بنا پر آ کر راتوں کو پہرہ دیا کرتے تھے، اسی زمانہ میں ایک رات صحابہ آپ کے خیمہ کا پہرہ دے رہے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ﴾ (٥/ المآئدة: ٦٧) ''اور اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا۔''

اور آپ نے اسی وقت خیمہ سے سر باہر نکال کر صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

((ايها الناس! انصرفوا فقد عصمني الله)) ❸

''لوگو! واپس جاؤ میری حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا ہے۔''

غزوۂ نجد سے واپسی میں آپ ﷺ نے ایک مقام پر پڑاؤ کیا۔ یہاں بہت سے درختوں کے جھنڈ تھے، دوپہر کا وقت تھا، صحابہ درختوں کے سایہ میں ادھر ادھر سو رہے تھے، آپ بھی ایک درخت کے نیچے تنہا استراحت فرما تھے۔ آپ کی تلوار ایک درخت سے لٹکی تھی کہ ناگاہ ایک بدو جو شاید اسی موقع کی تاک میں تھا چپکے سے آیا اور آپ کی تلوار اتار کر نیام سے باہر کی اور آپ کے سامنے آیا کہ دفعتہً آپ ہوشیار ہوئے دیکھا کہ ایک بدو تیغ بکف کھڑا ہے بدو نے پوچھا: ''اے محمد ﷺ! اب مجھ سے تم کو کون بچا سکتا ہے؟'' ایک پر اطمینان صدا آئی کہ ''اللہ''! ❹

ایک دفعہ ایک شخص گرفتار ہو کر پیش ہوا کہ یہ آپ ﷺ پر حملہ کی گھات میں تھا آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کو چھوڑ دو کہ یہ مجھ کو قتل کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا۔'' ❺ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ میری حفاظت کا ذمہ دار کوئی اور ہے۔ خیبر میں جس یہودیہ نے آپ کو زہر دیا تھا اس سے دریافت کیا کہ ''تم نے یہ حرکت کیوں کی؟'' اس نے جواب دیا کہ ''آپ ﷺ کے قتل کرنے کے لیے'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدا تم

❶ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی ﷺ: ٣٩٠٦۔ ❷ سیرت جلد اول، سلسلہ غزوات، ص: ٢٠٧ وما بعد۔ ❸ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة المائدة: ٣٠٤٦۔
❹ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة ذات الرقاع...: ٤١٣٦۔ ❺ مسند ابن حنبل، ج٣، ص:٤٧١۔

کو اس پر مسلط نہ کرتا۔'' [1]

اُحد اور حنین کے معرکوں میں جب میدانِ جنگ تھوڑی دیر کے لیے جان نثاروں سے خالی ہو گیا تھا آپ ﷺ کا استقلال توکل علی اللہ وسکینت روحانی کی معجزانہ مثال ہے۔ یہ توکل اور اعتماد علی اللہ کی یک رخی تصویر ہے اس مرقع کا دوسرا رخ بھی کچھ اس سے کم مؤثر نہیں ہے۔ آپ ﷺ پر فقر وغنا کے مختلف دور گزرے کوئی دن ایسا آتا کہ مسجد نبوی کا صحن زر ومال سے معمور ہو جاتا اور پھر متصل کئی کئی دن ایسے آتے کہ فاقہ سے شکم مبارک پر دو دو تین تین پتھر بندھے ہوتے حالانکہ بالکل ممکن تھا کہ آج کا سرمایہ کل کے مصارف کے لیے اٹھا رکھا جائے لیکن تمام عمر آپ ﷺ کا طرزِ عمل اس کے خلاف رہا کبھی ایک دن کی آمدنی دوسرے دن کے لیے اٹھا کر نہیں رکھی گئی ضروری اور بقدرِ کفالت اخراجات کے بعد جو کچھ بچ جاتا وہ شام تک اہل استحقاق پر صرف کر دیا جاتا تھا، ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

ان رسول اللہ ﷺ کان لا یدخر لغد۔ [2]

''آنحضرت ﷺ کل کے لیے کوئی چیز اٹھا کر نہیں رکھتے تھے۔''

اتفاق سے یا بھولے سے اگر کوئی چیز گھر میں رہ جاتی تو آپ ﷺ کو سخت تکلیف ہوتی تھی، [3] بلکہ آپ ﷺ اس وقت تک گھر میں تشریف نہیں لے جاتے تھے جب تک یہ نہ معلوم ہو جاتا کہ اب وہاں خدا کی برکت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ [4] اس قسم کے متعدد واقعات جود وسخا کے عنوان میں مذکور ہیں۔

نزع کے وقت جب انسان ہر چیز کو فراموش کر دیتا ہے آپ ﷺ کو یاد آیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں، وہ پڑی ہوں گی، اس نازک موقع پر بھی یہ سہو آپ کو توکل علی اللہ کی شان کے خلاف نظر آیا، ارشاد ہوا کہ ''عائشہ! کیا محمد (ﷺ) خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا، جاؤ پہلے ان کو خیرات کر دو۔'' [5]

صبر وشکر

رنج وغم کے متعاقب اور توأم دور کس کی زندگی میں نہیں آتے لیکن انسان کے روحانی کمال کا جوہر یہ ہے کہ ایک طرف حصول مقصد اور کامیابی کے نشہ میں سرشار اور از خود رفتہ ہو تو دوسری طرف مصائب وآلام کی تلخی کو خندہ جبینی اور کشادہ دلی کے ساتھ گوارا کرلے اور یہ یقین رکھے کہ انسان کا فرض صرف عمل ہے کامیابی و ناکامی دونوں کا سر رشتہ کسی بالاتر ہستی کے ہاتھ میں ہے۔ قرآن مجید نے اس آیت میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

---

[1] صحیح مسلم، کتاب السلام، باب السم: ۵۷۰۵۔ [2] ترمذی، ابواب الزھد، باب ماجآء فی معیشة النبی ﷺ: ۲۳۶۲۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب من صلی بالناس فذکر حاجته فتخطاھم: ۸۱۵، ۱۲۲۱ ومسند احمد، ج۶، ص: ۲۹۳۔ [4] ابو داود، کتاب الخراج والامارة، باب قبول ھدایا المشرکین: ۳۰۵۵۔ [5] مسند احمد، ج۶، ص: ۴۹ وابن سعد جزء الوفاة، جز ثانی قسم ثانی، ص: ۳۳۔

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ ۚ لِّكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۙ﴾ (۵۷/ الحدید:۲۲۔۲۳)

''جتنی مصیبتیں زمین پر اور خود تم پر نازل ہوتی تھیں وہ ان کے وجود سے پہلے دیوان قضا میں لکھ لی گئی ہیں، یہ بات خدا کے لیے آسان ہے، یہ اس لیے کیا گیا، تا کہ تم ناکامی پر غم اور حصول مقصد پر فخر نہ کرو، خدا مغرور اور فخار کو دوست نہیں رکھتا۔''

رسول اللہ ﷺ کو اپنی زندگی میں وہ بڑی سے بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں جو اس آسمان کے نیچے نوع انسان کے کسی فرد کو حاصل ہوسکتی تھیں۔ تاہم آپ ﷺ کے آئینہ دل میں کبھی فخر وغرور نے اپنا عکس نہیں ڈالا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((انا سید ولد آدم ولا فخر)) ''میں آدم کے بیٹوں کا سردار ہوں، لیکن مجھے اس پر فخر نہیں۔'' عدی بن حاتم طائی نے جو مذہبًا عیسائی تھے آپ ﷺ کے جو حالات سنے تھے ان کی بنا پر ان کو یہ شک تھا کہ آپ ﷺ بادشاہ ہیں یا پیغمبر؟ جب وہ اپنے قبیلہ کا وفد لے کر حاضر خدمت ہوئے تو عین اسی وقت ایک مسکین سی عورت اپنی کسی غرض کے لیے بارگاہِ اقدس میں آئی اور مجمع سے ذرا ہٹ کر کچھ سن لینے کی درخواست کی، آپ ﷺ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اس وقت تک گلی میں کھڑے رہے جب تک وہ خود اپنی مرضی سے چلی نہیں گئی۔ عدی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی تواضع اور خاکساری کا یہ عالم دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ آپ پیغمبر ہیں، بادشاہ نہیں۔ [1]

مفتوح شہروں میں داخل ہوتے ہوئے دنیا کے ہر فاتح کا سر غرور وناز سے بلند ہو جاتا ہے لیکن مکہ وخیبر کا فاتح اس وقت بھی اپنا سر نیاز بارگاہ ایزدی میں جھکا کر شہر میں داخل ہوا۔ ابن اسحاق نے روایت کی ہے کہ فتح مکہ میں جب آنحضرت ﷺ ذی طویٰ میں پہنچے اور دیکھا کہ خدا نے آپ ﷺ کو فتح کی عزت عطا کی ہے تو آپ ﷺ نے اپنی سواری پر توقف کیا۔

ان رسول اللّٰہ ﷺ لما انتھی الی ذی طوی وقف علی راحلته لیضع رأسه تواضعًا للّٰہ حین رای ماا کرمه اللّٰہ به من الفتح حتی ان عثنونه لیکاد یمس واسطة الرحل۔ [2]

''جب آنحضرت ﷺ ذی طویٰ میں پہنچے اور دیکھا کہ خدا نے آپ ﷺ کو فتح کی عزت عطا کی ہے تو آپ نے اپنی سواری پر توقف کیا، تا کہ اپنا سر خدا کے سامنے جھکا لیں پھر یہاں تک آپ جھکے کہ آپ کی ٹھڈی قریب تھی کہ کجاوہ کی لکڑی سے لگ جائے۔''

آنحضرت ﷺ کثرت سے عبادت اور تسبیح وتہلیل کیا کرتے تھے، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی:

[1] سیرت ابن ہشام، ج۲، ص:۳۷۵۔ [2] سیرت ابن ھشام ذکر فتح مکه، ج۲، ص:۲۶۹۔

یارسول اللہ! خدا تو آپ ﷺ کو بے گناہ اور معصوم بنا چکا اب آپ کیوں یہ زحمت اٹھاتے ہیں ارشاد ہوا:

((افلا اکون عبدا شکورا))۔ [1] ''کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔''

یعنی اگر یہ تعبد و تسبیح و تحمید پہلے اس مرتبہ کے حصول کے لیے تھی تو اب اس مرتبہ کے حصول پر شکر گزاری اور احسان مندی کے اعتراف میں ہے۔

دنیا کے اعاظم رجال جن کو روحانیت کا کوئی حصہ نہیں دیا گیا اپنی ہر کامیابی کو اپنی قوت بازو، اپنے حسن تدبیر اور اپنے ذاتی رعب وداب کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن مقربینِ الٰہی کی اصطلاح میں یہ تخیل شرک و کفر کے ہم پایہ ہے ان کو ہر کامیابی اور مسرت کے واقعہ کے اندر خود قادرِ کل کا دستِ غیر مرئی کام کرتا ہوا نظر آتا ہے حدیث میں ہے: [2]

انه کان اذا جاء ه امر سرور اوبشر به خرّسا جدًا شاکرًا لله تعالی ۔

''آنحضرت ﷺ کے پاس جب کوئی خوشی کی خبر آتی تھی تو خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے آپ ﷺ فوراً سجدہ میں گر پڑتے تھے۔''

قبیلہ ہمدان کے اسلام لانے کی خبر جب آپ ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے سجدۂ شکر ادا کیا [3] اسی طرح ایک دفعہ اور کسی بات کی آپ ﷺ کو خبر دی گئی تو آپ فوراً سجدۂ الٰہی بجالائے۔ [4] وحی کے ذریعہ سے جب آپ ﷺ کو یہ معلوم ہوا کہ جو مجھ پر درود بھیجے گا اس پر خدا درود بھیجے گا، تو اس رفعِ منزلت پر آپ ﷺ نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ [5]

حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے ساتھ مکہ سے مدینہ طیبہ روانہ ہوئے اور جب مقام عزورا کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر گئے اور ہاتھ اٹھا کر دیر تک بارگاہِ الٰہی میں دعا کی پھر سجدہ میں گئے اور دیر تک اسی حالت میں پڑے رہے۔ پھر سر اٹھا کر بدستور دعا کے لئے ہاتھ پھیلائے اور پھر دیر تک سجدہ میں رہے پھر اُٹھ کر تضرع کے ساتھ دعا شروع کی اور اس کے بعد جبین نیاز خاک پر رکھی، اس دعا و سجود سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ''میں نے اپنی امت کی مغفرت کے لیے خدا سے دعا مانگی تھی جس کا ایک حصہ مقبول ہوا، میں شکر کے لیے سجدہ میں گرا پھر مزید درخواست کی اس نے وہ بھی قبول کی، میں سجدۂ شکر بجالایا اور پھر دعا وزاری کی۔ اس نے اس کو بھی درجۂ استجابت بخشا اور پھر میں سجدہ میں گر پڑا۔'' [6]

سورۂ والضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اسی وصف کو نمایاں فرمایا ہے:

﴿ وَالضُّحٰى ۙ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۭ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التهجد، باب قیام النبی ﷺ اللیل: ۱۱۳۰۔ [2] ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی سجود الشکر: ۲۷۷۴۔ [3] زاد المعاد بحواله بیهقی بسند علی شرط البخاری، ج ۱، ص: ۹۷۔

[4] زاد المعاد مذکور بحواله ابن ماجه۔ [5] مسند احمد عن عبدالرحمٰن بن عوف، ج۱، ص: ۱۹۱۔

[6] ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی السجود الشکر: ۲۷۷۵۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰىؕ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَاٰوٰىۖ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰىۖ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰىؕ فَاَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْؕ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْؕ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ (۹۳/ الضحیٰ:۱ تا ۱۱)

''(اے پیغمبر)! دن کے پہلے پہر کی قسم، اور رات کی قسم جب وہ پردہ ڈال دے کہ تیرے پروردگار نے نہ تو تجھ کو چھوڑا اور نہ تجھ سے ناراض ہوا یقیناً تیری پچھلی زندگی پہلی سے بہتر ہے، وہ تجھ کو وہ کچھ دے گا جس سے تو خوش ہو جائے گا، کیا اس نے تجھ کو یتیم نہیں پایا تو اپنی پناہ میں لے لیا، اور تجھ کو راہ حق کا جویاں پایا تو اس نے سیدھی راہ دکھادی اور تجھ کو مفلس پایا تو غنی کر دیا تو (ان نعمتوں کے شکریہ میں) یتیم پر ظلم نہ کرنا اور سائل کو نہ جھڑکنا اور اپنے پروردگار کے احسان کو یاد کرتے رہنا۔''

آپ ﷺ کی سوانح زندگی کا حرف حرف شاہد ہے کہ آپ ﷺ عمر بھر کیونکر اس ارشاد ربانی کی تعمیل کرتے رہے۔

صبر کا مفہوم بالکل شکر کے مخالف ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کی ذات پاک میں یہ دونوں متضاد اوصاف ایک ساتھ جمع ہو گئے تھے اور آپ کو عملاً دونوں کے اظہار کا موقع ملا۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابی نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ ''یا رسول اللہ! سب سے زیادہ مصیبت کس پر آتی ہے؟'' ارشاد ہوا کہ ''پیغمبروں پر، پھر اسی طرح درجہ بدرجہ لوگوں پر'' [1] واقعات بھی اس روایت کی تصدیق کرتے ہیں آپ سرورِ انبیا تھے اس بنا پر دنیا کے شدائد اور مصائب کا بار اس مقدس گروہ میں سب سے زیادہ آپ کے دوش مبارک پر تھا اسی لیے قرآن مجید میں بار بار آپ کو صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ سورۂ احقاف میں ہے:

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (۴٦/ الاحقاف:۳۵)

''(اے پیغمبر)! جس طرح اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا تم بھی صبر کرو۔''

آپ ﷺ ابھی پیدا نہ ہوئے تھے کہ والد نے انتقال کیا۔ عہد طفولیت میں تھے کہ سر سے ماں کا سایہ اٹھ گیا، اس کے دو برس کے بعد دادا نے جن کی نگاہ لطف زخم یتیمی کا مرہم تھی، وفات پائی، نبوت کے بعد ابوطالب نے جو قریش کے ظلم وستم کی سپر تھے، مفارقت کی، محرم اسرار ام المؤمنین خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا جو اس ہجوم مصائب میں آپ کی تنہا مونس وغم خوار تھیں، موت نے ان کو بھی اسی زمانہ میں آپ ﷺ سے علیحدہ کر دیا، والدین اور بیوی کے بعد انسان کو سب سے زیادہ اولاد سے محبت ہوتی ہے جس کی مفارقت کا زخم تمام عمر مندمل نہیں ہوتا آپ ﷺ کی اولاد ذکور حسبِ اختلافِ روایت کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ آٹھ تھی، لڑکیوں کی تعداد چار تھی لیکن ایک (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا) کے سوا سب نے کمسنی یا جوانی میں آپ ﷺ کی

---

[1] سنن ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب الصبر علی البلاء:۴۰۲۳۔

نگاہوں کے سامنے جان دی۔ ان واقعات پر اگرچہ کبھی کبھی آپ ﷺ کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں لیکن زبان ودل پر ہمیشہ صبر وسکینت کی مہر لگی رہی اور کبھی کوئی کلمہ زبان مبارک سے ایسا نہیں نکلا جس سے کارکنان قضا کی شکایت کا پہلو نکلتا ہو۔

آپ ﷺ کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے ۸ھ میں وفات پائی تو تجہیز و تکفین کے متعلق آپ ﷺ نے خود بہ نفسِ نفیس ہدایات دیں۔ جنازہ قبر کے سامنے رکھا گیا تو آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، لیکن زبان مبارک سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ (پروردۂ خاص) اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ (ابن عم) دونوں آپ ﷺ کو بہت محبوب تھے۔ غزوۂ موتہ میں ان کی شہادت کی خبر آئی تو چشم مبارک اشک آلود ہوگئی، [1] لیکن اسی اثنا میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر سے نوحہ کی آواز آئی تو آپ ﷺ نے منع کر بھیجا، آپ کا ایک نواسہ جس سے آپ ﷺ کو محبت تھی، مبتلائے نزع ہوا تو صاحبزادی نے بلا بھیجا لیکن آپ ﷺ نے اس کے جواب میں سلام کے بعد یہ پیغام بھیجا:

((ان للّٰہ ما اخذ و لہ ما اعطی و کل عندہ باجل مسمی فلتصبر و لتحتسب)) [2]

''اللہ نے جو لے لیا وہ اسی کا تھا اور جو دیا وہ بھی اسی کا ہے، اس کا ہر کام وقت مقررہ پر ہوتا ہے، صبر کرو اور اس سے خیر طلب کرو۔''

صاحبزادی نے دوبارہ بہ اصرار بلایا۔ آپ ﷺ چند صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے بچہ آپ ﷺ کی گود میں رکھ دیا گیا وہ دم توڑ رہا تھا، آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یا رسول اللہ ﷺ! یہ کیا ہے'' فرمایا: ''یہ جذبہ محبت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دل میں رکھا ہے، خدا اپنے بندوں میں سے رحم دلوں ہی پر رحم کرتا ہے۔'' [3]

ایک بار آپ ﷺ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی عیادت کو تشریف لائے اور ان کی حالت دیکھ کر فرمایا: ''انتقال کر گئے؟۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: ''نہیں یا رسول اللہ'' آپ ﷺ رو پڑے تو آپ کو روتے دیکھ کر صحابہ رضی اللہ عنہم بھی رو پڑے آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ آنکھوں کے آنسو اور دل کے غم کو منع نہیں کرتا لیکن (زبان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ) اس سے عذاب ہوتا ہے۔'' [4] حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت جب آپ ﷺ کی آنکھوں سے اشک محبت جاری ہوئے تو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یا رسول اللہ ﷺ! یہ کیا بات ہے'' فرمایا: ''یہ رحمت وشفقت ہے۔'' حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے دوبارہ گزارش کی، ارشاد ہوا: [5]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجنائز: ۱۲۹۹، ۱۳۰۵ دیکھو۔ [2] بخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبی ﷺ یعذب المیت...... الخ: ۱۲۸٤۔ [3] ایضًا۔ [4] بخاری، کتاب الجنائز، باب البکاء عند المریض: ۱۳۰٤۔ [5] ان تمام واقعات کے لیے صحیح بخاری، کتاب الجنائز دیکھو۔

((ان العين تدمع والقلب يحزن ولا نقول الا مايرضى ربنا وانا بفراقك يا ابراهيم لمحزونون)) [1]

''آنکھ اشک ریز ہے، دل غمگین ہے، لیکن ہم وہی کہیں گے جو ہمارے رب کی مرضی ہو۔ اے ابراہیم! ہم تمہارے فراق میں بہت غمگین ہیں۔''

بہر حال یہ واقعات آنی ہیں یعنی ان کا اثر ایک خاص وقت تک انسان پر رہتا ہے پھر مٹ جاتا ہے لیکن مسلسل اور غیر منقطع مصائب وحوادث کو اس طرح برداشت کرنا کہ کبھی پیمانۂ صبر لبریز نہ ہونے پائے۔ سخت مشکل ہے ہجرت سے پہلے ۱۳ سال تک طائف اور مکہ کے اشقیا، نے دعوت حق کا جس تحقیر واستہزاء، سب وشتم، تعذیب وایذارسانی کے ساتھ جواب دیا، اس کے دہرانے کی حاجت نہیں۔ مدینہ منورہ میں آٹھ نو برس تک جن خونی معرکوں کا ہمیشہ سامنا رہا اور دشمنوں نے آپ کی جلاوطنی وقتل وشکست کے جو جو منصوبے باندھے ان کے اعادہ کی بھی ضرورت نہیں لیکن ان تمام تیروں کی بوچھاڑ صبر کے سوا آپ ﷺ نے کس سپر پر روکی؟

اس سے بھی زیادہ مشکل ان واقعات پر صبر ہے جو خود اختیاری ہوں، فتوحات کی کثرت گو ہر دفعہ بیت المال کو معمور کر دیتی تھی لیکن دست کرم کو اسی وقت آرام ملتا جب سارا خزانہ اربابِ حاجت اور فقرا میں لٹ چکا ہوتا، چنانچہ اسی بنا پر خود آپ ﷺ اور تمام اہل بیت کی زندگی اکثر فقر و فاقہ میں گزرتی تھی۔ جسم مبارک کے لیے ایک کے سوا کپڑے کا کوئی دوسرا جوڑا نہیں ہوتا تھا تاہم یہ تمام شدائد اس لیے گوارا تھے کہ صبر کی لذت الوانِ نعمت کی خوشگواری اور لباس ہائے فاخرہ کی مسرت سے کہیں زیادہ تھی۔ لیکن سب سے زیادہ حوصلہ شکن اور صبر آزما اس تیر کا نشانہ ہے جو دشمنوں کے نہیں بلکہ دوستوں کے ہاتھ سے لگایا جائے، دو دفعہ ایسا ہوا کہ بعض جلد باز نوجوانوں نے آپ ﷺ کے کسی فعل پر جو کسی مصلحت پر مبنی تھا اعتراض کیا اس موقع پر بھی صبر کا رشتہ آپ کے ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ غنائمِ حنین کے متعلق ایک دو انصاریوں نے اعتراض کیا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ دوسروں کو کیوں دے دیا، حق تو ہمارا تھا، آپ ﷺ کو اس کی خبر پہنچی۔ فرمایا:

((رحمة الله على موسىٰ قد اوذى اكثر من ذالك فصبر)) [2]

''موسیٰ پر خدا کی رحمت ہو وہ اس سے بھی زیادہ (اپنے دوستوں کی طرف سے) ستائے گئے ہیں لیکن انہوں نے صبر کیا۔''

---

[1] بخاری، کتاب الجنائز، باب انابك لمحزونون: ۱۳۰۳۔

[2] بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة حنين: ٤٣٣٥۔

اخلاقِ نبوی ﷺ

﴿ وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾ (٦٨/ القلم:٤)

حضرت رسالت پناہ ﷺ کی حیاتِ اقدس کا یہ وہ حصہ ہے جہاں آ کر آپ کی زندگی تمام انبیائے کرام اور مصلحین عالم سے علانیہ ممتاز نظر آتی ہے، تاریخی ہستی کا ثبوت ایک طرف، اگر یہ سوال کیا جائے کہ ان اخلاقی واعظوں کا خود عملی نمونہ کیا تھا، تو دنیا اس کے جواب سے عاجز رہ جائے گی، دنیا کے تمام مصلحین اخلاق میں گوتم بدھ اور مسیح علیہ السلام کا درجہ سب سے بڑا ہے، لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ہندوستان کا یہ مصلحِ اعظم (بودھ) عملاً خود کیا تھا؟ کوہِ زیتون کے رحیمانہ اخلاق کا واعظ (مسیح علیہ السلام) دنیا کو اخلاق کا بہترین درس دیتا تھا، لیکن اس کی زندگی کا ایک واقعہ بھی اس کے زریں مقولوں کی تائید میں تم کو معلوم ہے؟ [1] لیکن مکہ کا معلم اُمّی پکار کر کہتا:

﴿ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ (٦١/ الصف:٢)

''جو نہیں کرتے، وہ کہتے کیوں ہو۔''

وہ خود اپنی تعلیم کا آپ نمونہ تھا، انسانوں کے مجمعِ عام میں وہ جو کچھ کہتا تھا، گھر کے خلوت کدہ میں وہ اسی طرح نظر آتا تھا، اخلاق و عمل کا جو نکتہ وہ دوسروں کو سکھاتا تھا، وہ خود اس کا عملی پیکر بن جاتا تھا، بیوی سے بڑھ کر انسان کے اخلاق کا اور کون راز داں ہو سکتا ہے، چند صاحبوں نے آ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے درخواست کی کہ حضرت ﷺ کے اخلاق بیان کیجئے، انہوں نے پوچھا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ان خلق رسول اللہ ﷺ کان القران۔ ''آپ ﷺ کا اخلاق ہمہ تن قرآن تھا۔'' [2]

موجودہ صحائف آسمانی اپنے داعیوں کے بہترین اقوال کا مجموعہ ہیں لیکن کیا ان کا ایک حرف بھی اپنے مبلغین کے عمل کا مدعی ہے، قرآن مجید لاکھوں مخالفین اور اہل عناد کی بھیڑ میں اپنے داعی حق کی نسبت گویا تھا:

﴿ وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾ (٦٨/ القلم:٤)

''اے محمد! تم اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو۔''

بے درد نکتہ چیں آج تیرہ سو برس کے بعد آپ ﷺ کو سنگ دل کہتے ہیں، لیکن اس وقت جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا، قرآن خود دشمنوں کے مجمع میں آپ کی نسبت کیا شہادت دے رہا تھا:

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ﴾

(٣/ آل عمران:١٥٩)

''خدا کی عنایت سے تم ان سے بہ نرمی پیش آتے ہو، اگر تم کہیں کج خلق اور سخت دل ہوتے تو

---

[1] اس عبارت میں اہل کتاب اور دیگر اقوام و مذاہب کے صحیفوں میں انبیا اور بزرگوں کے جو احوال مذکور ہیں ان کی طرف اشارہ ہے۔ اس کی تفسیر کے لیے سیرۃ النبی ﷺ جلد ا عنوان ''پیغمبروں پر آنحضرت کی فضیلت حاشیہ ص:۲،۳ دیکھنا چاہیے۔'' ''ض'' [وطبع ہذا ج ا ص: ۲۳،۳۱]

[2] ابوداود، کتاب التطوع، باب فی صلاۃ اللیل:١٣٤٢۔

یہ لوگ تمہارے آس پاس سے ہٹ جاتے۔''

دوسری جگہ کہتا ہے:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (۹/ التوبة:۱۲۸)

''تمہارے پاس تم میں سے خود ایک پیغمبر آیا، اس پر تمہاری تکلیف بہت شاق گزرتی ہے، تمہاری بھلائی کا وہ بھوکا ہے، اہل ایمان پر نہایت نرم اور مہربان ہے۔''

مسئلہ اخلاق کی نسبت ایک بڑی غلطی یہ کی گئی ہے کہ صرف رحم و رافت اور تواضع و خاکساری کو پیغمبرانہ اخلاق کا مظہر قرار دے دیا گیا، حالانکہ اخلاق وہ چیز ہے جو زندگی کی ہر تہ میں اور واقعات کے ہر پہلو میں نمایاں ہوتی ہے، دوست و دشمن، عزیز و بیگانہ، صغیر و کبیر، مفلس و تونگر، صلح و جنگ، خلوت و جلوت غرض ہر جگہ اور ہر ایک تک دائرۂ اخلاق کی وسعت ہے۔ آنحضرت ﷺ کے عنوان اخلاق پر اسی حیثیت سے نظر ڈالنی چاہیے۔

اخلاق نبوی ﷺ کا جامع بیان

اس سے پہلے کہ حضور انور ﷺ کے اخلاق مبارکہ کے جزئی اور تفصیلی واقعات لکھے جائیں، ان صاحبوں کے بیانات زیر تحریر آتے ہیں، جنہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سالہا سال اور مدت ہائے دراز بسر کی ہیں اور جو آپ ﷺ کے اخلاق و عادات کے دفتر کے ایک ایک حرف سے واقف تھے، انسان کے حالات کا واقف کار بیوی سے بڑھ کر دنیا میں کون ہو سکتا ہے، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا جو نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد ۲۵ برس تک آپ کی خدمت زوجیت میں رہی تھیں، زمانۂ آغاز وحی میں آپ ﷺ کو ان الفاظ میں تسلی دیتی تھیں ''ہرگز نہیں، خدا کی قسم! خدا آپ کو کبھی غمگین نہ کرے گا، آپ صلۂ رحم کرتے ہیں، مقروضوں کا بار اٹھاتے ہیں، غریبوں کی اعانت کرتے ہیں مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، حق کی حمایت کرتے ہیں، مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔'' [1]

امہات المؤمنین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر کسی نے آپ ﷺ کے اوصاف تفصیل سے نہیں بیان کیے ہیں۔ فرماتی ہیں: آنحضرت ﷺ کی عادت کسی کو برا بھلا کہنے کی نہ تھی، برائی کے بدلہ میں برائی نہیں کرتے تھے، بلکہ درگزر کرتے تھے اور معاف فرما دیتے تھے [2] آپ ﷺ کو جب دو باتوں میں اختیار دیا جاتا، تو ان میں جو آسان ہوتی اس کو اختیار فرماتے، بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو، ورنہ آپ ﷺ اس سے بہت دور ہوتے، آپ ﷺ نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا، لیکن جو احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتا خدا اس سے انتقام لیتا تھا، [3] (یعنی خدا کی طرف سے بموجب احکامِ ربانی آپ اس پر حد جاری

---

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی: ۳۔

[2] جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی خلق النبی ﷺ: ۲۰۱٦ وشمائل ترمذی: ۳٤٦۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قول النبی ﷺ یسروا ولا تعسروا......: ٦١٢٦ ومسلم، کتاب الفضائل، باب مباعدته للآثام...... ٦٠٤٥ وابوداود کتاب الادب، باب التجاوز فی الامر: ٤٧٨٥۔

فرماتے تھے) آپ نے نام لے کر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی، آپ نے کبھی کسی غلام کو، لونڈی کو، کسی عورت کو، خادم کو، جانور کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، ❶ آپ ﷺ نے کبھی کسی کی کوئی درخواست رد نہیں فرمائی لیکن یہ کہ وہ ناجائز ہو، ❷ آپ جب گھر کے اندر تشریف لاتے تو نہایت خنداں، ہنستے اور مسکراتے ہوئے، دوستوں میں پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے، ❸ باتیں ٹھہر ٹھہر کر اس طرح فرماتے تھے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ لے۔ ❹

حضرت علی رضی اللہ عنہ جو آنحضرت ﷺ کے تربیت یافتہ تھے اور آغاز نبوت سے آخر عمر تک کم از کم ۲۳ برس آپ کی خدمت اقدس میں رہے تھے۔ ایک دفعہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے ان سے آپ ﷺ کے اخلاق و عادات کی نسبت سوال کیا، فرمایا: آپ خندہ جبین، نرم خو، مہربان طبع تھے، سخت مزاج اور تنگ دل نہ تھے، بات بات پر شور نہیں کرتے تھے، کوئی برا کلمہ منہ سے کبھی نہیں نکالتے تھے، عیب جو اور تنگ گیر نہ تھے، کوئی ایسی بات ہوتی جو آپ کے ناپسند ہوتی تو اس سے اغماض فرماتے تھے، کوئی آپ سے اس کی امید رکھتا تو نہ اس کو مایوس بناتے تھے اور نہ منظوری ظاہر فرماتے تھے، (یعنی صراحتاً انکار و تردید نہیں کرتے تھے، بلکہ خاموش رہتے تھے اور مزاج شناس آپ کے تیور سے آپ کا مقصد سمجھ جاتے تھے) اپنے نفس سے تین چیزیں آپ نے بالکل دور کر دی تھیں، بحث و مباحثہ، ضرورت سے زیادہ بات کرنا اور جو بات مطلب کی نہ ہو اس میں پڑنا، دوسروں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز کرتے تھے، کسی کو برا نہیں کہتے تھے، کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے، کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے، وہی باتیں کرتے تھے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا تھا، جب آپ کلام کرتے صحابہ رضی اللہ عنہم اس طرح خاموش ہو کر اور سر جھکا کر سنتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں، جب آپ چپ ہو جاتے تو پھر وہ آپس میں بات چیت کرتے، کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک وہ بات ختم نہ کر لیتا، چپ سنا کرتے، لوگ جن باتوں پر ہنستے آپ بھی مسکرا دیتے، جن پر لوگ تعجب کرتے، آپ بھی کرتے، کوئی باہر کا آدمی اگر بے باکی سے گفتگو کرتا تو آپ تحمل فرماتے، دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے لیکن اگر کوئی آپ کے احسان و انعام کا شکریہ ادا کرتا تو قبول فرماتے، جب تک بولنے والا خود چپ نہ ہو جاتا آپ اس کی بات درمیان سے نہیں کاٹتے تھے۔ ❺ نہایت فیاض، نہایت راست گو، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے، اگر کوئی دفعتہً آپ کو دیکھتا تو مرعوب ہو جاتا لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا

❶ یہ تفصیل مسلم اور ابوداؤد وغیرہ احادیث کی مختلف روایات میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ مسلم: ٦٠٥٠؛ ابن ماجه: ١٩٨٤؛ شمائل ترمذی: ٣٤٧۔ ❷ مستدرك حاكم به سند متصل، كتاب التاريخ ذكر خلق رسول الله ﷺ، ج ٢، ص: ٦١٣، ٦١٤ اس کے بعض ٹکڑے صحیح مسلم: ۲۰۴۸ میں بھی ہیں۔ ❸ ابن سعد جزء اوّل، قسم ثانی، ص: ٩١، ٩٩۔ ❹ صحيح بخاری: ٣٥٦٨؛ صحيح مسلم: ٦٣٩٩؛ ابوداود: ٣٦٥٥۔

❺ یہ پوری تفصیل شمائل ترمذی بیانِ اخلاق: ۳۵۰ میں ہے۔

جاتا، آپ سے محبت کرنے لگتا۔ ❶

ہند بن ابی ہالہ جو گویا آنحضرت ﷺ کے آغوش پروردہ تھے وہ بیان کرتے ہیں ❷ کہ آپ ﷺ نرم خو تھے، سخت مزاج نہ تھے، کسی کی توہین روا نہیں رکھتے تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہار شکر فرماتے تھے کسی چیز کو برا نہیں کہتے تھے کھانا جس قسم کا سامنے آتا تناول فرماتے اور اس کو برا بھلا نہ کہتے، کوئی اگر کسی امر حق کی مخالفت کرتا تو آپ ﷺ کو غصہ آجاتا اور اس کی پوری حمایت کرتے لیکن خود اپنے ذاتی معاملہ پر کبھی آپ کو غصہ نہیں آیا اور نہ کسی سے انتقام لیا۔

مداومت عمل

اخلاق کا سب سے مقدم اور ضروری پہلو یہ ہے کہ انسان جس کام کو اختیار کرے اس پر اس قدر استقلال کے ساتھ قائم رہے کہ گویا وہ اس کی فطرتِ ثانیہ بن جائے، انسان کے سوا تمام دنیا کی مخلوقات صرف ایک ہی قسم کا کام کرسکتی ہے اور وہ فطرۃً اسی پر مجبور ہے، آفتاب صرف روشنی بخشتا ہے، اس سے تاریکی کا صدور نہیں ہوسکتا، رات تاریکی ہی پھیلاتی ہے، وہ روشنی کی علت نہیں، درخت اپنے موسم ہی میں پھلتے ہیں اور پھول ایام بہار ہی میں پھولتے ہیں، حیوانات کا ایک ایک فرد اپنے نوعی افعال و اخلاق سے ایک سرمو تجاوز نہیں کرسکتا، لیکن انسان خدا کی طرف سے مختار پیدا ہوا ہے، وہ آفتاب بھی ہے اور رات کی تاریکی بھی، اس کے جوہر کا درخت ہر موسم میں پھلتا ہے اور اس کے اخلاق کے پھول ایام بہار کے پابند نہیں، وہ حیوانات کی طرح کسی ایک ہی خاص قسم کے اعمال و اخلاق پر مجبور نہیں اس کو اختیار دیا گیا ہے اور یہی اختیار اس کے مکلّف اور ذمہ دار ہونے کا راز ہے۔ لیکن اخلاق کا ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے اخلاق حسنہ کا جو پہلو پسند کرے، اس کی اس شدت سے پابندی کرے اور اس طرح دائمی اور غیر متبدل طریقے سے اس پر عمل کرے کہ گویا وہ اپنے اختیار کے باوجود اس کام کے کرنے پر مجبور ہے اور لوگ دیکھتے دیکھتے یہ یقین کرلیں کہ اس شخص سے اس کے علاوہ اور کوئی بات سرزد ہو ہی نہیں سکتی گویا اس سے یہ افعال اس طرح صادر ہوتے ہیں جیسے آفتاب سے روشنی، درخت سے پھل، پھول سے خوشبو، کہ یہ خصوصیات ان سے کسی حالت میں الگ نہیں ہو سکتیں، اس کا نام استقامتِ حال اور مداومتِ عمل ہے۔ آنحضرت ﷺ اپنے تمام کاموں میں اسی اصول کی پابندی فرماتے تھے، جس کام کو جس طریقہ سے جس وقت آپ ﷺ نے شروع فرمایا، اس پر برابر شدت کے ساتھ قائم رہتے تھے، سنت کا لفظ ہماری شریعت میں اسی اصول سے پیدا ہوا ہے، سنت وہ فعل ہے جس سے آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ مداومت فرمائی ہے اور بغیر کسی قوی مانع کے کبھی اس کو ترک نہیں فرمایا، اس بنا پر جس قدر سنن ہیں وہ درحقیقت آپ ﷺ کی استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کی ناقابلِ انکار مثالیں ہیں،

❶ یہ ٹکڑا شمائل ترمذی بیان حلیہ مبارک: ۷، ص: ۳۵ میں ہے۔

❷ شمائل ترمذی: ٢٤٦ تا ٣٥٠ میں اسی مفہوم کی روایات ہیں۔

آپ ﷺ کے معمولات کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے، جس سے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ آپ ﷺ کے تمام اخلاق و اعمال کس قدر پختہ اور مستحکم تھے کہ کبھی تمام عمران میں ایک ذرہ فرق نہیں پیدا ہوا، ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کے عبادات و اعمال کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ کیا آپ ﷺ کسی خاص دن یہ کرتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا لا کان عمله ديمة۔ آپ ﷺ کا عمل جھڑی ہوتا تھا یعنی جس طرح بادل کی جھڑی جب برسنے پر آتی ہے تو نہیں رکتی، اس طرح آپ ﷺ کا حال تھا کہ جو بات ایک دفعہ آپ ﷺ نے اختیار کر لی، ہمیشہ اس کی پابندی کی، پھر فرمایا: وايكم يستطيع ما كان النبي ﷺ يستطيع۔ ''آنحضرت ﷺ جو کر سکتے تھے وہ تم میں سے کون کر سکتا ہے؟'' ❶

دوسری روایت میں ہے:

وكان اذا عمل عملاً اثبته۔ ❷

''جب آنحضرت ﷺ کوئی کام کرتے تھے تو اس پر مداومت فرماتے تھے۔''

اس لیے آنحضرت ﷺ کا خود ارشاد ہے:

ان احبّ العمل الى الله ادومه۔ ❸

''خدا کے نزدیک سب سے محبوب وہ کام ہے جس پر سب سے زیادہ انسان مداومت کرے۔''

آپ ﷺ راتوں کو اٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی رات کی یہ عبادت ترک نہیں کی، اگر کبھی مزاج اقدس ناساز یا سست ہوا تو بیٹھ کر ادا کرتے تھے۔ ❹ جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں، جن کو دیکھ کر آپ ﷺ محبت سے مسکرا دیا کرتے تھے، ان کا بیان ہے کہ کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا ہوں اور آپ ﷺ نے مسکرا نہ دیا ہو۔ ❺

جس کام کے کرنے کا جو وقت آپ ﷺ نے مقرر کر لیا تھا اس میں کبھی تخلف نہ ہوا، نماز اور تسبیح و تہلیل کے اوقات، نوافل کی تعداد، خواب اور بیداری کے مقررہ ساعات، ہر شخص سے ملنے جلنے کے طرز و انداز میں کبھی فرق نہیں آیا اور اب وہی مسلمانوں کی زندگی کا دستور العمل ہے۔

حسنِ خلق

حضرت علی، حضرت عائشہ، حضرت انس، حضرت ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہم وغیرہ جو مدتوں آپ ﷺ کی خدمت میں رہے تھے، ان سب کا متفقہ بیان ہے کہ آپ ﷺ نہایت نرم مزاج، خوش اخلاق اور نیک سیرت

---

❶ صحيح بخاری، كتاب الرقاق، باب القصد والمداومة على العمل: ٦٤٦٦۔ ❷ ابو داود، كتاب التطوع، باب مايؤمر به من القصد في الصلوٰة: ١٣٦٨۔ ❸ بخاری: ٤٣؛ مسلم: ١٨٢٧ تا ١٨٣٤؛ ابو داود: ١٣٦٨۔ ❹ ابو داود، كتاب التطوع، باب قيام الليل: ١٣٠٧۔

❺ صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل جرير بن عبدالله: ٦٣٦٣۔

تھے، آپ ﷺ کا چہرہ ہنستا تھا، وقار ومتانت سے گفتگو فرماتے تھے، کسی کی خاطر شکنی نہیں کرتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام اور مصافحہ فرماتے۔ کوئی شخص جھک کر آپ ﷺ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اس کی طرف سے رخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منہ نہ ہٹا لے، مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا، یعنی کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک وہ خود نہ چھوڑ دے، اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے، مجلس میں بیٹھتے تو آپ ﷺ کے زانو کبھی ہم نشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے۔ ❶

اکثر نوکر چاکر، لونڈی غلام خدمت اقدس میں پانی لے کر آتے کہ آپ اس میں ہاتھ ڈال دیں، تا کہ متبرک ہو جائے، جاڑوں کے دن اور صبح کا وقت ہوتا، تاہم آپ ﷺ کبھی انکار نہ فرماتے۔ ❷

ایک دفعہ آپ ﷺ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے ملنے گئے، واپس آنے لگے تو انہوں نے اپنے صاحبزادہ قیس رضی اللہ عنہ کو ساتھ کر دیا، کہ آنحضرت ﷺ کے ہمرکاب جائیں، آنحضرت ﷺ نے قیس سے کہا: ''تم بھی میرے اونٹ پر سوار ہولو۔'' انہوں نے بے ادبی کے لحاظ سے تامل کیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یا سوار ہولو، یا گھر واپس جاؤ۔'' وہ واپس چلے آئے۔ ❸

ایک دفعہ نجاشی کے ہاں سے ایک سفارت آئی، آپ ﷺ نے اس کو اپنے ہاں مہمان رکھا اور خود بہ نفس نفیس مہمانداری کے تمام کام انجام دیئے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ ہم یہ خدمت انجام دیں گے، ارشاد ہوا: ''ان لوگوں نے میرے دوستوں کی خدمت گزاری کی ہے اس لیے میں خود ان کی خدمت گزاری کرنی چاہتا ہوں۔'' ❹

عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ جو اصحاب بدر میں تھے، ان کی بینائی میں فرق آ گیا تھا، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر درخواست کی کہ میں اپنے محلّہ کی مسجد میں نماز پڑھاتا ہوں، لیکن جب بارش ہو جاتی ہے تو مسجد تک جانا مشکل ہو جاتا ہے اس لیے اگر آپ ﷺ میرے گھر میں تشریف لا کر نماز پڑھ لیتے تو میں اس جگہ کو سجدہ گاہ بنا لیتا۔ دوسرے دن صبح کے وقت آپ ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر ان کے گھر گئے اور دروازہ پر ٹھہر کر اذن مانگا۔ اندر سے جواب آیا تو گھر میں تشریف لے گئے اور دریافت فرمایا: ''کہاں نماز پڑھوں؟'' انہوں نے جگہ بتا دی آپ ﷺ نے تکبیر کہہ کر دو رکعت نماز ادا کی، نماز کے بعد لوگوں نے کھانے کے لئے اصرار کیا، خزیرہ ایک کھانا ہوتا ہے، قیمہ پر آٹا چھڑک کر تیار کرتے ہیں، وہ سامنے آیا، محلّہ کے تمام لوگ کھانے میں شریک ہوئے، حاضرین میں سے کسی نے کہا: مالک بن دُخشن نظر نہیں آتے، ایک نے کہا وہ منافق ہے، ارشاد فرمایا: ''یہ نہ کہو وہ لا الہ الا اللہ کہتے ہیں۔'' لوگوں نے کہا: ہاں ان کا میلان منافقین کی طرف ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص خدا کی مرضی کے لیے لا الہ الا اللہ کہتا ہے، خدا اس پر

❶ ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب تواضعه مع جليسه: ۲٤۹۰؛ ابو داود: ٤۷۹٤؛ ابن ماجه: ۳۷۱٦۔

❷ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی قرب النبی ﷺ من الناس: ٦٠٤٢۔

❸ ابو داود، کتاب الادب، باب کم مرة یسلم الرجل: ٥١٨٥۔

❹ شرح شفاء قاضی عیاض، ج ۲، ص: ۱۰۰ مطبعه عثمانیه: ۱۳۱۲ھ بحواله دلائل بیهقی جلد اخلاق۔

آگ کو حرام کر دیتا ہے۔“ ❶

(ابتدائے ہجرت میں خود آنحضرت ﷺ اور تمام مہاجرین انصار کے گھر مہمان رہے تھے، دس دس آدمیوں کی ایک ایک جماعت ایک ایک گھر میں مہمان اتاری گئی تھی، مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اس جماعت میں تھا جس میں خود آنحضرت ﷺ شامل تھے، گھر میں چند بکریاں تھیں جن کے دودھ پر گزارا تھا، دودھ دوھ چکتا تو سب لوگ اپنے اپنے حصہ کا پی لیتے اور آپ کے لئے پیالہ میں چھوڑ دیتے، ایک شب کا واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری میں تاخیر ہوئی، لوگ دودھ پی کر سو رہے۔ آپ نے آ کر دیکھا تو پیالہ خالی پایا، خاموش ہو رہے، پھر فرمایا: ”خدایا، جو آج کھلا دے اس کو تو بھی کھلا دینا۔“ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ چھری لے کر کھڑے ہوئے کہ بکری کو ذبح کر کے گوشت پکائیں، آپ نے روکا اور بکری کو دوبارہ دوھ کر جو کچھ نکلا اسی کو پی کر سو رہے ❷ اور کسی کو اس فعل پر ملامت نہ کی)۔ ابوشعیب رضی اللہ عنہ ایک انصاری تھے، ان کا غلام بازار میں گوشت کی دوکان رکھتا تھا، ایک دن وہ خدمت اقدس میں آئے، آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کے حلقہ میں تشریف فرما تھے اور چہرہ سے بھوک کا اثر پیدا تھا، ابوشعیب رضی اللہ عنہ نے جا کر غلام سے کہا کہ پانچ آدمیوں کا کھانا تیار کرو، کھانا تیار ہو چکا تو آ کر آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ قدم رنجہ فرمائیں، کل پانچ آدمی تھے، راہ میں ایک اور شخص ساتھ ہو لیا، آنحضرت ﷺ نے ابوشعیب رضی اللہ عنہ سے کہا: ”یہ شخص بے کہے ساتھ ہو لیا ہے، تم اجازت دو تو یہ بھی ساتھ آئے، ورنہ رخصت کر دیا جائے۔“ انہوں نے کہا: آپ ان کو بھی ساتھ لائیں۔ ❸

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ پہاڑ کے درہ میں اونٹ پر سوار جا رہے تھے، یہ بھی ساتھ تھے، آنحضرت ﷺ نے ان سے کہا: ”آؤ سوار ہو لو۔“ انہوں نے اس کو گستاخی سمجھا کہ رسول اللہ کو پیادہ بنا کر خود سوار ہوں، آنحضرت ﷺ نے دوبارہ کہا، اب انکار کرنا امتثال امر کے خلاف تھا، آنحضرت ﷺ اتر پڑے اور یہ سوار ہوئے۔ ❹ مجالس صحبت میں لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت فرماتے، اور اس کا اظہار نہ کرتے، حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے جب نکاح ہوا، اور دعوت ولیمہ کی تو کچھ لوگ کھانا کھا کر وہیں بیٹھے رہے، اس وقت پردہ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا بھی مجلس میں شریک تھیں، آپ ﷺ چاہتے تھے کہ لوگ اٹھ جائیں لیکن زبان سے کچھ نہیں فرماتے تھے، لوگوں نے کچھ خیال نہ کیا، آپ ﷺ اٹھ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ تک گئے واپس آئے تو اسی طرح مجمع موجود تھا، پھر واپس چلے گئے اور دوبارہ تشریف لائے۔ پردہ کی آیت اسی موقع پر اتری۔ ❺

---

❶ بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب المساجد فی البیوت: ۴۲۵۔ ❷ مسند احمد، ج ۶، ص: ۴۔

❸ بخاری، کتاب الاطعمۃ، باب الرجل یدعی الی الطعام: ۵۴۶۱۔ ❹ نسائی، کتاب الاستعاذۃ: ۵۴۳۹۔

❺ بخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ: لا تدخلوا بیوت النبی…… ۴۷۹۱، ۴۷۹۲۔

غزوۂ حنین سے واپس آ رہے تھے کہ راہ میں نماز کا وقت آ گیا، حسب دستور ٹھہر گئے، مؤذن نے اذان دی، ابو محذورہ جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے، چند دوستوں کے ساتھ گشت لگا رہے تھے، اذان سن کر سب نے چلا چلا کر استہزا کے طور پر اذان کی نقل اتارنی شروع کی، آنحضرت ﷺ نے سب کو بلوا کر ایک ایک سے اذان کہلوائی، ابو محذورہ خوش لحن تھے، ان کی آواز پسند آئی، سامنے بٹھا کر سر پر ہاتھ پھیرا اور برکت کے لیے دعا کی، پھر ان کو اذان سکھلا کر ارشاد فرمایا: ''جاؤ اس طرح حرم میں اذان دیا کرنا۔'' ❶

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ بچپن میں میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا اور ڈھیلوں سے مار کر کھجوریں گراتا، لوگ مجھ کو خدمت اقدس میں لے گئے، آپ ﷺ نے پوچھا: ''ڈھیلے کیوں چلاتے ہو؟'' میں نے کہا: کھجوروں کے لیے، ارشاد فرمایا: ''زمین پر ٹپکی ہوئی کھجوریں کھا لیا کرو، ڈھیلے نہ مارو۔'' یہ کہہ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔ ❷

عباد بن شرحبیل مدینہ میں ایک صاحب تھے، ایک دفعہ قحط پڑا اور بھوک کی حالت میں ایک باغ میں گھس گئے اور خوشے توڑ کر کچھ کھائے، کچھ دامن میں رکھ لیے، باغ کے مالک کو معلوم ہوا تو اس نے ان کو مارا اور کپڑے اتروا لیے، یہ آنحضرت ﷺ کے پاس شکایت لے کر آئے، مدعا علیہ بھی ساتھ تھا، آپ نے اس کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: ''یہ جاہل تھا اس کو تعلیم دینا تھا، یہ بھوکا تھا، اس کو کھانا کھلانا تھا۔'' یہ کہہ کر کپڑے واپس دلوائے اور ساٹھ صاع غلہ اپنے پاس سے عنایت فرمایا۔ ❸

یہود کا دستور تھا کہ عورتوں کو جب ایام آتے تو ان کو گھروں سے نکال دیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے، آنحضرت ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے، تو انصار نے آپ سے اس کے متعلق سوال کیا، اس پر آیت اتری کہ اس حالت میں مقاربت ناجائز ہے، اس بنا پر آپ نے حکم دیا کہ مقاربت کے سوا کوئی چیز منع نہیں، یہودیوں نے آپ کا حکم سنا تو بولے کہ یہ شخص بات بات میں ہماری مخالفت کرتا ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کی خدمت میں آئے کہ یہود جب یہ کہتے ہیں تو ہم مقاربت بھی کیوں نہ کریں، رخسارۂ مبارک غصہ سے سرخ ہو گیا، دونوں صاحب چلے گئے، آپ نے ان کے پاس کچھ کھانے کی چیزیں بھیجیں اس وقت ان کو تسکین ہوئی کہ آپ ناراض نہ تھے۔ ❹

کسی شخص کی کوئی بات ناپسند آتی تو اکثر اس کے سامنے اس کا تذکرہ نہ فرماتے ایک دفعہ ایک صاحب عرب کے دستور کے مطابق زعفران لگا کر خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے کچھ نہ فرمایا، جب وہ اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں سے کہا: ''ان سے کہہ دینا کہ یہ رنگ دھو ڈالیں۔'' ❺

❶ دار قطنی، ۱/ ۲۳۳: ۸۹۰۔ ❷ ابوداود، کتاب الجهاد، باب من قال انه یاکل مما سقط: ۲۶۲۲۔
❸ ایضًا: ۲۶۲۰۔ ❹ ابوداود، کتاب الطهارة، باب مواکلة الحائض: ۲۵۸۔
❺ ابوداود، کتاب الادب، باب فی حسن العشرة: ۴۷۸۹۔

ایک دفعہ ایک شخص نے باریابی کی اجازت چاہی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اچھا آنے دو، وہ اپنے قبیلہ کا اچھا آدمی نہیں ہے۔'' لیکن جب وہ خدمت مبارک میں حاضر ہوا تو نہایت نرمی کے ساتھ اس سے گفتگو فرمائی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس پر تعجب ہوا اور آپ سے دریافت فرمایا کہ آپ تو اس کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، پھر اس رفق و ملاطفت کے ساتھ کلام کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدا کے نزدیک سب سے برا وہ شخص ہے، جس کی بدزبانی کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔'' [1] یہود جس درجہ شقی اور دشمن اسلام تھے، اس کا اندازہ گزشتہ واقعات سے ہو چکا ہوگا، بایں ہمہ آنحضرت ﷺ ان سنگ دلوں کے ساتھ ہمیشہ نرمی اور لطف کا برتاؤ کرتے اور ان سے داد و ستد رکھتے، سخت سے سخت غصہ کی حالت میں صرف اس قدر فرماتے: ''اس کی پیشانی خاک آلود ہو۔'' [2]

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مدینہ میں ایک یہودی رہتا تھا جس سے میں قرض لیا کرتا تھا، ایک سال اتفاق سے کھجوریں نہیں پھلیں اور قرضہ ادا نہ ہو سکا اس پر پورا سال گزر گیا، بہار آئی تو یہودی نے تقاضا شروع کیا، اب کی بار بھی پھل کم آئے، میں نے آیندہ فصل کی مہلت مانگی، اس نے انکار کیا، میں نے آنحضرت سے آ کر تمام واقعات بیان کیے، آپ ﷺ چند صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ خود یہودی کے گھر تشریف لے گئے اور سمجھایا کہ مہلت دے دو، اس نے کہا: ابوالقاسم! میں کبھی مہلت نہ دوں گا۔ آپ ﷺ نخلستان میں تشریف لے گئے اور ایک چکر لگا کر پھر یہودی کے پاس آئے اور اس سے گفتگو کی لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوا، بالآخر آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''چبوترہ پر (جو مسقف تھا) فرش بچھا دو۔'' اس پر آرام فرمایا اور سو گئے، سو کر اٹھے تو پھر یہودی سے خواہش کی کہ مہلت دے دو، اس شقی نے اب بھی نہ مانا، آپ درختوں کے جھنڈ میں جا کر کھڑے ہو گئے اور جابر سے کہا: ''کھجوریں توڑنی شروع کر۔'' آنحضرت ﷺ کی برکت سے اتنی کھجوریں نکلیں کہ یہودی کا قرضہ ادا کر کے بچ رہیں۔ [3]

مجلسِ نبوی میں جگہ بہت کم ہوتی تھی، جو لوگ پہلے سے آ کر بیٹھ جاتے تھے ان کے بعد جگہ باقی نہیں رہتی تھی ایسے موقع پر اگر کوئی آ جاتا تو اس کے لیے آپ خود اپنی ردائے مبارک بچھا دیتے تھے، ایک دفعہ مقام جعرانہ میں آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے، اور اپنے ہاتھ سے لوگوں کو گوشت تقسیم فرما رہے تھے کہ اتنے میں ایک عورت آئی اور آپ کے پاس چلی گئی، آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو اس کی نہایت تعظیم کی، اپنی چادر مبارک اس کے لیے بچھا دی، راوی کہتا ہے کہ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون عورت تھی؟ تو لوگوں نے کہا: یہ حضور ﷺ کی رضاعی ماں تھیں۔ [4]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب: ٦٠٣٢ وابوداود، کتاب الادب، باب حسن العشرۃ: ٤٧٩١۔

[2] الادب المفرد امام بخاری، باب سباب المسلم فسوق: ٤٣٥۔ [3] بخاری، کتاب الاطعمۃ، باب الرطب والتمر: ٥٤٤٣۔ [4] ابوداود، کتاب الادب، باب فی برالوالدین: ٥١٤٤۔

اس طرح ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے کہ آپ کے رضاعی والد آئے، آپ نے ان کے لیے چادر کا ایک گوشہ بچھا دیا، پھر رضاعی ماں آئیں، آپ نے دوسرا گوشہ بچھا دیا، آخر میں رضاعی بھائی آئے، تو آپ اٹھ کھڑے ہوئے اوران کو اپنے سامنے بٹھالیا۔ ❶

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں، ایک دفعہ ان کو بلا بھیجا تو وہ گھر میں نہیں ملے، تھوڑی دیر کے بعد حاضر خدمت ہوئے تو آپ لیٹے ہوئے تھے، ان کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے سینہ سے لگالیا۔ ❷ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بھی جب حبشہ سے واپس آئے تھے تو آپ نے ان کو گلے لگالیا اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ ❸ سلام میں پیش دستی فرماتے، راستہ میں جب چلتے تو مرد، عورتیں بچے جو سامنے آتے ان کو سلام کرتے ❹ ایک دفعہ آپ ﷺ راستہ سے گزر رہے تھے ایک مقام پر مسلمان اور منافق وکافر یکجا بیٹھے ملے، آپ نے سب کو سلام کیا۔ ❺ کسی کی کوئی بات بری معلوم ہوتی تو مجلس میں نام لے کر اس کا ذکر نہیں کرتے تھے، بلکہ صیغۂ تعمیم کے ساتھ فرماتے تھے کہ لوگ ایسا کرتے ہیں، لوگ ایسا کہتے ہیں، بعض لوگوں کی یہ عادت ہے یہ طریقۂ ابہام اس لئے اختیار فرماتے تھے کہ شخص مخصوص کی ذلت نہ ہو اور اس کے احساسِ غیرت میں کمی نہ آجائے۔

حسن معاملہ

اگرچہ غایت فیاضی کی وجہ سے اکثر مقروض رہتے تھے یہاں تک کہ وفات کے وقت بھی آپ ﷺ کی زرہ من بھر غلہ پر ایک یہودی کی ہاں گروی تھی، لیکن ہر حال میں حسنِ معاملہ کا سخت اہتمام تھا، مدینہ میں دولت مند عموماً یہودی تھے اور اکثر انہی سے آپ قرض لیا کرتے، یہودی عموماً دنی الطبع اور سخت گیر ہوتے تھے، آپ ان کی ہر قسم کی بدمزاجیاں برداشت فرماتے تھے۔

نبوت سے پہلے جن لوگوں سے آپ ﷺ کے تاجرانہ تعلقات تھے، انہوں نے ہمیشہ آپ کی دیانت اور حسن معاملہ کا اعتراف کیا ہے، اسی لیے قریش نے متفقاً آپ کو امین کا خطاب دیا تھا، نبوت کے بعد بھی گو قریش بغض وکینہ کے جوش سے لبریز تھے، تاہم ان کی دولت کے لیے مامون مقام آپ ہی کا کاشانہ تھا، عرب میں سائب رضی اللہ عنہ نام کے ایک تاجر تھے، وہ مسلمان ہو کر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے، لوگوں نے مدحیہ الفاظ میں آپ سے ان کا تعارف کرایا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔'' سائب رضی اللہ عنہ نے کہا: میرے ماں باپ فدا، آپ میرے ساجھی تھے، لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا۔ ❻

---

❶ ابوداود، کتاب الادب، باب فی برالوالدین: ٥١٤٥۔ ❷ ابوداود، کتاب الادب، باب فی المعانقة: ٥٢١٤۔ ❸ ابوداود، باب فی قبلة ما بین العینین: ٥٢٢٠۔ ❹ بخاری، کتاب الاستئذان، باب التسليم علی الصبیان: ٦٢٤٧، ٦٢٤٨ وابوداود، کتاب الادب، باب فی السلام علی الصبیان، ٥٢٠٢، ٥٢٠٣ السلام علی النسآء: ٥٢٠٤۔ ❺ بخاری، کتاب الاستئذان، باب التسليم فی مجلس فيه: ٦٢٥٤۔
❻ ابوداود، کتاب الادب، باب فی کراهية المراء: ٤٨٣٦۔

ایک دفعہ ایک شخص سے کچھ کھجوریں قرض کے طور پر لیں۔ چند روز کے بعد وہ تقاضا کو آیا آپ نے ایک انصاری کو حکم دیا کہ اس کا قرضہ ادا کر دیں، انصاری نے کھجوریں دیں لیکن ویسی عمدہ نہ تھیں جیسی اس نے دی تھیں، اس شخص نے لینے سے انکار کیا، انصاری نے کہا تم رسول اللہ ﷺ کی عطا کردہ کھجور کے لینے سے انکار کرتے ہو، بولا ہاں رسول اللہ ﷺ عدل نہ کریں گے تو اور کس سے توقع رکھی جائے، آنحضرت ﷺ نے یہ جملے سنے تو آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور فرمایا: ''یہ بالکل سچ ہے۔'' [1]

ایک دن ایک بدو آیا جس کا کچھ قرضہ آنحضرت ﷺ پر تھا، بدو عموماً وحشی مزاج ہوتے ہیں، اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس گستاخی پر اس کو ڈانٹا اور کہا کہ تجھ کو خبر ہے تو کس سے ہم کلام ہے؟ بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں، آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا: ''تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہیے، کیونکہ اس کا حق ہے۔'' (قرض خواہ کو بولنے کا حق ہے) اس کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کا قرض ادا کر دینے کا حکم صادر فرمایا اور زیادہ دلوایا۔ [2]

ایک غزوہ میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ ہمرکاب تھے، ان کی سواری میں جو اونٹ تھا سست رو تھا اور تھک جانے کی وجہ سے اور بھی سست ہو گیا تھا، آپ نے اونٹ ان سے خرید لیا اور دام کے ساتھ اونٹ بھی ان کو دے دیا کہ دونوں تمہارے ہیں۔ [3]

یہی واقعہ ایک روایت میں اس طرح پر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا: ''تمہارے پاس کوئی لکڑی ہو تو دو۔'' انہوں نے دی، آپ نے اس سے اونٹ کو مارا تو وہ اس قدر تیز دوڑنے لگا کہ سب سے آگے نکل گیا پھر آنحضرت ﷺ نے ان سے چار دینار پر اونٹ اس شرط پر خرید لیا کہ مدینہ تک ان کا سواری کا حق ہے، مدینہ پہنچ کر جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے قیمت طلب کی، آپ نے بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''ان کو قیمت چار دینار اور اس سے کچھ اور زیادہ بھی دو۔'' چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے چار دینار پر ایک قیراط سونا اور زیادہ دیا۔ [4]

معمول تھا کہ کوئی جنازہ لایا جاتا تو پہلے فرماتے کہ میت پر کچھ قرضہ تو نہیں ہے، اگر معلوم ہوتا کہ مقروض تھا تو صحابہ سے فرماتے: ''جنازہ کی نماز پڑھا دو، خود شریک نہ ہوتے۔'' [5]

ایک دفعہ کسی سے اونٹ قرض لیا، جب واپس کیا تو اس سے بہتر اونٹ واپس کیا اور فرمایا: ''سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرض کو خوش معاملگی سے ادا کرتے ہیں۔'' [6]

---

[1] طبرانی الاوسط: ۵۰۲۹۔ [2] ابن ماجہ، ابواب الصدقات، باب لصاحب الحق سلطان: ۲۴۲۵، ۲۴۲۶۔

[3] صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب شراء الدواب: ۲۰۹۷۔ [4] صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، باب اذا وکل رجل رجلا ان یعطی شیئًا: ۲۳۰۹، روایت میں یوں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ قیمتاً نہیں بلکہ ہدیتاً یہ اونٹ حضور ﷺ کی نذر کرنا چاہتے تھے، اور مدینہ پہنچ کر انہوں نے خود سے قیمت بھی طلب نہیں کی بلکہ حضور ﷺ نے از خود حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو قیمت ادا کرنے کا حکم دیا۔ ''ض'' [5] صحیح بخاری، کتاب الکفالۃ، باب الدین: ۲۲۹۸۔

[6] ترمذی، ابواب البیوع، باب استقراض البعیر: ۱۳۱۸۔

ایک دفعہ کسی شخص سے ایک پیالہ مستعار لیا، سوئے اتفاق سے وہ گم گیا تو اس کا تاوان ادا فرمایا۔ ❶

عموماً فرمایا کرتے تھے: ''میں تین دن سے زیادہ اپنے پاس ایک دینار بھی رکھنا پسند نہیں کرتا، بجز اس دینار کے جن کو قرض ادا کرنے کے انتظار میں اپنے پاس رکھ چھوڑتا ہوں۔'' ❷

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا، آنحضرت ﷺ کو یہ خیال تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں، آپ نے ایک وسق چھوہاروں پر گوشت چکا لیا، گھر میں آ کر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے، باہر تشریف لا کر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں، اس نے واویلا مچایا کہ ہائے بد دیانتی! لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ ﷺ بد دیانتی کریں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں چھوڑ دو، اس کو کہنے کا حق ہے، پھر قصاب کی طرف خطاب کر کے وہی فقرہ ادا کیا، اس نے پھر وہی لفظ کہے، لوگوں نے پھر روکا، آپ نے فرمایا اس کو کہنے دو اس کو کہنے کا حق ہے اور اس جملہ کو کئی بار دہراتے رہے، اس کے بعد آپ نے ایک انصاریہ کے ہاں اس کو بھجوا دیا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے، جب وہ چھوہارے لے کر پلٹا تو آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس کا دل آپ کے حلم وعفو اور حسنِ معاملت سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا: محمد! تم کو خدا جزائے خیر دے تم نے قیمت پوری پوری دی اور اچھی دی۔ ❸

ایک دفعہ مدینہ منورہ کے باہر ایک مختصر سا قافلہ آ کر فروکش تھا، ایک سرخ رنگ کا اونٹ اس کے ساتھ تھا، اتفاقاً ادھر سے آپ کا گزر ہوا، آپ نے اونٹ کی قیمت پوچھی، لوگوں نے قیمت بتائی بے مول تول کئے آنحضرت ﷺ نے وہی قیمت منظور کر لی اور اونٹ کی مہار پکڑ کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے، بعد کو لوگوں کو خیال آیا کہ بے جان پہچان ہم نے جانور کیوں حوالہ کر دیا اور اس حماقت پر اب پورے قافلہ کو ندامت تھی، قافلہ کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی، اس نے کہا: ''مطمئن رہو ہم نے کسی شخص کا چہرہ ایسا روشن نہیں دیکھا'' یعنی ایسا شخص دغا نہ کرے گا، رات ہوئی تو آپ نے ان کے لیے کھانا اور قیمت بھر کھجوریں بھجوا دیں۔ ❹

غزوۂ حنین میں آپ کو کچھ اسلحہ کی ضرورت تھی۔ صفوان اس وقت تک کافر تھے، ان کے پاس بہت سی زرہیں تھیں، آپ نے ان سے کچھ زرہیں طلب کیں انہوں نے کہا محمد! کیا کچھ غصب کا ارادہ ہے؟ فرمایا: ''نہیں میں عاریۃً مانگتا ہوں اگر ان میں سے کوئی تلف ہوئی تو میں تاوان دوں گا۔'' چنانچہ انہوں نے تیس چالیس زرہیں مسلمانوں کو عاریۃً دیں، حنین سے واپسی کے بعد جب اسلحہ ودیگر سامانوں کا جائزہ لیا گیا تو کچھ زرہیں کم نکلیں، آپ ﷺ نے صفوان سے کہا: ''تمہاری چند زرہیں کم ہیں ان کا معاوضہ لے لو۔''

❶ ترمذی، ابواب الاحکام، باب ماجاء فی من یکسر له الشيء: ۱۳۶۰۔

❷ بخاری، کتاب الاستقراض، باب اداء الدیون: ۲۳۸۸، ۲۳۸۹۔ ❸ مسند احمد، ج ۶، ص: ۲۶۸۔

❹ دار قطنی، کتاب البیوع: ۳/ ۴۳، رقم: ۲۹۵۷۔

صفوان نے عرض کی: ''یا رسول اللہ ﷺ! میرے دل کی حالت اب پہلے جیسی نہیں۔'' [1] یعنی مسلمان ہو گیا، اب معاوضہ کی حاجت نہیں۔

عدل وانصاف

کوئی شخص گوشہ نشین ہو کر بیٹھ جائے تو اس کے لیے عدل وانصاف سے کام لینا نہایت آسان ہے۔ آنحضرت ﷺ کو عرب کے سینکڑوں قبائل سے کام پڑتا تھا یہ آپس میں ایک ایک کے دشمن تھے ایک کے موافق فیصلہ کیا جاتا تو دوسرا دشمن بن جاتا۔ اسلام کی اشاعت کی غرض سے ہمیشہ آنحضرت ﷺ کو تالیف قلوب سے کام لینا پڑتا۔ ان سب مشکلات اور پیچیدگیوں پر بھی عدل وانصاف کا پلہ کبھی کسی طرف جھکنے نہ پایا۔ فتح مکہ کے بعد تمام عرب میں صرف طائف رہ گیا تھا جس نے گردن تسلیم خم نہیں کی۔ آنحضرت ﷺ نے اس کا محاصرہ کیا لیکن پندرہ بیس روز کے بعد محاصرہ اٹھا لینا پڑا۔ صخر ایک رئیس تھے ان کو یہ حال معلوم ہوا تو خود جا کر طائف کی حصار بندی کی اور اہل شہر کو اس قدر دبایا کہ بالآخر وہ مصالحت پر راضی ہو گئے۔ صخر نے بارگاہ نبوت میں اطلاع کی، مغیرہ بن شعبہ ثقفی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے کہ صخر نے میری پھوپھی کو قبضہ میں کر رکھا ہے، آپ نے صخر کو بلا بھیجا اور حکم دیا کہ مغیرہ کی پھوپھی کو ان کے گھر پہنچا دو۔ اس کے بعد بنوسلیم آئے کہ جس زمانہ میں ہم کافر تھے۔ صخر نے ہمارے چشمہ پر قبضہ کر لیا تھا، اب ہم اسلام لائے ہمارا چشمہ ہم کو واپس دلایا جائے، آپ نے صخر کو بلا بھیجا اور فرمایا: ''جب کوئی قوم اسلام قبول کرتی ہے تو اپنے جان و مال کی مالک ہو جاتی ہے اس لیے ان کو چشمہ دے دو۔'' صخر کو منظور کرنا پڑا۔ راوی کا بیان ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے حکم سے صخر نے دونوں حکم منظور کیے تو میں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ کے چہرہ پر شرم سے سرخی آ گئی [2] کہ صخر کو دونوں معاملوں میں شکست ہوئی اور فتح طائف کا ان کو کوئی صلہ نہ ملا۔

ایک دفعہ ایک عورت نے جو خاندان مخزوم سے تھی، چوری کی، قریش کی عزت کے لحاظ سے لوگ چاہتے تھے کہ سزا سے بچ جائے اور معاملہ دب جائے، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے محبوب خاص تھے، لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ سفارش کیجئے، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے معافی کی درخواست کی، آپ ﷺ نے غضب آلود ہو کر فرمایا: ''بنی اسرائیل اسی کی بدولت تباہ ہوئے کہ وہ غربا پر حد جاری کرتے اور امرا سے درگزر کرتے تھے۔'' [3]

خیبر کے یہودیوں سے جب صلح ہو کر وہاں کی زمین مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تو عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ ایک دفعہ کھجوروں کی بٹائی کے لیے گئے۔ محیصہ ان کے چچیرے بھائی بھی ساتھ تھے عبداللہ گلی میں جا رہے تھے

---

[1] ابوداود، کتاب البیوع، باب تضمین العاریة: ۳۵۶۳۔

[2] ابوداود، کتاب الخراج والامارة، باب فی اقطاع الارضین: ۳۰۶۷۔

[3] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء: ۳۴۷۵۔

کہ کسی نے ان کو قتل کر کے لاش ایک گڑھے میں ڈال دی، محیصہ نے رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر استغاثہ کیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے ان کو قتل کیا'' بولے: میں نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا آپ نے فرمایا: ''تو یہود سے حلف لیا جائے؟'' بولے: ''حضرت! یہودیوں کی قسم کا اعتبار کیا، یہ سو دفعہ جھوٹی قسم کھالیں گے۔'' خیبر میں یہود کے سوا اور کوئی قوم آباد نہ تھی یہ یقینی تھا کہ یہودیوں نے ہی عبداللہ بن سہل کو قتل کیا ہے، تاہم چونکہ عینی شہادت موجود نہ تھی، آنحضرت ﷺ نے یہود سے تعرض نہیں فرمایا اور خون بہا کے سو اونٹ بیت المال سے دلوائے۔ ❶

طارق محاربی کا بیان ہے کہ جب اسلام عرب میں پھیلنا شروع ہوا، تو ہم چند آدمی ربذہ سے نکلے اور مدینہ کو روانہ ہوئے۔ شہر کے قریب پہنچ کر مقام کیا، زنانی سواری بھی ساتھ تھی، ہم سب بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صاحب سفید کپڑے پہنے ہوئے آئے اور سلام علیک کی، ہم نے سلام کا جواب دیا ہمارے ساتھ سرخ رنگ کا اونٹ تھا اس کی قیمت پوچھی، ہم نے جواب دیا اتنی کھجوریں، انہوں نے کچھ مول تول نہیں کیا، اور وہی قیمت منظور کر لی، پھر اونٹ کی مہار پکڑ کر شہر کی طرف بڑھے نظروں سے اوجھل ہو گئے تو سب کو خیال آیا کہ دام رہ گئے اور ہم لوگ ان کو پہچانتے نہیں۔ لوگوں نے ایک دوسرے کو ملزم ٹھہرانا شروع کیا محمل نشین خاتون نے کہا: مطمئن رہو، ہم نے کسی شخص کا چہرہ اس قدر چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن نہیں دیکھا (یعنی ایسا شخص دغا نہ کرے گا) رات ہوئی تو ایک شخص آیا کہ رسول اللہ ﷺ نے تمہارے لیے کھانا اور کھجوریں بھیجی ہیں۔ دوسرے دن صبح کو ہم لوگ مدینہ میں آئے، آنحضرت ﷺ مسجد میں خطبہ دے رہے تھے، ہم لوگوں کو دیکھ کر ایک انصاری نے اٹھ کر کہا: یارسول اللہ! یہ لوگ بنو ثعلبہ کے قبیلہ کے ہیں اور ان کے مورث نے ہمارے خاندان کے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا اس کے بدلہ میں ان کا ایک آدمی قتل کرا دیجئے آپ ﷺ نے فرمایا: ''باپ کا بدلہ بیٹے سے نہیں لیا جا سکتا۔'' ❷

سرق رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے، انہوں نے ایک بدوی سے ایک اونٹ مول لیا، لیکن قیمت نہ ادا ہو سکی، بدو ان کو پکڑ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے گیا اور واقعہ بیان کیا۔ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ قیمت ادا کر دو، انہوں نے ناداری کا عذر کیا، آپ ﷺ نے بدو سے کہا: ''بازار میں لے جا کر ان کو فروخت کر لو۔'' بدو ان کو بازار میں لے گیا، ایک صاحب نے دام دے کر بدو سے خریدا اور آزاد کر دیا۔ ❸

ابو حدرد اسلمی رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے، جن پر ایک یہودی کا قرض آتا تھا اور ان کے پاس بدن پر جو کپڑے تھے ان کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آنحضرت ﷺ خیبر کی مہم کا ارادہ کر رہے تھے۔ ابو حدرد نے یہودی سے کچھ مہلت طلب کی لیکن وہ نہ مانا اور ان کو پکڑ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لایا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان کا قرض ادا کر دو'' انہوں نے عذر کیا، آپ نے پھر فرمایا، انہوں نے پھر یہی

❶ یہ واقعہ بخاری، کتاب الدیات، باب القسامة: ٦٨٩٨ ونسائی، کتاب القسامة، باب تبدئة اهل الدم فی القسامة: ٤٧١٤ وغیرہ میں باختلاف روایات مذکور ہے۔ ❷ دار قطنی، کتاب البیوع: ٣/ ٤٣، رقم: ٢٩٥٧۔

❸ دار قطنی، کتاب البیوع: ٣/ ٦١، رقم: ٣٠٠٧۔

جواب دیا اور عرض کی کہ یارسول اللہ! غزوۂ خیبر قریب ہے، شاید وہاں سے واپسی پر کچھ ہاتھ آئے، تو میں اس کوادا کردوں، آپ نے پھر یہی حکم دیا کہ فوراً ادا کردو، آخر اپنا تہبند اس یہودی کو قرض میں نذر کیا اور سر سے جو عمامہ بندھا تھا، اس کو کھول کر کمر سے لپیٹ لیا۔ ❶

اس عدل وانصاف کا یہ اثر تھا کہ مسلمان ایک طرف یہود بھی جو آپ ﷺ کے شدید ترین دشمن تھے اپنے مقدمات آپ ﷺ ہی کی بارگاہ عدالت میں لاتے تھے ❷ اوران کی شریعت کے مطابق اس کا فیصلہ ہوتا تھا چنانچہ قرآن مجید میں اس واقعہ کا مصرح ذکر ہے اسلام سے پہلے یہودیان بنونضیر وقریظہ میں عزت و شرافت کی عجیب وغریب حد قائم تھی کوئی قریظی اگر کسی نضیری کو قتل کرتا تو قصاص میں وہ مارا جاتا تھا لیکن اگر کوئی قریظی کسی نضیری کے ہاتھ سے مارا جاتا تو اس کے خون کی قیمت سو بار شتر چھوہارا تھی۔ اسلام میں جب یہ واقعہ پیش آیا تو قریظہ نے آنحضرت ﷺ کے سامنے مقدمہ پیش کیا، آپ نے فوراً تورات کے آئین کے مطابق النفس بالنفس کے حکم سے دونوں قبیلوں میں برابر کا قصاص جاری کردیا۔ ❸

عدل وانصاف کا سب سے نازک پہلو یہ ہے کہ خود اپنے مقابلہ میں بھی حق کا رشتہ چھوٹنے نہ پائے ایک بار آپ مال غنیمت تقسیم فرمارہے تھے لوگوں کا گردوپیش ہجوم تھا، ایک شخص آ کر منہ کے بل آپ ﷺ پر لد گیا، دست مبارک میں پتلی لکڑی تھی آپ نے اس سے اس کو ٹھوکا دیا، اتفاق سے لکڑی کا سرا اس کے منہ میں لگ گیا اور خراش آگئی فرمایا: ''مجھ سے انتقام لے لو۔'' اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے معاف کردیا۔ ❹

مرض الموت میں آپ نے عام مجمع میں اعلان کیا کہ اگر میرے ذمہ کسی کا قرض آتا ہو، اگر میں نے کسی کی جان و مال یا آبرو کو صدمہ پہنچایا ہو تو میری جان و مال وآبرو حاضر ہے اسی دنیا میں وہ انتقام لے لے مجمع میں سناٹا تھا، صرف ایک شخص نے چند درہم کا دعویٰ کیا جو دلوادیے گئے۔ ❺

جود وسخا

جود وسخا آپ ﷺ کی فطرت تھی (ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ آپ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور خصوصاً رمضان کے مہینہ میں آپ اور زیادہ سخاوت فرماتے تھے ❻ تمام عمر کسی کے سوال پر ''نہیں'' کا لفظ نہیں فرمایا۔ ❼

((انما انا قاسم وخازن واللّٰه يعطي)) ❽

---

❶ مسند احمد، ج ۳، ص: ۴۲۳۔ ❷ ابوداود، کتاب الحدود، باب في رجم اليهوديين: ۴۴۴۶، ۴۴۴۹۔ ❸ ابوداود، کتاب الدیات، باب النفس بالنفس: ۴۴۹۴۔

❹ ابوداود، کتاب الدیات، باب القود من الضربة: ۴۵۳۶۔ ❺ ابن اسحاق بروایت ابن ہشام، طبقات ابن سعد جزء ثانی، قسم ثانی، ص: ۴۵۔ ❻ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی: ۶۔

❼ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب حسن الخلق: ۶۰۳۴۔

❽ صحیح بخاری، کتاب فرض الخمس، باب قوله تعالیٰ: فان لله خمسه: ۳۱۱۶۔۳۱۱۷۔

''میں تو صرف دینے بانٹنے والا اور خازن ہوں اور دیتا اللہ ہے۔''

ایک دفعہ ایک شخص خدمت اقدس میں آیا اور دیکھا کہ دور تک آپ ﷺ کی بکریوں کا ریوڑ پھیلا ہوا ہے اس نے آپ سے درخواست کی اور آپ نے سب کی سب دے دیں، اس نے اپنے قبیلہ میں جا کر کہا کہ اسلام قبول کر لو محمد ﷺ ایسے فیاض ہیں کہ مفلس ہو جانے کی پروا نہیں کرتے۔ ❶

ایک دفعہ ایک شخص نے کچھ مانگا آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے تم میرے ساتھ آؤ۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے عرض کی کہ آپ کے پاس کچھ موجود نہیں تو آپ ﷺ پر کیا ذمہ داری ہے ایک اور صاحب حاضر تھے، انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ دیئے جائیے اور عرش والے خدا سے نہ ڈریئے وہ آپ کو محتاج نہ کرے گا آپ فرط بشاشت سے مسکرا دیے۔ ❷

عام فیاضی کا یہ حال تھا کہ جو شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا اگر آپ کے پاس کچھ سرمایہ موجود ہوتا تو اس کو کچھ نہ کچھ ضرور عطا فرماتے ورنہ وعدہ فرماتے۔ اس معمول کی بنا پر لوگ اس قدر دلیر ہو گئے تھے کہ ایک مرتبہ عین اقامت نماز کے وقت ایک بدو آیا اور آپ کا دامن پکڑ کر کہا کہ میری ایک معمولی سی حاجت باقی رہ گئی ہے خوف ہے کہ میں اس کو بھول نہ جاؤں اس کو پورا کر دیجئے، چنانچہ آپ اس کے ساتھ تشریف لے گئے اور اس کی حاجت برآری کر کے آئے تو نماز پڑھی۔ ❸

بعض اوقات ایسا ہوتا کہ ایک شخص سے ایک چیز خریدتے، قیمت چکا دینے کے بعد پھر وہ چیز اس کو بطور عطیہ کے عنایت فرماتے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک اونٹ خریدا اور پھر اسی وقت اس کو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دے دیا۔ ❹ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی اسی قسم کا واقعہ مذکور ہے۔ ❺

کھانے پینے کی چیزوں میں معمولی سے معمولی چیز بھی تنہا نہ کھاتے بلکہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو شریک فرما لیتے۔ کسی غزوہ میں ۱۳۰ صحابہ رضی اللہ عنہم ہمراہ تھے آپ نے ایک بکری خرید کر ذبح کروائی اور کلیجی کے بھوننے کا حکم دیا، وہ تیار ہوئی تو تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو تقسیم فرمایا، جو لوگ موجود نہ تھے ان کا حصہ الگ محفوظ رکھا۔ ❻ جو چیز آنحضرت ﷺ کے پاس آتی جب تک صرف نہ ہو جاتی آپ کو چین نہ آتا۔ بے قراری سی رہتی، ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ گھر میں تشریف لائے تو چہرہ متغیر تھا، ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ! خیر ہے؟ فرمایا: ''کل جو سات دینار آئے تھے شام ہو گئی اور وہ بستر پر پڑے رہ گئے۔'' ❼

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی سخائه: ۶۰۲۰۔ ❷ شمائل ترمذی، باب ما جاء فی خُلُق رسول الله ﷺ: ۳۵٤۔ ❸ ادب المفرد، باب سخاوة النفس: ۲۷۸۔

❹ صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب اذا اشتری شیئا فوهب من ساعته: ۲۱۱۵۔

❺ بخاری، باب شراء الدواب: ۲۰۹۷۔ ❻ صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب اکرام الضیف: ۵۳٦٤۔

❼ مسند احمد، ج ٦، ص: ۲۹۳۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شب کو وہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایک راستہ سے گزر رہے تھے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ابوذر! اگر احد کا پہاڑ میرے لیے سونا ہو جائے تو میں کبھی یہ پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور میرے پاس ایک دینار بھی رہ جائے، لیکن ہاں وہ دینار جس کو میں ادائے قرض کے لیے چھوڑ دوں۔'' ❶

اکثر یہاں تک معمول تھا کہ گھر میں نقد کی قسم سے کوئی چیز موجود ہوتی تو جب تک کل خیرات نہ کر دی جاتی گھر میں آرام نہ فرماتے۔ رئیس فدک نے ایک دفعہ چار اونٹ پر غلہ بار کر کے خدمت نبوی میں بھیجا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بازار میں غلہ فروخت کر کے ایک یہودی کا قرض تھا وہ ادا کیا، پھر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر اطلاع کی، آپ ﷺ نے پوچھا: ''کچھ بچ تو نہیں رہا۔'' بولے: ہاں کچھ بچ بھی رہا، فرمایا: ''جب تک کچھ باقی رہے گا میں گھر میں نہیں جا سکتا۔'' حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا: میں کیا کروں کوئی سائل نہیں، آنحضرت ﷺ نے مسجد میں رات بسر کی۔ دوسرے دن حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آ کر کہا: یا رسول اللہ! خدا نے آپ کو سبکدوش کر دیا، یعنی جو کچھ تھا وہ بھی تقسیم کر دیا گیا آپ نے خدا کا شکر ادا کیا اور اٹھ کر گھر تشریف لے گئے۔ ❷

اسی طرح ایک بار عصر کی نماز پڑھ کر خلاف معمول فوراً گھر کے اندر تشریف لے گئے اور پھر فوراً نکل آئے، لوگوں کو تعجب ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ کو نماز میں خیال آیا کہ کچھ سونا گھر میں پڑا رہ گیا ہے گمان ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات ہو جائے اور وہ گھر میں پڑا رہ جائے اس لیے جا کر اس کو خیرات کر دینے کو کہہ آیا۔'' ❸

غزوۂ حنین میں جو کچھ ملا آنحضرت ﷺ اس کو خیرات فرما کر واپس آ رہے تھے، راہ میں بدوؤں کو خبر لگی کہ ادھر سے آنحضرت ﷺ کا گزر ہونے والا ہے، آس پاس سے دوڑ دوڑ کر آئے اور لپٹ گئے کہ ہمیں بھی کچھ عنایت ہو، آپ اژدہام سے گھبرا کر ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے، انہوں نے ردائے مبارک تھام لی، بالآخر اس کشاکش میں جسمِ اطہر سے چادر اتر کر ان کے ہاتھ میں رہ گئی۔ فیاض عالم نے کہا: ''میری چادر دے دو، خدا کی قسم اگر ان جنگلی درختوں کے برابر بھی اونٹ میرے پاس ہوتے، تو میں سب تم کو دے دیتا اور پھر مجھ کو بخیل نہ پاتے، نہ دروغ گو، نہ نامرد۔'' ❹

لوگوں کو حکم عام تھا کہ جو مسلمان مر جائے اور اپنے ذمہ قرض چھوڑ جائے تو مجھے اطلاع دو، میں اس کو ادا کر دوں گا اور جو ترکہ چھوڑ جائے وہ وارثوں کا حق ہے، ❺ مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ ایک دفعہ آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مجمع میں تشریف فرما تھے، ایک بدو آیا اور آپ کی چادر کا گوشہ زور سے کھینچ کر بولا: ''محمد! یہ مال

❶ صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، باب اداء الدیون: ۲۳۸۸، ۲۳۸۹۔ ❷ ابوداود، کتاب الخراج، باب فی الامام یقبل هدایا المشرکین: ۳۰۵۵۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب العمل فی الصلاۃ، تفکر الرجل الشيء فی الصلوۃ: ۱۲۲۱۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب الشجاعة فی الحرب: ۲۸۲۱۔
❺ صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، باب الصلوۃ علی من ترك دینا: ۲۳۹۸، ۲۳۹۹۔

نہ تیرا ہے، نہ تیرے باپ کا ہے، ایک بار شتر دے۔'' آپ ﷺ نے اس کے اونٹ کو جو اور کھجوروں سے لدوا دیا۔ ❶

ایک دفعہ بحرین سے خراج آیا اور اس قدر کثیر رقم تھی کہ اس سے پہلے کبھی دارالاسلام میں نہیں آئی تھی۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اس کو صحن مسجد میں ڈلوا دو۔ اس کے بعد جب آپ مسجد میں تشریف لائے تو اس پر مڑ کر بھی نظر نہ ڈالی۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ نے اس کی تقسیم شروع کی، جو سامنے آتا اس کو دیتے چلے جاتے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو جو غزوۂ بدر کے بعد دولت مند نہیں رہے تھے اتنا دیا کہ اٹھ کر چل نہیں سکتے تھے اسی طرح اور لوگوں کو بھی عنایت فرماتے جاتے تھے جب کچھ نہ رہا تو کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ❷

اسلام میں قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی آزاد شدہ غلام مر جائے تو اس کا ترکہ اس کے آقا کو ملتا ہے، ایک دفعہ آپ کا اسی قسم کا ایک غلام مر گیا، لوگ اس کا متروکہ سامان اٹھا کر آپ کے پاس لائے، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''کوئی اس کا یہاں ہم وطن ہے؟'' لوگوں نے کہا: ہاں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ تمام چیزیں اسی کے حوالہ کر دو۔'' ❸

ایک دفعہ چند انصار نے آپ ﷺ سے کچھ مانگا، آپ نے دے دیا، پھر مانگا، پھر دیا، پھر جب تک رہا آپ دیتے رہے، یہاں تک کہ آپ کے پاس کچھ نہیں رہا، لیکن وہ باوجود اس کے حاضر ہوئے اور درخواست کی، فرمایا: ''میرے پاس جو کچھ ہو، میں اس کو تم سے بچا کر نہیں رکھوں گا۔'' ❹

ایثار

آپ ﷺ کے اخلاق و عادات میں جو وصف سب سے زیادہ نمایاں اور جس کا اثر ہر موقع پر نظر آتا تھا، وہ ایثار تھا۔ اولاد سے آپ کو بے انتہا محبت تھی، اور ان میں حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اس قدر عزیز تھیں کہ جب آتیں فرط محبت سے کھڑے ہو جاتے، پیشانی کو بوسہ دیتے، اور اپنی جگہ بٹھاتے، تاہم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عسرت اور تنگ دستی کا یہ حال تھا کہ گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی، خود چکی پیستیں اور خود ہی پانی کی مشک بھر لاتیں۔ چکی پیستے پیستے ہتھیلیاں گھس گئیں تھیں اور مشک کے اثر سے سینہ پر نیل پڑ گئے تھے ایک دن خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں خود تو پاسِ حیا سے عرض حال نہ کر سکیں، جناب امیر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف سے یہ حال عرض کیا اور درخواست کی کہ فلاں غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں ان میں سے ایک کنیز مل جائے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ابھی اصحاب صفہ کا انتظام نہیں ہوا اور جب تک ان کا بندوبست نہ ہو لے میں اور طرف توجہ

---

❶ ابوداود، کتاب الادب، باب فی الحلم واخلاق النبی ﷺ: ٤٧٧٥۔ روایت میں ہے کہ بدو کے ساتھ دو اونٹ تھے اور آپ نے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے پر کھجوریں لدوا دیں۔ ''ض'' ❷ صحیح بخاری، کتاب الجزیة، باب ما اقطع النبی ﷺ من البحرین: ٣١٦٥۔ ❸ مسند احمد، ج٦، ص: ١٧٥۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الزکاة، باب الاستعفاف عن المسئلة: ١٤٦٩۔

نہیں کر سکتا۔'' ❶ ایک روایت میں ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادیاں اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا خدمت اقدس میں گئیں اور اپنے افلاس وتنگدستی کی شکایت کر کے عرض کی کہ اب کے غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں، ان میں سے ایک دو ہم کو مل جائیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے۔'' ❷ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کسی امر کی درخواست کی، فرمایا: ''یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تم کو دوں اور اہل صفہ کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ وہ بھوک سے اپنے پیٹ لپیٹتے پھریں۔'' ❸

ایک دفعہ ایک عورت نے ایک چادر لا کر پیش کی۔ آپ ﷺ کو ضرورت تھی، آپ نے لے لی، ایک صاحب حاضر خدمت تھے، انہوں نے کہا: کیا اچھی چادر ہے۔ آپ نے اتار کر ان کو دے دی، جب اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں نے ان کو ملامت کی کہ تم جانتے ہو کہ آنحضرت ﷺ کو چادر کی ضرورت تھی، یہ بھی جانتے ہو کہ آنحضرت ﷺ کسی کا سوال رد نہیں کرتے، انہوں نے کہا: ہاں لیکن میں نے تو برکت کے لیے لی ہے کہ مجھ کو اسی چادر کا کفن دیا جائے۔ ❹

زہد وقناعت کے عنوان سے جو واقعات لکھے گئے ہیں، ان سے ظاہر ہوگا کہ آنحضرت ﷺ کس عسرت اور تنگ دستی میں بسر فرماتے تھے۔ ۳ھ کے بہت بعد فتوحات کو وسعت حاصل ہوئی ہے۔ عرب میں باغات سب سے بہتر جائیداد تھی۔ ۳ھ ❺ میں یہودیان بنونضیر میں سے مخیریق نامی ایک شخص نے اپنے سات باغ مشیب، صائفہ، دلال، حسینی، برقہ، اعواف، مشربہ ام ابراہیم مرتے وقت آنحضرت ﷺ کو وصیت کر دیئے۔ آپ نے سب کو خیرات کر دیا یعنی وہ خدا کی راہ میں وقف تھے، جو کچھ پیدا ہوتا تھا وہ غربا اور مساکین کو دے دیا جاتا تھا۔ ❻

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے شادی کی، سامان ولیمہ کے لیے گھر میں کچھ نہ تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے پاس جاؤ اور آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ، وہ گئے اور جا کر لے آئے، حالانکہ کاشانۂ نبوت میں اس ذخیرہ کے سوا شام کے کھانے کو کچھ نہ تھا۔ ❼ ایک دفعہ ایک غفاری آکر مہمان ہوا۔ رات کو کھانے کے لیے صرف بکری کا دودھ تھا۔ وہ آپ ﷺ نے اس کی نذر کر دیا۔ یہ تمام رات خانۂ نبوی میں فاقہ سے گزری حالانکہ اس سے پہلی شب میں بھی یہاں فاقہ ہی تھا۔ ❽

---

❶ یہ روایت کتب احادیث (سنن ابو داود، کتاب الخراج والامارة، باب بیان مواضع قسم الخمس: ٢٩٨٨) وغیرہ میں مختلف طریقوں سے مروی ہے، ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایک دعا بتادی کہ یہ لونڈی سے بڑھ کر ہے: (٥٠٦٢، ٥٠٦٣)۔ ❷ ایضاً: ٢٩٨٧۔ ❸ مسند احمد، ج ، ص: ٧٩۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب حسن الخلق والسخاء: ٦٠٣٦ وباب من استعد الکفن: ١٢٧٧۔

❺ فتح الباری شرح کتاب الفرائض۔ ❻ اصابہ تذکرہ مخیریق، ج٣، ص: ٣٩٣ مطبعة السعادة مصر۔

❼ مسند احمد، ج ٤، ص: ٥٨۔ ❽ مسند احمد، ج ٦، ص: ٣٩٧۔

مہمان نوازی

عرب کے مختلف اطراف اور صوبوں سے جوق در جوق لوگ بارگاہ نبوی میں آتے تھے۔ رملہ رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ تھیں، ان کا گھر دارالضیوف تھا۔ ❶ یہیں لوگ مہمان اترتے تھے، ام شریک رضی اللہ عنہا جو ایک دولت منداور فیاض انصاریہ تھیں، ان کا گھر بھی گویا ایک مہمان خانہ تھا۔ ❷ مخصوص لوگ مسجد نبوی میں اتارے جاتے تھے چنانچہ وفد ثقیف یہیں اترا تھا۔ آنحضرت ﷺ خود بہ نفس نفیس ان مہمانوں کی خاطر داری اور تواضع فرماتے تھے۔ یوں بھی جو لوگ حاضر ہوتے تھے بغیر کچھ کھائے پیئے واپس نہ آتے تھے۔ ❸

فیاضی میں کافر و مسلمان کا امتیاز نہ تھا۔ مشرک و کافر سب آپ ﷺ کے مہمان ہوتے اور آپ یکساں ان کی مہمان نوازی کرتے۔ جب اہل حبشہ کا وفد آیا تو آپ نے خود اپنے ہاں ان کو مہمان اتارا، اور خود بہ نفس نفیس ان کی خدمت کی۔ ❹ ایک دفعہ ایک کافر مہمان ہوا۔ آپ ﷺ نے ایک بکری کا دودھ اسے پلایا وہ سارے کا سارا پی گیا، آپ نے دوسری بکری منگوائی، وہ بھی کافی نہ ہوئی غرض سات بکریوں تک نوبت آئی جب تک وہ سیر نہ ہوا آپ پلاتے گئے۔ ❺ کبھی ایسا ہوتا کہ مہمان آجاتے اور گھر میں جو کچھ موجود ہوتا وہ ان کی نذر ہو جاتا اور تمام اہل و عیال فاقہ کرتے۔ ❻ آپ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنے مہمانوں کی خبر گیری کرتے تھے۔ ❼

صحابہ رضی اللہ عنہم میں سب سے مفلس اور نادار گروہ اصحاب صفہ کا تھا، وہ مسلمانوں کے مہمان عام تھے لیکن ان کو زیادہ تر خود آنحضرت ﷺ کے مہمان ہونے کا شرف حاصل ہوتا ایک بار آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص کے پاس دو آدمی کا کھانا ہو وہ ان میں سے تین آدمی کو اور جن کے پاس چار آدمی کا کھانا ہو وہ ان میں سے پانچ آدمی کو ساتھ لے جائے۔“ ❽ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تین آدمیوں کو ساتھ لائے لیکن آنحضرت ﷺ دس آدمیوں کو ہمراہ لے گئے۔

اصحاب صفہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اپنے فقر و فاقہ کی داستان نہایت درد انگیز طریقہ سے بیان کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک روز شدت گرسنگی کی حالت میں گزرگاہ عام پر بیٹھ گیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ راستے سے گزرے تو میں نے بطور حسن طلب کے ان سے قرآن مجید کی ایک آیت پوچھی لیکن وہ گزر گئے اور میری حالت کی طرف توجہ نہ کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا اور وہی نتیجہ ہوا، اس کے بعد آنحضرت ﷺ کا گزر ہوا تو آپ مجھ کو دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا: ”میرے ساتھ آؤ۔“

---

❶ زرقانی ذکر وفد بنی حنیفة، ج ٤، ص:٢٢۔ ❷ مسلم، کتاب الطلاق، باب المطلقة البائن...... ٣٦٩٧۔
❸ شمائل ترمذی: ٣٩٧۔ ❹ شرح شفاء قاضی عیاض بسند متصل، ج ٢، ص: ١٠٠۔
❺ صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب المؤمن یأکل فی معی:٥٣٧٩۔ ❻ مسند احمد، ج ٦، ص: ٣٩٧۔
❼ ابوداود، کتاب الادب، باب فی الرجل ینبطح علی بطنه:٥٠٤٠۔
❽ صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب اکرام الضیف:٥٣٦٧ تا ٥٣٧١۔

آپ ﷺ گھر میں پہنچے تو دودھ کا ایک پیالہ نظر آیا، آپ نے دریافت فرمایا، تو معلوم ہوا کہ کسی نے ہدیۃً بھیجا ہے، آپ ﷺ نے مجھ سے کہا: ''اصحاب صفہ کو بلا لاؤ۔'' میں ان کو بلا لایا۔ تو آپ نے مجھ کو دودھ کا وہ پیالہ دیا کہ سب کو تقسیم کر دو۔ ❶

آنحضرت ﷺ کے گھر میں ایک پیالہ اس قدر بھاری تھا کہ اس کو چار آدمی اٹھا سکتے تھے جب دوپہر ہوتی تو وہ پیالہ آتا اور اصحاب صُفّہ اس کے گرد بیٹھ جاتے یہاں تک کہ جب زیادہ مجمع ہو جاتا تو آنحضرت ﷺ کو اوکڑوں بیٹھنا پڑتا کہ لوگوں کے لیے جگہ نکل آئے۔ ❷

مقداد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں اور میرے دو رفیق اس قدر تنگ دست تھے کہ بھوک سے بینائی جاتی رہی ہم لوگوں نے اپنے تکفل کی درخواست کی لیکن کسی نے منظور نہیں کیا آخر ہم لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ دولت خانہ میں لے گئے اور تین بکریوں کو دکھا کر فرمایا: ''ان کا دودھ پیا کرو۔'' چنانچہ ہم میں ہر شخص دودھ دوھ کر اپنا اپنا حصہ پی لیا کرتا تھا۔ ❸

ایک دن اصحاب صفہ کو لے کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر پہنچے اور فرمایا کھانے کو جو کچھ ہو لاؤ، چونی کا پکا ہوا کھانا سامنے لا کر رکھا گیا آپ نے کھانے کی کوئی اور چیز طلب کی تو چھوہارے کا حریرہ پیش ہوا، اس کے بعد بڑے پیالہ میں دودھ حاضر کیا گیا اور یہی سامان مہمانی کی آخری قسط تھی۔ ❹

گداگری اور سوال سے نفرت

باوجود اس کے کہ آپ ﷺ کا ابرِ کرم ہر وقت برستا رہتا تھا تاہم کسی کا بے ضرورت شدید سوال کرنا آپ پر سخت گراں ہوتا تھا، ارشاد فرماتے: ''اگر کوئی شخص لکڑی کا گٹھ پیٹھ پر لا دلائے اور بیچ کر اپنی آبرو بچائے تو اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے سوال کرے۔'' ❺

ایک دفعہ ایک انصاری آئے اور کچھ سوال کیا آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے پاس کچھ نہیں ہے؟'' بولے کہ بس ایک بچھونا ہے، جس کا کچھ حصہ اوڑھ لیتا ہوں کچھ بچھا لیتا ہوں اور ایک پانی پینے کا پیالہ ہے، آپ نے دونوں چیزیں منگوائیں پھر فرمایا: ''یہ چیزیں کون خریدتا ہے؟'' ایک شخص نے دو درہم لگائے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس سے بڑھ کر بھی کوئی دام لگاتا ہے؟'' ایک صاحب نے ایک کے دو کر دیے۔ آپ نے دونوں چیزیں دے دیں اور درہم انصاری کو دیے کہ ایک درہم کا کھانا خرید کر گھر میں دے آؤ اور دوسرے سے رسی خریدو اور جنگل سے لکڑیاں لا کر شہر میں بیچو۔ پندرہ دن کے بعد وہ خدمت اقدس میں آئے تو دس درہم ان کے

---

❶ ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب قصة اصحاب الصفة: ۲۴۷۷۔

❷ ابوداود، كتاب الاطعمة، باب ماجآء فی الأكل من اعلى الصحفة: ۳۷۷۳۔

❸ صحیح مسلم، كتاب الاشربة، باب اكرام الضيف: ۵۳۶۳۔

❹ ابوداود، كتاب الادب، باب فی الرجل ينبطح علی بطنه: ۵۰۴۰۔

❺ صحیح بخاری، كتاب الصدقات، باب الاستعفاف عن المسئلة: ۱۴۷۱۔

پاس جمع ہو گئے تھے اس سے کچھ کپڑا خریدا کچھ کا غلہ مول لیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”یہ اچھا ہے یا یہ کہ قیامت میں چہرہ پر گدائی کا داغ لگا کر جاتے۔“ ❶

ایک دفعہ چند انصاری آئے اور سوال کیا، آپ نے عنایت فرمایا پھر جب تک کچھ رہا آپ نے ان کی درخواست رد نہیں فرمائی جب کچھ نہیں رہا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”میرے پاس جب تک رہے گا تم سے بچا کر اس کو نہیں رکھوں گا لیکن جو شخص اللہ سے دعا مانگے کہ وہ اس کو سوال و گداگری کی ذلت سے بچائے تو وہ اس کو بچا دیتا ہے اور جو خدا سے غنیٰ کا طالب ہوتا ہے وہ اس کو غنیٰ مرحمت فرماتا ہے اور جو صبر کرتا ہے اللہ اس کو صابر بنا دیتا ہے اور صبر سے کوئی بہتر اور وسیع تر دولت کسی کو نہیں دی گئی ہے۔“ ❷

حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فتح مکہ میں اسلام لائے تھے، ایک دفعہ انہوں نے آپ ﷺ سے کچھ طلب کیا آپ نے عنایت فرمایا، کچھ دن کے بعد پھر مانگا، آپ نے پھر ان کو دیا، تیسری دفعہ پھر سوال کیا پھر کچھ مرحمت کیا، اس کے بعد فرمایا: ”اے حکیم! یہ دولت سبز و شیریں ہے جو استغنا کے ساتھ اس کو قبول کرتا ہے اس کو برکت ملتی ہے اور جو حرص و طمع کے ساتھ اس کو حاصل کرتا ہے وہ اس سے محروم رہتا ہے اور اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کھاتا چلا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا دستِ بالا دستِ زیریں سے بہتر ہے۔“ حکیم رضی اللہ عنہ پر آنحضرت ﷺ کی نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ جب تک زندہ رہے، کبھی کسی سے کوئی معمولی چیز بھی نہیں مانگی۔ ❸

حجۃ الوداع میں آنحضرت ﷺ صدقات کا مال تقسیم فرما رہے تھے کہ دو صاحب آ کر شامل ہو گئے آپ نے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ تنومند اور ہاتھ پاؤں کے درست معلوم ہوئے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”اگر تم چاہو تو میں اس میں سے دے سکتا ہوں لیکن غنی اور تندرست کام کرنے کے لائق لوگوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔“ ❹ قبیصہ نام ایک صاحب تھے وہ مقروض ہو گئے تھے، آپ کے پاس آئے تو اپنی حاجت عرض کی، آپ ﷺ نے وعدہ کیا، اس کے بعد ارشاد فرمایا: ”اے قبیصہ! سوال کرنا اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا صرف تین شخصوں کو روا ہے، ایک اس شخص کو جو قرض سے زیر بار ہو، وہ مانگ سکتا ہے، لیکن جب اس کی ضرورت پوری ہو جائے تو اس کو رک جانا چاہیے، دوسرے اس شخص کو جس پر کوئی ایسی ناگہانی مصیبت آ گئی، جس نے اس کے تمام مالی سرمایہ کو برباد کیا، اس کو اس وقت تک مانگنا جائز ہے جب تک اس کی حالت کسی قدر درست نہ ہو جائے، تیسرے وہ شخص جو مبتلائے فاقہ ہو اور محلّہ کے تین معتبر آدمی گواہی دیں کہ ہاں اس کو فاقہ ہے، اس کے علاوہ جو کوئی کچھ مانگ کر حاصل کرتا ہے وہ حرام کھاتا ہے۔“ ❺

❶ ابوداود، کتاب الزکوٰۃ، باب ما تجوز فیہ المسالۃ: ۱۶۴۱ وترمذی: ۱۲۱۸؛ ابن ماجہ: ۲۱۹۸۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الصدقات، باب الاستعفاف عن المسئلۃ: ۱۴۶۹۔

❸ ایضا: ۱۴۷۲۔ ❹ ابوداود، کتاب الزکوٰۃ، باب من یعطی من الصدقۃ: ۱۶۳۳۔

❺ ایضا: باب ما تجوز فیہ المسالۃ: ۱۶۴۰۔

صدقہ سے پرہیز

آنحضرت ﷺ اپنے اور اپنے خاندان کے لیے صدقہ وزکوۃ لینے کوسخت موجب ننگ و عار سمجھتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ ''میں گھر میں آتا ہوں تو کبھی کبھی اپنے بستر پر کھجور پاتا ہوں جی میں آتا ہے کہ اٹھا کر منہ میں ڈال لوں، پھر خیال ہوتا ہے کہ کہیں صدقہ کی کھجور نہ ہو، اس لیے ڈال دیتا ہوں۔'' ❶ ایک دفعہ راستہ میں ایک کھجور ہاتھ آگئی، فرمایا: ''اگر صدقہ کا شبہ نہ ہوتا تو میں اس کو کھا جاتا۔'' ❷ ایک بار امام حسن رضی اللہ عنہ نے صدقہ کی کھجوروں میں سے منہ میں ایک کھجور ڈال لی، آپ ﷺ نے ڈانٹ کر کہا: ''کیا تمہیں یہ خبر نہیں کہ ہمارا خاندان صدقہ نہیں کھاتا۔'' ❸ پھر منہ سے اگلوا دیا۔ آپ کے سامنے جب کوئی شخص کوئی چیز لے کر آتا تو دریافت فرماتے: ''ہدیہ ہے یا صدقہ؟'' اگر ہدیہ کہتا قبول فرماتے اور اگر یہ کہتا کہ صدقہ تو آپ ہاتھ روک لیتے اور دوسرے صاحبوں کو عنایت فرمادیتے۔

ہدایا اور تحفے قبول کرنا

دوست واحباب کے ہدایا اور تحفے آپ ﷺ قبول فرماتے تھے بلکہ آپ نے اس کو زیادہ محبت کا بہترین ذریعہ فرمایا ہے:

((تهادوا تحابوا)) ❹ ''باہم ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجو تو باہم محبت ہوگی۔''

اسی لیے صحابہ رضی اللہ عنہم عموماً کچھ نہ کچھ روز آپ ﷺ کے گھر بھیجا کرتے تھے اور خصوصیت کے ساتھ اس دن بھیجتے تھے جس دن آپ حجرہ عائشہ رضی اللہ عنہا میں قیام فرماتے تھے۔ ❺ اوپر گزر چکا ہے کہ کوئی چیز آپ کے سامنے پیش کی جاتی تو آپ دریافت فرماتے تھے کہ یہ صدقہ ہے یا ہدیہ؟ اگر ہدیہ ہوتا تو قبول فرماتے ورنہ احتراز کرتے۔ ایک دفعہ ایک عورت نے ایک چادر خدمت اقدس میں پیش کی آپ نے لے لی، اسی وقت ایک صاحب نے مانگ لی، آپ نے ان کو عنایت فرمادی۔ ❻

آس پاس کے ملوک وسلاطین بھی آپ کو تحفے بھیجا کرتے تھے۔ حدودِ شام کے ایک رئیس نے ایک سفید خچر تحفہ دیا تھا ❼ عزیز مصر نے بھی ایک خچر مصر سے بھیجا تھا ایک امیر نے آپ کو موزے بھیجے تھے۔ ❽ ایک دفعہ قیصر روم نے آپ کی خدمت میں ایک پوستین بھیجی جس میں دیبا کی سنجاف لگی ہوئی تھی آپ نے ذرا دیر کے لیے پہن لی، پھر اتار کر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی) کے پاس بھیج دی۔ وہ پہن کر خدمت اقدس میں آئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں نے اس لیے نہیں بھیجی کہ تم خود پہنو'' عرض کی

---

❶ بخاري، كتاب في اللقطة، اذا وجد تمرة في الطريق: ٢٤٣٢۔ ❷ ايضًا: ٢٤٣١۔

❸ بخاري، كتاب الزكوة، باب اخذ صدقة التمر: ١٤٨٥، ١٤٩١۔ ❹ مؤطا امام مالك، كتاب حسن الخلق، باب ما جاء في المهاجرة: ١٦٨٥۔ ❺ بخاري، كتاب فضائل اصحاب النبي ﷺ، باب فضل عائشة: ٣٧٧٥۔ ❻ صحيح بخاري، كتاب الجنائز، باب من استعد الكفن: ١٢٧٧۔

❼ زاد المعاد ابن قيم، ج١، ص: ٣٤۔ ❽ شمائل ترمذي: ٧٢، ٧٣۔

پھر کیا کروں، ارشاد فرمایا: ”اپنے بھائی نجاشی کو بھیج دو۔“ ❶ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ ایک مدت یعنی فتح خیبر تک حبش میں رہے تھے اور نجاشی نے انہی سے اسلام کی تعلیم پائی تھی۔

ہدایا اور تحفے دینا

جن لوگوں کے ہدایا اور تحفے قبول فرماتے تھے، ان کو ان کا صلہ بھی ضرور عطا فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

كان يقبل الهدية ويثيب عليها۔ ❷ ”آنحضرت ﷺ ہدیہ قبول فرماتے تھے اور اس کا معاوضہ دیتے تھے۔“

یمن کا مشہور بادشاہ ذی یزن جس نے حبشی حکومت مٹا کر ایران کے زیر اثر عربی حکومت قائم کی تھی اس نے آنحضرت ﷺ کو ایک قیمتی حلہ بھیجا جس کو اس نے ۳۳ اونٹوں کے بدلہ میں خریدا تھا، آپ ﷺ نے قبول فرمایا اور پھر اس کو ایک حلہ ہدیۃً بھیجا جو ۲۰ سے کچھ زیادہ اونٹ دیکر خریدا گیا تھا۔ ❸

ایک دفعہ قبیلہ بنی فزارہ کے ایک شخص نے آپ ﷺ کی خدمت میں ہدیۃً ایک اونٹنی پیش کی آپ نے اس کا صلہ دیا تو وہ سخت ناراض ہوا۔ آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر خطاب عام کیا اور فرمایا: ”تم لوگ مجھے ہدیہ دیتے ہو اور میں بقدر استطاعت اس کا صلہ دیتا ہوں تو ناراض ہوتے ہو، آیندہ قریش، انصار، ثقیف اور دوس کے سوا کسی قبیلہ کا ہدیہ قبول نہ کروں گا۔“ ❹

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ جن کے مکان میں آپ چھ مہینے تک فروکش رہے تھے، آپ اکثر ان کو بچا ہوا کھانا بھیجا کرتے ❺ ہمسایوں اور پڑوسیوں کے گھروں میں بھی تحفے بھیجتے تھے۔ اصحابِ صفہ اکثر آپ کے تحفوں سے مشرف ہوا کرتے تھے۔

عدم قبول احسان

کبھی کسی کا احسان گوارا نہ فرماتے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر جان نثار کون ہوسکتا تھا، تاہم ہجرت کے وقت جب انہوں نے سواری کے لیے ناقہ پیش کیا تو آپ نے قیمت ادا کی۔ ❻ مدینہ میں مسجد کے لیے جو زمین درکار تھی مالکان زمین نے مفت نذر کرنی چاہی تھی لیکن آپ نے قیمت دے کر لی۔ ❼ ایک دفعہ عبداللہ بن عمر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما دونوں ہمسفر تھے، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی سواری کا اونٹ سرکش تھا اور آنحضرت ﷺ کے ناقہ سے آگے نکل نکل جاتا تھا، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روکتے تھے لیکن وہ قابو نہ آتا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بار بار عبداللہ کو ڈانٹتے تھے، آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: ”یہ اونٹ میرے

---

❶ ابو داود، كتاب اللباس، باب من كرهه: ٤٠٤٧۔ ❷ بخاري، كتاب الهبة، باب المكافاة في الهبة: ٢٥٨٥۔ ❸ ابوداود، كتاب اللباس، باب لبس المرتفع: ٤٠٣٤، ٤٠٣٥۔ ❹ الادب المفرد امام بخاری: ٥٩٦؛ ترمذی: ٣٩٤٥۔ ❺ مسلم، كتاب الاشربة، باب اباحة اكل الثوم: ٥٣٥٨۔

❻ بخاري، باب هجرة النبي ﷺ: ٣٩٠٥۔ ❼ طبقات ابن سعد، ج١، ق٢، ص:٢۔

ہاتھ بیچ ڈالو۔'' انہوں نے کہا کہ نذر ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں دام لو۔'' انہوں نے دوبارہ عرض کی کہ یوں ہی حاضر ہے، آپ نے انکار کیا، بالآخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دام لینے منظور کیے۔ آپ نے خرید کر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دے دیا کہ اب یہ تمہارا ہے۔ ❶

عدم تشدد

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ (جو اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے) ایک محلّہ میں امامت کرتے اور نماز فجر میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے تھے ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی کہ وہ اس قدر لمبی نماز پڑھتے ہیں کہ میں ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے قاصر رہتا ہوں، ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو کبھی اس قدر غضب ناک نہیں دیکھا، جس قدر اس موقع پر دیکھا۔ آپ ﷺ نے لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا: ''بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو لوگوں کو متنفر کر دیتے ہیں، جو شخص تم میں سے نماز پڑھائے مختصر پڑھائے کیونکہ نماز میں بوڑھے، کمزور، کام والے سبھی طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔'' ❷

حدّ و قصاص میں نہایت احتیاط فرماتے اور جہاں تک ممکن ہوتا، درگزر کرنا چاہتے۔ ماعز اسلمی ایک صاحب تھے جو زنا میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن فوراً مسجد میں آئے اور کہا: یارسول اللہ! میں نے بدکاری کی، آپ نے منہ پھیر لیا وہ دوسری سمت آئے، آپ نے اور طرف منہ پھیر لیا آپ بار بار منہ پھیر لیتے اور وہ بار بار سامنے آ کر زنا کا اقرار کرتے، بالآخر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم کو جنون تو نہیں ہے؟'' بولے: نہیں پھر پوچھا: ''تمہاری شادی ہو چکی ہے؟'' بولے: ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے صرف ہاتھ لگایا ہوگا؟'' بولے: نہیں بلکہ مجامعت کی، آخر مجبور ہو کر آپ نے حکم دیا کہ سنگسار کیے جائیں۔ ❸

ایک دفعہ ایک شخص نے آ کر عرض کی کہ مجھ سے گناہ سرزد ہوا، آپ حد (سزا) کا حکم دیں، آپ چپ رہے اور نماز کا وقت آ گیا، نماز کے بعد انہوں نے پھر آ کر وہی درخواست کی آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم نے نماز نہیں پڑھی؟'' بولے: ہاں پڑھ لی، ارشاد فرمایا: ''تو خدا نے تمہارا گناہ معاف کر دیا۔'' ❹

ایک دفعہ قبیلہ غامد کی ایک عورت آئی اور اظہار کیا کہ میں نے بدکاری کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''واپس جاؤ۔'' دوسرے دن پھر آئی اور بولی کہ کیا آپ مجھ کو ماعز کی طرح چھوڑ دینا چاہتے ہیں، خدا کی قسم! مجھ کو حمل رہ گیا ہے، پھر فرمایا: ''واپس جاؤ۔'' وہ چلی گئی تیسرے دن پھر واپس آئی، آپ نے ارشاد فرمایا: ''بچہ کے پیدا ہونے تک انتظار کرو۔'' بچہ جب پیدا ہوا تو بچہ کو گود میں لیے ہوئے آئی، (یعنی اب زنا کی سزا دینے میں کوئی تامل ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا: ''دودھ پینے کی مدت تک انتظار کرو، جب دودھ چھوٹ جائے

❶ بخاری، کتاب البیوع، باب اذا اشتری شیئًا فوھب من ساعتہ: ۲۱۱۵۔

❷ بخاری، کتاب الاذان، باب من شکا امامہ: ۷۰۴ وکتاب الاحکام، باب ھل یقضی القاضی ... : ۷۱۵۹۔

❸ یہ حدیث بخاری کے مختلف ابواب میں ہے موقع کے لیے کتاب المحاربین، باب سوال الامام المقر: ۶۸۲۴، ۶۸۲۵۔ دیکھنا چاہیے۔ ❹ بخاری، کتاب الحدود، اذا اقر بالحد: ۶۸۲۳۔

تب آنا۔'' جب رضاعت کا زمانہ گزر گیا تو پھر حاضر ہوئی، اب آپ ﷺ نے مجبور ہو کر سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ لوگوں نے اس پہ پتھر برسانے شروع کیے، ایک صاحب کا پتھر اس کے چہرہ پر لگا اور خون کی چھینٹیں اڑ کر ان کے چہرہ پر آئیں انہوں نے اس کو گالی دی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''زبان روکو، خدا کی قسم! اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ جبراً محصول لینے والا بھی اگر یہ توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا۔'' 1 ایک دن ایک صاحب نے عرض کی کہ ہم لوگ یہودیوں اور عیسائیوں کے ملک میں رہتے ہیں کیا ان کے برتنوں میں کھانا کھا لیا کریں؟ فرمایا: ''اور برتن ہاتھ آئیں تو ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ ورنہ ان کو دھو کر کھا سکتے ہو۔'' 2

ایک بار ایک صحابی نے ماہ رمضان تک کے لیے اپنی بیوی سے ظہار کر لیا لیکن ابھی یہ مدت گزرنے نہ پائی تھی کہ اس سے مقاربت کر لی، پھر لوگوں کو اس واقعہ کی خبر کی اور کہا: مجھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے چلو، سب نے انکار کر دیا، انہوں نے خود آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا، آپ نے پہلے تو تعجب ظاہر کیا پھر ایک غلام کے آزاد کرنے کا حکم دیا، انہوں نے ناداری کا عذر کیا، تو آپ نے متصل دو ماہ تک روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی، انہوں نے کہا یہ سب تو رمضان ہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اب آپ نے ساٹھ مسکینوں پر صدقہ کرنے کو فرمایا، انہوں نے کہا: ہم تو خود فاقہ کر رہے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: ''صدقہ کے عامل کے پاس جاؤ وہ تمہیں ایک وسق کھجور دے گا اس میں سے ساٹھ مسکینوں کو دے دینا اور جو بچے وہ اپنے اہل و عیال پر صرف کرنا۔'' وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ تم لوگ متشدد اور بدتدبیر تھے لیکن مجھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حسن رائے اور آسانی نظر آئی۔ 3

ایک بار ایک اور صحابی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں برباد ہو گیا روزہ میں اپنی بیوی سے ہم بستر ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک غلام آزاد کر سکتے ہو؟'' کہا: نہیں، فرمایا: ''دو مہینے تک متصل روزہ رکھ سکتے ہو؟'' کہا: نہیں، فرمایا: ''ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلا سکتے ہو؟'' کہا: اس کی بھی قدرت نہیں، آنحضرت ﷺ نے تامل فرمایا، کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ایک شخص نے کھجوروں کی ایک ٹوکری ہدیۃً پیش کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''سائل کہاں گیا؟'' سائل نے کہا: یا رسول اللہ! میں یہ ہوں، فرمایا: ''ان کھجوروں کو لے جاؤ اور کسی غریب کو خیرات دے دو۔'' سائل نے کہا: یا رسول اللہ! مدینہ میں مجھ سے زیادہ غریب کون ہوگا، آنحضرت ﷺ ہنس پڑے اور فرمایا: ''جاؤ گھر ہی والوں کو کھلا دو۔'' 4

تقشف ناپسند تھا

رہبانیت اور تقشف کو ناپسند فرماتے تھے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض بزرگ میلانِ طبعی یا عیسائی راہبوں

---

1 ابوداود، کتاب الحدود، باب المرأۃ التی أمر النبی ﷺ برجمھا: ٤٤٤٢۔

2 بخاری، کتاب الذبائح، باب صید القوس: ٥٤٧٨۔ 3 ابوداود، کتاب الطلاق، باب الظھار: ٢٢١٣۔

4 بخاری، کتاب الصوم، باب اذا جامع فی رمضان: ١٩٣٦۔

کے اثر سے رہبانیت پر آمادہ تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو باز رکھا۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم ناداری کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے تھے اور ضبط نفس پر بھی قادر نہ تھے، انہوں نے قطع اعضا کرنا چاہا، آپ نے سخت ناراضی ظاہر کی۔ قدامہ بن مظعون اور ایک اور صحابی آئے کہ ہم میں سے ایک نے ترکِ حیوانات اور دوسرے نے ترکِ نکاح کا عزم کرلیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں تو دونوں سے متمتع ہوتا ہوں۔'' آپ ﷺ کی مرضی نہ پاکر دونوں صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے۔ عرب میں صومِ وصال کا طریقہ مدت سے جاری تھا یعنی کئی کئی دن متصل روزے رکھتے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اس کا ارادہ کیا لیکن آپ نے سختی سے روکا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نہایت مرتاض زاہد تھے، انہوں نے عہد کرلیا تھا کہ ہمیشہ دن کو روزے رکھیں گے اور رات بھر عبادت کریں گے، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو بلا بھیجا اور پوچھا: ''کیا یہ خبر صحیح ہے؟'' عرض کی ہاں، فرمایا کہ ''تم پر تمہارے جسم کا حق ہے، آنکھ کا حق ہے، بیوی کا حق ہے، مہینہ میں تین دن کے روزے کافی ہیں۔'' عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا: مجھ کو اس سے زیادہ کی طاقت ہے فرمایا: ''اچھا تیسرے دن'' بولے میں اس سے بھی زیادہ طاقت رکھتا ہوں ارشاد فرمایا: ''ایک دن بیچ دے کر کہ یہی داؤد علیہ السلام کا روزہ تھا اور یہی افضل الصیام ہے'' انہوں نے عرض کی کہ مجھ کو اس سے بھی زیادہ قدرت ہے، ارشاد ہوا: ''بس اس سے زیادہ بہتر نہیں۔'' [1]

ایک روایت میں ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی روزہ داری کا چرچا ہوا تو آنحضرت ﷺ خود ان کے پاس تشریف لے گئے انہوں نے استقبال کیا اور چمڑے کا گدا بچھا دیا، آپ زمین پر بیٹھ گئے اور ان سے کہا: ''کیا تم کو مہینہ میں تین روزے بس نہیں کرتے۔'' عرض کی نہیں، فرمایا: ''پانچ۔'' بولے نہیں غرض آپ بار بار تعداد بڑھاتے جاتے اور وہ اس پر راضی نہ ہوتے، بالآخر آپ ﷺ نے فرمایا: ''آخیر حد یہ ہے کہ ایک دن افطار کرو ایک دن روزہ رکھو۔'' [2]

ایک دفعہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ یارسول اللہ! میں جوان آدمی ہوں اور اتنا مقدور نہیں کہ نکاح کروں، نہ اپنے نفس پر اطمینان ہے۔ آنحضرت ﷺ چپ رہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے پھر انہی الفاظ کا اعادہ کیا، آپ چپ رہے، سہ بارہ کہا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدا کا حکم ٹل نہیں سکتا۔'' [3]

قبیلہ باہلہ کے ایک صاحب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر واپس گئے پھر سال بھر کے بعد آنے کا اتفاق ہوا، لیکن اتنے ہی زمانہ میں ان کی شکل وصورت اس قدر بدل گئی کہ آنحضرت ﷺ ان کو نہ پہچان سکے، انہوں نے اپنا نام بتایا تو آنحضرت ﷺ نے تعجب سے پوچھا: ''تم تو نہایت خوش جمال تھے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب صوم الدهر: ۱۹۷۶۔

[2] بخاری، کتاب الصوم، باب صوم داود علیہ السلام: ۱۹۸۰؛ کتاب النکاح، باب لزوجك علیك حق: ۵۱۹۹۔

[3] بخاری، کتاب النکاح، باب ما یکره من التبتل والخصاء: ۵۰۷۶۔

تمہاری صورت کیوں بگڑ گئی؟'' انہوں نے کہا: جب سے آپ ﷺ سے رخصت ہوا متصل روزے رکھتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالا، رمضان کے علاوہ ہر مہینہ میں ایک دن کا روزہ کافی ہے۔'' انہوں نے کہا: اس سے زیادہ کی قوت رکھتا ہوں۔ آپ نے ایک دن کا اور اضافہ کر دیا، انہوں نے اور اضافہ کی درخواست کی، آپ نے تین دن کر دیے۔ ان کو اس سے بھی تسکین نہ ہوئی تو آپ نے اشہر حرام کے روزوں کا حکم دیا۔ ❶ ایک دن چند صحابہ رضی اللہ عنہم خاص اس غرض سے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ آنحضرت ﷺ کی عبادت کے حالات دریافت کریں۔ وہ سمجھتے تھے کہ آنحضرت ﷺ رات دن عبادت کے سوا کچھ نہ کرتے ہوں گے، حالات سنے تو ان کے معیار کے موافق نہ تھے، بولے: بھلا ہم کو آنحضرت ﷺ سے کیا نسبت؟ ان کے پچھلے پہلے گناہ سب خدا نے معاف کر دیے ہیں، پھر ایک صاحب نے کہا کہ میں رات بھر نماز پڑھا کروں گا۔ دوسرے صاحب بولے میں عمر بھر روزہ رکھوں گا ایک اور صاحب نے کہا: میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔ آنحضرت ﷺ سن رہے تھے فرمایا کہ ''خدا کی قسم! میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں تاہم روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو شخص میرے طریقہ پر نہیں چلتا وہ میرے گروہ سے خارج ہے۔'' ❷

کسی غزوہ میں ایک صحابی کا ایک غار پر گزر ہوا جس میں پانی تھا اور آس پاس کچھ بوٹیاں تھیں خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو عرض کی: یارسول اللہ! مجھ کو ایک غار مل گیا ہے، جس میں ضرورت کی سب چیزیں ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ نشین ہو کر ترک دنیا کر لوں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں یہودیت یا نصرانیت لے کر دنیا میں نہیں آیا، میں آسان اور سہل ابراہیمی مذہب لے کر آیا ہوں۔'' ❸

عیب جوئی اور مداحی کی ناپسندیدگی

مداحی اور تعریف کو بھی (گو دل سے ہو) ناپسند فرماتے تھے۔ ایک دفعہ مجلس اقدس میں ایک شخص کا مذکور نکلا، حاضرین میں سے ایک شخص نے ان کی بہت تعریف کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے اپنے دوست کی گردن کاٹی۔'' یہ الفاظ چند بار فرمائے پھر ارشاد کیا کہ ''تم کو اگر کسی کی خواہی نخواہی مدح کرنی ہو تو یوں کہو کہ میرا ایسا خیال ہے۔'' ❹ ایک دفعہ ایک شخص کسی حاکم کی مدح کر رہا تھا، حضرت مقداد رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے انہوں نے زمین سے خاک اٹھا کر اس کے منہ میں جھونک دی اور کہا کہ ہم کو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ مداحوں کے منہ میں خاک بھر دیں۔ ❺ ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف لائے، ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا۔ محجن

❶ ابوداود، کتاب الصیام، باب صوم اشهر الحرم: ۲٤۲۸۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح: ٥٠٦٣۔ ❸ مسند احمد، ج ٥، ص: ٢٦٦۔ ❹ بخاری، ادب المفرد، باب ماجاء فی التمادح: ٣٣٣۔ ❺ ایضا، باب یحثی فی وجوه المداحین: ٣٣٩۔

ثقفی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''یہ کون ہے؟'' مجن نے ان کا نام بتایا اور بہت تعریف کی، ارشاد فرمایا: ''دیکھو یہ سن نہ پائے ورنہ تباہ ہو جائے گا۔'' یعنی دل میں غرور پیدا ہوگا، جو موجب ہلاکت ہوگا۔ (1)

ایک دفعہ اسود بن سریع جو شاعر تھے، خدمت عالی میں آئے اور عرض کی کہ میں نے خدا کی حمد اور حضور کی مدح میں کچھ اشعار کہے ہیں۔ فرمایا: ''ہاں اللہ کو حمد پسند ہے۔'' اسود نے اشعار پڑھنے شروع کیے اسی اثنا میں کوئی صاحب باہر سے آ گئے، آپ نے اسود کو روک دیا، وہ کچھ دیر باتیں کر کے چلے گئے پھر اسود نے پڑھنے شروع کئے وہ صاحب پھر آ گئے آپ نے اسود کو پھر روک دیا، دو تین دفعہ یہی اتفاق ہوا، اسود نے عرض کی کہ یہ کون صاحب ہیں جن کے لیے آپ ﷺ مجھ کو بار بار روک دیتے ہیں، فرمایا: ''یہ وہ شخص ہے جو فضول باتیں پسند نہیں کرتا۔'' (2)

اس موقع پر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ حسان رضی اللہ عنہ کو منبر پر بٹھا کر ان کے اشعار سنتے تھے اور فرماتے تھے: ((اللّٰھم ایدہ بروح القدس)) حالانکہ یہ اشعار آنحضرت ﷺ کی مدح میں ہوتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ حسان کے اشعار کفار کے مطاعن کا جواب تھے، عرب میں شعرا کو یہ رتبہ حاصل تھا کہ زور کلام سے جس شخص کو چاہتے ذلیل اور جس کو چاہتے معزز کر دیتے۔ ابن الزبعری اور کعب بن اشرف وغیرہ نے اس طریقہ سے آنحضرت ﷺ کو ضرر پہنچانا چاہا تھا، حسان رضی اللہ عنہ کی مداحی ان کا ردعمل تھا۔

سادگی اور بے تکلفی

معمول تھا کہ مجلس سے اٹھ کر گھر میں تشریف لے جاتے تو کبھی کبھی ننگے پاؤں چلے جاتے اور جوتی وہیں چھوڑ جاتے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ پھر واپس تشریف لائیں گے۔ (3) روز روز کنگھا کرنا ناپسند فرماتے۔ ارشاد تھا: ''ایک دن بیچ دے کر کنگھا کرنا چاہیے۔'' کھانے پینے، اوڑھنے، اٹھنے بیٹھنے، کسی چیز میں تکلف نہ تھا۔ کھانے میں جو سامنے آتا تناول فرماتے، پہننے کو موٹا جھوٹا جو مل جاتا پہن لیتے، زمین پر، چٹائی پر، فرش پر جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے۔ (4) آپ کے لیے آٹے کی بھوسی کبھی صاف نہیں کی جاتی تھی، (5) کرتہ کا تکمہ اکثر کھلا رکھتے تھے، لباس میں نمائش کو ناپسند فرماتے تھے، سامان آرائش سے آپ طبعاً نفور تھے، غرض ہر چیز میں سادگی اور بے تکلفی پسند خاطر تھی۔ (6)

امارت پسندی سے اجتناب

اسلام رہبانیت اور جوگی پن کا سخت مخالف ہے۔ ((لا رھبانیۃ فی الاسلام)) اسی بنا پر آپ ہر قسم کے جائز حظوظ دنیوی سے متمتع ہونا جائز رکھتے تھے اور خود بھی کبھی کبھی ان چیزوں سے تمتع اٹھاتے تھے، تاہم

---

(1) ایضا: ۳٤۱۔ (2) ادب المفرد، باب من مدح فی الشعر: ۳٤۲۔ (3) ابوداود، کتاب الادب، باب اذا قام من مجلسہ ثم رجع: ٤۸٥٤۔ (4) دیکھو شمائل، ص: ۲۳۔ (5) صحیح بخاری، کتاب الاطعمۃ، باب النفخ فی الشعیر: ٥٤۱۰، ٥٤۱۳۔ (6) صحاح کی کتاب اللباس میں متعدد واقعات ہیں۔

نازونعمت تکلف وعیش پرستی کو ناپسند فرماتے تھے اور اوروں کو بھی اس سے روکتے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دعوت کی اور کھانا پکوا کر گھر بھیج دیا۔ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ بھی تشریف لاتے اور ہمارے ساتھ کھاتے تو خوب ہوتا، حضرت علی رضی اللہ عنہ گئے اور آپ سے جا کر عرض کی آپ تشریف لائے، لیکن دروازہ پر پہنچے تو یہ دیکھ کر کہ گھر میں دیواروں پر پردے لٹکے ہوئے ہیں واپس چلے گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے واپسی کی وجہ دریافت کی تو فرمایا: ''پیغمبر کی شان کے خلاف ہے کہ وہ کسی زیب وزینت کے مکان میں داخل ہو۔'' [1] فرمایا کرتے: ''گھر میں ایک بستر اپنے لیے ایک بیوی کے لیے اور ایک مہمان کے لیے کافی ہے، چوتھا شیطان کا حصہ ہے۔'' [2]

ایک دفعہ کسی غزوہ میں تشریف لے گئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رہ گئیں، لڑائی سے واپس تشریف لائے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے تو دیکھا کہ گھر میں چھت گیر لگی ہوئی ہے اسی وقت پھاڑ ڈالی اور فرمایا: ''خدا نے ہم کو دولت اس لیے نہیں دی ہے کہ اینٹ پتھر کو کپڑے پہنائے جائیں۔'' [3] ایک انصاری نے ایک مکان بنوایا جس کا گنبد بہت بلند تھا، آپ ﷺ نے دیکھا تو پوچھا: ''کس نے بنایا ہے؟'' لوگوں نے بتایا، آپ چپ ہو رہے جب وہ حسب معمول خدمت اقدس میں آئے اور سلام کیا تو آپ نے منہ پھیر لیا، انہوں نے پھر سلام کیا، آپ نے پھر منہ پھیر لیا، وہ سمجھ گئے کہ ناراضی کی کیا وجہ ہے، جا کر گنبد کو زمین کے برابر کر دیا۔ ایک دن آپ بازار میں نکلے تو گنبد نظر نہ آیا، معلوم ہوا کہ انصاری نے اس کو ڈھا دیا۔ ارشاد فرمایا کہ ''ضروری عمارت کے سوا ہر عمارت انسان کے لئے وبال ہے۔'' [4]

ایک دفعہ کسی نے کمخواب کی قبا بھیجی آپ نے پہن لی، پھر خیال آیا اور اتار کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ روتے ہوئے آئے اور عرض کی کہ آپ نے جو چیز ناپسند کی وہ مجھ کو عنایت ہوتی ہے، ارشاد ہوا کہ میں نے استعمال کے لئے نہیں بلکہ فروخت کرنے کیلئے بھیجی، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فروخت کیا تو دو ہزار درہم پر اٹھی۔ [5]

ایک دفعہ کسی نے ایک مخطط جوڑا بھیجا، آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عنایت فرمایا وہ پہن کر خدمت اقدس میں آئے، آپ ﷺ کے چہرہ پر غضب کے آثار پیدا ہوئے اور فرمایا: ''میں نے اس لئے بھیجا تھا کہ پھاڑ کر زنانی چادریں بنائی جائیں۔ [6]

---

[1] بخاری، کتاب الهبة، باب هدية ما يكره بسها: ۲٦۱۳؛ ابو داود: ٤۱٤٩۔ [2] ابوداود، کتاب اللباس، باب فی الفرش: ٤۱٤۲۔ [3] ایضا، باب فی الصور: ٤۱٥۳۔ [4] ابوداود، کتاب الادب، باب ماجاء فی البناء: ٥۲۳۷۔ [5] ابوداود، کتاب اللباس، باب فی لبس الحرير: حضرت عمر کا یہ واقعہ ایک ہی باب کی دو روایتوں میں پہلی روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس قبا کو اپنے ایک مشرک بھائی کو دے جو مکہ میں رہتا تھا (دیکھیں حدیث نمبر: ۴۰۴۰) اور دوسری روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے ان سے کہا کہ اس کو فروخت کرکے اپنی ضرورت پوری کرو۔ ''زبین'' (دیکھیں حدیث نمبر: ۴۰۴۱)۔

[6] ابوداود، کتاب اللباس، باب فی لبس الحرير: ٤۰٤۳۔

مہر کرنے کی غرض سے جب آپ ﷺ نے انگوٹھی بنوائی تو پہلے سونے کی بنوائی آپ کی تقلید میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی زریں انگوٹھیاں بنوائیں، آپ ﷺ منبر پر چڑھے اور انگوٹھی اتار کر پھینک دی اور فرمایا کہ ''اب نہ پہنوں گا۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اسی وقت اتار کر پھینک دیں۔ ❶

جس طرح آپ ﷺ خود سادگی پسند فرماتے تھے اسی طرح آپ یہ بھی چاہتے تھے کہ آپ کے اہل وعیال بھی سادہ زندگی بسر کریں اور تکلف و تنعم سے پاک رہیں۔ عورتوں کو شریعت میں سونے کے زیور کا استعمال مباح ہے مگر آنحضرت ﷺ اہل بیت کرام کے لیے اس بات کو بھی خلافِ اولیٰ تصور فرماتے تھے۔

ایک دفعہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گلے میں سونے کا ہار دیکھا تو فرمایا: ''تم کو یہ ناگوار نہ ہوگا جب لوگ کہیں گے کہ پیغمبر کی لڑکی کے گلے میں آگ کا ہار ہے۔'' ❷

ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن (مسکتہ) دیکھے، فرمایا: ''اگر اس کو اتار کر ورس کے کنگن کو زعفران سے رنگ کر پہن لیتیں تو بہتر ہوتا۔'' ❸

ایک دفعہ نجاشی نے کچھ زیورات آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ہدیۃً بھیجے، ان میں ایک انگوٹھی بھی تھی جس میں حبشی پتھر کا ایک نگینہ جڑا تھا، آپ کے چہرہ پر کراہت کے آثار ظاہر ہوتے تھے اور لکڑی سے اس کو چھوتے تھے ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ ❹

ایک دفعہ کسی نے ریشم کا شلوکہ ہدیۃً بھیجا، آپ ﷺ نے پہن لیا اور اس کو پہن کر نماز ادا فرمائی نماز سے فارغ ہو کر نہایت کراہت اور نفرت کے ساتھ نوچ کر اتار ڈالا، پھر فرمایا: ''پرہیز گاروں کے لیے یہ کپڑے مناسب نہیں۔'' ❺

تواضع اور خاکساری کی راہ سے اکثر معمولی کپڑے استعمال فرماتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیال تھا کہ جمعہ وعیدین میں یا سفراء کے ورود کے موقع پر آپ شان وتجمل کے کپڑے زیب تن فرمائیں۔ اتفاق سے ایک بار راستہ میں ایک ریشمی کپڑا (حلۂ سیرا) بک رہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے موقع پا کر عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! یہ کپڑا حضور خرید لیں اور جمعہ میں اور سفراء کی آمد کے موقع پر ملبوس فرمائیں، ارشاد فرمایا کہ ''یہ وہ پہنے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔'' (بخاری، کتاب اللباس، باب الحریر للنساء: ۵۸۴۱) اکثر موٹے جھوٹے اور بھیڑ کے بال کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے اور انہی کپڑوں میں وفات پائی۔ ❻ بستر کمبل کا تھا، کبھی چمڑے کا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوتی تھی کبھی معمولی کپڑے کا جو دوتہہ کر دیا جاتا تھا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک شب کو میں نے بستر مبارک چارتہ کر کے بچھایا کہ ذرا نرم ہو جائے، صبح اٹھ کر آنحضرت ﷺ نے ناگواری ظاہر فرمائی۔ ❼

---

❶ ابوداود، کتاب الخاتم، ماجاء فی اتخاذ الخاتم: ۴۲۱۸۔ ❷ نسائی، کتاب الزینة، باب الکراهیة للنسآء فی اظهار الحلی والذهب: ۵۱۴۳۔ ❸ ایضا: ۵۱۴۶۔ ❹ مسند احمد، ج ۶، ص: ۱۱۹۔ ❺ صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینة: ۵۴۲۷۔ ❻ اوپر کی تمام روایتیں صحیح بخاری، کتاب اللباس سے ماخوذ ہیں۔ ❼ شمائل ترمذی: ۳۲۸۔

۹ھ میں جب کہ یمن سے شام تک صرف اسلام کی حکومت تھی، فرمانروائے اسلام کے گھر میں صرف ایک کھری چارپائی اور چمڑے کا سوکھا ہوا مشکیزہ تھا۔ ❶ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب آپ نے وفات پائی تو تھوڑے سے جو کے سوا گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا، ❷ صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کرتے تھے کہ ''دنیا میں انسان کے لیے اتنا کافی ہے جتنا ایک مسافر کو زادِ راہ کے لئے۔'' ❸ ایک دفعہ ایک بوریے پر آرام فرمارہے تھے اٹھے تو لوگوں نے دیکھا کہ پہلوئے مبارک پر نشان پڑ گئے ہیں، عرض کی: یارسول اللہ! کیا ہم لوگ کوئی گدا بنوا کر حاضر کریں، ارشاد ہوا کہ مجھ کو دنیا سے کیا غرض؟ مجھ کو دنیا سے اس قدر تعلق ہے جس قدر اس سوار کو جو تھوڑی دیر کے لیے راہ میں کسی درخت کے سایہ میں بیٹھ جاتا ہے پھر اس کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ ❹

ایلاء کے زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب مشربہ میں جو اسباب کی کوٹھڑی تھی حاضر ہوئے تو ان کو نظر آیا کہ سرورِ عالم ﷺ کے بیتِ قدس میں دنیاوی ساز و سامان کی کیا کیفیت ہے؟ جسم مبارک پر صرف ایک تہبند ہے ایک کھری چارپائی بچھی ہے، سرہانے ایک تکیہ پڑا ہے جس میں خرمے کی چھال بھری ہے، ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہیں، ایک کونے میں پائے مبارک کے پاس کسی جانور کی کھال پڑی ہے، کچھ مشکیزہ کی کھالیں سر کے پاس کھونٹی پر لٹک رہی ہیں، یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، آنحضرت ﷺ نے رونے کا سبب دریافت فرمایا، عرض کی: یارسول اللہ! میں کیوں نہ روؤں، چارپائی کے بان سے جسم اقدس میں بدھیاں پڑ گئی ہیں، یہ آپ کے اسباب کی کوٹھری ہے، اس میں جو سامان ہے وہ نظر آ رہا ہے، قیصر و کسریٰ تو باغ و بہار کے مزے لوٹیں اور آپ خدا کے پیغمبر اور برگزیدہ ہو کر آپ کے سامان خانہ کی یہ کیفیت ہو، ارشاد ہوا کہ ''اے ابن خطاب! تم کو یہ پسند نہیں کہ وہ دنیا لیں اور ہم آخرت۔'' ❺

مساوات

آپ ﷺ کی نظر میں امیر و غریب، صغیر و کبیر، آقا و غلام سب برابر تھے۔ سلمان و صہیب و بلال رضی اللہ عنہم کہ سب کے سب غلام رہ چکے تھے، آپ کی بارگاہ میں رؤسائے قریش سے کم رتبہ نہ تھے ایک دفعہ حضرت سلمان و بلال رضی اللہ عنہما ایک موقع پر جمع تھے اتفاق سے ابوسفیان نکلے، ان لوگوں نے کہا ابھی تلوار نے اس دشمن خدا کی گردن پر پورا قبضہ نہیں پایا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے کہا سردارانِ قریش کی شان میں یہ الفاظ! پھر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کہیں تم نے ان لوگوں کو ناراض تو نہیں کیا، ان لوگوں کو ناراض کیا تو خدا کو ناراض کیا۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فوراً جا کر ان بزرگوں سے کہا:

---

❶ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب ماکان النبی ﷺ یتجوز من اللباس والبسط:٥٨٤٨۔ روایت میں حصر (چٹائی) کا لفظ ہے۔ ❷ مسند احمد، ج ٦، ص: ١٠٨۔ ❸ ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب الزھد فی الدنیا: ٤١٠٤۔
❹ جامع ترمذی کتاب الزھد:٢٣٧٧۔ ❺ صحیح مسلم کتاب الطلاق باب فی الایلاء:٣٦٩٢۔

بھائیو! آپ لوگ مجھ سے ناراض تو نہیں ہوئے ان لوگوں نے کہا: نہیں خدا تم کو معاف کرے۔ ❶

قبیلہ مخزوم کی ایک عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوئی۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما جن سے آنحضرت ﷺ نہایت محبت رکھتے تھے، لوگوں نے ان کو شفیع بنا کر خدمت نبوی ﷺ میں بھیجا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسامہ کیا تم حدود خداوندی میں سفارش کرتے ہو۔'' پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو جمع کر کے خطاب فرمایا: ''تم سے پہلے کی امتیں اسی لئے برباد ہو گئیں کہ جب معزز آدمی کوئی جرم کرتا تو تسامح کرتے اور معمولی آدمی مجرم ہوتے تو سزا پاتے، خدا کی قسم! اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) سرقہ کرتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے۔'' ❷

غزوۂ بدر میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی گرفتار ہو کر آئے تھے، قیدیوں کو زرفدیہ لے کر رہا کیا جاتا تھا بعض نیک دل انصار نے اس بنا پر کہ وہ آپ سے قرابت قریبہ رکھتے تھے، عرض کی کہ یارسول اللہ! اجازت دیجئے کہ ہم اپنے بھانجے (عباس رضی اللہ عنہ) کا زرفدیہ معاف کر دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں ایک درہم بھی معاف نہ کرو۔'' ❸ مجلس میں جو چیزیں آتیں ہمیشہ داہنی طرف سے اس کی تقسیم شروع فرماتے اور ہمیشہ اس میں امیر وغریب، صغیر وکبیر سب کی مساوات کا لحاظ ہوتا۔

ایک دفعہ خدمت اقدس میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا مجمع تھا اتفاق سے داہنی طرف حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیٹھے ہوئے تھے جو بہت کمسن تھے، بائیں جانب بڑے بڑے معمر صحابہ رضی اللہ عنہم تھے۔ کہیں سے دودھ آیا، آپ نے نوش فرما کر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: ''تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں۔'' انہوں نے عرض کی: اس عطیہ میں میں ایثار نہیں کر سکتا۔ چونکہ داہنی جانب تھے اور ترتیب مجلس کی رو سے انہی کا حق تھا، آپ نے انہی کو ترجیح دی۔ ❹ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میرے مکان پر تشریف لائے اور پینے کو پانی مانگا میں نے بکری کا دودھ پیش کیا، مجلس کی ترتیب یہ تھی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بائیں جانب، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سامنے اور ایک بدو داہنی طرف تھا، آپ نے پی لیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کیا یعنی بقیہ ان کو عنایت ہو آپ ﷺ نے فرمایا: ''پہلے داہنی طرف والے کا حق ہے۔'' یہ کہہ کر بچا ہوا دودھ بدو کو عنایت فرمایا۔ ❺

قریش اپنے فخر وامتیاز کے لئے مزدلفہ میں قیام کرتے تھے لیکن آنحضرت ﷺ نے اس تفریق کو کبھی پسند نہ فرمایا، بعثت سے پہلے ❻ اور بعثت کے بعد بھی ہمیشہ عام لوگوں کے ساتھ مقام کرتے تھے، علاوہ بریں یہ بھی

---

❶ صحیح مسلم، باب فضائل من سلمان: ٦٤١٢۔ ❷ بخاري، كتاب الحدود، باب كراهية الشفاعة في الحد: ٦٧٨٨؛ مسلم، كتاب الحدود، باب قطع اليد السارق: ٤٤١٠؛ ابوداود، كتاب الحدود، باب في الحد يشفع فيه: ٤٣٧٤۔ ❸ صحيح بخاري، كتاب الجهاد، باب فداء المشركين: ٣٠٤٨۔

❹ صحيح بخاري، كتاب الاشربة، باب هل يستاذن الرجل من عن يمينه في الشرب: ٥٦٢٠۔

❺ بخاري، كتاب الهبة، باب من استسقى: ٥٦١٩۔ ❻ ابوداود، كتاب المناسك ابوداود میں اس مضمون کی کوئی روایت نہیں ملی بلکہ یہ صراحت موجود ہے کہ قریش کے ظن وگمان کے برخلاف آپ نے مزدلفہ پار کر کے وادی نمرہ میں قیام فرمایا ''ض''۔

گوارانہ تھا کہ وہیں خاص طور سے کوئی عمدہ جگہ دیکھ کر آپ ﷺ کیلئے مخصوص کر دی جائے اور وہاں سایہ کیلئے کوئی چھپر ڈال دیا جائے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے تجویز پیش کی تو فرمایا: ''جو پہلے پہنچ جائے اسی کا مقام ہے۔'' ❶

صحابہ رضی اللہ عنہم جب سب مل کر کوئی کام کرتے تو ہمیشہ آنحضرت ﷺ ان کے ساتھ شریک ہو جاتے اور معمولی مزدور کی طرح کام انجام دیتے۔ مدینہ میں آ کر سب سے پہلا کام مسجد نبوی کی تعمیر تھی اس مسجد اقدس کی تعمیر میں دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح خود آنحضرت ﷺ بھی بہ نفس نفیس شریک تھے۔ خود اپنے دست مبارک سے اینٹ اٹھا اٹھا کر لاتے تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم عرض کرتے تھے کہ ہماری جانیں قربان، آپ کیوں زحمت فرماتے ہیں لیکن آپ اپنے فرض سے باز نہ آتے۔ ❷ غزوۂ احزاب کے موقع پر بھی جب تمام صحابہ رضی اللہ عنہم مدینہ کے چاروں طرف خندق کھود رہے تھے آپ بھی ایک ادنیٰ مزدور کی طرح کام کر رہے تھے یہاں تک کہ شکم مبارک پر مٹی اور خاک کی تہ جم گئی تھی۔ ❸

ایک سفر میں کھانا تیار نہ تھا، تمام صحابہ نے مل کر پکانے کا سامان کیا، لوگوں نے ایک ایک کام بانٹ لیا جنگل سے لکڑی لانے کا کام آنحضرت ﷺ نے اپنے ذمہ لیا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یارسول اللہ! یہ کام ہم خدام کر لیں گے فرمایا: ''ہاں سچ ہے لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ میں تم سے اپنے کو ممتاز کروں خدا اس بندہ کو پسند نہیں کرتا جو اپنے ہمراہیوں میں ممتاز بنتا ہے۔'' ❹

غزوۂ بدر میں سواریوں کا سامان بہت کم تھا تین تین آدمیوں کے بیچ میں ایک ایک اونٹ تھا۔ لوگ باری باری سے چڑھتے اترتے تھے۔ آنحضرت ﷺ بھی عام آدمیوں کی طرح ایک اونٹ میں دو اور آدمیوں کے ساتھ شریک تھے ہمراہ جان نثاران اپنی باری پیش کرتے اور عرض کرتے کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ سوار رہیں حضور کے بدلہ ہم پیادہ چلیں گے، ارشاد ہوتا: ''نہ تم مجھ سے زیادہ پیادہ پا چل سکتے ہو، اور نہ میں تم سے کم ثواب کا محتاج ہوں۔'' ❺

تواضع

گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے، گھر میں خود جھاڑو دیتے، دودھ دوھ لیتے، بازار سے سودا لاتے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے، (گدھے کی سواری سے آپ کو عار نہ تھا، غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز نہ تھا)۔ ❻ ایک دفعہ گھر سے باہر تشریف

---

❶ مسند احمد، ج ٦، ص: ١٨٧۔ ❷ صحیح بخاری، باب هجرة النبی ﷺ: ٣٩٠٦، ٣٩٣٢۔

❸ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة احزاب: ٤١٠٠، ٤١٠١۔

❹ زرقانی، ج ٤، ص: ٣٠٤ بحوالہ سیرت محب طبری۔ یہ روایت کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔

❺ مسند احمد بن حنبل، ج ١، ص: ٤٢٢ ومسند ابوداود طیالسی، جز ٢، ص: ٤٧۔

❻ شمائل ترمذی، باب ماجاء فی تواضع رسول اللہ ﷺ: ٣٣١۔

لائے لوگ تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے فرمایا کہ ''اہل عجم کی طرح تعظیم کے لیے نہ اٹھو۔'' ❶ غریب سے غریب بیمار ہوتا تو عیادت کو تشریف لے جاتے۔ ❷ مفلسوں اور فقیروں کے ہاں جا کر ان کے ساتھ بیٹھتے، صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیٹھتے تو اس طرح بیٹھتے کہ امتیازی حیثیت کی بنا پر کوئی آپ کو پہچان نہ سکتا۔ کسی مجمع میں جاتے تو جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے۔

ایک دفعہ ایک شخص ملنے آیا لیکن نبوت کا اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''گھبراؤ نہیں میں فرشتہ نہیں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔'' ❸

تواضع اور خاکساری کی راہ سے آپ ﷺ اکڑوں بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے تھے اور فرمایا کرتے تھے: ''میں بندہ اور بندوں کی طرح کھاتا اور بندوں ہی کی طرح بیٹھتا ہوں۔'' ایک دفعہ کھانے کے موقع پر جگہ تنگ تھی اور لوگ زیادہ آ گئے آپ اکڑوں بیٹھ گئے کہ جگہ نکل آئے ایک بدو بھی مجلس میں شریک تھا، اس نے کہا محمد! یہ کیا طرز نشست ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدا نے مجھے خاکسار بندہ بنایا ہے، جبار اور سرکش نہیں بنایا ہے۔'' ❹

تواضع کی انتہا یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے متعلق جائز تعظیمی الفاظ بھی نہیں پسند فرماتے تھے ایک بار ایک شخص نے ان الفاظ سے آپ ﷺ کو خطاب کیا: ''اے ہمارے آقا اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر اور ہم میں سب سے بہتر کے فرزند! آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگو، پرہیزگاری اختیار کرو، شیطان تمہیں گرا نہ دے میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں خدا کا بندہ اور اس کا رسول۔ مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا میں پسند نہیں کرتا کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔'' ❺ ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کو یا خیر البریة (یعنی اے بہترین خلق) کہہ کر مخاطب کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ ابراہیم علیہ السلام تھے۔'' ❻

عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ بنی عامر کی سفارت کے ساتھ جب ہم لوگ خدمت اقدس میں آئے تو عرض کی، حضور ہمارے آقا (سید) ہیں۔ ارشاد فرمایا کہ ''آقا خدا ہے۔'' پھر ہم لوگوں نے عرض کی آپ ہم میں سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں ارشاد ہوا کہ ''بات کہو تو دیکھ لو کہ شیطان تو تم کو نہیں چلا رہا ہے۔'' ❼

مدینہ منورہ میں ایک عورت تھی جس کے دماغ میں کچھ فتور تھا آپ کی خدمت میں آئی اور کہا کہ محمد! مجھ کو تم سے کچھ کام ہے، فرمایا: ''جہاں کہو چل سکتا ہوں۔'' وہ آپ کو ایک کوچہ میں لے گئی اور وہیں بیٹھ گئی

---

❶ ابوداود، كتاب الادب، باب الرجل يقوم للرجل: ٥٢٣٠۔ ❷ شمائل ترمذی: ٣٣١۔

❸ مستدرك، ج ٣، ص: ٤٨ على شرط الشيخين۔ ❹ ابوداود، كتاب الأطعمة، باب فى الاكل من اعلى الصحفة: ٣٧٧٣۔ ❺ مسند احمد، ج ٣، ص: ١٥٣۔

❻ صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب فضائل ابراهيم: ٦١٣٨۔

❼ ابوداود كتاب الادب، باب فى كراهية التمادح: ٤٨٠٦۔

آپ ﷺ بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے اور جو کام تھا انجام دے دیا۔ ❶ مخرمہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے ایک دفعہ انہوں نے اپنے بیٹے مسور رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس کہیں سے چادریں آئی ہیں اور وہ تقسیم فرما رہے ہیں آؤ ہم بھی چلیں، آئے تو آپ زنانہ میں تشریف لے جا چکے تھے کہا: آواز دو، انہوں نے کہا: میرا یہ رتبہ ہے کہ میں آنحضرت ﷺ کو آواز دوں، مخرمہ نے کہا: بیٹے! محمد جبار نہیں ہیں۔ ان کی جرأت دلانے سے مسور رضی اللہ عنہ نے آواز دی، آنحضرت ﷺ فوراً نکل آئے اور ان کو دیبا کی قبا عنایت کی جس کی گھنڈیاں زریں تھیں۔ ❷

ایک دفعہ ایک انصاری نے ایک یہودی کو یہ کہتے سنا کہ اس خدا کی قسم! جس نے موسیٰ کو تمام انسانوں پر فضیلت دی، یہ سمجھے کہ آنحضرت ﷺ پر تعریض ہے، غصہ میں آ کر اس کے منہ پر تھپڑ کھینچ مارا، وہ آنحضرت ﷺ کے پاس فریادی آیا، آپ نے انصاری کو بلا بھیجا اور واقعہ کی تحقیق کے بعد فرمایا کہ ''مجھ کو انبیا پر فضیلت نہ دو۔'' ❸

(انسان کے غرور و ترفع کا اصلی موقع وہ ہوتا ہے جب وہ اپنے چپ و راست جلو میں ہزاروں آدمیوں کو چلتے ہوئے دیکھتا ہے جو اس کے ایک اشارہ پر اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار ہو جاتے ہیں، خصوصاً جب وہ فاتحانہ ایک جرار و پرجوش لشکر کے ساتھ شہر میں داخل ہوتا ہے لیکن آنحضرت ﷺ کے تواضع و خاکساری کا منظر اس وقت اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر جب آپ شہر میں داخل ہوئے تو تواضعاً سر مبارک کو اس قدر جھکا دیا کہ کجاوہ سے آ کر مل گیا۔ ❹ غزوۂ خیبر میں جب آپ کا داخلہ ہوا تو آپ ایک گدھے پر سوار تھے جس میں لگام کی جگہ کھجور کی چھال بندھی تھی۔ ❺ حجۃ الوداع میں جس کجاوہ پر آپ سوار تھے سن چکے ہو کہ اس کی قیمت کیا تھی)۔

تعظیم اور مدح مفرط سے روکتے تھے

اس نکتہ کا بڑا لحاظ فرماتے تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال پیش نظر تھی۔ فرمایا کرتے تھے: ''میری اس قدر مبالغہ آمیز مدح نہ کیا کرو جس قدر نصاریٰ ابن مریم کی کرتے ہیں۔ میں تو خدا کا بندہ اور اس کا فرستادہ ہوں۔'' بخاری: ۶۸۳۰ قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ حیرہ گیا وہاں لوگوں کو دیکھا کہ رئیس شہر کے دربار میں جاتے ہیں تو اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں یہ واقعہ بیان کیا اور عرض کی کہ آپ کو سجدہ کیا جائے کہ آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری قبر پر گزر رو

❶ ابوداود، كتاب الادب في الجلوس بالطرقات: ٤٨١٨، ٤٨١٩۔ ❷ بخاري، كتاب اللباس، باب المزرّر بالذهب: ٥٨٦٢۔ ❸ بخاري، كتاب احاديث الانبياء، باب: ٣٤٠٨۔

❹ شرح شفاء قاضي عياض، ج٢، ص: ١١٣ وسيرت ابن هشام؛ مستدرك حاكم، ج٤، ص: ٣١٧۔

❺ ابن ماجه، كتاب الزهد، باب البراة من الكبر: ٤١٧٨؛ بيهقي: ٨١٩٠۔

گے تو سجدہ کرو گے؟'' کہا: نہیں، فرمایا: ''تو جیتے جی بھی سجدہ نہیں کرنا چاہیے۔'' ❶

معوذ بن عفراء کی صاحبزادی (ربیع) کی جب شادی ہوئی تو آپ ﷺ ان کے گھر تشریف لے گئے اور دلہن کے لیے جو فرش بچھایا گیا تھا، اس پر بیٹھ گئے۔ گھر کی لڑکیاں آس پاس جمع ہو گئیں اور دف بجا بجا کر شہدائے بدر کا مرثیہ گانے لگیں، گاتے گاتے ایک نے یہ مصرع گایا:

فینا نبی یعلم ما فی غد۔ ''ہم میں ایک پیغمبر ہے جو کل کی باتیں جانتا ہے۔''

فرمایا: ''یہ چھوڑ دو اور وہی کہو جو پہلے کہہ رہی تھیں۔'' ❷

آنحضرت ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم نے جس روز انتقال کیا اتفاق سے اس روز سورج گرہن لگا لوگوں کے خیال میں ایک پیغمبر کی ظاہر عظمت کا فرضی تخیل یہ تھا کہ اس کے درد وصدمہ سے کم از کم اجرام سماوی میں انقلاب پیدا ہو جائے۔ لوگوں نے اس اتفاقی واقعہ کو اسی قسم کے واقعہ پر محمول کیا ایک جاہ پسند انسان کے لیے اس قسم کا اتفاق بہترین موقع ہو سکتا تھا لیکن نبوت کی شان اس سے بدرجہا ارفع واعلیٰ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اسی وقت لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور خطبہ دیا کہ چاند اور سورج میں گرہن لگنا خدا کی آیات قدرت میں ہے کسی کی زندگی اور موت سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔ ❸

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ وضو کر رہے تھے، وضو کا پانی جو دست مبارک سے گرتا فدائی برکت کے خیال سے اس کو چلو میں لے کر بدن میں مل لیتے، آپ ﷺ نے پوچھا: ''تم یہ کیوں کر رہے ہو۔'' انہوں نے عرض کیا کہ خدا اور خدا کے رسول کی محبت میں، فرمایا: ''اگر کوئی اس بات کی خوشی حاصل کرنا چاہے کہ وہ خدا اور خدا کے رسول سے محبت رکھتا ہے، تو اس کو چاہیے کہ جب باتیں کرے سچ بولے، جب امین بنایا جائے ادائے امانت کرے اور کسی کا پڑوسی ہے تو ہمسائگی کو اچھی طرح نباہے۔'' ❹

ایک صاحب بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے اثنائے گفتگو میں انہوں نے کہا: جو خدا چاہے اور جو آپ ﷺ چاہیں۔ ارشاد ہوا: ''تم نے خدا کا شریک اور ہمسر ٹھہرایا کہو کہ جو خدا تنہا چاہے۔'' ❺

شرم وحیا

صحاح میں ہے کہ آپ ﷺ دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے اور شرم وحیا کا اثر آپ ﷺ کی ایک ایک ادا سے ظاہر ہوتا تھا، کبھی کسی کے ساتھ بدزبانی نہیں کی، بازاروں میں جاتے تو چپ چاپ گزر جاتے، تبسم کے سوا کبھی لب مبارک خندہ وقہقہہ سے آشنا نہیں ہوئے۔ بھری محفل میں کوئی بات ناگوار ہوتی تو لحاظ کی وجہ سے زبان سے کچھ نہ فرماتے چہرہ کے اثر سے ظاہر ہوتا اور صحابہ رضی اللہ عنہم متنبہ ہو جاتے۔

---

❶ ابوداود، کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المراۃ: ۲۱۴۰۔

❷ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب ضرب الدف فی النکاح والولیمۃ: ۵۱۴۷۔

❸ صحیح بخاری، ابواب الکسوف: ۱۰۴۳، ۱۰۶۰ ومسلم، کتاب الکسوف: ۲۱۲۲۔

❹ شعب الایمان بیہقی: ۱۵۳۳؛ مشکوٰۃ، کتاب الآداب، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق۔

❺ ادب المفرد امام بخاری: ۷۸۳۔

عرب میں اور ممالک کی طرح شرم وحیا کا بہت کم لحاظ تھا، ننگے نہانا عام بات تھی، حرم کعبہ کا طواف ننگے ہو کر کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو بالطبع یہ باتیں سخت ناپسند تھیں، ایک دفعہ فرمایا: ''حمام سے پرہیز کرو۔'' لوگوں نے عرض کی کہ حمام میں نہانے سے میل چھوٹتا ہے اور بیماری میں فائدہ ہوتا ہے، ارشاد فرمایا: ''نہاؤ تو پردہ کرلیا کرو۔'' عرب میں حمام نہ تھے لیکن شام وعراق کے جو شہر عرب کی سرحد سے ملے ہوئے تھے وہاں کثرت سے حمام تھے، اس بنا پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم جب عجم فتح کرو گے تو وہاں حمام ملیں گے ان میں جانا تو چادر کے ساتھ جانا۔''

ایک دفعہ کچھ عورتیں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئیں، انہوں نے وطن پوچھا، بولیں حمص (شام کا ایک شہر ہے) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: تمہیں وہ عورتیں ہو جو حمام میں نہاتی ہیں؟ بولیں: کیا حمام کوئی بری چیز ہے؟ فرمایا کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ ''جو عورت اپنے گھر کے سوا کسی گھر میں کپڑے اتارتی ہے، خدا اس کی پردہ دری کرتا ہے۔'' (1) ابوداؤد میں روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حمام میں نہانے کو مطلقاً منع کر دیا تھا، پھر مردوں کو پردہ کی قید کے ساتھ اجازت دی (2) لیکن عورتوں کے لیے وہی حکم قائم رہا۔ عرب میں جائے ضرور نہ تھے۔ (3) لوگ میدانوں میں رفع حاجت کے لیے جایا کرتے تھے لیکن پردہ نہیں کرتے تھے بلکہ آمنے سامنے بیٹھ جایا کرتے اور ہر قسم کی بات چیت کرتے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی سخت ممانعت کی اور فرمایا: ''خدا اس سے ناراض ہوتا ہے۔'' (4) معمول تھا کہ رفع حاجت کے لیے اس قدر دور نکل جاتے کہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے۔ مکہ معظمہ میں جب تک قیام تھا حدود حرم سے باہر چلے جاتے جس کا فاصلہ مکہ معظمہ سے کم از کم تین میل تھا۔

اپنے ہاتھ سے کام کرنا

اگرچہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کے جان نثار خادموں میں داخل تھے بایں ہمہ آپ خود اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو پسند کرتے تھے۔ حضرت عائشہ، ابوسعید خدری اور امام حسن رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ کان یخدم نفسہ۔ یعنی آپ اپنے کام خود اپنے دست مبارک سے انجام دیا کرتے تھے (5) ایک شخص نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ آپ گھر میں کیا کیا کرتے تھے۔ جواب دیا کہ ''گھر کے کام کاج میں مصروف رہتے تھے، کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے خود پیوند لگا لیتے تھے، گھر میں خود جھاڑو دے لیتے تھے، دودھ دوھ لیتے تھے، بازار سے سودا خرید لاتے تھے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے تھے، ڈول میں ٹانکے لگا دیتے تھے، اونٹ کو

---

(1) یہ تمام روایتیں الترغیب والترہیب منذری، کتاب الطہارۃ، باب الترہیب من دخول الرجال الحمام میں کتب حدیث کے حوالہ سے منقول ہیں، طبرانی: ۲۴/ ۶۴۵، ۶۴۶؛ مسند احمد: ۶/ ۳۰۱۔ (2) ابو داود، کتاب الحمام، باب الدخول فی الحمام: ۴۰۰۹۔ (3) صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث افک: ۴۱۴۱۔

(4) ابو داود، کتاب الطہارۃ، باب کراہیۃ الکلام عند الخلاء: ۱۵ وابن ماجہ، ابواب الطہارۃ، باب النہی عن الاجتماع علی الخلاء: ۳۴۲۔ (5) شرح شفاء قاضی عیاض، ج۱، ص: ۱۱۰۔

اپنے ہاتھ سے باندھ دیتے تھے اس کو چارہ دیتے، غلام کے ساتھ مل کر آٹا گوندھتے۔'' [1]

ایک دفعہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ خدمت مبارک میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ ﷺ خود اپنے ہاتھ سے ایک اونٹ کے بدن پر تیل مل رہے تھے۔ ان سے دوسری روایت ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ آپ صدقہ کے اونٹوں کو داغ رہے ہیں، تیسری روایت میں وہ کہتے ہیں کہ آپ بکریوں کو داغ لگا رہے تھے۔ [2]

ایک دفعہ مسجد نبوی میں تشریف لے گئے دیکھا تو کسی نے مسجد میں ناک صاف کی ہے، آپ ﷺ نے خود دست مبارک سے ایک کنکر لے کر اس کو کھرچ ڈالا اور آیندہ لوگوں کو اس فعل سے منع فرمایا۔ [3]

آپ ﷺ جب بچے تھے اور خانہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی تو اس وقت بھی پتھر اٹھا اٹھا کر معماروں کے پاس لاتے تھے۔ [4] مسجد قبا اور مسجد نبوی کی تعمیر اور خندق کے کھودنے میں جس طرح زمین کھودی اس کی تفصیل جلد اول کے واقعہ میں گزر چکی ہے۔ ایک سفر میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے بکری ذبح کی اور اس کے پکانے کے لیے آپس میں کام بانٹ لیے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جنگل سے لکڑی میں لاؤں گا۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے تامل کیا تو فرمایا: ''میں امتیاز پسند نہیں کرتا۔'' [5] ایک اور سفر میں آپ کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ گیا، آپ نے خود اس کو درست کرنا چاہا، ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! لایئے میں ٹانک دوں، فرمایا: ''یہ تشخص پسندی ہے جو مجھے محبوب نہیں ہے۔'' [6] دو صحابی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ خود اپنے دست مبارک سے مکان کی مرمت کر رہے ہیں، ہم لوگ بھی اس کام میں شریک ہو گئے، جب کام ختم ہو گیا تو آپ نے ہمارے لیے دعائے خیر فرمائی۔ [7]

دوسروں کے کام کر دینا

خباب بن ارت ایک صحابی تھے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ان کو کسی غزوہ پر بھیجا، خباب رضی اللہ عنہ کے گھر میں کوئی مرد نہ تھا اور عورتوں کو دودھ دوہنا نہیں آتا تھا اس بنا پر آپ ہر روز ان کے گھر جاتے اور دودھ دوہ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب کیف یکون الرجل فی اهله: ٦٠٣٩ میں مجمل ہے، قاضی عیاض نے شفاء ج ٢، ص: ١٦ا میں متعدد حدیثوں سے لے کر اور ٹکڑے بھی جمع کر دیے ہیں، زرقانی نے ج ٤، ص: ٣٠٤ میں مسند احمد و ابن سعد سے یہ روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے۔ [2] یہ تینوں روایتیں صحیح مسلم میں ہیں، پہلی روایت کتاب الادب، باب استحباب تحنيك المولود: ٥٦١٢ میں اور دوسری اور تیسری کتاب اللباس والزينة، باب جواز وسم الحيوان: ٥٥٥٥، ٥٥٥٦ میں ہے۔ [3] سنن نسائی، کتاب المساجد، باب النهى عن ان يتنخم الرجل فى...: ٧٢٥۔

[4] صحیح بخاری، باب بنیان الکعبة: ٣٨٢٩۔ [5] زرقانی، ج ٤، ص: ٣٠٦ بحواله سیرت محب طبری۔

[6] زرقانی، بحواله کتاب تمثال النعل الشریف لابی الیمن ابن عساکر۔

[7] مسند احمد، ج ٣، ص: ٤٦٩۔

دیا کرتے۔ ❶ حبش سے جو مہمان آئے تھے صحابہ رضی اللہ عنہم نے چاہا کہ وہ ان کی خدمت گزاری کریں لیکن آپ ﷺ نے ان کو روک دیا اور فرمایا کہ ''انہوں نے میرے دوستوں کی خدمت کی ہے اس لیے میں خود ان کی خدمت گزاری کا فرض انجام دوں گا۔'' ❷ کفار ثقیف جنہوں نے طائف میں آپ ﷺ کے پائے مبارک کو زخمی کر دیا تھا، ۹ھ میں وفد لے کر آئے تو آپ ﷺ نے ان کو مسجد نبوی میں اتارا اور بہ نفس نفیس ان کی مہمانی کے فرائض ادا کیے۔

مدینہ کی لونڈیاں آپ ﷺ کی خدمت میں آتیں اور کہتیں: یارسول اللہ! میرا یہ کام ہے۔ آپ ﷺ فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور ان کا کام کر دیتے۔ مدینہ میں ایک پاگل لونڈی تھی وہ ایک دن حاضر ہوئی اور آپ ﷺ کا دست مبارک پکڑ لیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے عورت! مدینہ کی جس گلی میں تو چاہے میں تیرا کام کر دوں گا۔'' چنانچہ آپ ﷺ اس کے ساتھ مدینہ کی ایک گلی میں جا کر بیٹھے اور اس کی ضرورت پوری کی۔ ❸ عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے وہ فرماتے ہیں:

ولا يأنف ان يمشي مع الا رملة والمسكين فيقضي له الحاجة ـ ❹

''بیوہ اور مسکین کے ساتھ چل کر ان کا کام کر دینے میں آپ ﷺ کو عار نہ تھا۔''

ایک دفعہ آپ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہو چکے تھے کہ ایک بدو آیا اور آپ ﷺ کا دامن پکڑ کر بولا میرا ذرا سا کام رہ گیا ہے ایسا نہ ہو کہ میں بھول جاؤں، پہلے اس کو کر دو۔ آپ ﷺ اس کے ساتھ فوراً مسجد سے باہر نکل آئے اور اس کا کام انجام دے کر نماز ادا کی۔ ❺

عزم واستقلال

خدا نے قرآن مجید میں ﴿اولو العزم من الرسل﴾ کہہ کر انبیا کی کئی بار مدح فرمائی ہے۔ آنحضرت ﷺ چونکہ خاتم الرسل ہیں اس لیے خصوصیت کے ساتھ خدا نے یہ وصف آپ ﷺ کی ذات میں ودیعت کیا تھا۔ ابتدا سے انتہا تک اسلام کا ایک ایک کارنامہ آنحضرت ﷺ کے عزم واستقلال کا مظہر اتم ہے۔ عرب کے کفرستان میں ایک شخص تنہا کھڑا ہوتا ہے، بے یار و مددگار دعوت حق کی صدائیں بلند کرتا ہے، ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ اس کی مخالفت میں پہاڑ بن کر سامنے آتا ہے لیکن وقار نبوت اور عزم ربانی سے ٹھوکر کھا کر پیچھے ہٹ جاتا ہے اور مخالفتوں کی تمام قوت اس کے سامنے چور چور ہو جاتی ہے۔

تیرہ برس کی متواتر ناکامیوں کے بعد بھی ذات اقدس جبن و یاس سے آشنا نہیں ہوتی اور بالآخر وہ دن

---

❶ ابن سعد، حصہ ششم، ص:۲۱۳ ترجمہ بنت خباب۔

❷ الشفاء قاضی عیاض، بسند متصل، ج۲، ص:۱۰۰، بحوالہ بیہقی۔ ❸ مسلم:٦٠٤٤ اورابوداود، کتاب الادب، باب فی الجلوس؛ طرقات: ٤٨١٨، ٤٨١٩۔ ❹ سنن النسائی، کتاب الجمعة، باب ما يستحب من تقصير الخطبة :١٤١٥؛ سنن دارمی، باب تواضع رسول اللہ ﷺ: ٧٤۔

❺ بخاری، کتاب الاذان، باب الکلام اذا اقیمت الصلوٰة: ٦٤٣ میں مختصراً ذکر ہے الادب المفرد: ٢٧٨۔

آ تا ہے جب ایک تنہا انسان ایک لاکھ جان نثاروں کو چھوڑ کر دنیائے فانی کو الوداع کہتا ہے۔ ہجرت سے قبل ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کفار کی ایذا رسانیوں سے تنگ آ کر خدمت مبارک میں عرض کی کہ آپ ﷺ ہمارے لیے کیوں دعا نہیں فرماتے، آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ ''تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان کو آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا تھا، ان کے بدن پر لوہے کی کنگھیاں چلائی جاتی تھیں جس سے گوشت پوست سب علیحدہ ہو جاتا تھا لیکن یہ آزمائشیں بھی ان کو مذہب سے برگشتہ نہیں کر سکتی تھیں، خدا کی قسم! دین اسلام اپنے مرتبہ کمال کو پہنچ کر رہے گا یہاں تک کہ صنعاء سے حضر موت تک ایک سوار اس طرح بے خطر چلا آئے گا کہ اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہو گا۔'' ❶

مکہ میں رؤسائے قریش جب ہر قسم کی تدبیروں سے تھک گئے تو انہوں نے آپ ﷺ کے سامنے حکومت کا تخت، زر و جواہر کا خزانہ اور حسن کی دولت پیش کی، ان میں سے ہر چیز بہادر سے بہادر انسان کے قدم کو ڈگمگا دینے کے لیے کافی تھی لیکن آپ نے ذلت کے ساتھ ان کی درخواست کو ٹھکرا دیا اور بالآخر وہ وقت آیا، جب آخری ہمدم و دمساز یعنی ابو طالب نے بھی ساتھ چھوڑنا چاہا تو یہ غور و فکر کا آخری لمحہ اور عزم و استقلال کا آخری امتحان تھا، اس وقت آپ نے جواب میں جو فقرے فرمائے، عالم کائنات میں ثبات و پامردی کے اظہار کا سب سے آخری طریقہ تعبیر ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''چچا جان! اگر قریش میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں میں چاند رکھ دیں تب بھی اپنے اعلان حق سے باز نہ آؤں گا۔'' ❷

غزوۂ بدر میں جب تین سو بے سروسامان مسلم ایک ہزار باساز و سامان فوج سے معرکہ آراء تھے، کفار قریش اپنے زور و کثرت سے بپھرتے آتے تھے، اس وقت مسلمان سمٹ سمٹ کر آنحضرت ﷺ کے پہلو میں آ جاتے تھے اور با ایں ہمہ نبوت کا کوہ وقار اپنی جگہ پر قائم تھا۔ ❸

غزوۂ اُحد میں آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا تو سب نے حملہ کی رائے دی لیکن جب آپ زرہ پہن کر تیار ہو گئے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے رک جانے کا مشورہ دیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''پیغمبر زرہ پہن کر اتار نہیں سکتا۔'' ❹ غزوۂ حنین میں جب قبیلہ ہوازن کے قدر اندازوں نے متصل تیروں کی بوچھاڑ کی، تو اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم کے قدم اکھڑ گئے لیکن آپ نہایت سکون و اطمینان سے چند جان نثاروں کے ساتھ میدان میں جمے رہے۔ اس وقت زبان مبارک پر یہ رجز جاری تھا:

((انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب)) ❺ ''میں پیغمبر صادق ہوں، میں فرزند عبدالمطلب ہوں۔''

ایک بار آپ کسی غزوہ میں درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے، ایک کافر آیا اور اسی حالت خواب میں

---

❶ صحیح بخاری، باب علامات النبوۃ فی الاسلام: ٣٦١٢۔ ❷ ابن هشام، ج١، ص:١٦٤۔

❸ مسند احمد، ج١، ص: ١٢٦۔ ❹ بخاری، کتاب الاعتصام، باب قول الله ﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ رقم الباب: ٢٨۔ ❺ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قول الله تعالیٰ: ویوم حنین...... ٤٣١٥ تا ٤٣١٧۔

تلوار کھینچ کر بولا: محمد (ﷺ) اب تم کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدا۔'' اس عزم واستقلال اور جرأت صادقہ نے اس کو اس قدر مرعوب کر دیا کہ فوراً اس نے تلوار میان میں کر لی اور پاس بیٹھ گیا۔ 1

شجاعت

یہ وصف انسانیت کا اعلیٰ جوہر اور اخلاق کا سنگ بنیاد ہے۔ عزم استقلال، حق گوئی، راست گفتاری، پردلی، یہ تمام باتیں شجاعت ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو سینکڑوں مصائب وخطرات اور بیسیوں معرکے اور غزوات پیش آئے لیکن کبھی پامردی اور ثبات کے قدم نے لغزش نہیں کھائی۔ غزوۂ بدر میں گھمسان کی لڑائی میں ۳۰۰ نہتے مسلمانوں کے قدم جب ایک ہزار مسلح فوج کے حملوں سے ڈگمگا جاتے تھے تو دوڑ کر مرکز نبوت ہی کے دامن میں آ کر پناہ لیتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جن کے دست وبازو نے بڑے بڑے معرکے سر کیے، کہتے ہیں کہ بدر میں جب زور کا رن پڑا تو ہم لوگوں نے آپ ہی کی آڑ میں آ کر پناہ لی۔ آپ سب سے زیادہ شجاع تھے۔ مشرکین کی صف سے اس دن آپ سے زیادہ کوئی قریب نہ تھا۔ 2

غزوۂ حنین میں ہوازن کے بے پناہ تیروں کی بارش ہوئی تو مسلمانوں کی کثیر التعداد فوج دفعتۃً میدان سے ہٹ گئی لیکن آپ مع چند جان نثاروں کے بدستور میدان میں کھڑے رہے۔ اس وقت بار بار آپ اپنے خچر کو ایڑ لگا کر آگے بڑھانے کا قصد فرما رہے تھے لیکن جان نثار مانع آتے تھے، اب دشمنوں کی تمام فوج کا نشانہ نہ صرف آپ کی ذات تھی، بااں ہمہ پائے اقدس میں لغزش نہیں ہوئی۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ جو اس معرکہ میں شریک تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ کیا حنین میں تم بھاگ کھڑے ہوئے تھے؟ جواب دیا، ہاں! یہ سچ ہے لیکن میں گواہی دیتا ہوں کہ آنحضرت ﷺ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے تھے، خدا کی قسم! جب لڑائی پورے زور پر ہوتی تھی تو ہم لوگ آپ ہی کے پہلو میں آ کر پناہ لیتے تھے، ہم میں سب سے بڑا بہادر وہ شمار ہوتا تھا جو آپ کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا۔ 3

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سب سے زیادہ شجاع تھے۔ ایک دفعہ مدینہ میں شور ہوا کہ دشمن آ گئے۔ لوگ مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے لیکن سب سے پہلے جو آگے بڑھ کر نکلا وہ خود آنحضرت ﷺ تھے۔ جلدی میں آپ نے اس کا بھی انتظار نہیں کیا کہ گھوڑے پر زین کسی جائے، گھوڑے کی برہنہ پشت پر سوار ہو کر آپ تمام خطروں کے مقامات میں گشت لگا آئے اور واپس آ کر لوگوں کو تسکین دی کہ کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ 4

آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی کو اپنے دست خاص سے قتل نہیں کیا۔ ابی بن خلف آپ کا سخت دشمن تھا،

---

1 بخاری، کتاب المغازی، غزوة ذات الرقاع: ٤١٣٥۔ 2 مسند احمد، ج ١، ص: ١٤٦۔
3 صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب غزوة حنين: ٤٦١٦۔ 4 صحیح بخاری، (کتاب الجہاد) کے متفرق ابواب میں یہ حدیث ہے مثلاً باب الشجاعة في الحرب: ٢٨٢٠ وباب اذا فزعوا بالليل: ٣٠٤٠۔

بدر میں فدیہ دے کر رہا ہوا تو ساتھ ساتھ یہ کہتا گیا: میرے پاس ایک گھوڑا ہے جس کو میں ہر روز جوار کھلاتا ہوں، اسی پر چڑھ کر محمد (ﷺ) کو قتل کروں گا۔ احد میں اسی گھوڑے کو اڑاتا اور صفوں کو چیرتا ہوا آپ کے پاس پہنچ گیا۔ مسلمانوں نے چاہا کہ اس کو بیچ میں روک لیں، آپ نے منع فرمایا اور ایک مسلمان کے ہاتھ سے نیزہ لے کر آپ اس کی طرف بڑھے اور آہستہ سے اس کی گردن میں انی چبھودی، وہ چنگھاڑ مار کر بھاگا، لوگوں نے کہا: یہ تو کوئی بڑا زخم نہیں، تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟ اس نے کہا: سچ ہے لیکن یہ محمد (ﷺ) کے ہاتھ کا زخم ہے۔ [1]

راست گفتاری

راست گفتاری پیغمبر کی ایک ضروری صفت ہے اور اس کا وجود ان کی ذات سے کبھی منفک نہیں ہوسکتا اس بنا پر آنحضرت ﷺ کے اخلاق کے عنوان میں اس کے جزئیات کی تفصیل کی ضرورت نہ تھی لیکن اس موقع پر ہم صرف ان شہادتوں کو قلم بند کرنا چاہتے ہیں جو دشمنوں کے اعتراف سے ہاتھ آسکی ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو کفار میں جو لوگ آپ سے واقف تھے انہوں نے آپ کو کاذب اور دروغ گو یقین نہیں کیا بلکہ یہ سمجھا کہ نعوذ باللہ آپ کے حواس درست نہیں ہیں یا اب عقل بجا نہیں رہی ہے یا یہ کہ ان میں اب شاعرانہ تخیل پرستی آگئی ہے، اسی بنا پر انہوں نے آپ کو مجنوں کہا، مسحور کہا، شاعر کہا لیکن کاذب نہیں کہا۔

ایک روز قریش کے بڑے بڑے رؤسا جلسہ جمائے بیٹھے تھے اور آپ ﷺ کا ذکر ہورہا تھا۔ نضر بن حارث نے جو قریش میں سب سے زیادہ جہاندیدہ تھا، کہا: اے قریش! تم پر جو مصیبت آئی ہے اب تک تم اس کی کوئی تدبیر نہ نکال سکے، محمد (ﷺ) تمہارے سامنے بچہ سے جوان ہوا، وہ تم میں سب سے زیادہ پسندیدہ، صادق القول اور امین تھا، اب جب اس کے بالوں میں سپیدی آچلی اور تمہارے سامنے یہ باتیں پیش کیں تو کہتے ہو کہ وہ ساحر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے، مجنوں ہے، خدا کی قسم! میں نے ان کی باتیں سنی ہیں۔ محمد (ﷺ) میں یہ کوئی بات نہیں، تم پر یہ کوئی مصیبت ہی نئی آئی ہے۔ [2] ابوجہل کہا کرتا تھا محمد (ﷺ) میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا، البتہ جو کچھ کہتے ہو ان کو صحیح نہیں سمجھتا۔ قرآن مجید کی یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی ہے: [3]

﴿قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾ (٦/ الانعام:٣٣)

''ہم جانتے ہیں کہ اے پیغمبر! ان کافروں کی باتیں تم کو غمگین کرتی ہیں کیونکہ وہ تجھ کو جھٹلاتے نہیں البتہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔''

---

[1] شرح شفاء قاضی عیاض، ج۲، ص:٦٤ بحوالہ بیھقی بسند صحیح ومصنف عبدالرزاق وابن سعدوواقدی۔

[2] ابن ہشام، ج۱، ص:۱۸۳۔ [3] جامع ترمذی، ابواب التفسیر، ومن سورۃ الانعام: ٣٠٦٤۔

جب آنحضرت ﷺ کو پیش گاہِ الٰہی سے حکم ہوا کہ اپنے اہل خاندان کو اسلام کی دعوت دو تو آپ ﷺ نے ایک پہاڑ پر چڑھ کر پکارا: ''یا معشر قریش!'' جب سب لوگ جمع ہو گئے تو فرمایا: ''اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آ رہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟'' سب نے کہا: ہاں! کیونکہ ہم نے تم کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ 1

قیصر روم نے دربار میں ابوسفیان سے پوچھا کہ تمہارے ہاں جو مدعی پیدا ہوا ہے اس دعویٰ سے پہلے کبھی تم نے اس کو دروغ گو بھی پایا، ابوسفیان نے کہا: نہیں۔ آخر میں قیصر نے جو تقریر کی اس میں کہا: میں نے تم سے پوچھا کہ تمہارے نزدیک وہ کبھی کذب کا بھی مرتکب ہوا تو تم نے جواب دیا کہ نہیں، مجھے یقین ہے کہ اگر وہ خدا پر افترا باندھتا تو وہ آدمیوں پر افترا باندھنے سے کب باز رہتا۔ 2

ایفائے عہد

ایفائے عہد آپ ﷺ کی ایک ایسی عام خصوصیت تھی کہ دشمن بھی اس کا اعتراف کرتے تھے، چنانچہ قیصر نے اپنے دربار میں آپ کے متعلق ابوسفیان سے جو سوالات کئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ کیا کبھی محمد (ﷺ) نے بدعہدی بھی کی ہے؟ ابوسفیان کو مجبوراً یہ جواب دینا پڑا کہ نہیں 3 وحشی جنہوں نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا، اسلام کے ڈر سے شہر بہ شہر پھرا کرتے تھے۔ اہل طائف نے مدینہ بھیجنے کے لیے جو وفد مرتب کیا اس میں ان کا نام بھی تھا لیکن ان کو ڈر تھا کہ کہیں مجھ سے انتقام نہ لیا جائے لیکن خود دشمنوں نے ان کو یقین دلایا کہ تم بے خوف وخطر جاؤ، محمد (ﷺ) سفراء کو قتل نہیں کرتے، چنانچہ وہ اس اعتماد پر دربار نبوت میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے۔ 4 صفوان بن امیہ (قبل اسلام) شدید ترین دشمنوں میں تھے، جب مکہ فتح ہوا تو وہ بھاگ کر یمن کے ارادہ سے جدہ چلے گئے۔ عمیر بن وہب رضی اللہ عنہ نے حاضر خدمت ہو کر واقعہ عرض کیا، آنحضرت ﷺ نے عمامہ مبارک عنایت کیا اور فرمایا: ''یہ صفوان کی امان کی نشانی ہے۔'' عمیر رضی اللہ عنہ عمامہ مبارک لے کر صفوان کے پاس پہنچے اور کہا کہ تم کو بھاگنے کی ضرورت نہیں، تم کو امان ہے، جب خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو عرض کی کہ کیا آپ ﷺ نے مجھے امان دی ہے؟ ارشاد ہوا کہ ''ہاں یہ سچ ہے۔'' 5

ابورافع ایک غلام تھے۔ حالت کفر میں قریش کی طرف سے سفیر بن کر مدینہ منورہ آئے۔ روئے اقدس پر نظر پڑی تو بے اختیار اسلام کی صداقت ان کے دل میں جاگزیں ہو گئی۔ عرض کی: یا رسول اللہ! اب میں کبھی کافروں کے پاس لوٹ کر نہ جاؤں گا، ارشاد ہوا: ''نہ میں عہد شکنی کر سکتا ہوں اور نہ قاصدوں کو اپنے پاس روک سکتا ہوں، تم اس وقت واپس جاؤ اگر وہاں پہنچ کر بھی تمہارے دل کی یہی کیفیت باقی رہے تو آ جانا۔'' چنانچہ وہ

---

1 صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ تبت: ٤٩٧١، ٤٩٧٢۔ 2 صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی: ٧۔ 3 صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی: ٧۔ 4 صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل حمزۃ بن عبدالمطلب: ٤٠٧٢۔ 5 ابن ہشام، ج ٢، ص: ٢٧٦، ٢٧٧۔

اس وقت واپس گئے اور پھر اسلام لائے۔ [1]

صلح حدیبیہ میں ایک شرط یہ تھی کہ مکہ سے جو مسلمان ہو کر مدینہ جائے گا وہ اہل مکہ کے مطالبہ پر واپس کر دیا جائے گا۔ عین اس وقت جب معاہدہ کی یہ شرطیں زیر تحریر تھیں، ابوجندل پابہ زنجیر اہل مکہ کی قید سے بھاگ کر آئے، اور رسول اللہ ﷺ سے فریادی ہوئے، تمام مسلمان اس درد انگیز منظر کو دیکھ کر تڑپ اٹھے لیکن آنحضرت ﷺ نے باطمینان تمام ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: ''اے ابوجندل! صبر کرو، ہم بدعہدی نہیں کر سکتے، اللہ تعالیٰ عنقریب تمہارے لیے کوئی راستہ نکالے گا۔'' [2]

نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے کہ عبداللہ بن ابی الحمساء نے آنحضرت ﷺ سے کچھ معاملہ کیا اور آپ کو بٹھا کر چلے گئے کہ آ کر حساب کر دیتا ہوں، اتفاق سے ان کو خیال نہ رہا، تین دن کے بعد آئے تو آنحضرت ﷺ اسی جگہ تشریف رکھتے تھے، ان کو دیکھ کر فرمایا: ''میں تین دن سے یہاں تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں۔'' [3]

غزوۂ بدر میں کافروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد ایک ثلث سے بھی کم تھی، ایسے موقع پر آنحضرت ﷺ کی قدرتی خواہش یہ ہونی چاہیے تھی کہ جس قدر آدمی بڑھ سکیں بہتر ہے لیکن آپ اس وقت بھی ہمہ تن وفا تھے۔ حذیفہ بن الیمان اور ابوحسیل رضی اللہ عنہما دو صحابی مکہ سے آ رہے تھے، راہ میں کفار نے ان کو روکا کہ محمد (ﷺ) کے پاس جا رہے ہو، انہوں نے انکار کیا، آخر اس شرط پر ان کو رہائی ملی کہ وہ جنگ میں آپ کا ساتھ نہ دیں گے۔ یہ دونوں صاحب آنحضرت ﷺ کے پاس آئے، تو صورت حال عرض کی، فرمایا: ''تم دونوں واپس جاؤ، ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے، ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے۔'' [4]

زہد وقناعت

مصنفین یورپ کا عام خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ جب تک مکہ میں تھے پیغمبر تھے، مدینہ پہنچ کر پیغمبر سے بادشاہ بن گئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ تمام عرب کے زیر نگین ہو جانے پر بھی فاقہ کش رہے۔ صحیح بخاری باب الجہاد میں روایت ہے کہ وفات کے وقت آپ کی زرہ ایک یہودی کے یہاں تین صاع جو پر گروی تھی۔ جن کپڑوں میں آپ نے وفات پائی ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب تمام عرب حدود شام سے لے کر عدن تک فتح ہو چکا ہے اور مدینہ کی سرزمین میں زر وسیم کا سیلاب آ چکا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ آپ ﷺ کی مہمات فرائض میں رہبانیت کا قلع قمع کرنا بھی تھا جس کی نسبت خدا نے نصاریٰ کو ملامت کی تھی کہ ﴿رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا﴾ اس بنا پر آپ نے کبھی کبھی اچھے کھانے اور اچھے کپڑے

---

[1] ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی الامام یستجن به فی العهود: ٢٧٥٨۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد آخری فقرے ابن ہشام ج۲، ص: ۳۱۰ میں ہیں۔ [3] ابوداود، کتاب الادب، باب فی العدة: ٤٩٩٦۔ [4] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب الوفاء بالعهد: ٤٦٣٩۔

بھی استعمال کئے ہیں لیکن اصلی میلانِ طبع زخارفِ دنیوی سے اجتناب تھا۔ فرمایا کرتے: ''فرزندِ آدم کوان چند چیزوں کے سوا اور کسی چیز کا حق نہیں، رہنے کے لیے گھر، ستر پوشی کے لیے ایک کپڑا اور شکم سیری کے لیے روکھی سوکھی روٹی اور پانی۔'' ❶ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ولا یطوی لہ ثوب۔ کبھی آپ کا کوئی کپڑا تہ کر کے نہیں رکھا گیا یعنی صرف ایک جوڑا کپڑا ہوتا تھا، دوسرا نہیں ہوتا تھا جو تہ کر کے رکھا جا سکتا۔ ❷

ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما گھر کی دیوار کی مرمت کر رہے تھے، اتفاقاً آپ کسی طرف سے آ گئے، پوچھا: ''کیا شغل ہے؟'' عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے عرض کی دیوار کی مرمت کر رہا ہوں ارشاد ہوا: ''اتنی مہلت کہاں؟'' ❸

گھر میں اکثر فاقہ رہتا تھا اور رات کو تو اکثر آپ ﷺ اور سارا گھر بھوکا سو رہتا تھا:

کان رسول اللہ یبیت اللیالی المتتابعۃ طاویا واھلہ لا یجدون عشاء۔ ❹

''آپ ﷺ اور آپ کے اہل و عیال متصل کئی کئی رات بھوکے رہ جاتے تھے کیونکہ رات کا کھانا میسر نہیں ہوتا تھا۔''

پیہم دو دو مہینے تک گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک موقع پر جب یہ واقعہ بیان کیا تو عروہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ آخر گزارا کس چیز پر تھا؟ بولیں کہ پانی اور کھجور، البتہ ہمسائے کبھی کبھی بکری کا دودھ بھیج دیتے تھے تو پی لیتے تھے۔ ❺ آپ نے تمام عمر کبھی چپاتی کی صورت نہیں دیکھی۔ ❻ میدہ جس کو عرب میں حواری اور نقی کہتے ہیں، کبھی نظر سے نہیں گزرا۔ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ جو اس واقعہ کے راوی ہیں ان سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں چھلنیاں نہ تھیں، بولے: نہیں، لوگوں نے کہا: پھر آخر کس چیز سے آٹا چھانتے تھے، بولے: منہ سے پھونک کر بھوسی اڑا دیتے تھے جو رہ جاتا اسی کو گوندھ کر پکا لیتے۔ ❼ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ تمام عمر یعنی مدینہ کے قیام سے وفات تک آپ نے کبھی دو وقت سیر ہو کر روٹی نہیں کھائی۔ ❽

فدک اور خیبر وغیرہ کے ذکر میں محدثین اور ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ ان کی آمدنی سے سال بھر کا خرچ لے لیا کرتے تھے۔ یہ واقعہ بظاہر روایات مذکورہ بالا کے مخالف معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت دونوں صحیح ہیں، بے شبہ آپ بقدر نفقہ آمدنی میں سے لیتے تھے باقی وہ بھی اہلِ حاجت کے نذر ہو جاتا تھا۔ احادیث میں آپ کی فاقہ کشی اور تنگدستی کے واقعات نہایت کثرت سے منقول ہیں۔ چند روایتیں اس موقع پر ہم درج کرتے ہیں۔

---

❶ جامع ترمذی، ابواب الزھد، باب منہ الخصال التی لیس لابن آدم...... ۲۳۴۱۔ ❷ ابن ماجہ، کتاب اللباس، باب لباس رسول اللہ ﷺ: ۳۵۵۴۔ ❸ جامع ترمذی، ابواب الزھد، باب ما جاء فی قصر الامل: ۲۳۳۵۔ لیکن یہاں عبداللہ بن عمرو کا ذکر ہے۔ ❹ جامع ترمذی، ابواب الزھد، باب ماجاء فی معیشۃ النبی ﷺ: ۲۳۶۰۔ ❺ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب کیف کان عیش النبی ﷺ: ۶۴۵۹۔ ❻ ایضًا: ۶۴۵۷۔
❼ شمائل ترمذی، باب ماجاء فی صفۃ خبز رسول اللہ ﷺ: ۱۴۵۔ ❽ ایضًا: ۱۴۷۔

ایک دفعہ ایک شخص خدمت اقدس میں حاضر ہوا کہ سخت بھوکا ہوں، آپ ﷺ نے ازواج مطہرات میں سے کسی کے ہاں کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو بھیج دو، جواب آیا کہ گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں، آپ نے دوسرے گھر کہلا بھیجا، وہاں سے بھی یہی جواب آیا، مختصراً یہ کہ آٹھ نو گھروں میں سے کہیں پانی کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔ ❶

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دن خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ نے شکم کو کپڑے سے کس کر باندھا ہے۔ سبب پوچھا تو حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ بھوک کی وجہ سے۔ ❷

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ مسجد میں زمین پر لیٹے ہوئے ہیں اور بھوک کی وجہ سے بار بار کروٹیں بدلتے ہیں۔ ❸

ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں فاقہ کشی کی شکایت کی اور پیٹ کھول کر دکھایا کہ پتھر بندھے تھے، آپ ﷺ نے شکم کو کھولا تو ایک کے بجائے دو دو پتھر تھے۔ ❹

اکثر بھوک کی وجہ سے آواز اس قدر کمزور ہو جاتی تھی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کی حالت سمجھ جاتے، ایک دن ابوطلحہ رضی اللہ عنہ گھر میں آئے اور بیوی سے کہا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ میں نے ابھی رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ان کی آواز کمزور ہوگئی ہے۔ ❺

ایک دن بھوک میں ٹھیک دوپہر کے وقت گھر سے نکلے، راہ میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ملے، یہ دونوں صاحب بھی بھوک سے بیتاب تھے، آپ سب کو لے کر حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر آئے۔ ان کا معمول تھا کہ آنحضرت ﷺ کے لیے دودھ مہیا رکھتے تھے، آج آپ کے آنے میں دیر ہوئی تو انہوں نے بچوں کو پلا دیا۔ آنحضرت ﷺ ان کے گھر پہنچے تو وہ نخلستان میں چلے گئے تھے، ان کی بیوی کو خبر ہوئی تو وہ باہر نکل آئیں اور عرض کی حضور ﷺ کا آنا مبارک۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''ابوایوب کہاں ہیں؟'' نخلستان پاس ہی تھا، وہ آواز سن کر دوڑے آئے اور مرحبا کہہ کر عرض کی، یہ حضور ﷺ کے آنے کا وقت نہیں، آپ نے حالت بیان کی، وہ نخلستان میں جا کر کھجوروں کا ایک خوشہ توڑ لائے اور کہا: میں گوشت تیار کراتا ہوں، ایک بکری ذبح کی، آدھے کا سالن، آدھے کے کباب تیار کرائے، کھانا سامنے لا کر رکھا تو آنحضرت ﷺ نے ایک روٹی پر تھوڑا سا گوشت رکھ کر فرمایا کہ ''فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کو بھجوا دو، کئی دن سے اس کو کھانا نصیب نہیں ہوا ہے۔'' پھر خود صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ مل کر کھانا نوش فرمایا۔ متعدد قسم کے کھانے دیکھ کر

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الاشربۃ، باب اکرام الضیف: ۵۳۵۹ وصحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ویؤثرون علی انفسھم.....الخ: ۳۷۹۸۔ ❷ صحیح مسلم، باب جواز استتباعہ غیرہ الی دارمن یثق: ۵۳۲۳۔ ❸ ایضا: ۵۳۲۲۔ ❹ شمائل ترمذی، باب ماجاء فی عیش النبی ﷺ: ۳۷۲۔
❺ صحیح مسلم، کتاب الاشربۃ: ۵۳۱۶۔

آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا کہ ”خدا نے جو کہا ہے کہ قیامت میں نعیم سے سوال ہوگا وہ یہی چیزیں ہیں۔“ [1]

اکثر ایسا ہوتا کہ آنحضرت ﷺ صبح کو ازواجِ مطہرات کے پاس تشریف لاتے اور پوچھتے: ”آج کچھ کھانے کو ہے؟“ عرض کرتیں: نہیں، آپ ﷺ فرماتے: ”اچھا میں نے روزہ رکھ لیا۔“ [2]

عفوو حلم

اربابِ سیر نے تصریح کی ہے اور تمام واقعات شاہد ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا، بجز اس صورت کے کہ اس نے احکام الٰہی کی تفضیح کی ہو۔ [3]

جنگ اُحد کی شکست سے زیادہ رؤسائے طائف کے تحقیر آمیز برتاؤ کی یاد خاطر اقدس پر گراں تھی، [4] تاہم دس برس کے بعد غزوہ طائف میں جب وہ ایک طرف منجنیق سے مسلمانوں پر پتھر برساتے تھے، تو دوسری طرف ایک سراپائے حلم وعفو انسان (خود آنحضرت ﷺ) یہ دعا مانگ رہا تھا کہ ”خدایا! انہیں سمجھ عطا کر اور ان کو آستانہ اسلام پر جھکا۔“ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ۹ھ میں جب ان کے وفد نے مدینہ کا رخ کیا تو آپ نے صحن مسجد میں ان کو مہمان اتارا اور عزت وحرمت کے ساتھ ان سے پیش آئے۔ [5]

قریش نے آپ ﷺ کو گالیاں دیں، مارنے کی دھمکی دی، راستوں میں کانٹے بچھائے، جسم اطہر پر نجاستیں ڈالیں، گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا، آپ کی شان میں گستاخیاں کیں، نعوذ باللہ کبھی جادوگر، کبھی پاگل، کبھی شاعر کہا لیکن آپ نے کبھی ان کی باتوں پر برہمی ظاہر نہیں فرمائی، غریب سے غریب آدمی بھی جب کسی مجمع میں جھٹلایا جاتا ہے تو وہ غصہ سے کانپ اٹھتا ہے، ایک صاحب جنہوں نے آنحضرت ﷺ کو ذی المجاز کے بازار میں اسلام کی دعوت دیتے ہوئے دیکھا تھا، بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ فرما رہے تھے کہ ”لوگو! لا الہ الا اللہ کہو تو نجات پاؤ گے۔“ پیچھے پیچھے ابوجہل تھا، وہ آپ پر خاک اڑا اڑا کر کہہ رہا تھا، لوگو! اس شخص کی باتیں تم کو اپنے مذہب سے برگشتہ نہ کردیں، یہ، یہ چاہتا ہے کہ تم اپنے دیوتاؤں لات وعزیٰ کو چھوڑ دو۔ راوی کہتا ہے کہ آپ اس حالت میں اس کی طرف مڑ کر دیکھتے بھی نہ تھے۔ [6]

سب سے بڑھ کر طیش اور غضب کا موقع افک کا واقعہ تھا، جب کہ منافقین نے حضرت عائشہ

---

[1] الترغیب والترھیب، کتاب الطعام، باب الترغیب فی حمداللہ تعالیٰ بعد الاکل: ۳۱۹۶؛ ابن حبان، کتاب الاطعمۃ: ۵۱۹۳ (یہ واقعہ صحیح مسلم: ۵۳۱۳ میں بھی جزئی اختلافات کے ساتھ موجود ہے)۔

[2] مسلم، کتاب الصیام، باب جواز صوم النافلۃ...... : ۲۷۱۴، ۲۷۱۵۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قول النبی ﷺ یسروا ولا تعسروا: ۶۱۲۶۔ [4] صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ: ۳۲۳۱؛ مسلم: ۴۶۵۳۔ [5] ابوداود، کتاب الخراج والامارۃ، باب ماجاء فی خبر الطائف: ۳۰۲۵، ۳۰۲۶ ومسند احمد، ج ۴، ص: ۲۱۸۔ [6] مسند احمد، ج ۴، ص: ۶۳۔

صدیقہ رضی اللہ عنہا کو نعوذ باللہ تہمت لگائی تھی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی محبوب ترین ازواج اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے یارِ غار اور افضل الصحابہ رضی اللہ عنہم کی صاحبزادی تھیں، شہر منافقوں سے بھرا پڑا تھا، جنہوں نے دم بھر میں اس خبر کو اس طرح پھیلا دیا کہ سارا مدینہ گونج اٹھا، دشمنوں کی شماتت، ناموس کی بدنامی، محبوب کی تفضیح یہ باتیں انسانی صبر وتحمل کے پیمانہ میں نہیں سما سکتیں، تاہم رحمت عالم نے ان سب باتوں کے ساتھ کیا کیا؟ تہمت کا تمام تر بانی، رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی تھا، اور آپ کو اس کا بخوبی علم تھا، بااین ہمہ آپ نے صرف اس قدر کیا کہ مجمعِ عام میں منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا: ''مسلمانو! جو شخص میرے ناموس کے متعلق مجھ کو ستاتا ہے اس سے میری داد کون لے سکتا ہے۔'' حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ غصہ سے بیتاب ہو گئے اور اٹھ کر کہا میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں، آپ نام بتائیں تو اس کا سر اڑا دوں، سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے جو عبداللہ بن ابی کے حلیف تھے، مخالفت کی اور اس پر دونوں طرف سے حمایتی کھڑے ہو گئے، قریب تھا کہ تلواریں کھنچ جائیں، آپ نے دونوں کو ٹھنڈا کیا، واقعہ کی تکذیب خود خدا نے کر دی اور تہمت لگانے والوں کو شرعی سزا دی گئی، تاہم عبداللہ بن ابی اس بنا پر چھوڑ دیا گیا کہ اس کو تہمت لگانے کا اقرار نہ تھا، اور ثبوت کے لیے شرعی شہادت موجود نہ تھی، تہمت لگانے والوں میں جن کو سزا دی گئی، ایک صاحب مسطح بن اثاثہ تھے، ان کی معاش کے کفیل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے، تہمت کے جرم میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کا روزینہ بند کر دیا، اس پر یہ آیت اتری:

﴿ وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾

(۲٤/ النور: ۲۲)

''تم میں سے جو لوگ صاحبِ فضیلت اور ذی مقدور ہیں ان کو یہ قسم نہیں کھانا چاہیے کہ قرابت داروں، مسکینوں اور مجاہدوں سے سلوک نہ کریں گے، تم کو عفو اور درگزر سے کام لینا چاہیے، کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ خدا تم کو بخش دے، خدا غفور رحیم ہے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کا روزینہ بدستور جاری کر دیا۔ (بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافک: ۴۱۴۱)

تہمت لگانے والوں میں (جیسا کہ ترمذی کتاب التفسیر سورۂ نور: ۳۱۸۰ میں تصریح ہے) حضرت حسان رضی اللہ عنہ بھی تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ان سے جو رنج تھا وہ عفو کی حد سے متجاوز تھا، لیکن یہ آنحضرت ﷺ کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ جب عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو برا کہنا شروع کیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روک دیا، کہ یہ (حسان رضی اللہ عنہ) آنحضرت ﷺ کی طرف سے کفار کو جواب دیتے تھے۔ [1]

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافك: ٤١٤٦۔

مدینہ کے منافق یہودیوں میں سے لبید بن اعصم نے آپ ﷺ پر سحر کیا، تاہم آپ نے کچھ تعرض نہ فرمایا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مزید تحقیق کی تحریک کی تو فرمایا: ''میں لوگوں میں شورش نہیں پیدا کرنا چاہتا۔'' ❶

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے، لین دین کا کاروبار کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان سے کچھ قرض لیا، میعاد ادا میں ابھی کچھ دن باقی تھے، تقاضے کو آئے، آنحضرت ﷺ کی چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت سست کہہ کر کہا: عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصہ سے بیتاب ہو گئے، اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا: ''او دشمن خدا! تو رسول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے مسکرا کر فرمایا: ''عمر! مجھ کو تم سے اور کچھ امید تھی، اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ نرمی سے تقاضا کرے اور مجھ سے کہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں۔'' یہ فرما کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا: ''قرضہ ادا کر کے بیس صاع کھجور کے اور زیادہ دے دو۔'' ❷

ایک دفعہ آپ ﷺ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا تھا اور وہ بھی موٹا اور گندہ تھا، پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا، اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجیے، آنحضرت ﷺ نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا، اس گستاخ نے کہا میں سمجھا مطلب یہ ہے کہ میرا مال یوں ہی اڑا لیں اور دام نہ دیں۔ آنحضرت ﷺ نے یہ ناگوار جملے سن کر صرف اس قدر فرمایا کہ ''وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں۔'' ❸

ایک دفعہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، ایک عورت قبر کے پاس بیٹھی رو رہی تھی، آپ رک گئے، اور اس سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''صبر کرو۔'' وہ آپ کو پہچانتی نہ تھی (گستاخی کے ساتھ) بولی، ہٹو تم کیا جان سکتے ہو کہ مجھ پر کیا کیفیت ہے، آپ چلے آئے، لوگوں نے عورت سے کہا: تو نے نہیں پہچانا، وہ رسول اللہ ﷺ تھے، دوڑی ہوئی آئی اور کہا: میں حضور کو پہچانتی نہ تھی، ارشاد فرمایا: ''صبر وہی معتبر ہے جو عین مصیبت کے وقت کیا جائے۔'' ❹

ایک دفعہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے، آپ عیادت کو سواری پر تشریف لے گئے، راہ میں ایک جلسہ تھا، آپ ٹھہر گئے، عبداللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا، وہ بھی جلسہ میں موجود تھا، آپ ﷺ کی

---

❶ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب السحر: ۵۷۰۳۔ ❷ یہ روایت بیہقی، ابن حبان (کتاب البر والاحسان: ۲۸۸) طبرانی اور ابو نعیم نے روایت کی ہے اور سیوطی نے کہا کہ اس کی سند صحیح ہے۔ (شرح شفاء از شہاب خفاجی، ج۲، ص: ۳۱، ۳۲) ❸ جامع ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی الرخصة فی الشراء الی أجل: ۱۲۱۳۔
❹ بخاری، کتاب الجنائز، باب زیارة القبور: ۱۲۸۳۔

سواری کی گرد اڑی تو اس نے چادر ناک پر رکھ لی اور آنحضرت ﷺ سے کہا: دیکھو گرد نہ اڑاؤ، جب آنحضرت ﷺ قریب پہنچے تو اس نے کہا محمد (ﷺ) اپنا گدھا ہٹاؤ، تمہارے گدھے کی بدبو نے میرا دماغ پریشان کر دیا۔ آنحضرت ﷺ نے سلام کیا، پھر سواری سے اترے اور اسلام کی دعوت دی، عبداللہ بن ابی نے کہا: ہمارے گھر آ کر ہم کو نہ ستاؤ، جو شخص خود تمہارے پاس جائے اس کو تعلیم دو۔ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ جو مشہور شاعر تھے، انہوں نے کہا: آپ ضرور تشریف لائیں، بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ قریب تھا کہ تلواریں نکل آتیں، آنحضرت ﷺ نے دونوں فریق کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا، جلسہ سے اٹھ کر آپ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے کہا: تم نے عبداللہ کی باتیں سنیں، سعد بن عبادہ نے عرض کی، کہ آپ کچھ خیال نہ فرمائیں، یہ وہ شخص ہے کہ آپ کی تشریف آوری سے پہلے اہل مدینہ نے اس کے لیے ریاست کا تاج تیار کر لیا تھا۔ [1]

غزوۂ حنین میں آپ ﷺ نے مال غنیمت تقسیم فرمایا تو ایک انصاری نے کہا، یہ تقسیم خدا کی رضامندی کے لیے نہیں ہے۔ آپ نے سنا تو فرمایا: ''خدا موسیٰ پر رحم کرے، ان کو لوگوں نے اس سے بھی زیادہ ستایا تھا۔'' [2]

ایک دفعہ ایک بدو خدمت اقدس میں آیا، آپ مسجد میں تشریف رکھتے تھے، اس کو پیشاب کی حاجت معلوم ہوئی، آدابِ مسجد سے واقف نہ تھا، وہیں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا، لوگ ہر طرف سے دوڑ پڑے کہ اس کو سزا دیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جانے دو اور پانی کا ایک ڈول لا کر بہا دو، خدا نے تم لوگوں کو دشواری کے لئے نہیں، بلکہ آسانی کے لیے بھیجا ہے۔'' [3]

حضرت انس رضی اللہ عنہ جو خادمِ خاص تھے، ان کا بیان ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو کسی کام کے لئے بھیجنا چاہا، میں نے کہا: نہ جاؤں گا، آپ چپ رہ گئے، میں یہ کہہ کر باہر چلا گیا، دفعتہً آنحضرت ﷺ نے پیچھے سے آ کر میری گردن پکڑ لی، میں نے مڑ کر دیکھا تو آپ ہنس رہے ہیں، پھر پیار سے فرمایا: ''انس! جس کام کے لئے کہا تھا اب تو جاؤ۔'' میں نے عرض کی: اچھا جاتا ہوں، حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اسی واقعہ کے ساتھ بیان کیا کہ میں نے سات برس آپ کی ملازمت کی، کبھی یہ نہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا، یا یہ کیوں نہیں کیا۔ [4]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی عادت تھی کہ ہم لوگوں کے ساتھ مسجد میں بیٹھ جاتے، اور باتیں کرتے، جب اٹھ کر گھر میں جاتے تو ہم لوگ بھی چلے جاتے، ایک دن حسب معمول مسجد

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب عیادۃ المریض: ٥٦٦٣، ٤٥٦٦۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الطائف...... :٤٣٣٥، ٤٣٣٦۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب صب الماء علی البول: ٢٢٠۔ [4] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب حسن خلقہ ﷺ: ٦٠١٥، ٦٠١٦ وابوداود، کتاب الادب، باب فی الحلم واخلاق النبی ﷺ: ٤٧٧٣۔

سے نکلے، ایک بدو آیا اور اس نے آپ ﷺ کی چادر اس زور سے پکڑ کر کھینچی کہ آپ کی گردن سرخ ہوگئی، آپ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا، بولا کہ میرے اونٹوں کو غلہ سے لاد دے، تیرے پاس جو مال ہے، وہ نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''پہلے میری گردن کا بدلہ دو۔'' تب غلہ دیا جائے گا، وہ بار بار کہتا تھا: خدا کی قسم! میں ہرگز بدلہ نہ دوں گا، آپ نے اس کے اونٹوں پر جو اور کھجوریں لدوا دیں اور کچھ تعرض نہ فرمایا۔ [1]

قریش (نعوذ باللہ) آنحضرت ﷺ کو گالیاں دیتے تھے، برا بھلا کہتے تھے، ضد سے آپ کو محمد (ﷺ) (تعریف کیا گیا) نہیں کہتے تھے، بلکہ مذمم (مذمت کیا گیا) کہتے تھے، لیکن آپ اس کے جواب میں اپنے دوستوں کو خطاب کر کے صرف اسی قدر فرمایا کرتے: ''تمہیں تعجب نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ قریش کی گالیوں کو مجھ سے کیونکر پھیرتا ہے، وہ مذمم کو گالیاں دیتے اور مذمم پر لعنت بھیجتے ہیں اور میں محمد ہوں (ﷺ)۔'' [2]

جس زمانہ میں آپ ﷺ فتح مکہ کے لیے تیاریاں کر رہے تھے، اس بات کی خاص احتیاط فرما رہے تھے، کہ قریش کو ہمارے ارادوں کی خبر نہ ہو، حاطب بن ابی بلتعہ ایک صحابی تھے، انہوں نے چاہا کہ قریش کو اس کی اطلاع کر دیں، چنانچہ ایک خط لکھ کر انہوں نے چپکے سے ایک عورت کی معرفت مکہ روانہ کیا، آپ کو اس کی خبر ہوگئی، حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما اسی وقت بھیجے گئے، جو قاصد کو مع خط کے گرفتار کر لائے، حاطب کو بلا کر دریافت کیا تو انہوں نے صاف صاف اپنے قصور کا اعتراف کیا اور معذرت چاہی، یہ موقع تھا کہ ہر سیاست دان، مجرم کی سزا کا فتویٰ دیتا، لیکن آنحضرت ﷺ نے اس لیے ان کو معاف فرمایا، کہ وہ شرکائے بدر میں تھے، عورت جو اس جرم میں شریک تھی اس سے بھی کسی قسم کا تعرض نہیں فرمایا۔ [3] حالانکہ یہ خط اگر دشمنوں تک پہنچ جاتا تو مسلمانوں کو سخت خطرات کا سامنا ہو جاتا۔

فرات بن حیان ایک شخص تھا، ابوسفیان کی طرف سے مسلمانوں کی جاسوسی پر مامور تھا اور آنحضرت ﷺ کی ہجو میں اشعار کہا کرتا تھا، ایک دفعہ وہ پکڑا گیا تو آنحضرت ﷺ نے اس کے قتل کا حکم دیا، لوگ اس کو پکڑ کر لے چلے، جب انصار کے ایک محلّہ میں پہنچا، تو بولا کہ میں مسلمان ہوں، ایک انصاری نے آ کر اطلاع دی، کہ وہ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے ایمان کا حال ہم انہیں پر چھوڑتے ہیں، ان میں سے ایک فرات بن حیان ہے۔'' [4] مؤرخین نے لکھا

---

[1] ابوداود کتاب الادب، باب فی الحلم واخلاق النبی ﷺ: ٤٧٧٥ یہی واقعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بخاری، کتاب الادب، باب التبسم والضحك: ٦٠٨٨ اورمسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب اعطاء المؤلفة ومن یخاف..... : ٢٤٢٩ میں مروی ہے بتغیر یسیر۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب ما جاء فی أسماء رسول اللہ ﷺ: ٣٥٣٣۔

[3] صحیح بخاری، کتاب المغازی باب غزوة الفتح: ٤٢٧٤۔ [4] ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی الجاسوس الذمی: ٢٦٥٢۔ یہ حدیث سفیان ثوری کے واسطہ سے دو طریقوں سے مروی ہے۔ ایک میں ابو ہمام الدلال ہے اور یہی ابو داؤد کا طریق ہے۔ یہ طریق ضعیف ہے دوسرا طریق بشر بن سری البصری کے ذریعہ سے ہے، جو صحیح ہے امام احمد رحمہ اللہ نے بھی مسند ج ٤، ص: ٣٣٦ میں یہ روایت نقل کی ہے۔

ہے کہ وہ بعد کو صدق دل سے مسلمان ہو گئے اور آنحضرت ﷺ نے ان کو یمامہ میں ایک زمین عنایت فرمائی، جس کی آمدنی ۴۲۰۰ تھی۔ ❶

دشمنوں سے عفوودرگزراورحسن سلوک

انسان کے ذخیرۂ اخلاق میں سب سے زیادہ کمیاب، نادرالوجود چیز دشمنوں پر رحم اور ان سے عفوودرگزر ہے، لیکن حامل وحی ونبوت کی ذات اقدس میں یہ جنس فراواں تھی، دشمن سے انتقام لینا انسان کا قانونی فرض ہے لیکن اخلاق کے دائرۂ شریعت میں آ کر یہ فرضیت مکروہ تحریمی بن جاتی ہے، تمام روایتیں اس بات پر متفق ہیں کہ آپ ﷺ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔

دشمنوں سے انتقام کا سب سے بڑا موقع فتح حرم کا دن تھا جبکہ وہ کینہ خواہ سامنے آئے، جو آنحضرت ﷺ کے خون کے پیاسے تھے اور جن کے دست ستم سے آپ ﷺ نے طرح طرح کی اذیتیں اٹھائی تھیں، لیکن ان سب کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا:

((**لا تثریب علیکم الیوم، اذھبوا فانتم الطلقاء**)) (سنن الکبری بیھقی، ۹/ ۱۱۸)

''تم پر کوئی ملامت نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔''

وحشی جو اسلام کے قوت بازو اور آنحضرت ﷺ کے عزیز ترین چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا قاتل تھا، مکہ میں رہتا تھا، جب مکہ میں اسلام کی قوت نے ظہور کیا، وہ بھاگ کر طائف آیا، طائف نے بھی آخر سر اطاعت خم کیا، وحشی کے لیے یہ بھی مامن نہ رہا، لیکن اس نے سنا کہ آنحضرت ﷺ سفراء سے کبھی سختی کے ساتھ پیش نہیں آتے، ناچار خود رحمت عالم کے دامن میں پناہ لی اور اسلام قبول کیا، آنحضرت ﷺ نے صرف اس قدر فرمایا کہ ''میرے سامنے نہ آیا کرنا کہ تم کو دیکھ کر مجھے چچا کی یاد آتی ہے۔'' ❷

ہند ابوسفیان کی بیوی جس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا سینہ چاک کیا اور دل وجگر کے ٹکڑے کیے، فتح مکہ کے دن نقاب پوش آئی کہ آنحضرت ﷺ پہچان نہ سکیں اور بے خبری میں بیعت اسلام کر کے سند امان حاصل کر لے، پھر اس موقع پر بھی گستاخی سے باز نہ آئی، آنحضرت ﷺ نے ہند کو پہچان لیا، لیکن اس واقعہ کا ذکر تک نہ فرمایا، ہند اس کرشمہ اعجاز سے متاثر ہو کر بے اختیار بول اٹھی ''یارسول اللہ! آپ کے خیمہ سے مبغوض تر خیمہ کوئی میری نگاہ میں نہ تھا، لیکن آج آپ کے خیمہ سے کوئی زیادہ محبوب خیمہ میری نگاہ میں دوسرا نہیں۔'' ❸

عکرمہ دشمن اسلام ابوجہل کے فرزند تھے اور اسلام سے پہلے باپ کی طرح آنحضرت ﷺ کے سخت ترین دشمن تھے، فتح مکہ کے وقت مکہ سے بھاگ کر یمن چلے گئے، ان کی بیوی مسلمان ہو چکی تھی، وہ یمن گئیں

❶ اصابہ ترجمہ فرات مذکور ج ۳، ص: ۲۰۱۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی، قتل حمزۃ: ۴۰۷۲۔
❸ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، ذکر ھند: ۳۸۲۵، ۲۲۱۱۔

اور عکرمہ کو تسکین دی اور ان کو مسلمان کیا اور خدمت اقدس میں لے کر حاضر ہوئیں، آنحضرت ﷺ نے جب ان کو دیکھا تو فرطِ مسرت سے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اس تیزی سے ان کی طرف بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی، ❶ اور زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے:

((مرحبا لراكب المهاجر)) ❷ ''اے ہجرت کرنے والے سوار تمہارا آنا مبارک ہو۔''

صفوان بن امیہ، قریش کے رؤسائے کفر میں سے اور اسلام کے شدید ترین دشمن تھے، ان ہی نے عمیر بن وہب کو انعام کے وعدہ پر آنحضرت ﷺ کے قتل پر مامور کیا تھا، جب مکہ فتح ہوا تو اسلام کے ڈر سے جدہ بھاگ گئے اور قصد کیا کہ سمندر کے راستہ سے یمن چلے جائیں، عمیر بن وہب نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی، کہ یا رسول اللہ! صفوان بن امیہ اپنے قبیلہ کے رئیس ہیں، وہ ڈر سے بھاگ گئے ہیں کہ اپنے کو سمندر میں ڈال دیں، ارشاد ہوا کہ اس کو امان ہے، مکرر عرض کی یا رسول اللہ! امان کی کوئی نشانی مرحمت فرمائیے جس کو دیکھ کر ان کو میرا اعتبار آئے، آپ ﷺ نے عمامہ مبارک ان کو عنایت فرمایا، جس کو لے کر وہ صفوان کے پاس پہنچے، صفوان نے کہا: مجھے وہاں جانے میں اپنی جان کا ڈر ہے۔ عمیر نے جواب دیا صفوان! ابھی تمہیں محمد ﷺ کے حلم وعفو کا حال معلوم نہیں۔ یہ سن کر وہ عمیر کے ساتھ دربارِ نبوی میں حاضر ہوئے اور سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ عمیر کہتے ہیں کہ تم نے مجھے امان دیا ہے، فرمایا: ''سچ ہے۔'' صفوان نے کہا: تو مجھے دو مہینے کی مہلت دو۔ ارشاد ہوا کہ ''دو نہیں تم کو چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے۔'' اس کے بعد وہ اپنی خوشی سے مسلمان ہو گئے، یہ واقعہ بہ تفصیل ابن ہشام میں مذکور ہے۔ ❸

ہبار بن الاسود وہ شخص تھا جس کے ہاتھ سے آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی زینب رضی اللہ عنہا کو سخت تکلیف پہنچی تھی، حضرت زینب رضی اللہ عنہا حاملہ تھیں اور مکہ سے مدینہ ہجرت کر رہی تھیں، کفار نے مزاحمت کی، ہبار بن الاسود نے جان بوجھ کر ان کو اونٹ سے گرا دیا، جس سے ان کو سخت چوٹ آئی اور حمل ساقط ہو گیا، اس کے علاوہ اور بھی بعض جرائم کا وہ مرتکب ہوا تھا اور اسی بنا پر فتح مکہ کے وقت ہبار اشتہاریان قتل میں داخل تھا چاہا کہ بھاگ کر ایران چلا جائے، کہ داعی ہدایت نے خود آستانہ نبوت کی طرف جھکا دیا، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: یا رسول اللہ! میں بھاگ کر ایران میں چلا جانا چاہتا تھا، لیکن پھر مجھے حضور کے احسانات اور حلم وعفو یاد آئے، میری نسبت آپ ﷺ کو جو خبریں پہنچی تھیں، وہ صحیح تھیں، مجھے اپنی جہالت اور قصور کا اعتراف ہے، اب اسلام سے مشرف ہونے آیا ہوں، دفعتہً باب رحمت وا تھا اور دوست و دشمن کی تمیز یکسر مفقود تھی۔ ❹

---

❶ مؤطا امام مالك، كتاب النكاح، باب نكاح المشرك اذا اسلمت زوجته قبله: ١١٥٦۔

❷ ترمذی، ابواب الاستئذان، ما جاء في مرحبا: ٢٧٣٥۔ ❸ ابن هشام، ج٢، ص:٢٧٦، ٢٧٧۔

❹ اصابه، ج٦، ص:٢٧٩، ٢٨٠ ذكر هبار بروايت ابن اسحاق وغيره۔

ابوسفیان اسلام سے پہلے جیسے کچھ تھے، غزوات نبوی کا ایک ایک حرف اس کا شاہد ہے، بدر سے لے کر فتح مکہ تک جتنی لڑائیاں اسلام کو لڑنی پڑیں ان میں سے اکثر میں ان کا ہاتھ تھا، لیکن فتح مکہ کے موقع پر جب وہ گرفتار کر کے لائے گئے، اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ ان کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، تو آپ ﷺ ان کے ساتھ محبت سے پیش آئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گزشتہ جرائم کی پاداش میں ان کے قتل کا ارادہ کیا لیکن آپ نے منع فرمایا، اور نہ صرف یہ بلکہ ان کے گھر کو امن وامان کا حرم بنا دیا، فرمایا کہ "جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اس کا قصور معاف ہوگا۔" [1] کیا دنیا کے کسی فاتح نے اپنے دشمن کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہے؟

عرب کا ایک ایک قبیلہ اطاعت کیشانہ اسلام کے پرچم کے نیچے جمع ہو رہا تھا، اگر کسی قبیلہ نے آخر تک سرتابی کی تو وہ بنو حنیفہ کا قبیلہ تھا، جس میں مسیلمہ نے ادعائے نبوت کیا تھا، ثمامہ بن اثال اس قبیلہ کے رؤسا میں تھا، اتفاق سے وہ مسلمانوں کے ہاتھ لگ گیا، گرفتار کر کے مدینہ لے آئے، آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ اس کو مسجد کے ستون میں باندھ دیا جائے، اس کے بعد آپ مسجد میں تشریف لائے اور اس سے دریافت کیا کہ کیا کہتے ہو، اس نے کہا اے محمد (ﷺ)! اگر تم مجھے قتل کرو گے تو ایک خونی کو کرو گے اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکر گزار پر احسان ہوگا اور اگر زر فدیہ چاہتے ہو، تو تم مانگو، میں دوں گا۔ یہ سن کر آپ خاموش رہے، دوسرے دن بھی یہی تقریر ہوئی، تیسرے روز بھی جب اس نے یہی جواب دیا تو آپ نے حکم دیا کہ ثمامہ کی رسی کھول دو اور آزاد کر دو، ثمامہ پر اس خلاف توقع لطف وعنایت کا یہ اثر ہوا کہ قریب ایک درخت کی آڑ میں جا کر غسل کیا اور مسجد میں واپس آ کر کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا اور عرض کی: یارسول اللہ! دنیا میں کوئی شخص میری نظر میں آپ سے زیادہ مبغوض نہ تھا اور اب آپ سے زیادہ دنیا میں مجھے کوئی محبوب نہیں، کوئی مذہب آپ کے مذہب سے زیادہ میری آنکھوں میں برا نہ تھا اور اب وہی سب سے زیادہ پیارا ہے، کوئی شہر آپ کے شہر سے زیادہ ناپسند نہ تھا اور اب وہی پسندیدہ ہے۔"

قریش کی ستم گری و جفا کاری کی داستان دہرانے کی ضرورت نہیں، یاد ہوگا کہ شعب ابی طالب میں تین برس تک ان ظالموں نے آپ ﷺ کو اور آپ کے خاندان کو اس طرح محصور کر رکھا تھا کہ غلہ کا ایک دانہ اندر پہنچ نہیں سکتا تھا، بچے بھوک سے روتے اور تڑپتے تھے اور یہ بے دردان کی آوازیں سن کر ہنستے اور خوش ہوتے تھے، لیکن معلوم ہے کہ رحمت عالم نے اس کے معاوضہ میں قریش کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ مکہ میں غلہ یمامہ سے آتا تھا، یمامہ کے رئیس یہی ثمامہ بن اثال تھے، مسلمان ہو کر جب یہ مکہ گئے تو قریش نے تبدیل مذہب پر ان کو طعنہ دیا، انہوں نے غصہ سے کہا کہ خدا کی قسم! اب رسول اللہ ﷺ کی اجازت کے بغیر گیہوں کا ایک دانہ نہیں ملے گا۔ اس بندش سے مکہ میں اناج کا کال پڑ گیا، آخر گھبرا کر قریش نے اس آستانہ کی طرف

---

[1] صحیح مسلم، فتح مكة: ٤٦٢٢ تا ٤٦٢٤؛ صحیح بخاری: ٤٢٨٠ ومع فتح الباری، ج٨، ص:١١۔

رجوع کیا جس سے کوئی سائل کبھی محروم نہیں گیا، حضور کو رحم آیا اور کہلا بھیجا کہ بندش اٹھا لو، چنانچہ پھر حسب دستور غلہ جانے لگا۔ ❶

کفار اور مشرکین کے ساتھ برتاؤ

کفار کے ساتھ آپ ﷺ کے حسن خلق کے بہت سے واقعات مذکور ہیں، مؤرخین یورپ مدعی ہیں کہ یہ اس وقت تک کے واقعات ہیں جب تک اسلام ضعیف تھا اور مجاملت اور لطف و آشتی کے سوا چارہ نہ تھا اس لئے ہم اس عنوان کے نیچے صرف وہ واقعات نقل کریں گے جو اس زمانہ کے ہیں جبکہ مخالفین کی قوتیں پامال ہو چکی تھیں اور آنحضرت ﷺ کو پورا اقتدار حاصل ہو چکا تھا۔ ابوبصرہ غفاری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب وہ کافر تھے، مدینہ میں آنحضرت ﷺ کے پاس آ کر مہمان رہے، رات کو گھر کی تمام بکریوں کا دودھ پی گئے، لیکن آپ نے کچھ نہ فرمایا، رات بھر تمام اہل بیت نبوی ﷺ بھوکا رہا۔ ❷ اسی طرح ایک اور واقعہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، شب کو ایک کافر آنحضرت ﷺ کا مہمان ہوا، آپ نے ایک بکری کا دودھ اس کے سامنے پیش کیا، وہ پی گیا، پھر دوسری بکری دوہی گئی، وہ دودھ بھی بے تامل پی گیا، پھر تیسری، پھر چوتھی، یہاں تک کہ سات بکریاں دوہی گئیں اور وہ سب دودھ پیتا گیا، آنحضرت ﷺ نے کوئی تنغص ظاہر نہ فرمایا، شاید اسی حسن اخلاق کا اثر تھا کہ وہ صبح کو مسلمان تھا اور صرف ایک بکری کے دودھ پر قانع ہو گیا۔ ❸

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ صلح حدیبیہ کے زمانہ میں ان کی ماں جو مشرکہ تھیں، اعانت خواہ، مدینہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے پاس آئیں، ان کو خیال ہوا کہ اہل شرک کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے، آنحضرت ﷺ کے پاس آ کر دریافت کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان کے ساتھ نیکی کرو۔'' ❹ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ماں کافرہ تھیں اور بیٹے کے ساتھ مدینہ میں رہتی تھیں، جہالت سے آنحضرت ﷺ کو گالیاں دیتی تھیں، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے خدمت اقدس میں عرض کی، آپ نے بجائے غیظ و غضب کے، دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ ❺

آنحضرت ﷺ کے گھر کا تمام کاروبار حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے سپرد تھا، روپیہ پیسہ جو کچھ آتا تھا ان کے پاس رہتا، ناداری کی حالت میں وہ بازار سے سودا سلف قرض لاتے اور جب کہیں سے کوئی رقم آ جاتی تو اس سے ادا کر دیا کرتے، ایک دفعہ بازار جا رہے تھے، ایک مشرک نے دیکھا، ان سے کہا: تم قرض لیتے ہو تو مجھ سے لیا کرو، انہوں نے قبول کیا، ایک دن اذان دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو وہ مشرک چند سوداگروں کے

---

❶ ثمامہ کا پورا واقعہ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب وفد بنی حنیفة: ٤٣٧٢ میں ہے، آخری ٹکڑا ابن ہشام ج ۲ ص: ۳۱۴ میں مذکور ہے۔ ❷ مسند احمد، ج ٦، ص: ٣٩٧۔ ❸ جامع ترمذی، ابواب الاطعمة، باب ما جاء ان المؤمن یاکل فی معی واحدة: ١٨١٩۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب صلة الوالد المشرك: ٥٩٧٨۔ ❺ اصابة، ج ٤، ص: ٢٠٦، ذکر ابو هريرة۔

ساتھ آیا اوران سے کہا: ''او حبشی! انہوں نے اس بدتہذیبی کے جواب میں ''لبیک'' کہا: بولا: کچھ خبر ہے؟ وعدہ کے صرف چار دن رہ گئے ہیں، تم نے اس مدت میں قرضہ ادا نہ کیا تو تم سے بکریاں چرواکے چھوڑوں گا۔ یہ عشاء پڑھ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور سارا حال بیان کر کے کہا کہ خزانہ میں کچھ نہیں ہے، کل وہ مشرک آکر مجھ کو فضیحت کرے گا، اس لئے مجھ کو اجازت ہو کہ میں کہیں نکل جاؤں، پھر جب قرضہ ادا کرنے کا سامان ہو جائے گا، تو واپس آجاؤں گا، غرض رات کو جا کر سو رہے اور سامان سفر یعنی تھیلا، جوتی، ڈھال سر کے نیچے رکھ لی، صبح اٹھ کر سفر کا سامان کر رہے تھے کہ ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہا آنحضرت ﷺ نے یاد فرمایا ہے، یہ گئے تو دیکھا کہ چار اونٹ غلہ سے لدے ہوئے دروازہ پر کھڑے ہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''مبارک ہو، یہ اونٹ رئیس فدک نے بھیجے ہیں۔'' انہوں نے بازار میں جا کر سب چیزیں فروخت کیں اور مشرک کا قرضہ ادا کر کے مسجد نبوی میں آئے اور آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ سارا قرضہ ادا ہو گیا۔ [1]

یہ واقعہ فدک کی فتح کے بعد کا ہے، جو ہجرت کا ساتواں سال ہے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے مقرب خاص اور گھر کے منتظم تھے، ایک مشرک ان کو حبشی کہہ کر پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ تجھ سے بکریاں چرواکے چھوڑوں گا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس کی تنگ گیری کے ڈر سے بھاگ جانے کا ارادہ کرتے ہیں، آنحضرت ﷺ یہ باتیں سنتے ہیں لیکن مشرک کی نسبت ایک لفظ نہیں فرماتے، نہ بلال رضی اللہ عنہ کی حمایت اور دلدہی کی تدبیر کرتے۔ ہیں اتفاق سے غلہ آجاتا ہے اور مشرک کا قرضہ ادا کیا جاتا ہے اور اس کی بدزبانی اور سخت گیری سے درگزر کیا جاتا ہے، یہ حلم، یہ عفو، یہ تحمل رحمت عالم کے سوا اور کس سے ہو سکتا ہے؟ سب سے مشکل معاملہ منافقین کا تھا، یہ کفار کا ایک گروہ تھا، جس کا رئیس عبداللہ بن ابی تھا آنحضرت ﷺ جس زمانہ میں مدینہ میں تشریف لائے، اس سے کچھ پہلے تمام شہر نے اس پر اتفاق کر لیا تھا کہ وہ مدینہ کا فرمانروا بنا دیا جائے، جنگ بدر کے بعد اس نے اسلام کا اعلان کیا لیکن دل سے کافر تھا، اس کے پیرو بھی اسی قسم کا منافقانہ اسلام لائے اور منافقین کی ایک مستقل جماعت قائم ہوگئی، یہ لوگ در پردہ اسلام کے خلاف ہر قسم کی تدبیریں کرتے تھے، قریش اور دیگر مخالف قبائل سے سازش رکھتے، ان کو مسلمانوں کے مخفی رازوں کی خبر دیتے رہتے، بایں ہمہ بظاہر اسلام کے مراسم ادا کرتے، جمعہ جماعت میں شریک ہوتے اور لڑائیوں میں ساتھ جاتے تھے، آنحضرت ﷺ ان کے حالات اور ایک ایک کے نام و نشان سے واقف تھے، لیکن چونکہ شریعت اور قانون کے احکام، دلوں کے اسرار سے نہیں بلکہ ظاہری اعمال سے متعلق ہیں اس لیے آپ ان پر کفر کے احکام جاری نہیں فرماتے تھے، یہاں تک تو شریعت اور قانون کا معاملہ تھا، لیکن فیاض دلی اور عفو وحلم کے اقتضا سے آپ ان سے ہمیشہ حسن اخلاق کا بھی برتاؤ کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایک غزوہ میں ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپڑ مارا، انصاری نے کہا ''یا للانصار'' یعنی

[1] ابوداود، کتاب الخراج والامارة، باب فی الامام یقبل هدایا المشرکین: ٣٠٥٥۔

انصار کی دہائی۔ مہاجر نے بھی مہاجر کی دہائی دی، قریب تھا کہ دونوں میں تلوار چل جائے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''یہ کیا جاہلیت کی باتیں ہیں۔'' دونوں رک گئے، عبداللہ بن ابی نے سنا تو کہا: مدینہ چل کر ذلیل مسلمانوں کو نکال دوں گا، ساتھیوں نے کہا: آسان بات یہ ہے کہ تم لوگ مہاجرین کی خبر گیری سے ہاتھ اٹھالو، یہ خود تباہ ہو جائیں گے، چنانچہ قرآن مجید میں یہ واقعہ مذکور ہے:

﴿ هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنفِقُوا عَلَىٰ مَنْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنفَضُّوا ﴾

(٦٣/ المنافقون:٧)

''یہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ پیغمبر کے ساتھیوں پر خرچ نہ کرو، تا کہ وہ منتشر ہو جائیں۔''

﴿ يَقُولُونَ لَئِن رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ ﴾ (٦٣/ المنافقون:٨)

''کہتے ہیں کہ جب ہم مدینہ کو واپس چلیں گے تو معزز لوگ کمینوں کو مدینہ سے نکال دیں گے۔''

آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن ابی کو بلا بھیجا کہ تم نے یہ الفاظ کہے تھے، اس نے صاف انکار کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ موجود تھے بولے: یا رسول اللہ! اجازت دیجئے کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگ چرچا کریں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔'' [1]

جنگ اُحد میں عبداللہ بن ابی عین لڑائی کے پیش آنے کے وقت تین سو آدمیوں کے ساتھ واپس چلا آیا، جس سے مسلمانوں کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا، تاہم آنحضرت ﷺ نے درگزر فرمایا (اور وہ جب مرا تو اس احسان کے معاوضہ میں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اس نے اپنا کرتہ دیا تھا، مسلمانوں کی ناراضی کے باوجود آپ ﷺ نے اپنا قمیص مبارک اس کو پہنا کر دفن کیا)۔ [2]

یہود و نصاریٰ کے ساتھ برتاؤ

خلق عمیم میں کافر و مسلم، دوست و دشمن، عزیز و بیگانہ کی تمیز نہ تھی، ابر رحمت دشت و چمن پر یکساں برستا تھا (یہود کو آنحضرت ﷺ سے جس شدت کی عداوت تھی اس کی شہادت غزوۂ خیبر تک کے ایک ایک واقعہ سے ملتی ہے، لیکن آپ ﷺ کا طرز عمل مدت تک یہ رہا کہ جن امور کی نسبت مستقل حکم نازل نہ ہوتا آپ ان میں انہیں کی تقلید فرماتے)۔ [3]

ایک دفعہ ایک یہودی نے برسر بازار کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام انبیا پر فضیلت دی۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ یہ کھڑے سن رہے تھے، ان سے رہا نہ گیا، انہوں نے پوچھا کہ کیا محمد ﷺ پر بھی؟ اس نے کہا: ہاں۔ انہوں نے غصہ میں ایک تھپڑ اس کے مار دیا، آنحضرت ﷺ کے عدل اور اخلاق پر

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورة المنافقون: ٤٩٠٥، ٤٩٠٧۔

[2] بخاری میں یہ واقعہ متعدد روایتوں اور متعدد طریقوں سے منقول ہے: ۱۲۶۹، ۲۶۷۴۔

[3] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اتیان الیہود [illegible]

دشمنوں کو بھی اس درجہ اعتبار تھا کہ وہ یہودی سیدھا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ عرض کیا، آپ نے ان صحابی رضی اللہ عنہ پر برہمی ظاہر فرمائی۔ ❶

ایک یہودی کا لڑکا بیمار ہوا تو آپ ﷺ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے اور اس کو اسلام کی دعوت دی، اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، گویا باپ کی رضامندی دریافت کی، اس نے کہا: آپ ﷺ جو فرماتے ہیں اس کو بجالاؤ۔ چنانچہ اس نے کلمہ پڑھا۔ ❷ ایک دفعہ سر راہ ایک یہودی کا جنازہ گزرا تو آپ کھڑے ہو گئے۔ ❸

ایک دفعہ چند یہودی آپ ﷺ کی خدمت میں آئے، اور شرارت سے سلام علیکم کے بجائے، السام علیکم (تم پر موت،) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے غصہ میں آ کر ان کو بھی سخت جواب دیا، لیکن آپ ﷺ نے روکا اور فرمایا: ''عائشہ بدزبان نہ ہو، نرمی کرو، اللہ تعالیٰ ہر بات میں نرمی پسند کرتا ہے۔'' ❹

یہودیوں کے ساتھ دادوستد کرتے تھے، ان کے سخت و ناجائز تقاضوں اور درشت کلمات کو برداشت کرتے تھے، یہودیوں اور مسلمانوں میں اگر معاملات میں اختلاف پیش آتا تو مسلمانوں کی بلاوجہ جنبہ داری نہ فرماتے، چنانچہ اس قسم کی متعدد مثالیں دوسرے عنوانات میں مذکور ہیں، ایک دفعہ ایک یہودی نے آ کر شکایت کی، محمد (ﷺ)! دیکھو ایک مسلمان نے مجھ کو تھپڑ مارا ہے۔ آپ نے اس مسلمان کو اسی وقت بلوا کر زجر فرمایا۔ نصاریٰ کا وفد جب نجران سے مدینہ حاضر ہوا تو آپ نے اس کی مہمانداری کی، مسجد نبوی میں ان کو جگہ دی، بلکہ ان کو اپنے طریق پر مسجد میں نماز پڑھنے کی بھی اجازت دے دی اور جب عام مسلمانوں نے ان کو اس کام سے روکنا چاہا تو آپ ﷺ نے منع فرمایا۔ ❺

یہود و نصاریٰ کے ساتھ کھانے پینے، نکاح و معاشرت کی اجازت تھی اور ان کے لئے مخصوص امتیازی احکام شریعت اسلامیہ میں جاری فرمائے۔

غریبوں کے ساتھ محبت وشفقت

مسلمانوں میں امیر بھی تھے اور غریب بھی، دولتمند بھی اور فاقہ کش بھی، لیکن آنحضرت ﷺ کا برتاؤ سب کے ساتھ یکساں تھا، بلکہ غریبوں کے ساتھ آپ اس طرح پیش آتے تھے کہ دنیاوی دولت کی محرومی ان کے دلوں کو صدمہ نہیں پہنچاتی تھی، ایک دفعہ تقاضائے بشریت سے آپ کا ایک فعل اس کے خلاف ہوا تو بارگاہ احدیت سے اس پر باز پرس ہوئی مکہ کا واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس چند اکابر قریش بیٹھے تھے اور آپ ان کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے، کہ اتفاق سے عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ جو آنکھوں سے معذور اور غریب

❶ بخاری، کتاب الخصومات: ۲٤۱۱، ٦٥۱۷۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی: ۱۳٥٦۔ ❸ ایضا، باب من قام لجنازۃ یھودی: ۱۳۱۱، ۱۳۱۲۔

❹ صحیح مسلم، کتاب السلام باب النھی عن ابتداء اھل الکتاب: ٥٦٥٨۔ ❺ زادالمعاد، ج ۲، ص:۳٥۔

تھے، ادھر آ نکلے اور وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر آپ ﷺ سے باتیں کرنے لگے، رؤسائے قریش چونکہ سخت متکبر اور فخار تھے، ان کو یہ برابری ناگوار گزری، آپ نے ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور اس امید پر انہیں سے باتیں کرتے رہے، کہ شاید یہ اشقیا اسلام کی سعادت کو قبول کرلیں اور ان کے دل حق کی لذت سے آشنا ہوں لیکن خدا کو یہ امتیاز پسند نہ آیا اور یہ آیات اتریں: [1]

﴿ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝ وَهُوَ يَخْشٰى ۝ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ ﴾ (۸۰/ عبس:۱ تا ۱۲)

’’پیغمبر نے ترش روئی کی اور منہ پھیر لیا کہ اس کے پاس اندھا آیا۔ (اے پیغمبر! تجھے کیا خبر کہ تیری زبان سے وہ پاک ہو جاتا، یا نصیحت حاصل کرتا تو نصیحت اس کو نفع پہنچاتی لیکن جو بے پروائی برتتا ہے، اس کی طرف تو متوجہ ہوتا ہے اور تیرا کیا نقصان ہے اگر وہ پاک وصاف نہ بنے، اور تیرے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا بھی ہے، تو تو اس سے بے اعتنائی کرتا ہے، نہیں ہرگز نہیں یہ نصیحت عام ہے جو چاہے اس کو قبول کرے۔‘‘

یہی غربا اور مفلس اسلام کے سب سے پہلے جان نثار بنے تھے، آنحضرت ﷺ ان کو لے کر حرم میں نماز پڑھنے جاتے تھے تو رؤسائے قریش ان کی ظاہری بدحیثیتی کو دیکھ کر استہزاءً کہتے تھے:

﴿ اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ﴾ (٦/ الانعام:٥٣)

’’یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم لوگوں کو چھوڑ کر احسان کیا ہے۔‘‘

لیکن آپ ﷺ ان کے اس استہزا کو خوشی سے برداشت کرتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے مزاج میں کسی قدر تعلّی تھی اور وہ اپنے آپ کو غریبوں سے بالاتر سمجھتے تھے، آپ نے ان کی طرف خطاب کرکے فرمایا: ’’تم کو جو نصرت اور روزی میسر آتی ہے، وہ انہیں غریبوں کی بدولت آتی ہے۔‘‘ [2] اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ’’میں نے در جنت پر کھڑے ہو کر دیکھا کہ زیادہ تر غریب و مفلس لوگ ہی اس میں داخل ہیں۔‘‘ [3]

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ مسجد نبوی ﷺ میں بیٹھا تھا اور غریب مہاجر لوگ حلقہ باندھے ایک طرف بیٹھے تھے، اسی اثنا میں آپ تشریف لے آئے اور انہی کے ساتھ مل کر بیٹھ گئے، یہ دیکھ کر میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ’’فقرائے مہاجرین کو بشارت ہو کہ وہ دولت مندوں سے چالیس برس پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔‘‘ عبداللہ بن

---

[1] ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة عبس: ۳۳۳۱۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب من استعان بالضعفاء......: ۲۸۹۶۔ [3] بخاری، کتاب الرقاق: ٦٥٤٧ ومسلم: ٦٩٣٧۔

عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ یہ سن کران کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے اور مجھے حسرت ہوئی کہ کاش میں بھی انہیں میں ہوتا۔ ❶

ایک دفعہ آپ ﷺ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، اس اثنا میں ایک شخص سامنے سے گزرا، آپ نے اپنے پہلو کے ایک آدمی سے دریافت فرمایا کہ ''اس کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے؟'' اس نے جواب دیا کہ یہ امرا کے طبقہ میں سے ایک صاحب ہیں، خدا کی قسم! یہ اس لائق ہے کہ اگر رشتہ چاہے تو کیا جائے اور اگر کسی کی سفارش کرے تو قبول کی جائے۔ کچھ دیر کے بعد ایک اور صاحب اسی راہ سے گزرے، آپ نے پھر اس سے استفسار فرمایا: ''اس کی نسبت کیا کہتے ہو؟'' عرض کی: یا رسول اللہ! یہ فقرائے مہاجرین میں سے ہے، اور اس لائق ہے کہ اگر رشتہ چاہے تو واپس کردیا جائے اور سفارش کرے تو رد کردی جائے اگر کچھ کہنا چاہے تو نہ سنا جائے۔ ارشاد ہوا: ''تمام روئے زمین میں اگر اس امیر جیسے آدمی ہوں تو اس سے ایک غریب بہتر ہے۔'' ❷

آنحضرت ﷺ اکثر دعا میں فرمایا کرتے تھے: ''خداوندا! مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا، اور مسکینوں ہی کے ساتھ میرا حشر کر۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا، یا رسول اللہ ﷺ! یہ کیوں؟ فرمایا: ''اس لئے کہ یہ دولت مندوں سے پہلے جنت میں جائیں گے۔'' پھر فرمایا: ''اے عائشہ! کسی مسکین کو اپنے دروازہ سے نامراد نہ پھیرو گو چھوہارے کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو، اے عائشہ! غریبوں سے محبت رکھو، اور ان کو اپنے سے نزدیک کرو تو خدا بھی تم کو اپنے سے نزدیک کرے گا۔'' ❸

ایک دفعہ چند غریب مسلمانوں نے آکر خدمت اقدس میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! امرا ہم سے درجہ اخروی میں بھی بڑھتے جاتے ہیں، نماز روزہ جس طرح ہم کرتے ہیں وہ بھی کرتے ہیں لیکن صدقات وخیرات سے جو نیکیاں ان کو ملتی ہیں ان سے ہم محروم ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تم کو وہ بات نہ بتاؤں جس سے تم اگلوں کے برابر ہو جاؤ، اور پچھلوں سے بڑھ جاؤ، اور پھر کوئی تمہاری برابری نہ کر سکے۔'' عرض کی: ہاں یا رسول اللہ! بتایئے ارشاد ہوا: ''ہر نماز کے بعد ۳۳۔۳۳ دفعہ سبحان اللہ اور الحمد للہ۔ اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔'' کچھ دن کے بعد یہ وفد پھر حاضر خدمت ہوا، اور عرض کی: یا رسول اللہ! ہمارے دولت مند بھائیوں نے بھی یہ وظیفہ سن لیا اور پڑھنا شروع کر دیا، فرمایا: ((﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾)) یعنی ''یہ خدا کی دین ہے جس کو چاہے دے۔'' ❹ مسلمانوں سے جو زکوۃ وصول ہوتی تھی اس کی نسبت عام حکم تھا کہ۔

---

❶ دارمی، کتاب الرقاق: ٢٨٤٤۔

❷ صحیح بخاری: ٦٤٤٧؛ ابن ماجہ: ٤١٢٠۔

❸ ترمذی، ابواب الزهد: ٢٣٥٢؛ بیهقی، کتاب الصدقات: ٧/ ١٢۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الذکر بعد الصلوٰۃ: ٨٤٣، ٦٣٢٩ ومسلم، کتاب المساجد، باب استحباب الذکر بعد الصلوٰۃ: ١٣٤٧۔

((تؤخذ من امرائهم وترد فی فقرائهم))

''ہر قبیلہ کے باہر شہر کے امراء سے لے کر وہیں کے غرباء میں تقسیم کر دی جائے۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم اس کی شدت سے پابندی کرتے تھے اور ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ نہیں بھیجتے تھے۔ ❶

مساوات کے بیان میں یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کسی بات پر حضرت سلمان و بلال رضی اللہ عنہما کو جن کا شمار فقرائے مہاجرین میں ہے ڈانٹا، آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ''تم نے ان لوگوں کو آزردہ تو نہیں کیا۔'' یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان لوگوں کے پاس آئے اور معافی مانگی اور ان لوگوں نے معاف کیا۔

عوالی میں ایک عورت رہتی تھی، وہ بیمار پڑی، اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی، خیال تھا کہ وہ آج کسی وقت مر جائے گی، آپ نے لوگوں سے کہا کہ وہ مر جائے تو میں جنازہ کی نماز خود پڑھاؤں گا تو اس کے بعد دفن کی جائے، اتفاق سے اس نے کچھ رات گئے انتقال کیا، اس کا جنازہ جب تیار ہو کر لایا گیا تو آپ آرام فرما رہے تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس وقت آپ کو تکلیف دینی مناسب نہ سمجھی، اور رات ہی کو دفن کر دیا، صبح کو آپ نے دریافت فرمایا تو لوگوں نے واقعہ عرض کیا، آپ یہ سن کر کھڑے ہو گئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو ساتھ لے کر دوبارہ اس کی قبر پر جا کر نماز جنازہ ادا کی۔ ❷

حضرت جریر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن پہلے پہر ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، کہ ایک پورا قبیلہ مسافر وار حاضر خدمت ہوا ان کی ظاہری حالت اس درجہ خراب تھی کہ کسی کے بدن پر کوئی کپڑا ثابت نہ تھا، برہنہ تن، برہنہ پا، کھالیں بدن سے بندھی ہوئی، تلواریں گلوں میں پڑی ہوئیں، ان کی یہ حالت دیکھ کر آپ بے حد متاثر ہوئے، چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا، اضطراب میں آپ اندر گئے باہر آئے، پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دینے کا حکم دیا، نماز کے بعد آپ نے خطبہ دیا اور تمام مسلمانوں کو ان کی امداد و اعانت کے لئے آمادہ کیا۔) ❸

دشمنان جان سے عفوو درگزر

جانی دشمنوں اور قاتلانہ حملہ آوروں سے عفوو درگزر کا واقعہ پیغمبروں کے صحیفہ اخلاق کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے، جس شب کو آپ نے ہجرت فرمائی ہے، کفار قریش کے نزدیک یہ طے شدہ تھا کہ صبح کو محمد (ﷺ) کا سر قلم کر دیا جائے، اس لیے دشمنوں کا ایک دستہ رات بھر خانۂ نبوی کا محاصرہ کئے کھڑا رہا اگرچہ اس وقت ان دشمنوں سے انتقام لینے کی آپ میں ظاہری قوت نہ تھی، لیکن ایک وقت آیا جب ان میں سے ایک ایک شخص کی گردن

---

❶ ابوداود، کتاب زکوٰۃ: ۱۵۸٤؛ بخاری، کتاب الزکوٰۃ: ۱۳۹۵؛ مسلم: ۱۲۱۔ لیکن یہاں اغنیاء ھم کے الفاظ ہیں۔ ❷ یہ واقعہ صحیح بخاری وغیرہ میں بھی ہے لیکن یہاں سنن نسائی، کتاب الجنائز، باب الصلوٰۃ علی الجنازۃ، باللیل: ۱۹۷۱ سے لیا گیا ہے۔ ❸ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب الحث علی الصدقۃ: ۲۳۵۱، ۲۳۵۲۔

اسلام کی تلوار کے نیچے تھی اوراس کی جان صرف آنحضرت ﷺ کے رحم و کرم پر موقوف تھی، لیکن ہر شخص کو معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی شخص اس جرم میں کبھی مقتول نہیں ہوا۔

ہجرت کے دن قریش نے آنحضرت ﷺ کے سر کی قیمت مقرر کی تھی، اور اعلان کیا تھا کہ جو محمد (ﷺ) کا سر لائے گا یا زندہ گرفتار کرے گا اس کو سو اونٹ انعام میں دیے جائیں گے، سراقہ بن جعشم پہلے شخص تھے جو اس نیت سے اپنے صبا رفتار گھوڑے پر سوار، ہاتھ میں نیزہ لئے ہوئے آپ ﷺ کے قریب پہنچے، آخر دو تین دفعہ کرشمۂ اعجاز دیکھ کر اپنی نیت بد سے توبہ کی اور خواہش کی کہ مجھ کو سند امان لکھ دیجیے، چنانچہ سند امان لکھ کر ان کو دی گئی ❶ اس کے آٹھ برس کے بعد فتح مکہ کے موقع پر وہ حلقہ اسلام میں داخل ہوئے اور اس جرم کے متعلق ایک حرفِ سوال بھی درمیان میں نہیں آیا۔ ❷

عمیر بن وہب آنحضرت ﷺ کا سخت دشمن تھا، مقتولین بدر کے انتقام کے لئے جب سارا قریش بیتاب تھا، تو صفوان بن امیہ نے اس کو بیش قرار انعام کے وعدہ پر مدینہ بھیجا تھا کہ چپکے سے جا کر نعوذ باللہ آنحضرت ﷺ کا کام تمام کردے، عمیر اپنی تلوار زہر میں بجھا کر مدینہ آیا، لیکن وہاں پہنچنے کے ساتھ اس کے تیور دیکھ کر لوگوں نے پہچان لیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے ساتھ سختی کرنی چاہی، لیکن آپ نے منع فرمایا اور اپنے قریب بٹھا کر اس سے باتیں کیں اور اصلی راز ظاہر کردیا، یہ سن کر وہ سناٹے میں آ گیا، لیکن آپ نے اس سے کوئی تعرض نہیں فرمایا۔ یہ دیکھ کر وہ اسلام لایا اور مکہ میں جا کر دعوتِ اسلام پھیلائی یہ واقعہ ۳ھ کا ہے۔ ❸

ایک دفعہ آپ ایک غزوہ سے واپس آرہے تھے، راہ میں ایک میدان آیا، دھوپ تیز تھی، لوگوں نے درختوں کے نیچے بستر لگا دیے، آنحضرت ﷺ نے بھی ایک درخت کے نیچے آرام فرمایا اور تلوار درخت کی شاخ سے لٹکا دی کفار موقع کے منتظر رہتے تھے۔ لوگوں کو غافل دیکھ کرناگاہ ایک طرف سے ایک بدو نے آکر بے خبری میں تلوار اتار لی، دفعتہً آپ بیدار ہوئے، تو دیکھا ایک شخص سرہانے کھڑا ہے، اور ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں ہے، آپ کو بیدار دیکھ کر بولا: کیوں محمد (ﷺ)! اب بتاؤ تم کو اس وقت مجھ سے کون بچا سکتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ'' یہ پراثر آواز سن کر اس نے تلوار نیام میں کرلی، اتنے میں صحابہ رضی اللہ عنہم آگئے، آپ نے ان سے واقعہ دہرایا، اور بدو سے کسی قسم کا تعرض نہیں فرمایا۔ ❹

ایک دفعہ ایک اور شخص نے آپ کے قتل کا ارادہ کیا، صحابہ رضی اللہ عنہم اس کو گرفتار کر کے آنحضرت ﷺ کے سامنے لائے، وہ آپ کو دیکھ کر ڈر گیا، آپ نے اس کو مخاطب کر کے فرمایا: ''ڈرو نہیں، اگر تم مجھ کو قتل کرنا

---

❶ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی ﷺ: ۳۹۰۶۔

❷ سراقه بن مالك بن جعشم مدلجی کا حال استیعاب، ج۲،ص:۵۹۷و اصابہ، ج۲،ص:۱۹وغیرہ میں دیکھو۔

❸ تاریخ طبری، ج۳، ص:۱۳۵۲ تا ۱۳۵٤ بروایت عروه بن زبیر۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب تفرق الناس عن الامام عند القائلة: ۲۹۱۳، ٤۱۳۵۔

چاہتے تھے تو نہیں کر سکتے تھے۔'' ❶

صلح حدیبیہ کے زمانہ میں ایک دفعہ اسی آدمیوں کا ایک دستہ منہ اندھیرے جبل تنعیم سے اتر کر آیا، اور چھپ کر آنحضرت ﷺ کو قتل کرنا چاہا، اتفاق سے وہ لوگ گرفتار ہو گئے، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کو چھوڑ دیا اور کچھ تعرض نہیں کیا، قرآن مجید کی یہ آیت اسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے: ❷

﴿ وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم ﴾ (٤٨/ الفتح: ٢٤)

''اُسی خدا نے ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک لئے۔''

خیبر میں ایک یہودیہ نے آنحضرت ﷺ کو کھانے میں زہر دیا، آپ نے کھانا کھایا تو زہر کا اثر محسوس کیا، آپ نے یہودیوں کو بلا کر دریافت کیا تو انہوں نے اقرار کیا، لیکن آپ نے کسی سے کچھ تعرض نہیں فرمایا، لیکن اسی زہر کے اثر سے جب ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے انتقال کیا تو آپ نے صرف اس یہودیہ کو قصاص کی سزا دی (حالانکہ خود آنحضرت ﷺ کو زہر کا اثر مرتے دم تک محسوس ہوتا رہتا تھا)۔ ❸

دشمنوں کے حق میں دعائے خیر

دشمنوں کے حق میں بددعا کرنا انسان کی فطری عادت ہے لیکن پیغمبروں کا مرتبہ عام انسانی سطح سے بدرجہا بلند ہوتا ہے، جو لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں، وہ ان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں، اور جو ان کے تشنۂ خون ہوتے ہیں، وہ ان کو پیار کرتے ہیں، ہجرت سے قبل مکہ میں مسلمانوں پر اور خود آنحضرت ﷺ پر جو پیہم مظالم ہو رہے تھے، اس داستان کے دہرانے کے لئے بھی سنگدلی درکار ہے، اسی زمانہ میں خباب بن ارت رضی اللہ عنہ ایک صحابی نے عرض کی کہ یارسول اللہ! دشمنوں کے حق میں بددعا فرمایئے۔ یہ سن کر چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا۔ ❹ ایک دفعہ چند صاحبوں نے مل کر اسی قسم کی بات کہی تو فرمایا: ''میں دنیا کے لئے لعنت نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔'' ❺

وہ قریش جنہوں نے تین برس تک آپ ﷺ کو محصور رکھا اور جو آپ کے پاس غلہ کے ایک دانہ کے پہنچنے کے روادار نہ تھے، ان کی شرارتوں کی پاداش میں دعائے نبوی کی استجابت نے ابر رحمت کا سایہ ان کے سر سے اٹھالیا اور مکہ میں اس قدر سخت قحط پڑا کہ لوگ ہڈی اور مردار کھانے لگے، ابوسفیان نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ محمد (ﷺ) تمہاری قوم ہلاک ہو رہی ہے، خدا سے دعا کرو کہ یہ مصیبت دور ہو آپ نے بلا عذر فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور خدا نے اس مصیبت سے ان کو نجات دی۔ ❻

جنگ احد میں دشمنوں نے آپ پر پتھر پھینکے، تیر برسائے، تلواریں چلائیں، دندان مبارک کو شہید کیا،

❶ مسند احمد، ج ۳، ص: ٤٧١۔ ❷ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة الفتح: ٣٢٦٤۔
❸ صحيح بخاری، كتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاته: ٤٤٢٣، ٥٧٧٧۔
❹ صحيح بخاری، كتاب مناقب الانصار، باب مالقی النبی ﷺ: ٣٨٥٢۔ ❺ صحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب النهی عن لعن الدواب... الخ: ٦٦١٣۔ ❻ صحيح بخاری، كتاب التفسير، تفسير سورة دخان: ٤٨٢٤۔

جبینِ اقدس کو خون آلودہ کیا، لیکن ان حملوں کا وار آپ ﷺ نے جس سپر پر روکا، وہ صرف یہ دعا تھی:

((اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون)) ❶

''خدایا! ان کو معاف کرنا کہ یہ نادان ہیں۔''

وہ طائف جس نے دعوت اسلام کا جواب استہزا اور تمسخر سے دیا تھا، وہ طائف جس نے داعی اسلام کو اپنی پناہ میں لینے سے انکار کر دیا تھا، وہ طائف جس نے پائے مبارک کو لہولہان کیا تھا، ان کی نسبت فرشتۂ غیب پوچھتا ہے کہ حکم ہو تو ان پر پہاڑ الٹ دیا جائے، جواب ملتا ہے کہ ''شاید ان کی نسل سے کوئی خدا کا پرستار پیدا ہو۔'' ❷ دس بارہ برس کے بعد یہی طائف اسلام کی دعوت کا جواب تیر وتفنگ (منجنیق) سے دیتا ہے، جان نثاروں کی لاشوں پر لاشیں گر رہی ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم عرض کرتے ہیں: کہ یا رسول اللہ ﷺ! ان کے حق میں بددعا کیجئے۔ آپ ﷺ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں، لوگ سمجھتے ہیں کہ حضور ان کے حق میں بددعا فرمائیں گے لیکن زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلتے ہیں: ''خداوندا! ثقیف (اہل طائف) کو اسلام نصیب کر اور دوستانہ ان کو مدینہ لا۔'' ❸ وہ تیر جو میدان جنگ میں نشانہ پر نہیں لگے تھے، وہ مدینہ کے صحن مسجد میں، زبان مبارک سے نکل کر ٹھیک اپنے ہدف پر پہنچے، یعنی وہ مدینہ آ کر خاص مسجد نبوی میں بیٹھ کر، جہاں وہ مہمان ٹھہرائے گئے، تھے مسلمان ہوئے۔ ❹

دوس کا قبیلہ یمن میں رہتا تھا، طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ اس قبیلہ کے رئیس تھے۔ وہ قدیم الاسلام تھے مدت تک وہ اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، لیکن وہ اپنے کفر پر اڑا رہا، ناچار وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنے قبیلہ کی حالت عرض کر کے گزارش کی کہ ان کے حق میں بددعا فرمایئے۔ لوگوں نے یہ سنا تو کہا کہ اب دوس کی بربادی میں کوئی شک نہیں رہا، لیکن رحمت عالم ﷺ نے جن الفاظ میں یہ دعا فرمائی وہ یہ تھے: ❺

((اللّٰھم اھد دوسًا وائت بھم)) ''خداوند! دوس کو ہدایت کر، اور ان کو لا۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ماں مشرکہ تھیں، اپنی ماں کو وہ جس قدر اسلام کی تبلیغ کرتے تھے، وہ ابا کرتی تھیں، اور ایک دن انہوں نے اسلام کی دعوت دی، تو ان کی ماں نے آنحضرت ﷺ کی شان میں گستاخی کی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ رونے لگے، اور اسی حالت میں آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور واقعہ عرض کیا آپ ﷺ نے دعا کی: ''الٰہی ابو ہریرہ کی ماں کو ہدایت نصیب کر۔'' وہ خوش خوش گھر واپس آئے تو دیکھا کواڑ بند ہیں اور ماں نہا رہی ہیں، غسل سے فارغ ہو کر کواڑ کھولے اور کلمہ پڑھا۔ ❻

---

❶ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ احد: ۳۲۳۱ مع فتح الباری، ج۷، ص: ۲۸۶؛ شعب الایمان بیہقی، ۳/ ۴۸۴۔ ❷ زرقانی، ج۱، ص: ۳۴۶ بروایت بخاری ومسلم۔

❸ ابن سعد غزوۃ طائف، جزء ثانی، قسم اوّل، ص: ۱۱۵۔ ❹ زاد المعاد، ج۲، ص: ۲۵۔

❺ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، من فضائل غفار واسلم: ۶۴۵۰۔

❻ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل ابی ہریرۃ: ۶۳۹۶۔

عبداللہ بن ابی بن سلول وہ شخص تھا جو عمر بھر منافق رہا اور کوئی موقع اس نے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف خفیہ سازشوں اور اعلانیہ استخفاف واہانت کا ہاتھ سے جانے نہ دیا، کفارِ قریش کے ساتھ اس کی خفیہ خط وکتابت تھی، غزوۂ احد میں عین موقع پر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مسلمانوں کی فوج سے الگ ہو گیا، واقعہ افک میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام لگانے والوں میں وہ سب سے آگے تھا، لیکن با ایں ہمہ اس کی فرد جرم کو رحمت عالم کا حلم وعفو ہمیشہ دھوتا رہا، وہ مرا تو آپ ﷺ نے اس کی مغفرت کی نماز پڑھی، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یارسول اللہ! آپ اس کے جنازہ کی نماز پڑھتے ہیں، حالانکہ اس نے یہ کہا اور یہ کہا اور یہ کہا، آپ ﷺ یہ سن کر متبسم ہوئے اور فرمایا: ''ہٹو اے عمر۔'' جب زیادہ اصرار کیا تو فرمایا: ''اگر مجھے اختیار دیا جاتا اور معلوم ہوتا کہ اگر ستر دفعہ میں نماز پڑھوں تو اس کی بخشش ہو سکتی ہے، تو میں اس سے بھی زیادہ پڑھتا۔'' [1]

بچوں پر شفقت

بچوں پر نہایت شفقت فرماتے تھے، معمول تھا کہ سفر سے تشریف لاتے تو راہ میں جو بچے ملتے ان میں سے کسی کسی کو اپنے ساتھ سواری پر آگے پیچھے بٹھاتے [2] (راستے میں بچے مل جاتے تو ان کو خود سلام کرتے)۔ [3]

ایک دن خالد بن سعید رضی اللہ عنہ خدمت اقدس میں آئے ان کی چھوٹی لڑکی بھی ساتھ تھی، اور سرخ رنگ کا کرتہ بدن پر تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: ((سنہ سنہ)) حبشی زبان میں حسنہ کو سنہ کہتے ہیں، چونکہ ان کی پیدائش حبش میں ہوئی تھی، اس لئے آپ ﷺ نے اس مناسبت سے حبشی تلفظ میں حسنہ کے بجائے سنہ کہا، آنحضرت ﷺ کی پشت پر جو مہر نبوت تھی، ابھری ہوئی تھی، بچوں کی عادت ہوتی ہے، غیر معمولی چیز نظر آئے تو اس سے کھیلنے لگتے ہیں، وہ بھی مہر نبوت سے کھیلنے لگیں، خالد نے ڈانٹا، آنحضرت ﷺ نے روکا کہ کھیلنے دو۔ [4]

ایک دفعہ آپ ﷺ کے پاس کہیں سے کپڑے آئے جن میں ایک سیاہ چادر بھی تھی، جن میں دونوں طرف آنچل تھے، آپ ﷺ نے حاضرین سے کہا: ''یہ چادر کس کو دوں۔'' لوگ چپ رہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ام خالد کو لاؤ۔'' [5] وہ آئیں تو آپ ﷺ نے ان کو پہنایا اور دو دفعہ فرمایا: ''پہننا اور پرانی کرنا۔'' چادر میں جو بوٹے تھے آپ ان کو دکھا دکھا کے فرماتے تھے: ''ام خالد دیکھنا یہ سنہ ہے یہ سنہ ہے۔'' [6] اوپر گزر چکا ہے کہ ام خالد حبش میں پیدا ہوئی تھیں، اور کئی سال تک وہیں رہی تھیں اس لیے ان سے حبشی زبان میں خطاب کیا۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب ما یکرہ من الصلوۃ علی المنافقین: ١٣٦٦۔

[2] مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ: ٦٢٦٨۔ [3] ابوداود، کتاب الادب، باب فی السلام علی الصبیان: ٥٢٠٢، ٥٢٠٣۔ [4] بخاری، کتاب الادب، باب من ترك صبیۃ غیرہ ...: ٥٩٩٣۔

[5] بخاری میں ہے کہ وہ اس قدر چھوٹی تھیں کہ لوگ ان کو گود میں اٹھا کر لائے۔

[6] صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب الخمیصۃ السوداء: ٥٨٢٣، ٥٨٤٥ سنہ حبشی میں حسن کو کہتے ہیں۔ (ایک روایت میں سَنَاہ: ٥٨٢٣۔ ایک روایت میں تلفظ سَنَا: ٥٨٤٥۔ اور ایک روایت میں تلفظ سنہ: ٥٩١٣ ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ بچپن میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا اور ڈھیلوں سے مار کر کھجوریں گراتا، لوگ مجھ کو خدمت اقدس میں لے گئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''ڈھیلے کیوں مارتے ہو۔'' میں نے کہا: کھجوریں کھانے کے لئے ارشاد فرمایا: ''کھجوریں جو زمین پر ٹپکتی ہیں ان کو اٹھا کر کھالیا کرو، ڈھیلے نہ مارو۔'' یہ کہہ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔ ❶

ماں بچے کی محبت کے واقعات سے آپ ﷺ پر سخت اثر ہوتا تھا، ایک دفعہ ایک نہایت غریب عورت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی، دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی ساتھ تھیں، اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس کچھ نہ تھا، ایک کھجور زمین پر پڑی ہوئی تھی وہی اٹھا کر دے دی، عورت نے کھجور کے دو ٹکڑے کئے اور دونوں میں برابر تقسیم کر دیا، آنحضرت ﷺ باہر سے تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ واقعہ سنایا، ارشاد ہوا کہ ''جس کو خدا اولاد کی محبت میں ڈالے اور وہ ان کا حق بجالائے وہ دوزخ سے محفوظ رہے گا۔'' ❷ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ فرماتے تھے: ''میں نماز شروع کرتا ہوں اور ارادہ ہوتا ہے کہ دیر میں ختم کروں گا، دفعتاً صف سے کسی بچہ کے رونے کی آواز آتی ہے اور مختصر کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں کو تکلیف ہوتی ہوگی۔'' ❸

یہ محبت اور شفقت مسلمان بچوں تک محدود نہ تھی بلکہ مشرکین کے بچوں پر بھی اسی طرح لطف فرماتے تھے، ایک دفعہ ایک غزوہ میں چند بچے جھپٹ میں آکر مارے گئے، آپ کو خبر ہوئی تو نہایت آزردہ ہوئے، ایک صاحب نے کہا: یا رسول اللہ! مشرکین کے بچے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''مشرکین کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں، خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو، خبردار، بچوں کو قتل نہ کرو، ہر جان خدا ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے۔'' ❹

معمول تھا کہ جب فصل کا نیا میوہ کوئی خدمت اقدس میں پیش کرتا، تو حاضرین میں جو سب سے زیادہ کم عمر بچہ ہوتا اس کو عنایت فرماتے۔ ❺ بچوں کو چومتے اور اُن کو پیار کرتے تھے، ایک دفعہ آپ ﷺ اسی طرح بچوں کو پیار کر رہے تھے کہ ایک بدوی آیا، اس نے کہا: تم لوگ بچوں کو پیار کرتے ہو، میرے دس بچے ہیں مگر اب تک میں نے کسی کو پیار نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اگر تمہارے دل سے محبت کو چھین لے تو میں کیا کروں۔'' ❻

جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ صحابی تھے، وہ اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے آنحضرت ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہو کر آپ اپنے گھر کی طرف چلے میں بھی ساتھ ہو لیا کہ

❶ ابوداود، کتاب الجهاد، باب من قال إنه يأكل مما سقط: ۲٦۲۲۔ ❷ بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الولد، وتقبيله ومعانقته: ۵۹۹۵۔ ❸ بخاری، کتاب الاذان، باب من اخف الصلاة عند بكاء الصبي: ۷۰۹، ۷۱۰۔ ❹ مسند احمد، ج ۳، ص: ۴۳۵۔ ❺ معجم صغیر طبرانی، باب المیم معجم محمد، ص: ۱٦۳۔ ❻ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الولد وتقبيله ومعانقته: ۵۹۹۸ ومسلم کتاب الفضائل، باب رحمة الصبيان: ٦۰۲۷، ٦۰۲۸۔

ادھر سے چند لڑکے نکل آئے، آپ ﷺ نے سب کو پیار کیا اور مجھے بھی پیار کیا۔ ❶ ہجرت کے موقع پر جب مدینہ میں آپ کا داخلہ ہو رہا تھا، انصار کی چھوٹی چھوٹی لڑکیاں خوشی سے دروازوں سے نکل نکل کر گیت گا رہی تھیں، جب آپ کا ادھر گزر ہوا، فرمایا: ''اے لڑکیو! تم مجھے پیار کرتی ہو'' سب نے کہا: ہاں یارسول اللہ ﷺ! فرمایا: ''میں بھی تمہیں پیار کرتا ہوں۔'' ❷

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کمسنی میں بیاہ کر آئی تھیں، محلہ کی لڑکیوں کے ساتھ وہ کھیلا کرتی تھیں، آپ جب گھر میں تشریف لاتے تو لڑکیاں آپ کا لحاظ کر کے ادھر ادھر چھپ جاتیں، آپ تسکین دیتے اور کھیلنے کو کہتے۔ ❸

غلاموں پر شفقت

آنحضرت ﷺ غلاموں پر خصوصیت کے ساتھ شفقت فرماتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ ''یہ تمہارے بھائی ہیں جو خود کھاتے ہو وہ ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنتے ہو وہ ان کو پہناؤ۔'' ❹ آنحضرت ﷺ کی ملکیت میں جو غلام آتے، ان کو آپ ہمیشہ آزاد فرما دیتے تھے لیکن وہ حضور کے احسان و کرم کی زنجیر سے آزاد نہیں ہو سکتے تھے ماں، باپ، قبیلہ، رشتہ کو چھوڑ کر عمر بھر آپ کی غلامی کو شرف جانتے تھے، زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ غلام تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا، ان کے باپ ان کو لینے آئے لیکن وہ اس آستانہ رحمت پر باپ کے ظل عاطفت کو ترجیح نہ دے سکے اور اپنے جانے سے قطعاً انکار کر دیا، ❺ زید کے بیٹے اسامہ سے آپ اس قدر محبت کرتے تھے کہ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''اگر اسامہ بیٹی ہوتی تو میں اس کو زیور پہناتا، خود اپنے دستِ مبارک سے ان کی ناک صاف کرتے تھے۔'' ❻

غلاموں کو لفظ ''غلام'' کا سن کر اپنی نظر میں اپنی آپ ذلت محسوس ہوتی تھی۔ آنحضرت ﷺ کو ان کی یہ تکلیف بھی گوارا نہ تھی، فرمایا: ''کوئی ''میرا غلام'' ''میری لونڈی'' نہ کہے ''میرا بچہ'' ''میری بچی'' کہے اور غلام بھی اپنے آقا کو خداوند نہ کہیں، خداوند خدا ہے، آقا کہیں۔'' ❼ آنحضرت ﷺ کو غلاموں پر شفقت اتنی ملحوظ تھی کہ مرض الموت میں سب سے آخری یہ وصیت فرمائی کہ ''غلاموں کے معاملہ میں خدا سے ڈرا کرنا'' ❽

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بہت قدیم الاسلام صحابی تھے، آنحضرت ﷺ ان کی راست گوئی کی مدح فرماتے تھے، ایک دفعہ انہوں نے ایک عجمی آزاد غلام کو برا بھلا کہا، غلام نے آنحضرت ﷺ سے جا کر شکایت کی، آپ ﷺ نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو زجر فرمایا کہ ''تم میں اب تک جہالت باقی ہے، یہ غلام تمہارے

❶ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب طیب رائحة النبی ﷺ: ٦٠٥٢۔
❷ سیرت جلد اول ہجرت، ص: ١٨٩ (طبع جدید: ١٩٩٧ء) [وطبع ہذا ٢٠١٢ء، ج١، ص: ٢٠٢]۔
❸ ابوداود، کتاب الادب، باب اللعب بالبنات: ٤٩٣١۔ ❹ الادب المفرد، باب لایکلف العبد من العمل: ١٩٢، ١٩٩۔ ❺ فتح الباری، ج٧، ص: ٦٩۔ ❻ طبقات ابن سعد، جزاول، قسم ثانی، ص: ٤٣۔
❼ الادب المفرد، باب لایقول عبدی: ٢٠٩، ٢١٠۔ ❽ ابوداود، کتاب الادب، باب فی حق المملوك: ٥١٥٦۔

بھائی ہیں خدا نے تم کو ان پر فضیلت عطا کی ہے، اگر وہ تمہارے مزاج کے موافق نہ ہوں تو ان کو فروخت کر ڈالو، خدا کی مخلوق کو ستایا نہ کرو، جو خود کھاؤ وہ ان کو کھلاؤ، جو خود پہنو وہ ان کو پہناؤ، ان کو اتنا کام نہ دو جو وہ نہ کر سکیں اور اگر اتنا کام دو تو خود بھی ان کی اعانت کر دو۔'' ❶

ایک دفعہ ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ اپنے غلام کو مار رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی ''ابو مسعود! تم کو جس قدر اس غلام پر اختیار ہے، خدا کو اس سے زیادہ تم پر اختیار ہے۔'' ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے مڑ کر دیکھا تو آنحضرت ﷺ تھے، عرض کی: یا رسول اللہ! میں نے لوجہ اللہ اس غلام کو آزاد کیا، فرمایا: ''اگر تم ایسا نہ کرتے تو آتش دوزخ تم کو چھو لیتی۔'' ❷

ایک شخص خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوا عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! میں غلاموں کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں؟ آپ خاموش رہے، اس نے پھر عرض کی، آپ نے پھر خاموشی اختیار کی، اس نے تیسری بار عرض کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر روز ستر بار معاف کیا کرو۔'' ❸ آنحضرت ﷺ کے عہد میں ایک خاندان میں سات آدمی تھے اور سات آدمیوں کے بیچ میں ایک ہی لونڈی تھی، ایک دفعہ ان میں سے ایک نے اس لونڈی کو تھپڑ مارا، آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کو آزاد کر دو۔'' لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! ہم سات آدمیوں کے بیچ میں یہی ایک خادمہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اچھا اس وقت تک خدمت گزاری کرے جب تک تم اس سے بے نیاز نہ ہو جاؤ، جب حاجت نہ رہے تو آزاد ہے۔'' ❹

ایک صاحب کے پاس دو غلام تھے، جن کے وہ بہت شاکی تھے، وہ ان کو مارتے تھے، برا بھلا کہتے تھے، لیکن وہ دونوں باز نہ آتے تھے، انہوں نے آکر آنحضرت ﷺ سے شکایت کی اور اس کا علاج پوچھا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہاری سزا اگر ان کے قصور کے برابر ہوگی تو خیر، ورنہ سزا کی جو مقدار زائد ہوگی اس کے برابر تمہیں بھی خدا سزا دے گا۔'' یہ سن کر وہ بیقرار ہو گئے اور گریہ وزاری شروع کی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''یہ شخص قرآن نہیں پڑھتا، ﴿ وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ ﴾'' (۲۱/ الانبیآء:۴۷) یہ سن کر انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! بہتر یہ ہے کہ میں ان کو اپنے سے جدا کر دوں۔ آپ گواہ رہیں کہ اب وہ آزاد ہیں۔ ❺ غلاموں کا لوگ بیاہ کر دیتے تھے اور پھر جب چاہتے تھے جبراً ان میں تفریق کر دیتے تھے، چنانچہ ایک شخص نے اپنی لونڈی سے اپنے غلام کا عقد کر دیا اور پھر دونوں میں علیحدگی کرنی چاہی غلام نے خدمت نبوی میں آکر شکایت کی آپ ﷺ نے منبر پر خطبہ دیا کہ ''لوگ کیوں غلاموں کا نکاح کر کے پھر تفریق کرانا چاہتے ہیں نکاح وطلاق کا حق صرف شوہر کو ہے۔'' ❻

❶ بخاری، کتاب الایمان، باب المعاصی من امر الجاهلية: ۳۰، ۲۵٤٥ وابوداود، کتاب الادب، باب فی حق المملوك: ۵۱۵۷، ۵۱۵۸۔ ❷ ابوداود، کتاب الادب، باب حق المملوك: ۵۱۵۹۔ ❸ ایضا: ۵۱٦٤۔
❹ ایضا: ۵۱٦۷۔ ❺ مسند احمد، ج ٦، ص: ۲۸۰۔
❻ سنن ابن ماجه، کتاب الطلاق، باب طلاق العبد: ۲۰۸۱۔

اسی رحم وشفقت کا اثر تھا کہ کافروں کے غلام بھاگ بھاگ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور آپ انہیں آزاد فرما دیتے تھے۔ ❶ مالِ غنیمت جب تقسیم ہوتا تو آپ اس میں سے غلاموں کو بھی حصہ دیتے تھے ❷ جو غلام نئے آزاد ہوتے تھے، چونکہ ان کے پاس کوئی مالی سرمایہ نہیں ہوتا تھا اس لیے جو آمدنی وصول ہوتی تھی اس میں سب سے پہلے آپ انہیں کو عنایت فرماتے تھے۔

مستورات کے ساتھ برتاؤ

دنیا میں یہ صنفِ ضعیف (عورتیں) چونکہ ہمیشہ ذلیل رہی ہیں، اس لئے کسی نامور شخص کے حالات میں یہ پہلو کبھی پیش نظر نہیں رہا کہ اس مظلوم گروہ کے ساتھ اس کا طریق معاشرت کیا تھا، اسلام دنیا کا سب سے پہلا مذہب ہے جس نے عورتوں کی حق رسی کی اور عزت ومنزلت کے دربار میں ان کو مردوں کے برابر جگہ دی، اس لئے شارع اسلام کے واقعاتِ زندگی میں ہم کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مستورات کے ساتھ ان کا طرز عمل کیا تھا۔ صحیح بخاری میں آنحضرت ﷺ کے ایلاء (ازواجِ مطہرات سے چند روز علیحدگی) کی جو روایت مذکور ہے اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مکہ میں ہم لوگ عورتوں کو بالکل ناقابل التفات سمجھتے تھے مدینہ میں نسبتاً عورتوں کی قدر تھی لیکن نہ اس قدر جس کی وہ مستحق تھیں ❸ آنحضرت ﷺ نے جس طرح اپنے ارشاد واحکام سے ان کے حقوق قائم کئے۔ آپ کے برتاؤ نے اور زیادہ اس کو قوی اور نمایاں کر دیا۔ ازواجِ مطہرات کے واقعات مستقلاً مذکور ہیں۔ یہاں ہم عام واقعات لکھتے ہیں:

آنحضرت ﷺ کے دربار میں چونکہ ہر وقت مردوں کا ہجوم رہتا تھا عورتوں کو وعظ وپند سننے اور مسائل کے دریافت کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ مستورات نے آکر درخواست کی کہ مردوں سے ہم عہدہ برآ نہیں ہو سکتیں اس لیے ہمارے لیے ایک خاص دن مقرر کر دیا جائے، آنحضرت ﷺ نے ان کی درخواست قبول فرمائی، اور ان کے دربار کا ایک خاص دن مقرر ہو گیا۔ ❹

جن لوگوں نے آغازِ اسلام میں حبش کو ہجرت کی تھی ان میں اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ خیبر کی فتح کے زمانہ میں مہاجرین حبش مدینہ میں آئے، تو وہ بھی آئیں۔ ایک دن وہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے ملنے گئیں اتفاق یہ کہ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، ان کو دیکھ کر پوچھا: یہ کون ہیں؟ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے نام بتایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہاں وہ حبش والی وہ سمندر والی۔'' اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے کہا: ہاں وہی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم نے تم لوگوں سے پہلے ہجرت کی اور اس لیے رسول اللہ ﷺ پر ہمارا زیادہ حق

❶ ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی عبید المشرکین یلحقون بالمسلمین: ٢٧٠٠ ومسند احمد، ج ١، ص: ٢٤٣۔

❷ ابوداود، کتاب الخراج والامارة، باب فی قسم الفيء: ٢٩٥١، ٢٩٥٢۔

❸ صحیح بخاری، کتاب التفسیر تفسیر سورة التحریم: ٤٩١٣۔

❹ صحیح بخاری، کتاب العلم، هل یجعل للنساء یوما علی حدة: ١٠١۔

ہے۔ اسماء رضی اللہ عنہا کو سخت غصہ آیا، بولیں: ہرگز نہیں تم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہتے تھے، وہ بھوکوں کو کھلاتے تھے، ہمارا یہ حال تھا کہ گھر سے دور بیگانے حبشیوں میں رہتے تھے لوگ ہم کو ستاتے تھے اور ہر وقت جان کا ڈر لگا رہتا تھا۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ آ گئے۔ اسماء نے کہا، یا رسول اللہ ﷺ! عمر رضی اللہ عنہ نے یہ، یہ کہا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے کیا جواب دیا۔'' انہوں نے ماجرا سنایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''عمر کا حق مجھ پر تم سے زیادہ نہیں ہے۔'' عمر اور ان کے ساتھیوں نے صرف ایک ہجرت کی اور تم لوگوں نے دو ہجرتیں کیں۔'' اس واقعہ کا چرچا پھیلا تو مہاجرین حبش جوق در جوق اسماء رضی اللہ عنہا کے پاس آتے اور آنحضرت ﷺ کے الفاظ ان سے بار بار دہروا کر سنتے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ مہاجرین حبش کے لیے دنیا میں کوئی چیز آنحضرت ﷺ کے ان الفاظ سے زیادہ تر مسرت انگیز نہ تھی۔ [1]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جو خادم خاص تھے، ان کی خالہ کا نام ام حرام تھا۔ (جو رضاعت کے رشتہ سے آپ ﷺ کی بھی خالہ تھیں) معمول تھا جب آپ قبا تشریف لے جاتے تو ان کے پاس ضرور جاتے وہ اکثر کھانا لا کر پیش کرتیں اور آپ نوش فرماتے۔ آپ سو جاتے تو بالوں میں سے جوئیں نکالتیں۔ [2]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کو نہایت محبت تھی، آپ اکثر ان کے گھر تشریف لے جاتے۔ وہ بچھونا بچھا دیتیں، آپ آرام فرماتے، جب سو کر اٹھتے تو وہ آپ کا پسینہ ایک شیشی میں جمع کر لیتیں۔ مرتے وقت وصیت کی کہ کفن میں حنوط ملایا جائے تو عرق مبارک کے ساتھ ملایا جائے۔ [3]

ایک دفعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی دادی ملیکہ نے آپ ﷺ کی دعوت کی۔ کھانا خود تیار کیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے کھانا نوش فرما کر فرمایا: ''آؤ میں تم کو نماز پڑھاؤں۔'' گھر میں صرف ایک چٹائی تھی اور وہ بھی پرانی ہو کر سیاہ ہو گئی تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے پہلے اس کو پانی سے دھویا اور پھر نماز کے لیے بچھایا آنحضرت ﷺ نے امامت کی، حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ان کی دادی اور یتیم (غلام) صف باندھ کر کھڑے ہوئے۔ آپ نے دو رکعت نماز ادا کی اور واپس آئے۔ [4]

حضرت ابوبکر کی صاحبزادی (اسماء رضی اللہ عنہا) جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی علاتی بہن تھیں، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے بیاہی تھیں، مدینہ میں آئیں تو اس وقت حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی یہ حالت تھی کہ ایک گھوڑے کے سوا اور کچھ نہ تھا، حضرت اسماء رضی اللہ عنہا خود ہی گھوڑے کے لیے جنگل سے گھاس لاتیں اور کھانا پکاتیں، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر: ۴۲۳۰، ۴۲۳۱۔ [2] بخاری، کتاب الجهاد، باب الدعاء بالجهاد: ۲۷۸۸، ۲۷۸۹۔ [3] بخاری، کتاب الاستئذان، باب من زار قوما فقال عندهم: ۶۲۸۱۔
[4] بخاری، کتاب الصلوۃ، باب الصلوۃ علی الحصیر: ۳۸۰۔

جو زمین آنحضرت ﷺ نے عطا فرمائی تھی اور جو مدینہ سے دو میل پر تھی وہاں سے کھجور کی گٹھلیاں سر پر لاد کر لاتیں، ایک دن وہ گٹھلیاں لیے ہوئے آ رہی تھیں کہ آنحضرت ﷺ نے دیکھا، آپ اس وقت اونٹ پر سوار تھے، اونٹ کو بٹھا دیا کہ وہ سوار ہو لیں۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا شرمائیں۔ آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھ کر کہ وہ حجاب کرتی ہیں کچھ نہیں فرمایا اور ان کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک خادم بھیجا جو گھوڑے کی خدمت کرتا تھا مجھ کو اس قدر غنیمت معلوم ہوا کہ گویا میں غلامی سے آزاد ہو گئی۔ ❶

ایک بار قرابت کی بہت سی بیبیاں بیٹھی ہوئی آنحضرت ﷺ سے بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے تو سب اٹھ کر چل دیں آنحضرت ﷺ ہنس پڑے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: خدا آپ ﷺ کو خنداں رکھے کیوں ہنسے؟ فرمایا: ''مجھے ان عورتوں پر تعجب ہوا کہ تمہاری آواز سنتے ہی سب آڑ میں چھپ گئیں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا: اے اپنی جان کی دشمنو! مجھ سے ڈرتی ہو اور آنحضرت ﷺ سے نہیں ڈرتیں۔ سب نے کہا: تم رسول اللہ ﷺ کی نسبت سخت مزاج ہو۔ ❷

ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں آپ منہ ڈھانک کر سوئے ہوئے تھے عید کا دن تھا، چھوکریاں گا بجا رہی تھیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے تو ان کو ڈانٹا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ان کو گانے دو یہ ان کی عید کا دن ہے۔'' ❸ عورتیں عموماً نہایت دلیری کے ساتھ آپ سے بے محابا مسائل دریافت کرتی تھیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان کی اس جرأت پر حیرت ہوتی تھی لیکن آپ کسی قسم کی ناگواری نہیں ظاہر فرماتے تھے۔ چونکہ عورتیں عموماً نازک طبع اور ضعیف القلب ہوتی ہیں ان کی خاطر داری کا نہایت خیال رکھتے تھے۔ انجشہ نام ایک حبشی غلام حدی خوان تھے یعنی اونٹ کے آگے حدی پڑھتے جاتے تھے۔ ایک دفعہ سفر میں ازواج مطہرات ساتھ تھیں۔ انجشہ حدی پڑھتے جاتے تھے اونٹ زیادہ تیز چلنے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''انجشہ! دیکھنا شیشے (عورتیں) ٹوٹنے نہ پائیں۔'' ❹

حیوانات پر رحم

حیوانات پر نہایت رحم فرماتے تھے۔ ان بے زبانوں پر جو ظلم مدت سے عرب میں چلے آتے تھے موقوف کرا دیے۔ اونٹ کے گلے میں قلادہ لٹکانے کا عام دستور تھا اس کو روک دیا۔ ❺ (زندہ جانور کے بدن

---

❶ بخاری، کتاب النکاح، باب الغیرۃ: ۵۲۲۴۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عمر ابن الخطاب: ۳۶۸۳۔ ❸ مسلم، کتاب العیدین، باب الرخصۃ فی اللعب: ۲۰۶۳۔
❹ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ماجآء فی قول الرجل ویلک: ۶۱۶۱۔
❺ صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، باب کراھۃ قلادۃ الوتر فی رقبۃ البعیر: ۵۵۴۹۔

سے گوشت کا لوتھڑا کاٹ لیتے تھے اور اس کو پکا کر کھاتے تھے، اس کو منع کر دیا۔ (1) جانور کی دم اور ایال کاٹنے سے بھی منع کیا اور فرمایا کہ ''دم ان کا مورچھل اور ایال ان کا لحاف ہے۔'' (2) جانوروں کو دیر تک ساز میں باندھ کر کھڑا رکھنے کی بھی ممانعت کی اور فرمایا کہ ''جانوروں کی پیٹھوں کو اپنی نشست گاہ اور کرسی نہ بناؤ۔'' (3) اسی طرح جانوروں کو باہم لڑانا بھی ناجائز بتایا۔ ایک بے رحمی کا دستور یہ تھا کہ کسی جانور کو باندھ کر اس کا نشانہ بناتے تھے اور مشق تیراندازی کرتے تھے اس سنگدلی کی بھی قطعاً ممانعت کر دی۔ (4)

ایک دفعہ ایک گدھا راہ میں نظر پڑا جس کا چہرہ داغا گیا تھا، فرمایا کہ ''جس نے اس کا چہرہ داغا ہے اس پر خدا کی لعنت ہے۔'' (5) علامت یا بعض دیگر ضرورتوں کی وجہ سے اونٹوں اور بکریوں کو داغنا پڑتا تھا ایسی حالت میں آپ ﷺ ان اعضاء کو داغتے جو زیادہ نازک نہیں ہوتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ بکریوں کے ریوڑ میں گیا تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ بکریوں کے کان داغ رہے ہیں۔ (6)

ایک بار آپ ﷺ کسی سفر میں جا رہے تھے لوگوں نے مقام پر منزل کیا، وہاں ایک پرندہ نے انڈا دیا تھا، ایک شخص نے وہ انڈا اٹھا لیا، چڑیا بے قرار ہو کر پر مار رہی تھی، آنحضرت ﷺ نے دریافت کیا کہ ''اس کا انڈا چھین کر کس نے اس کو اذیت پہنچائی۔'' ان صاحب نے کہا: یا رسول اللہ! مجھ سے یہ حرکت ہوئی ہے آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہیں رکھ دو۔'' (7)

ایک صحابی رضی اللہ عنہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے ان کے ہاتھ میں چادر سے چھپے ہوئے کسی پرندہ کے بچے تھے، آپ نے دریافت فرمایا تو عرض کی کہ ایک جھاڑی سے آواز آ رہی تھی جا کر دیکھا تو یہ بچے تھے میں نے ان کو نکال لیا، پرندہ نے یعنی ان بچوں کی ماں نے یہ دیکھا تو وہ میرے سر پر منڈلانے لگی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جاؤ اور بچوں کو وہیں پھر رکھ آؤ۔'' (8)

ایک بار راستہ میں ایک اونٹ نظر سے گزرا جس کے پیٹ اور پیٹھ شدتِ گرسنگی سے ایک ہو گئے تھے، فرمایا کہ ''ان بے زبانوں کے متعلق خدا سے ڈرو۔'' (9) ایک دفعہ ایک انصاری کے باغ میں آپ تشریف لے گئے، ایک گرسنہ اونٹ نظر آیا، آپ کو دیکھ کر بلبلایا، آپ نے شفقت سے اس پر ہاتھ پھیرا، پھر لوگوں سے اس کے مالک کا نام پوچھا، معلوم ہوا کہ ایک انصاری کا ہے۔ ان سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس جانور کے

---

(1) ترمذی، ابواب الصید، باب ماجاء ماقطع من الحی فھو میت: ۱۴۸۰۔ (2) ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی کراهية جز نواصی الخیل وأذنابها: ۲۵۴۲۔ (3) ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی الوقوف علی الدابة: ۲۵۶۷۔ (4) مسلم، کتاب الصید، باب النهی عن صبر البهائم: ۵۰۵۷ تا ۵۰۶۳۔ (5) مسلم، کتاب اللباس، باب النهی عن ضرب الحیوان فی وجهه، ووسمه فیه: ۵۵۵۲۔ (6) مسلم، کتاب اللباس، باب جواز وسم الحیوان...الخ: ۵۵۵۶۔ (7) الادب المفرد امام بخاری، باب اخذ البیض من الحمرة: ۳۸۲۔

(8) ابوداود، کتاب الجنائز، باب الأمراض المكفرة للذنوب: ۳۰۸۹۔

(9) ابوداود، کتاب الجهاد، باب مايؤمر به من القيام على الدواب: ۲۵۴۸۔

معاملہ میں تم خدا سے نہیں ڈرتے۔'' ❶

رحمت ومحبت عام

حضور انور ﷺ کی ذات پاک تمام دنیا کے لیے رحمت بن کر آئی تھی حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا تھا کہ ''میں امن کا شہزادہ ہوں'' لیکن شہزادۂ امن کی اخلاقی حکومت کا ایک کارنامہ بھی اس کے ثبوت میں محفوظ نہیں لیکن امن کے شہنشاہ کو خداوند ازل ہی نے خطاب کیا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۱۰۷)

''محمد ﷺ! ہم نے تجھ کو تمام دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

تم آنحضرت ﷺ کے حلم وعفو، مسامحت ودرگزر کے سینکڑوں واقعات پڑھ چکے، نظر آیا ہوگا کہ اس خزانۂ رحمت میں دوست دشمن، کافر مسلم، بوڑھے، بچے، عورت مرد، آقا وغلام، انسان وحیوان ہر ایک صنف ہستی برابر کی حصہ دار تھی۔ ایک صاحب نے آپ ﷺ سے کسی پر بددعا کرنے کی درخواست کی تو غضبناک ہو کر فرمایا کہ ''میں دنیا میں لعنت کے لیے نہیں آیا ہوں۔ ❷ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں'' آپ ﷺ نے دنیا کو پیغام دیا:

((لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وكونوا عباد الله اخوانا)) ❸

''ایک دوسرے پر بغض وحسد نہ کرو۔ ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو اور اے خدا کے بندو! سب آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔''

ایک اور حدیث میں حکم فرمایا:

((احب للناس ماتحب لنفسك تكن مسلما)) ❹

''لوگوں کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلم بنو گے۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لا يؤمن احدكم حتى يحب للناس مايحب لنفسه وحتى يحب المرء لا يحبه الا لله عز وجل)) ❺

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ سب لوگوں کے لیے وہی محبوب نہ رکھے جو اپنے لیے رکھتا ہے اور جب تک وہ دوسرے کو بے غرض صرف خدا کے

❶ ایضًا:۲۵٤۹۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والأدب، باب النهی عن لعن الدواب وغیرها: ٦٦١٣؛ زرقانی، ج٤، ص: ۲۸۹۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الهجرة:٦٠٧٦۔

❹ جامع ترمذی، ابواب الزهد، باب من اتقی المحارم فهو أعبد الناس:۲۳۰۵ بسند غریب۔

❺ مسند أحمد بن حنبل، ج۳، ص:۲۷۲۔

لیے پیار نہ کرے۔''

ایک شخص نے مسجد نبوی میں آ کر دعا کی: خدایا! مجھ کو اور محمد ﷺ کو مغفرت عطا کر۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا۔'' ❶ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک اعرابی مسجد نبوی میں آیا اور آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، نماز پڑھ کر اپنے اونٹ پر سوار ہوا، اور بولا: خداوند! مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحمت بھیج، اور ہماری رحمت میں کسی اور کو شریک نہ کر۔ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف خطاب کر کے فرمایا: ''بتاؤ یہ زیادہ راہ بھولا ہوا ہے یا اس کا اونٹ؟'' ❷ یعنی آپ نے اس قسم کی دعا کو ناپسند فرمایا۔

رقیق القلبی

آنحضرت ﷺ نہایت نرم دل اور رقیق القلب تھے مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ ایک وفد کے رکن بن کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تھے، ان کو بیس دن تک مجلس نبوی میں شرکت کا موقع ملا تھا، وہ فرماتے تھے:

كان رسول الله ﷺ رحيمًا رقيقًا۔ ❸

''آنحضرت ﷺ رحیم المزاج اور رقیق القلب تھے۔''

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا بچہ مرنے لگا تو انہوں نے آنحضرت ﷺ کو بلا بھیجا اور قسم دلائی کہ ضرور تشریف لائیے، مجبوراً آپ ﷺ تشریف لے گئے، حضرت سعد بن عبادہ، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت رضی اللہ عنہم بھی ساتھ تھے۔ بچہ کو لوگ ہاتھ میں لے کر سامنے لائے وہ دم توڑ رہا تھا بے اختیار آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو تعجب ہوا کہ یارسول اللہ! یہ کیا، فرمایا: ''خدا انہی بندوں پر رحم کرتا ہے جو اوروں پر رحم کرتے ہیں۔'' ❹ غزوۂ اُحد کے بعد جب آپ مدینہ میں تشریف لائے تو گھر گھر شہیدوں کا ماتم برپا تھا۔ مستورات اپنے اپنے شہیدوں پر نوحہ کر رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر آپ ﷺ کا دل بھر آیا اور فرمایا: ''حمزہ (عم رسول اللہ ﷺ) کا کوئی نوحہ خواں نہیں۔'' ❺

ایک بار ایک صحابی رضی اللہ عنہ جاہلیت کا اپنا ایک قصہ بیان کر رہے تھے کہ میری ایک چھوٹی لڑکی تھی، عرب میں لڑکیوں کے مار ڈالنے کا کہیں کہیں دستور تھا، میں نے بھی اپنی لڑکی کو زندہ زمین میں گاڑ دیا، وہ ابا ابا کہہ کر پکار رہی تھی اور میں اس پر مٹی کے ڈھیلے ڈال رہا تھا۔ اس بے دردی کو سن کر آنحضرت ﷺ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس قصہ کو پھر دہراؤ۔'' ان صحابی رضی اللہ عنہ نے اس دردناک ماجرے کو دوبارہ بیان کیا، آپ بے اختیار روئے یہاں تک کہ روتے روتے محاسن مبارک تر ہو گئے۔ ❻

❶ صحيح بخاري، كتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ٦٠١٠۔ ❷ ابوداود كتاب الادب، باب من ليست له غيبة: ٤٨٨٥ شاید یہ دونوں واقعے ایک ہوں۔ ❸ بخاري، كتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ٦٠٠٨۔
❹ صحيح بخاري، كتاب المرضى، باب عيادة الصبيان: ٥٦٥٥۔ ❺ سیرۃ ج ١، ذکر احد بحوالہ مسند أحمد، ج ٢، ص: ٨٤۔ ❻ مسند دارمي، باب ماكان عليه الناس قبل مبعث النبي ﷺ: رقم الحديث: (٢)

حضرت عباس رضی اللہ عنہ بدر میں گرفتار ہو کر آئے تو لوگوں نے ان کے ہاتھ پاؤں بہت جکڑ کر باندھ دیے تھے اور وہ درد سے کراہتے تھے، ان کے کراہنے کی آواز گوش مبارک میں بار بار پہنچ رہی تھی لیکن اس خیال سے ان کے ہاتھ نہیں کھولتے تھے کہ لوگ کہیں گے کہ یہ اپنے عزیز کے ساتھ غیر مساویانہ رحمدلی ہے تاہم نیند نہیں آتی تھی، آپ بے چین ہو ہو کر کروٹیں بدل رہے تھے، لوگوں نے بے قراری کا سبب سمجھ کر گرہیں ڈھیلی کر دیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی کرب اور بے چینی رفع ہوئی تو آپ نے استراحت فرمایا۔ ❶

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے جو اسلام سے پہلے بہت ناز و نعمت میں پلے تھے، ان کے والدین بیش قیمت سے بیش قیمت لباس ان کو پہناتے تھے خدا نے ان کو اسلام کی توفیق عطا فرمائی اور وہ مسلمان ہو گئے، یہ دیکھ کر لڑکے نے اپنے آبائی مذہب کو ترک کر دیا، والدین کی محبت دفعۃً عداوت میں بدل گئی۔ ایک دفعہ وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت مبارک میں اس حال میں آئے کہ وہ جسم جو حریر و قاقم میں ملبوس رہتا تھا اس پر پیوند سے ایک کپڑا سالم نہ تھا۔ یہ پر اثر منظر دیکھ کر آپ آبدیدہ ہو گئے۔ ❷

عیادت و تعزیت و غم خواری

بیماروں کی عیادت میں دوست دشمن، مومن کافر کسی کی تخصیص نہ تھی۔ (سنن نسائی میں ہے کان النبی ﷺ احسن شیء عیادۃ للمریض۔ ❸ آنحضرت ﷺ بیمار کی عیادت کا بہت اچھی طرح خیال رکھا کرتے تھے۔ بخاری و ابوداؤد وغیرہ میں روایت ہے کہ ایک یہودی غلام مرض الموت میں بیمار ہوا تو آپ عیادت کو تشریف لے گئے۔ ❹

عبداللہ بن ثابت رضی اللہ عنہ جب بیمار ہوئے اور آپ عیادت کو گئے تو ان پر غشی طاری تھی، آواز دی وہ خبر نہ ہوئے۔ فرمایا: ''افسوس ابوالربیع! تم پر ہمارا زور اب نہیں چلتا۔'' یہ سن کر عورتیں بے اختیار چیخ اٹھیں اور رونے لگیں، لوگوں نے روکا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس وقت رونے دو، مرنے کے بعد البتہ رونا نہیں چاہیے۔'' عبداللہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی لڑکی نے کہا: مجھ کو ان کی شہادت کی امید تھی کیونکہ جہاد کے سب سامان تیار کر لیے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان کو نیت کا ثواب مل چکا۔'' ❺

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو اگرچہ ان کا گھر فاصلہ پر تھا، پیادہ پا ان کی عیادت کو جایا کرتے تھے۔ ❻ ایک دفعہ وہ بیمار ہوئے تو آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر پیدل ان کی عیادت کو گئے، ان پر غشی طاری تھی، پانی منگوا کر وضو کیا اور بچے ہوئے پانی کو ان کے منہ پر چھڑکا۔ جابر رضی اللہ عنہ ہوش میں آ گئے، اور عرض کی: یارسول اللہ!

❶ طبقات ابن سعد، جزء ٤، قسم اول، ص:٧۔ ❷ ترمذی، ابواب صفة القیامة، باب حدیث علی فی ذکر مصعب بن عمیر: ٢٤٧٦ ومسند ابویعلی: ١/ ٢٤١۔ ❸ سنن نسائی، کتاب الجنائز، باب عدد التکبیر علی الجنازة:١٩٨٣۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب عیادة المشرك:٥٦٥٧؛ ابو داود، کتاب الجنائز: ٣٠٩٥۔ ❺ ابوداود، کتاب الجنائز، باب فی فضل من مات فی الطاعون:٣١١١۔
❻ ایضا، باب المشی فی العیادة:٣٠٩٦۔

اپنا ترکہ کس کو دوں، اس پر یہ آیت اتری: ﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ﴾ ❶ (٤/ النسآء:١١)

ایک صاحب بیمار ہوئے آپ ﷺ چند دفعہ ان کی عیادت کو گئے جب انہوں نے انتقال کیا تو لوگوں نے اس خیال سے کہ اندھیری رات ہے آپ کو تکلیف ہوگی، خبر نہ کی اور دفن کر دیا، صبح کو معلوم ہوا تو آپ نے شکایت کی اور قبر پر جا کر نماز جنازہ پڑھی۔ ❷

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے غزوۂ اُحد میں شہادت پائی تھی اور کافروں نے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے تھے، ان کی لاش آنحضرت ﷺ کے سامنے لا کر رکھی گئی اور اس پر چادر ڈال دی گئی ان کے صاحبزادے (جابر) آئے اور جوش محبت میں چاہا کہ کپڑا اٹھا کر دیکھیں، حاضرین نے روکا انہوں نے دوبارہ ہاتھ بڑھایا، لوگوں نے پھر روک دیا، آنحضرت ﷺ نے درد پدری کے خیال سے حکم دیا کہ چادر اٹھا دی جائے، چادر کا اٹھانا تھا کہ عبداللہ کی بہن بے اختیار چلا اٹھیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''رونے کی بات نہیں فرشتے ان کو اپنے پروں کے سایہ میں لے گئے۔'' ❸

ایک دفعہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے آپ عیادت کو تشریف لے گئے، ان کو دیکھ کر آپ پر رقت طاری ہوئی اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے آپ کو روتا دیکھ کر سب رو پڑے۔ ❹

ایک حبشی مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا، مر گیا تو لوگوں نے آپ کو خبر نہ کی، ایک دن آپ نے اس کا حال دریافت فرمایا، لوگوں نے کہا: وہ انتقال کر گیا ارشاد ہوا: ''تم نے مجھ کو خبر نہ کی۔'' لوگوں نے اس کی تحقیر کی (یعنی وہ اس قابل نہ تھا کہ آپ ﷺ کو اس کے مرنے کی خبر کی جاتی) آپ ﷺ نے لوگوں سے اس کی قبر دریافت کی اور جا کر جنازہ کی نماز پڑھی۔ ❺

جنازہ جاتا تو آپ ﷺ کھڑے ہو جاتے۔ بخاری میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''جنازہ جاتا ہو تو اس کے ساتھ جاؤ ورنہ کم از کم کھڑے ہو جاؤ اور اس وقت تک کھڑے رہو کہ سامنے سے نکل جائے۔'' ❻

اگرچہ آپ ﷺ نہایت رقیق القلب اور متاثر الطبع تھے خصوصاً اعزہ کی وفات کا آپ ﷺ کو سخت صدمہ ہوتا تھا تاہم نوحہ اور ماتم کو نہایت ناپسند فرماتے تھے۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے) سے آپ کو نہایت محبت تھی، جب ان کی شہادت کی خبر آئی تو آپ مجلس ماتم میں بیٹھے۔ اسی حالت میں کسی نے

---

❶ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر آیت مذکور: ٤٥٧٧۔ ❷ بخاری، کتاب الجنائز، باب صفوف الصبیان مع الرجال فی الجنائز: ١٣٢١۔ ❸ بخاری، کتاب الجنائز، باب الدخول علی المیت بعد الموت إذا أدرج فی أکفانه: ١٢٤٤۔ ❹ بخاری، کتاب الجنائز، باب البکاء عند المریض: ١٣٠٤۔

❺ بخاری، کتاب الصلوٰة، باب الصلوة علی القبر: ١٣٣٧ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے راوی نے شک کیا ہے کہ یہ مرد تھا یا عورت لیکن دوسری روایتوں میں اس کا عورت ہونا بہ تحقیق ذکر ہے۔ (ام محجن اس کا نام تھا)۔

❻ بخاری، کتاب الجنائز، باب القیام للجنازة: ١٣٠٧، ١٣٠٨۔

آ کر کہا کہ جعفر کی عورتیں رو رہی ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: ”جا کر منع کر دو۔“ وہ گئے اور واپس آ کر کہا کہ میں نے منع کیا لیکن وہ باز نہیں آتیں، آپ ﷺ نے دوبارہ منع کرا بھیجا، پھر بھی وہ باز نہ آئیں، سہ بارہ منع کرنے پر بھی جب وہ باز نہ آئیں تو فرمایا: ”جا کر ان کے منہ میں خاک ڈال دو۔“ ❶

لطف طبع

کبھی کبھی ظرافت کی باتیں فرماتے۔ ایک دفعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو پکارا تو فرمایا: ”او دو کان والے۔“ ❷ اس میں یہ نکتہ بھی تھا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نہایت اطاعت شعار تھے اور ہر وقت آنحضرت ﷺ کے ارشاد پر کان لگائے رکھتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی کا نام ابوعمیر رضی اللہ عنہ تھا وہ کمسن تھے اور ایک ممولا پال رکھا تھا، اتفاق سے وہ مر گیا، ابوعمیر رضی اللہ عنہ کو بہت رنج ہوا آپ ﷺ نے ان کو غمزدہ دیکھا تو فرمایا: ((یا ابا عمیر ما فعل النغیر)) ❸ یعنی ”ابوعمیر! تمہارے مولے نے کیا کیا۔“

ایک شخص نے خدمت اقدس میں عرض کی کہ مجھ کو کوئی سواری عنایت ہو۔ ارشاد ہوا کہ ”میں تم کو اونٹنی کا بچہ دوں گا۔“ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”کوئی اونٹ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو اونٹنی کا بچہ نہ ہو؟“ ❹

ایک بڑھیا خدمت اقدس میں آئی کہ حضور ﷺ میرے لیے دعا فرمائیں کہ مجھ کو بہشت نصیب ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”بڑھیاں بہشت میں نہ جائیں گی۔“ اس کو بہت صدمہ ہوا اور روتی ہوئی واپس چلی، آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ”اسے کہہ دو کہ بڑھیاں جنت میں جائیں گی لیکن جوان ہو کر جائیں گی۔“ ❺

ایک بدوی صحابی تھے جن کا نام زاہر رضی اللہ عنہ تھا، وہ دیہات کی چیزیں آپ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا کرتے تھے، ایک دفعہ وہ شہر میں آئے، گاؤں سے جو چیزیں لائے تھے ان کو بازار میں فروخت کر رہے تھے، اتفاقاً آپ ادھر سے گزرے، زاہر رضی اللہ عنہ کے پیچھے جا کر ان کو گود میں دبا لیا، انہوں نے کہا: کون ہے چھوڑ دو، مڑ کر دیکھا تو سرور عالم ﷺ تھے، اپنی پیٹھ اور بھی آنحضرت ﷺ کے سینہ سے لپٹا دی، آپ ﷺ نے فرمایا: ”کوئی اس غلام کو خریدتا ہے۔“ وہ بولے کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھ جیسے غلام کو جو شخص خریدے گا نقصان اٹھائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: ”لیکن خدا کے نزدیک تمہارے دام زیادہ ہیں۔“ ❻

ایک شخص نے آ کر شکایت کی کہ میرے بھائی کے شکم میں گرانی ہے۔ فرمایا: ”شہد پلاؤ۔“ وہ دوبارہ آئے کہ شہد پلایا لیکن شکایت اب بھی باقی ہے، آپ ﷺ نے پھر شہد پلانے کی ہدایت کی، سہ بارہ آئے پھر وہی جواب ملا، چوتھی دفعہ آئے تو ارشاد فرمایا: ”خدا سچا ہے (قرآن مجید میں ہے کہ شہد میں شفا ہے) لیکن

❶ بخاری، کتاب الجنائز، باب من جلس عندالمصیبة یعرف فیه الحزن: ۱۲۹۹۔
❷ شمائل ترمذی: ۲۳۴۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الانبساط الی الناس: ۶۱۲۹۔
❹ شمائل ترمذی: ۲۳۷۔ ❺ شمائل ترمذی: ۲۳۹۔ ❻ شمائل ترمذی: ۲۳۸۔

تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے، جا کر شہد پلاؤ۔'' اب کی بار پلایا تو شفا ہوگئی۔ ❶ معدہ میں مادۂ فاسد کثرت سے موجود تھا جب پورا تنقیہ ہوگیا تو گرانی جاتی رہی۔

اولاد سے محبت

اولاد سے نہایت محبت تھی، معمول تھا جب کبھی سفر فرماتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس جاتے اور سفر سے واپس آتے تو جو شخص سب سے پہلے باریاب خدمت ہوتا وہ بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی ہوتیں۔ ایک دفعہ کسی غزوہ میں گئے اس اثنا میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے دونوں صاحبزادوں (حسنین رضی اللہ عنہما) کے لیے چاندی کے کنگن بنوائے اور دروازہ پر پردے لٹکائے، آنحضرت ﷺ واپس تشریف لائے تو خلاف معمول حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر نہیں گئے وہ سمجھ گئیں، فوراً پردوں کو چاک کر ڈالا اور صاحبزادوں کے ہاتھ سے کنگن اتار لیے، صاحبزادے روتے ہوئے خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے کنگن لے کر بازار میں بھیج دیے کہ ان کے بدلے ہاتھی دانت کے کنگن لادو۔ ❷ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جب آپ ﷺ کی خدمت میں تشریف لاتیں تو آپ کھڑے ہو جاتے، ان کی پیشانی چومتے اور اپنی نشست گاہ سے ہٹ کر اپنی جگہ بٹھاتے۔ ❸

ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم لوگ مسجد نبوی میں حاضر تھے کہ دفعتہ رسول اللہ ﷺ امامہ (آنحضرت ﷺ کی نواسی تھیں) کو کندھے پر چڑھائے ہوئے تشریف لائے اور اسی حالت میں نماز پڑھائی۔ جب رکوع میں جاتے تو ان کو اتار دیتے پھر کھڑے ہوتے تو چڑھا لیتے، اسی طرح پوری نماز ادا کی۔ ❹

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو اپنے خاندان سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جس قدر آپ ﷺ کرتے تھے۔ آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم عوالی میں پرورش پاتے تھے جو مدینہ سے تین چار میل ہے ان کے دیکھنے کیلئے مدینہ سے پیادہ پا جاتے، گھر میں دھواں ہوتا رہتا تھا، گھر میں جاتے بچہ کو انا کے ہاتھ سے لے لیتے اور منہ چومتے پھر مدینہ کو واپس آتے۔ ❺

ایک دفعہ اقرع بن حابس عرب کے ایک رئیس خدمت اقدس میں آئے، آپ ﷺ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا منہ چوم رہے تھے، عرض کی کہ میرے دس بچے ہیں میں نے کبھی کسی کو بوسہ نہیں دیا، ارشاد فرمایا کہ ''جو اوروں پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا۔'' ❻ (یعنی خدا اس پر رحم نہیں کرتا) حسنین رضی اللہ عنہما سے بے انتہا محبت تھی فرماتے تھے: ''یہ میرے گلدستے ہیں۔'' حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے جاتے تو فرماتے:

❶ بخاری، کتاب الطب، باب الدواء بالعسل:٥٦٨٤۔ ❷ ابوداود، کتاب الترجل، باب فی الانتفاع بالعاج:٤٢١٣۔ ❸ ابوداود، کتاب الادب، باب فی القیام:٥٢١٧۔ ❹ نسائی، کتاب المساجد، باب ادخال الصبیان فی المساجد:٧١٢ صحیح بخاری:٥١٦ میں بھی یہ حدیث مذکور ہے۔ ❺ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب رحمة الصبیان والعیال:٦٠٢٦۔ ❻ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب رحمة الصبیان:٦٠٢٨؛ ابوداود، کتاب الادب، باب رحمة الولد:٥٢١٨۔

"میرے بچوں کو لانا" وہ صاحبزادوں کو لاتیں، آپ ﷺ ان کو سونگھتے اور سینہ سے لپٹاتے۔ ❶

ایک دفعہ مسجد میں خطبہ فرما رہے تھے، اتفاق سے حسنین رضی اللہ عنہما سرخ کرتے پہنے ہوئے آئے، کمسنی کی وجہ سے ہر قدم پر لڑکھڑاتے جاتے تھے، آپ ﷺ ضبط نہ کر سکے منبر سے اتر کر گود میں اٹھالیا اور اپنے سامنے بٹھالیا، پھر فرمایا: "خدا نے سچ کہا ہے: ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾" فرمایا کرتے تھے: "حسین میرا ہے اور میں حسین کا ہوں خدا، اس سے محبت رکھے جو حسین سے محبت رکھتا ہے۔" ❷

ایک دفعہ امام حسن یا حسین رضی اللہ عنہما دوش مبارک پر سوار تھے۔ کسی نے کہا: کیا سواری ہاتھ آئی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: "اور سوار بھی کیسا ہے۔" ❸

ایک دفعہ امام حسن یا حسین رضی اللہ عنہما (راوی کو بہ تعین یاد نہیں رہا) آپ ﷺ کے قدم پر قدم رکھ کر کھڑے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: "اوپر چڑھ آؤ۔" انہوں نے آپ کے سینہ پر قدم رکھ دیے، آپ ﷺ نے منہ چوم کر فرمایا: "اے خدا! میں اس سے محبت رکھتا ہوں تو بھی رکھ۔" ❹

ایک دفعہ آپ ﷺ کہیں دعوت میں جا رہے تھے، امام حسین رضی اللہ عنہ راہ میں کھیل رہے تھے، آپ ﷺ نے آگے بڑھ کر ہاتھ پھیلا دیے، وہ ہنستے ہوئے پاس آ آ کر نکل جاتے تھے، بالآخر آپ نے ان کو پکڑ لیا، ایک ہاتھ ان کی ٹھوڑی پر اور ایک سر پر رکھ کر سینہ سے لپٹا لیا، پھر فرمایا: "حسین میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔" ❺

اکثر امام حسین رضی اللہ عنہ کو گود میں لیتے اور ان کے منہ میں منہ ڈالتے اور فرماتے: "خدایا! میں اس کو چاہتا ہوں اور اس کو بھی چاہتا ہوں جو اس کو چاہے۔" آپ ﷺ کے داماد (حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے شوہر) جب بدر سے قید ہو کر آئے تو فدیہ کی رقم ادا نہ کر سکے تو گھر کہلا بھیجا، حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے گلے کا ہار بھیج دیا، یہ وہ ہار تھا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے جہیز میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کو دیا تھا، آنحضرت ﷺ نے ہار دیکھا تو بے تاب ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے پھر صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: "اگر تمہاری مرضی ہو تو یہ ہار زینب رضی اللہ عنہا کو بھیج دو۔" سب نے بسر و چشم منظور کیا۔ ❻

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی کمسن صاحبزادی کا نام امامہ تھا، ان سے آپ ﷺ کو بہت محبت تھی، آپ نماز پڑھتے ہوئے بھی ان کو ساتھ رکھتے، جب آپ نماز پڑھتے تو وہ دوش مبارک پر سوار ہو جاتیں، رکوع کے وقت

---

❶ ترمذی، ابواب المناقب: ۳۷۷۲۔ ❷ ابوداود، کتاب الصلوۃ، باب الإمام یقطع الخطبة للأمر یحدث: ۱۱۰۹؛ ترمذی: ۳۷۷٤۔ ❸ یہ تمام روایتیں ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب الحسنین: ۳۷۸٤ میں مذکور ہیں، اخیر حدیث کے ایک راوی کی نسبت ترمذی نے لکھا ہے کہ بعض اہل علم نے اس کو ضعیف الحافظہ کہا ہے۔

❹ الادب المفرد، باب الانبساط الی الناس: ۲٤۹۔

❺ الادب المفرد، باب معانقة الصبی: ۳٦٤۔

❻ ابوداود، کتاب الجهاد، باب فداء الاسیر بالمال: ۲٦۹۲۔

آپ ان کو کاندھے سے اتار دیتے، پھر کھڑے ہوتے تو وہ پھر سوار ہو جاتیں۔ ❶ روایتوں کے الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ خود ان کو کاندھوں پر بٹھا لیتے اور اتار دیتے تھے لیکن ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ عمل کثیر ہے، وہ خود سوار ہو جاتی ہوں گی اور منع نہ فرماتے ہوں گے۔

آپ ﷺ کی ایک نواسی حالت نزع میں تھیں، صاحبزادی نے بلا بھیجا، آپ تشریف لے گئے تو لڑکی اسی حالت میں آغوش مبارک میں رکھ دی گئی، آپ نے اس کی حالت دیکھی تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ رحم ہے جس کو خدا نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔'' ❷

حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات میں بھی آپ ﷺ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا تھا: ''آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں دل غمزدہ ہو رہا ہے لیکن منہ سے ہم وہی باتیں کہیں گے جس کو خدا پسند کرتا ہے۔'' ❸ لیکن یہ محبت صرف اپنے ہی آل و اولاد تک کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ عموماً بچوں سے آپ ﷺ کو انس تھا۔

---

❶ بخاری، کتاب الصلوۃ، باب اذا حمل جاریۃ صغیرۃ علی عنقه: ٥١٦۔

❷ بخاری، کتاب المرضی، باب عیادۃ الصبیان: ٥٦٥٥۔

❸ بخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبی ﷺ انابك لمحزونون: ١٣٠٣۔

ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا

سلسلۂ نسب یہ ہے، خدیجہ بنت خویلد بن اسعد بن عبدالعزیٰ بن قصی، قصی پر پہنچ کر ان کا خاندان رسول اللہ ﷺ کے خاندان سے مل جاتا ہے، آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے وہ طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں۔ ان کی والدہ فاطمہ بنت زائدہ تھیں، ان کے والد اپنے قبیلہ میں ممتاز تھے، مکہ میں آ کر سکونت اختیار کی اور بنو عبدالدار کے حلیف بنے، ❶ عامر بن لوی کے خاندان میں فاطمہ بنت زائدہ سے نکاح کیا، ان کے بطن سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں، ان کی پہلی شادی ابو ہالہ بن زرارہ تمیمی سے ہوئی، ان سے دو لڑکے پیدا ہوئے ایک کا نام ہند تھا ❷ اور دوسرے کا حارث۔ ابو ہالہ کے انتقال کے بعد عتیق بن عایذ مخزومی کے عقد نکاح میں آئیں، ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، اس کا نام بھی ہند تھا، اسی بنا پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ام ہند کے نام سے پکاری جاتی تھیں، ہند نے اوّل اسلام قبول کیا۔ آنحضرت ﷺ کا مفصل حلیہ انہی کی روایت سے منقول ہے۔ نہایت فصیح و بلیغ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ جمل میں شریک تھے اور شہید ہوئے۔ ❸

عتیق کے انتقال کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کے عقد نکاح میں آئیں، جس کے مفصل حالات گزر چکے۔ آنحضرت ﷺ سے چھ اولادیں ہوئیں اور دو صاحبزادے کہ دونوں بچپن میں انتقال کر گئے اور چار صاحبزادیاں حضرت فاطمہ زہرا، حضرت زینب، حضرت رقیہ، حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہن۔ ان سب کے حالات آگے آئیں گے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ایک بہن ہالہ تھیں، وہ اسلام لائیں اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد تک زندہ رہیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت ﷺ کو بے انتہا محبت تھی، وہ جب عقد نکاح میں آئیں تو ان کی عمر چالیس سال کی تھی اور آنحضرت ﷺ پچیس سال کے تھے، نکاح کے بعد وہ پچیس برس تک زندہ رہیں ان کی زندگی تک آنحضرت ﷺ نے دوسری شادی نہیں کی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد آپ کا معمول تھا کہ جب کبھی گھر میں کوئی جانور ذبح ہوتا، تو آپ ڈھونڈ ڈھونڈ کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ہم نشین عورتوں کے پاس گوشت بھجواتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: کہ گو میں نے خدیجہ رضی اللہ عنہا کو نہیں دیکھا لیکن مجھ کو جس قدر ان پر رشک آتا تھا کسی اور پر نہیں آتا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ ہمیشہ ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے اس پر آپ ﷺ کو رنجیدہ کیا لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''خدا نے مجھ کو ان کی محبت دی ہے۔'' ❹

❶ طبقات ابن سعد، ذكر خديجة، كتاب النساء، ج٨، ص:٨۔ ❷ ايضًا۔ ❸ اصابه ذكر هند، ج٣، ص:٦١١۔ ❹ صحيح بخاري، كتاب مناقب الانصار، باب تزويج النبي ﷺ خديجة وفضلها:٣٨١٨؛ صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب فضائل خديجة: ٦٢٧٧، ٦٢٨١۔

ایک دفعہ ان کے انتقال کے بعد ان کی بہن ہالہ آنحضرت ﷺ سے ملنے آئیں اور استیذ ان کے قاعدہ سے اندر آنے کی اجازت مانگی، ان کی آواز حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ملتی تھی، آپ کے کانوں میں آواز پڑی تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا یاد آ گئیں اور آپ ﷺ بے جھجک اٹھے اور فرمایا کہ ''ہالہ ہوں گی۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی موجود تھیں، ان کو نہایت رشک ہوا بولیں کہ آپ کیا ایک بڑھیا کو یاد کرتے ہیں جو مر چکیں اور خدا نے ان سے اچھی بیویاں دیں۔ [1] صحیح بخاری میں یہ روایت یہیں تک ہے لیکن استیعاب میں ہے کہ جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''ہرگز نہیں جب لوگوں نے میری تکذیب کی تو انہوں نے تصدیق کی، جب لوگ کافر تھے، تو وہ اسلام لائیں، جب میرا کوئی معین نہ تھا تو انہوں نے میری مدد کی۔'' [2]

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا بنت زمعہ

ازواج مطہرات میں یہ فضیلت صرف حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد سب سے پہلے وہی آنحضرت ﷺ کے عقد نکاح میں آئیں۔ وہ ابتدائے نبوت میں مشرف باسلام ہو چکی تھیں، اس بنا پر ان کو قدیم الاسلام ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی شادی پہلے سکران بن عمرو رضی اللہ عنہ سے ہوئی تھی، حضرت سودہ رضی اللہ عنہا انہیں کے ساتھ اسلام لائیں اور انہی کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت (ہجرت ثانیہ) کی، حبشہ سے مکہ کو واپس آئیں، سکران نے کچھ دن کے بعد وفات پائی اور ایک لڑکا یادگار چھوڑا، جس کا نام عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ تھا، انہوں نے جنگ جلولاء میں شہادت حاصل کی۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال سے آنحضرت ﷺ نہایت پریشان و غمگین تھے یہ حالت دیکھ کر خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا نے عرض کی کہ آپ کو ایک مونس و رفیق کی ضرورت ہے آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں۔'' گھربار بال بچوں کا انتظام سب خدیجہ رضی اللہ عنہا کے متعلق تھا آپ کے ایما سے وہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے والد کے پاس گئیں اور جاہلیت کے طریقہ پر سلام کیا: انعم صباحا پھر نکاح کا پیغام سنایا انہوں نے کہا ہاں محمد ﷺ شریف کفو ہیں لیکن سودہ رضی اللہ عنہا سے بھی تو دریافت کرو۔ غرض سب مراتب طے ہو گئے تو آنحضرت ﷺ خود تشریف لے گئے اور سودہ رضی اللہ عنہا کے والد نے نکاح پڑھایا۔ [3] چار سو درہم مہر قرار پایا، نکاح کے بعد عبداللہ بن زمعہ (رضی اللہ عنہ) (حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے بھائی) جو اس وقت کافر تھے، آئے اور ان کو یہ حال معلوم ہوا تو سر پر خاک ڈال لی کہ کیا غضب ہو گیا، چنانچہ اسلام لانے کے بعد اپنی اس حماقت شعاری پر ہمیشہ افسوس آتا تھا۔

حضرت عائشہ اور سودہ رضی اللہ عنہا کا خطبہ اور نکاح چونکہ قریب قریب ایک ہی زمانہ میں ہوا اس لیے مؤرخین میں

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب تزویج النبی ﷺ خدیجة وفضلها: ۳۸۲۱؛ مسلم: ۶۲۸۲۔

[2] مسند احمد، ۶/ ۱۱۸؛ اسد الغابة، ج۷، ص: ۸۶۔ [3] طبقات ابن سعد، ج۸، ص: ۳۶ میں ہے کہ رمضان ۱۰ھ میں ان کا نکاح ہوا، زرقانی نے ۸ھ بھی لکھا ہے، یہ اختلاف اس بنا پر ہے کہ خود حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے وفات کے سنہ میں اختلاف ہے۔

اختلاف ہے کہ کس کو تقدم حاصل ہے۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ سودہ رضی اللہ عنہا کو تقدم ہے، عبداللہ بن محمد بن عقیل کا قول ہے کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بعد نکاح میں آئیں۔

شکل وشباہت

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا بلند بالا اور فربہ اندام تھیں اور اس وجہ سے تیزی کے ساتھ چل پھر نہیں سکتی تھیں، حجۃ الوداع میں جب مزدلفہ سے روانہ ہونے کا وقت آیا تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اسی بنا پر سب سے پہلے چلنے کی اجازت مانگی کہ ان کو بھیڑ بھاڑ میں چلنے سے تکلیف ہوگی۔ [1] آیتِ حجاب سے پہلے عرب کے قدیم طرز پر ازواج مطہرات قضائے حاجت کے لیے صحرا کو جایا کرتی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ ناگوار ہوتا تھا، اس بنا پر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پردہ کی تحریک کرتے رہتے تھے، لیکن ابھی ان کی استدعا قبول نہیں ہوئی تھی کہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا رات کے وقت قضائے حاجت کے لیے نکلیں چونکہ ان کا قد نمایاں تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا سودہ! تم کو ہم نے پہچان لیا۔ اسی واقعہ کے بعد آیت حجاب نازل ہوئی۔ [2]

اخلاق وعادات

آنحضرت ﷺ کے اخلاق وعادات میں سخاوت وفیاضی ایک نمایاں وصف تھا اس بنا پر صحابہ رضی اللہ عنہم میں جس کو آپ سے جس قدر تقرب حاصل تھا اسی قدر اس پر اس وصفِ خاص کا زیادہ اثر پڑتا تھا۔ ازواج مطہرات کو آپ کے اخلاق وعادات وفیضِ صحبت سے متمتع ہونے کا سب سے زیادہ موقع حاصل تھا اس لیے یہ وصف ان میں عموماً نظر آتا ہے۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا اس وصف میں بہ استثنائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سب سے ممتاز تھیں، ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی خدمت میں ایک تھیلی بھیجی، لانے والے سے پوچھا اس میں کیا ہے؟ بولا: درہم، بولیں: کھجور کی طرح تھیلی میں درہم بھیجے جاتے ہیں، یہ کہہ کر اسی وقت سب کو تقسیم کر دیا۔ [3]

اطاعت اور فرماں برداری بھی ان کا خاص وصف ہے اور اس وصف میں وہ تمام ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے

---

[1] الاصابة، ج ٤، ص: ٤٣٨۔ [2] بخاری، کتاب الوضوء، باب خروج النسآء الی البراز: ١٤٦ آیت حجاب کے شان نزول میں سخت اختلاف ہے، ایک روایت تو یہی ہے، دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ آپ کے یہاں نیک وبد ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، کاش! آپ ان کو پردے کا حکم دیتے۔ (بخاری، کتاب التفسیر: ٤٧٩٠) ابن جریر نے اپنی تفسیر میں مجاہد سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی شریک طعام تھیں، ایک آدمی کا ہاتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ سے چھو گیا، رسول اللہ ﷺ کو ناگوار گزرا، اس پر آیت حجاب اتری، عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے دعوت ولیمہ میں آیت حجاب نازل ہوئی۔ (بخاری، کتاب التفسیر: ٤٧٩٣) چنانچہ صحاح میں یہ واقعہ بہ تفصیل موجود ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان روایتوں میں یہ تطبیق دی ہے کہ آیت حجاب کے نزول کے متعدد اسباب تھے جن میں آخری سبب حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا واقعہ تھا اور وہی آیت کا شان نزول ہے کیونکہ خود آیت میں واقعہ کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں (فتح الباری، ج ١، ص: ٢١٩) [3] الاصابة، ج ٤، ص: ٣٣٩۔

ممتاز تھیں۔

روایت حدیث

ان کے ذریعہ سے صرف پانچ (۵) حدیثیں مروی ہیں جن میں سے بخاری میں صرف ایک ہے صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن اسعد بن زرارہ نے ان سے روایت کی ہے۔

وفات

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے سنہ وفات میں اختلاف ہے۔ واقدی کے نزدیک انہوں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت ۵۴ھ میں وفات پائی، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ان کا سال وفات ۵۵ھ قرار دیتے ہیں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ میں بہ سند صحیح روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں انتقال کیا۔ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ کبیر میں اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری زمانہ میں وفات کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ۲۳ھ میں وفات پائی ہے اس لیے ان کا زمانۂ خلافت ۲۲ھ ہوگا، خمیس میں ہے کہ یہی روایت سب سے زیادہ صحیح ہے۔ [1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا [2]

عائشہ رضی اللہ عنہا نام تھا اگرچہ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تاہم اپنے بھانجے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے تعلق سے ام عبداللہ کنیت کرتی تھیں۔ ماں کا نام زینب اور ام رومان کنیت تھی۔ بعثت کے چار برس بعد پیدا ہوئیں۔ ۱۰ نبوی میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ نکاح ہوا، اس وقت شش سالہ تھیں آنحضرت ﷺ سے پہلے جبیر بن مطعم کے صاحبزادے سے منسوب تھیں، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد خولہ بنت حکیم نے آنحضرت ﷺ سے نکاح کی تحریک کی، آپ ﷺ نے رضامندی ظاہر کی، خولہ نے ام رومان سے کہا، انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مذکور کیا، بولے کہ جبیر بن مطعم سے وعدہ کر چکا ہوں اور میں نے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی لیکن مطعم نے خود اس بنا پر انکار کر دیا کہ اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کے گھر میں آ گئیں تو گھر میں اسلام کا قدم آ جائے گا، بہر حال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خولہ کے ذریعہ سے آنحضرت ﷺ سے عقد کر دیا، [3] چار سو درہم مہر قرار پایا [4] لیکن مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ازواج مطہرات کا مہر پانچ سو درہم ہوتا تھا۔ [5]

---

[1] زرقانی، ج۳، ص: ۲۶۲ میں بہ تفصیل مذکور ہے، طبقات ابن سعد، ج۸، ص: ۳۷ میں صرف پہلی روایت نقل کی ہے۔
[2] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حالات اور خصوصاً انکے علمی کمالات کے لئے الگ مستقل تصنیف درکار ہے، یہاں صرف ضروری سوانح زندگی لکھ دیئے گئے ہیں۔ [3] صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب تزویج الصغار: ۵۰۸۱؛ مسند امام احمد، ص: ۲۵۔ [4] طبقات ابن سعد، ج۸، ص: ۴۲۔
[5] صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الصداق: ۳۴۸۹۔

نکاح کے بعد مکہ میں آنحضرت ﷺ کا قیام ۳ سال تک رہا۔ ۱۳ نبوی میں آپ ﷺ نے ہجرت کی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ساتھ تھے، اہل و عیال کو مکہ چھوڑ آئے تھے، جب مدینہ میں اطمینان ہوا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن اریقط رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ ام رومان، اسماء اور عائشہ رضی اللہ عنہن کو لے آئیں، آنحضرت ﷺ نے بھی زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور ابورافع رضی اللہ عنہ کو حضرت فاطمہ، ام کلثوم اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہن وغیرہ کے لانے کے لیے روانہ فرمایا۔ مدینہ آ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سخت بخار میں مبتلا ہوئیں، اشتداد مرض سے سر کے بال تک جھڑ گئے، ❶ صحت ہوئی تو ام رومان کو رسم عروسی ادا کرنے کا خیال آیا، اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۹ سال کی تھی، سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھول رہی تھیں کہ ام رومان نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو آواز دی، ان کو اس واقعہ کی خبر تک نہ تھی، ماں کے پاس آئیں، انہوں نے منہ دھویا، بال درست کیے، گھر میں لے گئیں، انصار کی عورتیں انتظار میں تھیں، یہ گھر میں داخل ہوئیں تو سب نے مبارک باد دی۔ چاشت کے وقت آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور رسم عروسی ادا ہوئی۔ ❷ شوال میں نکاح ہوا تھا اور شوال ہی میں یہ رسم بھی ادا کی گئی۔ زمانہ قدیم میں اس مہینہ میں طاعون آیا تھا اس بنا پر اہل عرب اس مہینہ کو اس تقریب کے لئے مکروہ خیال کرتے تھے۔ اس خیال کے مٹانے کے لیے غالباً یہ مہینہ انتخاب کیا گیا تھا۔ ❸

وفات

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ ۹ برس تک زندگی بسر کی۔ نو سال کی عمر میں وہ آپ کے پاس آئیں اور جب آنحضرت ﷺ نے انتقال فرمایا تو ان کی عمر ۱۸ برس کی تھی۔ ❹ آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا قریباً ۴۸ سال تک زندہ رہیں، ۵۷ھ میں وفات پائی اس وقت ان کی عمر ۶۶ سال کی تھی۔ وصیت کے مطابق جنت البقیع میں رات کے وقت دفن ہوئیں۔ قاسم بن محمد، عبداللہ بن عبدالرحمن، عبداللہ بن ابی عتیق، عروہ بن زبیر اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم نے قبر میں اتارا۔ اس وقت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مروان بن حکم کی طرف سے مدینہ کے حاکم تھے، اس لیے انہوں نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ❺

آنحضرت ﷺ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بہت محبت تھی، اس محبت سے آپ نے مرض الموت میں تمام ازواج مطہرات سے اجازت لی اور اپنی زندگی کے آخری دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں بسر کیے، اس محبت کا اظہار جن طریقوں سے ہوتا تھا ان کے متعلق احادیث و سیر میں نہایت کثرت سے واقعات

---

❶ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب تزویج النبی ﷺ عائشۃ: ۳۸۹٤۔

❷ صحیح بخاری، باب تزویج النبی ﷺ عائشۃ وقدومها المدینة وبنائه بها: ۳۸۹٤؛ مسلم: ۳٤۷۹۔

❸ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب التزویج فی شوال: ۳٤۸۳۔

❹ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب التزویج الأب البکر الصغیرۃ: ۳٤۸۰ تا ۳٤۸۲۔

❺ طبقات ابن سعد، ج۸، ص: ۵۵۔

درج ہیں۔

علمی زندگی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی علمی زندگی بھی نمایاں حیثیت رکھتی ہے، حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں فتویٰ دیتی تھیں۔ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم پر انہوں نے دقیق اعتراضات کیے ہیں جن کو علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ میں جمع کر دیا ہے، [1] ان سے ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں جن میں ۱۷۴ حدیثوں پر شیخین نے اتفاق کیا ہے۔ بخاری نے منفرداً ان سے ۵۴ حدیثیں روایت کی ہیں۔ ۶۸ حدیثوں میں امام مسلم منفرد ہیں۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ احکام شرعیہ میں سے ایک چوتھائی ان سے منقول ہے۔ ترمذی میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے جب کوئی مشکل سوال پیش آ جاتا تھا تو اس کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی حل کرتی تھیں، [2] ان کے شاگردوں کا بیان ہے کہ ہم نے ان سے زیادہ خوش تقریر نہیں دیکھا، تفسیر، حدیث، اسرارِ شریعت، خطابت اور ادب وانساب میں ان کو کمال تھا۔ شعرا کے بڑے بڑے قصیدے ان کو زبانی یاد تھے۔ حاکم نے مستدرک (ج ۴، ذکر عائشہ رضی اللہ عنہا) میں اور ابن سعد نے طبقات (ج ۸ ذکر عائشہ رضی اللہ عنہا) میں یہ تفصیل ان واقعات کو لکھا ہے اور مسند ابن حنبل وغیرہ میں بھی جستہ جستہ ان کے فضل وکمال کے دلائل وشواہد ملتے ہیں۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں، ماں کا نام زینب بنت مظعون تھا۔ بعثت سے پانچ برس پہلے عین اس سال جب قریش خانہ کعبہ کو تعمیر کر رہے تھے پیدا ہوئیں، ان کی شادی خنیس بن حذافہ رضی اللہ عنہ سے ہوئی اور انہی کے ساتھ مدینہ کو ہجرت کی، خنیس رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر میں زخم کھائے اور واپس آ کر انہی زخموں کی وجہ سے شہادت پائی۔ [3] خنیس رضی اللہ عنہ نے اپنی یادگار میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، [4] حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے بیوہ ہو جانے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کے نکاح کی فکر ہوئی، سوئے اتفاق سے اسی زمانہ میں حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو چکا تھا اس بنا پر سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے نکاح کی خواہش حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کی۔ انہوں نے کہا کہ اس معاملہ میں غور کروں گا، حضرت

---

[1] یہ رسالہ بھی سیرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اخیر میں منسلک ہے۔ [2] جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب من فضل عائشة: ۳۸۸۳۔ [3] زرقانی، ج ۲، ص: ۲۷۰ عام طور پر یہی مشہور ہے لیکن اصابہ میں ہے کہ غزوۂ احد میں شہید ہوئے، (ج ۱، ص: ۴۵۶) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رقیہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ان کے نکاح کی خواہش کی تھی اور یہ مسلم ہے کہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا انتقال غزوۂ بدر کے بعد ہوا اور اسی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شریک غزوہ بدر نہ ہو سکے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خنیس رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر کے بعد وفات پائی، دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مغموم بیٹھے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ادھر سے گزرے اور پوچھا حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کرتے ہو؟ اس کی عدت گزر گئی، اگر خنیس رضی اللہ عنہ نے احد میں شہادت پائی ہوتی تو ان کی عدت کا زمانہ ۴ھ ہوتا حالانکہ نکاح ۳ھ میں ہوا فتح الباری، ج ۹، ص: ۱۵۲۔ [4] طبری، ج ۴، ص: ۱۷۷۱۔

عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا، انہوں نے خاموشی اختیار کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کی بے التفاتی سے رنج ہوا، اس کے بعد خود جناب رسالت پناہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کی خواہش کی، نکاح ہوگیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملے اور کہا کہ جب تم نے مجھ سے حفصہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کی درخواست کی اور میں خاموش رہا تو تم کو ناگوار گزرا لیکن میں نے اسی بنا پر کچھ جواب نہیں دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کا ذکر کیا تھا اور میں آپ کا راز فاش کرنا نہیں چاہتا تھا، اگر رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح نہ کرلیا ہوتا تو میں اس کے لئے آمادہ تھا۔ 1 حضرت حفصہ آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں اس لیے مزاج میں ذرا تیزی تھی۔ صحیح بخاری میں واقعہ ایلاء کے متعلق خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ''ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کو کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے، میں ایک دن کسی معاملہ میں غور کر رہا تھا، اتفاق سے میری بی بی نے مجھ کو مشورہ دیا، میں نے کہا: تم کو ان معاملات میں کیا دخل ہے، بولیں کہ تم میری بات پسند نہیں کرتے حالانکہ تمہاری بیٹی رسول اللہ ﷺ کو برابر کا جواب دیتی ہے، میں اٹھا اور حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا میں نے کہا: بیٹی! تم رسول اللہ ﷺ کو جواب دیتی ہو یہاں تک کہ آپ دن بھر رنجیدہ رہتے ہیں، بولیں: ہاں ہم ایسا کرتے ہیں، میں نے کہا: خبردار میں تمہیں عذاب الٰہی سے ڈراتا ہوں، تم اس کے گھمنڈ میں نہ آجانا جس کے حسن نے رسول اللہ ﷺ کو فریفتہ کرلیا ہے۔'' 2 (یعنی عائشہ رضی اللہ عنہا) ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا رو رہی تھیں، آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور رونے کی وجہ پوچھی، انہوں نے کہا: مجھ کو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ تم یہودی کی بیٹی ہو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نبی کی بیٹی ہو، تمہارا چچا پیغمبر ہے اور پیغمبر کے نکاح میں ہو۔ حفصہ تم پر کس بات میں فخر کرسکتی ہے؟'' 3

ایک بار حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے نزدیک تم سے زیادہ معزز ہیں، ہم آپ کی بیوی بھی ہیں اور چچازاد بہن بھی۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو ناگوار گزرا، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس کی شکایت کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ تم مجھ سے زیادہ کیونکر معزز ہوسکتی ہو، میرے شوہر محمد ﷺ میرے باپ ہارون علیہ السلام اور میرے چچا موسیٰ علیہ السلام ہیں۔'' 4

حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی بیٹی تھیں جو تقرب نبوی میں دوش بدوش تھے، اس بنا پر حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما دیگر ازواج کے مقابلہ میں باہم ایک تھیں لیکن کبھی کبھی خود بھی باہم رشک و رقابت کا اظہار ہوجایا کرتا تھا، ایک مرتبہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا

---

1 بخاري، كتاب النكاح، باب عرض الانسان ابنته: ٥١٢٢۔

2 صحيح بخاري، كتاب التفسير سورة التحريم: ٤٩١٣۔

3 ترمذي، ابواب المناقب، باب فضل ازواج النبي ﷺ: ٣٨٩٤۔ 4 ايضا: ٣٨٩٢۔

دونوں آنحضرت ﷺ کے ساتھ سفر میں تھیں۔ رسول اللہ ﷺ راتوں کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اونٹ پر چلتے تھے اور ان سے باتیں کرتے تھے ایک دن حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ آج رات کو تم میرے اونٹ پر اور میں تمہارے اونٹ پر سوار ہوں، تاکہ مختلف مناظر دیکھنے میں آئیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راضی ہو گئیں، آنحضرت ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اونٹ کے پاس آئے جس پر حفصہ رضی اللہ عنہا سوار تھیں جب منزل پر پہنچے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو نہیں پایا تو اپنے پاؤں کو اذخر (ایک گھاس ہے جس میں سانپ بچھو رہتے ہیں) کے درمیان لٹکا کر کہنے لگیں: خداوندا! کسی بچھو یا سانپ کو متعین کر جو مجھے ڈس جائے۔ [1]

وفات

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے ۴۵ھ میں، جو امیر معاویہ کی خلافت کا زمانہ تھا، وفات پائی۔ وفات سے پیشتر اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن عمر سے اس وصیت کی تجدید کی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو کی تھی۔ کچھ جائداد بھی وقف کی اور کچھ مال صدقہ میں دیا مروان بن حکم نے جو اس وقت مدینہ کا گورنر تھا نماز جنازہ پڑھائی اور بنی حزم کے گھر سے مغیرہ بن شعبہ کے گھر تک جنازہ کو کاندھا دیا، یہاں سے قبر تک حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جنازہ کو لے گئے، ان کے بھائی عبداللہ، عاصم، سالم، عبداللہ، حمزہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے لڑکوں نے قبر میں اتارا۔ [2]

حضرت زینب اُمّ المساکین رضی اللہ عنہا

زینب نام تھا، چونکہ فقرا و مساکین کو نہایت فیاضی کے ساتھ کھانا کھلاتی تھیں، اس لیے اُمّ المساکین کی کنیت کے ساتھ مشہور ہو گئیں۔ آنحضرت ﷺ سے پہلے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے جنگ احد ۳ھ میں شہادت پائی اور آنحضرت ﷺ نے اسی سال ان سے نکاح کر لیا، نکاح کے بعد آنحضرت ﷺ کے پاس صرف دو تین مہینے رہنے پائی تھیں کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد صرف یہی ایک بی بی تھیں جنہوں نے وفات پائی۔ آنحضرت ﷺ نے

---

[1] بخاری، کتاب النکاح، باب القرعة بین النسآء: ۵۲۱۱؛ مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فی فضائل عائشة: ۶۲۹۸۔ اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیے کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں اس قسم کی روایتیں صرف حفصہ و عائشہ رضی اللہ عنہما کے متعلق مذکور ہیں اس لئے اس کے اسباب کی تلاش کرنی چاہیے۔ حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ منافقین کو جو عداوت تھی وہ قابل لحاظ ہے۔

[2] حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے بھی سنہ وفات میں اختلاف ہے، ایک روایت ہے کہ انہوں نے جمادی الاول ۴۱ھ میں وفات پائی، اس وقت ان کا سنہ ۵۹ سال کا تھا لیکن اگر سنہ وفات ۴۵ قرار دیا جائے تو ان کی عمر ۶۳ سال کی ہوگی، ایک روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ۲۷ھ میں انتقال کیا، یہ روایت اس بنا پر پیدا کی گئی کہ وہب نے ابن مالک سے روایت کی کہ جس سال افریقہ فتح ہوا حفصہ رضی اللہ عنہا نے اسی سال وفات پائی اور افریقہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ۲۷ھ میں فتح ہوا، لیکن یہ سخت غلطی ہے، افریقہ دو مرتبہ فتح ہوا ہے، اس دوسری فتح کا فخر معاویہ بن خدیج رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے اور یہ فتح ۵۰ھ میں ہوئی، وہب بن مالک نے حفصہ رضی اللہ عنہا کا سال وفات اسی فتح کے سنہ کو قرار دیا ہے۔

خود نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۳۰ سال کی تھی۔

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا

ہند نام، اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کنیت تھی، باپ کا نام سہیل اور ماں کا عاتکہ تھا، پہلے عبداللہ بن الاسد کے نکاح میں آئیں، جو زیادہ تر ابوسلمہ کے نام سے مشہور ہیں اور جو ان کے چچا زاد اور رسول اللہ ﷺ کے رضاعی بھائی تھے، اپنے شوہر ہی کے ساتھ اسلام لائیں اور ان کے ساتھ سب سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی، چنانچہ سلمہ ان کے بیٹے حبشہ ہی میں پیدا ہوئے، حبشہ سے مکہ میں آئیں اور یہاں سے مدینہ کو ہجرت کی، ہجرت میں ان کو یہ فضیلت حاصل ہوئی کہ اہل سیر کے نزدیک وہ پہلی عورت ہیں جو ہجرت کر کے مدینہ میں آئیں۔ ان کے پہلے شوہر ابوسلمہ رضی اللہ عنہ بڑے شہسوار تھے، مشہور غزوات بدر و اُحد میں شریک ہوئے، غزوۂ احد میں چند زخم کھائے جن کے صدمہ سے جانبر نہ ہو سکے اور جمادی الثانی ۴ھ میں وفات پائی، ان کے جنازہ کی نماز نہایت اہتمام سے پڑھی گئی، آنحضرت ﷺ نے ۹ تکبیریں کہیں، لوگوں نے نماز کے بعد پوچھا: یارسول اللہ! آپ کو سہو تو نہیں ہوا، فرمایا: ''یہ ہزار تکبیر تک مستحق تھے۔'' ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت ام سلمہ رضی اللہ عنہا حاملہ تھیں، وضع حمل کے بعد جب عدت گزر گئی تو آنحضرت ﷺ نے ان سے نکاح کرنا چاہا تو انہوں نے چند عذر پیش کیے:

① میں سخت غیور عورت ہوں۔ ② صاحب عیال ہوں۔ ③ میرا سن زیادہ ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ان سب زحمتوں کو گوارا کیا۔

وفات

اہل سیر متفق اللفظ ہیں کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں سب کے بعد حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے وفات پائی، لیکن ان کے سنہ وفات میں نہایت اختلاف ہے۔ واقدی نے ۵۹ھ بتایا ہے، ابراہیم حربی کے نزدیک ۶۲ھ ہے اور تقریب میں اسی کو صحیح کہا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے کہ ۵۸ھ میں وفات پائی، بعض روایتوں میں ہے کہ ۶۱ھ میں جب امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر آئی اس وقت ان کا انتقال ہوا ہے، ابن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس روایت کی تصحیح کی ہے۔ [1]

اس اختلاف روایت کی حالت میں سنہ وفات کی تعیین مشکل ہے تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ واقعہ حرہ تک زندہ تھیں، مسلم میں ہے کہ حارث بن عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عبداللہ بن صفوان رضی اللہ عنہما ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس لشکر کا حال پوچھا جو زمین میں دھنس جائے گا، یہ سوال اس وقت کیا گیا تھا جب یزید نے مسلم بن عقبہ کو لشکر شام کے ساتھ مدینہ کی طرف بھیجا تھا اور واقعہ حرہ پیش آیا تھا، [2] واقعہ حرہ ۶۳ھ میں پیش آیا ہے

[1] زرقانی، ج۳، ص:۲۷۶۔ [2] مسلم، کتاب الفتن، باب الخسف بالجیش الذی یؤم البیت: ۷۲۴۰۔

اس لئے اس سے پہلے ان کی وفات کی تمام روایتیں صحیح نہیں۔ ابن عبد البر نے لکھا ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی وصیت کی بنا پر سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی لیکن اس روایت کی صحت میں کلام ہے، سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے باختلاف روایت ۵۱ھ ۵۲ھ یا ۵۵ھ میں انتقال کیا ہے اور یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ اس وقت ام سلمہ رضی اللہ عنہا زندہ تھیں، واقدی نے لکھا ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ان کا جنازہ پڑھایا اگر ان کی وفات کے وقت سعید بن زید زندہ ہوتے تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ خلاف وصیت کیونکر جنازہ پڑھا سکتے تھے، بہر حال ازواج مطہرات میں سب کے بعد حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے وفات پائی اور وفات کے وقت ان کی عمر ۸۴ سال کی تھی۔ ❶

فضل وکمال

ازواج مطہرات میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بعد فضل و کمال میں انہیں کا درجہ ہے، ابن سعد نے طبقات میں اس کی تصریح کی ہے، روایت حدیث اور نقل احکام میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوا اور تمام بیبیوں پر ان کو فضیلت حاصل ہے۔ صلح حدیبیہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو مکہ سے باہر حلق اور قربانی میں تامل تھا تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ہی کی تدبیر سے یہ مشکل حل ہوئی اور یہ ان کی دانش مندی و ذہانت کی سب سے بہتر مثال ہے، یہ واقعہ صحیح بخاری میں بہ تفصیل موجود ہے۔ ❷

حضرت زینب رضی اللہ عنہا

ازواج مطہرات میں جو بیبیاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہمسری کا دعویٰ رکھتی تھیں ان میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا بھی تھیں خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: كانت تساميني۔ ❸ یعنی وہ میرا مقابلہ کرتی تھیں اور ان کو اس کا حق بھی تھا، نسبی حیثیت سے وہ آنحضرت ﷺ کی پھوپی زاد بہن تھیں، جمال میں بھی ممتاز تھیں، آنحضرت ﷺ کو بھی ان سے نہایت محبت تھی، زہد وتورع میں یہ حال تھا کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر اتہام لگایا گیا اور اس اتہام میں خود حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی بہن حمنہ رضی اللہ عنہا شریک تھیں تو آنحضرت ﷺ نے ان سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اخلاقی حالت دریافت کی تو انہوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا:

ماعلمت الا خیرا۔ ❹ ''مجھ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بھلائی کے سوا کسی چیز کا علم نہیں۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ان کے اس صدق واقرار حق کا خود اعتراف کرنا پڑا۔

عبادت میں نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ مشغول رہتی تھیں، جب آنحضرت ﷺ نے ان کو عقد میں لانا چاہا تو انھوں نے کہا کہ میں بغیر استخارہ کے کوئی رائے قائم نہیں کرتی۔ ایک دفعہ آپ ﷺ مہاجرین

---

❶ زرقانی، ج ۳، ص: ۲۷٦۔ ❷ بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد: ۲۷۳۱، ۲۷۳۲۔

❸ بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافك: ٤١٤١۔

❹ بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافك: ٤١٤١۔

پر کچھ مال تقسیم کر رہے تھے، حضرت زینب رضی اللہ عنہا اس معاملہ میں کچھ بول اٹھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ڈانٹا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان سے درگزر کرو یہ اواہ ہیں۔'' (یعنی خاشع و متضرع ہیں) نہایت قانع اور فیاض طبع تھیں، خود اپنے دست و بازو سے معاش پیدا کرتی تھیں اور اس کو خدا کی راہ میں لٹا دیتی تھیں۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا سالانہ نفقہ بھیجا انہوں نے اس پر ایک کپڑا ڈال دیا اور برزہ بنت رافع کو حکم دیا میرے خاندانی رشتہ داروں اور یتیموں کو تقسیم کر دو، برزہ نے کہا: آخر ہمارا بھی کچھ حق ہے، انہوں نے کہا کہ کپڑے کے نیچے جو کچھ ہو وہ تمہارا ہے، دیکھا تو پچاس درہم نکلے، جب تمام مال تقسیم ہو چکا تو دعا کی کہ خدایا! اس سال کے بعد میں عمر رضی اللہ عنہ کے عطیہ سے فائدہ نہ اٹھاؤں، یہ دعا مقبول ہوئی اور اسی سال ان کا انتقال ہو گیا۔

وفات

آنحضرت ﷺ نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے فرمایا تھا:

((اسرعکن لحاقابی اطولکن یدا)) [1] ''تم میں مجھ سے جلد وہ ملے گی جس کا ہاتھ لمبا ہوگا۔''

یہ استعارۃً فیاضی کی طرف اشارہ تھا لیکن ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اس کو حقیقت سمجھیں، چنانچہ باہم اپنے ہاتھوں کو ناپا کرتی تھیں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اپنی فیاضی کی بنا پر اس پیشین گوئی کا مصداق ثابت ہوئیں اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں سب سے پہلے انتقال کیا۔ کفن کا خود سامان کر لیا تھا اور وصیت کی تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی کفن دیں تو ان میں سے ایک کو صدقہ کر دینا، چنانچہ وصیت پوری کی گئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی، اس کے بعد ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے دریافت کیا کہ کون قبر میں داخل ہوگا، انہوں نے کہا: وہ شخص جو ان کے گھر میں داخل ہوا کرتا تھا، (چنانچہ اسامہ، محمد بن عبداللہ بن جحش، عبداللہ بن ابی احمد بن جحش نے ان کو قبر میں اتارا) ۲۰ھ میں انتقال کیا اور ۵۳ برس کی عمر پائی۔ واقدی نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے جس وقت نکاح ہوا اس وقت ۳۵ سال کی تھیں۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا حارث بن ضرار کی بیٹی تھیں، جو قبیلہ بنی مصطلق کا سردار تھا۔ مسافع بن صفوان سے شادی ہوئی تھی، جو غزوہ مریسیع میں قتل ہوا، اس لڑائی میں کثرت سے لونڈی غلام مسلمانوں کے ہاتھ آئے، ان ہی لونڈیوں میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ جب مال غنیمت کی تقسیم ہوئی تو وہ ثابت بن قیس بن شماس انصاری رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئیں۔

اسلام میں اگر آقا راضی ہو تو لونڈی غلام کچھ رقم ادا کر کے آزاد ہو سکتے ہیں، اس طریقہ کو فقہا کی اصطلاح میں ''کتابت'' کہتے ہیں، اسی اصول کے موافق حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا مکاتبہ بن گئیں، ان کو شرط کے

[1] مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل زینب: ٦٣١٦۔

موافق ۹۔اوقیہ سونا ادا کرنا تھا لیکن یہ رقم ان کی استطاعت سے بہت زیادہ تھی، وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور کہا: یارسول اللہ ﷺ! میں مسلمان کلمہ گو عورت جویریہ، حارث کی بیٹی ہوں جو اپنی قوم کا سردار ہے، مجھ پر جو مصیبتیں آئیں وہ آپ ﷺ سے مخفی نہیں، میں ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی اور نو اوقیہ سونے پر ان سے عہد کتابت کیا، یہ رقم میرے امکان میں نہ تھی لیکن میں نے آپ کے بھروسہ پر اس کو منظور کرلیا اور اب آپ سے اس کا سوال کرنے کے لیے آئی ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو کیا تم کو اس سے بہتر چیز کی خواہش نہیں؟'' انہوں نے کہا: وہ کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں یہ رقم ادا کردیتا ہوں اور تم سے نکاح کرلیتا ہوں۔'' وہ راضی ہوگئیں، آپ نے ثابت بن قیس کو بلایا وہ بھی راضی ہوگئے، آپ نے رقم ادا کی اور ان کو آزاد کرکے نکاح کرلیا، یہ چرچا پھیلا تو لوگوں نے قبیلہ بنی مصطلق کے تمام لونڈی غلام کو اس بنا پر آزاد کر دیا کہ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں سے رشتہ مصاہرت قائم کرلیا۔ [1] آزاد شدہ غلاموں کی تعداد ایک روایت میں سات سو بتائی گئی ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ''جویریہ رضی اللہ عنہا کی برکت سے سینکڑوں گھرانے آزاد کردیے گئے۔'' [2] بعض روایتوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ سے خود حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے یہ خواہش ظاہر کی تھی اور آپ ﷺ نے تمام قیدیوں کو ان پر ہبہ کردیا تھا۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے ۵۰ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں اس وقت ان کا سن ۶۵ برس کا تھا۔ [3]

حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا

رملہ نام اور ام حبیبہ کنیت تھی، آنحضرت ﷺ کی بعثت سے ۱۷ سال پہلے پیدا ہوئیں اور عبیداللہ بن جحش سے عقد ہوگیا، آنحضرت ﷺ معبوث ہوئے تو دونوں مشرف باسلام ہوئے اور حبشہ کی طرف ہجرت ثانیہ کی۔ ایک روایت ہے کہ ان کی بیٹی جن کی کنیت کے ساتھ وہ مشہور ہیں، حبشہ ہی میں پیدا ہوئیں، حبشہ میں جاکر عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے عیسائیت قبول کرلی لیکن ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اسلام پر قائم رہیں، اختلافِ مذہب کی بنا پر عبیداللہ بن جحش نے ان سے علیحدگی اختیار کرلی اور اب وہ وقت آگیا کہ ان کو اسلام اور ہجرت کی فضیلت کے ساتھ ام المومنین بننے کا شرف بھی حاصل ہو، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے عمرو بن امیہ الضمری کو نجاشی کی خدمت میں بغرض نکاح بھیجا، جب وہ نجاشی کے پاس پہنچے تو نجاشی نے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو اپنی لونڈی ابرہہ کے ذریعہ سے پیغام دیا کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو تمہارے نکاح کے لئے لکھا ہے، انہوں نے خالد بن سعید اموی کو وکیل مقرر کیا اور اس مژدہ کے صلہ میں ابرہہ کو چاندی کے دو کنگن اور انگوٹھیاں دیں، جب شام ہوئی تو

[1] ابوداود، کتاب العتق، باب فی بیع المکاتب اذا فسخت المکاتبۃ: ۳۹۳۱۔

[2] الاصابہ، ج۸، ص:٤٤؛ اسد الغابۃ، ج٥، ص:٤٢٠۔ [3] طبقات ابن سعد، ج۸، ص: ۸۵۔

نجاشی نے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور وہاں کے مسلمانوں کو جمع کر کے خود نکاح پڑھایا [1] اور آنحضرت ﷺ کی طرف سے چار سو دینار مہر ادا کیا۔ [2]

تمام لوگوں کے سامنے خالد بن سعید کو یہ رقم دی گئی تو لوگوں نے بعد نکاح اٹھنا چاہا، لیکن نجاشی نے کہا: دعوت ولیمہ تمام پیغمبروں کی سنت ہے ابھی بیٹھنا چاہیے، چنانچہ کھانا آیا لوگ دعوت کھا کے رخصت ہوئے، جب مہر کی رقم ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو ملی تو انہوں نے پچاس دینار ابرہہ کو دیے لیکن اس نے اس رقم کو اس کنگن کے ساتھ جو پہلے دیے گئے تھے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ بادشاہ نے مجھ کو منع کر دیا ہے، دوسرے روز ان کی خدمت میں عود، زعفران، عنبر وغیرہ لے کر آئی، جن کو وہ اپنے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائیں، جب نکاح کے تمام رسومات ادا ہو گئے، تو نجاشی نے ان کو شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں روانہ کیا۔ [3] ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے ۴۴ھ میں وفات پائی [4] اور مدینہ میں دفن ہوئیں۔

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا

میمونہ نام، باپ کا نام حارث اور ماں کا نام ہند تھا، پہلے مسعود بن عمرو بن عمیر الثقفی کے نکاح میں تھیں، مسعود نے طلاق دے دی تو ابورہم بن عبدالعزیٰ نے نکاح کر لیا، ابورہم کے انتقال کے بعد رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ [5] نکاح کے متعلق مختلف روایتیں ہیں، ایک روایت ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ہبہ کیا۔ دوسری روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مدینہ سے اپنے غلام ابورافع کو اوس بن خولی کے ساتھ وکیل بنا کر بھیجا اور انہوں نے ایجاب وقبول کیا، لیکن صحیح روایت یہ ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اس نکاح کی تحریک کی اور انہوں نے نکاح پڑھایا۔ [6]

وفات

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ مقام سرف میں ان کا نکاح ہوا تھا اور سرف ہی میں انہوں نے انتقال بھی [7]

[1] سال نکاح میں اختلاف ہے۔ مشہور یہ ہے کہ ۷ھ میں نکاح ہوا لیکن بعض روایتوں میں ۶ھ بھی بیان کیا گیا ہے ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عمرو بن امیہ الضمری کو بغرض نکاح بھیجا ہو اور ۷ھ میں نکاح پڑھایا گیا ہو، اس میں بھی اختلاف ہے کہ نکاح کہاں ہوا اور کس نے پڑھایا لیکن صحیح یہ ہے کہ حبشہ میں نکاح ہوا اور نجاشی نے نکاح پڑھایا۔ [2] صحیح روایت یہی ہے لیکن اور بھی مختلف تعداد بیان کی گئی ہے، بعض روایتوں میں نوسو دینار ہے، بعضوں کے نزدیک چار ہزار دینار ہے، ابو داود، کتاب النکاح، باب الصداق: ۲۱۰۸ میں دینار کی بجائے چار ہزار درہم ہے، زہری کی روایت میں چالیس اوقیہ کی تعداد کا ذکر ہے، اس لیے اگر چاندی ہو گی تو اس کے سولہ سو درہم ہوتے ہیں۔ [3] مسند امام احمد، ج ٦، ص: ٤٢٧۔ [4] بعضوں نے سال وفات ۴۲ھ لکھا ہے، ابن ابی خیثمہ کے نزدیک ان کا سال وفات ۵۹ھ ہے، بعض لوگوں نے ۵۰ھ اور بعضوں نے ۵۵ھ بیان کیا ہے، ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ دمشق میں مدفون ہوئیں۔ زرقانی، ج ۳، ص: ۲۹۲۔ [5] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے حالت احرام میں نکاح کیا۔ بخاری، کتاب جزاء الصید، باب تزویج المحرم: ۱۸۳۷۔

[6] زرقانی، ج ۳، ص: ۲۹۹۔ [7] بخاری، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء: ٤٢٥٨۔

کیا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور قبر میں اتارا۔ صحاح میں ہے کہ جب ان کا جنازہ اٹھایا گیا تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ رسول اللہ ﷺ کی بی بی ہیں جنازہ کو زیادہ حرکت نہ دو، باادب آہستہ لے چلو۔ [1] سال وفات کے متعلق اگرچہ اختلاف ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ انہوں نے ۵۱ھ میں وفات پائی۔ [2]

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا

صفیہ رضی اللہ عنہا اصل نام نہ تھا، زرقانی نے لکھا ہے کہ عرب میں مال غنیمت کا جو بہترین حصہ امام یا بادشاہ کے لیے مخصوص ہو جاتا تھا اس کو صفیہ کہتے تھے، چونکہ وہ جنگ خیبر میں اسی طریقہ کے موافق آنحضرت ﷺ کے نکاح میں آئی تھیں، اس لیے صفیہ رضی اللہ عنہا کے نام سے مشہور ہو گئیں، ورنہ اصلی نام زینب تھا۔ باپ کا نام حیی بن اخطب اور ماں کا نام ضرہ تھا، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو باپ اور ماں دونوں کی جانب سے سیادت حاصل تھی، باپ قبیلہ بنو النضیر کا سردار اور ماں قریظہ کے رئیس کی بیٹی تھی۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی شادی پہلے سلام بن مشکم القرظی سے ہوئی تھی، ابن مشکم نے طلاق دی تو کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں آئیں، کنانہ جنگ خیبر میں مقتول ہوا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے باپ اور بھائی بھی کام آئے اور خود بھی گرفتار ہوئیں، جب خیبر کے تمام قیدی جمع کیے گئے تو دحیہ کلبی نے آنحضرت ﷺ سے ایک لونڈی کی درخواست کی، آنحضرت ﷺ نے انتخاب کرنے کی اجازت دی، انہوں نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو منتخب کیا، لیکن ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے آپ کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ آپ نے رئیسہ بنو نضیر و قریظہ کو دحیہ کو دیدیا، وہ تو صرف آپ کے قابل ہے۔ آپ نے حکم دیا کہ دحیہ اس عورت کے ساتھ حاضر ہوں، وہ صفیہ کو لیکر آئے تو آپ نے ان کو دوسری لونڈی عنایت فرمائی اور صفیہ کو آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ [3] خیبر سے روانہ ہوئے تو مقام صہبا میں رسم عروسی ادا کی اور جو کچھ سامان لوگوں کے پاس تھا، اس کو جمع کر کے دعوت ولیمہ فرمائی، وہاں سے روانہ ہوئے تو آپ نے ان کو خود اپنے اونٹ پر سوار کر لیا اور اپنے عبا سے ان پر پردہ کیا یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ وہ ازواج مطہرات میں داخل ہو گئیں۔ [4]

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو نہایت محبت تھی اور ہر موقع پر ان کی دلجوئی فرماتے تھے۔ ایک بار آپ سفر میں تھے، ازواج مطہرات بھی ساتھ تھیں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا اونٹ سوئے اتفاق سے بیمار ہو گیا، حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس ضرورت سے زیادہ اونٹ تھے، آپ نے ان سے کہا کہ ایک اونٹ صفیہ رضی اللہ عنہا کو دے دو، انہوں نے کہا: کیا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دوں؟ اس پر آنحضرت ﷺ ان سے

[1] بخاري، كتاب النكاح، باب كثرة النساء: ٥٠٦٧۔ [2] زرقاني، ج ٣، ص: ٣٠٢۔
[3] بخاري، كتاب الصلوة، باب مايذكر في الفخذ: ٣٧١۔
[4] بخاري، كتاب المغازي، باب غزوة خيبر: ٤٢١١۔

اس قدر ناراض ہوئے کہ دو مہینے تک ان کے پاس نہ گئے۔ ❶ ایک بار آپ ﷺ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے دیکھا کہ رو رہی ہیں، آپ نے رونے کی وجہ پوچھی، انہوں نے کہا کہ عائشہ اور زینب رضی اللہ عنہما کہتی ہیں کہ ہم تمام ازواج میں افضل ہیں، ہم آپ کی زوجہ ہونے کے ساتھ آپ کی چچا زاد بہن بھی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ ہارون علیہ السلام میرے باپ، موسیٰ علیہ السلام میرے چچا اور محمد (ﷺ) میرے شوہر ہیں اس لیے تم لوگ کیونکر مجھ سے افضل ہو سکتی ہو؟'' ❷

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے ۵۰ ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ ❸

---

❶ زرقانی، ج۳، ص ۳۰۶، ۳۰۷۔ ❷ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب فضل ازواج النبی ﷺ: ۳۸۹۴ اس روایت میں حضرت زینب کے بجائے حضرت حفصہ کا نام مذکور ہے۔ ''ض'' ❸ زرقانی، ج۳، ص: ۳۱۰۔

اولاد

آنحضرت ﷺ کی اولاد کی تعداد میں سخت اختلاف ہے۔ متفق علیہ روایت یہ ہے کہ آپ کے چھ اولادیں تھیں، قاسم رضی اللہ عنہ ابراہیم رضی اللہ عنہ، زینب، رقیہ، ام کلثوم، فاطمہ رضی اللہ عنہن ان تمام لڑکیوں نے اسلام کا زمانہ پایا اور ہجرت سے شرف اندوز ہوئیں لیکن ابن اسحاق نے دو صاحبزادوں کا نام اور لیا ہے طاہر، طیب رضی اللہ عنہما ❶ اس بنا پر اولاد مذکور کی تعداد لڑکیوں کے برابر ہو جاتی ہے۔ اس بارہ میں تمام اقوال کے جمع کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بارہ اولادیں تھیں، جن میں آٹھ لڑکے اور چار لڑکیاں تھی لڑکیوں کی تعداد میں کسی قسم کا اختلاف نہیں، البتہ صاحبزادوں کی تعداد میں سخت اختلاف ہے، مجموعی تعداد آٹھ تک پہنچتی ہے، جن میں قاسم اور ابراہیم رضی اللہ عنہما پر تمام راویوں کا اتفاق ہے۔ حضرت ابراہیم ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے اور بقیہ اولاد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے تھیں۔ ❷

حضرت قاسم رضی اللہ عنہ

آپ ﷺ کی اولاد میں سب سے پہلے حضرت قاسم رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے (اور غالباً نبوت سے گیارہ برس پہلے پیدا ہوئے ہوں گے) مجاہد کے نزدیک یہ صرف سات دن زندہ رہے، ابن سعد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سال تک زندہ رہے، ❸ ابن فارس نے لکھا ہے کہ سن تمیز کو پہنچ گئے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی اولاد میں جس طرح یہ سب سے پہلے پیدا ہوئے تھے اسی طرح سب سے پہلے انتقال بھی کیا۔ عام روایت یہ ہے کہ قبل بعثت وفات پائی، آنحضرت ﷺ کی کنیت ابوالقاسم انہیں کے انتساب سے ہے، آپ اس کنیت کو بہت پسند فرماتے تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم بھی جب آپ کا محبت سے نام لیتے ابوالقاسم ہی کہتے۔ ایک دن آپ بازار سے گزر رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے یا اباالقاسم کہہ کر آواز دی، آپ نے مڑ کر دیکھا تو اس نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! میں اسی نام کے ایک اور شخص کو پکار رہا ہوں، رفع اشتباہ کے لیے پھر آپ ﷺ نے منع فرما یا کہ کوئی یہ کنیت نہ رکھے۔ ❹

حضرت زینب رضی اللہ عنہا

اہل سیر کا اتفاق ہے کہ لڑکیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ زبیر بن بکار کا قول ہے کہ حضرت قاسم رضی اللہ عنہ کے بعد پیدا ہوئیں لیکن ابن کلبی کے نزدیک آنحضرت ﷺ کی سب سے پہلی اولاد حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہی ہیں۔ بعثت سے دس برس پہلے جب آنحضرت ﷺ کی عمر ۳۰ سال کی تھی پیدا ہوئیں۔ آنحضرت ﷺ نے

---

❶ کتاب الاستیعاب برحاشیہ اصابہ، ج ۱، ص ۳۸، "ک" ❷ زرقانی، ج ۳، ص ۲۳۱۔

❸ طبقات ابن سعد، جز اول، ق ۱، ص: ۸۵۔ ❹ صحیح مسلم، کتاب الآداب، باب النھی عن التکنی بأبی القاسم: ۵۵۸۶؛ الادب المفرد، باب اسم النبی ﷺ وکنیتہ: ۸۴۵۔

جب مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی تو اہل وعیال مکہ میں رہ گئے تھے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شادی ان کے خالہ زاد بھائی ابوالعاص بن ربیع بن لقیط سے ہوئی۔ غزوۂ بدر میں ابوالعاص گرفتار ہو گئے، جب یہ رہا کیے گئے تو ان سے وعدہ لیا گیا کہ مکہ جا کر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو بھیج دیں گے، ابوالعاص نے مکہ جا کر اپنے بھائی کنانہ کے ساتھ ان کو مدینہ کی طرف روانہ کیا چونکہ کفار کے تعرض کا خوف تھا، کنانہ نے ہتھیار ساتھ لے لیے تھے، مقام ذی طویٰ میں پہنچے تو کفار قریش کے چند آدمیوں نے تعاقب کیا، ہبار بن اسود نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو نیزے سے زمین پر گرا دیا، وہ حاملہ تھیں، حمل ساقط ہو گیا، کنانہ نے ترکش سے تیر نکالے اور کہا کہ اب اگر کوئی قریب آیا تو ان تیروں کا نشانہ ہوگا۔ لوگ ہٹ گئے تو ابوسفیان سرداران قریش کے ساتھ آیا اور کہا: تیر روک لو ہم کو کچھ گفتگو کرنی ہے انہوں نے تیر ترکش میں ڈال دیے، ابوسفیان نے کہا: محمد (ﷺ) کے ہاتھ سے جو مصیبتیں پہنچی ہیں تم کو معلوم ہیں اب اگر تم اعلانیہ ان کی لڑکی کو ہمارے قبضے سے نکال کر لے گئے تو لوگ کہیں گے کہ ہماری کمزوری ہے، ہم کو زینب رضی اللہ عنہا کے روکنے کی ضرورت نہیں، جب شور و ہنگامہ کم ہو جائے اس وقت چوری چھپے لے جانا۔ کنانہ نے یہ رائے تسلیم کی اور چند روز کے بعد ان کو رات کے وقت لے کر روانہ ہوئے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو آنحضرت ﷺ نے پہلے بھیج دیا تھا، وہ بطنِ یاجج میں تھے، کنانہ نے زینب رضی اللہ عنہا کو ان کے حوالے کیا، وہ ان کو لیکر روانہ ہو گئے۔ ❶

حضرت زینب رضی اللہ عنہا مدینہ میں آئیں اور اپنے شوہر ابوالعاص کو حالت شرک میں چھوڑا۔ ابوالعاص دوبارہ ایک سریہ میں گرفتار ہوئے۔ ❷ اس وقت بھی حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے ان کو پناہ دی، مکہ جا کر انہوں نے لوگوں کی امانتیں حوالے کیں اور اسلام لائے، اسلام لانے کے بعد ہجرت کر کے مدینہ میں آئے، حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے ان کو حالت شرک میں چھوڑا تھا اس لیے دونوں میں باہم تفریق ہو گئی تھی، وہ مدینہ آئے تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا دوبارہ ان کے نکاح میں آئیں۔ ❸ ترمذی وغیرہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ کوئی جدید نکاح نہیں ہوا لیکن دوسری روایت میں جدید نکاح کی تصریح ہے۔ ❹ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے اگرچہ اسناد کے لحاظ سے دوسری روایت پر ترجیح ہے لیکن فقہا نے دوسری روایت پر عمل کیا ہے اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ تاویل کی ہے کہ نکاح جدید کے مہر اور شرائط وغیرہ میں کسی قسم کا تغیر نہ ہوا ہوگا، اس لیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کو نکاح اول سے تعبیر کیا ورنہ بعد

❶ زرقانی، ج۳، ص: ۲۲۳۔ ❷ اصابہ میں ہے کہ ابوالعاص قریش کے ایک قافلہ کے ساتھ جمادی الاول ۶ھ میں روانہ ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے زید بن حارثہ کو ۱۷۰ سواروں کے ساتھ بھیجا۔ مقام عیص میں قافلہ ملا، کچھ لوگ گرفتار کیے گئے اور مال واسباب لوٹ میں آیا، ان ہی میں ابوالعاص تھے۔ ابوالعاص آئے تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے ان کو پناہ دی اور ان کی سفارش سے آنحضرت ﷺ نے ان کا مال بھی واپس کر دیا۔ (ج ٤، ص: ۳۱۲) ❸ مستدرك حاكم، ۳/ ۲۳۷: ۵۰۳۸؛ دلائل النبوة، ج ٤، ص: ۸٤۔
❹ ترمذی، ابواب النكاح، باب فی الزوجين المشركين يسلم احدهما: ۱۱٤۲۔

تفریق نکاح ثانی ضروری ہے۔

ابوالعاص نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ نہایت شریفانہ برتاؤ کیا اور آنحضرت ﷺ نے ان کے شریفانہ تعلقات کی تعریف کی، نکاح جدید کے بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہا بہت کم زندہ رہیں۔ ۷ھ یا ۶ھ میں (باختلاف روایت) ابوالعاص اسلام لائے تھے اور اس لیے ۸ھ میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے انتقال کیا۔ ام ایمن، حضرت سودہ بنت زمعہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہن نے غسل دیا اور آنحضرت ﷺ نے نماز جنازہ پڑھائی ابوالعاص اور آنحضرت ﷺ نے قبر میں اتارا۔ 1 حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے دو اولاد چھوڑی۔ امامہ اور علی۔ علی کی نسبت ایک روایت ہے کہ بچپن میں وفات پائی لیکن عام روایت یہ ہے کہ سن رشد کو پہنچے۔ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ یرموک کے معرکہ میں شہادت پائی۔ 2

امامہ سے آنحضرت ﷺ کو نہایت محبت تھی، آپ ان کو اوقات نماز میں بھی جدا نہیں کرتے تھے۔ صحاح میں ہے کہ آپ ﷺ ان کو کاندھے پر رکھ کر نماز پڑھتے تھے، جب رکوع میں جاتے تو دوش مبارک سے اتار دیتے، جب سجدہ سے سر اٹھاتے تو پھر سوار کرا لیتے۔ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ایک مرتبہ کسی نے کچھ چیزیں ہدیے میں بھیجیں جن میں ایک زریں ہار بھی تھا، امامہ ایک گوشہ میں کھیل رہی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں اس کو اپنی محبوب ترین اہل کو دوں گا۔'' ازواج نے سمجھا کہ یہ شرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہوگا لیکن آپ ﷺ نے امامہ کو بلا کر وہ ہار خود ان کے گلے میں ڈال دیا۔ ابوالعاص نے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کو امامہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کی وصیت کی تھی، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی تو مغیرہ کو وصیت کر گئے کہ امامہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیں مغیرہ رضی اللہ عنہ نے نکاح کیا اور ان سے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام یحییٰ تھا لیکن بعض روایتوں میں ہے کہ امامہ رضی اللہ عنہا کے کوئی اولاد نہیں ہوئی، امامہ رضی اللہ عنہا نے مغیرہ کے ہاں وفات پائی۔ 3

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا

جرجانی نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی لڑکیوں میں سب سے چھوٹی تھیں 4 لیکن مشہور روایت یہ ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے بعد قبل نبوت میں پیدا ہوئیں، پہلے ابولہب کے بیٹے عتبہ سے شادی ہوئی۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ یہ شادی قبل نبوت ہوئی تھی۔ 5 آنحضرت ﷺ کی دوسری صاحبزادی ام کلثوم کی شادی بھی ابولہب کے دوسرے لڑکے عتیبہ سے ہوئی تھی، جب آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی اور آپ نے دعوتِ اسلام کا اظہار کیا، ابولہب نے بیٹوں کو جمع کر کے کہا: اگر تم محمد (ﷺ) کی بیٹیوں سے علیحدگی اختیار نہیں کرتے تو تمہارے ساتھ میرا سونا بیٹھنا حرام ہے۔ دونوں فرزندوں نے باپ کے حکم کی تعمیل کی، آنحضرت ﷺ نے

1 زرقانی، ج۳، ص:۲۲۳۔ 2 ایضًا، ص: ۲۳۵۔ 3 زرقانی، ج۳، ص: ۲۳۵۔
4 ایضًا، ص: ۲۳۶۔ 5 طبقات ابن سعد، ج۸، ص: ۲۴۔

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی شادی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کردی۔ ❶

دولابی نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کا نکاح زمانۂ جاہلیت میں ہوا لیکن خود ایک روایت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں زمانۂ اسلام کی تصریح ہے، نکاح کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حبش کی طرف ہجرت کی، حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بھی ساتھ گئیں۔ مدت تک آنحضرت ﷺ کو ان کا کچھ حال معلوم نہ ہوا، ایک عورت نے آ کر خبر دی کہ میں نے ان دونوں کو دیکھا ہے آنحضرت ﷺ نے دعا دی اور فرمایا کہ ''ابراہیم اور لوط علیہما السلام کے بعد عثمان پہلے شخص ہیں جنہوں نے بی بی کو لے کر ہجرت کی ہے۔'' ❷

حبش میں حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے ایک بچہ پیدا ہوا، جس کا نام عبداللہ تھا لیکن صرف ۶ سال زندہ رہا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حبش سے مکہ کو واپس آئے اور وہاں سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا مدینہ میں آ کر بیمار ہوئیں یہ غزوۂ بدر کا زمانہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کی تیمارداری کی وجہ سے شریک جہاد نہ ہو سکے، عین اسی دن جس روز زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ آ کر فتح کا مژدہ سنایا، وفات پائی۔ غزوۂ بدر کی وجہ سے آنحضرت ﷺ ان کے جنازہ میں شریک نہ ہو سکے۔ ❸

حضرت اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا

کنیت ہی کے نام سے مشہور ہیں۔ ۳ھ میں جو غزوۂ بدر کا سال تھا جب حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو ربیع الاول میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کر لیا۔ بخاری میں ہے کہ جب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بیوہ ہوئیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تامل کیا۔ ❹ لیکن دوسری روایتوں میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: ''میں تم کو عثمان سے بہتر شخص کا پتہ دیتا ہوں اور عثمان کے لیے تم سے بہتر شخص ڈھونڈتا ہوں تم اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کر دو، میں اپنی لڑکی کی شادی عثمان سے کر دیتا ہوں۔'' ❺ بہر حال نکاح ہوا، اور نکاح کے بعد حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا ۶ برس تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہیں شعبان ۹ھ میں انتقال کیا۔ آنحضرت ﷺ نے نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت علی، حضرت فضل بن عباس، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم نے قبر میں اتارا۔ ❻

حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا

فاطمہ نام، زہرا لقب، سن ولادت میں اختلاف ہے، ایک روایت ہے کہ ۱ھ بعثت میں پیدا ہوئیں۔

---

❶ طبقات ابن سعد، ج۸، ص: ۲۴ ک ❷ اسد الغابہ، ج۵، ص: ۴۲۷؛ الطبقات ابن سعد، ج۸، ص: ۲۴۔
❸ زرقانی، ج۳، ص: ۲۳۶، ۲۳۷۔ ❹ بخاری، کتاب النکاح، باب عرض الانسان ابنته: ۵۱۲۲۔
❺ مسند امام احمد، ج۱، ص: ۲۰۳؛ اسد الغابة، ج۷، ص: ۶۷؛ زرقانی، ج۳، ص: ۲۳۸۔
❻ ایضا، ص: ۲۳۹۔

ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ ابراہیم کے علاوہ آپ ﷺ کی تمام اولاد قبل نبوت پیدا ہوئی۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت چالیس سال کی عمر میں ہوئی تھی اس بنا پر بعضوں نے دونوں روایتوں میں یہ تطبیق دی ہے کہ بعثت کے آغاز میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئی ہوں گی اور چونکہ دونوں کی مدت میں بہت فاصلہ ہے اس لیے یہ اختلاف روایت ہو گیا ہوگا، ابن جوزی نے لکھا ہے کہ بعثت سے پانچ برس پہلے جب خانہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی پیدا ہوئیں بعض روایتوں میں ہے کہ تقریباً ایک سال پیشتر پیدا ہوئیں۔ (1) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اگر ان کا سال ولادت ۱ بعثت صحیح تسلیم کرلیا جائے جب پندرہ سال ساڑھے پانچ مہینے کی ہوئی تو ۲ھ میں آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکاح کر دیا اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سن ۲۱ برس پانچ مہینے کا تھا، (2) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے عقد کی درخواست سب سے پہلے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کی تھی لیکن آنحضرت ﷺ نے کچھ جواب نہیں دیا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خواہش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے پاس مہر ادا کرنے کو کچھ ہے؟'' بولے: ایک گھوڑا اور زرہ کے سوا کچھ نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''گھوڑا تو لڑائی کے لئے ضروری ہے زرہ کو فروخت کر ڈالو۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ۴۸۰ درہم پر خریدی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قیمت لا کر آنحضرت ﷺ کے سامنے ڈال دی، آنحضرت ﷺ نے بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ بازار سے خوشبو لائیں، عقد ہوا اور آنحضرت ﷺ نے جہیز میں ایک پلنگ اور ایک بستر دیا۔ اصابہ میں لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک چادر، دو چکیاں اور ایک مشک بھی دی (3) اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہی دو چیزیں عمر بھر ان کی رفیق رہیں۔

نکاح کے بعد رسم عروسی کا وقت آیا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ایک مکان لے لیں، چنانچہ حارثہ بن النعمان رضی اللہ عنہ کا مکان ملا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اس میں قیام کیا۔ (4) آنحضرت ﷺ ہمیشہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے تعلقات میں خوشگواری پیدا کرنے کی کوشش فرماتے، چنانچہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا میں کبھی کبھی خانگی معاملات کے متعلق رنجش ہو جاتی تھی، تو آنحضرت ﷺ دونوں میں صلح کرا دیتے تھے، ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا آپ ﷺ گھر میں تشریف لے گئے اور صفائی کرادی، گھر سے مسرور نکلے لوگوں نے پوچھا آپ ﷺ گھر میں گئے تھے، تو اور حالت تھی اب آپ ﷺ اس قدر خوش کیوں ہیں، فرمایا: ''میں نے ان دو شخصوں میں مصالحت کرادی ہے جو مجھ کو محبوب ہیں۔'' (5)

ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان پر کچھ سختی کی، وہ آنحضرت ﷺ کے پاس شکایت لے کر چلیں، پیچھے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آئے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے شکایت کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''بیٹی تم کو خود سمجھنا

---

(1) زرقانی، ج۳، ص: ۲٤۱۔ (2) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق ایک روایت ہے کہ ۸ برس کی عمر میں اسلام لائے [illegible] سن کی یہ تعیین اسی روایت کی بنا پر ہے لیکن قول راجح یہ ہے کہ وہ دس سال کی عمر میں مشرف باسلام ہوئے [illegible] اس وقت ان کا سن ۲۴ سال ۵ مہینہ کا تھا۔ (3) اصابہ، ج۸، ص ۱۵۹۔ (4) ایضا، ص ۱۵۸۔ (5) ایضا، ص: ۱۶۰۔

چاہیے کہ کون شوہر اپنی بی بی کے پاس خاموش چلا آتا ہے۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اس کا یہ اثر ہوا کہ انہوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: اب میں تمہارے خلاف مزاج کوئی بات نہ کروں گا۔ ❶

(ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک دوسرا نکاح کرنا چاہا آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے، آپ ﷺ نے مسجد میں خطبہ دیا اس میں اپنی ناراضی ظاہر کی فرمایا: ''میری لڑکی میرا جگر گوشہ ہے، جس سے اس کو دکھ پہنچے گا، مجھے بھی اذیت ہوگی۔'' چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس ارادہ سے باز آ گئے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی تک پھر کبھی دوسرا نکاح نہ کیا)۔ ❷

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پانچ اولادیں ہوئیں۔ حسن، حسین، محسن رضی اللہ عنہم ام کلثوم، زینب رضی اللہ عنہما۔ محسن رضی اللہ عنہ نے بچپن ہی میں انتقال کیا۔ حضرت زینب، امام حسن، حسین اور ام کلثوم رضی اللہ عنہم اہم واقعات کے لحاظ سے تاریخ اسلام میں مشہور ہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے رمضان ۱۱ ھ میں آنحضرت ﷺ کے انتقال کے ۶ ماہ بعد وفات پائی۔ ❸ اس وقت ان کا سن ۲۹ سال کا تھا، سن کی تعین میں سخت اختلاف ہے، بعض نے ۲۴ سال، بعض نے ۲۵ سال اور بعض نے ۳۰ سال بتایا ہے لیکن زرقانی نے لکھا ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے، ❹ اگر ۴۱ کو سال ولادت قرار دیا جائے تو اس وقت ان کا یہ سن نہیں ہوسکتا تھا، البتہ اگر ۲۴ سال کی عمر تسلیم کی جائے تو اس سن کو سال ولادت قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے کہ وہ پانچ برس قبل نبوت میں پیدا ہوئیں تو اس وقت ان کا سن ۲۹ سال کا ہوسکتا ہے۔

حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ

آنحضرت ﷺ کی سب سے آخری اولاد ہیں۔ ذی الحجہ ۸ ھ بمقام عالیہ جہاں حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا رہتی تھیں، پیدا ہوئے۔ اس بنا پر لوگ عالیہ کو مشربہ ابراہیم بھی کہنے لگے تھے۔ ابورافع کی بی بی سلمٰی نے جو آنحضرت ﷺ یا آپ کی پھوپھی صفیہ کی لونڈی تھیں، دایہ گری کی خدمت انجام دی۔ ابورافع نے جب آنحضرت ﷺ کو ان کی ولادت کا مژدہ سنایا تو آپ نے اس کے صلہ میں ایک غلام عطا فرمایا۔ ساتویں دن عقیقہ ہوا، آپ نے بال کے برابر چاندی خیرات کی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام پر نام رکھا۔ دودھ پلانے کے لیے تمام انصار نے خواہش کی، لیکن آپ نے ان کو ام بردہ خولہ بنت منذر بن زید الانصاری کے حوالے کیا اور اس کے معاوضہ میں کھجور کے چند درخت دیئے۔ بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت

❶ اصابہ، ج ٤، ص: ٣٧٩۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب ذکر اصهار النبی ﷺ: ٣٧٢٩۔

❸ اس میں بھی اختلاف ہے بعض نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد صرف تین دن زندہ رہیں، بعض نے چار مہینے بتایا ہے، بعضوں کے نزدیک دو مہینے کے بعد انتقال ہوا، کسی نے ایک مہینہ کسی نے ۳ مہینے بعد اور بعضوں نے ۳ مہینے ۵ دن بعد لکھا ہے لیکن صحاح میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ذریعہ سے ۶ مہینے والی روایت مذکور ہے۔ ❹ زرقانی، ج ۳، ص: ٢٤٥۔

ہے کہ آپ ﷺ نے یہ خدمت اُمّ سیف کے متعلق کی۔ 1 قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ امّ سیف اور ام بردہ ایک ہی ہیں، یہ تاویل کچھ مستبعد نہیں، لیکن ان کے شوہر کا نام براء بن اوس بتایا جاتا ہے اور وہ ابوسیف کی کنیت کے ساتھ مشہور نہیں۔ 2 اُمّ سیف حوالی مدینہ میں رہتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ فرط محبت سے وہاں جاتے، حضرت ابراہیم کو گود میں لیتے اور چومتے، اُمّ سیف کے شوہر لوہار تھے، اس لیے گھر دھوئیں سے بھرا رہتا تھا لیکن آنحضرت ﷺ باوجود نظافتِ طبع گوارا فرماتے۔

ابراہیم نے اُمّ سیف ہی کے یہاں انتقال کیا۔ آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے ساتھ تشریف لائے۔ نزع کی حالت تھی، گود میں اٹھالیا، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا: یارسول اللہ! آپ کی یہ حالت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ رحمت ہے۔'' 3

عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مر جاتا ہے تو چاند میں گہن لگ جاتا ہے، اتفاق سے جس روز حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ نے وفات پائی۔ سورج میں گہن لگ گیا تھا۔ عام طور پر مشہور ہو گیا کہ یہ ان کی موت کا اثر ہے آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو فرمایا: ''چاند اور سورج خدا کی نشانیاں ہیں، کسی کی موت سے ان میں گہن نہیں لگتا۔'' 4

چھوٹی سی چارپائی پر جنازہ اٹھایا گیا۔ آنحضرت ﷺ نے خود نماز جنازہ پڑھائی، عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی قبر کے متصل دفن ہوئے۔ قبر میں فضل بن عباس اور اسامہ رضی اللہ عنہما نے اتارا۔ آنحضرت ﷺ قبر کے کنارے کھڑے تھے، قبر پر پانی چھڑکا گیا اور اس پر ایک امتیازی علامت قائم کی گئی۔ 5 ابوداؤد اور بیہقی کی روایت کے موافق دو مہینے دس دن کی عمر پائی۔ ذی الحجہ ۸ھ میں پیدا ہوئے تھے، اس روایت کی بنا پر ۹ھ میں انتقال ہوا۔ واقدی کے نزدیک ماہ ربیع الاول ۱۰ھ میں وفات کی، اس لحاظ سے تقریباً پندرہ مہینے زندہ رہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ سولہ مہینے آٹھ دن کی عمر پائی، بعض لوگوں نے مدت حیات ایک برس دس ماہ چھ دن لکھی ہے لیکن صحاح میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ابراہیم ۱۷ یا ۱۸ مہینے تک زندہ رہے۔ 6

1 بخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبی ﷺ......: ۱۳۰۳۔ 2 زرقانی، ج۳، ص: ۲۵۱۔

3 بخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبی انابك لمحزونون: ۱۳۰۳۔

4 بخاری، کتاب الکسوف، باب الصلوۃ فی کسوف الشمس: ۱۰۴۳۔

5 استیعاب برحاشیہ اصابہ ج۱، ص: ۴۶۔ 6 زرقانی، ج۳، ص: ۲۵۳تا۲۵۴۔

ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ معاشرت

ازواجِ مطہرات کی تعداد ۹ تک پہنچی تھی، ان میں عام اصولِ فطرت کے موافق ہر مزاج اور ہر طبیعت کی عورتیں تھیں، باہم رشک اور منافست بھی تھی۔ آنحضرت ﷺ چونکہ ہمیشہ فقر و فاقہ سے بسر کرتے تھے، ان کی خورد و پوشش کا انتظام بھی خاطر خواہ نہیں ہوسکتا تھا، اس لیے ان کو شکایت کا موقع ملتا تھا۔ ان تمام حالات کے ساتھ بھی آپ ﷺ کی جبین خلق پر کبھی شکن نہیں پڑتی تھی۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپ ﷺ کو بے انتہا محبت تھی، جب وہ عقد نکاح میں آئیں تو آنحضرت ﷺ کا ریعان شباب اور ان کا بڑھاپا تھا تاہم آپ ﷺ نے ان کی وفات تک کوئی شادی نہیں کی۔ وفات کے بعد بھی جب کبھی ان کا ذکر آجاتا تو آپ جوشِ محبت سے بے تاب ہو جاتے۔ (تفصیل اوپر گزر چکی ہے)

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ازواج مطہرات میں سب سے محبوب تر تھیں لیکن محبت کے اسباب وہ نہ تھے جو عام انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ حسن صورت میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ان سے بڑھ کر تھیں اور کمسن بھی تھیں، دیگر ظاہری محاسن میں بھی دیگر ازواج ان سے کم نہ تھیں، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی قابلیت، ذہانت، قوتِ اجتہاد، دقتِ نظر، وسعت معلومات ایسے اوصاف تھے جو ان کی ترجیح کا اصلی سبب تھے۔

ایک دفعہ چند ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کو سفیر بنا کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجا، جناب سیدہ رضی اللہ عنہا خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں۔ دستور کے موافق پہلے اذن طلب کیا، اجازت ملی تو سامنے آئیں اور عرض کی کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے مجھ کو وکیل بنا کر بھیجا ہے کہ آپ ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی کو ہم پر کیوں ترجیح دیتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جانِ پدر! کیا تم اس کو نہیں چاہتیں جس کو میں چاہتا ہوں۔'' جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے لیے اتنا ہی کافی تھا واپس جا کر ازواج مطہرات سے کہا میں اس معاملہ میں دخل نہ دوں گی۔

اب اس خدمت (سفارت) کے لیے حضرت زینب رضی اللہ عنہا انتخاب کی گئیں کیونکہ ازواج میں سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو خصوصیت کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہمسری کا دعویٰ تھا، اس لیے وہی اس خدمت کے لیے زیادہ موزوں تھیں، انہوں نے یہ پیغام بڑی دلیری سے ادا کیا اور بڑے زور کے ساتھ یہ ثابت کرنا چاہا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس رتبہ کی مستحق نہیں ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چپ سن رہی تھیں اور رسول اللہ ﷺ کے چہرہ کی طرف دیکھتی جاتی تھیں، حضرت زینب رضی اللہ عنہا جب تقریر کر چکیں تو مرضی پا کر کھڑی ہوئیں اور اس زور و شور کے ساتھ تقریر کی کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا لاجواب ہو کر رہ گئیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''کیوں نہ ہو ابوبکر کی

بیٹی ہے۔'' ❶

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''شادی کرنے کے لیے عورت کا انتخاب چار اوصاف کی بنا پر ہوسکتا ہے، مال، نسب، حسن، دینداری، سوتم دیندار عورت تلاش کرو۔'' ❷ آنحضرت ﷺ کو ہر کام میں سب سے مقدم جو چیز پیش نظر ہوتی تھی وہ دین ہوتا تھا اس لیے ازواج میں بھی وہی زیادہ منظور نظر ہوتی تھیں جن سے دین کی خدمت زیادہ ادا ہوسکتی تھی۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو باریابی کا زیادہ موقع ملتا تھا۔ وہ خلوت و جلوت کی شریک صحبت تھیں اس لیے مذہبی احکام ومسائل کے علم واطلاع کا بھی ان کو سب سے زیادہ موقع مل سکتا تھا لیکن ساتھ ہی اس کی ضرورت تھی کہ مسائل کے سمجھنے اور نکاتِ شریعت کی تہ تک پہنچنے کی بھی قابلیت جس قدر زیادہ ہوتی اسی قدر زیادہ تمتع اٹھا سکتا تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مجتہدانہ دل ودماغ رکھتی تھیں، اس لیے قرب وصحبت سے اس قدر فائدہ اٹھا سکیں کہ بڑے بڑے نازک اور دقیق مسائل میں وہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مخالفت کرتی تھیں اور انصاف بالائے طاعت است اکثر مسئلوں میں ان کی فہم ودقت نظر کا پلہ بھاری نظر آتا ہے، چنانچہ اس کی کسی قدر تفصیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حالات میں گزر چکی ہے۔

معمول تھا کہ ہر روز آپ ﷺ تمام ازواج مطہرات کے گھروں میں (جو پاس پاس تھے) تشریف لے جاتے، ایک ایک کے پاس تھوڑی تھوڑی دیر ٹھہرتے، جب ان کا گھر آجاتا جن کی باری ہوتی تو شب کو وہیں قیام فرماتے۔ ❸ یہ ابوداؤد کی روایت ہے۔ زرقانی میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے حال میں لکھا ہے کہ عصر کا وقت ہوتا تھا اور ابتدا حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ہوتی تھی۔ ❹ بعض روایتوں میں ہے کہ جن کی باری ہوتی تھی انہی کے گھر پر تمام ازواجِ مطہرات آجاتی تھیں اور دیر تک صحبت رہتی تھی، کچھ رات گئے سب رخصت ہوجاتی تھیں۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ گو ازواج میں کبھی کبھی منافست کا اظہار ہوتا تھا لیکن دل صاف تھے اور باہم مل کر لطف صحبت اٹھاتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کے شرف صحبت نے جس طرح ان آئینوں کو جلا دی تھیں اس کا اندازہ افک کے واقعہ سے ہوسکتا ہے۔ جس میں جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کو منافقین نے متہم کیا تھا اس سے بڑھ کر حریفوں کے لیے انتقام کا کیا موقع مل سکتا تھا لیکن باوجود اس کے کہ غیر متعلق لوگ تہمت لگانے

---

❶ یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بخاری، کتاب الھبة، باب من أهدى إلى صاحبه: ۲۵۸۱؛ مسلم، کتاب الفضائل، باب في فضل عائشة: ۶۲۹۰، اور دیگر احادیث کی کتابوں میں ہے۔ الفاظ روایت سے بظاہر متبادر ہوتا ہے کہ دونوں فریق نے صرف نکتہ چینی اور ایک دوسرے کی کسر شان کی تھی جیسا کہ عام طور پر سوکنیں باہم خانگی جھگڑوں میں کرتی ہیں لیکن یہ کم نظری ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی ترجیح کی وہ مسکت دلیلیں بیان کی ہوں گی جس کا جواب سکوت کے سوا اور کچھ نہ ہوسکتا ہوگا۔ ❷ بخاری، کتاب النکاح، باب الاکفا، فی الدین ۵۰۹۰؛ مسلم، کتاب الرضاع، باب استحباب نکاح ذات الدین: ۳۶۳۵۔

❸ ابوداود، کتاب النکاح، باب القسم بین النسآء: ۲۱۳۵۔ ❹ زرقانی، ج ۳، ص: ۲۸۸۔

میں آلودہ ہو گئے تھے تاہم ازواج مطہرات کا دامن صاف رہا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی حریف حضرت زینب رضی اللہ عنہا تھیں۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے ان سے استفسار فرمایا تو انہوں نے کانوں پر ہاتھ رکھا کہ حاشا یہ محض تہمت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب واقعہ افک کا ذکر کرتیں تھیں تو ہمیشہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی پاک باطنی کی شکرگزاری ظاہر کرتی تھیں، چنانچہ بخاری کی متعدد روایتوں میں تفصیلاً مذکور ہے۔ ❶

آنحضرت ﷺ جس طرح ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی خاطر داری فرماتے اوران کی نازک مزاجیاں برداشت کرتے تھے اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے ہوگا۔

ایک دفعہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سفر میں تھیں۔ ساربان، اونٹ کو تیز ہانکنے لگے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''دیکھنا یہ آبگینے (شیشے) ہیں۔'' ❷

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کھانا نہایت عمدہ پکاتی تھیں، ایک دن انہوں نے کھانا پکا کر آنحضرت ﷺ کے پاس بھیجا، آپ اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تشریف رکھتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خادم کے ہاتھ سے پیالہ چھین کر زمین پر دے مارا، آنحضرت ﷺ نے پیالے کے ٹکڑے چن چن کر یکجا کیے اوران کو جوڑا پھر دوسرا پیالہ منگوا کر واپس کیا۔ ❸

ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ سے برہم ہو کر بلند آواز سے باتیں کر رہی تھیں، اتفاقاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آ گئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو پکڑ کر تھپڑ مارنا چاہا کہ تو رسول اللہ ﷺ سے چلا کر بولتی ہے، آنحضرت ﷺ بیچ میں آ گئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے آڑے آ گئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غصہ میں بھرے ہوئے باہر چلے گئے، آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ''کیوں؟ کس طرح تم کو بچا لیا۔'' چند روز کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے، تو وہ حالت بدل چکی تھی، بولے: مجھ کو بھی صلح میں شریک کیجیے۔ جیسا کہ اس موقع پر میں نے جنگ میں شرکت کی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں اور ہاں۔'' ❹

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ ''تو مجھ سے جب ناراض ہوتی ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں۔'' بولیں: کیونکر؟ ارشاد ہوا: ''جب تو خوش رہتی ہے (اور کسی بات پر قسم کھانی ہوتی ہے) تو یوں قسم کھاتی ہے۔ محمد ﷺ کے خدا کی قسم! اور جب ناراض ہو جاتی ہے تو کہتی ہے ابراہیم علیہ السلام کے خدا کی قسم!'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا، ہاں یارسول اللہ! میں صرف آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں۔ ❺

---

❶ بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافك: ٤١٤١۔ ❷ بخاری، کتاب الادب، باب ما جاء فی قول الرجل ویلك: ٦١٦١۔ ❸ بخاری میں یہ روایت کتاب النکاح، باب الغیرۃ: ٥٢٢٥ کے ذیل میں ہے لیکن ازواج کے نام نہیں نسائی میں نام کی تصریح ہے۔ لیکن روایت میں کسی قدر اختلاف ہے۔ نسائی: ٣٤٠٧؛ ابو داود: ٣٥٦٧، ٣٥٦٨۔

❹ ابو داود، کتاب الادب، باب ماجاء فی المزاح: ٤٩٩٩۔

❺ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فی فضل عائشة: ٦٢٨٥۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا شادی کے وقت بہت کمسن تھیں اور لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ اتفاقاً آ جاتے تو لڑکیاں بھاگ جاتیں، آپ ﷺ ان کو بلا کر حضرت عائشہ کے پاس بھیج دیا کرتے۔ ❶

حبشی ایک چھوٹا سا نیزہ رکھتے ہیں جس کو حراب کہتے ہیں اور جس طرح ہمارے ملک میں پٹہ ہلاتے ہیں حبشی اس سے کھیلتے ہیں، ایک دفعہ عید کے دن حبشی یہ تماشا دکھا رہے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، آنحضرت ﷺ آگے کھڑے ہو گئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دوش مبارک پر رخسارے رکھ کر تماشا دیکھنے لگیں اور دیر تک دیکھتی رہیں یہاں تک کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیوں ابھی تک تم سیر نہیں ہوئیں۔'' بولیں نہیں آپ ﷺ چپ ہو رہے یہاں تک کہ خود تھک کر ہٹ گئیں۔ ❷

ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا گڑیوں سے کھیل رہی تھیں، آنحضرت ﷺ باہر سے تشریف لائے گڑیوں میں ایک گھوڑا بھی تھا جس کے پر بھی تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کیا ہے۔'' بولیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے گھوڑوں کے پر بھی تھے، آپ نے تبسم فرمایا۔ ❸ عوام میں مشہور ہے کہ پہلے گھوڑوں کے پر ہوتے تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس بنا پر کہ گھوڑوں کی سیر میں ان کی نماز قضا ہوگئی تھی پر کٹوا دیے، اس وقت سے پر جاتے رہے لیکن نشان اب بھی باقی ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ ''آؤ تیز قدمی میں مقابلہ کریں۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس وقت تک دبلی پتلی تھیں آگے نکل گئیں، جب سن زیادہ ہوا اور پُر اندام ہوگئیں تو پھر مسابقت کی نوبت آئی، اب کے وہ پیچھے رہ گئیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ اس دن کا جواب ہے۔'' ❹

ازواجِ مطہرات اور اہل وعیال کی سادہ زندگی

انسان بذات خود فاقہ کشی کر سکتا ہے، سخت سے سخت تکلیفیں اٹھا سکتا ہے، زخارف دنیوی کو کلیتہً چھوڑ سکتا ہے لیکن وہ اپنے اعزہ واقربا یا مخصوص عزیز ترین اولاد کو اس قسم کی سادہ اور متقشفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جن لوگوں نے راہبانہ زندگی بسر کی ہے انہوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ اہل وعیال کے جھگڑوں سے الگ رکھا ہے دنیا کی مذہبی تاریخ میں صرف آنحضرت ﷺ کی زندگی اس کلیہ کی ایک مستثنیٰ مثال ہے۔ آپ ﷺ کے ۹ بیبیاں تھیں جن میں بعض ناز ونعمت میں پلی تھیں اور اکثر معزز گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں، اس لیے ان کا قدرتی میلان غذا ہائے لطیف اور لباس ہائے فاخرہ کی طرف ہو سکتا تھا، متعدد صغیر السن بچے تھے جن کو کھانے پہننے کی ہر خوشگوار اور خوشنما چیز اپنی طرف مائل کر سکتی تھی۔

---

❶ ایضاً:٦٢٨٧۔ ❷ مسلم، کتاب صلاة العيدين، باب الرخصة في اللعب الذي لا معصية فيه: ٢٠٦٤، ٢٠٦٥۔ ❸ ابو داؤد کتاب الادب، باب اللعب بالبنات:٤٩٣٢۔

❹ ابو داود، كتاب الجهاد، باب في السبق على الرجل:٢٥٧٨۔

آنحضرت ﷺ کو جیسا کہ اوپر کے واقعات سے معلوم ہوا ہوگا اعزہ، اولاد اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ سخت محبت تھی آپ نے رہبانیت کا بھی قلع قمع کر دیا تھا اور فتوحات کی کثرت مدینہ میں مال وزر کے خزانے لٹا رہی تھی لیکن بایں ہمہ آنحضرت ﷺ نے اپنی ذات کی طرح ان کو بھی زخارف دنیوی کا خوگر نہیں بنایا بلکہ ہر موقع پر روک ٹوک کی، اس بنا پر آپ کے تمام خاندان کی زندگی آپ کے اسوۂ حسنہ کا اعلیٰ ترین مظہر بن گئی۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی محبوب ترین اولاد تھیں، لیکن انھوں نے آپ کی محبت سے کوئی دنیوی فائدہ نہیں اٹھایا، ان کی عام خانگی زندگی یہ تھی کہ اس قدر چکی پیستی تھیں کہ ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے، بار بار مشک میں پانی بھر بھر کر لانے سے سینے پر گٹے پڑ گئے تھے، گھر میں جھاڑو دیتے دیتے کپڑے چیکٹ ہو جاتے تھے، چولہے کے پاس بیٹھتے بیٹھتے کپڑے دھوئیں سے سیاہ ہو جاتے تھے [1] لیکن بایں ہمہ جب انھوں نے آنحضرت ﷺ سے ایک بار گھر کے کاروبار کیلئے ایک لونڈی مانگی اور ہاتھ کے چھالے دکھائے تو آپ ﷺ نے صاف انکار کر دیا کہ یہ فقرا و یتامیٰ کا حق ہے۔

ایک دفعہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے دیکھا کہ انہوں نے ناداری سے اس قدر چھوٹا دوپٹہ اوڑھا ہے کہ سر ڈھانکتی ہیں تو پاؤں کھل جاتے ہیں اور پاؤں چھپاتی ہیں تو سر برہنہ رہ جاتا ہے۔ [2]

صرف یہی نہیں کہ خود عام طریقہ اظہارِ محبت کے خلاف ان کو آرائش و زیب و زینت کی کوئی چیز نہیں دیتے تھے بلکہ اس قسم کی جو چیزیں ان کو دوسرے ذرائع سے ملتی تھیں، ان کو بھی ناپسند فرماتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو سونے کا ایک ہار دیا، آپ ﷺ کو معلوم ہوا تو فرمایا: ''کیوں فاطمہ! کیا لوگوں سے یہ کہلوانا چاہتی ہو کہ رسول اللہ ﷺ کی لڑکی آگ کا ہار پہنتی ہے۔'' چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس کو فوراً بیچ کر اس کی قیمت سے ایک غلام خرید لیا۔ [3]

ایک دفعہ آپ ﷺ کسی غزوہ سے تشریف لائے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بطور خیر مقدم کے گھر کے دروازوں پر پردہ لگایا اور امام حسن و امام حسین رضی اللہ عنہما کو چاندی کے کنگن پہنائے۔ آپ ﷺ حسب معمول حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے یہاں آئے تو اس دنیوی ساز و سامان کو دیکھ کر واپس گئے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آپ کی ناپسندیدگی کا حال معلوم ہوا تو پردہ چاک کر دیا اور بچوں کے ہاتھ سے کنگن نکال ڈالے، بچے آپ کی خدمت میں روتے ہوئے آئے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ میرے اہل بیت ہیں میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ ان

[1] ابو داود، کتاب الادب، باب فی التسبیح فی النوم: ٥٠٦٣۔

[2] ابوداود، کتاب اللباس، باب فی العبد ینظر الی شعر مولاته: ٤١٠٦۔

[3] نسائی، کتاب الزینة، باب الکراهیة للنسآء فی اظهار الحلی: ٥١٤٣۔

زخارف دنیا سے آلودہ ہوں، اس کے بدلے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے ایک عصب کا ہار اور ہاتھی دانت کے دو کنگن خرید لاؤ۔'' ❶ ازواج مطہرات کے ساتھ آپ ﷺ کو جو محبت تھی اس کا اظہار کبھی دنیا دارانہ طریقہ سے نہیں ہوتا تھا، چنانچہ ازواج مطہرات نے جب اچھے کھانے اور اچھے لباس کی خواہش ظاہر کی تو آپ ﷺ نے ان سے ایلاء کرلیا۔ تمام ازواج میں آپ ﷺ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سب سے زیادہ محبوب تھیں لیکن یہ محبت رنگین لباس اور سنہرے زیوروں کی صورت میں کبھی نہیں ظاہر ہوئی۔ تمام بیبیوں کا جو لباس تھا وہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بھی تھا چنانچہ وہ خود فرماتی تھیں:

ما كانت لا حدانا الا ثوب واحد۔ ❷

''ہم تمام بیبیوں کے پاس صرف ایک ایک جوڑا کپڑا تھا۔''

اگر کبھی اس کے خلاف ان کے بدن پر دنیوی آرائش کے سروسامان نظر آتے تو آنحضرت ﷺ ان کو منع فرماتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے سونے کے کنگن پہنے (مسکہ) آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر ورس کے کنگن زعفران سے رنگ کر پہنتیں تو بہتر ہوتا۔'' ❸ (تمام اہل وعیال وخانوادۂ نبوت کو ممانعت تھی کہ وہ پرتکلف و ریشمی لباس اور سونے کے زیور استعمال کریں۔ آپ ﷺ ان سے فرمایا کرتے تھے کہ ''اگر تم کو اس کی تمنا ہے کہ یہ چیزیں جنت میں ملیں تو دنیا میں ان کے پہننے سے پرہیز کرو۔'' ❹

انتظامِ خانگی

اگرچہ ازواج مطہرات کی تعداد ایک زمانہ میں ۹ تک پہنچ گئی تھی اور اس وجہ سے خانہ داری کے بہت سے بکھیڑے تھے تاہم آپ ﷺ کو خود بہ نفسِ نفیس ان چیزوں سے سروکار نہ تھا، اپنی ذات کی نسبت تو التزام تھا کہ جو کچھ آتا دن کے دن صرف ہو جاتا، یہاں تک کہ اگر دے دلا کر کچھ باقی رہ جاتا تو آپ اس وقت تک گھر میں نہ جاتے جب تک وہ بھی کار خیر میں صرف نہ ہو جاتا لیکن ازواجِ مطہرات اور مہمانوں کے کھانے پینے، رہنے سہنے کا انتظام حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے متعلق تھا۔ ابوداؤد میں عبداللہ ہوزنی سے روایت ہے کہ میں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کے خانگی انتظام کا کیا حال تھا؟ انہوں نے کہا: آنحضرت ﷺ کا تمام کاروبار میرے سپرد تھا اور آغاز سے اخیر زمانۂ وفات تک میرے ہاتھ میں رہا تھا۔ معمول تھا کہ جب کوئی نادار مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، تو مجھ کو ارشاد ہوتا، میں جا کر کہیں سے

❶ ابوداود، كتاب الترجل، باب ماجاء فى الانتفاع بالعاج:٤٢١٣۔

❷ بخاری، كتاب الحيض، باب هل تصلى المرأة فى ثوب حاضت فيه:٣١٢۔

❸ نسائی، كتاب الزينة، باب كراهية للنسآء فى اظهار الحلى:٥١٤٦۔

❹ نسائی، كتاب الزينة، باب كراهية للنسآء فى اظهار الحلى: ٥١٣٩۔

قرض لاتا اور اس کے کھانے کپڑے کا انتظام کر دیتا۔ ❶

اہل وعیال کے مصارف کا انتظام

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے لیے یہ انتظام تھا کہ بنو نضیر کے نخلستان میں ان کا حصہ مقرر کر دیا گیا تھا، وہ فروخت کر دیا جاتا جو سال بھر کے مصارف کے لیے کافی ہوتا۔ ❷ خیبر فتح ہوا تو تمام ازواج کے لیے فی کس ۸۰ وسق کھجور اور ۲۰ وسق جو سالانہ مقرر ہو گیا تھا۔ وسق ۶۰ صاع کا ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بعض ازواج نے جن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں پیداوار کے بدلے زمین لے لی۔ ❸

تم المجلدُ الثانی من السیرۃ النّبویۃ علٰی صاحبہا الصّلوٰۃ والتحیّۃ۔

❶ ابوداود، کتاب الخراج، باب فی الامام یقبل هدایا المشرکین:۳۰۵۵۔

❷ بخاری، کتاب فرض الخمس: ۳۰۹۴۔

❸ بخاری، کتاب الحرث والمزارعة، باب المزارعة بالشطر:۲۳۲۸۔



سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

تخریج شدہ ایڈیشن

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب



سیرۃ النبی ﷺ

تالیف

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ اسلامیہ

تخریج شدہ ایڈیشن

حصہ سوم

سیرۃ النبی ﷺ

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب

اس کے مقدمے میں معجزے کی حقیقت، اس کے وقوع پر جدید و قدیم فلسفے، علم کلام اور قرآن مجید کے تناظر میں سیر حاصل بحث ہے، پھر دلائل و خصائل نبوت کا بیان ہے، اسی طرح قرآن و حدیث میں مذکور آیات و معجزات اور اس سلسلے میں غیر معتبر روایات مع تنقید درج ہیں۔ سابقہ آسمانی کتب میں نبی کریم ﷺ کی آمد کی بشارات بھی اس جلد کا خاص حصہ ہیں۔

تالیف

علامہ شبلی نعمانی

علامہ سید سلیمان ندوی

مکتبہ اسلامیہ

کتاب ---------------- سیرۃ النبی ﷺ

تالیف ---------------- علامہ شبلی نعمانی ، علامہ سید سلیمان ندوی

ناشر ---------------- محمد سرور عاصم

اشاعت ---------------- اکتوبر 2012ء

قیمت ----------------

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون: 042-37244973 فیکس: 042-37232369

بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد۔ پاکستان فون: 041-2631204, 2034256

E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

فہرست مضامین سیرۃ النبی ﷺ حصہ سوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

دیباچہ طبع سوم

سیرت النبی ﷺ کی یہ تیسری جلد جو آنحضرت ﷺ کے منصبِ نبوت، حقیقتِ نبوت اور فضائل و معجزات پر مشتمل ہے، تیسری دفعہ چھپ کر اب منظر عام پر آ رہی ہے، اس اثنا میں بعض مباحث پر جدید تحقیقیں سامنے آئیں، اس لیے پوری کتاب پر نظر ثانی کی گئی، روایتوں اور حوالوں کو اصل ماخذوں سے دوبارہ ملایا گیا، اگر اختلاف نظر آیا تو تصحیح کی گئی، کوئی پہلے سے زیادہ مستند حوالہ ملا تو اس کا اضافہ کیا گیا، کوئی عبارت اگر مشتبہ تھی تو اس کے شبہ کو دور کیا گیا، خصوصیت کے ساتھ معراج کے جسمانی و روحانی، یا حالت بیداری یا خواب کے ہونے کے مسئلہ کو صاف کیا گیا۔

معجزات کی روایتوں کی اصل سے پھر تطبیق کی گئی اور کہیں کہیں حواشی کے اضافہ سے بعض نئے فوائد بڑھائے گئے، کہیں کہیں عبارت کے اغلاق کو بھی دور کیا گیا ہے۔

ایک ظلوم وجہول انسان کی طاقت میں تحقیق کی جو حد تھی، اس نے اپنی وسعت کے مطابق وہ پوری صرف کی ہے، اس پر بھی عصمت کا دعویٰ نہیں، اہلِ نظر سے التماس ہے کہ اگر اب بھی کوئی قابلِ اصلاح چیز نظر آئے تو مؤلف کو مطلع کر کے جزائے خیر کے مستحق ہوں۔

حسنِ خاتمہ کا طالب

سید سلیمان ندوی

۱۶/شوال ۱۳۷۷ھ۔ ۳۱/اگست ۱۹۴۷ء،

دارالقضاء بھوپال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى اله واصحابه اجمعين.

خدا کا شکر ہے کہ اس نے چند در چند مزاحمتوں کے باوجود سیرت پاک کی تیسری جلد کی تکمیل وانجام کا سامان بہم پہنچایا اور ایک گناہگار کو توفیق بخشی کہ ان اوراق کو ترتیب دے کر اپنے سیاہ اعمال نامہ کے دھونے کے لیے آب رحمت کے چند قطرے فراہم کر سکے، دوسری جلد ۱۳۳۸ھ (۱۹۲۰ء) میں چھپ کر نکلی تھی، چار برس کے بعد یہ ۹۰۰ [1] صفحوں کا مجموعہ مشتاق نگاہوں کے سامنے ہے، اس مجموعہ کی تالیف وترتیب، واقعات کی تفتیش وتلاش اور مسائل ونظریات کی بحث وتحقیق میں جو محنت وکاوش اور دیدہ ریزی کی گئی ہے، اس کا بڑا صلہ یہی ہے کہ صواب کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹا ہو اور حقیقت کی منزل سے بعد نہ ہوا ہو، (والعصمة لله وحدهٗ)

ان اوراق کی تالیف میں ہم اپنے ان محسنوں کے شکر گزار ہیں جنہوں نے ان کی تکمیل میں ہمارا ہاتھ بٹایا، مشکلات اور غوامض میں مخدومنا مولانا حمید الدین صاحب کے مشوروں نے فائدہ پہنچایا ہے، رفیق کار مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے معجزات کے جزئی واقعوں کے فراہم کرنے میں مدد کی ہے، ہماری جماعت میں بلکہ علما کی جماعت میں پروفیسر مولانا عبدالباری ندوی (معلم فلسفہ جدیدہ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) سے بڑھ کر فلسفہ جدیدہ کا کوئی ماہر نہیں، معجزات کی بحث میں ضرورت تھی کہ اس باب میں فلسفہ جدیدہ کی جو موشگافیاں اور نکتہ آفرینیاں ہیں، ان سے بھی تعرض کیا جائے، چنانچہ میری درخواست پر موصوف نے ''معجزات اور فلسفہ جدیدہ'' کا باب لکھ کر عنایت کیا ہے، جو اس کتاب کے ص ۱۱۷ سے شروع ہو کر ص ۳۱۰ پر تمام ہوا ہے۔

کہیں کہیں آپ کو احادیث کی بعض غیر مطبوعہ کتابوں مثلاً: بیہقی، ابویعلیٰ، ابن راہویہ، ابن ابی شیبہ، بزار وغیرہ کے حوالے دوسری مطبوعہ کتب احادیث کے حوالوں کے ساتھ تائیداً ملیں گے، ہم نے ان کے حوالوں میں دوسرے مفسرین، شارحینِ حدیث اور مصنفینِ سیرت مثلاً: ابن کثیر، ابن حجر، ابن قیم، سیوطی وغیرہ پر بھروسہ کیا ہے، معجزات کے جزئی واقعات میں ایک دو مقام پر قوی روایتوں کے ساتھ اگر ضعیف روایتوں کو جگہ دی گئی ہے تو ان سے مقصود صرف یہ ہے کہ قوی روایتوں سے جس نوع کے معجزات ثابت ہیں، اس نوع کے معجزات کی دوسری تائیدیں بھی گو اس رتبہ کی نہیں، مگر موجود ہیں۔ کتاب میں کہیں کہیں غلطیاں رہ گئی ہیں، جن کی آخر میں غلط نامہ [2] کے اضافہ سے تلافی کی کوشش کی گئی ہے۔

[1] کتاب کی چھوٹی تقطیع کے پچھلے ایڈیشن کے لحاظ سے یہ لکھا گیا ہے۔ [2] اب جدید طباعت میں یہ اغلاط دور کر دی گئی ہیں۔

اس راہ کی ایک منزل آج اور تمام ہوئی، لیکن قلم کے مسافر کو آرام نہیں کہ اب چوتھی منزل اس کے سامنے ہے، احباب دعا کریں کہ یہ جلد چہارم ان کی خدمت میں جلد پیش ہو سکے۔

سید سلیمان ندوی

۱۷/ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دلائل و معجزات

﴿ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۳۲)

”اور ہمارے پیغمبر لوگوں کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے۔“

روحانی نوامیس کا وجود

سیرتِ نبوی کا یہ حصہ آنحضرت ﷺ کے ان حالات، مشاہدات اور کیفیات کے بیان میں ہے جن کا تعلق اس عالم سے ہے جو ہمارے اس مادی عالم اور اس کے مادی قوانین کی حدود سے باہر ہے، جس طرح ہماری یہ مادی دنیا ایک نظام خاص پر چل رہی ہے، مثلاً: رات کے بعد دن نمودار ہوتا ہے، خزاں کے بعد بہار آتی ہے، ستارے غروب ہوتے ہیں تو آفتاب نکلتا ہے، گرمی جاتی ہے تو جاڑے آتے ہیں، پھول اپنے وقت پر کھلتے ہیں، درخت اپنے موسم میں پھلتے ہیں، ستارے اپنے معین اوقات پر ڈوبتے اور نکلتے ہیں، اسی طرح روحانی عالم بھی اپنا ایک خاص نظام رکھتا ہے، اس کا بھی ایک آسمان و زمین ہے، وہاں بھی تاریکی اور روشنی ہے، خزاں اور بہار ہے، فصل و موسم ہے۔

؎ آسماںہاست در ولایتِ جاں کار فرمائے آسمانِ جہاں

نبوت کے فطری و روحانی آثار

جب روئے زمین پر گناہوں کی تاریکی اور بدیوں کی ظلمت محیط ہوجاتی ہے تو صبح کا تڑکا ہوتا ہے اور آفتابِ ہدایت نمودار ہوتا ہے، باغِ عالم میں جب برائیوں کی خزاں چھا جاتی ہے، تو موسم بدلتا ہے اور بہار نبوت [1] رونق افزا ہوتی ہے اور جس طرح زمین، آسمان، چاند، سورج، پھل اور پھول کے خاص خاص قوانینِ فطرت ہیں، جن میں عموماً تغیر نہیں ہوتا، اسی طرح دنیا کی رشد و ہدایت، عذاب و رحمت اور نبوت و رسالت کے خاص خاص اصول و قواعد ہیں، جن میں تغیر راہ نہیں پاتا، انبیا اور رسل اپنے اپنے وقت پر مبعوث ہو کر قوموں کو دعوت دیتے ہیں، قومیں ان کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہیں، منکرین ہلاک اور مومنین کامیاب ہوتے ہیں اس روحانی جہاد میں انبیا و رسل سے ہمارے علم و دانش سے بالا ... صادر ہوتے ہیں اور ان سے عجیب عجیب خوارق ظہور

[1] خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کے وجود باوجود سے پہلے انبیا کا سلسلہ جاری رہا، حضور کی آمد کے بعد جانشینانِ نبوت محمدی یعنی مجددینِ امت اس فرض کو انجام دیتے ہیں، یہ مجددین ملتِ رسول ﷺ کے متبع کامل ہوتے ہیں اور منصب نبوت سے عاری ہوتے ہیں، اسی لیے ان کے انکار سے کفر لازم نہیں آتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں مختلف ملکوں میں یا ایک ہی ملک کے مختلف حصوں میں یا جماعتوں میں مختلف مجددین ملـ ... ں، ان کی پہچان کا سب سے بڑا معیار عقائد و اعمال، اخلاق اور طرقِ دعوت میں رسول اکرم ﷺ کا اتباع کامل ہے، ان کا کام یہ ہے کہ وقت کے اوہام و رسوم و اعمال کو جو باہر سے آ کر دین میں شامل ہوگئے ہیں، دور کریں اور امورِ دین میں جو امور مٹ گئے ہوں، ان کو دوبارہ جاری کریں۔

پذیر ہوتے ہیں۔

نبوت کے روحانی نوامیس انسانی قوانین پر حکمران ہیں

جس طرح ہمارا نفس اور ہماری روح یا ہمارے جسم کی پر اسرار مخفی قوت ہمارے کالبد خاکی پر حکمران ہے اور ہمارے تمام اعضاء وجوارح اس کے ایک ایک اشارہ پر حرکت کرتے ہیں، اسی طرح نبوت کی روحِ اعظم اذنِ الٰہی سے سارے علمِ جسمانی پر حکمراں ہوجاتی ہے اور روحانی دنیا کے سنن واصول عالم جسمانی کے قوانین پر غالب آجاتے ہیں اس لیے وہ چشم زدن میں فرشِ زمین سے عرشِ بریں تک عروج کرجاتی ہے، سمندر اس کی ضرب سے تھم جاتا ہے، چانداس کے اشارہ سے دوٹکڑے ہوجاتا ہے، اس کے ہاتھوں کی دی ہوئی چند خشک روٹیاں ایک عالم کو سیر کردیتی ہیں، اس کی انگلیوں سے پانی کی نہریں بہتی ہیں، اس کے نفس پاک سے بیمار تندرست ہوجاتے ہیں اور مردے جی اٹھتے ہیں، وہ تنہا مٹھی بھر خاک سے پوری فوج کو تہ وبالا کردیتا ہے، کوہ و صحرا، بحر وبر، جاندار وبے جان بحکمِ الٰہی اس کے آگے سرنگوں ہوجاتے ہیں، وہ اس کا نہیں بلکہ اس کے رب کا فعل ہوتا ہے اور اسی کی مشیت اور قدرت سے پیغمبر کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے ہیں، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے ظاہر کیے جاتے ہیں۔

نبوت کے روحانی نوامیس کے اسباب وعلل سے ہم اسی طرح لاعلم ہیں جس طرح جسمانی قوانین کے

لیکن جس طرح ہم کبھی یہ نہیں بتا سکتے کہ خاص خاص پھول، خاص خاص درخت، خاص خاص ستارے، فلاں فلاں معین اوقات پر ہی کیوں جلوہ نما ہوتے ہیں؟ پھول سرخ کیوں ہوتے ہیں؟ ستارے چمکتے کیوں ہیں؟ شہد میٹھا کیوں ہوتا ہے؟ چانداور سورج چلتے کیوں ہیں؟ تخم، درخت، غذا، خون، گوشت کیونکر بن جاتا ہے؟ اسی طرح اس کا جواب بھی نہیں دے سکتے کہ پیغمبروں کا ظہور اپنے اپنے وقت پر کیونکر ہوتا ہے اور ان سے یہ مافوق العادۃ افعال واعمال بحکم الٰہی کیونکر صادر ہوتے ہیں؟ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ ہوتے ہیں چنانچہ دنیا کا ہر پیغمبر بلکہ روحانیت کا ہر حامل اپنی پراسرار زندگی کے اندر اس قسم کے حالات وکیفیات کی ایک دنیا رکھتا ہے، عالم کی تاریخ آپ کے سامنے ہے، جس میں اگر قوموں کے روحانی معلموں کے حالات وسوانح غور سے پڑھیں تو آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا کہ وہ، وہ کچھ دیکھتے تھے، جو ہم نہیں دیکھ سکتے، وہ، وہ کچھ سنتے تھے جو ہم نہیں سن سکتے، وہ، وہ کچھ جانتے تھے جو ہم نہیں جان سکتے اور ان سے وہ اعمال بھی صادر ہوتے تھے جو کسی اور سے نہیں ہوسکتے، یہ تاریخی واقعات ہیں جن سے انکار کرنا اسی طرح ناممکن ہے، جس طرح سکندر اور نپولین کی فتوحات اور بودھ اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے وجود سے۔ ہندوستان کی روحانی داستان کا ایک ایک حرف، اسرائیلی نبیوں کے صحیفوں کا ایک ایک باب اور عیسائیوں کی انجیل کا ایک ایک صفحہ اس تاریخ کی مثالیں اور نظیریں ہیں۔

انبیا کا اصلی معجزہ خود ان کا سرتاپا وجود ہے

گو پیغمبر کا اصلی معجزہ اور اس کے منجانب اللہ ہونے کی کھلی نشانی خود اس کا سرتاپا وجود ہوتا ہے، دیکھنے والوں کے لیے اس کی چشم وابرو میں اور سننے والوں کے لیے اس کے لب ولہجہ میں اور سمجھنے والوں کے لیے اس کے پیام ودعوت میں اعجاز ہوتا ہے لیکن جو لوگ احساسِ حقیقت میں فروتر ہوتے ہیں ان کو اس سے تسکین نہیں ہوتی اور وہ مادی اور محسوس نشانیوں کے طلب گار ہوتے ہیں جو بالآخر ان کو دی جاتی ہیں۔

انبیا کے کامل پیرو اُن سے معجزہ نہیں مانگتے تھے

لیکن انبیا کے تبعین میں سے سابقین اولین اور صدقین وصالحین نے اپنے پیغمبروں سے معجزہ طلب نہیں کیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر ان کو پیغمبر تسلیم نہیں کیا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے ان کا معجزہ دیکھ کر آسمانی دولت کا حصہ نہیں پایا تھا، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سب سے پہلے آنحضرت ﷺ پر ایمان لائیں مگر چاند کے دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھ کر نہیں، بلکہ یہ جان کر کہ ''آپ ﷺ غریبوں کے دست وبازو ہیں، قرضداروں کی تسکین اور سہارا ہیں، مسافروں کے ملجا وماویٰ ہیں۔'' [1] حضرت ابوبکر وعمر اور عثمان وعلی اور دیگر اصحاب کبار رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک نے بھی آپ ﷺ کی صداقت اور راستی کی حقیقت کو ظاہری آیات ومعجزات کی روشنی میں تلاش نہیں کیا، ان کے لیے آپ کا سرتاپا وجود نفس دعوت حق اور پیام اخلاص ہی معجزہ تھا، انہوں نے اسی کو دیکھا اور اسی سے ایمان کی دولت پائی۔

معاندین معجزوں کے بعد ایمان نہیں لائے

مگر نمرود وفرعون وابوجہل اور ابولہب جو آتش خلیل، طوفان نیل، قحط مکہ اور انشقاق قمر کے معجزوں کے طالب تھے پھر بھی ایمان کی دولتِ عظمیٰ سے محروم رہے، لیکن بایں ہمہ ایک درمیانی طبقہ بھی دنیا میں موجود رہا ہے جس کی بصیرت کے آئینہ پر غفلت کے زنگ کی کچھ کچھ چھائیاں پڑی ہوتی ہیں، جب حقیقت کا آفتاب طلوع ہوتا ہے اور اس کی معجزانہ کرنیں ان آئینوں پر پڑتی ہیں تو وہ چمک اٹھتے ہیں اور ﴿ اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴾ (۲۰/ طٰهٰ: ۷۰) پکار اٹھتے ہیں۔

معجزوں سے کن کو فائدہ پہنچتا ہے؟

فرعون کے ساحروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کو دیکھا تو موسیٰ وہارون علیہما السلام کے خدا کے آگے سجدہ میں گر پڑے، آنحضرت ﷺ کی فتح روم کی پیشین گوئی پوری ہوئی، تو قریش کے نیک طبع لوگوں کی چشم باطن کھل گئی اور حقیقت کا پیکر ان کے سامنے جلوہ نما ہوگیا۔ [2] یہی طبقہ ہے جس کو معجزات کی ظاہری نشانیوں سے بقدر استعداد حصہ پہنچتا ہے، اس کے علاوہ معجزات کا بڑا حصہ مؤیدات یعنی تائید حق کے لیے غیر منتظر اور غیر

[1] صحيح بخاري، كتاب بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي: ٣۔

[2] جامع ترمذي، ابواب تفسير القرآن، تفسير سورة الروم: ٣١٩٤۔

متوقع حالات کا رونما ہونا ہے، مومنین صادقین کو مشکلات کے عالم اور اضطراب کی گھڑیوں میں ان کے ذریعہ سے تسکین دی جاتی ہے اور رسوخ ایمانی اور ثبات قدم مرحمت ہوتا ہے، ان کی بے سروسامانیوں اور بے نوائیوں کی مکافات کی جاتی ہے اور اس سے ان کی دولت ایمانی کا سرمایہ ترقی کرتا ہے۔

ان واقعات کا اصطلاحی نام

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام سے جو یہ مافوق العادت کیفیات اور اعمال صادر ہوتے ہیں ان کے لیے عام طور پر معجزہ کا لفظ بولا جاتا ہے، لیکن یہ اصطلاح کئی حیثیتوں سے غلط ہے، اول تو اس لیے کہ قرآن مجید اور احادیث میں یہ لفظ مستعمل نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی جگہ آیت (نشانی) اور برہان (دلیل) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو اپنے مفہوم کو نہایت خوبی سے ظاہر کرتے ہیں قدیم محدثین نے ان کی جگہ دلائل اور علامات کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جو الفاظ قرآنی کے ہم معنی ہیں، دوسرے یہ کہ عام استعمال کی بنا پر ''معجزہ'' کے ساتھ کچھ خاص لوازم ذہنی پیدا ہو گئے ہیں جو حقیقت میں صحیح نہیں ہیں، مثلاً: اس لفظ سے عوام میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ وہ خود پیغمبر کا فعل ہوتا ہے، جس کا صدور خاص اس کے اعضاء و جوارح سے ہوتا ہے اور نیز یہ کہ اس لفظ کے سبب سے اس کا معجزہ ہونا گویا اس کی حقیقت میں داخل ہو گیا ہے، حالانکہ یہ دونوں خیال غلط ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ معجزہ پر عقلی حیثیت سے جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کا ایک بڑا حصہ خود لفظ معجزہ کے غلط استعمال سے پیدا ہو گیا ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم کو ایک ایسا جامع لفظ درکار ہے جس میں نبوت کے تمام خواص کیفیات، مشاہدات اور اعمال خارقہ عادت و غیر خارقہ عادت سب داخل ہیں، لیکن معجزہ کا لفظ اتنا وسیع نہیں آئندہ جہاں از روئے قرآن معجزہ کی حقیقت پر بحث آئے گی وہاں اس کے متعلق مزید تفصیل کی جائے گی، جس سے معلوم ہوگا کہ قرآن پاک کی اصطلاح کس قدر صحیح اور موزوں ہے، ان وجوہ کی بنا پر صحیح طریقہ یوں ہے کہ ہم اس کتاب میں صرف قرآن کی اصطلاح آیت، برہان اور محدثین کی اصطلاح علامات و دلائل کو اختیار کریں، تاکہ ہمارا مفہوم زیادہ صحیح طریقہ سے اور زیادہ وسیع طور سے ادا ہو سکے، لیکن چونکہ ہماری زبان میں معجزہ کا لفظ عام طور پر چل گیا ہے اس لیے اس کو یک قلم ترک بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دلائل و براہین و آیات کا تعلق انبیا کی سیرتوں سے

قرآن مجید اور دیگر صحف آسمانی میں انبیائے سابقین علیہم السلام کے جو قصص اور واقعات مذکور ہیں، ان میں ان کے روحانی حالات و کیفیات یعنی دلائل و براہین اور آیات کا ذکر نہایت مؤثر اور عبرت انگیز طریقہ سے کیا گیا ہے، سیرِ ملکوت، مکالمۂ الٰہی، رؤیتِ ملائکہ، رؤیائے صادقہ، استجابتِ دعا، طوفانِ نوح، آتشِ خلیل، عصائے موسیٰ، نفسِ عیسیٰ علیہم السلام اور اس قسم کے اور بھی بہت سے کیفیات و حالات کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا

ہے اور ان کے ساتھ ان کے عواقب و نتائج بھی نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیا علیہم السلام کی سیرت سے ہر زمانہ میں ان چیزوں کا خاص تعلق رہا ہے اور اس وجہ سے وہ ان کے واقعات زندگی کا جزو لاینفک ہو گئے ہیں۔

انبیا علیہم السلام کی زندگی اگرچہ گوناں گوں واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے لیکن نتائج کے لحاظ سے ان تمام واقعات کا مرکز صرف یہ ہوتا ہے کہ اس خاکدان کو اخلاقِ ذمیمہ کے خس و خاشاک سے پاک کر کے محاسن اخلاق کے گل و ریحان سے آراستہ کیا جائے، تاکہ برکات آسمانی کا دامن کانٹوں سے نہ الجھنے پائے، اس مقدس فرض کے ادا کرنے میں اگرچہ کبھی کبھی انبیا علیہم السلام کو مادی آلات سے بھی کام لینا پڑتا ہے لیکن وہ لوگ اکثر اپنی روحانی طاقت سے اس مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں اور مادی آلات کے استعمال میں بھی ان کے جسمانی دست و بازو سے زیادہ ان کے روحانی دست و بازو کام کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے انبیا علیہم السلام کے واقعاتِ زندگی میں ان دلائل و آیات کو نہایت اہمیت دی ہے اور ان کے ذکر سے گویا انبیا علیہم السلام کے تمام حالاتِ زندگی کو سلسلہ علل و اسباب سے مربوط کر دیا ہے۔

دلائل و آیات کا تعلق سیرت محمدی ﷺ سے

آنحضرت ﷺ کی سیرت تمام انبیا علیہم السلام کے واقعات زندگی کا خلاصہ، ان کی تعلیمات کا عطر اور ان کے حالات و مشاہدات کا برزخ ہے، آپ ﷺ ایک عالمگیر اور ابدی مذہب لے کر مبعوث ہوئے تھے، اس لیے آپ نے ایک ہی خطاب کے ساتھ ان تمام لوگوں کو مخاطب فرمایا، جن کو طوفان نوح دفعتہً بہا لے گیا تھا۔ جن کو دریائے قلزم کی نہریں نگل چکی تھیں۔ جن کو نفسِ عیسیٰ علیہ السلام نے دوبارہ زندہ کر دیا تھا اور ان سب سے بڑھ کر آپ کا مخاطب ایک گروہ اور بھی تھا جو ان چیزوں کو صرف عجائب پرستی کی نگاہ سے نہیں، بلکہ ژرف نگاہی سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا، اس بنا پر جس چشمۂ فیض نے اسباطِ موسیٰ علیہ السلام کو سیراب کیا تھا وہ ان تشنہ کامانِ روحانیت سے کیونکر بے پروا ہو سکتا تھا، چنانچہ اس نے آنحضرت ﷺ کی ذات کو ان تمام معجزات کا مجموعہ بنا دیا جو اعلیٰ قدرِ مراتب ہر طبقہ، ہر فرقہ اور ہر گروہ کے لیے ضروری تھے، آپ کے اخلاق و عادات معجزہ تھے، آپ کی شریعت معجزہ تھی، آپ پر جو کتاب نازل ہوئی اس سے بڑا کوئی معجزہ نہیں ہو سکتا تھا، ان کے علاوہ آپ کی روحانی طاقت نے جسم و روح دونوں کی کائنات میں بہت کچھ اثر ڈالا، اس نے کبھی طوبیٰ کے سایہ میں آپ کے لیے بستر لگایا، کبھی سدرۃ المنتہیٰ کے حدود میں رفرف کی سواری کھڑی کی، کبھی ﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ﴾ (۵۳/ النجم:۱۱) کے نور سے قلب مبارک کو منور کیا اور کبھی ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ﴾ (۵۳/ النجم:۱۷) کے سرمہ سے آپ کی آنکھوں کو روشن کیا، کبھی نزول رحمت الٰہی کے لیے آسمان کے دروازے کھولے، کبھی وادیٔ حق کے پیاسوں کے لیے زمین کی تہ سے پانی کے چشمے نکالے، کبھی سنگ خارا کے شراروں کی روشنی میں قیصر و

کسریٰ کے خزائے دکھائے، کبھی انبیائے سابقین علیہم السلام کی زبانِ الہام سے اپنی کامیابی کے نغمہ ہائے بشارت سنائے اور آئندہ دنیا کے واقعات غیب بتا کر رہروان عالم کو منزلِ حقیقت کے نشان دکھائے۔

آنحضرت ﷺ کے واقعاتِ زندگی کا سب سے بڑا جزو، غزوات ومحاربات ہیں، ان ہنگامہ خیز واقعات کے تاریخی علل واسباب اوران کے نتائج کا ذکر کتاب کے ایک حصہ میں بہ تصریح گزر چکا ہے لیکن جہاد کے میدان میں آپ کو جوفتوحات عظیمہ حاصل ہوئیں ان میں انسانوں کے لشکراور سپاہیوں کے تیغ وخنجر سے زیادہ فرشتوں کے پرے، دعاؤں کے تیر، توکل علی اللہ کے سپر، اعتماد علی الحق کی تلوار کام کرتی نظر آتی تھی، آپ کی زندگی کا سب سے بڑا فرض اسلام کی اشاعت ہے اور روئے انور نے، نگاہ کیمیا اثر نے، تقریر دلپذیر نے، اخلاقِ اعجاز نمانے آیات ودلائل بن کر بہت سے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا ہے غرض آپ ﷺ کی پیغمبرانہ زندگی کے ہر مظہر میں یہ دلائل، یہ براہین، یہ آیات، یہ معجزات، اسبابِ ظاہری کے پہلو بہ پہلو، اسباب حقیقی بن کر رونما ہوتے رہے ہیں۔

دلائل ومعجزات اور عقلیت

ان دلائل ومعجزات کے الفاظ کو سننے کے ساتھ ہی سب سے پہلے دلوں میں یہ سوال پیدا ہونے لگتا ہے کہ کیا یہ ممکن بھی ہیں؟ کیا عقلِ خردہ گیران کے وقوع کو جائز بھی رکھتی ہے؟ دنیا میں عقل ونقل اور فلسفہ ومذہب کا جب سے وجود ہے ان مباحث پر معرکہ آراء بحثیں ہوتی چلی آئی ہیں، لیکن فلسفہ قدیمہ ہو یا جدیدہ، فلسفۂ یونان ہو یا فلسفہ اسلام، مشرق کا فلسفہ ہو یا مغرب کا، ان سب کا حاصل بحث یہ نکلتا ہے کہ اگر کچھ فرقے ان کو ممکن بلکہ واقع سمجھتے ہیں تو دوسرے ان کو محالِ قطعی تصور کرتے ہیں، عقل وفہم کا یہ اختلاف دنیا میں ہمیشہ سے قائم تھا، قائم ہے اور قائم رہے گا لیکن جولوگ ان چیزوں کے امکان اور وقوع کے قائل ہیں، وہ خود اپنے کج بحث دل اور بدگمان قلب کی تسلی، طمانیت اور رفع شک کے لیے اپنے فہم وادراک کے موافق مختلف نظریے قائم کرتے ہیں، تاکہ وہ اپنی راز جو طبیعت کی تشنہ لبی کو تسکین دے سکیں ان تمام نظریات کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ ان عقل وحواس سے مافوق حقائق کو اپنے دریافت کردہ معلوم ومحسوس قواعد کے مطابق بنا سکیں لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ کیا محسوس وغیر محسوس یا جسمانی وروحانی دنیا دونوں ایک ہی نظام پر چل رہی ہے، کہ ایک عالم کے قیاسِ تمثیلی واستقرائی سے ہم دوسرے عالم کے ثبوت پر شہادتوں کا انبار لگانا چاہتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جو جانا نہیں جا سکتا اس کو ہم جاننا چاہتے ہیں اور جو سمجھا نہیں جا سکتا اس کو سمجھنا چاہتے ہیں جب ہماری عقل وفہم کی لنگ پائی محسوسات کے میدان میں صاف نظر آتی ہے تو ماورا سے محسوسات میں اس کی تگ ودو کہاں تک منزل مقصود کے قریب کر سکتی ہے۔

؎ آنانکہ وصفِ حسن تو تقریر می کنند خواب نا دیدہ راہمہ تعبیر می کنند

بہرحال اب تک انسان نے اس ''خواب نادیدہ'' کی جو کچھ تعبیر کی ہے وہ دین کے اوراق میں پھیلائی گئی ہے اور سلسلہ بحث میں سب سے پہلے فلسفہ قدیمہ کے نظریات کی تشریح کی گئی ہے اور اس کے بعد فلسفہ جدیدہ ان چیزوں کی گرہ کشائی جہاں تک کرسکتا ہے، اس کی تفصیل ہے اور آخر میں خود قرآن مجید نے ہمیں اس باب میں جو کچھ تلقین کی ہے اس کو بیان کیا جائے گا۔

دلائل و معجزات اور فلسفۂ قدیم و علمِ کلام

اسلام میں عقائد کی سطح جب تک صاف اور ہموار رہی، دلائل اور معجزات کے متعلق عقلی مباحث نہ پیدا ہو سکتے تھے اور نہ پیدا ہوئے لیکن دوسری صدی میں جب یونانی علوم کے تراجم مسلمانوں میں پھیلے تو وہ ہمارے علمِ کلام کے ضروری اجزا بن گئے اور ان کو اس درجہ اہمیت ہوگئی کہ اب ان سے تعرض کیے بغیر گویا موضوع مزید بحث کے لیے تشنہ رہ جاتا ہے۔ اہل یونان کسی شریعتِ الٰہی سے مشرف نہ تھے، اس لیے وہ نبوت، خواص نبوت، وحی الہام اور معجزہ وغیرہ سے واقف نہ تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے خاص فلسفہ میں ان مباحث کا وجود نہیں ہے، چنانچہ علامہ ابنِ رشد رحمۃ اللہ علیہ نے تہافۃ التہافہ میں اس کی خاص تصریح کی ہے اور علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تصنیفات میں اس کو جا بجا لکھا ہے۔ مسلمانوں میں سب سے پہلا فلسفی یعقوب کندی ہے، لیکن چند مختصر رسائل کے سوا اس کی عام تصنیفات ناپید ہیں، کندی کے بعد فارابی کا زمانہ ہے اور اسی نے سب سے پہلے ان مسائل کے متعلق اپنے خاص نظریے قائم کیے، چنانچہ اس نے اپنے رسالہ فصوص الحکم [1] میں نبوت اور خواصِ نبوت کے متعلق بہ ترتیبِ حسبِ ذیل خیالات ظاہر کیے ہیں:

فقرہ ۲۸

صاحبِ نبوت کی روح میں ایک قوتِ قدسیہ ہوتی ہے جس طرح تمہاری روح عالمِ اصغر میں (یعنی اپنے جسم میں) تصرف کرتی ہے اور تمہارا جسم تمہاری روح کا تابع و فرمانبردار رہتا ہے، اسی طرح وہ روحِ قدسی عالم اکبر میں یعنی تمام جسمانیات میں تصرف کرتی ہے اور تمام عالم جسمانی اس کا تابع و فرمانبردار رہتا ہے اور اسی بنا پر اس سے خارق فطرت معجزات صادر ہوتے ہیں اور چونکہ اس کا آئینہ باطنی صاف اور زنگ و غبار سے پاک ہوتا ہے، اس لیے لوحِ محفوظ یعنی اس کتاب میں جو کبھی غلط نہیں ہو سکتی اور ملائکہ کی ذاتوں میں جو کچھ ہے اس کا عکس اس کے آئینہ پر پڑتا ہے اور وہ قدرتِ قدسیہ یا روح قدسیہ اس کو مخلوقات تک پہنچاتی ہے۔ [2]

فقرہ ۲۹

ملائکہ ان صورِ علمیہ کا نام ہے جو بذاتہا قائم ہیں اس طرح نہیں جس طرح لوح میں نقوش یا ذہن میں معلومات ہوتے ہیں بلکہ خود معانی قائم بالذات ہیں اور وہ امر الٰہی سے فیض حاصل کرتے ہیں، عام روحِ بشری تو حواس ظاہری کے تعطل یعنی خواب میں اس امر الٰہی سے لگاؤ پیدا کرتی ہے، لیکن روح نبوی (ﷺ) بیداری میں اس سے تخاطب کرتی ہے۔ [3]

---

[1] فصوص الحکم یورپ اور مصر دونوں جگہ چھپ گئی ہے، اس وقت میرے پیش نظر لیڈن ای۔ جی۔ بریل کا نسخہ مطبوعہ ۱۸۹۰ء ہے۔ (س) اس وقت دائرۃ المعارف حیدرآباد کا نسخہ مطبوعہ ۱۳۴۵ھ پیش نظر ہے آگے اسی کے حوالے بقید صفحات دیے گئے ہیں۔ (ض)

[2] فصوص الحکم، ص: ۹۔ [3] فصوص الحکم، ص: ۹، ۱۰۔

فقرہ ۴۰

عام روح بشری کا حال یہ ہے کہ جب اس کے حواس ظاہری مشغول ہوتے ہیں تو حواس باطنی معطل ہو جاتے ہیں اور جب حواس باطنی کام کرتے ہیں تو حواسِ ظاہری بیکار ہو جاتے ہیں مگر ارواح قدسیہ کا یہ حال ہے کہ نہ صرف یہ کہ ان کے حواس ظاہری کی مصروفیت ان کے حواسِ باطنی کو اور ان کے حواس باطن کو مشغولیت ان کے حواسِ ظاہری کو معطل نہیں ہونے دیتی اور دونوں ایک دوسرے کے فرائض میں مخل نہیں ہوتے، بلکہ ان کی تاثیر کا عمل ان کے اجسام سے متعدی ہو کر دوسرے اجسام تک پہنچتا ہے اور وہ انسانی تعلیم سے نہیں بلکہ ارواح و ملائکہ کے ذریعہ سے علم کی تلقی کرتے ہیں۔ [1]

فقرہ ۴۱

عام روحوں کی درماندگی یہاں تک ہے کہ نہ صرف یہ کہ حواسِ ظاہری کی مصروفیت، حواس باطنی کو اور حواس باطنی کی مصروفیت، حواسِ ظاہری کو اپنے فرائض سے باز رکھتی ہے بلکہ خود ان کے ایک حس کی مشغولیت دوسرے حس کو بیکار کر دیتی ہے، ہم جس وقت غور سے سنتے ہیں، دیکھتے نہیں، جب دیکھنے میں مستغرق ہوتے ہیں تو سنتے نہیں، خوف کا احساس ہو تو اشتہا نہیں پیدا ہو سکتی، اشتہا ہو تو غصہ نہیں پیدا ہو سکتا، جب ہم فکر کرتے ہیں تو ذکر سے غفلت ہو جاتی ہے اور جب ذکر کرتے ہیں تو تفکر سے خالی ہو جاتے ہیں لیکن ارواحِ قدسیہ کی یہ حالت نہیں ہوتی، ان کے تمام ظاہری و باطنی حواس ایک ساتھ کام کرتے ہیں اور ان کا ایک حاسہ دوسرے حاسہ کا عائق و مانع نہیں ہوتا۔ [2]

فارابی کے یہی چند لفظ ہیں جو ابنِ سینا اور ابن مسکویہ تک پہنچتے پہنچتے ایک داستان بن گئے ہیں اور اب چھوٹی اور بڑی تمام اسلامی فلسفیانہ تصنیفات میں باب النبوۃ کے نام سے یہ مسائل شامل ہیں، یہاں تک کہ امام غزالی ورازی کی تصنیفات سے انہی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ صوفیہ کے لسان القوم مولانا رومی کے ساز ''نے'' سے بھی یہی آواز نکلتی ہے۔ فلسفہ و عقل کی راہ سے جو حکمائے اسلام منزلِ حقیقت کے جویاں ہیں، ان کے نزدیک نبی وہ ہے جس میں یہ تین باتیں جمع ہوں:

① اول یہ کہ اس کو امورِ غیب پر اطلاع ہو۔

② دوسرے یہ کہ ملائکہ اس کو نظر آئیں اور وہ اس سے کلام کریں۔

③ تیسرے یہ کہ اس سے خوارقِ عادت ظاہر ہوں۔

ان تینوں دعووں کے امکان پر ان کے دلائل بہ ترتیب یہ ہیں:

---

[1] فصوص الحکم، ص:۱۳۔۱۴۔

[2] فصوص الحکم، ص:۱۳۔۱۴۔

اطلاع غیب

یہ عالمِ کائنات ایک باترتیب اور مسلسل نظامِ فطرت پر قائم ہے، جس کا ہر درجہ دوسرے درجہ سے بلند ہے، پہلے جمادات ہیں، جن میں نہ حرکت ہے نہ نمو، احساس ہے نہ ارادہ، نطق ہے نہ ادراکِ کلیات کی قوت، اس کے بعد نباتات کا درجہ ہے، جن میں حرکت ونمو تو ہے لیکن وہ دوسرے صفات سے محروم ہیں، اس کے بعد حیوانات آتے ہیں جن میں حرکت ونمو کے ساتھ ارادہ اور احساس بھی ہے، سب سے آخر انسان کا مرتبہ ہے جس میں ان تمام خصوصیات کے ساتھ نطق اور ادراک کلیات کی قوت بھی ہے، کائنات کے ان چاروں طبقوں میں بھی یکسانی نہیں ہے بلکہ ان میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ایک ترقی محسوس ہوتی ہے یہاں تک کہ ان کا پست تر نقطہ اپنے پچھلے سے بلند تر اپنے اگلے سے جا کر مل جاتا ہے لیکن کیا اس ترقی کی انتہا یہیں پر جا کر ختم ہو جاتی ہے؟ نہیں ابھی نطقِ ادارک اور احساس وتمیز کا مرتبہ کمال کو نہیں پہنچا ہے انسانوں میں وحشی اور غیر متمدن قبائل سے شروع کرو تو ان سے ترقی یافتہ ودہقانی اور گنوار ہیں، ان سے اعلیٰ شہری اور متمدن ہیں اور ان سے زیادہ بلند تر علما اور عقلائے روزگار ہیں جو نظر وفکر اور قیاس واستدلال سے مجہول کو معلوم کرتے ہیں لیکن انسانوں کی بلند تر صنف وہ ہے جس کی عقل وہوش کے سامنے نظریات بھی بدیہیات ہیں جن کی روح قدسی اپنے تمام معلومات کو تجربہ ومشاہدہ سے نہیں بلکہ براہِ راست عالم ملکوت سے حاصل کرتی ہے جن کے حواس کی طاقت عام انسانوں سے اس قدر تیز ہوتی ہے کہ وہ، وہ کچھ دیکھتے ہیں جو عام انسان نہیں دیکھ سکتے اور وہ، وہ کچھ سنتے ہیں جو عام انسان نہیں سن سکتے، یہ قوت کمالیہ اور یہ روح قدسیہ جس صنفِ انسانی میں ہوتی ہے وہی انبیا ہیں۔

رؤیتِ ملائکہ

انسان کے علم واحساس کا منبع روح ہے اور اس کے آلات وذرائع اس کے باطنی اور ظاہری حواس ہیں۔ اگر اس سطح زمین پر کوئی ایسا انسان ہو جو ان تمام آلات سے معرا ہو تو وہ نہ کسی شے کا احساس کر سکتا ہے اور نہ کسی چیز کا علم حاصل کر سکتا ہے لیکن جیسے علم واحساس کے ان آلات میں ترقی اور تیزی آتی جاتی ہے اس کے علم واحساس میں بھی ترقی ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ ایک خاص نقطہ پر آ کر وہ رک جاتے ہیں اور مادیات ومحسوسات سے آگے نہیں بڑھ سکتے، لیکن خواب کی حالت میں روح کو مادیات اور محسوسات کی زنجیروں سے جب آزادی ملتی ہے تو غیر مادی چیزوں کا مشاہدہ کرتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ روح انسانی کے علائق جس قدر مادیات سے پاک ہوں گے، اسی قدر اس کے علم واحساس کے قویٰ میں ترقی ہوگی اور جس قدر اس عالمِ مادی سے اس کو افتراق ہوگا اسی قدر عالم ملکوت کے ساتھ اس کا اتصال بڑھتا جائے گا، اس بنا پر اگر کسی روح میں اس قدر استعداد اور صلاحیت عطا ہوتی ہو کہ وہ عالم بیداری میں بھی ان مادی تعلقات کو منقطع کر سکتی ہو تو جو کچھ عام روحوں کو خواب میں نظر آتا ہے اس سے بہت بڑھ کر اس کو بیداری میں محسوس ومشاہد ہو سکتا ہے، وہ

غیب کی آوازوں کو سن سکتی ہے، فرشتوں کو دیکھ سکتی ہے، ان سے باتیں کر سکتی ہے اور ان کے ذریعہ سے علم و معرفت کا فیض حاصل کر سکتی ہے۔

خوارق عادت

دنیا کے مادی حوادث جس طرح مادی اسباب وعلل کے نتائج ہیں، اسی طرح وہ نفسیاتی اسباب کے نتائج بھی ہوتے ہیں، نفس کے اندر مختلف قسم کے جذبات اور حرکات پیدا ہوتے ہیں اور ان سے ہمارا مادی جسم متاثر ہوتا ہے درخت یا دیوار پر چڑھنے والے کو اکثر یہ پیش آتا ہے کہ جہاں اس کے دل میں خوف پیدا ہوا اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور وہ کانپ جاتا ہے اور گر پڑتا ہے۔ وہمی خوف سے بے ہوش ہو جاتا ہے، بیمار پڑ جاتا ہے، یہاں تک کہ مر بھی جاتا ہے۔ شرمندگی اور خجالت سے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے، غیظ و غضب میں چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔ یہ کمزور نفوس کا حال ہے، اس سے زیادہ قوی نفوس اپنے تاثرات سے دوسروں کو متاثر کر لیتے ہیں اور اپنی قہر و محبت کی نگاہ سے دوسروں کو اپنا معمول بنا لیتے ہیں، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اصحاب نفوسِ قدسیہ اور ارباب قوتِ کمالیہ اس مادی دنیا میں بہت کچھ تصرف کر سکتے ہیں۔ [1]

اکثر متکلمینِ اسلام نے پہلی اور دوسری شقوں کو ایک میں داخل کر دیا ہے اور ہیں بھی وہ درحقیقت ایک ہی امور غیب کی اطلاع، ملائکہ اور روحانیات کا مشاہدہ، رؤیت اور ان سے تخاطب، یہ تمام تر وحی و مشاہدۂ روحانیت کے تحت میں داخل ہو سکتے ہیں اور تیسری چیز کا نام ان کی زبان میں معجزہ ہے، ہم ان دونوں پر الگ الگ بحث کرتے ہیں۔

---

[1] ابن سینا نے اشارات میں تفصیل سے اور نجات میں اختصار کے ساتھ ان نظریات کو بیان کیا ہے۔ نصیر الدین طوسی نے اشارات کی شرح النمط العاشر میں بھی اس کی تفصیل لکھی ہے۔ دیکھئے ص: ۴۱۱، امام رازی نے مباحثِ شرقیہ جزء ثانی، ص: ۴۲۳، ۴۲۴ دائرۃ المعارف النظامیہ حیدر آباد ۱۳۴۳ھ میں اور ابن مسکویہ نے فوز الاصغر بحث نبوات، ص: ۱۱۹ بیروت ۱۳۱۹ھ میں ان کو لکھا ہے دیگر فلسفیانہ تصانیف میں بھی کم و بیش یہی ہے۔

وحی و مشاہدہ

ہمارے حکمائے متکلمین اور صوفیا نے وحی و الہام اور مشاہدۂ روحانیات کی تشریح میں متعدد نظریے قائم کیے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① الہام فطری اور الہام نوعی

دنیا میں جتنی چیزیں پردۂ عدم سے منصۂ وجود پر آتی ہیں، وہ اپنے اپنے وجود کے ساتھ مختلف قسم کے خواص اور فطری علم اپنے ساتھ لاتی ہیں، گلاب کا پھول سرخ اور چنبیلی سفید کیوں ہوتی ہے؟ کھجور میٹھی اور اندرائن کڑوا کیوں ہوتا ہے؟ ایک ہی زمین اور ایک ہی آب و ہوا میں مختلف پودے اُگتے ہیں، مگر ہر ایک کا رنگ، مزہ اور بُو مختلف کیوں ہوتی ہے؟ ان کے خواص اور کیفیات میں کیوں اس درجہ اختلاف ہوتا ہے؟ پرندہ کا بچہ انڈے کے چھلکے سے باہر آنے کے ساتھ زمین سے دانہ چگنے لگتا ہے، بط کا بچہ پانی میں تیرنے لگتا ہے، حیوانات کے بچے ماؤں کے تھن میں منہ لگا دیتے ہیں، چوہے کے بچہ نے گو کبھی بلّی نہ دیکھی ہو اور نہ بلّی کے بچہ نے کبھی چوہا دیکھا ہو، مگر عمر میں پہلی دفعہ جب ان کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے تو ہر ایک سے اس کے فطری حرکات سرزد ہونے لگتے ہیں۔ ہر حیوان اپنے نفع و ضرر کو سمجھتا ہے۔ وہ مہلکات سے بھاگتا اور منافع کی طرف لپکتا ہے، یہ تعلیم ان کو کس نے دی؟ شیر، لومڑی، کتا، بلی، ہر ایک کے بچہ سے وہی اعمال سرزد ہوتے ہیں جو ان کے نوعی خصوصیات ہیں، ان اعمال کا معلم کون ہے؟ کوّے، بُلبلوں کے جھنڈ میں اور بُلبلیں کوؤں کے غول میں نہیں بیٹھتیں یہ ہم جنسی کا علم ان میں کہاں سے آیا؟ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں میں عظیم الشان اور حیرت انگیز جماعت بندی اور ذخیرہ اندوزی کی قابلیت کیونکر پیدا ہوئی؟ ان سب باتوں کا جواب یہ ہے کہ معلمِ فطرت نے عطیہ وجود کے ساتھ ساتھ یہ طبعی خصوصیات اور الہامات بھی ان میں ودیعت کر دیے ہیں۔

یہ تو انواع کا حال ہے۔ ہر نوع کے تحت میں اصناف ہیں جس طرح ہر نوع کی خصوصیتیں اور قابلیتیں الگ الگ ہیں، اسی طرح ہر صنف کی خصوصیات اور استعدادات بھی الگ ہیں، ایک کبوتر کی کتنی قسمیں ہیں؟ ایک آم میں کس قدر اقسام ہیں؟ ایک نوعِ انسان میں کس قدر طبقات ہیں؟ ان میں سے ہر ایک صنف، قسم اور طبقہ اپنی مشترک نوعی خصوصیات کے ساتھ کچھ مستقل الگ صنفی اوصاف بھی اپنے اندر رکھتا ہے جو دوسرے اصناف میں نہیں پائے جاتے، افریقہ کے ایک وحشی انسان سے لے کر یورپ کے متمدن شہری تک، ایک ناخواندہ جاہل سے لے کر ایک فلسفی اور حکیم تک، کس قدر مختلف انسانی طبقات ہیں ہر طبقہ اپنے اندر متعدد صنفی خصوصیات اور ادراکات رکھتا ہے، اسی طرح ممکن ہے کہ معلم ازل انسانوں کے ایک اور صنف (انبیا) کو علوم و معارف اور حقائق و اسرار کے وہ الہامات عطا کر دے جن سے دیگر صنفِ انسانی محروم اور ناآشنا ہیں۔

دنیا میں جس قدر علوم و فنون، صنائع و حرف، ایجادات و اختراعات پیدا ہو چکے ہیں ان کا کوئی نہ کوئی بانی،

موجد اور مخترع ہوگا پارچہ بافی اور خیاطی سے لے کر ریاضیات اور میلنکس تک جس قدر صنائع وایجادات اور علوم ومعارف ہیں، وہ کسی نہ کسی ایک شخص کے ذہن کا نتیجہ ہیں۔ اس بانی اور مخترع اول کے ذہن میں اس خاص یا ایجادِ خاص کا خطور کیونکر ہوگیا؟ اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ دوسرے سے سیکھے بغیر اس کے نفس میں اس مسئلہ خاص اور اس ایجادِ خاص کے متعلق ایک خاص قسم کی سوجھ یا فہم پیدا ہوگئی اور اس کے ذہن میں کہیں سے ایسی حقیقت بے پردہ مشہود ہوگئی جو دوسروں کے لیے تمام تر مستور تھی، یہی الہام ہے، اب جس شخص کو فلسفیانہ الہامات ہوتے ہیں وہ فلسفی ہے۔ جس کو شاعرانہ ہوتے ہیں وہ شاعر ہے۔ جس کو آلات اور مشینوں کا الہام ہوتا ہے وہ آلات ساز اور انجینئر ہے اور جس نفسِ قدسی میں اسرارِ الٰہیہ ،نوامیسِ ملکوتیہ، عقائدِ حقہ، اعمالِ صالحہ، قوانینِ عادلہ کا الہام ہو وہ پیغمبر ہے اور اس کے اس الہام کو وحی کہتے ہیں۔

② انقطاعِ حواس عن المادیات

انسان کے تمام محسوسات اور مدرکات بواسطہ یا بلاواسطہ اس کے حواسِ خمسہ یعنی سامعہ، باصرہ، شامہ، ذائقہ اور لامسہ سے ماخوذ ہیں جن کے کام بہ ترتیب سننا، دیکھنا، سونگھنا، چکھنا اور ٹٹولنا ہیں۔ اسی طرح انسان میں پانچ قوائے دماغی بھی ہیں جن کے نام حسِ مشترک، خیال، واہمہ، حافظہ اور متخیلّہ ہیں ان قوائے خمسہ کے متفرق کام ہیں۔ حسِ مشترک تو آلاتِ حواس کا خزانہ یا لیٹر بکس ہے، انسان کو اپنے پانچوں حواس کے ذریعہ سے جو کچھ محسوس ہوتا ہے وہ سیدھا حسِ مشترک میں جا کر منطبع ہو جاتا ہے اور پھر وہاں سے منتقل ہو کر خیال میں جمع ہو جاتا ہے اور وہاں محفوظ رہتا ہے۔ واہمہ وہ قوت ہے جو اپنے اس گزشتہ محفوظ خزانۂ مدرکات کا بار بار جائزہ لیتی رہتی ہے اور اس پر احکام جاری کرتی رہتی ہے، مثلاً: دور سے ہم نے ایک زرد سیال شے دیکھی پہلے سے ہمارے خیال میں شہد کی صورت محفوظ ہے اس زرد سیال شے کو دیکھتے ہی ہم نے کہہ دیا کہ ''یہ شہد ہے اور یہ میٹھا ہوتا ہے'' یہ واہمہ کا کام ہے۔ حافظہ میں قوتِ واہمہ کے مخزونات جمع رہتے ہیں اور متخیلّہ جس کا دوسرا نام مفکرہ بھی ہے اس قوت دماغی کو کہتے ہیں جو مدرکات خیال کی ترکیب تحلیل کرتی رہتی ہے اور ہمیشہ نئی نئی شکلیں اور عجیب عجیب صورتیں، سینما (صور متحرکہ) کے تماشہ کی طرح ہمارے ذہن کے سامنے لاتی رہتی ہے کبھی دوسر کا انسان بنا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ کبھی بے سر کا چلتا پھرتا انسان مشاہدہ کراتی ہے۔ کبھی پرستان کی سیر کراتی ہے اور کبھی عالم قدس میں جانے کے لیے پر تولتی ہے۔ ذہن کو ہزاروں لاکھوں میل کی مسافت دم کے دم میں طے کرادیتی ہے۔ آنکھیں بند کرتے ہی ہماری دوسری آنکھوں کے سامنے جو ہنگامۂ فکر وخیال برپا ہو جاتا ہے وہ اسی کا کارنامہ ہے۔

اس تمہید کے بعد اب یہ سمجھنا چاہیے کہ ہماری قوتِ متفکرہ صرف آرام وسکون کے لمحوں میں کیوں یہ تماشے دکھاتی ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارا حسِ مشترک ہمیشہ خارج سے آلاتِ حواس کے بھیجے ہوئے محسوسات کی تحصیل ووصول میں مصروف رہتا ہے، اس لیے جب تک بیماری، نیند یا غفلت یا کسی اور سبب سے

آلاتِ حواس میں تعطل نہیں ہوتا، ہمارے قوائے دماغی میں آرام وسکون نہیں پیدا ہوسکتا۔ خواب کی حالت میں جب یہ حواس تھوڑی دیر کے لیے اپنا کام موقوف کر دیتے ہیں، اس وقت ہمارے پراسرار قوائے ذہنی عالم بالا کی سیر کرنے لگتے ہیں اور وہاں کے مشاہدات ومسموعات حس مشترک میں آ کر ہماری قوتِ متفکرہ کو حرکت دیتے ہیں اور ہم عجیب عجیب چیزیں دیکھنے اور عجیب عجیب آوازیں سننے لگتے ہیں۔ اب اگر کسی کی روح میں اتنی قوت ہو کہ حالت بیداری میں بھی اپنے ظاہری آلات کو معطل کر کے عالمِ بالا سے اپنا سلسلۂ تعلق قائم کر سکے تو اس کو سب کچھ اسی عالم بیداری میں نظر آ سکتا ہے۔

③ قوتِ نبوت

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ حواس انسانی صرف پانچ کے اندر محدود نہیں ہیں، چنانچہ شیخ الاشراق نے حکمۃ الاشراق میں اس پر دلائل قائم کیے ہیں، بعض جمادات میں نباتاتی اوصاف ملتے ہیں، بعض نباتات ایسے دریافت ہوئے ہیں جن میں قوت حس ہے، جس سے دیگر نباتات عام طور سے محروم ہیں، حیوانات کے مختلف انواع میں بعض ایسے قویٰ کا پتہ چلتا ہے جو دیگر حیوانات میں نہیں، شہد کی مکھیوں میں ایک ایسی عجیب وغریب قوت ہے جس سے ان کو کسی طرح بند کر کے لے جایئے اور کہیں جا کر چھوڑ دیجئے وہ اپنے چھتہ کا راستہ پالیتی ہیں مکڑیوں کی اقلیدسی اشکال بھی کسی نہ کسی قوت کا نتیجہ ہیں، خواہ اس کا نام جبلت یا فطرت ہی کیوں نہ رکھو اسی طرح ممکن ہے کہ انبیا علیہم السلام میں احساس وادراک کی وہ خاص قوت ہو جس سے اور اصناف انسانی محروم ہیں وہ اپنی اسی قوت قدسیہ کے ذریعہ سے ان چیزوں کا احساس وادراک کر لیتے ہیں جن کو عام قوائے انسانی نہیں کر سکتے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں اس خیال کو جابجا ظاہر کیا ہے:

پنج حسے ہست جز ایں پنج حس   آن چوزرّ سرخ و ایں حسہا چومس

''ان پانچ جسمانی حواسوں کے علاوہ پانچ اور روحانی حواس بھی ہیں، وہ سونا ہیں اور یہ تانبا ہیں۔''

حسِ ابداں قوتِ ظلمت خورد   حسِ جاں از آفتابے می چرد

''جسمانی حواس تاریکی سے قوت اخذ کرتے ہیں تو روحانی حواس آفتاب سے۔''

ہر کہ از حسِ خدا دیدآیتے   در برحق داشت بہتر طاعتے

''حس نے اس خدائی احساس کی کوئی نشانی دیکھ لی ہے، وہ خدا کے سامنے زیادہ مطیع ہے۔''

گربدیدے حسِ حیواں شاہ را   پس بدیدے گاؤ خر اللّٰہ را

''اگر حیوان اپنے احساس سے بادشاہ کا مرتبہ پہچان سکتے تو بیل اور گدھے بھی خدا کو دیکھ لیتے۔''

گر نہ بودے حس دیگر مر ترا   جز حسِ حیواں زبیروں ہوا

''اگر احساس حیوانی کے علاوہ تم کو اور دوسرے قوائے احساس نہ ملے ہوتے۔''

پس بنی آدم مکرّم کے بدے کے بہ حس مشترك محرم شدے [1]

''تو بنی آدم کا درجہ اتنا بڑھایا کیوں جاتا اور صرف حس مشترک کی بنا پر محرم راز کیونکر ہوسکتا۔''

فلسفی گویدز معقولات دوں عقل از دہلیز می ماند بروں

''فلسفی لغو معقولات کی باتیں کرتا ہے تو عقل دہلیز کے باہر رہ جاتی ہے۔''

فلسفی منکر شود در فکر وظن گو برو سر را بران دیوار زن

''فلسفی جو صرف اپنی فکر وگمان کے باعث ان حقائق کا انکار کرتا ہے اس کو کہنا چاہیے کہ وہ اپنا سر دیوار پر دے مارے۔''

نطقِ آب و نطقِ بادو نطقِ گل ہست محسوسِ حواس اہلِ دل

''پانی، ہوا، مٹی، ان سب کا نطق اہل دل کے حواس کو محسوس ہوتا ہے۔''

فلسفی کو منکر حنانہ است از حواس انبیاء بیگانہ است [2]

''فلسفی جو ستون نبوی ﷺ کے گریہ کا منکر ہے اس کا سبب یہ ہے کہ انبیا کے حواس سے واقف نہیں ہے۔''

④ حواس کی غیر محدودیت

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حواس پانچ ہی ہیں اور ان کے علاوہ کوئی حاسہ کسی انسان میں موجود نہیں ہے، تو یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ان حواسوں کی وسعتِ احساس، ان کے حدود کے اندر محدود ہے اور چند اشخاص کو جو چیز دکھائی یا جو آواز سنائی دیتی ہے، وہ اس لیے غلط ہے کہ عام انسان اس کو دیکھ سُن نہیں سکتے، یا جو چیز ہم کو اس وقت دکھائی یا سنائی نہیں دیتی۔ وہ آئندہ بھی ہم کو دکھائی یا سنائی نہیں دے گی، بالکل ممکن ہے کہ ایک انسان جس کو دیکھ یا سُن نہ سکے، دوسرا انسان اس کو دیکھ اور سُن لے۔ کورنظر پاس کی چیز بھی نہیں دیکھ سکتے، لیکن تیز نظر میلوں کی خبر لیتے ہیں، بعض انسانوں اور حیوانوں میں بعض قوائے احساس اوروں سے بہت زیادہ تیز ہوتے ہیں، چیونٹی میں قوت شامہ، چیل اور کبوتر میں قوتِ باصرہ، سانپ میں قوت لامسہ، کتوں اور گھوڑوں میں قوت سامعہ معمولی سطح حواس سے بہت زیادہ بلند ہوتی ہے، خود انسان کے حواس کے درجے کس قدر متفاوت اور مختلف ہیں، ایک انسان دور سے آواز سنتا ہے، دور کی چیز اس کو نظر آتی ہے، دور کی نہایت نازک خوشبو محسوس کر لیتا ہے، لیکن کمزور حواس کے انسان ان کا مطلق احساس نہیں کر سکتے، لیکن کسی طریقہ سے اگر ان کے حواس کی قوت اور تیزی میں اضافہ ہو سکے تو وہ پھر اسی طرح دیکھ سکتے، سن سکتے اور سونگھ سکتے ہیں۔ مقدمۂ بالا سے معلوم ہوا کہ ایک کم نظر انسان یا گراں گوش آدمی جس قدر دیکھتا یا سنتا ہے اگر اس کی قوت بصارت و سماعت کو کسی تدبیر سے ترقی دی جائے تو وہ حیرت انگیز طریقہ سے ترقی کر سکتی ہے اور پھر جس قدر اس کے

---

[1] مثنوی مولانا روم، ج۲، ص:۱۰۶، مطبع ناصری بمبئی وکلیات مثنوی معنوی مولوی دفتر روم، ص: ۲۲۳ تا ۲۲٤ کانون انتشارات علمی"ك، ص"۔ [2] مثنوی مولانا روم، ج۱، مرتد شدن کاتب وحی الخ ص:۸٦؛ کلیات مثنوی معنوی مولوی دفتر اول مرتد شدن کاتب وحی الخ، ص:۱۸۳۔ "ك، ص"

حواس میں ترقی ہوتی جائے گی، اس کے احساسات میں اضافہ اور محسوسات میں وسعت آتی جائے گی، ہمارے ہاتھ میں پانی کا ایک گلاس ہے ہم اس کو پینا چاہتے ہیں، اس میں گرد وغبار کا ایک ذرہ بھی ہم کو نظر نہیں آتا، لیکن ہم خوردبین لگا کر دیکھیں تو قطرہ قطرہ میں ہم کو کیڑوں کی بستی کی بستی نظر آئے گی، خالی آنکھ سے ہم کو صرف آفتاب، ماہتاب اور کچھ چھوٹے بڑے روشن ستارے دکھائی دیتے ہیں، یہاں تک کہ بطلیموس کو ثوابت کی حرکت تک محسوس نہیں ہوئی اور اس وقت تک صرف تین سو ستارے دریافت ہو سکے اور جب ایک سے ایک طاقتور دوربینیں نکل رہی ہیں تو ہر نئی دوربین کی ایجاد کے بعد پہلے سے زیادہ ہماری آنکھیں روشن ہوتی جاتی ہیں یہاں تک کہ صرف ساتویں درجہ کے ستارے تیرہ ہزار اور آٹھویں درجہ کے چالیس ہزار، نویں درجہ کے ایک لاکھ بیس ہزار، ہم کو اس فضائے آسمانی پر تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ہر شکل کی دوربین سے کل چھوٹے بڑے دو کروڑ ستاروں کی فوج ہم کو دکھائی دینے لگی ہے۔

یہی حال سماعت کا ہے، پہلے ہماری آواز زیادہ سے زیادہ ایک میل جاسکتی ہوگی، ٹیلیفون کی پہلی ایجاد نے اس فاصلہ کو بڑھایا اور دو چار قدم کے بعد شہر کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر دوسرے گوشہ کے لوگوں سے باتیں کرنے لگے، چند سالوں میں یہاں تک ترقی ہوگئی کہ سویزرلینڈ کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر ہم بولتے ہیں اور فرانس میں لوگ اس کو سنتے ہیں، لکھنؤ سے الٰہ آباد دم کے دم میں آپ کی آواز پہنچتی ہے اور اب ہندوستان سے ہزاروں میل دُور لندن میں آپ کی آواز پہنچنے والی ہے۔ [1]

ان روزمرہ کی مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حواس کے فعل وانفعال اور تاثیر اور تاثر کے دائرے کی تحدید نہیں کی جاسکتی ہے اور یہ ممکن ہے کہ ایک صنفِ انسانی کے حواس اس قدر تیز، سریع اور قوی ہوں کہ ان کو وہ کچھ نظر آئے جو ہم کو نظر نہیں آتا اور وہ کچھ سنائی دے جو ہم کو سنائی نہیں دیتا، آنحضرت ﷺ نماز کی صف کے اندر فرماتے ہیں کہ مجھ کو اسی مقام سے دوزخ اور جنت نظر آئی، حضرت یعقوب علیہ السلام کو کنعان کی وادی میں بیٹھ کر مصر سے حضرت یوسف علیہ السلام کے پیرہن کی خوشبو معلوم ہوتی ہے، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ اسی خیال کو ان اشعار میں ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس حالت میں ایک حس کی تیزی دوسرے حواس کو بھی تیز کر دیتی ہے:

پنج حس بایک دگر پیوستہ اند   زانکہ ایں ہر پنج ز اصلے رستہ اند

''حواس خمسہ باہم ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، کیونکہ یہ پانچوں حواس ایک ہی اصل سے نکل کر آئے ہیں۔''

قوتِ یک قوتِ باقی شود   مابقیٰ را ہر یکے ساقی شود

''ایک حاسہ کی قوت بقیہ حواس کی قوت بن جاتی ہے۔''

دیدن دیدہ فزاید عشق را   عشق اندر دل فزاید صدق را

[1] اس دورِ جدید میں سائنسی ترقی مزید عروج پر ہے۔

''دیدار چشم، عشق کو ترقی دیتا ہے اور عشق دل میں سچائی پیدا کرتا ہے۔''

صدق بیداری ہر حس می شود　　حسہارا ذوقِ مونس می شود ❶

''سچائی ہر حاسہ کی بیداری کا سبب ہو جاتی ہے اور احساس کو ذوق و وجدان سے مدد ملنے لگتی ہے۔''

⑤ عالم مثال

علمائے اسلام میں جن کے سینے علم و حکمت کے ساتھ نور معرفت سے بھی منور ہیں، انہوں نے نظر و استدلال سے نہیں بلکہ ذوق و عرفان سے ایک اور راستہ اختیار کیا ہے، حکما میں دو گروہ ہیں، ایک وحدیہ اور دوسرا ثنویہ۔ وحدیہ وہ ہیں جو ایک ہی عالم کے قائل ہیں، یعنی ان کے نزدیک مبدئے عالم صرف ایک ہی ہے ان کی دو جماعتیں ہیں، ایک وہ جو مبدئے عالم صرف مادہ کو مانتی ہے اور مادہ کے علاوہ کسی اور چیز کو تسلیم نہیں کرتی، یہاں تک کہ عقل و حیات اور قوائے ذہنیہ تک اس کے نزدیک تمام تر مادہ کی نیرنگیاں ہیں ان کو مادیّین اور طبعیین کہتے ہیں دوسری جماعت مادہ سے یکسر منکر ہے وہ صرف نفس اور روح کو تسلیم کرتی ہے اور اس عالم محسوس کو وہم و تصور سے زیادہ رتبہ نہیں دیتی اس کے نزدیک عالم اور عالم میں جو کچھ ہے وہ نفس و روح کے مظاہر ہیں ان کو روحانیّین کہتے ہیں۔

ثنویہ

دو مبدئے عالم تسلیم کرتے ہیں، یعنی مادہ اور روح اور عالم کو ان دونوں کا جلوہ گاہ تسلیم کرتے ہیں۔ ہم نے اوپر کی سطروں میں جن اربابِ معرفت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ تین عالم تسلیم کرتے ہیں، ایک تو یہ عالم اجساد یا عالم شہادت جس کو تم مادہ اور مادیات کہتے ہو، دوسرا عالمِ ارواح یا عالمِ غیب جو مادی اور مادیات سے منزہ اور مافوق ہے اور تیسرا عالم برزخ یہ وہ عالم ہے جہاں عالم اجساد اور عالمِ ارواح عالم شہادت اور عالمِ غیب دونوں کے اوصاف اور قوانین مجتمع ہو جاتے ہیں، عالم اجساد کی چیزیں وہاں جا کر پیکر مادی سے پاک ہو کر سامنے آتی ہیں اور غیر مادی معانی اور حقائق اور عالمِ ارواح کی مخلوقات وہاں مجسم اور متجسد ہو کر نظر آتی ہیں امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ مکتوبات میں لکھتے ہیں:

اے برادر! عالم ممکنات راسہ قسم قرار دادہ اند، عالم ارواح ۱ـ وعالم مثال ۲ـ وعالم اجساد ۳ـ عالم مثال رابرزخ گفتہ اند درمیان عالم ارواح وعالم اجساد ونیز گفتہ اند کہ عالم دررنگ مرآۃ است مرمعانی وحقائق ایں ہر دو عالم راکہ	عالم ممکنات کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ عالم ارواح ۱ عالم مثال ۲، عالم اجساد ۳، عالم مثال کو عالم ارواح اور عالم اجساد کے بیچ میں کہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ عالم مثال عالم ارواح اور عالمِ اجساد کے معانی وحقائق کے لیے آئینہ کے مانند ہے کہ اس عالمِ مثال میں اجساد وارواح کے معانی وحقائق لطیف صورتوں میں ظاہر

❶ مثنوی مولانا روم، ج۲، کرامات ابراھیم الخ، ص:۱۷۷ وکلیات مثنوی معنوی مولوی دفتر دوم، ص:۳۷٤۔

معانی وحقائق اجساد وارواح در عالم مثال بصور لطیفه ظهور می نماید چه در آنجا مناسب ہر معنی وحقیقی صورت وہئیت دیگر است وآں عالم فی حد ذاته متضمن صور وہیئات واشکال نیست صور واشکال دروے ازعوالم دیگر منعکس گشته ظهور یافته است ورنگ مرآة است که فی حد ذاتہا متضمن، ہیچ صورت نیست، اگر دروے صورت کائن است از خارج آمده است۔ [1]

ہوتے ہیں، کیونکہ اس عالم مثال میں ہر معنی وحقیقت کی ایک خاص مناسب شکل ہے اس عالم مثال میں بذات خود کوئی صورت وشکل وہیئت نہیں ہے یہ صور واشکال دوسرے عالموں سے آ کر اس میں عکس انداز ہوتی ہیں جس طرح خود آئینہ میں کوئی صورت نہیں ہوتی بلکہ جو صور واشکال اس میں نمودار ہوتی ہیں وہ خارج سے آ کر اس میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔

بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان بزرگوں کا عالم مثال وہی افلاطون کا عالم مثل ہے لیکن افلاطون فرقۂ وحدیہ سے تھا، یعنی عالم کا مبدأ صرف ایک تسلیم کرتا تھا۔ اس لیے اس کے نظریہ کا منشا صرف یہ ہے کہ اس عالم محسوس میں ہر شے فرداً فرداً جزئی اور مشخص ہو کر آئی ہے۔ نفس کلی اور مطلق نوع کا وجود خارج میں نہیں، مثلاً: ہم کہتے ہیں، انسان ہنستا ہے، گھوڑا ہنہناتا ہے، کتا بھونکتا ہے تو یہ کسی خاص انسان، خاص گھوڑے، یا خاص کتے کی نسبت حکم نہیں ہے بلکہ انسان، گھوڑے اور کتے کی نوع پر یہ حکم لگایا گیا ہے لیکن کلی انسان، مطلق گھوڑا اور مطلق کتے کا وجود تو اس عالم محسوس میں نہیں مگر کہیں نہ کہیں تو اس کا وجود ہونا چاہیے، پھر کہاں ہے؟ عام جواب یہ ہے کہ ذہن میں مگر ذہن جو ہمارے محدود ومختصر دماغ کا دوسرا نام ہے کوئی ایسا ظرف نہیں جس کے اندر یہ ساری دنیا سما سکے اس لیے ایک اور عالم ہے جس میں کلیات اور انواع بستے ہیں، اس عالم محسوس میں جتنی چیزیں ہیں وہ کسی نہ کسی نوع کے تحت میں ہیں، یہ انواع عالم مثل میں ہیں اور ان کے عکس اور سائے جن کا نام افراد اور جزئیات ہے وہ اس عالم محسوس میں ہیں حقیقی وجود ان ہی انواع یا مثل کا ہے وہ گویا قدرت کے سانچے ہیں اور ان سے ہی ڈھل ڈھل کر اس عالم محسوس میں افراد اور جزئیات نمودار ہوتے ہیں مگر ان افراد اور جزئیات کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے وہ صرف اپنی اپنی نوع کے آثار اور ظلال (سایہ) ہیں پھر ان میں سے ہر نوع کی مستقل روح نوعی ہے جو اس نوع کا خدا ہے، اسی کا نام ان کی اصطلاح میں رب النوع ہے۔

یہ ہے مثل افلاطون کی حقیقت، عالم مثال کی حقیقت اس سے بالکل الگ ہے، اس عالم کے قائلین جیسا کہ ابھی امام ربانی کے مکتوب کے حوالہ سے گزر چکا ہے، تین عالم کے قائل ہیں۔ عالم جسمانی، عالم روحانی اور عالم مثالی، عالم مثالی جسم وروح کے احکام کا جامع ہے، اس میں روحانی اشیاء متجسم اور جسمانی چیزیں کسی اور مناسب شکل میں متشکل ہو کر نظر آتی ہیں اور وہ معانی وحقائق جن میں جسم وجان نہیں، مثلاً: حیات،

[1] مکتوبات، مکتوب سی ویکم، ج ۳، ص:۵۷ مطبع نول کشور: ۱۸۷۷ء۔

موت، علم، عقل، جسمانی رنگ و روپ میں وہاں نمایاں ہوتی ہیں ارواح، فرشتے، جبریل جو جسم سے پاک ہیں، اس عالم میں متجسم معلوم ہوتے ہیں، اس کی مثال بالکل خواب کی سی ہے کہ اس میں کبھی روحانیات متجسم ہو کر اور کبھی جسمانیات کسی اور شکل میں نمودار ہو کر جلوہ گر ہوتے ہیں اور اہل معرفت ان کو دیکھ کر ان کی مناسب تعبیر کرتے ہیں، مثلاً: کبھی خواب میں علم دریا کی صورت میں، غیظ وغضب آگ کی شکل میں، شجاعت شیر کی ہیئت میں نظر آتی ہے، اسی طرح عالمِ مثال میں بھی معانی وحقائق وروحانیات ومجردات کسی مناسب جسمانی شکل وصورت میں دکھائی دیتے ہیں اور ان کو دیکھ کر اہل بصیرت ان رموز وکنایات کی حقیقت کو پالیتے ہیں۔ خود عالمِ مثال میں کوئی آبادی نہیں، وہ صرف ایک آئینہ خانہ ہے جس میں عالمِ بالا یا عالمِ زیریں سے جو شکل بھی اس کے سامنے آتی ہے، اہل بصیرت کو نظر آجاتی ہے۔

علمائے اسلام میں سب سے پہلے یہ خیال امام غزالی کے ہاں ملتا ہے لیکن اس کو انہوں نے عالم کے لفظ سے نہیں بلکہ وجود کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، کسی شے کے وجود کا ثبوت ہمارے پاس اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح اس کا احساس یا تعقل کرتے ہیں ہمارے معلومات ومحسوسات ذہن میں موجود ہیں اور ان کا یہ وجود بھی اسی طرح ناقابل انکار ہے جس طرح عام اشیاء کا یہ خارجی وجود، لیکن نہ ہم ان کو دیکھ سکتے ہیں، نہ سن سکتے ہیں، نہ چکھ سکتے ہیں، نہ سونگھ سکتے ہیں، نہ ٹٹول سکتے ہیں، اس بنا پر امام صاحب کے نزدیک وجود کی تین قسمیں ہیں: وجود حسی، وجود عقلی اور وجود خیالی۔ اس آخری قسم کی انہوں نے حسب ذیل تفصیل کی ہے اور وہ یہ ہے کہ زبانِ حال تمثیلی رنگ میں محسوس اور مشاہد بن کر سامنے آئے اور یہ خاص انبیا علیہم السلام اور پیغمبروں کی نشانی ہے، اس کی مثال خواب کی ہے جس طرح خواب میں زبانِ حال پیغمبروں کے علاوہ عام آدمیوں کو بھی تمثیلی رنگ میں نظر آتی ہے اور وہ آوازیں سنتے ہیں، مثلاً: کوئی خواب دیکھتا ہے کہ اونٹ اس سے باتیں کررہا ہے یا گھوڑا اس کو خطاب کررہا ہے۔ یا کوئی مردہ اس کو کچھ دے رہا ہے یا اس کا ہاتھ پکڑ رہا ہے یا اس سے چھینتا ہے یا یہ دیکھے کہ اس کی انگلی پر آفتاب سورج یا چاند گہن بن گئی ہے یا اس کا ناخن شیر ہوگیا ہے یا اس قسم کی صورتیں جن کو لوگ خواب میں دیکھا کرتے ہیں، انبیا علیہم السلام کو یہ چیزیں بیداری میں نظر آتی ہیں اور اسی بیداری کی حالت میں یہ چیزیں ان سے خطاب کرتی ہیں ایک جاگتا ہوا آدمی جس کو یہ چیزیں نظر آتی ہیں اور محسوس ہوتی ہیں وہ اس بات میں کچھ فرق نہیں کرسکتا کہ یہ خیالی گویائی ہے یا خارجی اور حسی ہے خواب دیکھنے والے کو تو یہ فرق اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جاگ جاتا ہے اور خواب و بیداری کی دونوں حالتوں میں وہ فرق محسوس کرتا ہے۔

جن لوگوں کو ولایتِ تامہ حاصل ہوجاتی ہے ان کو یہ تمثیلی رنگ تنہا نظر نہیں آتا بلکہ اس کا اثر عام حاضرین پر بھی پڑتا ہے اس کی ولایت اپنے فیض کی شعاعیں ان پر ڈالتی ہے اور وہ بھی وہی دیکھتے ہیں جو صاحب ولایت کو نظر آتا ہے اور وہی سنتے ہیں جو صاحبِ ولایت کو سنائی دیتا ہے۔ [1]

[1] مضنون بہ علیٰ غیر اھلہ، ص: ۱۹۔ مصر۔

احیاء العلوم باب عذاب القبر میں بھی امام صاحب نے اس کی تشریح کی ہے۔ امام خطابی (مشہور امام الحدیث) نے معالم السنن میں اس کو رؤیا کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ افسوس ہے کہ معالم کا اصل نسخہ موجود نہیں، [1] حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے شرح بخاری میں ان کی رائے نقل کی ہے شریک بن عبداللہ کی روایت جن میں معراج میں خدا کے قرب کی تصریح ہے، اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

فمن لم يبلغه هذا من الحديث الاهذا القدر مقطوعًا عن غيره ولم يعتبره باول القصة واخرها اشتبه عليه وجهه ومعناه وكان قصاراه امارد الحديث من اصله واما الوقوع فى التشبيه وهما حطتان مرغوب عنهما و امامن اعتبراول الحديث باخره فانه يزول عنه الاشكال فانه مصرح فيهما فانه كان رؤيا لقوله فى اوله "و هونائم" وفى اخره "استيقظ" و بعض الرؤيا مثل يضرب ليتأول على الوجه الذى يجب ان يصرف اليه معنى التعبير فى مثله و بعض الرؤيا لايحتاج الى ذالك بل يأتى كالمشاهدة [2]

''پس جس شخص کو اس حدیث کا اتنا ہی ٹکڑا (کہ معراج میں آنحضرت ﷺ سے خدا قریب ہوا) حدیث کے دوسرے ٹکڑوں سے الگ ہو کر پہنچا اور اس نے آغازِ روایت اور آخر روایت کو باہم ملا کر نہ دیکھا تو اس حدیث کا مطلب اس پر مشتبہ ہو جائے گا اور اس کا انجام یہی ہوگا کہ یا وہ اصل حدیث سے انکار کر دے اور یا یہ کہ وہ خدا کی تجسیم کا قائل ہو جائے اور یہ دونوں باتیں ناپسندیدہ ہیں لیکن جو شخص اول و آخر حدیث کو ملا کر دیکھے گا تو اس سے اشکال رفع ہو جائے گا کیونکہ حدیث کے شروع میں اور آخر میں یہ تصریح ہے کہ یہ خواب تھا کیونکہ شروع میں ہے کہ آپ ﷺ سو رہے تھے کہ آپ نے دیکھا اور آخر میں ہے کہ اس کے بعد آپ بیدار ہوئے بعض خواب برنگ تمثیل ہوتے ہیں جن کی تعبیر اسی طرح کی جاتی ہے جس طرح اس قسم کے خوابوں کی تعبیر کی جاتی ہے اور بعض خواب تعبیر کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ وہ مشاہدہ کی طرح ہوتے ہیں۔''

امام صاحب کے بعد شیخ الاشراق نے اس کا عالم نام رکھا اور اس کی کچھ کیفیت بیان کی، مگر انہوں نے عالمِ مثال اور مثلِ افلاطونیہ کو باہم خلط ملط کر دیا ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی نے بھی اپنی بعض تصنیفات میں اس خیال کو ظاہر کیا ہے۔ خواجہ حافظ کے ہاں یہ خیال پایا جاتا ہے:

ع عالمے ہست کہ ایں عالم ازاں تمثالے است

---

[1] اب یہ کتاب شائع ہوگئی ہے۔ [2] فتح الباری، ج۱۳، ص: ۴۰۲۔

حضرات نقشبندیہ میں نہیں معلوم یہ خیال کب سے قائم ہے۔ بہرحال امام ربانی شیخ احمد سرہندی کے زمانہ کے بہت پہلے سے یہ خیال ان میں پایا جاتا ہے کیونکہ امام ربانی کی تحریروں میں متعدد مقام پر اس کا ذکر ہے ان کے بعد تو حضرات مجددیہ کی تصنیفات میں اس عالم کی نیرنگی اور بوقلمونی پر نہایت پراسرار مباحث ہیں علمائے متکلمین میں سے جس کو سب سے پہلے اس نظریہ کو علم کلام میں استعمال کرنے کا خیال پیدا ہوا وہ مجدد الف ثانی کے ایک مرید مُلّا بدرالدین ہیں، چنانچہ وہ ایک خط میں مجدد صاحب کو لکھتے ہیں:

پس عذاب قبر در عالم مثال خواہد بود در رنگ المے کہ درخواب در عالم مثال احساس نمایند و نوشتہ بودند کہ این سخن شاخہائے بسیار دارد اگر قبول نمایند فروع بسیار بریں سخن متفرع خواہد ساخت [1]

''پس عذابِ قبر بھی عالمِ مثال میں ہوگا، اسی طرح جس طرح کہ خواب میں مثالی رنگ میں درد اور تکلیف محسوس ہوتی ہے اور یہ بھی انہوں نے لکھا کہ اس مسئلہ سے بہت سی شاخیں نکل سکتی ہیں اور اگر آپ قبول فرمائیں تو اس سے بہت سے فروع پیدا ہو سکیں گے۔''

یہی چند منتشر خیالات تھے جن کو شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک عالم بنا دیا۔ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں عالمِ مثال کا ایک باب باندھا ہے اور اس کے تمام اصول وفروع بیان کیے ہیں۔

ہم اس موقع پر شاہ صاحب کے اس باب کا پورا ترجمہ درج کرتے ہیں:

''جاننا چاہیے کہ بہت سی حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عالمِ موجودات میں ایک ایسا عالم بھی ہے جو غیر مادی ہے اور جس میں معانی (اعراض وحقائق) ان اجسام کی صورت میں متشکل ہوتے ہیں جو اوصاف کے لحاظ سے ان کے مناسب ہیں، پہلے (اس عالم میں اشیاء کا ایک گونہ وجود ہو لیتا ہے تب دنیا میں ان کا وجود ہوتا ہے اور یہ دنیاوی وجود ایک اعتبار سے بالکل اس عالم مثال کے وجود کے مطابق ہوتا ہے۔''

اکثر وہ اشیاء جو عوام کے نزدیک جسم نہیں رکھتیں، اس عالم میں منتقل ہوتی ہیں اور اترتی ہیں اور عام لوگ ان کو نہیں دیکھتے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب خدا نے رحم کو پیدا کیا تو وہ کھڑی ہو کر بولی کہ یہ اس شخص کا مقام ہے جو قطع رحم سے پناہ مانگ کر تیرے پاس پناہ ڈھونڈھتا ہے۔'' اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''سورۂ بقرہ اور آل عمران قیامت میں بادل یا سائبان یا صف بستہ پرندوں کی شکل میں آئیں گی اور ان لوگوں کی طرف سے وکالت کریں گی جنہوں نے ان کی تلاوت کی ہے۔'' اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''قیامت میں اعمال حاضر ہوں گے تو پہلے نماز آئے گی پھر خیرات، پھر روزہ۔'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''نیکی اور بدی دو مخلوق ہیں جو قیامت میں لوگوں کے سامنے کھڑی کی جائیں گی سو نیکی، نیکی والوں کو بشارت دے گی اور برائی، برائی

[1] مکتوب سی ویکم، ج ۳، ص: ۵۷۔

والوں کو کہے گی کہ ہٹو ہٹو لیکن وہ لوگ اس سے چمٹے ہی رہیں گے۔'' اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''قیامت میں اور جتنے دن ہیں وہ معمولی صورت میں حاضر ہوں گے لیکن جمعہ کا دن چمکتا دمکتا آئے گا۔'' اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''قیامت میں دنیا ایک بڑھیا کی صورت میں لائی جائے گی جس کے بال کھچڑی دانت نیلے اور صورت بدنما ہوگی۔'' اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جو میں دیکھتا ہوں کیا تم بھی دیکھتے ہو؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ فتنے تمہارے گھروں پر اس طرح برس رہے ہیں جس طرح بادل سے قطرے۔'' اور آنحضرت ﷺ نے معراج کی حدیث میں فرمایا: ''اچانک چار نہریں نظر آئیں دو نہریں اندر بہتی تھیں اور دو باہر، میں نے جبریل سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ بولے، اندر کی نہریں تو جنت کی ہیں اور باہر کی نیل اور فرات ہیں۔'' آنحضرت ﷺ نے کسوف کی نماز میں فرمایا: ''بہشت اور دوزخ میرے سامنے مجسم کر کے لائی گئیں۔'' اور ایک روایت میں ہے: ''میرے اور قبلہ کی دیواروں کے بیچ میں بہشت اور دوزخ مجسم ہو کر آئیں۔ میں نے ہاتھ پھیلائے کہ بہشت سے انگور کا ایک خوشہ توڑ لوں لیکن دوزخ کی گرمی کی لپٹ سے رک گیا۔'' اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حاجیوں کے چور کو اور ایک عورت کو دوزخ میں دیکھا، جس نے ایک بلی کو باندھ کر مار ڈالا تھا اور ایک فاحشہ عورت کو بہشت میں دیکھا جس نے ایک کتے کو پانی پلایا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ بہشت اور دوزخ کی وسعت جو عام لوگوں کے خیال میں ہے وہ اس قدر مسافت (یعنی کعبہ کی چار دیواری) میں نہیں سما سکتی اور حدیث میں ہے کہ بہشت کو مکروہات نے اور دوزخ کو شہوات نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ پھر جبریل کو خدا نے حکم دیا کہ دونوں کو دیکھیں اور حدیث میں ہے ''بلا جب نازل ہوتی ہے تو دُعا اس سے کشتی لڑتی ہے۔'' اور یہ بھی حدیث میں ہے کہ ''خدا نے عقل کو پیدا کیا اور اس سے کہا کہ آگے آ، تو وہ آگے آئی پھر کہا کہ پیچھے ہٹ تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔'' اور حدیث میں ہے کہ ''یہ دونوں کتابیں پروردگار عالم کی طرف سے ہیں۔'' اور حدیث میں ہے کہ ''(قیامت میں) موت ایک مینڈھے کی شکل میں لائی جائے گی پھر دوزخ اور بہشت کے درمیان ذبح کر دی جائے گی۔'' اور خدا نے فرمایا کہ ''ہم نے اپنی روح مریم کے پاس بھیجی، تو وہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی کی شکل بن کر آئی۔'' اور حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ''جبریل علیہ السلام آنحضرت ﷺ کے سامنے آتے تھے اور آپ سے باتیں کرتے تھے اور کوئی ان کو نہیں دیکھتا تھا۔'' اور حدیث میں ہے کہ ''قبر ہفتاد در ہفتاد گز چوڑی ہو جاتی ہے یا اس قدر سمٹ جاتی ہے کہ مردہ کی پسلیاں بھر کس ہو جاتی ہیں۔'' اور حدیث میں ہے کہ ''فرشتے قبر میں آتے ہیں اور مردہ سے سوال کرتے ہیں اور مردہ کا عمل مجسم ہو کر اس کے سامنے آتا ہے اور نزع کی حالت میں فرشتے حریر یا گزی کا کپڑا لے کر آتے ہیں اور فرشتے مردہ کو لوہے کے گرز سے مارتے ہیں، مردہ شور کرتا ہے اور اس کے شور کی آواز مشرق سے مغرب تک کی چیزیں سنتی ہیں۔'' اور حدیث میں ہے کہ ''قبر میں کافر کے اوپر ننانوے اژدھے مسلط ہوتے ہیں جو اس کو

کاٹتے ہیں تا بہ قیامت۔'' اور حدیث میں ہے کہ ''جب مردہ قبر میں آتا ہے تو اس کو نظر آتا ہے کہ آفتاب غروب ہو رہا ہے وہ اٹھ بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ ٹھہرو نماز پڑھ لوں۔'' اور حدیث میں اکثر جگہ آتا ہے کہ ''قیامت میں خدا بہت سی مختلف صورتوں میں لوگوں کے سامنے جلوہ گر ہوگا اور آنحضرت ﷺ خدا کے پاس اس حالت میں جائیں گے کہ خدا اپنی کرسی پر بیٹھا ہوگا اور یہ کہ خدا انسانوں سے بالمشافہ بات چیت کرے گا۔'' اس قسم کی اور بہت سی حدیثیں ہیں جن کا شمار نہیں ہوسکتا۔

ان حدیثوں کو جو شخص دیکھے گا تین باتوں میں سے ایک نہ ایک بات اس کو ماننی پڑے گی یا تو ظاہری معنی مراد لے اور اس صورت میں اس کو ایک ایسے عالم کا قائل ہونا پڑے گا، جس کی کیفیت ہم بیان کر چکے ہیں (یعنی عالم مثال) اور یہ صورت وہ ہے جو اہل حدیث کے قاعدے کے مطابق ہے، چنانچہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور خود میری بھی یہی رائے ہے اور یہی مذہب ہے۔ یا اس بات کا قائل ہو کہ دیکھنے والے کے حاسہ میں واقعات کی یہی شکل ہوگی اور اس کی نظر میں وہ اسی طرح جلوہ گر ہوں گے گو اس کے حاسہ کے باہر ان کا وجود نہ ہو، قرآن مجید میں جو آیا ہے کہ ''آسمان اس دن صاف دھواں بن کر آئے گا۔'' اس کے معنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی کے قریب قریب لیے ہیں یعنی یہ کہ لوگوں پر قحط پڑا تھا تو جب کوئی آسمان کی طرف دیکھتا تھا تو اس کو بھوک کی وجہ سے آسمان دھواں سا معلوم ہوتا تھا، ابن ماجشون (مشہور محدث تھے) سے مروی ہے کہ جن حدیثوں میں خدا کے اترنے اور مرئی ہونے کا ذکر ہے ان کے معنی یہ ہیں کہ خدا مخلوقات کی نظر میں ایسا تغیر پیدا کر دے گا کہ وہ خدا کو ایسی حالت میں دیکھیں گے کہ وہ اتر رہا ہے اور جلوہ دکھا رہا ہے اور اپنے بندوں سے گفتگو اور خطاب کر رہا ہے، حالانکہ خدا کی جو شان ہے اس میں نہ تو تغیر ہوگا نہ منتقل ہوگا اور یہ اس لیے ہوگا کہ لوگ جان لیں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ یہ سب باتیں بطور تمثیل بیان کی گئی ہیں جن سے مقصود کچھ اور ہے لیکن جو شخص صرف اس احتمال پر بس کرتا ہے میں اس کو اہل حق میں شمار نہیں کرتا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے عذاب قبر کے بیان میں ان تینوں مقامات کو بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ ان تمام واقعات کے ظاہری معنی صحیح ہیں اور ان کے اندرونی اسرار مخفی ہیں لیکن ارباب بصیرت کے نزدیک یہ اسرار فاش اور کھلے ہوئے ہیں تو جن لوگوں پر یہ اسرار فاش نہ ہوں ان کو ان کے ظاہری معنوں کا انکار مناسب نہیں ہے کہ ایمان کا آخری درجہ تسلیم اور اقرار ہے۔ [1]

اس کے بعد دوسرے متفرق ابواب میں وحی، معراج، رؤیت ملائکہ، ملاقات انبیا علیہم السلام، براق، سدرۃ المنتہیٰ وغیرہ سب کی تشریح اسی عالم میں کی ہے، ہم نے آگے چل کر ایک عالم رؤیا کا قائم کیا ہے، اس میں دکھایا ہے کہ اس اصول کی صحت پر آیات و احادیث سے استناد ہوسکتا ہے۔ ان تمام نظریات پر ایک نظر ڈال لینے کے

[1] حجة الله البالغة، جزء اوّل، ص: ۱۰، ۱۱ مطبع خیریه: ۱۳۲۲ھ۔

بعد یہ بآسانی کہا جاسکتا ہے کہ ان کا درجہ دلائل و براہین کا نہیں ہے بلکہ حقیقت میں ان سے ہر نظریہ کا ماحصل صرف اسی قدر ہے کہ بظاہران چیزوں کو تسلیم کرنے میں عقل کو جو استحالہ یا کم ازکم استبعاد نظر آتا ہے وہ کم یا دور ہوجائے اس لیے ہر گواہ نے اپنے اپنے ذوق اور طریقِ فکر کے مطابق اپنے تجربات اور مشاہدات کے ذریعہ سے ایک ایسا تمثیلی نظریہ قائم کیا ہے جس پر قیاس کر کے وہ باتیں جو تجربہ و مشاہدہ سے ماوراہیں ان کا کچھ دھندلا سا خاکہ ذہنِ انسانی میں قائم ہوجائے کہ وہ ان کے انکار و استبعاد کی جرأت نہ کرسکے اور قلبِ بدگمان اور عقلِ نارسا کسی قدر تسلی پاسکے، ورنہ ظاہر ہے کہ شاہد سے غائب پر، محسوسات سے غیر محسوسات پر، تجربیات سے ناممکن التجربہ حقائق پر، جسمانی قوانینِ فطرت سے روحانی خصائص پر استشہاد کیونکر کیا جاسکتا ہے؟

کہ کس نہ کشود و نہ کشاید بہ حکمت ایں معمارا

مُعجزات

ہمارے متکلمین کے نزدیک معجزہ وہ امر ہے، جس کو اللہ تعالیٰ کسی پیغمبر کے دعویٰ صداقت کے لیے دنیا پر ظاہر کرتا ہے، اس کے لیے چند شرائط ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ وہ خارق عادت ہو، تو گویا معجزہ کی عام تعریف یہ سمجھی جانی چاہیے کہ معجزہ اس خارق عادت چیز کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے پیغمبر کی تصدیق کے لیے صادر ہو، اب معجزہ کے ثبوت میں اصل اشکال جو پیش آتا ہے، وہ یہ ہے کہ عالم کائنات ایک نظامِ خاص پر قائم ہے، ہر شے کی ایک علت اور ہر حادثہ کا ایک سبب ہے، علت اور سبب کے بغیر کوئی شے پیدا نہیں ہوتی، علت و معلول کا جو سلسلہ اشیاء میں نظر آتا ہے ان میں باہم اس قدر لزوم ہے کہ وہ ایک دوسرے سے منفک نہیں ہوسکتے، ہر شے میں ایک خاصیت ہے جو اس سے الگ نہیں ہوسکتی اور نیز جس شے میں جس چیز کی خاصیت نہیں ہے اس کا اس سے صدور بھی نہیں ہوسکتا، آگ جلاتی ہے، سمندر بہتا ہے درخت ساکن ہے، پتھر چلتا نہیں، سورج میں نور ہے، کنکر بولتے نہیں، سنکھیا زہر قاتل ہے، انسان مرکر پھر جیتا نہیں، اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ آگ نے جلایا نہیں، سمندر دفعۃً تھم گیا، درخت چلنے لگا، پتھر حرکت کرنے لگا، آفتاب میں سیاہی آ گئی، زہر کھا کر آدمی مرا نہیں اور انسان مرکر اشارے سے پھر جی اٹھا تو درحقیقت وہ اس پورے نظامِ فطرت کو جس پر دنیا قائم ہے درہم برہم کرنا چاہتا ہے، علل و اسباب کے تار و پود کو بکھیر دینا چاہتا ہے اور اشیاء کے ان طبائع اور خواص کے اعلانیہ انکار پر آمادہ ہے جو بارہا کے تجربہ سے ثابت ہو چکے ہیں اور جن میں کبھی تخلف نہیں ہوا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ نظامِ فطرت، یہ سلسلہ علل و اسباب، یہ طبائع اور خواص اس درجہ ناقابل تنسیخ ہیں کہ ان میں کسی قسم کی تغیر و تبدیلی نہیں ہوسکتی، فلاسفہ اور حکما کے ایک گروہ کے نزدیک یہ نظام، یہ سلسلہ، یہ اصول ناقابل شکست اور ناقابلِ تغیر ہیں۔ حکمائے اسلام کا گروہ (مثلاً: فارابی، ابن سینا، ابن مسکویہ وغیرہ) اس بات کا قائل ہے کہ یہ تو سچ ہے کہ اس نظام فطرت اور سلسلہ علل و اسباب میں نہ تغیر و تبدل ہوسکتا اور نہ دنیا میں کوئی شے بغیر علت عادیہ اور سبب طبعی کے پیدا ہوسکتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں کہ معجزات اس نظام و سلسلہ سے الگ ہیں اور وہ فطرت کی قانون شکنی کرتے ہیں بلکہ وہ بھی علل و اسباب طبعی کے نتائج ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ہم ان علل و اسباب کے احاطہ سے اب تک قاصر ہیں اور وہ اب تک ہماری نگاہوں سے مخفی ہیں ممکن ہے کہ تحقیقات انسانی کا دائرہ کبھی اتنا وسیع ہوجائے کہ ان کے علل و اسباب ہماری فہم میں آ جائیں۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ ہم کو یہ تسلیم ہے کہ عالم میں ایک خاص نظامِ فطرت، موجودات میں سلسلہ علل و معلولات اور اشیاء میں طبائع و خواص ہیں لیکن ہم ان کی اس درجہ ہمہ گیری کو تسلیم نہیں کرتے کہ یہ کسی حال میں اور کسی طریق سے شکست نہیں ہوسکتے آج تک ہمارا علم یہ ہے کہ نباتات دانہ سے، پرندے انڈے سے اور حیوانات نطفے سے پیدا ہوتے ہیں مگر ممکن ہے کہ کل وہ ان کے بیچ کے وسائط اور ذرائع کے بغیر دفعۃً پیدا ہوجائیں، غرض یہ کہ خرق

فطرت کلیتہً محال نہیں ہے، اشاعرہ اپنا عقیدہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ نہ تو عالم میں حقیقتاً قوانینِ فطرت ہیں اور نہ خود اشیاء کے اندر خواص ہیں بلکہ ہر شے سے جو فعل سرزد ہوتا ہے اس کو درحقیقت اللہ تعالیٰ اسی وقت اس میں پیدا کر دیتا ہے، اشاعرہ کے اس عقیدہ کا نہ صرف مدعیانِ عقل نے بلکہ اربابِ ظواہر [1] تک نے مضحکہ اڑایا ہے لیکن درحقیقت یہ خیال ایسا نہیں ہے کہ اس کو ہنسی میں اڑا دیا جائے، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

فلاسفہ اور حکما کی وہ جماعت جو قوانینِ فطرت کے ناقابلِ شکست ہونے پر ایمان رکھتی ہے اور اس بنا پر معجزات وخوارق سے قطعی انکار کرتی ہے امام رازی نے لکھا ہے [2] کہ گو خود ان فلاسفہ کا اصل عقیدہ یہی ہے کہ وہ متعدد ایسے اصول تسلیم کرتے ہیں جن کی بنا پر خوارقِ فطرت کا تسلیم کرنا ان کے لیے لازم ہو جاتا ہے۔ مثلاً:

① وہ ''تولدِ ذاتی'' کے قائل ہیں یعنی یہ کہ جن جانداروں کی پیدائش ایک نظامِ خاص کے ساتھ ہوتی ہے ایک قطرۂ آب سے خون، خون سے گوشت، پھر بتدریج مدتِ حمل کے اندر وہ شکم مادر میں پرورش پاتے رہتے ہیں، ایک متعین زمانہ کے بعد وضع حمل ہوتا ہے، پھر شیر خوارگی اور بچپن کے دور سے آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے ایک تنومند، قوی ہیکل، ذی روح صورت میں ظاہر ہوتے ہیں وہ دفعتہً ان بیچ کے منازل کو طے کیے بغیر اس ہیکل اور صورت میں نمودار ہو جائیں، یہ فلاسفہ کہتے ہیں کہ قطرۂ آب کے زمانہ سے لے کر اس عالمِ شباب کے عہد تک اس مجموعۂ عناصر کو جو سالہا سال صرف کرنے پڑے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان عناصر میں حیات کی قابلیت پیدا ہونے کے لیے ایک خاص قسم کے اعتدال ترکیب کی ضرورت تھی جب ترکیب میں یہ اعتدال پیدا ہوا، حیات پیدا ہو گئی اس بنا پر اگر کسی مجموعہ عناصر میں اس قسم کا اعتدال پیدا ہو جائے جس میں حیاتِ انسانی کے قبول کی صلاحیت ہو تو بغیر نطفہ حمل، خون، گوشت، وضع حمل، شیر خوارگی، بچپن وغیرہ، درمیانی وسائل طبعی کے، ایک اچھا خاصہ ایک نوجوان مٹی کے پتلا سے بن کر کھڑا ہو سکتا ہے جیسا کہ برسات میں اکثر کیڑے مکوڑے سڑی گلی مٹی میں ایک خاص اعتدالی کیفیت پیدا ہو جانے سے جان دار اور ذی روح بن جاتے ہیں، اسی کا نام ''تولد ذاتی ہے۔''

اسی تفصیل کی بنا پر ان کے نزدیک یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ذی روح کی پیدائش کے لیے دنیا میں جو سلسلہ اسباب عادۃً جاری ہے اس کے خلاف ہو سکتا ہے، تو پھر عصا سانپ بھی ہو سکتا ہے، مردے زندہ بھی ہو سکتے ہیں۔ پہاڑ سونا بھی ہو سکتا ہے۔ ایک عصا کے سانپ بن جانے کی فطری صورت یہ ہے کہ پہلے وہ سڑ گل کر مٹی ہو جاتا ہے، وہ مٹی غذا کی شکل میں ایک سانپ کے اندر جاتی ہے اور پھر وہ غذا دوسری شکل میں بن کر سانپ کا بچہ بن جاتی ہے۔ تولد ذاتی کے اصول پر یہ ممکن ہے کہ بیچ کے وسائل کے بغیر عصا میں سانپ بننے کی صلاحیت

---

[1] علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے الرد علی المنطقیین میں اور ابن حزم ظاہری نے کتاب الفصل فی الملل والنحل جزء۵، ص:۱۴ و ۱۵ مطبعۃ الموسوعات مصر: ۱۳۲۱ھ میں اس کی پرزور تردید کی ہے۔ اردو کے جدید کلام کے بانیوں نے بھی اس کا کچھ کم مذاق نہیں اڑایا ہے، استاد مرحوم نے تو تقریباً اپنی ہر کلامی تصنیف میں اشاعرہ کے اس خیال کو حماقت سے تعبیر کیا ہے۔ [2] مطالب عالیہ بحث معجزات نسخہ قلمی موجودہ دار المصنفین و تفسیر کبیر سورۂ اعراف آیت ﴿فالقی عصاہ﴾ الجزء الرابع، ص: ۳۹۳ دار الطباعۃ العامرۃ استنبول۔

پیدا ہو جائے۔

② یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں جو کچھ حوادث ہوتے ہیں، وہ کسی نہ کسی حیثیت سے مادہ (ہیولیٰ) ہی کے تغیرات کے نام ہیں مادہ (ہیولیٰ) اس تمام عالم عنصری کا ایک ہی ہے اس بنا پر عالم میں انواع، اشکال اور خواص کے یہ لاکھوں اور کروڑوں تنوعات اور اختلافات جو ہم کو نظر آتے ہیں ان کا سبب مؤثر اگر بالفرض خود مادہ ہی ہوتا تو ضروری تھا کہ تمام دنیا میں ایک ہی شکل اور ایک ہی خاصیت ہوتم کہو گے کہ یہ اختلاف وتنوع مادہ کے اختلاف استعداد سے پیدا ہوا لیکن وہ استعداد تو تاثر اور انفعال کا نام ہے علت فاعلہ اور سبب مؤثر کیا ہے؟ فلاسفہ کہتے ہیں کہ اجرام فلکی کی گردش اور رفتار ہے مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اجرامِ فلکی اس گردش ورفتار اور اختلافِ اشکال کی کوئی نہ کوئی حد ونہایت ہے اور نہ کسی قانون فطری کے ماتحت ہیں اور نہ ان کا علم ہم کو ہوسکتا ہے تو اس اصول کے صحیح باور کر لینے پر عجائبِ قدرت اور خوارقِ فطرت کی وہ کون سی مثال ہے جس کے محال ہونے کا دعویٰ وہ کر سکتے ہیں۔

③ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے یا تو وہ کسی سبب مؤثر کی بنا پر ہوتا ہے یا بلاسبب مؤثر کے ہوتا ہے اور دونوں صورتوں میں خرق عادت کو تسلیم کرنا پڑے گا، اگر یہ کہیے کہ یہ حوادث بلاسببِ مؤثر کے وجود پذیر ہوتے ہیں تو گویا آپ نے خود خرقِ عادت کو تسلیم کر لیا پھر دنیا میں کوئی عجیب سی عجیب اور مستبعد سے مستبعد بات بھی ناممکن نہیں رہتی اور اگر یہ کہیے کہ یہ سبب مؤثر کے نتائج ہیں تو دو حال سے خالی نہیں یا یہ سبب مؤثر صاحب اختیار و ارادہ ہے اور یہ تمام حوادث وتاثیرات اس کے ارادہ اور اختیار سے صادر ہوتے ہیں یا وہ بے اختیار اور مسلوب الارادہ ہے اور یہ حوادث وتاثیرات اس سے اسی طرح بے ارادہ اور اضطرارانہ طبعی طور سے سرزد ہوتے ہیں جس طرح سورج سے روشنی، آگ سے گرمی، برف سے ٹھنڈک، پہلی صورت میں معجزات اور خوارق کے صدور میں کوئی استحالہ نہیں کیونکہ اس مدبرّ ومؤثر کا جب، جیسا ارادہ ہو وہ شے اسی طرح واقع ہوگی کوئی اس کا مانع نہیں۔ دوسری صورت میں ظاہر ہے کہ یہ تمام تاثیرات اس بے ارادہ مؤثر عالم سے زمانہ قدیم سے ایک ہی طور پر سرزد ہوتی چلی آتی ہیں جیسے آفتاب سے روشنی، ایسی حالت میں ایک عام واحد، قدیم وازلی سبب ومؤثر سے، یہ ہر نئے آن اور نئے لمحہ میں نئی اور مختلف شکل وصورت اور خواص کی اشیاء کیونکر ظہور پذیر ہوتی ہیں آپ کہیں گے کہ علت تو بے شک واحد قدیم ہے مگر علت کے وجود کے ساتھ معلول میں بھی تو استعداد اور قبولیت کا مادہ پیدا ہونا چاہیے مادہ میں یہ استعداد وصلاحیت گردشِ فلکی کے مختلف اشکال کا نتیجہ ہے لیکن ابھی یہ کہا جا چکا ہے کہ آپ کے نزدیک اشکال فلکی کی نہ تو کوئی حد وپایاں ہے اور نہ وہ کسی خاص قاعدہ اور اصول کے اندر محدود ہیں اس بنا پر حوادث عالم کے اختلاف اور نیرنگی کا باعث اگر گردش فلکی کا اختلاف اور نیرنگی ہے تو ایسی صورت میں یہ کیوں نہیں ممکن ہے کہ جو چیز آپ کو بظاہر خلاف فطرت اور خلاف عادت معلوم ہوتی ہے وہ کسی خاص

شکل فلکی کا نتیجہ ہو۔

گزشتہ تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ حکمائے اسلام نے معجزات کے امکان پر حسب ذیل دلائل قائم کیے ہیں:

① **تاثیرات فلکیہ:** معجزات کے انکار کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اس کے حل کرنے کے لیے کوئی مادی علت ہمارے پیش نظر نہیں ہے اور ہم تمام معمولات کی تشریح مادی اور طبعی علل واسباب سے کرنا چاہتے ہیں لیکن حکما کا اس امر پر اتفاق ہے کہ گردش افلاک اور گردشِ نجوم کا اس دنیا کے حوادث پر بہت بڑا اثر ہے اور قوائے فلکی اس عالم کے واقعات میں مؤثر ہوتے ہیں، ایسی صورت میں اگر کسی بظاہر عجیب وغریب شے کی تعلیل ہم مادی وطبعی علل واسباب سے نہیں کر سکتے تو یہ کیوں ممکن نہیں ہے کہ اس کے اسباب فلکی وسماوی ہوں۔

② **عِلل خفیہ:** یہ ہم کو تسلیم ہے کہ تمام حوادث کسی نہ کسی سبب طبعی کی بنا پر ہوتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سبب طبعی ہمارے علم وفہم میں آ جائے دنیا میں بیسیوں اسرارِ قدرت ہیں جن کی اب تک تحلیل نہیں ہو سکی ہے، اس بنا پر ممکن ہے کہ معجزات بھی اسباب طبعی کے ماتحت ظہور پذیر ہوتے ہوں لیکن ان کے اسباب وعلل اب تک ہماری نگاہوں سے مخفی ہوں، مثلاً: یہ کہ انبیا نے چالیس دن تک ایک ساتھ روزہ رکھا اور اس مدت میں ایک دانہ بھی انہوں نے نہیں کھایا، لیکن بایں ہمہ ان کی قوت جسمانی میں کوئی فرق نہیں آیا، یہ بظاہر عجیب بات ہے مگر سبب طبعی سے الگ نہیں ہے، ہم کو کیوں بھوک لگتی ہے؟ اس لیے کہ ہمارے قوائے معدہ غذا کو ہضم کر لینے کے بعد اس کے خون کو جسم کے مختلف حصوں میں پہنچا دیتے ہیں تو ان کے لیے پھر کوئی کام باقی نہیں رہتا اور ان کو کام کی تلاش ہوتی ہے لیکن ہم روزمرہ دیکھتے ہیں کہ بیماری کے سبب یا خوف طاری ہو جانے کے باعث سے یا کسی غم کے سبب سے جسم پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کئی کئی روز تک معدہ کے قویٰ معطل ہو جاتے ہیں اور وہ اپنا کام انجام نہیں دیتے، اس لیے اس کو بھوک بھی نہیں لگتی اس بنا پر اگر یہی حالت کسی نفس کی اس بنا پر ہو جائے کہ اس کو روحانیات کے ساتھ شدتِ انہماک اور جسمانیات سے قطعِ علائق ہو گیا ہے تو اس کے قوائے جسمانی بھی معطل ہو سکتے ہیں اور وہ مدت تک فاقہ کر سکتا ہے، اسی طرح دوسرے معجزات کی تشریح بیان کی جا سکتی ہے۔

③ **قوتِ کمالیہ:** اس عالم میں جس قدر انسان ہیں ان کے نفسانی خصوصیات کو اگر غور سے دیکھا جائے تو عجیب وغریب اختلافات نظر آتے ہیں ایک بلید الفہم اور کودن ہے تو دوسرا زیرک اور ذی فہم ہے، ایک کو بولنے کا شوق ہے تو دوسرے کو سننے کا، ایک علم کا عاشق ہے تو دوسرا اس کا دشمن، ایک کے علوئے ہمت اور بلند حوصلگی کے سیلاب کے سامنے مشکلات کے بڑے بڑے پہاڑ بھی خس وخاشاک ہیں دوسرا اتنا پست ہمت اور ضعیف الارادہ ہے کہ وہ تنکے کو بھی پہاڑ جانتا ہے، ایک اس قدر قوی الحافظہ ہے کہ معمولی سے معمولی بات بھی اس کے ذہن کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکتی، دوسرے کو موٹی موٹی بات بھی یاد نہیں رہتی، پھر علم وفن کے عشاق میں بھی

کسی کو ادبیات سے لگاؤ ہے، کسی کو عقلیات کا چسکا ہے، کسی کو منقولات میں مزہ ملتا ہے۔قوت شہوانیہ کے لحاظ سے دیکھو تو کسی کو سواری کا شوقین پاؤ گے، کسی کو لباس و پوشاک اور وضع قطع کا، کسی کو کھانے پینے کا، ایک کو صرف دولت جمع کرنے میں مزہ ملتا ہے تو دوسرے کو اس کو اڑانے میں لطف حاصل ہوتا ہے، کوئی طبعاً حلیم ہے تو دوسرا سرتاپا غضب کا شعلہ، ایک خلقی طور سے قانع ہے تو دوسرا حریص اور طماع، کوئی بدزبان ہے مگر بدکردار نہیں، دوسرا بظاہر سنجیدہ اور متین نظر آتا ہے مگر بباطن نہایت بداطوار اور خفیف الحرکتہ ہے۔ان میں سے ہر وصف وخاصیت کے بھی سینکڑوں مدارج اور مراتب ہیں الغرض صفات وخواص نفسانی کے مظہر اس قدر گوناگوں اور بوقلموں ہیں کہ وہ حصر وتحدید میں بھی نہیں آسکتے ،غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک انسان کے نفس میں جو خصوصیات ہیں ان کے مطابق جو اعمال وآثار اس سے صادر ہوتے ہیں ان پر اس کو مطلق تعجب نہیں آتا لیکن دوسرے اعمال وآثار جن کے خصائص اس کے نفس میں نہیں ہیں ان پر اس کو سخت تعجب آتا ہے بلکہ اگر ان اشخاص کو اس نے خود دیکھا نہ ہو تو اس کو ان خصائص کا یقین مشکل سے آئے گا۔ایک بخیل کے نزدیک ایک بذل وکرم کی راہ میں تمام گھر بار لٹا دینا ایک مافوق البشریت کارنامہ ہے، ایک دنیادار جاہ پسند اور حریص آدمی کو ایک زاہد قانع اور متواضع آدمی کو دیکھ کر تعجب آتا ہے، معمولی حافظہ والوں سے کوئی کہے کہ امام بخاری کو ۶ لاکھ حدیثیں یاد تھیں اور اندلس کے ایک نابینا ادیب کو اغانی کی ۲۰ جلدیں نوک زبان تھیں، تو اس کو یقین نہیں آئے گا، تیمور، بابر، ہینبال اور نپولین کی قوتِ عزم وارادہ کے قصے کمزور اور ضعیف ارادہ کے آدمیوں کو معجزہ معلوم ہوں گے، ایک کمزور ارادہ کا آدمی خود اپنی اولاد واعزہ وخدام کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکتا لیکن غیر معمولی عزمِ وارادہ کے لوگ ہزاروں لاکھوں آدمیوں پر اس طرح استیلا حاصل کر لیتے ہیں کہ وہ اس کے ہاتھ میں پیکرِ بے جان بن جاتے ہیں، یہی حال دوسرے خصائص کے اختلاف کا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ تمام نفوس انسانی کے اتحادِ ماہیت کے باوجود یہ اختلافات کہاں سے آئے؟ اس کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ ہر نفس کی جوہریت دوسرے سے مختلف ہے، اس لیے ایک سے جو خصوصیات اور افعال صادر ہوتے ہیں وہ دوسرے سے نہیں ہوتے یا یہ کہ ہر جسم کی ترکیبِ عنصری میں اختلاف مزاج ہے جس کے سبب سے ایک کی خصوصیات دوسرے سے نہیں ملتیں، بہر حال ان دو میں سے جو پہلو بھی اختیار کیجیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ممکن ہے کہ بعض ایسے نفوس بھی ہوں جن کی روحانی یا جسمانی قوت میں کوئی خاص ایسی بات ہو جس کی بنا پر ان سے عجیب وغریب اعمال اور تصرفات صادر ہوتے ہیں جن کا صدور عام انسانوں کی روحانی وجسمانی قوت سے باہر ہے اور اس لیے وہ ان کو مستبعد اور ناقابلِ فہم نظر آتے ہیں ٹھیک اسی طرح جس طرح ایک بلید کو ایک ذی فہم کے افعال پر، ایک ضعیف الحافظہ کو ایک قوی الحافظہ کی قوت پر، ایک طماع وحریص کو ایک قانع وزاہد کے حالات پر، ایک کمزور وضعیف الارادہ کو قوی الارادہ اور مستحکم العزم پر تعجب

آتا ہے لیکن چونکہ وہ نفوس جن میں معجزات کی یہ قوت ہے نادر الوجود ہیں اس لیے عموماً ان کے خصائص و آثار پر تعجب اور استبعاد بھی معمول سے زیادہ ہوتا ہے۔

④ قوتِ نفسیہ: ہر انسان اپنے جسم کے ایک ایک عضو کو جس طرح چاہتا ہے حرکت دیتا ہے۔ گویا ایک قوت ہے جو اس کے تمام قالب جسمانی پر مسلط ہے اور یہ جسم اس کے امر اور ارادہ کے ماتحت اس کے حکم کو اس طرح بجالاتا ہے کہ وہ اس کی اطاعت سے سرمو انحراف نہیں کر سکتا یہ تصرف اور عمل ہر نفس انسانی اپنے جسم کے اندر کرتا ہے اور یہ معمولی اور ادنیٰ نفوس کی قوت کی نیرنگی ہے لیکن جو نفوس ان سے زیادہ طاقتور ہیں، وہ اپنے جسم کے باہر دوسرے نفوس اور اجسام کو بھی اپنا مطیع فرمان کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ ان میں سے جن کو کمال کا معجزانہ حصہ ملا ہے، ان کے لیے یہ سارا مادی عالم مثل جسم کے ہوتا ہے اور وہ اسی طرح اس عظیم الشان جسم میں تصرف کرنے لگتے ہیں جس طرح معمولی انسان اپنے جسم میں کرتے ہیں۔

⑤ تاثیراتِ نفسانیہ: یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ نفس انسانی میں جو جذباتی تغیرات پیدا ہوتے ہیں، وہ اس کے جسم مادی کو متاثر کر دیتے ہیں، رات کو کوئی چیز دیکھی اور اس کا ہیبت ناک تصور کیا اور گھبرا کر چیخ اٹھا، یا بے ہوش ہو کر گر پڑا، کسی درخت کی پتلی شاخ پر چڑھتے یا چھت کے منڈیر یا پتلے تختہ کے پل سے گزرتے ہوئے خوف طاری ہوا، ہاتھ پاؤں میں لغزش ہوئی اور آدمی گر پڑا، غصہ سے آدمی کا چہرہ سرخ اور خجالت و شرمندگی سے زرد پڑ جاتا ہے، آدمی نے کسی ناگوار واقعہ کا تخیل کیا، غصہ آ گیا، غصہ سے بدن میں گرمی پیدا ہو گئی اور گرمی سے پسینہ آ گیا، محض وہم سے آدمی ڈر جاتا ہے بلکہ بیمار پڑ جاتا ہے، یہاں تک کہ کبھی کبھی مر جاتا ہے، ان تمام واقعات میں دیکھو کہ نفسانی اثرات مادی جسم کو متاثر کر دیتے ہیں یہ تو کمزور نفوس کا حال ہے لیکن جو لوگ کہ ارباب نفوس قدسیہ ہیں وہ اپنے نفسانی اثرات سے دوسرے اجسام کو متاثر کر سکتے ہیں اور ان میں عجیب عجیب تغیرات اور تصرفات کر سکتے ہیں، یہ آخری دلیلیں بعینہ وہی ہیں جو آج ہپناٹزم (تنویم مقناطیسی) اور مسمرازم کے نام سے لوگ پیش کرتے ہیں۔

معتزلہ اور اشاعرہ دونوں فطرت شکنی اور خرقِ عادات کو تسلیم کرتے ہیں، جہاں تک ہم ان کی عبارتوں سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس نتیجہ میں دونوں کا اختلاف نہیں ہے بلکہ جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اصل نظریہ میں ہے معتزلہ یہ سمجھتے ہیں کہ خاصیت و اثر علیت و معلولیت و سببیت نفس اشیاء میں ہے یعنی خود اشیاء کی طبیعت کے اندر کوئی ایسی بات ہے جو ایک علت و سبب اور دوسرے کو معلول و مسبب بناتی ہے آگ کی طبیعت میں جلانا اور برف کی طبیعت میں ٹھنڈک پیدا کرنا ازل سے اللہ تعالیٰ نے رکھ دیا ہے اسی کا نام طبیعت ہے جس سے اس کی خاصیت کا ظہور ہوتا ہے، اس لیے معتزلہ سمجھتے ہیں کہ آگ سے سوزش اور برف سے ٹھنڈک کا جو صدور ہوتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ نفس آگ یا برف کی طبیعت میں کوئی ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے آگ میں سوزش اور

برف میں ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے اور جب کوئی معجزۂ نبوی ظاہر ہوتا ہے تو یہ طبیعت یا اس کی خاصیت تھوڑی دیر کے لیے بدل دی جاتی ہے یا روک لی جاتی ہے۔

اشاعرہ یہ کہتے ہیں کہ خود اشیاء کی طبیعت کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جس کی بنا پر ایک علت وسبب اور دوسرا معلول ومسبب ہو نفس آگ میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کو ہم گرمی کا سبب قرار دیں اور نہ برف کے اندر ٹھنڈک طبیعت کے طور پر موجود ہے بلکہ مختلف اشیاء کے متعلق ہم کو جو مختلف احساسات ہوتے ہیں، مثلاً: کسی سے گرمی، کسی سے سردی، کسی سے سختی، کسی سے نرمی، کسی سے جلن، کسی سے ٹھنڈک کا، یہ ہمارے ذاتی احساسات ہیں جن کو ہم حسب ارادۂ الٰہی اشیاء میں محسوس کرتے ہیں، ہماری عادت یہ ہوگئی ہے کہ ہم ایک شے کے بعد دوسری شے کو ہوتے ہوئے جب دیکھتے ہیں تو ہم ایک کو علت اور دوسری کو معلول سمجھنے لگتے ہیں، ورنہ حقیقت میں علت ومعلول میں لزوم کا کوئی طبعی تعلق نہیں، اگر ارادۂ الٰہی بدل جائے تو ہم آگ میں ٹھنڈک اور برف میں گرمی محسوس کرنے لگیں، نفس آگ اور برف کی طبیعت میں کوئی ایسی شے نہیں جو اس تغیر کو محال قرار دے اور اس لیے حسبِ ارادۂ الٰہی معجزات کا صدور ہوا کرتا ہے۔ علامہ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ''الرد علی المنطقیین'' میں لکھا ہے کہ اس مسئلہ کا اصل بانی جہم ہے جس کے انتساب سے فرقۂ جہمیہ قائم ہوا تھا، اس کے بعد ابوالحسن الاشعری نے اس کی پیروی کی، علامہ موصوف نے مسئلہ مذکور کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

لكن من لايثبت الاسباب والعلل من اهل الكلام كالجهم وموافقيه في ذالك مثل ابي الحسن الاشعري واتباعه يجعلون المعلوم اقتران احد الامرين بالاخر لمحض مشيئة القادر المريد من غير ان يكون احد هما سببا للاخر ولا مولدًا له. واما جمهورا لعقلاء من المسلمين وغير المسلمين اهل السنة من اهل الكلام والفقه والحديث والتصوف وغير اهل السنة من المعتزلة وغيرهم فيثبتون الاسباب ويقولون كما يعلم اقتران احدهما بالاخر فيعلم ان في النار قوة تقتضي التسخين وفي الماء قوة تقتضي التبريد وفي العين قوة تقتضي الابصار وفي اللسان قوة تقتضي الذوق ويثبتون الطبيعة التي تسمى الغريزة النحيزة والخلق والعادة ونحو ذلك من الاسماء۔ [1]

''لیکن متکلمین میں جو لوگ اسباب وعلل کے منکر ہیں، جیسے جہم اور اس مسئلہ میں جہم کے جو موافق ہیں، جیسے ابوالحسن اشعری اور ان کے پیرو، وہ یہ مانتے ہیں کہ ہم کو صرف یہ معلوم ہے کہ

[1] الرد علی المنطقیین، ص: ۹۰، ۹۱۔

ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ ایک لگاؤ اور علاقہ ہے اور یہ لگاؤ اور علاقہ صرف اسی قادر ذی ارادہ کی مشیت سے ہے بغیر اس کے کہ ایک دوسرے کا سبب ہو، ایک دوسرے کو پیدا کرتا ہو۔ جہمیہ اور اشاعرہ کے علاوہ تمام عقلا یا مسلمان یا غیر مسلمان، مسلمانوں میں اہل سنت ہوں خواہ وہ متکلم ہوں، اہل فقہ ہوں، اہل حدیث ہوں، اہلِ تصوف ہوں اور غیر اہل سنت میں معتزلہ ہوں یا کوئی اور فرقہ ہو، یہ سب لوگ اسباب کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح ہم کو یہ معلوم ہے کہ ایک کا دوسرے سے لگاؤ اور علاقہ ہے اسی طرح یہ بھی معلوم ہے کہ آگ میں ایک قوت ہے جو گرمی کو چاہتی ہے اور پانی میں ایک قوت ہے جو ٹھنڈک کو مقتضی ہے اور اسی طرح آنکھ میں ایک قوت ہے جو رویت کا باعث ہے اور زبان میں ایک قوت ہے جو مزہ پیدا کرتی ہے یہ لوگ طبیعت کو ثابت کرتے ہیں جس کا دوسرا نام فطرت، خلقت، عادت وغیرہ ہے۔"

اوپر خرق عادت کے امکان اور عدم امکان کے متعلق چار مذہب ہم نے نقل کیے ہیں یہی مذاہب آج بھی فلسفہ کی مملکت میں قائم ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حقیقت میں اس باب میں صرف دو ہی مذہب ہو سکتے ہیں ایک ان لوگوں کا جو کسی نہ کسی طرح سے باری تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں اور دوسرا ان لوگوں کا جو اس کے یکسر منکر ہیں۔ دوسرا گروہ حکمائے طبیعین کا یا مادہ پرستوں کا ہے جن کے نزدیک عالمِ مادی کے باہر کچھ نہیں ہے اور تمام کائنات ذرات مادہ کے باہمی تاثیر و تاثر کی جلوہ انگیزیاں ہیں اور سلسلہ علل و معلول اور اسباب و مسببات اور آثار و خواص کے مظاہر اور نتائج ہیں ظاہر ہے کہ اس عقیدہ کی جماعت معجزہ اور خرق عادت پر کیونکر ایمان لاسکتی ہے جو لوگ ان کے سامنے فلسفیانہ حیثیت سے براہ راست معجزہ اور خرق عادت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ ایک بے سود کوشش کرتے ہیں اور اگر عقلی حیثیت سے خرق عادت کا ثبوت بھی بہم پہنچ گیا ہے تو جب وہ اس بنیاد کو جس پر نبوت اور شریعت کی عمارت قائم ہے یعنی ایک برتر خالق قوت کا وجود تسلیم نہیں کرتے تو اس خرقِ عادت کے ثبوت سے اربابِ مذاہب اور پیروانِ شرائع کی کیا مقصد براری ہو سکتی ہے؟

اشاعرہ نے اثبات مدعا کا طریقہ اختیار کرنا چاہا کہ پہلے معجزہ اور عادت کا امکان اور وقوع ثابت کیا جائے اور اس معجزہ اور خرق عادت سے نبوت پر استدلال کیا جائے، نبوت کے ثبوت سے ایک قادر مطلق کا ثبوت ہاتھ آئے گا اور پھر اس کے احکام شریعت کا ثبوت بہم پہنچے گا، اس طریقہ استدلال کو اختیار کرنا درحقیقت الٹی گنگا بہانا ہے۔

ع این رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

صحیح راستہ ان کے مقابلہ میں یہ ہے کہ پہلے باری تعالیٰ کے وجود کا اثبات کیا جائے اس کے بعد نبوت،

شریعت، خرقِ عادت، معجزہ سب کچھ ثابت ہو جائے گا جب تک اس چٹان پر بنیاد قائم نہ ہو گی عمارت مستحکم نہیں ہو سکتی۔

اسبابِ خفیہ کی توجیہ بے کار ہے

دوسرا فرقہ باری تعالیٰ کے وجود کا قائل ہے اور معجزہ کو تسلیم کرتا ہے خواہ وہ اس کے وقوع کے کچھ ہی اسباب بیان کرے، وہ درحقیقت خرق عادت کو بھی تسلیم کرتا ہے یا اس کو تسلیم کرنا لازم آتا ہے اور اس سے اس کو کوئی چارہ نہیں۔ حکمائے اسلام، فارابی اور ابن سینا وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ معجزہ اسباب خفیہ کی بنا پر صادر ہوتا ہے اور اس کے اندرونی طبعی علل واسباب ہوتے ہیں، اس لیے خرق عادت لازم نہیں آتا اور معمولِ نظام عالم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے بنی اسرائیل کو لے کر چلے تو راستہ میں بحرِ قلزم (ریڈسی) حائل تھا، حکم ہوا کہ اپنی لکڑی سے دریا کو مارو، دفعتہً دریا خشک ہو گیا اور راستہ پیدا ہو گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر پار اتر گئے لیکن جب فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ دریا میں قدم رکھا تو دریا پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا اور وہ اپنے لشکر کے ساتھ ڈوب کر مر گیا وہ اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ دریا میں مدوجزر تھا، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پہنچے تو جزر تھا اور دریا پایاب ہو گیا تھا اور جس وقت فرعون دریا میں داخل ہوا، مد شروع ہو گیا اور ڈوب گیا۔ ہم ان اعتراضات کو جو نقلی حیثیت سے اس توجیہ پر وارد ہوئے ہیں کہ توراۃ اور قرآن مجید نے اس معجزہ کی جس طرح تشریح کی ہے اس کی یہ صحیح نقل نہیں ہے، نظر انداز کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پہنچے تو جزر تھا اور جب فرعون آیا تو مد ہو گیا آیا یہ اتفاقی امر تھا اور ممکن تھا کہ اس کے برعکس ہوتا یعنی فرعون بچ جاتا اور حضرت موسیٰ ڈوب جاتے اور یا یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے جزر اور فرعون کے لیے مد خاص طور سے پیدا کیا گیا تھا یا ایسے اسباب بہم پہنچائے گئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جزر کے وقت پہنچیں اور فرعون مد کے وقت پہنچے اور اس کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ وہ اس خطرناک دریا میں بے سمجھے بوجھے قدم رکھے پہلی صورت میں تو معجزہ کیا نبوت کی بھی تشکیک لازم آتی ہے اور دوسری صورت میں خرقِ عادت کی تسلیم سے چارہ نہیں اور خرق عادت تسلیم کر لینے کے بعد خدا کی قدرت مطلقہ پر بھی ایمان لانا ہو گا۔

حکمائے اسلام کی غلطی کا سبب

اصل یہ ہے کہ حکمائے اسلام نے ارسطو کی تقلید کی ہے اور مسئلہ علت میں تمام تر مشائیہ کے نظریہ کو قبول کر لیا ہے کہ ذاتِ واجب الوجود علتِ اولیٰ یا عقل اوّل کی علتِ تامہ ہے اور علتِ تامہ سے معلول کا تخلف نہیں ہوتا اور اضطراراً اس سے پیدا ہو جاتا ہے، اس میں اس کے ارادہ اور قصد کو دخل نہیں ہوتا۔ اس کی صحیح مثال آفتاب اور روشنی کی ہے کہ آفتاب کی روشنی علت تامہ ہے، جب آفتاب نکلے گا، روشنی کا ظہور ہو گا۔ خواہ وہ

موانع کی وجہ سے کبھی ہم کو نظر نہ آئے اور آفتاب سے اس روشنی کا صدور آفتاب کے قصد و ارادہ سے نہیں ہے بلکہ مجبوراً اور اضطراراً ایہ روشنی پیدا ہو رہی ہے عقل اول کے پیدا ہونے کے بعد عالم کائنات کا تمام کارخانہ باہمی سلسلۂ علل و معلول سے خود بخود پیدا ہونے لگا اور تمام عالم ایک ایسے نظام میں بندھ گیا۔ اب خالق اول کو اس میں دست اندازی کی مطلق قدرت ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مذہب کا پیرو سلسلۂ علل و معلول کو نہیں توڑ سکتا اور اس لیے وہ خرقِ عادت کو بھی تسلیم نہیں کر سکتا لیکن تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن کی توجیہ ظاہری سلسلۂ علل و معلول سے نہیں ہو سکتی اور نہ ان کے وقوع سے کوئی انکار کر سکتا ہے، اس لیے ایک طرف اس کو لامحالہ ان واقعات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ [1] اور دوسری طرف چونکہ وہ خدا کو مضطر اور مجبور مان چکا ہے، اس لیے براہِ راست ان واقعات کو اس کی طرف منسوب نہیں کر سکتا اور چونکہ بلاسبب اور بے علت کے کوئی شے ہو نہیں سکتی، اس بنا پر اسباب و عللِ خفیہ کے سایہ کے سوا اس کو اور کہیں پناہ نہیں مل سکتی مگر آپ نے اوپر دیکھ لیا کہ یہ بھی محفوظ نہیں اور خدا کو سوائے قادر مطلق ماننے چارہ نہیں۔

اشاعرہ اور معتزلہ میں نتیجہ کا اختلاف نہیں

اشاعرہ اور معتزلہ کے درمیان جو اختلاف ہے وہ صرف نظریہ کا فرق ہے اس سے نفسِ خرقِ عادت اور معجزہ کے ثبوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، یہ امر کہ اشیاء کے طبائع میں فی نفسہٖ خواص اور آثار ودیعت ہیں یا اللہ تعالیٰ بروقت ان کو پیدا کر دیتا ہے، ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے کسی پہلو کے اثبات اور دوسرے کی نفی پر کوئی دلیل نہیں قائم کی جا سکتی اور معجزہ کے سلسلہ میں ہم کو اس کے چھیڑنے کی ضرورت نہیں، اس کا کوئی پہلو بھی صحیح ہو، بہرحال دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ کبھی کبھی اشیاء کی عادتِ جاریہ کو اللہ تعالیٰ توڑ دیتا اور بدل دیتا ہے۔

خرق عادت سے انکار کا اصلی سبب سلسلۂ اسباب و علل پر یقین ہے

الغرض معجزہ بمعنی خرق عادت سے صرف اس فریق کو انکار ہے جو یا تو خدا کا قطعاً منکر ہے یا یہ کہ وہ خدا کو قادر و ذی ارادہ نہیں مانتا اور ناقابل شکست سلسلۂ علل و معلول کے گورکھ دھندے پر یقین کامل رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ تمام نظم کائنات باہمی تاثیر و تاثر کا نتیجہ ہے، غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس مذہب کے پیرو اپنے اس عقیدۂ باطل کے ضمن میں چند اور موہوم باتوں کو بھی بلا دلیل تسلیم کیے بیٹھے ہیں اور اس لیے خرق عادت کے قبول کرنے کی ان کو جرأت نہیں ہوتی۔

---

[1] حکمائے اسلام میں مسئلہ خرق عادت کا سب سے بڑا منکر بوعلی سینا اشارات میں لکھتا ہے:

ولکنها تجارب لماثبتت طلب اسبابها…… ثم انی لو اقتصصت جزئیات هذا الباب فیما شاهدناه وفیما حکی عمن صدقناه لطال الکلام۔

''لیکن یہ تجربے ہیں جب وہ ثبوت کو پہنچ گئے تو ان کے اسباب کی تلاش ہوئی اور اگر اس قسم کی جزئیات کا تتبع کریں جو ہم نے خود مشاہدہ کیا یا ان لوگوں سے جن کو ہم معتبر سمجھتے ہیں سنا ہے تو بہت طول ہو جائے گا۔''

سلسلۂ اسباب وعلل پر علم انسانی کو احتوا نہیں

① گویا انہوں نے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ کائنات کے جو علل اور اشیاء کے جو خواص انہوں نے دریافت کر لیے ہیں وہ نظام کائنات کے چلانے کے لیے کافی ہیں، اس کے لیے کسی اور کے دست اندازی کی ضرورت نہیں۔

② کائنات کے چہرۂ اسرار کو انہوں نے تمامتر بے نقاب کرلیا ہے اور ہر شے کی علت اور خاصیت انہوں نے دریافت کر لی ہے۔

حالانکہ انسانی معلومات اس کے مجہولات کے مقابلہ میں بہت کم حیثیت ہیں، اس فضائے کائنات کی بے شمار آبادیوں میں زمین نام ایک آبادی کے چوتھائی خشک حصے کے بعض اجزائے کائنات تک فقط ان کی رسائی ہوسکی ہے، اس مبلغ علم پر اتنا عظیم الشان دعویٰ کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ جن چیزوں تک ان کی رسائی ہوئی بھی ہے ان کے متعلق جو کچھ انہیں معلوم ہوا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ یہ چیز اس طرح چل رہی ہے لیکن یہ حقیقت کہ وہ کیوں چل رہی ہے اور اگر وہ اس کے خلاف چلے تو کیا استحالہ لازم آئے گا؟ یہ ایک معمہ ہے اور ہمیشہ معمہ رہے گا، اجرامِ فلکیہ اور طبقاتِ ارضیہ کو چھوڑ دو کہ وہ دور ہیں، تم یہ کہتے ہو کہ بجلی میں یہ قوت ہے، سنکھیا میں یہ اثر ہے، مقناطیس کا یہ خاصہ ہے لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ کیوں ایسا ہے؟ اور نزدیک آؤ، اپنے جسم کی دنیا کو دیکھو، تم صرف یہ جانتے ہو کہ سانس کی آمد ورفت ہمارے پھیپھڑوں کی حرکت سے ہے؟ نبض کی رفتار قلب کی قبض وبسط کی ڈوری سے وابستہ ہے، تمہارا نفس یا ذہن لمحوں میں ہزاروں میل کی خبر لیتا ہے اور خدا جانے عجائباتِ نفسانی کے کیا کیا تماشے دکھاتا ہے لیکن کوئی یہ حل کر سکا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ دل کو کس نے مضطرب بنا رکھا ہے؟ پھیپھڑوں کی دھونکنی کس طرح روز وشب مصروف عمل ہے دماغ کے ذہنی افعال کیونکر سرانجام پاتے ہیں؟ جب اتنے قریب کی چیز تمہارے فلسفہ علل واسباب کے دائرہ سے باہر ہے تو دور دراز کی اشیاء کی نسبت تمہارا دعویٰ علم کس قدر تمسخر انگیز ہے۔ حکما یعنی سائینٹسٹ اعلانیہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ صرف ''کیسے'' کا جواب دے سکتے ہیں ''کیوں'' کا جواب ان کے موضوع بحث سے خارج ہے۔ فلاسفہ کا یہ حال ہے کہ دو فلسفی بھی ایک نظام خیال پر متفق نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ نے الرد علی المنطقیین میں لکھا ہے:

''فلاسفہ کوئی ایک متحد الخیال جماعت نہیں جس کا علم الٰہیات وطبیعیات وغیرہ میں کوئی ایک مذہب ہو، بلکہ وہ مختلف الخیال فرقے ہیں اور ان کے اندر آراء وخیالات کا اتنا اختلاف ہے کہ اس کا احاطہ بھی مشکل ہے ان کے باہمی اختلافات تو اس سے بھی زیادہ ہیں جس قدر کسی ایک آسمانی مذہب کے مختلف فرقوں کے اندر ہیں۔'' [1]

اس اختلاف رائے اور اس اختلاف خیال کی بنا پر کسی فلسفی کا یہ دعویٰ مذہب کا فلاں مسئلہ فلسفہ کے خلاف ہے، اس لیے ناقابل قبول ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ یہ مسئلہ ہماری رائے یا ہماری جماعت کی رائے کے خلاف ہے، اس لیے ناقابل تسلیم ہے تو یہ مذہب پر ہی کیا موقوف ہے ہر نظامِ فلسفہ کا قائل

[1] الرد علی المنطقیین، ص: ۲۹۰۔

دوسرے نظام فلسفہ کے بطلان پر اسی قدر وقوت سے اس استدلال کو کام میں لا سکتا ہے غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ فلسفہ کے جس قدر فرقے (اسکول) اور نظامات (سسٹم) ہیں درحقیقت وہ اسرار کائنات کے متعلق ایک مرتب خیال کی کڑیاں ہیں، ان مرتب خیال کی کڑیوں کو مان کر جس کے نفس کی تسکین ہو جاتی ہے، وہ ان کا فلسفہ ہے اسی طرح مذہب بھی اپنا ایک نظامِ خیال رکھتا ہے اور جو لوگ اس نظامِ خیال پر یقین رکھتے ہیں ان کی اس سے تشفی ہو جاتی ہے ایسی حالت میں اگر معجزہ کا امکان یا وقوع کسی نظامِ خیال کے خلاف ہے تو نفس یہ اختلاف اس کے ابطال کی دلیل نہیں ہو سکتا ورنہ یہ لازم آئے گا کہ ہر فلسفیانہ مسئلہ اس لیے باطل ہے کہ دوسرے نظامِ فلسفہ کے وہ خلاف ہے۔

نظامِ عالم کے چلانے کے لیے علل و اسباب کے کافی ہونے کے فلسفہ پر یقین رکھنے کے لیے سب سے پہلی بحث کا آغاز آفرینش کی آتی ہے، آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ شے اس سبب سے پیدا ہوئی اور اس شے کی پیدائش کا یہ سبب ہے؟ لیکن کیا کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ یہ مادہ کہاں سے آیا؟ اور اس کے حدوث کا سبب کیا ہوا؟ عناصر کیونکر اور کیوں وجود میں آئے؟ یہ نوع بنوع چیزیں کیونکر بن گئیں؟ ہمارے جواب میں ان نظریات کا ذکر نہ کیجئے جن کا نام اصول ارتقا اور انتخابِ طبعی وغیرہ ہے کہ ان کی علمی حیثیت مفروضات اور وہمیات سے زیادہ نہیں اور ان کی اخیر سرحد بالآخر لاعلمی اور جہالت پر جا کر ختم ہو جاتی ہے، مادہ کی ابتدائی بنیاد چاہے اربع عناصر کو بتائے یا جواہر فردہ کو، یا سالمات کو، یا ایتھر کو، یا برق پاروں کو جن کو بھی بتاؤ لیکن ان کے حدوث کی علت نہیں بتائی جا سکتی اور نہ بتا سکتے ہیں کہ بالآخر وہ کہاں سے آئے؟ اب تو حیوانات نطفہ سے، پرندے انڈے سے اور درخت گٹھلی سے پیدا ہوتے ہیں اور بغیر ان کے پیدا ہونا ناممکن سمجھا جاتا ہے لیکن یہ کوئی بتا سکتا ہے کہ دنیا کا پہلا حیوان پہلا پرندہ اور پہلا درخت بغیر کسی نطفہ، کسی انڈے اور کسی گٹھلی کے پیدا ہوا یا نہیں؟ اگر ہاں کہتے ہیں تو آپ نے اپنے دعویٰ کے خلاف ایک شہادت قبول کر لی اور اگر انکار کرتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پہلا نطفہ، پہلا انڈا اور پہلی گٹھلی، انسان، پرندہ اور درخت کے بغیر پیدا ہوئی غرض اس گتھی کو آپ اپنے ناخنِ حکمت سے کسی طرح سلجھا نہیں سکتے اور ناچار آپ کو سلسلۂ علل و اسباب کے مذہب سے برگشتہ ہونا پڑے گا۔

حقیقی علت خدا کی قدرت اور ارادہ ہے

جہاں آپ اپنے سلسلہ اسباب وعلل کو چند قدم بڑھا سکتے ہیں وہاں بھی بالآخر سپر افگن ہونے سے چارہ نہیں، پانی بادل سے برسا، بادل بخارات سے بنے، بخارات پانی سے اٹھے، جو سورج کی تپش سے گرم ہو کر یہ صورت اختیار کر لیتے ہیں، غرض پانی بخارات سے پیدا ہوا اور بخارات پانی سے پیدا ہوئے اس دور کے عقدہ لاینحل کو آپ حل کر سکتے ہیں؟ یہ ناممکن ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ایک قادر و ذی ارادہ ہستی کو تسلیم کیجئے جس کی مشیت اور ارادہ سے سارا کارخانہ چل رہا ہے اسباب وعلل صرف اس کی مشیت و ارادہ کے

مظاہر ہیں اور وہ اپنی عادت کے مطابق ایک طریقِ خاص پر اس کو چلا رہا ہے لیکن وہ اس کا پابند نہیں ہے صدیوں میں جب اس نے ضرورت سمجھی انسانوں میں اپنا ایک نشان قائم کرنے کے لیے عادت کے خلاف کوئی بات ظہور پذیر کر دی، علت و معلولیت کا تعلق جو بظاہر نظر آتا ہے ہم نے اس کی عادت جاریہ کی یک رنگی اور یکسانی سے اس کو سمجھ لیا ہے کہ اگر اس کی عادت جاریہ یک رنگی اور یکسانی اختیار نہ کرتی تو مخلوقات اپنے منافع کے حصول اور مضرتوں کے دفع کے لیے پہلے سے کوئی تیاری نہ کر سکتیں۔

مولانا روم اور اسباب وعلل اور معجزہ کی حقیقت

عارف روم نے اسی حقیقت کو ان اشعار میں ادا کیا ہے:

سنتے بنہا دو اسباب و طرق　　طالباں را زیر ایں ازرق تتق

''اللہ تعالیٰ نے آسمان کے ان نیلے پردوں کے نیچے کام کرنے والوں کے لیے علل واسباب اور عادات مقرر کر دیے ہیں۔''

بیشتر احوال بر سنت رود　　گاہ قدرت، خارقِ سنت شود

''دنیا کے زیادہ تر واقعات انہی عادات جاریہ کے مطابق ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی قدرت الٰہی اس عادت کو توڑ بھی دیتی ہے۔''

سنت و عادت نہادہ بامزہ　　باز کردہ خرق عادتِ معجزہ

''طریق و عادات (یعنی اسباب وعلل) کو اس نے خوش آئند بنایا ہے لیکن پھر معجزہ سے خرق عادت بھی کر دیتا ہے۔''

اے گرفتارِ سبب! بیروں مپر　　لیک عزل آں مسبب ظن مبر

''اے وہ جو اسباب وعلل کی زنجیر میں گرفتار ہے زیادہ نہ اُڑ اور یہ خیال نہ کر کہ ان اسباب وعلل کے بنا دینے سے وہ علۃ العلل مسبب الاسباب بیکار ہو گیا۔''

ہر چہ خواہد او مسبب آورد　　قدرت مطلق سببہا بردرد

''وہ حقیقی مسبب الاسباب جو چاہے کرے اور اس کی قدرت علی الاطلاق اسباب کو توڑ دے۔''

لیک اغلب بر سبب راند نفاذ　　تا ابد از طالبے جستن مراد

''لیکن بیشتر وہ اسباب ہی کے مطابق دنیا کو چلاتا ہے، تاکہ کام کرنے والوں کو اپنے حصولِ مقصد کا راستہ معلوم ہو۔''

چوں سبب نبود چہ رہ جوید مرید　　پس سبب در راہ می آید پدید

''اگر اسباب معلوم نہ ہوں تو کام کرنے والوں کو راہ کیونکر ملے؟ یہی اسباب تو نشانات بن کر نمودار ہوتے ہیں۔''

ایں سببہا بر نظرہا پردہ ہاست　　　　کہ نہ ہر دیدار صنعش راسزااست

''یہ ظاہری اسباب نگاہوں کے پردے ہیں کیونکہ ہر آنکھ اس کی صنعت کو نہیں دیکھ سکتی۔''

دیدۂ باید سبب سوراخ کن　　　　تاحجب را برکند از بیخ وبُن

''اس کے لیے ایسی آنکھ چاہیے جو اسباب کا پردہ چاک کردے، تاکہ حجابات اٹھ جائیں۔''

از مسبب می رسد ہر خیر و شر　　　　نیست اسباب و وسائط را اثر [1]

''درحقیقت ہر نیک وبد اسی اصلی مسبب الاسباب کے یہاں سے پہنچتا ہے اور اس میں درمیانی اسباب دوسائط کو دخل نہیں۔''

باد و خاك و آب و آتش بنده اند　　　　بامن و مرده باحق زنده اند

''ہوا، مٹی، پانی اور آگ سب خدا کے محکوم ہیں یہ ہمارے تمہارے سامنے تو بے جان مگر خدا کے سامنے جاندار ہیں۔''

سنگ بر آہن زنی بیروں جہد　　　　ہم بہ امر حق قدم بیروں نہد

''جب پتھر لوہے پر مارو تو اس سے آگ نکلتی ہے یہ خدا ہی کے حکم سے اپنا قدم باہر نکالتی ہے۔''

آہن و سنگ از ستم برہم مزن　　　　کایں دومی زایند ہمچو مرد و زن

''لوہے اور پتھر کو بے فائدہ ایک دوسرے پر مت مارو کہ یہ دونوں نر و مادہ ہیں جو آگ کا بچہ پیدا کرتے ہیں۔''

سنگ وآہن خود سبب آمد ولیک　　　　توبہ بالا تر نگر اے مرد نیک

''پتھر اور لوہا گو یہ دونوں آگ کا سبب ہیں لیکن ذرا اس سے آگے بڑھ کر غور کرو۔''

کایں سبب را آں سبب آورد پیش　　　　بے سبب کے شد سبب ہرگز بخویش

''کہ اس ظاہری سبب کو اس حقیقی سبب (خدا) نے آگے کردیا یہ ظاہری سبب خود بخود بلا سبب کب پیدا ہوا ہے۔''

آں سبب راآں سبب عامل کند　　　　باز گاہے بے پرد عاطل کند

''اس ظاہری سبب کو اس حقیقی سبب نے دنیا میں مؤثر اور عامل بنا دیا ہے پھر جب چاہے وہ اس کو بے اثر اور بیکار قرار دے سکتا ہے۔''

واں سبب ہا کانبیاء را رہبر است　　　　آں سبب ہازیں سبب ہا برتر است

''جو اسباب کہ انبیا کے کاموں میں پیش پیش ہوتے ہیں وہ ان ظاہری و دنیاوی اسباب سے بلند اور برتر ہیں۔''

ایں سبب را محرم آمد عقل ما　　　　واں سبب ہا راست محرم انبیاء

''ان ظاہری علل واسباب کی محرم تو ہماری انسانی عقلیں ہیں لیکن ان حقیقی اسباب کے محرم انبیا علیہم السلام ہیں۔''

چونکہ ظاہر بین انسان ان اسباب وعلل کو دیکھ کر اصل علۃ العلل اور مسبب الاسباب کو بھول جاتے ہیں

---

[1] مثنوی مولانا روم، دفتر پنجم ص: ۱۷۲ مطبع ناصری بمبئی ۱۳۱۸ھ ایضاً مترجمہ قاضی سجاد حسین فتح پوری، ص: ۱۹۱ بمبئی آرٹ پریس قاسم جان دہلی: ۱۹۷۶ء۔

اور وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اس لیے انبیا علیہم السلام اس غفلت کے پردے کو چاک کر دیتے ہیں اور ظاہری علل واسباب ان کے لیے بیکار کر دیے جاتے ہیں۔

ہست بر اسباب، اسبابِ دگر در سبب منگر در آں افگن نظر

''ان ظاہری اسباب کے اوپر حقیقی اسباب بھی کارفرما ہیں، ان ظاہری اسباب کو نہ دیکھو حقیقی اسباب پر غور کرو۔''

انبیا در قطع اسباب آمدند معجزات خویش بر کیواں زدند

''انبیا قطع اسباب کے درپے ہیں اور اپنے معجزات کا جھنڈا انہوں نے مریخ میں گاڑ دیا ہے۔''

بے سبب مر بحر را بشگافتند بے زراعت چاش گندم یافتند

''بغیر کسی سبب ظاہری کے انہوں نے سمندر کو شق کر دیا اور کھیتی کے بغیر گیہوں کا خوشہ حاصل کیا۔''

جملہ قرآں ہست در قطعِ سبب عزِ درویش و ہلاکِ بولہب

''تمام قرآن قطعِ اسباب کے بیان سے بھرا ہوا ہے، آنحضرت ﷺ کا غلبہ اور ابولہب کی بربادی بھی اسی طرح ہوئی۔''

مرغ با بیلے دو سہ سنگ افگند لشکر زفت حبش را بشکنند

''پرندے کنکریاں پھینکتے ہیں اور حبش کے سیاہ لشکر کو شکست دیتے ہیں۔''

پیل را سوراخ سوراخ افگند سنگ مرغ کو ببالہ پرزند

''یہ کنکریاں جو اُوپر سے آتی ہیں، ہاتھیوں کے بدن میں چھید کر کے ڈال دیتی ہیں۔''

ہمچنیں ز آغاز قرآں تا تمام رفض اسباب است وعلت والسلام [1]

''اسی طرح شروع سے آخر تک قرآن اسباب وعلل کے مؤثر حقیقی ہونے کا منکر ہے۔''

علت، خاصیت اور اس کی حقیقت

اس اجمال کی تفصیل علت، خاصیت اور اثر کی تحقیق پر مبنی ہے، اشیاء میں جو خواص اور آثار ہیں، ان کا علم ہم کو کیونکر ہوتا ہے؟ محض تکرارِ احساس سے، جس کا دوسرا نام تجربہ ہے۔ جب ہم آگ کے پاس جاتے ہیں تو گرمی اور سوزش کا احساس کرتے ہیں اور پھر جب جب ہم آگ کے پاس گئے تو ہم کو اسی قسم کا احساس ہوتا رہا۔ اس سے ہم میں یہ یقین پیدا ہوا کہ آگ کا خاصہ اور اثر گرمی اور سوزش ہے، فرض کرو کہ اگر تکرارِ احساس سے یہی تجربہ ہم کو برف سے حاصل ہو جائے تو یقیناً ہم کہہ دیں گے کہ برف کی خاصیت سوزش اور گرمی ہے برف اور آگ دونوں آپ کے سامنے ہیں دونوں کو اچھی طرح غور سے دیکھئے کیا ان کی ذات میں کوئی ایسی

[1] مثنوی مولانا روم، دفتر سوم، ص: ٢٤٤ مترجم قاضی سجاد حسین۔ ''ض''۔

چیز نظر آتی ہے۔ جس کی بنا پر احساس بلکہ تکرار احساس سے قبل آپ یہ فیصلہ کر دیں کہ ایک میں گرمی اور دوسری میں ٹھنڈک کا ہونا ضروری ہے اور آپ کے ہاتھ میں کوئی شخص کافور اور سنکھیا دونوں کی تھوڑی تھوڑی مقدار لا کر رکھ دیتا ہے اس سے پہلے آپ ان چیزوں سے واقف نہ تھے اب آپ دونوں کو غور سے دیکھئے اور خوب الٹ پلٹ کر دیکھئے، سونگھ کر، چکھ کر، چھو کر، کس طرح آپ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کے خواص و آثار کیا ہیں؟ یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہے۔ جب تک ان کا بار بار تجربہ نہ کیا جائے اور ہر بار کے عمل سے ایک ہی نتیجہ ظاہر نہ ہو اس سے ثابت ہوا کہ اشیاء کے خواص و آثار کا علم صرف یکسانی عمل اور تجربہ پر موقوف ہے۔ عمل کی اسی یکسانی اور تجربہ کی بنا پر ہم علل و معلولات اور اسباب و مسبباب کا سلسلہ قائم کرتے ہیں اور اسی کی بنا پر مدعیان عقل و دانش وہ صنم کدہ قائم کرنا چاہتے ہیں جس کے پرستاروں کے نام نیچری، میٹریلسٹ، مادہ پرست، فطرت پرست اور طبیعی ہیں وہ جب ایک شے سے ایک ہی عمل اور اثر کا بار بار تجربہ کرتے ہیں تو یقین کر لیتے ہیں کہ اس شے سے اس خاصیت واثر کا انفکاک قطعاً محال ہے اور جب ایک شے کے بعد فوراً دوسری چیز پیدا ہوتے دیکھتے ہیں اور بار بار دیکھتے ہیں اور کبھی اس میں تخلف نہیں پاتے تو یہ یقین کلی کر لیتے ہیں کہ دوسری شے معلول و مسبب اور پہلی شے علت و سبب ہے اور یہ کلیہ قائم کر لیتے ہیں کہ گرمی و سوزش کا سبب آگ ہے، ٹھنڈک اور برودت کا سبب برف ہے، موت کا سبب سنکھیا ہے یا یوں کہیے کہ آگ کا خاصہ جلانا، برف کا خاصہ ٹھنڈا کرنا، سنکھیا کا خاصہ انسان کی زندگی کو ختم کر دینا ہے۔ معجزہ کے امکان سے چونکہ ان کے خیال کے مطابق ان آثار و خواص کا انکار یا علل و اسباب کا ابطال لازم آتا ہے یعنی یہ ماننا پڑتا ہے کہ آگ، ہو اور جلائے نہیں، سمندر ہو اور غرق نہ کرے، اس لیے وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ معجزہ قطعاً محال ہے۔

اسباب و علل محض عادی ہیں

لیکن ابھی ثابت ہو چکا کہ ہم جن کو آثارِ خاص یا اسباب و علل کہتے ہیں محض اس تجربہ پر ان کی بنیاد ہے کہ ہم نے ہمیشہ اس شے کو ہوتے دیکھا ہے اور اس سے یہ توقع یا زیادہ سے زیادہ ظن غالب یہ پیدا ہوتا ہے کہ آئندہ بھی جب یہ شے پیدا ہوگی تو اس کے بعد دوسری شے پیدا ہو جائے گی لیکن اس سے یہ یقین کس طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ ہم نے جو کچھ مشاہدہ کیا ہے وہ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا اور ہمارے علاوہ شروع سے آج تک اور جن جن لوگوں نے اس کو دیکھا ہے ان کے مشاہدہ کا بھی یہی نتیجہ نکلا ہے اور آئندہ بھی ان کے مشاہدہ کا یہی نتیجہ نکلا کرے گا۔ آج تک آگ کے متعلق اور جن آگوں کے متعلق آپ کا جو تجربہ ہے اس پر آپ یقین کر سکتے ہیں لیکن محیط ارض کی ہر آگ کے متعلق جو آپ کے تجربہ میں نہیں آئی ہے اور نہ آ سکتی ہے یہ کیونکر یقین پیدا کر لیتے ہیں کہ ان سب کا اثر جلانا ہی ہے اور نیز یہ اعتماد کس مقدمہ یقین پر قائم کر لیتے ہیں کہ آئندہ تا قیامت آگ کا عمل واثر ہمیشہ جلانا ہی رہے گا اور جب آپ کے اس یقین

واعتماد کے لیے کوئی دلیل قائم نہیں ہے تو چند آگوں کو دیکھ کر آپ اس قضیۂ کلیہ پر کیونکر نا قابل شکست یقین کی مہر لگا دیتے ہیں کہ دنیا کی یہ آگ جلاتی ہے اور ہمیشہ جلاتی رہے گی۔

اسبابِ عادیہ کا علم صرف تجربہ سے ہوتا ہے

غرض خواص وآثار اور اسباب وعلل کی نسبت علم انسانی کا جہاں تک احاطہ ہے وہ صرف یکسانی عمل اور تجربہ کا نتیجہ ہے ہم ایک شے کے بعد دوسری شے کو ہوتے ہوئے دیکھتے آئے ہیں، اس لیے یہ توقع رکھتے ہیں کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا، اس کی مثال یہ ہے کہ ہم ایک شخص کو آغازِ عمر سے دیکھتے ہیں کہ وہ فلاں وقت سوتا ہے فلاں وقت جاگتا ہے، مسجد میں فلاں دروازہ سے اندر داخل ہوتا ہے، کبھی کسی سے انتقام نہیں لیتا ہے، سالہا سال کے مشاہدہ اور تجربہ کے بعد ہم اس کے متعلق بطریقِ ظن غالب یہ خیال قائم کر لیتے ہیں کہ اس وقت اتنے بجے ہیں اس لیے وہ اٹھا ہوگا، اتنے بج کر اتنے منٹ ہوئے ہیں اس لیے وہ سو گیا ہوگا، آج جب وہ نماز کے لیے جائے گا تو فلاں دروازہ سے اندر داخل ہوگا۔ اسی کا نام عادت ہے مگر کیا کبھی کوئی اس حماقت میں مبتلا ہوگا کہ سالہا سال کے تجربہ کے بعد وہ یقینی دعویٰ کر بیٹھے کہ اس وقت اس کا سویا رہنا محالِ قطعی ہے اس وقت اس کا جاگنا لامحالہ ضروری ہے اور فلاں دروازہ سے اس کا داخلہ عقلاً لازم ہے۔

اسباب وعلل کا علم بدلتا رہتا ہے

اسی طریق پر اشیاء اور موجوداتِ عالم سے عادتاً جو مختلف آثار ونتائج کا صدور ہوتا رہتا ہے، اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم ان اشیاء اور موجودات سے ان آثار ونتائج کے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں اور عادۃً ایسا سمجھتے ہیں کہ آئندہ بھی ان سے یہی آثار وخواص صادر ہوں گے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمثیل صحیح نہیں ہے انسان ایک صاحب ارادہ ہستی ہے، اس لیے اس کے افعال، اس کے ارادہ کے ماتحت ہیں جن کو وہ جب چاہے بدل سکتا ہے دیگر غیر ذی روح اشیاء کے افعال ارادی نہیں ہیں، بلکہ خلقی ہیں اس لیے ان میں تغیر نہیں ہو سکتا لیکن یہ درحقیقت ایک قسم کا مغالطہ ہے آپ کے حرکات وافعال آپ کے اعضاء سے صادر ہوتے ہیں جو بے ارادہ ہیں اور ارادہ آپ کے نفس یا روح یا ذہن کا فعل ہے جس طرح آپ کی روح یا نفس یا ذہن کی قوتِ ارادہ آپ کے جامد اور بے جان مضغۂ گوشت اعضا سے اپنی حسبِ خواہش مختلف حرکات وافعال صادر کراتی ہے اسی طرح روحِ اعظم کی قوت ارادہ اس بے جان عالمِ کائنات سے اپنی خواہش کے مطابق مختلف افعال اور حرکات صادر کراتی رہتی ہے اور چونکہ عموماً وہ اس کو ایک ہی نہج پر چلاتی رہتی ہے اس لیے ہم کو اسبابِ عادیہ کا علم کسی قدر عطا ہو گیا ہے۔

اسی عادت کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ذہن کے اندر آگ اور گرمی، برف اور ٹھنڈک کے درمیان ایک

تلازم پیدا ہو گیا ہے جس کی بنا پر ہم سمجھتے ہیں کہ آگ سے گرمی اور برف سے ٹھنڈک کا انفکاک نہیں ہو سکتا، حالانکہ اگر آگ اور برف کے متعلق ہمارا آئندہ تجربہ بدل جائے تو یقیناً یہ تلازم کا خیال بھی بدل جائے گا، مثلاً: جس عہد قدیم میں گردشِ آسمانی اور دورِ نجوم حادثات کے اسباب وعلل یقین کیے جاتے تھے اور ستاروں کی مختلف چالوں اور ان کی خاص خاص اشکال سے حوادثِ عالم کی توجیہ کی جاتی تھی اسی وقت ستاروں کی ایک خاص شکل کے ظہور یا کسی خاص ستارہ کے طلوع اور اس کے آثار ونتائج کے درمیان ایک خاص تلازم سمجھا جاتا ہوگا اور اس یقین کو کہ یہ دونوں باہم علت ومعلول ہیں ناقابل انکار سمجھا جاتا ہوگا لیکن آج ایسا نہیں ہے۔ قدیم وجدید فنِ طب میں اب آسمان وزمین کا اختلاف ہے دواؤں کے خواص واثرات اور امراض کے علل واسباب میں عظیم الشان تبدیلی ہوگئی ہے مگر قدیم اطبا یا اب بھی قدیم طب کے واقف کاروں اور قدر شناسوں کے نزدیک ان کے تجربے اور یکسانی عمل کی بنا پر جن دواؤں کے جو اثرات اور جن امراض کے جو علل واسباب ہیں وہ ان کے یقینیات میں داخل تھے اور ہیں لیکن ممالک یورپ میں جہاں کوئی اس طب کا نام بھی نہیں جانتا اور اس کے تجارب وتحقیقات کا مشاہدہ نہیں کیا گیا ہے ہمارے اطبا کے یقین کردہ آثار وخواص اور اسباب وعلل کو وہاں اوہام سے زیادہ رتبہ نہیں دیا جا سکتا۔

خود اوہام کیا چیز ہیں؟ جاہل طبقوں اور وحشی قوموں میں بہت سے ایسے یقینیات ہیں جن کو آپ اوہام سے تعبیر کرتے ہیں مگر ان میں یہ اوہام کیونکر پیدا ہوئے؟ اسی تکرارِ تجربہ سے انہوں نے کئی دفعہ دیکھا کہ جب صبح کا فلاں پرندہ بولا یا اڑا تو فلاں بات ہوگئی، چند بار کے دیکھنے سے ان کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ اس کا یہ اثر ہے حالانکہ معلوم ہے کہ اس پرندہ کے بولنے یا اڑنے اور اس بات کے ہونے کے درمیان کسی قسم کا تلازم نہیں ہے، تاہم چونکہ ان کا یقین ان کے تجربے پر مبنی ہے اس لیے اس کے خلاف باور کرانا ان کے لیے اتنا ہی محال ہے جتنا کہ آگ اور گرمی وسوزش کے درمیان تلازم اور ان دونوں کے درمیان علت ومعلول پر عقیدہ رکھنے والوں کے لیے یہ تخیل کہ آگ موجود ہو اور اس سے گرمی وسوزش کا اثر ظاہر نہ ہو۔ جن ملکوں میں خچر نہیں ہوتے وہاں کے باشندے اپنے تجربہ کی بنا پر اس مسئلہ پر یقین کامل رکھتے ہیں کہ دو مختلف النوع جانوروں میں باہم توالد وتناسل نہیں ہو سکتا اور اگر اس کے خلاف ان کو یقین دلانا چاہیں کہ گھوڑے اور گدھے مل کر باہم اس فرض کو انجام دیتے ہیں اور اس سے خچر نام ایک تیسری نوع تیار ہوتی ہے تو اس کے تسلیم کرنے میں ان کو کس قدر تامل ہوگا لیکن کیا ان کا تامل ہندوستان ومصر میں مطابقِ واقعہ سمجھا جائے گا جہاں ہزاروں دفعہ یہ مشاہدہ ہو چکا ہے۔

اسباب وعلل کا علم تجربہ سے ہوتا ہے

الغرض ہم جن کو اصول فطرت، نوامیس قدرت اور لاز آف نیچر کہتے ہیں وہ صرف روزمرہ کے مشاہدات

عادیہ کا نام ہے، ہم دیکھتے آئے ہیں کہ درخت کس طرح اُگتے ہیں، جاندار موجودات کس طرح پیدا ہوتے ہیں، آفتاب کس طرح طلوع ہوتا ہے، پانی کس طرح برستا ہے، ان کو دیکھتے دیکھتے ہم اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ ہم ان کا اسی طرح ہونا ضروری اور اس کے خلاف ہونا محال قطعی سمجھتے ہیں، حالانکہ اس کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دانہ زمین میں ڈالا جاتا ہے، کچھ دنوں کے بعد وہ پھوٹتا ہے۔ اس میں کوپلیں نکل آتی ہیں پھر وہ پودے کی شکل اختیار کرتا ہے شاخیں نکلتی ہیں اور بڑھ کر درخت ہو جاتا ہے، ایک قطرۂ آب خون اور خون سے گوشت بن جاتا ہے اس میں رگیں پٹھے اور ہڈیاں پیدا ہو جاتی ہیں، دل ودماغ اور جگر وگردہ اپنی اپنی جگہ پر بن جاتے ہیں پھر کہیں سے اس میں روح آ جاتی ہے پھر اس آئینہ میں احساس وعقل جلوہ آرا ہوتی ہے، ایک مدت متعینہ کے بعد وہ پیدا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے، اس طرز پیدائش کو دیکھتے دیکھتے حیرت زائی اور استعجاب واستبعاد کی روح ہم سے بالکل فنا ہو گئی ہے اور ہم کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی غور نہیں کرتے کہ ایک جاندار وذی عقل انسان کی صورت میں کیونکر بدل گیا لیکن ہمیں سے یہ کہا جاتا ہے کہ ایک بے جان لکڑی جاندار سانپ بن گئی اور عیسیٰ (علیہ السلام) نام ایک بچہ بن باپ کے پیدا ہو گیا تو ہماری محدود عقل وتجربہ کا پرغرور سر انکار سے ہلنے لگتا ہے یہ کیوں؟ اس لیے کہ کبھی ہم نے ایسا ہوتا دیکھا نہیں، آفتاب روز پورب سے طلوع ہوتا ہے اور پچھم میں جا کر غروب ہو جاتا ہے، ہم کو اس پر مطلق تعجب نہیں ہوتا اور نہ یہ مستبعد معلوم ہوتا ہے اور جب یہ سنتے ہیں کہ قیامت کے دن آفتاب پورب کے بجائے پچھم سے نکلے گا تو ہم اس کو خلاف عقل کہتے ہیں، کیا پورب سے اس کا نکلنا عقل کے موافق تھا؟ اور تم آفتاب کو اگر پورب سے نکلتے نہ دیکھتے تو خود بخود عقلاً یہ فیصلہ کر لیتے کہ اس کو پورب ہی سے نکلنا چاہیے اور مغرب ہی میں ڈوبنا چاہیے۔ عموماً انسان کے ایک سر، دو آنکھیں، دو کان، دو ہاتھ اور دو پاؤں اور ہر ہاتھ پاؤں میں پانچ پانچ انگلیاں ہوتی ہیں۔ لیکن تاریخ طبعی انسانی کی کوئی کتاب پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ قدرت کے مستثنیات کی بھی کوئی انتہا نہیں اور سینکڑوں ہزاروں بچے اس کے خلاف پیدا ہوئے ہیں، اب جس طرح آپ اس پر اعتراض نہیں کرتے کہ انسان کے دو ہی ہاتھ اور دو ہی پاؤں کیوں ہوتے ہیں؟ اس پر بھی اعتراض نہیں کر سکتے کہ اس بچہ کے چار ہاتھ اور چار پاؤں کیوں ہیں اور جس طرح آپ کو اس پر حیرت نہیں ہوتی کہ آدمی جی کر مر کیونکر جاتا ہے، ایسے ہی اس پر حیرت نہ کیجئے کہ مر کر جی کیونکر جاتا ہے، ان دونوں میں صرف یہ فرق ہے کہ ایک واقعہ کو آپ نے بار بار دیکھا ہے اور دوسرے کو کبھی نہیں دیکھا لیکن کسی چیز کا دیکھنا اور نہ دیکھنا کسی چیز کے فی نفسہ محال یا ممکن ہونے پر دلیل نہیں ہو سکتی۔

حاصل یہ ہے کہ ہم کو معجزات کے متعلق جو استبعاد نظر آتا ہے اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ وہ ہمارے گزشتہ مشاہدات وتجربات کے خلاف ہوتا ہے لیکن اس کا فیصلہ ہر شخص کر سکتا ہے کہ اس کے گزشتہ مشاہدات وتجربات

میں غلطی کا ہونا یا اس میں انقلاب ہو جانا کچھ محال نہیں، طبعیات جدیدہ نے طبعیاتِ قدیمہ کی تحقیقات کی دیوار ڈھا دی۔ حکمائے جدید نے حکمائے قدیم کے سینکڑوں تجربات باطل کر دیے۔ ہیئتِ قدیم اور ہیئتِ جدید میں آسمان وزمین کا اختلاف پیدا ہو گیا، اختراعاتِ جدیدہ نے سینکڑوں اور ہزاروں قدیم مستبعدات اور ممتنعات کو ممکن بلکہ واقعہ بنا دیا، جب ہمارے گزشتہ تجربات اور تحقیقات کا یہ حال ہے تو انسانی تحقیقات و تجربات کی آئندہ صحت کی کون ضمانت کر سکتا ہے؟ فلسفۂ یونان پڑھ کر ہم یقین کرتے تھے کہ زمین ساکن اور آفتاب متحرک ہے، اب روز روشن کی طرح یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ آفتاب ساکن اور زمین متحرک ہے، اس لیے اگر کسی پیغمبر کی زبان سے اس وقت یہ خیال ادا ہوتا کہ زمین متحرک اور آفتاب ساکن ہے تو حکمت قدیمہ کی درس گاہوں میں یہ خیال شاید جاہلانہ اور مضحکہ خیز سمجھا جاتا پھر حکمتِ جدیدہ کے دانایانِ روزگار کو آج مذہب کی جو چیز مضحکہ خیز نظر آتی ہے کیا معلوم کہ کل خود ان کی تحقیقات ''حکمتِ مستقبلہ'' کے مدرسہ میں قابل مضحکہ نہ ٹھہرے گی۔

الغرض صفحات بالا سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ بنی نوعِ انسان کے اصل سرمایہ علم علل و معلول میں جو کچھ ہے وہ صرف ان کے تجربہ کی کمائی ہے اور اسی کی بنا پر استدلال تمثیلی کے طور پر وہ ایک چیز کو چند بار دیکھ کر اپنے ذہن میں ایک حکمِ کلی پیدا کر لیتے ہیں، مثلاً: ایک سیب کو دیکھا، اس کی خوشبو کو سونگھا، اس کے مزہ کو چکھا، اب دوسرا سیب ہمارے سامنے آتا ہے اس کی شکل وصورت اور رنگ کو دیکھ کر اس کی خوشبو کو سونگھ کر ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ بھی سیب ہے اور اس کا مزہ ایسا ہوتا ہے اور پھر چند سیبوں کو دیکھ کر ہم یہ حکم کلی لگا دیتے ہیں کہ ہر سیب ایسا ہوتا ہے اور اس کا یہ خاصہ اور اثر ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم نے برف کو دیکھا اس کی شکل وصورت، رنگ و مزہ اور ٹھنڈک کو محسوس کیا اور پھر کئی دفعہ اس کے دیکھنے کا اتفاق ہوا، ہم نے ہر دفعہ پہلی برف کے مثل دیکھ کر یہ کہہ دیا کہ یہ بھی برف ہے اور ہر برف ٹھنڈا ہوتا ہے۔ یہی حال اس قضیہ کا ہے کہ ''ہر تیز آگ جلاتی ہے۔'' اب غور کیجیے کہ آپ کے یہ قضایا جو محض استدلال تمثیلی کی بنیاد پر قائم ہیں، عقلاً کیونکر ناقابل شکست یقین بننے کا دعویٰ کر سکتے ہیں یہ اور بات ہے کہ آپ عادتاً اپنی عملی اور کاروباری دنیا کے لیے ان پر یقین کر کے جلبِ منافع اور دفعِ مضار میں ان سے کام لیں اور یہی علتِ عادیہ کی حقیقت و مصلحت ہے۔

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا بیان کہ اسباب و علل تجربی ہیں

ہم نے جس پرواز پر مسئلہ علیت کی تشریح کی ہے یہ کوئی نیا خیال نہیں ہے، علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے الرد علی المنطقیین میں جابجا اس خیال کو ظاہر کیا ہے، چنانچہ ہم یہاں اس کی تلخیص اس لیے درج کرنا چاہتے ہیں کہ مسئلہ پوری وضاحت کے ساتھ ناظرین کے سامنے آ جائے۔ ''کھانے کے بعد آسودگی، پینے کے بعد سیری بدیہی تجربیات میں ہے، اسی طرح لذت وغیرہ کا احساس ہے کہ جب انسان اس کا احساس کرتا ہے تو

اس کے بعد فوراً ایک اثر پاتا ہے پھر جب بار بار اس شے کے احساس کے بعد وہی اثر پاتا ہے تو یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہی شے اس اثر کا سبب ہے اسی کا نام تجربیات ہے۔ قضائے کلیہ کی اصل یہی تجربیات ہیں، تفصیل یہ ہے کہ مثلاً: جب ایک شخص کسی خاص دوا کو استعمال کرتا ہے اور یہ پاتا ہے کہ اس سے فلاں مرض دور ہوگیا، یا فلاں قسم کا نقصان ہوگیا تو مرض کا اس سے پیدا ہوجانا یا زائل ہوجانا تجربہ ہے، یہی حال دیگر آلام ولذات کا ہے جو مشمومات، مسموعات، مرئیات اور ملموسات سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ جب اس کو سونگھتا یا دیکھتا یا سنتا یا چکھتا یا چھوتا ہے، پھر نفس میں جو لذت کا احساس ہوتا ہے، وہ وجدانیات میں سے ہے جن کو حواس باطن سے دریافت کرتا ہے، اب نفس میں جو اعتقادِ کلی قائم ہوجاتا ہے کہ اس جنس کے ہر فرد سے لذت حاصل ہوتی ہے اور جنس کے ہر فرد سے الم حاصل ہوتا ہے وہ من قبیلِ تجربیات ہے کیونکہ حواس ظاہرہ وباطنہ سے شے کلی کا احساس نہیں ہوسکتا۔ حکم کلی کا جو اعتقاد نفس میں قائم ہوجاتا ہے وہ حس اور عقل کے مجموعہ سے ہوتا ہے اور اسی کا نام تجربیات ہے، مثلاً: یہ اعتقاد کہ کھانے اور پینے کی چیزوں سے آسودگی اور سیری پیدا ہوتی ہے اور زہر قاتل کے استعمال سے آدمی مرجاتا ہے اور بیماری پیدا کرنے والے اسباب سے آدمی بیمار پڑ جاتا ہے اور اس بیماری کا فلاں اسباب و ذرائع سے استیصال ہوجاتا ہے، یہ کل کے کل قضایائے تجربیہ ہیں کیونکہ حس تو صرف جزئی اور شخصی چیزوں کا احساس کرتا ہے لیکن جب ایک شے سے ایک ہی احساس بار بار ہوتا ہے تو عقل ادراک کرتی ہے کہ اس مشترک امر کی وجہ سے جو ان تمام افراد میں تھا یہ بات پیدا ہوئی اور یہ چیز فلاں قسم کی لذت پیدا کرتی ہے اور اس شے سے فلاں قسم کی تکلیف پیدا ہوتی ہے، یہی حال حدسیات کا ہے کہ ان کی جزئیات کا تو علم احساس سے ہوتا ہے لیکن تکرار سے عقل قدر مشترک کا اندازہ لگالیتی ہے، مثلاً: جب چاند کی روشنی کا اختلاف آفتاب کے مقابلہ کے اختلاف سے دیکھتے ہیں، تو گمان کرلیتے ہیں، کہ چاند کی روشنی آفتاب سے حاصل ہوئی ہے یا یہ دیکھتے ہیں کہ ثوابت کی حرکت میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا اور وہ سب ایک ساتھ حرکت کرتے ہیں تو سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا فلک ایک ہے، اسی طرح جب سبع سیارہ کے اختلافِ حرکات کو دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہر سیارہ کا فلک دوسرے سے مختلف ہے۔'' [1]

قیاس کی بحث میں علامہ ممدوح رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

''فلاسفہ نے یقینیات کو صرف چند قضایا میں محدود کردیا ہے، جن میں سے ایک حسیات ہیں، حالانکہ یہ معلوم ہے کہ حس سے ہرگز کسی عام اور کلی شے کا ادراک نہیں ہوسکتا، اس لیے فقط حسیات سے کوئی قضیہ کلیہ عامہ نہیں بن سکتا جو برہان یقینی کا کوئی جزو بن سکے، تمثیلاً اہل منطق کہتے ہیں کہ ''آگ جلاتی ہے'' حالانکہ اس قضیہ کی عمومیت اور کلیت کا علم تجربہ اور عادت سے ہوا ہے جو قیاس تمثیلی کی ایک قسم ہے اگر یہ کہا جائے کہ اس کا علم اس طرح ہوا کہ آگ میں جلانے والی قوت موجود ہوتی ہے تو یہ علم بھی کہ ہر آگ میں یہ قوت موجود ہوتی

[1] الرد علی المنطقیین، ص: ۳۳۷، ۳۳۸۔

ہے، ایک حکمِ کلی ہے جو احساس سے نہیں دریافت ہوسکتا اور اگر یہ کہا جائے کہ ضروری ہے کہ آگ کی صورت نوعیہ میں یہ قوت موجود ہو اور جس میں یہ قوت موجود نہ ہوگی وہ آگ نہ ہوگی تو یہ دعویٰ اگر صحیح بھی ہو تو مفید یقین نہیں کیونکہ یہ قضیہ کو "جس شے میں یہ قوت ہوتی ہے وہ جلاتی ہے" اس میں تمثیلِ شمول، عادت اور استقرائے ناقص کو دخل ہے اور یہ معلوم ہے کہ جو شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ آگ ہر شے کو جو اُس کے اندر پڑتی ہے جلا دیتی ہے۔ وہ غلطی کرتا ہے کیونکہ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس شے میں جلنے کی قابلیت ہو ورنہ ہر شے کو نہیں جلا سکتی، جس طرح کہ پتھر اور یاقوت کو نہیں جلا سکتی یا ان اجسام کو نہیں جلا سکتی جن میں مانع آتش دوائیں لگا دی گئی ہوں، خرقِ عادت کی بحث کا مقام دوسرا ہے، بہر حال قضایائے حسیہ میں کوئی کلیہ ایسا نہیں ہے جس کا نقض نہ ہو سکے اور در حقیقت قضیہ، کلیہ حسیہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ قضیہ، حسیہ مثلاً "یہ آگ جلاتی ہے" اس میں حس صرف ایک خاص چیز کا ادراک کرتی ہے اور حکم کلی جو عقل لگا دیتی ہے تو فلاسفہ یہ کہتے ہیں کہ نفس ان خاص افراد اور مثالوں کو دیکھنے کے بعد اپنے میں یہ استعداد پیدا کر لیتا ہے کہ اس کے اندر یہ الہام پیدا ہو جائے کہ "ہر آگ جلاتی ہے" یہی حکم کلی ہے تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ بھی قیاس تمثیلی ہے اور اس کی کلیت اور عمومیت پر اس وقت تک وثوق نہیں کیا جا سکتا جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ یہ حکم تمام افراد میں مشترک ہے اور یہ اسی وقت تک ممکن ہے جب تمام افراد کا تجربہ کر لیا جائے پھر بھی قضایائے عادیہ میں سے کوئی قضیہ ایسا نہیں ہے جس کا ٹوٹنا باتفاق عقلاً جائز نہ ہو بلکہ فلاسفہ تک خرق عادت کو جائز سمجھتے ہیں مگر وہ اس کے لیے فلکی طبعی اور نفسیاتی اسباب بیان کرتے ہیں اور ان ہی تینوں اسباب کی طرف خرقِ عادت کو منسوب کرتے ہیں اور اسی سے انبیا کے معجزات اولیا کے کرامات اور سحر وغیرہ کو ثابت کرتے ہیں۔" [1]

اسی قیاس کی بحث کے آغاز میں علامہ ممدوح لکھتے ہیں:

"اور یہی حال تجربیات کا ہے، لوگوں نے عموماً تجربہ کیا ہے کہ پانی پینے سے سیری ہوتی ہے اور گلا کٹ جانے سے آدمی مر جاتا ہے اور ضرب شدید سے تکلیف ہوتی ہے۔ ان تمام قضیوں کا علم محض تجربہ کی بنا پر ہے کیونکہ حس نے ایک خاص سیری کا ادراک کیا ہے اور گلا کٹنے سے ایک خاص شخص کو مرتے دیکھا ہے اور مارنے سے تکلیف ایک خاص شخص نے محسوس کی ہے، اب یہ حکم کہ جو شخص ایسا کرے گا یہ خاص اثر پیدا ہوگا تو یہ قضیۂ کلیہ حس سے نہیں معلوم ہوگا بلکہ اس کے ساتھ حکمِ عقلی کا لگاؤ بھی ہے۔ تجربہ سے جو اثر معین میں معلوم ہوتا ہے اس کی نسبت یہ دیکھنا ہے کہ اس شے معین میں اور اس کے اثرِ معین میں ایک خاص تلازم ہے اور اسی سے عادتِ مستمرہ کا علم ہوتا ہے، خصوصاً جب ان دونوں کے درمیان کسی مناسبت کا بھی شعور ہو جائے اور یہ ثابت ہو جائے کہ جہاں وہ شے پائی جاتی ہے وہاں وہ اثر بھی پایا جاتا ہے اور جہاں وہ اثر پایا جاتا ہے وہاں وہ شے

[1] الرد علی المنطقیین، ص:٢٦٦، ٢٦٧ وملخص الرد علی المنطق، مجموع فتاوی ابن تیمیة، ج٩، ص:٢١٨، ٢١٩ مطبوعه مؤسسة الرساله بیروت: ١٣٩٨ھ۔

بھی پائی جاتی ہے اور نیز یہ کہ جہاں وہ شے نہیں پائی جاتی وہ اثر بھی نہیں پایا جاتا اور جہاں وہ اثر نہیں پایا جاتا وہاں وہ شے بھی نہیں پائی جاتی۔ اب جس قدر اس لزوم میں ظنیت پائی جائے گی اسی قدر علیت کا اعتقاد بھی ظنی ہوگا اور جس قدر لزوم میں قطعیت ہوگی اسی قدر لزوم کے اعتقاد میں قطعیت ہوگی اور یہی قضایائے عادیہ ہیں جیسے طب کے تجربیات وغیرہ، یا یہ علم کہ روٹی کھانے سے آسودگی اور پانی پینے سے سیری ہوتی ہے اور کپڑے پہننے سے بدن میں گرمی اور برہنگی سے بدن میں ٹھنڈک پیدا ہوتی ہے...... [1] پس تجربیات سے علم حاصل ہونے کا سبب ایک شے کا دوسری شے کے بعد ہونے سے اور تکرار اثر سے پیدا ہوتا ہے۔'' [2]

تجربیات کی بنا شہادت اور رعایت اور تاریخ پر ہے

غرض ان مباحث کا ماحصل یہ ہے کہ اشیاء کے خواص اور موجودات کے اسباب کا علم ہم کو محض تجربہ سے حاصل ہوا ہے، اب یہاں یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ کیا تجربی یقین کے پیدا ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ خود اس یقین کرنے والے نے اس کا تجربہ کیا ہو، ہم دنیا میں ہزاروں تجربی مسائل پر یقین رکھتے ہیں، مگر ان میں سے بہت کم ہمارے ذاتی تجربہ میں آئے ہیں، طبیعیات، کیمیائیات، طبیات، فلکیات، ارضیات کی ہزاروں باتیں ہیں جن پر ہم یقین رکھتے ہیں مگر ہمارے ذاتی تجربہ میں بہت کم آئی ہیں، اگر آپ یہ کہیں کہ گو وہ ہمارے ذاتی تجربہ میں نہیں آئی ہیں، لیکن ان علوم کے ماہرین نے ان کا تجربہ کیا ہے اور ہم کو ان کی شہادت کا اس لیے یقین ہے کہ وہ اپنے اپنے علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور اپنے ذاتی تجربوں کو انہوں نے اپنی تصنیفات میں لکھ دیا ہے تو گویا آپ نے قبول کر لیا کہ دوسروں کے تجربیات بھی مفیدِ یقین ہیں، بشرطیکہ خود ان تجربہ کرنے والے علما پر ان کو وثوق ہو اور ان کے تجربیات صحیح و مستند شہادتوں اور واسطوں سے آپ تک پہنچیں۔ دنیا کے واقعات کا سب سے بڑا دفتر تاریخ ہے جو عہد ماضی کی ظلمت میں ہمارے لیے چراغِ راہ ہے اور اس چراغ میں تیل کون برابر ڈالتا جاتا ہے، کہ یہ بجھتا نہیں؟ وہ راویانِ اخبار اور ناقلانِ حکایات ہیں جو ایک عہد سے دوسرے عہد تک اس کو روشن کرتے چلے جاتے ہیں اگر یہ سلسلہ روایت کہیں منقطع ہو جائے تو عہد ماضی کی دنیا بھی عالمِ مستقبل کی طرح تیرہ و تار ہو جائے لیکن تاریخ کی ہر شہادت آسانی کے ساتھ قبول نہیں کر لی جاتی بلکہ اس کے لیے چشم دید گواہوں کا وجود، ان کی صداقت اور راست شعاری اور پھر اس کے بعد بیچ کے واسطوں کی سچائی اور راست گفتاری اور عدم فریب کے ثبوت کی بھی ضرورت ہے لیکن اگر یہ شرائط پورے پورے ہو جائیں تو روایات منقولہ کی صداقت میں کسی کو شک نہ ہونا چاہیے۔

فلسفہ اور سائنس بھی ایک قسم کی تاریخ ہیں

حقیقت میں فلسفہ اور سائنس بھی ایک قسم کی تاریخ ہیں، فلسفہ تو اشخاص یا جماعتوں کے منتظم خیالات کی

---

[1] الرد علی المنطقیین، ص:۸۹، ۹۰۔ [2] ایضاً، ص: ۹۲۔

اور سائنس کائنات،فطرت کے تجربی اکتشافات کی تاریخ ہے،فلسفہ کی درسگاہ کا ہر پروفیسر نہایت وثوق سے یہ کہتا ہے کہ اس مسئلہ میں یونان، اسلام اور یورپ کے فلاں فلاں اساطینِ فلسفہ کی یہ رائیں ہیں؟ کیا اس وثوق کی بنیاد صرف شہادتِ تاریخی پر نہیں ہے؟ آغاز آفرینش سے لے کر اس وقت تک دنیائے انسانی نے علم و اکتشاف، تجربہ و دانش کا جو سرمایہ جمع کیا ہے کیا وہ بجز شہادت تاریخ کے کسی اور طریقہ سے حاصل ہوا؟ یا ہوسکتا ہے؟ یا آئندہ ہوگا آپ یقین رکھتے ہیں کہ جسم بہتر بسیط عنصروں سے مرکب ہے، ہائیڈروجن اور آکسیجن پانی کے دو جز ہیں، سنکھیا کے استعمال سے آدمی مرجاتا ہے مگر ان میں سے ایک بات بھی آپ کے تجربہ میں نہیں آئی ہے، البتہ چونکہ صحیح اور مستند ذریعوں سے آپ تک یہ تحقیقات پہنچی ہیں، اس لیے آپ ان کو باور کرتے ہیں، لندن اور پیرس کو آپ نے خود نہیں دیکھا، لیکن بااین ہمہ آپ کو ان شہروں کے وجود میں شک نہیں، مگر کوہ قاف کے پرستان کے وجود پر آپ کو یقین نہیں، اس لیے کہ پہلے دو شہروں کے وجود کی خبر آپ نے بہ کثرت لوگوں سے اور ایسے ثقہ اور مستند لوگوں سے سنی ہے کہ آپ اس میں شک نہیں کرسکتے، لیکن کوہ قاف کے پرستان کے عینی شاہدوں تک آپ کا سلسلہ روایت صحیح اور مستند ذریعہ سے نہیں پہنچا ہے، اس لیے آپ کو اس کے وجود میں بہت حد تک شک ہے، اسی طرح ہیئت وفلکیات کے اکثر مسائل، مثلاً: ستاروں کی چالیں، خاص ستاروں کا طلوع وغروب وغیرہ کسی نہ کسی ہیئت دان اور فلکی کا مشاہدہ ہے اور پھر صدیوں کے مشاہدات یکجا ہو کر آپ کے سامنے ہیئت وفلکیات کا ناقابل انکار دفتر بن کر آتا ہے مگر غور کیجئے کہ اس دفترِ بے پایاں کا ہر ایک مشاہدہ بجز تاریخی روایت وشہادت کے کسی اور طریقہ سے پہنچا ہے، یا پہنچ سکتا ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ آگ جلاتی ہے، برف ٹھنڈک پہنچاتی ہے، آفتاب روشن ہے، پتھر سخت ہے، کھانے سے سیری ہوتی ہے، چوٹ سے تکلیف ہوتی ہے، غرض تمام قضایائے تجربیہ جن پر علوم وفنون کی بنیاد قائم ہے اور جن کی عمومیت وکلیت کا آپ کو یقین یا ظن غالب ہے ان کی اس کلیت اور عمومیت کا یقین یا غلبہ ظن صرف آپ ہی کے ذاتی تجربہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان میں سے ہر قضیہ کی عمومیت اور کلیت کے بنانے میں آپ کے سوا اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں اور بیسیوں نسلوں کے مشاہدات کو دخل ہے اور یہ مشاہدات آپ تک تحریری یا زبانی تاریخی شہادتوں کے ذریعہ سے پہنچے ہیں تب جاکر وہ انسانی مسلمات میں داخل ہوئے ہیں۔

تاریخی شہادتوں کے شرائطِ استناد

لیکن کسی تاریخی شہادت کے مستند ہونے پر آپ کچھ قیود بھی عائد کرسکتے ہیں، مثلاً: یہ کہ اخیر راوی چشم دید گواہ ہو، یعنی یہ کہ وہ واقعہ کے وقت، مقام واقعہ پر حاضر ہو اور خود اس کا بلاواسطہ ذاتی علم حاصل کیا ہو، وہ راست گفتار ہو، اس کا حافظہ صحیح اور درست ہو، فریبی اور جھوٹا نہ ہو، اسی طرح آغازِ سلسلۂ روایت سے لے کر آخر تک بیچ کا ہر راوی بھی انہی صفات سے متصف ہو، جہاں تک ان صفات میں ترقی ہوگی واقعہ کے متعلق

آپ کے علم واذعان میں بھی ترقی ہوگی اور جہاں تک ان میں کمی ہوگی آپ کے علم واذعان میں بھی کمی ہوگی۔

مسلمانوں کا علم روایت

اب مسلمانوں کے علم اخبار، یا علم نقل وروایت یعنی اصول حدیث پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ بعینہٖ یہی اصول انہوں نے ہر روایتی شہادت کے قبول کرنے کے لیے مقرر کیا ہے، سلسلہ روایت کے ان اوصاف میں جس قدر بھی نقص ہوگا، اس جزو واقعہ کے علم واذعان میں بھی اسی قدر نقص ان کے نزدیک پیدا ہوگا۔ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی طرف جس قدر بھی صحیح ومستند معجزات منسوب ہیں، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی صداقت کو اس اصول پر پرکھ نہ لیا گیا ہو، ہیوم نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''فہم انسانی'' میں جہاں معجزات پر بحث کی ہے، انجیل کے بیان کردہ معجزات کی نسبت وہ اس لیے بے اعتباری ظاہر کرتا ہے کہ مصنفینِ انجیل جو ان واقعات کے راوی اول ہیں ان میں سے کوئی واقعہ کا چشم دید گواہ نہیں ہے لیکن ہیوم کو اگر اسلامی طرز روایت واصول وحدیث کی احتیاطوں سے آگاہی ہوتی تو کبھی اسلام کے معجزات کی نسبت اس بے اعتباری کا اس کو موقع نہ ملتا۔ صحیح معجزات نبوی کے پہلے رواۃ یعنی وہ صحابہ کرام جو واقعات کے چشم دید گواہ ہیں، صدق مقال اور راست گفتاری پر ان کی زندگی کا ایک ایک حرف گواہ ہے اور ان کی عقل، رزانت اور متانت رائے پر ان کے کارنامے شاہد عدل ہیں، بیچ کے رواۃ وہ محدثین عظام ہیں، جن کی سچائی، راستی اور حفظ وفہم پر اسمائے رجال کے اوراق کی مہریں ثبت ہیں پیغمبر اسلام علیہ السلام نے علی رؤس الاشہاد کہا اور بار بار کہا کہ ''جو شخص میری طرف کسی جھوٹی بات کی نسبت کرے گا اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔'' [1] صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا کہ آنحضرت کے متعلق کسی خبر کو بیان کرتے ہوئے کانپ جاتے تھے۔ بیچ کے ثقہ اور مستند رواۃ بھی انتہائی انسانی احتیاط سے کام لیتے تھے اس پر بھی ان کی تمام روایات کا درجہ یکساں نہیں ہے۔

اگر روایت کے ہر دور میں راویوں کی تعداد کثیر شریک ہو تو اس کو خبرِ متواتر کہتے ہیں اور اگر ہر دور میں گو تعداد کثیر نہ ہو لیکن دو یا تین سے زیادہ ہوں تو وہ مستفیض اور مشہور ہے اور اگر کسی دور میں ایک ہی راوی رہ گیا ہو تو اس خبر کو خبر احاد کہتے ہیں۔ معجزاتِ نبوی ﷺ مختلف طرق سے مروی ہیں اور اسی کے اعتبار سے ان کی صحتِ بیان کا درجہ ہے یہ سچ ہے کہ بعد کے لوگوں نے آپ ﷺ کی طرف بہت سے ایسے معجزات منسوب کردیے ہیں جو صحیح نہیں ہیں لیکن ہمارے محدثین نے نہایت جاں فشانی اور ایمانداری سے ان روایات کو معیار پر پرکھ پرکھ کر الگ کردیا ہے اور اس کتاب کی جلد اول کے مقدمہ میں تمام وکمال بحث موجود ہے۔ معجزات کے ثبوت پر یہ طرزِ استدلال گو عجیب ہے لیکن غلط نہیں، دنیا میں ہر واقعہ کے ثبوت کا یہی طریقہ ہے اور وہی اس باب میں بھی کارآمد ہے یہ کیسی زبردستی ہے کہ جس طرزِ استدلال پر دنیائے یقین کا عملی کاروبار چل رہا ہے اس

[1] صحیح مسلم، مقدمۃ الکتاب، باب تغلیظ الکذب علی رسول اللہ ﷺ: ۳، ٤، ٥۔

کو اگر مذہب استعمال کرے تو مدعیانِ عقل کی جبینِ متانت پر بل پڑ جاتے ہیں۔

نادیدہ واقعات پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف روایات کی شہادت ہے

دنیا میں جو واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے اس کے علم کے دو ہی طریقے ہیں یا تو انسان اس واقعہ کے وقت موجود ہوگا یا موجود نہ ہوگا پہلی صورت میں اس کا علم اس کے احساس ومشاہدہ پر موقوف ہے اور وہ روایت کے تمام جھگڑوں سے بے نیاز ہے، جیسے کہ ان صحابہ کا اس معجزہ کے متعلق علم جو ان کے سامنے ظاہر ہوا اور دوسری صورت میں اس واقعہ کا علم صرف روایت سے ہوسکتا ہے اور اس کے سوا کوئی ذریعہ علم اس کے لیے دنیا میں موجود نہیں ہے، آپ کا فرض صرف اس قدر ہے کہ روایت کی اچھی طرح تنقید کر لیجئے اور جس طرح دنیا کے دوسرے عملی کاروبار میں واقعات پر یقین کرنے کے ذرائع استعمال میں ہیں اس باب میں بھی انہی کو استعمال کیجئے، عقلی احتمالات اور ذہنی شبہات کی کوئی حد نہیں ہے مگر کبھی روزمرہ کے معاملات میں وہ آپ کے یقین کے سدِ راہ نہیں ہوتے۔

خبر احاد پر بھی عملاً یقین ہوتا ہے

متواتر، مشہور اور مستفیض خبروں کو چھوڑ کر خبر احاد تک پر آپ روزانہ یقین کرتے ہیں خطوط، تار، اخبارات، آج کل کی زندگی کا جزو ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر آپ کو کامل وثوق ہے، رائٹر ایجنسی کے تاروں اور سنجیدہ اخباروں کے کالموں میں عجیب سے عجیب حیرت افزا واقعات وایجادات وطبی علاجات عموماً بیان ہوتے رہتے ہیں اور لوگ ان کو تسلیم کر لیتے ہیں، آج تمام تجارت کا دار ومدار ان ہی تاروں پر ہے، یہ شدید مالی خطرات کا موقع ہے مگر ہر بیوپاری اور تاجر بخوشی اس خبر احاد کو یقین کر لیتا ہے اور اپنی تمام دولت اس کی نذر کر دیتا ہے اور کبھی یہ عقلی مباحث اور شکوک نہیں پیش کرتا کہ ممکن ہے کسی نے غلط کہا ہو، ممکن ہے غلط لکھا گیا ہو، ممکن ہے نامہ نگار جھوٹ بولتا ہو، ممکن ہے کاتب نے خود گھڑ کر لکھ دیا ہو، یہ تمام احتمالاتِ عقلی قائم ہو سکتے ہیں مگر عملی یقین پر ان احتمالات کا مطلق اثر نہیں پڑتا۔

ہم شفاخانوں میں جاتے ہیں اور عطاروں اور کمپونڈروں سے دوائیں لے کر باطمینانِ تمام ان کو استعمال کرتے ہیں، حالانکہ معلوم ہے کہ ان شفاخانوں میں اکسیر اور سنکھیا دونوں کی بوتلیں پہلو بہ پہلو رکھی ہیں، ممکن ہے کہ تنہا دوا بنانے والے کی یہ اطلاع کہ یہ دوا تمہارے نسخہ کے مطابق ہے، غلط ہو اور اس لیے کہ اس کے استعمال سے احتراز لازم ہے مگر کبھی یہ خدشہ ہمارے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آتا اور ہم بخوشی اپنی جان کو خبر احاد کے یقین کی نذر کر دیتے ہیں پھر معجزات اور مذہب ہی کے باب میں شہادت کے مسئلہ پر تمام عقلی احتمالات اور شکوک کا ازالہ ضروری کیوں تصور کیا جاتا ہے۔

واقعات پر یقین کے لیے اصلی بنیاد امکان اور عدمِ امکان کی بحث نہیں بلکہ روایت کے ثبوت اور عدم ثبوت کی ہے

آج کل مغربی علم تاریخ اور فن روایت کا بڑا کارنامہ یہ اصول سمجھا جاتا ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو سب سے پہلے اس پر غور کرو کہ کیا وہ ممکن بھی ہے؟ اور جب یہ طے ہو جائے تو روایت کے دوسرے پہلوؤں پر غور کرنا چاہیے لیکن یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے تمام واقعی علوم، ہمارے تجربہ اور روایات ہی پر مبنی ہیں، اس لیے کسی شے کے ممکن اور ناممکن ہونے کا فیصلہ محض مشاہدہ کی تحقیق پر ہی مبنی ہے، اس لیے علمِ تاریخ اور فنِ روایت کی بنیاد اس کے امکان اور عدم امکان کی بحث پر قائم نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ ہمارے علمائے اصول نے بتایا ہے صرف اس پر قائم ہے کہ آیا یہ واقعہ روایۃً صحیح بھی ہے یا نہیں؟

جس درجہ کا واقعہ ہو، اُسی درجہ کی شہادت ہونی چاہیے

ہم کو اس اصول کی صحت سے انکار نہیں ہے کہ جس درجہ کا واقعہ ہو اسی درجہ کی شہادت بھی ہونی چاہیے لیکن درجہ نام کمیتِ اشخاص سے زیادہ کیفیتِ اشخاص کا ہے۔ ایک واقعہ کو چند آدمی بیان کرتے ہیں مگر ان کی راست گفتاری معرض بحث میں ہے لیکن ایک ایسا شخص اس کے خلاف اپنی روایت بیان کرتا ہے جس کی صداقت مسلم ہے، جس کی راست گفتاری کا بار بار تجربہ ہو چکا ہے، جس کی سمجھ، حافظہ اور وثوق کا ہم کو علم ہے اور جس کی دوسری اخلاقی صفات جن کا روایت پر اثر پڑتا ہے نہایت بلند ہیں تو ظاہر ہے کہ واقعہ کی حیثیت سے دوسری شہادت پہلی شہادت سے زیادہ قابل قبول ہے۔ راویوں کی ان صفات کی واقفیت کا روایاتِ اسلامیہ کے سواد نیا میں کسی اور قوم و مذہب کی روایات کے متعلق کوئی دعویٰ نہیں کیا جاسکتا، اس لیے دنیا کے اور مذاہب اور قوموں کی روایات کے مقابلہ میں اسلامی روایات کی ایک خاص اہمیت ہے۔

معجزات دراصل تجربیات کے خلاف نہیں ہوتے

اس موقع پر ایک اور مسئلہ کو بھی صاف کرنا ہے عام طور سے معجزات کی شہادت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ معجزہ کی شہادت سینکڑوں ہزاروں شہادتوں کے خلاف ہوتی ہے، اس لیے وہ ناقابل یقین ہے یہ حقیقت میں ایک قسم کا مغالطہ ہے، ہزاروں لاکھوں شہادتیں اس بات کی بے شک ہیں کہ آگ نے فلاں فلاں موقع پر جلایا، اب جو شخص ایک معجزہ کو بیان کرتا ہے کہ فلاں موقع پر آگ نے نہیں جلایا تو یہ شہادت ان ہزاروں لاکھوں شہادتوں کے خلاف نہیں ہے، بلکہ ان سے الگ ایک واقعہ ہے اس روایت سے ان لاکھوں ہزاروں شہادتوں کی مخالفت اور انکار اس وقت لازم آتا کہ جن موقعوں کے متعلق یہ کثیر التعداد شہادتیں اپنا مشاہدہ بیان کرتی ہیں ان کی تکذیب و تغلیط کی جاتی، دو شہادتوں کی باہمی ترجیح کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے

جب دونوں ایک ہی خاص واقعہ کو مختلف نتیجوں کے ساتھ بیان کریں اور یہاں یہ صورت نہیں ہے، جن آگوں کے جلانے کے متعلق سینکڑوں شہادتیں موجود ہیں، معجزہ کا راوی ان کی تغلیط وتکذیب نہیں کرتا بلکہ ایک خاص آگ کی نسبت اپنا مشاہدہ بیان کرتا ہے جس کے متعلق ان کو نفیاً یا اثباتاً کوئی علم نہیں، مثلاً: ایک طرف ایک شخص کی تنہا یہ شہادت ہوتی ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کے ہاتھوں سے پانی کا چشمہ ابلنے لگا، دوسری طرف سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کی یہ شہادت ہوتی کہ نہیں ایسا واقعہ نہیں ہوا تو بے شک اس موقع پر دوسری شہادت کو پہلی شہادت پر ترجیح دی جاسکتی اور تمام مسلمان اس کے لیے تیار ہیں کہ اگر کسی معجزۂ نبوی کے متعلق اس قسم کی مخالف شہادت موجود ہو تو وہ اس معجزہ کو صحیح معجزاتِ نبوی ﷺ کی فہرست سے خارج کر دیں گے۔

معجزات کا ثبوت روایتی شہادتیں ہیں

الغرض معجزہ کی شہادت کے متعلق اصل بحث یہ نہیں کہ یہ ممکن ہے یا ناممکن ہے بلکہ اصل بحث یہ ہے کہ یہ شہادت کس درجہ کی ہے؟ اور اس کے رواۃ کی صحیح البیانی کا کیا پایہ ہے؟ اس کے لیے صحابہ کرام اور تابعین عظام کی راستی، دیانت، صدق مقال اور ان کی اخلاقی زندگی کے دیگر پہلوؤں کے مطالعہ کی حاجت ہے اور یہی شے ہے جو معجزات کی شہادت کو طاقتور یا کمزور بناسکتی ہے اور یہی ہمارے محدثین اور اہلِ اصول کا قانونِ شہادت ہے اور اسی طریق سے اہل السنۃ والجماعۃ معجزہ کو ثابت کرتے ہیں۔ علامہ ابو منصور عبدالقادر بغدادی اشعری کتاب الفرق میں اہل سنت کا مسلک لکھتے ہیں:

> وبهذا النوع من الاخبار (المستفيض) علمنا معجزة نبيناﷺ في انشقاق القمر وتسبيح الحصا في يده وحنين الجذع اليه لما فارقه واشباعه الخلق الكثير من الطعام اليسير ونحو ذلك من معجزاته۔ [1]

> ’’اسی خبر مشہور کے ذریعہ سے ہم نے آنحضرت ﷺ کے معجزات کو جانا، مثلاً: شقِ قمر، دستِ مبارک میں کنکریوں کا تسبیح پڑھنا، شاخ خرما کا گریہ وبکا کرنا اور تھوڑے کھانے سے بہت سے لوگوں کو سیر کر دینا وغیرہ۔‘‘

خلاصۂ مباحث

گزشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خلاصہ حسبِ ذیل سطروں میں کیا جاسکتا ہے:

1. معجزہ خرقِ عادت اور قاعدۂ علت ومعلول کی ارتقائی شکست کا نام ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنے کسی پیغمبر کی سچائی کی نشانی کے طور پر لوگوں میں ظاہر کرتا ہے۔
2. خرقِ عادت اور قاعدۂ علت ومعلول کی شکست ممکن، بلکہ واقع ہے۔

---

[1] کتاب الفرق، لابی منصور عبدالقادر بغدادی، ص:۳۱۳، مصر۔

③ کیونکہ عاداتِ طبعی اور سلسلۂ علل و معلول کا علم ہم کو تجربہ سے ہوا ہے۔

④ اور تجربہ سے جو علم حاصل ہو، اس کی کلیت اور عمومیتِ عقلی کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، اس لیے اس سے معجزہ کے محال ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

⑤ تجربہ کی بنیاد ذاتی مشاہدہ یا دوسرے مشاہدہ کرنے والوں کی شہادت پر ہے۔

⑥ اس لیے معجزہ کا ثبوت ذاتی مشاہدہ کرنے والوں کی شہادت پر مبنی ہے۔

⑦ اسلامی روایات اور صحیح معجزاتِ نبوی ﷺ کی شہادت اس قدر بلند ہے کہ دنیا کی کوئی تاریخی روایت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور اس سے معجزات اور خوارقِ عادت کا وقوعی ثبوت بہم پہنچتا ہے۔

یقین معجزات کے اصولِ نفسی

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خطاب فلسفہ اور منطق سے تھا لیکن ظاہر ہے کہ عملی دنیا کا کاروبار ارسطو کے بنائے ہوئے اصول و قواعد پر نہیں چل رہا ہے بلکہ خالق فطرت اپنے وضع کردہ اصول و قواعد پر اس کو چلا رہا ہے واقعات کسی حد تک تعجب انگیز اور دور از عقل ہوں، تاہم انسانوں کی بڑی تعداد، دلیل و برہان منطقی کے بغیر صدق دل سے ان پر یقین رکھتی ہے، کسی واقعہ پر یقین رکھنے کے لیے اس کا فہم انسانی میں آ جانا اور عقل و استدلال کی میزان میں اس کا پورا اتر جانا ضروری نہیں ہے ایک طبیعی فلسفی سے لے کر عامی تک مادہ کے وجود پر یقین رکھتا ہے، حالانکہ استدلال سے اس کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک واقعہ کی جب روایت کی جاتی ہے تو کچھ لوگ بے دلیل اس کو فوراً تسلیم کرتے ہیں اور بعض ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ استدلال و برہان کے باوجود اس کے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتے اگر استدلال کی قوت سے وہ خاموش بھی ہو جائیں تو ان کے دل کو تسلی نہیں ہوتی، جو اشخاص کسی جماعت یا ملک کے اندر کام کرتے ہیں ان کی سچائی اور خلوص و ایثار کے متعلق سب لوگوں کی رائے برابر نہیں ہوتی، ایک جماعت جس زور و قوت سے ان کے صدق و اخلاص پر ایمان رکھتی ہے۔ دوسری جماعت اسی زور و قوت کے ساتھ ان کو خائن اور ریاکار جانتی ہے حالانکہ دونوں کے سامنے ان کے اعمال کا ایک ہی نقشہ پیش رہتا ہے مگر نتائج مختلف ہوتے ہیں اور دو میں سے کوئی اپنے دعویٰ پر کھلے دلائل نہیں رکھتا اس لیے ایمان و کفر اور یقین و شک کے وجوہ منطقی طرزِ استدلال سے نہیں بلکہ زیادہ تر نفسیاتی اصول و قواعد سے ماخوذ ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور یقین اور اذعان کی صورتیں

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے الجام العوام میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے [1] کہ واقعات کا اذعان اور یقین ہمارے اندر کیونکر پیدا ہوتا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ ”عام مسلمانوں کو علمِ کلام کی ضرورت نہیں، لیکن اگر

[1] الجام العوام عن علم الکلام، ص: ۳۹، ۴۰ مطبع میمنیہ مصر: ۱۳۰۹ھ۔

کوئی یہ کہے کہ ہم کو خدا نے اپنی توحید وصفات وغیرہ پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے اور یہ باتیں بدیہی نہیں کہ ان کے لیے دلائل کی ضرورت نہ ہو اسی طرح ہم کو پیغمبر کی تصدیق کی ضرورت ہے اور یہ تصدیق مسئلہ معجزات پر غور وفکر کیے اور معجزہ کی حقیقت اور شرائط کے جانے بغیر ممکن ہی نہیں، اس بنا پر علم کلام کی اشد ضرورت ہے تو امام صاحب اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ''عام مخلوق کو صرف ان چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے اور ایمان اس یقین جازم کا نام ہے جس میں تردد اور شک نہ ہو اس میں خطا اور غلطی کا خیال اس کو نہ ہو اس یقین جازم کے چھ درجے ہیں جو چھ مختلف طریقوں سے حاصل ہوتے ہیں:

① پہلا درجہ اس یقین کا ہے جو ایسے دلائل سے حاصل ہو، جن میں برہان کے تمام منطقیانہ شرائط ایک ایک کر کے پائے جائیں اور ان دلائل کے مقدمات کا ایک ایک حرف اچھی طرح جانچ لیا گیا ہو یہاں تک کہ کسی میں شک وشبہ اور غلطی والتباس کا احتمال نہ رہا ہو اس اصول کے مطابق تو بہت کم لوگ ایسے ہو سکتے ہیں جن کو یقین کا یہ مرتبہ نصیب ہو سکے بلکہ ہر زمانہ میں ایک دو آدمی سے زیادہ اس معیار پر پورے نہیں اتر سکتے اگر نجات صرف اسی یقین پر منحصر ہو تو نجات پانے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہو گی، بلکہ انسانوں کے لیے دنیا کے واقعات پر یقین کرنے کی بہت کم گنجائش نکل سکے گی اور شاید ریاضیات کے علاوہ کہیں اور اس صورت کا یقین پیدا کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

② دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان مسلمات سے یقین حاصل ہو، جن کو عام طور سے لوگ مانتے ہیں اور ارباب عقل کے حلقوں میں وہ مقبول ومشہور ہیں جن میں شک کا اظہار کرنا لوگ معیوب سمجھتے ہیں اور نفوس انسانی ان کے انکار سے ابا کرتے ہیں، ان مقدمات سے استدلال بعض لوگوں میں ایسا یقین جازم پیدا کرتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا تزلزل راہ نہیں پا سکتا۔

③ تیسری صورت یہ ہے کہ ان خطابیات کے ذریعہ سے یقین پیدا کیا جائے جن کو لوگ عام بول چال اور عملی کاروبار میں استعمال کیا کرتے ہیں اور عادۃً ان کو صحیح سمجھتے ہیں اگر طبع انسانی میں، خاص طور سے اس مسئلہ کی طرف غیر معمولی انکار یا شدید تعصب نہ ہو اور سامع میں تشکیک، مناظرہ اور خواہ مخواہ کرید اور حجت کی عادت نہ ہو اور اس کی طرف فطرت صالحہ اور سادہ اور صاف ہو تو اس طریقہ سے اکثر افراد انسانی کو یقین کی دولت ہاتھ آ سکتی ہے اور اس لیے قرآن مجید نے اسی طرز استدلال سے اکثر کام لیا ہے۔

④ چوتھی صورت یہ ہے کہ جس شخص کی دیانت اور ایمانداری پر یقین ہو اور اس پر کامل اعتقاد ہو، بکثرت لوگ اس کے مداح ہوں، یا تم خود اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اس کی ہر بات کو صحیح باور کرتے ہو تو اس کا کہنا تمہارے اندر یقین پیدا کر دیتا ہے، جیسے اپنے بزرگوں اور استادوں اور مرشدوں کے بیان کا لوگ حرف بحرف یقین کر لیتے ہیں، ایک بڑا شخص کسی کی موت کی خبر دیتا ہے تو یہ شخص اس کو باور کر لیتا ہے، اسی طرح اگر کسی شخص

کو کسی کی صداقت سچائی یا پاکیزگی اور زہد وتقویٰ کا یقین ہو جائے تو وہ بلا پس وپیش اس کی ہر بات کو صحیح تسلیم کرلے گا، چنانچہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ (یا اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم) کو آنحضرت ﷺ کے ساتھ جو حسن اعتقاد تھا وہ اسی قسم کا تھا، اس لیے آپ ﷺ جو کچھ فرماتے تھے ان کو اس کے باور کرنے میں کسی دلیل و برہان کی حاجت نہ تھی۔

⑤ حصول یقین کا پانچواں طریقہ یہ ہے کہ روایت کی صورت حال کی ایسی دوسرے قرائن سے تصدیق ہو جن سے گو ایک مناظرہ پسند اور حجت طلب شخص کی تشفی نہ ہو مگر عام اشخاص کی ان سے تسلی ہو جاتی ہے، مثلاً: اگر شہر میں یہ عام خبر پھیلی ہوئی تھی کہ امیر شہر بیمار ہے، اسی اثنا میں قلعہ سے گریہ وبکا کی آوازیں بلند ہوئیں اور ایک شاہی غلام نے آ کر روایت کی کہ امیر نے وفات پائی تو اس روایت کے تسلیم کر لینے میں عام لوگوں کو کوئی جائے انکار نہیں رہتی گو اس کی صحت کی راہ میں آپ بیسیوں عقلی احتمالات پیدا کرتے رہیں یہی سبب ہے کہ کتنے اعرابی تھے جنہوں نے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھا یا آپ کی دل آویز اور پر اثر باتیں سنیں یا آپ کے اخلاق کریمانہ کو مشاہدہ کیا اور بے دلیل و برہان آپ کی نبوت پر ایمان لے آئے (کیونکہ انہوں نے پہلے آپ کی نبوت کا چرچا تو سنا تھا لیکن اس دعویٰ کی صداقت نے ان کے دل میں پوری طرح گھر نہیں کیا تھا، مگر جب اتفاق سے آپ کے دیدار کا موقع ملا تو قرائن حال اور آثار قیافہ کے ذریعہ سے نیک وبد اور اچھے برے کی تمیز کا جو ایک خاص جوہر انسان میں ودیعت ہے، اس نے فیصلہ کر دیا کہ یہ دعویٰ صحیح ہے یا غلط)۔

⑥ چھٹا طریقہ یہ ہے کہ جو روایت بیان کی جائے اگر وہ سامع کے مزاج، اخلاق اور خواہش کے مطابق اور مناسب ہو تو اس کے صحیح تسلیم کر لینے میں اس کو کبھی پس وپیش نہ ہوگا اس حصول یقین میں نہ تو حسنِ اعتقاد کی ضرورت ہے اور نہ قرائن وآثار کی تائید کی یہ فطری اور طبعی مناسبت خود حصول یقین کے لیے کافی ہے، (یہی سبب ہے کہ سابقین اسلام میں وہی صحابہ داخل ہیں جو فطرۃً نیک اور طبعاً راستی پسند اور جویائے حق تھے)۔

انہی مختلف طریقوں سے لوگ یقین واذعان کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرتے ہیں اور یہی طریقے غیبیات اور معجزات پر بھی یقین کرنے کے ہیں۔

معجزہ اور سحر کا فرق

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معجزہ سے جس طرح عجیب وغریب امور صادر ہوتے ہیں سحر طلسم نیرنگ، شعبدہ سے بھی اس قسم کی باتیں دکھائی جاسکتی ہیں سحر وطلسم کے الفاظ اگر اس بیسویں صدی میں مکروہ معلوم ہوں تو ان کے معنی مسمرائزم اور ہپنوٹزم کے سمجھ لیے جائیں، ایسی صورت میں ایک پیغمبر اور ساحر وشعبدہ باز اور مسمرائزم کے درمیان کیا فرق ہوگا؟ یہ سوال ہے جس پر علم کلام میں بڑی بڑی بحثیں ہیں، معتزلہ اور ارباب

ظواہر میں علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ کا یہ دعویٰ ہے [1] کہ معجزہ کے علاوہ سحر و طلسم و شعبدہ وغیرہ جو چیزیں ہیں وہ صرف فریبِ نظر ہیں لیکن معجزہ سے قلبِ حقیقت اور تبدیلِ خاصیت ہو جاتی ہے۔ اشاعرہ سحر و طلسم کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ معجزہ سے جو عظیم الشان عجائبات سرزد ہوتے ہیں مثلاً: سمندر کا خشک ہونا، چاند کا شق ہو جانا وغیرہ یہ چیزیں سحر و طلسم کے زور سے نہیں ہو سکتیں، حکمائے اسلام کا مسلک یہ ہے کہ معجزہ اور سحر میں فرق یہ ہے کہ صاحب معجزہ اپنی قوت کو خیر میں صرف کرتا ہے اور ساحر شر میں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان جوابات سے اشکال کی اصلی گرہ نہیں کھلتی۔ ایک شخص اپنے دعوے کے ثبوت میں بظاہر ایک خارق عادت کرشمہ پیش کرتا ہے، اب اس پر یہ بحث کہ یہ دھوکا یا نظر بندی ہے یا رمزِ الٰہی ہے، یا معمولی کام ہے، یا عظیم الشان کارنامہ ہے، نہایت مشکل ہے کیونکہ ان اشیاء کے وقوع میں کوئی ظاہری امتیاز نمایاں نہیں ہو سکتا، نیز اس کا فیصلہ کہ یہ قوت خیر میں صرف ہوئی یا شر میں؟ یا یہ کہ ضروری ہے کہ یہ خوارقِ عادات محلِ خیر میں صرف ہوں یا محلِ شر میں؟ اس کے علاوہ کوئی تیسری نہیں ہو سکتی بہت کچھ قابل بحث ہے ایک مسمریزر اپنی قوت سے بعض بیماریوں کو دور کر دیتا ہے اور اس سے غریبوں کا علاج کرتا ہے تو یہ خیر اور نیکی کی چیز ہے تو کیا آپ اس کو معجزہ کہہ دیں گے؟

اصل یہ ہے کہ معجزہ اور دیگر عجائبات امور میں دو عظیم الشان فرق ہیں ایک یہ کہ معجزہ براہ راست خدا کا فعل ہوتا ہے اور دوسرے عجائب امور اسباب طبعی و نفسی کے نتائج ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ معجزہ سے مقصود اعدائے دعوت الٰہی کی ہلاکت یا مبلغ رسالت کی تائید اور مومنین صادقین کی حمایت اور برکت ہوتی ہے محض کھیل تماشا، شعبدہ بازی اور بازی گری اس کا مقصد نہیں ہوتی اور سب سے آخری شے جو ان دونوں کے درمیان حد فاصل بن جاتی ہے یہ ہے کہ ساحر و بازی گر و شعبدہ باز صرف تماشائے کرتب اور عجائبات دکھاتے ہیں اس کے ساتھ وہ اپنی زندگی کی پاکیزگی، ارادوں کی بے گناہی، دلوں کی طہارت اور صفائی، شریعت الٰہی کی تبلیغ، قلوب کے تزکیہ اور سیہ کاریوں کے قلع و قمع کے نہ وہ مدعی ہوتے ہیں اور نہ یہ خواص اور کارنامے ان سے ظاہر ہوتے ہیں لیکن انبیا علیہم السلام کی معصوم زندگی، پاک اخلاق، مقدس اعمال اور دیگر پیغمبرانہ خصائص و کیفیات خود ان کی نبوت کی منادی کرتے رہتے ہیں قدم قدم پر خدا ان کی دعوت کی تائید کرتا ہے، ان کی صدائے حق جماعتوں، قوموں اور ملکوں میں روحانی انقلاب پیدا کر دیتی ہے، ان کی سچائی، راستی اور صداقت پر ان کے سوانح حیات کا حرف حرف گواہ ہوتا ہے، وہ سونے چاندی پر نہیں بلکہ دلوں پر اخلاص و ایثار اور صدق و صفا کی مہر لگاتے ہیں۔ ایک ساحر اور مسمریزر خواص اشیاء میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے مگر کافر کو مومن، بدکار کو عفیف، بے باک کو متقی، بخیل کو فیاض، سخت کو نرم اور جاہل کو عالم نہیں بنا سکتا، وہ لوہے کو زر خالص کی صورت میں بدل

[1] الفصل فی الملل والنحل، الجزء الخامس، ص:۲ ومابعد، مصر۔

سکتا ہے لیکن کسی زنگ آلودہ دل کو جلا نہیں دے سکتا۔ یہ ظاہری اشتباہ اور التباس صرف نبی اور ساحر و متنبی (جھوٹے پیغمبر) ہی میں نہیں ہے بلکہ دنیا کی ہر حقیقت اسی طرح اپنے مقابل سے مشتبہ اور ملی جلی ہوئی ہے، صبر اور بےحمیتی توکل اور کاہلی بخل اور کفایت شعاری، سخاوت اور اسراف حق گوئی اور گستاخی، شجاعت اور تہوران کے ڈانڈے باہم اس قدر ملے ہوئے ہیں کہ انسان کی قوتِ ممیّزہ کبھی کبھی دھوکا کھا جاتی ہے لیکن اہلِ نظران دونوں حقیقتوں کے ظاہری تشابہ سے فریب میں نہیں آتے ان دونوں کی ظاہری شکل وصورت گو ایک ہو مگر ان دونوں کے خصائص و آثار اس درجہ متفاوت اور متمائز ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے حدود اور فرق و امتیاز کو فوراً پہچان لیتے ہیں جب پیغمبر اپنا معجزہ اور جادوگر اپنا کرتب دکھاتے ہیں تو ظاہری حیرت زائی کے لحاظ سے عوام کے نزدیک ایک لمحہ کے لیے گو دونوں ایک ہوں، مگر جب حقیقت کا پردہ چاک ہو جاتا ہے تو ایک اخلاق کا مجسمہ، پاکیزگی کا فرشتہ، شریعت کا حامل، گناہگاروں کا طبیب اور قلوب کا معالج ہوتا ہے اور دوسرا محض تماشا گر، یا شعبدہ باز یا مصنوعی حیلہ گر اور نقال۔

ایک عطائی اور طبیب حاذق اور ایک معمولی سپاہی اور ایک بہادر جنرل، ایک حرف شناس اور ماہر علوم، ایک مکار اور زاہد، ایک مصنوعی اور حقیقی صوفی کے درمیان شاید کبھی عوام فرق نہ کر سکیں مگر جب ان دونوں کے آثار و خصائص اور علامات وقرائن باہم ملائے جائیں تو ظلمت و نور کی طرح ان دونوں میں علانیہ فرق محسوس ہو جاتا ہے۔ مولانائے روم نے اس فرق مراتب کو مثنوی میں نہایت عمدہ تشبیہات کے ذریعہ سے ظاہر کیا ہے، فرماتے ہیں:

صد ہزاراں ایں چنیں اشباہ بیں فرق شاں ہفتاد سالہ راہ بیں

''اسی طرح کی لاکھوں ہم شکل چیزیں ہیں، لیکن ان میں کوسوں کا فاصلہ ہے۔''

ہر [1] دو صورت گر بہم ماندرواست آب تلخ و آب شیریں را صفاست

''دونوں کی صورتیں اگر باہم مشابہ ہوں تو کچھ حرج نہیں۔ میٹھا اور تلخ پانی دونوں کا رنگ ایک ہی طرح صاف ہوتا ہے۔''

ہر دو یک گل خوردہ زنبور و نحل لیک شد زاں نیش و زیں دگر عسل

''بھڑ اور شہد کی مکھی ایک ہی پھول چوستی ہیں لیکن اس سے زہر اور اس سے شہد پیدا ہوتا ہے۔''

ہر دو گوں آہو گیا خوردند و آب زیں یکے سرگیں شد وزاں مشک ناب

''دونوں قسم کے ہرن ایک ہی گھاس کھاتے اور ایک ہی پانی پیتے ہیں مگر اس سے مینگنی اور اس سے مشک پیدا ہوتا ہے۔''

---

[1] مثنوی مولانا روم میں یہ مصرع اس طرح ہے" ہر دو گوں زنبور خوردند از محل " حکایت مرد بقال جلد ۱ ، ص: ۸ و کلیات مثنوی معنوی مولوی دفتر اول ، ص: ۲۱ "ک"، "ص"

ہر دو نے خورد نداز یک آب خور   آں یکے خالی و آن پر از شکر

''دونوں قسم کی نے ،ایک پانی سے پرورش پاتی ہیں،لیکن ایک مزہ سے خالی اور دوسرے سے شکر پیدا ہوتی ہے''

ایں خورد زائد ہمہ بخل و حسد   وآں خورد آید ہمہ نور احد

''ایک آدمی غذا کھاتا ہے تو اس سے بخل اور حسد پیدا ہوتا ہے اور دوسرا وہی غذا کھاتا ہے تو اس سے خدائی نور پیدا ہوتا ہے۔''

ایں زمیں پاک ست وآں شورست وبد   ایں فرشتہ پاک و آں دیواست ودد

''یہ زمین سیر حاصل ہے اور وہ بری اور بنجر ہے یہ مقدس فرشتہ ہے اور وہ شیطان اور جانور۔''

بحر تلخ وبحر شیریں درمیاں   درمیان شان برزخ لا یبغیان

''شیریں اور تلخ سمندر ملے ہوئے ہیں،مگر ان کے درمیان ایک حد فاصل ہے جس سے تجاوز نہیں کر سکتے۔''

زر قلب وزر نیکو در عیار   بے محک ہرگز نہ دانی ز اعتبار ❶

''کھوٹے اور کھرے سونے کی تمیز کسوٹی کے بغیر نہیں ہو سکتی۔''

صالح و طالح بہ صورت مشتبہ   دیدہ بکشای کہ گردی منتبہ

''نیک اور بدکار کی صورتیں ملتی جلتی ہیں آنکھیں کھولو تو تمیز ہو سکے گی''

بحر رانیمش شیریں چو شکر   طعم شیریں رنگ روشن چوں قمر

''دریا کا آدھا حصہ شکر کی طرح شیریں ہے مزا میٹھا اور رنگ چاند کی طرح سپید ہے۔''

نیم دیگر تلخ ہمچو زہر مار   طعم تلخ و رنگ مظلم قیر وار

''دوسرا نصف حصہ سانپ کے زہر کی طرح ہے مزا کڑوا اور رنگ تارکول کی طرح سیاہ ہے۔''

اے بسا شیریں کہ چو شکر بود   لیک زہر اندر شکر مضمر بود ❷

''بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو شکر کی طرح میٹھی ہیں لیکن اس کے باطن میں زہر چھپا ہے۔''

جز کہ صاحب ذوق شنا سد بیاب   او شناسد آب خوش از شورہ آب

''صاحب ذوق کے سوا اور کون پہچان سکتا ہے وہی تمیز کر سکتا ہے کہ یہ پانی میٹھا اور یہ کھارا ہے۔''

جز کہ صاحب ذوق کاشناسد طعوم   شہد را نا خوردہ کے دانی زموم

''صاحب ذوق کے سوا مزے کی تمیز اور کون کر سکتا ہے جب تک شہد کو نہ کھاؤ موم اور شہد میں کیونکر تمیز کر سکتے ہو۔''

❶ مثنوی مولانا روم، ج ۱،ص: ۸؛ کلیات مثنوی معنوی مولوی، دفتر اوّل،ص: ۲۱، ۲۲۔

❷ مثنوی مولانا روم، ج ۱،تفسیر آیہ کریمہ مرج البحرین......ص: ۶۸۔

سحر را با معجزہ کردہ قیاس ہر دورا بر مکر پندار د اساس

''اس نے سحر کو معجزہ پر قیاس کیا اور یہ سمجھا کہ دونوں کی بنیاد فریب پر ہے۔''

زر قلب و زرنیکو در عیار بے محک ہرگز نہ دانی ز اعتبار

''تم کھوٹے اور کھرے سونے کو کسوٹی کے بغیر تمیز نہیں کر سکتے۔''

ہر کرا در جاں خدا بنہد محک ہر یقین را بار داند او ز شک ❶

''خدا نے جس کی روح میں کسوٹی رکھی ہے وہی یقین اور شک میں تمیز کر سکتا ہے۔''

چوں شود از رنج و علت دل سلیم طعم صدق و کذب را باشد علیم ❷

''جب آدمی کے دل میں بیماری نہیں ہوتی تو وہ صدق اور کذب کے مزے کو پہچانتا ہے۔''

اب صرف یہ شبہ رہ جاتا ہے کہ جو قوت حیرت زا خوارق کی قدرت رکھتی ہے، اس کا رخ بھی نہایت آسانی کے ساتھ بدلا جا سکتا ہے، یعنی ساحر بے تکلف اپنی ساحرانہ قوت کو دنیا کے تزکیہ اخلاق و اصلاح عالم میں صرف کر سکتا ہے اور اس سے کوئی محال عقلی لازم نہیں آتا، لیکن امکان عقلی اور امکان واقعہ دو مختلف چیزیں ہیں یہ عقلاً ممکن ہے کہ ہر شخص بادشاہ ہو سکتا ہے، عالم عصر ہو سکتا ہے، کشور کشا ہو سکتا ہے مگر واقعتاً اور عملاً یہ قدرت ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے ساحر محض ایک تماشا گر ہوتا ہے، اس میں یہ قدرت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اس قوت سے تزکیۂ نفوس، تطہیر اخلاق اور اصلاح عالم کا کام لے سکے، یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی ساحر اور شعبدہ گر نے اصلاح عالم کا فرض ادا نہیں کیا۔ لیکن پیغمبر اپنے معجزانہ کارناموں سے دنیا کو الٹ دیتا ہے، بدی کے کانٹوں کو ہٹا کر نیکی کے گل و ریحان سے اس خاکدان عالم کو سجا دیتا ہے۔

معجزہ دلیل نبوت ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اسی تقریر سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ معجزہ دلیل نبوت ہے یا نہیں؟ اشاعرہ کا جواب اثبات میں اور معتزلہ کا نفی میں ہے۔ اس مسئلہ پر سب سے زیادہ سیر کن بحث ابن رشد نے ''کشف الادلہ'' ❸ میں کی ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ معجزہ دلیل نبوت نہیں ہو سکتا کیونکہ منطقیانہ حیثیت سے دعویٰ اور دلیل میں مناسبت کا ہونا ضروری ہے اور معجزہ اور نبوت میں کسی قسم کی مناسبت نہیں پائی جاتی مثلاً: جب ایک شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے قوم کے عقائد و اعمال اور اخلاق کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوا ہے لیکن جب اس سے دعویٰ کی تصدیق کے لیے دلیل طلب کی جاتی ہے تو وہ خشک چشمے کو پانی سے لبریز کر دیتا ہے، چاند کو دو ٹکڑے کر دیتا ہے، لاٹھی کو سانپ بنا دیتا ہے، یہ تمام واقعات اگرچہ نہایت عجیب و غریب

---

❶ مثنوی مولانا روم، ج ۱، ص:۸ حکایت مرد بقال۔

❷ ایضاً، ج ۲، ص:۱۶۵ باز الحاح کردن۔ ❸ ص: ۹۲ وما بعد مکتبہ محمودیہ جامع ازھر مصر۔

ہیں، لیکن ان دلائل کو دعویٰ کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟

فرض کیجیے کہ ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ وہ فلسفہ و ریاضی کا بہت بڑا ماہر ہے اور اس کے ثبوت میں انسان کو جانور اور جانور کو انسان بنا دیتا ہے تو اس واقعہ سے اس کے فلسفہ اور ریاضی کا کمال کیونکر ظاہر ہو سکتا ہے؟ اشاعرہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ نبوت علم و عمل کے مجموعہ کا نام ہے اور جو شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اس کی نسبت یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ وہ ان دونوں چیزوں میں کمال رکھتا ہے اور اسی کمال کے اظہار کے لیے معجزہ طلب کیا جاتا ہے اور انبیا علیہم السلام کے معجزات اگرچہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں، تاہم ان کو صرف دو نوع میں شمار کیا جاتا ہے اخبار بالغیب اور تصرف فی الکائنات اور ان دونوں کو اجزائے نبوت کے ساتھ ربط واتحاد ہے اخبار بالغیب سے اس کے علمی کمال کا اظہار ہوتا ہے اور تصرف فی الکائنات سے اس کی عملی قوت ظاہر ہوتی ہے ایک اور مناسبت یہ ہے کہ معجزہ خرق عادت کا نام ہے اس میں کوئی نزاع نہیں کہ اشیاء اور حقائق کے خصائص اور علل خدا کے امر و حکم سے ہیں اب جو شخص ان خصائص و علل کو اپنے معجزہ سے توڑ دیتا ہے وہ گویا اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ جس برتر ذات نے ان اسباب و علل کو بنایا ہے وہی ان کو توڑ سکتی ہے اور یہ شکست و خرق چونکہ اس کے واسطہ سے ظاہر ہوا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اسی کا فرستادہ ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ ایک بادشاہ اپنی رعایا کے پاس قاصد بھیجتا ہے رعایا پوچھتی ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم بادشاہی قاصد ہو؟ وہ اس کے جواب میں بادشاہ کی مہر اور انگوٹھی پیش کرتا ہے اگرچہ ظاہر ہے کہ قاصد کے دعوائے پیامبری کو مہر اور انگوٹھی سے براہ راست کوئی مناسبت نہیں، لیکن یہ مناسبت یوں ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ مہر اور انگوٹھی بادشاہی کی نشانی ہے جو ایک معمولی قاصد کے ہاتھ میں نہیں ہو سکتی اس سے معلوم ہوا کہ وہ بادشاہ کی طرف سے نشانی دے کر بھیجا گیا ہے۔ علم کلام کی کتابوں میں ایک عام مثال یہ دی جاتی ہے کہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ شاہی دربار اور جلوس کے رسوم و آداب خاص ہوتے ہیں بادشاہ دربار میں معمولی فرش پر نہیں، بلکہ طلائی و نقرئی تخت پر بیٹھتا ہے جلوس میں وہ پیادہ نہیں بلکہ سوار ہو کر نکلتا ہے، ایک شخص بادشاہ کی طرف سے قاصد بن کر مجمع میں آتا ہے، یہ مجمع اس کو شاہی پیامبر تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے قاصد بادشاہ سے کہتا ہے کہ اے بادشاہ! اگر میں حقیقتاً تیرا فرستادہ ہوں تو رسم و عادت کے خلاف تو فرش پر جلوس فرما اور پیادہ پا نکل، بادشاہ اس کے مطابق دربار میں فرش پر جلوس کرتا ہے اور پیادہ پا چلتا ہے بادشاہ کا یہ عمل یقیناً اس بات کی تصدیق ہوگی کہ وہ شاہی قاصد ہے۔ اسی طرح دنیا کے اسباب و علل اس دنیا میں خدا کی بادشاہی کے رسوم و عادات ہیں پیغمبر اس بات کا مدعی ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آیا ہے، کفار اس کے قاصد الٰہی ہونے سے انکار کرتے ہیں وہ کہتا ہے کہ اے خدا! اگر میں حقیقتاً تیرا فرستادہ ہوں تو اپنے رسوم و عادات کے خلاف معجزہ اور خرق عادت دکھا، وہ دکھا دیتا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آیا ہے۔ لیکن معجزہ اگر دلیل نبوت ہے تو منطقی حیثیت سے یہ کس

قسم کا استدلال ہے، ظاہر ہے اس کو برہان یقینی نہیں کہا جا سکتا، تاہم دلیل کا انحصار صرف برہانیات میں نہیں ہے بلکہ اس کی اور بھی متعدد قسمیں ہیں اور معجزہ ان مقدمات میں داخل ہو سکتا ہے۔ ابن رشد نے کشف الادلہ میں معجزہ کو خطابیات میں داخل کیا ہے، یعنی معجزہ اگرچہ نبوت پر بالذات یقینی طور پر دلالت نہیں کرتا، تاہم جب کوئی پیغمبر سلسلہ کائنات میں عجیب وغریب تصرف کرتا ہے تو اس کو دیکھ کر ہر شخص اس کے کمال روحانی کا اعتراف کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جو شخص ان عظیم الشان تصرفات کی قدرت رکھتا ہے وہ ضرور اپنے دعویٰ میں صادق ہوگا ان دونوں نتائج یعنی تصرف فی الکائنات اور اصلاح روحانی میں اگرچہ باہم کوئی تلازم نہیں، تاہم عوام کی دلفریبی کے لیے یہ کافی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ جدل ہے جس میں مسلمات خصم سے استدلال کیا جاتا ہے اور تاریخی حیثیت سے معجزات کو قیاس جدل کہنا زیادہ موزوں ہوگا زمانہ قدیم سے یہ خیال چلا آتا ہے کہ جو لوگ پیغمبر ہوتے ہیں ان میں کوئی نہ کوئی مافوق الفطرت قوت ضرورت ہوتی ہے اور وہی پیغمبر کو عام لوگوں سے ممتاز کرتی ہے اس بنا پر جب کوئی پیغمبر کسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے تو اس موروثی اور مسلمہ عقیدہ کی بنا پر تمام لوگ اس سے معجزہ طلب کرتے ہیں اور پیغمبر کو مجبوراً دکھانا پڑتا ہے۔ یہ معجزہ اگرچہ ایک فلسفی کے لیے دلیل و حجت نہیں ہو سکتا، تاہم جو لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ معجزہ دلیل نبوت ہے اور ان ہی کے طلب و اصرار سے اس معجزہ کا ظہور ہوا ہے ان کو اس کے ذریعہ سے ساکت کیا جا سکتا ہے اور وہ ان کے لیے دلیل ہو سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے درمیان اس بحث میں خلط مبحث ہو گیا ہے، اشاعرہ کا یہ کہنا کہ معجزہ دلیل نبوت ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ منطقی دلیل ہے معتزلہ کا اعتراض اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب اشاعرہ اس کو منطقی دلیل کہیں دلیل کا لفظ یہاں منطقی محاورہ میں نہیں بلکہ عام اور لفظی معنی (نشان) میں استعمال ہوا ہے، اس بنا پر جب معجزہ سرے سے دلیل منطقی ہی نہیں تو یہ تلاش کہ وہ انواع دلیل کی کس قسم میں داخل ہے بے سود ہے، چنانچہ اشاعرہ خود کہتے ہیں کہ معجزہ کی دلالت نبوت پر دلالت عقلی نہیں بلکہ عادی ہے، شرح مواقف بحث معجزات میں ہے:

وھذہ الدلالة لیست دلالة عقلیة محضة کدلالة الفعل علی وجود الفاعل ودلالة احکامه واتقانه علی کونه عالماً بما صدر عنه فان الادلة العقلیة ترتبط لنفسها بمدلولاتها ولا یجوز تقدیرها غیر دالة علیها ولیست المعجزة کذالك..... بل ھی دلالة عادیة کما اشار الیه بقوله وھی عندنا ای الاشاعرة اجراء اللّٰه عادته بخلق العلم بالصدق عقیبة: ای عقیب ظھور المعجزاة۔ [1]

[1] شرح مواقف، حصہ ہشتم، ص: ۲۲۸، مصر۔

’’معجزہ کی دلالتِ نبوت پر محض دلالت عقلی نہیں جیسے فعل کی دلالت وجود فاعل پر یا فعل کے استحکام ونظم کی دلالت فاعل کے علم پر ہے کیونکہ دلائل عقلی اپنے مدلولات کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں اور یہ فرض ناممکن ہے کہ وہ اپنے مدلول پر دال نہ ہوں اور معجزہ کی دلالت کی صورت ایسی نہیں ہے بلکہ معجزہ کی دلالت، دلالت عادیہ ہے، جیسا کہ صاحب مواقف نے اپنے ان لفظوں میں کہا ہے کہ یہ دلالت ہمارے (اشاعرہ) کے نزدیک اس بنا پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ جب معجزہ صادر ہوتا ہے تو صاحب معجزہ کی سچائی کا علم وہ لوگوں کے دلوں میں پیدا کردیتا ہے۔‘‘

آج کل کے محاورۂ علمی میں اشاعرہ کے اس قول کی تشریح کہ معجزہ کی دلالت عقلی نہیں بلکہ عادی ہے یہ ہے کہ معجزہ منطقی نہیں بلکہ نفسیاتی (سائیکالوجیکل) دلیل ہے، عادت انسانی یہ ہے کہ جب کسی شخص سے کوئی غیر معمولی کارنامہ ظہور پذیر ہوتا ہے تو نفوس اس کی عظمت وکبریائی کے سامنے سرنگوں ہوجاتے ہیں، جب ایک شخص عام انسانی حالت سے بلندتر سطح میں آکر منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور خوارق عادت اس سے ظاہر ہوتے ہیں تو عام متاثر طبع فوراً اس کو تسلیم کرلیتے ہیں۔ آج گو نبوت نہیں مگر ولایت ہے، آج بھی جس شخص کی نسبت باخدا اور ولی کامل ہونے کا خیال لوگوں میں ہوتا ہے تو فوراً یہ سوال ہوتا ہے کہ ان سے کچھ کرامات بھی صادر ہوتی ہیں؟ اگر جواب ہاں میں ملا اور خود ذاتی مشاہدہ بھی ہوا تو اس شخص کی نسبت حسن اعتقاد بڑھ جاتا ہے یہ عام تقاضائے انسانی ہے اس میں مومن وکافر، عقلمند وبے وقوف اور زنگی وفرنگی کی کوئی تخصیص نہیں۔ لیکن جو طبیعتیں فطرتاً اثر پذیر نہیں بلکہ معاند، متعصب اور کور باطن ہیں، ان کے لیے یہ خوارق و معجزات قطعاً بے سود ہوتے ہیں کیونکہ ان کا عناد، تعصب اور کور باطنی حسن ظن کے بجائے ہمیشہ سوئے ظن کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور وہ بڑے سے بڑے معجزہ کو بھی دیکھ کر یہی کہہ دیتے ہیں کہ یہ سحر و جادو اور طلسم و نیرنگ ہے، اس لیے صحیح راستہ یہ ہے کہ مدعی نبوت کے اخلاق خلوص پاکیزگی وطہارت کا امتحان کیا جائے جس میں یہ باتیں ثابت ہوجائیں گی عادۃً ناممکن ہے کہ وہ کاذب اور جھوٹا ہو۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے منقذ میں، امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے مطالب عالیہ میں اور عارف روم نے مثنوی میں نہایت تفصیل سے اس بحث کو لکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ نبوت کی اصل دلیل معجزہ نہیں بلکہ تعلیم وارشاد اور قوت علم وعمل کا کمال ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر

نبوت کے کچھ آثار وخواص ہیں اگر کسی شخص کی نسبت یہ شبہ ہو کہ یہ پیغمبر ہے یا نہیں تو اس کا علم صرف اس کے احوال کی معرفت سے ہوسکتا ہے یہ معرفت یا تو ذاتی مشاہدہ سے حاصل ہو، جیسی صحابہ کو تھی یا خبرِ متواتر سے اور سن کر ہو جیسی اب عام لوگوں کو ہے، نبوت کے آثار وکیفیات کی ذوق شناسی جس میں ہوتی ہے وہی

آمادۂ تصدیق ہوتا ہے، مثلاً: اگر تم کو طب اور فقہ سے کچھ واقفیت ہے اور ان کا ذوق رکھتے ہو تو جو شخص فقیہ یا طبیب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تم اس کے احوال کو دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر فوراً یہ فیصلہ کر سکتے ہو کہ یہ طبیب یا فقیہ ہے یا نہیں اور اسی طرح تم امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی فقاہت اور جالینوس کی طبابت کی تصدیق تقلید سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی تحقیق سے کر سکتے ہو گو آج امام شافعی اور جالینوس کا وجود نہیں مگر ان کے سوانح اور تصنیفات پڑھ کر اب بھی تم کہہ سکتے ہو کہ امام شافعی فقیہ کامل اور جالینوس طبیب حاذق تھے یا نہیں، اسی طرح گو آنحضرت ﷺ ہمارے درمیان نہیں مگر آپ کی سیرت مبارکہ آپ کی شریعت، آپ کی تعلیمات، آپ کے ارشادات موجود ہیں جن سے آپ کی نبوت کی تصدیق ہر شخص کر سکتا ہے، اسی معیار سے کسی مدعی نبوت کے دعویٰ پر یقین کرنا چاہیے۔ لاٹھی کے سانپ اور قمر کے شق ہونے سے نہیں کیونکہ اگر ان خوارق پر نظر ڈالو اور دوسرے بے شمار قرائن اور شہادتوں کو ان کے ساتھ نہ ملاؤ تو ممکن ہے کہ یہ خطرہ پیدا ہو کہ یہ جادوگری اور نظر بندی ہے۔ [1]

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر

امام رازی نے مطالب عالیہ میں نبوت اور متعلقات نبوت کی بحث سب سے زیادہ استیعاب سے لکھی ہے ان کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ جو لوگ نبوت کو تسلیم کرتے ہیں ان میں دو جماعتیں ہیں ایک کا مذہب یہ ہے کہ نبوت کی دلیل معجزہ ہے، یہ جمہور اہل مذاہب کا مسلک ہے، دوسرا مذہب یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم کو خود غور کرنا چاہیے کہ صداقت و راستی کیا ہے؟ اس کے بعد ہم ایک شخص کو دیکھتے ہیں جو نبوت کے دعویٰ کے ساتھ لوگوں کو دین حق کی دعوت دیتا ہے اس کی دعوت مؤثر ہوتی ہے اور وہ لوگوں کو باطل پرستی سے ہٹا کر حق پرستی کی طرف لا رہی ہے تو ہم یقین کر لیں گے کہ یہ سچا پیغمبر ہے یہ مذہب عقل سے قریب تر ہے اور اس راہ میں شکوک و شبہات کم ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسانیت کا کمال، قوت علمی و عملی کی تصحیح، تکمیل اور تزکیہ ہے، اس قوت کے لحاظ سے انسان کے تین طبقے ہیں، ایک وہ جو اس میں ناقص ہے، یا عام انسان ہیں، دوسرا وہ جو خود کامل ہے مگر دوسروں کو کامل نہیں بنا سکتا، یہ خواص اور صلحا کا درجہ ہے، تیسرا وہ جو خود کامل ہے مگر دوسروں کو بھی کامل کر دیتا ہے یہ انبیا ہیں اس کمال و نقص کے ہزاروں متفاوت درجے اور مرتبے ہیں اور انہی کے لحاظ سے ان کی قوت اور مرتبہ کا اندازہ ہوگا، ان کی قوت علمی کے سامنے تمام مقدمات بدیہی ہوتے ہیں اور معارف الٰہی پر ان کو عبور ہوتا ہے اور ان کی قوت عملی اس عالم جسمانی میں تصرفات کرتی ہے اور یہی معجزات کا مقصد ہے، اس قوت علمی و عملی کے کمال کے ساتھ یہ نظر آتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو جو ان دونوں میں پست اور ناقص ہیں اپنے فیض صحبت اور فیض تعلیم سے کامل کر دیتے ہیں اور امراض قلبی کا وہ علاج کرتے ہیں تو یہی ان کی نبوت کی دلیل ہے۔ امام

---

[1] المنقذ من الضلال، ص: ۳۵، ۳۶، مصر۔

رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس تفصیل کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ اثبات نبوت کا یہی طریقہ قرآن مجید نے اختیار کیا ہے اور چند سورتوں کی تفسیر لکھ کر دکھایا ہے، ان میں نبوت کے یہی آثار و خصائص بیان ہوئے ہیں۔ ❶

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے حقائق

مولانا نے اس بحث کو عمدہ تشبیہات اور تمثیلات سے اس درجہ قریب الفہم بنا دیا ہے کہ تمام شکوک و شبہات دفع ہو جاتے ہیں، اس سے پہلے مولانا کے وہ اشعار لکھے جا چکے ہیں جن میں یہ دکھایا ہے کہ نبوت کی تصدیق کے لیے سب سے پہلی چیز حسن ذوق ہے آب شیریں اور آب شور، صورت و شکل اور رنگ و بو دونوں میں ایک ہوتے ہیں مگر صرف صاحب ذوق ان دونوں کا فرق محسوس کرسکتا ہے، اسی طرح نبی اور متنبی گو ظاہری شکل وصورت اور دعوائے نبوت میں یکساں نظر آتے ہیں مگر صاحب ذوق ان دونوں کے آثار و خصائص سے فوراً تمیز کر لیتا ہے۔

جز کہ صاحب ذوق بشناسد بیاب	"غور کرو صاحب ذوق کے سوا اور کون پہچان سکتا ہے؟
اوشناسا آب خوش از شور آب	وہی تمیز کرسکتا ہے کہ یہ پانی میٹھا ہے اور یہ کھاری ہے۔
جز کہ صاحب ذوق بشناسد طعوم	صاحب ذوق کے سوا مزہ کی تمیز اور کون کرسکتا ہے؟
شہد را ناخوردہ کے دانی زموم	اگر شہد نہ کھایا ہو تو موم اور شہد میں تمیز کیونکر کر سکتے ہو۔
سحر را با معجزہ کردہ قیاس ہردو را بر مکر پندارو اساس	اس نے سحر کو معجزہ پر قیاس کیا اور یہ سمجھا کہ دونوں کی بنیاد فریب پر ہے۔
زر قلب و زرنیکو در عیار بے محک ہرگز نہ دانی ز اعتبار	تم کھوٹے اور کھرے سونے کا فرق کسوٹی پر پرکھے بغیر نہیں کر سکتے۔
ہر کرا در جاں خدا بنہد محک	خدا نے جس کی روح میں یہ کسوٹی رکھی ہے
ہر یقیں را باز داند او زشک ❷	وہی یقین اور شک میں تمیز کرسکتا ہے
چوں شود از رنج و علت دل سلیم	جب آدمی کا دل بیماری سے پاک ہو
طعم صدق و کذب را باشد علیم ❸	تو وہ صدق و کذب کے مزہ کو پہچان لے گا"

دوسری چیز طلب ہے، جب تک دل میں کسی چیز کی طلب نہیں ہوتی اس کی طرف التفات نہیں ہوتا جس کا دل صداقت وراستی کا بھوکا نہیں، وہ غذائے روحانی کا طالب نہیں اور جب دل میں طلب اور روح میں بے قراری پیدا ہو جاتی ہے، اس وقت وہ دلیل و برہان کے لفظی مباحث سے بہت بلند ہو جاتا ہے، کسی کو اگر پیاس

❶ مطالب عالیہ کا پیش نظر قلمی نسخہ ناقص ہے، یہ فصل راغب پاشا نے اپنے سفینہ میں بہ تمام وکمال نقل کی ہے اور مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے الکلام کے ضمیمہ میں اس کو شائع کر دیا ہے، دیکھو سفینہ راغب پاشا مطبوعہ مصر، ص: ٢٧٧۔ ❷ مثنوی مولانا روم تفسیر آیہ کریمہ مرج البحرین...... ج ١، ص:٦٨۔ ❸ ایضًا، باز الحاج کردن ج ٢، ص:١٦٥۔

ہو اور وہ تم سے پانی طلب کرے اور تم پانی کے گلاس کی طرف اشارہ کرو کہ یہ پانی ہے تو کیا وہ تمہارے اس دعویٰ پر دلیل مانگے گا کہ پہلے یہ ثابت کرو کہ یہ پانی ہے، نہیں بلکہ وہ بلا دلیل نہایت شوق سے اپنا ہاتھ بڑھائے گا اور پانی پینے لگے گا۔

تشنہ راچوں بگوئی رو شتاب	''جب کسی پیاسے کو کہو کہ جلد جاؤ
در قدح آب است بستان زود آب	دیکھو وہ پیالہ میں پانی ہے۔
ہیچ گوید تشنہ کیں دعویٰ است رو	کیا کوئی پیاسا اس وقت یہ کہتا ہے کہ
از برم اے مدعی! مہجو ر شور	یہ فقط تمہارا دعویٰ ہے چلو ہٹو۔
یا گواہ و حجتی بنما کہ ایں جنس آب است و ازاں ماء معین	یا کیا وہ یہ کہتا ہے کہ پہلے اس دعویٰ کی دلیل لاؤ کہ یہ پانی ہے۔
یا بہ طفل شیر مادر بانگ زد کہ بیامن مادرم ہاں اے ولد	یا جب شیر خوار بچہ کو اس کی ماں بلا کر کہتی ہے کہ اے بچہ! میں تیری ماں ہوں
طفل گوید مادرا حجت بیار تا کہ باشیرت بہ گیرم من قرار	تو بچہ یہ کہتا ہے کہ اپنی ماں ہونے پر دلیل پیش کرو تب میں تمہارا دودھ پیوں گا۔
در دل ہر امتی کز حق مزہ است روئے و آواز پیغمبر معجزہ است	جس کے دل میں حق کا مزہ ہوتا ہے اس کے لیے خود پیغمبر کا چہرہ اور پیغمبر کی آواز معجزہ ہوتی ہے۔
چوں پیمبر از بروں بانگے زند جان امت دردروں سجدہ کند	جب پیغمبر باہر سے آواز بلند کرتا ہے تو امت کی روح اندر ہی اندر سجدہ کرتی ہے۔
زانکہ جنس بانگ او اندر جہاں از کسے نشنیدہ باشد گوش جاں [1]	سبب یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں اس کی آواز کی سی کوئی آواز روح کے کانوں نے اس سے پہلے نہیں سنی تھی۔''

تیسری چیز اتحاد جنسیت ہے۔ معجزات کا مقصد عموماً معارض کو لاجواب اور خاموش کرنا ہوتا ہے، لاجواب کو خاموش کر کے تم خصم کو زیر کر سکتے ہو مگر اس کے دل میں تشفی نہیں پیدا کر سکتے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں سچائی اور راستی کا عنصر ہے وہ خود اپنی ہم جنس شے کے طلب گار اور خریدار ہوتے ہیں۔

موجب ایماں نباشد معجزات بوئے جنسیت کند جذب صفات	''در حقیقت معجزات ایمان کا باعث نہیں ہوتے بلکہ اتحاد جنسیت کی بو اس کے صفات کو اپنی طرف کھینچتی ہے
معجزات از بہر قہر دشمن است بوئے جنسیت سوئے دل بردن است	معجزات تو مخالفت کو دبانے کے لیے ہوتے ہیں اور اتحاد جنسیت کی بو دل کو متاثر کرنے کے لیے ہے

[1] مثنوی مولانا روم بیان آں دعویٰ، ج ۱، ص: ۱۸۵۔

قہر گردو دشمن اما دوست نے دوست کے گردد بہ بستہ گردنے ❶	دبا کر تم دشمن کو زیر کر سکتے ہو مگر دوست نہیں بنا سکتے جس کو زبردستی گردن باندھ کر زیر کرو وہ دوست کیونکر ہوسکتا ہے۔"

معجزات کا صدور اکثر اسی طرح ہوتا ہے کہ معاندین یہ سمجھ کر کہ پیغمبر کاذب ہے، اس سے کسی خرق عادت کا مطالبہ کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ وہ اس کو پیش نہیں کرسکتا اور اس طریقہ سے لوگوں میں اس کی رسوائی ہوگی اور اس کے دعویٰ کی تکذیب ہوجائے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس خرق عادت کو ظاہر کردیتا ہے اور اس سے پیغمبر کی رسوائی اور فضیحت کے بجائے اس کی صداقت اور راست بازی اور عالم آشکارا ہوجاتی ہے اور اس بنا پر معجزہ اس کے صدق پر ایک نشانی اور آیت بن جاتی ہے، فرعون نے جادوگروں کو جمع کر کے چاہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رسوا کرے مگر یہی واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی اور فرعون کی ناکامی کا سبب بن گیا اور سینکڑوں جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر صدائے لبیک بلند کردی، اس بنا پر معاندین کا وجود اعلان نبوت کی بلند آہنگی اور شہرت کے لیے ضروری ہے۔

منکراں را قصد از لالِ ثقات ذل شدہ عزو ظہور معجزات	"مخالفوں کا یہ ارادہ کہ طلب معجزہ سے نیکوکاروں کو لغزشیں دیدیں ان کی ذلت اور معجزہ کے غلبہ و عزت کا باعث ہوگا
قصد شاں زاں کار ذل ایں بدہ عین ذل عز رسولاں آمدہ	ان کا ارادہ اس طلب معجزہ سے پیغمبر کی ذلت تھی لیکن یہی تذلیل کا ارادہ پیغمبروں کی عزت کا باعث ہوجاتا ہے
گرنہ انکار آمدے ازہر بدے	اگر کوئی بدکار پیغمبر کا انکار نہ کرتا
معجزہ برہاں چرا نازل شدے	تو معجزہ برہان بن کر کیوں نازل ہوتا
خصم منکر تانہ شد مصداق خواہ کے کند قاضی تقاضائے گواہ	جب تک فریق دوم دعویٰ سے منکر اور خواہان تصدیق نہ ہو قاضی گواہ اور شاہد کب طلب کرتا ہے؟
معجزہ ہمچوں گواہ آمد، زکی!	اسی طرح اے عقل مند! معجزہ بھی پیغمبر کا گواہ ہے
بہر صدق مدعی درپیشگی	جو مدعی کی تصدیق کے لیے سامنے آیا ہے
طعنہ چوں می آمدازہر ناشناخت	جب کوئی ناشناس طعنہ کرتا تھا
معجزہ می داد حق و بنواخت	تو خدا پیغمبر کو معجزہ دے کر نوازش فرماتا تھا
مکر آں فرعون سی صد تو شدہ	فرعون موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں سینکڑوں چالیں چلا
جملہ ذل او و قمع او شدہ	مگر ان میں سے ہر ایک خود اسی کی ذلت اور بیخ کنی کا باعث ہوئی
ساحراں آوردہ حاضر نیک و بد	اس نے اچھے برے ہر قسم کے جادوگر جمع کیے
تاکہ جرح معجزہ موسیٰ کند	تاکہ موسیٰ کے معجزہ کو باطل کرے

❶ مثنوی مولانا روم دربیان حکایت رنجوری، ج ٦، ص: ٥٨٠۔

تا عصا را باطل و رسوا کنند	اور عصائے موسیٰ کی قوت کو باطل اور رسوا کرے
اعتبار او ز دلہا بر کنند	اور لوگوں کے دلوں سے اس کے اعتبار کو کھوئے
عین آن مکر آیت موسیٰ شدہ	لیکن عین یہی سازش موسیٰ کی صداقت کی نشانی ہوگئی
اعتبار آن عصا بالا شدہ	اور اس سے اس عصا کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی۔“ [1]

معجزہ سے مقصود اگر معاندین کو خاموش اور رسوا کرنے کے علاوہ ان کے دلوں کو متاثر کرنا ہوتا تو اس کے لیے اس کی ضرورت نہ تھی کہ عصا کو سانپ بنایا جائے اور قمر کو دو ٹکڑے کر دیا جائے اور اس کے ذریعہ سے قلوب کو متاثر کیا جائے، ان جمادات و نباتات پر تصرف کر کے قلوب میں تصرف کرنے سے زیادہ صاف اور سیدھا راستہ یہ تھا کہ براہِ راست خود دلوں میں تصرف کیا جائے کہ وہ صدائے نبوت کے سننے کے ساتھ لبیک پکار اٹھیں۔ معاندین کا معجزہ طلب فرقہ جو انبیا سے جمادات و نباتات پر ان کے اثرات کا طالب ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ سے قبول ایمان پر آمادگی ظاہر کرتا ہے، خود ان کی یہ طلب، ان کے ضمیر کی پستی اور قلب کی سیاہی کی دلیل ہے جن کے آئینہ دل پاک و صاف ہوتے ہیں، وہ بلا واسطہ جمادات و نباتات پیغمبر سے براہ راست خود اس اثر کو قبول کرتے ہیں، اس کے علاوہ معجزہ سے ہر شخص کو ہدایت نہیں ملتی، اس کے لیے بھی استعداد کی ضرورت ہے، دریا کی طراوت اور اس کے روح افزا ہونے میں شک نہیں، لیکن اس میں خشکی کے پرند زندہ نہیں رہ سکتے۔

معجزہ کاں برجما داتے اثر　　　یا عصا یا بحر یا شق القمر

”معجزہ جو بے جان چیزوں پر اثر و تصرف کرتا ہے، مثلاً: عصا کا سانپ ہو جانا، سمندر کا پھٹ جانا، چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا۔“

گر اثر بر جاں زندبے واسطہ　　　متصل گردد بہ پنہاں رابطہ

”اگر وہ معجزہ براہ راست روح کو متاثر کرے تو اندر اندر روح سے اس کا رابطہ پیدا ہو۔“

برجمادات آن اثر ہا عاریہ است　　　آں پئے رُوح خوش متواریا است

”لیکن غیر ذی روح پر اس کا اثر عاریۃً ہے اور روح کے لیے پوشیدہ ہے۔“

تا ازاں جامد اثر گیر د ضمیر　　　حبذا ناں بے ہیو لائے خمیر

”مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس غیر ذی روح شے کی اثر پذیری کو دیکھ کر روحِ انسانی اثر پذیر ہو۔“

برزند از جانِ کامل معجزات　　　بہ ضمیر جانِ طالب چوں حیات

”لیکن معجزہ روح کامل کو خود بے واسطہ اور براہ راست متاثر کرتا ہے اور طالب کے لیے زندگی ہوتا ہے۔“

معجزہ بحر است و ناقص مرغ خاک　　　مرغ خاکی رفت دریم شد ہلاک

[1] مثنوی مولانا روم گفتن عسس، ج۶، ص: ۶۵۶۔

''معجزہ کی مثال دریا کی ہے اور ناقص کی خشکی کے پرندہ کی، خشکی کا پرندہ دریا میں جائے گا تو ڈوب جائے گا۔''

مرغ آبی دروے ایمن از ہلاك ماہیاں را مرگ بے دریاست خاك [1]

''لیکن آبی پرندہ اس میں جائے تو موت سے بے پروا رہے گا بلکہ مچھلیوں کے لیے تو دریا کے بغیر خشکی موت ہے۔''

الغرض ناقصین اور معاندین کے لیے جس طرح صدقِ نبوت کے دوسرے دلائل بے کار ہوتے ہیں، معجزہ کی شہادت بھی بے کار ہوتی ہے۔ معجزہ طلب فرقہ شاذ و نادر ہی دولت ایمان پاتا ہے لیکن وہ ہستیاں جو براہ راست پیغمبر کے وجود سے اثر پذیر ہوتی ہیں، ان کو قبول اثر کے لیے معجزہ کے واسطہ کی حاجت نہیں، ابوجہل معجزہ جمادات دیکھ کر بھی کافر ہی رہا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ معجزہ دل سے صدیق اکبر ہوئے۔

ازستیزہ خواست بوجہل لعین معجزات از مصطفیٰ شاہ بہین

''ابوجہل نے عناد سے آنحضرت ﷺ سے معجزہ طلب کیا۔''

معجزہ جست از نبی ابو جہل سگ دیدو نفزودش ازاں الا کہ شک

''لیکن یہ معجزہ دیکھ کر بھی شک کے سوا اس کو یقین نہ پیدا ہوا۔''

لیک آں صدیق حق معجز نخواست گفت ایں رو خود نہ گوید غیر راست [2]

''لیکن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے معجزہ طلب نہ کیا، انہوں نے کہا کہ یہ چہرہ نبوی ﷺ سچ کے سوا جھوٹ کہہ ہی نہیں سکتا۔''

صحابہ کو کیونکر رسالت کا یقین آیا

اب یہاں پہنچ کر مفروضات اور نظریات کو جانے دیجئے واقعات کو لیجیے، آنحضرت ﷺ نے جب آوازۂ نبوت بلند کیا تو اس آواز کی تائید کرنے والا کوئی دوسرا نہ تھا، عرب کا ذرہ ذرہ اس صدائے حق کا دشمن تھا، آپ پشت ہا پشت کے خوکردہ عادات کے ترک کی دعوت دیتے تھے، موروثی مذہب جو لوگوں کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا، آپ اس کی مذمت کرتے تھے، جن بتوں اور دیوتاؤں کے رعب و ہیبت سے وہ کانپتے تھے، آپ ان کو منہدم کرنے کا حکم دیتے تھے، سرقہ، ڈاکہ، لوٹ مار، قتل، خونریزی، کینہ، عداوت، سود، قمار، زنا، شراب، غرض وہ تمام افعال جو عرب کے خصائص بن گئے تھے، آپ ان کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے، علاوہ بریں آپ کے دست مبارک میں کوئی ظاہری مادی طاقت نہ تھی، دولت و خزانہ نہ تھا، اس دعوت کو قبول کرنے والوں کے لیے بجز مصائب و بلا کے، آپ کے پاس کوئی ظاہری قابل معاوضہ چیز نہ تھی، ہر شخص کو معلوم تھا کہ اسلام کا نام لینے کے ساتھ وہ اپنے گھر سے بیگانہ، اپنی جائیداد سے محروم اپنے خاندان سے ناآشنا،

---

[1] مثنوی مولانا روم دربیان حکایت رنجوری، ج ٦، ص:٥٨٣۔ [2] ایضاً رد کردن معشوق، ج ٤، ص:٣٣١۔

اپنے وطن سے مہجور اور اکابر شہر اور رؤسائے قریش میں رسوا، بدنام اور ہر قسم کی مصیبتوں کا ہدف اور نشانہ بن جائے گا، غریب مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ بے رحمیاں اور سفاکیاں کی جارہی تھیں وہ سب کے سامنے تھیں، بایں ہمہ ایک خلقت تھی کہ آستانہ محمدی ﷺ کی تلاش میں چلی آتی تھی، عرب کے دور دور کے قبائل سے لوگ چھپ چھپ کر پہنچتے تھے اور بیعت کرکے واپس جاتے تھے اور آخر وہ بھی جو سالہا سال تک آنحضرت ﷺ کے دشمن تھے، اسلام کے شدید مخالف اور بدر و احد اور احزاب و خندق کے بانی تھے، وہ بھی ایک روز سرِ اطاعت جھکانے پر مجبور ہوئے۔

آخر اس کے کیا اسباب تھے؟ اور کیونکر ان کو محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور صداقت کا یقین آیا۔ عیسائیوں کی طرح یہ کہنا آسان ہے کہ محمد ﷺ نے لڑ کر لوگوں کو مطیع بنالیا، لیکن سوال یہ ہے کہ ہزاروں جاں نثار لڑنے والے کہاں سے اور کیونکر پیدا ہوئے؟ ان کو کس نے لڑ کر مطیع بنایا؟ اب اگر اسلام لانے والوں کے اسباب پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ سب کے اسلام لانے کا ایک ہی سبب نہ تھا، سینکڑوں ہزاروں آدمی ایک متحد نتیجہ کا یقین رکھتے ہیں لیکن ان کے یقین کے اسباب وعلل کی تلاش کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک کے یقین کے اسباب وعلل اور اذعان کے طرق اور ذریعے مختلف ہیں، ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کی، آپ کی رسالت پر ایمان لائے، آپ کی صداقت پر یقین کیا، مگر یہ تصدیق، یہ ایمان اور یہ یقین کسی ایک سبب کا نتیجہ نہ تھا، اس سے معلوم ہوا کہ صرف معجزہ ہی نبوت کی دلیل نہیں ہے بلکہ ہر طبیعت صالحہ اور قلب سلیم کے لیے پیغمبر کی صداقت کی مختلف دلیلیں مؤثر اور کارگر ہوئی ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صرف دعوائے نبوت کو سن کر ایمان لے آئے، محض دعویٰ کی صداقت نے ان کو ہر دلیل و برہان سے بے نیاز کردیا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عثمان، حضرت عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم یہ دیکھ کر اسلام لے آئے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سا دانش منداس صداقت سے متاثر ہے، خدیجہ رضی اللہ عنہا ایمان لائیں، مگر یہ کہہ کر آپ ﷺ جیسے اخلاق گراں مایہ کا انسان جو غریبوں کا مولیٰ، مقروضوں کا ماویٰ اور مسافروں کا ملجا ہے، کبھی شیطان کے پنجہ میں گرفتار نہیں ہوسکتا، حضرت انیس غفاری اور حضرت عمرو بن عنبسہ سلمی رضی اللہ عنہما یہ دیکھ کر اسلام لائے کہ آپ ﷺ مکارمِ اخلاق کا حکم دیتے ہیں، حضرت عمر، حضرت طفیل بن عمرو دوسی، حضرت جبیر بن مطعم، نجاشی شاہِ حبش وغیرہ سینکڑوں اشخاص کلامِ ربانی سن کر حلقہ بگوش ہوگئے، حضرت ضماد بن ثعلبہ ازدی نے نفس کلمہ طیبہ سننے کے ساتھ نعرۂ حق بلند کردیا، حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ چہرہ انور کو دیکھتے ہی پکار اٹھے کہ ''یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں۔'' حضرت ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ رئیس بنی سعد اس طرح اسلام لائے کہ انہوں نے بے تکلفی کے ساتھ دربار نبوی میں آکر آنحضرت ﷺ کو قسم دلائی کہ تم کو سچ مچ خدا نے بھیجا ہے اور جب آپ نے قسم کھائی تو وہ مسلمان ہوگئے۔ [1]

[1] آگے یہ واقعات مفصلاً حوالوں کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ ''ض''

اوس وخزرج کے بہت سے لوگ اپنے یہودی ہمسایوں سے سنا کرتے تھے کہ ایک نبی آخرالزمان کا ظہور ہونے والا ہے، جب انہوں نے آپ کی تقریر سنی تو پہچان لیا کہ یہ وہی پیغمبر ہیں، فتح مکہ کے بعد سینکڑوں قبائل اسلام لانے پر اس لیے مجبور ہوئے کہ خانہ خلیل کسی جھوٹے پیغمبر کے قبضہ میں نہیں جاسکتا۔ ایک پورا قبیلہ صرف آپ کی فیاضی سے متاثر ہو کر کلمہ لا الہ الا اللہ پکار اٹھا، متعدد شعرائے عرب اور اصحاب علم صرف قرآن مجید کے اثر کو دیکھ کر دل کو قابو میں نہ رکھ سکے، متعدد قریشی جانباز جو معرکۂ بدر سے مرعوب نہیں ہوئے تھے، مسلمانوں کے آداب واخلاق کو دیکھ کر اسلام لے آئے، صلح حدیبیہ کے بعد ہزاروں مکہ کے آدمیوں کو جب مسلمانوں سے بے تکلف میل جول کا موقع ملا تو وہ اسلام کی صداقت کے اعتراف پر مجبور ہوگئے، ابو سفیان جس کو نہ تو معجزات اور خوارقِ عادات متاثر کر سکے اور نہ بدر وخندق کی تلواریں اس کو مرعوب کر سکیں، نہ آنحضرت ﷺ کا رشتہ دامادی اس کے سخت دل کو نرم کر سکا، وہ اس نظارہ کو دیکھ کر اپنے ضمیر کے اعتراف کو نہ روک سکا کہ قیصر روم اپنے تخت جلال پر بیٹھ کر مکہ کے بوریا نشین پیغمبر کے پاؤں دھونے کی آرزو رکھتا ہے۔ ثمامہ بن اثال، ہندہ زوجہ ابوسفیان، ہبار بن الاسود، وحشی قاتل حمزہ رضی اللہ عنہ یہ دیکھ کر مسلمان ہوگیا کہ آپ ﷺ دشمنوں کے ساتھ بھی کس محبت سے پیش آئے، قیصر روم صرف آپ کے چند اوصاف اور اسلام کے چند مناقب سن کر اظہار حق پر مائل ہوگیا۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ قبیلہ طے کے عیسائی رئیس تھے، وہ آپ ﷺ کو بادشاہ سمجھ کر مدینہ آئے، مگر یہاں انھوں نے دیکھا کہ ایک لونڈی آئی ہے اور آپ اس کی حاجت روائی کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر ان کا دل اندر سے پکارا اٹھا کہ آپ بادشاہ نہیں پیغمبر ہیں۔ ایسے لوگ بھی تھے، جو ان روحانی واخلاقی معجزات کے مقابلہ میں مادی معجزات سے متاثر ہونے کی زیادہ قابلیت رکھتے تھے، قریش کے بہت سے لوگ فتح روم کی پیشین گوئی کو پوری ہوتے دیکھ کر اسلام لے آئے، ایک سفر میں ایک قبیلہ کی عورت آپ ﷺ کی انگلیوں سے پانی کا چشمہ بہتے دیکھ کر اپنے قبیلہ میں جا کر کہتی ہے کہ آج میں نے عرب کے سب سے بڑے جادوگر کو دیکھا اور اسی استعجاب نے پورے قبیلہ کو مسلمان کر دیا، متعدد یہودی اس لیے مسلمان ہوگئے کہ گزشتہ انبیا کی کتابوں میں آنے والے پیغمبر کی جو نشانیاں بتائی گئی تھیں، وہ حرف بحرف آپ میں صحیح نظر آتی تھیں، متعدد یہودی علمانے آکر آپ کا امتحان لیا اور جب آپ نے ازروئے وحی ان کے جوابات صحیح دیے تو وہ آپ کی نبوت پر ایمان لائے۔ ایک شخص نے کہا کہ میں اس وقت آپ کو سچا رسول تسلیم کروں گا۔ جب یہ خرمے کا خوشہ آپ کے پاس آکر آپ کی رسالت کی شہادت دے اور جب یہ تماشا اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو مسلمان ہوگیا۔ [1] ایک سفر میں ایک اعرابی نظر آیا، آپ نے اس کو اسلام کی دعوت دی، اس نے کہا کہ آپ کی صداقت کی شہادت کون دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”سامنے کا درخت۔“ اور یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اس درخت کو بلایا، وہ اپنی جگہ سے اکھڑ کر آپ کے پاس

[1] جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب فی حنین الجذع: ۳۶۲۸۔

کھڑا ہوگیا اور تین بار اس کے اندر سے کلمہ توحید کی آواز آئی، یہ دیکھ کر وہ مسلمان ہوگیا۔ ❶ سراقہ بن مالک جو ہجرت کے وقت آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تعاقب میں گھوڑا دوڑاتے آرہے تھے، جب انہوں نے دیکھا کہ آپ کی دعا سے تین دفعہ ان کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے تو ان کو یقین ہوگیا کہ اسلام کے اقبال کا ستارہ نقطہ اوج پر پہنچ کر رہے گا، چنانچہ خطِ امان حاصل کیا اور بعد کو مسلمان ہوگئے۔ ❷

چوں پیمبر از بروں بانگے زند　　جان امت در دروں سجدہ کند ❸
برزند ازجانِ کامل معجزات　　بر ضمیر جانِ طالب چوں حیات ❹

❶ سنن دارمی، المقدمة، باب ما اکرم اللّٰه نبيه من ایمان الشجر:١٦۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی ﷺ، واصحابه الی المدینة: ٣٩٠٦۔ ❸ مثنوی مولانا روم، بیان آں دعوی کہ...... ج٢، ص:١٨٥۔ ❹ مثنوی مولانا روم دربیان حکایت رنجوری، ج٦، ص: ٥٨٣۔

دلائل و معجزات اور عقلیاتِ جدیدہ

نوشتہ مولانا عبدالباری صاحب ندوی، سابق استاذ فلسفہ جدیدہ، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد۔ دکن

﴿وَمَا تُغْنِي الْآيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ﴾ (۱۰/ یونس: ۱۰۱)

''جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے لیے آیات و نذر بے کار ہیں۔''

لیکن

در دل ہر کس کہ دانش را مزہ است روئے و آواز پیمبر معجزہ است (عارف روم)

متکلمین و حکمائے اسلام نے عقلی حیثیت سے معجزہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ گزشتہ مباحث میں نظر سے گزر چکا ہے۔ ''سیرت'' کے اس حصہ کو اصلاً معجزات نبوی کی نقلی اور روایاتی تحقیق سے تعلق تھا، تاہم ضمناً قدیم کلامی مباحث بھی ایک حد تک آ گئے ہیں، ذیل میں اس موضوع پر صرف عقلائے مغرب کی ترجمانی کرنی ہے اور جدید تحقیقات و خیالات کی روشنی میں جو نتائج نکلتے ہیں، ان کو پیش کرنا ہے۔

آغاز کتاب میں نبوت اور معجزہ کے مفہوم کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہے، سب سے پہلے اس پر ایک نظر اور ڈال لو۔

مفہوم نبوت

جس طرح رات کی تاریکی کے بعد دن کی روشنی کا آنا قانونِ قدرت ہے، اسی طرح یہ بھی ایک سنت الٰہی ہے کہ جب عالم انسانیت پر ضلالت و گمراہی کی تاریکی چھا جاتی ہے تو اس کے مطلع سے ہدایت و راہنمائی کا نور طلوع کرتا ہے اور اگرچہ جس طرح ظلمت شب میں چھوٹے بڑے ستارے اپنی جھلملاہٹ سے کچھ نہ کچھ روشنی پیدا کرتے رہتے ہیں، اسی طرح عام مصلحین و مجددین کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی حد تک ضلالت انسانی کی سیاہی کو کم کرتا رہتا ہے، تاہم آفتاب کی ضیا پاشی کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے، اس کے سامنے ستاروں کی جھلملاہٹ بالکل ماند پڑ جاتی ہے اور کرۂ ارض دفعۃً بقعۂ نور بن جاتا ہے۔

سلسلۂ مصلحین کے اسی آفتاب ہدایت کے نام ادیان و شرائع کی اصطلاح میں نبی پیغمبر یا رسول ہے، عام مصلحین کے ہاتھ میں صرف انسانی عقل و بصیرت کی مشعل ہوتی ہے لیکن مشکوٰۃ نبوت سے جو نورِ ہدایت اُبلتا ہے اس کا سرچشمہ وہ ''نور السموات والارض'' ہوتا ہے، جس سے عام مادی آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں، پیغمبر وہ کچھ دیکھتا ہے جو ہم نہیں دیکھتے، وہ کچھ سنتا ہے جو ہم نہیں سنتے، اس کے احوال و کوائف سے ہم ناآشنا اور اس کے عقل و حواس سے بیگانہ ہوتے ہیں، مختصراً یوں سمجھو کہ پیغمبرانہ خصائص کی اصلی روح عالم ناسوت سے ماورا کسی عالم غیب کے ساتھ تعلق و ربط ہے، انسان اسی عالم اسرار و غیوب کو اپنی محدود تعبیر میں عالم قدس، عالم روح، عالم مثال وغیرہ سے موسوم کرتا ہے۔

مفہوم معجزہ

حامل رسالت اپنے ابنائے جنس کو جو دعوت دیتا ہے اور دنیا کو جو پیام پہنچاتا ہے، اس کی سچائی کی واضح ترین دلیل یا آیت، اگرچہ خود یہ پیام اور اس کے حامل کا مجسم وجود ہوتا ہے، تاہم بہ اقتضائے "لیطمئن قلبی" یا بلحاظ اتمام حجت اس داعی حق کے تعلق سے کچھ ایسے واقعات ظاہر ہوتے ہیں جو عام حالات میں انسانی دسترس سے باہر نظر آتے ہیں اور ان کی توجیہ و تعلیل سے انسانی عقل اپنے کو درماندہ پاتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ سرد ہوگئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اژدھا بن گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بے باپ کے پیدا ہوئے، آنحضرت ﷺ نے چشم زدن میں "مسجد حرام" سے لے کر "مسجد اقصیٰ و سدرۃ المنتہیٰ" تک کی سیر کر لی، ان واقعات کی توجیہ سے چونکہ عقل انسانی عاجز ہے، اس لیے ان میں ایک طرح کا غیب نظر آتا ہے اور جس شخص کے تعلق سے ان کا ظہور ہوتا ہے، عالم غیب کے ساتھ اس کے روابط کی نشانی و آیات یا تائید غیبی کا کام دیتے ہیں، قرآن مجید کی زبان میں اس قسم کے واقعات کا نام بینات، براہین یا زیادہ تر آیات (یا آیات بینات) ہے، محدثین ان کو "دلائل نبوت" سے تعبیر کرتے ہیں اور حکما اور متکلمین کی اصطلاح میں انہی کو معجزات کہا جاتا ہے۔

ترتیب مباحث

معجزات کی جو نوعیت ہے اس کے لحاظ سے سب سے پہلی بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ آیا ان کا وقوع ممکن بھی ہے یا نہیں؟ قدما نے علل مخفیہ وغیرہ سے توجیہ معجزات کی جو کوششیں کی ہیں ان کا مدعا حقیقتاً امکان ہی کو ثابت کرنا ہے مگر حکمت و فلسفہ کے دور جدید میں امکان کے ساتھ ایک دوسری زیادہ اہم بحث شہادت کی پیدا ہوگئی ہے، نفس امکان سے تو اب شاید ہی کسی حکیم یا فلسفی کو انکار ہو، البتہ یہ امکان اس قدر بعید الوقوع معلوم ہوتا ہے کہ یقین وقوع کے لیے عام واقعات تاریخی کے درجہ کی شہادت کافی نہیں خیال کی جاتی۔

لیکن چونکہ امکان اور شہادت دونوں کی بحث کا اصلی مرجع معجزانہ واقعات کا قابل یقین واذعان ہونا یا نہ ہونا ہے، اس لیے امکان و شہادت دونوں سے زیادہ اہم سوال خود یقین کی ماہیت و اسباب کا ہے تعجب ہوتا ہے کہ اس طرح بحث معجزات کے ضمن میں متقدمین و متاخرین میں سے جہاں تک علم ہے کسی کا بھی ذہن نہیں گیا۔ صفحات ذیل میں نہ صرف اس اہم سوال کا مستقلاً جواب دیا گیا ہے بلکہ دراصل یہی جواب معجزہ کے متعلق تمام مباحث کا مقطع اور خاتمہ سخن ہے

بہر کیف اس خاکہ کی بنا پر ترتیب مباحث یہ ہوگی:

① امکان معجزات ② شہادت معجزات ③ استبعاد معجزات

④ یقین معجزات ⑤ غایت معجزات۔

امکان معجزات

یوں تو یورپ میں معجزات پر بیسیوں مستقل کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ اس بحث پر ہیوم [1] نے جو چند اوراق لکھے تھے، وہ سارے طومار پر بھاری ہیں اور گو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اس موضوع پر یہ سب سے پہلی تحریر تھی، تاہم وقوع معجزات کے خلاف جو آخری حربہ استعمال کیا جا سکتا ہے، وہ بھی یہی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان اوراق پر کم و بیش دو صدیاں گزر جانے پر بھی موافق و مخالف دونوں کے قلم کی روشنائی انہی کے نقوش مٹانے یا اجاگر کرنے میں صرف ہوتی رہی ہے۔

ہیوم کا استدلال

ہیوم کے استدلال کا ماحصل یہ ہے کہ

① انسان کے علم و یقین کا مدار تمام تر تجربہ پر ہے جس طرح آدمی تجربہ سے یہ جانتا ہے کہ آگ لکڑی کو جلاتی ہے اور پانی سے بجھ جاتی ہے، اسی طرح تجربہ ہی کی بنا پر وہ اس کا بھی یقین رکھتا ہے کہ جب تک دروغ بیانی کا کوئی خاص سبب نہ ہو لوگ علی العموم سچ بولتے ہیں، یعنی جس چیز کی وہ روایت یا تصدیق کرتے ہیں وہ عام طور پر تحقیق کے بعد صحیح ثابت ہوتی ہے۔

② جس نسبت سے کسی امر کے متعلق گزشتہ تجربات کی شہادت قوی یا ضعیف ہوتی ہے، اسی نسبت سے ہمارے دل میں اذعان، شک یا انکار کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور ہونی چاہیے۔

فرض کرو کہ تمہارے محلّہ میں ساٹھ ستر برس کی عمر کا ایک بوڑھا فقیر رہتا ہے، جس کو تم بچپن سے دیکھتے ہو کہ چیتھڑے لپیٹے ہوئے بھیک مانگ کر زندگی بسر کرتا ہے، پیری و فاقہ کشی سے ہڈیوں کا صرف ڈھانچہ رہ گیا ہے، کل تک تم نے اس کو اسی حال میں دیکھا تھا، آج تمہارا ایک پڑوسی آ کر کہتا ہے کہ وہ بیچارہ بڈھا فقیر رات کو مر گیا۔ تم کو اس کے بیان کے باور کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا لیکن یہی پڑوسی اگر یہ بیان کرے کہ میں نے اس فقیر کو نہایت قیمتی لباس میں اعلیٰ درجہ کی موٹر پر سوار واہٹ وے کی دوکان پر کچھ چیزیں خریدتے دیکھا تو تم کو سخت اچنبھا ہوگا اور اگر پڑوسی کی صداقت کا غیر معمولی طور پر تم کو اعتبار نہیں ہے یا اور بہت سے معتبر لوگ اس کی تصدیق نہیں کرتے تو اس بیان کے قبول کرنے میں تم بہت زیادہ پس و پیش کرو گے۔ تیسری صورت یہ فرض کرو کہ اس پڑوسی نے یہ بیان کیا کہ ''میں نے اس پیر فرتوت، پوست و استخوان فقیر کو آج دیکھا کہ بیس پچیس برس کا جوان رعنا ہے'' اب تم اپنے پڑوسی کو یا تو محض لاغی سمجھو گے یا یہ خیال کرو گے کہ اس کو کچھ نہ کچھ دھوکا ہوا ہے لیکن اس بیان کی واقعیت کا اذعان ہرگز تمہارے دل میں نہ پیدا ہوگا کیوں؟

صرف اس لیے کہ اس قسم کی مثال انسان کے گزشتہ تجربات میں ایک بھی نہیں ملتی، اسی بنا پر اس کو خلاف

[1] Human under standing ''فہم انسانی'' باب بحث معجزات۔ اردو ترجمہ از ص ۱۴۴ تا ۱۴۹ مطبع معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۳۸ء

فطرت یا خارق عادت قرار دیا جاتا ہے، جس کو تسلیم کرنے کے بجائے یہ سمجھ لینا کہیں زیادہ قرین قیاس ہے کہ راوی کو دھوکا ہوا یا وہ دانستہ جھوٹ بول رہا ہے کیونکہ سچے سے سچے آدمی کا جھوٹ بول دینا، یا عاقل سے عاقل انسان کا دھوکا کھا جانا بجائے خود ایک نادر الوقوع شے سہی، تاہم عدیم الوقوع نہیں ہے اور خرق عادت کے مقابل میں اس کا وقوع بہت زیادہ ممکن و قابل قبول ہے۔

③ معجزہ اسی ضعف کے عدیم الوقوع یا قانون فطرت کے خارقِ واقعہ سے عبارت ہوتا ہے ورنہ پھر وہ معجزہ نہیں رہتا اس لیے کہ اگر یہ محض نادر الوقوع شے کا نام ہو جس طرح کہ کسی آخری درجہ کے مدقوق کا صحت یاب ہو جانا یا ایک مفلس کا رات بھر میں دولت مند ہو جانا تو یہ ایسے واقعات ہیں جن کی توجیہ کے لیے عام انسانی زندگی میں کچھ نہ کچھ تجربات ملتے ہیں، مثلاً: مفلس کے گھر میں کوئی دفینہ نکل سکتا ہے بخلاف اس کے معجزہ کی حقیقت ہی یہ ہے کہ اس کی تعلیل و توجیہ عام تجربات کی دسترس سے باہر ہو۔ اس لیے معجزہ گویا بذات خود آپ اپنی تردید ہے۔

اس استدلال کو خود ہیوم کے الفاظ میں بھی سن لینا چاہیے:

> ''معجزہ نام ہے قوانین فطرت کے خرق کا اور چونکہ یہ قوانین مستحکم اور اٹل تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں، اس لیے معجزہ خود اپنے خلاف اتنا زبردست ثبوت ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی تجربی ثبوت کا تصور ہی نہیں ہو سکتا، کیا وجہ ہے کہ ہم ان باتوں پر قطعی یقین رکھتے ہیں کہ تمام انسان فانی ہیں، سیسہ آپ ہی آپ ہوا میں معلق نہیں رہ سکتا، آگ لکڑی کو جلاتی ہے اور پانی سے بجھ جاتی ہے، صرف یہی کہ یہ امور قوانین فطرت کے مطابق ثابت ہو چکے ہیں اور اب ان کا توڑنا بغیر قوانین فطرت کے توڑے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ بلا معجزہ کے ناممکن ہے جو چیز عام قانون فطرت کے اندر واقع ہوتی ہے وہ کبھی معجزہ نہیں خیال کی جاتی، مثلاً: یہ کوئی معجزہ نہ ہوگا کہ ایک آدمی جو دیکھنے میں تندرست و توانا ہے، اچانک مر جائے کیونکہ اس قسم کی موت گو نسبتاً قلیل الوقوع سہی لیکن پھر بھی بارہا مشاہدہ میں آچکی ہے، البتہ یہ معجزہ ہوگا کہ کوئی مردہ زندہ ہو جائے کیونکہ ایسا کبھی کسی ملک میں نہیں دیکھا گیا ہے، لہٰذا جس واقعہ کو معجزہ کہا جاتا ہے اس کے خلاف تجربہ کا مستمر و متواتر ہو جانا ضروری ہے، ورنہ پھر یہ معجزہ کے نام سے نہ موسوم ہوگا اور چونکہ کسی شے کا متواتر تجربہ خود ایک قطعی ثبوت ہے، تو گویا معجزہ کے نفس حقیقت و ماہیت میں اس کے وجود کے خلاف ایک قطعی و براہ راست ثبوت موجود ہے اور ایسا ثبوت جو نہ اس وقت معجزہ کو ثابت ہونے دے سکتا ہے اور نہ خود باطل کیا جا سکتا ہے، جب تک اس کے خلاف اس سے بڑھ کر ثبوت نہ پیدا کیا جائے۔''

''لہٰذا صریح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو ایک کلی اصول کی حیثیت رکھتا ہے کہ کوئی تصدیق و شہادت معجزہ کے اثبات کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ یہ ایسی نہ ہو جس کی تکذیب خود اس معجزہ سے بڑھ کر معجزہ ہو، جس کو یہ ثابت کرنا چاہتی ہے اور اس صورت میں بھی دلائل میں باہم تصادم ہوگا جو دلیل جتنی زیادہ قوی ہوگی اپنی زائد قوت کے مناسب یقین پیدا کرے گی فرض کرو کہ ایک شخص آ کر مجھ سے کہتا ہے کہ اس نے ایک مردہ کو دیکھا کہ زندہ ہو گیا تو میں ذرا سوچنے لگتا ہوں کہ آیا یہ زیادہ ممکن ہے کہ یہ شخص دھوکا دینا چاہتا ہو یا خود دھوکا کھا گیا ہو یا یہ اغلب ہے کہ جو کچھ وہ بیان کر رہا ہے صحیح ہو میں ان دونوں معجزوں میں موازنہ کرتا ہوں اور جدھر کا پلہ زیادہ جھکتا معلوم ہوتا ہے اسی کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں اور ہمیشہ اسی احتمال کو رد کرنا پڑتا ہے جس میں معجزہ پن زیادہ نظر آتا ہے البتہ اگر روایت کی تکذیب واقعہ روایت سے بڑھ کر معجزہ ہو تو اس صورت میں بے شک مجھ کو روایت کے یقین پر مجبور ہو جانا پڑے گا لیکن اس کے بغیر قطعاً ناممکن ہے۔'' [1]

غرض ہیوم کے استدلال اور اس کی تعریف معجزہ کی رو سے اگر ایک طرف ہم اپنی میزان عقل میں کسی خارق عادت واقعہ کی شہادت و روایت کو رکھیں اور دوسری طرف اس کے خلاف دنیا کے ہزار ہا سال کے مستمر و متواتر تجربہ کو تو ظاہر ہے کہ یہ شہادت چاہے کتنی ہی معتبر و وقیع کیوں نہ ہو تا ہم اس متواتر تجربہ کے ہم وزن کسی حال میں نہیں ٹھہر سکتی لہٰذا انسانی شہادت کی کوئی کمیت و کیفیت بھی معجزہ کے یقین و اثبات کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنی جان کے دشمن اور اپنے سب سے بڑے منکر فرعون کے گھر میں پرورش پائی، ہیوم سے بڑھ کر معجزہ کا کون دشمن و منکر ہوگا لیکن اس انکار کو جب اس کے پورے فلسفہ کی روشنی میں دیکھو تو نظر آتا ہے کہ قبول معجزات کی راہ میں عقل کی خود فریبی کا جو سب سے زبردست طلسم حائل تھا اس کو ہیوم ہی نے توڑا اور ہمیشہ کے لیے برباد کر دیا ہے جس کے بعد راستہ کے صرف چند کانٹوں کا ہٹانا باقی رہ جاتا ہے۔ چراغ تلے اندھیرا، آدمی بارہا اپنے ہاتھ کی مشعل سے دوسروں کو راستہ دکھلاتا ہے اور خود نہیں دیکھ سکتا۔

انسان کے ذہن میں جس قدر یہ اعتقاد راسخ ہے، شاید ہی کوئی اور ہو کہ کائنات کا ذرہ ذرہ مادی علل و اسباب اور قویٰ و خواص کی زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے، چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی اپنے ظہور کے لیے ایک اٹل اور غیر متغیر علت رکھتا ہے، ہر شے اپنے اندر کوئی نہ کوئی ایسی قوت یا خاصہ رکھتی ہے، جس سے اس وقت تک اس کا انفکاک ناممکن ہے، جب تک یہ خود اپنی ذات و حقیقت سے منفک نہ ہو جائے، یہ ناممکن ہے کہ میرا قلم میز کی ایک جانب سے دوسری جانب کو چلا گیا ہو، بغیر اس کے کہ کسی ہاتھ یا کسی اور مادی شے نے اس کو حرکت دی ہو، اس کاغذ پر جو نقوش تم کو نظر آ رہے ہیں ضروری ہے کہ ان کو کسی نہ کسی قلم نے کھینچا ہے، اسی طرح یہ نہیں ہو سکتا

[1] فہم انسانی، باب معجزات، ص:۱۳۱ تا ۱۳۳۔

کہ انار کے درخت سے آم کا پھل، یا آم کے درخت سے انار کا پھل پیدا ہو، آم کے درخت سے ہمیشہ آم اور انار کے درخت سے ہمیشہ انار ہی پیدا ہوگا۔

غور کرو جب تم سے یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ نہ جلا سکی تو تم کو اس کے باور کرنے میں کیوں پس وپیش ہوتا ہے، اس لیے کہ آگ جب تک آگ ہے جلانے کا خاصہ اس سے منفک نہیں ہوسکتا اس کو ابراہیم اور نمرود کی تمیز نہیں، اژدھا ایک جاندار مخلوق ہے جو تولید مثل کے قاعدے سے اپنی ہی جیسی جاندار مخلوق سے وجود میں آتا ہے اس لیے یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا کیونکر اژدھا بن گیا، انسان کا بچہ اپنے والدین کے بندھے ہوئے اور مشترک عمل توالد وتناسل کا نتیجہ ہوتا ہے پھر یہ کیونکر مان لیا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بے باپ کے پیدا ہوئے۔ دس قدم کی مسافت طے کرنے کے لیے بھی آدمی کو اپنے پاؤں یا کسی اور مادی وسیلہ کی احتیاج ہوتی ہے اور جس قدر مسافت زیادہ ہوتی ہے اسی قدر اس کے قطع کرنے میں زیادہ وقت لگتا ہے، لہٰذا یہ کیونکر یقین کیا جائے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے بلا معمولی وسائل مادی کے استعمال کے طرفۃ العین میں ''مسجد حرام'' سے ''مسجد اقصیٰ'' اور ''سدرۃ المنتہیٰ'' تک کی سیر کرلی، زمین وآسمان کی آیات کا مشاہدہ کیا اور تمام انبیائے سابقین سے گفتگو فرمائی، پھر یہ تمام مراحل اتنے وقفہ میں کیونکر طے ہوسکتے ہیں کہ واپسی پر کواڑ کی زنجیر ہل رہی ہو اور بستر کی گرمی ہنوز قائم ہو۔

سلسلۂ علل واسباب اور اشیاء کے افعال وخواص ہی کے اصول وقوانین کا نام حکما اور فلاسفہ کی اصطلاح میں قوانین فطرت ہے، جن کا خرق محال خیال کیا جاتا ہے، مثلاً: کشش ثقل ایک قانون فطرت ہے جس کا یہ اقتضا ہے کہ جب تم ڈھیلے کو اوپر پھینکو گے تو وہ لوٹ کے ہمیشہ نیچے آئے گا فضا میں اس کا معلق رہنا ناممکن ہے، ہائیڈروجن اور آکسیجن دو عناصر کے ایک خاص مقدار میں ملنے کا خاصہ یہ ہے کہ پانی بن جاتا ہے جس کے خلاف کبھی نہیں ہوسکتا۔

قوانینِ فطرت کی حقیقت

اب دیکھو کہ جن چیزوں کو تم قوانین فطرت کا لقب دیتے ہو اور جو بظاہر اس قدر قطعی اور اٹل نظر آتے ہیں، واقعات کی کسوٹی پر ان کی کیا بساط ٹھہرتی ہے؟ اگر کوئی شخص یہ پوچھے کہ نمک نمکین اور شکر میٹھی کیوں ہوتی ہے؟ تو یہ سوال تم کو ایسا ہی مہمل ومضحک معلوم ہوگا، جیسے کوئی یہ سوال کرے کہ جز کل سے چھوٹا کیوں ہوتا ہے؟ جز کی حقیقت ہی یہ ہے کہ کل سے چھوٹا ہو، اسی طرح لوگ سمجھتے ہیں کہ نمکینی اور مٹھاس نمک اور شکر کی حقیقت میں داخل ہیں، لیکن سوچو کہ کیا نمک کی نفس ذات میں تم کو کوئی ایسی شے نظر آتی ہے جن کی بنا پر بلا اس کو چکھے ہوئے تم یہ حکم لگا سکو کہ اس کا مزہ بالضرورت شکر کے مزہ سے مختلف ہونا چاہیے صرف دونوں کے چکھنے اور تجربہ کی بنا پر نمک کو نمکین اور شکر کو شیریں یقین کیا جاتا ہے۔ سنکھیا زہر ہے جس کے کھانے سے آدمی مرجاتا ہے

سنکھیا کا ایک ٹکڑا لے کر اس کو خوب الٹ پلٹ کر دیکھو، اس کی ذات یا حقیقت میں کہیں کوئی ایسی شے محسوس ہوتی ہے، جس کی وجہ سے تم بلا تجربہ اس کو موت کی علت قرار دے سکو جس شخص نے سنکھیا کبھی نہیں دیکھی یا اس کے اثر سے ناواقف ہے اس کو تم با آسانی کھلا سکتے ہو کیوں؟ صرف اس لیے کہ اس کو خود سنکھیا کے اندر کوئی ایسی شے نہیں نظر آتی جس سے بلا سابق تجربہ کے وہ اس کے زہر قاتل یا علت موت ہونے کا علم و یقین حاصل کر سکے بیسویں صدی کے سائنس دان کے لیے یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ پانی دو مختلف اجزا یا عناصر سے مرکب ہے لیکن جب تک اس حقیقت کا تجربہ نہیں ہوا تھا، ڈھائی ہزار سال تک حکما اور عقلائے عالم پانی کو ایک مفرد و بسیط عنصر یقین کرتے رہے، حالانکہ پانی کی جو صورت و شکل کاونڈس ❶ کے سامنے تھی وہی طالیس ملطی ❷ کے سامنے بھی تھی، سنکھیا اور شکر کے بجائے اگر ہم کو سمیت اور شیرینی کا تجربہ پتھر کی کنکریوں میں ہوتا تو ہم ان کو اسی طرح مہلک (ہلاکت کی علت) و شیریں یقین کرتے جس طرح آج سنکھیا اور شکر کو کرتے ہیں۔

جان اسٹورٹ مل نے اپنی مشہور کتاب ''نظام منطق'' ❸ میں اس کی نہایت عمدہ مثال دی ہے کہ

> ''آج سے پچاس سال پہلے وسط افریقہ کے باشندوں کے نزدیک غالبًا کوئی واقعہ اس سے زیادہ تجربہ کی قطعیت و یکسانی پر مبنی نہ تھا جتنا یہ کہ تمام انسان کالے ہوتے ہیں، اسی طرح کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے کہ اہل یورپ کو اس فطرت کی یکسانی کی ایک بالکل قطعی و غیر مشتبہ مثال سمجھتے تھے کہ تمام ہنس سفید ہوتے ہیں ❹ مزید تجربہ کے بعد افریقہ و یورپ والوں دونوں کو معلوم ہوا کہ یہ خیالات غلط تھے لیکن اس تجربہ کے لیے ان کو پانچ ہزار برس انتظار کرنا پڑا اور اس طویل مدت میں انسانی آبادی کے دو براعظم فطرت کی ایک ایسی یکسانی پر یقین کرتے رہے جس کا حقیقۃً کوئی وجود نہ تھا۔''

کائناتِ فطرت کی وسعت بیکراں کو دیکھتے ہوئے آج بھی نوع انسان کے تجربہ پر مبنی قوانین فطرت کی بساط اس سے زیادہ نہیں ہے، جتنی کہ اس تجربہ کی تھی کہ تمام انسان کالے ہوتے ہیں اور تمام ہنس سفید۔ انیسویں صدی کے ایک مشہور فلسفی ڈاکٹر وارڈ نے اسی حقیقت کو ایک مفروض مثال کے پیرایہ میں اس طرح بیان کیا کہ فرض کرو کہ

> ''افریقہ کے کسی صحرا میں ایک نہایت عظیم الشان سلسلۂ عمارت ہے جو چاروں طرف ایک چار دیواری سے گھرا ہوا ہے، اس کے اندر ایک خاص ذی عقل مخلوق آباد ہے جو اس احاطہ سے باہر نہیں جا سکتی، یہ عمارت ایک ہزار سے زائد کمروں پر مشتمل ہے جو سب مقفل ہیں اور کنجیوں کا

❶ جس نے پانی کو بسیط عنصر کے بجائے آکسیجن و ہائیڈروجن سے مرکب ثابت کیا۔

❷ یونان کا پہلا فلسفی جو پانی کو مبدء عالم جانتا تھا۔ ❸ سسٹم آف لاجک کتاب سوم باب ۳ فصل دوم۔

❹ وسط افریقہ کے آدمی کالے ہوتے ہیں اور یورپ کے ہنس سفید ہوتے ہیں۔

پتہ نہیں کہ کہاں ہیں، بڑی محنت وجستجو کے بعد کل پچیس کنجیاں ملتی ہیں، جن سے اِدھر اُدھر کے پچیس کمرے کُھل جاتے ہیں جو سب ہم شکل ہیں لہٰذا کیا اس بنا پر اس احاطہ کے اندر رہنے والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ کر دیں کہ بقیہ ۹۷۵ کمرے بھی اسی شکل کے ہیں۔ [1]

قوانین فطرت یا خواص اشیاء وعلاقۂ تعلیل (علت ومعلول) کی مذکورہ بالا حقیقت اگرچہ اب حکمت (سائنس) وفلسفہ دونوں کے مسلمات میں داخل ہے لیکن اس حقیقت کو سب سے پہلے جس شخص نے اجاگر کیا۔ وہ معجزات کا منکر ہیوم ہی تھا، اس لیے خود اسی کی زبان سے سنو کہ جس چیز کو وہ خرق عادت کہہ کر ناممکن قرار دیتا ہے اس کے عدم امکان کا کیا وزن ہے۔

''جب [2] ہم اپنے آس پاس کی خارجی چیزوں پر نظر کرتے ہیں اور مختلف علتوں کے افعال کو غور سے دیکھتے ہیں تو ان میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس کے اندر کسی قوت یا لزوم کا پتہ چلتا ہو، نہ ان کی کوئی ایسی صفت نظر آتی ہے جو معلول کو اس طرح علت سے جکڑے ہوئے ہو کہ ایک کو دوسرے سے مستنبط کرنے میں خطا کا کوئی امکان نہ ہو، ہم کو جو کچھ نظر آتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ ایک واقعہ کا ظہور دوسرے کے بعد ہوتا ہے بلیرڈ کے ایک گیند میں ضرب لگانے سے دوسرے میں حرکت ظاہر ہوتی ہے بس حواس ظاہری سے جو کچھ نظر آتا ہے اس کی بساط اسی قدر ہے اشیاء میں اس تقدم وتاخیر یا تبعیت کے پائے جانے سے ذہن کو نفس تبعیت کے علاوہ کوئی اور احساس یا ارتسام باطنی نہیں حاصل ہوتا۔ کسی شے کو پہلی دفعہ دیکھنے سے ہم کبھی قیاس نہیں کر سکتے کہ اس سے کیا معلول یا نتیجہ ظاہر ہوگا حالانکہ اگر علت کے اندر کسی قوت یا انرجی کا پتہ محض ذہن دوڑانے سے چل سکتا تو بلا کسی سابق تجربہ کے ہم اس نتیجہ ومعلول کی پیشین گوئی کر دیتے اور پہلی ہی نظر میں قطعی حکم لگا دیتے۔''

حقیقت امر یہ ہے کہ کائنات مادی کا ایک ذرہ بھی ایسا نہیں ہے جس کی صفات محسوسہ کی بنا پر ہم اس کے اندر کسی قوت کا سراغ لگا سکیں یا قیاس سے بتلا سکیں کہ اس سے کوئی اور دوسری شے ایسی وجود پذیر ہو سکتی ہے جس کو معلول کا لقب دیا جاتا ہے، صلابت، امتداد، حرکت یہ چیزیں بجائے خود مستقل صفات اور ایسے واقعہ کا نشان نہیں دیتیں جس کو ان کا نتیجہ کہا جا سکے موجودات عالم میں ہر آن تغیر وتبدل جاری ہے، ایک چیز دوسری چیز کے بعد برابر آتی جاتی رہتی ہے لیکن وہ قوت وطاقت جو اس ساری مشین کو چلاتی رہتی ہے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے اور اجسام کی کسی محسوس صفت میں اپنا کوئی نشان نہیں رکھتی' ہم یہ واقعہ جانتے ہیں کہ آگ کے شعلہ میں گرمی پائی جاتی ہے لیکن ان دونوں (گرمی وشعلہ) میں کیا لزوم ہے اس کے قیاس سے ہمارا تخیل قطعاً عاجز ہے۔ [3]

اسی سلسلہ میں چند صفحات بعد کی ایک اور طویل عبارت [4] کا یہاں اقتباس مناسب ہے جس سے

---

[1] مل کی منطق کتاب سوم، باب ۲۱ فصل ۴، حاشیہ۔ [2] فہم انسانی باب ۷ فصل ۱، ص: ۷۰۔

[3] فہم انسانی باب ۱، ۷ فصل ۱۔ [4] ایضاً ص: ۷۷، ۷۸۔

آگے چل کر کام پڑے گا۔

"عام طور پر لوگوں کو فطرت کے پیش پا افتادہ اور مانوس واقعات وافعال کی توجیہ میں کوئی دشواری نہیں نظر آتی (مثلاً: بھاری چیزوں کا نیچے آ جانا، درختوں کی بالیدگی، حیوانات میں توالد وتناسل، یا غذا سے جسم کی پرورش وغیرہ کے واقعات) بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان صورتوں میں ان کو علت کی بذات خود اس قوت کا علم واحساس ہے جس کی بنا پر یہ اپنے معلول کو مستلزم ہے اور اس لیے ظہور معلول میں خطا کا امکان نہیں، بات یہ ہے کہ تجربہ یا عادت دراز کی وجہ سے ان کے ذہن میں ایک ایسا میلان ورجحان پیدا ہو جاتا ہے کہ علت کے سامنے آتے ہی اس نتیجہ کا یقین ہو جاتا ہے جو معمولاً اس کے ساتھ پایا گیا ہے اور یہ مشکل سے ممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سوا کوئی اور نتیجہ ظاہر ہو سکتا تھا، صرف اس صورت میں جب کہ غیر معمولی واقعات وحوادث ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً: زلزلہ، وبا یا کوئی اور عجیب وغریب بات، تو البتہ ان کی صحیح علت کا پتہ نہیں لگتا اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی توجیہ وتشریح کیسے کی جائے اس مشکل میں پڑ کر لوگ علی العموم کسی ان دیکھی صاحب عقل وارادہ ذات کے قائل ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ناقابل توجیہ ناگہانی واقعات اسی ذات کے پیدا کردہ ہیں لیکن فلاسفہ کی باریک بین نگاہ کو نظر آتا ہے کہ روزمرہ کے معمولی واقعات کی پیدا کرنے والی قوت بھی اسی طرح نامعلوم ناقابل توجیہ ہے جس طرح کہ انتہائی سے انتہائی غیر معمولی واقعات کی چنانچہ بہت سے فلاسفہ اپنی عقل کو اس پر مجبور پاتے ہیں کہ بلا استثنا تمام واقعات عالم کا مبدأ اسی ذات کو قرار دیں جس کی طرف عوام صرف معجزات اور فوق الفطرت واقعات وحوادث کے ظہور کو منسوب کرتے ہیں (ان کے نزدیک) ہر معلول کی واقعی و براہ راست علت فطرت کی کوئی قوت نہیں بلکہ ایک ہستی برتر کا ارادہ ہوتا ہے بلیرڈ کا ایک گیند جب دوسرے گیند سے ٹکراتا ہے تو خود خدا اپنے ارادۂ خاص سے اس کو متحرک کر دیتا ہے اور یہ ارادہ ان عام قوانین کے مطابق ہوتا ہے جو اس نے اپنی مشیت سے کائنات پر حکم فرمائی کے لیے مقرر کر دیئے ہیں۔"

جب یہ مسلّم ہو چکا کہ قوانینِ فطرت کی بنیاد تمام تر تجربہ پر ہے اور تجربہ کے ناقابل خط ہونے کا کبھی کسی حالت میں بھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا تو پھر ظاہر ہے کہ کسی شے کو خلافِ فطرت یا خارقِ عادت کہہ کر اس کو غلط یا ناممکن کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے، چنانچہ خود ہیوم کا اپنے اسی اصول پر دعویٰ ہے کہ "جس شے کا تصور ممکن ہے وہ کسی تناقض کو مستلزم نہیں ہو سکتی اور جو شے مستلزمِ تناقض نہ ہو اس کو کسی حجت و برہان یا عقلی دلیل سے غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا۔" [1]

---

[1] فہم انسانی، باب ۴، فصل ۱، ص: ۲۶، ۲۷۔

پروفیسر ہکسلے جو فلسفی سے زیادہ حکیم (Scientist) ہے اور جس کی جگہ حکما کی صفِ اول میں ہے اس نے ہیوم کے اس قول کو اپنی تحریروں میں جا بجا نقل کر کے اس کی نہایت شدت سے تائید کی ہے۔ خود ہیوم کے نظریہ معجزات پر بحث کرتے ہوئے [1] پہلے تو معجزہ کے متعلق اس کی تعریف کی تغلیط کی ہے کہ ''وہ نام ہے قوانین فطرت کے خرق کا'' اور بتلایا ہے کہ معجزات کے معنی زیادہ سے زیادہ ''انتہائی حیرت انگیز واقعات'' [2] کے ہو سکتے ہیں، پھر اسی ضمن میں ہیوم کے مذکورہ بالا قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ

''لیکن معجزہ کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ یہ کسی تناقض کو مستلزم نہیں ہے، لہٰذا خود ہیوم ہی کے دعویٰ کے مطابق معجزہ کو کسی برہانی دلیل سے غلط نہیں ثابت کیا جا سکتا۔'' بااین ہمہ ہیوم خود اپنے ہی اصول کے خلاف اور بالکل متناقض ایک دوسری جگہ لکھتا ہے کہ ''مردہ کا زندہ ہو جانا معجزہ ہے کیونکہ ایسا پہلے کبھی کسی زمانہ اور کسی ملک میں نہیں ہوا ہے۔''

اس ارتکاب تناقض کی تشریح کرتے ہوئے پروفیسر موصوف نے طنزاً لکھا ہے کہ اگر ہیوم کے استدلال کی مہلمیت کو برہنہ کر کے دیکھا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ جو چیز پہلے کبھی نہیں واقع ہوئی وہ آئندہ بغیر قوانین فطرت کے خرق کے واقع نہیں ہو سکتی۔''

ہکسلے کا ایک نہایت دلچسپ مضمون ''ممکنات و ناممکنات'' ہے، اس میں بھی ہیوم اس کے پیش نظر ہے اور اپنی حکیمانہ ذمہ داری کے پورے احساس و شعور کے ساتھ لکھتا ہے کہ [3]

''صحیح معنی میں بجز تناقض کے اور کسی بھی ایسی چیز سے میں واقف نہیں ہوں جس کو ''ناممکن'' کہنا حق بجانب ہو، منطقی ناممکنات کا وجود ہے لیکن طبعی ناممکنات کا قطعاً کوئی وجود نہیں ''مربع مدور، ماضی موجود، دو متوازی خطوط کا تقاطع'' یہ چیزیں ناممکنات سے ہیں، اس لیے کہ مدور موجود یا حاضر اور تقاطع کا تصور ہی مربع ماضی اور متوازی کے تصور کے متناقض ہے، لیکن پانی پر چلنا، یا پانی کو شراب بنا دینا، بچہ کے بے باپ پیدا ہونا، مردہ کو زندہ کر دینا، یہ چیزیں مفہوم بالا کی رو سے ناممکنات سے نہیں ہیں۔ ہاں اگر یہ دعویٰ کر سکتے کہ فطرت اشیاء کے متعلق ہمارے علم نے تمام ممکنات کا کامل احاطہ کر لیا ہے تو شاید یہ کہنا بجا ہوتا کہ آدمی کے صفات چونکہ پانی پر چلنے یا ہوا میں اڑنے کے متناقض ہیں اس لیے یہ افعال اس کے لیے ناممکن ہیں لیکن یہ حقیقت روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ علم فطرت کی انتہا تک پہنچنا کیسا؟ ابھی تک ہم اس کی ابتدا اور ابجد سے آگے نہیں بڑھے ہیں بلکہ ہماری قوتیں اس قدر محدود ہیں کہ کبھی بھی ہم ممکنات فطرت کی حد بندی نہیں کر سکتے جو کچھ واقع ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے، اس کا ہم کو علم ہے باقی جو کچھ واقع ہونے

[1] ہکسلے کی کتاب ''ہیوم'' باب ۷ (متعلق معجزات) [2] انگریزی میں معجزہ کے لیے جو لفظ مستعمل ہے (مرکیل) اس کے لفظی معنی بھی ''حیرت انگیز'' کے ہیں۔ [3] ''ہیوم'' ۸۔۱۹۷۔

والا ہے اس کی نسبت ہم صرف ایک توقع قائم کر سکتے ہیں، جس کی بنیاد کم و بیش گزشتہ تجربہ کے صحیح سمجھنے پر ہے، جس سے ہم کو خیال ہوتا ہے کہ مستقبل ماضی کے مماثل ہوگا۔"

اس میں شک نہیں کہ کچھ دن پہلے بعض گوشوں سے اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی تھیں، کہ کائنات کا ہر ذرہ قانون کا پابند ہے اور وہم و بے عقلی انسان کی بدترین دشمن ہے اور عقل و حکمت بہترین دوست ہے لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ جہاں کہیں عقیدۂ معجزات کا پتہ چلے اس پر حملہ کریں۔ [1]

لیکن یہ باتیں قریباً چوتھائی صدی قبل کی ہیں، [2] ۱۹۲۷ء کے بعد کوانٹم نظریہ کی بدولت سائنس میں جو بھونچال آیا ہے اس نے سائنس کی دنیا میں بھی اب ایسے بے باکانہ و مدعیانہ فقروں کی گنجائش نہیں چھوڑی، فلسفہ میں تو علت و معلول کے لزوم و وجوب کی بنیادوں کو ہیوم کیا، ہیوم سے صدیوں پہلے امام ابوالحسن اشعری ہی نے کھوکھلا کر دیا تھا، البتہ سائنس کی بنیاد ہی فطرت کی یکسانی یا علیت کے اٹل قانون پر رکھی اور سمجھی جاتی تھی، اس ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ خود سائنسی تجربات و اختبارات ہی کی راہ سے یہ اٹل قانون نہ صرف مجروح و متزلزل ہوگیا ہے، بلکہ سر آرتھر ایڈنگٹین جیسے اکابرِ سائنس کے نزدیک اس کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دینا پڑا ہے، چند سال قبل دنیا کے سائنس کے تازہ ترین معلومات و خیالات پر "ماڈرن بلیف" کے نام سے رسائل کا ایک سلسلہ شائع ہوا تھا، اسی کے جستہ جستہ یہ اقتباسات پڑھو:

"کوانٹم نظریہ نے بڑا زبردست انقلاب برپا کر دیا ہے کہ مادی دنیا میں اب تک علل و معلول کے قانون کی فرمانروائی کو اٹل تصور کیا جاتا تھا، سارے طبعی واقعات و حوادث بالکلیہ جبری یا وجوبی قوانین کے تابع یقین کیے جاتے تھے، سلسلۂ علل و معلولات میں کہیں کوئی خلل و رخنہ نہ تھا مگر ۲۷ء میں اس خیال و یقین کو سخت دھکا لگا اور ماہرین طبیعیات نے دیکھا کہ علیت کے وجوب و کلیت کو مادی دنیا سے رخصت کرنا پڑا اور سارے قرائن اسی کے نظر آتے ہیں کہ وجوبی یا قطعی علیت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا، ابھی بالکل حال تک قانون علیت کو سائنسی تحقیقات کا بالاتفاق بنیادی اصول قرار دیا جاتا تھا لیکن اب اسی اصول کو ترک کر دینے کا سوال پیدا ہوگیا ہے کہ آیا کارخانۂ فطرت میں ہر واقعہ لزوماً کسی ایسے دوسرے واقعہ ہی سے پیدا ہوتا ہے جس کو علیت کہا جاتا ہے؟ یا اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حوادث فطرت کی تہ میں کوئی ایسی شے کارفرما ہے جس کو اختیار یا آزادی ارادہ کہا جاتا ہے۔ ماحصل یہ کہ اس وقت تک طبعی مظاہر کی تحلیل کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ ہم کو کہیں بھی وجوبی یا جبری قانون کی موجودگی کی شہادت نہیں ملتی۔" [3]

---

[1] (Wonder of Life) عجائبات حیات) از ہیگل باب ۱۳ معجزات۔

[2] معجزات پر سیرت کا یہ ٹکڑا آج (۴۵ء) سے ۲۴ سال قبل لکھا گیا تھا۔ [3] بحوالہ جرنل آف فلاسفی بابت ۳۲ء۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ قوانینِ فطرت کا سرے سے کوئی وجود نہیں بلکہ ''ان'' کی حیثیت اعداد وشمار کے لیے قوانین کی رہ جاتی ہے، زندگی کا بیمہ کرنے والی کمپنیاں کوئی ایسا قانون نہیں جانتی ہیں کہ فلاں شخص چالیس برس کی عمر میں مرجائے گا لیکن اتنا جانتی ہیں کہ کسی بڑی جماعت میں اتنے فیصد آدمی چالیس کے سن میں مرجائیں گے یعنی افراد کا عمل ناقابل پیش بینی ہونے کے باوجود جماعت کی نسبت پیش بینی ممکن ہے بس قوانینِ فطرت فقط اسی معنی میں موجود ہیں اور سائنسی پیشین گوئی یا پیش بینی ہوسکتی ہے۔ ❶

بالفاظ دیگر قانون فطرت کی نوعیت دراصل قانون عادت کی ہے یعنی کسی خاص فرد کے بارے میں وجوباً پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی کہ وہ فلاں عمر میں مرجائے گا البتہ عادۃً یہ معلوم ہے کہ کسی بڑی جماعت میں اتنے فیصد چالیس سال کی عمر میں مرجائیں گے مذہب کی زبان میں اسی قانون عادت کو عادۃ اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی بناپر عمل فطرت کی یکسانی یا قوانین فطرت کے نفس وجود کا انکار نہیں لازم آتا البتہ ان قوانین کا منشا یہ ہے، بہرے، بے علم واختیار مادہ کا اٹل وجوب ولزوم سے نہیں۔ بلکہ ایک علم واختیار والی ذات (اللہ تعالیٰ) کی عادت جاریہ سے ہے جو کسی حکمت ومشیت کے تحت کبھی کبھی اس عادت جاریہ کے خلاف بھی کرسکتی اور کرتی ہے یہی معجزہ ہے اور بقول مشہور سائنس دان ڈاکٹر کارپنٹر کے کہ قائل مذہب سائنس دان کو اس کے ماننے میں کوئی عقلی دشواری نہیں پیش آسکتی کہ خالق فطرت اگر چاہے تو کبھی کبھی قوانین فطرت کے خلاف بھی کرسکتا ہے ہم کو معجزات کے خلاف اگر سائنس کے کسی ایسے فتویٰ کا علم نہیں جو معتبر شہادت کی موجودگی میں ان کے قبول کرنے سے مانع ہو۔ ❷

جب کارپنٹر کے زمانہ میں ہی سائنس کا کوئی ایسا فتویٰ معلوم نہ تھا تو اب کو ائٹم نظریہ کے بعد جب کہ کلام وفلسفہ کے نرے قیاسات سے گزرکر خود سائنس کی دنیا میں اور سائنس ہی کی راہ سے فطرت یا علیت کے نام نہاد اٹل قوانین کا وجود اتنا مشتبہ ہوگیا ہے کہ مادی دنیا سے بظاہر ان کو ہمیشہ کے لیے رخصت کرنا پڑ رہا ہے تو اور بھی سائنس کا یا قوانین فطرت کے خرق کا نام لے کر کسی معجزہ کا انکار کس منہ سے کیا جاسکتا ہے لہٰذا بقول کارپنٹر ہی کے اصل سوال صرف یہ ہے کہ آیا اس قسم کی تاریخی شہادت موجود ہے یا نہیں جس سے معلوم ہو کہ خالق فطرت کبھی کبھی خلاف فطرت بھی کردیا کرتا ہے۔'' ❸

یہ صرف ممکن ہی نہیں ہے کہ خالق فطرت اگر چاہے تو کبھی کبھی قوانین فطرت کے خلاف کرسکتا ہے یعنی معمولی سلسلۂ علل واسباب ومعلولات کو توڑ سکتا ہے بلکہ ایک اور نامور عالم طبعیات پروفیسر ڈالبیر ❹ کا اعتراف یہ ہے کہ اس امر کی ہمارے پاس خاصی شہادت موجود ہے جس کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا

❶ پورا نام (Out Line of Modern Belief) ہے، مرتبہ جے ڈبلیوان سولیوان (Sulivan) واٹر گریرسن (Grierson) حصہ چہارم، باب ٦، صفحہ: ٢٨۔ ❷ دیکھو فرانک بیلارڈ کی (The Miracle of unbelife)
❸ ایضاً۔ ❹ دیکھو اس کی کتاب Metter, Either, Notion (مادہ، ایتھر، حرکت)۔

کہ بعض طبعی حوادث اس طرح وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ ان کے تمام معمولی علل واسباب غائب ہوتے ہیں اجسام حرکت کرتے ہیں اور درانحالیکہ نہ کوئی شخص ان کو چھورہا ہے اور نہ برقی یا مقناطیسی عوامل کا پتا ہے اس کی بھی شہادت موجود ہے کہ ایک نفس کا خیال دوسرے نفس میں (بلا کسی وساطت کے) پہنچ سکتا ہے اور جس قسم کے واقعات کو معجزہ سمجھا جاتا تھا ان کا وقوع اب غیر اغلب نہیں رہا ہے۔ ہکسلے کو اگرچہ اس بارے میں ہیوم سے شدید اختلاف ہے کہ معجزہ نام قوانین فطرت کے خرق کا ہے۔ لیکن تصریحات بالا سے قانون فطرت کی جو حقیقت ثابت ہوتی ہے اس کو اگر وضاحت کے ساتھ سامنے رکھا جائے تو ہمارے نزدیک معجزہ کی یہ تعریف چنداں قابل اعتراض نہیں رہ جاتی۔

① قوانینِ فطرت عبارت ہیں قوانینِ عادت سے۔

② جو ہم کو بذاتِ خود اشیاء کے اندر معلوم نہیں بلکہ ان کی بنیاد تمام تر گزشتہ تجربہ پر ہوتی ہے جس کے خلاف ہونا ہمیشہ ممکن ہے اور کسی اصلی استحالہ کو مستلزم نہیں۔

③ لہٰذا قوانین فطرت کے خلاف ہونا (یعنی ان کا خرق) بذاتِ خود ممکن، عقلاً جائز ہے بہ الفاظ دیگر کہ معجزہ عقلاً بالکل جائز و ممکن ہے۔

شہادتِ معجزات

امکان، وقوع کے لیے کافی نہیں

لیکن کسی امر کا صرف عقلاً جائز و ممکن ہونا اس کے وقوع کی دلیل نہیں، یہ عقلاً بالکل جائز و ممکن تھا کہ اکبر ہندوستان کے ساتھ انگلستان کا بھی بادشاہ ہوتا، مگر واقعتاً ایسا نہیں، کسی شے کے وقوع کو قبول کرنے کے لیے دو صورتیں ہیں: (۱) غیر مشتبہ مشاہدہ یا (۲) تشفی بخش شہادت، غیر مشتبہ مشاہدہ کی صورت میں کوئی شے بحث طلب نہیں رہ جاتی، مثلاً:

> ’’آنحضرت ﷺ نے ایک سفر میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے وضو کا پانی طلب فرمایا، انہوں نے قافلہ میں بہت ڈھونڈا پانی نہیں ملا، انصار میں ایک شخص تھے، جو خاص طور پر آپ کے لیے پانی ٹھنڈا کر کے رکھتے تھے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آپ کی خدمت میں پانی نہ ملنے کی اطلاع کی تو آپ نے ان کو ان انصاری کے پاس بھیجا لیکن ان کے پاس بھی اس قدر کم پانی نکلا کہ اگر انڈیلا جاتا تو برتن کے خشک حصہ ہی میں جذب ہو کر رہ جاتا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کو اس کی خبر دی تو آپ نے اس برتن کو منگا بھیجا اور ہاتھ میں لے کر کچھ پڑھا اور اس کو ہاتھ سے دبا دیا پھر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو برتن دیا اور طشت طلب فرمایا، آپ نے ہاتھ کی انگلیاں پھیلائیں اور اس طشت کے اندر رکھ کر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ

بسم اللہ کہہ کر آپ کے ہاتھ پر پانی گرائیں ، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے پانی ڈالنا شروع کیا پہلے آپ کی انگلیوں کے درمیان سے پانی اُمڈا پھر تمام طشت بھر گیا یہاں تک کہ سب لوگ پانی پی کر سیراب ہوگئے اس کے بعد آپ نے اس کے اندر سے ہاتھ نکال لیا تو طشت بھرا کا بھرارہ گیا۔'' 1

اب اگر حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کو بچشم خود مشاہدہ کیا اور ان کو اس میں کسی قسم کا کوئی اشتباہ نہیں تھا تو ظاہر ہے کہ ان کو اس کے یقین وقبول کرنے میں کیا تامل ہوسکتا تھا، البتہ ہمارے لیے اس کے باور کرنے میں یہ بحث پیدا ہوسکتی ہے کہ یہ واقعہ فی نفسہٖ ممکن ہے یا ناممکن اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی شہادت کہاں تک قابل اعتبار ہوسکتی ہے۔ لہٰذا امکان معجزات کا مرحلہ طے ہو چکنے کے بعد دوسری بحث شہادت معجزات کی پیدا ہوتی ہے۔

ہیوم کا فتویٰ

ہیوم کا روایاتِ معجزہ کے متعلق اگرچہ آخری فتویٰ یہی ہے کہ اس کے اثبات کے لیے انسانی شہادت کی کوئی کمیت وکیفیت نہیں کافی ہوسکتی ، تاہم نفس خارق فطرت وواقعات کے لیے اس کے نزدیک بھی انسانی شہادت کا ایک درجہ ایسا موجود ہے جس کی بنا پر ان کو قبول کیا جاسکتا ہے۔

''فرض کرو کہ تمام زبانوں کے تمام مصنفین اس پر متفق ہوں کہ یکم جنوری ۱۶۰۰ء سے لے کر آٹھ دن تک برابر تمام روئے زمین پر تاریکی چھائی رہی یہ بھی فرض کرو کہ اس خارقِ عادت واقعہ کی روایت آج تک لوگوں کی زبان پر ہے اور دوسرے ممالک سے جو سیاح آتے ہیں وہ بے کم وکاست اور بلاشائبہ تناقض وہاں کے لوگوں کے یہی روایت بیان کرتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہمارے زمانہ کے حکما کا کام شک کے بجائے اس واقعہ کا یقین کرکے اس کی توجیہ اور اس کے علل واسباب کی جستجو ہوگی کائنات فطرت میں زور وانحطاط ، فنا وفساد کی مثالیں اس کثرت سے ملتی ہیں کہ اگر کسی حادثہ سے اس کی تباہی کے آثار پائے جائیں تو اس کے بارے میں انسانی شہادت قابل قبول ہوگی بشرطیکہ یہ نہایت وسیع ، متواتر اور متفق علیہ ہو۔'' 2

ہیوم کا تعصب

اب اگر یہی واقعہ کسی نبی کی طرف منسوب کرکے معجزہ قرار دیا جائے تو ہیوم کے نزدیک اس پر یقین کرنے کے لیے کوئی انسانی شہادت قابل قبول نہ ہوگی ، کیوں؟ اس لیے کہ ''اس قسم کی شہادت خود اپنی تکذیب ہے۔'' حتی کہ ''جس معجزہ کی بنا کسی انسانی شہادت پر ہو، وہ حجت واستدلال کے بجائے محض تمسخر انگیز چیز

1 دیکھو کتاب ھذا بیان عام معجزات (صحیح مسلم ، کتاب الزھد ، باب حدیث جابر الطویل ...... : ۷۵۱۹)۔

2 فھم انسانی ، باب ۱ ، ص: ۱۴۶۔

ہے۔ ''مذہب کے نام سے لوگ ہمیشہ مضحک وخرافات افسانوں کے دام میں آ جاتے ہیں لہٰذا مذہب کی طرف نفس انتساب ہی معجزہ کے حیلہ وفریب ہونے کا پورا ثبوت ہے۔ مذہب جیسی مقدس شے کی تائید میں لوگ بے ضرر کذب وافترا سے باک نہیں کرتے، پیمبر (معاذ اللہ) عزت پیمبری کے شوق میں ہر طرح کے خطرات کو گوارا کرسکتا ہے، مکر واحتیال پر آمادہ ہوسکتا ہے۔ انسان زود اعتقاد اور بالطبع عجائب پسند ہے، معجزات کا قبول عام اور بہ آسانی شائع وذائع ہو جانا خود اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ انسان میں عجائب پرستی کا کیسا شدید میلان ہے اور اس لیے عجائب پرستی کے تمام بیانات کو بجا طور پر اشتباہ کی نگاہ سے دیکھا جاسکتا ہے پھر معجزات اور فوق الفطرت باتوں کے خلاف ایک ہی قوی قرینہ یہ ہے کہ ان کا اعتقاد زیادہ تر جاہل اور وحشی اقوام میں پایا جاتا ہے۔ ایک عقل مند آدمی پرانے زمانے کی حیرت زا تاریخوں کو پڑھ کر پکار اٹھتا ہے کہ عجیب بات ہے کہ اس قسم کے خارقِ عادت واقعات ہمارے زمانہ میں ظاہر نہیں ہوتے انہی وجوہ کی بنا پر دعویٰ ہے کہ مذہب کے نام سے جتنے معجزات بیان کیے جاتے ہیں وہ سب کے سب محض خرافات اور انسان کی اوہام پرست فطرت کا ڈھکوسلا ہیں۔ [1]

بلاشبہ شہادت کی جرح وتعدیل اور تحقیق وتنقیح کے وقت یہ تمام امور قابل لحاظ ہیں لیکن کیا ان میں سے کوئی ایک شے بھی ایسی ہے جس کی بنا پر محض معجزہ یا مذہب کے نام آتے ہی ہیوم کا یہ ایسا نا قابلِ حمایت اور صریح تعصب تھا جس کے لیے صدائے تائید حکمت وفلسفہ کے سنجیدہ حلقوں سے نہیں اٹھ سکتی تھی اور اگر کسی معجزہ کی تصدیق تشفی بخش شہادت موجود ہو تو اس کے قبول سے محض معجزہ ہونے کی بنا پر کسی عاقل کو انکار نہیں ہوسکتا۔ مثلاً: ایک سفر میں ''صحابہ رضی اللہ عنہم بھوک سے اس قدر بے تاب ہوئے کہ اونٹنیاں ذبح کرنی چاہیں لیکن آپ ﷺ نے ان تمام لوگوں کے زادراہ کے جمع کرنے کا حکم دیا، ایک چادر بچھائی اور اس پر تمام زادراہ ڈھیر کیا گیا، اس تمام سامان کی مجموعی تعداد نے صرف اس قدر زمین کا احاطہ کیا جس پر ایک بکری بیٹھ سکتی تھی اور اشخاص کی تعداد چودہ سو تھی لیکن تمام لوگوں نے سیر ہو کر کھالیا اور اپنے اپنے توشہ دان بھر لیے۔'' [2]

کافی شہادت

اب اس روایت میں اگر ان امور کی کافی شہادت مل جائے کہ (۱) تمام زادراہ صرف ایک بکری کے بیٹھنے بھر کی جگہ میں آ گیا تھا (۲) اشخاص کی تعداد چودہ سو تھی (۳) سب لوگوں نے سیر ہو کر کھالیا (۴) اور اپنے اپنے توشہ دان بھر لیے تو ہکسلے جیسے حکیم وفلسفی تک کو اس روایت کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ چنانچہ اسی نوعیت کا ایک معجزہ حضرت مسیح علیہ السلام کا انجیل میں مذکور ہے کہ پانچ روٹیوں اور مچھلیوں سے پانچ ہزار

---

[1] یہ تمام قریب قریب ہیوم ہی کے الفاظ ہیں جو تم کو اس کے مضمون ''معجزات'' میں جا بجا ملیں گے۔ [2] دیکھو کتاب ہذا بیان عام معجزات۔ صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب استحباب خلط الازواد اذا قلت، والمواساة فيها:٤٥١٨۔

آدمیوں کا پیٹ بھر گیا اور پھر بھی اتنے ٹکڑے بچ رہے جن کو جمع کرنے سے بارہ ٹوکریاں بھر گئیں [1] لیکن اس معجزہ کے باور کرنے میں روایتاً و درایتاً جو دشواریاں نظر آتی ہیں ان کو پوری طرح واضح کرنے کے بعد ہکسلے نے لکھا ہے کہ

''اگر یہ ثابت کیا جائے کہ (۱) کھانا شروع کرتے وقت روٹیوں اور مچھلیوں کا وزن کیا گیا تھا (۲) پانچ ہزار آدمیوں میں یہ تقسیم کی گئیں بلا اس کے کہ ان کی کمیت یا کیفیت میں کوئی اضافہ ہوا ہو (۳) تمام آدمی واقعتاً پوری طرح آسودہ ہو گئے (۴) اور اس کے بعد ٹوکریوں میں جو ٹکڑے جمع کیے گئے، ان کا وزن کیا گیا تھا تو پھر ممکنات و ناممکنات کے بارہ میں میرے موجودہ خیالات کچھ ہی ہوں لیکن مذکورہ بالا چار چیزوں کی تشفی بخش شہادت کے بعد مجھ کو ماننا پڑے گا کہ پچھلے خیالات غلط تھے اور اس معجزہ کو ممکنات فطرت کی ایک نئی اور خلاف توقع مثال سمجھوں گا۔'' [2]

غرض معجزہ نہ صرف فی نفسہ ایک ممکن الوقوع شے ہے بلکہ ''تشفی بخش شہادت'' کی بنا پر اس کے وقوع کا یقین بھی کیا جا سکتا ہے اس کے بعد یہ بحث رہ جاتی ہے کہ آیا مذہبی یا تاریخی کتابوں میں جو معجزات مذکور ہیں ان کے یقین کرنے کے لیے ''تشفی بخش'' شہادت موجود ہے؟ اس سوال کا جواب ہیوم کو تو نفی میں دینا ہی چاہیے تھا لیکن یہاں پہنچ کر ہکسلے بھی سپر افگندہ ہو جاتا ہے اور ہیوم کے جواب سے لفظاً و معناً کامل طور پر اتفاق کر لیتا ہے۔ [3]

''یہ سچ ہے کہ معجزات کے ناممکن ہونے کا دعویٰ نہیں ثابت کیا جا سکتا لیکن مجھ کو کوئی ایسی شے قطعاً نہیں معلوم جس کی بنا پر میں ہیوم کے اس وزنی فتویٰ میں کچھ ترمیم کر سکوں کہ تاریخ کے سارے دفتر میں ایک بھی ایسا معجزہ نہیں ملتا جس کی تصدیق و تائید میں ایسے فہمیدہ، باہوش اور تعلیم یافتہ لوگوں کی کافی تعداد موجود ہو جن کے خود فریب مغالطہ میں پڑنے کا ہم کو اندیشہ نہ ہو جن کی راست بازی اس درجہ غیر مشتبہ ہو کہ کسی مصلحت کی بنا پر دوسروں کو فریب دہی کا ان پر گمان نہ ہو سکے جو لوگوں کی نگاہ میں ایسی عزت و شہرت رکھتے ہوں کہ اگر ان کا جھوٹ کھل جائے تو ساری عزت خاک میں مل جائے ساتھ ہی جن واقعات کی وہ روایت یا تصدیق کر رہے ہیں وہ ایسے علی الاعلان طریقے سے اور ایسے مشہور مقام پر واقع ہوئے ہوں کہ ان کی نسبت دروغ بیانی چھپ ہی نہ سکے حالانکہ انسانی شہادت کو قطعی بنانے کے لیے یہ تمام باتیں ضروری ہیں۔''

ہیوم نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ قبول معجزات کے لیے جس درجہ کی شہادت درکار ہے اس کا تاریخ کے دفتر

[1] یوحنا باب ٦، آیت: ٥-١٤۔ [2] مقالات ہکسلے، ج ٥، ص: ٢٠٣۔
[3] مقالات ہکسلے، ج ٢، ص: ٢٠٧۔

میں کہیں پتہ نہیں لیکن معجزات کے عدم قبول کی کیا واقعتاً یہی وجہ ہے؟ اور کیا اس نے اپنے اس دعویٰ کی چند ہی صفحات آگے بڑھ کر خود تردید نہیں کر دی ہے؟ فرانس میں کوئی مشہور درگاہ ہے جس کے تقدس پر بقول ہیوم لوگ مدتوں فریفتہ رہے ہیں۔

''بہروں کو سماعت، اندھوں کو بصارت مل جانا اور بیماروں کا اچھا ہو جانا اس مقدس درگاہ کی معمولی کرامتیں تھیں جن کا ہر گلی کوچے میں چرچا رہتا تھا لیکن سب سے حیرت انگیز اور غیر معمولی بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سی کرامتیں ایسے اشخاص کو حکم یا ثالث بنا کر ان کے رو برو ثابت کر کے دکھائی گئی ہیں جن کی دیانت پر حرف رکھنا ناممکن ہے پھر ان پر ایسے گواہوں کی مہر تصدیق ثبت ہے جن کی شہرت وسند مسلّم ہے، جس زمانہ میں ان کرامتوں کا ظہور ہوا وہ علم کا زمانہ ہے اور جگہ بھی ایسی جو دنیا کا مشہور ترین خطہ ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ یہ کرامتیں چھاپ چھاپ کر ہر جگہ شائع کی گئیں با ایں ہمہ یسوعی فرقہ تک کو ان کی تکذیب یا پردہ دری کی مجال نہ ہوئی، حالانکہ یہ لوگ خود اہل علم تھے، مجسٹریٹ ان کی حمایت پر تھا اور ان خیالات کے جانی دشمن تھے، جن کی تائید میں یہ معجزات پیش کیے جاتے تھے، اب یہ بتاؤ کہ کسی امر کی توثیق و تصدیق کے لیے اتنی تعداد میں موافق حالات ہم کو کہاں میسر آ سکتے ہیں اور ان دل بادل شہادتوں کے خلاف ہمارے پاس بجز اس کے اور کیا دلیل ہے کہ یہ واقعات بذات خود قطعاً ناممکن اور سراسر خارق فطرت ہیں اور معقول پسند آدمیوں کی نگاہ میں ان کی تردید کے لیے بس یہی ایک دلیل کافی ہے۔'' [1] (اللّٰھم احفظنا من شرور انفسنا)

ہیوم کا صریح تناقض

ایک ہی مضمون کے اندر ایسے زبردست فلسفی کی ایسی صریح تناقض بیانی جس قدر حیرت افزا ہے اس سے کہیں زیادہ عبرت انگیز ہے، بات یہ ہے کہ انسان کا یقین ہمیشہ اس کی منطق کا ساتھ نہیں دیتا۔ جبریہ اس کے قائل ہیں کہ انسان اپنے افعال میں مجبور محض ہے اور اس دعویٰ پر انہوں نے اٹل سے اٹل دلائل قائم کر دیے ہیں، تاہم دیکھو کہ ۲۴ گھنٹے کی زندگی میں وہ خود کتنے لمحے ان دلائل کی بنا پر اپنے کو مجبور محض یقین کرتے ہیں، ہیوم کے دلائل فلسفہ نے بے شک یہ ثابت کر دیا کہ ''معجزہ فی نفسہٖ ناممکن نہیں لیکن پھر بھی دل سے یہ کھٹک نہیں نکلتی کہ یہ واقعات (معجزات) بذات خود ناممکن اور سراسر خارق عادت ہیں۔'' اور ان کی تردید کے لیے بس یہی ایک دلیل کافی ہے، فرانس کی درگاہ کے متعلق جو کرامتیں مشہور ہیں ان کی توثیق و تصدیق کے لیے اسی درجہ کی شہادت اس کو مل گئی جس کا چند صفحہ پہلے اس کے نزدیک تاریخ کے سارے دفتر

[1] فہم انسانی، باب ۱۰، فصل ۲، ص:۱٤۲، قابل توجہ فقرات کو زیر خط میں مؤلف ہذا نے کیا ہے۔

میں وجود نہ تھا لیکن پھر بھی ان کرامتوں سے قطعی انکار ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ معجزات کا یقین کرانے کے لیے کسی معجزہ یا کرامت کی تائید میں صرف ممکن سے ممکن انسانی شہادت کا مہیا کر دینا کافی نہیں ہے بلکہ پہلے اس کے عدم امکان کا وسوسہ پوری طرح ذہن سے نکالنا چاہیے اور پھر خود یقین کی ماہیت واسباب پر بحث کرنی چاہیے۔

انتہائی استبعاد

اوپر اگرچہ ہم نے ہیوم کی اس تعریف میں چنداں مضائقہ نہیں خیال کیا تھا کہ معجزات نام ہے خارق فطرت واقعات کا، لیکن تم نے اقتباس بالا کے آخری زیر خط جملہ میں دیکھ لیا کہ ''خارق'' کا لفظ کس قدر گمراہ کن ہے، خود ہیوم ہی کے فلسفہ کی رو سے معجزات کا بالذات ممکن ہونا قطعی طور پر محقق ہو چکا ہے، پھر بھی اس کی زبان قلم اس لغزش سے اپنے کو نہیں بچا سکتی کہ واقعات (معجزات) بذات خود قطعاً ناممکن اور سراسر خارق فطرت ہیں۔ اصل یہ ہے کہ نفسی ائتلافات کی بنا پر ہمارے ذہن میں یہ غلط خیال بے طرح جاگزیں ہو چکا ہے کہ فطرت یا قانون فطرت ایک اٹل اور ناممکن التغیر شے ہے، اس لیے کسی واقعہ کو خارق فطرت کہتے ہی اس کے ناممکن ہونے کا تصور ذہن پر مسلط ہو جاتا ہے۔

لہٰذا جب یہ مختتم طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ خود معجزہ کی ذات میں عدم امکان داخل نہیں ہے بلکہ ''تشفی بخش شہادت'' کی موجودگی میں اس کا یقین کیا جا سکتا ہے تو اس کو ''خارق فطرت'' کی گمراہ کن تعبیر کے بجائے بکسلے کے الفاظ میں زیادہ سے زیادہ انتہائی حیرت انگیز واقعہ کہا جا سکتا ہے لیکن انتہائی حیرت انگیز سے بھی مناسب تر تعبیر انتہائی مستبعد کی ہوگی۔

استبعادِ معجزات

فطرت کی یکسانی

ایک عام خیال جو اس ''حیرت انگیزی'' میں اضافہ کرتا ہے، یہ ہے کہ کارخانہ فطرت کے تمام پرزے ہمیشہ اور ہر حالت میں یکساں ہی نتائج پیدا کرتے ہیں، حکما جب تک فطرت کی یک رنگی پر زور دیتے ہیں تو اسی مغالطہ میں مبتلا نظر آتے ہیں حتی کہ مل کو اپنی ''منطق'' [1] میں اس خیال کی تردید کرنی پڑی کہ فطرت کی کارفرمائی ہمیشہ یکسانی پر مبنی ہوتی ہے، ہم خود غور کریں تو کچھ نہ کچھ مثالیں ایسی سامنے آتی رہتی ہیں جن سے یہ مغالطہ دور ہو جانا چاہیے ابھی آج ہی اخبار پڑھتے وقت اس قسم کے دو واقعے نظر پڑے۔ [2]

عورتوں کے علی العموم بہ وقتِ واحد ایک لڑکا ہوتا ہے یا کبھی کبھی دو لیکن حال میں میکسکو (امریکہ) میں ایک عورت کے ایک ساتھ آٹھ لڑکے پیدا ہوئے۔ ایک دوست سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو اس نے کہا: کچھ

[1] نظام منطق کتاب ۳، باب: ۳۔ [2] یہ دونوں واقعے آج ۲۷ فروری ۱۹۲۲ء کے لیڈر میں مذکور ہیں۔

عرصہ ہوا کہ برہما میں ایک عورت کے چھ لڑکے ہونے کی خبر شائع ہوئی تھی۔ طبعی دنیا کا عام تجربہ ہے کہ جب خون کی حرارت ۱۰۷ یا ۱۰۸ درجے پر پہنچ جاتی ہے تو آدمی نہیں بچتا لیکن برسٹل میں انفلوائنزا کی مریض ایک لڑکی کا بخار ۱۱۴ درجے تک پہنچ گیا، پھر بھی وہ اچھی ہوگئی اور زندہ ہے خود حیرت زدہ ڈاکٹر کی شہادت ہے کہ

''جب وہ پہلی دفعہ اس لڑکی کو دیکھنے کے لیے بلایا گیا تو اس کی حرارت ۱۱۲ نکلی، خیال ہوا کہ تھرمامیٹر میں کچھ نقص ہے، دوسرا تھرمامیٹر منگا کر لگایا تو پھر وہی ۱۱۲۔ ڈاکٹر کو اب بھی یقین نہ آیا اس نے دو تھرمامیٹر اور منگوائے، بالآخر یقین کرنا پڑا کچھ علاج سے بخار اپنی معتدل حالت پر آ گیا لیکن رات کو پھر بڑھ گیا اور دوسرے دن صبح کو جب ڈاکٹر نے دیکھا تو ۱۱۴ تھا، حیرت کی انتہا نہ رہی، بہرحال علاج سے فائدہ ہوا اور اب مریضہ خاصی روبصحت ہے۔''

تریکون متی (ٹرگنامیٹری) یا ''مساحۃ المثلثات'' وغیرہ ریاضیات عالیہ کی وہ شاخیں ہیں جن کی کالجوں میں ریاضیات کے اعلیٰ مدارج میں تعلیم دی جاتی ہے۔ ۱۰، ۱۱ برس کے بچے جو علی العموم زیادہ سے زیادہ اسکول کی چوتھی پانچویں جماعت میں پڑھتے ہیں، ان کی ریاضی دانی بس حساب کے چند ابتدائی قواعد تک محدود ہوتی ہے جو لڑکے غیر معمولی طور پر ذہین ومحنتی اور جن کی تعلیم کا گھر پر معلم رکھ کر کچھ خاص اہتمام کیا جاتا ہے وہ بہت ترقی کرتے ہیں تو ۱۳۔۱۴ برس کی عمر میں اسکول کی تعلیم پوری کر پاتے ہیں۔

لیکن گزشتہ سال اکتوبر میں (۱۷ کا تار۔ لیڈر) راج نرائن نامی ۱۱ برس کے ایک مدراسی لڑکے کا معجزہ ریاضیات اسی عنوان سے) یہ چھپا تھا کہ اس نے بلاکسی علم کی مدد کے اعلیٰ الجبراء، تریکون متی، تحلیلی، اقلیدس (جامیٹری) وغیرہ از خود حاصل کی ہے۔

ولادت مسیح علیہ السلام (بے باپ کے) یا احیائے موتی سے بڑھ کر کس شے میں انتہائی استبعاد یا اعجاز ہوسکتا ہے لیکن سائنس کی تحقیقات نے (جس کے نزدیک انسان کی حقیقت حیوان عالم سے زیادہ نہیں) حیوانات ہی کے اندر اس کے نظائر بھی تلاش کر لیے، چنانچہ ہکسلے جیسے سائنس دان نے معجزات ہی کے ضمن میں لکھا ہے کہ

''رہا مریم علیہا السلام کے کنوار پن میں مسیح علیہ السلام کا پیدا ہونا، تو یہ نہ صرف ممکن التصور شے ہے بلکہ علم الحیات کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ بعض اصناف حیوانات میں یہ روزانہ کا واقعہ ہے، یہی حال احیائے موتی کا ہے، بعض جانور مر کر مومیات کی طرح بالکل خشک ہو جاتے ہیں اور عرصہ تک اسی حالت میں رہتے ہیں لیکن جب ان کو مناسب حالات میں رکھ دیا جاتا ہے۔ تو پھر جان آ جاتی ہے۔'' [1]

---

[1] مقالات ہکسلے، ج ۵، ص: ۱۹۹۔

ایجادات سائنس

یہ تو سائنس کا علمی و تحقیقی پہلو تھا، ایجادی و اختراعی پہلو نے بھی اس سے کم ''انتہائی حیرت انگیز'' اعجاز نمائیاں نہیں کی ہیں۔ لاسلکی ذریعہ پیغام رسانی کی ایجاد سے پہلے یہ کس قدر مستبعد بلکہ ایک حد تک ناقابل تصور بات تھی کہ آپ بمبئی میں بیٹھے ہیں اور آپ کا دوست لندن میں، اور درمیان میں ہزار ہا میل سمندروں کی پنہائی حائل ہے، تار وغیرہ کوئی محسوس شے آپ دونوں کے مابین رابطہ نہیں پھر بھی چشم زدن میں آپ اس کو اپنا پیغام پہنچا دے سکتے ہیں ایک منٹ میں ۶۰ سیکنڈ ہوتے ہیں ایک سیکنڈ کے بھی ۱۶ حصے کیجئے اور اس سولہویں حصہ میں یہ پیام ۱۲ ہزار میل سے زائد کی مسافت طے کر سکتا ہے۔ [1]

حیرت پر حیرت یہ ہے کہ آپ صرف پیغام ہی نہیں پہنچا سکتے ہیں بلکہ حال میں ایک فرانسیسی سائنس دان نے اس معجزہ کا دعویٰ کیا ہے کہ بمبئی میں اپنے میز پر بیٹھے بیٹھے آپ اسی لاسلکی کے ذریعہ سے لندن، پیرس، یا نیویارک میں چیک پر اپنے دستخط ثبت کر سکتے ہیں قریب قریب یعنی سینکڑوں میل، کے مقامات پر اس کے کامیاب تجربات ہو چکے ہیں۔ [2]

تنویم

طبیعات کے ان کرشموں کو دیکھ چکنے کے بعد اب ذرا نفسیات کے اس شعبہ کی تحقیقات کو سامنے لایئے جس کا نام ہپناٹزم ہے، عربی میں اس کو تنویم مقناطیسی کہتے ہیں لیکن ہم صرف تنویم یا عمل تنویم سے تعبیر کریں گے اس عمل کی کرامات ہمارے زمانہ میں ایک نہایت بلند پایہ محقق نفسیات پروفیسر ولیم جیمس کے الفاظ میں یہ ہیں:

> ''عامل تنویم اپنے معمول سے جو کچھ بھی کہتا ہے اس کو وہ یقین کر لیتا ہے اور جس چیز کا حکم کرتا ہے اس کو بجا لاتا ہے حتیٰ کہ جو چیزیں معمولی حالت میں آدمی کے اختیار سے باہر ہوتی ہیں وہ بھی عامل کے حکم سے واقع ہو سکتی ہیں۔ مثلاً: چھینک، چہرے کا سرخ یا زرد پڑ جانا، حرارت خون کا کم یا زیادہ ہو جانا، حرکت قلب میں تیزی یا سستی پیدا ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔''
>
> تم معمول کو یقین دلا سکتے ہو کہ وہ یخ ہوا جا رہا ہے یا آگ میں جلا جا رہا ہے، تم اس کو آلو کھلاؤ لیکن یہ یقین دلا سکتے ہو کہ شفتالو کھا رہا ہے، تم اس کو سرکہ پلا کر یقین دلا سکتے ہو کہ شراب پی رہا ہے نوشادر میں اس کو کالونگی کی بو محسوس ہو سکتی ہے کرسی اس کو شیر نظر آ سکتی ہے، جھاڑو اس کے لیے خوبصورت عورت بن سکتی ہے، راستہ کا شور اس کو موسیقی معلوم ہو سکتا ہے، جوان آدمی اپنے کو بچہ، یا نپولین عظیم سمجھنے لگ سکتا ہے۔ سر یا دانتوں کا درد دور کر دیا جا سکتا ہے۔ وجع مفاصل

[1] معارف ج ۱۰، عدد ۲، اگست: ۱۹۲۲ء۔ [2] انڈین ریویو بابت جنوری ۱۹۲۳ء صفحہ ۷۷۔

وغیرہ کے مریض کو اچھا کیا جا سکتا ہے۔ بھوک فنا کر دی جا سکتی ہے، یہاں تک کہ ایک شخص نے ۱۴ دن تک کھانا نہیں کھایا جس چیز سے تم چاہو اسی چیز سے معمول بہرا یا اندھا ہو سکتا ہے، مثلاً: فلاں لفظ وہ نہ سنے لاکھ اس کے سامنے چیخو نہ سنے گا یا فلاں آدمی کو وہ نہ دیکھے اس کے سامنے کھڑا کر دو وہ نہ دیکھ سکے گا۔'' ❶

اس عمل کے وقت معمول پر ایک نیند کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اس لیے اس کا نام تنویم ہے لیکن عمل کا اثر اس کیفیت کے بعد بھی قائم رہ سکتا ہے، مثلاً: جس مرض کے لیے تم عمل کرو وہ ہمیشہ کے لیے دور ہو سکتا ہے یا فرض کرو کہ معمول سے تم یہ کہہ دو کہ آئندہ سال جنوری کی ۲۰ تاریخ کو صبح ۹ بجے اپنے پلنگ کے پاس ایک شیر کھڑا دیکھو گے، سال بھر کے بعد ٹھیک اسی وقت پلنگ کے پاس معمول کو شیر دکھائی دے گا۔ گو عمل تنویم کے تجربات زیادہ تر نیند کی کیفیت طاری ہونے کے بعد کیے جاتے ہیں لیکن اس کیفیت کا نمایاں طور پر طاری ہونا کامیابی عمل کے لیے لازمی شرائط میں نہیں ہے بلکہ ڈاکٹر مول کا خیال تو یہ ہے کہ ایسے معمول نسبتاً کم ہوتے ہیں جن پر کیفیت نوم طاری ہوتی ہو ❷ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس عمل کا اثر افراد ہی تک محدود نہیں بلکہ جماعتوں اور مجمعوں کو بھی متاثر کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر البرٹ مول کا بھی نام لیا جا چکا ہے، اس جرمن فاضل کی کتاب ''ہپناٹزم'' اپنے موضوع پر سب سے بہتر نہایت محققانہ اور مستند خیال کی جاتی ہے، ڈاکٹر موصوف نے اس کتاب میں دکھلایا ہے کہ بہت سے معجزات کی توجیہ نہایت آسانی کے ساتھ تنویم مقناطیسی سے کی جا سکتی ہے، معجزات ہی پر کیا موقوف ہے، سحر وعلمیات تک کے صدہا عجائب کے گرہ کھل جاتی ہے اور جن واقعات پر عقلا نے اوہام واباطیل کی مہر ثبت کر دی تھی وہ قوانین مادی کی طرح قوانین نفسی کے حقائق بن گئے ہیں۔

معجزاتِ شفا

بہت سے معجزات وکرامات کا تعلق امراض کی ایسی شفا سے ہے جو طب کے مادی وسائل علاج پر مبنی نہیں اور اس کے لیے مدعیان عقل کے ہاں اس کا نام ''وہم پرستی'' تھا لیکن آج تنویمی تحقیقات نے ایک نیا اور نہایت کامیاب اصول علاج منکشف کر دیا ہے جو عام مادی وسائل اور استعمال ادویہ سے قطعاً مستغنی ہے اور اس بے دوا کے علاج سے بہرے شنوا ہو جاتے ہیں پھیپھڑے اور سل کے امراض میں شفا حاصل ہوتی ہے آنکھوں کی بیماریاں جاتی رہتی ہیں وجع مفاصل دور ہو جاتا ہے زخم بھر آتے ہیں ❸ کیا اس کے بعد بھی انجیل

❶ دیکھو پروفیسر موصوف کی کتاب ''پرنسپلس آف سائیکالوجی'' (اصول نفسیات) جلد دوم، باب: ۲۷)۔

❷ ڈاکٹر مول کی کتاب ''ہپناٹزم'' صفحہ ۲۹۲ مطبوعہ ۱۹۰۹ء۔

❸ ڈاکٹر مول کی کتاب ''ہپناٹزم'' صفحہ ۳۵۵ مطبوعہ ۱۹۰۹ء۔

کی روایات مسیحائی کو محض خوش اعتقادی یا اکاذیب کا طومار کہنا خود اپنے جہل مرکب کی گواہی نہ ہوگی؟ فرانس کی جس مشہور درگاہ کی کرامات شفا کا اوپر ذکر گزرا ہے ہیوم نے معتبر سے معتبر شہادت کے باوجود ان کو قطعاً ناممکن قرار دیا تھا لیکن ڈاکٹر مول بلاکسی مطالبہ شہادت کے قدیم مصری اور یونانی مندروں کی کرامات شفا کو تنویم ہی کا معجز نما نفسی اثر سمجھتا ہے [1] غرض جو چیز ہیوم کے نزدیک قطعاً ناممکن تھی مول کے نزدیک اب اس میں اتنا استبعاد بھی باقی نہیں کہ کسی غیر معمولی شہادت کا مطالبہ کرے۔ جان اسٹورٹ مل نے معجزہ کی تعریف یہ کی تھی کہ وہ عبارت ہے ایسے واقعہ سے جس کے پہلے وہ لوازم وشرائط نہ پائے جاتے ہوں جو دوبارہ اس کو وجود میں لانے کے لیے کافی ہوتے ہیں لیکن آج ہمارے سامنے وہ لوازم وشرائط موجود ہیں جن کی بنا پر عصا اسی طرح اژدھا بن جاتا ہے جس طرح کہ کرسی شیر نظر آسکتی ہے، تم کہو گے کہ تو پھر اس صورت میں حضرت موسی علیہ السلام کا اعجاز کیا رہا، اس کا جواب آئے گا، سردست تم صرف اتنا سمجھ لو کہ عصا کا اژدھا بن جانا اتنا مستبعد واقعہ نہیں جس پر یقین کے لیے نفس نوعیت واقعہ کی بنا پر کسی غیر معمولی شہادت کی احتیاج ہو۔

عام تجربات

تنویمی تجربات کے علاوہ یوں بھی کچھ نہ کچھ ایسے پراسرار واقعات مشاہد ومسموع ہوتے رہتے ہیں، جن کی توجیہ عام قوانین فطرت سے نہیں ہوتی اور جو بہت سے معجزات کے متعلق ہماری حیرت واستبعاد میں کمی پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے صوبہ کے مشہور انگریزی اخبار ''لیڈر'' نے پچھلے سال اپریل میں بردوان کا ایک عجیب وغریب واقعہ چھاپا تھا جو نامہ نگار کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

> ''بردوان میں ایک عجیب و پراسرار واقعہ پیش آیا جس نے لوگوں میں کافی سنسنی پیدا کردی ہے، لالہ کندن لال کپور ایک کھتری زمیندار ۱۱ ماہ حال کو ٦ بجے شام کے وقت مرا۔ متوفی چونکہ سوریہ بنسی کھتری تھا، اس لیے جب تک دوسرے دن صبح آفتاب نہ نکل لیا اس کی لاش جلائی نہیں گئی جلانے سے پہلے اس کے لڑکے (انند لال) نے ایک خالی کمرہ میں جہاں کوئی اور نہ تھا لاش کا فوٹو لیا لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کے فوٹو پر پانچ اور دھندلی تصویریں آگئی ہیں، ان تصویروں میں سے دو کو تو خاندان کے لوگوں نے پہچانا تھا کہ متوفی کی پہلی بیوی اور لڑکی کی ہیں جن کو مرے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں باقی تین تصویریں جو زیادہ روشن نہ تھیں پہچانی نہ جاسکیں۔''

''ٹائمس آف سیلون'' میں ایک انگریز پلانٹر (چائے کا کاشتکار) نے اپنے قلیوں کی قربانی اور پوجا کے کچھ مشاہدات لکھے تھے جو اس کو عجیب معلوم ہوتے تھے ان میں یہ بھی تھا: [2]

---

[1] ہپناٹزم، صفحہ: ۳۵٦۔ [2] لیڈر'' نے ''ٹائمس آف سیلون'' کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

''ایک شخص آگ کی سوراخ دار چپٹی ہتھیلی پر رکھ کر مندر کے گرد رقص وطواف کرتا تھا اس نے مجھ کو یقین دلایا کہ یہ چپٹی اس کو بالکل گرم نہیں محسوس ہوتی تھی حالانکہ جب میں نے تجربۃً چپٹی کے اسی حصہ کو جو اس شخص کی ہتھیلی پر تھی چھوا تو میری انگلی جل گئی ان کا بڑا پجاری کم وبیش ایک منٹ تک آگ میں ہاتھ ڈالے رہا اور کوئی اثر نہ ہوا اسی طرح اور بھی کئی قلیوں نے نہایت غیر معمولی حرکتیں کیں۔''

ان چشم دید عجائب کو لکھ کر پلانٹر نے ناظرین اخبار سے درخواست کی ہے کہ اگر کسی اور صاحب نے اس قسم کے واقعات دیکھے ہوں تو براہ مہربانی اطلاع دیں یا اگر ان کی کوئی توجیہ وتشریح ہو سکتی ہو تو کریں اس پر خود ''ٹائمس'' نے لکھا ہے کہ سیلون اور ہندوستان دونوں جگہ مذہبی رسوم کے مواقع پر اس قسم کے واقعات اکثر دیکھنے میں آتے ہیں، مثلاً: کولمبو میں محرم کے موقع پر لوگ آگ میں چلتے ہیں ہم کو نہیں معلوم کہ ایسے واقعات کی اب تک علمی توجیہ ہو سکی ہے، ایک نظریہ یہ ہے کہ لوگ اپنے آپ پر عمل تنویم کر لیتے ہیں۔ [1]

بہر حال توجیہ ہو سکے یا نہ ہو سکے لیکن ایڈیٹر ٹائمس نے پلانٹر کے بیان کی تکذیب نہیں کی نہ کسی مزید شہادت کا مطالبہ کیا، کیوں؟ اس لیے کہ اس طرح کے واقعات اور بھی وقتاً فوقتاً پیش آتے رہتے ہیں جن کو سامنے رکھنے کے بعد پلانٹر کا بیان اتنا مستبعد نہیں رہتا کہ نفس نوعیت واقعات ہی کی بنا پر ان کی تغلیط وتردید کر دی جائے یا کسی غیر معمولی شہادت کا مطالبہ کیا جائے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم اس واقعہ کو غلط سمجھو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ نہ جلا سکی زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی بنا پر تم ان کی نبوت کا اقرار نہ کرو لیکن نفس واقعہ سے انکار کا کیا حق حاصل ہے؟

رؤیائے صادقہ

رؤیا یا خواب کی تشفی بخش عقدہ کشائی سے حکمت وفلسفہ کا ناخن اب تک عاجز ہے، مختلف اصناف خواب کی توجیہ کے لیے جو جو نظریات فرض کیے گئے ہیں، خود ایک خواب پریشان معلوم ہوتے ہیں لیکن قدرت اپنی عجائب آفرینیوں کے لیے انسانی توجیہات کا انتظار نہیں کرتی۔ تم کسی مصر آدمی سے دریافت کرو، اس کو اپنی زندگی کے بہت سے ایسے خواب یاد ہوں گے جو واقعات مستقبل کی تمثیلی یا صریحی پیش بینی تھے میرے ایک فلسفی دوست کو اپنے خوابوں کی صحت کا اس قدر تجربہ ہے کہ جب کسی شخص سے خواب میں ان سے بے لطفی ہو جاتی ہے تو بیداری میں اس نتیجہ کے لیے وہ تیار رہتے ہیں اور اکثر کچھ نہ کچھ بدمزگی کی نوبت آ ہی جاتی ہے مجھ کو اپنے خواب بہت ہی کم یاد رہتے ہیں لیکن جو جس قدر زیادہ وضاحت کے ساتھ یاد رہتا ہے اسی قدر زیادہ صحیح نکلتا ہے، ۱۹۲۰ء کے روزنامچہ میں (۱۵، اپریل) ایک جگہ لکھا ہے کہ

[1] تنویم مقناطیسی کی تحقیقات کی رو سے آدمی خود اپنے اوپر بھی عمل کر سکتا ہے۔

''آج دوپہر کو سویا تو کیا خواب دیکھتا ہوں کہ ''ح'' کا خط آیا ہے، جس میں ''س'' کا بھی ایک خط ملفوف ہے، اٹھنے کے بعد ڈاک آئی تو یہ خواب بالکل واقعہ تھا، انتہا یہ کہ خطوں کا جو مضمون خواب میں دیکھا تھا، وہی قریب قریب بیداری میں بھی پایا، حالانکہ مجھ کو ''ح'' کے خط کا کوئی انتظار نہ تھا اور ''س'' کا خط تو حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا''

پروفیسر بلپر کت اسیریا کے آثار قدیمہ کا ایک مشہور ماہر ہے، اس نے دو بابلی کتبات کے متعلق ایک اشکال کو جو بیداری میں حل نہیں ہو سکا تھا، خواب میں حل کیا اور وہ بھی اس طرح کہ بابل کے ایک پرانے کاہن نے خواب میں آ کر اس کی راہنمائی کی۔ [1]

جب عام لوگوں کے یہ تجربات ہیں تو پھر اس میں کیا استعجاب واستبعاد رہ جاتا ہے کہ بعض نفوس قدسیہ (انبیا) کے تمام خواب رؤیائے صادقہ یا ایک طرح کا وحی والہام ہوتے ہیں، رسالت پناہ ﷺ پر وحی کی ابتدا رؤیائے صادقہ (صالحہ) سے ہوئی تھی، اخبار بالغیب کی گرہ بھی بڑی حد تک رؤیائے صادقہ سے کھل جاتی ہے۔

حقیقی اسرارِ نبوت

اسرار نبوت میں سب سے زیادہ پر اسرار مقام وہ ہے جہاں ابراہیم علیہ السلام کو خدا خود ندا دیتا ہے ﴿ وَنَادَيْنَٰهُ أَن يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ ﴾ (۳۷/ الصّٰفّٰت:۱۰۴) جہاں سے موسیٰ علیہ السلام کو ﴿ وَكَلَّمَ ٱللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ﴾ (۴/ النسآء:۱۶۴) کی بنا پر کلیم اللہ کا شرف عطا ہوتا ہے اور جہاں محمد ﷺ اور خدا میں [2] ﴿ قَابَ قَوْسَيْنِ ﴾ (۵۳/ النجم:۹) یا اس سے بھی کم کی دوری رہ جاتی ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں منطق واستدلال کا ''حجاب اکبر'' اٹھ جاتا ہے اور ظنی علم کی جگہ کشف ومشاہدہ کا حق الیقین حاصل ہو جاتا ہے، ابراہیم علیہ السلام کو کس نے ندا دی؟ موسیٰ علیہ السلام نے طور پر کس سے کلام کیا؟ اور ''لن ترانی'' کے باوجود کیا دیکھا؟ وہ کون سی ہستی تھی جس میں اور محمد ﷺ میں صرف قاب قوسین کی دوری تھی؟ اور ﴿ فَأَوْحَىٰٓ إِلَىٰ عَبْدِهِۦ مَآ أَوْحَىٰ ﴾ (۵۳/ النجم:۱۰) کا ماجرا کیونکر پورا ہوا؟ ان سوالات کا جواب جامہ تحدید میں رہ کر نہ دیا جا سکتا ہے اور نہ سمجھا جا سکتا ہے۔

حقیقی آیاتِ نبوت کی عام مثالیں

عام معجزات کی نوعیت ہے چونکہ اس کی مثالیں جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے معمولی واقعات زندگی میں بھی ملتی رہتی ہیں، لہٰذا اسی نسبت سے ان کے استبعاد میں بھی بہت کچھ کمی ہو جاتی ہے لیکن ''وادی ایمن'' اور (سدرۃ المنتہیٰ) کی واردات جو اصلی معجزات اور مقام نبوت کی حقیقی ''آیات کبریٰ'' ہیں ان کی، بظاہر کوئی مثال اس عالم ناسوت میں نہیں نظر آتی جس سے عام انسانوں کو ان کی فہم میں مدد ملے، بے شک ﴿ لِنُرِيَكَ مِنْ ءَايَٰتِنَا ٱلْكُبْرَى ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۲۳) کا رتبہ بلند ملا، جس کو مل گیا اور یہ سچ ہے کہ آفتاب کی عالم افروزی کا اندازہ ستاروں کی چمک

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا مضمون ''ڈریم''۔ [2] یا جرائیل میں ''س''۔

سے نہیں ہوسکتا تاہم بہ قدر استعداد تجلی طور کا ہلکا سا پرتو ذرات پر کبھی کبھی پڑ ہی جاتا ہے اور چشم بینا کی ہدایت کے لیے اتنا ہی بس ہے۔ انبیائے مرسلین علیہم السلام کے بعد اولیائے مقربین کے ہاں ان تجلیات کی کافی شہادتیں ملتی ہیں لیکن عام انسانی سطح سے چونکہ یہ درجہ بھی بہت بلند ہے، اس لیے اور نیچے اتر کر ہم کو اپنی سطح کی کچھ مثالیں تلاش کرنی چاہئیں۔ پروفیسر ولیم جیمس جو ہمارے زمانہ کا سب سے نامور محقق نفسیات اور جس کا شمار اکابر فلاسفہ میں ہے اس نے لوگوں کے ذاتی واردات مذہب یا مذہبی تجربہ وشعور کے مختلف اصناف پر ۵۰۰ صفحات سے زائد کی ایک کتاب لکھی ہے۔ [1] اس میں بلا قید مشرق ومغرب، انبیا واولیا عوام وخواص علما وحکما سب کے تجربات مذہبی کی آپ بیتی واردات کو یکجا کیا اسی ذخیرہ میں سے ہم صرف عام انسانی سطح کے چند واقعات کا بہ ترتیب ذیل انتخاب کرتے ہیں۔ سب سے پہلے جیمس نے اپنے ایک بے تکلف اور نہایت ہی ذہین وزیرک دوست کے متعدد تجربات لکھے ہیں، اس دوست کو کبھی کبھی رات کے وقت جب کہ یہ کتب بینی میں مشغول ہے، یا خالی بیٹھا ہے ایسا معلوم ہوا کہ کمرے کے اندر کوئی موجود ہے پلنگ کے پاس ہے، اپنی گود میں اس کو دبا رہا ہے، گو وہ نہیں جانتا کہ یہ کون ہے؟ یا کیا ہے؟ تاہم نفس اس کی موجودگی کا اس سے کہیں زیادہ اس کو یقین ہے جتنا کہ دن کی روشنی میں کسی ذی روح کی موجودگی کا ہوسکتا ہے وہ اس کو کسی متشخص ذات یا انسان کی طرح نہیں دیکھ رہا ہے پھر بھی اپنے تمام محسوسات سے زیادہ اس کے حقیقی، واقعی ہونے کا اذعان ہے:

> ''اس کی موجودگی میں نہ کوئی ابہام والتباس ہے، نہ یہ شعر یا موسیقی کے وجد وکیف کا سا پیدا کردہ کوئی جذبہ ہے، بلکہ یہ ایک قوی شخصیت کی نہایت قریب موجودگی کا قطعی علم ویقین ہے اور اس کے چلے جانے کے بعد میرے حافظہ میں اس کی یاد ایک حقیقت کی طرح تازہ ہے، ہر چیز جو میں لکھتا یا سنتا ہوں خواب ہوسکتی ہے، لیکن یہ واقعہ خواب نہ تھا۔'' (صفحہ ۶۰، ۶۱)

یہ دوست کوئی وہم پرست نہیں ہے بلکہ جیمس کو اس بات پر حیرت ہے کہ وہ ان تجربات کو مذہبی رنگ میں کیوں نہیں تعبیر کرتا، اس کے بعد ایک اور شخص کا بیان ہے:

''میری آنکھ بہت رات رہے کھل گئی، ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے جان بوجھ کر جگا دیا اور پہلے میں یہی سمجھا کہ کوئی شخص اندر گھس آیا ہے، میں نے پھر سونے کے لیے کروٹ بدل لی فوراً ہی محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی موجود ہے اور یہ کچھ عجیب احساس تھا کسی عام ذی حیات شخص کی موجودگی کا نہیں بلکہ ایک روحانی وجود کا احساس تھا ممکن ہے کہ تم کو اس پر ہنسی معلوم ہوتی ہو لیکن میں وہ بیان کرتا ہوں جو مجھ پر گزری بجز اس کے کہ میں ایک روحانی وجود سے اس کو تعبیر کروں اور کوئی بہتر صورت مجھ کو اپنے احساس کے ادا کرنے کی نہیں ملتی، ساتھ ہی مجھ کو ایک یہ دہشت بھی محسوس ہوئی کہ کوئی عجیب وخوفناک واقعہ ظاہر ہوا چاہتا ہے۔'' (ص ۶۲)

[1] اس کا نام The Uireeties of Religious Exprerience تجربہ مذہبی کے اصناف پروفیسر موصوف کا انتقال ابھی ۱۹۱۰ء میں ہوا ہے۔

ایک سائنس دان کے اعترافات سنو!

''بیس اور تیس سال کی عمر کے مابین میں بتدریج لا ادری اور لا مذہب ہوگیا تھا، تاہم اس ''غیر متعین شعور'' سے میں کبھی خالی نہیں رہا، جس کا نام ہربرٹ اسپنسر نے حقیقتہ مطلقہ رکھا ہے لیکن اسپنسر کی طرح یہ حقیقت میرے لیے محض ناممکن العلم نہ تھی کیونکہ گو میں نے طفلانہ طریقہ سے خدا سے دعائیں مانگنا چھوڑ دیا تھا اور مذہبی رسم کے مطابق کبھی نماز نہیں پڑھی نہ دست بدعا ہوا، تاہم میرا زیادہ حال کا تجربہ یہ بتلاتا ہے کہ عملاً اس ذات کے ساتھ مجھ کو وہی تعلق رہا ہے جو دعا اور نماز کا ہوتا ہے جب مجھ پر کوئی مصیبت پڑی خواہ وہ خانگی ہو یا کاروباری یا جب میں کسی معاملہ کے متعلق پریشان و متردد ہوا اور میرا دل بیٹھنے لگا تو اعتراف کرتا ہوں کہ استعانت کے لیے میں اسی تعلق کی طرف بھاگا جو اس ذات کے ساتھ مجھ کو حاصل تھا، اس نے ہمیشہ میری نصرت کی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی تائید غیبی نے مجھ کو بے انتہا قوی کر دیا ہے میں پاتا ہوں کہ اس کے ساتھ میرا تعلق دراصل شخصی تھا کیونکہ ادھر چند سال سے اس سے استعانت کی قوت نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے جس سے مجھ کو ایک صریح فقدان کا شعور ہے اور اقرار ہے کہ میں اپنی زندگی میں ایک بڑی قوت و نصرت سے محروم ہو گیا ہوں جس ذات کو میں ''اس'' سے تعبیر کر رہا ہوں، یہ اسپنسر کی نامعلوم حقیقت نہ تھی بلکہ یہ میرا خدا تھا جس کی تائید پر مجھ کو بھروسا تھا لیکن جس کو نہیں معلوم میں نے کس طرح کم کر دیا۔'' (صفحہ ٦٥-٦٦) [1]

سوئٹزرلینڈ کے ایک شخص کی آپ بیتی یہ ہے کہ

''میں پوری طرح صحیح و تندرست تھا کسی قسم کی تھکن بھوک یا پیاس قطعاً نہ تھی طبیعت بالکل چاق اور شگفتہ تھی گھر سے جو خبر ملی تھی اچھی تھی غرض دور و نزدیک کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ تھی ہوشیار راہنما ہم لوگوں کے ساتھ تھا، رات میں بھٹکنے کا بھی مطلقاً اندیشہ نہ تھا، مختصر طور پر اپنی اس حالت کو یوں ادا کرسکتا ہوں کہ میرا دل و دماغ اس وقت کامل توازن کی حالت میں تھا کہ یکا یک مجھ کو اپنے اندر ایک طرح کا ارتقا محسوس ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ خدا موجود ہو گیا اس کی رحمت و قوت میرے سارے وجود میں نفوذ کر رہی ہے، یہ کیفیت اس درجہ شدید تھی کہ ساتھیوں سے بہ مشکل اتنا کہہ سکا کہ آگے چلو میرا انتظار نہ کرو، اب مجھ میں کھڑے ہونے کی تاب نہ تھی، ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا امنڈ آیا، میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ایک حقیر اور میرے جیسی گناہگار مخلوق پر اتنا بڑا رحم و فضل فرمایا کہ زندگی ہی میں اپنے کو پہچنوا

[1] اس حالت کو سامنے رکھ کر ذرا ان آیات کو پڑھیے ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ (١/ الفاتحہ:٤) ''فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ'' (٥١/ الذاریات: ٥٠) ﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ (٨/ الانفال:١٠)

کر اپنی ربوبیت کا کرشمہ دکھلایا، میں نے اس سے نہایت الحاح کے ساتھ دعا کی کہ میری زندگی تمام تر اس کی رضا جوئی میں بسر ہو جواب ملا کہ بس تو روز بروز عاجزی و مسکنت کے ساتھ میری رضا پر چلنے کی کوشش کر اور اس کا فیصلہ مجھ خدائے قادر و توانا پر چھوڑ دے کہ اس سے بھی زیادہ شعور کے ساتھ تو مشاہدۂ حق کے قابل ہوا ہے یا نہیں؟ یہ احساس و اثر اس قدر گہرا اور واضح تھا کہ میں نے اپنے دل سے سوال کیا کہ کیا موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر کچھ اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ دیکھا تھا اس قدر بیان کر دینا اور مناسب ہوگا کہ اس عالم وجد میں خدا کسی شکل و صورت اور رنگ و بو سے متصف نہ تھا، نہ میں اس کی موجودگی کی کوئی خاص جگہ محسوس کر رہا تھا۔'' (صفحہ ۶۶۔۶۷)

جیمس نے تو اس قسم کے تجربات کا ایک انبار لگا دیا ہے لیکن ہم ایک طویل بیان کے دو جملوں کے اقتباس پر بس کرتے ہیں قیاس اور اخذ نتائج کے لیے امید ہے کہ یہی تین چار مثالیں کافی ہوں گی امراض دماغی کے ایک ماہر ڈاکٹر نے خود اپنا تجربہ لکھا ہے:

''اس کے بعد مجھ پر ایک انتہائی فرحت و انبساط کی کیفیت طاری ہوئی جس کے ساتھ ہی ایک ایسی اشراقی یا انشراحی حالت پیدا ہوئی جس کا بیان ناممکن ہے اس حالت میں دوسری چیزوں کے ساتھ اس بات کا بھی مجھ کو صرف یقین نہیں بلکہ عینی مشاہدہ ہوا کہ کائنات بے جان مادہ سے نہیں بنی ہے بلکہ ایک ذی حیات وجود ہے مجھ کو خود اپنے اندر ایک ابدی حیات کا احساس ہوا یہ کیفیت صرف چند سیکنڈ تک رہی لیکن اس کی یاد اور حقیقت کا احساس آج چوتھائی صدی گزر جانے پر بھی اسی طرح تازہ ہے۔'' (صفحہ ۳۹۹)

ان مثالوں کو سامنے رکھ کر اب یہ حدیث پڑھو:

ایک دفعہ صبح کی نماز کے لیے آپ ﷺ دیر سے برآمد ہوئے نماز کے بعد لوگوں کو اشارہ کیا کہ اپنی اپنی جگہ ٹھہر جائیں پھر فرمایا: ''آج شب کو میں نے اتنی رکعتیں پڑھیں جتنی کہ میرے لیے مقدر تھیں تو نماز ہی میں کچھ اونگھ سا گیا، (نَعِسْتُ) اس حالت میں میں نے دیکھا کہ جلال الٰہی بے پردہ میرے سامنے ہوا۔ خطاب ہوا اے محمد (ﷺ)! تم جانتے ہو کہ فرشتگان خاص کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں؟ عرض کی نہیں اے میرے رب! میں نہیں جانتا۔ اس نے اپنا ہاتھ دونوں مونڈھوں کے بیچ میں میری پیٹھ پر رکھا، جس کی ٹھنڈک میرے سینہ تک پہنچ گئی اور آسمان و زمین کی تمام چیزیں نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو گئیں، سوال ہوا یا محمد (ﷺ)! تم جانتے ہو کہ فرشتگان خاص کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں، عرض کی، ہاں اے میرے رب......'' الخ [1]

[1] پوری حدیث کے لیے دیکھو آگے ذکر مشاہدات۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۵، ص: ۲۴۳۔

اس میں کلام نہیں مکالمہ طور اور ماجرائے اسراء (معراج) کا مقام مذکورۂ بالا مثالوں سے اتنا ہی بلند ہے جتنا کہ انبیا علیہم السلام کا مقام انسانوں سے بلند ہونا چاہیے تاہم ”عالمے هست كه ايں عالم ازاں تمثالے است“ ان مثالوں میں ایک نہ ایک حد تک اس مقام برتر کا دھندلا سا تصور پیدا کیا جا سکتا ہے اور ہمارے مدعا کے لیے اسی قدر کافی ہے۔

مقدمات ثلاثہ

یقین معجزات کے لیے ہماری منطق استدلال کے تین مقدمات تھے، جن میں سے دو کو تو ہیوم اور ہکسلے نے بہ ترتیب پورا کر دیا تھا، تیسرا مختلف اصناف استبعاد کے شواہد سے پورا ہو جاتا ہے، ان مقدمات ثلثہ کا خلاصہ یہ ہے:

① معجزات بذات خود کوئی ناقابل تصور یا ناممکن الوقوع شے نہیں ہیں۔ (ہیوم)

② زیادہ سے زیادہ ان کو ’’انتہائی حیرت انگیز‘‘ یا ’’انتہائی مستبعد‘‘ واقعات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس لیے (الف) انسانی شہادت کی بنا پر ان کو قبول کیا جا سکتا ہے (ب) البتہ ’’انتہائی حیرت انگیزی‘‘ و استبعاد کی وجہ سے بظاہر ان کو قبول کرنے کے لیے جو شہادت مطلوب ہے، اس کو بھی ہر لحاظ سے انتہائی حد تک قابل اعتبار ہونا چاہیے (ہکسلے)

③ لیکن معجزات میں جس قسم کا استبعاد یا حیرت انگیزی پائی جاتی ہے اس کے شواہد چونکہ عام انسانوں کے مادی، نفسی یا روحانی تجربات میں بھی ملتے رہتے ہیں جن کے قبول و یقین کے لیے لوگ کوئی غیر معمولی شہادت طلب نہیں کرتے۔

لہٰذا یقین معجزات کے لیے بھی کسی غیر معمولی شہادت کی ضرورت نہیں۔

اصلی بحث یقین کی ہے

لیکن سوال یہ ہے کہ ہیوم و ہکسلے کی ناقص منطق سے اگر کوئی شخص گمراہ ہو گیا تھا تو کیا وہ اس منطق کا صرف تیسرا مقدمہ پورا کر دینے سے راہ راست پر آ جائے گا اور کیا اب صفحات بالا کے پڑھ لینے سے معجزہ کا کوئی منکر نہ رہ جائے گا مجھ کو تو اندیشہ ہے کہ محض یہ سیاہ نقوش ایک منکر کو بھی مومن نہ بنا سکیں گے آپ کہیں گے کہ شاید استدلال ہی بودا ہے لیکن کیا دنیا کا کوئی قوی سے قوی استدلال بھی، نفس اپنی قوت استدلال کی بنا پر کسی کو معجزات کا یقین دلا سکتا ہے؟ ارسطو، مل اور ہیگل [1] جو منطق کے ’’اقانیم ثلثہ‘‘ ہیں کیا یہ سب کے سب مل کر بھی کوئی ایسی منطق یا عقلی استدلال پیدا کر سکتے تھے جو بذات خود ہر عام و خاص کو معجزات کا یقین دلا دیتا؟

ان سوالات کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر معجزات کے متعلق خالی امکان وقوع اور شہادت وقوع کی بحث چنداں اہم نہیں رہ جاتی بلکہ اصلی بحث یقین کی ماہیت اور اس کے علل و اسباب کی ہے۔

[1] ارسطو اور مل علی الترتیب قیاسی و استقرائی منطق کے امام ہیں، جن کا تعلق اضافی حقائق و علوم سے ہے لیکن ہیگل (جرمنی) نے منطق کے زمین و آسمان ہی بدل دیے یعنی منطق کو مابعد الطبیعات بنا کر اس کے ذریعہ حقیقۃ مطلقہ کا سراغ لگانا چاہا ہے۔

یقینِ معجزات

یقین کی ماہیت

یقین کی فلسفیانہ ماہیت پر کوئی مفصل و مستقل بحث چھیڑنا مقصود نہیں ہے، نہ یہاں چنداں اس کی ضرورت ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ نفس تصور اور اس کے یقین میں کیا فرق ہے۔ یہاں ہمارے مقصد کے لیے صرف اتنا جان لینا چاہیے کہ ریاضی کے تصورات مجردہ [1] کی طرح امور واقعیہ (واقعات) کے متعلق ہمارا یقین ناقابل تغیر یا اطلاقی نوعیت کا نہیں ہوتا بلکہ لذت والم، حیرت واستعجاب، رنج وغم، محبت ونفرت ارادہ و خواہش وغیرہ دیگر کیفیات نفسی کی طرح محض ایک اضافی وتغیر پذیر ذہنی کیفیت کی حیثیت رکھتا ہے، جس طرح کسی واقعہ سے ہر شخص کے نفس میں کیفیات بالا کا پیدا ہونا یا یکساں طور پر پیدا ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح ہر آدمی کے دل میں اس واقعہ کا یقین یا ایک ہی معنی میں یقین پیدا ہونا بھی لازمی نہیں۔ تاریخ کی بعض کتابوں میں ایک روایت مذکور ہے کہ اسکندریہ کا کتب خانہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے اس بیدردی کے ساتھ جلایا گیا کہ چھ مہینہ تک مصر کے حماموں کا ایندھن بنا رہا، علم کا فدائی اور حکمت وفلسفہ کا عاشق اس روایت کو پڑھ کر کف افسوس ملنے لگتا ہے اور اس کے دل میں نفرت وغصہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے بخلاف اس کے اسی روایت کو اگر ایک سپاہی پڑھتا ہے تو نہ وہ اپنے اندر کوئی نفرت وغصہ پاتا ہے اور نہ اتنا افسوس کرتا ہے اس کے نزدیک قلعہ انٹورپ کی بربادی کتب خانہ اسکندریہ کی تباہی سے کہیں زیادہ ماتم انگیز ہے لیکن یہی روایت اگر کسی صوفی عارف کی نظر سے گزرے تو رنج وغصہ کی جگہ اس کو انتہائی مسرت ہو سکتی ہے کہ ''حجاب اکبر'' کا یہ ''دفتر بے معنی'' اسی سلوک کا مستحق تھا۔'' ''صد کتاب و صد ورق در نار کن''

تم نے دیکھا کہ ایک ہی چیز سے مختلف اشخاص پر مختلف بلکہ متضاد جذبات طاری ہوئے۔ جذبات کی طرح یقین وعدم یقین کے بھی متضاد اثرات طاری ہوئے ہیں جن اہل یورپ کے دل میں مسلمانوں کی وحشت وجہالت کا تعصب راسخ تھا اور جن کی طبیعت تنقیص اسلام کی ہر شہادت کو قبول کرنے پر حریص تھی انہوں نے نہ صرف شہادت کی تحقیق وتفتیش کے بغیر اس خبر کا یقین کر لیا بلکہ اس کی روایتی ودرایتی تضعیف کے بعد بھی ان کا یقین قائم رہا لیکن انہی اہل یورپ میں جو گروہ اس درجہ اسلام کے ساتھ عداوت نہیں رکھتا تھا کہ

[1] معجزات کا تعلق چونکہ تاریخ اور روایت کے واقعات سے ہے نہ کہ ریاضی کی مجردات سے، اس لیے ہم مجردات ریاضیہ کے علم ویقین کی جو نوعیت ہے اس کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے ورنہ دراصل یہ یقین بھی کسی اطلاقی اور اٹل یا ناقابل تغیر بنیاد پر قائم نہیں ہے جس کا انکار نہ ہو سکے بلکہ مل جیسے منطقی وفلسفی کا تو یہ دعویٰ ہے کہ ریاضیات کی مفروضہ قطعیت محض ایک وہم وفریب ہے جس طرح براق کی اس تعریف سے کہ وہ نام ہے آدھے گھوڑے اور آدھے انسان کا یہ نہیں لازم آتا کہ براق کا وجود یقینی اور واقعی ہے اسی طرح دائرہ کی اس تعریف سے کہ وہ نام ہے ایسی شکل کا جس کے نصف قطر تمام برابر ہیں یہ لازم نہیں آتا کہ واقعتاً ایسا کوئی دائرہ موجود بھی ہے انتہا یہ کہ مل کے نزدیک اس میں بھی کوئی تناقض نہیں کہ دو اور تین مل کر چھ ہو سکتے ہیں۔

اس کے جذبۂ انصاف پسندی کو تعصب نے مغلوب کر لیا ہو، اس کو تحقیق کے بعد یہ روایت ہی سرے سے بے اصل و مضحکہ خیز نظر آئی اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ایک مسلمان مؤرخ جو کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کو دامن اسلام پر وحشت و جہالت کا ایک بدنما داغ سمجھتا تھا اور کسی طرح اس کا محبت اسلام سے لبریز دل اس کے قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا اس کی تحقیقات نے اس روایت کو نہ صرف دشمنوں کا صریح افترا و بہتان قرار دیا بلکہ الٹے خود ان ہی افترا پرداز دشمنوں کو اصلی مجرم ثابت کر دکھایا۔

ع ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا۔ ❶

نظریاتِ حکمت کا یقین

یقین کی یہ جذباتی و اضافی حیثیت صرف واقعات تاریخ و روایت ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ فلسفہ و حکمت (سائنس) کے نظریات و نظامات کا یقین بھی یہی حیثیت رکھتا ہے پروفیسر جیمس نے ''ارادہ یقین'' اور ''جذبہ عقل پرستی'' ❷ کے عنوان سے دو نہایت دلچسپ مضمون لکھے ہیں ان میں اس نے دکھایا ہے کہ ہمارا یقین کس قدر خواہش و ارادہ یا جذبات کی اضافی کیفیات کا پابند ہے اور سائنس و فلسفہ کی بنیاد جس عقل پرستی پر ہے وہ بھی دراصل مذہب پرستی یا عجائب پرستی کی نوعیت کا ایک جذبہ ہے۔

یکسانی کا جذبہ

ایک فلسفی یا حکیم فلسفیانہ یا حکیمانہ فکر و تفحص میں کیوں اپنا سر کھپاتا ہے؟ زیادہ تر اس ''خواہش'' کی بنا پر کہ عالم میں جو ایک تشتت و پریشانی کثرت و پراگندگی نظر آتی ہے، کوئی ایسا اصول یا قانون دریافت ہو جائے جو اس کثرت و پراگندگی کو وحدت و یکسانی کے رشتہ سے مربوط و مسلسل کر دے، اس قانون و اصول کے عقلی یا صحیح ہونے کا کیا معیار ہے؟ صرف یہی کہ اس کے قبول و باور کرنے سے ہمارے دماغ کی حیرانی و پریشانی رفع ہو جاتی ہے اور کارخانۂ فطرت میں یکسانی و ہمواری کی موجودگی کا ایک خوش گوار و لذیذ احساس یا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

یہ لذت کہ پراگندہ واقعات دراصل کسی ایک ہی مخفی واقعہ کے مظاہر ہیں، اسی طرح کی لذت ہے جو کسی گویّے کو پراگندہ آوازوں کے ایک نغمہ یا راگ میں منتظم کر دینے سے حاصل ہوتی ہے کون شخص اس امر کی دلفریبی کو نہ محسوس کرے گا کہ سیب کو زمین کے ساتھ وہی تعلق ہے جو چاند کو اس کے ساتھ ہے، غبارہ اسی قانون کے ماتحت اوپر چڑھتا ہے جس کے ماتحت پتھر نیچے گرتا ہے، اس یقین میں کس کے لیے لذت نہ ہوگی کہ پہاڑ پر

❶ دیکھو رسائل شبلی، مضمون کتب خانہ اسکندریہ، اب یہ مضمون مقالات شبلی حصہ ششم میں شامل ہے، دیکھئے ص:۱۵۱۔

❷ انگریزی میں ان دونوں مضامین کے نام علی الترتیب Will to believe اور Sentiment of Rationalism ہے جو دیگر مضامین کے ساتھ شائع ہوئے ہیں افسوس کہ یہاں ہم بہ خوف طوالت ان سے زیادہ استفادہ نہیں کر سکتے لیکن جو انگریزی دان اصحاب یقین کی حقیقت و نوعیت کو اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہیں ان کو یہ دونوں مضمون ضرور پڑھنے چاہیے۔

چڑھنے یا درخت کے کاٹنے میں جس طاقت سے ہم کام لیتے ہیں وہ وہی ہے جو آفتاب کی ان کرنوں میں پائی جاتی ہے جو اس غلہ کو پکاتی ہیں جس کا صبح ہم نے ناشتہ کیا ہے۔ ❶ نظم و یکسانی کی لذت کے لیے انسان کی فطرت جس درجہ حریص ہے اسی کو ملحوظ رکھ کر ہمارے زمانہ کے ایک زبردست معلم فلسفہ پروفیسر روائس نے تنبیہ کی ہے کہ ''جہاں کہیں بھی ہم کو کسی قانون فطرت کی وحدت و یکسانی کا یقین محسوس ہو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس احساس وحدت کا بڑا حصہ اصل فطرت کی واقعی وحدت کے بجائے اس ناقابل استیصال جذبہ پر مبنی ہوسکتا ہے جو وحدت و نظم کی پسندیدگی کے لیے خود ہمارے نفوس کے اندر موجود ہے۔ ❷ یہی تعصب تھا جس کی بنا پر ایک بڑے سائنس دان نے جیمس سے کہا کہ کلام نفسی کا دعویٰ اگر صحیح بھی ہو تو بھی تمام اہل سائنس کو اس کے دبانے اور چھپانے پر ایکا کر لینا چاہیے کیونکہ اس سے فطرت کی یکسانی اور نیز بہت سی ایسی چیزوں کی تکذیب ہوتی ہے جن کے مانے بغیر سائنس دان اپنا کام نہیں چلا سکتے۔ اس قول کو نقل کر کے جیمس نے لکھا ہے کہ اگر یہی سائنس دان حضرات کلام نفسی کو سائنس کے حق میں مفید مطلب پاتے تو اس سے اغماض کے بجائے نہ صرف اس کی شہادت کی تحقیق پر آمادہ ہوتے بلکہ یہی شہادت یقین کے لیے کافی ہوتی ❸ اب تم ہی فیصلہ کرو کہ کیا ''عقل پرست سائنس'' کے تعصّبات ''وہم پرست مذہب'' کے تعصّبات سے کچھ بھی کم یا مختلف ہیں؟ اور کیا اہل سائنس کا انکار معجزات وحدت و یکسانی کے مذکورۂ بالا تعصب کا نتیجہ نہیں ہے؟

نظریات فلسفہ کا یقین

خیر اہل سائنس یا حکما کو تو خود ہی بڑی حد تک اس امر کا اعتراف ہے کہ سائنس کے نظریات و نوامیس زیادہ تر اضافی و مفروضی حیثیت رکھتے ہیں لیکن فلاسفہ یا متالہین، جو حقائق عالیہ اور صداقت مطلقہ کے چہرہ سے پردہ اٹھانے کا دعویٰ رکھتے ہیں ان کے اصول و نظریات پر تو انسانی جذبات یا ذاتی میلانات کا سایہ تک نہ پڑنا چاہیے تھا مگر یہ کس قدر حسرت انگیز منظر ہے کہ سب سے زیادہ فلسفہ ہی کے مذاہب و نظامات شخصی جذبات وخواہشات کا عکس نظر آتے ہیں! بلکہ سچ یہ ہے کہ جتنے فلاسفہ اتنے ہی مذاہب، حتیٰ کہ ایک عام دلچسپ تقسیم کی رو سے فلاسفہ کی دو قسمیں یہ قرار پائی ہیں کہ رونے والے (بکائیہ) اور ہنسنے والے (ضحکیہ) فلاسفہ جن کو زیادہ سنجیدہ اصطلاح میں علی الترتیب ''شریہ'' اور ''خیریہ'' ❹ کہا جاتا ہے، یا اس کو ''یاسیہ'' اور ''رجائیہ'' بھی کہہ سکتے ہو، اگر نفسیاتی تحلیل کی جائے تو اس اختلاف کا مبنی رونے اور ہنسنے، یاس و رجا امید و بیم وغیرہ کے ذاتی جذبات و احوال ہی ثابت ہوں گے۔ دور جدید کا ایک زبردست فلسفی شوپنہار جس کا شمار فلسفہ کے اکابر ائمہ میں ہے اور جو فلاسفہ کی رونی جماعت کا ایک نامور فرد ہے اس کا سارا فلسفہ ہی یہ ہے کہ صداقت مطلقہ صرف ارادہ یا

❶ جیمس کا مضمون ''جذبہ عقلیت'' Sentiment of Rationality ❷ دیکھو اصول نفسیات، جلد ۲، ص: ۳۱۶
بحوالہ The Religious Aspect of Philosophy (فلسفہ کا مذہبی پہلو) مصنفہ پروفیسر روائس۔
❸ ارادہ یقین، ص: ۱۰ طبع جدید: ۱۹۱۷ء۔ ❹ انگریزی میں ان کا لقب علی الترتیب Pessimists اور Optimists ہے۔

خواہش ہے نہ کہ عقل یا فکر اور یہ ارادہ چونکہ ''بے عقل'' ہے، اس لیے اس کی کوئی غایت نہیں دنیا میں کوئی فلاح و سعادت نہیں بلکہ یہ تمام تر بے مقصد ارادہ کا ایک کھلونا یا تماشا ہے، خارجی عالم اسی بے عقل و بے مقصد ارادہ کی محض ایک تصویر ہے۔ کرۂ عقل کی سب سے اونچی سطح پر بسنے والے ان فلاسفہ کے باہمی اختلافات بلکہ تضادِ آرا کا یہ عالم ہے کہ جتنے منہ اتنی باتیں، کوئی کہتا ہے کہ دنیا تمام تر عقل پر مبنی ہے، کوئی مدعی ہے کہ اس کا وجود سراپا بے عقلی ہے، کوئی شخصی خدا کا یقین رکھتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ شخصی خدا ناقابلِ تصور ہے، کسی کو ذہن سے باہر خارجی دنیا کا اذعان ہے، کوئی ثابت کرتا ہے کہ خارجی دنیا کا وجود محض وہم وفریب ہے کسی کی زبان پر ہے کہ ایک مستقل وقائم بالذات روح ہے کوئی پکارتا ہے کہ نفس کے تغیر پذیر احوال کے سوا کچھ نہیں ہے، کسی کا دعویٰ ہے کہ سلسلہ علل لامتناہی ہے، کوئی مانتا ہے کہ نہیں ایک علۃ العلل ہے، کوئی انسان کو مجبور محض پاتا ہے اور کوئی مختار کوئی جسد و عالم کی وحدت کا قائل ہے اور کوئی کثرت کا بظاہر مہمل سے مہمل بات بھی تم کو ایسی نہ ملے گی جس کا باور کرنے والا عاقل سے عاقل فلسفی نہ ملتا ہو۔

عقل انسانی کی انہی حیرانیوں کو دیکھ کر آدمی پکار اٹھتا ہے کہ کسی چیز کو حق کہنے کے صرف یہ معنی ہیں کہ جب تم اس کو حق یقین کرو تو حق ہے ورنہ نہیں [1] اور خصوصاً موجودہ زمانہ میں تو اس سرعت وکثرت کے ساتھ نظریات ابل پڑے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے زیادہ واقعی خیال کرنا قریباً ناممکن ہوگیا ہے، اس قدر مختلف ہندسات، اس قدر مختلف منطقیں اس قدر مختلف طبیعاتی وکیمیاوی مفروضات پیدا ہوگئے ہیں کہ صحیح سے صحیح اصول کی نسبت بھی گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی واقعیت کا پرتو ہونے کے بجائے محض انسانی ذہن کی ایجاد ہے۔ [2]

مشاہدات کا یقین

تم سمجھتے ہوگے، کہ علم ویقین کی یہ اضافی یا ذہنی نوعیت زیادہ سے زیادہ اصول ونظریات تک محدود ہوگی، باقی مشاہدات ومحسوسات جو ان اصول ونظریات کا آخری مرجع ہیں وہ تو بہر حال کوئی اضافی شے نہیں ہوسکتے کیونکہ ان کے متعلق زید وعمر کی نوعیت یقین میں کوئی تفاوت ناممکن ہے لیکن تمہارا یہ ''ناممکن'' نہ صرف ''ممکن'' بلکہ واقعہ ہے۔

دن رات کے ان معمولی تجربات کا تو ذکر ہی کیا کہ ایک چیز جو ایک آدمی کو خوبصورت معلوم ہوتی ہے دوسرے کو بدصورت نظر آتی ہے، ایک کو خوش مزہ محسوس ہوتی ہے دوسرے کو بدمزہ، آلات حس ومشاہدہ کی ساری دنیا عبارت ہے، رنگ و بو، آواز ومزہ، سردی وگرمی، شکل وصورت، طول وعرض، (امتداد) پستی و بلندی، دوری ونزدیکی سے لیکن کیا ان میں سے ایک شے کے متعلق بھی عامی، حکیم اور فلسفی سب کا یقین یکساں نوعیت رکھتا ہے۔ عامی آدمی اپنے حواس کی مذکورہ بالا ساری دنیا کو ٹھوس خارجی حقائق یقین کرتا ہے لیکن حکیم یا

---

[1] ارادۂ یقین Theories of Knowledge (نظریات علم) از پروفیسر واکرص: ۴۳۲ بحوالہ۔

[2] The Meaning of Truth (معنی صداقت) ص ۵۸۔

سائنس دان کے نزدیک ان میں سے کسی ایک کا بھی خارج میں کوئی وجود نہیں اور آج کل کے سائنس دان تو بار بار اس حقیقت کو دہراتے رہتے ہیں کہ اشیاء دراصل وہ یا ویسی نہیں جیسی کہ ہمارے حواس کو محسوس ہوتی ہیں۔'' (ماڈرن بلیف صفحہ ۵۶) ذہن یا احساس سے باہر نہ کوئی رنگ ہے نہ بو، نہ کوئی آواز ہے نہ مزہ، لیکن حکمت کو چونکہ اپنی تحقیقات میں قدم قدم پر مادہ وقوت کے الفاظ دہرانا پڑتے ہیں اس لیے خالص حکیم کے دل میں مادہ پرستی کا ایک ایسا جذبہ و میلان پیدا ہو جاتا ہے کہ باوجود اس اقرار کے کہ ''مادہ'' کسی نامعلوم شے کا نام ہے'' پھر بھی کسی نہ کسی مفہوم میں اس کے وجود خارجی کے یقین پر اپنے کو مجبور پاتا ہے بخلاف اس فلسفہ یا مابعد الطبیعیات کا عالم چونکہ حکیمانہ تعصبات سے بالاتر ہے، لہٰذا بے جھجک سرے سے وجود مادہ ہی کا انکار کر دیتا ہے، اس کے نزدیک بس جو کچھ وجود ہے وہ ذہن یا نفس کا، مگر یقین کی گردن دلائل سے کب جھکتی ہے ممکن ہے کہ چند لمحات کے لیے حکیم یا فلسفی عالم رنگ و بو یا مادہ کے وجود فی الخارج کے خلاف یقین پر قائم رہ سکتا ہو، لیکن بالآخر اس کو جبلت کی حکومت قاہرہ اسی نقطہ پر واپس لاتی ہے جہاں سے غور و فکر نے اس کو منحرف کیا تھا اور شب و روز کی زندگی میں وہ عالم رنگ و بو کے وجود خارجی پر اسی طرح اذعان رکھتا ہے جس طرح ایک عامی آدمی۔ غرض یقین اپنی ماہیت کی رو سے تمام تر صرف ایک نفسی میلان ہے جو نہ علم کا پابند ہے، نہ جہل کا، جس کا انحصار نہ عقل پر ہے، نہ بے عقلی پر، جو نہ سچ پر موقوف ہے، نہ جھوٹ پر، وہ فلسفہ، حکمت، علم و عقل سب چیزوں سے پیدا ہو سکتا ہے اور کسی سے بھی نہیں پیدا ہو سکتا اور جب پیدا ہونا چاہتا ہے تو کلیفرڈ کے اس مشورہ کا منہ نہیں دیکھتا کہ ''جھوٹ پر یقین کرنے سے بہتر ہے کہ ہمیشہ یقین کے بغیر رہو۔'' کیا عجیب بات ہے کہ یقین کی اس ماہیت پر بھی کہ وہ دلائل کا کوئی منطقی نتیجہ نہیں بلکہ محض ایک ذہنی میلان ہے خود اس شخص کی نکتہ رس نظر پڑی تھی جو یقین معجزات کا سب سے بڑا مخالف ہے چنانچہ ''ارسٹاٹیلین'' سوسائٹی کے ایک ممبر براڈ نامی نے ۳۔۴ سال ہوئے ہیوم کے نظریہ معجزات پر ایک مضمون کے ضمن میں خود ہیوم کے اصول کی بنا پر لکھا ہے: [1]

''ہیوم کے یقین معجزہ سے اس لیے انکار ہے کہ معجزہ گزشتہ مستمر تجربہ کے منافی ہوتا ہے مثلاً: گزشتہ تجربہ یہ ہے کہ الف کے بعد ہمیشہ ب ظاہر ہوتا رہا ہے جس سے ہمارے اندر ایک قوی یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ آئندہ بھی ''ب'' ہمیشہ ''الف'' کے تابع ہوگا، ایک مذہبی آدمی معجزہ پر اس لیے یقین کرتا ہے کہ اس کے اندر عجائب پرستی اور ایسی چیزوں کے یقین کا ایک فطری میلان موجود ہے، جن سے مذہب کی تائید ہوتی ہو دونوں صورتوں میں یقین کا نفسیاتی سبب ظاہر ہے، ہیوم کا عدم یقین اس کے اس فطری میلان پر مبنی ہے کہ جو کچھ پہلے ہوا ہے وہی آئندہ بھی ہوگا اور مذہبی آدمی کا یقین اس کی عجائب پرستی اور ایسی چیزوں کے قبول کرنے کے

[1] دیکھو ارسٹاٹیلین سوسائٹی (جمعیۃ ارسطاطالیسیہ) لندن کی روداد بابت ۱۷۔۱۹۱۶ء ص: ۹۲۔

فطری میلان پر مبنی ہے جن سے مذہب کی تائید ہوتی ہو لیکن خود ہیوم کو تسلیم ہے کہ گزشتہ مستمر تجربہ سے آئندہ پر حکم لگانے کا ہم کو کوئی منطقی حق حاصل نہیں لہٰذا مذہبی آدمی کا یقین معجزات پر اور ہیوم کا یقین قوانین فطرت پر (جس کا نتیجہ معجزات کا عدم یقین ہے) منطق کی نگاہ میں دونوں بالکل یکساں حیثیت رکھتے ہیں دونوں صورتوں میں یقین نفسیاتی علت پر مبنی ہے اور کسی صورت میں بھی کوئی منطقی علت ہیوم نہیں پیش کر سکتا۔''

جب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ یقین کی ماہیت صرف ایک طرح کا غیر منطقی میلان نفسی ہے تو اس کے اسباب کی جستجو منطق و فلسفہ کے دلائل میں بے سود ہے، منطقی یا فلسفیانہ دلائل زیادہ سے زیادہ میلان یقین کی تقویت و تضعیف کا کام دے سکتے ہیں لیکن خود اس میلان کی تخلیق ان کے بس سے باہر ہے یہ میلان بذات خود ایک نفسی حقیقت ہے لہٰذا اس کے اسباب تخلیق کا سراغ نفسیات (علم النفس) ہی کے اوراق میں مل سکتا ہے کم و بیش تمام علمائے نفسیات نے یقین کی ماہیت و اسباب پر بحث کی ہے لیکن ہمارے لیے یہاں علم النفس عام تفصیل طلب طرز بحث سے ہٹ کر کسی قدر مختلف اور مختصر راہ زیادہ مناسب ہوگی۔

نفسیات یقین

البتہ بنیاد بحث کے لیے استناداً کسی معتبر شہادت کا سامنے رکھنا ضروری ہے، جس کے لیے عہد حاضر میں امریکہ کے سب سے بڑے استاد نفسیات پروفیسر ولیم جیمس کا نام مستند ترین ضمانت ہو سکتا ہے، اس لیے پہلے ہم پروفیسر موصوف کی کتاب ''اصول نفسیات'' کے باب احساس حقیقت (جلد دوم) سے اسباب یقین کے متعلق چند اصولی باتیں بلفظہٖ نقل کرتے ہیں۔

① ''معالجات (تدابیر شفا طلبی) کے بارے میں انسان کی زود اعتقادی اسی قسم کے نفسی اسباب یعنی جذباتی (احوال) پر مبنی ہے، حتی کہ جب کوئی محبوب و عزیز شخص خطرناک بیماری یا تکلیف میں مبتلا ہو تو ناگوار سے ناگوار شے بھی زود اعتقادی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی (خصوصاً عورتوں کے لیے) جس شے میں کچھ بھی امید و شفا ہو اس کے کرنے سے تسلی حاصل ہوتی ہے لہٰذا جو علاج بھی ایسی حالت میں تجویز کیا جائے وہ آتش گیر مادہ کے لیے چنگاری کا کام دیتا ہے، طبیعت فوراً اس پر عمل کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے، آدمی اس علاج کا سامان کرتا ہے اور کم از کم ایک دن کے لیے اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ خطرہ جاتا رہا لہٰذا معلوم ہوا کہ یقین آفرینی کے بڑے اسباب امید و بیم وغیرہ کے جذبات ہیں جن کے احاطہ اقتدار میں ماضی مستقبل اور حال تینوں داخل ہیں۔'' [1]

اس کے بعد دوسرے صفحہ پر ہے کہ

[1] اصول نفسیات، ج ۲، ص: ۳۱۰، ۳۱۱۔

② ''سب سے زیادہ یقین آفرین وہ نظریہ ہوتا ہے جو ہمارے محسوسات کی تشفی بخش توجیہ کے علاوہ ایسی چیزیں ہمارے سامنے پیش کرتا ہو جو سب سے زیادہ دلچسپ ہوں اور جو ہمارے حاسہ جمال پرستی اور جذباتی و عملی ضروریات کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہوں۔''

لیکن ہم کو یہاں نفسیات یقین کے متعلق اصل میں جس مختصر متن کی شرح کرنی ہے وہ یہ ہے کہ

③ ''ارادہ (خواہش) اور یقین (جس کے معنی نفس اور اشیاء کے مابین ایک خاص تعلق کے ہیں) ایک ہی نفسیاتی واقعہ کے دو نام ہیں۔'' [1]

خواہش یقین

ارادہ اور یقین کے ایک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے یقین کے لیے لازمی ہے کہ پہلے دل میں اس کے یقین کا ارادہ یا خواہش پیدا ہو یقین ایک قسم کی تشفی ہے جب تک اس کے لیے طلب و تشنگی نہ موجود ہو یہ نہیں حاصل ہوتا، پانی پینے اور اس سے سیراب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے پیاس لگے لیکن اکثر پیاس لگنا ہی پانی پی لینے کے لیے کافی نہیں ہوتا بلکہ شرط یہ ہے کہ اس کے پینے سے کوئی روکنے والا خیال موجود نہ ہو، مثلاً: پانی کا دشمن کے ہاتھ سے ملنا، اس کی ناپاکی کا شبہ یا کسی بیماری کے لیے اس کے مضر ہونے کا اندیشہ اسی طرح نفس پیاس کے علاوہ کبھی کبھی ترغیبات کی موجودگی بھی پانی پینے پر آمادہ کر دیتی ہے، مثلاً: گرمی کے موسم میں کسی دوست کے یہاں صفائی و نفاست کے ساتھ کوری کوری صراحیوں میں ٹھنڈا پانی رکھا ہوا اور ان کے آس پاس لکھنؤ کے نازک کاغذی آبخورے چنے ہوں تو بے پیاس کے پیاس لگ آتی ہے۔

موانع و مؤیدات یقین

یقین کی صورت میں ہم ان دونوں چیزوں کو علی الترتیب خواہش یقین کے موانع اور مؤیدات سے تعبیر کریں گے، جب کوئی چیز یقین و اذعان کے لیے پیش کی جاتی ہے تو خواہش اور اس کے موانع و مؤیدات میں باہم ایک نفسی معرکہ آرائی ہوتی ہے اور یقین یا عدم یقین کا فیصلہ اس معرکہ آرائی کے آخری نتیجہ پر منحصر ہوتا ہے اگر خواہش یقین زیادہ قوی ہے تو وہ بلا مؤیدات کی اعانت کے موانع پر غالب آ جاتی ہے اگر موانع زیادہ قوی ہیں تو وہ خواہش کو مغلوب کر دیتے ہیں اگر موانع سرے سے نہیں موجود ہیں تو تنہا خواہش کافی ہو سکتی ہے یا اگر موانع بہت ہی معمولی درجہ کے ہیں تو ضعیف سے ضعیف خواہش بھی اپنے مؤیدات کی مدد سے ان کو زیر کر لے گی۔ عقلی یا منطقی دلائل کو زیادہ سے زیادہ انہی موانع و مؤیدات کی صف میں جگہ مل سکتی ہے لیکن اصل یہ ہے کہ اس معرکہ کے تینوں (خواہش) موانع اور مؤیدات پہلوانوں کا اصلی حربہ جذبات ہی ہوتے ہیں۔

اب اوپر اقتباس اول میں جیمس نے جو مثال دی ہے، اس کو سامنے رکھ کر دیکھو کہ یقین کے پیدا کرنے

---

[1] ایضاً، ص: ۳۲۱۔

میں خواہش وارادہ کو کیا دخل ہے اور مؤیدات وموانع کا اس پر کیا اثر پڑتا ہے؟

فرض کرو کہ زید کے گھر میں ایک شخص مہینوں سے مریض پڑا ہے، طبی علاج کوئی کارگر نہیں ہوتا، ایک دوست آکر کہتا ہے کہ شہر میں ایک متقی پرہیز گار اور بے طمع بزرگ ہیں جن کی دعا سے بہتوں کو فائدہ ہوا ہے تم بھی انہی کی طرف کیوں نہ رجوع کرو۔ ظاہر ہے کہ زید کے دل میں اس مریض کے لیے شفا طلبی کی خواہش موجود ہے، اب اگر اس کو بزرگوں سے بدعقیدگی (مانع) نہیں ہے، تو بے تکلف دوست کے مشورہ پر عمل کے لیے آمادہ ہو جائے گا اور طبیعت میں کم از کم کچھ دیر کے لیے شفا کی ایک امید بندھ جائے گی، جس کا نام میلان یقین ہے، اب بزرگ موصوف کے پاس پہنچ کر وہ دیکھتا ہے، کہ اہل حاجت کا میلہ لگا ہوا ہے، پھر ان کے اتقا اور بے لوثی کی کچھ مثالیں آنکھ کے سامنے آتی ہیں، لازماً ان چیزوں سے زید کے میلان یقین کی اور تائید و تقویت ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس کو بزرگوں سے بدعقیدگی ہے، وہ نہایت سخت ملحد و مادہ پرست ہے، تو ایسی حالت میں وہ دوست کے مشورہ پر عمل کرنے کی جگہ الٹے اس سے طرح طرح کی بحثیں کرنے پر آمادہ ہو جائے گا، دعا کے اثر کو قانون فطرت کے منافی بتائے گا، اس کی شہادت پر جرح کرے گا، جو لوگ ان بزرگ کے پاس حاجت لے کر جاتے ہیں، ان کو اوہام پرست کہے گا اور اپنے اندر کوئی میلانِ یقین نہ محسوس کرے گا۔

البتہ اگر یہی مادہ پرست و بدعقیدہ زید ایک دولت مند آدمی ہے، مریض خود اس کا اکلوتا، نوجوان اور ہونہار لڑکا ہے جو اس کی دولت کا تنہا وارث اور خاندان کا ایک ہی چراغ ہے جس مرض میں اپنے بوڑھے باپ کی تمام امیدوں اور آرزوؤں کا یہ مرکز مبتلا ہے وہ نہایت خطرناک ہے، ڈاکٹر اور اطبا علاج کرتے کرتے تھک گئے اور جواب دے چکے ہیں ان حالات میں زید کی خواہش شفا طلبی جس درجہ قوی ہوگی، معلوم ہے، انہی مواقع کے لیے کہا جاتا ہے کہ مصیبت میں خدا یاد آتا ہے، اب زید کی ساری بدعقیدگی دھری رہ جائے گی، دوست کا مشورہ اس کی مایوسیوں میں امید کی ایک جھلک ثابت ہوگا، اس کی انتہائی طلب و تشنگی، الحاد و مادہ پرستی کے تمام دلائل و موانع پر غالب آئے گی اور وہ بلا بحث و حجت دوست کے ساتھ ہو جائے گا اور جتنی ہی زیادہ اس کی خواہش قوی ہوگی، اتنی ہی زیادہ امید و یقین کے ساتھ یہ ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ لیکن اگر زید کے الحاد و بدعقیدگی کا جذبہ اتنا زبردست ہے کہ وہ اس کی قوی سے قوی خواہش شفا طلبی کو بھی زیر کر سکتا ہے تو بڑے سے بڑے بزرگ کی بزرگی بھی بیکار ثابت ہوگی اور دوست کی جانب سے دعا کی شفا بخشی کے دلائل و شواہد کا اگر انبار بھی لگا دیا جائے تو رائیگاں جائے گا ﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۷) میں غالباً اسی حقیقت کی جانب اشارہ ہے ایمان و یقین کا حاسہ قلب ہے اگر وہ مختوم ہے تو پھر عقل انسانی کی کوئی منطق اس مختومیت کا ازالہ نہیں کر سکتی۔ ساحروں کے دل میں ذوق ایمان کی کچھ نہ کچھ تشنگی موجود تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر بے اختیار سر بسجود ہو گئے اور پکار اٹھے ﴿ اٰمَنَّا بِرَبِّ

هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۷۰) لیکن کیا فرعون کے معاند و مختوم قلب پر بھی کوئی معجزہ اثر کر سکا؟ انبیائے کرام علیہم السلام خصوصاً سید الانبیاء ﷺ کی حیات طیبہ تمہارے سامنے ہے "سیرۃ النبی ﷺ" میں ابتدائی قبول اسلام کے صفحات پڑھو ہر سطر ذوق ایمان وطلب یقین کے مذکورہ بالا نفسی حقائق سے معمور ملے گی۔

نفسیات یقین کی شہادت واقعاتِ سیرت سے

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کا واقعہ یہ ہے کہ وہ بت پرستی سے متنفر ہو چکے تھے اور حق کی تلاش میں تھے، انہوں نے اپنے بھائی (انیس) سے کہا کہ تم مکہ جاؤ اور دیکھو کہ یہ شخص آنحضرت ﷺ جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، اس کی تعلیم وتلقین کیا ہے؟ انیس مکہ آئے اور واپس جا کر بیان کیا کہ وہ مکارم اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور جو کلام پیش کرتا ہے وہ شاعری سے الگ ہے۔ ان مؤیدات یقین کے بعد حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ خود مکہ گئے اور گو اس وقت مکہ کی سرزمین پر اعلان اسلام کے لیے نہایت خطرناک موانع موجود تھے، تاہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری کے بعد ذوقِ ایمان کی تشفی نے اتنا جوش پیدا کر دیا کہ عین حرم کے اندر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے نہایت بلند آہنگی سے اعلان کر کے کہا کہ (**اشهد ان لااله الا اللّٰه واشهد ان محمدا عبده ورسوله**) اس اعلان کی بدولت جان بچنی مشکل ہو گئی۔ ❶

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ سے خاص محبت تھی، آپ سے صرف دو تین برس بڑے تھے اور ساتھ کھیلے تھے وہ گو ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے لیکن آپ کی ہر ادا کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے، دل میں نور حق موجود تھا، بالآخر ان بے رحمانہ ایذاؤں نے جو دشمنانِ اسلام آنحضرت ﷺ کو پہنچاتے تھے، اظہار اسلام پر بے تاب کر دیا۔ اظہار تو کر دیا لیکن گھر پر آئے تو متردد تھے کہ "آبائی دین کو دفعتہً کیونکر چھوڑ دوں تمام دن سوچتے رہے آخر غور وفکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ دین حق یہی ہے۔" ❷ موانع یقین موجود تھے لیکن دین حق کے قبول اور اس کے داعی کی حمایت کا جذبہ ان موانع سے قوی تر تھا۔ قیصر روم کے پاس جس وقت داعی اسلام ﷺ کا نامہ مبارک پہنچا اور قیصر و ابوسفیان میں باہم جو گفتگو ہوئی اس کے بعد گو قیصر کے ضمیر میں ایمان واذعان کی روشنی پیدا ہوئی اور اس نے کہا کہ مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا میں اگر وہاں جا سکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا، لیکن قیصر نے ابوسفیان سے جو گفتگو کی تھی اس سے بطارقہ اور اہل دربار سخت برہم ہو چکے تھے نامۂ مبارک پڑھے جانے کے بعد اور بھی برہم ہوئے یہ حالت دیکھ کر قیصر نے اہل عرب کو دربار سے اٹھا دیا اور گو اس کے دل میں نور ایمان آ چکا تھا لیکن تاج وتخت کی تاریکی میں وہ روشنی بجھ کر رہ گئی۔ ❸ تخت وتاج کی حرص دولت ایمان کی ترغیب سے قوی تر

❶ یہ پورا واقعہ پڑھنے کے لائق ہے، دیکھو سیرۃ النبی ﷺ طبع ہٰذا ج دوم، ص: ۴۲۴۔

❷ سیرۃ النبی ﷺ طبع ہٰذا جلد اول، ص: ۱۶۸۔ ❸ ایضاً پورا مکالمہ پڑھو۔

ثابت ہوئی۔

خسرو پرویز کے تاریک دل میں قیصر روم کے برابر بھی ایمان کی روشنی نہ تھی، اس پر طرہ یہ ہوا کہ عجم کا طریقہ یہ تھا کہ سلاطین کو جو خطوط لکھتے تھے، ان میں عنوان پر پہلے بادشاہ کا نام ہوتا تھا، بخلاف اس کے نامہ مبارک پر پہلے خدا کا نام اور پھر عرب کے دستور کے موافق رسول اللہ ﷺ کا نام تھا، خسرو نے اس کو اپنی تحقیر سمجھا اور بولا کہ میرا غلام ہو کر مجھ کو یوں لکھتا ہے پھر نامۂ مبارک چاک کر ڈالا۔ لیکن چند روز کے بعد خود سلطنت عجم کے پرزے اڑے۔ [1] اسی قسم کے واقعات کی بنا پر مصنف سیرت نے اوائل دعوت میں اسلام لانے والوں اور ان کے مخالفین کے جو مشترک خصائص گنائے ہیں، ان سے بھی تمام تریقین کے انہی اصول و اسباب کی تائید ہوتی ہے، جو اوپر بیان ہوئے ہیں، تفصیل کے لیے خود سیرت (جلد اول) کی طرف رجوع کرنا چاہیے یہاں اختصار کے ساتھ صرف ضروری خلاصہ کا اعادہ کیا جاتا ہے۔

اسلام لانے والوں کے خصائص مشترک۔

① اکثر وہ لوگ اسلام لائے جو پہلے سے تلاشِ حق میں سرگرداں اور فطرۃً نیک طبع و پاکیزہ اخلاق تھے، حضرت ابوبکر، حضرت صہیب اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہم وغیرہ کا شمار انہی طالبانِ حق میں ہے۔ (خواہش یقین)

② بعض صحابہ ایسے تھے جو احناف کے تربیت یافتہ تھے، یعنی وہ لوگ جو زمانۂ اسلام سے پہلے بت پرستی ترک کر چکے تھے اور اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کا پیرو کہتے تھے۔ (موانع یقین کی کمی)

③ یہ امر سب میں مشترک تھا کہ یہ لوگ قریش کے مناصب اعظم میں سے کوئی منصب نہیں رکھتے تھے بلکہ اکثر ایسے تھے، مثلاً: عمار، خباب، ابوفکیہ، صہیب رضی اللہ عنہم وغیرہ جن کو دولت و جاہ کے دربار میں جگہ بھی نہیں مل سکتی تھی (موانع کی کمی)

قریش سے بڑھ کر اسلام کا کون دشمن ہوگا لیکن ان کی دشمنی کے کیا اسباب تھے؟

① مکہ کی جو عزت تھی کعبہ کی وجہ سے تھی قریش ہمسایگان خدا بلکہ آل اللہ یعنی خاندان الٰہی کہلاتے تھے جس کی صرف یہ وجہ تھی کہ وہ کعبہ کے مجاور وکلید بردار تھے۔ عرب ایک مدت سے بت پرستی میں مبتلا تھا، خلیل بت شکن کی یادگار (کعبہ) تین سو ساٹھ معبودوں سے مزین تھی۔

اسلام کا اصلی فرض اس طلسم کو برباد کر دینا تھا لیکن اس کے ساتھ قریش کی عظمت واقتدار اور عالم گیر اثر کا بھی خاتمہ تھا، اس لیے قریش نے شدت سے مخالفت کی اور ان میں جن لوگوں کو جس قدر زیادہ نقصان کا اندیشہ تھا، اسی قدر وہ مخالفت میں سرگرم تھے۔

② قریش کو عیسائیوں سے بالطبع نفرت تھی لیکن اسلام اور عیسائیت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں سب سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانہ میں اسلام کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ ان اسباب سے قریش کو خیال ہوا کہ

[1] سیرۃ النبی ﷺ جلد اول۔

آنحضرت ﷺ عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

③ ایک بڑا سبب قبائل کی خاندانی رقابت تھی۔قریش میں دو قبیلے نہایت ممتاز اور حریف یکدگر تھے، بنوہاشم اور بنوامیہ۔آنحضرت ﷺ کی نبوت کو خاندان بنوامیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتے تھے، اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرت ﷺ کی مخالفت کی۔

④ ایک اور بڑا سبب یہ تھا کہ قریش میں سخت بداخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں، بڑے بڑے ارباب اقتدار نہایت ذلیل بداخلاقیوں کے مرتکب تھے، ابولہب نے حرم محترم کا غزال زریں چرا کر بیچ ڈالا تھا، اخنس بن شریق نمام وکذاب تھا، نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی، آنحضرت ﷺ ایک طرف بت پرستی کی برائیاں بیان فرماتے تھے، دوسری طرف ان بداخلاقیوں پر سخت دار گیر کرتے تھے، جس سے ان کی عظمت واقتدار کی شہنشاہی متزلزل ہوتی جاتی تھی، قرآن مجید میں پیہم علانیہ ان بدکاروں کی شان میں آیتیں نازل ہوتی تھیں۔

غرض اولاً تو ان قریش میں ایمان ویقین کی خواہش کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ثانیاً اگر نفس خواہش کچھ موجود بھی ہوتی تو مذکورہ بالا موانع اس قدر زبردست تھے کہ جب تک یہ نہ ہٹا دیے جاتے، اس خواہش کا ظہور ناممکن تھا۔

یقین کے متعلق اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ ٹھہرتا ہے کہ

① بذات خود یقین عام انسانی جذبات واحساسات ہی کی طرح کا ایک نفسی میلان یا ذہنی کیفیت ہے فلسفہ وحکمت، بلکہ ریاضی تک کے منطقی دلائل سے جو یقین پیدا ہوتا ہے اس کی ماہیت بھی اس نفسی میلان سے زیادہ میلان نہیں ہے۔

② یقین کی بنیاد عقلی ونقلی تمام چیزوں میں یقین کی نفس خواہش اور پھر اس خواہش کے موانع ومؤیدات کا وزن ہے۔

③ ان بنیادی اسباب یقین کی تعمیر تمام تر ان جذبات ومعتقدات اور مزعومات ومفروضات (علوم عقلیہ) سے ہوتی ہے جو کسی شے کے قبول ویقین کو پیش کرنے سے پہلے افراد یا جماعت کے نفس میں جاگزیں ہوتے ہیں۔

لہٰذا اب دیکھنا یہ ہے کہ معجزات کے یقین وقبول کے لیے کس قسم کے معتقدات کی نفس میں پہلے سے موجودگی لازمی ہے۔

غایتِ معجزات

معجزہ منطقی دلیل نہیں

اوپر آغاز کلام میں معجزہ کا جو مفہوم بیان کیا جا چکا ہے، اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ معجزہ نبوت کی کوئی منطقی دلیل نہیں ہے، البتہ جو شخص مذہب کا قائل ہے، غیب پر ایمان رکھتا ہے اور اس سنت الٰہی کا معتقد ہے کہ بندوں

کی ہدایت و راہنمائی کے لیے خدا ان ہی کے اندر سے کسی نہ کسی برگزیدہ بندہ کو اپنے پیام کے ساتھ بھیجتا رہا ہے، اس کے سامنے جب کسی مقدس انسان کی طرف سے اس پیام کے حامل یا نبی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور یہ داعی الی اللہ اپنے ظاہری و باطنی کمالات اخلاقیہ و اوصاف حمیدہ کے لحاظ سے عام انسانوں سے برتر نظر آتا ہے تو اس شخص کے دل میں ایمان کی ایک لہر پیدا ہوتی ہے، اب اگر اس پیغمبر سے کوئی معجزہ نما واقعہ ظاہر ہوتا ہے یا اس کی طرف کسی معجزہ کا انتساب کیا جاتا ہے تو وہ اس کی صداقت کی ایک آیت یا نشانی کا کام دیتا ہے، جس سے ذوق ایمان کی تقویت ہوتی ہے اور اس طرح ایمان کے تشنہ کام نفوس کے لیے ایک معنی کر کے معجزہ براہ راست خود نبوت کی نہیں، البتہ مدعی نبوت کی صداقت کی ایک نفسی دلیل بن جاتا ہے۔

معجزہ کی اصلی غایت

اس دلیل یا آیت کی جو غرض و غایت ہو سکتی ہے اس کی نفسی حقیقت کو یوں سمجھو کہ مذہب کی بنیاد تمام تر اسرار و غیوب پر ہے، سب سے بڑا سر یا غیب بلکہ غیب الغیوب خود خدا کا وجود اور اس کی ذات ہے، حشر و نشر، جن و ملک، وحی و الہام تمام چیزیں ایک عالم غیب ہیں، نبوت نام ہے اسی عالم غیب کے ساتھ روابط و علائق کا، معجزہ میں بھی چونکہ ایک طرح کا غیب پایا جاتا ہے یعنی وہ عالم ظاہری کے سلسلۂ علل و اسباب سے الگ معلوم ہوتا ہے، اس لیے جو شخص غیب پر ایمان رکھتا ہے، اس کا نفس قدرتاً اس یقین کی جانب مائل ہو جاتا ہے کہ جس برگزیدہ انسان سے معجزہ ظاہر ہوا ہے وہ عالم غیب سے خاص تعلق رکھتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص سرے سے ایمان نہیں رکھتا یعنی سرے سے خدا اور مذہب ہی کا منکر ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے معجزہ تصدیق نبوت کی نہ کوئی دلیل بن سکتا ہے اور نہ آیت۔ کسی نبی کے صادق یا کاذب ہونے کا تصفیہ تو اس کے بعد کی شے ہے کہ پہلے آدمی کا نفس اس امر کا قائل ہو کہ خدا کا کوئی وجود ہے اور وہ ہدایت خلق کے لیے انبیا کو بھیجتا یا بھیج سکتا ہے جو آدمی نقطۂ خط یا سطح وغیرہ مبادی اقلیدس ہی کا قائل نہیں اس کو تم اقلیدس کی کوئی شکل کیسے سمجھا سکتے ہو جس طرح علوم کی فرعی تفصیلات کے ماننے کے لیے پہلے ان کے مبادی کا ماننا لازمی ہے اسی طرح تفصیلات مذہب پر یقین کرنے کے لیے پہلے نفس مذہب کا یقین ضروری ہے۔

مل نے ہیوم کے انکار معجزات کی تنقیح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> ''جو شخص کسی فوق الفطرت ہستی اور انسانی معاملات میں اس کی مداخلت کا پہلے ہی سے قائل نہیں ہے اس کے سامنے اگر کسی انسان کی نسبت فوق الفطرت یا خارق عادت باتوں کی روایت کی جائے تو وہ ان کو معجزہ نہ مانے گا معجزات سے خود خدا کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکتا اس لیے اگر خدا کا اعتقاد پہلے ہی سے نہ موجود ہو تو کسی فوق الفطرت ہستی کی مداخلت کے علاوہ معجزہ نما واقعات کی اور بھی توجیہات ممکن ہیں، یہاں تک تو ہیوم کی دلیل بامعنی کہی جا سکتی ہے لیکن

اگر ایک ایسی ذات کا وجود قطعی یا غالب طور پر مان لیا جائے جو موجودہ نظام فطرت کی خالق ہے اور اس لیے اس میں تغیر و ترمیم بھی کر سکتی ہے تو ہیوم کی دلیل بے معنی ہو جاتی ہے جب تم نے خدا کو مان لیا تو پھر جس شے کو اس کے ارادہ نے پیدا کیا تھا اس پر اس ارادہ کا براہ راست عمل واثر خوانخواہ کا فرض نہیں رہتا بلکہ ایک سنجیدہ ''امکان'' بن جاتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں سوال کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے اور خدا کی مداخلت یا عدم مداخلت کا فیصلہ اس بحث پر ٹھہرتا ہے کہ کائنات فطرت میں اس کی سنتِ عمل کیا رہی ہے یا عقلاً کیا رہنا چاہیے۔'' [1]

غرض معجزہ کو معجزہ سمجھ کر اس کے یقین وقبول کی اولین شرط یہ ہے کہ آدمی پہلے غیب (خدا اور مذہب) پر ایمان رکھتا ہو اس کے بعد دیکھو کہ معجزہ کی مذکورۂ بالا غایت اور اس پر یقین کی اولین شرط کو پیش نظر رکھ کر وقوع معجزہ کی مختلف صورتیں یا توجیہات کیا ہو سکتی ہیں جزئی شقوق یا فرعی احتمالات سے قطع نظر کر کے جن سے قدیم وجدید علم کلام کا دفتر پر ہے، اصولی طور پر صرف وہی دو صورتیں نکلتی ہیں جن کی جانب مل نے اقتباس بالا میں اشارہ کیا ہے۔

پہلی صورت: یہ ہے کہ خدا نے کارخانۂ عالم چلانے کے لیے کچھ اصول وقوانین مقرر کر دیئے ہیں جن کے مطابق اس کل کا ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ پر کام کرتا رہتا ہے اور ارادۂ الٰہی اپنی اس سنت جاریہ میں کبھی کسی حالت میں تغیر وتبدل نہیں کرتا بقول اسپنوزا کے کہ ''خدا کی خدائی اور اس کی حقیقی عظمت وحکمت کا اظہار اسی سے ہوتا ہے کہ عالم ایک بندھے ہوئے غیر متغیر نظام کا پابند ہو قدرت خداوندی کے معنی یہی ہیں کہ کارخانۂ فطرت اپنے ازلی یا اٹل قوانین کا تابع ہے۔ [2]

اس احتمال کی رو سے معجزہ کا وقوع بھی انہی ازلی قوانین کی کسی نہ کسی ایسی کارفرمائی کے ماتحت ہونا چاہیے جس کا کم از کم ظہور معجزہ کے وقت عام لوگوں کو علم نہیں ہوتا اور اس لیے معجزہ جو دراصل محض ایک فطری واقعہ ہوتا ہے بظاہر لوگوں کو معجزہ نظر آتا ہے مثلاً: جس وقت تک عمل تنویم کے نفسی قوانین فطرت کا انکشاف نہیں ہوا تھا عصائے موسیٰ کا اژدہا بن جانا معجزہ تھا لیکن آج اس نفسی قانون کے جاننے والوں کے لیے کرسی کا شیر بن جانا فطری واقعہ ہے اور عصائے موسیٰ کے اژدہا نظر آنے کی بھی اس سے توجیہ کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس توجیہ سے یہ کسی طرح نہیں نکلتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں یہ واقعہ معجزہ نہ تھا، اس لیے کہ اس زمانہ تک

---

[1] دیکھو Three Essays on Religion (مذہب پر تین مضامین) مطبوعہ ایشیاٹک پریس ص: ۹۸ نیز نظام منطق کتاب سوم باب ۲۵ فصل ۲، اسی میں مل نے ایک اور غلط فہمی کا بھی ازالہ کیا ہے وہ یہ کہ خدا کو مان لینے کے بعد معجزہ کو قانون فطرت کا سرے سے خارق ہی نہیں کہا جا سکتا پتھر کو اوپر پھینکو اور کوئی شے بیچ میں مانع یا عائق نہ ہو تو اس صورت میں اس کا زمین پر لوٹ کر نہ گرنا یا ہوا میں معلق رہنا بے شک خلاف فطرت ہوگا لیکن اگر اس کو بیچ میں کوئی روک لے تو زمین پر نہ گرنا بالکل خارق عادت نہ ہوگا کیونکہ مانع موجود ہے معجزہ کی صورت میں جو ارادۂ خداوندی معمولی سلسلۂ علل واسباب کا خالق ہے وہی اس کے عمل سے مانع ہو جاتا ہے لہٰذا معجزہ نہ خلاف فطرت ہے اور نہ بلا علت کیونکہ عمل علت کی شرط تو یہ ہے کہ کوئی مانع نہ موجود ہو اور یہاں موجود ہے۔

[2] اسپنوزا جدید فلسفہ کا ایک نامور امام ہے دیکھو اس کا مجموعہ تصنیفات Spinosa's Work جلد اول سباب ۶ بحث معجزات۔

معجزہ کی وہ غایت جس کا ابھی اوپر ذکر آ چکا ہے اس واقعہ سے پوری طرح حاصل تھی یعنی اس میں ایک طرح کا غیب پایا جاتا تھا اور اس کا وقوع عالم ظاہری کے سلسلہ علل واسباب سے الگ معلوم ہوتا تھا، لہٰذا اس سے نبی کی تصدیق کا (جو عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے) نفس میں میلان پیدا ہوسکتا تھا جیسا کہ ساحروں کے نفس میں پیدا ہوا، انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نبی ہونے کی تصدیق کی۔ البتہ آج یہ واقعہ البرٹ مول یا ولیم جیمس کے سامنے بیان کیا جائے تو وہ اس کو بجائے معجزہ کے صرف ایک فطری واقعہ سمجھنے کا حق رکھتے ہیں اس لیے اب اگر کوئی نبی یا ولی اپنی نبوت یا ولایت کی تصدیق کا میلان کسی معجزہ یا کرامت کے ذریعہ سے مول اور جیمس وغیرہ کے دل میں پیدا کرنا چاہے تو کوئی ایسی نشانی ظاہر کرنا ہوگی جس کی توجیہ سے ان کا موجودہ علم اسی طرح عاجز ہو جس طرح کہ انبیائے سابقین کے زمانہ میں ان کے معجزات کی توجیہ سے اس وقت کا علم عاجز تھا یا بعض کی توجیہ سے اب بھی عاجز ہے، مثلاً: شق قمر لیکن اصل یہ ہے کہ عمل تنویم کے تجربات میں اگر تھوڑی سی قیاسی وسعت اور پیدا کر لی جائے تو شق قمر وغیرہ تقریباً ہر قسم کے خوارق کی توجیہ ہوسکتی ہے۔ کیونکہ اس عمل کا دارومدار تمامتر عامل کی قوت اثر آفرینی اور معمول کی اثر پذیری پر ہے، یہ نفسی تاثیر و تاثر کم وبیش ہر انسان میں موجود ہے جس کی ادنیٰ مثالیں ہم کو روزانہ کی معمولی زندگی میں ملتی رہتی ہیں، ہماری زبان کی ایک عامیانہ مثل ہے کہ ''خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔'' جس کے یہی معنی ہیں کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کے اوضاع واطوار سے اثر پذیر ہوتا ہے، نیک صحبت کے فوائد اور بری صحبت کے مضار کا بھید یہی نامحسوس تاثر ہے، جس قدر کسی شخص کی قوت ارادی یا قوت تاثیر زبردست ہوتی ہے اسی قدر زیادہ دوسروں پر اثر ڈال سکتا ہے۔ دنیا کے اکابر رجال کی کامیابی کا ایک بڑا راز یہی قوت رہی ہے ان کے صرف کہنے کا لوگوں پر جو اثر پڑتا ہے وہ دوسروں کے دلائل وبراہین کا نہیں پڑتا، اس کی بہترین زندہ مثال گاندھی جی ہیں، انہوں نے جس درجہ کے امرا واعیان ملک سے چرخہ کتوالیا ہے اور اپنی سیدھی سادی گفتگو اور تحریروں سے جس طرح اس کی خوبیوں کا یقین ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دل میں پیدا کر دیا ہے وہ بڑی حد تک اسی قوت کا کرشمہ ہے ورنہ ملک میں ان سے زبردست خطیب، انشا پرداز اور منطقی سینکڑوں ملیں گے لیکن اثر آفرینی کا یہ سحر وجادو کسی کی تقریر، کسی کی تحریر اور کسی کے دلائل میں نہیں ملتا، غرض اثر آفرینی [1] کی یہی قوت ہے جس کو عامل تنویم عشق سے بڑھا کر کرسی کو شیر اور جھاڑو کو حسین عورت بنادے سکتا ہے۔

ان واقعات کی بنا پر ہم کو یقیناً اپنے قیاس میں اتنی توسیع کا حق حاصل ہے کہ ماہرین تنویم یا عام اکابر رجال ومصلحین کی قوت آثر آفرینی کے مقابلہ میں انبیائے کرام علیہم السلام کی وہبی وروحانی قوت تاثیر ونفوذ کا

---

[1] انگریزی میں اثر آفرینی کے لیے (Suggestion) کی اصطلاح ہے جس کی پوری حقیقت کو تجربات اور مثالوں سے سمجھنے کے لیے انگریزی دان حضرات ڈاکٹر سیڈس کی دلچسپ کتاب ''نفسیات اثر آفرینی'' The Psychology of suggestion کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

مرتبہ کہیں زیادہ اعلیٰ وارفع ہوتا ہے اور اس لیے وہ ان سے بھی بدرجہا زیادہ عجیب تر و محیر العقول امور کا یقین لوگوں کے دل میں پیدا کر دے سکتے ہیں، عامل تنویم اثر آفرینی کے لیے کچھ نہ کچھ ظاہری حرکات وسکنات یا الفاظ وخطاب کا محتاج ہوتا ہے اور اس کا زیادہ تر اثر افراد تک محدود رہتا ہے لیکن نبی کی اعلیٰ اور روحانی قوت تاثیر کے لیے صرف باطنی ارادہ کافی ہوسکتا ہے اور اس کا اثر افراد سے بڑھ کر جماعت تک کو محیط ہوسکتا ہے۔

البتہ یہاں ایک وسوسہ دل میں پیدا ہوگا جس کا دور کر لینا ضروری ہے وہ یہ کہ معجزہ کی اس توجیہ کو قبول کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کی حقیقت ایک طرح کے سحر، نظر بندی یا فریب حواس سے زیادہ نہیں ہے یعنی جس شخص کو کوئی معجزہ نظر آتا ہے اس کا وجود خود اس شخص کی نظر، حواس یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ ذہن سے باہر کسی خارجی و حقیقی شے کی صورت میں نہیں ہوتا۔

بعض وسوسوں کا جواب

اوپر معجزہ کی جو غایت معلوم ہو چکی ہے، اس کے لحاظ سے اس وسوسہ کا صاف جواب تو یہ ہوگا کہ وہ غایت ہر نوع حاصل ہے، معجزہ فی نفسہ چاہے کوئی خارجی شے ہو یا محض ذہنی، اصلی غرض صرف اتنی ہے کہ جس فرد یا جماعت کے سامنے کوئی معجزہ پیش کیا جائے، اس کے علم کے لحاظ سے وہ اپنے اندر کچھ نہ کچھ غیب رکھتا ہو، ہاں بظاہر اس سے بھی ایک اور قوی تر اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں پھر نبی اور عالم تنویم یا ساحر میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ اس اشکال کا حل بھی ضمناً اوپر ہی گزر چکا ہے کہ معجزہ بجائے خود نبوت کی کوئی منطقی دلیل نہیں ہے بلکہ جس شخص میں ظاہری و باطنی کمالات یعنی اصل خصائص نبوت واوصاف حمیدہ عام انسانوں کے مقابلہ میں فوق العادہ حد تک مجتمع ہوتے ہیں اس کے حق میں معجزہ محض تائید مزید کا کام دے سکتا ہے اور جس شخص پر نبوت کے یہ اصلی خصائص وکمالات روحانی مؤثر نہ ہوں وہ بلاشبہ نبی کو بھی زیادہ سے زیادہ ایک بڑا ساحر قرار دے گا جیسا کہ منکرین نے ہمیشہ کہا ہے کہ ﴿ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴾ (۳۸/ ص:٤) ﴿ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴾ (۲٦/ الشعراء:۳٤) ﴿ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ (۲۷/ النمل:۱۳) ﴿ وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ﴾ (٥٤/ القمر:۲) [1]

[1] متکلمین اسلام کے ہاں سحر و معجزہ کی بحث ایک مستقل مسئلہ ہے لیکن ان میں بھی اہل تحقیق کا مسلک یہی ہے کہ دونوں میں کوئی نوعی فرق نہیں ہے بعضوں کے نزدیک تو محض استعمال کا فرق ہے یعنی انبیا اور اولیا اپنے نفس کی قوت معجز نمائی کو مقاصدِ خیر کے لیے استعمال کرتے ہیں اور ساحر مقاصد شر کے لیے سفینة الراغب، ص: ۱۱۸۔ مولانا حمید الدین فراہی جن سے بڑھ کر موجودہ دنیائے اسلام میں شاید ہی کسی کو فہم قرآن کی سعادت حاصل ہو وہ بھی ﴿لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ﴾ (۱۰/ یونس:۷۷) سے یہی نتیجہ اخذ فرماتے ہیں کہ معجزہ اور سحر میں صرف یہ فرق ہے کہ ساحر فلاح یاب نہیں ہوتا یعنی وہ اپنی قوت سحر کو خود اپنے یا دوسروں کے لیے فلاح وخیر کے اغراض میں استعمال نہیں کرتا بلکہ علی العموم جادوگروں کی اخلاقی حالت نہایت پست ہوتی ہے۔ لیکن ﴿ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:٦۹) کی نص قرآنی کا زیادہ صاف و صحیح مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ساحر کا سحر جب نبی اور اس کے معجزہ کے مقابلہ میں آتا ہے تو وہ مغلوب و ناکام رہتا ہے جیسا کہ عصائے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ظاہر ہوا۔ اس سے سحر و معجزہ میں جب کہ دونوں میں مقابلہ ہو ظاہری فرق وتمیز کا بھی ایک یقینی معیار ہاتھ آجاتا ہے باقی دونوں کی باطنی حقیقت میں کیا فرق ہے یہ تو فن سحر کا عالم ہی جان سکتا ہے جیسا کہ تمام فنی حقائق میں معلوم ہوتا ہے اور جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مدمقابل ساحروں نے فرق جان لیا تھا۔

لیکن اس وسوسہ کا (کہ توجیہ بالا کی بنا پر معجزہ کی حقیقت کسی خارجی و واقعی وجود کی جگہ محض ایک ذہنی یا خیالی وہم کی رہ جاتی ہے) تحقیقی جواب دراصل مابعد الطبیعیات سے متعلق ہے جو تمام عقلی موشگافیوں کی آخری عدالت مرافعہ ہے مگر اس عدالت کا آخری فیصلہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ حقیقی یا واقعی وجود صرف خارجی چیزوں کا ہے بلکہ اس کے نزدیک تو یہی امر سرے سے مشتبہ ہے کہ خود خارج کا کوئی وجود ہے اور اساطینِ فلسفہ کی ایک بڑی جماعت (تصوریہ) کا مسلک یہ ہے کہ ''عالم تمام حلقہ دام خیال ہے۔'' حقیقی وجود صرف روح، ذہن یا نفس کا ہے باقی دریا پہاڑ، چاند، سورج زمین و آسمان جو کچھ دیکھتے ہو یہ سب تمہارے ذہن ہی کے اندر ہیں مادہ اور عالم مادی محض ایک ''وہم و گمان ہے۔'' [1] اس جماعت نے عالم خارجی کی ایک توجیہ یہ کی ہے کہ جن چیزوں کو ہم موجوداتِ خارجی سمجھتے ہیں وہ صرف ذہن کے تصورات ہیں جو خدا ہمارے اندر پیدا کر دیتا ہے اسی راز کی طرف اکبر مرحوم نے باتوں باتوں میں اس طرح اشارہ کیا ہے کہ ''جو کچھ ہے سب خدا کا وہم و گمان ہمارا'' لہٰذا جس ذات یا قوت نے سارے ذہن میں عصائے موسوی اور ثابت و مسلم قمر کا تصور پیدا کیا تھا اسی نے اگر تھوڑی دیر کے لیے عصا کی جگہ اژدہا اور قمر مسلم کی جگہ شق قمر کا تصور پیدا کر دیا تو دونوں کے وجود کی حقیقت و نوعیت میں کیا فرق پڑا۔ سائنس جس کا جذبہ مادہ پرستی دلائل سے لا جواب اور خود مادہ کو غیر مادی و غیر جوہری کہنے کے باوجود مادیات کے وجود خارجی سے یک قلم دست برداری پر راضی نہیں اور اس تار عنکبوت میں کسی نہ کسی طرح الجھا رہنا ہی پسند کرتا ہے وہ بھی کم از کم محسوسات کی نسبت تو یہ ماننے پر مجبور ہی ہے کہ رنگ و بو، آواز و مزہ، سردی و گرمی وغیرہ کا وجود صرف ایک ذہنی احساس یا تصور ہے جس کو مادہ نامی کوئی ''نامعلوم شے'' ہمارے ذہن میں خلق کر دیتی ہے اور جس کا ذہن سے باہر کوئی وجود نہیں جب رنگ اور آواز جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں اس کے حقیقی و واقعی وجود کے صرف اتنے ہی معنی ہیں کہ ہم اس کا احساس و تصور رکھتے ہیں تو پھر کیا ضرورت ہے کہ معجزات کے وجود کو ہم اس سے زیادہ حقیقی و واقعی ثابت کرنے کی کوشش کریں۔

ایک اور اعتراض

یہ تو وہ شبہات تھے جو معجزہ اور سحر و تنویم کی یکسانی یا معجزات کے محض ذہنی وجود کی بنا پر پیدا ہوتے تھے لیکن ایک اور اعتراض معجزہ کی تمام ان توجیہات پر وارد ہوتا ہے جن کی رو سے یہ فطرت کے معمولی یا غیر متغیر قوانین اور علل و اسباب (چاہے وہ نفسی ہوں یا طبعی و مادی) ہی کے کسی نہ کسی ایسے مخفی عمل کا معلول کیا جاتا ہے جس کا ظہور معجزہ کے وقت عام لوگوں کو علم نہیں ہوتا، یہ ایک اعتراض معجزہ کے اضافی ہونے کا ہے فرض کرو کہ

---

[1] مابعد الطبیعیات کے اس نازک مسئلہ کی توضیح کی گنجائش یہاں نہیں نکالی جا سکتی البتہ دورِ جدید میں تصوریت کے بانی اول برکلے کا فلسفہ اردو میں منتقل ہو چکا ہے جو لوگ فلسفہ کا ذوق رکھتے ہیں وہ تو اس کی اصل کتاب ''مکالمات رساوی'' کا مطالعہ کر سکتے ہیں عام لوگ شاید فلسفہ برکلے سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے (مطبوعہ دار المصنفین)۔

شقِ قمر کی علت خواہ تنویم کی طرح کوئی نفسی قانون ہو یا کیمیاوی جذب واتصال کی طرح جو چاند کے مختلف اجزا کو باہم ملحق کیے ہوئے ہے کوئی ایسا مادی قانون دفع وافتراق ہو جس نے چاند کے دو ٹکڑے کر دیے ہوں ان دونوں صورتوں میں شق قمر صرف اسی وقت تک معجزہ ہے جب تک کہ اس کے نفسی یا مادی قوانین وعلل کا انکشاف نہیں ہوتا لاسلکی پیام رسانی کے انکشاف سے پہلے اگر کوئی شخص ہندوستان میں بیٹھ کر ایک سیکنڈ میں امریکہ کا کوئی واقعہ معلوم کر لیتا تو یہ کسی معجزہ سے کم نہ ہوتا لیکن اب معمولی بات ہے۔ بے شبہ اس معنی کر کے معجزہ یقیناً اضافی شے ہے اور ہمیشہ رہے گا کوئی معجزہ ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جو اس احتمال اضافیت سے خالی ہو کیونکہ انسان کا علم ہی تمام تر اضافی ہے اگر اس کا علم قطعی ومختتم طور پر تمام قوانین فطرت کا احاطہ کر سکتا تو البتہ کسی حد تک معجزہ کی نسبت یہ مطالبہ بجا ہو سکتا تھا کہ ابد الآباد تک کسی قانون فطرت سے اس کی توجیہ نہ ہونی چاہیے لیکن جب ہمارا علم ہی اضافی ہے تو کوئی معجزہ احتمال اضافیت سے کیسے خالی ہو سکتا ہے؟ ایک مدعی نبوت یہ اعجاز دکھلا سکتا ہے کہ ایک ہفتہ تک آفتاب غروب نہ ہو لیکن اس کا قطعی یقین کیسے دلایا جا سکتا ہے کہ آگے چل کر علم ہیئت کے اکتشافات سے اس اعجاز کی توجیہ نہ ہو سکے گی؟ لہٰذا جو شے آج معجزہ ہے بالفرض کل وہ طبعی واقعہ ثابت ہو جائے تو بھی اس سے آج اس کے معجزہ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اور معجزہ کی غرض وغایت کو پورا کرنے کے لیے اسی قدر کافی ہے۔ (دیکھو اوپر صفحہ)

دوسری صورت: یہ ہے کہ عام طور پر تو کارخانۂ کائنات ایک مقررہ سنت یا بندھے ہوئے قوانین ہی کے ماتحت چلتا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی خدا اپنے مرسلین ومقربین کی تائید غیبی کے لیے اس ''سنت جاریہ'' میں مداخلت اور تغیر وتبدل کو بھی جائز رکھتا ہے خواہ یہ تغیر وتبدل فطرت میں کسی نئے حذف واضافہ کی وساطت سے ہو یا اس کا منشا براہ راست ارادۂ الٰہی ہو اور جس طرح اسپنوزا کے نزدیک خدا کی خدائی اس میں نظر آتی ہے کہ عالم ایک بندھے ہوئے غیر متغیر نظام کا پابند ہو، اسی طرح بہت سے فلاسفہ اپنی عقل کو اس پر مجبور پاتے ہیں کہ ہر معلول کی براہ راست علت فطرت کی کوئی قوت نہیں بلکہ ایک ہستی برتر کا ارادہ ہے۔ ان فلاسفہ کے نزدیک وقوع معجزہ کے لیے بھی ارادۂ الٰہی کی براہ راست مداخلت ہی والا احتمال زیادہ قابل قبول ہوگا۔

اس صورت کے مختلف احتمالات

صورت مداخلت کے ان احتمالات ثلٰثہ میں اگرچہ کوئی قطعی تفریق ہر جگہ نہیں کی جا سکتی، تاہم جو موٹا سا فرق کیا جا سکتا ہے اس کو مثالوں سے سمجھ لینا چاہیے:

① عام قانون فطرت یہ ہے کہ انسان کا بچہ بلا اتصال جنسی نہیں پیدا ہوتا لیکن اس اتصال جنسی سے جو مادۂ تولید رحم مادر میں داخل ہوتا ہے اس کو اگر خدا خود رحم کے اندر ہی پیدا کر دے جس طرح کہ اور بہت سی رطوبات جسم میں پیدا ہوتی رہتی ہیں تو بلا اتصال جنسی لڑکا پیدا ہو سکتا ہے اور مداخلت خداوندی کی یہ صورت فطرت میں

ایک نئے عارضی اضافہ کی وساطت پر مبنی ہوگی ممکن ہے کہ ''ولادت مسیح علیہ السلام'' میں خدا نے اپنی مداخلت کی اسی صورت سے کام لیا ہو۔

② اسی طرح اضافہ کے بجائے حذف کی مثال یہ ہوسکتی ہے کہ چاند کے مختلف اجزا جس کیمیاوی جذب و اتصال کی قوت سے آپس میں پیوستہ ہیں ان میں سے صرف اس حصہ قوت کو جو چاند کے نصفین میں موجب اتصال ہے تھوڑی دیر کے لیے خدا حذف یا سلب کرلے جس سے شق قمر کا معجزہ ظاہر ہوسکتا ہے۔

③ تیسرا احتمال یہ ہے کہ کسی مادی واسطہ کا حذف واضافہ کیے بغیر براہ راست خدا نے صرف ارادہ ''کن فیکون'' سے قمر کو شق اور مسیح علیہ السلام کو پیدا کردیا ہو۔

یہی آخری صورت عمیق النظر فلاسفہ ومتکلمین اور اہل حق کا مذہب ہے بلکہ تنویمی احتمال کی تو خود کلام مجید کی رو سے گنجائش نہیں اس لیے کہ تنویم کا عمل اس کے عامل کے علم وارادہ کے تحت ہوتا ہے اور معجزات میں انبیا علیہم السلام کے علم وارادہ کو قطعاً دخل نہیں ہوتا اسی لیے وہ فرمائش وتعدی پر کسی آیت یا معجزہ کو خود پیش کرسکنے سے عجز کا صاف اعتراف اور اس امر کا غیر مشکوک اعلان کرتے ہیں کہ آیات تو صرف اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔﴿ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾(٦/ الانعام:١٠٩) اور رسول اگر ان کو پیش کرتا یا کرسکتا ہے تو صرف اللہ ہی کے براہ راست حکم واذن سے، خود کسی رسول میں ہرگز اس کی طاقت نہیں کہ اللہ کی مرضی ومشیت کے بغیر کوئی آیت یا معجزہ پیش کرسکے۔﴿ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾(٤٠/ المؤمن:٧٨) اگر عامل تنویم کی طرح انبیا علیہم السلام اپنے ہی علم وارادہ سے معجزات ظاہر کرتے ہوتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے عصا کو سانپ کی صورت میں ظاہر فرما کر خود اسی سے کیوں ڈرتے اور پھر اس کے عصا بنا دینے کو اللہ تعالیٰ براہ راست اپنی طرف کیوں منسوب فرماتا کہ ''ڈرو نہیں ہم اس کو پھر ابھی چھڑی ہی بنا دیں گے۔''﴿ وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴾(٢٠/ طٰہٰ:٢١)

باقی اور جتنے احتمالات اوپر بیان ہوئے وہ بھی بس احتمالات وتاویلات ہی کے درجہ میں ہیں لیکن تاویل خواہ بعید ہی ہو تکذیب کے مقابلہ میں اہون ہے لہٰذا یہ درحقیقت ایسے طفل مزاج عقل پرستوں پر اتمام حجت اور انکار وتکذیب کی راہ سے ان کو بچانے کے لیے ہیں جو بچوں کی طرح مٹھائی وعقل کا نام لیے بغیر کسی اعلیٰ حقیقت کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتے اور جن کی عقل، عقل کے نام سے اتنی مرعوب ہے کہ خود عقل کی نارسائی تک بھی رسائی نہیں پاسکے ہیں۔ اصل بحث وتوجہ کی بات ایک ہی ہے کہ سارے کارخانۂ فطرت کی اساس وبنیاد کوئی بے شعور وبے ارادہ مبدء ہے یا اندر باہر انفس وآفاق میں جو کچھ بھی ہے اور ہوتا ہے تمام تر بالذات وبراہ راست کسی علم وارادہ والی ذات کی مشیت وقدرت کا ظہور ہے فلسفہ اور فلسفیانہ عقل کے لیے ایک طرف تو یہ بات بہت پرانی ہوچکی ہے کہ جہاں کہیں جو کچھ بھی ہے یا ہو رہا ہے وہ ایک ہی ہستی کی جلوہ

فرمائی وکارفرمائی کے مظاہر ہیں اور فلسفہ تصوریت کی رو سے (جس کا جدید فلسفہ میں خصوصاً دور دورہ رہا ہے) یہ ہستی اسی نوعیت کی ہے جس کو ہم شاعر الذات، نفس وروح یا انا وایغو تعبیر کرتے ہیں، باقی مادہ وطبیعت یا مادی و طبعی عوامل وقوانین کی ساری تعبیرات واصطلاحات دفتر بے معنی ہیں۔

؎ تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں دفتر پیدا ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا (اکبر)

نئی بات جو سائنس اور سائنس دانوں کے نام سے مرعوب ذہنوں اور عقلوں کے لیے خصوصاً لائق توجہ ہے یہ ہے کہ مادہ کی بظاہر جس ٹھوس چٹان پر مادیت یا طبعی عوامل وقوانین کی پوری عمارت کھڑی تھی، وہ خود نئی طبیعیات ہی میں برف کی طرح پگھل رہی ہے۔ ''اب ازلی وغیر فانی مادہ اور ٹھوس سالمات پرانا افسانہ ہو چکے ہیں قائم بالذات جوہر کی حیثیت سے مادہ کو اب کوئی اساسی حقیقت نہیں تسلیم کیا جاتا وہ اب عملاً برقی توانائی (یا برقیات) میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔'' لیکن خود برق یا برقیات کی انتہائی حقیقت کیا ہے؟ کوئی نہیں جانتا، یہی نہیں بلکہ مادہ کو کسی معنی میں موجود جاننے کے لیے عام انسانی ذہن ودماغ کے لیے کم از کم اتنا سہارا ناگزیر تھا کہ وہ کسی جگہ (یا مکان میں) موجود ہے لیکن نظریۂ اضافیت نے اس آخری سہارے کو بھی چھین لیا۔

''مادہ جو ہماری عام عقل وفہم کے لیے ایک موجود فی المکان اور قائم فی الزمان جوہر تھا اور کائنات نام تھا مادہ کے ڈھیروں ڈلوں یا ایسے مادی جوہروں کا جو خاص خاص قوانین کے مطابق زمان ومکان میں اِدھر سے اُدھر مارے مارے پھرتے تھے۔ اب جو بڑا انقلاب سائنس کے نقطہ نظر سے برپا ہوا ہے وہ صحیح معنی میں اسی واقعہ کا نتیجہ ہے کہ مادہ اور زمان ومکان سرے سے تین جداگانہ حقائق ہی نہیں قرار دیے جاتے۔'' [1]

ایک عام آدمی عریاں الفاظ میں اس کے سوا کیا سمجھ سکتا ہے کہ مادہ نہ کسی جگہ ہے نہ کسی وقت میں یعنی نہ کسی زمان میں تو پھر ''ہے'' کے کیا معنی؟ اضافیت کے اس شاہکار کو پوری طرح سمجھنا یا سمجھانا تو اعلیٰ ریاضیات کے ماہرین ہی کا کام ہے، ہم عامیوں کو سچ پوچھئے تو ایسے مادہ کی نسبت جو زمان ومکان سے الگ یا مستقل بالذات ہو کر کسی جگہ اور وقت میں یا زمان ومکان کے مظروف کی حیثیت سے نہ پایا جاتا ہو بے ساختہ یہی کہنا پڑتا ہے کہ ریاضیات نے تحلیل کرتے کرتے ہماری خارجی (یا مادی) دنیا کو قریباً عدم تک پہنچا دیا ہے۔ [2] اور یہ تو بہرحال واضح ہو گیا ہے کہ کائنات کو کوئی مشین نہیں قرار دیا جا سکتا۔ پرانی مادیت دیوالیہ ہو چکی ہے، یعنی وہ مادیت جو کائنات، زندگی اور ذہن سب کا ایک مادی تصور رکھتی تھی۔ [3] اسی طرح سائنس وریاضی کے جھروکوں سے بھی فلسفیانہ تصوریت ہی جھانکنے لگی ہے حتیٰ کہ

''سائنس دانوں کو طبعی کائنات میں کسی اساسی خارجی یا معروضی حقیقت کی جستجو میں معلوم ہوا ہے کہ کوئی خارجی حقیقت اگر سرے سے ہو بھی تو وہ کوئی ایسی نہایت ہی عجیب وغریب شے

---

[1] ماڈرن بلیف۔ مقدمہ ص:۱۵۱۔ [2] ایضاً ص:۱۴۳۔ [3] ایضاً۔

ہوگی جو کبھی خواب وخیال میں بھی نہ آتی تھی، ایڈنگٹن نے نظریہ اضافیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو طبعیات کی ایک دوسری جدید ترقی کوانٹم تھیوری تک پہنچ کر ہم نے خارجی حقیقت کی جستجو کے مقصد کو ترک کر دیا ہے اور طبعی کائنات کی ایسے عناصر میں تحلیل کرنا پڑی ہے جو صراحتۂ ذہنی (SUBJECTIVE) ہیں، اگر خارجی دنیا کو جاننے میں ہمارے لیے خود اپنے ذہنی عنصر کو جدا کرنا مشکل ہے تو خود ان (SELF KNOWING) شعور کے مسئلہ میں جہاں ''ذہن وخارج'' (یعنی جاننے والا اور جانا گیا) حقیقتۂ ایک ہو جاتے ہیں اس کو جدا یا ممتاز کرنا کہیں زیادہ مشکل ہوگا۔'' ❶

غرض فلسفہ کے بعد سائنس میں بھی ہوا کا رخ جس طرح تصوریت یعنی اس خیال کی طرف جا رہا ہے کہ ہماری کائنات اور اس کی نیرنگیاں بے شعور مادہ کی میکانکی کارستانیاں نہیں بلکہ ذہن وشعور کی کارفرمائیاں ہیں اور خالص سائنس دان نہ سہی لیکن سائنس دان فلسفی کی حیثیت سے سر جیمس، جیانس، ماکس، پلانک، شرودونگر آئنسٹائن وغیرہ جیسے رجال سائنس کا تصوریت کی جانب رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور کائنات کا اساسی سرچشمہ شعور کو قرار دینے لگے ہیں جیسا کہ سر جیمس جیانس کا صاف اعتراف ہے کہ میرا رجحان تصوریہ کے اسی نظریہ کی طرف ہے کہ اساسی وبنیادی حقیقت شعور ہے اور مادی کائنات اس سے ماخوذ ہے۔ ❷

مذاہب کا وجود اسی ذی شعور وذی علم اساسی سرچشمہ کائنات کے سوا کیا ہے اور جب ساری کائنات ہی کسی نہ کسی طرح اس کے علم وشعور سے ماخوذ یا اس کی مخلوق ہے تو معجزات کے مادی یا میکانکی عوامل وقوانین کی جستجو خود عقل کی رو سے کونسی عقلمندی کا کارنامہ ہے۔ ❸ عقل ودانش کی بات تو بس وہی اکبرالہ آبادی کی ہے کہ

؎ تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں دفتر پیدا ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا

یقین معجزہ کے شرائط

غرض یقین معجزہ کی اولین شرط خدا اور غیب کا یقین ہے اس کے بعد اپنے اپنے علم ومذاق کے مطابق توجیہ معجزات کی جس طرح یہ ''پہلی صورت'' ممکن ہے کہ وہ عام قوانین فطرت (خواہ نفسی یا مادی) ہی کے کسی مخفی عمل کا نتیجہ ہوں اسی طرح مداخلت کی (خواہ براہ راست ہو یا بواسطہ حذف واضافہ) ''دوسری صورت'' بھی قابل قبول ہے، انگلستان کے مشہور منطقی ولیم اسٹال جیونس نے ایک نہایت ضخیم کتاب ''اصول سائنس'' ❹ کے نام سے لکھی ہے جس میں آخری نتیجہ یہ نکالا ہے کہ

''اوپر علم سائنس کی حقیقت ونوعیت کے متعلق جو بحثیں گزری ہیں ان سے ایک نتیجہ جو نہایت

---

❶ ماڈرن بلیف مقدمہ،ص:۸۔ ❷ ماڈرن بلیف،ص:۵۲۰۔
❸ ان مباحث کی کامل وتشفی بخش تفصیل ان شاءاللہ فلسفہ اسلام کے ذیل میں بشرط صحت وحیات ملے گی۔
❹ The Principal of Scienc (حاشیہ) طبع آخر ۱۹۱۳ء ص ۷۶۶۔

صاف طور پر نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کارخانۂ فطرت میں مداخلت خداوندی کے امکان کو کسی طرح باطل نہیں ٹھہرا سکتے ،جس قوت نے کائنات مادی کو خلق کیا ہے وہ میرے نزدیک اس میں حذف واضافہ بھی کرسکتی ہے اس قسم کے واقعات ایک معنی کر کے ہمارے لیے نا قابل تصور کہے جاسکتے ہیں پھر بھی یہ اس سے زیادہ نا قابل تصور نہیں ہیں جتنا کہ خود عالم کا وجود ہے۔''

مگر جو شخص اس خالقِ کائنات قوت ہی کا قطعاً منکر ہو، جو سرے سے غیب ہی پر ایمان نہ رکھتا ہو اور جو آرنسٹ ہیگل (جرمنی کا مشہور ملحد و مادہ پرست) کی طرح خود خدا، روح، حشر ونشر وغیرہ کو معجزات (بمعنی اوہام و خرافات) قرار دیتا ہو اور جس کے نزدیک معجزات کا یقین جہالت و بربریت کی آخری نشانی ہو، جس کا فنا کردینا ہی علم وتمدن کی فتح ہوگی۔'' [1] تو ایسے آدمی کو آپ کسی معجزہ کا اس معنی میں کیونکر یقین دلا سکتے ہیں کہ وہ کسی غیبی قوت کا آفریدہ ہے یا جس شخص سے وہ ظاہر ہوا ہے، اس کے عالم غیب کے ساتھ رابطہ وتعلق (نبوت) کی آیت یا نشانی ہے؟ یقین کی اُوپر جو حقیقت بیان کی گئی ہے اس کے لحاظ سے معجزہ پر بہ حیثیت آیت نبوت کے یقین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ غیب پر ایمان ہو جس کے بغیر یقین معجزہ کی خواہش کا پیدا ہونا ناممکن ہے پھر بھی جس شخص کی نسبت کوئی معجزہ بیان کیا جاتا ہو یا جس سے یہ ظاہر ہوا ہو، اس کی زندگی ﴿ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ ﴾(٦٨/ القلم: ٤) کی تفسیر اور ظاہری و باطنی کمالات کا بجائے خود ایک معجزہ ہو، (یہ چیزیں خواہش یقین کے لیے مؤیدات کا کام دیں گی) اور سب سے آخری لیکن سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ فرعون و ابوجہل کی طرح دل میں خصومت وعناد، خودی وخود بینی، ذاتی اغراض یا ہوا وہوس کے موانع یقین نہ موجود ہوں۔ جس طرح ان شرائط کی عدم موجودگی میں کوئی دلیل یقین معجزات پر آمادہ نہیں کر سکتی بالکل اسی طرح ان کی موجودگی میں کوئی دلیل یقین معجزات سے باز نہیں رکھ سکتی۔

میرے ایک دوست جن کا شمار کم از کم مسلمانوں میں تعلیم جدید کے مستثنیٰ افراد میں سے ہے، آج سے چند برس پہلے مغربی عقل وحکمت کے شدید پرستار تھے اور وجود خدا کا ان سے اقرار کرانا، اس لیے ناممکن تھا کہ وہ مل کی منطق اور ہکسلے وہیگل کی تحقیقات سے نہیں ثابت ہوا تھا۔ قرآن میں ان کے نزدیک علم النفس کے بیسیوں دقائق مرعی تھے اور اس کا پیش کرنے والا پیغمبر اسلام (علیہ السلام) سکندر، اسیزر، سقراط، ونپولین وغیرہ قائدین عظام و مصلحین عالم کی صف اول میں اپنی جگہ رکھتا تھا، تاہم اگر آیات قرآنی کو بہ حیثیت کلام الٰہی ان کے سامنے تلاوت کیا جاتا یا پیغمبر اسلام علیہ السلام کی مکارم اخلاق سے معمور زندگی کو آپ ﷺ کی پیغمبری کے ثبوت میں بیان کیا جاتا تو وہ ''جواب جاہلاں'' کی باتمکین ''خاموشی'' یا زیادہ سے زیادہ ایک ''خندۂ تحقیر'' کی سزاوار تھی ظاہر ہے کہ بدعقیدگی کے اس عالم میں روایات معجزہ کی حقیقت اس سے زیادہ کیا ٹھہر سکتی ہے کہ وہ

[1] دیکھو ہیگل کی کتاب Wonders of Life (عجائبات حیات) باب ۳ معجزات۔

محض اپنے رواۃ کی خوش اعتقادیوں یا جاہلانہ عجائب پرستیوں کا مجموعہ ہیں۔ لیکن ادھر ان کی اس درجہ حیرت انگیز کایا پلٹ ہوئی ہے کہ عقلیات مغرب کا سارا طومار ان کے نزدیک "صد کتاب و صد ورق در نار کن" سے زیادہ کا مستحق نہیں ہے قرآن کریم "دقائق نفسیہ" کی جگہ "حقائق الٰہیہ" کا منبع بن گیا ہے "سیرت نبویہ ﷺ" کا ایک ایک حرف نبوت پر شاہد عدل ہے جو زبان جیمس اور راونٹ کی نفسیاتی تحقیقات سے رطب اللسان رہتی تھی اس کو انتہائی لذت اب صرف بزرگان دین کے مناقب، کشف و کرامات اور مسائل تصوف کے ذکر میں ملتی ہے حتیٰ کہ دور اول کے "ناصح احباب" کو اب خود ان پر "خوش اعتقادی" کا گمان ہونے لگا ہے۔

اس قلب ماہیت کا نتیجہ یہ ہے کہ انبیائے عظام علیہم السلام کا تو ذکر ہی کیا ملک کی موجودہ تحریک "ترک موالات" کے بانی کی ذرا غیر معمولی اخلاق سے آراستہ زندگی بھی ان کو روحانی کمالات ہی کا پرتو نظر آتا ہے انتہا یہ کہ ان کی طرف جو طرح طرح کی کرامتیں منسوب کی جاتی ہیں [1] ان میں ایک مشہور واقعہ بعض درختوں سے روئی جیسی ایک چیز کا نکلنا تھا میرے یہ دوست بھی اس کو تائید غیبی کی ایک نشانی سمجھنے میں شریک تھے میں نے کہا کچھ لوگ اس روئی کو کسی کیڑے کی رطوبت بتلاتے ہیں۔ کہا، اس سے کیا ہوتا ہے خدا نے اسی وساطت سے تائید کی ہوگی۔ شرائط یقین وغایت معجزات کے مقدمات بالا کو سامنے رکھ کر اب ذرا ریگستان عرب کے اس امی انسان کی زندگی، دعوت اور تعلیمات پر ایک سرسری نظر کرو، جس نے ساڑھے تیرہ صدی ادھر کوہ صفا پر کھڑے ہو کر اپنی نبوت کا اعلان کیا تھا۔

اس قدسی صفات انسان کی امانت و دیانت نے ہم وطنوں کی طرف سے اس کے لیے امین کا لقب حاصل کیا تھا اس کی راست گوئی دوست و دشمن سب کو یکساں تسلیم تھی، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جن کو پچیس برس تک آپ ﷺ کی زوجیت کا شرف حاصل رہا، وہ ایک موقع پر آپ کو تسلی دیتی ہیں کہ "ہرگز نہیں خدا کی قسم! خدا آپ کو کبھی غمگین نہ کرے گا، آپ صلہ رحم کرتے ہیں، مقروضوں کا بار اٹھاتے ہیں، غریبوں کی اعانت کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، حق کی حمایت کرتے ہیں، مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔" [2]

اس اپنے پرائے کے غم خوار کی دعوت صرف یہ تھی کہ لوگو ((لا الٰہ الا اللّٰہ)) کہو تو نجات پاؤ گے، اس دعوت سے باز رکھنے میں رؤسائے قریش جب ہر قسم کی تدبیروں سے تھک گئے تو انہوں نے آپ ﷺ کے سامنے حکومت کا تخت، زر و جواہر کا خزانہ اور حسن کی دولت پیش کی [3] اور بالآخر وہ وقت آیا جب آخری ہمدم و دمساز یعنی ابوطالب نے بھی ساتھ چھوڑنا چاہا۔ جس کا جواب اولوالعزم من الرسول کی زبان سے فقط یہ ملا کہ "چچا جان! اگر قریش میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں تب بھی اپنے اعلان حق

---

[1] یہ تحریر گزشتہ تحریک ترک موالات کے شباب کے زمانہ میں لکھی گئی تھی اس وقت اس طرح کی بہت سی کرامتیں بانی ترک موالات کی زندگی اور اوصاف سے متعلق ملک میں پھیلی تھیں۔ [2] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی: باب کیف کان بدء الوحی: ۳۔ [3] سیرۃ النبی ﷺ طبع ہذا حصہ اول، ص: ۱۶۱۔

سے باز نہ آؤں گا۔'' ❶ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی حق کامیاب ہوا لیکن کیا اس کامیابی سے داعیٔ حق ﷺ نے خود کوئی فائدہ حاصل کیا ہے؟

مسجد نبوی کے صحن میں آپ ﷺ کے سامنے مال غنیمت کے انبار لگ جاتے تھے ❷ مگر خود اس انبار کو تقسیم کرنے والے شاہ کونین ﷺ کی زندگی یہ تھی کہ آپ کھال کی چٹائی یا خالی زمین پر آرام فرماتے تھے۔ کاشانۂ نبوت گو انوار الٰہی کا مظہر تھا، تاہم اس میں رات کو چراغ نہیں جلتا تھا۔ ❸ کئی کئی دن تک فاقہ سے شکم مبارک پر دو دو تین تین پتھر بندھے ہوتے۔ گھر کا کام کاج خود کرتے۔ کپڑوں میں پیوند لگاتے، گھر میں خود جھاڑو دیتے، دودھ دوھ لیتے، بازار سے سودا لاتے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے، اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھتے، اس کو چارہ دیتے، غلام کے ساتھ مل کر آٹا گوندھتے۔ ❹ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کی محبوب ترین اولاد تھیں جن کی عام خانگی زندگی یہ تھی کہ چکی پیسنے سے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے، بار بار مشک میں پانی بھرنے سے سینہ پر گھٹے پڑ گئے تھے گھر میں جھاڑو دیتے دیتے کپڑے چیکٹ ہو جاتے تھے لیکن بااین ہمہ جب انہوں نے آنحضرت ﷺ سے ایک بار گھر کے کاروبار کے لیے ایک لونڈی مانگی اور ہاتھ کے چھالے دکھائے تو آپ نے صاف انکار کر دیا کہ یہ فقرا و یتامیٰ کا حق ہے۔ ❺

اتنا ہی نہیں کہ آپ ﷺ دنیاوی عیش و آرام سے دست بردار تھے بلکہ دشمنان دین طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے تھے گالیاں دیتے تھے۔ گو ''رحمۃ للعالمین'' کا ہاتھ ان کے حق میں بھی ہمیشہ صرف دعا ہی کے لیے اٹھتا تھا اور ان کے ساتھ نیکی ہی کا حکم فرماتے تھے۔ راہ میں کانٹے بچھا دیتے تھے، نماز پڑھنے میں جسم مبارک پر نجاست ڈال دیتے تھے۔ ایک دفعہ آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ بن معیط نے آپ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ ❻ یہ سب کچھ تھا لیکن دعوت حق، نوع انسان کی ہدایت اور فلاح و بہبود کی تعلیمات کا کام بلا شائبہ تزلزل جاری تھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ آپ کو اپنے فرستادۂ خدا ہونے کا اذعان، ہر وقت اس کی نصرت و معیت پر اعتماد اور بالآخر باطل کے زہوق اور حق کے غلبہ کا اسی طرح یقین تھا جس طرح تم کو رات کی تاریکی کے بعد طلوع صبح کا یقین ہوتا ہے کفار کی دشمنی اور ایذا رسانی سے تنگ آ کر ابو طالب سمجھاتے ہیں کہ ''جان پدر! اس کام سے ہاتھ اٹھا لو۔'' آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ ''عم محترم! میری تنہائی کا خیال نہ کیجیے۔ حق زیادہ دیر تک تنہا نہیں رہے گا، عجم و عرب ایک دن اس کے ساتھ ہوگا۔'' کفار قریش بدنیتی (قتل) کے ساتھ آپ کے تعاقب میں نکلے ہیں، غار ثور جس میں آپ مخفی ہیں اس کے قریب پہنچ گئے ہیں کہ ''رفیقِ فی الغار'' (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ) نے گھبرا کر عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ دشمن اس قدر قریب ہیں کہ ذرا نیچے جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھیں تو ہم پر نظر پڑ جائے گی۔'' آپ ﷺ

---

❶ سیرۃ النبی ﷺ طبع ہذا حصہ اوّل، ص: ۱۶۷۔ ❷ سیرۃ النبی ﷺ طبع ہذا حصہ دوم، ص: ۲۰۹۔
❸ ایضاً ص: ۶۴۶۔ ❹ ایضاً۔ ❺ ایضاً۔ ❻ ایضاً۔

نے فرمایا کہ ﴿ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴾ (۹/ التوبۃ: ۴۰) ''غم نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔'' ❶ ایک موقع پر آپ کسی درخت کے نیچے تنہا استراحت فرما رہے تھے کہ ایک بدو جو شاید اسی موقع کی تاک میں تھا، چپکے سے آیا اور آپ ﷺ کی تلوار درخت سے اتار کر نیام سے باہر کھینچ لی اور آپ کے سامنے آیا کہ دفعتہً آپ ہشیار ہو گئے، دیکھا کہ ایک بدو تیغ بکف کھڑا ہے جس نے پوچھا کہ اے محمد! اب تم کو کون بچا سکتا ہے؟ ایک پر اطمینان صدا آئی کہ ''اللہ۔'' ❷

کیا تشنگان ایمان کے لیے خود یہ صدا معجزہ نہیں ہے؟ اور کیا جن لبوں سے یہ صدا نکلی تھی ان کو کوئی دیکھنے والا کاذب تصور کر سکتا تھا؟ اسی کا اثر تھا کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ پکار اٹھے کہ

(لیس هذا بوجه كذاب) ''یہ جھوٹے کا منہ نہیں ہے۔'' ❸

یہ سمندر کے صرف چند قطرے تھے اور اگرچہ انسان کا ناقص قلم پیغمبرانہ سیرت کے تمام خط و خال کو کامل طور پر نمایاں نہیں کر سکتا، تاہم ''سیرۃ النبی ﷺ'' کے گزشتہ دو حصوں میں (جہاں سے یہ چند منتشر قطرات ماخوذ ہیں) انسانی ہاتھ سے جو ناتمام مرقع کھچ سکا ہے، اس سے تم بڑی حد تک اندازہ کر سکتے ہو کہ کسی پیکر بشری کے اندر ﴿ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾ (۶۸/ القلم: ۴) کی اس ''جامعیت کبریٰ'' کا ظہور بجائے خود اتنا بڑا اعجاز ہے، جس سے بڑھ کر کوئی معجزہ نہ طلب کیا جا سکتا ہے اور نہ پیش کیا ہے، نہ کیا جا سکتا ہے۔

ایسی اعجاز مجسم جامع ہستی کے متعلق جو صاحب شمشیر و نگین بھی ہو اور گوشہ نشین بھی، بادشاہ کشور کشا بھی ہو اور گدائے بے نوا بھی، فرمانروائے جہان بھی ہو اور سجہ گردان بھی، مفلس قانع بھی ہو اور غنی دریا دل بھی، جس کی زبان ہمہ وقت ذکر الٰہی اور تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو، جس کے پاؤں رات رات بھر نماز میں کھڑے رہنے سے آماس کرتے ہوں۔ اگر کوئی ایسا واقعہ بیان کیا جائے جو خدا کی طرف سے تائید غیبی کی نشانی یا آیت معلوم ہو تو اس شخص کو اس کے یقین و قبول میں کیا تامل ہو سکتا ہے جو خدا اور غیب پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن جو شخص ہیگل کی طرح خدا اور غیب ہی کا منکر ہو یا فرعون کی طرح خود اپنے کو خدا کہتا ہو ﴿ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴾ (۷۹/ النازعات: ۲۴) یا جس کے قلب کو ابوجہل و ابولہب کی طرح کفر و عناد کی تاریکی نے سیاہ کر رکھا ہو اس کے سامنے بڑے سے بڑا معجزہ پیش کرنے پر بھی زیادہ سے زیادہ جواب یہ مل سکتا ہے کہ ﴿ سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ﴾ (۵۴/ القمر: ۲)

یہی راز تھا کہ سیرت نبویہ ﷺ کے سارے دفتر میں بمشکل ایک آدھ ایسا واقعہ ملتا ہے کہ معجزات کی بنا پر لوگوں نے رسالت کی تصدیق کی ہو بلکہ عہد رسالت کے ہزاروں ایمان لانے والے وہی ہیں جن کے دل میں ایمان کا مزہ تھا اور جن کے لیے ''روئے و آواز پیمبر'' ہی اصل معجزہ تھا گو آج ظاہری روئے و آواز ہم سے مستور ہے لیکن معنوی آدمی قرآن اور حقیقی ''روئے پیمبر'' سیرت طیبہ ابد الآباد تک ذوق ایمان رکھنے والوں کے لیے معجزہ نمائی کرتی رہے گی۔ (ﷺ)

---

❶ سیرۃ النبی ﷺ طبع ہٰذا حصہ اوّل، ص: ۱۹۸۔ ❷ سیرۃ النبی ﷺ طبع ہٰذا حصہ دوم، ص: ۲۰۸۔

❸ ترمذی: ۲۴۸۵؛ ابن ماجہ: ۱۳۳۴؛ مسند احمد، ۵/ ۴۵۱۔

لُبِّ لُباب

گزشتہ مباحث کا لب لباب یہ ہے کہ

① معجزہ نام ہے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے جامع انسان کے تعلق سے کسی ایسے واقعہ کے ظہور کا جس کی کم از کم بوقت ظہور عام علل و اسباب سے توجیہ نہ ہو سکے۔

② ایسے واقعات بذاتِ خود عقلاً ناممکن نہیں، ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ''انتہائی حیرت انگیز'' یا مستبعد واقعات کی ہوتی ہے، اس لیے بظاہر ان کو قبول کرنے کے لیے بھی نہایت غیر معمولی شہادت کی ضرورت نظر آتی ہے۔

③ لیکن دراصل یہ استبعاد ایسا نہیں ہوتا جس کی کافی مثالیں عام زندگی میں بھی نہ ملتی ہوں اور جن کے قبول کے لیے کسی غیر معمولی شہادت کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔

لہٰذا یقین معجزات کے لیے بھی معمولی درجہ کی قابل اعتماد شہادت کافی ہو سکتی ہے۔

④ مگر یقین صرف شہادت وغیرہ خارجی چیزوں سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کا دار و مدار زیادہ تر یقین کی خواہش اور اس کے موانع و مؤیدات پر ہے جس کا تعلق بڑی حد تک خود یقین کرنے والے کے گزشتہ معتقدات و مزعومات سے ہوتا ہے۔

⑤ یقین معجزات کی خواہش کا پیدا ہونا موقوف ہے۔ ''ایمان بالغیب پر''

⑥ اگر غیب پر ایمان ہے اور فرعون و ابوجہل کی طرح عناد و تعصب کے موانع موجود نہیں ہیں تو ساتھ ہی ساتھ انبیا کی نبوت کی زندگی اپنے احوال و اخلاق کے لحاظ سے بجائے خود اس کی نبوت کی مؤید ہے تو معجزہ (بمعنی خارق عادت) کا کیا ذکر ہے خود پیغمبر کی آواز و اصوات ہی معجزہ ہے۔

؎ در دلِ ہر کس کہ دانش را مزہ است
روئے و آوازِ پیمبر معجزہ است

آیات و دلائل اور قرآن مجید

انبیا علیہم السلام اور آیات و دلائل

گزشتہ صفحات میں جو کچھ پھیلایا گیا ہے وہ انسانی افکار و خیالات کی جہاں تک دسترس ہے، اس کی تشریح ہے، لیکن مسلمانوں کے نزدیک ہدایت و ارشاد کا اصلی سرچشمہ قرآن مجید ہے، اس لیے آیات و دلائل کی نسبت اخیر فیصلہ اسی کی عدالت میں ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں اکثر انبیا علیہم السلام کے سوانح و حالات کے ضمن میں ان آیات اور معجزات کا بھی بیان ہے جو ان کو خدا کی بارگاہ سے عطا ہوئے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات و دلائل انبیا علیہم السلام کے سوانح کا ضروری جزو ہیں، خصوصاً حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے معجزات سب سے زیادہ تفصیل اور تکرار کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئے ہیں کہ نزول قرآن مجید کے وقت انہی دونوں انبیا علیہم السلام کی امتیں عرب میں موجود تھیں اور ان ہی کے سامنے اسلام اپنے دعووں کو پیش کر رہا تھا۔

قرآن مجید میں جن انبیا علیہم السلام کا تذکرہ ہے ان میں سے کم و بیش حسب ذیل انبیا علیہم السلام کے آیات و دلائل بیان ہوئے ہیں، حضرت نوح، حضرت لوط، حضرت صالح، حضرت ہود، حضرت شعیب، حضرت زکریا، حضرت یونس، حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بعض ایسے انبیا بھی ہیں جن کے آیات و دلائل کے ذکر سے قرآن خاموش ہے، مثلاً: حضرت اسحق، حضرت اسمٰعیل، ذوالکفل اور الیسع علیہم السلام وغیرہ لیکن اس خاموشی سے یہ نہیں ثابت ہوگا کہ ان کو کسی قسم کی نشانی اور دلیل عطا نہیں ہوئی تھی صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنَ الْاَنْبِيَاءِ نَبِيٌّ اِلَّا اُعْطِيَ مِنَ الْاٰيَاتِ مِثْلَهٗ اٰمَنَ۔اَوْ آمَنَ۔عَلَيْهِ الْبَشَرُ)) [1]

''ہر نبی کو کچھ ایسی باتیں دی گئیں جس کو دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لائے۔''

البتہ انبیائے کرام علیہم السلام کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غیر معمولی آیات و دلائل انہی انبیا علیہم السلام کو مرحمت ہوئے جن کو سخت و شدید معاندین اور منکرین کا سامنا کرنا پڑا اور ضرورت بھی انہی کو تھی کہ ان کے عناد و انکار کا وہ ان کے ذریعہ سے جواب دے سکتے، باقی وہ انبیا علیہم السلام جو اپنی جماعتوں میں صرف تجدید و اصلاح کے لیے مبعوث ہوئے ان کو اس قسم کے دلائل کی حاجت نہ تھی کہ ان کی جماعتوں نے ان کی دعوت کے مقابلہ میں عناد و انکار کا اظہار نہیں کیا تھا۔

قرآن مجید اور اصطلاح آیات و دلائل

قرآن مجید نے انبیا علیہم السلام کے ان معجزات کو عموماً آیت یعنی نشانی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے:

[1] بخاری، کتاب الاعتصام، باب قول النبی ﷺ بعثت بجوامع الکلم: ۷۲۷۴؛ مسلم، کتاب الایمان، باب وجوب الایمان، برسالة نبينا محمد ﷺ الی جمیع الناس و نسخ الملل بملته: ۳۸۵ یہ الفاظ صحیح بخاری کے ہیں۔

﴿ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى ﴾ (۲۸/ القصص:۳٦)

''جب موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس ہماری آیات لے کر آئے تو انہوں نے کہا کہ یہ تو صرف مصنوعی جادو ہے۔''

﴿ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ﴾

(۷/ الاعراف:۱۳۳)

''تو ہم نے فرعون کی قوم پر طوفان، ٹڈی، جوں، مینڈک اور خون کی کھلی ہوئی آیتیں بھیجیں۔''

فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہتا ہے:

﴿ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۝ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۰٦، ۱۰۷)

''اگر تم کوئی آیت لے کر آئے ہو تو اب لاؤ اگر تم سچے ہو، موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈال دی تو وہ دفعتہً سانپ بن گئی۔''

کفار معجزہ طلب کرتے ہیں تو اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ (٦/ الانعام:۱۱۰) ''آیتیں تو خدا ہی کے پاس ہیں۔''

﴿ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ (۲۹/ العنکبوت:۵۰) ''آیتیں تو خدا ہی کے پاس ہیں۔''

کفار کہتے ہیں:

﴿ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیاء:۵)

''چاہیے کہ وہ ہمارے پاس کوئی آیت لائیں جیسے پہلے پیغمبر بھیجے گئے۔''

حضرت صالح علیہ السلام اپنے معجزہ کی نسبت کہتے ہیں:

﴿ وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً ﴾ (۱۱/ هود:٦٤) ''اور اے لوگو! یہ خدا کی اونٹنی آیت ہے۔''

لفظ آیت اور معجزہ کی حقیقت

آیت کے معنی ''نشانی'' اور ''علامت'' کے ہیں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو علم و احساس کے جو ذرائع عطا کیے ہیں وہ حقیقت میں صرف آیات و علامات کی شناخت اور یاد ہے، دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں تم ان کو کس طرح جانتے اور پہچانتے ہو؟ صرف آیات و علامات سے، کلیات سے لے کر جزئیات تک جو کچھ ہم کو خارج سے علم حاصل ہوا ہے وہ محض نشانیوں کو دیکھ کر۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ گھوڑا ہے، یہ انسان ہے، یہ درخت ہے، یہ سیب ہے، یہ انگور ہے لیکن ہم کیونکر جانتے ہیں؟ اس طرح کہ ان چیزوں کی جو مخصوص نشانیاں ہیں وہ الگ الگ ہمارے ذہن میں محفوظ ہو گئی ہیں اور اب انہی کی مدد سے ہم کہتے ہیں کہ یہ فلاں چیز ہے ہم پہچانتے ہیں

کہ یہ زید ہے، یہ عمرو ہے، یہ میرا عزیز ہے، یہ میرا گھر ہے، یہ میرا گھوڑا ہے مگر یہ تمام شناختیں آیات وعلامات ہی کی مدد سے ہیں اگر دنیا میں ہر شے کی مخصوص آیات وعلامات مٹادی جائیں تو ہم یقیناً کسی چیز کو نہ شناخت کر سکتے ہیں، نہ جان سکتے ہیں، نہ پہچان سکتے ہیں۔

یہی آیات وعلامات کی جان پہچان اور شناخت ہے جو حیوان وانسان اور عقل مند و بے وقوف میں فرق پیدا کرتی ہے، جس میں ان آیات وعلامات کی شناخت، تمیز اور یاد کی قوت جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر اس کی عقل ودانائی کا کمال زیادہ ہوگا، ہماری منطق کا تمام تر استدلال بجز آیات وعلامات کے اور کیا ہے؟ ہم اپنے جس دعویٰ پر جو دلیل قائم کرنا چاہتے ہیں وہ انہی آیات وعلامات کی مدد سے کرتے ہیں بلکہ ہمارے تمام تر تجربے اور مشاہدے، بلکہ طبعیات، کیمیات، نباتات، حیوانات، ارضیات، ہندسیات، ریاضیات وغیرہ جو کچھ اور جس قدر علوم بھی ہیں وہ صرف علامات شناسی کا مجموعہ ہیں جن سے ہم براہ راست جزئیات کا علم حاصل کرتے ہیں اور پھر ہم ان سے کلیات تیار کر لیتے ہیں۔

غرض ہمارا تمام تر فن استدلال دراصل ان ہی آیات وعلامات پر موقوف ہے اگر اشیاء کی علامات و آیات محو کر دی جائیں تو نہ ہم کسی چیز کو پہچان سکیں گے اور نہ کسی دعویٰ پر کوئی دلیل قائم کر سکیں گے ہم علت سے معلول پر اور معلول سے علت پر استدلال کرتے ہیں مگر انہی آثار وعلامات کے ذریعہ سے ہم کو تجربہ سے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ شے جب پیدا ہوتی ہے تو اس کے ساتھ یہ آثار وآیات ظاہر ہوتے ہیں اب کبھی ہم اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ ''یہ شے پیدا ہوگئی ہے، اس لیے اس کا فلاں نشان اور اثر بھی ضرور پیدا ہوا۔'' یہ علت سے معلول پر استدلال ہے اور کبھی ہم اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ ''فلاں نشان اور علامت ظاہر ہے اس لیے وہ شے بھی ہے۔'' یہ معلول سے علت پر استدلال ہے کبھی ہم آگ کے وجود سے حرارت کے وجود پر اور کبھی حرارت کے وجود سے آگ کے وجود پر استدلال کرتے ہیں۔

ہم کسی غیر آباد میدان میں پہنچ جاتے ہیں، وہاں ہم کو ایک شاندار عمارت نظر آتی ہے اگر چہ ہم نے اس عمارت کے بنانے والوں کو نہیں دیکھا ہے، مگر اس عمارت کو دیکھ کر ہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کسی معمار کی صنعت ہے۔ایک جنگل میں ایک جھونپڑے کے اندر ایک تنہا زخمی پڑا ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے زخم صاف ہیں مرہم پٹی ٹھیک ہے، اس کے آرام وآسائش کے تمام سامان قرینہ سے رکھے ہوئے ہیں، ہم نے گو اس کے تیمار دار کو نہیں دیکھا مگر آس پاس کے علامات وآثار بتاتے ہیں کہ اس بیمار کا کوئی تیمار دار ہے اور وہ نہایت رحم ومہربانی سے اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ایک شخص آکر کہتا ہے ''میں طبیب ہوں'' اس کے پاس جو مریض آتے ہیں وہ اس کے نسخہ سے شفا بھی پاتے ہیں اب گو ہم نے اس کو طب کی تحصیل کرتے ہوئے نہیں دیکھا مگر اس کے آثار وعلامات کو دیکھ کر اس کے دعویٰ کی تصدیق کر سکتے ہیں، یہی ہمارا فنِ استدلال ہے اور

اسی پر ہمارے تمام حصولی علوم کی بنیاد ہے۔

آیات اللہ

قرآن مجید میں آیت کا لفظ اسی معنی میں اس کثرت سے آیا ہے کہ ہم یہاں ان کا استقصا بھی نہیں کر سکتے، صرف متفرق سورتوں سے چند آیات یہاں نقل کرتے ہیں، جن سے مفہوم کی تشریح ہو جائے گی:

﴿ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَفِیْ خَلْقِكُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ۝ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾ (٤٥/ الجاثیة:٣۔٦)

’’آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور تمہاری پیدائش میں اور زمین میں جو چوپائے چلتے ہیں، ان میں ان کے لیے جو یقین کرتے ہیں نشانیاں ہیں اور رات دن کے الٹ پھیر اور آسمان سے خدا جو روزی برساتا ہے اور جس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور ہواؤں کے پھرنے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں، یہ آیتیں ہیں جن کو ہم سچائی کے ساتھ پڑھ کر تم کو سناتے ہیں تو پھر خدا اور اس کی نشانیوں کے بعد وہ کس چیز پر ایمان لائیں گے۔

﴿ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ ﴾ (٢/ البقرة:١٦٤)

’’بے شک آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے الٹ پھیر اور ان کشتیوں میں جو دریا کے اندر انسانوں کو فائدہ پہنچانے والے سامان لے کر چلتی ہیں اور خدا آسمان سے جو پانی برساتا ہے جس سے وہ زمین کو مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور زمین میں جو چوپائے اس نے پھیلا رکھے ہیں اور ہواؤں کو مختلف سمتوں میں چلانے میں اور ان بادلوں میں جو آسمان و زمین کے بیچ میں مسخر ہیں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔‘‘

﴿ وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْٓا اِلٰی ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۝﴾ (٦/ الانعام:٩٩)

''اور وہی خدا جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اس سے ہر چیز کی نشو ونما کو ظاہر کیا پھر اس سے سبزے پیدا کیے، جس سے ہم تہ بہ تہ دانہ نکالتے ہیں اور کھجور جن کے خوشے نیچے لٹکے ہوتے ہیں اور انگوروں کے باغوں کو اور زیتون و انار کو اس نے پیدا کیا جو باہم ملے جلے ہوتے ہیں اور ان میل بھی ہوتے ہیں، ان کے پھلنے اور پکنے کو دیکھو ان چیزوں میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ۝﴾

(١٠/ یونس:٦٧)

''اس نے تمہارے لیے رات بنائی کہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو اس نے روشن بنایا اور اس میں ان کے لیے جو سنتے ہیں نشانیاں ہیں۔''

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ﴾

(٣٠/ الروم:٢١-٢٥)

''اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے خود تمہاری ہی جنس سے تمہارے جوڑے بنائے کہ تم کو ان کے پاس سکون اور قرار حاصل ہو اور تم دونوں کے لیے لطف و محبت پیدا کر دیا۔ اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے زمین و آسمان کی پیدائش اور تمہاری زبانوں کا اور رنگوں کا ایک دوسرے سے الگ ہونا ہے اس میں جاننے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں رات اور دن کو تمہاری نیند ہے اور تمہارا اس کی مہربانی (روزی) کی تلاش کرنا ہے اس میں ان کے لیے جو سنتے ہیں، نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی دکھاتا ہے جس میں خدا کا خوف اور رحمت کی امید دونوں ہیں اور آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے اس میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے

یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔''

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴾ (٤١/ فصلت :٣٧)

''اور اس کی نشانیوں میں سے رات دن سورج اور چاند ہیں۔''

یہ آیات اللہ یعنی خدا کی نشانیاں، خدا کے وجود اور اس کے صفات کمالیہ کی علامات ہیں جس طرح ویرانہ کی عمارت معمار کے وجود کو اور ایک زخمی کی مرہم پٹی اور اس کے آرام و آسائش کا اہتمام، تیماردار کے رحم و کرم کے صفات کو ظاہر کرتا ہے، اسی طرح اس عالم کی یہ عظیم الشان عمارت جس کی چھت آسمان اور صحن زمین ہے ایک خالق و صانع کے وجود کو بتاتی ہے اور زمین کے اندر و باہر ابر، بارش، دن، رات، چاند، سورج، درخت، میوے پھل، غلہ کے اقسام وغیرہ زمین کے جانداروں کی زندگی کے سامان آرام و آسائش اس خالق و صانع کے رحم و کرم، عطا و بخشش اور دیگر اوصاف کمال کو نمایاں کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ خالق کو اپنے تمام مخلوقات کے ساتھ ایک خاص تعلق اور اعتنا ہے، کفر انہی کے دلوں میں پرورش پاتا ہے جو ان آیات الٰہی میں غور و فکر نہیں کرتے اور ان کی جلوہ گری سے حقیقی جلوہ آرا ہستی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

﴿ وَتِلْكَ عَادٌ ۟ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ ﴾ (١١/ هود:٥٩)

''اور یہ عاد کا قبیلہ ہے جس نے اپنے پروردگار کی نشانیوں کا انکار کیا۔''

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ ﴾ (١٨/ الكهف:١٠٥)

''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی نشانیوں کا انکار کیا۔''

﴿ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ (١٠/ يونس:٩٥)

''اور ان لوگوں میں نہ ہو جنہوں نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا۔''

﴿ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ (٦/ الانعام:١٥٧)

''اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جس نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا۔''

جس طرح یہ آیات الٰہی عام بندہ اور خدا اور خالق و مخلوق کے تعلق اور رابطہ کو نمایاں کرتی ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کسی خاص بندہ سے اپنے تعلق اور رابطہ کو اپنے مخصوص علامات و آیات کے ذریعہ سے نمایاں کرتا رہتا ہے۔

① انبیاء علیہم السلام قوموں کے تاریک ترین زمانوں میں نور الٰہی کی مشعل ہاتھ میں لے کر تنہا مجمعوں کے اندر آتے ہیں، لوگ اس نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور تیغ و خنجر سے مشعل کے تھامنے والے دست و بازو کو زخمی کرنا چاہتے ہیں مگر وہ شمع الٰہی بجھنے کے بجائے رفتہ رفتہ اپنے دائرہ نورانی کو وسیع کرتی جاتی ہے اور بالآخر سطح ارض

کے کناروں تک پہنچ جاتی ہے:

﴿ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝ هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝ ﴾

(٦١/ الصف:٨'٩)

''وہ چاہتے ہیں کہ اپنے منہ سے خدا کے نور کو بجھا دیں اور خدا اپنے نور کو پورا روشن کرنے والا ہے گو کافر اس سے خوش نہ ہوں اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچائی کا مذہب دے کر بھیجا ہے، تاکہ وہ اس کو ہر مذہب پر غالب کر دے گو مشرک اس سے ناراض ہوں۔''

② باوجود تمام معاندانہ کوششوں اور مخالفانہ جدوجہد کے اس نور الٰہی کا پھیلتا جانا خود اس بات کی شہادت ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے اور اس مشتعل گیر دست و بازو میں خدا کی غیر مرئی قوت کام کر رہی ہے۔''

﴿ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ﴾ (٨/ الانفال:١٧)

''اور تم نے وہ مٹھی بھر کنکریاں نہیں پھینکیں بلکہ خدا نے پھینکیں۔''

قدم قدم پر تائیدات الٰہی اس کا ساتھ دیتی ہیں:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝ ﴾ (١٥/ الحجر:٩)

''ہم نے اس نصیحت کو اتارا اور بے شک ہم ہیں اس کی حفاظت کرنے والے۔''

③ پیغمبر کے صحیفہ زندگی کا صفحہ صفحہ ہر قسم کے اخلاقی داغ سے پاک ہوتا ہے، اس کی سچائی اور راستبازی عالم آشکارا اور دوست و دشمن سب کے نزدیک بے عیب ہوتی ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام کی نسبت کافروں نے گواہی دی:

﴿ يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ ﴾ (١١/ هود:٦٢)

''اے صالح! پہلے تم سے بڑی بڑی امیدیں تھیں۔''

حضرت شعیب علیہ السلام کی مخالفت کے باوجود ان کو اقرار کرنا پڑا کہ وہ بڑے عبادت گزار ہیں:

﴿ يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ ﴾ (١١/ هود:٨٧)

''اے شعیب! کیا یہ تمہاری عبادت گزاری تم کو کہتی ہے کہ ہم اس کو چھوڑ دیں جس کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے۔''

آنحضرت ﷺ اپنی شہادت میں خود اپنی زندگی کو پیش کرتے ہیں:

﴿ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝ ﴾ (١٠/ یونس:١٦)

''میں نے تمہارے درمیان مدت تک عمر گزاری ہے کیا تم سمجھتے نہیں۔''

④ سب سے آخر یہ کہ تبلیغ و دعوت میں دین الٰہی کی نصرت اور اشاعت میں مخالفین کی شکست اور ہزیمت میں صلحا کو مزید ایمان اور تسکین کے حصول میں عجیب وغریب مافوق فہم نشانات ظہور پذیر ہوتے ہیں، جن کو عرف عام میں معجزات کہتے ہیں۔

غرض یہی وہ امور ہیں جو خالق اور داعی حق کے درمیان رابطہ خاص اور علاقہ مخصوص کو نمایاں کرتے ہیں اور جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرستادۂ الٰہی ہے۔

آیات و دلائل کی دو قسمیں، ظاہری اور باطنی

تفصیل بالا سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آیات اور نشانات دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک ظاہری اور مادی اور دوسری باطنی اور روحانی، ظاہری اور مادی آیات و دلائل تو وہ خوارق ہیں جن کو لوگ عام طور پر معجزات کہتے ہیں، مثلاً: مردہ کا زندہ کرنا، عصا کا سانپ بن جانا، انگلیوں سے پانی کا چشمہ ابلنا، بیمار کو اچھا کرنا وغیرہ۔ باطنی اور روحانی آیات و دلائل مدعی نبوت کی صداقت، معصومیت، تزکیہ، تاثیر، تعلیم، ہدایت، ارشاد و فلاح اور تائید ہے اہل نظر اور حقیقت شناسوں کے لیے یہی باطنی آثار و آیات نبوت کی حقیقی نشانیاں ہیں، باقی ظاہری نشانیاں صرف سطحی اور ظاہر بین نگاہوں کے لیے ہیں جو ہر چیز کو ان ظاہری آنکھوں سے دیکھ کر پہچانتی ہیں۔

نبوت کی باطنی نشانیاں واقعات کی روشنی میں

ہم نے نبوت کی ظاہری اور باطنی دو نشانیاں قرار دی ہیں اور باطنی نشانیوں کو ظاہری علامات پر ترجیح دی ہے اور یہ بتایا ہے کہ حقیقت شناس صرف باطنی نشانیوں کے طلب گار ہوتے ہیں، آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ قرآن مجید بھی ان ہی کو نبوت کی اصلی علامات قرار دیتا ہے، یہاں واقعات کی روشنی میں یہ واضح کرنا ہے کہ عہد نبوی ﷺ میں بھی جو لوگ اہل نظر تھے، وہ انہی علامات کی تلاش کرتے تھے، چنانچہ ان لوگوں کو بھی چھوڑ و جنھوں نے بالآخر نبوت کی تصدیق کی اس عہد کے ان یہودیوں اور عیسائیوں کو دیکھو جنھوں نے گو کسی سبب سے علی الاعلان اس کی تصدیق کی جرأت نہیں کی مگر وہ اندرونی طور سے متاثر ہو چکے تھے۔

بنی اسرائیل سے بڑھ کر عرب میں علاماتِ الٰہی کا راز دان کوئی اور نہ تھا سینکڑوں یہودی مشککانہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے، امتحانات لیے، تجربات کیے، مگر ان کا امتحان و تجربہ کیا تھا؟ یہ تھا کہ وہ آپ ﷺ کے اخلاق کی آزمائشیں کرتے تھے، صحف انبیائے بنی اسرائیل کے سوالات دریافت کرتے تھے، آپ کی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کرتے تھے، ان میں سے کسی نے آکر آپ سے خارق عادت معجزہ کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ تماشے بظاہر اور لوگ بھی دکھا سکتے ہیں اور یہ خوارق نبوت کی باطنی اور اندرونی علامات نہیں ہیں، آنے والے نبی کی بشارتیں اور صفتیں توراۃ اور انجیل دونوں میں مذکور تھیں لیکن ان میں سے کسی میں بھی صاحب خوارق ہونا اور ظاہری معجزات دکھانا۔ اس کی صفت نہیں بتائی گئی تھی بلکہ توراۃ میں اس

کے اوصاف یہ بتائے گئے تھے کہ وہ فاران سے طلوع ہوگا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آئے گا، اس کے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہوگی، وہ غریبوں اور مسکینوں کا مددگار ہوگا اور بدکاروں کو جنگی مرد کے مانند ہلاک کرے گا، وہ عبادت گزار اور خدا کے احکام کا مطیع ہوگا، مختون قوم (عرب) میں پیدا ہوگا۔ انجیل نے بتایا تھا کہ وہ تسلی کی روح ہوگا، وہ مسیح علیہ السلام کی نامکمل تعلیم کی تکمیل کرے گا، خدا کی زبان اس کے منہ میں ہوگی۔

سینکڑوں یہود ونصاریٰ آپ ﷺ کی خدمت میں آئے اور انہوں نے آپ ﷺ کی نبوت کا امتحان لیا مگر امتحان کے پرچہ میں مادی معجزات کا سوال شامل نہ تھا بلکہ عام علمی اور مذہبی باتوں کی نسبت استفسار تھا قرآن مجید نے ان کے دو سوالوں کو دہرایا ہے: ﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ ﴾ (۱۸/ الکہف:۸۳) اور ﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ﴾ (۱۷/ الاسراء:۸۵) پہلے سوال میں ''ذی القرنین'' کا قصہ پوچھا گیا ہے اور دوسرے سوال میں ''روح'' کی حقیقت دریافت کی گئی ہے، ان کے علاوہ قرآن مجید میں اہل کتاب کے متعدد اعتراضات اور سوالات مذکور ہیں مگر ان میں سے ایک میں بھی یہ نہیں کہ ہم کو اپنی نبوت کی صداقت کے ثبوت میں کوئی خارق عادت تماشا دکھاؤ بلکہ وہی سوالات کرتے تھے جس کو پیغمبر کے علم وعمل میں یا تعلیم وتزکیہ سے تعلق تھا، آگے چل کر ایک خاص باب میں ہم نے یہودیوں کے امتحانی سوالات جمع کر دیے ہیں، ان کو پڑھ کر تم بہتر فیصلہ کر سکتے ہو۔ قرآن مجید میں ان کا ایک سوال بے شبہ ایسا مذکور ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ بھی آنحضرت ﷺ سے کسی مادی معجزہ کی خواہش رکھتے تھے اور وہ یہ ہے:

﴿ يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَاۗءِ ﴾ (٤/ النسآء:١٥٣)

''اہل کتاب تجھ سے فرمائش کرتے ہیں کہ تو ان پر آسمان سے کتاب اتارے۔''

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ یہودیوں کی معجزہ طلبی نہ تھی بلکہ چونکہ تورات کے متعلق ان کا یہ خیال تھا کہ اس کی چند لوحیں خود اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے لکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی تھیں، اس لیے وہ اسی تخیل کے مطابق قرآن کے منجانب اللہ ہونے کے لیے اس کے نزول کو بھی اسی طرح چاہتے تھے۔ اب اس عہد کے عیسائیوں کو لو، قیصر روم کے دربار میں جب قاصد نبوی پہنچا تو ابوسفیان کو (جو اس وقت آنحضرت ﷺ کے دشمن تھے) بلوا کر قیصر نے آنحضرت ﷺ کے متعلق جو سوالات کیے، وہ حسب ذیل ہیں:

قیصر: مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان: شریف ہے۔

قیصر: اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: اس خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: جن لوگوں نے اس کا مذہب قبول کیا ہے، وہ کمزور ہیں یا صاحب اثر؟

ابوسفیان: کمزور لوگ ہیں۔

قیصر: اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟

ابوسفیان: بڑھتے جاتے ہیں۔

قیصر: کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہے؟

ابوسفیان: ابھی تک تو نہیں لیکن اب جو معاہدہ ہوا ہے دیکھیں وہ اس پر قائم رہتا ہے یا نہیں۔

قیصر: تم لوگوں نے اس سے جنگ کی ہے؟

ابوسفیان: ہاں۔

قیصر: نتیجہ کیا رہا؟

ابوسفیان: کبھی ہم غالب رہے کبھی وہ۔

قیصر: وہ کیا سکھاتا ہے؟

ابوسفیان: کہتا ہے ایک خدا کی عبادت کرو، کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاک دامنی اختیار کرو، سچ بولو، صلۂ رحم کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے کہا کہ ''تم نے اس کو شریف النسب بتایا، پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندان سے پیدا ہوتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اس کے خاندان میں کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے، تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا، جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے؟ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے اس کی پیروی کی ہے، پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں، تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے، سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں دیا، پیغمبر کبھی فریب نہیں دیتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز و تقویٰ اور عفاف کی ہدایت کرتا ہے اور اگر یہ سچ ہے تو وہ یقیناً پیغمبر ہے۔'' [1]

باوجود طول کلام کے ہم نے یہ تمام آیات سوالات و جوابات یہاں نقل کر دیے ہیں، غور کرو یہ تمام سوالات صرف پیغمبر کے حقیقی آثار و علامات سے متعلق ہیں، ان میں ایک سوال بھی ایسا نہیں ہے جن میں یہ مذکور ہو کہ یہ مکہ کا مدعی نبوت کوئی معجزہ بھی پیش کرتا ہے؟ حالانکہ اگر نبوت کی حقیقی علامت خوارق عادت ہوتے

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی إلی رسول اللہ ﷺ:7۔

تو سب سے پہلے عیسائی قیصر کو یہی سوال پوچھنا چاہیے تھا۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نجاشی کے دربار میں اسلام پر تقریر کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ ایھا الملك!ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے، اس اثنا میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا جس کی شرافت اور صدق و دیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے، اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو تکلیف نہ دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں، ہم ان پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمال سے باز آئے۔ [1]

نجران کے عیسائی علما جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے تو انہوں نے قرآن کی آیتیں سنیں، مسلمانوں کی روحانی کیفیتوں کا مشاہدہ کیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت اسلام کا فیصلہ دریافت کیا، اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے قرآن مجید کے حکم کے مطابق ان سے مباہلہ کرنا چاہا مگر انہوں نے منظور نہیں کیا اور آپس میں کہا کہ اگر یہ واقعی پیغمبر ہے تو ہم تباہ ہو جائیں گے، بالآخر سالانہ خراج پر صلح کر لی، [2] دیکھو انہوں نے اسلام کی تعلیمات کا ہر طرح امتحان کیا لیکن دعویٰ کے ثبوت میں انہوں نے ظاہری نشان نہیں مانگا۔

اب خاص عرب کے حقیقت شناس افراد کا مطالعہ کرو آنحضرت ﷺ کی نبوت کی ان میں سے ہزاروں اشخاص نے تصدیق کی جن کے فضل و کمال، عقل و ہوش اور فہم و ذکا پر ان کے حالات و واقعات گواہ ہیں مگر ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا، جو باطنی علامات کو دیکھ لینے کے بعد ظاہری نشانیوں کا طلب گار رہا ہو، مسلمانوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اسلام لائیں، چنانچہ آغاز وحی ہی میں آنحضرت ﷺ نے جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اپنے مشاہدات روحانی کا تذکرہ فرمایا تو وہ ایمان لے آئیں مگر کس اثر سے؟ اس کی توضیح اس سے ہوتی ہے کہ جب آپ ﷺ نے بتقاضائے بشریت ان سے اپنے خوف جان کا تذکرہ کیا تو انہوں نے جواب دیا:

والله ما يخزيك الله ابدا انك لتصل الرحم وتحمل الكل وتكسب المعدوم وتقري الضيف وتعين على نوائب الحق۔ [3]

"اللہ کی قسم! خدا آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا، آپ صلہ رحم کرتے ہیں، قرض داروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، غریبوں کی مدد کرتے ہیں، مہمانوں کو کھانا کھلاتے ہیں، حق کی مصیبتوں پر لوگوں

---

[1] مسند احمد، ج ۱، ص: ۲۰۲، ۲۰۳۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قصة اهل نجران: ۴۳۸۰۔ [3] صحیح بخاری، باب بدء الوحی: ۳۔

کی اعانت کرتے ہیں۔"

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو جب آنحضرت ﷺ کی بعثت کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے بھائی سے کہا کہ ذرا اس شخص کے پاس جا کر دیکھو جو دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے پاس آسمان سے خبر آتی ہے، وہ مکہ آئے اور تحقیق حال کر کے واپس گئے اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے جا کر کہا:

رأيته يامر بمكارم الاخلاق وكلامًا ماهو بالشعر۔ ❶

"میں نے اس کو دیکھا، وہ مکارم اخلاق کا حکم دیتا ہے اور ایک کلام پیش کرتا ہے جو شعر نہیں۔"

اس قسم کے بیسیوں واقعات ہیں جن سے حقیقت حال کی تشریح ہوتی ہے اور جن کی تفصیل سے "سیرۃ النبی ﷺ" کی گزشتہ جلدیں بھری پڑی ہیں۔

قرآن مجید اور نبوت کی باطنی علامات

یہ تمام بیانات درحقیقت قرآن مجید کی ان آیتوں کی تشریح ہیں، جن میں نبوت کی حقیقت اور اس کے اصلی آثار وعلامات بتائے گئے ہیں:

﴿ يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمۡ كَثِيرٗا مِّمَّا كُنتُمۡ تُخۡفُونَ مِنَ ٱلۡكِتَٰبِ وَيَعۡفُواْ عَن كَثِيرٖۚ قَدۡ جَآءَكُم مِّنَ ٱللَّهِ نُورٞ وَكِتَٰبٞ مُّبِينٞ ۝ يَهۡدِي بِهِ ٱللَّهُ مَنِ ٱتَّبَعَ رِضۡوَٰنَهُۥ سُبُلَ ٱلسَّلَٰمِ وَيُخۡرِجُهُم مِّنَ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِ بِإِذۡنِهِۦ وَيَهۡدِيهِمۡ إِلَىٰ صِرَٰطٖ مُّسۡتَقِيمٖ ۝ ﴾

(٥/ المآئدة:١٥۔١٦)

"اے یہود ونصاریٰ! تمہارے پاس ہمارا رسول آچکا جو تمہاری کتاب کی بہت سی باتیں جن کو تم چھپاتے ہو صاف صاف بیان کرتا ہے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے، اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی اور قرآن آچکا خدا اس کے ذریعہ سے ان کو جو اس کی خوشنودی کے پیرو ہیں سلامتی کے راستے دکھاتا ہے اور ان کو اپنے حکم سے وہ اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور ان کو سیدھا راستہ بتاتا ہے۔"

﴿ رَسُولٗا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُواْ عَلَيۡهِمۡ ءَايَٰتِهِۦ وَيُزَكِّيهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلۡكِتَٰبَ وَٱلۡحِكۡمَةَ ﴾

(٦٢/ الجمعه:٢)

"خود ان امیوں میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو خدا کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک و صاف کرتا ہے اور کتاب وحکمت کی ان کو تعلیم دیتا ہے۔"

﴿ رَسُولٗا مِّنۡ أَنفُسِهِمۡ يَتۡلُواْ عَلَيۡهِمۡ ءَايَٰتِهِۦ وَيُزَكِّيهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلۡكِتَٰبَ وَٱلۡحِكۡمَةَ ﴾

---

❶ صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابى ذر:٦٣٦٢۔

(۳/ آل عمران: ۱٦٤)

''خود امیوں میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو خدا کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک وصاف کرتا ہے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

﴿ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ ﴾ (۷/ الاعراف: ۱۵۷)

''اس امی فرستادۂ الٰہی اور پیغامبر کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ توراۃ وانجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ ان کو اچھے کام کا حکم دیتا ہے اور برے کام سے روکتا ہے اور پاک چیزوں کو ان کے لیے حلال اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے اور (رسم ورواج) کے جو بوجھ اور بیڑیاں ان پر پڑی ہوئی تھیں وہ ان سے دور کرتا ہے۔''

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ٤٥، ٤٦)

''اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو اپنا گواہ اور (نیکوکاروں کو) خوشخبری سنانے والا اور بدکاروں کو ڈرانے والا، خدا کی طرف اس کے حکم سے پکارنے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔''

الغرض نبوت کے اصلی آثار وعلامات یہ ہیں کہ وہ آیات الٰہی تلاوت کرتا ہے، زنگ آلودہ نفوس اور سیہ کار قلوب کو جلا دیتا ہے، لوگوں کو کتاب وحکمت اور اخلاق کی تعلیم دیتا ہے، اچھی باتوں کو پھیلاتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے، وہ طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام کرتا ہے، وہ قوموں کے بوجھ کو اتارتا ہے اور ان کے پاؤں کی بیڑیوں کو کاٹ ڈالتا ہے، وہ خدا کا گواہ بن کر اس دنیا میں آتا ہے، لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتا ہے، نیکوکاروں کو بشارت سناتا ہے، بدکاروں کو عذاب الٰہی سے ڈراتا ہے اور اس ظلمت کدۂ عالم میں وہ ہدایت کا چراغ بن کر چمکتا ہے۔ قریش آنحضرت ﷺ سے معجزہ کے طالب ہوتے ہیں اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْــَٔـلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۱۸، ۱۱۹)

''اور جن کو علم نہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا خود ہم سے باتیں کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی، ان سے پہلے لوگوں نے بھی اسی طرح کہا تھا، دونوں کے دل ایک ہی قسم کے ہوگئے، ہم نے تو نشانیاں ان لوگوں کے لیے جو یقین کرتے ہیں کھول کر رکھ دیں (اے

محمد ﷺ) ہم نے تجھ کو سچائی دے کر نیکو کاروں کو خوشخبری سنانے والا اور بدکاروں کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا اور (جن کو اب بھی یہ نشانیاں باور نہ آئیں) ان دوزخیوں کی تم سے باز پرس نہ ہو گی۔‘‘

کفار پیغمبر کی صداقت کی نشانی چاہتے ہیں، اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس کی صداقت کی روشنی تو اس کا سرتا پا وجود ہے اور اہل یقین کے لیے اس کی سچائی کی تمام نشانیاں ظاہر کر دی گئی ہیں، اس کی حقانیت نیکو کاروں کو خوشخبری سنانا، بدکاروں کو ڈرانا اور متنبہ کرنا اور اس سے انقلاب انسانی اور نتائج روحانی کا ظہور یہ خود اس کی صداقت کی کھلی نشانیاں ہیں:

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ ﴾

(۲۹/ العنکبوت:۵۰، ۵۱)

’’اور وہ کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اس کے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اتریں، کہہ دے کہ نشانیاں تو خدا کے پاس ہیں اور میں تو کھلا ڈرانے والا ہوں۔ ان کافروں کو یہ نشانی کافی نہیں کہ تجھ پر ہم نے کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔‘‘

یعنی خود یہ دعوت الٰہی اور پیغام ربانی آیت و نشانی ہے اور اہل بصیرت کے لیے یہی معجزہ ہے:

﴿ اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰۗؤُا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۝ﰁ ﴾ (۲۶/ الشعراء:۱۹۷)

’’کیا ان کافروں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں کہ بنی اسرائیل کے عالم لوگ اس کو جانتے ہیں۔‘‘

یعنی پیغمبر اسلام ﷺ کا معجزہ یہ ہے کہ ایک اُمی ہو کر وہ ایک ایسی کتاب اور ایسی تعلیم پیش کرتا ہے جس کی صداقت کو علمائے بنی اسرائیل جانتے اور سمجھتے ہیں، کیا یہ معجزہ جہلائے قریش کی تسلی کے لیے کافی نہیں ہے کہ بڑے بڑے علما اس کی سچائی کے دل سے معترف ہیں:

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ ﴾

(۲۰/ طٰہٰ:۱۳۳، ۱۳۴)

’’اور وہ کہتے ہیں کہ یہ پیغمبر اپنے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں لاتا کیا ان کو اگلی کتابوں کی گواہی نہیں پہنچی اور اگر ہم ان کو اس سے پہلے ہلاک کر دیتے تو یہ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار! کیوں تو نے ہمارے پاس کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کہ ہم تیری نشانیوں کی پیروی کرتے۔‘‘

یعنی گزشتہ انبیا علیہم السلام کی کتابوں میں آنے والے پیغمبر کی جو صفات اور نشانیاں مذکور تھیں، پیغمبر اسلام ﷺ کا ان کا مصداق کامل ہونا یہی سب سے بڑی نشانی ہے یا اس آیت کا دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ یہ کفار بار بار یہی کہتے ہیں کہ معجزہ دکھاؤ، معجزے تو انہیں دکھائے جاچکے، کیا یہ نہیں معلوم کہ گزشتہ قومیں معجزات دیکھ کر بھی جب ایمان نہ لائیں تو ان کا کیا حشر ہوا کفار کا سوال تھا کہ

﴿ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ﴾ (۱۳/ الرعد:۷)

''اس پیغمبر پر اس کے خدا کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری۔''

اس کے جواب میں خدا نے ارشاد فرمایا:

﴿ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾ (۱۳/ الرعد:۷)

''اے محمد (ﷺ)! تو صرف ڈرانے والا ہے اور ہر قوم میں ایک ہادی گزرا ہے۔''

مقصود یہ کہ نبوت کی حقیقت معجزہ نہیں بلکہ انذار اور ہدایت ہے۔

ظاہری آیات اور نشانات

لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انبیا علیہم السلام ظاہری آیات اور مادی نشانات سے خالی ہوتے ہیں، تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتیں بیک زبان اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ باطنی آیتوں کے ساتھ ان کو ظاہری حصہ بھی ملتا ہے، قرآن مجید نے اکثر انبیا علیہم السلام کے سوانح وواقعات کے ضمن میں ان کے ظاہری آثار ودلائل کو بھی بہ تفصیل بیان کیا ہے، بلکہ کہنا یہ ہے کہ یہ مادی اور ظاہری نشانات نبوت کی اصل حقیقت سے خارج ہیں یہی سبب ہے کہ متعدد مقامات پر قرآن مجید نے کفار کی مادی نشانیوں کی طلب میں آپ ﷺ کی طرف سے یہ الفاظ کہے:

﴿ هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل:۹۳)

''میں تو صرف ایک انسان پیغمبر ہوں۔''

ظاہری نشانات صرف معاندین طلب کرتے ہیں

لیکن نبوت کے ظاہری اور عامیانہ آثار وعلامات یعنی خارق عادت معجزات صرف وہ فرقہ طلب کرتا ہے جس کے دل کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں اور جو تعصب وعناد اور جہل کے باعث حق کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا، چنانچہ انبیائے کرام پر ایمان لانے والوں کے حالات پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ معجزات کی طلب نیکو کاروں نے نہیں کی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معجزہ بنی اسرائیل کے مقابلہ میں نہیں بلکہ فرعون کے مقابلہ میں دیا گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ان کے حواریوں نے نہیں بلکہ یہودیوں نے معجزہ طلب کیا، آنحضرت ﷺ سے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے نہیں، بلکہ ابوجہل وابولہب نے معجزہ مانگا، یہی حال دوسرے انبیا علیہم السلام کا بھی ہے، قرآن

مجید نے اس حقیقت کی پوری تصریح کی ہے اور طلب معجزہ کے سوال کو ہمیشہ کفار کی طرف منسوب کیا ہے:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۱۸)

''اور جن کو کتاب الٰہی کا علم نہیں (یعنی کفار قریش) کہتے ہیں کہ کیوں خدا ہم سے خود باتیں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔''

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ ﴾ (۶/ الانعام: ۳۷)

''اور کفار نے کہا کہ اس پیغمبر پر کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی۔''

﴿ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ ﴾ (۱۳/ الرعد: ۲۷)

''اور کفار کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی۔''

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۱۳۳)

''اور کفار نے کہا کہ یہ پیغمبر اپنے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں لاتا۔''

دیکھو کہ ہر آیت میں کفار ہی کا معجزہ طلب کرنا ظاہر کیا گیا ہے۔

کفار کا یہ معجزہ طلب کرنا نفی معجزہ کی دلیل نہیں

کفار کے اس بار بار کے اصرار سے کہ پیغمبر ہم کو معجزہ کیوں نہیں دکھاتے بعض نادان یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے ان کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا، اگر وہ کوئی معجزہ دیکھ چکے ہوتے تو بار بار معجزہ کے لیے اصرار کیوں کرتے؟ لیکن یہ استدلال سرتاپا غلط ہے، ان کو نفس معجزہ مانگنے پر بھی بلکہ مادی اور ظاہری معجزات طلب کرنے پر تنبیہ کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ نشانیوں کے ظاہر ہونے کے بعد بھی یہ عناد سے طلب معجزہ پر مصر ہیں، چنانچہ ان تمام مقامات میں جہاں کفار کی اس طلب معجزہ کا ذکر ہے یہ تصریح موجود ہے اور انہیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ان خوارق سے انہیں تسلی نہ ہوگی ان کو چاہیے کہ نبوت کے اصلی آثار و علامات کی طرف توجہ کریں کہ سعادت مند دلوں کی تسلی ان ہی سے ممکن ہے:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۞ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۞ ﴾ (۲/ البقرہ: ۱۱۸: ۱۱۹)

''اور جو نہیں جانتے وہ کہتے ہیں کہ کیوں خدا ہم سے خود باتیں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی آیت نہیں آتی ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی اسی طرح کہا تھا دونوں کے دل ایک سے ہو گئے ہیں، ہم نے نشانیاں ان لوگوں کے لیے جو یقین کرتے ہیں کھول کر رکھ دی ہیں، اے

پیغمبر! ہم نے تجھ کو سچائی دے کر، نیکوکاروں کو خوشخبری سنانے والا اور بدکاروں کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور (جن کو یہ نشانیاں باور نہ آئیں) ان دوزخیوں کی تم سے باز پرس نہ ہوگی۔"

اس آیت کریمہ میں صاف موجود ہے کہ ہم نشانیاں کھول کر بتا چکے ہیں لیکن ان نشانیوں سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اہل یقین ہیں اور جو ہر امر میں شک کرتے ہیں ان کا علاج صرف دوزخ ہے، دوسری آیت میں ہے:

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا يَأْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ ﴾

(۲۰/ طٰہٰ:۱۳۳، ۱۳۴)

"اور کہتے ہیں کہ یہ پیغمبر اپنے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں لاتا؟ کیا ان کے پاس گزشتہ کتابوں کی گواہی نہیں پہنچی؟ اگر ہم اس سے پہلے کسی عذاب سے ان کو ہلاک کر دیتے تو وہ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار! کیوں ہمارے پاس کوئی رسول تو نے نہیں بھیجا کہ ہم تیری نشانیوں کی پیروی کرتے۔"

اس آیت میں بھی معجزات ظاہر ہونے کے بعد مزید معجزات کی طلب پر گزشتہ قوموں کے واقعات کی طرح جو اگلی کتابوں میں مذکور ہیں، متوجہ کیا گیا ہے کہ دیکھ لو! دنیا میں ان کا کیا حشر ہوا جنہوں نے معجزوں کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں قبول کیا۔

معجزات تو بہرحال کسی نہ کسی آنی زمانہ اور مخصوص وقت میں ظاہر ہوتے ہیں اور پھر دنیا کے دوسرے حوادث کی طرح فنا ہو جاتے ہیں اس بنا پر اگر ہر معاند کے سوال پر پیغمبر معجزہ ہی دکھاتا رہے تو یہ تسلسل شاید کبھی ختم نہ ہو اور پیغمبر کی زندگی صرف ایک تماشا گر کی حیثیت اختیار کر لے اس لیے ظاہری معجزہ طلب کرنے والوں کو دائمی اور مسلسل معجزہ کی طرف ملتفت ہونے کی تاکید ہوتی ہے:

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ ﴾ (۲۹/ العنکبوت:۵۰، ۵۱)

"اور وہ کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی کہہ دے کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں میں صرف کھلا ڈرانے والا ہوں کیا یہ ان کو بس نہیں کرتا کہ ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔"

معاندین کو معجزہ سے بھی تسلی نہیں ہوتی

نفسیاتِ انسانی کا خاصہ ہے کہ جب کسی کی طرف سے اس کے جذبات مخالفانہ ہوتے ہیں تو وہ اس کی

کسی بات کو حسن ظن پر محمول نہیں کرتا اور اس کو اس کی ہر شے کے اندر شر، خبث اور بدی نظر آتی ہے، جلی سے جلی اور واضح سے واضح براہان بھی اس کے دل کے ریب اور قلب کے شک کو دور نہیں کر سکتے، معاندین جو انبیا علیہم السلام کے مکارم اخلاق، حسن عمل، حسن تعلیم اور دیگر علمی و عملی تلقینات کو باور نہیں کرتے اور ان کے کھلے اور بدیہی دعوؤں کو بھی تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے اور ہر قسم کی دلیلوں کو سن لینے کے بعد بھی وہ اپنے لاعلاج مرض شک سے نجات نہیں پاتے تو آخر الحیل کے طور پر وہ پیغمبروں سے خارق عادت معجزوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور چونکہ انہیں بدگمانی سے یہ یقین ہوتا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک مدعی انسان کبھی ایسی عجیب وغریب چیز پر قدرت نہیں رکھتا، اس لیے وہ کبھی کوئی خارق عادت امر پیش نہ کرے گا اور اس طرح اس کی رسوائی عالم آشکارا ہو جائے گی اور خود اسی کے ہاتھوں سے اس کے دعوؤں کے تار و پود بکھر جائیں گے لیکن قدرت الٰہی آخری حجت کے طور پر ان کے سامنے معجزات اور خوارق عادت بھی پیش کر دیتی ہے، تاہم ان کو دیکھ کر بھی معاندانہ روح ان کے دلوں میں پیغمبروں کی سچائی کا اعتبار نہیں پیدا ہونے دیتی اور بدگمانی انہیں یہ بتاتی ہے کہ گو اس خارق عادت کے ظہور میں تو شک نہیں مگر یہ خدائی قوت کا کرشمہ نہیں بلکہ یہ شیطانی عمل اور سحر و جادو کی قوت سے پیدا ہوا ہے اور چونکہ بظاہر معجزہ اور سحر و شعبدہ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا اس لیے ان کے بدگمان قلب کو اس سے بھی تسلی نہیں ہوتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو متعدد معجزے دکھائے مگر ہر ایک کے جواب میں انہیں یہی سننا پڑا کہ تم جادوگر ہو:

﴿ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ (۲۷/ النمل:۱۳) ''یہ تو کھلا جادو ہے۔''

﴿ اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۶۳) ''یہ موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) یقیناً جادوگر ہیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزۂ عصا کو دیکھ کر مصر کے جادوگر سجدے میں گر گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبری پر ایمان لے آئے مگر فرعون یہی کہتا رہا:

﴿ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۷۱)

''یہ موسیٰ علیہ السلام تم سب کا بڑا جادوگر ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے۔''

توراۃ میں یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کو جب کوئی معجزہ دکھاتے تھے تو ہر معجزہ کے بعد فرعون کے دل کی سختی علیٰ حالہ باقی رہ جاتی تھی، چنانچہ توراۃ میں تقریباً ہر معجزہ کے بعد یہ مذکور ہے۔ ''لیکن فرعون کا دل سخت رہا اور اس نے ان کی نہ سنی'' [1] انجیل کے بیان کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سب سے زیادہ معجزات دکھائے لیکن خود انجیل میں مذکور ہے کہ تقریباً ہر معجزہ کے بعد حاضرین کی دو جماعتیں ہو جاتی تھیں، ایک تو ان کی معتقد ہو جاتی تھی اور یقین کرتی تھی کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور

[1] توراۃ کتاب الخروج۔

دوسری کہتی تھی کہ یسوع کے ساتھ شیطان رہتا ہے تب یہودیوں کے بیچ ان باتوں کے سبب اختلاف ہوا اور بہتوں نے ان میں سے کہا کہ اس کے ساتھ ایک دیوتا رہتا ہے اور وہ مجنون ہے۔" [1] تم اس کی کیوں سنتے ہو اوروں نے کہا، یہ باتیں اس کی ہیں جس میں دیو ہے کیا دیوانہ اندھے کی آنکھیں کھول سکتا ہے۔ [2] ایک دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک گونگے کو اچھا کیا لوگ حیرت زدہ رہ گئے لیکن فریسی یہودیوں نے کہا: یہ دیوؤں کے سردار کی مدد سے دیوؤں کو نکالتا ہے۔ [3] حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے معاندین کے جواب میں کہا: "تم کہتے ہو کہ میں دیوؤں کو بعل زبول (ایک دیوتا کا نام ہے) کی مدد سے نکالتا ہوں۔ [4] حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے متعدد دفعہ لوگوں سے کہا کہ "تم معجزات دیکھتے ہو مگر ایمان نہیں لاتے۔"

یسوع (عیسیٰ علیہ السلام) نے یہ باتیں کہیں اور اپنے تئیں ان سے (فریسی یہودیوں سے) چھپایا اور اگرچہ اس نے ان کے روبرو اتنے معجزے دکھائے پر وہ اس پر ایمان نہ لائے [5] "تب ان شہروں کو جن میں اس کے بہت سے معجزے ظاہر ہوتے، ملامت کرنے لگا کیونکہ انہوں نے توبہ نہ کی تھی۔" [6]

کفار قریش آنحضرت ﷺ سے معجزوں کے طالب ہوتے تھے مگر جب معجزے دیکھتے تھے تو کاہن اور جادوگر کہنے لگتے تھے۔ [7] عرب میں پیشین گوئی کاہن کیا کرتے تھے، آنحضرت ﷺ کی پیشین گوئیوں کو دیکھ کر معاندین نے آپ ﷺ کو کاہن کا خطاب دیا تھا، اس لیے قرآن مجید نے کہا:

﴿ فَمَآ أَنتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ ﴾ (۵۲/ الطور:۲۹)

"اے پیغمبر! تو اپنے پروردگار کے فضل سے کاہن نہیں ہے۔"

﴿ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ ﴾ (۶۹/ الحاقۃ:۴۲) "اور یہ کسی کاہن کی بات نہیں ہے۔"

آنحضرت ﷺ کے معجزات اور خوارق کو وہ دیکھتے تھے اور ان کو جادو کا اثر سمجھتے تھے۔

﴿ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿٢٣﴾ فَقَالَ إِنْ هَٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ﴿٢٤﴾ ﴾ (۷۴/ المدثر:۲۳، ۲۴)

"پھر پیٹھ پھیر کر چلا اور غرور کیا اور کہا کہ یہ تو جادو ہے جو اگلے وقتوں سے چلا آتا ہے۔"

کفار ایک دوسرے کو منع کیا کرتے تھے کہ محمد (ﷺ) کے پاس نہ جایا کرو کیونکہ وہ جادو کیا کرتے ہیں:

﴿ هَلْ هَٰذَآ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۖ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ ﴿٣﴾ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۳)

"یہ محمد تو تمہاری ہی طرح آدمی ہیں کیا تم جادو کے پاس آتے ہو اور تم دیکھ رہے ہو۔"

﴿ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٧﴾ ﴾ (۴۶/ الاحقاف:۷)

"حق کے منکرین کے پاس جب حق آیا تو انہوں نے کہا یہ تو کھلا جادو ہے۔"

---

[1] یوحنا کی انجیل، باب: ۱۰۔۱۹۔ [2] متی کی انجیل، باب: ۹۔۳۴۔
[3] لوقا کی انجیل: ۱۱، ۱۸۔ [4] یوحنا کی انجیل: ۱۳، ۳۷۔ [5] متی کی انجیل: ۱۱، ۱۰۔
[6] متی کی انجیل: ۱۱، ۱۰۔ [7] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، مناقب ابی ذر: ۶۳۶۱۔

آنحضرت ﷺ نے جب معجزہ شق القمر دکھایا تو کفار نے اس کو بھی جادو کہا:

﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ ﴾

(٥٤/ القمر:١، ٢)

''نزدیک آ گئی قیامت اور چاند پھٹ گیا اور اگر وہ کوئی بھی نشانی دیکھیں تو منہ پھیر لیں اور کہیں کہ یہ تو جادو ہے جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔''

دوسرے معجزات کو دیکھ کر وہ یہی کہتے رہے کہ محمد (ﷺ) تو جادوگر ہے:

﴿ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝ ﴾

(١٠/ يونس:٢)

''کیا لوگوں کو اس پر تعجب ہے کہ ہم نے ان میں سے ایک پر وحی اتاری کہ لوگوں کو ڈرا اور ان کو جو ایمان لائے بشارت دے کہ ان کے پروردگار کی بارگاہ میں ان کی بڑی پائے گاہ ہے کافر کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادوگر ہے۔''

معاندین کو معجزہ سے بھی ایمان کی دولت نہیں ملتی

چونکہ معاندین کو حق و باطل کی تمیز کی قوت نہیں ہوتی اور یقین کی سعادت سے وہ محروم ہوتے ہیں، اس لیے بڑی سے بڑی نشانی بھی شک و شبہ کے گرداب سے ان کو باہر نہیں نکال سکتی، وہ کبھی اس کو بخت و اتفاق کا نتیجہ سمجھتے ہیں، کبھی اس کو سحر و جادو سمجھ کر اس کی تکذیب کرتے ہیں، کبھی فریب اور قوت شیطانی کا ان کو دھوکا ہوتا ہے، اس لیے معجزات سے بھی ان کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی، حجت کے لیے ایک دفعہ معجزہ ان کو دکھایا گیا تو ان کا شبہ رفع نہیں ہوا پھر معجزہ طلب کرتے ہیں تو قرآن کہتا ہے کہ اب بھی ان کی تسلی نہ ہوگی، چنانچہ سورۂ انعام کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام مراتب کو بیان کر دیا ہے:

﴿ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۝ ﴾ (٦/ الانعام:٤)

''اور خدا کی نشانیوں سے کوئی نشانی ان کے پاس نہیں آتی لیکن یہ کہ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔''

﴿ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ ﴾ (٦/ الانعام:٧)

''اے پیغمبر! اگر ہم تجھ پر ایسی کتاب بھی آسمان سے اتاریں جو اوراق میں لکھی ہو کہ وہ اس کو اپنے ہاتھوں سے چھوئیں تو وہ جو کافر ہیں یہی کہیں گے کہ یہ فقط ایک ساحرانہ تماشا ہے۔''

﴿ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ (٦/ الانعام:٢٥)

''اور اگر وہ تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں گے تو وہ ایمان نہ لائیں گے یہاں تک کہ جب وہ تیرے پاس آتے ہیں تو تجھ سے جھگڑا کرتے ہیں اور کافر کہتے ہیں کہ یہ تو صرف اگلوں کی کہانیاں ہیں۔''

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝ ﴾ (٦/ الانعام:٨، ٩)

''اور کہتے ہیں کہ اس پیغمبر کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا، کہہ دے کہ اگر فرشتہ اتارا جاتا تو ان کو پھر مہلت نہ دی جاسکتی اور بات پوری ہو جاتی اگر ہم رسول کا ساتھی کسی فرشتہ کو بناتے تو اس کو بھی انسان ہی کی صورت میں بناتے تو پھر وہی شبہے ان کے دلوں میں ہم پیدا کرتے جواب یہ کر رہے ہیں۔''

﴿ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰۗىِٕكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ۝ ﴾ (٦/ الانعام:١١١)

''اور اگر ہم ان کے پاس آسمان سے فرشتے بھی اتار کر بھیجیں اور مردے بھی ان سے باتیں کریں اور ہر چیز ان کے سامنے لا کھڑی کر دیں تو وہ ایمان نہ لائیں گے لیکن یہ کہ خدا کی مشیت ہو لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔''

آنحضرت ﷺ کو فرط شفقت سے یہ خیال بار بار آتا تھا کہ یہ رؤسائے قریش ایمان کی دولت سے محروم نہ رہنے پائیں خدا نے فرمایا کہ ان کو حقیقت میں براہ راست نبوت کا انکار نہیں بلکہ ان کو نبوت سے اس لیے انکار ہے کہ ان کو اولاً نفس خدا پر یقین نہیں یہ بظاہر نبوت کی نشانیوں کو طلب کرتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کو خدا کی نشانیاں بھی تسلیم نہیں ایسے لوگوں کی قسمت میں ایمان کی سعادت نہیں، ان کے لیے معجزے بیکار ہیں یہ سعادت انہی کو ملتی ہے جو حق کے طالب ہیں اور حق کی باتوں کو سنتے ہیں:

﴿ قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰي مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓي اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَاۗءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاۗءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَي الْهُدٰي فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ

يَسْمَعُوْنَ ؕ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (٦/ الانعام:٣٣ تا ٣٧)

''ہم جانتے ہیں کہ ان کافروں کی باتیں تجھ کو غمگین کرتی ہیں لیکن تجھ کو غمگین نہ ہونا چاہیے کیونکہ وہ تجھ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ دراصل ان ظالموں کو خدا کی نشانیوں سے انکار ہے تجھ سے پہلے انبیا بھی جھٹلائے گئے تو انہوں نے اپنی تکذیب پر صبر کیا اور ان کو بھی ایذا پہنچائی گئی یہاں تک کہ ان کے پاس خدا کی نصرت آئی خدا کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں گزشتہ پیغمبروں کے واقعات مجھ کو معلوم ہو چکے ہیں اور اگر ان کافروں کی روگردانی تجھ پر گراں ہو تو اگر تجھ میں طاقت ہو تو زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ کر ان کو کوئی نشانی لاکر دے (ان نشانیوں سے ان پر کوئی اثر نہ ہوگا) اگر خدا چاہتا تو ان کو راہ ہدایت پر متفق کر دیتا تو (غمگین ہوکر) جاہلوں میں سے نہ بن، دعوت الٰہی کو وہی قبول کرتے ہیں جو آواز پر کان دھرتے ہیں (اور یہ کافر جو دل کے مردے) ہیں ان کو خدا ہی اٹھائے گا پھر اسی کی طرف لائے جائیں گے یہ کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اس کے پروردگار کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی کہہ دے کہ خدا نشانی لانے پر قادر ہے لیکن اکثر لوگ نادان ہیں۔''

لیکن معجزہ دیکھنے پر بھی ان کے قلوب کو اطمینان حاصل نہ ہوگا کیونکہ اس شک وشبہ کا منشا محض عناد ہے حق طلبی نہیں اگر حق طلبی مقصود ہوتی تو پہلی ہی دفعہ دیکھ کر وہ ایمان لے آتے:

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ﴾ (٦/ الانعام:١١٠ تا ١١٣)

''اور یہ کافر خدا کی بڑی بڑی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی ان کے پاس آ جائے گی تو وہ اس پر ایمان لے آئیں گے کہہ دے کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں اور تمہیں کس نے بتایا کہ یہ نشانیاں دیکھ کر ایمان لائیں گے یہ ایمان نہیں لائیں گے (نشانی کے بعد) ہم ان کے دلوں کو (حصول یقین سے) اور ان کی آنکھوں کو (اپنے دیکھنے پر اعتبار کرنے سے) پھیر دیتے ہیں جس طرح کہ یہ پہلے اس پر ایمان نہیں لائے اور ہم ان کو ان کی اسی سرکشی کی حالت

میں چھوڑ دیں گے کہ بھٹکتے رہیں اگر ہم ان کے پاس فرشتے بھی اتار کر بھیجیں اور مردے بھی اٹھ کر ان سے باتیں کریں اور ہر چیز ہم ان کے سامنے بھی کر دیں تو وہ ایمان لانے والے نہیں، مگر جو چاہے اللہ، لیکن ان میں اکثر نادان ہیں اور ہم نے اسی طرح ہر نبی کا معاند انسانوں اور جنوں سے بنایا ہے جو ایک دوسرے کو دھوکے کی نمائشی باتیں سکھایا کرتے ہیں (اسی عناد کے باعث وہ نشانیوں کو نہیں مانتے)۔''

اگر رفع حجت کے لیے ان کو معجزہ دکھایا بھی جاتا ہے تو حیلہ جوئی کر کے کہتے ہیں کہ گزشتہ انبیا کو جیسے معجزے دیے گئے، جب تک وہی معجزے ہم کو نہ دیے جائیں ہم ایمان نہ لائیں گے:

﴿ فَلْيَأْتِنَا بِآيَةٍ كَمَآ أُرْسِلَ الْأَوَّلُونَ ۝﴾ (۲۱/ الانبیاء:۵)

''چاہیے کہ ہمارے پاس کوئی نشانی لائے جیسے پہلے لوگ پیغمبر بنا کر بھیجے گئے۔''

لیکن فرض کرو کہ وہی معجزات دکھائے جائیں تو ان کی حیلہ جو طبیعت ان سے کب تسلی پائے گی، وہ فوراً یہ کہہ دیں گے جیسا کہ انہوں نے بارہا کہا ہے کہ یہ محض ساحرانہ کرشمہ ہے اور ہماری آنکھوں کو مسحور کر دیا گیا ہے:

﴿ وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ۝ لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَائِكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ مَا نُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُنْظَرِينَ ۝ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْأَوَّلِينَ ۝ وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ كَذَٰلِكَ نَسْلُكُهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ۝ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ ۝ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ۝ لَقَالُوا إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَسْحُورُونَ ۝﴾ (۱۵/ الحجر: ۶ تا ۱۵)

''اور کافر کہتے ہیں کہ اے وہ جس پر نصیحت اتری ہے تجھ پر کوئی جن سوار ہے، کیوں تو فرشتوں کو ہمارے پاس نہیں لے آتا اگر تو سچا ہے، خدا کہتا ہے ہم فرشتوں کو دنیا میں حق کے ساتھ اتارتے ہیں، اگر فرشتے اتار دیے جائیں تو پھر ان کافروں کو مہلت نہ دی جائے گی اس نصیحت کو ہم نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔ ہم نے تجھ سے پہلی قوموں میں بھی پیغمبر بھیجے اور ان میں سے کسی کے پاس کوئی پیغمبر نہ گیا لیکن انہوں نے اس سے تمسخر کیا اسی طرح ہم گنہگاروں کے دلوں میں بٹھا دیتے ہیں وہ اس پر ایمان نہ لائیں گے یہ اگلوں سے رسم ہوتی آئی ہے اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیں اور وہ اس میں چڑھ بھی جائیں تو یہی کہتے رہیں گے کہ ہماری آنکھوں کو متوالا بنایا گیا ہے بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔''

حاصل یہ کہ ان معاندین کے شکوک وشبہات کا تو بر تو بادل معجزات اور آیات کی روشنی سے بھی نہیں چھٹتا، آنحضرت ﷺ نے جب پہلے پہل اسلام کی دعوت ان کے سامنے پیش کی تو آپ کو انہوں نے مجنون کا خطاب دیا قرآن مجید نے ان کی تردید کی:

﴿ مَآ أَنتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ ﴾ (۶۸/ القلم:۲)

''تو اپنے پروردگار کی عنایت سے مجنون نہیں۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے ان کے سامنے معجزات اور آیات پیش کیے کہ کہیں مجنون سے بھی یہ افعال صادر ہوتے ہیں؟ تو انہوں نے آپ کو مجنون کے ساتھ ''کاہن'' اور ''جادوگر'' کہا:

﴿ فَمَآ أَنتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَلَا مَجْنُونٍ ﴾ (۵۲/ الطور:۲۹)

''تو اپنے پروردگار کی عنایت سے نہ تو کاہن ہے اور نہ مجنون۔''

﴿ قَالَ الْكَافِرُونَ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ مُّبِينٌ ﴾ (۱۰/ یونس:۲)

''کافروں نے کہا کہ یہ تو کھلا ہوا جادوگر ہے۔''

آپ ﷺ نے ان کے اس الزام کے جواب میں اپنی تعلیمات وتلقینات کو پیش فرمایا کہ کاہن و جادوگر علم وحکمت کا یہ خزانہ نہیں رکھتے لیکن پر عناد قلوب کو اس سے بھی تسلی نہ ہوئی اور کہا کہ علم وحکمت کے اسرار انہیں کوئی سکھاتا ہے:

﴿ وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ ﴾ (۴۴/ الدخان:۱۴)

''اور (ان معاندوں نے) کہا کہ یہ سکھایا ہوا مجنون ہے۔''

الغرض انسانوں کے افہام وتفہیم اور ہدایت وراہنمائی کے جو اسلوب اور طریق ہو سکتے تھے وہ سب ان کے سامنے پیش کیے گئے مگر انہیں شک وشبہ کی کشمکش سے نجات نہ ملی۔

بایں ہمہ انبیا علیہم السلام معاندین کو معجزات دکھاتے ہیں اور وہ اعراض کرتے ہیں

معاندین کی اس پیہم طلب اور اصرار سے خیال ہو سکتا ہے کہ اگر ان کو کوئی معجزہ دکھایا جائے تو وہ شاید ایمان لے آئیں لیکن تمام انبیا علیہم السلام کی سیرتیں شہادت دیتی ہیں کہ ایسا نہیں ہوا، انہوں نے معجزات دیکھے پھر بھی اپنے انکار واعراض پر نہایت استقلال کے ساتھ قائم رہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو بار بار معجزہ دکھایا لیکن اس کا انکار ایمان سے متبدل نہ ہوا جیسا کہ توراۃ اور قرآن دونوں میں بہ تکرار بیان ہوا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ فَلَمَّا جَآءَهُم بِآيَاتِنَآ إِذَا هُم مِّنْهَا يَضْحَكُونَ ۝ وَمَا نُرِيهِم مِّنْ آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا وَأَخَذْنَاهُم بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ وَقَالُوا يَآ أَيُّهَ السَّاحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِندَكَ

اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ۝﴾ (۴۳/ الزخرف:۴۷ تا ۵۰)

''جب موسیٰ علیہ السلام ہماری نشانیاں لے کر فرعون کے پاس آیا تو وہ ہنستے ہیں اور ہم انہیں کوئی نشانی نہیں دکھاتے ہیں، لیکن یہ کہ وہ پہلی نشانی سے زیادہ بڑی ہوتی ہے اور ہم نے ان کو بڑے عذاب میں گرفتار کیا کہ شاید وہ رجوع کریں اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے جادوگر! اپنے خدا سے ہمارے لیے دعا کر جیسا کہ اس نے تجھ سے تیری دعاؤں کے قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے کہ وہ ہم سے یہ عذاب دور کر دے ہم راہ راست قبول کیے لیتے ہیں جب ہم نے ان سے عذاب ہٹا دیا تو وہ اپنا وعدہ توڑ ڈالتے ہیں۔''

اس موقع پر ایک نکتہ خاص خیال کے لائق ہے، یہ حکایت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کا ایک ٹکڑا ہے جو زمانہ ماضی کا ایک واقعہ تھا، جس کو تمام تر صیغۂ ماضی سے ادا ہونا چاہیے تھا لیکن اس میں تین جگہ اللہ تعالیٰ نے صیغہ مضارع کا استعمال کیا ہے جو واقعہ حال و مستقبل کے بیان کے لیے مقرر ہے:

① جب موسیٰ علیہ السلام ہماری نشانیاں لے کر فرعون کے پاس آئے تو وہ ہنستے ہیں۔

② اور ہم انہیں کوئی نشانی نہیں دکھاتے ہیں لیکن وہ پہلی نشانی سے بڑی ہوتی ہے۔

③ پہلے انہوں نے وعدہ کیا کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول ہوگئی تو ہم ایمان لے آئیں گے لیکن جب دعا قبول ہو کر اس کا اثر ہوا تو وہ اپنا وعدہ توڑ ڈالتے ہیں۔

اس موقع پر صیغہ مضارع کے استعمال سے یہ نکتہ پیدا ہوتا ہے کہ گو یہ واقعہ خاص فرعون کے ساتھ پیش آیا مگر یہ مخصوص حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کے فرعون کے ساتھ نہیں بلکہ ہر عہد کے فرعون اور ہر پیغمبر کے معاندین کی نفسی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ جب ان کے پیغمبر خدا کے احکام اور نشانیاں لے کے ان کے پاس جاتے ہیں تو وہ صدائے خندۂ تحقیر بلند کرتے ہیں لیکن خدا ان کو نشانیوں پر نشانیاں دکھاتا جاتا ہے، تاہم ان سے ان کی تسکین نہیں ہوتی اور دوسری کوئی نشانی مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ نشانی ہم کو دکھا دی گئی تو ہم یقیناً ایمان لے آئیں گے لیکن جب وہ نشانی بھی ان کو دکھا دی جاتی ہے تو ان کو اس سے بھی تسکین نہیں ہوتی اور وہ آخر تک ایمان کی سعادت سے محروم رہتے ہیں۔

حضرت صالح علیہ السلام کی امت نے حضرت صالح علیہ السلام سے ایک نشانی طلب کی، انہوں نے کہا یہ اونٹنی تمہاری نشانی ہے، جو ایک دن میں ان کے چشمہ یا کنوئیں کا تمام پانی پی جاتی تھی اور دوسرے دن ان کے جانوروں کو پانی ملتا تھا لیکن اس نشانی کو دیکھ کر کہ اونٹنی تمام چشمہ یا کنوئیں کا پانی پی جاتی ہے، انہیں تسکین نہ ہوئی اور اس اونٹنی کو مار ڈالا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی پاداش میں وہ ہلاک کر دیے گئے، سورۂ شعراء میں ہے:

﴿ مَاۤ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۝ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ

وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ۝ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾

(۲۶/ الشعرآء:۱۵٤ تا ۱۵۸)

''اے صالح! تم ہماری ہی طرح آدمی ہو، اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہوتو کوئی نشانی لاؤ، صالح نے کہا یہ اونٹنی ہے اس کے لیے پانی پینے کی ایک باری ہے اور تمہارے لیے ایک مقرر دن کا پانی پینا ہے اور اس کے ساتھ کوئی برائی نہ کرو ورنہ ایک بڑے دن کا عذاب تم کو آئے گا تو انہوں نے اس کی کونچ کاٹ ڈالی پھر نادم ہوئے تو عذاب نے انہیں آ گھیرا۔ اس واقعہ میں بڑی نشانی ہے، صالح علیہ السلام کی قوم کے لوگ اکثر مؤمن نہ تھے۔''

عہد محمدی ﷺ کے فرعونوں اور معاندوں کی نفسی کیفیت بھی یہی تھی کہ ان کو نشانیاں دکھائی جاتی تھیں، مگر انہیں عناد کی کور باطنی کے باعث ان سے تسکین نہیں ہوتی تھی، چنانچہ کفار قریش کے حال میں قرآن مجید کا بیان ہے:

﴿ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۝ فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۭ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰۗؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ﴾

(٦/ الانعام:٤، ٥)

''ان کے پاس خدا کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی نہیں آتی لیکن وہ اس سے اعراض کرتے ہیں، حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے اس کو جھٹلایا تو عنقریب جس چیز کا مذاق اڑاتے ہیں، اس کی حقیقت ان کو معلوم ہوگی۔''

ایک موقع پر قرآن مجید نے اسی واقعہ کو بیان کیا ہے کہ جب محمد رسول اللہ ﷺ کے صدق نبوت کی کوئی نشانی ظاہر ہوتی ہے تو معاندین قریش کہتے ہیں کہ ان نشانیوں سے ہم کو تسکین نہ ہوگی، جب تک گزشتہ پیغمبروں کی طرح خود ہم کو بھی وہی نشانیاں نہ دی جائیں، یعنی نبوت کے تمام آثار و کیفیات خود ہم پر طاری نہ ہوں، تاکہ ہم کو دھوکا اور فریب کا شبہ نہ رہے، خدا نے کہا، یہ نبوت ہر ایک کا حصہ نہیں:

﴿ وَاِذَا جَاۗءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ڃ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ۭ ﴾ (٦/ الانعام:١٢٤)

''اور جب ان کفار قریش کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں ہم اس وقت تک نہ مانیں گے جب تک ہم کو بھی وہ کچھ نہ دیا جائے جو خدا کے پیغمبروں کو دیا گیا ہے، خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغامبری کا منصب کس کو عطا کرے۔''

اس لیے بالآخر معاندین کی طلب معجزہ سے تغافل برتا جاتا ہے

ان تمام منازل کے طے ہونے کے بعد بالآخر معاندین پر حجت تمام ہو جاتی ہے اور پھر طلب معجزہ کے لیے ان کے پیہم اصرار الحاح اور طلب کی کوئی پروا نہیں کی جاتی اور صرف عذاب الٰہی کی آخری نشانی ان کے لیے باقی رہ جاتی ہے، انجیل کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تمام انبیا علیہم السلام سے زیادہ معجزات اور نشانیاں دکھائیں، تاہم فریسی یہودیوں کو معجزہ کی تشنگی باقی رہ گئی اور ہر ملاقات میں انہوں نے معجزہ کی نئی فرمائش کی۔

''تب فریسی نکلے اور اس (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) سے حجت کر کے اس کے امتحان کے لیے کوئی آسمان سے نشان چاہا۔'' (مرقس ۸۔۱۱)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آہ سرد بھر کر فرمایا:

''اس زمانہ کے لوگ کیوں نشان چاہتے ہیں تم سے کہتا ہوں کہ زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان نہ دیا جائے گا۔'' (مرقس ۱۸۔۱۲)

ایک دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک گونگے کو اچھا کیا بعضوں نے کہا کہ

''یہ بعل زبول دیوتا کی مدد سے ایسے عجیب کام کرتا ہے اور اوروں نے آزمائش کے لیے اس سے ایک آسمانی نشان مانگا۔'' (لوقا ۱۱۔۱۶)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا:

''اس زمانہ کے لوگ بُرے ہیں، وہ نشان ڈھونڈتے ہیں، پر کوئی نشان ان کو نہ دیا جائے گا مگر یونس نبی کا نشان۔'' (لوقا: ۱۱۔۲۹)

اللہ تعالیٰ نے معاندینِ قریش کے جواب میں اسی نکتہ کا اظہار فرمایا:

﴿ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۵۹)

''اور ہم کو نشانیوں کے بھیجنے سے صرف اس امر نے باز رکھا کہ پہلوں نے ان کو جھٹلایا۔''

قرآن مجید میں چار پانچ مقام پر مذکور ہے کہ عہد محمدی ﷺ کے معاندین نے کہا:

﴿ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ ﴾ (۱۳/ الرعد: ۷)

''محمد ﷺ پر اس کے خدا کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری جاتی۔''

اس کے جواب میں ان کو نبوت کی اصلی حقیقت، انذار، تبشیر اور ہدایت کی طرف متوجہ کیا گیا اور خرق عادت کی کسی مزید نشانی کے دکھانے سے تغافل اور احتراز برتا گیا۔ عیسائی معترضین قرآن مجید کی ان آیتوں کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ ''محمد (ﷺ) نے معجزہ دکھانے سے اس لیے انکار کیا کہ ان کو خدا کی طرف سے کوئی معجزہ نہیں ملا تھا۔'' اگر ان آیتوں سے یہ استنباط صحیح ہے تو انجیل کی جو آیتیں ہم نے اوپر نقل کی ہیں، ان کا کیا

مطلب ہوگا؟ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فریسیوں کو معجزہ دکھانے سے انکار کرنا بھی یہی نتیجہ ظاہر کرتا ہے کہ نعوذ باللہ ان کو کوئی معجزہ خدا کی طرف سے نہیں ملا تھا؟

معجزہ کے انکار یا تاخیر کے اسباب

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات روحانی کو بھی ایک نظام اور اصول کے تحت رکھا ہے، اس بنا پر ہم کو ضرورت ہے کہ ان مصالح اور اسباب کا پتہ لگائیں جن کی بنا پر باوجود قدرت اور اشد ضرورت کے معجزات سے کلیتہً انکار کیا گیا ہے یا ان کے ظہور میں تاخیر ہوتی ہے۔ قرآن مجید کے امعان مطالعہ سے ان اسباب کو ذیل کی صورتوں میں محدود کیا جا سکتا ہے۔

① معجزات کے ذریعہ سے جو لوگ ایمان لاتے ہیں، ان کا ایمان محض جبری، تقلیدی اور بالواسطہ ہوتا ہے، وہ لوگ اپنے دل میں انبیا کے محاسن تعلیم کا کوئی خاص ذوق نہیں پاتے، صرف معجزات کی قوت اور عجوبگی ان کو متحیر اور مبہوت کر دیتی ہے، حالانکہ انبیا علیہم السلام کی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی جماعت میں ایسے افراد شامل ہوں جو شریعت کے رمز شناس اور اس کے اسرار و حکم سے ذوق آشنا ہوں۔ یہی حالت ہے جس کو قرآن مجید نے ''شرح صدر'' اور انشراح قلب سے تعبیر کیا ہے:

﴿ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ ﴾ (٦/ الانعام:١٢٦)

''جس کو خدا ہدایت دینا چاہتا ہے، اس کے سینہ کو قبول اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔''

اس قسم کے لوگوں کے لیے معجزات کی ضرورت نہیں ہوتی، ان کے لیے آفتاب و ماہتاب آسمان و زمین، دن اور رات غرض دنیا کا ایک ایک ذرہ معجزہ ہوتا ہے اور خدا کے وجود، خدا کی وحدانیت اور پیغمبر کی نبوت پر بلاواسطہ دلالت کرتا ہے، ان کے لیے صرف تفکر اور بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے، یہی گروہ ہے جس پر زیادہ سے زیادہ انبیا علیہم السلام کی نگاہ انتخاب پڑتی ہے اور وہ ان کو صرف تفکر و اعتبار کی ترغیب دیتے ہیں، اس گروہ کے بالمقابل ایک کور باطن فرقہ اور بھی ہوتا ہے جس پر نظام فطرت کے دوسرے شواہد و آیات کی طرح معجزات کا بھی کوئی خاص اثر نہیں پڑ سکتا، انبیا علیہم السلام کو ابتدائے بعثت سے انہی دو گروہوں سے سابقہ پڑتا ہے اور چونکہ فطرۃً ایک معجزات سے بے نیاز ہوتا ہے اور دوسرے پر معجزات کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، اس لیے ان دونوں گروہوں کے لیے معجزات بیکار ہوتے ہیں اور اس بنا پر انبیا علیہم السلام ان کے پیش کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ اسی نکتہ کو خداوند تعالیٰ نے ان آیتوں میں بیان کیا ہے:

﴿ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾

(١٠/ یونس: ١٠١)

''کہہ کہ دیکھو آسمان و زمین میں کس قدر نشانیاں ہیں اور نشانیاں اور ڈراوے تو اس قوم کے

لیے کچھ بھی مفید نہیں جو ایمان نہیں لانا چاہتی۔''

﴿ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ﴾ (۱۳/ الرعد:۲۷)

''اور کفار کہتے ہیں کہ اس پر خدا کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نہیں اترتا کہ خدا جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے، اس کو ہدایت کرتا ہے۔''

② بعض دفعہ معاندین ایسی نشانیوں کے طلب گار ہوتے ہیں جن کے بار کے متحمل، قوت انسانی کے دوش وباز و نہیں ہو سکتے، خدا کا خود انسانوں کے سامنے آنا، خدا کا خود ہر انسان سے باتیں کرنا، فرشتوں کا نظر آنا، آسمان سے کوئی مجسم کتاب اتارنا بازیگری کی طرح پیغمبر کا آسمان پر چڑھنا، کفار کی طرف سے جب اس قسم کے معجزات طلب کیے جاتے ہیں تو انبیا علیہم السلام کو ہمیشہ انکار کرنا پڑتا ہے اور اس انکار کا منشا خود منکرین کی فطرت ہے:

﴿ يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَن تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِّنَ السَّمَاءِ ۚ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَىٰ أَكْبَرَ مِن ذَٰلِكَ فَقَالُوا أَرِنَا اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ﴾ (٤/ النسآء:١٥٣)

''تم سے یہود کہتے ہیں کہ ان کے اوپر آسمان سے ایک کتاب اتار دو، لیکن ان لوگوں نے تو موسیٰ سے اس سے بھی بڑا سوال کیا تھا یعنی ان لوگوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو کھلم کھلا دکھا دو اس ظلم کا جو انہوں نے اپنے اوپر کیا یہ نتیجہ ہوا کہ بجلی کی کڑک نے ان کو دبا دیا۔''

﴿ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۘ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ ۗ ﴾ (٢/ البقرہ:١١٨)

''اور جن لوگوں کو علم نہیں وہ کہتے ہیں کیوں خدا ہم سے باتیں نہیں کرتا یا کوئی نشانی ہمارے پاس نہیں لاتا، اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی کہا، دونوں کے دل ایک سے ہیں۔''

﴿ لَّوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَائِكَةِ إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ مَا نُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُّنظَرِينَ ۝ ﴾ (١٥/ الحجر:٧، ٨)

''کیوں نہیں فرشتوں کو ہمارے پاس لے آتے اگر تم سچے ہو (خدا کہتا ہے) ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے لیکن حق کے ساتھ اگر وہ ان کافروں کے سامنے اتریں تو پھر ان کو مہلت نہ دی جا سکے گی۔''

③ مادیت کی ترقی کے زمانہ میں تمام فضائل ومحاسن کا مرکز صرف دولت، جائداد، مال واسباب ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ عام لوگ اخلاق وعادات، تمدن ومعاشرت، رسم ورواج غرض تمام چیزوں میں امرا کی تقلید

کرتے ہیں لیکن انبیا علیہم السلام ہمیشہ اپنی معاشرت، اپنی وضع، اپنے لباس غرض اپنی ایک ایک ادا سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ فضائل کا منبع صرف روح ہے اور زخارف دنیوی سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔

اسی بنا پر جب منکرین انبیا علیہم السلام سے اس قسم کے معجزات طلب کرتے ہیں جو امرا کے ساتھ مخصوص ہیں تو انبیا علیہم السلام کو عموماً ان کا انکار کرنا پڑتا ہے:

﴿ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝ ﴾ (۲۵/ الفرقان: ۷، ۸)

''اور ان لوگوں نے کہا کہ یہ پیغمبر کیوں کھاتا ہے اور کیوں بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، کیوں اس پر ایک فرشتہ نہیں اترتا جو اسکے ساتھ لوگوں کو ڈرائے یا اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا جاتا یا اس کے پاس کوئی باغ کیوں نہیں ہے، جس سے وہ کھائے اور ظالموں نے کہا تم صرف ایک ایسے شخص کا اتباع کرتے ہو جس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔''

④ آیت بالا سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس انکار کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کفار کا عام خیال یہ تھا کہ خدا کی طرف سے جو قاصد بن کر آئے اس کو مرتبہ بشریت سے بالاتر ہونا چاہیے اور اس کو بے انتہا خدائی قدرتیں حاصل ہونی چاہئیں، اس بنا پر جب اس قسم کے معجزے طلب کیے جاتے ہیں جن سے اس ظن فاسد کی تائید ہوتی ہے تو انبیا ان سے انکار کرتے ہیں:

﴿ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّىْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ ﴾ (۶/ الانعام: ۵۰)

''کہہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ میں نے یہ کہا کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف وحی کا اتباع کرتا ہوں۔''

⑤ متحدی بہ معجزات یعنی وہ معجزات جو کفار کے مطالبہ پر صادر ہوتے ہیں، ان کی تاخیر کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ایسے معجزات پر ایمان نہ لانے کے بعد پیغمبر کو ہجرت کا حکم ہوتا ہے اور منکرین کا گروہ ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی مثالیں قوم نوح، نمرود اور فرعون سے لے کر قریش تک کی تمام تاریخیں پیش کرتی ہیں اور قرآن کریم نے اس کو بتصریح بیان کر دیا ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام کی امت نے ان سے نشانی طلب کی، خدا نے کہا نشانی تمہیں دکھائی جائے گی لیکن اس کے بعد بھی ایمان نہ لائے تو تمہاری ہلاکت یقینی ہے:

﴿ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۵۹)

''اور ہم نے نشانیاں بھیجنا اس لیے موقوف کیا کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا اور ہم نے ثمود کو اونٹنی کی نشانی دی، سمجھانے کو اور پھر اس کا حق نہ مانا اور نشانیاں جو ہم بھیجتے ہیں تو ڈرانے کو۔''

لیکن جس طرح افراد کی موت وحیات کا ایک زمانہ ہے، اسی طرح قوموں کی ہلاکت و بربادی کی ایک خاص مدت متعین ہے:

﴿ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ﴾ (۷/ الاعراف:۳٤، ۱۰/ یونس:٤۹) ''ہر قوم کا ایک زمانہ مقرر ہے۔''

اس لیے اس قسم کے معجزات کے ظہور میں اس مدت معینہ تک کے لیے تاخیر کی جاتی ہے اور پیغمبر اور معاندین دونوں اس کے منتظر رہتے ہیں:

﴿ وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ ﴾ (۱۰/ یونس:۲۰)

''اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں اس پر خدا کی طرف سے کوئی نشان نہیں اترتا؟ کہہ کہ غیب صرف خدا کے ساتھ مخصوص ہے تم لوگ اس کے ظہور کا انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔''

یہی سبب ہے کہ جن انبیا علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا مظہر اتم بنایا ان کے ہاتھوں سے تحدی اور مطالبہ کے معجزوں کے صدور میں تاخیر برتی جاتی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق انجیل کی آیتیں گزر چکی ہیں کہ یوں تو ان سے بیسیوں معجزے سرزد ہوتے تھے مگر تحدی اور مطالبہ کے معجزہ سے انہوں نے بالعموم انکار کیا کہ وہ بنی اسرائیل کو تباہ و برباد نہیں دیکھنا چاہتے تھے، یہاں تک کہ حوارین نے جب زیادت ایمان اور ترقی ایمان کے لیے معجزہ کی فرمائش کی تو خدا نے جواب دیا:

﴿ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۖ فَمَن يَكْفُرْ بَعْدُ مِنكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَّا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ ﴾ (۵/ المآئدہ:۱۱۵)

''میں یہ آسمانی خوان تم پر اتار سکتا ہوں لیکن اس کے بعد اگر تم میں سے کسی نے انکار کیا تو میں اس کو ایسا سخت عذاب دوں گا کہ دنیا میں کسی کو نہ دیا ہوگا۔''

غرض کائنات روحانی کا یہی اصول پیش نظر تھا، جس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کفار کے مطالبہ کی پروا نہیں کرتے تھے، کیونکہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ ان کے مطالبہ اور تحدی کے مطابق معجزہ آنے کے بعد ان کو پھر فرصت نہ دی جا سکے گی اور وہ برباد ہو جائیں گے۔ چنانچہ معاندین قریش آنحضرت ﷺ سے یہ معجزہ طلب کرتے تھے کہ فرشتوں کو ہماری آنکھوں کے سامنے لے آؤ، خدا نے کہا کہ اگر وہ سامنے آئیں بھی تو انسانوں کی صورت میں آئیں گے اور تم کو پھر وہی شبہ رہ جائے گا، علاوہ ازیں قانون الٰہی میں یہ آخری حجت ہے، اگر فرشتے اتر آئے اور اس سے بھی تمہاری تسلی نہ ہوئی تو پھر تم کو اس مطالبہ کے معجزہ کے بعد مہلت نہ مل

سکے گی اور تم ہلاک و برباد کر دیے جاؤ گے:

﴿ لَوْمَا تَأْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۝ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ۝ ﴾ (۱۵/ الحجر:۷، ۸)

''کیوں تم فرشتوں کو ہمارے پاس نہیں لے آتے اگر تم سچے ہو خدا کہتا ہے فرشتوں کو حق کے ساتھ اتارتے ہیں، اگر وہ اتریں تو پھر تم کو اس وقت مہلت نہ دی جا سکے گی۔''

⑥ معاندین عموماً پیغمبروں کو جھوٹا جان کر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ جس آخری معجزانہ عذاب کی تم دھمکی دیتے ہو، وہ آخر کب آئے گا اور وہ جلد کیوں نہیں آتا؟ چونکہ اپنی نافہمی سے ان کو یقین ہوتا ہے کہ یہ معجزانہ عذاب ظاہر نہ ہوگا، اس لیے وہ اس کا مطالبہ بار بار کرتے ہیں، تاکہ لوگوں میں پیغمبر کی سبکی ہو اور ہماری طرح اور لوگ بھی اس کو کاذب تسلیم کریں۔ چنانچہ قرآن میں بار بار ہر قرن کے کافروں کے اس مقولہ کو دہرایا گیا ہے اور اس کا جواب دیا گیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی امت نے کہا:

﴿ وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ۝ۚ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۝ؕ ﴾ (۲۶/ الشعرآء:۱۸۶، ۱۸۷)

''اور ہمارے خیال میں تم جھوٹے ہو اگر سچے ہو تو ہم پر آسمان کا ایک ٹکڑا گرا دو۔''

لیکن اس کے لیے خدا کے ہاں ایک قانون مقرر ہے:

﴿ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ۝ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ۝ ﴾ (۱۰/ یونس:۴۹ تا ۵۱)

''ہر قوم کا ایک وقت مقرر ہے تو جب اس کا مقررہ وقت آ جاتا ہے تو پھر نہ ایک گھڑی وہ دیر کر سکتے ہیں اور نہ جلدی، کہہ دے اے پیغمبر! بھلا دیکھو تو اگر خدا کا عذاب راتوں رات یا دن کو آ پہنچے تو یہ گناہگار جلدی کر کے کیا کر لیں گے؟ کیا جب آنے والا واقعہ آ جائے گا تب تم ایمان لاؤ گے، اب ایمان لاتے ہو؟ حالانکہ تم تو اسی کی جلدی کر رہے تھے۔''

عقیدۂ معجزات کی اصلاح

قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے کہ اس کی نظر میں ان ظاہری معجزات کی چنداں وقعت نہیں، وہ لوگوں کو ہمیشہ اصل روح نبوت کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس کے خاص اسباب ہیں، اسلام دنیا میں دین الٰہی کی تکمیل اور گزشتہ مذہبی اغلاط کی تصحیح کے لیے آیا تھا ان ظاہری معجزات نے گزشتہ قوموں میں بہت سے فاسد عقیدے پیدا کر دیے تھے جن انبیا علیہم السلام اور بزرگوں سے بکثرت معجزات صادر

ہوئے ان میں الوہیت اور خدائی کا عنصر تسلیم کیا گیا اور اس طرح توحید اور نبوت کی اصلی حقیقت جس پر دین الٰہی کی بنیاد ہے متزلزل ہوگئی اس لیے قرآن مجید نے نہایت وضاحت اور نہایت صفائی اور نہایت تصریح کے ساتھ ان غلطیوں کا پردہ چاک کیا اور دنیا میں توحید اور نبوت کی اصل حقیقت اس استواری اور مضبوطی کے ساتھ قائم کردی کہ آئندہ فساد اور سوئے عقیدہ کے سیل وطوفان سے اس کو گزند پہنچنے کا خطرہ باقی نہ رہا۔

① سب سے پہلے اس نے یہ حقیقت واضح کی کہ نبوت اور ظاہری معجزات میں کوئی تلازم نہیں اور یہ آثار و دلائل اصل نبوت سے خارج اُمور ہیں۔ نبوت کے اصل لوازم وحی، مخاطبہ الٰہی، تزکیہ، انذار، تبشیر، تعلیم اور ہدایت ہیں، جیسا کہ ان کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے، اس بناپر جب معاندین نے معجزہ کا مطالبہ کیا ہے تو قرآن مجید نے اکثر اس کے جواب میں نبوت کی اصلی حقیقت کی طرف ان کو متوجہ کیا ہے:

﴿ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۱۸، ۱۱۹)

''اور جن کو علم نہیں وہ کہتے ہیں خدا خود ہم سے کیوں باتیں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی، ان سے پہلے لوگوں نے بھی اسی طرح کہا تھا، دونوں کے دل ایک ہی قسم کے ہوگئے، ہم نے تو نشانیاں ان لوگوں کے لیے کھول دی ہیں جو یقین کرتے ہیں، اے محمد (ﷺ)! ہم نے تجھ کو سچائی دے کر نیکوکاروں کو خوشخبری سنانے والا اور بدکاروں کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے جن کو اب بھی یہ نشانیاں نہ نظر آئیں تو ان دوزخیوں کا حال تجھ سے نہ پوچھا جائے گا۔''

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ ﴾ (۲۹/ العنکبوت: ، ۵۰، ۵۱)

''اور وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اترتی ہیں کہہ دے کہ نشانیاں تو خدا کے پاس ہیں اور میں تو کھلا ڈرانے والا ہوں کیا ان کافروں کو یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔''

﴿ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ ﴾

(۱۳/ الرعد: ۷)

''اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر کوئی نشان اس کے پروردگار کی طرف سے کیوں نہیں اتارا جاتا، اے محمد (ﷺ)! تو تو ڈرانے والا ہے اور ہر قوم کا ایک ہدایت کرنے والا ہوتا ہے۔''

② قرآن مجید نے نہایت وضاحت اور تکرار کے ساتھ اس حقیقت کا اعادہ کیا ہے کہ ہمارا پیغمبر بشر اور خالص بشر ہے، اس میں الوہیت کا کوئی شائبہ نہیں ہے اور اس لیے وہ اپنی طرف سے خدا کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا:

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ ﴾ (۱۸/ الکہف: ۱۱۰، ۴۱/ حٰم السجدۃ: ۶)

''میں بھی تمہاری طرح ایک آدمی ہوں، (البتہ) مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔''

کفار قریش کا خیال تھا کہ پیغمبر کے ساتھ فرشتوں کا پرا ہونا چاہیے، کبھی کبھی خود خدا اس کے سامنے آ کر نمایاں ہو، اس کے لیے سونے چاندی کا محل ہو، عجیب وغریب اقسام کے باغ اس کے قبضہ میں ہوں، ہمارے سامنے وہ آسمان پر چڑھے اور وہاں سے ہمارے لیے کتاب اتار لائے:

﴿ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۹۰۔۹۳)

''اور کافروں نے کہا کہ ہم تم پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمارے لیے زمین سے ایک چشمہ نہ بہا دو یا تمہارے قبضہ میں کھجور اور انگور کا ایک باغ نہ ہو اور پھر تم اس کے بیچ میں نہریں نہ بہا دو یا جیسا کہا کرتے ہو، آسمان کو ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرا دو یا خدا اور فرشتوں کو ضامن بنا کر لے آؤ یا تمہارے لیے سونے کا ایک گھر نہ ہو جائے تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور وہاں تمہارے آسمان پر چڑھنے کا یقین اس وقت تک ہم کو نہ آئے گا جب تک وہاں سے کوئی ایسی کتاب نہ اتار لاؤ جس کو ہم پڑھ سکیں۔''

ان سب کے جواب میں قرآن مجید آپ ﷺ کو سکھاتا ہے:

﴿ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ ﴾ (۱۷/ الاسرآء: ۹۳)

''کہہ دے اے پیغمبر! سبحان اللہ! میں کون ہوں، ایک آدمی پیغمبر۔''

﴿ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ ﴾ (۶/ الانعام: ۵۰)

''اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دے کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں میں تو اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف الہام کیا جاتا ہے۔''

﴿ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾

(۷/ الاعراف:۱۸۸)

''اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دے کہ خود میرا نفع اور نقصان بھی میرے قبضہ اختیار میں نہیں لیکن جو چاہے خدا اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا تو اپنا بہت سا فائدہ کر لیتا اور مجھ کو کوئی گزند نہ پہنچتا، میں تو صرف ڈرانے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں، ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں۔''

غور کرو کہ زمین سے باغ کا اُگا دینا، یا سونے کا محل کھڑا کر دینا یا چشمہ بنا دینا یا آسمان سے لکھی لکھائی کتاب اتار دینا، نہ خدا کی قدرت سے باہر تھا اور نہ اس رسول کے ان معجزات سے مافوق مطالبہ تھا، جس کے ہاتھ سے چشمے بہ چکے تھے، جس کے اشارے سے درخت چل چکے تھے یا جو معراج میں ساتوں آسمانوں کی منزلیں طے کر چکا تھا لیکن چونکہ اگر ان کے مطالبہ پر یہ امور واقع ہو جاتے تو وہ اگر بدعقیدگی کو راہ دیتے تو وہ آپ ﷺ کو جادوگر کہہ دیتے اور اگر خوش عقیدگی کا اظہار کرتے تو آپ کو نعوذ باللہ مافوق بشر تسلیم کر لیتے اور یہ دونوں باتیں اصول کے منافی ہیں، اس لیے سرے سے ان کے اس جاہلانہ مطالبہ کو رد کر دیا گیا کہ چند لوگوں کے ایمان و عدم ایمان کی خاطر نفس پیغام و دعوت کے اصول کی بیخ کنی نہیں کی جا سکتی۔

③ عام لوگوں میں انبیا علیہم السلام کی نسبت یہ غلط عقیدہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ براہ راست عالم کائنات کے تصرف پر قادر ہیں، چنانچہ موجودہ انجیل کے مصنفوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو جس طریقہ سے پیش کیا ہے، اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ یہ تمام کائنات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قبضۂ قدرت میں تھی اور وہ اس میں جس طرح چاہتے تھے تصرف کرتے تھے، یہی بنیادی پتھر ہے جس پر انجیل کے مصنفوں نے دین حق کی دیوار کج کھڑی کی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ توحید کی عمارت اس پر قائم نہ رہ سکی۔ قرآن مجید نے نہایت شدت اور نہایت اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ معجزات اور نشانات، پیغمبر کی قوت اور ارادہ سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت اور مشیت سے ظاہر ہوتے ہیں:

﴿ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ (۶/ الانعام:۱۰۹)

''کہہ دے اے پیغمبر! کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں۔''

﴿ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ (۲۹/ العنکبوت:۵۰)

''کہہ دے اے پیغمبر! کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں۔''

﴿ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓي اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً ﴾ (۶/ الانعام:۳۷)

''کہہ دے اے پیغمبر! کہ خدا کو قدرت ہے کہ وہ نشان اتارے۔''

سب سے زیادہ صاف اور صریح آیت یہ ہے:

﴿ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (۱۳/ الرعد:۳۸)

''کسی رسول میں یہ قدرت نہیں کہ وہ خدا کی اجازت کے بغیر کوئی نشان لائے۔''

انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات جس عبارت اور لب ولہجہ میں بیان ہوئے ہیں۔ان کا صاف منشا یہ ہے کہ گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تمام کائنات کی بادشاہی سپرد کردی گئی تھی،اس لیے وہ خاص اپنی قدرت اور اختیار سے جو چاہتے تھے کردیتے تھے۔قرآن مجید اس عقیدہ کو تسلیم نہیں کرتا،اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تمام معجزات کو بیان کردیا ہے مگر اسی کے ساتھ اس عقیدۂ باطل کو بھی رد کرتا گیا ہے اور نہایت تصریح کے ساتھ یہ ظاہر کردیا ہے کہ یہ جو کچھ تھا خدا کی قدرت سے تھا،حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اختیار سے نہیں،چنانچہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے قرآن کہتا ہے:

﴿ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ ﴾

(۳/ آل عمران:۴۹)

''میں تمہارے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر آیا ہوں کہ میں مٹی سے پرندہ کی صورت کا جانور بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ ہوجاتا ہے اور مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا اور مردہ کو زندہ کرتا ہوں،خدا کے حکم سے۔''

دوسرے موقع پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اپنے احسانات جتاتے ہوئے خدا نے فرمایا:

﴿ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۱۰)

''اور یاد کر جب تو مٹی سے پرندہ کی طرح صورت میرے حکم سے بناتا تھا پھر اس میں پھونک مارتا تھا تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ ہوجاتا تھا اور تو اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کرتا تھا اور جب مردے کو میرے حکم سے زندہ کرتا تھا۔''

یہ قرآن مجید کے اسی اظہار حقیقت اور خالص تعلیم کا اثر تھا کہ اسلام میں توحید اور نبوت کی حقیقتیں مشتبہ نہ ہوئیں اور پیغمبر اسلام ﷺ میں الوہیت کا ادنیٰ سا شائبہ بھی مسلمانوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا اور تمام دنیا کے مذاہب میں توحید کامل کی علمبرداری صرف اسلام کے دست وبازو کو سپرد ہوئی۔

مسئلہ اسباب وعلل میں افراط وتفریط

عقیدۂ معجزات کے اصلاحات ہی کے تحت میں مسئلہ اسباب وعلل سے بھی تعرض کرنا ہے۔جس نے

دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں بھی دو فرقے پیدا کر دیے ہیں، ایک فرقہ وہ ہے جو دنیا میں صرف اسباب وعلل کے اختیارات کو تسلیم کرتا ہے اور ان اختیارات کو نا قابل نسخ وتغیر مانتا ہے، اس کے نزدیک اس عالم میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ ان ہی مادی علل واسباب کے ماتحت ہوتا ہے اور ان میں کسی قسم کا ردو بدل اور نسخ وتغیر نہیں ہوتا اور اس لیے وہ خرق عادت کو ممتنع اور محال یقین کرتا ہے کیونکہ یہ اسباب وعلل اور عالم کا یہ نظام کارسنت الٰہی ہے اور سنن الٰہی میں تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا، جیسا کہ قرآن مجید کی حسب ذیل آیتوں سے ثابت ہوتا ہے:

﴿ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ ﴾ (۳۵/ فاطر:۴۳)

''تم خدا کی سنت (طریقہ) میں ہرگز تبدیلی نہ پاؤ گے۔''

﴿ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۝ ﴾ (۳۵/ فاطر:۴۳)

''تم خدا کی سنت (طریقہ) میں ہرگز تغیر نہ پاؤ گے۔''

﴿ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ﴾ (۳۰/ الروم:۳۰) ''اللہ کے بنائے کو بدلنا نہیں۔''

دوسرا فریق اللہ تعالیٰ کو نظام خاص، قوانین فطرت اور اسباب وعلل کا پابند ٹھہرانا، اس کی شان قدرت کے منافی سمجھتا ہے اور وہ ان بیچ کے وسائط کے بغیر اسکو فرماں روائے مطلق یقین کرتا ہے، یہ فریق اپنے دعویٰ پر حسب ذیل دلیلیں پیش کرتا ہے:

﴿ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝ ﴾ (۸۵/ البروج:۱۶) ''وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

﴿ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۴۰)

''اسی طرح خدا جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔''

﴿ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ۝ ﴾ (۱۴/ ابراھیم:۲۷)

''اور خدا جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ۝ ﴾ (۲۲/ الحج:۱۸)

''بے شک خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۵۳)

''لیکن خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۝ ﴾ (۵/ المائدۃ:۱)

''بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝ ﴾ (۲۲/ الحج:۱۴)

''بے شک اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

ان آیات کے علاوہ حسب ذیل آیت قرآن مجید میں کم وبیش تغیر کے سات آٹھ مقامات پر مذکور ہے:

﴿ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ (۲/ البقرة:۲۸٤، ۳/ آل عمران:۱۸۹، ۵/ المائدة:۱۷)

''اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔''

ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر شے کی علت صرف خدا کی قدرت مشیت اور ارادہ ہے اور اس لیے ہر قسم کے خرق عادت ممکن ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں فریق افراط وتفریط کے دو کناروں پر ہیں اور انہوں نے قرآن مجید کی تمام آیتوں پر غور وتدبر کی نظر نہیں ڈالی ہے، یہی سبب ہے کہ انہوں نے اشیاء کے خواص وطبائع اور عقلی مصالح وحکم کا انکار کیا ہے۔

قرآن مجید اسباب ومصالح کا قائل ہے

حالانکہ ان آیات بالا کی بنا پر یہ دعویٰ کرنا کہ قرآن اسباب وعلل اور مصالح وحکم کا منکر ہے، کتاب الٰہی سے اپنی جہالت کا ثبوت پیش کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے صفات کمالیہ اور اس کے حکیم ہونے کی نفی کرنا ہے، قرآن مجید نے جا بجا مخلوقات الٰہی میں تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے اگر یہ صحیفۂ قدرت اسباب ومصالح سے خالی ہوتا تو یہ دعوت بے سود تھی، قرآن ان عجائب قدرت کو آیات اللہ کے نام سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے اسرار وحکم پر غور وفکر کرنے کا حکم دیتا ہے اور اسی دلیل سے وہ خدا کی قادر وحکیم ہستی کے وجود پر استدلال کرتا ہے اگر یہ چیزیں اسباب ومصالح سے خالی ہوتیں تو ان میں غور وفکر کرنا بیکار ہوتا، قرآن نے آسمان وزمین، چاند وسورج، ہوا بادل، پھول پھل، جسم وجان ان میں سے ہر شے کو اللہ کی وسیع قدرت اور دقیق مصلحت کا اعلان عام قرار دیا ہے اور انسان کو بار بار ادھر متوجہ کیا ہے:

﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۹۰، ۱۹۱)

''آسمان اور زمین کے بنانے اور رات اور دن کے بدلنے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور جو اللہ کو اٹھتے بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے ہیں اور آسمان وزمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار تو نے یہ بے فائدہ نہیں بنایا۔''

خدا نے ان لوگوں کو جو اشیاء کی پیدائش کو خالی از مصلحت جانتے ہیں زجر فرمایا ہے:

﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۱۱۵)

''کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کیا ہے اور تم ہمارے پاس نہیں لوٹائے

جاؤ گے۔“

﴿ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ﴾ (٤٤/ الدخان:٣٨)

”اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو، جو ان کے درمیان ہے ان کو محض کھیل کے لیے نہیں بنایا ہے۔“

﴿ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ﴾

(٦/ الانعام:٩٩)

”اور اسی خدا نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس سے ہر شے کی روئیدگی پیدا کی پھر ہم نے اس سے ہری کھیتی نکالی اور اس سے توبرتو دانے پیدا کیے اور چھوہاروں کے درخت سے اس کے پھولوں سے لٹکے ہوئے خوشے اور انگور اور زیتون اور سیب کے باغ جن کے میوے ایک ہی قسم کے اور مختلف اقسام کے بھی پیدا کیے، جب وہ پھلتا ہے تو اس کے پھل اور اس کے پکنے کو دیکھو۔“

اگر ان چیزوں میں اللہ تعالیٰ مصالح واحکام کے آثار پوشیدہ نہ رکھتا تو ان میں نظر وفکر کی دعوت کیوں دیتا، متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے مخلوق الٰہی کے ”منافع“ کی خاص تصریح فرمائی ہے:

﴿ وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ۭ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۭ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَاۗىِٕرٌ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝﴾

(١٦/ النحل:٥ تا ١٤)

''اور خدا نے جانوروں کو پیدا کیا، ان کے اون میں خوشگوار گرمی اور بہت سے فائدے ہیں، ان میں سے بعض جانور تمہاری خوراک ہیں اور تم کو ان سے رونق ہے، جب شام کو ان کو پھیر لاتے ہو اور جب چراتے ہو اور وہ تمہارے مال واسباب کو اس شہر تک اٹھا لے چلتے ہیں جہاں تم بغیر سخت تکلیف کے نہیں لے جا سکتے تھے، بے شک تمہارا رب شفقت والا مہربان ہے اور گھوڑے، خچر اور گدھے بنائے کہ تم ان پر سوار ہو اور رونق ہو اور وہ پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے، خدا ہی پر ہے سیدھی راہ اور اس سے ہٹنے والی بھی اور اگر چہ چاہے تو سیدھی راہ دے تم سب کو، اسی نے آسمان سے تمہارے لیے پانی اتارا، کچھ اس میں سے پینے کے کام آتا ہے اور کچھ سے درخت اگتے ہیں جس میں تم اپنے جانور چراتے ہو، اس پانی سے خدا تمہارے لیے کھیتی اگاتا ہے اور زیتون، چھوہارے، انگور اور ہر قسم کے پھل پیدا کرتا ہے اس میں غور وفکر کرنے والوں کے لیے بڑی نشانی ہے اور اسی خدا نے رات اور دن اور سورج اور چاند تمہارے کام میں لگائے اور تارے اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں اس میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور جو بکھیرا ہے تمہارے لیے زمین میں کئی رنگ کے غلے اور دانے، اس میں ان کے لیے جو سوچتے ہیں نشانی ہے، اور وہی خدا ہے جس نے دریا کو کام میں لگایا ہے کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے وہ (موتی اور مونگے) نکالو جس کو زینت کا سامان بنا کر پہنتے ہو اور تم دیکھو کہ کشتیاں اس دریا کو پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں اور اس واسطے کہ تلاش کرو اس کی روزی کو اور شاید احسان مانو۔''

غور کرو، اگر ان چیزوں میں مصالح وحکم نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ ہم انسانوں کو ان چیزوں کی پیدائش پر شکر کا حکم کیوں دیتا۔

بعض اشیاء کے مصالح واسباب کو خود قرآن مجید نے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے پہاڑوں کی مصلحت یہ ظاہر کی ہے:

﴿ وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ ﴾ (١٦/ النحل:١٥)

''اور اس نے زمین میں بڑے بڑے پہاڑوں کے گرد ڈال دیئے ہیں کہ زمین تم کو لے کر جھک نہ پڑے۔''

ستاروں کی پیدائش کی یہ غرض بتائی:

﴿ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ۝ ﴾ (١٦/ النحل:١٦)

''اور ستاروں سے لوگ راہ پاتے ہیں۔''

رات کی پیدائش کی مصلحت یہ بتائی:

﴿ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ ﴾ (۱۰/ یونس:٦٧)

''اور اسی نے رات بنائی کہ تم سکون حاصل کرو۔''

چاند کے گھٹنے بڑھنے کی غایت یہ ظاہر کی:

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ ﴾ (۲/ البقرة:١٨٩)

''لوگ تجھ سے چاند کی نسبت دریافت کرتے ہیں کہہ دے کہ وہ لوگوں کے لیے وقت اور زمانہ کا معیار ہیں۔''

سایہ، آفتاب، رات، دن، ہوا اور پانی کے مصالح یہ تعلیم کیے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۙ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ۝ وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ۝ وَهُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ۙ لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِىَّ كَثِيْرًا ۝ ﴾

(۲۵/ الفرقان: ٤٥ تا ٤٩)

''کیا تو نے نہ دیکھا کہ تیرے رب نے سایہ کو کس طرح پھیلا رکھا ہے اور اگر وہ چاہتا تو ایک ہی جگہ ٹھہرا رہتا، پھر سورج کو سایہ کا راہنما بنایا، پھر اس سایہ کو ہم اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹ لیتے ہیں، اسی خدا نے رات کو تمہارا اوڑھنا اور نیند کو آرام اور دن تمہارے جدوجہد کے لیے بنایا اسی خدا نے اپنے ابر رحمت کے آگے آگے ہواؤں کو خوشخبری سنانے والا بنایا اور ہم نے آسمان سے ستھرا اور نکھرا پانی اتارا کہ اس سے مردہ زمین کو زندہ کر دیں اور چوپایوں اور بہت سے انسانوں کو اس سے سیراب کریں۔''

قرآن مجید نے اشیاء کے اسباب وعلل ہونے کا بھی صاف اقرار کیا ہے، مثلاً: جابجا بارش کو کھیتی اور پھل پھول کے پیدا ہونے کا سبب بتایا ہے:

﴿ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ ﴾ (۲/ البقرة:٢٢)

''اور آسمان سے پانی برسایا اور اس پانی سے تمہاری روزی کے لیے پھل نکالے۔''

تمام ذی روح چیزیں پانی سے زندہ ہیں:

﴿ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ ﴾ (۲٤/ النور:٤٥)

''اور خدا نے ہر چلنے والے کو پانی سے پیدا کیا۔''

﴿ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۳۰)

''اور ہم نے ہر زندہ شے کو پانی سے بنایا۔''

ہر قسم کے نباتات پانی سے اگتے ہیں:

﴿ وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ (۶/ الانعام:۹۹)

''اسی نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس سے ہر چیز کی روئید گی ظاہر کی۔''

بادصرصر اور آندھی ہلاکت اور بربادی کا ذریعہ ہے:

﴿ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ ﴾

(۴۱/ حٰمٓ السجدة:۱۶)

''ہم نے عاد کی قوم پر بادصرصر بھیجا منحوس دنوں میں، تا کہ ہم ان کو رسوائی کا عذاب چکھائیں۔''

﴿ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا ﴾ (۴۶/ الاحقاف:۲۴، ۲۵)

''ایسی آندھی جس میں دردناک عذاب تھا جو خدا کے حکم سے ہر شے کو برباد کر دیتی ہے۔''

﴿ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ۚ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴾

(۵۱/ الذریات:۴۱، ۴۲)

''یاد کرو جب ہم نے فائدہ نہ پہنچانے والی آندھی ان پر بھیجی جو جس شے پر گزرتی تھی اس کو بوسیدہ ہڈی کی طرح کر دیتی تھی۔''

آگ جلاتی ہے:

﴿ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴾ (۲۳/ المؤمنین:۱۰۴)

''آگ ان کے چہروں کو جھلسا دیتی ہے۔''

آگ لکڑی سے پیدا ہوتی ہے:

﴿ اِۨلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا ﴾ (۳۶/ یٰس:۸۰)

''جس نے ہرے درختوں سے آگ کو پیدا کیا۔''

قرآن مجید اشیاء کے طبعی خواص کا بھی منکر نہیں شراب میں خواص ہے:

﴿ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ﴾ (۲/ البقرة:۲۱۹)

''کہہ دے کہ شراب اور جوئے میں بڑا گناہ ہے اور ان میں لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں لیکن ان کا گناہ انکے فائدے سے زیادہ ہے۔''

اون میں گرمی کی خاصیت ہے۔

﴿ فِيهَا دِفْءٌ ﴾ (١٦/ النحل:٥) ''جانوروں کے اون میں خوشگوار گرمی ہے۔''

پانی میں پیاس بجھانے اور درخت اگانے کی خاصیت ہے:

﴿ هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ ﴾ (١٦/ النحل:١٠)

''وہی خدا آسمان سے پانی برساتا ہے، اس سے پینا ہے اور اس سے درخت ہیں۔''

شہد میں صحت بخشنے اور بیماری دور کرنے کی خاصیت ہے:

﴿ يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ﴾ (١٦/ النحل:٦٩)

''شہد کی مکھیوں کے پیٹ میں سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے کئی رنگ ہوتے ہیں ان میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔''

لیکن علت حقیقی قدرت ومشیت ہے

غرض ان آیات کریمہ سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید اسباب وعلل، مصالح وحکم اور طبائع وخواص کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور اس جماعت کا ساتھ نہیں دیتا جو ان چیزوں کا انکار کرتی ہے اور یہ جانتی ہے کہ ان چیزوں کے تسلیم کرنے سے قدرت ومشیت الٰہی کے عقیدہ کا ابطال لازم آتا ہے، حالانکہ یہ تو اس وقت لازم آتا ہے جب ان اسباب وعلل اور طبائع وخواص کو خدا سے مستقل اور مستغنی تسلیم کیا جائے اور قرآن اس کی تعلیم نہیں دیتا قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اشیاء اسباب وعلل سے پیدا ہوتی ہیں اور ان میں طبائع وخواص ہیں، لیکن یہ اسباب وعلل اور طبائع وخواص خود خلاق عالم کے پیدا کردہ اور مقرر کردہ ہیں اور وہ ان ہی پر عموماً کاربند رہتا ہے لیکن وہ اس درجہ ان کا مجبور اور پابند نہیں کہ وہ ان میں تغیر نہ کر سکتا ہو اور کبھی اپنے خاص حکم وارادہ سے بھی وہ ان کو شکست نہ کر سکتا ہو کیونکہ اس عقیدہ سے کفر پرورش پاتا ہے اور خدا کی قدرت اور عظمت میں فرق آتا ہے اس لیے ہر موقع پر قرآن مجید نے اپنی تعلیم میں اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے کہ اسباب وعلل کے ساتھ ساتھ خدا کی مشیت اور ارادہ کو پیش نظر رکھتا ہے، تاکہ انسانوں میں خدا کی معذوری، مجبوری اور عدم قدرت کا تصور نہ پیدا ہو اور نہ اس کی مشیت وارادہ پر خود اس کی مشیت وارادہ کے سوا خارجی پابندیاں عائد ہوں، چنانچہ وہ تمام آیتیں جو اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادہ کے متعلق اور پر دوسرے فریق کی طرف سے پیش کی گئی ہیں وہ اسی موقع کی ہیں اور جن سے یہی تعلیم مقصود ہے۔

ہم نے اوپر اسباب وعلل اور طبائع وخواص کے ثبوت میں جس قدر آیتیں لکھی ہیں غور کرو ان سب میں فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان مسببات کے اسباب وعلل اور اشیاء کے طبائع وخواص خود اس نے اپنی مشیت وارادہ اور اپنے حکم وامر سے بنائے ہیں اور ہر جگہ اس کی توضیح کر دی ہے، تاکہ ظاہر میں انسان ان ظاہری علل واسباب اور طبائع وخواص کو دیکھ کر اشیاء کی علت حقیقی کا انکار

کر کے مبتلائے الحاد یا اسباب وخواص کو مستقلاً شریک تاثیر مان کر گرفتار شرک نہ ہو جائے یہ انبیا کی تعلیم کا خاص طریقہ ہے اور قرآن نے اس نکتہ کو کہیں فراموش نہیں کیا ہے یہاں تک کہ انبیائے کرام علیہم السلام اور بزرگان خاص کو بھی عادتِ جاریہ اور ظاہری علل واسباب کے خلاف باور کرنے میں جب استعجاب اور استبعاد ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو متنبہ کیا ہے اور ان کے اس استعجاب اور استبعاد کو اپنی قدرت اور مشیت کو یاد دلا کر رفع کیا ہے، حضرت سارہ علیہا السلام کو پیرانہ سالی میں جب حضرت اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دی گئی تو توراۃ اور قرآن دونوں میں ہے کہ ان کو اس پر سخت تعجب ہوا انہوں نے کہا:

﴿ يَٰوَيْلَتَىٰٓ ءَأَلِدُ وَأَنَا۠ عَجُوزٌ وَهَٰذَا بَعْلِى شَيْخًا ۖ إِنَّ هَٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيبٌ ۝ ﴾

(۱۱/ ھود:۷۲)

''اے خرابی! کیا میں جنوں گی؟ اور میں بڑھیا ہوں اور میرا یہ خاوند بوڑھا ہے یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔''

فرشتوں نے جواب میں کہا:

﴿ أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ ٱللَّهِ ﴾ (۱۱/ ھود:۷۳)

''اے سارہ! کیا تم خدا کے کام سے تعجب کرتی ہو؟''

اس قدر تنبیہ ان کے ایمان کے لیے کافی تھی۔

حضرت زکریا علیہ السلام بوڑھے ہو گئے تھے اور ان کی بیوی بانجھ تھیں، حضرت زکریا علیہ السلام کو اپنی اور اپنی بیوی کی حالت کا قطعی علم تھا لیکن وہ اپنی اور اپنی بیوی کی ظاہری عدم استعداد اور اسباب وعلل کے نہ موجود ہونے کی صورت میں بھی خدا کی قدرت اور مشیت کے مؤثر حقیقی ہونے پر یقین کامل رکھتے تھے، چنانچہ اسی حالت میں انہوں نے ایک وارث کی دعا مانگی مگر جب ان کو اجابت دعا کی بشارت دی گئی تو تقاضائے بشریت سے کہ انسان ظاہری اسباب وعلل کے دیکھنے کا عادی ہے، اس کمال ایمان کے باوجود ان کو یہ واقعہ مستبعد معلوم ہوا اور انہوں نے عرض کی:

﴿ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِى غُلَٰمٌ وَكَانَتِ ٱمْرَأَتِى عَاقِرًا وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ ٱلْكِبَرِ عِتِيًّا ۝ ﴾

(۱۹/ مریم:۸)

''اے میرے رب! کہاں سے میرے لڑکا ہوگا میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو گیا ہوں یہاں تک کہ بڑھاپے سے اکڑ گیا ہوں۔''

خدا نے اس کے جواب میں صرف اسی قدر فرمایا:

﴿ قَالَ كَذَٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِن قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ۝ ﴾

(۱۹/ مریم:۹)

''کہا یوں ہی ہے تیرے رب نے کہا! یہ مجھ پر آسان ہے (زکریا تجھ کو یاد نہیں) کہ میں نے تجھ کو پیدا کیا اور تو کچھ نہ تھا۔''

حضرت مریم علیہا السلام کو جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خوشخبری دی گئی تو انہوں نے بھی ظاہری علل واسباب کے خلاف ہونے پر حیرت ظاہر کی:

﴿ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ۝ ﴾ (۱۹/ مریم:۲۰)

''مریم علیہا السلام نے کہا! میرے لڑکا کہاں سے ہوگا مجھ کو کسی آدمی نے چھوا بھی نہیں اور نہ میں کبھی بدکار تھی؟''

فرشتہ نے جواب میں کہا:

﴿ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ ﴾ (۱۹/ مریم:۲۱)

''بولا یوں ہی ہے، تیرے رب نے کہا، وہ مجھ پر آسان ہے اور ہم اس کو لوگوں کے لیے نشانی بنانا چاہتے ہیں اور اپنی طرف سے رحمت۔''

قرآن میں سنت اللہ کا مفہوم

وہ فریق جو خرق عادت اور خلاف اسباب وعلل کے محال ہونے پر قرآن مجید کی ان آیتوں سے استدلال کرتا ہے جن میں ''سنت الٰہی'' کے عدم تبدیل کا ذکر ہے درحقیقت دانستہ یا نادانستہ مفہوم قرآن کی تحریف کا مجرم ہے قرآن مجید میں ''سنت الٰہی'' کا ایک خاص مفہوم ہے اور اسی اصطلاح خاص میں یہ لفظ کئی جگہ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے، خیر وشر، حق وباطل، نور وظلمت اور ظلم وانصاف جب باہم ٹکراتے ہیں تو بالآخر اللہ تعالیٰ خیر کو شر پر، حق کو باطل پر، نور کو ظلمت پر اور انصاف کو ظلم پر فتح اور کامیابی عطا کرتا ہے، گناہ گار اور مجرم قومیں جب حق کی دعوت قبول نہیں کرتیں اور پند وموعظت ان کے لیے مؤثر نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان قوموں پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے اور وہ بالآخر بجلی کی کڑک، آسمان کی گرج، زلزلہ کی تھرتھراہٹ، آندھی کی گھڑگھڑاہٹ، دریا کے طوفان، پہاڑ کی آتش فشانی یا دشمن کی تلوار سے ہلاک اور برباد ہو جاتی ہیں، یہ سنت الٰہی ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی اور اس میں کبھی کوئی فرق پیدا نہ ہوگا۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے اسی مفہوم میں آیا ہے چنانچہ وہ تمام آیتیں ذیل میں لکھ دی جاتی ہیں، تاکہ ناظرین کو شک وشبہ نہ رہے۔ قریش داعی حق کو شہر مکہ سے نکالنے کی تیاری کرتے ہیں اور اس دعوت کو قبول کرنے سے اعلانیہ انکار کر دیتے ہیں تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِن رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآءیل:۷۶، ۷۷)

''اور وہ (کفار قریش) تو تجھ کو اس شہر سے لگے تھے گھبرانے، تا کہ وہ تجھ کو یہاں سے نکال دیں لیکن اگر ایسا ہوتو وہ تیرے بعد کم ٹھہریں گے یہ دستور پڑا ہوا ہے ان رسولوں کا جن کو ہم نے تجھ سے پہلے بھیجا اور تو اللہ کے دستور کو ٹلتے نہ پائے گا۔''

مدینہ کے منافقین اپنی شرارت سے باز نہیں آتے، خدا فرماتا ہے:

﴿ أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا ۞ سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۞﴾ (۳۳/ الاحزاب:٦١، ٦٢)

''وہ جہاں پائے گئے پکڑے گئے اور مارے گئے، دستور پڑا ہوا ہے اللہ کا ان لوگوں میں جو پہلے ہو چکے اور تو اللہ کے دستور کو بدلتے نہ پائے گا۔''

اس مفہوم کو واضح کرنے کے لیے سورۂ فاطر کی حسب ذیل آیت سے بڑھ کر اور کون سی آیت ہو سکتی ہے:

﴿ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ ۚ فَهَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ ۚ فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا ۞ أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ﴾ (۳۵/ فاطر:٤٣، ٤٤)

''اور بدی کا داؤ پیچ خود داؤ پیچ کرنے والوں کو الٹ جاتا ہے تو کیا اب یہ کافر پہلی قوموں کے دستور ہی کی راہ دیکھتے ہیں تو تم اللہ کے دستور کو ہرگز نہ بدلتے پاؤ گے اور نہ کبھی اللہ کے دستور کو ٹلتے پاؤ گے کیا وہ زمین میں پھرے نہیں ہیں کہ دیکھتے کہ اس سے پہلی قوموں کا کیا انجام ہوا۔''

حدیبیہ کے موقع پر کفار قریش کو تنبیہ اور مسلمانوں کو تسکین دی جاتی ہے:

﴿ وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوُا الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۞ سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۞﴾ (٤٨/ الفتح:٢٢، ٢٣)

''اور اگر یہ کافر سے لڑتے، تو پیٹھ پھیر دیتے پھر وہ کوئی حامی نہ پاتے اور نہ مددگار، اللہ کا دستور یہ پہلے سے چلا آتا ہے اور تم اللہ کے دستور کو بدلتے نہ پاؤ گے۔''

اب ان آیتوں کے پڑھ لینے کے بعد بھی سنۃ اللہ کے مفہوم کے سمجھنے میں کس کو غلطی ہو سکتی ہے؟

قرآن میں فطرۃ اللہ کا مفہوم

قرآن مجید کی ایک اور آیت ہے جس کو یہ فریق اپنے ثبوت میں پیش کرتا رہتا ہے:

﴿ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ﴾ (۳۰/ الروم:۳۰)

’’خدا کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا خدا کے بنائے میں بدلنا نہیں۔‘‘

اس موقع پر اس آیت کو پیش کرنا قرآن مجید کی معنوی تحریف ہے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں فطرۃ اللہ سے مقصود توحید ہے جس کو وہ دین فطری سے تعبیر کرتا ہے چنانچہ اوپر کی پوری آیت اگر پیش نظر ہو تو یہ مفہوم خود بخود آئینہ ہو جاتا ہے، خدا فرماتا ہے:

﴿ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴾ (۳۰/ الروم: ۳۰)

’’سو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھ، وہی اللہ کی فطرت خاص پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے، خدا کے بنائے میں بدلنا نہیں یہی سیدھا دین ہے، لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔‘‘

قرآن مجید کی اس اصطلاح کی تفسیر ایک صحیح حدیث سے پوری ہو جاتی ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے:

((مامن مولود یولد إلاّ علی الفطرة فابواه یهودانه أوینصرانه اویمجسانه کما تنتج البهیمة بَهِیْمَةً جمعاء هل تحسون فیها من جدعاء ثم یقول ﴿فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ ...... الخ﴾)) [1]

’’کوئی بچہ ایسا نہیں جو فطرت پر پیدا نہیں ہوتا لیکن ماں باپ اس کو یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں، جس طرح ہر جانور صحیح وسالم بچہ پیدا کرتا ہے، کیا تم نے دیکھا کہ کوئی کان کٹا بچہ بھی وہ جنتا ہے، اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ’’خدا کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔‘‘ اور آخیر آیت تک۔

معجزہ کا سبب صرف ارادۂ الٰہی ہے

الغرض اس تمام تفصیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید نہ تو اسباب عادیہ کا منکر ہے اور نہ عالم کے نظام کار کو علل و مصالح سے خالی تسلیم کرتا ہے لیکن وہ ان تمام اسباب وعلل سے مافوق ایک اور قادر اور ذی ارادہ ہستی کو فرمانروائے کل یقین کرتا ہے جس کی مشیت اور ارادہ کی قوت سے کائنات کی یہ مشین چل رہی ہے معجزہ کا سبب اور علت براہ راست اس کی مشیت اور ارادہ ہے، کبھی یہ مشیت اور ارادہ عادات جاریہ اور ظاہری علل و اسباب کے پردہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً: قوم نوح کے لیے طوفان آنا، قوم ہود کے لیے کوہ آتش فشاں کا پھوٹنا یا زلزلہ آنا، حضرت ایوب علیہ السلام کا چشمہ کے پانی سے صحیح وتندرست ہو جانا، قوم صالح کے لیے آندھی آنا، مکہ

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الروم: ۴۷۷۵۔

میں قحط عظیم کا رونما ہونا، غزوۂ خندق میں آندھی چلنا یہ تمام نشانیاں ظاہری اسباب اور عادات جاریہ کے خلاف نہیں لیکن ان اسباب کے ظاہر ہونے کا سبب جس میں حق کی فتح اور باطل کی شکست، نیکو کاروں کی نجات اور گناہگاروں کی ہلاکت ہوئی محض بخت و اتفاق نہیں بلکہ ارادۂ و مشیت الٰہی نے خاص ان قوموں کے لیے بطور نشانی کے ان کو پیدا کیا اور کبھی یہ مشیت الٰہی عادات جاریہ اور اسباب ظاہری کا نقاب اوڑھ کر نہیں بلکہ بے پردہ نشان بن کر سامنے آتی ہے، مثلاً: عصا کا سانپ بن جانا، انگلیوں سے چشمہ کا جاری ہونا، مردہ کا جی اٹھنا، چاند کا دوٹکڑے ہو جانا، پتھر سے چشمہ کا ابلنا، درختوں کا اپنی جگہ سے حرکت کرنا، بے جان چیزوں میں آواز پیدا ہونا کہ ان چیزوں کی تشریح موجودہ علم و اسباب و علل کی بنا پر نہیں کی جا سکتی اور نہ ان کو عادات جاریہ کے مطابق کہا جا سکتا ہے، اس لیے ان کی علت خدا کی مشیت اور ارادہ کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی، اس لیے انبیا علیہم السلام نے یہ تصریح کی ہے کہ جو کچھ ان سے ظاہر ہوتا ہے وہ صرف خدا کی قدرت، مشیت اور اذن سے ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ ظاہری علل و اسباب کے مطابق ہوں تو وہ پیغمبر اور خدا کے باہمی ربط و علاقہ کی دلیل کیونکر بن سکتے ہیں کفار ان کو دیکھ کر فوراً کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو فلاں سبب سے ہوا ہے، اس لیے خدائی نشان ہونے کا ثبوت کیونکر بہم پہنچ سکتا ہے؟

معجزہ کی باعتبار خرق عادت کے چار قسمیں

اس بنا پر یہ ضروری ہے کہ معجزات اور نشانیاں کسی نہ کسی حیثیت سے خارق عادت ہوں چنانچہ:

① کبھی نفس واقعہ خارق عادت ہوتا ہے، مثلاً: عصا کا سانپ بن جانا، چاند کا دوٹکڑے ہو جانا، انگلیوں سے چشمہ کا اُبلنا، مردہ کا زندہ کرنا وغیرہ

② کبھی یہ ہوتا ہے کہ نفس واقعہ خلافِ عادت نہیں ہوتا، مگر اس کا اس وقتِ خاص پر رونما ہونا خرق عادت بن جاتا ہے، مثلاً: طوفان آنا، آندھی آنا، زلزلہ آنا، کفار کا باوجود کثرتِ تعداد کے، بے یار و مددگار اہل حق سے خوف کھانا وغیرہ تمام تائیدات الٰہی اسی قسم میں داخل ہیں۔

③ ایک صورت یہ ہے کہ نفسِ واقعہ اور اس کے ظہور کا وقت خاص تو عادات جاریہ کے خلاف نہیں ہوتا مگر اس کا طریقہ ظہور خلاف عادت ہوتا ہے، مثلاً: انبیا کی دعاؤں سے پانی کا برسنا، بیمار کا اچھا ہونا، آفتوں کا ٹل جانا، کہ نہ تو پانی کا برسنا یا بیمار کا اچھا ہو جانا یا کسی آئی ہوئی آفت کا ٹل جانا، خلاف عادت ہے اور نہ اس کے ظہور کا کوئی خاص وقت ہے لیکن جس طریقہ سے اور جن اسباب و علل سے یہ معجزات ظاہر ہوئے وہ خارق عادت ہیں، استجابت دعا اسی قسم میں داخل ہے۔

④ کبھی نہ تو واقعہ خارق عادت ہوتا ہے اور نہ اس کا طریقہ ظہور خارق عادت ہوتا ہے بلکہ اس کا قبل از وقت علم، خارق عادت ہوتا ہے، مثلاً: انبیا علیہم السلام کی پیشین گوئیاں، ایک دفعہ زور سے آندھی چلی آنحضرت ﷺ مدینہ سے باہر تھے آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ آندھی ایک منافق کی موت کے لیے چلی ہے۔“ چنانچہ جب لوگ

مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ مدینہ میں ایک منافق اس آندھی سے مرگیا، [1] اس معجزہ میں نہ تو آندھی کا چلنا خرق عادت ہے، نہ آدمی کا آندھی کے صدمہ سے مرجانا خلاف اسباب ہے، بلکہ صرف واقعہ کا قبل از وقت علم خرق عادت ہے۔

اہل ایمان پر اثر کے لحاظ سے معجزات کی دو قسمیں

انبیا علیہم السلام کی زندگی علم وعمل دونوں کا مجموعہ ہوتی ہے اور ان کے تمام ارشادات وتعلیمات سے صرف ان ہی دونوں کی ترقی اور تکمیل مقصود ہوتی ہے، اس لحاظ سے انبیا کے بعض معجزات کا اثر صرف علم ویقین پر پڑتا ہے ان سے کوئی عملی نتیجہ مترتب نہیں ہوتا، ہاتھ کا چمک اٹھنا، عصا کا سانپ بن جانا، چاند کا شق ہوجانا، اگرچہ نہایت عظیم الشان معجزے ہیں لیکن ان کا نتیجہ صرف اس قدر ہے کہ ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے نے انکار کیا لیکن انبیا کے بہت سے معجزات ایسے ہوتے ہیں جن سے نہایت عظیم الشان عملی نتائج ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً: عصا کے سانپ بن جانے سے بنواسرائیل کو کوئی عملی فائدہ نہ پہنچ سکا لیکن اس کے ذریعہ سے پانی کا جو چشمہ اُبلا وہ ان کے لیے حیات بخش ثابت ہوا پہلی قسم کے معجزات کو قرآن میں حجت، برہان اور سلطان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ ان سے علم ویقین کو ترقی ہوتی ہے اور دوسری قسم کے معجزات کو اس نے تائید اور نصرت الٰہی کہا ہے پہلی قسم کے معجزات طلب اور سوال کے محتاج ہوتے ہیں لیکن تائید اور نصرت الٰہی اس کی پابند نہیں ہوتی۔

آغاز نبوت میں چونکہ انبیا علیہم السلام صرف عقائد کی تعلیم دیتے ہیں اور کفار کی طرف سے ان ہی عقائد کا انکار کیا جاتا ہے اور انہی کے اثبات پر دلیل طلب کی جاتی ہے، اس لیے اول اول انبیا علیہم السلام سے اسی قسم کے معجزات کا ظہور ہوتا ہے، جن کا اثر صرف علم و یقین پر پڑسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی قسم کے دو معجزے دے کر فرعون کے پاس بھیجا اور اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے کفار قریش کو معجزہ شق القمر دکھایا لیکن اس کے بعد انبیا علیہم السلام کی تعلیم و ہدایت سے مومنین مخلصین کا ایک گروہ پیدا ہوجاتا ہے جو عموماً مفلوک الحال، خانہ بدوش، بے سروسامان اور بے یار و مددگار ہوتا ہے، یہ گروہ اگرچہ صفائے باطن اور خلوص نیت اور شدت ایمان کی بنا پر کسی معجزہ کا خواستگار نہیں ہوتا، تاہم تائید الٰہی خود اس کی طلب گار ہوتی ہے اور ہر موقع پر اس کی حفاظت اور حمایت کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ تائیدات الٰہیہ کا ظہور اکثر بغیر طلب وسوال کے ہوتا ہے، مسلمانوں نے آنحضرت ﷺ سے کسی معجزہ کا سوال نہیں کیا لیکن آپ سے اکثر معجزات کا ظہور انہی کے درمیان ہوا، بالخصوص غزوات میں اکثر تائید الٰہی نے مسلمانوں کی مدد کی ہے، غزوۂ بدر وحنین میں فرشتوں کا آسمان سے نازل ہونا، تھوڑے سے زادراہ کا تمام فوج کے لیے کافی ہونا، آپ کی انگلیوں سے پانی کا نکلنا، یہ اور اس قسم کے بہت سے معجزات غزوات ہی کے زمانہ میں آپ سے ظہور

[1] مسند امام احمد، ج ۳، ص: ۳۴۱، ۳۴۶، ۳۴۷۔

پذیر ہوئے اور ان سے تمام مسلمانوں نے ایسی حالت میں فائدہ اٹھایا جب کہ تمام دنیوی اسباب و وسائل منقطع ہو چکے تھے۔

اسی کا نام قرآن مجید کی زبان میں نصر (مدد) اور تائید ہے اور یہ ہر نبی کو آخر وقت میں عطا کی جاتی ہے اور عین اس وقت جب بظاہر اسباب مایوسیوں کے تمام مناظر پیش ہوتے ہیں اور تائید حق کا بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتا دفعتہً نصرت الٰہی توقع کے خلاف گرد و پیش کے واقعات کے خلاف بجلی کی طرح ناامیدیوں کے بادل سے چمک اٹھتی ہے:

﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱٤)

''کیا تم کو خیال ہے کہ تم جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی تم پر وہ حالت گزری نہیں جو تم سے پہلوں پر گزری ان پر مصیبت اور تکلیف آئی اور اس قدر جھڑ جھڑائے گئے کہ پیغمبر اور اس کے ساتھ مسلمان (گھبرا کر) کہہ اٹھے کہ خدا کی نصرت کہاں ہے؟ ہاں خدا کی نصرت نزدیک ہے۔''

﴿ حَتّٰٓي اِذَا اسْتَيْــَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ ﴾ (۱۲/ یوسف:۱۱۰)

''یہاں تک کہ جب ناامید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے نصرت کا وعدہ پورا نہیں کیا گیا کہ ہماری نصرت آ گئی پھر ہم نے جن کو چاہا وہ بچا دیئے گئے اور پھیری نہیں جاتی ہماری آفت گناہگار قوم سے۔''

خدا کا یہ قطعی وعدہ ہے کہ وہ حق پرستوں کو ہمیشہ آخر کار نصرت عطا کرے گا:

﴿ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ (۳۰/ الروم:٤۷)

''اور ایمان داروں کی مدد ہم پر فرض ہے۔''

یہ نصرت مسلمانوں کو ہر قدم پر تسلی کا پیغام سناتی تھی، بدر ہو کہ احد، خندق ہو کہ حنین، ہر جگہ وہی ان کی دستگیر تھی:

﴿ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ ﴾ (۹/ التوبۃ:۲۵)

''خدا نے بہت سے موقعوں پر تمہاری نصرت کی۔''

لیکن سب سے بڑی نصرت بدر کی تھی، جب تین سو بے برگ و ساز نہتوں نے قریش کی ایک ہزار مسلح فوج کو کامل شکست دے دی:

﴿ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۲۳)

''اور خدا نے یقیناً بدر میں تمہاری مدد کی، جب تمہارے پاس کوئی قوت نہ تھی۔''

لیکن عام معجزات اور نصرت الٰہی میں یہ فرق ہے کہ جو معجزات بطور حجت اور برہان کے پیش کیے جاتے ہیں، وہ صرف انبیا علیہم السلام کی روحانی طاقت کا فیض ہوتے ہیں، یعنی ان کا یہ فیض سبب ہوتا ہے ارادۂ الٰہی کے ظہور کا، لیکن نصرت الٰہی میں پیغمبر کی روحانی طاقت کے ساتھ مومنین کے کمال ایمان، شدت یقین، تزکیہ نفس اور استعداد قلب کی شرکت بھی ضروری ہوتی ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت نے جب سخت فاقہ کی حالت میں نزول مائدہ (خوان آسمانی) کی درخواست کی تو انہوں نے ان کو تقویٰ اختیار کرنے کی تعلیم دی:

﴿ اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۱۲)

''یاد کرو جب حواریوں نے کہا، اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا آپ کا پروردگار ہم پر آسمان سے ایک خوان اتار سکتا ہے؟ عیسیٰ نے کہا، خدا سے تقویٰ کرو اگر تم کو یقین ہے۔''

میدان جنگ میں آنحضرت ﷺ صحابہ کو نزول ملائکہ کی بشارت سناتے ہیں، تو ساتھ ساتھ صبر اور تقویٰ کی بھی تعلیم دیتے ہیں:

﴿ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۝ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۝﴾ (۳/ آل عمران: ۱۲۴، ۱۲۵)

''یاد کر اے پیغمبر! جب تو مسلمانوں سے کہہ رہا تھا کہ کیا تم کو یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتے اتار کر تم کو مدد دے (خدا کہتا ہے) ہاں اگر تم مستقل رہو اور تقویٰ کرو اور وہ فوراً آجائیں تو خدا پانچ ہزار سوار فرشتوں کے ذریعہ سے تمہاری مدد کرے گا۔''

یہی وہ معجزات تھے جن کی نسبت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ ہم ان کو برکت سمجھا کرتے تھے۔

کفار کے لیے نتائج کے لحاظ سے معجزات کی دو قسمیں

جس طرح مومنین پر اثر کے لحاظ سے معجزات کی دو قسمیں ہیں، اسی طرح کفار پر نتائج کی حیثیت سے بھی ان کی دو قسمیں ہیں، آیت ہدایت اور آیت ہلاک، انبیا علیہم السلام کفار کو پہلے ہدایت کی نشانیاں دکھاتے ہیں اور ان کو حق کی دعوت دیتے ہیں، کفار کی کثیر تعداد میں جس قدر صالح اجزا ہوتے ہیں، وہ اس دعوت کو قبول کرتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ بالآخر وہ وقت آتا ہے، جب مادۂ فاسد کے سوا کفار کی جماعت میں کوئی صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں رہ جاتا تو اس وقت آیت ہلاک، آسمان کی بجلی، فضا کی آندھی، زمین کا سیلاب، لوہے کی تلوار بن کر رونما ہوتی ہے اور سطح خاک کو ان کے وجود کی نجاست سے پاک کر دیتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو متعدد معجزے عنایت ہوئے تھے مگر وہ اس لیے تھے کہ ان کو دکھا کر فرعون کو حق کی طرف دعوت دی جائے، جب ایک مدت کے بعد اہل مصر میں سے جس قدر لوگ ایمان لا سکتے تھے لے آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شق بحر کی آیت ہلاک عنایت ہوئی اور رود احمر کی لہریں فرعون کو اس کے سارے ساز و سامان اور امرائے دربار کے ساتھ ہمیشہ کے لیے نگل گئیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کو آیت طوفان، حضرت صالح علیہ السلام کو آیت ناقہ، حضرت لوط علیہ السلام کو بربادی سدوم کی نشانی، حضرت شعیب علیہ السلام کو آیت صاعقہ بحر، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آیت رفع اور آنحضرت ﷺ کو معجزہ بطشۃ الکبریٰ (بدر) جو دیا گیا تھا، وہ اسی دوسری قسم میں داخل تھا، ان میں سے ہر معجزہ اور نشانی کے ظہور کے بعد یا خود اسی معجزہ اور نشانی کے ذریعہ سے معاندین کی ہلاکت، استیصال اور بربادی ہوئی اور اسی کو قرآن مجید نے سنۃ اللہ (خدا کا دستور) اور سنۃ الاولین (پہلوں کا دستور) کہا ہے کہ ہر پیغمبر کی قوم میں یہ اسی طرح ہوتا چلا آیا ہے:

﴿ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ ۚ فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ ۚ ﴾

(۳۵/ فاطر:۴۳)

''اور بدی کا داؤ پیچ کرنے والوں پر الٹ جاتا ہے تو کیا اب یہ کافر اگلی قوموں کے دستور ہی کی راہ دیکھتے ہیں۔''

﴿ أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا ۝ سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۶۱، ۶۲)

''یہ جہاں پائے گئے پکڑے گئے اور مارے گئے، یہ اللہ کا دستور پڑا ہوا ہے اگلی قوموں میں۔''

اس معجزۂ عذاب کے ظاہر ہونے میں عموماً ایک وقت معین تک تاخیر کی جاتی ہے جس کے اسباب حسب ذیل ہیں:

① یہ معجزۂ عذاب اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتا، جب تک آیات ہدایت سے قوم کے تمام صالح اجزا اس کے فاسد عنصر سے الگ نہیں ہو جاتے اور مومنین اور کافرین ایک دوسرے سے چھٹ کر جدا نہیں ہو جاتے اور رسول کو بقیہ عناصر کے ایمان سے قطعی مایوسی نہیں ہو جاتی، حضرت نوح علیہ السلام نے ایک طویل زمانہ تک اپنی قوم کو دعوت دی اور اس کے بعد ناامید ہو کر انہوں نے آخری معجزہ کی دعا مانگی:

﴿ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝ إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ ﴾ (۷۱/ نوح:۲۶، ۲۷)

''اے میرے پروردگار! زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑ، اگر تو ان کو چھوڑے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور وہ نہ جنیں گے لیکن فاجر اور کافر کو۔''

اس کے بعد طوفان آیا اور قوم نوح کو بہا لے گیا۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعون سے پوری مایوسی ہوگئی تو انہوں نے دعا کی:

﴿ رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓي اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝ ﴾

(۱۰/ یونس:۸۸)

''اے ہمارے رب! تو نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں شان وشوکت اور دولت عطا کی ہے، اے ہمارے رب! وہ اس سے یہ کام لیتے ہیں کہ وہ لوگوں کو تیرے راستہ سے گمراہ کرتے ہیں، خداوندا ان کی دولت کو سمیٹ دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے جب تک وہ تیرے دردناک عذاب کا مزہ نہ دیکھیں گے ایمان نہ لائیں گے۔''

اسی موقع پر اسی قسم کی دعائیں دیگر انبیا علیہم السلام نے بھی کی ہیں۔

② اس منزل پر پہنچ کر پیغمبر کو اپنے مومنین کی جماعت کو ساتھ لے کر ہجرت کا حکم ہوتا ہے، حضرت نوح علیہ السلام کو مع رفقا کے کشتی پر چڑھا کر کفار سے الگ کیا جاتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کے ملک سے اپنی ہجرت کا اعلان کرتے ہیں ﴿ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ۭ ﴾ (۲۹/ عنکبوت:۲۶) ''میں خدا کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاتے ہیں، حضرت لوط، حضرت ہود، حضرت شعیب، حضرت صالح علیہم السلام، سب نے اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر اپنی نافرمان قوموں سے علیحدگی اختیار کی اور جب تک یہ ہجرت نہیں ہو لیتی اور مومن وکافر الگ نہیں ہو جاتے، معجزۂ عذاب نہیں بھیجا جاتا، حضرت نوح علیہ السلام جب تک کشتی پر سوار ہو کر علیحدہ نہ ہو لیے، طوفان نہ آیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام جب تک کلدانیوں کے ملک عراق سے نکل کے شام اور مصر نہ چلے گئے، ان پر عذاب نہ آیا، اسی طرح حضرت لوط، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت شعیب علیہم السلام اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر جب تک الگ نہ ہو گئے، ہلاکت کا عذاب نہیں آیا اور جب انہوں نے ہجرت کر لی تو یہ معجزۂ عذاب مختلف صورتوں میں ان قوموں پر نازل ہوا اور مومنین کی نجات اور کافروں کو ہلاکت نصیب ہوئی۔

قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں ان واقعات کو بکثرت بیان کیا گیا ہے اور نیز اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا وہ دستور اور قانون فرمایا ہے، جس میں تغیر وتبدل ناممکن ہے جیسا کہ اس سے پہلے ''قرآن مجید میں سنۃ اللہ کے مفہوم'' کے ضمن میں آیات قرآنی کے حوالہ سے اس کی پوری تفصیل گزر چکی ہے، سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ اس اصول کو اس طرح بیان کرتا ہے:

﴿ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ

الْمُنْتَظِرِيْنَ۝ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ۝﴾

(۱۰/ یونس:۱۰۲، ۱۰۳)

''کیا یہ کافر گزشتہ قوموں کی طرح واقعہ ہلاکت کا انتظار کرتے ہیں، کہہ دے کہ انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں پھر ہم اپنے رسولوں کو نجات دیتے ہیں اور ایسے ہی ایمان لانے والوں کو ہم پر فرض ہے، ہم نجات دیں گے ایمان والوں کو۔''

آنحضرت ﷺ اور معجزۂ ہدایت

ہدایت کی غرض سے آنحضرت ﷺ سے جو معجزات اور نشانیاں صادر ہوتی رہتی تھیں، ان کا بڑا حصہ غیر معمولی قوت تاثیر، استجابت دعا، تائید و نصرت اور پیشین گوئی کا تھا، اسی غیر معمولی قوت تاثیر کا نتیجہ تھا کہ قریش لوگوں کو آپ ﷺ کے پاس جانے سے روکتے تھے، سیرت کی کتابوں میں اس قسم کے متعدد واقعات مذکور ہیں، قرآن مجید کی یہ آیت کفار کے اس باطنی اعتراف کا آئینہ ہے:

﴿لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۝﴾ (۴۱/ حٰمٓ السجدة:۲۶)

''اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں شور وغل کرو، شاید تم غالب آؤ۔''

قرآن کے اثر کا ان پر یہ رعب چھایا ہوا تھا کہ وہ لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہ دیکھتے تھے کہ وہ شور وغل اور ہنگامہ کر کے لوگوں کو سننے نہ دیں، آنحضرت ﷺ کی استجابت دعا کا بھی کفار کو بدرجۂ اتم یقین تھا، ایک دفعہ صحن حرم میں جب ابوجہل وغیرہ رؤسائے قریش آنحضرت ﷺ کی نماز میں خلل انداز ہوئے اور آپ نے ان پر بددعا کی تو ﷺ مسلم میں یہ تصریح ہے کہ وہ اس کو سن کر کانپ اٹھے۔ ❶ ایک دفعہ جب مکہ میں قحط عظیم پڑا تو ابوسفیان نے آپ کے پاس آ کر کہا کہ ''محمد (ﷺ) تمہاری قوم ہلاک ہوگئی، خدا سے دعا کرو کہ وہ اس بلا کو ان سے دور کرے۔'' چنانچہ آپ نے دعا کی اور وہ بلا دور ہوئی۔ ❷ اسی طرح آپ کی پیشین گوئی کی صداقت کا بھی ان کو دل سے اعتراف تھا، یاد ہوگا کہ غزوۂ بدر سے پہلے جب امیہ کو حضرت سعد انصاری رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ معلوم ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کے مارے جانے کی پیشین گوئی کی ہے تو وہ گھبرا اٹھا اور اس کی بیوی پر یہ اثر ہوا ہے کہ اس نے غزوۂ بدر کے موقع پر اپنے شوہر کا دامن تھام لیا کہ ''محمد (ﷺ) کی پیشین گوئی تمہیں یاد نہیں؟'' ❸ فتح روم کی مشہور پیشین گوئی جس دن پوری ہوئی

❶ صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب اذا القی علی ظهر المصلی قذر اوجیفة لم تفسد علیه صلوته: ۲۴۰ ومسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب مالقی النبی ﷺ من اذی المشرکین والمنافقین: ۴۶۴۹۔

❷ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورة حم الدخان: ۴۸۲۴۔

❸ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب ذکر النبی ﷺ من یقتل ببدر: ۳۹۵۰۔

بہت سے لوگ اس نشان صداقت سے ہدایت پا کر مسلمان ہو گئے۔ ❶ آنحضرت ﷺ کی تائید ونصرت کے عجائبات بھی قریش کی نظروں سے گزر چکے تھے وہ بار بار آپ پر حملے کی تیاریاں کرتے تھے اور ناکام رہتے تھے ایک دفعہ ابوجہل نے یہ ناپاک ارادہ کیا اور اس نیت سے آگے بڑھا تو فوراً ڈر کر پیچھے ہٹ گیا ساتھیوں نے واقعہ پوچھا تو بتایا کہ مجھے یہ نظر آیا کہ میرے اور محمد (ﷺ) کے درمیان آگ کی خندق ہے اور چند پردار ہستیاں کھڑی ہیں۔ ❷ الغرض ہدایت کے متعدد نشانات تھے جو مکہ میں کفار کو اس غرض سے دکھائے گئے تھے کہ ان کو دیکھ کر ان کے قلوب میں قبولِ حق کی صلاحیت پیدا ہو۔

شق قمر آخری نشانِ ہدایت تھا

ہدایت کی ان نشانیوں میں کفار مکہ کے لیے سب سے آخری ❸ اور فیصلہ کن نشان شق قمر کا تھا، جس کے بعد آیات ہلاکت کا آغاز ہونے والا تھا احادیث میں ہے کہ کفار مکہ آپ ﷺ سے معجزہ کے طالب تھے تو آپ ﷺ نے ان کو شق قمر کا معجزہ دکھایا، چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا لیکن معاندین کو اس عظیم الشان اور واضح تر معجزے سے بھی ہدایت نہ ملی، بعضوں نے کہا محمد (ﷺ) نے جادو کیا ہے، کسی نے کہا ایسی عجیب عجیب باتیں ہمیشہ ہوتی رہتی ہیں، چنانچہ قرآن مجید نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے:

﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ ﴾ (٥٤/ القمر: ١، ٢)

''قیامت کا وقت قریب آ گیا ہے اور چاند شق ہو گیا اور اگر یہ کافر کوئی نشانی دیکھیں تو اس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جادو تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔''

اب خداوند ذوالجلال کے رحم وکرم نے دوسری شان اختیار کی یعنی اس کے قہر وغضب نے ان غیر صلاحیت پذیر ہستیوں سے سطح ارضی کو پاک کر دینے کا تہیہ کر لیا اور وہ سنت الٰہی جو تمام گزشتہ امتوں کے ساتھ جاری رہی تھی یعنی یہ کہ معجزہ کے دیکھنے کے بعد ایمان نہ لانے پر کفار کی ہلاکت اور بربادی فرض ختم ہو جاتی ہے، وہ قریش کے حق میں جاری ہوئی۔

گزشتہ دستور الٰہی کی تفصیل کے مطابق اس ہلاکت کے عذاب کے نازل ہونے کے لیے پہلے دو چیزوں کی ضرورت تھی:

---

❶ ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ الروم: ٣١٩٤۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین واحکامھم، باب قولہ تعالیٰ: ﴿ان الانسان لیطغی ان رآہ استغنی﴾: ٧٠٦٥۔ ❸ ہم نے قرآن مجید کے بتائے ہوئے اصول الٰہی کے مطابق اولاً ایسا سمجھا تھا کہ شق قمر کا معجزہ ہجرت سے پہلے ظاہر ہوا ہوگا لیکن سیر ومغازی اور کتب احادیث کا مطبوعہ ذخیرہ اس دعویٰ کے ثبوت و انکار دونوں سے خاموش تھا، اسی اثنا میں حاکم کی مستدرک کی دوسری جلد حیدر آباد سے چھپ کر پہنچی، اس میں سورۂ قمر کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے جو واقعہ کے عینی شاہد ہیں، یہ تصریح ملی کہ یہ نشان قبل مخرج النبی ﷺ یعنی ہجرت سے پہلے ظاہر ہوا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے کچھ ہی پہلے کا ہے حاکم کی یہ روایت بخاری ومسلم کی شرط کے مطابق ہے اور حافظ ذہبی نے تلخیص مستدرک میں اس کی تصدیق کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ روایت مصنف عبدالرزاق میں بھی موجود ہے، (مستدرک، ج ٢، ص: ٤٧١، ٤٧٢ حیدر آباد)۔

① مومنین کی جماعت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی شہر مکہ سے ہجرت۔

② ہجرت سے پہلے ہدایت کی کسی آخری کھلی نشانی کا ظاہر ہونا۔

چنانچہ ہجرت سے پہلے شق قمر کا نشان ظاہر ہوا اور اس کو دیکھ کر بھی جب قریش کے رؤسا اسلام نہ لائے تو آنحضرت ﷺ کو مکہ سے ہجرت کا حکم ہوا اور ہلاکت کے عذاب کے نازل ہونے کا وقت قریب آ گیا صحابہ رضی اللہ عنہم میں اسرار نبوت کے جو محرم تھے وہ پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ یہ ہجرت قریش کی بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ مستدرک حاکم (جلد۳،ص:۷) اور مسند ابن حنبل (جلد۱،ص:۲۱۶) میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ مکہ سے نکلے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا ﴿اِنَّا لِلّٰہِ﴾ مکہ والوں نے اپنے پیغمبر کو نکال دیا اب یہ ضرور ہلاک ہو جائیں گے، چنانچہ ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ﴾ والی قتال کی آیت نازل ہوئی۔'' [1]

آنحضرت ﷺ اور معجزہ ہلاکت

آنحضرت ﷺ نے مکہ میں قریش کو تقریباً ۱۳ برس تک دعوت دی اور ان تیرہ سالوں کے اندر اس راہ میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی اور آیات ہدایت کے مختلف نمونے ان کو دکھائے، بالآخر شق قمر کا معجزہ بھی ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزرا اور آخر وہ وقت آیا جو اپنے اپنے پیغمبروں کے سامنے دوسری قوموں پر آ چکا تھا یعنی قبیلہ قریش میں سے وہ افراد صالحہ جو بے خوف وخطر حق کو قبول کر سکتے تھے، انہوں نے حق کو قبول کر لیا اور صرف وہ رؤسائے قریش رہ گئے جو قبول حق کی مطلق صلاحیت نہیں رکھتے تھے یا وہ ضعفا تھے جو ان رؤسا کی موجودگی میں حق کا ساتھ دینے کی قوت نہیں رکھتے تھے اور اس لیے ضرورت ہوئی کہ ان رؤسا کے وجود سے ارض حرم کو پاک کیا جائے۔

آنحضرت ﷺ مکہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے لیکن وہاں بھی کوئی حق کا سننے والا نہیں تھا، بازار اور راستہ میں شریروں نے آپ کو پتھر مارے، یہاں تک کہ قدم مبارک خون آلود ہو گئے، آپ مکہ واپس آ رہے تھے کہ فرشتہ جبال نے آپ کو ندا دی کہ اگر اجازت ہو تو پہاڑوں سے ان کو چکنا چور کر دیا جائے رحمت عالم ﷺ اب بھی مایوس نہ ہوئے اور بارگاہ الٰہی میں عرض کی کہ ابھی وہ معجزۂ ہلاکت ظاہر نہ ہو، شاید کہ ان کی نسل سے کوئی توحید کا پرستار پیدا ہو۔ صحیح بخاری ومسلم میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! احد کے علاوہ آپ پر سب سے زیادہ سخت دن کون تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ دن جب میں نے طائف کے سردار عبدیالیل کے سامنے اپنے کو پیش کیا اور اس نے انکار کیا میں مغموم واپس آ رہا تھا کہ فرشتہ جبال نظر آیا۔'' اور اس کے بعد آپ نے کفار کی ہلاکت کے لیے فرشتہ جبال کی اجازت طلبی اور اپنا جواب بیان کیا۔ [2] آنحضرت ﷺ اس دن کو ایام مصائب کی تاریخ میں سب

---

[1] نسائی، کتاب الجهاد، باب وجوب الجهاد: ۳۰۸۷ اور ترمذی تفسیر آیت بالا: ۳۱۷۱ میں بھی یہ حدیث مذکور ہے''س''۔

[2] مسلم، کتاب الجهاد والسير، باب ما لقى النبى ﷺ من اذى المشركين: ٤٦٥٣ وبخاری، کتاب بدء الخلق: ۳۲۳۱۔

سے زیادہ سخت فرماتے ہیں، بظاہر ایسا سمجھا جاتا ہے کہ آپ نے طائف کی تکلیف کو سخت ترین دن فرمایا لیکن واقعہ یہ نہیں ہے اس سے بھی زیادہ تکالیف اور مصیبت کی گھڑیاں آپ پر آئی ہیں بلکہ اس لحاظ سے آپ اس کو سخت ترین دن قرار دیتے ہیں کہ یہ قریش کی فرصت اور مہلت کی اخیر گھڑی تھی اور اب معجزۂ ہلاک ان کے سر پر تھا اور رحمت عالم ﷺ کو اس کا صدمہ تھا، تاہم قریش کو اب آخری عذاب کی اطلاع دی گئی تھی اور وہ نادان استہزا کرتے تھے، جیسا کہ دوسری قومیں بھی اپنے اپنے پیغمبروں کے ساتھ یہی کرتی آئی ہیں۔ کفار قریش آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جا کر کہتے تھے جس عذاب کی دھمکی دی جاتی ہے وہ کیوں نہیں آتا؟ اگر تم میں قدرت ہے تو وہ عذاب لاؤ اور اپنی صداقت کی یہ آخری نشانی بھی دکھادو:

﴿ وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ ﴾ (۱۰/ یونس:۲۰)

’’اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس پر خدا کی طرف سے کوئی نشان کیوں نہیں اترتا۔ اے پیغمبر کہہ دے کہ غیب کی بات خدا کے پاس ہے، تم اس کے ظہور کا انتظار کرو، ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔‘‘

کبھی آ کر کہتے:

﴿ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ﴾

(۱۷/ بنی اسرآئیل:۹۲)

’’یا جیسا تم کہا کرتے ہو، آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرادو یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آؤ۔‘‘

﴿ لَّوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَائِكَةِ إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴾ (۱۵/ الحجر:۷)

’’اگر تم سچے ہو تو کیوں نہیں ہمارے پاس فرشتوں کو لے آتے۔‘‘

خدا نے جواب میں کہا:

﴿ وَمَا كَانُوا إِذًا مُّنظَرِينَ ﴾ (۱۵/ الحجر:۸)

’’جب فرشتے آجائیں گے تو پھر انہیں مہلت نہ دی جائے گی۔‘‘

کفار قریش کو معجزۂ عذاب کے دیکھنے کی جلدی تھی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ پیشین گوئی سراسر جھوٹ ہے، خدا نے کہا جب تک پیغمبر کی آمد کی برکات ختم نہ ہو جائیں یعنی تمام افراد صالحہ الگ نہ ہو جائیں گے عذاب نہیں آئے گا۔

﴿ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِمُ الْمَثُلَاتُ ۗ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو

مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ۝ ﴾ (١٣/ الرعد:٦)

''اور کفار جلدی چاہتے ہیں تجھ سے بھلائی سے پہلے برائی، حالانکہ ان سے پہلے گزشتہ قوموں میں اس قسم کے واقعات گزر چکے ہیں اور تیرا رب لوگوں کی گناہگاری کے باوجود ان کو معاف کرتا ہے اور تیرا رب بڑے عذاب والا بھی ہے۔''

اللہ تعالیٰ قرآن مجید کے معجزہ کا ذکر کر کے کہتا ہے:

﴿ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۙ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۙ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ؕ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ۝ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ۙ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۙ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ؕ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ۛ﴾ (٢٦/ الشعرآء:٢٠١ تا ٢٠٨)

''وہ نہ مانیں گے اس کو جب تک دکھ کا عذاب نہ دیکھ لیں گے پھر یہ عذاب اچانک ان پر اس طرح آ جائے گا کہ ان کو خبر (نہیں) ہونے پائے گی تو اس وقت کہیں گے کہ ہم کو مہلت بھی کچھ مل سکتی ہے؟ کیا یہ کفار ہمارا عذاب جلد مانگتے ہیں، بھلا دیکھ تو اگر ہم نے ان کو چند سال فائدہ اٹھانے کا موقع دے بھی دیا اور پھر ان پر وہ عذاب آ گیا جس کا وعدہ تھا تو کیا ان کی یہ دولت ان کے کچھ کام آئے گی؟ ہم نے کسی آبادی کو ہلاک نہیں کیا لیکن اس کو ڈرسنانے والے پہلے موجود تھے۔''

یعنی اس اصول کی بنا پر کہ قوموں کی ہلاکت سے پہلے ان کے اندر ایک ڈرسنانے والا مامور ہوا کرتا ہے، قریش میں بھی ایک ڈرسنانے والا آ گیا اگر وہ اس کی نہ سنیں گے تو پچھلی قوموں کی طرح وہ بھی نیست و نابود ہو جائیں گے۔ سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ قریش کو مختلف قوموں کے حالات سنا کر کہتا ہے:

﴿ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ۝ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ۝ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۠ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ﴾ (٢٢/ الحج:٤٥ تا ٤٩)

''تو کتنی بستیاں ہم نے برباد کیں اور وہ گناہگار تھیں اور اب وہ اپنی چھتوں پر ڈھی پڑی ہیں اور کتنے کنویں بے کار پڑے ہیں اور کتنے اونچے اونچے محل خراب اور ویران ہیں، کیا یہ کافر

زمین میں چلتے پھرتے نہیں ہیں کہ ان کے پاس دل ہوتے جن سے سمجھتے یا کان ہوتے جن سے سنتے کیونکہ آنکھیں کچھ اندھی نہیں ہوتی ہیں (کہ ان کو یہ عبرتناک مناظر سوجھائی نہ دیتے ہوں) مگر وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں اور یہ کافر تجھ سے جلدی مانگتے ہیں عذاب اور اللہ ہرگز اپنا وعدہ نہ ٹالے گا اور تیرے رب کے نزدیک ایک دن تمہارے ہزار برس کے برابر ہے اور کتنی بستیاں ہیں کہ میں نے ان کو ڈھیل دی اور وہ گناہگار تھیں پھر ان کو پکڑا اور میری طرف پھر آنا ہے، کہہ دے اے لوگو! میں تو صاف صاف تم کو ڈرسنانے والا ہوں۔''

قرآن نے رؤسائے قریش کی طرف اشارہ کرکے پوچھا:

﴿ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ ﴾ (۳۵/ فاطر:۴۳)

''کیا وہ پہلی قوموں کے دستور کا انتظار کر رہے ہیں۔''

چنانچہ گزشتہ قوموں کے قانون کے پورے ہونے کے دن آگئے ہیں یعنی رسول اور مومنین کو گناہگار قوم کی آبادی کے اندر سے نکل جانے کی اجازت ملی، کیونکہ جیسا پہلے گزر چکا ہے، جب تک رسول اپنی قوم سے ہجرت نہیں کرتا عذاب و ہلاکت کا نشان ظاہر نہیں ہوتا، چنانچہ کفار قریش کو جو اس نشان کے دیکھنے کے لیے بے تاب تھے، پہلے ہی یہ جتادیا گیا تھا:

﴿ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآء یل:۷۶، ۷۷)

''اور اگر وہ اس زمین سے تجھ کو گھبرانے لگے ہیں، تاکہ تجھ کو یہاں سے نکال دیں تو یاد رہے کہ تیرے چلے جانے کے بعد بہت کم پھر ٹھہر سکیں گے تجھ سے پہلے جو رسول گزرے ہیں ان کی یہ سنت ہے اور خدا کی سنت کو تم مٹانہ پاؤ گے۔''

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ صحن حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، رؤسائے قریش ادھر ادھر بیٹھے ہنسی، دل لگی کی باتیں کر رہے تھے، ابوجہل نے کہا کہ کون مذبح میں جاکر وہاں سے اونٹ کی اوجھڑی اٹھا لائے گا؟ چنانچہ ایک شریر نے یہ خدمت انجام دی اور جب آنحضرت ﷺ سجدہ میں گئے تو وہ نجاست آپ کی پشت مبارک پر ڈال دی، آنحضرت ﷺ اس بوجھ سے سر نہیں اٹھا سکتے تھے اور کفار اس منظر کو دیکھ کر ہنسی سے بے خود ہوئے جاتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو اس موقع پر موجود تھے، کہتے ہیں کہ میں یہ دیکھ رہا تھا لیکن مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ میں ان کے سامنے کچھ کرسکتا، اسی اثنا میں ایک شخص نے جاکر فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اطلاع دی جو اس زمانہ میں بچی تھیں وہ آئیں اور اس نجاست کو ہٹایا تو آپ ﷺ نے

سر اٹھایا [1] یہ پہلا موقع ہے کہ سرور عالم ﷺ رؤسائے قریش کے ایمان سے قطعاً مایوس ہوتے ہیں اور یہ اس لیے نہیں کہ آپ کے جسم مبارک کو تکلیف پہنچی بلکہ اس لیے کہ وہ نماز (یعنی مشاہدۂ جمال الٰہی) میں جو اس دنیا میں آپ کی محبوب ترین چیز تھی خلل انداز ہوئے۔ قرآن نے کہا:

﴿ اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يَنْهٰىۙ عَبْدًا اِذَا صَلّٰىؕ ﴾ (۹۶/ العلق:۹۔۱۰)

''کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بندہ الٰہی کو نماز سے روکتا ہے۔''

یہ رؤسائے قریش کی مہلت کا اخیر لمحہ تھا، آنحضرت ﷺ نے بلند آواز میں بددعا کی اور اس آخری معجزۂ ہلاک کی درخواست کی مگر پھر بھی رحمت عالم ﷺ کی شفقت دیکھئے کہ حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی طرح پوری قوم کی تباہی و بربادی کی دعا نہیں مانگی، بلکہ صرف قریش کے رئیسوں کے حق میں بددعا کی اور ان میں سے بھی سات رئیسوں کے نام لیے اور فرمایا ''خداوندا! قریش کے سرداروں کو لے، خداوندا! ابوجہل، عتبہ، شیبہ، عقبہ بن معیط، امیہ بن خلف، ولید بن عقبہ اور ابی بن خلف کو پکڑ۔'' یہ بددعا سن کر سب کے ہوش اڑ گئے۔ [2]

اب سنت الٰہی کے مطابق معراج کے ساتھ ہجرت کی دعا آپ ﷺ کو بتائی گئی: [3]

﴿ رَّبِّ اَدْخِلْنِىْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِىْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّىْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا۝ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل:۸۰)

''خداوندا! مجھ کو خوبی سے کہیں پہنچا اور خوبی سے نکال اور اپنے پاس سے مجھے ایک مدد کرنے والی طاقت عطا کر۔''

یہ دعا مقبول ہوئی اور بشارت آئی:

﴿ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۝ ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل:۸۱)

''حق آ گیا اور باطل ہٹ گیا اور باطل مٹنے ہی کو ہے۔''

انبیا کی سنت کے مطابق آنحضرت ﷺ نے اپنے متبعین کے ساتھ ہجرت فرمائی اور جس دن کا انتظار تھا وہ آ گیا، قرآن نے کہا رؤسائے قریش پر آیت عذاب کے نازل ہونے کے لیے ہجرت کا انتظار تھا، وہ ہو چکی اور اب کوئی مزید انتظار نہیں۔

﴿ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُؕ وَاللّٰهُ

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد و السیر، باب مالقی النبی ﷺ من اذی المشرکین:۴٦٤۹۔
[2] بخاری، کتاب الوضوء، باب اذا القی علی ظهر المصلی......:۲٤۰ اور مسلم باب ما لقی النبی ﷺ من اذی المشرکین:٤٦٤۹۔ [3] ترمذی، ابواب التفسیر: ۳۱۳۹ اور مستدرك حاکم، باب الهجرة، ج۳، ص:۳ میں تصریح ہے کہ یہ دعائے ہجرت ہے۔

خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۝ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۝ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۝ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۝ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (۸/ الانفال: ۳۰ تا ۳٤)

''اور جب (اے پیغمبر) منکرین داؤ کر رہے تھے تیری جان لینے کا کہ وہ تجھ کو قید کر دیں یا مار ڈالیں یا جلا وطن کر دیں وہ داؤ کرتے ہیں اور خدا بھی داؤ کرتا ہے اور خدا داؤ کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں، ہاں ہم نے سنا، اگر چاہیں تو ہم بھی ایسا کہہ سکتے ہیں، یہ تو فقط اگلوں کی کہانیاں ہیں اور جب وہ کہتے ہیں کہ اے خدا! اگر یہ قرآن حق ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش کر یا کوئی اور بڑا عذاب ہم پر لا اور خدا ان پر (ہجرت سے پہلے) کیونکر عذاب کرتا، جب کہ تو ان میں تھا اور خدا ان پر عذاب کرنے والا نہیں ہے، درآنحالیکہ وہ مغفرت چاہتے ہوں اور خدا ان پر عذاب کیوں نازل نہ کرے گا، جب وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں، حالانکہ وہ اس کی تولیت کے مستحق نہیں، اس کے مستحق صرف پرہیزگار ہیں۔''

غزوۂ بدر معجزۂ ہلاک تھا

جس طرح دوسری قوموں کے لیے مختلف معجزات عذاب، آئے اسی طرح جس قوم میں آنحضرت ﷺ مبعوث ہوئے تھے، اس کے لیے غزوۂ بدر معجزۂ عذاب تھا، ہجرت سے قبل آنحضرت ﷺ کی بددعا سے پہلے قریش پر قحط کا عذاب آیا، جو اس قدر سخت تھا کہ بھوک سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا، آسمان کی طرف دیکھتے، تو دھواں سا نظر آتا تھا بعض روسائے قریش نے خدمت نبوی ﷺ میں آکر کہا کہ محمد (ﷺ)! تم رحمت و شفقت اور صلہ رحمی کی دعوت دیتے ہو، تم دیکھتے ہو کہ اس قحط سے قریش کا کیا حال ہے؟ آنحضرت ﷺ نے دعا کی اور یہ بلا دور ہوئی [1] مگر پھر قریش کی سرگردانی کا وہی عالم ہوگیا تو ان کے لیے معجزہ عذاب کے سوا کوئی اور طریقہ علاج باقی نہ رہا، چنانچہ ہجرت کے بعد بدر کا بطشۂ کبریٰ (بڑی پکڑ) ان کے لیے ہلاکت کی نشانی قرار پائی، قرآن مجید نے ہجرت سے پہلے مکہ میں اپنا یہ اعلان عام سنا دیا تھا، جس میں پہلے اس قحط کی پھر اس کے گڑگڑانے کی اور اس کے بعد غزوۂ بدر کی پیشین گوئی کی تھی:

﴿ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِى السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ۝ يَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝ رَبَّنَا اكْشِفْ

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ حم الدخان: ٤٨٢٤۔

عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ۝ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ۝ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ۝ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ۝ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ﴾

(٤٤/ الدخان: ١٠ تا ١٧)

''اس دن کی راہ دیکھ جب آسمان صاف دھواں کرلاوے جو لوگوں کو گھیر لے، اس وقت کہا جائے گا، یہ ہے دکھ کی مار، تب گڑگڑائیں گے کہ خداوند! ہم سے یہ عذاب دور کردے، ہم ایمان لاتے ہیں، کہاں ہے ان کے لیے سمجھنا، حالانکہ ان کے پاس کھول کے سنانے والا رسول آچکا تو اس سے پیٹھ پھیری اور کہا کہ سکھایا ہوا دیوانہ ہے، اچھا ہم تھوڑے دنوں کے لیے عذاب کو دور کردیتے ہیں تم پھر وہی کرنے والے ہو انتظار کرو اس دن کا جب ہم بڑی پکڑ پکڑیں گے، ہم بدلہ لینے والے ہیں اور ان سے پہلے ہم فرعون کی قوم کو آزما چکے ہیں۔''

ان آیات کریمہ میں پورے واقعہ کی تصویر کھینچ دی گئی ہے اور آخر میں یہ بھی ظاہر کردیا گیا ہے کہ بطش اکبر ان رؤسائے قریش کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو فرعون کے لیے غرق بحر کی حیثیت تھی، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ یہ آیتیں قریش کی شان میں نازل ہوئی ہیں، قریش نے جب نافرمانی کی تو آنحضرت ﷺ نے خدا سے دعا کی کہ ''اے خدا! ان پر حضرت یوسف علیہ السلام کے سات برس والے قحط کی طرح قحط نازل کر۔'' چنانچہ مکہ میں سخت قحط پڑا، یہاں تک کہ بھوک سے آسمان اور قریش کی آنکھوں کے درمیان دھواں سا اڑتا نظر آتا تھا انہوں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے آکر دعا کی درخواست کی چنانچہ آپ نے دعا کی اور بارش ہوئی۔ خدا نے کہا کہ وہ پھر اپنی پہلی حالت پر آجائیں گے یعنی ایمان نہ قبول کریں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، تب اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بطشۃ الکبریٰ (بڑی پکڑ) کا دن مقرر فرمایا، یعنی بدر۔ [1]

یاد ہوگا کہ صحن حرم میں رؤسائے قریش جو نماز میں خلل انداز ہوئے تھے، آپ نے ان کا نام لے لے کر ہر ایک کے حق میں بددعا کی تھی، اس سے پہلے کہ غزوۂ بدر کا واقعہ پیش آئے، ہجرت کے بعد ہی آپ نے ان کی ہلاکت و بربادی کا اعلان کردیا تھا، بدر سے پہلے حضرت سعد انصاری رضی اللہ عنہ عمرہ کو گئے تھے ابوجہل نے ان کو روکا، امیہ نے بیچ میں دخل دینا چاہا حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: ''امیہ تم دخل نہ دو آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم ان کے ہاتھوں سے مارے جاؤ گے۔'' یہ سن کر امیہ ڈر گیا، چنانچہ جب بدر کا موقع پیش آیا تو اس نے جانے میں پس و پیش کیا، لوگوں کے طعن سے اس نے جانا چاہا تو اس کی بیوی نے دامن تھام لیا اور کہا: ''کیا تم کو اپنے یثربی دوست کی بات یاد نہیں؟'' [2]

جب غزوۂ بدر کے لیے آپ ﷺ مسلمانوں کو ساتھ لے کر نکلے تو اس وقت جیسا کہ پہلی جلد میں تفصیل

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر سورۃ حم الدخان: ٤٨٢١۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المغازی: ٣٩٥٠۔

گزر چکی ہے، مسلمانوں کے سامنے قریش کی دو جمعیتیں تھیں، ایک قریش کا شامی قافلہ جو مدینہ کی راہ سے گزر کر مکہ جا رہا تھا، دوسرا رؤسائے قریش کا جنگی لشکر جو مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکلا تھا، خدا نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان دو جمعیتوں میں سے ایک ان کے ہاتھ لگے گی، عام مسلمان یہی سمجھتے تھے کہ تجارتی قافلہ ان کے ہاتھ آئے گا لیکن حضور انور ﷺ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آج معمولی فتح وشکست کا نہیں بلکہ اس بطشۃ الکبریٰ کا دن ہے جس کا بارگاہ الٰہی میں مدت سے وعدہ تھا۔ رات کو جب مسلمان بدر کے پڑاؤ پر پہنچے ہیں تو انہیں یہ فکر ہوئی کہ قریش کے تجارتی قافلہ کا پتہ لگایا جائے، چنانچہ مسلمان مخبر ادھر ادھر گئے اور ایک چرواہے کو پکڑ لائے اور اس سے قریش کے قافلے کا حال پوچھنے لگے، اس نے جواب دیا کہ ”قریش کے قافلہ کا تو مجھے علم نہیں، البتہ ان کا لشکر ادھر پڑا ہے۔“ یہ سن کر مسلمانوں نے اس کو مارا کہ یہ ہم سے صحیح حال چھپاتا ہے مار کھانے پر اس نے کہا، اچھا ٹھہرو قافلہ کا حال بتاتا ہوں۔ جب لوگ اس کو چھوڑ دیتے تو وہ پھر یہی کہتا کہ مجھ کو قافلہ کی خبر نہیں، البتہ یہ جانتا ہوں کہ ادھر قریش کا لشکر سامنے پڑا ہے۔ آنحضرت ﷺ نماز میں مصروف تھے، اس سے فراغت ہوئی تو فرمایا: ”جب وہ جھوٹ کہتا ہے تو تم چھوڑ دیتے ہو اور جب وہ سچ کہتا ہے تو تم مارتے ہو۔“ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ قریش کی تباہی کا دن ہے، یہ ابوجہل کا مقتل ہے، یہ عتبہ کا ہے، یہ ابی کا ہے وغیرہ۔“ راوی کہتا ہے کہ آپ نے جس کا مقتل جہاں متعین فرمایا تھا ایک سر موفرق وہاں سے اس نے تجاوز نہیں کیا اور معرکۂ جنگ میں وہ وہیں مرا پڑا ملا۔ حضرت عبداللہ مسعود رضی اللہ عنہ جو صحن حرم کی بددعا کے دن موجود تھے، وہ کہتے ہیں کہ عرب کے ساتوں رئیس جن کے حق میں آپ نے بددعا کی تھی کل کے کل بدر کے میدان میں ڈھیر ہو گئے [1] اور بطشۃ الکبریٰ کے انتقام کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ سورۂ انفال جس میں بدر کے تمام واقعات کا ذکر ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ یہی وہ فیصلہ کا دن تھا جس کا مدت سے انتظار تھا:

﴿ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَن يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ ۝ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ۝ ﴾ (۸/ الانفال:۷، ۸)

”اور خدا جو چاہتا ہے کہ حق کو اپنی بات سے مستحکم کر دے اور کافروں کا پیچھا کاٹ دے تا کہ حق کو حق اور باطل کو باطل کر دے گا اگرچہ گناہ گار اس کو پسند نہ کریں۔“

وسط سورہ میں فرمایا:

﴿ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ ﴾

(۸/ الانفال:۵۲)

”یہ ویسا ہی ہوا جیسا فرعون والوں کا اور ان سے پہلوں کا کہ انہوں نے اپنے پروردگار کی

---

[1] یہ دونوں واقعے صحیح بخاری، کتاب المغازی: ۳۹۶۰ ومسلم، کتاب الجهاد، باب مالقى النبى ﷺ من اذى المشركين: ٤٦٤٩ میں موجود ہیں۔

نشانیوں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کے گناہوں کے سبب ان کو ہلاک کر دیا۔''

یہ فیصلہ کا دن تھا:

﴿ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ﴾ (۸/ الانفال:۴۱)

''اور جو ہم نے اپنے بندہ پر فیصلہ کے دن اتارا جس دن دونوں لشکر آمنے سامنے بھڑے۔''

یہ سب اس لیے ہوا کہ

﴿ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ﴾ (۸/ الانفال:۴۲۔۴۴)

''تا کہ خدا اس کام کو پورا کر دے جو پہلے مقرر کیا جا چکا تھا۔''

نکتہ: بدر کے میدان میں جب تین سو بے سروسامان مسلمان ایک ہزار، لوہے میں غرق فوج سے مقابل تھے، آنحضرت ﷺ نے بھی اسی قسم کی بددعا مانگی، جیسی حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان سے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غرق سے پہلے اپنی اپنی قوم کے لیے مانگی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کہا: ''خداوند! اب زمین پر کوئی کافر بسنے والا نہ چھوڑ کہ جب تک وہ زندہ رہیں گے تیرے نام کی تقدیس نہ ہوگی اور نہ ان کی نسل سے کوئی تیرا نام لینے والا پیدا ہوگا۔'' (۷۱/ نوح:۲۶۔۲۷) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''خداوند! ان کے دل سخت کر دے جب تک عذاب نہ دیکھ لیں گے ایمان نہ لائیں گے۔'' (۱۰/ یونس:۸۸) لیکن اس موقع پر آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے جو فقرہ نکلا وہ یہ تھا کہ ''خداوندا! اپنا وعدہ پورا کر، اگر یہ مٹھی بھر مسلمان تباہ ہو گئے تو پھر کوئی تیرا نام لینے والا نہ ملے گا۔'' [1] حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السلام نے براہ راست اپنی اپنی قوم کی تباہی کی دعا مانگی لیکن رحمت عالم ﷺ نے اب بھی دعا مانگی تو صرف اہل توحید کی فتح و نصرت کی دشمنوں کی تباہی و بربادی کی نہیں۔

حاکم نے مستدرک (جلد ۳ صفحہ ۲۱) میں بہ روایت صحیحہ نقل کیا ہے کہ بدر کے قیدی جب گرفتار ہو کر آئے اور آپ نے ان کے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ طلب کیا اور مختلف صاحبوں نے مختلف رائیں پیش کیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کفار قریش اپنے انہی بھائیوں کی طرح ہیں جو ان سے پہلے تھے (یعنی گزشتہ انبیا کی امتوں میں) نوح علیہ السلام نے دعا کی کہ'' خداوند! زمین پر ان کافروں میں سے کوئی آباد گھر والا باقی نہ رکھ۔'' (۷۱/ نوح:۲۶۔۲۷) موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''ہمارے پروردگار! ان کی دولت کو مٹا دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے۔'' (۱۰/ یونس:۸۸) ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ''جس نے میری پیروی کی وہ مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو خدا غفور و رحیم ہے۔'' (۱۴/ ابراہیم:۳۶) عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''الٰہی اگر تو ان (نافرمانوں) پر عذاب بھیجے تو وہ تیرے بندے ہیں اگر تو ان کو معاف کر دے تو تو غالب اور دانا ہے۔''

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب الامداد بالملائکة فی غزوة بدر واباحة الغنائم: ٤٥٨٨۔

(۵/المآئدہ:۱۱۸) اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے قریش کو خطاب کر کے فرمایا کہ ”تم لوگ وہ قوم ہو جس میں فریب اور دغا سے قتل کر دینے کا رواج ہے تو تم میں سے کوئی زر فدیہ یا اپنا سر دیے بغیر لوٹ کر نہ جا سکے گا۔“

اس روایت سے ہمارے اصول مذکورہ کی حرف حرف تائید ہوتی ہے، یعنی یہ کہ

① بدر قریش کے لیے ویسا ہی عذاب ہلاکت کا دن تھا، جیسا گزشتہ قوموں پر ہلاکت کے لیے دن آیا کئے ہیں۔

② آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر دو قسم کے انبیا علیہم السلام کے نام اور ان کی دعاؤں کا ذکر فرمایا ہے، ایک وہ جنھوں نے سخت گیری کا پہلو اختیار کیا، مثلاً: حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السلام اور دوسرے وہ جنھوں نے نرمی کا اظہار کیا، مثلاً: حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام، آنحضرت ﷺ نے ان دونوں میں سے بیچ کی راہ اختیار کی۔

سحر اور معجزہ کا فرق اور ساحر اور پیغمبر میں امتیاز

گزشتہ صفحات میں انبیا علیہم السلام کے جو خصائص و امتیازات اور علامات و آثار بتائے گئے ہیں ان سے خود سحر و معجزہ کا فرق اور ساحر و پیغمبر کا امتیاز ظاہر ہوتا ہے، سحر و شعبدہ صرف دل لگی کے آنی تماشے ہوتے ہیں، لیکن معجزات و آیات قوموں اور جماعتوں کے صلاح و فساد و تعمیر و تخریب، ترقی اور تنزل کے اسباب و سامان ہوتے ہیں، ساحر کا مقصد کسی غیر معمولی واقعہ کا صرف حیرت انگیز طریقہ سے اظہار ہوتا ہے، تاکہ وہ دیکھنے والوں کو تھوڑی دیر کے لیے متحیر کر دے، لیکن پیغمبر کا مقصد اپنے ان حیرت انگیز اعمال سے دنیا کی اصلاح، قوموں کی دعوت، جماعتوں کی تہذیب اور دین الٰہی کی تقویت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا پیغمبر، بشیر، نذیر، مزکی، ہادی، سراج منیر اور شاہد عالم ہوتا ہے، ساحر ان تمام اوصاف سے خالی ہوتا ہے اور حیرت انگیز تماشا گری کے سوا اور کوئی ممتاز بات اس کے اندر نہیں ہوتی۔ قرآن مجید میں سحر کے متعلق جس قدر بیانات ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سحر کی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا اور تخیل اور نظر بندی سے زیادہ اس کو وقعت نہیں دیتا۔ ہاروت و ماروت کے قصہ میں سحر کے زور و قوت کا منتہا یہ بیان کیا ہے:

﴿ مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ۚ وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ ۚ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۰۲)

”سحر کا وہ فن سیکھتے ہیں جس سے خاوند اور اس کی بیوی میں تفریق کر دیتے ہیں اور یہ کسی کو حکم الٰہی کے بغیر نقصان نہیں پہنچا سکتے اور یہ وہ چیز سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان پہنچاتی ہے اور نفع نہیں پہنچاتی۔“

غرض سحر و جادو کوئی مؤثر حقیقی شے نہیں سورہ طٰہٰ میں نہایت تصریح کے ساتھ یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خیال سے زیادہ اس کی حقیقت نہیں:

﴿ حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۶۶)

''پھر ناگاہ مصر کے جادوگروں کی رسیاں لاٹھیاں اور ان کے جادو کے اثر سے موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں معلوم ہونے لگیں کہ وہ دوڑ رہی ہیں۔''

حکم ہوا کہ موسیٰ تم بھی اپنا عصائے اعجاز ڈال دو نتیجہ یہ ہوا کہ حق نے باطل پر فتح پائی:

﴿ قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنتَ الْأَعْلَىٰ ۝ وَأَلْقِ مَا فِي يَمِينِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوا ۖ إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدُ سَاحِرٍ ۖ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۶۸، ۶۹)

''ہم نے کہا، موسیٰ! ڈرو نہیں تم ہی سربلند رہو گے تمہارے داہنے ہاتھ میں جو ہے تم اس کو ڈال دو وہ ان کی صنعت کاری کو نگل جائے گا بے شک جادوگروں نے جو صنعت کی تھی وہ جادو کا فریب تھا اور جادوگر جدھر سے بھی آئے وہ فلاح نہیں پا سکتا۔''

ساحر اور نبی میں اللہ تعالیٰ نے جو فرق و امتیاز بتایا وہ یہی ہے کہ نبی فلاح پاتا ہے اور جادوگر فلاح نہیں پاتا، نبی کے تمام اعمال، مساعی، جدوجہد اور معجزات کا مرکز و محور فلاح اور خیر ہوتا ہے اور جادوگر کا مقصد صرف فریب، دھوکا اور شر ہوتا ہے، دوسری جگہ ایک اور آیت میں اسی مفہوم کو دہرایا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر کے جادوگروں سے کہتے ہیں:

﴿ مَا جِئْتُم بِهِ السِّحْرُ ۖ إِنَّ اللَّهَ سَيُبْطِلُهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ ۝ ﴾

(۱۰/ یونس:۸۱)

''جو تم لائے ہو وہ جادو ہے، اللہ اس کو باطل کر دے گا، بے شک اللہ شریروں کے کام کو نہیں سنوارتا۔''

یعنی وہ سحر و جادو ایک آنی تماشا ہوتا ہے اور اعجاز کا اثر دائمی ہوتا ہے اور اس کے نتائج دنیا میں نہایت عظیم الشان ہوتے ہیں، فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز کو دیکھ کر کہا کہ یہ سب جادو کے کرشمے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿ أَسِحْرٌ هَٰذَا وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ ۝ ﴾ (۱۰/ یونس:۷۷)

''کیا یہ جادو ہے اور جادو کرنے والے تو فلاح نہیں پاتے۔''

غرض ''فلاح'' اور ''عدم فلاح'' سحر اور اعجاز کے درمیان سب سے بڑا فرق ہے۔

کفار آنحضرت ﷺ کی نسبت کہتے تھے کہ یہ شیطان کی قوت سے یہ کلام پیش کرتے ہیں اور ان کے

کلام کا سرچشمہ شیطان کی تعلیم ہے، خدا نے اس کے جواب میں کہا کہ اس حقیقت کا امتیاز کہ اس کا منبع اور سرچشمہ خیر ہے یا شر اور یہ شیطان کی قوت کا نتیجہ ہے، یا ملکوتی طاقت اس کا مظہر ہے، نہایت آسان ہے اور خود مدعی کی زندگی اور اس کے اخلاق واعمال اس کے شاہد عدل ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قول کے مطابق درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے ان دونوں قوتوں کے درمیان تفریق کچھ زیادہ نہیں، خدا نے کہا ''ہم بتائیں شیطان کس پر اترتے ہیں؟''

﴿ تَنَزَّلُ عَلٰی كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِیْمٍۙ۝ یُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَؕ۝ ﴾

(۲٦/ الشعرآء: ۲۲۲، ۲۲۳)

''شیطان اترتے ہیں ہر جھوٹے گناہگار پر، لا ڈالتے ہیں وہ سنی بات اور بہت ان میں جھوٹے ہیں۔''

یعنی نبی اور متنبّی کا فرق خود اس کی اخلاقی زندگی ہے علاوہ ازیں افترا پرداز اور شریر کے کام کو مستقل اور دائمی زندگی عطا نہیں ہوتی:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَؕ۝ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ۪ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۝ ﴾

(۱٦/ النحل: ۱۱٦، ۱۱۷)

''جو لوگ کہ خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پاتے چندروزہ کامیابی اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

معجزات اور نشانات سے کن لوگوں کو ہدایت ملتی ہے

معجزات و دلائل، آیات اور آثار سے ہدایت کن لوگوں کو عطا ہوتی ہے، قرآن مجید نے ان کے اوصاف وشرائط بیان کیے ہیں:

① سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اس کو خدا پر ایمان ہو اگر اس کو سرے سے خدا پر ایمان نہیں تو اس کو معجزہ سے ہدایت نہیں مل سکتی، اس کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ پہلے کائنات کے اسرار و عجائب کو دیکھ کر ایک قادر مطلق ہستی کے وجود پر یقین کرے، اس کے بعد معجزات اور نشانیوں کے ذریعہ سے اس کو نبوت کے باب میں ہدایت نصیب ہوگی:

﴿ قُلِ انْظُرُوْا مَا ذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ١ؕ وَ مَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ۝ ﴾

(۱۰/ یونس: ۱۰۱)

''کہہ اے پیغمبر! کہ غور سے دیکھو کیا کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور کچھ کام نہیں آتیں نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کے جو ایمان نہیں رکھتے۔''

② دوسری چیز جو آیات اور نشانیوں سے عبرت پذیر نہیں ہونے دیتی وہ خودی اور تکبر ہے معاندین چونکہ عموماً دولت مند رؤسا اور مدعیان عقل وخرد ہوتے ہیں اس لیے ان کا جذبہ انانیت ان کو داعیان حق کے علم کے نیچے کھڑے ہونے سے باز رکھتا ہے، اس بنا پر آیات اور نشانیوں سے ہدایت پانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس جذبہ سے پاک ہوں معاندین نے ہمیشہ انبیا، کو کہا ﴿ اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ ۙ ﴾ (٥٤/ القمر: ٢٤) ''یہ پیغمبر تو ہماری طرح ایک آدمی ہے کیا ہم اس کی پس روی قبول کرلیں۔'' مصر کے بادشاہ اور سرداروں نے اسی جذبہ کی بنا پر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا اور ان کو گوناگوں معجزات دیکھنے کے بعد بھی ہدایت نہیں ملی:

﴿ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ۬ بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍۙ۝ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِیْنَۚ۝ فَقَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَۚ۝ ﴾

(٢٣/ المومنون: ٤٥ تا ٤٧)

''پھر ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور اس کے بھائی ہارون علیہ السلام کو نشانیاں اور کھلی قوت دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا تو انہوں نے غرور کیا اور وہ مغرور لوگ تھے تو انہوں نے کہا: کیا ہم اپنی ہی طرح کے آدمیوں پر ایمان لائیں درآنحالیکہ ان کی قوم ہماری رعایا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایسے منکروں اور خود پسندوں کی نسبت اپنا یہ فیصلہ سنا دیا:

﴿ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَكَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ یَّرَوْا كُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ ﴾ (٧/ الاعراف: ١٤٦)

''ہم ان لوگوں کو اپنی نشانیوں کے سمجھنے سے پھیر دیں گے جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں۔ اور اگر وہ تمام نشانیوں کو دیکھ بھی چکیں تب بھی ایمان نہ لائیں گے۔''

قریش کے معاندین جو اپنی قوم کے رؤسا، اکابر اور اہل دولت تھے وہ بھی ان نشانیوں سے اسی لیے ہدایت نہ پاسکے کہ ان کو ایک غریب ومفلس اور بے یار ومددگار انسان کی پیروی گوارا نہ تھی وہ کہتے تھے کہ اگر نبوت ہوتی تو مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی کو ملتی:

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ۝ ﴾

(٤٣/ الزخرف: ٣١)

''اور انہوں نے کہا کہ یہ قرآن طائف اور مکہ کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا۔''

سب سے آخری چیز جو ان آیات اور نشانیوں سے ہدایت پانے کی صلاحیت اور استعداد پیدا کرتی ہے وہ دل کا قبول حق کی طرف میلان ہے۔ بڑے سے بڑے خوارق اور عجیب سے عجیب معجزات ان لوگوں کے

نزدیک سحر و جادو سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے جن کے دل انابت اور رجوع الی الحق کی استعداد سے خالی ہیں:

﴿ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّنْ رَّبِّهِ ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ﴾ (۱۳/ الرعد:۲۷)

''اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر اس کے خدا کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری کہدے کہ خدا جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور اسی کو اپنی راہ دکھاتا ہے جو خدا کی طرف اپنے کو رجوع کرتا ہے۔''

اگر قبولیت اور اصلاح کی یہ استعداد نہ ہو تو بڑے سے بڑا معجزہ بھی باطل پرستی سے زیادہ نہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر گمراہی کے شقاوت کی مہر لگی ہوئی ہے۔

مشرک جو کسی مذہب حق کو نہیں مانتے اور علم سے بے بہرہ ہیں ان کا یہی حال ہے:

﴿ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِآيَةٍ لَّيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مُبْطِلُونَ ۝ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝ ﴾ (۳۰/ الروم:۵۸، ۵۹)

''اور (اے پیغمبر ﷺ)! اگر تو ان کے پاس کوئی نشانی لائے تو وہ جو منکر ہیں کہیں گے کہ تم فریبی ہو اسی طرح اللہ ان لوگوں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے جو علم نہیں رکھتے۔''

اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ پیغمبر اسلام ﷺ کی صداقت کے طلب ثبوت میں یہ کہتے ہیں کہ اس وقت تک ہم ان کو پیغمبر برحق تسلیم نہ کریں گے جب تک اسی قسم کے معجزے وہ نہ دکھائیں جیسے ان پیغمبروں نے لوگوں کو دکھائے تھے قرآن کہتا ہے کہ فرض کرو کہ صرف ان ہی جیسے معجزوں سے پیغمبری کی سچائی تسلیم کی جا سکتی ہے، تو ان پیغمبروں نے تو وہی معجزے دکھائے تھے پھر ان کو دیکھ کر ان کے زمانہ کے کل منکرین کیوں ایمان نہ لے آئے اور آخر تک وہ ان کو جادوگر ہی کیوں سمجھتے رہے:

﴿ فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا لَوْلَا أُوتِيَ مِثْلَ مَا أُوتِيَ مُوسَىٰ ۚ أَوَلَمْ يَكْفُرُوا بِمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ ۖ قَالُوا سِحْرَانِ تَظَاهَرَا وَقَالُوا إِنَّا بِكُلٍّ كَافِرُونَ ۝ ﴾

(۲۸/ القصص:۴۸)

''تو جب ہماری طرف سے سچائی ان کے پاس آئی تو انہوں نے کہا، کیوں نہیں (محمد ﷺ کو) ویسی ہی چیز دی گئی جیسی موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی، کیا موسیٰ کو جو چیز دی گئی تھی اس کا انکار منکرین پہلے نہیں کر چکے انہوں نے کہا کہ یہ جادوگر ہیں جو باہم ایک دوسرے کے مددگار ہیں ہم ان سب کے ماننے سے انکار کرتے ہیں۔''

صداقت کی نشانی صرف ہدایت ہے

قرآن مجید نے اس کے بعد ہی کہا کہ صداقت کی نشانی صرف ہدایت وراہنمائی ہے کہ مدعی جو پیغام اور جو احکام پیش کرتا ہے وہ انسانوں کو فلاح، نجات اور رشد کی طرف لے جاتے ہیں اور جو ان سے انکار کرتے ہیں وہ ظالم اور خود سر ہیں ان کو ہدایت کی سعادت نہیں ملتی:

﴿ قُلْ فَأْتُوا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ۭ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۝ ﴾ (۲۸/ القصص:۴۹، ۵۰)

''کہہ دے (اے پیغمبر ﷺ)! کہ اگر تورات اور قرآن دونوں جھوٹی کتابیں ہیں اور تم سچے ہوتو ہدایت میں ان سے بڑھ کر کوئی ایسی کتاب الٰہی لاؤ تو میں اس کی پیروی کروں تو اگر وہ تمہارے اعلان کے مطابق نہ کر دکھائیں تو جان لے کہ یہ صرف اپنی خواہش نفسانی کی پیروی کرتے ہیں اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو ہدایت الٰہی کو چھوڑ کر اپنی خواہش نفسانی کی پیروی کرتا ہے اللہ خود سر لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔''

آیات و دلائل نبوی ﷺ کی تفصیل

''معجزہ'' کے ہر پہلو پر کلی حیثیت سے بحث کرنے کے بعد اب موقع آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے تمام مافوق فہم بشری سوانح و واقعات کی تفصیل کی جائے، یہ سوانح و واقعات دو قسم کے ہیں، ایک وہ جو حقیقت میں لوازم نبوت ہیں اور کم وبیش ہر پیغمبر کو وہ ایک ہی طرح پیش آئے ہیں ہم نے ان کا نام ''خصائص النبوۃ'' رکھا ہے، دوسری قسم میں وہ جزئی واقعات داخل ہیں جو ہر پیغمبر سے اس کے حالات زمانہ کے مطابق مختلف صورتوں میں صادر ہوئے ہیں اور جن کو اصطلاح عام میں معجزات کہتے ہیں۔

ہم نے ان معجزات کو ان کے استناد اور ماخذ کی حیثیت سے تین مختلف ابواب میں منقسم کر دیا ہے پہلے میں وہ معجزانہ واقعات ہیں جو بنص صریح یا اشارۃً قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ دوسرا باب ان معجزات کا قرار دیا ہے جو صحیح اور مستند روایات سے ثابت ہیں اور تیسرے باب میں ان معجزات پر بحث کی ہے جن کو تو بعض محدثین اور ارباب سیر نے اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے مگر محدثانہ اصول کی بنا پر وہ تمام تر کمزور اور غیر مستند ہیں اس کے بعد کتب سابقہ کی وہ پیشین گوئیاں درج ہیں جو آنحضرت ﷺ کی آمد کے متعلق ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں اور سب سے آخر میں خصائص محمدی ﷺ کا باب ہے اس تفصیل کے مطابق آئندہ اوراق کی ترتیب حسب ذیل صورت ہوگی:

① خصائص النبوۃ۔
② وہ آیات و دلائل جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔
③ صحیح اور مستند روایتوں سے جو آیات و دلائل ثابت ہیں۔
④ غیر مستند روایتیں اور ان پر تنقید۔
⑤ کتبِ سابقہ کی بشارتیں۔
⑥ خصائص محمدی ﷺ۔

خصائص النبوۃ

دنیا میں ہر جنس اور نوع کی کچھ نہ کچھ خصوصیات ہوتی ہیں، جن سے وہ اپنے غیر سے ممتاز ہوتی ہیں، وہ خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جن سے اس جنس اور نوع کی کوئی فرد خالی نہیں ہوتی، اسی طرح نبوت کی بھی کچھ نہ کچھ خصوصیتیں ہیں جو اس کے لئے بمنزلہ لوازم حقیقت کے ہیں چنانچہ دنیا میں جس قدر پیغمبر کسی نہ کسی قوم اور کسی نہ کسی زمانہ میں آئے ہیں وہ ان خصوصیات سے ہمیشہ ممتاز ہوئے ہیں، مثلاً: یہ کہ خدا نے کسی نہ کسی طرح ان کو اپنے کلام وارشاد سے مفتخر اور اپنے احکام سے مطلع فرمایا ہے ان کے ادراک واحساس کی قوتوں کو اس قدر بلند کیا کہ عام انسانوں کو جو چیزیں نظر نہیں آتیں ان کو نظر آتی ہیں، عامہ بشر جن آوازوں کو نہیں سن سکتے وہ ان کو سنائی دی ہیں، ملائکہ الٰہی خدا کے قاصد بن کر ان کے پاس آئے ہیں صداقت کے لحاظ سے ان کے خواب و بیداری کا ایک ہی عالم رہا ہے کیونکہ گو ان کی آنکھیں سوتی ہیں لیکن ان کے دل نہیں سوتے [1] اور ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں میں سے کوئی نہ کوئی نشانی بھی عطا فرمائی ہے۔ [2]

آنحضرت ﷺ چونکہ افضل الرسل اور خاتم النبیین تھے اس لئے ان خصوصیات میں سے ہر خصوصیت کا وافر حصہ آپ کو عنایت ہوا تھا اسی لئے مکالمۂ الٰہی، نزول ملائکہ، مشاہدۂ خواب و بیداری وغیرہ خصائص نبوت کے واقعات آپ کی سیرت میں دوسرے انبیا علیہم السلام کی سیرتوں سے بیشتر اور کامل تر نظر آتے ہیں [3] چنانچہ قرآن مجید میں ان کے اشارات اور احادیث صحیحہ میں ان کی تفصیلات مذکور ہیں مختلف انبیا علیہم السلام میں ان خصائص کا کم وبیش ہونا بھی قرآن مجید کا فیصلہ ہے:

﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۵۳)

''ان پیغمبروں میں سے بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت بخشی ہے ان میں سے بعض سے خدا نے باتیں کی، بعضوں کے رتبے بلند کئے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو ہم نے کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس کے ذریعہ سے اس کی تائید کی۔''

دیکھئے مکالمۂ الٰہی، رفع درجات، عطائے نشان، تائید بروح القدس، یہ چاروں باتیں ایسی ہیں جن سے خدا کا کوئی فرستادہ محروم نہ تھا، تاہم چونکہ ان میں سے ہر چیز تمام پیغمبروں میں یکساں نہ تھی بلکہ بعض کو ان میں سے کسی چیز کا حصہ وافر دیا گیا تھا اور بعض کو کوئی دوسری چیز زیادہ ملی تھی اس لئے ہر پیغمبر کی طرف اس خاص چیز کی نسبت مخصوص طور سے کی گئی ہے، جس کا ان کی قسمت میں بڑا حصہ آیا تھا، اس سے یہ مقصود نہیں کہ نبوت

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب، کان النبی ﷺ تنام عینه......: ۳۵۷۰ وکتاب التوحید، باب وکلم اللّٰه موسی تکلیما: ۷۵۱۷۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الاعتصام: ۷۲۷٤۔

[3] کما قیل حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضاء داری ۔ آنچه خوبان ہمه دارند تو تنہا داری۔

کے ان خصائص سے کوئی پیغمبر محروم بھی تھا۔

ان خصائص میں سے اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ زور وحی اور نزول ملائکہ پر دیا ہے ہر جگہ رسول اور نبی کی گویا تعریف ہی یہی کی ہے کہ ایک ایسا انسان جس کو خدا نے اپنی پیغمبری کے لئے منتخب کیا ہو اور اس پر اپنی وحی نازل کی ہو چنانچہ سورۂ نحل اور سورۂ انبیاء میں تمام پیغمبروں کا مشترک وصف یہ بتایا ہے:

﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْۤ اِلَیْهِمْ ﴾ (۱۲/ یوسف:۱۰۹)

''اور ہم نے اپنا قاصد بنا کر تم سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں بھیجا لیکن وہ انسان تھے جن کی طرف ہم نے اپنی وحی بھیجی۔''

نزول ملائکہ کی نسبت بھی خدا نے یہ فرمایا: ''وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے فرشتوں کو اس لئے اتارتا ہے، تاکہ وہ اس کی بات کو ان تک پہنچا دیں۔''

﴿ یُنَزِّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ ﴾ (۱٦/ النحل:۲)

'' خدا اپنی بات کی روح دے کر اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے فرشتوں کو نازل کرتا ہے۔''

ان کے علاوہ رؤیت و مشاہدۂ غیب اور سیر ملکوت کے احوال و مشاہدہ کا بھی اکثر انبیا علیہم السلام کے سوانح زندگی میں ان کے درجوں اور رتبوں کے مطابق پیش آنا، اسفار و کتب الٰہی سے ثابت ہے جیسا کہ آئندہ اوراق کے مطالعہ سے ناظرین پر روشن ہوگا۔

مکالمۂ الٰہی

﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ ﴾ (٤٢/ الشورٰی:٥١)

پیغمبروں کی خصوصیات میں سے سب سے بڑی خصوصیت مکالمہ الٰہی ہے۔قرآن مجید میں بار بار پیغمبروں کے ساتھ مخاطبہ ربانی اور مکالمۂ الٰہی کی تصریح ہے اور مجموعۂ توراۃ میں ہر پیغمبر کے متعلق اس کی شہادتیں موجود ہیں۔خدا انبیا سے کلام کیونکر کرتا ہے؟ قرآن مجید کی ایک آیت میں اس کی حسب ذیل تصریح ہے:

﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ ﴾ (٤٢/ الشورٰی:٥١)

''اور کسی بشر کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے دوبدو کلام کرے لیکن وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی آڑ سے یا یہ کہ وہ کسی قاصد کو بھیجے جو اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے پہنچا دیتا ہے، بے شک وہ علی وحکیم ہے۔''

اس آیت میں مکالمۂ الٰہی کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں کلام بالوحی، کلام پس پردہ اور کلام بذریعہ قاصد وفرشتہ، ان ہر سہ اقسام میں سے ہر پیغمبر کو کسی نہ کسی طریقۂ کلام سے مشرف کیا گیا ہے، بعض پیغمبروں کو خصوصیت کے ساتھ کلام پس پردہ کے شرف سے ممتاز کیا گیا ہے اسی لئے ان کے فضائل میں تکلم الٰہی کی فضیلت کو مستقل حیثیت دی گئی ہے، مثلاً: حضرت موسیٰ علیہ السلام کہ ان کی شان میں:

﴿ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝ ﴾ (٤/ النساء:١٦٤)

''اور خدا نے موسیٰ (علیہ السلام) سے باتیں کیں۔''

کی تصریح ہے، ان کو وادی سینا کے ایک درخت سے خدا کی آواز سنائی دی، سورۂ بقرہ میں اس خاص طریقۂ کلام کے دائرہ کو اور بھی وسعت دی گئی ہے چنانچہ پیغمبروں کے وصف میں خدا نے فرمایا:

﴿ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ ﴾ (٢/ البقرہ:٢٥٣)

''ان پیغمبروں میں سے بعض سے خدا نے باتیں کیں۔''

اس آیت کریمہ میں یہ تصریح نہیں کہ کن پیغمبروں کو خدا تعالیٰ نے اس مخصوص طریقۂ کلام سے مشرف کیا اس لئے اس شرف خاص میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دوسرے انبیا علیہم السلام بھی شریک ہو سکتے ہیں۔آنحضرت ﷺ کو مکالمۂ الٰہی کے تینوں مذکورۂ بالا طریقوں سے خدا کی ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا ہے، بلکہ واقعہ معراج میں وہ مرتبہ بھی پیش آیا ہے جہاں حبیب ومحبوب کے درمیان قاصد و پیامبر سرے سے بیگانہ تھے، جہاں زمان ومکان اور جلوہ ونگاہ کی شرکت بھی مخل تنہائی تھی، جہاں نہ کوہ سینا تھا، نہ برق طور دشت یمن تھا، نہ نخل وادی صوت سرمدی سامعہ نواز تھی اور حقیقتِ محمدی ﷺ گوشِ سامع ﴿ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ۝ ﴾ (٥٣/ النجم:١٠)

''پھر اس نے اپنے بندہ سے چپ چاپ باتیں کیں۔جو باتیں کیں۔''

وحی

﴿ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ ﴾ (۵۳/ النجم: ۳، ٤)

گو مکالمۂ الٰہی کی متعدد صورتیں ہیں جن میں سے ایک وحی بھی ہے، لیکن اسلام کے محاورہ میں وحی کا مفہوم اس قدر وسیع کر دیا گیا ہے کہ مکالمۂ الٰہی کی تمام صورتیں اس کے تحت میں داخل ہوگئی ہیں وحی کے معنی لغت میں حسب ذیل ہیں:

الوحی الاشارة والکتابة والرسالة والالهام والکلام الخفی وکل ما القیته الی غیرك۔ ❶

''وحی کے معنی اشارہ کرنا، لکھنا، پیغام دینا، دل میں ڈالنا، چھپا کر بولنا اور جو کچھ تم دوسرے کے خیال میں ڈالو۔''

لکھنا، عجاج کا شعر ہے:

حتی نحاهم جدنا والناحی لقدر کان وحاه الواحی ❷

خط اور کتاب، لبید کہتے ہیں:

فمدافع الریان عری رسمها خلقا کما ضمن الوحی سلامها ❸

''توریان پہاڑ کے نالوں کے آثار پرانے ہو کر ایسے دھندلے ہوگئے، جیسے پتھر میں لکھی ہوئی عبارت۔''

حکم دینا، عجاج کہتا ہے:

وحی لها القرار فاستقرت وشدها بالراسیات الثبت ❹

''زمین کو ٹھہرنے کا حکم دیا تو وہ ٹھہر گئی اور اسے جمے ہوئے پہاڑوں سے جکڑ دیا۔''

چھپا کر بات کرنا، ابوذویب کا شعر ہے:

فقال لها وقد اوحت الیه الا للّٰه أمّك ما تعیف ❺

''اس مرد نے کہا جب عورت نے اس سے پوشیدہ طریقہ پر گفتگو کی کہ تیری ماں کا کیا کہنا وہ کیا فال بدلتی ہے۔''

اشارہ کرنا: یوحی الیها بانقاض ونقنقة ❻

''وہ مرغ اس مرغی کی طرف کڑکڑا کر اشارہ کرتا ہے۔''

آواز: ابوزبید مرتجز الجوف بوحي اعجم ❼

❶ لسان العرب، ج۳، ص: ۸۹۲ بیروت۔ ❷ ایضًا۔ ❸ سبع المعلقات کا شعر ہے دیکھئے دیوان لبید بن ربیعة عامری۔ ❹ لسان العرب حواله مندرجه بالا۔ ❺ ایضًا۔
❻ علقمہ کا شعر ہے لسان العرب حواله مندرجه بالا۔ ❼ ایضًا۔

''گھوڑے کے پیٹ سے نہ سمجھنے والی آواز آتی ہے۔''

لیکن اہل لغت کہتے ہیں کہ اس لفظ کے اصلی معنی ''دوسروں سے چھپا کر کسی سے چپکے چپکے بات کرنے کے ہیں۔'' کسائی عرب کا محاورہ بتاتا ہے کہ ''وحیت الیه بالکلام واوحیه الیه هو ان تکلمه بکلام تخفیه من غیره۔'' ❶ ''یعنی کسی سے اس طرح باتیں کرو کہ اس کو دوسروں سے چھپاؤ۔'' ابواسحاق لغوی کہتا ہے: واصل الوحی فی اللغة کلها اعلام فی خفاء۔ ❷ ''وحی کا اصل مفہوم اس کے تمام معنوں میں چھپا کر اطلاع دینے کے ہیں۔''

قرآن مجید میں یہ لفظ اپنے اصل مفہوم کے اندر تین معنوں میں آیا ہے:

① فطری حکم:

﴿ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ ﴾ (١٦/ النحل:٦٨)

''تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو وحی کیا۔''

﴿ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ﴾ (٩٩/ الزلزال:٥)

''اس لئے کہ تیرے پروردگار نے ''زمین'' کو وحی کیا۔''

عجاج کے اس شعر میں بھی یہی معنی ہیں:

وحی لها القرار فاستقرت   وشدها بالراسیات الثبت

''خدا نے زمین کو ساکن رہنے کی ''وحی'' کی تو وہ ساکن ہے اور اس کو مضبوط پہاڑوں سے باندھ دیا ہے۔''

② دل میں بات ڈال دینا:

﴿ وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَى الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ ﴾ (٥/ المائدہ:١١١)

''اور جب میں نے حواریوں کو ''وحی'' کیا کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ۔''

﴿ وَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِیْهِ ﴾ (٢٨/ القصص:٧)

''اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو ''وحی'' کیا کہ اس بچہ کو دودھ پلاؤ۔''

③ چپکے سے بات کرنا:

﴿ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ ﴾ (٦/ الانعام:١١٢)

''یہ ایک دوسرے کی چکنی چپڑی بات ''وحی'' کرتے ہیں۔''

﴿ وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِیٰٓـئِهِمْ ﴾ (٦/ الانعام:١٢١)

''اور یہ شیطان لوگ اپنے دوستوں کو ''وحی'' کرتے ہیں۔''

---

❶ لسان العرب، ج٣، ص:٨٩٢۔ ❷ ایضا، ص:٨٩٢۔

وحی کے ان متفرق معنوں میں ایک مفہوم مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ''منہ سے لفظ نکالے بغیر ایک شخص کا دوسرے شخص کو اپنا مفہوم سمجھا دینا'' یا اگر الفاظ ہوں تو وہ اس قدر پوشیدہ ادا ہوں کہ دوسرے ان کو نہ سن سکیں''۔ اس لئے اشارہ کرنا، لکھنا، دل میں ڈال دینا، حکم فطری، خط اور کتابت اور جانوروں کا اپنے حرکات سے اپنا مطلب ظاہر کرنا سب اس کے معنوں میں داخل ہیں۔ بہرحال اس تفصیل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وحی کا لفظ جس مذہبی معنی میں مستعمل ہے وہ درحقیقت لغوی معنی کے بہت قریب ہے، چنانچہ خود شعرائے جاہلیت نے اس کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے مکالمۂ الٰہی اور وحی کا آغاز رؤیا اور خواب سے ہوا۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

اول مابدی به رسول اللهﷺ من الوحی الرؤیا الصالحة فی النوم فکان لایری رؤیا الاجاءَ تُ مثل فلق الصبح۔ ❶

''آنحضرت ﷺ کے ساتھ وحی کا آغاز اچھے خواب سے ہوا آپ ﷺ جو خواب دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح ظاہر ہوتا تھا۔''

صحیح بخاری کے پہلے ہی باب میں حدیث ہے کہ ایک صحابی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپ ﷺ پر وحی کیونکر آتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

((احیانا یأتینی مثل صلصلة الجرس وهو اشده عَلی فیفصم عَنِّی وقد وعیت عنه ما قال واحیاناً یتمثل لی الملك رجلا فیکلمنی فاعی مایقول)) ❷

''کبھی گھنٹی کی آواز کی طرح میرے پاس آتی ہے اور یہ مجھ پر زیادہ سخت ہوتی ہے اور پھر یہ حالت دور ہو جاتی ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے میں اس کو محفوظ کر لیتا ہوں اور کبھی وہ فرشتہ (جبریل) میرے لئے انسان کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور وہ مجھ سے باتیں کرتا ہے اور جو وہ کہتا ہے اس کو میں محفوظ کر لیتا ہوں۔''

صلصلة الجرس یعنی ''گھنٹہ کی آواز کی طرح آواز کا ہونا'' اس کی تشریح متکلمین اور ارباب باطن نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے لیکن ہم اس کا صاف اور صریح مطلب وہ سمجھتے ہیں جو عوام ہاتف غیب یا منادی غیب کے لفظ سے سمجھتے ہیں یعنی یہ کہ آواز سنائی دے لیکن کوئی صورت نظر نہ آئے، بانگ جرس کے ساتھ اس کی تشبیہ محض اس بات میں ہے کہ جس طرح دور سے جرس کی آواز سنائی دیتی ہے اور اس کے متعینہ اشاروں سے انسان کچھ سمجھ سکتا ہے حالانکہ جرس یا اس کے بجانے والے کی شکل آنکھوں سے اوجھل یا بہت دور ہوتی ہے، اسی طرح پیغمبر کبھی دور سے منادی غیب کی آواز سنتا ہے لیکن کوئی مجسم شکل اس کے سامنے نہیں ہوتی، اسی کے بالمقابل آپ ﷺ نے وحی کی دوسری صورت بیان فرمائی کہ بولنے والا فرشتہ مجسم ہو کر سامنے

❶ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی:۳؛ مسلم، کتاب الایمان: ۴۰۳۔

❷ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی:۲۔

آتا ہے اور وہ باتیں کرتا ہے۔

حدیثوں میں طریقۂ وحی کی اور صورت بھی آئی ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((ان روح القدس نفث فی روعی)) ❶

''روح القدس نے میرے دل میں پھونکا۔''

اور کہیں یہ صیغہ مجہول کے ساتھ آیا ہے:

نفث فی روعی ❷ ''میرے دل میں پھونکا گیا۔''

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ان ہی حدیثوں کو پیش نظر رکھ کر وحی کی حسب ذیل قسمیں قرار دی ہیں:

① رؤیائے صادقہ، سچ خواب دیکھنا۔

② نفث فی الروع یا القائی القلب، دل میں پھونکنا، یا دل میں ڈالنا۔

③ صلصلۃ الجرس، گھنٹہ کی طرح آواز آنا۔

④ تمثل فرشتہ کی کسی شکل میں متشکل ہو کر نظر آنا۔

⑤ فرشتہ کا اپنی اصلی صورت میں نمودار ہونا۔

⑥ وہ طریق مکالمہ جو معراج میں پیش آیا۔

⑦ بلا واسطہ مکالمہ۔ ❸

صحیح بخاری، بدء الوحی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیسری صورت مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے اور پھر وہ شدت جاتی رہتی ہے۔'' آپ پر وحی آتی تھی تو آپ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ''وحی اترنے کی حالت میں میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی تھی تو سخت سردی کے دنوں میں بھی جبینِ مبارک عرق آلودہ ہو جاتی تھی۔'' ❹ ایک اور موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ ''وحی کی حالت میں آپ کی پیشانی سے موتیوں کی طرح پسینے کے قطرے ڈھلکنے لگتے۔'' ❺ صحابہ رضی اللہ عنہم کا بیان ہے کہ اس حالت میں جسم مبارک بہت بھاری ہو جاتا تھا سواری کے اونٹ بیٹھ جاتے تھے۔ ❻ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ ﷺ پر وحی آئی اور میرا پاؤں زانوئے مبارک کے نیچے دبا تھا مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا پاؤں بوجھ سے ٹوٹ جائے گا۔ ❼ یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ

---

❶ النهاية فی غريب الحديث والأثر، ج٢، ص: ١١١، مصر۔ ❷ شعب الايمان: ١١٨٥؛ مصنف عبدالرزاق، باب القدر، ١١/ ١٢٥؛ ابن ابی شيبه، كتاب الزهد، ١٩/ ٦٩ طبع جديد بيروت؛ مسند الشهاب: ١١٥١؛ شرح السنه بغوی، باب التوكل على الله، ٧/ ٢٤٤۔ ❸ زاد المعاد، ج١، ص: ١٨، ١٩۔

❹ بخاری، كتاب بدء الوحی: ٢۔ ❺ بخاری، كتاب المغازی، حديث الافك: ٤١٤١۔

❻ مسند احمد، ج ٦، ص: ١١٨ ومستدرك حاكم، كتاب التفسير، سورة المزمل، ج ٢، ص: ٥٠٥۔

❼ صحيح بخاری، كتاب التفسير، سورة النساء، باب: لا يستوى القاعدون من المؤمنين: ٤٥٩٢ وجامع ترمذی، ابواب تفسير القرآن، تفسير باب ومن سورة النساء: ٣٠٣٣۔

ایک صحابی تھے ان کو بڑا شوق تھا کہ ایک دفعہ نزول وحی کے عالم میں وہ آپ کی زیارت کرتے، اتفاق سے حج کے سفر میں ان کو یہ سعادت نصیب ہوگئی وہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آپ کا چہرہ سرخ ہوگیا ہے اور آپ خراٹے لے رہے ہیں تھوڑی دیر میں یہ حالت رفع ہوگئی۔ ❶ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کو بے چینی ہوتی، چہرہ کا رنگ بدل جاتا، آپ سر جھکا لیتے، صحابہ جو آپ کے ساتھ بیٹھے ہوتے وہ بھی سر نیچے کر لیتے وحی کے بعد آپ سر اٹھاتے۔ ❷

فرشتہ کی زبانی سب سے پہلی وحی غار حرا میں آئی اس وقت عمر شریف چالیس برس کی تھی اور ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ﴾ (۹۶/ العلق:۱) کی ابتدائی آیتیں اس مکتب کا اولین درس تھا، اس کے بعد کچھ دنوں تک وحی کا سلسلہ رکا رہا آپ کو سخت صدمہ ہوا، ابن اسحاق کی روایت ہے کہ اس موقع پر یہ آیتیں نازل ہوئی۔ ❸

﴿ وَالضُّحٰى ۙ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۭ ﴾ (۹۳/ الضحی:۱ تا ۳)

''قسم ہے دن کی جب کہ وہ پوری روشنی پر ہو اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ سنسان ہو جائے کہ تیرے پروردگار نے نہ تجھ کو چھوڑا ہے اور نہ تجھ سے اس نے اپنی محبت اٹھائی۔''

لیکن صحیح بخاری تفسیر سورۂ والضحیٰ اور باب کیف نزل الوحی میں ہے کہ اس سورہ کا شان نزول یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ بیمار تھے چند روز راتوں میں اٹھ کر عبادت الٰہی میں مصروف نہ ہو سکے تو ایک ہمسایہ عورت نے طعن سے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ دو تین روز سے تیرے پاس نہیں آیا۔ اس پر یہ سورہ نازل ہوئی۔ ❹ اسی موقع پر دوسری روایت ہے کہ اس عورت نے کہا میں دیکھتی ہوں کہ تمہارے رفیق نے تم سے ملنے میں تاخیر کی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورہ اس کے بعد کسی اور زمانہ میں نازل ہوئی۔ ❺

تمام محدثین ❻ کا اس پر اتفاق ہے کہ فترۃ الوحی یعنی سلسلہ وحی کے رک جانے (فترۃ) کے بعد سب سے پہلے سورۂ مدثر کی آیتیں نازل ہوئیں، آپ ﷺ حرا سے واپس آ رہے تھے کہ راہ میں ایک آواز سنائی دی آپ نے ادھر اُدھر دیکھا کچھ نظر نہ آیا، اوپر دیکھا تو وہی فرشتہ نظر آیا، آپ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے تو کہا کہ مجھے کمل اوڑھاؤ اور مجھ پر ٹھنڈا پانی ڈالو، اسی حالت میں یہ آیتیں نازل ہوئیں:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۽ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۽ ﴾ (۷٤/ المدثر:۱ تا ۳)

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب غسل الخلوق ثلاث مرات من الثیاب:۱۵۳۶، کتاب فضائل القرآن: ٤۹۸۵۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب عرق النبی ﷺ: ٦۰٦۱۔

❸ سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۱۵٤۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الضحی: ٤۹۵۰۔ ❺ ایضا:٤۹۵۱۔ ❻ اس کے برخلاف صرف حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے (بخاری، کتاب بدء الوحی: باب کیف نزول الوحی:٤ نیز دیکھیں کتاب التفسیر، سورۃ المدثر: ٤۲٤) کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے سنا کہ سب سے پہلی وحی میں سورۂ مدثر کی یہ آیتیں نازل ہوئیں مگر اجماع عام یہ ہے کہ یہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا وہم ہے وہ آیتیں فترۃ وحی کے بعد سب سے پہلے اتریں۔

''اے گلیم پوش! اٹھ اور لوگوں کو خدا سے ڈرا اپنے رب کی کبریائی بیان کر۔''

اس کے بعد مسلسل وحی نازل ہونی شروع ہوگئی ❶ اور اس کا تار اس وقت تک نہ ٹوٹا جب تک حیات طیبہ کا ظاہری سلسلہ منقطع نہ ہوگیا، یعنی چالیس برس کے سن سے لے کر تریسٹھ کے سن تک کل ۲۳ برس نزول وحی کے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کی آخر عمر میں وحی کی کثرت ہوگئی تھی۔ ❷ محدثین نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ چونکہ مسلمانوں کی کثرت ہوگئی تھی۔ اطراف ملک سے وفود کا سلسلہ جاری ہوگیا تھا، احکام اور لوگوں کے استفسارات بڑھ گئے تھے، اس لئے مخاطبۂ الٰہی کی ترقی بھی اس کے ساتھ ضروری تھی۔

''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وفات نبوی ﷺ کے بعد جب ان ایام سعادت کو یاد کرتے تھے جب مدینہ کی گلیاں روح الامین کی گزرگاہ اور مدینہ کے در و دیوار وحی کے مطلع انوار تھے تو ان کی آنکھیں اشک آلودہ ہو جاتی تھیں، آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ جمعہ کی نماز کے بعد ایک بوڑھی صحابیہ رضی اللہ عنہا تھیں ان کی ملاقات کو تشریف لے جاتے تھے، آپ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ان کے گھر تشریف لے گئے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں سبب دریافت کیا تو کہا آہ! کہ آنحضرت ﷺ وفات پا گئے اور وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا، یہ سن کر ان صاحبوں کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ ❸

قرآن مجید نے وحی کی حقیقت کو اس قدر بلند کیا ہے کہ وہ نبوت کے مترادف ہوگئی ہے۔ دنیا کے دوسرے مذاہب میں نبوت کی حقیقت یا تو سراسر مفقود ہے اور یا یہ کہ اس کو انسانیت و بشریت کے پرتو سے اس قدر منزہ سمجھا ہے کہ اس کو الوہیت کا ہم رتبہ قرار دے دیا ہے، لیکن قرآن مجید نے آنحضرت ﷺ کو کئی دفعہ اس اعلان کی تاکید کی ہے کہ

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾

(۱۸/ الکھف: ۱۱۰، ۴۱/ فصلت: ۶)

''کہہ دو کہ میں تمہاری ہی طرح ایک آدمی ہوں (فرق یہ ہے) کہ میرے پاس وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک ہے۔''

آنحضرت ﷺ جو کچھ خدا کی طرف سے لوگوں کو سناتے تھے، وہ چیز آپ کے نفس و ارادہ سے نہیں اٹھتی تھی بلکہ خدا کی طرف سے ان کے اندر آتی تھی:

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ ﴾ (۵۳/ النجم: ۳، ۴)

''وہ خواہش نفس سے نہیں بولتا بلکہ وہ وحی ہے جو اس کو بھیجی جاتی ہے۔''

البتہ اس کا مواد اور مہبط آپ ﷺ کا پاک و منزہ قلب تھا:

---

❶ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی: ٤ وکتاب التفسیر: ٤٩٢٢۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب کیف نزل الوحی: ٤٩٨٢۔ ❸ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل ام ایمن: ٦٣١٨۔

﴿ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۹۷)

''اسی نے اس کو تمہارے قلب پر خدا کے حکم سے اتارا ہے۔''

﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۙ عَلٰى قَلْبِكَ ﴾ (۲٦/ الشعرآء:۱۹۳، ۱۹٤)

''روح الامین نے اس کو تیرے قلب پر اتارا ہے۔''

اور یہی مجموعہ وحی آپ ﷺ کی نبوت کا بڑا معجزہ ہے ارشاد ہوا کہ ''دنیا میں کوئی پیغمبر نہیں آیا لیکن اس کو ایسی چیزیں دی گئی جس کو دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لائے لیکن مجھے جو چیز دی گئی وہ وحی ہے جو مجھ پر اتاری گئی۔'' ❶

سرمایۂ وحی کی جو دولت اسلام کے ہاتھ آئی وہ قرآن کی صورت میں مسلمانوں کے سینوں اور سفینوں میں اب تک محفوظ ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ گنج گراں مایہ حدیث صحیحہ کے اوراق میں مخزون ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مجھے قرآن عطا کیا گیا، اور اتنا ہی اور۔'' ❷ یعنی وہ احکام و مواعظ جن کو جان نثاروں نے حرز جان بنا کر رکھا اور دوسروں کو سپرد کیا۔ یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ صحابی حجۃ الوداع کے زمانے کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جعرانہ میں آپ ﷺ تھے کہ ایک شخص نے آ کر سوال کیا کہ یا رسول اللہ! آپ ﷺ اس شخص کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں، جس نے کپڑوں میں خوشبو مل لینے کے بعد احرام کی نیت کی، آنحضرت نے کسی قدر انتظار کیا، آپ پر وحی کی کیفیت طاری ہوئی جب وہ کیفیت زائل ہوئی تو آپ نے دریافت کیا کہ وہ آدمی کہاں گیا؟ لوگ اس کو سامنے لائے آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو خوشبو تم مل چکے ہو اس کو تین دفعہ دھوڈالو اور اس کپڑے کو اتار ڈالو پھر حسب معمول عمرہ ادا کرو۔'' ❸

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''روح القدس نے میرے دل میں یہ ڈالا ہے کہ کوئی انسان اس وقت تک نہیں مر سکتا جب تک وہ اپنی روزی پوری نہ کرے، تو لوگو! خدا سے ڈرو اور روزی کی تلاش میں صحیح طریقہ کو کام میں لاؤ رزق میں تاخیر تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ گناہ کے ذریعوں سے روزی تلاش کرو، کیونکہ جو خدا کے پاس ہے وہ اس کی بندگی ہی سے مل سکتا ہے۔'' ❹ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ سے جبریل علیہ السلام نے کہا کہ آپ کی امت میں جو شخص اس حال میں مرا کہ اس نے کسی کو خدا کا شریک نہیں کیا تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔'' ❺

اور بہت سی حدیثیں ہیں جن میں یہ تصریح ہے کہ ''خدا نے مجھے حکم دیا ہے'' یا ''خدا نے مجھ سے یہ کہا۔''

---

❶ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب کیف نزل الوحی:٤٩٨١ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وجوب الایمان برسالة...... ۳۸۵۔ ❷ ابوداود، کتاب السنة، باب فی لزوم السنة:٤٦٠٤۔

❸ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب نزل القرآن بلسان قریش والعرب:٤٩٨٥۔

❹ مستدرك حاكم، ج٢، ص:٤ حیدر آباد۔

❺ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب ومن کان آخر کلامه لا اله الا الله: ١٢٣٧۔

لیکن وہ قرآن مجید کے اجزا نہیں ہیں، اسی لئے فقہا نے وحی کی دو قسمیں کر دی ہیں، وحی متلو یعنی وہ وحی جو تلاوت کی جاتی ہے یعنی قرآن اور وحی غیر متلو جو تلاوت نہیں کی جاتی مثلاً: وہ احکام و نصائح جو بہ روایت صحیح احادیث میں مذکور ہیں، پہلی وحی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک ایک حرف تواتر روایت سے ثابت ہے اور وہ اپنے لفظ و معنی دونوں کے لحاظ سے خدا کا کلام ہے۔ دوسری قسم تواتر سے بہت کم مروی ہے اور وہ اپنے الفاظ کے لحاظ سے خدا کا کلام نہیں بلکہ اپنے معنی کے لحاظ سے خدا کا ارشاد ہے۔

نزول ملائکہ

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا ﴾ (۲۲/ الحج:۷۵)

لفظ "ملائکہ" کا واحد "ملاك" ہے جو عربی کے قاعدہ سے "ملك" ہوگیا ہے یہ الوکۃ سے مشتق ہے، جس کے معنی "پیغام" کے ہیں اس لئے ملائکہ کے معنی پیغام رساں اور قاصد کے ہیں۔

ملائکہ الٰہی خالق اور مخلوق کے درمیان قاصد ہیں۔ قرآن مجید نے متعدد مقام پر ان کو رسل اور رسل اللہ یعنی قاصدان الٰہی کہا ہے:

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا ﴾ (۲۲/ الحج:۷۵)

"خدا فرشتوں میں سے اپنے پیغامبر منتخب کرتا ہے۔"

علاوہ ازیں یہ خدا کے حکم سے عالم کی مشین کے پرزوں کو ہلاتے اور چلاتے ہیں اور اسی لئے خدا نے ان کو مدبراتِ امر کے نام سے بھی یاد کیا ہے (سورۂ والنازعات) ان کی مخصوص صفت یہ ہے کہ خدا کے سراپا مطیع ہیں اور اس کے کسی امر یا اشارہ سے کبھی روگردانی نہیں کرتے:

﴿ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ ﴾

(۶۶/ التحریم:۶)

"اس پر سخت اور مضبوط فرشتے ہیں اللہ ان کو جو حکم دیتا ہے وہ اس سے روگردانی نہیں کر سکتے اور وہ وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔"

انبیا علیہم السلام کی تمام سیرتیں، فرشتوں کی آمد، ان کی بشارت اور نصرت سے معمور ہیں، تورات اور انجیل و قرآن ہر کتاب الٰہی ان کے کارناموں کی شاہد ہے، حضرت آدم علیہ السلام کی بارگاہ میں انہوں نے سجدہ کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمان خانہ میں یہ بھیجے گئے، حضرت لوط علیہ السلام کی حفاظت اور ان کی قوم کی بربادی پر یہ مامور ہوئے، حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو بیابان میں یہ نظر آئے، حضرت یعقوب علیہ السلام کے خیمہ میں ان کا دنگل ہوا، حضرت ایوب علیہ السلام کے مناظرۂ جبر و اختیار میں حکم یہ قرار پائے، حضرت زکریا اور مریم علیہما السلام کو بشارت انہوں نے دی، آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں بھی یہ مختلف فرائض پر مامور ہوئے، یہ آپ کی خدمت میں احکام الٰہی کے قاصد تھے، دشمنوں سے وجود اقدس ﷺ کی محافظت ان کے سپرد تھی، کمزور اور ناتواں مسلمانوں کی دستگیری ان کا فرض تھا۔ ملائکہ کے سرخیل جبرئیل علیہ السلام ہیں اور وہی خدا اور پیغمبروں کے درمیان سفارت پر مامور ہیں اور یہی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھی آ کر سفارت کا فرض انجام دیتے تھے اور خدا کا پیغام پہنچاتے تھے۔

نزولِ جبریل

''جبریل'' عبرانی لفظ ہے جس کے لغوی معنی ''مردخدا'' کے ہیں لیکن یہ اصطلاح شریعت میں اس فرشتہ کا نام ہے جو خدا اور خاصان خدا کے درمیان پیامبری کی خدمت انجام دیتا ہے توراۃ اور انجیل میں بھی یہ نام اسی حیثیت سے مستعمل ہوا ہے، چنانچہ دانیال (۸۔۱۶۔۱۹۔۲۱) میں اس کی پیامبری کا بیان ہے اسی طرح انجیل (لوقا ۱۔۱۹۔۲۶) میں مذکور ہے کہ وہ حضرت زکریا علیہ السلام کے پاس حضرت یحییٰ علیہ السلام کی بشارت اور حضرت مریم علیہا السلام کے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت لے کر آیا تھا۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ وہ پیامبر جو آنحضرت ﷺ اور خدا کے درمیان وحی کا ایلچی تھا وہ یہی جبریل تھا:

﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۹۷)

''جو جبریل کا دشمن ہو وہ ہو کیونکہ (اے پیغمبر ﷺ)! اس نے خدا کے حکم سے تیرے دل پر اس کو نازل کیا ہے۔''

اور کہیں اسی کو الروح الامین (امانت دار روح) سے تعبیر کیا ہے:

﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝ ﴾

(۲۶/ الشعرآء:۱۹۳، ۱۹۴)

''امانت دار روح اس کو لے کر تیرے دل پر اتری، تا کہ تم لوگوں کو خدا کے خوف سے ڈرانے والوں میں ہو۔''

سورۂ نحل میں اس کو روح القدس (پاکی کی روح) کہا گیا ہے۔

﴿ قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ ﴾ (۱۶/ النحل:۱۰۲)

''کہہ دے کہ اس کو روح القدس نے تیرے پروردگار کی طرف سچائی کے ساتھ اتارا ہے۔''

رسول (فرستادہ) کا لفظ بھی اس کی شان میں استعمال کیا گیا ہے:

﴿ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ ﴾ (۶۹/ الحاقۃ:۴۰)

''یہ تو ایک بزرگ فرستادہ کی بات ہے۔''

سورۂ تکویر'' میں اس رسول'' کے متعدد صفات کا بھی ذکر ہے:

﴿ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ۝ ﴾

(۸۱/ التکویر:۱۹، ۲۱)

''یہ تو ایک بزرگ فرستادہ کی بات ہے جو قوت والا ہے اور تخت والے خدا کے حضور میں اس کا

اعتبار ہے اس کی سب اطاعت کرتے ہیں اور وہ امانت والا ہے۔''

سورۂ نجم میں اس کے کچھ اور صفات بھی مذکور ہیں:

﴿ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۝ ﴾ (۵۳/ النجم:۵، ٦)

''اس پیغمبر کو بڑی قوتوں والے اور بڑی طاقت والے نے تعلیم دی۔''

آغاز وحی کے واقعہ میں آنحضرت ﷺ نے جبریل کے لئے الملک کا لفظ فرمایا ہے اور ورقہ نے اس کو ''ناموس'' کے لفظ سے ادا کیا ہے، [1] ملک کی اصل جیسا کہ ابتدا میں بتایا جا چکا ہے، املاک جو الوکہ سے نکلا ہے اور جس کے معنی پیغام کے ہیں، اس لئے ملک کے معنی پیغامبر کے ہوئے اور لفظ ناموس کے معنی محرم اسرار اور راز داں کے ہیں۔ بہرحال یہ تمام مختلف الفاظ اور عنوانات ایک ہی مفہوم و معنی کو ادا کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں جبریل علیہ السلام کا نام تین مقام پر آیا ہے دو دفعہ سورۂ بقرہ میں اور ایک جگہ سورۂ تحریم میں لیکن اس کی خصوصیت کے ساتھ کہ وہ وحی محمدی کے پیامبر اور قرآن کے حامل ہیں، صرف ایک ہی موقع پر قرآن مجید نے اس نام سے ان کو یاد کیا ہے اور وہ اس آیت میں:

﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (۲/ البقرہ:۹۷)

''جو جبریل کا دشمن ہو وہ ہو کیونکہ اس نے تیرے قلب پر خدا کے حکم سے اس کو اتارا ہے۔''

دوسری آیتوں میں قرآن مجید نے حامل قرآن فرشتہ کی تعبیر جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، روح الامین، روح القدس اور رسول کریم کے الفاظ سے کی ہے لیکن احادیث اور روایات میں ان الفاظ کے بجائے جبریل کا ہی لفظ عام طور سے مستعمل ہوا ہے۔

ایک پیامبر کی حیثیت سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جبرئیل کی سب سے پہلی آمد اس وقت ہوئی ہے جب آپ غار حرا میں معتکف تھے، صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی یہ واقعہ ان الفاظ میں ادا ہوا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی وحی کا آغاز خواب میں رؤیائے صالحہ سے ہوا۔ آپ جو رؤیا دیکھتے تھے وہ سپیدۂ سحر کی طرح (سچا ہو کر) نمودار ہوتا تھا پھر (طبیعت مبارک میں) تخلیہ پسندیدہ کیا گیا۔ غار حرا میں جا کر آپ تنہا کچھ دن بسر کرتے تھے اور عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ کھانے پینے کی چیزیں ساتھ لے جاتے تھے، جب وہ سامان ختم ہو جاتا تو گھر واپس آتے اور پھر نیا سامان لے کر غار میں چلے جاتے یہاں تک کہ حق آپ کے سامنے آ گیا اور وہ فرشتہ آپ کے پاس آیا اور اس نے کہا: ''پڑھ'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں پڑھا نہیں ہوں۔'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اس نے مجھ کو پکڑ کر اتنا دبایا کہ وہ تھک گیا پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ ''پڑھ'' میں نے پھر وہی جواب دیا اس نے مجھے اتنا دبایا کہ وہ تھک گیا اور چھوڑ دیا اور کہا کہ ''پڑھ'' میں نے پھر کہا کہ ''میں پڑھا

[1] صحیح بخاری، باب کیف کان بدء الوحی: ۳۔

نہیں ہوں۔" اس نے تیسری دفعہ دبایا اور چھوڑ دیا اور کہا:

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۗ ﴾ (٩٦/ العلق: ١ تا ٥)

"اپنے پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھ اور تیرا پروردگار بڑا بزرگ ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے سکھایا اور انسان کو وہ کچھ تعلیم کی جو نہیں جانتا تھا۔"

آنحضرت ﷺ ان آیتوں کے ساتھ گھر واپس آئے، قلب مبارک پر لرزہ تھا، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور فرمایا: "مجھے کمل اوڑھاؤ، مجھے کمل اوڑھاؤ۔" لوگوں نے آپ کو کمل اوڑھایا، جب آپ کو سکون ہوا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے تمام ماجرا بیان کر کے فرمایا کہ "مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے۔" حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا: "ہرگز آپ کی جان کو خطرہ نہیں خدا آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا آپ قرابتداروں کا حق ادا کرتے ہیں، لوگوں کے بوجھ کو آپ خود اٹھاتے ہیں، فقیروں اور مسکینوں کی مدد کرتے ہیں، مسافروں کی مہمان نوازی کرتے ہیں، انصاف کی خاطر آپ لوگوں کی مصیبتوں میں کام آتے ہیں۔" پھر آپ ﷺ کو لے کر وہ ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے اور عبرانی یا عربی لکھنا جانتے تھے (شاید توارۃ سے مراد ہو) اور انجیل کو عبرانی یا عربی میں لکھتے تھے۔ [1] اور بہت بوڑھے تھے اور آنکھوں کی روشنی بھی جاتی رہی تھی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اے ابن عم! اپنے بھتیجے کا ماجرا سنیے، ورقہ نے کہا: "اے میرے بھتیجے بتاؤ تم کیا دیکھتے ہو؟" آنحضرت ﷺ نے جو کچھ دیکھا تھا بیان فرمایا، ورقہ نے کہا: "یہ وہی ناموس (محرم اسرار ہے) جو موسیٰ پر اتارا گیا تھا، اے کاش کہ میں اس وقت جوان ہوتا، اے کاش کہ میں اس وقت زندہ ہوتا جب کہ تمہاری قوم تم کو نکال دے گی۔" آپ ﷺ نے پوچھا: "کیا میری قوم مجھ کو نکال دے گی؟" اس نے جواب دیا: "ہاں جو کچھ تم لے کر آئے ہو اس کو لے کر کوئی آدمی نہیں آیا جس سے لوگوں نے دشمنی نہ کی ہو اور اگر اس زمانہ تک میں زندہ رہا تو تمہاری ہر طرح مدد کروں گا۔" اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ورقہ نے وفات پائی۔ [2]

اس کے بعد جبریل علیہ السلام کی آمد رکی رہی اور آپ ﷺ بدستور غار حرا میں جاتے رہے، اسی اثنا میں ایک دن آپ غار حرا سے نکل کر اور پہاڑی سے نیچے اتر کر جب میدان میں پہنچے تو غیب سے ایک آواز آئی، آپ ﷺ نے فرمایا: "میں نے آگے پیچھے داہنے بائیں دیکھا پھر نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی تو دیکھا کہ وہی

---

[1] دو روایتیں ہیں ایک میں ہے کہ عبرانی میں لکھتے تھے اور دوسری میں ہے کہ عربی میں لکھتے تھے۔ [2] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی: ٣ و کتاب التعبیر: ٦٩٨٢ و کتاب التفسیر: ٤٩٥٣ میں یہ پورا واقعہ مفصل مذکور ہے میں نے ان تینوں روایتوں کو تسلسل کے لئے یکجا کر دیا ہے چونکہ استاذ مرحوم نے جلد اول میں ان تفصیلات کو قلم انداز کر دیا تھا، اس لئے یہاں ان کے لکھنے کی ضرورت ہوئی۔

فرشتہ جو پہلے غار حرا میں نظر آیا تھا آسمان اور زمین کے بیچ تخت پر بیٹھا ہے اور میں مرعوب ہو کر گھر واپس آیا۔" ❶
اس کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام کی پے در پے آمد شروع ہوئی۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام جب وحی لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آتے تو آپ جلد جلد اپنی زبان سے ان کے الفاظ کو ادا کرنے لگتے اس پر حکم ہوا: ❷

﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ ﴾ (۷۵/ القیامۃ: ۱۶، ۱۷)

"وحی کے الفاظ کے ساتھ اپنی زبان کو عجلت طلبی کے لئے جنبش نہ دو اس کی حفاظت اور قراءت کا فرض ہم پر ہے۔"

اس کے بعد جب جبریل علیہ السلام نازل ہوتے تو آپ خاموشی سے سنتے اور ان کے چلے جانے کے بعد آپ اس کو پڑھتے۔

بارگاہ نبوی میں جبریل علیہ السلام کے آنے کا کوئی وقت متعین نہ تھا صبح و شام، روز و شب، صلح و جنگ، ہر وقت فیضانِ الٰہی کا چشمہ ابلتا رہتا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ نصف شب کو سوتے تھے کہ اٹھ کر بقیع کے قبرستان میں تشریف لے گئے صبح کو آپ ﷺ نے فرمایا: "رات جبریل علیہ السلام نے مجھے پیغام دیا کہ میں اس وقت بقیع جا کر لوگوں کی مغفرت کی دعا مانگوں۔" ❸ غزوۂ بدر میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ "دیکھو یہ جبریل علیہ السلام اپنے گھوڑے کی لگام تھامے کھڑے ہیں۔" ❹ غزوۂ خندق سے جب مسلمانوں کی فوج لے کر آنحضرت ﷺ واپس آئے اور ہتھیار کھول کر غسل فرمایا تو جبرئیل علیہ السلام نے سامنے آ کر کہا کہ آپ ﷺ نے ہتھیار کھول دیے حالانکہ ہم اب تک مسلح ہیں اور بنو قریظہ کو ابھی ان کی غداری کا صلہ دینا ہے۔ ❺ بایں ہمہ سب سے زیادہ جبریل علیہ السلام کی آمد آپ کے پاس ماہ رمضان میں ہوتی تھی جس میں وہ ہر روز آ کر آپ سے قرآن مجید سنتے تھے اور خود آپ کو سناتے تھے۔ ❻

جبرائیل علیہ السلام اس وقت بھی آتے تھے جب آپ لوگوں کے مجمع میں بیٹھے ہوتے تھے لیکن جو کچھ آپ دیکھتے اور سنتے تھے وہ عموماً اوروں کو دکھائی اور سنائی نہیں دیتا تھا، ایک دفعہ آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: "اے عائشہ! جبریل علیہ السلام تم پر سلام بھیجتے ہیں۔" انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ وہ دیکھتے ہیں جو میں نہیں دیکھتی۔ ❼ توراۃ میں انبیائے بنی اسرائیل کے قصوں میں اس فرشتہ غیب کے تجسم اور تشکل کے بکثرت واقعات مذکور ہیں۔ انجیل میں ہے کہ روح القدس کبوتر کی شکل میں

❶ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی: ٤، ٤٩٢٤۔ ❷ بخاری، کتاب التفسیر: ٤٩٢٧۔
❸ نسائی، کتاب الجنائز، باب الامر بالاستغفار للمؤمنین: ۲۰۳۹۔
❹ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب شهود الملائكة بدرا: ۳۹۹۵۔ ❺ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرجع النبی ﷺ من الاحزاب ومخرجه الی بنی قریظة: ٤١١٧۔ ❻ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی: ٦۔
❼ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب فضل عائشة: ۳۷٦۸۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتری۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن آنحضرت ﷺ لوگوں کے ساتھ باہر بیٹھے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آ کر آپ کے پاس بیٹھا اور سوال کیا کہ ایمان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایمان یہ ہے کہ خدا پر، اس کے فرشتوں پر، خدا سے ملنے پر اور اس کے پیغمبروں پر اور قبر سے پھر جی اٹھنے پر تم یقین رکھو۔'' اس نے پھر پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟ جواب دیا کہ ''تم خدا کی اطاعت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور نماز پڑھو، زکوٰۃ مفروضہ دو، روزے رکھو۔'' اس نے کہا اور احسان کیا ہے؟ ارشاد ہوا: ''احسان یہ ہے کہ تم خدا کو اس طرح پوجو کہ گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' اس نے پھر سوال کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجیب اس باب میں سائل سے زیادہ واقف نہیں البتہ میں تمہیں اس کی علامتیں بتاتا ہوں جب لونڈی اپنے آقا کو جنے اور جب اونٹوں کے چرانے والے بڑی بڑی عمارتیں بنانے لگیں، قیامت کا علم ان پانچ باتوں میں سے ہے جن کو خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔'' پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ﴾ (۳۱/ لقمان:۳٤) ''قیامت کا علم خدا ہی کو ہے۔''

وہ شخص اس کے بعد اٹھ کر چلا تو آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ''ذرا اس کو واپس بلا لو۔'' لوگوں نے ادھر ادھر دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ جبریل تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔'' ❶

صحابہ میں دحیہ رضی اللہ عنہ نام کے ایک صحابی بہت حسین تھے، جبریل اکثر انہی کی صورت میں مجسم ہو کر آیا کرتے اور اس حالت میں کبھی کبھی لوگوں کو نظر بھی آ جاتے تھے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ دحیہ رضی اللہ عنہ آپ کے سامنے بیٹھے آپ سے باتیں کر رہے ہیں مجھے کچھ بھی شک نہ ہوا کہ یہ دحیہ رضی اللہ عنہ نہیں ہیں، اتنے میں مسجد نبوی ﷺ میں میں نے آپ کے خطبہ کی آواز سنی کہ آپ فرما رہے تھے: ''ابھی میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے۔'' ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ تب میں سمجھی کہ وہ اصل میں دحیہ رضی اللہ عنہ نہیں بلکہ جبریل امین علیہ السلام تھے۔ ❷

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جبریل علیہ السلام کو آنحضرت ﷺ نے ان کی اصلی شکل میں دو دفعہ ملاحظہ فرمایا ❸ ایک دفعہ تو معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اور دوسری دفعہ ایک اور مقام پر وہ آسمان کے کناروں میں نظر آئے۔ سورۂ نجم کی یہ آیتیں اسی کے متعلق ہیں:

﴿ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ۝ ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ ۝ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ ۝ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۝ أَفَتُمَارُونَهُ

❶ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبریل: ٥٠ ـ ❷ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب کیف نزل الوحی: ٤٩٨٠ـ ❸ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ والنجم: ٤٨٥٥ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب معنی قول اللّٰہ عزوجل ﴿ولقد رآہ نزلة اخریٰ﴾: ٤٣٩ـ

عَلٰى مَا يَرٰى ۞ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۞ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۞ ﴾ (۵۳/ النجم: ۵ تا ۱٤)

''بڑی قوتوں والے طاقتور نے اس کو سکھایا اور پھر وہ برابر ہوا اور بہت اوپر آسمان کے کنارے تھا پھر قریب ہوا، پھر لٹک آیا تو دو کمانوں کے بقدر تھا یا اس سے بھی قریب تر، تو خدا نے اپنے بندہ پر وحی کی جو وحی کی، دل نے جھوٹ نہیں بولا جو دیکھا، کیا تم لوگ اس سے اس کے مشاہدہ پر جھگڑتے ہو، حالانکہ اس نے اس کو دوسری دفعہ اترتے دیکھا سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔''

سورۂ تکویر کی حسب ذیل آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کفار آپ کو مجنوں اسی لئے کہتے تھے کہ آپ اس غیر مشاہد ہستی کے مشاہدہ کا دعویٰ کرتے تھے:

﴿ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۞ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۞ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۞ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۞ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۞ ﴾ (۸۱/ التکویر: ۱۹ تا ۲۳)

''یہ ایک بزرگ پیغام رساں کی بات ہے قوت والا، جو عرش والے خدا کے پاس معتبر ہے وہاں اس کی اطاعت کی جاتی ہے، وہ امانت دار ہے، تمہارا ساتھی (یعنی پیغمبر) مجنوں نہیں ہے، یقیناً اس کو آسمان کے کھلے کنارے میں دیکھا۔''

وہ ذوق وشوق جو حضور ﷺ کو اس قاصد الٰہی کی آمد کے ساتھ تھا، وہ اس آرزو کی شکل میں ظاہر ہوا کہ آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے فرمایا: ''تم اس سے بھی زیادہ میرے پاس کیوں نہیں آیا کرتے۔'' جواب ملا:

﴿ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۞ ﴾ (۱۹/ مریم: ٦٤) [1]

''ہم تو تیرے پروردگار کی اجازت اور حکم سے اترتے ہیں ہمارے آگے اور پیچھے اور درمیان کا سب علم اسی کو ہے اور تیرا رب بھول چوک سے پاک ہے۔''

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ شب کو میں نکلا تو دیکھا کہ آنحضرت ﷺ تنہا چاندنی میں ٹہل رہے ہیں، میں سمجھا کہ شاید آپ اس وقت تنہائی چاہتے ہیں اور کسی اور کا یہاں ہونا، پسند نہ فرمائیں گے، چنانچہ اسی خیال سے میں سایہ میں ہو گیا لیکن آپ کی نگاہ پڑ گئی پوچھا: ''کون ہے؟'' عرض کیا آپ پر قربان میں، ابوذر۔ آپ نے ساتھ لے لیا اور تھوڑی دیر تک ٹہلتے رہے، پھر فرمایا: ''جو آج دولت مند ہیں وہی کل قیامت میں غریب ہوں گے لیکن وہ شخص جس کو خدا نے دولت دی ہو وہ اس کو داہنے بائیں آگے پیچھے پھینک دے اور اس میں نیکی کا کام کرے۔'' ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں تھوڑی دیر تک ساتھ ٹہلتا رہا، اس کے بعد ایک خاص جگہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''تم یہاں ٹھہرے رہو۔'' اور یہ کہہ کر آپ پہاڑ کی طرف گئے اور

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب وما نتنزل الا بامر ربك......: ٤٧٣١۔

میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، میں نے دور سے آواز سنی تو میں ڈرا لیکن چونکہ آپ نے حکم دیا تھا کہ میں اپنی جگہ سے نہ ٹلوں اس لیے ٹھہرا رہا تھوڑی دیر کے بعد آپ سامنے سے آتے نظر آئے اور زبان مبارک سے یہ فرما رہے تھے: ''اگرچہ چوری کرے اور زنا کرے۔'' میں نے کہا، یارسول اللہ! آپ پر قربان ہو، آپ پہاڑی کی اوٹ میں کس سے باتیں کر رہے تھے فرمایا: ''کیا تم نے آواز سنی؟'' عرض کیا ہاں فرمایا: ''جبریل علیہ السلام تھے پہاڑی کے بیچ مجھے نظر آئے اور کہا کہ اپنی امت کو خوشخبری سنا دیجئے کہ جو اس حال میں مرا کہ اس نے کسی کو خدا کا شریک نہ بنایا ہو، وہ جنت میں داخل ہوگا۔'' آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں: ''میں نے کہا، یا جبریل علیہ السلام کیا اس نے زنا یا چوری ہی کیوں نہ کی ہو؟'' جواب دیا: ''ہاں'' میں نے پھر کہا: ''اگرچہ زنا چوری ہی کیوں نہ کی ہو؟، وہی جواب دیا: ''ہاں'' میں نے پھر کہا: ''اس نے زنا یا چوری ہی کیوں نہ کی ہو؟'' تیسری دفعہ بھی جواب وہی تھا۔ [1]

فرشتہ میکائیل کا نزول

جبرائیل علیہ السلام کے علاوہ دوسرے ملائکہ کا بھی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آنا ثابت ہے، قرآن مجید میں جبریل علیہ السلام کے علاوہ ایک دو اور فرشتوں کے نام بھی آئے ہیں، جن میں سے ایک میکائیل علیہ السلام ہیں یہودیوں نے قرآن کے ماننے سے اس لئے اپنا انکار ظاہر کیا تھا کہ یہ جبرئیل علیہ السلام کی وساطت سے نازل ہوتا ہے، خدا نے اس کے جواب میں کہا:

﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۹۸)

''جو اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبرائیل اور میکائیل کا دشمن ہو تو خدا ان کافروں کا دشمن ہے۔''

یہودیوں کے اعتقاد میں یہ عرش الٰہی کے چار مخصوص فرشتوں میں سے ایک کا نام تھا، یہ خاص طور پر اسرائیل اور اس کے خاندان کا محافظ سمجھا جاتا تھا اور لڑائیوں میں ان کی مدد کیا کرتا تھا (دانیال ۱۰۔۱۳۔۲۱) عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق یہی فرشتہ تھا جو کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہمکلام ہوا تھا۔ (اعمال ۷۔۳۸)

میکائیل بھی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں کئی بار حاضر ہوئے ہیں، معراج کے موقع پر جو دو فرشتے آئے تھے وہ جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام تھے، اسی طرح غزوۂ احد میں جو دو فرشتے دشمنوں سے آپ کی حفاظت کرتے تھے، وہ بھی جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام تھے [2] بعض روایتوں میں ہے کہ

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی ﷺ ما یسرنی ان عندی مثل احد ھذا ذھبا: ٦٤٤٤۔
[2] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب اکرامه ﷺ بقتال الملائكة...... ٦٠٠٤، ٦٠٠٥۔

نبوت کے ابتدائی تین سالوں میں میکائیل علیہ السلام ہی آپ کے ساتھ تھے۔

عام ملائکہ کا نزول

جبریل اور میکائیل علیہما السلام کے ناموں کی تخصیص کے علاوہ دوسرے عام فرشتوں کا بلاتعین نام آپ کی خدمت میں آنا بھی صحیح روایتوں سے ثابت ہے اور انہی کی روحانی تائیدات کا اثر تھا کہ آپ کا دل ہر وقت سکینتِ الٰہی سے معمور رہتا تھا، آنحضرت ﷺ کے دوش مبارک پر جب نبوت کا بار گراں رکھا گیا تو یقیناً آپ کو نظر آتا ہوگا کہ ایک طرف بظاہر ایک بے دست و پا انسان ہے جس کے قبضہ میں نہ سونے چاندی کے خزانے ہیں اور نہ اس کے علم کے نیچے خود اس کی ذات کے سوا کوئی دوسرا سپاہی ہے اور دوسری طرف ایک دنیا ہے جس کے ہاتھوں میں دنیاوی دولت کے خزانے اُبل رہے ہیں اور جس کے پرچم کے زیر سایہ ہزاروں اور لاکھوں کا ٹڈی دل ہر وقت حق کے مٹانے کو آمادۂ پیکار ہے، یہ وہ وقت تھا جب فرشتوں کو حکم پہنچا کہ میرے پیغمبر کو اپنی بشارتوں اور خوشخبریوں سے مطمئن کرو:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۵٦)

”بے شک خدا اور اس کے فرشتے اس پیغمبر پر رحمت بھیجتے ہیں، اے مسلمانو! تم بھی اس پر درود وسلام بھیجو۔“

رئیس قریش اپنی قوت و طاقت پر نازاں ہو کر اعلان کرتا ہے کہ رؤسائے قریش ہمارے ساتھ ہیں۔ پیغمبر کی طرف سے خدا منادی فرماتا ہے:

﴿ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝ ﴾ (۹٦/ العلق:۱۷، ۱۸)

”وہ اپنی مجلس کے لوگوں کو بلائے ہم بھی اپنے فرشتوں کو آواز دیں گے۔“

اس وقت جب منافقین آپ ﷺ کی بزم خاص میں نفاق ڈالنا اور گھر میں خانہ جنگی کے سامان بہم پہنچانا چاہتے ہیں بعض ازواج سے آپ آزردہ ہیں، تو ارشاد ہوتا ہے:

﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝ ﴾

(٦٦/ التحریم:٤)

”تو خدا پیغمبر کا والی و ناصر ہے اور جبریل اور نیک مسلمان اور اس کے بعد فرشتے اس کے مددگار ہیں۔“

ایک بار ابوجہل نے کفار سے پوچھا کہ کیا محمد (ﷺ) کبھی تمہارے سامنے سر بسجود ہوتے ہیں۔ سب نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: لات و عزیٰ کی قسم! اگر میں ان کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھوں گا تو ان کی گردن توڑ

ڈالوں گا اور ان کی پیشانی کو زمین میں رگڑ دوں گا۔ چنانچہ ایک دفعہ جب آپ ﷺ مصروف نماز تھے وہ اسی نیت سے آپ کی طرف بڑھا لیکن فوراً سہم کر پیچھے ہٹ گیا، کفار نے سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ میرے اور محمد ﷺ کے درمیان آگ کی ایک خندق اور بہت سے پر (یعنی فرشتوں کے) حائل ہو گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کی تکا بوٹی کر دیتے۔''

قرآن مجید کی اس آیت میں:

﴿ اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يَنْهٰىۙ۝ عَبْدًا اِذَا صَلّٰىؕ۝ ﴾ (۹۶/ العلق:۹، ۱۰)

''تم نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ کو نماز سے مانع آتا ہے۔''

اسی واقع کی طرف اشارہ ہے۔ ❶

سفر طائف سے جب آپ ناکام واپس آرہے تھے تو حسب اقتضائے بشری آپ دل شکستہ تھے، جب آپ قرن الثعالب میں پہنچے اور سر اٹھایا تو دیکھا کہ ابر کا ایک لکہ سایہ فگن ہے، اس میں آپ کو ایک فرشتہ نظر آیا جس نے پکار کر کہا: ''یا محمد ﷺ! میں پہاڑوں پر موکل (ملک الجبال) ہوں، آپ کے پروردگار نے آپ کی اور آپ کی قوم کی گفتگو سنی مجھے بھیجا ہے کہ اگر آپ حکم دیں تو میں پہاڑوں کے نیچے ان کو کچل ڈالوں۔'' فرمایا: ''شاید ان کی نسل سے کوئی خدا کا پرستار پیدا ہو۔'' ❷

اسلام کی تاریخ میں ابتلا و امتحان کا سب سے زیادہ سخت اور سب سے پہلا موقع غزوۂ بدر میں پیش آیا، مسلمانوں کی تعداد تین سو انیس آدمیوں سے زیادہ نہ تھی لیکن اس شرذمۂ قلیلہ کے مقابلہ کے لئے کفار کا ٹڈی دل امڈا ہوا چلا آتا تھا، آنحضرت ﷺ نے جب اس منظر کو دیکھا تو قبلہ رو ہو کر درگاہ الٰہی میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، دفعتہً ایک ہزار فرشتوں کی روحانی فوج مسلمانوں کی صف جنگ میں آکر کھڑی ہو گئی۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ۝ ﴾

(۸/ الانفال:۹)

''جب تم خدا سے فریاد کر رہے تھے تو خدا نے تمہاری فریاد کو سنا اور کہا کہ میں ایک ہزار ہمرکاب سواروں سے تمہاری مدد کرتا ہوں۔''

اس فوج نے جس طرح مسلمانوں کی مدد کی اس کی کیفیت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس طرح بیان کی ہے کہ ایک مسلمان ایک کافر کا تعاقب کر رہا تھا کہ اس نے کافر کے اوپر سے کوڑے کی آواز سنی اور سوار

❶ صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین واحکامهم، باب قوله تعالیٰ: ﴿ان الانسان لیطغی﴾: ۷۰۶۵؛ مسند أحمد، ج۲، ص:۳۷۰۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکة: ۳۲۳۱ وصحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب ما لقی النبی ﷺ من اذی المشرکین: ٤٦٥٣۔

کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ''آگے بڑھ اے حیزوم'' یہ کہنا تھا کہ کافر چت زمین پر گر پڑا مسلمانوں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو اس کی ناک میں سوراخ ہو گیا تھا جس میں نکیل لگی ہوئی تھی اور تمام چہرہ پھٹ گیا تھا اور اس میں نیلی بدھیاں پڑ گئی تھیں ان صحابی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس واقعہ کو بیان کیا آپ ﷺ نے فرمایا:

''سچ کہتے ہو یہ تیسرے آسمان کی مدد ہے۔'' [1]

غزوۂ احد میں بھی مسلمانوں کی تعداد کفار کے مقابلہ میں بہت کم تھی مسلمانوں کو یہ دیکھ کر اضطراب ہوا لیکن آنحضرت ﷺ نے تسلی دی کہ ''اپنی قلت تعداد اور بے سروسامانی پر نہ جاؤ، خدا اپنے ہزاروں فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا، خدا نے کہا، کہ ہاں بے شک اگر مسلمان جرأت و ہمت اور صبر سے کام لیں گے تو میں پانچ ہزار فرشتوں کی فوج ان کی مدد کو اتاروں گا۔'' سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو بتفصیل بیان کیا ہے:

﴿ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۝ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۗ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۲٤ تا ۱۲٦)

''اے پیغمبر! جب تم مسلمانوں سے کہتے تھے کہ کیا تم کو یہ بس نہیں کرتا کہ خدا تین ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا، ہاں بے شک اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کرو اور تمہارے دشمن بڑے زوروں سے بڑھ کر آئیں تو وہ پانچ ہزار بہادر فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا، خدا نے اس وعدہ کو تمہارے لئے ایک خوشخبری بنایا اور تا کہ تمہارے دلوں میں طمانیت پیدا ہو مدد تو خدا ہی کے پاس سے آتی ہے۔''

لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو مسلمانوں کے ہاتھوں سے صبر کا سررشتہ چھوٹ گیا، اس لئے خدا کے وعدۂ نصرت سے وہ محروم رہ گئے مگر آنحضرت ﷺ کے وجود اقدس کی حفاظت کے لئے دو فرشتے ساتھ تھے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''میں نے غزوۂ احد میں دو سفید پوش آدمیوں کو دیکھا جو آپ ﷺ کی طرف سے سخت جانبازی کے ساتھ لڑ رہے تھے اور میں نے ان کو نہ اس سے پہلے دیکھا تھا نہ اس کے بعد دیکھا۔'' [2]

صحیح مسلم کی روایت میں تصریح ہے کہ یہ دونوں فرشتے جبریل و میکائیل علیہما السلام تھے۔ [3]

غزوۂ احد کے بعد غزوۂ خندق پیش آیا، اس غزوہ میں بھی مسلمانوں کی بے چارگی اور بے سروسامانی کا

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب امداد بالملائکة: ٤٥٨٨۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المغازی: ٤٠٥٤۔ [3] صحیح مسلم، کتاب الفضائل باب اکرامه ﷺ بقتال الملائکة...... : ٦٠٠٤، ٦٠٠٥۔

وہی عالم تھا، اسلامی فوج کی رسد کی یہ کیفیت تھی کہ خود مقدس سپہ سالار ﷺ اپنے سپاہیوں کے ساتھ کئی وقت کا بھوکا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ روحانی فوج نازل کی جو بھوک اور پیاس سے بے نیاز ہے۔ سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر اپنا احسان جتاتا ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۚ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۹)

''اے ایمان والو! خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب کفار نے تم کو آ کر گھیر لیا تو ہم نے ان پر بھی ہوا بھیجی اور اس فوج کو بھیجا جس کو تم نے نہیں دیکھا اور اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا تھا۔''

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے جو قدیم الاسلام صحابی تھے، روایت ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ کو پہلے پہل کیونکر معلوم ہوا کہ آپ ﷺ پیغمبر ہیں، فرمایا کہ ''میں ایک دفعہ جا رہا تھا کہ آسمان سے دو فرشتے اترے، ایک آسمان کی طرف گیا اور ایک زمین پر آیا، ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ ''کیا یہ وہی ہے؟'' دوسرے نے کہا ''ہاں یہ وہی ہے'' پھر اس نے کہا: ان کو ایک آدمی سے تولو تو میرا پلہ بھاری رہا، پھر دس سے، پھر سو سے، پھر ہزار آدمیوں کے مقابلہ میں تولا گیا تب بھی میرا پلہ ہی بھاری رہا، دوسرے فرشتے نے کہا اگر ان کی تمام امت بھی ایک پلہ میں رکھو اور ان کو دوسرے میں تب بھی ان کا ہی پلہ جھکتا رہے گا۔'' [1]

یہ حقیقت میں آنحضرت ﷺ کی فضیلت بشری کی تمثیل تھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مکہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ ایک شب عشاء کی نماز پڑھ کر لوٹے تو میرا ہاتھ پکڑ کر مکہ کے باہر میدان میں لے گئے اور ایک جگہ خط کھینچ کر فرمایا: ''یہاں ٹھہرو اور اگر تم کو کچھ لوگ نظر آئیں تو ان سے بولنا نہیں وہ بھی تم سے نہیں بولیں گے۔'' یہ کہہ کر آپ ﷺ ایک طرف تشریف لے گئے، اس اثنا میں مجھے وہ لوگ نظر آئے جو زطی قوم کی طرح معلوم ہوتے تھے نہ وہ برہنہ تھے اور نہ ان کے کپڑے نظر آتے تھے، وہ میری طرف آ کر پھر رسول اللہ ﷺ کی طرف چلے جاتے تھے اور خط سے آگے نہیں بڑھتے تھے، آدھی رات کے بعد آپ ﷺ واپس تشریف لائے اور فرمایا: ''تم دیکھتے ہو کہ آج شب میں سویا نہیں۔'' یہ کہہ کر میرے زانو پر سر رکھ کر سو گئے، اتنے میں کچھ لوگ اجلے اجلے کپڑے پہنے جن کے حسن و جمال کا حال خدا ہی جانے کہ کیا تھا، پاس آ کر بیٹھ گئے کچھ آپ کے سرہانے بیٹھے اور کچھ آپ ﷺ کے پاؤں کے پاس آ کر بیٹھے، دونوں نے مل کر آنحضرت ﷺ کی نبوت و رسالت کی ایک تمثیل بیان کی اور

[1] یہ حدیث سنن دارمی، باب کیف کان اول شأن النبی ﷺ: ۱۴ میں ہے اس کا سلسلہ سند یہ ہے: اخبرنا عبداللّٰہ بن عمران حدثنا ابو داود حدثنا جعفر بن عثمان القرشی عن عثمان بن عروۃ بن الزبیر عن ابیہ عن ابی ذر غفاری تیسرے راوی جعفر بن عثمان القرشی کا صحیح نام جعفر بن عبداللہ بن عثمان القرشی ہے جو محدثین میں معتبر نہیں۔

کہا کہ یہ وہ پیغمبر ہے جس کی آنکھیں گو سوتی ہیں مگر دل ہشیار رہتا ہے، اس کے بعد وہ چلے گئے، آپ ﷺ بیدار ہوئے تو فرمایا: ''ان لوگوں نے جو باتیں کیں وہ میں نے سنیں تم جانتے ہو یہ کون تھے؟'' عرض کی خدا اور خدا کا رسول زیادہ جانتے ہیں فرمایا: ''یہ فرشتے تھے ان کی تمثیل کی تفسیر یہ ہے۔'' ❶

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ نماز عشاء پڑھ کر آپ ﷺ چلے تو میں آپ کے پیچھے ہولیا، فرمایا: ''کون؟ حذیفہ۔'' عرض کی، جی ہاں۔ فرمایا: ''آج وہ فرشتہ مجھ پر اترا جو آج تک زمین پر نہیں اترا تھا، اس نے خدا سے اذن مانگا کہ وہ میرے پاس آ کر مجھے یہ بشارت سنائے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا جنتی بیبیوں کی اور حسن اور حسین علیہما السلام جنتی جوانوں کے سردار ہیں۔'' ❷

❶ ترمذی، ابواب الامثال، باب ماجاء فی مثل الله عزوجل لعباده: ٢٨٦١۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن غریب کہا ہے۔

❷ ترمذی، ابواب المناقب، باب ان الحسن والحسین سید اشباب.....: ٣٧٨١ حدیث حسن غریب۔

عالم رؤیا

﴿ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ ﴾ (٤٨/ الفتح:٢٧)

رؤیا اور خواب درحقیقت نفس یا روح کے عجائبات کا ایک حیرت انگیز طلسم ہے۔ علمائے نفس کہتے ہیں کہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کے قوائے نفسی و دماغی ہر وقت اور ہر آن اپنے ذہنی اعمال میں مصروف رہتے ہیں، جب وہ سو جاتا ہے اور اس کے ظاہری حواس بے کار ہو جاتے ہیں، اس وقت بھی ان کے فکر و نظر کا عمل جاری رہتا ہے مگر چونکہ عموماً انسان عمیق اور پرسکون نیند سوتا ہے، اس لئے جاگنے کے بعد اس کو اپنی حالتِ خواب کا احساس نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھی جب اس کی نیند مستغرق اور گہری نہیں ہوتی تو اس کو اپنی گزشتہ سیر دماغی کے مکمل یا نامکمل مناظر یاد رہ جاتے ہیں، اسی کا نام خواب ہے، یہ تو فلسفۂ قدیمہ کا ''فرسودہ خیال'' تھا، اب جدید عہدِ ترقی میں سائیکالوجی اور نفسیات کے علما کا مشہور و مقبول نظریہ یہ ہے کہ ہم عالم بیداری میں اپنے جن خیالات، جذبات اور ارادوں اور تمناؤں کو جان کر یا بے جانے کسی سبب سے دبا دیتے ہیں، عالم خواب میں جب ہمارے تعقل اور احساس کی جابرانہ حکومت ان سے اٹھ جاتی ہے تو ان کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے اور وہ ہم کو خواب بن کر نظر آتے ہیں، بہر حال یہ شاید ان رؤیا کی توجیہ ہوگی جن کو ''خواب پریشاں'' یا ''اوہام دماغی'' کہنا زیادہ موزوں ہے۔

عرفائے روح اس خوابِ پریشاں یا اوہام دماغی کے منکر نہیں ہیں لیکن رؤیا کی حقیقت ان کے نزدیک کچھ اور ہے، وہ کہتے ہیں کہ انسان جسم و روح سے عبارت ہے، روح جب تک جسم کے اندر رہے اس کی جلوہ نمائی کے دو رُخ ہیں، جسمانی و روحانی، اپنے جسمانی دروازہ سے وہ جھانکتی ہے تو اس کو جسم کے مادہ کی سطح پر رنگا رنگ کے نقش و نگار اور گلکاریاں نظر آتی ہیں، یہ اس کے وہ تعلقات اور دلچسپیاں ہیں جو اس کے اس جسمانی و مادی عالم کے ساتھ قائم ہیں لیکن اس کے پیچھے ایک دوسرا دروازہ ہے جہاں سے وہ روحانیت کے عالم کی سیر کر سکتی ہے، جس قدر اس کا تعلق انس، دلبستگی، شیفتگی اور مشغولیت عالم جسم سے زیادہ ہوگی اسی قدر دوسرے عالم کی طرف سے فراموشی، غفلت اور بے تعلقی زیادہ ہوگی، حالت خواب میں روح کی ظاہری جسمانی مصروفیتیں چونکہ کم ہو جاتی ہیں، اس لئے اس کو دوسری کھڑکی کی طرف جھانکنے کی فرصت مل جاتی ہے اور پھر روح کو جس قدر تعلقات خارجی سے بے گانگی زیادہ ہوتی ہے شہرستان ملکوت میں اس کی سیر بہت آگے تک اور بہت دور تک اور وہاں کے تمثیلی مناظر و مشاہدات سے اس کی اطلاع اور واقفیت زیادہ صحیح اور سچی ہوتی ہے جو روحیں کہ اس عالم جسمانی کی بندشوں میں رہ کر بھی ان میں گرفتار و مقید نہیں ان کے لئے عالم بیداری بھی اقلیم روح کی گلگشت سے مانع نہیں، اسی کا نام مشاہدہ و مکاشفہ ہے۔

انبیا علیہم السلام کے مقدس قالبوں میں جو ارواح طیبات ہیں وہ عالم ظاہری کی گرفتاریوں کے بعد بھی جس حد

تک آزاد اور بے تعلق رہتی ہیں وہ عام حد انسانی سے بہت آگے اور بہت بلند ہے، اسی لئے عالم مشاہدہ اور عالم رؤیا دونوں میں حقائق و اسرار کی بستیاں ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتی ہیں، بیداری تو بیداری وہ سوتے بھی ہیں تو بیدار رہتے ہیں، ان کے جسم سوتے ہیں لیکن ان کی روحیں ہمیشہ جاگتی رہتی ہیں:

((تنام اعینهم و لا تنام قلوبهم)) [1]

''پیغمبروں کی آنکھیں سوتی ہیں لیکن ان کے دل ہمیشہ بیدار رہتے ہیں۔''

غافل انسان ادھر التفات نہیں کرتا، ورنہ درحقیقت نیند اور خواب کا معاملہ ایک سرّ ملکوتی اور راز الٰہی ہے:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝ ﴾ (۳۰/ الروم:۲۳)

''خدا کی نشانیوں میں سے (اے انسانو!) راتوں میں اور دنوں میں تمہاری نیند ہے (اور پھر بیدار ہو کر اپنے کاروبار میں تمہارا مصروف ہونا) اور اس کی دولت کو تلاش کرنا ہے، اس میں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں، بڑی بصیرتیں ہیں۔''

موت اور نیند دونوں کم و بیش ایک ہی جنس کی چیزیں ہیں، فرق اس قدر ہے کہ موت کی حالت میں جسم سے روح کو دائمی مفارقت ہو جاتی ہے اور نیند میں عارضی، موت میں تمام تعلقات ظاہری کے بند ٹوٹ جاتے ہیں اور نیند میں کچھ نہ کچھ گرہیں باقی رہ جاتی ہیں۔ قرآن مجید نے اسی روزانہ پیش آنے والے حیرت افزا واقعہ قدرت کی طرف ہم کو اس آیت میں متوجہ کیا ہے:

﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ ﴾

(۳۹/ الزمر:۴۲)

''وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو موت کے وقت اور جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا، ان کو نیند میں ان کی (مصروفیت دنیاوی) کا وقت پورا کر دیتا ہے پھر جن پر موت کا فرمان جاری ہو چکا ہے، ان کو اپنے پاس روک لیتا ہے اور دوسروں کو ایک وقت مقررہ تک کے لئے چھوڑ دیتا ہے، اس میں سوچنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔''

حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''توفی نوم ازاں قبیل است کہ شخصے از وطن مالوف خود بہ شوق و رغبت

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب کان النبی ﷺ تنام عینہ و لا ینام قلبہ: ۳۵۷۰۔

از برائے سیر و تماشا بیرون آید تا فرح و سرور حاصل کند وخرم و شاداں بہ وطن خودباز رجوع نماید و سیرگاہ او عالم مثال است کہ متضمن عجائب ملک و ملکوت است۔'' 1

عربی زبان میں خواب کے لئے دو لفظ ہیں، ایک حلم جس کی جمع احلام آتی ہے، اس کے معنی ''خواب و خیال'' کے ہیں یعنی محض وہم و تخیل، دوسرا رؤیا یہ اس خواب کو کہتے ہیں جس میں حقیقت بینی اور رمز شناسی ہو، ان دونوں لفظوں میں ایک اور فرق یہ ہے، پہلے میں وسوسہ شیطانی کا دخل ہوتا ہے اور دوسرا اس سے پاک ہے، یہ فرق سورۂ یوسف کی ان آیتوں میں صاف نظر آئے گا، عزیز مصر نے خواب دیکھا ہے، اپنے درباریوں سے اس کی تعبیر پوچھتا ہے، اہل دربار کہتے ہیں یہ محض خواب و خیال اور وہم ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ إِنْ كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ ۝ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ ۖ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ ۝ ﴾ (۱۲/ یوسف:۴۳، ۴۴)

''اے درباریو! میرے اس خواب کے بارہ میں مجھے رائے دو، اگر خواب کی تعبیر تم بیان کر سکتے ہو، انہوں نے کہا، یہ تو محض اوہام و خیالات کا مجموعہ ہے، ان اوہام اور خیالات کی تعبیر سے ہم واقف نہیں۔''

گو عالم رؤیا کا نظارہ ہر اس ہستی کو کبھی کبھی پیش آتا ہے جو روح سے وابستہ ہے اور جس میں کالے گورے، مومن و کافر، شقی و سعید اور نیک و بد کی کوئی تمیز نہیں لیکن جس طرح ایک نہایت نازک اور باریک یا کسی دور سے آنے والی چیز کو بہت سی آنکھیں دیکھ سکتی اور دیکھتی ہیں لیکن ان میں حقیقت اور صحت کے قریب اسی کی رؤیت ہوتی ہے جس کی بینائی تیز، آلات باصرہ صحیح اور فہم و استنباط کی قوت لطیف ہوتی ہے، اسی طرح عالم رؤیا کے مشاہدات کی حقیقی اور صحیح رؤیت بھی انہی کے لئے ہے جن کی روح و دل کی بینائی تیز اور بصیرت کی آنکھیں روشن اور ادراک و عرفان کے حواس لطیف ہوں اور جن کے نفس کے آئینہ میں صلاح و تقویٰ کا صیقل زیادہ ہو:

﴿ وَمَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ ﴾ (۱۷/ الاسراء:۷۲)

''اور جو یہاں اندھے ہیں وہ وہاں بھی اندھے ہوں گے۔''

﴿ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۲)

''خدا سے تقویٰ کرو اور وہ تم کو علم بخشتا ہے اور خدا کو ہر چیز کا علم ہے۔''

اسی لئے دنیا کے تمام مذاہب نے رؤیا کو خاص اہمیت دی ہے، اسلام اور شارع اسلام نے جس طرح دین کے اور شعبوں کی تکمیل کی ہے، اس حقیقت کو بھی نہایت واضح اور روشن کر دیا ہے، قرآن مجید کی آیت ہے:

1 مکتوبات سی ویکم، ج ۳، ص:۵۸۔

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾ (۱۰/ یونس:٦٣، ٦٤)

''جو ایمان لائے اور وہ متقی ہیں، ان کے لئے اس دنیا میں بشارت ہے اور آخرت میں بھی، خدا کی باتوں میں تبدیلی نہیں یہی بڑی کامیابی ہے۔''

جب یہ آیتیں اتریں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! اس دنیا میں بشارت کیا ہے؟ فرمایا کہ ''وہ رؤیائے صالحہ ہے جو ایک مرد مسلم دیکھتا ہے۔'' ❶ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''نبوت اور رسالت ختم ہوگئی لیکن صرف ایک چیز باقی رہ گئی ہے اور وہ مبشرات (خوشخبریاں) ہیں۔'' لوگوں نے عرض کی: یارسول اللہ! مبشرات کیا ہیں؟ فرمایا: ''مسلم کی رؤیائے صالحہ یہ نبوت کے اجزا میں سے ایک جزو ہے۔'' ❷ بخاری، مسلم ❸ اور ترمذی کی متعدد روایتوں میں مختلف صحابیوں سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مومن کی رؤیائے صالحہ نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔'' ❹ اس سے زیادہ رؤیا کی اہمیت اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ نبوت کا ایک حصہ ہے لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ وہ کون سی رؤیا ہے، ابھی ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ عربی میں خواب کے لئے دو لفظ ہیں، حلم (خواب پریشاں یا خیالات نفسانی) اور رؤیا، حدیث صحیح میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((الرؤيا من الله و الحلم من الشيطان)) ❺

''رؤیا خدا کی طرف سے اور حلم شیطان کی طرف سے ہے۔''

آغاز مضمون میں علمائے نفس اور عرفائے روح کی تشریحات کی تفصیل ہوچکی ہے، ذیل کی حدیث سے یہ حقیقت بہت اچھی طرح ظاہر ہوجاتی ہے، صحیح مسلم اور جامع ترمذی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اصدقكم رؤيا اصدقكم حديثا)) ❻ ''تم میں سے سب سے سچا خواب دیکھنے والا وہ ہے جو سب سے زیادہ سچ بولتا ہے۔'' حقیقت میں انسان کا ظاہر اس کے باطن کا آئینہ ہے جس کی زبان سچ بولے گی اس کی روح بھی یقیناً سچ دیکھے گی۔ علمائے نفسیات حدیث کے اس ایک فقرہ کی گرہ کشائی پورے ایک باب میں کرسکتے ہیں۔

اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''خواب تین قسم کے ہوتے ہیں ایک رؤیائے صالحہ یہ خدا کی طرف سے خوشخبری ہوتی ہے، دوسرا غم پیدا کرنے والا خواب یہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے، تیسرا وہ خواب ہوتا ہے جو انسان کی اپنے دل کی باتیں اور خیالات ہوتے ہیں۔'' ❼ اس تقسیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ علمائے نفس اور عرفائے روح جس خواب اور رؤیا کی تشریح کرتے ہیں وہ اپنی اپنی حقیقت کی روح سے بالکل الگ

❶ جامع ترمذی، ابواب الرؤيا، باب ذهبت النبوة وبقيت المبشرات: ٢٢٧٥۔ ❷ ایضًا: ٢٢٧٢۔

❸ مسلم، ٥٩١٦، ٥٩٥٠، ٥٩٥٠ میں ۴۵ اور ۷۰ کے عدد بھی آئے ہیں ''ض''۔ ❹ ترمذی: ٢٢٧٠؛ بخاری: ٦٩٨٣؛ مسلم: ٥٩٠٦۔ ❺ صحيح بخاری، كتاب التعبير، باب الرؤيا الصالحة جزء من ستة واربعين جزء من النبوة: ٦٩٨٦؛ مسلم: ٥٨٩٧ وترمذی، ابواب الرؤيا: ٢٢٧٧۔

❻ صحيح مسلم، كتاب الرؤيا: ٥٩٠٥؛ جامع ترمذی، ابواب الرؤيا: ٢٢٩١۔ ❼ ایضًا۔

ہیں اس عالم رؤیا کے تحت میں جس قسم سے بحث ہے وہ صرف پہلی قسم ہے۔

عام انسانوں اور انبیا علیہم السلام کی رؤیا میں وہی نسبت ہے جو ان دونوں کی ذات میں ہے جب عام انسانوں کی آنکھیں سوتی ہیں تو کم و بیش ان کے دل بھی سوتے رہتے ہیں۔ لیکن انبیائے کرام علیہم السلام کی آنکھیں جب سوتی ہیں تو بھی ان کے دل بیدار رہتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک دفعہ آپ نے بڑی دیر تک تہجد کی نماز پڑھی لیکن ابھی وتر نہیں پڑھے تھے کہ لیٹ گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: یارسول اللہ! آپ بے وتر پڑھے سوتے ہیں، فرمایا: ''اے عائشہ! میری آنکھیں سوتی ہیں، لیکن میرا دل نہیں سوتا۔'' ❶ معراج کے ذکر میں ہے کہ آپ اس حالت میں تھے کہ آپ کی آنکھیں سوتی تھیں، لیکن دل بیدار تھا اور انبیا علیہم السلام کا یہی حال ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں تو سوتی ہیں لیکن ان کے دل بیدار رہتے ہیں۔ ❷

انہی حدیثوں کو پیش نظر رکھ کر جمہور علمائے اسلام کا یہ فیصلہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کی رویا بھی اسی قدر قطعی اور یقینی ہے، جس قدر آپ کے عام احکام وحی اور مخاطبات الٰہی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو خواب اپنے پہلوٹے بیٹے کی قربانی کے متعلق دیکھا، اس کے حکم الٰہی ہونے میں انہیں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہوا اور انہوں نے اس کی تعمیل ویسی ہی ضروری سمجھی جیسی اس حکم کی جو عالم بیداری میں انہیں خدا کی طرف سے ملتا۔ دوسرے پیغمبروں کے حالات میں بھی یہی نظر آتا ہے کہ ان کو اپنی رؤیا کی صحت وصداقت اور واجب العمل ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ تھا خود آنحضرت ﷺ کے سوانح مبارک میں یہ احوال بہ کثرت پیش آئے ہیں اور اس عالم میں جو احکام اور علوم آپ کو دیے گئے ہیں وہ بھی اسی طرح قطعی ہیں جس طرح وہ احکام اور علوم جو وحی کے دوسرے طریقوں سے آپ کو مرحمت ہوئے۔ چنانچہ ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ (رویا الانبیاء وحی) ''انبیا کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔'' ❸

اوپر اشارہ گزر چکا ہے کہ بعض علمائے اسلام اور اصحاب کشف وعرفان عالم غیب اور عالم ملکوت اور اس عالم شہادت اور عالم جسمانیات کے درمیان ایک تیسرے عالم کے قائل ہیں جس کا نام انہوں نے عالم برزخ (درمیانی مقام) اور عالم مثال رکھا ہے، چنانچہ علما میں امام خطابی، امام غزالی، علامہ سیوطی، شاہ ولی اللہ صاحب اور صوفیہ میں حضرت امام ربانی اور تمام حضرات مجددیہ اس عالم کے قائل ہیں شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس کا ایک خاص باب باندھا ہے ❹ جس میں متعدد احادیث سے علامہ سیوطی اور امام غزالی کی تحریروں سے اس عالم کا ثبوت بہم پہنچایا ہے عالم مثال ان کے نزدیک گویا ایک صاف پانی کی غیر محدود نہر یا شیشہ ہے جس میں عالم شہادت کی وہ چیزیں جو جاندار یا مجسم نہیں ہیں، مثلاً: صفات، اعراض، نیکی وبدی، ایمان وعلم، وغیرہ وہاں اپنی مناسب وموزوں

❶ صحیح مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین، باب صلوۃ اللیل وعدد رکعات النبی ﷺ: ۱۷۲۳۔

❷ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب کان النبی ﷺ تنام عینه......: ۳۵۷۰۔

❸ ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب عمر فاروق: ۳۶۸۹۔

❹ حجة الله البالغة، جزء اوّل، ص: ۱۰۔

شکلوں میں جاندار اور مجسم ہو کر نظر آتی ہیں، نیکی ایک حسین وجمیل کی شکل میں، بدی ایک کریہہ المنظر صورت میں، ایمان آفتاب بن کر علم دریا کے رنگ میں جلوہ گر ہوتا ہے، اسی طرح عالم غیب کی چیزیں، جنت، دوزخ، ملائکہ وغیرہ اسی نہر و آئینہ میں منعکس ہو کر اس عالم شہادت کے لوگوں کو نظر آتی ہیں اور جس طرح تصویر کی شبیہ اور نہر و آئینہ کے عکس میں اور اصل جسمانی شکلوں میں کامل مشابہت اور مماثلت ہوتی ہے اسی طرح عالم غیب کی اشیاء اور عالم مثال کی شبیہوں اور تصویروں میں پوری مماثلت اور مشابہت پائی جاتی ہے۔

بہر حال اس عالم کا مستقل وجود ہو یا نہ ہو مگر اس میں شک نہیں کہ قرآن پاک اور احادیث صحیح میں ایسے واقعات، حالات، مشاہدات اور کیفیات مذکور ہیں جن کی تشریح اس عالم میں بخوبی کی جاسکتی ہے، انجیل اور قرآن مجید دونوں میں ہے کہ جبریل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت لے کر آئے:

﴿ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ ﴾ (۱۹/ مریم:۱۷)

''مریم کے سامنے ایک پورے انسان کی مثال بن کر آئے۔''

احادیث میں ہے کہ ایک دفعہ نماز کی حالت میں آپ ﷺ کے سامنے جنت اور دوزخ کی صورتیں جلوہ گر کی گئیں، اس موقع پر مختلف صحابیوں نے اس مفہوم کو حسب ذیل مختلف الفاظ میں ادا کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

((انه صورت لی الجنة والنار حتی رأیتهما دون الحائط)) [1]

''میرے لئے جنت اور دوزخ مصور کی گئی یا میرے سامنے جنت اور دوزخ کی صورت پیش کی گئی یہاں تک کہ میں نے ان کو اس دیوار کے پاس دیکھا۔''

((لقد رأیت الان منذ صلیت لکم الصلوٰة الجنة والنار ممثلتین فی قبلة هذا الجدار)) [2]

''میں نے ابھی جب تم کو نماز پڑھا رہا تھا جنت اور دوزخ کو اس دیوار کے رخ میں ممثل دیکھا یا میرے سامنے جنت اور دوزخ کی مثال پیش کی گئی۔''

((انی رأیت الجنة...... ورأیت النار)) [3]

''میں نے جنت کو دیکھا اور دوزخ مجھے بھی دکھائی گئی۔''

((فعرضت علی الجنة......وعرضت علی النار)) [4]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب التعوذ من الفتن: ۷۰۸۹۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب رفع البصر الی السماء فی الصلوة: ۷٤۹۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الکسوف، باب صلوة الکسوف جماعة: ۱۰۵۲۔

[4] صحیح مسلم، کتاب صلوة الکسوف، باب ما عرض علی النبی ﷺ: ۲۱۰۰۔

''مجھ پر جنت اور دوزخ پیش کی گئی۔''

((لقد جيء بالنار...... ثم جيء بالجنة)) ❶

''میرے پاس جنت اور دوزخ لائی گئی۔''

((اطلعت فى الجنة...... واطلعت فى النار)) ❷

''میں جنت اور دوزخ میں جا نکلا۔''

ایک ہی مفہوم کو مختلف راویوں نے ان مختلف الفاظ میں ادا کیا ہے لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ الفاظ کی احتیاط بھی جس قدر امام بخاری کے ہاں ہے کسی اور کے ہاں نہیں اس لئے امام بخاری کے الفاظ تصویر اور تمثیل یا صورت اور امثال یا امام مسلم کے الفاظ لایا جانا اور پیش کیا جانا پر ذرا تامل درکار ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسان کی زبان اس درجہ ادائے مطلب میں قاصر ہے کہ وہ اپنے الفاظ سے عالم محسوس کی کیفیتوں کی بھی پردہ دری نہیں کرسکتی پھر اس سے یہ توقع کس قدر بے جا ہے، کہ غیر محسوس عالم کی کیفیتوں کو وہ کبھی الفاظ کا جامہ پہنا سکتی ہے جو ہم کرسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ صحیح مستند اور محفوظ ذریعہ سے جو کچھ ہم تک پہنچا ہے، وہ دوسروں تک پہنچادیں۔

وحی نبوی ﷺ کا آغاز رؤیائے صالحہ سے ہوا آپ ﷺ کو چیزیں رؤیا میں دکھائی جاتی تھیں اور وہ سپیدۂ صبح کی طرح ٹھیک ٹھیک پوری اترتی تھیں۔ ❸

معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف منہ کرکے آپ ﷺ جائے نماز پر بیٹھے رہتے اور ان سے دریافت فرماتے کہ تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ لوگ بیان کرتے اور اگر وہ رؤیائے صالحہ ہوتی تو آپ ﷺ اس کی تعبیر کرتے اگر وہ خواب وخیال ہوتا تو کہہ دیتے کہ یہ محض خواب وخیال ہے، اسی اثنا میں اس شب میں اگر خود آنحضرت ﷺ کو کوئی رؤیا دکھائی گئی ہوتی تو آپ ﷺ اس کو سناتے۔ ❹

آنحضرت ﷺ کی جس قدر رؤیا احادیث میں مذکور ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ ہیں جو تمثیلی رنگ میں دکھائی گئی ہیں اور آنحضرت ﷺ نے ان کی تعبیر وتشریح خود اپنی زبان مبارک سے کردی ہے، دوسری وہ رؤیا ہیں جو بعینہٖ واقعہ اور حقیقت ہیں اور اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ان کو بیان کرتے وقت ان کی تاویل وتشریح نہیں کی، اس کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس میں بعض اوقات دنیا کے متعلق پیشین گوئی اور اخبار غیب ہے، دوسری وہ جس میں احوال آخرت اور اسرار غیب کا اظہار ہے، ذیل میں ہم ہر قسم کے واقعات کو الگ الگ عنوانوں کے تحت میں بیان کرتے ہیں۔

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب ماعرض علی النبی ﷺ: ۲۱۰۲۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة: ٦٥٤٦۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی: ۳؛ کتاب التعبیر: ٦٩٨٢؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بدء الوحی: ٤٠٣۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب تعبیر الرؤیا بعد صلوۃ الصبح: ٧٠٤٧؛ مسلم، کتاب الرؤیا: ٥٩٣١، ٥٩٣٧؛ ترمذی، ابواب الرؤیا: ٢٢٩٤۔

رؤیائے تمثیلی

ابھی آپ ﷺ مکہ معظمہ میں تھے، اسلام پر سختی اور مصیبت کے دن تھے، صدائے حق پر لبیک کہنے والوں کی تعداد کم تھی کہ آپ کو عالم رؤیا میں دکھایا گیا کہ آپ اپنی جماعت کے ساتھ عقبہ بن رافع کے گھر میں ہیں اور ابن طاب کی تر و تازہ کھجوریں لا کر آپ کو اور آپ کے رفقا کو دی گئی ہیں، آپ نے اس کی تعبیر یہ کی کہ دنیا میں مسلمانوں کی ترقی اور آخرت میں عاقبت بخیر ہوگی اور ان کا مذہب پھلے اور پھولے گا۔ ❶

ابھی آپ ﷺ نے ہجرت نہیں کی تھی لیکن ہجرت کا زمانہ قریب تھا کہ آپ کو ہجرت اور ہجرت کے بعد کے تمام اہم واقعات رؤیا میں دکھائے گئے، آپ نے فرمایا کہ ''میں نے دیکھا کہ میری ہجرت کی سرزمین چھوہاروں کا باغستان ہے، میرا خیال تھا کہ یہ یمامہ یا ہجر کا شہر ہوگا لیکن وہ شہر یثرب کا نکلا'' اسی خواب میں نظر آیا کہ میرے ہاتھ میں تلوار ہے، میں نے اس کو ہلایا تو وہ ٹوٹ گئی۔ یہ احد کی شکست کی طرف اشارہ تھا، پھر میں نے اس کو ہلایا تو وہ ایک نہایت عمدہ تلوار ہوگئی۔ یہ اس واقعہ کی تمثیل تھی کہ احد کے بعد اللہ تعالیٰ فتح و کامیابی اور مسلمانوں کا اجتماع نصیب کرے گا۔ میں نے اسی خواب میں گائے کو ذبح ہوتے دیکھا۔ یہ وہ مسلمان ہیں جو احد میں شہید ہوئے اس کے بعد بھلائی دیکھی یہ وہ بھلائی ہے جو اسلام کو نصیب ہوئی۔'' ❷

مسلمانوں نے جب مدینہ کو ہجرت کی ہے تو یہاں کی آب و ہوا ان کے موافق نہ تھی وبا بھی پھیلی تھی، مہاجرین میں اضطراب سا تھا، آپ نے خواب میں دیکھا کہ ایک کالی سیاہ عورت جس کے سر کے بال الجھے اور پریشان ہیں وہ مدینہ سے نکل کر جحفہ کی طرف جا رہی ہے، اس کی تعبیر یہ ارشاد فرمائی کہ مدینہ کی وبا جحفہ میں منتقل کر دی گئی ❸ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مدینہ منورہ اس سے پاک ہو گیا۔

ایک دفعہ رؤیا میں آپ کو دکھایا گیا کہ آپ کے دونوں ہاتھ میں سونے کا ایک ایک کنگن ہے، اس سے آپ کو تکلیف ہوئی حکم ہوا کہ ان کو پھونک دو، آپ نے پھونکا تو دونوں کنگن ہاتھوں سے علیحدہ ہو کر اڑ گئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں نے اس کی تعبیر یہ کی کہ یہ نبوت کے دو جھوٹے مدعی ہیں (مسیلمہ اور اسود عنسی) جو میرے بعد پیدا ہوں گے۔'' ❹

آپ ﷺ نے دیکھا کہ آپ کے سامنے دودھ کا پیالا لایا گیا، آپ نے اس کو اس قدر سیر ہو کر پیا کہ انگلیوں سے دودھ بہنے لگا، پیالہ کا بچا ہوا دودھ آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا۔ آپ نے لوگوں

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الرؤیا، باب رؤیا النبی ﷺ: ۵۹۳۲۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الرؤیا، باب رؤیا النبی ﷺ: ۵۹۳۴۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب اذا رأی انه اخرج الشيء......: ۷۰۳۸، باب المرأة السوداء: ۷۰۳۹؛ ترمذی، ابواب الرؤیا، باب ما جاء فی رؤیا النبی ﷺ: ۲۲۹۰۔

❹ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب اذا طار الشيء فی المنام: ۷۰۳۴؛ صحیح مسلم، کتاب الرؤیا، باب رؤیا النبی ﷺ: ۵۹۳۶؛ ترمذی، ابواب الرؤیا، باب رؤیا النبی ﷺ: ۲۲۹۲۔

سے جب یہ خواب بیان کیا تو انہوں نے دریافت کیا، یارسول اللہ ﷺ! اس کی تعبیر آپ نے کیا کی؟ فرمایا: ''علم'' ❶ اسی طرح آپ ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا: ''آج شب کو جب میں سویا تھا، میرے سامنے کچھ لوگ پیش کیے گئے، ان میں سے کسی کے بدن پر کرتہ سینہ تک تھا، کسی کے اس سے نیچے تک عمر رضی اللہ عنہ جب سامنے آئے تو ان کے جسم پر کرتہ اتنا بڑا تھا کہ اس کے دامن زمین پر لوٹ رہے تھے۔'' سننے والوں نے پوچھا، یارسول اللہ! آپ نے اس کی کیا تعبیر کی فرمایا: ''دین۔'' ❷ ایک شب میں آپ کو ذات محمدی ﷺ پر ختم نبوت اور تکمیل دین کی تمثیل دکھائی گئی، آنکھیں خواب آلودہ تھیں لیکن قلب اقدس بیدار تھا، کچھ فرشتے اتر کر آپ کے پاس آ کر بیٹھے اور آپس میں ایک دوسرے سے بولے کہ ''اس پیغمبر کی کوئی تمثیل بیان کرو، اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی آقا ہو، اس نے ایک محل تیار کیا اور اس میں دستر خوان بچھایا اور لوگوں کو کھانے کی دعوت دی، اب جس نے اس کی بات کو قبول کیا، وہ آیا اور کھا پی کر سیر ہوا اور جو نہیں آیا اس کو اس نے سزا دی'' بیدار ہو کر آپ ﷺ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''وہ آقا تو خدا ہے، جنت اس کا محل ہے جس نے اس کی دعوت کو قبول کیا وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے انکار کیا اس کو اس نے عذاب دیا۔'' ❸

ایک دفعہ آپ ﷺ کو یہ دکھایا گیا کہ آپ ایک کنویں کے اندارے پر کھڑے ہیں، بعض روایتوں میں ہے کہ آپ نے دیکھا کہ میں حوض کوثر پر کھڑا ہوں، اردگرد لوگوں کا جماؤ ہے، آپ ڈول سے پانی کھینچ کھینچ کر ان کو پلا رہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ ''اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ابوبکر آئے اور انہوں نے میرے ہاتھ سے ڈول لے کر مجھے سبکدوش کر دیا اور پھر وہ پانی کھینچ کھینچ کر پلانے لگے مگر خدا ان پر رحم کرے، ذرا کھینچنے میں کمزوری معلوم ہوتی تھی، اس کے بعد عمر آئے تو ڈول بڑھ کر بڑا ہو گیا اور عمر نے اس قوت اور تیزی سے پانی کھینچا کہ حوض کناروں تک پر ہو گیا اور لوگ پی کر سیراب ہو گئے۔'' ❹ یہ خواب اتنا واضح تھا کہ آنحضرت ﷺ نے اس کی تعبیر کی ضرورت نہیں سمجھی، کون نہیں سمجھا کہ ڈول اور پانی کھینچنے سے مراد خلافت اور خدمت خلق کی بجا آوری ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان چند سعید لوگوں میں ہیں جن کو اسی دنیا میں جنت کی بشارت دی جاچکی تھی

❶ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب اللبن: ۷۰۰۶، باب اذا اعطی فضله غیره فی النوم: ۷۰۲۷، باب القدح فی النوم: ۷۰۳۲؛ ترمذی، ابواب الرؤیا: ۲۲۸۴۔

❷ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب القمیص فی المنام: ۷۰۰۸؛ جامع ترمذی، ابواب الرویا: ۲۲۸۵۔

❸ جامع ترمذی، ابواب الامثال، باب ماجاء فی مثل اللّٰه عزوجل لعباده: ۲۸۶۱۔

❹ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب نزع الذنوب والذنوبین: ۷۰۲۰، ۷۰۲۱؛ صحیح مسلم، باب من فضائل عمر: ۶۱۹۶؛ ترمذی، ابواب الرؤیا، باب ماجاء فی رؤیا النبی ﷺ فی المیزان والدلو: ۲۲۸۹۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''رات میں نے دیکھا کہ میں جنت میں ہوں، سامنے ایک محل ہے اور ایک عورت اس میں بیٹھی وضو کر رہی ہے، میں نے پوچھا کہ یہ کس کا محل ہے، جواب دینے والے نے جواب دیا کہ یہ عمر کا مسکن ہے، میں نے چاہا کہ اندر جاؤں مگر عمر کی غیرت یاد آئی تو الٹا پھر گیا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ سن کر رو پڑے اور کہا، یا رسول اللہ میں آپ سے غیرت کرتا؟ [1] ایک دفعہ آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ''اے بلال! تم کون سا ایسا نیک عمل کرتے ہو کہ میں جب جنت میں گیا تو تمہارے جوتوں کے چاپ کی آواز سنی۔'' عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! میں ہمیشہ باوضو رہتا ہوں اور جب نیا وضو کرتا ہوں دو رکعت نماز پڑھ لیتا ہوں۔ [2]

ورقہ بن نوفل کا نام آغاز وحی کے ضمن میں ابھی گزر چکا ہے، یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے رشتہ دار تھے اور اسلام سے پہلے سچے عیسائی ہو گئے تھے، جب آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی اور آپ سے نزول جبریل علیہ السلام کا حال سنا تو انہوں نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی اور کہا کہ ''اگر زندہ رہا تو اس وقت جب آپ کی قوم آپ کو شہر بدر کرے گی میں آپ کی پوری مدد کروں گا۔'' حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ورقہ جنت میں گئے یا دوزخ میں، انہوں نے تو آپ کی تصدیق کی تھی، لیکن آپ کے ظہور سے پہلے مر گئے۔ فرمایا: ''مجھے وہ خواب میں دکھائے گئے کہ وہ سپید کپڑے پہنے ہیں اگر وہ دوزخ میں ہوتے تو ان کے جسم پر یہ لباس نہ ہوتا۔'' [3]

ایک شب کو جب آپ ﷺ مصروف نماز تھے جمال الٰہی بے نقاب ہو کر سامنے آ گیا، صحیحین کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ صبح کی نماز کے لئے آپ دیر کو برآمد ہوئے، نماز کے بعد لوگوں کو اشارہ کیا کہ اپنی اپنی جگہ پر ٹھہرے رہیں، پھر فرمایا: ''آج شب کو جب میں نے اتنی رکعتیں پڑھیں جتنی میرے لئے مقدر تھیں تو نماز ہی کے اندر میں اونگھ گیا، میں نے دیکھا کہ جمال الٰہی بے پردہ میرے سامنے ہے، خطاب ہوا یا محمد ﷺ! تم جانتے ہو کہ فرشتگان خاص کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں، عرض کی، نہیں اے میرے رب! میں نہیں جانتا۔ اس نے اپنا ہاتھ دونوں مونڈھوں کے بیچ میں میری پیٹھ پر رکھا، جس کی ٹھنڈک میرے سینہ تک پہنچ گئی اور آسمان و زمین کی تمام چیزیں نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو گئیں، سوال ہوا، یا محمد! تم جانتے ہو کہ فرشتگان خاص کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں، عرض کی، ہاں! اے میرے رب ان اعمال کی نسبت

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب القصر فی المنام: ۷۰۲۳؛ صحیح مسلم، باب من فضائل عمر: ۶۱۹۸؛ ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب عمر: ۳۶۸۸، ۳۶۸۹۔

[2] بخاری، کتاب التهجد، باب فضل الطهور باللیل والنهار: ۱۱۴۹؛ مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل بلال: ٦٣٢٤؛ ترمذی، ابواب المناقب: ۳۶۸۹۔

[3] جامع ترمذی، ابواب الرؤیا، باب ماجاء فی رؤیا النبی ﷺ: ۲۲۸۸۔

گفتگو کر رہے ہیں جو گناہوں کو مٹا دیتے ہیں۔ پوچھا: وہ کیا ہیں؟ عرض کی: نماز باجماعت کی شرکت کے لئے قدم اٹھانا، نماز کے بعد مسجد میں ٹھہرنا اور نا گواری کے باوجود اچھی طرح وضو کرنا جو ایسا کرے گا اس کی زندگی اور موت دونوں بخیر ہوں گی، وہ گناہوں سے ایسا ہی پاک ہو جائے گا جیسا اس دن تھا جب اس کی ماں نے اس کو جنا تھا۔ پھر سوال ہوا کہ یا محمد! درجات کیا ہیں؟ گزارش کی، کھانا کھلانا، نرمی سے باتیں کرنا، جب دنیا سوتی ہو تو اٹھ کر نماز پڑھنا۔ پھر حکم ہوا کہ اے محمد! مجھ سے مانگو، میں نے عرض کی، خداوند میں نیک کاموں کے کرنے اور برے کاموں سے بچنے اور غریبوں سے محبت کرنے کی توفیق چاہتا ہوں، میری مغفرت کر، مجھ پر رحم فرما، جب کسی قوم کو تو آزمانا چاہے تو مجھے بے آزمائے اٹھالینا، میں تیری محبت کا اور جو تجھ سے محبت رکھے اس کی محبت کا اور جو عمل مجھ کو تیری محبت کے قریب کر دے اس کی محبت کا خواستگار ہوں۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے لوگوں سے کہا: ''یہ جو کچھ تھا حق تھا اور اس کو پڑھا کرو۔'' [1]

آثار قیامت کے بعض واقعات بھی اسی عالم میں آپ پر پیش کئے گئے، آپ نے صحابہ کے مجمع میں ایک دن فرمایا: ''رات مجھے ایک رؤیا دکھائی گئی، میں نے دیکھا کہ میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا ہوں، اسی اثنا میں میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کا رنگ گندم گوں تھا، بہتر سے بہتر گندم گوں آدمی جو تم نے دیکھا ہو، اس کے گیسو پڑے ہوئے تھے، بہتر سے بہتر گیسو جو تم نے دیکھے ہوں، کنگھی سے بال درست کئے تھے اور ان سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے دو آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر وہ طواف کر رہا تھا میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ جواب ملا مسیح ابن مریم علیہما السلام میں ادھر دیکھنے کو مڑا تو ان کے پیچھے ایک اور آدمی نظر آیا سرخ رنگ، موٹا، بھدا، بالوں میں بہت گھونگھر پڑے ہوئے ایک آنکھ سے کانا آنکھ ایسی معلوم ہوتی تھی گویا کہ ابھرا ہوا انگور ہے میں نے پوچھا، یہ کون ہے؟ معلوم ہوا دجال ہے۔'' [2]

ام المومنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ آپ سونے سے جاگ اٹھے چہرۂ مبارک سرخ تھا اور زبان پر یہ کلمات تھے: ''لا الہ الا اللہ! افسوس ہے عرب پر! برائی نزدیک آ گئی، یاجوج ماجوج کی دیوار میں آج اتنا سوراخ ہو گیا۔'' [3]

حضرت جبریل علیہ السلام اور دوسرے فرشتے جس طرح آپ کے عام مشاہدہ میں آتے تھے اسی طرح اس عالم رؤیا میں حاضر ہوتے تھے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن آپ نے فرمایا: ''آج شب کو

---

[1] یہ روایت جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة صٓ: ۳۲۳۵ ومسند احمد، ج ۵، ص: ۲۴۳ مذکور ہے، ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔

[2] صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب الطواف بالکعبة فی المنام: ۷۰۲۶ وصحیح مسلم، باب ذکر المسیح الدجال: ۴۲۵ تا ۴۲۹۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب قول النبی ﷺ: ویل للعرب من شر قد اقترب: ۷۰۵۹؛ صحیح مسلم، باب اشراط الساعة: ۷۲۳۵۔

میں نے خواب میں دو شخص دیکھے جو مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ دوزخ کی آگ کو جو جلاتا ہے وہ مالک داروغہ دوزخ ہے میں جبریل ہوں اور یہ میکائیل ہیں۔ [1]

نظارۂ جمال الٰہی کے بعد اس عالم کا سب سے بڑا مشاہدہ وہ تھا جس میں آپ ﷺ کو دوزخ کے مہیب وہولناک مناظر اور بہشت کی بعض دلکش اور مسرت افزا جلوہ آرائیاں دکھائی گئیں، حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد آپ ہم لوگوں کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتے تھے اور پھر دریافت فرماتے کہ تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے، بہر حال حسب معمول آج بھی آپ نے دریافت فرمایا ہم نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ ﷺ! ارشاد ہوا: ''آج شب کو مجھے رؤیا میں یہ نظر آیا کہ دو آنے والے میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھے اٹھایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک مقدس سرزمین میں لے گئے، میں نے دیکھا کہ ایک آدمی پڑا ہے، دوسرا شخص ایک بڑا پتھر ہاتھ میں لئے اس کے پاس کھڑا ہے، وہ زور سے پتھر اس کے سر پر مارتا ہے جس سے اس کا سر چور چور ہو جاتا ہے اور پتھر لڑھکنے لگتا ہے، وہ دوڑ کر پتھر اٹھاتا ہے تو اس کا سر پھر درست ہو جاتا ہے، وہ پھر آ کر اسی طرح مارتا ہے اور سر کے پرخچے اڑ جاتے ہیں، میں نے پوچھا: سبحان اللہ! یہ کیا ہے؟ میرے ساتھیوں نے کہا آگے چلو، آگے چلو میں آگے چلا تو دیکھا کہ ایک آدمی بیٹھا ہے دوسرے شخص کے ہاتھ میں لوہے کا آنکڑا ہے، وہ ایک طرف اس کے منہ میں آنکڑا ڈال کر کھینچتا ہے تو باچھیں پھٹ کر گدی سے مل جاتی ہیں پھر آنکھ میں پھر نتھنے میں آنکڑا ڈال کر کھینچتا ہے اور چیر ڈالتا ہے ادھر سے فرصت کر کے دوسری جانب جاتا ہے اور ادھر کے بھی جبڑے اور آنکھ اور نتھنے کو اسی آنکڑے سے پیچھے تک چیر ڈالتا ہے، اسی اثنا میں پہلی طرف کے سب زخم بھر آتے ہیں اور پھر آ کر وہ ان کو چیرتا ہے تو دوسری طرف کے بھر جاتے ہیں، میں نے کہا: سبحان اللہ! یہ کیا ہے؟ جواب ملا آگے چلو آگے چلو میں اور آگے بڑھا تو دیکھا ایک تنور ہے اس میں آگ روشن ہے کچھ مرد اور عورتیں اس میں ننگے ڈالے گئے ہیں، جب نیچے سے آگ کا شعلہ اٹھتا ہے تو چیختے ہیں چلاتے ہیں، تھوڑی دیر میں وہ آگ دب جاتی ہے اور پھر بلند ہوتی ہے اور پھر وہ چیختے ہیں اور چلاتے ہیں، میں نے کہا: سبحان اللہ! یہ کیا ہے؟ انہوں نے پھر آگے بڑھنے کو کہا، اب آگے بڑھے تو دیکھا کہ ایک خون کی سرخ ندی ہے، اس میں ایک آدمی تیر رہا ہے اور کنارے پر ایک شخص پتھر لئے کھڑا ہے وہ آدمی چاہتا ہے کہ تیر کر کنارے لگ جائے مگر جب وہ قریب آتا ہے وہ شخص پتھر اس زور سے تاک کر مارتا ہے کہ وہ اس کے منہ میں جا کر لگتا ہے اور حلق سے نیچے اتر جاتا ہے، وہ آدمی ہٹ کر پھر جہاں تھا وہیں پہنچ جاتا ہے اور پھر وہ کنارے پر آنے کا قصد کرتا ہے کہ پھر اسی طرح پتھر آ کر اس پر پڑتا ہے، میں نے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: آگے چلو، آگے چلو میں اور آگے چلا تو ایک شخص نظر آیا کریہہ منظر سے کریہہ منظر آدمی جو تم نے دیکھا ہو وہ اس سے بھی زیادہ کریہہ منظر تھا

[1] بخاري، بدء الخلق، باب ذكر الملائكة: ٣٢٣٦۔

آگ اس کے سامنے دہک رہی تھی اور وہ اس کو اور دہکا رہا تھا اور اس کے چاروں طرف پھر رہا تھا میں نے اپنے ساتھیوں سے پھر پوچھا کہ یہ کون ہے؟ انہوں نے آگے بڑھنے کو کہا: میں آگے بڑھا تو ایک ہرا بھرا گنجان باغ نظر آیا جس میں نوبہار کے رنگ برنگ پھول کھلے ہوئے تھے، باغ کے بیچ میں ایک نہایت ہی خوبصورت عمارت دکھائی دی کہ میں نے ویسی کبھی نہیں دیکھی تھی، اس میں بچے بوڑھے، جوان، عورت، مرد ہر طرف آگے نظر آئے، آگے بڑھا تو ایک اور عمارت جو پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت تھی نظر آئی اس میں بھی کچھ لوگ مختلف سن وسال کے دکھائی دیے، ایک باغ میں ایک درخت کے پاس ایک دراز قد انسان دیکھا جس کا سرا تنا اونچا تھا کہ آسمان تک پہنچ گیا تھا اور مجھے نظر نہیں آتا تھا، اس انسان کے چاروں طرف اتنے بچے نظر آئے کہ میں نے اتنے نہیں دیکھے تھے میں نے اپنے ہمراہیوں سے پھر سوال کیا مگر انہوں نے اور آگے بڑھا دیا تو ایک بہت بڑے باغ کے قریب جس سے زیادہ بڑا اور زیادہ خوبصورت باغ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا پہنچا، اندر گیا تو ایک شہر نظر آیا جس کی چار دیواری ایک ایک سونے اور ایک ایک چاندی کی اینٹوں سے تعمیر ہوئی تھی دروازہ کے پاس پہنچ کر دروازہ کھلوایا دروازہ کھلا اور ہم اس کے اندر داخل ہوئے تو وہاں ہم کو ایسے لوگ نظر آئے جن کا آدھا دھڑ تو نہایت خوبصورت تھا اور آدھا دھڑ نہایت بدصورت میرے ہمراہیوں نے ان سے کہا کہ جاؤ اس نہر میں غوطے لگاؤ ناگاہ ایک نہایت صاف وشفاف نہر نظر پڑی وہ گئے اور جا کر اس میں غوطے لگائے غوطے لگا کر باہر آئے تو ان کی بدصورتی جاتی رہی اور وہ نہایت خوبصورت ہو گئے ساتھیوں نے کہا: یہ شہر جنت عدن ہے اور آپ کی منزل وہ ہے میری نگاہ اوپر اٹھی تو ایک محل سپید بادل کی طرح دکھائی دیا میں نے کہا: خدا تمہارا بھلا کرے مجھے وہاں جانے دو انہوں نے جواب دیا کہ ابھی نہیں مگر آپ وہاں یقیناً جائیں گے پھر میں نے کہا کہ آج رات کو میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں۔ بتاؤ یہ کیا تھیں انہوں نے کہا اب ہم آپ کو سب بتا دیں گے۔ پہلا آدمی جس کا سر پتھر سے توڑا جا رہا تھا وہ تھا جو قرآن پڑھ کر پھر اس کو چھوڑ دیتا ہے اور فرض نماز سے غافل ہو کر سو جاتا ہے اور وہ شخص جس کی آنکھ ناک اور منہ چیرا جا رہا تھا وہ تھا جو جھوٹ بولتا ہے، تنور میں جو عورت مرد ننگے بدن نظر آئے وہ زنا کار ہیں خون کے دریا میں جو غوطے لگا رہا تھا اور پتھر نگل رہا تھا وہ سود خور ہے (کہ وہ لوگوں کا خون چوس کر حرام کھاتا تھا) کریہہ منظر شخص جو آگ دہکا رہا تھا دوزخ کا داروغہ مالک تھا باغ میں جو دراز قد انسان اور اس کے چاروں طرف بچے نظر آتے تھے وہ ابراہیم علیہ السلام تھے اور یہ بچے وہ کم سن تھے جو دین فطرت پر مرے۔'' یہاں پر حاضرین مسجد میں سے ایک مسلمان نے آنحضرت ﷺ کو ٹوک کر کہا: ''یا رسول اللہ! اور مشرکین کے بچے؟ فرمایا: ''اور وہ بھی۔'' (کیونکہ وہ ہوش میں آنے سے پہلے دین فطرت ہی پر مرے) پھر سلسلۂ گفتگو آگے بڑھا اور فرمایا: ''اور فرشتوں نے بتایا کہ پہلی عمارت جس میں ہر عمر کے لوگ تھے عام اہل ایمان کا مسکن ہے اور دوسری عمارت جو اس سے بہتر تھی اور جس میں ہر سن وسال کے

کچھ آدمی ملے وہ شہیدوں کا مقام ہے اور یہ لوگ جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا وہ تھے جنہوں نے نیک اعمال کے ساتھ برے اعمال بھی کیے خدا نے ان سے درگزر کیا۔'' [1]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب تعبیر الرؤیا بعد صلوۃ الصبح:٧٠٤٧ وکتاب الجنائز:١٣٨٦۔

مشاہدات ومسموعات

عالم بیداری

﴿ أَفَتُمٰرُونَهُ عَلٰى مَا يَرٰى ۝ ﴾ (۵۳/ النجم:۱۲)

''پیغمبر جو کچھ دیکھتا ہے کیا اس پر تم اس سے جھگڑتے ہو۔''

انبیا علیہم السلام کے حواس عام اصناف انسانی کے حواس سے زیادہ لطیف ہوتے ہیں یا ہمارے حواس کے ماسوا ان کے کچھ اور بھی حواس ہوتے ہیں، جن سے عام انسان اسی طرح بیگانہ ہیں جس طرح مادرزاد نابینا ایک تیز نگاہ نوجوان کی قوت بینائی اور لطف نظر سے ناآشنا ہے۔

مشاہداتِ نبوی ﷺ عام مادی واقعات نہیں جن کی روایت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خود اپنے علم یا رؤیت یا سماعت سے کر سکتے، بلکہ وہ ان واقعات سے اسی قدر جان سکتے تھے، جن کو آنحضرت ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے کبھی کبھی ظاہر فرمایا، اس لئے روایاتِ حدیث میں مشاہدات نبوی ﷺ کا احاطہ نہیں ہوسکا ہے اور نہ عام امت کے عمل دین کے لئے ان کیفیات مافوق کا علم ضروری ہے، بہر حال لفظ وعبارت کے حدود میں جہاں تک ممکن ہے ہم ان کے احاطہ کی کوشش کرتے ہیں۔

مشاہداتِ نبوی ﷺ کی فہرست میں سب سے پہلی چیز روح القدس یا روح الامین یا جبریل نامی فرشتہ کی رؤیت ہے، جو سب سے پہلے غار حرا میں نظر آیا اور اس کے بعد کچھ زمانہ تک وہ آپ کی نگاہ سے اوجھل رہا [1] اور آنحضرت ﷺ کو اس کی وجہ سے تکلیف رہی۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ مکہ میں آپ کے چند سال ایسے گزرے کہ آپ کو صرف غیب کی آوازیں سنائی اور روشنی دکھائی دیتی تھی اور کوئی چیز آپ کو نظر نہیں آتی تھی۔ [2] غالباً یہی فترۃ الوحی کا زمانہ ہے، یہ زمانہ ختم ہوگیا تو آپ نے ایک دن آواز سنی، نظر اٹھا کر دیکھا تو آسمان وزمین کے بیچ ایک کرسی پر وہی فرشتہ بیٹھا ہوا نظر آیا، [3] مگر عموماً وہ کسی نہ کسی شکل میں نظر آتا، صحیح روایتوں میں ہے کہ جبریل صرف دو دفعہ اپنی اصلی صورت میں آپ کو نظر آئے، آپ نے اس وقت دیکھا کہ ان کے جسم پر چھ سو پر ہیں اور ان کے دونوں بازوؤں نے افق کو گھیر لیا ہے [4] جبریل کے علاوہ دوسرے فرشتگانِ الٰہی بھی بارگاہ نبوت میں آیا کرتے تھے، جس کی تفصیل نزول ملائکہ کے عنوان میں گزر چکی ہے۔

فرشتوں کے مقابل دوسری ہستی شیطان کی ہے، یہ قوت شر ہے، جس سے کوئی انسان محفوظ نہیں رہ سکتا،

---

[1] صحیح بخاری:۳، ۴ ومسلم باب بدء الوحی: ۴۰۳ تا ۴۰۹۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب کم اقام النبی ﷺ بمکۃ: ۶۱۰۴۔ [3] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بدء الوحی: ۴۰۶۔

[4] صحیح بخاری، بدء الخلق: ۳۲۳۲، ۳۲۳۳ وکتاب التفسیر، سورۃ والنجم: ۴۸۵۵ تا ۴۸۵۸؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء: ۴۳۴۔

سب سے پہلے اس سے حضرت آدم علیہ السلام کی آزمائش ہوئی اور خدا نے یہ نتیجہ ظاہر کیا:

﴿ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۱۱۵) ''ہم نے آدم میں استقلال نہیں پایا۔''

سفر ایوب اور قرآن میں ہے کہ اس سے حضرت ایوب علیہ السلام کی بھی آزمائش ہوئی اور وہ اس امتحان میں پورے اترے۔ انجیل میں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام بھی شیطان سے آزمائے گئے اور انہوں نے کامیابی سے اس میدان کو سر کیا۔ حدیث صحیح میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہے۔'' پوچھنے والے نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ کے ساتھ بھی ہے؟ فرمایا: ''ہاں لٰكِنَّهٗ اسلم لیکن وہ مسلمان ہو گیا ہے یا مطیع ہو گیا ہے، ایک دفعہ کا واقعہ ارشاد فرمایا: ''میں نماز پڑھ رہا تھا کہ شیطان مجھے چھیڑنے لگا اور میری نماز توڑنے لگا تو خدا نے مجھے اس پر غلبہ عطا کیا۔'' [1]

جنت و دوزخ گو اور عالم کی چیزیں ہیں لیکن نگاہوں سے پردہ اٹھ جائے تو سامنے آ جائیں، آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ایک دفعہ سورج گرہن ہوا، آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ نماز کو کھڑے ہوئے اور بہت دیر تک قراءت، رکوع اور سجدہ میں مصروف رہے، اسی اثنا میں صحابہ نے دیکھا کہ آپ نے ایک بار ہاتھ آگے کو بڑھایا، پھر دیکھا کہ آپ کسی قدر پیچھے ہٹے، نماز کے بعد لوگوں نے دریافت کیا، تو فرمایا: ''اس وقت میرے سامنے وہ تمام چیزیں پیش کی گئیں، جن کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، جنت اور دوزخ کی تمثیل اسی دیوار کے پاس دکھائی گئی، میں نے بہشت کو دیکھا کہ انگور کے خوشے لٹک رہے ہیں چاہا کہ توڑ لوں اگر میں توڑ سکتا تو تم تا قیامت اس کو کھا سکتے تھے پھر میں نے دوزخ کو دیکھا جس سے زیادہ بھیانک چیز میں نے آج تک نہیں دیکھی لیکن میں نے اس میں زیادہ تر عورتوں کو پایا۔'' لوگوں نے سوال کیا یا رسول اللہ! یہ کیوں۔ فرمایا کہ ''اپنے خاوندوں کی ناشکری کے سبب اگر ایک عورت پر تم عمر بھر احسان کرو اور صرف ایک دفعہ وہ تمہارے کسی فعل سے آزردہ ہو جائے تو وہ کہے گی کہ میں نے کبھی تمہارا اچھا برتاؤ نہیں دیکھا۔ میں نے اس دوزخ میں اس چور کو دیکھا جو حاجیوں کا اسباب چرایا کرتا تھا میں نے اس میں ایک یہودی عورت کو دیکھا جس پر اس لئے عذاب ہو رہا تھا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا تھا اس کو نہ کچھ کھانے کو دیتی تھی اور نہ چھوڑتی تھی کہ وہ زمین پر گری پڑی چیزیں کھائے اور آخر اسی بھوک سے اس نے جان دے دی۔'' [2]

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں جنت میں جا نکلا تو دیکھا یہاں کے باشندوں میں بڑی تعداد ان کی ہے جو دنیا میں غریب تھے اور دوزخ میں جا کر دیکھا تو ان میں بڑی تعداد عورتوں کی پائی۔'' [3] عمر

---

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة ابلیس: ۳۲۸۴۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الکسوف، باب صلوة الکسوف جماعة: ۱۰۵۲، ۷۴۵ وصحیح مسلم، باب صلوة الکسوف، باب ما عرض النبی ﷺ فی صلوة الکسوف من امر الجنة والنار: ۲۱۰۰ تا ۲۱۰۲ تا میں پورے واقعہ کی تفصیل ہے امام بخاری رحمہ اللہ نے مختلف ابواب میں متفرقاً نقل کیا ہے کسی ایک باب میں پوری تفصیل نہیں۔ ''ض''

[3] صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء فی صفة الجنة: ۳۲۴۱۔

کے اخیر سال میں آپ ﷺ شہدائے احد کے مقبرے میں تشریف لے گئے اور وہاں سے واپس آ کر آپ نے ایک خطبہ دیا، اسی درمیان میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں اپنے حوض (کوثر) کو یہیں سے دیکھ رہا ہوں اور مجھ کو زمین کے خزانہ کی کنجیاں حوالہ کی گئیں، اے لوگو! مجھے یہ خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم شرک کرنے لگو گے لیکن ڈرتا اس سے ہوں کہ اس دنیا کی دولت میں پڑ کر آپس میں رشک وحسد نہ کرنے لگو۔'' ❶

منبر مبارک مسجد نبوی ﷺ میں تھا اور اسی سے متصل ازواج مطہرات کے حجرے بھی تھے جن میں سے ایک میں جسد اقدس سپرد خاک ہے آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے اور میرا منبر میرے حوض پر رکھا ہے۔'' ❷

محدثین نے اس حقیقت کو مختلف تاویلوں سے ظاہر کرنا چاہا ہے لیکن ہمارے نزدیک اس کی صحیح تشریح یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ایسا مشاہدہ کرایا گیا۔ معمول تھا کہ تہجد کی نماز کے لئے جب آپ بیدار ہوتے تو امہات المومنین کو بھی جگا دیتے، ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ آپ ﷺ ایک شب خواب سے بیدار ہوئے تو فرمایا: ''سبحان اللہ! آج شب کو کیا کیا دولت کے خزانے اور کیا کیا فتنے نازل ہوئے ہیں ان حجروں میں رہنے والیوں (ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن) کو کون جگائے، اے افسوس! دنیا میں کتنی عورتیں سامان آرائش سے آراستہ ہیں مگر آخرت میں وہ ننگی ہوں گی۔'' ❸ (کہ دنیا میں وہ جامۂ عملی سے برہنہ تھیں۔)

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن آپ ﷺ مدینہ سے باہر تشریف لے گئے، ایک ٹیلے پر چڑھے پھر فرمایا: ''اے لوگو! جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ تم دیکھ رہے ہو؟'' لوگوں نے عرض کی، نہیں یا رسول اللہ ﷺ! فرمایا: ''میں تمہارے گھروں کے درمیان فتنوں کو بارش کی طرح برستے دیکھ رہا ہوں۔'' ❹ (یہ غالباً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے بعد کے واقعات کا مشاہدہ تھا۔)

آنحضرت ﷺ کو ہر حال میں اپنی امت کی فکر دامن گیر رہتی تھی ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے زمین کے تمام کناروں کو میری نگاہوں کے سامنے کر دیا، میں نے ان کے مغرب ومشرق کو دیکھا، میری امت کی سلطنت ان تمام کناروں تک پہنچ جائے گی جو مجھے دکھائے گئے ہیں، مجھے سرخ وسپید (سونا چاندی) کے دونوں خزانے دیے گئے ہیں میں نے خدا کے حضور میں دعا کی کہ بار الہا! میری امت کو کسی عالمگیر قحط سے برباد نہ کرنا اور نہ ان پر ان کے سوا کسی غیر دشمن کو مسلط کرنا، حکم ہوا کہ میرے دربار میں فیصلہ کی تبدیلی نہیں ہوتی میں نے تمہاری یہ

❶ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الصلوة علی الشهید: ۱۳۴۴؛ کتاب الرقاق، باب یحذر من زهرة الدنیا: ٦٤٢٦۔

❷ صحیح بخاری، کتاب فضل الصلاة فی مسجد...... وباب فضل مابین القبر والمنبر: ۱۱۹٦۔

❸ صحیح بخاری، کتاب التهجد، باب تحریض علی قیام اللیل: ۱۱۲٦۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب قول النبی ﷺ: ویل للعرب: ۷۰٦۰ وصحیح مسلم، کتاب الفتن، باب نزول الفتن کمواقع القطر: ۷۲٤٥۔

دعا قبول کی، تو اب میری امت کو کوئی دوسرا تباہ نہ کرے گا بلکہ وہ خود ایک دوسرے کو تباہ کریں گے۔" [1] مسلمانوں کی پوری تاریخ اس مشاہدۂ اقدس کی تفسیر ہے۔ گزشتہ انبیائے کرام کی تمثیلیں اکثر آپ کو دکھائی گئی ہیں اور معراج اور عالم رؤیا کے علاوہ بیداری کے عالم میں بھی یہ مشاہدے ہوئے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ سفر میں (غالباً سفر حج) جاتے ہوئے وادی ازرق سے گزرے آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: "یہ کون سی وادی ہے؟" لوگوں نے کہا، یہ وادی ازرق ہے فرمایا: "گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ موسیٰ گھاٹی سے اتر رہے ہیں اور ان کی زبان پر تلبیہ (صدائے حج) جاری ہے۔" اس کے بعد ہرشا کی گھاٹی آئی، فرمایا: "یہ کون سی گھاٹی ہے؟" لوگوں نے بتایا کہ یہ ہرشا کی گھاٹی ہے فرمایا: "گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ متی کے بیٹے یونس علیہ السلام سرخ اونٹنی پر سوار ہیں، کمبل کا جبہ پہنے ہیں، اونٹنی کی نکیل کھجور کی چھال کی ہے اور وہ لبیك اللّٰھم لبیك کہتے جا رہے ہیں۔" [2]

معراج کے واقعہ میں یاد ہوگا کہ جب کفار نے بیت المقدس کا نقشہ دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "وہ مجھے اچھی طرح یاد نہ تھا کہ دفعتہً اللہ تعالیٰ نے اس کو میری نگاہوں کے سامنے کر دیا وہ ایک ایک چیز کو پوچھتے جاتے تھے اور میں جواب دیتا جاتا تھا۔" [3]

ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک دن آپ ﷺ کسی قبرستان سے گزر رہے تھے، فرمایا: "ان دو قبروں پر عذاب ہو رہا ہے۔" "یہ عذاب کسی گناہ کبیرہ کی پاداش میں نہیں ہے ایک کو اس بات پر سزا دی جا رہی ہے کہ وہ طہارت کے وقت پردہ نہیں کرتا تھا، یا یہ کہ پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا، دوسرے کے عذاب کا سبب یہ ہے کہ وہ لوگوں کی چغلی کھایا کرتا تھا۔" اس کے بعد آپ نے ایک درخت کی سبز ٹہنی کو دو ٹکڑے کر کے دونوں پر کھڑا کر دیا اور فرمایا: "شاید ان کی تسبیح و تہلیل سے ان کی سزاؤں میں تخفیف ہو۔" [4]

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک دفعہ آپ ﷺ دوپہر کو گھر سے نکلے تو آپ کے کانوں میں ایک آواز آئی فرمایا: "یہ یہود پر ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے۔" یہ بخاری کی روایت ہے۔ [5]

طبرانی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "یہود کو ان کی قبروں میں جو عذاب دیئے جا رہے ہیں، ان کی آوازیں میرے کانوں میں آ رہی ہیں۔" [6] ایک جہاد میں مسلمانوں کی طرف ایک آدمی مارا گیا تھا لوگوں نے کہا وہ شہید ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "ہرگز نہیں میں نے اس کو دوزخ میں دیکھا ہے کیونکہ اس نے مال غنیمت میں سے ایک عبا چرائی تھی۔" اس کے بعد آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ اعلان کر دیں کہ

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب ھلاك الامة بعضھم ببعض: ۷۲۵۸۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء: ۴۲۰۔ [3] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب حدیث الاسراء: ۳۸۸۶ وصحیح مسلم باب الاسراء: ۴۲۸۔ [4] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب عذاب القبر من الغیبة والبول: ۱۳۷۸۔ [5] بخاری، کتاب الجنائز، باب التعوذ من عذاب القبر: ۱۳۷۵۔

[6] ارشاد الساری قسطلانی شرح حدیث مذکور، ج ۲، ص: ۵۲۷۔

جنت میں صرف اہل ایمان جائیں گے۔ ❶

عمرو بن عامر خزاعی عرب میں پہلا شخص ہے جس نے جانوروں کو دیوتاؤں کے نام نذر کرنے کی بدعت پیدا کی۔ بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں نے جہنم کو دیکھا اس کے شعلے ایک دوسرے کو توڑ رہے ہیں اور اس میں عمرو بن عامر کو دیکھا کہ وہ اپنی آنتیں گھسیٹ رہا ہے۔'' ❷

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ ایک دفعہ بنی نجار کے نخلستان میں جا نکلے آپ ایک خچر پر سوار تھے اور جان نثار ساتھ ساتھ تھے کہ دفعتہً خچر اس زور سے بھڑکا کہ قریب تھا کہ آپ گر پڑیں، پاس پانچ چھ قبریں تھیں دریافت فرمایا: ''ان قبروں کو کوئی جانتا ہے؟'' ایک نے کہا ہاں یا رسول اللہ! میں جانتا ہوں فرمایا: ''یہ لوگ کب مرے ہیں۔'' عرض کیا کہ یہ لوگ شرک کی حالت میں مرے ہیں۔ فرمایا: ''ان لوگوں کی ان کی قبروں میں آزمائشیں ہو رہی ہیں اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ تم مردوں سے ڈر کر ایک دوسرے کو دفن کرنے میں ڈرنے لگو گے تو میں خدا سے دعا کرتا کہ تم کو بھی عذاب قبر کی وہ آوازیں سنائے جو میں سن رہا ہوں۔'' ❸

ایک دفعہ آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ کسی طرف کو تشریف لے جا رہے تھے، اتنے میں ایک سخت بدبو پھیلی فرمایا: ''جانتے ہو یہ کیسی بدبو ہے؟ یہ ان لوگوں کی بدبو ہے جو مسلمانوں کی غیبت کرتے ہیں۔'' ❹

حاکم میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ کسی طرف جا رہے تھے آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے بلال! جو میں سن رہا ہوں تم سن رہے ہو؟'' عرض کی نہیں یا رسول اللہ ﷺ! فرمایا: ''تم نہیں سنتے کہ مردوں پر عذاب ہو رہا ہے۔'' ❺ مستدرک حاکم، کتاب الزہد۔ امام احمد، بزار اور بیہقی کی شعب الایمان میں ہے کہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پینے کی کوئی چیز مانگی تو لوگ شہد اور پانی لے آئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ دیکھ کر رونے لگے لوگوں نے گریہ کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ ایک دن میں خدمت نبوی ﷺ میں حاضر تھا تو دیکھا کہ آپ ہاتھ سے کوئی چیز ہٹا رہے ہیں اور مجھے کوئی چیز ہٹانے کی نظر نہیں آتی تھی تو میں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ کس چیز کو ہٹا رہے ہیں؟ فرمایا: ''یہ دنیا ہے جو میرے سامنے متمثل ہو کر آئی ہے، میں نے اس سے کہا کہ میرے پاس سے چلی جا، تو اس نے کہا، اگر آپ مجھ سے بچ گئے تو آپ کے بعد کے لوگ مجھ سے نہیں بچ سکتے۔'' ❻

---

❶ جامع ترمذی، ابواب السیر، باب ماجاء فی الغلول: ۱۵۷٤۔ ❷ بخاری، کتاب المناقب، باب قصة خزاعة: ۳۵۲۱، ٦٤۲٤۔ ❸ صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب عرض مقعد المیت من الجنة: ۷۲۱۳۔

❹ مسند احمد بن حنبل، ج۳، ص: ۳۵۱۔ ❺ احمد، ج۳، ص: ۲۵۹؛ حاکم، ج۱، ص: ٤۰۔

❻ مستدرك حاکم، ج٤، ص: ۳۰۹؛ شعب الایمان: ۱۰۵۱۸ ذہبی نے لکھا ہے کہ بخاری وغیرہ نے اس کے ایک راوی عبدالصمد کو متروک کہا ہے۔

اسراء یا معراج

﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل:۱)

اسراء کے معنی ''رات کو چلانے یا لے جانے کے ہیں۔'' چونکہ آنحضرت ﷺ کا یہ حیرت انگیز معجزانہ سفر رات کو ہوا تھا، اس لئے اس کو اسراء کہتے ہیں اور قرآن مجید نے اسی لفظ سے اس کو تعبیر کیا ہے، ﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل:۱) ''پاک ہے وہ خدا جو رات کے وقت اپنے بندے کو لے گیا۔'' معراج ''عروج'' سے نکلا ہے جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں، چونکہ احادیث میں آپ ﷺ سے لفظ عرج بی مجھ کو اوپر چڑھایا گیا، مروی ہے، اس لئے اس کا نام معراج پڑا۔

انبیا اور سیر ملکوت

انبیا علیہم السلام کے روحانی حالات و واقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اولوالعزم پیغمبروں کو آغاز نبوت کے کسی خاص وقت اور مخصوص ساعت میں یہ منصب رفیع حاصل ہوتا ہے اور اس وقت شرائط رؤیت کے تمام مادی پردے ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیے جاتے ہیں، اسباب ساعت کے دنیاوی قوانین ان کے لئے منسوخ کر دیے جاتے ہیں، قیود زمانی و مکانی کی تمام فرضی بیڑیاں ان کے پاؤں سے کاٹ ڈالی جاتی ہیں، آسمان و زمین کے مخفی مناظر بے حجابانہ ان کے سامنے آتے ہیں اور وہ اس کے بعد نور کا حلۂ بہشتی پہن کر فرشتوں کے روحانی جلوس کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں پیش ہوتے ہیں اور اپنے اپنے رتبہ اور درجہ کے مناسب مقام پر کھڑے ہو کر فیض ربانی سے معمور اور غرق دریائے نور ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض مقربان خاص کو یہ درجہ عطا ہوتا ہے کہ وہ حریم خلوت گاہ قدس میں بار پا کر قاب قوسین (دو کمانوں کے فاصلہ) سے بھی نزدیک تر ہو جاتے ہیں اور پھر وہاں سے اپنے منصب کا فرمان خاص لے کر اسی کاشانہ آب و خاک میں واپس آجاتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب نبوت عطا ہوتی ہے تو ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَکَذٰلِکَ نُرِیۡۤ اِبۡرٰہِیۡمَ مَلَکُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ (۶/ الانعام:۷۵) ''اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمان اور زمین کی بادشاہی دکھاتے ہیں۔'' یہ سیر ملکوت یعنی آسمان و زمین کی بادشاہی کا مشاہدہ کیا ہے، یہی اسراء و معراج ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے متعلق توراۃ میں مذکور ہے۔

''یعقوب بیر سبع سے نکلا اور حاران کی طرف روانہ ہوا اور وہاں ایک مقام پر جا کر لیٹا کیونکہ سورج ڈوب گیا تھا اور اسی مقام سے کچھ پتھر اپنے سر کے نیچے رکھ لئے اور وہیں سو رہا، وہاں خواب میں دیکھا کہ زمین سے آسمان تک ایک زینہ لگا ہوا ہے، جس پر سے خدا کے فرشتے چڑھ اور اتر رہے ہیں اور خدا اس پر کھڑا ہے اور اس نے کہا میں ہوں خداوند، تیرے باپ ابراہیم اور

اسحاق کا خدا، جس زمین پر تو سویا ہے وہ تجھ کو اور تیری نسل کو دوں گا۔'' (تکوین۔۲۸)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر جلوۂ حق کا پرتو نظر آیا، وہی ان کی معراج ہے، دیگر انبیائے بنی اسرائیل کے مشاہدات ربانی اور سیاحت روحانی کی تفصیل سے تورات کے صفحات معمور ہیں، عیسائیوں کے مجموعۂ انجیل میں یوحنا رسول کا مکاشفہ بہ تفصیل مذکور ہے، جس میں ان کو خواب کے اندر بہت سے روحانی مناظر دکھائے گئے ہیں اور قیامت کے واقعات تمثیلی رنگ میں ان کے سامنے پیش کئے گئے ہیں، یہ پورا مکاشفہ جس کو ہم سفر نامہ ملکوت کہہ سکتے ہیں ۲۲ بابوں میں ختم ہوا ہے اور ان میں آثار قیامت جزا و سزا اور جنت و دوزخ وغیرہ کے متعلق اکثر ایسی باتیں بیان کی ہیں جو قرآن مجید کے بالکل مطابق ہیں اور ان کو تمام مسلمان پسند کرتے ہیں۔ مجوس اپنے پیغمبر زردشت کے متعلق بھی معراج کا ایک طویل افسانہ سناتے ہیں جس میں زیادہ تر آنحضرت ﷺ کے واقعات معراج کے نقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، پیروان بدھ بھی نخلِ حکمت کے سایہ میں بودھ کے مشاہدہ ربانی کا ایک قصہ بیان کرتے ہیں۔

بہرحال اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ ہمیشہ سے سیر ملکوت انبیائے مقربان الٰہی اور مدعیان قرب الٰہی کے سوانح کا جزو رہی ہے اور ہر ایک نے اپنے اپنے منصب اور رتبہ کے مطابق اس عالم کے مشاہدہ کا فیض حاصل کیا ہے، اسلام نے اس خزانہ کو یہاں تک عام کیا ہے کہ اہل ایمان کے لئے دن میں پانچ دفعہ اس دربار کے کسی نہ کسی گوشہ تک رسائی ممکن کر دی ہے کہ ((الصلوۃ معراج المؤمنین))۔

معراج نبوی ﷺ

لیکن حضور ﷺ چونکہ سرور انبیا اور سید اولاد آدم تھے، اس لئے اس حظیرۂ قدس اور بارگاہ لامکان میں آپ ﷺ کو وہاں تک رسائی حاصل ہوئی جہاں تک کسی فرزند آدم کا قدم اس سے پہلے نہیں پہنچا تھا اور وہ کچھ مشاہدہ کیا جو اب تک دوسرے مقربان بارگاہ کی حد نظر سے باہر رہا تھا۔

معراج نبوی کا وقت و تاریخ اور تعداد وقوع

اس امر میں اختلاف ہے کہ معراج کب اور کس تاریخ کو واقع ہوئی اور ایک دفعہ ہوئی یا مختلف اوقات میں، صحیح و مستند روایات کے مطابق اور جمہور علما کی رائے کے موافق معراج صرف ایک دفعہ واقع ہوئی جو لوگ تعدد کے قائل ہیں اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ چونکہ روایتوں میں جزئیاتِ معراج کے بیان میں اختلاف ہے، اس لئے انہوں نے رفع اختلاف کے لئے متعدد دفعہ معراج کا وقوع تسلیم کیا ہے۔ [1] تاکہ ہر مختلف فیہ واقعہ ایک ایک جداگانہ معراج پر منطبق کیا جائے لیکن درحقیقت یہ ایک فرض محض ہے جس کو واقعیت سے کوئی تعلق نہیں مستند اور صحیح روایات ہمارے سامنے ہیں اور ان میں تعدد معراج کا اشارہ تک نہیں ہے، ایک ایسے اہم مافوق مشاہدۂ بشری اور

[1] امام سہیلی نے روض الانف شرح سیرۃ ابن ہشام میں اسی استدلال کی بنا پر تعدد کا میلان ظاہر کیا ہے، ج۱، ص: ۲۴۴ مصر۔

طویل واقعہ کے متعلق جو اس وقت واقع ہوا جب مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور جس قدر تھی وہ بھی پراگندہ حال اور منتشر الخیال تھی اور ایک ایسے واقعہ کے متعلق جس کے رواۃ اکثر وہ لوگ ہیں جو اس وقت پیدا نہیں ہوئے تھے یا بہت چھوٹے تھے یا مدنی لوگ ہیں جن کو قبل ہجرت کے واقعات کی ذاتی اور بلاواسطہ واقفیت نہ تھی اگر جزئیات میں معمولی اختلاف یا بعض واقعات کی ترتیب میں تقدم و تاخر واقع ہوا ہے تو ان کی تطبیق کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں خود ہمارے سامنے روزانہ واقعات پیش آتے رہتے ہیں ان کے جزئیات کی تفصیل اگر مختلف راویوں سے سنیں یا مختلف اوقات میں ہم خود بیان کریں تو ترتیب واقعات اور دیگر جزئی امور میں بیسیوں اختلافات پیدا ہو جائیں گے بااین ہمہ اصل معاملہ اور اس کے اہم اجزا کے وقوع میں شک وشبہ نہ ہوگا۔

بعض ارباب سیر نے دو دفعہ معراج کا ہونا ظاہر کیا ہے جن میں وہ ایک کو اسراء اور دوسرے کو معراج کہتے ہیں کہ قرآن میں اسراء اور احادیث میں معراج آیا ہے، انہوں نے اس کی ضرورت اس لئے سمجھی ہے کہ قرآن کے پندرھویں پارہ میں اسراء کا بیان ہے، اس میں صرف مکہ سے بیت المقدس تک کا سفر مذکور ہے اور قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جسم کے ساتھ حالت بیداری میں ہی ہوا، حالانکہ معراج میں تو آسمان کا سفر ہوا ہے اور عجیب وغریب واقعات پیش آئے ہیں اور بعض روایتوں میں یہ تصریح ہے کہ یہ خواب تھا، بہر حال یہ بھی استنباط اور قیاس سے آگے نہیں بڑھتا، قرآن مجید کے الفاظ خواب و بیداری دونوں کے متحمل ہیں، اس بنا پر اس میں کوئی شک نہیں کہ معراج ایک ہی دفعہ واقع ہوئی ہے۔

علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح کی ہے کہ ''یہی جمہور محدثین، متکلمین اور فقہا کی رائے ہے اور روایات صحیحہ کا تواتر بھی بظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے اور اس سے عدول نہیں کرنا چاہئے۔'' [1] حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کے تعدد معراج کے قول کو بالکل لغو اور بے سند اور خلاف سیاق احادیث ٹھہرایا ہے۔ [2]

معراج کے وقت اور زمانہ کی تعیین میں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ یہ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے جب کہ تاریخ اور سنہ کی تدوین نہیں ہوئی تھی اور عرب میں عموماً اسلام سے پہلے کسی خاص سنہ کا رواج نہ تھا، تاہم وقت کے متعلق اتنا تو یقینی طور پر معلوم ہے کہ رات کا وقت تھا خود قرآن مجید میں ہے اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا یعنی (لے گیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو رات کے وقت) اور تمام روایات بھی اس پر متفق اللفظ ہیں لیکن صحیح دن اور تاریخ کا پتہ لگانا نہایت مشکل ہے، محدثین کے ہاں کسی سے بھی بروایت صحیحہ اس کی تصریح موجود نہیں ہے۔

ارباب سیر نے بعض صحابہ، تابعین اور تبع تابعین سے کچھ روایتیں کی ہیں لیکن ان کی تصریحات مختلف ہیں، تاہم اتنی بات پر بلا اختلاف سب کا اتفاق ہے کہ یہ بعثت اور آغاز وحی [3] کے بعد اور ہجرت سے پہلے کا واقعہ

[1] شرح مواهب، جلد ۱، ص: ۲۵۵۔ [2] تفسير القرآن العظيم، الجزء الثالث، ص: ۲۲۔

[3] صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں معراج کے بیان میں شریک نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ یہ قبل آغاز وحی کے ہوا، اس کا مطلب محض فرشتوں کا آنا ہی نفس معراج نہیں، تفصیل آگے آئے گی۔

ہے جو مکہ معظمہ میں پیش آیا۔

مہینہ کی تعیین کے متعلق ارباب سیر کے پانچ اقوال ہیں کوئی (۱) ربیع الاول کہتا ہے (۲) کسی نے ربیع الآخر کی روایت کی، (۳) بعض رجب کی تعیین کرتے ہیں، (۴) بعض رمضان یا (۵) شوال کہتے ہیں یہ آخری روایت سدی کی ہے جس کو ابن جریر طبری اور بیہقی نے نقل کیا ہے، اس کی روایت ہے کہ معراج ہجرت سے ۱۷ مہینے پیشتر واقع ہوئی، ہجرت اوائل ربیع الاول میں ہوئی ہے، اس بنا پر ۱۷ مہینے پیشتر آخر رمضان ہوگا یا آغاز شوال لیکن کون نہیں جانتا کہ سدی پایہ اعتبار سے ساقط ہے، واقدی سے ابن سعد نے دو روایتیں کی ہیں [1] ایک یہ کہ "سنیچر کی شب تھی، ۱۷ تاریخ تھی اور رمضان کا مہینہ تھا، ہجرت (ربیع الاول سنہ ۱ھ) سے ۱۸ مہینے پیشتر کا یہ واقعہ ہے" دوسری یہ ہے کہ "یہ ہجرت سے ایک سال پہلے ۱۷ ربیع الاول کا واقعہ ہے۔" واقدی نے ان روایات میں کسی قدر تصریح کے ساتھ دن اور تاریخ اور وقت بتا دیا ہے لیکن ہمارے علمائے رجال کی عدالت میں ان کی شہادت کوئی بڑی قدر و قیمت نہیں رکھتی، چنانچہ ان روایتوں میں بھی جس روایت میں وقت اور یا تاریخ کی جس قدر تفصیل زیادہ ہے، اسی قدر وہ زیادہ نامعتبر ہے کیونکہ اس کی سند ناتمام ہے، دوسرے مہینوں کی روایتیں بھی اسی قسم کی ہیں، ابن قتیبہ دینوری (المتوفی ۲۶۷ھ) اور علامہ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۴۶۳ھ) نے رجب کی تعیین کی ہے اور متاخرین میں امام رافعی اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے (روضہ میں) اسی کو تیقن کے ساتھ ظاہر کیا ہے اور محدث عبدالغنی مقدسی نے بھی اسی مہینہ کو اختیار کیا ہے بلکہ ۲۷ تاریخ کی بھی تصریح کر دی ہے اور علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ لوگوں کا اسی پر عمل ہے اور بعضوں کی رائے ہے کہ یہی قوی ترین روایت ہے کیونکہ اصول یہ ہے کہ جب کسی بات میں اسلاف کا اختلاف ہو اور کسی رائے کی ترجیح پر کوئی دلیل قائم نہ ہو تو بظن غالب وہ قول صحیح ہوگا جس پر عمل درآمد ہو اور جو لوگوں میں مقبول ہو۔ [2] اس مسئلہ کے حل کی ایک صورت یہ ہے کہ متاخرین کے نقول، قیاسیات، استنباطات اور مجادلات سے جو دس سے زیادہ مختلف اقوال پر مشتمل ہیں قطع نظر کر لیا جائے تو دیکھا جائے کہ قدیم راویوں کی اصل تصریحات کیا کیا ہیں اور کثرت روایت اور گمان صحت کا راجح پہلو کس کی جانب ہے، چنانچہ یہ تصریحات حسب ذیل ہیں:

نام راوی	روایت	کیفیت سند
(۱) ابن سعد بواسطہ واقدی از حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص و ام سلمہ و عائشہ و ابن عباس و ام ہانی رضی اللہ عنہم	۱۷ ربیع الاول ہجرت سے ایک سال قبل	ابن سعد نے یہ روایت متعدد مسلسل طریقوں سے صحابہ سے نقل کیا ہے۔
	=	
	=	
(۲) موسیٰ بن عقبہ بواسطہ زہری	ہجرت سے ایک سال قبل	موسیٰ بن عقبہ کی سیرت معتبر ترین کتب سیرت میں ہے۔
(۳) زہری بواسطہ سعید بن مسیب	=	

[1] ابن سعد، ج ۱، ص: ۱۴۳۔ [2] یہ تمام تفصیل زرقانی، ج ۱، ص: ۳۵۵ و ۳۵۸ میں مذکور ہے۔

(۴) عروہ بن زبیر از حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا	ہجرت سے ایک سال قبل	=
(۵) قتادہ	=	یہ تابعی ہیں۔
(۶) مقاتل	=	=
(۷) ابن جریج	ہجرت سے ایک سال قبل	=
(۸) ابراہیم بن اسحاق الحربی	۲۷ ربیع الآخر ہجرت سے ایک سال پہلے	=
(۹) مسلم بن قتیبہ	ہجرت سے ۱۸ ماہ پیشتر	یہ مؤرخ ہیں۔
(۱۰) عمرو بن شعیب از حضرت عمرو بن العاص	۱۷ ربیع الاول ہجرت سے ایک سال پہلے	=
(۱۱) سُدی	ہجرت سے ۱۷ یا ۱۶ مہینے پیشتر	سدی پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔

متاخرین نے امام زہری کے انتساب سے دو مختلف اقوال نقل کیے ہیں، ایک ہجرت سے پانچ سال قبل، اور دوسرا بعثت سے پانچ سال بعد، پہلے قول کے ناقل علامہ ابن حجر (فتح الباری جلد ۷ ص ۱۵۵ مصر) ہیں اور ان کا بیان ہے کہ قاضی عیاض، امام قرطبی اور امام نووی شارحین صحیح مسلم اسی کے مؤید ہیں لیکن امام نووی کی شرح صحیح مسلم مطبوعہ ہندوستان (ص ۹۱) اور قسطلانی کی سیرۃ مواہب لدنیہ (مطبوعہ مصر مع زرقانی) میں دوسرا قول منقول ہے۔ زرقانی [1] نے جلد اول فصل معراج میں اس اختلاف پر حیرت ظاہر کی ہے، افسوس ہے کہ قلمی نسخے موجود نہیں، ہمارا خیال ہے کہ یہ اختلاف کتابت کی غلطی اور مسامحت سے پیدا ہوا ہے، اسی طرح اسد الغابہ، ابن اثیر مطبوعہ مصر (ص ۲۰) میں سدی کی نسبت لکھا ہے کہ ''وہ کہتا ہے کہ معراج ہجرت سے چھ مہینے (ستۃ اشھر) پہلے ہوئی یہ ۶ درحقیقت ۱۶ ہے ستۃ اشھر کے بجائے ستۃ عشر شھراً چاہیے جیسا کہ حافظ ابن کثیر نے اس سے (تفسیر اسراء) نقل کیا ہے اور جو اس کی ۱۷ مہینے والی روایت کے قریب قریب ہے جو طبری و بیہقی میں ہے، چھٹی صدی میں علامہ ابن اثیر نے کسی قیاس یا استنباط تاریخی کی بنا پر ہجرت سے تین سال پہلے معراج کا وقوع تسلیم کیا ہے مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہے، کسی اور نے ان کا ساتھ نہیں دیا ہے اور نہ کہیں سیرت کی امہات کتب میں یہ تاریخ مذکور ہے، بجز اس قیاس کے کہ ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں واقعہ معراج کو ابوطالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات سے پہلے نقل کیا ہے اور یہ دونوں حادثے ہجرت سے تین سال پہلے پیش آئے تھے اس سے اشارۃً سمجھا جاسکتا ہے کہ ابن اسحاق کا خیال تھا کہ معراج ہجرت سے تین سال پہلے ہوئی۔

ہم نے مقدمہ کی پوری روداد ناظرین کے سامنے رکھ دی ہے جس سے معلوم ہوا ہوگا کہ قدیم روایوں کا ایک بڑا حصہ ایک سال قبل ہجرت کا زمانہ متعین کرتا ہے، ایک دو بزرگ ۷ یا ۸ مہینے کی مدت اور بڑھا دیتے ہیں، متاخرین میں سے بعض اصحاب نے جو قیاس تاریخی سے تین سال یا پانچ سال قبل ہجرت کا زمانہ متعین کرنا چاہا

[1] یہ تمام روایات مختلف ماخذوں سے جمع کی گئی ہیں، اول ابن سعد میں ہے دوم، چہارم یازدہم تفسیر ابن کثیر، (سورہ اسراء، ص: ۴۰) میں ہے، ہشتم تفسیر ابن جریر (۱۵،۲،۷) میں ہے، پنجم و ششم تفسیر ابن حبان (اسراء، ص: ۵) میں ہے، بقیہ اقوال و روایات کے لئے فتح الباری، زرقانی، شرح شفاء عیاض، استیعاب ابن عبدالبر، اسد الغابہ ابن اثیر اور روض الانف (ذکر معراج) دیکھیے۔

ہے اس کا مبنی یہ ہے کہ بخاری میں ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نماز پنجگانہ کی فرضیت سے پہلے وفات پا چکی تھیں۔ نماز بالاتفاق معراج میں فرض ہوئی پھر بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ہجرت سے تین سال پہلے وفات پائی اور دوسرے راویوں نے بیان کیا ہے کہ ہجرت سے پانچ سال پہلے انتقال کیا ان مقدمات کو یکجا کر کے انہوں نے یہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے کہ معراج کا واقعہ ہجرت سے تین سال پہلے (بقول ابن اثیر) پانچ سال پہلے (بقول قاضی عیاض وغیرہ) پیش آیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ استدلال اس وقت درست ہوسکتا تھا جب یہ ثابت ہوتا کہ نماز پنجگانہ کی فرضیت اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات دونوں ایک ساتھ ہوئیں یا کم از کم یہ کہ پہلا واقعہ دوسرے واقعہ کے چند روز بعد پیش آیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے معراج (فرضیتِ نماز پنجگانہ) سے پہلے وفات پائی، اب یہ نہیں معلوم ہے کہ ایک مہینہ پہلے یا سال بھر پہلے یا چند سال پہلے اس لئے ان قیاسات سے معراج کی تاریخ متعین نہیں ہوسکتی۔

بہرحال ابتدائی راویوں کی کثیر جماعت جن میں بعض نہایت معتبر اور ثقہ ہیں، اسی جانب ہیں کہ یہ ہجرت یعنی ربیع الاول سنہ ۱ھ سے ایک سال یا ڈیڑھ سال پہلے کا واقعہ ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جامع صحیح میں گو کوئی تاریخ نہیں بیان کی ہے لیکن ترتیب میں وقائع قبل ہجرت کے سب سے آخر میں اور بیعت عقبہ اور ہجرت سے متصلاً پہلے واقعہ معراج کو جگہ دی ہے اور ابن سعد نے بھی سیرت میں واقعہ معراج کا یہی موقع ترتیب میں رکھا ہے، اس سے حدیث اور سیرت کے ان دو اماموں کا یہی منشا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہجرت سے کچھ ہی زمانہ پہلے خواہ وہ ایک سال ہو یا اور کچھ کم و بیش معراج کا زمانہ متعین کرتے ہیں، آگے چل کر ہم یہ بتائیں گے کہ ہمارے نزدیک قرآن مجید سے یہی مستنبط ہوتا ہے کہ معراج اور ہجرت کے بیچ میں کوئی زمانہ حائل نہ تھا بلکہ معراج درحقیقت ہجرت ہی کا اعلان تھا۔ مہینہ کی تعیین مشکل ہے جو لوگ ہجرت یعنی ربیع الاول سنہ ۱ھ سے ایک سال پہلے کہتے ہیں ان کے حساب سے اگر یہ ربیع الاول ادھر شامل کر لیا جائے تو ادھر معراج کا ایک مہینہ ربیع الآخر پڑے گا اور اگر شامل نہ کیا جائے تو ربیع الاول ہی رہے گا اور اگر عام مشہور و معمول بہ رجب کی تاریخ اختیار کی جائے تو ہجرت سے ایک سال ۶ مہینے پیشتر کا واقعہ تسلیم کرنا ہوگا۔

معراج کی صحیح روایتیں

واقعہ معراج چونکہ نہایت اہم، ہماری مادی کائنات سے ماورا اور قیاس استنباط اور عقل انسانی کی سرحد سے بالاتر ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اس باب میں صحیح و خالص روایتوں کی پیروی کی جائے، احادیث و سیر کی کتابوں میں اس واقعہ کو کثیر التعداد صحابیوں نے بیان کیا ہے۔ علامہ زرقانی نے ۴۵ صحابیوں کو نام بنام گنایا ہے اور حدیث و تفسیر کی جن جن کتابوں میں ان کی روایتیں مذکور ہیں ان کی تصریح کی ہے۔ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے

تفسیر (بنی اسرائیل) میں ان میں سے اکثر روایتوں کو یکجا کر دیا ہے، ان میں صحیح، مرفوع، قوی، ضعیف، موقوف، مرسل، منکر سبھی قسم کی روایتیں ہیں، صحاح ستہ میں معراج کا واقعہ مستقلاً صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مذکور ہے، ترمذی اور نسائی وغیرہ میں ضمناً اور مختصراً یہ واقعات مختلف ابواب میں کہیں کہیں آ گئے ہیں، امام بخاری اور مسلم نے اس واقعہ کو حضرت ابوذر، حضرت مالک بن صعصعہ، حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابوہریرہ، حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سات اکابر صحابہ سے روایت کیا ہے، ان میں چار پچھلے صحابیوں نے صرف چند متفرق جزئیات بیان کئے ہیں۔

صحیحین میں واقعہ معراج کا مسلسل اور مفصل بیان حضرت ابوذر، حضرت مالک بن صعصعہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ نے تین طرق سے روایت کی ہے، ایک طریقہ میں صحیح مسلم باب الاسراء اور صحیح بخاری کتاب التوحید، اخیر راوی وہی ہیں لیکن اس میں یہ تصریح نہیں ہے کہ انہوں نے خود آنحضرت ﷺ سے سنا یا کسی صحابی نے ان سے بیان کیا، دوسرے طریقہ میں (صحیح بخاری باب ذکر الملائکہ و باب المعراج اور صحیح مسلم باب الاسراء) یہ تصریح ہے کہ انہوں نے حضرت مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ سے سنا اور تیرے طریقہ (صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ و کتاب الانبیاء) میں یہ صراحت ہے کہ انہوں نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے بھی سنا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے متعدد اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے معراج کا واقعہ سنا تھا اور اسی لئے ان کا بیان سب سے زیادہ جامع اور مفصل ہے۔ تابعین میں سے متعدد بزرگوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اس روایت کو صحیحین میں نقل کیا ہے، مثلاً: ثابت البنانی، ابن شہاب زہری، قتادہ اور شریک بن عبداللہ بن ابی نمر، ان میں محفوظ تر بیان ثابت کا ہے، شریک کی روایت متعدد امور میں ثقات کی روایت کے مخالف ہے اور اسی لئے امام مسلم نے صحیح مسلم باب الاسراء میں اس کی طرف اشارہ کر کے چھوڑ دیا ہے اور لکھ دیا ہے کہ "ان کی روایت میں تقدم و تاخر اور زیادت و نقص ہے۔"

حضرت مالک بن صعصعہ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہما نے یہ تصریح کی ہے کہ انہوں نے معراج کے واقعہ کو لفظ بلفظ اور حرف بحرف آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے سنا ہے گو یہ دونوں بزرگوار جلیل القدر صحابی ہیں لیکن حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ میں ایک مزید خصوصیت یہ ہے کہ وہ سابقین اسلام میں ہیں اور وقوع معراج سے پہلے ہی مکہ میں آ کر اسلام لا چکے تھے، حضرت مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ انصاری ہیں، اس بنا پر معراج کی تمام روایتوں میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت کو ہم سب سے مقدم سمجھتے ہیں۔

معراج کا واقعہ

الغرض جب اسلام کی سخت اور پرخطر زندگی کا باب ختم ہونے کو تھا اور ہجرت کے بعد اطمینان و سکون کے ایک نئے دور کا آغاز ہونے والا تھا تو وہ شب مبارک آئی اور اس شب مبارک میں وہ ساعت ہمایوں آئی جو دیوان قضا میں سرور عالم ﷺ کی سیر ملکوت کے لئے مقرر تھی اور جس میں پیش گاہ ربانی سے احکام خاص کا

اجرا اور نفاذ عمل میں آنے والا تھا، رضوان جنت کو حکم ہوا کہ آج مہمان سرائے غیب کو نئے ساز و برگ سے آراستہ کیا جائے کہ شاہد عالم آج یہاں مہمان بن کر آئے گا، روح الامین کو فرمان پہنچا کہ وہ سواری جو بجلی سے زیادہ تیز گام اور روشنی سے زیادہ سبک خرام ہے اور جو خطہ لاہوت کے مسافروں کے لئے مخصوص ہے، حرم ابراہیم (کعبہ) میں لے کر حاضر ہو، کارکنان عناصر کو حکم ہوا کہ آب و خاک کے تمام مادی احکام و قوانین تھوڑی دیر کے لئے معطل کر دیے جائیں اور زمان و مکان، سفر و اقامت، رؤیت و سماعت، تخاطب و کلام کی تمام طبعی پابندیاں اٹھا دی جائیں۔

صحیحین میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ مکہ میں تھے کہ آپ کے گھر کی چھت کھلی اور جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے، انہوں نے پہلے آپ کا سینہ مبارک چاک کیا، پھر اس کو آب زمزم سے دھویا اس کے بعد سونے کا ایک طشت ایمان اور حکمت سے بھر لائے اور ان کو سینہ مبارک میں ڈال کر بند کر دیا، پھر آپ کا ہاتھ پکڑ کر آسمان پر لے گئے جب آپ آسمان پر پہنچے تو جبرئیل علیہ السلام نے آسمان کے داروغہ سے کہا کہ ''کھولو'' اس نے کہا، کون؟ انہوں نے جواب دیا: جبرئیل۔ اس نے پوچھا: کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں میرے ساتھ محمد ﷺ ہیں۔ اس نے سوال کیا: کیا وہ بلائے گئے ہیں؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔

بہر حال آپ ﷺ جب پہلے آسمان پر چڑھے تو آپ کو ایک شخص بیٹھا ہوا نظر آیا، جس کے دائیں بائیں بہت سی پرچھائیاں تھیں، جب وہ دائیں دیکھتا تھا تو ہنستا تھا اور جب بائیں جانب نگاہ پڑتی تھی تو وہ روتا تھا۔ آنحضرت ﷺ کو دیکھ کر اس نے کہا: ''مرحبا اے نبی صالح! اے فرزند صالح!'' آنحضرت ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا: ''یہ کون ہیں؟'' انہوں نے کہا: یہ آدم ہیں اور ان کی دائیں بائیں پرچھائیاں ان کی اولاد کی روحیں ہیں، دائیں جانب والے جنتی اور بائیں جانب والے دوزخی ہیں، اس لئے وہ دائیں جانب دیکھتے ہیں تو ہنستے ہیں اور جب بائیں جانب نگاہ کرتے ہیں تو روتے ہیں، اس کے بعد آپ دوسرے آسمان پر پہنچے تو اسی قسم کا سوال و جواب ہوا اور ہر آسمان پر کسی نہ کسی پیغمبر سے ملاقات ہوئی، پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام اور چھٹے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے (حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے پیغمبروں کی منازل کی تعیین نہیں بیان کی)۔ بہر حال حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کو ادریس علیہ السلام کے پاس سے لے کر گزرے، انہوں نے آپ کو دیکھ کر کہا: ''مرحبا اے نبی صالح اور برادر صالح!'' آپ نے نام پوچھا: حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نام بتایا، پھر یہی واقعہ حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کے ساتھ پیش آیا، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے نبی صالح اور برادر صالح کہہ کر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نبی صالح اور فرزند صالح کہہ کر آپ کا خیر مقدم کیا، اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کو اوپر لے گئے اور آپ

اس مقام پر پہنچے جہاں قلم (قدرت) کے چلنے کی آواز آتی تھی اس موقع پر خداوند تعالیٰ نے آپ کی امت پر پچاس وقت کی نماز فرض کی آنحضرت ﷺ اس عطیۂ ربانی کو لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے تو انہوں نے پوچھا کہ ''خدا نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''پچاس وقت کی نماز'' انہوں نے کہا: ''خدا کے پاس دوبارہ جائیے کہ آپ کی امت اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔'' آنحضرت گئے اور خدا نے ایک حصہ کم کردیا، آپ واپس آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ''دوبارہ خدا کے پاس جائیے، آپ کی امت اس کی بھی متحمل نہیں ہوگی'' آپ گئے تو خدا نے ایک حصہ کی پھر تخفیف کردی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر کہا: ''آپ کی امت میں اس کی بھی قوت نہیں۔'' آپ پھر گئے تو خدا نے اس تعداد کو گھٹا کر پانچ وقت کردیا اور ارشاد ہوا: ''گو نمازیں پانچ وقت کی ہوں گی لیکن ثواب ان ہی پچاس وقتوں کا ملے گا۔ کیونکہ میرے حکم میں تغیر وتبدل نہیں ہوتا۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تخفیف مزید کی غرض سے آنحضرت ﷺ کو پھر خدا کے پاس مراجعت کا مشورہ دیا لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: ''اب تو مجھے شرم آتی ہے۔'' اس کے بعد آپ کو سدرۃ المنتہیٰ کی سیر کرائی گئی جو ایسے مختلف رنگوں سے ڈھکا ہوا تھا جن کو آپ جان نہ سکے، پھر آپ کو حضرت جبریل علیہ السلام جنت میں لے گئے، وہاں آپ ﷺ کو موتی کی عمارتیں نظر آئیں اور آپ نے دیکھا کہ اس کی مٹی مشک کی ہے۔ [1]

کتب حدیث میں واقعہ معراج کے متعلق یہ مقدم ترین اور معتبر ترین روایت ہے اس کے بعد حضرت مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ کی روایت کا درجہ ہے۔ اس روایت میں بہت سی باتیں پہلی روایت سے زائد ہیں، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس کی تصریح نہیں کہ آپ ﷺ اس وقت بیدار تھے یا خواب میں تھے۔ اس میں یہ ہے کہ آپ خواب و بیداری کی درمیانی حالت میں تھے، پہلی روایت میں ہے کہ آپ نے دیکھا کہ آپ کے گھر کی چھت کھلی اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے اور اس میں ہے کہ آپ ﷺ حطیم یا حجر [2] میں لیٹے ہوئے تھے کہ حضرت جبرائیل آئے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت میں براق کا ذکر نہیں اور اس روایت میں ہے کہ آپ براق پر سوار ہوکر گئے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت میں منازل انبیا نہیں بیان کئے گئے ہیں لیکن اس روایت میں نام بنام تصریح ہے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اوقاتِ نماز کی تعداد تین مرتبہ میں گھٹائی گئی۔ [3] لیکن اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اس غرض سے خدا کے پاس پانچ بار گئے، ان دونوں روایتوں میں درحقیقت اجمال و

---

[1] بخاری، کتاب الصلوة، باب کیف فرضت الصلوٰة فی الاسراء:۳۴۹؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء برسول اللہ ﷺ:۴۱۵۔ [2] حطیم اور حجر ایک ہی مقام کے دو نام ہیں یہ مختصر سی جگہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصل تعمیر کردہ کعبہ میں سے قریش کے بنائے ہوئے کعبہ کی چاردیواری سے باہر رہ گئی ہے اور اندر داخل نہیں ہوسکی ہے۔

[3] بخاری، کتاب احادیث الانبیاء: ۳۳۴۲، ۳۸۸۷؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء:۴۱۵۔

تفصیل کا فرق ہے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت مجمل ہے اور حضرت مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں واقعات کی کسی قدر تفصیل ہے، تاہم یہ دوسری روایت بھی معراج کے تمام واقعات وسوانح کو محیط نہیں ہے، اب ذیل میں ہم صحیحین کی تمام روایتوں کو ملا کر معراج کے سوانح ومشاہدات کا ایک جامع بیان لکھتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اصل خانہ کعبہ کے جو عمارت بنائی تھی وہ سیلاب سے کئی دفعہ گر چکی تھی اور پھر بنی تھی، اس طرح قریش کے زمانہ میں جب آنحضرت ﷺ ہنوز پیغمبر نہیں ہوئے تھے، سیلاب سے گر گئی، قریش نے اس کو دوبارہ تعمیر کرنا چاہا تو سرمایہ کی کمی کے باعث ایک طرف اندر کی تھوڑی سی زمین چھوڑ کر دیوار کے طول کو کم کر دیا، اس طرح کعبہ کی تھوڑی سی زمین چار دیواری سے باہر رہ گئی اور اب تک اسی طرح اس زمین کا نام حجر اور حطیم ہے، قریش کے نوجوان اور رؤسا اکثر یہاں رات کو سویا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ بھی کبھی کبھی یہاں آرام فرمایا کرتے تھے، نبوت سے پہلے بھی آپ ﷺ کو حالت رؤیا میں فرشتے نظر آتے تھے۔ ❶

جس شب کو معراج ہوئی آپ ﷺ اسی مقام ❷ پر استراحت فرما رہے تھے، بیداری اور خواب کی درمیانی حالت تھی، آپ نے دیکھا کہ آپ کے گھر کی چھت کھلی اور حضرت جبریل علیہ السلام نازل ہوئے، ان کے ساتھ چند اور فرشتے بھی تھے، پہلے وہ آپ کو چاہِ زم زم کے پاس لے گئے اور وہاں آپ ﷺ کے سینۂ مبارک کو چاک کیا اور قلبِ اطہر کو نکال کر آبِ زمزم سے دھویا، اس کے بعد سونے کا ایک طشت ایمان وحکمت سے معمور لایا گیا۔ جبریل نے اس طشت سے ایمان وحکمت کے خزانہ کو لے کر آپ ﷺ کے سینہ میں رکھ کر اس کو برابر کر دیا۔ اس کے بعد گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا سپید رنگ کا ایک

❶ بخاري، كتاب التوحيد، باب قول الله: وكلم الله موسىٰ تكليما: ۷۵۱۷، كتاب احاديث الانبياء، باب كان النبي ﷺ تنام عينه و لا ينام قلبه: ۳۵۷۰۔ ❷ اس شب کو جس مقام پر آپ ﷺ استراحت فرماتے تھے اور جہاں معراج کا واقعہ پیش آیا، اس کی تعیین میں اختلاف بیان کیا جاتا ہے، صحیحین میں حضرت مالک اور حضرت انس رضی اللہ عنہما کی جو روایتیں ہیں ان میں بتصریح تمام یہ مذکور ہے کہ آپ ﷺ مسجد حرام (کعبہ) میں تھے اور اسی کے ایک بیرونی گوشہ میں جس کا نام حجر اور حطیم ہے آپ سو رہے تھے، یہ تو صحیحین کا بیان ہے، بعض نیچے درجے کی روایتوں میں ہے کہ ام ہانی رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کو میرے ہی گھر میں معراج ہوئی، ام ہانی رضی اللہ عنہا کا گھر شعب ابی طالب میں تھا، یہ روایت مشہور دروغ گو کلبی کی ہے، اس میں حد درجہ لغو وغریب ومنکر باتیں مذکور ہیں، مسند ابو یعلیٰ میں ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ عشاء کی نماز پڑھ کر ہم لوگوں کے ساتھ میرے ہی مکان میں سوئے، شب کو میری آنکھ کھلی تو آپ کو نہ پایا۔ رؤسائے قریش کی دشمنی کے باعث دل میں عجیب عجیب بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں، نیند نہ آئی، صبح اٹھ کر آنحضرت ﷺ نے معراج کا واقعہ بیان کیا اور فرمایا: ''میں رؤسائے قریش سے کہنے جاتا ہوں۔'' میں نے آپ کا دامن پکڑ لیا کہ خدا کے لئے ان سے نہ کہئے وہ تکذیب کریں گے اور آپ کی جان پر حملہ کریں گے لیکن آپ نے نہ مانا اور دامن جھٹک کر چلے گئے، ان روایتوں میں علاوہ اور لغویات کے عشاء اور صبح کی نماز و جماعت کی تصریح کس قدر غلط ہے کہ یہ نماز پنجگانہ تو عین شب معراج میں فرض ہوئی ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کی روایتوں کا صحیحین کے مقابلہ میں کیا درجہ اور کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟ اس لئے اس میں کوئی شک نہیں کہ معراج کی شب آپ ﷺ خانہ کعبہ میں تھے، البتہ بخاری ومسلم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ میں مکہ میں تھا کہ میرے گھر کی چھت کھلی اور جبریل آئے ہمارے نزدیک اس کی صحیح تعبیر یہ ہے کہ آپ ﷺ آرام تو خانہ کعبہ ہی میں فرما رہے تھے لیکن مشاہدہ آپ کو یہ کرایا گیا کہ آپ اپنے گھر میں ہیں اور اس کی چھت کھلی اور حضرت جبریل نازل ہوئے۔

لمبا جانور براق نامی لایا گیا جس کی تیز رفتاری کا یہ حال تھا کہ اس کا ہر قدم وہاں پڑتا تھا جہاں نگاہ کی آخری حد ہوتی تھی [1] آپ اس پر سوار ہو کر بیت المقدس آئے اور براق کو اس قلابہ میں باندھ کر جس میں انبیا اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے، آپ نے مسجد اقصیٰ کے اندر قدم رکھا اور وہاں دو رکعت نماز ادا کی، یہاں سے نکلے تو جبرائیل نے شراب اور دودھ کے دو پیالے آپ کے سامنے پیش کئے، آپ ﷺ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا۔ جبرائیل نے کہا کہ آپ نے فطرت کو پسند کیا۔ اگر شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی، بعدازیں جبرائیل آنحضرت ﷺ کو لے کر آسمان پر چڑھے، پہلا آسمان آیا تو جبرائیل نے دربان کو آواز دی، اس نے کہا: کون ہے؟ جبرائیل نے اپنا نام بتایا، پوچھا کہ تمہارے ساتھ اور کون ہے؟ جواب دیا محمد ﷺ ہیں پھر دریافت کیا، کیا وہ بلائے گئے ہیں؟ کہا: ہاں۔ یہ سن کر فرشتہ نے دروازہ کھول دیا اور مرحبا خوش آمدید کہا اور کہا کہ اس خبر کو سن کر آسمان والے خوش ہوں گے، خدا اہل زمین کے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتا ہے جب تک وہ آسمان والوں کو اس کا علم نہ بخشے وہ جان نہیں سکتے، اب آپ ﷺ پہلے آسمان میں داخل ہوئے تو ایک شخص نظر آیا جس کی داہنی اور بائیں طرف بہت سی پرچھائیں تھیں، جب وہ داہنی طرف دیکھتا تو ہنستا اور جب بائیں طرف دیکھتا تو رو دیتا تھا، وہ آپ ﷺ کو دیکھ کر بولا: مرحبا اے نبی صالح! اے فرزند صالح!'' آپ ﷺ نے جبریل سے دریافت کیا کہ ''یہ کون ہے؟'' جبریل نے بتایا کہ یہ آپ کے باپ آدم علیہ السلام ہیں ان کی دائیں اور بائیں طرف جو پرچھائیاں ہیں یہ ان کی اولادوں کی روحیں ہیں، داہنی طرف والے اہل جنت ہیں اور بائیں طرف والے دوزخی ہیں۔ اس لئے جب اُدھر دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور اِدھر دیکھ کر آزردہ ہوتے ہیں۔ اسی آسمان میں آپ ﷺ کو آمنے سامنے دو نہریں نظر آئیں، پوچھنے پر جبریل نے بتایا کہ یہ نیل اور فرات کی سوتیں ہیں، چلتے پھرتے آپ کو ایک اور نہر نظر آئی جس پر لؤلؤ وزبرجد کا ایک محل تعمیر تھا اور اس کی زمین مشک ازفر کی تھی جبریل نے کہا: یہ نہر کوثر ہے جس کو پروردگار نے مخصوص آپ ﷺ کے لیے رکھا ہے۔

اسی طرح ہر آسمان پر گزرتے گئے اور ہر آسمان کے دربان اور جبریل علیہ السلام سے اسی قسم کی گفتگو ہوتی گئی اور ہر ایک میں کسی نہ کسی پیغمبر سے ملاقات ہوئی، دوسرے میں حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام ملے جو دونوں خالہ زاد بھائی تھے ملاقات ہوئی، تیسرے میں حضرت یوسف علیہ السلام ملے جن کو حسن کا ایک حصہ عطا ہوا

---

[1] مسند احمد، ج۳، ص:۱٦٤ میں بروایت انس اور ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة بني اسرائيل: ۳۱۳۱، اور ابن جرير طبری، ج١٥، ص:٥ میں ہے کہ جب آپ ﷺ نے براق پر سوار ہونے کا قصد کیا تو اس نے شوخی کی، جبریل نے کہا کیوں شوخی کرتے ہو، تیری پشت پر آج تک محمد ﷺ سے زیادہ خدا کے نزدیک برگزیدہ کوئی دوسرا سوار نہیں ہوا، یہ سن کر براق پسینہ پسینہ ہو گیا، ابن جریر کی روایت کی نسبت حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس کے بعض الفاظ میں نکارت وغرابت ہے (تفسیر ابن کثیر، ج۳، ص:۵)، ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ غریب ہے، غريب لا نعرفه الا من حديث عبدالرزاق۔ (ترمذی، تفسير سورة بني اسرائيل: ۳۱۳۱)۔

تھا، چوتھے میں حضرت ادریس علیہ السلام سے ملاقات ہوئی جن کی نسبت خدا نے قرآن میں فرمایا ہے: ﴿ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝ ﴾ (۱۹/ مریم:۵۷) ''ہم نے اس کو ایک بلند مقام تک اٹھایا ہے۔'' اور پانچویں میں حضرت ہارون علیہ السلام سے ملے اور ہر ایک نے اے پیغمبر صالح اور اے برادر صالح کہہ کر خیر مقدم کیا، چھٹے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، انہوں نے کہا: مرحبا اے پیغمبر صالح اور اے برادر صالح!'' جب آپ ﷺ آگے بڑھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام رو پڑے آواز آئی کہ اے موسیٰ! اس گریہ کا کیا سبب ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: ''خداوندا! میرے بعد تو نے اس نوجوان کو معبوث کیا ہے، اس کی امت کے لوگ میری امت سے زیادہ بہشت میں جائیں گے۔'' ساتویں آسمان میں داخل ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مرحبا اے پیغمبر صالح اور اے فرزند صالح کہہ کر خیر مقدم کیا۔ جبریل نے بتایا کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت معمور (آباد گھر) سے پیٹھ لگائے بیٹھے تھے جس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ کو جنت کی سیر کرائی گئی جس کے گنبد موتی کے تھے اور زمین مشک کی تھی۔ [1] اس مقام تک پہنچے جہاں قلم قدرت کے چلنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ آگے بڑھ کر آپ سدرۃ المنتہیٰ (انتہا کی بیری کا درخت) تک پہنچے۔ اس درخت پر شانِ ربانی (امر اللہ) کا پرتو تھا جس نے آ کر جب اس کو چھالیا تو اس کی ہیئت بدل گئی اور اس میں حسن کی وہ کیفیت پیدا ہوئی جس کو کوئی زبان بیان نہیں کر سکتی اور اس میں رنگ برنگ کے ایسے انوار کی تجلی نظر آئی جن کو الفاظ ادا نہیں کر سکتے، یہی وہ مقام ہے جہاں سے چیزیں نیچے زمین پر اترتی ہیں اور زمین سے چڑھ کر اوپر وہاں جاتی ہیں۔ یہاں پہنچ کر حضرت جبرائیل علیہ السلام اپنی اصلی کمالی صورت میں آپ کے سامنے نمودار ہوئے، پھر شاہد مستور ازل نے چہرہ سے پردہ اٹھایا اور خلوت گاہ راز میں ناز و نیاز کے وہ پیغام ادا ہوئے جن کی لطافت و نزاکت الفاظ کے بوجھ کی متحمل نہیں ہو سکتی، ﴿ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ۝ ﴾ (۵۳/ النجم:۱۰) اس وقت آپ ﷺ کو بارگاہِ الٰہی سے تین عطیے مرحمت ہوئے۔ سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں جن میں اسلام کے عقائد و ایمان کی تکمیل اور اس کے دور مصائب کے خاتمہ کی بشارت ہے، رحمت خاص نے مژدہ سنایا کہ امت محمدی ﷺ میں سے ہر ایک جو شرک کا مرتکب نہ ہوا ہو کرم مغفرت سے سرفراز ہوگا اور ندا آئی اُمت پر پچاس وقت کی نماز فرض کی گئی۔ آپ ﷺ ان عطیوں کو لے کر واپس پھرے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچے تو انہوں نے دریافت کیا کہ بارگاہِ خاص سے کیا احکام عطا

[1] کتب روایت کی غیر محتاط کتابوں میں مثلاً: ابن ابی حاتم (تفسیر) ابن جریر طبری (تفسیر بنی اسرائیل) بیہقی (دلائل النبوۃ) میں جنت و دوزخ کے بہت سے عجیب و غریب مناظر و مشاہدات اور پیغمبروں اور فرشتوں کی تعجب انگیز ملاقاتوں اور گفتگوؤں کی تفصیل ہے، ان روایتوں کے ناقل ابو ہارون العبدی، ابو جعفر رازی اور خالد بن یزید ہیں۔ ابو ہارون عبدی اور خالد بن یزید تو مشہور دروغ گو ہیں ابو جعفر رازی کو گو بعضوں نے ثقہ کہا ہے لیکن اکثروں کے نزدیک وہ ضعیف اور راوی منکرات ہیں اور ان کی تنہا روایت قبول نہیں کی جاتی نیز ان روایتوں میں بہت سی لغو و منکر باتیں مذکور ہیں جن کو محدثین تسلیم نہیں کرتے علاوہ ازیں یہ مناظر و مشاہدات جیسا کہ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب تعبیر الرؤیا) میں ہے کہ معراج کے سوا ایک اور موقع پر آنحضرت ﷺ کو دکھائے گئے تھے سرے سے یہ معراج کے مشاہدات ہی نہیں۔

ہوئے ؟ فرمایا: ''امت پر پچاس وقت کی نماز۔'' موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''میں نے بنی اسرائیل کا خوب تجربہ کیا ہے آپ کی امت سے یہ بار نہ اٹھ سکے گا۔'' آپ واپس جایئے اور عرض کیجئے۔ آپ نے مراجعت کی اور عرض پرداز ہوئے کہ ''بارِ الٰہا! میری امت نہایت کمزور اور اس کے قویٰ نہایت ضعیف ہیں۔'' حکم ہوا کہ دس وقت کی نمازیں معاف ہوئیں لوٹے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر ٹوکا اور دوبارہ عرض کرنے کا مشورہ دیا۔ اس پر دس اور معاف ہوئیں، اسی طرح آپ ﷺ چند بار حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ سے بارگاہِ الٰہی میں عرض پرداز ہوتے رہے، یہاں تک کہ شب وروز میں صرف پانچ وقت کی نمازیں رہ گئیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر یہی مشورہ دیا کہ اب بھی مزید تخفیف کی درخواست کیجئے۔ فرمایا: ''اب مجھے اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے۔'' ندا آئی کہ ''اے محمد ﷺ! میرے حکم میں تبدیلی نہیں ہوگی۔ نمازیں پانچ ہوں گی لیکن ہر نیکی کا بدلہ دس گنا بخشوں گا یہ پانچ بھی پچاس ہوں گی، میں نے اپنے بندوں پر تخفیف کر دی اور اپنا فیصلہ نافذ کر دیا۔''

اب آسمان سے اُتر کر آنحضرت ﷺ زمین پر تشریف لائے اور بیت المقدس میں داخل ہوئے دیکھا کہ یہاں انبیا علیہم السلام کا مجمع ہے، حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام نماز میں مصروف ہیں۔ آپ نے ان میں سے چند پیغمبروں کی شکل وصورت بھی بیان کی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت فرمایا: ''ان کا لمبا قد اور گندمی رنگ تھا اور الجھے ہوئے گھونگر والے بال تھے اور شنوءہ کے قبیلہ کے آدمی معلوم ہوتے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قد میانہ اور رنگ سرخ وسپید تھا۔ سر کے بال سیدھے اور لمبے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حمام سے نہا کر نکلے ہیں، عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ثقفی (صحابی) سے ان کی صورت ملتی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صورت تمہارے پیغمبر (خود آنحضرت ﷺ) کی سی تھی۔ بہر حال اسی اثنا میں نماز (غالباً صبح کی نماز) کا وقت آ گیا، سرور انبیا علیہ السلام منصب امامت سے سرفراز ہوئے۔ [1] نماز سے فراغت ہوئی تو ندا آئی کہ ''اے محمد ﷺ! دوزخ کا داروغہ حاضر ہے، سلام کرو۔'' آپ ﷺ نے مڑ کر دیکھا تو داروغہ دوزخ نے سلام کیا۔ بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ شب معراج میں دجال بھی آپ ﷺ کو دکھایا گیا۔ [2]

---

[1] مسند احمد، سنن نسائی، کتاب الصلوة، باب فرض الصلوة: ٤٥١ اور سیرت ابن اسحاق (طبقات ابن سعد، ج۱، قسم۱، ص:۱۴۴) کی بعض روایتوں میں ہے کہ آسمان پر جانے سے پہلے ہی بیت المقدس میں انبیا نے آپ ﷺ کی اقتدا میں یہ نماز پڑھی تھی، صحیح بخاری میں اس کا ذکر نہیں۔ صحیح مسلم میں وقت کی تصریح نہیں مگر قرینہ سے مفہوم ہوتا ہے کہ یہ واپسی کا واقعہ ہے، (کتاب الایمان، باب ذکر المسیح ابن مریم: ٤٣٠) حافظ ابن کثیر نے اسی کو صحیح لکھا ہے (تفسیر سورۂ اسراء، ج۳، ص:۲۳) اور ہم نے اسی کی تقلید کی ہے، ترمذی (تفسیر سورۂ اسراء) اور مسند ابن حنبل میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ آنحضرت ﷺ نے مسجد اقصیٰ میں آتے جاتے سرے سے نماز ہی نہیں پڑھی، مگر صحیح مسلم کے مقابلہ میں اس کو کون تسلیم کرے گا؟

[2] صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکة: ٣٢٣٩۔

ان تمام منازل کے طے ہونے کے بعد آپ ﷺ مسجد حرام (کعبہ) میں صبح کو بیدار ہوئے۔ [1]

کفار کی تکذیب

خانہ کعبہ کے آس پاس رؤسائے قریش کی نشست رہتی تھی، آپ ﷺ بھی وہیں مقام حجر میں تشریف فرماتھے، صبح کو آپ نے ان سے اس واقعہ کو بیان کیا تو ان کو سخت اچنبھا ہوا، جو زیادہ کور باطن تھے انہوں نے آپ کو (نعوذ باللہ) جھٹلایا بعضوں نے مختلف سوالات کیے ان میں اکثر شام کے تاجر تھے، اور انہوں نے بیت المقدس کو بارہا دیکھا تھا، اور انہیں معلوم تھا کہ آنحضرت ﷺ بیت المقدس نہیں گئے ہیں، اس لئے آخر میں خاتمہ دلائل کے طور پر سب نے کہا کہ اے محمد! تم کہتے ہو کہ صرف ایک شب میں تم خانہ کعبہ سے بیت المقدس گئے اور واپس آئے، اگر یہ سچ ہے تو بتاؤ بیت المقدس کی کیا ہیئت ہے؟ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں: ''میرے ذہن میں عمارت کا صحیح نقشہ نہ تھا بہت بے قراری ہوئی کہ ناگاہ نظر کے سامنے پوری عمارت جلوہ گر کر دی گئی وہ سوال کرتے جاتے تھے اور میں اس کو دیکھ کر جواب دیتا جاتا تھا۔''

اتنا واقعہ تو صحیحین میں مذکور ہے لیکن واقدی، ابن اسحاق، ابن جریر طبری، ابن ابی حاتم، بیہقی اور حاکم میں جن کا مرتبہ کتب روایات میں بلند نہیں ہے اس واقعہ پر لوگوں نے عجیب وغریب حاشیے لگائے ہیں حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ صبح اٹھ کر آنحضرت ﷺ نے گھر والوں سے شب کا واقعہ بیان کر کے باہر جانا چاہا کہ اور لوگوں سے بیان کریں، تو میں نے دامن تھام لیا کہ اس کا قصد نہ کیجئے کفار صریح جھٹلائیں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ رات کو جب آپ کے اعزہ نے آپ کو بستر پر نہ پایا تو ان کو قریش کا خوف ہوا کہ انہوں نے آپ کو گزند تو نہیں پہنچایا، اور پہاڑوں اور غاروں میں آپ کو ڈھونڈنے لگے، ایک روایت میں ہے کہ معراج کی واپسی میں قریش کے ایک تجارتی قافلہ سے آپ ﷺ کی ملاقات ہوئی اور ان کے ساتھ کچھ واقعات پیش آئے جب لوگوں نے جھٹلایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اچھا تمہارا قافلہ پرسوں تک آجائے گا اس سے پوچھ لینا۔'' چنانچہ وہ آیا اور اس نے تصدیق کی انہی روایتوں کا ایک ٹکڑا یہ ہے کہ کچھ کفار دوڑے ہوئے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے کہ آج محمد ﷺ کعبہ میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے یہ کہہ رہے ہیں کہ رات کو وہ بیت المقدس گئے اور آئے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا واقعی یہ آپ فرمارہے ہیں؟'' لوگوں نے کہا: ہاں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تو میں آپ کو سچا جانتا ہوں اور اس پر ایمان لاتا ہوں۔'' کفار نے کہا: تم کھلم کھلا ایسی خلاف عقل بات کیونکر صحیح سمجھتے ہو! جواب دیا: میں تو اس سے بھی زیادہ خلاف عقل بات پر یقین رکھتا ہوں میں تو یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہر روز آپ ﷺ کی خدمت میں آسمان سے فرشتے آتے ہیں۔'' اسی دن

[1] معراج کے یہ تمام واقعات صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، کتاب التوحید، کتاب الانبیاء، باب المعراج، کتاب بدء الخلق میں اور صحیح مسلم، کتاب الایمان باب المعراج اور اس کے بعد متفرق ابواب متعلقہ معراج میں حرفاً حرفاً مذکور ہیں، ہم نے ان واقعات کے لکھنے میں صرف ترتیب وترجمہ کا فرض ادا کیا ہے۔

سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا لقب صدیق ہوگیا۔

لیکن یہ تمام قصے سرتاپا لغو اور باطل ہیں۔ ابن اسحاق اور ابن سعد نے تو سرے سے ان واقعات کے اسناد ہی نہیں لکھے ہیں ابن جریر طبری، بیہقی، ابن ابی حاتم، ابویعلیٰ، ابن عساکر اور حاکم نے ان کی سندیں ذکر کی ہیں، ان کے رواۃ ابوجعفر رازی، ابوہارون عبدی اور خالد ابن یزید بن ابی مالک ہیں، جن میں پہلے صاحب گو بجائے خود ثقہ ہیں، مگر بے سروپا حدیثوں کو بیان کرنے میں بے باک ہیں بقیہ دو مشہور دروغ گو، کاذب اور قصہ خواں ہیں ان ہی لغو قطعوں کا اختتامی جزو یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے لوگوں سے معراج کا واقعہ بیان کیا تو بہت سے مسلمانوں کے ایمان بھی متزلزل ہوگئے اور مرتد ہوگئے فارتد کثیر ممن اسلم .[1]

یہ قصہ غالباً قرآن مجید کی اس آیت کی غلط توضیح میں گھڑا گیا ہے:

﴿ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ ﴾ (۱۷/ الاسراء:۶۰)

''ہم نے یہ دکھاوا جو تجھ کو دکھایا ہے اس کو لوگوں کی آزمائش ہی کے لئے کیا ہے۔''

ابن سعد اور واقدی نے اس قصہ کو یوں ہی بے سند بیان کیا ہے۔ طبری، ابن ابی حاتم اور بیہقی وغیرہ کے معتمد ارکان وہی اصحاب ثلثہ ہیں جن کے اوصاف گرامی ابھی اوپر گزر چکے ہیں، ابن جریر نے اس آیت کے تحت میں جو روایتیں درج کی ہیں ان میں سے حسن، قتادہ اور ابن زید سے یہ واقعہ ارتداد مذکور ہے، لیکن ان کا سلسلہ ان سے آگے نہیں بڑھتا[2] اس واقعہ کے انکار کی سب سے پرزور دلیل ہمارے پاس یہ ہے کہ اس وقت تک مکہ میں جو اصحاب اسلام لائے تھے وہ گنے چنے لوگ تھے، جو ہم کو نام بہ نام معلوم ہیں، ان میں سے کسی کی پیشانی پر ارتداد کا داغ نہیں، واقعہ کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ کافروں میں بعض لوگ ایسے ہوں گے جو اس سے پہلے آپ کے سخت مخالف نہ ہوں اور اگر آپ کو پیغمبر نہ جانتے ہوں مگر آپ کو مفتری اور کاذب بھی نہ کہتے ہوں لیکن اس واقعہ معراج کے بعد سے انہوں نے بھی آپ کے ساتھ اس نیکی اور حسن ظن کا خیال اٹھا دیا ہو، قرآن مجید نے اس کو فِتْنَةً لِّلنَّاسِ ''لوگوں کے لئے آزمائش کہا ہے'' فِتْنَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ یعنی ''مومنوں اور مسلمانوں کے لئے آزمائش نہیں کہا ہے'' اور اگر ان کے لئے بھی آزمائش ہو تو اس آیت سے کہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس آزمائش میں پورے نہیں اترے۔

کیا آپ ﷺ نے معراج میں خدا کو دیکھا

معراج کے مشاہدات میں شئون وصفات کی جلوہ انگیزی اور آیات اللہ کی نیرنگی تو آپ نے دیکھی، لیکن کیا ذات الٰہی بھی تجلہ حجاب سے باہر آکر منصۂ حقیقت پر رونما ہوئی؟ یعنی دیدار الٰہی سے بھی آپ مشرف ہوئے؟ بعض روایتوں میں اس کا جواب اثبات میں ملتا ہے، صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے شریک بن عبداللہ

[1] سیرت ابن هشام، ج۱، ص: ۲٤۱ ومابعد میں یہ تمام واقعات موجود ہیں۔

[2] تفسیر ابن جریر، ج۱۵، ص: ۷۱، ۷۲۔

نے جو معراج کی روایت کی ہے اس کے آخر میں ہے:

((حتی جاء سدرة المنتھٰی و دنا الجبار رب العزة فتدلی حتی کان منه قاب قوسین او ادنی)) [1]

''آنحضرت ﷺ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تو عزت والا جبار (خدا) یہاں تک قریب ہوا اور جھک آیا کہ اس کے اور آپ ﷺ کے درمیان دو کمانوں یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا۔''

محدثین نے شریک کی اس روایت کے اس حصہ پر سخت اعتراضات کئے اور سب سے پہلے امام مسلم نے اس کی نسبت بے احتیاطی کا الزام قائم کیا ہے۔ صحیح مسلم باب المعراج میں شریک کی اس سند کو اور کسی قدر متن کو لکھ کر ناتمام چھوڑ دیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے فقدم فیه واخر وزاد ونقص ، [2] شریک نے اس روایت میں واقعات کو آگے پیچھے کر دیا ہے اور گھٹا بڑھا دیا ہے۔ امام خطابی نے لکھا ہے کہ ''صحیح بخاری میں کوئی حدیث ایسی نہیں جو بظاہر اس قدر قابل اعتراض ہو جس قدر یہ حدیث۔'' اس کے بعد اس حدیث کی تاویل بیان کر کے لکھا ہے:

فانه کثیر التفرد بمناکیر الالفاظ التی لایتابعه علیها سائر الرواة۔

''شریک ایسے منکر الفاظ خود تنہا بکثرت روایت کرتے ہیں جن کی تائید ان کے دیگر ہم درس راوی نہیں کرتے۔''

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے واقعہ معراج کو اور بہت سے لوگوں نے نقل کیا ہے مگر شریک کے سوا کسی اور نے ان الفاظ کی روایت نہیں کی ہے۔ امام بیہقی نے بھی یہی کہا ہے اور یہی حافظ ابن کثیر کی بھی تحقیق ہے [3] علامہ ابن حزم نے بھی اس کے متعلق قریب قریب یہی رائے ظاہر کی ہے [4] بعض علمائے رجال نے بھی شریک کی نسبت اچھی آرائیں نہیں ظاہر کی ہیں۔ نسائی اور ابن جارود کا قول ہے کہ ''وہ قوی نہیں۔'' یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں کہ ''اس سے حدیث نہ بیان کی جائے۔'' البتہ ابن سعید اور ابوداؤد نے ان کے وثوق کی شہادت دی ہے اسی لئے محدثین کا فیصلہ ان کے حق میں یہ ہے کہ جب وہ تنہا کسی بات کو بیان کریں تو ان کی وہ بات شاذ اور منکر قرار دی جائے گی۔'' [5] چنانچہ اس روایت میں یہ فقرہ بھی اسی قسم کا ہے۔

اصل یہ ہے کہ شریک کی یہ روایت سورۃ والنجم کی ان آیتوں کی تعبیر پر مبنی ہے:

﴿ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب کلم اللہ موسی تکلیما: ۷۵۱۷۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء: ۴۱۴۔ [3] بیہقی اور ابن کثیر کا قول تفسیر ابن کثیر، سورۂ اسراء، ج ۳، ص: ۳ میں ہے۔ [4] امام خطابی اور ابن حزم کے اقوال ابن حجر نے فتح الباری، ج ۳، ص: ۴۰۳ اور ۴۰۴ میں نقل کئے ہیں۔

[5] تهذیب التهذیب، ج ٤، ص: ۳۳۳ وما بعد۔

عَلٰی مَا یَرٰی ﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی ﴿۱۴﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی ﴿۱۵﴾ اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ﴿۱۷﴾ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ﴿۱۸﴾ ﴾

(۵۳/ النجم:۵ تا ۱۸)

''محمد (ﷺ) کو پُر زور اور طاقتور نے تعلیم دی وہ آسمان کے بلند تر افق پر تھا پھر قریب ہوا اور جھک آیا یہاں تک کہ دو تیر ناپ کے برابر یا اس سے بھی قریب تر ہو گیا پھر اس کے بندے کی طرف جو کچھ وحی کرنا تھی کی، دل نے جو کچھ دیکھا غلط نہیں دیکھا وہ جو کچھ دیکھتا ہے کیا تم لوگ اس سے اس کے متعلق آپس میں شک کرتے ہو، حالانکہ سدرۃ المنتہٰی کے نزدیک جس کے پاس جنت الماویٰ ہے، اس نے دوسری مرتبہ یقیناً اور بے شک اترتے ہوئے دیکھا جب کہ سدرۃ کو چھالیا تھا، جس نے چھالیا تھا نگاہ نہ جھپکی، نہ بہکی اور اس نے اپنے پروردگار کی عظیم الشان نشانیاں دیکھیں۔''

یہی آیتیں ہیں جن کی بنا پر صحابہ میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے، بعضوں کا خیال ہے کہ آپ کو خود خدا نظر آیا اور اکثر صحابہ یہ کہتے ہیں کہ وہ فرشتہ تھا۔ ترمذی (تفسیر سورۂ نجم) میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سدرۃ المنتہٰی کے پاس خود خدا کو دیکھا تھا۔ ترمذی میں ہے کہ ایک مقام پر کعب احبار (نومسلم یہودی عالم) سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ملاقات ہوئی کعب نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام اور اپنے دیدار کی موسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ میں تقسیم کر دی، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دو دفعہ شرف کلام حاصل ہوا اور آپ دو دفعہ خدا کے دیدار سے مشرف ہوئے، مسروق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ایک شاگرد نے یہ گفتگو ان سے جا کر نقل کی وہ نہایت برہم ہوئیں اور قرآن مجید کی آیتوں سے انہوں نے اس خیال کی تردید کی کہ خدا خود فرماتا ہے: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾ ''آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے اس آیت کو پیش کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ''ہاں سچ ہے مگر اس وقت جب خدا اپنے اصلی نور میں نمایاں ہو، آنحضرت ﷺ نے خدا کو دو دفعہ دیکھا تھا۔ ❶

صحیح مسلم و ترمذی میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے خدا کو بھی دیکھا ہے؟ فرمایا: ''وہ تو نور ہے میں اس کو کہاں دیکھ سکتا ہوں۔'' ❷ دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے صرف ایک نور دیکھا۔'' ❸

اکابر صحابہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مذہب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خدا کو نہیں بلکہ جبریل علیہ السلام کو دیکھا تھا اور ان ہی نے آپ کی طرف وحی کی تھی،

❶ یہ تمام روایتیں ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة والنجم :۳۲۷۸ تا ۳۲۸۰ میں ہیں اور ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے۔ ❷ مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء:۴۴۳ وترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة نجم:۳۲۸۲۔ ❸ مسلم، کتاب الایمان: ۴۴۴۔

چنانچہ صحیح بخاری و مسلم و ترمذی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو اس حالت میں دیکھا کہ ان کے چھ سو پر تھے۔ [1] صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی قسم کی روایت ہے۔ تمام صحابہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس مسئلہ پر سخت اصرار تھا، صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے کہ حضرت مسروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک بار پوچھا کہ مادر من! کیا آنحضرت ﷺ نے اپنے خدا کو دیکھا تھا؟ بولیں: ''یہ سن کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے، تین باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق اگر کوئی شخص روایت کرے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ جھوٹ کہتا ہے، جس نے یہ روایت کی کہ آنحضرت ﷺ نے خدا کو دیکھا تھا اس نے جھوٹ کہا ہے خدا خود کہتا ہے:

﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾ (٦/ الانعام:١٠٤)

''خدا کو نگاہیں نہیں پاسکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے اور وہ لطیف و خبیر ہے۔''

پھر فرماتا ہے:

﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ:٥١)

''اور کسی آدمی میں یہ قوت نہیں کہ اللہ سے کلام کرے لیکن یہ کہ بذریعہ وحی کے یا پردے کی آڑ سے۔''

ان آیتوں کو پڑھ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے خدا کو نہیں دیکھا البتہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں دوبار دیکھا۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شارح مسلم نے لکھا ہے [2] کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول حجت نہیں ہوسکتا، کیونکہ انہوں نے قرآن مجید کی آیات سے صرف عقلی استدلال کیا ہے آنحضرت ﷺ سے کوئی مرفوع روایت نہیں بیان کی ہے کہ ''آپ ﷺ نے خدا کو نہیں دیکھا تھا۔'' لیکن خود صحیح مسلم میں جس کی شرح میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے اسی مقام پر حضرت مسروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تکیہ لگائے ہوئے بیٹھا تھا انہوں نے کہا: ''اے ابو عائشہ! تین باتیں ایسی ہیں جن میں سے اگر کسی نے ایک کو بھی کہا تو اس نے خدا پر بڑا بہتان باندھا۔'' میں نے پوچھا: وہ کیا باتیں ہیں؟ فرمایا: ''جس شخص نے یہ کہا کہ محمد ﷺ نے خدا کو دیکھا تھا اس نے خدا پر بڑی تہمت لگائی، میں ٹیک لگائے بیٹھا تھا یہ سن کر سیدھا اٹھ بیٹھا اور کہا: اے ام المومنین! جلدی نہ کیجیے کیا خدا خود نہیں فرماتا:

﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴾ (٨١/ التکویر: ٢٣)

''اور اس نے اس کو افق المبین پر دیکھا۔''

---

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ:٣٢٣٢؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان: ٤٣٤؛ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورۃ والنجم:٣٢٧٧۔

[2] شرح صحیح مسلم نووی نولکشور، ص: ٩٧۔

﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴾ (۵۳/ النجم:۱۳)

''اور اس نے اس کو دوسری مرتبہ اترتے ہوئے دیکھا۔''

بولیں: سب سے پہلے خود میں نے اس کے متعلق آنحضرت ﷺ سے سوال کیا تھا آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ جبرائیل علیہ السلام تھے میں نے ان دو مرتبوں کے سوا ان کو اصلی صورت میں کبھی نہیں دیکھا۔'' [1] اس سے زیادہ مستند مرفوع روایت کیا ہوسکتی ہے برخلاف اس کے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے (جن سے روایتیں ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے خدا کو دیکھا) کبھی اپنی روایت میں یہ تصریح نہیں کی ہے کہ انہوں نے خود آنحضرت ﷺ سے اس کو سنا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ صحابہ میں سے کوئی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیر کا مخالف نہیں (تفسیر سورۂ اسراء، ج ۳، ص:۸) بلکہ اصل یہ ہے کہ بقول ابن حجر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے خیال کی تشریح میں بعض راویوں سے غلط فہمی ہوئی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ منشا نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ان ظاہری آنکھوں سے خدا کو دیکھا، بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دل کی آنکھوں سے جلوۂ ربانی کا مشاہدہ کیا، صحیح مسلم (متعلقات اسراء، ص:۸۴) اور جامع ترمذی (تفسیر والنجم) میں ان کے یہ الفاظ ہیں (رای بقلبه رای بفؤاده) دل کی آنکھوں سے دیکھا، چشم قلب سے مشاہدہ کیا۔ مردویہ نے اس سے بھی زیادہ ان کے تصریحی الفاظ نقل کئے ہیں:

لم يره رسول الله ﷺ بعينيه انما راه بقلبه۔ [2]

''آنحضرت ﷺ نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا بلکہ اپنے قلب سے دیکھا۔''

اس تشریح کے بعد اس باب میں کوئی نزاع باقی نہیں رہ جاتی، رہی یہ بات کہ دل کا دیکھنا اور قلب کا مشاہدہ کیا ہے؟ تو اس رمز کو وہی سمجھے جس کے دل میں نور بصیرت اور جس کے دل میں مشاہدہ کی طاقت ہو۔

معراج جسمانی تھی یا روحانی خواب تھا یا بیداری

ہمارے متکلمین اور شراح حدیث نے اس باب میں بے سود مباحث کا ایک انبار لگا دیا ہے، فیصلہ کی صحیح صورت یہ ہے کہ متکلمانہ اعتراضات، فلسفیانہ خدشات اور عقلی محالات اور نیز عامیانہ ظواہر پرستی اور جمہور کے خیالات کی بے جا حمایت کے وسوسوں سے خالی الذہن ہو کر صحیح روایتوں کے اصل الفاظ پر غور کیا جائے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ سورۂ اسراء (معراج) کی اس آیت کی نسبت:

﴿ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۶۰)

''ہم نے جو رؤیا (دکھاوا) تجھ کو دکھایا اس کو ہم نے لوگوں کے لئے صرف آزمائش بنایا ہے۔''

بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ یہ معراج کے متعلق ہے، رؤیا عربی زبان میں

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان: ۴۳۹۔ [2] فتح الباری، ج ۸، ص: ۴۶۸۔

''دکھاوا'' کو کہتے ہیں یعنی جو دیکھنے میں آئے اور عام طور سے اس کے معنی ''خواب'' کے ہیں اس لئے جو فریق معراج کو خواب بتاتا ہے وہ اس آیت کو اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرتا ہے، لیکن صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت میں یہ ان کی تصریح ہے کہ اس آیت میں رؤیا کے معنی مشاہدۂ چشم کے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ واقعہ معراج خواب نہ تھا بلکہ آنکھوں کا مشاہدہ تھا روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابن عباس فی قوله تعالیٰ: ﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ﴾ (١٧/ بنی اسرائیل: ٦٠) قال هی رؤیا عین اریها رسول الله ﷺ لما اسری به الی بیت المقدس۔ [1]

''ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں کہ ''ہم نے جو رؤیا تجھ کو دکھایا اس کو نہیں بنایا لیکن لوگوں کے لئے آزمائش'' کہتے ہیں کہ یہ آنکھ کا مشاہدہ تھا جو رسول اللہ ﷺ کو دکھایا گیا جب آپ ﷺ کو رات کے وقت بیت المقدس میں لے جایا گیا۔''

اس پر یہ لغوی بحث چھڑ گئی کہ رؤیا لغت میں ''آنکھ کے دیکھنے'' کو نہیں کہتے مگر ذرا غور کیجئے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر لغت عرب کا واقف کار اور کون ہوسکتا ہے، جب وہ رؤیائے عین کہتے ہیں تو کس کو انکار ہوسکتا ہے، علاوہ ازیں راعی اور متنبی بعض عرب شعرا نے ظاہری آنکھ سے دیکھنے کو بھی ''رؤیا'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

راعی کہتا ہے: فکبر للرؤیا وهشّ فواده۔

متنبی کا مصرع ہے: ورؤیاك احلی فی العیون من الغمض۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم، مسند ابن حنبل اور حدیث کی دیگر معتبر کتابوں میں جن میں معراج کے مسلسل اور تفصیلی واقعات درج ہیں ان سب کو ایک ساتھ پیش نظر رکھنے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ صحیحین کی دو روایتوں کے سوا باقی روایتوں میں خواب کا مطلق ذکر نہیں ہے، چنانچہ بخاری و مسلم اور مسند احمد بن حنبل میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی جو صحیح ترین روایت ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی وہ روایت جو ثابت البنانی کے ذریعہ سے ہے خواب کے ذکر سے قطعاً خالی ہے، اس لئے حسب محاورۂ عام اس کو بیداری کے معنی میں سمجھنا قطعی ہے، لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں جو شریک کے واسطہ سے ہے یہ مذکور ہے کہ یہ واقعہ آنکھوں کے خواب اور دل کی بیداری کی حالت میں پیش آیا، بخاری میں یہ حدیث کتاب التوحید اور باب صفة النبی ﷺ دو مقامات میں ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

((سمعت انس بن مالك يقول ليلة اسری برسول الله ﷺ من مسجد الكعبة انه جاء ه ثلثة نفر قبل ان يوحیٰ اليه وهو نائم فی المسجد الحرام فقال اولهم

[1] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب المعراج:٣٨٨٨۔

ایھم ھو فقال اوسطھم ھو خیرھم فقال اٰخرھم خذوا خیرھم فکانت تلك اللیلة فلم یرھم حتیٰ اتوہ لیلة اخریٰ فیما یریٰ قلبه وتنام عینه ولاینام قلبه وکذالك الانبیاء تنام اعینھم ولا تنام قلوبھم)) ❶

''انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو میں نے اس شب کا واقعہ جب آپ ﷺ کو کعبہ کی مسجد سے لے جایا گیا (معراج) بیان کرتے ہوئے سنا کہ اس سے پہلے کہ آپ کی طرف وحی بھیجی جائے آپ کے پاس تین شخص آئے اور آپ اس وقت مسجد حرام میں سوئے ہوئے تھے پہلے نے کہا: وہ کون ہے؟۔ بیچ والے نے کہا: ان (سونے والوں) میں جو سب سے بہتر ہے۔ پچھلے نے کہا: ان میں جو سب سے بہتر ہے اس کو لے لو، یہ رات ہوگئی، پھر آپ نے ان کو نہیں دیکھا یہاں تک کہ ایک اور رات کو وہ آئے۔ ❷ اس حالت میں کہ آپ کا دل دیکھتا تھا اور آپ کی آنکھ سوتی تھی لیکن آپ کا دل نہیں سوتا تھا اسی طرح پیغمبروں کی آنکھیں سوتی ہیں مگر ان کے دل نہیں سوتے۔''

((سمعت انس بن مالك یحدثنا عن لیلة اسری بالنبی ﷺ من مسجد الکعبة جاءہ ثلٰثة نفر قبل ان یوحیٰ الیه وھو نائم فی المسجد الحرام فقال اولھم ایھم ھو فقال اوسطھم ھو خیر ھم وقال اٰخرھم خذ وا خیرھم فکانت تلك فلم یرھم حتی جاء وا لیلة اخریٰ فیمایریٰ قلبه والنبی ﷺ نائمة عیناہ ولاینام قلبه وکذالك الانبیاء تنام اعینھم ولا تنام قلوبھم فتولاہ جبریل ثم عرج به الی السماء)) ❸

''انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہم لوگوں سے آپ ﷺ کی شب معراج کا قصہ بیان کرتے تھے کہ اس سے پہلے کہ آپ پر وحی آئے آپ مسجد حرام میں سو رہے تھے، آپ کے پاس تین آدمی آئے پہلے نے کہا: وہ کون ہے؟ بیچ والے نے کہا: وہ ان میں سب سے بہتر ہے۔ پچھلے نے کہا: جو ان میں سب سے بہتر ہو اس کو لے لو یہ تو ہوگیا، پھر آپ نے ان کو نہیں دیکھا یہاں تک کہ وہ ایک اور رات کو آئے اس حالت میں کہ آپ کا دل دیکھتا تھا اور آپ کی آنکھیں سوتی تھیں لیکن آپ کا دل نہیں سوتا تھا انبیا کا یہی حال ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں سوتی ہیں اور ان کے دل نہیں سوتے پھر جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو اپنے اہتمام میں لیا پھر وہ آپ کو لے کر

---

❶ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ماجاء فی قوله: وکلم اللّٰه موسیٰ تکلیما: ۷۵۱۷۔ ❷ (ان دونوں راتوں میں کم ازکم بارہ برس کا فصل ہوگا کیونکہ پہلی رات آغاز وحی سے پہلے تھی اور دوسری رات جو شب معراج تھی نبوت کے بارہویں سال تھی)

❸ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب کان النبی ﷺ تنام عینه...... : ۳۵۷۰۔

آسمان پر چڑھے۔''

بخاری نے اس باب میں اس حدیث کو یہاں تک لکھا ہے لیکن کتاب التوحید میں اس کے بعد معراج کے تمام واقعات بیان کر کے آخر میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ فقرہ روایت کیا ہے:

فاستيقظ وهو فی المسجد الحرام۔ ❶

''پھر آپ ﷺ بیدار ہوئے تو مسجد حرام میں تھے۔''

صحیح مسلم میں یہ روایت نہایت مختصر ہے، سند کے بعد صرف اس قدر لکھ کر کہ ''آپ ﷺ مسجد حرام میں سوتے تھے'' اس کو ختم کر دیا ہے اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ ''شریک نے اس روایت میں واقعات کو گھٹا بڑھا کر اور آگے پیچھے کر دیا ہے۔'' اس لئے ائمہ نے جیسا کہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے شفاء ❷ میں اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ شریک کی اس روایت میں بہت سے اوہام ہیں اور اسی لئے اس کو انہوں نے رد کر دیا ہے، دوسری روایت صحیحین میں وہ ہے جس میں حضرت مالک بن صعصعہ انصاری رضی اللہ عنہ خود آنحضرت ﷺ کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے معراج کا واقعہ دہراتے ہوئے فرمایا:

((بينما انا عند البيت بين النائم و اليقظان)) ❸

''میں کعبہ کے پاس خواب و بیداری کی درمیانی حالت میں تھا۔''

صحیح بخاری باب المعراج ❹ اور مسند ابن حنبل میں مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((بينما انا فی الحطيم مضطجعًا))

''اس اثنا میں کہ میں (خانہ کعبہ کے مقام) حطیم میں لیٹا ہوا تھا۔''

لیکن یہ شب معراج میں آغاز کی کیفیت کا بیان ہے، اس وقت آنحضرت ﷺ آرام فرما رہے تھے دلائل بیہقی میں ایک روایت ہے جس میں حضرت ابو سعید خدری کے واسطہ سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''میں عشاء کے وقت خانہ کعبہ میں سو رہا تھا ایک آنے والا (جبرائیل علیہ السلام) آیا اور اس نے آ کر مجھے جگایا اور میں جاگا۔'' اس کے بعد واقعہ معراج کی تفصیل ہے اس میں سونے کے بعد جگائے جانے کی گو تصریح ہے، لیکن اس کا دوسرا ہی راوی جھوٹا اور دروغ گو اور ناقابل اعتبار ہے ❺ اور اس میں جو منکرات اور غرائب امور بیان کئے گئے ہیں وہ سرتا پا لغو ہیں۔ ابن اسحاق نے سیرت میں اور ابن جریر

---

❶ صحیح بخاری، کتاب التوحید: ٧٥١٧۔ ❷ شرح شفا شهاب خفاجی ج٢، ص: ٢٦٠۔

❸ صحیح بخاری، باب ذکر الملائکة: ٣٢٠٧ و صحیح مسلم، باب الاسراء: ٤١٦۔

❹ بخاری، کتاب مناقب الانصار: ٣٨٨٧۔ ❺ حافظ ابن کثیر نے تفسیر سورۃ اسراء، ج٣، ص: ١٩ میں اس روایت کو نقل کیا ہے اس کے سلسلۂ سند میں دوسرا راوی وہی ابو ہارون العبدی ہے جس کو علمائے رجال نے بالاتفاق ساقط الاعتبار قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ هو اكذب من فرعون ''وہ فرعون سے بھی زیادہ جھوٹا ہے۔''

طبری نے تفسیر میں (سورۂ اسراء) حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اس قسم کی روایت کی ہے کہ "میں سورہا تھا کہ جبرائیل، نے پاؤں سے ٹھوکر مار کر مجھے اٹھایا" لیکن اس کا سلسلہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے آگے نہیں بڑھتا، سیرت ابن ہشام اور تفسیر ابن جریر طبری میں محمد بن اسحاق کے واسطہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے دو روایتیں ہیں جن میں یہ تصریح ہے کہ یہ بزرگوار معراج کو روحانی اور رؤیائے صادقہ کہتے تھے یہ روایتیں مع سند کے حسب ذیل ہیں:

عن محمد بن اسحاق قال حدثني يعقوب بن عتبة بن المغيرة ان معاوية بن ابى سفيان كان اذاسئل عن مسرىٰ رسول الله ﷺ قال: كانت رؤيا من الله صادقة ۔ [1]

"محمد بن اسحاق سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ نے بیان کیا کہ معاویہ بن سفیان سے جب معراج کا واقعہ پوچھا جاتا تو وہ کہتے کہ یہ خدا کی طرف سے ایک سچا خواب تھا۔"

لیکن یہ روایت منقطع ہے۔ یعقوب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے خود نہیں سنا ہے کیونکہ انہوں نے ان کا زمانہ نہیں پایا ہے، دوسری روایت ہے:

حدثنا ابن حميد قال حدثنا سلمة عن محمد قال حدثني بعض آل ابى بكر ان عائشة كانت تقول مافقد جسد رسول الله ﷺ ولكن اسرى بروحه۔ [2]

"ابن حمید نے ہم سے بیان کیا، ان سے سلمہ نے، سلمہ سے محمد بن اسحاق نے، انہوں نے کہا: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خاندان کے ایک شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہا کرتی تھیں کہ آنحضرت ﷺ کا جسم نہیں کھویا گیا بلکہ آپ کی روح شب کو لے جائی گئی۔"

اس روایت کے سلسلہ میں محمد بن اسحاق اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان ایک راوی یعنی خاندان ابوبکر صدیق کے ایک شخص کا نام ونشان مذکور نہیں ہے، اس لئے یہ بھی پایۂ صحت سے فروتر ہے، تاہم ان روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ معراج کو رؤیا یا روحانی کہنا قرن اول میں بعض لوگوں کا قول تھا، ابن اسحاق میں ہے کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے یہ بیان کیا جاتا تھا کہ "یہ رؤیا تھا تو وہ اس کی تردید نہیں کرتے تھے۔" [3] لیکن جمہور کا مذہب یہی ہے کہ معراج جسمانی تھی اور بیداری کی حالت میں تھی قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے شفاء میں اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم میں لکھا ہے:

اختلف الناس فى الاسراء برسول الله ﷺ فقيل انما كان جميع ذلك فى

---

[1] ابن جرير، تفسير سورة اسراء، ج١٥، ص: ١٣٠؛ سيرت ابن هشام ذكر معراج، ج١، ص: ٢٤٩۔

[2] حواله مذكور۔ [3] سيرت ابن هشام، ج١، ص: ٢٤٢۔

المنام والحق الذی علیه اکثر الناس ومعظم السلف وعامة المتاخرین من الفقهاء والمحدثین والمتکلمین انه اسریٰ بجسده ﷺ والآثار تدل علیه لمن طالعها وبحث عنها ولا یعدل عن ظاهرها الابدلیل والاستحالة فی حملها علیه فیحتاج الی تاویل.[1]

''رسول اللہ ﷺ کی معراج میں لوگوں کا اختلاف ہے، کہا گیا ہے کہ یہ سارا واقعہ خواب میں پیش آیا اور حق یہ ہے کہ جس پر اکثر لوگ اور سلف صالحین کا بڑا حصہ اور عامہ متاخرین میں سے فقہا اور محدثین اور متکلمین سب متفق ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو جسم کے ساتھ معراج ہوئی اور جو شخص تمام آثار واحادیث کا غائر مطالعہ اور تحقیق کرے گا اس پر یہ حق واضح ہو جائے گا اور اس ظاہر سے بے دلیل انحراف نہیں کیا جائے گا اور نہ ظاہر پر ان کو محمول کرنے میں کوئی محال لازم آتا ہے جو تاویل کی حاجت ہو۔''

مفسرین میں سے ابن جریر طبری سے لیکر امام رازی تک نے جمہور کے اس مسلک پر چار عقلی دلیلیں بھی قائم کی ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

① قرآن مجید میں ہے کہ ﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِهٖ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل:۱) ''پاک ہے وہ خدا جو (شب معراج) میں لے گیا اپنے بندہ (عبد) کو'' اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا اپنے ''بندہ'' کو لے گیا بندہ یا عبد کا اطلاق جسم یا روح دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے تنہا روح کو عبد یا بندہ نہیں کہتے۔

② واقعات معراج میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ براق پر سوار ہوئے اور آپ نے دودھ کا پیالہ نوش فرمایا، سوار ہونا پینا یہ سب جسم کے خواص ہیں، اس لئے یہ معراج جسمانی تھی۔

③ اگر واقعۂ معراج رؤیا اور خواب ہوتا تو کفار اس کی تکذیب کیوں کرتے؟ انسان تو خواب میں خدا جانے کیا کیا دیکھتا ہے، محال سے محال چیز بھی اس کو عالم خواب میں واقعہ بن کر نظر آتی ہے۔

④ خدا نے قرآن مجید میں کہا ہے: ﴿وَمَا جَعَلۡنَا الرُّءۡیَا الَّتِیۡۤ اَرَیۡنٰكَ اِلَّا فِتۡنَةً لِّلنَّاسِ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل:٦٠) ''کہ اس مشاہدۂ معراج کو ہم نے لوگوں کے لئے معیار آزمائش بنایا ہے۔'' اگر یہ عام خواب ہوتا تو یہ آزمائش کی کیا چیز تھی اور اس پر ایمان لانا مشکل کیا تھا۔[2]

معراج کے بحالت بیداری ہونے پر صحیح استدلال

میرے نزدیک معراج کے بحالت بیداری کے ثبوت کا صاف و صحیح طریقہ یہ ہے کہ کلام کا فطری قاعدہ

[1] شرح مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء، ج۱، ص: ۹۱ مطبوعہ نول کشور پریس لکھنو۔

[2] تفسیر طبری، ج۱۵، ص: ۱۳۔

یہ ہے کہ جب تک متکلم اپنے کلام میں یہ ظاہر نہ کر دے کہ یہ خواب تھا تو طبعاً یہی سمجھا جائے گا کہ وہ واقعہ بحالت بیداری پیش آیا، قرآن پاک کے ان الفاظ میں ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا﴾ ''پاک ہے وہ جو اپنے بندہ کو ایک رات لے گیا۔'' میں کسی خواب کی تصریح نہیں، اسی طرح حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی صحیح ترین روایت میں بھی اس کی تصریح نہیں، اس لئے بے شبہ بیداری ہی کا واقعہ سمجھا جائے گا اور یہی جمہور امت کا عقیدہ ہے اور وہ بھی بجسم، اسی طرح صحیح احادیث میں بھی خواب کی تصریح نہیں، اس لئے زبان کے محاورۂ عام کی بنا پر اس کو بیداری کا واقعہ سمجھا جائے گا۔

مدعیان رؤیا کا مقصود بھی رؤیا سے عام خواب نہیں

جو لوگ اس کو ''رؤیا'' کہتے ہیں، اس سے ان کا مقصود بھی وہ عام خواب نہیں ہے جو ہر روز ہر شخص دیکھا کرتا ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ لوگوں نے انبیا علیہم السلام کے رؤیا کی حقیقت پر غور نہیں کیا ہے، وہ غلطی سے انبیا علیہم السلام کے رؤیا کو بھی عام انسانی خواب سمجھتے ہیں، حالانکہ دراصل صرف لفظ کا اشتراک ہے اور نہ اس کی حقیقت بالکل جداگانہ ہے، یہ وہ ''رؤیا'' ہے جس میں گو آنکھیں بند ہوتی ہیں، مگر دل بیدار ہوتا ہے، کیا یہی عام رؤیا کی حقیقت ہے؟ یہ وہ حالت ہے جو بظاہر خواب ہے مگر دراصل ہشیاری بلکہ مافوق ہشیاری ہے، عام خواب اور اس رؤیا میں مشابہت صرف اس قدر ہے کہ اس عالم مادی اور کاروبار حواس ظاہری سے پہلے میں تغافل ہے تو دوسرے میں تعطل ہے لیکن پہلے میں عالم روح اور کائنات ملکوت کو دخل نہیں اور دوسرے میں سراپا ہشیاری، بیداری، حقیقت بینی، اہم سفری ناموس، سیر سماوات، القائے ارواح، رؤیت حق سب کچھ ہے، اسی لئے جن لوگوں نے اس کو ''منام'' یا ''رؤیا'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، انہوں نے درحقیقت مجاز و استعارہ سے کام لیا ہے، ورنہ اصل مقصود یہی کیفیت روحانی اور یہی حالت ملکوتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ہمارے ظاہری حواس کے مادی قوانین طبعی کی رو سے جو چیزیں محال معلوم ہوتی ہیں وہ اس عالم میں محال نہیں ہیں۔

رؤیائے صادقہ کی تاویل

بہر حال جو لوگ اس کو رؤیائے صادقہ کہتے ہیں۔ ان کو گو یہ مغالطہ بعض روایات حدیث سے پیش آیا ہے، جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے اور جن میں سب سے مستند شریک کی روایت ہے، جس کے الفاظ میں کمی بیشی پر اکثر محدثین نے اعتراض کیا ہے، اسی لئے اس کو انہوں نے رد کر دیا ہے، تاہم محدثین میں سے امام خطابی صاحب معالم السنن شریک کی اس روایت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

واما من اعتبر اول الحديث باخره فانه يزول عنه الاشكال فانه مصرّح فيهما بانه كان رؤيا لقوله في اوله وهو نائم وفي اخره استيقظ وبعض الرؤيا مثل يضرب ليتاول على الوجه الذي يجب ان يصرف اليه معنى

التعبير في مثله وبعض الرؤيا لا يحتاج الى ذالك بل ياتي كالمشاهدة. ❶

''لیکن جو شخص اس حدیث کے ابتدائی الفاظ کو آخری الفاظ سے ملا کر دیکھے گا اس سے یہ اشکال اس لئے دور ہو جائے گا کہ ان میں یہ تصریح ہے کہ یہ رویا تھا، کیوں کہ اس روایت کے شروع میں ہے کہ ''آپ ﷺ سو رہے تھے۔'' اور آخر میں ہے، کہ آپ ﷺ جاگ پڑے، بعض رویا تمثیلی رنگ میں ہوتے ہیں، جن کی تاویل ضروری ہے کہ اسی طرح کی جائے، جس طرح اس قسم کے خواب کی تعبیر کی جاتی ہے اور بعض رویا اس کے محتاج نہیں ہوتے، بلکہ وہ مشاہدۂ عینی کی طرح پیش آتے ہیں۔''

رؤیا سے مقصود روحانی ہے

لیکن جو لوگ ان میں آشنائے راز ہیں، وہ یہ نہیں کہتے کہ وہ ایک عام قسم کا خواب تھا، جو ہر انسان تقریباً ہر شب کو دیکھتا ہے، بلکہ وہ اس کیفیت پر رؤیا کا اطلاق محض مجازی اور انسانی طریقہ ادا کے قصور کے باعث کرتے ہیں، انسان روح اور جسم سے مرکب ہے، یہ روح جو جسم سے وابستہ ہے، اس کا تعلق محض عارضی ہے اور یہی عارضی تعلق عالم نور سے اس کے حجاب کا باعث ہے، جس قدر اس تعلق کا رشتہ ڈھیلا ہو جائے گا۔ اسی نسبت سے وہ حجاب اُٹھتا جائے گا۔ انسان جب بیداری میں ہوتا ہے تو حواس ظاہری کی مصروفیت روح کو مشاہدۂ باطن سے باز رکھتی ہے، نیند کی حالت میں کسی قدر اس کو ظاہری مشغولیت سے آزادی ملتی ہے تو اس کو رنگا رنگ کی چیزیں نظر آتی ہیں یہ حالت انسان کی باطنی و روحانی قویٰ کی ترقی و تنزل پر موقوف ہے ایک دن تو ہر انسان مر جاتا ہے یعنی اس کی روح کا تعلق اس کے جسم سے منقطع ہو جاتا ہے لیکن انسانوں کی ایک صف ایسی بھی ہے جس کا طائر روح خدا کے فضل و موہبت بازوؤں سے پرزور ہو کر اپنے قفس عنصری کو تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ کر عالم ملکوت کی سیر کرتا پھرتا ہے اور پھر اسی قفس عنصری کی طرف رجعت کر جاتا ہے یہی حالت ہے جس کو وہ اپنی محدود زبان میں مجازاً ''رؤیائے صادقہ'' یا رؤیائے نبوت کہتے ہیں اور اسی عالم کو عالم رؤیا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور ممکن ہے کہ اسی کو قرآن مجید کی آیت ﴿وما جعلنا الرؤيا التي اريناك﴾ میں رؤیا کہا گیا ہے یہی وہ دنیا ہے جس میں آنکھیں سوتی ہیں اور دل بیدار رہتا ہے اور اسی کی طرف وحی کی حدیثوں میں اشارہ ہے اور ابن ہشام میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف جو روایت منسوب ہے کہ

ما فقد جسد رسول الله ﷺ ولكن اسرى بروحه۔ ❷

''یعنی حضور انور ﷺ کو معراج روح کے ذریعہ ہوئی۔''

کا بھی یہی مطلب ہے۔

---

❶ فتح الباری، ج ۱۳، ص: ۴۰۲۔ ❷ سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۲۴۲۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد [1] میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

فصل: وقد نقل ابن اسحاق عن عائشة ومعاوية انهما قالا انما كان الاسراء بروحه ولم يفقد جسده ونقل عن الحسن البصري نحوذالك ولكن ينبغي ان يعلم الفرق بين ان يقال كان الاسراء منامًا وبين ان يقال كان بروحه دون جسده وبينهما فرق عظيم وعائشة ومعاوية لم يقولا كان منامًا وانما قالا اسرى بروحه ولم يفقد جسده وفرق بين الامرين فان مايراه النائم قديكون امثالا مضروبة للمعلوم في الصور المحسوسة فيرى كانه قد عرج به الى السماء اوذهب به الى مكة واقطار الارض وروحه لم تصعد ولم تذهب وانما ملك الرؤيا ضرب له المثال والذين قالوا عرج برسول الله ﷺ طائفتان طائفة قالت عرج بروحه وبدنه وطائفة قالت عرج بروحه ولم يفقد بدنه وهؤلاء لم يريدوا ان المعراج كان منامًا وانما ارادوا ان الروح ذاتها اسرى بها وعرج بها حقيقة وباشرت من جنس ماتباشر بعد المفارقة وكان حالهافي ذالك كحالها بعد المفارقة في صعود ها الى السمٰوات سماءً حتي ينتهي بها الى السماء السابعة فتقف بين يدي الله عزوجل فيا مرفيها بما يشاء ثم تنزل الارض فالذي كان لرسول الله ﷺ ليلة الاسراء اكمل مما يحصل للروح عندالمفارقة ومعلوم ان هذا امر فوق ما يراه النائم لكن لماكان رسول الله ﷺ في مقام خرق العوائد حتى شق بطنه وهوحي لايتالم بذالك عرج بذات روحه المقدسة في غير اماتة ومن سواه لاينال بذات روحه الصعود الى السماء الا بعد الموت والمفارقة فالانبياء انما استقرت ارواحهم هناك بعد مفارقة الابدان و روح رسول الله ﷺ صعدت الى هناك في حال الحياة ثم عادت وبعد وفاته استقرت في الرفيق الاعلى مع ارواح الانبياء ومع هذا فلها اشراف على البدن واشراق وتعلق به بحيث يرد السلام على من سلم عليه وبهذا التعلق رأى موسٰى قائمًا يصلي في قبره وراه في السماء السادسة ومعلوم انه لم يعرج بموسٰى من قبره ثم رد اليه وانما ذالك مقام روحه واستقرارها وقبره مقام

[1] جلد ۱، ص: ۳۰۴ مصر۔

بدنه واستقراره الى يوم معاد الارواح الى اجسادها فراه يصلى فى قبره وراه فى السماء السادسة كما انه ﷺ فى ارفع مكان فى الرفيق الاعلى مستقرًا هناك وبدنه فى ضريحه غير مفقود واذاسلم عليه المسلم رد الله عليه روحه حتى يرد عليه السلام ولم يفارق الملاء الاعلى ومن كثف ادراكه وغلظت طباعه عن ادراك هذا فلينظر الى الشمس فى علو محلها وتعلقها وتاثيرها فى الارض وحيات النبات والحيوان بها هذا وشان الارواح فوق هذا فلها شان وللبدن شان وهذه النار تكون فى محلها حرارتها تؤثر فى الجسم البعيد عنها مع ان الارتباط والتعلق الذى بين الروح والبدن اقوى واكمل من ذالك واتم فشان الروح اعلى من ذالك والطف۔

''فصل: ابن اسحاق نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور معاویہ رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ ان دونوں نے کہا کہ معراج میں آپ ﷺ کی روح لے جائی گئی اور آپ کا جسم کھویا نہیں گیا (یعنی وہ اسی دنیا میں اپنی جگہ پر موجود تھا) اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی قسم کی روایت ہے لیکن یہ جاننا چاہیے کہ یہ کہنا کہ معراج منام (خواب) تھا اور یہ کہنا کہ بذریعہ روح کے تھی جسم کے ساتھ نہ تھی، ان دونوں میں بڑا فرق ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ نہیں کہا کہ وہ منام (خواب) تھا، انہوں نے یہی کہا ہے کہ معراج میں آپ کی روح کو لیجایا گیا اور آپ کا جسم کھویا نہیں گیا ان دونوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ سونے والا جو کچھ دیکھتا ہے کبھی محسوس صورتوں میں جو کچھ معلوم ہے اس کی تمثیلیں اس کے سامنے کی جاتی ہیں، پس وہ دیکھتا ہے کہ گویا وہ آسمان پر چڑھایا گیا یا مکہ اس کو لے جایا گیا اور زمین کے گوشوں میں اس کو پھرایا گیا، حالانکہ اس کی روح نہ چڑھی، نہ گئی، نہ پھری، صرف یہ ہوا کہ خواب کے فرشتے نے اس کے لئے ایک تمثیل اس کے سامنے کر دی اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو آسمان پر چڑھایا گیا ان میں دو فرقے ہیں ایک فرقہ کہتا ہے کہ آپ کو معراج روح و بدن دونوں کے ساتھ ہوئی اور دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ صرف روح کے ساتھ ہوئی اور بدن کھویا نہیں گیا (یعنی اس عالم سے) ان لوگوں کا یہ مقصد نہیں کہ وہ خواب تھا بلکہ یہ مقصد ہے کہ خود بذاتہٖ روح کو معراج ہوئی اور وہی درحقیقت اوپر چڑھائی گئی اور اس نے اس طرح کیا جس طرح جسم سے مفارقت کے بعد کرتی ہے اور اس میں اس کی حالت وہی تھی جو مفارقت جسم کے بعد آسمانوں پر ایک ایک آسمان کر کے چڑھنے میں ہوتی ہے، یہاں تک کہ ساتویں آسمان پر جا کر ٹھہر جاتی ہے اور

اللہ تعالیٰ کے سامنے جا کر کھڑی ہو جاتی ہے پھر وہ جو چاہتا ہے اس کی نسبت حکم دیتا ہے پھر زمین پر واپس آ جاتی ہے پس آنحضرت ﷺ کو شب معراج میں جو حاصل ہوا وہ اس سے بھی زیادہ کامل تھا جو روح کو مفارقت جسم کے بعد حاصل ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ درجہ اس سے بڑا ہے جو سونے والے کو خواب میں نظر آتا ہے لیکن چونکہ رسول اللہ ﷺ خرق عادات کے مقام میں تھے، یہاں تک کہ آپ کا سینہ چاک کیا گیا اور آپ زندہ تھے لیکن آپ کو تکلیف نہیں ہوئی اسی طرح خود روح مبارک بذاتہٖ اوپر چڑھائی گئی بغیر اس کے کہ آپ پر موت طاری کی جائے آپ کے علاوہ اور کسی کی روح کو موت اور مفارقت تن کے بغیر یہ عروج نصیب نہ ہوا، انبیا علیہم السلام کی روحیں جو یہاں ٹھہری تھیں اور وہ مفارقت جسم کے بعد تھیں لیکن آنحضرت ﷺ کی روح پاک زندگی کی حالت میں وہاں گئی اور واپس آئی اور مفارقت کے بعد انبیا کی روحوں کے ساتھ ''رفیق اعلیٰ'' میں جا کر ٹھہر گئی لیکن باوجود اس کے روح پاک کو اپنے جسم کے ساتھ ایک نوع کا تعلق اور رشتہ ہے کہ اگر آپ ﷺ پر کوئی سلام بھیجے تو آپ سلام کا جواب دیتے ہیں اسی تعلق سے آپ نے شب معراج میں دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں پھر آپ نے ان کو چھٹے آسمان میں دیکھا، حالانکہ معلوم ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قبر سے اٹھا کر نہیں لے جایا گیا تھا اور نہ پھر واپس کیا گیا تھا، اس کی گرہ یوں کھلتی ہے کہ وہاں آسمان پر جو موسیٰ علیہ السلام کو آپ نے دیکھا تو وہ ان کی روح کا مقام و مستقر تھا اور قبر ان کے جسم کا، جہاں وہ قیامت میں روحوں کے لوٹانے کے وقت تک رہے گا، اس طرح آپ نے ان کو ان کی قبر میں نماز پڑھتے بھی دیکھا اور چھٹے آسمان پر بھی دیکھا جس طرح کہ (بعد وفات) آنحضرت ﷺ اس سے بلند تر مقام یعنی رفیق اعلیٰ میں بھی قرار گیر ہیں اور جسم مبارک قبر شریف میں بھی موجود ہے، جب سلام کرنے والا آپ پر سلام کرتا ہے تو اللہ آپ کی روح کو واپس کرتا ہے، تا آنکہ آپ جواب دیتے ہیں، حالانکہ مقام رفیق اعلیٰ سے آپ علیحدہ نہیں ہوئے جو شب معراج میں حاصل ہوا۔ وہ اس سے بھی زیادہ کامل تھا جو روح کو مفارقت جسم کے بعد حاصل ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ درجہ اس سے بڑا ہے جو سونے والے کو خواب میں نظر آتا ہے لیکن چونکہ رسول اللہ ﷺ خرق عادات کے مقام میں تھے یہاں تک کہ آپ کا سینہ مبارک چاک کیا گیا اور آپ زندہ تھے لیکن آپ کو تکلیف نہیں ہوئی، اسی طرح روح مبارک بذاتہٖ اوپر ہے۔ جو موٹی سمجھ اور بھدی طبیعت کا آدمی اس معاملہ کو سمجھ نہ سکے اس کو

چاہیے کہ آفتاب کی طرف دیکھے کہ اس دوری اور بلندی کے باوجود اس کا تعلق اور رشتہ زمین سے قائم ہے اور اس کے اندر وہ اثر ڈالتا ہے اور نباتات وحیوانات کی زندگی میں اس کو دخل ہے پھر روح کا مرتبہ تو اس سے بدرجہا زیادہ ہے کیونکہ روح کا معاملہ اور ہے جسم کا معاملہ اور ہے اور دیکھو کہ آگ اپنی جگہ پر رہتی ہے اور اس کی گرمی دور کے جسم پر اثر انداز ہوتی ہے۔ روح اور بدن کا باہمی تعلق تو اس سے بھی زیادہ قوی اور کامل ہے اس لئے کہ روح آگ سے زیادہ اعلیٰ اور لطیف ہے۔"

فقل للعيون الرمد اياك ان ترى
سنا الشمس فاستغشى ظلام اللياليا

"گرد آلود آنکھوں سے کہہ دو کہ وہ آفتاب کی روشنی کو نہیں دیکھ سکتیں تو راتوں کی تاریکی کو اوڑھ لیں۔"

صوفیہ اور ارباب حال نے معراج کے واقعات کی تشریح اپنے مذاق اور رنگ میں کی ہے، علمائے اسلام میں کم از کم ایک شخص تو ایسا ہے جو صوفی اور صاحب حال ہے اور محدث و متکلم بھی یعنی حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ صاحب کے متعلق معلوم ہے کہ وہ دیگر اہل باطن کی طرح عالم برزخ اور عالم مثال زمام اور عالم جسد اور عالم روح کے درمیان ایک تیسرے عالم کے قائل ہیں جہاں جسم پر روح کے خواص طاری ہوتے ہیں اور روح اپنی خصوصیت اور مناسبت کے مطابق جسمانی شکل وصورت میں نمایاں ہوتی ہے، شاہ صاحب اس بات کے قائل ہیں کہ معراج بیداری میں اور جسم کے ساتھ ہوئی لیکن یہ عالم برزخ کی سیر تھی جہاں آپ ﷺ کے جسم پر روحانی خواص طاری کیے گئے اور معانی و واقعات مختلف اشکال وصورت میں مشاہدہ کرائے گئے چونکہ ایک بیگانہ کے لئے اس نادیدہ شہرستان کی ہو بہو تشریح اپنی زبان میں مشکل ہے، اس لئے ہم اس ملک کے ایک سیاح کا بیان نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔

شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں معراج کی حقیقت ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

واسرى به الى المسجد الاقصى ثم الى سدرة المنتهى والى ماشاء الله وكل ذالك لجسده ﷺ فى اليقظة ولكن ذالك فى موطن هو برزخ بين المثال والشهادة جامع لاحكامهما فظهر على الجسد احكام الروح وتمثل الروح والمعانى الروحية اجسادًا ولذلك بان لكل واقعة من تلك الوقائع تعبير وقد ظهر لحز قيل وموسٰى وغيرهما عليهم السلام نحو من تلك الوقائع وكذالك لاولياء الامة ليكون علو درجاتهم عندالله كحالهم فى

الرؤیا۔ واللہ اعلم۔[1]

''آپ ﷺ کو معراج میں مسجد اقصیٰ میں لے جایا گیا اور پھر سدرۃ المنتہیٰ اور جہاں خدا نے چاہا اور یہ تمام جسم مبارک کے لئے بیداری کی حالت میں ہوا لیکن اس مقام میں جو عالم مثال اور عالم ظاہر کے بیچ میں ہے اور جو دونوں عالموں کے احکام کا جامع ہے، اس لئے جسم پر روح کے احکام ظاہر ہوئے اور روح پر معاملات روحانی جسم کی صورت میں نمایاں ہوئے اور اسی لئے ان واقعات میں سے ہر واقعہ کی ایک تعبیر ظاہر ہوئی اور اسی طرح کے واقعات میں حضرت حزقیل اور موسیٰ علیہم السلام وغیرہ کے لئے ظاہر ہوئے تھے، جیسے اولیائے امت کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں کہ خدا کے نزدیک ان کے درجے کی بلندی مثل اس حالت کے ہوتی ہے جو رؤیا میں ان کو معلوم ہوتی ہے، واللہ علم۔''

اس کے بعد شاہ صاحب نے معراج کے مشاہدات میں سے ایک ایک کی تعبیر کی ہے، خود احادیث صحیحہ اور معتبر روایات میں جہاں یہ واقعہ مذکور ہے کہ آپ ﷺ کے سامنے دودھ اور شراب کے دو پیالے پیش کئے گئے تو آپ نے دودھ کا پیالا اٹھالیا، اس پر فرشتہ نے کہا کہ آپ نے فطرت کو اختیار کیا اگر شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپ کی تمام امت گمراہ ہو جاتی۔'' اس عالم تمثیل میں گویا فطرت کو دودھ اور ضلالت کو شراب کے رنگ میں مشاہدہ کرایا گیا ہے۔

شاہ صاحب معراج کو عالم برزخ کا واقعہ بتا کر اسی طرح معراج کے تمام واقعات کی تشریح کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

اما شق الصدر وملؤه ايمانا فحقيقته غلبة انوار الملكية وانطفاء لهيب الطبيعة وخضوعها لما يفيض عليها من حظيرة القدس واما ركوبه على البراق فحقيقة استواء نفسه النطقية على نسمته التى هى الكمال الحيوانى فاستوىٰ راكبًا على البراق كما غلبت احكام نفسه النطقية على البهيمية وتسلطت عليها واما اسرآء ه الى المسجد الاقصىٰ فلانه محل ظهور شعائر الله ومتعلق همم الملاء الاعلى ومطمح انظار الانبياء عليهم السلام فكانه كوة الى الملكوت واما ملاقاته مع الانبياء صلوات الله عليهم ومفاخرته معهم فحقيقتها اجتماعهم من حيث ارتباطهم بحظيرة القدس وظهور ما اختص به من بينهم من وجوه الكمال واما رقيه الى السموات سماء بعد

[1] حجة الله البالغة، ج ٢، ص: ١٥٤.

سماء فحقيقة الانسلاخ الى مستوى الرحمان منزلة بعد منزلة ومعرفته حال الملائكة المؤكلة بها ومن لحق بهم من افاضل البشر والتدبير الذى اوحاه الله فيها والاختصام الذى يحصل فى ملئها واما بكاء موسىٰ فليس بجسد ولكنه مثال لفقده عموم الدعوة وبقاء كمال لم يحصله مما هو فى وجهه واما سدرة المنتهىٰ فشجرة الكون وترتب بعضها على بعض وانجماعها فى تدبير واحد كا نجماع الشجرة فى الغاذية والنامية ونحوهما ولم تتمثل حيوانا لان التدبير الجملى الاجمالى الشبيه بسياسة الكلى بافراده وانما اشبه الاشياء به الشجرة دون الحيوان ، فان الحيوان فيها قوى تفصيلية والارادة فيه اصرح من سنن الطبيعة واما الانهار فى اصلها فرحمة فائضة فى الملكوت حذ والشهادة وحياة وانماء فلذالك تعين هنالك بعض الامور النافعة فى الشهادة كالنيل والفرات واما الانوار التى غشيتها فتدليات الهية وتدبيرات رحمانية تلعلعت فى الشهادة حيثما استعدت لها واما بيت المعمور فحقيقة التجلى الا لهى الذى يتوجه اليه سجدات البشر وتضرعاتها يتمثل بيتًا على حذوما عندهم من الكعبة وبيت المقدس ثم اتى باناء من لبن واناء من خمر فاختار اللبن فقال جبرائيل هديت للفطرة ولو اخذت الخمر لغوت امتك فكان هو ﷺ جامع امة ومنشأ ظهورهم وكان اللبن اختيارهم الفطرة والخمر اختيارهم لذات الدنيا وامر بخمس صلوات بلسان التجوز لانها خمسون باعتبار الثواب ثم اوضح الله مراده تدريجًا ليعلم ان الحرج مدفوع وان النعمة كاملة وتمثل هذا المعنىٰ مستندًا الى موسىٰ فانه اكثر الانبياء معالجة للامة ومعرفة بسياستها۔ [1]

”لیکن سینہ کا چیرنا اور اس کا ایمان سے بھرنا تو اس کی حقیقت ملکیت کے انوار کا غلبہ اور طبیعت (بشری) کے شعلہ کا بجھنا اور طبیعت کی فرمانبرداری اس فیضان کو قبول کرنے کے لئے جو حظیرۃ القدس سے خدا اس پر فائض کرتا ہے لیکن آپ کا براق پر سوار ہونا تو اس کی حقیقت آپ کے نفس ناطقہ (بشری) کا اپنے اس روح حیوانی پر استیلا حاصل کرنا ہے جو کمالِ حیوانی ہے تو

[1] حجۃ اللہ البالغۃ ، باب الاسراء ، ج ۲ ، ص:۱۵٤۔

آپ ﷺ براق پر اسی طرح سوار ہو گئے، جس طرح آپ کی روح بشری کے احکام آپ کی روح حیوانی پر غالب آ گئے اور اس پر مسلط ہو گئے لیکن آپ کا رات کو مسجد اقصیٰ لے جانا تو وہ اس لئے کہ یہ مقام شعائر الٰہی کے ظہور کا مکان ہے اور ملائے اعلیٰ کے ارادوں کا تعلق گاہ ہے اور انبیا علیہم السلام کی نگاہوں کا نظارہ گاہ ہے، گویا وہ ملائے اعلیٰ کی طرف ایک روشندان ہے جہاں سے روشنی چھن چھن کر اس روشندان کے ذریعہ اس کرۂ انسانی پر فائض ہوتی ہے لیکن آپ کی انبیا علیہم السلام سے ملاقات اور مفاخرت (اور امامت) تو اس کی حقیقت تو ان کا اجتماع ہے، بحیثیت اس کے کہ وہ سب ایک ہی رشتہ میں حظیرۃ القدس سے مربوط ہیں اور آپ ﷺ کی ان حیثیاتِ کمال کا ظہور ہے جو ان تمام پیغمبروں میں آپ کی ذات سے مخصوص تھیں لیکن آپ کا آسمان پر ایک ایک آسمان کر کے چڑھنا (اور فرشتوں اور مختلف پیغمبروں سے ملاقات) تو اس کی حقیقت درجہ بدرجہ (تحت کی منزلوں سے) کھینچ کر عرش الٰہی تک پہنچنا ہے اور ہر آسمان پر جو فرشتے متعین ہیں اور کامل انسانوں میں سے جو جہاں جس جس درجہ تک پہنچ کر ان کے ساتھ مل کر گیا ہے، ان کے حالات سے اور اس تدبیر سے جو ہر آسمان میں خدا نے وحی کی اور اس مباحثہ سے جو اس آسمان کے فرشتوں کی جماعت میں ہوتا ہے آگاہی ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رونا تو از راہ حسد نہ تھا بلکہ وہ اس بات کی تمثیل تھی کہ ان کو دعوت عامہ نہیں ملی تھی اور اس کمال کی بقا ان کو عنایت نہیں ہوئی تھی جو عموم دعوت سے حاصل ہوتی ہے لیکن سدرۃ المنتہیٰ تو وہ وجود کا درخت ہے اس کا ایک دوسرے پر مرتب ہونا اور پھر ایک ہی تدبیر میں مجتمع ہونا ہے جس طرح درخت (اپنی شاخوں کے بے شمار افراد کے اختلاف کے باوجود) اپنی قوت غاذیہ اور اپنی قوت نامیہ کی تدبیر میں متحد و مجتمع ہوتا ہے، سدرۃ المنتہیٰ حیوان کی شکل میں نمایاں نہیں ہوا، اس لئے کہ اجمالی اور مجموعی تدبیر اس طرح ہے جس طرح کلی اپنے افراد کی سیاست (اجمالی) کرتی ہے اور اس تدبیر اجمالی کی بہترین شبیہ درخت ہے نہ کہ حیوان، کیونکہ حیوان میں تفصیلی قوتیں ہوتی ہیں اور خصوصاً اس میں ارادہ قوانین طبعی سے زیادہ مصرح صورت میں ہوتا ہے لیکن نہروں (کی جڑوں اور سوتوں کا وہاں نظر آنا) تو وہ رحمت و حیات و نشو و نما کا منبع ہے جو عالمِ ملکوت میں اسی طرح جاری ہے جس طرح عالم ظاہر میں اسی لئے وہاں بھی بعض وہ پرفیض امور نظر آئے جو یہاں اس عالم میں ہیں، جیسے دریائے نیل اور نہر فرات لیکن وہ انوار جو اس درخت کو ڈھانکتے تھے وہ تنزلات الٰہیہ اور تدبیرات رحمانیہ ہیں جو اس عالمِ ظاہر میں وہاں چمکتی ہیں جہاں جہاں ان کے قبول کی استعداد ہوتی ہے لیکن بیت معمور تو اس کی حقیقت وہ تجلی

ہے جس کی طرف انسانوں کے تمام سجدے اور بندگیاں متوجہ ہوتی ہیں، وہ گھر کی صورت میں اس لئے نمایاں ہوا کہ وہ ان قبلوں کی طرح ہو جو انسانوں کے درمیان کعبہ اور بیت المقدس کی صورت میں ہیں پھر آپ ﷺ کے سامنے ایک دودھ کا پیالہ اور ایک شراب کا پیالہ لایا گیا، آپ نے دودھ پسند فرمایا تو جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ فطرت کی طرف آپ نے ہدایت پائی اگر شراب پسند فرماتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی آپ کے پسند و قبول کو امت کا پسند و قبول کہنا اس لئے تھا کہ آپ اپنی امت کے جامع و مرکز اور اس کے ظہور کے منشا و مولد تھے اور دودھ کا پیالہ پسند کرنا فطرت کا پسند کرنا تھا اور شراب کا لینا دنیاوی لذتوں کو پسند کرنا تھا اور آپ کو بزبان مجاز پانچ وقتوں کی نمازوں کا حکم دیا گیا کیونکہ وہ درحقیقت ثواب کے اعتبار سے پچاس وقت ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے مقصد کو کہ "۵۰ وقتوں سے ۵ وقت مقصود ہیں" بدفعات اور بتدریج اس لئے ظاہر کیا، تا کہ یہ معلوم ہو کہ (۵۰ وقت کو ۵ کر دینے میں) تنگی دور کر دی گئی ہے اور نعمت پوری ہوئی ہے اور یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مکالمہ کی طرف منسوب ہو کر اس لئے ظاہر ہوئی کہ تمام پیغمبروں میں امت کا تجربہ اور امت کی سیاست کی آگاہی انہی کو سب سے زیادہ تھی۔"

ہم نے ارباب حال اور محدثین کے انکشافات و حقائق اور جسم و روح کے یہ گوناگوں احوال و مناظر خود انہی کی زبانوں سے بتائے اور دکھائے ہیں، ورنہ ہم خود اس باب میں سلف صالحین کا عقیدہ رکھتے ہیں، جو ابن اسحاق کی عبارت میں حسب ذیل ہے:

وكان في مسراه وما ذكر منه بلاء وتمحيص وامر من امر الله في قدرته وسلطانه، فيه عبرة لاولي الالباب وهدى ورحمة وثبات لمن امن بالله وصدق وكان من امر الله على يقين فاسرى به كيف شاء وكما شاء ليريه من آيات ربه ما اراد حتى عاين ما عاين من امره وسلطانه العظيم وقدرته التي يصنع بها ما يريد۔ [1]

"آپ ﷺ کے اس سفر شبانہ اور جو کچھ اس کے متعلق بیان کیا گیا ہے اس میں آزمائش اور کافر و مومن کی تمیز ہے اور خدا کی قدرت اور سلطنت میں سے کوئی الٰہی شان ہے اور اس میں اہل عقل کے لئے عبرت ہے اور جو اللہ پر ایمان لایا اور تصدیق کی اور خدا کے کاموں پر یقین رکھا اس کے لئے اس میں ہدایت رحمت و ثابت قدمی ہے پس اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو رات کے

[1] سیرت ابن هشام، باب الاسراء، ج ١۔

وقت لے گیا جس طرح چاہا، اور جیسے چاہا، تا کہ وہ اس کو اس کے پروردگار کی نشانیوں میں سے جو چاہے دکھائے یہاں تک کہ آپ ﷺ نے خدا کی شان اور اس کی عظیم الشان قوت کے مناظر دیکھے، جو کچھ دیکھے، اور اس قدرت کو دیکھا جس سے وہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔''

قرآن مجید اور معراج

معراج کے اسرار، اعلانات، احکام، بشارتیں اور انعامات

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں معراج کا بیان سورۂ اسراء (جس کو سورۂ بنی اسرائیل بھی کہتے ہیں) کی صرف ابتدائی تین چار آیتوں میں ہے، یعنی:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل:۱)

''پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو رات کے وقت مسجد حرام (کعبہ) سے اس مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے گیا جس کے گرداگرد ہم نے برکت نازل کی ہے، تاکہ ہم اپنے بندہ کو اپنی نشانیاں دکھائیں وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''

لیکن ہم نے اس سورہ کو شروع سے اخیر تک بار بار پڑھا اور ہر بار اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ یہ پوری سورہ معراج کے اسرار وحقائق، نتائج وعبر اور احکام واعلانات سے معمور ہے، سب سے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس سورہ کے جلی عنوانات کیا ہیں۔

① یہ اعلان کہ آنحضرت ﷺ نبی القبلتین (یعنی کعبہ اور بیت المقدس دونوں کے پیغمبر) ہیں۔

② یہود جو اب تک بیت المقدس کے اصلی وارث اور اُس کے نگہبان وکلید بردار بنائے گئے تھے، اُن کی تولیت اور نگہبانی کی مدت حسب وعدۂ الٰہی ختم کی جاتی ہے اور آلِ اسمٰعیل کو ہمیشہ کے لئے اس کی خدمت گزاری سپرد کی جاتی ہے۔

③ کفار قریش کو اعلان کہ تمہارے پند وموعظت کا عہد گزر گیا، فیصلۂ حق کے ثبوت کے لئے جس عذاب کو تم مانگتے تھے، اب وہ آتا ہے کہ رسول اب ہجرت کرتے ہیں۔

④ رسولوں کی سنت کے مطابق اب آنحضرت ﷺ کو ہجرت کا اذن دیا جائے گا جس کے بعد نافرمان قوم پر عذاب آئے گا۔

⑤ معراج کے احکام وشرائع۔

⑥ نماز پنجگانہ کی فرضیت۔

⑦ نبوت، قرآن، قیامت اور معجزات پر اعتراضات کے جوابات۔

⑧ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات اور واقعات سے استشہاد۔

آنحضرت ﷺ کا نبی القبلتین ہونا

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھرانے کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی سعادتوں اور برکتوں کا کلید بردار بنایا تھا اور

اُن کو ارضِ مقدس کی تولیت کا منصب عطا کیا تھا جس کے حدود خدا نے خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دکھائے تھے لیکن اسی کے ساتھ تورات میں بار بار اعلان کر کے یہ بھی ان کو سنا دیا گیا تھا کہ اگر انہوں نے خدا کے احکام کی اطاعت اور پیغمبروں کی تصدیق نہ کی تو یہ منصب ان سے چھین لیا جائے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسمٰعیل و اسحٰق علیہما السلام دو بیٹے عطا ہوئے تھے اور ارضِ مقدس کو ان دونوں بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا تھا یعنی شام کا ملک حضرت اسحٰق علیہ السلام کو اور عرب کا ملک حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ملا تھا، شام میں بیت المقدس اور عرب میں کعبہ واقع تھا، حضرت اسحاق علیہ السلام کے فرزندوں کو جن کا مشہور نام بنی اسرائیل ہے (اسرائیل حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے یعقوب کا لقب تھا) بیت المقدس کی تولیت عطا ہوئی تھی اور بنو اسمٰعیل کو کعبہ کا متولی بنایا گیا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں جس قدر پیغمبر پیدا ہوئے ان میں سے بنو اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس اور اسمٰعیل علیہ السلام کا کعبہ تھا گویا آنحضرت ﷺ سے پہلے جس قدر انبیا علیہم السلام عرب یا شام میں مبعوث ہوئے وہ ان دونوں قبلوں میں سے صرف ایک کے متولی تھے آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمام دوسرے پیغمبروں کے متفرق اوصاف و خصوصیات کا جامع اور برزخ بنایا تھا، اسی طرح حضرت اسحاق و اسمٰعیل علیہما السلام دونوں کی برکتوں اور سعادتوں کا گنجینہ بھی ذات محمدی ﷺ ہی کو قرار دیا یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وارثت جو صدیوں سے دو بیٹوں میں بٹتی چلی آتی تھی وہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پھر ایک جگہ جمع ہوگئی اور گویا وہ ''حقیقتِ ابراہیمیہ'' جو خاندانوں اور نسلوں میں منقسم ہوگئی تھی ذات محمدی ﷺ میں پھر یکجا ہوگئی اور آپ ﷺ کو دونوں قبلوں کی تولیت تفویض ہوئی اور نبی القبلتین کا منصب عطا ہوا، یہی نکتہ تھا جس کے سبب سے آنحضرت ﷺ کو کعبہ اور بیت المقدس دونوں طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا اور اسی لئے معراج میں آپ کو مسجد حرام (کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے جایا گیا اور مسجد اقصیٰ میں تمام انبیا علیہم السلام کی صف میں آپ کو امامت پر مامور کیا گیا، تاکہ آج اس مقدس دربار میں اس کا اعلان عام ہو جائے کہ دونوں قبلوں کی تولیت سرکار محمدی ﷺ کو عطا ہوتی ہے اور وہ نبی قبلتین نامزد ہوتے ہیں اور قرآن مجید میں سورۂ اسراء کی ابتدا اور واقعہ معراج کا آغاز اسی حقیقت کے اظہار سے ہوتا ہے:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝ ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآءیل:۱)

''پاک ہے وہ ذات جو رات کے وقت اپنے بندہ کو مسجد حرام سے اس مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں نازل کی ہیں، تاکہ ہم اپنے اس بندہ کو اپنی چند نشانیاں دکھائیں بے شک خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''

بنی اسرائیل کی مدتِ تولیت کا قیام

بنواسرائیل کو ارضِ مقدس کی تولیت کا شرف بہت سی شرائط اور معاہدوں کے ساتھ عطا ہوا تھا اور یہ کہہ دیا گیا تھا کہ جب وہ غیر معبودوں کی طرف جھکیں گے اور احکام الٰہی کی عدم پیروی کے ملزم ہوں گے تو یہ منصب اُن سے چھین لیا جائے گا اور محکومی و غلامی کی زنجیر اُن کی گردنوں میں ڈال دی جائے گی حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے عہد میں اُن کو جو نیابت اور وراثت عطا کی گئی تھی عدم ایفائے عہد کی پاداش میں بابل کے بادشاہ بخت نصر (بنوخذ نذر) کے ہاتھوں اُن سے چھین لی گئی، ارض مقدس سے وہ جلاوطن کردیے گئے، شہر یروشلم کھنڈر کردیا گیا، بیت المقدس کی ایک ایک اینٹ چور چور کردی گئی اور توراۃ کے پرزے پرزے اڑادیے گئے۔ اُس پرغم سانحہ پر انبیائے بنی اسرائیل نے ماتم کیا، خدا کے سامنے دست تضرع دراز کیا بنی اسرائیل کو توبہ وانابت کی دعوت دی تو پھر اُن کو معاف کیا گیا اور ایرانیوں کے عہد میں ارض مقدس کی دوبارہ تولیت سے وہ سرفراز ہوئے لیکن اس کے بعد پھر وہ اپنے عہد پر قائم نہ رہے، بتوں کو سجدے کئے، توراۃ کے احکام سے روگردانی کی تو ان پر یونانیوں اور رومیوں کو مسلط کیا گیا، جنہوں نے بیت المقدس کو جلا کر خاکستر کردیا، یہودیوں کا قتل عام کیا، قربان گاہ کے مقدس ظروف توڑ پھوڑ دیے۔ اب اس کے بعد آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوتی ہے اور بنواسرائیل کو توبہ وانابت کا آخری موقع دیا جاتا ہے اگر انہوں نے حق پسندی کو راہ دیا تو خدا ان پر رحم فرمائے گا ورنہ ہمیشہ کے لئے وہ اس منصب سے محروم کردیے جائیں گے۔

چنانچہ آیات بالا کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝ وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝ عَسٰي رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنی اسراءیل: ۲ تا ۸)

''اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی اور اس کو بنی اسرائیل کے لئے ہدایت نامہ ٹھہرایا کہ ہمارے سوا وہ کسی کو کارساز نہ بنائیں، اے ان لوگوں کی اولاد و! جن کو ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا دیکھو کہ ان کا جنہوں نے اپنا کارساز دوسروں کو بنالیا تھا کیا حشر ہوا؟ تم

کو اس احسان کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا کیونکہ تمہارا باپ نوح شکر گزار بندہ تھا اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل کے متعلق فیصلہ کر دیا تھا کہ تم دو دفعہ زمین میں فساد کرو گے اور بڑی زیادتیاں کرو گے جب ان میں سے پہلے فساد کا وقت آیا تو ہم نے تم پر ایسے بندوں کو کھڑا کر دیا جو بڑے سخت گیر تھے وہ تمہارے شہروں کے اندر پھیل گئے اور خدا کا وعدہ پورا ہوا پھر ہم نے تمہارے دن پھیرے اور تم کو مال و اولاد سے مدد دی اور تمہاری تعداد بہت بڑھا دی اور کہہ دیا کہ اگر تم نے اچھے کام کیے تو اپنے ہی لئے اور برے کام کیے تو اپنے لئے ، پھر جب تمہارے دوسرے فساد کا وقت آیا تو پھر ہم نے اپنے دوسرے بندوں کو کھڑا کر دیا کہ وہ تمہارے چہروں کو خراب کر دیں اور یہ بھی بیت المقدس میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح تمہارے پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر وہ قابو پائیں اس کو توڑ پھوڑ ڈالیں (اب محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد) ممکن ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے اور اگر تم نے پھر ویسا ہی کیا تو ہم بھی ویسا ہی کریں گے اور حق کے منکروں کے لئے ہم نے جہنم کا احاطہ بنا رکھا ہے۔''

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی تھی، وہاں بنی اسرائیل سے تعلقات نہ تھے، اس لئے مکی سورتوں میں بنو اسرائیل کو عموماً مخاطب نہیں کیا گیا ہے، یہ پہلا موقع ہے کہ بنو اسرائیل کو مخاطب کیا جا رہا ہے کیونکہ اب اسلام کے نئے دور کا آغاز ہونے والا ہے اور آپ ﷺ کو مدینہ کی طرف ہجرت کی اجازت ملنے والی ہے جہاں ان سے تعلقات کا آغاز ہو گا از سر نو خدا کے سامنے اپنی شرمساری کے اظہار کا موقع ملے گا اور خدا اُن پر اپنی رحمت کا دروازہ کھولے گا لیکن اگر انہوں نے قبول حق سے انکار کیا تو ان کے لئے پھر وہی سزا ہے جو ان کو اس سے پہلے دو دفعہ مل چکی ہے لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے عملاً اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا اور حق کو قبول نہیں کیا حالانکہ خدا نے ان سے کہا:

﴿ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۴۰)

''تم میرا عہد پورا کرو تو میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔''

اس لئے خدا نے ان پر رحمت کا دروازہ نہیں کھولا اور ان کو تیسری دفعہ بھی وہی سزا ملی اور وہ مدینہ، اطراف مدینہ، باغات وغیرہ سے بے دخل کر دیے گئے اور بیت المقدس کی تولیت مسلمانوں کے سپرد کر دی گئی۔

کفار مکہ کے نام آخری اعلان

آج کفار مکہ کے نام آخری اعلان ہے، ان کا مطالبہ تھا کہ اگر اسلام سچا اور ہمارا مذہب باطل ہے تو ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر عذاب آئے اُن کو یہ سنت الٰہی بتائی گئی کہ قوم پر اس وقت تک عذاب نہیں آتا جب اس میں مبلغ الٰہی مبعوث نہیں ہو لیتا اور اس کو بالکل اس کی طرف سے مایوسی نہیں ہو جاتی،

اس وقت قوم کا دولت منداور مغرور طبقہ اس حق کی بیخ کنی کے لئے آگے بڑھتا ہے، بہت سے دوسرے لوگ جن کو ان کی قوت پر بھروسہ ہوتا ہے ان کا ساتھ دیتے ہیں، مومنوں کا طبقہ جو بظاہر کمزور اور ضعیف ہوتا ہے اس حق کو قبول کر لیتا ہے، ایک دنیا کے نفع عاجل کا طالب ہے اور دوسرا آخرت کے نفع جاوید کو ترجیح دیتا ہے، دنیا میں بظاہر دونوں کو برابر زندگی کی نعمتیں ملتی ہیں مگر ایک دن آتا ہے جب رات اور دن کی روشنی الگ ہو جاتی ہے دنیا میں کوئی ایک دوسرے کا ذمہ دار نہیں، مصلح اور ہادی اپنا فرض ادا کر دیتے ہیں ایمان وکفر کے وہ ذمہ دار نہیں، اس دنیا میں ہر شخص اپنا آپ ضامن ہے، اسی انکار وکفر کی بدولت قریش مکہ بھی تولیت کعبہ کے شرف سے معزول کیے جاتے ہیں اور مسلمانوں کو فتح مکہ کی خوشخبری سنائی جاتی ہے:

﴿ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۙ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاۗءَهٗ بِالْخَيْرِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ۝ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰۗىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۝ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ۝ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَاۗءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَاۗءِ وَهٰٓؤُلَاۗءِ مِنْ عَطَاۗءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَاۗءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۹ تا ۲۱)

"یہ قرآن وہ راستہ بتاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے اور ان مومنوں کو جو نیک کام کرتے ہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لئے بڑی مزدوری ہے اور یہ بتاتا ہے کہ وہ لوگ جن کو آخرت پر ایمان نہیں ہم نے ان کے لئے دردناک عذاب تیار کیا ہے، انسان (کبھی) برائی (عذاب) کو بھی اسی طرح چاہتا ہے جس طرح بھلائی کو، انسان بڑا ہی عجلت پسند واقع ہوا ہے ہم نے دن اور رات کو دو نشانیاں بنایا ہے نشان شب کو ہم مٹا دیتے ہیں اور نشان روز کو روشن کر دیتے ہیں

کہ اس روشنی میں اپنے خدا کی مہربانی کو ڈھونڈ و اور ماہ و سال کا شمار اور حساب جانو ہم نے ہر چیز کھول کر بیان کر دی اور ہر انسان کے نیک و بد کو اسی کی گردن میں ڈال دیا ہے قیامت کے دن ہم اس کے اعمالنامہ کو نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا (اور اس وقت ہم اس سے کہیں گے کہ) لو! (اپنا اعمال نامہ پڑھو)، آج تم ہی اپنا حساب آپ لے لو تو جو ہدایت کو قبول کرتا ہے، وہ خود اپنے لئے کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے وہ اپنے لئے، کوئی ایک دوسرے کے بوجھ کو نہیں اٹھاتا اور ہم اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتے جب تک ایک پیغمبر نہ بھیج لیں اور جب کسی آبادی کو ہلاک کرنا ہوتا ہے تو ہم وہاں کے دولت مندوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ اس میں فسق و فجور کرتے ہیں (تو اس پر قانون الٰہی کے مطابق) سزا واجب ہو جاتی ہے تو ہم اس آبادی کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں اور یاد کرو نوح کے بعد سے ہم کتنی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں، تیرا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر رکھتا ہے اور دیکھتا ہے جو (اس دنیا کا نفع) عاجل چاہتے ہیں تو ان میں سے جس کے لئے ہم چاہتے ہیں (اسی دنیا کا نفع) عاجل اس کو دے دیتے ہیں پھر دوزخ کو اس کا ٹھکانا بناتے ہیں جس میں وہ ہر طرح برا ٹھہر کر راندۂ درگاہ بن کر داخل ہوگا اور جو آخرت کو چاہے گا اور آخرت کے لئے کوشش کرے گا اور وہ مومن ہوگا تو اس کی کوشش خدا کے یہاں مشکور ہوگی ہم نیک و بد ہر ایک کو تیرے پروردگار کے عطیہ سے دیتے ہیں تیرے پروردگار کا عطیہ محدود نہیں ہے دیکھ! ہم نے کیونکر دنیا میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے لیکن سب سے بڑا درجہ اور مرتبہ آخرت کا درجہ اور مرتبہ ہے۔''

معراج کے احکام ووصایا

یہود اور قریش دونوں کی معزولی کے بعد بیت المقدس اور خانہ کعبہ دونوں کی تولیت کا منصب عطا کرنے کے لئے شہنشاہِ عالم اپنے بندۂ خاص کو اپنے حضور میں طلب کرتا ہے اور اس روحانی حکومت کے شرائط و احکام کا ایک نسخہ عطا کرتا ہے، جیسا کہ اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کو عطا ہوا تھا:

﴿ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا۝ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا۝ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا۝ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا۝ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ

ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ۝ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى
عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ
وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۢ بَصِيْرًا ۝ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ
نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ
سَبِيْلًا ۝ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ
سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ
اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۝ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا
كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ
عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ
مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ
مَكْرُوْهًا ۝ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰۤى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ
جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآئیل: ۲۲ تا ۳۹)

’’خدا کے ساتھ کسی اور کو خدا نہ بنانا ورنہ تو برا ٹھہرے گا اور بے یار و مددگار رہ جائے گا اور تیرے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کو نہ پوجنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا، اگر ان میں ایک یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کی بات میں اونھ تک نہ کرنا اور ان کو نہ جھڑکنا ان سے ادب کے ساتھ بات کرنا اور ان کے سامنے نرم دلی سے اطاعت کا بازو جھکا دینا اور ان کے حق میں یہ دعا مانگنا کہ پروردگار میرے والدین پر اسی طرح رحم فرما جس طرح انہوں نے جب میں چھوٹا تھا مجھ پر رحم کیا تھا، تمہارا پروردگار تمہارے دلوں کے راز سے خوب واقف ہے، اگر تم نیک ہو تو وہ تو توبہ کرنے والوں پر بخشش کرتا ہے اور قرابت دار کو اس کا حق ادا کر اور غریب و مسافر کا حق بھی دے اور فضول خرچی نہ کیا کر، فضول خرچ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے آقا کا بڑا ہی ناشکر گزار ہے، اگر اپنے پروردگار کے فضل کے انتظار میں جس کی تجھ کو توقع ہے ان مستحقین میں سے کسی سے تجھ کو منہ موڑنا پڑے تو ان کو نرمی سے سمجھا دے اور اپنا ہاتھ نہ اتنا سکیڑ لے کہ گویا گردن میں بندھا ہے اور نہ اتنا پھیلا ہی دے کہ ہر طرف سے تجھ کو لوگ ملامت کریں اور تو تہی دست ہو جائے، تیرا پروردگار جس کی روزی چاہتا ہے کم کر دیتا ہے، وہ اپنے بندوں کے حال کا دانا و بینا ہے اور تم افلاس کے ڈر سے اپنے بچوں کو

قتل نہ کرو، ہم ہیں جواُن کواور تم دونوں کو روزی دیتے ہیں ان کا قتل کرنا درحقیقت بڑا گناہ ہے اور زنا کے پاس بھی نہ جا کہ وہ بے حیائی ہے اور بری راہ ہے اور جس جان کا مارنا اللہ نے حرام کیا ہے ان کو ناحق قتل نہ کرنا اور جو شخص ظلم سے مارا جائے تو اس کے والی وارث کو قصاص کا حق ہم نے دیا ہے تو چاہیے کہ وہ اس میں زیادتی نہ کرے کیونکہ اسی میں اس کی جیت ہے اور یتیم جب تک اپنی عقل و شعور اور جوانی کو نہ پہنچ جائے اس کے مال و جائداد کے قریب بھی نہ جانا لیکن اس طریقہ سے جاسکتے ہو جو ان کے حق میں بہتر ہو، عہد کو پورا کیا کرو کہ اس کی باز پرس ہوگی اور جب ناپ کرو تو پورا ناپ کرو اور تول کرو تو سیدھی ترازو سے تول کر دو، یہ طریقہ اچھا ہے اور اس کا انجام بھی بہتر ہے اور جس بات کا تجھ کو علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ ہو لے، کیونکہ کان آنکھ دل سب سے مؤاخذہ ہوگا اور زمین میں اکڑ اکڑ کر نہ چل کہ تو (اس چال سے) نہ زمین کو چیر ڈالے گا اور نہ پہاڑوں کے برابر اونچا ہو جائے گا، ان تمام باتوں کی برائی تیرے پروردگار کے نزدیک ناپسندہ ہے یہ تمام احکام دانش مندی کی ان باتوں میں سے ہیں جو خدا نے تجھ پر وحی کی ہیں اور خدا کے ساتھ کوئی اور دوسرا خدا نہ بنائے ورنہ تو ملامتی اور راندۂ درگاہ ہو کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔''

ان احکام کی تفصیل کے بعد آخر میں خدا فرماتا ہے:

﴿ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل:۳۹)

''یہ تمام باتیں دانش مندی کی ان باتوں میں سے ہیں جو خدا نے تم پر وحی کی ہیں۔''

معراج کے روحانی احوال کی تشریح کے ضمن میں خدا نے جو یہ فرمایا ہے:

﴿ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝ۭ ﴾ (۵۳/ النجم:۱۰)

''پھر خدا نے اپنے بندہ کی طرف وحی کی جو کچھ کہ وحی کی۔''

اس اجمال اور ابہام کے اندر جس قدر احکام و شرائع کا حصہ تھا، شاید وہ یہی ہیں کہ جن کی اس مقام پر تفصیل کی گئی ہے۔

ان آیتوں میں جو احکام مذکور ہوئے وہ تعداد میں بارہ ہیں اور یہی احکام دوازدہ گانہ درحقیقت دنیا کے تمام خیر و شر کی بنیاد و اساس ہیں، کوئی اخلاق کی تفصیل پر دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے، تاہم ان احکام دوازدہ گانہ کے حلقہ سے باہر نہ نکل سکے گا مختصر اور سادہ عبارت میں یہ احکام حسب ذیل ہیں:

① شرک نہ کرنا۔ ② ماں باپ کی عزت و اطاعت کر۔

③ حق والوں کا حق ادا کر۔ ④ اسراف نہ کر اور افراط و تفریط کے بیچ میں

اعتدال اور میانہ روی کی راہ چل۔

⑤ اپنی اولاد کو قتل نہ کر۔ ⑥ زنا کے قریب نہ جانا۔

⑦ ناحق کسی کی جان نہ مارنا۔ ⑧ یتیم سے بہتر سلوک کر۔

⑨ اپنا عہد پورا کر کہ تجھ سے اس کی پوچھ ہوگی۔ ⑩ ناپ تول میں پیمانہ اور ترازو کو بھرپور رکھ۔

⑪ نامعلوم بات کی پیروی نہ کر۔ ⑫ زمین پر مغرور نہ بن۔

یہ انہی احکام عشرہ کا نقش ثانی اور تکملہ ہے، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور کی معراج میں عطا ہوئے تھے (توراۃ سفر استثناء ۵۔۶)

① میرے آگے تیرا کوئی دوسرا خدا نہ ہو۔ ② تو خداوند اپنے خدا کا نام بے سبب نہ لے (یعنی جھوٹی قسم نہ کھا)۔

③ سبت کے دن کی یاد کر۔ ④ اپنے باپ اور اپنی ماں کو عزت دے۔

⑤ تو خون مت کر۔ ⑥ تو زنا نہ کر۔

⑦ تو چوری نہ کر۔ ⑧ تو اپنے ہمسایہ پر جھوٹی گواہی نہ دے۔

⑨ تو اپنے ہمسایہ کی جورو کو مت چاہ۔ ⑩ تو اپنے ہمسایہ کے کسی مال کا لالچ نہ کر۔

سورہ کے آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو یہ احکام عشرہ ملے تھے ان کی طرف اشارہ آئے گا۔

ہجرت اور عذاب

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس عالم مادی میں کچھ طبعی وفطری قوانین مقرر کر دیے ہیں، جن میں عموماً تخلف نہیں ہوا کرتا، اسی طرح عالم روحانی میں بھی اس نے کچھ اصول وقوانین بنا دیے ہیں جن کے خلاف نہیں ہوا کرتا، منجملہ ان اصول وقوانین کے ایک یہ ہے کہ جب کسی قوم میں کوئی پیغمبر مبعوث ہوتا ہے تو ہر طرح اس کو سمجھایا جاتا ہے، تبلیغ کا ہر فرض اس کے سامنے ادا کیا جاتا ہے، شریر قوم معجزات طلب کرتی ہے، بالآخر اس کے سامنے معجزے پیش کیے جاتے ہیں اور جب اس پر بھی وہ ایمان نہیں لاتی تو پیغمبر کو ہجرت کا حکم ہوتا ہے اور اس کے بعد اس بدبخت قوم پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے، چنانچہ انبیائے کرام کی سیرتیں اس اصول کی بہترین تشریح ہیں آج اسی قاعدہ کی تعمیل کا آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے، آپ کو معراج کی سب سے بڑی نشانی عطا کی گئی، مگر اس کو بھی وہ جھٹلاتے ہیں:

﴿وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۝ وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ

رَبَّكَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ ۚ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ ۚ وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا طُغْيَانًا كَبِيرًا ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل:۵۸ تا ۶۰)

''(دنیا میں نافرمانوں کی) کوئی آبادی ایسی نہیں ہے جس کو ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کر ڈالیں یا اس پر سخت عذاب نہ نازل کریں یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے اور ہم کو (فرمائشی) معجزات کے بھیجنے سے سوا اس کے کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اگلوں نے بھی ان نشانیوں کی فرمائش کی اور جب ہم نے ان کو بھیجا تو انہوں نے جھٹلا دیا، ہم نے ثمود کو ناقہ کی سوجھانے والی نشانی دی، تو انہوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم ان نشانیوں کو تو ڈرانے کے لئے بھیجتے ہیں یاد کرو اے پیغمبر کہ یہ کفار تیری ایذا (بلکہ قتل کے درپے ہیں لیکن) ہم نے تم سے کہہ دیا ہے کہ تیرا رب لوگوں سے تیری حفاظت کئے ہوئے ہے اور ہم نے (معراج کی جو) رویا تجھ کو دکھائی تو وہ لوگوں کے لئے آزمائش ہے اور اسی طرح اس درخت کا ذکر جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے وہ بھی لوگوں کے لئے آزمائش ہے اور ہم ان کو آئندہ عذاب سے ڈراتے ہیں لیکن اس سے ان کی سرکشی میں اور ترقی ہوتی جاتی ہے۔''

اس لئے حضرت آدم علیہ السلام اور شیطان کے قصہ سے اس واقعہ پر استدلال ہے، پھر ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَإِن كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ ۖ وَإِذًا لَّاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا ۝ وَلَوْلَا أَن ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۝ إِذًا لَّأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا ۝ وَإِن كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا ۖ وَإِذًا لَّا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ سُنَّةَ مَن قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِن رُّسُلِنَا ۖ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل:۷۳ تا ۷۷)

''ہم نے تم پر جو وحی کے ذریعہ سے نازل کیا ہے قریب تھا کہ لوگ تم کو اس سے آزمائش میں ڈال دیں کہ اس وحی کے علاوہ تم کوئی اور وحی بنا کر ہماری طرف جھوٹ منسوب کر دو اور اس وقت وہ تم کو اپنا دوست بنا لیتے اور اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رکھتے تو کچھ ان کی طرف تم جھک چلے تھے، اگر تم ایسا کرتے تو ہم تم کو زندگی اور موت کے دوگونہ عذاب کا مزہ چکھا دیتے اور پھر تم کو میرے مقابلہ میں اپنے لئے کوئی مددگار بھی نہ ملتا اور وہ تم کو اس سرزمین مکہ سے قریب ہے کہ دل برداشتہ کر دیں، تاکہ تم کو یہاں سے نکال دیں اگر ایسا ہوا تو پھر وہ تمہارے چلے جانے کے بعد اطمینان سے بہت کم رہ سکیں گے تم سے پہلے جتنے رسول ہم نے بھیجے ہیں سب کے ساتھ یہی دستور رہا ہے اور تم ہمارے دستور میں ردوبدل نہ پاؤ گے۔''

اس بیان سے یہ بھی واضح ہوگا کہ معراج ہجرت سے کچھ ہی پہلے کا واقعہ ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ معراج آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے خدا کی وہ نشانی تھی جس کے نہ تسلیم کرنے پر عذاب الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔

نماز پنجگانہ کی فرضیت

اوپر گزر چکا ہے کہ نماز پنجگانہ اسی معراج میں فرض ہوئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۷۸، ۷۹)

''آفتاب کے ڈھلنے کے وقت (ظہر، عصر، مغرب) سے لے کر رات کے اندھیرے (عشاء) تک نمازیں پڑھا کرو اور صبح کی نماز میں حضور قلب خوب ہوتا ہے اور رات کے ایک حصہ میں تہجد پڑھ لیا کرو یہ تمہارے لئے نفل ہے عجب نہیں کہ تمہارا پروردگار تم کو مقام محمود میں پہنچا دے۔''

لفظ لدلوك الشمس (آفتاب کے ڈھلنے کے وقت) میں ظہر، عصر، مغرب، نماز کے تین اوقات اور ان اوقات کے تعین کی طرف لطیف اشارہ ہے، یہ معلوم ہے کہ دین محمدی ملت ابراہیمی کا نقش ثانی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں آفتاب پرستی اور ستارہ پرستی عام تھی اور جس کی رسم کہن دنیا میں آج بھی قائم ہے، اس مذہب میں آفتاب کی پرستش کے وہ اوقات تھے جن میں اس کی روشنی کا ظہور یا کمال ہوتا ہے اور اسی لئے طلوع سے لے کر نصف النہار تک اس کی پرستش کی جاتی ہے امت ابراہیمی نے اس کے برخلاف اپنے لئے وہ اوقات متعین کئے جو آفتاب کے زوال کے ہیں یعنی سورج ڈھلنے سے لے کر آفتاب کے غروب تک کہ یہ تمام اوقات اس کے انحطاط نور اور زوال کے ہیں آفتاب کے انحطاط کی تین منزلیں ہیں، ایک وہ جب سمت راس (سر) سے وہ ڈھلتا ہے، یہ ظہر کا وقت ہے اور دوسری منزل وہ ہے، جب وہ برابر کی نگاہ سے نیچے اترتا ہے، یہ عصر کا وقت ہے اور تیسری منزل وہ ہے، جب سمت افق سے نیچے گر جاتا ہے اور یہ مغرب کا وقت ہے، چوتھی نماز کا وقت رات کی تاریکی کا مقرر کیا ہے جب آفتاب کے بقیہ وجود کی سرخ نشانی جس کو عرف عام میں شفق کہتے ہیں، وہ بھی مٹ جاتی ہے اور صبح کی نماز ادبار النجوم یعنی ستاروں کی روشنی کے ماند ہونے کے بعد ہے، غرض آیات بالا میں پنجگانہ نماز کی فرضیت نہایت لطیف اور خوبی سے ادا کی گئی ہے۔ [1]

---

[1] یہ نکتہ مخدومی مولانا حمید الدین صاحب مفسر تفسیر نظام القرآن کا افادہ ہے۔

ہجرت کی دعا

اس کے بعد ہجرت کے لئے دعا بتائی جاتی [1] اور اس کے بعد فتح مکہ کی فوراً بشارت بھی سنائی جاتی ہے کہ نماز کے ساتھ قبلہ کا فوراً خیال آتا ہے جہاں اس وقت تین سو ساٹھ بت پوجے جارہے تھے:

﴿ وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا۝ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۝ ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآئیل:۸۰، ۸۱)

''اے پیغمبر! یہ دعا مانگو کہ خداوندا! مجھے اچھی جگہ پہنچا اور (مکہ) سے اچھی طرح نکال اور دشمنوں پر اپنی طرف سے فتح ونصرت دے اور اے پیغمبر! اعلان کردے کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، باطل کو مٹ ہی جانا تھا۔''

یہ آخری الفاظ اسلام کے ایک نئے دور کی بشارت اور فتح مکہ کی نوید ہیں، اس لئے فتح مکہ کے دن جب خلیل بت شکن کا گھر بتوں سے پاک کیا جارہا تھا، آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک پر یہی آیت جاری تھی۔ [2]

نبوت، قرآن، قیامت، معراج اور معجزات پر اعتراض

کفار مکہ کو ان مسائل پر جو معاندانہ اعتراضات تھے اس موقع پر جب پیغمبر کی ہجرت اور ان کے لئے عذاب الٰہی کے نزول کا وقت قریب آ رہا ہے، ان کے جوابات دیئے جارہے ہیں کہ اب بھی ان کی تشفی ہو جائے تو یہ بلائے آسمانی جو پیغمبر کے ہجرت کرتے ہی ان پر نازل ہونا شروع ہوجائے گی وہ رُک جائے گی:

﴿ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوْسًا۝ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰی شَاكِلَتِهٖ ۭ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰی سَبِيْلًا۝ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۝ وَلَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا۝ قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۝ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۡ فَاَبٰٓی اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا۝ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا

[1] مستدرك حاكم، كتاب الهجرة، ج۳، ص:۳؛ جامع ترمذى، ابواب التفسير: ۳۱۳۹۔

[2] صحيح بخارى، كتاب التفسير، باب وقل جاء الحق وزهق الباطل: ۴۷۲۰؛ احمد، ۱/ ۳۷۸۔

كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۝ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ ۚ
وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا
رَّسُولًا ۝ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَن يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَن قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا
رَّسُولًا ۝ قُل لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ
مَلَكًا رَّسُولًا ۝ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ۝ وَمَن
يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۖ وَمَن يُضْلِلْ فَلَن تَجِدَ لَهُمْ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِهِ ۖ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُمْيًا وَبُكْمًا وَصُمًّا ۖ مَّأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنَاهُمْ سَعِيرًا ۝ ذَٰلِكَ
جَزَاؤُهُم بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا وَقَالُوا أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ۝
أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَن يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ
لَهُمْ أَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيهِ فَأَبَى الظَّالِمُونَ إِلَّا كُفُورًا ۝ قُل لَّوْ أَنتُمْ تَمْلِكُونَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّي
إِذًا لَّأَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْإِنفَاقِ ۚ وَكَانَ الْإِنسَانُ قَتُورًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل:۸۳ تا ۱۰۰)

’’(یہ کفار قریش اپنے مال اور دولت پر بھولے ہوئے ہیں) انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اس پر انعام کرتے ہیں تو الٹا ہم سے منہ پھیر لیتا ہے اور پہلو تہی کرتا ہے جب اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو آس توڑ بیٹھتا ہے، اے پیغمبر! ان سے کہہ دے کہ اپنے اپنے طور پر عمل کئے جاؤ، تمہارا پروردگار ان کو خوب جانتا ہے جو زیادہ سیدھے راستہ پر ہیں وہ تم سے روح الامین [1] کی (جو قاصد وحی ہے) حقیقت دریافت کرتے ہیں کہہ دے کہ وہ میرے پروردگار کی ایک بات ہے اور تم کو علم نہیں دیا گیا ہے لیکن بہت تھوڑا، اسی وحی کے معجزۂ صداقت کے لئے یہ بات کیا کم ہے کہ باوجود امی ہونے کے وہ لفظ بہ لفظ تم کو یاد ہے اگر ہم چاہیں تو جو کچھ ہم نے تم پر وحی کی وہ سب تمہارے سینہ سے لے جائیں پھر تم کو اس کے لئے ہمارے مقابل کوئی حمایتی بھی نہ ملے لیکن یہ تیرے پروردگار کی رحمت ہے (کہ اس کا لفظ لفظ تم کو محفوظ ہے) بے شک اس کی تم پر بڑی مہربانی ہے (ان شک کرنے والوں سے) کہہ دو کہ اگر تمام انس و جن بھی اکٹھے ہو کر چاہیں کہ اس قرآن کی طرح کا کوئی اور کلام بنا لائیں تو یہ ناممکن ہے اگرچہ وہ ایک دوسرے کی پشتی پر کیوں نہ ہوں باوجودیکہ ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے سمجھنے کے لئے سبھی قسم کی مثالیں طرح طرح سے بدل کر بیان کی ہیں مگر اکثر لوگ انکار کئے بدوں نہ رہے اور یہ کفار مکہ

[1] یہاں مصنف نے روح سے روح امین یعنی جبرائیل علیہ السلام مراد لیا ہے، ورنہ تمام تر تفاسیر اور روایات میں اس سے مراد روح حیوانی ہی ہے جس کے متعلق یہود نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا تو ان کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، بخاری، کتاب التفسیر: ۴۷۲۱۔

کہتے ہیں کہ ہم تو اس وقت تک تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم ہمارے لئے کوئی چشمہ نہ بہادو یا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ تمہارے لئے ہو جائے اور تم اس میں نہریں بہادو یا یہ کہ جیسا تم کہتے ہو کہ ہم ایمان نہ لائیں گے تو ہم پر آسمان ٹوٹ پڑے گا تو ہم پر آسمان کے ٹکڑے لاگراؤ یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے کھڑا کردو یا یہ کہ تمہارے رہنے کے لئے ایک سونے کا گھر بن جائے یا آسمان پر چڑھ جاؤ اور ہاں تمہارے آسمان پر چڑھنے کو بھی اس وقت تک باور نہیں کریں گے جب تک وہاں سے ہم پر کوئی ایسی کتاب اتار نہ لاؤ جس کو ہم پڑھیں، کہہ دو اے پیغمبر سبحان اللہ! میں خدا کا ایک قاصد بندہ ہوں ہدایت آجانے کے بعد لوگوں کو اس کے قبول سے بجز اس کے کوئی امر مانع نہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ایک بشر کو اپنا قاصد بنایا ہے، کہہ دو کہ اگر زمین پر فرشتے بستے ہوتے تو البتہ ہم آسمان سے کسی فرشتہ ہی کو ان کے پاس قاصد بنا کر بھیجتے، کہہ دو کہ اب دلیلوں اور حجتوں کا وقت گزر گیا اب میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کے لئے خدا بس ہے وہ اپنے بندوں کے حال کا دانا اور بینا ہے جس کو وہ راست دکھائے وہی راہ راست پر ہے اور جن کو وہ گمراہ کرے تو اس کے سوا ان کا کوئی یار و مددگار نہیں پھر ہم انہیں قیامت کے دن اوندھے منہ اندھے اور بہرے کر کے اٹھائیں گے کہ وہ اس دنیا میں حق کے دیکھنے اور سننے سے اندھے اور بہرے تھے اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہوگا جب وہ بجھنے کو ہوگی تو ہم پھر اس کو بھڑکا دیں گے؟ یہ ہماری نشانیوں کے انکار کا بدلہ ہوگا اور وہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مر کر ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر از سر نو پیدا کر کے اٹھائیں جائیں گے کیا یہ ممکن ہے؟ کیا وہ نہیں سمجھتے کہ وہ خدا جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا وہ بے شک اس پر قادر ہے کہ وہ ان جیسے آدمی پھر پیدا کر دے اور اس نے ان کے لئے ایک معیاد مقرر کر رکھی ہے جس میں کوئی شک نہیں لیکن یہ ظالم انکار کئے بدوں نہ رہے اے پیغمبر! یہ کفار مکہ اس حسد سے تم پر ایمان نہیں لائے کہ تم کو اور تمہارے خاندان کو یہ شرف کیوں عطا ہوا ہے ان سے کہہ دو کہ اگر میرے اور میرے پروردگار کی رحمت کا خزانہ تمہارے قبضہ میں ہوتا، بے شک تم اس کے خرچ ہو جانے کے ڈر سے اس کو روکے رہتے سچ یہ ہے کہ انسان بڑا ہی تنگ دل ہے۔''

ان آیتوں میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کے آسمان پر تشریف لے جانے پر بھی یقین نہیں رکھتے، یعنی واقعہ معراج کو تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اس واقعہ کو ہم اس وقت تک تسلیم نہیں کریں گے جب تک آپ ہمارے سامنے آسمان پر نہ چڑھ جائیں اور وہاں سے پورا قرآن مکمل لکھا ہوا لا کر ہمارے ہاتھ میں نہ دے دیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات اور حالات سے استشہاد

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ کے واقعات زندگی میں متعدد حیثیتوں سے مماثلت ہے اور خود قرآن نے اس مماثلت کو ظاہر کر دیا ہے:

﴿ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴾

(۷۳/ المزمل:۱۵)

''(لوگو)! ہم نے جس طرح فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا، اسی طرح تمہاری طرف بھی ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر گواہ ہے۔''

اسی سبب سے قرآن مجید میں بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کو دہرایا گیا ہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دشمنوں کے اندر رہ کر زندگی بسر کی، یہی حال آنحضرت ﷺ کا تھا جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے اہل دربار کو ہر طرح سمجھایا مگر وہ ایمان نہ لائے اور بالآخر حضرت موسیٰ کو بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے ہجرت کرنا پڑی، اسی طرح صنادید قریش بھی آپ ﷺ پر ایمان نہ لائے اور بالآخر آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو لے کر مکہ سے ہجرت فرمائی جس طرح ہجرت سے کچھ پہلے موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر خدا کی ہم کلامی نصیب ہوئی اور احکام عشرہ عطا ہوئے، اسی طرح آنحضرت ﷺ کو بھی ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے معراج ہوئی اور احکام دوازدہ گانہ عطا ہوئے، جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہجرت کے بعد فرعونیوں پر بحر احمر کی سطح پر عذاب نازل ہوا، اسی طرح آنحضرت ﷺ کی ہجرت کے بعد صنادید قریش پر بدر کے میدان میں عذاب آیا اور جس طرح اس کے بعد فرعون کی شاہی مملکت پر بنی اسرائیل قابض ہو گئے، اسی طرح مکہ معظّمہ کی حکومت بھی ہجرت کے بعد آپ ﷺ کو عطا کی گئی۔

ان اُمور کو پیش نظر رکھ کر کفار قریش کو معلوم ہونا چاہیے کہ قانون الٰہی معراج کے بعد ہجرت کا حکم دے گا اور اس کے بعد ان پر عذاب الیم کا نزول ہوگا چنانچہ سورۂ اسراء کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ۝ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝ فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ۙ ۝ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۱۰۱ تا ۱۰۴)

''اور ہم نے (کوہ طور) پر موسیٰ علیہ السلام کو [1] کھلے احکام دیے جس طرح محمد ﷺ کو معراج

[1] سبت کا حکم خاص یہود کے لئے تھا اس لئے شمار میں اس کو چھوڑ دیا گیا ہے جیسا کہ آئندہ حدیث سے معلوم ہوگا۔

میں عطا کئے تو پوچھ لو بنی اسرائیل سے جب موسیٰ بنی اسرائیل کے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ! میں سمجھتا ہوں کہ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے، تمہاری عقل کھو دی ہے موسیٰ نے کہا اے فرعون! تجھ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ان حکموں کو آسمان اور زمین کے مالک کے سوا کسی اور نے ان کو دانائی بنا کر نہیں اتارا ہے اور اے فرعون! میں سمجھتا ہوں کہ تم اب ہلاک اور برباد ہو جاؤ گے، فرعون نے چاہا کہ بنی اسرائیل کو ملک سے اکھیڑ دے تو ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو سب کو غرق کر دیا اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تم ملک میں رہو جب قیامت کا وعدہ پورا ہوگا تو سب کو سمیٹ کر ہم اپنے حضور میں لائیں گے۔''

ان آیتوں کے آغاز میں جن نو (۹) نشانیوں کے دیے جانے کا حکم ہے، بعض مفسرین نے اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نو (۹) معجزات مراد لئے ہیں مگر بعض احادیث میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے سامنے سے دو یہودی گزرے ایک نے دوسرے سے کہا کہ چلو اس پیغمبر سے کچھ سوال کریں۔ دوسرے نے کہا پیغمبر نہ کہو سن لے گا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی خوش ہوگا) اس کے بعد وہ آپ ﷺ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ موسیٰ کو نو آیتیں کون سی دی گئیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ یہ ہیں، ① کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ۔ ② زنا نہ کرو، ③ کسی بے گناہ کو قتل نہ کرو، ④ چوری نہ کرو ⑤ جادو نہ کرو، ⑥ کسی حاکم کے پاس بے جرم کی چغلی نہ کھاؤ ⑦ سود نہ کھاؤ، ⑧ کسی پاک دامن پر تہمت نہ لگاؤ ⑨ اور میدان جہاد سے نہ بھاگو۔'' (اس نویں حکم میں راوی کو شک ہے'' اور خاص تمہارے لئے اے یہود! یہ دسواں حکم ہے کہ ''سبت کے دن زیادتی نہ کرو۔'' یہ سن کر دونوں یہودیوں نے آپ ﷺ کے دست و پا کو بوسہ دیا۔

یہ حدیث جامع ترمذی، مسند احمد، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر میں ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو دو جگہ نقل کیا ہے ایک تفسیر بنی اسرائیل: ۳۱۴۴ میں اور دوسرے باب ماجاء فی قبلة الید والرجل: ۲۷۳۳۔ میں اور دونوں جگہ کہا ہے کہ ''حدیث حسن صحیح''

اس حدیث میں جن دس احکام کی تفصیل ہے اور موجودہ ترجمۂ توراۃ میں یہ احکام جن الفاظ میں مذکور ہے ان میں کسی قدر فرق ہے خصوصاً حدیث کا نواں حکم جس کے متعلق شعبہ راوی خود اقرار کرتے ہیں کہ اس کو یہ نویں بات اچھی طرح یاد نہیں یہ نواں حکم دراصل ماں باپ کی اطاعت اور عزت ہے، باقی احکام وہی ہیں جو تورات میں مذکور ہیں صرف طریقہ ادا اور تعبیر کا فرق ہے تورات کے موجودہ تراجم لفظی تو ہیں نہیں، علاوہ ازیں اس حدیث کے ایک راوی عبداللہ بن سلمہ کا حافظہ اچھا نہ تھا، ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں اس کی تصریح کی ہے بہر حال اس تشریح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان احکام عشرہ اور آنحضرت ﷺ

کے احکام دوازدہ گانہ میں ایک وجہ مماثلت ہے، اس لئے ان دونوں کے منکروں کا ایک ہی حال ہوگا۔

معراج کے انعامات

ان احکامات بشارت اور نماز پنجگانہ کے علاوہ آنحضرت ﷺ کو دو اور خاص عطیے عنایت ہوئے، ایک یہ بشارت کہ امت محمدیہ میں سے جو شرک کا مرتکب نہ ہوگا دامن مغفرت کے سایہ میں اس کو پناہ مل سکے گی، دوسرے سورۂ بقرہ کا اختتامی رکوع اسی بارگاہ میں فرمان خاص کے طور پر مرحمت ہوا، [1] اس رکوع میں سب سے پہلی مرتبہ ایمان کی تکمیل کے اصول اور عفو ومغفرت کے سبق انسانوں کو سکھائے گئے، اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ پہلے عطیہ کی بشارت بھی درحقیقت انہی آیات میں مذکور ہے:

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۵، ۲۸۶)

’’پیغمبر اس پر ایمان لایا جو اس پر اترا اور تمام مسلمان بھی اس پر ایمان لائے، یہ سب کے سب خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے اور کہتے ہیں کہ ہم خدا کے پیغمبروں میں یہ تفریق نہیں کرتے کہ بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے خدا کے احکام کو سنا اور ان کی اطاعت کی، تو اے ہمارے پروردگار! ہم پر بخشش فرما اور تیری ہی طرف آخر لوٹ کر جانا ہے، خدا کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا جس نے اچھے کام کئے اور اپنے ہی لئے کئے اور برے کام کئے تو اس کا نقصان بھی وہی اٹھائے گا، اے ہمارے پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو اس کی باز پرس ہم سے نہ کر، اے ہمارے پروردگار! اور ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈال جس طرح ہم سے پہلوں پر تو نے ڈالا، اے ہمارے پروردگار! اور اتنا بوجھ جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں ہم سے نہ اٹھوا، اور ہمارے قصوروں سے درگزر فرما، ہمارے قصوروں کو معاف کر اور ہم پر رحم فرما تو ہی ہمارا مددگار ہے تو ان لوگوں کے مقابلہ میں جو تیرے منکر ہیں ہماری مدد فرما۔‘‘

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب فی ذکر سدرۃ المنتھی: ۴۳۱ اس روایت میں یہ ہے کہ سورۂ بقرہ کے خاتمہ کی آیتیں مرحمت ہوئیں، یہ تفصیل نہیں کہ وہ کس قدر آیتیں ہیں لیکن حدیث کی دوسری کتابوں میں جن میں خواتیم سورۂ بقرہ کی فضیلت آئی ہے، وہ یہی ہیں۔

معراج کا پُراسرار منظر

سورۂ اسراء کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے معراج کے روحانی مناظر کا بیان صرف دو لفظوں میں ختم کر دیا ہے۔

﴿ لِنُرِيَهُ مِنْ ءَايَٰتِنَآ ﴾ (۱۷/ الاسرآء:۱) ''ہم نے اپنے بندہ کو یہ سیر اس لئے کرائی کہ ہم اپنی کچھ نشانیاں اس کو دکھائیں۔''

یہ ''نشانیاں کیا تھیں؟'' کیا ان کی تفصیل کے لئے عاجز و درماندہ انسان کی زبان میں کچھ الفاظ ہیں؟ ہاں ہیں، مگر ناتمام، ہماری فہم، ہمارا علم، ہمارا خیال، ہمارا قیاس، غرض جو کچھ ہمارے پاس ہے اس کا دائرہ ہمارے محسوسات اور ہمارے تعقلات سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور ہمارے ذخیرۂ لغت میں صرف انہی کے لئے کچھ الفاظ ہیں، اس بنا پر وہ معانی جو نہ عام محسوسات انسانی کی حدود میں داخل ہیں اور نہ تعقل و تصور کے احاطہ کے اندر ہیں وہ الفاظ و کلمات میں کیونکر سما سکتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے کمال قدرت سے ان کو حروف و کلمات کا جامہ پہنا بھی دے تو دماغ انسانی ان کے فہم و تحمل کی قدرت کہاں سے لائے گا؟

﴿ وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ ٱلْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝ ﴾ (۱۷/ الاسرآء:۸۵)

''اے انسانو! تم کو علم کا بہت تھوڑا سا حصہ عطا کیا گیا ہے۔''

اسی لئے سورۂ والنجم میں جہاں ان اسرار کے چہرہ سے کچھ پردہ ہٹایا گیا ہے، ایسی تفصیل ہے جو تمام تر اجمال ہے اور ایسی توضیح ہے جو سرتاپا ابہام ہے، دو دو لفظ کے فقرے ہیں، ضمیریں محذوف ہیں، فاعل کا ذکر ہے تو مفعول کا نہیں، مفعول کا بیان ہوا ہے تو فاعل نہیں، متعلقات فعل کی تشریح نہیں، ضمائر کے مرجعوں کی تعیین نہیں، کیوں؟ اس لئے کہ اس مقام کا مقتضا یہی ہے۔

عبادت از سخنداں ہم نہ گنجد

﴿ وَٱلنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۝ وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلْهَوَىٰٓ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْىٌ يُوحَىٰ ۝ عَلَّمَهُۥ شَدِيدُ ٱلْقُوَىٰ ۝ ذُو مِرَّةٍ فَٱسْتَوَىٰ ۝ وَهُوَ بِٱلْأُفُقِ ٱلْأَعْلَىٰ ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ ۝ فَأَوْحَىٰٓ إِلَىٰ عَبْدِهِۦ مَآ أَوْحَىٰ ۝ مَا كَذَبَ ٱلْفُؤَادُ مَا رَأَىٰٓ ۝ أَفَتُمَٰرُونَهُۥ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ۝ وَلَقَدْ رَءَاهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ ۝ عِندَ سِدْرَةِ ٱلْمُنتَهَىٰ ۝ عِندَهَا جَنَّةُ ٱلْمَأْوَىٰٓ ۝ إِذْ يَغْشَى ٱلسِّدْرَةَ مَا يَغْشَىٰ ۝ مَا زَاغَ ٱلْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ۝ لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ ءَايَٰتِ رَبِّهِ ٱلْكُبْرَىٰٓ ۝ ﴾ (۵۳/ والنجم:۱ تا ۱۸)

''قسم ہے ستارہ کی جب وہ گرے کہ تمہارا رفیق (محمد ﷺ) نہ تو بھٹکا ہے اور نہ بہکا ہے اور نہ وہ یہ باتیں اپنے دل سے بنا کر کہتا ہے، بلکہ وہ تو وحی ہے جو اس کو بتایا جاتا ہے، اس کو تو بڑی طاقتوں

والا اور بڑی عقل والا تعلیم دیتا ہے وہ آسمان کے اونچے کنارے میں سیدھا ہو کر نمودار ہوا پھر قریب آیا اور جھکا تو دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا اس سے بھی کم پھر اس کے بندہ سے جو باتیں کیں دل نے جو دیکھا اس نے جھوٹ نہیں بیان کیا، اے لوگو! کیا وہ جو دیکھتا ہے اس پر تم اس سے نزاع اور مناظرہ کرتے ہو، اس نے یقیناً دوبارہ اس کو اترتے دیکھا انتہا کے درخت کے پاس جس کے قریب (نیک بندوں کے) رہنے کی بہشت ہے جب بیری کے درخت پر چھا رہا تھا، جو چھا رہا تھا نہ نظر بہکی نہ اچٹی، اس لیے یقیناً اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔"

حضور ﷺ نے جب معراج کے روحانی مشاہدات و مناظر اور ملکوتی آیات و مظاہر کا قریش سے تذکرہ کیا تو انہوں نے کہا یہ راہ حق سے دیدہ و دانستہ (غوایت) یا نادانستہ (ضلالت) بھٹک گیا ہے یا اپنے دل سے بنا کر یہ جھوٹی باتیں بیان کرتا ہے یہ انہوں نے کیوں کہا؟ اس لئے کہا کہ روحانی جلوؤں کے دیکھنے کی ان کے پاس آنکھیں نہ تھیں، صوت سرمدی کے سننے کی اس کے کانوں میں طاقت نہ تھی، اسرار ملکوتی کے سمجھنے کے لئے ان کے سینوں میں دل نہ تھے، خدا نے کہا یہ جو کچھ تھا اور جو کچھ معلوم ہوا یہ ایک بڑی طاقت وقدرت اور علم وعقل والی ہستی کی جلوہ انگیزیاں تھیں، وہ کبھی اتنا دور تھا کہ آسمان کے کناروں میں نظر آیا اور کبھی اتنا قریب کہ دو کمانوں کے فاصلہ سے بھی قریب تر تھا کون جھکا؟ کون قریب آیا؟ کون دو کمانوں کے فاصلہ تک آ کر رک گیا کیا خدا؟ نہیں کیا جلوہ خدا؟ شاید، کس نے باتیں کیں؟ معلوم نہیں، کیا باتیں کیں؟ بتائیں نہیں۔ سدرۃ المنتہٰی کیا ہے؟ انسانی فہم وادارک کی اخیر سرحد پر ایک درخت! [1] کیا اس کو شئون وصفات الٰہی کی نیرنگی نے ڈھانک لیا؟ [2] کیا انسانی فہم وادراک کی اخیر سرحد کا درخت صرف شئون وصفات کی نیرنگی کا مظہر ہے؟ کیا یہاں پہنچ کر کون ومکان اور وجوب وامکان کا عقدۂ مشکل حل ہو گیا؟ کیا دل بھی دیکھتا ہے؟ حضور ﷺ نے دل کی آنکھوں سے کیا دیکھا؟ دیدۂ چشم سے کیا نظر آیا؟ آپ ﷺ کو اس سفر میں آیات ربانی دکھائی گئیں مگر یہ مشاہدہ قلب تھا یا معائنۂ چشم؟

راز ایں پردہ نہاں است ونہاں خواہد بود

[1] اکابر تابعین سے یہی روایت طبری نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کی ہے۔ ج ۲۷، ص: ۲۹ وما قبل وما بعد۔

[2] بخاری شریف میں ہے فغشیھا من امر اللہ ما غشی یعنی جلوہ الٰہی اس پر چھا گیا۔ یہ الفاظ صحیح مسلم، باب الاسراء: ٤١١ میں ہیں، صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ، باب کیف فرضت الصلوۃ فی الاسراء: ۳٤۹ میں (فغشیھا الوان لا ادری ماھی) کے الفاظ ہیں۔

شرح صدر یا شقِ صدر

﴿ اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ ۝ۙ﴾ (۹۴/ الانشراح:۱)

''کیا اے پیغمبر ﷺ! ہم نے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا''؟

منجملہ نبوت کے ان خصائص کے جو ایک پیغمبر کو عطا ہوتے ہیں شقِ صدر یا شرح صدر بھی ہے۔ چنانچہ یہ رتبہ خاص پیش گاہ الٰہی سے آنحضرت ﷺ کو مرحمت ہوا۔ شق صدر سے مراد یہ ہے کہ سینۂ مبارک کو چاک کر کے اس کو بشری آلودگیوں سے پاک اور ایمان و حکمت کے نور سے منور کیا گیا۔ بعض روایتیں ایسی بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ معراج سے پہلے بھی یہ کیفیت آپ پر گزری تھی۔ ان روایتوں میں بعض جزئیات کی تفصیل اور وقت کی تعیین میں اختلافات ہیں۔ چنانچہ تمام روایتوں کے جمع کرنے سے پانچ مختلف اوقات میں آپ پر اس کیفیت کا گزرنا ظاہر ہوتا ہے، ایک جب آپ چار پانچ سال کے تھے اور حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں پرورش پا رہے تھے، دوسرے جب عمر شریف دس برس کی تھی، تیسرے جب آپ بیس برس کی عمر کو پہنچے، چوتھے جب حضرت جبریل علیہ السلام سب سے پہلی دفعہ وحی لے کر آئے، پانچویں معراج کے موقع پر۔

یہ مسئلہ کہ شق صدر واقع ہوا، تمام صحیح روایتوں سے ثابت ہے اور اس کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ البتہ وقت کی تعیین اور بعض جزئیات کی تفصیل میں روایتیں مختلف ہیں۔ تیسری دفعہ کی روایت جس میں بیس برس کی عمر میں اس کیفیت کا گزرنا بیان کیا گیا ہے۔ محدثین [1] بلکہ خود اربابِ سیر [2] کے نزدیک قطعاً غیر ثابت ہے۔ باقی چار موقعوں کو حافظ ابن حجر وغیرہ نے جو ہر اختلاف روایت کو ایک نیا واقعہ تسلیم کر کے مختلف روایتوں میں توفیق اور تطبیق کی کوشش کرتے ہیں تسلیم کیا ہے۔ امام سہیلی روض الانف میں صرف دو موقعوں کی روایت کو صحیح سمجھتے ہیں۔ ایک دفعہ صغر سنی میں اور دوسری دفعہ معراج میں اور اس کی مصلحت یہ بتائی ہے کہ صغر سنی میں اس لئے یہ ہوا کہ بچپن ہی سے حضور ﷺ کے قلب مبارک سے ذمائم کے حصہ کو نکال دیا جائے اور معراج کے وقت تو ظاہر ہے، اس لئے تاکہ حضور ربانی کے موقع پر حکم صلوٰۃ کا جو طہارت محض ہے تحمل کیا جائے اور ملائکہ الٰہی کی امامت نماز میں فرما سکیں۔ (صفحہ ۱۱۰ مصر) لیکن یہ بات ہر شخص کو کھٹک سکتی ہے کہ سینۂ مبارک کا آلودگیوں سے پاک و صاف ہو کر منور ہو جانا ایک ہی دفعہ میں ہو سکتا ہے۔ اور وہ ایک دفعہ پاک و منور ہو کر پھر دوبارہ پاکی و طہارت کا محتاج نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر بعض محدثین جیسے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اس کو ایک ہی دفعہ کا واقعہ سمجھتے ہیں۔ اور وہ صغر سنی میں جب آپ ﷺ حضرت حلیمہ کے یہاں پرورش پا رہے تھے

---

[1] فتح الباری، ج ۱، ص: ۳۸۹ مصر۔ [2] زرقانی بر مواہب، ج ۱، ص: ۱۸۰۔

اور معراج کے موقع پر شق صدر کے واقعہ کو راویوں کا سہو جانتے ہیں۔ [1] لیکن یہ پوشیدہ نہیں کہ واقعہ شق صدر کی روایت جن طریقوں کے ساتھ آئی ہے۔ ان میں سب سے صحیح، سب سے مستند اور معتبر طریقہ وہی ہے جس میں اس کا شب معراج میں ہونا بیان ہوا ہے۔ اس لئے اس موقع کو راویوں کا سہو قرار دینا اور بچپن میں اس کا ہونا تسلیم کرنا اصول روایت سے صحیح نہیں۔

شق صدر کی ضعیف روایتیں

اصل یہ ہے کہ شق صدر کے وقت یا اوقات کی تعیین اور اس کا مکرر اور بار بار پیش آنا صرف مختلف روایات کے پیش کر دینے سے نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے اور قسطلانی اور زرقانی نے اس کی تقلید کی ہے، بلکہ ضرورت ہے کہ ان روایات کے سلسلہ سند پر بھی بحث اور راویوں کی قوت وضعف پر بھی تنقید کی جائے۔ دس برس کے سن میں شق صدر والی روایت جس میں یہ تصریح ہے کہ سب سے پہلی دفعہ آپ ﷺ پر نبوت کی یہ علامت طاری ہوئی حسب ذیل ہے:

> ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ سے نبوت کا ابتدائی نشان پوچھتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:
>
> ''میں دس برس کا تھا کہ میدان میں دو آدمی میرے سر پر آئے۔ ایک نے کہا: یہ وہی ہیں؟ دوسرے نے کہا: ہاں، پھر دونوں نے پیٹھ کے بل مجھے پچھاڑا اور میرے پیٹ کو پھاڑا، ایک سونے کے طشت میں پانی لاتا رہا اور دوسرا پیٹ کو دھوتا رہا۔ پھر ایک نے کہا: سینہ کو چاک کرو تو ناگاہ دیکھتا ہوں کہ سینہ چاک ہے اور کچھ تکلیف نہیں معلوم ہوتی۔ پھر ایک نے کہا، کہ دل کو چاک کرو تو اس نے دل کو چاک کیا۔ پھر اس نے کہا: اس میں سے کینہ اور حسد نکال لو۔ تو اس میں سے جمے ہوئے خون کی طرح کی کوئی چیز نکالی۔ پھر کہا: اس میں مہربانی اور رحمت رکھ دو۔ تو اس نے چاندی کی طرح کی کوئی چیز رکھ دی۔ پھر اس نے چند گھنڈیاں جو اس کے پاس تھیں نکالیں اور وہ گھنڈیاں میرے سینہ پر لگا دیں۔ پھر میرے انگوٹھے کو کھونٹ کر مجھ سے کہا جاؤ، جب میں لوٹا تو اپنے میں وہ لے کر لوٹا جو لے کر نہیں آیا تھا۔ یعنی چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کے ساتھ نرمی۔''

یہ روایت زوائد مسند احمد، ابن حبان، حاکم، ابن عساکر اور ابونعیم میں ہے۔ لیکن ان تمام کتابوں میں

---

[1] فتح الباری، کتاب الصلوٰۃ، باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء، ج ۱، ص: ۳۸۹ و کتاب التوحید، ج ۱۳، ص: ۴۰۰ باب ما جاء فی قوله عزوجل ﴿وکلم اللّٰه موسی تکلیما﴾ روض الانف سهیلی، ص: ۱۱۰ مصر، زرقانی برمواهب، ج ۱، ص: ۱۷۹، قاضی عیاض شفاء میں لکھتے ہیں:

وقد خلط فيه غيره لاسيما من رواية شريك بن ابى تمر فقد ذكر فى اوله مجيء الملك له وشق صدره وغسله بماء زمزم وهذا انما كان وهو صبى وقبل الوحى (نسيم الرياض شرح شفاء قاضى عياض ۲، ص: ۲۶۵۔)

مرکزی سلسلۂ سند ایک ہی ہے۔ یعنی یہ کہ معاذ بن محمد اپنے باپ محمد بن معاذ اور وہ اپنے باپ معاذ بن محمد سے اور وہ اپنے دادا ابی بن کعب سے روایت کرتے ہیں۔ محدث ابن المدینی نے اپنی کتاب العلل میں اس حدیث کے تحت میں لکھا ہے:

حديث مدني واسناده مجهول كله ولا نعرف محمدا ولا اباه ولا جده۔ [1]

''یہ مدنی حدیث ہے اس کی سند تمام تر مجہول ہے۔ ہم لوگ نہ محمد کو جانتے ہیں اور نہ اس کے باپ کو اور نہ اس کے دادا کو۔

حافظ ابونعیم نے دلائل میں جہاں یہ حدیث نقل کی ہے صاف لکھ دیا ہے:

وهذا الحديث تفرد به معاذ بن محمد وتفرد بذكر السن الذي شق فيه عن قلبه۔ [2]

''یہ حدیث صرف معاذ بن محمد نے نقل کی ہے اور وہی اس عمر کی تعیین کے بیان میں جس میں شق صدر ہوا منفرد ہیں۔ (یعنی اس روایت کی کسی اور نے تائید نہیں کی ہے)۔''

بیس برس کے سن کی روایت بھی بعینہٖ ان ہی لوگوں سے تھوڑے تغیر کے ساتھ ان ہی الفاظ میں زوائد احمد، صحیح ابن حبان، حاکم، بیہقی اور مختارۂ ضیاء میں ہے۔ (کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۹۶) لیکن اس سلسلہ روایت کا حال آپ سن چکے کہ وہ معتبر نہیں۔

آغاز وحی کے موقع پر شق صدر کی روایتیں دلائل ابونعیم، دلائل بیہقی، مسند طیالسی اور مسند حارث میں ہیں۔ یہ روایتیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی آغاز وحی والی حدیث، بخاری، مسلم اور ابن حنبل وغیرہ تمام مستند کتابوں میں مذکور ہے اور اس باب میں یہی روایت سب سے زیادہ مفصل، صحیح اور محفوظ ہے لیکن ان کتابوں میں اس موقع پر شق صدر کا مطلق ذکر نہیں۔ اس سے اس واقعہ کی بے اعتباری ظاہر ہوتی ہے۔ علاوہ بریں ابونعیم، بیہقی، طیالسی اور حارث والی اس روایت کی مرکزی سند ابوعمران الجونی، یزید بن بانبوس عن عائشہ ہے، یزید بن بانبوس مجہول ہے اور اس سے صرف ابوعمران الجونی ہی نے روایت کی ہے کسی اور نے اس کو نہیں لیا ہے، طیالسی میں (صفحہ ۲۱۵ حیدر آباد) اس روایت کی سند یہ ہے کہ حماد بن سلمہ ابوعمران جونی سے اور وہ ایک شخص سے اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے راوی ہے، معلوم نہیں یہ نامعلوم شخص کون ہے؟ اور ابوعمران نے اس کا نام کیوں نہیں لیا ہے، ابونعیم میں (صفحہ ۶۹ حیدر آباد) اس روایت کا جو سلسلہ سند ہے اس میں یہ خالی جگہ یزید بن بانبوس کے نام سے پر کی گئی ہے، جس کا حال ابھی اوپر گزر چکا علاوہ ازیں ابونعیم کی روایت میں اس کے نیچے داؤد بن المجر ایک شخص آتا ہے جس کو اکثر محدثین ضعیف، بلکہ دروغ گو تک کہتے ہیں، اسی کے ساتھ اس روایت کے اندر بعض ایسی لغو باتیں بھی ہیں جو اس کو صحت کے پایہ سے

[1] تهذيب التهذيب، ج ۱۰، ص: ۱۹٤۔ [2] دلائل النبوة جز اول، فصل ۱۷، ص: ۷۱ حیدرآباد طبع اول: ۱۳۲۰ھ۔

ساقط کرتی ہیں۔

ایک اور روایت حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ہے کہ ''انہوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! جب آپ کو نبی بنانا چاہا گیا تو آپ کو اپنی پیغمبری کا حال کیونکر معلوم ہوا اور آپ نے کیونکر یقین کیا کہ آپ پیغمبر ہیں؟ فرمایا: ''اے ابوذر! میں مکہ کی ترائی میں تھا کہ دو فرشتے میرے پاس آئے، ایک زمین پر آیا اور دوسرا آسمان پر تھا ایک نے دوسرے سے کہا: یہی وہ ہیں پھر کہا ان کو تو لو، پہلے ایک سے پھر دس سے پھر سو سے پھر ہزار سے مجھ کو تولا لیکن میرا پلہ بھاری رہا تو کہا کہ یہ تمام امت سے بھاری ہیں، بعدازیں میرا شکم چاک کیا (اس کے بعد شق صدر کے مختلف واقعات کا ذکر ہے، اس کے بعد ہے) کہ ان فرشتوں نے پھر میرے شانے پر مہر کی۔'' اس روایت میں گو وقت کی تعیین نہیں مگر یہ ذکر ہے کہ یہ واقعہ مکہ کی ترائی میں پیش آیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے پاس بنو ہوازن میں قیام کے زمانہ سے بہت بعد کا واقعہ ہے، پھر اس میں یہ ہے کہ جب آپ ﷺ کو نبی بنانا چاہا گیا اور نبوت کی سب سے پہلی علامت کا سوال ہے اور امت کا ذکر ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ آغاز وحی کا واقعہ ہے، یہ روایت مسند دارمی (صفحہ ۶) اور دلائل ابونعیم (صفحہ ۷۱) میں ہے، ان کے مشترک راوی بہ ترتیب ابوداؤد، جعفر بن عبداللہ بن عثمان القریشی، عثمان بن عروہ بن زبیر ہیں، جعفر بن عبداللہ کی نسبت محدث عقیلی نے تنقید کی ہے کہ اس میں ''وہم'' تھا یعنی الفاظ کی صحیح یادداشت نہ تھی اور اضطراب تھا۔ یعنی ایک ہی واقعہ اور سند کو کبھی کسی طرح اور کبھی کسی طرح بیان کرتا تھا، پھر اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ ''اس کی متابعت نہیں کی جاتی'' یعنی اس کے ہم شیخ اور ہم درس اس کی تائید نہیں کرتے [1] پھر بعینہ یہی واقعات شداد بن اوس کی روایت سے ابونعیم، [2] ابویعلیٰ اور ابن عساکر [3] نے عتبہ بن عبد سلمی کی روایت سے دارمی [4] اور ابن اسحاق [5] نے (مرسلاً) بچپن کے شق صدر میں بیان کیا ہے جن سے ان کا باہمی تعارض واضح ہے۔

اب رہ گئی وہ روایت جس میں حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے ہاں قیام کے زمانہ میں شق صدر کا ذکر ہے، یہ روایت سات مختلف سلسلوں سے اور مختلف صحابیوں سے لوگوں نے نقل کی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ان میں دو سلسلوں کے علاوہ بقیہ سلسلے صحت اور قوت سے تمام تر خالی ہیں اور ان میں بعض ایسی لغو باتیں شامل ہیں جو اس کو درجہ اعتبار سے گرا دیتی ہیں۔

① اس روایت کا سب سے پہلا طریقہ یہ ہے کہ جہم بن ابی جہم، عبداللہ بن جعفر سے اور عبداللہ بن جعفر خود

[1] دیکھئے میزان الاعتدال ذہبی، ج ۱، ص: ۱۹۱ اور لسان المیزان ابن حجر، ج ۲، ص: ۱۱۶۔
[2] دلائل النبوۃ، ص: ۱۷۶۔ [3] تاریخ ابن عساکر، ج ۱، ص: ۳۷۱، ۳۷۲۔
[4] کیف کان اول شان النبی ﷺ ص: ٦۔
[5] طبقات ابن سعد ذکر علامات النبوۃ:...... الجزء الاوّل، القسم الاول، ص: ۹٦۔

حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا سے راوی ہیں، اس طریقہ سے یہ روایت ابن اسحاق اور دلائل ابی نعیم میں ہے، جہم بن ابی جہم مجہول ہے اور عبداللہ بن جعفر کی حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات ثابت نہیں، اور ابن اسحاق جہم بن ابی جہم کا شک ظاہر کرتا ہے اس نے کہا کہ عبداللہ ابن جعفر نے خود مجھ سے کہا یا ان سے سن کر کسی اور نے مجھ سے کہا۔ ابونعیم میں گو یہ شک مذکور نہیں ہے بلکہ اس میں تصریحاً عبداللہ بن جعفر کا نام لیا گیا ہے مگر اس میں اس کے نیچے کے راوی مجروح ہیں۔

② دوسرا طریقہ واقدی کا ہے، ابن سعد نے اس روایت کو اسی سلسلہ سے ذکر کیا ہے (جلد اصفحہ ۷۰) مگر علاوہ اس کے کہ واقدی کا اعتبار نہیں اس کی تفصیلی سند تک اس میں مذکور نہیں اوپر کے راویوں کا نام مطلق نہیں بتایا گیا ہے۔

③ ابونعیم نے ایک اور سلسلہ سے اس کو بیان کیا ہے، جو یہ ہے عبدالصمد بن محمد السعدی اپنے باپ سے، وہ اپنے باپ سے اور وہ ایک شخص سے جو حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کی بکریاں چرایا کرتا تھا بیان کرتے ہیں۔ [1] یہ تمام تر مجہول لوگ ہیں۔

④ بیہقی اور ابن عساکر [2] نے ایک اور سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ واقعہ نقل کیا ہے لیکن اس سند میں محمد بن زکریا الغلابی جھوٹا اور وضاع ہے، اس کا شمار قصہ گویوں میں ہے۔

⑤ ابن عساکر [3] نے شداد بن اوس رضی اللہ عنہ صحابی کے واسطہ سے ایک نہایت طویل داستان نقل کی ہے، جس میں مذکور ہے کہ قبیلہ بنی عامر کے ایک پیر مرد نے خدمت نبوی ﷺ میں آ کر آپ سے آپ کے ابتدائی حالات دریافت کئے، آپ نے پورا پورا حال بیان کیا، منجملہ اس کے ایک واقعہ اپنے بچپن کے شق صدر کا بیان کیا، لیکن خود ابن عساکر اس روایت کو غریب (یعنی ثقات کے بیان سے مختلف) کہتے ہیں اس کے سوا اس کے سلسلۂ سند کے بیچ میں ایک بے نام ونشان راوی ہے، اس سے اوپر ایک اور قابل اعتراض راوی اس میں ابو یحییٰ ہے جو شداد بن اوس رضی اللہ عنہ صحابی سے اس قصہ کا سننا بیان کرتا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ صغیر (ص ۱۴۳، الٰہ آباد) میں اس کی نسبت لکھا ہے: في حديثه نظر اس کی حدیث بحث طلب ہے، ابوحاتم کہتے ہیں: ليس حديثه بالقائم یعنی اس کی حدیث ٹھیک نہیں۔ [4]

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مکحول شامی کے واسطہ سے ابویعلیٰ اور ابن عساکر [5] نے بعینہٖ اسی واقعہ کو ایک اور سلسلہ سے نقل کیا ہے جس میں گو کوئی مجہول راوی بیچ میں نہیں آیا ہے، مگر اس میں یہ کمی ہے کہ مکحول اور شداد رضی اللہ عنہ صحابی کے بیچ میں ایک راوی چھوٹ گیا ہے یا چھوڑ دیا گیا ہے، یعنی روایت منقطع ہے، کیونکہ مکحول

[1] دلائل النبوه، ص: ١١٥۔ [2] تاريخ ابن عساكر، ج ١، ص: ٣٧٦۔
[3] ايضًا، ص: ٣٧١تا ٣٧٦۔ [4] ميزان الاعتدال، ج ٣، ص: ٣٧٠؛ تهذيب التهذيب، ج ١٢، ص: ١٦٥۔
[5] تاريخ ابن عساكر، ج ١، ص: ٣٧٤۔

نے حضرت شداد رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے، مکحول تدلیس میں بدنام تھے یعنی ان کی عادت یہ تھی کہ بیچ میں اگر کوئی کمزور راوی آ جاتا تو وہ اس کا نام چھپا دیتے تھے یا بیچ سے اس کو حذف کر کے اگلے سے سلسلہ جوڑ دیتے تھے میرا خیال ہے کہ مکحول اور حضرت شداد رضی اللہ عنہ کے بیچ میں دراصل وہی ابوالعجفاء تھا، مکحول نے یہ دیکھ کر کہ وہ مجروح ہے اس کو بیچ سے نکال دیا ہے، اس لئے یہ سلسلہ بھی نامعتبر ہے۔

⑥ عتبہ بن عبد السلمی ایک کمسن صحابی ہیں، ان سے ایک ہی سلسلہ سند کے ذریعہ سے حاکم، دارمی، ابویعلیٰ، ابن عساکر اور ابن حنبل نے اس واقعہ کی یوں روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک دن میں اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ بکریاں چرانے گیا، کھانا ساتھ نہ تھا، میں نے اس کو ماں (دایہ) کے پاس کھانا لانے کے لئے بھیجا، وہ گیا تو دیکھا کہ گدھ کی طرح کے دو پرندے آئے ایک نے دوسرے سے کہا کہ یہی ہے؟ دوسرے نے کہا :ہاں، پھر دونوں نے جھپٹ کر مجھے پکڑا اور زمین پر پچھاڑ کر میرا پیٹ چاک کیا اور اس میں سے دو سیاہ جمے ہوئے خون کے قطرے نکالے اور برف اور ٹھنڈے پانی سے دھویا، یہ حاکم کے الفاظ ہیں، [1] دارمی [2] وغیرہ میں اس کے بعد اتنا زیادہ ہے کہ ''دھونے کے بعد ایک نے کہا کہ سکینت یعنی تسکین قلبی لاؤ، اس کو لا کر میرے سینہ پر چھڑک دیا، پھر دونوں چھوڑ کر مجھے چلے گئے، میں ڈرا اور اپنی ماں کے پاس گیا اور حال کہا وہ ڈری کہ بچہ کی عقل ٹھیک نہیں رہی اس نے کہا: میں تم کو خدا کی پناہ میں دیتی ہوں اور پھر وہ مجھے اونٹ پر بٹھا کر میری والدہ کے پاس لائی، والدہ نے کہا: تم نے امانت پوری طرح ادا کی، دایہ نے میرا حال اور اپنا خوف بیان کیا، لیکن والدہ نے یہ واقعہ سن کر کوئی خوف یا تعجب نہیں کیا فرمایا: ''جب یہ بچہ پیدا ہوا تو میں نے دیکھا تھا کہ ایک نور میرے بدن سے نکلا جس سے شام کے محل روشن ہو گئے۔'' حاکم نے اس حدیث کو مسلم کی شرط کے مطابق کہا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلہ روایت کا پہلا مشترک راوی بقیہ بن ولید ہے، جس کو گو بذات خود بعضوں نے ثقہ کہا ہے تاہم اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ سخت بے احتیاط تھا، ابن مبارک کہتے ہیں: وہ راست گو ہے، مگر وہ آگے پیچھے کے ہر شخص سے روایت لے لیا کرتا تھا۔ ابن عیینہ کہتے ہیں: ''بقیہ سے احکام کی روایتیں نہ لیا کرو، ثواب (فضائل) کی روایتیں خیر لے لیا کرو۔'' امام ابن حنبل اور امام یحییٰ رحمۃ اللہ علیہما کا قول ہے: ''اگر وہ مشہور لوگوں سے روایت کرے تو خیر ورنہ مت کرو۔'' ابوحاتم کہتے ہیں کہ ''اس کی حدیث لکھی جائے مگر وہ دلیل میں نہ پیش کی جائے۔'' امام نسائی فرماتے ہیں: ''جب وہ اخبرنا اور حدثنا کہے تو خیر اور جب عن عن کر کے بیان کرے تو نہ لو۔'' (یہ یاد رہے کہ یہ روایت مذکورہ بہ طریق عن عن ہی ہے) ابن عدی کا قول ہے: ''اس کی بعض روایتیں ثقہ اور معتبر راویوں کے خلاف ہیں۔'' امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ایک شخص سے فرماتے ہیں کہ ''میں سمجھتا تھا کہ بقیہ مجہول الحال لوگوں سے سن کر حدیثیں نقل کرتا ہے لیکن دیکھا تو وہ مشہور لوگوں سے بھی اس قسم کی حدیثیں بیان کرتا ہے تم نے جانا کہ وہ

---

[1] مستدرك حاكم، كتاب التاريخ، ذكر شق صدره ...... ج ٢، ص: ٦١٦۔ برف اور پانی سے دھونے کا ذکر ''حاکم'' کے بجائے سنن دارمی میں ہے۔ [2] سنن دارمی، باب کیف کان اول شان النبی ﷺ: ١٣۔

کہاں سے یہ روایتیں لاتا ہے؟ مخاطب نے جواب دیا۔ ہاں تدلیس کے ذریعہ سے۔ (یعنی بیچ کے کمزور راوی کو حذف کر کے، آگے کے معتبر راوی سے سلسلہ جوڑ دیا کرتا تھا) ابوعبداللہ حاکم کہتے ہیں کہ ''اوزاعی وغیرہ مشہور لوگوں سے وہ ایسی روایتیں کرتا ہے جو موضوعات کے مشابہ ہیں اور اس کی صورت یہ کرتا ہے کہ بیچ کے ضعیف راوی کو حذف کر دیتا ہے۔'' خطیب کہتے ہیں کہ ''اس کی اکثر روایتیں منکر ہیں، گو وہ بذات خود راست گو تھا۔'' ابن القطان کا قول ہے کہ ''وہ ضعیف راویوں سے تدلیس کر کے بیان کرتا ہے اور اس کو وہ جائز سمجھتا ہے، یہ الزام اگر اس پر سچ ہے تو اس کے معتبر ہونے میں خلل انداز ہے۔'' ❶

حماد بن سلمہ کی روایت میں ان کا وہم

بچپن میں شق صدر کا سب سے صحیح اور محفوظ سلسلۂ سند وہ ہے جو حماد بن سلمہ ثابت بنانی سے اور ثابت، انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں چنانچہ یہ روایت صحیح مسلم ❷ مسند احمد ❸ ابن سعد ❹ اور دلائل ابونعیم ❺ میں ایک ہی سلسلۂ سند سے مذکور ہے یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ثابت البنانی اور ان سے حماد بن سلمہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور آپ ﷺ کو پکڑ کر زمین پر لٹایا اور قلب مبارک کو چاک کیا اور اس کو نکال کر اس میں سے ذرا سا جما ہوا خون نکالا اور کہا کہ یہ اتنا شیطان کا حصہ تم میں تھا، پھر اس کو سونے کے طشت میں آب زمزم سے دھویا، پھر شگاف کو جوڑ دیا پھر اس کو اپنی جگہ پر رکھ دیا، لڑکے دوڑے ہوئے آپ کی ماں (دایہ حلیمہ) کے پاس گئے اور جا کر کہا کہ محمد (ﷺ) مار ڈالے گئے، لوگ آپ کے پاس پہنچے، دیکھا تو چہرہ کا رنگ متغیر ہے، انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''کہ سینۂ مبارک میں زخم کے نشان یعنی ٹانکے مجھ کو نظر آتے تھے۔'' مسند ابن حنبل میں یہی حدیث اسی سلسلہ سند سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس میں آخر واحد متکلم کے بجائے جمع متکلم ہے، یعنی یہ کہ ''مجھ کو نظر آتے تھے۔'' کی جگہ پر یہ ہے کہ ''ہم کو زخم کے ٹانکے نظر آتے تھے۔''

اس سلسلۂ سند کے صحیح اور محفوظ ہونے میں کوئی شک نہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ صحاح میں معراج اور شق صدر کی جس قدر روایتیں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں، ان کے دوسرے راوی تابعین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں سے قتادہ، زہری، شریک اور ثابت بنانی چار شخص ہیں، ثابت بنانی سے دو آدمی ان واقعات کو نقل کرتے ہیں، سلیمان بن خیرہ اور حماد بن سلمہ، حماد کے علاوہ اور جو طرق اوپر مذکور ہوئے، ان سب میں معراج کے واقعات کے آغاز میں شق صدر کا ذکر ہے لیکن حماد نے اپنی روایت میں یوں کیا ہے کہ معراج کے سلسلہ میں وہ شق صدر کے ذکر کو ترک کر دیتے ہیں اور شق صدر کے واقعہ کو الگ اور مستقل بچپن کے زمانہ کی تخصیص کے ساتھ بیان کرتے ہیں، حالانکہ نہ صرف حضرت انس رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں سے کوئی بلکہ

---

❶ تهذيب التهذيب، ج١، ص: ٤٧٤ تا ٤٧٨۔ ❷ كتاب الايمان، باب الاسراء...... ٤١٣۔
❸ ج٣، ص: ١٤٩۔ ❹ ذكر علامات النبوة، ج١، ص: ٩٧۔ ❺ ص: ١٧٦، ١٧٧

حماد کے دوسرے ہم درس طلبہ میں سے بھی کوئی ان کی تائید نہیں کرتا، غالباً یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے معراج کی حدیث، حماد کے واسطہ سے نقل نہیں کی ہے حماد کی نسبت اسماء الرجال کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ''آخر عمر میں ان کا حافظہ خراب ہوگیا تھا۔'' [1] اسی سبب سے امام بخاری نے ان کی روایتیں نہیں لی ہیں۔ امام مسلم اپنی سمجھ کے مطابق کوشش کر کے خرابی حافظہ سے پہلے کی جو ان کی روایتیں ہیں انہی کو چن کر اپنی کتاب میں لائے ہیں۔ میرا میلان تحقیق یہ ہے کہ حماد کی یہ روایت اسی خرابی حافظہ کے زمانہ کی ہے کہ انہوں نے تمام معتبر راویوں کے خلاف شق صدر اور معراج کے مشترک واقعہ کو دو کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ امام مسلم بھی اپنی ترتیب بیان کے اشارات سے ایسا ہی کچھ بتانا چاہتے ہیں کہ معراج اور شق صدر کو دو الگ الگ زمانوں کے واقعات قرار دینے میں حماد سے غلطی ہوئی ہے چنانچہ واقعات معراج کے ذکر میں امام مسلم یہ کرتے کہ پہلے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ثابت کے شاگرد حماد کی یہ حدیث نقل کرتے ہیں جس میں معراج کے شق صدر کا ذکر نہیں پھر حماد کے ساتھی اور ثابت کے شاگرد سلیمان بن مغیرہ کی روایت ہے، جس میں شق صدر کے ساتھ معراج کا ذکر ہے، اس کے بعد حماد کی وہ روایت ہے جس میں تنہا بچپن کے شق صدر کا تذکرہ ہے، بعد ازیں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے دوسرے شاگردوں کی روایتیں ہیں، جس میں شق صدر اور معراج کا ایک ساتھ واقع ہونا مذکور ہے۔

حماد کی اس روایت میں بعض ایسے معنوی وجوہ بھی ہیں جن کی تائید کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہوتی، مثلاً: یہ کہ شق صدر کی یہ کیفیت کسی عمر میں بھی گزری ہو، مگر بہر حال اس کا تعلق روحانی عالم سے تھا، گزشتہ تمام مستند اور مجروح روایتوں میں حسد، بغض، حصہ شیطانی، سکینت، تسلی، رحمت، شفقت ایمان اور حکمت وغیرہ جن امور کا سینہ مبارک سے نکالنا یا اس میں رکھنا بیان ہوا ہے ان میں سے کسی چیز کا تعلق جسمانیات سے نہیں، باایں ہمہ حماد حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کر کے کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے سینہ پر زخم کے ٹانکے کے نشان مجھ کو (جیسا کہ مسلم میں ہے) یا ہم کو (جیسا کہ مسند احمد میں ہے) نظر آتے تھے۔ اگر یہ جسمانی واقعہ بھی تھا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی دیگر مروی روایات میں سے جو حماد کے علاوہ دوسرے راویوں نے نقل کی ہیں یہ مذکور نہیں، علاوہ ازیں آنحضرت ﷺ کی شکل شمائل کا ایک ایک حرف، جسم اطہر کے ایک ایک خط و خال کی کیفیت صحابہ رضی اللہ عنہم نے بیان کی ہے، مگر کسی نے سینہ مبارک کے ان نمایاں ٹانکوں کا نام تک نہیں لیا، ایسی حالت میں واقعہ کی یہ صورت کیونکر تسلیم ہوسکتی ہے۔

دو دفعہ شقِ صدر ہو تو اس کی تاویل

اس تشریح اور تفصیل کے بعد بھی اگر کسی کو حماد کی اس روایت کے قبول کرنے پر اصرار ہو تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس روایت کے مطابق بچپن میں جب عقل و ہوش کا آغاز ہوا تو سینہ مبارک سے حصہ شیطانی، جو ہر انسان کے اندر ہے، اس کو نکالا گیا کہ صحیح مسلم کی اس روایت میں اسی قدر ہے، ابھی علم و حکمت کی کوئی چیز رکھی نہیں گئی، مگر معراج

[1] تهذيب التهذيب، ج٣، ص: ١٤۔

کی رات جب اس عقل و ہوش کی تکمیل ہوئی تو وہ دھو کر علم و حکمت سے معمور کیا گیا، جیسا کہ تمام روایتوں میں ہے۔

شقِ صدر کی صحیح کیفیت

شق صدر کی صحیح کیفیت حالت معراج کے سلسلہ میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، اور نسائی وغیرہ میں متعدد روایتوں اور طریقوں سے مذکور ہے کہ ایک شب کو آنحضرت ﷺ خانہ کعبہ میں آرام فرما رہے تھے، آنکھیں سوتی تھیں، مگر دل بیدار تھا کہ ناگاہ حضرت جبرائیل علیہ السلام چند فرشتوں کے ساتھ نظر آئے، آپ کو اٹھا کر وہ چاہ زمزم کے پاس لے گئے یا آب زمزم لے کر کوئی آپ کے پاس آیا، سینہ مبارک کو چاک کیا پھر آب زمزم سے دھویا، اس کے بعد سونے کا ایک طشت ایمان و حکمت سے بھرا ہوا لایا گیا، پھر اس طشت کے سرمایہ کو سینہ مبارک میں بھر کر شگاف کو برابر کر دیا گیا اس کے بعد فرشتے آپ کو آسمان کی طرف لے چلے۔ [1]

شق صدر کی حقیقت

علمائے ظاہر بین اس واقعہ کے ظاہر الفاظ کے جو عام اور سیدھے سادھے معنی سمجھتے ہیں کہ واقعی سینہ مبارک چاک کیا گیا اور قلب اقدس ﷺ کو اسی آب زمزم سے دھو کر ایمان و حکمت سے بھر دیا گیا، اس کو ہر مسلمان سمجھ سکتا ہے، لیکن صوفیائے حقیقت بین اور عرفائے رمز شناس ان الفاظ کے کچھ اور ہی معنی سمجھتے ہیں اور ان تمام غیر متحمل الالفاظ معنی کو تمثیل کے رنگ میں دیکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ عالم برزخ کے حقائق ہیں، جہاں روحانی کیفیات جسمانی اشکال میں اسی طرح نظر آتے ہیں جس طرح حالت خواب میں تمثیلی واقعات جسمانی رنگ میں نمایاں ہوتے ہیں اور جہاں معنی اجسام کی صورت میں متمثل ہوتے ہیں۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

اما شق الصدر وملؤه ايمانا فحقيقة غلبة انوار الملكية وانطفاء لهيب الطبيعة وخضوعها لما يفيض عليها من حظيرة القدس۔ [2]

''لیکن سینہ کا چاک کرنا اور اس کو ایمان سے بھرنا اس کی حقیقت انوار ملکیہ کا روح پر غالب ہو جانا اور طبیعت (بشری) کے شعلہ کا بجھ جانا اور عالم بالا سے جو فیضان ہو تو اس کے قبول کے لئے طبیعت کا آمادہ ہو جانا ہے۔''

ان کے نزدیک معراج بھی اسی عالم کی چیز تھی، اس لئے شق صدر بھی اسی دنیا کا واقعہ ہوگا۔

ہمارے نزدیک صحیح اصطلاح شرح صدر ہے، جیسا کہ صحیح مسلم باب الاسراء میں حضرت مالک بن

---

[1] صحيح بخاري، كتاب الصلوة، باب كيف فرضت الصلوة في الاسراء: ٣٤٩؛ كتاب بدء الخلق، باب ذكر الملائكة: ٣٢٠٧؛ كتاب مناقب الانصار، باب المعراج: ٣٨٨٧؛ كتاب التوحيد، باب (كلم الله موسىٰ تكليما): ٧٥١٧؛ صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب الاسراء برسول الله إلى السمٰوٰت: ٤١٥، ٤١٧؛ نسائي، كتاب الصلوة، باب فرض الصلوة: ٤٤٩، ٤٥٣۔ [2] حجة الله البالغة، ج ٢، ص: ٢٠٦۔

صعصعہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں مذکور ہے ((فشرح صدري الى كذا و كذا)) ''میرا سینہ یہاں سے یہاں تک کھولا گیا۔'' ❶ اور قرآن مجید کی اس سورہ میں جیسا کہ ترمذی میں ہے اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ ❷

﴿ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ ﴾

(۹۴/ الانشراح:۱ تا ۳)

''کیا ہم نے تیرے لئے سینہ کو کھول نہیں دیا اور تجھ سے تیرے اس بوجھ کو ہٹا نہیں دیا جس نے تیری پیٹھ کو توڑ دیا تھا۔''

''شرح'' کے لغوی معنی عربی میں ''چیرنے پھاڑنے'' کے ہیں اسی سے طب کی اصطلاح ''علم تشریح'' اور ''تشریح اجسام'' نکلی ہے، چونکہ چیرنے اور پھاڑنے سے اندر کی چیز کھل کر نمایاں ہو جاتی ہے، اس لئے اس سے ''تشریح امر'' اور ''تشریح کلام'' ''شرح بیان'' اور ''شرح کتاب'' وغیرہ مجازی معنی پیدا ہوئے ہیں، اسی سے ایک اور محاورہ ''شرح صدر'' کا پیدا ہوا ہے، جس کے معنی ''سینہ کھول دینے'' کے ہیں اور کلام عرب میں اس سے مقصود ''بات کا سمجھا دینا اور اس کی حقیقت کا واضح کر دینا'' ہوتا ہے، قرآن مجید اور احادیث میں یہ محاورہ بکثرت استعمال ہوا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعون کے پاس جانے کی ہدایت ہوئی تو آپ ﷺ نے دعا مانگی

﴿ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۙ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ۙ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۙ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۠ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۲۵ تا ۲۸)

''پروردگار میرے سینہ کو کھول دے اور میرے کام کو آسان کر دے، اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات سمجھیں۔''

انبیا علیہم السلام کا علم و فہم انسانی تعلیم و تعلم اور مادی حکمت و دانائی سے پاک و مبرا ہوتا ہے اور وہ اپنے اخذ نتائج اور اثبات دعویٰ کے لئے گزشتہ تجربات اور منطق کے استقرا و تمثیل اور ترتیب مقدمات کے ممنون نہیں ہوتے، بلکہ وہ جو کچھ جانتے ہیں اور جو کچھ سمجھتے ہیں اس کا ماخذ تعلیم الٰہی، القائے ربانی اور فہم ملکوتی ہوتا ہے، اس کا نام علم لدنی ہے ''لـــــدن'' کے معنی عربی زبان میں ''پاس اور نزدیک'' کے ہیں، چونکہ یہ علم ان کو کسب و تحصیل کے بغیر خدا کے پاس سے اور اس کے نزدیک سے عطا ہوتا ہے اس لئے عرف عام میں علم لدنی کہلاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۞ ﴾ (۱۸/ الکهف:۶۵)

''ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا۔''

آنحضرت ﷺ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

﴿ كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ۞ ﴾

(۲۰/ طٰہٰ:۹۹)

❶ مسلم: ۴۱۶۔ ❷ ترمذی، ابواب التفسیر: ۳۳۴۶۔

''اسی طرح ہم تجھ سے گزشتہ زمانہ کی باتیں بیان کرتے ہیں اور ہم نے اپنی طرف سے تجھ کو علم (ذکر) بخشا ہے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کے آغاز میں آنحضرت ﷺ کو خطاب ہوتا ہے:

﴿ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ ۖ وَإِن كُنتَ مِن قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَٰفِلِينَ ۝ ﴾ (۱۲/ یوسف:۳)

''ہم تجھ کو قرآن کی وحی بھیج کر ایک بہترین قصہ سناتے ہیں جس سے تو قطعاً اس سے پہلے بے خبر تھا۔''

سورۂ شوریٰ میں ہے:

﴿ وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَٰبُ وَلَا الْإِيمَٰنُ وَلَٰكِن جَعَلْنَٰهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِۦ مَن نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۵۲)

''اور اسی طرح ہم نے (اے محمد ﷺ) تیری طرف اپنے حکم سے ایک روح کو وحی کیا۔ تو، تو پہلے یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان سے واقف تھا۔ لیکن ہم نے اس کو روشنی بنایا ہے جس کے ذریعہ سے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہم راستہ دکھا دیتے ہیں۔''

دوسرے پیغمبروں کی نسبت بھی یہی ارشاد ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ سے کہتے ہیں:

﴿ يَٰٓأَبَتِ إِنِّي قَدْ جَآءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ ﴾ (۱۹/ مریم:۴۳)

''اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔''

حضرت داؤد وسلیمان علیہما السلام کے متعلق ہے:

﴿ وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُۥدَ وَسُلَيْمَٰنَ عِلْمًا ۖ ﴾ (۲۷/ النمل:۱۵)

''اور ہم نے داؤد وسلیمان کو علم بخشا۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کی نسبت ارشاد ہے:

﴿ آتَيْنَٰهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ ﴾ (۱۲/ یوسف:۲۲) ''ہم نے یوسف کو حکم اور علم عطا کیا۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کہتے ہیں:

﴿ ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ۚ ﴾ (۱۲/ یوسف:۳۷)

''یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھائی ہیں۔''

حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق ہے:

﴿ وَلُوطًا آتَيْنَٰهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۷۴)

''اور لوط کو ہم نے حکم اور علم عطا کیا۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام اور چند دیگر انبیا علیہم السلام کے ذکر کے بعد ہے:

﴿ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ﴾ (۲۱/ الانبیاء:۷۹)

''ہم نے یہ بات سلیمان کو سمجھا دی، اور ہم نے ان سب کو حکم اور علم عطا کیا۔''

الغرض انبیا علیہم السلام کا یہ علم محض تعلیم الٰہی اور القائے ربانی کا نتیجہ ہوتا ہے اور غور و فکر، تجربہ و امتحان، تحصیل واکتساب اور جمع معلومات اور ترتیب مقدمات کے بغیر ان کے علم کی باتیں ان کے سامنے آئینہ ہو کر آ جاتی ہیں صرف فہم و تمثیل کے لئے یہ سمجھنا چاہئے کہ کبھی کبھی شعراء، مصنفین، موجدین اور دیگر عقلا کے ذہن میں بے غور و تامل ایک بات اس طرح خطور کر جاتی ہے کہ گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ سینہ یا دماغ کا دروازہ یک بیک کھل گیا اور ایک چیز اندر داخل ہو گئی، لیکن یہ شرح صدر کی نہایت معمولی مثال ہے، اس منصب خاص کے سینکڑوں مدارج ہیں، جو انبیا علیہم السلام کو، اولیا کو اور دیگر مومنین کو اپنے اپنے رتبہ کے مطابق عطا ہوتے ہیں:

﴿ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ ﴾ (٦/ الانعام:١٢٦)

''جس کی راہنمائی خدا چاہتا ہے اس کے سینہ کو اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔''

یعنی بلا حجت و برہان اسلام کی صداقت اس کے سامنے آئینہ ہو جاتی ہے، بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ان کی خلافت کے زمانہ میں مشورہ دیا اور بہ اصرار کہا کہ قرآن مجید کو اوراق و مصاحف میں لکھوا دیجئے، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مخالفت کی کہ جو کام آنحضرت ﷺ نے خود اپنی زندگی میں نہیں کیا وہ ہم لوگ کیونکر کر سکتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس پر اصرار اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو انکار رہا، مگر چند ہی روز میں یک بیک ان کی سمجھ میں بات آ گئی اس موقع پر انہوں نے فرمایا:

(حتی شرح اللّٰہ صدری لذالك) ''یہاں تک کہ خدا نے اس کام کے لئے میرے سینہ کو کھول دیا۔'' [1] مفسر ابن جریر طبری نے متعدد صاحبوں سے روایت کی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! شرح صدر کیونکر ہوتا ہے؟ فرمایا: ''قلب میں ایک نور داخل ہوتا ہے جس سے سینہ کھل جاتا ہے۔'' پھر سوال کیا کہ یا رسول اللہ! اس کی نشانی کیا ہے؟ ارشاد ہوا: ''حیات جاوید کے گھر کا اشتیاق، اور اس فریب کدہ عالم سے دل برداشتگی اور موت سے پہلے موت کی تیاری۔'' [2] یہ تو حقیقت ہے اور اس حقیقت کی جسمانی تمثیل سینہ مبارک کا چاک کیا جانا اور اس میں نور و حکمت کا بھرا جانا ہے۔

شرح صدر کے لئے مناسب موقع و مصلحت

جن آیتوں میں دیگر انبیا علیہم السلام کو عطیۂ علم کے دیے جانے کا ذکر ہے، ان میں اکثر ''علم'' کے ساتھ

[1] بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن: ٤٩٨٦۔ [2] تفسیر ابن جریر طبری، ج ٨، ص: ١٩، مطبوعہ مصر و حاکم فی المستدرك، ج ٤، ص: ٣١١ بسند فیه عدی بن الفضل۔

''حکم'' کا لفظ بھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علاوہ خالص شرعی ضرورتوں کے نظم وحکومت اور فیصلہ احکام کے لئے بے غور وفکر کے بدیہی، صحیح اور حاضر علم کی ضرورت ہے، چونکہ معراج ہجرت کا اعلان اور اسلام کے مستقبل کا عنوان ملا، جس کے بعد آنحضرت ﷺ کو حکم کی طاقت عطا کی جانے والی تھی، اس لئے شرح صدر کے عطیہ کے لئے یہی مناسب موقع تھا، علاوہ ازیں معراج کے حقائق ومناظر جو نفوس نبویہ کے ادراکات کی آخری سرحد ہیں ان کے احاطہ کے لئے بھی شرح صدر کی ضرورت تھی۔

آیات ودلائل نبوی ﷺ قرآن مجید میں

یہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید میں انبیائے سابقین علیہم السلام کے معجزے جس تفصیل اور تکرار کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، آنحضرت ﷺ کے معجزے اس تفصیل اور تکرار کے ساتھ اس میں مذکور نہیں، اس سے ایک طرف تو مخالفین اسلام نے یہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے کہ نعوذ باللہ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی ذات پاک اس عطیۂ الٰہی سے محروم تھی، دوسری طرف اسلام کے عقل پرست فرقہ کو اس سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ اسلام نے خوارق عادت کے ظہور سے انکار کیا ہے، کیونکہ جب اس کے نزدیک خاتم الانبیا ﷺ کی زندگی ان سے خالی تھی، تو گزشتہ انبیا کے سوانح میں جو اعجاز نظر آتا ہے وہ بھی سمجھنے والوں کے لئے وہم کا قصور ہے۔

قرآن مجید میں آپ ﷺ کے تمام معجزات کا تفصیلی ذکر کیوں نہیں ہے

لیکن واقعہ یہ ہے کہ دیگر انبیائے کرام اور آنحضرت ﷺ کے معجزات اور آیات ودلائل میں جو یہ اختلاف منظر نمایاں ہے اس کے متعدد وجوہات اور اسباب ہیں، جن پر ان کوتاہ بینوں کی نظر نہیں پڑی، اس لئے وہ مختلف قسم کے شکوک وشبہات میں گرفتار ہوگئے۔

① اس اختلاف منظر کی پہلی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص جس نے قرآن مجید کا پورے غور سے مطالعہ کیا ہے یا گزشتہ صفحات میں قرآن مجید کے نقطۂ نظر سے معجزہ کی جو حقیقت واضح کی گئی ہے اس کو سمجھا ہے، وہ تسلیم کرے گا کہ اسلام نے نبوت کی تصدیق کے باب میں ظاہری اور مادی معجزات کو وہ اہمیت نہیں دی ہے جو خصوصیت کے ساتھ عیسائی مذہب اور اس کے مقدس صحیفہ میں نظر آتی ہے، بلکہ وہ انسانوں کو زیادہ تر غور وفکر، فہم وتدبر، سوچ اور سمجھ کی دعوت دیتا ہے اور نبوت کی اندرونی خصوصیات اور روحانی دلائل کو ایمان وتصدیق کی بنیاد قرار دیتا ہے، اس بنا پر اس کے لئے اپنے پیش کرنے والے کی سچائی کے ثبوت میں اس کے خوارق اور معجزات کو تفصیل اور تکرار کے ساتھ ہر جگہ پھیلانا اور دہرانا اس کے اصول کے خلاف تھا، چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلام ان گمراہیوں سے پاک رہا، جن کی تاریکیوں کے پردہ میں عیسوی مذہب کا نور چھپ کر رہ گیا۔

② دوسری وجہ یہ ہے کہ گزشتہ انبیا علیہم السلام کو جو نشانیاں ملی تھیں وہ چند محدود گنی ہوئی اور متعین شکل میں تھیں اس لئے قرآن مجید کو جب بھی ان پیغمبروں کی نشانیوں کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے تو خواہ مخواہ ان کے انہی چند

حیرت انگیز واقعات کو بار بار دہرانا پڑتا ہے، اور اس کی تفصیل اور تکرار سے کوتاہ بینوں کی نگاہوں میں ان پیغمبروں کی یہ نشانیاں اجاگر ہو کر نظر آتی ہیں، اس کے برخلاف آنحضرت ﷺ کو جو نشانیاں عطا ہوئیں، وہ اس قدر متنوع، مختلف اور غیر محدود تھیں کہ ان کے تذکرہ کے وقت ایک ہی نشانی کو بار بار پھیلانے اور دہرانے کی حاجت نہ تھی، اس لئے یہ دلائل محمدی ﷺ قرآن مجید کے سینکڑوں صفحات کے مختلف گوشوں میں اس طرح بکھرے ہوئے ہیں کہ دوسرے انبیا علیہم السلام کے معجزوں کی طرح وہ اجاگر اور نمایاں ہو کر کم سوادوں کو نظر نہیں آتے۔

③ تیسری وجہ یہ ہے کہ گزشتہ مباحث میں یہ پوری تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر قسم کے معجزات، خوارق اور نشانیاں پیغمبر کی قوت اور اختیار سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ و مشیت سے ظہور پذیر ہوتی ہیں، اس بنا پر آنحضرت ﷺ کی آیات و دلائل بھی ذات محمدی ﷺ کی طرف منسوب ہو کر نہیں بلکہ قدرت الٰہی کی طرف منسوب ہو کر بیان ہوئے ہیں، اس لئے عام لوگوں کا خیال ان کو دلائل محمدی ﷺ کے سمجھنے کی طرف مائل نہیں ہوتا۔

④ چوتھی وجہ یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے پاس ایک ہی مستند چیز یعنی ان کا صحیفہ ہے، جس میں ان کے ربانی احکام، ان کے پیغمبروں کے اقوال، حالات، سوانح، معجزات سب کچھ ملے جلے ہیں، لیکن اسلام کے قبضہ میں دو چیزیں ہیں، ایک صحیفۂ الٰہی جس میں صرف خدائی احکام و مطالب ہیں، دوسرے حدیث و سنت جس میں پیغمبر کے حالات، اقوال اور معجزات وغیرہ الگ اور مستقل حیثیت سے مذکور ہیں اور وہ بجائے خود روایتی استناد کے لحاظ سے دوسرے مذاہب کے صحیفوں سے کہیں بلند تر ہے، اس لئے خدا نے پیغمبر ﷺ کے ان دلائل و معجزات کو عدم اہمیت کے باعث بہ تفصیل اپنے صحیفہ میں جگہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی، بلکہ اس کے لئے احادیث کے مستند ذخیرۂ روایات کی موجودگی کو کافی قرار دیا۔

قرآن مجید سے آپ ﷺ کے صاحب معجزہ ہونے کی دلیل

غرض یہ اسباب ہیں جن کی بنا پر بعض کم سواد اس دعویٰ کی جرأت کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیتیں آپ ﷺ کو معجزات اور نشانیوں سے معرّا ظاہر کرتی ہیں، لیکن اس سلسلہ میں غور کے قابل سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے آپ ﷺ کے متعلق آپ کے زمانہ کے کافروں کے جو اقوال تردید کی غرض سے نقل کئے ہیں، ان میں متعدد موقعوں پر آپ کو (نعوذ باللہ) ''کاہن'' اور ''ساحر'' کہا گیا ہے اور قرآن مجید پر سحر کا الزام لگایا گیا ہے، عرب میں کاہنوں کا کام پیشین گوئی کرنا اور غیب کا حال بتانا تھا اور ساحر کی نسبت تو عام طور پر معلوم ہے کہ وہ عوام کے نزدیک عجائب و خوارق کا پیکر ہوتا ہے اب اگر آپ ﷺ امور غیب کی قبل از وقت اطلاع نہیں دیتے تھے اور معجزات اور خوارق کا صدور آپ ﷺ سے نہیں ہوا کرتا تھا تو کفار آپ کو کاہن اور ساحر کے خطاب سے کیوں یاد کرتے تھے؟ اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر حسب ذیل آیتوں پر غور کی ایک نگاہ ڈالئے:

﴿ فَمَآ اَنۡتَ بِنِعۡمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ ﴾ (۵۲/ الطور:۲۹)

''اے محمد! تو اپنے پروردگار کے فضل سے کاہن نہیں ہے۔''

﴿ وَلَا بِقَوۡلِ كَاهِنٍ ﴾ (۶۹/ الحاقہ:۴۲)

''یہ (قرآن) کسی کاہن کا کلام نہیں۔''

آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے خدا کفار قریش کا حال بتاتا ہے:

﴿ وَاِذَا رَاَوۡا اٰيَةً يَّسۡتَسۡخِرُوۡنَ ۞ وَقَالُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۞ ﴾

(۳۷/ الصآفات:۱۴، ۱۵)

''جب وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔''

اس آیت سے صاف ثابت ہے کہ کفار کو جو نشانیاں نظر آتی تھیں وہ ان کا ٹھٹھا اڑاتے تھے اور ان کو جادو کہتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی خارق عادت نشانیاں ان کے مشاہدہ میں آتی تھیں اور دوسری آیتوں میں بھی سحر کی نسبت آپ ﷺ کی طرف کفار کی زبان سے کی گئی ہے:

﴿ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الۡحَقُّ قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ۞ وَقَالُوۡا لَوۡلَا نُزِّلَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡيَتَيۡنِ عَظِيۡمٍ ۞ ﴾ (۴۳/ الزخرف:۳۰، ۳۱)

''اور جب ان کے پاس سچی بات آئی تو انہوں نے کہا یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو نہیں مانتے اور انہوں نے کہا کہ یہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا۔''

﴿ قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمۡ هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۞ ﴾ (۴۶/ الاحقاف:۷)

''حق کے منکروں نے جب ان کے پاس حق آیا تو کہا یہ تو کھلا جادو ہے۔''

﴿ هَلۡ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ اَفَتَاۡتُوۡنَ السِّحۡرَ وَاَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ۞ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۳)

''یہ محمد ﷺ تو تمہاری ہی طرح ایک آدمی ہیں کیا تم جان بوجھ کر جادو کے پاس آتے ہو۔''

﴿ قَالَ الۡكٰفِرُوۡنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيۡنٌ ۞ ﴾ (۱۰/ یونس:۲)

''کافروں نے کہا یہ محمد (ﷺ) تو کھلا جادوگر ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپ کی آمد کی جو بشارت دی تھی اس کے بعد ہے:

﴿ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۞ ﴾ (۶۱/ الصف:۶)

''پس جب وہ آنے والا پیغمبر کھلی آیتیں لے کر آیا تو کافروں نے کہا یہ تو کھلا جادو ہے۔''

کفار کے ان اقوال سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ کی ذات بابرکات سے کچھ تو مافوق العادت باتیں ظاہر ہوتی تھیں جن کی تعبیر کہانت اور جادوگری کے الفاظ سے کر کے وہ اپنے نادان دل کو تسلی دیتے تھے اور اسی

سے آپ ﷺ کے صاحب معجزہ ہونے کا ناقابل تردید ثبوت قرآن مجید سے ملتا ہے۔

قرآن مجید میں آپ ﷺ کے دلائل و معجزات مذکور ہیں

اس اجمالی ثبوت کے بعد ضرورت ہے کہ ہم آنحضرت ﷺ کے ان آیات و دلائل کے بکھرے ہوئے موتیوں کو جو قرآن مجید کے اوراق میں منتشر ہیں، ایک خاص ترتیب کے رشتہ میں منسلک کر دیں کہ وہ نمایاں ہو کر نگاہوں کے سامنے آ جائیں۔ تنوع کے لحاظ سے یہ آیات و دلائل تین قسم کے ہیں، ایک تو کفار کی ہدایت و دعوت اور مسلمانوں کی مزید ایمانی تسلی کے لئے معجزانہ نشانیاں، دوسری مصیبتوں کی گھڑیوں میں تائیدات غیبی کا ظہور، اور تیسری وہ پیشین گوئیاں جن کا لفظ لفظ صداقت کے معیار پر صحیح اترا ہے، آئندہ اوراق میں اس اجمال کی تفصیل آئے گی۔

معجزۂ قرآن

﴿ قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآئیل:۸۸)

آنحضرت ﷺ کو پیش گاہِ الٰہی سے جو معجزات عطا ہوئے ان میں سب سے بڑا معجزہ خود قرآن مجید ہے۔ چنانچہ جب کفار نے معجزہ طلب کیا تو خدا نے فرمایا:

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ اَوَ لَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰى عَلَیْهِمْ ؕ ﴾

(۲۹/ العنکبوت:۵۰، ۵۱)

''اورانھوں نے کہا کہ پیغمبر پر اس کے خدا کی طرف سے نشانیاں کیوں نہ اتریں، کہہ دے کہ نشانیاں خدا کی قدرت میں ہیں۔ میں تو صاف صاف خدا کے عذاب سے صرف ڈرانے والا ہوں، کیا ان کو یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے اس پر کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔''

اور آنحضرت ﷺ نے بھی دیگر انبیا علیہم السلام کے معجزات کے مقابلہ میں اپنی اسی وحی آسمانی کو سب سے بڑا معجزہ قرار دیا۔ چنانچہ گویا اسی آیت پاک کی تفسیر میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((ما من الانبیاء نبی الا اعطی من الایات ما مثله اومن او أمن علیه البشر وانما کان الذی اوتیت وحیًا اوحاه اللّٰه إلي فارجو انی اکثرهم تابعًا یوم القیامة)) [1]

''پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر معجزات عنایت کئے۔ جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے۔ لیکن جو معجزہ مجھے مرحمت ہوا وہ وحی (قرآن) ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اتارا اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے پیروؤں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔''

اس حدیث سے متعدد نکتے حل ہوتے ہیں:

① ہر پیغمبر کو کوئی نہ کوئی معجزہ عطا ہوا ہے۔

② دیگر انبیا علیہم السلام کے معجزات وقتی اور عارضی تھے۔ ہوئے اور ہو کر مٹ گئے، لیکن آنحضرت ﷺ کا معجزۂ اعظم یعنی قرآن مجید قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے گا۔

③ چونکہ وہ معجزے وقتی اور عارضی تھے۔ اس لئے ان سے جو اثر پیدا ہوا وہ بھی وقتی اور عارضی تھا، برخلاف

[1] بخاری، کتاب الاعتصام، باب قول النبی ﷺ بعثت بجوامع الکلم: ۷۲۷٤۔

اس کے قرآن مجید چونکہ ہمیشہ دنیا میں قائم رہنے والا ہے۔ اس لئے اس کا اثر بھی دائمی اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اور قیامت تک نئے نئے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا رہے گا۔

آنحضرت ﷺ کو جو ربانی نشانیاں خدا کی طرف سے عنایت ہوئیں۔ ان میں صرف یہی ایک معجزہ ہے، جس کی اللہ تعالیٰ نے تحدی کی ہے اور اعلان عام کیا ہے کہ کوئی اس کی مثال پیش کرے اور پھر خود ہی اس کی پیشین گوئی بھی کر دی ہے کہ دنیا ہمیشہ اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز اور درماندہ رہے گی:

﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا۝ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآءیل:۸۸)

''کہہ دے اے پیغمبر! اگر تمام جن وانس مل کر بھی چاہیں کہ اس جیسا قرآن بنا لائیں تو نہیں لا سکتے۔ اگر چہ وہ ایک دوسرے کی مدد پر کیوں نہ ہوں۔''

سورۂ ہود میں پورے قرآن کے بجائے صرف دس سورتوں کا جواب مانگا گیا ہے:

﴿ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۝ ﴾ (۱۱/ ھود:۱۳)

''کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو اپنے جی سے بنا لیا ہے، تو کہہ دے کہ وہ ایسی بنائی ہوئی دس ہی سورتیں لے آئیں اور اپنی مدد کے لئے خدا کے سوا جس کو چاہیں بلا لیں اگر وہ سچے ہیں۔''

اس کے بعد کی آیتوں میں دس سورتوں سے گھٹا کر ایک ہی سورہ کا جواب لانے کی تحدی کی گئی ہے:

﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرہ:۲۳)

''اور اگر تم کو اس میں بھی کچھ شک ہو تو جو ہم نے اپنے بندہ پر اتارا ہے تو اس جیسی ایک ہی سورہ لاؤ اور خدا کے سوا اپنے تمام گواہوں کو بلاؤ اگر تم سچے ہو۔''

﴿ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرہ:۲٤)

''تو اگر تم ایسی سورہ بنا کر نہ لا سکو اور یقیناً نہ لا سکو گے تو اس آتش دوزخ سے بچو جس کے ایندھن آدمی اور پتھر (جن کو تم پوجتے ہو) سب ہوں گے جو کافروں کے لئے تیار رکھی گئی ہے۔''

اسی کے ہم معنی دوسرے آیت سورۂ یونس میں ہے:

﴿ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ

صٰدِقِیْنَ﴾ (۱۰/ یونس:۳۸)

''کیا یہ کفار یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس قرآن کو اپنی طرف سے بنالیا ہے، ان سے کہہ دے کہ اس جیسی ایک سورہ تم بھی لاؤ خدا کے سوا اور جس کو چاہو مدد کے لئے بلالو اگر تم سچے ہو۔''

پھر سورۂ طور میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس جیسی ایک ہی بات پیش کرو:

﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴾

(۵۲/ الطور:۳۳، ۳۴)

''کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو گھڑ لیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ان کو ایمان نہیں۔ اگر وہ سچے ہیں تو اس جیسی ایک بات بھی وہ پیش کریں۔''

اس امر پر تو تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ قرآن معجزہ ہے لیکن اختلاف اس میں ہے کہ وہ کس حیثیت سے معجزہ ہے اور وجہ اعجاز کیا ہے؟

① بعض معتزلہ کے نزدیک قرآن مجید کا نظم کلام (اسٹائل) معجزہ ہے۔ یعنی اہل عرب کا کلام جس طرز اور اسلوب پر ہوا کرتا تھا۔ قرآن مجید نے ان کو چھوڑ کر ایک اور بدیع طرز اور عجیب اسلوب اختیار کیا جو عرب میں موجود نہ تھا۔ ان کے کلام کا تمام تر نمونہ شعر تھا۔ قرآن مجید نے نثر کا ایک اسلوب اختیار کیا، کاہنان عرب کا کلام بھی نثر ہوتا تھا۔ مگر اس میں تکلف اور آورد تھا۔ قرآن مجید نے نظم ونثر کے درمیان ایک ایسا پسندیدہ اسلوب اختیار کیا جو بلغائے عرب کے تخیل میں بھی نہ تھا۔ قرآن کے مطالعہ، مقاطع اور فواصل یعنی جس طرح قرآن کسی بیان کا آغاز اور اس کا خاتمہ کرتا ہے، جس طرح ایک ایک آیت کو توڑتا جاتا ہے وہ حد اعجاز میں داخل ہے۔

② معتزلہ سے جاحظ اور تمام اشاعرہ قرآن مجید کو فصاحت و بلاغت کی حیثیت سے معجزہ قرار دیتے ہیں۔

③ نظام معتزلی اور ابن حزم ظاہری [1] یہ اعتقاد رکھتے ہیں اور امام رازی بھی اس کو اقرب الی الصواب کہتے ہیں [2] کہ قرآن مجید کا اعجاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے تمام بلغائے عرب وعجم کی زبانیں اس کے مقابلہ میں گنگ کردیں اور اس لئے وہ اس کا جواب نہیں لا سکتے۔

④ بعض متکلمین کے نزدیک وجہ اعجاز قرآن مجید کا اظہار غیب اور پیشین گوئیاں ہیں جو انسان کے حیطہ امکان سے باہر ہیں۔

⑤ بعض علما کہتے ہیں کہ قرآن مجید کا اعجاز یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دل کے چھپے ہوئے اسرار کو فاش کرتا تھا جو انسانی دسترس سے باہر ہے۔

[1] الفصل فی الملل والنحل ابن حزم ج سوم باب اعجاز القرآن، ص:۵۱۔

[2] تفسیر کبیر، ج۱، ص: ۲۳۵ تفسیر آیة ﴿وان كنتم فی ریب﴾۔

⑥ کسی نے وجہ اعجاز یہ بتائی ہے کہ اور انسانوں کے کلام بلند و پست، کامل و ناقص، صحیح و غلط غرض مختلف المراتب ہوتے ہیں لیکن قرآن مجید شروع سے اخیر تک بلندی کمال اور صحت کے لحاظ سے ایک ہی نوعیت کا ہے۔

⑦ ایک دو آدمیوں کی یہ رائے ہے کہ معجزہ یہ ہے کہ ایک اُمیّ کی زبان سے ایسا کلام بلاغت نظام نکلا۔ [1]

⑧ قرآن مجید کے اعجاز کی ایک وجہ اس کی خارق عادت تاثیر اور قلوب انسانی کی تسخیر بھی قرار دی جا سکتی ہے۔

⑨ بعضوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کا اصلی اعجاز اس کے احکامات، تعلیمات اور ارشادات ہیں۔ [2]

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام اختلافات باہم متضاد نہیں ہیں جو ایک جگہ نہ مجتمع ہو سکیں اور نہ، ضروری ہے کہ وجہ اعجاز صرف ایک میں محدود ہو۔ قرآن مجید کے وجوہ اعجاز اس قدر کثیر ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں ہو سکتا، جس شخص کو اپنے مذاق کے مطابق جو بات نمایاں نظر آئی ہے اسی کو اس نے وجہ اعجاز قرار دے لیا ہے، کوئی حسین اور خوبصورت چیز جب نقادان فن کی نگاہوں کے سامنے آتی ہے تو کوئی اس کے رنگ و روغن کا مداح ہوتا ہے، کوئی اس کے اعتدال قامت کی تعریف کرتا ہے، کوئی اس کی وضع قطع کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے، کوئی اس کی زیبائش و آرائش کی مدح کرتا ہے، تو درحقیقت اس کی ذات ان تمام اوصاف کا مجموعہ ہوتی ہے اور ہر ناقد اپنی چشم اعتبار سے جو کچھ دیکھتا ہے اسی کو اس کے حسن کا معیار قرار دیے لیتا ہے۔ حافظ و سعدی کے کلام کا معترف کون نہیں؟ لیکن لوگوں سے ان کے حسن و خوبی کی تفصیل پوچھو تو کوئی ایک بات نہیں کہے گا۔ کسی کے نزدیک ان کے کلام کا حسن یہ ہے کہ وہ اپنی غزلوں کے لئے بحریں نہایت مطربانہ اور موسیقیانہ اختیار کرتے ہیں۔ کوئی طریقہ ادا اور اسلوب تعبیر کی تعریف کرے گا، بعض ناقدین سخن الفاظ کی شیرینی اور ترکیب کی ندرت پیش کریں گے۔ کوئی تشبیہ و استعارہ کی جدت پر زور دے گا، دوسرے اصحاب ان کی نازک خیالی کے معترف ہوں گے۔ بعضوں کے نزدیک ان کی معنی آفرینی عمیق فلسفہ و حکمت او دل پذیر موعظت ان کے کلام کا تمغائے کمال ہے:

عبارا تناشتی وحسنك وا حد وکل الی ذاك الجمال یشیر

''ہماری عبارتیں گو مختلف ہیں لیکن تیرا حسن ایک ہی ہے، ہر شخص اپنی عبارت میں اسی ایک حسن کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔''

قرآن مجید کی ان آیتوں کا اگر استقصا کیا جائے جن میں اس کے وجوہِ اعجاز کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے

---

[1] متکلمین کے یہ مذاہب شرح مواقف اعجاز قرآن باقلانی، الاتقان سیوطی، فصل فی الملل والنحل ابن حزم میں مذکور ہیں۔

[2] شاہ ولی اللہ صاحب نے فوز الکبیر مبحث اعجاز القرآن، ص: ۴۲ میں اور مولانا شبلی نے اپنے مضمون اعجاز القرآن مقالات شبلی، حصہ اوّل ص: ۳۵ میں یہی مسلک اختیار کیا ہے۔

تو وہ ہم کو خود مختلف نظر آتی ہیں، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے وجوہِ اعجاز اس قدر متعدد اور کثیر الاطراف ہیں کہ ان کو کسی ایک میں محدود نہیں کیا جاسکتا، اس نے کہیں تو اپنی تعلیم وارشاد کی مدح کی ہے، کہیں اپنی تاثیر اور قوت جذب کی طرف اشارہ کیا ہے، کہیں اپنی یکسانی اور عدم اختلاف کو اپنے خدا کی طرف سے ہونے کی نشانی بتائی ہے، کہیں اس نے اپنی عربیت اور حسن کلام کو ظاہر کیا ہے، کہیں ایک امی کی زبان کا پیغام ہونا اپنا معجزہ بتایا ہے، ایک موقع پر اپنی ہدایت وراہنمائی کو مخصوص ترین وصف قرار دیا ہے، کہیں وہ خود کو نور ، هدیٰ ، حکمة ، بینة اور دیگر مختلف اوصاف معنوی کا پیکر کہتا ہے چنانچہ ذیل میں ہم ان آیتوں کو بہ ترتیب لکھ دیتے ہیں:

فصاحت و بلاغت

﴿ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ ۞ ﴾ (١٦/ النحل:١٠٣)

’’جس کی طرف یہ کفار نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ ایسی زبان ہے جو عربی ہے اور اپنے مدعائے دلی کو خوبی سے ظاہر کرتی ہے۔‘‘

﴿ بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ ۞ ﴾ (٢٦/ الشعرآء:١٩٥)

’’یہ قرآن ایک ایسی زبان میں ہے جو اپنے مدعائے دلی کو خوبی سے ظاہر کرتی ہے۔‘‘

﴿ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ ﴾ (٣٩/ الزمر:٢٨)

’’قرآن عربی زبان میں ہے، جس میں کوئی کجی نہیں۔‘‘

﴿ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ ۞ ﴾ (٣٦/ یٰسٓ:٦٩)

’’اپنے مدعا کو خوبی سے ظاہر کرنے والا قرآن۔‘‘

﴿ وَّقُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ ۞ ﴾ (١٥/ الحجر:١)

یکسانی اور عدم اختلاف

﴿ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ۞ ﴾

(٤/ النسآء:٨٢)

’’کیا یہ کافر قرآن میں غور نہیں کرتے، اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت سے اختلاف پاتے۔‘‘

قوتِ تاثیر

﴿ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِیْهِ مُزْدَجَرٌ ۞ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۞ ﴾

(٥٤/ القمر:٤، ٥)

’’ان کو (قرآن کے ذریعہ سے) اگلی امتوں کے اتنے حالات سنائے جاچکے ہیں جو اُن کی تنبیہ کو

کافی تھے، یہ قرآن دل تک پہنچ جانے والی دانائی ہے لیکن ان کو ڈرانا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔"

کفار قرآن مجید کو سحر اور جادو کہتے تھے؟ یہ کیوں؟ اس کی اسی تاثیر اور قوت تسخیر کی بنا پر:

﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ؕ ﴾

(٤٦/ الاحقاف:٧)

"جب ان کافروں پر ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو سچائی آنے کے بعد اس کا انکار کرتے ہیں کہتے ہیں یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔"

کفار کہتے تھے کہ جب محمد ﷺ لوگوں کو قرآن پڑھ کر سنانے لگیں تو شور کرو، تا کہ لوگ سن کر متاثر نہ ہوں:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝ ﴾

(٤١/ فصلت:٢٦)

"کفار نے کہا کہ اس قرآن کو سنا نہ کرو اور اس کے پڑھتے وقت شور وغل کرو شاید تم جیت جاؤ۔"

تعلیم وہدایت

﴿ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ۙ ﴾ (٢/ البقرة:٢)

"یہی ہے وہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں ہے، یہ پرہیز گاروں کے لئے سرتا پا ہدایت ہے۔"

﴿ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ ﴾ (١٧/ بنیٓ اسرآء یل:٩)

"یہ قرآن اس تعلیم کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے زیادہ صحیح اور سیدھی ہے۔"

﴿ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ ﴾ (٢٨/ القصص:٤٩)

"کہہ دے قرآن اور تورات سے بڑھ کر کوئی ہدایت والی کتاب لاؤ تو میں اس کی پیروی کروں۔"

﴿ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ۙ ﴾ (٥/ المآئدة:١٥)

"تمہارے پاس روشنی اور مدعا کو ظاہر کرنے والی کتاب آ چکی۔"

﴿ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ ۚ ﴾ (٢/ البقرة:٩٩)

"ہم نے تیری طرف کھلی ہوئی آیتیں اتاریں۔"

﴿ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ۙ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۠ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝ۙ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ ﴾

(٦/ الانعام:١٥٦ تا ١٥٨)

’’یہ مبارک کتاب ہم نے اتاری تو اس کی پیروی کرو اور پرہیز گاری اختیار کرو، تا کہ تم پر رحم کیا جائے اور یہ نہ کہو کہ ہم سے پہلے یہود و نصاریٰ دو قوموں پر کتاب اتاری گئی اور ہم ان کے پڑھنے سے بے خبر تھے یا یہ کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان دونوں قوموں سے زیادہ راہ راست پر ہوتے تو لو یہ تمہارے رب کی طرف سے دلیل و ہدایت و رحمت آئی ہے۔‘‘

﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (۱۷/ الاسراء:۸۲)

’’اور قرآن سے ہم وہ اتارتے ہیں جو مومنوں کے لئے شفا اور رحمت ہے۔‘‘

﴿ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ۝ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ۭ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ۭ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ۭ ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۴۱ تا ۴۴)

’’یہ عزت والی کتاب ہے جس کے آس پاس بھی باطل نہیں آ سکتا یہ حکمت اور تعریف والے خدا کی اتاری ہوئی ہے اے پیغمبر! تجھ سے وہی کہا جاتا ہے جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا تیرا پروردگار بخشش والا بھی ہے اور عذاب والا بھی ہے، اگر ہم اس قرآن کی زبان عجمی کرتے تو وہ لوگ یہ کہتے کہ اس کے احکام کیوں نہیں کھول کر بیان کئے گئے ہم عرب ہیں اور کتاب عجمی، کہہ دو کہ یہ کتاب مومنوں کے لئے ہدایت اور شفا ہے۔‘‘

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ڏ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ (۱۰/ یونس:۵۷)

’’ لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت آ چکی ہے اور وہ دلوں کے امراض کا علاج ہے اور مسلمانوں کے لئے ہدایت و رحمت ہے۔‘‘

﴿ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ ﴾ (۳۶/ یٰسٓ:۹) ’’حکمت والا قرآن۔‘‘

﴿ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ۝ ﴾ (۳۸/ صٓ:۱) ’’نصیحت والا قرآن۔‘‘

قرآن کا جواب لانے کی قدرت نہیں

﴿ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ ﴾ (۱۷/ الاسراء:۸۸) ’’جن وانس اس کا جواب نہیں لا سکتے۔‘‘

﴿ وَلَنْ تَفْعَلُوْا ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۴) ’’یہ کفار ہرگز اس کا جواب نہیں لا سکتے۔‘‘

ایک امی کی زبان سے ادا ہو

﴿ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ

بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ اَوَلَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝﴾

(۲۹/ العنکبوت:۴۸ تا ۵۱)

’’قرآن سے پہلے اے پیغمبر ﷺ! نہ تو، تو کچھ پڑھ کرسنا تا تھا اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا اگر ایسا ہوتا تو البتہ یہ باطل پرست شک کرسکتے بلکہ یہ کھلی آیتیں ہیں جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جن کو علم بخشا گیا ہے اور ہماری آیتوں سے صرف گنہگار ہی انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیوں اس پیغمبر پر اس کے خدا کی طرف سے نشانیاں نہیں اتریں، کہہ دے کہ نشانیاں خدا کے قبضہ میں ہیں، میں تو کھلا ڈرانے والا ہوں، کیا ان کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے، اس میں ایمان والوں کے لئے رحمت اور نصیحت ہے۔‘‘

حفظ و بقا کا وعدہ

﴿وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝﴾ (۱۵/ الحجر:۹)

’’اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔‘‘

﴿اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝﴾ (۷۵/ القیامۃ:۱۷)

’’ہم پر ہے اس قرآن کا جمع کرنا۔‘‘

﴿لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ﴾ (۴۱/ فصلت:۴۲)

’’اس قرآن کے پاس آگے اور نہ پیچھے سے باطل آسکتا ہے۔‘‘

قوت دلائل

﴿فَقَدْ جَآءَكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (۶/ الانعام:۱۵۷)

’’یقیناً تمہارے پاس تمہارے خدا کی دلیل آچکی۔‘‘

﴿قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ﴾ (۶/ الانعام:۱۴۹)

’’کہہ دے کہ خدا ہی کے لئے وہ دلیل ہے جو دلوں تک اتر جاتی ہے۔‘‘

﴿هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (۷/ اعراف:۲۰۳)

’’یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے سمجھ بوجھ کی باتیں ہیں اور ہدایت ورحمت ہے مومنوں کے لئے۔‘‘

قرآن مجید کی یہ آیتیں صرف چند حیثیتوں کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں اگر کوئی استقصا کرے تو متعدد

وجوہ اور بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

الغرض مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید صرف فصاحت و بلاغت ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنی تمام حیثیات کے لحاظ سے معجزہ کامل ہے، اس کے معجزہ کامل ہونے پر مختصر ترین دلیل یہ ہے کہ ساڑھے تیرہ سو برس گزرے کہ کوہ صفا کی چٹان پر کھڑے ہو کر ایک امی نے دنیا سے یہ غیر متزلزل تحدی کی کہ وہ اس کا جواب پیش کرے تو کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان تیرہ صدیوں کا ایک ایک سال گزر گیا مگر ایک آواز بھی اس تحدی کو قبول کرنے کے لئے بلند نہ ہوئی، اگر صرف فصاحت و بلاغت ہی کو معیار اعجاز قرار دیا جائے تو کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ عین اُس وقت جب ایک اُمی کی طرف سے جو ایک شعر تک موزوں نہیں پڑھ سکتا تھا یہ مدعیانہ اعلان عرب میں شائع ہوا اس عرب کے قبیلہ، قبیلہ میں زبان آور شعرا، اور آتش بیان خطبا موجود تھے مگر اس ''صوت سرمدی'' کے سامنے سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں کفار عرب نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی تکذیب کی کیا کیا کوششیں نہ کیں، انہوں نے اس راہ میں جان و مال قربان کیا، دین و کیش کو برباد کیا، اپنے عزیزوں اور فرزندوں کو نثار کیا، خود اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھیں، ان کے سپاہیوں نے میدان جنگ میں پرے جمائے، ان کے دولت مندوں نے اپنے خزانے کھول دیے، ان کے شاعروں اور خطیبوں نے اپنی آتش بیانیوں سے تمام ریگستان عرب کو تنور بنا دیا، یہ سب کچھ کیا مگر یہ نہ ہو سکا کہ قرآن مجید کی ایک سورہ کا جواب پیش کریں جو اسلام کے دعوائے حق و صداقت کے کنگرہ کو چشم زدن میں پست کر دیتا، کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس کی مثال لانے سے عاجز تھے اور جب وہ جو زبان کے اصل مالک اور محاورۂ عرب کے طبعی ماہر تھے اس کے مقابلہ سے عاجز تھے تو اس زمانہ کے بعد کے لوگوں کے لئے تو یہ عجز اور درماندگی اور زیادہ نمایاں ہے۔

حسان بن ثابت، عامر بن اکوع، طفیل بن عمرو، زید الجلیل، زبرقان، شماس، اسود بن سریع، کعب بن زہیر، عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم وغیرہ عرب کے مشہور زبان آور اور شاعر تھے، مگر قرآن کے سامنے ان سب نے سر نیاز خم کیا، لبید رضی اللہ عنہ عرب کے شاعر تھے اور سبعہ معلقہ کی بزم مشاعرہ کے ایک رکن تھے، اسلام کے بعد جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے چند اشعار کی فرمائش کی تو انہوں نے جواب دیا: ''جب خدا نے مجھ کو بقرہ اور آل عمران سکھائی تو مجھے شعر کہنا زیبا نہیں۔'' [1]

انیس قبیلہ غفار کے شاعر تھے، انہوں نے جب آنحضرت ﷺ کا چرچا سنا، تو چھپ کر مکہ آئے اور آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے کلام ربانی کی کچھ آیتیں سن کر واپس آ گئے، انکے بھائی نے پوچھا کہ تم نے کیسا پایا؟ انہوں نے جواب دیا کہ قریش کہتے ہیں کہ وہ شاعر ہیں، ساحر ہیں اور کاہن ہیں، ہم نے کاہنوں کا کلام سنا ہے یہ انکی بولی نہیں، ہم نے شعر کے ایک ایک وزن کو دیکھ لیا ہے وہ شعر بھی نہیں ہے، خدا کی قسم! محمد ﷺ سچے اور قریش جھوٹے ہیں۔ [2]

[1] استیعاب ابن عبدالبر ترجمة لبید، ج ۱، ص: ۳۳٦۔

[2] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی ذر: ٦٣٥٩۔

ضماد ازدی رضی اللہ عنہ ایک صاحب تھے جو جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے وہ یہ سن کر کہ محمد ﷺ (نعوذ باللہ) دیوانے ہوگئے ہیں آپ کے علاج کے لئے آئے، آپ نے مختصر سی حمد کلمہ شہادت پڑھا، وہ سن کر متحیر رہ گئے، تین دفعہ پڑھوا کر سنا، پھر کہا کہ خدا کی قسم! میں نے کاہنوں کی بولی اور جادوگروں کے منتر اور شاعروں کے قصائد سنے ہیں لیکن تمہارا کلام کچھ اور ہی ہے یہ تو سمندر تک میں اثر کر جائے گا۔ ❶ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ابوجہل اور قریش کے دیگر اکابر جمع ہوکر مشورہ کرنے لگے کہ محمد ﷺ کی تحریک روز بروز زور پکڑتی جاتی ہے کسی ایسے آدمی کو تلاش کرنا چاہیے جو جادو، کہانت اور شعر کہنا جانتا ہو، تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ کیا ہے؟ قریش کے مشہور سردار عتبہ بن ربیعہ نے کہا میں یہ سب کچھ جانتا ہوں، کہوتو میں جا کر دیکھوں، چنانچہ آستانہ نبوی ﷺ میں آکر اس نے صلح کے کچھ شرائط پیش کیے، آنحضرت نے اس کے جواب میں سورۂ فصلت پڑھنی شروع کی، کچھ ہی آیتیں پڑھی تھیں کہ اس نے آپ ﷺ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ قرابت کا واسطہ بس کرو، واپس پھرا تو چند روز تک گھر سے باہر نہیں نکلا، ابوجہل نے جا کر کہا: کیوں عتبہ! محمد ﷺ کے یہاں کھانا کھا کر پھسل گئے؟ عتبہ نے کہا: تم جانتے ہو کہ میں سب سے زیادہ دولت مند ہوں، مجھ کو دولت کی طمع دامن گیر نہیں ہوسکتی لیکن محمد ﷺ نے میرے جواب میں جو کلام پیش کیا، وہ نہ شعر تھا، نہ کہانت تھی، نہ جادو، میں نے ایسا کلام کبھی نہیں سنا، انہوں نے جو کلام پڑھا اس میں عذاب الٰہی کی دھمکی تھی، میں نے ان کو قرابت کا واسطہ دیا کہ چپ ہو جائیں میں ڈرا کہ تم پر عذاب نہ آجائے، لوگوں نے کہا: محمد ﷺ نے اپنی زبان سے عتبہ پر جادو کر دیا۔ ❷

ولید بن مغیرہ قریش میں بڑا دولت مند اور صاحبِ اثر تھا، وہ ایک دفعہ آپ ﷺ کی خدمت میں آیا اور فرمائش کی کہ کچھ پڑھ کر سنایئے، آپ نے چند آیتیں پڑھیں، اس نے مکرر پڑھوا کر سنیں، آخر بے خود ہوکر بولا: خدا کی قسم! اس میں کچھ اور ہی شیرینی اور تازگی ہے، اس نخل کی شاخوں میں پھل اور اس کا تنا بھاری ہے، یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ ❸

بنوذہل بن شیبان کے سردار مفروق کے سامنے آپ ﷺ نے چند آیتیں پڑھیں تو گو وہ مسلمان نہ ہوا مگر کلام الٰہی سے متاثر ہوا۔ ❹

نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے جب سورۂ مریم کی تلاوت کی تو اس پر رقت طاری ہوگئی اور اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، پھر کہا: ''خدا کی قسم! یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔'' ❺

❶ صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفیف الصلوٰة والخطبة: ۲۰۰۸۔ ❷ کتاب التفسیر ابن مردویہ؛ مسند ابی یعلیٰ وسیرة ابن اسحاق، اخیر فقرہ صرف سیرۃ ابن اسحاق میں ہے۔ بحوالہ سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۱۸۰۔ ❸ مستدرك حاكم، ج ۲، ص: ۵۰٦ میں یہ اور اوپر کا واقعہ دونوں مل جل گئے ہیں۔ ❹ روض الانف شرح سيرة ابن هشام، ج ۱، ص: ۲٦٤ مطبوعہ مصر۔ ❺ مسند احمد، ج ۱، ص: ۲۰۲ ومستدرك حاكم، ج ۲، ص: ۳۱۰۔

اس قسم کے اور بعض واقعات ابن اسحاق نے سیرت میں نقل کیے ہیں پہلی جلدوں میں پڑھ چکے ہیں کہ لوگ کیونکر قرآن مجید کی آیتیں سن کر متاثر ہو جاتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دل ایک سورہ کی چند آیتیں پڑھ کر ❶ اور سن کر ❷ پتھر سے موم ہو گیا۔ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ اسیران بدر کو چھڑانے آئے تھے، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے سورۂ طور کی ایک دو آیتیں سن لیں تو حلقۂ بگوش اسلام ہو گئے۔ ❸ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے چند آیتیں سن لیں تو فوراً حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ ❹ حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ کے کانوں میں اتفاقیہ قرآن مجید کی چند آیتیں پہنچ گئیں تو مسلمان ہو گئے۔ ❺ طائف کے سفر میں حضرت خالد العدوانی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو ﴿ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۝ ﴾ (۸۶/ الطارق:۱) پڑھتے سنا تو گو وہ اس وقت مسلمان نہ ہوئے مگر پوری سورہ ان کے دل میں گھر کر گئی، یعنی یاد ہو گئی۔ ❻

حبش سے بیس آدمیوں کی ایک جماعت حاضر خدمت ہوئی، آپ ﷺ نے ان کو قرآن مجید پڑھ کر سنایا، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ❼ حضرت ابوعبیدہ، حضرت ابوسلمہ، حضرت ارقم بن ارقم رضی اللہ عنہم یہ تینوں اصحاب اسی کی کشش مقناطیسی سے کھنچ کر حلقۂ اسلام میں آئے۔ ❽ اور تو اور خود مہبط وحی اور حامل کلام ربانی کا کیا حال تھا؟ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ قراءت شروع کی تو بے اختیار چشم مبارک سے آنسو جاری ہو گئے۔ ❾ ایک اور موقع پر قرآن مجید کی چند آیتیں زبان مبارک سے ادا ہوئیں اور اس کے بعد آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ ❿

کلام کی یہ شیرینی، یہ نمکینی، یہ تاثیر، یہ تسخیر جو دوست و دشمن، موافق و مخالف، شاہ و گدا، عالم و جاہل، پیغمبر و امت سب کو یکساں فریفتہ کرتی ہے، اعجاز نہیں تو اور کیا ہے؟ حکما، فلاسفہ، ادبا، اہل لغت، مفسرین، محدثین، فقہا، شعرا، متکلمین، غرض نوع انسانی کی وہ کون سی صنف ہے جس نے ایک امی کی زبان سے ادا ہونے والے پیغام کے عشق و محبت میں اپنا سرمایہ حیات قربان نہیں کر دیا اور جن کو اس کلام کی تشریح و تفصیل اور تحقیق و توضیح کے خدمات کی لذت میں دنیا کی تمام نعمتیں ہیچ نظر آئیں، کیا یہ اعجاز نہیں؟ غور کیجیے کہ ایک اُمّی محض جو اُمیوں ہی کی گودوں میں پلا اور پل کر جوان ہوا، اس نے ہوش سنبھالا تو گرد و پیش تاریکیوں اور ظلمتوں کے سوا اس کو کچھ نظر نہیں آیا، علوم و فنون اور تمدن و تہذیب سے ایک عاری ملک، عاری شہر اور عاری خاندان

---

❶ ابن سعد، ج ۳، حصہ اول، ص: ۱۹۱۔ ❷ مسند احمد، ج ۱، ص: ۱۷۔
❸ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، طور: ٤٨٥٤۔ ❹ مسند احمد، ج ۱، ص: ۳۱۸۔
❺ استیعاب تذکرۃ طفیل بن عمرو دوسی، ج۱، ص: ۲۱۸۔ ❻ مسند احمد، ج ٤، ص: ۳۳۵۔
❼ سیرۃ ابن ہشام، ج۱، ص:۲۳۷۔ ❽ اسد الغابۃ تذکرۃ ابوسلمۃ بن عبدالاسد، ج۵، ص:۲۱۸ (اس میں حضرت عثمان بن مظعون کا نام بھی ہے)۔ ''ض'' ❾ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب ﴿فكيف اذا جئنا من كل امة بشهيد﴾: ٤٥٨٢۔ ❿ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب دعاء النبی ﷺ لامۃ: ٤٩٩۔

کے اندر نشو ونما پائی، جہاں اہل فکر اور ارباب علم کا وجود نہ تھا وہ خود اس کا خاندان اور اس کا وطن نوشت وخواند کے نقوش وحروف سے آشنا نہ تھا اور گزشتہ صحف انبیا اور افکار عالیہ کا ایک حرف اس کے کان میں کبھی نہیں پڑا، علما اور دانشوروں کی صحبت اس نے نہیں اٹھائی، اصول قانون، مبادی اخلاق، محاسن علم وعمل کی کوئی ظاہری تعلیم اس کو نہیں ملی، بلکہ مدرسہ علم وحکمت کے سایۂ دیوار تک کبھی اس کا گزر نہیں ہوا، اور اسی طرح وہ اپنی زندگی کے چالیس دورے پورے کرتا ہے کہ دفعتہً غار حرا کے ایک دہانے سے اُجالا ہوتا ہے، علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا سرچشمہ ابلتا ہے، ظاہری نوشت وخواند کے نقوش وحروف کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے، صحف انبیا اور افکار عالیہ کے اوراق اس کی زبان پر جاری ہوجاتے ہیں، اس کے پرتو صحبت سے اُمی اور جاہل علمائے دہر اور دانشوران روزگار بن کر نکلنے لگتے ہیں، اصول قانون، مبادی اخلاق، اور محاسن علم وعمل کی تعلیم کا غلغلہ اس کی بزم فیض کے گوشہ گوشہ سے بلند ہوتا ہے، کلام ربانی کے پردہ میں علم وحکمت کے پوشیدہ اسرار فاش ہونے لگتے ہیں، اس سے زیادہ قرآن مجید کے معجزہ ہونے کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے۔

توراۃ قانون وشریعت ہے لیکن اخلاق اور موعظت نہیں، انجیل اخلاق وموعظت ہے، لیکن قانون اور شریعت نہیں، زبور مخاطبات قلبی اور دعاؤں کا مجموعہ ہے لیکن دیگر صفات سے خالی، مسیح علیہ السلام کے صحیفہ میں خطابت کی ہنگامہ آرائیاں ہیں، مگر استدلال اور فکر ونظر کی دعوت نہیں، صحف بنی اسرائیل پیشین گوئیوں سے لبریز ہیں مگر دقائق حکمت اور اسرار ایمان وعمل سے خالی ہیں، دنیا میں ایک ہی کتاب الٰہی ہے جو قانون و شریعت بھی ہے اور اخلاق وموعظت بھی، مخاطبات قلبی اور دعاؤں کا گنجینہ بھی ہے اور دیگر کتب الٰہیہ کی مجموعی صفتوں کی حامل بھی، خطابت بھی ہے اور استدلال وفکر بھی، اظہار غیب اور پیشین گوئیوں سے لبریز بھی ہے اور دقائق حکمت واسرار ایمان وعمل سے معمور بھی اور ان سب کے ساتھ عین اس وقت جب اور کتب الٰہی تحریف وتغیر اور تراجم وتعبیر سے اپنی اصلی زبان اور اصلی الفاظ کھو چکی ہیں، اس کی بقا اور حفاظت کی یہ ذمہ داری کہ تیرہ سو برس کے بعد بھی اس کے ایک لفظ، ایک حرف، ایک نقطہ میں تغیر وتبدل نے راہ نہیں پائی، وہ اپنی زندگی جاوید کے لئے کاغذ کے نقوش وحروف کی محتاج نہیں کہ لاکھوں انسانوں کے سینے اس خزانہ کے صندوق ہیں اور وہ اسی زبان اور انہی الفاظ اور انہی حروف کے قالب میں اب تک جلوہ گر ہے، جس میں دست قدرت نے اس کو ڈھالا تھا اور جبریل امین نے اس کو اتارا تھا اور محمد عربی ﷺ نے اس کو امت کے ہاتھوں میں سونپا تھا، کیا یہ اعجاز نہیں؟

یہیں سے یہ نکتہ بھی حل ہوتا ہے کہ قرآن مجید اپنی تعلیمات اور معانی کے ساتھ ساتھ اپنے الفاظ، کلمات اور عبارت میں بھی معجزہ ہے اور اس کی فصاحت وبلاغت کے معجزانہ کمال کی دوسری آسمانی کتابیں حریف نہیں بن سکتیں، کیونکہ دوسری آسمانی کتابیں اپنے الفاظ کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے معنی کے لحاظ سے وحی ہیں،

چنانچہ نہ تو خود ان کتابوں کو اور نہ ان کے ماننے والوں کو اس کا دعویٰ ہے اور نہ کبھی انہوں نے اپنی کتابوں کو کلام وعبارت کے لحاظ سے معجزہ کہا ہے، چنانچہ اسی لئے وہ اصل الفاظ اور زبان جس کے قالب میں وحی موسوی (تورات) اور عیسوی (انجیل) نے ظہور کیا، مدت ہوئی کہ دنیا ان سے محروم ہوگئی، تورات کی اصلی عبرانی زبان جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے نکلی تھی، وہ بخت نصر کی آگ کی نذر ہوگئی اور اس نے آرامی اور سریانی زبان کا قالب اختیار کر لیا اور آخر صدہا سال کے بعد حضرت عزیر علیہ السلام نے پھر اس کو عبرانی زبان میں منتقل کیا، انجیل کے متعلق ابھی تک یہی طے نہیں ہوا کہ اس کی اصل زبان کیا تھی؟ اور انجیل پہلے پہل کس زبان میں لکھی گئی تھی؟ انجیل کی سب سے قدیم زبان یونانی زبان ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ وہ زبان نہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فلسطین کے ملک میں بولتے تھے ایسی حالت میں ان کتابوں کی فصاحت وبلاغت کا اعجاز اور اس کے الفاظ کے منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ کیونکر کیا جا سکتا ہے، برخلاف اس کے دنیا میں ''وحی محمدی ﷺ'' سب سے پہلی اور سب سے آخری کتاب ہے، جس نے اس حیثیت سے اپنے اعجاز کا دعویٰ کیا۔ چنانچہ قرآن مجید کا حرف حرف اور لفظ لفظ وحی ہے اور وہی ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے ادا ہوا اور وہ ہر قسم کی تحریف وتغییر سے پاک ہے اس لئے اس کے الفاظ، کلمات، اور عبارات تک معجزہ ہیں اور اس وصف میں دنیا کی کوئی آسمانی کتاب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ [1]

[1] یہاں مسئلہ اعجاز القرآن پر بحث مقصود نہیں یہ مباحث مفصل آئندہ کسی جلد میں آئیں گے، یہاں صرف سلسلہ معجزات میں اس کا محض تذکرہ مقصود تھا۔

اُمّیت

یعنی

آنحضرت ﷺ کا ظاہری تعلیم اور نوشت وخواند کے داغ سے پاک ہونا

﴿ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ ﴾ (۷/ الاعراف: ۱۵۷)

یہ واقعہ محتاج بیان نہیں کہ آنحضرت ﷺ ظاہری تعلیم اور نوشت وخواند کے داغ سے پاک تھے۔ قرآن مجید نے متعدد موقعوں پر اس واقعہ کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵۷)

''یہ مسلمان وہ ہیں جو ان پڑھ پیغمبر اور فرستادۂ الٰہی کی پیروی کرتے ہیں۔''

اسی سورہ میں پھر اس کے بعد ہی ہے:

﴿ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵۸)

''تو لوگو! خدا پر اور اس کے ان پڑھ پیغمبر اور فرستادہ پر ایمان لاؤ۔''

سورۂ جمعہ میں نہ صرف آپ ﷺ کے اُمی بلکہ اغلب آبادی کی حالت کے لحاظ سے تمام قریش اور عرب کے امی ہونے کا اظہار ہے:

﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ (۶۲/ الجمعة:۲)

''اسی خدا نے اُمیوں کے درمیان انہی میں سے ایک پیغمبر بنا کر بھیجا۔''

دوسری جگہ سورۂ عنکبوت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ۝ ﴾ (۲۹/ العنکبوت:۴۸)

''اور قرآن کے نزول سے پہلے اے پیغمبر! نہ تو تم کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے اس کو لکھ سکتے تھے اگر ایسا ہوتا تو یہ باطل پرست شک کر سکتے تھے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کا انسانی تعلیم سے پاک ہونا بھی مصلحت الٰہی کا ایک خاص منشا تھا۔ اسی لئے اس کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ ﴾ (۲۹/ العنکبوت:۵۰، ۵۱)

''اور معترضین کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانیاں کیوں نہیں

اتریں، کہہ دے کہ نشانیاں خدا کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور میں تو صرف خدا سے ڈرانے والا ہوں کیا ان معترضین کو یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر (جو امی ہے) کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔''

قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں اس کا اظہار ہے کہ اے محمد ﷺ! تمہاری زبان سے آج گزشتہ پیغمبروں، اگلی امتوں اور عہد ماضی کے واقعات ادا ہوتے ہیں۔ ان واقعات اور حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے تین ہی ذریعے انسان کے ہاتھ میں ہیں، ایک یہ کہ وہ اس واقعہ کے وقت موجود ہو، دوسرا یہ کہ ان حالات کو کتابوں میں پڑھے، تیسرا یہ کہ اوروں سے سنے۔ آنحضرت ﷺ اطلاع کے ان ذرائع سے ناآشنا تھے۔ اول ذریعہ تو ظاہر ہے کہ مفقود تھا قرآن مجید میں آدم علیہ السلام سے مولد محمدی ﷺ تک کے تمام واقعات بیان کئے گئے ہیں جو آپ کی پیدائش سے پہلے وقوع پذیر ہوئے تھے اور آپ کے پاس ان کے علم کا کوئی ظاہری ذریعہ نہ تھا۔ اسی لئے قرآن مجید نے متعدد مواقع مثلاً: حضرت مریم اور زکریا علیہما السلام کے قصہ میں کہا ہے:

﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران: ٤٤)

''یہ گزشتہ زمانہ کی خبروں میں سے ہے جس کو ہم تیری طرف وحی کر رہے ہیں۔ تو ان کے پاس اس وقت موجود نہ تھا جب وہ اپنا اپنا پانسہ ڈال رہے تھے کہ کون مریم کی کفالت کرے گا اور نہ تو ان کے پاس اس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ۝ۙ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ۝ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ﴾

(۲۸/ القصص: ٤٤:٤٦)

''جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنا فیصلہ دیا تو تو اس وقت مغربی گوشہ میں موجود نہ تھا۔ بلکہ ہم نے صدیاں اس پر گزار دیں، قومیں پیدا کیں جن کی بڑی بڑی عمریں ہوئیں اور نہ تو اہل مدین میں قیام پذیر ہو کر آیات الٰہی ان کو پڑھ کر سناتا تھا۔ بلکہ ہم آئندہ تم کو بھیجنے والے تھے اور نہ تو اس وقت گوشہ طور میں تھا جب ہم نے موسیٰ کو آواز دی ہے بلکہ (اس قصہ کا علم تجھ کو جو حاصل ہو رہا ہے محض تیرے پروردگار کی رحمت ہے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا:

﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ ﴾

(۱۲/ یوسف: ۱۰۲)

’’یہ اس گزشتہ زمانہ کے قصہ کا علم ہم تم کو اپنی وحی سے عطا کر رہے ہیں تو اس وقت ان میں موجود نہ تھا۔ جب وہ باہم مشورہ سے بات کر رہے تھے۔‘‘

علم کا دوسرا ذریعہ یہ تھا کہ کتابوں کو پڑھ کر اطلاع حاصل ہو۔ قرآن مجید نے اس کی بھی نفی کی:

﴿ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ ﴾ (۲۹/ العنکبوت:۴۸)

’’نہ تو، تو اس سے پہلے کوئی کتاب پڑھ کر سناتا تھا اور نہ اپنے ہاتھ سے تو اس کو لکھ سکتا تھا۔‘‘

﴿ مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۵۲)

’’تجھ کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا چیز ہے اور ایمان کس کو کہتے ہیں۔‘‘

تیسری صورت یہ تھی کہ دوسروں سے سن کر یہ علم حاصل کیا جائے، سب کو معلوم ہے کہ نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ کی زندگی تمام تر مکہ معظمہ میں گزری۔ بجز اس کہ چند مہینے بصریٰ وغیرہ کے سفر تجارت میں گزرے ہوں اور خود مکہ معظمہ میں نہ ان واقعات کا کوئی واقف کار تھا اور نہ قریش کو ان سے آگاہی تھی۔ اس لئے یہ ذریعہ علم بھی ثابت نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے علی الاعلان کہا:

﴿ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَاۤ اِلَیْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ؕ ﴾

(۱۱/ ہود:۴۹)

’’یہ گزشتہ زمانہ کی باتیں ہیں جن کی بذریعہ وحی ہم تجھ کو تعلیم کرتے ہیں تو خود اور تیری قوم اس سے پہلے ان سے آگاہ نہ تھی۔‘‘

آنحضرت ﷺ کی جو زندگی مکہ معظمہ میں گزری اور سفر تجارت میں قریش کے شامی قافلوں کے ساتھ جو زمانہ بسر ہوا۔ اس کا ایک ایک واقعہ قریش کے سامنے تھا، جب آپ مکہ میں تھے تب بھی آپ قریش کے مجمع میں تھے۔ اور جب کبھی مکہ سے باہر گئے تو بھی قریش ہی کے جھرمٹ میں رہے اس لئے آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ ان سے مخفی نہ تھا۔ اگر آپ نے کوئی ظاہری تعلیم پائی ہوتی تو شاعر و مجنون و ساحر کی طرح وہ اس الزام کا اظہار بھی کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ محمد ﷺ کا سینہ ظاہری تعلیم کے عیب سے داغدار نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے بآواز بلند کہا:

﴿ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖؗ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝ ﴾ (۱۰/ یونس:۱۶)

’’اگر خدا کو منظور ہوتا تو میں تم کو نہ یہ قرآن پڑھ کر سناتا اور نہ خدا تم کو اس قرآن سے آگاہ کرتا

اس سے پہلے میں مدتوں تم میں رہ چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے۔‘‘

قرآن مجید میں ان تمام شکوک اور الزامات کو دہرایا ہے، ان کو یہ شک تھا کہ محمد ﷺ کسی دوسرے سے سن کر یہ قرآن پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کے اس اعتراض کو نقل کیا اور اس کا جواب دیا:

﴿ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝﴾ (۱٦/ النحل:۱۰۳)

’’اور ہم کو بہ تحقیق معلوم ہے کہ یہ کفار کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کو کوئی آدمی سکھاتا ہے، اس شخص کی زبان جس کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں عجمی ہے اور یہ فصیح عربی زبان ہے۔‘‘

سورۂ فرقان میں چند آدمیوں کی شرکت کا شبہ مذکور ہے:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨ افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝ۚ﴾ (۲۵/ الفرقان:٤)

’’اور کافر کہتے ہیں کہ یہ قرآن من گھڑت چیز ہے۔ جس کو محمد ﷺ نے گھڑ لیا ہے اور اس افترا پردازی میں چند اور آدمی بھی شریک ہیں۔ وہ یقیناً غلط اور جھوٹ کہتے ہیں۔‘‘

یہ سب شبہات کئے گئے مگر کفار نے کبھی یہ شبہ نہیں ظاہر کیا کہ محمد ﷺ نے چپکے سے پڑھنا سیکھ لیا ہے اور دوسری آسمانی کتابیں پڑھ کر یہ قرآن بنا لیتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ آپ ﷺ کی اُمیت پر ان کو یقین تھا۔ مدینہ آ کر یہودیوں سے معاملہ پڑا، روایات میں بکثرت اس قسم کے واقعات مذکور ہیں کہ یہود آپ ﷺ کے پاس آتے تھے اور آپ سے وہ سوالات کرتے تھے جو ان کی کتابوں میں مذکور تھے اور کہتے تھے کہ ان کے جواب پیغمبر ہی دے سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ ان کے صحیح جوابات دیتے تھے اور وہ متحیر رہ جاتے تھے۔ اس واقعہ سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ یہود کو بھی یہ یقین تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ اُمیِ محض ہیں اور ہماری کتابوں کو نہ انہوں نے پڑھا ہے اور نہ پڑھ سکتے ہیں اور نہ اس جرأت کے ساتھ وہ اپنی کتابوں کے سوالات اس شخص کے سامنے جس کی نسبت ان کو معلوم ہوتا، کہ وہ ان کو پڑھ چکا ہے یا پڑھ سکتا ہے نہ پیش کرتے اور نہ اس کو حق و باطل کا معیار قرار دیتے۔

قریش کو جس شخص کی نسبت شبہ تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کو سکھاتا ہے۔ اس کے متعلق امام طبری رحمہ اللہ نے تفسیر میں مختلف روایتیں نقل کی ہیں جن سے اس کی شخصیت اور نام کے متعلق کوئی صحیح فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ تاہم مجموعی حیثیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مکہ معظّمہ میں کوئی نصرانی غلام تھا۔ جو اپنی زبان میں کتب مقدسہ کبھی کبھی پڑھا کرتا تھا اور آپ ﷺ راستہ چلتے اس کے پاس کبھی کبھی کھڑے ہو جاتے تھے۔ اسی پر کفار نے کہا کہ محمد ﷺ کو یہی قرآن کی آیتیں سکھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ اس غلام کی اور جو کتابیں وہ

پڑھا کرتا ہے ان کی زبان عربی نہیں اور نہ وہ عربی جانتا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ عربی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے اور خود قرآن کی زبان فصیح عربی ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ غیر زبان کو سمجھ لیں اور وہ عجمی غلام قرآن جیسی فصیح زبان میں کلام کرے۔ ❶

آنحضرت ﷺ کے بچپن کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کو آپ کے چچا ابوطالب اپنے ساتھ شام لئے جا رہے تھے۔ راستہ میں بحیرا نام ایک راہب نے آپ کو دیکھا اور آثار سے پہچان لیا کہ آپ ﷺ ہی پیغمبر آخر الزمان ہیں۔ چنانچہ اس نے ابوطالب کو مشورہ دیا کہ ان کو مکہ واپس بھیج دو۔ ورنہ یہود اگر دیکھ لیں گے تو قتل کر ڈالیں گے۔ اگرچہ یہ واقعہ جیسا کہ سیرۃ نبوی جلد اول (شام کا سفر) میں بہ تفصیل لکھا جا چکا ہے۔ صحیح نہیں ہے، تاہم ہمارے عیسائی احباب اس ضعیف روایت پر اپنے شکوک و شبہات کی عظیم الشان عمارت قائم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اسی راہب کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ اگر یہ صحیح ہے تو دنیا کے لئے اس سے بڑا معجزہ محمد رسول اللہ ﷺ کا اور کیا چاہیے کہ ایک ابجد ناشناس طفل دوازدہ سالہ نے چند گھنٹوں میں حقائق و اسرار دین، اصول عقائد، نکات اخلاق، مہمات قانون اور ایک شریعت عظمیٰ کی تکمیل و تاسیس کے طریقے سب کچھ سیکھ لئے۔ کیا ہمارے عیسائی دوست اس معجزہ کو تسلیم کرتے ہیں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی پیغمبرانہ زندگی پورے ۲۳ برس تک قائم رہی۔ اگر آنحضرت ﷺ کسی انسانی معلم سے فیض پاتے رہتے تو ضرور تھا کہ وہ اس پورے زمانہ تک یا بڑی حد تک خلوت و جلوت میں آپ کے ساتھ رہتا کہ وقت ضرورت (نعوذ باللہ) آپ اس سے قرآن بنواتے، احکام و مواعظہ سیکھتے، اسرار و نکات معلوم کرتے اور یہ شخص یقیناً مسلمان نہ ہوتا۔ کیونکہ جو شخص خود مدعی نبوت کو تعلیم دے رہا ہو وہ کیونکر اس کی نبوت کو تسلیم کر سکتا تھا اور پھر اس شہرت عام، ذکر جمیل، رفعت مقام کو دیکھ کر جو مدعی نبوت ﷺ کو حاصل ہو رہی تھی، وہ خود پردہ کے پیچھے گمنامی پسند کرتا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نگاہوں سے اس کا وجود ہمیشہ مستور رہتا۔ جس عجمی کی نسبت قریش کو شبہ تھا۔ اگر حقیقت میں آپ ﷺ اس سے تعلیم حاصل کیا کرتے تو قریش جو آپ کی تکذیب، تذلیل اور آپ کو خاموش کرنے کی ہر تدبیر پر عمل پیرا ہو رہے تھے ان کے لئے آسان تھا کہ اس غلام عجمی کو الگ کر دیتے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی اور قرآن کا تمام کاروبار دفعتہً درہم برہم ہو جاتا۔ علاوہ ازیں زیادہ سے زیادہ اس کا وجود مکہ میں تھا پھر مدینہ میں ۱۳ برس تک سینۂ نبوت سے فیضانِ الٰہی کا سرچشمہ کیونکر اُبلتا رہا۔ قرآن مجید، شریعت اسلام اور احکام کا بڑا حصہ یہیں وحی ہوا ہے۔ مکہ میں تو نسبتاً بہت کم سورتیں نازل ہوئی ہیں۔

جب مدینہ منورہ میں اسلام کا چرچا پھیلا تو یہود و نصاریٰ نے اسلام کو بدنام اور بے اثر کرنے کی ایک

---

❶ تفسیر ابن جریر، جز ۱۴، ص: ۱۰۹ تا ۱۱۱۔

تدبیر یہ سوچی کہ لوگ جھوٹ موٹ آ کر پہلے مسلمان اور پھر چند روز کے بعد مرتد ہو جائیں، تا کہ محمد ﷺ کی بدنامی ہو اور لوگوں کو خیال ہو کہ اگر یہ مذہب سچا ہوتا تو اس کو قبول کر کے کوئی کیوں چھوڑ دیتا:

﴿ وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ (۳/ آل عمران:۷۲)

''اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو اترا ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس سے پھر جاؤ۔ شاید کہ وہ لوگ (مسلمان) بھی پھر جائیں۔''

چنانچہ اسی سازش کے مطابق ایک عیسائی نے اسلام قبول کیا اور سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران پڑھی۔ آنحضرت ﷺ نے کتابت وحی کی خدمت اس کے سپرد کی۔ چند روز کے بعد وہ مرتد ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں نے محمد ﷺ کو جو کچھ لکھ دیا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے، خدا نے اپنی نشانی ظاہر کی اور موت نے بہت جلد اس کی افترا پردازی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ [1] اور دنیا نے دیکھ لیا کہ محمد ﷺ کے فیضان نبوت کا چشمہ اب بھی اسی طرح جوش زن ہے۔

صلح حدیبیہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان عہد نامہ مرتب ہو رہا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ عہد نامہ لکھ رہے تھے۔ عہد نامہ کی عبارت یہ تھی کہ ''یہ وہ شرائط ہیں جن کو خدا کے رسول محمد ﷺ نے منظور کیا۔'' قریش نے کہا: ''اگر ہم آپ کو خدا کا رسول مانتے تو اس لڑائی کی نوبت ہی کیوں آتی۔ اس لفظ کو مٹا کر اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھیے'، آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''ان کی حسب خواہش ترمیم کر دو۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھ سے یہ گستاخی نہیں ہو سکتی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''وہ الفاظ کہاں ہیں؟'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انگلی رکھ کر بتایا تو آپ نے خود اپنے دست مبارک سے رسول اللہ کا لفظ مٹا دیا اور محمد بن عبداللہ لکھ دیا۔ یہ واقعہ بخاری، مسلم، نسائی، مسند ابن حنبل اور تمام کتب سیر میں مذکور ہے۔ اسی کے ساتھ بخاری میں یہ تصریح ہے کہ (ولیس یحسن یکتب) [2] اور مسند احمد میں بروایت اسرائیل یہ الفاظ ہیں: (ولیس یحسن ان یکتب) [3] یعنی آپ ﷺ لکھنا نہیں جانتے تھے۔ لیکن باوجود اس کے تمام احادیث وسیر میں یہ ہے کہ ''آپ ﷺ نے محمد بن عبداللہ کے الفاظ لکھ دیے۔'' روایت کے ظاہری معنی سے بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ آپ ﷺ نے خود اپنے دست مبارک سے یہ الفاظ لکھے اور آپ نے شاید اخیر زمانہ میں لکھنا سیکھ لیا تھا۔ ابن ابی شیبہ نے مجاہد کے واسطہ سے یہ روایت کی ہے کہ ''آپ ﷺ نے اس وقت تک وفات نہیں پائی جب تک آپ کو لکھنا پڑھنا نہ آ گیا۔'' اور ایک اور روایت (بواسطہ یونس بن میسرہ عن ابی کبشۃ السلول عن سہل بن

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب، علامات النبوۃ فی الاسلام:۳۶۱۷۔

[2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب عمرۃ القضاء:۴۲۵۱۔ [3] مسند احمد، ج ٤، ص: ۲۹۸۔

الحنظلیہ) نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے ایک فرمان لکھوا کر اقرع اور عیینہ کو عنایت فرمایا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے آ کر کہا کہ معلوم نہیں اس میں کیا لکھا ہے؟ آپ نے اس پر ایک نظر ڈال کر فرمایا: ''وہی لکھا ہے جو میں نے حکم دیا ہے۔'' ❶

اگر یہ روایتیں صحیح ہیں تو یہ آنحضرت ﷺ کا ایک اور معجزہ ہوگا کہ انسانی تعلیم کے بغیر اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ فن بھی اپنی بارگاہ سے عنایت کیا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ روایتیں تمام تر موضوع یا نہایت ضعیف ہیں۔ اس لئے آپ کی امیت کے متعلق جو متواتر روایتیں ہیں۔ ان سے ان کی تنسیخ نہیں ہو سکتی۔ یہ ممکن ہے کہ امی سے امی آدمی کے ہاں جب شب و روز لکھنے پڑھنے کا کام لگا رہے تو وہ کسی قدر حرف شناس ہو جائے، خصوصاً اپنے نام اور دستخط کو پہچان لینا اور ان کو لکیر کھینچ کر لکھ دینا تو معمولی بات ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ فاعل مجازی و حقیقی کی تفصیل میں راویوں سے مسامحت ہوئی ہے۔ عموماً سلاطین، امرا و اکابر جو فرامین اور مراسلات لکھاتے ہیں، محاورہ عام میں ان کو لکھنا ہی کہتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ ''عالمگیر نے یہ فرمان لکھ کر دیا۔'' شاہجہان نے جامع مسجد بنائی۔ فلاں بادشاہ نے یہ قلعہ تعمیر کیا۔ حالانکہ لکھنے والے، بنانے والے اور تعمیر کرنے والے، کاتب اور معمار تھے۔ مگر چونکہ ان سلاطین کے حکم سے اور انہی کی طرف سے وہ لکھا یا بنایا گیا۔ اس لئے بولنے والے خود سلاطین اور امرا کی طرف فعل کی نسبت کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اسی محاورہ کے مطابق اس موقع پر جب آنحضرت ﷺ نے سلاطین عالم کے نام دعوت نامے بھیجے ہیں۔ تو وہاں عام طور پر یہ الفاظ ہیں: وکتب الی قیصر وکتب الی کسریٰ۔ آپ ﷺ نے قیصر کو یہ خط لکھا، کسریٰ کو یہ لکھا مگر سب کو معلوم ہے کہ آپ ﷺ نے دست خاص سے یہ خطوط لکھ کر نہیں بھیجے۔ مگر چونکہ آپ ﷺ ہی نے لکھوائے تھے۔ اس لئے ان کی نسبت آپ ہی کی طرف کی گئی۔

روزمرہ کی بات ہے کہ ہندوستان کے ادنیٰ طبقے جو نوشت وخواند سے عاری ہیں وہ اپنے اعزہ اور احباب کو خط لکھاتے ہیں مگر کہنے والے اس کو یوں ہی کہتے ہیں کہ ''اس نے خط میں لکھا ہے کہ میں آنے والا ہوں۔'' حالانکہ وہ خود لکھنے والا نہیں۔ اس نے دوسروں سے لکھایا ہے۔ مگر چونکہ لکھنے والے نے اپنا مدعا نہیں لکھا۔ بلکہ لکھانے والے کی زبان سے اس کا مدعا ظاہر کیا ہے۔ اس لئے اسی کی طرف فعل کی نسبت کر دی گئی۔ قرآن پاک نے آپ ﷺ کو بار بار اور برملا اُمی کہا ہے۔ اس سے زیادہ ثبوت اس کا اور کیا چاہئے؟ لیکن آپ امی ہو کر، امیوں میں پل کر، کتب سابقہ کی ظاہری تعلیم سے ناآشنا ہو کر بھی سب کچھ جانتے تھے اور یہ آپ کا معجزہ تھا۔ کفار کو خطاب کر کے قرآن کہتا ہے کہ محمد ﷺ کی صداقت کی یہ دلیل کافی نہیں کہ وہ ناآشنائے تعلیم ہو کر بھی وہ کچھ جانتا ہے جس کی علمائے بنی اسرائیل کے سوا اور کسی کو خبر نہیں:

❶ فتح الباری، ج۷، ص: ۳۸۶، ۳۸۷۔

﴿وَإِنَّهُۥ لَفِى زُبُرِ ٱلْأَوَّلِينَ ۝ أَوَلَمْ يَكُن لَّهُمْ ءَايَةً أَن يَعْلَمَهُۥ عُلَمَٰٓؤُا۟ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ۝﴾

(۲۶/ الشعرآ:۱۹۶، ۱۹۷)

''یہ باتیں گزشتہ پیغمبروں کی کتابوں میں ہیں۔ کیا ان کافروں کے لئے یہ نشانی نہیں کہ ان باتوں کو (جو ایک امی کی زبان سے ادا ہو رہی ہیں) بنی اسرائیل کے عالم جانتے ہیں۔''

ذاتِ نبوی ﷺ کی حفاظت

﴿ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ ﴾ (٥/ المآئدۃ: ٦٧)

انبیائے کرام علیہم السلام جب دنیا میں تشریف لاتے ہیں تو وہ دنیا کی جہالت وظلمت، جوروستم، گناہ ومعصیت کے خلاف اپنا جہاد شروع کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں انسان ان کے دشمن بلکہ ان کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ اس تنہائی وبیکسی کے عالم میں جس سے ہر مصلح کو آغاز دعوت میں دوچار ہونا پڑتا ہے۔ صرف اُسی قادر وتوانا کا ہاتھ ہوتا ہے جو ان کی تسکین ونصرت کا سہارا ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کے دربار میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی بارگاہ میں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام رومیوں اور یہودیوں کی عدالت میں ایک ہی گناہ کے مجرم تھے۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے اس پیغام کی بقاد قیام کا جس کے لئے وہ پیغمبر کو مبعوث کرتا ہے خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس لیے اس بیکسی و بیچارگی کے عالم میں اس کی زندگی کا وہی محافظ اور نگہبان بن جاتا ہے کہ وہ بے خوف وخطر اپنے فرائض کو انجام دے سکیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کو شروع ہی میں تسکین دے دی گئی تھی:

﴿ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ﴾ (٥٢/ الطور: ٤٨)

''اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر کئے بیٹھا رہ کہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔''

سب کو معلوم ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب دعوت کا آغاز کیا تو مکہ کا بچہ بچہ آپ کا دشمن ہو گیا۔ آپ کو طرح طرح کے آزار پہنچائے گئے۔ آپ کے خلاف سینکڑوں منصوبے باندھے گئے۔ آپ کے قتل کی سازشیں ہوئیں۔ تلواریں زہر میں بجھا کر رکھی گئیں۔ سوتے میں آپ کے قتل کا ارادہ کیا گیا۔ میدان جنگ میں آپ پر نرغہ کیا گیا۔ کمین گاہوں سے آپ پر حملے کئے گئے۔ غفلت میں آپ کے سر پر پتھر گرانے کی تدبیر سوچی گئی۔ کھانے میں زہر دیا گیا مگر ہر موقع پر یہ ظاہر ہوا کہ

ع دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تراست

اور قرآن مجید کا یہ اعلان صحیح ثابت ہوا:

﴿ إِنَّ رَبَّكَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ ۭ ﴾ (١٧/ الاسرآء: ٦٠)

''تیرے پروردگار نے لوگوں کو گھیر رکھا ہے کہ تجھ پر دسترس پائیں۔''

یہ خود ایک مستقل معجزہ ہے کہ ان ہنگاموں، فتنوں اور سازشوں کے عالم میں خصوصاً عرب کے ملک میں جہاں اقتدار حکومت یا نظام امن کا نام ونشان تک نہ تھا۔ کیونکر آپ ﷺ نے بحفاظت تمام اپنے فرض کو انجام تک پہنچایا۔

قریش کی مجلسیں اکثر خانہ کعبہ میں منعقد ہوا کرتی تھیں اور اکثر وہیں ان کی نشست وبرخاست رہا کرتی

تھی، تاہم آنحضرت ﷺ نماز اور طواف کے لئے بے خوف وخطر وہیں تشریف لے جایا کرتے اور برملا ان کے دیوتاؤں اور بتوں کی برائیاں بیان کیا کرتے تھے۔ آخر قریش نے ایک دفعہ ارادہ کیا کہ نعوذ باللہ آپ ﷺ کا خاتمہ کر دیں۔ یہ خبر آپ تک پہنچتی ہے۔ مگر اس سے آپ کے ارادہ میں کسی قسم کا وہن یا ضعف نہیں پیدا ہوتا۔ ایک دن قریش نے یہ طے کیا کہ آج محمد ﷺ کی بوٹی بوٹی اڑا دی جائے۔ اتفاق سے کفار کی یہ تقریر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سن لیتی ہیں۔ وہ روتی ہوئی باپ کی خدمت میں حاضر ہوتی ہیں۔ آپ تسلی دیتے ہیں اور وضو کر کے حرم کی سمت روانہ ہو جاتے ہیں۔ دشمنوں کی نگاہیں آپ پر پڑتی ہیں تو وہی نگاہیں جو اب تک خون آشامی کے لئے تیار تھیں۔ دفعتہ سرنگوں ہو جاتی ہیں حاکم میں ہے کہ اس کے بعد آپ ﷺ نے چند کنکریاں اٹھا کر ماریں جن کو یہ کنکریاں جا کر لگیں وہ بدر میں مارے گئے۔ [1]

ایک دفعہ ابوجہل نے ارادہ کیا کہ اگر اب وہ آپ ﷺ کو سجدہ میں دیکھے گا تو آپ ﷺ کی پیشانی کو رگڑ دے گا۔ جب وہ اس ارادہ سے آگے بڑھا تو جھجک کر پیچھے لوٹ گیا۔ لوگوں نے دریافت کیا تو اس نے کہا: مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے اور محمد (ﷺ) کے درمیان آگ کی خندق حائل ہے اور چند پہرہ دار ہستیاں کھڑی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کے ٹکڑے اڑا دیتے۔'' [2]

معلوم ہے کہ جس شب کو آپ ﷺ نے ہجرت کا ارادہ کیا ہے۔ قریش کے تمام خاندانوں نے مل کر آپ کے قتل کا فیصلہ کر لیا تھا۔ قریش کے بہادر رات بھر خانہ اقدس کا پہرہ دے رہے تھے، تاہم آپ ﷺ ان کے سامنے سے نکلے، زبان مبارک پر یہ آیت پاک تھی:

﴿ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ۝ ﴾

(۳۶/ یٰسٓ:۹)

''اور ہم نے ان کے آگے اور پیچھے دیواریں کھڑی کر دیں (ان کی آنکھوں پر) پردہ ڈال دیا کہ وہ نہیں دیکھتے ہیں۔''

پہرہ داروں کی آنکھوں پر قدرت نے مہر لگا دی اور آنحضرت ﷺ ان کے درمیان سے نکل کر چلے گئے۔ صبح ہوئی تو دشمن آپ ﷺ کے تعاقب میں اس غار تک پہنچ گئے۔ جہاں آپ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جا کر چھپے تھے۔ وہ اس غار کے دہانہ تک پہنچ گئے اور اگر وہ ذرا جھک کر دیکھتے تو ان مقدس پناہ گزینوں پر ان کی نظر پڑ جاتی مگر خدا نے ان کی عقل اور دور اندیشی کے نور کو بجھا دیا کہ نیچے جھک کر دیکھنے کا خیال تک ان کے دل میں نہیں آیا۔

کفار نے یہ اعلان کیا تھا کہ جو محمد (ﷺ) کو گرفتار کر لائے گا یا ان کا سر کاٹ کر لائے گا اس کو سو اونٹ

[1] مستدرك حاكم، ج ۱، ص: ۱۶۳ حیدرآباد، مسند احمد، ج ۱، ص: ۳۶۸۔

[2] صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین، باب قوله: ﴿ان الانسان ليطغىٰ﴾: ۷۰۶۵۔

انعام میں ملیں گے۔ یہ سن کر سراقہ بن جعشم اپنے اسپ راہوار پر سوار ہو کر آپ ﷺ کے تعاقب میں روانہ ہوا اور دمبدم اس مختصر قافلہ کے قریب ہو رہا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر بتقاضائے بشری اضطراب طاری تھا۔ مگر آنحضرت ﷺ کی سکینت خاطر میں کوئی فرق نہ آیا۔ آپ نے دعا کی تین دفعہ اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس دھنس گئے۔ اس نے فال کے تیر نکال کر دیکھے تو ہر دفعہ نفی میں جواب آیا۔ بالآخر اس کو یقین ہو گیا کہ یہ کوئی اور ہی راز ہے اور ذات محمدی (ﷺ) ہماری گرفت سے باہر ہے۔ اس نے اپنے ارادۂ فاسد سے توبہ کی اور آنحضرت ﷺ سے ایک خط امان لے کر واپس پھر گیا اور بعد کو مسلمان ہو گیا۔ [1]

شروع شروع میں جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو صحابہ رضی اللہ عنہم جان نثاری کی بنا پر راتوں کو آپ کے گرد پہرہ دیا کرتے تھے۔ ایک رات صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کے خیمہ کے گرد پہرہ دے رہے تھے کہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٦٧)

''اور اللہ ان لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا۔''

آپ ﷺ نے اسی وقت خیمہ سے باہر سر نکالا اور پہرہ والوں کو خطاب کر کے فرمایا: ''لوگو! واپس جاؤ خدا نے میری حفاظت کا فرض خود اپنے ذمہ لے لیا ہے۔'' [2] یہ وعدۂ حفاظت ہزارہا مشکلات اور خطرات کے باوجود بھی پورا ہوتا رہا۔ غزوۂ احد میں جب مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ چلے تھے اور ذات مبارک ﷺ دشمنوں کے نرغہ میں تھی۔ آپ پر تیغ و تبر و سنگ کی بارش ہو رہی تھی۔ لیکن دو سپید پوش فرشتے آپ کے پاس کھڑے ہوئے آپ کی حفاظت کا فرض انجام دے رہے تھے۔ [3]

ایک دفعہ ایک شخص کو لوگ گرفتار کر لائے اور عرض کی کہ یہ حضور ﷺ کے قتل کی گھات میں تھا۔ فرمایا: ''اس کو چھوڑ دو کہ اگر یہ مجھ کو قتل کرنا چاہتا بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔'' [4] اسی طرح سے خیبر میں جب ایک یہودیہ نے گوشت میں زہر ملا کر پیش کیا تو آپ ﷺ نے پہلا ہی لقمہ اٹھایا تھا کہ فرمایا: ''یہ گوشت نہ کھاؤ کیونکہ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ اس میں زہر ملا ہے۔'' یہودیہ کو بلا کر جب واقعہ کی تحقیق کی اور اس نے اپنی نیت فاسد کا اقرار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدا تجھ کو اس پر قابو نہ دیتا۔'' [5]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی ﷺ: ٣٩٠٦۔ [2] جامع ترمذی، ابواب التفسیر، ومن تفسیر سورة المائدة: ٣٠٤٦۔ [3] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب اذهمت طائفتان: ٤٠٥٤ وصحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب في قتال جبریل ومیکائیل عن النبی ﷺ یوم أحد: ٦٠٠٥۔
[4] مسند احمد، ج٣، ص: ٤٧١۔ [5] صحیح مسلم، کتاب السلام، باب السم: ٥٧٠٥، مگر اس روایت سے واقعہ کی نوعیت سامنے نہیں آتی۔ عن انس ان امراة یهودیة اتت رسول الله ﷺ بشاة مسمومة فاكل منها فجئ بها الى رسول الله ﷺ فسالها عن ذلك فقالت اردت لاقتلك قال ما كان الله يسلط على ذلك۔
معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے پیش نظر اس سلسلے کی دوسری روایات بھی رہی ہیں چنانچہ تاریخ طبری میں ہے کہ آپ نے ایک لقمہ کھا کر ہاتھ کھینچ لیا کیونکہ خود گوشت نے آپ سے کہا کہ اس میں زہر ملا ہے۔ (ج ٣، ص: ١٥٨٣)

لیلۃ الجن

جنوں کی انقلابِ آسمانی کی تلاش اور اُن کا مشرف باسلام ہونا

﴿ قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ ﴾ (۷۲/ الجن:۱)

''مخلوقاتِ الٰہی کی تعداد اور اصناف کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔''

﴿ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ﴾ (۷۴/ المدثر:۳۱)

''اور تیرے رب کی فوجوں کا علم اس کے سوا کسی کو نہیں۔''

مخلوقاتِ الٰہی کی ایک صنف کا نام جن ہے۔ اہل لغت کہتے ہیں کہ عربی میں جن کا لفظ جنٌّ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ''چھپنے اور چھپانے'' کے ہیں۔ چونکہ یہ مخلوق انسانوں کی آنکھوں سے عموماً مستور رہتی ہے اس لئے اس کو جن کہتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہ لفظ اسی معنی میں یا اسی کے قریب قریب مختلف قوموں کی زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ فرنچ میں جنی (GENEE) اور انگریزی میں (GENEI) اسی مفہوم میں ہے جس میں عربی میں جنی (دیو، بھوت، پلیت) ہے، لاطینی میں جینیوس (GENIUS) اور جینی (GENII) وہ مفہوم رکھتا ہے جو ہمارے ہاں ہمزاد کا ہے اور روح نوعی کے معنی میں بھی یہ لفظ رومی اساطیر (میتھالوجی) میں مستعمل ہوا ہے۔ فارسی میں ''جان'' کے معنی مطلق ''روح'' کے ہیں بہر حال دنیا کی قوموں میں یہ اعتقاد کسی نہ کسی حیثیت سے موجود رہا ہے کہ انسانوں کے سوا اس سطح ارضی پر ایک اور غیر مرئی مخلوق بھی موجود ہے، یورپ کے موجودہ دورِ الحاد میں ارواح سے نامہ و پیام اور ان کے عمل و تسخیر کے کارنامے بڑے بڑے فلسفیوں اور مادہ پرستوں کو آئینہ حیرت بنائے ہوئے ہیں اور روز بروز ان کے انکار اور شک کی جرأت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسلام کے علاوہ دوسری مسلّم مذہبی کتابوں میں بھی جن اور شیطان کے تذکرے موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات جو موجودہ انجیل میں مذکور ہیں، ان کی بڑی تعداد انسانوں اور حیوانوں کو ان کے پنجۂ ظلم سے رہائی ہے۔

قرآن نے بتایا ہے کہ ان کی پیدائش انسانوں سے پہلے ہوئی ہے اور آگ سے بنائے گئے ہیں:

﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۝ ﴾ (۱۵/ الحجر: ۲۶)

''اور ہم نے آدمی کو کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا اور جنوں کو اس سے پہلے لو کی آگ سے پیدا کیا۔''

﴿ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۝ ﴾ (۵۵/ الرحمٰن:۱۵)

''اور اس نے جنوں کو آگ کی لو سے پیدا کیا ہے۔''

اسلام سے پہلے عرب میں جنات کا بڑا تسلط تھا۔ ان کی پوجا کی جاتی تھی، [1] ان کی دہائی مانگی جاتی تھی۔ بت خانوں میں جو عامل اور کاہن ہوتے تھے ان سے ان کی دوستی ہوتی تھی اور وہ ان کو غیب کی خبریں بتایا کرتے تھے۔ بچوں کے سرہانے استرے رکھے جاتے تھے کہ ان سے جنات بھاگ جاتے ہیں۔ یہ اعتقاد تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک جن ہوتا ہے، یہ بھی خیال تھا کہ وہ صورتیں بدل بدل کر لوگوں میں پھرتے ہیں اور ان کو ستاتے ہیں، خدا کے کارخانۂ قدرت میں بھی ان کے استیلا اور تصرف کو دخل تھا۔ وہ جنگلوں میں انسانوں کو مار ڈالتے تھے۔ راستوں سے اٹھا لے جاتے تھے۔ لوگوں کو بیمار ڈال دیتے تھے۔ ان کے ہوش وحواس کے خزانہ پر قبضہ کر لیتے تھے۔ غرض جس طرح خدائی الوہیت میں عرب کے بہت سے دیوتا اور دیویاں شریک تھیں اسی طرح یہ جنات بھی شریک تھے:

﴿ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ ﴾ (٦/ الانعام:١٠٠)

''اور ان مشرکوں نے جنوں کو خدا کا شریک بنایا ہے۔''

﴿ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ﴾ (٣٧/ الصآفات:١٥٨)

''اور ان مشرکوں نے خدا اور جنوں کے درمیان رشتے قائم کر رکھے ہیں۔''

﴿ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴾ (٣٤/ سبا:٤١)

''(خدا قیامت میں ان سے کہے گا) بلکہ یہ لوگ جنوں کی پرستش کرتے تھے اور ان میں اکثر لوگ انہی کے معتقد تھے۔''

اسلام آیا تو اس نے ان اعتقادات باطلہ کے تار و پود کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، اس نے دنیا میں صرف ایک ہی قوت کی تعلیم دی اور وہ خدا کی تھی۔ اس نے بتایا کہ جنات بھی اس کے حضور میں ویسے ہی عاجز اور درماندہ ہیں جیسے انسان۔ وہ بھی اسی طرح اس کی مخلوق ہیں جیسی اس کی دوسری مخلوقات۔ ان میں لوگ اسی طرح اچھے اور برے، کافر اور مومن، سعید اور شقی ہوتے ہیں۔ جس طرح انسانوں میں، وہ بھی توحید و رسالت اور احکام الٰہی کے ماننے کے ویسے ہی مکلّف ہیں جیسے عام انسان:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ (٥١/ الذاريات:٥٦)

''میں نے جن اور انس کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔''

قیامت میں دونوں سے سوال ہوگا:

﴿ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ﴾ (٦/ الانعام:١٣٠)

''اے جن اور انس (کی جماعت)! کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر تمہارے پاس نہیں آئے

[1] صحیح مسلم، کتاب التفسیر: ٧٥٥٤، ٧٥٥٥۔

اور وہ تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر نہیں سناتے تھے اور اس دن کے آنے سے نہیں ڈراتے تھے۔''

قرآن کے تحدی کے جواب سے دونوں عاجز ہیں:

﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ ﴾

(۱۷/ الاسرآء:۸۸)

''کہہ دو کہ اگر انس و جن دونوں مل کر چاہیں کہ ایسا قرآن بنالائیں تو ان کے لئے یہ ناممکن ہے۔''

خدا کی قدرت اور طاقت کے سامنے دونوں لاچار اور درماندہ ہیں:

﴿ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۚ﴾ (۵۵/ الرحمان:۳۳)

''اے جن و انس! اگر آسمان و زمین کے حدود سے نکل کر باہر جا سکتے ہو۔ تو نکل جاؤ لیکن خدا کی قدرت قاہرہ کے بغیر تم نکل نہیں سکتے۔''

کاہنوں اور عاملوں کو جو غیب کی بعض بعض باتیں معلوم ہو جاتی ہیں تو اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ اپنے ملائے اعلیٰ میں اس کا ذکر کرتا ہے۔ ملائے اعلیٰ والے اپنے نیچے کے فرشتوں سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس طرح درجہ بدرجہ ہر آسمان کے فرشتوں کو علم ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آخری آسمان تک بات پہنچ جاتی ہے۔ جہاں سے نیچے دنیا کی حد شروع ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جنات و شیاطین سن گن لینے کے لئے ادھر ادھر چھپے رہتے ہیں ایک دو لفظ انہوں نے سن لئے اور ان میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا کر کاہنوں اور عاملوں سے کہہ دیتے ہیں، وہ اس کو انسانوں میں مشتہر کرتے ہیں۔ [1] اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آسمان میں بے شمار ستاروں کے شعلے بھڑکا رکھے ہیں کہ ایک تو ان سے آسمان کی زیبائش و آرائش ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب یہ جنات اور شیاطین اپنی سرحد سے آگے بڑھ کر فرشتوں کی باتیں سننا چاہتے ہیں تو فوراً ایک چمکتا ہوا تارا (شہاب ثاقب) ٹوٹ کر ان پر گرتا ہے۔ مختلف سورتوں میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِى السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۙ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۙ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴾ (۱۵/ الحجر:۱۶ تا ۱۸)

''اور ہم نے اس کو آسمان میں برج بنایا ہے اور ان ستاروں کو دیکھنے والوں کے لئے زینت و آرائش بنایا ہے اور ہر راندۂ درگاہ شیطان سے اس کو محفوظ رکھا ہے۔ لیکن اتنا ہے کہ وہ چوری چھپے کچھ سن لے تو ایک چمکتا ستارہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ﹰالْكَوَاكِبِ ۙ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۚ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الحجر: ۴۷۰۱ وتفسیر سورۃ سبا: ۴۸۰۰۔

الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝﴾ (۳۷/ الصافات:٦ تا ١٠)

''ہم نے آسمان زیریں کو ستاروں کی آرائش سے مزین کیا ہے اوران کو ہر سرکش شیطان کا نگہبان بنایا ہے، وہ ملائے اعلی کی باتیں نہیں سن سکتے وہ ہر طرف سے پھینک کر مارے جاتے ہیں اور یہ ان کے لئے لازمی سزا ہے اس طرح وہ فرشتوں کی باتیں نہیں سن سکتے لیکن یہ کہ کوئی اچک کر سن لے تو ایک دہکتا ہوا ستارا اس کے پیچھے لگا رہتا ہے۔''

﴿ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ ﴾

(٦٧/ الملك:٥)

''ہم نے آسمان زیریں کو ستاروں کے چراغوں سے مزین کیا ہے اوران کو شیطانوں کے لئے پھینک کر مارنے کی ایک چیز بنایا ہے۔''

﴿ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ۖ وَحِفْظًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ ﴾

(٤١/ فصلت:١٢)

''اور ہم نے آسمان زیریں کو ستاروں کے چراغوں سے مزین کیا ہے اوران کو نگہبان بنایا ہے۔ یہ غالب ودانا خدا کی تقدیر ہے۔''

دنیا میں اس سلسلۂ نبوت کا جو آغاز آفرینش سے جاری تھا اور دین الٰہی کا ہزاروں منزلوں کے طے ہونے کے بعد تکمیل کی منزل میں پہنچ جانا اور نوع انسان کو خدا کی وہ آخری شریعت سپرد ہونا۔ جس کے بعد خاکدان عالم کو وحی ونبوت کے کسی اور حامل کی ضرورت نہ ہوگی۔ ایک ایسا واقعہ تھا جس نے آب وخاک کے عالم میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اس نے سطح زمین کے ہزاروں پیغمبروں کے دین وملت کو منسوخ کر دیا۔ ان کی آسمانی کتابوں کے احکام ورسوم کو بدل دیا۔ ملکوں کی شہنشاہیاں ہل گئیں۔ قیصر وکسریٰ کے تخت الٹ گئے۔ صومعہ وکلیسا ویران ہو گئے۔ اسی طرح مملکت فلکی اور آسمانی بادشاہی میں بھی انقلاب کا ظاہر ہونا ضروری تھا۔ آسمانی مخلوقات میں بھی ایک انقلاب پیدا ہوا۔ مگر اس کو وہی دیکھ سکے جو دیکھ سکتے تھے۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے موقع پر بھی ایک نئے نورانی ستارہ کے ظہور کی خبر ہے، جس کو دیکھ کر دوسرے ملک کے لوگ ان کی تلاش میں بیت لحم پہنچے اور ان کے دیدار سے مشرف ہوئے۔ مگر بنی اسرائیل کو آخر تک اس بینائی سے محرومی رہی۔

صحیحین میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نبوت سے سرفراز ہوئے تو ستاروں کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔ جن اور شیاطین اب اوپر چڑھنے سے روک دیے گئے۔ ٹوٹنے والے ستاروں کی بھرمار ہو

گئی۔ کاہنوں اور عاملوں کی خبر رسانی کے ذرائع مسدود ہو گئے اور ان باطل پرستیوں کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا، اس آسمانی انقلاب نے جنوں اور شیطانوں کی محفلوں میں حیرت پیدا کر دی۔ سب نے کہا: یقیناً روئے زمین پر کوئی اہم واقعہ رونما ہوا ہے۔ دنیا کی ہر سمت کو انہوں نے چھان ڈالا اس پر چند سال گزر گئے۔ آنحضرت ﷺ اسلام کی تبلیغ کے لئے قبائل میں دورے کر رہے تھے اور اسی تقریب سے عکاظ کے میلہ میں تشریف لے جا رہے تھے، راستہ میں رات کے وقت مقام نخلہ میں قیام ہوا۔ صبح کے وقت آنحضرت ﷺ اپنے رفقا کے ساتھ نماز میں مصروف تھے اور قرآن مجید کی آیتیں جہر کے ساتھ تلاوت فرما رہے تھے کہ اتفاق سے جنوں کی ایک جماعت کا جو تفتیش حال کے لئے تہامہ کی طرف آئی تھی۔ اس مقام پر گزر ہوا۔ اس نے جب قرآن مجید کی آیتیں سنیں تو یکبار پکار اٹھی کہ یہی وہ نور حق ہے جو درخشاں ستاروں میں ہمیں نظر آتا ہے۔ وہ لوٹ کر اپنی قوم میں گئی اور ان کو جا کر خاتم نبوت کے ظہور کی بشارت سنائی: [1]

﴿ قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًاۙ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًاۙ وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًاۙ وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًاۙ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًاۙ وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًاۙ وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًاۙ وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاۗءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًاۙ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۭ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًاۙ وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًاۙ وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ۭ كُنَّا طَرَاۗىِٕقَ قِدَدًاۙ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًاۙ وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ ۭ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًاۙ وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ۭ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰۗىِٕكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًاۙ ﴾ (۷۲/ الجن: ۱ تا ۱۵)

''اے پیغمبر ﷺ! لوگوں سے کہہ دے کہ مجھ کو بذریعہ وحی خبر دی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے قرآن کو سنا تو انہوں نے کہا کہ ہم نے عجیب وغریب کتاب الٰہی سنی جو ہدایت کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ تو ہم اس پر ایمان لائے اور اب ہم ہرگز خدا کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے۔

---

[1] یہ پوری تفصیل صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب الجهر بالقراۃ فی الصبح: ۱۰۰۶، ۱۰۰۷ میں ہے اور امام بخاری ؒ نے مختلف ابواب میں اس واقعہ کو درج کیا ہے۔ مثلاً تفسیر سورۃ جن: ۴۹۲۱ وباب الجهر بقراءۃ صلوٰۃ الفجر: ۷۷۳ ومسند احمد، ج ۱، ص: ۲۵۲ وجامع ترمذی ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ الجن: ۳۳۲۳۔

خداوند تعالیٰ کی نہ تو کوئی بیوی ہے اور نہ کوئی لڑکا ہے، ہم میں سے کچھ بیوقوف خدا پر بہت دوراز عقل الزام قائم کرتے تھے، ہم سمجھتے تھے کہ کوئی انسان یا جن خدا پر جھوٹا الزام نہیں قائم کرسکتا۔ انسانوں میں کچھ ایسے لوگ تھے جو بعض جنوں کی پناہ مانگا کرتے تھے تو انہی نے ان کو اور زیادہ گمراہ کردیا۔ انسان بھی ہماری ہی طرح یہ سمجھتے تھے کہ اب خدا کوئی پیغمبر نہ بھیجے گا۔ ہم نے آسمان کو خوب ٹٹولا تو ہم نے پایا کہ وہ نگہبانوں سے اور ٹوٹنے والوں تاروں سے بھرا ہوا ہے۔ ہم پہلے اس آسمان کی بعض نشست گاہوں میں سننے کو بیٹھ جاتے تھے۔ اب جو کوئی سننے جاتا ہے تو اپنی تاک میں ٹوٹنے والے ستارہ کو پاتا ہے اور ہمیں نہیں معلوم کہ اس انقلاب سے زمین والوں کے ساتھ کسی برائی کا ارادہ کیا جارہا ہے یا ان کا پروردگار ان کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے، ہم میں اچھے بھی ہیں اور ان کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں، ہم جدا جدا راستوں پر تھے اور ہم سمجھتے تھے کہ ہم خدا کو اس زمین میں عاجز نہیں کرسکتے اور نہ بھاگ کر اس کے قبضہ سے نکل سکتے ہیں اور اب جب ہم نے اس ہدایت کی بات کو سن لیا تو اب ہم اس پر ایمان لاتے ہیں، تو جو شخص اپنے پروردگار پر ایمان لے آتا ہے تو پھر گھاٹے ٹوٹے کا اس کو ڈر نہیں رہتا، ہم میں کچھ اطاعت گزار ہیں، کچھ گناہگار ہیں، تو جو اطاعت گزار ہیں انہی نے حقیقت میں ہدایت کا راستہ ڈھونڈ نکالا ہے اور جو گناہگار ہیں وہ جہنم کے ایندھن ہیں۔''

پھر سورۂ احقاف میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿ وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْۤا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ ۝ قَالُوْا یٰقَوْمَنَاۤ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یَهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ وَ اِلٰى طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ یٰقَوْمَنَاۤ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ یُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ ﴾ (٤٦/ الحقاف:٢٩ تا ٣١)

''ہم نے جب جنوں کی ایک جماعت کے رخ کو اے پیغمبر! تیری طرف پھیر دیا کہ وہ قرآن کو سنیں تو جب وہ آئے تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا: چپ رہو۔ جب قرآن ختم ہوگیا تو وہ اپنی قوم کے پاس گئے کہ انہیں خبردار کریں۔ انہوں نے جا کر کہا: بھائیو! ہم نے ایک شریعت کی کتاب کو سنا جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد اتاری گئی ہے اور اس کے پہلے جو کتاب الٰہی آئی ہے اس کی تصدیق کرتی ہے اور سچائی اور سیدھی راہ دکھاتی ہے۔ اے بھائیو! خدا کے پکارنے والے کو قبول کرو اور اس پر ایمان لاؤ، تاکہ وہ تمہارے گناہوں کو معاف کرے اور دردناک عذاب سے تم کو پناہ دے۔''

صحیح مسلم سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں نے دو دفعہ آنحضرت ﷺ کو کلام مجید پڑھتے سنا، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی یہ دونوں سورتیں الگ الگ واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہوں۔ پہلے واقعہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ شریک نہ تھے (1) اور آنحضرت ﷺ نے اور نہ کسی صحابی نے ان جنوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ (2) بلکہ آنحضرت ﷺ کو اس کی اطلاع ایک درخت نے کی (3) اور تفصیلی کیفیت وحی آسمانی سے معلوم ہوئی۔ اسی واقعہ کو واقعہ لیلۃ الجن (جن کی رات) کہتے ہیں لیکن یہ دونوں واقعے مکہ معظمہ ہی میں گزرے ہیں۔ صحیح مسلم (4) ترمذی (5) اور مسند طیالسی میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ان کے شاگرد خاص علقمہ نے پوچھا کہ آپ صاحبوں میں سے کوئی لیلۃ الجن میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھا؟ انہوں نے کہا: نہیں لیکن ایک اور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ شب کو ہم لوگوں نے آنحضرت ﷺ کو نہیں پایا۔ میدانوں اور گھاٹیوں میں ہر جگہ ڈھونڈا۔ مگر آپ نہیں ملے۔ ہم لوگوں کو طرح طرح کے خیال آنے لگے کہ آپ کو کوئی اٹھا لے گیا، یا دھوکے سے کسی نے قتل کر دیا۔ سخت اضطراب اور قلق میں ہم نے یہ رات بسر کی، صبح ہوئی تو دیکھا کہ آپ غار حرا کی طرف سے چلے آرہے ہیں۔ ہم سب نے عرض کی کہ یارسول اللہ! ہم نے شب کو ہر جگہ آپ کو ڈھونڈا مگر آپ کہیں نہیں ملے۔ ہم نے سخت اضطراب اور قلق میں رات بسر کی۔ فرمایا: ''رات کو جنوں کا قاصد آیا تھا میں اس کے ساتھ گیا تھا۔ میں نے ان کو قرآن پڑھ کر سنایا۔'' اس کے بعد آپ ہم سب کو لے کر اس مقام پر تشریف لے گئے اور وہاں ان کے قیام اور آگ جلانے کے نشانات دکھائے اور فرمایا: ''انہوں نے مجھ سے زادراہ کی خواہش کی میں نے ان کے لئے دعا کی کہ وہ جس ہڈی اور گوبر پر گزریں ان کے لئے وہ کھانا ہو جائے۔'' (6)

مسند ابن حنبل کے زیادات میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زبانی جنوں کی آمد کا ایک اور واقعہ مذکور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ مکہ میں رات کے وقت ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھے تھے کہ یکا یک آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی میرے ساتھ چلے۔ لیکن وہ نہ چلے جس کے دل میں ذرا سا بھی کھوٹ ہو۔'' ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں پانی کا لوٹا لے کر آپ کے ساتھ ہو لیا۔ آپ مجھے ساتھ لئے ہوئے مکہ کے آگے پہنچے۔ وہاں مجھ کو کچھ پرچھائیاں ایک جگہ اکھٹی نظر آئیں۔ آپ نے ایک خط کھینچ دیا۔ اور فرمایا: ''جب تک میں واپس نہ آؤں تم یہیں کھڑے رہو۔'' یہ کہہ کر آنحضرت ﷺ آگے بڑھ گئے۔ میں

---

(1) صحیح مسلم، باب الجهر بقراءة الصبح: ۱۰۱۰۔
(2) مسلم: ۱۰۰۷ ومسند احمد، ج ۱، ص: ۲۵۲۔ (3) صحیح مسلم: ۱۰۱۱۔
(4) صحیح مسلم: ۱۰۰۷۔ (5) ترمذی، تفسیر سورة احقاف: ۳۲۵۸۔
(6) صحیح مسلم، باب الجهر بالقراة فی الصبح: ۱۰۰۷؛ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ذکر الجن: ۳۸۵۹، ۳۸٦۰ وترمذی ابواب الطهارة، باب ما جاء فی کراهية ما يستنجى به: ۱۸۔

نے دیکھا کہ وہ پرچھائیاں آپ کی طرف چلیں۔ آپ ان کے ساتھ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ جب فجر کا اجالا ہوا تو آپ میرے پاس آئے اور وضو کا پانی مانگا۔ میں نے دیکھا تو وہ پانی کے بجائے کھجور کا شربت (نبیذ) تھا آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس میں کیا حرج ہے۔ کھجور بھی پاک ہے اور پانی بھی پاک ہے۔'' یہ کہہ کر آپ نے اسی سے وضو کیا اس کے بعد نماز کو کھڑے ہوئے تو ان میں سے دو آدمی پاس آ کر کہنے لگے کہ یارسول اللہ! ہم بھی آپ کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ وہ بھی میرے ساتھ آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے۔ نماز سے فارغ ہو کر میں نے پوچھا کہ یارسول اللہ! یہ کون لوگ تھے؟ فرمایا: ''یہ شہر نصیبین کے جن تھے۔ اپنے کچھ معاملات میرے پاس فیصلہ کے لئے لائے تھے۔ انہوں نے مجھ سے توشہ مانگا۔ تو میں نے دے دیا۔'' عرض کی، یارسول اللہ! کیا آپ کے ساتھ کوئی توشہ کا سامان تھا؟ فرمایا: ''میں نے انہیں گوبر اور ہڈی کا توشہ دے دیا ہے۔ گوبر ان کے لئے جو، اور ہڈی پر گوشت ہو جائے گی۔'' اسی موقع پر آپ ﷺ نے گوبر اور ہڈی سے استنجا منع فرمایا۔ [1] زیادات مسند اور صحیح مسلم کی یہ دونوں روایتیں کیا ایک ہی واقعہ کی دو تفصیلیں ہیں؟ مگر ان دونوں روایتوں کے جزئیات میں اس قدر فرق ہے کہ وہ یقیناً ایک نہیں ہوسکتیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ زیادات مسند کی روایت بالکل لغو اور بے سروپا ہے۔ اس روایت کا سلسلہ سند یہ ہے: عن ابی فزارة عن ابی زید مولیٰ عمرو بن الحریث المخزومی عن عبداللہ بن مسعود۔ اس میں ابوزید مولیٰ عمرو بن حریث ایک مجہول راوی ہے، جس سے محدثین میں کوئی واقف نہیں۔ حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں:

> ابـوزيـد مولى عمرو بن حريث لا يعرف عن ابن مسعود وعنه ابو فزارة لا يصح حديثه ذكره البخاري في الضعفاء ومتن حديثه ان نبي الله توضأ بالنبيذ وقال ابو محمد الحاكم رجل مجهول قلت: ما له سوىٰ حديث واحد۔ (میزان الاعتدال، ج۳، ص: ۳۵۹)
>
> ''ابوزید غلام عمرو بن حریث اس کو کوئی جانتا نہیں۔ اس نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور اس سے ابوفزارہ نے اس کی حدیث صحیح نہیں۔ بخاری نے ضعفاء میں اس کو درج کیا ہے۔ اس کی حدیث کا متن یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نبیذ سے وضو کیا، ابواحمد حاکم کہتے ہیں کہ یہ مجہول الحال آدمی ہے، میں کہتا ہوں کہ اس کی یہی ایک حدیث ہے۔''

البتہ جامع ترمذی میں اسی قسم کا ایک واقعہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرشتوں کی آمد اور دیدار کے متعلق بروایت صحیحہ مروی ہے۔

[1] مسند احمد، ج۱، ص: ۴۵۸۔

شقِ قمر

﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ ﴾ (٥٤/ القمر:١)

پیغمبر کی صداقت کی گواہی کائنات کا ذرہ ذرہ دیتا ہے۔ آسمان اور زمین، چاند اور سورج ہر چیز اس کی صداقت کا ثبوت بن جاتی ہے۔ انجیل (متی ۲۔۲) میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ایک نیا ستارہ طلوع ہوا اور جب انہوں نے وفات پائی تو تین گھنٹہ کے لئے تمام دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ (متی ۲۷۔ ۴۵) قرب قیامت کی ایک نشانی یہ بھی تھی کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔ یہ نشانی آنحضرت ﷺ کے دست مبارک پر پوری اتری اور قرآن نے کہا:

﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ ﴾

(٥٤/ القمر:١، ٢)

''قیامت نزدیک آ گئی اور چاند شق ہو گیا، اگر کافر کوئی سا بھی نشان دیکھیں تو اس سے اعراض ہی کریں اور کہیں کہ یہ تو جادو ہے جو سدا سے ہوتا آیا ہے۔''

بعض عقل پرست مسلمانوں نے قرب قیامت کی مناسبت سے یہ تاویل کی ہے کہ اس آیت سے آنحضرت ﷺ کے عہد میں شق قمر کا ثبوت نہیں ہوتا۔ بلکہ قیامت کے واقعہ کا ذکر ہے۔ لیکن اس حالت میں اول تو بے قرینہ ماضی (چاند پھٹ گیا) کو مستقبل (چاند پھٹ جائے گا) کے معنی میں لینا پڑے گا، دوسرے یہ کہ اگر یہ قیامت کا واقعہ ہوتا۔ تو اس کے بعد یہ کیوں ہوتا کہ یہ'' کافر اگر کوئی سی نشانی بھی دیکھیں تو منہ پھیر لیں اور کہیں کہ یہ تو جادو ہے، جو ہوتا آیا ہے۔'' قیامت سامنے آ جانے کے بعد اس کے انکار کے کیا معنی اور اس کو مستمر جادو کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مستند اور صحیح روایات کی کیونکر تردید کی جا سکتی ہے۔

اس شق قمر کا واقعہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، مسند ابن حنبل، مسند طیالسی، مستدرک حاکم، دلائل بیہقی و دلائل ابو نعیم میں تصریح تمام مذکور ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، انس بن مالک، جبیر بن مطعم علی بن ابی طالب اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہم وغیرہ نے اس واقعہ کی روایت کی ہے [1] ان میں سب سے صحیح اور مستند تر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جو صحیح بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ میں مروی ہے۔ وہ اس واقعہ کے وقت موقع پر موجود تھے اور اس معجزے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں:

انشق القمر ونحن مع النبی ﷺ بمنی فقال: ((اشهدوا)) وذهبت فرقة نحو الجبل۔ [2]

---

[1] زرقانی بر مواهب، ج ٥، ص: ١٢٤۔

[2] بخاری، کتاب التفسیر، سورة اقتربت الساعة:٤٨٦٥؛ مسلم، کتاب صفات المنافقین، باب انشقاق القمر: ٧٠٧٢ تا ٧٠٧٣؛ ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة القمر: ٣٢٨٥۔

''ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ منیٰ میں تھے کہ چاند پھٹ گیا اور اس کا ایک ٹکڑا پہاڑ کی طرف چلا گیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''گواہ رہو۔''

صحیحین میں ان کی دوسری روایت یہ ہے:

انشق القمر علی عهد رسول الله ﷺ فرقتين فرقة فوق الجبل وفرقة دونه فقال رسول الله ﷺ: ((اشهدوا))۔ ❶

''آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے اور ایک ٹکڑا تو پہاڑ کے اوپر رہا اور دوسرا اس کے نیچے آپ ﷺ نے فرمایا: ''گواہ رہو۔''

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بخاری و مسلم دونوں میں ہے:

ان اهل مكة سألوا رسول الله ﷺ ان يريهم آية فاراهم القمر شقتين حتى رأوا حراء بينهما۔ ❷

''اہل مکہ نے آپ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ آپ ان کو کوئی معجزہ دکھائیں۔ آپ نے ان کو چاند کے ٹکڑے دکھائے ایک ٹکڑا حرا کے اس طرف تھا دوسرا اس طرف۔''

صحیح مسلم میں ہے:

ان اهل مكة سألوا النبى ﷺ ان يريهم اية فاراهم انشقاق القمر فرقتين۔ ❸

''اہل مکہ نے آنحضرت ﷺ سے کوئی نشانی طلب کی تو آپ نے چاند کو دو ٹکڑے ہونے کو دکھایا۔''

جامع ترمذی میں ان کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

سأل اهل مكة النبى ﷺ اية فانشق القمر بمكة فرقتين فنزلت: ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾۔ ❹

''اہل مکہ نے آنحضرت ﷺ سے کوئی نشانی طلب کی۔ تو چاند مکہ میں دو ٹکڑے ہو گیا۔ اس پر یہ آیت اتری قیامت آ گئی اور چاند پھٹ گیا۔''

جامع ترمذی (تفسیر سورۂ قمر) اور مسند ابن حنبل میں جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی جو روایت ہے اس میں ہے کہ اس معجزہ کو دیکھ کر کفار نے کہا کہ محمد (ﷺ) نے ہم پر جادو کر دیا ہے۔ دوسروں نے کہا کہ اگر ہم پر جادو کر دیا ہے تو تمام آدمیوں پر تو وہ جادو نہیں کر سکتے۔ مسند ابوداؤد طیالسی ❺ اور بیہقی میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ

---

❶ صحيح بخارى: ٤٨٦٤ ومسلم: ٧٠٧٣۔ ❷ بخارى ايضًا: ٤٨٦٧، ٣٦٣٧؛ مسلم، ايضًا: ٧٠٧٦۔ راؤ احرا بينهما کے الفاظ نہیں ملے۔ ❸ مسلم، ايضًا: ٧٠٧٦۔ اس میں "فرقتين" کی بجائے "مرتين" کا لفظ ہے۔
❹ ترمذى، تفسير سورة قمر: ٣٢٨٦۔ ❺ مسند عبدالله بن مسعود، ص: ٣٨، حيدر آباد دكن۔

محمد (ﷺ) تمام دنیا پر تو جادو نہیں کر سکتے۔ مسافروں کو اور مقامات سے آنے دو۔ دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔ چنانچہ جب ادھر ادھر سے مسافر آئے اور اُن سے پوچھا گیا تو انہوں نے بھی اپنا یہی مشاہدہ بیان کیا۔ بہر حال یہ معجزہ رات کے وقت مکہ میں بمقام منیٰ واقع ہوا۔ عقلی حیثیت سے یہ معجزہ زمانہ قدیم سے معرکۃ الآراء رہا ہے۔ علمائے متکلمین نے فلسفۂ قدیم کے اصول پر اس میں خوب خوب موشگافیاں کی ہیں۔ مثلاً: فلاسفہ قدیم کا یہ اعتقاد تھا کہ اجرام فلکی میں خرق و التیام اور شکست و ریخت محال ہے۔ اس لئے شق قمر بھی ناممکن ہے۔ متکلمین نے ثابت کیا کہ اجرام فلکی میں خرق و التیام اور شکست و ریخت ممکن ہے۔ مگر اب کہ جدید طبیعیات و ہیئت نے ہماری معلومات کے آسمان و زمین کو بدل دیا ہے۔ یہ مباحث بے سود اور بے کار ہیں۔ اب تو ہر روز نئے نئے ستاروں کے شکست و ریخت اور تصادم کے حادثے سنے جار ہے ہیں اور ہیئت جدید اور علم تکوین میں تو زمین سورج اور ستاروں کے آغاز آفرینش کی داستان ہی اس باب سے شروع ہوتی ہے۔

اس سے دوسرے درجہ پر ایک اور قدیم اعتراض و جواب کتابوں میں لکھا چلا آتا ہے اور ہمارے مسیحی مناظرین نے اس کو نئے آب و رنگ سے شہرت دی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر یہ معجزہ درحقیقت واقع ہوتا تو یہ صرف اہل مکہ ہی کو نظر نہ آتا۔ بلکہ اس کو تمام دنیا دیکھتی اور اس کی روایتیں مشرق سے لے کر مغرب تک پھیل جاتیں۔ لیکن بجز آنکہ کے دنیا کے اور ملکوں میں اس واقعہ کا چرچا نہیں ہوا اور تمام قدیم اہل نجوم وہیئت و تاریخ اس کی روایت سے خاموش ہیں۔

لوگوں نے اس شبہ کے یہ جوابات دیے ہیں کہ اولاً ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ یہ واقعہ دوسرے ملک کے لوگوں کو نظر نہیں آیا۔ تم اس کے ثبوت میں کہو گے کہ اگر نظر آتا تو اس ملک کے اہل تاریخ اس کا ذکر کرتے۔ حالانکہ کسی تاریخ میں اس کا ذکر نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ایک ملک کا مشہور واقعہ جو دوسرے ملک کی معاصر تاریخوں میں مذکور نہ ہو۔ صرف اس کا یہ عدم ذکر کیا اس کے انکار کی سند ہو سکتا ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو ہندوؤں کی مہابھارت کا تم انکار کر سکتے ہو۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے تمام معجزات بلکہ واقعات زندگی تک کا انکار کر سکتے ہو کہ شام و مصر کے معاصر رومی مؤرخوں نے ایسے عجیب و غریب واقعات کا ایک حرف بھی قلمبند نہیں کیا۔ اس کے برخلاف ابھی اوپر کی روایتوں میں بیان کیا جا چکا ہے کہ عرب و شام سے آنے والے مسافروں نے یہ بیان کیا کہ انہوں نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا تھا۔

فلکی حیثیت سے جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ اہل ہیئت جو اجرام فلکی کے ایک ایک واقعہ کو قلمبند کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معجزہ رات کے وقت ظاہر ہوا تھا اور اس وقت دنیا کا بڑا حصہ خواب راحت میں مصروف تھا جو لوگ بیدار بھی ہوں گے وہ اپنے دوسرے مشاغل میں مصروف ہوں گے اور جنہوں نے دیکھا بھی ہوگا ان میں کتنا بڑا حصہ ان کا ہوگا جو اپنے مشاہدات کو تحریری

صورت میں لانے پر قادر نہ تھے۔ یعنی ناخواندہ تھے اور اگر ان میں چند لکھے پڑھے ارباب ہیئت اور اصحاب تاریخ تھے تو ضروری نہیں کہ انہوں نے اپنے اس مشاہدہ کا تذکرہ بھی کیا ہو۔ یا تذکرہ کیا ہو تو ان کی یادداشت مثل دوسری سینکڑوں علمی یادداشتوں کے ضائع ہوگئی ہو۔ آغاز آفرینش سے اب تک اجرام فلکی میں لاکھوں انقلابات پیش آئے ہوں گے۔ لیکن کیا وہ سب کے سب دنیا کے اوراق ہیئت میں درج ہیں؟ اور ان کا درج نہ ہونا ان کے عدم و وقوع کی دلیل ہے؟ مختلف مذاہب کی کتابوں میں اس قسم کے حوادثات فلکی کا ذکر ہے۔ لیکن علم ہیئت و فلک اس کے ذکر سے خاموش ہے لیکن یہ خاموشی اس کے عدم وقوع پر شہادت ہے؟ جو تمہاری انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ایک ستارہ نبوت طلوع ہوا جس کو یورپ کے لوگوں نے دیکھا، پھر انجیل میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی تو تمام دنیا دفعتہً تاریک ہوگئی۔ لیکن کیا ہیئت و افلاک کی کتابوں میں ان انقلاب سماوی کا تذکرہ موجود ہے؟

حوادث فلکی کے حدوث اور وقوع میں بڑی چیز یہ ہے کہ اس کا مشاہدہ مطالع اور مغارب پر موقوف ہے اور ہر جگہ کے مطالع مغارب دوسری جگہ سے نہایت مختلف ہیں۔ بلکہ بالخصوص قمر کے مطالع میں تو اور بھی سخت اختلاف ہے اور ایک جگہ چاند ڈوبتا ہے دوسری جگہ نکلتا ہے، ایک جگہ چاندنی ہے دوسری جگہ اندھیری ہوتی ہے، ایک جگہ چاند کو گہن لگتا ہے اور دوسرے مقامات کے لوگوں کو وہ نظر تک نہیں آتا۔ اس لئے اگر تمام دنیا نے اس معجزہ کو نہیں دیکھا تو یہ شق قمر کی نفی کی دلیل نہیں۔ چنانچہ دنیا کی مختلف باخبر قوموں نے اپنی اپنی کتابوں میں مختلف حوادث فلکی کا ذکر کیا ہے لیکن جس واقعہ کو ایک نے بڑے شد و مد سے بیان کیا ہے۔ اس کی معاصر قوموں کی کتابیں اس کی شہادت سے قطعاً خالی ہیں۔ لیکن کیا یہ خاموشی اس کے عدم وقوع کی سند ہو سکتی ہے؟ علاوہ اور وجوہ کے اس خاموشی اور اختلاف کی ایک وجہ یہی ہوتی ہے کہ تمام دنیا کا ایک مطلع نہیں ہے۔ اس لئے ایک چیز ایک جگہ نظر آتی ہے دوسری جگہ نہیں آتی۔ بعض متکلمین نے جن میں ایک شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں لکھا ہے اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ادھر ہی رجحان معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت چاند میں شگاف نہیں ہوا تھا بلکہ لوگوں کو ایسا نظر آیا۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں:

ان اهل مكة سألوا النبى ﷺ ان يريهم اٰية فاراهم انشقاق القمر فرقتين ۔ [1]

''اہل مکہ نے آپ ﷺ سے نشانی طلب کی تو آپ نے چاند دو ٹکڑے دکھایا۔''

ہم ان تمام پُر پیچ راستوں سے گزر کر صرف ایک سیدھی سی بات کہہ دینا چاہتے ہیں کہ شق القمر اہل مکہ کی طلب پر ایک آیت الٰہی تھی۔ یعنی ان منکروں کو ان کی خواہش کے مطابق نبوت کی ایک نشانی دکھائی گئی

---

[1] صحيح مسلم، كتاب صفات المنافقين، باب انشقاق القمر: ٧٠٧٦۔ اس میں ''فرقتین'' کی بجائے ''مرتین'' کا لفظ ہے۔

تھی۔احادیث میں یہ ہے کہ ان کو چاند دوٹکڑے ہو کر نظر آیا۔خواہ دراصل چاند کے دوٹکڑے ہو گئے ہوں یا خدا نے ان کی آنکھوں میں ایسا تصرف کر دیا ہو کہ ان کو چاند دوٹکڑے ہو کر نظر آیا۔جو خدا انسانوں کی آنکھوں میں خلاف عادت تصرف کر سکتا ہے وہ خود چاند میں بھی خلاف عادت تصرف کر سکتا ہے۔پھر چونکہ اللہ نے یہ نشانی اہل مکہ کے لئے ظاہر کی تھی اور انہی کے لئے یہ آئینہ ثبوت تھی اس لئے تمام دنیا میں اس کے ظہور اور روایت کی حاجت نہ تھی اس بنا پر بالفرض اگر دنیا کے دوسرے حصوں میں شق قمر مشاہدہ نہ ہوا تو یہ حیرت اور تعجب کی بات نہیں۔بلکہ اہل مکہ کے علاوہ اور لوگوں کو دوسرے شہروں اور ملکوں میں اس کا نظر نہ آنا ہی مصلحت الٰہی تھی کہ اگر یہ عام طور سے دوسرے اقطاع عالم کے لوگوں کو بھی نظر آتا تو یہ سمجھا جا سکتا کہ یہ آسمان کی طبعی انقلاب میں سے کوئی انقلاب تھا جیسا کہ اور سینکڑوں قسم کے تغیرات اس سے پہلے ہو چکے ہیں۔جیسا کہ فلکیات اور علم بدء خلق (کسموگریفی اور نیچرل ہسٹری) میں مذکور ہیں۔لیکن جب اہل مکہ کے علاوہ جو شہر میں تھے یا باہر قافلہ میں تھے صرف انہی کو نظر آیا، تو اس بات کی صاف اور صریح دلیل ہے کہ یہ صرف آنحضرت ﷺ کے ایک نشان کے طور پر ظاہر ہوا۔وللہ الحمد۔

غلبہ روم کی پیشین گوئی

﴿ الٓمّٓ ۞ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۞ فِیْۤ اَدْنَی الْاَرْضِ ﴾ (۳۰/ الروم: ۱ تا ۳)

آنحضرت ﷺ نے اپنی الہامی زبان سے جن واقعات کی پیشین گوئی کی ہے، ان سب میں سب سے زیادہ شاندار، سب سے زیادہ صاف وصریح سب سے زیادہ معرکۃ الآ راء غلبہ روم کی پیشین گوئی ہے۔

عرب کے چپ وراست دونوں پہلوؤں میں روم وفارس کی پرزور حکومتیں قائم تھیں۔اس وقت ایران کا تاجدار خسرو اور روم کا فرماں روا ہرقل تھا۔ان دونوں سلطنتوں میں ایک مدت سے معرکہ آرائیوں کا سلسلہ قائم تھا۔بعثت نبوی کے پانچویں سال یعنی ۶۱۳ء میں ان دونوں ہمسایہ سلطنتوں میں ایک خونریز جنگ شروع ہوگئی۔اگرچہ ان دونوں قوموں میں کسی قوم نے مذہب اسلام قبول نہیں کیا تھا، تاہم رومی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیرو اور اہل کتاب تھے اور ایرانیوں کے عقائد مشرکین مکہ کے عقائد کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے، اس لئے لازمی طور سے مسلمانوں کو رومی عیسائیوں کے ساتھ اور مشرکین مکہ کو ایرانیوں کے ساتھ ہمدردی تھی۔اس لئے مسلمانوں اور کفار قریش دونوں کو جنگ کے نتیجہ کا شدت کے ساتھ انتظار تھا۔جنگ کا نتیجہ جب ایسا خلاف امید ظاہر ہوا تو مسلمانوں کو یقیناً رنج اور کفار کو مسرت حاصل ہوئی اور انہوں نے مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ جس طرح ہمارے بھائی غالب ہوئے ہیں اسی طرح اگر تم ہم سے لڑتے تو ہم غالب ہوتے۔اس وقت رومیوں کی جو افسوس ناک حالت تھی وہ آپ ﷺ سن چکے کہ وہ اپنے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک چپہ کھو چکے تھے۔ خزانہ خالی تھا فوج منتشر تھی۔ملک میں بغاوتیں پیدا تھیں۔شہنشاہ روم ہرقل ہمہ تن عیاش، بے پرواست اور مبتلائے اوہام تھا۔ایرانیوں کا فاتح سپہ سالار قسطنطنیہ کے دروازہ پر پہنچ کر رومیوں کے سامنے حسب ذیل شرائط پیش کرتا ہے۔رومی باج ادا کریں۔ایک ہزار ٹالنٹ سونا، ایک ہزار ٹالنٹ چاندی، ایک ہزار حریر کے تھان، ایک ہزار گھوڑے اور ایک ہزار باکرہ لڑکیاں ایرانیوں کے حوالہ کریں۔

رومیوں کی کمزوری کی یہ حالت ہے کہ وہ ان شرمناک شرائط کو قبول کرتے ہیں۔اس پر بھی جب رومی قاصد شہنشاہ ایران کے دربار میں مصالحت کا پیام لے کر جاتا ہے تو مغرور خسرو جواب دیتا ہے۔''مجھ کو یہ نہیں، بلکہ خود ہرقل زنجیروں میں بندھا ہوا میرے تخت کے نیچے چاہیے اور اس وقت تک صلح نہیں کروں گا جب تک شہنشاہ روم اپنے مصلوب خدا کو چھوڑ کر سورج دیوتا کے آگے سر نہ جھکائے گا۔''

کارزار عالم کا نقشہ یہ تھا کہ معرکہ جنگ سے بہت دور ایک خشک اور بنجر زمین کی سنسان پہاڑی سے ایک شہزادۂ امن نمودار ہوا اور واقعات عالم کے بالکل خلاف سروش غیب سے نغمہ قدس میں گویا ہوا:

﴿ الٓمّٓ ۞ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۞ فِیْۤ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۞ فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۞ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

﴿وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝ وَعْدَ﴾ (۳۰/ الروم:۱ تا ٦)

''رومی قریب تر زمین میں مغلوب ہو گئے لیکن وہ چند سال میں مغلوب ہو جانے کے بعد پھر غالب ہوں گے۔ خدا ہی کے ہاتھ میں پہلے اور پیچھے سب اختیار ہے اور اس دن مسلمان خدا کی مدد سے خوش ہوں گے۔ وہ جس کی چاہے مدد کرے وہ غالب رحم والا ہے۔ خدا کا وعدہ ہے خدا اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔''

یہ پیشین گوئی واقعات کے لحاظ سے اس قدر مستبعد اور نا قابل یقین تھی کہ کفار نے اس کے صحیح ہونے کی صورت میں کئی اونٹوں کے ہارنے کی مسلمانوں سے شرط لگائی۔ اب مسلمانوں اور کافروں کو بڑی شدت سے واقعات کے پہلو کا انتظار تھا۔ آخر چند سال کے بعد دنیا نے خلاف امید پلٹا کھایا۔ مؤرخ گبن کے الفاظ میں ''شہنشاہ جو اپنی ابتدائی اور آخری زندگی میں مستی، عیاشی اور اوہام کا غلام اور رعایا کے مصائب کا نامرد تماشائی تھا، جس طرح صبح و شام کا کہرا آفتاب نصف النہار کی روشنی سے پھٹ جاتا ہے۔ دفعتہً (۶۲۱ء میں) محلوں کا ارکارڈیوس میدان جنگ کا سیزر بن گیا اور روم و ہرقل کی عزت نہایت شاندار طریقہ سے بچالی گئی۔ ❶

جس وقت ہرقل اپنی بقیہ فوج لے کر قسطنطنیہ سے چلا ہے لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ رومۃ العظمیٰ کے آخری لشکر کا منظر دنیا کے سامنے ہے ❷ لیکن عرب کے نبی اُمی ﷺ کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور عین اس وقت جب مسلمانوں نے بدر کے میدان میں قریش کو شکست دی۔ رومیوں نے ایرانیوں پر غلبہ حاصل کیا۔ مشرقی مقبوضات کا ایک ایک شہر واپس لے لیا اور ایرانیوں کو باسفورس اور نیل کے کناروں سے ہٹا کر پھر دجلہ وفرات کے سواحل کی طرف دھکیل دیا۔

اس عظیم الشان پیشین گوئی کی صداقت کے اثر نے دنیا کو محو حیرت کر دیا۔ قریش کے بہت سے لوگ اس صداقت کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے۔ ❸ واقعہ کے ساڑھے بارہ سو برس کے بعد تاریخ زوال روم کا مشہور مصنف گبن اس حیرتناک پیشین گوئی کی سچائی سے متحیر ہو کر کہتا ہے۔

''مشرق کی ان دو عظیم الشان سلطنتوں کے ڈانڈے پر بیٹھ کر ان دونوں کی ایک دوسرے کو تباہ کر دینے والی روز افزوں کوششوں کی ترقی کو دلی مسرت کے ساتھ بغور مطالعہ کر رہا تھا اور عین اس وقت جب کہ ایرانیوں کو پیہم کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں۔ اس نے اس پیشین گوئی کی جرأت کی کہ چند سال میں فتح وظفر رومی علم پر سایہ فگن ہوگی۔'' جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کوئی پیشین گوئی اس سے زیادہ دوراز قیاس نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ ہرقل کی بارہ سال کی (۶۱۰ء سے ۶۲۲ء تک) کی حکومت نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ رومی شہنشاہی کا شیرازہ

❶ تاریخ زوال روم مصنفہ گبن، ج۳، ص: ۳۰٤ مطبوعہ ۱۸۹۰ء۔

❷ ایضاً۔ ❸ ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة الروم: ۳۱۹٤۔

جلد بکھر جائے گا۔'' [1]

ہرقل کی طبیعت میں اس فوری انقلاب اور واقعات کی رو سے اس حیرتناک تغیر اور اس کے اسباب کی تفصیل میں تاریخ روم کے مصنفین نے عجیب عجیب باتیں پیدا کی ہیں لیکن انہیں کیا معلوم کہ اس خونی معرکہ سے دور ایک پیغمبرانہ ہاتھ رومیوں کی مدد کے لئے دراز تھا اور وہی اس انقلاب اور تغیر کا سب سے بڑا روحانی سبب تھا۔ مستدرک [2] (علی شرط الصحیحین) اور جامع ترمذی [3] میں ہے کہ ''روم وفارس کی جب جنگ شروع ہوئی تو مشرکین ایرانیوں کے طرف دار تھے۔ کیونکہ وہ بھی بت پرست تھے اور مسلمان رومیوں کے طرفدار تھے کہ وہ اہل کتاب تھے۔ اس وقت ایرانی روم کو دباتے جارہے تھے۔ اس پر سورۂ روم کی پیشینگوئی نازل ہوئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چلا چلا کر تمام مشرکین کو یہ پیشین گوئی سنائی۔ مشرکین نے کہا کہ اس پیشین گوئی کے لئے کوئی سال مقرر کرو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پانچ سال کی شرط کی، آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ بضع کا لفظ ۳ سے ۹ تک بولا جاتا ہے، اس لئے دس سال سے کم کی مدت مقرر کرنی چاہیے تھی۔ چنانچہ اس تشریح کے مطابق نویں سال غزوۂ بدر کے موقع پر پیشین گوئی پوری ہوئی اور رومی غالب آئے۔'' غزوۂ بدر ہجرت کے پہلے سال اور بعثت کے چودھویں برس پیش آیا۔ اس سے ۹ برس پہلے بعثت کا پانچواں سال ہوگا۔ اس بنا پر پیشین گوئی کا زمانہ ۵ ء بعثت اور اس کے پورے ہونے کا زمانہ ۱۴ء بعثت یا ۱ھ ہے۔ بعض لوگوں نے اس پیشینگوئی کے پورے ہونے کا زمانہ صلح حدیبیہ کا سال یعنی ۶ھ بیان کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں شاید لوگوں کو اس سے دھوکا ہوا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ قاصد نبوی ﷺ جب اسلام کا دعوت نامہ لے کر قیصر کے پاس گیا تو وہ اس وقت فتح کا شکریہ ادا کرنے کے لئے شام آیا ہوا تھا اور معلوم ہے کہ قاصد صلح حدیبیہ کے زمانہ میں روانہ ہوئے تھے۔ اس لئے لوگوں نے یہ سمجھا کہ حصول فتح کی بھی یہی تاریخ ہے۔ مگر یہ مغالطہ ہے اور بالکل ظاہر ہے کہ یہ فتح مکہ کی تاریخ نہیں۔ بلکہ فتح کے جشن کی تاریخ ہے۔ رومی تاریخ کی مطابقت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ۶۰۹ء میں آپ ﷺ کی بعثت ہوئی ۶۱۰ء سے روم وفارس کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ ۶۱۳ء میں اعلان جنگ ہوا۔ ۶۱۴ء سے رومیوں کی شکست کا آغاز ہوا۔ (۶۱۶ء میں رومی شکست تکمیل کو پہنچ گئی ۶۲۲ء سے پھر رومیوں نے حملہ شروع کیا۔ ۶۲۳ سے ان کی کامیابی کا آغاز ہوا اور) ۶۲۵ء میں ان کی فتح تکمیل کو پہنچ گئی اس ترتیب سے دیکھئے تو ظاہر ہوگا کہ اس پیشین گوئی کی خوبی یہ ہے کہ اگر آغاز شکست سے آغاز فتح تک جوڑیے تو بھی وہی ۹ برس ہوں گے اور اگر انجام شکست سے آغاز فتح تک جوڑیے تو بھی وہی نو برس ہوں گے۔ اس فتح کی تکمیل کے بعد ہرقل پھر وہی سست وعیاش قیصر بن گیا۔ جو پہلے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دست قدرت نے صرف اس پیشین گوئی کے پورا کرنے کے لئے چند سال کے واسطے اس

[1] تاریخ زوال روم، ج۳، ص: ۳۰۲ و ۳۰۳ طبع مذکور۔ [2] كتاب التفسير، تفسير سورة الروم، ج۲، ص: ۴۱۰۔ [3] ابواب التفسير، ومن سورة الروم: ۳۱۹۳، ۳۱۹۴۔

کے دل و دماغ کو بیدار اور دست و بازو کو ہشیار کر دیا تھا۔ پیشین گوئی کی تکمیل کے بعد پھر پہلے کی طرح تعیش اور کاہلی نے اس کو عیش و غفلت کے بستر پر تھپک تھپک کر سلا دیا۔

دیگر آیات و دلائل نبوی ﷺ
قرآن مجید میں

طیراً ابابیل کی نشانی

آنحضرت ﷺ کی ولادت عام الفیل میں ہوئی، جس میں ابرہۃ الاشرم نے ہاتھیوں کی قطار کے ساتھ خانہ کعبہ پر حملہ کرنا چاہا تھا۔لیکن فضائے آسمانی کے ایک حقیر پرندہ نے کنکریوں کے ذریعہ سے اُن کو ہلاک کردیا۔یہ ایک عظیم الشان نشان تھا جس کا ظہور مسلمان اور عیسائی دونوں تسلیم کریں گے کہ مشرکین عرب کی تائید کے لئے نہیں ہوسکتا تھا۔کیونکہ ابرہۃ الاشرم ایک عیسائی بادشاہ تھا جس کا مذہب بہرحال مشرکین سے بہتر تھا بلکہ یہ خود آنحضرت ﷺ کے ظہور کا نشان تھا جن کی ذات پاک حقیقی طور پر خانہ کعبہ کی حفاظت کی کفیل تھی۔یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اس معجزہ کے ذکر میں خاص طور پر آپ ﷺ کی طرف روئے خطاب کیا ہے:

﴿ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ۝ أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ۝ وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ۝ تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۝ ﴾

(۱۰۵/ الفیل:۱تا۵)

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا ان کی چھپی گھاتوں کو بے راہ نہیں کردیا؟ اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے جو ان کو پتھریلی کنکریوں سے مارتے تھے۔تو خدا نے ان کو کھائی ہوئی بھس کے مانند کردیا۔''

یہ سورۂ واقعہ کے تقریباً ۴۵ برس بعد اتری تھی اور غالباً اس وقت متعدد اشخاص اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہوں گے اور ایسے تو ہزاروں ہوں گے، جنہوں نے دیکھنے والوں سے براہ راست اور بلا واسطہ اس واقعہ کو سنا ہو گا۔کفار جو ہمیشہ آنحضرت ﷺ کی تکذیب کے درپے رہتے تھے، اگر اس صورت واقعہ کے بیان میں کچھ بھی غلطی یا جھوٹ شامل ہوتا تو وہ اس کی علانیہ تردید کردیتے مگر ایسا نہیں ہوا۔اس لئے اس کی سچائی میں کوئی شک وشبہ نہیں کیا جاسکتا۔

شہاب ثاقب کی کثرت

آنحضرت ﷺ کو جب نبوت عطا ہوئی تو نظم آسمانی میں ایک خاص انقلاب پیدا ہوا۔جنات جو پہلے آسمان کے قریب تک جاسکتے تھے، ان کی آمدورفت مسدود کردی گئی اور ان پر ٹوٹنے والے تاروں کی بارش ہونے لگی۔چنانچہ قرآن مجید اور خود جنات کی زبانی بیان ہے:

﴿ وَأَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْنَاهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيدًا وَشُهُبًا ۝ وَأَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا

مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۖ فَمَنْ يَسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ﴾ (۷۲/ الجن:۸، ۹)

''ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو پایا کہ وہ سخت پہرہ داروں اور ٹوٹنے والے تاروں سے بھر دیا گیا ہے اور ہم پہلے سننے کو وہاں ٹھکانوں پر بیٹھتے تھے لیکن اب جو کوئی سنے تو تارے کو اپنی تاک میں پائے۔''

شرح صدر

شرح صدر یعنی سینہ کا کھول دینا یا اس غرض سے چاک کر دینا کہ وہ نور الٰہی سے معمور کیا جائے، ایک دولت ربانی تھی، جو آنحضرت ﷺ کو عطا ہوئی، ارشاد ہوا:

﴿ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ ﴾ (۹۴/ الانشراح:۱)

''اے محمد ﷺ! کیا ہم نے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا (یا چاک نہیں کر دیا؟)''

احادیث میں گو شرح صدر کی پوری تفصیل مذکور ہے، مگر بہر حال قرآن پاک سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ خواہ یہ ظاہری طور سے یا باطنی رنگ میں علم و حکمت اور نور معرفت کی غیر معمولی اور مافوق بشری بخشش ہو۔ ہر صورت میں وہ ایک فہم سے بالاتر کیفیت تھی۔

مکہ سے بیت المقدس تک ایک شب میں سفر

آنحضرت ﷺ نے معجزانہ طریق پر ایک شب میں مکہ معظّمہ سے بیت المقدس تک جو پراسرار سفر کیا۔ قرآن نے ان الفاظ میں ان کی تصدیق کی ہے:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا ﴾

(۱۷/ الاسرآء:۱)

''پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو خانہ کعبہ سے بیت المقدس تک رات کے وقت ایک شب میں لے گیا۔''

حالانکہ ان دونوں مقامات کے بیچ میں اس زمانہ میں مہینوں کا سفر تھا۔

قریش پر قحط سالی کا عذاب

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے پہلے بھی یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جب قریش نے آپ ﷺ کی مخالفت کی تو آپ نے ان کو بددعا کی کہ ''خداوندا! ان کو سات سال تک قحط میں مبتلا رکھ جس طرح تو نے حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں سات سال تک مستقل قحط کو قائم رکھا تھا، چنانچہ ان پر ایسا سخت قحط پڑا کہ لوگوں نے بھوک کے مارے مردار اور چمڑے کھائے۔ یہاں تک کہ جب لوگ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو وہ ان کو دھوئیں کی طرح نظر آتا تھا، یہ حالت دیکھ کر ابو سفیان آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ

"اے محمد (ﷺ)! تم خدا کی اطاعت اور صلہ رحم کا حکم دیتے ہو حالانکہ خود تمہاری قوم تباہ ہو رہی ہے۔ اس کے لئے خدا سے دعا کرو۔" آپ ﷺ نے دعا فرمائی اور بارش ہوئی جس نے قحط کی مصیبت کو دور کر دیا۔ اس کے بعد پھر قریش نے حسب دستور آپ ﷺ کی مخالفت شروع کی، تو قیام مکہ ہی کے زمانہ میں خدا نے آپ کی زبان سے یہ پیشین گوئی قریش کو سنائی کہ آیندہ اس کا انتقام ایک اور سخت گرفت سے لیا جائے گا، وہ گرفت بدر کی لڑائی تھی۔ چنانچہ سورۂ دخان کی ان آیتوں میں اسی واقعہ کا ذکر ہے: [1]

﴿ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۙ يَّغْشَى النَّاسَ ۭ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ۝ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۙ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۘ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ۘ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ۝ ﴾ (٤٤/ الدخان: ١٠ تا ١٦)

"اس دن کا انتظار کرو، جب آسمان دھواں نمایاں کرے گا۔ جو لوگوں پر چھا جائے گا۔ یہ نہایت تکلیف دہ عذاب ہے، خداوندا! یہ عذاب ہمارے اوپر سے ہٹا لے، ہم مسلمان ہیں اور کہاں ان کے لئے ہے، نصیحت پکڑنا۔ حالانکہ ان کے پاس ایک رسول کھلم کھلا آیا۔ پھر ان لوگوں نے اس سے اعراض کیا اور کہا یہ سکھایا ہوا پاگل ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے اس عذاب کو ہٹا لینے والے ہیں، تم لوگ اسی قدیم حالت کی طرف عود کر جاؤ گے ہم اس روز انتقام لیں گے جو سب سے بڑی پکڑ کا دن ہوگا۔"

متوقع ہجرت کی معجزانہ نشانیاں

کفار نے دار الندوہ میں چھپ کر آپ ﷺ کے قتل وغیرہ کے مشورے کئے۔ کوئی مسلمان نہ ان میں شریک تھا اور نہ کسی طرح ہو سکتا تھا۔ مگر آنحضرت کو ہر چیز کی خبر اللہ تعالیٰ نے دے دی۔ تاریخ، وقت، سب سے آگاہی ہوگئی اور پھر یہ کہ جس شب کو آپ نے ہجرت کی سب کو معلوم ہے کہ اس رات کو آپ کے گھر کے چاروں طرف دشمنوں کا پہرا تھا، تاہم آپ ان کی آنکھوں میں خاک جھونک کر انہی کے درمیان سے گزر کر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ شہر سے نکل گئے۔ آپ مکہ کے قریب ہی غار ثور میں جا کر چھپے۔ عرب آثار قدم سے اشخاص کے مقام وگزرگاہ کا پتہ لگانے میں نہایت مشاق تھے، صبح کو وہ آپ کا پتہ لگاتے ہوئے غار مذکور کے دہانہ تک پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ اگر وہ ذرا جھک کر دیکھتے تو آپ ان کے سامنے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اقتضائے بشری سے گھبرا اٹھے۔ مگر آپ نے تسلی دی کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ چنانچہ ساتھ والے خدا نے یہ تدبیر کی کہ کافروں سے ان کی یہ سوجھ چھین لی کہ وہ جھک کر دیکھیں اور ان کے دل میں ایسی بات ڈال دی کہ وہ

[1] صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین واحکامهم، باب الدخان: ٧٠٦٦، ٧٠٦٧۔

بے دیکھے واپس چلے گئے۔ سیر کی اکثر ضعیف روایتوں میں اور مسند ابن حنبل [1] کی ایک روایت میں جو زیادہ کمزور نہیں ہے۔ مذکور ہے کہ مکڑی نے غار کے منہ پر جالے تن دیے تھے۔ کفار نے کہا: اگر کوئی اس غار میں جا کر چھپتا تو ظاہر ہے کہ یہ جالے ٹوٹ جاتے اور یہ کہہ کر وہ واپس چلے گئے۔ اس غار سے نکل کر جب آپ ﷺ مدینہ کی راہ چلے تو قریش کے سوار آپ کے تعاقب میں نظر آئے۔ چنانچہ سراقہ اپنا گھوڑا دوڑاتا آپ ﷺ کے قریب پہنچ گیا۔ دفعتہً گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ تین بار یہی واقعہ پیش آیا۔ سراقہ اس اعجاز کو دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور خط امان لے کر واپس چلا گیا۔

واقعہ ہجرت کے ان معجزانہ واقعات کا تفصیلی بیان احادیث میں ہے مگر قرآن مجید کا یہ اجمالی اعتراف ان کی تائیدی شہادت ہے:

﴿ وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ﴾ (۸/ الانفال: ۳۰)

''اور یاد کرو (اے پیغمبر ﷺ!) جب کفار تمہارے ساتھ داؤ کر رہے تھے، تاکہ تم کو قید کریں یا قتل کریں یا گھر سے نکال دیں وہ بھی داؤ کر رہے تھے اور خدا بھی داؤ کر رہا تھا اور خدا سب داؤ کرنے والوں میں سے بہتر داؤ کرنے والا ہے۔''

﴿ إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴾

(۹/ التوبۃ: ۴۰)

''اے لڑائی سے پیچھے رہنے والے لوگو! اگر تم اس پیغمبر کی مدد نہ کرو تو وہ تمہاری مدد سے بے نیاز ہے کہ خدا نے اس وقت اس کی مدد کی جب اس کو کافروں نے مکہ سے نکال دیا تھا، دو رفیقوں میں سے ایک نے جب وہ دونوں غار میں تھے اپنے ساتھی سے کہا تھا کہ گھبراؤ نہیں خدا ہمارے ساتھ ہے۔ پھر خدا نے اس پر اپنی تسکین نازل کی اور ان فوجوں سے اس کی مدد کی جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کی بات کو نیچا کیا اور خدا ہی کی بات اونچی رہتی ہے اور خدا غالب اور تدبیر والا ہے۔''

خواب میں کفار کا کم دیکھنا

ہجرت کے بعد سب سے بڑا معرکہ غزوۂ بدر پیش آیا۔ جس میں ایک طرف تین سو تیرہ مسلمان تھے جو ہتھیاروں سے بھی پورے آراستہ نہ تھے، دوسری طرف ایک ہزار قریش کی لوہے میں غرق فوج تھی۔ دنیا قیاس

[1] مسند احمد، ج ۱، ص: ۳۴۸۔ [2] بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ہجرۃ النبی ﷺ: ۳۹۰۶۔

کرسکتی ہے کہ اس جنگ کا خاتمہ کس کے حق میں ہوتا، لیکن چونکہ یہ اسلام کی ہمیشہ کے لئے موت وحیات کی ساعت تھی۔ اس لئے کارساز قدرت نے اپنی عجیب وغریب نشانیوں سے حق کو فتح اور باطل کو شکست دی۔

چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ بدر سے پہلے آنحضرت ﷺ کو اس معرکہ کا نقشہ عالم رؤیا میں دکھایا گیا تھا اور اس میں کفار کی تعداد بہت کم دکھائی گئی تھی۔ جو ان کی ذلت اور شکست کی طرف اشارہ تھا۔ مسلمانوں نے جب یہ خواب سنا تو ان کی ہمت ہوئی اگر عالم رؤیا میں کفار کی کثرت دکھائی جاتی تو مسلمانوں کے حوصلے پہلے ہی پست ہو جاتے۔ چنانچہ خود قرآن نے اس کی تصریح کردی:

﴿ اِذْ یُرِیْكَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِكَ قَلِیْلًا ؕ وَ لَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِیْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَ لَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ ﴾ (٨/ الانفال:٤٣)

''خدا کے احسان کو یاد کرو جب وہ تجھ کو تیری خواب میں ان کافروں کو تھوڑا دکھا رہا تھا۔ اگر تم کو زیادہ کر کے دکھاتا تو تم ہمت ہار دیتے اور لڑائی کے بارہ میں آپس میں اختلاف کرتے لیکن خدا نے بچالیا۔ بے شک خدا سینوں کے راز جانتا ہے۔''

مسلمانوں کا کافروں کی نظر میں اور کافروں کا مسلمانوں کی نظر میں کم کر کے دکھانا

اس معرکہ میں سن چکے ہو، کافروں کی تعداد مسلمانوں سے تگنی تھی۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کا بددل ہونا لازمی تھا۔ خدا نے اپنی قدرت کاملہ کا یہ تماشا دکھایا کہ مسلمانوں کی نگاہوں میں کچھ ایسا تغیر کردیا کہ وہ مسلمانوں کو بہت تھوڑے معلوم ہونے لگے۔ ادھر کفار کو مسلمان تھوڑے نظر آتے تھے۔ مقصود یہ تھا کہ رؤسائے کفار میدان سے بھاگ کر جانیں بچا کر نہ لے جانے پائیں۔ اس نے یہ تدبیر کی کہ مسلمان اپنی تعداد سے بھی ان کو کم نظر آنے لگے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے اپنی فتح کو یقینی سمجھ کر حصول نتیجہ کے لئے نہ تو سرفروشانہ کوشش کی اور نہ بھاگنے کی کوئی ضرورت سمجھی اور یہی بات مسلمانوں کے حق میں مفید ہوگئی:

﴿ وَ اِذْ یُرِیْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَیْتُمْ فِیْۤ اَعْیُنِكُمْ قَلِیْلًا وَّ یُقَلِّلُكُمْ فِیْۤ اَعْیُنِهِمْ لِیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ ﴾ (٨/ الانفال:٤٤)

''خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب تم دشمنوں سے صف آرا ہوئے تو وہ تمہاری نگاہوں میں ان کو تھوڑا کر کے دکھاتا تھا اور تم کو ان کی آنکھوں میں کم کر کے دکھا رہا تھا تاکہ اس کام کو جس کا ہونا مقرر ہے طے کردے۔''

پھر کافروں کی آنکھوں میں مسلمانوں کا دونا نظر آنا

پہلے تو خدا نے کافروں کی نگاہ میں مسلمانوں کو کم کر کے دکھایا، تاکہ کفار بے پروا ہو کر لڑ پڑیں۔ پھر جب دونوں صفیں گتھ گئیں تو خدا کے حکم سے مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کی آنکھوں میں ان کی اپنی تعداد سے بھی دوگنی

نظر آنے لگی۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ قریش نے ڈر کر ہمت ہار دی:

﴿ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۳)

''اے یہودیو! تمہارے لئے ان دونوں فوجوں میں جو صف آرا ہوئیں جن میں ایک خدا کی راہ میں لڑ رہی تھی اور دوسری خدا کی منکر تھی۔ یقیناً ایک نشانی تھی، کافروں کا لشکر آنکھوں دیکھتے اپنی مقابل فوج کو اپنے سے دونا دیکھ رہا تھا اور اللہ جس کی چاہتا ہے اپنی مدد سے تائید کرتا ہے اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے جو چشم بینا رکھتے ہیں بڑی عبرت ہے۔''

فرشتوں کی آمد

یہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ کیونکر گئی؟ کیا آسمان سے فرشتے اُتر آئے؟ خدا فرماتا ہے:

﴿ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَىِٕنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ ﴾

(۸/ الانفال:۹، ۱۰)

''یاد کرو جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری سن لی کہ میں لگاتار ہزاروں فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا اور خدا نے یہ نہیں کیا، لیکن خوش کرنے کے لئے اور تا کہ تمہارے دل مطمئن ہوں ورنہ فتح تو اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ اللہ غالب حکمت والا ہے۔''

﴿ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰۗىِٕكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ ﴾ (۸/ الانفال:۱۲)

''یاد کر جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تو تم مسلمانوں کے دل مضبوط کئے رہو۔ کافروں کے دلوں میں میں عنقریب رعب ڈال دوں گا۔''

میدان جنگ میں پانی برسانا

بدر کے میدان جہاں مسلمانوں نے اپنی صفیں قائم کی تھیں وہ جگہ بلند تھی اور جہاں سے قریش کی فوج لڑ رہی تھی وہ جگہ نشیب تھی۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی شکست کا ایک ظاہری سبب یہ پیدا کر دیا کہ عین اس وقت میدان جنگ میں موسلا دھار پانی برسایا جس نے ادھر تو مسلمانوں کی طرف گرد و غبار بٹھا کر اُن کے پاؤں جما دیے اور ادھر کافروں کی طرف پانی کا ریلا ہوا کہ ان کو زمین پر قدم رکھنا مشکل ہو گیا۔ خدا خود فرماتا ہے:

﴿ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ﴾ (۸/ الانفال:۱۱)

''اور خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب وہ آسمان سے پانی برسا رہا تھا، تاکہ تم کو اس پانی سے پاک کردے اور ناپاکی تم سے دور کرے اور تمہارے دلوں کو مضبوط کرے اور اس سے قدموں کو جمادے۔''

لڑائیوں میں نیند کا طاری ہونا

معرکہ جنگ وہ مقام ہے جہاں بڑے بڑے بہادروں کی آنکھ سے نیند اڑ جاتی ہے۔ مگر مایۂ تسکین عالم ﷺ کا اعجاز یہ تھا کہ بدر واحد کے کارزاروں میں مسلمان سپاہیوں کی بے خطری اور بے خوفی کے لئے ان کی آنکھوں پر نیند کا غلبہ کر دیا گیا، تاکہ کسی خوف وخطر کا خیال کئے بغیر وہ اپنے فرض کو انجام دیں۔ چنانچہ خدا احسان جتاتا ہے:

﴿ إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ ﴾ (۸/ الانفال:۱۱)

''یاد کرو جب خدا اپنی طرف سے تمہاری بے خوفی کے لئے تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا۔''

﴿ ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِّنكُمْ ۖ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵٤)

''پھر خدا نے غم کے بعد بے خوفی کے لئے تم پر نیند اتاری جو ایک گروہ پر چھا رہی تھی اور دوسرا گروہ تھا جس کو اپنی جان کی فکر غم میں ڈالے تھی۔''

آپ ﷺ کا کنکری پھینکنا

یہ سب کچھ تھا لیکن عین اس دار و گیر کے معرکہ میں ایک مقدس وجود پر سکون دل اور سر بسجود پیشانی کے ساتھ ظاہری ہتھیاروں سے منزہ ہو کر دعاؤں میں مصروف تھا۔ اس نے سر اٹھایا اس حیرتناک منظر پر نگاہ ڈالی اور زمین سے ایک مٹھی کنکری اور خاک اٹھا کر دشمن کی طرف پھینکی دفعتہً باطل کا طلسم چور چور تھا۔ قرآن گواہی دیتا ہے:

﴿ فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ۚ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴾ (۸/ الانفال:۱۷)

''تو تم نے (مسلمانو!) ان کو قتل نہیں کیا بلکہ خود خدا نے ان کو قتل کیا اور اے پیغمبر! تو نے نہیں پھینکا۔ جب تو نے پھینکا بلکہ خدا نے پھینکا، تاکہ مسلمانوں کو اس سے فتح کی اچھی نعمت عطا کرے، خدا دعاؤں کا سننے والا اور بھیدوں کا جاننے والا ہے۔''

کوئی رمی کے معنی تیر پھینکنے کے نہ لے کہ آپ ﷺ نے اس موقع پر کیا، تمام عمر میں سخت سے سخت خطرہ میں کبھی تیغ و تبر اور تیر و خنجر سے دست مبارک کو آلودہ نہیں کیا۔

غزوۂ بدر میں دو میں سے ایک کا وعدہ

پڑھ چکے ہیں کہ بدر کے معرکہ سے پہلے قریش کا ایک تجارتی قافلہ مال و اسباب سے لدا ہوا شام سے مکہ جا رہا تھا اور ادھر سے قریش کی فوج بڑے سروسامان کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے کو نکلی تھی۔ مدینہ سے نکلنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے اس صورت واقعہ سے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ ان دونوں میں سے ایک چیز تم کو ملے گی یا تو یہ قافلہ اور یا یہ قریش کی فوج شکست کھائے گی اور تم کو غنیمت کا مال ملے گا، چنانچہ یہ صورت واقعہ بھی درست نکلی اور وعدہ بھی پورا ہوا:

﴿ وَاِذْ یَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَیْنِ اَنَّهَا لَكُمْ ﴾ (۸/ الانفال:۷)

''اور یاد کرو جب تم سے اللہ وعدہ کر رہا تھا کہ ان دو گروہوں میں ایک تمہارا ہے۔''

غزوۂ احزاب کی خبر

غزوۂ احزاب جس میں دفعتہً متحدہ عرب قبائل کا سیلاب مدینہ کے چاروں طرف امڈ آیا تھا۔ واقعہ سے بہت پہلے آنحضرت ﷺ کو عالم رؤیا میں اس کی اطلاع دی جا چکی تھی اور آپ ﷺ نے تمام مسلمانوں کو اس مصیبت کے آنے سے پیشتر باخبر کر دیا تھا۔ چنانچہ جب یہ صورت حال نظروں کے سامنے آ گئی تو اس نشان کے ظاہر ہونے سے مسلمانوں کے ایمان میں اور زیادہ پختگی آ گئی اور ان کے دلوں میں آپ کی صداقت کا مزید یقین پیدا ہو گیا:

﴿ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ۝ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۲۲)

''اور جب مسلمانوں نے ان متحدہ حملہ آور قبائل کو دیکھا تو کہا یہی وہ ہے جس کا وعدہ ہم سے خدا اور اس کے رسول نے کیا تھا اور خدا اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا اور اس واقعہ نے ان کو ایمان اور اقرار میں اور زیادہ پختہ کر دیا۔''

غزوۂ احزاب میں آندھی

اس غزوہ میں عرب کے مختلف قبائل نے مل کر مسلمانوں پر متحدہ حملہ کیا تھا اور چاروں طرف سے مدینہ کا محاصرہ کر لیا تھا اور ڈیرے خیمے ڈال کر اس بات پر جم گئے تھے کہ ہم اسی محاصرہ کی حالت میں مسلمانوں کو مدینہ میں گھیر کر ان کا خاتمہ کر دیں گے۔ چنانچہ ۲۰ دن تک وہ محاصرہ کیے پڑے رہے آس پاس کے یہودی جو پہلے مسلمانوں سے عہد کر چکے تھے۔ دشمنوں سے جا کر مل گئے اور اس قدر زور کا حملہ کیا کہ مسلمان فریضۂ نماز بھی

وقت پر ادا نہیں کر سکتے تھے۔ مدینہ میں فاقہ ہونے لگا۔ منافقین اور کچے دل کے لوگ گھبرا کر ساتھ چھوڑنے لگے کہ عین وقت پر اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے باہر اس زور کی آندھی چلائی کہ دشمنوں کے خیمے اکھڑ گئے۔ طنابیں ٹوٹ گئیں، ہانڈیاں الٹ گئیں اور ایسی سخت سردی پڑی کہ دشمن ٹھٹھر کر رہ گئے اور ہمت ہار کر خود محاصرہ چھوڑ کر چلے گئے خدا نے مسلمانوں کو اپنا یہ احسان جتایا:

﴿ يَآأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَّجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۹)

''مسلمانو! اپنے اوپر خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ جب فوجوں نے تم پر حملہ کیا تو ہم نے ان پر ہوا اور ایسی فوجیں بھیجیں جن کو تم نے نہیں دیکھا اور جو تم کر رہے تھے خدا اس کو دیکھ رہا تھا۔''

غزوۂ حنین میں نصرت

فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین پیش آیا گو اس میں مسلمانوں کے ساتھ بڑی بھیڑ شامل تھی۔ لیکن اس میں کچھ نو جوان تھے جو لڑائی کا تجربہ نہیں رکھتے تھے، کچھ مکہ کے نو مسلم تھے جو ابھی صبر وضبط کے خوگر نہیں ہوئے تھے۔ فوج میں زرہ پوش بھی کم تھے اور مقابلہ قبیلۂ ہوازن سے پڑا جو قدر اندازی میں کمال رکھتے تھے۔ مسلمان جونہی آگے بڑھے حریف نے ان کو تیروں پر رکھ لیا پہلے ہی حملہ میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، لیکن مرکز نبوت اپنی جگہ پر تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا انہوں نے مہاجرین وانصار کو آوازیں دیں، وہ پلٹے تو آپ سواری سے نیچے اترے اور زمین سے ایک مشت خاک اٹھا کر دشمنوں کی طرف پھینکی۔ دفعتہً جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ ہوازن شکست کھا کر بھاگ نکلے۔ یہ واقعہ صحیح مسلم اور دیگر معتبر روایتوں سے مذکور ہے اور قرآن اس کی صداقت کی گواہی دیتا ہے:

﴿ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِينَ ۚ ثُمَّ أَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلٰى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ ﴾

(۹/ التوبة: ۲۵، ۲٦)

''خدا نے تمہاری نصرت بہت سے مقامات میں کی اور نیز حنین کے دن جب تمہاری کثرت تعداد نے تم کو مغرور بنا دیا تھا۔ تو یہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور تم پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی، پھر پیٹھ پھیر کر پیچھے ہٹے پھر اللہ نے اپنی تسکین اپنے رسول پر اور مومنوں پر نازل کی اور وہ فوجیں اتاریں جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کفر کرنے والوں کو پوری سزا دی۔''

''نظر نہ آنے والی فوجوں'' کے الفاظ سے قرآن مجید نے ہمیشہ فوق الفہم اور غیر مادی ذرائع و وسائل

کی تعبیر کی ہے۔

غیب پر اطلاع

غیب کا ذاتی علم تو خدا کے سوا کسی اور کو نہیں مگر وہ جس کو چاہے اپنی اس بخشش سے سرفراز بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی نگاہوں کے سامنے کبھی دور دراز مقامات کی خبریں، کبھی لوگوں کے دلوں کے حالات، کبھی مخفی واقعات آئینہ کر دیے جاتے تھے۔ مسلمان تو مسلمان، وہ بھی جو سچے دل سے آپ ﷺ کی صداقت کے قائل نہ تھے۔ اس سے ڈرتے تھے کہ وحی الٰہی جس کے متعلق انہیں تجربہ ہو چکا تھا کہ وہ واقعات غیبی کی پردہ در ہے، کہیں ان کے مخفی جرائم اور دل کی کھونٹوں کو برملا ظاہر نہ کر دے:

﴿ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ ﴾

(۹/ التوبة:٦٤)

''منافقین اس سے ڈرتے ہیں کہ مسلمانوں پر کوئی ایسی سورہ اترے جو ان کو ان باتوں سے آگاہ کر دے جو منافقوں کے دلوں میں ہیں۔''

بنونضیر کی سازش کی اطلاع

ایک دفعہ ایک ضروری کام کے لئے آنحضرت ﷺ چند رفقائے خاص کے ساتھ بنونضیر کے قلعہ میں تشریف لے گئے۔ یہود بنی نضیر نے آنحضرت ﷺ اور دیگر اکابر اسلام کے خفیہ قتل کا اس کو بہترین موقع سمجھا۔ چنانچہ جس دیوار کے نیچے آپ کھڑے تھے۔ اس کی چھت پر ایک شخص چڑھ گیا کہ اوپر سے ایک بھاری پتھر آپ پر گرا دے کہ دب کر مر جائیں۔ اللہ تعالیٰ جو اپنے پیغمبر کی حفاظت کا کفیل تھا۔ اس نے بروقت اطلاع دی اور آپ فوراً ان کے دام سے باہر نکل آئے اور ان کو اس ارادۂ فاسد کی اطلاع بھیج دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾

(۵/ المآئدة:١١)

''اے مسلمانو! خدا کے اس احسان کو جو اس نے تم پر کیا یاد کرو کہ جب ایک گروہ نے تم پر دست درازی کا قصد کیا تو خدا نے تم سے ان کے ہاتھوں کو روک دیا اور اللہ سے ڈرتے رہو اور مسلمانوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں۔''

مہاجرین حبش کو بشارت

قریش کے گوناگوں مظالم سے تنگ آ کر مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اپنے ملک و وطن کو خیرباد کہہ کر حبش

چلی گئی۔ اول تو غیر ملک اور بدلیس میں ان مسلمانوں کا جانا ہی فکر و تردد کا باعث تھا اور معلوم نہ تھا کہ حبش کے عیسائی بادشاہ اور امرائے مذہب کے ان پیرووں کے ساتھ کیونکر پیش آئیں گے، اس سے زیادہ فکر کی یہ چیز تھی کہ رؤسائے قریش کے تجارتی تعلقات کے باعث حبش کے امراان سے شناسا تھے اور باہم ان کے درمیان دیرینہ روابط تھے۔ اس کے بعد اس سے بھی زیادہ تردد انگیز یہ واقعہ ہوا کہ رؤسائے قریش نے اپنے گزشتہ تعلقات کی بنا پر نجاشی کے دربار میں تحفہ تحائف دے کر اپنے سفراء اس غرض سے بھیجے، تا کہ ان بے وطن مسلمانوں کو اپنے ملک میں رہنے کی اجازت نہ دے، یہ تمام اسباب ایسے تھے جن کی بنا پر مسلمانوں کو عموماً اور مہاجرین کو خصوصاً اپنے مستقبل کی نسبت سخت تشویش پیدا ہونا ضروری تھا، اس بنا پر سکینت الٰہی نے ان کو امن وامان کا پیام سنانا ضروری سمجھا۔ چنانچہ اسی تشویش ناک اور تردد انگیز عہد میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ﴾ (١٦/ النحل: ٤١)

''اور جن لوگوں نے اللہ کی خاطر، مظلومی کی حالت میں ہجرت کی ہم ان کو بالیقین دنیا میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا ثواب سب سے بڑا ہے۔''

اگر چہ ہجرت کا لفظ عام ہے مگر اس دلیل سے کہ یہ سورہ قیام مکہ کے زمانہ کی ہے اور جن لوگوں نے اس عہد میں ہجرت کی تھی ان کا ذکر ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاص مہاجرین حبش کے لئے بشارت ہے، سب کو معلوم ہے کہ خدا کا یہ وعدہ کتنا سچا ہوا۔ نجاشی نے نہ صرف یہ کہ قریش کے سفراء کو خلاف توقع ناکام واپس کر دیا بلکہ مسلمانوں کو اس نے بڑی عزت سے جگہ دی اور خود اسلام کی طرف میلان ظاہر کیا۔ بعض مسلمان چودہ چودہ برس وہاں رہے اور اس اثنا میں کئی نجاشی سریر آرا ہوئے مگر کسی نے ان سے تعرض نہیں کیا۔

ہجرت کے بعد قریش کو مہلت نہ ملے گی

آنحضرت ﷺ نے جس بے سروسامانی کے ساتھ ہجرت فرمائی تھی اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، اس حالت کو دیکھ کر کسی شخص کے دل میں یہ خیال بھی نہ پیدا ہو سکتا تھا کہ یہ بے خانماں قافلہ ایک دن مدینہ سے اس قدر طاقتور ہو کر نکلے گا کہ جن لوگوں نے ابتدائے نبوت سے آغاز ہجرت تک اس کی جان لینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، وہ ان کے ہاتھوں خود ہلاک و برباد ہو جائیں گے لیکن قرآن مجید دوسری پیشین گوئی کر رہا تھا چنانچہ ہجرت سے ایک سال پہلے مکہ معظمہ میں یہ آیت اتری:

﴿ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ ﴾

(١٧/ بنیٓ اسرآءیل: ٧٦)

''اگر وہ تم کو سرزمین مکہ سے گھبرا چکے، تا کہ تم کو اس سے نکال دیں تو وہ تمہارے بعد بہت کم

مدت تک باقی رہیں گے۔''

چنانچہ یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری اتری اور ایک ہی سال کے بعد غزوۂ بدر نے صناد ید قریش کا خاتمہ کر دیا اور اہل عرب کی مخالفت کی جڑ کٹ گئی۔

مدینہ میں بڑے بڑے مصائب کا سامنا ہوگا

عجب نہیں کہ مدینہ آ کر مسلمانوں کو یہ اطمینان ہو گیا ہو کہ ان کی تمام تکلیفوں کا خاتمہ ہو گیا اور اس وقت کوئی ایسا قرینہ بھی نہ تھا جس سے یہ معلوم ہوتا، کہ قریش انتقام کے جوش میں نیام سے تلواریں کھینچ لیں گے اور تمام عرب اس مہم میں ان کا ہم آہنگ ہو جائے گا اور متصل آٹھ برس تک لڑائیوں کا سلسلہ قائم رہے گا۔ جس میں مسلمانوں کو تنگدستی، فاقہ، قتل وخونریزی ہر نوع کی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ مگر عالم غیب کا پیغام محمد رسول اللہ ﷺ کو پہلے ہی پہنچ چکا تھا:

﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۵۵)

''اور ہم یقیناً تم کو کسی قدر خوف، فاقہ اور جانوں کی اور مال اور پھلوں کی کمی کی مصیبتوں سے آزمائیں گے۔''

دینی ودنیاوی شہنشاہی کا وعدہ

لیکن اس بے سروسامانی کے عالم میں اس بے خانماں گروہ کے ساتھ خداوند تعالیٰ نے ایک وعدہ اور بھی کیا اور ان کو خلافت ارض یعنی دینی ودنیاوی شہنشاہی کی بشارت دی۔ یہ بشارت واقعات موجودہ کے کس قدر خلاف تھی؟ مگر چند ہی سال میں محال نے وقوع کی صورت اختیار کر لی:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ﴾ (۲٤/ النور:٥٥)

''تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا۔ خدا نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین کا خلیفہ بنائے گا جیسا کہ اس نے تم سے پہلے کے لوگوں کو خلیفہ بنایا اور جو دین ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو مستحکم کر دے گا اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔''

مسلمانوں کی حالت کے لحاظ سے یہ بشارت کس قدر عجیب وغریب تھی۔ مسلمانوں کا گروہ ایک مظلوم بے کس اور ضعیف گروہ تھا۔ جس کو کفار نے طرح طرح کی اذیتیں دے کر خانماں برباد کر دیا تھا اور اس نے مدینہ میں آ کر خدا کے چند نیک بندوں کے سایہ میں پناہ لی تھی۔ یہاں آ کر بھی اس کو اطمینان وراحت کی نیند

نصیب نہ ہوئی، کفار مکہ پہلے ہی سے جان کے دشمن تھے یہاں آ کر دشمنوں کی تعداد میں منافقین اور یہود کا اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ہمیشہ کفار کے حملہ کا خوف لگا رہتا تھا اور ذرا سے شور وغل پر مدینہ میں بدحواسی پھیل جاتی تھی۔ یہاں تک کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہمیشہ سوتے جاگتے مسلح رہتے تھے۔ چنانچہ اس مظلوم گروہ نے اس حالت سے تنگ آ کر ایک دن کہا کہ کیا کبھی وہ دن بھی آئے گا، جب ہم کو اطمینان حاصل ہو گا اور خدا کے سوا کسی اور کا ڈر نہ ہو گا، اس پر ان کو قرآن مجید نے خلافت ارض کی بشارت دی [1] اور وہ پوری ہوئی۔ اس گروہ نے دنیا پر اس طرح کامیاب حکومت کی کہ اس کے سامنے تمام متمدن حکومتوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس سے بڑھ کر اس پیشین گوئی کی صداقت کیا ہو سکتی ہے۔

قبائل عرب کی شکست ہو گی

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جو غزوات پیش آئے اسلام کو جو غلبہ حاصل ہوا کفار کو جو شکستیں ہوئیں۔ قرآن مجید نے ان کے متعلق پیشین گوئیاں کیں اور اس حالت میں کیں جب ظاہری اسباب کے لحاظ سے کسی کو وہم وگمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب ہر طرف سے کفار کا ہجوم تھا اور اس ہجوم کو دیکھ کر ان کو یقین تھا کہ تمام عرب مل کر مسلمانوں کا خاتمہ کر دے گا۔ خدا نے یہ اعلان عام کر دیا کہ عنقریب خود مسلمان تمام عرب قبائل کی مخالفانہ قوتوں کا خاتمہ کر دیں گے:

﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ۝ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝ ﴾

(٥٤/ القمر: ٤٤، ٤٥)

''کیا وہ کفار کہتے ہیں کہ ہم سب ایک اور ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ یہ جتھا عنقریب توڑ دیا جائے گا اور وہ پشت پھیریں گے۔''

﴿ وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ ﴾

(٤٨/ الفتح: ٢٢)

''اور اگر کفار تم سے لڑیں گے تو ان کو بھاگنا پڑے گا پھر وہ کوئی حامی اور مددگار نہ پائیں گے۔''

﴿ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ﴾ (٩/ التوبة: ١٤، ١٥)

''تم ان سے لڑو، خدا ان کو تمہارے ہاتھ سے عذاب دے گا اور ان کو رسوا کرے گا اور تم کو ان پر فتح دے گا اور مسلمانوں کے دل ٹھنڈے کرے گا اور ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا۔''

اور یہ تمام پیشین گوئیاں آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں پوری ہوئیں اسلام نے عرب کے تمام قبائل کی

[1] مستدرك حاكم، ج ٢، ص: ٤٠١۔

مخالفانہ قوتوں کا خاتمہ کر دیا اور انہوں نے ہر موقع پر شکستیں کھائیں۔

قریش کی شکست اور بربادی کے وعدے

مصیبت زدہ اور بے سروسامان مسلمانوں کی تسکین کی خاطر آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے قریش کی تباہی و بربادی اور مسلمانوں کی فتح و کامیابی کے متعدد وعدے کئے گئے تھے۔ جن میں سے بعض آپ ﷺ کی زندگی میں اور بعض آپ کی وفات کے بعد پورے ہونے والے تھے:

﴿ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ۝ اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ۝ ﴾ (٤٣/ الزخرف: ٤١، ٤٢)

''پس اگر ہم تجھ کو اٹھالیں تو بھی ان کافروں سے انتقام لیں گے اور اگر ہم تیری زندگی میں تجھ کو وہ دکھادیں۔ جس کی دھمکی ان کافروں کو ہم نے دی ہے۔ تو ہم ان پر یہ قدرت رکھتے ہیں۔''

﴿ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ۝ ﴾ (٤٠/ المؤمن: ٧٧)

''تو صبر کر، خدا کا وعدہ یقیناً سچا ہے۔ تو جس بات کی دھمکی ہم ان کافروں کو دیتے ہیں اس کو یا تیری زندگی میں دکھا دیں گے یا تجھ کو موت دیں گے تو وہ ہمارے ہی پاس لوٹائے جائیں گے؟''

﴿ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ۭ ﴾

(١٣/ الرعد: ٤٠، ٤١)

''اور اگر تیری ہی زندگی میں بعض وہ وعدے جو ہم نے ان سے کئے ہیں دکھادیں یا تجھ کو موت دے دیں تو تیرا فرض صرف پیام پہنچا دینا ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے، کیا یہ کافر نہیں دیکھتے کہ (ہم اسلامی فتوحات کے ذریعہ سے) سرزمین (عرب) کے حدود میں (کافروں کے قبضہ کو) کم کرتے جاتے ہیں۔ خدا ہی اپنا حکم چلاتا ہے کوئی اس کے حکم کو رد و بدل نہیں کر سکتا۔''

فتح مکہ کی پیشین گوئیاں

جو چیز مسلمانوں کے دل سے لگی ہوئی تھی، وہ فتح مکہ تھی یعنی اس شہر پر قبضہ جہاں سے وہ نہایت بے کسی اور بے بسی کے عالم میں نکلے تھے اور جس کے حدود میں ان کو قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ گو اب مدینہ کے دارالسلطنت میں تھے، تاہم وطن کی یاد دلوں سے کم نہیں ہوتی تھی۔ ان کو فتح پر فتح ہوتی جاتی تھی۔ لیکن ان کے دل کی کلی اپنی شگفتگی کے لئے جس موسم بہار کا انتظار کر رہی تھی وہ ہنوز نگاہوں سے دور تھا۔ مگر بشارت الٰہی ہر

قدم پر ان کے لئے تسکین کا نیا پیام لا رہی تھی اور مژدہ فتح سے ان کو دلشاد کرتی جاتی تھی۔ سورۂ قصص میں یہ آیت اتری:

﴿ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ ﴾ (۲۸/ القصص:۸۵)

''جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے وہ تجھ کو ٹھکانے کی طرف پھر لوٹا کر لے جانے والا ہے۔''

یعنی مکہ [1] پھر سورۂ صف میں خدا نے مسلمانوں کو آخرت میں جنت کی بشارت دینے کے ساتھ اس دنیا میں بھی ایک بشارت دی:

﴿ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ ﴾

(۶۱/ الصف:۱۳)

''اور دوسری نعمت جس کو تم دل سے چاہتے ہو وہ خدا کی طرف سے نصرت اور عنقریب فتح ہے اور مسلمانوں کو بشارت سنا دے۔''

صلح حدیبیہ سے پہلے خواب میں آپ ﷺ کو خانہ کعبہ کا داخلہ دکھایا گیا:

﴿ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ ۙ مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِیْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ ﴾ (۴۸/ الفتح:۲۷)

''خدا نے اپنے رسول کے خواب کو سچ کر دیا، تم لوگ یقیناً مسجد حرام میں اگر خدا نے چاہا تو بے خوف و خطر داخل ہو گے۔ بال منڈا کر یا ترشوا کر، کسی سے نہ ڈرو گے۔''

حدیبیہ سے آپ ﷺ واپس آ رہے تھے کہ سورۂ فتح نازل ہوئی:

﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۝ ﴾ (۴۸/ الفتح:۱) ''ہم نے کھلی فتح تم کو دی۔''

آپ ﷺ نے اسی وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلوا کر یہ خوش خبری سنائی، [2] اس کے دو برس کے بعد مکہ کی دولت مسلمانوں کو مل گئی۔

خیبر اور حنین کی فتح کی پیشین گوئی

۶ھ کی صلح حدیبیہ میں فتح مکہ کی پیشین گوئی کی جا چکی تھی۔ جو ۸ھ میں پوری ہوئی۔ لیکن حدیبیہ کی صلح میں مسلمانوں نے رسول کی اطاعت اور متابعت کا جو بہترین نمونہ پیش کیا تھا اور جس صبر اور تحمل سے صلح حدیبیہ کے شرائط کو مسلمانوں نے تسلیم کر لیا تھا اس کے معاوضہ میں اللہ تعالیٰ نے دوسری فتوحات عظیمہ کا وعدہ مسلمانوں سے کیا۔ جن میں بے شمار مال غنیمت ان کو ہاتھ آنے والا تھا:

﴿ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِیْبًا ۝ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى

[1] صحیح بخاری، تفسیر آیت مذکور:۴۷۷۳۔ [2] بخاری: ۴۸۳۳۔

﴿وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴾

(٤٨/ الفتح: ٢٧، ٢٨)

”تو خدا نے وہ جانا جو تم نے نہیں جانا اور اس (فتح مکہ) سے پہلے ایک عنقریب فتح تمہارے لئے بنائی اور اسی نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا، تا کہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے اور خدا گواہ کافی ہے۔“

یہ خیبر کی فتح تھی جو صلح حدیبیہ کے ایک سال کے بعد اور فتح مکہ سے ایک سال پہلے حاصل ہوئی اور جس پر عرب میں یہودیوں کی قوت کا خاتمہ ہو گیا اور اسلام کو عرب کے تمام مذاہب پر غلبہ عام حاصل ہو گیا:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۙ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ ﴾

(٤٨/ الفتح:١٨، ١٩)

”خدا مسلمانوں سے خوش ہو گیا۔ جب وہ درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کر رہے تھے۔ تو ان کے دلوں میں جو کچھ تھا (یعنی فتح مکہ کے لئے بے چینی) اس کو جان لیا تو اس نے ان پر تسکین نازل کی اور مکہ کے بدلہ میں سردست ایک فتح ان کو دی اور بہت سا مال غنیمت جس پر وہ قبضہ کریں گے۔“

﴿وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (٤٨/ الفتح:٢٠)

”خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جس کو تم لو گے۔ تو یہ ایک غنیمت تم کو جلد عطا کر دی اور لوگوں کی دست درازی کو تم سے روک دیا اور تا کہ مسلمانوں کے لئے ایک نشانی ہو۔“

چنانچہ خیبر کی فتح میں مسلمانوں کو خیبر کی تمام سرسبز و شاداب زمینیں اور ہرے بھرے نخلستان مل گئے اور اس کے ایک سال بعد حنین کی فتح میں مال غنیمت کا بے شمار ذخیرہ (چھ ہزار اسیران جنگ، چوبیس ہزار اونٹ چالیس ہزار بکریاں اور چار اوقیہ چاندی) مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

یہود کو اعلان

عرب کے یہود اگرچہ آنحضرت ﷺ کی مخالفت میں جان و مال سے دریغ نہیں کرتے تھے، تاہم یہ آنحضرت ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ ہے کہ قرآن مجید نے یہودیوں کے متعلق بعض پیشین گوئیاں ایسی کیں کہ اگر وہ ہمت سے کام لیتے تو اسکا ابطال خود ان کے امکان میں تھا۔ مثلاً: یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ ”وہ خدا کے چہیتے ہیں اور جنت ان کیلئے مخصوص ہے۔“ لیکن چونکہ جنت صرف مرنے کے بعد نصیب ہو سکتی ہے اور جن

لوگوں کو اس کے ملنے کا یقین کامل ہو او وہ اس کے لئے جان دینے سے دریغ نہیں کر سکتے۔ اس لئے قرآن مجید نے یہودیوں کے متعلق کہا کہ

﴿ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ۝ ﴾

(۲/ البقرہ:۹۴:۹۵)

’’کہہ اگر آخرت کا گھر صرف تمہارے لئے مخصوص ہے تو اگر تم سچے ہو تو موت کی آرزو کرو۔ لیکن وہ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے ہرگز یہ آرزو نہ کریں گے۔ خدا ظالموں کو خوب جانتا ہے۔‘‘

﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَاۗءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ۝ ﴾

(٦٢/ الجمعة:٦، ٧)

’’کہہ اے یہود! اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ صرف تمہیں خدا کے دوست ہو تو اگر تم اس میں سچے ہو تو موت کی آرزو کرو وہ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے ہرگز اس کی آرزو نہ کریں گے خدا ظالموں کو خوب جانتا ہے۔‘‘

لیکن باوجود اس کے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی تکذیب کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے تھے اور آرزوئے موت ان کے لئے ممکن نہ تھی، تاہم قرآن مجید کی پیشین گوئی پوری ہوئی اور آج تک کسی یہودی نے لقائے الٰہی کی آرزو میں جان نہیں دی۔

یہود کی دائمی ناکامی

یہود سے دم بہ دم مقابلہ درپیش تھا اور پورے سات برس تک یہ مقابلہ درپیش رہا۔ یہود عرب میں بڑی طاقت رکھتے تھے۔ تمام مالی کاروباران کے قبضہ میں تھا۔ ان کے پاس بکثرت دولت تھی۔ عربوں سے تہذیب وتمدن اور علوم وفنون میں علانیہ فائق تھے۔ ہر طرح کے سامان جنگ رکھتے تھے اور فن جنگ سے بھی کماحقہٗ واقف تھے مدینہ سے لے کر حدود شام تک ان کے تجارتی قلعوں کی مسلسل قطاریں تھیں اور ادھر مسلمانوں کے پاس ان میں سے کوئی چیز نہ تھی بااین ہمہ قرآن مجید نے اپنے پیغمبر کی زبانی یہ اعلان عام کر دیا:

﴿ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ۝ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ

عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۱۰ تا ۱۱۱)

''اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لئے یہ بہتر ہوتا۔ ان میں بعض ایماندار اور اکثر فاسق ہیں۔ وہ تم کو سوا تھوڑی تکلیف دینے کے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اگر وہ تم سے لڑیں تو پشت پھیر دیں۔ پھر ان کی مدد نہ کی جائے گی ان پر ذلت جہاں کہیں وہ ہوں پھینک ماری گئی ہے۔ لیکن خدا کے کسی وسیلہ سے یا لوگوں کی سفارش سے کبھی کبھی اس ذلت سے بچ جائیں۔ خدا کا غضب لے کر وہ لوٹیں گے اور بے چارگی ان پر چھا جائے گی۔''

اس وقت سے آج تک ان کی ایشیا، افریقہ اور یورپ ہر جگہ کی تاریخ اس صداقت سے معمور پیشین گوئی کی حرف بحرف تصدیق ہے۔

روم کی قوت ٹوٹ جائے گی

۸ھ کے بعد مسلمانوں کا مقابلہ عرب کے مشرکین اور یہود سے زیادہ سخت اور طاقت ور دشمن رومی عیسائیوں سے آ پڑا، رومن ایمپائر کی وسعت، قوت سامان، نظام، فوج، خزانہ کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کی حالت پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ایک پر کاہ کا کوہ سے مقابلہ ہے، تاہم اسلام کے پیغمبر کی زبان سے اسی وقت یقین وتسلی کے کلمات دنیا نے سن لئے:

﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ﴾

(۶۱/ الصف:۹)

''وہی خدا ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے، تاکہ اس دین کو تمام دینوں پر غلبہ عطا کرے۔''

دنیا کو اس پیشین گوئی کی تصدیق کے لئے صرف سال کا انتظار کرنا پڑا۔

خلفائے راشدین کے زمانہ کی لڑائیاں

لیکن قرآن مجید کی پیشین گوئیاں صرف انہی غزوات کی ساتھ مخصوص نہ تھیں جو عہد نبوت میں پیش آئے۔ بلکہ اس کے بعد بھی خلفا کے زمانہ میں جو عظیم الشان لڑائیاں واقع ہوئیں۔ ان کے متعلق قرآن مجید نے پہلے سے پیشین گوئی کر دی تھی اور وہ آئندہ زمانہ میں پوری ہوئیں۔ مسلمانوں کو ایرانیوں اور رومیوں سے جو جنگ کرنا پڑی وہ تاریخ اسلام کا ایک نمایاں واقعہ ہے۔ لیکن قرآن مجید نے اس کے نتائج کا پہلے ہی سے اعلان کر دیا تھا:

﴿ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ﴾ (۴۸/ الفتح:۱۶)

’’جہاد میں جان چرانے والے بدوؤں سے کہہ دو کہ تم کو ایک سخت طاقتور قوم سے جنگ کرنے کے لئے بلایا جائے گا، تم لوگ ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہوں گے۔‘‘

چنانچہ یہ جنگ ہوئی اور وہی نتیجہ ہوا، جس کو قرآن مجید نے دو صورتوں یعنی قتل اور اسلام میں محدود کر دیا تھا۔

وفاتِ نبوی ﷺ کی پیشین گوئی

مکہ کی فتح کے بعد آپ ﷺ کی زندگی کا مقصد پورا ہو گیا اور اس عام اصول کی بنا پر کہ انبیا اپنی زندگی کا مقصد پورا کرنے کے بعد نہیں رہتے وہ وقت آیا کہ آپ ﷺ اپنے اصلی مرکز یعنی ملائے اعلیٰ سے جا ملیں۔ اس لئے خداوند تعالیٰ نے اس راز کو ایک مستقل پیشین گوئی کی صورت میں ظاہر کر دیا:

﴿ إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ ﴾ (۱۱۰/ النصر:۱، ۳)

’’جب خدا کی مدد اور فتح آ گئی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ خدا کے دین میں جھنڈ کے جھنڈ داخل ہو رہے ہیں تو خدا کی تسبیح اور استغفار کر۔ وہ بڑا توبہ کا قبول کرنے والا ہے۔‘‘

اس سورہ میں آپ ﷺ کے وصال کی پیشین گوئی اگرچہ نہایت مبہم الفاظ میں کی گئی ہے۔ لیکن اشارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مژدۂ فتح نہیں بلکہ مژدۂ وصال ہے۔ کیونکہ مژدۂ فتح کے ساتھ تسبیح و استغفار کو کوئی مناسبت نہیں۔ بلکہ اس کے لئے شکر موزوں ہے۔ تسبیح و استغفار کا اصلی وقت وہ ہے۔ جب انسان دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں جو لوگ نکتہ دانِ شریعت تھے وہ اس راز کو سمجھ گئے تھے۔ [1]

[1] صحیح بخاری، تفسیر آیت مذکور: ۴۹۷۰۔

آیات ودلائل نبویہ ﷺ

بروایات صحیحہ

گزشتہ صفحات میں صرف وہی آیات ودلائل بیان کئے گئے ہیں، جو صراحۃً قرآن مجید میں مذکور ہیں یا کم ازکم ان کے اشارات قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں لیکن ذیل میں ان آیات ودلائل کا استقصا مقصود ہے، جو صحیح اور مستند روایتوں سے حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں، اس قسم کے آیات ودلائل کا بڑا حصہ گو فرڈاً فرڈاً اخبار احاد سے ثابت ہے، مگر مجموعی حیثیت سے ان کا درجہ خبر مشہور تک پہنچ جاتا ہے، مثلاً: تھوڑی سی مقدار کا بڑھ کر زیادہ ہوجانا، ہاتھ سے پانی کے چشمہ کا ابلنا، امراض سے غیر معمولی طور پر شفایابی حاصل کرنا، دعاؤں کا غیر معمولی طریق سے قبول ہوجانا، ان میں سے ہر قسم کے معجزات کے جزئی جزئی واقعے گو صرف ایک ایک دودو راویوں کی زبانی بیان ہوئے ہیں، مگر ان میں سے ہر قسم کے معجزہ کے متعلق تو برتو شہادتیں موجود ہیں، جن کی بنا پر ان میں سے ہر قسم کے معجزات خبر متواتر نہیں تو خبر مشہور تک ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ البتہ بعثت سے پہلے جو عجائبات آپ ﷺ سے صادر ہوئے یا جو غیر معمولی سوانح آپ ﷺ کو پیش آئے، ان کی صحت محدثانہ اصول سے بہت کم ثابت ہے، لیکن اس کی وجہ اس عہد میں اس قسم کے واقعات کا کم ہونا یا غلط ہونا نہیں ہے، بلکہ اس عہد کے واقعات کے راوی چونکہ عموماً ماں باپ اور خاندان کے بڑے بزرگ ہوا کرتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کے عہد بعثت کے بعد بلکہ مدینہ کی پرامن زندگی کے شروع ہونے کے بعد جب اسلام کے سلسلہ روایات کا صحیح طریقہ سے آغاز ہوا، تو آپ ﷺ کے خاندان کے بزرگوں میں سے جنہوں نے آپ ﷺ کے بچپن اور نوجوانی کا عہد دیکھا تھا، کوئی موجود نہ تھا، والدین پہلے ہی وفات پاچکے تھے، دادا کا بھی انتقال ہوچکا تھا، چچاؤں میں ابولہب آپ ﷺ کا دشمن ہی تھا، ابوطالب آغاز اسلام ہی میں مرچکے تھے، حضرت حمزہ محسن تھے اور ۳ھ ہی میں شہادت پاچکے تھے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ صرف دو برس بڑے تھے، اس بنا پر محدثانہ اصول تنقید کے معیار پر اس زمانہ کے واقعات کا سلسلہ روایت بہت کم صحیح اترتا ہے اور اس لئے وہ غیر مستند ٹھہرتے ہیں۔

بہر حال تمام صحیح معجزات کے استقصا سے کچھ واقعات بعثت سے پہلے کے معلوم ہوتے ہیں کچھ مکہ کی زندگی کے اور زیادہ تر مدینہ کے عہد کے، جب اسلامی روایتوں کا سلسلہ راویوں کی کثرت کے باعث مستحکم ہوچکا تھا، ملتے ہیں بعثت کے بعد جو معجزات ظاہر ہوئے ہیں، وہ نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہیں، مثلاً: بعض واقعات اجسام کائنات میں تصرف اور تاثیر کے ہیں بعض تکثیر اشیاء کے ہیں، بعض استجابتِ دعا اور شفائے امراض وغیرہ کے ہیں، اس لئے ذیل میں ہر نوع کے معجزات کو ہم علیحدہ علیحدہ لکھتے ہیں۔

علاماتِ نبوت
قبل بعثت

ہر شخص اس کو تسلیم کرے گا کہ ممتاز افراد کے سوانح زندگی میں شروع ہی سے ایسے آثار پائے جاتے ہیں، جو ان کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کرتے ہیں، جب یہ ان، عام ممتاز افراد انسانی کا یہ حال ہے، جو خاندانوں، قوموں اور ملکوں کے صرف ظاہری راہنما اور رہبر ہوتے ہیں، تو اس حیثیت سے ان برتر ہستیوں کی نسبت کیا شبہ ہو سکتا ہے، جو قوموں کے روحانی پیشوا اور انسانیت کے حقیقی رہبر اور راہنما ہوتے ہیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے ابتدائی سوانح زندگی میں اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں کتب سیر و دلائل کے مصنفین نے آنحضرت ﷺ کی ولادت سے لے کر بعثت تک کے ان تمام واقعات کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے، مگر جیسا کہ پہلے گزر چکا محدثانہ اصول کی سخت گیری نے ہمارے لئے ان کا دائرہ بہت تنگ کر دیا ہے، صحیح روایتوں سے اس عہد کے جو واقعات علامات نبوت کے تحت میں آ سکتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

حضرت آمنہ کا خواب

متعدد صحابیوں سے روایت ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اپنا حال بیان فرمائیے، فرمایا: ''میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور اپنی ماں کا خواب ہوں، میری ماں نے جب میں پیٹ میں تھا، خواب دیکھا کہ ان کے بدن سے ایک نور نکلا ہے، جس سے شام کے محل روشن ہو گئے۔'' [1] یہ خالد بن معدان تابعی کی روایت ہے، جو گو ابن سعد میں مرسل ہے، مگر مستدرک میں ہے کہ انہوں نے اصحاب رسول اللہ ﷺ سے سنا، حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ صحابی کی روایت میں کچھ الفاظ زیادہ ہیں، انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے سنا کہ ''میں خدا کا بندہ اور خاتم الانبیاء اس وقت سے ہوں کہ میرا باپ (آدم) آب و گل میں تھا، میں اس کی تفصیل بتاتا ہوں، میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا، عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور اپنی ماں آمنہ کا خواب ہوں اور اسی طرح پیغمبروں کی مائیں خواب دیکھا کرتی ہیں۔'' آنحضرت ﷺ کی والدہ نے آپ ﷺ کی ولادت کے وقت خواب دیکھا کہ ایک نور ہے، جس سے شام کے محل روشن ہو گئے [2] پھر یہ آیت پڑھی: [3]

﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۴۵، ۴۶)

''اے پیغمبر! میں نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا اور خدا کے حکم سے خدا کی

[1] ابن سعد، ج ۱، ص: ۹۶؛ مستدرك حاكم، ج ۲، ص: ۶۰۰۔
[2] مسند احمد، ج ۴، ص: ۱۲۷؛ مستدرك حاكم، ج ۲، ص: ۶۰۰ وابن سعد، ج ۱، ص: ۹۶۔
[3] مستدرك حاكم (صحيح)، ج ۲، ص: ۴۱۸۔

طرف پکارنے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا۔"

ولادتِ نبوی ﷺ کی پیشین گوئیاں یہود و نصاریٰ میں

احادیث، سیر اور دلائل کی کتابوں میں تو بر تو ایسی روایتیں ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ظہور نبوی ﷺ کے عہد میں یہود و نصاریٰ خاص طور سے اس آنے والے پیغمبر کے منتظر تھے اور اس کے جلد ظہور اور بعثت کی مختلف پیشین گوئیاں کر رہے تھے، ان روایتوں میں سے گو ہر روایت بجائے خود ضعیف ہے، مگر ان کی مجموعی حیثیت سے یہ قدر مشترک ضرور نکلتا ہے کہ یہ عہد ان لوگوں کے نزدیک آنے والے پیغمبر کے خاص انتظار کا تھا اور مدینہ کے لوگوں میں اور مکہ کے جویان حق اشخاص میں اس پیغمبر کے ظہور کا خاص ذکر اور چرچا تھا۔

بت خانوں سے غیبی آوازیں

اسی طرح ان کتابوں میں بکثرت روایتیں ایسی ہیں جن میں بیان ہے کہ آپ ﷺ کی پیدائش کے بعد لوگوں نے بت خانوں کے اندر سے غیبی آوازیں سنیں کہ "اب صنم خانوں کی بربادی کا زمانہ آ گیا، پیغمبر صادق کی ولادت ظہور میں آ چکی ہے۔" ان روایتوں کا اکثر حصہ سخت کمزور اور ناقابل اعتبار ہے، تاہم مجموعی شہادت سے اس قدر اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس عہد میں اس قسم کا کوئی واقعہ ضرور ہوا تھا، چنانچہ صحیح بخاری کے حوالہ سے اس قسم کی ایک روایت آگے آتی ہے۔

شق صدر

تمام ارباب سیر اور بعض محدثین کی روایت کی بنا پر بچپن کے زمانہ میں جب آپ ﷺ حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں پرورش پا رہے تھے، شق صدر کا واقعہ پیش آیا، ایک روایت میں ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کو سب سے پہلا غیبی واقعہ کیا پیش آیا؟ اس کے جواب میں آپ نے دو فرشتوں کی آمد اور شق صدر کا واقعہ بیان کیا۔ [1]

اس واقعہ کی سب سے مستند روایت وہ ہے جو حماد بن سلمہ اور ثابت البنانی کے واسطہ سے صحیح مسلم، مسند احمد اور ابن سعد [2] وغیرہ میں ہے کہ آپ ﷺ ایک روز بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ ایک آنے والا آیا اور اس نے آپ کو پکڑ کر سینہ مبارک کو چاک کیا اور قلب اقدس سے خون کا ایک لوتھڑا نکال کر پھینک دیا اور کہا کہ یہی حصہ تجھ میں شیطان کا تھا، پھر سونے کے طشت میں زمزم کے پانی سے دھو کر برابر کر دیا، لڑکے بھاگے ہوئے حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے کہ محمد ﷺ کو کسی نے مار ڈالا، حلیمہ رضی اللہ عنہا آئیں تو دیکھا کہ

---

[1] مستدرك حاكم، ج ٢، ص: ٦١٦؛ ابن سعد، ج ١، ص: ٩٦؛ سنن دارمی، باب كيف كان اول شأن النبی ﷺ: ١٣ وابن عساكر، ج ١، ص: ٣٧١۔ [2] صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب الاسراء: ٤١٣؛ ابن سعد، ج ١، ص: ٩٧؛ مسند احمد، ج ٣، ص: ١٢١۔

آپ ﷺ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ کے سینہ میں اس زخم کے ٹانکے کے نشان ہم کو نظر آتے تھے، مستدرک میں بھی اسی قسم کی ایک اور روایت خالد بن معدان سے عتبہ بن عبد السلمی کے واسطہ سے مذکور ہے۔

ارباب سیر اور بعض محدثین کی روایت کے مطابق میں نے اس واقعہ کو یہاں لکھ دیا ہے، مگر اس باب میں میری جو ذاتی تحقیق ہے، وہ اس سے پہلے (شرح صدر) حوالہ قلم کر چکا ہوں۔

مبارک قدم ہونا

روایتوں میں آپ ﷺ کے مبارک قدم ہونے کے بہت سے واقعات مذکور ہیں، مگر ان میں سے کوئی بطریق صحیح مروی نہیں، صرف ایک روایت صحیح طریقہ سے مذکور ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک صحابی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اسلام سے پہلے جاہلیت میں حج کرنے گئے تھے، تو انہوں نے دیکھا کہ ایک شخص طواف میں مصروف ہے اور اس کی زبان پر شعر میں دعا ہے:

رُدَّ الی راکبی محمداً ﷺ   یارب رد واصطنع عندی یدا

''اے میرے پروردگار! میرے سوار محمد ﷺ کو واپس بھیج اور مجھ پر یہ ایک احسان کر۔''

وہ کہتے ہیں کہ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ عبدالمطلب ہیں، ان کا ایک اونٹ گم ہو گیا تھا، انہوں نے اپنے پوتے کو اس کے ڈھونڈنے کے لئے بھیجا ہے اور وہ اب تک لوٹ کر نہیں آیا ہے، ان کا یہ پوتا ایسا ہے کہ انہوں نے جس کسی کام کے لئے اس کو بھیجا ہے، ان کو کامیابی ہی ہوئی ہے، کچھ دیر کے بعد آپ ﷺ اُونٹ لے کر واپس آتے نظر آئے، عبدالمطلب نے سینہ سے لگا لیا۔ [1]

بے ستری میں آپ ﷺ کا غش کھا کر گرنا

آپ ﷺ بچہ تھے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر در پیش ہوئی، تمام شرفائے مکہ اس مقدس گھر کے معمار اور مزدور بنے، بچے اینٹیں اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے، انہی بچوں کی صف میں آنحضرت ﷺ اور آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی تھے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ تہبند کھول کر گردن پر رکھ لو، کہ پتھر کی رگڑ سے گردن پر خراش نہ آئے، آنحضرت ﷺ نے چچا کے حکم کی تعمیل کی، دفعتہً آپ غش کھا کر گر پڑے اور آنکھیں پھٹ کر آسمان سے لگ گئیں، جب ہوش آیا، تو آپ کی زبان پر یہ لفظ تھا ''میرا تہبند میرا تہبند'' لوگوں نے تہبند کمر سے باندھ دی، [2] یہ صحیحین کی روایت ہے حاکم اور ابونعیم میں ہے کہ ابوطالب نے اس کے بعد

---

[1] مستدرك حاكم، ج ۲، ص: ۶۰۳، ذہبی نے حاکم کی اس روایت کو علی شرط مسلم تسلیم کیا ہے، علاوہ ازیں تاريخ بخاری، ابن سعد، ابویعلی، طبرانی، بیہقی، ابونعیم اور ابن مندہ میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب بنیان الکعبة: ۳۸۲۹؛ صحیح مسلم، کتاب الحیض: ۷۷۱، ۷۷۲۔

واقعہ دریافت کیا تو فرمایا کہ ''مجھے ایک سپید پوش مرد نظر آیا، جس نے کہا کہ ستر پوشی کر'' (1) بیہقی وابن سعد میں اور حاکم کی دوسری روایت میں ہے کہ ندا آئی کہ ''اے محمد ﷺ اپنے ستر کو چھپا'' ان روایتوں میں ہے کہ غیب کی یہ پہلی آواز تھی، جو آپ کو سنائی دی۔ (2)

نیند طاری ہونا

حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے سن کر بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بعثت سے پہلے صرف دو دفعہ میرے دل میں برا خیال آیا اور دونوں دفعہ میرے خدا نے مجھے بچالیا، ایک دفعہ رات کو میں نوجوان چرواہوں کے ساتھ مکہ کے باہر تھا، میرے دل میں آیا کہ شہر کے اندر جا کر لطف احباب اٹھاؤں، چلا تو سر راہ شادی کا ایک جلسہ نظر آیا، میں دیکھنے کھڑا ہو گیا، تو خدا نے مجھ پر نیند طاری کر دی، تو اس وقت تک میں نہ جاگا، جب تک سورج کی کرنوں نے آکر میرے شانے نہ ہلائے، دوسری دفعہ جب خیال آیا تو پھر یہی واقعہ گزرا، اس کے بعد میں نے جاہلیت کا کوئی ارادہ نہ کیا، یہاں تک کہ خدا نے مجھ کو نبوت سے مشرف کیا۔ (3)

صدائے غیب

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ بیٹھے تھے، سامنے سے ایک خوبصورت سا آدمی گزرا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلوا کر حال پوچھا، اس نے کہا میں جاہلیت میں کاہن تھا، دریافت کیا کہ اس زمانہ میں عجیب ترین واقعہ تم نے کیا دیکھا، اس نے کہا میں بازار میں تھا کہ میرا موکل جن میرے پاس گھبرایا ہوا آیا، اور یہ شعر پڑھا:

الم تر الجن وابلا سها   ویا سها من بعد انكاسها

ولحوقها بالقلاص واحلاسها

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس نے سچ کہا، خود مجھ پر اسی قسم کا ایک واقعہ گزرا، ایک دفعہ میں جاہلیت کے بتوں کے پاس سویا تھا کہ ایک آدمی بچھڑا لے کر آیا، اور اس کی قربانی کی، ناگاہ اس کے اندر سے بڑے زور سے چیخنے والے کی آواز آئی، جس سے زیادہ چیخ کی آواز میں نے کبھی نہیں سنی، آواز یہ تھی:

یا جلیح ، امر نجیح رجل فصیح ، یقول لا اله الا الله۔

''اے جلیح! کامیاب بات ایک فصیح آدمی کہتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ آواز سن کر سب لوگ کود کود کر بھاگ نکلے، لیکن میں اپنی جگہ سے نہ ٹلا، اور دل میں کہا کہ اصل حقیقت دریافت کر کے ٹلوں گا، ناگاہ دوسری دفعہ اور پھر تیسری دفعہ وہی آواز آئی، اس

(1) دلائل النبوة، ج ١، ص: ٦٠۔ (2) طبقات ابن سعد، جزء اوّل، ص: ٩٣۔

(3) اسحاق بن راهويه، بزار، بيهقى، ابو نعيم، ابن عساكر، قال ابن حجر اسناده حسن متصل ورجاله ثقات؛ خصائص كبرىٰ سيوطى، ج ١، ص: ٨٨، حيدر آباد؛ مستدرك حاكم، ج ٤، ص: ٢٤٥ على شرط مسلم۔

واقعہ کو کچھ ہی دن گزرے تھے کہ مکہ میں یہ شہرہ ہوا کہ آپ ﷺ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ ❶

پتھروں سے سلام کی آواز

آنحضرت ﷺ نبوت کے بعد فرمایا کرتے تھے: ''میں مکہ کے اس پتھر کو پہچانتا ہوں، جو مجھ کو بعثت سے پہلے سلام کیا کرتا تھا، میں اب بھی اس کو پہچانتا ہوں۔'' ❷ یہ صحیح مسلم، مسند احمد اور مسند دارمی کی روایت ہے دوسری روایتوں میں ہے کہ ''میں مکہ کے اس پتھر کو پہچانتا ہوں، جو میری بعثت کے زمانہ میں مجھ کو سلام کیا کرتا تھا۔'' ❸

خواب میں فرشتوں کی آمد

نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ کو حالت خواب میں فرشتے نظر آیا کرتے تھے، صحیح بخاری میں ہے آغاز وحی سے پہلے رؤیا میں تین فرشتے آپ ﷺ کے پاس آئے، آپ دوسرے لوگوں کے ساتھ کعبہ کے احاطہ میں آرام فرما رہے تھے، ایک فرشتے نے پوچھا: ''ان میں وہ کون ہے؟'' بیچ والے نے جواب دیا: ''ان میں جو سب سے بہتر ہے۔'' پچھلے نے کہا: ''تو ان میں سے بہتر کو لے لو۔'' اس کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔ ❹

---

❶ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اسلام عمر: ٣٨٦٦۔

❷ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فضل نسب النبی ﷺ: ٥٩٣٩؛ مسند احمد، ج ٥، ص: ٨٩ وسنن دارمی، باب ما اکرم اللّٰہ بہ نبیہ من ایمان الشجر: ٢٠۔

❸ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی آیات نبوۃ النبی ﷺ...... : ٣٦٢٤۔

❹ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب کان النبی ﷺ تنام عینہ ولا ینام قلبہ: ٣٥٧٠۔

اشیاء میں اثر

اشیا میں اثر سے مقصود یہ ہے کہ بحکم الٰہی کبھی کبھی آپ ﷺ کے فیض و برکت کی قوت اثر سے جمادات، نباتات، حیوانات اور انسانوں میں ایک ایسا انقلاب پیدا ہوگیا، جس کی بنا پر اشیاء سے ان کی فطرت کے مافوق، یا ان کے معمول کے برخلاف افعال، حرکات اور اثرات رونما ہوئے، اس قسم کے معجزات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت میں زیادہ نمایاں ہیں، مثلاً: پانی کا خون ہو جانا، عصا کا سانپ بن جانا، ہتھیلی کا چمکنے لگنا، عصا کی ضرب سے دریا کا خشک ہو جانا، چٹان سے پانی بہنے لگنا، اوس کے اٹھانے سے دشمن کا شکست کھانا، آنحضرت ﷺ کو بھی یہ نشانیاں ملی تھیں جن میں سب سے مستند معجزہ شق القمر ہے جس کی تفصیل دلائل قرآنی کے ضمن میں پہلے گزر چکی، اس کے بعد ستون حنانہ، یعنی مسجد نبوی ﷺ کے ستون خرما سے گریہ و بکا کی آواز پیدا ہونے کا واقعہ ہے۔

ستون کا رونا

مسجد نبوی میں پہلے منبر نہ تھا، مسجد میں خرمے کے تنے کا ایک ستون تھا، آپ ﷺ اس سے ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے، منبر تیار ہوا تو آپ نے اس پر کھڑے ہو کر جمعہ کا خطبہ دینا شروع کیا تو دفعتہً اس ستون سے بچوں کی طرح رونے کی آواز آنے لگی، بعض روایتوں میں ہے، کہ اونٹنیوں کی طرح بلبلانے کی آواز آئی، یہ حاضرین کے اختلاف مذاق کی بنا پر رونے کی مختلف تشبیہیں ہیں، راویوں کا مشترک مقصود یہ ہے کہ دردِ فراق سے اس سے جزع وفزع کی آواز سنائی دینے لگی، یہ دیکھ کر آنحضرت ﷺ منبر سے اتر کر آئے اور ستون پر تسکین کے لئے ہاتھ پھیرا اور اس کو سینہ سے لگایا، تو آواز بند ہوگئی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس کا رونا اس بنا پر تھا کہ یہ پہلے خدا کا ذکر سنا کرتا تھا۔'' [1] یہ واقعہ حدیث وسیر کی کتابوں میں گیارہ مختلف صحابیوں سے منقول ہے۔ [2]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب باب علامات النبوۃ:٣٥٨٤، ٣٥٨٥ ومسند احمد، ج٣، ص:٢٩٣ وترمذی ابواب المناقب: ٣٦٢٧ وابن ماجه، کتاب اقامة الصلوة والسنة فيها، باب ماجاء بدء شان المنبر: ١٤١٤، ١٤١٥ ودارمی، ما اکرم الله النبی ﷺ بحنین المنبر:٣١ تا٤٠ ونسائی، کتاب الجمعة، باب مقام الامام فی الخطبة: ١٣٩٧۔

[2] (١) جابر بن عبدالله (بخاری: ٩١٨؛ نسائی، امام احمد، بزار، ابو نعیم) (٢) سهیل بن سعد (ابن ابی شیبه، ابن سعد علی شرط الصحیحین) (٣) عبدالله بن عمر (بخاری، امام احمد: ٢/ ١٠٩ ترمذی: ٥٠٥) (٤) انس بن مالك (ترمذی: ٣٦٢٧ امام احمد، ابو یعلیٰ، ابن ماجه، بزار، ابونعیم) (٥) ابی بن کعب (امام احمد: ٥/ ١٣٧ امام شافعی؛ ابن ماجه: ١٤١٤؛ دارمی: ٣٦؛ ابو یعلیٰ (ابن سعد) (٦) عبدالله بن عباس (امام احمد، ابن ماجه، ابن سعد، بیهقی، دارمی: ٣٩) (٧) ابو سعید خدری (ابن ابی شیبه، ابو یعلیٰ: ١٠٦٢؛ دارمی: ٣٧؛ عبد بن حمید: ٨٧٣؛ ابو نعیم علی شرط مسلم) (٨) بریدة (دارمی: ٣٢) (٩) مطلب بن دوانة (زبیر بن بکار فی اخبار المدینة) (١٠) ام سلمة (مجمع الزوائد، ٢/ ٣٣٦ بیهقی) (١١) عائشة (طبرانی اوسط: ٢٢٥٠)۔

منبر کا ہلنے لگنا

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ منبر پر خطبہ دے رہے تھے جلال و کبریائی الٰہی کا بیان تھا، آپ ﷺ خود بہت متاثر تھے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا تو آپ داہنے بائیں ہل رہے تھے، اور نیچے سے منبر اس زور سے ہل رہا ہے کہ مجھے ڈر ہوا کہ آپ کو لے کر گر نہ پڑے۔ ❶

چٹان کا پارہ پارہ ہو جانا

غزوۂ خندق میں تمام صحابہ رضی اللہ عنہم مل کر مدینہ کے چاروں طرف دشمنوں سے بچنے کے لئے خندق کھود رہے تھے، اتفاق سے ایک جگہ ایک بہت سخت چٹان نکل آئی، لوگوں نے ہر چند اس کو توڑنا چاہا، مگر وہ نہ ٹوٹی، کدالیاں اس پر پڑ پڑ کر اچٹ جاتی تھیں، آخر لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آکر صورت حال عرض کی، آپ ﷺ اٹھ کر خود تشریف لائے اور کدالی ہاتھ میں لے کر ایک ضرب لگائی تو وہ چٹان ریگ ہو کر چور چور ہو گئی۔ ❷

درختوں اور پہاڑوں سے سلام کی آواز

حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ایک دفعہ میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ مکہ میں ایک طرف کو نکلا تو میں نے دیکھا کہ جو پہاڑ اور درخت بھی سامنے آتا ہے، اُس سے السلام یا رسول اللہ! کی آواز آتی ہے اور میں اُن کو سن رہا تھا۔ ❸

پہاڑ کا ہلنا

صحیح بخاری میں ہے ایک دن آپ ﷺ اور آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم ❹ اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم بھی تھے، ❺ ایک پہاڑ پر چڑھے، پہاڑ جنبش کرنے لگا، آپ ﷺ نے پہاڑ کو پائے مبارک سے ٹھوکر مار کر فرمایا ''ٹھہر جا، کہ تیری پشت پر اس وقت پیغمبر ہے، یا صدیق ہے، یا شہید ہے۔'' ❻

صحیح بخاری میں راوی کو شک ہے، یہ پہاڑ کوہ احد تھا، یا کوہِ حرا، مگر صحیح مسلم اور مسند احمد میں صرف کوہ حرا کا اور مسند ابویعلیٰ اور بیہقی میں صرف کوہ اُحد کا نام ہے، بہرحال اگر یہ کوہ اُحد تھا تو مدینہ کا واقعہ ہے اور اگر کوہِ حرا

❶ صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین، باب صفة القیامة: ۷۰۵۲؛ ابن ماجه، باب ذکر البعث: ٤٢٧٥۔

❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الخندق: ٤١٠١ ونسائی، کتاب الجهاد، باب غزوة الترك والحبشة: ٣١٧٨۔ ❸ جامع ترمذی، کتاب المناقب: ٣٦٢٦۔

❹ صحیح بخاری، کتاب فضائل الصحابة: ٣٦٧٥۔ ❺ صحیح مسلم من فضائل طلحة والزبیر: ٦٢٤٧، مسلم کی حدیث رقم: ۶۲۴۸ میں سعد بن ابی وقاص کا نام بھی ہے۔

❻ صحیحین کے علاوہ یہ واقعہ مسند ابن حنبل بروایت بریدہ اور ترمذی، نسائی اور دارقطنی بروایت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ابویعلیٰ، اور بیہقی میں بروایت سہل بن سعد مذکور ہے۔

تھا تو مکہ کا ہے۔

آپ ﷺ کے اشارہ سے بتوں کا گر جانا

فتح سے پہلے خانہ کعبہ تین سو ساٹھ بتوں کا معبد تھا، جب مکہ فتح ہوا تو آپ ﷺ کعبہ میں تشریف لے گئے، دست مبارک میں ایک چھڑی تھی اور زبان اقدس پر یہ آیت کریمہ جاری تھی:

﴿ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۸۱)

''حق آیا اور باطل مٹ گیا، باطل مٹنے ہی کے لئے آیا تھا۔''

آپ ﷺ چھڑی سے جس بت کی طرف اشارہ کرتے تھے، وہ بے چھوئے دھم سے گر پڑتا تھا۔ [1]

یہ واقعہ کہ کعبہ کے چاروں طرف تین سو ساٹھ بت تھے اور آپ ﷺ دست مبارک میں چھڑی لے کر ان بتوں کی طرف اشارہ کرتے جاتے تھے، آیت مذکور تلاوت کرتے جاتے تھے، بخاری [2] و مسلم [3] باب فتح مکہ میں موجود ہے، مگر اس اشارے سے بے چھوئے بتوں کا خود بخود گرتے جانا، صحیحین میں مذکور نہیں، البتہ فاکہی میں بروایت عمر اور طبرانی، ابن اسحاق اور ابونعیم میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما موجود ہے، فاکہی کی روایت کو ابن حبان نے صحیح کہا ہے، صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الفتح میں جو روایت ہے، اس سے ضمناً اس کے خلاف یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے ان لوگوں سے اکھڑوا کر پھینکوا دیا، اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابن عباس لما قدم رسول الله ﷺ ابى ان يدخل البيت فيه الآلهة فامر بها فاخرجت۔ [4]

''ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب آپ ﷺ (مکہ) آئے تو اس حالت میں کہ خانہ کعبہ کے اندر بت تھے، آپ نے اس کے اندر جانے سے انکار کیا تو آپ نے ان کے باہر نکال دینے کا حکم دیا تو وہ باہر نکال دیئے گئے۔''

اگر فاکہی، طبرانی، ابن اسحاق اور ابونعیم کی روایت بالا صحیح ہو تو اس میں اور بخاری کی اس روایت میں یہ تطبیق ممکن ہے کہ پہلے جن بتوں کا ذکر ہے، وہ حول البیت یعنی خانہ کعبہ کے باہر چاروں طرف تھے، آپ ﷺ ان کی طرف اشارہ کر کے آیت مذکور کو پڑھتے اور وہ گر جاتے تھے اور خانہ کعبہ کے اندر جو بت تھے اپنے جانے سے پہلے آپ نے ان کو نکلوا کر پھینکوا دینے کا حکم دیا تھا، اسی طرح بخاری و مسلم کی فتح مکہ والی روایت میں جن بتوں کو چھڑی سے کونچے دینے کا ذکر ہے، وہ وہ ہیں جو باہر تھے یعنی حول البیت اور جن کے نکلوانے کا ذکر بخاری کی دوسری روایت میں ہے وہ خانہ کعبہ کے اندر تھے۔

---

[1] ابو نعیم، ذکر ما کان فی فتح مکة، ص: ٤٥٢، ٤٥٣۔

[2] بخاری، کتاب المغازی، باب این رکز النبی ﷺ: ٤٢٨٧۔

[3] مسلم، کتاب الجهاد، باب فتح مکة: ٤٦٢٥۔ [4] بخاری، ایضا: ٤٢٨٨۔

کھانوں سے تسبیح کی آواز

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تم لوگ معجزوں کو خوف کی چیز سمجھتے ہو اور ہم لوگ ان کو برکت سمجھتے تھے، ہم کھانوں سے جب وہ کھائے جاتے تھے تسبیح کی آواز سنا کرتے تھے۔ ❶

زمین کا ایک مرتد کو قبول نہ کرنا

ایک عیسائی نے اسلام قبول کیا، اور سورۂ بقرہ و آل عمران پڑھی، آنحضرت ﷺ نے اس کے متعلق کتابت وحی کی خدمت کی، چند دنوں کے بعد وہ مرتد ہو کر بھاگ گیا اور عیسائی ہو گیا اور مشہور کیا کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے محمد ﷺ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے، اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانی دکھائی یعنی اس کو موت دے دی، اس کے دوستوں نے اُسے کو دفن کیا، تو صبح کے وقت لاش قبر سے باہر تھی، اس کے دوستوں کو معلوم ہوا تو کہنے لگے کہ یہ محمد ﷺ اور اصحاب محمد کا کام ہے، چونکہ وہ ان سے علیحدہ ہو گیا، اس لئے قبر کھود کر اس کو باہر پھینک دیا، اس خیال سے ان لوگوں نے اب کے خوب گہری قبر کھود کر اس میں اس کو دفن کیا، صبح کے وقت پھر مردہ قبر سے باہر تھا، اب ان کا یہ خیال پختہ ہو گیا اور کہنے لگے کہ یہ مسلمانوں ہی کی حرکت ہے، پھر جس قدر وہ گہری قبر کھو سکتے تھے کھود کر اس میں اس کو دفن کیا، صبح کو دیکھا تو پھر وہی منظر سامنے تھے اور اب ان کو یقین ہوا کہ یہ آدمی کا کام نہیں، چنانچہ اس کو اسی طرح زمین پر چھوڑ دیا۔ ❷

درختوں کا چلنا

ایک بار آپ ﷺ سفر میں قضائے حاجت کے لئے نکلے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ پانی لئے ہوئے ساتھ تھے، آپ نے میدان میں ادھر ادھر دیکھا، تو کوئی چیز آڑ کرنے کے لئے نہ ملی، میدان کے کنارے صرف دو درخت تھے، آپ ایک درخت کے پاس گئے اور اس کی ڈالی کو پکڑ کر کہا کہ ''خدا کے حکم سے میری اطاعت کر'' وہ فرمانبردار اونٹ کی طرح آپ کے ساتھ ہولیا، پھر دوسرے درخت کے نزدیک تشریف لے گئے اور وہ بھی اسی طرح آپ کے ساتھ چل پڑا، پھر آپ نے دونوں کو ایک جگہ جمع کیا اور فرمایا کہ ''خدا کے حکم سے جڑ جاؤ'' دونوں باہم مل گئے جب ان کی آڑ میں فراغت کر چکے تو پھر دونوں درخت الگ الگ اپنی جگہ پر آ گئے۔ ❸

اسی قسم کا واقعہ دوسرے سفروں میں بھی پیش آیا ہے، چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی عینی شہادت کی بنا پر اس کو بیان کیا ہے، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ حجۃ الوداع میں ❹ اور حضرت یعلیٰ بن مرہ رضی اللہ عنہ نے کسی سفر میں ❺

---

❶ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام: ۳۵۷۹۔

❷ ایضًا: ۳۶۱۷۔ ❸ مسلم، کتاب الزھد حدیث جابر الطویل: ۷۵۱۸ ودارمی، باب ما اکرم اللہ بہ نبیہ من ایمان الشجر بہ والبھائم والجن: ۱۷۔ ❹ مسند ابی یعلی وبیہقی وابو نعیم، الفصل الثالث والعشرون، ذکر ما روی فی تسلیم الاشجار واطاعتھن...... ص: ۳۳۳ حافظ ابن حجر نے مطالب عالیہ میں اس روایت کی تحسین کی ہے۔

❺ امام احمد بروایت یعلیٰ بن مرہ و ابن شیبہ برجال ثقات و حاکم بروایت صحیح، کتاب التاریخ، باب اجتماع الشجرتین بامر رسول اللہ ﷺ، ج ۲، ص: ۶۱۷، ۶۱۸۔

اپنا مشاہد بیان کیا ہے۔

ایک اور واقعہ ہے کہ آپ ﷺ ایک روز اہل مکہ کی ایذا رسانی سے نہایت غمگین بیٹھے ہوئے تھے، اسی حالت میں حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور انہوں نے دریافت کیا، تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا یا خود آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی (روایتیں مختلف ہیں) کہ ''مجھے ایک ایسی نشانی دکھا جو اس غم کو مجھ سے دور کر دے۔'' حکم ہوا کہ میدان کے کنارے جو ایک درخت ہے، آپ اس کو بلائیے، آپ نے بلایا تو وہ سامنے آ کر کھڑا ہو گیا، پھر اس سے واپس جانے کو کہا تو وہ اپنی جگہ پر واپس چلا گیا، آپ نے فرمایا: ''اب مجھے کوئی غم نہیں۔'' ❶

خوشۂ خرما کا چلنا

آپ ﷺ کی خدمت میں ایک بدو آیا اور کہا کہ مجھے یہ کیونکر یقین ہو کہ آپ پیغمبر ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں اس خوشۂ خرما کو بلا لوں تو تم میری نبوت کی شہادت دو گے؟'' اس نے کہا ہاں۔ آپ نے خوشہ خرما کو بلایا اور وہ درخت سے اتر کر آپ کے پاس آیا اور پھر آپ کے حکم سے واپس گیا، بدو فوراً اس معجزہ کو دیکھ کر ایمان لایا۔ ❷

درخت کا چلنا اور اس سے آواز آنا

آپ ﷺ ایک سفر میں تھے کہ بدو آتا ہوا نظر آیا، جب وہ آپ کے قریب آ گیا تو آپ نے پوچھا: ''کہاں جاتے ہو؟'' اس نے جواب دیا، مکان کا ارادہ ہے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہیں نیکی کی حاجت ہے؟'' اس نے کہا، وہ نیکی کیا ہے؟ آپ نے کلمہ توحید کی تلقین کی، اس نے کہا، اس کی شہادت کون دیتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سامنے کا یہ درخت۔'' چنانچہ یہ کہہ کر آپ نے وادی کے کنارے سے اس درخت کو بلایا، وہ دوڑتا ہوا آیا اور آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا، آپ نے اس سے تین بار کلمہ توحید پڑھایا اور اس نے پڑھا، پھر وہ اپنی جگہ پر واپس چلا گیا اور بدو یہ کہہ کر اپنے مکان کو روانہ ہوا کہ اگر میرے اہل و عیال نے بھی اسلام قبول کر لیا، تو ان سب کو لے آؤں گا، ورنہ تنہا آپ کے ساتھ قیام کروں گا۔ ❸

بے دودھ کی بکری نے دودھ دیا

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نوخیز چھوکرا تھا، عقبہ بن معیط ایک قریشی

---

❶ سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب الصبر على البلاء: ٤٠٢٨ ومسند احمد، ٣/ ١١٣؛ ابو يعلى، ٦/ ٣٥٨۔

❷ ترمذي، ابواب المناقب: ٣٦٢٨ نے اس کو صحیح کہا ہے اور امام بخاری نے تاریخ میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے، اور ابو یعلیٰ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی روایت کی ہے۔

❸ مسند دارمی، باب ما اكرم الله به نبيه...... ١٦، بسند صحيح وبزار: ٢٤١١ وابونعيم ص: ٣٣٢ باختلاف يسير وابن سعد، ج ١، ص: ١٢١۔

کا فر رئیس کی بکریاں مکہ میں چرایا کرتا تھا، آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ادھر سے گزر ہوا۔ [1] آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا: ''لڑکے تمہارے پاس دودھ ہے!، ہم کو پلاؤ گے؟'' میں نے کہا، میں امین ہوں میں تم کو نہیں پلا سکتا، آپ ﷺ نے پوچھا: ''اچھا کوئی بکری کا بچہ ہے؟'' میں نے کہا، ہاں۔ فرمایا: ''لے آؤ۔'' میں لے آیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بچہ پکڑا اور آنحضرت ﷺ نے تھن میں ہاتھ لگایا اور دعا کی، ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک گہرا پتھر لے آئے اس میں دودھ دوہا گیا، پہلے آپ ﷺ نے خود پیا، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پیا، اس کے بعد حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، پھر مجھے پلایا، دودھ پی کر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے تھن! سمٹ جا۔'' وہ سمٹ کر خشک ہو گیا، اس کے بعد میں آپ کے پاس حاضر ہوا، اور عرض کی کہ اس عمدہ کلام یعنی قرآن مجید میں سے مجھے کچھ سکھایئے، فرمایا: ''تم سیکھنے والے لڑکے ہو۔'' تو میں نے خود

---

[1] یہ روایت مسند احمد، ابوداؤد طیالسی، ابن سعد اور دلائل ابی نعیم میں ہے، طیالسی اور ابونعیم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر جب مشرکین سے بھاگے تھے، تب یہ واقعہ پیش آیا یعنی ہجرت کے ایام میں طیالسی کی اس روایت کا سلسلہ سند ہر طرح سے محفوظ ہے، ابوداؤد، حماد بن سلمہ سے اور وہ عاصم ابن بہدلہ سے اور عاصم زر بن حبیش سے اور وہ خود عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس کی روایت کرتے ہیں، یہ تمام اصحاب ثقہ اور معتبر ہیں، بایں ہمہ اس واقعہ کو زمانہ ہجرت میں قرار دینے سے متعدد خرابیاں نظر آتی ہیں، جن سے ثابت ہوا ہے کہ اس روایت میں کسی صاحب سے بھول ہوئی ہے، اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہجرت کے وقت نوخیز لڑکے تھے اور ابھی تک قرآن مجید سے ناواقف تھے بلکہ مسلمان بھی نہ تھے، حالانکہ وہ ہجرت سے بہت پہلے اسلام لا چکے تھے، وہ چھٹے مسلمان تھے اور ہجرت کے وقت وہ حبش میں تھے، اور وہاں سے اس وقت لوٹے جب آنحضرت ﷺ مدینہ جا چکے تھے، جیسا کہ نماز میں سلام کرنے والی روایت سے جو حدیث کی تمام کتابوں میں ہے ثابت ہوتا ہے، اس لئے وہ اس وقت مکہ میں سرے سے موجود ہی نہ تھے، اس روایت کے ان الفاظ کے متعلق میں اپنے شکوک لکھ چکا تھا کہ رجال اور سیر کی مختلف کتابوں میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا حال الٹ پلٹ کر پڑھا، سب نے ان کے حال میں اس روایت کو نقل کیا ہے، مگر ان شبہات پر کسی کی نظر نہیں پڑی، اسی اثنا میں فتح الباری جلد ہجرت اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بعینہ یہی اعتراضات حافظ ابن حجر کے ذہن میں بھی گزرے ہیں، لیکن انہوں نے حسب دستور مختلف روایات کی تطبیق کے متعلق جو ان کا عام اصول ہے، اس سے کام لے کر آگے بڑھ گئے ہیں یعنی یہ کہہ دیا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ ہجرت کے علاوہ کسی اور زمانہ کا واقعہ ہو مگر مشکل یہ ہے کہ ہجرت کے علاوہ کوئی اور زمانہ ایسا نہیں۔ جس میں آنحضرت ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مشرکین سے بھاگے ہوں، لیکن الحمدللہ کہ اثنائے تحقیق میں مجھے مسند احمد بن حنبل (جلد اص ۳۷۹) میں یہی روایت اسی قسم کی سند سے مل گئی ہے، جس میں ان قابل اعتراض الفاظ کے بجائے مطلق یہ الفاظ ہیں کہ میں بکریاں چرا رہا تھا کہ آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا اس میں فرار اور ہجرت کا مطلق ذکر نہیں ہے، اس سے ثابت ہوا ہے کہ ہجرت سے بہت پہلے کا کوئی واقعہ ہے، پہلے الفاظ کے راوی عاصم سے ان کے شاگرد حماد بن سلمہ ہیں، اور دوسرے الفاظ کے راوی ان ہی کے شاگرد ابوبکر عیاش ہیں گو حافظہ کی خرابی اور اغلاط کی کثرت میں یہ دونوں برابر ہیں، تاہم ناقدانہ وجوہ ابوبکر بن عیاش کی تائید میں ہیں پہلی روایت میں ''فر'' (بھاگے) کا لفظ ہے اور دوسری میں ''مر'' یعنی گزرے کا لفظ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ راویوں میں فر اور مر کے الفاظ میں باہم تشابہ ہو گیا ہے، اور بعد کو پھر فر کی مناسبت سے عن المشرکین بڑھ گیا ہے، ابن سعد نے بسند حسن (جلد اول، ص: ۱۲۲) اس واقعہ کو ان الفاظ میں روایت کیا ہے جس سے تمام مسئلہ صاف ہو جاتا ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں اپنے سے پہلے کسی کا مسلمان ہونا نہیں جانتا، میں گھر کی بکریاں چرا رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ میرے پاس آئے اور دریافت فرمایا کہ تمہاری کسی بکری میں دودھ ہے، میں نے عرض کیا نہیں، آپ ﷺ نے ایک بکری کے تھن میں ہاتھ لگایا، فوراً دودھ اتر آیا، تو میں اپنے سے پہلے کسی مسلمان کا ہونا نہیں مانتا۔

آنحضرت ﷺ کے منہ سے ستر سورتیں سیکھیں، جن میں کوئی دوسرا میرا مقابلہ نہیں کرسکتا، ابن سعد میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ میرے اسلام لانے میں اسی معجزہ کا دخل ہے۔ 1

سست گھوڑے کا تیز رفتار ہو جانا

ابوطلحہ صحابی رضی اللہ عنہ کا گھوڑا نہایت سست رفتار اور مٹھا تھا، ایک دفعہ مدینہ میں شور وغل ہوا، آپ ﷺ نے اسی گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا چکر لگایا، وہ آپ کی سواری کی برکت سے اس قدر تیز ہو گیا کہ جب آپ ﷺ واپس تشریف لائے تو فرمایا کہ ''یہ تو دریا ہے۔'' اس کے بعد کوئی گھوڑا اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ 2

اندھیرے میں روشنی ہونا

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ دو صحابی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رات کو دیر تک حاضر رہے، جب واپس ہوئے تو رات بہت اندھیری تھی، مگر خدا کی قدرت کہ ان کے سامنے دو چراغوں کی طرح آگے آگے کوئی چیز روشن ہوگئی، جب دونوں الگ ہو کر اپنے اپنے گھر چلے تو ایک چراغ ایک کے ساتھ اور دوسرا دوسرے کے ساتھ ہو گیا، یہاں تک کہ دونوں گھر چلے گئے، 3 یہ صحیح بخاری کی روایت ہے۔ اس میں ان دونوں صحابیوں کے ناموں کی تصریح نہیں، لیکن حاکم، 4 ابن سعد، بیہقی اور ابونعیم 5 میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ان کے نام عباد بن بشر اور اسید بن حضیر رضی اللہ عنہما بتائے ہیں اور ان میں یہ اضافہ ہے کہ یہ روشنی ان کی لکڑیوں کے سروں میں پیدا ہوگئی تھی، ابونعیم کی ایک دوسری روایت میں جو حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے، عباد بن بشیر اور اسید بن حضیر رضی اللہ عنہما کے بجائے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے نام ہیں، روایت کی صحت کی صورت میں ممکن ہے کہ دوسرا واقعہ ہو، نیز حاکم بیہقی اور ابونعیم 6 میں اسی قسم کا واقعہ ابوعبس ابن جبر رضی اللہ عنہ صحابی جو ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھا کرتے تھے، ان کو بھی ایک دفعہ پیش آنا بیان کیا گیا ہے، تاریخ بخاری اور بیہقی میں ایک سفر میں اندھیری رات کو حضرت حمزۃ الاسلمی رضی اللہ عنہ کی انگلیوں کا روشن ہو جانا بھی مشہور ہے۔

جانور کا سجدہ کرنا

حدیث کی اکثر کتابوں میں چند الفاظ کے تغیر کے ساتھ یہ روایت مذکور ہے کہ ایک دفعہ ایک انصاری کا اونٹ باؤلا ہو گیا تھا، یا بگڑ گیا تھا، لوگوں نے جا کر آپ ﷺ کو خبر کی، آپ نے اس کے پاس جانا چاہا، تو سب نے روکا کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ آدمی کو کتے کی طرح کاٹ کھاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ

---

1 ابن سعد، ج ۱، ص: ۱۲۲۔ 2 صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب الركوب على الدابة الصعبة: ۲۸۶۲۔

3 صحیح بخاری، کتاب المناقب: ۳٦۳۹، باب منقبة اسید بن حضیر، و عباد بن بشر: ۳۸۰۵۔

4 مستدرك حاكم، كتاب معرفة الصحابة، ج ۳، ص: ۲۸۸۔ 5 دلائل النبوة لابی نعیم، ص: ۴۹۳ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے فتح الباری، باب منقبة اسید بن حضیر وعباد بن بشر، ج ۷، ص: ۹۴، ۹۵۔

6 دلائل النبوة لابی نعیم، ص: ۴۹۳۔

''مجھے اس کا خوف نہیں۔'' یہ کہہ آپ آگے بڑھے تو اونٹ نے آپ کے سامنے آ کر اپنی گردن ڈال دی، آپ نے اس پر ہاتھ پھیرا، اور اس کو پکڑ کر اس کے مالک کے حوالہ کر دیا پھر فرمایا: ''ہر مخلوق جانتی ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں، لیکن گناہ گار انسان اور نافرمان جن۔'' ❶ صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ منظر دیکھ کر کہا، یارسول اللہ ﷺ! جب جانور آپ کو سجدہ کرتے ہیں تو انسان کو سب سے پہلے کرنا چاہیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر کسی انسان کا دوسرے انسان کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔'' ❷

جانور کا آپ ﷺ کے مرتبہ کو پہچاننا

ایک دفعہ آپ ﷺ ایک انصاری کے باغ میں گئے ایک اونٹ کھڑا چلا رہا تھا، آپ کو دیکھ کر وہ بلبلانے لگا، اور اس کی دونوں آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، آپ نے قریب جا کر اس کے سر اور کنپٹی پر ہاتھ پھیرا تو وہ چپ ہوگیا، آپ نے دریافت فرمایا: ''یہ کس کا اونٹ ہے؟'' لوگوں نے ایک انصاری کا نام بتایا، وہ بلوائے گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم ان جانوروں پر جن کو خدا نے تمہارا محکوم بنایا ہے، رحم کیا کرو، اس اونٹ نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو، اور اس کو تکلیف دیتے ہو۔'' ❸

حافظہ بڑھ جانا

تمام صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایتیں سب سے زیادہ ہیں حالانکہ وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں صرف تین چار برس رہے تھے، لوگوں کو آج بھی اس پر تعجب ہے، وہ خود ان کے زمانہ میں بھی تھا لیکن حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمارے مہاجر بھائی تو بیوپار میں لگے رہتے تھے، اور انصاری بھائی اپنے کھیتوں میں، اور میرا آپ ﷺ کی خدمت میں حاضری کے سوا اور کوئی کام نہ تھا، ایک دن خدمت میں حاضر تھا کہ زبان مبارک سے نکلا کہ ''جو دامن پھیلا کر اس وقت میری باتیں سینہ میں سمیٹ لے گا وہ پھر کبھی نہ بھولے گا۔'' میں نے دامن پھیلایا جب کلام مبارک ختم ہوا، سینہ میں سمیٹ لیا، اس وقت سے میں کوئی بات نہ بھولا۔ ❹ صحیح بخاری میں یہی واقعہ ایک اور طرح سے بھی مذکور ہے، چنانچہ وہ آگے آئے گا۔

---

❶ دارمی :۱۸۔ ❷ امام احمد بن حنبل نے مسند میں متعدد صحابیوں کی سند سے یہ واقعہ نقل کیا ہے چنانچہ کتاب مذکور میں حضرت جابر، حضرت ابن عباس، حضرت انس رضی اللہ عنہم اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مسند ج ۶، ص: ۷۶ دیکھو نیز سنن نسائی وابن ابی شیبہ طبرانی اور بیہقی اہل دلائل نے اس ایک واقعہ کو ذرا ذرا سے لفظی اختلاف کے باعث متعدد واقعات بنا دیا ہے (البدایة والنهایة، ج ٦، ص: ١٣٩)

❸ ابوداود، کتاب الجهاد: ٢٥٤٩ ومسند احمد بسند عبدالله بن جعفر ومسلم بسند مهدی بن میمون البدایة ج ٦ ص ١٢٧ ابونعیم وغیرہ میں اسی واقعہ میں نامستند باتیں شامل ہیں۔

❹ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب حفظ العلم: ١١٩ وصحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب من فضائل ابی هريرة:٦٣٩٧۔

شفائے امراض

﴿ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴾ (٢٦/ الشعرآء: ٨٠)

پیغمبر دنیا میں درحقیقت بیمار دلوں کے روحانی طبیب بن کر آتے ہیں، مگر کبھی کبھی ارواح وقلوب کے معالجہ میں ان کو جسمانی امراض اور عوارض کا علاج بھی کرنا پڑتا ہے، تمام انبیا علیہم السلام میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی اس وصف میں سب سے ممتاز ہے، آنحضرت ﷺ کو بھی اس قسم کے معجزات کا وافر حصہ ملا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آنکھوں کا اچھا ہونا

حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت سلمہ بن اکوع اور حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ عنہم تین چشم دید گواہوں سے روایت ہے کہ غزوۂ خیبر میں جب آپ ﷺ نے علم عطا فرمانے کے لئے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا، تو معلوم ہوا کہ ان کی آنکھوں میں آشوب ہے، اور یہ آشوب جیسا مسند ابن حنبل میں ہے، ایسا سخت تھا کہ ایک صاحب (سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ) ان کا ہاتھ پکڑ کر لائے تھے، آپ نے ان کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن مل دیا اور دم کر دیا، وہ اسی وقت اچھی ہوگئیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی آنکھوں میں کبھی درد تھا ہی نہیں۔ ❶

ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا درست ہو جانا

حضرت عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ قلعہ میں داخل ہو کر جب ابو رافع یہودی کو قتل کر کے واپس آنے لگے تو کوٹھے کے زینہ سے گر پڑے، جس سے ان کی ایک ٹانگ میں سخت چوٹ آئی، پہلے پہل تو یہ چوٹ معلوم نہیں ہوئی لیکن بعد کو یہ حالت ہوئی جیسا کہ ابن اسحاق میں ہے کہ ان کے ہمراہی اٹھا کر ان کو لائے، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر واقعہ بیان کیا، آپ نے اس ٹانگ پر دست مبارک سے مسح کر دیا، اور وہ فوراً بالکل اچھی ہوگئی اور یہ معلوم ہونے لگا کہ کبھی چوٹ لگی ہی نہ تھی۔ ❷

تلوار کے زخم کا اچھا ہونا

غزوۂ خیبر میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی ٹانگ میں تلوار کا زخم لگ گیا، وہ آنحضرت ﷺ کے پاس آئے، آپ نے اس پر تین مرتبہ دم کر دیا، پھر انہیں کوئی شکایت محسوس نہ ہوئی، صرف نشان رہ گیا تھا۔ ❸

غزوۂ حنین میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاؤں میں زخم لگا، جب لڑائی ختم ہو چکی تو آنحضرت ﷺ کو معلوم

---

❶ بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر: ٤٢١٠ ومناقب علی: ٣٧٠١ کتاب الجهاد: ٢٩٤٢ وصحیح مسلم، باب من فضائل علی: ٦٢٢٣ ومسند ابن حنبل ج ٤ ص: ٥٢ سہیل بن سعد اور سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی روایت بخاری ومسلم دونوں میں ہے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی روایت صرف مسلم میں ہے۔

❷ بخاری، باب قتل ابی رافع: ٤٠٣٩ میں واقعہ دو طرح بیان ہوا ہے، یہاں ان دونوں میں تطبیق کر دی گئی ہے۔

❸ صحیح بخاری، باب غزوۃ خیبر: ٤٢٠٦؛ مسند احمد، ٤/ ٤٨۔

ہوا آپ ﷺ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی فرودگاہ پوچھتے ہوئے ان کے پاس آئے، دیکھا کہ کجاوہ سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہیں، آپ ﷺ نے ان کے زخم پر ایک نگاہ ڈالی، اور اس پر لعاب دہن ڈال دیا، زخم اچھا ہوگیا۔ [1]

اندھے کا اچھا ہونا

آپ ﷺ کی خدمت میں ایک اندھا حاضر ہوا اور اپنی تکلیفیں بیان کیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر چاہو تو دعا کردوں؟ اور اگر چاہو تو صبر کرو اور یہ تمہارے لئے اچھا ہے۔'' عرض کی دعا کیجئے فرمایا: ''اچھی طرح وضو کر کے یہ دعا مانگو کہ خداوندا! اپنی رحمت والے پیغمبر کے وسیلہ سے میری حاجت پوری کردے۔'' ترمذی [2] اور حاکم کی ایک روایت [3] میں اسی قدر ہے مگر ابن حنبل [4] اور حاکم [5] کی دوسری روایت میں اس کے بعد ہے کہ اس نے ایسا کیا تو فوراً اچھا ہوگیا، حاکم کی ایک اور روایت میں جو علی شرط البخاری ہے، یہ واقعہ ان الفاظ میں منقول ہے، حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ صحابی کہتے ہیں کہ ایک نابینا صحابی آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! میری خدمت کے لئے کوئی آدمی نہیں، مجھے سخت تکلیف ہے، فرمایا: ''وضو خانہ میں جا کر وضو کرو، پھر دو رکعت نماز پڑھو، اس کے بعد یہ دعا مانگو'' عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابھی ہم مجلس سے الگ بھی نہیں ہوئے تھے اور نہ کچھ زیادہ بات کرنے پائے تھے کہ وہ نابینا بینا واپس آیا تو ایسا معلوم ہوا کہ اس کو نابینائی کی بیماری کبھی تھی ہی نہیں۔ [6]

حبیب بن فدیک رضی اللہ عنہ ایک اور نابینا صحابی کے اچھے ہونے کا واقعہ ابن ابی شیبہ، طبرانی، بیہقی اور ابونعیم میں مذکور ہے، [7] مگر چونکہ اس کے سلسلۂ سند میں مجہول الاسم اشخاص ہیں، اس لئے اس کو قلم انداز کر دیا ہے۔

بلا دور ہونا

آپ ﷺ ایک سفر میں جا رہے تھے، راستہ میں ایک عورت بچہ کو لئے ہوئے سامنے آئی، اور کہا کہ یا رسول اللہ! اس کو دن میں کئی دفعہ کسی بلا کا دورہ ہوتا ہے، آپ نے بچہ کو اٹھا کر کجاوہ کے سامنے رکھا، اور تین بار کہا کہ ''اے خدا کے دشمن نکل، میں خدا کا رسول ہوں۔'' پھر لڑکے کو اس عورت کے حوالے کر دیا، سفر سے پلٹے تو وہ عورت دو دنبے لے کر حاضر ہوئی، اور عرض کی یا رسول اللہ! میرا ہدیہ قبول فرمائیے، خدا کی قسم! پھر بچے کے پاس وہ بلا نہ آئی، آپ ﷺ نے ایک دنبہ قبول فرما لیا، اور دوسرے کو واپس کر دیا۔ [8]

---

[1] مسند احمد، ج ٤، ص: ٨٨ وعبدالرزاق وعبد بن حمید وابن عساکر۔ [2] ترمذی، کتاب الدعوات:٣٥٧٨۔
[3] مستدرک، ج ١، ص: ٥١٩۔ [4] مسند، ج ٤، ص: ١٣٨۔ [5] مستدرک، ج ١، ص: ٥٢٦۔
[6] مستدرک، ج ١، ص: ٥٢٦۔ [7] دلائل ابی نعیم، ص: ١٦٠ واصابه ترجمة حبيب بن فديك، ج ١، ص: ٣٠٨۔ [8] مسند ابن حنبل، جلد ۴، صفحہ: ۱۷۰، ۱۷۱ میں دو حسن روایتوں سے حضرت یعلی بن مرہ سے یہ واقعہ مذکور ہے، علاوہ ازیں ابن ابی شیبہ اور حاکم میں بھی یہ منقول ہے، دارمی صفحہ ۷ میں یہ واقعہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے جس سلسلہ سند سے مذکور ہے وہ مستند نہیں، نیز دارمی اور ابونعیم میں اسی قسم کا ایک اور واقعہ (یعنی ایک جن کا ایک بچہ پر مسلط ہونا اور آپ ﷺ کے اثر سے ایک کتے کے پلہ کی شکل میں نکل کر بھاگنا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ بھی صحیح نہیں)

گونگے کا بولنا

حجۃ الوداع میں آپ ﷺ کی خدمت میں ایک عورت اپنے بچہ کو لے کر حاضر ہوئی اور عرض کی کہ یہ بولتا نہیں، آپ نے پانی منگایا، ہاتھ دھویا اور کلی کی اور فرمایا کہ یہ پانی اس کو پلا دو اور کچھ اس کے اوپر چھڑک دو، دوسرے سال وہ عورت آئی تو بیان کیا کہ لڑکا بالکل اچھا ہو گیا اور بولنے لگا۔ ❶

مرض نسیان کا دور ہونا

ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آکر شکایت کی کہ یا رسول اللہ! قرآن یاد کرتا ہوں تو بھول جاتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس طرح نماز پڑھ کر یہ دعا مانگو۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اسی طرح کیا اور فائدہ ہوا اور جا کر آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ پہلے چار چار آیتیں یاد کرتا تھا اور اب چالیس چالیس آیتیں یاد کر لیتا ہوں، پہلے بات بھول جاتا تھا اور اب حرف حرف یاد رہتا ہے۔ ❷

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے طائف کا عامل مقرر فرمایا، انہوں نے وہاں سے آکر بیان کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھے یہ مرض پیدا ہو گیا ہے کہ نماز میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کیا پڑھتا ہوں، آپ نے پاس بلا کر ان کے سینہ پر ہاتھ مارا اور منہ میں دم کیا، پھر یہ حالت بالکل زائل ہو گئی۔ ❸

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی ایک دفعہ حافظہ کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''دامن پھیلاؤ۔'' انہوں نے پھیلایا، آپ ﷺ نے اس میں ہاتھ ڈالا، پھر فرمایا: ''اب اس کو سمیٹ لو۔'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا، تب سے پھر میں کوئی بات نہ بھولا۔ ❹

بیمار کا تندرست ہونا

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ وہ ایک دفعہ سخت بیمار ہوئے، آنحضرت ﷺ ان کی عیادت کو تشریف لے گئے، تو فرمایا: ''یہ دعا سات دفعہ پڑھو اور ہاتھ بدن پر پھیرو۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا تو خدا نے میری بیماری دور کر دی اور اب میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھی یہ دعا بتایا کرتا ہوں۔ ❺

ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ اس قدر بیمار ہوئے کہ موت کی دعا کرنے لگے، آپ ﷺ کا گزر ہوا تو ان کو اس پر تنبیہ کی اور دعا فرمائی، پھر ان کو اس مرض کی تکلیف محسوس نہ ہوئی۔ ❻

---

❶ سنن ابن ماجه، ابواب الطب، باب النشرة: ٣٥٣٢ وابو نعيم، ص: ١٦٧ ابن ابی شیبه۔

❷ جامع ترمذی، ابواب الدعوات: ٣٥٧٠ ومستدرك حاكم، ج ١، ص: ٣١٦ ذہبی نے جودت سند کے باوجود اس روایت میں کلام کیا ہے۔ ❸ سنن ابن ماجه، کتاب الطب، باب الفزع والارق: ٣٥٤٨۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب المناقب: ٣٦٤٨۔ ❺ جامع ترمذی، کتاب الطب، باب کیف یدفع الوجع عن نفسه: ٢٠٨٠۔

❻ جامع ترمذی، ابواب الدعوات: ٣٥٦٤، بروایت حسن وصحیح حاکم فی المستدرک۔

ایک جلے ہوئے بچے کا اچھا ہونا

محمد بن حاطب رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں، وہ جب بچے تھے، تو اپنی ماں کی گود سے گر کر آگ میں گر پڑے، اور کچھ جل گئے، ان کی ماں ان کو لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئیں آنحضرت ﷺ نے اپنا لعاب دہن ان پر ملا، اور دعا پڑھ کر دم کیا، طیالسی اور ابن حنبل میں اسی قدر ہے، مگر امام بخاری نے تاریخ میں بہ سند بیان کیا ہے کہ محمد بن حاطب رضی اللہ عنہ کی ماں کہتی تھیں کہ بچے کو لے کر میں وہاں سے اٹھنے بھی نہیں پائی تھی کہ بچہ کا زخم چنگا ہو گیا۔ [1]

جنون دور ہونا

ایک شخص نے آ کر درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرا بھائی بیمار ہے، دعا کیجئے، پوچھا: ''کیا بیماری ہے؟'' عرض کی، اس پر جنون کا اثر ہے، فرمایا: ''اس کو لے آؤ۔'' وہ آیا تو آپ نے قرآن مجید کی متعدد سورتیں پڑھ کر جھاڑ دیا، وہ کھڑا ہوا تو اس پر جنون کا کوئی اثر نہ تھا۔ [2]

---

[1] مسند ابوداود طیالسی، ص: ۱۶۵؛ مسند احمد، ج ٤، ص: ۲۵۹، تاریخ بخاری کی روایت ابن عبدالبر نے بہ سند استیعاب (ترجمہ محمد بن حاطب رضی اللہ عنہ میں) اور سیوطی نے خصائص کبری، ج ۲، ص: ٦٩ میں نقل کی ہے۔

[2] سنن ابن ماجه، کتاب الطب باب الفزع والارق: ۳٥٤٩، اس روایت کے سلسلۂ سند میں ابوخباب ایک راوی ہیں جن پر تدلیس کا الزام ہے، مگر اس روایت میں تو تدلیس کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا، واللہ اعلم۔

استجابتِ دُعا

منجملہ دیگر علامتوں کے اللہ کی بارگاہ میں دعاؤں کا قبول ہونا بھی ایک بڑی علامت ہے، جس سے نیک اور مقبول بندوں کی پہچان اور شناخت ہوتی ہے، انبیائے الٰہی سے بڑھ کر خدا کے نیک اور مقبول بندے اور کون ہو سکتے ہیں؟ اسی لئے اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کو شرف اجابت بخشتا ہے اور ان کی نداؤں کو جو دل کے اندر سے نکلتی ہیں، سمع قبول سے سنتا ہے، حضرت آدم علیہ السلام نے ندامت کے ساتھ خدا کو پکارا تو اس نے ان کو معاف کر دیا، حضرت نوح علیہ السلام نے طوفانی عذاب کی درخواست کی تو پوری ہوئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لئے نبوت اور برکت کی دعا کی تو قبول ہوئی، حضرت یونس علیہ السلام نے سمندر کی تہ میں سے خدا کو پکارا تو اس نے سنا، حضرت زکریا علیہ السلام نے خانوادۂ نبوت کے لئے ایک وارث مانگا تو دیا گیا۔ آنحضرت ﷺ نے بھی بارگاہ الٰہی میں دعائیں مانگیں، حاجتمندیوں میں اس کے آگے ہاتھ پھیلائے، تنہائیوں میں اس کی رفاقت چاہی، بے کسیوں میں اس کی نصرت مانگی، فقر و فاقہ میں اس کے خزانۂ غیب سے مدد طلب کی، حق کی اشاعت میں اس کی اعانت کی درخواست کی، نیک بندوں کے حق میں اپنے آپ کو اس کے سامنے شفیع بنایا، شریروں کے دفع شر کے لئے اس کی غیبی امداد کا سہارا ڈھونڈا، اور ان میں سے ہر موقع پر آپ ﷺ کے لئے قبول و اجابت کا دروازہ کھول دیا گیا۔

مسند احمد میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ جب کبھی کسی کے حق میں دعا فرماتے تھے تو وہ نہ صرف اسی کے بلکہ اس کی اولاد در اولاد کے حق میں مستجاب ہوتی تھی ❶ صحیح مسلم میں ہے کہ جب کسی کے متعلق آپ ﷺ "یرحمہ اللہ" یعنی "خدا اس پر رحمت کرے" فرماتے تھے تو صحابہ رضی اللہ عنہم سمجھ جاتے تھے کہ اس کو شہادت نصیب ہو گی۔ ❷ چنانچہ ایسا ہی ہوتا تھا، یہاں تک کہ وہ بھی جو آپ ﷺ کی دعوت حق کے سخت منکر تھے اور اس امر کا دل سے یقین رکھتے تھے کہ محمد ﷺ کی دعاؤں میں حیرتناک تاثیر ہے، مکہ میں جب قحط پڑا تو ابوسفیان نے بھی بحالت کفر اسی آستانہ پر حاضر ہو کر دعائے رحمت کی درخواست کی ❸ ابوجہل وغیرہ رؤسائے قریش کے حق میں جو آپ ﷺ کی نماز میں خلل انداز ہوئے تھے، جب آپ نے بددعا کی تو وہ خوف سے کانپ اٹھے ❹ یہ واقعات بہ تفصیل پہلے گزر چکے ہیں، اس لئے یہاں موضوع سخن کی تقریب سے اختصار پر اکتفا کی جاتی ہے۔

---

❶ مسند احمد بروایت حضرت حذیفة، ج ٥، ص: ٣٨٥۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب غزوة خيبر: ٤٦٦٨، ٤٦٦٩۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورة الدخان: ٤٨٢٤۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب اذا القی علی ظهر المصلی.....: ٢٤٠ ومسلم باب ما لقی النبی ﷺ من اذی المشرکین: ٤٦٤٩۔

قریش پر عذاب آنا اور اس کا دور ہونا

قریش نے جب اسلام کی سخت مخالفت کی تو خدا نے ان پر قحط کا عذاب بھیجا، اہل مکہ سخت مصیبت میں مبتلا ہوئے، بالآخر سوا اس کے کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ اسی رحمت عالم ﷺ کی بارگاہ کی طرف رجوع کریں، قریش کے بعض رئیسوں نے خدمت نبوی ﷺ میں جا کر عرض کی کہ اے محمد ﷺ! تمہاری قوم برباد ہوگئی، اللہ سے دعا کرو کہ وہ اس مصیبت سے اس کو نجات دے، رحمت عالم ﷺ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، دعا قبول ہوئی، خوب پانی برسا اور اہل مکہ کو قحط کے عذاب سے نجات ملی۔ [1]

رؤسائے قریش کے حق میں بد دعا

آپ ﷺ ایک دفعہ صحن حرم میں نماز پڑھ رہے تھے کہ بعض رؤسائے قریش نے عین حالت نماز میں آپ کی گردن مبارک پر نجاست ڈال دی، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آ کر جب یہ نجاست ہٹائی اور آپ نے سجدہ سے سر اٹھایا تو نام بنام دعا مانگی کہ ''خداوندا! ان کو تو پکڑ۔'' سب کے سب بدر کی لڑائی میں مارے گئے۔ [2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا

ایک طرف قریش کے سربر آوردہ اصحاب اور داعی اسلام کی عداوت اور دشمنی کی کوششوں میں مصروف تھے اور دوسری طرف داعی اسلام ﷺ ان کی ہدایت و راہنمائی کے پر محبت ولولوں سے معمور تھا، ابوجہل و عمر کہ دونوں آنحضرت ﷺ کی دشمنی میں سب سے زیادہ سخت اور مستقل تھے، ان ہی کی ہدایت کا پر شوق ارمان آپ کے قلب مبارک میں سب سے زیادہ تھا، جب تبلیغ و دعوت کے دوسرے حربے ان پر کامیاب نہ ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے ان سب سے کارگر حربہ کو ان کے مقابلہ میں استعمال کیا، جس کے وار کی کوئی روک نہیں ہو سکتی تھی، آپ ﷺ نے دعا فرمائی کہ ''خداوندا! ابوجہل و عمر میں جو تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہو، اس سے اسلام کو معزز کر۔'' [3] ابن ماجہ اور حاکم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام لیا تھا، [4] اس دعا کو ابھی چند روز بھی نہیں گزرے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے،

---

[1] صحیح بخاری، تفسیر سورۃ دخان: ٤٨٢٤ وصلوۃ الاستسقاء: ١٠٠٧ [2] صحیح بخاری، کتاب المغازی: ٣٩٦٠۔ [3] جامع ترمذی، ابواب المناقب: ٣٦٨٣ حدیث حسن غریب ترمذی کے اسی باب میں اسی مضمون کی ایک اور روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے، اس میں اس قدر اضافہ ہے کہ اس دعا کے دوسرے ہی دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے، مگر اس روایت میں ایک راوی قابل اعتراض ہے، ترمذی کے علاوہ یہ روایت ابن سعد میں تین مختلف سلسلوں سے بہ سند حسن مذکور ہے، (جلد ۳، حصہ اول، صفحہ: ۱۹۱) حافظ ابن حجر نے اصابہ (ترجمہ عمر) میں لکھا ہے کہ یہ روایت مسند ابو یعلیٰ اور عبد بن حمید وغیرہ میں بھی ہے، خصائص سیوطی میں ہے کہ یہ روایت حاکم، طبرانی، ابن ماجہ، احمد اور صحیح ابن حبان میں بھی ہے۔

[4] ابن ماجہ، کتاب السنۃ، باب، فضل عمر: ١٠٥؛ مستدرك حاكم، كتاب معرفة الصحابة، مناقب امير المؤمنين عمر، ج ٣، ص: ٨٣۔

کارساز قدرت نے اس دعا کے قبول و تاثیر کا سامان کیونکر پیدا کیا؟ روایتوں میں اس کی تفصیل میں کچھ اختلاف ہے، استاذ مرحوم نے سیرت کی پہلی جلد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کا واقعہ جس طرح لکھا ہے وہ حرف حرف الفاروق کی نقل ہے، اس میں مذکور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن سے لے کر جو سورہ پڑھی اور جس سے متاثر ہو کر وہ مسلمان ہوئے، وہ ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ﴾ یعنی سورۂ حدید تھی، اس میں شک نہیں کہ بزار، طبرانی، بیہقی اور ابونعیم میں یہ روایت بھی ہے لیکن حد درجہ کمزور ہے، علاوہ ازیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام مکہ کا واقعہ ہے، اور سورۂ حدید مدنی ہے، اس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیونکر اس وقت پڑھ سکتے تھے، استاذ مرحوم نے الفاروق میں یہ واقعہ کتب رجال و تاریخ کے حوالہ سے نقل کیا ہے، لیکن حدیث و سیر کی صحیح روایتوں میں یہ واقعہ دو صورتوں سے مذکور ہوا ہے، ایک تو وہی مشہور صورت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تلوار کمر سے لگا کر آنحضرت ﷺ کے قتل کے ارادہ سے نکلے تھے کہ راہ میں ایک مسلمان سے ملاقات ہوگئی، اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارادہ کا حال سن کر کہا کہ پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو، تمہاری بہن اور بہنوئی اس نئے دین میں داخل ہو چکے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصہ میں اپنی بہن کے گھر گئے اور مار پیٹ کی، بالآخر انہوں نے قرآن کی ایک سورہ بہن سے لے کر پڑھی، اور وہ سورۂ طٰہٰ تھی، اور جب اس آیت پر پہنچے:

﴿اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ (۲۰/ طٰهٰ:۱٤)

''میں ہوں خدا، کوئی خدا نہیں لیکن میں، تو مجھ کو پوجو، اور میری یاد کے لئے نماز کھڑی کرو۔''

تو یہ اثر ہوا کہ دل سے لا الہ الا اللہ پکار اٹھے اور در اقدس پر حاضری کی درخواست کی یہ روایت بہ سند [1] ابن سعد، ابویعلیٰ، دارقطنی، حاکم [2] اور بیہقی میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، لیکن حد درجہ کمزور ہے، یہ دو طریقوں سے مروی ہے، اور ان دونوں میں ایسے رواۃ ہیں جو قبول کے لائق نہیں، اور محدثین

---

[1] طبع اول میں ہم نے اس واقعہ کو لکھا تھا، کہ وہ ''بہ سند صحیح'' مذکور ہے، مگر تحقیق سے یہ واقعہ اس مرتبہ صحیح کا نہیں ثابت ہوا۔ دارقطنی نے اس روایت کو مختصراً لکھ کر کہا ہے کہ اس کا ایک راوی قاسم بن عثمان بصری قوی نہیں کتاب الطهارة، باب في نهي المحدث عن مس القرآن) ذہبی نے مستدرک حاکم (جلد۴، صفحہ:۵۹) کے استدراک میں لکھا ہے کہ یہ روایت واہی اور منقطع ہے اور میزان الاعتدال میں قاسم بن عثمان بصری کے حال میں جو اس روایت کا ایک راوی ہے لکھا ہے، کہ اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کا پورا قصہ بیان کیا ہے، وهي منكرة جدًا۔ اور وہ نہایت ہی منکر ہے کنز العمال (فضائل عمر بن الخطاب) میں بھی اس روایت کی کمزوری ظاہر کی گئی ہے۔ ان روایتوں کے مشترک راوی اسحاق بن یوسف، قاسم بن عثمان اور اسحاق بن ابراہیم الحسینی اور اسامہ بن زید بن اسلم ہیں اور یہ سب پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں لیکن بایں ہمہ کہ یہ روایت اپنی سند کے لحاظ سے نہایت کمزور ہے، تاہم اس میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں، ان میں سے متعدد ٹکڑوں کی صحیح روایتوں سے تائید ملتی ہے، مثلاً: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنی بہن اور بہنوئی کو ان کے مسلمان ہو جانے پر آزار دینا (بخاری، باب اسلام سعيد بن زيد: ۳۸٦۲) اور آنحضرت ﷺ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کے لئے دعائے خیر کرنا (ترمذی: ۳٦۸۳) اور متعدد طریقوں سے ایک واقعہ کا ذکر ہونا گو وہ سب ضعیف ہی کیوں نہ ہوں کچھ نہ کچھ اصلیت کا پتہ دیتا ہے، اس لئے ہم نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے۔

[2] مستدرك حاكم، كتاب معرفة الصحابة، ج ٤، ص: ٥٩۔

نے اس کی تصریح کی ہے۔

دوسری روایت مسند ابن حنبل میں ❶ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک شب میں آنحضرت ﷺ کے چھیڑنے کو نکلا، آپ بڑھ کر مسجد حرام میں داخل ہو گئے، اور نماز شروع کر دی اس وقت آپ نے سورۃ الحاقہ تلاوت فرمائی، میں کھڑا استنا رہا اور قرآن کے نظم اور اسلوب سے حیرت میں تھا، دل میں کہا خدا کی قسم! یہ شاعر ہے، جیسا قریش کہا کرتے ہیں، ابھی یہ خیال تھا ہی کہ آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی:

﴿ إِنَّهُۥ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ ۝ ﴾

(٦٩/ الحاقة: ٤٠، ٤١)

''یہ ایک بزرگ قاصد کا کلام ہے اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں، تم بہت کم ایمان رکھتے ہو۔''

میں نے کہا یہ تو کاہن ہے، میرے دل کی بات جان گیا کہ اس کے بعد ہی یہ آیت پڑھی:

﴿ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ ﴾

(٦٩/ الحاقة: ٤٢، ٤٣)

''یہ کاہن کا کلام بھی نہیں، تم بہت کم نصیحت پکڑتے ہو، یہ تو جہانوں کے پروردگار کی طرف سے اترا ہے۔''

آپ ﷺ نے یہ سورہ آخر تک پڑھی اور اس کو سن کر اسلام میرے دل میں پوری طرح گھر کر گیا۔

ابن اسحاق نے ان دونوں روایتوں کو بہت کچھ گھٹا بڑھا کر بغیر کسی سند کے اپنی سیرت میں لکھا ہے، اس لئے، وہ اس باب میں سند کے قابل نہیں، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں یہ دونوں روایتیں لکھ کر چھوڑ دی ہیں ❷ اور یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ ان دونوں واقعوں میں سے مرجح کون ہے؟ اور اگر دونوں قابل قبول ہیں تو ان کی ترتیب کیا ہے؟ میرا خیال یہ ہے کہ اگر یہ دونوں واقعے صحیح ہیں تو ان کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو نماز میں سورۃ الحاقہ پڑھتے سنا اور اس سے ان کو اسلام کی طرف میلان ہوا، جیسا کہ ان کے اس فقرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوقع الاسلام فی قلبی کل موقع یعنی ''اسلام میرے دل میں پوری طرح بیٹھ گیا'' تاہم چونکہ وہ طبعاً مستقل اور پختہ کار تھے، اس لئے اپنے اسلام کا انہوں نے اعلان نہیں کیا، بلکہ اس اثر کو وہ شاید روکتے رہے، لیکن اس کے بعد جب ان کی بہن کا واقعہ پیش آیا اور سورہ طٰہٰ پر نظر پڑی تو پھر دل پر قابو نہ رہا اور جوش حق کا چشمہ ان کی زبان و دل سے بے اختیار ابل پڑا اور فوراً در اقدس پر حاضری کی

❶ مسند ابن حنبل، ج ١، ص: ١٧۔ اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں، لیکن ابتدائی راوی کی ملاقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں اس لئے اس میں انقطاع ہے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کے بارہ میں سب سے محفوظ روایت یہی ہے۔

❷ الاصابة، تذكرة عمر، ج ٢، ص: ٥١٩؛ تذكرة فاطمة بنت خطاب، ج ٨، ص: ١٦١۔

درخواست پیش کی، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا یہ شوق ظاہر کیا، حضرت خباب رضی اللہ عنہ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن اور بہنوئی کو سورۂ مذکور کی تعلیم دے رہے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز سن کر گھر میں چھپ گئے تھے، ❶ بے تامل نکل کر سامنے آ گئے اور بشارت دی کہ ''اے عمر! نوید مژدہ کہ جمعرات کی رات کو تمہارے حق میں آنحضرت ﷺ نے جو دعا کی تھی شاید اس کے پورے ہونے کا دن آ گیا، حضور ﷺ نے دعا فرمائی تھی کہ ''خداوندا! عمر بن خطاب یا عمرو بن ہشام (ابوجہل) سے اسلام کو عزت دے۔''

غور کرو کہ یہ دعائے نبوی ﷺ کس طرح حرف بحرف پوری ہوئی، نہ صرف یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا، بلکہ ان کی ذات سے اسلام کو وہ عزت نصیب ہوئی جس کا ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی دنیا کو اعتراف ہے، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ گواہی دیتے ہیں کہ مَازِلْنَا اَعِزَّةً مُنْذُ اَسْلَمَ عُمَرُ۔ ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے، ہم مسلمانوں کو عزت اور قوت حاصل ہوگئی۔'' ❷ اسلام کی اس عزت کو اگر سوانح فاروقی کے کارناموں میں تلاش کرو، تو دعائے نبوی ﷺ کے قبول و اجابت کا پر حیرت سماں نگاہوں کے سامنے گزر جائے گا۔

سراقہ کے گھوڑے کے پاؤں کا دھنس جانا

جب آپ ﷺ ہجرت کی غرض سے مدینہ کو روانہ ہوئے، تو کفار کے جاسوسوں میں سراقہ نے آپ ﷺ کا پیچھا کیا اور آپ سے اس قدر قریب آ گیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گھبرا کے بول اٹھے کہ ''ہم آ لئے گئے'' آپ نے ان کی دل دہی کی اور دعا فرمائی جس کے اثر سے اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے، سراقہ نے یہ حالت دیکھ کر کہا کہ تم دونوں نے مجھے بددعا دی، اب دعا کرو تو میں تمام لوگوں کو تمہارے تعاقب سے واپس لے جاؤں۔ آپ ﷺ نے اس کے لئے دعا فرمائی اور اس نے مصیبت سے نجات پائی، وہاں سے واپس آیا تو تمام تعاقب کرنے والوں کو واپس لے گیا۔ ❸

مدینہ کی آب وہوا کے لئے دُعا

مدینہ کی آب وہوا اچھی نہ تھی، وبا کا بھی اثر تھا، اکثر مہاجرین یہاں آ کر بیمار پڑ گئے، اس حالت میں لوگوں کو بار بار اپنا وطن مکہ یاد آنے لگا، ❹ یہ دیکھ کر آنحضرت ﷺ نے دعا فرمائی کہ ''الٰہی! مدینہ کو بھی ہمارے لئے ویسا ہی محبوب کر دے، جیسا کہ ہم کو مکہ محبوب ہے، بلکہ اس سے زیادہ محبوب بنا دے، الٰہی!

---

❶ خباب کا ذکر حاکم اور دارقطنی کی روایتوں میں بھی ہے۔ لیکن بشارت کا ذکر ابن سعد کی روایت میں ہے۔ (طبقات جز ثالث فی البدریین، ص:۱۹۲)۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اسلام عمر: ۳۸۶۳۔
❸ بخاری باب هجرة النبی ﷺ: ۳۹۰۶۔ ❹ صحیح بخاری، باب مقدم النبی ﷺ: ۳۹۲۶ وصحیح مسلم باب الترغیب فی سکنی المدینة: ۳۳۳۶۔

ہمارے صاع اور مد میں برکت دے اور اس کو ہمارے لئے صحت بخش بنا دے اور یہاں کا بخار جحفہ میں منتقل کر دے۔'' ❶ یہ دعا حرف بہ حرف قبول ہوئی، مہاجرین کو اس شہر سے جو محبت ہوگئی وہ ان کی زندگی کے واقعات سے ظاہر ہے، وہی ابوبکر و بلال رضی اللہ عنہما جو چند روز میں یہاں سے گھبرا اٹھے تھے اس کے ایسے والہ وشیدا ہوئے کہ پھر مکہ کا نام بھی نہیں لیا، اور آنحضرت ﷺ کو یہاں سے وبا کا دور ہونا خواب میں دکھایا گیا۔ ❷

قحط کا دور ہونا اور پانی کا برسنا

ہجرت سے پہلے مکہ میں جب قحط پڑا تھا، تو مسلمانوں نے نہیں کافروں نے جا کر آپ ﷺ سے درخواست کی کہ دعا کیجئے، آپ نے دعا فرمائی تو پانی برسا، ❸ حضرت ابوطالب عم رسول نے شاید اسی منظر کو دیکھ کر آپ کی مدح میں یہ شعر کہا تھا:

وابیض یستسقی الغمام بوجهه ثمال الیتامی عصمة للارامل ❹

''محمد ﷺ گورے رنگ والا ہے، اس کے چہرے کے وسیلہ سے ابر باراں کی سیرابی مانگی جاتی ہے، یتیموں کی جائے پناہ اور بیواؤں کا بچاؤ ہے۔''

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آپ ﷺ جب پانی برسنے کی دعا مانگتے تو میں آپ کے چہرۂ مبارک کو تکتا رہتا، اور ابوطالب کا یہ شعر یاد آتا، آپ دعا مانگ کر منبر سے اترنے بھی نہیں پاتے تھے کہ مدینہ کا ہر پرنالہ زور وشور سے بہنے لگتا، ❺ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے متعدد واقعات حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے گزرے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں جب قحط پڑا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دعا مانگی کہ ''خداوندا! ہم اپنے پیغمبر ﷺ کی زندگی میں اس کو وسیلہ بنا کر تیرے سامنے پیش کرتے تھے تو تو ہم کو سیراب کرتا تھا۔'' ❻

ایک دفعہ مدینہ میں خشک سالی ہوئی، آنحضرت ﷺ مسلمانوں کو لے کر نکلے، اور کھڑے ہو کر بارگاہ الٰہی میں دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر دعا مانگی، پھر قبلہ رخ ہو کر چادر اُلٹی اور دو رکعت نماز پڑھی، ابر آیا، پانی برسا اور لوگ سیراب ہوئے۔ ❼

دعائے نبوی ﷺ سے پانی برسنے کا سب سے حیرت انگیز لیکن مستند تر واقعہ حسب ذیل ہے، جو متعدد طریقوں اور سلسلوں سے احادیث میں مذکور ہے، واقعہ یہ ہے کہ ایک بار مدینہ اور اطراف مدینہ میں قحط پڑا،

---

❶ ایضاً۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب اذا رای انه اخرج شیئا من کوة: ۷۰۳۸۔

❸ صحیح بخاری، ابواب الاستسقاء، باب دعا النبی ﷺ: ۱۰۰۷۔ ❹ ایضاً: ۱۰۰۸، ۱۰۰۹۔

❺ صحیح بخاری، ابواب الاستسقاء، باب سوال الناس الامام الاستسقاء اذا قحطوا: ۱۰۱۰ وابن ماجه ابواب الاستسقاء: ۱۲۷۲۔ ❻ صحیح بخاری، ابواب الاستسقاء: ۱۰۱۰۔

❼ ایضاً: ۱۰۱۲؛ مسلم: ۲۰۷۳؛ ترمذی، ابواب الاستسقاء: ۵۵۶۔

آنحضرت ﷺ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ اسی حالت میں ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! مویشی ہلاک ہو گئے، لوگ بھوکوں مر گئے، خدا سے دعا فرمایئے کہ ہم کو سیراب کرے، آپ ﷺ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، یہ اثر ہوا کہ پہلے تو آسمان آئینہ کی طرح صاف تھا، اوراب ایک آندھی چلی، بادل امنڈ آئے اور آسمان کا دہانہ کھل گیا، لوگ مسجد سے نکلے تو پانی میں بھیگتے ہوئے مکان تک پہنچے، ایک ہفتہ تک مسلسل پانی برستا رہا، یہاں تک کہ لوگ گھبرا اٹھے اور دوسرے جمعہ کو اسی آدمی نے یا کسی اور نے کہا، یارسول اللہ ﷺ! مکانات گر گئے، دعا کیجئے کہ خدا پانی کو روک لے، آنحضرت ﷺ مسکرائے اور دعا فرمائی، بادل پھٹ گئے اور مدینہ تاج کی طرح چمک اٹھا۔ [1]

ابن ماجہ باب الاستسقاء میں اس قسم کے دو واقعے اور لکھے ہیں، اگر وہ اس واقعہ سے الگ ہیں تو اس قسم کے دو واقعوں کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حق میں دعائے برکت

آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ ان کو چادر میں لپیٹ کر لائیں، اور آپ کی خدمت میں بطور خادم کے پیش کیا اور ان کے لئے دعا کی درخواست کی، آپ نے ترقی مال واولاد کی دعا دی، حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ''آج اس دعا کی برکت سے میرے پاس بہ کثرت دولت ہے اور میرے لڑکوں اور پوتوں کی تعداد سو کے قریب پہنچ گئی ہے۔'' [2] اور اس دعا کا یہ اثر تھا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا ایک باغ تھا جو سال میں دو بار پھل لاتا تھا اور اس میں ایک پھول کا درخت تھا جس سے مشک کی بو آتی تھی۔ [3]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں دعائے علم

ایک بار آپ ﷺ قضائے حاجت کے لئے گئے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے پہلے ہی سے وضو کا پانی بھر کے رکھ دیا، آپ نے ان کو تفقہ فی الدین کی دعا دی، [4] چنانچہ ان کو یہ درجہ حاصل ہوا کہ انہوں نے ''حبر الامة'' کا خطاب پایا۔

حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا کے حق میں دعائے شہادت

ایک روز آپ ﷺ ام حرام رضی اللہ عنہا کے مکان پر تشریف لے گئے انہوں نے آپ کو کھانا کھلایا، اور سر سے جوئیں نکالنے لگیں اور اسی حالت میں آپ کو نیند آ گئی، پھر ہنستے ہوئے بیدار ہوئے، تو ام حرام رضی اللہ عنہا نے

---

[1] صحیح بخاری، باب علامات النبوۃ: ۳۵۸۲ وصحیح مسلم، کتاب صلوۃ الاستسقاء: ۲۰۷۸۔

[2] مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ باب من فضائل انس بن مالک: ۶۳۷۶۔ [3] ترمذی، ابواب المناقب: ۳۸۳۳۔

[4] مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل عبداللہ بن عباس: ۶۳۶۸۔

ہنسی کی وجہ پوچھی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت میں سے مجاہدین کا ایک گروہ میرے سامنے پیش کیا گیا جو بغرض جہاد دریا میں اس طرح سوار ہو کر چلے گا جس طرح تخت پر بادشاہ۔'' ام حرام رضی اللہ عنہا نے درخواست کی کہ خدا سے دعا فرمائیے کہ میں بھی انہی میں سے ہوں، چنانچہ آپ نے دعا فرمائی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ان کو بحری جنگ کا شرف حاصل ہوا اور دریا سے نکل کر خشکی میں آئیں تو سواری سے گر کر درجہ شہادت حاصل کیا۔ ❶

ایک نوجوان کی ہدایت کے لئے دعا

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ صحابی بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ایک دن اصحاب کے حلقہ میں تشریف فرما تھے، ایک نوجوان نے آ کر کہا کہ یارسول اللہ! مجھے زنا کی اجازت دیجئے۔ یہ سن کر چاروں طرف سے اس پر لوگوں نے ملامت شروع کی۔ آپ نے روکا پھر اس نوجوان کو اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور دل دہی سے پوچھا کہ ''تم اس فعل کو اپنی ماں کے لئے پسند کرو گے۔'' عرض کی، آپ پر قربان نہیں یارسول اللہ! فرمایا: ''تو اور لوگ بھی اپنی ماؤں کے لئے نہیں پسند کریں گے۔ تو کیا تم اپنی بیٹی کے لئے یہ پسند کرو گے؟'' عرض کی نہیں یارسول اللہ! تو فرمایا: ''تو اور لوگ بھی اپنی ماؤں کے لئے اس کو نہ پسند کریں گے۔ تو کیا اپنی بیٹی کے لئے یہ پسند کرو گے؟'' عرض کی نہیں یارسول اللہ! فرمایا: ''تو اور لوگ بھی اپنی بیٹیوں کے لئے یہ پسند نہ کریں گے۔ تو کیا اپنی بہن کے لئے یہ پسند کرو گے۔'' گزارش کی نہیں یارسول اللہ! فرمایا: ''تو اور لوگ بھی اپنی بہنوں کے لئے یہ پسند نہیں کریں گے۔'' پھر اس طرح خالہ اور پھوپھی کے متعلق آپ ﷺ نے پوچھا، اس نے وہی جواب دیا اور آپ بھی اسی طرح فرماتے گئے۔ اس کے بعد اس پر ہاتھ رکھ کر دعا کی کہ ''خداوندا! اس کے گناہوں کو بخش اور اس کے دل کو پاک اور اس کو عصمت عطا کر۔'' ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد اس نوجوان کا یہ حال تھا کہ وہ کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ ❷

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی شفایابی کے لئے دعا

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں آنحضرت ﷺ کی ہم رکابی میں مکہ گیا اور وہاں جا کر ایسا سخت بیمار ہوا کہ مرنے کے قریب ہو گیا۔ یہاں تک کہ وصیت کی تیاری کی۔ آپ عیادت کو تشریف لائے تو عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! میں اس سرزمین میں مرتا ہوں جس سے ہجرت کی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں ان شاءاللہ'' ❸ پھر تین دفعہ دعا کی کہ ''الٰہی سعد کو شفا دے۔ سعد کو شفا دے سعد کو شفا دے۔'' ❹ چنانچہ

---

❶ بخاری، کتاب الجهاد، باب فضل من يصرع في سبيل الله: ٢٧٩٩، ٢٨٠٠۔ لیکن کھانا کھلانے اور سر سے جوئیں نکالنے کا ذکر حدیث نمبر ٢٧٨٨، ٢٧٨٩ میں ہے۔ ❷ مسند احمد، ج ٥، ص: ٢٥٦ به سند صحيح وشعب الايمان بيهقي۔

❸ نسائي، كتاب الوصايا، باب الوصية بالثلث: ٣٦٦٠۔

❹ صحيح مسلم، كتاب الوصية، باب الوصية بالثلث: ٤٢١٥۔

ان کو شفا ہوئی اور آنحضرت ﷺ کے بعد چودہ پندرہ برس تک زندہ رہے اور لشکر عراق کے امیر مقرر ہوئے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے مستجاب الدعوات ہونے کی دعا

ان ہی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے حق میں آپ ﷺ نے دعا فرمائی تھی کہ ''خداوندا! ان کو مستجاب الدعوات بنا۔'' ❶ چنانچہ اس کا یہ اثر تھا کہ وہ جس کو دعا دیتے تھے وہ یقیناً قبول ہو جاتی تھی۔ کوفہ کی امارت کے زمانہ میں بعض شریروں نے بارگاہ فاروقی میں ان کی غلط شکایت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تحقیق حال کے لئے آدمی بھیجا وہ ایک ایک مسجد میں جا جا کر لوگوں سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے متعلق حالات دریافت کرتا پھرتا تھا۔ ایک محلّہ کی مسجد میں ایک شخص نے جھوٹی گواہی دی کہ وہ نماز بھی ٹھیک نہیں پڑھاتے۔ یہ سن کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ بے اختیار ہو گئے۔ فرمایا: ''خداوندا! اگر یہ جھوٹا ہو تو اس کو آزمائش میں ڈال۔'' اس شخص کا یہ حال ہو گیا تھا کہ بوڑھے ہو کر اس کی پلکیں لٹک آئی تھیں۔ تاہم بازاروں میں چھوکریوں کو چھیڑتا پھرتا تھا اور کہتا تھا کہ سعد کی بددعا مجھے لگ گئی۔ ❷ احادیث و سیر میں ان کی قبولیت دعا کے اور بھی واقعات مذکور ہیں۔

حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دعائے برکت

ایک بار آپ ﷺ نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو ایک دینار دیا کہ اس کی ایک بکری خرید لائیں۔ انہوں نے اس سے دو بکریاں خریدیں۔ ایک کو ایک دینار پر فروخت کر ڈالا اور آپ کی خدمت میں دوسری بکری اور دینار کو پیش کیا، آپ ﷺ نے ان کو خرید و فروخت کے معاملات میں برکت کی دعا کی اور اس کا یہ اثر ہوا کہ اگر وہ مٹی بھی خریدتے تھے اس میں نفع ہوتا تھا۔ ❸

ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ کے حق میں دعائے سلامتی

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں آنحضرت ﷺ کہیں فوج بھیج رہے تھے۔ میں نے حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرے لئے دعا کیجئے کہ شہادت نصیب ہو۔ فرمایا: ''خداوندا! ان کو سالم و غانم واپس لا۔'' چنانچہ ہم صحیح و سلامت مال غنیمت لے کر واپس آئے۔ پھر کہیں فوج جانے لگی۔ میں نے پھر وہی درخواست کی۔ آپ نے پھر وہی دعا دی اور پھر وہی ہوا۔ تیسری مرتبہ پھر یہی موقع پیش آیا۔ میں نے عرض کی، یا رسول اللہ! میں نے دو دفعہ دعائے شہادت کے لئے درخواست پیش کی قبول نہ ہوئی۔ اب یہ تیسرا موقع ہے۔ آپ نے پھر وہی دعا دی اور وہی نتیجہ تھا۔ ❹

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے حق میں برکت اولاد کی دعا

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کی بیوی نہایت ہوشمند اور اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر دل سے فدا تھیں۔ ایک

---

❶ ترمذی، مناقب سعد بن ابی وقاص: ۳۷۵۱۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب وجوب القراءۃ الامام والماموم فی الصلوات کلها: ۷۵۵۔ ❸ بخاری، کتاب المناقب: ۳۶۴۲۔

❹ مسند احمد، ج ۵، ص: ۲۴۸ وابو یعلیٰ وبیہقی۔

دفعہ ان کا بچہ بیمار ہوا۔ حضرت طلحہ گھر سے باہر ہی تھے کہ بچہ نے دم توڑ دیا۔ بیوی نے بچہ کو ایک گوشہ میں لٹا دیا۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ جب گھر واپس آئے تو بیوی سے دریافت کیا کہ بچہ کیسا ہے؟ نیک بخت نے جواب دیا کہ ''وہ آرام پا گیا'' ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سمجھے کہ وہ اچھا ہے، دونوں میاں بیوی ایک ہی بستر پر سوئے۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ صبح کو اٹھے غسل کر کے مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کو جانے لگے تو بیوی نے اصل حقیقت ظاہر کی۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے آ کر آنحضرت ﷺ کو شب کا ماجرا سنایا۔ تو فرمایا: ''شاید کہ خدا نے آج شب کو برکت عطا کی ہو۔'' چنانچہ اس شب کی برکت مقررہ مہینوں کے بعد پوری ہوئی [1] ایک انصاری کہتے ہیں کہ برکت کا یہ اثر ہوا کہ میں نے ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی نو (۹) اولادیں دیکھیں اور سب کی سب قرآن خواں تھیں۔ [2]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی والدہ کے حق میں دعائے ہدایت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی والدہ کافرہ تھیں اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ان کو دعوت اسلام دیتے تھے۔ لیکن وہ نہیں مانتی تھیں، ایک دن انہوں نے حسب دستور دعوت اسلام دی تو انہوں نے آنحضرت ﷺ کو برا بھلا کہا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو سخت تکلیف ہوئی۔ وہ روتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس ناگوار واقعہ کا ذکر کیا اور درخواست کی کہ میری والدہ کے لئے ہدایت کی دعا فرمایئے۔ آپ ﷺ نے دعا کی ''کہ خداوندا! ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت نصیب کر۔'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو اس دعا کے قبول ہونے کا اس درجہ یقین تھا کہ وہ خوش خوش گھر واپس آئے۔ دیکھا کہ دروازہ بند ہے۔ ماں نے پاؤں کی آہٹ سنی تو کہا کہ دروازے پر ٹھہرے رہو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو پانی گرنے کی آواز بھی محسوس ہوئی۔ جب وہ غسل کر کے کپڑے بدل چکیں تو دروازہ کھولا اور کلمہ شہادت پڑھا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ خوشی کے مارے الٹے پاؤں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں واپس آئے اور آپ کو مژدہ سنایا۔ آپ نے خدا کا شکر ادا کیا اور دونوں کو دعا دی۔ [3]

اونٹ کا تیز ہو جانا

ایک غزوہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی سواری کا اونٹ اس قدر تھک گیا یا بیمار ہو گیا تھا کہ تقریباً چل نہیں سکتا تھا۔ آپ ﷺ نے دیکھا تو دعا دی اور اب وہ اس قدر تیز ہو گیا کہ تمام اونٹوں کے آگے آگے رہتا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے آ کر پھر دریافت فرمایا کہ ''اے جابر! اب کیا حال ہے۔'' عرض کی، آپ کی دعا کی برکت قبول ہوئی۔ [4]

---

[1] صحیح مسلم، باب من فضائل ابی طلحة: ٦٣٢٢۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب من لم یظهر حزنه عند المصیبة: ١٣٠١۔

[3] صحیح مسلم، باب من فضائل ابی هریرة: ٦٣٩٦۔

[4] بخاری، کتاب الجهاد، باب استئذان الرجل الامام: ٢٩٦٧۔

بیمار کا اچھا ہونا

آپ ﷺ ایک صحابی کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ جو ضعف سے چور ہو گئے تھے۔ آپ نے فرمایا: ''کیا تم صحت کی حالت میں خدا سے کوئی دعا کرتے تھے؟'' انہوں نے کہا، ہاں میں خدا سے دعا کرتا تھا کہ مجھے آخرت میں جو عذاب دینا ہے وہ دنیا ہی میں دے دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سبحان اللہ! تم دنیا کے عذاب کے متحمل نہیں ہو سکتے تو تم نے یہ دعا کیوں نہیں کی:

﴿ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۰۱)

''خداوندا! ہم کو دنیا و آخرت دونوں میں بھلائی دے اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے درگاہ خداوندی میں دعا کی اور خدا نے ان کو شفا عطا فرمائی۔ ❶

سواری میں قوت آ جانا

حضرت جریر رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے۔ جو گھوڑے کی پشت پر جم کر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ایک بار آپ ﷺ نے ان کو ذی الخلصہ کے بت خانے کے ڈھانے کے لئے بھیجنا چاہا۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے گھوڑے پر جم کر نہ بیٹھنے کی شکایت کی۔ آپ ﷺ نے انکے سینہ پر ہاتھ مارا اور دعا دی کہ ''خداوندا! اس کو گھوڑے پر بیٹھنے کی قوت دے اور اس کو ہادی و مہدی بنا۔ چنانچہ وہ گئے اور اس میں آگ لگا کر آئے۔ ❷

ایک مغرور کا ہاتھ شل ہو جانا

آپ ﷺ کے سامنے ایک شخص نے بائیں ہاتھ سے کھانا شروع کیا۔ آپ نے فرمایا: ''دائیں ہاتھ سے کھاؤ'' اس نے غرور سے کہا، میں اس سے کھا نہیں سکتا۔ چونکہ اس نے غرور سے ایسا کہا تھا آپ نے فرمایا: ''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' چنانچہ اس کے بعد ایسا ہوا کہ وہ دائیں ہاتھ کو اٹھا کر واقعی اپنے منہ تک نہیں لے جا سکتا تھا۔ ❸

قبیلہ دوس کا مسلمان ہونا

ایک بار حضرت طفیل دوسی رضی اللہ عنہ اپنے رفقا کے ساتھ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا، یا رسول اللہ ﷺ! دوس کے قبیلہ نے دعوت اسلام کے قبول کرنے سے انکار کیا۔ آپ ﷺ اس پر بددعا فرمایئے۔ لیکن رحمت عالم ﷺ نے یہ دعا فرمائی:

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء باب کراھۃ الدعاء بتعجیل العقوبۃ فی الدنیا: ۶۸۳۵۔

❷ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ باب من فضائل جریر بن عبداللّٰہ: ۶۳۶۶۔

❸ صحیح مسلم، کتاب الاشربۃ، باب آداب الطعام و الشراب واحکامھما: ۵۲۶۸۔

((اللّٰھم اھد دوساوات بھم)) [1] ”خداوندا! دوس کو ہدایت دے اور ان کو لا۔“

بالآخر یہ دعا قبول ہوئی اور پورا قبیلہ مسلمان ہو کر حاضر خدمت ہوا۔

رفع بے پردگی کے لئے دُعا

ایک حبشیہ عورت نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے صرع کا دورہ ہوتا ہے۔ جس سے میں بے پردہ ہو جاتی ہوں۔ میرے لئے دعا فرمایئے۔ ارشاد ہوا: ”اگر صبر کرنا چاہو تو تمہیں جنت نصیب ہوگی اور اگر کہو تو میں دعا کروں کہ خدا تم کو صحت دے۔“ اس نے کہا، میں صبر کرتی ہوں لیکن ستر عورت کے لئے دعا فرمایئے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے لئے دعا کی۔ [2]

سلطنت کسریٰ کی تباہی

پڑھ چکے ہو کہ آنحضرت ﷺ نے دعوت اسلام کے لئے جب کسریٰ کے پاس خط بھیجا تو اس نے خط کو چاک کر کے پھینک دیا۔ آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ نے اس کو بددعا دی کہ اس کے بھی پرزے پرزے ہو جائیں [3] چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس کی سلطنت کے پرخچے اڑ گئے۔

دعائے برکت کا اثر

آنحضرت ﷺ ہمیشہ فوج کو صبح تڑکے روانہ فرماتے تھے اور تمام امت کے لئے دعا کی تھی کہ ”خداوندا! میری امت کو صبح کے سویرے میں برکت دے۔“ ایک تجارت پیشہ صحابی نے اس پر عمل کیا اور اپنا سامان تجارت عموماً صبح سویرے روانہ کرنا شروع کیا۔ چنانچہ اس دعا کی برکت ظاہر ہوئی اور وہ اتنے دولت مند ہو گئے کہ ان کو اپنی دولت کے رکھنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ [4]

طول عمر کی دعا

ام قیس رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ تھیں ان کا لڑکا مر گیا تو وہ اس قدر بدحواس ہو گئیں کہ غسل جنازہ دینے والے سے کہا کہ میرے بچے کو ٹھنڈے پانی سے غسل نہ دو ورنہ مر جائے گا۔ آنحضرت ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو مسکرائے اور ان کو طول عمر کی دعا دی۔ چنانچہ انہوں نے تمام عورتوں سے زیادہ عمر پائی۔ [5]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قصة دوس: ٤٣٩٢ ومسلم، باب من فضائل غفار واسلم و ....: ٦٤٥٠۔ [2] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب ثواب المومن فیما یصیبه....: ٦٥٧١۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب دعوة الیهود والنصاری: ٢٩٣٩۔

[4] ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی الابتکار فی السفر: ٢٦٠٦؛ ترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی التبکیر بالتجارة: ١٢١٢؛ ابن ماجه، باب مایرجی من البرکة فی البکور: ٢٢٣٦ ومسند احمد، ج٣، ص: ٤٣٠ عن صخر الغامدی۔ [5] نسائی، کتاب الجنائز، باب غسل المیت بالحمیم: ١٨٨٣۔

ایک بچہ کی ہدایت کے لئے دُعا

رافع بن سنان نے اسلام قبول کر لیا۔ لیکن بی بی نے جس کی گود میں ایک لڑکی تھی۔ اس سعادت ابدی سے انکار کیا۔ اب اختلاف مذہب کی بنا پر لڑکی کے بارے میں نزاع پیدا ہوئی۔ بارگاہ نبوت میں مقدمہ پیش ہوا۔ آپ ﷺ نے دونوں کو الگ الگ بٹھایا اور کہا: ''لڑکی کو بلاتے جاؤ۔'' دونوں نے بلایا تو لڑکی ماں کی طرف بڑھی۔ آپ ﷺ نے اس حالت کو دیکھ کر دعا فرمائی کہ ''خداوندا! اس کو ہدایت دے۔'' اس کا یہ اثر ہوا کہ لڑکی کا رخ فوراً باپ کی طرف پھر گیا۔ [1] یہ ابوداؤد کی روایت ہے۔

ابن سعد نے اسی قسم کا ایک واقعہ ابوسلمہ صحابی رضی اللہ عنہ کی نسبت لکھا ہے کہ وہ بچہ تھے۔ ان کے دادا اور نانا میں سے ایک کافر اور ایک مسلمان تھا۔ دونوں نے بچہ کی تولیت کا دعویٰ کیا آنحضرت ﷺ نے اس کا فیصلہ خود بچہ کے اختیار پر رکھ دیا۔ پہلے تو بچہ اپنے کافر رشتہ دار کی طرف چلا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدایا! اس کو ہدایت دے۔'' فوراً بچہ مسلمان عزیز کی طرف چلا گیا اور فیصلہ اسی کے حق میں رہا۔ [2]

---

[1] ابوداود، کتاب الطلاق، باب اذا اسلم احد الابوین لمن یکون الولد: ٢٢٤٤۔

[2] ابن ماجه، کتاب الاحکام، باب تخییر الصبی بین ابویه: ٢٣٥٢ میں بھی یہ روایت ہے۔

اشیاء میں اضافہ

مسلمانوں کی ابتدا کی زندگی جس فقر و فاقہ میں گزری تھی، اس کا حال کتاب کے مختلف حصوں میں پڑھ چکے ہو۔ کئی کئی دن گزر جاتے تھے کہ ان کو کھانے کی کوئی چیز نہیں ملتی تھی۔ ایسی حالت میں اگر برکت الٰہی ان کو اپنا خاص مہمان نہ بنالیتی تو ان کا کیا حشر ہوتا؟ انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تھوڑی سی روٹی اور مچھلی سے کئی سو آدمیوں کو شکم سیر کر دیا اور یہ ان کا بڑا معجزہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کے دست مبارک اور فیض روحانی سے ایک دفعہ نہیں متعدد دفعہ اس قسم کے برکات ظاہر ہوئے۔

تھوڑے سے کھانے میں ستر آدمیوں کا سیر ہونا

ایک دن حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی آواز سے محسوس کیا کہ آپ بھوک کی شدت سے ضعیف ہو رہے ہیں۔ گھر میں آئے اور بی بی (ام سلیم رضی اللہ عنہا) سے کہا کہ مجھ کو آنحضرت ﷺ کی ضعیف آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھوکے ہیں۔ تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ انہوں نے جو کی چند روٹیاں دوپٹے میں لپیٹ کر حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجیں۔ وہ روٹیاں لے کر آئے تو آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سامنے کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ نے پوچھا: ''ابوطلحہ نے تمہارے ہاتھ کھانا بھیجا ہے؟'' انہوں نے کہا، ہاں آنحضرت ﷺ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ اٹھے اور حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے مکان پر تشریف لائے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ان کو خبر کی تو انہوں نے بی بی سے کہا کہ آنحضرت ﷺ ایک جماعت کے ساتھ تشریف لائے ہیں اور ہمارے پاس کھلانے کا کوئی سامان نہیں آنحضرت ﷺ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ آئے اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ جو کچھ تمہارے پاس ہو لاؤ۔ انہوں نے وہی روٹیاں پیش کیں جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ بھیجی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کے حکم سے ان کو چورا کیا گیا اور ام سلیم رضی اللہ عنہا نے گھی کا برتن انڈیل دیا۔ جس نے سالن کا کام دیا۔ لیکن ان ہی روٹیوں میں یہ برکت ہوئی کہ آپ ﷺ دس دس آدمیوں کو بلا بلا کر کھلاتے تھے اور وہ شکم سیر ہو ہو کر جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ستر، اسی آدمی آسودہ ہو گئے۔ [1]

چھوہارے کے ڈھیر کا بڑھ جانا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد نے اپنے اوپر یہودیوں کا قرض چھوڑ کر وفات کی قرضداروں نے تقاضا کیا تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ والد نے اپنے اوپر قرض چھوڑ کر انتقال کیا ہے اور بجز کھجوروں کے میرے پاس ادا کرنے کا کوئی سامان نہیں۔ صرف کھجوروں کی پیداوار سے کئی برس تک یہ قرض ادا نہیں ہوسکتا۔ آپ ﷺ میرے ساتھ نخلستان میں تشریف لے چلیے، تا کہ آپ کے

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ:۳۵۷۸۔

ادب سے قرض دار مجھ پر سختی نہ کریں۔ آپ ان کے ساتھ تشریف لائے اور کھجوروں کا جو ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس کے گرد چکر لگا کر دعا کی اور اسی پر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ اپنے اپنے قرض میں لیتے جاؤ۔ آپ کی دعا کی تاثیر سے ان ہی کھجوروں میں یہ برکت ہوئی کہ تمام قرض ادا ہو گیا اور جس قدر کھجوریں قرض داروں کو دی گئی تھیں۔ اتنی ہی بچ رہیں۔ [1]

کھانے میں حیرت انگیز برکت

چونکہ اصحاب صفہ بالکل محتاج تھے ان کی معاش کا کوئی سامان نہ تھا۔ اس لئے آپ ﷺ نے ایک بار حکم دیا کہ جس کے پاس دو آدمیوں کے کھانے کا سامان ہو وہ اصحاب صفہ میں سے ایک کو اور جن کے پاس چار آدمیوں کی غذا ہو وہ دو کو اپنے ساتھ لے جائے اور کھانا کھلائے۔ چنانچہ اس اُصول کے موافق آنحضرت ﷺ کے حصہ میں دس اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حصے میں تین آدمی آئے۔ یہ لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر میں آئے لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ ہی کے یہاں کھانا کھایا اور آپ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی۔ اس لئے کسی قدر رات گزر گئی۔ وہ گھر میں دیر سے آئے تو ان کی بیوی ام رومان رضی اللہ عنہا نے کہا کہ مہمانوں کو چھوڑ کر کہاں رہ گئے؟ انہوں نے کہا، کیا تم نے ان کو کھانا نہیں کھلایا؟ وہ بولیں، بغیر تمہارے ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نہایت برہم ہوئے اور ان لوگوں کو کھانا کھلانا شروع کیا۔ وہ لوگ جو لقمہ اٹھاتے تھے اس میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ لوگ شکم سیر ہو کر کھا چکے تو بچا ہوا کھانا پہلے سے بھی زیادہ نکلا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس برکت کو دیکھ کر ام رومان رضی اللہ عنہا کی طرف مسرت سے دیکھا اور غصہ میں اگرچہ نہ کھانے کی قسم کھا چکے تھے۔ لیکن قسم توڑنے کے لئے ایک لقمہ اس میں سے کھایا اور تمام کھانا آنحضرت ﷺ کے گھر بھیج دیا۔ وہ کھانا آپ ﷺ کے گھر میں صبح تک رہا۔ دوسرے روز آپ کی خدمت میں ۱۲ آدمی آئے جن میں سے ہر ایک کے ساتھ کئی کئی آدمی خدا جانے کتنے تھے۔ آپ ﷺ نے وہ کھانا ان کے پاس بھیج دیا اور وہ لوگ بھی سیر ہو گئے۔ [2]

گھی کی مقدار میں برکت

امّ مالک رضی اللہ عنہا کا دستور تھا کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ہمیشہ ایک برتن میں گھی ہدیۃً بھیجا کرتی تھیں۔ جب ان کے بچے سالن مانگتے اور گھر میں نہ ہوتا تو وہ اس برتن کو جس میں آنحضرت ﷺ کو گھی بھیجتی تھیں اٹھا لاتیں اور اس میں سے بقدر ضرورت گھی نکل آتا۔ ایک دن انہوں نے اس برتن کو نچوڑ لیا۔ پھر آپ کی خدمت میں آئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم نے اس کو نچوڑ نہ لیا ہوتا تو ہمیشہ اس میں سے گھی نکلا کرتا۔'' [3]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ: ۳۵۸۰۔ [2] ایضًا: ۳۵۸۱۔ [3] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی معجزات النبی ﷺ: ۵۹۴۵ ومسند احمد عن جابر، ج ۳، ص: ۳۴۰۔

جو کی مقدار میں برکت

ایک بار ایک شخص نے آپ ﷺ سے غلہ مانگا۔ آپ نے تھوڑے سے جَو دے دیئے۔ اس میں اس قدر برکت ہوئی کہ وہ روز اپنے لئے، اپنی بیوی کے لئے، اپنے مہمان کے لئے اس میں سے صرف کرتا تھا اور اس میں کمی نہ ہوتی تھی۔ ایک دن اس نے اس کو تولا اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم اس کو نہ تولتے تو ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہتا۔'' ❶

کھانے میں حیرت انگیز اضافہ

غزوۂ احزاب میں تمام مہاجرین اور انصار خندق کھود رہے تھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ سخت بھوکے ہیں وہ اپنی بیوی کے پاس آئے اور پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ انہوں نے ایک صاع جو نکالا اور گھر میں ایک بکری تھی۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اس کو ذبح کیا اور بی بی نے آٹا گوندھا گوشت دیگچی میں چڑھایا گیا تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کو لینے کے لئے چلے۔ بی بی نے کہا کہ دیکھو آپ کے ساتھ لوگوں کو لا کر مجھے رسوا نہ کرنا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ آئے اور چپکے سے آپ کے کان میں کہا کہ ہم نے کھانے کا انتظام کیا ہے۔ آپ چند اصحاب کے ساتھ تشریف لے چلئے۔ لیکن آپ ﷺ نے تمام اہل خندق کو پکارا کہ ''آؤ جابر نے دعوت عام کی ہے۔'' اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ جب تک میں نہ آلوں چولھے سے دیگچی نہ اتاری جائے اور روٹی نہ پکے۔ آنحضرت ﷺ تمام لوگوں کو لے کر روانہ ہوئے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ گھر میں آئے تو بی بی نے برا بھلا کہنا شروع کیا۔ انہوں نے کہا، میں کیا کروں تم نے جو کہا تھا میں نے اس کی تعمیل کر دی۔ آپ آئے تو بی بی نے آپ کے سامنے آٹا پیش کیا۔ آپ ﷺ نے اس میں اپنا لعاب دہن ملا دیا اور برکت کی دعا دی۔ پھر اسی طرح دیگچی میں بھی لعاب دہن ڈالا اور دعائے برکت کی۔ اس کے بعد آپ نے روٹی پکانے اور سالن نکالنے کا حکم دیا۔ کم و بیش ایک ہزار آدمی تھے۔ سب کھا کر واپس گئے لیکن گوشت اور آٹے میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ ❷

تھوڑی سی زادراہ میں غیر معمولی برکت

غزوۂ تبوک میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھوک کی اتنی تکلیف ہوئی کہ آنحضرت ﷺ نے سواریوں تک کے ذبح کرنے کی اجازت دے دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ اگر ایسا کیا گیا تو سواریاں کم ہو جائیں گی آپ بچا ہوا زادراہ سب سے طلب فرمائیں اور اس پر دُعائے برکت کریں۔ ممکن ہے کہ خدا اس میں ان کا بھلا کر دے۔ آپ نے ایک چادر بچھوائی اور تمام فوج کا زادراہ جمع

❶ صحيح مسلم، باب في معجزات النبي ﷺ: ٥٩٤٦ ومسند احمد عن جابر، ج٣، ص: ٣٣٧۔

❷ بخاري، كتاب المغازي، باب ذكر غزوة الخندق: ٤١٠٢۔

کرادیا اوراس پر برکت کی دعا کی۔ پھر تمام لوگوں سے فرمایا: ''اپنے اپنے برتن بھر لیں۔'' لوگوں نے تمام برتن بھر لئے اور خوب سیر ہو کر کھایا۔ یہاں تک کہ کھانے سے بچ گیا۔ ❶

تھوڑی سی زادراہ میں عظیم برکت

آنحضرت ﷺ ایک سفر میں تھے صحابہ رضی اللہ عنہم بھوک سے اس قدر بیتاب تھے کہ اونٹنیاں ذبح کرنی چاہیں۔ لیکن آپ نے تمام لوگوں کے زادراہ کے جمع کرنے کا حکم دیا۔ ایک چادر بچھائی گئی اوراس پر تمام زادراہ ڈھیر کیا گیا۔ اس تمام سامان کی مجموعی مقدار نے صرف اس قدر زمین کا احاطہ کیا۔ جس پر ایک بکری بیٹھ سکتی تھی اور اشخاص کی تعداد ۱۴ سو تھی۔ لیکن تمام لوگوں نے سیر ہو کر کھا لیا اور اپنے اپنے توشہ دان بھر لئے۔ کھانے کے بعد آپ نے پانی طلب فرمایا۔ ایک صاحب ایک برتن میں تھوڑا سا پانی لائے۔ آپ نے اس کو پیالے میں انڈیل دیا اور ۱۴سو آدمیوں نے اس سے وضو کیا۔ ❷

آدھ سیر آٹے اور ایک بکری میں برکت

آنحضرت ﷺ ایک سفر میں تھے۔ ۱۳۰ آدمیوں کی جماعت ساتھ تھی۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ تمہارے ساتھ کچھ کھانے کا سامان ہے؟ ایک شخص ایک صاع آٹا لایا اور وہ گوندھا گیا۔ پھر ایک کافر بکریاں چراتا ہوا آیا۔ آپ نے اس سے ایک بکری خرید فرمائی اور ذبح کرنے کے بعد کلیجی کے بھوننے کا حکم دیا اور ہر شخص کو تقسیم کی۔ گوشت تیار ہوا تو دو پیالوں میں بھرا گیا اور سب کے سب کھا کر آسودہ ہو گئے اور بچ بھی گیا۔ ❸

تھوڑے سے کھانے میں غیر معمولی برکت

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے ایک بار ایک قسم کا کھانا تیار کیا اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ آنحضرت ﷺ کو بلا لائیں وہ گئے تو آپ نے پوچھا کیا میرے ساتھیوں کو بھی بلایا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے گھر میں آ کر پوچھا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے آپ سے آ کر کہا کہ وہ تو ذرا سی چیز ہے۔ جس کو ام سلیم رضی اللہ عنہا نے تیار کیا ہے۔ آپ تشریف لائے اور وہ کھانا سامنے رکھا گیا تو فرمایا کہ دس دس آدمیوں کو لاؤ۔ اس طرح چالیس آدمی دس دس کر کے آئے اور شکم سیر ہو کر کھایا لیکن کھانے میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی۔ ❹

قلیل تعداد میں کثیر برکت

آنحضرت ﷺ نے جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کیا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ ام

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من مات...... : ۱۳۹۔

❷ مسلم، کتاب اللقطة، باب استحباب خلط الازواد اذا قلت:۴۵۱۸۔ ❸ بخاری، کتاب الاطعمة، باب من اکل حتی شبع: ۵۳۸۲۔ ❹ بخاری، کتاب الاطعمة، باب من ادخل الضیفان...... :۵۴۵۰۔

سلیم رضی اللہ عنہا نے تھوڑا سا حیس (ایک قسم کا کھانا ہوتا ہے) تیار کیا اور ایک طشت میں کر کے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ آپ کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کھانا لے کر آئے تو آپ نے بہت سے اصحاب کو مدعو کیا۔ تقریباً تین سو آدمی جمع ہو گئے۔ آپ نے حکم دیا کہ دس دس آدمی حلقہ باندھ کر بیٹھ جائیں اور اپنے سامنے سے کھانا شروع کریں تمام لوگ کھا کر آسودہ ہو گئے۔ لیکن اس میں اس قدر برکت ہوئی کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ جس وقت میں نے طشت کو اٹھا کر رکھا اس وقت کھانا زیادہ تھا یا جب لوگوں کے سامنے رکھا گیا تھا۔ [1]

ایک پیالہ میں حیرت انگیز برکت

سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم لوگ دس دس آدمی صبح سے شام تک آنحضرت ﷺ کے پاس ایک پیالہ سے متصل کھاتے رہے تھے۔ لوگوں نے پوچھا کہ اس میں اس قدر بڑھتی کیونکر ہوتی جاتی تھی؟ انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ ''وہاں'' سے۔ [2]

دودھ کے پیالہ میں برکت

ایک دن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھوک کی شدت سے بے تاب ہو کر راستہ میں بیٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا تو ان سے قرآن مجید کی ایک آیت پوچھی لیکن اس کا مقصد اپنی حالت زار کی طرف توجہ دلانا تھا وہ گزر گئے اور کچھ توجہ نہ کی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ گزرے۔ انہوں نے اسی غرض سے ان سے بھی ایک آیت پوچھی لیکن انہوں نے بھی بے التفاتی کی۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ کا گزر ہوا، اور آپ نے ان کے چہرہ کو دیکھ کر اصل حقیقت معلوم کر لی اور ان کو پکارا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے لبیک کہا اور ساتھ ہو لئے۔ آپ گھر میں داخل ہوئے تو دودھ کا ایک پیالہ بھرا ہوا نظر آیا۔ پوچھنے سے معلوم ہوا کہ ہدیۃً آیا ہے۔ آپ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اصحاب صفہ کو بلا لائیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ ناگوار گزرا کہ اس دودھ کا سب سے زیادہ مستحق تو میں تھا۔ لیکن آپ کی تعمیل ارشاد سے چارہ نہ تھا۔ مجبوراً اصحاب صفہ بلا لے گئے اور سب کے سب اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ آپ کے حکم سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے سب کو پلانا شروع کیا۔ جب سب کے سب سیراب ہو گئے تو آنحضرت ﷺ نے پیالہ کو ہاتھ پر رکھا اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور کہا کہ اب صرف ہم اور تم باقی ہیں۔ آؤ بیٹھو اور پینا شروع کرو۔ آپ ان کو متصل پلاتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ خود بول اٹھے کہ اب گنجائش نہیں۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے خود پیالہ لیا اور جو کچھ بچ گیا تھا۔ بسم اللہ کر کے پی گئے۔ [3]

[1] صحيح مسلم، كتاب النكاح، باب زواج زينب: ٣٥٠٧۔ [2] ترمذي، ابواب المناقب، باب ماجاء في آيات نبوة النبي ﷺ: ٣٦٢٥۔ [3] بخاري، كتاب الرقاق، باب كيف كان عيش النبي ﷺ: ٦٤٥٢۔

بکری کے دست میں برکت

ایک صحابی نے آپ ﷺ کے لئے گوشت پکایا۔ چونکہ آپ ﷺ کو بکری کا دست نہایت مرغوب تھا۔ انہوں نے آپ کو دونوں دست دیئے۔ جب آپ ان کو تناول فرما چکے۔ تو پھر دست مانگا۔ انہوں نے کہا، یارسول اللہ! بکری کے کتنے دست ہوتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدا کی قسم! اگر تم خاموش رہتے تو میں جس قدر دست مانگتا تم مجھے دیتے رہتے۔'' [1]

بکری کے تھنوں میں برکت

حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں اپنے دو رفیقوں کے ساتھ سخت عسرت اور فاقہ زدگی کی حالت میں آیا اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کی خدمت میں اپنے آپ کو پیش کیا۔ لیکن کسی نے ہماری کفالت منظور نہیں کی۔ بالآخر ہم سب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ہم کو گھر لے گئے۔ وہاں تین بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان کا دودھ دوھ کر پیا کرو۔'' چنانچہ ہم سب دودھ دوھ کر اپنا حصہ پی لیتے اور آنحضرت ﷺ کا حصہ رکھ دیتے تھے۔ آپ ﷺ رات کو آتے تو پہلے نرم آواز میں سلام کرتے۔ پھر مسجد میں آ کر نماز پڑھتے اس کے بعد اپنا حصہ دودھ پیتے۔ ایک دن جب کہ میں اپنے حصہ کا دودھ پی چکا تھا۔ شیطان نے مجھ کو دھوکا دیا کہ آنحضرت ﷺ انصار کے یہاں سے آتے ہیں وہ آپ کی خدمت میں تحائف پیش کرتے ہیں اور آپ ان کو تناول فرماتے ہیں۔ آپ کو اس دودھ کی ضرورت نہیں۔ میں اس کے دھوکے میں آ گیا۔ اور تمام دودھ اٹھا کر پی گیا۔ جب میرے پیٹ میں گنجائش نہ رہی تو شیطان یہ کہہ کر چلتا ہوا کہ کمبخت تو آنحضرت ﷺ کا حصہ پی گیا۔ جب آپ تشریف لائیں گے اور اپنے حصہ کو نہ پائیں گے تو تجھ کو بددعا دیں گے اور تیرا دین و دنیا سب برباد ہو جائے گا۔ چنانچہ اس ڈر سے میری آنکھوں کی نیند اڑ گئی آپ تشریف لائے۔ حسب معمول سلام کیا اور نماز پڑھی اس کے بعد دودھ کو کھولا تو آپ کا حصہ غائب تھا۔ آپ نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور میں سمجھا کہ اب آپ مجھ پر بددعا فرمائیں گے اور میں ہلاک ہو جاؤں گا۔ لیکن آپ ﷺ نے یہ دعا فرمائی ''خداوندا! جس شخص نے مجھ کو کھلایا اس کو کھلا اور جس نے مجھے پلایا اسے پلا۔'' اب میں چادر لپیٹ کے اٹھا ہاتھ میں چھری لی کہ ان بکریوں میں جو سب سے زیادہ فربہ ہو اس کو ذبح کروں۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ ان سب کے تھنوں میں دودھ بھرا ہوا ہے۔ اب میں نے ایک برتن کی طرف ہاتھ بڑھایا جس کے متعلق آنحضرت ﷺ کے اہل و عیال کو یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ کبھی اس قدر دودھ ہوگا کہ اس میں دوہا جائے گا۔ لیکن میں نے اس میں دودھ دوہا تو وہ بھر گیا اور اوپر جھین نظر آنے لگا۔ میں نے دودھ کو آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔

---

[1] شمائل ترمذی، باب ما جاء فی ادام رسول اللہ ﷺ: ۱۶۸۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم اپنا حصہ پی چکے۔'' میں نے کہا، آپ پی لیجئے۔ آپ ﷺ نے پی کر مجھے دودھ عنایت فرمایا۔ میں نے عرض کی کہ آپ نوش جاں فرمائیے۔ آپ نے پی لیا اور مجھے عنایت فرمایا۔ چنانچہ جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ سیر ہو گئے اور آپ کی دعا کی برکت میں میں شامل ہو گیا تو میں ہنستے ہنستے زمین پر گر پڑا اور آپ کی خدمت میں اول سے آخر تک تمام واقعہ بیان کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ خداوند تعالیٰ کی رحمت ہے۔ تم نے اپنے دونوں ساتھیوں کو کیوں نہیں جگایا کہ وہ بھی پیتے۔'' میں نے کہا کہ جب میں نے آپ ﷺ کے ساتھ پی لیا تو مجھے اس کی پروا نہیں کہ کسی اور نے پیا یا نہیں؟ ❶

ایک وسق جو کی برکت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے وفات پائی تو کچھ وسق (ایک پیمانہ) جو کے سوا کچھ گھر میں نہ تھا تو میں نے اسی کو کھانا شروع کیا تو وہ ختم ہی ہونے پر نہیں آتا تھا تو ہم نے اس کو تولا تو پھر وہ ختم ہو گیا۔ یعنی اس کی وہ برکت جاتی رہی۔ ❷

توشہ دان ہمیشہ بھرا رہتا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ پر اسلام میں تین مصیبتیں سب سے سخت پڑیں۔ پہلی آنحضرت ﷺ کی وفات، دوسری حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت، تیسری میرے توشہ دان کا جاتے رہنا، لوگوں نے پوچھا کیوں کیسا توشہ دان؟ انھوں نے کہا، آپ ایک غزوہ میں تھے۔ رسد ختم ہو گئی تھی۔ آپ ﷺ نے مجھ سے دریافت فرمایا: ''ابوہریرہ! کچھ تمہارے پاس ہے؟'' میں نے عرض کی کہ کچھ کھجوریں ہیں۔ ارشاد ہوا: ''وہ لے آؤ'' میں لایا تو آپ نے ان کو دستر خوان پر پھیلا دیا۔ اکیس کھجوریں تھیں۔ آپ ایک ایک کھجور لے کر اور اس پر خدا کا نام پڑھ کر رکھتے جاتے تھے۔ پھر آپ نے سب کو ملا دیا اور حکم دیا کہ دس دس آدمی آکر شریک ہوں۔ چنانچہ اس طرح لوگ آتے گئے اور پوری فوج سیر ہو گئی اور کچھ کھجوریں بچ گئیں۔ میں نے عرض کی، یارسول اللہ! ان پر میرے لئے برکت کی دعا فرمائیے، آپ نے دعا کی، میں نے ان کو اپنے توشہ دان میں ڈال لیا ان کی برکت یہ تھی کہ جب میں ہاتھ ڈالتا تھا اس میں سے کھجوریں نکل آتی تھیں اور ۵۰ وسق تو میں نے اس میں سے راہ خدا میں خیرات کی۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ تک میں اس میں سے کھاتا رہا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ہنگامہ میں جہاں اور چیزیں گئیں۔ توشہ دان بھی جاتا رہا۔ ❸

❶ صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب اکرام الضیف: ٥٣٦٢۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب فضل الفقر: ٦٤٥١؛ مسلم، کتاب الزھد: ٧٤٥١۔ ❸ مسند احمد، ج٢، ص:٣٥٢؛ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب ابی ھریرة: ٣٨٣٩؛ ابن سعد، ابن حبان، بیھقی۔

تھوڑی کھجوروں میں برکت

حضرت دکین اور نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہما صحابی کہتے ہیں کہ ہم لوگ چار سو چودہ آدمی خدمت نبوی ﷺ میں ایک ساتھ حاضر ہوئے اور ہم سب نے کھانے کی درخواست کی۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ان کو کھانا کھلاؤ انہوں نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! میرے پاس تو اسی قدر ہے جو بال بچوں کو کافی ہو۔ ارشاد ہوا: ''جاؤ اور ان کو کھلا دو۔'' عرض کی جیسا حکم ہو تعمیل میں عذر نہیں۔ یہ کہہ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہم کو لے کر چلے اور ایک جگہ لا کر بٹھایا اور جو کچھ کھجوریں تھیں وہ سامنے لا کر رکھ دیں اور ان میں یہ برکت نظر آئی کہ ہم سب سیر ہو گئے۔ لیکن کھجوروں میں کمی نہیں آئی۔ [1]

---

[1] مسند احمد عن دکین، ج ٤، ص: ١٧٤ وابوداود، کتاب الادب: ٥٢٣٨؛ ابن حبان وابن سعد عن نعمان بن مقرن۔

پانی جاری ہونا

عرب کے خشک وریگستانی ملک میں سب سے کم یاب جنس پانی کا ایک چشمہ ہے۔ دنیا کے فاتحوں اور کشور کشاؤں کے حملوں سے یہ ملک جن اسباب کی بنا پر ہمیشہ محفوظ رہا ہے۔ ان میں سے ایک قوی سبب اس میں پانی کے وجود کی کم یابی بھی ہے۔ چنانچہ یونانیوں، رومیوں اور ایرانیوں کی ہمتیں اسی لئے اس صحرائے لق ودق میں آباد قبائل کے فتح سے قاصر رہیں، غور کرو کہ اسلام کا فاتحانہ لشکر بھی اگر نبوت کے برکات الٰہی کے یہ چشمے اس کے ساتھ ساتھ نہ ہوتے تو اس مشکل کو وہ کبھی حل کر سکتا تھا؟ انبیائے عالم میں صرف ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات ہے جن کے لئے ایک دفعہ چٹان کی رگیں پانی کی سوتیں بنیں۔ لیکن رسول عرب کے لئے مشکیزہ کا چمڑا، گوشت و پوست کی انگلیاں، خشک چشموں کے دہانے، سوکھے ہوئے کنوؤں کی سوتیں، دہان مبارک کی کلیاں متعدد دفعہ پانی کا خزانہ ثابت ہوئیں۔

مشکیزہ سے پانی اُبلنا

ایک دفعہ آپ ﷺ سفر میں تھے۔ صبح کو آنکھ کھلی اور آپ نے نماز پڑھانی شروع کی تو ایک صحابی جماعت سے الگ ہو گئے۔ آپ نے شریک جماعت نہ ہونے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جنابت کا عذر کیا۔ چونکہ پانی نہ تھا، اس لئے ان کو آپ نے تیمم کا حکم دیا۔ اس کے بعد آپ نے چند صحابہ رضی اللہ عنہم کو پانی کی جستجو میں روانہ فرمایا۔ وہ لوگ چلے تو ایک عورت ملی جو اونٹ پر دو مشکیزوں میں پانی لاد کر لئے جا رہی تھی۔ ان لوگوں نے اس چشمہ کا پتہ پوچھا تو اس نے کہا اس جگہ پانی نہیں ہے۔ پھر ان لوگوں نے دریافت کیا کہ تمہارے قبیلہ اور چشمہ کے درمیان کس قدر فاصلہ ہے۔ اس نے ایک دن اور ایک رات کی مسافت بتائی۔ وہ لوگ اس کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لائے اور آنحضرت ﷺ نے ہاتھ سے مشکیزوں کو چھو دیا۔ آپ کے دست مبارک کی برکت سے اس پانی کی مقدار میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ چالیس آدمیوں نے اس سے خوب سیراب ہو کر پانی پیا اور اپنے اپنے تمام مشکیزے اور برتن بھر لئے۔ اس کے بعد آپ نے کھجور اور روٹی کے ٹکڑے جمع کرا کے اس عورت کو دیے، وہ اپنے گھر لے آئی تو حیرت و استعجاب سے لبریز تھی اس نے اپنے قبیلہ کے لوگوں سے کہا کہ میں نے سب سے بڑے ساحر کو یا اس کے معتقدین کے خیال میں ایک پیغمبر کو دیکھا۔ آخر اسی خاتون کے اثر سے یہ پورا قبیلہ مع اس عورت کے مسلمان ہو گیا۔ [1]

انگلیوں سے پانی جاری ہونا

ایک دن آپ ﷺ مقام زوراء میں تھے۔ عصر کا وقت آ گیا۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے پانی کی جستجو شروع کی۔ لیکن صرف آنحضرت ﷺ کے لئے پانی ملا۔ جب آپ ﷺ کی خدمت میں پانی کا برتن پیش کیا گیا

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب باب علامات النبوۃ: ۳۵۷۱۔

تو آپ ﷺ نے اس پر اپنا ہاتھ ڈال دیا اور انگلیوں سے پانی کا فوارہ چھوٹنے لگا۔ یہاں تک کہ تقریباً تین سو آدمیوں نے اس سے وضو کیا۔ ❶

پانی کا بڑھ جانا

آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ کسی سفر میں تھے۔ نماز کا وقت آیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے پانی تلاش کیا لیکن کہیں نہ ملا۔ ایک صحابی پیالہ میں تھوڑا سا پانی لائے۔ پہلے آنحضرت ﷺ نے اس سے وضو کیا۔ پھر پیالے پر آپ نے انگلیاں پھیلا دیں۔ پانی کی مقدار میں اس قدر برکت ہوئی کہ تقریباً ستر (۷۰) آدمی کے وضو کے لئے کافی ہوا۔ ❷

انگلیوں کی برکت

ایک بار نماز کا وقت آیا۔ تو جن لوگوں کا گھر مسجد کے قریب تھا۔ وہ گھر کے اندر وضو کرنے کے لئے چلے گئے لیکن بقیہ لوگ بے وضو رہ گئے۔ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ایک برتن میں وضو کا پانی پیش کیا گیا۔ آپ نے اس کے اندر ہاتھ ڈالنا چاہا تو اس کا دہانہ اس قدر تنگ نکلا کہ آپ کی ہتھیلیاں اس کے اندر نہ پھیل سکیں۔ اس لئے آپ نے اپنی انگلیاں اس کے اندر ڈالیں اور وہ پانی تقریباً اسی (۸۰) آدمیوں کے وضو کے لئے کافی ہوا۔ ❸

انگلیوں سے پانی کا چشمہ بہنا

صلح حدیبیہ کے دن صحابہ رضی اللہ عنہم پیاس سے بے تاب ہوئے۔ آنحضرت ﷺ کے سامنے صرف چمڑے کے ایک برتن میں پانی تھا۔ آپ نے اس سے وضو کرنا شروع کیا تو تمام صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھے۔ آپ نے اس بے تابی کی وجہ پوچھی تو لوگوں نے کہا کہ ہماری ضروریات کے لئے صرف یہی پانی تھا۔ آپ نے اس کے اندر ہاتھ ڈال دیا اور آپ کی انگلیوں کے درمیان سے چشمہ کی طرح پانی جاری ہوا۔ چودہ پندرہ سو آدمی ساتھ تھے۔ سب نے اس سے وضو کیا اور سیراب ہو کر پانی پیا۔ ❹

کلی سے پانی بڑھ جانا

دوسری روایت ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اس دن اس کنوئیں پر ٹھہرے جس کا نام حدیبیہ تھا اور اس کا تمام پانی اولچ لیا۔ یہاں تک کہ کنوئیں کے اندر ایک قطرہ پانی نہ رہا۔ آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو کنوئیں کے کنارے

❶ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ: ۳۵۷۲؛ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی معجزات النبی ﷺ: ۵۹۴۳۔ ❷ صحیح بخاری، ایضًا: ۳۵۷۴ ومسلم ایضًا: ۵۹۴۱۔

❸ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ: ۳۵۷۵۔ ❹ ایضًا: ۳۵۷۶۔

بیٹھ گئے اور تھوڑا سا پانی منہ میں لے کر اس میں کلی کر دی۔ تھوڑی دیر میں اس قدر ابلا کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اور صحابہ کے تمام اونٹ سیراب ہو گئے۔ (1)

ہاتھ منہ دھونے کی برکت

غزوۂ تبوک کے سفر میں دو دو وقت کی نمازیں ایک ساتھ پڑھتے جا رہے تھے۔ ایک دن عشاء اور مغرب کی نماز ایک ساتھ ادا کی۔ پھر فرمایا: ''کل تم لوگ دوپہر کے وقت تبوک کے پاس پہنچو گے لیکن جب تک میں نہ آلوں کوئی شخص اس کے پانی میں ہاتھ نہ لگائے۔'' لوگ پہنچے تو نہر تسمہ کی طرح تنگ اور باریک نظر آئی۔ آنحضرت ﷺ کے حکم سے لوگوں نے پانی کو اولیچنا شروع کیا۔ پانی ایک گڑھے میں جمع ہو گیا تو آنحضرت ﷺ نے اس میں منہ ہاتھ دھوئے پھر وہ پانی نہر میں ڈال دیا گیا تو وہ پانی سے ابل گئی۔ (2)

انگلیوں کی برکت

آپ ﷺ نے ایک سفر میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے وضو کا پانی طلب فرمایا۔ انہوں نے قافلہ میں بہت ڈھونڈھا پانی نہیں ملا، انصار میں ایک شخص تھے جو خاص طور پر آنحضرت ﷺ کے لئے پانی ٹھنڈا کر رکھتے تھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں پانی نہ ملنے کی اطلاع کی تو آپ نے ان کو ان انصاری کے پاس بھیجا۔ لیکن ان کے پاس بھی اس قدر کم پانی نکلا کہ اگر انڈیلا جاتا تو برتن کے خشک حصہ میں جذب ہو کر رہ جاتا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کو اس کی خبر دی تو آپ نے اس برتن کو منگا بھیجا اور ہاتھ میں لے کر کچھ پڑھا اور اس کو طشت کے اندر رکھ کے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ بسم اللہ کر کے آپ کے ہاتھ پر پانی گرائیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے پانی ڈالنا شروع کیا تو پہلے آپ کی انگلیوں کے درمیان سے پانی امنڈا۔ پھر تمام طشت بھر گیا یہاں تک کہ سب لوگ پانی پی کر سیراب ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے اس کے اندر سے ہاتھ نکال لیا تو طشت بھرا کا بھرا رہ گیا۔ (3)

انگلیوں سے پانی کا جوش مارنا

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار عصر کا وقت آ گیا۔ صرف تھوڑا سا بچا ہوا پانی رہ گیا تھا۔ آپ ﷺ نے اپنی انگلیاں اس میں ڈال دیں اور ان کے اندر سے پانی جوش مارنے لگا۔ یہاں تک کہ ۱۴سو آدمیوں نے اس سے وضو کیا اور سیراب ہوئے۔ (4)

تھوڑے پانی میں کثیر برکت

ایک بار آپ ﷺ سفر میں تھے صبح کے وقت قافلہ سے الگ ہو کر سو گئے اور چند اشخاص سے جو ساتھ

(1) صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ: ۳۵۷۷۔ (2) مسلم، کتاب الفضائل، باب فی معجزات النبی ﷺ: ۵۹۴۷۔ (3) مسلم، کتاب الزھد، باب حدیث جابر الطویل: ۷۵۱۹۔
(4) بخاری، کتاب الاشربۃ، باب شرب البرکۃ والماء المبارک: ۵۶۳۹۔

تھے کہہ دیا کہ نماز کا خیال رکھنا لیکن سب کے سب سو گئے اور سب سے پہلے آنحضرت ﷺ بیدار ہوئے تو دن نکل چکا تھا اب سب کے سب گھبرا کے اٹھے تو آپ ﷺ نے کوچ کرنے کا حکم دیا۔ دن چڑھا تو آپ ﷺ نے سواری سے اتر کر وضو کیا۔ تھوڑا سا پانی جو بچ رہا تھا اس کی نسبت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اس کو محفوظ رکھنا اس سے ایک عظیم الشان نشان ظاہر ہوگا۔'' جب آفتاب خوب بلند ہو چکا تو آپ قافلہ سے جا ملے لوگوں نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! پیاس نے ہم کو مار ڈالا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگ تباہ نہیں ہو سکتے۔'' یہ کہہ کر آپ نے وضو کا بچا ہوا پانی ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے طلب کر کے لوگوں کو پلانا شروع کیا اور تمام لوگ سیراب ہو گئے۔ [1]

انگلیوں سے پانی اُبلنا

حبان بن بح الصدائی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میری قوم حالت کفر میں تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ ان کے لئے فوجی تیاریاں فرما رہے ہیں۔ میں آیا اور آپ کو اطلاع دی کہ میری قوم مسلمان ہے پھر میں نے رات بھر آپ کے ساتھ سفر کیا۔ جب صبح ہوئی تو میں نے اذان دی۔ آپ نے پانی کا ایک برتن مجھے عطا فرمایا۔ میں نے اس سے وضو کیا۔ پھر آپ نے اپنی انگلیاں اس میں ڈال دیں اور ان کے درمیان سے چشمہ کی طرح پانی ابلنے لگا۔ آپ نے حکم دیا کہ جو شخص چاہے اس سے وضو کرے۔ [2]

ایک اور واقعہ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ معجزات کو برکت سمجھا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ پانی کی کمی کی شکایت ہوئی تو آپ نے بچے ہوئے پانی کو طلب فرمایا۔ وہ ایک برتن میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا اور آپ نے اس میں ہاتھ ڈال کر فرمایا کہ ''وضو کر کے مبارک پانی کی طرف دوڑو خدا کی طرف سے برکت ہوگی۔'' میں نے دیکھا تو آپ ﷺ کی انگلیوں کے درمیان پانی ابل رہا تھا۔ [3]

یہ واقعات جو مختلف عنوانوں میں بیان کئے گئے ہیں ممکن ہے کہ ان میں سے بعض ایک ہی واقعہ کی متعدد حکایتیں ہوں۔ لیکن چونکہ ہر ایک کے ساتھ خصوصیات میں کچھ فرق و امتیاز محسوس ہوا، اس لئے ان کو مستقل واقعات کی صورت دے دی گئی ہے۔

---

[1] مسلم، کتاب المساجد، باب قضاء الصلوٰۃ الفائتۃ:١٥٦٢۔ [2] مسند امام احمد بن حنبل، ج٤، ص:١٦٩۔
[3] صحیح بخاری، کتاب المناقب باب علامات النبوۃ فی الاسلام:٣٥٧٩۔

اطلاعِ غیب

﴿ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ ﴾ (۷۲/ الجن:۲۶، ۲۷)

قرآن مجید نے اس حقیقت کو بار بار بے نقاب کیا ہے کہ ''غیب کا علم خدا کے سوا کسی اور کو نہیں۔'' چنانچہ قرآن مجید میں اس معنی کی بکثرت آیتیں ہیں اور ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم غیب کی صفت سے خدا کے سوا کسی اور کو متصف نہیں کیا جا سکتا:

﴿ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ ﴾ (۱۰/ یونس:۲۰)

''کہہ دے (اے پیغمبر ﷺ) کہ غیب تو خدا ہی کے لئے ہے۔''

﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ (۲۷/ النمل:۶۵)

''کہہ دے (اے پیغمبر ﷺ) کہ خدا کے سوا آسمان و زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا۔''

یعنی خدا کے سوا کسی مخلوق کو غیب کا ذاتی علم نہیں اور نہ غیب کی باتیں خدا نے آسمان و زمین میں کسی مخلوق کو بتائی ہیں۔ چنانچہ قیامت کے دن تمام انبیا کو یہ اعتراف کرنا پڑے گا:

﴿ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَاۤ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ ﴾

(۵/ المآئدۃ:۱۰۹)

''جس دن خدا تمام پیغمبروں کو جمع کرے گا اور کہے گا کہ تم کو کیا جواب دیا گیا وہ کہیں گے کہ ہم کو کچھ علم نہیں غیب کی باتوں کا، پورا جاننے والا تو ہی ہے۔''

آنحضرت ﷺ جو اعلم الانبیاء تھے ان کو یہ اقرار کرنے کا حکم ہوتا ہے:

﴿ قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ ﴾ (۶/ الانعام:۵۰)

''کہہ دے (اے پیغمبر ﷺ) کہ میں نہیں کہتا کہ خدا کے تمام خزانے میرے قبضہ میں ہیں اور یہ بھی کہہ دیتا ہوں کہ میں غیب کی باتیں نہیں جانتا۔''

﴿ قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾

(۷/ الاعراف:۱۸۸)

''کہہ دے اے پیغمبر (ﷺ)! کہ میں اپنے آپ کے لئے کسی نفع وضرر پر قادر نہیں ہوں۔ لیکن یہ کہ خدا جو چاہے، اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو بہت سے فائدے اٹھا لیتا اور مجھ کو کبھی مصیبت نہ پیش آتی لیکن میں تو ایمان دار قوم کو ڈرانے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں۔''

ان آیتوں نے صاف کھول دیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو نہ غیب کا ذاتی علم تھا اور نہ تمام غیب کی باتیں

آپ ﷺ کو بتائی گئی تھیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم میں سے جو کچھ چاہا اور پسند کیا، آنحضرت ﷺ کو وقتاً فوقتاً اس سے مطلع فرماتا رہا۔ چنانچہ صاف ارشاد ہوا:

﴿ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۵۵)

''وہ (یعنی مخلوقات الٰہی) خدا کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے، لیکن اتنے کا جتنے کا خدا چاہے۔''

سورۂ جن میں فرمایا:

﴿ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۞ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ ﴾ (۷۲/ الجن:۲۶، ۲۷)

''اللہ تعالیٰ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ لیکن اس پیغمبر پر جس کو پسند کرے۔''

دوسری جگہ سورۂ آل عمران میں فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِن رُّسُلِهِ مَن يَشَاءُ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۷۹)

''اور خدا غیب کی باتیں تم کو نہیں بتا سکتا لیکن وہ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہتا ہے (اس کے لئے) چن لیتا ہے۔''

امور غیب میں سے قیامت کے متعلق تصریح کر دی گئی ہے کہ اس کا علم کسی کو عطا نہیں ہوا ہے:

﴿ يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا ۖ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي ۖ لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ ۚ ثَقُلَتْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً ۗ يَسْأَلُونَكَ كَأَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۖ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ اللَّهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۞ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۸۷)

''(اے پیغمبر ﷺ) لوگ تجھ سے قیامت کی نسبت پوچھتے ہیں کہ وہ کب لنگر انداز ہوگی۔ کہہ دے کہ اس کا علم تو صرف میرے پروردگار ہی کو ہے وہی اپنے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا وہ وقت آسمان و زمین پر بڑا بھاری ہوگا وہ دفعتہً آ جائیگا۔ تجھ سے وہ قیامت کا حال اس طرح پوچھتے ہیں کہ گویا وہ تجھے معلوم ہے اور تو چھپاتا ہے کہہ دے کہ اس کا علم صرف خدا ہی کے پاس ہے لیکن اکثر آدمی نہیں سمجھتے۔''

صحاح میں حضرت جبریل علیہ السلام کے ایک مسافر کی صورت میں آنے کی جو روایت ہے اور جس میں انہوں نے ایمان، اسلام اور احسان کے متعلق آنحضرت ﷺ سے سوالات پوچھے ہیں اور آپ نے ان کے جوابات دیے ہیں۔ اس کے آخر میں وہ پوچھتے ہیں کہ قیامت کب ہوگی؟ اس کے جواب میں آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:

((ماالمسئول عنھابا علم من السائل وساحد ثلك عن اشراطھا)) ❶

''جس سے پوچھتے ہو وہ پوچھنے والے سے اس باب میں زیادہ علم نہیں رکھتا۔ہاں اس کی علامتیں بتاؤں گا۔''

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ وہ کہا کرتی تھیں کہ جو تم سے یہ کہے کہ آنحضرت ﷺ غیب کی باتیں جانتے تھے وہ جھوٹا ہے، ❷ قرآن نے صاف کہہ دیا ہے:

﴿ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ ﴾ (۳۱/ لقمان:۳٤)

''کسی نفس کو یہ علم نہیں کہ کل وہ کیا کرے گا۔''

ایک دفعہ چند لڑکیاں آپ ﷺ کے سامنے بیٹھی کچھ گا رہی تھیں، گاتے گاتے ایک نے ان میں سے کہا:

وفینا نبی یعلم مافی غدٍ ''ہم میں سے ایک نبی ہے جو کل کی ہونے والی بات جانتا ہے۔''

آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا ❸ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:''غیب کی کنجی پانچ باتیں ہیں۔''اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ❹

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ ﴾ (۳۱/ لقمان:۳٤)

''خدا ہی کے پاس اس آنے والی گھڑی کا علم ہے۔وہی پانی برساتا ہے۔وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا ہے؟ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا، اور نہ یہ کوئی جانتا ہے کہ کس سرزمین میں وہ کہاں مرے گا۔''

یہی روایت بخاری کے دوسرے باب میں اس طرح ہے کہ غیب کی کنجیاں پانچ ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔بجز خدا کے کوئی نہیں جانتا کہ حاملہ عورت کے رحم میں لڑکا ہے یا لڑکی اور نہ خدا کے سوا یہ جانتا ہے کہ کل کیسا ہوگا اور خدا کے علاوہ کسی کو اس کا علم ہے کہ پانی کب برسے گا اور نہ بجز خدا کے کسی کو اس کی خبر ہے۔کہ وہ کہاں مرے گا۔ ❺

بہرحال ان مخصوص باتوں کے علاوہ جن کا علم صرف عالم الغیب کو ہے، اپنے غیب کی باتوں میں جن باتوں کو وہ مناسب سمجھتا تھا۔آنحضرت ﷺ کو وقتاً فوقتاً ان کی اطلاع دیتا تھا۔سورۂ ہود میں بعض انبیا علیہم السلام کے حالات کے تذکرہ کے بعد خدا فرماتا ہے:

﴿ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ ﴾ (۱۱/ ھود:٤۹)

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبریل النبی ﷺ: ۵۰؛ مسلم، کتاب الایمان: ۹۳۔

❷ بخاری، کتاب التوحید: ۷۳۸۰۔

❸ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب ضرب الدف فی النکاح والولیمۃ: ۵۱٤۷۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ لقمان: ٤۷۷۸۔ ❺ صحیح بخاری، کتاب التوحید: ۷۳۷۹۔

''یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تیری طرف وحی کر رہے ہیں، نہ تو ان کو جانتا تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔''

خود آنحضرت ﷺ کے متعلق ارشاد ہوا:

﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ﴾ (۸۱/ التکویر:۲٤)

''یعنی آپ (ﷺ) کو امور غیب میں سے جس کی تعلیم دی جاتی ہے، آپ اپنی امت کو اس کے بتانے میں بخل نہیں فرماتے۔''

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کے عہد میں سورج کو گرہن لگا تھا۔ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ نماز کسوف ادا فرمائی تھی اور نماز کے بعد ایک نہایت بلیغ و موثر خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا:

((یا امة محمد واللّٰه لو تعلمون ما علمت لضحکتم قلیلا ولبکیتم کثیرا)) ❶

''اے گروہ محمد! خدا کی قسم! اگر تم وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو ہنستے کم اور روتے زیادہ۔''

ایک دفعہ نماز کے بعد آپ ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا:

((هل ترون قبلتی ههنا فواللّٰه ما یخفی علی خشوعکم و لا رکوعکم انی لاراکم من وراء ظهری)) ❷

''تم دیکھتے ہو کہ میرا رخ ادھر ہے لیکن خدا کی قسم! مجھ سے (نماز میں) نہ تمہارا خشوع اور نہ رکوع پوشیدہ رہتا ہے میں تم کو اپنی پیٹھ کے پیچھے سے دیکھتا ہوں۔''

دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((انی لاراکم من ورائی کما اراکم)) ❸

''میں جس طرح تم کو دیکھ رہا ہوں اسی طرح میں تم کو پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔''

احادیث میں متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے۔ بعض صاحبوں نے کچھ سوالات کئے جن کو آپ نے پسند نہیں کیا۔ آپ کو جوش آ گیا۔ آپ نے فرمایا: ((سلونی عما شئتم)) ''جو چاہو مجھ سے دریافت کر لو۔'' ایک شخص نے اٹھ کر کہا: یا رسول اللہ! میرا باپ کون ہے؟ فرمایا: ''حذافہ۔'' دوسرے نے اٹھ کر کہا اور میرے باپ کا نام کیا ہے فرمایا: ''سالم، غلام شیبہ۔'' اور بار بار آپ ﷺ فرماتے جاتے تھے: ''پوچھو مجھ سے، پوچھو مجھ سے۔'' یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور عرض کی، یا رسول اللہ! ہم کو اللہ اپنا پروردگار، محمد ﷺ اپنا رسول اور اسلام اپنا دین پسند ہے۔ ❹

❶ صحیح بخاری، کتاب الکسوف، باب الصدقة فی الکسوف:۱۰٤٤۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الصلوة، باب عظة الامام الناس:٤۱۸۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الصلوة، باب عظة الامام الناس:٤۱۹۔
❹ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الغضب فی الموعظة والتعلیم:۹۲۔

صحابہ رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ ایک دن آپ ﷺ نے صبح کی نماز پڑھ کر تقریر شروع کی یہاں تک کہ ظہر کا وقت آ گیا۔ ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر عصر تک پھر تقریر کی، اس کے بعد عصر کی نماز پڑھی، اس سے فارغ ہو کر غروب آفتاب تک پھر تقریر کا سلسلہ جاری رہا۔ اس طویل خطبہ میں آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ ہو گا۔ یعنی آغاز آفرینش سے لے کر قیامت تک کے واقعات، پیدائش عالم، علامات قیامت فتن حشر ونشر سب کچھ سمجھایا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہا کرتے تھے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ بہت کچھ بھول گئے۔ بعضوں کو بہت کچھ یاد ہے، ان واقعات میں سے جب کوئی واقعہ پیش آ جاتا ہے تو ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی شخص کی صورت ذہن سے اتر جاتی ہے پھر اس کو دیکھ کر یاد آ جاتی ہے۔ [1]

نجاشی شاہ حبش جس کے سایہ حکومت میں جا کر مسلمانوں نے پناہ لی تھی اور جس نے اسلام کی صداقت کا اعتراف کیا تھا، جس دن اس نے حبش میں وفات پائی۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس سانحہ کی اطلاع دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''آج تمہارے بھائی نجاشی نے وفات پائی۔'' اور اس کے بعد اس کے جنازہ کی نماز غائبانہ ادا فرمائی۔ [2]

۸ھ میں غزوۂ موتہ پیش آیا ہے تو آپ ﷺ نے فوج کا علم زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو عنایت کیا اور فرمایا: ''جب زید شہید ہوں تو یہ امانت جعفر رضی اللہ عنہ کے سپرد کی جائے۔ جب وہ بھی جاں بحق ہوں تو عبداللہ بن رواحہ اس خدمت کو انجام دیں اور جب وہ بھی کام آ جائیں تو مسلمان اپنے مشورہ سے جس کو چاہیں اپنا سردار بنائیں۔'' یہ افسری اور سرداری کے متعلق ترتیبی بیان درحقیقت واقعہ کا اظہار تھا۔ میدان جنگ میں پہلے زید رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی، ان کی جانشینی جعفر رضی اللہ عنہ نے کی، وہ بھی جب علم نبوت پر قربان ہو چکے، تو عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے پیش قدمی کی۔ جب وہ بھی نثار ہو گئے تو مسلمانوں نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اپنا افسر بنایا۔ چونکہ اس جنگ میں رومیوں کی عظیم الشان سلطنت کا مقابلہ تھا، اس لئے مسلمانوں کو بڑا اضطراب تھا۔ عین اس وقت جب مدینہ سے کوسوں دور شام کی سرحد پر یہ خونی مناظر درپیش تھے۔ آنحضرت ﷺ مسجد نبوی میں منبر پر تشریف فرما تھے۔ دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور فرما رہے تھے علم کو زید رضی اللہ عنہ نے لیا وہ بھی شہید ہوئے۔ پھر جعفر رضی اللہ عنہ نے لیا وہ بھی جاں بحق ہوئے۔ تو عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے لیا انہوں نے بھی شہادت پائی تو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے لیا اور ان کو فتح دی گئی۔ [3]

ایک غزوہ میں ایک شخص نہایت جانبازانہ حملے کر رہا تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے دیکھا تو اس کی بڑی تعریف کی۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے اس کو دیکھ کر فرمایا: ''یہ جہنمی ہے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس پر تعجب ہوا اور ایک

[1] صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب اخبار النبی ﷺ، فیما یکون الی قیام الساعۃ: ۷۲۶۳ تا ۷۲۶۷۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الرجل ینعی الی اھل المیت بنفسہ: ۱۲۴۵ وصحیح مسلم، باب فی التکبیر علی الجنازۃ: ۲۲۰۴۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الجنائز: ۱۲۴۶، باب علامات النبوۃ فی الاسلام: ۳۶۳۰ وغزوۃ موتۃ: ۴۲۶۲۔

صحابی اس کے پیچھے ہو لئے۔ایک موقع پر اس کو سخت زخم لگا اور اس نے بے صبری کی حالت میں خودکشی کر لی۔ وہ صحابی خدمت مبارک میں دوڑے ہوئے آئے اور کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ﷺ خدا کے رسول ہیں۔آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا واقعہ ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ابھی حضور نے ایک شخص کے متعلق فرمایا تھا کہ وہ جہنمی ہے لوگوں کو اس پر تعجب ہوا تھا، میں اس کے پیچھے ہولیا۔میں نے دیکھا کہ ایک زخم کے صدمہ سے اس نے خودکشی کر لی۔ ❶

ایک غزوہ میں ایک شخص شریک تھا، وہ قتل ہوا، کسی نے آکر خبر دی کہ یا رسول اللہ ﷺ! فلاں شخص شہید ہو گیا۔فرمایا کہ ”یہ ناممکن ہے، شہادت اس کے لئے کہاں؟ میں نے اس کو دوزخ میں دیکھا ہے، کیونکہ مال غنیمت میں سے اس نے ایک عبا چرائی تھی۔“ ❷

مسلمانوں نے ۸ھ میں طائف کا محاصرہ کیا آنحضرت ﷺ کو معلوم ہو چکا تھا کہ طائف کی فتح اس محاصرہ سے مقدر نہیں۔اس لئے ایک روز آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”کل ان شاء اللہ ہم محاصرہ چھوڑ کر کوچ کریں گے۔“ لوگوں کو اتنی محنت وزحمت کے بعد حصول فتح کے بغیر واپسی شاق ہوئی اور انہوں نے کہا، ہم فتح حاصل کئے بغیر چلے جائیں۔آپ ﷺ نے فرمایا: ”اچھا کل پھر قسمت آزمائی کرلو۔“ چنانچہ دوسرے دن مسلمان لڑے تو ان کو زیادہ نقصانات ہوئے شام ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”کل ان شاء اللہ ہم محاصرہ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔“ مسلمانوں کو اس سے تعجب ہوا اور آپ مسکرا دیے ❸ یہ (گویا) اس بات کا اظہار تھا کہ تمہیں میری طرح حقیقت حال کا علم نہ تھا۔

عمیر بن وہب اسلام کا سخت دشمن تھا، وہ اور صفوان بن امیہ دونوں خانہ کعبہ میں بیٹھ کر بدر کے مقتولین پر ماتم کر رہے تھے اور بالآخر ان دونوں میں پوشیدہ طور سے یہ سازش قرار پائی کہ عمیر مدینہ جا کر رسول اللہ ﷺ کو دھوکے سے قتل کر آئے اور اگر وہ مارا گیا تو صفوان اس کے تمام قرض اور گھر کے مصارف اور اولاد کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لے گا۔عمیر یہاں سے اٹھ کر گھر آیا اور تلوار کو زہر میں بجھا کر مدینہ کو چل کھڑا ہوا۔مدینہ پہنچا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو دیکھ لیا وہ اس کو پکڑ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لائے۔آپ ﷺ نے پوچھا: ”عمیر! یہاں کس ارادہ سے آئے ہو؟“ اس نے کہا، اپنے بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں فرمایا: ”کیوں نہیں؟ کیا تم نے اور صفوان نے خانہ کعبہ میں بیٹھ کر میرے قتل کی سازش نہیں کی ہے؟“ عمیر یہ راز کی بات سن کر سناٹے میں آ گیا اور اس کو سخت تعجب ہوا، اور بے اختیار بول اٹھا کہ محمد ﷺ بے شک تم خدا کے پیغمبر ہو! خدا کی قسم! میرے اور صفوان کے سوا کسی تیسرے کو اس معاملہ کی خبر نہ تھی۔ ❹

❶ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب لایقول فلان شهید: ۲۸۹۸ وکتاب الرقاق، باب العمل بالخواتیم: ٦٤٩٣۔

❷ جامع ترمذی، باب ماجاء في الغلول: ١٥٧٤۔ ❸ صحیح بخاری: ٤٣٢٥ ومسلم غزوة الطائف: ٤٦٢٠۔

❹ تاریخ طبری بروایت عروة بن زبیر، ج٣، ص: ٣٠٤، طبع یورپ۔

حضرت وابصہ اسدی رضی اللہ عنہ صحابی کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اس غرض سے حاضر خدمت ہوا کہ نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کروں۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں آپ ﷺ نے فرمایا: ''وابصہ! میں تمہیں بتاؤں کہ تم کیا پوچھنے آئے ہو؟'' عرض کی، ارشاد ہو۔ فرمایا: ''تم نیکی اور گناہ کی حقیقت پوچھنے آئے ہو۔'' عرض کی، قسم اس ذات کی جس نے آپ کو بھیجا آپ نے سچ فرمایا۔ ارشاد ہوا: ''نیکی وہ ہے جس کے کرنے کے خیال سے تمہارے دل میں انشراح اور خوشی پیدا ہو اور گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کرے۔ اگرچہ لوگوں نے اس کے کرنے کا فتویٰ ہی کیوں نہ دے دیا ہو۔'' [1]

ایک دفعہ ایک صحابیہ نے آپ ﷺ کی دعوت کی۔ بکری ذبح کی اور آپ کو اور دیگر رفقا کو کھانا کھانے کے لئے بلایا۔ آپ تشریف لے گئے اور گوشت کا ایک لقمہ اٹھا کر ابھی چکھا ہی تھا کہ فرمایا: ''یہ بکری اپنے مالک کی اجازت کے بغیر ذبح کی گئی ہے۔'' صحابیہ نے عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ! آل معاذ اور ہمارے خاندان میں پوچھنے گچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی وہ ہماری چیز بے تکلف لیتے ہیں اور ہم ان کی چیز [2] دوسری روایت میں ہے کہ اس نے جواب دیا کہ ہاں یارسول اللہ ﷺ! میں نے اپنی پڑوسن سے یہ بکری مانگی اس نے اپنے شوہر سے پوچھے بغیر دے دی۔

غزوۂ خیبر میں ایک یہودیہ نے آپ ﷺ کی دعوت کی۔ کھانے میں بکری کا گوشت تھا۔ آپ نے چند رفقا کے ساتھ اس کو کھانا چاہا، ابھی پہلا ہی لقمہ اٹھایا تھا کہ آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ''ہاتھ روک لو اس گوشت میں زہر ملایا گیا ہے۔'' اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ خیبر کے تمام یہود کو جمع کیا جائے جب وہ جمع ہو چکے تو آپ نے دریافت کیا کہ جو کچھ میں پوچھوں گا تم سچ سچ بتاؤ گے؟ انہوں نے ہاں کہا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟'' انہوں نے کچھ بتایا آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم جھوٹے ہو تمہارے باپ کا یہ نام ہے۔'' اس امتحان کے بعد آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''کیا تم نے بکری کے گوشت میں زہر ملایا تھا؟'' انہوں نے کہا، ہاں۔ آپ ﷺ کو کیونکر معلوم ہوا؟ فرمایا: ''بکری کے اس دست نے مجھ سے کہا۔'' [3]

حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ جو صہیب رومی کر کے مشہور ہیں جس شب کو آنحضرت ﷺ نے ہجرت فرمائی۔ انہوں نے بھی ہجرت کرنی چاہی، لیکن کفار نے ان کو روک دیا۔ وہ رات بھر کھڑے رہے اور بیٹھنے کا نام بھی نہیں لیا۔ کفار نے ان کی اس حالت کو دیکھ کر کہا کہ چلو اس کو تو پیٹ کے عارضے نے خود ہی مجبور کر دیا ہے یہ

---

[1] مسند احمد، حديث وابصة الاسدي، ج ٤، ص: ٢٢٧ وابو يعلى وبيهقى وابو نعيم فى حلية الاولياء، ذكر وابصة بن معبد الجهنى، ج٢، ص:٢٤۔ [2] حاكم فى المستدرك عن جابر ٤/ ٢٣٤، ٢٣٥؛ مسند احمد، ج٣، ص:٣٥١۔ [3] سنن ابى داود، كتاب الديات، باب فيمن سقى رجلا سما أواطعمه فمات: ٤٥١٢ ودارمى باب ما اكرم النبى: ٦٩ وبيهقى۔

کہہ کر وہ چلے گئے۔ انہوں نے نگہبانوں سے اپنے کو آزاد پا کر مدینہ کا راستہ لیا۔ کافروں نے ان کو پکڑ لیا۔ آخر کچھ زر و نقد دے کر ان سے رہائی حاصل کی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو دیکھنے کے ساتھ فرمایا: ''اے ابویحییٰ! تمہاری خرید و فروخت بڑے نفع کی رہی۔'' حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! مجھ سے پہلے کوئی یہاں آیا نہیں جو اس راز کی آپ ﷺ کو خبر کرتا یہ یقیناً آپ کو بذریعہ وحی معلوم ہوا۔ ❶

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی والدہ مکرمہ نے ایک دن اپنے بیٹے پر عتاب کیا کہ تم آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اتنے دن ہو گئے کیوں نہ گئے۔ انہوں نے معذرت کی اور کہا کہ آج جا کر اپنی اور آپ کی مغفرت کی دعا کراؤں گا۔ چنانچہ وہ مغرب کی نماز میں جا کر حاضر ہوئے۔ عشاء کی نماز کے بعد جب آپ ﷺ واپس ہوئے تو یہ بھی پیچھے چلے۔ آپ نے آواز پہچان کر فرمایا: ''کون؟ حذیفہ! خدا تمہاری اور تمہاری ماں کی مغفرت کرے۔'' ❷ گویا درخواست سے پہلے ہی حذیفہ کی درخواست سمع اقدس تک پہنچ چکی تھی۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کو آپ ﷺ کی اس قوت اطلاع کا اس قدر یقین تھا کہ جب تک آنحضرت ﷺ زندہ رہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنے ایک ایک عمل کا خوف لگا رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ خدا آپ کو اس سے باخبر کر دے۔ یہاں تک کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ہم لوگ اپنی بیویوں سے بھی کھل کر ملتے ہوئے ڈرتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ ہماری نسبت قرآن میں کچھ نازل ہو جائے، تو رسوائی ہو ❸ علاوہ ازیں منافقین کے تمام اندرونی حالات اور ناموں سے بھی آپ ﷺ کو ایک ایک کر کے واقفیت تھی۔ ❹

❶ مستدرك حاكم، ج ٣، ص: ٤٠٠ بروایت صحیحہ ذہبی نے بھی اس کی تصریح کی ہے ذکر مناقب صہیب۔

❷ جامع ترمذی، كتاب المناقب: ٣٧٨١۔ ❸ صحیح بخاری، كتاب النكاح، باب الوصاة بالنسآء: ٥١٨٧؛ مسند احمد، ج ٢، ص: ٦٢۔ ❹ صحیح بخاری، كتاب المغازی، باب حديث كعب بن مالك: ٤٤١٨۔

اہل کتاب کے سوالات کا جواب دینا

یہ دوست دشمن اور موافق و مخالف سب کو معلوم ہے کہ آنحضرت ﷺ لکھے پڑھے نہ تھے۔ یہود و نصاریٰ کی مذہبی کتابوں سے آپ ﷺ کو تعلیمی واقفیت نہ تھی۔ تورات و انجیل اور علمائے یہود و نصاریٰ نے ان کی شرحوں میں یا اپنی دوسری مذہبی تصنیفات میں جو کچھ لکھا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کا ایک صفحہ بھی ملاحظہ نہیں فرمایا تھا اور یہی آخری چیزیں اس وقت یہود و نصاریٰ کے ایمان و عقائد کا جزو ہو گئی تھیں اور عوام میں ان ہی کتابوں کو مقبولیت حاصل تھی بایں ہمہ آپ ﷺ کا ان کے سوالات کا صحیح جواب دینا، آپ کی روحانی تعلیم کی کھلی شہادت ہے۔ مکہ میں جب آنحضرت ﷺ نے اپنی نبوت کا اعلان کیا تو کفار عرب کو عموماً آپ کے اس دعویٰ پر یقین نہیں آیا۔ اس لئے انہوں نے معجزات طلب کئے اور جب وہ دکھائے گئے تو ان کو سحر اور جادو کہنے لگے۔ پھر ان کو خیال آیا کہ یثرب خیبر اور شام میں جا کر یہودیوں سے ملیں اور ان سے پوچھ کر چند ایسے سوالات دریافت کریں۔ جن کے جوابات محمد ﷺ سے مانگے جائیں اور چونکہ وہ لکھے پڑھے نہیں ہیں اور مکہ میں بھی کوئی ایسا نہیں ہے جو ان کو ان کے جوابات بتا سکے گا اس لئے وہ ان کے جوابات نہ دے سکیں گے اور اس طرح اس مدعی نبوت کی قلعی کھل جائے گی اور اس کا کذب سب پر واضح ہو جائے گا اس خیال کی بنا پر وہ یہودیوں سے جا کر ملے۔ ان سے آپ کے حالات بیان کئے اور آپ سے پوچھنے کے لئے ان سے چند سوالات مانگے۔ چنانچہ انہوں نے چند سوالات دیے کہ یہ جا کر اس سے پوچھو اگر وہ پیغمبر نہ ہو گا تو ہرگز اس کا جواب نہ دے سکے گا۔

یہ تین تاریخی سوالات تھے۔ اصحاب کہف کا حال، حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کی ملاقات کا واقعہ اور ذوالقرنین کا قصہ، اللہ تعالیٰ نے یہ تینوں قصے وحی کے ذریعے سے آنحضرت ﷺ کو بتا دیے اور آپ نے ان کو پڑھ کر کفار کو سنایا۔ چنانچہ سورۂ کہف میں یہ تینوں قصے مذکور ہیں اور آخری قصہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ یہ کفار کے سوال کے جواب میں ہے:

﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَن ذِي ٱلْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَأَتْلُوا۟ عَلَيْكُم مِّنْهُ ذِكْرًا ﴾

(۱۸/ الکھف:۸۳)

''اور کفار تجھ سے (اے پیغمبر ﷺ!) ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں کہ دے کہ میں اس کا تھوڑا ذکر تم کو سناتا ہوں۔''

آنحضرت ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے۔ جو گویا یہودیوں ہی کا شہر تھا تو انہوں نے بھی مناسب سمجھا کہ اس مدعی نبوت علیہ السلام کے دعوائے نبوت کا امتحان انہی کتابی سوالات سے لیا جائے۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ ہماری کتابوں سے واقف نہیں۔ اس لئے وہ ان کے صحیح جوابات نہ دے سکے گا اور اگر اس

نے یہ کہہ دیا کہ یہ سوالات یا جن کتابوں میں وہ سوالات مذکور ہیں وہ غیر معتبر ہیں تو ان سوالوں اور کتابوں کا اثر یہود میں اس قدر ہے کہ ان کی تکذیب سے خود محمد ﷺ کی جہالت اور کذب دعویٰ کا (نعوذ باللہ) پردہ فاش ہو جائے گا۔ لیکن اتنے بڑے مجمع میں سب لوگ بدنیت ہی نہ تھے۔ بلکہ ان میں بعض لوگ نیک نیت بھی تھے اور وہ نیک نیتی سے یہ سمجھتے تھے کہ ہماری کتابوں میں جو مخفی اسرار لکھے ہوئے ہیں، ان کو پیغمبر کے سوا کوئی اور نہیں بتا سکتا۔

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ آئے، تو عبداللہ بن سلام مدینہ کے ایک مشہور یہودی عالم آپ سے ملنے آئے اور کہا کہ میں آپ سے تین سوال کروں گا، جن کا جواب پیغمبر کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا۔ (نمبر ۱) یہ بتائیے کہ قیامت کی پہلی علامت کیا ہے؟ (نمبر ۲) اور اہل جنت کی پہلی غذا کیا ہوگی؟ (نمبر ۳) اور بچہ کبھی ماں سے اور کبھی باپ سے مشابہ کیوں ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کی پہلی نشانی ایک آگ ہے جو لوگوں کو مشرق سے لے کر مغرب تک لے جائے گی اور اہل جنت کی پہلی غذا مچھلی کا جگر ہے اور ماں یا باپ سے بچہ کی مشابہت کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جب باپ کا نطفہ سبقت کرتا ہے تو بچہ باپ سے مشابہ ہوتا ہے اور جب ماں کا نطفہ سبقت کرتا ہے تو ماں سے مشابہ ہوتا ہے۔'' عبداللہ بن سلام نے یہ جوابات سن کر کہا کہ میں آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں۔ [1]

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک یہودی عالم خدمت والا میں حاضر ہوا اور کہا کہ اے محمد (ﷺ!) میں تم سے چند سوالات کروں گا تم جواب دو۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے جواب سے تم کو فائدہ ہوگا۔'' اس نے کہا، سنو! یہ بتاؤ کہ قیامت کے دن جس وقت آسمان اور زمین بدلے جائیں گے لوگ کہاں ہوں گے؟ فرمایا: ''پل کے پیچھے تاریکی میں۔'' دوسرا سوال اس نے کیا کہ سب سے پہلے جنت میں جانے کی کس کو اجازت ملے گی؟ جواب دیا: ''ان غریبوں کو جو راہ حق میں گھر سے بے گھر ہوئے ہیں۔'' اس نے کہا، اب میں تم سے وہ بات پوچھتا ہوں جس کا جواب روئے زمین پر صرف پیغمبر یا پیغمبر کے علاوہ ایک ہی دو آدمی دے سکتے ہیں۔ بتاؤ کہ بچہ کبھی لڑکی اور کبھی لڑکا کیوں ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مرد کا نطفہ سپید اور عورت کا زرد ہوتا ہے۔ جب یہ دونوں ملتے ہیں تو اگر مرد کا نطفہ غالب ہوتا ہے تو وہ خدا کے حکم سے لڑکا ہوتا ہے اور جب عورت کا نطفہ غالب ہوتا ہے تو وہ لڑکی ہوتی ہے۔'' یہودی نے یہ جواب سن کر کہا کہ بے شک تم نبی ہو اور یہ کہہ کر چلا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ جوابات مجھ کو خدا نے القا کیے۔ مجھے پہلے سے معلوم نہ تھے۔'' [2]

مسند ابوداؤد طیالسی میں ہے کہ ایک دفعہ چند یہودی خدمت اقدس میں آئے اور کہا کہ ہم آپ ﷺ

[1] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب خلق آدم و ذریته: ۳۳۲۹۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب بیان صفة منی الرجل والمرأة: ۷۱۶۔

سے چند باتیں دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ جن کا جواب پیغمبر کے سوا کوئی اور نہیں دے سکتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو تم چاہو پوچھ سکتے ہو لیکن یہ وعدہ کرو کہ اگر میں نے ایسے جوابات دیے، جن کو تم نے صحیح سمجھا تو کیا اسلام قبول کرلو گے؟'' انہوں نے کہا، ہاں ہم کو یہ شرط منظور ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اچھا پوچھو کیا پوچھتے ہو۔'' انہوں نے کہا کہ چار سوالوں کے جواب دیجئے۔ پہلا یہ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے تورات کے اترنے سے پہلے جو کھانا اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔ اس کا کیا واقعہ ہے؟ دوسرا یہ کہ ایک ہی نطفہ کبھی نر اور کبھی مادہ کیونکر ہو جاتا ہے؟ تیسرا یہ کہ توراۃ میں نبی امی کی کیا پہچان بتائی گئی ہے [1] اور چوتھا یہ کہ فرشتوں میں سے تمہارا دوست یا نگہبان کون ہے؟ آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''تم کو اس خدا کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی تم یہ جانتے ہو کہ ایک دفعہ یعقوب علیہ السلام سخت بیمار پڑے تو انہوں نے نذر مانی کہ اگر میں اچھا ہو گیا تو کھانے اور پینے کی جو چیز مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے وہ چھوڑ دوں گا۔ ان کو کھانے میں سب سے زیادہ اونٹ کا گوشت اور پینے میں اونٹ کا دودھ پسند تھا۔ چنانچہ صحت کے بعد انہوں نے اونٹ کا گوشت اور دودھ چھوڑ دیا۔'' یہودیوں نے کہا، خدایا سچ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدایا گواہ رہو۔'' پھر فرمایا: ''میں تم کو اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ نازل کی تم کو یہ معلوم ہے کہ مرد کا نطفہ گاڑھا اور سپید ہوتا ہے اور عورت کا پتلا اور زرد ان میں جو جنس غالب ہوتی ہے وہ نطفہ بھی خدا کے حکم سے وہی ہو جاتا ہے اور اسی کے مشابہ ہو جاتا ہے۔'' انہوں نے کہا، خدایا درست ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدایا گواہ رہ۔'' پھر فرمایا: '' میں تم کو اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ پر تورات نازل کی تم کو یہ معلوم ہے کہ اس نبی کی آنکھیں سوئیں گی اور دل نہیں سوئے گا۔'' انہوں نے کہا، خدایا ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدایا گواہ رہ۔'' یہودیوں نے کہا، اچھا یہ بتائیے کہ فرشتوں میں آپ کا رفیق کون ہے؟ اسی جواب کے معلوم کرنے کے بعد ہم آپ کے ساتھ ہو جائیں گے یا آپ سے الگ ہو جائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرا رفیق جبرائیل ہے اور دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں ہوا جس کا وہ رفیق نہ ہو۔'' یہودیوں نے کہا، تو ہم پھر آپ ﷺ کے ساتھ نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ ہمارا دشمن ہے۔ [2]

صحیح بخاری باب التفسیر (بنی اسرائیل) میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایک کھیت میں جا رہا تھا کہ راہ میں چند یہودی ملے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ محمد ﷺ سے کچھ پوچھنا چاہیے بعضوں نے کہا، اس کی ضرورت نہیں۔ شاید وہ کوئی ایسا جواب دیں جو تم کو ناگوار ہو۔ بالآخر انہوں نے طے کیا کہ بہر حال کچھ پوچھنا چاہیے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ محمد! بتاؤ روح کیا چیز ہے؟ آنحضرت ﷺ خاموش ہو گئے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں سمجھ

[1] روایت کے الفاظ یہ ہیں کیف هذا النبی فی النوم یعنی حالت خواب میں نبی امی کی کیا پہچان ہے۔

[2] مسند ابی داود الطیالسی: ۲۸۵۴ بروایت شهر بن حوشب عن ابن عباس۔

گیا کہ آپ ﷺ پر وحی نازل ہو رہی ہے جب وحی نازل ہو چکی تو آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی:

﴿ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ﴾

(۱۷/ بنی اسرآئیل: ۸۵)

''وہ پوچھتے ہیں کہ روح کیا ہے؟ اے پیغمبر ﷺ! کہہ دے کہ روح میرے پروردگار کی ایک بات ہے اور تم کو علم کا بہت کم حصہ دیا گیا ہے۔'' [1]

جامع ترمذی (تفسیر بنی اسرائیل) مستدرک حاکم (جلد ا ص ۹) اور مسند احمد میں ہے کہ حضرت صفوان بن عسال مرادی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ دو یہودی راستہ میں جا رہے تھے، ایک نے دوسرے سے کہا کہ چلو اس پیغمبر سے کچھ پوچھیں، دوسرے نے کہا کہ اس کو پیغمبر نہ کہو تم کو وہ اپنی نسبت پیغمبر کہتے سنے گا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی۔ اس کے بعد وہ دونوں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور آ کر پوچھا کہ موسیٰ کو جو نو احکام ملے تھے وہ کیا تھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ یہ تھے کہ (۱) شرک نہ کرو (۲) زنا نہ کرو (۳) ناحق قتل نہ کرو (۴) چوری نہ کرو (۵) جادو نہ کرو (۶) بے گناہ کی چغلی نہ کھاؤ (۷) سود نہ کھاؤ (۸) پاک دامن عورت پر بہتان نہ باندھو اور (۹) میدان جنگ سے فرار نہ کرو۔'' راوی کو اس نویں حکم میں شک ہے۔ پھر فرمایا: ''اور تمہارے لئے اے یہود! خاص حکم یہ ہے کہ (۱۰) سبت مناؤ۔'' ان دونوں نے یہ جواب سن کر آپ ﷺ کے دست و پائے مبارک کے بوسے دیے اور یہ کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ پیغمبر ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو پھر تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟'' انہوں نے کہا کہ داؤد علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ اس کی نسل میں ہمیشہ پیغمبر ہوا کرے گا اور اگر ہم مسلمان ہو جائیں تو ہم ڈرتے ہیں کہ یہود ہم کو مار نہ ڈالیں۔ [2]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب العلم، باب قول اللہ تعالٰی ﴿وما اوتیم من العلم الا قلیلا﴾: ۱۲۵ وکتاب التفسیر: ۴۷۲۱۔ [2] جامع ترمذی، ابواب التفسیر، ومن سورۃ بنی اسرائیل: ۳۱۴۴؛ مستدرک حاکم، ج ۱، ص: ۹؛ مسند ابی داود الطیالسی: ۱۲۶۰ میں بھی روایت موجود ہے۔

اخبارِ غیب یا پیشین گوئی

فطرت بشری کے عجز اور بیچارگی کا سب سے بڑا دردناک نظارہ مستقبل سے ناواقفیت اور جہالت ہے انسان کی مضطرب اور بے چین فطرت مستقبل کے بحر ظلمات میں ہاتھ پاؤں مارتی ہے اور تھک کر اپنی نادانی اور جہالت کا اعتراف کر لیتی ہے اور اسی لئے وہ اس بات پر مجبور ہے کہ جو انسانیت سے مافوق کسی دعویٰ کا مدعی ہو اس کی آزمائش اور امتحان کے لئے اسی بحر بیکراں کی شناوری کو معیار اور سند قرار دیدے، چنانچہ یہی اخبار غیب اور پیشین گوئی کی قدرت نبوت اور رسالت بلکہ عام بزرگی اور ولایت کے ثبوت پر نوع انسانی کے عام افراد کے نزدیک ایک دلیل اور حجت قائمہ ہے، بنی اسرائیل کے نزدیک یہ وصف نبوت کا اس درجہ لازمہ تھا کہ ان کی زبان میں پیغمبر کا نام ہی ''پیشین گو'' ہے، عربی، عبرانی اور دوسری ساری زبانوں میں ''نبی'' یا ''نابی'' جو پیغمبر کے معنی میں مستعمل ہے، اس کے لغوی معنی مخبر اور پیشین گو کے ہیں اور نبوت کے معنی مخبری اور پیشین گوئی کے ہیں اور اسی لئے بنی اسرائیل کے نزدیک نبی اور پیغمبر کی صرف اسی قدر حقیقت ہے کہ وہ غیب کا قاصد اور جہان نادیدہ کا مخبر ہے۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب کی یہ کیفیت تھی کہ تمام عرب کاہنوں کے جال میں گرفتار تھا، عرب کے تمام مشرکانہ معابد کاہنوں کے دارالسلطنت تھے، جن میں بیٹھ کر وہ عرب کے دل و دماغ پر حکومت کر رہے تھے، مشہور کاہنوں کے پاس لوگ دور دور سے سفر کر کے آتے تھے اور ان سے مستقبل اور غیب کی باتیں دریافت کرتے تھے وہ ایک خاص قسم کی مقفیٰ اور مسجع عبارتوں میں ان کو غیب اور مستقبل کی باتیں بتاتے تھے، آنحضرت ﷺ جب پیغمبر بنا کر عربوں کے درمیان بھیجے گئے، تو ان کے لئے ثبوت نبوت کی بڑی دلیل یہی اخبار غیب اور پیشین گوئی ہو سکتی تھی، آنحضرت ﷺ نے بیسیوں پیشین گوئیاں کیں اور مستقبل کے واقعات اور باتوں کو رای العین کی طرح پیش فرمایا اور سب کی سب بے کم و کاست پوری اتریں۔

آنحضرت ﷺ سے ان پیشین گوئیوں کا صدور مختلف حالتوں میں ہوا اور آپ کو ان کی اطلاع مختلف صورتوں میں دی گئی، مثلاً: کبھی قرآن مجید کی وحی کی صورت میں، کبھی عالم خواب میں اور کبھی زبان صداقت نشان کے عام الفاظ میں جس میں طریقہ اطلاع کا اظہار نہیں ہے، قرآن مجید کی پیشین گوئیوں کی تفصیل اس سے پہلے گزر چکی ہے، خواب کی پیشین گوئیوں کا تذکرہ کچھ عالم رؤیا کے بیان میں آ چکا ہے، باقی پیشین گوئیاں سطور ذیل میں تحریر ہیں۔

فتوحاتِ عظیمہ کی اطلاع

اسلام کا آغاز جس بے اطمینانی اور بے سرو سامانی کے ساتھ ہوا، اس سے کس کو اس وقت خیال ہو سکتا تھا کہ چند نہتے، فاقہ کش، غریب الدیار مسلمانوں کے بازوؤں میں یہ قوت پیدا ہو جائے گی کہ وہ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیں گے، لیکن پیغمبر صادق ﷺ نے اسی وقت بشارت سنائی کہ مسلمانو! تم عنقریب قسطنطنیہ فتح

کرو گے، مداین تمہارے ہاتھوں میں آئے گا قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے دست تصرف میں ہوں گے، مصر تمہاری حکومت میں داخل ہو گا، تم سے اور ترکوں سے جن کی چھوٹی آنکھیں اور چوڑے چہرے ہونگے (ترکستانی ومنغولی ترک) جنگ ہوگی۔'' [1] دنیا ان میں سے کس واقعہ کی تردید کر سکتی ہے؟

یہ پیشین گوئیاں الگ الگ بھی کی گئی ہیں۔مگر مجموعی حیثیت سے اس وقت کی گئیں جب مسلمان مدینہ میں محصور ہو رہے تھے اور تمام عرب مدینہ کو گھیرنے کے لئے امنڈا چلا آ رہا تھا اور مسلمان ہر آن اپنی موت کا نقشہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے تھے۔غزوۂ خندق کے موقع پر جب خندق کھودتے ہوئے ایک سخت پتھر حائل ہو گیا تھا اور صحابہ رضی اللہ عنہم اس کو توڑنے سے عاجز ہو چکے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے معجز نما ضرب خارا شگاف سے پتھر کے ٹکڑے کر دیے تھے، تو آپ ﷺ نے تین ضربیں ماری تھیں اور ہر ضرب کے بعد ایک چنگاری سی اڑتی تھی اور آپ ﷺ ہر بار نعرہ لگاتے تھے۔

﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ ﴾

(٦/ الانعام:١١٥)

''اور تیرے پروردگار کی باتیں سچائی اور انصاف سے پوری ہوئیں، اس کی باتوں کو کوئی بدل نہیں سکتا اور وہی سننے والے جاننے والا ہے۔''

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حقیقت دریافت کی، فرمایا: ''جب میں نے پہلی ضرب ماری تو کسریٰ کے شہر اور ان کے اردگرد میرے سامنے کر دیے گئے۔یہاں تک کہ میں نے اپنی دونوں آنکھوں سے ان کو دیکھا۔'' حاضرین نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! دعا کیجئے کہ وہ فتح ہوں آپ نے دعا فرمائی۔پھر فرمایا: ''دوسری ضرب میں قیصر کے شہر اور اس کے آس پاس کے مقامات دیکھے۔'' حاضرین نے پھر عرض کی، یا رسول اللہ! ان کی فتح کی بھی دعا فرمایئے۔آپ ﷺ نے دعا کی پھر ارشاد ہوا: ''تیسری ضرب میں حبشہ کے شہر اور گاؤں نگاہوں کے سامنے آئے۔'' پھر فرمایا: ''حبشہ والے جب تک تم سے تعرض نہ کریں، تم بھی تعرض نہ کرو اور ترکوں کو اس وقت تک چھوڑ دو جب تک وہ تمہیں چھوڑ دیں۔'' [2]

یہ پیشین گوئی تو تمثیلی شکل میں تھی، آنحضرت ﷺ نے کھلے اور صریح الفاظ میں بھی بشارت سنا دی تھی۔فرمایا: ''تم لوگ جزیرہ عرب میں لڑو گے اور خدا فتح دے گا۔پھر فارس سے لڑو گے اور فتح ہوگی، پھر روم سے لڑو گے اور فتح ہوگی۔'' [3]

قیصر و کسریٰ کی بربادی کی خبر

عین اس وقت جب کسریٰ اور قیصر کی حکومتیں پورے جاہ وجلال سے دنیا پر حکمران تھیں اور بظاہر ان کی

---

[1] صحیح بخاری، باب علامات النبوۃ فی الاسلام:٣٥٨٧ تا ٣٥٩٥ میں یہ حدیثیں ہیں۔

[2] سنن نسائی، کتاب الجهاد، باب غزوة الترك وحبشة: ٣١٧٨۔

[3] صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب مایکون من فتوحات المسلمين:٧٢٨٤۔

بربادی کا کوئی سامان نہ تھا کہ مکہ کے منادی حق نے یہ پیشین گوئی کی ((اذا ھلك كسرىٰ فلا كسرىٰ بعده واذا ھلك قيصر فلا قيصر بعده))۔ ''جب کسریٰ ہلاک ہوگا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہوگا اور جب قیصر ہلاک ہوگا تو پھر دوسرا قیصر نہ ہوگا۔'' [1]

نہ صرف تاریخ بلکہ آج بھی دنیا کا مشاہدہ اس آواز کی صداقت سے معمور ہے۔ ایرانی مجوسیوں کی شہنشاہی کی شکست کے بعد کیا پھر کسی ایرانی مجوسی شہنشاہ کا تاج خسروی کسی نے دیکھا؟ اور رومی شہنشاہی کی بربادی کے بعد رومی قوم کا وجود بھی اس سطح زمین پر کہیں نظر آیا؟

ساز وسامان کی بشارت

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ ﷺ میرے گھر تشریف لائے اور دریافت کیا کہ کیا قالین ہے؟ عرض کی، ہمارے پاس قالین کہاں؟ ارشاد فرمایا کہ ''ہاں عنقریب تم قالینوں اور عمدہ فرشوں پر بیٹھو گے۔'' حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ وہ دن آیا جب ہم قالینوں پر بیٹھے اب اپنی بیوی سے کہتا ہوں کہ قالین ہٹا لے جاؤ تو وہ کہتی ہے، یہ تو آنحضرت ﷺ کی پیشین گوئی ہے۔ [2]

امن وامان کی بشارت

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا کہ دو شخص آئے، ایک نے بھوک کی، دوسرے نے رہزنی کی شکایت کی۔ آپ ﷺ نے عدی رضی اللہ عنہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: ''کیوں عدی! تم نے حیرہ کو دیکھا ہے؟'' انہوں نے کہا، دیکھا تو نہیں ہے۔ لیکن اس کو جانتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ حیرہ سے ایک ہودج نشین عورت چل کر خانہ کعبہ کا طواف کرے گی اور اس کو خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔ اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ کسریٰ کا خزانہ فتح کر لیا گیا۔ اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ ایک شخص مٹھی بھر سونا چاندی لے کر نکلے گا کہ کسی کو خیرات کر دے لیکن دولت کی کثرت کا یہ عالم ہوگا کہ کوئی قبول کرنے والا نہ ملے گا۔'' عدی رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ بات کھٹکتی تھی کہ آخر قبیلہ طے کے وہ ڈاکو کیا ہو جائیں گے۔ جنہوں نے تمام ملک میں آگ لگا رکھی ہے۔ لیکن خود عدی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے دیکھ لیا کہ حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت تنہا چل کر آتی ہے اور خانہ کعبہ کا طواف کر کے واپس جاتی ہے اور اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔ ان کا بیان ہے کہ جن لوگوں نے کسریٰ کا خزانہ فتح کیا۔ ان میں میں بھی تھا۔ صرف تیسری پیشین گوئی میرے سامنے پوری ہونے سے رہ گئی ہے۔ جو لوگ زندہ رہیں گے وہ اس کو بھی پورا ہوتے ہوئے دیکھ لیں گے۔ [3] چنانچہ راویوں کا بیان ہے کہ بنی امیہ کی سلطنت کے زمانہ

---

[1] صحيح بخارى، باب علامات النبوة: ٣٦١٨، ٣٦١٩ وصحيح مسلم، كتاب الفتن، باب لاتقوم الساعة حتى...... : ٧٣٢٧۔ [2] صحيح بخارى، كتاب المناقب، باب علامات النبوة: ٣٦٣١۔ [3] ايضًا: ٣٥٩٥۔

میں یہ واقعہ بھی بعینہٖ گزرا۔

ابوصفوان کے قتل کی خبر

ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کو مدینہ منورہ کا دارالامان مل گیا اور اسلام روز بروز ترقی کرنے لگا تو یہ دیکھ کر قریش کے سردار مدینہ پر حملہ کرنے کی تدبیر سوچنے لگے۔ اسی اثنا میں انصار کے ایک رئیس سعد رضی اللہ عنہ عمرہ ادا کرنے کے لئے مکہ معظمہ گئے اور ابوصفوان (امیہ) کے گھر جا کر مہمان ہوئے۔ ابوصفوان ایک دفعہ موقع پا کر ان کو طواف کرانے لایا۔ وہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ ابوجہل نکل آیا۔ اس نے کہا، تم مکہ آ کر بے خوف و خطر کعبہ کا طواف کرتے ہو۔ حالانکہ تم نے بے دینوں (مسلمانوں) کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے اور سمجھتے ہو کہ خدا اور سول کی تم نصرت کر رہے ہو۔ خدا کی قسم! اگر ابوصفوان کے ساتھ تم نہ ہوتے تو یہاں سے سلامت گھر نہ جا سکتے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ڈانٹ کر جواب دیا کہ اگر تم ہم کو طواف نہ کرنے دو گے تو ہم تمہارا قافلہ تجارت مدینہ کے راستہ سے گزرنے نہ دیں گے۔ ابوصفوان نے کہا کہ اے سعد! ان سے سخت لہجہ میں گفتگو نہ کرو یہ اس وادی کے سردار ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا، اے صفوان! اپنی طرف داری رہنے دو میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ تم عنقریب مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے جاؤ گے۔ ابوصفوان نے کہا، کیا وہ یہاں آ کر مجھے ماریں گے؟ انہوں نے جواب دیا، یہ مجھے نہیں معلوم۔ یہ سن کر ابوصفوان کے بدن پر رعشہ پڑ گیا وہ گو کافر تھا لیکن اس کو معلوم تھا کہ دہن رسالت ﷺ سے آج تک کوئی غلط بات نہیں نکلی۔ چنانچہ اس کے بعد بدر کی لڑائی کا موقع پیش آیا۔ تو اس کی بیوی نے جانے سے روکا اور سعد رضی اللہ عنہ کی پیشین گوئی یاد دلائی۔ ابوصفوان نے بھی ڈر کر اس فوج میں شرکت سے انکار کر دیا، لیکن ابوجہل اس کو سمجھا بجھا کر لے گیا۔ بالآخر اسی کا رزار بدر میں یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔ [1]

نام بنام مقتولین بدر کی خبر

بدر کا معرکہ جب پیش آنے والا تھا۔ آنحضرت ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کو لے کر میدان میں گئے اور بتایا کہ یہ فلاں کافر کی قتل گاہ ہے۔ یہ ابوجہل کا مقتل ہے۔ یہاں قریش کا وہ بڑا سردار مارا جائے گا۔ یہ عجیب و غریب پیشین گوئی تھی۔ تین سو، ساڑھے تین سو نیم مسلح بے سروسامان سپاہیوں کا افسر ایک ہزار سے زیادہ سپاہیوں کی غرق آہن باساز وسامان فوج کی شکست اور افسروں کے قتل وموت کا اعلان کر رہا تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہر سردار قریش کے لئے آپ نے جو جگہ مقرر فرما دی تھی، وہیں اس کی لاش خاک وخون میں لتھڑی پائی گئی۔ [2]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب ذکر النبی ﷺ من یقتل ببدر: ٣٩٥٠۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب غزوة بدر: ٤٦٢١۔

فاتح خیبر کی تعیین

خیبر میں یہودیوں کے متعدد مستحکم اور مضبوط قلعے تھے۔ ہر روز مسلمان افسر علم وفوج لے کر جاتے تھے اور زور آزمائی کرتے تھے اور شام کو ناکام واپس آتے تھے۔ ایک دن آپ ﷺ نے فرمایا: ''کل علم میں اس کے ہاتھوں میں دوں گا، جس کو خدا اور اس کا رسول پیار کرتا ہے اور اسی کے ہاتھ پر کل فتح ہوگی۔'' اسلام کی صف میں ہر حوصلہ مند شمشیرزن نے کل کی توقع پر بے قراری میں رات بسر کی، کو کبہ صبح جب طلوع ہوا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پردۂ غبار سے نمودار ہوئے۔ حضرت ممدوح کو آشوب چشم تھا۔ اس لئے وہ ساتھ نہ آ سکے تھے۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں علم دیا اور خیبر کا میدان اسی دن ان کے ہاتھوں سے سر ہوا۔ [1]

حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی وفات کی اطلاع

آنحضرت ﷺ نے اپنے مرض الموت میں ایک دفعہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو اپنے پاس بلایا اور ان کے کان میں کوئی بات کہی کہ وہ رونے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ان سے ایک اور بات کہی تو وہ ہنسنے لگیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ مجھ کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا اور ان سے اس کا سبب دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کا راز ظاہر نہیں کر سکتی۔ جب آپ کی وفات ہوگئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دوبارہ ان سے دریافت کیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا، ہاں اب میں بتا سکتی ہوں۔ حضور ﷺ نے پہلے مجھ سے یہ فرمایا: ''میں اسی بیماری میں انتقال کروں گا۔'' اور پھر فرمایا: ''اے فاطمہ! میرے اہل بیت میں سب سے پہلے تم آ کر مجھ سے ملو گی۔'' [2] یہ دونوں باتیں صحیح ہوئیں۔ آپ ﷺ نے اسی مرض میں وفات پائی اور آپ کی وفات کے تقریباً چھ ہی مہینوں کے بعد حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا بھی اس دنیا سے چل بسیں۔

خود اپنی وفات کی اطلاع

آنحضرت ﷺ نے جس سال وفات پائی ہے۔ آپ نے اسی سال اس دنیا سے اپنی تشریف بری کا عام اعلان کر دیا تھا۔ حجۃ الوداع سے پہلے معاذ رضی اللہ عنہ کو داعی اسلام بنا کر یمن بھیجا تھا۔ ان کو رخصت کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے معاذ! اب اس کے بعد تم مجھ سے نہ مل سکو گے۔ واپس آؤ گے تو میری مسجد اور میری قبر کے پاس سے گزرو گے۔'' یہ سن کر وہ رونے لگے۔ [3] حجۃ الوداع کے خطبہ میں ہزاروں مسلمانوں کے روبرو آپ ﷺ نے فرمایا: ''شاید کہ آئندہ سال تم مجھے نہ پا سکو گے۔'' مرض الموت سے کچھ دن پیشتر فرمایا: ''خدا نے اپنے بندہ کو دنیا اور آخرت کی زندگی کا اختیار دیا، تو اس نے آخرت کی زندگی پسند کی۔'' [4]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر: ۴۲۰۹۔ [2] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ: ۶۳۱۲، ۶۳۱۴ وصحیح بخاری، باب علامات النبوۃ فی الاسلام: ۳۶۲۳، ۳۶۲۵۔ [3] مسند احمد، ج ۵، ص: ۲۳۵۔

[4] صحیح بخاری، فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قول النبی ﷺ سدوا الابواب الا باب ابی بکر: ۳۶۵۴؛ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل ابی بکر: ۶۱۷۰۔

فتح یمن کی خبر

یمن ۸ ہجری میں فتح ہوا، مگر آنحضرت ﷺ نے اس کی فتح اور وہاں کے مسلمانوں کی دور دراز ملکوں میں ہجرت کی خبر پہلے ہی دے دی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''یمن فتح کیا جائے گا، تو لوگ اپنی سواریوں کو ہنکاتے ہوئے اور اہل وعیال اور جوان کا کہا مانیں گے ان کو لے کر آئیں گے۔ حالانکہ مدینہ ہی کا قیام ان کے لئے بہتر ہوتا، اگر وہ جانتے۔'' 1 آخر یمن خود آپ کی زندگی میں فتح ہوا اور آپ کے بعد جب وہاں بغاوت ہوئی تو عہد صدیقی میں دوبارہ فتح ہوا اور وہاں سے لوگ نکل نکل کر ایک طرف مشرق میں خراسان اور ترکستان تک اور دوسری طرف مغرب میں افریقہ اور اسپین تک پھیل گئے اور پھر ان تمام ملکوں میں یمنی اور حجازی قبائل کی باہمی خانہ جنگی کے باعث تباہی تاریخ کے مشہور ومعروف واقعات ہیں۔

فتح شام کی خبر

پھر فرمایا: ''اور شام مفتوح ہوگا تو لوگ اپنی سواریوں کو ہنکاتے ہوئے اور اپنے اہل وعیال اور ہمراہیوں کو لے کر آئیں گے اور مدینہ ان کے لئے بہتر ہوتا، اگر وہ جانتے۔'' 2 امام احمد نے مسند میں روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''عنقریب تم لوگ شام کی طرف ہجرت کرو گے تو وہ تمہارے لئے فتح کر دیا جائے گا۔'' 3 معلوم ہے کہ شام فتح ہونے کے ساتھ وہ عربوں کا مسکن بن گیا اور آج بھی ان کی آبادی وہاں سب سے زیادہ ہے۔

فتح عراق کی خبر

پھر ارشاد ہوا: ''عراق مفتوح ہوگا اور لوگ وہاں بھی اپنی سواریوں کو ہنکاتے ہوئے اہل وعیال کو لے کر آئیں گے۔ حالانکہ مدینہ ان کے لئے بہتر تھا، اگر وہ سمجھتے۔'' 4 فتح عراق کی بشارت کی بعض اور روایتیں بھی ہیں۔

خوزستان اور کرمان کی فتوحات اور ترکوں سے جنگ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قیامت سے پہلے تم لوگ ایسے لوگوں سے لڑو گے جن کے جوتے بال کے ہوں گے۔'' 5 دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی، جب تک تم خوز و کرمان کے عجمیوں سے نہ لڑو گے، جن کے چہرے سرخ، ناکیں چپٹی، آنکھیں چھوٹی ہوں گی۔ ان کے چہرے ہتھوڑوں سے پٹی ہوئی ڈھالوں کے مانند ہوں گے (یعنی چوڑے چپٹے) اور ان کے جوتے بال کے ہوں گے۔'' 6 اور روایتوں میں یہ الفاظ ہیں: ''اس وقت تک قیامت نہ آئے گی، جب تک مسلمان ترکوں سے نہ لڑیں، جن کے چہرے چپٹے ہوں گے، جن کے لباس

---

1 صحیح مسلم، کتاب الحج، باب ترغیب الناس فی المدینة عند فتح الامصار: ٣٣٦٤، ٣٣٦٥ وموطا مالك: ١٦٤٢ وعبدالرزاق وابن خزيمة وابن حبان۔ 2 مسلم، ایضًا: ٣٣٦٤، ٣٣٦٥۔

3 مسند احمد، ج٥، ص: ٢٤١ روایت معاذ۔ 4 صحیح مسلم، کتاب الحج: ٣٣٦٤، ٣٣٦٥ وموطا امام مالك: ١٦٤٢۔ 5 صحیح بخاری، باب علامات النبوة فی الاسلام: ٣٥٩١۔ 6 ایضًا: ٣٥٩٠۔

بال کے ہوں گے اور بال ہی کے (موزے یا جوتے) پہن کر وہ چلتے ہوں گے۔'' ❶ یہ تمام پیشین گوئیاں پہلی ہی صدی کے آخر تک پوری ہو گئیں۔

فتح مصر کی بشارت اور ایک واقعہ کا حوالہ

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم عنقریب مصر فتح کرو گے جہاں کا قیراط مشہور ہے۔ جب اس کو فتح کرو تو وہاں کے باشندوں کے ساتھ نیکی سے پیش آنا۔ کیونکہ تمہارے اور ان کے درمیان تعلق اور رشتہ ہے۔ (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کی بیوی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ماں ہاجرہ مصر کی تھیں اور جب تم دیکھنا کہ وہاں ایک اینٹ بھر جگہ کے لئے دو آدمی لڑتے ہوں تو وہاں سے نکل جانا۔ خود ابوذر رضی اللہ عنہ نے بعینہٖ ایسا ہی دیکھا اور وہ وہاں سے واپس چلے آئے۔ ❷

غزوۂ ہند کی خبر

ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان یہ سن کر خوش ہوں گے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی زبان قدسی بیان سے ہندوستان میں اسلام کے داخل اور غالب ہونے کی خوشخبری سنائی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کے دو گروہ ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ آتش دوزخ سے بچائے گا۔ ایک وہ جو ہندوستان کے غزوہ میں شریک ہوگا۔'' دوسری روایت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے (مسلمانوں سے) ہندوستان کے غزوہ کا وعدہ فرمایا تھا۔ تو اگر میں نے وہ زمانہ پایا تو اس کی راہ میں اپنی جان و مال قربان کر دوں گا، تو اگر میں اس میں شہید ہوا تو بہترین شہید ٹھہروں گا اور اگر زندہ لوٹا تو میں آتش دوزخ سے آزاد ابوہریرہ ہوں گا۔ ❸ یہ پیشین گوئیاں امام نسائی المتوفی ۳۰۲ ھجری کی سنن میں ہیں۔ جو سلطان محمود کے حملہ ہندوستان ۳۹۲ھ سے تقریباً سو برس پہلے لکھی گئی ہے۔

بحر روم کی لڑائیاں

بحر روم جس کو بحر اخضر اور بحر متوسط (میڈیٹیرین سی) بھی کہتے ہیں۔ یورپ اور ایشیا کی اور اب گویا اسلام اور عیسائیت کی حد فاصل ہے اور اس زمانہ میں یہ رومیوں کی بحری قوت کا جولان گاہ تھا۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ خواب راحت سے مسکراتے ہوئے بیدار ہوئے اور فرمایا: ''اس وقت خواب میں میری امت کے کچھ لوگ تخت شاہی پر بادشاہوں کی طرح بیٹھے ہوئے دکھائے گئے۔ یہ بحر اخضر میں (جہاد کے لئے) اپنے جہاز ڈالیں گے۔'' ❹ یہ بشارت سب سے پہلے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں پوری ہوئی اور

❶ ایضا: ۳۵۸۷۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب الوصية النبي ﷺ باهل مصر: ٦٤٩٣، ٦٤٩٤؛ احمد، ٥/ ١٧٤۔ ❸ یہ دونوں روایتیں سنن نسائی، کتاب الجهاد، باب غزوة الهند: ٣١٧٥، ٣١٧٦ میں ہیں۔ ❹ صحيح بخاری، باب الرؤيا فی النهار: ٧٠٠٢؛ مسلم، کتاب الامارة، باب غزوة البحر: ٤٩٣٤، ٤٩٣٥ وابوداود، كتاب الجهاد، باب فضل الغزو فی البحر: ٢٤٩٠۔

دیکھا گیا کہ دمشق کی سرزمین پر اسلام میں سب سے پہلے تخت شاہی بچھایا جاتا ہے اور دمشق کا شہزادہ یزید اپنی سپہ سالاری میں مسلمانوں کا پہلا لشکر لے کر بحر اخضر میں جہازوں کے بیڑے ڈالتا ہے اور دریا کو عبور کر کے قسطنطنیہ کی چہار دیواری پر تلوار مارتا ہے۔

بیت المقدس کی فتح

بیت المقدس اسلام کا دوسرا قبلہ ہے اور اس کی تولیت امت محمدیہ کا حق تھا۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس تولیت کی بشارت دے دی تھی اور فرما دیا تھا کہ میری موت کے بعد یہ واقعہ پیش آئے گا۔ عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت سے پہلے چند واقعے گن رکھو۔ (اول) میری موت، پھر بیت المقدس کی فتح۔'' [1] اس کے بعد آپ ﷺ نے چار اور باتیں بیان فرمائیں۔ یہ بشارت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ١٦ھ میں پوری ہوئی۔

فتح قسطنطنیہ کی بشارت

فتح قسطنطنیہ کی متعدد بشارتیں ہیں، ایک دفعہ فرمایا: ''تم لوگ یقیناً آئندہ قیصر کے خزانوں پر متصرف ہو گے۔'' [2] اور فرمایا: ''میری امت کی ایک جماعت بحر اخضر (بحر روم جس کے ساحل پر قسطنطنیہ) میں سوار ہو گی۔'' [3] مسلمانوں کی پہلی جماعت اسی قسطنطنیہ کی فتح کے لئے اس دریا میں سوار ہوئی۔ آثار قیامت کے سلسلہ میں فرمایا: ''یہ ہوگا یہ ہوگا پھر تم قسطنطنیہ فتح کرو گے۔'' [4] ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگ بے شبہ قسطنطنیہ فتح کرو گے تو اس کا حاکم (مسلمان) کتنا اچھا حاکم ہوگا اور وہ (فتح کرنے والی) فوج کیسی اچھی فوج ہوگی۔'' [5] مسلمان خلفا اور سلاطین میں سے ہر باہمت نے اس کو پورا کرنے کے لئے قسمت آزمائی کی۔ مگر ازل سے یہ سعادت سلطان محمد فاتح کی قسمت میں آ چکی تھی۔

فتح روم کا اشارہ

جس طرح قسطنطنیہ مشرقی رومی سلطنت کا پایہ تخت تھا، رومیہ (روم) مغربی رومی سلطنت کا دارالحکومت تھا اور جواب اٹلی کا پایہ تخت ہے۔ یہ مغربی عیسائیوں کا مقدس شہر ہے۔ گو صاف اور صریح الفاظ میں نہیں، لیکن اشارہ پایا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو اس کی فتح کی بشارت دی تھی۔ چنانچہ تاریخوں سے ثابت ہے کہ اسپین اور مغرب کے مسلمانوں نے اس کے مناروں کے اوپر بھی اسلام کا علم ایک دفعہ بلند کر دیا

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجزیة، باب مایحذر من الغدر: ٣١٧٦۔ [2] صحیح بخاری، باب علامات النبوة: ٣٦١٨، ٣٦١٩ وصحیح مسلم، کتاب الفتن، باب لا تقوم الساعة: ٧٣٢٧۔

[3] صحیح بخاری، باب رکوب البحر: ٢٨٩٤ وباب الرؤیا فی النهار: ٧٠٠٢۔

[4] صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب فی فتح القسطنطنیة: ٧٢٧٨۔

[5] مسند احمد، ج٤، ص: ٣٣٥، وحاکم وابن ابی شیبه۔

تھا۔حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے کسی نے پوچھا کہ پہلے قسطنطنیہ فتح ہوگا یا رومیہ؟ انہوں نے اپنی یادداشت کے کاغذوں کو دیکھ کر جواب دیا کہ ہم لوگ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کے اردگرد حاضر تھے کہ کسی نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! پہلے قسطنطنیہ فتح ہوگا یا رومیہ؟ فرمایا: ''نہیں پہلے ہرقل کا شہر فتح ہوگا۔'' 1 آنحضرت ﷺ نے رومیہ کے متعلق جوزیادہ وضاحت نہیں فرمائی اس کی وجہ غالباً یہ ہو کہ مسلمانوں کی حکومت کا وہاں فتح کے بعد قسمت الٰہی میں باقی رہنا منظور نہ تھا۔

فاتح عجم کا اشارہ

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ حجۃ الوداع میں آنحضرت ﷺ کی ہمرکابی میں مکہ معظّمہ گئے تھے۔ وہاں جا کر وہ اس قدر سخت بیمار پڑے کہ ان کو اپنی زندگی کی امید نہ رہی۔آنحضرت ﷺ ان کی عیادت کو تشریف لے گئے۔تو ان کا اضطراب دیکھ کر ان کو تسلی دی اور ان کے حق میں دعا کی اور فرمایا: ''تم اگر خدا نے چاہا تو ابھی نہیں مرو گے۔تم اگر خلوص سے کام کرو گے تو درجہ عظیم ملے گا۔بہتیرے لوگوں کو تم سے فائدہ اور بہتوں کو تم سے نقصان پہنچے گا۔'' 2 یہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے عجمی فتوحات کی بشارت تھی کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے سپہ سالار اسلام بن کر بڑا درجہ پایا اور چند سال میں کسریٰ کا تاج وتخت چھین لیا۔اور اس طرح مسلمانوں کو ان کی ذات سے فائدہ عظیم اور مجوسیوں کو نقصان عظیم پہنچا۔

مرتدین کی اطلاع

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں عرب کے متعدد اطراف میں دعویداران کاذب پیدا ہو گئے اور بہت سے لوگ جو اسلام کا کلمہ پڑھ چکے تھے ان کے ساتھ ہو گئے۔آنحضرت ﷺ نے اس واقعہ کی پہلے ہی اطلاع دے دی تھی۔فرمایا: ''حوض کوثر پر بہت سے لوگ آئیں گے میں کہوں گا کہ یہ میرے ساتھی ہیں لیکن فرشتے ان کو دھکے دے کر نکال دیں گے اور کہیں گے کہ یارسول اللہ! آپ کو معلوم نہیں کہ یہ آپ کے بعد بدل گئے تھے۔'' 3

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی وفات کی اطلاع

آنحضرت ﷺ نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو اطلاع دی تھی: ''تم میں سب سے پہلے مجھ سے آکر وہ ملے گی،جس کا ہاتھ سب سے لمبا ہوگا۔'' ازواج مطہرات کو آنحضرت ﷺ سے جو محبت تھی،اس کا ایک نتیجہ

---

1 مسند احمد، ج ۲، ص:۱۷۶۔ 2 صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار: ۳۹۳٦ ومسلم، کتاب الوصیۃ، باب الوصیۃ بالثلث: ٤۲۰۹ وابوداود، کتاب الوصایا: ۲۸٦٤۔

3 صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب ماجاء فی قول اللہ: ﴿واتقوا فتنۃ......﴾ ۷۰۵۰، ۷۰۵۱؛ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب اثبات حوض نبینا: ۵۹۷٤۔

یہ تھا کہ اس پیشین گوئی کے مطابق وہ اپنے اپنے ہاتھ ناپا کرتی تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہم میں سے سب سے پہلے حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے وفات پائی تو ہم سمجھے کہ ہاتھ کی لمبائی سے حضور ﷺ کا کیا مقصد تھا۔ (ہاتھ کا لمبا ہونا عربی میں کشادہ دستی اور فیاضی سے کنایہ ہے) زینب رضی اللہ عنہا ہم سب سے زیادہ کشادہ دست تھیں۔ ❶

اُم ورقہ رضی اللہ عنہا کو شہادت کی خوشخبری

ام ورقہ رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے جب بدر کا ارادہ کیا تو انہوں نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ! مجھ کو بھی اس میں شرکت کی اجازت دیجئے۔ شاید کہ خدا مجھے شہادت نصیب کرے۔ فرمایا: ''تم اپنے گھر ہی میں رہو۔ تمہیں شہادت نصیب ہوگی۔'' چنانچہ وہ زندگی ہی میں اس پیشین گوئی کے مطابق شہیدہ کہلاتی تھیں۔ ان کے پاس ایک غلام اور ایک لونڈی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ان دونوں نے مل کر ایک رات ان کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور اس طرح اطلاع نبوی ﷺ کے مطابق انہوں نے گھر بیٹھے یہ دولت پائی۔ ❷

خلفا کی بشارت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بنی اسرائیل کی سرداری اور نگہبانی انبیا کرتے تھے۔ جب کوئی نبی مرتا تھا تو دوسرا نبی اس کا قائم مقام ہوتا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ البتہ خلفا ہوں گے اور بہت ہوں گے۔'' ❸

بارہ خلفا

آپ ﷺ کے بعد بارہ خلفا کے ہونے کی بشارتیں حدیث کی مختلف کتابوں میں مختلف الفاظ میں آئی ہیں۔ صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں: ''اس وقت تک یہ اسلامی حکومت اچھی رہے گی جب تک اس پر بارہ آدمی حکومت کریں گے۔ ❹ یہ حکومت اس وقت تک ختم نہ ہوگی۔ جب تک اس پر بارہ حکمران نہ ہولیں۔ بارہ خلیفوں تک اسلام معزز اور محفوظ رہے گا۔ میرے بعد قریش میں سے بارہ خلیفہ ہوں گے۔ پھر چھوٹے لوگ ہونگے۔'' ابوداؤد (کتاب المھدی) میں یہ الفاظ ہیں: ''یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا۔ یہاں تک کہ اس میں بارہ خلیفہ گزر جائیں۔ ان سب پر تمام امت مجتمع ہوگی۔'' علمائے اہل سنت میں سے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے یہ مطلب بتاتے ہیں کہ تمام خلفا میں سے بارہ وہ شخص مراد ہیں جن سے اسلام کی خدمت بن آئی اور وہ متقی تھے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ابوداؤد کے الفاظ کی بنا پر خلفائے راشدین اور بنوامیہ میں سے ان بارہ خلفا کو گناتے

❶ صحیح مسلم، باب من فضائل زینب: ٦٣١٦۔ ❷ سنن ابی داود، کتاب الصلوۃ، باب امامۃ النسآء: ٥٩١ وابن راھویہ۔ ❸ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب الوفاء ببیعۃ الخلیفۃ: ٤٧٧٣۔
❹ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب الناس تبع لقریش: ٤٧٠٨، ٤٧١٠۔

ہیں جن کی خلافت میں تمام امت کا اجتماع رہا۔ یعنی حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم، یزید، عبدالملک، ولید، سلیمان، عمر بن عبدالعزیز، یزید ثانی، ہشام۔ (1) شیعہ فرقہ تو اس حدیث کی تشریح میں اپنے بارہ اماموں کو پیش کردے گا۔

خلافت راشدہ کی مدت

فرمایا: ''خلافت (یعنی خلافت راشدہ) میرے بعد تیس برس ہوگی (2) پھر بادشاہی ہو جائے گی۔'' یہ تیس سال کی مدت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر تمام ہوتی ہے۔

خلیفہ کا نام	خلافت کی مدت	خلیفہ کا نام	خلافت کی مدت
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ	١١ھ - ١٣ھ	حضرت عثمان رضی اللہ عنہ	٢٣ھ - ٣٥ھ
حضرت عمر رضی اللہ عنہ	١٣ھ - ٢٣ھ	حضرت علی رضی اللہ عنہ	٣٥ھ - ٤٠ھ

شیخین کی خلافت کی پیشین گوئی

آنحضرت ﷺ نے گو صریح اور صاف الفاظ میں اپنے جانشینوں کی تعیین نہیں فرمادی تھی۔ مگر آپ کو یہ علم بخشا جا چکا تھا کہ حالات اس طرح رونما ہوں گے۔ ایک دفعہ آپ نے بیان فرمایا کہ ''میں سویا تھا کہ ''میں نے اپنے آپ کو ایک کنوئیں کی جگت پر دیکھا۔ جس پر ڈول پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس میں سے اتنے ڈول پانی نکالے جتنے خدا نے چاہے۔ پھر اس ڈول کو ابوقحافہ کے بیٹے ابوبکر نے لیا۔ انہوں نے بھی اس سے ایک دو ڈول پانی کھینچا۔ مگر ان کے کھینچنے میں کسی قدر ضعف تھا۔ خدا ان کو معاف کرے۔ پھر یہ ڈول ایک بڑا سا ڈول بن گیا۔ تو خطاب کے بیٹے عمر نے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس طرح کھینچا کہ کسی طاقتور آدمی کو میں نے ان کے برابر کھینچتے نہیں دیکھا، یہاں تک کہ حوض لبالب بھر گیا اور پینے والوں کا چاروں طرف سے ہجوم ہوگیا۔'' (3)

یہ خلافت صدیقی وفاروقی کی تمثیلی پیشین گوئی ہے۔ جس کی آئندہ واقعات نے حرف حرف تصدیق کی۔

مسلمانوں کو دولت کی کثرت اور فتنوں کے ظہور سے آگاہ کرنا

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جن فتنوں کا آغاز ہوا، اور مسلمانوں میں جو خانہ جنگیاں پیش

---

(1) مقدمہ تاریخ الخلفاء سیوطی، ص:٩۔ (2) جامع ترمذی، کتاب الفتن، باب ما جاء فی الخلافة: ٢٢٢٦؛ سنن ابی داود، کتاب السنة، باب فی الخلفاء: ٤٦٤٦، ٤٦٤٧؛ مسند احمد، ٥/ ٢٢٠۔

(3) صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عمر: ٣٦٨٢ کتاب التعبیر، باب نزع الذنوب: ٧٠٢٠؛ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر: ٦١٩٢ آخری فقرے حتی ضرب الناس بعطن کا مرادی ترجمہ ہے لفظی نہیں دیکھو فتح الباری، ج ١٢، ص: ٣٦٤۔

آئیں۔ان کا پورا پورا علم آپ ﷺ کو عطا ہوا تھا اور اسی لئے آپ نے بار بار مسلمانوں کو اس سے متنبہ کر دیا تھا۔ایک دفعہ آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ شہر کے باہر تھے۔آپ نے ہمراہیوں سے پوچھا:''مجھ کو جو نظر آ رہا ہے وہ تم دیکھ رہے ہو؟'' سب نے عرض کی، نہیں یارسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا:''میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے گھروں پر بارش کی طرح فتنے برس رہے ہیں۔'' 1 دوسری دفعہ فرمایا:''خدا کی قسم! مجھ کو تم پر فقر و فاقہ کا خوف نہیں۔ بلکہ دولت کا خوف ہے کہ جس طرح تم سے پہلوں پر دنیا پھیلا دی گئی تھی۔تم پر بھی نہ پھیلا دی جائے۔تو تم اس میں آپس میں رشک وحسد کرنے لگو گے۔اور جس طرح اس نے تم سے پہلوں کو غافل کر دیا، تم کو بھی غافل کر دے۔'' 2 ایک اور موقع پر ارشاد ہوا:''دیکھو میرے بعد ایک دوسرے کی گردن نہ مارنے لگنا۔'' ایک دفعہ ارشاد ہوا:''ایک زمانہ آئے گا کہ تمہارے سامنے دن کو ایک کھانے کا پیالہ اور رات کو دوسرے کھانے کا پیالہ آئے گا اور کعبہ کے پردوں کی طرح (بیش قیمت اور عمدہ) تمہارے لباس ہوں گے۔'' حاضرین نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! ہم اس حالت میں اچھے ہیں یا اس حالت میں اچھے رہیں گے۔فرمایا:''نہیں تم اس حالت میں اچھے ہو کہ تم سب باہم ایک دوسرے سے محبت اور پیار کرتے ہو اور اس وقت تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹو گے۔'' 3 حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ ﷺ مجلس میں رونق افروز تھے، فرمایا:''میرے بعد اختلاف اور فتنہ ہوگا۔'' لوگوں نے عرض کی، یارسول اللہ! تو اس وقت ہم کو کیا حکم ہے؟ فرمایا:''امیر اور اس کے رفقا کا ساتھ دینا۔'' 4 ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:''عنقریب میرے بعد کچھ فتنے پیدا ہوں گے۔جن میں بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا۔'' 5

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد فتنوں کا ظہور ہوگا

خلافت راشدہ کے عہد میں جو فتنے برپا ہوئے۔اللہ تعالیٰ نے ان کی اطلاع آنحضرت ﷺ کو پہلے ہی دے دی تھی اور آپ نے ان کو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو بتا دیا تھا۔ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ حضور ﷺ نے فتنہ کی نسبت جو فرمایا تھا وہ کس کو زیادہ یاد ہے؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا، مجھے یاد ہے۔، انسان کو اہل وعیال اور دولت و مال میں جو فتنہ پیش آتا ہے وہ نماز، صدقہ، اچھی باتوں کے کہنے اور بری باتوں کے روکنے سے دور ہو جاتا ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، میں اس کی نسبت نہیں پوچھتا میں اس فتنہ کو پوچھتا ہوں جو سمندر کی موجوں کی طرح لہریں لے گا۔حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا، اے

---

1 صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب ویل للعرب من شر قد اقترب:۷۰۶۰ وکتاب فضائل المدینۃ، باب اطام المدینۃ:۱۸۷۸۔ 2 صحیح بخاری، کتاب الجزیۃ والموادعۃ:۳۱۵۸ ومسلم، کتاب الزھد:۷۴۲۵۔

3 مسند احمد حدیث طلحۃ (النضری) ومستدرک حاکم۔ 4 مستدرک حاکم، ج ۳، ص:۹۹ ذہبی نے اس کو صحیح کہا ہے۔ 5 صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب تکون فتنۃ القاعد فیھا خیر من القائم:۷۰۸۱۔

امیر المومنین! اس فتنہ سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا کہ اس کے اور آپ کے درمیان ایک بند دروازہ ہے۔دریافت فرمایا کہ کیا یہ دروازہ کھول دیا جائے گا یا توڑ دیا جائے گا؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا توڑ دیا جائے گا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، تو یہ دروازہ کبھی بند نہ ہو سکے گا۔حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا، ہاں ایسا ہی ہے۔راوی کہتا ہے کہ میں نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ وہ دروازہ کون تھا؟ انہوں نے جواب دیا، ہاں بے شک ان کو اس کا اسی طرح علم تھا جس طرح اس بات کا علم ہے کہ آج کے بعد کل آئے گا۔راوی کہتا ہے، میں لحاظ سے نہ پوچھ سکا کہ وہ دروازہ کون تھا۔اس لئے مسروق (تابعی) سے کہا کہ وہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے اس کو دریافت کریں۔مسروق نے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ دروازہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وجود تھا [1] یہ دروازہ جب سے ٹوٹا کس کو معلوم نہیں کہ اسلام پر فتنوں کا سیلاب امنڈ آیا۔

فتنے مشرق کی جانب سے اُٹھیں گے

مستند اور معتبر حدیثوں میں پوری تصریح کے ساتھ بروایت کثیرہ مذکور ہے کہ اسلام میں فتنوں کا آغاز مشرق کی طرف سے ہوگا۔آپ ﷺ نے انگلی سے اشارہ کر کے بار بار فرمایا: ''ادھر سے جدھر شیطان کی سینگیں یعنی سورج کی کرنیں نکلتی ہیں۔'' [2] یہ اشارہ عرب سے مشرق کی جانب تھا۔یعنی عراق کی طرف، دیکھو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قاتل عجمی تھا۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد کا فتنہ عراق ہی سے اٹھ کر مصر تک پھیلا۔جنگ جمل اسی سرزمین پر ہوئی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ یہیں شہید ہوئے۔امیر معاویہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی جنگ صفین یہیں پیش آئی۔خوارج اسلام کا پہلا گمراہ کن فرقہ یہیں سے نکلا۔جبریہ اور قدریہ وغیرہ اسلام کے دیگر فرقوں کی یہ بدعتیں جنہوں نے اسلامی عقائد کی سادگی کو پارہ پارہ کر دیا، یہیں پیدا ہوئے۔جگر گوشہ رسول اور خانوادۂ نبوت کا قافلہ یہیں فرات کے کنارہ لٹا۔مختار نے ادعائے کاذب کا فتنہ یہیں پیدا کیا۔شیعیت جس نے اسلام کو دو حصوں میں منقسم کیا، یہیں کی پیداوار ہے۔حجاج کی سفاکیاں اسی سرزمین پر ہوئیں۔ترک و تاتار کی غارتگریوں کے نتائج جنہوں نے اسلام کی رہی سہی طاقت اور عرب و خلافت عربی کا تار تار الگ کر دیا، یہیں رونما ہوئے۔حتیٰ کہ اس جنگ عظیم میں بھی واحد اسلامی طاقت کے ساتھ غداری کے نتائج بھی اولاً یہیں ظاہر ہوئے اور اس کے اثرات بعد کو اور اطراف میں بھی رونما ہوئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو فتنہ کی اطلاع

آنحضرت ﷺ مدینہ کے ایک باغ میں ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دروازہ کھلوا

---

[1] صحيح بخاری، کتاب الفتن، باب الفتنة التی تموج کموج البحر: ۷۰۹۶۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب قول النبی ﷺ: الفتنة من قبل المشرق: ۷۰۹۲، ۷۰۹۳؛ مسلم، کتاب الفتن: ۷۲۹۳ وغیرہ۔

کر آئے تو آپ ﷺ نے ان کو جنت کی بشارت دی، اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور آپ نے ان کو جنت کا مژدہ سنایا۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو آپ ﷺ نے ان کو جنت کی بشارت کے ساتھ فتنہ وامتحان سے دوچار ہونے کی بھی اطلاع دی۔ [1] چنانچہ ان کو اپنے زمانہ خلافت میں یہ فتنہ وامتحان پیش آیا اور شہادت نصیب ہوئی۔ حدیث کی کتابوں میں اس قسم کی اور بھی روایتیں ہیں۔

حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما شہید ہوں گے

ایک دفعہ مکہ معظمہ میں کوہ ثبیر یا کوہ احد پر آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ کی رفاقت میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم بھی تھے کہ دفعتہً پہاڑ کو جنبش ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے ثبیر! ٹھہر جا کہ تیری پشت پر ایک پیغمبر ایک صدیق اور دو شہید ہیں۔'' [2] پیغمبر اور صدیق کو تو سب جانتے تھے لیکن حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی شہادت کے بعد یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ دو شہید کون تھے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی مشکلات اور شہادت

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا: ''تم سے میری اُمت میرے بعد بے وفائی کرے گی۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ''اے علی! خبردار کہ تم کو میرے بعد مصیبت پیش آئے گی۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے استفسار کیا، کیا یہ مصیبت میری سلامتی دین کے ساتھ پیش آئے گی؟ فرمایا: ''ہاں تمہاری سلامتی دین کے ساتھ۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم ایک سفر میں ایک موقع پر آنحضرت ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ آپ نے فرمایا: ''میں بتاؤں کہ دو سب سے بدبخت انسان کون ہیں؟'' لوگوں نے عرض کی کہ ہاں یارسول اللہ ﷺ! بتایئے فرمایا: ''ایک ثمود کا سرخ رنگ بدبخت جس نے ناقہ ثمود کو قتل کیا دوسرا وہ جو اے علی! تمہارے یہاں پر (گردن کی طرف اشارہ کیا) تلوار مارے گا۔'' [3]

جنگ جمل کی خبر

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرہ کے درمیان جو اتفاقی لڑائی بصرہ میں پیش آ گئی تھی۔ اس کو جنگ جمل کہتے ہیں۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ ازواج مطہرات کے درمیان تشریف فرما تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کسی پر حواب کے کتے بھونکیں گے۔'' (حواب عراق میں ایک تالاب کا نام ہے)

---

[1] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة باب من فضائل عثمان: ٦٢١٤؛ بخاری: ٣٦٧٤۔

[2] صحیح بخاری مناقب ابی بکر: ٣٦٧٥ وسنن ترمذی: ٣٧٠٣؛ نسائی: ٣٦٣٨؛ ابو داود: ٤٦٤٨۔

[3] یہ تینوں روایتیں مستدرک حاکم میں ہیں، امام ذہبی نے پہلی روایات کو مطلق صحیح دوسری کو بشرط بخاری ومسلم صحیح اور تیسری کو بشرط مسلم صحیح کہا ہے، ج ٣، ص: ١٤٠ و ١٤١۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب اصحاب جمل کے ساتھ روانہ ہوئیں اور حواب کے تالاب پر پہنچیں اور کتوں نے بھونکنا شروع کیا تو ان کو آنحضرت ﷺ کی یہ پیشین گوئی یاد آئی۔ ❶

حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کی جنگ

ایک بار آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس وقت تک قیامت نہ آئے گی جب تک دو ایسے گروہ باہم جنگ آزما نہ ہوں گے جن میں سے ہر ایک کا دعویٰ ایک ہی ہوگا۔'' ❷ علما کا بیان ہے کہ یہ پیشین گوئی حضرت علی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کی لڑائیوں پر صادق آتی ہے۔ ❸

حضرت عمار رضی اللہ عنہ شہید ہوں گے

آپ ﷺ نے غزوۂ خندق میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے سر پر دست شفقت پھیر کر فرمایا: ''افسوس تجھ کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔'' ❹ یہ پیشین گوئی متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے حضرت عمار رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معیت میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کے ہاتھ سے جنگ صفین میں شہید ہوئے۔

امام حسن رضی اللہ عنہ کی مصالحت

ایک دفعہ آپ ﷺ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو لے کر گھر سے باہر نکلے اور ان کو گود میں لے کر منبر پر چڑھے پھر فرمایا کہ ''میرے اس فرزند کے ذریعہ سے خدا مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان مصالحت کرا دے گا۔'' ❺ چنانچہ یہ پیشینگوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے چھ مہینے بعد پوری ہوئی اور طرف داران علی رضی اللہ عنہ اور حامیان معاویہ رضی اللہ عنہ میں بعض شرائط پر صلح ہوگئی۔

نوخیز حکمرانان قریش کے ہاتھوں اسلام کی تباہی

آنحضرت ﷺ نے جن مخصوص اصحاب کو اسلام کے مستقبل سے باخبر کر دیا تھا۔ ان میں ایک حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ کہتے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کی بربادی قریش کے چند نوخیزوں کے ہاتھ سے ہوگی۔'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ اگر میں چاہوں تو سب کو نام بنام گنا دوں ❻ یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح نکلی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد کا سیاسی طوفان، ان کی شہادت، پھر جمل کی لڑائی۔ یہ سب چند نوخیز قریشی رئیس زادوں کی بے جا امنگوں کے نتائج تھے۔ جیسا کہ عام تاریخوں میں مسطور ہے اور صحیح بخاری میں ہے کہ راوی کہتا ہے کہ ہم نے شام جا کر بنی مروان کو دیکھا تو ان کو اسی طرح نوخیز نوجوان پایا۔ ❼

---

❶ مسند احمد، ج ٦، ص: ٩٧۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب اذا تواجه المسلمان بسیفیهما: ٧٢٥٦۔ ❸ دیکھو شرح صحیح مسلم للنووی، ج ٢، ص: ٣٩٠۔ ❹ صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب لا تقوم الساعة حتی یمر الرجل بقبر الرجل .....: ٧٣٢٠۔ ❺ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الاسلام: ٣٦٢٩ وترمذی، ابواب المناقب: ٣٧٧٣ وحاکم، ج ٣، ص: ١٧٥۔
❻ صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب قول النبی ﷺ هلاك امتی علی یدی اغیلمة سفهاء: ٧٠٥٨۔ ❼ ایضًا۔

یزید کی تخت نشینی کی بلا اسلام پر

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۶۰ھ میں وفات پائی اور ان کی بجائے یزید تخت نشین ہوا اور یہی اسلام کے سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور روحانی ادبار ونکبت کی اولین شب ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے متعدد روایتیں ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں سے فرمایا: "۶۰ھ کے شروع ہونے سے اور لڑکوں کی حکومت سے پناہ مانگا کرو اور دنیا ختم نہ ہوگی یہاں تک کہ اس پر ایسے ویسے لوگ حکمران نہ ہولیں۔" [1] حاکم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "عربوں پر افسوس اس مصیبت سے جو ۶۰ھ کے آغاز پر قریب آئے گی۔ امانت لوٹ کا مال اور صدقہ وخیرات جرمانہ اور تاوان سمجھا جائے گا اور گواہی پہچان سے دی جائے گی اور فیصلے ہوا وہوس سے ہوا کریں گے۔" بیہقی میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مدینہ کے بازار میں یہ کہتے جاتے تھے: "کہ خداوندا! میں ۶۰ھ اور لڑکوں کی حکومت کا زمانہ نہ پاؤں۔" خدا نے ان کی یہ دعا قبول کی اور ۵۹ھ میں انہوں نے وفات پائی۔ [2]

امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی متعدد پیشین گوئیاں حاکم، بیہقی، ابن راہویہ اور ابونعیم وغیرہ میں مذکور ہیں۔ مگر اصولاً ان روایات کا درجہ بلند نہیں، تاہم اتنی بات مجملاً ثابت ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کو اس واقعہ کا علم ضرور عطا کیا گیا تھا اور آپ نے اہل بیت کو اس کے متعلق کوئی خاص اطلاع دی تھی، اس باب میں بہترین حدیث حاکم کی یہ روایت ہے جس کو اس نے متعدد طریقوں سے نقل کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو اطلاع دی تھی کہ "میں نے یحییٰ (پیغمبر) کا بدلہ ستر ہزار سے لیا تھا اور میں تیرے نواسے کا بدلہ ستر اور ستر ہزار سے لوں گا۔" حافظ ذہبی نے اس روایت کو علی شرط مسلم تسلیم کیا ہے [3] لیکن یہ روایت خود اس کا اشارہ کرتی ہے کہ اس سے پہلے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی اطلاع دی جا چکی تھی، یہ اطلاع الٰہی حرف بحرف صحیح ہوئی۔ امام موصوف کی شہادت کے بعد مختار کے ہاتھوں قاتلین حسین سے اسی قدر انتقام لیا گیا۔

خوارج کی اطلاع

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن آنحضرت ﷺ مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے۔ قبیلہ بنوتمیم کا ایک آدمی آیا اور کہا کہ یارسول اللہ ﷺ! انصاف سے مال تقسیم فرمایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "میں نہ انصاف کروں گا تو کون کرے گا؟" اس کی گستاخی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سخت برہم ہوئے اور

---

[1] مسند احمد، ج۲، ص:۳۲۶۔

[2] یہ روایتیں خصائص کبری سیوطی، ج۲، ص: ۱۲۹ کے حوالہ سے نقل کی گئی ہیں۔

[3] مستدرک حاکم، ج۳، ص: ۱۷۸۔

آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ اجازت دیجئے تو اس کی گردن اڑا دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جانے دو۔ اس کے ایسے رفقا ہوں گے جن کے نماز، روزے کے مقابل تم کو اپنے نماز روزے حقیر معلوم ہوں گے۔ وہ لوگ قرآن کی تلاوت کریں گے لیکن گلے کے نیچے نہ اترے گا۔ مذہب کے دائرہ سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر نشانہ کے پار نکل جاتا ہے۔ اس گروہ کی علامت یہ ہے کہ ان میں ایک سیاہ فام شخص پیدا ہو گا۔ جس کے دونوں بازوؤں میں عورت کے سینہ کی طرح گوشت لٹکتا ہوگا۔'' حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اس گروہ سے جنگ کی اور میں ان کے ساتھ موجود تھا۔ اس سیاہ فام کی تلاش کی گئی تو آنحضرت ﷺ نے جو علامات بتائی تھیں وہ ان کے ساتھ متصف نکلا۔ 1

مختار اور حجاج کی اطلاع

آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا: ''کہ قبیلہ ثقیف میں دو شخص پیدا ہوں گے۔ جن میں ایک کذاب، دوسرا مبیر یعنی ہلاک کرنے والا ہوگا۔'' چنانچہ جب حجاج ثقفی نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو پھانسی دی اور ان کی والدہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو بلایا تو انہوں نے جانے سے انکار کیا۔ بار بار کے انکار کے بعد حجاج خود ان کے پاس آیا بہت سے سوال و جواب کے بعد انہوں نے کہا، قبیلہ ثقیف کے دو شخصوں کے متعلق آنحضرت ﷺ نے جو پیشین گوئی فرمائی تھی۔ ان میں کذاب (مختار ثقفی) کو تو ہم نے دیکھ لیا اور مبیر کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ تم ہی ہو۔ یہ سن کر حجاج چپ چاپ الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔ 2

حجاز میں ایک آگ

آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا: ''قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی، جب تک حجاز میں ایک ایسی آگ نہ نکلے جس کی روشنی بصریٰ کے اونٹوں کی گردنوں کو روشن نہ کر دے۔'' 3 یہ روایت صحیح مسلم اور حاکم میں ہے امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ یہ آگ ہمارے زمانہ میں ۶۸۴ھ میں مدینہ میں ظاہر ہوئی اور آگ اس قدر بڑی تھی کہ مدینہ کے مشرقی پہلو سے لے کر پہاڑی تک پھیلی تھی۔ اس کا حال شام اور تمام شہروں میں بتواتر معلوم ہوا اور ہم سے اس شخص نے بیان کیا جو اس وقت مدینہ میں موجود تھا 4 ابوشامہ ایک اور معاصر مصنف کا بیان ہے کہ ہمارے پاس مدینہ سے خطوط آئے جن میں لکھا تھا کہ چہار شنبہ کی رات کو جمادی الثانیہ کی تیسری تاریخ کو مدینہ میں ایک سخت دھماکا ہوا۔ پھر بڑا زلزلہ آیا جو ساعت بساعت بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ پانچویں کو بہت بڑی آگ پہاڑی میں قریظہ کے محلّہ کے قریب نمودار ہوئی۔ جس کو

---

1 بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام: ۳۶۱۰۔ 2 مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب ذکر کذاب ثقیف ومبیرھا: ۶۴۹۶۔ 3 مسلم، کتاب الفتن، باب لا تقوم الساعۃ حتی تخرج نار......: ۷۲۸۹۔
4 شرح مسلم نووی، ج ۲، ص: ۳۹۳۔

ہم مدینہ کے اندر اپنے گھروں سے اس طرح دیکھتے تھے کہ گویا وہ ہمارے قریب ہی ہے اور ترائیاں بہہ نکلیں اور ہم اس کو دیکھنے کو چڑھے تو دیکھا کہ پہاڑ آگ بن کر بہہ رہے ہیں اور ادھر ادھر شعلہ بن کر جا رہے ہیں۔ آگ کے شعلے پہاڑ معلوم ہوتے تھے۔ محلوں کے برابر برابر چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ یہ آگ مکہ معظّمہ اور صحرا سے بھی نظر آتی تھی۔ لوگ گھبرا کر روضہ نبوی ﷺ میں دعا و استغفار کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ یہ حالت ایک مہینہ سے زیادہ رہی [1] علامہ ذہبی اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ اسی سال ۶۵۴ھ میں مدینہ میں آگ نکلی۔ جو ان بڑی نشانیوں میں سے تھی۔ جن کی آنحضرت ﷺ نے خبر دی تھی۔ اس آگ میں اس شدت اور روشنی کے باوجود گرمی نہ تھی اور چند روز رہی، اہل مدینہ کا خیال تھا کہ قیامت آ گئی تو انہوں نے خدا کی بارگاہ میں توبہ و استغفار کیا۔ [2] اس آگ کا حال بتواتر معلوم ہے۔ حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ متعدد لوگوں سے جو بصریٰ میں اس وقت موجود تھے، یہ شہادت منقول ہے کہ انہوں نے رات کو اس کی روشنی میں بصریٰ کے اونٹوں کی گردنیں دیکھیں۔ [3]

ایک صدی یا ایک دور کے بعد انقلاب

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اخیر زندگی میں آنحضرت ﷺ نے نماز عشاء کے بعد حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا: ''آج اس شب میں مَیں تم کو بتاؤں کہ اس سے سو برس بعد آج کے لوگوں میں سے کوئی بھی روئے زمین پر باقی نہ رہے گا۔'' راوی کہتا ہے کہ اس سے آپ کا مقصود ایک دور (قرن) کا ختم ہو جانا تھا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اسی واقعہ کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں کہ اپنی وفات سے ایک مہینہ پہلے آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم قیامت کی نسبت دریافت کرتے ہو، اس کا علم تو خدا کو ہے، میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ آج روئے زمین پر کوئی سانس لینے والی جان نہیں جو سو برس بعد زندہ رہے گی۔'' [4] اس سے مقصود صحابہ رضی اللہ عنہم کے خیر و برکت کے دور کا اختتام تھا۔ ابوالطفیل رضی اللہ عنہ صحابی سب کے اخیر میں مرے ہیں۔ ان کا بیان تھا کہ اب میرے سوا کوئی باقی نہیں جس نے جمال محمدی ﷺ سے آنکھیں روشن کیں۔ یہ ابوالطفیل رضی اللہ عنہ پوری صدی کے اختتام پر رحلت گزین ہوئے۔

چار دوروں کے بعد پورا انقلاب

متعدد راویوں نے آنحضرت ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے علی الاعلان فرمایا: ''بہترین دور (قرن) وہ ہے جس میں میں ہوں [5] پھر اس دور کے لوگ جو میرے بعد ہیں، پھر اس دور کے لوگ جوان

---

[1] تاریخ الخلفاء بحواله ابو شامة واقعات ٦٥٤، ص: ٤٧٧۔ [2] مختصر تاریخ الاسلام ذهبی، ج٢، ص: ١٢١ حیدر آباد۔ [3] تاریخ الخلفاء سیوطی واقعات: ٦٥٤ھ، ص: ٤٨٠۔ [4] یہ تمام حدیثیں صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة باب بیان معنی قوله علی رأس مائة سنة لا یبقی نفس......: ٦٤٧٩ تا ٦٤٨٦ میں ہیں، اور پہلی روایت ابوداود، کتاب الملاحم، باب قیام الساعة: ٤٣٤٨ میں بھی مذکور ہے۔ [5] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضل الصحابة ثم الذین یلونهم: ٦٤٧٠ ومسند احمد حدیث بریدة، ج٥، ص: ٣٥٧۔

کے بعد ہیں، پھر اس دور کے لوگ جو ان کے بعد ہیں، پھر ایسے لوگ ہوں گے جو گواہی کے لئے بلائے نہیں جائیں گے، خود جا کر گواہی دیں گے۔ خیانت کار ہوں گے۔ امین نہ ہوں گے۔ نذر مانیں گے، لیکن ایفا نہ کریں گے۔'' پہلا دور عہد نبوی ﷺ ہے، دوسرا دور صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہے، تیسرا تابعین کا، چوتھا تبع تابعین کا۔ یہ چار عہد اسلام کے روحانی، دینی اور اخلاقی مناقب و مکارم کا اور صلحائے امت، ائمہ دین اور علمائے خیر کے پے در پے ظہور اور وجود کا اور خالص مذہبی علوم کی نشو و نما، ترتیب و تدوین اور نشر و اشاعت کا ہے۔ اس کے بعد ہی بدعات کا سیلاب امنڈتا ہے۔ علمائے سوء اور امرائے جور بیدار ہوتے ہیں۔ فرق باطلہ کا ظہور ہوتا ہے۔ فقہا میں جمود آتا ہے۔ علما میں ہوا و ہوس راہ پاتی ہے۔ ہند، فارس اور یونان کے فلسفیانہ خیالات مسلمانوں میں رائج ہوتے ہیں۔ اسلام کے اعتقادی و عملی قویٰ سست ہو جاتے ہیں اور تمام نظام ابتر ہو جاتا ہے۔

مدعیانِ کاذب

صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت سے پہلے تیس کاذب دجال پیدا ہوں گے۔ جن میں سے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ وہ نبی ہے۔'' ❶ ایسے مدعیان کاذب کی تعداد اگر مسیلمہ کے وقت سے لے کر آج تک کی تاریخوں سے چن کر الگ کی جائے تو قریب قریب تیس کے پہنچ جائے گی۔ جن میں سے دو جو ہندوستان اور ایران میں ابھی ابھی گزرے ہیں وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہیں۔

منکرین حدیث

ابوداؤد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں کہ وہ اپنی مسند پر تکیہ لگائے (یعنی غرور کی شان سے) بیٹھا ہو اور اس کے پاس میرے کاموں میں سے کوئی کام جس کے کرنے کا میں نے حکم دیا، یا جس سے منع کیا، وہ اس سے بیان کیا جائے تو کہے ہم نہیں جانتے، جو ہم نے قرآن میں پایا اسی کو مانتے ہیں۔'' ❷ بیہقی میں اس سے زیادہ صاف الفاظ ہیں دور اول میں اگر یہ پیشین گوئی معتزلہ پر صادق آ سکتی تھی تو اب آج کل مصر و ہند کے ان اشخاص پر پوری طرح صادق آتی ہے جو خود کو اہل القرآن کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

تجارت کی کثرت اور اس میں عورتوں کی شرکت

قیامت کے آثار اور نشانیوں میں سے ایک یہ واقعہ بھی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''قیامت سے پہلے خصوصیت کا سلام ہوگا اور تجارت کی کثرت ہوگی۔ ❸ یہاں تک کہ عورت بھی اپنے مرد کا ہاتھ بٹایا کرے گی۔'' کیا اس موجودہ دور تمدن سے بڑھ کر اس پیشین گوئی

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الفتن: ۷۳۴۲ وابوداود (کتاب الملاحم: ۴۳۳۳) کے علاوہ مسند احمد، ج ۲، ص: ۲۳۷، ۳۱۳ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور ابو یعلیٰ، بزار اور طبرانی میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے اسی قسم کی روایت ہے۔

❷ سنن ابی داود، کتاب السنة، باب فی لزوم السنة: ۴۶۰۴۔ ❸ مسند احمد، ج ۱، ص: ۴۱۹، ۴۲۰ وادب المفرد، امام بخاری باب من کرہ تسلیم الخاصة: ۱۰۴۹ ومستدرك حاكم وبزار وطبرانی۔

کی صداقت کا کوئی اور زمانہ ہوگا؟ آج سے زیادہ کبھی تجارت کی گرم بازاری تھی اور عورتیں کبھی اس سے پہلے اس بیبا کی سے مردوں کے دوش بدوش ہوکر اس پیشہ میں درآئی تھیں؟

اہل یورپ کی کثرت

آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ ''قیامت جب آئے گی تو روم سب سے زیادہ ہوں گے۔'' [1] عربوں کے محاورہ میں روم سے مقصود اہل فرنگ یعنی اہل یورپ ہیں۔ آج اہل یورپ کی یہ کثرت ہے کہ اس وقت ان کے وجود سے دنیا کا کوئی گوشہ خالی نہیں اور ان کی قوت وطاقت کا دنیا کی کوئی قوم مقابلہ نہیں کرسکتی۔ یہ پیشینگوئی آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کی گئی تھی اور آج اس کی صداقت آفتاب کی طرح روشن ہے۔

سود کی کثرت

پہلے وہی لوگ سود کھاتے تھے اور کھا سکتے تھے جو براہ راست اس کا کاروبار کرتے تھے۔ لیکن آپ ﷺ نے پیشین گوئی کی تھی کہ ''ایک زمانہ آنے والا ہے جس میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو سود نہ کھائے گا اگر وہ براہ راست نہیں کھائے گا تو اس کا غبار یا دھواں بھی اڑ کر اس تک ضرور پہنچے گا۔'' [2] کیا آج وہی زمانہ بعینہ نہیں ہے آج کی تجارت اور سوداگری تمام تر سود پر مبنی ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے ملک کی ہر چیز جو بازار سے خریدی جاتی ہے وہ بیسیوں سودی معاملوں سے گزر کر ہم تک پہنچتی ہے تمام وہ لوگ جن کی معیشت سرکاری نوکری ہے اور اکثر غیر سرکاری نوکر بھی بینک کے جمع شدہ روپوں سے معاوضہ حاصل کرتے ہیں اور امرا اور اہل دولت بھی اپنا سرمایہ امانتی منافع سے وصول کرتے ہیں۔ غرض آج دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں کہی جاسکتی ہے جو تمام تر سود سے پاک اور مبرا ہو اور یہ یورپ کے تمدن کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ عالمگیر اثر ہے۔ یہ عظیم الشان پیشین گوئی کتنی بڑی صداقت پر مبنی ہے اور جس کو کبھی کوئی انسان صرف قیاس سے اس بلند آہنگی کے ساتھ دنیا کو نہیں سنا سکتا ہے۔

یہودیوں سے جنگ

صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خبر دی تھی کہ ''مسلمانوں اور یہودیوں میں ایک عظیم الشان جنگ ہوگی۔ یہودی شکست کھا کر چٹانوں اور درختوں کے پیچھے چھپیں گے تو وہاں بھی ان کو پناہ نہ ملے گی اور ان میں سے آواز آئے گی کہ اے مسلمان دیکھ! یہ یہودی چھپا ہے۔'' [3] اس حدیث کو پڑھتے ہوئے پہلے دل میں خطرہ گزرتا تھا کہ الٰہی یہودیوں میں نہ تو قوت ہے، نہ کوئی ان کی سلطنت ہے، نہ مسلمانوں

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الفتن: ۷۲۷۹۔ [2] ابوداود، کتاب البیوع، باب اجتناب الشبہات: ۳۳۳۱؛ نسائی، کتاب البیوع: ۴۴۶۰ وابن ماجہ: ۲۲۷۸ ومسند احمد، ج ۲، ص: ۴۹۴۔

[3] صحیح مسلم، کتاب الفتن: ۷۳۳۷۔

کے درمیان کہیں ان کی بڑی آبادی ہے۔ یہ لڑائی کیونکر پیش آئے گی۔ مگر پچھلی جنگ نے اپنے نتیجہ کے طور پر فلسطین میں جو صورت نمایاں کر دی ہے اور عہد نامہ بالفور نے فلسطین کو یہودی کا قومی وطن بنانے اور صیہونی تحریک نے فلسطین کو خالص یہودی ملک بنانے اور بالآخر وہاں یہودی سلطنت قائم کرنے کا جو تہیہ کیا ہے، اس نے مُخبر صادق علیہ السلام کی پیشین گوئی کی صداقت کے منظر کو آنکھوں کے سامنے کر دیا۔

حجاز کا انقطاع مصر، شام اور عراق سے

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''عراق نے اپنا نقرئی سکہ (درہم) اور غلہ کا پیمانہ (قفیز) روک دیا۔ شام نے اپنے غلہ کا پیمانہ (مد) اور اپنا طلائی سکہ (دینار) روک دیا اور مصر نے اپنے غلہ کا پیمانہ (اروب) اور اپنی اشرفی روک دی اور تم وہیں لوٹ گئے۔ جہاں سے چلے تھے۔'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا، اس حدیث کے ارشاد نبوی ﷺ ہونے پر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا گوشت اور خون گواہی دیتا ہے۔ [1]

اس حدیث میں درحقیقت دو پیشین گوئیاں ہیں: ایک یہ کہ مسلمان ان ممالک کو فتح کریں گے اور حجاز کے تعلقات وہاں سے قائم ہوں گے اور اس خشک اور بنجر خطہ کی پرورش انہی ہمسایہ علاقوں سے ہوگی اور پھر وہ زمانہ آئے گا، جب یہ علاقے الگ ہو جائیں گے اور حجاز پھر ویسا ہی ہو جائے گا جیسا اسلام سے پہلے یا اسلام کے آغاز میں تھا۔ پہلی پیشین گوئی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں پوری ہوئی اور اس وقت سے لے کر تیرہ سو برس تک برابر یہ حالت قائم رہی، حجاز کے لئے ہر قسم کا سامان انہی ممالک کی پیداوار سے آتا تھا۔ مصر و شام سے برابر غلہ قانوناً بھیجا جاتا تھا۔ سالانہ نذرانے تقسیم ہوتے تھے۔ بڑی بڑی جائدادیں وقف تھیں۔ لیکن ہمارے خیال میں اس دوسری پیشین گوئی کا محل اس زمانہ سے بہتر نہیں ہوسکتا، تیرہ سو برس کے اندر کبھی ایسا زمانہ پیش نہیں آیا۔ جب حجاز عراق و شام اور مصر سے دفعتہً منقطع ہو گیا ہو۔ آج حجاز کی وہی حالت نہیں جو اسلام سے پہلے یا آغاز اسلام میں تھی؟ جب عراق پر ایرانی اور شام و مصر پر رومی حکمران تھے اور خود عرب کے صوبے پراگندہ اور بے نظام تھے اور ہر قطعہ پر ایک حاکم فرمانروا تھا۔ آج عراق و مصر و فلسطین و بحرین وغیرہ پر انگریز اور شام پر فرانسیسی حکمران ہیں۔ عرب کے تمام صوبے پراگندہ اور بے نظام ہیں اور ہر خطہ پر ایک مستقل فرمانروا ہے اور باہمی آتش جنگ وجدل برپا ہے، ایک کو دوسرے کی ماتحتی سے عار ہے، عراق کا غلہ اور نذرانہ بند ہے۔ شام کی موقوفہ جائدادیں فرانسیسیوں نے ضبط کر لیں اور آپ نے گزشتہ سال سن لیا کہ مصر نے حجاز کے غلہ اور اشرفیوں کا وہ نذرانہ بند کر دیا جو عہد فاروق رضی اللہ عنہ سے اب تک کبھی بند نہیں ہوا تھا۔

[1] صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب لا تقوم الساعة حتى يحسر الفرات: ۷۲۷۷۔

اہل یورپ سے شام میں جنگ

صحیح مسلم وغیرہ میں فتن اور آثار قیامت کے سلسلہ میں متعدد حدیثیں ایسی ہیں، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے صاف وصریح الفاظ میں اپنی امت کو یہ اطلاع دی ہے کہ آخر زمانہ میں دجال کے ظہور اور نزول مسیح سے پہلے ملک شام میں مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان عظیم الشان خونی معرکے پیش آئیں گے، گو اس ملک میں ان دونوں کے درمیان صلیبی جنگوں نے اس قسم کے سینکڑوں خونی معرکے پیش کئے ہیں، مگر جنگ عظیم نے شام کی جو صورت حال پیدا کر دی ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ تمام واقعات آنے والے خونی معرکوں کی تقریب وتمہید ہیں۔

مسلمانوں کے خلاف تمام دنیا کی قومیں اٹھ کھڑی ہوں گی

ابوداؤد [1] اور بیہقی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''قریب ہے کہ قومیں تم پر حملہ کرنے کے لئے ایک دوسرے کو اس طرح پکاریں گی (یعنی تم پر متحدہ حملہ کریں گی) جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالہ پر گرتے ہیں۔'' حاضرین میں سے ایک نے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! کیا یہ اس لئے کہ اس زمانے میں ہم مسلمانوں کی تعداد کم ہو جائے گی؟ فرمایا: ''نہیں، تمہاری تعداد ان دنوں بہت بڑی ہوگی، لیکن تم ایسے ہو جاؤ گے جیسے سیلاب کی سطح پر کف اور خس وخاشاک ہوتا ہے کہ (سیلاب ان کو بہائے لئے جاتا ہے) اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رعب دور کر دے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری ڈال دے گا۔'' کسی نے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! وہ کمزوری کیا ہوگی؟ فرمایا: ''دنیا (فوائد دنیا) کی محبت اور موت سے کراہت۔'' موجودہ دنیائے اسلام کے پیش نظر تاریخ میں کیا حرف حرف اس کی تصدیق نہیں؟

---

[1] ابو داود، کتاب الملاحم، باب فی تداعی الامم علی الاسلام: ٤٢٩٧۔

معجزاتِ نبوی ﷺ کے متعلق غیر مستند روایات

آنحضرت ﷺ کے معجزات کے متعلق جو جھوٹی اور بے سروپا روایتیں مسلمانوں میں مشہور ہوگئی ہیں ضرورت نہ تھی کہ اس کتاب میں ان کو کسی حیثیت سے جگہ دی جائے، مگر چونکہ عام ناظرین کے دلوں میں ان کو اس کتاب میں نہ پاکر مختلف قسم کے شبہے پیدا ہوں گے۔ اس لئے صرف ان کی تسکین اور کشف حقیقت کی خاطر ان روایتوں سے بھی اس کتاب میں تعرض کرنا ضروری پڑا۔ یہ روایتیں زیادہ تر کتب دلائل میں ہیں۔ یعنی ان کتابوں میں ہیں، جن کو لوگوں نے عام حدیث کی کتابوں سے الگ کر کے صرف آنحضرت ﷺ کے معجزات کے ذکر و تفصیل میں لکھا ہے۔ یہی کتابیں ہیں جنہوں نے معجزات کی جھوٹی اور غیر مستند روایتوں کا ایک انبار لگا دیا ہے اور انہی سے میلاد و فضائل کی تمام کتابوں کا سرمایہ مہیا کیا گیا ہے۔ خوش اعتقادی اور عجائب پرستی نے ان غلط معجزات کو اس قدر شرف قبول بخشا کہ ان کے پردہ میں آپ ﷺ کے تمام صحیح معجزات چھپ کر رہ گئے اور حق و باطل کی تمیز مشکل ہوگئی۔ حالانکہ اس تمام ذخیرہ سے کتب صحاح اور خصوصاً بخاری و مسلم یکسر خالی ہیں۔ لیکن تیسری اور چوتھی صدی میں اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں، وہ اس درجہ بے احتیاطی کے ساتھ لکھی گئیں کہ محدثین ثقات نے ان کو بیشتر ناقابل اعتبار قرار دیا۔ کتب دلائل کے ان مصنفین کا مقصد معجزات کی صحیح روایات کو یکجا کرنا نہیں، بلکہ کثرت سے عجیب و حیرت انگیز واقعات کا مواد فراہم کرنا تھا، تاکہ خاتم المرسلین کے فضائل و مناقب کے ابواب میں معتد بہ اضافہ ہو سکے۔ بعد کو جو احتیاط پسند محدثین آئے۔ مثلاً: زرقانی وغیرہ وہ ان روایات کے نقل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تردید اور تضعیف بھی کرتے گئے۔ لیکن جو چیز اس وسعت کے ساتھ پھیل گئی ہو، جو اسلامی لٹریچر کا ایک جزو بن گئی ہو۔ جو اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہو، اس کے لئے صرف اس قدر کافی نہیں بلکہ وہ مزید تنقید کی محتاج ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ ہمارے ملک میں میلاد کی مجلسوں میں جو بیانات پڑھے جاتے ہیں وہ تمام تر ان ہی بے بنیاد روایتوں سے بھرے ہوتے ہیں۔

اس تنقید کے تین حصے ہو سکتے ہیں۔ اصول روایت کی بنا پر ان کتابوں کا اور محدثین میں ان کے مصنفوں کا درجہ کیا ہے؟ ان کتابوں میں جو غلط موضوع اور ضعیف معجزات مذکور ہیں، ان کے پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں؟ ان کتابوں کے خاص خاص مشہور اور زبان زد معجزات کی روایتی حیثیت کیا ہے؟

کتب دلائل اور ان کے مصنفین کا درجہ

علمائے اسلام نے روایات کی تنقید اور اُن کے اصول کے منضبط کرنے میں جو کوششیں کی ہیں اور جو خدمات انجام دی ہیں، ان کی پوری تفصیل کتاب کے مقدمہ میں گزر چکی ہے، اسی سلسلہ میں یہ بات بھی ضمناً آگئی ہے کہ ان روایات کی جانچ اور تنقید میں جن کا تعلق احکام فقہی سے ہے۔ محدثین نے جو سختی اور شدت اختیار کی ہے، وہ مناقب اور فضائل کے باب میں نہیں کی ہے۔ چنانچہ علم حدیث کے بڑے بڑے اماموں نے

اعلانیہ اس کا اعتراف کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ آیاتِ قرآنی کے الگ الگ فضائل، نام بنام تمام خلفا کے مناقب، مقامات اور شہروں کے محامد، اعمال انسانی کے مبالغہ آمیز ثواب وعقاب کے بیانات، آنحضرت ﷺ کے متعلق کاہنین عرب کی پیشین گوئیاں اور اشعار اور عجیب وغریب غیر صحیح فضائل، معجزات اور برکات وغیرہ کا یہ بے پایاں دفتر روایات میں موجود اور کتابوں میں مدون ہے۔

یہ روایات زیادہ تر تیسرے اور چوتھے درجہ کی کتب حدیث میں پائی جاتی ہیں۔ تیسرے درجہ میں بقول شاہ ولی اللہ صاحب یہ کتابیں ہیں۔ [1]

مسند ابو یعلیٰ، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ، مسند عبد بن حمید، مسند طیالسی، بیہقی، طحاوی اور طبرانی کی تصنیفات، ان میں سچی جھوٹی اچھی بری قوی ضعیف ہر قسم کی حدیثیں پہلو بہ پہلو درج ہیں اور چوتھے درجہ میں وہ کتابیں ہیں جن کے مصنفین صدیوں کے بعد پیدا ہوئے۔ انہوں نے چاہا کہ اول اور دوم درجوں میں جو روایتیں داخل نہیں کی گئی تھیں، ان کو ایک جگہ جمع کر دیں۔ یہ روایتیں ان لوگوں کی زبانوں پر تھیں جن کی روایتوں کو حدیث کے اماموں نے قلمبند کرنا پسند نہیں کیا تھا اور قصہ گو واعظین محض ان سے رونق محفل کا کام لیتے تھے۔ اسرائیلیات، اقوال حکما، اشارات حدیث، قصص وحکایات اور روایات نامعتبر کو انہوں نے حدیث کا درجہ دے کر کتابوں کے اوراق میں مدون کر دیا۔ کتاب الضعفاء لابن حبان، کامل لابن عدی اور خطیب، ابونعیم، جوزقانی، ابن عساکر، ابن نجار اور دیلمی کی تصنیفات کا اسی طبقہ میں شمار ہے۔ اس تفصیل کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں: صرف اول اور دوم درجہ کی کتابوں پر یعنی صحاح ستہ پر محدثین کا اعتماد ہے اور انہی پر ان کا مدار ہے، تیسرے طبقہ کی کتابوں سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو فن کے ناقد اور جوہری ہیں اور جن کو اسماء الرجال پر عبور اور علل حدیث سے واقفیت ہے۔ غرض جو صحیح اور غلط اور خطا وصواب میں امتیاز کامل رکھتے ہیں۔ چوتھے طبقہ کی کتابوں کو جمع اور تدوین کرنا اور ان کو کام میں لانا متاخرین کی ایک قسم کی بے فائدہ کی کاوش فکر ہے۔ آنحضرت ﷺ کے آیات ودلائل پر جو مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے کچھ تیسرے طبقہ میں اور بقیہ تمام تر چوتھے طبقہ کی کتابوں میں داخل ہیں۔ متاخرین نے عام طور سے سرمایہ جن کتابوں سے حاصل کیا ہے وہ طبری، طبرانی، بیہقی دیلمی، بزار اور ابونعیم اصفہانی کی تصنیفات ہیں۔ حافظ قسطلانی نے انہی روایات کو تمیز اور نقد کے بغیر مواہب لدنیہ میں داخل کیا اور معین فراہی نے ان کو معارج النبوۃ میں فارسی زبان میں اس آب ورنگ سے بیان کیا کہ یہ روایتیں گھر گھر پھیل گئیں اور عوام نے اس شیفتگی اور وارفتگی کے ساتھ ان کو قبول کیا کہ اصلی اور صحیح معجزات اور آیات بھی اس پردہ میں چھپ کر رہ گئے۔

مواہب لدنیہ اور معارج النبوۃ وغیرہ کا سرمایہ جن کتابوں سے ماخوذ ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں، کتاب

[1] حجة الله البالغة، باب طبقات كتب الحديث، ج ۱، ص: ۱۰۷۔

الطبقات لابن سعد، سیرۃ ابن اسحٰق، دلائل النبوۃ ابن قتیبہ المتوفی ۲۷۶ھ، دلائل النبوۃ ابو اسحٰق حربی المتوفی ۲۵۵ھ، شرف المصطفیٰ ابوسعید عبدالرحمٰن بن حسن اصفہانی المتوفی ۳۰۷ھ، تاریخ وتفسیر ابوجعفر بن جریر طبری المتوفی ۳۱۰ھ مولہ یحییٰ بن عائذ، دلائل النبوۃ جعفر بن محمد مستغفری المتوفی ۴۳۲ھ، دلائل النبوۃ ابوالقاسم اسمٰعیل اصفہانی المتوفی ۵۳۵ھ، تاریخ دمشق ابن عساکر المتوفی ۵۷۱ھ لیکن متاخرین میں ان روایات کا سب سے بڑا خزانہ یہ دو کتابیں ہیں: کتاب الدلائل ابونعیم اصفہانی المتوفی ۴۳۰ھ اور کتاب الدلائل امام بیہقی المتوفی ۴۳۰ھ۔

ان بزرگوں کے بذات خود معتبر اور مستند ہونے میں کسی کو کم کلام ہے۔ جو کچھ کلام ہے، وہ اس میں ہے کہ انہوں نے ہر قسم کے راویوں سے ہر قسم کی روایتیں نقد اور تمیز کے بغیر اخذ کیں اور ان کو کتابوں کے اوراق میں مدون کر دیا اور عام لوگوں نے ان مصنفین کی عظمت اور جلالت کو دیکھ کر ان روایتوں کو قبول کر لیا۔ حالانکہ ان میں نہ صرف ضعیف اور کمزور بلکہ موضوع حدیثیں تک موجود ہیں اور ان کے سلسلہ روایت میں ایسے راوی آتے ہیں۔ جن کو محدثین کے دربار میں صف نعال میں بھی جگہ نہیں مل سکتی۔ ان مصنفین نے یہ سمجھ کر کہ چونکہ ہر قسم کا سلسلہ روایت لکھ دیا گیا ہے اور لوگ اس سلسلہ روایت کو دیکھ کر صحیح اور غلط، سچی اور جھوٹی روایت کا خود فیصلہ کر لیں گے۔ ان روایتوں کی تدوین میں ضروری احتیاطیں مدنظر رکھیں یا یوں کہو کہ عشق نبوی ﷺ نے فضائل ومناقب کی کثرت کے شوق میں ہر قسم کی روایتوں کے قبول کرنے پر ان کو آمادہ کر دیا۔ حالانکہ خود اسی جذبہ عشق اور اسی ولولہ شوق نے ثقات محدثین اور علم حدیث کے اکابر کو روایتوں اور راویوں کے نقد اور بحث میں اس قدر سخت گیر بنا دیا تھا کہ وہ ایک لفظ میں بھی تحقیق اور کاوش کے بغیر آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کرنا گناہ عظیم سمجھتے تھے اور ((من كذب على متعمدا)) کی دارو گیر سے ہمیشہ ڈرتے اور کانپتے رہتے تھے۔ محدث ابن مندہ نے کتاب الدلائل کے مصنف حافظ ابونعیم اصفہانی کی نسبت نہایت سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں ان دونوں معاصرین کے درمیان محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لا اعلم لهما ذنبًا اكثر من روايتهما الموضوعات ساكتين عنها۔ [1]

"مجھے ان دونوں کا اس سے زیادہ کوئی گناہ معلوم نہیں کہ وہ موضوع روایتوں کو خاموشی کے ساتھ روایت کر جاتے ہیں۔"

لیکن ثقات محدثین کی بارگاہ میں یہ کوئی معمولی گناہ ہے؟ یہی ان کی خاموشی خدا انہیں معاف کرے، آج ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کی گمراہی کی بنیاد بن گئی ہے۔ اس سے زیادہ مصیبت یہ ہے کہ ہمارے علمائے رجال نے زیادہ تر ان راویوں کی بحث وتدقیق کی ہے، جو پہلی تین صدیوں میں تھے، اس لئے چوتھی اور پانچویں صدی کے رواۃ اور رجال کے نام ونشان ہماری موجودہ اسماء الرجال کی کتابوں میں بہت کم ملتے ہیں،

[1] ترجمہ ابونعیم، ج ۱، ص: ۵۲۔

اگر تراجم اور انساب میں ان کے کچھ حالات مل جاتے ہیں تو محدثانہ حیثیت سے ان پر نقد و تبصرہ نہیں ملتا، اس لئے ان بزرگوں کے شیوخ اور راویوں میں مجہول الحال اشخاص کی بھی کمی نہیں، اس بنا پر ان کتابوں کی روایتوں کی تنقید کرنا نہایت مشکل ہے۔

اسلام میں میلاد کی مجلسوں کا رواج غالباً چھٹی صدی سے ہوا ہے [1] تتبع سے یہ ثابت ہوا کہ ان روایتوں کا بڑا حصہ انہی کتابوں کے ذریعہ سے پھیلا ہے، جو ان مجالس کی غرض سے وقتاً فوقتاً لکھی گئیں اور جن کے بکثرت حوالے مواہب لدنیہ میں جابجا آتے ہیں۔

علامہ سیوطی کی خصائص کبریٰ جو حیدر آباد میں چھپ گئی ہے، معجزات کے موضوع پر سب سے زیادہ مبسوط ہے اور جامع تالیف ہے، علامہ ممدوح نے صحاح ستہ کے علاوہ احمد سعید، ابن منصور، طیالسی، ابن ابی شیبہ، حاکم، ابویعلیٰ، بلکہ ان سے بھی فروتر بیہقی، ابونعیم، بزار، ابن سعد، طبرانی، دارمی، بلکہ غیر محتاط مصنفوں مثلاً: ابن ابی الدنیا، ابن شاہین، ابن ابی النجار، ابن مندہ، ابن مردویہ، ابن عساکر، دیلمی، خرائطی، خطیب وغیرہ کی کتابوں کو اپنا ماخذ بنایا، قوی اور ضعیف اور صحیح وغلط ہر قسم کے واقعات کا انبار لگا دیا اور مختلف دفتروں میں جو کچھ پھیلا تھا، ان کو خصائص کی دو جلدوں میں یکجا کر دیا، تاہم مصنف کو یہ فخر ہے جیسا کہ دیباچہ میں تصریح کی ہے، اس تالیف میں موضوع اور بے سند روایتوں سے اگرچہ احتراز کیا گیا ہے، لیکن ضعیف روایتیں جن کی سندیں ہیں وہ داخل کر لی گئی ہیں۔

غور کے قابل امر یہ ہے کہ بلا امتیاز بھلی بری کسی سند کا موجود ہونا، روایت کی معتبری کی حجت کیونکر ہو سکتی ہے؟ اس سے زیادہ یہ ہے کہ کتاب میں صحیح وغلط، قوی اور ضعیف مشہور و منکر ہر قسم کی روایتوں کو ان کے درجہ اور مرتبہ کے ذکر کے بغیر پہلو بہ پہلو وہ لکھتے چلے گئے ہیں، اس لئے عام ناظرین کو یہ پتہ نہیں لگتا کہ اس انبار خانہ میں جہاں جواہرات کا خزانہ ہے وہیں خزف ریزوں کا بھی ڈھیر لگا ہے، پوری کتاب میں شاید دس بیس مقام سے زیادہ نہیں، جہاں مصنف نے اپنی روایتوں کے درجہ استناد کا پتہ دیا ہو، اس سے زیادہ یہ کہ بعض واقعات کے متعلق باوجود ان کی شدید روایت پرستی کے، ان کو بہ تحقیق معلوم تھا کہ یہ صحیح نہیں، تاہم چونکہ وہ پہلی کتابوں میں مندرج تھے، ان کی نقل سے احتراز نہیں کیا، چنانچہ آنحضرت ﷺ کی ولادت کے موقع پر عام کتب میلاد میں جو عجیب و غریب واقعات مذکور ہیں، ان کو تمام تر دلائل ابونعیم سے نقل کر کے آخر میں لکھتے ہیں:

هذا الاثر والاثر ان قبله فيها نكارة شديدة ولم اورد في كتابي هذا اشد نكارة منها ولم تكن نفسي تطيب با يرادها لكن تبعت الحافظ ابانعيم في

---

[1] الملك المظفر شاه اربل مولود ۵۴۹ھ متوفی ۶۳۳ھ نے جیسا کہ ابن خلکان (ج ۲، ص: ۱۹۵) نے اس کے حال میں لکھا ہے، مولد شریف بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے منایا کرتا تھا، یہ جنگ صلیبی کا زمانہ تھا، اس کے لئے ابن دحیہ المتوفی ۶۳۳ھ نے ۶۰۴ھ میں کتاب التنویر فی مولد السراج المنیر تصنیف کی۔

ذالك۔ ❶

’’اس روایت اور اس سے پہلے دو روایتوں میں سخت نامعتبر (منکر) باتیں ہیں اور میں نے اپنی کتاب میں اس سے زیادہ ناقابل اعتبار روایتیں نہیں لکھیں۔ میرا دل ان کے لکھنے کو نہیں چاہتا تھا لیکن حافظ ابونعیم کی پیروی کر کے لکھ دیں۔‘‘

ایک اور جگہ خطیب کی ایک کتاب سے وفد نجران کے متعلق ایک واقعہ نقل کرتے ہیں، حالانکہ وہ خود اس روایت کو بے اعتبار سمجھتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

واخرج الخطيب فی المتفق والمفترق بسند فيه مجاهيل۔ ❷

’’خطیب نے المتفق والمفترق میں ایسی سند سے جس میں مجہول الحال راوی ہیں بیان کیا ہے۔‘‘

ایک اور مقام پر ایک گدھے کا واقعہ نقل کرتے ہیں جو گدھے کی صورت میں ایک جن تھا اور آپ ﷺ کی سواری میں آنے کا مشتاق تھا یہ لوگوں کے گھروں میں جا کر اشارہ سے ان کو بلاتا تھا یہ عجیب جانور آپ ﷺ کو خیبر میں ملا تھا اس نے آنحضرت ﷺ کو یہودیوں کے مظالم کی داستان سنائی اور جب آپ ﷺ نے وفات پائی تو فرط غم سے اپنے آپ کو کنوئیں میں گرا کر جان دیدی۔ حافظ سیوطی نے ابن عساکر سے یہ واقعہ خصائص میں نقل کیا ہے اور اس پر بے تعرض کئے گزر گئے ہیں حالانکہ بعینہ اسی واقعہ کے متعلق ابن حبان کے حوالہ سے اپنی دوسری تصنیف اللآلی المصنوعة فی الاحاديث الموضوعة میں لکھتے ہیں کہ ’’یہ سرتاپا موضوع ہے۔‘‘ ❸

محدث صابونی نے معجزہ کی ایک روایت لکھ کر پھر خود ہی اس پر یہ جرح کی ہے کہ اس کی سند اور متن دونوں غریب ہیں۔ بااین ہمہ وہ اس کے متعلق آخری رائے ظاہر کرتے ہیں کہ

هو فی المعجزات حسن۔ ❹ ’’معجزات میں وہ حسن (اچھی) ہے۔‘‘

اس پر علامہ زرقانی شرح مواہب میں لکھتے ہیں:

لان عادة المحدثين التساهل فی غير الاحكام والعقائد۔ ❺

’’یہ اس لئے کہ محدثین کی عادت ہے کہ عقائد اور احکام کے علاوہ دیگر روایتوں میں وہ نرمی برتتے ہیں۔‘‘

لیکن کیا یہ اصول صحیح ہے؟ اور ((من كذب علی متعمدا)) کی تہدید سے خالی ہے؟ معجزات ہوں یا فضائل، ضروری ہے کہ آپ ﷺ کی طرف جس چیز کی نسبت بھی کی جائے وہ شک و شبہ سے پاک ہو۔ جیسا کہ امام نووی، حافظ عسقلانی، ابن جماعۃ، طیبی، بلقینی اور علامہ عراقی نے اپنی اپنی تصنیفات میں اس کی

❶ خصائص، ج ۱، ص: ۴۹۔ ❷ ج ۲، ص: ۲۵۔ ❸ کتاب المناقب، ص: ۱٦٤۔
❹ زرقانی، ج ۱، ص: ۱۷۲ وخصائص سیوطی، ج ۱، ص: ۵۳۔ ❺ ج ۱، ص: ۱۷۲۔

تصریح کی ہے۔ ❶

معجزات کے متعلق غلط اور موضوع روایتوں کے پیدا ہونے کے اسباب

① ان روایتوں کے پیدا ہونے کا بڑا سبب یہ ہے کہ مقبولیت عام کی بنا پر یہ کام واعظوں اور میلاد خانوں کے حصہ میں آیا۔ چونکہ یہ فرقہ علم سے عموماً محروم ہوتا ہے اور صحیح روایات تک اس کی دسترس نہیں ہوتی اور ادھر گرمی محفل اور شور احسنت کے لئے اس کو دلچسپ اور عوام فریب باتوں کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس لئے لامحالہ ان کو اپنی قوت اختراع پر زور دینا پڑا۔ ان میں جو کسی قدر محتاط تھے۔ انہوں نے ان کو لطائف صوفیانہ اور مضامین شاعرانہ میں ادا کیا، سننے والوں نے ان کو روایت کی حیثیت دے دی، یا بعد کو انہی بیانات نے روایت کی حیثیت اختیار کر لی اور جو نڈر اور بے احتیاط تھے۔ انہوں نے یہ پردہ بھی نہیں رکھا بلکہ ایک سند جوڑ کر انہوں نے براہ راست اس کو حدیث وخبر کا مرتبہ دے دیا۔ حافظ سیوطی، علامہ ابن جوزی کی کتاب الموضوعات کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

احدهما القصاص ومعظم البلاء منهم يجري لا نهم يريدون احاديث تتفق وترقق والصحاح يقل فيه هذا ثم ان الحفظ يشق عليهم ويتفق عدم الدين وهم يحضر هم جهال۔ ❷

''جھوٹی حدیثیں بنانے والوں میں ایک واعظوں کا گروہ ہے اور سب سے بڑی مصیبت انہی سے پیش آتی ہے کیونکہ وہ ایسی حدیثیں چاہتے ہیں جو مقبول عام اور مؤثر ہوسکیں اور صحیح حدیثوں میں یہ بات نہیں۔ اس کے علاوہ صحیح حدیثوں کا یاد رکھنا ان کو مشکل ہے۔ اس کے ساتھ ان میں دین داری نہیں ہوتی اور ان کی محفلوں میں جاہلوں ہی کا مجمع ہوتا ہے۔''

چنانچہ فضائل ومناقب، عذاب وثواب، بہشت ودوزخ، وقائع میلاد اور معجزات ودلائل کا جو جعلی دفتر پیدا ہو گیا ہے وہ زیادہ تر انہی جاہلوں کا ترتیب دیا ہوا ہے۔

علامہ ابن قتیبہ المتوفی ۲۷۶ھ تاویل مختلف الحدیث میں جواب مصر میں چھپ گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ احادیث وروایات میں فساد تین راستوں سے آیا۔ منجملہ ان کے ایک راستہ واعظین ہیں۔

والقصاص فانهم كانوا يميلون وجوه العوام اليهم ويستدرون ما عندهم بالمناكير والغرائب والاكاذيب من الاحاديث ومن شان العوام القعود عند القاص ما كان حديثه عجيبًا خارجًا عن فطر العقول اوكان رقيقاً يحزن القلوب ويستفزر العيون۔ ❸

❶ دیکھو موضوعات ملا علی قاری، ص: ۹ مطبوعہ مجتبائی دھلی۔

❷ آخر کتاب اللآلی المصنوعة، ص: ۲۴۹۔ ❸ ص: ۳۵۶۔

''اور واعظین کیونکہ وہ عوام کا رخ اپنی طرف پھیرنا چاہتے ہیں اور جو کچھ ان کے پاس ہے اس کو لغو، منکر اور عجیب وغریب باتیں بیان کر کے وہ وصول کرتے ہیں اور عوام کی حالت یہ ہے کہ وہ اسی وقت تک ان واعظین کے پاس بیٹھتے ہیں۔ جب تک وہ خارج از عقل باتیں یا ایسی مؤثر باتیں بیان کیا کرتے ہیں، جو ان کے دلوں میں اثر پیدا کریں اور ان کو رلائیں۔''

آپ ﷺ کی برتری اور جامعیت کا تخیل

② ان روایات کے پیدا ہونے کا دوسرا سبب یہ ہوا کہ مسلمانوں کے نزدیک آنحضرت ﷺ افضل الانبیاء ہیں۔ آپ کامل ترین شریعت لے کر مبعوث ہوئے ہیں۔ آپ تمام محاسن کے جامع ہیں۔ یہ اعتقاد بالکل صحیح ہے، لیکن اس کو لوگوں نے غلط طور پر وسعت دے دی ہے اور انبیائے سابقین کے تمام معجزات کو آنحضرت ﷺ کی ذات میں جمع کر دیا اور وہ اس اعتقاد کی بدولت تمام مسلمانوں میں پھیل گئے۔ بیہقی اور ابونعیم نے دلائل میں اور سیوطی نے خصائص میں اعلانیہ دوسرے انبیا علیہم السلام کے معجزات کے مقابل میں انہی کے مثل آپ ﷺ کے معجزات بھی ڈھونڈ کر نکالے ہیں اور ثابت کرنا چاہا ہے کہ جس طرح آپ کی تعلیم تمام انبیا کی تعلیمات کا اثر، خلاصہ اور مجموعہ ہے۔ اسی طرح آپ کے معجزات بھی تمام دیگر انبیا کے معجزات کا مجموعہ ہیں اور جو کچھ عام انبیا سے متفرق طور پر صادر ہوا، وہ تمام کا تمام مجموعاً آپ ﷺ سے صادر ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس مماثلت اور مقابلہ کے لئے تمام تر صحیح روایتیں دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے لوگوں نے ان ہی ضعیف اور موضوع روایتوں کے دامن میں پناہ لی، کہیں شاعرانہ تخیل کی بلند پروازی اور نکتہ آفرینی سے کام لیا، مثلاً: حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے تمام اسماء کی تعلیم کی، دیلمی نے مسند الفردوس میں روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بھی تمام اسماء کی تعلیم دی۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق قرآن میں ہے کہ خدا نے ان کو بلند جگہ میں اٹھایا، لیکن رسول اللہ ﷺ کی بلندی اس سے بھی آگے قاب قوسین تک ہوئی۔ حضرت نوح علیہ السلام کی طوفان کی دعا اگر قبول ہوئی، تو آپ ﷺ کی قحط کی دعا قبول ہوئی، حضرت صالح علیہ السلام کے لئے اونٹنی معجزہ تھی تو آنحضرت ﷺ سے اونٹ نے باتیں کیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں نہ جلے، آپ سے بھی آتشیں معجزے صادر ہوئے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے گلے پر اگر چھری رکھی گئی، تو آپ کا سینہ بھی چاک کیا گیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام سے بھیڑیئے نے گفتگو کی، روایت کی گئی ہے کہ آپ سے بھی بھیڑیا ہم کلام ہوا۔ ابونعیم میں حکایت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو حسن کا آدھا حصہ عطا کیا گیا، لیکن آنحضرت ﷺ کو پورا حصہ دیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے پتھر سے نہریں جاری ہوئیں، تو آپ کی انگلیوں سے بھی پانی بہا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لکڑی معجزہ دکھاتی تھی، تو آپ ﷺ کے فراق میں بھی چھوہارے کا درخت رویا اور چھوہارے کی خشک ٹہنی تلوار بن گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے بحر احمر شق ہوا تو آپ ﷺ کے لئے معراج میں آسمان و

زمین کے درمیان کا دریائے فضا بیچ سے پھٹ گیا۔ یوشع علیہ السلام کے لئے آفتاب ٹھہرا دیا گیا، تو آپ ﷺ کے اشارے سے آفتاب ڈوب کر نکلا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گہوارہ میں کلام کیا تھا۔ یہ روایت واضع کی گئی کہ آپ ﷺ نے بھی گہوارے میں کلام کیا اور آپ کی زبان سے پہلے تکبیر و تسبیح کی صدا بلند ہوئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سب سے بڑا معجزہ مردوں کا زندہ کرنا ہے اور صرف انہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی طرف بھی یہ معجزہ منسوب کیا گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو اسلام کی دعوت دی۔ اس نے کہا کہ جب تک آپ میری لڑکی کو زندہ نہ کر دیں گے میں ایمان نہ لاؤں گا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی قبر پر جا کر آواز دی اور وہ زندہ نکل کر باہر آئی اور پھر چلی گئی۔ اسی طرح یہ روایت بھی گھڑی گئی ہے کہ آپ کی والدہ بھی آپ کی دعا سے زندہ ہوئیں اور آپ پر ایمان لائیں۔

غیبی آوازوں اور پیشین گوئیوں سے نبوت کی تصدیق کا شوق

③ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ انبیا علیہم السلام کے گزشتہ صحیفوں میں آنحضرت ﷺ کے ظہور کی پیشین گوئیاں ہیں اور ان کے مطابق یہود و نصاریٰ کو ایک آنے والے پیغمبر کا انتظار تھا، اس واقعہ کو دروغ گو راویوں نے یہاں تک وسعت دی کہ یہودیوں کو دن، تاریخ، سال، وقت اور مقام سب کچھ معلوم تھا۔ چنانچہ ولادت نبوی ﷺ سے قبل علمائے یہود ان سب کا پتہ بتایا کرتے تھے اور عیسائی راہبوں کو تو ایک ایک خط و خال معلوم تھا۔ بلکہ پرانے گھرانوں اور ویرانوں اور کنیسوں میں ایسی مخفی کتابیں موجود تھیں، جن میں آپ ﷺ کا تمام حلیہ لکھا تھا اور اگلے لوگ ان کو بہت چھپا چھپا کر رکھتے تھے۔ بلکہ بعض دیروں میں تو آپ ﷺ کی تصویر تک موجود تھی۔ توراۃ وانجیل میں آنحضرت ﷺ کے متعلق بعض پیشین گوئیاں حقیقت میں موجود تھیں۔ اور وہ آج بھی ہیں، وہ استعارات و کنایات اور مجمل عبارتوں میں ہیں، ان کو ضعیف و موضوع روایتوں میں صاف صاف آپ ﷺ کے نام و مقام کی تخصیص و تعیین کے ساتھ پھیلایا گیا۔

عرب میں بت خانوں کے مجاور اور کاہن تھے۔ جو فال کھولتے تھے اور پیشین گوئیاں کرتے تھے، ان کا ذریعہ علم جنات اور شیاطین تھے۔ چنانچہ جب آپ ﷺ کے قرب ولادت کا زمانہ آیا تو عموماً بت خانوں سے اور بتوں کے پیٹ سے آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کاہن مقفّی اور مسجع فقروں میں اور جنات شعروں میں یہ خبریں سنایا کرتے تھے کہ محمد ﷺ کی پیدائش کا زمانہ قریب آ گیا۔ یمن کے ایک بادشاہ کی طرف آپ ﷺ کی منقبت میں پورا ایک قصیدہ منسوب کیا گیا۔ ملوک یمن میں شاہان فارس اور قریش کے اکابر نے آپ کو خواب میں دیکھا، پتھروں پر اسم مبارک لوگوں کو منقوش نظر آتا تھا۔ قریش کا مورث اعلیٰ کعب بن لؤی ہر جمعہ کو اپنے قبیلہ کے لوگوں کو یکجا کر کے ان کے سامنے خطبہ دیتا تھا۔ جس میں مسجع فقروں اور شعروں میں آپ ﷺ کے ظہور کی خوشخبری ہوتی تھی۔ مکہ کے لوگ احبار اور راہبوں کی زبان سے محمد آپ ﷺ کا

نام سن کر اپنے بچوں کا یہی نام رکھتے تھے کہ شاید یہی پیغمبر ہو جائے۔ مدینہ کے لوگوں کو انہی یہودیوں کی زبانی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ شہر یثرب آپ ﷺ کا دارالہجرت ہوگا۔ اس لئے وہ آپ کے ورود کے منتظر تھے۔ سطیح کاہن کا آپ ﷺ کی پیشین گوئی میں ایک طویل افسانہ ہے، لیکن اس دفتر کا بڑا حصہ موضوع اور جعلی ہے اور باقی نہایت ضعیف اور کمزور ہے اور ان میں جو ایک آدھ صحیح ہے۔ وہ پہلے گزر چکا ہے۔

شاعرانہ تخیل کو واقعہ سمجھ لینا

④ آنحضرت ﷺ کی پیدائش عالم کی رحمت کا باعث تھی، اس لئے کائنات کا فخر و ناز اس پر بجا ہو سکتا ہے۔ اگلے واعظوں اور میلاد خانوں نے اس واقعہ کو شاعرانہ انداز میں اس طرح ادا کیا کہ آمنہ کا کاشانہ نور سے معمور ہو گیا۔ جانور خوشی سے بولنے لگے، پرندے تہنیت کے گیت گانے لگے۔ مغرب کے چرندوں اور پرندوں نے مشرق کے چرندوں اور پرندوں کو مبارک باد دی۔ مکہ کے سوکھے درختوں میں بہار آ گئی۔ ستارے زمین پر جھک گئے۔ آسمانوں کے دروازے کھل گئے۔ فرشتوں نے ترانہ مسرت بلند کیا۔ انبیا نے روئے روشن کی زیارت کی۔ فرشتوں نے بچہ کو زمین و آسمان کی سیر کرائی۔ شیطانوں کی فوج پابہ زنجیر کی گئی۔ پہاڑ غرور سے اونچے ہو گئے۔ دریا کی موجیں خوشی سے اچھلنے لگیں۔ درختوں نے سرسبزی کے نئے جوڑے پہنے، بہشت و جنت کے ایوان نئے سروسامان سے سجائے گئے، وغیرہ بعد کے واعظوں اور میلاد خوانوں نے اس شاعرانہ انداز بیان کو واقعہ سمجھ لیا اور روایت تیار ہو گئی۔

آئندہ کے واقعات کو اشارات میں ولادت کے موقع پر بیان کرنا

⑤ آنحضرت ﷺ کے عہد رسالت میں یا بعد کو جو واقعات ظہور پذیر ہوئے، ان کا وقوع آنحضرت ﷺ کی ولادت کے زمانہ میں تسلیم کر لیا گیا ہے اور ان کو بحیثیت معجزہ کے آئندہ واقعات کا پیش خیمہ بنا لیا گیا ہے۔ مثلاً: آپ ﷺ کے زمانہ میں بت پرستی کا استیصال ہو گیا۔ کسریٰ و قیصر کی سلطنتیں فنا ہو گئیں۔ ایران کی آتش پرستی کا خاتمہ ہو گیا۔ شام کا ملک فتح ہوا۔ ان واقعات کو معجزہ اس طرح بنایا گیا کہ جب آپ کی ولادت ہوئی تو کعبہ کے تمام بت سرنگوں ہو گئے، قصر کسریٰ کے کنگرے ہل گئے۔ آتش کدۂ فارس بجھ کر رہ گیا۔ نہر ساوہ خشک ہو گئی۔ ایک نور چمکا جس سے شام کے محل نظر آنے لگے۔

معجزات کی تعداد بڑھانے کا شوق

⑥ بعض واقعات ایسے ہیں جن کو کسی حیثیت سے معجزہ نہیں کہا جا سکتا، لیکن تکثیر معجزات کے شوق میں ذرا سا بھی کسی بات میں عجوبہ پن ان کو نظر آیا تو اس کو مستقل معجزہ بنا لیا۔ مثلاً: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

روایت ہے [1] اور وہ مسند امام احمد بن حنبل [2] میں بھی مذکور ہے کہ آپ ﷺ کے گھر میں کوئی پالتو جانور تھا جب آپ اندر تشریف لاتے تو وہ نہایت سکون واطمینان کے ساتھ ایک جگہ بیٹھا رہتا تھا اور جب آپ باہر چلے جاتے تو وہ ادھر اُدھر دوڑنے لگتا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حیوانات کو بھی آپ ﷺ کی جلالت قدر اور حفظ مراتب کا پاس تھا اور وہ آپ کی عظمت وشان سے واقف تھے۔ لیکن درحقیقت یہ کوئی معجزہ نہیں بلکہ عام لوگوں سے بھی بعض جانور اسی طرح ہل مل جاتے ہیں۔

صحیح بخاری و مسلم [3] میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سخت بیمار تھے۔ آنحضرت ﷺ ان کی عیادت کو گئے تو وہ بے ہوش تھے۔ آنحضرت ﷺ نے وضو کر کے ان کے منہ پر پانی چھڑکا تو ان کو ہوش آ گیا۔ یہ ایک معمولی واقعہ ہے۔ مگر کتب دلائل کے مصنفین نے اس کو بھی معجزہ قرار دیا ہے۔ [4]

اسی طرح یہ روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ مختون پیدا ہوئے تھے۔ یہ روایت متعدد طریقوں سے مروی ہے، مگر ان میں سے کوئی طریقہ بھی ضعف سے خالی نہیں ہے۔ حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے کہ آپ ﷺ کا مختون پیدا ہونا متواتر روایتوں سے ثابت ہے۔ [5] اس پر علامہ ذہبی نے تنقید کی ہے کہ تواتر تو کجا صحیح طریقہ سے ثابت بھی نہیں۔ [6] اور بقول علامہ ابن قیم [7] اگر یہ ثابت بھی ہو تو آنحضرت ﷺ کی کوئی فضیلت نہیں ہے، کیونکہ ایسے بچے اکثر پیدا ہوئے ہیں۔

روایات صحیحہ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے تھے یا سجدہ میں جاتے تھے تو آپ ﷺ کی بغل کی سپیدی نظر آتی تھی۔ [8] یہ ایک معمولی بات ہے مگر محبّ طبری، قرطبی اور سیوطی [9] وغیرہ نے اس کو بھی معجزہ اور آپ ﷺ کا خاصہ قرار دے دیا ہے۔ معجزات کی تعداد بڑھانے کے شوق میں کتب دلائل کے مصنفین نے یہ بھی کہا ہے کہ ایک ہی واقعہ کی روایت میں اگر مختلف سلسلہ سند کے راویوں میں باہم موقع یا مقام یا کسی اور بات میں ذرا سا بھی اختلاف نظر آیا تو اس کو چند واقعہ قرار دے دیا۔ مثلاً: ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک اونٹ جو دیوانہ ہو گیا تھا یا بگڑ گیا تھا۔ آنحضرت ﷺ جب اس کے پاس گئے تو اس نے مطیعانہ سر ڈال دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا، یا رسول اللہ! جب جانور آپ کے سامنے سر جھکاتے ہیں تو ہم کو انسان ہو کر تو ضرور آپ کے سامنے سربسجود ہونا چاہیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں کسی انسان کو سجدہ کرنا روا رکھتا تو

---

[1] الخصائص الکبری، ذکر معجزاته فی ضروب الحیوانات، باب قصة الوحش، ج۲، ص:٦٣۔

[2] مسند أحمد، ج٦، ص: ١١٢، ١١٣۔ [3] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قوله (یوصیکم الله فی اولادکم......): ٤٥٧٧؛ صحیح مسلم، کتاب الفرائض، باب میراث الکلالة: ٤١٤٦۔

[4] خصائص کبریٰ سیوطی، ج ٢، ص:٧١ حیدر آباد دکن۔ [5] مستدرك حاکم، ج٢، ص:٦٠٢؛ خصائص کبریٰ، ج١، ص: ٥٣ باب الایة فی ولادة مختونا مقطوع السر ودلائل النبوة، ص: ١١٠، ١١١۔

[6] مستدرك حاکم، ج٢، ص:٦٠٢۔ [7] زاد المعاد، ج١، ص:١٩۔ [8] صحیح مسلم، کتاب صلوة الاستسقاء، باب رفع الیدین......: ٢٠٧٤، ٢٠٧٦؛ مسند احمد، ج ٤، ص: ١٩٣۔

[9] الخصائص الکبری، ذکر المعجزات والخصائص فی خلقه الشریف، ج١، ص:٦٣۔

بیوی کو کہتا کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے۔'' [1] یہ ایک ہی واقعہ ہے جو ذرا ذرا سے اختلاف بیان کی بنا پر چودہ پندرہ واقعات بن گئے ہیں۔

الفاظ کی نقل میں بے احتیاطی

⑦ ان کتابوں میں بعض معجزات ایسے مذکور ہیں جن کی اصل صحاح میں مذکور ہے اور اس طرح مذکور ہے کہ وہ کوئی معجزہ نہیں، بلکہ معمولی واقعہ ہے۔ لیکن نیچے درجہ کی روایتوں میں بے احتیاط راویوں نے الفاظ کے ذرا الٹ پھیر سے اس کو معجزہ قرار دے دیا۔ صحاح [2] کی متعدد روایتوں میں ہے کہ شانہ مبارک پر ابھرا ہوا گوشت تھا۔ جس کو ''خاتم نبوت'' کہتے تھے اور آپ کی انگشت مبارک میں جو نقرئی خاتم (چاندی کی انگوٹھی) تھی۔ اس پر ''محمد رسول اللہ ﷺ'' منقوش تھا۔ [3] بے احتیاط راویوں نے ان دونوں واقعوں کو ملا دیا اور اس طرح واقعہ کی صورت حاکم کی تاریخ نیشاپور، ابن عساکر کی تاریخ دمشق اور ابونعیم کی دلائل میں جا کر یوں ہو جاتی ہے کہ پشت مبارک کے گوشت کی خاتم نبوت پر کلمہ وغیرہ کی عبارتیں لکھی تھیں۔ [4]

مشہور عام دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت

دلائل و معجزات کے باب میں موضوع، منکر، ضعیف غرض ہر قسم کی قابل اعتراض روایات کا اتنا بڑا انبار ہے کہ اگر ایک ایک کر کے اس کی جانچ پڑتال کی جائے تو ایک مستقل ضخیم جلد تیار ہو جائے، لیکن یہاں اس کا موقع نہیں۔ اس لئے ہم صرف ان روایتوں کی تنقید پر قناعت کرتے ہیں۔ جو عام طور سے ہمارے ملک میں مشہور ہیں اور میلاد کی محفلوں میں ان کو بصد شوق و ذوق پڑھا اور سنا جاتا ہے۔

① اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ روایت آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوح و قلم، عرش و کرسی، جن و انس غرض سب سے پہلے نور محمد ﷺ کو پیدا کیا۔ پھر لوح و قلم، عرش و کرسی، آسمان و زمین ارواح و ملائکہ سب چیزیں اسی نور سے پیدا ہوئیں۔ اس کے متعلق ((اول ما خلق الله نوری)) [5] یعنی ''سب سے پہلے خدا نے میرا نور پیدا کیا۔'' کی روایت عام طور سے زبانوں پر جاری ہے۔ مگر اس روایت کا پتہ احادیث کے دفتر میں مجھے نہیں

---

[1] الخصائص، ذکر معجزاته فی ضروب الحیوانات، باب قصة الجمل والناقة، ج۲، ص:۵۷؛ دلائل النبوة، ص:۳۲۷۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب من ذهب بالصبی المریض لیدعی له:۵۶۷۰؛ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب اثبات خاتم النبوة:۶۰۸۴، ۶۰۸۵؛ جامع ترمذی، کتاب ابواب المناقب، باب ما جاء فی خاتم النبوة:۳۶۴۳، ۳۶۴۴؛ مسند أحمد، ج۳، ص:۶۹، ج۵، ص:۸۲، ۸۳، ۹۸۔

[3] صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب خاتم الفضة: ۵۸۶۶؛ صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینة، باب لبس النبی ﷺ خاتما من ورق نقشه محمد......:۵۴۷۶۔ [4] الخصائص الکبریٰ، باب ماجاء فی خاتم النبوة، ج۱، ص: ۶۰۔ [5] بعض ارباب سیر نے اس بنا پر کہ فضائل میں ہر قسم کی روایات قبول کر لی جاتی ہیں، اور خصوصاً وہ جن کی تائید ان کے خیال میں دوسرے طریقوں سے ہوتی ہے، اس روایت کو اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے، زرقانی علی المواهب، ج۱، ص: ۴۳ مگر جو علما ہر قسم کی روایت میں صحت کے پہلو کا خیال ضروری سمجھتے ہیں، ان کو اس میں کلام ہے، البتہ حضور انور ﷺ کا تمام انبیا میں اول مخلوق ہونا ثابت ہے۔

ملا۔البتہ ایک روایت مصنف عبدالرزاق میں ہے ((یا جابر! اول ما خلق اللّٰہ نور نبیك من نورہ)) ''اے جابر! سب سے پہلے خدا نے تیرے پیغمبر ﷺ کا نور اپنے نور سے پیدا کیا۔'' اس کے بعد ذکر ہے کہ اس نور کے چار حصے ہوئے اور انہی سے لوح و قلم، عرش و کرسی، آسمان و زمین اور جن و انس کی پیدائش ہوئی۔ زرقانی [1] وغیرہ نے اس روایت کو نقل کیا ہے مگر افسوس ہے کہ اس کی سند نہیں لکھی۔ ہندوستان میں مصنف عبدالرزاق کی گو دوسری جلد ملتی ہے، مگر پہلی نہیں ملتی۔ [2] دوسری جلد دیکھ لی گئی، اس میں یہ حدیث مذکور نہیں۔ اس لئے اس روایت کی تنقید نہ ہو سکی اور چونکہ کتاب مذکور میں صحیح حدیثوں کے ساتھ ساتھ موضوع حدیثیں تک موجود ہیں اور فضائل و مناقب میں اس کی روایتوں کا اعتبار کم کیا جاتا ہے۔ اس لئے اصولی حیثیت سے اس روایت کے تسلیم کرنے میں مجھے پس و پیش ہے۔ اس تردد کو قوت اس سے اور بھی زیادہ ہوتی ہے کہ صحیح احادیث میں مخلوقات الٰہی میں سب سے پہلے ''قلم تقدیر'' کی پیدائش کا تصریحی بیان ہے کہ ((اول ما خلق اللّٰہ القلم)) [3]

② روایتوں [4] میں ہے کہ یہ نور پہلے ہزاروں برس سجدہ میں پڑا رہا، پھر حضرت آدم علیہ السلام کے تیرہ و تار جسم کا چراغ بنا، پھر آدم علیہ السلام نے مرتے وقت شیث علیہ السلام کو اپنا وصی بنا کر یہ نور ان کے سپرد کیا۔ اسی طرح یہ درجہ بدرجہ ایک سے دوسرے پیغمبر کو سپرد ہوتا رہا اور حضرت عبداللہ کو سپرد ہوا اور حضرت عبداللہ سے حضرت آمنہ کو منتقل ہوا۔ نور کا سجدہ میں پڑے رہنا اور اس کا موجود ہونا بالکل موضوع ہے اور نور کا ایک دوسرے وصی کو درجہ بدرجہ منتقل ہوتے رہنا بے سروپا ہے۔ طبقات ابن سعد اور طبرانی، ابونعیم [5] اور بزار میں اس آیت پاک:

﴿ الَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ ۝ وَتَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ ۝ ﴾ (۲۶/ الشعرآء: ۲۱۸، ۲۱۹)

''وہ خدا جو تجھ کو دیکھتا ہے جب تو (تہجد کی نماز) میں کھڑا ہوتا ہے اور سجدہ کرنے والوں میں تیرے الٹ پھیر کو بھی دیکھتا ہے۔''

کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت [6] نقل کی گئی ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا پیغمبروں کی پشت بہ پشت منتقل ہونا خدا دیکھ رہا تھا۔ لیکن اول تو پوری آیت الفاظ اور سیاق و سباق اس مطلب کا ساتھ نہیں دیتے اور دوسرے یہ روایت اعتبار کے قابل نہیں۔

③ روایت ہے کہ یہ نور جب (بلوغ کے وقت) عبدالمطلب کو سپرد ہوا تو وہ ایک دن خانہ کعبہ میں سوئے

---

[1] ج۱، ص:۳۳۔ [2] ۱۹۷۲ء میں بیروت سے مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے تحشیہ و تعلیق کے ساتھ یہ مکمل کتاب ۱۱ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے مگر اس میں یہ روایت نہیں ملی۔ ڈاکٹر رضوان علی ندوی کا ایک مفصل مقالہ ''حدیث جابر اور نور محمدی ﷺ'' پر شائع ہوا ہے جس میں صراحتاً لکھا ہے ''یہ حدیث مصنف عبدالرزاق میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ (معارف جولائی، ۱۹۹۷ء)'' ''ض''

[3] جامع ترمذی، ابواب القدر، باب اعظام أمر الایمان بالقدر: ۲۱۵۵ ان علما نے جنہوں نے ((اول ماخلق اللّٰہ نوری)) کو قبول کرلیا ہے، نور محمدی اور قلم کی اولیت پیدائش میں تطبیق کی کوشش کی ہے۔ [4] بحوالہ خصائص، باب اختصاصہ بطھارۃ نسبہ، ج۱، ص:۳۹۔ [5] دلائل النبوۃ، ذکر فضیلۃ بطیب مولودہ، ص:۲۵۔

[6] خصائص، ج۱، ص:۳۸؛ ابن عساکر، ج۱، ص:۳۴۶۔

ہوئے تھے۔سوکر اٹھے تو دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں سرمہ اور بالوں میں تیل لگا ہے اور بدن پر جمال ورونق کا خلعت ہے۔یہ دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔آخرکار ان کے باپ ان کو قریش کے ایک کاہن کے پاس لے گئے،اس نے کہا کہ آسمانوں کے خدا نے اجازت دی ہے کہ اس لڑکے کا نکاح کر دیا جائے۔اس نور کے اثر سے عبدالمطلب کے بدن سے مشک کی خوشبو آتی تھی اور وہ نور ان کی پیشانی میں چمکتا تھا۔قریش پر قحط وغیرہ کی جب کوئی مصیبت آتی تھی تو اس نور کے وسیلہ سے وہ دعا مانگتے تھے،تو قبول ہوتی تھی۔یہ روایت ابوسعد نیشاپوری المتوفی ۴۰۷ھ نے اپنی کتاب شرف المصطفٰی میں ابوبکر ابن ابی مریم کے واسطہ سے کعب احبار (نومسلم یہودی) تابعی سے نقل کی ہے۔اول تو یہ سلسلہ ایک تابعی تک موقوف ہے،آگے کی سند نہیں،علاوہ ازیں کعب احبار گو نومسلم اسرائیلیوں میں سب سے بہتر سمجھے جاتے ہیں،تاہم امام بخاری ان کے کذب کا تجربہ بیان کرتے ہیں **1** اسلام میں اسرائیلیات اور عجیب وغریب حوادث کی روایات کے سرچشمہ یہی ہیں۔بیچ کا راوی ابوبکر بن ابی مریم باتفاق محدثین ضعیف ہے۔ **2** اس کا دماغ ایک حادثہ کے باعث ٹھیک نہیں رہا تھا۔

④ ابونعیم،حاکم،بیہقی اور طبرانی میں ایک روایت ہے **3** کہ عبدالمطلب یمن گئے تھے۔وہاں ایک کاہن ان کے پاس آیا اور ان کی اجازت سے ان کے دونوں نتھنوں کو دیکھ کر بتایا کہ ایک ہاتھ میں نبوت اور دوسرے میں بادشاہی کی علامت ہے،تم بنوزہرہ کی کسی لڑکی سے جا کر شادی کرو۔ان مصنفوں کا مشترک راوی عبدالعزیز بن عمران الزہری ہے۔اس کی نسبت میزان **4** میں ہے کہ امام بخاری نے کہا:''اس کی حدیث نہ لکھی جائے۔''نسائی نے کہا:''متروک ہے''یحیٰی نے کہا:''یہ شعروشاعری کا آدمی ہے۔ثقہ نہ تھا۔''عبدالعزیز کے بعد کا راوی اس میں یعقوب بن زہری ہے۔جس کی نسبت ابن معین کہتے ہیں کہ''اگر ثقات سے روایت کرے تو خیر لکھو۔''ابوزرعہ نے کہا:''وہ کچھ نہیں،وہ واقدی کے برابر ہے۔''امام احمد نے کہا:''وہ کچھ نہیں اس کی حدیث لاشے کے برابر ہے۔''ساجی نے کہا:''وہ منکر الحدیث ہے۔'' **5** علاوہ ازیں اس روایت میں بعض اور مجہول بھی ہیں۔حاکم نے مستدرک میں اس کو روایت کیا ہے **6** لیکن امام ذہبی نے نقد مستدرک میں یعقوب اور عبدالعزیز دونوں کو ضعیف کہا ہے۔

⑤ روایت ہے کہ حضرت عبداللہ کی پیشانی میں جب یہ نور چمکا تو ایک عورت جو کاہنہ تھی،اس نے نور کو پہچانا اور چاہا کہ وہ خود عبداللہ سے ہم بستر ہو کر اس نور کی امین بن جائے۔مگر یہ سعادت اس کی قسمت میں نہ تھی۔اس وقت عبداللہ نے عذر کیا اور گھر چلے گئے۔وہاں یہ دولت آمنہ کو نصیب ہوئی۔عبداللہ نے واپس آ کر اس کاہنہ سے اب خود درخواست کی تو اس نے رد کر دی کہ''اب وہ نور تمہاری پیشانی سے منتقل ہو چکا۔'' **7**

1 تہذیب التہذیب،ج۸،ص:۴۳۹۔ **2** ایضاً،ج۱۲،ص:۲۹،۳۰۔
3 دلائل النبوۃ،ص۸۹؛ خصائص،ج۱،ص:۴۰ باب ما وقع فی حملہ من الایات۔
4 میزان الاعتدال،۲،ص:۱۳۸۔ **5** ایضاً،ج۳،ص:۲۲۵۔ **6** مستدرك،کتاب التاریخ،اخبار سید المرسلین،ج۲،ص:۶۰۱۔ **7** طبقات ابن سعد،جزاوّل،ص:۵۸،۵۹؛ دلائل النبوۃ،ص:۸۹؛ خصائص،ج۱،ص:۴۰ باب ما وقع فی حملہ ...۔

یہ روایت الفاظ اور جزئیات کے اختلاف کے ساتھ ابن سعد، خرائطی، ابن عساکر ❶ بیہقی اور ابونعیم میں مذکور ہے۔ ابن سعد میں تین طریقوں سے اس کی روایت ہے، ایک طریقہ میں پہلا راوی واقدی ہے، دوسرے میں کلبی ہے، یہ دونوں مشہور دروغ گو ہیں۔ تیسرا طریقہ ابویزید مدنی تابعی پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ ابویزید مدنی کی اگرچہ بعض ائمہ نے توثیق کی ہے، مگر مدینہ کے شیخ الکل امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''میں اس کو نہیں جانتا۔'' ابوزرعہ نے کہا: ''مجھے نہیں معلوم۔'' ❷ ابونعیم نے چار طریقوں سے اس کی روایت کی ہے، لیکن کوئی ان میں قابل وثوق نہیں۔ ایک طریقہ میں نضر بن سلمہ اور احمد بن محمد بن عبدالعزیز بن عمرو الزہری ہیں اور یہ تینوں نامعتبر ہیں۔ تیسرے سلسلہ میں مسلم بن خالد الزنجی ہیں۔ جو ضعیف سمجھے جاتے ہیں ❸ اور معتدد مجاہیل ہیں۔ چوتھا طریقہ یزید بن شہاب الزہری پر ختم ہے اور وہ اپنے آگے کا سلسلہ نہیں بتاتے اور ان کا حال بھی نہیں معلوم بیہقی کا سلسلہ وہی تیسرا ہے۔ خرائطی اور ابن عساکر کا یوں بھی اعتبار نہیں۔

⑥ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ عبد مناف اور قبیلہ مخزوم کی دو سو عورتیں گنی گئیں۔ جنہوں نے اس غم میں کہ عبداللہ سے ان کو یہ دولت حاصل نہ ہوئی وہ مر گئیں۔ لیکن انہوں نے شادی نہ کی۔ (یعنی عمر بھر کنواری رہیں) اور قریش کی کوئی عورت نہ تھی جو اس غم میں بیمار نہ پڑ گئی ہو۔ یہی حکایت ہے جس کا غلط ترجمہ اردو مؤلفین میلاد نے یہ کیا ہے کہ ''اس رات دو سو عورتیں رشک وحسد سے مر گئیں۔'' یہ روایت سند کے بغیر زرقانی شرح مواہب لدنیہ میں بصیغہ رُوِیَ یعنی بیان کیا گیا ہے مذکور ہے ❹ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خود مصنف کو بھی اس کی صحت میں کلام ہے یہ درحقیقت بالکل بے سند اور بے اصل روایت ہے اور کسی معتبر کتاب میں اس کا پتا نہیں۔

⑦ روایت ہے کہ اس رات کو کسریٰ کے محل میں زلزلہ پڑ گیا اور اس کے چودہ کنگرے گر پڑے اور ساوہ کی نہر (واقع فارس) اور بعض روایتوں میں طبریہ کی نہر (واقع شام) خشک ہوگئی اور فارس کا آتش کدہ جو ہزاروں برس سے روشن تھا بجھ گیا اور کسریٰ نے ایک ہولناک خواب دیکھا جس کی تعبیر یمن کے ایک کاہن سطیح سے دریافت کی گئی۔ یہ قصہ بیہقی، خرائطی، ابن عساکر اور ابونعیم میں سند اور سلسلہ روایت کے ساتھ مذکور ہے۔ ❺ ان سب کا مرکزی راوی مخزوم بن ہانی ہے۔ جو اپنے باپ ہانی مخزومی (قریش) سے جس کی ڈیڑھ سو برس کی عمر تھی بیان کرتا ہے۔ ہانی کے نام کا کوئی صحابی جو مخزومی قریشی ہو اور جو ڈیڑھ سو برس کی عمر رکھتا ہو معلوم نہیں۔ اصابہ وغیرہ میں اسی روایت کے سلسلہ میں ان کا نام مشکوک طریقہ سے آیا ہے، ان کے صاحبزادہ مخزوم بن ہانی سے محدثین میں بھی کوئی شناسا نہیں۔ نیچے کے راویوں کا بھی یہی حال ہے۔ یہاں تک کہ ابن عساکر جیسے ضعیف روایتوں کے

❶ ابن عساکر، ج ۱، ص: ۳۴۶۔ ❷ تهذيب التهذيب، ج ۱۲، ص: ۲۸۰۔
❸ تهذيب التهذيب، ج ۱۰، ص: ۱۲۹، ۱۳۰۔ ❹ زرقانی، ج ۱، ص: ۱۲۲ ذکر تزوج عبدالله آمنة۔
❺ دلائل النبوة، ص: ۹۶۔

سرپرست بھی اس روایت کو غریب کہنے کی جرأت کرتے ہیں اور ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ جیسے کمزور روایتوں کے سہارا اور پشت پناہ بھی اس کو مرسل ماننے کو تیار ہیں۔ ابونعیم کی روایت میں محمد بن جعفر بن اعین مشہور وضاع ہے۔

⑧ روایت ہے کہ جب آنحضرت ﷺ پیدا ہوئے [1] تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی ماں شفاء بنت اوس ولادت کے وقت زچہ خانہ میں موجود تھیں۔ وہ کہتی ہیں کہ جب آپ ﷺ پیدا ہوئے تو پہلے غیب سے ایک آواز آئی، پھر مشرق ومغرب کی ساری زمین میرے سامنے روشن ہوگئی۔ یہاں تک کہ شام کے محل مجھ کو نظر آنے لگے۔ میں نے آپ ﷺ کو کپڑا پہنا کر لٹایا ہی تھا کہ اندھیرا چھا گیا اور میں ڈر کر کانپنے لگی۔ پھر داہنی طرف سے کچھ روشنی نکلی تو آواز سنی کہ کہاں لے گئے تھے؟ جواب ملا، کہ ''مغرب کی سمت'' ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ پھر وہی کیفیت پیدا ہوئی، میں ڈر کر کانپی اور آواز آئی کہاں لے گئے تھے؟ جواب ملا کہ ''مشرق کی سمت۔'' یہ حکایت ابونعیم میں ہے۔ [2] اس کے بیچ کا راوی احمد بن محمد بن عبدالعزیز زہری نامعتبر ہے اور اس کے دوسرے رواۃ مجہول الحال ہیں۔

⑨ روایت ہے کہ حضرت آمنہ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی ان سے کہہ رہا ہے اے آمنہ! تیرا بچہ تمام جہان کا سردار ہوگا۔ جب بچہ پیدا ہو تو اس کا نام احمد اور محمد رکھنا اور یہ تعویذ اس کے گلے میں ڈالنا۔ جب وہ بیدار ہوئیں تو سونے کے پتر پر یہ اشعار لکھے ملے۔ (اس کے بعد اشعار ہیں) یہ قصہ ابونعیم میں ہے [3] جس کا راوی ابوغزیہ محمد بن موسیٰ انصاری ہے، جس کی روایتوں کو امام بخاری منکر کہتے ہیں۔ ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ دوسروں کی حدیثیں چرایا کرتا تھا اور ثقات سے موضوع روایتیں بنا کر بیان کیا کرتا تھا۔ [4] متاخرین میں حافظ عراقی نے اس روایت کو بے اصل اور شامی نے بہت ہی ضعیف کہا ہے۔ ابن اسحاق نے بھی اس کو بے سند روایت کہا ہے۔ ابن سعد میں یہ روایت واقدی کے حوالہ سے ہے جس کی دروغ گوئی محتاج بیان نہیں۔

⑩ روایت: عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ صحابی کی ماں ولادت کے وقت موجود تھیں [5] وہ کہتی ہیں کہ جب آمنہ کو دردزہ ہوا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام ستارے زمین پر جھکے آتے ہیں۔ یہاں تک کہ میں ڈری کہ کہیں زمین پر نہ گر پڑیں اور جب پیدا ہوئے تو جدھر نظر جاتی تھی تمام گھر روشنی سے معمور تھا۔ یہ قصہ ابونعیم طبرانی اور بیہقی میں مذکور ہے۔ اس کے رواۃ میں یعقوب بن محمد زہری پایہ اعتبار سے ساقط ہے [6] اور عبدالعزیز بن عمر بن عبدالرحمٰن بن عوف ایک محض داستان گو اور جھوٹا تھا۔

⑪ روایت: حضرت آمنہ کہتی ہیں کہ ''مجھے ایام حمل میں حمل کی کوئی علامت معلوم نہ ہوئی اور عورتوں کو ان ایام میں جو گرانی اور تکلیف محسوس ہوتی ہے، وہ بھی نہ ہوئی بجز اس کے کہ معمول میں فرق آ گیا تھا۔'' [7]

---

[1] خصائص، ج۱، ص:٤٦، ٤٧۔ [2] دلائل النبوۃ، ص:٩٣، ٩٤۔ [3] دلائل النبوۃ، ص:٩٤؛ مواھب شرح الزرقانی، ج۱۱، ص: ١٢٦۔ [4] میزان الاعتدال، ج۳، ص: ١٤٠۔

[5] الخصائص، ج۱، ص:٤٥؛ دلائل النبوۃ، ص:٩٣۔ [6] تھذیب، ج۱۱، ص: ٣٩٦، ٣٩٧۔

[7] الخصائص، ج۱، ص:٤٢؛ طبقات، ابن سعد، جزء اوّل قسم اول۔

قسطلانی نے مواہب لدنیہ ❶ میں اس قصہ کو ابن اسحاق اور ابونعیم کے حوالہ سے بیان کیا ہے لیکن ابن اسحاق کا جونسخہ ابن ہشام کے نام سے مشہور اور چھپا ہوا ہے اور نیز دلائل ابونعیم کے مطبوعہ نسخہ میں تو اس قسم کا کوئی واقعہ مذکور نہیں۔ قسطلانی کی پیروی میں دوسرے بے احتیاط متاخرین مثلاً: صاحب سیرت حلبیہ اور مصنف خمیس ❷ نے بھی ابن اسحاق اور ابونعیم ہی کی طرف اس روایت کی نسبت کی ہے لیکن ابن سید الناس نے عیون الاثر میں بجا طور سے اس روایت کے لئے واقدی کا حوالہ دیا ہے۔ ❸ دراصل یہ قصہ ابن سعد نے نقل کیا ہے اور اس کی روایت کے دو سلسلے لکھے ہیں، مگر ان میں سے ہر ایک کا سر سلسلہ واقدی ہے اور اس کی نسبت محدثین کی رائے پوشیدہ نہیں۔ علاوہ ازیں ان میں سے کوئی سلسلہ بھی مرفوع نہیں۔ پہلا سلسلہ عبداللہ بن وہب پر ختم ہوتا ہے۔ جو اپنی پھوپھی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ کہتی ہیں کہ ہم یہ سنا کرتے تھے۔ دوسرے سلسلہ کو واقدی زہری پر جا کر ختم کر دیتا ہے۔

⑫ ایک روایت اس کے بالکل برخلاف ابن سعد ❹ میں یہ ہے کہ غالباً آنحضرت ﷺ کی جلالت و عظمت کے باعث حضرت آمنہ کو سخت گرانی اور بار محسوس ہوتا تھا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ میرے پیٹ میں کئی بچے رہے۔ مگر اس بچہ سے زیادہ بھاری اور گراں مجھے کوئی نہیں معلوم ہوا، اول تو یہ روایت معروف اور مسلم واقعہ کے خلاف ہے، حضرت آمنہ کے ایک کے سوا نہ کوئی اور بچہ ہوا اور نہ حمل رہا دوسرے یہ کہ اس روایت کا سلسلہ ناتمام ہے۔ اسی معنی کی ایک اور روایت شداد بن اوس صحابی رضی اللہ عنہ کی زبانی منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "میں اپنے والدین کا پہلوٹا ہوں۔ جب میں شکم میں تھا تو میری ماں عام عورتوں سے بہت زیادہ گرانی محسوس کرتی تھیں۔" ❺ معانی بن زکریا القاضی نے اس روایت پر اتنی ہی جرح کی ہے کہ "یہ منقطع ہے۔" یعنی شداد بن اوس اور ان کے بعد کے راوی مکحول میں ملاقات نہیں۔ اس لئے بیچ میں ایک راوی کم ہے حالانکہ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کا پہلا راوی عمر بن صبیح کذاب، وضاع اور متروک تھا۔ ❻

⑬ روایت: جب ولادت کا وقت آیا خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آسمانوں اور بہشتوں کے دروازے کھول دو، فرشتے باہم بشارت دیتے پھرتے تھے۔ سورج نے نور کا نیا جوڑا پہنا۔ اس سال دنیا کی تمام عورتوں کو یہ رعایت ملی کہ سب فرزند نرینہ جنیں، درختوں میں پھل آ گئے۔ آسمان میں زبرجد و یاقوت کے ستون کھڑے کئے گئے۔ نہر کوثر کے کنارے مشک خالص کے درخت اگائے گئے۔ مکہ کے بت اوندھے ہو گئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ حکایت مواہب لدنیہ ❼ اور خصائص کبریٰ ❽ میں ابونعیم کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے، لیکن ابونعیم کی دلائل النبوۃ کے مطبوعہ نسخہ میں جہاں اس کا موقع ہو سکتا تھا۔ وہاں یہ روایت مجھ کو نہیں ملی۔ ممکن ہے کہ ابونعیم

---

❶ مواهب لدنية، ج١، ص:١٢٥۔ ❷ سيرة حلبية، ج١، ص:٥١ باب ذكر حمل امه، تاريخ الخميس، ج١، ص:١٨٦۔ ❸ ج١، ص: ٢٥ مكتبه القدسي۔ ❹ طبقات، ج١، ص:٦١۔ ❺ كنز العمال، كتاب الفضائل من قسم الافعال جامع الدلائل واعلام النبوة، ج٦، ص:٣٠٥۔ ❻ تهذيب، ج٧، ص:٤٦٣۔ ❼ ج١، ص: ١٣٤۔ ❽ ج١، ص: ٤٧۔

نے اپنی کسی اور کتاب میں یہ روایت لکھی ہو یا یہ مطبوعہ نسخہ نامکمل ہو، بہر حال اس روایت کی بنا صرف اس قدر ہے کہ ابونعیم چوتھی صدی کے ایک راوی عمرو بن قتیبہ راوی سے نقل کرتے ہیں کہ ان کے والد قتیبہ جو بڑے فاضل تھے، یہ بیان کرتے تھے۔ قسطلانی نے مواہب میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ وہ مطعون ہے۔ [1] حافظ سیوطی نے خصائص میں اس کو منکر کہا ہے [2] اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام تر بے سند اور موضوع ہے۔

⑭ روایت: آنحضرت ﷺ کے حمل میں ہونے کی جو نشانیاں تھیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس رات کو قریش کے سب جانور بولنے لگے اور کہنے لگے کہ کعبہ کے خدا کی قسم! آنحضرت ﷺ شکم مادر میں آ گئے وہ دنیا جہاں کی امان اور اہل دنیا کے چراغ ہیں۔ قریش اور دیگر قبائل کی کاہنہ عورتوں میں کوئی عورت ایسی نہ تھی کہ اس کا جن اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گیا ہو اور ان سے کہانت کا علم چھین لیا گیا اور دنیا کے تمام بادشاہوں کے تخت اوندھے ہو گئے اور سلاطین اس دن گونگے ہو گئے۔ مشرق کے وحشی جانوروں نے مغرب کے وحشی جانوروں کو جا کر بشارت دی۔ اسی طرح ایک دریا نے دوسرے دریا کو خوشخبری سنائی، پورے ایام حمل میں ہر ماہ آسمان وزمین سے یہ ندا سنی جانے لگی کہ ''بشارت ہو کہ حضرت ابوالقاسم ﷺ کے زمین پر ظاہر ہونے کا زمانہ قریب آیا۔'' [3] حضرت ﷺ کی والدہ فرماتی تھیں: ''جب میرے حمل کے چھ مہینے گزرے تو خواب میں کسی نے مجھ کو پاؤں سے ٹھوکر دے کر کہا کہ اے آمنہ! تمام جہان کا سردار تیرے پیٹ میں ہے۔ جب وہ پیدا ہو تو اس کا نام محمد ﷺ رکھنا اور اپنی حالت کو چھپائے رکھنا۔'' کہتی ہیں کہ جب ولادت کا زمانہ آیا، تو عورتوں کو جو پیش آتا ہے وہ مجھ کو بھی پیش آیا اور کسی کو میری اس حالت کی خبر نہ تھی، میں گھر میں تنہا تھی۔ عبدالمطلب خانہ کعبہ کے طواف کو گئے تھے تو میں نے ایک زور کی آواز سنی جس سے میں ڈر گئی، میں نے دیکھا کہ ایک سپید مرغ ہے جو اپنے بازو کو میرے دل پر مل رہا ہے، اس سے میری تمام دہشت دور ہو گئی اور درد کی تکلیف بھی جاتی رہی۔ پھر ایک طرف دیکھا کہ سپید شربت ہے۔ پیاسی تھی، دودھ سمجھ کر اس کو پی گئی، اس کے پینے سے ایک نور مجھ سے نکل کر بلند ہوا۔ پھر میں نے دیکھا کہ چند عورتیں جن کے قد لمبے لمبے ہیں۔ گویا عبدالمطلب کی بیٹیاں ہیں۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہی ہیں، میں تعجب کر رہی ہوں کہ ان کو کیسے میرا حال معلوم ہوا (ایک اور روایت میں ہے کہ ان عورتوں نے کہا کہ ہم فرعون کی بیوی آسیہ اور عمران کی بیٹی مریم اور یہ حوریں ہیں) میرا درد بڑھ گیا اور ہر گھڑی آواز اور زیادہ بلند تھی اور خوفناک ہوتی جاتی تھی، اتنے میں ایک سپید دیبا کی چادر آسمان وزمین کے درمیان پھیلی نظر آئی اور آواز آئی کہ اس کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپالو۔ میں نے دیکھا کہ چند مرد ہوا میں معلق ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چاندی کے آفتابے ہیں اور میرے بدن سے موتی کی طرح پسینہ کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ جس میں مشک خالص سے بہتر خوشبو تھی اور میں دل میں کہہ رہی تھی کہ کاش! عبدالمطلب اس وقت

[1] ج ۱، ص: ۱۳٤۔ [2] ج ۱، ص: ٤٩۔ [3] خصائص الکبریٰ، ج ۱، ص: ٤٧۔

پاس ہوتے۔ پھر میں نے پرندوں کا ایک غول دیکھا جو نہیں معلوم کدھر سے آئے وہ میرے کمرے میں گھس آئے۔ ان کی منقاریں زمرد کی اور باز و یاقوت کے تھے۔ میری آنکھوں سے اس وقت پردے اٹھا دیے گئے تو اس وقت مشرق و مغرب سب میری نگاہوں کے سامنے تھے۔ تین جھنڈے نظر آئے۔ ایک مشرق میں، ایک مغرب میں اور ایک خانہ کعبہ کی چھت پر۔ اب درد زیادہ بڑھ گیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ مجھے کچھ عورتیں ٹیک لگائے بیٹھی ہیں اور اتنی عورتیں بھر گئیں کہ مجھے گھر کی کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ اسی اثنا میں بچہ پیدا ہوا میں نے پھر کر دیکھا تو وہ سجدہ میں پڑا تھا اور دو انگلیوں کو آسمان کی طرف دعا کی طرح اٹھائے تھا۔ پھر ایک سیاہ بادل نظر آیا۔ جو آسمان سے اتر کر نیچے آیا اور بچہ پر چھا گیا اور بچہ میری نگاہ سے چھپ گیا۔ اتنے میں ایک منادی سنی کہ محمد ﷺ کو زمین کے پورب اور پچھم گھما دو اور سمندروں کے اندر لے جاؤ کہ سب ان کے نام نامی اور شکل و صورت کو پہچان لیں اور جان لیں کہ یہ مٹانے والے ہیں۔ یہ اپنے زمانہ میں شرک کا نام ونشان مٹا دیں گے۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں بادل ہٹ گیا اور آپ ﷺ دودھ سے زیادہ سفید کپڑے میں لپٹے نظر آئے۔ جس کے نیچے سبز ریشم تھا۔ ہاتھوں میں سفید موتیوں کی تین کنجیاں تھیں اور ایک آواز آئی کہ محمد کو فتح، نصرت اور نبوت کی کنجیاں دی گئی ہیں۔ ❶

میں نے دل پر جبر کر کے یہ پوری حکایت نقل کی ہے یہ اس لئے کہ میلاد کے عام جلسوں کی رونق انہی روایتوں سے ہے۔ یہ روایت ابونعیم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے ❷ اور سند کا سلسلہ بھی ہر طرح درست ہے۔ مگر اگر کسی کو اسماء الرجال سے آگاہی نہ بھی ہو اور وہ صرف ادب عربی کا صحیح ذوق رکھتا ہو تو وہ فقط روایت کے الفاظ اور عبارت کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر دے گا کہ یہ تیسری چوتھی صدی کی بنائی ہوئی ہے۔ اس روایت میں یحییٰ بن عبداللہ البابلی اور ابوبکر بن ابی مریم ہیں۔ پہلا شخص بالکل ضعیف ہے ❸ اور دوسرا نا قابل حجت ہے ❹ ان کے آگے کے راوی سعید بن عمرو الانصاری اور ان کے باپ عمرو الانصاری کا کوئی پتہ نہیں۔

⑮ اسی قسم کی ایک اور روایت حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کی جاتی ہے، وہ کہتے ہیں: میرے چھوٹے بھائی عبداللہ جب پیدا ہوئے تو ان کے چہرہ پر سورج کی سی روشنی تھی اور والد نے ایک دفعہ خواب دیکھا۔ بنو مخزوم کی ایک کاہنہ نے یہ خواب سن کر پیشین گوئی کی کہ اس لڑکے کی پشت سے ایک ایسا بچہ پیدا ہوگا جو تمام دنیا پر حکومت کرے گا۔ جب آمنہ کے شکم سے بچہ پیدا ہوا تو میں نے ان سے پوچھا کہ ولادت کے اثنا میں تم کو کیا کیا نظر آیا۔ انہوں نے کہا کہ جب مجھے درد ہونے لگا تو میں نے بڑے زور کی آواز سنی، جو انسانوں کی آواز کی طرح نہ تھی اور سبز ریشم کا پھریرا یاقوت کے جھنڈے میں لگا ہوا آسمان و زمین کے بیچ میں گڑا نظر آیا اور میں نے دیکھا

❶ مواهب لدنية، ج١، ص: ١٣٤ تا ١٣٦ والخصائص، ج١، ص: ٤٧، ٤٨۔
❷ الخائص، ج١، ص: ٤٧، ٤٨ میں بھی یہ روایت ہے مگر کسی قدر فرق کے ساتھ۔
❸ تهذيب التهذيب، ج١١، ص: ١٤٠، ٢٤١۔ ❹ ایضا، ج١٢، ص: ٢٩۔

کہ بچہ کے سر سے روشنی کی کرنیں نکل نکل کر آسمان تک جاتی ہیں۔ شام کے تمام محل آگ کا شعلہ معلوم ہوتے تھے اور اپنے پاس مرغابیوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیا۔ جس نے بچہ کو سجدہ کیا پھر اپنے پروں کو کھول دیا اور سعیرہ اسدیہ کو دیکھا کہ وہ کہتی ہوئی گزری کہ تیرے اس بچہ نے بتوں اور کاہنوں کو بڑا صدمہ پہنچایا۔ ہائے سعیرہ ہلاک ہوگئی۔ پھر ایک بلند و بالا سپید رنگ جوان نظر آیا۔ جس نے بچہ کو میرے ہاتھ سے لے لیا اور اس کے منہ میں اپنا لعاب دہن لگایا۔ اس کے ہاتھ میں سونے کا ایک طشت تھا۔ بچہ کے پیٹ کو پھاڑا۔ پھر اس کے دل کو نکالا اس میں سے ایک سیاہ داغ نکال کر پھینک دیا۔ پھر سبز حریر کی ایک تھیلی کھولی، اس میں سے ایک انگوٹھی نکال کر مونڈھے کے برابر مہر کی اور اس کو ایک کرتہ پہنا دیا۔ اے عباس! یہ میں نے دیکھا۔ ❶

اس روایت کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے کہ ناقلین نے اس کے ضعف کو خود تسلیم کیا ہے اور حافظ سیوطی نے لکھا ہے کہ اس روایت اور اس کے پہلے کی دو روایتوں (۱۳۔۱۴) میں سخت نکارت ہے اور میں نے اپنی اس کتاب (خصائص) میں ان تینوں سے زیادہ منکر کوئی روایت نقل نہیں کی اور میرا دل ان کے لکھنے کو نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میں نے محض ابونعیم کی تقلید میں لکھ دیا ہے۔ ❷ جن روایتوں کو حافظ سیوطی لکھنے کے قابل نہ سمجھیں آپ ان کے ضعف کے درجہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ سیوطی اس روایت کا ماخذ ابونعیم کو بتاتے ہیں، مگر یہ روایت دلائل ابی نعیم کے مطبوعہ نسخہ میں نہیں ملی۔ یہ بھی یاد رہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے ایک ہی دو سال بڑے تھے۔ جب آمنہ نے وفات پائی تو وہ سات آٹھ برس کے بچہ ہوں گے۔

⑯ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آمنہ آنحضرت ﷺ کی ولادت کا قصہ بیان کر رہی تھیں کہ "میں حیرت میں تھی کہ تین آدمی دکھائی دیے۔ جن کے چہرے سورج کی طرح چمک رہے تھے ایک کے ہاتھ میں چاندی کا آفتابہ تھا، جس سے مشک کی سی خوشبو آ رہی تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں سبز زمرد کا طشت تھا۔ جس کے چار گوشے تھے اور ہر گوشہ میں سپید موتی رکھا تھا اور ایک آواز آئی۔ اے حبیب اللہ! یہ پوری دنیا، پورب، پچھم، خشکی و تری سب مجسم ہو کر آئی ہے۔ اس کے جس گوشہ کو چاہے مٹھی میں لے لیجئے۔ آمنہ کہتی ہیں کہ میں نے گھوم کر دیکھا کہ بچہ کہاں ہاتھ رکھتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس نے بیچ میں ہاتھ رکھا تو کہنے والے کی آواز سنی کہ "محمد نے کعبہ کے خدا کی قسم! کعبہ پر قبضہ کیا ہے۔ ہاں یہ کعبہ اس کا قبلہ اور اس کا مسکن بنے گا۔" تیسرے کے ہاتھ میں سپید حریر لپٹا تھا۔ اس نے اس کو کھولا تو اس میں ایک انگوٹھی نکلی۔ جس کو دیکھ کر دیکھنے والوں کی آنکھیں حیرت کرتی تھیں۔ پھر وہ میرے پاس آیا تو طشت والے نے اس انگوٹھی کو لے کر اس آفتابہ سے سات بار اس کو دھویا اور بچہ کے مونڈھے پر مہر کر دی اور حریر میں اس کو لپیٹ کر مشک خالص کے تاگے سے اس کو باندھ دیا اور تھوڑی دیر تک اپنے بازوؤں میں لپٹائے رکھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ یہ

❶ خصائص، ج ۱، ص: ۴۸، ۴۹۔ ❷ خصائص، ج ۱، ص: ۴۹۔

رضوان جنت تھا۔ پھر بچہ کے کان میں کچھ کہا جس کو آمنہ کہتی ہیں کہ میں سمجھ نہ سکی اور پھر اس نے کہا: اے محمد ﷺ! بشارت ہو کہ کسی نبی کو کوئی ایسا علم عطا نہیں کیا گیا جو تم کو نہیں بتایا گیا۔ تم سب پیغمبروں سے زیادہ شجاع بنائے گئے تم کو فتح و نصرت کی کنجی دی گئی اور رعب و داب بخشا گیا جو تمہارا نام سنے گا اس نے تم کو کبھی دیکھا بھی نہ ہو تو وہ کانپ جائے گا۔ اے خدا کے خلیفہ!

اس روایت کا ماخذ یہ ہے کہ یحییٰ بن عائذ المتوفی ۳۷۸ھ نے اپنی کتاب میلاد میں اس کا ذکر کیا ہے ابن دحیہ محدث نے بڑی جرأت کر کے اس خبر کو غریب کہا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کو غریب کہنا بھی اس کی توثیق ہے یہ تمام تر بے اصل اور بے بنیاد ہے۔ [1]

⑰ روایت: آمنہ کہتی ہیں کہ جب ولادت ہوئی تو ایک بہت بڑا ابر کا ٹکڑا نظر آیا جس میں سے گھوڑے کے ہنہنانے اور پروں کے پھڑپھڑانے اور لوگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں، وہ ابر کا ٹکڑا بچہ کے اوپر آ کر چھا گیا اور بچہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ البتہ منادی کی آواز سنائی دی کہ محمد ﷺ کو ملکوں ملکوں پھراؤ اور سمندروں کی تہوں میں لے جاؤ کہ تمام دنیا ان کے نام و نشان کو پہچان لے اور جن وانس، چرند و پرند ملائکہ بلکہ ہر ذی روح کے سامنے ان کو لے جاؤ ان کو آدم علیہ السلام کا خلق، شیث کی معرفت، نوح علیہ السلام کی شجاعت ابراہیم علیہ السلام کی دوستی، اسمٰعیل علیہ السلام کی زبان، اسحاق علیہ السلام کی رضا، صالح علیہ السلام کی فصاحت، لوط علیہ السلام کی حکمت، موسیٰ علیہ السلام کی سختی، ایوب علیہ السلام کا صبر، یونس علیہ السلام کی اطاعت، یوشع علیہ السلام کا جہاد، داؤد علیہ السلام کی آواز، دانیال علیہ السلام کی محبت، الیاس علیہ السلام کا وقار، یحییٰ علیہ السلام کی پاکدامنی اور عیسیٰ علیہ السلام کا زہد عطا کرو اور تمام پیغمبروں کے اخلاق میں ان کو غوطہ دو۔ آمنہ کہتی ہیں، پھر یہ منظر ہٹ گیا۔ تو میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ سبز حریر میں لپٹے ہیں اور اس کے اندر سے پانی ٹپک رہا ہے۔ آواز آئی، ہاں محمد ﷺ نے تمام دنیا پر قبضہ کر لیا اور کوئی مخلوق ایسی نہ رہی جو ان کے حلقۂ اطاعت میں نہ آ گئی ہو۔ کہتی ہیں کہ پھر میں نے دیکھا تو نظر آیا کہ آپ ﷺ کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہے اور مشک خالص کی سی خوشبو آپ سے نکل رہی ہے۔ دفعتۃً تین آدمی نظر آئے، ایک کے ہاتھ میں چاندی کا آفتابہ ہے، دوسرے کے ہاتھ میں سبز زمرد کا طشت ہے اور تیسرے کے ہاتھ میں سپید ریشم ہے، اس نے سپید ریشم کو کھول کر اس میں سے انگوٹھی جس کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں، نکالی پہلے اس نے انگوٹھی کو سات دفعہ اس آفتابہ کے پانی سے دھویا۔ پھر مونڈھے پر مہر کر کے بچہ کو تھوڑی دیر کے لئے اپنے بازوؤں میں لپیٹ دیا اور پھر مجھے واپس کر دیا۔ [2]

اس حکایت کی بنیاد یہ ہے کہ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں "السعادۃ و البشریٰ" نامی ایک میلاد کی کتاب سے اس کو نقل کیا ہے اور السعادۃ و البشریٰ کا مصنف کہتا ہے کہ اس نے خطیب سے اس کو لیا ہے۔ [3] روایات

[1] خصائص، ج ۱، ص:۴۹۔ [2] مواہب، ج ۱، ص:۱۳۶ تا ۱۳۹۔ [3] مواہب، ج ۱، ص:۱۳۶۔

کے لحاظ سے خطیب کی تاریخ کا جو درجہ ہے وہ کس کو معلوم نہیں۔ قسطلانی نے اس روایت کو ابونعیم کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔ مگر دلائل ابونعیم کے مطبوعہ نسخہ میں تو اس کا پتہ نہیں۔ غنیمت ہے کہ حافظ قسطلانی نے خود تصریح کر دی ہے کہ اس میں سخت نکارت ہے۔

⑱ روایت: آمنہ کہتی ہیں کہ جب آپ ﷺ پیدا ہوئے تو ایک روشنی چمکی جس سے تمام مشرق و مغرب روشن ہو گیا اور آپ ﷺ دونوں ہاتھ ٹیک کر زمین پر گر پڑے (شاید مقصود یہ کہنا ہے کہ آپ سجدہ میں گئے) پھر مٹھی سے مٹی اٹھائی (اہل میلاد اس سے یہ مطلب لیتے ہیں کہ آپ نے روئے زمین پر قبضہ کر لیا) اور آسمان کی طرف سر اٹھایا۔

یہ حکایت ابن سعد میں متعدد طریقوں سے مذکور ہے [1] مگر ان میں سے کوئی قوی نہیں اسی کے قریب قریب ابونعیم اور طبرانی میں روایتیں ہیں۔ ان کا بھی یہی حال ہے۔

⑲ روایت: جس شب کو آپ ﷺ پیدا ہوئے قریش کے بڑے بڑے سردار جلسہ جمائے بیٹھے تھے۔ ایک یہودی نے جو مکہ میں سوداگری کرتا تھا۔ ان سے آ کر دریافت کیا کہ ''آج تمہارے یہاں کسی کے گھر بچہ پیدا ہوا ہے؟'' سب نے اپنی لاعلمی ظاہر کی اس نے کہا، اللہ اکبر! تم کو نہیں معلوم تو خیر میں جو کہتا ہوں اس کو سن رکھو۔ آج شب کو اس پچھلی امت کا نبی پیدا ہو گیا۔ اس کے دونوں مونڈھوں کے بیچ میں ایک نشانی ہے۔ اس میں گھوڑے کی ایال کی طرح کچھ اوپر تلے بال ہیں وہ دو دن تک دودھ نہ پیئے گا۔ کیونکہ ایک جن نے اس کے منہ میں انگلی ڈال دی ہے۔ جس سے وہ دودھ نہیں پی سکتا۔ جب جلسہ چھٹ گیا اور لوگ گھروں کو لوٹے تو معلوم ہوا کہ عبداللہ بن مطلب کے گھر لڑکا پیدا ہوا ہے لوگ اس یہودی کو آمنہ کے گھر لائے۔ اس نے بچہ کی پیٹھ پر تل دیکھا تو غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا، لوگوں نے سبب پوچھا، اس نے کہا، خدا کی قسم! اسرائیل کے گھرانے سے نبوت رخصت ہو گئی۔ اے قریش! تم اس کی پیدائش سے خوش ہو۔ ہشیار! خدا کی قسم! یہ تم پر ایک دن ایسا حملہ کرے گا جس کی خبر چہار دانگ عالم میں پھیلے گی۔'' یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے مگر اہل علم جانتے ہیں کہ حاکم کا کسی روایت کو صحیح کہنا ہمیشہ تنقید کا محتاج رہتا ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے تلخیص مستدرک [2] میں حاکم کی تردید کی ہے۔ اس کا سلسلہ روایت یہ ہے کہ یعقوب بن سفیان فسوی ابوغسان محمد یحییٰ کنانی سے اور یہ اپنے باپ (یحییٰ بن علی کنانی) سے اور وہ محمد بن اسحاق (مصنف سیرت) سے روایت کرتے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ابن اسحاق نے خود اپنی سیرت سے یہ روایت نہیں لی ہے۔ ابوغسان محمد بن یحییٰ کو گو بعض محدثین نے اچھا کہا ہے۔ مگر محدث سلیمانی نے ان کو منکر الحدیث کہا ہے۔ ابن حزم نے ان کو مجہول کہا ہے۔ [3] بہرحال ان تک غنیمت ہے مگر ان کے باپ یحییٰ بن علی کا کہیں کوئی ذکر نہیں کہ یہ کون تھے؟ اور کب تھے؟ اسی قسم

---

[1] طبقات ابن سعد، ذکر مولد رسول اللہ ﷺ ج ۱، ص: ۶۳؛ مواہب، ج ۱، ص: ۱۳۹۔ [2] ج ۲، ص: ۶۰۲۔
[3] تہذیب التہذیب، ج ۹، ص: ۵۱۸۔

کی ایک اور روایت عیص راہب کے متعلق ابوجعفر بن ابی شیبہ سے ہے اور ابونعیم نے دلائل میں اور ابن عساکر نے تاریخ [1] میں اس کو ذکر کیا ہے۔لیکن زرقانی نے لکھ دیا ہے کہ ابوجعفر بن ابی شیبہ نامعتبر ہے۔

⑳ روایت: حضرت عباس رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے ذکر کرتے ہیں کہ یارسول اللہ! مجھ کو جس نشانی نے آپ کے مذہب میں داخل ہونے کا خیال دلایا، وہ یہ ہے کہ جب آپ گہوارہ میں تھے تو میں نے دیکھا کہ آپ چاند سے اور چاند آپ سے باتیں کرتا تھا اور انگلی سے آپ اس کو جدھر اشارہ کرتے تھے، ادھر جھک جاتا تھا۔فرمایا، ہاں میں اس سے اور وہ مجھ سے باتیں کرتا تھا اور رونے سے بہلاتا تھا اور عرش کے نیچے جا کر جب وہ تسبیح کرتا تھا تو میں اس کی آواز سنتا تھا۔یہ حکایت دلائل بیہقی کتاب المائتین صابونی، تاریخ خطیب اور تاریخ ابن عساکر میں ہے۔مگر خود بیہقی نے تصریح کر دی ہے کہ "یہ صرف احمد بن ابراہیم جبلی کی روایت ہے اور وہ مجہول ہے۔" صابونی نے روایت لکھ کر کہا ہے کہ "یہ سند اور متن دونوں لحاظ سے غریب ہے۔" علاوہ ازیں حضرت عباس رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے شاید ایک یا دو سال بڑے تھے۔آنحضرت ﷺ کی شیر خوارگی کے عالم میں وہ خود شیر خوار ہوں گے۔

㉑ حافظ ابن حجر نے فتح الباری [2] میں واقدی کی سیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے گہوارہ میں کلام کیا۔ابن سبع التوفی کی خصائص میں ہے کہ فرشتے آپ ﷺ کا گہوارہ ہلاتے تھے اور (پیدائش کے بعد) سب سے پہلا فقرہ زبان مبارک سے یہ نکلا۔الحمد للہ کبیرًا والحمد لله کثیرًا ابن عائذ وغیرہ۔میلاد کی بعض اور کتابوں میں اور فقرے بھی منسوب ہیں مثلاً: کہ آپ ﷺ نے لا الہ الا اللّٰہ یا جلال ربی الرفیع پڑھا۔

واقدی کی سیر سے مراد اگر واقدی کی مغازی ہے تو اس کا مطبوعہ کلکتہ کا نسخہ جو میرے پیش نظر ہے۔اس میں یہ واقعہ مذکور نہیں اور اگر ہوتا بھی تو واقدی کا اعتبار کیا ہے؟ ابن سبع اور ابن عائذ وغیرہ زمانہ متاخر کے لوگ ہیں اور قدما سے روایت کی نقل میں بے احتیاط ہیں۔کسی قدیم ماخذ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی معلوم نہیں یہ روایتیں انہوں نے کہاں سے لیں۔

㉒ آنحضرت ﷺ کی رضاعت اور شیر خوارگی کے زمانہ کے فضائل اور معجزات

جب آپ ﷺ کو حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر لے جاتی ہیں۔ابن اسحاق، ابن راہویہ، ابویعلی، طبرانی، بیہقی، ابونعیم، ابن عساکر اور ابن سعد میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کا آنا اور آپ کا ان کو دیکھ کر مسکرانا۔حلیمہ رضی اللہ عنہا کے خشک سینوں میں دودھ بھر آنا۔آپ کا صرف ایک طرف کے سینہ سے سیر ہو جانا اور دوسرے طرف کا اپنے رضاعی بھائی کے لئے بنظر انصاف چھوڑ دینا۔آپ کے سوار ہوتے ہی

[1] تاریخ ابن عساکر، ج ۱، ص: ۳۵۴۔ [2] جلد ٦، ص: ۳٤٤۔

حلیمہ رضی اللہ عنہا کی کمزور اور دبلی پتلی گدھی کا تیز رو طاقتور اور فربہ ہو جانا اور حلیمہ رضی اللہ عنہا کے قبیلہ کی قحط زدہ زمین کا سرسبز و شاداب اور ہرا بھرا ہو جانا۔ حلیمہ رضی اللہ عنہا کی بکریوں کا موٹا ہونا۔ اور سب سے زیادہ دودھ دینا۔ آپ ﷺ کا غیر معمولی نشو و نما پانا۔ دو برس کے سن میں آپ کے سینہ کا چاک ہونا۔ حلیمہ رضی اللہ عنہا کا اس واقعہ سے ڈر کر آپ کو آمنہ کے پاس واپس لانا۔ آمنہ کا حلیمہ رضی اللہ عنہا کو تسلی دینا۔ یہ تمام واقعات ان کتابوں میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔

یہ واقعات دو طریقوں سے مروی ہیں ایک طریقہ کا مشترک راوی جہم بن ابی جہم ایک مجہول شخص ہے اور دوسرے کا مشترک راوی واقدی ہے۔ جس کا کوئی اعتبار نہیں۔

پہلے طریقہ سے اس کو ابن اسحاق، ابن راہویہ، ابویعلیٰ، طبرانی اور ابونعیم نے روایت کیا ہے اس کا سلسلہ یہ ہے کہ ابن اسحاق نے کہا کہ مجھ سے جہم بن ابی جہم مولیٰ حارث بن حاطب جمحی نے کہا اور وہ کہتا ہے کہ ''مجھ سے عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے خود بیان کیا یا کسی ایسے شخص نے بیان کیا، جس نے عبداللہ بن جعفر سے سنا اور عبداللہ بن جعفر نے حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا سے سنا۔'' اس روایت میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جہم کا اس روایت کا خود عبداللہ بن جعفر سے سننا یقینی نہیں آتا۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ ''عبداللہ بن جعفر یا کسی نے ان سے سن کر مجھ سے کہا۔'' معلوم نہیں وہ کون تھا؟ اور کیسا تھا؟ ابونعیم وغیرہ متاخرین نے اس روایت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ شک سرے سے نظر انداز ہو گیا ہے۔ اگر بالفرض جہم نے عبداللہ بن جعفر سے سنا تو عبداللہ بن جعفر کا جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں آٹھ نو برس کے تھے اور ۷ھ کے بعد حبش کے ملک سے مدینہ آئے تھے۔ حلیمہ رضی اللہ عنہا سے ملنا اور ان سے نقل روایت کرنا محتاج ثبوت ہے۔ بلکہ علمائے سیر و رجال میں خود حلیمہ رضی اللہ عنہا سے ملنا اور ان کے بعد آپ سے ملاقات میں اختلاف ہے۔ صرف ایک دفعہ غزوۂ ہوازن کے موقع پر ان کا آنا کسی کسی نے بیان کیا ہے۔ مگر اس موقع پر عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کا جو کمسن تھے موجود ہونا اور ان سے ملنا مطلق ثابت نہیں۔ جہم بن ابی جہم جو اس روایت کا سر بنیاد ہے۔ ذہبی نے میزان الاعتدال [1] میں اسی روایت کی تقریب سے اس کا نام لکھ کر لکھا ہے: ''لا یعرف'' یعنی معلوم نہیں یہ کون تھا۔

دوسرا طریقہ وہ ہے جس کا مرکزی راوی واقدی ہے، اس سلسلہ سے ابن سعد، ابونعیم اور ابن عساکر نے اس واقعہ کو لکھا ہے۔ یہ سلسلہ علاوہ ازیں کہ واقدی کے واسطہ سے ہے۔ موقوف بھی ہے۔ یعنی کسی صحابی تک وہ نہیں پہنچتا۔ اس کو واقدی زکریا بن یحییٰ بن یزید سعدی سے اور وہ اپنے باپ یحییٰ بن زید سعدی سے نقل کرتا ہے۔ [2] ابن سعد نے دوسری جگہ (جلد اول صفحہ ۹۷) ایک اور سلسلہ سے اس کو واقدی سے روایت کیا ہے اور واقدی، عبداللہ بن زید بن اسلم سے اور عبداللہ اپنے باپ زید بن اسلم تابعی سے نقل کرتے ہیں، یہ سلسلہ بھی علاوہ ازیں کہ اس کا پہلا راوی وہی واقدی ہے اور روایت بھی موقوف ہے زید مذکور کی نسبت اہل

[1] ج ۱، ص: ۱۹۷۔ [2] ابن سعد، ج ۱، ص: ۶۹۔

مدینہ کلام کرتے تھے اور ان کے بیٹے عبداللہ کو اکثر محدثین نے ضعیف کہا ہے۔ اس لئے یہ سلسلہ بھی استناد کے قابل نہیں ہے۔ ابونعیم نے تیسری روایت میں واقدی کے واسطہ سے ان واقعات کو بے سند لکھا ہے۔

(23) شق صدر یعنی سینہ مبارک کے چاک ہونے کا واقعہ معراج میں پیش آنا مسلم ہے۔ مگر بعض لوگوں نے بچپن کے زمانہ میں بھی اس واقعہ کا پیش آنا بیان کیا ہے۔ بچپن کے وقت کی تعیین میں ان روایتوں میں اختلاف ہے۔ اکثر روایتوں میں یہ ہے کہ حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے پاس قیام کے زمانہ میں یہ پیش آیا۔ جب عمر شریف غالباً صرف چار برس کی تھی۔ ایک دو روایتوں میں ہے کہ اس وقت آپ ﷺ دس برس کے تھے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عہد طفولیت میں شق صدر کی جس قدر روایتیں ہیں۔ صحیح مسلم کی روایت کے علاوہ وہ تمام تر ضعیف ہیں۔ صحیح مسلم کی روایت میں حماد بن سلمہ کی غلطی سے معراج کا واقعہ عہد طفولیت میں بیان ہوگیا ہے۔ اس بارہ میں میں نے اپنی تحقیق شرح صدر کی بحث میں مفصل بیان کی ہے۔ [1]

(24) حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے پاس قیام کے زمانہ میں ایک اور واقعہ بھی راویوں نے بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو دیکھ کر بعض یہودیوں نے یا عرب قیافہ شناسوں نے (روایت میں اختلاف ہے) یہ معلوم کرلیا کہ نبی آخرالزمان ہیں اور یہی ہمارے آبائی کیش اور مذہب کو دنیا سے مٹائیں گے۔ یہ سمجھ کر انہوں نے آپ ﷺ کو خود قتل کرنا چاہا، یا دوسروں کو آپ کے قتل پر آمادہ کرنا چاہا (روایت میں اختلاف ہے) ایک روایت میں ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا۔ جب حلیمہ رضی اللہ عنہا آپ کو پہلے پہل مکہ معظّمہ سے لے کر عکاظ کے میلہ میں آئیں۔ وہاں قبیلہ ہذیل کا ایک قیافہ شناس بڈھا تھا۔ عورتیں اپنے اپنے بچوں کو لے کر اس کے پاس آتی تھیں اور فال نکلواتی تھیں۔ اس کی نظر جب آنحضرت ﷺ پر پڑی تو وہ چلا اٹھا کہ اس کو قتل کر ڈالو مگر آپ لوگوں کی نظر سے غائب ہو چکے تھے۔ حلیمہ رضی اللہ عنہا آپ کو لے کر چل دی تھیں۔ لوگوں نے بڈھے سے واقعہ پوچھا تو اس نے کہا کہ میں نے ابھی وہ بچہ دیکھا جو تمہارے اہل مذہب کو قتل کرے گا اور تمہارے بتوں کو توڑے گا اور وہ کامیاب ہوگا، اس کے بعد لوگوں نے آپ ﷺ کو بہت ڈھونڈا، مگر آپ نہ ملے حضرت حلیمہ نے اس کے بعد آپ کو پھر کسی قیافہ شناس اور فال دیکھنے والے کے سامنے پیش نہ کیا، ایک اور روایت میں ہے کہ اس کے بعد اس بڈھے کی عقل جاتی رہی اور وہ کفر ہی کی حالت میں مر گیا۔ دوسری روایت میں یہ واقعہ اس طرح ہے کہ حضرت آمنہ نے حلیمہ کو کہہ دیا تھا کہ میرے بچے کو یہودیوں سے بچائے رکھنا، اتفاق سے جب وہ آپ کو لے کر چلیں تو کچھ یہودی راستہ میں مل گئے انہوں نے آپ کا حال سن کر ایک دوسرے سے کہا کہ اس کو مار ڈالو پھر انہوں نے دریافت کیا کہ کیا یہ بچہ یتیم ہے؟ حلیمہ نے کہا، نہیں میں اس کی ماں ہوں اور اپنے شوہر کو بتایا کہ وہ اس کا باپ ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ یتیم ہوتا تو ہم اس کو قتل کر ڈالتے (یعنی آخری پیغمبر کی ایک علامت یتیمی بھی تھی اور چونکہ ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ علامت بچہ میں پائی نہیں جاتی اس سے ان کا

[1] اس کے لیے اسی کتاب کے صفحات شرح صدر ملاحظہ ہوں۔

یقین جاتا رہا۔)

یہ روایتیں ابن سعد جلد اول ص ۷۱ و ۹۸ میں ہیں، مگر حالت یہ ہے کہ پہلی روایتوں کا ماخذ واقدی کی داستانیں ہیں اور اس پر بھی ان کے سلسلے ناتمام ہیں۔ آخری راویت کا سلسلہ یہ ہے کہ عمرو بن عاصم کلابی، ہمام بن یحیٰی، اسحاق بن عبداللہ گو یہ تینوں عموماً ثقہ اصحاب ہیں۔ مگر ان کی یہ روایت موقوف ہے، یعنی آخری راوی اسحاق بن عبداللہ گو تابعی ہیں۔ مگر وہ کسی صحابی سے اس کا سننا ظاہر نہیں کرتے۔ معلوم نہیں یہ روایت ان کو کہاں سے پہنچی؟ تقریباً اسی واقعہ کو ابونعیم نے دلائل [1] میں اس طرح بیان کیا ہے کہ حلیمہ جب آپ ﷺ کو مکہ سے لے کر روانہ ہوئیں تو ایک وادی میں پہنچ کر ان کو حبش کے کچھ لوگ ملے۔ جو غالباً عیسائی ہوں گے۔ حلیمہ ان کے ساتھ ہو گئیں۔ انہوں نے جب آنحضرت ﷺ کو دیکھا تو آپ کی نسبت کچھ دریافت کیا۔ اس کے بعد بہت غور سے انہوں نے آپ کو دیکھنا شروع کیا۔ دونوں مونڈھوں کے بیچ میں جو مہر نبوت تھی وہ دیکھی۔ آپ کی آنکھوں میں تھوڑی سرخی تھی اس کو دیکھتے رہے۔ پھر پوچھا کہ کیا بچہ کی آنکھوں میں یہ سرخی کسی بیماری سے ہے؟ حلیمہ رضی اللہ عنہا نے کہا نہیں یہ ہمیشہ سے اسی طرح ہے۔ انہوں نے کہا ''خدا کی قسم! یہ پیغمبر ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے چاہا کہ بچہ کو حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا سے چھین لیں۔ لیکن خدا نے آپ ﷺ کی حفاظت کی۔ ابونعیم کی اس روایت کا سلسلہ نہایت ضعیف اور کمزور ہے، اور اس کے رواۃ مجہول الحال لوگ ہیں۔

(25) کہتے ہیں کہ پیار اور محبت سے حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا آپ کو دھوپ میں نکلنے نہیں دیتی تھیں ایک دن آپ اپنی رضاعی بہن کے ساتھ دھوپ میں نکل پڑے۔ حلیمہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا تو لڑکی پر خفا ہوئیں کہ تم دھوپ میں کیوں لے گئیں۔ لڑکی نے کہا، اماں جان میرے بھائی کو دھوپ نہیں لگتی۔ میں نے دیکھا کہ اس پر بادل سایہ کئے تھے۔ جدھر وہ جاتا تھا وہ بھی چلتے جاتے تھے اور جہاں وہ رک جاتا تھا وہ بھی رک جاتے تھے۔ اس کیفیت سے وہ یہاں تک پہنچا ہے۔ ابن سعد نے دو طریقوں سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ ایک میں تو صرف واقدی کا حوالہ ہے اور اس کے آگے کوئی نام نہیں دیا۔ (ص ۷، جلد اول) اور دوسرے میں ہے کہ واقدی نے معاذ بن محمد سے اور اس نے عطاء سے اور عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سنا (صفحہ ۹۸ جلد اول۔) ابن سعد کے علاوہ ابونعیم، ابن عساکر اور ابن طرماح نے بھی اسی سلسلہ سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے، مگر اس سلسلہ میں واقدی کے علاوہ معاذ بن محمد مجہول اور نامعتبر ہے۔

یہاں تک تو ہم نے فضائل و معجزات کی غلط اور ضعیف روایتوں کی مسلسل تنقید کی ہے۔ اگر اسی طرح ہم آخر تک نبھانا چاہیں تو یہ دفتر ان اوراق میں نہیں سما سکتا۔ اس لئے ہم صرف مشہور ترین روایتوں کی تنقید پر قناعت کرتے ہیں۔

(26) سب سے مشہور بحیرا راہب کا قصہ ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب آپ ﷺ دس بارہ برس کے

---

[1] ص:۱۱۶۔

تھے، تو اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ شام کا سفر کیا۔ راہ میں ایک عیسائی خانقاہ ملی جس میں بحیرا نام ایک راہب رہا کرتا تھا۔ اس نے آپ ﷺ کو دیکھ کر اور علامتوں سے پہچان کر یہ جان لیا کہ پیغمبر آخر الزمان اور سردار عالم یہی ہیں۔ اس نے دیکھا کہ ابر آپ پر سایہ فگن ہے جس درخت کے نیچے آپ بیٹھے ہیں۔ اس کی شاخیں آپ پر جھکی آتی ہیں۔ اس نے آپ کی خاطر قافلہ کی دعوت کی اور ابوطالب سے با اصرار کہا کہ اس بچہ کو مکہ واپس لے جاؤ ورنہ رومی اگر اس کو پہچان گئے تو اس کو قتل کر ڈالیں گے۔ (شاید اس لئے کہ آپ کے ہاتھوں ان کی سلطنت کا خاتمہ ہوگا) ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ رومیوں کا ایک گروہ پہنچ گیا۔ دریافت سے ظاہر ہوا کہ رومیوں کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ پیغمبر آخر الزمان کے ظہور کا وقت آ گیا ہے۔ اس لئے رومیوں نے تحقیق حال کے لئے ہر طرف اپنے دستے روانہ کئے ہیں۔ بحیرا نے ان سے کہا کہ ''خدا کی تقدیر ٹل نہیں سکتی۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم واپس جاؤ'' وہ رک گئے اور ادھر ابوطالب نے آنحضرت ﷺ کو مکہ واپس بھیج دیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو آپ کے ساتھ کر دیا اور بحیرا نے کیک اور ناشتہ آپ کے ساتھ کیا۔

یہ روایت اختصار اور تفصیل کے ساتھ سیرت کی اکثر کتابوں میں اور بعض حدیثوں میں بھی مذکور ہے۔ مگر ابن اسحاق اور ابن سعد وغیرہ کتب سیر میں اس کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں، ان سب کے سلسلے کمزور اور ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اس قصہ کا سب سے محفوظ طریقہ سند وہ ہے جس میں عبدالرحمٰن بن غزوان جو ابونوح قراد کے نام سے مشہور ہے۔ یونس بن اسحاق سے اور وہ ابوبکر بن ابی موسیٰ سے اور وہ اپنے باپ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے اس کی روایت کرتے ہیں۔

یہ قصہ اس سلسلہ سند کے ساتھ جامع ترمذی، مستدرک حاکم، مصنف ابن ابی شیبہ، دلائل بیہقی اور دلائل ابی نعیم میں مذکور ہے۔ ترمذی نے اس کو ''حسن وغریب'' اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔ استاذ مرحوم نے سیرت کی پہلی جلد (طبع اول ص ۱۳۰) وطبع دوم ص ۱۶۸) [1] میں اس روایت پر پوری تنقید کی ہے اور عبدالرحمٰن بن غزوان کو اس سلسلہ میں مجروح قرار دیا ہے اور حافظ ذہبی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ اس روایت کو موضوع سمجھتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلہ سند میں نہ صرف عبدالرحمٰن بن غزوان بلکہ دوسرے رواۃ بھی جرح کے قابل ہیں۔

(۱) سب سے اول یہ کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ مسلمان ہو کر ۷ھ میں یمن سے مدینہ آئے تھے اور یہ واقعہ اس سے ۵۰ برس پہلے کا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نہ تو خود آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے اور نہ کسی اور شریک واقعہ کی زبان سے اپنا سننا بیان کرتے ہیں۔ اس لئے یہ روایت مرسل ہے۔

(۲) اس واقعہ کو حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے ان کے صاحبزادے ابوبکر روایت کرتے ہیں۔ مگر ان کی نسبت کلام ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے کوئی روایت سنی بھی ہے یا نہیں، چنانچہ ناقدین فن کو اس باب میں بہت

[1] طبع ہذا، ج ۱، ص: ۱۴۱۔

کچھ شک ہے۔امام ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے تو اس سے قطعی انکار کیا ہے۔ ❶ بنا بریں یہ روایت منقطع ہے۔اس کے سوا ابن سعد نے لکھا ہے کہ ''وہ ضعیف سمجھے جاتے ہیں۔''

(۳) ابوبکر سے یونس بن اسحاق اس واقعہ کو نقل کرتے ہیں۔گو متعدد محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، تاہم عام فیصلہ یہ ہے کہ وہ ضعیف ہیں۔ ❷ یحییٰ کہتے ہیں کہ ''ان میں سخت بے پروائی تھی۔'' شعبہ نے ان پر تدلیس کا الزام قائم کیا ہے۔امام احمد اُن کی اپنے باپ سے روایت کو ضعیف اور ان کی عام روایتوں کو مضطرب اور ''ایسی ویسی'' کہتے ہیں، ابوحاتم کی رائے ہے کہ وہ راست گو ہیں۔لیکن ان کی اپنے باپ سے حدیث حجت نہیں۔ساجی کا قول ہے کہ ''وہ سچے ہیں اور بعض محدثین نے ان کو ضعیف کہا ہے'' ابو حاکم کا بیان ہے کہ اکثر ان کو اپنی روایتوں میں وہم ہو جاتا تھا۔

(۴) چوتھا راوی عبدالرحمٰن بن غزوان ہے، جس کا نام مستدرک اور ابونعیم میں ابونوح قراد ہے۔اس کو اگرچہ بہت سے لوگوں نے ثقہ کہا ہے۔تاہم وہ متعدد منکر روایتوں کا راوی ہے۔ممالیک والی جھوٹی حدیث اسی نے روایت کی ہے۔ابواحمد حاکم کا بیان ہے کہ اس نے امام لیث سے ایک منکر روایت نقل کی ہے۔ابن حبان نے لکھا ہے کہ ''وہ غلطیاں کرتا تھا اور امام لیث اور مالک سے ممالیک والی حدیث نقل کرنے کی وجہ سے اس کی طرف سے دل میں خلجان ہے۔'' ❸

(۵) حافظ ذہبی میزان میں لکھتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن غزوان کی منکر روایتوں میں سب سے زیادہ منکر بحیرا راہب کا قصہ ہے۔اس قصے کے غلط ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس میں یہ ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بلال رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کے ساتھ کر دیا۔حالانکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس وقت بچہ تھے حضرت بلال رضی اللہ عنہ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

(۶) حاکم نے مستدرک میں اس واقعہ کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ بخاری و مسلم کی شرط کے مطابق ہے۔حافظ ذہبی مستدرک کی تلخیص میں اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ میں اس روایت کو بنایا ہوا خیال کرتا ہوں۔کیونکہ اس میں بعض واقعات غلط ہیں۔ ❹

(۷) امام بیہقی اس کی صحت کو صرف اسی قدر تسلیم کرتے ہیں کہ ''یہ قصہ اہل سیر میں مشہور ہے'' حافظ سیوطی نے خصائص میں امام موصوف کے اس فقرہ سے یہ سمجھا ہے کہ وہ بھی اس کے ضعف کے قائل ہیں۔اس لئے اصل روایت میں ابن سعد وغیرہ سے چند اور سلسلے نقل کیے ہیں، ❺ مگر ان میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔

(27) اسی قسم کا ایک اور واقعہ دوسری دفعہ کے سفر شام میں جب آپ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال تجارت لے کر بصریٰ تک تشریف لے گئے تھے، بیان کیا جاتا ہے آپ کے ساتھ اس سفر میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا غلام میسرہ بھی تھا۔اس کی زبانی روایت ہے کہ ہر جگہ ابر آپ پر سایہ افگن رہتا، کبھی فرشتے اپنے پروں کا سایہ کرتے

---

❶ تهذيب التهذيب، ج١٢، ص: ٤١۔ ❷ ايضًا، ج١١، ص: ٤٣٤۔ ❸ ايضا، ج٦، ص: ٢٢٨۔
❹ مستدرك، ج٢، ص: ٦١٥۔ ❺ خصائص، ج١، ص: ٨٤۔

تھے۔ایک عیسائی خانقاہ کے قریب جہاں نسطورا راہب رہتا تھا۔آپ ﷺ نے ایک درخت کے نیچے آرام کیا۔راہب نے یہ دیکھا تو میسرہ سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے؟ اس نے نام ونشان بتایا۔راہب نے کہا کہ اس درخت کے نیچے پیغمبر کے سوا اور کوئی نہیں ٹھہرا ہے۔پھر دریافت کیا کہ ان کی آنکھوں میں ہمیشہ یہ سرخی رہتی ہے۔،غلام نے اثبات میں جواب دیا۔راہب نے کہا ''تو یہ یقیناً آخر زمانہ کا پیغمبر ہے۔تم کبھی اس کی رفاقت نہ چھوڑنا۔'' اسی درمیان میں ایک شخص سے خرید وفروخت میں کوئی جھگڑا پیش آیا۔خریدار نے آپ ﷺ سے کہا کہ تم لات وعزیٰ کی قسم کھاؤ۔آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''میں کبھی ان کی قسم نہیں کھاتا۔'' راہب نے میسرہ سے کہا، خدا کی قسم یہ پیغمبر ہے۔اس کی صفتیں ہماری کتابوں میں لکھی ہیں۔میسرہ کا بیان ہے کہ جب دوپہر کی سخت دھوپ پڑتی تو دو فرشتے آپ پر سایہ کر لیتے، جب آپ تجارت سے فارغ ہو کر مکہ آ رہے تھے۔اتفاق سے اس وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا چند سہیلیوں کے ساتھ چھت پر تھیں۔حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی نظر آپ ﷺ پر پڑی کہ آپ اُونٹ پر سوار ہیں اور دو فرشتے آپ پر سایہ افگن ہیں۔انہوں نے یہ منظر اپنی سہیلیوں کو دکھایا اور میسرہ سے اس کا تذکرہ کیا۔میسرہ نے کہا، پورے سفر میں یہی تماشا دیکھتا آیا ہوں اور اس کے بعد اس نے نسطورا راہب کی گفتگو بھی ان سے دہرائی۔

یہ واقعہ ابن اسحاق، ابن سعد، ابونعیم اور ابن عساکر [1] میں ہے۔ابن اسحاق میں اس روایت کی کوئی سند نہیں ہے۔بقیہ کتابوں میں اس کی سند یہ ہے کہ ان کتابوں کے مصنفین واقدی سے اور واقدی موسیٰ بن شیبہ سے اور وہ عمیرہ بنت عبداللہ بن کعب سے اور عمیرہ ام سعد بنت کعب سے اور وہ یعلیٰ بن منیہ رضی اللہ عنہ صحابی کی بہن نفیسہ بنت منیہ سے جو صحابیہ تھیں، روایت کرتے ہیں۔واقدی کی بے اعتباری تو محتاج بیان نہیں۔اس کے علاوہ موسیٰ بن شیبہ کی نسبت امام ابن حنبل کہتے ہیں: احادیثہ مناکیر۔ [2] اس کی حدیثیں منکر ہیں۔عمیرہ بنت ابن کعب اور ام سعد کا حال معلوم نہیں۔

(28) ابن سعد [3] ابن اسحاق، بیہقی اور ابونعیم [4] میں ہے کہ ''قریش نے جب بنو ہاشم کا مقاطعہ کر کے شعب ابی طالب میں محصور کیا اور باہم ایک معاہدہ مرتب کر کے خانہ کعبہ میں رکھ دیا، تو چند سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے دیمک کو بھیجا، جس نے کاغذ کو کھا لیا۔ایک روایت میں ہے کہ خدا کا نام چھوڑ کر باقی عبارت کو جس میں بنو ہاشم کے مقاطعہ کا عہد تھا۔اس نے کھا لیا تھا اور دوسری روایت میں ہے کہ خدا کا نام کھا لیا تھا اور بقیہ عبارت چھوڑ دی تھی۔پھر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو اس واقعہ سے مطلع فرمایا۔آنحضرت ﷺ نے ابوطالب سے اس کا ذکر کیا۔ابوطالب نے قریش کو اس کی خبر کی اور بالآخر اس واقعہ کو جھوٹ اور سچ ہونے پر معاہدہ باقی رہنے یا ٹوٹ جانے کا فیصلہ قرار پایا۔کفار نے جب کاغذ کو اتار کر دیکھا تو آنحضرت ﷺ کے

[1] طبقات جزء اوّل، ص:۸۳؛ دلائل النبوۃ، ص۱۳۳؛ خصائص الکبریٰ، ج۱، ص:۹۱۔
[2] تہذیب التہذیب، ج۱، ص: ۳۴۹۔ [3] طبقات جزء اول، ص:۱۴۰۔
[4] دلائل النبوۃ، ص:۲۲۸، ۲۲۹۔

قول کی تصدیق ہوگئی۔

ابن اسحاق کی روایت بے سند ہے بقیہ تمام روایتیں یا واقدی اور ابن لہیعہ سے ہیں، جن کا اعتبار نہیں اور یا ثقات سے ہیں، تو وہ تمام تر مرسل ہیں۔ ان مرسل روایتوں میں اگر کوئی بہتر روایت ہے۔ تو وہ بیہقی میں موسیٰ بن عقبہ کی ہے۔ جو امام زہری سے اس کو روایت کرتے ہیں، مگر وہ زہری تک پہنچ کر رہ جاتی ہے، کسی صحابی تک نہیں پہنچتی۔

㉙ مشہور ہے کہ ہجرت میں جب آپ ﷺ نے غار ثور میں پناہ لی۔ تو خدا کے حکم سے فوراً غار کے منہ پر بنولے یا ببول کا درخت اگ آیا۔ جس کی ڈالیاں پھیل کر چھا گئیں۔ کبوتر کے ایک جوڑے نے آ کر وہاں انڈے دے دیئے اور مکڑی نے جالے تن دیئے، تا کہ مشرکین کو آنحضرت ﷺ کے اس کے اندر ہونے کا گمان نہ ہو۔ درخت کے اُگنے، کبوتر کے انڈے دینے، مکڑی کے جالا تننے ان تینوں کا ذکر صرف ابومصعب مکی کی روایت میں ہے۔ بقیہ روایتوں میں صرف کبوتروں کے انڈے دینے اور مکڑی کے جالا تننے کا بیان ہے۔ بہرحال یہ واقعہ کتب سیر میں ابن اسحاق، ابن سعد، ❶ دلائل بیہقی اور ابونعیم ❷ میں اور کتب حدیث میں سے ابن مردویہ اور بزار میں ہے۔ ابن مردویہ بزار اور بیہقی میں جو روایت ہے۔ نیز ابن سعد اور ابونعیم کی ایک روایت ابومصعب مکی سے ہے۔ جو متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس واقعہ کا سننا ظاہر کرتا ہے۔ ابومصعب سے عون بن عمرو القیسی اس کی روایت کرتا ہے۔ لیکن یہ دونوں صاحب پایہ اعتبار سے گرے ہوئے ہیں۔ ابومصعب مکی مجہول ہے اور عون بن عمرو کی نسبت ابن معین کہتے ہیں کہ ''وہ کچھ نہیں۔'' امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''وہ منکر الحدیث اور مجہول ہے۔'' ابونعیم میں عون بن عمرو کے بجائے عوین ابن عمرو القیسی لکھا ہے۔ یہ عوین بن عمرو بھی بے اعتبار ہے۔ عقیلی نے اس کا ضعفاء میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کی روایتوں کی تصدیق نہیں ہوتی اور اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ ابومصعب مجہول ہے۔ ❸

استاذ مرحوم نے سیرت نبوی جلد اول واقعہ ہجرت میں صرف ابومصعب کی روایت پر تنقید کی ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ابومصعب کے علاوہ اور دوسرے سلسلوں سے بھی یہ مروی ہے۔ چنانچہ ابن سعد نے ایک اور طریقہ سے اس واقعہ کی روایت کی ہے۔ مگر اس روایت کا ہر سلسلہ واقدی ہے۔ جس نے متعدد روایتوں کو یکجا کر کے ان کی ایک مشترک روایت ہجرت تیار کی ہے۔ اس واقعہ کی بہترین روایت وہ ہے جو مسند ابن حنبل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

فمروا بالغار فرأ وا على بابه نسج العنكبوت فقالوا لو دخل ههنا لم يكن

❶ طبقات، جز اوّل، ص:۱۵٤۔ ❷ دلائل النبوة، ص:۲۷۰۔

❸ دیکھو لسان المیزان ترجمة ابی مصعب مکی، ج٦، ص:٤٣٧ وعون بن عمرو، ج٤، ص:۳۸۸ اور میزان الاعتدال ترجمة عون بن عمرو، ج۲، ص:۳۰۹ اور عوین بن عمرو۔

نسج العنکبوت علی بابہ۔ ❶

''کفار آپ ﷺ کی تلاش میں غار کے منہ تک پہنچ گئے۔ دیکھا کہ منہ پر مکڑی کے جال ہیں، تو انہوں نے کہا کہ اگر محمد (ﷺ) اس کے اندر جاتے تو یہ جال نہ ہوتے۔''

لیکن ان الفاظ سے اس واقعہ کا غیر معمولی ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔ البتہ اس روایت کی بنا پر اس کو تائیدات میں جگہ دی جاسکتی ہے، تاہم یہ روایت بھی قوی نہیں، اس کے راوی مقسم ہیں۔ جو اپنے کو مولی ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں اور ان سے عثمان الجزری نام ایک شخص روایت کرتا ہے۔ مقسم کی اگرچہ متعدد محدثین نے توثیق کی ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح میں ان سے حجامت کی روایت نقل کی ہے۔ مگر وہ خود کتاب الضعفاء میں ان کو ضعیف کہتے ہیں۔ ابن سعد نے بھی ان کو ضعیف کہا ہے۔ ساجی نے لکھا ہے کہ ''لوگوں نے ان کی روایات میں کلام کیا ہے۔'' ابن حزم نے لکھا ہے کہ ''وہ قوی نہیں'' ❷ اور عثمان الجزری جو عثمان بن عمرو ساج الجزری ہے اور کہیں عثمان بن ساج کے نام سے مشہور ہے۔ گو ابن حبان نے اپنے مشہور تساہل کی بنا پر اس کو ثقات میں داخل کیا ہے۔ مگر محدث ابوحاتم کہتے ہیں کہ اس کی حدیث لکھی جائے۔ حجت میں پیش نہ کی جائے۔ علامہ ذہبی نے میزان ❸ میں اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لسان ❹ میں صرف ابوحاتم کا قول نقل کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نسبت محدثین کا آخری فیصلہ یہی ہے۔

30 روایتوں میں ہے کہ اسی سفر میں راہ میں ایک جگہ بکریوں کے ایک چرواہے سے آپ ﷺ نے دودھ طلب کیا۔ اس نے معذرت کی کہ کوئی دودھ والی بکری نہیں۔ لیکن آپ نے اس کی اجازت سے ایک دودھ والی بکری کے تھن میں ہاتھ لگایا فوراً دودھ نکل آیا۔ چنانچہ سب نے دودھ پیا۔ چرواہا یہ دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔ ❺

ایک روایت میں ہے کہ یہ چرواہا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ ❻ لیکن عام معجزات کے تحت میں ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا واقعہ زمانہ ہجرت کا نہیں بلکہ وہ کسی اور زمانہ کا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا واقعہ مسند طیالسی ❼ اور مسند احمد ❽ میں خود حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زبانی صحیح روایات کے ساتھ مذکور ہے۔ مسند ابویعلیٰ، متدرک حاکم اور طبرانی میں بجائے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے صرف ''عبد'' یعنی ایک غلام کا ذکر ہے۔ جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔ صحابہ میں سے اس کے راوی قیس بن نعمان رضی اللہ عنہ سکونی ہیں۔ یہ صرف ایک دفعہ ایک وفد کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور ان سے صرف یہی ایک روایت مروی ہے۔ بعضوں نے ان سے ایک اور روایت ہدیہ کی بھی نقل کی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ شریک واقعہ نہ تھے۔ انہوں نے یہ واقعہ کس سے سنا؟ معلوم نہیں، اس لئے یہ

---

❶ مسند أحمد، ج ١، ص: ٣٤٨۔ ❷ تهذیب، ج ١٠، ص: ٢٨٩۔ ❸ ج ٢، ص: ١٨٧۔

❹ ج ٤، ص: ١٤٩۔ ❺ مستدرك حاكم، ج ٣، ص: ٨، ٩؛ خصائص، ج ١، ص: ١٨٩۔

❻ دلائل النبوة ابی نعیم، ص: ٢٣٧۔ ❼ جزء ثانی، ص: ٤٧۔ ❽ أحمد، ج ١، ص: ٣٧٩۔

روایت مرسل ہے۔اس کے بعد ایک راوی عبید اللہ بن ایاد بن لقیط کی گو اوروں نے توثیق کی ہے۔مگر بزار نے لکھا ہے کہ وہ قوی نہیں، تاہم ذہبی نے تلخیص مستدرک [1] میں اور حافظ ابن حجر نے اصابہ (ترجمہ قیس بن نعمان سکونی رضی اللہ عنہ) [2] میں اس کو صحیح کہا ہے۔مگر یہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو واقعہ ہجرت کی مفصل روایت صحیحین میں ہے، اس میں ایک غلام کے بکری کے دودھ پلانے کا واقعہ مذکور ہے مگر اس معجزہ کا وہاں نام ونشان بھی نہیں۔

ہجرت کے موقع پر بے دودھ والی بکری کے تھنوں میں دودھ پیدا ہو جانے کا مشہور ترین معجزہ اُم معبد کے خیمہ کا ہے کہتے ہیں مکہ اور مدینہ کی راہ میں قبیلہ خزاعہ کے ایک خاندان کا میدان میں خیمہ تھا۔ام معبد اور ابومعبد دونوں میاں بیوی اس خیمہ میں رہتے تھے اور مسافروں کو آرام پہنچایا کرتے تھے۔بکریوں کی پرورش پر ان کا گزارہ تھا۔صبح کو ابومعبد تمام اچھی اور دودھ والی بکریاں لے کر چراگاہ کو نکل گیا تھا۔صرف بے دودھ والی دبلی بکریاں خیمہ میں رہ گئی تھیں۔اتنے میں آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ادھر سے گزر ہوا کھانے پینے کی کچھ چیزیں آپ نے بقیمت طلب کیں جو نہیں ملیں۔خیمہ کے ایک گوشہ میں ایک بکری نظر آئی۔آپ نے پوچھا کہ ام معبد یہ بکری کیسی ہے؟ اس نے کہا یہ لاغری سے بکریوں کے ساتھ نہ جا سکی۔پھر فرمایا کہ اس کے کچھ دودھ ہے؟ جواب دیا یہ دودھ سے معذور ہے۔راوی کا بیان ہے کہ امسال خشک سالی تھی اور لوگ قحط میں مبتلا تھے۔فرمایا کہ مجھے اس کے دوہنے کی اجازت ہے؟ عرض کی میرے ماں باپ قربان اگر اس کے دودھ ہو تو دوھ لیجئے۔آپ نے دعا فرمائی اور پھر بسم اللہ کہہ کر تھن میں ہاتھ لگایا۔فوراً اس کے تھنوں میں دودھ اتر آیا۔دودھ سب نے پی لیا اور کچھ بچ گیا اور قافلہ نبوی ﷺ آگے روانہ ہوا کچھ دیر کے بعد ابومعبد آیا دیکھا کہ گھر میں دودھ رکھا ہے تعجب سے پوچھا یہ دودھ کہاں سے آیا؟ بکریاں تو سب میرے ساتھ تھیں۔ام معبد نے سارا قصہ بیان کیا۔ابومعبد نے کہا کہ ذرا اس شخص کی صورت وشکل تو بیان کرو۔ام معبد نے نہایت تفصیل سے آپ کے حسن و جمال اور شکل وشمائل کی تصویر کھینچی، جس کو سن کر ابومعبد نے کہا یہ تو خدا کی قسم قریش والا آدمی معلوم ہوتا ہے، جس کا کچھ حال میں سن چکا ہوں۔میری آرزو ہے کہ مجھے اس کی صحبت میسر ہوتی اور جب انشاء اللہ موقع مل گیا میں یہ کروں گا۔اسی وقت مکہ میں کچھ اشعار غیب سے سنے گئے یہ اشعار بھی روایت میں ہیں۔ان اشعار میں ام معبد کے اس واقعہ کا بیان ہے۔حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے جب ہاتف کی یہ آواز سنی تو ان اشعار کے جواب میں یہ اشعار کہے (یہ جوابی اشعار بھی روایت میں مذکور ہیں)

یہ روایت بغوی، ابن شاہین، ابن سکن، ابن مندہ، طبرانی، بیہقی، ابونعیم [3] اور حاکم [4] میں ام معبد کے

---

[1] مستدرك حاكم، ج ٣، ص: ٨، ٩۔ [2] ج ٣، ص: ٢٦١۔ [3] دلائل النبوة، ص: ٢٨٢ تا ٢٨٤؛ ابن سعد، جزء اوّل، ص: ١٥٥ تا ١٥٧؛ خصائص، ج ١، ص: ١٨٨۔ [4] مستدرك، ج ٣، ص: ٩، ١٠۔

بھائی حبیش بن خالد کی زبانی مذکور ہے اور حاکم نے نہ صرف یہ کہ اس کو صحیح کہا ہے، بلکہ اور دیگر طریقوں سے بھی اس کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر معلوم ہے کہ حاکم کے صحیح کہنے کی علما کی نگاہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے تصریح کر دی ہے کہ ''ان میں سے کوئی طریقہ سند صحیح کے شرائط کے مطابق نہیں۔'' حافظ ذہبی نے مجملاً اسی قدر لکھا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت حاکم کے علاوہ اور کتابوں میں بھی اسی سلسلہ سے مذکور ہے اور وہ یہ ہے کہ حزام اپنے باپ ہشام سے اور ہشام اپنے باپ حبیش بن خالد خزاعی سے ناقل ہیں۔ حزام مجہول ہیں۔ حبیش بن خالد سے صرف یہی ایک روایت تمام کتب حدیث میں مذکور ہے۔ حبیش اصل واقعہ کے وقت موجود نہ تھے۔ معلوم نہیں انہوں نے کس سے سنا۔ اس لئے یہ روایت اگر ثابت بھی ہو تو مرسل ہے۔ حاکم نے دو طریقوں سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ ایک انہی حزام اور ہشام بن حبیش کے ذریعہ سے اور دوسرے حر بن صباح سے اور وہ ام معبد کے شوہر ابو معبد سے راوی ہیں۔ پہلے طریقہ میں حاکم نے یہ کمال کیا ہے کہ حبیش کے بجائے خود ہشام بن حبیش بن خویلد (بجائے خالد) کو اصل راوی اور صحابی قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طریق سے روایت کا ارسال اور بڑھ گیا ہے۔ ہشام کا صحابی ہونا بھی مشکوک ہے۔ دوسرے طریقہ میں حر بن صباح گو ثقہ ہیں۔ مگر ابو معبد سے ان کی سماعت ثابت نہیں۔ چنانچہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے تہذیب [1] میں لکھا ہے کہ حر ابو معبد سے مرسل روایتیں کرتے ہیں۔ یہ تو ان تمام روایتوں کے اوپر کے راویوں کا حال ہے۔ نیچے کے راویوں میں اکثر مجہول لوگ ہیں۔ حر والی روایت میں نیچے ایک شخص بشر بن محمد سکری ہے۔ جس کو ازدی نے منکر الحدیث اور ابن عدی نے واہی کہا ہے [2] ابو نعیم نے دلائل میں ایک اور صحابی سلیط ابو سلیمان رضی اللہ عنہ انصاری بدری سے اس کی روایت کی ہے۔ سلیط سے ان کے بیٹے سلیمان اور ان سے ان کے بیٹے محمد بن سلیمان بن سلیط انصاری روایت کرتے ہیں۔ لیکن ان سلیط کا نام صرف اسی روایت کے راوی کی حیثیت سے بعض مؤلفین سیر صحابہ نے کیا ہے۔ ورنہ ان کا کوئی حال ہم کو معلوم نہیں۔ سلیط انصاری بدری رضی اللہ عنہ جو مشہور ہیں۔ وہ سلیط بن قیس انصاری خزرجی بدری ہیں۔ ان کے بیٹے کا نام عبداللہ تھا جن سے گو نسل چلی نہیں۔ لیکن ان سے روایت نسائی میں موجود ہے۔ مگر سلیط ابو سلیمان انصاری رضی اللہ عنہ بدری سے کوئی روایت اس کے سوا موجود نہیں۔ اسی لئے اسماء و رجال صحابہ کے مؤلفین میں سے بعض نے ان کو اور سلیط بن قیس رضی اللہ عنہ انصاری بدری کو ایک سمجھا ہے اگر ایسا ہے تو سلیمان ان کے بیٹے اور محمد ان کے پوتے کا نام نہ تھا اور اگر دو ہیں تو اصحاب بدر کے نام سب گنے ہوئے ہیں۔ ان میں سلیط بن قیس رضی اللہ عنہ خزرجی کے سوا کوئی دوسرا سلیط نام نہیں۔ پھر یہ مدینہ کے باشندہ تھے اور ام معبد قبیلہ خزاعہ کی تھی جو مکہ اور مدینہ کے بیچ میں آباد تھا، معلوم نہیں کہ سلیط انصاری نے کس سے سنا؟ پھر ان کے بیٹے سلیمان اور پوتے محمد سے ہم کو کوئی واقفیت نہیں۔ حافظ ابن حجر

[1] ج ۲، ص: ۲۲۱۔ [2] لسان المیزان، ترجمة بشر بن محمد السکری، ج ۲، ص: ۳۲، سابقہ ایڈیشنوں میں 'بشر بن محمد' کے بجائے 'محمد بن بشر' چھپ گیا ہے، ناظرین تصحیح کر لیں ''ض''

لسان المیز ان میں محمد بن سلیمان بن سلیط انصاری کے تحت میں لکھتے ہیں:

قال العقیلی مجهول بالنقل روی عن ابیه عن جده فذکر قصة ام معبد......
وهو واهٍ وقال لیس هذا الطریق محفوظا فی حدیث ام معبد .... قال ابن
منده مجهول۔ [1]

علاوہ ازیں ان روایتوں کے الفاظ ام معبد اور آنحضرت ﷺ کے باہم طرز تخاطب اور اشعار کی زبان اور ابومعبد کی گفتگو میں ایک خاص غرابت ہے۔جس کو ناقدین حدیث اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہاتف غیب نے تو اشعار مکہ میں لوگوں کو سنائے اور حسان رضی اللہ عنہ نے جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔مدینہ میں بیٹھے بیٹھے ان کا جواب کہا۔ہجرت کے سال میں مکہ کے آس پاس قحط کا پڑنا اور خشک سالی ہونا بھی ثابت نہیں۔

مجھے ہجرت کے موقع پر ان دودھ والی روایتوں کے تسلیم کرنے میں اس لئے بھی پس وپیش ہے کہ ہجرت کے رفیق سفر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے واقعات ہجرت کی جو روایت صحیح بخاری میں مذکور ہے،اس میں ایک جگہ ایک چرواہے سے دودھ مانگ کر پینے کا ذکر موجود ہے۔مگر اس معجزہ کا مطلق ذکر نہیں ہے۔چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ قصہ ان الفاظ میں مذکور ہے۔''دفعتہً ایک چرواہا نظر آیا۔جو اپنی بکریوں کو ہانکے لئے جارہا تھا۔میں نے اس سے پوچھا تم کس کے غلام ہو؟ اس نے قریش کے ایک آدمی کا نام لیا۔جس کو میں جانتا تھا۔پھر میں نے کہا تمہاری بکریوں کے دودھ ہے؟ اس نے کہا ''ہاں'' میں نے کہا ''اپنے ہاتھ اور بکری کے تھن جھاڑ کر پیالہ میں دودھ تو دوہو'' اس نے دوہا تو میں آنحضرت ﷺ کیلئے ایک برتن میں رکھ کر اور تھوڑا پانی ملا کر کہ دودھ ٹھنڈا ہو جائے۔آپ ﷺ کے پاس لایا آپ نے نوش فرمایا۔'' [2]

مدینہ پہنچ کر مسلمانوں کی ایک اجتماعی زندگی شروع ہوگئی تھی اور خلوت وجلوت میں ہر موقع پر جان نثاروں کا ہجوم رہتا تھا۔اس لئے آپ ﷺ کے واقعات وسوانح کا ایک ایک حرف پہلے سے زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔اس بنا پر اس زمانہ کے دلائل ومعجزات زیادہ محفوظ طریقہ سے احادیث میں مذکور ہیں اور اس عہد کے متعلق جو غلط اور مشتبہ روایات بعد کو پیدا ہوئی ہیں۔محدثین نے موضوعات میں اعلانیہ ان کی پردہ دری کر دی ہے۔ [3] اس لئے فن موضوعات پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں،ان میں ان کی تفصیل موجود ہے۔مثلاً:

① وہ تمام روایتیں جن میں آنحضرت ﷺ کے معجزہ سے حضرت آمنہ یا کسی اور مردہ کے زندہ ہونے کا

---

[1] لسان المیزان،ج۵،ص:۱۹۰۔ [2] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الی المدینة: ۳۹۱۷۔ [3] علامہ زرقانی نے شرح مواہب لدنیۃ کی پانچویں جلد میں ان روایتوں کو مع تنقید کے جمع کر دیا ہے۔

بیان ہے وہ سب جھوٹی اور بنائی ہوئی ہیں۔

② وہ معجزے جن میں گدھے، اونٹ، بکری، ہرن، گوہ، بھیڑیے، شیر وغیرہ جانوروں کے انسانوں کی طرح بولنے یا کلمہ پڑھنے کا ذکر ہے۔ بروایت صحیحہ ثابت نہیں ہیں۔ ❶

③ ایسی روایتیں جن میں آنحضرت ﷺ کے لئے آسمان سے خوان نعمت یا جنت سے میووں کے آنے کا ذکر ہے۔ موضوع ہیں یا ضعیف ہیں۔ ❷

④ وہ روایتیں جن میں حضرت خضر یا الیاس علیہ السلام سے ملنے یا ان کے سلام و پیام بھیجنے کا بیان ہے صحت سے خالی ہیں۔

⑤ عوام میں مشہور ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سایہ نہ تھا۔ لیکن یہ کسی روایت سے ثابت نہیں ہے۔

⑥ روایت ہے کہ آپ ﷺ قضائے حاجت سے واپس آتے تھے تو وہاں کوئی نجاست باقی نہیں رہتی تھی۔ یہ سرتاپا موضوع ہے۔

⑦ واعظوں میں مشہور ہے کہ ابوجہل کی فرمائش سے اس کے ہاتھ کی کنکریاں آنحضرت ﷺ کے معجزہ سے کلمہ پڑھنے لگیں لیکن، یہ ثابت نہیں۔

⑧ وہ تمام حکایات جن سے ہماری زبان میں کتب وفات نامہ اور ہرنی نامہ ترتیب پائی ہیں، تمام تر جھوٹی ہیں۔

⑨ ایک روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زانو پر سر رکھ کر آرام فرمارہے تھے۔ آفتاب ڈوب رہا تھا اور نماز عصر کا وقت ختم ہو رہا تھا، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ادباً آپ کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ جب آفتاب ڈوب گیا تو دفعتہً آپ بیدار ہوئے اور دریافت فرمایا کہ تم نے نماز پڑھی؟ عرض کی نہیں۔ آپ نے دعا کی، فوراً آفتاب لوٹ کر نکل آیا، یہ روایت بھی صحیح طریقہ سے ثابت نہیں ہے۔ ❸

---

❶ یعنی ضعیف روایتوں میں گویا آیا ہے، لیکن ان کو صحیح کا درجہ حاصل نہیں، ان روایتوں میں سے ایک بھیڑیئے کے بولنے کا قصہ زیادہ مشہور ہے، جو دلائل بیہقی؛ مسند احمد، (ج ۲، ص: ۳۰۶، عن ابی هريرة، ج ۳، ص: ۸۳، ۸٤، عن ابی سعيد الخدری) حاکم، ج ۴، ص: ۴۶۷ اور ترمذی میں بطریق متعددہ مذکور ہے جن میں سب سے قوی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے اور ذہبی نے بشرط مسلم کہا ہے، (مستدرك ٤، ص: ٤٦٧) لیکن امام بخاری نے کہا ہے کہ اس کی سند قوی نہیں (زرقانی علی المواهب، جلد ٥، ص: ١٩٣)۔ ❷ اس قسم کی ایک روایت مسند احمد، ج ٤، ص: ١٠٤)؛ دارمی: ٥٥؛ نسائی، حاکم، بزار، ابو یعلیٰ اور طبرانی میں سلمہ بن نفیل سکونی سے مروی ہے، حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے، لیکن ذہبی نے اس کے استدراک میں اس کی سند کو صحیح کہا ہے، لیکن غرائب صحاح میں قرار دیا ہے، (مستدرك حاكم، ج ٤، ص: ٤٤٧، ٤٤٨ وخصائص کبریٰ سیوطی، ج ٢، ص: ٥٦ حیدرآباد)۔ ❸ گو بعض علمائے اہل سنت مثلاً: قاضی عیاض، ابوحفص طحاوی اور عام علمائے روافض نے اس روایت کے ضعف کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، مگر عام ائمہ رجال کا رجحان اس روایت کے موضوع یا کم از کم ضعیف ہونے کی طرف ہے، ابن جوزی نے موضوعات میں شمار کیا ہے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ہمارے استاذ حافظ مزی اور امام ذہبی نے بھی اس کے موضوع ہونے کی تصریح کی ہے۔ (البداية والنهاية، ج ٦، ص: ٢٨٢)

⑩ ایک روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کا چہرۂ مبارک اس قدر روشن تھا کہ اندھیرے میں آپ ﷺ جاتے تھے تو اجالا ہو جاتا۔ چنانچہ ایک دفعہ رات کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ سے سوئی گر گئی۔ تلاش کی نہیں ملی۔ دفعتہً آپ تشریف لے آئے، تو چہرہ مبارک کی روشنی میں سوئی چمک اٹھی اور مل گئی یہ بالکل جھوٹ ہے۔

گو ان میں سے بعض روایتوں کو اہلِ سیر اور مصنفین نے فضائل نبوی ﷺ میں اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ مگر اس سے ان کی صحت ثابت نہیں ہوتی اور اگر ان میں کوئی روایت سنداً صحیح ثابت ہو جائے تو اس خاکسار ہیچمدان کو اس کے قبول میں کوئی عذر نہیں۔ ﴿ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ﴾ (۱۲/ یوسف:۷٦) ان روایتوں کی تنقید سے غرض نعوذ باللہ فضائل نبوی ﷺ میں کلام نہیں ہے۔ بلکہ یہ اعتقاد ہے کہ حضور انور ﷺ کی ذات پاک کی طرف جو بات منسوب کی جائے وہ ہر طرح صحیح ہو۔ [1]

---

[1] اس کتاب کی تصنیف کے برسوں بعد حافظ ابن کثیر کی کتاب البدایة والنهایة مصر سے چھپ کر آئی ہے، جو سیرت پر بڑی مفصل کتاب ہے، اس کی چھٹی جلد میں حافظ موصوف نے معجزات نبویہ ﷺ کی ہر قسم کی روایتوں کو جمع کر دیا ہے، اور ان پر کلام بھی کیا ہے، اور ان کے اسناد کی جرح و تعدیل بھی کی ہے، اہل تحقیق حضرات اس کی طرف توجہ فرمائیں۔

بشارات

﴿ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵۸)

''جس پیغمبر کو وہ اپنے پاس توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔''

یہود و نصاریٰ میں یہ خیال ہے کہ کسی پیغمبر کا دعوائے نبوت اس وقت تک مسلم نہیں جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ پہلے پیغمبروں نے اس کی آمد کی پیشین گوئی کی ہے اور جو اس کی نشانیاں بتائی ہیں، وہ مدعی نبوت میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی نبوت کو بھی وہ اسی معیار پر پرکھتے تھے اور بہت سے یہود و نصاریٰ جن کو اس معیار سے تشفی کی دولت حاصل ہوئی، وہ علی الاعلان ایمان لائے اور جو اپنی کمزوری سے اپنے ایمان کا اعلان نہ کر سکے، انہوں نے اسلام کی صداقت کا اعتراف کیا۔ لیکن جن کے قلوب عناد و تعصب کے گرد و غبار سے تیرہ و تار تھے۔ وہ اس ظلمات سے باہر نہ آ سکے اور آب حیات کا سرچشمہ ان کے ہاتھ نہ آ سکا۔

آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے جواب میں فرمایا ہے کہ ''میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔'' [1] اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام نے جب کعبہ کی تعمیر سے فراغت پائی تو مقدس باپ بیٹے نے مل کر دعا مانگی کہ ہماری اولاد میں ایک پیغمبر اس سرزمین میں مبعوث ہو:

﴿ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ﴾ (۲/ البقرة:۱۲٤ تا ۱۲۹)

''اور یاد کرو جب ابراہیم کے پروردگار نے ابراہیم علیہ السلام کا چند باتوں میں امتحان لیا۔ پس

---

[1] مستدرك حاكم، ج۲، ص:۶۰۰؛ ابن سعد، جزاوّل، ص:۹۶، ذکر علامات النبوۃ صفحات ذیل میں صرف انہیں بشارات سے بحث ہے جن کے حوالے قرآن میں مذکور ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام نے ان کو پورا کیا۔ خدا نے کہا کہ اے ابراہیم! میں تم کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا، اور میری اولاد میں سے، خدا نے کہا: میرا وعدہ گناہ گار نہ پائیں گے اور یاد کرو جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا مرجع اور مامن بنایا اور حکم دیا کہ ابراہیم کے قیام گاہ کو نماز کی جگہ مقرر کرو اور ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو فرمایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے لئے پاک صاف کرو اور یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی کہ میرے پروردگار اس (مکہ) کو امن کا شہر بنا اور اس کے رہنے والوں میں سے جو خدا اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں، ان کو پھل روزی دے۔ خدا نے کہا، جو ان میں سے خدا اور آخرت کا منکر ہوگا، اس کو بھی ہم دنیا کی چندروزہ زندگی میں بہرہ مند کریں گے۔ پھر اس کو مجبور کر کے عذاب دوزخ میں لے جائیں گے اور بہت برا ٹھکانا ہے اور یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام خانہ کعبہ کی بنیادیں رکھ رہے تھے تو انہوں نے دعا کی خداوندا! ہماری یہ خدمت قبول کر تو ہی دعا کا سننے والا ہے نیتوں کا جاننے والا ہے۔ خداوندا! ہم کو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری نسل میں بھی ایک گروہ اپنے فرمانبرداروں کا پیدا کر اور ہم کو ہماری عبادت کے طریقے سکھا، ہم سے درگزر کر، تو ہی بڑا درگزر کرنے والا اور مہربان ہے۔ خداوندا! انہی میں سے ایک پیغمبر مبعوث کر جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کا تزکیہ کرے تو غالب اور حکمت والا ہے۔''

ان آیات میں بتصریح یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے مل کر خدا کے حضور میں دعا کی کہ اس شہر میں ہماری نسل سے ایک پیغمبر مبعوث فرما، چونکہ مقام بعثت مکہ مقرر کیا گیا اور دعا میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بھی شرکت تھی۔ اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس دعا کا مقصود یہ تھا کہ یہ پیغمبر نسل اسماعیل علیہ السلام سے ہوگا اور مکہ میں اس کی بعثت ہوگی۔

موجودہ تورات کی کتاب پیدائش باب ۱۶ کے آخر اور باب ۱۷ کے اول میں بھی کچھ اس کے اشارات پائے جاتے ہیں:

اور ہاجرہ ابراہیم علیہ السلام کے لئے بیٹا جنی، اور ابراہیم نے اپنے بیٹے کا نام جو ہاجرہ جنی، اسمٰعیل (خدا نے دعا سنی) رکھا (پیدائش ۱۶۔۱۵)

''جب ابراہیم علیہ السلام ننانوے برس کا ہوا۔ تب خداوند ابرام کو نظر آیا اور اس نے کہا کہ میں خدائے قادر ہوں تو میرے حضور میں چل اور کامل ہو اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد کرتا ہوں کہ میں تجھے نہایت بڑھاؤں گا۔ تب ابرام منہ کے بل گرا اور خدا اس سے ہم کلام ہو

کر بولا کہ دیکھ میں جو ہوں، ہوں تیرا عہد ہے، میرے ساتھ ہے اور تو بہت قوموں کا باپ ہوگا اور تیرا نام پھر ابرام نہ کہلایا جائے گا بلکہ تیرا نام ابرہام ہوگا۔ کیونکہ میں نے تجھے بہت قوموں کا باپ ٹھہرایا اور میں تجھے بہت پھل دوں گا اور قومیں تجھ سے پیدا ہوں گی اور بادشاہ تجھ سے نکلیں گے اور میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان کے پشت در پشت کے لئے اپنا عہد جو ہمیشہ کا عہد ہے کرتا ہوں کہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا ہوں گا اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے، دیتا ہوں کہ ہمیشہ کے لئے ملک ہو اور میں ان کا خدا ہوں گا۔'' (پیدائش ۱۷، ۱ تا ۸)

خدا کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ عہد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی پیدائش کے بعد ہی اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت سے پہلے ہوتا ہے، جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ بشارت اسمٰعیل علیہ السلام کے لئے ہے۔ اسحاق کے لئے نہیں اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہم ہوا کہ اس نئی بشارت سے یہ مراد تو نہیں ہے کہ اسمٰعیل زندہ نہ رہیں گے اور وہ عہد اسحاق علیہ السلام کے ساتھ پورا ہوگا فوراً بارگاہ الٰہی میں عرض کی، کاش کہ اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے۔ (پیدائش ۱۷:۱۸)

خدا نے جواب دیا:

''اور اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی۔ دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے بار آور کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔'' (پیدائش ۱۷۔۲۰)

حضرت ہاجرہ جب حاملہ ہونے کے بعد حضرت سارہ سے خفا ہو کر بیر سبع چلی گئیں تو فرشتہ نے آواز دی:

''میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائیگی اور خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ تو بیٹا جنے گی اس کا نام اسمٰعیل رکھنا کہ خدا نے تیرا دکھ سن لیا۔'' (پیدائش ۱۰۔۱۶)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام کو فاران (مکہ) کے بیابان میں رخصت کیا اور مشکیزہ کا پانی چک گیا اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے گریہ زاری شروع کی۔

''تب خدا نے اس لڑکے (اسمٰعیل (علیہ السلام)) کی آواز سنی اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ علیہا السلام کو پکارا اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہ! تجھ کو کیا ہوا مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے۔ خدا نے سنی، اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں (بیر زمزم) دیکھا خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا اور بیابان (عرب) [1] میں رہا...... اور وہ

[1] عرب (عرب کے لفظی معنی بیابان کے ہیں)

فاران کے بیابان میں رہا۔'' ❶ (پیدائش ۲۱، ۱۷ تا ۲۱)

موجودہ توراۃ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی پیدائش اوران کی نسل کی برومندی، کثرت اور برکت اوران کی نسل کے بارہ سرداروں کے پیدا ہونے کی بشارتیں مذکور ہیں اوران سے قرآن مجید کے بیان کردہ دعائے ابراہیمی اور عہد الٰہی کی تائید ہوتی ہے۔ الغرض اسی لئے روایات میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ میں تمہیں بتاؤں کیا ہوں؟ ((انا دعوة ابی ابراهيم)) ''میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں۔'' ❷

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی نسل میں جس رسول کے پیدا ہونے کی دعا مانگی تھی۔ اس کے اوصاف یہ گنائے تھے:

﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ﴾

(۲/ البقرہ:۱۲۹)

''اے ہمارے خداوندا! ان میں (یعنی اسمٰعیل کی اولاد میں) ایک پیغمبر کو مبعوث کرنا جو ان کو تیرے احکام پڑھ کر سنائے اوران کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اوران کو پاک وصاف کردے۔''

قرآن مجید نے متعدد مقامات پر آنحضرت ﷺ کے یہی اوصاف ظاہر کئے ہیں:

﴿ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (۶۲/ الجمعۃ:۲)

''اسی خدا نے ان پڑھوں میں انہی کی قوم سے ایک پیغمبر مبعوث کیا۔ جو ان کو خدا کے احکام پڑھ کر سناتا ہے اوران کو پاک وصاف کرتا ہے اوران کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

﴿ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۶۴)

''خدا نے مومنوں پر یقیناً یہ احسان کیا کہ ان میں ایک پیغمبر خود انہی کی قوم سے مبعوث کیا، جو ان کو خدا کے احکام سناتا ہے اوران کو پاک کرتا ہے اوران کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

اس سے یہ اشارہ صاف واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا وجود مبارک دعائے ابراہیمی کی قبولیت کا مظہر ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کی جو بشارت دی ہے، وہ اس سے بھی زیادہ صاف ہے:

﴿ وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ﴾ (۶۱/ الصف:۶)

❶ قرآن مجید نے اس کو وَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ بن کھیتی کے میدان سے تعبیر کیا ہے۔

❷ طبقات ابن سعد جزء اوّل، ص:۹۶ ومستدرك حاكم، ج۲، ص:۶۰۰۔

''اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمہارے پاس خدا کا قاصد بن کر اور مجھ سے پہلے جو توراۃ آئی میں اس کی تصدیق کرتا ہوں اور اپنے بعد احمد نام ایک پیغمبر کی خوشخبری لے کر آیا ہوں۔''

انجیل یوحنا باب ۱۴ میں ایک آنے والے کی بشارت ان الفاظ میں ہے:

''اور میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا اور وہ تمہیں دوسرا ''فارقلیط'' بخشے گا کہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے۔'' (۱۴۔۱۶)

آگے بڑھ کر پھر ہے:

''لیکن وہ ''فارقلیط'' جو روح القدس ہے جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو کچھ کہ میں نے کہی ہیں تمہیں یاد دلائے گا۔'' (۱۴۔۲۶)

اسی انجیل کے باب ۱۵۔۱۶ میں ہے:

''پر جب وہ ''فارقلیط'' جسے میں تمہارے لئے باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کی روح جو باپ سے نکلتی ہے، تو وہ میرے لئے گواہی دے گا۔''

اسی انجیل کے باب ۱۶۔۷ میں ہے:

''لیکن میں تمہیں سچ کہتا ہوں کہ تمہارے لئے میرا جانا ہی فائدہ ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو ''فارقلیط'' تمہارے پاس نہ آئے گا، پر اگر میں جاؤں تو میں اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آن کر دنیا کو گناہ سے اور راستی سے اور عدالت سے قصوروار ٹھہرائے گا گناہ کے بارے میں اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے، راست بازی کے بارے میں اس لئے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہیں دیکھو گے، ہدایت کے بارے میں اس لیے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے، میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تمہیں کہوں، پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے، لیکن جب وہ سچائی کی روح آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی بات بتائے گی، اس لئے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ وہ سنے گی سو کہے گی اور تمہیں آئندہ کی خبر دے گی، وہ میری بزرگی کرے گی اس لئے کہ وہ میری چیزوں سے پائے گی اور تمہیں دکھائے گی۔''

انجیل کی ان آیتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جس آنے والے پیغمبر کی بشارت بار بار دی ہے، اس کو لفظ ''فارقلیط'' سے تعبیر کیا ہے، یہ لفظ عبرانی یا سریانی ہے، جس کے لفظی معنی ٹھیک محمد ﷺ اور احمد ﷺ کے ہیں، یونانی کے قدیم تراجم میں اس کا ترجمہ ''پریکلیوطاس'' کیا گیا تھا، جو بعینہٖ فارقلیط اور احمد کا ہم معنی ہے، مگر یہ دیکھ کر کہ اس سے اسلام کی تصدیق ہوتی ہے ذرا سے تغیر سے ''پریکلیوطاس'' کی بجائے ''پریکلیطاس'' کر دیا

گیا، جس کا ترجمہ اب عام طور سے ''تسلی دہندہ'' کیا جاتا ہے، عیسائی اور مسلمان علما کے درمیان اس لفظ کی تحقیق پر سینکڑوں برس سے مناظرہ قائم ہے اور مسلمان علماء نے خود قدیم عیسائی علما کی تحریروں سے یہ ثابت کیا ہے کہ صحیح لفظ ''پریکلیوطاس'' ہے سب سے زیادہ سیدھی بات یہ ہے کہ یہ فقرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے نکلے تھے، ان کی زبان سریانی آمیز عبرانی تھی یونانی نہ تھی، اس لئے جو لفظ ان کی زبان سے نکلا ہوگا، وہ عبرانی یا سریانی ہوگا۔ اس لئے یہ بالکل صاف ہے کہ انہوں نے فارقلیط کا لفظ کہا ہوگا، جو احمد یا محمد کا مترادف ہے جیسا کہ اوپر کی آیت میں قرآن کا دعویٰ ہے۔ [1]

گزشتہ صفحات میں یہ کہیں ثابت کیا جاچکا ہے کہ آنحضرت ﷺ توراۃ وانجیل کی انسانی تعلیم سے قطعاً ناآشنا تھے، بایں ہمہ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس آنے والے پیغمبر کی جو صفتیں گنوائی ہیں، وہ حرف بحرف آنحضرت ﷺ پر صادق آتی ہیں:

> ''لیکن وہ فارقلیط (احمد) جو روح القدس (پاکیزگی کی روح) ہے جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں تمہیں یاد دلائے گا۔'' (یوحنا ۱۴۔۲۶)

> ''وہ فارقلیط (احمد) جو باپ (خدا) سے نکلتی ہے آئے تو وہ میرے لئے گواہی دے گا۔'' (یوحنا ۱۵۔۲۶)

> ''اور وہ فارقلیط آن کر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصوروار ٹھہرائے گا، گناہ سے اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے ...... میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ تم سے کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی، تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی، اس لئے کہ وہ اپنی نہ کہے گی، لیکن جو کچھ سنے گی سو کہے گی میری بزرگی کرے گی۔'' (یوحنا ۱۶۔۸)

انجیل کے ان فقروں میں آنے والے پیغمبر کی یہ صفات گنائی گئی ہیں:

① مسیح کی اصلی تعلیم لوگ بھول جائیں گے اس لئے وہ پیغمبر آکر اس کو یاد دلائے گا۔

② وہ مسیح کی ناتمام باتوں کی تکمیل کرے گا اور وہ ساری سچائی کی باتیں بتائے گا اور سب باتوں کی خبر دے گا۔

③ مسیح کی عظمت کو دنیا میں قائم کرے گا اور ان کی گواہی دے گا اور ان پر ایمان نہ لانے پر دنیا کو گناہ گار ٹھہرائے گا۔

④ اس کی باتیں خود اس کی نہ ہوں گی، بلکہ جو کچھ خدا کی طرف سے اس کو سنایا جائے گا وہی کہے گا۔

---

[1] خطبات احمدیہ، خطبہ بشارات محمدی، منقول از گاڈ فری ہیگنس صاحب، ص: ۶۳۹، ۶۴۰۔

اس صداقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کی اصلی تعلیم عیسائی بھلا چکے تھے، توحید کی جگہ تثلیث تھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیماتِ صادقہ میں ابنیت، الوہیتِ مسیح علیہ السلام، مجسمہ پرستی اور بیسیوں عقائد فاسدہ کا اضافہ کر دیا گیا تھا، وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی ذات مبارک ہے، جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھلائی ہوئی باتوں کو پھر یاد دلایا اور بتایا کہ ان کی اصلی تعلیم کیا تھی؟ قرآن مجید نے پورے واشگاف طریق سے نصاریٰ کے عقائد فاسدہ اور غلط تعلیمات کی تشریح کی اور دنیا میں تثلیث کے بجائے توحید کا علم نصب کیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی الوہیت کی تردید کی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ابنیت اور ان کی حیات وموت کے مسئلہ کو صاف کیا۔

اس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا کہ وہ میری ناتمام باتوں کی تکمیل کرے گا، یہ خصوصیت بھی خاتم النبیین ﷺ کے سوا اور کسی پر صادق نہیں آسکتی، مسیح کے اس فقرہ سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ مسیح تک دین الٰہی ناتمام ہے اور دوسری یہ کہ آئندہ آنے والے پیغمبر کے ہاتھ سے اس کی تکمیل ہوگی اور وہ سچائی کی تمام راہیں دکھائے گا اور ساری باتوں کی خبر دے گا یہ پیشین گوئی آنحضرت ﷺ کی ذات سے پوری ہوئی آپ کی ذات سے دین الٰہی تکمیل کو پہنچا اور آپ نے عقائد، عبادات، اخلاق، احکام، آثار قیامت، جنت، دوزخ، سزا، جزا وغیرہ تمام باتوں کو اس تفصیل، تشریح اور تکمیل کے ساتھ بتایا، جس کی مثال دنیا کے کسی پیغمبر کی تعلیم میں نہیں ملتی، اسی لئے آپ کو خاتم النبیین کا لقب دیا گیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس پیغمبر کی تیسری نشانی یہ بتائی کہ وہ دنیا میں میری عظمت کو قائم کرے گا اور میرے لئے گواہی دے گا۔ یہ نشانی بھی آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس کے سوا کسی اور پر صادق نہیں ہو سکی۔ وہ آنحضرت ﷺ ہی ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصلی شخصیت اور عظمت کو دنیا میں آشکار کیا اور دوستوں اور دشمنوں کی طرف سے ان پر جو غلط اتہامات قائم کئے گئے تھے، ان کی پردہ دری کی اور ان کی نبوت ورسالت کی گواہی دی اور ان کی صداقت کو تسلیم کرنا اسلام کا ضروری رکن قرار دیا۔ ان کے حقیقی اوصاف ومحامد کی تصویر کو جسے یہود نے دشمنی سے اور نصاریٰ نے محبت سے دھندلی کر دیا تھا، اپنی روشنی سے اجاگر کر دیا۔ یہودیوں نے ان پر اور ان کی ماں حضرت مریم علیہا السلام پر جو بہتان باندھے تھے۔ ان کی علیٰ رؤس الاشہاد تردید کر دی اور نصاریٰ نے ان کی ولادت، وفات، ابنیت، الوہیت اور تعلیمات پر رومی مشرکانہ اعمال وعقائد کا جو پردہ ڈال رکھا تھا، اس کو چاک کر دیا اور قرآن کی بیسیوں آیتوں میں نہایت صفائی کے ساتھ ان امور کی تشریح کی گئی اور اب کروڑوں دلوں میں ان کی اصلی عظمت اور حقیقی بزرگی کا نقش کندہ ہے۔

چوتھی نشانی حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ بتائی کہ وہ خود اپنی طرف سے نہیں کہے گا بلکہ وہی کہے گا جو اس کو اوپر سنایا جائے گا۔ یہ آنحضرت ﷺ کا خاص وصف ہے، قرآن نے کہا:

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ ﴾ (۵۳/ النجم:۳، ٤)

''اور وہ خواہش نفس سے نہیں بولتا بلکہ وہ جو کچھ بولتا ہے وہی بولتا ہے جو اس پر وحی کی جاتی ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما آنحضرت ﷺ جو کچھ ارشاد فرمایا کرتے تھے اس کو لکھ لیا کرتے تھے۔ لوگوں نے کہا آپ کبھی غصہ میں کچھ کہہ دیتے ہیں، ان کو نہ لکھا کرو۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے جا کر آنحضرت ﷺ سے عرض کیا۔ آپ نے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''اس سے رضا مندی اور نارضا مندی دونوں حالتوں میں حق اور سچائی کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔'' قرآن مجید نے اپنی نسبت بارہا کہا کہ وہ سچائی کی روح ہے، وہ حق ہے، وہ تذکرہ ہے، وہ ہدایت ہے، اور اس کا پیغمبر چراغ ہدایت ہے، راہنمائے عالم ہے، مذکر (یاد دلانے والا) ہے، اس تفصیل کے بعد کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ حضرت مسیح کی پیشین گوئی آنحضرت ﷺ کے ظہور سے حرف بحرف پوری نہیں ہوئی اور آنحضرت ﷺ کے سوا کوئی اور ہستی نہیں، جس پر یہ اوصاف صادق آ سکیں۔ قرآن مجید میں ایک اور مقام پر بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ظہور کی پیشین گوئی توراۃ اور انجیل دونوں میں مذکور ہے اور یہود و نصاریٰ دونوں اس پیشین گوئی کو جانتے ہیں:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵۷)

''جو لوگ اس ان پڑھ پیغام رساں قاصد کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے پاس توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔''

انجیل میں گزشتہ بشارت فارقلیط کے علاوہ آنحضرت ﷺ کی دو اور بھی پیشینگوئیاں مذکور ہیں۔

انجیل لوقا میں ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے آسمان پر چلے جانے سے تھوڑی دیر پہلے فرمایا:

''دیکھو میں اپنے باپ خدا کے اس موعود کو تم پر بھیجتا ہوں لیکن جب تک عالم بالا سے تم کو قوت عطا نہ کی جائے۔ یروشلم میں ٹھہرو۔'' (لوقا۔۲۴۔۴۹)

اس کی چند سطروں کے بعد لوقا کی انجیل ختم ہوگئی ہے اور اس موعود کے ظہور کا کوئی ذکر نہیں وہ رسول موعود کون تھا؟ ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آنحضرت ﷺ کے سوا کوئی پیغمبر نہیں ہوا۔ انجیل کے اس فقرہ میں یہ الفاظ غور کے قابل ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کہتے ہیں کہ اس قوت آسمانی کے ظاہر ہونے کے وقت تک شہر یروشلم میں ٹھہرو، اس سے مقصود اس قوت آسمانی کے ظہور تک شہر یروشلم میں محض اقامت نہیں ہے۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس رسول موعود کے ظہور تک تمہارا کعبہ اور قبلہ بیت المقدس رہے گا، لیکن جب وہ

آئے گا تو رخ شہر مکہ کی طرف بدل جائے گا۔ اسی لئے قرآن مجید نے تحویل قبلہ کے موقع پر یہ کہا ہے:

﴿ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۗ ﴾ (۲/ البقرہ: ۱۴۴)

''تو تو اپنا منہ مسجد حرام (کعبہ) کی طرف پھیر اور تم جہاں بھی ہو اسی کی طرف اپنے منہ پھیرو اور جو اہل کتاب ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے، ان کے پروردگار کی جانب سے۔''

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپ ﷺ کی آمد کی بشارت کس قدر کھلے کھلے لفظوں میں دی تھی، اسی لئے احادیث میں ہے کہ آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ''میں اپنے بھائی عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔'' [1] انجیل کی دوسری بشارت حضرت یحییٰ علیہ السلام کے ظہور کے موقع پر مذکور ہے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام جب ظاہر ہوتے ہیں، تو لوگ ان سے پوچھتے ہیں کہ تین آنے والے پیغمبروں میں سے تم کون ہو؟

''یہودیوں نے یروشلم سے کاہنوں اور لاویوں کو بھیجا کہ اس سے پوچھیں کہ تو کون ہے؟ اور اُس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں مسیح نہیں ہوں۔ تب انہوں نے اس سے پوچھا، تو اور کون ہے؟ کیا تو الیاس ہے؟ اس نے کہا، میں نہیں ہوں پس آیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں...... اور انہوں نے اس سے سوال کیا اور کہا، اگر تو نہ مسیح ہے نہ الیاس اور نہ وہ نبی تو کیوں بپتسمہ دیتا ہے۔'' (یوحنا ا۔ ۱۹)

اس فقرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ توراۃ کی پیشین گوئی کے مطابق یہود کو تین پیغمبروں کا انتظار تھا۔ جن میں سے دو کے نام الیاس اور مسیح علیہما السلام تھے، لیکن تیسرے کا نام صرف وہ نبی لیا گیا ہے۔ یہ تیسرا نبی محمد رسول اللہ ﷺ کے سوا کون ہے؟ کہ یہود و نصاریٰ دونوں یقین رکھتے ہیں کہ اب مسیح علیہ السلام کے سوا کوئی اور آنے والا نہیں۔ صرف آنحضرت ﷺ ہی کی ذات ہے جو نبی اور پیغمبر کے مطلق نام سے دنیا میں مشہور ہے۔ مسلمان آپ کو آنحضرت ﷺ، وہ حضرت یعنی پیغمبر کہتے ہیں اور مسیحیوں میں آپ کا نام ''دی پرافٹ'' وہ پیغمبر مشہور ہو گیا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین میں جن لوگوں کو توراۃ سے واقفیت تھی، یا علمائے یہود میں سے جو لوگ اسلام لائے تھے، ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آنحضرت ﷺ کی بشارت گزشتہ صحف انبیا علیہم السلام میں مذکور ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما گو آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں کم سن تھے۔ مگر وہ مطالعہ کتب کے شائق تھے اور وہ توراۃ پڑھا کرتے تھے، سورۂ فتح میں آنحضرت ﷺ کی شان میں ہے:

﴿ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ ۚ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ ﴾ (۴۸/ الفتح: ۸، ۹)

[1] مستدرک حاکم، ج ۲، ص: ۶۰۰۔

''ہم نے تجھ کو گواہ، خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، تا کہ خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اور اس کی عظمت کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔''

سورۂ احزاب میں کچھ اوصاف اور زیادہ مذکور ہیں:

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًاۙ۝ وَّدَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۝ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۴۵، ۴۶)

''اے پیغمبر ﷺ! ہم نے تجھ کو گواہ، خوشخبری دینے والا، ڈرانے والا اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس آیت میں آنحضرت ﷺ کے جو اوصاف گنائے گئے ہیں وہ بعینہٖ توراۃ میں ہیں۔

عن عبدالله بن عمرو ان هذه الاية التى فى القراٰن ﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًاۙ۝ ﴾ قال فى التوراة: يا ايها النبى انا ارسلنك شاهدا ومبشرا [1] وحرزا للاميين انت عبدى ورسولى سميتك المتوكل ليس بفظ ولا غليظ ولا سخاب بالاسواق ولا يدفع السيئة بالسيئة ولكن يعفو ويصفح ولن يقبضه الله حتى يقيم به الملة العوجاء بان يقولوا لا اله الا الله فيفتح بها اعينا عميا واذانا صما وقلوبا غلفا۔[2]

''عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا کہ قرآن کی یہ آیت کہ اے پیغمبر ﷺ! میں نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ توراۃ میں یونہی ہے کہ اے نبی! میں نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری سنانے والا اور امیوں کا ماویٰ و ملجا بنا کر بھیجا، تو میرا بندہ ہے اور میرا رسول ہے اور میں نے تیرا نام خدا پر بھروسہ رکھنے والا رکھا، وہ سخت اور سنگ دل نہ ہوگا اور بازاروں میں وہ شور نہ کرے گا، وہ برائی کے بدلہ برائی نہ کرے گا، بلکہ عفو اور درگزر کرے گا اور اس وقت تک خدا اس کی روح قبض نہ کرے گا، جب تک اس کے ذریعہ سے وہ کج دین کو سیدھا نہ کر لے گا کہ لوگ کہنے لگیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خدا نہیں۔ پس وہ اس دین سے اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور نافہم دلوں کو کھول دے گا۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں کعب ایک مشہور یہودی عالم تھے جو مسلمان ہو گئے تھے۔ تفسیر طبری میں ہے کہ حضرت عطاء تابعی نے ان سے پوچھا کہ آنحضرت ﷺ کی کوئی بشارت توراۃ میں مذکور ہے؟ انہوں نے کہا،

[1] بخاری میں ''ونذیرا'' کے الفاظ بھی ہیں۔

[2] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قوله ﴿انا ارسلنك شاهدا......﴾: ٤٨٣٨۔

ہاں، ہے اور اس کے بعد انہوں نے توراۃ کی اسی عبارت کا ترجمہ پڑھا۔ چنانچہ اس وقت توراۃ کے جو نسخے موجود ہیں، ان میں اشعیاء نبی کی کتاب میں کسی قدر الفاظ کے تغیر کے ساتھ یہ پیشین گوئی اب تک موجود ہے اور جس پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو اور حضرت کعب نے اپنی پیشین گوئی کو اختصار اور اجمال کے ساتھ اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ اشعیاء نبی کی پیشین گوئی یہ ہے:

''دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا، میرا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے، میں نے اپنی روح اس پر رکھی، وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرائے گا، وہ نہ چلائے گا اور اپنی صدا نہ بلند کرے گا اور اپنی آواز بازاروں میں نہ سنائے گا، وہ مسلے ہوئے سینٹھے کو نہ توڑے گا اور دھکتی ہوئی بتی کو نہ بجھائے گا، وہ عدالت کو جاری کرائے گا کہ دائم رہے، اس وقت تک اس کا زوال نہ ہوگا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے اور بحری ممالک اس کی شریعت کی راہ تکیں۔ خداوند خدا جو آسمانوں کو خلق کرتا اور انہیں تانتا جو زمین کو اور انہیں جو اس میں سے نکلتے ہیں، پھیلاتا اور ان لوگوں کو جو اس پر ہیں۔ سانس دیتا اور ان کو جو اس پر چلتے ہیں، روح بخشتا ہے۔ یوں فرماتا ہے میں خداوند نے تجھے صداقت کے لئے بلایا، میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا اور میں تجھ کو لوگوں کے لئے عہد اور قوموں کے لئے نور بناؤں گا [1] کہ تو اندھوں کی آنکھیں کھولے اور بند ہوؤں کو قید سے نکالے اور ان کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں، قید خانہ سے چھڑائے۔ یہودا میں ہوں، یہ میرا نام ہے اور اپنی شوکت دوسرے کو نہ دوں گا اور وہ ستائش جو میرے لئے ہوتی ہے، کھودی ہوئی مورتوں کے لئے ہونے نہ دوں گا۔ دیکھو تو سابق پیشین گوئیاں بر آئیں اور میں نئی باتیں بتاتا ہوں، اس سے پیشتر کہ واقع ہوں۔ میں تم سے بیان کرتا ہوں۔ خداوند کے لئے ایک نیا گیت گاؤ۔ اے تم جو سمندر پر گزرتے ہو اور تم جو اس میں بستے ہو، اے بحری ممالک اور ان کے باشندو تم زمین پر سرتا سر اسی کی ستائش کرو۔ بیابان اور اس کی بستیاں، قیدار کے آباد دیہات اپنی آواز بلند کریں گے۔ سلع کے بسنے والے ایک گیت گائیں گے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے للکاریں گے۔ وہ خداوند کا جلال ظاہر کریں گے اور بحری ممالک میں اس کی ثنا خوانی کریں گے۔ خداوند ایک بہادر کے مانند نکلے گا۔ وہ جنگی مرد کے مانند اپنی عزت کو اکسائے گا۔ وہ چلائے گا، ہاں وہ جنگ کے لئے بلائے گا وہ اپنے دشمنوں پر غالب ہوگا۔ میں بہت مدت سے چپ رہا، میں خاموش ہو رہا اور آپ کو روکتا گیا، پر اب میں اس عورت کی طرح جسے دردزہ ہو چلاؤں گا اور ہانپوں گا اور زور زور سے ٹھنڈی سانس بھی لوں گا۔ میں

[1] اس فقرہ کا اردو ترجمہ میرے پیش نظر اردو نسخہ میں صحیح نہ تھا، میں نے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے عربی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۹۰ء سے درست کیا ہے۔

پہاڑوں اور ٹیلوں کو ویران کر ڈالوں گا اور ان کے سبزہ زاروں کو خشک کروں گا اور ان کی ندیاں، بسنے کے لائق زمین بناؤں گا اور تالابوں کو سکھادوں گا اور اندھوں کو اس راہ سے کہ جسے وہ نہیں جانتے لے جاؤں گا، میں انہیں ان رستوں پر جن سے وہ آگاہ نہیں لے چلوں گا۔ میں ان کے آگے تاریکی کو روشنی اور اونچی نیچی جگہوں کو میدان کر دوں گا۔ میں ان سے یہ سلوک کروں گا اور انہیں ترک نہ کروں گا، وہ پیچھے ہٹیں اور نہایت پشیمان ہوں، جو کھودی ہوئی مورتوں کا بھروسہ رکھتے ہیں اور ڈھالے ہوئے بتوں کو کہتے ہیں کہ تم ہمارے الٰہ ہو، سنو اے بہرو، اور تاکو اے اندھو! تاکہ تم دیکھو اندھا کون ہے مگر میرا بندہ؟ اور کون ایسا بہرا ہے، جسے میرا رسول جیسے میں بھیجوں گا اندھا کون ہے؟ جیسا کہ وہ جو کامل ہے اور خداوند کے خادم کی مانند اندھا کون ہے؟ تو نے بہت چیزیں دیکھی ہیں پر ان پر لحاظ نہیں رکھا اور کان تو کھلے ہیں، پر کچھ نہیں سنتا خداوند اپنی صداقت کے سبب راضی ہوا اور وہ شریعت کو بزرگی دے گا اور اسے عزت بخشے گا۔'' (باب ۴۲)

حضرت عبداللہ بن عمرو اور حضرت کعب رضی اللہ عنہما کی پیش کردہ بشارت میں جو الفاظ ہیں، وہ حرف حرف اس میں موجود ہیں۔ پہلا لفظ اس بشارت میں "شاھد" ہے۔ یعنی خدا کی طرف سے وہ قوموں کے درمیان گواہ اور شاہد ہوگا۔ اشعیاء میں ہے: ''وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرے گا اور اس عدالت کا وہ گواہ ہوگا۔'' اس کے بعد مبشر کی صفت ہے۔ یعنی وہ نیکوکاروں کو خدا کی بادشاہی کی خوشخبری سنائے گا۔ اشعیاء کے اس پورے باب میں اس آنے والے پیغمبر کے یہی اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ بعدازیں "حرز اللامیین "امیوں کا ماویٰ اور پناہ ہے۔ امّی وہ ہیں جن کو اب تک کوئی شریعت نہیں ملی تھی۔ چنانچہ اشعیاء میں ہے: کہ اس رسول کے ذریعہ سے اندھوں کو اس راہ سے کہ جسے وہ نہیں جانتے، لے جاؤں گا، میں انہیں ان رستوں (شریعت) پر جن سے وہ آگاہ نہیں لے چلوں گا۔"انت عبدی ورسولی "یعنی تو میرا بندہ اور میرا رسول ہے۔ اشعیاء کے شروع میں ہے: ''دیکھو میرا بندہ'' اور آخر میں ہے۔ ''میرا بندہ میرا رسول جسے میں بھیجوں گا۔'' "سمیتك بالمتوكل" میں نے تیرا نام خدا پر بھروسہ کرنے والا رکھا۔ اشعیاء میں ہے: ''میرا بندہ جس کو میں سنبھالتا ہوں...... میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا اور تیری حفاظت کروں گا۔'' "لیس بفظ ولا غلیظ ولا یدفع السیئة بالسیئة ولکن یعفو ویصفح۔" وہ سنگ دل اور سخت نہ ہوگا، یعنی کمزوروں اور ضعیفوں کو نہ ستائے گا اور برائی کا بدلہ برائی نہ دے گا بلکہ معاف کرے گا۔ اشعیاء تمثیل واستعارہ میں کہتے ہیں: ''وہ مسلے ہوئے سینٹھے کو نہ توڑے گا اور دھیمی بتی کو نہ بجھائے گا، وہ عدالت کو جاری کرائے گا۔'' "ولا سخاب بالاسواق۔" وہ بازاروں میں نہ چلائے گا، یعنی وہ متین اور سنجیدہ ہوگا اشعیاء نے کہا، وہ نہ چلائے گا، اپنی صدا بلند نہ کرے گا، اپنی آواز بازاروں میں نہ

سنائے گا" ولن يقبضه الله حتى يقيم به الملة العوجاء۔" خدا اس وقت تک اس کی روح قبض نہ کرے گا، جب تک اس کے ذریعہ سے وہ کج دین کو سیدھا نہ کرالے گا۔ اشعیاء میں ہے، اس وقت تک اس کا زوال نہ ہوگا اور نہ مسلا جائے گا، جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے گا۔" فيقولوا لا اله الا الله" تو لوگ کہیں کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں۔ اشعیاء کہتے ہیں، میں خدا (یہودا) اپنی شوکت دوسرے معبودان باطل کو نہ دوں گا اور وہ ستائش جو میرے لئے ہوتی ہے۔ کھودی ہوئی مورتوں کے لئے ہونے نہ دوں گا...... وہ پیچھے ہٹیں اور نہایت پشیمان ہوں، جو کھودی ہوئی مورتوں کا بھروسہ رکھتے ہیں اور ڈھالے ہوئے بتوں کو کہتے ہیں کہ تم ہمارے الٰہ ہو" فيفتح به اعينا عمياوا ذانا صما و قلوبا غلفا" وہ اس کے ذریعہ سے اندھی آنکھوں بہرے کانوں اور زیر پردہ دلوں کو کھول دے گا۔ اشعیاء کہتے ہیں: لوگوں کے عہد اور قوموں کی روشنی کے لئے تجھے نہ دوں گا کہ تو اندھوں کی آنکھیں کھولے جو بند ہیں۔ ان کو قید سے نکالے اور ان کو جو اندھیرے میں ہیں قید سے نکالے...... سنو اے بہرو! تاکو اے اندھو!

حضرت اشعیاء کی یہ بشارت حرف بحرف آنحضرت ﷺ پر صادق آتی ہے۔ حضرت اشعیاء نے ان فقروں میں جس نبی کی پیشین گوئی کی ہے، وہ یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہیں کہ نہ تو وہ عیسائیوں میں خدا کے بندہ اور رسول کی حیثیت سے تسلیم ہوتے ہیں اور نہ وہ ایک جنگی مرد کی طرح دنیا میں آئے، نہ انہوں نے توحید کو دنیا میں قائم کیا اور نہ بت پرستی کا استیصال کیا، علاوہ ازیں اس پیشین گوئی میں اس کی طرف بھی خاص اشارہ ہے کہ وہ آنے والا نبی قیدار بن اسمٰعیل کی نسل سے اور قیدار کے دیہاتوں میں پیدا ہوگا۔ قیدار بن اسمٰعیل کا مشہور خاندان قریش تھا اور قیدار کا دیہات مکہ معظمہ ہے۔ اس باب ۴۲ سے پہلے جس میں یہ بشارت ہے۔ باب ۴۱ میں بھی اس بشارت کا ایک حصہ مذکور ہے۔

کس نے اس راست باز کو پورب کی طرف سے برپا کیا اور اپنے پاؤں کے پاس بلایا اور امتوں کو اس کے آگے دھر دیا اور اسے بادشاہوں پر مسلط کیا، کس نے انہیں (کافروں) خاک کے مانند اس کی تلوار کے اور اڑتی بھوسی کے مانند اس کی تلوار کے حوالہ کیا۔

اس درس میں یہ تصریح ہے کہ "وہ راستباز پورب کی طرف سے مبعوث ہوگا" توراۃ کے محاورہ میں پورب کی سرزمین سے عموماً عرب مراد ہوتا ہے [1] اس سے ثابت ہوا کہ وہ راستباز بندہ اور رسول ملک عرب میں مبعوث ہوگا۔

اس بشارت میں آنے والے پیغمبر کے سب سے پہلے وصف کا ترجمہ "برگزیدہ" کیا گیا ہے، جو آنحضرت ﷺ کے لقب مصطفیٰ کا ترجمہ ہے، دوسرا وصف راستباز ہے، یہ امین کا وہ لقب ہے جو نبوت سے

[1] میں نے اپنی تصنیف ارض القرآن، ج ۱، ص: ٦١ میں جغرافیہ عرب میں توراۃ کے حوالہ سے اس کو بہ تفصیل دکھایا ہے۔

پہلے اہل مکہ کی زبان سے آپ ﷺ کو ملا تھا۔اب حضرت اشعیاء کی بشارت کے ایک ایک لفظ پر غور کرو تو آنحضرت ﷺ کے اوصاف وحالات سے اس کی عجیب مطابقت ہوتی ہے۔سب سے پہلے یہ کہ اس پیغمبر کو بندہ اور رسول کے وصف سے یاد کیا ہے، یہ وہ وصف ہے جو آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص ہے۔آنحضرت ﷺ کے سوا کوئی پیغمبر اس وصف خاص کے ساتھ شہرت نہیں رکھتا۔یہ اسلام ہی کا پیغمبر ہے، جس کا طغرائے فخر صرف عبدیت اور رسالت ہے۔اس نے دنیا میں اپنے نام کا اعلان ہی ان الفاظ کے ساتھ کیا کہ عبدہ، ورسولہ، کسی مسلمان کی کوئی نماز اس وقت تک ختم نہیں ہوتی۔جب تک وہ اپنی زبان سے تشہد میں یہ نہیں ادا کر لیتا ''واشهد ان محمدا عبدهٗ ورسولهٗ'' میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد خدا کے بندہ اور اس کے رسول ہیں۔اس موقع پر ایک خاص نکتہ بیان کے لائق ہے کہ دیگر انبیا جس طرح خلیل اللہ، کلیم اللہ، روح اللہ وغیرہ کے خطابات سے مشرف ہیں۔آنحضرت ﷺ کا سب سے بڑا خطاب ''عبداللہ'' خدا کا بندہ ہے معراج میں جو تقرب الٰہی کی آخری منزل اور انسانی رتبہ کی آخری شرف یابی تھی، آنحضرت ﷺ اسی لقب خاص سے پکارے گئے:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل:۱)

''پاک ہے وہ خدا جو معراج میں اپنے بندہ کو لے گیا۔''

اس کے علاوہ اور متعدد آیتوں میں آپ ﷺ کو اس خطاب سے تعبیر کیا گیا ہے:

﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۳)

''اگر تم کو اس میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندہ پر اتارا۔''

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۱)

''بابرکت ہے وہ خدا جس نے اپنے بندہ پر قرآن اتارا۔''

﴿ وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ ﴾ (۷۲/ الجن:۱۹)

''اور جب خدا کا بندہ اس کو پکارتے ہوئے کھڑا ہوا۔''

آنحضرت ﷺ دونوں زانوں کھڑے کر کے کھانا تناول فرماتے تھے، اس کی وجہ یہ ارشاد فرمائی:

''میں خدا کا بندہ ہوں'' اسی طرح کھاتا ہوں، جس طرح غلام کھاتا ہے۔''

آنحضرت ﷺ کا دوسرا وصف ''رسول'' ہے گو دنیا میں پیغمبر ہزاروں آئے، مگر لفظ رسول سے ان کے نام کو شہرت نہیں، یہ صرف آنحضرت ﷺ ہی کا وصف ہے، جو تمام مسلمانوں کی زبانوں پر رسول اللہ ﷺ کے نام سے ملقب ہیں، یہاں تک کہ عیسائیوں میں بھی ''دی پرافٹ'' یعنی پیغمبر مخصوص آپ کا نام ہے۔قرآن نے بتصریح کہا:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ﴾ (٤٨/ الفتح:٢٩) ''محمد خدا کا رسول ہے۔''

﴿ يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﴾ (٦٣/ المنافقون:٥)

''خدا کا رسول تمہاری مغفرت چاہے۔''

﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ﴾ (٩/ التوبة:١٢٨)

''تمہارے پاس خود تمہاری قوم کا رسول آیا۔''

﴿ اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﴾ (٤٩/ الحجرات:٧) ''تم میں خدا کا رسول ہے۔''

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ (٣٣/ الاحزاب:٢١)

''تمہارے لئے خدا کے رسول کے اندر اچھی پیروی ہے۔''

﴿ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ﴾ (٥/ المآئدة:٦٧)

''اے رسول تجھ پر جو کچھ اتارا گیا ہے اس کو لوگوں تک پہنچا دے۔''

ان مقامات کے علاوہ اور بیسیوں جگہ آنحضرت ﷺ کے لئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو بشارت دی ہے، وہ بھی اسی رسول کے لفظ کے ساتھ دی ہے: ﴿ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ﴾ میرے بعد احمد نام ایک رسول آنے والا ہے۔

حضرت اشعیاء علیہ السلام نے آنے والے پیغمبر کا تیسرا وصف برگزیدہ بتایا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ آنحضرت ﷺ مصطفیٰ (برگزیدہ) کے لقب سے عام طور پر مشہور ہیں۔ حدیث صحیح میں ہے:

((ان اللّٰه اصطفٰی کنانة من ولد اسمٰعیل و اصطفٰی قریشا من کنانة واصطفٰی بنی هاشم من قریش و اصطفانی من بنی هاشم)) [1]

''بے شک خدا نے اولاد اسمٰعیل میں سے کنانہ کو برگزیدہ کیا اور کنانہ میں سے قریش کو برگزیدہ کیا اور قریش میں سے بنی ہاشم کو برگزیدہ کیا اور بنی ہاشم میں مجھ کو برگزیدہ کیا۔''

چوتھی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ جس سے میرا جی راضی ہوا۔ یہ صفت نہ صرف آنحضرت ﷺ کے لئے بلکہ آپ کے وسیلہ سے تمام پیروان محمدی میں عام ہے:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ﴾ (٤٨/ الفتح:٢٩)

''محمد خدا کا رسول اور جو اس کے ساتھ ہیں...... وہ خدا کی مہربانی اور رضا کو ڈھونڈتے ہیں۔''

﴿ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾

(٥/ المآئدة:١١٩، ٩/ توبة:١٠٠، ٥٨/ المجادلة:٢٢، ٩٨/ البينة:٨)

[1] جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب ما جآء فی فضل النبی ﷺ: ٣٦٠٥، ٣٦٠٦۔

''خدا ان سے راضی ہوا اور وہ خدا سے راضی ہوئے۔''

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (٤٨/ الفتح:١٨)

''بے شک خدا مومنوں سے راضی ہوا۔''

تمام انبیا کی امتوں سے یہ مخصوص وصف امت محمدی ہی کا ہے، اس کے پیرو رضی اللہ عنہ کی دعا سے ہمیشہ مخاطب ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اشعیاء اس پیغمبر کا وصف یہ بتاتے ہیں کہ خدا اس سے کہتا ہے: میں نے اپنی روح اس پر رکھی۔ قرآن نے اس وصف سے بھی آنحضرت ﷺ کو متصف کیا ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ﴾ (٤٢/ الشوریٰ:٥٢)

''ہم نے تیری طرف اپنی شان کی ایک روح وحی کی۔''

﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴾ (٢٦/ الشعرآء:١٩٣)

''امانت دار روح اس کو لے کر اتری۔''

﴿ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ ﴾ (١٦/ النحل:١٠٢)

''کہہ دے کہ روح القدس نے اس کو اتارا ہے۔''

پانچواں وصف یہ بتایا گیا کہ وہ نہ چلائے گا اور وہ اپنی صدا بلند نہ کرے گا اور اپنی آواز بازاروں میں نہ سنائے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کی سیرت کے خط و خال کی بھی تصویر کھینچی ہے۔ متعدد صحابہ سے روایت ہے کہ آپ کبھی زور سے نہیں ہنستے تھے۔ بلکہ صرف مسکراتے تھے۔ 1 شمائل ترمذی میں حضرت ہند رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ اکثر چپ رہتے، بے ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے، ایک ایک فقرہ الگ اور صاف اور واضح ہوتا۔ ہنستے بہت کم تھے۔ ہنسی آتی تو مسکرا دیتے۔ 2

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک شخص نے آپ کے اخلاق پوچھے، انہوں نے جواب دیا کہ آنحضرت ﷺ بدگو نہ تھے اور نہ بازاروں میں شور کرتے تھے۔ 3 حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ آپ کے اوصاف کیا تھے؟ فرمایا، آپ شور و غل نہیں کرتے تھے۔ 4

سفر اشعیاء میں اس کے بعد ہے، وہ مسلے ہوئے سینٹھے کو نہ توڑے گا اور دھکتی ہوئی بتی کو نہ بجھائے گا مسکینوں، غریبوں اور کمزوروں کو نہ ستائے گا، وہ نرم دل اور نیک خو ہوگا۔ قرآن مجید نے آپ کے اس وصف کو نمایاں طریق سے بتایا ہے:

﴿ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾ (٦٨/ القلم:٤) ''اور بے شک تو بڑے خلق پر ہے۔''

---

1 شمائل ترمذی، باب ماجاء فی ضحك رسول الله ﷺ: ٢٢٥۔
2 شمائل ترمذی، باب کیف کان کلام رسول الله ﷺ: ٢٢٤۔
3 شمائل ترمذی، باب ما جاء فی خلق رسول الله ﷺ: ٣٤٦۔ 4 ایضًا: ٣٥٠۔

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۵۹)

''خدا کی رحمت کے سبب سے تو ان کے ساتھ نرم ہے، اگر تو کڑا اور دل کا سخت ہوتا تو یہ تیرے اردگرد سے ہٹ جاتے۔''

﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۲۸)

''تمہاری قوم سے تمہارے پاس ایک پیغمبر آیا، جس کو تمہاری تکلیف شاق ہوتی ہے، تمہاری بہی خواہی کا حریص ہے اور مسلمانوں پر مہربان اور رحمت والا ہے۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ آپ ﷺ نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام نہیں لیا، آپ برائی کے بدلہ برائی نہیں کرتے تھے، بلکہ معاف کرتے تھے اور درگزر فرماتے تھے۔ آپ نے کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ خندہ جبین، نرم خو، مہربان طبع تھے، سخت مزاج اور تنگ دل نہ تھے، ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ جو گویا آپ کے آغوش پروردہ تھے، بیان کرتے ہیں کہ آپ نرم خو تھے، سخت مزاج نہ تھے، خود اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی غصہ نہ فرماتے اور نہ کسی سے انتقام لیتے۔ ❶

حضرت انس رضی اللہ عنہ خادم خاص کہتے ہیں کہ میں نے دس برس آپ ﷺ کی خدمت کی مگر آپ نے کبھی کسی معاملہ کی مجھ سے باز پرس نہ فرمائی۔ ❷ مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ جو بیس دن تک آپ کی صحبت میں رہے تھے، کہتے ہیں کہ آپ رحیم المزاج اور رقیق القلب تھے۔ ❸

حضرت اشعیاء اس کے بعد کہتے ہیں کہ وہ عدالت کو قائم کرے گا کہ دائم رہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نبی آخر الزمان ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا اور نہ آپ کی شریعت منسوخ ہوگی، آپ آخری دین لے کر آئے، جو قیامت تک دائم رہے گا، پھر کہتے ہیں کہ اس وقت تک اس کا زوال نہ ہوگا اور نہ مسلا جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے، یعنی جب تک اس کی شریعت اور تعلیم قائم نہ ہو جائے گی، اس کو موت نہ آئے گی، ظاہر ہے کہ یہ وصف حضرت عیسیٰ پر صادق نہیں آتا کہ وہ اپنی تعلیم و شریعت کے استحکام سے پہلے اس دنیا سے اٹھ گئے، یہ مخصوص وصف آنحضرت ﷺ کا ہے، جو اس وقت تک اس دنیا میں تشریف فرما رہے، جب تک آپ کی تعلیم و شریعت نے ظہور تام اور استحکام کامل نہیں حاصل کر لیا، چنانچہ جب یہ بات حاصل ہوگئی تو آپ کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہونے کی اجازت ملی، حضرت اشعیاء کی یہ پیشین گوئی قرآن مجید کے

---

❶ یہ تمام روایات شمائل ترمذی، باب ماجاء فی خلق رسول اللہ ﷺ: ۳٤٦ تا ۳۵۰ میں مذکور ہیں۔

❷ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب کان رسول اللہ ﷺ احسن خلقا:۲۰۱۱ وابو داود، کتاب الادب، باب فی الحلم واخلاق النبی ﷺ: ٤٧٧٤۔

❸ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الناس والبھائم:۲۰۰۸۔

اس سورہ کے مطابق ہے۔

﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ ﴾ (١١٠/ النصر)

''جب خدا کی نصرت اور فتح آ چکی اور تو نے لوگوں کو گروہ در گروہ دین الٰہی میں آتے دیکھ لیا (تو تیرا فرض انجام پا چکا اور اس دنیا سے تیری رخصت کے دن قریب آ گئے) اب خدا کے حمد و استغفار میں مصروف ہو، کہ وہ رحم کرنے والا ہے۔''

جب یہ سورہ نازل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے تمام صحابہ کو جمع کر کے فرمایا: ''خدا کے ایک بندہ کو اختیار دیا گیا تھا کہ چاہے وہ اس دنیا کو قبول کرے یا دوسری دنیا کا سفر اختیار کرے، مگر اس بندہ نے آخرت کو پسند کیا'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ سن کر رو پڑے، وہ سمجھ گئے کہ یہ بندہ کون ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے امتحاناً اس سورہ کا مطلب پوچھا، انہوں نے جواب دیا کہ اس میں آنحضرت ﷺ کی وفات کا اشارہ ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس کی تصدیق کی۔ [1]

اس کے بعد اشعیاء کہتے ہیں کہ تمام بحری ممالک اس کی شریعت کی راہ تکیں ۔ یہ اسلام ہی تھا، جس کی شریعت نہر سیحون اور جیحون اور دجلہ و فرات سے ہو کر بحر روم تک اور بحر ہند سے بحر ظلمات تک پھیل گئی اور بڑے بڑے جزیرے اس کے نور سے منور ہو گئے ، بعد ازیں اشعیاء اللہ کا وعدہ سناتے ہیں کہ میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا اور تیری حفاظت کروں گا۔'' یہ وعدہ بھی آنحضرت ﷺ کے ساتھ پورا ہوا، آپ نے یکہ وتنہا دعوت توحید کی اس وقت اشاعت کی جب ملک عرب کا ذرہ ذرہ آپ کے خون کا پیاسا تھا اور خدا کے سوا کوئی آپ کا دستگیر نہ تھا، اس نے دشمنوں کے نرغہ میں نازک سے نازک اور خطرناک سے خطرناک حملوں سے آپ کی ذات گرامی کو محفوظ رکھا اور سفر اشعیاء کے وعدے کو قرآن کے ذریعہ سے دوبارہ دہرایا اور مکہ میں عین اس وقت جب دشمنوں کی عداوت کا آفتاب پوری تمازت پر تھا یہ آیت اتری:

﴿ وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ۭ ﴾ (١٧/ الاسرآء:٦٠)

''اور یاد کرو اے محمد (ﷺ!) جب ہم نے تم سے فرمادیا کہ تمہارے پروردگار نے لوگوں کو ہر طرف سے روک رکھا ہے کہ تم پر ہاتھ ڈالیں۔''

﴿ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا ﴾ (٥٢/ الطور:٤٨)

''اور اپنے رب کے حکم کا صبر کے ساتھ انتظار کر کہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔''

مدینہ میں آ کر یہ وعدہ مکرر دہرایا گیا:

﴿ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ ﴾ (٥/ المائدہ:٦٧)

---

[1] صحیح بخاری، تفسیر سورۂ مذکور:٤٩٦٩، ٤٩٧٠۔

''اور خدا لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا۔''

صحابہ جان نثاری سے آنحضرت ﷺ کے خیمہ کے گرد پہرا دیا کرتے تھے، جب یہ آیت اتری تو آپ نے خیمہ سے سر مبارک باہر نکال کر فرمایا: ''لوگو واپس جاؤ کہ خدا نے میری حفاظت کا خود وعدہ کیا ہے۔'' اس وصف کے مستحق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہو سکتے جو عیسائیوں کے اقرار کے مطابق رومیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر سولی پر لٹکائے گئے۔

بشارات اشعیاء میں اس کے بعد ہے: ''میں تجھ کو لوگوں کے لئے عہد اور قوموں کے لئے نور بناؤں گا کہ تو اندھوں کی آنکھوں کو کھولے اور بندھے ہوؤں کو قید سے نکالے اور ان کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں قید سے نکالے۔'' تاریخ گواہ ہے کہ بشارت کا یہ حصہ پیغمبر اسلام کے وجود سے کس خوبی سے پورا ہوا، قرآن مجید نے بھی بشارت کے اس حصہ کو ان الفاظ میں مکمل کیا:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ (۷/ الاعراف: ۱۵۷، ۱۵۸)

''وہ لوگ جو اس ان پڑھ فرستادہ پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں، جس کو وہ اپنے ہاں توراۃ و انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ ان کو نیکی کا حکم کرتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور اچھی چیزیں ان کے لئے حلال کرتا ہے اور بری چیزیں ان پر حرام کرتا ہے اور ان سے ان کی ان پابندیوں اور زنجیروں کو جو ان پر ہیں ہلکا کرتا ہے۔ تو جن لوگوں نے اس کو مانا اور اس کی مدد اور نصرت کی اور اس کی روشنی کے پیچھے چلے جو اس کے ساتھ اتاری گئی ہے۔ وہی کامیاب ہوں گے، کہہ دے (اے پیغمبر ﷺ) اے لوگو! میں تم سب کے پاس خدا کا بھیجا ہوا ہوں۔''

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۴۵)

''اے پیغمبر ﷺ! ہم نے تجھ کو گواہ، خوشخبری دینے والا ہشیار کرنے والا اور خدا کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔''

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝ ﴾

(۴/ النسآء: ۱۷۵)

''اے لوگو! تمہارے پاس خدا کی طرف سے دلیل آ چکی۔ ہم نے تمہاری طرف وہ نور اتارا جو

ہر چیز کو روشن کرتا ہے۔"

﴿ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ ﴾ (٦٤/ التغابن:٨) "اور اس نور پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتارا۔"

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (٢١/ الانبیآء:١٠٧)

"اے محمد (ﷺ)! ہم نے تجھ کو تمام دنیا کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔"

﴿ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڏ ﴾ (١٤/ ابراھیم:١)

"یہ کتاب ہے جس کو ہم نے تیری طرف اتارا ہے۔ تاکہ تو لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لائے۔"

﴿ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ:٥٢)

"لیکن ہم نے اس کو نور بنایا ہے، تاکہ ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ دکھائیں اور تو سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔"

اس کے بعد اس بشارت میں ہے کہ آنے والا پیغمبر توحید کامل کا مبلغ، بت شکن اور باطل پرستی کا دشمن ہو گا اور بت پرست کفار و مشرکین کو وہ شکست عظیم دے گا۔

"یہودا (اللہ) میرا نام ہے اور اپنی شوکت دوسرے (معبودان باطل) کو نہ دوں گا اور وہ ستائش جو میرے لئے ہوتی ہے کھودی ہوئی مورتوں کے لئے نہ دوں گا...... وہ پیچھے ہٹیں اور نہایت پشیمان ہوں، جو کھودی ہوئی مورتوں کا بھروسہ رکھتے ہیں اور ڈھالے ہوئے بتوں کو کہتے ہیں کہ تم ہمارے الٰہ ہو۔"

حضرت اشعیاء کے بعد دنیا میں وہ کون پیغمبر آیا جس نے توحید کامل کی تعلیم پیغمبر اسلام سے واضح تر اور کامل تر دی ہو۔ جس نے بت پرستی کی بیخ کنی کی ہو، جس نے بت خانوں کو منہدم کیا ہو، جس نے مشرکین کی صفوں کو درہم برہم کیا ہو اور باطل پرستی کے علم کو ہمیشہ کے لئے سرنگوں کر دیا ہو۔ قرآن اور آپ ﷺ کی تعلیمات کا بڑا حصہ شرک و بت پرستی کے خلاف جہاد عظیم ہے اور تمام دنیا کو اعتراف ہے کہ اس فرض کو رسول اللہ ﷺ نے جس خوبی اور تکمیل کے ساتھ ادا کیا، وہ کسی اور سے نہ ہو سکا۔

بعد ازیں حضرت اشعیاء بتاتے ہیں کہ وہ آنے والا پیغمبر مجاہد اور تیغ زن ہو گا اور وہ باطل پرستوں کے خلاف اپنی تلوار اٹھائے گا۔

"خداوند ایک بہادر کے مانند نکلے گا، وہ جنگی مرد کی طرح اپنی غیرت کو اکسائے گا، وہ چلائے گا ہاں وہ جنگ کے لئے بلائے گا، وہ اپنے دشمنوں پر غالب ہو گا۔"

یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صفت نہیں ہو سکتی، یہ صرف بدر واُحد اور حنین وخندق کے سپہ سالار پیغمبر کی شان ہے:

''بیابان (عرب) اور اس کی بستیاں قیدار کے آباد دیہات اپنی آواز بلند کریں گے۔''

اس فقرہ میں آنے والے پیغمبر کا وطن (بیابان عرب) اور خاندان (قیدار بن اسمٰعیل) بھی بتا دیا گیا ہے۔ آخر میں ہے:

''اور اندھوں کو اس راہ سے جسے وہ نہیں جانتے لے جاؤں گا، میں انہیں ان رستوں پر جن سے وہ آگاہ نہیں لے چلوں گا۔''

اس فقرہ میں یہ ارشاد ہے کہ وہ امیوں کا پیغمبر اور اس قوم کا داعی ہوگا۔ جس کو کبھی راہ راست کی ہدایت نہیں ملی۔ یہ صفت اہل عرب کی ہے، جن کو آپ ﷺ سے پہلے کوئی صاحب شریعت پیغمبر نہیں ملا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے تھے۔ جن کو شریعت مل چکی تھی۔ اس لئے یہ ان کی صفت نہیں ہو سکتی، بلکہ یہ صرف پیغمبر عرب کا وصف خاص ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے صاف کہا:

﴿ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ ﴾ (۲۸/ القصص:۴۶)

''تاکہ ان کو ہوشیار کرے جن کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ہوشیار کرنے والا نہیں آیا۔''

﴿ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ ﴾ (۳۶/ یٰسٓ:۳ تا ۶)

''تو یقیناً پیغمبروں میں سے ہے اور سیدھی راہ پر ہے اور یہ غالب مہربان خدا کی طرف سے اترا ہے، تاکہ تو ان کو ہوشیار کرے جن کے باپ دادا ہشیار نہیں کیے گئے تو وہ غفلت میں ہیں۔''

﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ ﴾ (۶۲/ الجمعۃ:۲)

''وہی خدا جس نے ان پڑھوں میں پیغمبر بنا کر ان ہی میں سے کھڑا کیا، جو ان کو خدا کی آیتیں پڑھ کر سناتا اور کتاب اور دانائی سکھاتا ہے، اگرچہ وہ پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔''

﴿ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۠ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ ﴾

(۶/ الانعام ۱۵۶ تا ۱۵۸)

''یہ کتاب ہے جس کو ہم نے اُتارا ہے، جو برکت والی ہے، تو اس کی پیروی کرو اور پرہیز گاری اختیار کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے (یہ کتاب تم کو اس لئے دی گئی) تاکہ یہ نہ کہو کہ کتاب تو ہم

سے پہلے یہود اور نصاریٰ دو قوموں کو عطا ہوئی اور ہم اس کے پڑھنے سے غافل تھے یا یہ کہو کہ اگر خاص ہم پر کوئی کتاب اترتی تو ہم ان سے زیادہ راہ راست پر ہوتے، تو لو تمہارے پاس خدا کی طرف سے کھلی دلیل، ہدایت اور رحمت آ چکی۔"

﴿ وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ۝ ﴾

(٣٤/ سبا:٤٤)

"اور ہم نے ان کو نہ تو کتابیں دیں جن کو وہ پڑھیں اور نہ تجھ سے پہلے ان کے پاس کوئی ڈرانے والا بھیجا۔"

اس بشارت کے تمام فقروں پر جو شخص اس تفصیل سے نظر ڈالے گا اور اس کے ایک ایک فقرہ کی قرآن پاک، احادیث شریف اور سوانح نبوی ﷺ کے ساتھ حرف حرف تطبیق پر غور کرے گا، وہ اس یقین کے پیدا کرنے پر مجبور ہوگا کہ اس بشارت کا مصداق محمد بن عبداللہ کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا:

﴿ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ ﴾

(٥٧/ الحدید:٩)

"وہی جو اپنے بندہ پر کھلی آیتیں اتارتا ہے، تا کہ وہ تم کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے جائے۔"

سورۂ فتح میں جس میں آنحضرت ﷺ کو فتح مکہ کی بشارت دی گئی ہے۔ توراۃ اور انجیل کی ایک پیشینگوئی کا حوالہ دیا گیا ہے:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ڔ ﴾ (٤٨/ الفتح:٢٩)

"محمد ﷺ خدا کا بھیجا ہوا اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر بھاری آپس میں مہربان ہیں۔ دیکھتے ہو تم ان کو کہ (خدا کے سامنے) رکوع اور سجدے میں گرے رہتے ہیں اور خدا کی رحمت اور خوشنودی کے جویاں رہتے ہیں۔ ان کے چہروں میں سجدہ کے اثر سے نور ہے ان کی حالت کا یہ بیان توراۃ میں ہے۔"

آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام کا یہ مجموعی وصف فتح مکہ کے موقع پر بیان کیا گیا ہے۔ جو اسلام کی دعوت کی تکمیل، توحید الٰہی کے انجام، خانہ خلیل کی کامل آزادی اور معبودانِ باطل کی دائمی شکست کا دن ہے اور اس کے بعد کوئی نیا پیغام سنانے والا دنیا میں آنے والا نہ تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی کی آخری

وصیت جس پر ان کی توراۃ اور ان کے صحیفہ حیات دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے، بنی اسرائیل کو یہ فرمائی:

''یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مرد خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لئے تھی۔ ہاں وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے، اس کے سارے مقدس (ہمراہی) تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں اور تیری باتوں کو مانیں گے۔'' (استثناء ۳۳_۱،۲،۳)

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آخری کلام ہے، جس میں آخری پیغمبر کی بعثت کی خبر دی ہے، اس بشارت میں کوہ فاران سے نور الٰہی کے طلوع ہونے کی خوشخبری ہے، اس میں چار باتیں بیان کی گئی ہیں۔ جو قرآن مجید کے بیان کے عین مطابق ہیں:

① وہ دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ ﴾ (۴۸/ الفتح:۲۹)

''محمد ﷺ خدا کے فرستادہ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں۔''

② اس کے ہاتھ میں ان کے لئے آتشیں شریعت ہوگی:

﴿ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ ﴾ (۴۸/ الفتح:۲۹)

''وہ اللہ کے منکروں پر سخت ہوں گے۔''

③ وہ اپنے لوگوں سے محبت کرے گا:

﴿ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ ﴾ (۴۸/ الفتح:۲۹)

''آپس میں ایک دوسرے پر مہربان ہونگے۔''

④ (اے خدا) اس (آنے والے پیغمبر) کے سارے مقدس لوگ (یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم) تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں اور تیری باتوں کو مانیں گے:

﴿ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ﴾ (۴۸/ الفتح:۲۹)

''دیکھتے ہو تم ان کو خدا کے آگے رکوع اور سجود میں جھکے ہوئے، خدا کی مہربانی اور خوشنودی کے طلب گار ہیں، اطاعت و عبادت کے اثر سے ان کے چہروں میں نورانیت ہے۔''

ایک عجیب بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس آنے والے پیغمبر کے مقدس ساتھیوں کی تعداد دس ہزار فرماتے ہیں۔ فتح مکہ کے دن بعینہٖ یہی دس ہزار مقدسین تھے۔ جو اس فاران سے آنے والے نورانی پیکر

کے ساتھ شہر خلیل (مکہ) کے دروازے میں داخل ہوئے اور اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کہا تھا وہ پورا ہوا۔

سورۂ فتح میں اس کے بعد ہے:

﴿ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ ۚ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ ﴾ (٤٨/ الفتح:٢٩)

''اور ان کی مثال انجیل میں مثل کھیت کے ہے۔ جس نے ٹہنی نکالی، پھر اس کو مضبوط کیا۔ پھر موٹا ہوا۔ پھر اپنی ٹہنیوں پر کھڑا ہوا۔ کھیت والوں کو خوش اور مسرور کر رہا ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ تمثیل آسمانی بادشاہی کی دی ہے۔ چنانچہ انجیل کے مختلف نسخوں میں یہ تمثیل ان مختلف الفاظ میں مذکور ہے:

''آسمان کی بادشاہت رائی کے دانہ کے مانند ہے۔ جسے ایک شخص نے لے کے اپنے کھیت میں بویا۔ وہ سب بیجوں میں چھوٹا ہے، پر جب اگتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے۔ اور ایسا پیڑ ہوتا ہے کہ ہوا کی چڑیاں آکے اس کی ڈالیوں پر بسیرا کریں۔'' (متی ۱۳۔۳۱، مرقس ۴۔۳۰)

''خدا کی بادشاہت ایسی ہے جیسا ایک شخص جو زمین میں بیج بوئے اور رات دن وہ سوئے، اٹھے اور بیج اس طرح اگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے، اس لئے کہ زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے۔ پہلے سبزی پھر بال بعد اس کے بال میں تیار دانے اور جب دانا پک چکا تو وہ فی الفور ہنسوا بھجواتا ہے کیونکہ کاٹنے کا وقت آچکا ہے۔'' (مرقس ۴۔۲۶)

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آسمانی بادشاہت کی جو تمثیل دی ہے۔ قرآن مجید نے اسی کو سورۂ فتح میں دہرایا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اسلام کی جسمانی اور روحانی، ظاہری و باطنی دونوں بادشاہیوں کے جلوس وشوکت کا دن فتح مکہ کا دن ہے اور آسمانی بادشاہی کی تمثیل پوری ہوئی کہ محمد ﷺ نام ایک کاشتکار نے ایک بیج زمین میں ڈالا اور اس سے سینکڑوں ہزاروں خوشے پیدا ہوگئے اور اس نے آسمانی بادشاہی کی منادی کی۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو نصیحت کرتے ہیں:

''خداوند! تیرا خدا تیرے لئے تیرے درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میرے مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی طرف کان دھرو۔'' (استثناء ۱۸۔۱۵)

''میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اس سے کہوں گا، وہ سب ان سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی

میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا، نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔ لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے، جس کے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے گا۔ اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ میں کیونکر جانوں کہ یہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں تو جان لے کہ جب نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے اور جو اس نے کہا ہے واقع نہ ہو یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی۔ بلکہ اس نبی نے گستاخی سے کہی ہے تو اس سے مت ڈرو۔'' (استثناء ۱۸۔۱۹)

عیسائیوں نے اس بشارت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ثابت کرنا چاہا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس کے مصداق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہو سکتے۔ اس بشارت میں ہے کہ یہ نبی بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے مبعوث ہوگا۔ بنی اسرائیل کے بھائی بنو اسمٰعیل تھے، اس سے یہ مفہوم ہے کہ وہ پیغمبر نسل اسمٰعیل علیہ السلام سے ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسماعیلی نہ تھے۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی نہیں مانتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ وہ آئندہ نبی میرے مانند ہوگا۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام میں کوئی وجہ مماثلت نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحب شریعت تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جنگجو اور مجاہد تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو غلامی سے نکال کر بادشاہی تک پہنچایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ظاہری و معنوی دونوں معنوں میں بادشاہ تھے،' حضرت عیسیٰ نہ تھے، حضرت موسیٰ صرف واعظ نہ تھے، عمل فرما اور کار پرداز بھی تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف واعظ تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوموں اور ملکوں کے فاتح تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک چپہ زمین پر بھی قابض نہ تھے۔ برخلاف اس کے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ میں یہ تمام اوصاف مشترک تھے، اس لئے وہ موعود نبی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مانند پیدا ہونے والا تھا۔ وہ آنحضرت ﷺ ہی تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بشارت میں جو کچھ فرمایا ہے، قرآن مجید نے اس کی حرف حرف تصدیق کی ہے۔ قرآن مجید کا بیان ہے کہ خدا نے روز اوّل تمام انبیا علیہم السلام سے یہ عہد لیا تھا کہ ہر نبی دوسرے نبی کی تائید کرتا جائے اور اپنی امت کو یہ نصیحت کر جائے کہ جب کوئی پیغمبران کے پاس آئے تو وہ اس کی تصدیق کرے:

﴿ وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ ۚ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي ۖ قَالُوا أَقْرَرْنَا ۚ قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ ﴾ (۳/ آل عمران: ۸۱)

''اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ ہم جو تم کو کتاب اور دانائی دیں اور پھر کوئی پیغمبر تمہارے پاس آئے جو کتاب اور شریعت تمہارے پاس ہے۔ اس کی تصدیق کرتا

ہو، تو ضرور اس کو ماننا اور اس کی مدد کرنا اور فرمایا کہ کیا تم نے اس کا اقرار کر لیا اور ان باتوں پر جو ہم نے تم سے عہد و پیمان لیا ہے۔اس کو تسلیم کیا؟ پیغمبروں نے عرض کیا کہ ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔فرمایا تو تم گواہ رہو اور تمہارے ساتھ ہم بھی گواہ ہیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو آنے والے پیغمبر کی اطاعت کی جو نصیحت فرمائی، وہ اسی ازلی عہد و پیمان کا ایفا تھا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آنے والے پیغمبر کی نسبت ارشاد فرمایا کہ وہ میرے مانند ہوگا۔قرآن مجید نے بھی اس کی تصدیق کی:

﴿ إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ أَرْسَلْنَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝ ﴾

(۷۳/ المزمل:۱۵)

''ہم نے تمہارے پاس ایک پیغمبر کو بھیجا ہے۔جو تم پر گواہ ہے، جس طرح کہ ہم نے فرعون کے پاس ایک پیغمبر بھیجا تھا۔''

اس پیغمبر کا وصف یہ ہوگا کہ خدا اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالے گا۔قرآن مجید نے اپنے پیغمبر کی نسبت کہا:

﴿ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰٓ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ ﴾ (۵۳/ النجم:۳، ٤)

''اور اپنی خواہش نفسانی سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہی کہتا ہے کہ جو اس سے خدا کی طرف سے کہا جاتا ہے۔''

توراۃ میں ہے:

''اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا۔نہ سنے گا تو میں اس کا حساب لوں گا۔''

قرآن مجید نے بھی یہی اعلان کیا کہ جو محمد رسول اللہ ﷺ کی پیروی سے منکر ہوگا، اس کو اپنے حساب کے لئے تیار رہنا چاہیے:

﴿ وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ ﴾

(۱۳/ الرعد:٤٠)

''اور اے پیغمبر! عذاب وغیرہ کے جو وعدے (ان کفار سے) ہم کرتے ہیں۔ان میں سے بعض تو تمہاری زندگی ہی میں تم کو پورا کر کے دکھائیں گے۔یا ان کے پورا ہونے سے پہلے تم کو دنیا سے اٹھالیں گے۔تمہارا کام ہمارے احکام کو ان تک پہنچا دینا تھا اور ان کا حساب لینا میرا کام ہے۔''

توراۃ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی اس بشارت میں یہ کہا:

''لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے۔ جس کے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے گا۔''

قرآن مجید نے بھی اس فرمان کی صداقت پر اپنی مہر ثبت کر دی:

﴿ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ۝ ﴾ (٦٩/ الحاقة:٤٤ تا ٤٧)

''اگر پیغمبر (محمد ﷺ!) کچھ جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر کہتا تو ہم اس کا ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی گردن کی شہ رگ کاٹ ڈالتے، پھر تم میں سے کوئی اس کو مجھ سے نہ بچا سکتا۔''

توراۃ نے اس آنے والے پیغمبر کی نشانی یہ بتائی کہ اس کی تمام پیشین گوئیاں سچی ہوں گی۔ سیرت نبوی ﷺ کے تمام ابواب تمہارے سامنے ہیں۔ دیکھو کہ اس نشانی کی صداقت میں ایک ذرہ بھی کبھی کمی ہوئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رؤیا میں جو کچھ آپ ﷺ دیکھتے تھے، وہ سپیدہ صبح کی طرح ظاہر ہوتا تھا [1] مسلمان تو مسلمان خود کفار تک کو اس پر یقین تھا کہ آنحضرت ﷺ کی کوئی پیشین گوئی غلط نہیں ہوتی۔ یاد ہوگا کہ غزوۂ بدر سے پہلے ایک صحابی عمرہ ادا کرنے مکہ گئے تھے۔ انہوں نے قریش کے رئیس امیہ سے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمادیا ہے کہ ''تو قتل ہوگا۔'' اس پیشین گوئی کا یہ اثر اس پر ہوا کہ کانپ گیا۔ معرکہ بدر میں وہ گھر سے نکلتے ہوئے ڈرتا تھا، جاتے ہوئے اس کی بیوی نے دامن پکڑ لیا کہ کہاں جاتے ہو۔ تم کو اس مدینہ والے کی پیشین گوئی یاد نہیں [2] آنحضرت ﷺ نے سینکڑوں پیشین گوئیاں کیں اور ان میں سے ایک ایک سچائی کے معیار پر پوری اتری۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ابن ناطور جو قیصر روم کا محرم راز اور شام کا اسقف (بشپ) تھا، اس نے بیان کیا کہ ہرقل قیصر روم منجم تھا۔ ایک دن وہ دربار میں آیا تو چہرہ متغیر تھا۔ کسی درباری نے سبب دریافت کیا، تو اس نے کہا: رات ستاروں کو دیکھ کر یہ نظر آیا کہ "ملك الختان" (ختنہ کا بادشاہ یا فرشتہ) ظاہر ہوگیا۔ تو تحقیق کرو کہ ختنہ کس قوم میں رائج ہے۔ درباریوں نے کہا کہ ختنہ تو صرف یہود کرتے ہیں۔ اس لئے آپ مضطرب نہ ہوں۔ صوبوں میں حکم جاری کر دیجئے کہ امسال یہودیوں کے یہاں جس قدر بچے پیدا ہوں سب قتل کر دیے جائیں، اسی اثنا میں حدود شام کے عرب رئیس غسان نے یہ خبر پہنچائی کہ عرب میں ایک پیغمبر پیدا ہوا ہے۔ قیصر نے کہا: دریافت کرو کہ کیا عرب ختنہ کرتے ہیں؟ اس کا جواب جب اس کو اثبات میں ملا تو اس نے کہا ہاں یہ اس امت کا ملک (بادشاہ یا فرشتہ) ہے۔ اور اس کے بعد اہل دربار سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر تم کو اپنی سلطنت بچانی منظور ہے تو اس پر ایمان لاؤ۔ درباریوں نے قیصر کی اس گفتگو کو سخت ناپسند کیا۔ مگر رومیہ میں

---

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی:٣۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب ذکر النبی ﷺ من یقتل ببدر:٣٩٥٠۔

قیصر کا ایک اور صاحب علم دوست تھا۔ قیصر نے اس کو لکھا تو اس نے بھی قیصر کی رائے کی تائید کی۔ [1]

ہمارے محدثین اس خبر کی صحیح حقیقت نہیں سمجھ سکے ہیں اور اسی لئے لفظ ملك الختان کا تلفظ نہ ملک (بادشاہ) ہے اور نہ ملک (فرشتہ) ہے۔ بلکہ ملاک ہے، جس کے معنی ''فرستادہ اور پیغامبر'' کے ہیں، جس کی اصل عربی میں الوکہ بمعنی پیغام ہے اور اگر یہ لفظ عربی تلفظ میں ملک پڑھا جائے تو یہ لفظ اس موقع پر ''فرشتہ'' کے اصطلاحی معنی میں نہیں بلکہ فرستادہ کے لغوی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ قیصر کا یہ لفظ ملاک الختان (ختنہ کا پیغامبر) استعمال کرنا درحقیقت توراۃ کی ایک پیشین گوئی کی طرف اشارہ ہے، ملاخیا نبی کی کتاب میں یہ پیشین گوئی ان الفاظ میں مذکور ہے:

''دیکھو میں اپنے رسول کو بھیجوں گا اور وہ میرے آگے میری راہ کو درست کرے گا اور وہ خداوند جس کی تلاش میں تم ہو۔ ہاں ختنہ کا رسول جس سے تم خوش ہو وہ اپنی ہیکل میں ناگہاں آئے گا۔ رب الافواج فرماتا ہے ''پر اس کے آنے کے دن کو کون ٹھہر سکے گا'' اور جب وہ ظاہر ہوگا کون ہے جو کھڑا رہے گا۔ کیونکہ وہ سنار کی آگ اور دھوبی کے صابون کے مانند ہے اور وہ روپیہ کا میل کاٹتا ہوا اور اسے خالص کرتا ہوا بیٹھے گا۔'' (باب۔۳)

آج کل کے ترجموں میں ''ختنہ کے رسول'' کے بجائے عہد کا رسول لکھا ہے۔ یہ ترجمہ صحیح بھی ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے جواب میں جس رسول کی بعثت کا وعدہ فرمایا تھا اس کے متعلق یہ بشارت ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ توراۃ کی زبان میں ''ختنہ'' نسل ابراہیمی علیہ السلام کے جسم پر اللہ اور ابراہیم علیہ السلام کے باہمی عہد و میثاق کی مہر کا نام ہے۔ توراۃ میں جہاں ختنہ کا حکم ہے مذکور ہے:

''اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ جسے تم یاد رکھو یہ ہے کہ تم میں ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کرو اور یہ اس عہد کا نشان ہے جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔'' (پیدائش ۱۷۔۱۰)

اس بنا پر ختنہ کے بجائے مترجمین نے عہد کا لفظ رکھ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے قرب مولد کے زمانہ میں اس پیشین گوئی کے مطابق اس "رسول الختان" کا یہود و نصاریٰ دونوں کو انتظار تھا اور قیصر روم اسی پیشین گوئی کے پورا ہونے کا منتظر تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں نہ تھی۔ کیونکہ اگر ان کے حق میں ہوتی تو عیسائی قیصر اس کی آمد کا منتظر نہ ہوتا۔ "رسول الختان" کے لفظ سے اس بات کا ارشاد بھی سمجھا جاتا ہے کہ وہ مختون قوم میں ظاہر ہوگا اور عیسائی مذہب نے اس رسم کو باطل قرار دیا ہے۔ یہودیت کے بعد اسلام ہی ہے۔ جس نے نسل ابراہیم کے اس عہد کو دنیا میں ہمیشہ برقرار

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی: ۷۔

رکھا ہے۔ تورات میں ایک اور بشارت ہے:

''خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔''
(استثناء ۳۳۔۲)

اس بشارت کا ایک ٹکڑا حضرت حبقوق نبی کے صحیفہ میں پھر دہرایا گیا ہے:

''خدا تیمان سے اور وہ جو قدوس ہے کوہ فاران سے آیا، اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا اور اس کی حمد سے زمین معمور ہوگئی۔'' (۳۔۳)

صحیفۂ استثناء کی بشارت میں خداوند کا مظہر تین پہاڑوں کو قرار دیا گیا ہے۔ کوہ سینا، کوہ سعیر اور کوہ فاران یہ درحقیقت خورشید نبوت کے تین مطلع ہیں۔ ان میں بہ ترتیب کوہ سینا سے حضرت موسیٰ علیہ السلام، کوہ سعیر سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور کوہ فاران سے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ مراد ہیں کہ وہ مکہ کی پہاڑیوں کا نام ہے۔ حضرت حبقوق اس بشارت میں کہتے ہیں کہ وہ تیمان سے آیا۔ تیمان کے لغوی معنی جنوب کے ہیں اور استعمال میں ملک یمن کو کہتے ہیں اور یہاں دونوں معنی ٹھیک ہیں۔ پھر کہتے ہیں: ''اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا۔'' یہ معراج آسمانی کی تشریح ہے۔ پھر کہتے ہیں: ''اس کی حمد سے زمین معمور ہوگئی۔'' زمین کا کون سا گوشہ ہے جو محمد ﷺ کی حمد سے معمور نہیں۔ لفظ حمد کہ محمد ﷺ کا مادہ اور عبادت اسلامی کا آغاز (الحمد الخ) ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تلمیح سے لبریز ہے۔

توراۃ کی اس بشارت کو قرآن مجید نے سورۂ والتین کے ان الفاظ میں ادا کیا:

﴿ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۙ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ ﴾ (۹۵/ التین: ۱ تا ۳)

''قسم ہے انجیر اور زیتون کی، طور سینا کی اور اس امن والے شہر کی۔''

سب کو معلوم ہے کہ انجیر اور زیتون والا ملک شام ہے۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مولد اور کوہ سعیر کا مبدأ ہے۔ طور سینا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عبارت ہے اور بلد امین یعنی مکہ سے محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف اشارہ ہے۔ علمائے اسلام نے توراۃ اور انجیل کی اور بھی بشارتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن ہم نے صرف ان ہی بشارتوں کا ذکر کیا ہے۔ جن کی طرف قرآن مجید اور احادیث میں اشارے پائے جاتے ہیں۔ کتب سیر و دلائل میں بہت سی پیشین گوئیاں عرب کے کاہنوں اور بت خانوں کے پجاریوں سے منقول ہیں۔ لیکن چونکہ ان کا بڑا حصہ اصول روایت کے رو سے کمزور ہے۔ اس لئے ہم ان کی تفصیل غیر ضروری سمجھتے ہیں، تاہم ان روایات کا قدر مشترک اس قدر ضرور نکلتا ہے کہ عرب بھی ایک پیغمبر کے وجود کا تشنہ تھا۔ روم و فارس کی دہ سالہ جنگ نے مشرق و مغرب کی سرزمین کو لالہ زار بنا دیا تھا اور خیالات میں تلاش امن کی شورش برپا کر دی تھی اور عرب میں اصحاب الفیل کا واقعہ دلوں میں لرزش پیدا کرنے کے لئے کافی تھا اور عین یہی موسم دنیا میں روح اعظم کے ظہور کا ہوتا ہے۔ اس لئے مولد نبی کے قریب زمانہ میں عرب و روم اور یہود و نصاریٰ سب کو توراۃ اور انجیل کی

بشارتوں کے مطابق ایک آنے والے کا انتظار تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی زبانی مروی ہے کہ جب قاصد نبوی ﷺ دعوت نامہ اسلام لے کر قیصر کے دربار میں پہنچا اور قیصر نے ابوسفیان کو بلا کر جو اس وقت تک کافر تھے۔ آنحضرت ﷺ کے متعلق چند استفسارات کیے اور ابوسفیان نے ان کے جو جوابات دیے ان کو سن کر اس نے بھرے دربار میں کہا تم نے جو کچھ بیان کیا اگر وہ سچ ہے تو ایک دن یہ میرے پاؤں کے نیچے کی مٹی اس کے قبضہ میں ہوگی۔ مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا، اگر ممکن ہوتا تو میں خود جا کر اسکی زیارت کرتا اور اگر وہاں ہوتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا۔ [1]

قیصر کے محرم راز اور شام کے بشپ ابن ناطور کا بیان اوپر پڑھ چکے ہو کہ قیصر کا خیال تھا کہ ختنہ والے رسول کی پیدائش کا زمانہ قریب ہے اور رومیہ کے ایک مسیحی عارف نے بھی خط لکھ کر قیصر کے خیال کی تائید کی۔ مقوقس شاہ مصر کے دربار میں جو قاصد نبوی ﷺ خط لے کر گیا تھا، وہ بھی یہ جواب لایا کہ ہاں ہم کو بھی یقین تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، لیکن خیال تھا کہ وہ شام میں پیدا ہوگا، حبش کے عیسائی بادشاہ نے لکھا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ سچے پیغمبر ہیں۔ [2]

یاد ہوگا کہ یمن کے شہر نجران سے عیسائیوں کا ایک وفد حاضر خدمت ہوا تھا اور فیصلہ حق کے لئے یہ قرار پایا تھا کہ دونوں فریق مباہلہ کریں۔ لیکن وفد کے سمجھدار عیسائیوں نے وفد کو آنحضرت ﷺ کے مقابل میں مباہلہ سے منع کیا اور کہا کہ خدا کی قسم! اگر یہ سچے پیغمبر ہیں تو ہم ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جائیں گے [3] اس سے معلوم ہوا کہ ان کو بھی پیغمبر کی آمد کا گمان تھا، اسلام سے پہلے زید ایک عرب موحد تلاش حق میں مدتوں سے سرگرداں رہے، وہ پہلے یثرب (مدینہ کا پہلا نام) گئے، دیکھا تو وہاں کے یہودی بھی توحید کامل پر قائم نہ تھے۔ یہاں سے نکل کر خیبر کے یہودیوں کے پاس گئے اور ان کا بھی یہی حال پایا۔ وہاں سے شام کے عیسائیوں میں گئے دیکھا کہ وہ بھی مشرک ہیں۔ آخر شام کے ایک راہب نے کہا کہ اگر تمہیں دین حق کی تلاش ہے تو عراق جاؤ، وہاں ایک بزرگ ہیں۔ زید جب ان کے پاس پہنچے اور لب سوال وا کیا تو دریافت کیا کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ زید نے کہا، حرم مکہ سے۔ ان بزرگ نے کہا، جاؤ تم اپنے وطن کو لوٹ جاؤ۔ دین حق کا وہیں ظہور ہونے والا ہے۔ وہ لوٹ کر مکہ آئے لیکن اسلام سے پہلے ان کی وفات ہوگئی [4] ورقہ بن نوفل کا واقعہ تم سیرت جلد اول میں پڑھ چکے ہو کہ وہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے۔ بعثت کے پہلے ہی روز جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو لے کر ورقہ کے پاس گئی تو ورقہ نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی اور آرزو ظاہر کی کہ کاش! میں آپ کی ہجرت تک رہتا تو آپ کی مدد کرتا، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں کو آنے والے پیغمبر کا اس وقت انتظار تھا۔ ابن سعد، ابن اسحاق، مسند احمد، تاریخ بخاری، مستدرک حاکم، دلائل بیہقی،

---

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی: ۷۔ [2] سیرت نبوی۔

[3] سیرت نبوی، جلد دوم۔ [4] مسند ابوزرعة، خصائص، ج۱، ص: ۲۴۔

معجم طبرانی، دلائل ابونعیم وغیرہ میں متعدد روایتیں ایسی ہیں جن سے مجموعی طور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ظہور سے پہلے مدینہ کے یہودیوں میں بھی آنے والے پیغمبر کے جلد ظاہر ہونے کے چرچے رہا کرتے تھے اور انہیں سے سن سن کر اوس وخزرج کے کانوں میں پیغمبر کی بعثت کی خبر پڑی ہوئی تھی اور اکثروں کے لئے یہ خبر ہدایت کا باعث بنی۔ چنانچہ ابن سعد کے علاوہ دیگر کتب مذکورہ میں ایک نوجوان انصاری کا واقعہ بسند صحیح مذکور ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں چھوٹا تھا تو مدینہ میں ایک یہودی واعظ تھے۔ اثنائے وعظ میں اس نے ایک پیغمبر کے ظہور کی بشارت دی۔ لوگوں نے پوچھا کہ وہ کب تک ظاہر ہوگا؟ اس نے ان انصاری کی طرف جو اس مجمع میں سب سے چھوٹے تھے۔ اشارہ کر کے کہا کہ اگر یہ لڑکا جیتا رہا تو وہ اس کا زمانہ پائے گا۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی کا لڑکا آپ ﷺ کی خدمت میں رہا کرتا تھا۔ اتفاق سے وہ بیمار پڑا۔ آنحضرت ﷺ اس کی عیادت کو گئے اور اس کے باپ سے پوچھا کہ ''کیا میرا ذکر تم توراۃ میں پاتے ہو؟'' اس نے کہا نہیں۔ لڑکے نے فوراً جواب دیا ہاں یارسول اللہ! آپ کا ذکر ہم نے توراۃ میں پڑھا ہے اور یہ کہہ کر اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوگیا۔ [1] عربوں اور یہودیوں میں جب لڑائی ہوتی تو یہودی کہا کرتے تھے کہ ایک پیغمبر آنے والے ہیں، ان کے عہد میں ہم کو کامل فتح ہوگی۔ قرآن مجید نے ان کے اسی عقیدہ کو دہرا کر ان کے عدم اسلام پر ملامت کی ہے:

﴿ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ ۚ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۹)

''اس سے پہلے کافروں پر اسی آنے والے پیغمبر کا نام لے کر فتح چاہا کرتے تھے۔ پس جب وہ سامنے آگئے جس کو انہوں نے پہچان لیا تو انکار کر دیا۔ کافروں پر خدا کی لعنت ہو۔''

قرآن مجید نے اس کے علاوہ اور بھی متعدد مقامات پر یہودیوں کو ان کے اس سابق یقین کے خلاف ان کے موجودہ اظہار کفر پر ان کی سرزنش کی ہے:

﴿ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۗ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۴۴)

''جن کو کتاب پہلے دی جا چکی ہے وہ یقیناً ان نشانیوں کی بنا پر جو اس کتاب میں مذکور ہیں جانتے ہیں کہ یہ حق ہے، ان کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے۔''

﴿ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۴۶)

''جب کہ ہم پہلے کتاب دے چکے ہیں، اسلام کی صداقت کو اسی طرح جانتے ہیں، جس طرح

[1] بیہقی باسناد صحیح، مگر یہ روایت صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی:۱۳۵۶، سے کسی قدر مختلف ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ وہ لڑکا اپنے باپ کے مشورہ سے مسلمان ہوگیا۔

وہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں، لیکن ان میں سے ایک فریق جان کر حق کو چھپاتا ہے۔''

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ﴾ (٦/ الانعام:٢٠)

''جن کو ہم پہلے کتاب دے چکے ہیں وہ اس کو اسی طرح جانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو۔''

یہ انہی بشارتوں اور پیشین گوئیوں کا اثر تھا کہ علمائے یہود آنے والے نبی کے متعلق توراۃ کی بیان کردہ مختلف علامات اور نشانیوں کو اپنے ذہن میں رکھ کر حاضر خدمت ہوتے تھے اور سوالات کرتے تھے اور آپ ﷺ کا امتحان لیتے تھے اور جب ان کو تشفی ہو جاتی تھی تو وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔ نجاشی کے دربار میں جب حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے اسلام پر تقریر کی اور سورۂ مریم کی آیتیں پڑھ کر سنائیں تو نجاشی پر رقت طاری ہوگئی اور اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور کہا، خدا کی قسم! یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں اور اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت اسلام کا جو عقیدہ سنا تو نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھا کر کہا واللہ! جو تم نے کہا عیسیٰ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں۔ [1]

کفار عرب کو مخاطب کر کے قرآن مجید نے کہا کہ اس کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ علمائے بنی اسرائیل اس کی سچائی کی گواہی دیتے ہیں:

﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ﴾ (٤٦/ الاحقاف:١٠)

''اے پیغمبر ﷺ! ان سے کہو کہ غور کرو اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے ہے اور تم اس سے منکر ہو اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے اس طرح کی ایک کتاب نازل ہونے کی گواہی بھی دی اور ایمان بھی لایا اور تم مغرور بنے رہے تو ایسی صورت میں تمہارا کیا انجام ہوگا۔''

﴿ اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ (٢٦/ الشعرآء:١٩٧)

''کیا ان کفار کو یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اس کو علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں۔''

[1] مسند ابن حنبل، ج ١، ص: ٢٠٢۔

خصائص محمدی ﷺ

خصائص وہ امور ہیں، جو کسی کی ذات کے ساتھ خاص ہوں۔ آنحضرت ﷺ کو بہت سی چیزیں ایسی دی گئی تھیں، جو اوروں کو نہیں ملی تھیں۔ یہ خصائص محمدی ﷺ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو صرف آپ کے لئے تھے اور آپ کی امت میں سے کسی اور کے لئے نہ تھے۔ دوسرے وہ جو صرف آپ کو عطا ہوئے اور دوسرے انبیا علیہم السلام کو مرحمت نہیں ہوئے۔ غرض پہلی خصوصیتیں امت کے مقابلہ میں اور دوسری انبیا علیہم السلام کے مقابلہ میں تھیں، ہم نے پہلے کا نام خصائص ذاتی اور دوسرے کا خصائص نبوی ﷺ رکھا ہے۔

ارباب سیر نے ان خصائص کی توسیع اور کثرت کو آنحضرت ﷺ کی فضیلت کا بڑا معیار قرار دیا ہے کہ اس سے بارگاہ الٰہی میں آپ کی خصوصیت ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے معمولی معمولی سی باتوں کو خصوصیت میں شمار کر کے خصائص نبوی کا ایک انبار لگا دیا ہے۔ مثلاً: حافظ ابوسعید نیشاپوری نے شرف المصطفٰے میں آپ ﷺ کے خصائص کی تعداد ساٹھ لکھی ہے۔ حافظ سیوطی نے خصائص کبریٰ میں اس پر سینکڑوں کا اور اضافہ کیا ہے۔ حالانکہ ان میں اکثر کا ماخذ تاویل بعید نکتہ آفرینی اور ضعیف روایتیں ہیں۔ بعض ایسی باتیں بھی خصائص میں شمار کر لی گئی ہیں، جو گو عام افراد امت کے لئے نہیں۔ لیکن امرا اور خلفائے اسلام کا ان سے اتصاف یا تعلق جائز ہے۔

محدثین نے خصائص ذاتی کو یہ وسعت دی ہے کہ انہوں نے یہ اصول بنا لیا ہے کہ حدیث قولی اور عملی میں اگر تصادم ہو تو حدیث قولی کو حدیث عملی پر ترجیح ہو گی۔ یعنی اگر ایک امر آنحضرت ﷺ کے قول سے ثابت ہے اور اس کے مخالف دوسرا امر آپ کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ تو عام امت کو آپ کے ذاتی عمل کی تقلید کے مقابلہ میں آپ کے قول کی تعمیل کرنی چاہیے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ عمل محض آپ کے لئے مخصوص اور آپ کے خصائص ذاتی میں ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ انبیا علیہم السلام دنیا میں اپنی امت کے لئے نمونہ اور عملی مثال ہی بن کر آتے ہیں۔ خصوصاً حضرت مقتدائے اعظم ﷺ کو ان کے متعلق فرمان الٰہی نے اعلان کر دیا ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۲۱)

''اور تمہارے لئے (اے مسلمانو!) رسول اللہ میں بہترین اقتدا ہے۔''

تو جب آپ ﷺ مقتدائے عالم اور امام اعظم بن کر آئے اور تمام لوگوں کو آپ کی تقلید اور پیروی کا حکم دیا گیا تو ایسی حالت میں آپ کا ہر فعل ہمارے لئے قابل تقلید اور لائق پیروی ہے۔ بے شک بعض امور ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو بحیثیت پیغمبر آپ کے ساتھ مخصوص ہوں۔ لیکن ضرورت ہے کہ دفع التباس اور رفع شک کے لئے ان تمام مخصوص امور کے متعلق ساتھ ساتھ یہ اعلان عام بھی کر دیا جائے کہ یہ مخصوصات

نبوی ﷺ ہیں اور یہ عام امت کے لئے نہیں ہیں۔اس بنا پر اس کے تسلیم کر لینے سے چارہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کے جس قدر خصائص ذاتی تھے۔شریعت نے ان کو برملا واضح کر دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ یہ صرف آپ کے ساتھ مخصوص ہیں۔اس لئے جن امور کے متعلق یہ تصریح موجود نہیں کہ یہ مخصوصات نبوی ﷺ میں ہیں۔ان کو ہرگز خصائص کے باب میں جگہ نہیں دی جا سکتی اور اس طرح یہ معلوم ہو گا کہ آنحضرت ﷺ کے جو خصائص ذاتی ہیں۔وہ چند محدود امور ہیں اور کتاب وسنت نے ان کا مخصوص ہونا عالم آشکارا کر دیا ہے۔

خصائص ذاتی

نبوت اور لوازم نبوت

سب سے پہلی چیز جو آپ ﷺ کی ذات مبارک کے ساتھ مخصوص تھی اور جس کا کوئی حصہ افراد امت کو نہیں ملا، وہ نبوت اور اس کے لوازم وحی، تشریع، اخبار الٰہی، نزول جبریل، نسخ احکام وغیرہ ہیں۔ یعنی آپ ﷺ کے سوا نہ تو کسی فرد امت پر کوئی وحی آئی اور نہ آ سکتی ہے۔ نہ کسی کو کوئی نئی شریعت لانے اور نئے مذہبی قانون وضع کرنے کا اختیار ہے۔ نہ وہ بے گناہ اور معصوم ہے، نہ اللہ تعالیٰ سے سن کر وہ خبر دے سکتا ہے۔ نہ اس کے پاس قاصد الٰہی آ سکتا ہے۔ نہ وہ احکام شرعی کو منسوخ کر سکتا ہے۔ وغیرہ، صرف دو چیزیں ایسی ہیں جو افراد امت کے لئے باقی ہیں اور وہ رؤیائے صادقہ اور کشف والہام ہیں۔

امور متعلقہ نکاح

مسئلہ نکاح میں آنحضرت ﷺ کے لئے چند امور مخصوص کر دیے گئے ہیں، جن کی رخصت عام امت کے لئے نہیں:

① عام مسلمان بشرط عدل صرف چار بیویاں ایک وقت میں رکھ سکتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ چار سے زیادہ رکھ سکتے تھے۔

② آنحضرت ﷺ کے لئے اس کی رخصت تھی کہ اگر کوئی عورت اپنی خوشی سے مہر کے بغیر آپ کی زوجیت میں آنا چاہتی اور آپ اس کو قبول کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے، گو ایسا واقعہ نہیں ہوا لیکن افراد امت کے لئے بغیر مہر نکاح ممکن ہی نہیں۔

یہ دو رخصتیں تھیں، لیکن ان کے مقابلہ میں اس باب میں آپ ﷺ پر کچھ قیدیں بھی تھیں۔ جو عام افراد امت پر نہیں۔

③ آپ ﷺ پر وہی عورتیں حلال تھیں جن کو ادائے مہر یا بغیر مہر کے آپ اپنی زوجیت میں اب تک لے چکے تھے اور رشتہ کی بہنوں میں سے صرف وہی عورتیں آپ کی زوجیت میں رہ سکتی تھیں، جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی تھی۔ عام مسلمانوں پر قید نہ تھی۔

④ عام مسلمان اہل کتاب کی عورتوں سے جنہوں نے گو اسلام نہ قبول کیا ہو نکاح کر سکتے تھے اور کر سکتے ہیں۔ مگر آپ ﷺ کو اس کی اجازت نہ تھی۔

⑤ جو بیویاں آپ ﷺ کے پاس تھیں، ان میں سے اب کسی کو نہ آپ طلاق دے سکتے تھے اور نہ ان کے بعد آپ اور کسی سے اب نکاح کر سکتے تھے۔

⑥ آپ ﷺ کو اختیار دے دیا گیا تھا کہ ان بیویوں میں سے چند کو اپنے قریب کر لیں اور باقی کو پیچھے

کردیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے چار کو یعنی حضرت عائشہ، حفصہ، زینب اور ام سلمہ رضی اللہ عنہن کو پاس رکھ لیا تھا اور بقیہ کو شرف زوجیت بخشنے کے ساتھ اپنے سے علیحدہ رکھا تھا اور ان میں آپ ردوبدل بھی کر سکتے تھے۔

⑦ آنحضرت ﷺ کی بیویوں کو آپ کی وفات کے بعد کسی دوسرے کے نکاح میں جانے کی اجازت نہ تھی:

﴿ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵۳)

''اور نہ یہ مناسب ہے کہ اپنے پیغمبر کی بیویوں سے اس کے بعد کبھی نکاح کرو۔''

یہ تمام احکام سورۂ احزاب میں بتصریح تمام مذکور ہیں اور ان کے خاص وجوہ و مصالح ہیں۔ اصل یہ ہے کہ عرب میں نکاح کی تعداد متعین نہ تھی۔ بلکہ بنی اسرائیل میں بھی اس کی تحدید نہ تھی، توراۃ میں ایسے انبیا علیہم السلام اور بزرگوں کے نام بھی ہیں، جن کی متعدد بلکہ سینکڑوں بیویاں تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے پورے عہد شباب میں یعنی ۲۵ سال سے ۵۰ برس کی عمر تک صرف ایک بی بی (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا) پر کفایت کی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد ایک ساتھ دو نکاح کیے۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے جو کبیر السن تھی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو صرف ۶ برس کی تھیں اتنی چھوٹی لڑکی سے نکاح ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ صرف دو خاندانوں میں محبت اور یک جہتی کی ترقی ہی کے لئے ہوسکتا تھا۔ مدینہ میں آ کر آپ نے چند اور نکاح کیے، ان نکاحوں پر ایک عمیق نظر ڈالنے سے یہ خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان میں دو قسم کی عورتیں تھیں۔ ایک وہ جو روٴسائے قبائل کی لڑکیاں تھیں اور جن سے نکاح کا مقصد اسلام کی بہتری کے لئے تعلقات کی توسیع اور اضافہ تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ابوسفیان رئیس بنی امیہ کی بیٹی تھیں۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا قبیلہ بنی المصطلق کی رئیسہ تھیں۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا رئیس خیبر کی دختر تھیں۔

ازواج مطہرات میں دوسری وہ بیوہ عورتیں تھیں جن کا سن زیادہ تھا اور گویا اس طرح ان کی کفالت کا بار آپ ﷺ نے اٹھایا تھا۔ چنانچہ حضرت سودہ، حضرت ام سلمہ، حضرت میمونہ، حضرت زینب ام المساکین رضی اللہ عنہن یہ سب بیوائیں تھیں۔ ایک اور بیوی حضرت زینب بنت جحش تھیں جو گو بیوہ نہ تھیں۔ لیکن مطلقہ تھیں۔ ان کے شوہر نے ان کو طلاق دے دی تھی۔ اس تفصیل سے آپ ﷺ کی کثرت ازواج کے اسباب منکشف ہوئے ہوں گے۔ اس کی تصریح نہیں ملتی کہ سورۂ احزاب میں یہ مخصوص احکام کب نازل ہوئے۔ لیکن اس بنا پر کہ آپ نے آخری سے آخری نکاح حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے ۷ھ میں ادائے عمرہ کے زمانہ میں کیا ہے اور اس کے بعد [1] آپ کا کوئی نکاح ثابت نہیں۔ اس لئے ان احکام کے نزول کی تاریخ اسی

[1] طبقات ابن سعد، جزء نساء، ج۸، ص:۹۴۔

ے ھ کو قرار دیا جا سکتا ہے کہ ۸ ھ میں اسلام کی طاقت اپنے کمال کو پہنچ گئی تھی اور خیبر، طائف اور مکہ معظمہ فتح ہو چکا تھا اور آنحضرت ﷺ کو ان تعلقات کے ذریعہ سے کسی نئے قبیلہ کو مطیع کرنے کی ضرورت نہ تھی اور غریب سن رسیدہ مسلمان بیواؤں کی کفالت کی حاجت نہ تھی۔

اس تمہید کے بعد یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو وقار نبوت کے برقرار رکھنے اور ان کو تمام تر احکام اسلامی کے نشر و اشاعت میں مصروف رہنے کا حکم دے کر ان کا آیندہ نکاح ناجائز قرار دیا اور ان کو تمام مسلمانوں کی ماؤں کا رتبہ دیا ﴿ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:٦) اب ایسی حالت میں چار سے زیادہ نکاح کرنے کی ممانعت کا حکم نازل ہوتا ہے۔ اب جناب رسالت مآب ﷺ کے لئے اس کے سوا چارہ کار کیا ہوتا، کہ وہ اپنی موجودہ بیویوں پر محدود رہیں کہ اگر ان میں سے کچھ کو طلاق دے دی جائے تو چونکہ وہ دوسرے مسلمانوں کے نکاح میں نہیں آ سکتیں۔ اس لئے ان پر یہ صریح ظلم ہوتا۔ بنابریں آنحضرت ﷺ کو موجودہ بیویوں کو آپ کی زوجیت میں رکھنے کی اجازت ہوتی ہے اور طلاق کی رخصت آپ سے سلب کر لی جاتی ہے اور ان محدود ازواج میں سے بھی چند کو قریب رکھنے اور بقیہ کو شرف زوجیت کے ساتھ علیحدگی (ارجاء) کا حکم دیا جاتا ہے اور آنحضرت ﷺ چار کو یعنی حضرت عائشہ، حفصہ، ام سلمہ، زینب رضی اللہ عنہن کو اختیار کرتے ہیں اور حضرت سودہ، حضرت جویریہ، حضرت میمونہ اور حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہن سے ارجاء کرتے ہیں۔ [1] کتابیہ سے آنحضرت ﷺ کو اس لئے نکاح کی اجازت نہیں دی گئی کہ نبوت محمدی پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے امور دین میں اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ اس کو محرم راز ہونے کا شرف بخشا جا سکتا تھا۔

نماز شبانہ

شروع میں جب نماز پنجگانہ کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ مسلمانوں پر رات کی نماز (تہجد) فرض تھی، اس کے بعد معراج میں جب پانچ وقت کی نماز فرض ہوگئی تو تہجد کی نماز عام امت پر فرض نہیں رہی بلکہ صرف مستحب رہ گئی۔ لیکن خود آنحضرت ﷺ کے لئے یہ نماز شبانہ فرض مزید کے طور پر باقی رہی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ پوری پابندی کے ساتھ اس کو ادا کرتے رہے۔ یہی وہ نماز تھی جس میں دیر تک کھڑے رہنے سے پائے مبارک میں ورم آ جاتا تھا۔ سورۂ بنی اسرائیل جو معراج کی سورہ ہے اس میں نماز پنجگانہ کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾

(۱۷/ بنی اسرآئیل:۷۹)

''اور رات کے حصہ میں بیدار ہو کر نماز پڑھ! یہ تیرے لئے مزید ہے، قریب ہے کہ تیرا پروردگار تجھ کو مقام محمود (مرتبہ شفاعت) میں اٹھا لے۔''

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری، تفسیر سورۃ احزاب، ج ۲۲، ص: ۱٦ مصر۔

نماز چاشت اور قربانی

اسی طرح چاشت کے وقت نماز عام مسلمانوں کے لئے نفل ہے، مگر احادیث ❶ میں ہے کہ یہ نماز آپ پر بمنزلہ فرض کے تھی اور اسی کے ساتھ قربانی کا حکم بھی، غالباً یہ حدیثیں سورۂ کوثر کی تفسیریں ہیں:

﴿ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ ﴾ (۱۰۸/ الکوثر:۱، ۲)

''اے پیغمبر ﷺ! میں نے تجھے کوثر عطا کیا تو، تو اس کے شکرانے میں اپنے رب کی نماز (چاشت) پڑھ اور قربانی کر۔''

مگر یہ بطریق صحاح مذکور نہیں، اسی لئے ہمیں ان کو خصائص نبوی ﷺ میں شمار کرنے میں اب بھی تامل ہے۔

عصر کے بعد نماز دوگانہ

عام امت کے لئے نماز عصر کے بعد سے غروب تک نماز پڑھنا ممنوع ہے، مگر آنحضرت ﷺ کو آخر میں بعض ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے عصر کے بعد نماز پڑھتے دیکھا، دریافت کیا تو فرمایا کہ ''ایک وفد کی ملاقات میں ظہر کے بعد کی دو رکعتیں مجھ سے رہ گئی تھیں، میں ان کی قضا پڑھتا ہوں۔'' ❷ یہ عام امت کے لئے تو اس کی قضا واجب نہ تھی اور اگر ہوتی بھی تو ایک دفعہ قضا پڑھ لینا کافی تھا، مگر آپ ﷺ نے اپنے لئے ایک نماز سنت کے ترک عمدی کی تلافی کی شاید آخر عمر تک کوشش کرتے رہے۔

صوم وصال

یعنی کئی کئی دن کا متصل افطار کئے بغیر روزہ رکھنا عام امت کے لئے ممنوع ہے، لیکن آنحضرت ﷺ کئی کئی دن کا روزہ رکھتے تھے اور بیچ میں افطار کے وقت کچھ کھاتے پیتے نہ تھے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کی پیروی میں اس طرح کا روزہ رکھنا چاہا تو آپ نے روک دیا اور فرمایا: ''تم میں کون میری طرح ہے مجھ کو تو میرا پروردگار کھلاتا اور سیراب کرتا ہے۔'' ❸

صدقہ وزکوٰۃ کھانے کی حرمت

آنحضرت ﷺ اور اہل بیت پر کئی کئی دن کے فاقے گزر جاتے تھے۔ عام مسلمان غربت اور تنگ دستی کی حالت میں اس سرمایہ سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ مگر آپ نے اپنے اور اپنے خاندان کے لئے اس مد کی ہر شے حرام کردی اور کبھی صدقہ کا مال ذاتی مصرف میں لانا گوارا نہ فرمایا۔ یہاں تک کہ اگر حسنین رضی اللہ عنہما لڑکپن کے اقتضا سے صدقہ وفطر کی کوئی کھجور بھی اپنے منہ میں ڈال لیتے تھے، تو آپ اگلوا دیتے تھے ❹ اور فرمایا کرتے

❶ بحوالہ خصائص کبریٰ سیوطی، ج۲، ص:۲۰۷، ۲۰۸ طبع حیدرآباد۔ ❷ ابوداود:۱۲۷۳؛ ترمذی، ابواب الصلاۃ، باب ما جاء فی الصلوٰۃ بعد العصر:۱۸٤۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام، باب ما یکرہ من التعمق......:۷۲۹۹۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، باب مایذکر فی الصدقۃ للنبی ﷺ وآلہ: ۱٤۹۱ ومسلم کتاب الزکوٰۃ، باب تحریم الزکوۃ علی رسول اللہ ﷺ: ۲٤۷۳۔

تھے: ''یہ لوگوں کے مال ودولت کا میل ہے، اس کا لینا اہل بیت نبوت کو روا نہیں۔'' ❶ چنانچہ سادات کے لئے قیامت تک اس قسم کے صدقات کا لینا جائز نہیں۔ آپ ﷺ کے پاس جب کوئی ناواقف شخص کوئی چیز لے کر جاتا تھا کہ اس کو آپ کی خدمت میں پیش کرے۔ تو آپ دریافت فرمایا کرتے تھے: ''یہ صدقہ ہے یا تحفہ؟'' اگر تحفہ کہتا قبول فرماتے اور اگر معلوم ہوتا کہ صدقہ ہے تو اجتناب فرماتے ❷ اس طرح آنحضرت ﷺ نے مخالفین کی اس بدگمانی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا کہ پیغمبر اسلام کی صدقہ وخیرات کی اس تاکید کا مقصود (نعوذ باللہ) اپنی اور اپنے خاندان کی دائمی پرورش کا سامان تھا۔

❶ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب ترك استعمال آل النبی ﷺ علی الصدقة: ۲٤۸۱۔

❷ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب قبول النبی ﷺ الهدية ورده الصدقة: ۲٤۹۱؛ صحیح بخاری، کتاب الهبة، باب قبول الهدية: ۲۵۷٦۔

خصائص نبوی ﷺ

دیگر انبیا کے مقابلہ میں جس قدر خصائص آپ ﷺ کو عطا ہوئے ہیں، وہ متعدد معتبر حدیثوں میں مختلف تعدادوں میں نام بنام خود زبان اقدس سے ادا ہوئے ہیں۔ صحیحین میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دی گئیں۔ مجھے رعب اور دھاک کے ذریعہ سے فتح و نصرت دی گئی۔ میرے لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنائی گئی۔ غنیمت کا مال میرے لئے حلال کیا گیا اور مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کے لئے حلال نہ تھا۔ مجھے شفاعت کا مرتبہ عنایت ہوا۔ مجھ سے پہلے انبیا خاص اپنی اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور میں تمام دنیا کے لئے مبعوث ہوا۔'' [1]

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی زبانی چھ باتیں گنائی ہیں: ''مجھے جوامع الکلم عنایت ہوئے، رعب و داب سے نصرت دی گئی۔ مال غنیمت میرے لئے حلال کیا گیا۔ تمام روئے زمین میرے لئے مسجد بنی۔ میری بعثت تمام دنیا کی طرف ہوئی۔ انبیا علیہم السلام کا سلسلہ میری ذات پر ختم ہوا۔'' [2]

احادیث کی دیگر روایتوں میں بعض اور خصائص بھی زبان اقدس سے بیان ہوئے ہیں، مثلاً: یہ کہ میرا معجزہ وحی قیامت تک کے لئے ہے۔ میرے پیرو تمام انبیا سے زیادہ ہیں۔ میری نبوت اولین ہے۔ مجھ کو فلاں فلاں سورتیں دی گئیں جو کسی اور کو نہیں ملیں۔ فلاں فلاں وقت کی نمازیں خاص میری امت کے لئے فرض ہوئیں۔ مگر حقیقت میں ان میں بعض جزئیات ایسی ہیں جو ان ہی چھ عنوانوں کے تحت میں کسی نہ کسی حیثیت سے درج ہیں۔ سورتوں کی خصوصیت جوامع الکلم میں داخل ہے۔ بعض نمازوں کے اوقات کا اضافہ ختم نبوت کے مدارج کے اندر ہے۔ قرآن مجید میں آپ ﷺ کی دو خصوصیتیں مذکور ہوئی ہیں۔ وہ ان سب کو جامع ہیں۔ یعنی تکمیل دین اور ختم نبوت۔ بہر حال اجمال کو چھوڑ کر ذیل میں ہم کو نمایاں خصوصیات پر قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں ایک تفصیلی نظر ڈالنا ہے۔

رعب و نصرت

آنحضرت ﷺ سے پہلے جو انبیا دنیا میں آئے وہ دو قسم کے تھے، یا وہ بظاہر کمزور اور بے یار و مددگار تھے اور ان کو دنیاوی طاقت کا کوئی حصہ عطا نہیں ہوا تھا۔ پیغمبروں کی بڑی تعداد ایسی ہی تھی دوسرے وہ انبیا ہیں جن کو دنیا کی ظاہری طاقت بھی ملی تھی اور وہ صرف چند ہیں۔ حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ، باب قول النبی ﷺ جعلت لی الارض مسجدًا:٤٣٨، کتاب التیمم: ٣٣٥؛ صحیح مسلم، کتاب المساجد:١١٦٣؛ نسائی کتاب الغسل، باب التیمم بالصعید:٤٣٢، نسائی کی روایت میں ''غنیمت کا مال میرے لیے حلال کیا گیا'' کے الفاظ نہیں ہیں۔

[2] صحیح مسلم، کتاب المساجد:١١٦٧؛ ترمذی، کتاب السیر، باب ما جاء فی الغنیمة: ١٥٥٣۔

سلیمان علیہ السلام مگر ان میں سے کسی کو بھی نام نامی کے رعب اور ہیبت کا انعام عطا نہیں ہوا اور تاریخ اس بیان پر شاہد ہے۔ آنحضرت ﷺ کا آغاز گو ایوبی بیچارگی اور مسیحی غربت سے ہوا، مگر انجام موسوی طاقت، داؤدی سلطنت اور سلیمانی شان وشکوہ پر ہوا اور ان سب سے مافوق یہ تھا کہ آپ کی تمام تر قوت، طاقت، رعب و ہیبت سب خدا کی راہ میں صرف ہوئی۔ اس سے گم گشتوں نے راستہ پایا۔ بھولوں نے یاد کیا۔ سننے والوں نے آواز دی اور یہ اثر پیدا ہوا کہ آپ جس راستہ سے نکل جاتے گناہ گار اور مجرم سر اطاعت خم کر دیتے اور اپنی سیہ کاریوں پر ندامت کا اظہار کرتے تھے۔

متعدد حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے فتح ونصرت، رعب و ہیبت کے ذریعہ بخشی گئی۔ یہاں تک کہ میری دھاک ایک مہینہ کی مسافت تک پر کام کرتی ہے۔'' [1] علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں فنون جنگ پر بحث کرتے ہوئے نہایت خوبی سے بتایا ہے کہ لڑائیوں میں کسی ایک فریق کو جو فتح ہوتی ہے وہ اسی وقت ہوتی ہے، جب دوسرے فریق پر پہلے کی خداداد مرعوبیت چھا جاتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے اسم گرامی کو یہ شرف اس لئے عطا ہوا، تاکہ مزید خونریزی کے بغیر ملک میں امن و امان اور سکون واطمینان پیدا ہو جائے اور صدائے حق کے لئے راستہ صاف ہو۔ قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس وصف کے عطا کرنے کا وعدہ فرمایا تھا:

﴿ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ ﴾ (۸/ الانفال:۱۲)

''عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈالوں گا۔''

چنانچہ یہ وعدہ پورا ہوا اور قرآن نے شہادت دی:

﴿ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۲۶ ، ۵۹/ الحشر:۲)

''اور خدا نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔''

چنانچہ بڑے بڑے دل گردہ کے بہادر زہر میں تلواریں بجھا بجھا کر آئے، مگر جب روئے روشن پر نظر پڑی کانپ کر رہ گئے۔ بڑے بڑے سرکش قبائل آپ ﷺ کا نام سن کر دم بخود ہو جاتے تھے۔ مدینہ کے آس پاس کے یہود جو بڑے بڑے قلعوں میں بیٹھ کر فرمان روائی کرتے تھے اور جن کو اپنی فوجی قوت اور جنگی سامانوں پر ناز تھا۔ جب انہوں نے سرتابی کی، بے لڑے بھڑے آپ کے سامنے اطاعت کی گردن ڈال دی۔ خیبر کے قلعہ نشین یہود جو سب سے زیادہ مضبوط تھے، جب ایک صبح کو ان کے قلعوں کے سامنے دفعتہً کوکبہ اسلام طلوع ہوا۔ تو ان کے منہ سے چیخ نکل گئی کہ محمد ﷺ کا لشکر! ابوسفیان جو بارہا ایک فریق مقابل کی حیثیت سے میدان جنگ میں فوجوں کے پرے لگاتا رہا۔ فتح مکہ کے دن جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ اس کو لے کر اسلام کے موجزن دریائے الٰہی کا نظارہ دکھا رہے تھے اور رنگ برنگ کے علم نگاہوں کے سامنے سے

[1] صحیح بخاری: ٤٣٨ وصحیح مسلم عن ابی ہریرۃ: ۱۱۶۳ واحمد ابن ابی شیبہ بیہقی وبزار عن علی۔

گزر رہے تھے تو ہر نئے دستہ اور نئے علم کو دیکھ کر کانپ کانپ جاتا تھا۔

بااین ہمہ اس مجسمہ ہیبت کا حال کیا تھا، ناآشنا ڈرتے تھے اور وہ ان کو تسکین دیتا تھا۔ بے خبر اس سے رعب کھاتے تھے اور آگاہ، پروانہ تھے کہ

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ ﴾

(٤٨/ الفتح:٢٩)

''محمد رسول اللہ اور ان کے ساتھی کافروں پر بھاری اور آپس میں رحم دل ہیں۔''

ایک بدوی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جیسے ہی چہرۂ مبارک پر نظر پڑی کانپ گیا۔ فرمایا: ''ڈرو نہیں میں بادشاہ نہیں ہوں، ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں، جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔'' [1] حضرت مخرمہ صحابی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے اسود سے کہا کہ آنحضرت ﷺ زنانخانہ میں ہیں۔ آپ کو آواز دو، وہ ہچکچانے لگے۔ باپ نے کہا: جان پدر محمد ﷺ جبار نہیں [2] یہ ہیبت، یہ وقار، یہ دبدبہ، یہ رعب، تیغ وسنا کی چمک، فوج وعسکر کے تلاطم، جلادوں کی صف بندی اور تیغ بکف سپاہیوں کی نمائش سے نہیں پیدا ہوا بلکہ

ہیبتِ حق است ایں از خلق نیست
ہیبتِ ایں مردِ صاحبِ دلق نیست [3]

سجدہ گاہ عام

اسلام کے علاوہ جس قدر مذاہب ہیں، وہ اپنے مراسم عبادت کے ادا کرنے لئے چند گھری ہوئی چار دیواریوں کے محتاج ہیں۔ گویا ان کا خدا ان ہی کے اندر بستا ہے۔ یہود اپنے صومعوں اور قربان گاہوں سے باہر نہ خدا کو پکار سکتے ہیں اور نہ قربانی کے نذرانے پیش کر سکتے ہیں۔ عیسائی اپنے کنیسوں کے بغیر خدا کے آگے نہیں جھک سکتے۔ یہاں تک کہ بت پرست قومیں بھی اپنے بت خانوں ہی کی چار دیواریوں کے اندر اپنے دیوتاؤں کو خوش کر سکتی ہیں۔ لیکن اسلام کے عالمگیر مذہب کا خدا اس آب وگل اور سنگ وخشت کی چار دیواریوں میں محدود نہیں۔ وہ ہر جگہ ہے اور ہر جگہ سے پکارا جا سکتا ہے۔ کوہ وصحرا، خشکی وتری، مسجد وکنشت [4] ہر جگہ اس کے سامنے سجدہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ جس طرح مسجدوں کے اندر ہے۔ مسجدوں کے باہر بھی ہے۔ اس کی قربانی مشرق ومغرب ہر جگہ گزرانی جا سکتی ہے:

﴿ اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ﴾ ''جدھر منہ پھیرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے۔''

ع ہر جا کنیم سجدہ بآں آستاں رسد

---

[1] شمائل ترمذی، شمائل ترمذی، میں یہ روایت موجود نہیں البتہ سنن ابن ماجه، ابواب الاطعمة، باب القدير:٣٣١٢ میں اس مفہوم کی روایت موجود ہے۔ [2] صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب المزرر بالذھب:٥٨٦٢۔

[3] مثنوی معنوی مولانا روم، یافتن رسول قیصر را...... ج ا، ص:٣٨۔ [4] صحیح بخاری، کتاب الصلوة، باب الصلوة فی البیعة:٤٣٤ میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ان گرجاؤں میں جن میں تصویریں نہ ہوتیں نماز پڑھ لیتے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنائی گئی۔'' [1] یہ مسئلہ ہر چند ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے اندر وہ صداقت پنہاں ہے۔ جو اسلام کی عالمگیری اور اس کے آخری مذہب ہونے کا اعلان عام کرتی ہے۔

پیرووں کی کثرت

دنیا میں لاکھوں پیغمبر آئے، مگر آج دنیا میں ان کی تعلیم وہدایت کی ایک یادگار باقی نہیں۔ یہاں تک کہ تاریخ کے اوراق میں بھی ان کا نام ونشان نہیں۔ وہ انبیا جن کے صرف حالات معلوم ہیں، ان کی نسبت وہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان کی آواز پر لبیک کہنے والے چند سے آگے نہ بڑھ سکے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ایک ایک پیغمبر کا کارنامہ دیکھ جاؤ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا ایک بھی ایسا نہ ملے گا جس کے ماننے والے سو بھی ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کوششوں کے جولان گاہ صرف بنی اسرائیل کے چند ہزار نفوس تھے۔ جو قدم قدم پر راہ حق سے ہٹ ہٹ جاتے ہیں۔ کہیں گوسالے کو پوجتے ہیں، کہیں خدا کو ان آنکھوں سے دیکھنے پر اصرار کرتے ہیں، کہیں سرفروشی اور جانبازی سے گھبرا کر میدان جنگ میں جانے سے انکار کر بیٹھتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزانہ کارنامے صرف اسی قدر اثر دکھاتے ہیں کہ چند دہائی انسان ان کی شیریں گفتاری کا دم بھرتے ہیں، مگر اس سے پہلے کہ مرغ بانگ دے، ابن آدم کو دشمنوں کے پنجہ میں اسیر کراتے ہیں اور تین دفعہ اس کے پہچاننے سے منکر ہوتے ہیں۔ لیکن آنحضرت ﷺ کا یہ حال ہے کہ مکہ کی گلیوں میں آپ نے تن تنہا بے یار ومددگار متلاشیانِ حق کو صدائے توحید دی۔ جواب میں ایک آواز بھی بلند نہ ہوئی۔ لیکن ۲۳ سال نہ گزرنے پائے تھے کہ ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ کلمہ لا الٰہ الا اللّٰہ سے پرشور ہو گیا اور جب آپ نے اسی مکہ کی سرزمین کے لیے حجۃ الوداع کا اعلان کیا تو کم وبیش ایک لاکھ جان نثار وفدا کار دائیں بائیں کھڑے تھے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس قدر میری نبوت کی سچائی کا اعتراف کیا گیا، کسی اور پیغمبر کی سچائی کا نہیں کیا گیا کہ بعض انبیا ایسے بھی ہیں جن کو سچا کہنے والا ان کی امت میں صرف ایک ہی نکلا۔'' [2]

صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک دفعہ مجھ پر (عالم مثال میں) قومیں پیش کی گئیں۔ بعض پیغمبر ایسے تھے کہ ان کے پیچھے صرف ایک ہی دو آدمی تھے۔ بعض تنہا ہی تھے ان کے ساتھ کوئی بھی نہ تھا۔ اتنے میں ایک بڑی بھیڑ نظر آئی، خیال ہوا کہ یہ میری امت ہوگی، تو بتایا گیا کہ یہ موسیٰ اور ان کی قوم ہے پھر کہا

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ: ۴۳۸ ومسلم، کتاب المساجد: ۱۱۶۳ ونسائی، کتاب الغسل: ۴۳۲ وترمذی، ابواب الصلوۃ: ۳۱۷۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب فی قول النبی ﷺ انا اوّل الناس یشفع......: ۴۸۵۔

گیا کہ دوسرے کنارہ کی طرف دیکھو! تو اتنا سواد اعظم نظر آیا کہ اس سے افق چھپ گیا۔ پھر کہا گیا اسی طرح ادھر دیکھو، بڑی تعداد کثیر دکھائی دی۔ کہا گیا کہ یہ سب تیری امت ہے۔'' ❶

دعوتِ عام

محمد رسول اللہ ﷺ کے پیروؤں اور حلقہ بگوشوں کی کثرتِ تعداد کا ایک اور سبب یہ ہے کہ آپ ﷺ سے پہلے جس قدر انبیا آئے، وہ خاص خاص قوموں اور قبیلوں کی طرف بھیجے گئے، ان کی دعوت عام نہ تھی۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے کو بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی گلہ بانی تک محدود رکھا۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی بعثت روئے زمین کی ہر قوم اور ہر جنس کی طرف ہوئی۔ کالے، گورے، رومی، حبشی، عرب، عجم، ترک، تاتار، چینی، ہندی سب آپ ﷺ میں برابر کے حقدار ہیں۔ قرآن نے کہا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ ﴾ (۳٤/ سبا:۲۸)

''اے محمد ﷺ! ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لئے بھیجا ہے۔''

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۙ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۱)

''بابرکت ہے وہ جس نے اپنے بندہ پر قرآن اتارا، تاکہ وہ تمام دنیا کو ہشیار کرے۔''

صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ سے پہلے نبی خاص اپنی قوم میں بھیجا جاتا تھا اور میں تمام دنیا کے لئے بھیجا گیا ہوں۔'' ❷ اس معنی کی بکثرت روایتیں حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی آئی ہیں۔ اس کی عملی دلیل یہ ہے کہ تمام پیغمبروں کے حالات پڑھ جاؤ، سب کے پیروؤں کو ان کی زندگی میں خود انہیں کے قوم و ملک کے اندر محدود پاؤ گے۔ لیکن آپ کے حلقہ بگوشوں میں خود آپ کی زندگی میں عرب کے علاوہ سلمان عجمی، صہیب رومی، بلال حبشی رضی اللہ عنہم سب کو پاؤ گے۔ سلاطین عالم کے نام آپ کا دعوت نامہ بھی اسی تعمیمِ دعوت کی مستحکم عملی دلیل ہے۔

جوامع الکلم

دنیا میں ہی آسمانی صحیفے اب بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ مگر ان میں ایک کے سوا وصف جامعیت سے سب محروم ہیں۔ توراۃ اقوام کی تاریخ اور احکام وقوانین کا مجموعہ ہے۔ عقیدہ توحید ورسالت کے سوا تمام دیگر ضروری عقائد سے اور رسم قربانی کے علاوہ تمام دیگر مسائل عبادات سے اور چند معمولی باتوں کو چھوڑ کر تمام دقائق اخلاق سے یکسر خالی ہیں۔ زبور صرف دعاؤں اور مناجاتوں کا ذخیرہ ہے۔ سفر ایوب علیہ السلام میں صرف عقیدہ تقدیر و رضا کی تعلیم ہے۔ امثال سلیمان صرف مواعظ وحکم ہیں۔ دیگر انبیائے بنی اسرائیل کے صحیفے صرف

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی دخول طوائف من المسلمین الجنة......:۵۲۷ وبخاری کتاب الطب:۵۷۰۵ کتاب احادیث الانبیاء باب وفات موسی:۳٤۱۰۔ ❷ بخاری، کتاب الصلوة، باب قول النبی ﷺ: جعلت لی الارض مسجدا: ٤۳۸ ومسلم، کتاب المساجد:۱۱٦۳۔

توبہ وندامت پیشین گوئی اور ماتم ہیں۔انجیل کا صحیفہ حضرت مسیح علیہ السلام کی سرگزشت اور تعلیمات اخلاقی کا مجموعہ ہے۔لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کو جو صحیفہ ملا، وہ جوامع الکلم ہے۔یعنی وہ تمام باتوں کو جامع ہے وہ توراۃ بھی ہے، زبور بھی اور انجیل بھی اور کچھ ان سے زیادہ بھی۔اسی لئے آپ ﷺ نے اپنے خصائص میں یہ ارشاد فرمایا ہے:''مجھے جوامع الکلم عنایت ہوئے۔'' ❶ بیہقی میں ❷ حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے مجھے فرمایا:'' مجھے توراۃ کی جگہ سبع طول (سات بڑی سورتیں) اور زبور کی جگہ مئین (تقریباً سو آیتوں والی سورتیں) انجیل کے قائم مقام مثانی دی گئیں اور سور مفصلات ❸ زیادہ ملیں۔'' ابونعیم میں یہی روایت ان الفاظ میں ہے کہ'' مجھے مثانی تو اۃ کی جگہ، مئین انجیل کی جگہ، حوامیم زبور کی جگہ اور مفصلات علاوہ بریں ملیں۔'' ❹

اس لئے قرآن مجید، توراہ، زبور اور انجیل کو جامع ہے اور ان کے سوا کچھ اور بھی ہے، وہ تاریخ اقوام بھی ہے، اخلاق و مواعظ بھی ہے۔دعا و مناجات بھی ہے، اس میں دین کامل کے تمام عقائد ہیں۔تمام مراسم عبادت ہیں، تمام معاملات کے احکام وقوانین ہیں۔اس میں ایک مسلمان کی زندگی کے ہر دور اور ہر شعبہ کے لئے کامل ہدایات اور صحیح تعلیمات موجود ہیں۔صرف توراۃ کے اسفار خمسہ یہود کی مذہبی زندگی کا کامل مجموعہ نہیں۔صرف انجیل عیسائیوں کی مذہبی حیات کا سرمایہ نہیں۔یہاں تک کہ ان کے عقائد و عبادات بھی ان کے صحیفوں کے رہین منت نہیں اور وہ ان کی صحیح تعلیم سے یکسر خاموش ہیں۔لیکن اسلام قرآن سے باہر کچھ نہیں۔باہر جو کچھ ہے (احادیث) اس کی عملی توضیح وتفسیر ہے۔وہی تنہا مسلمانوں کی ہر ضرورت کا کفیل اور ہر سوال کا مجیب ہے اور اسی لئے اس کے پیرو کامل ''حسبنا کتاب اللہ'' ❺ (ہم کو خدا کی کتاب کافی ہے) کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔قرآن جوامع الکلم ہے کہ اس کی ایک ایک آیت کے اندر سینکڑوں لطائف ہیں۔اس کے ایک ایک لفظ سے متکلمین اور فقہا نے چند در چند مسائل نکالے ہیں اور صوفیہ اور ارباب حال نے متعدد نکتے پیدا کئے، ہیں تاہم اس کی لطافتوں اور نزاکتوں کا خاتمہ نہیں ہوا اور اس کی جوامع الکلمی کا حصر نہ ہوسکا۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام، باب قول النبی ﷺ بعثت بجوامع الکلم:۷۲۷۳ وکتاب التعبیر، باب المفاتیح فی الید:۷۰۱۳ ومسلم کتاب المساجد:۱۱۶۸۔ ❷ بحوالہ خصائص کبریٰ، ج ۲، ص: ۱۹۸۔

❸ سبع طوال مئین اور مفصلات، قرآن مجید کی کئی کئی سورتوں کے مختلف مجموعوں کے نام ہیں۔

❹ ابونعیم عن ابن عباس (بحوالہ خصائص سیوطی، ج ۲، ص: ۲۲٤، دوسری روایت کے الفاظ پہلے سے زیادہ قرین قیاس ہیں، کیونکہ مثانی اور سبع طوال ہماری تحقیق میں ایک ہی ہیں، اور پہلی روایت میں ان کو دو بتایا گیا ہے، حالانکہ خود قرآن نے ﴿سبعا من المثانی﴾ مثانی کی سات سورتیں، کہا ہے۔حوامیم وہ سورتیں ہیں، جن کے شروع میں حم ہے، سبعا من المثانی کی تفصیل میں روایات اور علما کی تشریحات میں بہت سے اختلافات ہیں بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سبعا من المثانی سورۂ فاتحہ کو کہا گیا ہے، جس میں سات آیتیں ہیں۔واللہ اعلم بالصواب۔ ❺ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ: ٤٤٣٢ ومسلم کتاب الوصیۃ، باب ترك الوصیۃ لمن لیس له شيء یوصی فیه:٤٢٣٤۔

تکمیل دین

اسلام کا صحیفہ جب ایسا جامع ہے۔ تو یقیناً وہ دین بھی جس کو لے کر وہ آیا۔ کامل ہوگا۔ قرآن مجید نے آنحضرت ﷺ کی وفات کے قریب عین مسلمانوں کے اجتماع عظیم کے دن (حجۃ الوداع) یہ عام اعلان کیا:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾

(۵/ المآئدۃ:۳)

''آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام کو دین کی حیثیت سے میں نے تمہارے لئے پسند کیا۔''

اسلام قرآن کے عقیدہ کے مطابق اس صحیح مذہب کا نام ہے جو اپنے اپنے وقت میں ہر پیغمبر کو عطا ہوا اور وہ عہد بہ عہد دنیا کی عمر کے ساتھ مختلف پیغمبروں کے ہاتھوں سے تکمیل کو پہنچتا رہا۔ یہاں تک کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت و تبلیغ کی تکمیل پر وہ اپنے معراج کمال کو پہنچ کر تمام ہو گیا اور یہ منصب خاص صرف آپ کی ذات پاک کے لئے روز اوّل سے مقدر ہو چکا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((انا خاتم النبیین وادم منجدل فی طینته)) [1] ''میں پیغمبر آخر تھا اور آدم علیہ السلام ابھی آب و گل میں پڑے تھے۔'' آنحضرت ﷺ نے ایک بلیغ تمثیل میں اسلام کی تکمیل دین کی تشریح فرمائی ہے، فرمایا: ''میری اور دوسرے انبیا کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی۔ لوگ اس کے اندر جاتے ہیں اور اس کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ لیکن دیکھتے ہیں کہ اس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے۔ تو میں وہ آخری اینٹ ہوں۔'' [2] عمارت دین و نبوت ہے۔ اس کی ایک ایک اینٹ، ایک ایک پیغمبر کا وجود اور اس کا دین و شریعت ہے اور اس کی تکمیل کا آخری پتھر نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وجود اقدس ہے۔

دائمی معجزہ

وہ دین جو مختلف انبیا علیہم السلام کی وساطتوں سے دنیا میں آتا رہا۔ چونکہ وہ محدود زمانوں کے لئے آیا۔ کیا اس لئے ان کے معجزے بھی محدود الوقت تھے۔ یعنی ایک خاص وقت میں پیدا ہوئے اور مٹ گئے، اب عصائے موسیٰ، لحن داؤد، تعبیر یوسف، ناقہ ہود، نفس عیسیٰ علیہم السلام کا کہاں پتہ ہے؟ لیکن جو دین محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ آیا کامل تھا اور قیامت تک کے لئے آیا تھا۔ بنا بریں اس کے لئے ایک دائمی اور مستقل معجزہ کی ضرورت تھی اور وہ خود صحیفہ اسلام ہے۔ صحیحین میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ہر نبی کو وہ معجزہ ملا۔ جس

---

[1] مستدرك حاكم، تفسير سورة احزاب، ج ۲، ص: ٤١٨۔ مگر اس روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: انی عبدالله وخاتم النبيين وابى منجدل فى طينته اور یہ روایت کتاب التاريخ، باب ذكر اخبار سيد المرسلين میں ان لفظوں کے ساتھ ہے: انی عندالله فى اول الكتاب لخاتم النبيين وان آدم لمنجدل فى طينته (ج ۲، ص: ٦٠٠) ''ض''

[2] صحيح بخارى، كتاب المناقب، باب خاتم النبيين: ٣٥٣٤، ٣٥٣٥؛ صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب ذكر كونه خاتم النبيين: ٥٩٥٩ تا ٥٩٦٣۔

پر اس کی امت ایمان لائی، لیکن جو مجھے ملا وہ وحی ہے۔ جو خدا نے بھیجی تو مجھے امید ہے کہ میرے پیرو تمام انبیا علیہم السلام سے زیادہ ہوں گے۔'' ❶ یہ خیال مبارک اسی لئے تھا کہ آپ ﷺ کا معجزہ وحی قیامت تک کے لئے ہے۔ اس لئے اس کو دیکھنے والے اور اس پر ایمان لانے والے سب سے زیادہ ہوں گے۔ دوسرے انبیا علیہم السلام کے صحیفے بجائے خود معجزہ نہ تھے۔ اسی لئے وہ تحریف وتغیر سے پاک نہیں رہے اور قرآن دین کا کامل صحیفہ خاتم الانبیاء کی وحی اور دائمی معجزہ بن کر آیا۔ اسی لئے وہ ہمیشہ کے لئے اپنی حفاظت کا سامان اپنے ساتھ لایا:

﴿ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (۱۵/ الحجر:۹) ''اور ہم ہیں اس کے محافظ۔''

ختم نبوت

یہ رعب ونصرت، یہ پیرووں کی کثرت، یہ سجدہ گاہی عام، یہ اعجاز دوام، یہ جوامع الکلمی، یہ دعوت عمومی، یہ تکمیل دین، یہ آیات مبین خود اس بات کے دلائل ہیں کہ آپ ﷺ کے وجود اقدس پر تمام پیغمبرانہ نعمتوں کا خاتمہ ہو گیا اور نبوت اور رسالت کا سلسلہ منتہی ہو گیا اور اب دنیا کسی نئے آنے والے کے وجود سے مستغنی ہو گئی۔ اسی لئے قرآن پاک نے عہد نبوت کے سب سے بڑے مجمع میں یہ اعلان عام کیا کہ

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾

(۵/ المآئدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لئے دین کی حیثیت سے اسلام کو پسند کیا۔''

یہ آیت جو نو ذوالحجہ ۱۰ھ کو نازل ہوئی۔ اس بات کی بشارت تھی کہ نبوت جس کا مقصد دین کی عمارت میں کسی نہ کسی اینٹ کا اضافہ تھا وہ آج تکمیل کو پہنچ گئی۔ لیکن اس سے پہلے ۵ھ میں بھی یہ بشارت ان الفاظ میں گوش گزار ہو چکی تھی:

﴿ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۴۰)

''محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔ لیکن خدا کے پیغمبر اور تمام نبیوں کے خاتم ہیں۔''

ختم کے لغوی معنی کسی چیز کو اس طرح بند کرنے کے ہیں کہ نہ اس کے اندر کی چیز باہر نکل سکے اور نہ باہر کی چیز اس کے اندر جا سکے۔ ❷ اسی سے اس کے دوسرے معنی کسی شے کو بند کر کے اس پر مہر کرنے کے ہیں۔

❶ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام، باب قول النبی ﷺ بعثت بجوامع الکلم:۷۲۷٤؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وجوب الایمان……۳۸۵۔

❷ دیکھو لسان العرب، ج۱، ص:۷۹۰ وصحاح جوھری واساس البلاغۃ زمخشری۔

جواس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر سے نہ کوئی چیز باہر نکلی ہے اور نہ کوئی باہر کی چیز اس کے اندر گئی ہے اور چونکہ یہ عمل مہر سب سے آخر میں کیا جاتا ہے۔اس کے معنی انتہا اور ختم کرنے کے بھی آتے ہیں۔قرآن مجید میں یہ تمام معنی مستعمل ہوئے ہیں۔مثلاً:

﴿ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ ﴾ (۳۶/ یٰسٓ:۶۵)

''آج (قیامت کے دن) ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے۔'' (یعنی بند کر دیں گے کہ بول نہ سکیں)

یہاں ختم کے معنی بند کر دینے کے بالکل ظاہر ہیں:

﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۷)

''خدا نے ان (کافروں کے) دلوں پر مہر لگا دی ہے (یعنی ان کے دلوں کے دروازے بند کر دیئے)۔''

کہ باہر سے جو نصیحت اور ہدایت کی باتیں وہ سنتے ہیں وہ ان کے دلوں کے اندر نہیں گھستیں اور بے اثر رہتی ہیں:

﴿ وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ ﴾ (۴۵/ الجاثیۃ:۲۳)

''اور خدا نے اس کے کان پر اور دل پر مہر لگا دی (یعنی اس کے کان اور دل بند کر دیئے)۔''

کہ اس کے کان کے اندر دعوت رسول کی آواز اور اس کے دل کے اندر اس آواز کا اثر نہیں جاتا۔

﴿ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴾ (۸۳/ المطففین:۲۵)

''اہل جنت پلائے جائیں گے وہ شراب جس پر مہر لگی ہوگی۔''

وہ سربمہر یعنی بند ہوگی جو اس بات کا ثبوت ہوگا کہ یہ خالص شراب ہے۔یہ کھلی نہیں کہ اس کے اندر کی خوشبو باہر نکل گئی ہو اور نہ اس کے اندر باہر سے کوئی چیز کسی نے ملا دی ہے۔جس سے اس کی تیزی کم ہوگئی ہے۔اسی کے بعد یہ آیت ہے:

﴿ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ﴾ (۸۳/ المطففین:۲۶)

''اس کی مہر خشت ہوگی (یا) اس شراب کا آخر مشک ہوگا۔''

یعنی اس کے ہر گھونٹ کے پینے کے بعد مشک کی بو اس میں سے نکلے گی،یا یہ معنی کہ بوتل یا صراحی کا منہ غایت صفائی اور نزاہت کی غرض سے دنیا کی طرح مٹی،لاکھ یا موم کے بجائے مشک خالص سے بند ہوگا۔

بہر حال ان تمام استعمالات سے یہ بالیقین معلوم ہوگا کہ اس لفظ سے عمومی اور مشترک معنی کسی چیز کے بند کرنے کے ہیں۔لفظ خاتم کی دو قراءتیں ہیں۔مشہور قراءت [1] تو خاتِم (بکسر تاء) کی ہے جس کے معنی ختم کرنے والے اور بند کرنے والے کے ہوئے اور دوسری قراءت خاتَم کی ہے۔جس کے معنی ہیں وہ شے جس

[1] تفسیر ابن جریر طبری، جز ۲۲، ص: ۱۱ وتفسیر ابن حبان اُندلسی، تفسیر آیت مذکور، ج۷، ص: ۲۳۶۔

کے ذریعہ سے کوئی شے بند کی جائے اور اس پر مہر لگائی جائے، تاکہ وہ کھولی نہ جا سکے اور نہ اس کے اندر کوئی چیز باہر سے جا سکے۔ الغرض دونوں حالتوں میں آیت پاک کا حاصل معنی ایک ہی ہوگا کہ آپ ﷺ کا وجود پیغمبروں کے سلسلہ کو بند کرنے والا اور ان پر مہر لگا دینے والا ہے کہ پھر آیندہ کوئی نیا شخص اس جماعت میں داخل نہ ہو سکے۔

آیت پاک کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ تمہارے وہ ظاہری باپ نہیں ہیں۔ جس کے رشتہ کی بنا پر وراثت اور حرمت نکاح وغیرہ کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ روحانی باپ (رسول اللہ) اور سب سے آخری روحانی باپ (خاتم النبیین) ہیں۔ اس لئے باپ ہونے کے ظاہری احکام کے بغیر آپ سے وہی پدرانہ محبت رکھنی چاہیے اور اسی طرح آپ کی پدرانہ اطاعت کرنی چاہیے۔

احادیث صحیحہ میں لفظ خاتم النبیین کی تشریح بالکل صاف اور واضح ہے۔ مسند احمد میں حضرت ثوبان [1] اور حضرت خدیفہ رضی اللہ عنہما [2] اور ترمذی میں صرف حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے بعد تیس کے قریب جھوٹے نبی پیدا ہوں گے۔''

((وانا خاتم النبيين لا نبي بعدي)) [3]

''بہ تحقیق میں نبیوں کا خاتم ہوں میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔''

(لا نبي بعدي) خاتم النبیین کی تفسیر وتشریح ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاتم النبیین کے یہ معنی ہیں کہ آپ ﷺ کے بعد پھر کوئی نبی نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ آپ کی تکمیل دین اور ختم نبوت کی جو مشہور تمثیل بیان کی ہے اور جس کو ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں۔ اس سے بھی لفظ خاتم النبیین کی پوری تفسیر ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری اور دیگر انبیا کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے کوئی عمدہ محل بنوایا ہو، لوگ اس کو آ کر دیکھتے ہیں اور اس کی عمدگی اور خوبصورتی پر عش عش کرتے ہیں، لیکن اس کے ایک گوشہ میں ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے، تو کہتے ہیں کہ اگر یہ اتنا ناتمام نہ رہ جاتا تو خوب ہوتا۔'' اس کے بعد مختلف روایتوں میں حسب ذیل الفاظ ہیں:

((فانا تلك اللبنة)) [4] ''تو میں وہی آخری اینٹ ہوں۔''

((فانا اللبنة وانا خاتم النبيين)) [5]

''تو میں وہی آخری اینٹ ہوں اور سب پیغمبروں کا خاتم ہوں۔''

---

[1] ج ۵، ص: ۲۷۸۔ [2] ج ۵، ص: ۳۹۶، اس روایت میں ۲۷ تعداد لکھی ہے جن میں چار عورتیں ہوں گی۔

[3] ابواب الفتن، باب ما جاء لا تقوم الساعة حتى يخرج......: ۲۲۱۹۔

[4] صحيح بخاري، كتاب المناقب باب خاتم النبيين: ۳۵۳۵؛ صحيح مسلم، كتاب الفضائل: ۵۹۵۹۔

[5] صحيح بخاري، ايضاً؛ صحيح مسلم: ۵۹۶۱۔

((فانا موضع اللبنة جئت فختمت الانبياء)) ❶

''میں پیغمبروں میں اسی آخری اینٹ کی جگہ ہوں میں آیا تو پیغمبروں کا سلسلہ ختم کر دیا۔''

((فی النبيين موضع تلك اللبنة)) ❷

''میں پیغمبروں میں اسی آخری اینٹ کی جگہ ہوں۔''

آنحضرت ﷺ نے دیگر انبیا کے مقابلہ میں اپنے جو مخصوص فضائل گنائے ہیں۔ ان میں ایک ختم نبوت بھی ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم (کتاب المساجد) ترمذی (کتاب السیر باب الغنیمہ) اور نسائی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((وختم بی النبیون)) ❸ ''اور انبیا مجھ سے ختم کیے گئے۔''

سنن دارمی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((وانا خاتم النبيين ولا فخر)) ❹

''اور پیغمبروں کا خاتم ہوں اور اس پر فخر نہیں۔''

آپ ﷺ کا خاتم نبوت ہونا کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا۔ بلکہ یہ آپ کی وہ خصوصیت تھی جو آپ کے لئے روز اوّل سے مقرر ہو چکی تھی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((انی عبدالله خاتم النبيين وان آدم لمنجدل فی طينته)) ❺

''میں خدا کا بندہ اور خاتم انبیا تھا اور آدم ہنوز اپنے عنصر خاکی میں پڑے تھے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب آپ ﷺ نے اہل بیت کی نگرانی کے لئے مدینہ میں چھوڑ کر تبوک جانا چاہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمرکاب نہ ہونے پر ملال خاطر ظاہر کیا تو آپ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا:

((الا ترضى ان تكون منی بمنزلة هارون من موسٰی الا انه ليس نبی بعدی)) ❻

''کیا تم اس پر خوش نہیں کہ تم میں اور مجھ میں وہ نسبت ہو جو ہارون اور موسیٰ میں تھی، لیکن یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔''

❶ صحیح مسلم، عن جابر: ۵۹۶۳۔ ❷ ترمذی، ابواب المناقب، باب سلوا الله لی الوسيلة: ۳۶۱۳۔

❸ صحیح مسلم، کتاب المساجد، :۱۱۶۷؛ جامع ترمذی، ابواب السير، باب ماجاء فی الغنيمة:۱۵۵۳۔

❹ سنن دارمی، المقدمة، باب ما اعطی النبی ﷺ من الفضل: ۴۹۔

❺ یہ حدیث حسب ذیل کتابوں میں ہے،مستدرك حاكم تفسير سورة احزاب، ج ۲، ص: ۴۱۸، حاکم اور ذہبی نے اس کی تصحیح کی ہے وتاریخ امام بخاری، بحواله فتح الباری، ج ۶، ص:۴۰۷ وحلية الاولياء ابی نعيم وشعب الايمان بيهقی (بحواله كنز العمال، ج ۶، ص: ۱۰۴ حیدرآباد) ومسند احمد، ج ۴، ص: ۱۲۷، ۱۲۸۔

❻ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة تبوك:۴۴۱۶۔

صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں:

((غیر انه لانبی بعدی)) ❶ ''لیکن یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔''

((الا انه لا نبوة بعدی)) ''لیکن یہ کہ میرے بعد کوئی نبوت نہیں۔''

صحیح بخاری ❷ اور صحیح مسلم ❸ میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بنو اسرائیل کی نگرانی اور سیاست انبیا کرتے تھے، ایک نبی جب مرتا تھا تو دوسرا نبی پیدا ہوتا تھا۔''

((وانه لا نبی بعدی)) ''اور بہ تحقیق میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔''

جامع ترمذی ❹ اور مستدرک ❺ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مدح میں فرمایا:

((لو کان نبی بعدی لکان عمر بن الخطاب))

''اور اگر میرے بعد کوئی نبی ہوسکتا تو وہ خطاب کے بیٹے عمر ہوتے۔''

عربی زبان جاننے والے کو معلوم ہے کہ ''لو'' امر محال کے لئے آتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کے بعد کسی دوسرے نبی کا آنا محال ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''میرے پانچ نام ہیں: میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میں ماحی ہوں کہ خدا میرے ذریعہ سے کفر کو محو کرے گا، میں حاشر ہوں کہ خدا میرے پیچھے سب کو جمع کرے گا اور میں عاقب (آخری) ہوں۔ ❻ "الذی لیس بعده نبی" جس کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ جامع ترمذی اور بعض دوسری کتابوں میں آخری فقرہ ان الفاظ میں ہے: ((الذی لیس بعدی نبی)) یعنی ''میں وہ عاقب ہوں کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔'' ❼

صحیح بخاری میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''خوشخبریوں کے سوا نبوت کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا۔'' صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! خوشخبریاں کیا ہیں۔ فرمایا: ''رؤیائے صالحہ۔'' ❽ (یعنی سچے خواب) پڑھ چکے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انبیا کو اپنے امور غیب سے مطلع کرنے کے متعدد ذرائع مقرر کئے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک رؤیائے صالحہ بھی ہے۔ اسی لئے احادیث میں آیا ہے کہ ''نبوت کے چھیالیس اجزا میں سے ایک جزو

---

❶ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی: ٦٢١٨، ٦٢١٧۔

❷ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ماذکر عن بنی اسرائیل: ٣٤٥٥۔

❸ صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب وجوب الوفاء......: ٤٧٧٣۔

❹ ابواب المناقب: ٣٦٨٦ حدیث غریب حسن۔ ❺ مناقب عمر، ج ٣، ص: ٨٥، حدیث صحیح صححه الذهبی۔ ❻ صحیح بخاری: ٣٥٣٢؛ صحیح مسلم، باب اسمائه ﷺ: ٦١٠٥ صحیح بخاری میں عاقب کی تفسیر مذکور نہیں؛ مسند احمد، ج ٤، ص: ٨٤، میں یہ حدیث اور عاقب کی یہ تفسیر امام زہری سے مذکور ہے۔

❼ فتح الباری شرح بخاری، ج ٦، ص: ٤٠٦۔

❽ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب المبشرات: ٦٩٩٠۔

ومومن کا رؤیائے صالحہ ہے۔" [1] ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "تم سے پہلے قوموں میں محدثین (بات کئے گئے) ہوا کرتے تھے۔ اگر میری امت میں کوئی محدث ہوگا تو وہ عمر ہیں۔" [2] ائمہ حدیث نے محدث کے معنی ملہم کے لکھے ہیں۔

غرض ختم نبوت کے بعد اب جو نعمت اہل ایمان کے لئے باقی رہ گئی ہے وہ صرف دو ہیں۔ رؤیائے صالحہ اور الہام۔ لیکن چونکہ نبی کے سوا کوئی انسان معصوم نہیں اور نہ اس کی سچائی کی کوئی قطعی شہادت موجود ہے۔ اس لئے کسی مومن کے رؤیائے صالحہ اور الہامات کسی دوسرے شخص پر بلکہ خود اس پر بھی حجت نہیں اور ان کے منجانب اللہ ہونے پر یقین کامل کرنا اور ان کی اطاعت و پیروی کرنا اور ان کی طرف لوگوں کو دعوت دینا اور ان کی صداقت پر تحدی کرنا ضلالت و گمراہی ہے۔ ان رؤیائے صالحہ اور الہامات صادقہ کے ذریعہ سے جو چیز مومن کو دی جاتی ہے۔ وہ احکام نہیں ہوتے بلکہ صرف خوشخبریاں ہوتی ہیں۔ یعنی امر غیب اور مستقبل سے کچھ اطلاعات اور مناظر۔

مسند ابن حنبل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے مرض الموت میں حجرہ مبارک کا پردہ اٹھایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ امام تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم صف بستہ پیچھے، اس وقت یہ آخری اعلان فرمایا:

((یاایها الناس لم یبق من مبشرات النبوة الا الرؤیا الصالحة یراها المسلم او تری له)) [3]

"اے لوگو! نبوت کی خوشخبریوں (غیبی ذرائع علم وخبر) میں سے اب کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ لیکن ایک رؤیائے صالحہ جو مسلمان اپنے متعلق آپ دیکھے یا کوئی دوسرا اس کے متعلق دیکھے۔"

اس سے صاف ہو گیا کہ رؤیائے صالحہ شخصی احوال و مناظر سے متعلق ہے۔ اسی کتاب میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہمارے مقصد کے اثبات کے لئے اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن مجلس نبوی ﷺ میں خدام حاضر تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((ان الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی))

"رسالت اور نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو میرے بعد نہ کوئی رسول ہوگا اور نہ کوئی نبی۔"

صحابہ رضی اللہ عنہم پر یہ بات سخت گزری تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((ولکن المبشرات)) "لیکن خوشخبریاں باقی ہیں۔" لوگوں نے عرض کی، یا رسول اللہ! خوشخبریاں کیا ہے؟ فرمایا: "مرد مسلم کی رؤیائے صالحہ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التعبیر: ٦٩٨٣ وصحیح مسلم، کتاب الرؤیا: ٥٩٠٦ ومسند احمد، ج٣، ص: ١٤٩، عن انس۔ [2] بخاری، کتاب فضائل الصحابة: ٣٦٨٩ ومسلم: ٦٢٠٤ وترمذی: ٣٦٩٣۔

[3] مسند أحمد، ج١، ص: ٢١٩۔

وہ نبوت کے اجزا میں سے ایک جزو ہے۔'' ❶

یہ تمام حدیثیں حقیقت میں جیسا کہ ترمذی ❷ وحاکم میں ہے۔اس آیت کی تفسیر میں ہیں:

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ﴾ (۱۰/ یونس:۶۳، ۶۵)

''ہاں! اولیائے الٰہی کو کوئی خوف اور غم نہیں۔ جو ایمان لائے اور تقویٰ کرتے تھے۔ان کو دنیا اور آخرت میں بشارت ہے۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ دنیا میں ان کے لئے بشارت کیا ہے؟ فرمایا: ''رؤیائے صالحہ۔'' اس آیت پاک سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ ان مبشرات کے حصول کا ذریعہ ایمان اور تقویٰ کی تکمیل ہے اور دوسری یہ کہ ایسے لوگوں کا نام جن کو یہ مرتبہ حاصل ہوا، اولیائے اللہ ہے اور اس لئے ان کے اس رتبہ کا نام ولایت ہوگا۔اس کو جزئی نبوت، لغوی نبوت، مجازی نبوت، نبوت ناقصہ وغیرہ کے الفاظ سے ادا کرنا ایسی لفظی گمراہی ہے، جو معنوی گمراہی کی طرف مفضی ہے اور اس سے شرک فی النبوۃ کی اسی طرح برائیاں پیدا ہوں گی، بلکہ ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مجازی معنوں میں ابن اللہ کہہ کر حقیقی معنوں میں عیسائی شرک فی التوحید میں مبتلا ہو گئے، کیونکہ ہر قسم کی نبوتوں کا خاتمہ ہو چکا، دین کی تکمیل ہو چکی، دنیا میں خدا کا آخری پیغام دعوت محمدی ﷺ کے ذریعہ سامعہ نواز ہو چکا، معمارِ قدرت اپنی عمارت میں اس آخری پتھر کو اپنی جگہ پر رکھ کر اپنی تعمیر پوری کر چکا، درجہ بدرجہ ستاروں کے طلوع کے بعد وہ خورشید انور طالع ہوا۔ جس کے لئے غروب نہیں۔طرح طرح کی بہاروں کے آنے کے بعد باغ کائنات میں وہ سدا بہار موسم آ گیا۔ جس کے بعد پھر خزاں نہیں۔

شفاعتِ اولین

عرصہ دار وگیر محشر میں جب جلال الٰہی کا آفتاب پوری تمازت پر ہوگا اور گناہگار انسانوں کو امن کا کوئی سایہ نہیں ملے گا۔ اس وقت سب سے پہلے فخر موجودات، باعث خلق کائنات، سید اولاد آدم، خاتم الانبیا و رحمت عالم ﷺ ہاتھوں میں لوائے حمد لے کر اور فرق مبارک پر تاج شفاعت رکھ کر گناہگاروں کی دستگیری فرمائیں گے۔لفظ ''شفاعت'' اصل لغت میں شـفـع سے نکلا ہے۔ جس کے معنی جوڑا بننے، ایک کے ساتھ دوسرے کے ہونے کے ہیں۔، چونکہ شفاعت اصل میں یہی ہے کہ کسی درخواست کنندہ اور عریضہ گزار کے ہم آہنگ ہو کر کسی بڑے کے سامنے اس کی عرض و درخواست کو قبول کر لینے کی خواہش کا اظہار کرنا۔ آپ ﷺ

❶ مسند احمد، عن انس ج ۳، ص: ۲٦۷ وترمذی، ابواب الرؤیا، باب ذھبت النبوۃ وبقیت المبشرات: ۲۲۷۲۔

❷ تفسیر سورۃ یونس وکتاب الرؤیا ومستدرك حاکم، ج ۲، ص: ۳٤۰ تفسیر یونس (صحیح)

کی شفاعت بھی یہی ہوگی کہ آپ ﷺ گناہگاروں کی زبان بن کر ان کی طرف سے خداوند ذوالجلال کے اذن سے اس کے سامنے ان کی بخشائش و مغفرت کی درخواست پیش کریں گے۔ سورۂ اسراء میں ہے:

﴿ عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝ ﴾ (۱۷/ الاسرآء:۷۹)

''قریب ہے کہ خدا تجھے مقام محمود میں اٹھائے۔''

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں تمام صحیح روایتوں میں متعدد صحابہ سے منقول ہے کہ مقام محمود سے مراد رتبہ شفاعت ہے۔ (1) صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے شفاعت کے تمام واقعات بیان کر کے یہ آیت بالا تلاوت کی، پھر حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا: یہی وہ مقام محمود ہے جس کا تمہارے پیغمبر سے وعدہ کیا گیا ہے۔ (2) صحیح مسلم میں ہے کہ بصرہ کے کچھ خوارج جو گناہ کبیرہ کے مرتکب کو دائمی جہنمی سمجھتے ہیں۔ یعنی ان کے حق میں شفاعت کے اثر کے قائل نہیں۔ مدینہ منورہ آئے۔ یہاں مسجد نبوی ﷺ میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ صحابی قیامت کے واقعات بیان کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے بڑھ کر کہا، اے رسول اللہ کے صحابی! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔ خدا تو قرآن میں یہ کہہ رہا ہے۔ یہ کہہ کر قرآن پاک کی ایک آیت پڑھی جس کا یہ مطلب ہے کہ دوزخی جب دوزخ سے نکلنا چاہیں گے تو پھر اسی میں ڈال دیے جائیں گے: ﴿ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِیْدُوْا فِیْهَا ﴾ (۳۲/ السجدۃ:۲۰) حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے پوچھا تم نے قرآن پڑھا ہے؟ اس نے جواب دیا، ہاں۔ فرمایا: تم نے اس مقام محمود کا حال سنا ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ تمہارے پیغمبر ﷺ کو مبعوث کرے گا؟ اس نے کہا، ہاں سنا ہے۔ فرمایا، تو یہی محمد رسول اللہ آنحضرت ﷺ کا مقام محمود ہے۔ جس کے ذریعہ سے خدا دوزخ سے جس کو نکالنا چاہے گا۔ نکالے گا۔ یہ سن کر ایک کے سوا باقی سب اپنے اپنے عقیدہ باطل سے تائب ہوگئے اور بولے کہ کیا یہ بوڑھا صحابی رسول پر جھوٹ بولے گا؟ (3)

بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ''قیامت کے روز ہر امت اپنے اپنے پیغمبر کے پیچھے چلے گی اور کہے گی کہ اے وہ! خدا کی درگاہ میں ہماری شفاعت کیجئے۔ یہاں تک کہ شفاعت کا معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچے گا۔ یہی وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود میں اٹھائے گا۔'' (4) جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص اذان سن کر یہ دعا مانگے گا کہ اے خدا! جو پوری دعا اور کھڑی ہونے والی نماز کا مالک ہے۔ محمد کو وسیلہ اور فضیلت اور وہ مقام محمود عطا فرما، جس کا تو نے وعدہ فرمایا تو قیامت کے دن اس کے لئے میری شفاعت اترے گی۔'' (5) آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر نبی کو کوئی نہ

---

(1) صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قوله: عسی ان یبعثك......: ٤٧١٨ وجامع ترمذی:٣١٣٧ ومستدرك تفسیر آیت مذکورة ج٢، ص: ٣٦٣ وصحیح مسلم کتاب الایمان: ٤٧٣۔ (2) صحیح بخاری، کتاب التوحید: ٧٤٤٠۔ (3) صحیح مسلم، کتاب الایمان:٤٧٣۔ (4) صحیح بخاری، تفسیر آیت مذکور:٤٧١٨۔

(5) صحیح بخاری، تفسیر آیت مذکور:٤٧١٩ باب الدعاء عندالنداء: ٦١٤۔

کوئی مستجاب دعا دی گئی، میں نے اپنی اس دعا کو اپنی امت کے لئے چھپا رکھا۔'' [1] پھر فرمایا: ''مجھ کو دیگر انبیا پر چند فضیلتیں عطا ہوئیں ...... ان میں سے ایک یہ کہ مجھے شفاعت عطا کی گئی۔'' [2] (یعنی شفاعت اولین)

مؤطا امام مالک اور صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے متعدد تابعیوں نے یہ متفقہ روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر نبی کو ایک مقبول دعا مانگنے کا موقع عطا کیا گیا تو انہوں نے وہ دعا مانگ لی اور وہ قبول کر لی گئی۔ لیکن میں نے اپنی دعا کا یہ موقع قیامت کے دن کے لئے چھپا رکھا ہے اور وہ اپنی امت کی شفاعت ہے۔'' [3] فرمایا: ''میں سب سے پہلا شفیع ہوں گا اور سب سے پہلا وہ شخص جس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔'' اور فرمایا: ''میں پہلا ہوں گا جو جنت کی شفاعت کرے گا۔'' [4]

اُس دن جب دنیا کی گناہگاریاں اپنی عریاں صورت میں نظر آئیں گی اور آدمی کی اولاد ترساں و لرزاں کسی شفیع کی تلاش میں ہوگی، کبھی آدم علیہ السلام کا سہارا ڈھونڈھے گی، کبھی نوح و ابراہیم علیہما السلام کو یاد کرے گی۔ کبھی موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کی طرف بے تابانہ لپکے گی، مگر ہر جگہ نفسی نفسی کی آواز بلند ہوگی۔ بالآخر شفیع المذنبین سید الاولین والآخرین آگے بڑھیں گے اور تسکین کا پیام سنائیں گے۔ حدیث کی اکثر کتابوں میں خصوصاً صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ، حضرت انس بن مالک، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہم سے متعدد طریقوں سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کی ایک مجلس میں بیان فرمایا: ''قیامت کے ہولناک میدان میں لوگوں کو ایک شفیع کی تلاش ہوگی۔ لوگ پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے پاس پہنچیں گے اور کہیں گے کہ آپ ہمارے باپ ہیں، خدا نے آپ کو اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا اور آپ میں اپنی روح پھونکی اور فرشتوں کو آپ کے سجدہ کا حکم دیا۔ آپ خدا کے حضور میں ہماری سفارش کیجئے۔ وہ جواب دیں گے کہ میرا یہ رتبہ نہیں۔ میں نے خدا کی نافرمانی کی تھی۔ آج خدا کا وہ غضب ہے جو کبھی نہ ہوا تھا اور نہ ہو گا۔ نفسی نفسی (اے میری جان! اے میری جان!) لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔ اور کہیں گے کہ آپ روئے زمین کے پہلے پیغمبر ہیں، خدا نے آپ کو شکر گزار بندہ کا خطاب دیا ہے۔ آج خدا کے حضور ہماری سفارش کیجئے وہ کہیں گے، ہمارا یہ رتبہ نہیں۔ آج خدا کا وہ غضب ہے جو نہ کبھی ہوا تھا اور نہ کبھی ہوگا۔ مجھ کو ایک مستجاب دعا کا موقع عنایت ہوا تھا۔ وہ اپنی قوم کی تباہی کے لئے مانگ چکا۔ نفسی نفسی! تم ابراہیم کے پاس

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب فی المشیئة والارادة......: ۷۴۷٤؛ کتاب الدعوات، باب لکل نبی دعوة مستجابة: ٦٣٠٤، ٦٣٠٥؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب اختباء النبی ﷺ دعوة الشفاعة: ٤٨٧۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الصلوة، باب قول النبی ﷺ جعلت لی الارض......: ٤٣٨؛ صحیح مسلم، کتاب المساجد: ١١٦٣۔ [3] صحیح بخاری، کتاب التوحید: ٧٤٧٤؛ کتاب الدعوات: ٦٣٠٤؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان: ٤٨٨۔

[4] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب انا اوّل الناس یشفع فی الجنة: ٤٨٣۔

جاؤ۔مخلوق ان کے پاس جائے گی اور اپنی وہی درخواست پیش کرے گی کہ آپ تمام انسانوں میں خدا کے دوست ہوئے اور اپنے پروردگار سے شفاعت کیجئے۔وہ بھی کہیں گے،میرا یہ رتبہ نہیں۔آج خدا کا وہ غضب ہے جو نہ کبھی ہوا اور نہ ہوگا۔نفسی نفسی!تم موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور کہیں گے کہ اے موسیٰ علیہ السلام!آپ خدا کے پیغمبر ہیں۔خدا نے اپنے پیغام وکلام سے آپ کو لوگوں پر برتری بخشی ہے۔اپنے خدا سے ہمارے لئے سفارش کیجئے۔کیا آپ ہماری مصیبتوں کو نہیں دیکھتے؟حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے کہیں گے کہ آج خدا کا وہ غضب ہے جو کبھی نہیں ہوا اور نہ ہوگا میں نے ایک ایسے شخص کو قتل کیا جس کے قتل کا مجھے حکم نہیں دیا گیا تھا۔نفسی نفسی!تم لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جا کر لوگ کہیں گے کہ اے عیسیٰ!آپ خدا کے وہ رسول ہیں،جس نے گہوارہ میں کلام کیا اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں۔اپنے پروردگار سے ہماری سفارش کیجئے وہ بھی کہیں گے،یہ میرا رتبہ نہیں۔آج خدا کا وہ غضب ہے۔جو نہ کبھی ہوا اور نہ ہوگا۔نفسی نفسی!تم محمد ﷺ کے پاس جاؤ۔مخلوق آپ کے پاس آئے گی اور کہے گی اے محمد ﷺ آپ خدا کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں اور وہ ہیں،جن کے اگلے اور پچھلے سب گناہ معاف ہیں۔آپ اپنے پروردگار سے ہماری شفاعت کیجئے۔آپ اٹھ کر عرش کے پاس آئیں گے اور اذن طلب کریں گے۔اذن ہوگا تو سجدہ میں گر پڑیں گے۔آپ ﷺ کے سامنے وہ کچھ کھول دیا جائے گا جو کسی اور کے لئے نہیں کھولا گیا۔اللہ تعالیٰ اپنے محامد اور تعریفوں کے وہ معنی اور وہ الفاظ آپ کے دل میں القا فرمائے گا جو اس سے پہلے کسی کو القا نہ ہوئے۔آپ دیر تک سربسجود رہیں گے۔پھر آواز آئے گی۔اے محمد (ﷺ)!سر اٹھاؤ کہو سنا جائے گا۔مانگو دیا جائے گا۔شفاعت کرو قبول کی جائے گی۔عرض کریں گے:((الٰهي امتي امتي))، خداوندا!میری امت،میری امت،حکم ہوگا،جاؤ جس کے دل میں جَو کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہوگا،اس کو نجات ہے۔آپ خوش خوش جائیں گے اور اس کی تعمیل کر کے اور پھر حمد وثنا کر کے عرض پرداز ہوں گے اور سجدہ میں گر پڑیں گے۔پھر صدائے غیب آئے گی کہ اے محمد (ﷺ)!سر اٹھاؤ کہو سنا جائے گا۔مانگو دیا جائے گا، شفاعت کرو قبول ہوگی،عرض کریں گے: ((الٰهي امتي امتي)) حکم ہوگا،جاؤ جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو وہ بخشا گیا۔حضور ﷺ جائیں گے اور پھر واپس آ کر عرض گزار ہوں گے۔حمد وثنا کریں گے اور سربسجود ہوں گے آواز آئے گی جاؤ جس کے دل میں چھوٹی سے چھوٹی رائی کے برابر ایمان ہو اس کو بھی دوزخ سے نکالو۔آپ ﷺ پھر جا کر واپس آئیں گے اور گزارش کریں گے اور حمد وثنا کر کے سجدہ میں گر پڑیں گے،پھر ندا آئے گی۔اے محمد (ﷺ)!سر اٹھاؤ کہو سنا جائے گا،مانگو دیا جائے گا،شفاعت کرو قبول ہو گی،عرض کریں گے:جس نے بھی تیری یکتائی کی گواہی دی اس کی شفاعت کا اذن عطا ہو۔صدا آئے گی،

اس کا اختیار تم کو نہیں لیکن مجھے اپنی عزت و کبریائی اور اپنی عظمت و جبروت کی قسم ہے میں دوزخ سے ہر اس شخص کو نکالوں گا جس نے مجھے ایک کہا اور اپنے لئے دوسرا معبود نہیں بنایا ((من قال لا اله الا اللّٰه))۔ ❶

کمزور انسانوں کو تسکین کا یہ پیام محمد رسول اللہ ﷺ کے سوا کس نے سنایا۔

فضائل اُخروی

آنحضرت ﷺ کے یہ وہ خصائص تھے، جو آپ کو پیغمبر، مبلغ دین، صاحب مذہب اور پیشوائے امت ہونے کی حیثیت سے عطا ہوئے تھے۔ علاوہ بریں آپ کو آخرت کی دنیا میں بھی مزید فضائل عنایت ہوئے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت میں میں پیغمبروں کا نمائندہ اور امام اور ان کی شفاعت کا پیرو کار ہوں گا اور اس پر فخر نہیں۔'' ❷ پھر فرمایا ہے: ''میں قیامت کے دن تمام بنی آدم کا سردار ہوں اور اس پر فخر نہیں اور میرے ہی ہاتھ میں لوائے حمد ہو گا اور اس پر فخر نہیں اور قیامت کے دن آدم وغیرہ تمام پیغمبر میرے علم کے نیچے ہوں گے اور اس پر فخر نہیں اور سب سے پہلے میں ہی قبر سے باہر آؤں گا۔'' ❸ نیز ارشاد ہے: ''لوگ قبروں سے جب اٹھائے جائیں گے تو سب سے پہلا اٹھنے والا میں ہوں گا۔ جب وہ خدا کے سامنے حاضر ہوں گے تو ان کی طرف سے بولنے والا میں ہوں گا۔ جب وہ ناامید ہوں گے تو ان کو خوشخبری سنانے والا میں ہوں گا۔ اس دن خدا کی حمد کا علم میرے ہاتھ میں ہو گا۔'' ❹

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّسَلَّمَ

تمت الجزء الثالث من السيرة النبوية

على صاحبها الصلوة والتحية

یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ

سید سلیمان ندوی

---

❶ یہ پوری حدیث صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورة بنی اسرائیل: ٤٧١٢ وکتاب احادیث الانبیاء: ٣٣٤٠ وصحیح مسلم، باب الشفاعة: ٤٧٥، ٤٧٩، ٤٨٠ میں مختلف صحابیوں سے تھوڑے تھوڑے الفاظ کے تغیر سے مروی ہے، ہم نے سب کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔

❷ ترمذی، ابواب المناقب، باب سلوا الله لی الوسیلة: ٣٦١٣ حدیث حسن صحیح غریب۔

❸ ایضاً: ٣٦١٥ حدیث حسن۔ ❹ ایضاً: ٣٦١٠ حدیث حسن غریب۔



سیرۃ النبی ﷺ

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

محمد رسول اللہ

تخریج شدہ ایڈیشن

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب



سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

تالیف

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ اسلامیہ

حصہ چہارم

تخریج شدہ ایڈیشن

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب

اس حصے میں منصب نبوت کے بیان کے ساتھ ساتھ اسلام سے پہلے دنیا بالخصوص عرب ممالک کی تہذیب و اخلاقی حالت پر تفصیلی بحث ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ نبوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اخلاقی و مذہبی اصلاح کا عظیم الشان فریضہ سرانجام دیا ہے۔ اسی طرح اسلامی عقائد کا بھی تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔

تالیف

علامہ شبلی نعمانی

علامہ سید سلیمان ندوی

مکتبہ اسلامیہ

کتاب ---------- سیرۃ النبی ﷺ

تالیف ---------- علامہ شبلی نعمانی ، علامہ سید سلیمان ندوی

ناشر ---------- محمد سرور عاصم

اشاعت ---------- اکتوبر 2012ء

قیمت ----------

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون: 042-37244973 فیکس: 042-37232369
بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد۔ پاکستان فون: 041-2631204, 2034256
E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

فہرست مضامین سیرۃ النبی ﷺ حصہ چہارم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ طبع اوّل

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اے باز کن درِ معانی — بر ما بکلیدِ آسمانی
ہر چہ از تو گمان برم بچونی — آن من بوم و تو از آن برونی
شاہ رسل و شفیع مرسل — خورشید پسین و نورِ اوّل
سلطانِ ممالکِ رسالت — طُغرائے صحیفۂ جلالت (خسرو)

پیش نظر کتاب ''سیرۃ النبی ﷺ'' کے سلسلہ کی چوتھی جلد ہے۔اس کا موضوع ''منصبِ نبوت'' ہے۔ اس تقریب سے سب سے پہلے اس میں ایک مقدمہ ہے، جس میں نبوت کی حقیقت اور اس کے لوازم و خصوصیات کی تشریح ہے۔اس کے بعد دیباچہ ہے، جس میں آنحضرت ﷺ کی ولادت اور ظہور اسلام کے وقت دنیا کی مذہبی و اخلاقی حالت کا مرقع دکھایا گیا ہے، بالخصوص آنحضرت ﷺ سے پہلے ملک عرب کی جو مذہبی و اخلاقی حالت تھی اور اس کی اصلاح میں جو دقتیں درپیش تھیں، شرح وبسط کے ساتھ ان کی تفصیل کی گئی ہے۔اس کے بعد آپ کی تعلیمات وارشادات کی تفصیل سے اصل کتاب کا آغاز ہوا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو پیش گاہِ باری سے جو شریعتِ کاملہ اور قانون ابدی عطا ہوا وہ درحقیقت چار عنوانوں پر منقسم ہے ① عقائد، ② عبادات، ③ اخلاق اور ④ معاملات، خیال تھا کہ عقائد وعبادات کی ایک جلد ہو اور اخلاق و معاملات دوسری جلد میں ہوں مگر جوں جوں مسافرِ قلم اس دشوار گزار مرحلہ میں آگے بڑھتا گیا، راستہ اس قدر وسیع اور مسافت اتنی ہی بعید نظر آنے لگی، ناچار اس جلد کو صرف عقائد کے بیان پر محدود رکھا گیا دوسری جلد میں عبادات اوران کی حقیقت اور فرائض چہارگانہ کے حقائق وفوائد سے بحث ہوگی اور تیسری جلد کا عنوان اخلاق و معاملات ہوگا جس میں ہم ان شاء اللہ بہ تفصیل بتائیں گے کہ تمدن ومعاشرت بالخصوص قوانینِ نکاح، طلاق، وراثت، حقوق نساء، غلامی، جہاد، اصولِ حکومت اور اقتصادیات وغیرہ کے متعلق تمام دنیا کے مذاہب کے کیا اصول اور تمام سلطنتوں اور قوموں کے کیا قوانین تھے اور آج مغرب نے اس انتہائی تہذیب تک پہنچ کر کس حد تک ان امور میں ترقی کی ہے پھر موازنہ کر کے ہم دکھائیں گے کہ شریعت اسلام کے مقابلہ میں مغرب کی معراجِ ترقی شریعت اسلام کا پایۂ اولین ہے۔

حضرت الاستاذ مرحوم نے اس جلد کا کام شروع ہی کیا تھا اور مذکورۂ بالا مباحث میں سے صرف عرب

جاہلیت کے مذہبی واخلاقی حالات کے پچیس تیس صفحے لکھنے پائے تھے کہ وفات پائی، یہ صفحے بھی ان اوراق میں شامل ہیں مگر چونکہ ان میں بکثرت اضافہ اور ترمیم کی ضرورت پیش آئی ہے اس لیے ان صفحات کو ان کے اسم گرامی کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط کرتا ہوں۔ بقیہ پوری کتاب کی ذمہ داری خاکسار ہی کے خطا کار قلم پر ہے۔ ﴿ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ ﴾ (۱۲/ یوسف:۵۳) کوشش ہے کہ ان اوراق میں پیغمبر علیہ السلام کے پیغام وتعلیم کو پوری تشریح، استناد، استدلال اور دلچسپی کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائے قرآن پاک کے استناد کو ہر موقع پر سب سے آگے رکھا گیا ہے اور اسی کے پرتو میں احادیث صحیحہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، مناظرانہ پہلو سے بچ کر ہر پیش نظر مسئلہ میں اسلام کا دوسرے مذاہب سے اس غرض سے موازنہ کیا گیا ہے۔ تاکہ اسلام کی تکمیلِ شان نمایاں ہو جائے۔ ان اوراق کے لکھنے والے کے نزدیک نسخ شریعت کے معنی کسی حکم کو اس کے غلط یا غیر مفید ہونے کے سبب سے سرے سے مٹا کر کسی دوسرے حکم کو نافذ کرنے کے نہیں ہیں۔ بلکہ محرف احکام کی جگہ پر اصل احکام کے دوبارہ نازل ہونے اور دنیا کے حسب حال ناقص کی جگہ کامل اور کامل کے بدلہ کامل تر تعلیمات بلکہ ان کی تکمیل کرنے والے کے ہیں۔ مذاہب کی تاریخ جب سے شروع ہوتی ہے ہر مذہب اور اس کی کتاب انسانی عروج وترقی کی ایک ایک منزل ہے اور اسلام اس عروج وترقی کی وہ انتہائی منزل مقصود ہے جس کے بعد تکمیل دین کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ خود اس کا دعویٰ ہے اور اس دعویٰ میں کوئی اور دین اس کا شریک نہیں ہے کہ ﴿ اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۳) ان کی تکمیلی مباحث میں سے یہ جلد صرف عقائد پر مشتمل ہے اور کون نہیں جانتا کہ مذاہب میں اعتقادات کی حیثیت کتنی اہم اور ان کی بحث کتنی نازک ہے۔ اس لیے اس خارزار سے کسی آبلہ پا کا بسلامت گزر جانا کس قدر مشکل ہے، تاہم میں نے جدوجہد اسی کی کی ہے کہ کسی آبلہ کو ٹھیس لگے بغیر اس راستہ کو طے کرلوں، چلنے والا تو تھک کر چور ہے۔ اب یہ دیکھنے والوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے رہروی کی یہ شرط کہاں تک پوری کی۔

ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقہ کے مطابق بھی اگر عقائد کی کتاب لکھی جاتی تو یہ منزل نہایت آسان تھی کہ ان میں سے ہر ایک کی مدوّن ومرتب کتابیں سامنے ہیں لیکن مجھے اس جلد میں کسی خاص فرقہ کے نہیں بلکہ اسلام کے وہ عقائد لکھنے تھے جن پر ایمان لانے کا قرآن نے ہم سے مطالبہ کیا ہے اور جن کی تعلیم محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو دی تھی چنانچہ ان اوراق میں چند عقائد کی تشریح ہے اور یہ وہی ہیں جو اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى میں مذکور ہیں یعنی ''خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں پر اور آخری دن اور قضا وقدر پر ایمان۔'' چنانچہ اس جلد میں مقدمہ ودیباچہ کے بعد ان ہی چھ باتوں کی تفصیل وتشریح ہے۔ میں نے

اپنے جانتے اس کی پوری احتیاط کی ہے کہ کسی مسئلہ کی تشریح میں قلم، صراط مستقیم سے تجاوز نہ کرے لیکن عالم الغیب جانتا ہے کہ قدم نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے اس لیے اس کی بارگاہ میں نہایت عجز سے دعا ہے کہ خداوند میری لغزش کو دوسروں کی لغزش کا سبب نہ بنانا اور ہم سب کو سیدھی راہ دکھانا۔

﴿ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۷۸)

''جس کو خدا راہ دکھائے وہ راہ پایا ہوا ہے۔''

﴿ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ۭ ﴾ (۳۹/ الزمر:۳۷)

''اور جس کو خدا راہ دکھائے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔''

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ ﴾ (۲/ البقرہ:۲۸۶)

''ہمارے پروردگار ہماری بھول چوک کی باز پرس ہم سے نہ فرمانا۔''

ایں نامہ کہ خامہ کرد بنیاد   توقیعِ قبولِ روزیش باد

طالبِ رحمت
سید سلیمان ندوی
دارالمصنفین، اعظم گڑھ
(۲۵/ربیع الاول ۱۳۵۱ھ)

دیباچہ طبع ثانی

سیرت النبی ﷺ جلد چہارم

سیرت جلد چہارم کو جو اسلام کے اصول وعقائد پر ہے جس وقت پہلی دفعہ ناظرین کرام کے ہاتھوں میں دے رہا تھا، میرا دل اضطراب کے عالم میں تھا کہ ایسے مشکل اور پیچیدہ راستہ میں معلوم نہیں، میرا قلم کہاں کہاں بہکا اور قدم نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی، لیکن الحمد للہ والمنة کہ سوائے دوزخ کی ابدیت وغیرابدیت کے ایک مسئلہ جس میں جمہور کی رائے ہمارے ساتھ نہ تھی، ہر مسئلہ میں اس کتاب کی تحریر کو قبولیت عام حاصل ہوئی، جن جن حوصلہ افزا طریقوں سے خواص علما اور عام مسلمانوں نے اپنی تحسین وآفرین کی عزت بخشی اس سے جی چاہتا تھا کہ یہ قیاس کروں کہ ملائے اعلیٰ کی خوشنودی ورضامندی بھی اس حقیر مؤلف کے شامل حال ہے۔

اس کتاب کی طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر چھاپی جارہی ہے اس میں طبع اوّل کے مطبعی اغلاط کی تصحیح کردی گئی ہے۔ کہیں کہیں عبارت کی خوبی وشستگی کے لیے لفظی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں اور مسئلہ ابدیتِ نار میں جمہور کے خیال کی ترجمانی کا اضافہ بھی کردیا گیا ہے، تاکہ ناظرین کو اس کے دونوں پہلوؤں سے واقفیت ہو جائے۔

واعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچائے، تاکہ ناچیز مؤلف کو اپنی مغفرت کا وسیلہ ہاتھ آئے۔

کتاب کی طبع اوّل چونکہ بڑی تقطیع پر چھپی تھی اس لیے ۶۸۶ صفحوں کی ایک جلد رہنے دی گئی لیکن چھوٹی تقطیع پر اس کی ضخامت ۸۸۸ صفحوں تک پہنچ گئی ہے جس کا ایک جلد میں سمانا مشکل تھا، اس لیے گو صفحوں کا شمار مسلسل رکھا گیا ہے مگر صفحہ ۴۰۵ سے کتاب دو حصوں میں علیحدہ بھی کردی گئی ہے، تاکہ اگر کسی کا جی چاہے تو اس کو دو جلدوں میں کرلے، تاکہ پڑھنے میں اور سفر میں ساتھ رکھنے میں آسانی ہو۔

جامع

سید سلیمان ندوی

۲۷ رجب ۱۳۵۳ھ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

منصبِ نبوّت

کتاب کا موضوع، آپ کے پیغمبرانہ کارنامے

سیرت کی عام کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے واقعاتِ زندگی کے اندر جو چیز سب سے زیادہ ممتاز ہو کر نظر آتی ہے وہ غزوات اور لڑائیاں ہیں لیکن یہ غزوات اور لڑائیاں ظاہر ہے کہ مقصود بالذات نہ تھیں بلکہ وہ سلسلۂ دعوت میں اتفاقاً پیش آ گئیں۔ آنحضرت ﷺ نے عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا اور نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کے مٹانے کی پرزور کوشش کی، اس کے قبول کرنے والوں کو ستایا اور ان کو ان کے گھروں سے نکال دیا، وہ اپنی جان بچا کر دوسرے شہر کو چلے گئے، وہاں ان کی دعوت نے فروغ پایا اور بہت بڑی تعداد نے ان کی سچائی کو قبول کیا، یہ دیکھ کر مخالفوں نے ہر طرف سے یورش کی اور چاہا کہ اس جماعت کو بزورِ شمشیر مٹا دیں اس نے اپنی جان کے بچاؤ کی تدبیریں کیں اور ان کی پرزور سازشوں اور کوششوں کے سیلاب کو پہاڑ بن کر روکا، اس کشمکش نے خونریز لڑائیوں کا ایک سلسلہ چھیڑ دیا جو متصل دس سال تک قائم رہا۔ رفتہ رفتہ اعجازِ نبوت، حسنِ تدبیر، لطفِ اخلاق سے تمام معرکے سر ہوئے اور پھر ایک پرامن نظام قائم ہو گیا بے شبہ یہ کارنامہ بھی کچھ کم مستوجب منقبت نہیں لیکن ناظرین اس نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوں گے کہ ہم کس (ذاتِ اقدس) کے سوانح لکھ رہے ہیں۔

یہ جو کچھ ہوا اور پیش آیا، وہ گو نہایت عجیب، حیرت انگیز اور کرشمہ ربانی کا پورا مظہر ہے، تاہم وہ درحقیقت آنحضرت ﷺ کا اصلی براہ راست اور مقصود بالذات کارنامہ نہیں وہ اتفاقی حوادث ہیں جو اسلام کی دعوت و اشاعت کی راہ میں دشمنوں کی مخالفت سے پیش آ گئے آپ کے اصلی پیغمبرانہ کارنامے وہ ہیں جو اگر یہ اتفاقی واقعات رونما نہ ہوئے ہوتے تب بھی ظاہر ہی ہوتے اور وہی آپ ﷺ کی سیرۃ مبارکہ کے اصلی وقائع اور سوانح ہیں یعنی عرب میں سرتاپا روحانی واخلاقی انقلاب پیدا کر دینا، تمام عالم کے سامنے کامل ترین اور اخیر شریعت کو پیش کرنا، دنیا کے گوشہ گوشہ کو ترانہ توحید اور سرور و محبت سے معمور کرنا، ظلمت کدہ عالم کو سراج منیر بن کر بقعۂ نور بنا دینا، گمراہوں کو راستہ بتانا، بھولوں کو یاد دلانا، بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا، غلط اوہام کو مٹانا، اخلاقِ فاضلہ کا سکھانا، گناہوں کے دفتر کو دھونا، انسانوں کو شیطانوں کے دامِ فریب سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرنا، دنیا کو رفق و محبت، لطف و شفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا، حکمت و دانائی پند و موعظت اور تہذیب و تمدن کے رموز سکھانا، روحانیت کی برباد شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر اور قلوب و ارواح کے ویران گھروں کی از سر نو آبادی، الغرض خاتم النبیین کا اصلی کام ایک شریعت ابدی کی تاسیس، مذاہب عالم کی

اصلاح، فن اخلاق کی علمی وعملی تکمیل، قانون الٰہی کا اظہار وعرض اور تہذیب نفوس کی معراج اخیر تھی اور یہ سب اُسی پر آشوب زمانہ میں ہوتا رہا جس کے لیل ونہار بظاہر صرف حملوں کے تیر باراں کے روکنے میں صرف ہو گئے پیش نظر جلد آنحضرت ﷺ کی سیرت مبارکہ کے انہیں واقعات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔

نبی اور مصلح اور حکیم

بظاہر نظر آتا ہے کہ اس قسم کے کچھ کام ایسے لوگوں سے بھی انجام پاتے ہیں جو نبوت اور رسالت کے منصب پر فائز نہیں ہوتے، وہ اپنی قوم وملک کے سامنے اپنی اصلاح کی دعوت پیش کرتے ہیں اور سعی ومحنت اور متواتر جدوجہد سے ان میں کوئی سیاسی، اجتماعی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی انقلاب پیدا کرتے ہیں اور ان کو قعرِ مذلت سے نکال کر ترقی کی سطح مرتفع تک پہنچا دیتے ہیں، ایسے لوگوں کو مصلح اور ریفارمر کہتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن کے منہ سے اخلاق وحکمت اور پندوموعظت کے موتی جھڑتے ہیں، جن کو حکیم کہتے ہیں۔ اس حالت میں ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کیا فرق ہوگا؟ اس التباس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے کوتاہ نظر ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کوئی امتیاز نہیں کرتے اس بنا پر اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں اس فرق وامتیاز کو نمایاں کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

نبوت کی حقیقت اور خصوصیات

اس فرق کو پوری طرح واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے نبوت کی حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے۔ نبوت کی فلسفیانہ حقیقت کی بہترین تشریح امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے معارج القدس [1] میں اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے۔ یہ دونوں بزرگ تصوف، فلسفہ اور نقلیات تینوں کوچوں سے باخبر ہیں، اس لیے یہ جو کچھ بتائیں گے اس میں کچھ کچھ ذاتی ذوق ومشاہدہ کا حصہ بھی شامل ہوگا۔ امام صاحب فرماتے ہیں:

''نبوت انسانیت کے رتبہ سے بالاتر ہے جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے، وہ عطیہ الٰہی اور موہبت ربانی ہے، سعی ومحنت اور کسب وتلاش سے نہیں ملتی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: [2]

﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسٰلَتَهٗ ﴾ (٦/ الانعام:١٢٤)

''اللہ بہتر جانتا ہے کہ جہاں وہ اپنی پیامبری کا منصب بنائے۔''

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا [2] مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ ﴾

---

[1] معارج القدس کا یہ حصہ حضرت الاستاذ مرحوم نے الکلام کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع کر دیا ہے۔ یہ ضمیمہ عربی عبارت میں الکلام کے قدیم اڈیشن مطبوعہ نامی پریس کان پور ۱۹۰۴ء (ص:۲۵۹ تا ۲۷۸) میں شامل تھا مگر بعد کے ایڈیشنوں میں صرف اردو خلاصہ ہی شامل رہا۔ ''ض'' [2] معارج القدس بحوالہ ضمیمہ الکلام، ص:۲۶۰، ۲۶۱۔

[2] امام صاحب نے آیت پوری نہیں لکھی ہے، میں نے اپنی طرف سے آیت پوری کر دی ہے۔

(۴۲/ الشوریٰ:۵۲)

''اور اسی طرح ہم نے تیرے پاس اپنے حکم سے ایک روح بھیجی، تو پہلے نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا؟ لیکن اس کو ہم نے ایک نور بنایا ہے جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ سوجھائیں۔''

اس موقع کے لیے صریح آیت یہ ہے:

﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ ﴾ (۶۲/ الجمعۃ:۴)

''یہ (نبوت) خدا کا فضل ہے جس کو چاہے دے۔''

گو یہ صحیح ہے کہ وہ عبادات و ریاضات جو فکر و مراقبہ پر مشتمل اور ریا اور شہرت طلبی سے پاک ہوں نفس میں آثار وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں، تاہم نبوت کا منصب خاص محض اتفاقی نہیں جو محنت اور کوشش سے کسی کو حاصل ہو جائے بلکہ جس طرح نوع انسان کا انسان اور فرشتوں کا فرشتہ بن جانا ان کے افراد کی سعی و محنت کا مرہون منت نہیں اسی طرح نوع انبیا کا نبی بن جانا، ان کے افراد کی کوشش اور محنت سے ممکن نہیں، ہر انسان کا بچہ اپنی ذاتی محنت سے نہیں بلکہ فیاض عالم کی بخشش سے انسانیت کا رتبہ حاصل کرتا ہے مگر انسانیت کے ممکن کمالات کو بالفعل حاصل ہو جانے کے لیے اس کو یقیناً کچھ نہ کچھ جدوجہد کرنی پڑتی ہے اسی طرح نبوت نوع انبیا کے لیے اکتسابی چیز نہیں لیکن منشائے نبوت کے مطابق ریاضت اور عمل، قبول وحی کی استعداد اور تیاری کے لیے البتہ ضروری ہیں۔

چنانچہ اسی اصول کے مطابق اکثر پیغمبروں کے آغاز وحی کے حالات میں آپ کو یہ ملے گا کہ انہوں نے ایک زمانہ تک عبادت و مراقبہ میں بسر کیا، ایک ایک مہینہ، ایک ایک چلہ اس طرح گزارا کہ وہ مادی دنیا کی آلائشوں سے یکسر الگ ہو گئے تو راۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے کہ کتاب ملنے سے پہلے وہ چالیس روز تک کوہ طور پر روزہ کی حالت میں رہے۔ اسی طرح انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے کہ وہ ایک سنسان جنگل میں چالیس روز تک روزہ رکھ کر عبادتوں میں مصروف رہے اور وحی سے پہلے آنحضرت ﷺ کا غار حرا میں مہینوں عزلت گزین رہنا اور فکر و مراقبہ اور عبادت اور ریاضت میں مصروف رہنا سب کو معلوم ہے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ نبوت سے پہلے حرا میں جا کر جب عبادت میں مشغول ہوئے تو رؤیائے صادقہ دیکھنے لگے جس کی سچائی مثل سپیدۂ صبح کے صاف نمایاں ہوتی تھی وحی کے بعد آپ اس قدر عبادت میں مصروف رہتے تھے کہ آپ کے دونوں پاؤں سوج جاتے تھے اسی لیے قرآن نے آپ کو خطاب کر کے کہا:

﴿ طٰهٰ ۚ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۙ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱، ۲)

''اے پیغمبر! ہم نے یہ قرآن تجھ پر اس لیے نہیں اتارا کہ تو تکلیف اٹھائے۔''

اس عبادت وریاضت کے ساتھ نبوت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے حامل میں حسنِ صورت، اعتدال مزاج، نشوونما کی پاکی، حسن تربیت، طہارت نسب، کرم اخلاق، نیکی، متانت، سنجیدگی دوستان الٰہی کے ساتھ نرم خوئی اور تواضع اور دشمنان حق کے ساتھ شدت قوت پائی جائے، علاوہ بریں وہ راست گفتار، امانت دار تمام برائیوں سے پاک، فضائل ومحاسن سے آراستہ اور ذلیل باتوں سے مبرا ہوتا ہے، وہ ظلم کرنے والوں کو معاف اور اپنے ساتھ برائی کرنے والوں کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے۔ قرابت مندوں اور ہمسایوں کے ساتھ احسان، مظلوموں کی اعانت، فریادخواہوں کی فریادرسی، اس کی طینت اور نیکی سے محبت اور بدی سے نفرت اس کی فطرت ہوتی ہے اس کی شان جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے یہ ہوتی ہے کہ

﴿ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ ﴾ (۵۳/ النجم:۲)

''تمہارا ساتھی (پیغمبر) گمراہ نہ ہوا اور نہ بہکا۔''

اس کی یہ صفت اس دنیاوی عالم میں ہے کہ وہ ہر گمراہی و بے راہروی سے پاک ہوتا ہے:

﴿ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ ﴾ (۵۳/ النجم:۷)

''اس کی نگاہ نہ کج ہوئی اور نہ سرکش ہوئی۔''

یہ اس دنیا کے مناظر اور مشاہدات کے متعلق اس کی کیفیت ہوتی ہے۔

تمام دنیا کی قوتیں، اس کی قوت کے سامنے بالآخر طوعاً وکرہاً سرنگوں ہو جاتی ہیں، بااین ہمہ وہ مغرور، جابر، جفاپیشہ، بدخو اور درشت مزاج نہیں ہوتا، وہ پیغمبری اور رسالت کے بارعظیم کو اٹھاتا ہے اور اس کا پورا حق ادا کرتا ہے اور تمام عالم میں اپنی رحمت کا فیض جاری کرتا ہے۔

نبوت ورسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ

نبوت کے ثبوت کے دو طریقے ہیں: ایک اجمالی اور دوسرا تفصیلی۔ اجمالی طریقہ یہ ہے کہ جس طرح انسان کو حیوان پر نفس ناطقہ کی بنا پر فضیلت حاصل ہے کہ یہ عقلی ودماغی خصوصیت حیوان میں نہیں پائی جاتی جس کے بل پر انسان حیوان پر حکمرانی کرتا ہے اور اس کا مالک بنا ہوا ہے اور اس کو اپنے کام میں لگائے ہوئے ہے اسی طرح انبیا علیہم السلام کو اپنے نفوس قدسیہ کی بنا پر تمام انسانوں پر برتری حاصل ہے وہ اپنے ان قدسی نفوس اور پیغمبرانہ قوت سے دوسروں کو راہ راست سوجھاتے اور خود راہ راست پر قائم رہتے ہیں ان کی پیغمبرانہ عقل وفہم تمام انسانی عقلوں سے بالاتر ہوتی ہے اور ان کو وہ ربانی خصوصیت حاصل ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ تمام انسانی نفوس کی تدبیر کا فرض انجام دیتے اور ان پر قابو پاتے اور ان کو کام میں لگاتے ہیں اور جس طرح انسانوں کے عجیب وغریب کام حیوانوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں اسی طرح پیغمبروں کے عجیب وغریب کام انسانوں کو معجزہ نظر آتے ہیں۔ اگرچہ نبی عام انسانوں کے ساتھ بشریت اور انسانیت میں برابر کا شریک ہوتا ہے مگر

عقلیت ومعنویت میں وہ ان سے بالکل الگ ہوتا ہے کیونکہ اس میں وحی کے قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی اسی مفہوم کو قرآن نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ ﴾ (۱۸/ الکھف: ۱۱۰)

''میں تمہاری ہی طرح بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔''

دیکھو کہ بشریت میں گو پیغمبر کو دوسرے انسانوں کے مثل کہا ہے مگر ساتھ ہی وحی کے فرق وامتیاز کو دونوں میں حد فاصل قرار دے دیا ہے۔

نبوت کے تفصیلی ثبوت کے تین طریقے ہیں:

پہلا طریقہ: انسان میں تین قسم کے اختیاری حرکات پائے جاتے ہیں فکری، قولی، عملی ان تینوں سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ فکر یعنی رائے صحیح بھی ہوتی ہے اور غلط بھی، قول سچ بھی ہوتا ہے اور جھوٹ بھی، عمل اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح اور غلط، سچ اور جھوٹ اور اچھے اور برے میں تمیز کیونکر ہو؟ پھر کیا یہ تمیز ہر شخص کر سکتا ہے یا کوئی نہیں کر سکتا، یا بعض کر سکتے ہیں اور بعض نہیں۔ پہلے دو احتمال بداہۃً غلط ہیں، اب رہ گیا تیسرا احتمال یعنی بعضے انسان ایسے ہوتے ہیں جو ان حدود کو متعین کر سکتے ہیں کہ فلاں رائے وعقیدہ صحیح اور فلاں غلط ہے، فلاں قول سچ ہے، فلاں جھوٹ ہے اور فلاں فعل اچھا اور فلاں برا ہے۔ جس شخص کو خالق فطرت اپنے فضل وکرم سے یہ قوت عطا فرماتا ہے وہی پیغمبر اور صاحب شریعت ہوتا ہے۔

دوسرا طریقہ: نوع انسان کو اپنے اختیاری اعمال وحرکات اور مصلحتی معاملات میں باہمی اجتماع اور تعاون کی ضرورت ہے، اگر انسانوں میں باہم یہ اجتماع اور تعاون نہ ہوتو نہ انسان کا کوئی فرد زندہ رہے نہ جان ومال اور عزت آبرو کی حفاظت ہو سکے، اسی بقائے نفس اور جان ومال وآبرو کے تحفظ کے اصول وآئین کا نام شریعت ہے۔ انسان کو اس کے لیے دو قسم کے کاموں کی ضرورت ہے، ایک یہ کہ اچھے کاموں میں سب مل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں، اس کو تعاون کہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ برے کاموں سے ایک دوسرے کو باز رکھنے کی کوشش کریں، اس کو تمانع کہتے ہیں اسی تعاون کے ذریعہ سے انسان کھانے پینے پہننے اور رہنے کے لیے سامان واسباب فراہم کرتا ہے تعاون کے ذریعہ نکاح وقربت اولاد واعزہ اور احباب ودوست کے حقوق وتعلقات پیدا ہوتے ہیں اور تمانع کے ذریعہ سے نوع انسانی اور افراد انسانی کی زندگی اور ان کی دولت وجائیداد اور عزت وآبرو کے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے اس تعاون اور تمانع کے اصول ضروری ہے کہ مرتب، محدود اور معلوم ہوں اور وہ اس طرح بنائے جائیں جن میں کسی خاص شخص، خاندان، قبیلہ، قوم اور ملک کے فوائد کی ترجیح نہ ہو بلکہ ان میں سب کا برابر فائدہ ہو یہ ظاہر ہے کہ ایسا قانون انسانوں کے ذریعہ نہیں بلکہ وحی ربانی اور تعلیم الٰہی

سے بن سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ محض کسی انسان کی عقل سے جو بہر حال کوئی خاص شخص، یا کسی خاص خاندان، قبیلہ، قوم اور ملک کا ہوگا ایسا غیر جانبدارانہ قانون جس میں تمام مخلوقات کی حیثیت یکساں ہو اور کسی طرف پلہ جھکنے نہ پائے اور تمام عالم کے لیے یکساں واجب العمل ہو محال ہے، اس لیے ضروری ہے کہ یہ اصول اس کی طرف سے وحی ہوں، جس کے ہاتھ میں نظام عالم کی باگ ہے اور جو پورے نوع انسانی کے اندرونی و بیرونی احوال و کیفیات کے رموز سے باخبر ہے، یہ اصول خلاق عالم کی طرف سے جس شخص پر وحی ہوتے ہیں وہی پیغمبر اور رسول ہوتا ہے۔

تیسرا طریقہ: یہ وہ طریقہ ہے کہ جس نے اس کو نہیں جانا، اس نے نبوت کی حقیقت نہیں پہچانی، پہلے یہ جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے دو کام ہیں، خلق (پیدا کرنا نیست سے ہست کرنا) اور امر (جو موجود و ہست ہے اس کو اپنی مصلحت کے مطابق حکم دینا) کائنات انہی دو چیزوں سے عبارت ہے تو جس طرح فرشتے خالق اور مخلوق کے درمیان خلق و ایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی میں واسطہ ہیں، اسی طرح پیغمبر، خدا اور بندہ کے درمیان احکام کے پہنچانے میں واسطہ ہیں اور جس طرح خدا پر بحیثیت خالق اور آمر (پیدا کرنے والے اور حکم دینے والے) کے ایمان لانا واجب ہے، اسی طرح فرشتوں پر اس حیثیت سے کہ وہ خالق و مخلوق کے درمیان ایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی کے واسطہ ہیں، ایمان لانا ضروری ہے اور اسی طرح پیغمبروں پر اس حیثیت سے ایمان لانا فرض ہے کہ وہ خدا اور بندہ کے درمیان حکم کے پہنچانے میں واسطہ ہیں۔

اس کے بعد حسب ذیل مقدمات ذہن نشین رکھنے چاہئیں:

① چونکہ ممکن کا وجود اور عدم برابر ہے اس لیے ممکن ہے کہ وجود میں آنے کے لیے ایک مرجح کا ہونا ضروری ہے جس کی وجہ سے وجود کو عدم پر ترجیح ہو اور وہ شے عدم سے وجود میں آ سکے یہی امر مرجح ممکن کی علت ہوتا ہے۔

② ہر قسم کے حرکات کے لیے ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے جو دم بہ دم حرکت کی تجدید کرتا رہے، حرکات کی بھی دو قسمیں ہیں طبعی اور ارادی۔ ارادی حرکت کے لیے ضروری ہے کہ اس کے محرک میں ارادہ اور اختیار پایا جائے اسی طرح طبعی حرکت کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ اس کا محرک عقل اور تدبیر والا ہو، آفتاب و ماہتاب اور دوسری آسمانی مخلوقات کی حرکات گو طبعی ہیں، تاہم ان کو حرکت دینے کے لیے کسی عاقل و مدبر کی ضرورت ہے اسی لیے قرآن نے ان کے لیے کہا:

﴿ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا ﴾ (٤١/ حٰمٓ السجدة:١٢)

''خدا نے ہر آسمان میں اس کا فرض اور کام وحی کیا۔''

③ اب جس طرح انسانی حرکات کو ارادہ اور اختیار کی حاجت ہے یعنی ارادہ اور اختیار کے بغیر وہ وقوع میں

نہیں آ سکتیں اسی طرح ان حرکات کو ایک ایسے راہنما کی ضرورت ہے جو ان اعمال وحرکات کا ٹھیک راستہ اور صحیح طریقہ بتائے اور حق کو باطل سے، سچ کو جھوٹ سے اور خیر کو شر سے ممتاز کر دے۔

④ خدا کے حکم دو قسم کے ہیں تدبیری اور تکلیفی، پہلا حکم تمام نظام عالم میں جاری ہے جس کی بنا پر تمام عالم میں تدبیر اور انتظام کا سلسلہ نظر آتا ہے، قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ ﴾

(۷/ الاعراف:٥٤)

''اور سورج اور چاند اور ستارے اس کے حکم کے تابعدار ہیں اسی کا نام ہے بنانا اور حکم فرمانا۔''

تکلیفی حکم صرف انسان کے لیے ہے، چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱)

''اے انسانو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا۔''

مقدمات مذکورۂ بالا سے ثابت ہوا کہ انسان کے تمام حرکات ممکن ہیں اس لیے مرجح کی ضرورت ہے۔ اختیاری ہیں، اس لیے عقل کی ضرورت ہے۔ خیر و شر کے متحمل ہیں، اس لیے راہنما کی ضرورت ہے، اسی راہنما کا نام پیغمبر ہے۔

نظام عالم میں خدا کا جو تدبیری حکم نافذ ہے وہ ملائکہ کے ذریعہ سے ہے اسی قیاس سے انسانوں پر خدا کا جو تکلیفی حکم نافذ ہے وہ بھی ایسی ہی نفوس کے ذریعہ سے ہوگا اور انہیں کا نام پیغمبر ہے۔

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے چھٹے مبحث کے دو ابتدائی بابوں میں اسی پر بحث کی ہے [1] اور حقیقت یہ ہے کہ کمال نکتہ سنجی سے کی ہے، شاہ صاحب کی تقریر کو ہم اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں۔

نبی کی ضرورت

انسان میں دو قسم کی قوتیں ہیں، بہیمی اور ملکوتی، کھانا، پینا، شہوت، حرص وطمع، استیلا و جبر وغیرہ افعال بہیمی قوت کے آثار ہیں اور غور وفکر، علم ومعرفت، حسن اخلاق، صبر وشکر، عبادت وطاعت وغیرہ ملکوتیت کے نتائج ہیں۔ انسان کی روحانی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بہیمی قوت اس کی ملکوتی قوت کے تابع ہو اگرچہ عقل سلیم ان اصول اور طریقوں کو معلوم کر سکتی ہے جن کے ذریعہ سے بہیمیت کے تابع ملکوتیت ہونے کے فائدے اور گناہ وعصیاں کے نقصانات ظاہر ہوں عقل سلیم کے اس علم سے انسان فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کر سکتا ہے مگر یہ تو امکان عقلی ہے عملی کیفیت یہ ہے کہ انسان کی آنکھوں پر، موجودہ دنیاوی لذائذ، حرص وطمع اور بے جا خواہشوں اور غفلتوں کے اتنے تو برتو پردے پڑ جاتے ہیں کہ اس کے اصلی اور فطری وجدان اور قوت

[1] حجة الله البالغة، ج۱، ص:٦٥ تا ٦٨۔

احساس کا مادہ فاسد ہو جاتا ہے جیسے بیماری میں انسان کی زبان کا ذائقہ جب بدل جاتا ہے تو میٹھی سے میٹھی چیز اس کو کڑوی معلوم ہوتی ہے اسی طرح اندرونی وجدان واحساس کے فاسد ہو جانے سے بھی وہ حق و باطل خیرو شر اور نیک و بد کی تمیز کو بھول جاتا ہے اس لیے نوع انسان کو ایسے صحیح راہنماؤں اور روحانی معلموں کی ضرورت ہے جن کے احساس و وجدان کا آئینہ گرد آلود نہ ہو۔

اگر افراد، جماعات اور اہل ملک کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اپنی سیاست کے زور سے ان میں صلح و آشتی اور امن وامان پیدا کر دے تو ایک قوم کی قوم بلکہ کل دنیا کے لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت کیوں نہ ہو جو ہر گروہ کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر اس کے مطابق اس کے حقوق وفرائض کی تعیین کرے ایسے لوگ جو ایسے اہم فریضہ کو انجام دے سکیں اسی طرح کم ہیں جس طرح دوسرے اصناف کے اہل کمال۔ انسانوں کے معمولی پیشوں نجاری اور لوہاری کو دیکھو کہ کس قدر معمولی ہیں مگر ان کو کرنا بھی ہر شخص کا کام نہیں، یہ پیشے بھی ایسے لوگوں کے بغیر وجود میں نہیں آئے جن کو ان کاموں کا خاص ذوق و وجدان تھا اور ان کو ان کاموں کی خاص فطری استعداد ملی تھی جس کے ذریعہ سے انہوں نے اس فن کو تکمیل تک پہنچایا اور اس کے اصول وقواعد وضع کیے اور بعد کے آنے والوں نے ان کی تقلید کی اور اس تقلید سے مدارج علیا تک پہنچے پھر اخلاق وروحانیات اور ملک و ملت کے مصالح وفوائد عامہ کا فن جس قدر اہم اور نازک ہے کیا اس کو سمجھنا اور وضع کرنا ہر کس و ناکس کا کام ہو سکتا ہے۔

نبی کی عصمت

پھر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص اس راہنمائی کے منصب کا مدعی ہو وہ اپنی نسبت یہ بھی ثابت کرے کہ وہ ان اصول وقواعد سے بخوبی واقف ہے اور وہ اپنے علم اور تعلیم میں غلطی اور گمراہی سے محفوظ ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے علم اور تعلیم کا ماخذ اور سرچشمہ غلطیوں سے پاک اور محفوظ نہ ہو، اس کو ان امور کا علم اسی طرح وجدانی ہو جس طرح انسان کو بھوک اور پیاس کا وجدان ہوتا ہے کیا کسی کو اس علم میں کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہوتی ہے کوئی غلطی ہو سکتی ہے؟ اس طرح اس کو حق و باطل، خیر و شر اور نیک و بد امور کے درمیان فیصلہ اسی طرح قطعی معلوم ہوتا ہے۔ جس میں نہ دلیل کی حاجت ہوتی ہے اور نہ عقل معاش کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر بھوک اور پیاس ہونے کا علم اس طرح رکھ دیا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی معاند کتنی ہی دلیلیں پیش کرے کہ ہم کو بھوک یا پیاس نہیں ہے ہم کبھی اس وجدانی یقین سے جس کو خدا نے ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے اس معاند کے ان عقلی دلائل سے متاثر ہو کر دست بردار نہیں ہو سکتے اور اپنے یقین کو غلط نہیں کہہ سکتے بعینہ اسی طرح ان نفوس قدسیہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے خاص قسم کا وجدان و ذوق سلیم رکھ دیا ہے جس کا عمل ہمیشہ صحیح اور جس کا احساس ہمیشہ درست اور جس کا فیصلہ ہمیشہ

ناطق ہی ہوتا ہے۔

نبی کی محبوبیت

ایسا شخص جب لوگوں کے سامنے آتا ہے اور لوگوں کو بار بار کے تجربہ سے اس کی صداقت، سچائی اور راست بازی کا یقین ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ سے جو تصرفات صادر ہوتے ہیں ان سے اس کا مقرب بارگاہ الٰہی ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے تو ہر طرف سے لوگ اس کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس کی محبت کی راہ میں جان و مال اور اہل و عیال سب کو قربان کر دیتے ہیں۔

شاہ صاحب اس کے بعد دوسری فصل میں اسی ''بحث نبوت'' کو ایک اور انداز سے لکھتے ہیں، [1] جس کا ماحصل یہ ہے۔

مصلحین

فضل و کمال اور علم و عمل کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجے ہیں ان میں سب سے بڑا درجہ مفہمین کا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی قوت ملکیہ نہایت بلند ہے اور جن میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ سچے اور صحیح جذبہ سے ایک خاص نظام کو دنیا میں قائم کر دیں اور ان پر بارگاہِ الٰہی سے ایسے علوم اور احوال کا ترشح ہوتا ہے جن میں ربانی آثار نظر آتے ہیں ایسے لوگ معتدل مزاج اور اپنی صورت و سیرت میں درست اور عقل و ذکاوت میں متوسط ہوتے ہیں، نہ اس قدر بلید کہ جزئیات سے کلیات تک ان کا پہنچنا مشکل ہو، نہ اس قدر تیز کہ جزئیات اور محسوسات سے قطع نظر کر کے ہمیشہ ذہنیات اور تخیلات میں مبتلا رہیں، صحیح فطرت پر وہ قائم رہتے ہیں، طور و طریق ان کے پسندیدہ ہوتے ہیں، خدا کے ساتھ ان کا تعلق عبادت و اطاعت سے اور بندوں کے ساتھ عدل و انصاف سے قائم رہتا ہے، وہ اپنے فیصلوں میں شخصی اور جزئی بھلائی اور منفعت کا لحاظ نہیں کرتے بلکہ منفعت عامہ اور تدبیر کلی کا لحاظ کرتے ہیں، وہ براہ راست کسی کو تکلیف نہیں دیتے الا یہ کہ منفعت عامہ کا حصول اور بڑی تعداد کا فائدہ چھوٹے سے نقصان سے حاصل ہو تو وہ اس جزئی تکلیف اور شخصی نقصان کو گوارا کر لیتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے کاروبار میں عالم غیب کی طرف مائل رہتے ہیں جس کا اثر ان کی بات چیت، کام کاج اور معاملات میں نمایاں ہوتا ہے، کارکنانِ عالم ان کی تائید و نصرت میں رہتے ہیں، معمولی ریاضت سے ان کے لیے قرب و سکینت کے وہ دروازے کھل جاتے ہیں جو دوسروں کے لیے نہیں کھلتے۔

مصلحین کی اقسام

مفہمین کے درجہ بدرجہ مختلف اصناف ہیں اور ان کی مختلف استعدادیں ہیں اور اس بنا پر ان میں سے ہر ایک کے الگ الگ اصطلاحی نام ہیں، جو زیادہ تر عبادات کے ذریعہ سے تہذیب نفس کے علوم پاتا ہے وہ کامل

[1] حجة الله البالغة، ج ۱، ص: ٦٥ تا ٦٦۔

ہے اور جو اخلاق فاضلہ اور تدبیر منزل کے اصول حاصل کرتا ہے وہ حکیم ہے۔ جو عمومی تدبیر و سیاست کے علوم کا فیض پاتا ہے اور ان کے مطابق اس کو لوگوں میں عدل کے قیام اور ظلم کے دور کرنے کی توفیق ملتی ہے وہ خلیفہ ہے اور جس پر ملائے اعلیٰ کا نزول ہو وہ اس سے تعلیم پائے اور وہ اس کو مخاطب کرے اور مختلف قسم کے تصرفات اس سے صادر ہوں وہ مؤید بروح القدس کہلاتا ہے اور وہ جس کی زبان اور دل میں وہ نور ہو کہ لوگ اس کی صحبت اور پند و موعظت سے نفع اٹھائیں اور وہ نور اس سے منتقل ہو کر اس کے رفقائے خاص میں منتقل ہو جس سے وہ بھی کمال کے درجہ تک پہنچ جائیں اس کا نام ہادی اور مزکی (پاک کرنے والا) ہے اور جس کے علم کا بڑا حصہ ملت کے اصول و قواعد اور اس کی مصلحتوں کی واقفیت ہو اور ملت کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کرنے کی طاقت ہو وہ امام کہا جائے گا اور جس کے قلب میں یہ ڈالا جائے کہ وہ لوگوں کو ان کی اس مصیبت عظمیٰ سے خبردار کرے جو اس دنیا میں ان کے لیے ان کے اعمال کے نتیجہ کے طور پر مقدر ہے اور ان کی بداعمالی کے سبب ان سے حق تعالیٰ کی رحمت کی جو دوری یا قبر اور حشر میں ان پر جو مصیبتیں آنے والی ہیں، اس کا نام منذر (ڈرانے والا ہوشیار کرنے والا) ہے اور جب حکمتِ الٰہی کا یہ اقتضا ہوتا ہے کہ مخلوق کی ہدایت و اصلاح کے لیے ان مفہمین میں سے کسی کو بھیجے تو اس کی آمد مخلوق کی تاریکی سے نکل کر روشنی میں آنے کا سبب ہو جاتی ہے اور وہ بندوں پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ دل و جان سے اس کی اطاعت کریں اور بارگاہ الٰہی میں تاکید ہوتی ہے کہ جو اس کی اطاعت کرے اس سے خوشنودی اور جو اس کی مخالفت کرے وہ اس سے ناخوشی ظاہر کرے۔ یہی شخص نبی ہوتا ہے۔

نبی کی دو بعثتیں

نبیوں میں بڑا درجہ اس کا ہوتا ہے جس کو اس پیغمبرانہ بعثت کے ساتھ ایک اور بعث ملتی ہے اور وہ یہ کہ مرادِ الٰہی یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کے ذریعہ سے اس کی قوم اور اس کی قوم کے ذریعہ سے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں تو اس نبی کی ذاتی بعثت کا نام بعثت اولیٰ اور اس کی قوم کی دوسری قوموں کی ہدایت کے لیے نامزدگی بعثت ثانیہ ہے۔

نبی کی پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

﴿ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ ﴾ (۶۲/ الجمعة:۲)

"وہی خدا جس نے ان پڑھوں میں، انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا اور ان کو پاک بناتا اور ان کو کتاب اور دانائی سکھاتا ہے۔"

اور دوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۱۰)

''تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے وجود میں لائی گئی نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے باز رکھتے ہو۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی پیغمبرانہ بعثت ان کی امت کے لیے ہوئی ویسی ہی ان کی امت کی بعثت دوسری قوموں کی طرف ہوئی اور اسی معنی میں قرآن پاک کی یہ آیت بھی ہے:

﴿ لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ (۲۲/ الحج:۷۸)

''تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔''

اسی لیے احادیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کو فرمایا ((فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ)) [1] ''تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو سختی کرنے والے بنا کر نہیں۔'' آنحضرت ﷺ سے پہلے جو انبیا آئے وہ ان مختلف مذکورہ بالا مناصب میں سے ایک یا دو منصب کے ساتھ مبعوث ہوئے لیکن آنحضرت ﷺ ان تمام منصبوں پر ایک ساتھ سرفراز ہوئے اور یہ تمام فنون آپ کی واحد ذات میں جمع کر دیے گئے اور آپ کو یہ دونوں بعثتیں بھی بکمال استحقاق عطا ہوئیں۔

بعثت کے لیے کسی قوم کا انتخاب

یہ بھی واضح ہو کہ رسول کی بعثت کے لیے حکمت الٰہی کا اقتضا اس لیے ہوتا ہے کہ عالم کی عمومی تدبیر و نظم و نسق میں جو اضافی خیر معتبر ہے وہ ان دنوں اسی رسول کی بعثت میں منحصر ہوتا ہے اور اس بعثت کے حقیقی سبب کا علم اسی دانائے غیب کو ہے مگر اتنی بات ہم قطعًا جانتے ہیں کہ کچھ اسباب ایسے ہیں جو بعثت کے ساتھ ضرور پائے جاتے ہیں اور امت پر اس رسول کی اطاعت اسی لیے فرض ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی تمام قوموں سے جس قوم کی نسبت یہ جانتا ہے کہ اس میں خدا کی اطاعت و پرستش کی استعداد اور اس میں اللہ تعالیٰ کے فیضان اٹھانے کی صلاحیت زیادہ ہے اس میں وہ رسول مبعوث ہوتا ہے اور چونکہ اس قوم کی اصلاح اسی پیغمبر کی پیروی اور اتباع میں منحصر ہوتی ہے اس لیے بارگاہ الٰہی کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت سب پر واجب کی جائے۔

بعثت کا زمانہ

اس موقع پر چند باتیں اور قابل لحاظ ہیں کیونکہ یہ وقت وہ وقت ہوتا ہے کہ کوئی نئی حکومت اس لیے قائم کی جائے، تا کہ اس کے ذریعہ سے ان دوسری حکومتوں کو جو دنیا میں فساد اور شر کا موجب بنی ہوئی ہیں مٹا دیا جائے تو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھیجتا ہے جو پہلے اس قائم ہونے والی سلطنت کی قوم کی اصلاح کرے اور اس کے دین کو درست کرے، تا کہ اس کے ذریعہ سے دوسری قوموں کی اصلاح ہو جس طرح

---

[1] بخاری، کتاب الوضوء، باب صب الماء علی البول فی المسجد: ۲۲۰؛ کتاب الادب، باب قول النبی ﷺ: یسروا ولا تعسروا: ۶۱۲۸؛ مسند امام احمد، ج ۲، ص: ۲۳۹۔

ہمارے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی زندگی کی بقا اور اس کو اپنا برگزیدہ بنانا چاہتا ہے تو اس میں وہ ایک ایسے شخص کو بھیجتا ہے جو اس کی کجی کو دور کردے اور اس کو کتاب الٰہی کی تعلیم دے کر اس کو اس کا مستحق بنا دے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بنی اسرائیل میں بعثت ہوئی یا کسی قوم کے متعلق قضائے الٰہی کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو مزید زندگی ملتی رہے اور اس کا دین و سلطنت برقرار رہے تو مجددین نبوت پیدا ہوتے ہیں، جیسے بنی اسرائیل کے مختلف زمانوں میں حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور پیغمبروں کے ایک گروہ کی بعثت ہوتی رہی۔

نبی کی یقینی کامیابی

ہر نبی کی بعثت کے دور میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کو اور اس کے دوستوں کو کامیابی دے، اور اس کے دشمنوں کو پے در پے ناکامی ہو (یہاں تک کہ حق استوار اور دعوت مکمل ہو جائے) قرآن میں ہے:

﴿ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۚ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۞ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۞ ﴾ (۳۷/ الصافات: ۱۷۱۔۱۷۳)

''اور (اے پیغمبر) ہماری بات بندوں کے متعلق پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ انہی کی مدد کی جائے گی اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوگا۔''

ان دونوں بزرگوں (امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب) نے اپنے اپنے الفاظ میں جو کچھ کہا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے، انبیائے کرام علیہم السلام کے احوال مبارکہ اور سوانح مقدسہ پر جس کی نظر عمیق و وسیع ہوگی ان کو ان اصول کے تسلیم کرنے میں ذرہ بھر شک نہیں ہو سکتا اور ان پر استدلال، واقعات اور حوادث سے اسی طرح کیا جا سکتا ہے جس طرح نفسیاتِ اجتماع (سائیکالوجی آف پیپل) یا نفسیات راہنمائی (سائیکالوجی آف لیڈرشپ) پر واقعات کے تسلسل اور تواتر سے کرتے ہیں اسی طرح امام غزالی اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہما نے اوپر کے صفحات میں جو کچھ کہا ہے ہم مجازاً کہہ سکتے ہیں کہ وہ ''نفسیات نبوت'' کے گویا ابواب ہیں۔

موجودہ زمانہ میں خیالات، طرز گفتار، اسلوب تحریر اور طریقۂ استدلال غرض ہر چیز میں فرق ہو گیا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اہل زمانہ سے ان کی اصطلاح میں گفتگو کی جائے اور جو اصول قائم کیا جائے اس پر قرآن مجید سے بھی ساتھ ساتھ استدلال کیا جائے کہ عقل و نقل دونوں درباروں میں کہنے والے کی بات کا اعتبار ہو۔ غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا کہ دنیا کا ذرہ ذرہ جس غرض و مقصد کے لیے پیدا ہوا ہے وہ اپنے ذاتی ارادہ اور قصد کے بغیر خود بخود اس کو پورا کر رہا ہے اور اس کے خالق نے اس کے روز پیدائش سے اس کو جو حکم دے دیا ہے اس کی تعمیل سے وہ سر مو انحراف نہیں کرتا۔ آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہے۔ آفتاب دنیا کو گرمی اور روشنی دینے پر مامور ہے اور وہ ہر آن اور ہر لمحہ اس میں مصروف ہے۔

زمین کو سرسبزی اور شادابی کا کام سپرد ہے اور وہ اس کو انجام دے رہی ہے۔ ابر کو سیرابی اور گوہر باری کا حکم ہے اور وہ اس کی تعمیل کر رہا ہے۔ درخت پھل دینے پر مقرر ہیں اور وہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ حیوانات جن کاموں پر مامور ہیں وہ بخوشی ان کو کر رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان بھی اس دنیا میں کسی کام پر اسی طرح مقرر ہو کر آیا ہے یا نہیں؟ اگر آیا ہے تو کیا اس کو انجام دے رہا ہے؟ آؤ انسان کو غور سے دیکھیں بظاہر وہ بھی کھاتا پیتا، چلتا پھرتا، اٹھتا بیٹھتا زندگی گزارتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ کیا اس کی زندگی کا بس اسی قدر مقصد ہے؟ اگر یہی ہے تو پھر انسان اور حیوان میں کیا پہچان؟ اور ذی ارادہ اور غیر ذی ارادہ میں کیا امتیاز؟ اور صاحب عقل اور بے عقل میں کیا فرق؟ چنانچہ قرآن پاک اسی لیے انسانوں سے سوال کرتا ہے اور بجا سوال کرتا ہے؟

﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۱۱۵)

''کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا۔''

﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴾ (۷۵/ القيامة:۳۶)

''کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی غرض و مقصد کے لیے پیدا ہوا ہے لیکن وہ غرض و مقصد کیا ہے؟

انسان کی پوری ہستی اگر کائنات کے صفحہ سے مٹ جائے تو بھی آفتاب اسی طرح چمکتا رہے گا، سمندر اسی طرح ابلتے رہیں گے، ہوائیں اسی طرح چلتی رہیں گی، پانی اسی طرح برستا رہے گا، سبزے اسی طرح اگتے رہیں گے اور درخت اسی طرح پھلتے رہیں گے لیکن اگر درخت نہ پھلیں تو انسان کی ہستی معرض خطر میں پڑ جائے، سبزیاں نہ اگیں تو انسان بھوکا مر جائے، پانی نہ برسے تو انسان پیاسا تڑپ جائے، اگر ہوا نہ چلے تو انسان گھٹ کر مر جائے، اگر زمین نہ ہو تو انسان کو کھڑے ہونے کی جگہ نہ ملے، اگر آفتاب نہ چمکے تو انسان کی ہستی کا چراغ فوراً بجھ جائے، سمندر نہ ہو تو نہ پانی برسے، نہ سبزیاں اگیں، نہ انسانی غذا میسر آئے، نہ پانی برس کر پھر زمین کو خشک ہونا نصیب ہو، الغرض دنیا کی کوئی اہم ہستی اپنے وجود کے لیے انسان کی محتاج نہیں لیکن انسان اپنے وجود کے لیے کارخانہ ہستی کے ایک ایک پرزہ کا حاجت مند ہے تو پھر کیا یہ نتیجہ صحیح نہیں کہ اس کارخانہ کے ہر پرزہ کی غرض و غایت انسان کا وجود اور اس کی بقا ہے لیکن خود انسان کے وجود کی غرض کوئی دوسری ہے جو دیگر موجودات کے وجود کی غرض سے زیادہ اہم ہے۔

قرآن پاک دوسرے موجودات و مخلوقات کی نسبت یہ کہتا ہے:

﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ (۲/ البقرة:۲۹)

''اسی نے تمہارے لیے (اے انسانو!) وہ سب پیدا کیا جو زمین میں ہے۔''

پھر یہ بھی بتایا:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ ﴾ (۲۲/ الحج:۶۵)

’’(اے انسان)! کیا تو غور نہیں کرتا کہ زمین میں جو کچھ ہے ان سب کو تمہارے کام میں اس نے لگا رکھا ہے۔‘‘

زمین کے بعد آسمان کی نسبت بھی اس نے اعلان کیا:

﴿ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۭ ﴾

(۱۶/ النحل:۱۲)

’’اور (اے انسانو!) اس نے رات اور دن کو سورج اور چاند کو تمہارے کام میں لگایا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔‘‘

ہستیاں دو ہی ہیں، خالق کی اور اس کی مخلوقات کی مخلوقات کے حالات پر غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ ان میں ادنیٰ چیز اپنے سے اعلیٰ چیز کے کام آ رہی ہے جمادات، نباتات کے، نباتات جمادات کے اور جمادات، نباتات اور حیوانات تینوں انسان کے کام آ رہے ہیں، آخر انسان کو بھی اپنے سے کسی اعلیٰ ہستی کے کام آنا چاہیے، مخلوقات میں تو اب اس طرح کی کوئی اعلیٰ ہستی نہیں تو لامحالہ اس کی تخلیق خود خالق کے لیے ہوئی ہے۔ الغرض دنیا کی ساری چیزوں کی غرض و غایت بواسطہ یا بلاواسطہ انسانوں کی بقا، زندگی اور آسائش ہے لیکن خود انسان کی زندگی اس کے لیے نہیں بلکہ خدا کے لیے ہے، جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ ﴾ (۵۱/ الذاریات ۵۶)

’’اور میں نے جن اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری اطاعت کریں۔‘‘

عقل و فہم اور ارادہ و اختیار کے لحاظ سے مخلوقات کی تین قسمیں ہیں:

① ایک وہ جو ان صفات سے یکسر محروم ہیں، جیسے آفتاب، ماہتاب، زمین، مٹی، پتھر، پھل، پھول، درخت۔

② دوسری وہ جو صرف ابتدائی احساس اور علم و فہم رکھتی ہیں لیکن قیاس و استقرا و تمثیل اور حاضر پر غائب کو قیاس کر کے کسی نئے علم کا استخراج کرنا ان کی قدرت سے باہر ہے، ان کا ارادہ و اختیار بھی صرف ظاہری محسوس اشیاء تک محدود ہے، جیسے حیوانات۔

③ تیسری وہ مخلوق ہے جو عقل و ادراک رکھتی ہے، قیاس آرائی کرتی ہے، استقرا اور تمثیل کے ذریعہ سے استنباط کرتی ہے، جزئیات سے کلیات بناتی اور کلیات سے جزئیات پر حکم لگاتی ہے، بدیہات سے نظریات تک پہنچتی اور غائب کو حاضر پر قیاس کرتی ہے۔

پہلی قسم کی مخلوقات سے جو حرکات اور آثار پیدا ہوتے ہیں وہ اضطراری اور غیر ارادی ہوتے ہیں اور کبھی ان میں تخلف نہیں ہوتا اسی لیے ان کو فطری آثار اور طبعی خصائص کہتے ہیں، جن کا صدور ان مخلوقات

سے ہمیشہ یکساں اور بلا ارادہ ہوتا رہتا ہے۔ دوسری قسم کی مخلوقات سے جو آثار اور حرکات پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ گوارادہ اور احساس اور ابتدائی فہم کے ماتحت صادر ہوتے ہیں لیکن ان کے ہر فرد سے صرف ایک ہی قسم کے افعال، حرکات اور آثار یکساں طور سے ظاہر ہوتے ہیں ان کے خلاف نہیں ہوسکتا اور نہ ایک دوسرے سے کم وبیش ہوسکتا ہے۔ ان کے افعال، حرکات اور آثار کو جبلت فطرت اور طبیعت کہتے ہیں ان کے صدور میں بھی وہ مخلوقات اپنی فطرت اور طبیعت کے تقاضے سے مجبور ہیں، جیسے حیوانات کے افعال اور ان کے مختلف انواع کے الگ الگ نوعی کام کہ وہ ازل سے قیامت تک یکساں ایک ہی طرح اور وہ بھی کسی غایت اور انجام و مآل کے پہلے سے سوچے بغیر ان سے صادر ہوتے ہیں۔

تیسری مخلوق کے بعض افعال گو طبیعت و جبلت کے مطابق ہوتے ہیں جو دیگر مخلوقات کی طرح ویسے ہی بے ارادہ اور اضطرار سرزد ہوتے ہیں مگر اس کے اور دوسرے افعال و حرکات تمام تر اس کے ارادہ، اختیار اور فہم سے صادر ہوتے ہیں صرف یہی آخری قسم کے افعال وہ ہیں جن پر خیر وشر اور نیک وبد کا حکم جاری ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے تمام عاقلانہ کام عاقبت بینی، انجام اور مآل کار کو خیال کر کے اس کے ارادہ سے صادر ہوتے ہیں اور یہیں سے اس کی ذمہ داری کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

جن وانس کے علاوہ تمام دوسری مخلوقات، خیر وشر کی ذمہ داری سے بری ہیں۔ جمادات ونباتات تو اس لیے کہ ان کے افعال وحرکات تمام تر مجبورانہ، بے ارادہ اور فکر انجام کے بغیر صادر ہوتے ہیں یا یوں کہو کہ ان احکام کے بموجب ہمیشہ ہوتے ہیں جو خدا نے ان کو اول ہی دن دے دیے ہیں، حیوانات بھی اس لیے اس ذمہ داری سے بری ہیں کہ ان کے افعال وحرکات بھی تمام تر جبلی وطبعی ہیں اور وہ جبلت وطبیعت پر مجبورانہ بے ارادہ اور انجام کے خیال کے بغیر عامل ہیں یا یوں کہو کہ وہ اپنے خالق کے احکام پر ہمیشہ اضطرارًا عمل پیرا ہیں اسی طرح فرشتے بھی اس تکلیف سے سبک دوش ہیں کیونکہ وہ بھی اپنی خلقت اور جبلت سے اطاعت پر مجبور ہیں اور اسی لیے ان سے عصیاں نہیں سرزد ہوتا صرف ایک انسان ایسی مخلوق ہے جو بہت سی باتوں میں ارادہ، اختیار اور علم رکھتا ہے، نیکی، بدی اور خیر وشر ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کے اختیار پر قطعی مجبور نہیں ہے بلکہ وہ عقل وفہم سے سوچ سمجھ کر مآل کار اور انجام پر غور کر کے یا اپنے جذبات کے ماتحت کوئی کام کرتا ہے اس لیے وہی خیر وشر کے امتیاز اور حق و باطل کے فرق کے لیے پیغام الٰہی کا محتاج قرار پایا ہے۔ جمادات ونباتات اور دیگر مخلوقات سے احکام الٰہی کی مجبورانہ اطاعت یعنی جبلت یا فطرت یا خاصیت کو قرآن پاک یوں ادا کرتا ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۝ ﴾ (١٦/ النحل:٤٩، ٥٠)

''اور خدا ہی کے آگے سر جھکاتے ہیں جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، جانداروں

میں سے اور فرشتے، وہ سرکشی نہیں کرتے، اپنے پروردگار کا اوپر سے ڈر رکھتے ہیں اور کرتے ہیں جو حکم پاتے ہیں۔''

اسی فطری اطاعت الٰہی کا دوسرا نام فطری وحی بھی رکھ لو، جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ﴾ (١٦/ النحل:٦٨، ٦٩)

''اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں پر وحی بھیجی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور جہاں چھت ڈالتے ہیں، اپنے لیے گھر بنالے، پھر ہر پھل میں سے کھا، پھر اپنے پروردگار کی راہوں پر (مقررہ احکام پر) چل، مطیع ہو کر۔''

دیکھو اس آیت پاک میں طبعی الہام کی مجبورانہ پیروی کو اطاعت الٰہی کہا گیا ہے اور دوسری جگہ ان کی اپنے خالق اور پیدا کرنے والے کے حکم کی اسی طبعی اطاعت اور فطری تعمیل کو ان کی زبان حال کی نماز اور تسبیح فرمایا گیا ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ۭ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾ (٢٤/ النور:٤١)

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین میں جو کوئی ہے وہ اڑتے جانور پر کھولے، اس کی یاد کرتے ہیں، ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی نماز اور اس کی پاکی کی یاد اور خدا کو معلوم ہے جو وہ کرتے ہیں۔''

لیکن انسان کو دوسرے موجودات ومخلوقات کی طرح مجبور محض پیدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے وہ احساس اور ارادہ جو جمادات میں معدوم، نباتات میں محل بحث اور حیوانات میں متحرک ہے وہ انسان میں پوری طرح بیدار اور کارفرما ہے اسی طرح وہ ارادی قوت واختیار جو جمادات میں معدوم، نباتات میں مفقود اور حیوانات میں محدود ہے وہ انسان میں ایک حد تک وسیع ہے علاوہ ازیں ہر کام میں عاقبت بینی اور مآل اندیشی صرف انسان کا خاصہ ہے اسی لیے تمام مخلوقات میں وہی ارادی ''تکلیف'' کا مستحق قرار پایا اور غیر ذی ارادہ مخلوقات کی طرح بالاضطرار اور مجبورانہ اطاعت الٰہی کے لیے نہیں بلکہ بارادہ اطاعت کے لیے اس کی تخلیق ہوئی، فرمایا:

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ ﴾ (٣٣/ الاحزاب:٧٢)

''ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے انکار کیا اور

اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔‘‘

یہ امانت، اس کی نیکی و بدی کی تمیز اور خیر و شر کا فرق ہے جس کے نتیجہ کے طور پر شریعت الٰہی کا نزول ہوا ہے انسان کو اپنی اس امانت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے باارادہ اور بااختیار افعال میں بھی بے ارادہ اور بے اختیارانہ افعال کی طرح احکام الٰہی کی اطاعت کرنا ضروری ہے یعنی جس طرح بے اختیارانہ افعال میں فطرت و جبلت کی مجبورانہ اطاعت کر کے حکم الٰہی کی تعمیل کی جاتی ہے اسی طرح باارادہ اور اختیاری افعال میں بھی شریعت کی بالارادہ اطاعت کر کے حکم الٰہی کی تعمیل ضروری ہے۔ اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ غیر ارادی افعال و حرکات میں جس طرح ہم اپنے فطری الہام و وحی کی مجبورانہ پیروی کرتے ہیں اسی طرح ارادی افعال میں بھی شرعی الہام و وحی کی بالارادہ پیروی کریں۔ لیکن کسی کی اطاعت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے احکام و امر سے ہم کو واقفیت نہ ہو انبیا اور رسول وہی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اپنے ان احکام اور اوامر کی شریعت کو وحی کرتا ہے اور وہ ان ذی ارادہ بندوں کو اس سے آگاہ و باخبر کرتے اور اس کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ نکتہ کہ انسان کے علاوہ تمام دیگر بے ارادہ مخلوقات خدا کی اطاعت پر طبعاً مجبور اور مجبول ہیں اور کسی قدر بااختیار انسان کے افراد اپنے اسی تھوڑے سے اختیار اور ارادہ کے بل پر اپنے خالق سے سرکشی کرنے پر آمادہ ہیں خود قرآن پاک کے الفاظ میں موجود ہے، فرمایا:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ ﴾

(۲۲/ الحج:۱۸)

’’کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی کے آگے سر جھکاتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان اور بہت سے (انسان) ہیں جن پر عذاب ٹھہر چکا ہے۔‘‘

دیکھو کہ انسان کے علاوہ تمام دوسری بے ارادہ اور بے عقل مخلوقات کی کلی اطاعت اور سرافگندگی کا اعلان ہے لیکن خاص باارادہ اور باعقل اور انجام میں انسانوں کی دو قسمیں کر دی گئیں ہیں مطیع اور سرکش!

کائنات کے صحیفہ کا تدریجی مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان میں، سے جس صنف مخلوقات میں احساس ارادہ اور اختیار کی جتنی کمی ہے اسی قدر فطرت اس کی دایہ گیری کی خدمات انجام دیتی ہے اور جس حد تک احساس اور اختیار کا دائرہ اصناف ہستی میں بڑھتا جاتا ہے اسی قدر معلم فطرت اپنے فرائض سے کنارہ کش ہوتا جاتا ہے اور وہ صنف کائنات اپنی ذمہ داری آپ قبول کرتی جاتی ہے۔ جمادات اپنی نشوونما کے لیے بیرونی غذا کے محتاج نہیں، نباتات جن میں ان اوصاف کی ہستی صرف اپنی

آنکھیں کھولتی ہے ان کی غذا خود ان کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے اور وہ خود اڑ کر اور چل کر ان تک پہنچ جاتی ہے۔ حیوانات جن میں یہ اوصاف جاگ کر کروٹیں بدلتے ہیں ان کی غذا بے جوتے، بے بوئے، بے چنے نکھارے، بن پکے پکائے ہر قدم پر ہر وقت تیار ملتی ہے لیکن انسان جس میں یہ تینوں اوصاف بیٹھ کر حکمران اور کارفرما ہوتے ہیں اس کے منہ تک غذا کا ایک دانہ بھی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کی جدوجہد، محنت اور جانفشانی کے پسینہ کا گرم قطرہ پیشانی سے چل کر اس کے پاؤں تک نہیں پہنچتا۔ جہاں احساس، ارادہ اور اختیار جیسے جیسے کم ہے اسی قدر طبیعت، فطرت اور جبلت کی اضطراری حکومت زیادہ قائم ہے لیکن جیسے جیسے ان تینوں اوصاف کی ترقی و تکمیل ہوتی جاتی ہے طبیعت، فطرت اور جبلت کی حکومت کا دائرہ تنگ ہو کر احساس، ارادہ اور اختیار کی شہنشاہی قائم ہوتی جاتی ہے اور حرکات واعمال کی باگ فطرت و جبلت کے مضبوط اور ناممکن التغیر ہاتھوں سے نکل کر اختیار وارادہ کے کمزور اور ہر آن بدل جانے والے ہاتھوں میں آ جاتی ہے، جمادات ہمیشہ وہی کریں گے جو ان کو کرنا چاہیے، نباتات عموماً وہی بنیں گے جو ان کو بننا چاہیے۔ حیوانات وہی کام انجام دیں گے جو ان کے سپرد کر دیا گیا ہے لیکن انسان کسی قدر اختیار اور ارادہ پا کر اکثر اپنی راہ سے ہٹ جاتا ہے اور حد و داعتدال سے قدم باہر نکال دیتا ہے اور اپنے اس اختیار وارادہ کی ذمہ داری کی امانت کو بھول جاتا ہے، انبیا اور رسول وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ذی ارادہ اور با اختیار مخلوق کو اس کی ذمہ داری کے فرائض سمجھانے کے لیے آتے ہیں۔

اس اختیار اور ارادہ کے مرکز کا نام مذاہب کی زبان میں ''دل'' ہے جو انسان کے سر سے لے کر پاؤں تک کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ کی ایک ایک ارادی جنبش و حرکت پر حکمران ہے اور اسی کے حکم سے اس جسم کے اندرونی عالم میں سب کچھ ہوتا اور سرانجام پاتا ہے انبیا علیہم السلام اسی دل کے نظام کو درست کرنے کے لیے آتے ہیں۔

انسان کو اپنے وجود، بقا، ترقی اور تکمیل کی ہر منزل میں قدم قدم پر ہزاروں چیزوں کی احتیاج ہوتی ہے ان چیزوں کے مہیا اور تیار کرنے کے لیے ہر انسان میں استعداد و قوت الگ الگ ہوتی ہے اور یہ استعداد و قوت فیاض قدرت کی طرف سے پیدائش بلکہ پیدائش سے پہلے ہی آب و گل کے عالم میں اس میں ودیعت رکھی جاتی ہے یہی سبب ہے کہ ہر انسان میں جس قسم کا میلان ہوتا ہے اسی کی استعداد اس میں پائی جاتی ہے اور پھر بعد کو خاص خاص فنی الہامات کے ذریعہ سے جن کو تم ایجادات اور اختراعات کہتے ہو ہر پیشہ ور اپنے متعلقہ کام کو بڑھاتا ہے اور ترقی دیتا ہے اور تمہاری ضرورت کے مطابق تمہارے لیے سامان فراہم کرتا ہے۔

ان مادی ضروریات کے بنانے والوں کے حسب استعداد اور حسب حیثیت مختلف درجے اور مرتبے ہیں، بعض ان میں سے محض مقلد ہوتے ہیں جو وہی بنا سکتے ہیں جو بنانا سیکھا ہے، بعض چابکدست اور ذہین ہوتے ہیں جو اچھے کاریگروں کے صرف نمونوں کو دیکھ کر اچھی چیزیں تیار کر سکتے ہیں، بعض ایسے ذہین اور

فطین ہوتے ہیں کہ وہ نئی نئی چیزیں بناتے، دریافت کرتے اور ایجاد کرتے ہیں اور بعد کے آنے والے مدت تک انہیں کی تقلید کرتے رہتے ہیں، کاشتکاری کے اصول، ازالہ مرض کی تدبیریں، کھانے پکانے کے طریقے، سواری کی ضروریات، رہنے سہنے کے سامان، پہننے کے کپڑے، لڑنے کے آلات، ان میں سے ہر شے کی ضرورت ہے اور ان میں ہر ضرورت کے لیے خالق فطرت نے ایک ایک گروہ پیدا کر دیا ہے وہ اپنے اپنے کام کو انجام دیتے رہتے ہیں، ان ضرورتوں کے فراہم ہو جانے سے انسان کی مادی زندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے، اب اس کے بعد اس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کی ضروریات کا جن کو تم اصول تمدن، طریقہ معاشرت، آئین عدل وانصاف، اخلاق حسنہ اور دین وتقویٰ کے نام سے موسوم کرتے ہو، دور شروع ہوتا ہے اگر یہ اصول اور تعلیمات انسانوں کے سامنے نہ ہوں تو آدم کے بیٹوں کی یہ جنت دوزخ ہو جائے اور اشرف المخلوقات کی یہ جماعت جانوروں کا گلہ اور درندوں کا جھنڈ بن جائے۔

جو تمہارے لیے غلہ پیدا کرتا ہے وہ کاشتکار ہے اور جو اوزار بناتا ہے وہ لوہار ہے، جو زیور گھڑتا ہے وہ سونار ہے، جو تمہارے کپڑے بناتا ہے وہ جولاہا ہے، جو تمہارے مکان بناتا ہے وہ معمار ہے، جو تمہاری حفاظت کرتا ہے وہ سپاہی ہے، جو تمہاری نگہبانی کرتا ہے وہ حاکم ہے، جو تمہارے آپس کے جھگڑے چکاتا ہے وہ قاضی ہے، جو تمہارے ملک کے اندر امن وامان کا ضامن ہے وہ بادشاہ ہے، جو تمہاری جسمانی بیماریوں کا معالج ہے وہ طبیب ہے، جو اپنی صناعیوں سے تمہاری ضرورتوں کے لیے کاریگری کی چیزیں بناتا ہے وہ صناع ہے اور جو تمہارے لیے مادی کائنات کے چہرہ سے اسرار کا پردہ ہٹا کر تم کو ہر چیز سے باخبر کرتا ہے وہ حکیم ہے۔

اسی طرح جو برگزیدہ افراد تمہارے روحانی واخلاقی واجتماعی حالات کے معلم ونگران ہیں ان کی بھی ایک جماعت ہے لیکن جس طرح تمہاری مادی ضروریات کے بنانے والوں کے لیے حسب استعداد اور حسب حیثیت درجے ہیں اسی طرح ان روحانی ضروریات کے فراہم کرنے والوں میں بھی مرتبے اور درجے ہیں بعض وہ ہیں جو صرف اگلے روحانی معلمین کی نقل وتقلید کرتے ہیں یہ عام علما ہیں، بعض وہ ہیں جو اچھے روحانی نمونوں کو دیکھ کر خود بھی ان کی عمدہ نقل اتارتے ہیں اور دوسروں کو بھی بتاتے ہیں یہ مجددین ہیں، بعض ایسے ہیں جو الہام ربانی سے فیض پا کر روحانیت کے نئے نئے اصول وضع کرتے اور دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں یہ انبیا ہیں، ان کے مقدس ہاتھ تمہارے لیے غلہ پیدا کرنے، مکان بنانے، کپڑا بنانے، اوزار بنانے اور صناعی کرنے کے لیے نہیں بلکہ ان سے بدرجہا بلند تر اور بہتر کام کے لیے ہیں ان کی مبارک انگلیاں تمہارے ان تاروں پر پڑتی ہیں جن سے صدہا قسم کے نغمے نکل رہے ہیں یعنی تمہارے دل کی رگوں پر۔ غور کرو کہ یہ اصل مرکز جس پر تمہارے اعمال وافعال اور ہر قسم کی حرکات وسکنات اور ہر طرح کی جدوجہد کا مدار ہے یعنی ''دل''۔ کیا انبیا علیہم السلام اور اس کے متبعین کے سوا نوع انسانی کا کوئی طبقہ اس کی نشوونما، حفاظت، ترقی تکمیل اور اصلاح

کے لیے بھی کام کر رہا ہے اور کیا خالق فطرت کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ مادی ترقی و اصلاح کی طرح تمہاری روحانی ترقی و اصلاح کی بھی فکر کرتا ہے اور ایسا سمجھنا کہ اس نے اس کی ترقی و تکمیل و اصلاح کی خدمت نوع انسانی کے کسی کارکن طبقہ سے متعلق نہیں کی ہے کیا اس کی شان ربوبیت کے ساتھ سوئے ظن نہیں ہے۔

یہی وہ طبقہ ہے جو تمام متفرق اور مختلف انسانی طبقوں کو باہم جوڑ کر ایک عام انسانی تمدنی سطح پر لایا ہے وہ ان سب کو جو تمہارے لیے روٹی تیار کرتے ہیں، کپڑے بنتے ہیں، جھونپڑے بناتے ہیں اور سامان اور اوزار درست کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مشارکت اور معاونت اور نیکی پر آمادہ کر کے ان میں روحانی برادری پیدا کرتے ہیں اور مٹی سے پیدا ہونے والے ایک آدم کے بیٹوں کو جن کو دولت وغربت، سوسائٹی اور مجلس اور حکومت اور اقلیم اور جغرافی وقومی تقسیم نے پارہ پارہ کر رکھا ہے باہم جوڑ دیتے ہیں اور ان تمام مصنوعی امتیازات کو مٹا کر پوری زمین کو ایک ملک، تمام اقوام عالم کو اولاد آدم، اور کل بلند و پست طبقوں کو ایک انسانی طبقہ قرار دیتے ہیں اور ان کے اخلاقی و روحانی عالم میں اصلاح و ترقی اور امن وامان پیدا کر دیتے ہیں ان کے دلوں سے بغض و کینہ کو نکال کر اخوت ومحبت کا نور بھرتے ہیں، ان کے احساس، ارادہ اور اختیار کی باگ پر ان کے دل کو قابو حاصل کرنے کی تدبیر بتاتے ہیں اور ان کو اعتدال کی حد بتا کر صحیح وغلط کی تمیز عطا کرتے ہیں۔

یہی وہ طبقہ ہے جس کو ہم نبی رسول اور پیغمبر کہتے ہیں ان کو گو براہ راست جسم و جسمانیات سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ صرف دل اور قلب و روح کے عالم سے سروکار ہوتا ہے تاہم اس دل اور قلب و روح کی اصلاح کے لیے جسم و جسمانیات کی کسی قدر اصلاح بھی اس حد تک ان کے فرائض میں داخل ہے جہاں تک ان کو دل اور قلب و روح کے کاموں کی اصلاح کے لیے اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اس مقام پر ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ افراد انسانی کے درمیان، امن وامان اور اطمینان پیدا کرنے کا کام تو بادشاہ بھی کرتے ہیں، اخلاق کا ایک معلم بھی ہے، ایک فلسفی اور اجتماعیات کا ایک حکیم بھی کرتا ہے مگر ان کے کاموں کے درمیان جو عظیم الشان فرق ہے اس کو سمجھ لینا ہی اس شبہ کا ازالہ ہے۔ علمی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ مختلف فنون کے ماہر ایک ہی چیز پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہیں اور اسی اختلافِ نظر سے ان کا فن بھی علیحدہ علیحدہ ہو جاتا ہے کسی جسم کے اجزائے ترکیبی سے اگر بحث کی جائے تو کیمسٹری ہے، اگر اس کی زندگی اور اسباب زندگی پر غور کیا جائے تو بیالوجی (علم الحیات) ہے، اگر اس کے دماغی قویٰ اور ان کے آثار کی تحقیق کی جائے تو سائیکالوجی (علم النفس) ہے اور اگر اس کے جذبات اور جذبات کے مطابق اس کے شخصی افعال و اعمال کے حدود اور ان کے اسباب وعلل اور غرض وغایت پر نظر ڈالی جائے تو یہ اتھکس (فلسفۂ اخلاق) ہے، اگر اس کے جماعتی خصائص اور لوازم کی تفتیش کی جائے تو یہ سوشیالوجی (علم اجتماع ومعاشرت) ہے، اگر جسم کی

صحت ومرض کے اسباب کی جستجو کی جائے تو یہ طب ہے۔ دیکھو کہ ایک ہی جسم یا متعلق جسم پر کتنی حیثیتوں سے بحثیں کی گئی ہیں اوران سے کتنے مختلف علوم پیدا ہو گئے ہیں تاہم وہ سب کے سب جسم اور جسمانیات ہی سے متعلق اور وابستہ ہیں اور بااین ہمہ ان میں سے ہر ایک علم وفن علیحدہ اور ہر ایک علم وفن کے جاننے والے علیحدہ ہیں۔ اسی طرح ایک نبی اور ایک رسول کا کام بھی بادشاہوں، فلاسفروں اور حکیموں کی طرح انسانوں ہی کی اصلاح ہے مگران میں سے کسی ایک کا کام بھی دوسرے سے ملتا جلتا نہیں ہے، بادشاہ صرف اس کا ذمہ دار ہے کہ وہ اپنے زور وقوت سے بازاروں، گلیوں، آبادیوں اور میدانوں میں امن وامان اور انصاف کو قائم رکھے، فلاسفر انسانوں کے تمام اعمال وخیالات کے اسباب وعلل کی تفتیش اور ان میں نظم وتسلسل اور علت ومعلول کا ربط پیدا کرنے کا کفیل ہے، فلسفۂ اخلاق کے معلم تمہارے اخلاق وعادات کے اسباب وعلل تم کو بتاتے اور ناقابل فہم جذبات کی تشریح کرتے ہیں، اس سے آگے ان کا کوئی کام نہیں، حکیم اور واعظ تمہارے اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لیے نہایت شیریں خوشگوار اور ڈھلے ہوئے فقرے سناتے ہیں مگران میں سے کوئی نہیں جو تمہارے دلوں کا راہنما ہو جو تمہارے احساس، ارادہ اور اختیار کے قدم کو غلط روی سے روک سکے وہ نہ صرف تمہارے اخلاق وعادات اور جذبات کے اسباب وعلل بتائے بلکہ تمہارے اخلاق وعادات اور جذبات میں خیر وشر کی تمیز کرے اور خیر کے حصول اور شر سے حفاظت کی تدبیر بتائے بلکہ اس کے ہاتھ اور زبان میں یہ قوت ہو کہ اپنی تعلیم وتلقین وفیض صحبت سے تمہارے اخلاق وعادات وجذبات بلکہ احساس، ارادہ اور اختیار کی غرض و غایت بلکہ پورے دل کی قوتوں میں انقلاب پیدا کردے اور شر کے تخم کو دلوں کی سرزمین سے نکال کر خیر کا برگ وبار پیدا کردے البتہ نبی یہ تمام کام سرانجام دیتا ہے وہ انسانوں کو اس کے احساس، ارادہ اور اختیار کی بھولی ہوئی ذمہ داری یاد دلاتا ہے اور ان قویٰ کے مرکز یعنی دل کو خدا کے حکم سے درست کر دیتا ہے۔

وہ بادشاہوں کی طرح صرف بازاروں، مجمعوں اور آبادیوں کا امن واطمینان نہیں چاہتا بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کے اندر کا امن واطمینان چاہتا ہے، وہ معلمین اخلاق کی طرح اسباب وعلل کی تلاش وجستجو کی تشریح کی پروا نہیں کرتا بلکہ اخلاق سیئہ خواہ کسی سبب سے ہوں، وہ ان کی بیخ کنی کرتا ہے اور اخلاق حسنہ خواہ کسی علت کے معلول ہوں، وہ ان کو انسانوں کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ انسانی اوہام کے طلسم کو توڑ دیتا ہے اور غلط رسوم ورواج کی بندشوں کو کھولتا ہے اور انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کر کے صرف خدا کی غلامی میں دیتا ہے:

﴿ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵۷)

''وہ ان کو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور اچھائیوں کو ان کے لیے حلال اور

خبیث چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے اور ان کے اس بندھن اور زنجیروں کو جو ان پر ہوتی ہیں ان سے اتارتا ہے۔''

﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ ﴾

(٤/ النسآء:١٦٥)

''ایسے رسول بھیجے جو نیکوں کو خوشخبری دیتے اور بدکاروں کو ہوشیار کرتے ہیں، تا کہ رسولوں کو اس وعظ و تذکیر کے بعد پھر انسانوں کو خدا پر الزام دینے کا موقع نہ ملے۔'' (کہ ہم بھولے تھے تو خدا نے ہم کو کیوں نہ یاد دلایا)

﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ ﴾

(٥٧/ الحدید:٢٥)

''ہم نے رسولوں کو کھلی ہدایتیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو، تا کہ لوگ عدل وانصاف پر قائم رہیں اور دنیا میں امن واطمینان کی زندگی بسر کریں۔''

نوع انسانی کے دوسرے تمام خدام اور کارکن اپنے فرائض کو جن اغراض سے انجام دیتے ہیں ان کا دائرہ موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی سے آگے نہیں بڑھتا مگر انبیا اور رسول نوع انسانی کی خدمت کے یہ کام بھی اس کی موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی کو اس لحاظ سے سامنے رکھ کر کرتے ہیں کہ ان کا اثر اس کی دوسری دائمی و پائیدار زندگی پر کیا پڑے گا، وہ جسم کی خدمت، جسم کے لیے نہیں بلکہ روح کے لیے کرتے ہیں اور مخلوق کی خدمت خالق کے منشا کے مطابق بجالاتے ہیں وہ صرف ایک مخلوق کو دوسری مخلوق ہی سے نہیں بلکہ مخلوق کو خالق سے اور خالق ہی کے لیے ایک مخلوق کو دوسری مخلوق سے جوڑتے ہیں۔ وہ صرف اچھی اچھی اور میٹھی میٹھی باتیں لوگوں کو نہیں سناتے بلکہ خود بہتر سے بہتر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کا عامل بناتے ہیں وہ خیال آراء شاعروں اور جھوٹے حکیموں کی طرح نہیں ہوتے جو کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ دماغ ہوتے ہیں مگر دل نہیں ہوتے، زبانیں ہوتی ہیں مگر ہاتھ نہیں ہوتے:

﴿ وَالشُّعَرَاۗءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾ (٢٦/ الشعرآء:٢٢٤_٢٢٦)

''اور شاعروں کے پیروکار گم کردہ راہ ہوتے ہیں تم دیکھتے نہیں کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور وہ وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔''

وہ اس دعویٰ کے ساتھ انسانوں میں آتے ہیں کہ ان کے خالق نے جس نے ان کے ذرہ ذرہ کا سامان راحت فراہم کیا ہے وہی ان کے قلب و روح کا سامان راحت بھی بہم پہنچاتا ہے ان کو اس لیے بھیجا ہے کہ

انسانوں کے قلب وروح کو اس سامان کا برتنا سکھائیں اور ان کے رب کا پیغام ان کو سنائیں اور بتائیں کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اپنے احساس، اپنے ارادہ اور اپنے اختیار کو کس طرح اس عالم میں صرف کریں کہ وہ پریشانی وبے اطمینانی کی تاریکی سے نکل کر سکون واطمینان اور امن وسعادت کی روشنی میں داخل ہوں:

﴿ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾ (۵۷/ الحدید:۹)

''وہی خدا جو اپنے (رسول) بندے پر کھلی آیتیں اتارتا ہے کہ تم کو (اے انسانو!) وہ تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائے (اور اللہ نے ایسا اس لیے کیا) کہ وہ تم پر شفقت کرنے والا مہربان ہے۔''

انبیا بھی ایک بادشاہ کی طرح جماعتوں کا انتظام کرتے ہیں مگر ملک کے خراج اور زمین کی آبادی کے لیے نہیں بلکہ خدا کے لیے، وہ بھی جان ومال کی حفاظت کے لیے مقنن کی طرح قانون بناتے ہیں اور قاضی کی طرح سزا وجزا کا حکم سناتے ہیں مگر انعام شاہی اور تنخواہ ماہانہ پا کر کسی دنیاوی بادشاہ کے فرمان کی تعمیل کے لیے نہیں، بلکہ جسم وجان کے شہنشاہ اور کائنات کے مالک کے فرمان کی تعمیل میں۔ وہ بھی فلاسفر کی طرح رموز واسرار کا پردہ فاش کرتے ہیں مگر تجربہ استقرا اور قیاس سے نہیں بلکہ عالم الاسرار کے مبدئے علم سے فیض پا کر۔ وہ بھی حکیم وواعظ کی طرح پر تاثیر کلام کرتے ہیں مگر ان کے مانند اپنے دل سے جوڑ کر نہیں بلکہ خدا سے سن کر اور وہ صرف کہتے نہیں بلکہ جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں اور جو کرتے ہیں وہ دوسروں سے کراتے ہیں وہ خدا سے ہیں خدا سے پاتے ہیں اور اسی سے سنتے ہیں اور وہی اوروں کو سناتے ہیں غرض اوپر آسمان سے ان کو جو کچھ ملتا ہے وہی نیچے زمین پر سب کو بانٹتے ہیں:

﴿ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝ ﴾ (۵۳/ النجم:۱۔۷۔۱۰۔۱۲۔۱۷۔۱۸)

''قسم ہے اس ستارہ کی جب وہ نیچے گرے، کہ تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ بھولا نہ بھٹکا اور نہ وہ نفس کی خواہش ہی سے بات کرتا ہے وہ تو وہ ہے جو اس کو وحی کے ذریعہ کہا جاتا ہے اس کو بڑی بڑی قوتوں والے ہی نے سکھایا، طاقت والا، تو وہ سیدھا ہوا درآنحالیکہ وہ آسمان کے سب سے اوپر کناروں میں تھا۔ تو اس نے اپنے بندہ پر وحی کی، جو وحی کی نہ اس کے دل نے جو اس نے دیکھا، اس کو جھوٹ کہا، کیا وہ جو دیکھتا ہے تم اس پر اس سے جھگڑتے ہو، نہ بینائی نے کجی کی اور

نہ سرکشی کی، اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے دیکھا۔''

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۲۰۳)

''کہہ دے (اے پیغمبر) کہ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے، یہ (اے انسانو)! تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں ہیں اوران کے لیے جوایمان رکھتے ہیں ہدایت اور رحمت ہیں۔''

﴿ وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ ﴾ (۲۶/ الشعرآء:۱۹۲، ۱۹۵)

''یہ تو عالم کی پرورش کرنے والے کی طرف سے اتارا گیا ہے، اس کو امانت والی روح نے تیرے دل پر اتارا، تاکہ فصیح عربی زبان میں تو ہشیار کرنے والوں میں سے ایک ہو۔''

نکتہ: یہ بالکل ممکن، بلکہ واقعہ ہے کہ ایک ہی قسم کا کام مختلف لوگ، مختلف غرض ونیت سے کرتے ہیں کسی قوم کی اصلاح ہی کا کام ہے کہ اس کو مختلف لوگ مختلف غرض ونیت سے کرتے ہیں، خودغرضی کے غیر مخلصانہ اغراض سے قطع نظر کرکے صرف مخلصانہ اغراض کو لو، کوئی یہ سمجھتا ہے کہ قوم کی مالی حالت کی درستی سے قوم بن سکتی ہے، کوئی اصلاح کی جڑ تعلیم کو قرار دیتا ہے، کوئی رسم ورواج اور معاشرت پر زور دیتا ہے، کوئی ظاہری تمدن پر مدار رکھتا ہے، کوئی جسمانی قوت پر بھروسہ رکھتا ہے، کوئی سیاسی کامیابی کو قومی اصلاح کا مرکز ٹھہراتا ہے، لیکن انبیا کے نزدیک یہ سب ثانوی درجہ کی باتیں ہیں، وہ اپنی بنیاد صرف قلب کی اصلاح پر رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی اصلی چیز ہے اور تمام دوسری ترقیوں اور اصلاحوں کو وہ یکسر اسی ایک اصل کی فروع اور اسی ایک جڑ کی شاخیں جانتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی دعوت کی کامیابی سے قوموں کو سلطنت بھی ملتی ہے، دولت بھی ہاتھ آتی ہے، علم بھی حاصل ہوتا ہے، زور اور قوت بھی پیدا ہوتی ہے اور دنیاوی عظمت وجلال کا ہر منظر خادمانہ اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھتا ہے، مگر یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ سیاسی مصلحین کی طرح قوت وطاقت ان کا مطمح نظر نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ ان کے سامنے ہوتا ہے وہ صرف خدا کی اطاعت، خدا کی محبت اور خدا کی خوشنودی ہوتی ہے باقی تمام چیزیں ان کی نگاہ میں فرعی، ثانوی اور ضمنی ہوتی ہیں۔

نبی اور غیر نبی کے امتیازات

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ انبیا علیہم السلام اور ان کے مشابہ اشخاص میں کتنا عظیم الشان فرق ہے۔ یہ فرق چار حیثیتوں سے نمایاں ہے مبدأ اور منبع کا فرق، غرض وغایت کا فرق، طریق دعوت کا فرق اور علم وعمل کا فرق۔ نبی کے علم کا مبدأ منبع، ماخذ اور سرچشمہ جو کچھ کہو وہ تعلیم ربانی، شرح صدر اور وحی والہام ہوتا ہے اور حکیم کے علم کا

ماخذ ومنبع تعلیم انسانی، گزشتہ تجربہ استقرا اور قیاس سے ہوتا ہے یعنی حکیم عقل سے جانتا ہے اور نبی خالق عقل سے، اسی طرح ایک حکیم کے تمام اقوال اور جدوجہد کا منشا اپنی شہرت طلبی، علم کا اظہار، قوم یا ملک کی محبت کی خاطر اس کی اصلاح ہوتا ہے مگر ایک نبی کا مقصد خدا کے حکم کا اعلان اور خالق کی رضامندی کے لیے مخلوق کی بھلائی ہوتا ہے، طریق دعوت کا فرق یہ ہوتا ہے کہ حکیم اپنی دعوت کی عمارت تمام تر حکمتوں، مصلحتوں اور علل و اسباب کے ستونوں پر کھڑی کرتا ہے لیکن نبی اپنی دعوت کو زیادہ تر خالق کی اطاعت، محبت اور رضا جوئی پر قائم کرتا ہے، حکیم کہتا ہے لیکن اس کا کرنا اس کے لیے ضروری نہیں۔ نبی جو کہتا ہے وہ کرتا ہے اور اس کا کر کے دکھانا اس کے لیے ضروری ہے۔ وہ صرف جلوت کے منبر پر آراستہ نہیں ہوتا بلکہ وہ جلوت وخلوت اور ظاہر و باطن میں یکساں حسنات سے آراستہ اور برائیوں سے پاک ہوتا ہے۔ دنیا میں سقراط، افلاطون، ارسطو، دیوجانیس وغیرہ ایک طرف اور ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم دوسری طرف ہیں اور دونوں کے سوانح اور سیرتیں اور کارنامے بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں کہ ان میں ذرا التباس نہیں۔

بادشاہ اپنی تلوار کے زور اور اپنی فوج و لشکر کی قوت سے رعایا کو اپنے قانون کا پابند بناتے ہیں، تاکہ فتنہ و فساد رک جائے۔ فلاسفر اپنے دعووں کو صرف استدلال کی قوت اور عقل کے خطاب سے ثابت کرنا چاہتے ہیں، تاکہ لوگ ان کی بات تسلیم کریں، لیکن پیغمبر اپنے پیرووں کے قلب کو اس طرح بدل دینا چاہتے ہیں کہ وہ ازخود برائی کو چھوڑ کر نیکی اختیار کرلیں وہ اگر کبھی قانون و حدو سزا کو اختیار کرتے ہیں یا ساتھ ساتھ عقل کو بھی مخاطب کرتے ہیں تو ان کا یہ ضمنی یا ثانوی کام ہوتا ہے اولین نہیں۔ ان کی اولین غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کے پیرووں کو خدا کی قدرت اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اتنا محکم اور پختہ یقین ہوجائے کہ وہ اس کے حکموں اور نصیحتوں کو جو ان کے ذریعہ آتی ہیں بے چون و چرا تسلیم کرلیں۔ دنیا کے بادشاہ اور فاتح اور کشورکشا اپنے زور بازو اور تلوار کی قوت سے دنیا کے تختے الٹ دیتے ہیں۔ انھوں نے کبھی کبھی چار دانگ عالم پر حکمرانی کی، قوموں کی جان و مال پر اپنا قبضہ اقتدار جمایا ان کی تلواروں کی دھاک نے آبادیوں اور مجمعوں کے مجرموں کو روپوش کردیا اور بازاروں اور راستوں میں امن وامان پیدا کردیا لیکن کیا انھوں نے دلوں کے طبقے بھی الٹے؟ اپنی سلطنت کے دائرہ سے باہر کسی کمزور سے کمزور انسان سے اپنے حکم کو منوا سکے؟ لوگوں کے دلوں کو بھی اپنے قبضۂ اقتدار میں لا سکے؟ وہ آبادیوں اور مجمعوں کے روپوش مجرموں کو بھی فنا کرسکے؟ وہ دلوں کی بستیوں میں بھی امن وامان پیدا کرسکے؟ وہ روحوں کی مملکتوں کا بھی نظم ونسق قائم کرسکے؟

حکما اور فلاسفر جو اپنی عقل رسا کے ذریعہ سے عجائبات عالم کی طلسم کشائی اور کائنات کے مخفی اسرار کے فاش کرنے کے مدعی ہیں کیا وہ قلب و روح کے عجائبات کو دریافت کرسکے؟ وہ ماورائے مادہ اسرار و رموز کو بھی حل کرسکے؟ وہ انسانوں کی اصلاح و ہدایت کا بھی کوئی سامان اپنی تحقیق و تفتیش سے فراہم کرسکے؟ ان کی دقیق

نکتہ سنجیوں اور خیال آرائیوں کے پیچھے ان کے ذاتی حسن عمل کا بھی کوئی نمونہ ہے؟ ارسطو نے فلسفہ اخلاق کی بنیاد ڈالی۔ دوسرے حکما نے اخلاق کے اسباب وعلل کے حدود، ظہور، اثر اور نتیجہ کے ایک ایک حرف کی تحقیق کی مگر کیا اس سے کسی انسان کے دل سے برائی کا تخم دور ہوا، اچھائی کے بیج نے نشو ونما پائی، ان کے اخلاق وتعلیمات کے فلسفیانہ رموز واسرار کا دائرہ ان کی درسگاہوں کی چہار دیواریوں سے کبھی آگے بڑھ سکا؟ کیونکہ وہ اپنے درس کے کمروں سے نکل کر جب انسانی صحبتوں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی اخلاقی زندگی اور قلبی صفائی عام انسانی افراد سے ایک انچ بھی بلند نہیں ہوتی، حکمائے یونان میں سقراط سے بڑھ کر کوئی نہیں، مگر کیا یہ وہی نہیں ہے جو بازار کی فاحشہ عورتوں سے ارتباط رکھتا تھا اور ان میں ایک پیشہ کے فروغ اور کامیابی کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ یہی یونان کے دوسرے حکماء کا حال تھا اور توحید وخدا پرستی تو اس سے بدرجہا بلند ہے، جس کی ان کو ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

ان سطروں سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ہر شیریں نوا واعظ، ہر مؤثر البیان خطیب، ہر دقیقہ رس مقنن، ہر کشور کشا فاتح اور ہر نکتہ دان حکیم اس لائق نہیں کہ نبوت ورسالت کا اہم اور بلند اور مقدس منصب اس سے منسوب کیا جائے، اس منصب کے ساتھ کچھ ایسے شروط، لوازم اور خصوصیات بھی وابستہ ہیں، جو اس کے ضروری اجزاء اور عناصر ہیں۔

① سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کا تعلق پراسرار عالم غیب سے ہو، وہ عالم غیب کی آوازیں سنتا ہو، غیب کی چیزیں دیکھتا ہو، غیب سے علم پاتا ہو، علم ملکوت کی تائید اس کے ساتھ ہو، روح القدس اس کا ہمسفر وہمنوا ہو۔

② اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام بندوں میں سے اس کے لیے چنا ہو کہ وہ اس بلند منصب پر سرفراز ہو۔

③ اس سے خدا کے حکم سے عجیب وغریب اور حیرت انگیز تصرفات صادر ہوں جن سے اس کا مقبولِ بارگاہ ہونا ثابت ہو۔

④ فضائل واخلاق کے پھولوں سے اس کا دامن بھرا ہو اور ہر قسم کے گناہ کے خس وخاشاک سے پاک وصاف ہو کہ گندے ہاتھوں سے میلے کپڑے پاک وصاف نہیں ہو سکتے۔

⑤ وہ لوگوں کو خدا اور عالم غیب پر یقین کی دعوت اور فضائل واخلاق کی تعلیم دے اور روز "أَلَسْتُ" کا بھولا ہوا عہد ان کو یاد دلائے۔

⑥ نہ صرف تعلیم بلکہ اس میں قوت ہو کہ وہ شریروں کو نیک اور گمراہوں کو راست رو بنا دے اور جو خدا سے بھاگتے ہوں ان کو پھیر کر پھر اس کے آستانہ پر لے آئے۔

⑦ اپنے سے پہلے خدا کی طرف سے آئے ہوئے صحیح اصول کو انسانی تصرفات سے پاک وصاف کر کے پیش کرے۔

⑧ اس کی دعوت وجد وجہد اور تعلیم وتلقین سے مقصود کوئی دنیاوی معاوضہ، شہرت، جاہ طلبی، دولت مندی، قیام سلطنت وغیرہ نہ ہو بلکہ صرف خدا کے حکم کی بجا آوری اور خلقِ خدا کی ہدایت ہو۔

یہ نبوت ورسالت کے وہ اوصاف اور لوازم ہیں جو دنیا کے تمام پیغمبروں میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ مذاہب عالم کے صحیفوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف اور آشکارا ہو جاتی ہے، خصوصاً قرآن پاک نے، جو دنیا کی نبوت کا سب سے آخری اور سب سے مکمل صحیفہ ہے اور جس نے نبوت ورسالت کی حقیقت اور شرائط ولوازم کی سب سے بہتر تشریح کی ہے۔ سورۂ انعام میں اکثر پیغمبروں کا ذکر کر کے یہ حقائق ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

﴿ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰبَاۗىِٕهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَاۗءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۭ قُلْ لَّآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (٦/ الانعام:٨٣۔٩٠)

’’اور یہ تھی ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اس کی قوم کے مقابلہ میں دی، ہم جس کو چاہتے ہیں کئی درجے بلند کرتے ہیں، بے شبہ تیرا پروردگار تدبیر والا خبردار ہے اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق اور یعقوب علیہما السلام بخشے اور ہر ایک کو ہدایت دی اور نوح علیہ السلام کو اس سے پہلے ہدایت دی تھی اور اس کی اولاد میں داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو اور اسی طرح ہم نیکو کاروں کو بدلہ دیتے ہیں اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس علیہم السلام کو ہر ایک نیکو کاروں میں سے اور اسمٰعیل اور الیسع اور یونس اور لوط علیہم السلام کو ہر ایک کو بزرگی بخشی دنیا والوں پر اور ان کے باپ دادوں اور بھائیوں میں سے اور ہم نے ان کو چن کر پسند کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا یہ اللہ کی ہدایت ہے اس پر وہ چلاتا ہے جس کو چاہتا ہے، اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا برباد ہو جاتا یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حق و باطل میں فیصلہ کرنا (حکم) اور نبوت دی تو اگر کوئی ان باتوں سے انکار کرے تو ہم نے ان

باتوں پر ایسے دوسروں کو مقرر کیا ہے جو ان کا انکار نہیں کرتے، یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی اے محمد ﷺ! تو بھی انہیں کی راہنمائی کی پیروی کر اور کہہ میں اپنے کام کی تم سے مزدوری نہیں چاہتا، یہ قرآن تو دنیا والوں کو یاددلانا ہے۔''

ان آیتوں میں اکثر پیغمبروں کے نام لے کر، ان کے پیغمبرانہ اوصاف گنائے ہیں اگر ہم ان کو یکجا کردیں تو نبوت ورسالت کے عام اوصاف خصوصیات اور لوازم واضح ہو جائیں:

① فرمایا: ''ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو دلیل دی اور ہم نے ان کو ہدایت بخشی'' جس سے معلوم ہوا کہ ان کے علم اور ہدایت کا سرچشمہ عالم ملکوت سے ہوتا ہے۔

② ارشاد ہوا کہ ''ہم نے ان کو سیدھی راہ چلایا اور یہ سب نیکو کار تھے'' اس سے ثابت ہوا کہ وہ معصوم اور گناہوں سے بے داغ ہوتے ہیں۔

③ یہ بھی کہا کہ ''ہم نے ان کو چن کر پسند کیا'' اور ''جس کو چاہیں اپنے بندوں میں سے یہ ہدایت عطا کریں'' جس سے یہ مقصود ہے کہ یہ منصب سعی ومحنت سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی اور انتخاب سے ملتا ہے۔

④ فرمایا کہ ''ہم نے ان کو کتاب حق و باطل کے فیصلہ کی طاقت (حکم) اور احکام غیب کی تعلیم (نبوت) دی'' اس سے معلوم ہوا کہ اس منصب والوں کو کیا کیا چیزیں عطا ہوتی ہیں۔

⑤ حکم ہوا کہ ''ان کی راہنمائی کی پیروی کر'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی راہنمائی اور دعوت پر مامور ہوتے ہیں اور لوگ ان کی پیروی سے نیکو کار اور صالح بنتے ہیں۔

⑥ فرمایا کہ ''اے پیغمبر! یہ کہہ دے کہ میں اپنے کام کا کوئی معاوضہ یا بدلہ تم سے نہیں چاہتا یہ تو اہل دنیا کے لیے نصیحت اور یاددلانا ہے'' اس سے ثابت ہوا کہ خالق کی خوشنودی اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی خیر خواہی اس کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا مقصود اور مطمع نظر نہیں ہوتا۔

دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کے علاوہ خاص محمد رسول اللہ ﷺ کے تعلق ونسبت سے ان حقیقتوں کو قرآن پاک نے کئی دفعہ بتصریح بیان کیا ہے جن میں سے چار باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں:

① اشیائے غیب، امور خیر اور فلاح وسعادت کے اسباب پر اس کا علم خدا کی تعلیم سے کامل ہو۔

② وہ اپنے علم کے مطابق اپنے عمل میں کامل اور راست باز ہو۔

③ وہ دوسروں کو ان امور کی تعلیم دیتا ہو۔

④ اور ان کو بھی اپنی تعلیم اور صحبت کے فیض سے حسب استعداد کامل بناتا ہو۔

قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر آپ ﷺ کی نسبت یہ فرمایا گیا:

﴿ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۲۹۔۶۲/ الجمعۃ:۲)

''وہ رسول ان پڑھوں کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو پاک وصاف بناتا اور ان کو کتاب وحکمت سکھاتا ہے۔''

اس مختصر سی آیت میں ان چاروں مذکورہ بالا امور کا یکجا ذکر کیا ہے جاہلوں کو آیات الٰہی پڑھانے اور کتاب وحکمت سکھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود اس کو آیات الٰہی پڑھائی اور کتاب وحکمت سکھائی گئی ہوں اور دوسروں کو پاک وصاف بنانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود پاک وصاف ہو کہ ایک جاہل اپنے ہی جیسے دوسرے جاہل کو عالم اور ایک ناپاک اپنے ہی جیسے دوسرے ناپاک کو پاک نہیں بنا سکتا۔

ایک دوسری آیت میں ہے:

﴿ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ؕ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۚۖ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ؕ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۙ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۙ ﴾

(۸۷/ الاعلیٰ:۶۔۱۱)

''ہم تجھے پڑھائیں گے تو تو نہیں بھولے گا، مگر جو اللہ چاہے، وہ جانتا ہے، پکار اور چھپا اور ہم تجھے آہستہ آہستہ آسانی تک پہنچائیں گے اور تو سمجھا اگر تیرا سمجھانا فائدہ دے جس کو خدا کا لحاظ ہوگا وہ سمجھے گا اور جو بدبخت ہوگا وہ اس سے پرہیز کرے گا۔''

ایسا پڑھانا جس میں بھول نہ ہو ''پیغمبر کی روحانی تعلیم ہے'' اور آسانی کی منزل کی طرف اس کو آہستہ آہستہ لے چلنا اور اس کے لیے اس کٹھن منزل کو آسان کر دینا اس کے ذاتی عمل کو کمال درجہ تک اس طرح پہنچا دینا ہے کہ تمام امور خیر اس سے بسہولت از خود صادر ہونے لگیں پھر اس کو دنیا کے ''سمجھانے'' پر مامور کرنا اس رمز کو آشکارا کرنا ہے کہ دوسروں کی تعلیم وتذکیر کا منصب اس کو ملا ہے۔ اس کے بعد یہ فرمانا کہ ''متقی اس نصیحت سے فیض پائیں گے اور بدبخت محروم رہیں گے'' اس کی تشریح یہ ہے کہ ناقصوں کی تکمیل اور ذی استعداد لوگوں کو ان کی استعداد کے مطابق فیض پہنچانا بھی اس کا فرض ہے۔ [1]

نبوت کے لوازم اور خصوصیات

نبوت کی شرح حقیقت اور اس کے ضروری لوازم اور خصوصیات کے اجمالی بیان کے بعد ضرورت ہے کہ نبوت کے چند اہم خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کی جائے، تاکہ وقت کی بہت سی غلط فہمیوں کا سدباب ہو لیکن ان خصوصیات کے ذکر سے پہلے خود ہم کو ''خصوصیت'' کو سمجھنا ہے کہ اس سے مقصود کیا ہے؟

دنیا میں ہر نوع اور ہر نوع کے ماتحت ہر صنف میں کچھ نہ کچھ مخصوص صفات ہوتی ہیں یہ مخصوص صفات

[1] یہ تشریح اور طریقہ استدلال امام رازی نے اپنی تفسیر "تفسیر کبیر، سورۃ الاعلیٰ، ج ٦، ص: ٥٢٨" اور بعض کتب کلامیہ میں اختیار کیا ہے۔

اس نوع اور صنف کے ہر فرد میں یکساں پائی جاتی ہیں انہیں کو ہم لوازم اور خصوصیات کہتے ہیں پھل، پھول، چوپائے، پرندے اور انسان تمام انواع میں کچھ نہ کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور انہیں خصوصیات کی بنا پر ہر نوع دوسرے سے ممتاز اور ہر صنف دوسرے سے علیحدہ ہے گلاب میں خاص قسم کا رنگ، خاص قسم کی خوشبو، خاص قسم کے پتے ہوتے ہیں یہ ناممکن ہے کہ کوئی گلاب ہو اور اس میں یہ چیزیں نہ پائی جائیں لیکن گلاب کی بھی مختلف صنفیں ہیں ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسی لازمی صفات ہوتی ہیں جن سے گلاب کی ہر صنف (قسم) دوسری صنف (قسم) سے علانیہ الگ نظر آتی ہے۔

اسی طرح انسانیت کے کچھ خاص لوازم ہیں دو ہاتھ، دو پاؤں، سیدھا قد، بولنے کی طاقت، سمجھ و بوجھ اور غور و فکر کی اہلیت، ایجاد و اختراع کی قوت، انجام بینی اور مآل اندیشی کی صلاحیت وغیرہ اس کے خواص ہیں اور جس طرح شہد میں میٹھاس، حنظل میں کڑواپن، آگ میں گرمی اور برف میں ٹھنڈک، نوعی خواص کی حیثیت سے خود بخود پیدا ہوگئی ہیں اسی طرح انسان میں انسانیت کی مذکورہ بالا خاصیتیں فطرتاً ودیعت ہیں لیکن اس وصفِ انسانیت میں اشتراک کے ساتھ گلاب کے اصناف کی طرح نوع انسانی کے بھی مختلف اصناف ہیں، جیسے ہندی، چینی، حبشی، رومی، ایشیائی اور یورپین وغیرہ۔ دیکھو کہ ان میں سے ہر ایک صنف میں انسانیت کے اشتراک کے باوجود قد و قامت، چہرہ مہرہ، رنگ و روغن، صورت و شکل اور اخلاق و عادات، وغیرہ بیسیوں چیزوں کا نمایاں امتیاز ہوتا ہے اور یہ تمام اصناف انسانی جو مختلف آب و ہوا، مختلف مرز و بوم، مختلف نسل اور مختلف ماحول سے تعلق رکھتے ہیں انسان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے صریحًا ممتاز ہیں۔

اسی طرح ہر صنفِ انسانی کے اندر مختلف افراد ہیں، خلاق فطرت نے ان میں سے ہر ایک کو مختلف قابلیتیں عطا کی ہیں، شاعری، زبان دانی، فلسفہ، ریاضی، صناعی، باغبانی، معماری، پہلوانی، سینکڑوں مختلف قسم کی انسانی استعداد کی خصوصیتیں دوسروں سے الگ ہیں ایک تخیل پسند شاعر اور ایک حقیقت شناس ریاضی دان میں عظیم الشان فرق ہوتا ہے۔ ادب و انشا کے خیالی بلند پرداز، عموماً ریاضیات جیسے ٹھوس اور واقعی علوم سے کورے ہوتے ہیں اور واقعیات سے لبریز ریاضیات کے جاننے والے، ادب و شاعری سے بیگانہ، پہلوانی کے جوہر باغبانی سے الگ ہیں اور ایک صناع کی طبیعت ایک فلسفی سے متضاد ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ صنف شعرا میں خاص دماغی قابلیت کا اتحاد ہوتا ہے، نظم کی قوت، تخیل کی بلندی، محاکات کی قدرت، الفاظ کا زور، معانی کا جوش، یہ تمام شعرا کی مخصوص صفات ہیں اسی طرح تمام فلسفیوں کی ایک خاص دماغی کیفیت ہوتی ہے، خاموشی، غور و فکر، دقتِ نظر، خارجی عالم سے بے پروائی، تصور میں انہماک، خلوت گزینی، اخلاق کی خشکی، الغرض مرز و بوم اور آب و ہوا کے اختلاف کی بنا پر جو اصنافِ انسانی پیدا ہوتے ہیں ان میں بھی یہ اختلاف و امتیاز نظر آتا ہے ہنیبال و نپولین، تیمور و چنگیز، دم کے دم میں آبادی کو ویرانہ اور

ویرانہ کو آبادی، پہاڑ کو میدان اور میدان کو پہاڑ بنا سکتے تھے مگر وہ بیٹھ کر فلسفۂ اخلاق پر چند صفحے نہیں لکھ سکتے تھے۔ افلاطون تنہائی میں بیٹھ کر جمہوریت کا فلسفیانہ خاکہ تیار کر سکتا تھا مگر ایتھنز کے تخت پر بیٹھ کر ایک لمحہ حکمرانی کا فرض انجام نہیں دے سکتا تھا۔ سلطان محمود کے درباری شاعر فردوسی نے اپنی طبیعت کے زور سے سینکڑوں خیالی سومنات کے معرکے فتح کیے لیکن پتھر کی ایک چٹان پر بھی کلہاڑی نہ مار سکا اس کے برخلاف سلطان محمود فوجوں کے دل کے ساتھ پہاڑوں کو چیرتا، دریاؤں کو پھاڑتا اور ریگستانوں میں پانی بہاتا ہوا، غزنی سے چل کر گجرات کے کناروں تک پہنچ گیا اور سومنات کے سنگی قلعہ اور مجسمہ کو چکنا چور کر ڈالا مگر فردوسی کی طرح تنہا بیٹھ کر وہ خیالی شاہنامہ کا ایک معرکہ بھی فتح نہیں کر سکتا تھا۔

ان مثالوں سے یہ ثابت ہوا کہ نوع انسانی میں اشتراک کے باوجود اصناف انسانی کی ہزاروں قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر قسم وصنف کے الگ الگ خصوصیات، صفات اور لوازم ہیں انہیں مختلف اصناف انسانی میں انبیاء علیہم السلام کی بھی ایک صنف ہے اور نوع انسانی کی اس مقدس صنف کے بھی، چند خاص اوصافِ خصوصیات اور لوازم ہیں جو ان کو دوسرے اصناف انسانی سے علانیہ ممتاز بناتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب ہم کو اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ نبوت و رسالت کے اہم لوازم اور خصوصیات کیا ہیں:

وہبی استعداد

ان میں سب سے پہلی چیز وہبی استعداد ہے، اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی فطری استعدادیں پائی جاتی ہیں اور انہیں کی طرف ان کا طبعی میلان ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں ان کی استعداد اور میلان طبع کا جوہر برگ و بار پیدا کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک خاص مقررہ مدت میں جا کر وہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے جس طرح ہر درخت سے آم کا پھل پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ اسی سے ہوگا جس کو خدا نے آم کا درخت بنایا ہے پھر آم کے درخت کے آثار و خواص، پھل، اس کا مزہ، اس کا رنگ و بوغرض جملہ خصوصیات خود اس درخت میں اسی وقت موجود ہوتے ہیں جب وہ ہنوز تخم کی صورت میں ہوتا ہے وہی تخم پودا بنتا ہے، پودا بڑھتا ہے، کونپل اور شاخیں پیدا کرتا ہے اور چند سال میں پھل دینے لگتا ہے لیکن اپنی ترقی کے ہر دور میں وہ اپنی مخفی خصوصیات وہی رکھتا ہے جو ایک دن اس سے آخر میں ظاہر ہونے والے ہیں اور اس پھل کی صفت ہمیشہ اس میں بالقوۃ موجود تھی۔

اسی تمثیل کے مطابق یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر انسان کوشش سے نبی نہیں ہو سکتا بلکہ وہی ہو سکتا ہے جس کو خدا نے نبی بنایا ہے اور نبوت کے یہ آثار و خواص اور کیفیات اس میں بالقوہ اور استعداد کی صورت میں اسی وقت سے موجود رہتے ہیں جب وہ ہنوز آب و گل کے عالم میں ہوتا ہے۔ شاید آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا کہ

''میں اس وقت نبی تھا جب آدم ہنوز آب وگل میں تھے۔'' [1] اسی قسم کا مطلب ہوگا۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ عرصہ وجود میں قدم رکھتے ہیں اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگتے سے ہیں وہ حسب و نسب اور سیرت وصورت میں ممتاز ہوتے ہیں، شرک وکفر کے ماحول میں ہونے کے باوجود اس کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں، اخلاق حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں، ان کی دیانت، امانت، سچائی، راست گفتاری مسلم ہوتی ہے اور یہ تمہیدیں اس لیے ہوتی ہیں، تاکہ منصب ملنے کے بعد ان کے دعوائے نبوت کی تصدیق اور لوگوں کے میلان خاطر کا سامان پہلے ہی سے موجود رہے، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان، حضرت یحییٰ، اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کے حالات و واقعات قبل نبوت پڑھو تو ہمارے اس دعویٰ کی سچائی تم کو نظر آئے گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نبوت پانے سے پہلے ہی آسمان وزمین کے خالق کی تلاش، سورج، چاند اور ستاروں پر متفکرانہ نظر اور بت پرستی کے خلاف نفرت کا شدید جذبہ کس بات کی شہادت ہے؟ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا بے آب وگیاہ میدان میں پرورش پانا، چاہ زمزم کا ظہور، آنے جانے والے قافلوں کا اس کی آبادی کی طرف میلان، چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو مقدس باپ کے ساتھ مقدس سفر کی تیاری اور اس کمسنی میں باپ کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پوری آمادگی اور صبر وشکر اور تسلیم ورضا کا اظہار کس مستقبل کی خبر دیتا ہے؟ حضرت اسحاق علیہ السلام کا فرشتوں کی بشارت سے پیدا ہونا اور پیدائش سے پہلے ہی ﴿ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴾ (۱۵/ حجر: ۵۳) کا خطاب پانا پھر مقدس باپ کی جانشینی اور شلیم کی مسجد کی پاسبانی کے لیے انتخاب کس مقصود کا دیباچہ ہے؟

حضرت یوسف علیہ السلام کا بچپن میں رؤیائے صادقہ اور صبر وشکر اور پاک دامنی کس بات کی گواہی دیتی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عین خطرہ میں پیدائش، حفاظت، پرورش اور نبوت سے پہلے فرعونیوں سے تن تنہا مجاہدانہ آویزش، کس مبتدا کی خبر ہے؟ حضرت سلیمان علیہ السلام کا آغاز عمر میں علم وفہم، فصل مقدمات کی قوت کس نتیجہ کے آثار ہیں؟ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی دعائیہ پیدائش بچپن ہی میں ان کی نیکی، سعادت مندی، نرم خوئی اور پاکی، کس مقصد کی تمہید ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور بچپن ہی میں نیکی، سلامت روی، توراۃ کی حقیقت رسی کس روز روشن کی صبح ہے؟ اور خود محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے دعائے خلیل، نوید مسیحا، رؤیائے آمنہ اور احوال ولادت وتربیت، مراسم شرک سے اجتناب، اخلاق حسنہ، دیانت، امانت، آثار خیر وبرکت نبوت سے پہلے ہی تنہائی پسندی، خلوت گزینی، حقیقت کی تلاش اور غور وفکر کس خورشید جہان تاب کا مطلع انوار ہے۔

---

[1] جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب ما جاء فی فضل النبی ﷺ: ۳۶۰۹ میں (آدم بین الرّوح والجسد) کے الفاظ ہیں و مستدرك حاكم، ج ۲، ص: ۶۰۰ و مسند أحمد، ج ٤، ص: ۱۲۷۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا یہ حال ہے:

﴿ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ؗ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ ﴾

(۳۷/ الصّٰفّٰت:۱۰۱، ۱۰۲)

''تو ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ایک بردبار لڑکے کی خوشخبری دی، تو جب وہ اس کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا، تو اس نے کہا کہ اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں، کہ تجھ کو میں ذبح کر رہا ہوں، اس نے جواب دیا اے میرے باپ کر ڈال جو تجھ سے کہا گیا، تو مجھے خدا نے چاہا تو صبر کرنے والوں میں پائے گا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خطاب ہے:

﴿ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ۝ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۳۷، ۳۸)

''اور ہم نے تجھ پر دوسری دفعہ احسان کیا جب (تیری حفاظت اور پرورش کے متعلق) تیری ماں کے دل میں وہ بات ڈال دی جو ڈالی گئی۔''

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی نسبت یہ ارشاد ہے:

﴿ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ؕ وَكَانَ تَقِيًّا ۝ وَّبَرًّاۢ بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ ﴾ (۱۹/ مریم:۱۲۔۱۵)

''اے یحییٰ کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ اور ہم نے اس کو فیصلہ کرنے کی قوت بچپن ہی میں دے دی اور اپنے پاس سے رحم و مہر اور ستھرائی۔ اور تھا پرہیزگار اور اپنے ماں باپ کا فرمان بردار اور نہ تھا زبردستی کرنے والا نافرمان، سلامتی ہو اس پر جس دن پیدا ہوا۔''

نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے:

﴿ كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۟ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ ﴾ (۱۹/ مریم:۲۹۔۳۱)

''ہم کیسے اس سے بات کریں، جو ہنوز گہوارہ میں بچہ ہے، عیسیٰ علیہ السلام نے کہا، میں خدا کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب الٰہی دی اور مجھے نبی ٹھہرایا اور مبارک بنایا میں جہاں ہوں۔''

اور مکہ کا ''الامین'' نبوت کے پہلے کی اپنی پوری زندگی موقع شہادت میں بے خطر پیش کر دیتا ہے:

﴿ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾ (۱۰/ یونس:۱۶)

''تو اس (پیغمبری کے دعویٰ) سے پہلے میں تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے۔''

انبیا علیہم السلام کے احوال مبارکہ کے یہ جزئیات باہم مل کر، اپنی نسبت خود کلیہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔

غیبی علم

نبوت کا دوسرا سب سے اہم خاصہ اس کا غیبی علم ہے یعنی وہ علم جو عام انسانوں کی طرح وجدان، احساس یا عقل و قیاس سے نہیں، بلکہ براہ راست صدائے غیب یا رویائے صادقہ یا فرشتوں کے ذریعہ سے خدائے پاک سے حاصل ہوتا ہے اسی کے آغاز سے نبوت کی استعداد بالقوۃ کا عملی ظہور شروع ہو جاتا ہے، اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

علم انسانی کے ماخذ

علم انسانی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو بلا واسطہ ہوتا ہے اور دوسرے وہ جو کسی واسطہ سے حاصل ہوتا ہے بے واسطہ علم کی بھی تین قسمیں ہیں:

① وجدان: انسان کو اپنے جسمانی وجود اور اس جسمانی وجود کے اندرونی کیفیات کا علم سب سے زیادہ یقینی طور سے ہوتا ہے، ہر شخص کو اپنے وجود کا یقین ہے اور اس کے اندر بھوک، پیاس، بیماری، صحت، غم، خوشی، خوف وغیرہ اندرونی تغیرات کا علم اس کو بلا واسطہ از خود ہو جاتا ہے۔

② فطرت: اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ہر نوع مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسی نوعی خصوصیتیں عطا ہوتی ہیں جو دوسری نوعوں میں نہیں پائی جاتیں اور انہیں سے باہم نوعوں کا اختلاف اور امتیاز ظاہر ہوتا ہے ان نوعی خصوصیتوں کا علم ہر نوع کے افراد کو بلا کسی ذریعہ اور واسطہ کے از خود ہوتا ہے اور اسی کو بعض علما کی اصطلاح میں فطری یا نوعی الہام اور اہل فلسفہ کی اصطلاح میں ''جبلت'' کہتے ہیں حیوانات کو اپنے متعلق بہت سی باتوں کا علم از خود فطرتاً ہوتا ہے، پرندوں کے بچوں کو دانہ چگنا اور اڑنا کون سکھاتا ہے؟ آبی جانوروں کو تیرنے کی تعلیم کون دیتا ہے، شیر کے بچہ کو درندگی کا سبق کس معلم نے پڑھایا؟ انسان کے بچہ کو پیدا ہوتے ہی رونا، سونا، دودھ پینا کون سکھا دیتا ہے؟

③ بداہت اولیہ: انسان کو کچھ ہوش و تمیز آنے کے بعد بلا دلیل بعض ایسی باتیں از خود یا بادنیٰ تامل اس طرح معلوم ہو جاتی ہیں کہ ان میں پھر کسی قسم کا شک و شبہ راہ نہیں پاتا، دو اور دو چار ہوتے ہیں، برابر کا برابر، برابر ہوتا ہے، ایک وقت ہی میں ایک ہی چیز سیاہ و سپید دونوں نہیں ہو سکتی، ہر بنی ہوئی چیز کا کوئی بنانے والا ہوتا ہے وغیرہ، بہت سے ایسے ضروری مقدمات اور کلیات جن پر انسان کے استدلال کا تمام تر مدار ہے اس کو بداہتاً معلوم ہو جاتی ہیں۔

یہ تو بلا واسطہ علم کی تین قسمیں تھیں اس کے بعد علم انسانی کی وہ قسمیں ہیں جن کا علم اس کو کسی واسطہ سے ہوتا ہے انسان کے پاس اس قسم کے دو واسطے ہیں، ایک احساس اور دوسرا عقل۔ پہلے سے وہ گرد و پیش کی مادی

چیزوں کا اور دوسرے سے ان مادی چیزوں کا جو سامنے موجود نہیں یا سرے سے خارج ہیں موجود نہیں بلکہ عالمِ غیب میں ہیں یا صرف ذہن میں ہیں، علم حاصل کرتا ہے۔

④ انسان کے جسم کے اندر پانچ قسم کی جسمانی قوتیں ہیں: باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ، باصرہ دیکھتی سامعہ سنتی، شامہ سونگھتی، ذائقہ چکھتی، اور لامسہ چھوتی ہے، انہیں کا نام حواس خمسہ ہے، انسان کے پاس یہی پانچ آلات ہیں جن کے ذریعہ سے وہ ان مادی چیزوں کے متعلق علم حاصل کرتا ہے جو اس کے ان آلات سے آ کر ٹکراتی ہیں اسی کا نام احساس ہے ہم چکھ کر مزہ پاتے، سن کر آواز پہچانتے، دیکھ کر صورت جانتے، چھو کر سختی و نرمی دریافت کرتے اور سونگھ کر بو معلوم کرتے ہیں ان حواس کے ذریعہ سے بھی جو علم ہم کو ہوتا ہے وہ اکثر یقینی اور شاذ و نادر غلط بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ کبھی کبھی کسی سبب سے دھوکا بھی کھا جاتے ہیں اور دریافت کرنے میں غلطی بھی کرتے ہیں اور دلائل سے ان کا یہ دھوکا اور ان کی غلطی ثابت ہوتی ہے بیماری میں قوت ذائقہ بدل جاتی ہے اور اس نے میٹھے کو کڑوا بتایا ہے، تیز حرکت میں قوت باصرہ نے ہم کو دھوکا دیا ہے، ریل میں ہم کو ساکن اور ٹھہری ہوئی چیز چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، چلتے ہوئے جہاز میں جہاز ہم کو ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے، متحرک چنگاری کا نقطہ تیز سیدھی حرکت میں ہم کو آتشیں خط اور گول حرکت میں آتشیں دائرہ معلوم ہوتا ہے، آسمان کے چمکتے ہوئے بڑے بڑے ستارے کتنے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں لیکن کیا درحقیقت وہ ایسے ہی چھوٹے ہیں۔

⑤ علم بالواسطہ کی دوسری قسم وہ ہے جس کو ہم اپنی عقل و قیاس، غور و فکر اور استدلال کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں ان کی بنیاد درحقیقت انہیں معلومات پر ہوتی ہے جن کا علم ہم کو اپنے وجدان الہام فطری (یا جبلت) بداہت اولیہ اور احساس سے پہلے ہو چکا ہے اور انہیں معلوم شدہ امور پر غیر معلوم امور کو تمثیل یا استقرا کے ذریعہ سے قیاس کر کے ان معلوم شدہ امور کے خصوصیات اور آثار کا حکم ان غیر معلوم لیکن مشابہ و مماثل امور پر لگا کر نیا نتیجہ حاصل کرتے ہیں وہ غیر معلوم امر جس پر معلوم امر کے ذریعہ ہم کوئی حکم لگاتے ہیں اگر مادی ہوتا ہے تو نتیجہ چنداں غیر مشکوک نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ جزئیات کا استقرا پورا نہ کیا گیا ہو یا تمثیل تام نہ ہو یا تجربہ و مشاہدہ نے دھوکا دیا ہو، یا کوئی اور اصولی غلطی ہوگئی ہو، طبیعات اور سائنس کے مسائل اکثر اسی طرح معلوم کیے گئے ہیں لیکن اگر وہ امر مجہول غیر مادی ہے تو مادی امور پر اس غیر مادی کو قیاس کر کے اس کی نسبت جو کچھ کہا جائے گا اس کا مرتبہ ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھتا، مگر یہ کہ وہ تمام تر فطریات و بدیہیات و محسوسات پر علانیہ منتہی ہو مابعد الطبیعہ اور فلسفہ الٰہیات کے مسائل اسی طریقہ استدلال سے حاصل ہوتے ہیں اور اسی لیے ان میں اختلاف کی بڑی گنجائش نکلتی ہے کہ ان کے آخری نتیجہ اور ابتدائی بنیادی وجدانی یا بدیہی یا حسی مقدمات کے درمیان قیاسات کی کئی منزلیں ہیں اور ان میں سے ہر منزل خطروں سے لبریز ہے مشابہت و مماثلت میں دھوکا ہو سکتا ہے، عقلی اور وجدانی اور حسی اشیاء کے خواص کے درمیان اختلاف اور فرق

ہوسکتا ہے، غور وفکر، بحث ونظر، تحقیق وجستجو اور ترتیب مقدمات جو اس قیاس کے عقلی کارکن اور فاعل ہیں وہ اپنے کام میں دھوکا کھاسکتے ہیں اسی لیے یہ علوم شکوک وشبہات سے لبریز ہیں۔

ذرائع علم کے حصول کے زمانے اور ان کے مراتب

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ ہمارے سب سے زیادہ یقینی علوم ہمارے وجدانیات اور فطریات ہیں جو ہم کو قدرت کی طرف سے سب سے پہلے عنایت ہوتے ہیں کہ ہمارے وجود کی بقا اس علم پر موقوف ہے، جیسے بھوک اور پیاس کا احساس اور اس علم کا یقینی ہونا بھی ضروری ہے ورنہ ہم اپنا وجود قائم نہ رکھ سکیں گے، ہم کو جو بھوک یا پیاس لگتی ہے کیا اس کے یقینی اور قطعی علم میں ہم سے غلطی ہوسکتی ہے اور کیا کسی کے شک دلانے سے یہ ممکن ہے کہ تم کو بھوک نہ ہو یا ممکن ہے کہ تم کو پیاس نہ ہو، کبھی بھوکے یا پیاسے کو اپنی بھوک اور پیاس کے متعلق شک ہوسکتا ہے اور یہ احساس اور علم وجود کے ساتھ ساتھ انسان کو ملتا ہے یہاں تک کہ آج کا پیدا شدہ بچہ بھی اس کا احساس کرتا اور علم رکھتا ہے ورنہ وہ اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے۔

وجدانیات وفطریات کے بعد محسوسات کا علم انسان کو ملتا ہے۔ دیکھنا، سننا، چکھنا، سونگھنا، چھونا یہ ہمارے پانچ حواس ہیں جو ہمارے مادی علم کے آلات ہیں اور جن کے بغیر کوئی باہر کا علم ہمارے اندر نہیں آسکتا یہ احساسات بھی ایک ہی دفعہ نہیں کمال پا جاتے بلکہ ضرورت کے مطابق حسب استعداد ملتے اور ترقی پاتے ہیں اور پیدائش کے چند ماہ بعد یہ تکمیل کو پہنچتے ہیں کیونکہ وجود کی بقا اور ضروریات کی تکمیل ابھی سے ان پر رفتہ رفتہ موقوف ہوتی جاتی ہے۔ محسوسات کے بعد بدیہیات اوّلیہ کا درجہ آتا ہے، انسان کو اپنے اس علم میں بھی وہی اذعان وقطعیت ہوتی ہے، دو اور دو چار ہوتے ہیں، دس پانچ کا دونا ہے، ایک چیز ایک ہی وقت میں دو جگہ نہیں ہوسکتی، ایک چیز ایک ہی وقت میں سیاہ وسپید نہیں ہوسکتی، ان بدیہی علوم کو ہر شخص مانتا ہے اور تسلیم کرتا ہے مگر اس کا علم انسان کو بچپن میں نہیں ہوتا بلکہ تمیز ورشد کے بعد ہوتا ہے کیونکہ اسی وقت اس کی ضرورت پیش آتی ہے، اگر یہ علوم اس سن میں اس کو عطا نہ ہوں تو وہ دنیا کے ضروری کاروبار چلانے کے لائق نہ ہو اور نہ دوسرے علوم کی دریافت کی اس میں استعداد پیدا ہو، فطری احمق اور بے وقوف انہیں کو کہتے ہیں جن میں ان بدیہیات کا علم کم یا بالکل نہیں ہوتا۔

سب سے اخیر میں اس علم کا درجہ آتا ہے جو وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات پر قیاس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور جن کو معقولات کہتے ہیں۔ اسی علم اور اسی کی قوت کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے کہ انسانی عقلیں درجہ اور مرتبہ میں متفاوت ہوتی ہیں ایک طرف تو (کمی کی سمت میں) وہ حماقت تک پہنچ جاتی ہے اور دوسری طرف (سمت کمال میں) عاقل، عاقل تر اور عاقل ترین طبقہ تک اونچی ہوجاتی ہیں یہاں تک کہ وہ درجہ بھی آتا ہے کہ کسی کی عقل اس مرتبہ تک جا پہنچتی ہے جہاں کوئی اس کا دوسرا حریف اور ہمسر نہیں ہوتا، ایک

جاہل حبشی سے لے کر ارسطو اور بوعلی سینا تک سب انہیں عقلی مدارج کے مختلف انسانی نظائر ہیں، بااین ہمہ یہ ظاہر ہے کہ اس علم کا طریقہ نہایت پرخطر اور منزل مقصود ہمیشہ مشکوک رہتی ہے۔ عام طور سے انسانی علم کے یہ پانچ ذریعے اور طریقے سمجھے جاتے ہیں لیکن درحقیقت ایک اور ذریعہ بھی ہے جس کا تعلق تمام تر ماورائے مادہ سے ہے، غور کیجئے کہ آپ کا سب سے پہلا علم یعنی وجدانیات، آپ کے اندرونی حواس کا نتیجہ ہے، دوسرا، یعنی فطریات کا علم، خالق فطرت خود آپ کے اندر ودیعت رکھتا ہے، تیسرا علم یعنی محسوسات کا علم آپ کے ان ظاہری حواس کا نتیجہ ہے جو گو باہر ہیں مگر آپ کے جسم کے اندر ہیں آپ کا چوتھا ذریعہ علم یعنی بدیہیات اولیہ آپ کے حواس اور ذہن کا ایک مشترکہ فیصلہ ہیں پانچواں ذریعہ علم جو آپ کی عقل و ذہن کی قیاس آرائی ہے وہ آپ ہی کے اندر کے دماغی قویٰ کا عمل ہے تھوڑے سے تامل سے معلوم ہوگا کہ آپ کا علم وجدان سے لے کر ذہن تک بتدریج مادیت سے ترقی کرکے ماورائے مادہ کے قریب تک پہنچتا ہے، وجدان تمام تر ہماری اندرونی جسمانی مادیت ہے جس میں کوئی شک نہیں، محسوسات بھی ہمارے ہی جسم کے مادی آلات علم کے نتائج ہیں بدیہیات ہمارے حواس سے جو مادی ہیں اور ہمارے ذہن سے جو غیر مادی ہے مشترک تعلق رکھتے ہیں یعنی بدیہیات مادی اور غیر مادی ذرائع علم کے بین بین ہیں اور معقولات تمام تر ذہنی اور غیر مادی ہیں تاہم اس غیر مادی قوت کا مرکز ہمارا مادی جسم ہی ہے اور اس حد تک اس غیر مادی قوت کا مادہ سے تعلق بہرحال ہوتا ہے۔

غیر مادی علم

اب اس کے بعد اس علم کا درجہ آتا ہے جس کی سرحد اس کے بعد آتی ہے اور جس کا تعلق مادہ سے اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا معقولات اور ذہنیات کا ہے وہ تمام تر مادہ اور مادیات سے پاک ہوتا ہے اس کو مادہ سے اسی قدر لگاؤ ہوتا ہے کہ وہ علم مادی، دل و دماغ کے آئینہ پر اوپر سے آ کر اپنا عکس ڈالتا ہے۔

اس غیر مادی علم کے بھی بہ ترتیب مختلف درجے ہیں جن کو فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی کہتے ہیں اور جس طرح انسانی علم کے مذکورہ بالا پانچوں ذریعے انسان کے جسمانی قویٰ سے متعلق تھے اسی طرح یہ غیر مادی ذرائع انسان کے روحانی قویٰ سے وابستگی رکھتے ہیں اور جس طرح آپ نے دیکھا ہے کہ وجدانیات سے لے کر عقلیات تک بہ ترتیب ہمارا ذریعہ علم خالص مادی، کامل مادی، کم مادی اور برائے نام مادی تک ترقی کرتا چلا گیا ہے اسی طرح فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی بھی برائے نام مادی اور روحانی سے لے کر پھر روحانی، کامل روحانی اور خالص روحانی کے ذریعہ تک ترقی کرتے چلے گئے ہیں۔ فراست کے لفظی معنی ''تاڑ جانے'' کے ہیں تاڑ لینے کی قوت ہر شخص میں نمایاں نہیں ہوتی مگر جس میں نمایاں ہوتی ہے اس کی یہ کیفیت ایک ملکہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے جو تجربہ کی کثرت اور عمل کی مہارت اور کمال کے بعد انسان کو حاصل ہو جاتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے دیکھنے، سننے، چکھنے، سونگھنے یا چھونے کے ساتھ ہی صرف

بعض علامتوں کے جان لینے سے دوسری متعدد ضروری علامتوں پر تفصیلی نظر ڈالے بغیر اتنی جلدی سے انسان صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ غیب کی بات بیان کر رہا ہے حالانکہ اس کا علم تمام تر ظاہری علامتوں اور نشانوں پر مبنی ہوتا ہے جن کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے مگر دیکھتا نہ تھا، ایسے ماہر فن اور ذی فراست اشخاص برابر ہر شخص کے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں جس کو جس چیز یا فن میں یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے اس کی فراست اس کو حاصل ہو جاتی ہے، جرائم کے پتہ لگانے والے ماہرین اور جاسوس اپنے فن کی فراست میں یہ کمال رکھتے ہیں کہ صورت دیکھی اور تاڑ گئے۔ اسی طرح ہر علم وفن کے ماہروں کو اپنے اپنے فن کے اندر یہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے، اخیار اور نیکو کاروں کو اپنی جماعت کے افراد کے پہچان لینے اور جان لینے کی طاقت بھی اسی طرح حاصل ہوتی ہے اور اسی کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

((اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله)) [1]

''مومن کے تاڑ لینے سے ڈرو کہ وہ خدا کی روشنی سے دیکھتا ہے۔''

② فراست کے بعد حدس کا درجہ ہے فراست کے ابتدائی مقدمات حواس پر مبنی ہوتے ہیں، لیکن حدس کے ابتدائی مقدمات ذہنی اور عقلی ہوتے ہیں اور ان ذہنی اور عقلی مقدمات کے غور وفکر، تلاش اور ترتیب سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے مگر فطری کمال یا فن کی حاصل کردہ مہارت کے سبب سے غور ونظر، فکر وتلاش اور ترتیب مقدمات کے منطقیانہ مرحلوں کو ذہن رسا اس تیزی اور سرعت کے ساتھ طے کر کے آخری نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ خود اس کو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا، کہ اس نتیجہ کے حاصل کرنے میں اس نے کوئی دماغی عمل بھی کیا ہے یہ چیز بھی ایک کامل العقل اور صائب الرائے انسانوں کو فطرۃً عطا ہوتی ہے اور دنیا کے مشہور عقلا اور دانایانِ روزگار کے واقعات میں اس کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں۔

③ کشف کے لفظی معنی کھولنے اور پردہ اٹھانے کے ہیں مگر اس سے مقصود یہ ہے کہ مادیت کے ظلمانی پردہ کو چاک کر کے مادی چیز روحانی عالم میں مشاہدہ کے سامنے آجاتی ہے وہ کبھی اصلی صورت میں اور کبھی اپنی مثالی صورت میں نظر آتی ہے، عام لوگوں کو سمجھنے کے لیے اس کی بہترین مثال خواب کی ہے فرق اتنا ہے کہ خواب، عالم خواب کی بات ہے اور کشف عالم بیداری کی، جس طرح عام لوگوں کو خواب میں جب ظاہری حواس بیکار ہو جاتے ہیں ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں، جو کبھی کبھی عین واقعہ ثابت ہوتی ہیں اسی طرح خاص لوگوں پر بیداری ہی میں ظاہری حواس کے تعطل سے ایسا سماں پیش آتا ہے۔ ہر شخص کے تجربہ میں ایسے متعدد حیرت انگیز واقعات گزرتے رہتے ہیں۔

④ الہام کے لفظی معنی ''دل میں ڈالنے'' کے ہیں اور اس سے مراد وہ علم ہے جو محنت، تلاش، تحقیق، غور اور

[1] جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورة الحجر: ۳۱۲۷۔

ترتیب مقدمات کے بغیر دل میں آ جاتا ہے اور ممکن ہے کہ اس کی صحت بعد کو حسی تجربوں اور عقلی دلیلوں سے بھی ثابت ہو جائے مگر خود وہ علم پہلے پہل ذہن میں کسی حسی تجربہ یا عقلی دلیل کے نتیجہ کے طور پر نہیں آتا بلکہ خود بخود دل میں آ جاتا ہے، کیوں آتا ہے اور کہاں سے آتا ہے؟ اس کے جوابات مختلف ہو سکتے ہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ آتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اس کی ابتدائی اور معمولی مثالیں وہ خیالات ہیں جو محققین علما، شعرا اور موجدین کے ذہن میں پردۂ عدم سے پہلے پہل آتے ہیں اور وہ ان کو دنیا کے سامنے اپنی ایجادات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

⑤ وحی کے لغوی معنی کسی کا اپنے دلی منشا کو لبوں کو جنبش دیئے بغیر اخفا اور آہستگی کے ساتھ دوسرے پر ظاہر کر دینا ہے اور اصطلاحًا اس کے معنی خدا کا اپنے دلی منشا سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعہ سے مطلع کرنا ہیں یہ علم واطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔

جس طرح علم کی تین جسمانی قسمیں یعنی وجدانیات، حسیات اور بدیہیات عام انسانوں کے لیے ذریعہ یقینی ہیں اسی طرح روحانی ذرائع علم کے یہ تین ذریعے کشف، الہام اور وحی انبیا علیہم السلام کے لیے یقینی ہیں اور جس طرح علم کے مادی ذریعوں میں سے یقین کا سب سے پہلا ذریعہ وہ ہے جو تمام تر مادی ہے یعنی وجدان پھر حس ظاہر اور پھر بدیہیات۔ اسی طرح علم کے روحانی واسطوں میں سب سے زیادہ یقینی وہ ہے جو تمام تر روحانی ہے یعنی وحی، پھر الہام، پھر کشف۔

ہم نے علم کے روحانی ذرائع کی جو تین قسمیں کی ہیں یعنی وحی، الہام اور پھر کشف یہ قرآن پاک کی اصطلاحیں نہیں ہیں اس کی اصطلاح میں روحانی ذریعہ علم کا نام مکالمۂ الٰہی (خدا سے بات کرنا) اور اس کی حسب ذیل تین قسمیں بیان کی ہیں:

① وحی (اشارہ) سے بات کرنا، یعنی دل میں کسی معنی کا بغیر آواز اور الفاظ کے آ جانا اگر یہ حالت بیداری میں ہے تو کشف ہے اگر خواب میں ہے تو رؤیا ہے۔

② خدا کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا یعنی متکلم نظر نہیں آتا مگر غیب سے آواز آتی ہے اور الفاظ سنائی دیتے ہیں اس کو الہام کہہ لو۔

③ فرشتوں کے ذریعہ سے بات کرنا، یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے نظر آتا ہے اور اس کے منہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں جن کو نبی سن کر محفوظ کر لیتا ہے اسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں کیونکہ قرآن پاک کا نزول اسی آخری طریقہ سے ہوا ہے لیکن اس شہرت عام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اور دوسرے دو طریقے وحی کی قسمیں نہیں، وحی کی ان اقسام کا ذکر سورۂ شوریٰ میں ہے:

﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ

بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ ﴾ (٤٢/ الشورٰی:٥١)

''اور کسی آدمی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے، لیکن وحی (اشارہ) سے یا، پردہ کے پیچھے سے یا کسی قاصد کو بھیجے تو وہ خدا کے حکم سے، خدا جو چاہے اس کو وحی کر دیتا ہے، بے شک اللہ بلند حکمت والا ہے۔''

مکالمۂ الٰہی کے یہ تینوں طریقے یعنی وحی (اشارہ) سے بات کرنا، پردہ کے پیچھے سے بات کرنا اور فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا، وحی کی یہ تین مختلف قسمیں بھی ہیں اور پھر ان تینوں کا اجمالاً مشترک نام بھی وحی ہے یعنی یہ منقسم بھی ہے اور اپنی تین قسموں میں سے بھی ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اسی آیت میں دیکھو کہ فرشتہ کے ذریعہ سے کلام کو بھی وحی فرمایا گیا اور تینوں مذکورہ بالا طریقوں میں جس طریقہ سے بھی آنحضرت ﷺ کو غیبی تعلیم واطلاع دی گئی ہے اس کو بھی وحی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ عام مکالمۂ الٰہی کے مترادف بھی مستعمل ہوا ہے:

﴿ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ ﴾ (٥٣/ النجم:٣، ٤)

''نبی خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔''

الغرض اسی امتیاز کے لیے علمی اصطلاح میں ان تینوں طریقوں کے لیے کشف، الہام اور وحی کے تین علیحدہ علیحدہ الفاظ وضع کر دیے گئے ہیں، تاکہ بول چال میں ہر روحانی طریقہ گفتگو دوسرے سے ممتاز ہو جائے بیداری میں اشارہ سے بات کرنا کشف ہے اور خواب کے عالم میں رؤیا ہے، پردہ کے پیچھے سے آواز کا آنا الہام ہے اور فرشتہ کی درمیانگی سے بات کرنا وحی ہے۔ [1]

نکتہ: اوپر کی آیت میں جہاں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے بات کرے لیکن ان تینوں طریقوں سے، اس کے آخر میں فرمایا ہے کہ وہ سب سے بلند اور حکیم ہے یعنی اس کی بلندی و برتری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے مکالمہ کے شرف کا مستحق نہ سمجھے مگر اس کی حکمت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے بندگانِ خاص کو عام بندوں کی ہدایت و راہنمائی کے لیے ان تین غیر معمولی طریقوں میں سے کسی طریقہ سے گفتگو فرمالے۔

بہر حال غیبی ذریعہ اطلاع کی یہ سب سے بلند قسم جس کو اصطلاح میں ''وحی'' کہتے ہیں اس کا تجربہ عام لوگوں کو نہیں، لیکن اس سے نیچے درجہ کے غیبی ذرائع اطلاع کا تجربہ ہر شخص کو تھوڑا بہت ہے اور ہر انسان کی زندگی میں جو بعض پراسرار اور ناقابل فہم واقعات پیش آتے ہیں ان پر غور کرنے سے غیب کے اس اعلیٰ ترین

---

[1] ان اصطلاحات کی بحث کے لیے اصول فقہ کی اہم کتابوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے، کم از کم اس موقع پر تحریر ابن همام المتوفی ٨٦١ھ کی شرح التقرير والتحبير لابن امير الحاج المتوفی: ٨٧٩ ج ٣، ص: ٤٩٥ مطبوعه اميريه بولاق مصر ١٣١٧ھ دیکھنی چاہیے۔

ذریعہ علم کا دھندلا سا خاکہ ذہن میں آ سکتا ہے جس سے غیر جسمانی اور غیر حسی مادی ذرائع علم کے سمجھنے اور باور کرنے میں جو استبعاد معلوم ہوتا ہے وہ دور ہو سکتا ہے خصوصاً اس عہد میں جب سائیکالوجی کی تحقیقات سے نفس کی بہت سی نامعلوم طاقتوں کا پتہ چل رہا ہے اور اسپریچوئلزم کے ذریعہ ارواح سے خطاب وکلام کی سلسلہ جنبانی ہو رہی ہے اور جدید روحانیات کا فن ایک مستقل سائنس کی صورت اختیار کر رہا ہے۔

انبیا علیہم السلام کو اپنے کشف، الہام اور وحی پر اتنا ہی یقین ہوتا ہے جس قدر عام انسانوں کو اپنے وجدانیات، محسوسات، فطریات اور بدیہیات پر، انبیا کا یہ روحانی علم ایسا ہی اندرونی ہوتا ہے جیسا عام انسانوں میں وجدانیات، فطریات اور بدیہیات ومحسوسات کا علم ہوتا ہے جس طرح کسی شخص کو اس علم میں دھوکا نہیں ہو سکتا کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہو رہی ہے یا اس کو غم یا خوشی ہے اسی طرح نبی کو بھی اپنے روحانی وجدانیات میں دھوکا نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے فطریات میں یہ مغالطہ نہیں ہوتا کہ دو اور دو چار نہیں ہوتے اسی طرح اس کو بھی پیغمبرانہ فطریات میں مغالطہ واقع نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے محسوسات میں اگر کسی کو سامنے دیکھ رہے ہو یا کسی کی آواز سن رہے ہو، شبہ نہیں ہوا کرتا، اس کو بھی اپنے روحانی محسوسات میں شبہ نہیں ہوا کرتا غرض وہ اپنے ان جملہ غیبی اور روحانی ذرائع علم میں ہر لغزش، فریب، خطا اور غلطی سے اسی طرح پاک ہوتا ہے جس طرح تم اپنے وجدانیات، فطریات، محسوسات اور بدیہیات میں غلطی اور خطا سے پاک ہوتے ہو۔

علم غیب

اسلام کے عقیدہ میں غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، قرآن میں بار بار آنحضرت ﷺ کو اس اعلان کی ہدایت ہوئی ہے:

﴿ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ ﴾ (۱۰/ یونس:۲۰)

''تو کہہ دے اے پیغمبر کہ غیب خدا کے لیے ہے۔''

﴿ قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ ﴾ (۲۷/ النمل:۶۵)

''کہہ دے کہ آسمانوں میں اور زمین میں خدا کے سوا کوئی نہیں جس کو غیب کا علم ہو۔''

رسول کہتے ہیں:

﴿ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ ﴾ (۶/ الانعام:۵۰) ''اور میں غیب نہیں جانتا۔''

لیکن اسی کے ساتھ دو موقعوں پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ باایں ہمہ خدا اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی اطلاع دیتا ہے۔

سورۂ جن میں ہے:

﴿ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۝ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ ﴾ (۷۲/ الجن:۲۶، ۲۷)

''تو اللہ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا لیکن اس پیغمبر پر جس کو پسند کرے۔''

دوسری جگہ سورۂ آل عمران میں ہے:

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾

''اور نہ تھا اللہ کہ غیب کی باتوں پر تم کو مطلع کرتا، لیکن یہ کہ اللہ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہے چن لیتا ہے۔'' (۳/ آل عمران:۱۷۹)

ان دو آیتوں میں سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی باتوں کی اطلاع دیتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں غیب دانی کی کلیتاً اور قطعاً نفی کی گئی ہے اس سے مراد ذاتی اور حقیقی علم ہے یعنی خدا کے سوا بالذات کسی کو غیب کا علم نہیں، البتہ خدا کے واسطہ اور ذریعہ سے اور اس کی تعلیم واطلاع سے پیغمبروں کو اس کا علم حاصل ہوتا ہے ساتھ ہی آیت الکرسی میں فرما دیا گیا:

﴿ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۵۵)

''اور وہ خدا کے ایک ذرہ علم کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے لیکن اتنے کا جتنے کا وہ چاہے۔''

یعنی اپنے علوم غیب سے جتنا اور جس قدر وہ پسند کرتا ہے اور مصلحت سمجھتا ہے وہ ان کو بذریعہ وحی ان سے واقف کرتا رہتا ہے، بااین ہمہ بعض باتوں کی نسبت جیسا کہ سورۂ ہود اور لقمان میں ہے، اللہ تعالیٰ نے قطعی طور سے یہ فیصلہ کر دیا کہ ان کا علم کسی کو نہیں مثلاً: قیامت، بارش، موت، شکم مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی ،کل کیا ہوگا ان باتوں کو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اسی طرح بعض آیتوں میں آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اس کا تم کو علم نہ تھا جیسا کہ غزوۂ تبوک میں عدم شرکت کے، بعض عذر خواہ اصحاب کے متعلق سورۂ توبہ میں ہے کہ انہوں نے جھوٹی قسمیں کھا کر اجازت حاصل کر لی خدا نے فرمایا:

﴿ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ۝ ﴾

(۹/ التوبۃ:۴۳)

''خدا نے تجھ سے درگزر کیا کیوں تو نے ان کو اجازت دی، تاآنکہ تجھے معلوم ہو جائے جو سچ بولے اور جھوٹوں کو جان لیتا۔''

﴿ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۴۸)

''انہوں نے پہلے فتنہ پیدا کرنا چاہا اور تیرے سامنے واقعات الٹ دیئے، یہاں تک کہ حق بات آ گئی اور خدا کی بات کھل گئی اور وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔''

آگے چل کر ہے:

﴿مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۭ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۰۱)

''یہ نفاق پر اڑے ہیں، تو ان کو نہیں جانتا ہم جانتے ہیں۔''

ان آیتوں سے یہ واضح ہے کہ پیغمبروں کو غیب کا کلی علم نہیں ملتا بلکہ ان کو غیب کی اطلاع دیے جانے کے موقع کی دونوں آیتوں میں ''رسول'' ہی کا لفظ استعمال کرنا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جن امور غیب کی اطلاع پیغمبروں کو دی جاتی ہے ان کا تعلق فریضۂ رسالت اور اس کی مصلحتوں اور شریعتوں سے ہے۔

غیب کی حقیقت

علم غیب کے اس نادیدہ راستہ میں اتنی منزل طے کر لینے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں غیب کس کو کہتے ہیں قرآن مجید کے اس لفظ کے استعمال کے تمام مواقع پر غور کرنے سے اس کے اجمالی اور تفصیلی دونوں معنی واضح ہوتے ہیں اجمالاً اس کا اطلاق ان امور پر ہوتا ہے جن کا علم انسان اپنے علم کے عام اور طبعی وفطری ذریعوں سے حاصل نہیں کر سکتا گزر چکا ہے کہ انسانی علم کے طبعی ذریعے وجدان، حواس، اور عقل واستدلال وغیرہ ہیں ان طبعی ذریعوں سے جو ہر انسان کو ملے ہیں جو علم حاصل نہیں ہوتا اس کو علم غیب کہتے ہیں یعنی اس شے یا ان اشیاء کا علم جو انسان کے ظاہری وباطنی حواس اور دماغی قویٰ کی نگاہوں کے سامنے غائب ہیں اس کا مقابل لفظ شہادت ہے جس کے معنی حاضر ہونے کے ہیں یعنی وہ اشیاء جو ہر انسان کے حواس اور قوائے دماغی کے سامنے ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے کو بار بار عالم الغیب والشہادۃ کہا ہے (۶/ انعام:۷۳، ۱۳/ الرعد:۹، ۵۹/ الحشر:۲۲، ۶۴/ التغابن:۱۸) یعنی انسانوں کے طبعی ذرائع علم کے سامنے جو حاضر ہے اور جو غائب ہے ان سب کا عالم اور واقف کل وہی ہے الغرض اجمالاً علم غیب اسی غیبی طریقہ علم کا نام ہے جو عام انسانوں کو نہیں ملا ہے۔

تفصیلی حیثیت سے قرآن پاک میں غیب کا اطلاق چار چیزوں پر ہوا ہے:

① ''زمانہ ماضی کے واقعات جن کا علم بعد کو نہ تو حواس کے ذریعہ ہو سکتا ہے، کہ حواس سے صرف شاہد (سامنے موجود) کا علم ہوتا ہے اور نہ عقل وفکر کے ذریعہ ہو سکتا ہے، اگر ہو سکتا ہے تو تحریر وروایت کے ذریعہ لیکن جس کے لیے تحریر وروایت کا ذریعہ یقینی طور سے مسدود ہو اس کے لیے ان کا علم اگر ہو سکتا ہے تو غیبی ہی ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔''

حضرت نوح علیہ السلام کے مختصر قصہ کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ڟ﴾

(۱۱/ ھود:۴۹)

''یہ غیب کی بعض خبروں میں سے ہے ہم ان کو وحی کرتے ہیں تیری طرف، تو، تو ان کو پہلے سے

جانتا ہی نہ تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔''

حضرت مریم علیہا السلام کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۴۴)

''یہ غیب کی خبروں میں سے ہے اس کو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور نہ تو ان کے پاس موجود تھا جب وہ اپنے قلم (قرعہ کے طور پر) ڈال رہے تھے کہ کون مریم کو پالے اور نہ تو ان کے پاس اس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے۔''

دیکھو کہ محسوس واقعات کے علم کا طبعی طریقہ اس وقت موجود رہ کر دیکھنا اور سننا تھا اس کی آنحضرت ﷺ سے نفی کی گئی کہ آپ وہاں یقیناً اس وقت موجود نہ تھے اب رہ گیا کسی دوسرے انسانی ذریعہ سے سننا اس کی بھی نفی پہلے ہی سے ہے کہ تیری قوم میں سے بھی کسی کو معلوم نہ تھا اور نہ دوسروں سے معلوم کیا اب اس کا علم جس غیر طبعی طریقہ سے رسول کو دیا گیا وہ وحی کا ذریعہ ہے۔

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے پورے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا:

﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۝ ﴾ (۱۲/ یوسف:۱۰۲)

''یہ غیب کی خبروں میں سے ہے ہم اس کو تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو اس وقت ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنا کام طے کرنے لگے اور چال چل رہے تھے۔''

اس میں بھی علم شاہد کی نفی کر کے علم غائب کو ثابت کیا گیا بہر حال ان تینوں آیتوں سے واضح ہے کہ ماضی کے واقعات کے غیر طبعی طریقہ علم کو بھی علم غیب کہا گیا ہے۔

② اسی طرح آئندہ مستقبل میں جو واقعات ہونے والے ہیں ان کو بھی غیب کہا گیا ہے ان کا علم دلائل و قیاس کے طبعی ذرائع کے علاوہ غیر طبعی ذریعہ سے ہوا ہو تو اس کو بھی علم غیب کہیں گے۔ قرآن پاک میں ایک موقع پر ان کفار کے جواب میں جو نشانیوں کے طالب تھے یہ کہا گیا:

﴿ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝ ﴾ (۱۰/ یونس:۲۰)

''تو کہہ دے کہ غیب کا علم خدا ہی کے لیے ہے، انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔''

مستقبل کے منتظرہ واقعات کو اس آیت میں غیب کہا گیا ہے اسی طرح قیامت کو بار بار غیب کہہ کر غیر خدا سے اس کے علم کی نفی کی گئی ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ﴾ (۳۱/ لقمان:۳٤)

”خدا ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔“

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ﴾

(۷/ الاعراف:۱۸۷)

”وہ قیامت کو پوچھتے ہیں کہہ دے کہ اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے۔“

اسی طرح مستقبل کے دوسرے واقعات کے علم کی بھی انسانوں سے نفی کی گئی ہے:

﴿ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ ﴾

(۳۱/ لقمان:۳٤)

”کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا اور نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔“

③ ان چیزوں پر بھی غیب کا اطلاق کیا گیا ہے جو گو ماضی اور مستقبل نہیں بلکہ زمانہ حال میں موجود ہیں، تاہم انسان کے حواس خمسہ اور عقل کی محدود طاقت سے ان کا علم نہیں ہو سکتا ہم کو دیکھنے اور سننے کی طاقت دی گئی ہے مگر اس کے لیے کسی نہ کسی مسافت، عدم حجاب اور دیگر چند شرائط کی قید لگا دی گئی ہے جن کے بغیر ہماری یہ طاقت بالکل بے کار ہے، ہم دلی میں بیٹھ کر بمبئی کے پیش نظر مناظر کو نہیں دیکھ سکتے اور نہ بغیر آلات کے ہم یہاں سے وہاں کی آواز آج بھی سن سکتے ہیں، اس لیے زمانہ حال کے علم کے لیے بھی جو طبعی شرائط اور قیود ہیں ان کے بغیر جو علم حاصل ہو گا وہ غیب ہو گا۔ حاملہ عورت سامنے موجود ہے مگر اس کے بطن کے پے در پے حجابات کے اندر جن کو آنکھیں چاک نہیں کر سکتیں کیا ہے؟ کس کو معلوم ہے:

﴿ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ ﴾ (۳۱/ لقمان:۳٤)

”اور اللہ جانتا ہے رحموں کے اندر جو ہے۔“

آسمان و زمین میں اس وقت جو کچھ ہے وہ سب زمانہ حال میں سب کے سامنے موجود ہے، تاہم اس کا علم ہمارے حواس اور عقل کی محدود دسترس سے اس وقت تک باہر ہے جب تک ہمارے دیکھنے اور سننے اور جاننے کے لیے خدا نے جو طبعی شرائط بتا دیے ہیں وہ پورے نہ ہوں:

﴿ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (۱۱/ ھود:۱۲۳)

”اور خدا ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔“

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ﴾ (٤۹/ الحجرات:۱۸)

”بے شک خدا جانتا ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔“

④ عالم غیب کی آخری چیز وہ امور ہیں جو غیر مادی ہونے کی وجہ سے ہمارے حواس اور عقل کے تنگ دائرہ

علم سے قطعاً باہر ہیں ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے، خدا کی رؤیت کی صلاحیت نہیں رکھتے، جنت اور دوزخ ہم کو یہاں نظر نہیں آ سکتی، یہ تمام امور بھی غیب ہیں:

﴿ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۴۹)

''جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں غیب میں۔''

﴿ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۳)

''وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں غیب میں۔''

﴿ الَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ﴾ (۱۹/ مریم۔۶۱)

''وہ جنت جس کا وعدہ اس مہربان خدا نے اپنے بندوں سے کیا ہے غیب میں۔''

''غیب میں'' کے معنی ہیں، بے جانے، بن دیکھے، حواس سے علم حاصل کیے بغیر اور باوجود اس کے کہ وہ چیزیں اس عالم میں دیکھی نہیں جا سکتی ہیں۔

پیغمبر کو اللہ تعالیٰ غیب کی جن باتوں سے آگاہ کرتا ہے وہ ان چاروں قسم کے امور غیب ہوتے ہیں بعض گزشتہ قوموں اور پیغمبروں کے عبرت انگیز اور نصیحت آموز حالات سے بھی روایت اور تحریر کے ذریعہ کے بغیر وحی کے واسطہ سے ان کو مطلع کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید کے حوالوں سے اوپر گزر چکا، آیندہ مستقبل میں دنیا کے فتنوں، امت محمدیہ کے انقلاب، قیامت کے مناظر اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کا علم آپ کو دیا گیا، جیسا کہ ان دنیاوی پیشین گوئیوں اور قیامت و محشر کے ان مناظر سے ظاہر ہے جو قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں بتصریح مذکور ہیں، اسی طرح حال کے ان مناظر و احوال کا علم بھی ثابت ہے جو باوجود سامنے موجود ہونے کے احساس و تعقل کے طبعی شرائط نہ پائے جانے کے سبب سے عام انسانوں کو نظر نہیں آتے۔ قبروں کا انکشاف، پس پردہ رؤیت، دوسروں کے سامنے موجود احوال سے واقفیت وغیرہ اس علم غیب میں سے بھی پیغمبروں کو عطا ہوتا ہے اور سب سے آخر میں وہ مغیبات ہیں جن کا احساس و تصور ہمارے مادی ذرائع علم سے قطعاً خارج ہے، تاہم وہ بھی اس کو دکھائے اور بتائے جاتے ہیں خود خدا کا دیدار اور فرشتوں کی رؤیت، جنت و دوزخ کا مشاہدہ وغیرہ ان تمام امور غیب میں سے اللہ تعالیٰ جس رسول کے لیے جس قدر مناسب اور سزاوار سمجھتا ہے اس کا علم وحی کے مختلف اقسام کے ذریعہ سے اس کو عطا فرماتا ہے۔

وحی اور ملکۂ نبوت

حکمائے اسلام نے وحی کی حقیقت ''ملکۂ نبوت'' کے لفظ سے ظاہر کی ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ ترتیب کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں علم اور تعقل نے پستی سے بلندی کی طرف رفتہ رفتہ ترقی کی ہے۔ جمادات بے حس ہیں ان کے اوپر نباتات ہیں جن میں صرف محدود احساس ہوتا ہے اور وہ دماغی قویٰ

حافظہ، تذکر اور غور وفکر کی قوت سے وہ محروم ہیں۔ ان سے اونچے حیوانات ہیں جن میں یہ تمام قویٰ ناقص طریقے سے نمودار ہوتے ہیں اور آخر میں ان سے بالاتر ہستی یعنی انسان میں جا کر یہ قویٰ پورے کمال میں ظاہر ہوتے ہیں ان قویٰ کی ترقی یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ جس طرح نباتات میں قوت احساس ہے جس سے جمادات محروم ہیں اور حیوانات میں حافظہ، تصور، تعقل وغیرہ کی وہ قوتیں ہیں جو نباتات میں نہیں، انسان میں وہ دماغی و ذہنی قویٰ ہیں، جو حیوانات میں نہیں اسی طرح انبیا میں علم وتعقل کی ایک ایسی قوت موجود ہوتی ہے جو عام انسانوں میں نہیں ہوتی اور اسی کا نام ملکۂ نبوت ہے۔

حواس صرف مادیات کو دریافت کرتے ہیں۔ دماغی قویٰ مادیات سے بلند ذہنیات اور عقلیات کو اور ملکۂ نبوت اس سے بھی اونچا جاتا ہے، وہ ذہنیات وعقلیات سے بلند تر حقائق یعنی غیبیات کو دریافت کرتا ہے۔ اس ذریعہ علم میں غور و بحث اور منطقیانہ فکر ونظر اور ترتیب مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں جس طرح وجدانیات، فطریات اور بدیہیات اور محسوسات سامنے آتے ہیں اور انہیں کی طرح وہ یقینی بھی ہوتے ہیں اور چونکہ اس ذریعہ میں علم انسانی کے عام ذریعے اور طریقے یعنی وجدان، فطرتِ نوعی، بداہت اوّلیہ، احساس اور غور وفکر سے معلومات حاصل نہیں کیے جاتے بلکہ خود علام الغیوب وہ علم ان انسانی وسائط کے بغیر ان کو عطا کرتا ہے شرع کی زبان میں اسی کو وحی والہام کہتے ہیں علم کلام کی اصطلاح میں ملکۂ نبوت اور عام محاورہ میں اس کو غیبی علم کہہ لیجئے۔

لیکن اہل نقل کی اصطلاح میں وحی کی یہ صورت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو وقتاً فوقتاً احکام اور ارادوں سے براہ راست فرشتوں کے ذریعہ سے مطلع کرتا رہتا ہے یہی وحی ہے۔

امعان نظر سے معلوم ہوگا کہ اہل عقل ونقل کے اختلاف کا منشا یہ ہے کہ آیا یہ وحی خود پیغمبر کے مافوق اور غیر معمولی وہبی علم وفہم کا نتیجہ ہوتی ہے یا خود براہ راست وقتاً فوقتاً تعلیم ربانی کا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ جس طرح عام انسانوں میں علم وفہم کی قوت آغاز پیدائش ہی میں فطرتاً ودیعت کردی جاتی ہے اسی طرح انبیا میں منشائے الٰہی جاننے کی قوت بھی شروع ہی میں ودیعت کردی جاتی ہے یا یہ کہ فطرتاً ویسے ہی عام انسانی طریقہ کا طبعی علم وفہم رکھتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نبوت کے بعد اپنے منشائے الٰہی سے ان کو کسی غیبی ذریعہ سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتا رہتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت، عقل کی نقل سے اور نقل کی عقل سے علیحدگی میں نہیں بلکہ اتحاد میں ہے، وہ لوگ جو عقل ونقل دونوں کے جامع ہیں وہ ان دونوں کو مجتمع کرتے ہیں۔

ع یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

انبیا علیہم السلام میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بدءِ فطرت اور آغاز پیدائش سے ان امور کے متعلق جن کا

ان کی رسالت و نبوت سے تعلق ہے اور جس کو دین کہتے ہیں وہ کلی استعداد اور عمومی فہم ہوتی ہے جس سے غیر انبیا محروم ہیں اور اس پوشیدہ قوت کا عملی ظہور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ نبوت کے منصب پر عملاً سرفراز ہوتے ہیں اسی کا نام ''ملکۂ نبوت'' ہے اور اہم امور دین کے متعلق ان کو وقتاً فوقتاً جو غیبی اطلاع ملتی رہتی ہے اس کا نام ''وحی'' ہے۔

آج کل قرآن فہمی اور عقل کے مدعیوں اور نقل کے لفظی پابندوں میں جو اختلاف ہے وہ دراصل انہیں دوقوتوں کے درمیان تمیز نہ کرنے کا نتیجہ ہے، نقل کے لفظی پابند یہ سمجھتے ہیں کہ ہر لفظ جو نبی کے منہ سے نکلتا ہے وہ اس معنی میں وحی ہے جس معنی میں قرآن ہے کہ وہ براہ راست خدا کی غیب کی اطلاع ہے اور عقل کے مدعی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن بے شک خدا کی براہ راست وحی ہے مگر اس کے ماسوا رسول جو کچھ کہتا ہے وہ اس کے پیغمبرانہ نہیں بلکہ انسانی و بشری علم وفہم کا نتیجہ ہے لیکن حقیقت ان دونوں کے ماورا ہے جیسے قرآنی وحی براہ راست ہے اسی طرح نبی کے دوسرے احکام اس کے عام انسانی و بشری علم وفہم کا نہیں بلکہ اس کی پیغمبرانہ وہبی قوت علم وفہم کا نتیجہ ہے جو وحی کی ایک دوسری قسم اس لیے کہی جاسکتی ہے کہ اس کا منشا ''ملکۂ نبوت'' کے ذریعہ وحی ربانی کی ترجمانی ہے اس لیے پیغمبر کی وحی اور ملکۂ نبوت دونوں کے احکام واجب الاتباع ہیں۔

کتاب اور سنت

اس تقریر کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر کو جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک وحی حقیقی یعنی وہ علم جس کو اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے خاص الفاظ میں پیغمبر پر نازل کرتا رہتا ہے اور جس کے مجموعہ کو کتاب الٰہی، صحیفۂ ربانی، تورات، انجیل، زبور اور قرآن کا نام دیا گیا ہے، دوسرا وہ علم جو پیغمبر کے ملکۂ نبوت یا نور نبوت یا فہم نبوت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پہلا علم اصلی اور دوسرا ضمنی ہے یا یوں کہو کہ پہلا اصولی اور دوسری فروعی ہے یعنی علم اول پیغمبر پر شریعت کے غیر متبدل اور ازلی احکام کلیہ اور مہمات کو واضح کرتا ہے اور دوسرا علم پہلے علم کے غیر متبدل کلی اصول کے ماتحت اس کے مقصود کی صحیح تشریح اور اس کے جزئیات کی ضروری تفصیل کرتا ہے اور غیر اہم اور متبدل امور کے متعلق ہنگامی اوقات میں مصلحتی احکام بتاتا ہے اور اسی دوسری قسم کا علم ہے جو روایات اور احادیث کی صورت میں ہے اور جس کو اہل اصول اصطلاحاً سنت کہتے ہیں۔ کتاب اصولی احکام ہیں اور سنت ان اصولی احکام کی عملی تشریح اور بیان ہے۔ کتاب براہ راست وحی الٰہی کا نتیجہ ہے اور سنت ملکۂ نبوت اور فہم نبوی کا، کتاب بلفظہٖ وحی ہے اور سنت بالمعنی۔

وحی متلو اور وحی غیر متلو

بعض علمائے اصول نے کتاب اور سنت دونوں کو وحی مانا ہے اور ان دونوں کے درمیان تفریق یہ کی ہے کہ کتاب اس وحی کا نام ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور سنت اس وحی کو کہتے ہیں جس کی تلاوت نہیں کی

جاتی اس تشریح کا مقصود حقیقتاً تلاوت وعدم تلاوت کا فرق نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ کتاب میں معنی کے ساتھ الفاظ بھی وحی کیے گئے ہیں اور وہ الفاظ بھی محفوظ ہیں ان کا حرف حرف اور نقطہ نقطہ ﴿وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ کی پیشین گوئی میں داخل ہے اور اس لیے اس میں الفاظ کی کمی بیشی اور حذف واضافہ محال ہے اور سنت میں الفاظ کی نہیں صرف معانی کی حفاظت ہے اسی لیے کتاب کی وحی مدون، مکتوب اور محفوظ کی گئی اور نماز میں اس کی قراءت کا حکم ہے اور یوں بھی عام طور سے اس کی تلاوت مسنون ہے اور سنت کی وحی بالفاظہا مقصود نہیں اس لیے اس کی لفظی حفاظت کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی اور نہ نماز میں اس کے الفاظ قراءت کیے جاسکتے ہیں اور نہ ان کی تلاوت کی جاتی ہے اور نہ اس کو کتاب الٰہی کہا جاسکتا ہے مگر معناً اصولی حیثیت سے ان کی حفاظت خود قرآن نے اپنے اندر کرلی ہے اور جزئیات کی حیثیت سے گو الفاظ میں نہیں مگر عمل میں خود رسول اور اس کے پیروؤں اور پھر ان کے پیروؤں کے مسلسل تعامل سے، یہاں تک کہ آج بھی تمام مسلمانوں کے عمل درآمد سے عملی تواتر کی صورت میں محفوظ ہے اور بعد کے اماموں نے اچھی طرح تحقیق کرکے الفاظ اور کتب حدیث کے اوراق میں بھی ان کو محفوظ کردیا ہے۔

سنت کو وحی کہنا اس لحاظ سے ہے کہ اس کے جزئیات اصولاً وحی حقیقی یعنی کتاب کے اندر داخل ہیں اور اس کی کلیت میں سنت کے تمام احکام مندرج ہیں بنابریں چونکہ سنت، وحی کے کلی منشا کے اندر داخل ہے، وہ بھی ضمنی حیثیت سے وحی کہی جاسکتی ہے لیکن چونکہ اس میں الفاظ کی تعیین خدا کی طرف سے نہیں اس لیے وہ غیر متلو ہے۔ اس فرق کا راز یہ ہے کہ کتاب کی اصلی حیثیت کلی قانون کی ہے قانون کے اصل منشا کی حفاظت اور وضاحت کے لیے نہ صرف اس کے ایک ایک لفظ کے محفوظ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس کے ایک ایک نقطہ، شوشہ، وقف، وصل، فصل، عطف، قطع، تقدم، تاخر یعنی آج کل کی اصطلاح میں ایک ایک ڈیش اور کامے کی بعینہٖ حفاظت کی ضرورت ہے، ورنہ ذرا سے تغیر میں قانون کا مطلب کچھ کا کچھ ہوجاسکتا ہے اور سنت کی یہ کلی قانونی حیثیت نہیں ہے بلکہ وہ اس کلی قانون کی تشریحات، تفصیلات اور جزئیات ہیں جو درحقیقت اس کلی قانون کے اندر مندرج تھے مگر چونکہ عام لوگوں کے فہم میں نہیں آتے تھے یا عام لوگ ان کو نہیں سمجھتے تھے اس لیے صحابہ کے دریافت پر، یا خود حضور ﷺ نے اس کی ضرورت محسوس فرما کر اس کو کھول کر بیان فرمادیا کہ پھر اشتباہ نہ رہ جائے۔

اسی مقام پر ایک نکتہ اور بھی ہے کہ کتاب الٰہی میں جو حکم جن الفاظ میں ادا ہوا ہے وہ اگر بعض کم فہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا اور انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس کی تشریح چاہی یا انہیں نہیں معلوم ہوا کہ اس خاص جزئی واقعہ کا کیا حکم ہے اور قرآن پاک کی کس اصل سے ماخوذ ومستنبط ہوگا اور اس لیے انہوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا، تو اس کے جواب میں اگر آنحضرت ﷺ قرآن پاک کے بعینہٖ انہیں الفاظ کو بے کم وبیش

دہرا دیتے تو یہ بیکار ہوتا کہ انہیں الفاظ کے نہ سمجھ سکنے کے سبب تو سوال کی نوبت آئی اس لیے ضروری تھا کہ آنحضرت ﷺ الفاظ کو بدل کر اور طریقہ تعبیر کو تغیر دے کر ان الفاظ کی تشریح فرمائیں اور یہی احادیث ہیں۔

درحقیقت احادیث میں قانون الٰہی اور کتاب ربانی ہی کے مفہوم ومنشا کو رسول اللہ ﷺ نے سمجھنے کی سہولت، گمراہوں کی تکمیل ہدایت اور اصل منشائے الٰہی کی پوری توضیح اور کہیں پوری تاکید کی خاطر مختلف لفظوں، مختلف عبارتوں اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا ہے اس لیے اصل مفہوم ومنشا کے لحاظ سے احادیث کے معانی ضمناً وحی ہیں لیکن الفاظ، عبارت اور تعبیر کی حیثیت سے یعنی لفظاً وحی نہیں ہیں بلکہ فہم نبوی، اجتہاد نبوی اور ملکۂ نبوت کے غیر خطاپذیر نتائج ہیں اسی لیے ان کو اصطلاح میں ''وحی غیر متلو'' کہتے ہیں۔ ہم اس فرق کی ایک مثال دے کر اپنے مطلب کو زیادہ واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ قرآن پاک میں والدین کی خدمت اور اطاعت کا حکم ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہے کہ والدین کی رضامندی گناہوں کی مغفرت کا سبب ہے [1] یہ وحی الٰہی کا حقیقی منشا ہے آنحضرت ﷺ نے اس منشائے الٰہی کو ان الفاظ اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا: ''ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔'' [2] کبھی ارشاد ہوا: ''رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے۔'' [3] ایک صحابی نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ فرمایا: ''تیری ماں، تیری ماں، تیری ماں۔'' [4] ایک دفعہ آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے صحابہ رضی اللہ عنہم حضوری کے شرف سے ممتاز تھے کہ زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے: ''وہ ذلیل ہوا، وہ ذلیل ہوا، وہ ذلیل ہوا'' حاضرین نے عرض کی، یارسول اللہ! کون؟ ارشاد ہوا: ''وہ جس نے اپنی ماں یا باپ کی ضعیفی پائی اور پھر ان کی خدمت گزاری کر کے جنت نہ حاصل کرلی۔'' [5] ایک اور مجلس میں صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! نیکی کے کاموں میں خدا کو سب سے زیادہ کون سا کام پسند ہے؟ فرمایا: ''وقت پر نماز ادا کرنا۔'' دریافت کیا اس کے بعد، فرمایا: ''ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔'' [6] ان تمام احادیث پر معمولی سی غور وفکر کی نظر بھی یہ راز ظاہر کر دے گی کہ یہ کل حدیثیں ذیل کی آیتوں کی تشریح وبیان ہیں:

﴿ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۳۔ ٤/ النسآء:۳٦)

''ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔''

﴿ فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ أُفٍّ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآء یل:۲۳)

''وہ بوڑھے ہو جائیں تو اُن کو اُف نہ کہو۔''

---

[1] ٤٦/ الاحقاف:١٦۔ [2] سنن نسائی، کتاب الجھاد، باب الرخصۃ فی التخلف لمن له والدۃ:٣١٠٦۔
[3] جامع ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ما جاء من الفضل فی رضا الوالدین:١٨٩٩۔
[4] مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب بر الوالدین:٦٥٠٠۔ [5] مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب رغم انف من ادرك ابویه .....الخ:٦٥١٠، ٦٥١١۔ [6] بخاری، کتاب الادب، باب البر والصلۃ:٥٩٧٠۔

﴿ وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ ﴾ (٤٦/ الاحقاف:١٦)

”یہ (ماں باپ کے خدمت گزار) وہ ہیں جن کی بدیوں سے ہم درگزر کرتے ہیں۔“

یہی حال دوسرے قرآنی احکام کے بیانات وتشریحات کا ہے۔ [1]

احادیث قرآن کا بیان ہیں

قرآن پاک اور احادیث دونوں پر جن کی عمیق اور وسیع نظر ہے ان کو یہ برملا معلوم ہوتا ہے کہ احادیث صحیحہ کے تمام فرعی اور ثانوی احکام قرآن پاک کے عمومی اور کلی احکام کے تحت میں مندرج ہیں آنحضرت ﷺ نے اپنے الفاظ میں صرف ان کی تشریح فرمائی ہے اس قسم کی حدیثوں کی عموماً تین شکلیں ہیں ایک وہ جن میں آنحضرت ﷺ نے اپنے الفاظ میں حکم بیان فرمانے کے بعد خود قرآن پاک کی کوئی آیت اس کے ساتھ پڑھ دی اس قسم کی حدیثوں کے بیان ہونے میں کس کو شبہ ہوسکتا ہے؟ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ نے آیت نہیں پڑھی مگر خود اس حکم میں ایک دو لفظ ایسے فرما دیے ہیں جو کسی آیت کا جزو ہیں جس سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ حکم فلاں آیت کی تشریح ہے اس صورت میں بھی اصل وفرع کی تمیز اہل علم کے لیے آسان ہے۔ تیسری شکل یہ ہے کہ آپ نے کسی آیت یا اشارہ کے بغیر صرف حکم بیان فرما دیا ہے اس قسم کی حدیثوں کے ماخذ کی تلاش دقت نظر کا کام ہے ان کا پتہ زبان نبوت اور فہم رسالت کے طرز واسلوب کے سمجھنے والے راسخین فی العلم ہی پاسکتے ہیں۔

الہام واجتہاد وحکمت

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الرسالہ میں احادیث وسنن کی تین قسمیں بیان کی ہیں، ایک وہ جو بعینہٖ قرآن پاک میں مذکور ہیں۔ دوسری وہ جو قرآن پاک کے مجمل حکم کی تشریح ہیں۔ تیسری وہ جن کا ذکر (بظاہر) قرآن پاک میں نہ تفصیلاً ہے نہ اجمالاً، یہی تیسری قسم قابل بحث ہے۔ امام صاحب نے اس کے متعلق ائمہ سلف کے چار نظریے نقل کیے ہیں: [2]

① اللہ تعالیٰ نے رسول کی کلی اطاعت فرض کی ہے اور اس کے علم میں پہلے ہی سے یہ ہے کہ رسول جو کچھ کہے اور کرے گا اس میں رضائے الٰہی کی توفیق اس کے ساتھ شامل ہوگی (حاصل یہ ہے کہ پہلے ہی رسول کو یہ توفیق ربانی عنایت کی گئی ہے کہ وہ رضائے الٰہی کو دریافت کرلے)

---

[1] مجھے پہلے یہی شبہ تھا کہ میں اس رائے میں منفرد ہوں مگر بحمد اللہ کہ تلاش وتفحص سے ثابت ہوا ہے کہ دیگر متعدد علمائے اصول کا یہی مسلک ہے چنانچہ یہ خیال اجمالاً سب سے پہلے امام شافعی کی کتاب الرسالة، ص: ٢٨۔ ٢٩۔ ٦٢ میں اور یہ نظریہ سب سے زیادہ مفصل امام شاطبی اندلسی المتوفی ٧٩٠ھ کی اہم تصنیف الموافقات فی اصول الاحکام، ج١، ص: ١٧٥، ٢٢١ مطبعة سلفية مصر ١٣٤١ھ میں موجود ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ میں بھی اس کا ایک باب ہے۔

[2] کتاب الرسالة امام شافعی، ص: ٣٨۔

② رسول نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا ہے جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو۔ (مقصود یہ ہوا کہ اس قسم کے احکام بھی دراصل کتاب اللہ ہی سے ماخوذ ہیں گو بظاہر کم بینوں کو ایسا نظر نہ آئے)

③ تمام احادیث نبوی القائی الروع ہیں (یعنی رسول ﷺ کے دل میں خدا نے ڈال دیے ہیں) اور یہ اس حکمت کا نتیجہ ہیں جو آپ کے دل میں ڈالی گئی۔

④ اس قسم کے تمام امور جو احادیث میں ہیں کتاب الٰہی سے جداگانہ، مستقل پیغام ربانی کے ذریعہ رسول کو معلوم ہوئے ہیں۔

چوتھے نظریہ کو چھوڑ کر بقیہ تین آراء میرے خیال میں تقریباً ایک ہی ہیں۔ پہلے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ صریح وحی کے علاوہ جو وقتاً فوقتاً نبی پر آتی رہتی ہے اس کو ابتدا ہی سے ایک توفیق ازلی عنایت ہوتی ہے جس سے وہ پیش آمدہ امور میں رضائے الٰہی کو دریافت کر کے فیصلہ کرتا ہے، تیسرے نظریہ میں اسی توفیق علم کو الہام، القائی الروع اور دل میں ڈال دینے سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ رسول کے جو احکام بظاہر کتاب اللہ میں نہ ہوں ان کی اصل بھی درحقیقت کتاب اللہ میں ہے اور رسول اسی اصل سے اپنے احکام کو مستنبط کرتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ استنباط عام انسانی و بشری فہم سے نہیں ہوتا ورنہ اس کا غلطی سے پاک ہونا مشتبہ رہے گا بلکہ وہ پیغمبرانہ قوتِ فہم کا نتیجہ ہوگا اور جب ایسا ہے تو اس پیغمبرانہ قوتِ فہم کی تعبیر خواہ الہام سے کرو، القا سے کرو یا اس کو حکمت نبوی کا نتیجہ کہو یا توفیق الٰہی کہو بات ایک ہی ہوئی۔

میرے نزدیک صحیح مسلک یہ ہے کہ رسول کے تمام صحیح ربانی احکام بھی عموماً اس کے صحیفۂ ربانی سے ماخوذ و مستنبط ہیں اور ان کے جزئیات کتاب الٰہی کے کلیات کے تحت میں مندرج ہیں اور رسول کا یہ اخذ، استنباط اور فہم اس کی پیغمبرانہ قوت علم کا نتیجہ ہیں جس کو حکما، ملکۂ نبوت اور اہل شرع، حکمت، الہام اور شرح صدر وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور جو خطا اور غلطی سے یکسر پاک ہے۔

اجتہادِ نبوت

اس موقع پر علمائے اصول کی ایک اور اصطلاح اجتہاد نبوی کی تشریح ضروری ہے، علمائے اصول لکھتے ہیں کہ جب کوئی نیا واقعہ آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش آتا اور وحی نازل نہ ہوتی تو آنحضرت ﷺ اجتہاد فرماتے یعنی گزشتہ وحی شدہ احکام کے تطابق سے آپ حکم دے دیتے تھے (یہ فقہا کا طریقہ تعبیر ہے ورنہ یوں کہنا چاہیے کہ رسول اپنی اس حکمت ربانی کے فیض سے مدد لے کر جو خدا نے ان کے سینہ میں ودیعت رکھی تھی گزشتہ وحی کے کلیات کی روشنی میں اس کا فیصلہ فرماتے تھے) بہر حال خواہ فقہا کے طریقہ پر اجتہاد نبوی کو نصوص قرآنی سے مستنبط سمجھیے یا شاہ ولی اللہ صاحب کے نظریہ کے مطابق رسول کے علمِ سینہ اور وحی شدہ اصول کلی کے جزئیات تسلیم کیجیے، ہر حال میں وہ نتیجہ امت کے لیے واجب العمل اور خطا سے پاک ہے کیونکہ یہ

مقدمہ اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ انبیا گناہوں سے معصوم، ضلالت و گمراہی سے پاک اور ہوائے نفسانی سے مبرا ہوتے ہیں اس لیے امور رسالت اور امور دین میں ان کی کوئی رائے غلط نہیں ہوسکتی کہ ان کی غلطی سے پوری امت کا غلطی پر قائم ہو جانا مسلم ہے، حالانکہ ان کی بعثت کی غرض ہدایت ہے، ضلالت نہیں، ان وجوہ سے ان کا اجتہاد اگر کبھی کسی ایسے نتیجہ پر پہنچ جائے جو مصلحت الٰہی کے مطابق نہیں ہوتا تو ہمیشہ اللہ تعالیٰ اس پر تنبیہ فرما کر ان کو اپنی مرضی سے مطلع فرما دیتا ہے (اس کی مثالیں آیندہ آئیں گی) الغرض بعض امور میں خیر کے کسی خاص پہلو کو پیش نظر رکھ کر اس سے بہتر پہلو سے تغافل ہونے، یا غیب اور مستقبل سے عدم واقفیت کے سبب سے نبی کا اجتہادی خطا کرنا ممکن ہے مگر اس خطا پر نبی کا قائم رکھا جانا ناممکن ہے ایسی صورت میں نبی کا ہر ایسا اجتہادی حکم جس پر وحی الٰہی نے فوراً کوئی تنبیہ نہیں کی یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ حکم علم الٰہی کے منشا کے مطابق اور خطا و غلطی سے مبرا ہے اور اس کے دوسرے معنی وحی خفی یا باطنی وحی کے ہیں۔ [1]

میری رائے میں یہ اصطلاح بھی معناً گزشتہ اصطلاحوں کے قریب قریب ہے اس لیے اس اجتہاد نبوی کے معنی الہام، حکمت، ملکۂ نبوت، فہم نبوی وغیرہ گزشتہ اصطلاحات سے عملاً الگ نہیں کہ اس کی حیثیت بھی وحی ثانوی کی قرار پاجاتی ہے۔

اس مبحث پر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں جو خیال ظاہر فرمایا ہے اس کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

---

[1] سطور بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے حوالہ کے لیے دیکھو شرح تحریر ابن همام المتوفی ۸۶۱ھ مسمی به التقریر والتحبیر للعلامه ابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ھ ج ۳، ص: ۲۹۴، ۲۹۹ مطبعه امیریه مصر ۱۳۱۷ھ اور التلویح فی کشف حقائق التنقیح و التوضیح فی حل غوامض التنقیح، ج ۲، ص: ۴۵۲ مطبع مکتبه صنائع قسطنطنیه ۱۳۱۰ھ بحث الرکن الثانی فی السنة۔

ساتواں مبحث: احادیثِ نبوی سے شریعت کے اخذ کرنے میں

علوم نبوی ﷺ کے اقسام

رسول اللہ ﷺ کی جو روایتیں حدیث کی کتابوں میں جمع کی گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں:

① ایک تو وہ جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے اور یہ آیت:

﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ (۵۹/ الحشر:۷)

''پیغمبر تم کو جو کچھ دے اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز آؤ۔''

اسی قسم کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

علوم معاد یعنی قیامت اور آخرت کے احوال یہ جزاوسزا اور عجائب الملکوت (یعنی دوسرے عالم کے احوال و کیفیات) اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سب کا دارومدار صرف وحی پر ہے اور ان اصول کے مطابق جن کا ذکر اوپر گزر چکا قوانین شریعت اور عبادات و معاملات کی جزئیات کا ضبط بھی اسی قسم میں داخل ہے، لیکن ان میں سے بعض چیزوں کا دارومدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کا اجتہاد بھی وحی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو غلط رائے قائم کرنے سے محفوظ رکھا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کا ہر اجتہاد کسی خاص نص و آیت سے استنباط کا نتیجہ ہو، جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے بلکہ آپ کے اجتہاد کی زیادہ تر صورت یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شریعت اور وضع قانون کے مقاصد، انسانوں کی آسانی اور بھلائی اور اصولی مقاصد کا قانون آپ ﷺ کو تعلیم کر دیا تھا وہ مقاصد، جن کا ماخذ وحی تھا آپ اس کلی و اصولی قانون کے ذریعہ سے جو آپ کو سکھایا گیا تھا ان کی تشریح فرمادیا کرتے تھے۔ حکمت کی متفرق باتیں اور عام مصلحتیں جن کے لئے آپ نے نہ کوئی وقت مقرر کیا نہ ان کے حدود بتائے مثلاً: اخلاق صالحہ اور اخلاق غیر صالحہ کا بیان بھی تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتا ہے لیکن ان میں اکثر کا دارومدار اجتہاد پر ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو باہمی معاملات و اجتماع کا کلی قانون تعلیم کر دیا تھا اور آپ نے حکمت کی باتیں اسی کلی قانون سے جو آپ کو تعلیم کر دیا گیا تھا مستنبط کیں اور ان کے متعلق ایک کلیہ بنایا، فضائلِ اعمال اور ان پر عمل کرنے والوں کے مناقب بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے خیال میں ان میں بعض کا دارومدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے، ان قوانین کا بیان اوپر گزر چکا ہے اور ہم اسی قسم کی شرح کرنا اور ان کے معانی کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

② دوسری وہ روایتیں ہیں جو تبلیغ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ ''میں صرف ایک آدمی ہوں جب میں تمہارے دین کے متعلق تم کو کوئی حکم دوں تو اس پر عمل کرو اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو یہ سمجھو کہ میں صرف ایک آدمی ہوں۔'' اور چھوہاروں کے جوڑ لگانے کے واقعہ میں

آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ ''میں نے ایک خیال قائم کیا تھا، میرے خیال پر تم لوگ عمل نہ کرو البتہ جب خدا کی کوئی بات بیان کروں تو اس پر عمل کرو کیونکہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا۔'' اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ طب کے متعلق حدیثیں اور آپ کا یہ ارشاد کہ ''تم سیاہ رنگ اور ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس کی پیشانی میں تھوڑی سی سفیدی ہو۔'' اسی قسم میں داخل ہے اور اس کا دارومدار تجربہ پر ہے۔

آپ نے جو کچھ عادتاً کیا، عبادت نہیں، اتفاقاً کیا قصداً نہیں وہ بھی اسی قسم میں داخل ہے۔ آپ نے جو واقعات ایسے بیان کئے جن کا تمام قوم میں چرچا تھا مثلاً: ام زرع اور خرافہ کے قصے وہ بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی بات کو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جب ان سے چند لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی اس طرح بیان کیا کہ ''میں آپ کا پڑوسی تھا اور جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ مجھ کو بلا بھیجتے تھے اور میں آپ کے حکم سے اس کو لکھا کرتا تھا لیکن جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر فرماتے تھے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے تو کیا میں ان تمام چیزوں کو بطور حدیث بیان کروں؟''

اسی میں وہ چیزیں بھی داخل ہیں جن کو آپ ﷺ نے اپنے زمانہ کے جزئی و عارضی مصلحت کے طور پر کیا ہے اور وہ تمام امت کے لئے ضروری نہیں مثلاً: فوجوں کی آراستگی اور جنگی علامت کی تعیین کے وہ احکام جن کو خلیفہ دیتا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کے کہ ''اب ہم کو حج میں اکڑ کر چلنے کی کیا ضرورت؟ ہم ایک قوم (کفار قریش) کے سامنے اس کی نمائش کرتے تھے لیکن اب خدا نے ان کو ہلاک کر دیا'' بھی یہی معنی ہیں کہ وہ اس کو ایک خاص جزئی و عارضی مصلحت سمجھتے تھے لیکن چونکہ اپنے اس اجتہاد پر پورا اطمینان نہ تھا اس لئے ان کو یہ خوف ہوا کہ شاید اس کا سبب کوئی اور ہو اس لئے اس میں دست اندازی نہیں کی اسی طرح دوسرے احکام بھی اسی پر محمول کئے گئے ہیں مثلاً: آپ کا یہ ارشاد کہ ''جو شخص جس کو قتل کرے اس کا ہتھیار اسی کا حق ہے۔'' نیز آپ کے مخصوص فیصلے بھی اسی قسم میں داخل ہیں کہ آپ مقدمات کے ان فیصلوں میں گواہوں اور قسموں کے مطابق فیصلے کرتے تھے آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو یہ فرمایا تھا کہ ''واقعہ میں حاضر جو کچھ دیکھتا ہے اس کو غائب نہیں دیکھتا۔'' اس کے معنی بھی یہی ہیں۔ [1]

شاہ صاحب کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جن کا تعلق پیغمبرانہ فرائض، تبلیغ رسالت اور مہمات امور دین سے ہے یہ تمام باتیں براہ راست وحی و تعلیم الٰہی سے ماخوذ ہیں۔ دوسری وہ جو عام انسانی باتیں ہیں، اس کی متعدد صورتیں ہیں:

[1] حجة الله البالغة، ج ۱، ص: ۱۰۲۔

① کسی جزئی عارضی مصلحت کی بنا پر کوئی حکم جیسے حج میں آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ قریش کے سامنے اکڑ کر سعی کریں، تاکہ قریش یہ نہ سمجھیں کہ مدینہ کی آب و ہوا نے ان کو کمزور کر دیا ہے۔

② وہ امور جن کو دین و رسالت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں بلکہ زمانہ کے حالات کے ساتھ وہ بدلتے رہتے ہیں مثلاً: جنگ کا طریق، ہتھیار کے اقسام، حکومت کے صیغوں کی ترتیب وغیرہ۔

③ وہ امور جن کو آپ اپنی شخصی، قومی یا ملکی عادت کے مطابق کرتے تھے جن کو دین و رسالت سے کوئی واسطہ نہیں مثلاً: وضع و لباس، فرش پر نشست، کمبل اوڑھنا، دستر خوان، چمچوں کا عدم استعمال، عمامہ باندھنا، تہبند پہننا، اونٹ پر سوار ہونا وغیرہ۔

④ وہ امور جو عرب میں بطور قصہ کے مشہور تھے اور آپ نے بھی ان کو اسی طرح تفنن طبع کے لئے یا کسی اخلاقی نتیجہ کی خاطر بیان فرمایا مثلاً: ام زرع اور اس کی نو سہیلیوں کی کہانی، خرافہ کی داستان، بنی اسرائیل کی بعض حکایتیں۔

⑤ عربوں کے بعض تجربی مسلمات اور علاج و معالجہ کی بعض باتیں۔

⑥ زراعت وغیرہ کے متعلق بعض ذاتی رائیں، مثلاً: مدینہ میں قاعدہ تھا کہ فصل کے موقع پر نر چھوہاروں کے پھول مادہ چھوہاروں کے درختوں میں ڈالے جاتے تھے آپ نے یہ طریقہ دیکھا تو اس کو محض رسمی بات سمجھ کر فرمایا کہ ''اگر ایسا نہ کرو تو کیا ہو۔'' مدینہ والوں نے آپ کے اس ہلکے سے اشارہ کو حکم کے طور پر مانا اور اس سال یہ ترکیب چھوڑ دی نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال پیداوار کم ہوگئی لوگوں نے آ کر عرض کی، فرمایا: ''میں نے ایسا خیال کیا تھا، ((انتم اعلم بامور دنیاکم)) [1] کہ تم اپنے دنیاوی کاروبار اور معاملات سے زیادہ واقف ہو۔'' یہ امور تغیر اور رد و بدل کے قابل ہو سکتے ہیں۔

الغرض یہ وہ امور ہیں جن میں رسول کے ارشادات کی حیثیت انسانی باتوں کی ہے لیکن ان کے دوسرے امور جن کا تعلق دین و رسالت و نبوت سے ہے مثلاً: عقائد، عبادات، اخلاق اور اخبار معاد اور معاملات کے بعض ضروری حصے یہ سب کے سب وحی اور تعلیم ربانی سے ہیں جو دائمی اور ناقابل تغیر ہیں۔

ان ناقابل تغیر امور کی تعلیم و اطلاع کی دو صورتیں ہیں ایک براہ راست وحی الٰہی جو وقتاً فوقتاً پیغمبر کی تعلیم و اطلاع کے لئے خدا کی طرف سے آیا کرتی تھی اور دوسری اجتہاد نبوی۔ یہاں بحث اسی دوسری چیز سے ہے شاہ صاحب اس کے متعلق دو باتیں فرماتے ہیں:

① یہ کہ اجتہاد نبوی کی صورت و حقیقت مجتہدین کے اجتہاد کی طرح نہیں ہے مجتہدین کا اجتہاد کسی خاص

[1] مسلم، كتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ماقاله شرعا: ٦١٢٦ تا ٦١٢٨؛ ابن ماجه، ابواب الرهون، باب تلقيح النخل: ٢٤٧٠، ٢٤٧١؛ مسند أحمد بن حنبل، ج ٣، ص: ١٥٢۔

نص سے استنباط کا نام ہے اور پیغمبروں کے اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اجمالی طور سے شریعت کے کلی اصول وقواعد کا علم، منصب نبوت کے ساتھ عطا فرما دیا ہے اسی علم کے مطابق آپ وحی کی توضیح، احکام منصوصہ کی تفصیل، کسی کل'' کے جزئیات مسائل کی تشریح اپنے الفاظ میں فرما دیا کرتے تھے۔

② پیغمبروں کا یہ اجتہاد، دوسرے عام انسانی مجتہدین کے اجتہادات کے برخلاف خطا وغلطی سے یکسر پاک ومنزہ ہوتا ہے کیونکہ ان کی رائے خطا وغلطی پر باقی رکھے جانے سے محفوظ بنائی گئی ہے، اس لئے ''ان کا پیغمبرانہ اجتہاد بھی بمنزلہ وحی کے ہے۔''

''پیغمبرانہ اجتہاد'' کی جو تشریح شاہ صاحب نے فرمائی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر یہ فیصلہ نہایت آسان ہے کہ دوسرے لوگ ملکۂ نبوت، الہام، القا، حکمتِ ربانی، فہم نبوی سے جو کچھ مراد لیتے ہیں اس میں اور ''اجتہاد نبوی'' میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے کہ اس اجتہاد سے مقصود وہ قوت علمیہ یا الہامیہ یا نبویہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ خاص پیغمبر کے سینہ میں ودیعت رکھتا ہے اسی لئے مجتہدانہ اجتہاد اور پیغمبرانہ اجتہاد کے درمیان صرف لفظ کی مشارکت ہے معنی کی نہیں مزید بحث آگے آئے گی۔

ایک نکتہ کی طرف یہاں اور اشارہ کر دینا ہے، آنحضرت ﷺ کے سوا اور جتنے صاحب کتاب انبیا آئے ان کی وحی کتاب اور نتائج حکمت نبوی میں فرق وامتیاز باقی نہیں رہا چنانچہ توراۃ وانجیل وزبور میں یہ سب باتیں ملی جلی ہیں، جیسا کہ ان کے پڑھنے سے ہر شخص کو نظر آ سکتا ہے مگر محمد رسول اللہ ﷺ چونکہ آخری اور غیر منسوخ کتاب لے کر آئے تھے اس لئے آپ کی کتاب کی ہر طرح حفاظت کی گئی اور ہر تخلیط اور آمیزش سے محفوظ رکھی گئی بلکہ اسی لئے آغاز اسلام میں آپ نے نتائج حکمت نبوی ﷺ کی تحریر سے لوگوں کو باز رکھا، تاکہ کتاب کے ساتھ ان کی آمیزش نہ ہو بعد کو جب یہ خطرہ باقی نہ رہا تو اکثروں کے نزدیک یہ ہے کہ آپ نے ان کی تحریر کی اجازت دے دی اور بعض متشدد صحابہ اور علما کے نزدیک یہ اجازت مخصوص لوگوں کے لئے تھی، عام نہیں، لیکن یہ اختلاف تحریر وکتابت میں ہے ان کی صحیح طور سے حفاظت وروایت وتبلیغ میں نہیں، اس لئے اس خدمت کو تمام صحابہ نے، تابعین، تبع تابعین اور تمام علمائے صالحین نے ہمیشہ ادا کیا۔

عصمت اور بے گناہی

نبی ﷺ کی تیسری اہم خصوصیت اس کی معصومی اور بے گناہی ہے یہود میں چونکہ پیشین گو ہونے کے علاوہ نبی کا کوئی صحیح تخیل نہیں، اس لئے ان کی کتابوں میں انبیائے کرام علیہم السلام کی طرف ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جو ان کی شان نبوت کے سراسر منافی ہیں۔ عیسائیوں میں صرف ایک مسیح علیہ السلام کی ذات معصوم مانی جاتی ہے لیکن اسلام میں یہ عقیدہ ہر نبی اور رسول کی نسبت عام ہے اس کے نزدیک تمام انبیا اور رسول گناہوں سے پاک اور معصوم تھے ان سے بتقاضائے بشریت بھول چوک ہو سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی وحی سے ان کی ان

غلطیوں کی بھی اصلاح کرتا رہتا ہے۔ نبوت کے متعلق عقلی حیثیت سے بھی جب تک عصمت کا اصول مان نہ لیا جائے، نبی اور عام حکیم و مصلح میں فرق نمایاں نہیں ہوسکتا اور نہ نبیوں اور رسولوں کی کامل صداقت اور صحت پر اعتبار کیا جاسکتا، اسی لئے اسلام نے اس عقیدہ کا بھی بڑا اہتمام کیا ہے۔ ایک ایک کر کے تمام پیغمبروں کے مقدس احوال کا تذکرہ کیا ہے اور ان واقعات کی تردید کی ہے جو شان عصمت کے خلاف ہیں اور جن کو لوگوں نے ان کے سوانح میں شامل کر دیا ہے۔

عرب کے مشرکوں کا یہ عقیدہ تھا کہ کاہن جو غیب کا حال بتاتے ہیں اور شاعر جو پر جوش اور پر تاثیر کلام نظم کرتے ہیں یہ شیطانوں سے سیکھ کر بتاتے اور کرتے ہیں اور یہی بات وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نسبت بھی (نعوذ باللہ) کہتے تھے، قرآن نے ان کے جواب میں کہا درخت اپنے پھل سے اور شے اپنے آثار سے پہچانی جاتی ہے:

﴿ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۝ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ۝ ﴾ (١٦/ النحل:٩٩، ١٠٠)

”شیطان کا زور ایمان والوں پر نہیں چلتا اور نہ ان پر، جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں، اس کا زور انہیں پر چلتا ہے جو اس سے دوستی کرتے ہیں، اور اپنے رب کا شریک ٹھہراتے ہیں۔“

اس کے بعد آخر تک اس خیال کی تردید کی ہے اور پھر خاتمہ اس پر ہے:

﴿ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ۝ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ۝ ﴾ (١٦/ النحل:١٢٧، ١٢٨)

”اور صبر کر اور تیرا صبر کرنا بھی خدا ہی کی مدد سے ہے اور نہ تو ان پر غمگین ہو اور نہ ان کے فریب سے تنگدل ہو، بے شک خدا ان کے ساتھ ہے، جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکوکار ہیں۔“

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ انبیائے کرام شیطانوں کے فریب سے آزاد، متقی، پرہیزگار اور نیکوکار ہوتے ہیں۔ سورۂ شعراء میں اسی شبہ کا جواب تمام پیغمبروں کے حالات کو سنا کر آخر میں یہ کہہ کر دیا ہے:

﴿ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ۝ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ۝ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ۝ ﴾ (٢٦/ الشعرآء:٢٢١۔٢٢٣)

”کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں، ان پر اترتے ہیں، جو جھوٹ گھڑتے ہیں، گناہگار ہوتے ہیں (لوگوں کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ وہ غیب کی باتیں سن رہے ہیں) کان میں ڈالتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔“

سورۂ جاثیہ میں مخالفین کے جواب میں کہا گیا:

﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۙ يَسْمَعُ آيَاتِ اللَّهِ تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا ۖ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴾ (٤٥/ الجاثية:٧، ٨)

''پھٹکار ہو اس پر جو جھوٹ گھڑنے والا گناہگار ہے، خدا کی آیتوں کو جو اس کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، وہ سنتا ہے اور پھر اپنے غرور پر اڑا ہی رہتا ہے گویا کہ اس نے سنا نہیں، تو اس کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔''

اس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیا علیہم السلام جھوٹ گھڑنے والے اور گناہگار نہیں ہوتے کہ اگر ایسے ہوں تو فرشتوں کے بجائے وہ شیطانوں کے قرین ورفیق ثابت ہوں اور ان کی سچائی اور صداقت مشتبہ ہو جائے اور نیز یہ کہ نبوت کی حقیقت کذب و گناہگاری کے صریح منافی ہے۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا:

﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللَّهِ ﴾ (٣/ آل عمران:٧٩)

''اس آدمی کے جس کو اللہ کتاب اور فیصلہ اور نبوت دے، یہ شایاں نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔''

یعنی پیغمبروں کی دعوت کا منشا خدا کی بندگی کا اعلان ہے نہ کہ لوگوں کو اپنا بندہ اور پرستار بنانا اور یہ گناہ ان سے سرزد نہیں ہوتا۔

اور ایک آیت میں فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَغُلَّ ۚ وَمَن يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَن بَاءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ هُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ ﴾ (٣/ آل عمران:١٦١-١٦٤)

''کسی پیغمبر کا یہ کام نہیں، کہ وہ جو کچھ چوری سے چھپا لے اور جو کوئی چھپا لے گا قیامت کے دن لے کر اس کو حاضر ہو گا، پھر اس وقت ہر شخص کو اس کے کام کا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہ ہو گا، کیا جو خدا کی خوشنودی کی پیروی کرے، وہ اس کے جیسا ہو سکتا ہے، جو خدا کا غضب کمائے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے، انسانوں کے خدا کے نزدیک کئی درجے ہیں اور خدا ان کے کام سے خبردار ہے بے شبہ اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں ایک ایسے

رسول کو بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک و صاف بناتا اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور وہ بے شک اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔"

ان آیتوں میں گو ہر نبی سے غلول (مال چھپانے) کی نفی کی ہے اور فرمایا ہے کہ نبی جو خدا کی خوشنودی کی ہمیشہ پیروی کرتے ہیں وہ ان کے مانند نہیں ہو سکتے جو خدا کی خفگی کماتے ہیں، مگر خصوصیت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ اس سے ایسا جرم سرزد ہو سکے، کیونکہ اللہ کی رضامندی کا طالب اس کی ناخوشی کے کام کا مرتکب نہیں ہو سکتا اور جو دوسروں کو احکام الٰہی سنائے خود اس سے ان احکام کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور جو دوسروں کو پاک و صاف کرنے پر مامور ہے وہ خود گنا ہگار و ناپاک نہیں ہو سکتا۔

انبیا علیہم السلام کے لئے بار بار قرآن نے "چن کر پسند کرنا" کا لفظ استعمال کیا ہے جو سرتاسر ان کی عصمت اور گناہوں سے محفوظ و پاک رہنے پر دلالت کرتا ہے، عام پیغمبروں کے متعلق یہ آیت ہے:

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ﴾ (۲۲/ الحج:۷۵)

"خدا فرشتوں میں سے اپنے پیغمبر کو چن کر پسند کرتا ہے اور آدمیوں سے۔"

☆ چند مخصوص پیغمبروں کی شان میں ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴾

(۳/ آل عمران:۳۳)

"اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام اہل دنیا پر چن کر پسند کیا۔"

☆ خاص حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہوا:

﴿ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ﴾ (۲/ البقرہ:۱۳۰)

"ہم نے اس کو دنیا میں چن کر پسند کیا۔"

☆ حضرت موسیٰ کی نسبت فرمایا:

﴿ اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۴۴)

"میں نے تجھ کو اپنے کلام اور پیغاموں کے لئے لوگوں پر چن کر پسند کیا۔"

ایک آیت میں پیغمبروں کے لئے اصطفاء کے ساتھ خیر (بہتر اور نیکوکار) کی صفت ظاہر کی گئی ہے:

﴿ وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ﴾

(۳۸/ ص:۴۵۔۴۷)

''ہمارے خاص بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کو یاد کرو جو ہاتھوں (قوت عمل) اور آنکھوں (قوت علم) والے تھے ہم نے ان کو آخرت کی خالص نصیحت کے لئے خالص کیا اور وہ ہماری بارگاہ میں چنے ہوئے نیکوکاروں میں تھے۔''

سورۂ انبیاء میں اکثر پیغمبروں کے تذکرہ کے بعد فرمایا:

﴿ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۷۲، ۷۳)

''ان میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا اور ہم نے ان کو وہ پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو راہ دکھاتے تھے اور ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے کی اور نماز کھڑی کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی اور وہ ہمارے پرستار تھے۔''

کیا اس سے زیادہ ان کی عصمت اور بے گناہی کی شہادت ہوسکتی ہے کہ وہ امام و پیشوا اور صالح اور خدا کے پرستار بنائے گئے۔

سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر سب کو صالح فرمایا گیا:

﴿ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ ﴾ (۶/ الانعام:۸۵) ''یہ سب صالحوں میں تھے۔''

پھر آگے چل کر فرمایا:

﴿ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (۶/ الانعام:۸۶)

''ہر ایک کو دنیا والوں پر فضیلت دی۔''

پھر ان کا ذکر کر کے فرمایا:

﴿ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ﴾ (۶/ الانعام:۸۷)

''اور ہم نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا۔''

صالح ہونا، برگزیدہ ہونا اور راہ راست پر ہونا سراسر عصمت اور بے گناہی ہے۔

شقی وسعید اور گناہگار و نیکوکار دونوں کی سیرتوں اور زندگیوں کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ ان میں التباس واشتباہ ممکن نہیں، تاریخ و سیر کی خاموش اور خلق کی گویا زبانیں چیخ چیخ کر اس فرق وامتیاز کی منادی کرتی رہتی ہیں، اس اصول کو قرآن پاک نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ ﴾ (۴۵/ الجاثیۃ:۲۱)

''کیا وہ جو گناہوں کے مرتکب ہیں، یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان کی طرح جو ایمان لائے

اور اچھے کام کیے بنائیں گے، ان دونوں کی زندگی اور موت یکساں ہو، یہ ان کا فیصلہ کتنا برا ہے۔''

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کی زندگی اور موت دونوں ممتاز ہوتی ہیں۔

انبیا علیہم السلام کے وصف میں فرمایا:

﴿ اِلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۳۹)

''جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔''

آنحضرت ﷺ کے اہل بیت اور بیویوں کو جو عزت اور شرف حاصل ہے، وہ نبوت و رسالت ہی کی نسبت سے ہے۔ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی شان میں ہے:

﴿ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۳۲)

''اے پیغمبر کی بیویو! تم عام عورتوں میں سے کوئی ایک نہیں ہو، اگر تم متقی ہو۔''

پھر اہل بیت نبوی کو خطاب کر کے فرمایا کہ ارادۂ ربانی یہ ہے کہ وہ تم کو برائی سے پاک اور صاف ستھرا بنائے:

﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۚ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۳۳)

''اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کر دے، اے نبی کے گھر والو! اور تم کو بالکل صاف ستھرا بنا دے۔''

ظاہر ہے کہ اگر انبیا علیہم السلام کے ازواج واولاد کی شرافت کے لیے گناہ اور بدی کی نجاست مخل ہے تو خود انبیا علیہم السلام کا کیا ذکر ہے۔ایک دوسری آیت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تہمت سے بری کر کے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ؕ ﴾ (۲٤/ النور:۲٦)

''گندیاں، گندوں کے واسطے اور گندے، گندیوں کے لئے اور ستھریاں، ستھروں کے واسطے، اور ستھرے، ستھریوں کے واسطے، یہ ان کی تہمت سے پاک ہیں۔''

یہاں طیب، پاک اور ستھرے سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہے اور اسی ستھرے

پن، پاکی اور طہارت سے ازواج مطہرات کے اخلاقی ستھرے پن، پاکی اور طہارت پر استدلال کیا گیا ہے۔

انبیا درحقیقت مقتدیٰ اور پیشوا اور نمونہ بن کر اس دنیا میں بھیجے جاتے ہیں، اسی لئے فرمایا:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۲۱)

''تمہارے لئے خدا کے رسول میں اچھی پیروی ہے۔''

نیز ان کی اطاعت واجب ہے:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (٤/ النسآء:٦٤)

''ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن اس لئے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔''

اور خاص آنحضرت ﷺ کی نسبت تصریح ہے کہ آپ کی پیروی، خدا کا محبوب بننے کا مستحق ٹھہراتی ہے:

﴿ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾ (۳/ آل عمران:۳۱)

''اگر تم خدا کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم کو چاہے گا۔''

کیا کسی گناہگار اور عصیاں کار کی زندگی، پیروی، اتباع اور نمونہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، تاریکی سے کبھی روشنی نکلی اور گندگی سے پاکی کبھی پیدا ہوئی اور گناہگاروں کی دعوت سے کبھی نیکوکاری پھیلی ہے؟ برائی اور گناہگاریوں کا اصلی سرچشمہ اور منبع شیطان یا انسان کی خود قوت شر ہے لیکن خدا کے خاص بندے اس کے دام فریب سے آزاد ہیں:

﴿ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل:٦٥)

''یقیناً میرے بندوں پر تیرا (اے شیطان) کوئی زور نہیں، تیرا پروردگار اپنے بندوں کی طرف سے سب کچھ کر دینے کو بس ہے۔''

کیا انبیائے کرام علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی بندۂ رب ہو سکتا ہے؟

انسانوں کی گمراہی اور عصیان کاری، وسوسہ شیطانی کا نتیجہ ہوتی ہے، خواہ یہ شیطان خود اپنے دل کے اندر (خناس) چھپا ہو، یا انسان اور جن کی صورت میں ہو، ہر ایک کے فتنہ سے ان کی ذات پاک اور بلند ہے۔

آنحضرت ﷺ کو بعض خود غرض لوگوں نے بعض مشوروں میں پھسلانا چاہا مگر خدا نے پھسلنے نہ دیا اور فرمایا کہ میری رحمت اور مہربانی تجھ پر مبذول ہے، وہ ہر وقت تیری دستگیر ہے اور گمراہی سے تیری نگہبان ہے اور کتاب الٰہی اور حکمت و دانائی جو تجھے عطا ہوئی وہ تیری پاسبان ہے:

﴿ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:۱۱۳)

''اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی، تو ایک گروہ نے تیرے گمراہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، اور وہ گمراہ نہیں کریں گے لیکن خود اپنے آپ کو اور تجھے کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور اس نے وہ سکھایا ہے جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔''

اور یقیناً موقع ومحل کی شہادت سے اس سب سے بڑے فضل سے یہاں مراد عصمت ہے۔

خود نفس انسانی بھی اپنی جھوٹی تمناؤں اور خود غرضانہ آرزوؤں اور خوش نما خیالوں سے لوگوں کو دھوکا دیتا ہے لیکن انبیا علیہم السلام اس فریب تمنا سے بھی پاک ہیں، بشریت کے اقتضا سے یہ تو ممکن نہیں کہ خود اپنے مشن اور جس دعوت حق کو لے کر وہ آئے ہیں اس کی جلد از جلد کامیابی اور لوگوں کے بسرعت قبول ایمان کے متعلق ان کے دل میں تمنائیں اور آرزوئیں نہ پیدا ہوتی ہوں لیکن وہ مصلحت الٰہی کے مطابق نہیں ہوتیں اس لئے اللہ تعالیٰ ان خیالات اور تمناؤں کو ان کے دلوں سے نکال دیتا ہے اور اپنے فیصلہ کو برجا رکھتا ہے، فرمایا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾

(۲۲/ الحج:۵۲)

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا، لیکن یہ کہ جب وہ خیال باندھتا ہے، تو شیطان اس کے خیال میں کچھ ملا دیتا ہے، تو خدا شیطانوں کی ملاوٹ کو مٹا دیتا ہے اور اپنے حکموں کو مضبوط کر دیتا ہے اور خدا دانا اور حکمت والا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام علیہم السلام غلط خیال آرائی کے گناہ سے بھی محفوظ رکھے جاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے متعلق فرمایا گیا ہے:

﴿ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ﴾ (۵۳/ النجم:۲)

''(اے مسلمانو!) تمہارا، صاحب نہ گمراہ ہوا نہ بھٹکا۔''

اس عدم گمراہی اور عدم ضلالت کا تعلق کسی خاص عہد اور وقت سے نہیں ہے بلکہ اس آیت میں آنحضرت ﷺ کے ہر عہدِ سابق اور زمانہ ماضی سے ضلالت اور غوایت کی پوری نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کا دامن سدا ان کانٹوں سے پاک رہا۔

بعض شبہات کا ازالہ

قرآن پاک میں بعض ایسے الفاظ ہیں جن سے ایک ظاہر بین کو یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کے دامن پر عدم معصومیت کے بھی داغ ہیں مگر علمائے محققین نے ان میں سے ہر ایک شبہ کا تشفی بخش جواب دے

دیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ علامہ ابن حزم اندلسی رحمۃ اللہ علیہ نے الفصل فی الملل والنحل (جلد چہارم) میں اور قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے شفاء (قسم ثالث، باب اول) میں، خفاجی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح شفاء (جلد چہارم) میں اور متاخرین میں مُلّا دوست محمد کابلی رحمۃ اللہ علیہ نے تحفة الاخلاء فی عصمة الانبياء میں ایک ایک شبہ کو پوری طرح رد کیا ہے جس سے ظاہر بینی کا پردہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور اصل حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے ان میں سے ہر شبہ کا ذکر کرنا اور اس کا رد کرنا ایک طویل عمل ہے مختصراً اصولی طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ میں جو غلط فہمیاں کسی کو پیش آتی ہیں ان کے دو اسباب ہیں اور ان اسباب کی تشریح کر دینا ہی ان غلط فہمیوں کو دور کر دینا ہے۔

① سب سے پہلی بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انبیا علیہم السلام کا پایہ بندوں میں بلکہ تمام مخلوقات میں خواہ کس قدر بلند ہو اور ان کا دامن گناہ وعصیاں کے گرد وغبار سے کتنا ہی پاک ہو، تاہم اس ذوالجلال والاکرام کے سامنے ان کی حیثیت ایک عبد، ایک بندہ اور ایک عاجز مخلوق کی ہی ہے ایک عبد وغلام خواہ کس قدر اطاعت کیش، کتنا ہی وفا شعار اور مطیع وفرمانبردار ہو، تاہم اپنے آقا کے سامنے اس کو اپنے قصور کا معترف، اپنی تقصیر کا مقر، اپنی کوتاہیوں پر خجل اور اپنی فروگزاشتوں پر نادم ہی ہونا چاہیے۔ اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کی نیکی اور پاکی کی شہادت سے قرآن بھرا ہوا ہے، وہ خدا کی عظمت وجلال اور اس کی رحمت وشفقت کے ذکر میں فرماتے ہیں:

﴿ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴾ (۲۶/ الشعرآء:۸۲)

''اور وہ خدا جس سے جزا کے دن اپنی بھول چوک کی معافی کی پوری امید رکھتا ہوں۔''

نبی کا یہ اعتراف واقرار اور خجالت وندامت اس کا نقص نہیں بلکہ اس کی بندگی اور عبودیت کا کمال ہے اور آقا کو حق پہنچتا ہے کہ اس کے غلام، اطاعت وفرمانبرداری کے جس حیرت انگیز رتبہ تک بھی پہنچتے ہیں وہ ان سے اطاعت کیشی اور وفا شعاری کے اس سے بھی بلند رتبہ کا مطالبہ کرے کہ اس کے دربار میں ان کے عروج و ترقی کی کرسی اور بھی اونچی ہوتی جائے بعض آیتوں میں اگر کسی پیغمبر کو خدا سے مغفرت مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے تو اس کا سبب گناہ کا وجود نہیں بلکہ ہر قدم پر گزشتہ رتبہ اطاعت پر قناعت کر لینے پر تنبیہ اور مزید اطاعت کا مطالبہ ہے، تاکہ وہ اس کے مزید تقریب کا ذریعہ بن سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا ہے:

﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ ﴾ (۱۱۰/ النصر:۱ تا ۳)

''جب اللہ کی مدد آ چکی اور (مکہ) فتح ہو چکا اور لوگوں کو اللہ کے دین میں گروہ در گروہ جاتے دیکھ چکا تو اپنے پروردگار کی پاکی بیان کر اور اس سے معافی چاہ کہ وہ بندے کے حال پر رجوع کرنے والا ہے۔''

غور کرو کہ خدائی مدد آنا، مکہ فتح ہونا، بت پرستی کی بیخ کنی اور لوگوں کا مسلمان ہو جانا کوئی جرم ہے جس سے کوئی معافی چاہیے، اسی طرح سورۂ فتح میں فرمایا:

﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝ ﴾

(٤٨/ الفتح:١-٣)

''ہم نے تجھ کو کھلی فتح دی، تاکہ اللہ تیری اگلی پچھلی خطا کو معاف کرے اور اپنا احسان تجھ پر پورا کرے اور تجھ کو سیدھی راہ چلائے اور تجھ کو مضبوط مدد دے۔''

دوبارہ غور کرو کہ مکہ کی فتح کامل نصیب ہونے کو حضور کی معافی سے بجز اس کے کیا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے حسن خدمت کو قبول فرما کر اپنی خوشنودی کا اظہار فرماتا ہے۔

اس استغفار سے مقصود نعوذ باللہ پیغمبر کی گناہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ اس کی عبدیت کاملہ کا اظہار ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کے خدا کے بیٹے ہونے کے عیسائی اور فرشتے جن کے خدا کی بیٹیاں ہونے کے اہل عرب قائل تھے اور ان کو خدا کا درجہ دیتے تھے، ان کے متعلق قرآن نے کہا:

﴿ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:١٧٢)

''مسیح علیہ السلام کو ہرگز اس سے عار نہ آئے گا، کہ وہ خدا کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتوں کو اور جو اس کی بندگی سے عار کرے گا اور بڑائی چاہے گا تو خدا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔''

اس سے مقصود نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین نہیں بلکہ ان کی عبدیت اور بندگی کا اعلان ہے۔

الغرض انبیا علیہم السلام کا خدا کے حضور میں اپنی کوتاہی کا اعتراف، ان کی گناہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ ان کی عبدیت کاملہ کا اظہار ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی پیغمبر کی نسبت یہ فرمانا کہ میں نے تجھے معاف کیا، اس کی گناہگاری کا اعلان نہیں، بلکہ اپنی پسندیدگی، رضا اور قبولِ تام کی بشارت ہے۔ سورۂ فتح کی جو آیتیں اوپر گزریں ان کو پڑھو تو ظاہر ہوگا کہ چونکہ بت پرستی کی آلائش سے مکہ کی تطہیر اور کل جزیرۂ عرب میں حق و باطل کی تمیز مکہ کی فیصلہ کن فتح پر موقوف تھی اس لئے جب وہ پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کی مسلسل کوششوں اور جاں فروشیوں سے حاصل ہوئی تو خدا نے اعلان فرمایا کہ آج اس فتح سے نبوت کے فرض کی اور تجھ پر میرے سلسلۂ احسانات کی تکمیل ہوئی، پھر خدا آپ سے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کا اور اپنی زبردست مدد کا وعدہ کرتا ہے حالانکہ ان میں سے ہر چیز آپ کو پہلے ہی عنایت ہو چکی تھی، کیا فتح مکہ سے پہلے آپ صراط مستقیم یعنی اسلام پر نہ تھے یا آپ کو زبردست مدد نہیں مل چکی تھی، یہ سب مرتبے حاصل تھے، مگر ان باتوں کے یہاں ذکر سے اللہ

تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اس موقع پر اس طرح اپنی مزید رضا مندی کا اظہار فرمائے اور رسول کی اگلی پچھلی تمام فروگزاشتوں پر (اگر ہوں) خطِ عفو پھیرنے کا اعلان کر کے ان کو نیا خلعتِ فاخرہ عطا اور نئے مراتب جلیلہ عنایت کرے۔عبدیت کاملہ کا یہی راز و نیاز ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے اس فقرہ میں نمایاں ہے، ایک سردار ان کو ''اے نیک استاذ!'' کہہ کر خطاب کرتا ہے اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں:

''تو کیوں مجھ کو نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں؟ مگر ایک یعنی خدا۔'' (لوقا ۱۸، ۱۹)

حضرت مسیح علیہ السلام کے اس فقرہ سے کسی کا یہ قیاس کرنا کہ وہ نیک نہ تھے کس قدر غلط ہوگا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی مشہور دعا میں یہ کہنا کہ

''اور جس طرح ہم اپنے قرض داروں کو بخشتے ہیں تو اپنا دین ہم کو بخش دے۔'' (متی ۔ ٦، ١٢)

ان کی گناہگاری کی دلیل نہیں بلکہ عبدیتِ کاملہ کے اظہار کا ثبوت ہے۔

نکتہ: عربی زبان میں گناہ کے لئے مختلف الفاظ ہیں، مثلاً: ذنب، اثم، حنث، جرم وغیرہ، ان میں سے ذنب کے سوا دوسرے الفاظ کا اطلاق اس حقیقی گناہ پر کیا جاتا ہے جو بالقصد اور جان بوجھ کر کیا جائے لیکن ذنب کا اطلاق ہر غلط فعل پر ہوتا ہے خواہ وہ جان بوجھ کر کیا جائے، یا بن جانے غلط فہمی سے ہو یا سوچ سمجھ کر بھول چوک سے ہو، یا قصداً اور ان کاموں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو درحقیقت عام امت کے لئے گناہ نہیں لیکن انبیا کے حق میں اتنی غفلت بھی مواخذہ کے قابل ہے، اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ حسنات الابرار سیئات المقربین (نیکوں کی نیکیاں، مقربین کی برائیاں ہیں)۔

ع جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل بھی ہے

انبیا علیہم السلام کے استغفار کے موقع پر ہمیشہ ''ذنب'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جرم، اثم یا حنث کا نہیں، ذنب کا لفظ بھول چوک اور غفلت سے لے کر عصیاں تک کو شامل ہے [1] اس لئے کسی نبی کو اگر خدا کی طرف سے استغفار ذنب کی ہدایت کی گئی تو اس کے معنی صریح عصیان و گناہ کے نہیں، بلکہ یہی انسانی بھول چوک اور فروگزاشت ہے جس کی اصلاح و تنبیہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم و لطف عنایت سے فرماتا رہتا ہے اور اسی کے لئے استغفار کا حکم ان کو ہوتا رہتا ہے۔

اسی سے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بھول چوک اور بلا ارادہ غفلت گو امت کے حق میں

---

[1] اس فرق کو عام لغت نویسوں نے ملحوظ نہیں رکھا ہے، مگر جن علمائے لغت نے الفاظ کے فرق پر کتابیں لکھی ہیں، انہوں نے اس کی تصریح کی ہے، ہم یہاں پر بیروت کے مشہور عیسائی لغت نویس وادیب الاب ہنریکوس لامنس کی کتاب فرائد اللغة فی الفروق کی عبارت نقل کرتے ہیں، الاثم الذنب الذی یستحق العقوبة علیه ولا یصح ان یوصف به المجرم، وبین الاثم والذنب فرق من حیث ان الذنب مطلق الجرم عمدًا کان او سهوًا بخلاف الاثم فانه مایستحق فاعله العقاب، فیختص بما یکون عمدًا، والحنث ابلغ من الذنب، لان الذنب یطلق علی الصغیرة، والحنث علی الکبیرة والجرم لایطلق الاعلی الذنب الغلیظ، (ص: ٩٦، ٩٧) مطبوعه کاثو لیکیه، ١٨٨٩ء۔

قابل مواخذہ نہیں، مگر انبیا علیہم السلام کے بلند مرتبہ کے لحاظ سے یہ چیزیں بھی گرفت میں آتی ہیں کیونکہ ان کا قول و فعل شریعت بن جاتا ہے اس لئے شریعت کی حفاظت کے لئے ان کے ہر قول و فعل کی حفاظت بھی ضروری ہے اس بنا پر اگر ان سے احیاناً کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے تو فوراً اس پر تنبیہ کی جاتی ہے اور ان کو ہوشیار کر دیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ان کی یہ چیز معاف کر کے ان کو بشارت سنا دی جاتی ہے اور اس طرح ہر چھوٹے بڑے دانستہ اور نادانستہ تمام گناہوں سے ان کا دامن پاک و صاف رکھا جاتا ہے:

﴿ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيۡهِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۳۷)

''تو آدم نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں تو وہ اس کی طرف رجوع ہوا۔''

﴿ ثُمَّ اجۡتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيۡهِ ﴾ (۲۰/ طٰهٰ:۱۲۲)

''پھر خدا نے آدم کو برگزیدہ کیا پھر اس کی طرف رجوع ہوا۔''

﴿ لَقَدۡ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِىِّ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۱۷)

''یقیناً اللہ نبی کی طرف رجوع ہوا۔''

﴿ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيۡنٰهُ مِنَ الۡغَمِّ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۸۸)

''پھر ہم نے یونس کی دعا قبول کی اور اس کو غم سے رہائی دی۔''

﴿ لِّيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ﴾ (۴۸/ الفتح:۲)

''تاکہ اللہ تیری اگلی پچھلی سب فروگزاشت معاف کرے۔''

کامل اور عام عفو و مغفرت کا یہ مرتبہ بلند خود بندہ کی زندگی میں انبیا علیہم السلام کے سوا کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔

② انبیا کی معصومیت کے مسئلہ میں غلط فہمی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ انبیا کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعل کا جو فرق ہے اس کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، علم اور جہل، ضلالت اور ہدایت اضافی الفاظ میں سے ہیں، علم کی ہر حد کو، علم کے مافوق درجہ کے لحاظ سے جہل اور ہدایت کے بلند سے بلند رتبہ کو اس سے بھی اوپر کے مرتبہ کے لحاظ سے ضلالت کہہ سکتے ہیں۔

انبیا علیہم السلام کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعلیت کا فرق ہے جس طرح تخم میں تمام برگ و بار پوشیدہ ہوتا ہے لیکن وہ اس وقت درخت نہیں ہوتا اور نہ اس میں تنا، شاخیں، پتے، پھول اور پھل ہوتے ہیں اور نہ اس کا عالم پناہ سایہ ہوتا ہے لیکن ایک وقت آتا ہے جب وہی تخم بڑھ کر ایک نیا درخت بن جاتا ہے، اس کے پتے آنکھوں میں ہریالی پیدا کرتے ہیں، اس کے پھول مشام جان کو معطر کرتے ہیں، اس کے پھل کام و دہن میں شہد ٹپکاتے ہیں، اس کے سایہ میں تھکے ماندے مسافر آرام پاتے ہیں، اسی طرح

نبوت کی سابقہ اور لاحقہ زندگیوں میں عظیم الشان فرق ہے اور اسی فرق کی بنا پر اس کی قبل از نبوت زندگی ظہور نبوت کے بغیر تاریکی اور ضلالت اور بعد کی زندگی نور اور ہدایت معلوم ہوتی ہے، جس طرح عام افراد کی زندگی اسلام و ایمان کے بغیر ضلالت اور اسلام و ایمان کے بعد ہدایت بن جاتی ہے، اسی طرح انبیا علیہم السلام کی زندگی ان کی نظر میں نبوت کے بغیر ضلالت اور نبوت کے بعد ہدایت ہوتی ہے، غرض یہ ہے کہ ظہور نبوت سے پہلے کا زمانہ ان کی ضلالت کا اور بعد کا زمانہ ان کی ہدایت کا عہد کہلاتا ہے لیکن ضلالت اور ہدایت کا یہ مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے جو غیر انبیا کے حق میں مستعمل ہے۔ اللہ تعالیٰ جہاں آنحضرت ﷺ پر اپنے احسانات گنا تا ہے فرماتا ہے:

﴿ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝ ﴾

(۹۳/ الضحی:٦۔۸)

''کیا اللہ نے تجھ کو یتیم نہ پایا، پھر پناہ دی اور اس نے تجھ کو بھولا پایا، تو راہنمائی کی اور تجھ کو محتاج پایا، تو بے نیاز کیا۔''

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ یہاں ہدایت سے نبوت اور ضلالت سے قبل نبوت کی زندگی مراد ہے جو نبوت کے بعد کی زندگی کے مقابلہ میں نسبتاً ضلالت ہی ہے۔

''ضلالت'' کے معنی عربی میں صرف صریح گمراہی ہی کے نہیں بلکہ نادانستہ بھول نے، بھٹکنے اور غفلت کرنے کے بھی ہیں۔ عورتوں کی شہادت کے موقع پر ہے:

﴿ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۲)

''کہ بھول جائے ایک عورت تو یاد دلا دے اس کو دوسری۔''

ایک اور آیت میں علم الٰہی کی تعریف میں ہے:

﴿ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۵۲)

''نہ چوکتا ہے میرا رب نہ بھولتا ہے۔''

ان آیتوں میں لفظ ضلالت کا استعمال بتاتا ہے کہ "ضـــال" کے معنی عربی میں اور محاورۂ قرآن میں صرف گمراہ کے نہیں، بلکہ بھول چوک کے بھی ہیں، اسی طرح اس حالت کے بھی ہیں جس میں گمراہی گو گمراہی معلوم ہوتی ہے لیکن ہنوز ہدایتِ الٰہی کا نور اس کے سامنے نہیں چمکا، غلطی کا احساس ہوتا ہے، مگر اس غلطی کی جگہ ہنوز صحت نظر نہیں آتی، جہل کی برائی تو معلوم ہوگئی ہے مگر ہنوز علم کا دروازہ نہیں کھلا ہے اور یہی قبل نبوت کی کیفیت ہوتی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی نبوت سے پہلے ایک ستم شعار قبطی کو گھونسہ مارا تھا، جس کے صدمہ سے وہ اتفاقاً مر گیا تھا، نبوت پا کر جب لوٹے تو فرعون نے ان کو طعنہ دیا کہ تم تو میرے فراری مجرم ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴾ (۲۶/ الشعرآء:۲۰)

''میں نے اس حالت میں کیا تھا، کہ میں چوکنے والوں میں سے تھا۔''

اس چوک اور ضلالت سے مقصد صرف یہی ہے کہ اس وقت میں نبوت کی عزت سے سرفراز نہ تھا ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت سے پہلے کوئی گمراہی کی بات نہیں کی تھی نہ بت کو پوجا تھا نہ فرعون کو سجدہ کیا تھا، نہ کوئی اور شرک کیا تھا، کسی کے طمانچہ مارنے سے اتفاقیہ کسی کمزور کا مرجانا مارنے والے کا بالقصد گناہ نہیں جس کو ضلالت کہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے کو اس وقت ضال کہنے سے مراد نبوت سے سابقہ زندگی ہے اس قبل نبوت کی زندگی کو بعد نبوت کی زندگی کے لحاظ سے جسے یہاں ''ضلالت'' کہا گیا ہے دوسری جگہ اس کو ''غفلت'' (بے خبری) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں آپ کو خطاب ہے:

﴿ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴾ (۱۲/ یوسف:۳)

''ہم تجھے بہترین قصہ سناتے ہیں، کیونکہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن اتارا، اگرچہ اس قرآن کی وحی سے پہلے تو بے خبروں میں تھا۔''

اس بے خبری کے عالم کی تفسیر دوسری آیت میں ہے، جس میں پیغمبر کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت کی زندگی کا فرق ظاہر فرمادیا ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾

(۴۲/ الشوریٰ:۵۲)

''اور اسی طرح ہم نے اپنے (خلوت خانہ) راز سے ایک روح تیری طرف وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان، لیکن ہم نے اس کو نور بنادیا جس سے جس کی چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے راہنمائی کرتے ہیں اور بے شک تو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔''

''کتاب و ایمان'' کے نور و ہدایت ملنے سے پہلے کی یہی وہ کیفیت و حالت ہے جس کو کہیں ضلالت اور کہیں غفلت کہا گیا ہے، اس سے مقصود حقیقی گناہگار، عصیان کاری اور باطنی گمراہی نہیں ہے بلکہ طلب حق تلاش معرفت اور انتظار حقیقت ہے کہ وہی ان کے حق میں ضلالت اور غفلت کا حکم رکھتا ہے آخر وہ وقت آتا ہے جب روشنی چمکتی ہے، روحانی سکون کا چشمہ بہتا ہے اور منزل رسی کے بعد دوسروں کی راہنمائی کا منصب عطا ہوتا ہے

یہ ہدایت کا دور ہے چنانچہ ایک موقع پر انبیا علیہم السلام کے نبوت ملنے کو ہدایت کے لفظ سے ادا فرمایا گیا ہے:

﴿ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن قَبْلُ ﴾ (٦/ الانعام:٨٤)

''اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب علیہما السلام بخشے اور ان میں ہر ایک کو ہدایت دی اور ان سے پہلے نوح کو ہدایت دی۔''

اس ہدایت دینے سے اگر نبوت عطا کرنا مراد ہے تو ظاہر ہے کہ عدم نبوت کا عہد ''ضلالت'' ہی کہلائے گا مگر اس سے مقصد صرف وہ حالت ہوگی جس میں ان کو ہنوز نبوت نہیں ملی تھی اور اس مرتبہ بلند کا انتظار تھا۔

اس تشریح سے یہ واضح ہوگیا کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے حق میں ضلالت سے مقصود گناہگاری، عصیان کاری اور گمراہی نہیں بلکہ عدمِ نبوت کا دور اور رسالت کی زندگی سے پہلے کا عہد ہے جو نبوت اور رسالت کی ہدایت کے مقابلہ میں نسبتاً ضلالت ہے۔

نبی کی بشریت

نبی کی معصومیت اور اس کے دوسرے مقدس خصوصیات کے باوجود اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ نبی خدا کا مخلوق، خدا کا بندہ اور آدمی ہی ہوتا ہے، وہ خدا، خدا کا اوتار، دیوتا یا فرشتہ نہیں ہوتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن کی اصل حقیقت محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے افراط وتفریط کی تاریکی میں گم تھی اور آپ کے فیض علم سے وہ روشن ہوئی، اسلام سے پہلے یہودیوں کی طرح ایسے اہل مذہب بھی تھے جو پیغمبروں کو ایک پیشین گوئی کی صفت کے علاوہ ہر حیثیت سے معمولی انسان سمجھتے تھے، وہ ہر قسم کے گناہ بھی کرتے تھے اور وہ بداخلاقیوں کے بھی مرتکب ہوتے تھے، وہ کفر بھی کرتے تھے، تاہم وہ پیغمبر سمجھے جاتے تھے، دوسری طرف عیسائی بھی تھے جو اپنے ''نجات دہندہ'' کو انسانیت سے پاک، خود خدا، یا خدا کا جزو یا ناسوت ولاہوت کا ایک مجموعہ سمجھتے تھے اور ہندو بھی تھے جو اپنے راہنماؤں کو دیوتا اور اوتار یعنی مجسم خدا یا انسان کے بھیس میں خدا سمجھتے تھے اور جن کو ہر قسم کی خدائی طاقتیں حاصل تھیں۔

اسلام نے اپنی تعلیم ان دونوں کے وسط میں پیش کی، وہ ایک طرف رسولوں کو مخلوق محض، صرف انسان اور پورا بندہ اور خدا کے حکم کے سامنے عاجز و درماندہ تسلیم کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہ ان کو خدا کا برگزیدہ، معصوم، نیک اور خدا کی قدرت سے فیض پا کر برکتوں، سعادتوں اور ہدایتوں کا مرکز اور اس کی اجازت سے عجیب وغریب امور صادر کرنے والا بتاتا ہے اور بے اعتدالی کے ان دونوں خیالات کی جو غلط فہمی پر مبنی ہیں، علانیہ تردید کرتا ہے اہل عرب بھی ہندوؤں، یونانیوں اور عیسائیوں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی راہنمائی کے لئے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مافوق ہستی ہونی چاہیے اور وہ ہستی صرف فرشتوں کی ہے، قرآن نے ان کے اس خیال کی بار بار تکذیب کی ہے اور کہا ہے کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے، تو فرشتہ کو ان کے پاس

رسول بنا کر بھیجا جاتا، اور انسانوں میں فرشتہ بھی آتا تو انسانیت ہی کے پیکر میں آتا تو ایسی حالت میں تم اس فرشتہ کو فرشتہ کب مانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے دُو رخ ہوتے ہیں ایک طرف تو وہ بشریت کے جامہ میں ہوتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، شادی بیاہ کرتے اور پیدا ہوتے اور مرتے ہیں دوسری طرف وہ اپنی روحانیت، بے گناہی، پاک دامنی اور اختصاص نبوت میں انسانوں سے بلند تر ہیں۔ یہودیوں کی طرح جن کی نظر ان کے انسانی رخ پر پڑتی ہے وہ ان کو ہر طرح معمولی انسان سمجھتے ہیں اور عیسائیوں کی طرح جن کی نظر ان کے مافوق انسانی خصائص پر پڑتی ہے وہ ان میں الوہیت کے اوصاف ثابت کرنے لگتے ہیں حالانکہ حق ان دونوں کے بیچ میں ہے وہ اپنے بشری اوصاف کے لحاظ سے بلاشبہ انسان ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے مافوق بشری خصوصیات کی بنا پر مافوق البشر ہوتے ہیں یہی مغالطہ اپنے اپنے پیغمبروں کے متعلق کفار کو ہوتا تھا۔ پیغمبران کے سامنے جب اپنی نبوت اور خدا کی طرف سے آنے کا دعویٰ پیش کرتے تھے تو وہ ان کی بشری خصوصیتوں کو دیکھ کر کہتے تھے کہ تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو، تم خدا کے قاصد اور پیامبر کیسے ہو سکتے ہو؟ چنانچہ کفار نے بار بار پیغمبروں سے کہا:

﴿ أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَّسُولًا ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۹۴)

''کیا خدا نے بشر کو قاصد (رسول) بنا کر بھیجا۔''

وہ بشریت کو رسالت کے منافی سمجھتے تھے اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۹۳)

''میں تو نہیں ہوں مگر انسان رسول۔''

ان کو شبہ تھا کہ کیا گمراہ انسانوں کی انسان ہی رہنمائی کر سکتا ہے:

﴿ أَبَشَرٌ يَهْدُونَنَا ﴾ (٦٤/ التغابن: ٦) ''کیا انسان ہماری راہنمائی کریں گے۔''

یہ وہی شبہ تھا، جس میں پھنس کر عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انسانیت سے منکر ہوئے کہ موروثی گناہ گار انسان کو انسان کا بیٹا کیونکر نجات دلا سکتا ہے اور یہ نہیں سمجھتے کہ انسان موروثی گناہگار نہیں بلکہ وہ گناہگار بھی ہو سکتا ہے اور بے گناہ بھی، بے گناہی اور معصومیت کے لئے انسانیت سے پاک ہونا ضروری نہیں، یہی بات اور کفار کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی، اور انبیا علیہم السلام کو ظاہری اور جسمانی طور سے اپنی ہی طرح انسان سمجھ کر ان کو نبوت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے:

﴿ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ (۱٤/ ابراهيم: ۱۰)

''تم تو نہیں ہو، لیکن ہماری ہی طرح ایک بشر۔''

دوسروں کو نبی کے انکار کرنے پر اس طرح آمادہ کرتے تھے کہ

﴿ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۳) ''نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔''

﴿ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۲٤)

''نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔''

انبیا کے سامنے وہ یہی دلیل پیش کرتے تھے:

﴿ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ ﴾ (۲٦/ الشعرآء:۱٥٤) ''تم تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔''

﴿ مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ ﴾ (۳٦/ یٰس:۱٥) ''تم لوگ تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔''

اور وہ اپنے اس دعویٰ کی صداقت کو ہدایت اور مشاہدہ سے ثابت کرتے تھے:

﴿ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا ﴾ (۱۱/ ھود:۲۷) ''ہم تو تم کو اپنی ہی طرح بشر دیکھتے ہیں۔''

انبیا علیہم السلام نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ ہاں تمہاری ہی طرح ہم بشر ہیں لیکن خدا کے فضل و کرم سے سرفراز ہیں اور یہی تم میں اور ہم میں فرق ہے۔ فرمایا:

﴿ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ ﴾

(۱٤/ ابراھیم:۱۱)

''ان کے رسولوں نے جواب دیا کہ ہم تمہاری ہی طرح بشر ہیں، لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے۔''

ان کفار کی نظر صرف ان کے ایک رخ یعنی عام انسانی پہلو پر پڑتی تھی، انبیا علیہم السلام نے جواب میں اس پہلو کے ساتھ اپنے دوسرے رخ کو بھی ان کے سامنے پیش کر دیا اور کہا کہ ہاں ہم انسان ہیں لیکن ایسے انسان جن پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بارش ہے یعنی نبوت سے سرفراز اور اس کی خصوصیتوں سے ممتاز ہیں۔

دوسرے نبیوں کی طرح ختم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ بار بار ارشاد فرمایا بلکہ وحی الٰہی نے آپ کی زبان سے یہ اعلان کر دیا کہ ''کہہ دو کہ میں تو تمہاری ہی طرح ایک آدمی اور بشر ہوں۔'' اس اعلان نے جو در حقیقت اس غلط عقیدہ کے مٹانے کے لئے تھا جو انبیا علیہم السلام کی شان الوہیت کے متعلق عیسائیوں کے اثر سے لوگوں میں پھیل گیا تھا اور افسوس ہے کہ اس قسم کا غلط خیال اس نبی کی اُمت کے ایک گروہ میں بھی پایا جاتا ہے جو دنیا میں خدا کی توحید کامل کا مبلغ بن کر آیا تھا، دوسری طرف اس اعلان سے ایک تفریط پسند گروہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ پیغمبر اور عام انسانوں میں کوئی فرق اور امتیاز نہیں اور نہ پیغمبروں کو عام انسانوں پر کوئی بلندی و برتری حاصل ہے الا یہ کہ پیغمبروں پر وحی آتی رہتی ہے اور عام انسان اس سے محروم ہیں گویا اس کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر صرف اس لمحہ اور آن میں منصب نبوت کا امتیاز پاتا جاتا ہے جب اس پر کسی قسم کی وحی نازل ہوتی ہے اور اس کے پہلے اور اس کے بعد وہ عام انسان ہوتا ہے اس سے آگے بڑھ کر اسی لئے ایک اور مختصر سے فرقہ نے یہ

دعویٰ کیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ حکم صرف وہی ہے جو وحی قرآنی کی صورت میں آیا اس کے علاوہ آپ کے تمام احکام جو قرآن سے باہر ہیں وہ صرف حاکمانہ اور انتظامی امور ہیں جن کی پیروی کرنا نہ اسلامی شریعت ہے اور نہ اسلام کا جزو ہے، یہ خیالات حقیقت میں دوسرے فرقہ کے مفرطانہ خیالات کے مقابلہ میں تفریطانہ ہیں اور یہ دونوں اعتدال کی حد سے باہر ہیں اور حقیقت ان کے بیچ میں ہے۔

قرآن پاک میں تین جگہ وہ آیتیں ہیں جن میں خاص آنحضرت ﷺ کی بشریت کا اعلان ہے مگر ہر جگہ توحید کامل کے بیان اور خدا کے مقابلہ میں رسولوں کی عبدیت کی تشریح اور اس عقیدۂ باطل کی تردید میں ہیں کہ رسولوں کے ہاتھوں میں یہ قوت ہونی چاہیے کہ وہ خدا سے زبردستی کسی بات کو منوالیں اور سعی و سفارش کر کے قصور معاف کرادیں۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ ان کو جو کچھ حاصل ہے وہ خدائے تعالیٰ کی اجازت، اذن اور عطا سے ہے۔

سورۂ کہف میں ان مشرکوں کا ذکر ہے جو خدا کے بندوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں:

﴿ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَاۗءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴾ (۱۸/ الکھف:۱۰۲)

”کیا وہ جنہوں نے کفر کیا، یہ سمجھے ہیں کہ وہ میرے بندوں (رسول اور فرشتوں) کو میرے سوا اپنا حمایتی بنائیں گے ہم نے ان کافروں کے لئے جہنم تیار کی ہے۔“

قرآن اس خیال کو کفر قرار دیتا ہے، یہ رکوع کا شروع ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے غیر محدود اوصاف و کمالات کا ذکر ہے، پھر ارشاد ہے:

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ (۱۸/ الکھف:۱۱۰)

”کہہ دے کہ میں تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔“

دوسری جگہ یہی تعلیم بعینہٖ سورۂ حٰم السجدہ (فصلت) میں ہے:

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ﴾ (٤١/ حٰمٓ السجدۃ:٦)

”کہہ دے کہ میں تو تمہاری طرح بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے، کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے، اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو، خرابی ہے شرک کرنے والوں کے لئے۔“

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں رسول اسی طرح ایک بندہ ہے جس طرح خدا

کے دوسرے بندے، دعائیں خدا ہی سے مانگنی چاہئیں اور اسی سے اپنے گناہوں کی معافی کی درخواست کرنی چاہیے یہ اختیارات خاص خدا کے بندوں کے نہیں، اس تعلیم سے مقصود حقیقت میں عیسائیوں کے مسئلہ کفارہ اور ان کے اس عقیدہ کی تردید ہے کہ گناہوں کا معاف کرنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اختیار میں ہوگا اور مسلمانوں کو اپنے رسول کی نسبت اس قسم کی باطل عقیدت مندیوں سے بچانا ہے۔ چنانچہ تیسری جگہ قرآن پاک میں جہاں آنحضرت ﷺ سے کفار کا یہ مطالبہ مذکور ہے کہ تم خدا کے پیغمبر ہو تو ہمارے لئے سونے کی چھت بنادو، اپنے ساتھ جلو میں فرشتوں کے پرے لے کر چلو، ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے ہاتھ میں کتاب لے کر سامنے اترو:

﴿ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۹۰-۹۳)

''اور انہوں نے کہا کہ ہم تم پر ایمان اس وقت تک نہیں لائیں گے، جب تک تم ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ نہ بہادو یا تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ نہ ہوجائے یا جیسا تم کہتے ہو آسمان کے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گراؤ یا خدا کو اور فرشتوں کو ضامن بنا کر نہ لے آؤ یا تمہارے لیے سونے کا ایک گھر نہ ہوجائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہاں تمہارے آسمان پر چڑھنے کا ہم کو اس وقت تک یقین نہ آئے گا جب تک تم وہاں سے ایک نوشتہ نہ ہم پر اتار لاؤ جس کو ہم پڑھ لیں۔''

یہ امور مشکل ومحال نہ تھے لیکن نبوت کے اوصاف کو ان بازی گرانہ تماشوں سے تعلق نہ تھا اور اس سے زیادہ یہ کہ اس غلط عقیدہ کا ابطال کرنا تھا کہ پیغمبر میں براہِ راست کچھ خدائی اختیارات ہوتے ہیں اس لئے آپ کو یہ جواب سکھایا گیا کہ آپ فرمائیں:

﴿ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرائیل: ۹۳-۹۵)

''کہہ دے اے پیغمبر! سبحان اللہ! میں تو ایک بشر ہوں رسول اور لوگوں کو جب ان کے پاس ہدایت آئی، ایمان لانے سے باز نہیں رکھا مگر اس خیال نے کہ کیا خدا نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے، کہہ دے کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر ان

پر اتارتے۔"

آنحضرت ﷺ سے بحکم خدا معجزات بھی صادر ہوئے اور ان کی حیرت انگیزی کو انہوں نے تسلیم بھی کیا، پھر بھی یہ خیال کہ ایک بشر رسول کیونکر ہوسکتا ہے، قائم رہا۔

کفار نے معجزات دیکھنے کے بعد بھی یہی کہا:

﴿ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۳)

"یہ تو تمہاری ہی طرح بشر ہے، کیا تم دیکھ بھال کر بھی جادو کے پاس آتے ہو۔"

معجزات کی حیرت انگیزی کو جادو کہہ کر تسلیم کیا مگر پھر بھی ان کو بشریت رسالت کے منافی ہی معلوم ہوئی، انہیں کہا گیا کہ نبوت و رسالت کے اوصاف و خصائص تم سے زیادہ ان کو معلوم ہیں، جن کو تم سے پہلے آسمانی کتابیں عطا ہوئیں، یعنی یہود ان سے پوچھ لو کہ رسول اور نبی بشر ہی ہوتے ہیں:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝ ﴾

(۲۱/ الانبیآء:۷)

"اور ہم نے نہیں بھیجا رسول بنا کر تم سے پہلے لیکن انسانوں ہی کو، جن کو ہم وحی کرتے تھے جاننے والوں سے پوچھو، اگر تم نہیں جانتے۔"

یہی جواب سورۂ یوسف میں دیا گیا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ ﴾

(۱۲/ یوسف:۱۰۹)

"اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے وہ بشر ہی تھے، آبادیوں کے رہنے والے ہم ان پر وحی کرتے تھے۔"

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ نحل میں ہے:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۭ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۝ ﴾

(۱۶/ النحل:۴۳، ۴۴)

"اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے لیکن انسانوں کو جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، تو پوچھ لو کتاب والوں سے اگر تم نہیں جانتے، کھلی نشانیاں اور کتابیں دے کر اور ہم نے تم پر کتاب (ذکر) اتاری، تاکہ تم کھول کر لوگوں سے بیان کرو جو ان کی طرف اتاری گئی اور، تاکہ وہ سوچیں۔"

ہر شخص جو مثلیت اور بشریت کی ان آیتوں پر ایک نگاہ ڈالے گا وہ یہی سمجھے گا کہ ان آیتوں میں جس قسم کی مثلیت اور بشریت کا ذکر ہے اس کا تعلق ظاہری جسمانیت اور جسمانی قویٰ اور مخلوقیت سے ہے ورنہ اخلاقی، روحانی، دماغی، قلبی، علمی اور عملی حیثیت سے وہ انسان رہ کر بھی، غیر نبی انسانوں سے بلند تر اور علانیہ ممتاز ہوتا ہے، نبی اور غیر نبی میں صرف وحی کے امرِ فارق ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی القائے ربانی سے متصف ہونے کے علاوہ بقیہ تمام اوصاف وکمالات یا عیوب ونقائص میں عام انسانوں کے برابر ہوتا ہے یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے اگر کوئی یہ کہے کہ عالم وجاہل میں صرف علم کا فرق ہے ورنہ دونوں برابر کے انسان ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ علم وجہل کے علاوہ علم وجہل کے علانیہ ممتاز ومتضاد اوصاف میں بھی وہ دونوں برابر ہیں اور ان میں عقل، اخلاق، تہذیب، سلیقہ، رائے اور حکمت ودانائی کا کوئی فرق نہیں، حالانکہ ان میں علم وجہل کا فرق کہہ کر درحقیقت ان دونوں کے درمیان علم اور جہل کے سینکڑوں اوصاف، لوازم اور خصائص کا فرق وامتیاز تسلیم کرنا ہے۔

اسی طرح نبی اور غیر نبی میں وحی کا فرق مان کر وحی والے اور بے وحی والے انسانوں میں خود وحی اور عدم وحی کے سینکڑوں لوازم، خصائص اور اوصاف کا فرق تسلیم کرنا پڑے گا وحی ورسالت کو چھوڑ دو، دوسرے انسانی کمالات کو مثالاً لو تو بھی یہی ماننا پڑے گا کہ انسان کے لئے جتنے اوصاف وکمالات ممکن ہیں ان سب کی اعلیٰ سے اعلیٰ جانبِ کمال تک پہنچنا ممکن ہے اور جو وہاں تک پہنچ جاتے ہیں وہ اپنے جسمانی اوصاف وخصائص کے لحاظ سے انسان ہونے کے باوجود اپنے دوسرے قویٰ میں عام انسانوں سے یقیناً بلند اور ممتاز ہوتے ہیں، کوئی کہہ سکتا ہے کہ جسمانی قوت کا ایرانی ہیرو رستم انسان نہ تھا، علم وعقل کا یونانی مجسمہ ارسطو انسانیت سے پاک تھا اور موجودہ دنیا کی بہت سی حیرت انگیز ایجادوں کا مخترع اڈیسن بشر نہیں لیکن اس انسانیت اور بشریت کے اشتراک کے باوجود اپنے اپنے دائرہ میں وہ عام انسانوں سے بلند تر اور ممتاز تر ہیں اور با ایں ہمہ وہ اپنے جسمانی خصائص، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، دیکھنے بھالنے، صورت شکل، ہاتھ پاؤں، ہر ایک چیز میں ویسے ہی انسان ہیں اور مخلوق انسان ہیں بلکہ مجبور انسان ہیں جیسے دوسرے کمزور، جاہل اور بلید الذہن انسان۔ یہی مثال ایک معنی میں انبیائے کرام علیہم السلام کی بھی ہے وہ غیر نبی انسانوں کے ساتھ بہت سے انسانی اوصاف میں شریک ہونے کے باوجود وحی اور اس کے خصائص اور لوازم میں ان سے صریحاً الگ، بلند اور اعلیٰ بلکہ بعض جسمانی خصائص میں بھی ان سے ممتاز ہوتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو صومِ وصال رکھتے دیکھ کر جب صحابہ بھی آپ کی پیروی میں کئی کئی دن تک کا مسلسل روزہ رکھتے ہیں تو آپ ان کو منع کرتے ہیں اور اپنی نسبت فرماتے ہیں: ((اَیُّکُمْ مِثْلِیْ؟ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ)) [1] ”تم میں کون میری مثل ہے میں رات گزارتا ہوں تو میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔“ کیا عام انسانوں کو بھی یہ روحانی غذا اور

[1] صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب التنکیل لمن اکثر الوصال: ۱۹۶۵۔

روحانی سیرابی میسر آتی ہے اور وحی کے علاوہ بعض دوسری حیثیتوں سے بھی مثلیت کی اس میں نفی نہیں ہے؟

اسی طرح نیند کی حالت میں بھی نبی کے قلب اور اس کے احساسات کا غافل نہ ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا۔'' ((وَكَذٰلِكَ الْاَنْبِيَآءُ تَنَامُ اَعْيُنُهُمْ وَلَا تَنَامُ قُلُوْبُهُمْ)) [1] ''اور اسی طرح انبیا کی آنکھیں سوتی ہیں مگر ان کے دل نہیں سوتے۔'' کیا یہی کیفیت عام انسانوں کی نیند کی بھی ہے؟ آنحضرت ﷺ لوگوں کو نماز میں صفوں کو درست رکھنے کی تاکید کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ ''میں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی ویسے ہی دیکھتا ہوں جیسے سامنے سے۔'' [2] کیا عام انسانوں کی قوت بصارت کا یہی عالم ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝ ﴾ (۵۳/ النجم:۱۲) ''کیا پیغمبر جو دیکھتا ہے تم اس میں اس سے جھگڑتے ہو۔'' ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝ ﴾ (۸۱/ التکویر:۲۳) ''اور اس نے فرشتہ کو آسمانوں کے کناروں میں دیکھا۔'' کیا عام انسان بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے انتساب سے امہات المومنین کو جو شرف حاصل ہوا اس کا اقتضا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے امہات المومنین کو خطاب کر کے فرمایا: ﴿ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۳۲) ''اے پیغمبر کی بیویو! تم ایسی نہیں ہو جیسی ہر عورت اگر خدا کا ڈر رکھو۔'' تو اگر پیغمبر کی بیویاں تقویٰ کے بعد عام عورتوں کی مثل نہیں ہیں تو خود پیغمبر تو بدرجہا اس کا سزاوار ہے کہ وہ كَاَحَدٍ مِنَ الرِّجَالِ نہ ہو اور اپنے خصائص میں عام انسانوں سے بدرجہا بلند تر اور ممتاز ہو۔

الغرض نبی اور غیر نبی میں صرف وحی و نبوت کا جو فرق ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ان دونوں میں وحی و رسالت کے تمام لوازم، خصوصیات اور ضروری اوصاف میں فرق اور امتیاز ہے اس لئے کسی انسان کو صاحب وحی ماننے کے ساتھ ہی اس کو ان تمام اوصاف و لوازم اور خصوصیات کا مالک بھی ضرور ہی ماننا پڑے گا۔

اجتہادِ نبوی میں خطا

شبہ کا ایک اور سبب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بعض جگہ آنحضرت ﷺ کو آپ کی چند فروگزاشتوں پر متنبہ کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاص وحی الٰہی کے علاوہ آپ اپنی عقل و مصلحت سے جو حکم دیتے تھے وہ غلطیوں سے پاک نہیں ہوتا تھا اس سلسلہ میں یہ بات تمام مسلمانوں کو تسلیم ہے کہ جن بعض امور میں آپ پر وحی قرآن نازل نہیں ہوتی تھی ان میں آپ اپنے پیغمبرانہ علم و حکم اور فہم نبوی سے فیصلہ فرماتے تھے لیکن غور کے قابل یہ بات ہے کہ اگر آپ کو آپ کے اس فیصلہ پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے کبھی کوئی تنبیہ نہ ہوئی تھی تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ آپ کے تمام فیصلے صحیح اور منشائے الٰہی کے مطابق ہوتے تھے مگر یہ بھی کہنے والا کہہ سکتا

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ما جاء فی قوله: وكلّم الله موسىٰ تكليما: ۷۵۱۷۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب عظة الامام الناس فی اتمام الصلوٰۃ: ۴۱۸۔

تھا کہ اجتہادِ نبوی کے فیصلوں کی صحت وخطا کی ذمہ داری خدا نے نہیں لی تھی اس لئے تنبیہ نہ فرمائی گئی مگر واقعہ ان دونوں کے خلاف ہے۔ صورت یہ ہے کہ بعض فیصلوں پر تنبیہ کی گئی ہے اور بعض پر نہیں، اس سے بداہتا ثابت ہوتا ہے کہ اجتہادِ نبوی ﷺ میں غلطی ہو جانا ممکن ہے مگر اس غلطی پر چند لمحوں کا قرار بھی ممکن نہیں ادھر لغزش ہوئی اور ادھر علام الغیوب کی بے خطا وحی نے اس کی تنبیہ اور اصلاح کی۔ اس واقعہ سے دوسرا نتیجہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام امور واحکام جن کو آپ نے اپنے پیغمبرانہ اجتہاد وعلم وحکمت سے ارشاد فرمایا ان پر عمل کیا اور وحی الٰہی نے ان پر خاموشی برتی تو منشائے الٰہی نے گویا ان کی صحت وصداقت پر اپنی خاموشی سے مہر کر دی اور ان کی حیثیت بمنزلہٗ وحی کے ہو گئی۔

آنحضرت ﷺ کی نبوت کی عمر ۲۳ سال ہے ان پورے ۲۳ سالوں میں ہزاروں واقعات اور امور پیش آئے جن پر آپ نے اپنے اجتہاد اور شرح صدر سے فیصلے صادر کیے مگر ان میں سے کل پانچ باتیں ایسی ہیں جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی اور عجیب تر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کا تعلق حکمِ دینی، شریعتِ ابدی، اعتقاد، عبادات یا شرعی معاملات میں سے ہو بلکہ وہ کل کے کل ایسے امور ہیں جن کی حیثیت تمام تر شخصی یا جنگی ہے اس سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دین وشریعت میں آپ کے یہ پیغمبرانہ اجتہادی فیصلے خطا اور غلطی سے تمام تر پاک تھے۔

اس خطا کے معنی

عام انسانوں کے اجتہادات میں جن اسباب سے غلطیاں واقع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ جن مقدمات پر ان کا اجتہاد مبنی ہوتا ہے وہ غلط ہوتے ہیں یا ان کا علم ان کو قطعی طور سے نہیں ہوتا، یا استقرائے تام نہیں ہوتا، تمثیل پوری نہیں ہوتی، علتِ مشترکہ صحیح نہیں معلوم ہوتی مگر یہ تمام صورتیں اجتہادِ نبوی میں نہیں ہیں کیونکہ اجتہادِ نبوی نہ ان طریقوں پر مبنی ہوتا، نہ وہ غور وفکر، نظر واستدلال اور استقرا وتمثیل کے منطقی واصولی ذرائع پر قائم ہوتا ہے بلکہ وہ نورِ رسالت، فہمِ نبوت، حکمِ ربانی اور شرحِ صدر پر مبنی وقائم ہوتا ہے جن میں یہ بیچ کی منزلیں سرے سے نہیں ہوتی ہیں اسی لئے لفظ اجتہاد جو عام طور پر پہلے معنی میں مستعمل اور مشہور ہے اس سے اس مقام پر التباس سے بچنے کی خاطر احتراز کرنا بہتر ہے۔

ایک اور نکتہ بھی پیش نظر رہے، آنحضرت ﷺ کے پیغمبرانہ اجتہاد میں اگر غلطی ہوئی ہے تو اس غلطی کا یہ مفہوم نہیں ہے آپ نے جو پہلو اختیار فرمایا وہ کوئی گناہ یا بدی یا بداخلاقی کا پہلو تھا بلکہ یہ ہے کہ دو بہتر راستوں میں سے آپ نے بہترین راستے کو چھوڑ کر بہتر راستے کو اختیار کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور بہتر کی جگہ بہترین کی تلقین کی۔

اس قسم کے جو چند واقعات پیش آئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ

بہترین کو چھوڑ کر جس بہتر کو آپ نے اختیار فرمایا اس کا منشا ہمیشہ امت پر رحم وکرم اور شفقت کی نگاہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری یا عارضی رحم وکرم وشفقت کی جگہ ان احکام کی تلقین فرمائی جن میں گو بظاہر سختی معلوم ہوتی ہے مگر علام الغیوب کی دائمی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہی سخت پہلو اختیار کیا جائے۔

ذیل میں ہم ان اجتہادی امور کی تشریح کرتے ہیں جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی ہے:

پانچ اجتہادی امور پر تنبیہ الٰہی

جن اجتہادی امور پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی ہے ان میں:

① پہلا واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے قبل مکہ معظمہ میں جب آنحضرت ﷺ اپنی دعوت کی تبلیغ فرما رہے تھے تو ایک دن قریش کے بڑے بڑے رؤسا آپ کی مجلس میں آ کر بیٹھے آپ ان کو سمجھا بجھا رہے تھے بت پرستی کی برائیاں اور توحید کی خوبیاں ان پر ظاہر فرما رہے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ اس دعوت کو قبول کر لیں کہ اتنے میں ایک مخلص لیکن غریب اور نابینا مسلمان عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ بھی آ کر بیٹھ گئے اور کچھ دریافت کرنا چاہا، قریش کے یہ رؤسا بے حد مغرور اور خود پسند تھے وہ آپ کے جلسوں میں صرف اس لئے آنا پسند نہیں کرتے تھے کہ آپ کی مجلس میں بدحال، بے حیثیت اور ادنیٰ درجہ کے لوگ آیا کرتے تھے۔ اس لئے اس موقع پر جب آنحضرت ﷺ کو ان رئیسوں کی اثر پذیری کے کچھ امکانات نظر آ رہے تھے، عبداللہ بن ام مکتوم کا آ جانا اور پوچھنا ناگوار ہوا کہ ان کے آنے سے ان رئیسوں کی خود پسندی اور بڑائی کے جذبہ کو اشتعال ہوا اور راستہ سے بدک گئے۔

عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی آمد اور دریافت پر یہ ناگواری جو بالکل نیک نیتی سے تھی یعنی اس لئے تھی کہ آپ جانتے تھے کہ عبداللہ بن ام مکتوم تو مسلمان ہی ہیں اس وقت ان کی بات کا جواب نہ دینے میں چنداں حرج نہیں لیکن ان رئیسوں کی ناگواری پورے باشندگانِ مکہ پر اثر انداز ہوگی اگر یہ مسلمان ہو گئے تو مکہ میں اسلام کی اشاعت کی راہ میں پھر کوئی روک باقی نہیں رہے گی یہ سمجھ کر آنحضرت ﷺ عبداللہ بن ام مکتوم کی طرف سے بے التفات ہو کر ان رئیسوں کی تبلیغ وموعظت کی طرف سرتاپا متوجہ رہے، اس پر وحی الٰہی نے حسب ذیل الفاظ میں تنبیہ کی:

﴿ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝ اَنْ جَاۗءَهُ الْاَعْمٰى ۝ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ جَاۗءَكَ يَسْعٰى ۝ وَهُوَ يَخْشٰى ۝ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ ﴾ (۸۰/ عبس: ۱۔۱۱)

”تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ وہ اندھا آیا اور تجھے کیا خبر شاید وہ سنورتا یا سوچتا تو (تمہارا) سمجھانا کام آتا، وہ جو پروا نہیں کرتا سو تو اس کی فکر میں ہے اور اس کے نہ سنورنے کا تجھ پر کوئی

الزام نہیں، وہ جو تیرے پاس دوڑا آیا اور (وہ خدا سے) ڈرتا ہے تو اس سے تغافل کرتا ہے، یوں نہیں، یہ تو نصیحت ہے جو چاہے اس کو یاد کرے۔''

ان آیتوں میں آنحضرت ﷺ کے اس اجتہاد پر کہ ایک پرانے لیکن غریب مسلمان کی مزید ہدایت سے قریش کے رئیسوں کا سمجھانا زیادہ بہتر ہے، تنبیہ کی گئی اور اس نکتہ کو ذہن نشین کیا گیا کہ اسلام کی اصولی بنیادوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے نزدیک امیر وغریب، آقا اور غلام، اونچے اور نیچے کی کوئی تمیز نہیں اس کی نگاہ میں بینا اور نابینا دونوں برابر ہیں، یہ نکتہ تو اس وقت کے فیصلہ میں آپ کے پیش نظر رہا کہ ایک مسلمان اندھے کی دلجوئی سے، ان رئیسوں کی جائز دلجوئی کر کے ان کو اسلام کی طرف مائل کرنا زیادہ بہتر ہے مگر یہ نکتہ نظر انداز ہو گیا کہ اس طرز عمل سے خود اسلام کی بنیادی تعلیم پر کیا اثر پڑے گا اس لئے وحی الٰہی نے تنبیہ کی کہ اسلام کا یہ پیغام دنیا کے لئے صدائے عام ہے، جو چاہے قبول کرے، اس میں کوئی تمیز و تخصیص نہیں علاوہ ازیں اس کا بھی اشارہ کیا کہ یہ رؤسائے قریش جن کے مسلمان ہونے کی آپ اس قدر کوشش فرما رہے ہیں وہ ایمان سے محروم ہی رہیں گے، اس لئے ان کی طرف مزید توجہ بے سود ہے اور ظاہر ہے کہ آپ ان کے حق میں دانائے غیب کے اس فیصلہ سے پہلے آگاہ نہ تھے، اس لئے آپ اپنے موجودہ علم کے مطابق اپنے فعل کو صحیح سمجھ رہے تھے۔

دوسرا واقعہ: سب سے پہلی لڑائی میں مسلمانوں کے مال غنیمت کو حاصل کرنے اور بدر کے قیدیوں سے زرِ فدیہ قبول کرنے کا ہے، اس وقت تک ظاہر ہے کہ مالِ غنیمت اور فدیہ کا قانون نازل نہیں ہوا تھا کہ ابھی اس کا موقع ہی نہیں آیا تھا، مسلمانوں کو مدینہ منورہ آ کر سب سے پہلے سریہ نخلہ میں مالِ غنیمت ہاتھ آیا، اس کے بعد ہی بدر کے معرکہ میں پھر مالِ غنیمت ملا اور ساتھ ہی قریش کے ستر قیدی بھی ہاتھ آئے جن میں اکثر مکہ کے دولت مند اور شرفا تھے، ان قیدیوں کی نسبت مسلمانوں کی مختلف رائیں تھیں، بعض ان کو آگ میں زندہ جلا دینا چاہتے تھے، کچھ لوگ فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینا چاہتے تھے، جس سے ان کو چالیس ہزار درہم ملنے والے تھے نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ جو قوم مدت سے ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف اٹھاتی رہتی ہے، وہ بے کسی، مظلومیت، مغلوبیت اور غربت کے دور سے نکل کر جب پہلے پہل غالب اور دولت مند ہوتی ہے اور اس کو ملکی و مالی قوت پر دسترس حاصل ہوتی ہے تو وہ لمحہ اس کی زندگی میں اخلاقی حیثیت سے بڑا ہی نازک ہوتا ہے۔ غلبہ، قوت اور دولت پا کر بھی اس کے نشہ میں وہ سرشار نہ ہو اور اپنے دل و دماغ پر قابو رکھے یہ بڑا ہی مشکل کام ہے جو مظلوم تھا وہ غالب ہو جائے اور جو ظالم تھا وہ مغلوب ہو جائے اور اس وقت ردِ عمل اپنا کام کر کے مظلوم غالب میں اپنے ظالم مغلوب سے شدید انتقام لینے کا جذبہ نہ پیدا کرے یہ کوئی آسان کام نہیں۔ سیاسی و مذہبی تاریخوں سے تین صدیوں تک برابر سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائیں لیکن قسطنطین کے زمانہ میں جب دفعتاً جو مظلوم تھے وہ غالب اور جو ظالم تھے وہ مغلوب ہو گئے تو عیسوی قوم کا پچھلا جو ہر ایک ایک کر کے رخصت ہو گیا

اوران لوگوں نے جو پہلے مظلوم تھے اس نشہ میں چور ہو کر یہودیوں اور رومی بت پرستوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جس سے اخلاقِ انسانی کی تاریخ آج بھی شرماتی ہے۔

غزوۂ بدر کی غیر متوقع فتح نے مظلوم و بے کس مسلمانوں کے لئے تاریخی دور کا وہی نازک موقع پیدا کر دیا، غریب و تنگدست مسلمانوں کو جو سالہا سال سے کسب معاش سے محروم اور غیر معمولی ضروریات کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے، ان کو غنیمت اور فدیہ کی دولت ہاتھ آئی اور وہی قریش جن کے ظلم وستم سے ان کے بدن زخمی اوران کے سینے داغ دار تھے وہ دفعتہً مغلوب ہوگئے، ان کے بڑے بڑے سرداران کے ہاتھوں سے لڑائی میں مارے گئے، اوران کے ہاتھوں میں قید ہو کر ستر سردار صرف ان کے رحم وکرم پر زندہ تھے۔

اب تک مسلمان نہایت یک دلی، یک جہتی اور خلوص سے اپنی راہ طے کر رہے تھے اور یہ اخلاقی جوہر مظلوموں کی برادری میں اکثر پیدا ہو جاتے ہیں۔لیکن دولت آ کر ان کے بجائے ان میں اختلاف، تفریق اور حرص وطمع اور ذاتی اغراض کے جذبات پیدا کر دیتی ہے، اس اتفاقی دولت اور غیر متوقع فتح وغلبہ نے صحابہ کرام کے لئے امتحان کا وہی نازک موقع پیش کر دیا اور دنیا کے سب سے بڑے راہنما کی قوتِ راہنمائی کے اظہار کا بھی یہی موقع تھا، چنانچہ اس وقت مالِ غنیمت، زرِ فدیہ اور قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق غالب وفاتح مسلمانوں میں اختلافِ رائے رونما ہوگیا آنحضرت ﷺ کے سامنے اس وقت اہم ترین کام تھا، آپ نے امراول کی طرف توجہ فرمائی کہ مظلوم فاتح قوت پا کر اپنا جوہر نہ کھو بیٹھیں، چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان قیدیوں کے قتل کی جو تجویز پیش کی تھی آپ نے رد فرمادی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تجویز کہ فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے قبول فرمائی اوران سے فرمایا کہ ''اے ابوبکر! تمہاری مثال ابراہیم اور عیسیٰ علیہما السلام کی ہے اور اے عمر! تمہاری مثال نوح اور موسیٰ علیہما السلام کی ہے [1] آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نیک دلی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رحم دلی کی مثال کی پیروی کی اور بدر کے ان قیدیوں کی جان بخشی فرمائی اور قتل کے بجائے زرِ فدیہ ادا کر دینے پر رہائی کا حکم دے دیا اور جو ان میں نادار تھے ان کو چند مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دینے پر آزادی کا فرمان جاری کر دیا اور صحابہ کو تاکید کی کہ ان کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کریں، چنانچہ بعضوں کا یہ حال تھا کہ وہ خود کھجور پر قناعت کرتے تھے اور اپنے قیدیوں کو روٹی کھلاتے تھے لیکن وحی الٰہی کی نگاہ میں اس سے زیادہ اہم پہلو ان غریبوں کا دفعتہً مال ودولت کی حرص وطمع میں مبتلا ہو جانا تھا، چنانچہ یہی صورت پیش آئی مالِ غنیمت کے فراہم کرنے والوں نے دعویٰ کیا کہ اس پر ہم نے لڑائی میں قبضہ کیا ہے اس لئے ہمارا ہے، لڑنے والے نوجوانوں نے دعویٰ کیا کہ ہماری تلواروں سے فتح حاصل ہوئی ہے اس لئے اس کے اصلی حق دار ہم ہیں، جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کر رہے تھے وہ کہتے تھے کہ سب سے نازک اور خطرناک فرض ہمارا تھا، اس لئے ہم کو ملنا چاہیے [2] یہی اختلاف زرِ فدیہ کی ملکیت کی نسبت بھی ہوا ہوگا جیسا کہ سورۂ انفال

[1] مستدرك حاكم، كتاب المغازی، ج۳، ص: ۲۱۔

[2] سیرت ابن ہشام، ذكر النبيء ببدر والاسارٰی، ج ۱، ص: ۳۹۱ مطبوعہ محمد علی مصر۔

کی ابتدائی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے:

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝ ﴾ (۸/ الانفال:۱)

''(اے پیغمبر)! تجھ سے (تیرے ساتھی) غنیمت کا حکم پوچھتے ہیں، تو کہہ دے کہ مال غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا ہے تو اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرو اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرو۔''

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ سورۂ انفال کے نزول کی کیا وجہ ہے، تو کہا:

فينا اصحاب بدر نزلت حين اختلفنا في النفل وساء ت فيه اخلاقنا فنزعه اللّٰه من ايدينا فجعله الى رسول الله ﷺ فقسمه رسول الله ﷺ بين المسلمين عن سواء۔ ❶

''یہ سورۂ ہم بدر والوں کے متعلق نازل ہوئی جب مال غنیمت میں ہم نے باہم اختلاف کیا اور اس میں ہمارے اخلاق برے ہوگئے تو خدا نے اس کو ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا اور رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں دے دیا، تو آپ نے تمام مسلمانوں کے مابین برابر تقسیم فرما دیا۔''

یہی وہ تنبیہ ہے جو وحی الٰہی نے آنحضرت ﷺ کے اس فیصلہ ❷ پر کی اور آیت اتری:

﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖۗ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۝ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖؗ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝ ﴾

(۸/ الانفال:۶۷، ۶۹)

''کسی پیغمبر کو زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں، تا کہ زمین میں فساد کریں، تم لوگ دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور دانا ہے اگر خدا کی طرف سے یوں ہونا مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو تمہارے اس لینے پر تم کو بڑی سزا ملتی، تو اب جو تم نے لوٹ میں پایا، حلال و پاک کر کے کھاؤ اور اللہ کا ادب کرو، اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

اسی قدر نہیں بلکہ ان قیدیوں کو جن سے زرفدیہ وصول ہو، یا وصول کیا جارہا تھا، اس کے بعد ہی یہ تسلی دی گئی:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝ ﴾ (۸/ الانفال:۷۰)

❶ سیرت ابن ھشام ذکر الفئ ببدر والاساری، ج۱، ص: ۳۹۱، ۳۹۲۔
❷ سیرت ابن ھشام، ج ۱، ص: ۳۹۱، ۳۹۲۔

"اے پیغمبر! تمہارے ہاتھوں میں جو قیدی ہیں، ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں نیکی پائے گا، تو تم کو اس سے بہتر چیز دے گا، جو تم سے لی گئی اور تم کو معاف کرے گا اور اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ یہ تنبیہ قیدیوں کے لئے زرفدیہ لے کر رہا کرنے اور قتل نہ کیے جانے پر ہوئی [1] حالانکہ ظاہر ہے کہ جن قیدیوں سے زرِفدیہ لئے جانے پر اللہ تعالیٰ نے ان سے ہمدردی فرمائی اور اگر وہ حسن نیت سے ظاہر کریں، تو ان کی مغفرت کا وعدہ اور اس دنیاوی خزف ریزہ سے جو ان سے بطور فدیہ لیا گیا، ان کو بہتر دولت دیے جانے کی امید دلائی، کیا ان کا قتل زرفدیہ لینے سے کم سزا ہوتی؟ اور جن سے فدیہ لیا گیا ان کے قتل کئے جانے پر ان کے قاتلوں پر اس سے زیادہ سرزنش اور مقتولوں سے اس سے زیادہ ہمدردی نہ کی جاتی۔

بہر حال وہی مال غنیمت اور زرفدیہ جس کو اس وقت آنحضرت ﷺ نے صاف وصریح وحی آنے سے پیشتر قبول فرمالیا تھا اور جس پر تنبیہ ہوئی وہ آخر کار اجتہادِ نبوی کے مطابق مناسب، موقع پر جائز وحلال وطیب ہی ٹھہرالیا گیا اور غلطی باقی نہیں رہی، مالِ غنیمت لینے کے متعلق ﴿كُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ﴾ کا حکم اسی وقت آ گیا، اور فدیہ لینے کی اجازت ﴿فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً﴾ الفاظ میں بعد کو مناسب زمانہ میں آ گئی اور اس مال و دولت کی حرص وطمع سے اس وقت جو بداخلاقی پیدا ہونے والی تھی اس کا ازالہ ہمیشہ کے لئے اس طرح کر دیا کہ اس کی تقسیم کا ابدی قانون بنا دیا گیا اور اس میں تمام ضروری مستحقین کے حصے لگا دیے گئے۔

تیسرا واقعہ: تیسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ غزوۂ تبوک کے لئے جا رہے تھے جس میں بکثرت مسلمانوں کی شرکت کی ضرورت تھی کہ مقابلہ رومیوں کے دل بادل فوج سے تھا اور کسی منظم سلطنت سے ٹکر کھانے کا یہ پہلا موقع مسلمانوں کو پیش آیا تھا اور موسم بھی نہایت گرم اور سخت تھا۔ تیس ہزار مسلمانوں کی جمعیت روانہ ہوگئی مگر کچھ مخلص مسلمان مجبوراً چھوٹ گئے اور اکثر منافقین نے جان بوجھ کر اس کی شرکت سے جی چرایا، آپ واپس آئے تو عدم شرکت کے قصوروار منافقین آ آ کر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے عذرات بیان کرنے لگے، آپ نے ان کا اعتبار کر کے رحم فرما کر ان کے قصور سے درگزر کیا، اس پر تنبیہ ہوئی:

﴿وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝﴾ (۹/ التوبة: ۴۲، ۴۳)

"وہ خدا کی قسمیں کھائیں گے اگر ہم مقدور رکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ نکلتے، وہ اپنی جانوں کو برباد کرتے اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں، اللہ تجھ کو بخشے تو نے ان کو رخصت کیوں دی،

[1] مزید تفصیل کے لیے دیکھو اسی سیرت النبی ﷺ جلد اول میں غزوۂ بدر کا بیان۔

جب تک تجھ پر وہ کھل نہ جاتے جو ان میں سچ بولتے اور تو جان لیتا جھوٹ بولنے والوں کو۔''

ظاہر ہے کہ آپ علم غیب سے آگاہ نہ تھے اور ان کے واقعی حالات سے بے خبر تھے اس لئے بظاہر ان کے قول پر اعتبار ہی کرنا تھا اور وہی آپ نے کیا مگر علام الغیوب نے حقیقت حال سے باخبر فرما کر ان کے جھوٹ کا پردہ چاک کیا بہرحال یہاں بھی منشائے خطا، اگر خطا سمجھی جائے، تو وہی ترحم کی شان تھی۔

چوتھا واقعہ: منافقین کی نسبت آپ ﷺ کو اطلاع دی گئی تھی کہ ان کے حق میں آپ کی دعائے مغفرت قبول نہ ہوگی اور فرما دیا گیا تھا کہ:

﴿ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ ﴾ (۹/ التوبة:۸۰)

''تو ان کی مغفرت کی دعا مانگے، یا نہ مانگے اگر ستر دفعہ بھی ان کی مغفرت کی دعا مانگے تو ہرگز ان کو خدا نہ بخشے گا، یہ اس لئے کہ انہوں نے خدا کا اور اس کے رسول کا انکار کیا۔''

اس حکم کے آنے کے بعد عبداللہ بن ابی بن سلول کا انتقال ہوا، یہ منافقوں کا سردار تھا، اس کا لڑکا مخلص مسلمان تھا۔ اس نے آکر آپ سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی، جس کو آپ فرط کرم سے رد نہ فرما سکے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض بھی کی، یارسول اللہ ﷺ! اس کے عدم مغفرت کے متعلق تو حکم ہو چکا ہے فرمایا: ''میں ستر دفعہ سے بھی زیادہ اس کی مغفرت کی دعا مانگوں گا۔'' [1] بہرحال آیت بالا میں گو آپ کے مغفرت مانگنے اور نہ مانگنے دونوں کو بے کار و بے سود بتایا گیا تھا مگر ان کے حق میں سرے سے دعائے مغفرت نہ مانگنے کی کوئی ممانعت نہ تھی اس لئے آنحضرت ﷺ نے غایت شفقت سے اس بیکار فرض کو انجام دیا، تاکہ اس کے مخلص مسلمان فرزند کی دل شکنی نہ ہو اور اس لیے تغافل فرمایا کہ گو ایک مسلمان کی دلجوئی تو ہوگی مگر بیسیوں منافقین کو اپنے چھپانے میں کامیابی ہو جائے گی اور وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر فتنوں کا باعث بنیں گے اس لئے حکم ہوا:

﴿ وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ۝ ﴾ (۹/ التوبة:۸٤)

''اور نہ کبھی ان میں سے کسی کے جنازہ کی نماز پڑھ اور نہ ان کی قبر پر کھڑا ہو، بے شک انہوں نے خدا اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اسی گناہ گاری کی حالت میں مرے۔''

پانچواں واقعہ: اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی بعض بیویوں کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے کسی مباح، چیز کو جو آپ ﷺ کو بہت مرغوب تھی اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، یعنی اس کے کبھی نہ استعمال

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ براءۃ: ٤٦٧٢۔

کرنے کا عہد فرما لیا تھا، ظاہر ہے کہ ہر شخص پر مباح چیز کا کھانا فرض نہیں، اس کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی خوشی سے یا کسی دوسرے کی رضامندی کے لئے اس کے نہ کھانے کا عہد کر لے، اس لئے آنحضرت ﷺ نے بعض بیویوں کی خاطر جن کو وہ شے پسند نہ تھی اس کو اپنے اوپر حرام کر لیا تو ظاہر ہے کہ آپ کا اپنی بعض بیویوں کی خاطر داری کے لئے ایسا کرنا الزام کے قابل نہیں کہ آپ نے بحیثیت شوہر کے ان کی اتنی دلجوئی کو بھی عورتوں کے ساتھ عدل وانصاف کے مناسب سمجھا، مگر اس مسئلہ کی ایک دوسری حیثیت بھی تھی اور وہ یہ کہ بحیثیت ایک پیغمبر کے ایک حلال وجائز چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور اس کے نہ کھانے کا عہد کرنے سے آپ کی اقتدا میں امت کے عام افراد بھی اس کو ناجائز نہیں تو ناپسند ضرور ہی کرتے اور یہ ایک طرح سے شریعتِ الٰہی میں تبدیل وتحریف کا، مترادف ہو جاتا اس لئے حکم آیا کہ ان امور میں پیغمبروں کو کسی کی دل جوئی اور خاطر داری کی پروانہ چاہیے۔ فرمایا:

﴿ يَآأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ ۚ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ ﴾

(٦٦/ التحریم:١)

''اے پیغمبر! جس کو اللہ نے تیرے لئے حلال کیا ہے، اس کو حرام کیوں کرتا ہے، اپنی بیویوں کی مرضی چاہتا ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا آپ کو نبی کہہ کر خطاب کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ بحیثیت ایک انسان اور شوہر ہونے کے آپ ایسا کر سکتے تھے مگر پیغمبر کی حیثیت سے آپ کو یہ اختیار نہیں۔

الغرض یہی وہ پانچ واقعے ہیں جن میں آپ کی اجتہادی خطا ثابت کی گئی ہے مگر تفصیلات سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ان کو خطا کہنا درحقیقت مجاز ہے کہ پیغمبر کی بلندی اور معصومی کو پیش نظر رکھ کر اس مجازی خطا کی بھی اجازت نہیں اور اسی لئے وحی الٰہی نے ان میں سے ہر موقع پر تنبیہ کی اور اپنے صحیح فیصلہ سے راہنمائی فرمائی۔

اب کیا کسی کا شبہ یہ بھی ہے کہ جس طرح آنحضرت ﷺ کو یہ معمولی مسامحات پیش آئے جن کی تنبیہ و اصلاح ہر وقت وحی الٰہی نے کی، ایسے ہی ممکن ہے کہ آپ کو اور بھی ایسے مسامحات پیش آئے ہوں جن کی تنبیہ وتصحیح کی حکمت الٰہی نے پروانہ کی اور خاموشی برتی، اگر کسی کو یہ شبہ ہے تو درحقیقت رسالت ونبوت کی مرتبہ شناسی اور دینِ الٰہی وشریعتِ ربانی کی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کے طرق رشد وہدایت کی معرفت سے کوسوں دور ہے، رسولوں کی بعثت اس لئے ہے کہ وہ غلط کار انسانوں کو ان کی غلطی سے نکال کر حق وصواب کی تعلیم دیں، نہ اس لئے کہ ان کے ذریعہ اُلٹے ہدایت کے بجائے مزید ضلالت کا اضافہ ہو استغفر اللہ ثم استغفر اللہ اس لئے ناممکن ہے کہ رسولوں کے ہاتھوں اور زبانوں سے کوئی ایسا کام یا حکم صادر ہو جو حکمت الٰہی کے مطابق نہ ہو اور پھر وہ اس کی تصحیح اور راہنمائی سے تغافل برتے اور انسانوں کو خود اپنے رسولوں کے ذریعہ گمراہ ہونے دے۔

پیغمبرانہ اجتہاد ورائے علم کا وہ کوثر ہے جس کی دھاریں دماغ سے نہیں بلکہ دل کے سرچشمہ سے بہتی ہیں جو انسانی رائے و تجربہ سے نہیں بلکہ الہام الٰہی، القائے ربانی، حکمتِ یزدانی، فہمِ رسالت، ملکۂ نبوت سے ماخوذ ہے اور جس کی نسبت محرمِ اسرارِ شریعت، عمر فاروق برسرِ منبر یہ فرماتے ہیں:

یا ایها الناس! ان الرأی انما کان من رسول اللہ ﷺ مصیبا لان اللہ کان یریه وانما هومنا الظن والتکلف۔ [1]

''اے لوگو! آنحضرت ﷺ کی رائے غلطی سے پاک تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو راہ دکھاتا تھا اور ہماری رائے، ہمارا گمان اور از خود کہنا ہے۔''

وہ رائے نبوی ﷺ جو خدا کے بتانے اور دکھانے سے قائم ہوئی ہو، ظاہر ہے کہ بمنزلۂ وحی کے ہے اور اس کا نام بشری اجتہاد اور انسانی رائے نہیں، بلکہ نبوی اجتہاد اور پیغمبرانہ رائے ہے جو عملاً وحی الٰہی کی ہم مرتبہ اور کلامِ ربانی کی ہم پایہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خطبہ میں جو کچھ کہا ہے درحقیقت وہ خود کلام پاک سے مستنبط ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:١٠٥)

''ہم نے تجھ پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری، تاکہ لوگوں کے درمیان جو اللہ تجھ کو سوجھائے فیصلہ کرے اور تو نہ ہو دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو جو دکھایا، سوجھایا اور رائے پیدا کرائی جاتی تھی وہ خدا کی طرف سے ہوتی تھی، یہی پیغمبرانہ رائے ہے جس کی نسبت خود آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((انّما اقضی بینکم برأی فیما لم ینزل علیّ فیه)) [2]

''میں تم لوگوں کے درمیان اس مسئلہ میں جس کی نسبت مجھ پر وحی نہیں ہوئی، اپنی رائے سے فیصلہ کرتا ہوں۔''

یہ فیصلہ اگر، غلط ہوتا تو فوراً وحی الٰہی دست گیری کرتی اور صحیح راستے پر لے آتی، جیسا کہ گزشتہ پانچوں واقعات سے ظاہر ہے۔

ایک غلط استدلال

اس آیت پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقدمات کے فیصلوں میں آپ کو ''ارائتِ الٰہی'' ہوتی تھی

---

[1] ابوداود، کتاب القضاء، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ: ٣٥٨٦۔

[2] ابوداود، کتاب القضاء، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ: ٣٥٨٥۔

یعنی خدا کی طرف سے آپ کو رائے سوجھائی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ ارائتِ الٰہی (خدا کی طرف سے سجھایا جانا) تا کہ آپ کتابِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں غلط نہیں ہوسکتی، لیکن ابوداؤد وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اہلِ مقدمہ سے فرمایا:

''میں ایک بشر ہوں تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو اور شاید تم میں سے بعض زیادہ زبان آور ہوں، جو اپنی دلیل کو خوبی سے بیان کر سکتے ہوں، تو میں جیسا سنتا ہوں ویسا فیصلہ کر دیتا ہوں، تو میں اگر کسی کو وہ حق دلا دوں جو اس کا نہیں، بلکہ اس کے بھائی کا ہے، تو وہ نہ لے کہ میں اس کو آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔'' [1]

اس سے ایک غلط فہم یہ استدلال بھی کر سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے فیصلے ہمیشہ غلطی سے پاک نہیں ہوتے تھے، اس لئے اُمت آپ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی پر مجبور نہیں، لیکن ایسا خیال کرنا سراسر مغالطہ ہے اصل یہ ہے کہ مقدمات میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک واقعہ کی اصلی روداد جس کو ہر مدعی اور مدعا علیہ اپنے دعویٰ کے مطابق بنا کر اپنے اپنے رنگ میں بیان کرتا ہے، اس کے بعد دوسری چیز اس بیان کردہ روداد کے مطابق صحیح اور عادلانہ حکم اور فیصلہ ہے جو تمام تر مقدمہ کی اس روداد پر مبنی ہوتا ہے جو حاکم وقاضی کے سامنے بیانات اور شہادتوں کے ساتھ پیش ہوتی ہے، یہ بات کہ واقعہ کی اصلی روداد کیا ہے اور ان میں سے کون صحیح کہہ رہا ہے، علم غیب سے تعلق رکھتی ہے جس کا دعویٰ کسی نبی کو نہیں اور اگر ہو بھی تو یہ دعویٰ بجائے خود مسلم ہے کہ قاضی کا ذاتی علم دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کا مبنیٰ نہیں قرار پا سکتا، اس کے لئے فریقین کے بیانات، شہادتیں اور دلائل ہی بکار آمد ہیں، آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امرِ اول کے متعلق عموماً آپ کو غیب کا علم عطا نہیں ہوا، لیکن دوسری چیز یعنی جس روداد کو آنحضرت ﷺ نے صحیح باور کیا اس کے مطابق آپ کا فیصلہ کبھی کبھی صحیح وصواب اور عادلانہ نہیں ہوتا تھا یہ کہنا رسول و نبی کی شان کی توہین وتحقیر ہے اور اس ''ارائتِ الٰہی'' کے خلاف ہے جس کا شرف مقدمات کے فیصلہ میں آپ کو بخشا جاتا تھا اس لئے جو غلطی فیصلوں میں آپ سے ہوسکتی تھی وہ فریقین میں سے کسی ایک کی دلیل وشہادت کو سن کر اس کے صحیح یا غلط، مطابقِ واقعہ یا مخالفِ واقعہ سمجھنے میں لیکن جس کو آپ نے صحیح باور فرمالیا اس کے مطابق مناسب وصحیح حکم وفیصلہ کرنے میں آپ سے کبھی غلطی نہ ہوئی اور نہ ہوسکتی تھی اور امت آپ کی پیروی، آپ کے ان قضایا اور فیصلوں میں کرتی ہے نہ کہ نزاعِ مذکور کے گزشتہ واقعات اور گزشتہ مقدمات کے صحیح یا غلط باور کرنے میں (فَشَتَّانَ بَيْنَهُمَا)۔

آنحضرت ﷺ کے اس اعلان میں نکتہ یہ ہے کہ شاید فریقین میں سے کوئی غلط بیان یا جھوٹا، برسرِ باطل جو اپنے مقدمہ کی روداد زیادہ خوبی سے بنا کر آپ کی عدالت سے موافق فیصلہ حاصل کر لے یہ سمجھے کہ گو

[1] ابوداود، کتاب القضاء، باب فی قضاء القاضی اذا أخطأ:٣٥٨٣۔

حقیقت میں میرا حق نہ تھا، لیکن اب جب عدالت نبوی ﷺ نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا تو میری ملکیت ثابت ہوگئی اور غصبِ حق کے گناہ سے بریت ہوگئی تو اس کا ایسا سمجھنا صحیح نہ ہوگا قانوناً حکم نافذ ہو جائے گا مگر عنداللہ جو برسرِ حق تھا وہ حق ہی رہے گا اور جو برسرِ باطل تھا وہ باطل ہی رہے گا اور جو اصل مالک تھا وہی مالک رہے گا اور جو غاصب ہے وہ غاصب ہی ٹھہرے گا، اسی اعلان کا اثر تھا کہ جب آنحضرت ﷺ نے ایک مقدمہ میں فریقین کو اس حقیقت سے مطلع فرمایا تو دونوں رو پڑے اور دونوں ایک دوسرے کے حق میں دست بردار ہونے پر آمادہ ہو گئے۔ [1]

آنحضرت ﷺ رودادِ مقدمہ کو سامنے رکھ کر جو فیصلے فرماتے تھے وہ تمام تر حق، منصفانہ اور صحیح ہوتے تھے اور ان کی اطاعت سے انحراف کفر و نفاق تھا اسی لئے ارشاد ہوا کہ

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴾ (٤/ النسآء:٦٥)

''سو قسم ہے تیرے رب کی، وہ مومن نہ ہوں گے، جب تک وہ تجھ کو حکم نہ مانیں، پھر اپنے دلوں میں تیرے فیصلہ سے تنگی نہ پائیں اور مان کر قبول کریں۔''

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِينًا ﴾ (٣٣/ الاحزاب:٣٦)

''اور کسی ایماندار، مرد یا عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے، تو بھی اس کو اپنے کام کا اختیار رہے، اور جو خدا اور اس کے بے حکم چلا، وہ صریح گمراہ ہوا۔''

کیا امت کو رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلوں کے بے چون و چرا قبول کر لینے کا خدا کی طرف سے تاکیدی حکم برسرِ باطل پہلو پر ہو سکتا ہے چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ آپ کا کوئی فیصلہ کبھی ظالمانہ اور غلط نہیں ہو سکتا:

﴿ وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُونَ ۝ وَإِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ۝ أَفِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ أَمِ ارْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَنْ يَّحِيفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهٗ ۚ بَلْ أُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ ﴾ (٢٤/ النور:٤٨۔٥٠)

''اور جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں، تا کہ رسول، ان کے درمیان فیصلہ کر دے، تو ان میں ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور اگر ان کو کوئی حق پہنچتا ہو، تو قبول کر کے

[1] ابوداود، کتاب القضاء، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ:٣٥٨٤۔

چلے آئیں، کیا ان کے دلوں میں روگ ہے یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ ناانصافی کرے گا، بلکہ وہی بے انصاف ہیں۔''

عقل بشری

اس میں بھی شک نہیں کہ وحی اور ملکۂ نبوت کے علاوہ نبی میں نبوت ورسالت کے فرائض سے باہر کی چیزوں میں اس کی عقل وہی ہوتی ہے جو عام انسانوں کی ہوتی ہے اور جس میں اجتہادی غلطی کا ہر وقت امکان ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے نزدیک اجتہاد کی یہی وہ دوسری قسم ہے جس میں نبی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے کہ اس کا مدار وحی والہام اور ملکۂ نبوت پر نہیں بلکہ انسانی علم وتجربہ پر ہوتا ہے اور یہی وہ قسم ہے جس کا اتباع پیروؤں پر واجب نہیں اور اس کی بہترین مثال کھجور کی کاشت کا واقعہ ہے۔ [1]

صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ کے بعض باغوں میں گزرے دیکھا کہ کچھ لوگ کھجوروں کے درختوں پر چڑھ کر کچھ کر رہے ہیں، آپ نے دریافت فرمایا: ''یہ کیا کر رہے ہیں؟'' ایک ہمراہی نے کہا کہ یہ مادہ کھجوروں میں نر کھجوروں کے پھول ڈالتے ہیں کہ پھل زیادہ آئیں، فرمایا: ''میں تو نہیں سمجھتا کہ اس سے کچھ فائدہ ہوگا۔'' ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر ایسا نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔'' اس نے جا کر باغ والوں سے آپ کا یہ فقرہ بیان کر دیا، صحابہ نے جو سراپا اطاعت تھے اس پر عمل کیا اور ایسا کرنا چھوڑ دیا پھل اس سال کم آئے، یا کم ٹھہرے آپ کا پھر گزر ہوا، تو ان لوگوں نے صورتِ حال عرض کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے تو یونہی ایک بات سمجھ سے کہہ دی تھی، اگر ان کو اس عمل سے فائدہ ہوتا تھا تو وہ کریں۔'' پھر فرمایا:

((اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَیْءٍ مِّنْ دِیْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهٖ وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَیْءٍ مِّنْ رَّاْیِیْ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ)) [2]

''میں تو ایک آدمی ہی ہوں، جب تمہیں دین کا کوئی حکم دوں تو اس کو قبول کرو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں ایک آدمی ہوں۔''

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ)) [3] ''تم اپنے دنیا کے کام کو زیادہ جانتے ہو۔''

تیسری روایت کے الفاظ ہیں:

((فانی انما ظَنَنْتُ ظنا فلا تؤاخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئا

---

[1] حجة الله البالغة، باب بیان اقسام علوم النبی ﷺ، ج ۱، ص: ۱۰۲ پر اس کی تشریح موجود ہے۔
[2] مسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قاله شرعا......: ۶۱۲۷۔
[3] ایضا: ۶۱۲۸۔

فخذو به فانی لن اکذب علی اللہ عز و جل)) 1

''میں نے ایک گمان سا کیا تھا، گمان پر مجھ کو نہ پکڑو، ہاں جب خدا کی طرف سے کوئی بات کہوں تو اس کو لو، کہ میں خدا پر جھوٹ نہ کہوں گا۔''

ان تینوں روایتوں میں آپ نے اپنے اس ارشاد کو ظن (گمان) رائے اور امرِ دنیا سے تعبیر فرمایا ہے اس سے یہ کلیہ سمجھ آتا ہے کہ امورِ دین وشریعت میں آپ کا ہر حکم واجب اور من جانب اللہ ہے، لیکن کھیتی باڑی، علاج معالجہ وغیرہ خالص دنیاوی امور میں اگر آپ نے کچھ کہا تو اس کی حیثیت فقط مشورہ اور رائے کی ہے یہی سبب ہے کہ صحابہ کرام جن باتوں میں اپنا مشورہ آپ کو دینا چاہتے تھے پوچھ لیتے تھے کہ یارسول اللہ! یہ وحی سے ہے یا رائے ہے، آپ جب فرما دیتے تھے کہ رائے سے ہے تو وہ اپنا مشورہ پیش کرتے اور آپ پسند فرماتے تو قبول فرماتے۔ غزوۂ بدر میں آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہا، ایک صحابی نے آکر عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! اس مقام کا انتخاب وحی سے ہے یا رائے سے ہے، فرمایا: ''محض رائے ہے۔'' تو عرض کی کہ جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام بہتر نہیں فلاں مقام بہتر ہے، آپ نے ان کی رائے پسند کی اور اس پر عمل فرمایا، اسی طرح صلح وجنگ اور حکومت کے دوسرے معاملات میں بھی صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا اور عمل فرمایا ہے اور اسی میں خود حضور ﷺ کو ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۹) یعنی ''امور حکومت یا عام امور میں صحابہ سے مشورہ لے لو۔'' کا حکم خدا کی طرف سے ہے چنانچہ غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی رائے پر عمل کیا، 2 لیکن امور جنگ وسیاست میں بھی جس بات کا حکم عقلِ بشری سے نہیں، بلکہ وحی الٰہی یا فہمِ نبوی ﷺ سے ہوا تھا اس میں آپ نے نہ کسی سے مشورہ لیا اور نہ کسی کے مشورے کو قبول فرمایا، صلح حدیبیہ کی شرائط اور دفعات جو سراسر مصلحتِ الٰہی اور حکمتِ ربانی پر مبنی تھے ان کے بدلنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ نے کیا کیا زور نہیں لگایا، مگر آنحضرت ﷺ نے کچھ التفات نہ فرمایا اور آخر مستقبل نے بتا دیا کہ فہمِ نبوت سراسر صحیح تھی، اسی طرح غزوۂ احد جیسے نازک موقع پر عبداللہ بن ابی کا تین سو آدمیوں کے ساتھ پھر جانا گوارا کیا، مگر مدینہ سے باہر جا کر صف آرا ہونے سے باز نہ آئے اور پھر مستقبل نے مصلحتِ الٰہی کے راز کو فاش کیا۔

ایک ادنیٰ سا تامل عقلی حیثیت سے بھی یہ راز بتا دے گا کہ دنیا میں ہر صاحبِ فن کی ایک نہیں دو عقلیں ہوتی ہیں ایک اس فن کے متعلق جس کی استعداد اس کے اندر رکھی جاتی ہے اور پھر تعلیم وتربیت مشق اور کثرتِ عمل سے وہ اتنی بلند اور پختہ ہو جاتی ہے کہ وہ اس فن کے بڑے بڑے عمیق اور مشکل دقائق کو ایک نظر میں معلوم کر لیتی ہے اور اس کے لاینحل عقدوں کو اشاروں میں حل کر دیتی ہے لیکن اس دائرہ کے باہر اس کی دوسری عقل عام انسانوں ہی کی طرح معمولی ہوتی ہے ایک شخص جو فن تعمیر کی مہارت اور ہندسہ اور انجینئرنگ کی

1 ایضا:۲۱۲۶۔ 2 سیرت ابن ھشام، ج۲، ص:۱۶۲؛ البدایة والنهایة، ج٤، ص:۹۵؛ کامل ابن اثیر، ج۲، ص:٦٧۔

صناعی میں غیر معمولی عقل و ذہانت رکھتا ہے بالکل ممکن ہے کہ کھجور کی کاشت میں اس کی عقل معمولی انسانوں سے بھی کم درجہ ہو، ایک فلسفی جو اپنے زورِ فکر سے افلاطون وارسطو کی غلطیاں نکالتا ہے وہ تعمیر کے فن میں ایک معمولی مزدور سے بھی زیادہ کم عقل ہو، یہ روزمرہ کی پیش آنے والی مثالیں ہیں اسی طرح وہ برگزیدہ انسان جو روحانیت کے اسرار، معرفتِ ربانی کے حقائق، تزکیہ نفس کے رموز، اخلاق و معاشرت کے آداب اور حقوق و شریعت کے مسائل میں دقیقہ رس فہم اور نکتہ دان عقل رکھتا ہو اس کو تعمیر و کاشتکاری کے مسائل میں محض معمولی درک ہو بلکہ بالکل نہ ہو۔

اسی طرح انبیا علیہم السلام امور دین و شریعت میں وحی اور ملکہ نبوت سے جو کچھ فرماتے ہیں وہ عین مصلحت، عین حکمت، خطا اور غلطی سے سرتا پا مبرا اور پاک ہوتا ہے لیکن دوسرے امور مثلاً: پہننے، اوڑھنے، کھانے پینے، رہنے سہنے، سلطنت و سیاست، نظم و نسق، صلح و جنگ، سامان و اسلحہ، جنگ و سواری، صنعت و حرفت، طب و علاج، وغیرہ دنیاوی امور کی نسبت کا مصلحتیں بتا کر جزئیات کی تفصیل سے انہوں نے احتراز فرمایا اور کسی قطعی فیصلہ کا مسلمانوں کو پابند نہیں کیا، پہننے اوڑھنے کے متعلق صرف تین باتیں فرمائیں پہلی یہ کہ وہ لباس اور طرز لباس نہ اختیار کیا جائے جس سے ستر عورت نہ ہو، دوسری یہ کہ مرد وہ لباس اختیار نہ کریں جو عورتوں کے لئے زیبا ہے، نہ عورتیں وہ لباس اختیار کریں جو مردوں کے لئے مناسب ہے، تیسری بات یہ ہے کہ وہ لباس پسندیدہ نہیں، جس سے غرور و نخوت نمایاں ہو، کھانے پینے میں چند حرام چیزوں کے سوا کسی کی ممانعت نہیں، نظم و نسق اور نظام حکومت و سلطنت میں چند کلی اصول تعلیم فرمائے، شہنشاہانہ اور جابرانہ حکومت نہ ہو لوگوں میں مساوات ہو اور اہم امور میں اہل حل وعقد کا باہمی مشورہ ہو وعلیٰ ہذا القیاس۔ الغرض یہی وہ امور ہیں جن میں زمانہ اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تغیر و انقلاب ہوتا ہے اس لئے ان کو ہمیشہ کے لئے محدود کر دینا مصلحتِ الٰہی کے خلاف تھا۔

ملکۂ نبوت یا عقلِ نبوت کا شرعی ثبوت

گزشتہ مباحث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ نبی ﷺ میں علم وفہم کے تین ذریعے ہیں وحی، ملکۂ نبوت اور عام عقل بشری ان میں سے اول و آخر کے ثبوت کے لئے اب کسی استدلال کی ضرورت نہیں کہ اول تو یہ مسلمات سے ہیں، اور دوسرے اوپر کی تشریحات میں مستقل طور سے ان پر بحثیں ہو چکی ہیں، لیکن اب تک ہم نے دوسری چیز یعنی ملکۂ نبوت کے لئے کوئی شرعی دلیل پیش نہیں کی اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ کہنی ہے کہ جن علما نے اس کی حقیقت ظاہر کی ہے، انہوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کے لئے الگ الگ اصطلاحیں قائم کی ہیں مگر مفہوم و معنی کے لحاظ سے وہ دراصل ایک ہیں سلف و صالحین میں سے بعض نے اس کو القاء فی الروع (دل میں ڈالنا) نبی کی حکمتِ قلبیہ، توفیقِ ازلی اور قوتِ تبیین سے تعبیر کیا ہے۔ [1] امام غزالی و

[1] یہ تمام الفاظ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الرسالہ میں مذکور ہیں۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے متکلمین نے اس کو ملکۂ نبوت سے ادا کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور علمائے اصول نے اس کو پیغمبرانہ قوتِ اجتہاد کہا ہے اور صوفیہ کی عام پسند اصطلاح میں اس کو علم لدنی کہا جاتا ہے، مگر ان سب کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں یعنی نبی کے اندر وہ پیغمبرانہ عقلی قوت، جو بشری عقل سے فوق ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ وحی کی تشریح، اسرارِ شریعت کا بیان اور دقائقِ حکمت کی اپنی زبان سے توضیح کرتا ہے۔

انبیائے کرام کے ان ربانی انعامات کی فہرست پڑھئے جن کا تذکرہ قرآن نے جا بجا کیا ہے تو وحی کی مخصوص نعمت کے بعد فہرست انعامات میں جو چیز نظر آئے گی وہ ''علمِ نبوت'' ہے جس کو کہیں ذکر (یادداشت) کہیں حکم (حق و باطل میں تمیز کا ملکہ) کہیں حکمت (دانائی) کہیں شرحِ صدر (سینہ کا کھول دینا) کہیں تفہیم (سمجھ بوجھ دینا) کہیں تعلیم (سکھا دینا) کہیں ارائت (دکھا دینا، سوجھا دینا) کہا گیا ہے، ان سب مختلف الفاظ کا مفہوم وحی سے نیچے اور عقلِ بشری سے اوپر عقل نبوی کے سوا اور کیا ہے؟ ان سے مراد وحی تو اس لئے نہیں کہ ان کا ذکر وحی سے الگ ہوتا ہے اور عقل بشری اس لئے نہیں کہ عقلِ بشری خاص نبی پر کوئی انعام نہیں کہ یہ نعمت تو ہر انسان کو کچھ نہ کچھ ملی ہے اس بنا پر اس سے مراد عقلِ نبوی ﷺ اور حکمت نبوی ﷺ کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

حکمت

انبیا علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں عطا ہوتی ہیں ان میں ایک خاص نعمت کا ذکر قرآن پاک میں بار بار آتا ہے اور وہ حکمت ہے۔ آل ابراہیم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے جو احسانات کئے ان کا ذکر وہ ان الفاظ میں فرماتا ہے:

(۱) ﴿ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا۝ ﴾

(٤/ النسآء:٥٤)

''تو بے شبہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو کتاب اور حکمت دی اور ان کو بڑی سلطنت بخشی۔''

حضرت لقمان علیہ السلام کی نسبت ہے:

(۲) ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ ﴾ (۳۱/ لقمان:۱۲)

''اور یقیناً ہم نے لقمان کو حکمت دی۔''

حضرت داوٗد علیہ السلام کی شان میں ہے:

(۳) ﴿ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ۝ ﴾ (۳۸/ صٓ:۲۰)

''اور ہم نے داوٗد علیہ السلام کی سلطنت مضبوط کی اور اس کو حکمت اور قولِ فیصل عطا کیا۔''

(٤) ﴿ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۭ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۵۱)

''اور داؤد نے جالوت کو مارا اور خدا نے داؤد کو سلطنت اور حکمت بخشی اور جو چاہتا ہے، اس میں سے کچھ سکھایا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

(۵) ﴿ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ﴾

(۴۳/ الزخرف:۶۳)

''میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں، تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔''

خود اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اپنا احسان جتاتا ہے، تو فرماتا ہے:

(٦) ﴿ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۱۰)

''اور یاد کر جب میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل کی تعلیم دی۔''

عام انبیا کے متعلق ہے:

(۷) ﴿ وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ﴾

(۳/ آل عمران:۸۱)

''اور جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لیا کہ جو میں تم کو کوئی کتاب اور حکمت دوں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کے ظہور کی یہ دعا مانگی تھی:

(۸) ﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۲۹)

''ہمارے پروردگار! اور ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج، جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو سنوارے بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے انکی یہ دعا قبول فرمائی:

(۹) ﴿ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۵۱)

''جس طرح ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا وہ تم کو ہماری آیتیں سناتا اور تم کو سنوارتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔''

اس دعائے ابراہیمی کے مطابق آنحضرت ﷺ کے ظہور کا احسان اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں ہم پر ظاہر فرمایا ہے:

(۱۰) ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۝﴾

(۳/ آل عمران:۱٦٤)

''یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہی احسان انہیں الفاظ میں سورۂ جمعہ میں دہرایا ہے:

(۱۱) ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۝﴾ (٦٢/ الجمعة:٢)

''وہی اللہ جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان کو اللہ کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو پاک وصاف کرتا ہے اور کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔''

خود آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے اپنا یہ احسان ان پر ظاہر فرمایا ہے:

(۱۲) ﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا۝﴾ (٤/ النسآء:١١٣)

''اور اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک جماعت ارادہ کر چکی تھی کہ وہ تجھے گمراہ کر دے اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے کچھ نقصان نہ پہنچا سکتے خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھ کو وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل تھا۔''

آنحضرت ﷺ سے خطاب ہے:

(۱۳) ﴿ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ﴾ (١٧/ بنی اسرآءيل:٣٩)

''یہ وہ ہے جو خدا نے حکمت کی باتوں میں سے تم پر وحی کی ہے۔''

عام مسلمانوں سے ارشاد ہے:

(۱٤) ﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ﴾

(٢/ البقرة:٢٣١)

''اور اللہ کا جو احسان تم پر ہے اور اس نے تم پر جو کتاب اور حکمت اتاری ہے ان کو یاد کرو خدا تم

کو اس سے سمجھا تا ہے۔‘‘

خاص طور سے ازواج مطہرات کو خطاب ہے:

(۱۵) ﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۳٤)

’’اورتمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو۔‘‘

یہ نعمت حسب استعداد عام مسلمانوں کو بھی ملا کرتی ہے:

(۱٦) ﴿يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ﴾

(۲/ البقرة:۲٦۹)

’’اور خدا جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جس کو حکمت بخش دی گئی اس کو بڑی دولت (بھلائی) دی گئی۔‘‘

اسی کے ذریعہ تبلیغ و دعوت کا حکم بھی ہوتا ہے:

(۱۷) ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ ۭ﴾

(۱٦/ النحل:۱۲۵)

’’اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف، تو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے عمدہ طریقہ سے مناظرہ کر۔‘‘

ایک جگہ قیامت اور عبرت کے واقعات پر حکمت کا اطلاق ہوا ہے:

(۱۸) ﴿وَلَقَدْ جَاۗءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَاۗءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝ۙ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝ۙ﴾

(٥٤/ القمر:٤_٥)

’’اور ان کو اتنے احوال جتنے میں ڈانٹ ہوسکتی ہے، پہنچ چکے ہیں، مؤثر حکمت، تو ان کو ڈر سنانے والے فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔‘‘

اوپر کی سطروں میں وہ تمام آیتیں لکھ دی گئیں ہیں جن میں ’’حکمت‘‘ کا لفظ آتا ہے ان آیتوں میں حکمت کا لفظ کہیں تنہا آیا ہے اور کہیں ’’کتاب‘‘ کے بعد آیا ہے کتاب کے دو معنی قرآن میں ہیں ایک صحیفۂ ربانی کے معنی میں اور یہ اکثر آیا ہے اور دوسرے نوشتۂ الٰہی اور علم الٰہی جیسے ﴿لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ﴾ ’’اگر خدا کا نوشتہ یا علم پہلے نہ ہوتا۔‘‘ ان سابقہ آیتوں میں کتاب سے تو بے شبہ آسمانی کتاب اور صحیفہ ربانی، یا یوں کہو کہ وحی سے کتاب مراد ہے جیسے تورات وقرآن وغیرہ مراد ہے لیکن ’’حکمت‘‘ کا مفہوم ان آیتوں میں کیا ہے؟ حکمت کے لغوی معنی تو دانائی کی بات اور کام کے ہیں، مگر یہاں اس سے مقصود کیا ہے؟ اس تحقیق کے

لئے ضرورت ہے کہ مستند اہلِ لغت اور ماہرین قرآن کے اقوال نقل کر کے تبصرہ کیا جائے اور سب سے قدیم لغت نویس ابن درید المتوفی ۳۲۱ھ اپنی کتاب ''جمهرة اللغة ''میں حکمت کے حسب ذیل معنی لکھتا ہے:

فكل كلمة وعظتك اوزجرتك اودعتك الى مكرمة اونهتك من قبيح فهي حكمة وحكم. ❶

''ہر وہ بات جو تجھ کو سمجھائے یا تجھ کو تنبیہ کرے یا کسی اچھی خصلت کی طرف بلائے یا کسی بری چیز سے روکے وہ حکمت اور حکم ہے۔''

لغت کا امام جوہری اپنی صحاح اللغة میں لکھتا ہے:

الحكمة من العلم والحكيم العالم و صاحب الحكمة والحكيم المتقن للامور. ❷

''حکمت یعنی علم اور حکیم یعنی عالم اور حکمت والا اور حکیم کاموں کو خوبی سے کرنے والا''

عربی لغت کی مبسوط و مستند کتاب لسان العرب میں ہے:

والحكمة عبارة عن معرفة افضل الاشياء بافضل العلوم. ❸

''اور حکمت بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعہ سے جاننے کو کہتے ہیں۔''

لغت قرآن کے مشہور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں کہتے ہیں:

والحكمة اصابة الحق بالعلم والعقل فالحكمة من الله تعالى معرفة الاشياء ايجادها على غاية الاحكام ومن الانسان معرفة الموجودات و فعل الخيرات. ❹

''اور حکمت، علم اور عقل سے سچی اور صحیح بات کو جاننا ہے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت چیزوں کا جاننا اور ان کو بکمال خوبی پیدا کرنا ہے اور انسان کی حکمت موجودات کو جاننا اور اچھی باتوں کا کرنا ہے۔''

یہ تو عربی لغت کے اماموں کی تصریحات تھیں اب ان بزرگوں کے اقوال پر غور کرنا چاہیے جو زبان دانی کے ساتھ قرآن اور شریعت کے استدلالات اور محاوروں سے بھی کامل طور سے آگاہ تھے۔ ابن حیان اندلسی نے اپنی تفسیر البحر المحیط میں ان کے اکثر اقوال کو یکجا کر دیا ہے: ❺

(۱) قال مالك وابورزين: الحكمة الفقه في الدين والفهم الذي هو سجية ونور من الله تعالى.

❶ جمهرة اللغة، ج۲، ص:۱۸۶، حیدرآباد۔ ❷ صحاح اللغة، ج۲، ص: ۶۲۷، مصر۔
❸ لسان العرب، ج۱۵، ص:۳۰، مصر۔ ❹ مفردات القرآن، ص:۱۲۶، مصر۔
❺ زیر آیت ﴿وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ﴾ الاية: ج۱، ص:۳۵۳ مطبوعه سعادت مصر۔

''امام مالک اور ابورزین کا قول ہے: حکمت دین میں سمجھ اور اس فہم کو کہتے ہیں جو ایک فطری ملکہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہے۔''

(۲) وقال مجاهد: الحكمة فهم القرآن.

''مجاہد کا قول ہے: حکمت یعنی قرآن کا فہم۔''

(۳) وقال مقاتل: العلم والعمل به لايكون الرجل حكيمًا حتى يجمعهما.

''مقاتل کا قول ہے: حکمت، علم اور علم کے مطابق عمل کو کہتے ہیں کسی شخص کو حکیم اس وقت تک نہیں کہا جاتا جب تک وہ علم وعمل دونوں کا جامع نہیں۔''

(٤) وقيل: الحكمة القضاء.

''بعضوں کا قول ہے: حکمت فیصلہ کرنا ہے۔''

(٥) وقيل: مالايعلم الامن جهة الرسول.

''کسی کا قول ہے: حکمت وہ ہے جو رسولوں کے سوا کسی اور ذریعہ سے معلوم نہ ہو سکے۔''

(٦) وقال ابوجعفر محمد بن يعقوب: كل صواب من القول ورث فعلاً صحيحًا فهو حكمة.

''ابوجعفر کا قول ہے: ہر وہ صحیح بات جو صحیح عمل پیدا کرے حکمت ہے۔''

(۷) وقيل: وضع الاشياء مواضعها.

''کسی کا قول ہے: چیزوں کو اپنی اپنی جگہ رکھنا حکمت ہے۔''

(۸) وقيل: كل قول وجب فعله.

''ایک اور شخص کا قول ہے: ہر وہ بات جس کا کرنا ضروری ہو حکمت ہے۔''

امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں حسب ذیل اقوال لکھے ہیں:

(۱) قال (مالك): المعرفة بالدين والفقه فى الدين والاتباع له.

''مالک کا قول ہے: دین کی معرفت اور دین میں سمجھ اور اس کی پیروی حکمت ہے۔''

(۲) قال ابن زيد: الحكمة الدين الذى لا يعرفونه الابه ﷺ يعلمهم اياها قال والحكمة العقل فى الدين وقرأ: ﴿ومن يؤت الحكمة فقد اوتى خيرًا كثيرًا﴾ وقال يعينى ويعلمه الكتب والحكمة والتوراة والانجيل وقرأ ابن زيد: ﴿و اتل عليهم نبأ الذى اتينه ايٰتنا فانسلخ منها﴾ قال لم ينتفع بالآيات حين لم تكن معها حكمة قال والحكمة شيء يجعله الله فى القلب نورله به۔

''ابن زید کا قول ہے: حکمت دین کا وہ حصہ ہے جو صرف رسول ﷺ سے معلوم ہوتا ہے وہی اس کو سکھاتا ہے نیز انہیں کا قول ہے کہ حکمت دینی عقل کا نام ہے اور اس پر یہ آیت پڑھی کہ ''جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی دولت دی گئی اور خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ خدا ان کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل سکھاتا ہے۔'' ابن زید نے یہ آیت بھی پڑھی کہ ''ان کو اس کا حال سناؤ جس کو میں نے اپنی آیتیں دیں تو وہ ان سے الگ ہو گیا۔'' یعنی ان آیتوں سے نفع نہیں اٹھایا کہ ان کے پاس حکمت نہ تھی حکمت وہ چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ بندہ کے قلب میں رکھتا ہے اور اس سے اس کو روشن کرتا ہے۔''

(۳) عن قتادہ: والحکمۃ ای السنۃ.

''قتادہ سے مروی ہے: حکمت یعنی، سنت نبوی۔''

آخر میں امام طبری اپنا فیصلہ سناتے ہیں:

(٤) قال ابن جریر الطبری: والصواب من القول عندنا فی الحکمۃ انها العلم باحکام اللّٰہ التی لا یدرك علمها الا ببیان الرسول ﷺ والمعرفۃ بها وما دل علیه ذلك من نظائرہ وهو عندی مأخوذ من الحکم الذی بمعنی الفصل بین الحق والباطل. ❶

''ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت ان احکامِ الٰہی کے علم کا نام ہے، جو صرف رسول کے بیان (تشریح) سے معلوم ہوتے ہیں اور جو ان کی مثالیں اور نظیریں ہیں ان کی معرفت کو کہتے ہیں اور حکمت کا لفظ میرے نزدیک حکم سے ماخوذ ہے جس کے معنی حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں۔''

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف کتاب الرسالہ میں قتادہ کے مسلک کو پسند کیا ہے، لکھتے ہیں:

(٥) وسمعت من ارضی من اهل العلم بالقران یقول: الحکمۃ سنۃ رسول اللّٰہ ﷺ. ❷

''میں نے قرآن کے ان اہلِ علم سے جن کو پسند کرتا ہوں یہ سنا کہ حکمت آنحضرت ﷺ کی سنت کا نام ہے۔''

امام شافعی اسی کتاب میں آگے چل کر بعضوں کا قول نقل کرتے ہیں:

وسنتہ الحکمۃ التی فی روعه عن اللّٰہ عزوجل. ❸

❶ تفسیر طبری، الجزء الاوّل، ص:٤١٥، مصر ❷ الرسالۃ، ص:٢٤۔ ❸ ایضًا، ص:٢٨۔

''اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے دل میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔''

ائمہ لغت اور علمائے قرآن کے ان تمام اقوال پر ایک غائر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ یہ کل کے کل ایک ہی مفہوم کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی حقیقت کی متعدد تفسیریں ہیں۔ حکمت عقل وفہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے، جس سے صحیح وغلط، صواب وخطا، حق وباطل اور خیر وشر کے درمیان تمیز وفیصلہ، بذریعہ غور وفکر، دلیل وبرہان اور تجربہ واستقرا کے نہیں، بلکہ منکشفانہ طور سے ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق اس صاحبِ حکمت کا عمل بھی ہوتا ہے۔

ہر فن کے واقف کار دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو کسی فن کو باقاعدہ حاصل کرتے، اس کی مشق کرتے اور اس میں مہارت اور کمال بہم پہنچاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو اس فن کی فطری استعداد اور قابلیت رکھتے ہیں اور تجربہ و دلیل کے بغیر خود اپنی فطری صلاحیت، صحیح وجدان اور سلیم ذوق سے اس فن کی کسی شے کو دیکھنے کے ساتھ اس کے متعلق جچی تلی رائے دیتے ہیں اور حرف حرف صحیح دیتے ہیں اسی کا نام آپ صحتِ وجدان اور سلامت ذوق رکھتے ہیں۔ شاعری، انشا پردازی اور دوسرے فنون لطیفہ میں اس کی مثالیں بکثرت دیکھی اور سنی جاتی ہیں اسی طرح بعض لوگوں میں اشیاء کے حق وباطل اور افعال کے خیر وشر کی تمیز کا صحیح وجدان اور صحیح ذوق ہوتا ہے وہ ان امور کے اس کے دقیق سے دقیق مسئلہ کے متعلق اپنے ربانی ذوق ووجدان سے صحیح رائے دیتے ہیں جو دوسرے لوگ وسیع مطالعہ اور غور وفکر کے بعد بھی نہیں دے سکتے یہی وہ معرفت اور نور الٰہی ہے جو جدوجہد اور سعی ومحنت سے نہیں بلکہ عطا وبخشش سے حاصل ہوتی ہے اور اسی کا نام ''حکمت'' ہے۔

دوسری زبانی استعدادوں اور فطری بخششوں کی طرح حکمت کا عطیہ بھی سب کو یکساں نہیں ملتا بلکہ حسب استعداد معمولی حکمت سے لے کر اعلیٰ ترین اور کامل ترین حکمت تک عطا ہوتی ہے اس کے مختلف درجے اور مراتب عام انسانوں کو مل سکتے ہیں اور ملتے ہیں لیکن اس کا اعلیٰ ترین اور کامل ترین درجہ اور مرتبہ صرف انبیا علیہم السلام کو ملتا ہے۔

مگر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح اس ربانی عطیہ، آسمانی فہم، دینی عقل اور نورانی قوت پر ''حکمت'' کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح اس قوتِ حکمت کے آثار ونتائج اور اس کی تعلیمات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، چنانچہ دوسری آیت، جس میں حضرت لقمان علیہ السلام کو حکمت دیے جانے کا بیان ہے اس کے بعد اس حکمت لقمانی کی حسب ذیل تعلیمات کا ذکر ہے، اللہ کا شکر ادا کرنا، شرک کی ممانعت، والدین کی خدمت، اچھوں کی پیروی، خدا کا ہمہ گیر علم، نماز کا حکم، صبر، فخر وغرور کی ممانعت، میانہ روی اور آہستہ بولنا۔ اسی طرح تیرہویں آیت میں حکمتِ محمدی کی حسبِ ذیل تعلیمات کی تفصیل بھی کی گئی ہے شرک کی ممانعت، والدین کے ساتھ احسان، قرابت داروں اور بے کسوں سے نیک سلوک، اسراف کی برائی، نرمی کی بات کرنا، میانہ روی، اولاد کے قتل کی مذمت، کسی کی جان نہ لینا، مقتول کا بدلہ لینا، یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ، عہد پورا کرنا، ناپ تول

ٹھیک رکھنا، بے جانی چیز کی پیروی نہ کرنا، فخر وغرور کی مذمت وغیرہ۔ ان تمام باتوں کو بیان فرما کر اللہ کہتا ہے:

﴿ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۳۹)

''یہ ہیں حکمت کی وہ بعض باتیں جو خدا نے تجھ پر وحی کی ہیں۔''

حکمت کی ان بعض باتوں کی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمت کے مظاہر اور نتائج کس قسم کی باتیں ہیں یہ عموماً وہی باتیں ہوتی ہیں جن کی عالم گیر صداقت اور سچائی کو خود فطرتِ انسانی اور حسِ اخلاقی تسلیم کرتی ہے اور یہی سبب ہے کہ تیسری اور چوتھی آیت میں حکمت کا اطلاق زبور پر اور پانچویں اور چھٹی آیت میں انجیل پر ہوا ہے کہ ان میں اسی قسم کی دلآویز نصیحتوں اور عالمگیر صداقتوں کی تعلیم ہے اور خود قرآن پاک نے بھی اپنی صفت ''حکمت والا قرآن'' ظاہر کی ہے ﴿ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۙ﴾ (۳۱/ لقمان:۲؛ ۱۰/ یونس:۱) ﴿ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ﴾ (۳۶/ یٰس:۲) ﴿ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ۝﴾ (۳/ آل عمران:۵۸) ان آیتوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ''حکمت'' کی بعض اہم تعلیموں اور باتوں کو وحی الٰہی خود اپنے اندر بھی شامل کر کے ان کو آب مقطر بنا دیتی ہے یہ چیز انبیا کو کتاب کی وحی الٰہی کے ساتھ عام طور پر ملتی ہے۔ فرمایا:

﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ﴾ (۳/ آل عمران:۸۱)

''اور یاد کرو جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ البتہ جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں۔''

بہرحال یہ حکمت کی قوت انبیا علیہم السلام کو بدرجہ اتم حاصل تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر بات، دانائی اور ان کا ہر کام، دانش مندی پر مبنی تھا اور چونکہ یہ قوت ان کو حاصل تھی تو اس قوت کے آثار اور نتائج بھی اقوال و اعمال کی صورت میں ظاہر ہوئے اور جن کا یہ صرف اقرار و اعتراف بلکہ ان پر عمل بھی نبوت کی تصدیق کے اندر داخل ہوا۔ پندرہویں آیت میں ہے:

﴿ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى [1] فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۳٤)

''(اور اے محمد رسول اللہ کی بیویو!) تمہارے گھروں میں خدا کی جو آیتیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو۔''

محمد رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کو آیات الٰہی کے علاوہ کس حکمت کے یاد رکھنے کا حکم دیا گیا، ظاہر ہے کہ وہ خود محمد رسول اللہ ﷺ کی حکمت و دانائی کی وہ باتیں تھیں، اب اگر وہ باتیں امور دین سے متعلق نہ ہوتیں تو ان کے لئے ان کا یاد رکھنا کیوں ضروری قرار دیا جاتا، اسی طرح آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارہویں آیت میں آنحضرت ﷺ کی صفت میں ہے:

﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ ﴾ (٦٢/ الجمعة:۲)

[1] لفظ "یتلی" سے کسی کو شبہ نہ ہو کہ وہ کتاب کے لیے خاص ہو کہ آنحضرت ﷺ کتاب کا کوئی صفحہ پڑھ کر نہیں سناتے تھے بلکہ الفاظ الٰہی کو زبانی ادا فرماتے تھے۔

''وہ مسلمانوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

محمد رسول اللہ ﷺ کتاب کے بعد کس حکمت کی تعلیم دیتے تھے؟ ظاہر ہے کہ خود اپنی حکمت کی، تو جس حکمت کی وہ تعلیم دیتے تھے وہ خود ان کے اندر بھی تھی، کہ جو چیز ان کے پاس نہیں وہ دوسروں کو کیا بخش سکتے تھے، تو جب یہ قوت آپ کے پاس تھی تو اس کے آثار ونتائج بھی اقوال وافعال کی صورت میں نمایاں ہوں گے، جن کی وہ تعلیم فرماتے ہیں اور اپنے ان امورِ حکمت کی تعلیم سے آپ کا مقصد بھی یہی ہوسکتا ہے کہ مسلمان ان پر عمل کریں۔

پانچویں آیت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ۖ ﴾

(٤٣/ الزخرف:٦٣)

''میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں، تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ حکمت کا ایک فریضہ تبیین بھی ہے یعنی کسی مجمل، ذو معنیین اور مختلف فیہ مسئلہ کی تشریح وتفصیل جس سے وہ اجمال اور اختلاف جاتا رہے، اور اصل مقصود کی تشریح ہوجائے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تورات کے بعض احکام کی جن میں یہود مختلف الرائے تھے تفصیل فرمائی اور ان کی غلطی دور کی، بارھویں آیت میں ہے:

﴿ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:١١٣)

''اور اگر خدا کا فضل وکرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک گروہ نے چاہا تھا کہ تجھ کو گمراہ کرلے، اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچائیں گے، اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت اُتاری اور تجھ کو سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور اللہ کا فضل تجھ پر بڑا ہے۔''

ان آیتوں میں بیان ہے کہ منافقین کا ایک گروہ آپ کو غلط رائے دے کر بہکانا چاہتا تھا مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کی یہ چال کارگر نہ ہوئی اور وہ تجھ کو بہکا نہ سکے اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کا تجھ پر فضل وکرم ہے اور وہ فضل وکرم یہ ہے کہ اس نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور تجھے وہ علم بخشا جو پہلے نہ تھا اس سے ظاہر ہوا کہ گمراہی سے آپ کی یہ حفاظت، خطا سے یہ عصمت اور علم کی یہ بخشش آپ کو کتاب اور حکمت دونوں کے ملنے کے سبب حاصل ہوئی ہے۔ الغرض اس حفاظت وعصمت کے حصول میں کتابِ الٰہی کے ساتھ حکمتِ ربانی کے

---

1 قرآن پاک میں حرف علت سے قبل ''واؤ'' آیا کرتا ہے جیسے ﴿وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ﴾ (٦/الانعام:٧٥) یہ حرف عطف نہیں۔

انعام کو بھی دخلِ کامل ہے۔

یہ تو وہ نبوی حکمت تھی جس کا سرچشمہ صرف سینہ نبوت تھا، لیکن یہ فیض حسبِ استعداد پیغمبر کے اتباع میں دوسروں کو بھی ملتا ہے، جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ سچی اور صحیح بات کو بہت آسانی سے سمجھ لیتے، قبول کر لیتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

تبلیغ اسلام کے تین ذریعوں، حکمت، موعظت اور خوش خلقی کے مناظرہ کرنے میں سب سے اول اسی کو جگہ دی گئی ہے:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ ﴾

(۱۶/ النحل:۱۲۵)

''تو اپنے رب کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دے اور ان سے مناظرہ بطریق احسن کر۔''

سچی، صحیح اور صاف بات دل تک پہنچ جاتی ہے اور بہت جلد اپنا اثر دکھاتی ہے۔فرمایا:

﴿ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ ﴾ (۵۴/ القمر:۵) ''دل تک پہنچ جانے والی حکمت۔''

یہ حکمت ہر نیکی کی جڑ اور بھلائی کی اصل ہے پھر اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا دولت ہو سکتی ہے، اس لئے ارشاد ہوا:

﴿ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ ﴾ (۲/ البقرة:۲۶۹)

''جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی نیکی (دولت) دی گئی۔''

اس سلسلہ میں دو مشہور اور مستند حدیثوں کا حوالہ بھی مناسب ہے جس سے حکمت کی حقیقت واضح ہوگی اور کم از کم قرن اول میں اس لفظ کا مفہوم ظاہر ہوگا، آنحضرت ﷺ نے وفد کے ایک خطیب کا بیان سن کر فرمایا:

((اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً، اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا)) [1]

''بعض شعر حکمت ہیں، اور بعض تقریریں جادو ہوتی ہیں۔''

اس حدیث میں بعض اشعار کو حکمت اور بعض تقریر و بیان کو جادو کہا گیا ہے۔اس تقابل سے ظاہر ہے کہ اس عربی حکمت کا مفہوم اردو حکمت کے مفہوم سے بلند تر ہے، یعنی سحر و جادو کے مافوق انسانی تصور کی طرح حکمت کے عربی مفہوم میں کوئی مافوق بشری تخیل ضرور ہے اسی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ عربی میں حکمت کے معنی عقل و فہم وغیرہ معمولی الفاظ سے کوئی بلند اور غیر معمولی حقیقت ہے اردو میں اس حقیقت کو ''حکمت'' کے ساتھ لفظ الہامی بڑھا کر ادا کیا جا سکتا ہے یعنی ''الہامی حکمت''

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب مایجوز من الشعر والرجز......الخ:۶۱۴۵ میں پہلا فقرہ اور کتاب الطب، باب ان من البیان سحرا:۵۷۶۷ میں دوسرا فقرہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''رشک وحسد اگر جائز ہے تو صرف دو شخصوں پر ایک اس پر جس کو مال کی دولت ملی تو وہ اس کو صحیح مصرف میں لٹاتا ہے اور دوسرے ((رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِيْ بِهَا وَيُعَلِّمُهَا)) [1] ''اس شخص پر جس کو حکمت ملی ہے تو وہ اس کے ذریعہ سے فیصلہ کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے اور اس میں معلم ہونے کی شان پیدا ہوتی ہے۔'' جب یہ عام انسانوں کا درجہ ہے تو انبیاء علیہم السلام کو یہ دولت کس بہتات سے ملی ہوگی اور وہ یقیناً آنحضرت ﷺ کے حصہ میں بھی آئی اب اس حصولِ دولت یعنی عطائے حکمت کا نتیجہ بھی آپ سے ظاہر ہونا چاہیے اور وہ فیصلہ اور تعلیم ہے، آپ کے یہ ملہمانہ فیصلے اور حکیمانہ تعلیمات جو تمام تر وحی ربانی کی عملی اور زبانی شرح اور بیان ہیں۔

کتاب وحکمت کی تعلیم

اوپر کی چار آیتوں ۸۔۹۔۱۰۔۱۱ میں خفیف سے تغیر کے ساتھ حسب ذیل آیت ہے:

﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (۶۲/ الجمعة:۲)

''(وہ رسول) ان (ان پڑھوں) کو خدا کی آیتیں سناتا اور ان کو سنوارتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔''

ان آیتوں میں آنحضرت ﷺ کے تین کاموں کا ذکر ہے:

1. خدا کی آیتوں کو پڑھنا اور دوسروں کو سنانا۔
2. ان کو شرک اور بداخلاقی کی نجاستوں سے پاک وصاف کرنا اور سنوارنا۔
3. ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا۔

سوال یہ ہے کہ پہلی اور تیسری آیتیں ایک ہی معنی رکھتی ہیں یا دو، اگر ایک معنی رکھتی ہیں، تو اس بے سود تکرار کا کیا فائدہ؟ کیوں نہ دوسری جگہ بھی یتلوا یعنی تلاوت ہی کا لفظ رکھ دیا گیا اور اگر دو الگ الگ معنی رکھتی ہیں، جیسا کہ ہر صاحب نظر سمجھ سکتا ہے، تو ان دونوں معنوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا، اگر رسول کا فرض محض وحی کی زبان سے سنی ہوئی آیتوں کو پڑھ کر دوسروں کو سنا دینا ہے اور اسی پر اس کی تبلیغ کا فریضہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کا تیسرا فرض الفاظ کی تلاوت سے آگے بڑھ کر کتاب اور حکمت کے سبق کی تعلیم کیونکر قرار دیا جا سکتا، بالکل ظاہر ہے کہ تعلیم کا مفہوم تلاوت سے بہت کچھ زیادہ، بےخصوصاً جبکہ لفظ تعلیم تلاوت کے بعد آتا ہے وحی کے الفاظ کو سنا دینے سے تلاوت کا فرض ادا ہو جاتا ہے مگر تعلیم کا فرض ہنوز باقی رہ جاتا ہے کتاب کی تعلیم کے معنی تلاوت کی طرح کتاب کے الفاظ کا سنا دینا اور پڑھا دینا اور دوسروں کو یاد کرا دینا نہیں بلکہ الفاظِ قرآنی کی

[1] صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الاغتباط فی العلم والحکمة:۷۳۔

تلاوت کے بعد جو آپ کا پہلا کام تھا اس کے مشکل مطالب کو حل کرنے، مجمل معانی کو سمجھانے اور اپنی زبان اور عمل سے ان کی شرح و تفصیل کر دینے کا نام ''کتاب و حکمت کی تعلیم'' ہے اور یہ آپ کا دوسرا یا تیسرا فریضہ تھا اور یہی وہ تعلیم تھی جس کا ان آیتوں میں بار بار ذکر ہے اب جب ان مطالب و معانی کی شرح و تفسیر بھی آپ کے فرائض نبوت میں داخل تھی تو اس پیغمبرانہ شرح و تفصیل کی حیثیت بھی دینی ہوگی اور اس کی تعمیل بھی امت کے لئے ضروری ہوگی آپ کی اسی زبانی و عملی شرح و تفصیل کو صحابہ اور تابعین نے اپنی روایت و عمل سے محفوظ رکھا اور وہ ''احادیث و سنن'' کے نام سے موسوم ہے۔

اس تفصیل کے بعد ''حکمت'' کے ان معنوں پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیجئے جو ائمہ لغت اور علمائے قرآن نے بیان کئے ہیں تو آپ کو یقین آ جائے گا کہ وہ کل ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی معنی کی متعدد تفسیریں ہیں آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال، جن کے اصطلاحی نام احادیث و سنن ہیں، کتاب الٰہی کی عملی و زبانی تشریحات ہیں۔ کتابِ الٰہی وحی ربانی کا نتیجہ ہے اور احادیث و سنن، سینۂ نبوی کی ملہمانہ حکمت کا۔ اس مقام پر امام شافعی کی تحقیق پیش نظر رہے:

وسنة الحكمة التي القى في روعه عن الله عزوجل۔ [1]

''اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے قلب میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔''

اور اسی مفہوم کو مجاہد اس طرح ادا کرتے ہیں کہ الحكمة فهم القرآن ۔ حکمت فہم قرآن کا نام ہے، دوسری عبارت میں یوں کہو کہ قرآن کے معانی و مطالب کی تشریح حکمت ہے اور اس تشریح کا نام جو رسول کے قول و عمل سے ادا ہوئی، سنت ہے اور اس معنی کو امام مالک اور ابورزین اور ابن زید وغیرہ دوسری صدی کے علمائے قرآن ان عبارتوں میں ادا کرتے ہیں کہ ''حکمت معرفتِ دین، فقہ دین اور اس دینی علم کو کہتے ہیں جس کو رسول نے بیان کیا اور حکمت اس نور کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کسی قلب میں پیدا کر کے اس کو منور کر دیتا ہے۔''

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اصل حکمتِ نبوی وہ نور نبوت اور الہامی معرفت ہے جو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب و سینہ میں ودیعت رکھا تھا اور چونکہ آپ کے سنن و اقوال آپ کی اسی ودیعت شدہ حکمتِ نبوی کی پیداوار اور آثار و نتائج ہیں اس لئے ان پر بھی حکمت کا اطلاق جائز ہے، اس تفصیل کے بعد ظاہر ہوگا کہ بعض اماموں اور عالموں نے حکمت کی تشریح میں اصل معنی کی طرف توجہ کی ہے اور بعض نے ثانوی معنی کو بیان کیا ہے اور دونوں حق پر ہیں۔

علم

علم کے لغوی معنی جاننے کے ہیں مگر ہر فن کے تعلق سے جاننے کی نوعیت اور معلومات کی حیثیت

[1] الرسالة، ص:۲۸، مصر۔

مختلف ہوگی۔ انبیاء علیہم السلام کے تعلق سے اس کا جب استعمال ہوگا تو اس سے طبعاً خدا کی توحید، ذات وصفات، دین وشریعت کے احکام اور اخلاقی تعلیمات مراد ہوں گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید پر استدلال کر کے اپنے باپ سے فرماتے ہیں:

﴿ يَٰٓأَبَتِ إِنِّي قَدْ جَآءَنِي مِنَ ٱلْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ ﴾ (۱۹/ مریم:۴۳)

''اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا۔''

حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق ہے:

﴿ وَعَلَّمْنَٰهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا ۝ ﴾ (۱۸/ الکھف:۶۵)

''اور ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا۔''

خدا کے پاس سے تو ہر چیز ہے، پھر اپنے پاس سے علم سکھانے کا مفہوم کیا ہے؟ ہر وہ شے جو انسان کی ذاتی محنت، کوشش، جدوجہد وغیرہ معمولی ذرائع کے بغیر حاصل ہوتی ہے وہ منجانب اللہ کہی جاتی ہے اسی طرح خدا کے پاس سے علم عطا ہونے کے معنی اس علم کے ہیں جو انسان کے طبعی ذرائعِ علم واستدلال اور تلاش وتحقیق کے بغیر خود بخود عطا ہو، وہی علم خداداد ہے اور اسی لئے صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو علم لدنی (پاس والا علم) کہتے ہیں:

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی نسبت ہے:

﴿ وَلَقَدْ ءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ وَسُلَيْمَٰنَ عِلْمًا ۖ ﴾ (۲۷/ النمل:۱۵)

''اور بے شک ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کے آغاز نبوت کے موقع پر ہے:

﴿ وَكَذَٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِن تَأْوِيلِ ٱلْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُۥ عَلَيْكَ ﴾

(۱۲/ یوسف:۶)

''اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو نواز دے گا اور تجھ کو باتوں کی حقیقت، کی (تاویل) سکھائے گا اور تجھ پر اپنا انعام پورا کرے گا۔''

ان آیتوں میں اس علم کا ذکر نہیں، جس کا منشا وحی موقت ہے، کیونکہ ان میں سیاق کلام سے علم کے یکبارگی دیے جانے کا ذکر ہے جو وحی موقت کی شان نہیں، خصوصاً آخری آیت میں تاویلِ احادیث کا علم بیک دفعہ دیے جانے کا تذکرہ ہے، اسی لئے حضرت یوسف علیہ السلام ایک خواب کی تعبیر بیان کر کے دوسرے موقع پر کہتے ہیں:

﴿ ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّيٓ ۚ ﴾ (۱۲/ یوسف:۳۷)

''یہ وہ ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھایا ہے۔''

یہ کہیں بیان نہیں کیا گیا ہے، کہ خواب کی تعبیر کے وقت ان پر وحی آ کر حقیقت سے ان کو مطلع کرتی تھی

بلکہ خود ان کے اندر یہ علمی قوت ہمیشہ کے لئے ودیعت کردی گئی تھی، اسی قسم کا وہ علم ہے جس کی نسبت سے بعض انبیا علیہم السلام کو بچپن ہی میں علیم (جاننے والے) کا خطاب ملا:

﴿ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴾ (۵۱/ الذاریات:۲۸)

''اور فرشتوں نے اس کو ایک بڑے صاحبِ علم فرزند کی خوشخبری دی۔''

﴿ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴾ (۱۵/ الحجر:۵۳)

''ہم تجھے ایک بڑے صاحبِ علم فرزند کی خوش خبری دیتے ہیں۔''

یہاں لفظ علیم اختیار کیا گیا ہے عالم نہیں اور یہ لفظ عالم سے زیادہ علم پر دلالت کرتا ہے ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ وحی موقت جو گاہ گاہ آتی ہے اس کے علاوہ علم کا ایک دائمی عطیہ بھی نبی کی شان ہے۔

علم و حکم

بہت سے انبیا کے متعلق علم کے ساتھ حکم کا عطا ہونا بھی بیان ہوا ہے، حکم کے معنی لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں جس کا ترجمہ اردو میں سمجھ اور بوجھ کا نتیجہ (یعنی فیصلہ کے) کر سکتے ہیں، امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں:

والحكم بالشیء ان تقضی بالشیء بانه كذا أو ليس كذا سواء الزمت ذلك غيره اولم تلزمه۔ [1]

''کسی شے پر حکم کرنا یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ ایسی شے ہے یا ایسی نہیں ہے، عام اس سے کہ اس فیصلہ کا تم دوسرے کو پابند کرسکو یا نہ کرسکو۔''

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے:

الحكم العلم والفقه والقضاء بالعدل۔ [2]

''حکم کے معنی علم، سمجھ اور منصفانہ فیصلہ کرنا ہے۔''

ان انبیا علیہم السلام کو جن پر کسی کتاب کا ملنا ثابت نہیں، اس علم اور حکم کا عطا ہونا ثابت ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ وحی کتاب کے علاوہ کسی اور عطیہ علم و حکم کی طرف اشارہ ہے، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کی شان میں ہے:

﴿ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ﴾ (۱۲/ یوسف:۲۲)

''اور جب یوسف علیہ السلام جوانی کی قوت کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکم اور علم دیا۔''

حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق ہے:

﴿ وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۷۴)

[1] مفردات القرآن، ص:۱۲۶، مصر۔ [2] لسان العرب، ج۱۵، ص:۳۰، مصر۔

''اور لوط کو ہم نے حکم اور علم دیا۔''

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے ذکر میں ہے:

﴿ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۷۹)

''تو ہم نے سلیمان کو وہ فیصلہ سمجھا دیا اور ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم دیا تھا۔''

حضرت یحیٰی علیہ السلام کی نسبت ہے:

﴿ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۙ﴾ (۱۹/ مریم:۱۲)

''اے یحیٰی کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ و اور ہم نے اس کو حکم بچپن میں عطا کر دیا۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنی نعمتیں ان الفاظ میں شمار کرتا ہے:

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ﴾ (۴۵/ الجاثیۃ:۱۶)

''اور بلاشک ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکم اور نبوت دی۔''

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اور حکم اور نبوت تین چیزیں ہیں یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ان آیتوں میں حکم سے مراد دنیاوی حکومت اور سلطنت ہے کہ اس کے معنی میں یہ لفظ خالص قدیم عربی میں نہیں آیا، یہ اہل عجم کا محاورہ ہے قرآن نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوت فیصلہ کے معنی میں استعمال کیا ہے، جیسے:

﴿ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ﴾ (۳۸/ صٓ:۲۲)

''ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر۔''

﴿ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ﴾ (۳۸/ صٓ:۲۶)

''تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔''

﴿ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۲)

''اور اگر تو ان کے درمیان فیصلہ کرے تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کر۔''

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہیں:

﴿ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۷۸)

''اور داؤد اور سلیمان کو جب وہ دونوں کھیت کا فیصلہ کر رہے تھے۔''

﴿ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۱۰)

''اور جس کسی چیز میں تم نے اختلاف کیا، تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے۔''

سب سے بڑھ کر یہ کہ، یہی تین باتیں سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر الگ الگ دہرائی گئی ہیں:

﴿ أُولَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ ءَاتَيۡنَٰهُمُ ٱلۡكِتَٰبَ وَٱلۡحُكۡمَ وَٱلنُّبُوَّةَ ﴾ (٦/ الانعام:٩٠)

''یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت بخشی ۔''

جن پیغمبروں کے نام اوپر گنائے گئے ہیں اور جن کی طرف وہ لوگ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے، یہ ہیں: ابراہیم، اسحاق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحیٰ، عیسیٰ، الیاس، اسماعیل، الیسع، یونس، لوط علیہم السلام۔ ان اٹھارہ ناموں میں حکم بمعنی حکومت وسلطنت (اگر ہو) تو اس کے مستحق صرف دو ہیں، سلیمان اور داؤد علیہما السلام اور چاہے کسی طرح کسی تاویل سے یوسف اور موسیٰ علیہما السلام کو بھی شامل کر لیا جائے باقی چودہ نام ان پیغمبروں کے ہیں جن کو اس کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا اس لئے لامحالہ حکم کا لفظ قرآن میں عربیت کے اصلی اور صحیح اور صریح معنی میں مستعمل ہے اور اس لفظ سے خدا کا جو مقصود ہے، وہ کتاب کے ساتھ ساتھ ان پیغمبروں کو برابر حیثیت میں ملا تھا۔ غلط فہمی کا پورا پردہ چاک کرنے کے لیے ایک اور آیت کریمہ پر نظر ڈالیے:

﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤۡتِيَهُ ٱللَّهُ ٱلۡكِتَٰبَ وَٱلۡحُكۡمَ وَٱلنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُواْ عِبَادٗا لِّي مِن دُونِ ٱللَّهِ وَلَٰكِن كُونُواْ رَبَّٰنِيِّـۧنَ بِمَا كُنتُمۡ تُعَلِّمُونَ ٱلۡكِتَٰبَ وَبِمَا كُنتُمۡ تَدۡرُسُونَ ۝ ﴾

(٣/ آل عمران:٧٩)

''کسی بشر کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بنو، بلکہ جو تم کتاب (توراۃ) سکھاتے تھے اور جو تم پڑھتے تھے اس کے ذریعہ سے تم خدا والے بنو۔''

ان آیتوں میں مخاطب اہل کتاب ہیں اور جس مقدس بشر کا ان میں ذکر ہے، بظاہر اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، وہ نہ ہوں تو خود محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور یہ اس وقت کی بات ہے جب یہود کی پوری قوت مدینہ کے اطراف اور حجاز میں موجود تھی اور اسلام ہنوز ان کے مقابلہ میں کمزور وناتواں تھا۔ ایسی صورت میں جس حکم کے ملنے کا ذکر ان آیتوں میں ہے، وہ کتاب اور نبوت ہی کی جنس کی کوئی چیز ہو سکتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو حکومت وسلطنت کا ادنیٰ سا شائبہ بھی عطا نہیں ہوا تھا اور آنحضرت ﷺ کو اس وقت تک جب تک بنی اسرائیل اپنی ممتاز قوت کے ساتھ مدینہ اور حجاز میں موجود تھے، یہ رتبہ نہیں ملا تھا آیت ﴿ إِنِ ٱلۡحُكۡمُ إِلَّا لِلَّهِ ﴾ میں بھی حکم سے مراد وہی فیصلہ اور قضائے ربانی ہے، حکومت وسلطنت نہیں، تسکین کے لئے اس آیت کے آگے پیچھے کے الفاظ پر نظر ڈالو:

﴿ قُلۡ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٖ مِّن رَّبِّي وَكَذَّبۡتُم بِهِۦۚ مَا عِندِي مَا تَسۡتَعۡجِلُونَ بِهِۦٓۚ إِنِ ٱلۡحُكۡمُ إِلَّا لِلَّهِۖ يَقُصُّ ٱلۡحَقَّۖ وَهُوَ خَيۡرُ ٱلۡفَٰصِلِينَ ۝ ﴾ (٦/ الانعام:٥٧)

''کہہ دے (اے پیغمبر!) کہ میں اپنے پروردگار کی کھلی دلیل پر ہوں اور تم اس کو جھٹلاتے ہو،

میرے پاس وہ نہیں جس کی تم جلدی کرتے ہو، فیصلہ کسی کا نہیں لیکن اللہ کا، وہ حق بیان کرتا ہے اور سب فیصلہ کرنے والوں سے وہ بہتر ہے۔''

ان وجوہ سے اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ انبیا علیہم السلام کو منصب نبوت اور وحی کتاب کے ساتھ حکم کی سند بھی ملتی ہے جس کے صاف وصریح معنی کلام عرب اور لغت اور قرآن کے قرینوں سے علم وفہم فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز ہے اور اس لئے رسول کی اس قوت وطاقت کے نتائج بھی ہمارے لئے واجب العمل ہیں۔

شرحِ صدر

ربانی علم ومعرفت کا ایک اور مقام شرحِ صدر ہے شرح صدر کے معنی سینہ کھولنے کے ہیں عام خیال یہ ہے کہ سینہ کی تنگی اور ضیق، جہل ونادانی کی علامت اور سینہ کی کشادگی اور فراخی علم کی وسعت اور معرفت کی فراوانی پر دلالت کرتی ہے اسی لئے شرح صدر کے اصطلاحی اور مجازی معنی علم کی کثرت اور آ گاہی کی وسعت کے ہیں اور خاص طور سے اس علم ومعرفت اور اطلاع وآ گاہی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کسی دقیق اور مشکل مسئلہ کے متعلق دفعۃً اور یک بیک قلب میں وارد ہو جاتی ہے اور اس حل سے اس کی تسلی وتسکین ہو جاتی ہے اور اس کے شکوک وشبہات دور ہو کر اس کو یقین کی راحت ومسرت حاصل ہو جاتی ہے جمہرہ ابن درید میں ہے:

والشرح من قولهم شرحت لك الأمر...... أى أوضحته وكشفته وشرح الله صدره فانشرح اذا اتسع بقبول الخير۔ ❶

''شرح اہل عرب کے اس محاورہ سے ہے کہ ''میں نے تیرے لئے بات کی شرح کردی'' یعنی اس کو واضح کر دیا اور کھول دیا اور اللہ نے اس کے سینہ کو کھول دیا تو وہ کھل گیا یعنی جب نیکی کے قبول کرنے کے لئے وسیع ہو گیا۔''

صحاح جوہری میں ہے:

الشرح الكشف تقول شرحت الغامض اذا فسرته۔ ❷

''شرح یعنی کشف (کھولنا) تم کہتے ہو میں نے اس پوشیدہ مسئلہ کی شرح کردی، یعنی اس کی تفسیر کردی۔''

لسان العرب میں ہے:

الشرح الكشف يقال شرح فلان امرى اوضحه وشرح مسئلةً مشكلةً بينها وشرح الشىء يشرحه شرحًا وشرحه فتحه بينه وكشفه وكل ما فتح من

---

❶ جمهرة اللغة، ج٢، ص:١٣٤۔

❷ صحاح اللغة، ج٢، ص:٢٦٠۔

الجواهر فقد شرح ايضا تقول شرحت الغامض اذا فسرته وشرح الله صدره لقبول الخير يشرحه شرحا فانشرح وسعه لقبول الحق فاتسع۔

''شرح یعنی کشف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اس کی بات کی شرح کردی، یعنی اس کو واضح کردیا اور مشکل مسئلہ کی شرح کردی، یعنی اس کو بیان کردیا اور کسی چیز کی شرح کردی یعنی تفصیل کردی اور کھول دیا اور جواہر میں سے جو کھولا جائے تو اس کی شرح کی گئی، تم بولتے ہو پوشیدہ مسئلہ کی شرح کردی، یعنی تفسیر کردی اور خدا نے اس کے سینہ کو کھول دیا کسی نیک بات کے قبول کرنے کے لئے تو وہ کھل گیا یعنی اس کو قبول حق کے لئے وسیع کردیا گیا یا وہ وسیع ہوگیا۔''

قال ابن الاعرابی: الشرح الحفظ والشرح الفتح والشرح البیان والشرح الفهم۔ [1]

''ابن اعرابی نے کہا: شرح کے معنی، یاد رکھنا، کھولنا، بیان کرنا، سمجھنا۔''

قرآن مجید میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت کا منصب ملتے وقت دعا مانگی:

﴿ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۙ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ۙ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۙ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۲۵_۲۸)

''اے میرے رب! میرے سینہ کو میرے لئے کھول دے اور میرے کام کو میرے لئے آسان کردے اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات کو پوری طرح سمجھیں۔''

دعا کے پہلے جملہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لئے شرحِ صدر کی استدعا کی ہے اور آخر میں فصاحت بیان کی یعنی اول میں صحیح معانی کے القا اور آخر میں ان کے لئے صحیح الفاظ کے انتخاب کی دعا کی ہے، تا کہ ان کی دعوت و تبلیغ کو مخاطب سمجھ سکیں لیکن یہ دولت محمد رسول اللہ ﷺ کو بن مانگے ملی۔ خدا نے فرمایا:

﴿ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ ﴾ (۹۴/ الانشراح:۱، ۲)

''کیا ہم نے (اے محمد ﷺ)! تیرے لیے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا اور تیرے بوجھ کو تجھ سے اتار لیا۔''

شرح صدر اور ''سینہ کھولنے'' کی جو تشریح احادیث صحیحہ میں مذکور ہے اس کے لئے عام اصطلاح شق صدر ہے یعنی عالم رؤیا یا بیداری میں فرشتوں نے آکر سینہ مبارک کو واشگاف کیا، اس کو آبِ زمزم سے دھویا اور

---

[1] لسان العرب، ج ۲، ص:۲۹۲، بیروت۔

سونے کے طشت میں ایمان اور حکمت بھر کر لائے اور ان سے سینہ مبارک کو معمور کر کے شگاف کو برابر کر دیا۔ [1] اگر یہ واقعہ اپنی ظاہر حقیقت پر محمول کیا جائے تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ سینہ مبارک کو واقعاً چاک کر کے اور زمزم کے پانی سے پاک وصاف کر کے ایمان اور حکمت اس میں بھری گئی اور اگر تمثیل کے رنگ میں لیا جائے تو یہ حقیقت ماننی پڑے گی کہ سینہ صافی ایمان وحکمت سے معمور کیا گیا بہر حال شرحِ صدر کی حقیقت ایمان اور حکمت کی ربانی بخشش ہے۔

شرحِ صدر کے اس مذکورہ بالا معنی کو جو شرح صدر کے واقعہ کی تفصیل سے واضح ہے، اگر کوئی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو تو بحمد اللہ کہ اس کی تسکین کا سرمایہ بھی قرآن پاک میں موجود ہے۔ سورۂ زمر میں ہے:

﴿ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ﴾ (۳۹/ الزمر:۲۲)

''بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا، تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشنی میں ہے۔''

اسلام کے لئے سینہ کے کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت مؤثر طریقہ سے اس پر اس طرح کھل گئی کہ اس کو اسلام کی سچائی کا پورا یقین آ گیا اور اس کو اپنے اس یقین پر کامل تسکین حاصل ہوگئی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو اپنی منزلِ مقصود کے ہر قدم پر اللہ کی روشنی حاصل ہوئی یہی شرحِ صدر کی حقیقت اور ہے اس روشنی کی کمی بیشی درجوں اور منصبوں کے مطابق ہوگی۔

اس سلسلہ میں حدیث کے دو ایسے موقعوں کا ذکر کرنا ہے جن سے لفظ ''شرحِ صدر'' کے معنی کی پوری تشریح ہو جاتی ہے یہاں یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ ان حدیثوں سے معنوی، احتجاج یہاں مقصود نہیں بلکہ صدرِ اول کے کلامِ عرب سے شرحِ صدر کے محاورہ کی تشریح مقصود ہے۔

① پہلا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد عرب کے بعض قبیلے زکوۃ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان پر فوج کشی کا ارادہ کرتے ہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ آ کر عرض کرتے ہیں کہ یا خلیفہ رسول اللہ! ان سے جہاد کیونکر ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس نے لا الٰہ الا اللّٰہ کہا اس نے جان و مال مجھ سے بچا لیا، حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا خدا کی قسم! میں اس سے لڑوں گا جو زکوۃ اور نماز میں فرق کرتا ہے۔ نماز خدا کا حق ہے اور زکوۃ بندوں کا حق ہے اگر وہ بکری کا ایک بچہ بھی جس کو وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دیتے تھے، اب نہ دیں گے تو میں ان سے لڑوں گا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب کیف فرضت الصلوٰۃ:۳۴۹؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء برسول اللہ ﷺ الی السموات...... ۴۱۳، ۴۱۵؛ نسائی، کتاب الصلوٰۃ، باب فرض الصلوٰۃ:۴۴۹؛ ترمذی، ابواب التفسیر، سورۃ انشراح:۳۳۴۶؛ مسند أحمد، ج ۳، ص:۱۲۱، عن انس بن مالک۔

فو اللّٰہ! ما ھو الا ان قد شرح اللّٰہ صدر ابی بکر فعرفت انہ الحق۔ ❶

''تو خدا کی قسم، نہ تھا یہ، لیکن یہ کہ کھول دیا تھا اللہ نے ابوبکر کے سینہ کو، تو میں نے جان لیا کہ وہی حق ہے۔''

② دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جنگِ یمامہ میں قرآن کے بہت سے حافظ شہید ہوئے اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ قرآن پاک کو ایک ترتیب سے کاغذ پر یکجا لکھ لیا جائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں وہ کام کیونکر کروں جس کو خود رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے مشورہ کے بہتر ہونے پر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سمجھ میں بات آ گئی، اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح اللّٰہ صدری لذلک ورأیت فی ذلک الذی رای عمر۔ ❷

''تو عمر رضی اللہ عنہ بار بار مجھ سے کہتے رہے، یہاں تک کہ خدا نے اس کے لئے میرے سینہ کو کھول دیا، اور میں نے بھی وہی دیکھا جو عمر رضی اللہ عنہ دیکھتے تھے۔''

ان دونوں موقعوں پر لفظ شرحِ صدر اپنے استعمال کا محل اور اپنی حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے، یہی شرح صدر ہے جس کو قرآن نے جیسا کہ اوپر سورۂ زمر کے حوالہ سے گزرا، نورِ ربانی یا نورِ بصیرت کہا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو شرحِ صدر کی جو وسعت عطا ہوئی تھی اس کے سمجھنے سے پہلے بلاغت کا ایک مسئلہ سمجھ لینا چاہیے، جب کوئی لفظ متعلقات کے صلہ اور مفعول کے ساتھ مقید ہو کر بولا جاتا ہے تو اس سے معنی کی تخصیص وتحدید ہو جاتی ہے لیکن وہی لفظ جب متعلقات کے صلہ اور مفعول کی قید کے بغیر بولا جائے گا تو وہ عموم کے ساتھ فعل کے ثبوت کا فائدہ دے گا مثلاً: علم (جاننا) مفعول کو چاہتا ہے جس چیز کا علم ہوتا ہے اس کو عبارت میں مفعول بناتے ہیں اور اس عبارت میں اس علم سے مقصود اسی خاص شے کا علم ہو گا جس کو مفعول بنایا ہے، لیکن اگر مفعول کو حذف کر دیں تو اس کا مقصد کسی خاص علم کے بجائے مطلق اور عام علم کا ثبوت ہو گا ایک جگہ قرآن میں ہے: ﴿ يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا ﴾ (۳۰/ الروم:۷) ''وہ حیات دنیا کا ظاہری پہلو جانتے ہیں۔'' ظاہر ہے کہ اس علم کا تعلق صرف ایک چیز کے علم سے ہے یعنی دنیا کی ظاہری زندگی کے علم سے عام علم سے نہیں لیکن دوسری جگہ ہے: ﴿ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴾ (۳۹/ الزمر:۹) ''کیا جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے (یعنی جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے) دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔''

❶ صحیح بخاری، کتاب الزکوۃ، باب وجوب الزکوۃ:۱۴۰۰۔

❷ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن:۴۹۸۶۔

یہاں یہ ذکر نہیں کہ کس خاص بات کو جانتے ہیں، بلکہ مقصود عام علم ہے تو یہاں معنی ہوں گے کہ جو ہر طرح کے علم والے ہیں اور جو مطلق بے علم ہیں دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ بلاغت کی کتابوں میں: "هُوَ يَأْمُرُ وَيَنْهٰى يُعْطِي وَيَمْنَعُ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى" کی مثالوں سے اس مفہوم کی توضیح کی گئی ہے۔

اس تمہید کے بعد شرح صدر کے گزشتہ استعمالوں اور مثالوں پر نظر ڈالیے ہر جگہ آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ جس بات کے سمجھنے کے لئے سینہ کھولا جاتا ہے اس پر لام آتا ہے، یا قرینہ سے سمجھا جاتا ہے، مثلاً: اسلام کے لئے سینہ کھول دیا، یا جمع قرآن کے لئے سینہ کھول دیا، مانعینِ زکوۃ کے قتال کے لئے سینہ کھول دیا، مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ کے لئے قرآن میں جس شرحِ صدر کا ذکر ہے، اس میں اس بات کا ذکر نہیں ہے جس کے لئے ان انبیا علیہم السلام کے لئے سینے کھولے گئے، اس سے یہ مقصود ہے کہ ان انبیا کو امور دین میں مطلق اور عمومی شرح صدر عنایت ہوئی اور یہیں سے عام امت اور انبیا کے فرقِ مراتب کا اظہار ہوتا ہے کہ امت کے عام افراد کو خاص خاص امر کے سمجھنے کے لئے شرحِ صدر ملتی ہے اور انبیا کو اپنے دائرہ میں کلی اور عمومی حیثیت سے یہ چیز عنایت ہوتی ہے۔

ایک اور لطیف پہلو بھی یہاں ذکر کے قابل ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر احسان دونوں موقعوں پر لِــيْ اور لَكَ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں "میرے لئے میرے سینہ کو کھول دے" اور آنحضرت ﷺ کے لئے خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ "کیا میں نے تیرے لئے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا" سوال یہ ہے کہ "میرے لئے" اور "تیرے لئے" کے اضافہ کی ضرورت" اور اس لام" کی حاجت کیا تھی؟ مفسرین میں امام زمخشری نے اس سوال کے جواب دینے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ صرف تاکید کے لئے ہے حالانکہ یہ لام تملیک کے بجائے لام افادہ ہے [1] جیسا کہ ﴿ خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۹) میں ہے مقصد یہ ہے کہ یہ شرحِ صدر کی دولت تجھ کو تیرے لیے ملی ہے یعنی تیرے کشفِ علم کے لیے یا تائید کرنے کے لیے، یا فائدہ کرنے کے لیے اور یہ کشفِ علم اور شرح صدر خود تیری ذات کے لیے ہے کہ وہ کامل سے کامل تر ہو کر ظاہر ہو۔

اب آخری سوال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو دین کی جو یہ عمومی شرح صدر عنایت ہوئی اس کا کوئی اثر ونتیجہ بھی تو نمایاں ہوگا تو دراصل اسی کے یہ آثار ونتائج ہیں جو "افعال واقوال" اور "احادیث وسنن" کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

تبیینِ کتاب

آنحضرت ﷺ دنیا میں جس شریعت کو لے کر آئے وہ آخری اور ابدی تھی اور ایسی آخری اور ابدی

---

[1] تفسیر کشاف، تفسیر سورۃ الانشراح، ج ۲، ص:۱۶۱۸ میں علامہ زمخشری کی یہ تشریح موجود ہے۔

شریعت کے لئے ضروری تھا کہ وہ زیادہ تر زور، شریعت کے کلی اور ابدی اصول و مبادی پر دے، چنانچہ اس آخری وحی الٰہی نے اپنی کتاب الٰہی کو صرف اصول وکلیات تک محدود رکھا اور جزئیات کے لئے اپنی آیتوں میں ایسے اشارے رکھے جن کے سہارے سے وہ دل جو علم و معرفت سے پرنور اور حکم و حکمت سے معمور اور شرحِ صدر اور تائیدِ ربانی سے فیضیاب ہوں وہ علی قدرِ مراتب جزئیات کو صحیح طور سے جان لیں، چنانچہ یہ رتبہ سب سے پہلے خود نبی ﷺ کو ملا اور چونکہ وہ خطا سے معصوم ہے، اس لئے اس منصب کے نتائج بھی خطا سے محفوظ ہیں، پھر رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے یہ رتبہ خلفائے راشدین، اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم، ائمہ تابعین و تبع تابعین و مجتہدین عظام اور علمائے اعلام رحمہم اللہ کو ہمیشہ کے لئے ملتا رہا اس کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے جس کو ہر زمانہ کے فیض یاب علومِ نبوت اور حاملینِ اسرارِ شریعت، خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق اس کی وحی کی روشنی میں ہمیشہ انجام دیتے رہے ہیں اور دیتے رہیں گے۔ یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی توضیح و تفسیر کی ذمہ داری بھی خود اپنے اوپر لی ہے۔ فرمایا:

﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۝ ﴾ (۷۵ / القیامۃ:۱۶۔۱۹)

''تو قرآن کی وحی کے ساتھ اپنی زبان کو اس غرض سے حرکت نہ دے، تاکہ تو اس کی تلاوت و اشاعت میں جلدی کرے، ہم پر ہے قرآن کو جمع کرنا اور اس کا پڑھانا اور جب ہم نے اس کو پڑھا دیا، تو تو اس پڑھائی کی پیروی کر، پھر ہم پر ہے اس کی شرح کرنا۔''

اس ''بیان' اور شرح'' کی ذمہ داری کبھی بذریعہ وحی ادا ہوئی ہے جو قرآن میں مذکور ہے اور کبھی رسول کی تقریر و عمل سے پوری ہوئی ہے جو عملی تواتر سے منقول اور احادیث اور سنن کے مستند دفتر میں موجود ہے۔

یہ امر کہ اس بیان و شرح کی طاقت اور اس شرح و بیان کا اختیار رسول کو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا، حسب ذیل آیت سے ثابت ہے:

﴿ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۝ ﴾

(۱۶ / النحل:٤٤)

''اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت (کی کتاب) اتاری، تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا ہے، تو اس کو کھول کر بتا دے شاید وہ سوچیں۔''

''بیان'' اور ''تبیین'' کے لغوی معنی کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں اور ان کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے، ایک اعلان اور اظہار کے معنی میں یعنی اخفا کے مقابل، دوسرے توضیح و تفسیر کے معنی میں، قرآن پاک میں یہ لفظ ''تبیین'' اپنے دونوں معنوں میں آیا ہے۔ اب یہ تمیز کہ کس آیت میں کیا معنی مراد ہے، سیاق و سباق

اور موقع ومحل سے ہوسکتی ہے، مثلاً: ایک جگہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴾ (٥/ المآئدة:١٥)

''اے کتاب والو! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا، کہ کتاب کی جو باتیں تم چھپاتے تھے، وہ ان کو تمہارے لئے ظاہر کردے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرے۔''

یہاں ''تبیین'' صریح طور کے اخفا کے مقابلہ میں ہے اس لئے یہاں ''تبیین'' کے معنی یقینی طور پر ''اظہار واعلان'' کے ہیں لیکن یہی لفظ دوسری جگہ سورۂ نحل میں اس طرح آیا ہے:

﴿ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾ (١٦/ النحل:٦٤)

''اور ہم نے تجھ پر کتاب نہیں اتاری، لیکن اس لیے، تاکہ تو واضح کردے اس کو، جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور ایمان والوں کے لیے راہنمائی اور رحمت بنا کر اس کو اتارا۔''

اختلاف کے مقابلہ میں اظہار اور اعلان کی نہیں بلکہ توضیح وتشریح کی ضرورت ہے کہ جس امر میں اختلاف ہو، وہ توضیح وتفسیر کے بعد دور ہو جائے اب پہلی آیت پر غور کرنا چاہیے جو اسی سورہ میں ایک اور مقام پر ہے:

﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ ﴾

(١٦/ النحل:٤٤)

''اور ہم نے (اے پیغمبر!) تیری طرف نصیحت کی کتاب (قرآن) کو اتارا، تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا تو اس کو ان کے لیے کھول کر بتادے، شاید کہ وہ سوچیں۔''

سوال یہ ہے کہ اس آیتِ پاک میں بیان کرنے کا مفہوم ظاہر کرنے کے ہیں یا تشریح وتفصیل کرنے کے ہیں، ہمارا دعویٰ ہے کہ ظاہر کرنے کے بجائے یہاں غور وفکر کی مناسبت اور قرینہ کے سبب سے تشریح و تفصیل کے معنی لینا صحیح ہے، امرِ مخفی کا اظہار سننے اور ماننے کے تو مناسب ہوسکتا ہے مگر سوچنے کے لیے نہیں اور غور وفکر کے لیے یہاں تشریح وتفصیل کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار واعلان کی اب جبکہ آنحضرت ﷺ کے لیے تفصیل وتبیین کا منصب خدا کی طرف سے ثابت ہے تو اس تفصیل وتبیین کی پیروی اور اتباع بھی خدا ہی کے احکام کی پیروی ہوگی اور آپ کی یہ تبیین وتشریح آپ کے نور حکمت کا فیضان ہوگا جس کے اشارے خود کتاب الٰہی کے اندر آپ کو موجود نظر آتے ہیں۔

ارائت

انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں کہ ان کے ذریعہ سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جاسکے، جو ایک طرف

اختلاف فہم سے محفوظ رہے اور دوسری طرف اس میں یہ وسعت ہو کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کے جزئیات کی کوئی حد نہیں پوری طرح حاوی ہو سکے لیکن فہم انسانی کے اختلاف کے جو نقائص قانون میں ہوتے ہیں گو ان کو تمام تر دور نہیں کیا جا سکتا، تاہم ان کو کم کیا جا سکتا ہے، اسلام نے اپنے قانون الٰہی سے جو بہر حال انسانی بول چال کے الفاظ میں ہے، اس اختلاف فہم کے نقص کو کم کرنے کے لیے یہ کیا کہ اپنے رسول کی معرفت زبانی، اور عملی طور سے اس کی تشریح و تبیین کرادی گو انسانی ذرائع وحفظ و روایت کی فطری کمزوریوں کے سبب سے اس تشریح و تبیین میں بھی اختلاف فہم پیدا ہو گیا مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر یہ تشریح و تبیین نہ ہوتی تو اختلافات کی خلیج اس سے بھی زیادہ عمیق اور وسیع ہوتی۔

روز مرہ کے پیش آتے رہنے والے جزئیات کے فیصلہ کی یہ صورت رکھی گئی کہ آنحضرت ﷺ کی عدالت میں روزانہ اس قسم کے واقعات اور مقدمات پیش ہوتے رہے اور آپ وحی کتاب کے اصول وکلیات کے تحت اپنے نور بصیرت اور فہم حکمت سے ان کے فیصلے فرماتے رہے۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اپنے اپنے عہد میں ان نو بنو اور تازہ بتازہ واقعات کے فیصلوں کے لیے اولاً وحی کتابی کو اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ کے ان قضایا اور فیصلوں کو جو فہم نبوت اور نور بصیرت اور ارائت الٰہی کے ذریعہ فیصل ہوئے تھے اپنا ماخذ قرار دیا اور یہی اصول بعد کے فقہا اور مجتہدین نے اختیار کیا، ہر نئے واقعہ کو وحی کتاب اور فیصلہ نبوی کے معصوم و مسلم معیار پر جانچ کر ان میں سے کسی نہ کسی مماثل اور مشابہ پر قیاس کر کے اپنے فیصلے دیے اور جو چیزیں ان میں نہ ملیں ان کو معمولی عدل وانصاف، رسم ورواج، عقل وفکر، استحسان وغیرہ کے اصول پر سمجھ کر ان کا فیصلہ کیا، یہی مجموعہ آج ''فقہ اسلامی'' کہلاتا ہے۔

وحی الٰہی قرآن پاک میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے قضایا اور فیصلے احادیث وسنن کی صحیح روایتوں میں محفوظ ہیں، وحی الٰہی کی صداقت میں تو کلام نہیں ہو سکتا، اب رہ گئی آنحضرت ﷺ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی، تو اس کے متعلق بھی وحی الٰہی ناطق ہے:

﴿ إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ ﴾

(٤ / النسآء:١٠٥)

''ہم نے (اے پیغمبر!) تیری طرف سچائی کے ساتھ کتاب اتاری، تاکہ تو لوگوں کے درمیان جو تجھ کو اللہ سوجھائے اس کے ذریعہ سے فیصلہ کرے۔''

اس کتاب الٰہی کے نزول کی غرض ہی یہ بتائی گئی ہے کہ تو اے پیغمبر! اس کے احکام اور قوانین کو لے کر اس فہم کے ذریعہ جو اللہ تعالیٰ تجھ کو سوجھائے اور دکھائے تو لوگوں کے درمیان فیصلہ اور انصاف کر۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبر کو یہی سوجھانا اور دکھانا جو کچھ تھا وہ آپ کے عمل اور قضایا فیصلوں کی صورتوں میں محفوظ ہے اور اسلام

کے قانون کا وحی الٰہی کے بعد دوسرا ماخذ ہے۔

آنحضرت ﷺ کے عدل و انصاف پر خود منافقین تک کو بھروسہ تھا، چنانچہ ان کا قاعدہ تھا کہ جب ان کا حق کسی پر ہوتا تو وہ دوڑے ہوئے عدالت نبوی ﷺ میں حاضر ہوتے، کیونکہ سمجھتے تھے کہ یہ حق آپ ہی کی عدالت سے ہم کو ملے گا لیکن جب ان پر کسی کا حق نکلتا تو وہ ٹال جاتے اور دوسرے طریقہ سے فیصلہ چاہتے اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی سرزنش کی:

﴿ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ۝ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ۭ بَلْ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ۝ ﴾ (۲٤/ النور:٤٨-٥٢)

''اور جب وہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی طرف بلائے جائیں کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کردے، تو ان میں سے کچھ لوگ منہ موڑتے ہیں اور اگر ان کو کچھ حق پہنچتا ہو تو فرماں بردار بن کر رسول کے پاس چلے آئیں، کیا ان کے دل میں بیماری ہے یا وہ شک میں ہیں یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کرے گا، بلکہ وہی لوگ بے انصاف ہیں۔ ایمان والوں کی بات یہ تھی کہ جب ان کو خدا اور رسول کی طرف بلایا جائے، تا کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کردے تو وہ کہیں ہم نے سنا اور مان لیا، انہیں لوگوں کا بھلا ہے اور جو کوئی اللہ کے اور اس کے رسول کے حکم پر چلے اور اللہ سے ڈرتا رہے، اور اللہ سے بچ کر نکلے وہی لوگ ہیں مراد کو پہنچے۔''

ان آیات سے معلوم ہوا کہ رسول کے تمام فیصلے منصفانہ ہوتے تھے اور رسول کے فیصلوں کی اطاعت خود خدا کے حکم کی اطاعت ہے، بلکہ ایمان کی دلیل اور نشانی ہے:

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰي يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَــرَ بَيْنَھُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِــيْمًا۝ ﴾ (٤/ النسآء:٦٥)

''تو قسم ہے تیرے رب کی، وہ مومن نہ ہوں گے، جب تک وہ تجھے اپنے جھگڑوں کا منصف نہ بنائیں اور پھر جو تو فیصلہ کرے اس سے اپنے دل میں خفگی نہ پائیں اور پوری طرح تسلیم کریں۔''

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِـيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۝ۭ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۳٦)

''اور مومن مرد یا مومن عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دے، تو ان کو اپنے کام کا اختیار رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلا گمراہ ہوا۔''

یہ اطاعت اور مطلقاً سرافگندگی اور تمام فیصلوں کا قطعی حق اور منصفانہ فیصلہ ہونے کی ربانی ذمہ داری ہر حاکمِ وقت اور سلطانِ زمانہ کے لیے نہیں، یہ انبیا علیہم السلام کے لیے خاص ہے۔ دو شخصوں کے باہمی جزئی و شخصی مقدمات کا فیصلہ ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ وحی قرآنی کے ذریعہ نہیں کرتا تھا بلکہ رسول کے فہم نبوت، نور نبوت، فیضِ حکمت، شرحِ صدر، تبیینِ حقیقت اور ارائت (دکھانا اور سوجھانا) کے ذریعہ فرماتا تھا لیکن کلیات کی حیثیت سے وہ یقیناً وحی قرآنی کے مطابق ہوتا تھا اور ان کلیات کے مطابق ان جزئیات کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ آپ کو سوجھاتا تھا۔

آپ کے ان قضایا اور فیصلوں کی رضامندانہ اطاعت ہر مسلمان پر قیامت تک ضروری ہے، آپ کی زندگی کے بعد ان فیصلوں کی اطاعت یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمات اور معاملات میں ہم وہی فیصلے جاری کریں جو آپ نے اپنی زندگی میں ان کے متعلق کیے کہ آپ کے فیصلے بحکمِ خدا غلطی سے پاک، ظلم سے بری اور بے انصافی سے منزہ تھے اور دنیا میں رسول کے سوا کسی انسان کو اس بے گناہی اور عصمت کا درجہ اور رتبہ حاصل نہیں۔

رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی و راہنما فرمایا ہے یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایت و راہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لیے خاص ہو جاتی ہے۔ ان کی بعثت اسی لیے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی راہنمائی فرمائیں اور ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں، جس امت میں مبعوث ہوتے ہیں اس کے سامنے ہدایت و راہنمائی کے دو چراغ روشن ہوتے ہیں، جن دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے۔
اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جنہیں یہود اپنی شرارت اور سازش سے گمراہ بنانا چاہتے تھے، خطاب کر کے فرماتا ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ كٰفِرِیْنَ۝ وَ كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَیْكُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ وَ فِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۰۰۔۱۰۱)

''اے مومنو! اگر تم اہل کتاب کے کسی گروہ کا کہا مانو گے تو وہ ایمان لا چکنے کے بعد تمہیں مرتد کر کے کافر بنا دیں گے اور تم کو کیونکر کفر کرنا چاہیے درآنحالیکہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔''

آیت کے آخری ٹکڑے سے ثابت ہوا کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں مسلمانوں کے پاس

تھیں ایک تو آیاتِ الٰہی جو ان کو سنائی جاتی تھیں اور دوسری خود رسول کا مستقل وجود، جو اپنی تعلیم، تلقین، فیضِ صحبت اور اثر سے ان کو بھٹکنے نہ دے گا اور ضلالت سے مانع آتا تھا اگر صرف کتاب الٰہی اس کتاب کو انجام دے سکتی تو رسول کے ذکر کی حاجت بلکہ خود بعثت کی ضرورت کیا تھی اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ کی کتاب صامت (قرآن) اس کی کتاب ناطق (رسول) سے مل کر اپنے فریضہ کو انجام دیتی ہے۔ اور غالباً اس حدیث صحیح کے بھی یہی معنی ہیں، جس کا اعلان آپ ﷺ نے حجۃ الوداع سے واپسی میں اپنی وفات سے کچھ مہینوں پہلے فرمایا:

((انی تارك فیكما الثقلین كتاب اللّٰه و سنتی)) ❶

''مسلمانو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ جاتا ہوں اللہ کی کتاب اور اپنی سنت۔'' (یعنی اپنی عملی زندگی)

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کا ظاہری وجود چھپ گیا مگر آپ کی عملی زندگی جس کو سنت کہتے ہیں قائم و باقی ہے اور وہ بھی قرآن کے بعد ہماری ہدایت کا دوسرا سرچشمہ ہے۔

تزکیہ

انبیا علیہم السلام کا عموماً اور آنحضرت ﷺ کا خصوصاً ایک اور امتیازی وصف تزکیہ ہے، تزکیہ کے معنی پاک و صاف کرنے کے ہیں۔ نبوت محمدیہ ﷺ کے اس وصف کا ذکر ان آیتوں میں ہے جن میں آپ کی یہ توصیف کی گئی ہے، ایک رسول جو لوگوں پر خدا کی آیتیں تلاوت کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے ظاہر ہے کہ آپ کا یہ تیسرا وصف پہلے دو اوصاف سے الگ ہے یہ پاک و صاف کرنا، آیاتِ الٰہی کی تلاوت اور کتاب و حکمت کی تعلیم کے بعد نبی کی عملی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی تعلیم و تربیت، فیضان صحبت، حسن اخلاق، پند و موعظت اور تبلیغ و دعوت کی تاثیر سے برے اچھے، بد نیک اور اشرار، اخیار بن جاتے ہیں۔

انبیا علیہم السلام کی ہر تاریخ اس واقعہ کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ گمراہ اور بدکار قوموں میں مبعوث ہوئے ہر طرح کی اذیتیں اٹھائیں، تکلیفیں سہیں، مصیبتیں جھیلیں اور آخر تاریکی کو روشنی سے، جہالت کو علم سے اور کفر کو توحید سے بدل کر رہے اور مدت تک ان کی تاثیر کا فیض جاری رہا ان کا یہ وصف تزکیہ، وحی و الہام کے علاوہ ان کے جسم و جان اور زبان و دل کی کیمیا اثری کا نام ہے، خواہ ان کی زبان اس وقت وحی الٰہی سے مترنم ہو یا خاموش ہر آن آفتابِ حق کی کرنیں مطلعِ نبوت سے نکل نکل کر دلوں کی سرزمین کو روشن کرتی رہتی تھیں۔

---

❶ یہ روایت مختلف الفاظ میں حدیث کی کئی کتابوں میں ہے۔ صحیح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن ابی طالب: ٦٢٢٥ تا ٦٢٢٨؛ ترمذی: ٣٧٨٨؛ دارمی: ٣٣١٦؛ موطا امام مالك: ١٦٦٢؛ مسند احمد، ج٣، ص: ١٤، ١٧، ٢٦، ٥٩۔

نور

اس لیے نبوت کا سینہ صدق وصفا کا آئینہ ہوتا ہے، نبی کا مجسم پیکر ظلمت کدہ عالم کا چراغ اور علم وہدایت کا مطلع نور ہوتا ہے، جس طرح اس کا صحیفہ الہامی اور وحی ربانی نور ہوتی ہے وہ خود بھی سراپا نور ہوتا ہے، جس سے اندھے دیکھتے، گمراہ راہ پاتے اور حق کے طالب روشنی حاصل کرتے ہیں خود آپ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:٤٥، ٤٦)

''اے نبی! ہم نے تجھ کو بتانے والا، خوشخبری سنانے والا، چوکنا کرنے والا، خدا کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا۔''

یہ آس پاس کی چیزوں کو روشن کرنے والا چراغ خود رسول ﷺ کی ذات ہے، سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے جسم وجان، زبان ودل، خلق وعمل، علم وفہم میں روشنی نہیں تو آپ کی ذات جو انہیں چیزوں کا مجموعہ ہے روشن چراغ کیونکر ثابت ہوگی اور جب آپ کی ذات مبارک کی یہ تمام چیزیں انوار الٰہی ہیں تو ان انوار میں سے ہر نور کی روشنی میں چلنا ہدایت ہے اور ان میں سے کسی سے قطع نظر کرنا بھی ظلمت کے ایک گوشہ میں قدم دھرنا ہے۔

آیات وملکوت کی رؤیت

جس طرح انبیا علیہم السلام اپنی قوتِ سامعہ سے ندائے غیب کو سنتے اور صدائے وحی کو سماعت کرتے ہیں اسی طرح ان کی آنکھیں بہت کچھ دیکھتی ہیں جو عام انسان نہیں دیکھتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ ﴾

(٦/ الانعام:٧٦)

''اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں کی اور زمین کی مملکت دکھاتے تھے، تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں ہو۔''

استعدادِ نبوت کی تربیت اور نشو ونما کے لیے یہ رؤیت وبصیرت کی مافوق قوت ان کو عطا ہوئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر جو کچھ نظر آیا وہ جلوہ گری حسن وعشق کی مشہور کہانی ہے، آنحضرت ﷺ کے مشاہدات روحانی کا تذکرہ معراج کے تعلق سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

﴿ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل:۱)

''تاکہ ہم اس (رسول بندہ) کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔''

دوسری جگہ ہے:

﴿ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ ﴾

(۵۳/ النجم:۱۱۔۱۳)

''دل جھوٹ نہیں بولا جو اس نے دیکھا، اس پر اس سے جھگڑتے ہو اور دوسری بار اس کو اترتے دیکھا۔''

﴿ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝ ﴾

(۵۳/ النجم:۱۷، ۱۸)

''نگاہ نہ بہکی اور نہ سرکش ہوئی، اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔''

ایک اور مقام پر ہے:

﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝ ﴾ (۸۱/ التکویر:۲۳)

''اور اس نے یقیناً اس کو آسمان کے کھلے کناروں میں دیکھا۔''

یہ مشاہدہ وحی والہام کے علاوہ نبوت کے دوسرے حاسۂ بصارت کے امتیاز کو ظاہر کرتا ہے۔

سماعِ غیب

جس طرح آیات وملکوت کا مشاہدہ انبیا کے حاسۂ سماعت کا امتیازی وصف ہے، اسی طرح غیب کی آواز اور وحی کی صدا کو سننا بھی ان کے حاسۂ سماعت کا خصوصی امتیاز ہے۔ قرآن پاک میں اس کی تصریحات موجود ہیں کہ انبیا خدا سے ہم کلام ہوتے تھے اور وحی کو پاتے تھے ﴿ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:١٦٤)

''اور خدا نے موسیٰ سے بات کی۔''

حضور کو حکم ہوا:

﴿ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۱۴)

''اور اس سے پہلے کہ قرآن کی وحی تجھ پر پوری ہو، قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کر۔''

خدا نے پیغمبروں کو پکارا اور انہوں نے اس کی آوازیں سنیں ''نَادَيْنَا'' ہم نے پکارا' بار بار یہ الفاظ قرآن میں پیغمبروں کے متعلق آئے ہیں۔

تبلیغ ودعوت

نبی کا سب سے پہلا اور اہم فرض تبلیغ اور دعوت ہے یعنی جو سچائی اس کو خدا سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے، اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا، خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سنا دینا، اس نے اس کو جس صداقت سے آگاہ کیا ہے اس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا، جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں ان کو اس راہ میں صرف کرنا اور اس سمجھانے بجھانے اور راہِ راست پر لانے میں صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا، اس اعلان اور دعوت میں جو تکلیف بھی

پیش آئے اس کو راحت جاننا، جو مصیبت درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا، جو کانٹے بھی اس وادی میں اس کے تلووں میں چبھیں ان کو رگِ گل سمجھنا، اس حق کی آواز کو دبانے کے لیے جو قوت بھی سر اٹھائے اس کو کچل دینا اور مال و منال، اہل و عیال غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگِ راہ ہو کر سامنے آئے اس کو ہٹا دینا اور ان کی ان ساری کوشش و کاوش کا مقصد خدا کی رضامندی مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرضِ رسالت کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ ہے انبیا علیہم السلام کی تبلیغ و دعوت کا مفہوم، دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے، انہوں نے اپنے فرض کو اسی ایثار اور قربانی کے ساتھ انجام دیا اور ایک لحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی اور آج دنیا میں جو کچھ خدا کی محبت، بھائیوں کا پیار، انسانوں کی ہمدردی، بے کسوں کی مدد، غریبوں کی اعانت اور دوسری نیکیوں کا اس سطحِ زمین پر وجود ہے وہ سب بواسطہ یا بلاواسطہ، دانستہ یا نادانستہ انہیں کی دعوت و تبلیغ اور جدوجہد کا اثر اور نتیجہ ہے۔ دنیا کے بڑے سے بڑے مفکر، بڑے سے بڑے شاعر، بڑے سے بڑے حکیم اپنا فرض خود سمجھ لینا یا زیادہ سے زیادہ دوسروں کو سمجھا دینا سمجھتے ہیں، لیکن انبیا علیہم السلام، جس صداقت کو پاتے ہیں اس کو دوسروں کے سمجھانے اور ہر ممکن طریق سے اس کو پھیلانے اور اہل دنیا کو اس کے باور کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں اور ہر مشکل کو جھیل کر نافہموں کو حقیقت سمجھاتے اور اندھوں کو راہ راست دکھاتے ہیں۔ انبیا علیہم السلام کی تعریف میں خدا فرماتا ہے:

﴿ اِلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَیَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِیْبًا۝ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۳۹)

”جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، اور اللہ بس ہے حساب اعمال کے لیے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے:

﴿ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۲٤)

”فرعون کے پاس جا کہ اس نے سرکشی کی۔“

آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ پیغامِ ربانی کی بے محابا تبلیغ کریں اور دشمنوں سے نہ ڈریں کہ تمہاری حفاظت کا خود شہنشاہ عالم ذمہ دار ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ ﴾ (۵/ المآئدۃ:٦٧)

”اے پیغمبر! تیرے رب کے پاس سے جو تیری طرف اُترا ہے، اس کو پہنچا دے اور اگر یہ نہ کیا

تو، تو نے اس کے پیغام کو پہنچانے کے فرض کو ادا نہیں کیا، اللہ تجھ کو لوگوں سے بچائے گا۔''

انبیا کی تبلیغ و دعوت میں تبشیر اور انذار دونوں ہوتے ہیں، تبشیر یعنی بشارت دینا اور خوش خبری سنانا اور انذار یعنی خدا کے جلال سے ڈرانا عذابِ الٰہی کا خوف دلانا اور ان کو ان کے انجامِ بد سے آگاہ کرنا اور انبیا کی آمد اس شان سے ہوتی ہے کہ خدا کے بندوں پر حجت تمام ہو جائے:

﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ﴾

(٤/ النسآء:١٦٥)

''یہ سب پیغمبر خوش خبری سناتے اور ہشیار و بیدار کرتے ہوئے آئے، تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کے لیے خدا پر کوئی حجت نہ رہے۔''

ان سب نے پیغامِ الٰہی پہنچانے کے ساتھ اپنی خیر خواہی، دلسوزی و اخلاص مندی کا اعلان کیا:

﴿ أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ ﴾ (٧/ الاعراف:٦٨)

''میں تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں، اور میں تمہارا امانت دار خیر خواہ ہوں۔''

﴿ يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلَٰكِن لَّا تُحِبُّونَ النَّاصِحِينَ ﴾

(٧/ الاعراف:٧٩)

''اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کا پیام تم کو پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کر چکا، لیکن تم خیر خواہوں کو پیار نہیں کرتے۔''

﴿ يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۖ فَكَيْفَ آسَىٰ عَلَىٰ قَوْمٍ كَافِرِينَ ﴾

(٧/ الاعراف:٩٣)

''اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کے پیام تم کو پہنچا دیے اور تمہاری خیر خواہی کر چکا، تو پھر کیسے نہ ماننے والے لوگوں پر میں غم کھاؤں۔''

یہ بھی فرمایا کہ

﴿ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي ﴾ (١١/ هود:٥١)

''میں اپنی نصیحت کی تم سے مزدوری نہیں مانگتا، میری مزدوری تو خدا پر ہے، جس نے مجھ کو پیدا کیا۔''

﴿ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ﴾ (١١/ هود:٢٩)

''میں اپنی تبلیغ کے بدلہ تم سے مال و دولت کا خواہاں نہیں ہوں، میری مزدوری تو خدا پر ہے۔''

ایک شبہ کا ازالہ

اس سلسلہ میں ہم کو ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو بعضوں کو حضور ﷺ کی صفت تبلیغ کے سمجھنے میں پیش آئی ہے، قرآن مجید میں متعدد آیتیں اس معنی کی آئی ہیں کہ ''رسول کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا (البلاغ) ہے'' اس سے آج کل کے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا کہ رسول کا فرض صرف ''وحی الٰہی کی تبلیغ ہے'' یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو انسانوں تک بعینہٖ پہنچا دینا اس کا کام ہے، اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح کا نہ اس کو منصب ہے اور نہ اس کا اس کو حق ہے، ان کے نزدیک مبلغ رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی ہے، جو ایک جگہ سے دوسری جگہ خط تو پہنچا دیتا ہے، مگر اس خط کے مفہوم و معنی کی تشریح کا اُس کو حق نہیں ہوتا، بلکہ اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس بند لفافہ میں کیا ہے۔

شاید ان کو یہ دھوکا اس آیت کے علاوہ لفظ ''رسول'' سے بھی ہوا ہے، جس کے لفظی معنی پیغمبر اور قاصد کے ہیں، لیکن وہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے، کہ جہاں اس کو رسول کہا گیا ہے، ''نبی'' (خبر پانے والا) بھی تو کہا گیا ہے، مبشر (خوشخبری سنانے والا) نذیر (ڈرانے والا) سراج منیر (روشن چراغ) صاحب حکمت، صاحبِ خلقِ عظیم، صاحبِ مقامِ محمود، مجتبیٰ (مقبول)، مصطفیٰ (برگزیدہ)، مبین (بیان اور شرح کرنے والا) معلم (سکھانے والا)، مزکی (پاک و صاف کرنے والا)، داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بلانے والا) حاکم (فیصلہ کرنے والا) مطاع (واجب الاطاعت) آمر (حکم دینے والا) ناہی (روکنے والا) بھی تو کہا گیا ہے، کیا یہ اوصاف والقاب اس کی اسی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں، کہ وہ صرف ایک پیغام پہنچانے والا قاصد ہے، جس کو اصل پیغام کے مفہوم و معنی سے ایک معمولی قاصد اور نامہ بر کی طرح کوئی سروکار نہیں؟ اس کے پیغام کے مفہوم و معنی کی تشریح و تفسیر کا آج تو ہر عربی دان کو حق حاصل ہے اور نہ اس کی اصل حقیقت تک پہنچ جانے کا ہر مدعی کو دعویٰ ہے، مگر خود صاحبِ پیغام کو اپنی پیغمبری کے وقت نہ مفہوم و معنی کا علم تھا اور نہ اس کی تشریح کا اس کو حق تھا، ﴿ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ﴾ (۳۸/ صٓ: ۵) ہم نے پچھلے صفحات میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس غلط خیال کی پوری تردید ہو جاتی ہے۔

ان کے اشتباہ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اسلام میں شرع اور وضع قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تسلیم کیا گیا ہے، وہی اصلی شارع ہے، اب اگر رسول کو بھی وحی کتابی سے الگ شرع بنانے کا حق تسلیم کیا جائے تو خدا کے سوا ایک اور شارع تسلیم کرنا ہوگا، لیکن اس کا پہلا جواب تو یہ ہے، کہ ہم رسول کو شارع نہیں شارح قرار دیتے ہیں، کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج جب حکومت کے قانون کی توضیح و تشریح کرتا ہے، تو وہ اپنے اس عمل سے سلطان وقت بن کر واضعِ قانون کا منصب حاصل کرتا ہے، یا صرف قانون کے مفہوم کا شارح ہوتا ہے؟ یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اس قاضی کی ہے، جس کو ہم نبی اور رسول اور معلم اور مبین کہتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر پیام اور مقصد اور مفہوم اور فیصلہ سے صرف وحی کے اسی طریقہ خاص کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو مطلع نہیں فرماتا، جس طریقہ خاص سے قرآن مجید نازل ہوا ہے، بلکہ وہ اپنی تینوں قسموں کے ذریعہ سے اپنے اغراض اس رسول پر واضح کرتا ہے اور ان میں سے ہر طریق کی وحی کی اطاعت تمام امت پر فرض ہے، خواہ وہ وحی ہو جو الفاظ الٰہی کی قید کے ساتھ آئی ہو، جس کو قرآن کہتے ہیں، یا ربانی مفہوم و معنی رسول کے الفاظ میں ادا ہوں، جس کو حدیث و سنت کہتے ہیں، الغرض خواہ وہ کتابِ الٰہی کے ذریعہ سے ہو یا، حکمتِ ربانی کے فیض سے ہو۔

قرآن مجید کی وہ آیتیں جن کے معنی یہ ہیں، کہ ''ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچانا ہے'' ان کا یہ منشا نہیں کہ وہ صرف پیغام پہنچانے والا ہے، خوش خبری سنانے والا نہیں، ہشیار و بیدار کرنے والا نہیں، پیغامِ الٰہی کے الفاظ سنانے کے بعد ان کی تعلیم دینے والا نہیں، آیاتِ الٰہی کی تبیین و تشریح کرنے والا نہیں، راہنما اور ہادی نہیں، نجاستوں سے پاک و صاف کرنے والا نہیں، ایسا کہنا قرآن کا انکار، اور عقل و فہم کا ماتم ہے، قرآن میں کئی جگہ ہے:

﴿ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ ﴾ (۱۳/ الرعد:۷، ۷۹/ النازعات:۴۵)

''تو تو صرف ڈر سنانے والا ہے۔''

ایک جگہ ہے:

﴿ اِنَّمَاۤ اَنَا مُنۡذِرٌ ﴾ (۳۸/ صٓ:۶۵) ''میں تو صرف ڈر سنانے والا ہوں۔''

کیا ان آیتوں کا مفہوم یہی ہے کہ ڈر سنانے کے سوا، رسول کا کام بشارت اور خوشخبری سنانا نہیں اور وہ صرف منذر ہے، مبشر نہیں، اصل یہ ہے کہ اس قسم کی آیتوں:

﴿ اَنَّمَا عَلٰی رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۹۲)

''ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔''

کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ صرف پیغام رساں اور قاصد ہے، مبین اور شارح نہیں، بلکہ یہ ہے کہ اس کا کام صرف خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے، زبردستی لوگوں کے دلوں میں اس کا پیغام اتار دینا نہیں، بزور لوگوں کو مسلمان بنا دینا نہیں، جبراً منوالینا نہیں اور نہ پیغام پہنچا دینے کے بعد تمہارے کفر و انکار و عدم ایمان کی ذمہ داری اس پر ہے۔ قرآن پاک میں جہاں جہاں اس معنی کی آیتیں آئی ہیں، ان کا منشا یہی اور صرف یہی ہے، قرآن پاک کی تیرہ مختلف آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے، اور ہر جگہ یہی ایک مفہوم ہے:

﴿ وَقُلۡ لِّلَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ وَالۡاُمِّیّٖنَ ءَاَسۡلَمۡتُمۡ ؕ فَاِنۡ اَسۡلَمُوۡا فَقَدِ اہۡتَدَوۡا ۚ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ ؕ وَاللّٰہُ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴾ (۳/ آل عمران:۲۰)

''کتاب والوں اور ان پڑھوں سے کہہ دے، کیا تم نے اسلام قبول کیا، اگر کیا ہدایت پائی، اور

اگر منہ پھیرا تو تجھ پر (اے رسول ﷺ) صرف پیام پہنچانا ہے اور اللہ بندوں کو دیکھنے والا ہے۔"

مفہوم بالکل ظاہر ہے، کہ اسلام کی ہدایت قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں، اگر لوگ قبول کریں تو انہوں نے حق کی راہ پائی اور اگر انکار کریں تو رسول ﷺ کا کام صرف پیغام پہنچا دینا تھا، وہ اس نے پہنچا دیا اس کا فرض ادا ہو چکا، اب خدا جانے اور اس کے بندے جانیں:

﴿ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ ﴾ (۱۳/ الرعد: ۴۰)

"تو تیرا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور ہمارا فرض ان سے حساب لینا ہے۔"

اس کی مزید تفصیل سورۂ غاشیہ میں ہے:

﴿ فَذَكِّرْ ۚ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝ إِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ۝ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ۝ إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝ ﴾ (۸۸/ الغاشیہ: ۲۱۔۲۶)

"تو (اے پیغمبر)! تو نصیحت کر، تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، ان پر داروغہ نہیں، لیکن جس نے منہ پھیرا اور انکار کیا، تو خدا اس کو بڑی سزا دے گا، بے شک پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے، اور ہمیں پر ان کا حساب ہے۔"

یہی مفہوم سورۂ شوریٰ میں ہے کہ رسول کا کام صرف سمجھانا اور تبلیغ کرنا ہے، وہ سلطان، کارفرما، داروغہ اور فرمانروا بنا کر نہیں بھیجا گیا، کہ لوگوں سے بزور اپنی بات منوا لے:

﴿ فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۗ إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلٰغُ ۗ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ: ۴۸)

"تو اگر وہ انکار کریں تو ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا، تیرا کام صرف پہنچا دینا ہے۔"

کافروں نے جب کبھی رسولوں کو جھٹلایا، انہوں نے یہی کہا کہ ہمارا کام پہنچا دینا ہے، ماننے نہ ماننے کا تمہیں اختیار ہے:

﴿ قَالُوا مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَا أَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَكْذِبُونَ ۝ قَالُوا رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّا إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُونَ ۝ ﴾ (۳۶/ یٰسٓ: ۱۵۔۱۷)

"کافروں نے کہا تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو، خدا نے کچھ نہیں اتارا، تم جھوٹ کہتے ہو، رسولوں نے جواب دیا، ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم بھیجے ہوئے ہیں اور ہمارا فرض صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔"

خود اللہ تعالیٰ نے بھی رسولوں کو تسلی دی ہے، کہ ان منکروں کے انکار سے دل شکستہ نہ ہوں، اگلے پیغمبروں کے منکروں نے بھی یہی کیا تھا، پیغمبروں کا فرض لوگوں کو منوانا نہیں، بلکہ ان تک ہمارا پیام پہنچانا ہے:

﴿ وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا

حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿ (١٦/ النحل:٣٥)

''اور مشرکوں نے کہا اگر خدا چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی اور کو نہ پوجتے، نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے، (خدا کہتا ہے کہ) ایسا ہی کیا تھا ان کے پہلوں نے، کیا ہمارے پیغمبروں پر پہنچا دینے کے سوا کچھ ہے؟''

﴿ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾

(٢٩/ العنكبوت:١٨)

''اگر تم جھٹلاؤ، تو (کیا ہے) تم سے پہلے بھی قومیں جھٹلا چکی ہیں اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔''

رسول کا کام پہنچا دینا ہے، باقی علام الغیوب جو چاہے سو کرے:

﴿ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴾ (٥/ المآئدة:٩٩)

''رسول پر نہیں ہے، لیکن پہنچا دینا اور اللہ جانتا ہے، جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔''

بقیہ آیتیں حسب ذیل ہیں، جو ایک ہی مفہوم کو ادا کرتی ہیں:

﴿ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾ (٥/ المآئدة:٩٢)

''اور اللہ کا فرمان اور رسول کی بات مانو اور بچو اور اگر تم نے منہ پھیرا تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔''

﴿ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾ (٢٤/ النور:٥٤)

''کہہ دے اے پیغمبر! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ منہ پھیریں، تو رسول پر وہ ہے جس کا اس پر بوجھ ہے اور تم پر وہ ہے جس کا بوجھ تم پر ہے، اگر اس کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔''

﴿ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ۞ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾

(١٦/ النحل:٨١، ٨٢)

''اسی طرح اللہ تم پر اپنا احسان پورا کرے گا، تا کہ تم مسلمان ہو جاؤ اور اگر انہوں نے منہ پھیرا تو تجھ پر سوا اس کے کچھ نہیں کہ کھول کر پہنچا دے۔''

﴿ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾

(٦٤/ التغابن:١٢)

''اور خدا کا کہا مانو اور رسول کی فرمانبرداری کرو، اگر تم نے منہ پھیرا تو ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔''

پیغمبر کا قول ہے:

﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَيْكُمْ ؕ ﴾ (١١/ هود:٥٧)

''تو اگر تم منہ پھیرو تو میں جو پیام دے کر تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں نے تم کو پہنچا دیا۔''

(یعنی میرا فرض ختم ہو چکا)

ان تمام آیتوں کا تعلق نبوت کے منکروں سے ہے، یہاں پر یہ نکتہ بھی لحاظ کے قابل ہے، کہ جو لوگ ہنوز نبوت کے منکر ہوں، ان سے رسول کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت، پند و موعظت اور سمجھانے کا ہے، لیکن جو خوش قسمت اقرار نبوت کی سعادت کو حاصل کر لیں، تو پھر ان کا تعلق رسول سے اتباع و پیروی و اطاعت کا ہو جاتا ہے، اس کے بعد رسول ان کو تبلیغ ہی نہیں، بلکہ امر و نہی بھی کرتا ہے، کوئی حکومت، دوسرے ملک کے کسی باشندے کو زبردستی اپنی رعایا نہیں بناتی، لیکن اگر کوئی شخص از خود اس حکومت کی رعایا بن جائے، تو پھر اس کو اس کے قانون کی پیروی پر بزور مجبور کیا جائے گا، کہ رعایا بننے کے معنی ہی اس کے قانون کے قبول کرنے کے ہیں۔

انبیا علیہم السلام کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ

دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے، وہ ایک ہی دین اور ایک ہی عقیدہ لے کر آئے، وہی توحید، وہی نبوت، وہی عبادت، وہی اخلاق، وہی جزا و سزا اور عمل کی پرسش، اس لحاظ سے انبیا علیہم السلام کی تعلیم میں کوئی اصولی فرق نہیں، اس لیے فرمایا کہ ﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا ﴾ الأية (٤٢/ الشوری:١٣) یعنی ''خدا نے تمہارے لیے وہی دین مشروع کیا، جو نوح وغیرہ دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا اور اسی کا نام اسلام ہے۔'' لیکن انبیا علیہم السلام کی تعلیم کا اہم الاصول اور سب سے ضروری جز توحید ہے اور وہی نبوت کے ساز کا اصلی اور ازلی ترانہ ہے۔

ممکن ہے کہ دنیا میں اسلام سے پہلے بہت سے اچھے لوگ گزرے ہوں، ان کی دعوت بھی مفید ہو، ان کے اخلاقی وعظ بھی دل پسند ہوں، وہ یونان کے حکیم ہوں، یا ہندوستان کے اوتار، لیکن ان کی تعلیم میں اگر توحید کی دعوت شامل نہیں، تو وہ نبوت کے رتبہ کے قابل نہیں، کہ پیغمبرانہ تعلیم کی پہچان ہی توحید کی دعوت ہے، اگر یہ نہیں تو نبوت بھی نہیں، فرمایا:

﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾

(٢١/ الانبیآء:٢٥)

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن ان کو یہ وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں،

میری ہی پرستش کرو۔''

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ﴾

(١٦/ النحل:٣٦)

''اور ہر قوم میں ہم نے ایک رسول بھیجا، کہ خدا کی عبادت کرو اور بتوں سے پرہیز کرو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ تعلیمی حیثیت سے نبوت کی شناخت اسی سے ہوسکتی ہے، اسلام سے پہلے جس مدعی نبوت کی تبلیغ کا اہم ترین جز توحید نہیں، اس کو دعوائے نبوت کا کوئی حق نہیں۔

نبوت کی غرض وغایت

انبیا علیہم السلام کی آمد کی غرض وغایت کو شاعرانہ زبان اور خطیبانہ جوشِ بیان میں بہت کچھ بتایا جاسکتا ہے، لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ ان اغراض کو گنایا جائے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی مبارک کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، اصل دعویٰ وہی ہے، جس کو مدعی ظاہر کرتا ہو، نہ کہ گواہ۔

انبیا علیہم السلام کی بعثت کی سب سے پہلی غرض اس روز اَلَسْتُ کے بھولے ہوئے ازلی عہد و پیمان بندگی کی یاددہانی ہے:

﴿ وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ ﴾

(٧/ الاعراف:١٧٢)

''اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی نسلوں سے عہد لیا اور ان کو خود اپنے اوپر آپ گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں، انہوں نے کہا کیوں نہیں تو ہے، ہم نے گواہی دی، کہ قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم اس کو بھول گئے تھے۔''

اس لیے ضروری ہوا کہ ان کو موقع بموقع ان کا یہ وعدہ یاددلایا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول کی بعثت کی ایک غرض یہ بھی بتائی گئی ہے، کہ اس کا وجود بنی آدم پر اتمام حجت ہے، ممکن ہے کہ آدم کے فرزند یہ بجا عذر کریں کہ ہم کو کوئی یاددلانے والا نہیں آیا، اس لیے فرمایا:

﴿ رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ﴾

(٤/ النسآء:١٦٥)

''رسول خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے، تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے لیے خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔''

تذکیر کے بعد نبی کا فرض اولین ہدایت اور راہنمائی ہے، کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفت ہادی کے

مظہر اور مورد ہیں، اسی لیے ایک آیت میں نبی اور رسول کے لیے ہادی کا لفظ آیا ہے، فرمایا:

﴿ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾ (۱۳/ الرعد:۷)

''اور ہر قوم کے لیے ایک راہ دکھانے والا آیا۔''

سورۂ شوریٰ میں فرمایا:

﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۵۲)

''اور تو اے پیغمبر سیدھی راہ دکھاتا ہے۔''

سورۂ انبیا میں بہت سے پیغمبروں کے ذکر کے بعد ہے:

﴿ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا ﴾ (۲۱/ الانبیاء:۷۳)

''اور ہم نے ان پیغمبروں کو ایسا پیشوا بنایا، جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے۔''

اسی طرح ان آسمانی کتابوں کو جو ان کو دی گئی تھیں، بار بار ھُدًی (ہدایت) کہا گیا ہے اور کہیں ان کو ضیا اور نور (روشنی) کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

اس ہدایت اور راہنمائی کا دوسرا مفہوم یہ ہے، کہ وہ بندگانِ الٰہی کو باطل کے اندھیرے سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتے ہیں، انسان جب فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے سود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر فطری بصیرت اور روحانی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں، انبیا ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو ظلمات سے انوار میں لاتے ہیں، ان کو شک کی جگہ یقین، جہل کی جگہ علم، باطل کی جگہ حق اور ظلمت کے بجائے نور عطا کرتے ہیں:

﴿ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾

(۵۷/ الحدید:۹)

''وہی اللہ جو اپنے بندہ پر کھلی آیتیں اتارتا ہے، تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے نور میں لائے۔''

اس دنیا کی نجات صرف اعتدال میں ہے، جب کبھی مزاج انسانی کی طرح اس کے ان عناصر میں جن سے اس کی ترکیب ہوئی ہے، افراط و تفریط پیدا ہوگی، روئے زمین پر فساد رونما ہوگا، انسانی جماعتوں اور قوموں میں بھی یہ ترازو جب اعتدال کے معیار پر پوری نہ ہوگی، کبھی دونوں پلے برابر نہ ہوں گے، آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرہ اعتدال کی ترازو میں تلا ہوا ہے، کیمسٹری اور علم الفلک کا واقف کار اس ترازو کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور حیرت کرتا ہے کہ کہیں ایک ذرہ کی کمی بیشی نہیں ہے، جس طرح اس مادی دنیا میں یہ حیرت انگیز توازن ہے، ٹھیک اسی طرح روحانی اور اخلاقی دنیا میں بھی اس توازن کی ضرورت ہے، عقائد ہوں کہ عبادات، اخلاق ہوں کہ معاملات، اسی توازن کا نام حق اور عدل ہے، فرمایا:

﴿ وَالسَّمَاۗءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا

تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۝﴾ (۵۵/ الرحمٰن:۷۔۹)

''اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی، کہ اس ترازو میں کمی بیشی نہ کرو اور تول کو ٹھیک رکھو اور ترازو کو گھٹاؤ نہیں۔''

یہ توازن اور برابر تول جو بے ارادہ اور بے اختیار دنیا کے ذرہ ذرہ اور اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک کام میں خالقِ فطرت کے اندازہ اور تقدیر سے قائم ہے، یہی توازن اور برابر کی تول رسولوں کے ذریعہ آئی ہوئی میزانِ شریعت کے مطابق ذی ارادہ اور خود اختیار انسانوں کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک جنبش میں ہونی چاہیے، بے ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانون فطرت ہے اور بالا رادہ دنیا کی میزان کا نام قانون شریعت ہے، بے ارادہ دنیا کا نظام عدل اسی خدائی میزان فطرت سے چل رہا ہے، اگر اس میزان میں ایک ذرہ بھی کمی بیشی ہو جائے، تو عالم کا نظام درہم برہم ہو جائے، اسی طرح انسانی دنیا کی سکینت، طمانیت اور امن و امان کا نظام اسی میزان شریعت کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو اس کا نظام درہم برہم ہونا بھی لازمی ہے، فرمایا:

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۖ﴾

(۵۷/ الحدید:۲۵)

''ہم نے بے شبہ اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری، تاکہ لوگ عدل کو قائم کریں۔''

انبیا علیہم السلام کی بعثت کی یہ غرض و غایت کہ لوگ شریعت کی میزان کے مطابق عدل اور توازن کو قائم رکھیں، اس موجودہ دنیا ہی کے نظام کی امن و سلامتی کے لیے ہے، آج یورپ کے اتحاد کی گونج نے دنیا کے گوشہ گوشہ کو پر شور بنا دیا ہے، آج رسولوں کی اہمیت اور ان کی تعلیمات کی ضرورت پر شکوک و شبہات کی ژالہ باری ہو رہی ہے، لیکن وہمی و خیالی مباحث سے قطع نظر کر کے عملی حیثیت سے دنیا کی ایک ایک اقلیم اور ایک ایک آبادی کا جائزہ لو، آج جہاں کہیں بھی سچائی کی کوئی روشنی اور حقیقت کی کوئی کرن چمکتی ہے، وہ اسی مطلعِ خورشید سے چھن کر نکلی ہے، کوئی دین دار ہو یا ملحد، خوش عقیدہ ہو یا بے عقیدہ، یونان کا حکیم ہو یا افریقہ کا جاہل، یورپ کا متمدن ہو یا صحاریٰ کا وحشی، رومی ہو یا زنگی، عیسوی ہو یا موسوی، بت پرست ہو یا موحد، مجوسی ہو یا ہندو، مسلم ہو یا غیر مسلم، شہری ہو یا دیہاتی، ہمالیہ کی چوٹی پر آباد ہو، یا زمین کی گہرائی میں، کہیں بھی ہو، کوئی بھی ہو، اگر وہ اللہ کے نام کی عظمت سے واقف ہے اور نیکی اور بدی کی تمیز سے آشنا ہے، تو وہ خدائی رسولوں اور ربانی پیغمبروں کے علاوہ کس معلم کی کوششوں کا ممنون ہے؟ آج جہاں بھی عدل و میزان کا وجود ہے، وہ کسی یونانی حکیم، یا یوروپین فلاسفر کی تعلیم و تصنیف و تقریر و خطبہ کا اثر نہیں ہے، بلکہ طبقہ انبیا ہی کے بے واسطہ یا بواسطہ تعلیمات کا نتیجہ ہے، آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں کیسے ہی بدترین مبلغ سہی مگر نیکی، عدل، احسان، ہمدردی،

نیکوکاری، حسنِ خلق کی تعلیم تبلیغ اور دعوت ان ہی کی زبانوں سے ہو رہی ہے جو رسول کے پیرو اور پیغمبروں کے تابع ہیں، جو عقیدہ کے ملحد ہیں ان کو بھی نیکوکاری ان ہی پیغمبروں کے نادانستہ فیضانِ تعلیم کا نتیجہ ہے، اس بنا پر جو لوگ ذہنی طور سے پیغمبروں کے منکر ہیں، وہ بھی عملی طور سے ان کی تعلیم کے مقر اور معترف ہیں، اسی لیے انبیا علیہم السلام کا وجود تمام دنیا کے لیے رحمت بن کر ظاہر ہوا ہے، قرآن نے آسمانی کتابوں کو بار بار رحمۃ و ھدی، رحمت اور راہنمائی کی غرض سے بھیجنے کا جو اعلان کیا ہے، وہ تمام تر اسی غرض و غایت کی تشریح ہے، اسی لیے خاتم نبوت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ والا صفات تمام عالم کے لیے رحمت بن کر آئی، فرمایا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۱۰۷)

''اور ہم نے تجھ کو (اے محمد)! تمام دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

تائید و نصرت

انبیا علیہم السلام جو مقصد لے کر آتے ہیں، خواہ کس قدر مشکلات پیش آئیں، کتنی ہی رکاوٹیں ہوں، کتنی ہی تکلیفوں اور زحمتوں کا سامنا ہو، بالآخر وہ مقصد کامیاب ہی ہوتا ہے پیغمبروں کی سیرت اور ان کی دعوت کی تاریخ، خود اس دعویٰ پر گواہ صادق ہے، قرآن نے کہا:

﴿ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ ﴾ (۳۷/ الصّٰفّٰت:۱۷۱۔۱۷۳)

''اور ہماری بات اپنے رسول بندوں کے لیے پہلے ہی طے ہو چکی ہے، کہ یقیناً انہیں کی مدد ہوتی ہے اور ہمارا لشکر غالب ہوتا ہے۔''

نہ صرف اس دنیا میں بلکہ حشر کے دن بھی انہیں کو اور ان کے ذریعہ اہلِ ایمان کو کامیابی ہوگی:

﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ۝ ﴾ (۴۰/ المؤمن:۵۱، ۵۲)

''اور بے شبہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد اس دنیا میں کرتے ہیں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے، جس دن گناہگاروں کو ان کے بہانے کام نہ دیں گے ان پر پھٹکار ہوگی اور ان کے لیے برا گھر ہوگا۔''

پیغمبروں پر ایسے بھی سخت وقت آتے ہیں، جب ان کو اپنی قوم کے قبول ہدایت کی طرف سے پوری مایوسی ہو جاتی ہے اور امید کی روشنی کسی طرف سے دکھائی نہیں دیتی اور عذاب میں دیر ہونے کے سبب سے ان کے منکر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کو عذاب کی دھمکی جھوٹ دی گئی، تو دفعتہً امید کا دروازہ کھلتا ہے اور خدا کی تائید و نصرت کے پرے اس طرح آتے دکھائی دیتے ہیں کہ صالح لوگوں کے دل قبول کے لیے کھول دیے جاتے

ہیں اور معاندوں پر کسی نہ کسی طرح عذاب آ کر ان کا استیصال ہو جاتا ہے، فرمایا:

﴿ حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ﴾

(۱۲/ یوسف: ۱۱۰)

''یہاں تک کہ جب پیغمبروں کو (اپنی قوم کے ایمان سے) مایوسی ہونے لگی اور ان کے منکروں کو یہ خیال ہونے لگا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تو ہماری مدد آ گئی۔''

اللہ تعالیٰ کی اسی تائید و نصرت و حفاظتِ دعوت کا یہ یقین ان کو ہوتا ہے کہ وہ ہر مشکل کو اس راہ میں جھیل لیتے ہیں اور اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لیے پھرتے ہیں، مخالفوں کی فوج و لشکر، تیغ و خنجر اور خوف و خطر کے باوجود اپنی دعوت و تبلیغ کے فریضہ سے باز نہیں آتے اور کسی دام پر بھی مخالفوں سے صلح پر آمادہ نہیں ہوتے، منکروں کو شروع شروع میں ان کی ظاہری بے چارگی اور تنہائی کو دیکھ کر، ان کی ناکامی کا گمان ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ ان کے سوئے ظن کی تردید کر کے فرماتا ہے:

﴿ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ﴾ (۱۴/ ابراھیم: ۴۷)

''سو تو مت خیال کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا۔''

ازل کے دن ہی یہ قانون بن چکا ہے کہ سچائی کے ان پکارنے والوں ہی کی آخر جیت ہو گی:

﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ﴾ (۵۸/ المجادلۃ: ۲۱)

''اللہ لکھ چکا کہ میں ہی غالب ہوں گا اور میرے رسول۔''

خاتمہ: اس تفصیل اور تشریح سے مقصود ناظرین کو نبوت کے اصلی کمالات کا ایک جلوہ دکھانا تھا:

فلسفی را از پیمبر وا شناس — آبگینہ راز گوہر وا شناس
آبگینہ را نہ پنداری بدست — جز دمے کہ گوہرے آری بدست
چوں گہر آمد بدستت شب چراغ — آبگینہ شد سیہ چون پرزاغ
فلسفی اندر بنِ چاہ نژند — نردباں دارد بخورشیدِ بلند
نردبانش می برد تاچند ارش — پس بخاك افتدنگوں گشتہ سرش
وآں پیمبرؐ خود زبام آسماں — رشتۂ افگندہ سوئے خاکیاں
رشتہ جاں رابدیں رشتہ بتاب — پس برآ تابارگاہ آفتاب
زآسماں پیغمبر آوازت دہد — فلسفی ازخاك پروازت دہد

این زدورت رہ نماید سوئے جاں
واں بخواند خود ترا از کوئے جاں [1]

[1] از دیوان فارسی مولانا حمید الدین رحمہ اللہ المتوفی ۱۹ جمادی الثانیہ ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) ونوائے پہلوی، ص ۴۸۔۴۹۔

شبِ ظلمت

پیغمبرِ اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اوراخلاقی حالت

اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کی ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے، بارش کی خنکی سخت اُمس کے بعد ہی زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی ہے، روشنی کی پوری قدر شب تارہی میں ہوتی ہے اور فضا جس قدر تاریک ہو بجلی کی چمک اتنی ہی زیادہ درخشاں نظر آتی ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ ہر اصلاحی تحریک کی وقعت اور عظمت کے جانچنے میں یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ دنیا اس وقت کتنی گمراہی میں مبتلا اور اصلاح کی محتاج تھی اور ایسی اصلاح کی محتاج تھی جس کے لیے پیغمبرانہ دست وبازو کی حاجت تھی اور وہ بھی ایک ایسے پیغمبر کے دست وبازو کی جس کے متعلق خود خدا یہ فرما چکے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ﴾ (۴۸/ الفتح: ۱۰)

''جو تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، وہ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور ان کے ہاتھوں کے اوپر خدا کا ہاتھ ہے۔''

اسلام یا محمد رسول اللہ ﷺ کے پیغام اور تعلیم کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کی ایک عظیم الشان روحانی واخلاقی معاشرتی دعوت تھی، اس بنا پر ہمیں دیکھنا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت دنیا کی کیا حالت تھی؟ اس وقت کی دنیا کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا کرۂ ارضی تھا جس پر آفتاب نہیں چمکتا تھا تو بالکل سچ ہوگا، تمام دنیا میں سچے اور صحیح عقیدہ کا کہیں وجود نہ تھا، توحید کی روشنی سے دنیا کا ذرہ ذرہ محروم تھا، مصر و یونان وروم میں سورج، چاند اور مختلف سیاروں اور ستاروں کی خدائی تھی، انہیں کے معبد تھے اور انہیں کے ناموں پر بے گناہ انسانوں اور جانوروں کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں، ہر جگہ پتھر کی مورتوں اور مٹی کی صورتوں اور سونے چاندی اور جواہرات کے بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

اس وقت کی دنیا میں اخلاق کے تین معلم تھے، رواقی، عیسائی اور بودھ مت کے پیرو اور یہ تینوں کے تینوں تجرد، رہبانیت اور جوگی پن میں مبتلا ہو کر اس طرح عضو معطل ہو گئے تھے کہ دنیا کا دست ترقی شل ہو کر رہ گیا تھا اور ایسی سخت سنگدلانہ ریاضتوں کو نیکی اور عبادت کا مرادف سمجھ رکھا تھا کہ آج ان کی تفصیلات سننے سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مسیح نے چھ صدی قبل تزکیہ نفس کے کچھ درس دیے تھے لیکن مدت ہوئی دنیا اس سبق کو بھلا چکی تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس سے بھی پیشتر ہدایت ونجات کی ایک شمع جلائی تھی لیکن فتنوں اور ہنگاموں کی آندھی میں یہ چراغ طور بھی جل کر گل ہو گیا تھا اور پھر یہ بھی سچ ہے کہ مدت مدید ہوئی کہ زردشت نے روحانیت کی آگ سلگائی تھی لیکن یہ شعلہ بھی انسانی خون کے چھینٹوں سے سرد ہو چکا تھا یہ بھی سچ ہے کہ اس سے بھی پہلے بودھ نے آریہ ورت کے پہاڑوں اور غاروں میں روح کا دارالامن ڈھونڈ نکالا تھا مگر حوادث

کے طوفان نے ان پہاڑوں کو بے نام ونشان صحرا اور ان غاروں کو درندوں کا بھٹ بنا دیا تھا۔ ہر قوم دوسری قوم سے برسر پیکار اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا، حرص وطمع اور کشت وخون کی گرم بازاری تھی، نفسِ انسانی کی ملکوتی طاقت جذبات خبیثہ کے دیوتا کے سامنے پامال ہو چکی تھی، عدل وراستی اور پاکبازی وپارسائی کے عطر معنبر کی خوشبو انسان کے جامہ خاکی سے اڑ چکی تھی، توحید اور خدا پرستی کا نور دیوتاؤں، دیویوں، ستاروں، شہیدوں، ولیوں اور مجسموں کی پرستش کی عالم گیر تاریکی میں چھپ گیا تھا، غرض دنیا کے حالات ہر طرح سے اس ضرورت کے متقاضی تھے کہ کوئی عالم کا مصلح، اخلاق کا معلم، حق کا داعی، بنی نوعِ انسانی کا نجات دہندہ، آخری بار وجود میں آئے اور انسانیت کے شیرازہ میں، جو عرصۂ دراز سے پراگندہ اور منتشر ہو رہا تھا، پھر نظم وانتظام پیدا کر دے اور روحانیت وخدا پرستی کے خزاں رسیدہ باغ کو از سرِ نو پر بہار بلکہ سدا بہار اور دنیا کے ظلمت کدہ کو پھر مطلعِ انوار بنا دے۔

یہ اس عہد کی دنیا کی حالت کا ایک اجمالی خاکہ تھا، تفصیل کے لیے ہمیں مختلف قوموں اور ان کے مذہبوں میں سے ایک ایک قوم اور اس کے مذہب کی تاریخ پر نظر کرنی چاہیے۔

ظہور اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مذہبی حالت کیا تھی؟

محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت مصر، یونان، کلدانیا، اسیریا اور بابل کی عظمت افسانہ پارینہ بن چکی تھی خود عرب ومضافاتِ عرب میں جو نامور حکومتیں کبھی تھیں مثلاً: نابتی، حمیری، سبائی وغیرہ مدت گزری کہ ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

اس موقع پر صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ صبحِ سعادت کے طلوع کے وقت کون کون سی قومیں دنیا پر حکمران تھیں اور ان کی مذہبی واخلاقی حالت کیا تھی اور دنیا کے مذاہب اس وقت کی روحانی حالت کے سنبھالنے کی کہاں تک استطاعت رکھتے تھے اس وقت روئے زمین کی اہم طاقتیں دو ہی تھیں، فارس اور روم۔ فارس کا مذہب مجوسیت تھا، جس کا دائرہ عراق سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک محیط تھا اور روم کا مذہب عیسوی تھا، جو یورپ، ایشیا اور افریقہ کے تینوں براعظموں کو گھیرے تھا، لیکن مذہبی حیثیت سے دو اور قومیں بھی ذکر کے قابل ہیں جن میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ قدامت کا دعویٰ ہے اور وہ یہود اور ہندو ہیں۔

مجوس فارس

عرب کی پہلی ہمسایہ سلطنت فارس تھی، جس کے تمدن کا ستارہ ایک زمانہ میں اوجِ کمال پر تھا، مگر عہدِ بعثت سے ڈیڑھ سو برس پہلے سے ساسانی شان وشوکت اور کیانی جاہ وجلال مٹتے مٹتے سایہ سارہ گیا تھا، مسلسل بغاوتوں، سفاکانہ خونریزیوں اور سیاسی بدامنیوں نے اس کو تہ وبالا کر دیا تھا، بادشاہوں کے ظلم ستم اور امرا کی عیاشیوں اور خود غرضیوں نے صداقت، اخلاق اور ہر قسم کے اخلاقی جوہر کو، جس کے خمیر سے قوم کی

زندگی کی تعمیر ہوتی ہے، فنا کر دیا تھا۔

ایران میں بابل کے اثر سے ستارہ پرستی بہت عام تھی، اسی کا اثر ہے کہ فارسی لٹریچر میں افلاک اور ستاروں کی کارفرمائی آج تک نمایاں ہے، زردشت نے اس تاریکی میں اپنی آگ روشن کی اور نور و ظلمت یا خیر و شر کے دو خالق یزداں و اہرمن اس کے دو خدا اور آگ اس کی مسجود بنی، اسلام سے کچھ صدیاں پیشتر مانی نے مسیحیت اور مجوسیت کی آمیزش سے مذہب کا ایک نیا مرقع تیار کیا تھا جس میں نور و ظلمت کے فلسفہ کا ایک ایسا گورکھ دھندا بنایا تھا جس سے اخیر تک اس قوم کو نکلنا نصیب نہ ہوا۔ [1] اس کی تعلیم یہ تھی کہ دنیا سے گوشہ گیری کر کے اس کو ویران و برباد اور ترک ازدواج سے نسل انسانی کو منقطع کر دیا جائے، تاکہ بدی کا خاتمہ ہو جائے۔ [2] اخلاقی حیثیت سے محرمات کا وجود ہمیشہ ان کے ہاں مختلف فیہ رہا، باپ کا بیٹی کو اور بھائی کا بہن کو اپنی زوجیت میں لینا، وہاں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ [3] یہ سن کر کس قدر حیرت ہوگی کہ یزدگرد ثانی جو پانچویں صدی عیسوی کے اوسط میں وہاں کا بادشاہ تھا، اس نے اپنی بیٹی سے اپنا عقد کیا اور پھر اس کو قتل کر ڈالا۔ [4] عورتوں کو اس قوم اور اس مذہب میں جو حیثیت حاصل تھی، وہ ان افسانوں اور مقولوں سے ظاہر ہے، جو ایرانی ادبیات کا اب بھی جزو ہیں اور جو شاہنامہ کے اوراق میں اب بھی ہر شخص کو نظر آ سکتی ہے، عورتوں کی بے وفائی بداخلاقی اور ان پر عدم اعتماد پرانے ایرانی تمدن کا سب سے بڑا جزو تھا۔

سلاطین اور امراء درجہ بدرجہ رعایا کے خدا اور دیوتا تھے، جن کو سجدے کیے جاتے تھے۔ [5] ان کی الوہیت کے گیت گائے جاتے تھے، ان کے دربار میں کوئی بیٹھ نہیں سکتا تھا، ان کے خلاف کوئی لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، ان کے جرائم پر ان کو سزا نہیں دی جا سکتی تھی اور رعایا ان کے مظالم کے سامنے دم نہیں مار سکتی تھی۔

ملک کا بڑا حصہ رومی عیسائیوں کی دائمی جنگ سے پریشان حال تھا اور گرجاؤں اور آتش کدوں کی باہمی آویزش کا مختتم سلسلہ قائم تھا جب رومی فاتح ہوتے تو آتش خانے ٹوٹ کر کلیسے بن جاتے اور جب ایرانی غالب آتے تو کلیسے ٹوٹ کر آفتاب دیوتا کے معبد اور آتش خانے تعمیر ہو جاتے، یہودیوں پر جو مظالم توڑے جاتے، اس کا ایک مختصر سا نقشہ توراۃ کے قصۃ البر میں نظر آتا ہے اور بعد کو مفتوح عیسائیوں پر وہ جس جس طرح ظلم کرتے تھے، اس کی تفصیل گبن کے اوراق میں منتشر طور پر ملے گی۔

بعثت سے پہلے جہانبانی کا قرعہ قباد اوّل بن فیروز کے نام پڑا، بیرونی حملوں اور اندرونی بدنظمیوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا گیا، آخر رعایا نے قباد کو قید کر دیا [6] قباد نے قید خانہ سے بھاگ کر تاتاریوں کے پاس

---

[1] كتاب الفهرست ابن نديم ذكر مانی، ص: ٤٥٨ وما بعد وكتاب البدء والتاريخ مقدسی، ج ٤، ص: ٢٤۔

[2] تاريخ غرر اخبار الفرس ثعالبی مطبوعه پیرس، ص: ٥٠٢۔

[3] ايضا، ص: ٢٧ وابوداود میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں حکم دیا کہ مجوسیوں کو اس فعل شنیع سے باز رکھا جائے کتاب الخراج والامارة والفيء، باب في اخذ الجزية من المجوس: ٣٠٤٣۔ [4] مورخوں کی تاریخ عالم، ج ٨، ص: ٨٤۔

[5] غرر اخبار الفرس ثعالبی، ص: ٥٠٠ پیرس۔ [6] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدھم، جلد ۲۱، ص: ۲۲۳۔

پناہ لی اوران کی اعانت سے دوبارہ تاج حاصل کیا، لیکن ملک پر اس سے بھی زیادہ مصیبت یہ نازل ہوئی کہ اس عہد میں مزدک نام ایک شخص پیدا ہوا، جو اس امر کی تعلیم دیتا تھا کہ دولت اور عورت کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں بلکہ ان کو تمام جماعت میں مشترک ہونا چاہیے، چنانچہ ایک شخص کی بیوی مزدک کے عقائد کی رو سے ہر شخص کے ساتھ ہم بستر ہوسکتی تھی، عیش پرست اور ہوس ران امرا اور عوام دونوں نے اس کو خوشی خوشی قبول کرلیا [1] اس مذہب نے بہت جلد شاہی سایہ میں ترقی حاصل کی اور خود قباد نے اس دین کی ترویج اور اشاعت میں نمایاں حصہ لیا، قوم کی اخلاقی حالت پر اس تعلیم کا جو اثر پڑ سکتا تھا، وہ ظاہر ہے نتیجہ یہ ہوا کہ سارا ملک عیش پرستی اور ہوس رانی کے نشہ میں سرشار ہوگیا۔

۵۳۱ء میں قباد کی جگہ نوشیرواں نے لی، ایرانیوں میں اس کی عدل پروری اب تک مشہور ہے مگر اس کو یہ مبارک لقب اپنے عزیزوں اور افسروں اور ہزاروں بے گناہوں کے قتل کی بدولت ملا، مزدکی فتنہ کو اس نے تلوار کے زور سے دبانا اور کیش زرتشتی کو دوبارہ فروغ دینا چاہا مگر خود اس کا بیٹا نوشہزاد تثلیث پرستی کی طرف مائل تھا، اس کی پاداش میں قید ہوا اور قید سے بھاگ کر ایک عیسائی فوج لے کر زرد شتیوں سے صف آرا ہوا اور مارا گیا۔

۵۷۹ء میں نوشیرواں نے وفات پائی اور ایران کا تخت، ہرمز چہارم کے حصہ میں آیا، اغیار کی دست اندازیوں کے ساتھ اندرونی بدنظمی اور باہمی خانہ جنگی، بادشاہوں کی تغافل شعاری اور امرا کی عیش پرستی اور عوام کے اخلاقی انحطاط میں برابر ترقی ہوتی گئی، یہاں تک کہ ۶۳۶ء میں مجاہدین اسلام کی فتح مندی کے طوفانی صرصر کے سامنے ملک فارس کی یہ ٹمٹماتی ہوئی شمع ہمیشہ کے لیے بجھ گئی۔

اوپر کے بیانات سے معلوم ہوگا کہ ایران کی سرزمین نغمہ توحید سے کبھی گوش آشنا نہیں ہوئی، اخلاق کے متعدد ابواب ہیں جو ان کے آئین میں کبھی داخل نہیں ہوئے، یزداں واہرمن، نور وظلمت اور خیر وشر کی بھول بھلیوں نے ان کو ہمیشہ سرگرداں رکھا، حکومت اور شاہی کے متعلق ان کا تخیل خدائی کا ہم رتبہ تھا، اسلام وفارس کی جنگ میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر جب سپہ سالارِ ایران کی بارگاہ میں گئے اور آزادی کے ساتھ جا کر اس کے ساتھ بیٹھ گئے تو ایرانی امیروں کو اس میں اپنے نائب السلطنت کی توہین نظر آئی اور ان مغیرہ کو سامنے سے ذلت کے ساتھ اٹھا دیا، انہوں نے جواب میں کہا: ''ہم عربوں کا یہ دستور نہیں کہ ایک خدا بن کر بیٹھے اور دوسرے اس کے سامنے غلامی اور بندگی کریں۔'' [2]

آنحضرت ﷺ کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ صدی پیشتر سے ایران میں جس قسم کا سیاسی انحطاط شروع ہوگیا تھا وہ روز بروز بڑھتا ہی گیا، اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ فارس کے روحانی آتش کدہ میں اب زندگی کی کوئی چنگاری باقی نہیں رہ گئی تھی، اس لیے جب اسلام کا نور طلوع ہوا تو اس کے شیوع کے لیے کوئی

[1] غرر اخبار الفرس ثعالبی، ص: ۵۹۸ تا ۶۰۰ پیرس۔ [2] تاریخ طبری واقعات ۱۴ھ ج۵، ص: ۲۲۷۴ مطبع بریل۔

دوسرا پردہ بیچ میں حائل نہ ہوا، ہرجان ملکم جن کا مسیحی تعصب، عساکر اسلامی کو ان کی زبان سے ’’قزاقانِ عرب‘‘ کا لقب دلواتا ہے، فتح فارس کے متعلق حسب ذیل رائے دیتے ہیں:

’’یزدجرد ثالث کا عہد حکومت اس لیے یادگار ہے کہ اسی زمانہ میں فارس کی قدیم شہنشاہی کا تختہ برہنہ تن ’’سوسمار خواروں‘‘ کے ایک دستہ نے الٹ دیا کہ اسی تحقیر آمیز لقب کے ساتھ عرب قبائل کے یہ مغرور ہمسائے ان کا ذکر کرتے تھے، اس انقلاب عظیم کی علت کوئی معمولی سبب نہیں ہوسکتا (مسلمان) فارسی مؤرخین کچھ تو اپنے حب وطن اور کچھ اپنی وہم پرستی کی بنا پر اس واقعہ کو ایک معجزۂ عظیم خیال کرتے ہیں جس کے ذریعہ سے خدا نے محمد ﷺ کی صداقت کو ظاہر کردیا تھا لیکن جو لوگ دُنیاوی حیثیت سے اس واقعہ پر غور کرتے ہیں انہیں فوراً نظر آجاتا ہے کہ فارس کی ایسی سلطنت، جو عیش پرستی کے ہاتھوں لاغر ونحیف ہوچکی تھی، جس میں اندرونی مناقشات کے باعث بدنظمیاں پھیلی ہوئی ہوں جو بیرونی محاربات سے یکسر خستہ و ناتواں ہو اور جو اپنی کبرسنی اور نقاہت سے قصر زوال کی جانب خمیدہ پشت ہو، اس کے لیے پرجوش ’’قزاقان عرب‘‘ کی مدافعت کرنا سخت دشوار تھا۔‘‘ [1]

مگر سوال یہ ہے کہ پاک نژاد ساسانیوں کی خستگی و ناتوانی اور نقاہت و کمزوری، قزاقان عرب ہی کی ترقی کی تمہید کیوں بنی؟ کیا نہتے عربوں کے پاس اس سے زیادہ سامان جنگ اور سپاہی تھے، جو عراق و ایران کے اخیر معرکوں میں بھی ایرانی عربوں کے مقابلہ میں لاتے رہے؟ واقعہ یہ ہے کہ زرتشت کی آگ میں اب گرمی نہیں باقی رہی تھی، نور و ظلمت، خیر و شر، نیکی و بدی کے فلسفہ نے ایران کی ہر قسم کی عملی طاقت فنا کردی تھی ’’یزداں اور اہرمن‘‘ کی دو عملی حکومت نے روحانی امن و امان کی سلطنت برباد کردی تھی، بیسیوں چھوٹے بڑے فلسفیانہ مذہبی فرقے پیدا ہوگئے تھے جن میں سب سے اہم مانوی فرقہ تھا، جو عیسائیت اور مجوسیت کا معجون مرکب تھا، آخر میں مزدکی فرقہ کی بہیمانہ تعلیم نے ایران کی اخلاقی روح کو اور بھی موت کے قریب کردیا [2] نوشیرواں نے تلوار کی نوک سے اس فتنہ کو دبایا اور اس کے صلہ میں بادشاہِ عادل و دادگر کا خطاب پایا، تاہم ایران کی روحانی زندگی ان خون کے چھینٹوں کے بعد بھی اسی طرح تشنہ لب رہی جس طرح پہلے تھی اور منتظر تھی کہ دنیا کے خشک صحرائے عرب سے چشمہ ابل کر ادھر آئے تو وہ اپنی پیاس بجھائے۔

عیسائی رُوم

آغازِ اسلام کے وقت جس قدر ایران کی جسمانی و روحانی شہنشاہی کے اوراق منتشر و پراگندہ تھے روم کی قبائے سلطنت اس سے کچھ کم کرم خوردہ نہ تھی حالانکہ یہ وہی رومۃ الکبریٰ ہے جو یونان کے زوال کے بعد

---

[1] ملکم صاحب کی تاریخ ایران جلد اول صفحہ ۱۳۴۔ [2] تفصیل کے لیے فہرست ابن ندیم دیکھو صفحہ ۴۷۹، ۴۸۰ مصر۔

دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سمجھی جاتی تھی اور جس کے ایک تاجدار جولیس سیزر کا نام ہمیشہ کے لیے قیصر کی صورت میں بادشاہ وشہنشاہ کا مرادف بن گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی سلطنت میں مبعوث ہو کر دنیا کو امن وسلامتی کا پیام سنا کر رخصت ہوئے، ان کے رفع وصعود کے بعد ہی ان کے شاگردوں میں فرقہ آرائیاں شروع ہوئیں اور بالآخر پال نے جو ایک نو عیسائی یہودی تھا، اس طرح عیسائیوں پر غلبہ پایا کہ اس کے بدعات کی خاک میں اصل عیسویت ہمیشہ کے لیے دفن ہوگئی اور باپ، بیٹے، روح القدس کا مشرکانہ عقیدہ اس میں داخل ہو گیا اور توراۃ جس کا کوئی نقطہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی مٹا نہیں سکتے تھے [1] وہ ان کی روحانی شاگردی کے مدعی (پال) کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے لعنت قرار پائی، [2] ۳۲۵ھ میں رومی سلطنت کے مشرقی ومغربی دو حصے ہو گئے، مشرقی حصہ کے تاجدار قسطنطین اعظم نے عیسائی مذہب اختیار کیا اور رفتہ رفتہ پوری رومی حکومت میں یہ مذہب پھیل گیا، مگر درحقیقت اس مشرقی تاجدار روم کے اس قبول مذہب کا جذبہ اخلاص وصداقت سے زیادہ سیاست اور سلطنت کی مصلحت پر مبنی تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اب باپ بیٹے اور روح القدس کی تثلیثی الوہیت میں ہر نیا ملک جو فتح ہوتا، اس کا دیوتا کسی نہ کسی نام اور رسم سے اس مذہب میں شامل ہو جاتا تھا تختِ سلطنت کے غیر متوقع حصول نے مذہبی خاکساروں میں یہ حوصلہ پیدا کر دیا کہ، کلیساؤں نے مذہبی شہنشاہی کا خواب دیکھنا شروع کر دیا اس کے لیے عقائد کی وہ لڑائیاں کھڑی کی گئیں کہ شاہانہ سایہ میں بیٹھ کر کونسلوں نے خدا کے دین کا خاکہ تیار کیا، اتحاد اور اجتماع کی ہر نئی کوشش، نئی مذہبی تفریق کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور ایک عیسوی مذہب ایک صدی کے اندر اندر بیسیوں فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔

۳۳۷ء میں قسطنطین کی وفات پر مذہبی خانہ جنگی کے ساتھ ساتھ رومیوں کی سیاسی خانہ جنگیوں کی زیر خاکستر آگ بھی زور وشور سے شعلہ زن ہوئی، اعیان سلطنت میں مختلف گروہ بندیاں ہوگئیں اور باہمی نفاق اور فتنہ وفساد کا بازار گرم ہو گیا، بالآخر سلطنت روم مختلف صوبوں میں تقسیم ہو کر مختلف دعویدارانِ حکومت کے حصہ میں آئی [3] ناقابل فرمان رواؤں کی کمزوری دیکھ کر ایک طرف گوتھ، ونڈال وغیرہ بعض وحشی قوموں نے حملے شروع کیے اور دوسری طرف خود دور افتادہ صوبوں کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہوگئی، نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطنتِ روم کا مغربی بازو جو برطانیہ اور فرانس وغیرہ پر مشتمل تھا، بالکل کٹ گیا اور خود روم کا دارالحکومت دشمنوں کے حملے سے محفوظ نہ رہ سکا۔ [4] اس وقت یعنی پانچویں صدی کے بیچ میں لوگوں کو صاف نظر آ رہا تھا کہ ان کے مورث اعلیٰ نے بارہ کرگسوں کو خواب میں دیکھا تھا اور جس کی بنا پر اس زمانہ کے کاہنوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ سلطنت بارہ صدیوں تک قائم رہے گی، اب اس پیشین گوئی کے

---

[1] انجیل متی: ۵۔ ۱۷۔ ۱۸۔ [2] یہ مضامین عیسائیوں کی انجیل کے حصہ اعمال اور خطوط میں جا بجا بتصریح مذکور ہیں۔

[3] گبن کی تاریخ زوال وانحطاط سلطنت روم، ج ۱، ص: ۴۸۸۔ ۴۹۱۔

[4] ایضاً، ج ۲، باب ۳۶ و باب ۳۸۔

پورا ہونے کا وقت آ گیا۔ مؤرخ گبن اس زمانہ کی تصویر ان لفظوں میں کھینچتا ہے:

''اس پیشین گوئی نے، جس پر اس قوم نے اپنے عروج و اقبال کے زمانہ میں کبھی اعتنا بھی نہ کی تھی، اب بارہ صدیوں کے خاتمہ پر جب کہ ہر طرف سے ذلت و بدقسمتی کا سامنا تھا، اہل روم کو یاس آمیز جذبات سے پر کر دیا لیکن ان کے زوال کی علامتیں کرگسوں کے خواب سے زیادہ واضح و نمایاں موجود تھیں، رومن حکومت، مخالفین کی نظروں میں روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں زیادہ ظالمانہ اور ناقابل برداشت ہوتی جاتی تھی، کفایت شعاری جتنی زیادہ ضروری ہوتی جاتی تھی، اسی نسبت سے اس کی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے ٹیکس میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ [1]

امرا نے اپنے مصارف کا بار بھی عام رعایا پر ڈالنا شروع کیا جس کے باعث وہ اپنی قلیل آمدنی سے بھی محروم ہوگئی اس کی عدم ادائیگی کی صورت میں رعایا پر اس قدر جبر کیا جاتا تھا کہ اس کے دل میں حکومت کی طرف سے نفرت و عداوت پیدا ہوگئی یہاں تک کہ وہی رومن قوم جو کبھی اپنے اس لقب پر فخر کرتی تھی، اب اپنے کو اس قوم کی طرف منسوب کرتے شرمانے لگی اور رومن حکومت پر ہر وقت وحشی سے وحشی سلطنت کی محکومیت کو ترجیح دینے لگی، امرا، وزرا اور سلاطین خود اپنی ناعاقبت اندیشیوں سے رعایا کو اپنا دشمن بناتے اور جب بغاوت ہوتی تو فوج کشی کرتے اور ناکام رہتے، غرض اندرونی بدنظمیوں سے ملک کی یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ گبن کے الفاظ میں:

''اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین بھی فنا ہو جاتے تو ان کی مجموعی معدومیت بھی سلطنت کے مغربی بازو کو زوال و بربادی سے بچا نہیں سکتی تھی۔'' [2]

پانچویں صدی کے خاتمہ پر مغربی حصہ کے نکل جانے کے بعد، مشرقی صوبوں تک یعنی ڈینیوب سے لے کر دجلہ و نیل تک کی سرزمین روم کے ماتحت رہ گئی تھی لیکن اس کی حالت بھی روز بروز نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی، مؤرخین کا بیان ہے کہ رومن فوج کی مجموعی تعداد جو ایک زمانہ میں ۶۴۵۰۰۰ تھی، اب شاہ جسٹنین کے زمانہ (یعنی ۵۲۷ء) میں گھٹ کر ایک چوتھائی سے بھی کم یعنی ۱۵۰۰۰۰ رہ گئی تھی اور وہ بھی نہایت متفرق و ابتر حالت میں۔ رعایا کی جیبیں خالی تھیں، فوج کی تنخواہیں چڑھتی جارہی تھیں اور امرا و اعیان سلطنت اپنے ذاتی مصارف کے لیے ہر طرح کے جعل و فریب، رشوت ستانی اور لوٹ مار کو جائز رکھتے تھے، فوج میں یوں تو بہت سے سپاہیوں کے نام لکھے ہوئے تھے، لیکن میدان جنگ میں جانے کے وقت بہت تھوڑے سے لوگ تیار ہوتے، فوجی افسر فنِ جنگ کے بجائے اپنا وقت باہمی حسد و رقابت میں صرف کرتے اور ہر افسر کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرے افسر کی بدنامی و ذلت سے فائدہ اٹھا کر خود ترقی و منصب حاصل کر لے۔ [3]

---

[1] ایضًا، ص: ٤٦١۔ [2] ایضًا، ص: ٤٦١۔

[3] حوالہ مذکور، ج٣، ص: ١١٣۔

اندرونی بدنظمیوں پر مستزاد یہ تھا کہ بیرونی غنیم اہلِ روم کو ایک دم کے لیے چین سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے، روم وفارس کے درمیان مدت سے لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا، پھر لومبارڈس، گوتھس اور ونڈالس وغیرہ کے پیہم حملے روم کی رہی سہی قوت کو اور بھی پامال کر رہے تھے۔

الغرض چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر یعنی خاتم النبیین ﷺ کی ولادت سے دو چار سال بعد روم بقول گبن کے اپنے زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ گیا تھا اور گبن کی زبان میں اس کی مثال بعینہٖ اس عظیم الشان درخت کی ہوگئی تھی، جس کے سایہ میں ایک وقت تمام اقوامِ عالم آباد تھیں مگر اس پر ایسی خزاں آئی کہ برگ وبار کے ساتھ اس کی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہوگئی تھیں اور اب خالی تنا خشک ہو رہا تھا خود پایہ تخت کے اندر غنیم کے گھس آنے کا ایسا خوف تمام آبادی پر چھایا ہوا تھا کہ تقریباً کل کاروبار بند ہوگئے تھے، وہ بازار اور تماشا گاہیں جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی اب ویران اور سنسان پڑی تھیں، عیش پرستی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک عرصہ سے تاہل کے بجائے تجرد کی زندگی زیادہ پسند کرتے تھے، تاکہ زیادہ آسانی اور آزادی کے ساتھ اپنے شہوانی جذبات کی تشفی کرسکیں۔ [1]

ملک کی عام سیاسی واخلاقی حالت سے قطع نظر کر کے جب ہم مذہبی پہلو پر نظر کرتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ دلخراش تصویر نظر آتی ہے بت پرست رعایا کو چھوڑ کر جو ستاروں، دیوتاؤں اور بتوں کی پوجا میں بدستور مصروف تھی اور لوگ جنھوں نے عیسائیت قبول بھی کرلی تھی، وہ باپ، بیٹا، روح القدس اور مریم کی خدائی کے معتقد تھے حضرت عیسیٰ اور مریم وروح القدس کی شخصیت اور مرتبہ کے تعین نے بیسیوں فرقے پیدا کردیے تھے جن میں زبانی مناظروں سے گزر کر جنگ وجدل کی نوبت آگئی تھی یہاں تک کہ ۵۱۴ء میں خود عیسائیوں کے دو گروہوں کے درمیان ایک عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑی جس میں ۶۵۰۰۰ عیسائیوں کو خارج البلد ہونا پڑا۔ [2]

اس جنگ عظیم کے علاوہ ہمہ وقت ہر فریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسا رہا کرتا اور بارہا چھوٹی چھوٹی باتوں پر کشت وخون کی نوبت آجاتی، پادریوں نے اپنے منصب مذہبی کو حصولِ جاہ کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا اور اس بنا پر محض حبِ جاہ کی خاطر وہ ہر طرح کی ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے تھے، ان پادریوں کے ایک اسقف اعظم سینٹ سرل نے جو جو سفاکیاں کی ہیں ان کی تفصیل کے لیے ایک پوری کتاب درکار ہے، ایک مرتبہ اس نے اپنے مریدوں کو ہمراہ لے کر غیر مسلح یہودیوں پر دھاوا کیا اور ان سب کو جلاوطن کردیا اور ان کا مال اسباب سرل کے مریدوں کے ہاتھ لگا اور ان کے معابد زمین کے برابر کردیے گئے، سرل کا حریف ارسٹس نامی پادری تھا، ایک روز جب ارسٹس راستہ سے گزر رہا تھا تو ۵۰۰ راہبوں کی جماعت اس پر ٹوٹ پڑی اور اپنی سنگ باری سے اس کو خون میں نہلا دیا [3] سرل کی ایک خاتون دوست بلیشیا نامی تھی ایک روز وہ اپنی درسگاہ

---

[1] گبن، ج ۳، ص: ۳۷۲۔ [2] گبن، ج ۳، ص: ۳۴٤۔ [3] ایضا، ص: ۳۲۷۔

سے واپس آرہی تھی کہ راہبوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس پر حملہ کر دیا، گاڑی سے اتار کر برہنہ کی گئی اور اس حالت میں تمام شہر کی سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے اسے کلیسا میں لائے جہاں پہنچ کر پادری پیٹر کے گرز سے اس کا خاتمہ کر دیا گیا، قتل کے بعد اس کا گوشت ہڈیوں سے جدا کیا گیا، نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور آلائش جسم کو آگ میں ڈال دیا گیا۔ ❶ یہ ایسے واقعات ہیں جن کے ذکر سے آج قلم لرزتا ہے مگر یہ عیسائی مذہب کے علمبرداروں کا سب سے روشن کارنامہ ہے۔

یہی حالت ان تمام ملکوں کی تھی جہاں رومیوں کے زیر سایہ عیسوی مذہب پھیلا ہوا تھا، یعقوبی، نسطوری اور دوسرے فرقے جو سرکاری عیسوی مذہب سے الگ تھے، وہ دور دراز صوبوں اور ملکوں میں پناہ ڈھونڈتے تھے، نائیس کی کونسل کے بعد آریوس اور اس کے حریفوں میں جو معرکہ آرائیاں ہوئیں، انہوں نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ''شہزادۂ امن'' کا مذہب ان جنگجوؤں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے سے بچ نہیں سکتا۔

مسٹر مارس، جو پیغمبر اسلام کو، نعوذ باللہ، بہت بڑا مکار قرار دیتے ہیں اپنی ''تاریخ ہندوستان'' میں ضمناً ایک موقع پر تحریر کرتے ہیں:

> ''اس نازک موقع پر (یعنی ظہور اسلام کے وقت) ان بے باکانہ بدعات کے درمیان جو چرچ کو نجس کر رہے تھے اور اختلافات کے اس غیر منقطع سلسلہ کے درمیان، جو چرچ میں ایک ہلچل ڈالے ہوئے تھے اگرچہ مشرق میں اصلی مسیحیت کی شعاع نظر آتی تھی لیکن بہت ہی مدھم، روم کے قیصروں کی قوت کچھ تو اندرونی نزاعوں اور کچھ بیرونی حملوں کے باعث اپنی بنیاد سے اکھڑ کر قصرِ فنا کی طرف تیز رفتاری کے ساتھ جارہی تھی، یہود بے صبری کے ساتھ گلیلی کے اس حقیر شخص کے مذہب پر نظر کر رہے تھے جس کے دین کو اب شاہ قسطنطین کے مسیحی ہوجانے کے بعد پوری شان و شوکت اور شاہی عظمت حاصل ہوگئی تھی اور ہر اس تحریک کی مدد کے لیے تیار تھے جو ایسے قابل نفرت مذہب کا خاتمہ کرنا چاہے، اہل فارس نہایت غیظ و غضب کے ساتھ ان پر جوش اور ناروادار فتح مند عیسائیوں کو دیکھ رہے تھے، جنہوں نے ان کے معبود ''آتش شمسی'' کی بے حرمتی کی تھی اور شرک کی ساری دنیا اپنے برباد شدہ معبودوں اور ڈھے ہوئے معبدوں پر ماتم کر رہی تھی اور ان کے انتقام کے لیے آمادہ اور مستعد تھی۔'' ❷

مارس صاحب خود واقعات کی نقشہ کشی میں خواہ کتنا ہی مسیحی رنگ بھریں لیکن نفس واقعات کی صحت ان کو شاید ہم سے بھی زیادہ مسلم ہے۔

بہر حال مؤرخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی تک مسیحیت کی جو حالت رہی

---

❶ ایضاً، ص: ۳۲۷، ۳۲۸ نیز ڈریپر تاریخ معرکہ آرائی مذہب وسائنس صفحہ: ۱۵۵۔

❷ مارس کی تاریخ ہندوستان، ج ۱، ص: ۱۸۳۔

ہے وہ اس کے لیے باعث ننگ ہے مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی، اصل رومی بت پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا، حضرت مسیح کی ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں کی تحلیل، مصر کو قابو میں لانے کے لیے کی گئی تھی جس سے حضرت مسیح کے ''وہی ایک ہے'' کی تعلیم ہمیشہ کے لیے ان کے مذہب سے مٹ گئی، ضعیف الاعتقادی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ قبر پرستی عام ہوگئی تھی اور ہر بڑے پادری سے اس کی وفات کے بعد دعا مانگی جاتی تھی، ملک شام میں جو بڑے پادری اور بطریق تھے ان کے معتقد ان کو سجدے کرتے تھے، 1 مسیح و مریم، روح القدس اور حوارین اور مسیحیت کے دیگر اساطین کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش اس کثرت سے ہونے لگی کہ اس کی نظیر زمانہ مابعد کے رومن کیتھولک فرقہ کی بت پرستی میں بھی نہیں ملتی۔ 2

سیل صاحب ترجمۂ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: ''گرجا کے پادریوں (CLERGY) نے مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن، محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا، اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے، اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کے لیے باعث ننگ ہیں، مذہبی صورت میں قائم کیے گئے خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی سے ہونے لگی۔ نیس کاؤنسل کے بعد مشرقی چرچ روزانہ کے مناظرات میں مشغول ہوگیا، اور ارینس، سلینس، نسطورینس اور یوٹیکینس کے جھگڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، انصاف علانیہ فروخت کیا جاتا تھا اور ہر طرح کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں، مغربی چرچ میں ڈینس اور ارسلیسی نس نے بشپ کی جگہ حاصل کرنے کے لیے قتل تک نوبت پہنچادی اور آخر ڈینس کی فتح ہوئی، اس موقعہ پر کہا جاتا ہے کہ سیسی نینس (SICININUS) کے گرجا میں ایک روز میں ۱۳۷ آدمی قتل ہوئے پائے گئے اور کوئی حیرت نہیں کہ یہ لوگ ان جگہوں کے اس قدر خواہاں ہوتے تھے، اس لیے اس ذریعہ سے ان کو گراں بہا تحفے ملتے تھے، اپنی گاڑیوں پر نہایت تزک و احتشام سے نکلتے تھے اور ان کے دستر خوان پر بادشاہوں سے زیادہ شان و شوکت ہوتی تھی۔ ان مناقشات کا سبب زیادہ تر شہنشاہ ہوا کرتے تھے۔ جسٹینین کے وقت میں حالت اور زیادہ خراب ہوگئی اس کے نزدیک اپنے عقیدہ کے مخالفوں کو مار ڈالنا کوئی جرم ہی نہ تھا:

> ''بادشاہوں اور پادریوں میں عقائد اور اخلاق کی جو برائیاں پھیلی ہوئی تھیں اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عوام کی حالت بھی متبذل ہوگئی، ان کا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا رہ گیا خواہ کسی ذریعہ سے ہو اور اس روپیہ کو وہ نفاست اور عیاشی میں اڑاتے تھے۔'' عقائد کی خرابی کے علاوہ روم اور فارس کی سلطنتیں بھی کمزور ہوگئی تھیں، شہنشاہ قسطنطین کے بعد روم کی سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی، عام طور سے اس کے جانشین بزدلی اور مظالم کے لیے مشہور تھے، آنحضرت ﷺ کے

---

1 سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب حق الزوج على المرأة: ١٨٥٣۔

2 سیل صاحب کا انگریزی ترجمۂ قرآن مقدمہ، صفحہ: ۲۵، ۲۶۔

وقت تک ملک کا مغربی حصہ گلاتھ (GOTHS) لوگوں نے روند ڈالا تھا، یونانیوں کی عیش پسندی اور اخلاقی خرابیوں نے ان کی قوت کو زائل کر دیا تھا۔ رومیوں نے عیسائی مذہب کو جس صورت میں قبول کیا، اس کی تصویر ڈریپر کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔ ''دونوں (عیسائیت اور بت پرستی) کی باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر وشکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا۔ جس میں بت پرستی وعیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں [1] جوں جوں زمانہ گزرتا گیا وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل ٹرٹلین نے بیان کی ہے متغیر ہو کر ایک عام پسند مگر پایۂ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے، ان عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا...... عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچہ میں ڈھال لیا گیا، مریم عذرا کو تو (خدا کی ماں) کا لقب دیا گیا۔'' [2]

اسی زمانہ میں ایک گروہ ''مریمی'' کے نام سے پیدا ہوا جو کہ حضرت مریم علیہا السلام کو بھی شریک الوہیت کر کے بجائے اقانیم ثلثہ! کے، اقانیم اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا، جس کی تردید قرآن پاک نے سورۂ آل عمران میں فرمائی ہے، اسی کے ساتھ اور بہت سے معتقدات رومی بت پرستوں سے لے کر عیسائیت میں داخل کیے گئے اور نام بدل بدل کر رومی بت پرستوں کے دیوتاؤں کے رسوم، مقدس عیسائی کلیساؤں میں جگہ پانے لگے اور ان مسائل میں بھی مختلف فرقوں کے اندر اختلاف باہمی نہایت شد ومد سے پیدا ہوئے، یہاں تک کہ ان مذہبی مناقشات کے تصفیہ کے لیے حکومت کو بار ہا دست اندازی کرنی پڑتی تھی، رفتہ رفتہ رشوت ستانی کا بازار گرم ہو گیا اور یہ حالت ہوگئی کہ جو شخص کسی بڑے دنیاوی عہدہ دار کے پاس جتنا رسوخ وتقرب حاصل کر سکتا اسی نسبت سے اس کو بڑی دینی خدمت مل جاتی۔ [3]

یہ تو مسیحی دنیا کے مشرقی حصہ کا حال تھا، مغربی حصہ کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی، یہاں رومن امپائر کی ماتحتی میں مذہبی مناصب کے لیے کشت وخون ایک عام ومعمولی واقعہ تھا، یہاں تک کہ بعض دفعہ مقتولین کی تعداد کسی سخت خونریز جنگ کے مقتولوں کے مساوی پہنچ جاتی، چنانچہ ایک مرتبہ جب ایک اعلیٰ مذہبی عہدہ کے لیے دو پادریوں کے درمیان مقابلہ ہوا تو صرف ایک دن میں ۱۳۷ آدمی کام آئے۔ [4]

اس سفاکانہ جدوجہد کا باعث صرف یہ تھا کہ اس زمانہ کے مذہبی عہدے اکتساب زر، حصول لذائذ اور کسب جاہ کے بہت بڑے ذرائع تھے، چنانچہ جتنی نفیس غذائیں پادریوں کے دسترخوان پر رہتی تھیں، اتنی بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی تھیں۔ [5]

سلاطین اور مذہب کے حاکمین کے اخلاق کا پرتو عام رعایا اور پیروؤں پر لازمی طور پر پڑتا ہے، نتیجہ یہ

---

[1] معرکہ مذہب وسائنس، ڈریپر، ص: ۶۲۔ [2] ایضاً صفحہ: ۶۵، ۶۶۔

[3] ایضاً، ص: ۲۶۔ [4] ایضاً، صفحہ: ۲۶۔ [5] ایضاً، صفحہ: ۲۶۔ ۶۸۔

ہوا کہ بد اخلاقی، اسراف اور ہوس پرستی مسیحی دنیا کی آب و ہوا میں سرایت کر گئی، لوگ ہر طرح کے ناجائز وسائل سے روپیہ کماتے اور کمال بے دردی کے ساتھ اپنے مسرفانہ لہو ولعب اور عیاشی میں اڑا ڈالتے۔ ❶

پوپوں نے اور ان کے بعد درجہ بدرجہ مذہبی عہدہ داروں نے اپنی اپنی جگہ شہنشاہانہ بلکہ خدائی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے، جو وہ زمین پر کھولتے تھے وہ آسمان پر کھولا جاتا تھا اور جو یہاں بند کرتے تھے وہ وہاں بھی بند ہو جاتا تھا، قرآن مجید نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے: ﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ (۹/ التوبۃ: ۳۱) ''انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو اپنا خدا بنا لیا تھا۔'' دینداری کا سب سے اہم جز وتجرد کی زندگی اور رہبانیت تھی ہر قسم کے آرام وآسائش سے جسم کو محروم کر کے ہر قسم کے تکلیف دہ عذاب میں اپنے کو تمام عمر مبتلا رکھنا بہترین عبادت تھی، کسی نے تمام عمر غسل نہ کرنے کی قسم کھائی تھی، کسی نے اپنے کو دلدل میں ڈال دیا تھا، کوئی اپنے کو بوجھل زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھا، کسی نے سایہ میں بیٹھنے کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا اور کسی نے اپنے کو اندھیری کوٹھری میں بند کر لیا تھا۔ ماں، باپ اور عزیز و اقارب، دینداری و تقویٰ شعاری کی راہ میں کانٹے تھے، ان سے پرہیز، بلکہ ان سے نفرت، کمالِ تقویٰ سمجھا جاتا تھا اور اسی پر فخر کیا جاتا تھا۔

ہندوستان

دنیا کے ان متمدن ملکوں میں جہاں کوئی با اثر مذہب قائم تھا ایک ہندوستان بھی ہے، ہندوستان کے تمدن کے پانچ مختلف دور گزرے ہیں، ایک اصلی ہندو ویدک عہد، جو دو ہزار سال ق م سے لے کر تقریباً چودہ سو سال ق م تک قائم رہا، دوسرا دور جنگ، یعنی جس میں کوروؤں اور پانڈوں وغیرہ کے مناقشات رہے اور جو چودہ سو سال ق م سے لے کر تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح تک رہا، تیسرا دور عقلیت جس میں حکما اور عقلیین کا دور دورہ تھا اور جو ۱۰۰۰ قبل مسیح سے لے کر تقریباً تیسری صدی قبل مسیح کے نصف تک رہا، چوتھا دور بودھ جس میں اس مذہب کا عروج تقریباً دو سو پچاس قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک رہا، پانچواں دور پرانک جس میں بجائے وید یا گوتم بدھ کی تعلیمات کے، پرانوں کی تلقین پر عمل درآمد ہوتا تھا اور یہ عہد تقریباً پانچویں صدی عیسوی کے اواخر سے لے کر مسلمانوں کے داخلہ ہند تک قائم رہا۔

مؤرخین کا اجماع ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک اور نقائص سے معمور آخری دور ہے جو تقریباً ۵۰۰ء سے شروع ہوتا ہے اس دور کے نمایاں خصوصیات حسب ذیل تھے:

❶ شرک جو ابتدا ہی سے ہندوستان کے خمیر میں داخل تھا اب وہ حد اعتدال سے باہر ہو گیا تھا چنانچہ وید میں جو ۳۳ دیوتاؤں کی تعداد تھی وہ اب بڑھتے بڑھتے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں تک پہنچ گئی۔ ❷

❶ تاریخ اخلاق یورپ لیکی کی دوسری جلد میں یہ واقعات مفصل لکھے ہیں۔ ❷ آرسی دت کی ہندوستانِ قدیم جلد ۳، صفحہ: ۲۷۶۔

2 ویدک عہد میں اصنام کی پرستش کا رواج نہ تھا لیکن اس زمانہ میں مندروں کے اندر بت پرستی علی العموم رائج ہوگئی۔ 1

3 مندروں کے محافظین بد اخلاقی کا سرچشمہ تھے جو لاکھوں کروڑوں ناواقف پرستش کرنے والوں کو مذہب کے نام سے خوب لوٹتے۔ 2

4 ویدک عہد میں ساری ہندو قوم میں یگانگی تھی لیکن اب ذات پات کی تفریق شروع ہوگئی جو نظام معاشرت کے لیے تباہ کن تھی۔ 3

5 عورتوں کو محکومیت وغلامی کا درجہ دیا گیا تھا۔ 4

6 قوانین اس قدر غیر معقول و نامنصفانہ وضع کیے گئے جن سے علانیہ بعض ذاتوں کی پاسداری وحمایت اور بعض پر جبر وستم مقصود تھا مثال کے لیے چند قوانین درج ذیل ہیں:

(الف) برہمن کو کسی حالت میں خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرائم کا مرتکب رہ چکا ہو سزائے موت نہیں دی جاسکتی۔

(ب) کسی اونچی ذات کے مرد کا کسی نیچی ذات کی عورت کے ساتھ زنا کرنا کوئی جرم نہیں۔

(ج) کسی بودھ راہبہ کی عصمت دری کی سزا میں کچھ جرمانہ کافی تھا۔

(د) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات والے کو چھو لے تو اس کی سزا موت ہے۔

(ھ) اگر کوئی نیچی ذات والا اپنے سے اونچی ذات والے کو مارے تو اس کے اعضا قطع کر ڈالنا چاہیے اگر اسے گالی دے تو اس کی زبان کاٹ ڈالنی چاہیے اور اگر اسے تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو گرم تیل اس کے منہ میں ڈالنا چاہیے۔ 5

7 راجاؤں کے محل میں بادہ نوشی کثرت سے رائج تھی اور رانیاں اسی حالتِ خمار میں جامہ عصمت اتار ڈالتی تھیں۔ 6

8 شاہراہوں پر آوارہ گرد اور جرائم پیشہ افراد کا مجمع لگا رہتا تھا۔ 7

9 خدا کی تلاش آبادیوں اور بازاروں میں کرنے کے بجائے جنگلوں اور پہاڑوں میں کی جاتی تھی جسم کو سخت سے سخت ایذا اور تکلیف ان کی بہترین عبادت تھی۔

10 اوہام وخیالاتِ فاسدہ، بھوتوں پلیتوں اور سینکڑوں قسم کے ظنون واوہام ان کا مذہب تھا اور آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز ان کا خدا تھی اور ہر ایک کے سامنے سربسجود ہونا ان کا دھرم تھا۔ بتوں، دیوتاؤں اور دیویوں کا شمار اندازہ وقیاس سے باہر تھا اور ان کے افسانوں کا گیت ان کا ترانہ حمد تھا۔ ظہورِ اسلام کے بعد بھی جو عرب

---

1 آرسی دت کی ہندوستانِ قدیم جلد ۳ صفحہ: ۲۸۱۔ 2 ایضا ص: ۲۸۳۔ 3 ایضا ص: ۳۰۷۔

4 ایضا ص: ۳۳۱۔ 5 ایضا ص: ۳۴۲، ۳۴۳۔ 6 ایضا ص: ۴۶۹۔

7 آرسی دت کی ہندوستانِ قدیم صفحہ: ۴۶۹۔

سیاح یہاں آتے رہے انہوں نے تپشا کرنے والے جوگیوں کے وہ دردناک حالات لکھے ہیں جن کو پڑھ کر ان کی حالت پر افسوس آتا ہے [1] اور اسی طرح وہ عرب سیاح جو سندھ اور دکن کے شہروں اور ساحلوں سے گزرے ہیں ان کے معبدوں میں پجاری عورتوں اور دیوداسیوں کی جو اخلاقی کیفیتیں لکھی ہیں [2] وہ حد درجہ شرمناک ہیں اور اس سے زیادہ شرمناک یہ ہے کہ یہ سب خدا کی خوشنودی اور مذہبی عقیدہ کی رو سے انجام دیا جاتا تھا۔

عورتیں جوؤں میں ہاری جاتی تھیں، ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے تھے [3] وہ بیوہ ہو کر زندگی کی ہر لذت سے عمر بھر کے لیے قانوناً محروم کر دی جاتی تھیں اور اسی لیے شوہر کے مرنے پر بعض عورتیں زندہ درآتش ہونا پسند کرتی تھیں۔ لڑائی میں شکست کے خوف کی صورت میں ان کو خود ان کے باپ اور بھائی اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالتے تھے یہاں کے بعض فرقوں میں عورتیں مرد کو اور مرد عورتوں کو ننگا کر کے ان کی پوجا کرتے تھے [4] مذہبی تہواروں میں شراب پی پی کر ایسے بدمست ہوتے تھے کہ پھر انہیں ماں، بہن، بیٹی اور اپنی اور پرائی کی تمیز باقی نہیں رہتی تھی اور اس کو وہ نیکی کا کام سمجھتے تھے۔ شودروں کے نام سے ایک پوری قوم کی قوم ایسی غلامی میں مبتلا تھی کہ تعلیم و تربیت، تہذیب و اخلاق اور دین و ایمان ہر چیز سے محروم رہنا اس کا فرض تھا۔ وید کی آواز بھی اس کے کان میں پڑ جائے تو اس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینے کا حکم تھا۔

راجاؤں کی بیویوں کی کوئی تعداد قانوناً مقرر نہ تھی۔ قانون کی بنیاد مساوات انسانی پر نہیں بلکہ ذاتوں پر تھی۔ عورتیں فروخت کی جاتی تھیں۔ اس مختصر سے خاکہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ ابتدائے اسلام سے ایک صدی پیشتر سے دیوتاؤں کی یہ جنم بھومی بھی شیطانوں کے اس جال میں گرفتار تھی جس کے شکار فارس و روم ہو رہے تھے۔

یہود

دنیا کی آبادی اور اصلاح کی سب سے زیادہ امید اسی قوم سے ہو سکتی تھی جو سام کی اولاد میں سب سے پہلے وحی الٰہی کی امانت دار بنی، اس لیے قرآن نے ان سے کہا: ﴿ وَلَا تَكُونُوٓا أَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهِۦ ﴾ (۲/ البقرۃ: ٤١) ''اور سب سے پہلے تم ہی پیغامِ الٰہی کے منکر نہ بنو'' مگر یہ قوم سخت جانی کے ساتھ سنگ دل بھی ثابت ہوئی، اس نے پتھروں کے سینوں کو پھٹتے اور ان کی چھاتیوں سے میٹھے پانی کا دودھ بہتے دیکھا اور پیا مگر پھر بھی اس کے سینہ کا دل پتھر ہی رہا۔ قرآن نے اپنے زمانہ میں اس کو طعنہ دیا:

﴿ فَهِىَ كَٱلْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ﴾ (۲/ البقرۃ: ٧٤)

''ان کے دل پتھروں کے مانند بلکہ ان سے بھی بڑھ کر سخت ہیں۔''

اس نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا، ان کو تکلیفیں دیں بلکہ ان کو قتل کر ڈالا، حضرت

---

[1] دیکھو ابوزید سیرانی کا سفرنامہ، صفحہ: ۱۱۵، ۱۱۸ پیرس و آثار البلاد قزوینی، صفحہ: ۸۱۔

[2] سفرنامہ ابو زید، ص: ۱۳۰، اور احسن التقاسیم مقدسی، ص: ٤٨٣۔ [3] مہابھارت کے قصہ کا آغاز پڑھو۔

[4] ستیارتھ پرکاش سمولاس گیارہ، ص: ۳۷۸، ۳۷۹ مطبوعہ سیوک اشٹیم پریس لاہور ۱۹۱۲ء۔

موسیٰ علیہ السلام اوران کے بعد کوئی پیغمبران میں ایسا نہیں آیا، جس نے ان کی سنگدلی کا ماتم نہ کیا ہواوران کی سرکشی پران کے حق میں بددعانہ کی ہو۔ چنانچہ خود قرآن مجید نے کہا:

﴿ لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾

(۵/ المآئدۃ:۷۸، ۷۹)

''بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر کیا، ان پر داؤد اور مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے لعنت کی گئی، یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھتے تھے اور ایک دوسرے کو اس برائی سے، جو وہ کرتے تھے منع نہیں کرتے تھے ان کا کام کتنا برا ہے۔''

حضرت داؤد علیہ السلام نے زبور میں کئی دفعہ بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا ماتم اپنے سوز وگداز کی لے میں کیا ہے۔ زبور ۷۸ میں ہے:

''اے میرے گروہ! میری تعلیم پر کان رکھ، میرے منہ کی باتیں کان دھر کے سنو، تاکہ آنے والی پشت میں وہ فرزند جو پیدا ہوں، سیکھیں اور وہ خدا پر توکل کریں اور خدا کے کاموں کو نہ بھلا دیں، بلکہ اس کے حکموں کا تحفظ کریں اور اپنے باپ دادوں کی طرح ایک شریر اور سرکش نسل نہ ہوں، نہ ایسی نسل کہ جس نے اپنا دل مستعد نہ کیا اور ان کے جی خدا سے نہ لگے رہے باوجود اس سبب کے پھر انہوں نے گناہ کیے اور اس کے عجائب قدرتوں کے سبب اعتقاد نہ کیا لیکن انہوں نے اپنے منہ سے اس کے (خدا کے) ساتھ ریا کاری کی اور اپنی زبانوں سے اس سے جھوٹ بولے اور وہ اس کے عہد میں وفادار نہ رہے، کیونکہ ان کے دل ان کے ساتھ قائم نہ رہے، کتنی بار انہوں نے بیابان میں اس خدا سے بغاوت کی اور ویرانہ میں اسے بیزار کیا۔ تس پر بھی انہوں نے خدا تعالیٰ کو آزمایا اور اسے بیزار کیا اور اس کی شہادتوں کو حفظ نہ کیا، بلکہ برگشتہ ہوئے اور اپنے باپ دادوں کے مانند بے وفائی کی اور وہ ٹیڑھی کمان کے مانند ایک طرف پھر گئے۔''

زبور ۸۱ میں ہے:

''اے میرے لوگو! سنو کہ میں تجھ پر گواہی دوں گا، اے بنی اسرائیل! اگر تو میری سنے گا تو تیرے درمیان کوئی دوسرا معبود نہ ہو تو کسی اجنبی معبود کو سجدہ نہ کرنا، خداوند تیرا خدا میں ہوں، جو تجھے مصر کی سرزمین سے باہر لایا، اپنا منہ کھول کہ اسے بھر دوں گا، پر میرے لوگوں نے میری آواز پر کان نہ دھرا اور اسرائیل نے مجھے نہ چاہا تب میں نے ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا۔''

بہت سے بنی اسرائیل جو حضرت داؤد علیہ السلام سے باغی ہو کر لڑنے پر آمادہ تھے، حضرت داؤد علیہ السلام نے ان کے متعلق یہ بد دعا کی:

''کہ تو وہ خدا نہیں جو شرارت سے خوش ہو، شریر تیرے ساتھ نہیں رہ سکتا، وہ جو شیخی باز ہیں تیری آنکھوں کے سامنے کھڑے نہیں رہ سکتے، تو سب بدکرداروں سے عداوت رکھتا ہے، تو ان کو جو جھوٹ بولتے ہیں نابود کر دے گا، اے خداوند! اپنی صداقت میں میرا رہبر ہو، میرے دشمنوں کے سبب سے میرے سامنے اپنی راہ کو سیدھا کر، ان کے باطن میں سراسر کھوٹا پن ہے اے خدا! تو انہیں ملزم جان، ایسا ہو کہ وہ اپنی مشورتوں سے آپ ہی گر جائیں، ان کو ان کے گناہوں کی کثرت کے سبب سے نکال پھینک کہ انہوں نے تجھ سے سرکشی کی ہے۔'' (زبور۔۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی انجیل میں بنی اسرائیل کو لعنت کی اور فرمایا:

''اے ریا کار فقیہو! اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو باہر سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں پر بھیتر مردوں کی ہڈیوں سے اور ہر طرح کی ناپاکی سے بھری ہوئی ہیں، اسی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو پر باطن میں ریا کار اور شرارت سے بھرے ہو۔''

''اے ریا کار فقیہو! اور فریسیو! تم پر افسوس کیونکہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راست بازوں کی گوریں سنوارتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر اپنے باپ دادوں کے دنوں میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے، اسی طرح تم اپنے اوپر گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو، پس اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھرو، اے سانپو اور اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے۔'' (متی ۲۳۔۲۷۔۳۳)

بعینہٖ یہی الزام قرآن نے بھی ان کو دیا ہے:

﴿ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۶۱)

''اور وہ ناحق پیغمبروں کو مار ڈالتے ہیں، اس لیے کہ وہ نافرمان اور حد سے بڑھنے والے ہیں۔''

﴿ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنبِيَاءَ اللَّهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۹۱)

''کہہ پھر کیوں اللہ کے نبیوں کو پہلے تم قتل کرتے رہے، اگر تم مومن تھے۔''

آل عمران میں اس سے بھی بڑھ کر ہر حق کے داعی اور خیر کے مبلغ کے قتل کر دینے کا ان پر بجا الزام ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴾ (۳/ آل عمران:۲۱)

"بے شک وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے اور ہر اس شخص کی زندگی کے دشمن بن جاتے ہیں جو ان کو عدل و نیکی کی بات سمجھاتا ہے، تو ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنادے۔"

سورۂ بقرہ اور آل عمران میں یہودیوں کے ایک ایک عیب کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دین وملت کا قوام کتنا بگڑ گیا تھا، ان کی مذہبی سنگدلی اور تعصب کا سب سے دردناک سانحہ وہ ہے جو اسلام سے ۵۰، ۶۰ برس پہلے یمن میں پیش آیا کہ یہودی حمیریوں نے نجران کے عیسائیوں کو گڑھوں میں آگ جلا کر ان میں جھونک دیا اور وہ کنارے بیٹھے اس حسرت ناک منظر کا تماشا دیکھتے رہے، چنانچہ قرآن مجید نے اس پر درد داستان کو ان لفظوں میں انہیں یاد دلایا:

﴿ قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۙ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۙ اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ ۙ وَّهُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ ؕ وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ ۙ ﴾

(۸۵/ البروج: ۴۔۸)

"گڑھے والے لوگ مارے گئے، بھڑکتی آگ کے گڑھے، جب وہ ظالم ان کے کنارے بیٹھے ایمان والوں کے ساتھ جو کر رہے تھے اس کو دیکھ رہے تھے، ان کا گناہ یہی تھا کہ وہ غالب اور خوبیوں والے خدا پر ایمان رکھتے تھے۔"

جزئیات کو چھوڑ کر کلی طریقہ سے ان میں حسب ذیل نقائص تھے:

① ان کو اپنے محبوب خدا اور خاص خدا کے کنبہ ہونے پر بے انتہا غرور تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ہم کچھ کریں، ہمیں قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا:

﴿ نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ ﴾ (۵/ المآئدۃ: ۱۸)

"ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔"

﴿ وَقَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدَةً ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۸۰)

"اور کہا، ہم کو دوزخ کی آگ ہرگز نہیں چھوئے گی، لیکن چند روز۔"

وہ سمجھتے تھے کہ جنت کی نعمتیں صرف انہی کے لیے خاص ہیں، قرآن نے کہا:

﴿ قُلۡ اِنۡ كَانَتۡ لَـكُمُ الدَّارُ الۡاٰخِرَةُ عِنۡدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنۡ دُوۡنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۹۴)

"کہہ دے کہ اگر آخرت کا گھر تمام لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لیے ہے تو موت کی آرزو کیوں نہیں کرتے اگر تم سچے ہو۔"

وہ سمجھتے تھے کہ نبوت اور رسالت صرف ان کے گھر کی چیز ہے، کسی دوسرے کا اس میں حق نہیں قرآن نے ان کے جواب میں کہا:

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (٦٢/ الجمعة:٤)

''یہ خدا کی مہربانی ہے، وہ جس کو چاہے دے۔''

جو ان میں پڑھے لکھے عالم تھے وہ خدا کے احکام کو اپنے منشا اور دولت مندوں کی خوشنودی کے لیے اپنی باطل تاویلوں سے ادلتے بدلتے رہتے تھے اور اپنی تصنیفات اور اجتہادات کو کتاب الٰہی کا درجہ دیتے تھے:

﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ﴾ (٥/ المآئدة:٤١)

''وہ لفظوں کو اپنی مناسب جگہوں سے ہٹا دیتے ہیں۔''

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ﴾ (٢/ البقرة:٧٩)

''تو پھٹکار ہو ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے، تاکہ وہ اس سے دنیا کا معمولی فائدہ اٹھائیں، تو پھٹکار ہے ان پر جو وہ لکھتے ہیں اور پھٹکار ہو ان پر جو وہ کماتے ہیں۔''

جو ان میں ان پڑھ اور جاہل تھے وہ اپنے سنے سنائے قصوں پر ایمان رکھتے تھے:

﴿وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ﴾

(٢/ البقرة:٧٨)

''اور ان میں بعض ان پڑھ ہیں، جن کو تورات کا علم نہیں، لیکن بناوٹی باتیں معلوم ہیں، وہ صرف ان کے خیالات ہیں۔''

احکام الٰہی میں سے جو آسان اور ضرورت کے مطابق حکم ہوتا، اس کو قبول کرتے اور دوسرے حکموں کو پس پشت ڈالتے:

﴿نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾

(٢/ البقرة:١٠١)

''جن کو خدا کی کتاب دی گئی تھی، ان میں سے ایک فریق اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈالتا ہے گویا کہ وہ جانتا ہی نہیں۔''

﴿اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾

(٢/ البقرة:٨٧)

”کیا جب کوئی رسول تمہارے پاس وہ لے کر آیا جو تمہاری نفسانی خواہشوں کے موافق نہ ہو، تم نے غرور کیا تو کچھ کو جھٹلایا اور کچھ کو مار ڈالتے ہو۔“

ایک دفعہ جب آنحضرت ﷺ مدینہ تشریف لا چکے تھے اور یہود نے بھی آپ کی ملکی سرداری کو ایک گونہ قبول کر لیا تھا تو ایک زنا کا مقدمہ آپ ﷺ کی عدالت میں لائے، آپ نے پوچھا کہ ”تمہارے مذہب میں اس جرم کی سزا کیا ہے؟“ بولے ہم مجرم کو کوڑے مارتے ہیں اور اس کی تشہیر کرتے ہیں، آپ نے ان سے توراۃ طلب فرمائی جب وہ لائے تو اس جرم کے متعلقہ حکموں کی آیتوں کو پڑھ کر سنانے لگے تو بیچ سے سنگ ساری کا حکم چھپا دیا، مگر ایک نومسلم یہودی عالم نے اس حکم کو پڑھ کر بتا دیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ”خداوندا! میں پہلا شخص ہوں گا جو تیرے مردہ حکم کو زندہ کروں گا۔“ ❶

آپس میں قتل و خونریزی کا بازار ان میں گرم تھا، ان میں ایک طاقتور قبیلہ دوسرے کمزور قبیلہ کو گھر سے بے گھر کر دیتا تھا اور پھر کوئی گرفتار ہو جاتا تو فدیہ دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے تھے، قرآن نے کہا:

﴿ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ۡ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۭ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْھُمْ وَھُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ۭ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۵)

”پھر تم ہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے اور ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو اور ان کے برخلاف گناہ اور ظلم سے مدد کرتے ہو اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی بن کر آتے تو تم فدیہ دے کر چھڑاتے ہو حالانکہ ان کا نکالنا تم پر حرام تھا، کیا تم کتاب کے کچھ حکموں کو مانتے اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔“

② دوسری چیز مال و دولت کی حرص و طمع تھی اس کی وجہ سے ان میں ہر قسم کا لالچ اور اخلاقی کمزوری پیدا ہو گئی تھی، کسی بڑے کام کی خاطر وہ اپنی راحت و آرام اور جسم و جان کو قربان نہیں کر سکتے تھے:

﴿ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُھُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۹۶)

”ان کو سب لوگوں سے زیادہ زندگی کا لالچی پاؤ گے، مشرکوں سے بھی زیادہ، ان میں ایک ایک چاہتا ہے کہ اس کو ہزار برس کی زندگی ملے۔“

عربوں کے ساتھ ان کے لین دین کے تجارتی تعلقات قائم تھے مگر وہ سخت نادہند تھے اور سمجھتے تھے کہ عربوں کے ساتھ جس طرح سختی اور بددیانتی کے ساتھ بھی برتاؤ کیا جائے وہ مذہباً منع نہیں، قرآن نے اس

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب احکام اهل الذمة واحصانهم اذا زنوا ورفعوا الی الامام: ۶۸۴۱؛ مسلم، کتاب الحدود، باب رجم الیهود: ۴۴۴۰؛ ابوداود، کتاب الحدود، باب فی رجم الیهودیین: ۴۴۴۶، ۴۴۴۷۔

معاملہ میں عیسائی اہل کتاب کی تعریف کے بعد اسرائیل اہل کتاب کی نسبت فرمایا:

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝﴾

(۳/ آل عمران:۷۵)

''کتاب والوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کو ایک دینار بھی امانت رکھنے کے لیے دو، وہ تم کو اس وقت تک واپس نہ دیں، جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ رہو، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ان جاہل عربوں کا ہم پر حق نہیں اور وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔''

توراۃ میں ''اپنے بھائی'' کے علاوہ ''اجنبی'' سے سود لینے کی اجازت کا مطلب وہ یہ لیتے تھے کہ یہود یہود سے نہ لے اور اہلِ عرب جو یہود نہ تھے ان سے بھاری سے بھاری شرح سے سود وصول کرنا جائز سمجھتے تھے اور تعجب پر تعجب یہ تھا کہ ان کے علما ان کو اس سے باز نہیں رکھتے تھے، اس حرام خوری اور ان کے علما کی اس خاموشی پر ان کو قرآن نے بار بار ٹوکا:

﴿ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝﴾ (۵/ المآئدۃ:۶۲، ۶۳)

''اور ان میں سے بہتوں کو تو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور ظلم کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں ان کے کرتوت کتنے برے ہیں ان کے درویش اور عالم گناہ کی بات بولنے اور حرام کھانے سے کیوں باز نہیں رکھتے ان کے کام درحقیقت کتنے خراب ہیں۔''

﴿ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۭ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۲)

''جھوٹ کو سننے والے اور حرام کو کھانے والے ہیں۔''

﴿ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُھُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭ﴾ (۴/ النسآء:۱۶۱)

''اور ان کے سود لینے کے سبب سے، حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھا جانے کی وجہ سے۔''

اسی لیے وہ تورات کی آیتوں میں تحریف اور ان کے معنوں میں تاویل کرکے ایسے فقہی حیلے تراشتے تھے کہ وہ ہر حکم کو اپنے مطلب کے مطابق بنا لیتے تھے، خدا نے فرمایا:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۴)

''ہم نے تورات اتاری، جس میں ہدایت اور روشنی ہے، اسی کے مطابق نبی جو تابعدار تھے، یہودیوں کا فیصلہ کرتے تھے، اور ان کے درویش و عالم بھی خدا کی کتاب کے جن حصوں کو انہوں نے بچا رکھا تھا، ان میں سے فیصلہ کرتے۔''

اس کے بعد اس کے احکام کے اجرا اور خاص کر قصاص کا ذکر کیا اور فرمایا:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٤٤)

''اور جو خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی لوگ کافر ہیں۔''

ان میں مشرکانہ بت پرستی کے بھی بعض اثرات پیدا ہو گئے وہ جبت اور طاغوت کی پرستش میں مبتلا تھے قرآن ان کو خطاب کر کے کہتا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ... اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ ﴾ (٤/ النسآء:٤٧۔٤٨)

''اے کتاب والو! ہم نے جو اتارا وہ تمہاری کتاب کی تصدیق کرتا ہے، اس پر ایمان لاؤ بے شک خدا شرک کو معاف نہیں کرتا اور اس کے سوا جس کو چاہے معاف کر دے۔''

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:٥١)

''کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ بتوں اور شیطانوں پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کافر مسلمانوں سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔''

اوہام و خرافات پر ان کا ایمان تھا، تعویذ، گنڈا، جادو اور عملیات پر فریفتہ تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعلیم ہے (بقرہ) لبید اعصم وغیرہ مدینہ میں بہت سے عامل تھے، جو کنگھیوں اور بالوں میں منتر پڑھ کر پھونکتے تھے۔ [1]

عرب سے باہر یہودی، یونانیوں اور رومیوں کی حکومتوں میں یورپ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں اور شہروں میں اس طرح پراگندہ اور منتشر تھے کہ عرب سے باہر دنیا کی قوموں میں ان کا کوئی شمار نہ تھا عرب کے اندر جو یہود زمانہ دراز سے آباد تھے ان کا بڑا شغل زراعت اور تجارت تھا، سودی کاروبار کرتے تھے، غریب عربوں کو اپنے گراں شرح سود اور قرضوں کے بار میں اسی طرح دبائے تھے کہ ان کی حالت ان کے سامنے غلاموں کی سی تھی اس سلسلہ میں صرف ایک واقعہ کا ذکر پوری حالت کے اندازہ کے لیے کافی ہوگا:

محمد رضی اللہ عنہ بن مسلمہ انصاری اور ان کے رفقا جو مدینہ کے یہودی سردار کعب بن اشرف کے قتل پر مامور ہوئے تھے وہ اس سے ملنے اور بات چیت کرنے گئے انہوں نے اس سے کہا، اے کعب! اس شخص محمد (رسول

[1] صحیح بخاری، کتاب الطب، باب السحر:٥٧٦٣۔

اللہ ﷺ) نے تو صدقہ وصول کر کر کے ہم کو دق کر ڈالا اب میں تم سے کچھ قرض لینے آیا ہوں اس نے کہا، خدا کی قسم! مجھے معلوم تھا کہ تم اس سے آخر بے زار ہو جاؤ گے۔ انہوں نے کہا، میں نے اس کی پیروی اختیار کی ہے لیکن اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا انتظار ہے کہ معاملہ کی صورت کس رخ پلٹتی ہے میں تم سے کچھ غلہ قرض لینے آیا ہوں۔ اس نے کہا، مگر تم کفالت میں کیا چیز رہن رکھو گے؟ انہوں نے کہا تم بتاؤ کیا چاہتے ہو؟ اس نے کہا، اپنی بیویاں گروی رکھو! انہوں نے جواب دیا ہم اپنی بیویاں گروی کیسے رکھ سکتے ہیں کہ تمام عرب میں تمہارے حسن کا جواب نہیں۔ بولا، اچھا تو اپنے لڑکوں کو گروی رکھو کہا، ہم اپنے لڑکوں کو گروی کیسے رکھیں، ان کی کوئی بے عزتی نہ کرے، یہ ہمارے لیے بڑی شرم کی بات ہے، ہاں ہم اپنے ہتھیار گروی رکھ سکتے ہیں۔ [1]

اس سوال و جواب سے اندازہ ہوگا کہ یہود کی اخلاقی حالت کتنی پست اور ذلیل ہو چکی تھی، کوئی غیر عورت اگر ان کے بازار کی طرف جا نکلتی تو اس کی عزت بچنی مشکل ہو جاتی تھی۔ [2] کسی بچہ کو معمولی سے زیور کے لالچ میں، موقع پاتے تو بے دردی سے قتل کر کے زیور اتار لیتے۔ [3] علما اور پیشوایانِ دین کی وہی کیفیت تھی جس کا ماتم اس وقت سے چھ سو برس پیشتر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا۔ لفظی موشگافیوں اور ظاہری دین داری کے سوا روح و اخلاق کا جوہر ان سے کھو گیا تھا اسلام جو ابراہیم حنیف کے ترانۂ توحید اور موسیٰ علیہ السلام کی صدائے طور کی آواز بازگشت تھا وہ ان کے نزدیک عرب کے بت پرستوں کے جاہلانہ مذہب سے زیادہ برا تھا وہ کہتے تھے کہ "ان مسلمانوں سے یہ مشرک زیادہ راہِ راست پر ہیں۔" (٤/ النسآء: ٥١) اسلام کی اس مصالحانہ دعوت:

﴿قُلْ يَٰٓأَهْلَ الْكِتَٰبِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ﴾ (٣/ آل عمران: ٦٤)

"اے کتاب والو! آؤ اس ایک بات پر ہم سب متحد ہو جائیں، جو ہم میں تم میں مشترک ہے، ہم خدا کے سوا کسی کو اپنا معبود نہ بنائیں اور نہ ہم خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا رب بنائیں۔"

میں بھی عداوت اور دشمنی ہی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اس لیے مدینہ میں اسلام کی صلح کی ہر کوشش کو وہ ٹھکراتے رہے کیونکہ روحانی عظمت کے مقابلہ میں اس دعوت کے قبول میں ان کو اپنی قومی و مالی و تجارتی عظمت کی بربادی نظر آتی تھی۔

عیسائیوں کی نقل میں وہ بھی عزیر (عزرا) کو خدا کا بیٹا کہتے تھے: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ﴾ (٩/ التوبۃ: ٣٠) اپنی دولت و ثروت کے غرور میں وہ کہتے تھے: ﴿يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ ۚ﴾ (٥/ المآئدۃ: ٦٤) "خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔" قرآن کی دعوت کے جواب میں کہتے تھے کہ ہم پر اس دعوت کا اثر نہیں

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، قتل کعب بن الاشرف: ٤٠٣٧۔ [2] دیکھو کتب سیر میں غزوۂ بنی نضیر کے اسباب۔ علامہ شبلی نے سیرۃ النبی حصہ اول پر غزوہ بنو قینقاع کے اتفاقیہ سبب کے پیش آنے کا ایک واقعہ یہ نقل کیا ہے کہ ایک انصاری کی بیوی نقاب پوش یہودی کی دکان میں آئی تو یہودیوں نے اس کی بے حرمتی کی ایک مسلمان نے غیرت سے بے تاب ہو کر یہودی کو قتل کر ڈالا۔ ممکن ہے کہ سید صاحب نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہو۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الدیات، باب من اقاد بالحجر: ٦٨٧٩۔

ہوسکتا کہ ہمارے دل نامختون ہیں: ﴿ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۸) ان فقروں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ اب دنیا میں نیابتِ الٰہی کے منصب کے قابل نہیں رہے تھے۔

عرب کے باہر یہودیوں کی پراگندہ ٹولیاں مختلف سلطنتوں کے سایہ میں پناہ گزین تھیں ان کا مذہبی مرکز ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا سیاسی اہمیت وہ مدت ہوئی کھو چکے تھے ان کے مذہبی فرقوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی جن میں باہمی عداوت قائم تھی اور اس وقت سے چھ سو برس پہلے کی طرح بنی اسرائیل اب پھر ایک نبی اعظم کی بعثت کا بے تابانہ انتظار کررہے تھے (بقرہ) خود عرب میں یہود اس وقت اس نبی کے جلد پیدا ہونے کی بشارت کا اپنی مجلسوں میں تذکرہ کرتے رہتے تھے جس کی پیشین گوئیوں سے تورات کے صفحے بھرے تھے اور انہیں سے سن کر یثرب کے اوس وخزرج ایک نبی کی آمد کی پیشین گوئیوں سے باخبر تھے۔ [1]

دنیا کی ان مختلف قوموں کے حالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کے بعد ضرورت ہے کہ اس قوم کے حالات پر ایک تفصیلی نظر ڈالی جائے جس کے وطن کے افق سے نبوت کی صبحِ سعادت طلوع ہونے والی تھی۔

---

[1] سیرت ابن ھشام ذکر بیعت عقبہ، جزء اوّل، ص:۲۵۹۔

ظہور اسلام کے وقت عرب کی مذہبی واخلاقی حالت

یمن میں جب وہ مشہور سیلاب آیا جس کی بلندی سطح زمین سے ایک سو بیس فٹ تھی، تو اس کا پایۂ تخت مآرب اور اس کے اضلاع دفعتہً تباہ و برباد ہو گئے، یہ دوسری صدی عیسوی کا واقعہ ہے۔ [1] قرآن مجید نے اسی سیلاب کو سیلِ عرم کہا ہے، اس سیلاب کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ بڑے بڑے خاندان جلاوطن ہو کر ادھر ادھر نکل گئے، جس سے نظام سلطنت میں ضعف آ گیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں یہاں کے فرمانروا ذونواس سے جو مذہباً یہودی تھا، رعایا نے بغاوت کی اور شاہِ حبش سے اعانت چاہی، اس نے ۵۲۹ء میں ایک فوج بھیجی جس نے ذونواس کو معزول کر دیا اور اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ۶۰۳ء میں قبیلہ حمیر کے ایک باحوصلہ شخص ذویزن نے فارس کی مدد سے اپنا ملک واپس لیا لیکن چند روز کے بعد وہ قتل کر دیا گیا اور یمن شہنشاہی فارس کا ایک معمولی صوبہ رہ گیا۔

جو قبیلے یمن سے نکلے، ان میں سے ایک نے دوسری صدی عیسوی میں حیرہ میں جہاں اب کوفہ آباد ہے ایک سلطنت قائم کی لیکن وہ فارس کے زیر اثر اور مذہبی خیالات میں مجوس سے متاثر تھی، دوسرا قبیلہ شام میں جا کر آباد ہوا جو غسانی خاندان کہلاتا ہے۔ [2] چونکہ یہ خاندان رومیوں کے زیر اثر تھا اس لیے رفتہ رفتہ وہ عیسائی ہو گیا اور اسلام کے زمانہ تک عیسائی رہا۔

غرض عرب کے اصلی تمدن پر بیرونی اثر جو کچھ پڑا تھا وہ مجوسیت یا نصرانیت کا تھا یہودی معتقدات اور خیالات کا اثر بھی بہت کچھ تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب کا ایک بڑا حصہ یعنی وادی القریٰ اور خیبر وفدک تمام تر یہودی آبادیاں تھا اور خود مدینہ میں یہودی ہی صاحب اقتدار اور صاحب حکومت تھے باقی تمام ملکوں میں مشرکانہ رسوم جاری اور جاہلانہ مذاہب پھیلے ہوئے تھے، لوگ بتوں، پتھروں، درختوں، ستاروں، فرشتوں اور جنوں کی پرستش کرتے تھے۔

خدا کا اعتقاد

تاہم اس میں شبہ نہیں کہ عرب زمانۂ دراز سے ایک خدائے برتر پر اعتقاد رکھتے تھے، آج کل عرب کے جو قدیم کتبات دستیاب ہوئے ہیں ان پر اللہ کا لفظ خدا کے معنی میں لکھا ہوا ہے، البتہ اس کا املا اللہ نہیں بلکہ ھلّہ ہے۔ عربِ شمال کے عرب جو نباتی کہلاتے ہیں ان کے ناموں کے ساتھ اللہ کا لفظ بھی شامل ہوتا تھا، مثلاً زید الٰہی عبدالٰہی [3] خود قرآن مجید میں خدا کفار کی نسبت کہتا ہے:

---

[1] اس بند کے انہدام کی تاریخ کی تعیین مشکل ہے اور اسی لیے اس کی تعیین میں کئی نظریے ہیں ایک اس کو دوسری صدی عیسوی کا واقعہ بتاتا ہے تو دوسرا پانچویں صدی عیسوی کا، اصلیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس بند کے مختلف حصے مختلف زمانوں میں منہدم ہوتے رہے اور بنتے رہے آخری دفعہ پانچویں صدی عیسوی میں بالکل برباد ہو گیا۔ (سلیمان) [2] اکثر علمائے انساب کا بیان یہی ہے کہ یہ قبائل یمن سے آئے تھے لیکن میں نے ارض القرآن میں بدلائل اس سے اختلاف کیا ہے۔ (سلیمان) دیکھیے حصہ اول زیر عنوان سبا و حمیر۔ ''ص''

[3] مذاہب واخلاق کی انسائیکلو پیڈیا، جلد اول، صفحہ: ۶۶۴ بحوالہ پروفیسر نولدیکی۔

﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ (۳۱/ لقمان:۲۵)

’’اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کیا ہے تو وہ بول اٹھیں گے کہ خدا نے۔‘‘

یہ اصل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم تھی لیکن رفتہ رفتہ شرک کا اعتقاد پیدا ہوا یعنی یہ کہ خدائے اعظم کے سوا اور بھی چھوٹے چھوٹے خدا ہیں، گو اللہ ان میں سب سے بڑا ہے، یہ اعتقاد اس قدر راسخ ہو گیا کہ اور معبودوں کے انکار سے ان کو اس قدر رنج ہوتا تھا جس قدر خود خدا کے انکار سے ہوسکتا تھا بلکہ چونکہ ان کے نزدیک دنیا کا کاروبار اور روزمرہ کی ضرورتیں انہی چھوٹے چھوٹے خداؤں سے انجام پاتی تھیں اور کام اکثر انہیں خداؤں سے پڑتا تھا اس لیے اللہ کا خیال کچھ یوں ہی سا رہ گیا، انہی خداؤں کی پرستش کرتے تھے، انہی پر قربانی چڑھاتے تھے، انہی سے حاجتیں مانگتے تھے، اللہ تو زمین و آسمان بنا کر بیکار سا ہو چکا تھا، جو کچھ کرتے تھے یہی خدایان اصغر کرتے تھے، یہی سبب تھا کہ کوئی شخص اللہ کا خالی نام لیتا تھا تو لوگ بہت کبیدہ ہوتے تھے:

﴿ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴾ (۳۹/ الزمر:۴۵)

’’اور جب خالی اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو یہ لوگ، جو کہ قیامت کے معتقد نہیں ہیں، ناک بھوں چڑھاتے ہیں، لیکن جب خدا کے سوا اوروں (معبودوں) کا بھی ذکر کیا جائے تو وہ دفعۃً کھل جاتے ہیں۔‘‘

اور سمجھتے تھے کہ ان چھوٹے معبودوں کی نذر و نیاز و قربانی سے خدا خوش رہے گا اور وہ اس کے دربار میں سفارش کریں گے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے:

﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ (۳۹/ الزمر:۳)

’’ہم ان بتوں کو اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں۔‘‘

ملائکہ کی الوہیت: شرک کے علاوہ خدائے اعظم کی نسبت یہ مانتے تھے کہ اس کے بال بچے بھی ہیں، چنانچہ فرشتوں کو وہ خدا کی بیٹیاں کہتے تھے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ﴾ (۵۳/ النجم:۲۷)

’’جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں۔‘‘

﴿ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴾ (۵۳/ النجم:۲۱، ۲۲)

’’تمہارے تو لڑکے ہوں اور خدا کے لڑکیاں! یہ تو کچھ اچھی تقسیم نہیں۔‘‘

اس لیے جس طرح بعض یہود عزیر کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدائی کا مستحق سمجھتے تھے وہ فرشتوں

کو خدا کی اولاد سمجھ کر ان کی الوہیت کے بھی قائل تھے:

﴿ وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ أَرْبَابًا ۗ ﴾ (۳/ آل عمران:۸۰)

''اور نہ تو خدا تم کو اس کا حکم دیتا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہراؤ۔''

﴿ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ؁ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ؁ .... وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ۭ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ۭ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْــَٔلُوْنَ ؁ وَقَالُوْا لَوْ شَاۗءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ۭ ﴾

(۴۳/ الزخرف:۱۵۔۱۶۔۱۹۔۲۰)

''اور ان مشرکوں نے خدا کے بندوں میں سے خدا کا ایک حصہ بنایا، بے شک انسان کھلا نافرمان ہے کیا خدا جو پیدا کرتا ہے وہ اپنے لیے لڑکیاں لے اور تم کو لڑکے دے کر عزت دے اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں لڑکیاں قرار دیا، کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے ان کی گواہی لکھی اور باز پرس کی جائے گی اور کہتے ہیں اگر خدا نہ چاہتا تو ہم ان کی پرستش نہ کرتے۔''

﴿ فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ؁ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ؁ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ؁ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ؁ ﴾ (۳۷/ الصّٰفّٰت:۱۴۹۔۱۵۲)

''تو ان سے پوچھ کہ کیا تیرے رب کی لڑکیاں ہوں اور ان کے لڑکے ہوں، کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں پیدا کیا، وہ حاضر تھے، ہاں یہ ان مشرکوں کی بناوٹ ہے، وہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہوئی اور وہ جھوٹے ہیں۔''

ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ یہ فرشتے خدا کے ہاں اپنے پرستاروں کے سفارشی بنیں گے۔ خدا نے اس کی تردید میں کہا:

﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـــًٔا ﴾ (۵۳/ النجم:۲۶)

''اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں کہ ان کی سفارش خدا کی اجازت کے بغیر کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔''

قیامت میں فرشتوں سے پرسش ہوگی کہ یہ مشرک تمہاری پوجا کرتے تھے:

﴿ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَاۗءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ؁ ﴾ (۳۴/ سبا:۴۰)

''پھر خدا فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ انسان تمہیں کو پوجتے تھے۔''

جنات کی الوہیت

فرشتوں کی طرح وہ جنات کو بھی خدا کے عزیز و قریب سمجھتے تھے اور خدا کے ان سے رشتے لگاتے تھے۔

﴿ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ﴾ (۳۷/ الصّٰفّٰت:۱۵۸)

''اور مشرکوں نے خدا اور جنوں کے درمیان رشتہ داری بنادی۔''

اس لیے وہ جنات کو خدا کی خدائی کا شریک کرتے تھے:

﴿ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ﴾

(٦/ الانعام:١٠٠)

''اور انہوں نے جنوں کو خدا کا شریک بنایا اور وہ خدا کی مخلوق ہیں اور بن جانے خدا کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑیں۔''

اور جب وہ خدا کے رشتہ دار اور خدائی کے شریک ٹھہرے تو ان کی عبادت اور پرستش بھی ضروری تھی چنانچہ جاہلیت میں اہلِ عرب ان جنوں کو بھی پوجا کرتے تھے [1] ﴿ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (٣٤/ سبـــــا:٤١) ''بلکہ یہ جن کو پوجتے تھے اور ان میں سے اکثر انہیں پر ایمان رکھتے تھے۔'' مسافر جب راستہ میں کہیں قیام کرتے تھے تو پہلے وہاں کے جنوں کی دہائی پکار لیتے تھے، قرآن میں ہے: ﴿ وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝﴾ (٧٢/ الجن:٦) ''اور بات یہ تھی کہ کچھ انسان بعض جنوں کی دہائی مانگا کرتے تھے اور انہوں نے ان کو اور مغرور بنا دیا تھا۔'' چنانچہ بعض مقامات میں خاص طور سے ان کے نام کی قربانی کی جاتی تھی اور ان میں سے ایک مشہور مقام دراہم تھا جہاں کے رہنے والے جنوں (مکان الدراہم) پر جانور ذبح کر کے چڑھائے جاتے تھے، تاکہ قربانی کرنے والے ان کی شرارت سے محفوظ رہیں۔ [2] قبیلہ خزاعہ کی شاخ بنو ملیح خاص طور سے جنوں کی پوجا کرتی تھی اور کلبی کا بیان ہے کہ انہیں کے متعلق یہ آیت اتری ہے: [3]

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ ﴾ (٧/ الاعراف:١٩٤)

''خدا کو چھوڑ کر تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری ہی طرح بندے ہیں۔''

بت پرستی

جن خداؤں کو یہ لوگ مانتے تھے ان کے بت بنا لیے تھے اور جابجا عظیم الشان بت کدے قائم ہو گئے تھے۔ یہ رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ جہاں کوئی خوبصورت پتھر مل گیا، اٹھا لیا اور اس کی پرستش شروع کر دی، زیادہ خوبصورت مل گیا تو اس کو پھینک دیا اور اس کی پرستش کرنے لگے، جہاں کوئی پتھر ہاتھ نہ آیا خاک کا ایک تودہ بنا لیا ایک بکری لا کر اس کا دودھ اس پر دھویا پھر اس کے گرد طواف کیا اور اب وہ ایک معبود بن جاتا تھا چنانچہ صحیح بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ: ٦٢٧ء٣ میں یہ پوری تفصیل مذکور ہے۔

[1] صحیح مسلم، کتاب التفسیر، باب قوله تعالیٰ: اولئك الذين يدعون يبتغون الى ربهم الوسيلة......:٧٥٥٤ تا٧٥٥٧۔

[2] لسان العرب لفظ سكن، ج ٢، ص:١٧٤۔ [3] كتاب الاصنام هشام الكلبى مطبوعه مصر، ص: ٣٤۔

اس بت پرستی کی ابتدا یوں ہوئی کہ قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص جس کا نام عمرو بن لحی تھا اور جو قبیلہ جرہم کو شکست دے کر کعبہ کا متولی بن گیا تھا ایک دفعہ بلقاء گیا اور وہاں لوگوں کو بت پرست دیکھ کر بت پرستی کی طرف مائل ہوا اور وہیں سے ایک بت لاکر کعبہ میں نصب کیا چونکہ اس کا اثر تمام عرب پر تھا اس لیے تمام عرب نے بت پرستی قبول کر لی اور گھر گھر بت خانے بن گئے۔ ان میں ہبل سب سے بڑا تھا، اس سے اتر کر منات، لات اور عزیٰ تھے۔ منات مدینہ منورہ سے سات میل پر تھا، انصار کے قبیلے یعنی اوس وخزرج اور آس پاس کے قبائل اسی کا حج کرتے تھے کعبہ کا حج بھی جب یہ لوگ کرتے تھے تو احرام یہیں آ کر اتارتے تھے، حلفیہ معاہدے بھی یہیں ہوتے تھے، عبدالعزیٰ مزنی کہتا ہے: ❶

انی حلفت یمین صدق برة بمناة عند محل آل الخزرج

''میں نے منات کی سچی قسم کھائی اہل خزرج کے احرام اتارنے کی جگہ کے پاس۔''

لات قبیلۂ ثقیف کا معبود تھا جو مقامِ طائف میں نصب تھا اہل طائف اس کو کعبہ کے برابر تسلیم کرتے تھے۔ عزیٰ ایک درخت تھا اس کے پاس ایک بت تھا یہ قبیلہ غطفان کا بت تھا لیکن قریش بھی اس کی نہایت عزت کرتے تھے اور اس کی زیارت کو جاتے تھے۔ قریش جب کعبہ کا طواف کرتے تھے تو یہ پڑھتے تھے: ❷

وَاللَّاتَ وَالْعُزّٰی وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰی اِنَّهُنَّ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰی۔

''لات، عزیٰ اور تیسرا مناۃ یہ بڑے برگزیدہ ہیں اور ان کی سفارش کی خدا کے ہاں امید ہے۔''

بت پرستی نے رفتہ رفتہ اور بہت سی برائیاں پیدا کر دیں، جانوروں سے گزر کر انسانی قربانیاں چڑھائی جانے لگیں، آنحضرت ﷺ کے جد امجد عبدالمطلب نے جو اپنے صاحب زادہ عبداللہ کی قربانی کرنی چاہی تھی اسی کہنہ رسم کی تقلید تھی۔

بحیرہ سائبہ، حام کے نام سے بتوں کے نام پر سانڈ چھوڑتے تھے، کعبہ کے سامنے جو قربانی کرتے تھے اس کا خون کعبہ کی دیواروں پر ملتے تھے۔ ❸ بتوں کے سامنے شگون کے تیر رہتے تھے، ان میں سے ایک پر ''ہاں'' ایک پر ''ناں'' لکھا رہتا تھا جو کام کرنا چاہتے پجاری سے کہتے فال نکالے، ہاں کا تیر نکلتا تو اس کو کرتے ورنہ باز رہتے۔

جاہلیت میں جن چیزوں کی پرستش کی جاتی تھی وہ مختلف قسموں کی تھیں اصنام واوثان، انصاب اور بیوت۔ اصنام واوثان جن کا واحد صنم اور وثن ہے یہ انسانی شکل وصورت کے بت تھے، اگر وہ لکڑی کے ہوتے تو بغیم کہلاتے اور اگر رنگ اور مسالے سے بنتے تو ان کو دمیہ کہتے، انصاب اور نصب بن گھڑے پتھر ہوتے

❶ یہ پوری تفصیل معجم البلدان لفظ مناۃ، ج ۸، ص: ۱۶۷، ۱۶۸ میں ہے۔

❷ معجم البلدان لفظ لات، ج ٦، ص: ١٦٦ و کتاب الاصنام للکلبی، ص: ١٩۔

❸ نیل المرام فی تفسیر آیات الاحکام، ص: ١١٠، ١١١۔

تھے جن کو کھڑا کر کے ان پر چڑھاوے چڑھاتے اور جانور ذبح کرتے تھے۔ بیوت جس کا واحد بیت ہے چند گھر تھے جیسے رضا، رئام، قلیس وغیرہ جن میں بت پرستانہ رسوم ادا کیے جاتے تھے جن بتوں کے اردگرد چکر لگاتے تھے ان کو دوار کہتے تھے اور ان پر جو قربانی کی جاتی اس کو عتیرہ کہتے تھے پتھروں کا ڈھیر لگا کر اس کے چاروں طرف چکر لگاتے تھے اس ڈھیر کو رجمہ کہتے تھے۔ جاہلی شاعر کہتا ہے:

كما طاف بالرجمة المرتجم

''جیسے پتھروں کے ڈھیر کا طواف کرنے والا طواف کرے۔'' [1]

جن بتوں کی پرستش کی جاتی تھی انکی کوئی انتہا نہ تھی۔

ع قبیلہ قبیلہ کا بت اک جدا تھا۔

خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو ساٹھ ۳۶۰ بت تھے [2] ان میں سے قرآن پاک میں جن کے نام بتائے گئے ہیں وہ یہ ہیں (۱) لات (۲) عزیٰ (۳) منات (۴) یغوث (۵) یعوق (۶) نسر (۷) ود (۸) سواع (۹) بعل۔ لیکن جاہلیت کے پرانے مؤرخوں اور لغت نویسوں نے جاہلیت کے شخصی ناموں اور شعرا کے اشعار سے بہت سے نام ذکر کیے ہیں ہشام کلبی کی کتاب الاصنام میں جو اس موضوع پر پہلی کتاب ہے اور جواب مصر میں چھپ بھی گئی ہے تقریباً تیس ۳۰ بتوں کے نام ہیں علامہ ذکی پاشا جنہوں نے کلبی کی اس کتاب کو ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۴۲ء میں تحشیہ اور تکملہ کے بعد شائع کیا ہے، اپنے تکملہ میں چھیالیس نام اور بڑھائے ہیں یمن اور حجاز میں آثارِ قدیمہ کے محققوں نے عہدِ جاہلیت کے جو کتبے پڑھے ہیں ان میں المقہ، عشتار، نکرہ، قینان وغیرہ بہت سے اور ناموں کا پتہ لگایا ہے، میں نے ارض القرآن کی دوسری جلد میں جو ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۱۸ء میں چھپی ہے، ان معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔

ذیل میں ہم ان بتوں کی فہرست درج کرتے ہیں جن کے نام اب تک معلوم ہو چکے ہیں:

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جو ان کو خاص طور سے پوجتے تھے
لات	ثقیف۔
عزیٰ	قریش و بنو شیبان بن جابر۔
مناۃ	اوس و خزرج اور عام عرب۔
یغوث	بنو مدحج اور اہل جرش۔
یعوق	بنو ہمدان اور اہل خیوان۔

[1] ان الفاظ کے لیے دیکھو لسان العرب۔

[2] صحيح بخاری، كتاب المغازی، باب اين ركز النبی ﷺ الراية...... :۴۲۸۷۔

نسر	حمیر۔
ودّ	بنوکلب۔
سواع	بنولحیان۔
اساف	بت، جس پرحج میں قربانی ہوتی تھی۔
نائلہ	بت، جس پرحج میں قربانی ہوتی تھی۔
اقیصر	قضاعہ ولخم وجذام وعاملہ وغطفان۔
باجر	ازدوطی وقضاعہ۔
ذوالخلصہ	بنوامامہ، خثعم، بجالہ، ازدالسراۃ۔
رضایارُضی	بنوربیعہ کا بت خانہ۔
رُمام	حمیر کا بت خانہ۔
سبحہ	
سعد	بنی ملکان بن کنانہ۔
سعیر	عنزہ۔
ذوالشریٰ	بنوحارث۔
عائم	ازدالسراۃ۔
عم انس یاعمیانس	خولان۔
فلس	طی۔
ذوالکفین	بنودوس۔
مناف	قریش۔
نہم	مزنیہ۔
ہبل	قریش۔
بعل	قبائل بنی عدنان۔
یغوب	حدیلہ (بنی طی)۔
اشہل	بنوعبدالاشہل۔
اوال	بکروتغلب۔

بس	غطفان کا بت خانہ۔
بعیم	ایک لکڑی کا بت۔
بلج	ایک بت۔
جیہ	ایک بت۔
جُرَیش یا جَرِیش	ایک بت جس کی طرف عبد جریش کی نسبت ہے۔
جلسد	ایک بت کا نام۔
جہار	ہوازن کا معبود۔
دار	بنو عبدالدار۔
دوار	ایک بت کا نام۔
ذوالرجل	حجاز کا ایک بت۔
شارق	ایک بت کا نام جس کی طرف عبدالشارق کی نسبت ہے۔
شمس	بنو عبد شمس۔
صدا	عاد کا بت۔
صمودا	عاد کا بت۔
ضمار	عباس بن مرداس سلمی کا قبیلہ۔
ضیزن	منذر اکبر۔
عبعب	قضاعہ۔
عوض	بکر بن وائل۔
عوف	ایک بت کا نام۔
غبغب	اس پر جانور ذبح کیے جاتے تھے۔
فراض	سعد العشیرہ۔
کثریٰ	جدیس و طسم۔
کسعہ	ایک بت کا نام۔
محرق	بکر بن وائل۔
مدان	عبدالمدان۔
مرحب	حضر موت۔

منہب	ایک بت کا نام۔
ہبا	عاد۔
ذات الودع	ایک بت کا نام۔
یالیل	عبد یالیل۔

ستارہ پرستی

عرب میں ستارہ پرستوں کا بھی ایک گروہ تھا، مختلف قبیلے مختلف ستاروں کی پوجا کرتے تھے ان میں سب سے اہم سورج اور چاند تھے، اسی لیے قرآن پاک نے خصوصیت کے ساتھ کہا:

﴿ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ ﴾ (۴۱/ حٰمٓ السجدۃ:۳۷)

''نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو۔''

یمن میں سبا کی قوم سورج ہی کو دیوی مانتی تھی (۲۷/ النمل:۲۴) یمن کے بادشاہ شمر یرعش نے سورج دیوی کا مندر بنوایا تھا۔ [1] سورج اور چاند کے بعد ستاروں میں شعری کی بڑی قدر و منزلت تھی، اس لیے قرآن پاک نے کہا:

﴿ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴾ (۵۳/ النجم:۴۹)

''اور وہی خدا شعریٰ کا مالک ہے۔''

صاعد اندلسی المتوفی ۴۶۲ھ نے اپنی کتاب طبقات الامم میں عرب کے حسب ذیل قبیلوں کو مختلف ستاروں کا پرستار بتایا ہے قبیلہ حمیر سورج کو پوجتا تھا، کنانہ چاند کو، تمیم دیران کو، لخم اور جذام مشتری کو، طی سہیل کو، قیس شعری العبور کو اور اسد عطارد کو۔ [2]

جن اور شیاطین اور بھوت پلیت

جن اور شیاطین کی نسبت عرب کے عجیب عجیب اعتقاد تھے وہ جن اور شیاطین بھوت پلیت سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے گو اختلاف صورت اور اشغال کی وجہ سے ان کے الگ الگ نام پڑ گئے تھے، جو اجنہ جنگلوں اور میدانوں میں رہتے تھے اور مسافروں کو اپنی صورتیں یا لباس بدل بدل کر دھوکا دیتے تھے ان کا نام غول تھا یہ مذکر بھی ہوتے تھے اور مؤنث بھی۔

عبید بن ایوب الغبری

وغولا قفرۃ ذکر وانثی   کان علیھما قطع البجاد

''اور بیابان کے دو غول مرد اور عورت بھی گویا ان دونوں پر کمل کے ٹکڑے پڑے ہیں۔''

---

[1] تاریخ ملوك الارض حمزۃ اصفھانی، ص:۱۱ کلکتہ۔ [2] طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی، ص:۴۳ بیروت۔

مونث کو سعلاۃ کہتے تھے:

ازل وسعلاۃ وغول بقفرۃ　　اذا اللیل واری الجن فیہ ارنّت

''میں پھسلتا ہوں اور چڑیل اور غول بیابان میں جب رات پردہ پوش ہوتی تھی تو اس میں بھوت آواز دیتے تھے۔''

عمرو بن یربوع ایک ممتاز شخص تھا، اس نے سعلاۃ سے نکاح بھی کیا تھا اور اس سے اولاد بھی ہوئی تھی راجز کہتا ہے:

یا قاتل اللہ بنی السعلاۃ۔　　''خدا سعلاۃ کے فرزندوں کو مارے۔''

بلقیس ملکۂ یمن (ان کے زعم میں) سعلاۃ ہی کے پیٹ سے تھی۔

یہ اکثر گاتے بجاتے تھے اور اہل عرب ان کے نغموں سے محظوظ ہوتے تھے:

کم حببت دونك من بهماء مظلمة　　تیه اذا ما مغنّی جنه سمرا

''کتنی اندھیری گھپ راتوں میں، میں نے صحرا کو قطع کیا جب وہاں کے جنات کا مغنی افسانہ گوئی کر رہا تھا۔''

یہ صحرانشین بدوؤں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ جاڑوں میں جب بدو آگ جلا کر بیٹھتے تھے یہ بھی آگ تاپنے کو آجاتے تھے، لیکن جب ان کو کھانے پر بلاتے تھے تو وہ عذر کرتے تھے کہ ہم آدمیوں کی غذا نہیں کھا سکتے۔

اتوا ناری فقلت منون انتم　　فقالوا الجن قلت عموا ظلما

دعوت الی الطعام فقال　　منهم زعیم نحسد الانس الطعامَا

''وہ لوگ رات کو میرے پاس آئے تو میں نے کہا: تم کون ہو؟ انہوں نے کہا: ہم جن ہیں، میں نے کہا: اس تاریکی میں خوش رہو۔ میں نے ان کو کھانے کے لیے بلایا تو ان میں سے ایک سردار نے کہا ہم انسان کے کھانے پر حسد کرتے ہیں۔''

یہ زیادہ تر جہاں آباد تھے ان موضعوں کے نام بدی بقار اور عبقر تھے:

ع: جن البدی رواسیا اقدامها　　''بدی کے جن، جن کے قدم جمے تھے۔''

ع: تحت السنور جنة البقار　　''زرہوں کے نیچے بقار کے بھوت تھے۔''

ع: علیهن فتیان کجنة عبقر

''اور ان پر شہسوار جوان عبقر کے بھوت معلوم ہوتے تھے۔''

ان کے اقسام حسب ذیل تھے:

جو آدمیوں کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے ان کو عامر کہتے تھے۔

جو بچوں کو ستاتے تھے ان کا نام روح تھا۔

جو زیادہ شریر تھے ان کو شیطان کہتے تھے۔

اس درجہ سے بڑھ کر جو شریر ہوتا تھا اس کو عفریت کہتے تھے۔

یہ اکثر بچوں اور جوانوں کو اٹھا کر لے جاتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک بھائی طالب تھے ان کو اٹھا کر لے گئے اور پھر ان کا پتہ نہ چلا۔ عمرو بن عدی لخمی جو عرب کا بادشاہ تھا اس کو بھی اٹھا لے گئے تھے لیکن کئی برس کے بعد جذیمۃ ابرش کو لا کر دے گئے۔

اسی طرح خرافہ کا قصہ ہے جس کو جن اٹھا کے لے گئے تھے مدت کے بعد وہ واپس آیا تو عجیب عجیب باتیں بیان کرتا تھا۔ ❶

ان اجنہ یا شیاطین سے جن لوگوں کے تعلقات زیادہ بڑھ گئے تھے ان میں تابط شرا اور ابو البلاد طہوی زیادہ مشہور تھے۔ طہوی نے ایک دفعہ ایک بھوت گوت کو مار ڈالا اس کے واقعات ایک نظم میں لکھے ہیں:

لقیت الغول تسری فی ظلام   فصدت وانتحیت لها بعضب

حسام غیر مؤتشب یمانی   فقد سراتها والبرد منها

فخرت للیدین والجوان ❷

''میں غول بیابانی سے ملا جو رات کو اندھیرے میں چلتے ہیں گو اس نے روکا اور میں یمن کی بنی ہوئی اصیل تلوار لے کر اس کی طرف بڑھا تو اس نے اس کے سر کو اور اس کی زرہوں کو کاٹ ڈالا اور وہ دونوں ہاتھوں اور سینہ کے بل زمین پر گر پڑا۔''

انہیں اجنہ اور شیاطین کا زور توڑنے کے لیے قرآن نے قیامت کے اس سوال و جواب کا انداز اختیار کیا۔ ان کے دوست انسان وہاں بھی ان کی دوستی کا دم بھرتے جائیں گے اس سے اندازہ ہوگا کہ جاہل عربوں پر ان کا کس قدر استیلا تھا:

﴿ يَٰمَعْشَرَ ٱلْجِنِّ قَدِ ٱسْتَكْثَرْتُم مِّنَ ٱلْإِنسِ ۖ وَقَالَ أَوْلِيَآؤُهُم مِّنَ ٱلْإِنسِ رَبَّنَا ٱسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ ﴾ (٦/ الانعام:١٢٨)

''اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانوں سے بہت کچھ وصول کیا اور ان کے دوست دار انسان بولے، اے ہمارے رب! ہم میں سے ایک نے دوسرے کا کام نکالا۔''

❶ شمائل ترمذی، باب ما جاء فی کلام رسول اللہ ﷺ فی السمر:٢٥١۔ ❷ یہ تمام تفصیل کتاب الحیوان جاحظ سے ماخوذ ہے اس نے کئی ورق میں نہایت تفصیل سے یہ واقعات لکھے ہیں، دیکھو کتاب مذکور از صفحہ ۴۸ تا صفحہ ۸۰ جز ششم مطبوعہ مطبع سعادت، مصر۔

کہانت

کہانت ایک سخت بلا تھی جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی ہر جگہ ایک یا کئی کاہن ہوتے تھے جو آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کرتے اور آسمانی خبریں بتاتے تھے اہل عرب کا اعتقاد اور خود کاہنوں کا دعویٰ تھا کہ ان کے ساتھ ایک ایک جن [1] رہتا ہے اور وہی ان کو القا کرتا ہے وہ اپنی شکل وصورت ایسی بناتے تھے کہ پہچان لیے جاتے تھے چنانچہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے سے ایک آدمی گزرا انہوں نے قیافہ سے اس کو پہچان لیا کہ وہ کاہن ہے اس کو بلا کر پوچھا کہ تیرے جن نے تجھ سے سب سے عجیب تر بات کیا بیان کی اس نے کہا: میں ایک روز بازار میں پھر رہا تھا کہ میرا جن گھبرایا ہوا آیا اور کہا:

الم ترالی الجن وابلاسھا ویاسھا من بعد انکاسھا ولحوقھا بالقلاص واحلاسھا۔

''کیا تم جنوں کی سراسیمگی ان کی ناامیدی اور ان کے کاروبار کی ابتری نہیں دیکھتے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سچ کہتا ہے، میں ایک روز زمانہ جاہلیت میں بتوں کے پاس سویا ہوا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی نے ایک گوسالہ لا کر ذبح کیا، اس کے بعد ایک شخص زور سے چلایا:

یا جلیح امر نجیح رجل فصیح یقول لا الہ الا اللّٰہ۔

''اے جلیح، کامیاب امر، ایک فصیح شخص لا الہ الا اللّٰہ کہتا ہے۔''

اس کے چند ہی دنوں بعد آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی تھی صحیح بخاری (تفسیر سورۂ والضحیٰ) میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کچھ علیل ہو گئے اور دو تین دن رات کو عبادت کے لیے نہیں اٹھے، اس پر ایک عورت (یہ ابولہب کی زوجہ تھی) نے آ کر آنحضرت ﷺ سے کہا:

انی ارجوان یکون شیطانك قد ترکك۔ [2]

''میرا خیال ہے کہ تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا۔''

یہ وہی خیال تھا چونکہ کفار آپ کو کاہن خیال کرتے تھے اس لیے ان کا خیال تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی جن یا شیطان رہتا ہے۔ قرآن پاک نے اسی کی تردید اس آیت میں کی ہے:

﴿ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ۝ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝ يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ۝ ﴾ (۲۶/ الشعرآء: ۲۲۱۔۲۲۳)

''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتا ہے شیطان ہر جھوٹے گناہگار پر اترتا ہے جو سنی سنائی بات القا کرتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔''

---

[1] کتاب البیان والتبیین للجاحظ، ج ۱، ص: ۱۱۳ مطبوعہ علمیہ مصر۔

[2] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ والضحیٰ: ۴۹۵۰۔

یہ کاہن تمام مقدمات اور نزاعات کا فیصلہ بھی کرتے تھے اور اس بنا پر تمام ملک پر ان کا اثر چھایا ہوا تھا ان میں سے حازی، شق، سطیح، عزی بہت مشہور تھے جاحظ نے ان کے کاہنانہ فقرے، کتاب البیان، ج ۱ ص: ۱۳۳ میں نقل کیے ہیں:

والارض والسماء والعقاب والصقعاء واقعة ببقعاء لقد نفر المجد بنی الشعراء للمجد السناء۔

''قسم ہے زمین اور آسمان کی اور عقاب اور آفتاب کی ایک واقعہ میدان میں واقع ہوا کہ بزرگی بنو عشرا پر غالب آ گئی بوجہ بڑائی اور بلندی کے۔''

یہ کاہن جو خبریں بتاتے یا تلقین کرتے وہ بڑے تکلف اور مقفیٰ اور مسجع فقرے ہوتے، اس لیے جب ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کے سامنے ایک ساقط الحمل بچہ کا مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے اس کی دیت کا فیصلہ کیا تو ایک شخص نے عرب کے دستور کے مطابق اعتراضاً کہا:

ارأیت من لا شرب ولا اکل ولا صاح فاستھل الیس دمه بطل۔ [1]

غور فرمائیے کہ جس بچہ نے نہ کھایا نہ پیا نہ چیخا نہ رویا، کیا اس کا خون معاف نہ ہوگا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کاہنوں کے بھائیوں میں سے ہے۔''

یہ کاہن بت خانوں میں رہتے تھے اور کسی خاص بت کے پجاری ہوتے تھے جب لوگ ان سے غیب کی بات پوچھتے یا وہ خود آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کرنے لگتے تو ایک خاص کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے، مرد بھی کاہن ہوتے تھے اور بعض عورتیں بھی ہوتیں جو کاہنہ کہلاتی تھیں یہ مصیبتوں اور بلاؤں کے دور کرنے کے لیے بت پرستانہ علاج اور تدبیر بتاتے تھے یہ اپنی کہانت کی اجرت میں بڑی بڑی رقم اور نذرانے وصول کرتے تھے۔ اسلام کے بعد ان میں جو مسلمان ہو گئے وہ علانیہ اپنے خدع وفریب کا اعتراف کرتے تھے ان کو نذر و نیاز اور اجرت کی جو رقم یا تحفہ ملتا اس کا نام حلوان الکاہن تھا یعنی کاہن کا منہ میٹھا کرنے کے لیے تحفہ، اسلام نے آ کر اس کو روک دیا۔ [2]

غرض ان کاہنوں نے عوام فریبی کا بڑا جال پھیلا رکھا تھا اور یہ انہی کا اثر تھا کہ ملک کا ملک سینکڑوں قسم کی وہم پرستیوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔

شعرا کی نسبت بھی عرب کا یہ خیال تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان رہتا ہے اور وہی اس کو اشعار القا کرتا ہے، چنانچہ مخبل شاعر کی شیطانہ، عمرو کی بیٹی تھی اور اعشیٰ جو عرب کا مشہور شاعر تھا اس کے شیطان کا نام مسحل تھا، اعشیٰ خود کہتا ہے:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الطب، باب الکهانة: ۵۷۵۸، ۵۷۶۰؛ صحیح مسلم، کتاب القسامة، باب دیة الجنین: ۴۳۹۱۔ [2] بخاری، کتاب، الطب، باب الکهانة: ۵۷۶۱۔

دعوت خلیلی مسحلا ودعواله بجهنام یدعی للهجین المذمم
حبانی اخی الجنی نفسی فداءه یاقبح جیاس العشیات مرجم ❶

''میں نے اپنے دوست مسحل کو پکارا اور انہوں نے اس کے لیے جہنام کو پکارا اور یہ کمینہ بد اطوار کے لیے بلایا جاتا ہے، مجھ کو میرے جن دوست نے میری جان اس پر فدا ہو، شاموں کے وقت سب سے بڑے جوش مارنے والے اور سخت پتھراؤ کرنے والے کو دیا۔''

جو اعلیٰ درجے کا شاعر ہوتا اس کا شیطان یا جن مذکر ہوتا تھا، ابوالنجم کہتا ہے:

انی وکل شاعر من البشر شیطانه انثی وشیطانی ذکر۔

''ہر شاعر کا شیطان تو مؤنث ہے مگر میرا شیطان مذکر ہے۔''

شنقنان اور شیصبان رؤسائے شیاطین تھے جو شاعری سکھلاتے تھے۔ ایک شاعر کو اس پر فخر تھا کہ اس کا معلم اسی شیصبان کی اولاد سے ہے:

ولی صاحب من بنی الشیصبان فطورا اقول وطورًا هوه

''میرا ساتھی شیصبان کی اولاد ہے تو کبھی میں شعر کہتا ہوں کبھی وہ۔''

اوہام پرستی

سانپ کو قتل نہیں کرتے تھے یہ اعتقاد تھا کہ سانپ مارا جائے تو اس کا جوڑا آ کر بدلہ لیتا ہے۔ ❷ یہ اعتقاد تھا کہ مرنے کے بعد روح ایک پرند بن کر اڑتی رہتی ہے اس کو ہامہ کہتے تھے، یہ اعتقاد تھا کہ پیٹ میں ایک سانپ رہتا ہے جو بھوک کے وقت کاٹتا ہے۔ جو کام کرنا چاہتے تھے پہلے شگون لے لیتے تھے مثلاً اس وقت کوئی پرندہ داہنی جانب سے اڑا تو مبارک سمجھتے تھے اور بائیں جانب سے اڑا تو اس وقت اس کام سے باز رہتے تھے۔ بکری کا جب بچہ پیدا ہوتا تو اگر نر ہوتا تو بت پر چڑھا دیتے، اونٹنی جب دس بچے جن لیتی تو اس کو چھوڑ دیتے وہ سانڈ کی طرح چھوٹی پھرتی۔ کسی شخص کے پاس جو اونٹوں کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ جاتی تو ایک اونٹ کی آنکھ پھوڑ دیتے کہ نظر نہ لگ جائے۔ جب کبھی قحط پڑتا تو بھیڑ یا دنبہ کی دم میں گھاس پھونس باندھ کر آگ لگا دیتے اور سمجھتے کہ اس سے پانی برسے گا۔ سفر میں جاتے تو کسی درخت میں ڈورو وغیرہ باندھ کر گرہ لگا دیتے واپس آ کر دیکھتے اگر گرہ کھل گئی ہے تو سمجھتے کہ ان کی بیوی نے بدکاری کی۔ سفر میں راستہ بھول جاتے تو کپڑے الٹ کر پہن لیتے اور سمجھتے کہ اس سے راستہ مل جائے گا ❸ یہ خیال تھا کہ جو شخص لات وعزیٰ کو گالی دیتا ہے اس کو برص یا جذام ہو جاتا ہے ❹ ہاتھوں میں پیتل کی انگوٹھی پہنتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے ضعف جاتا رہتا ہے ❺ اس قسم کے

❶ اعشیٰ کے دیوان مطبوعہ ویانا صفحہ ۶۵ (اور شعراء النصرانیة القسم الثالث، ص: ۳۷۷) میں صرف پہلا شعر ہے اور اس کا بھی دوسرا مصرع اس طرح ہے: جهنام جدعا للهجین المذمم۔ ❷ ابوداود، کتاب الادب، باب فی قتل الحیات: ۵۲۵۰۔ ❸ یہ باتیں بلوغ العرب اور اطوار العرب وغیرہ کتابوں میں مذکور ہیں۔ ❹ دارمی، کتاب الصلوٰۃ، باب فرض الوضوء والصلوٰۃ: ۶۵۲۔ ❺ ابن ماجه، ابواب الطب، باب تعلیق التمائم: ۳۵۳۱۔

سینکڑوں اوہام پھیلے ہوئے تھے جن کا شمار نہیں ہوسکتا۔

یہ تو ان کے مذہبی حالات وخیالات تھے ان کی اخلاقی کیفیت بھی ایسی ہی پست تھی ان کے اخلاقی معائب میں سب سے نمایاں چیز ان کی جنگ جوئی تھی جس نے ان کو حد درجہ خونخوار، سنگدل اور سفاک بنا دیا تھا۔

جنگ جوئی

ذرا ذرا سی بات پر لڑنا مرنا اور ایک دوسرے کا سر کاٹ لینا ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی۔ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے اور ہر خاندان دوسرے خاندان سے برسر پیکار تھا، ہر بچہ اپنے باپ اور عزیزوں کے قاتل سے انتقام لینے کے جذبہ میں پرورش پاتا تھا اور جوان ہوکر اس مقدس فرض کو انجام دیتا تھا اور اس طرح ایک لڑائی کا سلسلہ برسوں تک قائم رہتا تھا۔ انہیں لڑائیوں کو مؤرخین اور اہل ادب ایام العرب کہتے ہیں جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ میدانی نیشاپوری المتوفی ۵۱۸ھ نے کتاب الامثال میں ان میں سے ۱۳۲ لڑائیوں کے نام بتانے کے بعد یہ لکھا ہے:

هذا الفن لایتقصاه الاحصاء فاقتصرت علیٰ ما ذکرت۔ [1]

''یہ فن شمار کا استقصا نہیں کرسکتا اس لیے جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس پر میں نے قناعت کی۔''

یہ تمام لڑائیاں وہ ہیں جو اسلام سے چالیس پچاس برس پیشتر سے اسلام تک ہوئیں ان میں سب سے زیادہ مشہور لڑائی عبس و ذبیان کی ہے جس کا واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں قبیلوں کے دو گھوڑے داحس اور غبرا کا باہمی مقابلہ تھا ان میں سے ایک فریق نے گھوڑ دوڑ کے قواعد کی خلاف ورزی کی اور لڑائی ہو پڑی یہ لڑائی ان دونوں قبیلوں میں پورے چالیس برس تک قائم رہی۔ دوسری مشہور لڑائی حرب بسوس ہے اس کا واقعہ یہ ہے کہ بسوس نامی ایک قبیلہ کی عورت کی اونٹنی کلیب بن وائل کی چراہ گاہ میں جا پڑی کلیب نے اپنے تیر سے اس کے تھن کو زخمی کردیا اس بات نے قبیلہ میں آگ لگا دی کلیب جان سے مارا گیا اور بکر و تغلب میں خونریز جنگ ہوئی۔ عکاظ کے میلہ میں سلیم اور غطفان کے سرداروں میں کچھ مناقشہ ہوا چند روز کے بعد موقعہ پا کر ایک کو قتل کردیا گیا اس کے انتقام کے لیے خون کی ندیاں بہیں۔ بکر و تمیم میں ایک چراہ گاہ کے معاملہ میں خونریز لڑائی ہوئی۔ اوس وخزرج مدینہ کے دو قبیلوں میں جو ہولناک لڑائیاں ہوتی رہیں ان میں سب سے مشہور یوم بعاث ہے، جس میں دونوں قبیلوں کے اکثر سردار کام آئے اس لڑائی کا خاتمہ انصار مدینہ کی بیعت پر ہوا۔ قریش کی مشہور لڑائیوں کا نام ایام فجار ہے۔ ایک اور مشہور لڑائی کا نام ذی قار ہے۔

---

[1] کتاب الامثال للمیدانی، ج ۲، ص: ۳۷۱۔

الغرض معمولی سے اشتعال سے قتل تک نوبت پہنچتی تھی، قتل سے انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا تھا اور لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جاتا تھا [1] ان میں لڑنا اور مرنا جاہلیت کا شرف اور ایک قبیلہ کی آن سمجھی جاتی تھی اور اس خون آشامی کا ذوق ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی ان لڑائیوں میں سفا کی بے رحمی اور قتل و غارت کی بدترین مثالیں پیش آتی رہتی تھیں۔

شراب خوری

شراب جو ہر قسم کے فسق و فجور اور مظالم اور بدکاری کا سرچشمہ ہے عربوں میں اس کا اس قدر رواج تھا کہ ہر گھر ایک مے کدہ بن گیا تھا۔ اس کا نہ پینا اس قدر نامانوس بات تھی کہ جن چند آدمیوں نے اسلام سے پہلے اس کے پینے سے پرہیز کیا تھا، ان کے نام یاد رکھے گئے تھے۔ دوست و احباب کسی گھر میں جمع ہوتے شراب کا دور چلتا، ساتھ ہی جوئے کھیلتے، ان میں اونٹوں کی ہار جیت ہوتی، جو جیتتا وہ جیتے ہوئے اونٹوں کو اسی وقت ذبح کر کے لوگوں کو کھلا دیتا، کبھی نشہ میں سرشار ہو کر خود صاحب خانہ اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے اونٹوں کو کاٹ کاٹ کر ڈھیر کر دیتا اور لوگ گوشت بھونتے، کباب لگاتے اور کھاتے اور کھلاتے اور اپنی اس بے جا فیاضی پر فخر کرتے، سامنے فاحشہ عورتیں گاتیں بجاتیں اور اسی مخموری کے عالم میں بے شرمی کی باتیں کرتے، جاہلیت کا مشہور شاعر طرفہ کہتا ہے:

فان تبغنی فی حلقة القوم تلقنی وان تقتنصنی فی الحوانیت تصطد

''پس اگر تو مجھے لوگوں کے حلقہ میں ڈھونڈے تو پائے گا اور اگر شراب خانوں میں مجھے شکار کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔''

متی تاتنی اصبحك کاسا رویة وان کنت عنها غانیا فاغن وازدد

''جب بھی تو میرے پاس آئے میں تجھے شراب کا پیالہ پلاؤں گا اور اگر تو اس سے بے نیاز ہو کر نہ آئے تو جا اور بے نیازی کر۔''

ندامای بیض کالنجوم وقینة تروح الینا بین برد ومجسّد

''میری محفل شراب کے ہم نشین ستاروں کی طرح گورے چٹے ہیں ایک مغنیہ ہے جو شام کو ہمارے پاس یمنی چادر اور زعفرانی کپڑوں میں آتی ہے۔''

رحیب قطاب الجیب منها رفیقةٌ بجس الندامی بضّة المتجرد

''اس کے گریبان کا شگاف بڑا ہے شرابی رفیقوں کی دست اندازی سے مانوس، اس کے بدن کے برہنہ حصے لطیف ہیں۔''

---

[1] ان لڑائیوں کے مفصل حالات کے لیے دیکھو: عقد الفرید ابن عبدربه، ج ۳، ص: ٤٤ اور امثال میدانی الجز الثانی، الباب التاسع والعشرون فی اسماء العرب، ص: ٢٦٠ وما بعد۔

اذ انحن قلنا اسمعينا انبرت لنا علی رسلها مطروقة لم تشدد

''جب ہم کہتے ہیں کہ ہمیں سناؤ تو آہستہ آہستہ نزاکت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔''

ومازال تشرابی الخمور ولذتی وبیعی وانفاقی طریفی ومتلدی

''اور میری شراب نوشی اور لذت اندوزی اور اپنی حاصل کردہ اور موروثی دولت کو خرچ کرنا میرا شعار ہے۔''

ولو لا ثلث هن من لذة الفتی وجدك لم احفل متی قام عودی

''اگر تین باتیں نہ ہوتیں جو ایک شریف کا لطف ذوق ہیں تو میں اپنی موت کی پروا نہ کرتا۔''

فمنهن سبقی العاذ لات بشربة كميت متی ماتعل بالماء تزبد

''ان میں سے ایک تو نصیحت کرنے والیوں کی بات کا خیال کیے بغیر سرخ وسیاہ رنگ شراب کا پیالہ پی لینا جس میں پانی ملانے سے جوش آئے۔''

وتقصير يوم الدجن والدجن معجب ببهكنة تحت الخباء المعمّد

''اور دوسری بات گھنگھور گھٹا کے دن کو اور وہ کیسا پرلطف دن ہوتا ہے کسی بلند خیمہ کے نیچے حسین معشوقہ سے لطف اندوزی میں چھوٹا کرتا ہے۔''

كريم يروی نفسه فی حياته ستعلم ان متناغدا اينا الصدی

''میں وہ فیاض ہوں جو اپنی زندگی میں اپنے آپ کو شراب پلا کر سیراب کرتا ہے موت کے بعد معلوم ہوگا کہ ہم میں پیاسا کون ہے۔''

وبرك هجود قد اثارت مخافتی بواديها امشی بعضب مجرد

''اور کتنے بیٹھے ہوئے سوئے اونٹ تھے کہ میرے خوف نے ان کے اگلوں کو بھڑکا دیا جب میں ننگی تلوار لے کر چلا۔''

فمرت كهاة ذات خيف جلالة عقيلة شيخ كالو بيل يلندد

''تو ایک موٹی اونٹنی جو ایک بڈھے کی، جو ایک لٹھ کی طرح جھگڑالو تھا قیمتی چیز تھی، سامنے آ گئی۔''

وقال الاماذا ترون بشارب شديد علينا بعينه متعمد

''(اور جب میں نے تلوار سے کونچ کاٹ کر اونٹنی کو گرادیا) تو اس بڈھے نے کہا: اس بدمست کو دیکھو جو جان بوجھ کر ظلم کر رہا ہے۔''

فظل الاماء يمتللن حوارها ويسعی عليها بالسديف المسرهد [1]

[1] شرح المعلقات السبع للزوزنی، ص:۵۷ وما بعد۔

''تو لونڈیاں اونٹنیکے بچہ کو (جو اس کے پیٹ سے نکلا تھا) بھوننے لگیں اور چربی دار کوہان کا گوشت لے کر ہمارے پاس دوڑا جانے لگا۔''

لبید بن ربیعہ جو عرب کا مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی محفل کا چوتھا ممبر ہے، کہتا ہے:

بل انت لا تدرین کم من لیلة　　　طلق لذیذ لهوها وندامها

''بلکہ تو نہیں جانتی کہ کتنی کھلی ہوئی راتیں جن کی دلچسپی اور ہم نوشی پر لطف تھی۔''

قد بت سامرها وغاية تاجر　　　وافيت اذ رفعت وعز ندامها

''میں ان کا قصہ گو تھا اور شراب نوش کی منزل میں آتا جاتا رہا جب جھنڈا بلند ہوا اور اس کی شراب گراں ہوگئی۔''

اغلی السباء بکل ادکن عاتق　　　اوجونة قدحت وفضّ ختامها

''میں اس کی قیمت کو اور گراں کر رہا تھا پرانی خاکی رنگ کی مشک یا خم خرید کر جو پیالوں میں بھری جاتی اور اس کی مہر توڑی جاتی۔''

وصبوح صافيةٍ وجذب كرينة　　　بموترتأتاله ابهامها

''اور کتنی صبح کی صاف شراب اور مغنیہ کا عود کو کھینچ کر اپنے انگوٹھے سے دبانا۔''

بادرت حاجتها الد جاج بسحرةٍ　　　لا علَّ منها حين هب نيامها [1]

''میں نے شراب کی ضرورت مرغ سحر سے پہلے پوری کی، تاکہ میں اس کے سونے والوں کے جاگنے سے پہلے دہرالوں۔''

تغلب ان قبیلوں میں تھا جنہوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا لیکن اس مذہب نے بھی عربوں کو اس بری عادت سے باز نہیں رکھا تھا بلکہ شراب کی درآمد زیادہ تر انہیں عیسائیوں کے ملک شام سے ہوتی تھی، تغلب کا سب سے بڑا شاعر اپنے فخریہ میں کہتا ہے:

الاهبّی بصحنك فاصبحينا　　　ولا تبتقی خمور الاندرينا

''ہاں اپنا پیالہ لیکر اٹھ جا اور مجھے صبح کی شراب پلا اور اندرین کے (شامی گاؤں) کی کوئی شراب چھوٹنے نہ پائے۔''

مشعشعة كان الحض فيها　　　اذا ما الماء خالطها سخينا

''پانی میں ملی ہوئی گویا اس میں کسم کے پھول پڑے ہیں جب گرم پانی اس میں ملاؤ۔''

تجور بذی اللبانة عن هواه　　　اذا ما ذا قها حتی یلینا

''غرض مند کو اس کی غرض بھلا دے اگر اس کو چکھ لے یہاں تک کہ اس کو نرم کر دے۔''

---

[1] شرح المعلقات، ص:۱۰۹ وما بعد۔

ترى اللحز الشحيح اذا أمرّت — عليه لماله فيها مهينا

''تنگ دل بخیل پر بھی اگر اس کا ایک دور گزار دیا جائے تو وہ اپنی دولت کو لٹا دے۔''

صبنت الكأس عنا امّ عمرو — وكان الكأس مجراها اليمينا

''اے عمرو کی ماں! تو نے ہم سے پیالہ ہٹا لیا حالانکہ پیالہ کا دور داہنی طرف تھا۔''

وما شر الثلثة ام عمرو — بصاحبك الذی لاتصبحينا

''حالانکہ تیرا وہ ہم نشین جس کو تو نہیں پلاتی تین میں سب سے بدتر نہیں۔''

كأس قد شربت ببعلبك — واخرى فی دمشق وقاصرينا ❶

''اور ایک وہ پیالہ جس کو بعلبک میں پیا اور دوسرا وہ جو دمشق اور قاصرین میں پیا۔''

ان اشعار سے اندازہ ہوگا کہ جاہلیت میں شراب نوشی کا کیا عالم تھا۔ شراب فروشوں کی دوکانیں کسی ممتاز مقام پر ہمیشہ کھلی رہتی تھیں اور نشان کے لیے وہاں جھنڈا اڑا کرتا تھا جس کو غایۃ کہتے تھے (دیکھو اوپر لبید کا دوسرا شعر) انتہا یہ ہے کہ تجارت کا لفظ شراب فروشی کا مترادف بن گیا تھا۔ ایک جاہلی شاعر عمرو بن قمیہ کہتا ہے:

اذا سحب الريط والمروط الى — ادنى تجاري وانفض اللمم ❷

''یاد ہے وہ دن جب میں اپنی چادر گھسیٹتا ہوا قریب ترین شراب خانے میں جاتا تھا اور اپنے گیسوؤں کو جھاڑتا تھا۔''

بدر میں قریش کے جو دولت مند روسا مارے گئے تھے ان کے مرثیہ میں قریش کا ایک شاعر خاص طور سے ان کی بزم شراب اور مجلس رقص و سرود کی بربادی کا ماتم کرتا ہے:

وما ذا بالقليب قليب بدر — من القينات والشرب الكرام ❸

''بدر کے گڑھے میں (جس میں مقتولین کی لاشیں ڈالی گئی تھیں) ناچنے والیوں اور فیاض شرابیوں کا ماتم ہے۔''

شراب کے رواج عام کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ عربی زبان میں شراب کے ڈھائی سو نام ہیں اور علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے خاص ان ناموں پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ تمام گھروں میں شراب کی مجلسیں قائم ہوتیں، گھر کی عورتیں اور چھوٹے بچے ساقی بنتے تھے۔ یہ شعر اوپر گزر چکا ہے جس میں شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے:

صبنت الكأس عنا ام عمر — وكان الكاس مجراها اليمينا۔

''اے ام عمرو! تو نے شراب کا پیالہ ہم سے ہٹا لیا حالانکہ پیالہ کی گردش داہنی طرف سے تھی۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے میں اپنے باپ (عباس) کی زبان سے کم

❶ شرح المعلقات السبع، ص:۱۱۷، ۱۱۸۔ ❷ ديوان حماسه، جزء الثانی، باب الادب:۱۰۔
❸ صحيح بخاری، كتاب مناقب الانصار، باب الهجرة واصحابه الى المدينة:۳۹۲۱۔

سنی میں یہ سنا کرتا تھا: اِسْقِنَا كَاْسًا دِهَاقًا ''شراب کا ایک لبریز پیالہ ہم کو پلا۔'' ❶

صحیح بخاری کتاب الاشربۃ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب شراب حرام ہوئی تو اس وقت ایک مجلس تھی جس میں حضرت ابو دجانہ، ابو طلحہ رضی اللہ عنہما، سہیل بن بیضا شریک تھے اور میں جو کہ سب سے کمسن تھا ساقی گری کی خدمت انجام دے رہا تھا۔ ❷

شراب کس بے تکلفی سے پی جاتی تھی، کس درجہ کے لوگ پیتے تھے، کس قسم کے افعال اس حالت میں سرزد ہوتے تھے، اس کا اندازہ صحیح بخاری کی ایک روایت سے ہوگا ❸ جو حرمت شراب سے قبل کا واقعہ ہے۔

غزوۂ بدر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مال غنیمت میں سے ایک اونٹنی ملی تھی خمس میں سے ایک اور اونٹنی آنحضرت ﷺ نے عطا فرمائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ہو چکا تھا اور وہ دعوت ولیمہ کی تیاری کر رہے تھے ارادہ تھا کہ جنگل میں جا کر اذخر (ایک گھاس کا نام) لائیں اور زرگروں کے ہاتھ فروخت کریں اس ارادہ سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ان کی اونٹنیوں کے کوہان کسی نے کاٹ لیے ہیں اور پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکال لیا ہے۔ لوگوں سے پوچھا یہ کام کس کا ہے؟ معلوم ہوا کہ پاس ہی ایک گھر میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ چند انصار کے ساتھ شراب پی رہے تھے ایک مغنیہ نے گاتے گاتے یہ مصرع گایا:

الا یا حمز للشرف النواء ''اے حمزہ! موٹی اونٹنیوں کے لیے۔''

حضرت حمزہ تلوار لے کر اٹھے اور اونٹنیوں کے پیٹ چاک کر کے ان کے کلیجے نکال لیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جا کر آنحضرت ﷺ کو خبر کی اور یہ ماجرا بیان کیا۔ آنحضرت ﷺ نے چادر اوڑھی حضرت علی اور زید رضی اللہ عنہما کو لے کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مخمور تھے، آنحضرت ﷺ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور کہا: ''تم سب میرے باپ کے غلام ہو۔'' آنحضرت ﷺ یہ حالت دیکھ کر چلے آئے۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے ۳ھ میں شہادت پائی اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔

شراب کی حرمت جس تدریج سے نازل ہوئی ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ تمام ملک کس طرح اس میں مبتلا تھا۔ کس طرح وہ مقبول عام ہو چکی تھی کہ اس کی حرمت کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا اور کنایہ اشاروں سے گزر کر جب تک صاف ممانعت نہیں کر دی گئی لوگ سمجھ نہیں سکے۔

ابوداؤد کتاب الاشربۃ میں روایت ہے کہ جب شراب کی ممانعت نازل ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے خدا! شراب کے بارہ میں ہم کو صاف صاف بتا دے۔'' ان کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

اللّٰهم بين لنافي الخمر بيانا شفاء۔ ❹

---

❶ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ایام الجاهلیة: ۳۸٤۰۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الاشربة، باب نزول تحریم الخمر وهی من البسر والتمر: ۵۵۸۲، ۵۵۸۳۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة بدر: ٤۰۰۳۔ ❹ ابوداود، کتاب الاشربة، باب تحریم الخمر: ۳٦۷۰۔

''اے خدا! شراب کے بارے میں ہمارے لیے شافی بیان کر دے۔''

اس پر سورۂ بقرہ کی یہ آیت اتری:

﴿ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ ؕ قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ٝ وَاِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱۹)

''لوگ تم سے شراب اور قمار بازی کی نسبت سوال کرتے ہیں تو کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں، لیکن فائدہ سے گناہ بڑھ کر ہے۔''

اس آیت کے اترنے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے پلاتے رہے یہاں تک کہ ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علی اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما وغیرہ کی دعوت کی، شراب کا دور چل رہا تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت آ گیا ایک صاحب [1] نے امامت کی، مگر نشہ کے خمار میں ﴿ قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۙ﴾ کی سورہ کو کچھ

---

[1] شراب کی حرمت یہ تدریجی صورت حضرت عمر رضی اللہ عنہ (ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورۃ مائدۃ:۳۰۴۹؛ ابوداود کتاب الاشربۃ، باب تحریم الخمر:۳۶۷۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (مسند احمد، ج ۲، ص: ۳۵۱) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ (ابوداود، کتاب الاشربۃ، باب تحریم الخمر:۳۶۷۱) سے مروی ہے یہ بات کہ وہ کون صحابی تھے جنہوں نے نشہ کی حالت میں غلط سلط سورہ پڑھ دی تھی، روایات سے صاف طور پر ظاہر نہیں ہوتی، ایک روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام ہے اور دوسری میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا نام اور تیسری میں کوئی مہاجر مذکور ہے حضرت الاستاذ نے سیرۃ جلد دوم (تاریخ احکام ذکر حرمتِ شراب) میں ابوداود کتاب الاشربۃ باب فی تحریم الخمر:۳۶۷۱ کے حوالہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لکھ دیا تھا مگر مزید تحقیق سے یہ نسبت مشکوک معلوم ہوتی ہے، اس خاص روایت کا مرکزی راوی عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمٰن ہے ابوعبدالرحمٰن سلمی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے، اس سے یہ روایت مختلف طریقوں سے آئی ہے اور ہر ایک میں شراب پینے والوں اور حالتِ نشہ میں نماز پڑھانے والے کے نام کا اختلاف ہے، چنانچہ ہر روایت کے اصل الفاظ میں وہ روایتیں جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام ہے:

۱۔ ((عن ابی جعفر الرازی عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن السلمی عن علی بن ابی طالب قال صنع لنا عبدالرحمن بن عوف طعامًا فدعانا وسقانا من الخمر فاخذت الخمر منا وحضرت الصلوٰۃ فقد مونی فقرأت قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكَا فِرُوْنَ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ونحن نعبد ما تعبدون فانزل اللہ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾)) (ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورہ نساء: ۳۰۲۶)

''ابوجعفر رازی نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے، ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کی ہے، انہوں نے فرمایا کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ہمارے لیے کھانا تیار کرایا اور ہم کو مدعو کیا اور شراب پلائی، جب ہم شراب کے نشہ میں چور ہو گئے اور نماز کا وقت آیا تو لوگوں نے مجھ کو امام بنایا اور میں نے ﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۙ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ﴾ ونحن نعبد ما تعبدون پڑھی اس پر خدا نے یہ آیت اتاری: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ (یعنی مسلمانو! نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو)''

۲۔ ((عن سفیان حدثنا عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمٰن السلمی عن علی علیه السلام ان رجلا من الانصار دعاہ وعبدالرحمن بن عوف فسقا هما قبل ان تحرم الخمر فامهم علی فی المغرب فقرأ ﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ فخلط فیها فنزلت ((لا تقربوا الصلوۃ وانتم سکارٰی حتی تعلموا ما تقولون))

(ابو داود، کتاب الاشربۃ، باب تحریم الخمر: ۳۶۷۱)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(﴿﴾ گزشتہ سے پیوستہ) سفیان نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے، ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کی ہے کہ انصار کے ایک شخص نے ان کو اور عبدالرحمٰن بن عوف کو مدعو کیا اور تحریم شراب سے پہلے ان دونوں کو شراب پلائی پھر علی رضی اللہ عنہ نے نماز مغرب کی امامت کی اور قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھی لیکن اس میں گڈمڈ کر دیا اس پر آیت اتری ﴿لا تقربوا الصلوٰة وانتم سکارىٰ حتى تعلموا ما تقولون﴾ ''نشے کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ جو کچھ کہتے ہو، اس کو جان لو''

وہ روایتیں جن میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا نام ہے۔

۳۔ ((حدثنا سفيان عن عطاء بن السائب عن ابى عبدالرحمٰن السلمى عن على قال دعانا رَجل من الانصار قبل ان تحرم الخمر فتقدم عبدالرحمٰن بن عوف وصلى بهم المغرب فقرأ قل يايها الكافرون))

فالتبس عليه فنزل ﴿لا تقربوا الصلوٰة وانتم سكارى﴾)) (مستدرك حاكم الاشربة، ج ٤، ص: ١٤٢)

''سفیان نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے، ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ تحریم شراب سے پہلے انصار کے ایک شخص نے ہم کو مدعو کیا تو عبدالرحمٰن بن عوف نے امامت کی اور ان کو مغرب کی نماز پڑھائی اور ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ پڑھی، لیکن اس میں غلط ہو گیا اس پر یہ آیت اتری: ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ ''نشے کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔''

٤۔ ((سفيان عن عطاء بن السائب عن ابن(؟) عبدالرحمٰن عن على انه كان هو وعبد الرحمن ورجل آخر يشربون الخمر فصلى بهم عبدالرحمٰن بن عوف فقرأ ﴿قل يا ايها الكفرون﴾ فخلط فيها فنزلت ﴿لا تقربو الصلوٰة﴾)) (مستدرك حاكم، كتاب الاشربة، ج ٤، ص: ١٤٢)

''سفیان نے عطا بن السائب سے، عطا نے ابن عبدالرحمٰن سے، ابن عبدالرحمٰن نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ اور عبدالرحمٰن بن عوف اور ایک دوسرے آدمی شراب پی رہے تھے اور ان کو عبدالرحمٰن بن عوف نے نماز پڑھائی اور ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ پڑھی جس میں خلط ملط کر دیا اس پر یہ آیت اتری: ﴿لَا تَقْرَبُو الصَّلٰوةَ﴾۔''

۵۔ ((خالد عن عبدالله عن عطاء بن السائب عن ابى عبدالرحمن ان عبدالرحمن صنع طعاما فدعا ناسا من اصحاب النبى ﷺ فيهم على بن ابى طالب فقرا: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لا اعبد ما تعبدون﴾ ونحن عابدون ما عبدتم فانزل الله عزوجل ﴿لاتقربوا الصلوٰة﴾ الاية)) (مستدرك حاكم، كتاب الاشربه، ج ٤، ص: ١٤٢)

''خالد بن عبداللہ، عطاء بن سائب سے، عطاء ابی عبدالرحمٰن سے روایت کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن نے کھانا تیار کرایا اور صحابہ میں سے چند لوگوں نے کہ جن میں علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی تھے بلایا پھر انہوں نے قُلْ يايها الكافرون لا اعبد ما تعبدون ونحن عابدون ما عبدتم پڑھی اس پر یہ آیت اتری ﴿لا تقربوا الصلوٰة﴾ الاية۔''

وہ روایت جس میں نام کی تعیین نہیں۔

٦۔ ((سفيان عن عطاء بن السائب عن ابى عبدالرحمٰن عن على قال دعانا رجل من الانصار قبل تحريم الخمر فحضرت صلوة المغرب فتقدم رجل فقراه ﴿قل يايها الكفرون﴾ فالتبس عليه فنزلت ﴿لا تقربوا الصّلوة﴾ الاية))۔ (مستدرك حاكم، تفسير سورنساء، ج ٢، ص: ٣٠٧)

''سفیان، عطاء بن سائب سے، عطاء، ابوعبدالرحمٰن سے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: تحریم شراب سے پہلے ہم کو انصار کے ایک شخص نے مدعو کیا، نماز مغرب کا وقت آیا تو ایک آدمی نے امامت کی اور ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ پڑھی لیکن اس میں خلط ملط کر دیا اس پر یہ آیت اتری ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ﴾ (الاية)۔''

ان چھ روایتوں میں مختلف قسم کے اختلافات ہیں:

(۱) پہلی اور پانچویں روایت میں ہے کہ داعی عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تھے، دوسری اور چھٹی میں ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ﴿﴾)

(⚙⚙ گزشتہ سے پیوستہ) کہ داعی کوئی انصاری تھے۔ چوتھی میں دعوت کے بغیر مجلسِ شراب کا ذکر ہے۔
(۲) پہلی اور دوسری میں ہے کہ امام حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، جنہوں نے نشہ میں کچھ کا کچھ پڑھ دیا، تیسری، چوتھی، پانچویں میں ہے کہ وہ امام عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تھے اور چھٹی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کوئی آدمی امام تھا۔
(۳) اور روایتوں میں ہے کہ وہ اس دعوت کی مجلس میں شراب تھی، چھٹی میں شراب کا مطلق ذکر نہیں ہے، بلکہ وہ شخص جو امام بنا تھا وہی شاید کہیں سے پی کر آیا ہو گو کہ حرمتِ شراب سے پہلے پینا کوئی شرعی جرم نہیں، تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پینا جو بچپن سے آنحضرت ﷺ کی صحبت و تربیت میں پل کر جوان ہوئے قیاس کے خلاف ہے، خصوصاً اس آیت کے بعد ﴿قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ﴾ (کہہ دے کہ شراب اور جوئے میں بڑا گناہ ہے) حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پینا اور بھی زیادہ واقعہ کی صورت میں شک پیدا کرتا ہے، پھر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ راویوں پر نظر ڈالی جاتی ہے، سب سے پہلا راوی ابو عبدالرحمٰن سلمی جن کا نام عبداللہ بن حبیب ہے وہ پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا طرفدار حامی (شیعہ) تھا، بعد کو عثمانی (بنو امیہ کا طرف دار) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مخالف ہو گیا، پھر اس کا یہ دعویٰ کہ اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا ہے، محدثین میں مسلم نہیں، بخاری نے اس کو مانا ہے لیکن ابن ابی حاتم نے اس سے انکار کیا ہے، (تهذيب التهذيب، ج ٥، ص: ١٨٤) روایت کے دوسرے راوی عطاء بن سائب کا حافظہ خراب ہو گیا تھا، اس لیے لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا تھا، گو سفیان کی اس سے روایتیں حافظہ کی خرابی سے پہلے کی سمجھی جاتی تھیں، مگر اوپر کی روایتوں میں دیکھو کہ خود سفیان کی روایتوں میں بھی وہی ناقابلِ تطبیق اختلاف موجود ہے، ان وجوہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف فیہ جزئیات غیر مسلم ہیں (تهذيب التهذيب، ج ٧، ص: ٢٠٥) اور واقعہ کی اصلی صورت وہی ہے جو چھٹی روایت میں ہے کہ وہ مجلس محض دعوت کی تھی جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ موجود تھے کہ نماز کا وقت آ گیا اور ایک صاحب جو مخمور تھے۔ نماز پڑھانے کھڑے ہو گئے اور آیتیں خلط ملط پڑھ دیں چونکہ اس واقعہ کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے اور وہ دعوت میں شریک تھے اس لیے یا تو ابو عبدالرحمٰن سلمی عثمانی نے فرقہ داری کے جذبہ میں یا عطاء نے ذرا سی بھول میں واقعہ کی نسبت ادھر سے اُدھر کر دی۔
اس آخری چھٹی روایت کی تائید حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہوتی ہے جس کی سند پورے سلسلہ سے الگ اور مستقل ہے۔

۷۔ ((عن ابی هريرة قال: حرمت الخمر ثلاث مرات قدم رسول الله ﷺ المدينة وهم يشربون الخمر ويأكلون الميسر فسألوا رسول الله ﷺ عنهما فانزل الله على نبيه ﷺ: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ز وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ الاية (٢/ البقرة:٢١٩) فقال الناس: ماحرم علينا انما قال ((فيهما اثم كبير)) وكانوا يشربون الخمر حتى اذا كان يوم من الايام صلى رجل من المهاجرين ام اصحابه في المغرب خلط في قراء ته فانزل الله فيها اية اغلظ منها ﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ وكان الناس يشربون حتى ياتي احدهم الصلوة وهو مفيق ثم انزلت اية اغلظ من ذٰلِكَ: ﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ فقالوا انتهينا ربّنا)) (مسند احمد، ج ٢، ص:٣٥١)
''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ شراب تین بار حرام کی گئی رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو لوگ شراب پیتے تھے اور جوئے کا مال کھاتے تھے۔ لوگوں نے آپ سے ان دونوں کے متعلق سوال کیا خدا نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ الآية لیکن لوگوں نے کہا کہ خدا نے ہم پر حرام نہیں کی صرف یہ کہا کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اب بھی لوگ شراب پیتے رہے یہاں تک کہ ایک دن ایک مہاجر نے نماز مغرب پڑھائی اور اپنی قراءت میں خلط ملط کر دیا، اس لیے خدا نے شراب کے متعلق اس سے زیادہ سخت آیت اتاری ﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ اب بھی لوگ شراب پیتے رہے البتہ جب کوئی نماز پڑھنے جاتا تھا تو ہوش کی حالت میں جاتا تھا، پھر اس سے زیادہ سخت آیت نازل ہوئی: ﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ اب لوگوں نے کہا کہ خداوند ہم باز آئے۔'' اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ⚙⚙)

کا کچھ پڑھ گئے، اس پر یہ آیت اتری:

﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ (٤/ النسآء:٤٣)

''نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو، یہاں تک کہ تم جو کہو اس کو سمجھ بھی سکو۔''

اس کے بعد جب نماز کا وقت آ تا تو منادی اعلان کرتا تھا کہ کوئی مخمور نماز میں شامل نہ ہونے پائے۔ لیکن چونکہ اب بھی ممانعت کا کوئی عام حکم نہ تھا اس لیے نماز کے علاوہ اور اوقات میں لوگ پیتے پلاتے رہتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر دعا کی، اتفاق سے اسی زمانہ میں بعض انصار نے حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کی دعوت کی۔ اس میں شراب کا دور بھی چلا یہ پی کر بدمستی میں کہنے لگے کہ مہاجر انصار سے بہتر ہیں اس پر بات بڑھی اور مار پیٹ تک نوبت پہنچی، اس پر حکم آیا: [1]

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾ (٥/ المآئدة:٩٠)

''اے ایمان والو! بے شک شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک اور شیطان کے کام ہیں تو ان سے بچو، تاکہ فلاح پاؤ۔''

اس کے بعد شراب قطعاً حرام ہوگئی، حرمتِ شراب کی یہ آخری آیت جس وقت اتری حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ امین هذه الامہ اور ابی بن کعب جو سید القراء تھے، ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں مہمان تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا۔ ساقی گری کی خدمت حضرت انس سے متعلق تھی، چنانچہ صحیح بخاری کتاب الاشربہ میں خود حضرت انس رضی اللہ عنہ کی زبانی روایت ہے:

كنت اسقى ابا عبيدة وابا طلحة وابى بن كعب فجاء هم أت فقال: ان الخمر حرمت۔ [2]

(گزشتہ سے پیوستہ) کہیں ذکر نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے قرآن کے صاحب فہم کی نسبت یہ خیال کرنا کہ پہلی آیت کے اشارہ سے وہ شراب کی حرمت کو نہ سمجھ سکے تھے، قبول کے قابل نہیں، محدثین میں حاکم نے مستدرک میں چھٹی روایت کو لکھ کر بیان کیا ہے کہ اس واقعہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام شامل کرنا خوارج کی کارستانی ہے جس کی تردید اس روایت سے ہو جاتی ہے جس کو خود علی رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں، حاکم کہتے ہیں:

وفى هذا الحديث فائدة كثيرة وهى ان الخوارج تنسب هذا السكر وهذا القراءة الى امير المؤمنين على بن ابى طالب دون غيره وقد براه الله منها فانه راوى هذا الحديث (مستدرك تفسير سورة نساء، ج ٢، ص: ٣٠٧)

''اور اس حدیث میں بہت بڑا نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ خوارج نے نشہ اور اس غلط قراءت کو امیر المؤمنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہی کی طرف منسوب کیا تھا تو خدا نے ان کو اس الزام سے بری کر دیا کہ وہی اس حدیث کے راوی ہیں۔''

درحقیقت واقعہ کے صرف راوی تھے لیکن عثمانی اور خارجی راوی نے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو صاحب واقعہ بنایا۔

[1] صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب فى فضل سعد بن ابى وقاص: ٦٢٣٨۔

[2] صحيح بخارى، كتاب الاشربة، باب نزل تحريم الخمر: ٥٥٨٢۔

''میں، ابوعبیدہ ابی بن کعب اور ابوطلحہ کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آ کر کہا کہ شراب حرام ہوگئی۔''

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی شرح میں صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس جلسہ میں گیارہ بزرگ شریک تھے، جن میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے، اس موقع پر لحاظ کے قابل یہ بات ہے کہ اگرچہ یہ مدتوں کی عادت تھی اور اس وقت بھی سب خمار میں جھوم رہے تھے۔ [1] تاہم جوں ہی یہ آواز آئی کہ رسول اللہ ﷺ نے شراب کی ممانعت کر دی کسی نے پوچھ گچھ تک نہیں کی اور دفعتہً جام و سبو توڑ ڈالے۔ یہ صرف ابوطلحہ کے گھر کا حال نہیں تھا بلکہ تمام مدینہ کے گلی کوچوں میں شراب کی ندیاں بہہ گئیں۔

بخاری باب المظالم میں ہے:

فجرت فی سکك المدینة۔ [2] ''مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی پھرتی تھی۔''

ان ندیوں کی روانی سے اندازہ ہوگا کہ عرب میں شراب نوشی کی کثرت کا کیا عالم تھا۔

قمار بازی

شراب خوری کے ساتھ ساتھ ان میں قمار بازی کا عام رواج ہوگیا تھا، عرب کے مال و دولت کا تمام تر سرمایہ اونٹوں کے چند گلوں تک محدود تھا، اس لیے جوا بھی انہیں کے ذریعہ سے کھیلا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنے حریف سے کہتا ہے:

اعیّرتنا البانها ولحومها وذلك عار یا بن ریطة ظاهر

''کیا تو ہم پر عیب لگاتا ہے کہ ہم اونٹ کا دودھ اور گوشت کھاتے ہیں، اے ابن ریطہ! ہم پر یہ عیب نہیں لگ سکتا۔''

نحابی بها اکفاء نا و نهیننا ونشرب فی اثمانها ونقامر

''ہم ان کو اپنے ہمسروں کو بطور عطیہ کے دیتے ہیں اور انکو مہمانی میں صرف کرتے ہیں اور ان کی قیمت سے شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہیں۔''

اس غرض سے اونٹوں کو ذبح کر کے ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور ان ہی ٹکڑوں پر پانسے ڈالتے تھے ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر کر لیے تھے جن کے نام یہ ہیں فذ، توام، رقیب، حلس، مسبل، معلیٰ، منافس، منیح، سفیح، وغد، ان میں ہر تیر کے مختلف حصے معین کر لیے تھے اور جب جوا کھیلتے تھے تو ان کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصف شخص کے ہاتھ میں دے دیتے تھے، وہ ان کو گڈمڈ کر کے ایک ایک تیر کو ایک ایک شخص کے نام پر نکالتا جاتا تھا جس کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے جن کے حصے مقرر تھے وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تین تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا وہ جس کے نام پر نکلتے ان کو ناکامی ہوتی تھی، اس طرح گوشت کے جو

[1] فتح الباری، ج ۱۰، ص: ۳۱ بحوالہ روایت ابی عاصم۔

[2] صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب صب الخمر فی الطریق: ۲٤٦٤۔

ٹکڑے جمع ہوتے تھے ان کو فقیروں محتاجوں اور دوستوں پر تقسیم کر دیتے تھے چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا، اس لیے قمار بازی کی مجلسوں میں شریک نہ ہونا ایک قومی عار تھا اور اس قسم کے لوگوں کو نہایت بخیل خیال کرتے تھے اور ان کو ''برم'' کا خطاب دے رکھا تھا 1 جو لوگ یہ خطاب حاصل کر لیتے تھے، ان سے شادی بیاہ کرنا ننگ و عار خیال کیا جاتا تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنی بی بی کو وصیت کرتا ہے:

واذا ھلکت فلا تریدی عاجزًا عنسا ولا برما ولا معزالا

''اور اگر میں ہلاک ہو جاؤں تو عاجز، کمزور اور جوئے میں نہ شریک ہونے والے اور سفر میں قوم سے علیحدہ رہنے والے سے نکاح نہ کرنا۔''

جوئے کی ایک صورت جس کو ''رہان'' کہتے تھے یہ تھی کہ شرط پر بازی لگاتے تھے اور جب وہ شرط پوری ہوتی تھی تو جس چیز پر بازی لگائی جاتی تھی اس کو لے لیتے تھے چنانچہ جب رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی اور باوجود رومیوں کی شکست کے قرآن مجید نے پیشین گوئی کی کہ ان کو چند سال میں ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہو جائے گا تو کفار نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اسی قسم کی شرط لگائی اور اس فتح کے لیے چھ برس کی مدت مقرر کی چنانچہ جب یہ مدت گزر چکی اور رومیوں کو فتح وظفر نصیب نہ ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بازی ہارنا پڑی۔ 2 اور رفتہ رفتہ اس قمار بازی کا مذاق ان میں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ لوگ مال و دولت کھو چکنے کے بعد بیوی اور بال بچوں پر بازی لگا دیتے تھے۔ 3 یہ قمار بازی اور وہ بھی شراب کی بدمستی کے عالم میں اکثر مار پیٹ اور لڑائی پر ختم ہوتی تھی عبس و ذبیان کی چہل سالہ جنگ گھوڑ دوڑ ہی کی قمار بازی کا نتیجہ تھی۔ حصول دولت اور کسب شہرت کے اس غلط طریقہ سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے تھے۔

سودخوری

عرب میں سودخوری کا عام رواج تھا، تمام دولت مند سود پر لین دین کرتے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب نے جو قریش کے سردار اور آنحضرت ﷺ کے چچا تھے، تجارت کا کاروبار نہایت وسیع پیمانے پر پھیلا رکھا تھا اور اس تعلق سے سودخوری میں نہایت شہرت رکھتے تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے جب حجۃ الوداع میں سود کی حرمت کا اعلان کیا تو سب سے پہلے ان ہی کے سود کو باطل قرار دیا، حضرت عثمان اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہما سود پر قرض دیتے تھے۔ مسعود ثقفی طائف کا مشہور رئیس تھا اور اس کے بھائی عبد یالیل، حبیب بن ربیعہ نہایت دولت مند تھے، بنو مغیرہ ان ہی لوگوں میں سود پر دادوستد کرتے تھے، چنانچہ جب طائف فتح ہوا اور چاروں بھائی اسلام لائے تو انہوں نے مغیرہ سے سود کا تقاضا کیا، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی: 4

---

1 یہ پوری تفصیل تفسیر کبیر، ج ۲، ص: ۳۳۱ میں ہے۔

2 ترمذی، ابواب التفسیر، سورۃ الروم: ۳۱۹۴ جوئے کی صورت کو رہان کہتے تھے اور اب تک وہ حرام نہیں ہوئی تھی۔

3 تفسیر کبیر، ج ۲، ص: ۳۳۱۔ 4 تفسیر کبیر، ج ۲، ص: ۵۴۰۔

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۷۸)

''مسلمانو! خدا سے ڈرو اور بقیہ سود کو اگر تم مسلمان ہو تو چھوڑ دو۔''

ان کے علاوہ طائف ایک سرسبز اور دولت مند شہر تھا اس لیے وہاں کے لوگ عموماً سود پر بیوپار کرتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان سے جن شرائط پر مصالحت کی ان میں ایک ضروری شرط یہ بھی تھی کہ وہ لوگ سودخوری نہ کریں گے۔ ❶ اسی طرح یمن کے نجرانی سوداگر بھی سودی کاروبار کرتے تھے ان سے بھی یہی شرط کی گئی۔ ❷

سود کا عام اور متداول طریقہ تو یہ تھا کہ ایک معین شرح پر قرض دیتے اور راس المال کے ادا کرنے کے لیے میعاد مقرر کر دیتے تھے جب میعاد گزر جاتی تو اس کا تقاضا کرتے تھے اگر مدیون اس کو ادا نہیں کر سکتا تھا تو میعاد میں اور اضافہ کر دیتے اور اس کے عوض میں شرح سود بڑھا لیتے تھے لیکن اس نے ترقی کر کے ایک نہایت ظالمانہ صورت اختیار کر لی تھی جو سود در سود سے بھی زیادہ خطرناک تھی یعنی ایک میعاد متعینہ کے لیے کسی کو مثلاً: سو روپیہ دیتے تھے لیکن مدت گزر چکتی اور تقاضا کرنے پر مدیون اس رقم کو ادا نہیں کر سکتا تو میعاد اور بڑھا دیتے تھے لیکن اس کے معاوضہ میں راس المال میں بھی اضافہ کروا لیتے تھے یہاں تک کہ کبھی کبھی یہ اضافہ دوگنی چوگنی مقدار تک پہنچ جاتا تھا اس طرح اضافہ ہوتے ہوتے مدیون کی کل جائداد مستغرق ہو جاتی تھی، یہ معاملہ زیادہ تر غریبوں اور کاشتکاروں کے ساتھ پیش آتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں اور کاشتکاروں کا تمام طبقہ چند دولت مندوں اور خصوصاً یہودیوں کے ہاتھ میں گرو تھا، قرآن مجید کی یہ آیت اسی طریقہ سود کو مٹانے کے لیے نازل ہوئی:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَۚ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۳۰)

''مسلمانو! دونا، چار گنا سود نہ کھاؤ اور خدا سے ڈرو یقین ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔''

سود کے علاوہ قرض کے متعلق اور بھی مختلف قسم کی ناجائز سختیاں پیدا ہو گئی تھی مثلاً: اگر راہن میعادِ متعینہ پر مالِ مرہونہ کو چھڑا نہ سکتا تھا تو مرتہن اس کا مالک ہو جاتا تھا ❸ مال و دولت سے گزر کر عورتوں اور بال بچوں تک کو رہن رکھواتے۔ ❹

لوٹ مار

عرب میں روز کی لوٹ مار نے اگرچہ ہر قبیلہ کو قتل و غارت گر اور راہزن بنا دیا تھا، تاہم بعض قبائل میں اس قسم کے خاص خاص جتھے تھے، جنہوں نے راہزنی کو اپنا بالکل ذریعۂ معاش اور عام مشغلہ بنا لیا تھا، اس قسم کے

❶ فتوح البلدان بلاذری فتح طائف، ص:۶۳۔ ❷ ابوداود، کتاب الامارۃ، باب فی اخذ الجزیۃ:۳۰۴۱۔
❸ مؤطا امام مالک، ص:۳۰۴۔ ❹ بخاری، کتاب المغازی قتل کعب بن الاشرف:۴۰۳۷۔

لوگوں کو ''لصوص'' کہتے تھے اور قبیلہ طے کو عرب میں عام طور پر جو شہرت حاصل تھی وہ اسی گروہ کی بدولت تھی۔

یہ گروہ شہر سے باہر میدانوں میں، جنگلوں میں، پہاڑ کے کھوؤں میں رہتا تھا اور ادھر سے جو مسافر یا قافلے گزرتے تھے ان کو لوٹ لیتا تھا ان کا استیصال صرف ایک پرزور نظام حکومت ہی سے ہوسکتا تھا جو عرب میں مفقود تھا، چنانچہ قبیلہ طے کے عیسائی سردار عدی بن حاتم مسلمان ہو کر جب آپ سے ملنے آئے اور آپ نے ان سے یہ پیشین گوئی کی کہ ''وہ دن آئے گا کہ جب حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت بے خوف وخطر حضرموت کا سفر کرے گی۔'' چونکہ وہ قبیلہ طے کے رئیس تھے اور ان کو اس قبیلہ کے ڈاکوؤں کا حال معلوم تھا اس لیے ان کو تعجب ہوا کہ طے کے لصوص کیا ہوجائیں گے؟ [1] ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال ودولت، مویشی بلکہ اہل وعیال تک پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ تاجروں اور سوداگروں کے قافلے بغیر کسی بھاری انعام کے کسی میدان میں سے بسلامت نہیں گزر سکتے تھے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کی عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کردیتا تھا اور مویشیوں کو ہانک کر لے جاتا تھا۔ چنانچہ صبح کا وقت جبکہ رات بھر چلنے کے بعد مسافر آرام کرتے تھے اس کام کے لیے مخصوص ہوگیا تھا، چنانچہ صبح کا لفظ عربی میں لوٹنے کے معنی میں جاہلیت میں عام طور پر بولا جاتا تھا۔ کامیاب ڈاکو اپنے کارناموں کو نظم کرتے تھے اور فخریہ پڑھتے تھے۔ ایک قبیلہ کا شاعر حارث نامی ڈاکو کے سلامت نکل جانے پر کہتا ہے:

يا لهف زيابة للحارث الصابح فالغانم فالآئب

''اے زیابہ کا افسوس حارث کے لیے جو صبح کو ڈاکہ ڈالنے والا، پھر لوٹنے والا، پھر بسلامت واپس جانے والا ہے۔''

حج کے تین مہینوں میں البتہ وہ اس پیشہ سے باز رہتے تھے لیکن اس سے زیادہ مدت پر وہ صبر نہیں کرتے تھے اور چونکہ ہر قبیلہ کے مال ودولت اور مویشی پر موقع پا کر اسی طرح تصرف کرتا تھا، اس لیے وہ اس کو عیب نہیں بلکہ بہادری کا کام سمجھتے تھے اور اس طرح ملک میں مسلسل قتل وغارت اور لوٹ مار کا طریقہ جاری تھا۔

چوری

ڈاکہ کے علاوہ اقتصادی حالات کی مجبوری سے بدوؤں میں چوری کا رواج عام تھا، مختلف قبیلوں کے ایسے بہادر جو قبیلہ میں کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتے تھے وہ خصوصیت کے ساتھ اس پیشہ کو اختیار کرتے تھے، وہ تنہا بڑے بڑے خطرناک موقعوں پر جا کر اس کام کو انجام دیتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، ان میں سے سلیک بن السلکہ اور تابط شرًا شہرت عام رکھتے تھے، تابط شرًا کا ایک قطعہ حماسہ میں ہے جس میں اپنی چوری اور حیلہ گری کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے۔

قریش میں تجارت کے سبب سے دولت بھی تھی اور خود خانہ کعبہ میں تحفوں اور نذرانوں کا خزانہ جمع رہتا

[1] صحيح بخاري، كتاب المناقب، باب علامات النبوة في الاسلام: ٣٥٩٥۔

تھا، اس لیے ان میں چوری کے مواقع بھی زیادہ تھے، چنانچہ کلبی نے متعدد ممتاز قریشیوں کے نام بتائے ہیں جنہوں نے اس خزانہ سے سونے کا ہرن چرا لیا تھا [1] بلکہ اس کے لیے خاص طور سے ابولہب کا نام لیا جاتا ہے۔ [2]

عام بدو عربوں میں یہ برائی جتنی عام ہوگئی تھی اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ آنحضرت ﷺ ان مردوں اور عورتوں سے جو اسلام قبول کرنے آتے تھے دوسری باتوں کے ساتھ ان سے یہ معاہدہ بھی لیتے تھے کہ ''وہ آئندہ چوری نہ کریں گے۔'' [3] بلکہ خود قرآن پاک نے آپ کو اس کا معاہدہ لینے کا حکم دیا تھا۔ [4]

چوری کرنے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کر لیے تھے۔ ایک شخص نے اپنی چھڑی کے کنارے ایک ٹیڑھا لوہا (محجن) لگا رکھا تھا حج کے زمانہ میں آتا اور جب حاجیوں کو غافل پاتا تو اس لوہے کے سہارے سے ان کے اسباب کو کھینچ لیتا۔ [5]

جس طرح عرب میں طے کے ڈاکو لوٹ مار میں مشہور تھے اسی طرح بعض قبائل چوری میں شہرت عام رکھتے تھے، چنانچہ اسلم، غفار، مزینہ اور جہینہ کے قبیلے تمام عرب میں اس بنا پر بدنام تھے کہ وہ خاص طور پر حاجیوں کے مال واسباب کی چوری کیا کرتے تھے۔ [6]

چونکہ یہ چوری عربوں کی اقتصادی کمزوری کا نتیجہ تھی، اس لیے اس کے لیے غیر و بیگانہ کی تخصیص نہ تھی بلکہ اس کا اثر اعزہ واقارب، ہمسایہ، دوست و آشنا، خاندان غرض سب پر پڑتا تھا چنانچہ مدینہ میں بشر، بشیر، مبشر تین آدمی تھے، جن کو ''بنوابیرق'' کہا جاتا تھا، ان میں بشیر منافق تھا اور آنحضرت ﷺ کی ہجو میں شعر کہہ کر دوسروں کی طرف منسوب کر دیتا تھا یہ لوگ نہایت تنگ دست اور فاقہ مست تھے، انہوں نے رفاعہ نامی ایک شخص کے بالا خانہ سے جس میں ہتھیار و تلوار اور زرہ وغیرہ بھی رکھی ہوئی تھی نقب لگا کر چوری کی، آپ ﷺ نے رفاعہ کے ہتھیار واپس دلائے، لیکن رفاعہ نے ان کو خدا کی راہ میں وقف کر دیا اور بشیر بھاگ کر مشرکین سے جاملا۔ [7]

مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس مرض میں گرفتار تھیں، اسی لیے قرآن پاک نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت یہ عہد لینے کی بھی تاکید کی کہ ﴿وَلَا يَسْرِقْنَ﴾ (٦٠/ الممتحنة: ١٢) یعنی ''وہ چوری نہ کریں گی۔'' شرفا اگر اس الزام میں پکڑے جاتے تو وہ چھوڑ دیے جاتے تھے اس لیے یہ برائی رکنے نہیں پاتی تھی،

---

[1] فتح الباری، ج ١٢، ص: ٧٧۔ [2] کتاب المعارف لابن قتیبة، ص: ٥٥۔
[3] صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب الحدود کفّارة: ٦٧٨٤۔ [4] ٦٠/ الممتحنة: ١٢۔
[5] مسلم، کتاب الکسوف، باب ماعرض علی النبی ﷺ فی صلوة الکسوف من امر الجنة والنار: ٢١٠٢۔
[6] بخاری، کتاب المناقب، باب ذکر اسلم وغفار ومزینة: ٣٥١٦؛ مسلم، کتاب المناقب، باب من فضائل غفار واسلم وغفار: ٦٤٤٤۔ [7] ترمذی، کتاب التفسیر سورة النسآء: ٣٠٣٦۔

چنانچہ اسلام کے بعد بھی جب قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو اس پر قریش کو سخت تردد ہوا اور لوگوں نے کہا، اس کے متعلق آنحضرت ﷺ کی خدمت میں کون سفارش کرے گا؟ لوگوں نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا جن کو آپ بہت پیار کرتے تھے، انہوں نے سفارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم حدود اللہ کے متعلق سفارش کرتے ہو؟'' پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ ''گزشتہ قومیں صرف اس لیے ہلاک ہو گئیں کہ جب شریف آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور ضعیف چوری کرتا تھا تو اس کو سزا دیتے تھے، خدا کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا۔'' [1]

خود شہر کے اندر اس قسم کی واردات کی یہ حالت تھی کہ صفوان بن امیہ ایک روز ایک بیش قیمت چادر اوڑھ کر سو رہے تھے ایک شخص نے موقع پا کر اس کو اڑا لیا وہ گرفتار کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لایا گیا، تو آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا صفوان کو اس پر رحم آیا اور آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ایک چادر کے لیے ایک عرب کا ہاتھ کاٹا جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے پاس لانے سے پہلے ہی اس کا خیال رکھنا تھا، حاکم تک معاملہ پہنچنے کے بعد کسی کو سفارش کا حق حاصل نہیں۔'' [2]

سفاکی و بے رحمی و وحشت

رات دن کی لوٹ مار اور کشت و خون سے درندوں کے تمام اوصاف پیدا ہو گئے تھے، زندہ اونٹ اور دنبہ کے کوہان اور چکیاں کاٹ کر کباب لگاتے اور یہ ان کی بڑی مرغوب غذا تھی۔

زندہ جانوروں کو درخت سے باندھ دیتے اور ان پر تیر اندازی کی مشق کرتے۔ لڑائیوں میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر ڈالتے، مقتولوں کے ناک کان کاٹ لیتے اور عورتیں ان کے ہار بنا کر پہنتیں، منت مانتے کہ دشمن کو قتل کریں گے تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔

سزا دینے کا ایک یہ طریقہ تھا کہ مجرم کو دو درختوں کی ٹہنیاں جھکا کر اس کے اعضاء ان میں باندھ دیتے اور پھر ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے مجرم کا بدن چر کر ٹہنیوں کے ساتھ رہ جاتا۔ کبھی کبھی عورتوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیتے، اس کے بدن کے ٹکڑے اڑ جاتے، اس قسم کی سزائیں اکثر عرب کے سلاطین اور روسا دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی آدمی کو کسی کوٹھری میں قید کر کے اس کا کھانا پینا بند کر دیتے تھے یہاں تک کہ وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ کر مر جاتا تھا اس طریقہ سزا کا نام ان کے ہاں ''صبر'' تھا، مردوں کی قبر پر اونٹ باندھ دیتے تھے اور اس کو کھانے کو نہیں دیتے تھے وہ چند روز میں مر جاتا تھا، سمجھتے تھے کہ یہ مردے کی سواری بنے گا، اس اونٹ کو ''بلیہ'' کہتے تھے۔

[1] بخاري، كتاب الحدود، باب كراهية الشفاعة في الحدود إذا رفع الى السلطان: ٦٧٨٨ـ
[2] دار قطني، كتاب الحدود والديات، ٣/ ٢٠٤: ٣٤٣٠ـ

زنا اور فواحش

زنا اور فسق و فجور عام تھا اور یہ واقعات فخریہ اشعار میں بیان کیے جاتے تھے۔ امرء القیس عرب کا سب سے بڑا شاعر تھا اس کے ساتھ شہزادہ اور والیِ ملک بھی تھا، اس نے اپنی پھوپھی زاد بہن عنیزہ، اور دیگر عورتوں کے ساتھ جو افعال شنیعہ اور بے حیائیاں کیں قصیدہ لامیہ میں فخر کے ساتھ تفصیل کے ساتھ لکھی ہیں، باوجود اس کے کہ اس قصیدہ کے اشعار عرب میں بچہ بچہ کی زبان پر تھے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اہل جاہلیت گو بالاعلان زنا کو جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن چوری چھپے کرنے کو جائز سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کھلم کھلا کرنا تو کمینہ پن ہے لیکن چھپ کر کرنے میں مضائقہ نہیں [1] فاحشہ عورتیں گھروں کے سامنے جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں [2] اور صاحب جائداد کہلاتی تھیں۔ ان کی اولاد اصلی اور حلالی اولاد کے برابر سمجھی جاتی تھی۔ اسلام سے پہلے ایسی عورتیں خود مکہ معظمہ میں تھیں ان میں سے ایک کا نام ''عناق'' تھا۔ مرثد غنوی نے آنحضرت ﷺ سے اجازت مانگی کہ میں عناق سے نکاح کرلوں۔ اس پر یہ آیت اتری: [3]

﴿ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ ﴾ (۲۴/ النور: ۳۰)

''اور زانیہ عورت سے زانی یا مشرک ہی نکاح کرتے ہیں۔''

بڑے بڑے رؤسا گھر کی لونڈیوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ بدکاری کے ذریعہ سے جا کر کچھ کما لائیں اور ان کی نذر کریں، عبداللہ بن ابی مدینہ کا رئیس تھا اور اس درجہ کا شخص تھا کہ ہجرت سے پہلے تمام انصار نے تاج بنوالیا تھا کہ اس کو بادشاہ بنا کر پہنائیں گے، چنانچہ صحیح بخاری میں یہ واقعہ منقول ہے۔ عبداللہ بن ابی کی دو لونڈیاں تھیں ایک کا نام مسیکہ تھا اور دوسری کا نام امیمہ تھا وہ ان دونوں کو زنا کاری کرانے پر مجبور کرتا تھا، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری: [4]

﴿ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ ﴾ (۲۴/ النور: ۳۳)

''اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔''

موجودہ طریقہ کے علاوہ نکاح کی اور چند قسمیں جاری تھیں جو حقیقت میں بدکاری ہی کی قسمیں تھیں ایک یہ کہ کوئی شجاع اور بہادر شخص ہوتا تو اپنی عورت کو بھیج دیتے کہ اس سے ہم بستر ہو، بچہ پیدا ہوتا تو سمجھتے تھے کہ اس میں بھی وہی اوصاف آجائیں گے جس کا یہ نطفہ ہے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ چند آدمی جن کی تعداد ایک وقت میں دس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی کسی عورت کے

---

[1] تفسیر طبری آیت: محصنٰت غیر مسافحٰت، ج۵، ص: ۱۳، مصر۔
[2] صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب من قال: لا نکاح الا بولی: ۵۱۲۷۔
[3] ابوداود، کتاب النکاح، باب قوله: الزانی لا ینکح الا زانیة: ۲۰۵۱۔
[4] صحیح مسلم، کتاب التفسیر، باب قوله تعالیٰ ﴿ولا تکرهوا فتیٰتکم علی البغاء﴾: ۷۵۵۳۔

پاس جاتے اور سب اس سے ہم صحبت ہوتے جب وہ حاملہ ہو جاتی اور بچہ جنتی تو سب کو بلوا بھیجتی اور کسی ایک سے کہتی تھی کہ یہ بچہ تمہارا ہے اس کو قبول کرنا پڑتا اور پھر وہ اس کا بیٹا سمجھا جاتا۔ تیسرا طریقہ یہ تھا کہ فاحشہ عورتیں جو سر بازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں ان کے لڑکا پیدا ہوتا تو قیافہ شناس کو بلوا بھیجتیں وہ صورت شکل دیکھ کر بتاتا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے عورت اس کو بلا کر کہتی کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔ صحیح بخاری کتاب النکاح باب من قال لا نکاح الا بولی: ۵۱۲۷ میں یہ تینوں طریقے تفصیل سے مذکور ہیں۔ ایک اور قسم عارضی نکاح کی جاری تھی اور وہ یہ تھی کہ کسی عورت سے مدت متعینہ کے لیے نکاح کر لیتے تھے اس مدت کے گزرنے کے بعد اس کی اجرت دے کر اس کو الگ کر دیتے تھے اس کو متعہ کہتے تھے، اسلام نے شروع میں اس کو ضرورۃً چندے باقی رکھا پھر ہمیشہ کے لیے اس کو حرام کر دیا۔

بے شرمی و بے حیائی

شرم و حیا کا وجود نہ تھا، حجِ کعبہ میں ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہوتے لیکن (قریش کے سوا) باقی سب مادر زاد ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے، عورتیں جب ننگی ہو کر کعبہ کا طواف کرتیں تو لوگوں سے کہتیں کہ کوئی ہم کو اتنا کپڑا دیتا کہ سترِ عورت ہو جاتا، پھر یہ شعر پڑھتیں:

الیوم یبدُوْ بعضُہٗ اوکلُّہٗ فما بدا منہ فلا اُحِلُّہٗ

''آج بدن کا کچھ حصہ کھلے گا یا سارا اور جو کھلا ہے اس سے لطف اٹھانے کی میں اجازت نہیں دیتی۔''

صحیح مسلم باب التفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے۔ [1]

نہاتے وقت اوٹ نہیں کرتے تھے کھلے میدان میں بے ستر ہو کر نہاتے تھے۔ [2]

پاخانہ پیشاب کے وقت پردہ نہیں کرتے تھے [3] جلسوں میں بیٹھتے تو بیویوں سے ہم صحبتی کے تمام واقعات بیان کرتے [4] سوتیلی ماؤں پر وراثۃً قبضہ کر کے بیوی بناتے۔

عورتوں پر ظلم

عورتوں کی حالت نہایت خراب تھی، مورث کے متروکہ میں سے ان کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ عرب کا قول تھا کہ میراث اس کا حق ہے جو تلوار پکڑ سکتا ہو، اسی بنا پر چھوٹے بچے بھی وراثت سے محروم رہتے تھے۔

لڑائیوں میں مفتوحہ قبیلہ کی عورتیں عین میدانِ جنگ میں فاتحین کے تصرف میں آ جاتیں اگر صلح ہو جاتی

---

[1] صحیح مسلم، کتاب التفسیر، باب قولہ تعالیٰ: ﴿خذوا زینتکم عند کل مسجد﴾: ۷۵۵۱۔

[2] نسائی، کتاب الغسل، باب الاستتار عند الغسل: ۴۰۶۔ [3] ابوداود، کتاب الطہارۃ، باب الاستبراء من البول: ۲۱۔ [4] ابوداود، کتاب النکاح، باب مایکرہ من ذکر الرجل ما یکون من اصابتہ اھلہ: ۲۱۷۴۔

اور عورتیں واپس دے دی جاتیں تو باوجود اس کے کہ سب کے ناموس برباد ہو چکے ہوتے بدستور گھروں میں لے لی جاتیں اور یہ کوئی عیب نہیں خیال کیا جاتا تھا، فاتحین اس تصرف پر فخر کرتے اور اشعار میں ادا کرتے۔ بنو ضبہ نے جب بنو عامر پر فتح پائی تو ان کی عورتوں کو عین میدان جنگ میں رسوا کیا۔ فرزدق نے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

فظلت وظلت یرکبون هبیرها　　ولیس لهم الا عوالیها ستر

''تو لوگ عورتوں پر متصرف ہو گئے اور اگر کوئی پردہ بیچ میں تھا تو وہ صرف نیزے تھے۔''

قبیلہ قیس اور بنو دارم میں جو معرکہ ہوا وہ حرحان کے نام سے مشہور ہے، اس کی نسبت جریر کہتا ہے:

نکحت نساء هم بغیر مهور　　''ان کی عورتوں سے بغیر مہر کے نکاح کیا۔''

عمرو معدیکرب، عرب کے مشہور بہادر اور شاعر تھے، ان کی بہن ریحانہ کی عصمت اسی طرح جب برباد ہوئی تو عمرو نے کہا:

امن ریحانة الداعی السمیع　　''کیا ریحانہ کی طرف سے کوئی پکارنے والا سننے والا ہے۔''

یورقنی واصحابی هجوع　　''جس نے مجھے بے خواب رکھا ہے لیکن میرے احباب سوتے ہیں۔''

اذالم تستطع امرا فدعه　　''اگر تم کسی کام کو نہ کر سکو تو اس کو چھوڑ کر

وجاوزه الی ماتستطیع [1]　　وہ کرو جو کر سکتے ہو۔''

طلاق کے لیے کوئی مدت اور عدت نہ تھی یعنی جب تک شوہر چاہے عورت نہ شوہر کے پاس رہ سکتی تھی نہ کسی اور سے شادی کر سکتی تھی۔

نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ غیلان بن سلمہ ثقفی جب اسلام لائے تو ان کی دس بیویاں تھیں۔ وہب اسدی نے اسلام قبول کیا تو ان کے عقد نکاح میں آٹھ بیویاں تھیں۔ [2]

دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرتے باپ مر جاتا تو اس کی کل بیویاں (بجز حقیقی ماں) بیٹے کے تصرف میں آتیں اور اس کی جائز بیویاں سمجھی جاتی تھیں۔

ایام کے زمانہ میں عورتوں کو الگ کر دیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے۔

عورت جب بیوہ ہو جاتی تو گھر سے باہر ایک نہایت تنگ کوٹھری رہنے کو اور خراب سے خراب کپڑے پہننے کو دیے جاتے خوشبو وغیرہ کی قسم کی کوئی چیز استعمال نہ کر سکتی، اس حالت کے ساتھ جب پورا سال گزر جاتا تو ایک بکری یا گدھا لاتے اس سے وہ اپنے جسم کو مس کرتی پھر کوٹھری سے باہر نکلتی اور اس کے ہاتھ میں مینگنی دی جاتی وہ مینگنی کو پھینک دیتی اس وقت سوگ سے نکل آتی اور قدیمی حالت قائم ہوتی [3] عورت کا جو مہر مقرر ہوتا

[1] کتاب الاغانی، جزء تاسع، ص: ۱۲ اخبار درید بن الصمة۔

[2] ابو داود، کتاب الطلاق، باب فی من اسلم وعنده نساء اکثر من اربع: ۲۲۴۱۔

[3] ابو داود، کتاب الطلاق، باب احداد المتوفی عنها زوجها: ۲۲۹۹۔

وہ باپ کو ملتا عورت کو اس سے سروکار نہ ہوتا۔

غرض مجموعی حیثیت سے عورت بدترین مخلوق اور ہر قسم کے جبر و تعدی کا تختہ گاہِ مشق تھی، رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی اس کو سخت رنج ہوتا اور شرم کے مارے لوگوں سے چھپتا پھرتا:

﴿ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ ﴾ (١٦/ النحل:٥٨، ٥٩)

''اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے، تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اورغصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے، اس خوشخبری کے رنج سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے) کہ ذلت کے ساتھ اس کو قبول کر لے یا زندہ زمین میں دفن کر دے۔''

ابوحمزہ ایک رئیس تھا اس کے لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے گھر میں رہنا چھوڑ دیا اس پر اس کی بیوی یہ اشعار پڑھ پڑھ کر بچی کو لوریاں دیتی تھی:

مالا بی حمزۃ لا یاتینا　　　یبیت فی بیت اللتی تلینا

''ابوحمزہ کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے پاس نہیں آتا اور ہمسایہ کے گھر میں رات بسر کرتا ہے۔''

غضبان الا نلد البنینا　　　تاللّٰہ ماذاك بایدینا

''اس پر ناراض ہے کہ ہم بیٹے نہیں جنتے، خدا کی قسم یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں۔''

ونحن کالزرع لزارعینا　　　ننبت ما قد زرعوہ فینا

''ہم بطور کھیت کے ہیں، ہم میں جو بویا جائے گا وہی اگے گا۔''

رفتہ رفتہ دختر کشی کی رسم جاری ہوگئی۔ لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو میدان میں لے جا کر زمین کھودتے اور زندہ گاڑ دیتے اس کو عربی میں واد کہتے ہیں۔ ایک صاحب نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر ظاہر کیا تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کیں۔ [1]

عورت کو وراثت کا کوئی حصہ نہیں ملتا تھا ان کا قانون تھا کہ وراثت کا حق اسی کو ہے جو تلوار چلائے۔ [2]

عورت بیوہ ہونے کے بعد اپنے شوہر کے وارثوں کی ملک سمجھی جاتی تھی وہ اگر بیوہ پر چادر ڈال دیتا تو وہ اس کی جائز مدخولہ بن جاتی۔ [3]

وحشت و جہالت

حلال و حرام کی کوئی تمیز نہ تھی ہر چیز اور ہر جانور جو کھا سکتے تھے کھاتے تھے۔ حشرات الارض عام غذا تھی،

[1] تفسیر ابن جریر تفسیر سورہ ﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾ جز ٣٠، ص: ٤٠؛ تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورہ مذکورہ، جز ٤، ص: ٤٧٨۔ [2] تفسیر ابن جریر، تفسیر ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ﴾ جز ٤، ص: ١٧١۔ [3] ایضا، ص: ١٩٢ تفسیر ﴿وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ﴾

چھپکلی تک کھا جاتے تھے، خون کو جما لیتے تھے اور قاشیں تراش تراش کر کھاتے، مردہ جانور کھانا عام بات تھی۔ [1] چمڑے کو آگ میں بھون کر کھاتے، زندہ جانور کا گوشت کاٹ کر کھا لیتے تھے، گردن مروڑ کر، ڈنڈے سے مار کر، درندوں کا مارا ہوا سب کھاتے تھے، [2] گدھے کا گوشت بھی کھاتے تھے۔ [3]

عرب کا مشہور جاہلی شاعر اعشی، میمون جس نے آغازِ اسلام کا زمانہ پایا اور اہلِ عرب نے آنحضرت ﷺ کی مدح میں اس کا قصیدہ نقل کیا ہے، اس میں وہ اسلام کی تائید میں اہلِ عرب کو جن باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے، وہ یہ ہیں:

وایاك والمیتات لا تاکلنها [4] ولا تاخذن سهمًا حدًا لتفصّدا

''مرداروں سے پرہیز کر اور ان کو نہ کھا اور نہ تیز تیر سے جانور کو فصد دے کر مار کر کھا۔''

وذا النصب المنصوب لا تنسکنه ولا تعبد الاوثان واللّٰه فاعبدا

''اور نہ کھڑے کیے ہوئے بتوں پر قربانی کر اور نہ بتوں کی پوجا کر اور اللہ کی عبادت کر۔''

ولا السائل المحروم لا تترکنه لعاقبة ولا الاسیر المقیدا

''اور محروم بھیک مانگنے والے کو کسی اور انجام کے لیے مت چھوڑ اور نہ زنجیر میں بندھے ہوئے قیدی کو۔''

ولا تسخرن من بائس ذی ضرارة ولا تحسبن المال للمرءِ مخلدا

''اور نہ کسی مصیبت زدہ مفلس سے ٹھٹھا کر اور نہ کبھی یہ سمجھ کہ مال آدمی کے لیے ہمیشہ رہنے والا ہے۔''

ولا تقربن جارة ان سرها علیك حرام فانکحن اوتابدا

''اور نہ اپنی ہمسایہ خاتون سے بدکاری کر، وہ تجھ پر حرام ہے تو یا نکاح کر لے اور یا کنوارا رہ جا۔''

---

[1] اسباب النزول سیوطی آیت ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ برحاشیہ تفسیر القران العظیم، ج۱، ص: ۹۸۔

[2] تفسیر طبری، سورۃ مائدۃ بیان ماکولات۔

[3] صحیح نسائی، کتاب الصید والذبائح، باب تحریم اکل لحوم الحمر الاهلیة: ۴۳۴۵، ۴۳۴۶۔

[4] دیوان اعشی مطبوعہ ویانا ۱۹۲۷ء ص: ۱۰۳ وشعراء النصرانیة، قسم ثالث، ص: ۳۶۵۔

عربوں کی خصوصیات

خیر الامم بننے کی اہلیت

لیکن ان تمام مفاسد اور برائیوں کے باوجود اہل عرب میں کچھ ایسی خصوصیتیں بھی تھیں جو دنیا میں صرف انہیں کے ساتھ مخصوص تھیں اور ان کی انہی فطری اور طبعی خصوصیات و امتیازات کا اثر تھا کہ خالق فطرت نے ان کو اپنی نبوت و رسالت اور تعلیم و شریعت کا اہل سمجھا اور ان کو اپنے اس خلعتِ خاص سے سرفراز کیا۔

صحتِ نسب

ان خصوصیات میں سب سے پہلی چیز ان کی صحیح النسبی ہے۔شمالی عرب کے تمام قبیلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور ان کی نسل سے تھے اور یہ بات ایسی مشہور و متواتر روایتوں سے ثابت تھی کہ کسی نے اس کی تردید کی ہمت نہیں کی ،توراۃ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جن اولادوں کے نام بتائے ہیں ان میں سے ایک ایک نام کا سراغ عرب کی پرانی آبادیوں میں ملتا ہے، چنانچہ ریورنڈ فارسٹر نے ۱۸۴۴ء میں عرب کا جو تاریخی جغرافیہ لکھا ہے اس میں پوری دلیل اور تفصیل اور شہادتوں کے ساتھ ان آبادیوں کا پتہ لگایا ہے اور ان کی جگہیں متعین کی ہیں ،قدیم یہودی مؤرخ یوسیفوس نے بھی یہی لکھا ہے [1] اور آج کل ایک یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون نے تاریخ الیھود فی بلاد العرب ایک کتاب لکھی ہے ،اس میں بھی اس نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے اور اس کی صحت پر دلیلیں پیش کی ہیں [2] اور بعض حال کے مناظر عیسائیوں کے علاوہ اس واقعہ کے تواتر میں کسی نے شک نہیں کیا ہے اور غالباً اسی لیے سینٹ پال نے اپنے خطوط میں عرب کی ہاجرہ کی تمثیل استعمال کی ہے [3] اور قرآن پاک نے اہل عرب اور قریش کو خطاب کر کے صاف کہا:

﴿ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ﴾ (۲۲/ الحج:۷۸) ''تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام تک نام بنام سلسلہ نسب کے پہنچنے میں پشتوں کی کمی بیشی یا ناموں کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے مگر مجموعی حیثیت سے یہ دعویٰ کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد تھے کسی حیثیت سے مشکوک نہیں ہے خصوصاً جب اس کے ساتھ خارجی قرآئن پر بھی نظر کر لی جائے کہ وہی تمدن اور طرز معاشرت جو توراۃ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے اہل و عیال کی نظر آتی ہے اسلام کے بعد تک بلکہ آج تک وہ اسی طرح عربوں میں قائم و باقی ہے وہی خیمے ہیں، وہی صحرا ہیں، وہی مویشی ہیں، وہی بدویانہ زندگی ہے، وہی رسوم و رواج ہیں جن کو اسلام نے آ کر اور زیادہ نکھار دیا، وہی بیت اللہ کا حج اور قربانی کی عبادتیں ہیں اور یہ ایسا کھلا قرینہ ہے جو آج بھی یورپ کے محققوں کی نگاہوں کے سامنے ہے۔مشہور جرمن محقق نولڈیک کہتا ہے:

---

[1] ترجمہ انگریزی ۱۸۲۲ء جلد اول،ص:۲۵۔ [2] تاریخ الیھود فی بلاد العرب لا سرائیل ولفنسون مطبوعه مطبعة الاعتماد مصر ، ص: ۷۵ ، ۷٦۔ [3] سینٹ پال گلتیون کے نام باب ۴۔۲۵ کتاب العہد الجدید،ص:۵۸۱۔

''اور نیز عربوں میں قدیم سامی کیریکٹر اپنے خالص رنگ میں باقی سمجھا جاتا ہے اور ان کی زبان اصل زبان کے بہت قریب ہے۔'' [1]

اہل عرب کو اپنے حسب ونسب کی حفاظت کا جو خیال ولحاظ تھا، اس کے ذکر سے عرب کی تاریخیں معمور ہیں، چنانچہ نسب پر فخر کرنا ان کی شاعری کا اور نسبی مفاخرت ان کی تقریر کا سب سے بڑا موضوع تھا۔ اپنے باپ دادوں کے مسلسل ناموں کو یاد رکھنا ان کا خاندانی فرض سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ انسانوں سے ہٹ کر جانوروں (گھوڑوں) تک کے نسب نامے محفوظ رکھتے تھے قبائل کے نسبی تعلقات کو یاد رکھنے والے خاص خاص لوگ ہر قبیلہ میں موجود رہتے تھے اور یہی سبب ہے کہ آج بھی ان کے اکابر اور مشاہیر کا سلسلہ نسب آپ کو معلوم ہو سکتا ہے اور اس پر بہت سی اہم کتابیں لکھی گئی ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا میں صرف اہلِ عرب کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہود اور بنی اسرائیل بھی گو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی نسل سے تھے مگر وہ بھی اس خصوصیت میں ان کی برابری نہیں کر سکتے کہ دوسری قوموں کے اختلاط اور میل جول اور کسی خاص وطن نہ ہونے کے سبب سے ان کی اکثر خاندانی خصوصیتیں مٹ گئیں۔

نسب بجائے خود کوئی فخر کی چیز نہیں اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ نے عمل کے مقابلہ میں نسبی فخر کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی ہدایت کے لیے جو دعا کی تھی اور ان کو جس بیت اللہ کی پاسبانی سپرد کی تھی اور ان میں ایک نبی کی بعثت کی جو دعا مانگی تھی اور خدا نے ان کی نسل میں دینی اور دنیاوی برکات کے عطا کرنے کا ان سے جو عہد کیا تھا ان سب کے پورا ہونے اور ان کے حقیقی مصداق بننے کے لیے نسل ابراہیم کی صحیح النسبی کی ضرورت تھی اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس شرف کے ساتھ مخصوص کیا۔

کسی پہلے مذہب میں داخل نہ تھے

اسی طرح ان کو ان تمام اثرات سے محفوظ رکھا جو قوموں کے عادات واخلاق اور استعدادات کو بدل دیتے ہیں، مثلاً: وہ باوجود اس کے کہ ہر چہار طرف سے مختلف بڑے بڑے مذہبوں سے ٹکرا رہے تھے مگر کوئی مذہب ان کو فتح نہیں کر سکا تھا۔ مجوسیت خلیج فارس سے لے کر یمن تک حکمران تھی، یہودیت یمن اور حجاز کی تجارت گاہوں پر قابض تھی، عیسائیت اپنی فوج ولشکر اور راہبوں اور قسیسوں کے دل بادل کے ساتھ یمن سے لے کر شام کی حدود تک پھیلی ہوئی تھی اور بعض افراد اور بعض قبیلوں کو وہ برائے نام عیسائی بنا بھی چکی تھی مگر پورا عرب بدستور اپنی خالص حالت پر باقی تھا۔ عرب میں جو نیک طبع اور دیندار لوگ ہوتے تھے وہ مجوسی یا یہودی یا عیسائی ہونے کے بجائے اپنے کو دین ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے اور اسی لیے اپنے مذہب کا نام ''دین حنیفی'' رکھتے تھے اور یہ سب اس لیے ہو رہا تھا کہ خاتم الانبیاء ﷺ کے ذریعہ دینِ ابراہیمی کی دعوت وتجدید کا راستہ کھلا رہے۔

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون ''السنہ سامیہ'' میں نے ارض القرآن، جلد اول، ص: ۱۰۷ سے ص: ۱۱۶ تک اس پر مدلل بحث کی ہے اور علمائے یورپ کے حوالے یکجا کر دیے ہیں۔

محکوم نہ تھے

عرب کا ملک تخلیقِ عالم کے آغاز سے اسلام تک ہر غیر قوم کی حکومت سے ہمیشہ آزاد رہا، شمالی عرب نے کبھی کسی قوم کی غلامی نہیں کی، بابل کے بخت نصر نے بنی اسرائیل کو زیروزبر کر دیا مگر عرب کی طرف آنکھ نہ اٹھا سکا، یونانیوں اور رومیوں نے مصر سے لے کر عراق کی سرحد تک صدیوں تک حکومت کی مگر خاص عرب کے اندر قدم نہ رکھ سکے، سکندر نے اور اس کے بعد رومی سپہ سالاروں نے جب ادھر نظر اٹھائی تو فطرت نے ہمیشہ ان کو شکست دی، عرب کا ملک دنیا کی دو عظیم الشان حکومتوں یعنی ایران اور روم کی سرحد پر واقع تھا مگر وہ دونوں اپنے حرص وآز کا ہاتھ اس کی طرف بڑھانے سے قاصر رہیں، گستاخ عیسائی حبشیوں نے یمن فتح کرنے کے بعد ہاتھیوں کے جھرمٹ کے ساتھ مکہ معظمہ پر چڑھائی کی مگر قدرتِ الٰہی نے ان کو تباہ کر دیا۔ یہ تمام اہتمام وانتظام اس لیے تھا کہ کوئی دوسری جابرانہ قوت ان کے دل ودماغ کی استعداد برباد نہ کر سکے، ان کی آزادی کی روح برقرار اور ان کی فاتحانہ طاقت بدستور قائم رہے، تاکہ یہ مخفی خزانہ خدا کے آخری مذہب کی حکومت کے قیام وبقا میں کارآمد ہو۔

کتابی فاسد تعلیم سے ناآشنا تھے

جس طرح وہ خارجی اثرات سے پاک تھے اسی طرح صحیفۂ فطرت کے سوا ہر قسم کے کتابی علم سے وہ ناآشنا تھے یعنی اس ذریعہ سے بھی وہ دوسری قوموں کے دماغی اثرات سے محفوظ تھے اور علم کی جاہلانہ اور کج بحثانہ ذہنیت سے پاک تھے وہ اُمّی تھے، تاکہ ایک اُمّی معلم کی ربانی تعلیم کے قبول کرنے کے لیے ہر طرح تیار رہیں۔

وہ زمین کے وسط میں آباد تھے

عرب کا ملک پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے، ایک طرف ایشیا، دوسری طرف افریقہ اور تیسری طرف یورپ کا راستہ اس سے قریب ہے۔ پھر بحری جائے وقوع نے اس کو جزائر اور دور دراز ملکوں سے قریب کر دیا تھا اس لیے عرب سے نکل کر وہ ایک طرف عراق ہو کر، ایران، ترکستان، خراسان، سیستان، کابل، ہندوستان تک پہنچ گئے اور دوسری طرف شام ہو کر مصر، افریقہ، الجزائر، تیونس، مراکش اور اسپین تک جا پہنچے اور بحری راستوں سے ایک طرف سے تمام جزائر افریقہ، حبشہ، زنجبار پھر ادھر جزائر ہند، جاوا، سماٹرا، اور چین تک ان کا گزر ہوا، اور دوسری طرف سائپرس، کریٹ اور سسلی تک ان کا پرچم لہرایا۔ یہ تمام مواقع اس لیے میسر آئے کہ عرب کی جائے وقوع اس دعوت کے لیے مناسب مرکز تھا۔ فرض کرو کہ اگر اس دعوت کی جگہ ہندوستان یا چین ہوتی تو اسپین اور سسلی تک پہنچنے کے لیے کتنا عرصہ درکار ہوتا پھر یہ کہ اس وقت تک دنیا جن دو مشرقی اور مغربی طاقتوں کے زیر فرمان تھی ان دونوں کے زور کو برابر طور سے اور ایک ساتھ توڑنے کے لیے عرب کے سوا دنیا میں کوئی جگہ موزوں نہ تھی جہاں سے دونوں پر ایک ساتھ حملہ کرنا اور دنیا کو ان کے خون آشام پنجوں سے نجات دینا با آسانی ممکن ہو۔

بعض اخلاقی خوبیاں

ان کے علاوہ اہل عرب کو خیر الامم بننے اور عالم کے لیے شاہد، نمونہ اور مصلح بننے کے لیے کچھ اور اخلاقی خوبیوں کی بھی ضرورت تھی اور وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان خوبیوں کے بغیر وہ اسلام کی عظیم الشان تحریک کے علم بردار نہیں ہو سکتے تھے اور نہ وہ دنیا کی راہنمائی کا فرض انجام دے سکتے تھے۔

شجاع و بہادر تھے

وہ حد سے زیادہ شجاع و بہادر تھے، وہ خطرات سے بے خوف تھے اور لڑائی کو کھیل سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے یہی سبب ہے کہ وہ تمام دنیا کی قوموں اور سلطنتوں کے مقابلہ میں تنہا کھڑے ہوئے اور کسریٰ وقیصر کو انہوں نے ایک ساتھ چیلنج دیا اور اس تحریک کے پھیلانے میں تھوڑی تھوڑی غیر مسلح جمعیتوں سے ہزاروں اور لاکھوں کی فوج کا بے خطر مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔

پر جوش تھے

ساتھ ہی وہ پر جوش بھی تھے اس لیے جس دعوت اور تحریک کو لے کر اٹھے اس کو پوری کوشش، عزم اور جوش کے ساتھ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا ان کے عزم اور جوش کو نہ پہاڑ روک سکا اور نہ سمندر اس سے ٹکرا سکا، ہر جگہ وہ توحید کا علم لیے بحر و بر، دشت و جبل میں پھیل گئے اور اپنے عزمِ راسخ سے ارکان عالم کو متزلزل کر دیا۔

حق گو تھے

ان کی جسمانی شجاعت و بہادری نے ان کو دل کا شجاع اور بہادر بھی بنا دیا تھا، جو بات ان کے دل میں ہوتی تھی وہی ان کی زبان پر تھی، اہل مدینہ میں جو نفاق کا عنصر پیدا ہو گیا تھا وہ یہود کے اثر کا نتیجہ تھا ورنہ قریش اور عام اہل عرب میں یہ بات نہ تھی یا تو وہ کھلے دشمن تھے یا کھلے دوست۔ اپنے نزدیک وہ جس کو حق سمجھتے تھے اس کے ظاہر کرنے میں ان کو کسی کا باک نہیں ہوتا تھا۔

عقل و دانش والے تھے

باوجود اس کے کہ وہ عموماً ظاہری نوشت وخواند سے عاری تھے مگر فطرت کے عطیۂ عقل و دانش سے وہ کافی طور بہرہ مند تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، طلحہ، زبیر، خالد، ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم وغیرہ سینکڑوں ہزاروں صحابہ نے علم، مذہب، اخلاق اور سیاست میں جو نکتہ سنجیاں کیں وہ خود ان کی عقل و دانش کی گواہ ہیں، روم و ایران کی متمدن قوموں سے جس طرح انہوں نے معاملہ، مراسلہ اور نامہ و پیام کیا اور علم و سیاست کے الجھے سے الجھے ہوئے مسئلہ کو جس طرح سلجھایا وہ خود اسی نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے شعرا کے کلام، ان کے مقرروں کی تقریریں، ان کے فصحا کے مقولے سنئے تو ان کی اس فطری صلاحیت کا

اندازہ ہوگا کہ ظاہری تعلیم کے بغیر کیونکر یہ لعل و گہر وہ اپنے منہ سے اگل سکے۔

ذہن اور حافظہ کے تیز تھے

فطرت کا قاعدہ ہے کہ اگر اس کے بعض قویٰ بیکار ہیں تو ان کی قوت دوسرے زیر عمل قویٰ کو وہ منتقل کر دیتی ہے اور جس عضو سے زیادہ کام لیا جاتا ہے اس کی قوت کو وہ ترقی دیتی رہتی ہے۔ اسی اصول کے موافق ظاہری تعلیم اور نوشت و خواند سے محروم ہونے کے سبب سے جہاں ان کے بعض قویٰ بیکار ہو رہے تھے وہاں ان کو اپنی یادداشت کے لیے تحریری اوراق اور سفینوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود اپنے دل و دماغ پر بھروسہ کرنے کی عادت تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا ذہن اور حافظہ بہت قوی تھا یہی سبب ہے کہ ان کے شعرا اپنے بڑے بڑے قصیدوں کو زبانی پڑھتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے اس کو برزبان یاد رکھتے تھے اور ان کی اسی قوت کا یہ فیض تھا کہ ان میں کا بڑا طبقہ تحریر کے بغیر قرآن پاک کی بڑی بڑی سورتوں کو یاد رکھتا تھا اور بہتیرے ایسے تھے جو پورے قرآن کو یاد رکھتے تھے اور یہ انہیں کی تقلید ہے کہ دنیا کے ہر حصہ میں ایسے ہزاروں مسلمان پائے جاتے ہیں جو پورے قرآن کے حافظ ہوتے ہیں اور اہل عرب کی اسی خصوصیت کا مظہر یہ بھی تھا کہ احادیث و سیر اور واقعات کا بڑا سرمایہ تحریر کے علاوہ زبانی ایک دوسرے کو پوری ذمہ داری اور حفاظت کے ساتھ منتقل ہوتا رہا اور سینکڑوں اصحاب ایسے تھے جو ہزاروں لاکھوں احادیث کو حرف حرف اور لفظ لفظ کی پابندی کے ساتھ یاد رکھتے تھے، اہلِ عرب کی اس خصوصیت نے اسلام کی حفاظت اور اشاعت کا نہایت اہم فرض انجام دیا۔

فیّاض تھے

اہل عرب کی ایک خاص امتیازی صفت ان کی فیاضی تھی، مہمان نوازی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ ہمسایوں اور پناہ گزینوں کی امداد میں وہ اپنی جان تک لڑا دیتے تھے، اپنی شہرت اور ناموری کے لیے اونٹوں کو ذبح کر کے کھلا دینا یا جوئے میں جیتی ہوئی دولت کو احباب کے جلسہ دعوت میں اڑا دینا اور اس پر فخر کرنا ان کی قومی رسم تھی اور یہی اوصاف ان کی شاعرانہ مدح میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ اسلام نے ان کی اسی صفت کو تھوڑی سی اصلاح کے بعد خدا کی راہ میں خیرات و صدقات و زکوٰۃ سے بدل دیا اور اسلام کی مشکل کشائی میں اس نے سب سے زیادہ مدد دی۔

مساوات پسند تھے

چونکہ وہ کبھی کسی دوسری قوم کے محکوم نہ ہوئے تھے اور نہ وہ کسی ایک مطلق العنان بادشاہ کے تابع فرمان بنے تھے، اس لیے ان کی خودداری کا جذبہ بیدار تھا، وہ غلام بننا نہیں جانتے تھے، وہ اپنے کو ذلیل کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور وہ بڑے سے بڑے شخص کے سامنے برابری کے ساتھ بے باکانہ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔

عرب میں بیسیوں لڑائیاں صرف اسی خودداری کی حفاظت میں پیش آئی تھیں جس کا ایک منظر سبعہ معلقہ کے آخری قصیدہ میں نظر آتا ہے۔ اہل عرب کے اس جذبہ نے حق گوئی مساوات اور جمہوریت پسندی وغیرہ اسلامی تعلیمات کے پھیلانے میں بڑی مدد دی۔

عملی تھے

اہل عرب کے فطری اخلاق وکردار کی آخری دفعہ یہ ہے کہ وہ طبعاً عملی اور عملیت پسند تھے وہ اہل ایمان اور اہل ہند کی طرح محض تخیل پسند، خیال آراء اور نظریہ باز نہ تھے وہ مجسم عمل تھے اور عملیت کو پسند کرتے تھے، وہ چون و چرا اور کیسے، کیونکر کی فلسفیانہ الجھنوں سے پاک تھے، وہ دنیا کے کاروباری آدمیوں اور سپاہیوں کی طرح چند اچھی باتوں کو قبول کر کے ان پر فوراً عامل بن جاتے تھے، یہی سبب ہے کہ عجمیانہ نکتہ آفرینی اور بال کی کھال نکال کر اس کی الجھنوں کے سلجھانے میں وہ کبھی گرفتار نہیں ہوئے، وہ ہمہ تن عمل اور صرف عمل تھے اسی بنا پر شارع علیہ السلام نے ان کے سامنے ایک عملی مذہب کو پیش کر کے ان کو سرتاپا عملی بنا دیا اور جو کچھ وہ تعلیم لائے تھے اس کا مجسم پیکر بن کر چند سال میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور دور دور سے بدوی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آتے اور شک و حجت اور مناظرہ و قیل و قال کے بغیر فرائض و اخلاق کی عملی تعلیم حاصل کر کے اپنے قبیلہ میں واپس چلے جاتے تھے اور بالآخر اپنی عملی دعوت سے اپنے پورے قبیلے کو مسلمان بنا لیتے تھے وہ اگر مگر اور ممکن و ناممکن کی بحث میں نہیں پڑتے تھے وہ تعلیم کو دیکھتے تھے اور سنتے تھے، وہ اچھی معلوم ہوتی تو اس کو قبول کرتے اور اس پر عمل کر کے دینی اور دنیاوی فوائد اور نتائج کے حصول کا یقین کرتے تھے اور اسی غیر متزلزل یقین اور ایمان کے بھروسہ پر وہ مشکل سے مشکل اور خطرناک سے خطرناک کام کر گزرتے تھے، اہلِ عرب کی اسی خصوصیت نے اسلام کی سادگی کو برقرار اور عجمی فلسفیت و نظریت سے پاک و مبرا رکھا اور ساتھ ہی چند سال کے اندر اندر مغرب و مشرق اور شمال و جنوب میں اسلام کا پھریرا آسمان پر اڑنے لگا۔

ان اوصاف کی مصلحت

اہل عرب کے ان تمام فطری و طبعی اوصاف و اخلاق کو دیکھ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری دین کی اشاعت اور حفاظت کے لیے جس قوم کا انتخاب کیا تھا وہ ازل سے اس کے لیے منتخب ہو چکی تھی باوجود ان کی ہر قسم کی گمراہیوں کے ان کے یہ چند اچھے اوصاف اس لیے ان میں ودیعت کیے گئے تھے، تاکہ جب خدا کی بادشاہی کا دن آپہنچے تو ان کی فطری استعداد کا یہ سرمایہ اس کی امداد و اعانت کے لیے خزانہ غیب کا کام دے، یہی وہ سرمایہ تھا جو اس وقت نہ ہند و عجم میں تھا نہ روم و فرنگ میں اور نہ ترک میں تھا نہ زنگ میں، وہ عرب اور صرف عرب میں تھا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری نبوت کے لیے اسی قوم کو برگزیدہ کر کے یہ امانت اس کے ہاتھ میں سپرد کی، آنحضرت ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام

کی اولاد میں اسماعیل کو پسند کیا اور اسماعیل کی اولاد میں بنی کنانہ کو اور بنی کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنو ہاشم اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو۔'' [1] ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ کا بیٹا ہوں، اللہ نے ان تمام لوگوں کو پیدا کیا تو مجھے اس نے ان سب میں سے بہتر نسل میں رکھا، ان کو دو حصوں میں (عرب وعجم) میں تقسیم کیا تو مجھے اس حصے میں یعنی عرب میں بنایا جو سب سے بہتر تھا، اس حصے کو بھی قبیلوں میں تقسیم کیا تو مجھے اس قبیلہ میں پیدا کیا جو سب سے بہتر تھا، پھر اس قبیلہ کو گھرانوں میں تقسیم کیا تو مجھے سب سے بہتر گھرانے میں پیدا کیا، پھر اس گھرانے کو افراد پر تقسیم کیا تو مجھے اس گھرانے کا سب سے بہتر فرد بنایا۔'' [2]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فضل نسب النبی ﷺ: ۵۹۳۸؛ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی فضل النبی ﷺ: ۳۶۰۵، ۳۶۰۶۔

[2] جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب ما جاء فی فضل النبی ﷺ: ۳۶۰۷۔

صبحِ سعادت

دنیا اور عرب کی سرزمین اس ظلمت میں تھی کہ صبح سعادت نمودار ہوئی اور خورشید نبوت کے طلوع کا غلغلہ برپا ہوا، ظلمتِ شب کافور ہوئی اور تھوڑی دیر میں ذرہ ذرہ سورج کی کرنوں سے پرنور ہوگیا۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ سورج گو دنیا کو روشن کرنے نکلا تھا لیکن وہ نکلا عرب ہی کے اُفق سے تھا اس لیے ضروری تھا کہ اس کے نور سے پہلے اسی ملک کی زمین روشن ہو۔

ایک قوم کا انتخاب

سرورِ کائنات ﷺ کو گو خدا نے تمام عالم کی اصلاح کے لیے بھیجا تھا اور اس بنا پر ایک ایسی شریعتِ کامل عطا کی جو نہ صرف عربوں بلکہ تمام عالم کے لیے ابد تک کافی ہے لیکن کوئی شریعت، کوئی قانون، کوئی دستور العمل اس وقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہوسکتا جب تک اس کے ساتھ ایسا گروہ موجود نہ ہو جو اس شریعت کی عملی تصویر ہو، وہ جس کی ہر بات، ہر ادا، ہر جنبش عملی خطیب بن کر گرد و پیش کو اپنا ہم زبان اور ہم عمل بنالے۔

اس بنا پر خاتم الانبیاء ﷺ کا سب سے اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اصلاح عالم کے لیے تیار کرنا تھا [1] دنیا کی اور قومیں باری باری اس منصب پر ممتاز ہوچکی تھیں ایک زمانہ تھا کہ جب بنی اسرائیل جیسی قوم جو آج تمام دنیا میں خوار اور ذلیل ہے ﴿ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۝ ﴾ (۲/البقرہ:۴۷) ''ہم نے تم کو دنیا کی قوموں پر فضیلت دی۔'' کا تاج پہن چکی تھی لیکن اوپر بہ تفصیل گزر چکا کہ اب تمام قوموں میں صلاحیت کا مادہ مفقود ہوچکا تھا۔ ایران تین ہزار برس تک ناز و نعمت میں پل کر ترقی کی روح فنا کرچکا تھا۔ رومیوں کے تمام قوائے عمل بوسیدہ ہوچکے تھے۔ ہندوؤں کا دل و دماغ صرف وہم پرستی کا کام دینے کے قابل رہ گیا تھا، صرف ایک عرب تھا جو بن جتی زمین کی طرح مادہ ہائے نشو و نما سے لبریز تھا اور ایک لوح سادہ کی طرح ہر قسم کی نقش آرائیوں کے قابل تھا مشیت ایزدی نے اسی کو تاکا اور چند روز میں وہی عرب جو سرتاپا جہل، سرتاپا وحشت اور سرتاپا درندہ بن چکا تھا ﴿ كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (۳/آل عمران:۱۱۰) ''تم بہترین قوم ہو جو انسانوں کے لیے (پردۂ عدم سے) باہر لائی گئی ہو جو نیکیوں کا حکم دیتی اور برائیوں سے روکتی ہے۔'' کا مظہر بن گیا۔

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ جو پیغمبر تمام عالم کے لیے مبعوث ہوتا ہے وہ علاوہ ان اصول کے جو اور مذاہب میں ہیں چند اور نئے اصول اختیار کرتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے:

یدعو قوما الی السنة الراشدة ویزکیهم ویصلح شانهم ثم یتخذهم بمنزلة جوارحه فیجاهد اهل الارض ویفرقهم فی البلاد وهو قوله تعالیٰ: ﴿كُنْتُمْ خیر امة اخرجت للناس﴾۔

(حجة الله البالغة، ص: ۱۲۳ مطبوعه هند)

''وہ ایک قوم کو سنت راشدہ کی طرف دعوت دیتا ہے ان کو پاک اور درست کرتا ہے، پھر ان کو اپنا دست و بازو بناتا ہے اور ان کو دنیا میں پھیلا دیتا ہے اور ان کے ذریعہ سے مجاہدہ کرتا ہے جیسا کہ خدا نے کہا کہ تم بہترین امت ہو جو دنیا کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔''

ان لوگوں کا حلیہ و جمال اور خط و خال یہ تھا:

﴿ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ ﴾ (۲۲/ الحج:٤١)

''وہ لوگ کہ ہم جب ان کو دنیا میں اقتدار دیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے، اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور بری باتوں سے روکیں گے۔''

اصلاح و ہدایت کی مشکلات

ہر قوم کی اصلاح و ہدایت میں اول سخت اور متعدد مشکلات پیش آتی ہیں لیکن ان کی نوعیت ایک دو سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن عرب کی اصلاح میں ہر نوع، ہر حیثیت، ہر جہت کی گوناگوں اور لاعلاج مشکلات تھیں اور ایسی تھیں جن میں سے ایک کا حل کرنا بھی قدرت انسانی سے بالاتر تھا۔ بنو اسرائیل ایک مدت سے مصر میں قبطیوں کی غلامی کر رہے تھے اور قبطیوں کے جور و ظلم کا طوفان ان کے سر سے گزر چکا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر یہ احسانِ عظیم کیا کہ فرعون کے پنجۂ ستم سے ان کو چھڑا کر نکال لائے لیکن غلامی میں رہتے رہتے ان کی طبیعت میں اس قدر ذلت پسندی آ گئی تھی کہ جب ان سے یہ کہا گیا کہ آگے کنعان کی زمین ہے اس کو لڑ کر لو اور اسی پر تخت سلطنت بچھاؤ تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صاف کہہ دیا کہ تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو ہم تو یہاں سے آگے قدم نہیں بڑھاتے۔ یہ ایک امتدادِ معاشرت کا اثر تھا جو مرتے مرتے ان لوگوں کی طبیعت سے نہیں گیا اور جب تک یہ نسل پوری اپنی موت سے مر کر منقرض نہیں ہوگئی، بنو اسرائیل کو کنعان کی زمین میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔ یہ صرف ایک مشکل کی مثال تھی اب عرب کی مشکلات کا اندازہ کرو۔

جہالت

عرب کی قوم اُمی محض تھی، الوہیت، رسالت، کتاب، معاد، عبادت ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی، جس سے ان کے کان آشنا ہوں، اسلام کا ہر لفظ جو ان کے کان میں پڑتا تھا ان کو تعجب انگیز اور بالکل بیگانہ آواز معلوم ہوتی تھی۔ قرآن مجید نے ان کے اس جاہلانہ حیرت و استعجاب کو متعدد آیتوں میں ذکر کیا ہے:

﴿ يٰسٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۭ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَاۗؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ ﴾ (۳٦/ یٰس:١۔٦)

''قرآن حکیم کی قسم، تو بے شبہ پیغمبروں میں سے ہے، راہِ راست پر ہے، یہ قرآن رحمت والے غالب خدا کے پاس سے اترا ہے، تاکہ تو اس قوم کو آگاہ کرے، جن کے اسلاف کو آگاہ نہیں کیا گیا اور اس لیے وہ غفلت میں پڑے ہیں۔''

یہ نبوت کے شرف سے محروم قوم ایک آسمانی مذہب کے تمام خصائص سے محض بیگانہ تھی۔

﴿ وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۝ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝ ﴾

(۳۸/ صٓ:۴-۷)

''اورانہوں نے تعجب کیا کہ ان میں ایک پیغمبر ہوکران کے پاس آیا، کافروں نے کہا یہ دروغ گو، جادوگر ہے اس نے اتنے خداؤں کا ایک خدا بنا دیا، یہ عجیب بات ہے، ان کے پنچ اٹھ کھڑے ہوئے کہ چلواوراپنے معبودوں پر جمے رہو، اس میں اس کی پیغمبر کی کوئی غرض ہے، ہم نے تو سابق مذہب میں یہ نہیں سنا یہ سب گھڑی ہوئی بات ہے۔''

﴿ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ ﴾

(۵۰/ قٓ:۲)

''بلکہ ان کوتعجب ہوا کہ ان ہی میں سے ایک ان کے پاس پیغمبر بن کر آیا، کافروں نے کہا: یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔''

صفاتِ الٰہی، آثارِ نبوت، احوالِ معادان میں سے ہر بات کوسن کر وہ اسی طرح سرتاپا حیرت بن جاتے تھے اور نبوت کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ انسان تو اس کے سزاوار نہیں اس منصب پر تو فرشتوں کوممتاز ہونا چاہیے تھا:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۲۱)

''اور جوایک دن ہمارے سامنے آنے کے منکر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ فرشتے پیغمبر بنا کر ہم پر کیوں نہ اتارے گئے۔''

﴿ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ ﴾ (۴۱/ حٰمٓ السجدۃ:۱۴)

''پیغمبر جب ان کے سامنے سے اور پیچھے سے آتے ہیں کہ ایک خدا کے سوا اور کسی کو نہ پوجو، تو وہ کہتے ہیں کہ خدا اگر کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو اتارتا، ہم تو تمہاری باتوں کا انکار ہی کریں گے۔''

﴿ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآء یل:۹۵)

''ہدایت آنے کے بعد صرف اس شبہ نے لوگوں کوایمان لانے سے باز رکھا ہے کہ کیا خدا نے

آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے جواب میں کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے بستے ہوتے تو البتہ ہم آسمان سے کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے۔''

نبی کا تخیل اگر ان کے ذہن میں کبھی آتا تھا تو بشریت سے ماورا صورت میں یعنی یہ کہ وہ انسانی ضروریات سے منزہ ہو، اس کے پیچھے خدا کا اور فرشتوں کا پرا ہو، آسمان اور زمین کے خزانے اس کے دست قدرت میں ہوں:

﴿ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآءیل:۹۰، ۹۳)

''انہوں نے کہا اے پیغمبر ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک زمین سے ہمارے لیے تو چشمہ نہ بہا دے، یا تیری ملکیت میں کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو، جن میں نہریں جاری کر دی ہوں یا جیسا کہ تو نے کہا ہم پر بادل کا کوئی ٹکڑا گرا دے، یا خدا اور فرشتوں کو پرا بنا کر نہ لے آئے یا تیرے پاس کوئی سونے کا گھر نہ ہو یا تو آسمان پر نہ چڑھ جائے۔''

﴿ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ ﴾

(۲۵/ الفرقان:۷، ۸)

''انہوں نے کہا یہ عجیب پیغمبر ہے، یہ تو کھاتا پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اترا جو اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا یا اس کے پاس کوئی خزانہ کیوں نہیں ڈال دیا گیا یا اس کے لیے خاص کوئی باغ ہوتا جس سے یہ کھاتا۔''

پیغمبر کے لیے ان کے خیال میں یہ بھی ضروری بات تھی کہ وہ بڑا دولت مند ہو، اس کے قبضہ میں کوئی بڑی جائیداد ہو، میوؤں کے ہرے بھرے باغ اور سونے چاندی کے خزانے اس کے پاس ہوں، چنانچہ گزشتہ آیت میں کفار کے اس خیال کی طرف بھی اشارہ ہے، اسی لیے مکہ اور طائف کے جو رؤسا دولت مند تھے وہ اس منصب کے سب سے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے:

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰي رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴾

(۴۳/ الزخرف:۳۱)

''وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا۔''

کسی کتاب کے نازل ہونے کے معنی ان کے خیال میں یہ تھے کہ آسمان سے کاغذوں میں ایک لکھی

لکھائی ترشی ترشائی جلد بندھی ہوئی ایک کتاب سب کے سامنے مجمع میں اتر آئے:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۳۲)

''کافروں نے کہا، اس پر قرآن یکبارگی کیوں نہیں اترا۔''

﴿ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۹۳)

''اور کافروں نے کہا ہم تیرے آسمان پر چڑھ جانے کے بھی اس وقت تک قائل نہیں ہوں گے، جب تک ہم پر کوئی ایسی کتاب نہ اتار لائے جس کو ہم لے کر پڑھنے لگیں۔''

﴿ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ ﴾ (۶/ الانعام:۷)

''اور اگر کاغذوں میں لکھا ہوا کوئی قرآن آسمان سے تم پر اترے جس کو تم اپنے ہاتھ سے ٹول بھی سکتے تو کافر یہی کہتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔''

غرض ایک آسمانی مذہب کی کیفیت سے بالکل بے خبر تھے۔ الوہیت اور صفاتِ الٰہی کے اسرار، نبوت کے خصائص، نزول کتاب کی حقیقت ہر چیز ان کے لیے حیرت اور استعجاب کا سرمایہ تھی:

﴿ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۶۸، ۶۹)

''کیا انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس وہ تعلیم آئی ہے جو ان کے اسلاف کے پاس نہیں آئی یا انہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا، تو اس کے منکر ہیں۔''

اس بنا پر عرب کے مشرکین اور کفار کو ایک مدت تک صدائے نبوت سے گوش آشنا ہونے کی حاجت تھی اور اس میں کئی برس صرف ہو گئے لیکن وہ لوگ جو اس صدا سے نامانوس نہ تھے ان تک آواز پہنچنے کی دیر تھی وہ سرتا پا لبیک تھے، حصہ اول میں گزر چکا ہے کہ سابقین اسلام عموماً وہی لوگ تھے جو اہل کتاب یا حنفا کے آغوش پروردہ تھے، اشخاص کے علاوہ قبائل کا بھی یہی حال تھا، مشرکین کلام الٰہی کا جواب خندۂ تحقیر سے دیتے تھے اور رموز نبوت کے دانا چشم پرنم اور دل پرکیف تھے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۝ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآءیل:۱۰۷، ۱۰۹)

''جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے (یہود و نصاریٰ) جب ان کو قرآن کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو منہ کے بل وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، ہم سے

(ایک پیغمبر آخرالزمان بھیجنے کا) جو وعدہ کیا تھا وہ ضرور پورا ہوا، رو کر وہ منہ کے بل گر پڑتے ہیں اور یہ ان کے خشوع کو اور بڑھاتا ہے۔''

﴿ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ ﴾

(٥/ المآئدۃ: ٨٢، ٨٣)

''ان میں سب سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ محبت رکھنے والے وہ ہیں جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں، سبب یہی ہے کہ ان میں قسیسین اور راہب ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے اور جب وہ کلام سنتے ہیں جو پیغمبر پر اترا ہے تو ان کی آنکھوں کو تو دیکھے گا کہ حق کو پہچان کر آنسو بہاتی ہیں اور کہتے ہیں کہ خدایا! ہم ایمان لائے ہم کو بھی حق کی شہادت دینے والوں میں لکھ لے۔''

مدینہ کے یہود جو اسلام سے سیاسی اور دینی کینہ اور تعصب رکھتے تھے اور اس بنا پر اسلام کے مقابلہ میں اپنی زبان سے اپنی کور باطنی کا اظہار وہ اپنا فرض سمجھتے تھے، تاہم چشم دل کو بینشِ حق سے باز نہیں رکھ سکتے تھے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰھُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاۗءَھُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (٢/ البقرۃ: ١٤٦)

''جن کو ہم کتاب دے چکے ہیں وہ اس پیغمبر کو اسی طرح پہچانتے ہیں، جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ جان کر حق پوشی کرتے ہیں۔''

﴿ وَلَمَّا جَاۗءَھُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَي الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ښ فَلَمَّا جَاۗءَھُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ ﴾ (٢/ البقرۃ: ٨٩)

''اور جب خدا کے پاس سے پیغمبر وہ کتاب لے کر آیا جو خود ان کی آسمانی کتابوں کو سچ کر رہی ہے، تو باوجود اس کے کہ وہ کافروں کو اس سے پہلے اسی کے نام سے دباتے تھے، اب حق پہچان کر اس کا انکار کرتے ہیں۔''

قرآن مجید کی شہادتوں سے قطع نظر کر کے اگر واقعات پر غور کیا جائے تب بھی یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی، مجرد دعوت حق سننے کے ساتھ جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو لبیک کہا ان کے حالات پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لیے صرف اثر پذیر دل اور ذوق آشنا نگاہوں کا جویاں ہے، حضرت سعید بن زید، عثمان بن مظعون، صہیب رومی، ابوذر غفاری، سلمان فارسی رضی اللہ عنہم وغیرہ جو سابقین اسلام ہیں اسی قسم کے لوگ تھے۔ ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ قریش کے مشرکین خدا کا کلام

تیرہ برس تک متصل سنتے رہے لیکن ان کے دل کی سنگینی میں کوئی فرق نہ آیا، ورقہ مکہ کا قریشی عیسائی صرف ایک بار قرآن سنتا ہے اور ناموس اکبر کی آواز پہچان لیتا ہے، مکہ کے مشرک ترپن (۵۳) برس تک آپ کے چہرہ پرنور کو دیکھتے رہے لیکن نورِ الٰہی کو نہ پہچان سکے اور عبداللہ بن سلام یہودی عالم نے صرف ایک دفعہ جمال پرانوار کو دیکھا اور پکار اٹھے کہ یہ حق کی تجلی ہے۔ رؤسائے قریش ہر روز اپنی آنکھوں سے نزول وحی کا تماشا دیکھتے ہیں اور جنبش نہیں کرتے، نجاشی حکومت کی مسند پر اور ہرقل شہنشاہی کے تخت پر بیٹھ کر غائبانہ کلام اللہ کی چند آیتیں سنتے ہیں اور تڑپ جاتے ہیں، قریش کے گھر یہ دولت خود اترتی ہے اور وہ اس کو ٹھکرا دیتے ہیں لیکن مدینہ سے بنی اسرائیل کے پڑوسی جوان کی زبان سے آخری نبوت کی بشارت سن چکے تھے اتفاقاً مکہ آتے ہیں اور اسی دولت ابدی کو اپنے گھر اٹھا لے جاتے ہیں، طائف کے سنگدل جاہل، نبی پر پتھر برساتے ہیں اور اس کی ہنسی اڑاتے ہیں اور نجران کے عیسائی عالم مناظرہ کی غرض سے مدینہ آتے ہیں لیکن چہرہ پر پیغمبری کی معصومیت دیکھ کر دہل جاتے ہیں اور صلح کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔

قریش اور حجاز کے راز نبوت کے نامحرم دعوتِ حق کا جواب اکیس برس تک تیغ و سنان سے دیتے ہیں، لیکن یثرب، ہجر، یمن، عمان، بحرین کے بڑے بڑے عیسائی اور عظیم الشان قبائل جو یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کے اثر سے ان رموز سے کس قدر آگاہ ہو چکے تھے وہ آوازِ حق پہنچنے کے ساتھ دفعتہً مسلمان تھے۔

آبائی دین و رسوم کی پابندی

ہر نئی تحریک کو غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس کے قبول کرنے میں جو چیز سب سے پہلے عائق ہوتی ہے وہ قومی رسم و رواج اور آبائی دین و مذہب کی پابندی ہے، انسانیت کے پاؤں میں اس سے بھاری کوئی زنجیر نہیں۔ دوست و آشنا کا چھوٹنا، ماں باپ سے علیحدگی، آل و اولاد سے کنارہ کشی، مال و جائداد سے دست برداری، جماعت کی مخالفت، قوم سے انقطاع اور وطن سے دوری ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو ہر انسان آسانی سے برداشت کر سکے۔ ملکی رسم و رواج کی دیرینہ محبت اور آبائی کیش و آئین کی موروثی الفت، حق و باطل کی تمیز اور نیک و بد کی پہچان کی حس مٹا دیتی ہے۔ عام دنیا کی فطری حالت کے علاوہ عرب کی قوم، قدامت پسندی اور قدیم حالت پر بقا اور استحکام میں خاص شہرت رکھتی ہے، دنیا کہاں سے کہاں بدلتی چلی گئی، پرانی سامی نسل کی بدویانہ خصوصیتیں جو توراۃ میں پڑھتے ہیں وہ تمام سامی قوموں سے مٹ گئیں مگر عرب میں اس وقت بھی نمایاں تھیں اور آج بھی نظر کے سامنے ہیں دینِ ابراہیم کے چند اصول حج، ختنہ اور قربانی وغیرہ ہزاروں برس کے بعد بھی عرب میں مٹ مٹا کر باقی رہ گئے تھے اور ان سے نہیں چھوٹے تھے ان کے شعر و شاعری اور فخر و مباہات کا سب سے پرجوش مضمون آباء و اجداد اور نام و نسب پر فخر و غرور تھا جس کو چھوڑنا ان کے نزدیک اپنی پرانی عزت و عظمت کی دیوار کو خود گرا دینا تھا۔

آنحضرت ﷺ نے جب مکہ میں دین حق کی منادی شروع کی تو اس کی شدید مخالفت جس بنا پر سب سے زیادہ کی گئی وہ یہی آبائی دین کے ترک کا مسئلہ تھا اور یہی دینِ جدید کے بطلان کی سب سے مستحکم دلیل ان کے پاس تھی، چنانچہ قرآن مجید نے بار باران کے اس قول کو دہرایا ہے اور اس کی لغویت کو ظاہر کیا ہے:

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۰)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم اس کی پیروی کریں گے جس پر اپنے باپ دادوں کو ہم نے پایا، کیا اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ نہ سمجھتے ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں (تب بھی)۔''

﴿ بَلْ قَالُوا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّهْتَدُونَ ۝ وَكَذَٰلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ ۝ قَالَ أَوَلَوْ جِئْتُكُم بِأَهْدَىٰ مِمَّا وَجَدتُّمْ عَلَيْهِ آبَاءَكُمْ ۖ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ۝ ﴾ (۴۳/ الزخرف:۲۲۔۲۴)

''بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم پر چل کر راہنمائی پائیں گے اور اسی طرح ہم نے اے پیغمبر تم سے پہلے کسی آبادی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، لیکن اس کے دولت مندوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم انہیں کے نقش قدم کے پیرو ہیں، کہو اے پیغمبر! کیا اگرچہ میں اس روش سے جس پر تم نے اپنے بزرگوں کو پایا زیادہ سیدھا راستہ لے کر تمہارے پاس کیوں نہ آؤں (تب بھی تم انہیں کی پیروی کرو گے) انہوں نے کہا کہ ہم تو (جو دے کر بھیجے گئے ہو) اس کا انکار ہی کرتے رہیں گے۔''

﴿ وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۲۸)

''اور جب وہ کوئی بے شرمی کی بات کرتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو اسی پر پایا اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے، کہہ دو اے پیغمبر کہ اللہ تو بے شرمی کی بات کا کبھی حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ پر وہ تہمت باندھتے ہو جو تم نہیں جانتے۔''

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۰۴)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کے پاس اور اس کے رسول کے پاس آؤ تو کہتے ہیں، ہم نے اپنے باپ دادوں کو جس پر پایا ہے، وہی ہم کو کافی ہے، کیا ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ سیدھے راستے پر ہوں (تب بھی وہ انہیں کی پیروی کریں گے؟)''

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ۝ ﴾ (۳۱/ لقمان: ۲۰، ۲۱)

''کچھ لوگ ایسے ہیں جو علم، ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر اللہ کے بارہ میں جھگڑا کرتے ہیں، اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں، بلکہ ہم اسی کی پیروی کریں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا اگرچہ ان کو شیطان دوزخ کے عذاب ہی کی طرف کیوں نہ پکارے (تو وہ اسی کی پیروی کریں گے)''

کفار کے یہ سوال و جواب خود ظاہر کرتے ہیں کہ ان کو اپنے آبائی رسوم کو چھوڑنا کس درجہ محال نظر آتا تھا، آپ ﷺ نے بعثت کے تین برس بعد جب بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع کی تو قریش کی عدالت میں آپ پر سب سے بڑا جرم یہی قائم کیا گیا کہ یہ خاندانی دیوتاؤں کی تحقیر، بزرگوں کی توہین اور آبائی رسم و رواج کی مذمت کرتے ہیں، مکہ میں جب آپ نے علی الاعلان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور بہت سے نیک لوگوں نے اس دعوت پر لبیک کہا تو قریش کے بڑے بڑے رئیسوں نے ابوطالب کے پاس جا کر آپ کے خلاف جو الزامات قائم کیے وہ یہ تھے ''اے ابوطالب! تمہارا بھتیجا ہمارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے، ہمارے مذہب کی توہین کرتا ہے، ہم کو بے وقوف اور نادان کہتا ہے اور ہمارے باپ دادوں کو گمراہ بتاتا ہے تو یا تو تم ان کو روکو، یا ہم کو اور اس کو چھوڑ دو کہ باہم سمجھ لیں۔''

یہ ان کی عدالت کا پہلا مطالبہ تھا۔ ابوطالب نے ان کو سمجھا بجھا کر واپس کیا تو کچھ دنوں کے بعد انہوں نے پھر اپنا مطالبہ ان الفاظ میں پیش کیا ''اے ابوطالب! تم نے اپنے بھتیجے کو اب تک منع نہیں کیا اب خدا کی قسم! ہم اپنے بزرگوں کی برائی، اپنی نادانی اور اپنے دیوتاؤں کی ہجو نہیں سن سکتے، تو یا تو اس کو باز رکھو اور یا ہم سے لڑنے پر آمادہ ہو جاؤ۔'' اس اعلان جنگ سے کام نہ چلا تو وہ تیسری دفعہ ابوطالب کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں: ''اے ابوطالب! ولید کا بیٹا عمارہ کیسا خوشرو جوان ہے تم اس کو متبنیٰ بنالو اور اپنے بھتیجے کو قتل کے لیے ہمارے حوالہ کر دو کہ اس نے تمہارے اور تمہارے بزرگوں کے دین و مذہب کی مخالفت کی ہے، تمہاری قوم کی جماعت کو پراگندہ کیا ہے اور ان کو بے وقوف اور نادان کہتا ہے۔'' سب سے آخری دفعہ قریش کے رئیسوں

نے خود آنحضرت ﷺ سے مل کر گفتگو کی اور کہا: ''اے محمد! تمہارے سوا کسی قوم میں کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جو اپنی قوم پر وہ مصیبت لایا ہو جو تم لائے ہو تم نے باپ دادوں کو برا کہا، ہمارے مذہب کی تحقیر کی، دیوتاؤں کو گالی دی ہم کو بے وقوف اور نادان بنایا اور جماعت میں تفرقہ ڈالا غرض کوئی ایسی برائی نہ تھی جو تم نے ہمارے ساتھ نہیں کی۔'' ❶

ان الزامات کی فہرست کی ایک ایک دفعہ پڑھو معلوم ہوگا کہ آبائی دین، موروثی رسم ورواج اور خاندانی دیوتاؤں کی غلامی سے آزاد ہونا ان پر کتنا بار تھا اور وہ اس جرم کو کتنا سنگین سمجھتے تھے۔ موسم حج میں آنحضرت ﷺ جب لوگوں کے پاس جا جا کر توحید کا پیغام سناتے تھے تو ابولہب آپ کے اثر کو باطل کرنے کے لیے آپ کی تقریر کے بعد آپ کے پیچھے پیچھے صرف یہ کہتا جاتا تھا کہ ''لوگو! یہ وہی ہے جو تم کو تمہارے باپ دادوں کے مذہب سے برگشتہ کرتا پھرتا ہے۔'' ❷

ابوطالب جنہوں نے ہر موقع پر آنحضرت ﷺ کی حمایت کی اور وہ آپ کو اپنے دل و جان سے عزیز رکھتے تھے وہ بھی آپ کی دعوت حق کو اپنے آبائی دین کے مقابلہ پر پذیرائی کے قابل نہ سمجھتے تھے، بھتیجے نے بار بار کہا: ''چچا جان! کلمہ شہادت ایک دفعہ پڑھ لیجئے کہ قیامت میں آپ کی شفاعت کی ایک سند مجھے ہاتھ آجائے۔'' ابوطالب نے جواب دیا: ''جان پدر! سب کچھ تم پر نثار لیکن بزرگوں کے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتا۔'' عین اس وقت جب ابوطالب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اور نزع کی حالت تھی آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ ''چچا جان لا الہ الا اللہ کہہ دیجئے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں۔'' ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ جو ان کے پاس بیٹھے تھے کہا: ''ابوطالب! کیا تم (اپنے باپ) عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے۔'' آپ بار بار لا الہ الا اللہ پڑھنے کی درخواست کرتے تھے اور یہ دونوں ان کو وہی عبدالمطلب کے دین سے علیحدگی پر شرم دلاتے تھے، بالآخر ابوطالب نے یہی کہا کہ ''میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں۔'' اور لا الہ الا اللہ نہیں کہا، یہ صحیح بخاری کی روایت ہے، ❸ صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے کہ ابوطالب نے کہا کہ ''اے بھتیجے! جو فقرہ تم کہتے ہو میں کہہ کر تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا لیکن قریش کہیں گے کہ ابوطالب موت سے ڈر گیا۔'' ❹ ابن اسحاق میں ہے کہ انہوں نے آہستہ سے وہ فقرہ کہہ دیا ❺ بہرحال اس واقعہ سے جو دکھانا ہے وہ یہ ہے کہ اس حالت میں بھی مخالفین کے پاس باز رکھنے کے لیے اس سے زیادہ پر زور اور پر اثر دلیل نہ تھی کہ ''ابوطالب! کیا آبائی مذہب چھوڑ دو گے؟'' اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام کی اشاعت کے راستہ میں یہ تخیل کتنا بڑا پتھر تھا۔

❶ یہ تمام واقعات ابن اسحاق اور سیرت کی تمام کتابوں میں بتفصیل مذکور ہیں۔ ملاحظہ ہوں سیرۃ ابن ہشام، ج ۱، ص: ۲۵۲۔
❷ مستدرك حاكم، ج ۱، ص: ۱۵ كتاب الايمان۔ ❸ صحيح بخاری، كتاب الجنائز، باب اذا قال المشرك عند الموت لا اله الا الله: ۱۳۶۰۔ ❹ صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب الدليل على صحة الاسلام من حضره الموت ...... الخ: ۱۳۵۔ ❺ ابن هشام وفات ابی طالب، ذكر الاسراء والمعراج، ج ۱، ص: ۲۵۳۔

توہم پرستی

عرب کی اصلاح و ہدایت کی راہ میں ایک اور عائق عرب کی توہم پرستی تھی، ہر قوم میں جاہلوں کا جس طرح یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ فلاں دیوتا یا فلاں پیر کے خلاف اگر زبان سے کچھ نکلا تو فوراً بلائیں آ کر ہم کو لپٹ جائیں گی، عرب میں گھر گھر سینکڑوں بت اور صنم خانے تھے، دنیا کے تمام کام انہیں اصنام اور بتوں سے متعلق سمجھے جاتے تھے، مدتوں سے یہ خیال راسخ چلا آتا تھا کہ فلاں بت کی پرستش یا خدمت گزاری میں اگر کوتاہی کی گئی تو آسمان سے پانی برسنا بند ہو جائے گا، فرزند نرینہ پیدا نہ ہوگا، باغوں میں پھل نہ آئیں گے، اسی بنا پر اسلام کے نام سے ان کو لرزہ آتا تھا اور یہ تخیل صرف اسی وقت پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ ایک مدت سے عرب میں چلا آتا تھا۔ حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں ثمود نے کہا:

﴿ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ۭ ﴾ ❶ (۱۱/ ھود:۵٤)

''ہم تو اس کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے کہ ہمارے کسی دیوتا نے تم کو آ کے ستایا ہے۔''

ابتدا میں جب آنحضرت ﷺ نے بتوں کے خلاف وعظ کہنا شروع کیا تو اکثر لوگوں نے (نعوذ باللہ) پاگل سمجھ لیا ❷ جاہلیت کے زمانہ کے بعض کافر احباب ہمدردی کی راہ سے جھاڑ پھونک کرنے آئے ❸ ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے وہ مسلمان ہو کر اپنے قبیلہ میں جب واپس گئے اور لات و عزیٰ کی مذمت شروع کی تو تمام قبیلہ خوف سے کانپ گیا کہ ''ضمام! ان کو برا نہ کہو، دیکھو کہیں تم کو برص، جنون یا جذام نہ ہو جائے۔'' ❹ حضرت زنیرہ رضی اللہ عنہا مسلمان ہونے کے بعد بصارت سے محروم ہو گئی تھیں، کفار نے کہنا شروع کیا ''لات و عزیٰ نے ان کو اندھا کر دیا ہے۔'' ❺ حضرت طفیل بن عمرو دوسی مسلمان ہو کر جب اپنے وطن تشریف لے گئے اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: ''دیکھو ذو الشریٰ (بت) کہیں برباد نہ کر دے۔'' ❻

فتح مکہ کے بعد جبکہ دیوتاؤں کے زور و قوت کا راز افشا ہو چکا تھا اور اکثر قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا تاہم لات، عزیٰ، منات، ذی الکفین، سواع کے بت خانوں کو وہ اپنے ہاتھ سے نہ توڑ سکے۔ خاص مدینہ سے راسخ الایمان مسلمان بھیجے گئے جنہوں نے اس فرض کو انجام دیا۔ پوجاریوں نے کوئی مزاحمت نہ کی وہ سمجھتے تھے کہ ان دیوتاؤں کو کون توڑ سکتا ہے جو اس گستاخی کا ارادہ کرے گا وہ خود تباہ و برباد ہو جائے گا۔ ❼

---

❶ ابن کثیر تفسیر سورۃ ھود، (آیت مذکور، ج۲، ص:۴۴۹) زمخشری، ۸، ص:۶۱۷؛ ابن حیان، ج۵، ص:۳۳، بغوی وغیرہ تمام مفسرین نے لکھا ہے۔ ❷ دیکھو تفسیر ابن کثیر، ج۴، ص:۴۰۲ تفسیر آیت ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝﴾ ونیز ﴿ما بصاحبهم من جنة﴾ صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفیف الصلوة والخطبة:۲۰۰۸۔ ❸ صحیح مسلم، باب تخفیف الصلوة والخطبة:۲۰۰۸۔ ❹ دارمی، کتاب الصلوة، باب فرض الوضوء والصلوة:٦٥٢۔ ❺ اسد الغابه، ترجمه حضرت زنیره، ج٥، ص:٤٦٢ وسیرة ابن هشام ذکر عدوان المشرکین علی المستضعفین، ج١، ص:١٩٥ ❻ اسد الغابة ذکر طفیل بن عمرو دوسی، ج٣، ص:٥٤؛ سیرت ابن هشام، ج١، ص:٢٣٣۔ ❼ ابن سعد جز ثانی، قسم اول، ص:٩٩ وطبری ذکر هدم اصنام، ج٣، ص:١٦٤٨۔

تو ہم پرستوں میں کسی مذہب کی صحت و بطلان کی دلیل شواہد عقلی نہیں بلکہ دنیا کے ظاہری، مادی فوائد اور جانی و مالی خیر و برکت ہوتی ہے، لیکن قوانین گاہ عالم میں ایک مذہب پرست بھی اسی طرح آلام ومصائب میں گرفتار ہوسکتا ہے جس طرح ایک غیر مسلم، عرب کے بدو اور اعراب ابتداءً مسلمان ہونے کی ہمت بھی کرتے تھے تو معاً یہ توقع بھی کر لیتے تھے کہ اب وہ ہر قسم کے آفات ارضی وسماوی سے محفوظ ہیں اس بنا پر اگر کبھی ان کی اس توقع کو صدمہ پہنچتا تو دفعتہً وہ متزلزل ہو جاتے تھے۔ صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے: 1

كان الرجل يقدم المدينة فيسلم فان ولدت امرأته غلاما ونتجت خيله قال هذا دين صالح وان لم تلد امرأته ولم تنتج خيله قال هذا دين سوء۔

”باہر کا جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ آتا تھا اس کی یہ حالت تھی کہ اگر اس کی بیوی لڑکا جنتی اور اس کی گھوڑی بچہ دیتی تو وہ کہتا کہ یہ نہایت عمدہ مذہب ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو کہتا یہ نہایت برا مذہب ہے۔“

قرآن مجید کی یہ آیت اسی قسم کے لوگوں کی شان میں نازل ہوئی: 2

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اِطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ اِنْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ ﴾ (۲۲/ الحج:۱۱)

”اور بعض لوگ وہ ہیں جو خدا کی بندگی کنارہ پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں (یعنی دل سے نہیں کرتے) اگر ان کو فائدہ پہنچے تو ان کو اطمینان ہو جاتا ہے، لیکن اگر مبتلائے مصیبت ہوئے تو فوراً روبرگشتہ ہو جاتے ہیں۔“

ہجرت کے بعد جب مسلمان مدینہ آئے تو اتفاق سے ایک عرصہ تک کسی مسلمان گھرانے میں کوئی لڑکا پیدا نہ ہوا تو دشمن اس واقعہ کو اپنی بددعاؤں کا نتیجہ سمجھتے تھے اور خوش ہوتے تھے، آخر چھ مہینے کے بعد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو مسلمان بے انتہا مسرور ہوئے۔ 3 سوئے اتفاق یہ کہ اول اول جو لوگ مدینہ میں آتے تھے ان کو وہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی تھی، ابتدائے ہجرت میں حضرت ابوبکر و حضرت بلال رضی اللہ عنہما آئے تو سخت بیمار ہو گئے 4 حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ نے جب مدینہ کو ہجرت کی تو ان کو بھی مدینہ کی آب و ہوا ناموافق ہوئی 5 اگرچہ مخلصین ارباب فہم پر اس قسم کی عارضی ناگواریوں کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا تاہم عام لوگ جن کی وہم پرستی فطرت ثانیہ ہو گئی تھی وہ اس قسم کے اتفاقی واقعات سے بے حد متاثر ہوتے تھے، چنانچہ جب عکل و عرینہ کے چند لوگوں نے مدینہ میں آکر اسلام قبول کیا اور آب و ہوا کی ناموافقت کے

1 تفسير سورة الحج:٤٧٤٢۔ 2 ايضاً۔

3 مستدرك حاكم، ج ٣، ص: ٥٤٨ واصابه ذكر عبدالله بن زبير، ج ٤، ص: ٦٩۔

4 صحيح بخاري، كتاب المرضى، باب عيادة النسآء الرجال:٥٦٥٤ وباب مقدم النبي ﷺ المدينة:٣٩٢٦۔

5 صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب الدليل على ان قاتل نفسه لا يكفر:٣١١۔

سبب سے بیمار ہو گئے اور آنحضرت ﷺ نے تبدیل آب و ہوا کی غرض سے ان کو اونٹوں کی چراگاہ میں بھیج دیا تو گو وہ صحیح ہو گئے تاہم مرتد ہو گئے ❶ اسی طرح ایک بدو نے آ کر آپ کے دست مبارک پر بیعت کی لیکن سوئے اتفاق سے دوسرے دن بخار میں مبتلا ہوا تو اپنی بیعت توڑنی چاہی آپ ﷺ نے تین بار منع فرمایا لیکن اس نے اصرار سے آخر بیعت فسخ کر دی، تو آپ نے ﷺ فرمایا: ❷

((المدینة کالکیر تنفی خبثها و تنصع طیبها))

''مدینہ آگ کی بھٹی ہے جو میل کو الگ کر دیتا ہے اور حقیقی جوہر کو خالص کر دیتا ہے۔''

انہی اسباب کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے مدینہ کے متعلق یہ دعا فرمائی:

((اللّٰھم حبب الینا المدینة کحبنا مکة او اشد اللّٰھم و صححها و بارك لنا فی مدها و صاعها و انقل حماها فا جعلها بالجحفة)) ❸

''خداوند مکہ کی طرح یا اس سے زیادہ ہمارے لیے مدینہ کو محبوب بنا دے، اس کو امراض سے صحیح کر دے اس کے پیمانے میں برکت دے اور اس کے بخار کو جحفہ میں منتقل کر دے۔''

قبائل کی خانہ جنگیاں

اسلام کی اشاعت کا ایک بڑا مانع عرب کی باہمی خانہ جنگیاں تھیں جو عرب کے خصائص قومی کا عنصر اعظم بن گئی تھیں، یہ خانہ جنگیاں ہزاروں برس سے چلی آتی تھیں اور ان کی وجہ سے قبائل میں ایسے مستمر اور ثابت الاساس انتقامی جذبات پیدا ہو گئے تھے جن کا مٹنا قریباً محال تھا، انہی لڑائیوں نے ثار (انتقامِ خون) کی رسم پیدا کر دی تھی جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور یہ رسم ایسی سخت اور شدید الاثر تھی کہ ایک شخص کے خون کے لیے قبیلہ کا قبیلہ مٹ جاتا تھا۔ ہزاروں برس کے خون قومی قرض کی طرح باقی چلے آتے تھے جو درج رجسٹر ہوتے رہتے تھے اور بچہ بچہ کی زبان پر ہوتے تھے جو بچہ پیدا ہوتا تھا وہ ہوش سنبھالنے کے وقت سب سے پہلے ''ثار'' کا لفظ سنتا تھا یعنی خاندان میں فلاں شخص قتل کیا گیا ہے اور اس کے خون کا انتقام اب تک باقی ہے، اس لیے بچہ بچہ کا نصب العین ابتدائے زندگی سے یہی ''ثار'' ہوتا تھا۔

اس بنا پر ایک شخص یا ایک خاندان جس خلوص اور عقیدت مندی کے ساتھ اسلام کی طرف جھکتا تھا معاً اسی زور اور قوت کے ساتھ دوسرا فریق اسلام کی مخالفت اور اس سے سرکشی پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ مکہ میں اسلام کی مخالفت کا صرف یہی راز تھا کہ خدا نے نبوت کے لیے ہاشم کا گھرانہ چن لیا تھا، بنو امیہ کی مخالفت اس کے لیے لامحالہ ہوتی تھی۔ مدینہ میں اوس و خزرج دو قبیلے تھے، اسلام سے پہلے دونوں لڑ لڑ کر تھک گئے تھے، اسلام کی آواز آئی تو

❶ صحیح بخاری، کتاب المحاربین، باب لم یسق المرتدون المحاربون حتی ماتوا: ٦٨٠٤۔

❷ صحیح بخاری، کتاب فضائل المدینة، باب المدینة تنفی الخبث:١٨٨٣ وباب اعتصام السنة:٧٣٢٢۔

❸ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب مقدم النبی ﷺ المدینة:٣٩٢٦۔

گو دونوں نے ایک ساتھ لبیک کہا تاہم قبیلہ اوس کا ایک ایک فرد اگر ہمہ تن اخلاص و جوش تھا تو خزرج میں بیسیوں منافق تھے، انتہا یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں ہجرت سے پہلے دونوں قبیلوں کی نماز کی امامت کے لیے باہر سے ایک تیسرے قبیلہ کا آدمی بلوایا گیا تھا کہ خدا کے سامنے بھی ایک کو دوسرے کے پیچھے کھڑے ہونے سے عار تھا۔ ❶

خزاعہ اور بنو بکر باہم شدید دشمن تھے اور ان میں پرانی عداوت چلی آتی تھی مدینہ آنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کو صلح کا پیام اور اسلام کی دعوت دی۔ خزاعہ نے اسلام کی دعوت قبول کی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے۔

خوب غور کرو کہ انصار اسلام لا کر ہمہ تن نیکو کاری اور پاکیزہ نفسی کے پیکر بن گئے لیکن ثار کے جذبات کس طرح آسانی سے دفعتہً مشتعل ہو جاتے تھے، ایک موقع پر ایک یہودی نے جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑ دیا تو انصار کے دونوں قبیلوں (اوس اور خزرج) کی تلواریں میان سے نکل آئیں ❷ اور بڑی مشکل سے آنحضرت ﷺ نے ان کے جوش کو فرو کیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ افک میں جب آنحضرت ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر اس کی شکایت کی اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا، یا رسول اللہ ﷺ! اگر وہ تہمت لگانے والا ہمارے قبیلہ کا ہے تو میں اس کی گردن اڑا دیتا ہوں، اگر ہمارے بھائی خزرج کے قبیلہ سے ہے تو آپ حکم دیں میں بجا لاؤں گا، اس پر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ جو قبیلہ خزرج کے رئیس تھے، دفعتہً کھڑے ہو گئے اور کہا:

كذبت لعمر الله لا تقتله ولا تقدر على قتله ولو كان من رهطك ما احببت ان يقتل۔

''خدا کی قسم! تو جھوٹ کہتا ہے، تو اس کو قتل نہ کرے گا، نہ کر سکتا ہے اور وہ شخص اگر تیرے قبیلہ کا ہوتا تو اس کا قتل کیا جانا پسند نہ کرتا۔''

اس پر اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے، چنانچہ صحیح بخاری حدیث افک میں ہے:

فثار الحيان الاوس والخزرج حتى هَمُّوْا ان يقتتلوا ورسول الله قائم على المنبر ❸۔

''پس دونوں قبیلے اوس اور خزرج مشتعل ہو گئے یہاں تک کہ دونوں کشت و خون پر آمادہ ہو گئے اور آنحضرت ﷺ اس وقت منبر پر کھڑے تھے۔''

---

❶ ابن هشام ذكر بيعت عقبه عرض رسول الله ﷺ نفسه على القبائل، ج ١ ص: ٢٦١۔ ❷ اصابه تذكره اوس بن قطبی، ج ١، ص: ٨٨؛ معجم صغير طبرانی میں بھی ایک اور اسی قسم کا واقعہ مذکور ہے، معجم عبداللہ، ص: ۱۲۴۔
❸ صحيح بخاری، كتاب المغازی، باب حديث الافك: ٤١٤١۔

ایک بار محلم بن جثامہ لیثی نے عہد اسلام میں قبیلہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر ڈالا، آنحضرت ﷺ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا، قبائل کے تعلقات کی بنا پر عیینہ نے مقتول اور اقرع بن حابس نے قاتل کی طرف سے وکالت کی اور بات بڑھی اور سخت شور وشغب ہوا تو آپ ﷺ نے عیینہ سے فرمایا: ''دیت کیوں نہیں قبول کر لیتے؟'' اس نے کہا: ''خدا کی قسم! اس وقت تک دیت نہ قبول کروں گا جب تک اس کی بیویوں کو اس قدر نہ ستا لوں جس قدر اس نے ہماری بیویوں کو ستایا ہے۔'' اس پر شور وغل ہوا آپ نے پھر یہی الفاظ دہرائے اور عیینہ نے وہی پہلا جواب دیا چونکہ یہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا اور قتل کا یہ پہلا مقدمہ تھا جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تھا اس لیے قبیلہ بنولیث کے ایک شخص نے جو مسلح کھڑا تھا کہا کہ ابتدائے اسلام میں اس واقعہ کی مثال بکری کے اس ریوڑ کی سی ہے کہ اس کے پہلے حصہ کو تیر مارا گیا تو دوسرا بدک کے بھاگ گیا یعنی اگر قاتل کے موافق فیصلہ کیا گیا تو لوگ سمجھیں گے کہ اسلام قصاص کو دیت سے بدل دینا چاہتا ہے اور چونکہ دلوں میں اب تک انتقام کے جذبات تازہ ہیں اور لوگ دیت لینا پسند نہیں کرتے اس لیے ان کو اسلام کے قبول کرنے میں تامل ہوگا، لیکن آنحضرت ﷺ چونکہ سفر میں تھے اس لیے دیت میں ۵۰ اونٹ اسی وقت دیے اور مدینہ پہنچ کر ۵۰ اونٹ کا وعدہ فرمایا۔ [1] اہل عرب میں یہ جذبہ اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ گو آپ نے فتح مکہ میں امن عام کی منادی کر دی اور تلوار کو میان میں کر لینے کا حکم دیا تاہم انتقام کا جوش اب تک تازہ تھا۔

قبیلہ ہذیل کا ایک شخص اسلام لانے کی غرض سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جا رہا تھا اس نے زمانہ جاہلیت میں قبیلہ خزاعہ کا کوئی جرم کیا تھا وہ لوگ انتقام کے لیے اس کو ڈھونڈ رہے تھے سوئے اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا اور ان لوگوں نے اس کو فوراً قتل کر دیا کہ اگر بارگاہ نبوت میں وہ پہنچ گیا تو پھر اس کا موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ آپ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئے۔ ان لوگوں نے حضرت عمر، حضرت ابوبکر، حضرت علی رضی اللہ عنہم سے سفارش کی درخواست کی، آنحضرت ﷺ نے نماز کے بعد ایک خطبہ دیا جس کے الفاظ یہ تھے:

> ''خدا نے مکہ کو دارالحرام بنایا ہے، آدمیوں نے نہیں بنایا ہے، خدا نے کل چند گھنٹوں کے لیے اس کو میرے لیے حلال کر دیا تھا لیکن آج اس کی قدیم حرمت دوبارہ لوٹ آئی ہے اور خدا کے سب سے نافرمان بندے تین آدمی ہیں ایک وہ جس نے حدود حرم میں کسی کو قتل کیا، دوسرا وہ جس نے اپنے قاتل کے سوا کسی دوسرے شخص کو مار ڈالا، تیسرا وہ جس نے زمانہ جاہلیت کا انتقام لیا، تم نے جس شخص کو قتل کر ڈالا ہے میں اس کی دیت دوں گا۔''

چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی دیت ادا فرمائی۔ [2]

بنوثعلبہ کے ایک آدمی نے جاہلیت میں اوس وخزرج کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا، بنوثعلبہ اسلام لا کر

[1] ابو داود، کتاب الدیات، باب الامام یأمر بالعفو فی الدم: ٤٥٠٣۔

[2] مسند امام احمد بن حنبل، ج ٤، ص: ٣١۔

جب مدینہ آئے تو آنحضرت ﷺ خطبہ دے رہے تھے، ایک انصاری بے اختیار چلا اٹھے کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ ہمارے مجرم ہیں ان سے قصاص دلوایئے، آنحضرت ﷺ نے ہاتھ اٹھا کر فرمایا: ((الا لا یجنی والد علی ولدہ)) 1 یعنی "لڑکے کے جرم کا بدلہ باپ سے نہیں لیا جائے گا۔"

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ثار کا جذبہ کس طرح رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا اور اس جذبہ کا مشتعل ہو جانا کس قدر آسان ہوتا تھا۔

خانہ جنگیوں پر ختم نہیں، یوں بھی تمام قبائل رقیب اور حریف مقابل تھے دو مختلف قبیلوں کے آدمیوں میں کسی ذاتی معاملہ پر بھی نزاع ہو جاتی تھی اور ان میں کوئی اپنے قبیلہ کا نام پکارتا تھا تو قومی جنگ کا سامان ہو جاتا تھا، ایک دفعہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپڑ مار دیا انصاری نے یا للانصار (انصار کی دہائی) پکارا، مہاجر نے بھی یاللمہاجرین (مہاجرین کی دہائی) کا نعرہ مارا، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی آپ نے نکل کر فرمایا کہ "یہ کیا جہالت کی پکار ہے۔"

((مابال دعوی الجاھلیة)) 2 "یہ کیا جہالت کا دعویٰ ہے۔"

لوگوں کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعلِ شنیع کا سخت دشمن ہے اس لیے جب تک وہ اپنا انتقام نہ لے لیتے ان کو اسلام لانے میں تامل ہوتا تھا۔ عمرو بن اقیش ایک صاحب تھے وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام سے متاثر اور اس کے قبول کرنے کے لیے ہر طرح آمادہ تھے لیکن ایک عائق تھا جو اس راہ میں حائل تھا یعنی ثار، وہ جانتے تھے کہ اسلام لا کر اس خاندانی فرض کے ادا کرنے کی ان کو اجازت نہیں مل سکتی۔ ابن مندہ نے ان کے حال میں لکھا ہے:

وکان له ثار فی الجاھلیة وکرہ ان یسلم حتی یأخذہ۔ 3

"ان کا انتقام زمانہ جاہلیت میں باقی رہ گیا تھا جب تک وہ نہ لے لیں انہوں نے مسلمان ہونا پسند نہ کیا۔"

اسی طرح حضرت عمرو بن مالک رضی اللہ عنہ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور اسلام کی دعوت دی تو قبیلہ والوں نے کہا بنوعقیل پر ہمارا ثار (انتقام) باقی ہے، وہ لے لیں تو اسلام لائیں، چنانچہ انہوں نے اسی وقت بنوعقیل پر جو مسلمان ہو چکے تھے حملہ کیا اور اس فرض سے سبکدوش ہوئے۔ 4

سیاسی مشکلات

جہالت، وحشت، پابندیٔ رسوم، آبائی اثر وغیرہ وغیرہ ان میں سے ایک چیز بھی مانع اصلاح نہ ہوتی،

1 دارقطنی، کتاب البیوع، ۳/ ٤٤: ۲۹۵۷۔
2 صحیح بخاری، کتاب المناقب باب ما ینھی من دعوی الجاھلیة: ۳۵۱۸۔
3 اسد الغابة، ج ٤، ص: ۸۵۔ 4 اصابه فی تمییز الصحابة ذکر عمرو بن مالك، ج ۳، ص: ۱۳۔

تاہم صرف سیاسی اسباب ایسے جمع تھے کہ قریش یا دیگر قبائلِ عرب کبھی اسلام کے آگے سر نہیں جھکا سکتے تھے، مکہ میں دو خاندان برابر کے رقیب تھے، امیہ اور ہاشم اور آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے امیہ کا پلہ ترجیح علانیہ گراں ہو چکا تھا، آنحضرت ﷺ نے جب نبوت کا اظہار کیا تو سب سے پہلے امیہ کے خاندان نے سرکشی کی اور فتح مکہ تک یہی خاندان تھا جو تمام لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا علم بردار تھا، بنوامیہ کے بعد اور دوسرے خاندان بھی تھے وہ بھی حرم کے مناصبِ دہ گانہ (رفادہ وغیرہ) کے ممتاز حصہ دار تھے، ان میں سے ہر ایک دیکھ رہا تھا کہ اس جدید انقلاب میں ان فوائد اور اقتدار کا بالکل خاتمہ ہے ابوجہل سے جب ایک شخص نے کہا کہ ''محمد کی دعوت اسلام کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے'' تو اس نے صاف کہا کہ ''میں کیا کہوں محمد ﷺ کے خاندان نے عزت و شرف میں برتری کا دعویٰ کیا اور ثبوت میں دعوتیں کھلائیں، اس کے جواب میں ہم نے اسی شان سے دعوتیں دیں، انہوں نے خون بہا دیے ہم نے بھی خون بہا دیے، انہوں نے زر پاشیاں کیں ہم نے بھی کیں، ہم دونوں دوش بدوش ہو چکے تھے کہ دفعتہً ان کی طرف سے یہ دعویٰ پیش ہوا کہ ہمارے خاندان میں نبوت اور آسمان سے وحی بھی آ گئی، اب ہم کہاں تک برداشت کریں، خدا کی قسم! ہم کبھی محمد ﷺ پر ایمان نہیں لا سکتے۔'' [1] یہی ابوجہل جب انصار کے ہاتھ سے قتل ہوا تو اس نے مرتے وقت حسرت سے کہا کہ کاش مجھ کو کاشتکاروں کے سوا کسی اور قوم نے قتل کیا ہوتا۔ [2]

خوب غور سے دیکھو بدر، احد، حمراء الاسد، احزاب وغیرہ تمام لڑائیوں میں یہی اموی عنصر تھا جو کام کرتا تھا، قریش کے قبیلہ سے باہر جو بڑے بڑے قبیلے تھے، مثلاً: غطفان اور اسد وغیرہ وہ یا اہل مکہ ہی کے خاندان کی کوئی شاخ تھی یا قریش کے حلیف وہم عہد تھے، خیبر میں یہود تھے جو قوم کے لحاظ سے قریش سے الگ تھے لیکن عرب تجارتی حیثیت سے تمام تر انہی یہودیوں کے زیر بار تھے، انہی سے قرض دام لیتے تھے، انہی کے ہاں مال و متاع رہن رکھتے تھے [3] خیبر اور غطفان ایک مدتِ دراز سے باہم حلیف تھے اس طرح مکہ سے لے کر خیبر اور نجد تک تمام عرب ایک سلسلہ اتحاد میں مربوط تھا۔

کعبہ تمام عرب میں قبلہ گاہِ اعظم تھا، ہر سال تمام ملک حج کرنے کے لیے آتا تھا اور آستانۂ کعبہ پر سر جھکاتا تھا، کعبہ کے مجاور معمولی پنڈوے نہ تھے بلکہ خیمہ وخرگاہ، تیغ وسپر، جاہ و حشم غرض ریاست و امارت کے تمام تر سروسامان رکھتے تھے، اس لیے تمام عرب میں ان کی شہنشاہی قائم تھی یہی بات ہے کہ جب تک مکہ فتح نہ ہوا اسلام چین سے نہیں بیٹھ سکا لیکن اسلام کی مخالفت، صرف قریش کی متابعت پر محدود نہ تھی بلکہ بڑا سبب یہ تھا کہ اسلام سے خاص قریش کو جو نقصان پہنچ سکتا تھا براہ راست وہی تمام رؤسائے قبائل کو پہنچتا تھا۔ عرب کا ملکی نظام یہ تھا کہ تمام ملک میں قبائل پھیلے ہوئے تھے اور ہر قبیلہ کا ایک رئیس اعظم ہوتا تھا جو تمام قبیلہ پر حکمران ہوتا تھا اور

[1] ابن ہشام، حصہ اول، ص: ۱۹۳ اسلام حمزہ۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل ابی جہل: ۳۹۶۲، ۳۹۶۳، ۴۰۲۰۔ [3] طبری واقعہ خیبر، ج ۳، ص: ۱۵۷۵۔

مال غنیمت سے چوتھ وصول کرتا تھا جس کو ''مرباع'' کہتے تھے، اس کے علاوہ غنائم میں سے جو عورت یا اور کوئی عمدہ چیز اس کو پسند آ جاتی تھی اس کو چھانٹ لیتا تھا اس کا نام ''صفی'' تھا یہ گویا چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں، جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ ریاست خاندانی اصول پر چلتی تھی، باپ کے مرنے کے بعد بیٹا رئیس منتخب ہوتا تھا، قبیلہ کے تمام معاملات، ذاتی نزاعیں، قصاص یا خون بہا کے فیصلے سب رئیس کے ہاتھ میں فیصل ہوتے تھے۔ یہ رؤسا عام قوم سے بہت سے حقوق میں ممتاز ہوتے تھے۔ قبائل میں یہی امتیازِ مراتب تھا کہ جو قبائل زیادہ شریف مانے جاتے تھے ان میں سے ایک آدمی کو اگر کوئی دوسرا قبیلہ قتل کر دیتا تھا تو اس کا خون دوسرے قبیلہ کے دو خون کے برابر سمجھا جاتا تھا اور اس لیے ایک کے بدلہ میں دو کو قتل کرتے تھے، یہ امتیاز اور فرق مراتب اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ جب غزوۂ بدر میں قریش کی فوج سے عتبہ وشیبہ میدان میں آئے اور مبارز طلب ہوئے اور انصار ان کے مقابلہ کو نکلے تو عتبہ نے اس بنا پر اس کے مقابلہ سے انکار کر دیا کہ قریش اور انصار کا جوڑ نہیں۔ [1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جبلہ بن الایہم خاندان غسان کا اخیر فرمانروا اسلام لایا اور مکہ میں آیا۔ ایک دن طواف میں اس کی چادر کسی شخص کے پاؤں کے نیچے آ گئی، جبلہ نے اس کے گال پر تھپڑ کھینچ مارا اس نے بھی برابر کا جواب دیا، جبلہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر شکایت کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واقعہ سن کر کہا، اس کا کیا قصور تم نے جو کیا اس کی جزا پائی، جبلہ نے کہا یہ میرا رتبہ ہے کہ کوئی مجھ پر ہاتھ اٹھاتا تو قتل کر دیا جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں زمانہ جاہلیت میں یہی قاعدہ تھا لیکن اسلام نے اس کا خاتمہ کر دیا، جبلہ نے کہا: جو مذہب شرفا کو ذلیل کر دیتا ہے، میں اس سے باز آتا ہوں۔ یہ کہہ کر چوری سے روم چلا گیا اور عیسائی ہو گیا۔ [2]

عرب کا ہر رئیسِ قبیلہ درحقیقت جبلہ تھا اور اسلام قبول کرنے کے وقت اس کو یہی منظر نظر آتا تھا، اسلام ان تمام واقعات اور خصوصیات کو مٹاتا تھا اس کے دربار میں شاہ وگدا، رئیس وعامی، شریف وحقیر کا ایک ہی درجہ تھا اس لیے عرب میں تمام رؤسائے قبائل کو صاف نظر آتا تھا کہ اسلام کا پھیلنا ان کے ہر قسم کے فخر وامتیاز کا مٹ جانا ہے۔

عرب میں ایک دوسری حریف طاقت یہودیوں کی تھی جو حجاز سے لے کر شام کے دروازوں تک پھیلے تھے ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے مضبوط قلعے تھے، فن جنگ سے واقف تھے، سامان واسلحہ وافر رکھتے تھے، دولت کی بہتات تھی، باغوں اور زمینوں پر ان کا قبضہ تھا، عرب کے تمام مادی ذرائع معاش کے وہ تنہا اجارہ دار تھے پھر اسلام آیا تو اس طرح کہ اس نے یہودیوں کی ایک ایک برائی کو طشت ازبام کیا اور ان کے مذہبی وقار کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا اس لیے انہیں صاف نظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں جڑ پکڑ کر ان کو بیخ وبنیاد سے اکھاڑ دے گی، چنانچہ قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع اور یثرب، خیبر، فدک، تیماء، وادی القریٰ وغیرہ کے

---

[1] ابوداود، کتاب الجهاد، باب في المبارزة: ٢٦٦٥۔

[2] فتوح البلدان بلاذري، ص: ١٢٤؛ دروس التاريخ، ج ٢، ص: ٩٠۔

یہودی زمیندار، سوداگر، مہاجن اور قلعہ نشین دل سے چاہتے تھے کہ اس قوت کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں اور آخر لڑائیاں پیش آئیں اور دینِ توحید کے مقابلہ میں اہل شرک کا ساتھ دے کر خندق واحزاب وغطفان کے معرکے پیش کیے، عرب کے مختلف قبیلوں اور سرحدی صوبوں پر ایران وروم کی سلطنتیں فرمانروائی کرتی تھیں، عراق، یمن اور بحرین پر ایران کی حکومت تھی اور حجاز کے شامی حدود پر قیصر کا قبضہ تھا، عرب کے مختلف ہمسایہ قبیلے انہیں دو میں سے کسی ایک سلطنت کی حفاظت کا دم بھرتے تھے اور یہ دونوں سلطنتیں اس بیچ کے سرحدی ملک کی ایک ایک حرکت اور جنبش پر نظر رکھتی تھیں، اس لیے اس ملک میں اتنی بڑی عظیم الشان تحریک کا قوت پکڑنا ان کو کسی طرح پسند نہ آ سکتا تھا اس لیے عرب میں اسلام کی قوت کا ان کو جب احساس ہوا تو انہوں نے اس کی دارو گیر کرنی چاہی کسریٰ ایران نے اپنے ایرانی گورنر کو لکھا کے اس نئے مدعی کو پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کرو قیصر نے تو کھلم کھلا حملہ کی تیاری ہی کر دی تھی جس کے باعث تبوک کی فوج کشی ہوئی اور آخر آنحضرت ﷺ کے بعد اسلام کو ان دونوں ہمسایہ طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

ذریعۂ معاش

اسلام لانے کا ایک بڑا مانع یہ تھا کہ عرب کا ذریعہ معاش عموماً قافلوں پر حملہ آوری اور سلب اموال اور رہزنی تھا۔ اوپر ہم امالی قالی سے نقل کر آئے ہیں کہ عرب کا ذریعہ معاش غارت گری تھا اور چونکہ حج کے چار مہینے تک جنگ وغارت سے باز رہنے میں ان کے ذرائعِ معاش مسدود ہو جاتے تھے، اس ضرورت سے وہ حج کے مہینوں کو ادل بدل کر لیا کرتے تھے۔ اندرونی عرب تمام تر دشت وصحرا اور بالکل ویرانہ ہے، زراعت یا تجارت کی کوئی صورت نہیں باوجود اس کے لاکھوں نفوس آباد ہیں، اس لیے ان کو غارت گری کرنی پڑتی اور امتداد زمانہ سے یہ عادت ان میں راسخ ہو گئی تھی، رفتہ رفتہ ٹھگی، رہزنی اور سرقہ تمام ملک میں پھیل گیا تھا یہاں تک کہ بڑے بڑے نامور شعرا، چور اور راہزن ہوتے تھے۔

اکثر بڑے بڑے جتھے اس لیے قائم ہوتے تھے کہ بنجارے جو ملک میں پھر کر غلہ کی تجارت کرتے تھے ان کو لوٹ لیا کریں۔ آنحضرت ﷺ نے دومۃ الجندل پر جو سریہ بھیجا تھا، اسی کے انسداد کی غرض سے بھیجا تھا دومۃ الجندل مدینہ منورہ سے پندرہ منزل کے فاصلہ پر ہے، تاہم یہ لوگ اس قدر فاصلہ سے خود مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تدبیر کر رہے تھے کہ آپ کو خبر ہو گئی اور حفظ ماتقدم کے لیے خود وہاں تک گئے اور چند روز قیام کر کے ان اطراف کا بندوبست کیا۔ [1] حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے سے پہلے چند شخصوں کو قتل کر کے ان کا مال چھین لیا تھا، چنانچہ جب اسلام لائے اور اس واقعہ کا اظہار کر کے لوٹ کا مال بھی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

[1] ابن سعد، جز ثانی، قسم اول، ص: ٤٤؛ زاد المعاد، ج ١، ص: ٣٧٠۔

((اما الاسلام فاقبل و اما المال فلست منه فی شیء)) [1]

''اسلام تو میں نے قبول کیا لیکن مال سے مجھ کو کسی قسم کا واسطہ نہیں۔''

ایک نکتہ یہاں خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے حدیثوں میں جو یہ وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ اکثر بیعت اسلام کے وقت جن باتوں کا اقرار لیتے تھے، ان میں ایک یہ بھی ہوتا تھا کہ ''چوری نہ کریں گے'' [2] اس کی یہی وجہ تھی کہ ان جرائم کا رواج تھا، ورنہ آج اگر شرفا سے بیعت کے وقت یہ اقرار لیا جائے تو لوگوں کو تعجب ہوگا کہ یہ بیعت لینے کی کیا چیز ہے۔ اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان تمام جرائم سے توبہ کرنا ہوتا تھا اس لیے عرب کو اسلام قبول کرتے وقت یہ نظر آتا تھا کہ وہ تمام ذرائع معاش سے مجبور ہو جاتے ہیں، وہ قافلوں پر حملہ نہیں کر سکتے، کہیں ڈاکہ نہیں ڈال سکتے، کسی کا مال نہیں چھین سکتے تو اب ان کے لیے کیا باقی رہ جاتا ہے۔

قریش خود رہزن اور غارت گر نہ تھے وہ شہر کی متمدن زندگی بسر کرتے تھے۔ تاہم دیگر اسباب کے ساتھ ان کے اسلام نہ قبول کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ قبول اسلام کا اثر ان کے وسائل معاش پر بھی پڑ سکتا تھا، قریش کا ذریعۂ معاش صرف ان تجارتی تعلقات تک محدود تھا جو انہوں نے باضابطہ طور پر دوسرے قبائل اور ممالک سے قائم کر لیے تھے اور یہ تمام قبائل اور ممالک مذہبی حیثیت سے اسلام کے دشمن اور حریف اور مقابل تھے اس بنا پر قریش کو خوف تھا کہ اگر وہ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو جائیں گے تو دفعتہً یہ تمام تجارتی تعلقات منقطع ہو جائیں گے چنانچہ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ''الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح'' (صفحہ ۱۳۸ جلد ۴) میں امام شافعی رحمہ اللہ کی روایت سے لکھتے ہیں:

قال الشافعی کانت قریش تنتاب الشام انتیابًا کثیرًا و کان کثیر من معائشها منه وتاتی العراق فیقال لما دخلت فی الاسلام ذکرت للنبی ﷺ خوفها من انقطاع معائشها بالتجارة من الشام والعراق اذ فارقت الکفر ودخلت فی الاسلام وخلاف ملك الشام والعراق لاهل الاسلام فقال النبی ﷺ **((اذا هلك کسرٰی فلا کسرٰی بعده فلم یبق بارض العراق کسرٰی یثبت له امر بعده))** وقال: **((اذا هلك قیصر فلا قیصر بعده فلم یکن بارض الشام قیصر فاجابهم علی ماقالوا))**

''امام شافعی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ قریش شام میں اکثر تجارتی حیثیت سے آمد و رفت رکھتے تھے اور ان کی معاش کا تعلق زیادہ تر اسی سے تھا اور اس غرض سے وہ عراق میں بھی آتے جاتے تھے تو کہا جاتا ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ سے ان ذرائع

[1] صحیح بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد......: ۲۷۳۱۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب توبة السارق: ۶۸۰۱۔

معاش کے منقطع ہو جانے کا خوف ظاہر کیا اور شام وعراق کے بادشاہوں کی اس مخالفت کا ذکر کیا جو ان کو اہل اسلام کے ساتھ تھی اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: "جب کسریٰ ہلاک ہو جائے تو پھر اس کے بعد دوسرا کسریٰ نہ ہوگا چنانچہ عراق سے کسریٰ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔" اور آپ ﷺ نے فرمایا: "جب قیصر ہلاک ہو جائے گا تو پھر دوسرے قیصر کا وجود نہ ہوگا چنانچہ ارض شام میں پھر کوئی قیصر نہ ہوا، جس کی وہاں حکومت ہو۔" اس لحاظ سے آنحضرت ﷺ نے یہ جواب ان کے بیان کے موافق دیا ہے۔"

رفع شک

اس موقع پر ایک غلطی کا ذکر کرنا ضرور ہے جو عام طور پر یورپ میں پھیلی ہوئی ہے، اہل مغرب کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی کہ اس میں عرب کی ہر قسم کی خواہش ہائے نفسانی کے پورے کرنے کا سامان موجود تھا، عرب جنگ وجدل اور لوٹ مار کے شائق تھے، اسلام نے انہی چیزوں کو جہاد وغنیمت کی صورت میں بدل دیا، عرب سخت نفس پرست تھے، اسلام نے چار بیویوں اور غیر محدود لونڈیوں کی اجازت دے دی، اہل عرب زاہدانہ زندگی سے بالکل آشنا نہ تھے اسلام نے بھی رہبانیت کی تحقیر کی، اب کیا چیز تھی جو اہل عرب کو اسلام سے روک سکتی تھی۔ لیکن یہ خیال تمام تر غلط ہے جہاد اور تعدد ازواج اور سراری کی بحث کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گی یہاں اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ جہاد یا تعدادِ ازواج جو کچھ بھی تھا قدیم آزادی سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا، جہاد صرف کافروں سے جائز تھا، فرض کرو ایک قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا تو اس پر کوئی شخص ہتھیار نہیں اٹھا سکتا تھا اور اس کے مال ومتاع سے تعرض نہیں کر سکتا تھا لیکن قدیم رسم کے لحاظ سے اتحاد مذہب کوئی روک نہ تھی، تمام قبائل بت پرستی میں متحد تھے، لیکن ہمیشہ ایک دوسرے کو لوٹتے رہتے تھے جہاد کے لیے اور بہت سی پابندیاں تھیں، جو پہلے بالکل نہ تھیں، جہاد میں صرف پاس پاس کے قبائل شریک ہوتے تھے اور دور کے قبائل اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے جہاد میں جو لونڈیاں گرفتار ہوتی تھی ان سے اس وقت تمتع جائز ہوتا تھا جب ایک مہینہ کی مدت گزر جائے یا اگر حاملہ ہے تو بچہ پیدا ہو چکے لیکن اسلام سے پہلے فتح کے ساتھ ہی عورتوں کو تصرف میں لے آتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، پہلے نکاح کے لیے تعداد کی کوئی قید نہ تھی ایک ساتھ آٹھ آٹھ، دس دس شادیاں کرتے تھے اب چار کی قید ہو گئی اور وہ بھی اس سخت شرط کے ساتھ کہ سب میں عدل ومساوات رہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ اسلام عرب کے مرغوبات کو قائم رکھتا تھا تمام تر غلط ہے، برخلاف اس کے عرب کی ایک ایک چیز روایاتِ قدیمہ، جہالت، عادات رسوم اور نفس پرستی ہر چیز اسلام کے قبول کرنے میں مانع تھی۔ ہر قوم پر جو چیز سب سے زیادہ سختی کے ساتھ حکمران ہے، وہ قدیم عادات اور رسوم اور خیالات ہیں، آج یورپ علوم وفنون اور آزادی خیال میں اس حد تک ترقی کر گیا ہے، لیکن جو بے ہودہ تعجب انگیز رسمیں پہلے قائم

تھیں، اب بھی قائم ہیں، یا تو تعود کی وجہ سے ان کی برائیاں سرے سے نظر ہی نہیں آتیں یا آتی ہیں تو عادت کی حکومت کے مقابلہ میں آزادی خیال اور علوم وفنون سب عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں۔

عرب میں جس قدر رسمیں قومی عادتیں تھیں جو ان کی ہستی کی عناصر بن گئی تھیں، اسلام ایک ایک کا دشمن تھا ثار یعنی انتقامِ خون عرب کے جذبات کا سب سے بڑا مظہر تھا، اسلام نے اس کو بالکل مٹا دیا۔ خاندانی فخر و مباہات ان کی قومی زندگی کی روح تھی، فنا کر دی گئی۔ ابوسفیان رئیس العرب کو بلال رضی اللہ عنہ (جو حبشی غلام تھے) کے ساتھ بیٹھنا پڑا، یا تو قریش کو انصار کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے سے بھی عار تھا یا اب قریش کی لڑکیاں غلاموں (زید وسالم وغیرہ) کے گھر میں آ گئیں، عکاظ وغیرہ کے میلے جہاں عرب سال کے سال جمع ہو کر اپنے مفاخر کی داستانیں سناتے تھے، سرد پڑ گئے۔ اسلام ایک طرف تو عرب کے تمام تر مفاخر کو خاک میں ملاتا تھا، دوسری طرف خود اس میں ہوائے نفس اور تفریحِ طبع کا کوئی سامان نہ تھا، اسلام قبول کرنے کے ساتھ پانچ وقت کی نماز گلے کا ہار بن جاتی تھی جو آزاد مزاجوں پر سخت گراں تھی:

﴿ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۴۵)

''اور وہ (نماز) خاشعین کے سوا اوروں پر یقیناً گراں ہے۔''

روزہ یعنی تیس دن تک متصل کھانا پینا چھوڑ دینا کوئی آسان کام نہ تھا، زکوٰۃ ایسا ٹیکس تھا کہ محض اس کے ادا کرنے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں عام بغاوت ہو گئی، صرف حج ایک ایسا فرض تھا جو بظاہر زندہ دلی کا سامان رکھتا تھا، لیکن اب وہ حج جاہلیت کا حج نہیں رہا، طواف عریاں کی اجازت نہیں رہی تھی۔ بڑی دلچسپی کی چیز بت تھے وہ ایک ایک کر کے حرم سے نکال دیے گئے۔ مقام منٰی میں خاندانی واقعات کی رجز خوانی کا جو طریقہ چلا آتا تھا بند کر دیا گیا یہ فرائض اور اوامر کا حال تھا اسی کے ساتھ محرمات اور نواہی کی وہ عالم گیری تھی کہ ان کے جاہلانہ خیال کے مطابق زندگی زندگی نہیں بلکہ زندان بن گئی تھی، زنا حرام، شراب حرام، قمار حرام، سونا چاندی حرام، اطلس وحریر حرام، چنگ وعود حرام، تصویر حرام، پھر زندہ دلی اور لطفِ زندگی کے لیے باقی کیا رہ جاتا ہے۔

خوب غور سے دیکھو! تمام مذاہب نے عبادتوں میں بھی دلچسپی کا سامان رکھا ہے، عیسائیوں کی نماز گا کر ادا کی جاتی ہے، پارسیوں میں زمزمہ ہوتا ہے، ہندو بھی عبادت کے وقت بھجن گاتے ہیں اور سامنے دلفریب بت ہوتے ہیں لیکن اسلام میں بظاہر دلآویزی اور دلفریبی کی ایک چیز بھی نہیں۔

مذکورہ بالا واقعات کی بنا پر یورپ کا یہ اعتراض کس قدر غلط اور تمام تر بے سروپا ہے کہ اسلام اس لیے پھیلا کہ وہ نفس پرستی کی ترغیب دلاتا اور اس کے سامان مہیا کرتا تھا۔ پھر کیا تھا؟

اس کا جواب آگے آتا ہے۔

تبلیغ نبوی

اوراس کے اصول اوراس کی کامیابی کے اسباب

تمام گزشتہ موانع، عوائق، مشکلات اور دشواریوں کی دیواریں آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے ٹوٹتی گئیں، اسلام پھیلا اور اس طرح پھیلا کہ آنحضرت ﷺ نے جب دنیا کو چھوڑا تو تمام عرب میں ایک بھی بت پرست نہ تھا، اس لیے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ مخالفین کے نزدیک تو اس کا جواب صرف تلوار ہے لیکن کارلائل [1] کے بقول نہتے اور یکہ وتنہا اسلام کے ہاتھ میں یہ تلوار کس کے زور سے آئی؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تلوار صرف اسلام کی تبلیغی دعوت تھی اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں اسلام کی اس طاقت کی تشریح کر دینا مناسب ہے۔

فریضۂ تبلیغ

''تبلیغ'' کے لفظی معنی پیغام پہنچانے کے ہیں اور اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اس کی اچھائی اور خوبی کو دوسرے لوگوں اور دوسری قوموں اور ملکوں تک پہنچائیں اور ان کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں۔ قرآن پاک میں تبلیغ کے ہم معنی چند اور الفاظ بھی ہیں جن میں سے ایک لفظ (انذار) ہے جس کے معنی ہشیار اور آگاہ کرنے کے ہیں، دوسرا دعوت جس کے معنی بلانے اور پکارنے کے ہیں اور تیسرا لفظ تزکیہ جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں۔ بعثت نبوی ﷺ کے وقت دنیا میں دو قسم کے مذہب تھے، دو ایسے جو تبلیغی تھے یعنی عیسائیت اور بودھ مت۔ باقی زیادہ تر ایسے تھے جو تبلیغی نہیں تھے، جیسے یہودیت، مجوسیت، ہندویت۔ جو دو تبلیغی سمجھے جاتے تھے ان کی نسبت یہ فیصلہ مشکوک ہے کہ آیا یہ تبلیغ ان کے اصل مذہب کا حکم تھا یا بعد کے پیرووں کا عمل کیونکہ ان کے مذہبی صحیفوں میں اس تعلیم کی دعوت کی کھلی ہوئی ہدایتیں اور ان کے بانیوں کی زندگی میں اس کی عملی مثالیں نہیں ملتیں، تمام مذاہب میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے تبلیغ کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے متعلق اپنے صحیفہ میں کھلے احکام دیے اور اس کے داعی وحامل علیہ السلام نے اپنی زندگی میں اس کی عملی مثالیں پیش کیں۔

جن مذہبوں نے تبلیغ کو اپنا اصول نہیں ٹھہرایا ان کے ایسا کرنے کی اصلی وجہیں دو ہیں، ایک یہ کہ ان کے نزدیک اس حق کے قبول کرنے کی عزت کا استحقاق پیدائش سے حاصل ہوتا ہے کوشش سے نہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ جو حق ان کے پاس ہے وہ ان کے نزدیک اتنا پاک ومقدس ہے کہ ان کی خاص پاک و بزرگ و محترم نسل وقوم کے علاوہ دوسری تمام قومیں جو ناپاک ونجس وکمتر ہیں ان تک اپنے پاک مذہب کو لے جانا خود اس مذہب کی پاکی کو صدمہ پہنچانا ہے، یہی سبب ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ایک دفعہ جب ایک کنعانی (متی

---

[1] ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ (محمد ﷺ)

۱۵) یا یونانی (مرقس ۷) عورت نے ان سے برکت چاہی تو فرمایا: ''میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔'' (متی ۱۵۔۲۵) پھر فرمایا: ''مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی (بنی اسرائیل کا مذہب) کتوں (غیر اسرائیلی قوموں) کو پھینک دیں۔'' (۲۷) پھر فرمایا: ''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ پہلے اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ اور چلتے ہوئے منادی کرو۔'' (متی ۔۶) پھر ارشاد فرمایا: ''وہ چیز جو پاک ہے کتوں کو مت دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ پھینکو۔'' (متی ۷۔۶)

ہندوؤں نے اپنے مذہب کو تمام قوموں سے جو چھپا کر رکھا اس کا بھی یہی سبب تھا کہ وہ اپنا پاک دھرم ملیچھوں اور اچھوتوں کو سکھا کر اس کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہودیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ نامختون اس نعمت کے اہل نہیں۔

تبلیغ کی اہمیت

آنحضرت ﷺ نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں مستحق قرار دیا، اس لیے اپنی تبلیغ کے لیے قریش، وغیر قریش حجاز و یمن، عرب و عجم، ہند و روم کی تخصیص نہیں فرمائی بلکہ دنیا کی ہر قوم، ہر زبان اور ہر گوشہ میں صدائے الٰہی کا پہنچانا فرض قرار دیا ابتدائی وحی میں انجانوں کو ہشیار اور بے خبروں کو آگاہ کرنا سب سے پہلا حکم تھا: ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنذِرْ ۝ ﴾ (۷۴/ المدثر: ۱، ۲) ''اے چادر پوش! اٹھ کھڑا ہو اور ہشیار وآگاہ کر'' پھر بار بار حکم ہوتا رہا کہ ﴿ بَلِّغْ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ ﴾ (۵/ المآئدہ: ۶۷) ''جو تیری طرف اتارا گیا اس کو اوروں تک پہنچا'' ﴿ فَادْعُ ۖ وَٱسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ ۖ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ: ۱۵) ''لوگوں کو دعوت دے اور مضبوط قائم رہ جس طرح تجھے حکم دیا گیا۔'' ﴿ فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ ٱلذِّكْرَىٰ ۝ ﴾ (۸۷/ الاعلیٰ: ۹) ''لوگوں کو نصیحت کر اگر نصیحت فائدہ مند ہو۔'' ﴿ وَذَكِّرْ فَإِنَّ ٱلذِّكْرَىٰ تَنفَعُ ٱلْمُؤْمِنِينَ ۝ ﴾ (۵۱/ الذاریات: ۵۵) ''اور نصیحت کر کہ نصیحت اہل ایمان کو فائدہ پہنچاتی ہے۔'' ﴿ فَذَكِّرْ بِٱلْقُرْءَانِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ ۝ ﴾ (۵۰/ ق: ۴۵) ''قرآن سے سمجھاؤ اس کو جو میری دھمکی سے ڈرتا ہو۔'' اور ان کے علاوہ بیسیوں آیتوں میں اس فرض کی اہمیت ظاہر کی گئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اے علی! تمہاری کوشش سے ایک آدمی کا بھی دین حق قبول کر لینا دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بڑھ کر ہے۔'' [1]

اس سے زیادہ یہ کہ اسلام نے اپنے ہر پیرو پر خیر کی دعوت امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور تواصی بالحق

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب دعاء النبی ﷺ الی الاسلام: ۲۹۴۲؛ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل علی: ۶۲۲۳۔

یعنی باہم ایک دوسرے کو سچائی کی نصیحت کرنا ضروری قرار دیا ہے اور مسلمانوں کا یہ فرض بتایا ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالنے کی جدوجہد کریں۔

آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہو کر پیامِ الٰہی لوگوں تک پہنچایئے اور اگر ایسا نہ کیا تو رسالت کا فرض انجام نہ دیا:

﴿ يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٦٧)

''اے خدا کے پیغام پہنچانے والے تیرے پروردگار کے پاس سے جو کچھ تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچا دے اگر تو نے ایسا نہیں کیا، تو تو نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا اور تجھ کو خدا لوگوں سے بچا لے گا۔''

اس کی وسعت

اس کے بعد اس فریضۂ تبلیغ کی وسعت کی بحث ہے، پیغام الٰہی، سچائی کا ایک بہتا چشمہ ہے، جو آہستہ آہستہ قدرتی رفتار سے پہلے اپنی قریب کی زمین کو، پھر آگے کو پھر اس سے آگے کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ زمین کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کو اس تبلیغ کا حکم اسی تدریج کے ساتھ ہوا سب سے پہلے خاص اپنے گھر اور خاندان کے لوگوں کو سمجھانے کا حکم ہوا:

﴿ وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴾ (٢٦/ الشعرآء:٢١٤)

''اور اپنے سب سے نزدیک کے اہل خاندان کو آگاہ وہشیار کر۔''

اس کے بعد یہ دائرہ بڑھ کر شہر مکہ اور اس کے اطراف کی آبادیوں تک پہنچتا ہے:

﴿ لِّتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾ (٤٢/ الشوریٰ:٧)

''تاکہ تو مکہ اور جو اس کے آس پاس کے بدوی ہیں ان کو آگاہ وہشیار کرے۔''

اب تبلیغ کا دائرہ اس سے بھی آگے بڑھتا ہے اور ہر زندہ روح یعنی سمجھ بوجھ، احساس وعقل وغیرہ حقیقی زندگی کی علامتیں جس میں موجود ہوں اس کی مخاطب ہوتی ہے:

﴿ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ ۝ لِّيُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا ﴾ (٣٦/ یٰسٓ:٦٩، ٧٠)

''یہ قرآن تو صرف ایک نصیحت اور صاف صاف خدا کا کلام ہے، تاکہ وہ اس کو ہشیار کرے جو زندہ ہے۔''

پھر جس تک بھی وہ آواز پہنچ جائے سب سے اس کا خطاب ہے:

﴿ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ ۚ ﴾ (٦/ الانعام:١٩)

"تا کہ میں تمہیں آگاہ و ہوشیار کروں اور ان کو جن تک میری یہ آگاہ و ہوشیار کرنے والی آواز پہنچے۔"

پھر تمام انسانوں تک اس کی وسعت ہے:

﴿ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ ﴾ (١٤/ ابراهیم:٥٢)

"یہ قرآن تمام انسانوں کے لیے پیغام ہے۔"

آنحضرت ﷺ کو خطاب ہوا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ﴾ (٣٤/ سبا:٢٨)

"اور ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ہوشیار کرنے والے بنا کر بھیجا۔"

آپ ﷺ کو حکم ہوا کہ تمام انسانوں کو خطاب کر کے یہ اعلان فرما دیں:

﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ (٧/ الاعراف:١٥٨)

"اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں۔"

اس سے زیادہ یہ ہے کہ تمام کائنات آپ کی دعوت و تبلیغ کے دائرہ میں داخل ہے۔ فرمایا:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۙ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (٢٥/ الفرقان:١، ٢)

"برکت والا ہے وہ خدا جس نے حق اور باطل میں امتیاز بتانے والی کتاب اپنے بندہ (محمد ﷺ) پر نازل کی، تا کہ وہ دنیا جہان کے لیے ہوشیار و آگاہ کرنے والا ہو وہ خدا جس کی ملکیت میں آسمانوں کی اور زمین کی سلطنت ہے۔"

اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اس تبلیغ و دعوت کی وسعت اور اس میں کامیابی کی خوشخبری بھی اس وقت دے دی گئی تھی جب مسلمانوں کے دلوں میں ایک قسم کی مایوسی چھائی ہوئی تھی، چنانچہ آیت ذیل نازل ہوئی:

﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ۝ ﴾ (٣٨/ ص:٨٧۔٨٨)

"یہ قرآن تو دنیا کے لیے نصیحت ہے اور تم ایک زمانہ کے بعد اس کی خبر جانو گے۔"

انبیا اور بانیان مذاہب کے عملی نمونوں اور مثالوں کی تلاش اور جستجو کرو تو یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائے گی کہ اسلام کے سوا اور جو مذہب تبلیغی سمجھے جاتے ہیں وہ حقیقت میں تبلیغی نہیں، خود بودھ نے ہندوؤں کے علاوہ کسی کو اپنی نجات کا راستہ نہیں بتایا اور نہ اس کا حکم دیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسرائیل کے علاوہ کسی دوسری قوم کو نہ اپنا وعظ سنایا اور نہ ان کو اپنا مخاطب بنایا اور نہ ان میں سے کسی کو اپنا شاگرد کیا نہ کسی دوسری قوم میں اپنی زندگی میں اپنا واعظ اور مبلغ بھیجا، حالانکہ فلسطین میں رومیوں اور یونانیوں کی بڑی جماعت موجود تھی۔

آنحضرت ﷺ نے مکہ میں رہ کر مکہ اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو بیدار و ہشیار کیا، حج کے موسم میں عرب کے ایک ایک قبیلہ کو جا کر حق کا پیغام پہنچایا اور اسی زمانہ میں یمن اور حبشہ تک آپ کی آواز پہنچ گئی اور لوگ تلاشِ حق کے لیے آپ کے پاس مدینہ منورہ آئے تو قریش گو برسوں تک دوسرے قبیلوں تک اسلام کے پہنچنے میں سدِ راہ بنے رہے پھر بھی مبلغ اور داعی بھیج بھیج کر قبیلوں تک آواز پہنچائی اور بالآخر قریش کے خلاف اس لیے تلوار اٹھائی گئی کہ اسلام کو تبلیغ کی پر امن آزادی ملے، چھ برس کے جنگ و جدل کے بعد حدیبیہ میں قریش نے اسلام کے اس مطالبہ کو تسلیم کیا اور تبلیغ کی آزادی عطا کی، قرآن نے اسلام کی اس روحانی فتح کو فتح مبین قرار دیا اور ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾ (٤٨/ الفتح:١) [1] نازل ہوا، اس کے بعد ہی عرب اور بیرونِ عرب میں اسلام کے واعظ قاصد اور مبلغ بھیجے گئے اور دنیا کے امرا اور سلاطین کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے گئے اور عربوں کے علاوہ دیلم، ایران، حبش اور روم کے طالبین اسلام لائے اور فیضان حق سے سیراب ہوئے مشرکینِ عرب، یہود اور عیسائی اور پارسی سب نے آپ کے زمانہ ہی میں آپ کے نور سے روشنی حاصل کی، لیکن نفسِ تبلیغ کی فرضیت و اہمیت سے بھی زیادہ اہم چیز تبلیغ کے اصول ہیں۔

تبلیغ کے اصول

یہ نکتہ کہ کس طرح لوگوں کو کسی سچائی کے قبول کی دعوت دینی چاہیے، دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا۔ وہ مذہب بھی جو تبلیغی ہونے کے دعوے رکھتے ہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لیے تبلیغ کے اہم اصول کی تشریح کی ہے لیکن صحیفۂ محمدی نے نہایت اختصار لیکن پوری تشریح کے ساتھ اپنے پیروؤں کو یہ بتایا ہے کہ پیغام الٰہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کو قبول حق کی دعوت کس طرح دی جائے:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾

(١٦/ النحل:١٢٥)

''اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو دانائی اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے مناظرہ خوش آئند طریق سے کر۔''

تبلیغ و دعوت کے یہ تین اصول مسلمانوں کو سکھائے گئے عقل و حکمت، موعظۂ حسنہ اور مناظرہ بطریق احسن۔ مسلمان متکلموں نے بیان کیا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے یہ تینوں اصول وہی ہیں جو منطقی استدلال میں عموماً کام میں لائے جاتے ہیں یعنی ایک تو برہانیات جن میں یقینی مقدمات کے ذریعہ سے دعویٰ کے ثبوت پر دلیلیں لائی جاتی ہیں، دوسرے خطابیات ہیں جن میں مؤثر اور دلپذیر اقوال سے مقصود کو ثابت کیا جاتا ہے اور تیسرے

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسير، باب صلح الحديبية:٤٦٣٧۔

جدلیات جن میں مقبول عام اقوال اور فریقین میں مسلم مقدمات سے استدلال کیا جاتا ہے۔قرآن پاک نے پہلے طریقہ کو حکمت اور دوسرے کو موعظت حسنہ اور تیسرے کو جدال سے تعبیر کیا ہے اور استدلال کے یہی وہ تین طریقے ہیں جن سے ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے مدعا کو ثابت کرتا ہے۔

خیر یہ تو فلسفیانہ نکتہ آفرینی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کے سامنے کوئی نئی بات پیش کرتے ہیں اور اس کو قبول کی دعوت دیتے ہیں تو عموماً تین طریقے برتتے ہیں یا تو اس بات کے ثبوت اور تائید میں کچھ دلنشین دلیلیں پیش کرتے ہیں یا اس کو مخلصانہ نصیحت کرتے ہیں اور مؤثر انداز سے اس کو نیک و بد اور نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہیں یا یہ کرتے ہیں کہ اس کی دلیلوں کو مناسب طریقہ سے رد کر کے اس کی غلطی کو اس پر واضح کرتے ہیں، پہلے طریقہ کا نام حکمت اور دوسرے کا نام موعظہ حسنہ اور تیسرے کا نام جدال بطریق احسن ہے۔تبلیغ و دعوت کے یہی تین طریقے اسلام نے بتائے ہیں۔

قولِ لین

حکیمانہ استدلال ہو یا وعظ و نصیحت ہو یا جدال و مناظرہ ہو، ضرورت یہ ہے کہ داعی نرمی اور خیر خواہی سے باتیں کرے کہ سختی اور شدت کا طریق دوسرے کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کرتا ہے کیسی ہی اچھی اور سچی بات ہو لیکن اس قسم کے جذبات اس کے قبول کی استعداد اس سے سلب کر لیتے اور سننے والے میں اپنی غلطی پر ضد اور ہٹ پیدا کر دیتے ہیں جس سے دعوت کا فائدہ اور نصیحت کا اثر باطل ہو جاتا ہے اسی لیے قرآن پاک نے اپنے پیغمبروں کو اپنے مخالف سے مخالف دشمن کو بھی نرمی ہی سے باتیں کرنے کی تاکید کی ہے، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون جیسے سرکش کے سامنے پیغام ربانی لے کر جانے کی ہدایت ہوتی ہے تو ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۚ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ ﴾

(٢٠/ طٰهٰ:٤٣، ٤٤)

’’تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی کی ہے تو اس سے نرم گفتگو کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے یا خدا سے ڈرے۔‘‘

دعوت و تبلیغ میں رفق و نرمی اور لطف و تحمل کی تعلیم کی اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی کہ نہ کوئی داعی اور واعظ پیغمبروں سے بہتر ہو سکتا ہے اور نہ فرعون سے بڑھ کر کوئی مجرم ہو سکتا ہے پھر ایسے مجرم کے سامنے اس لطف و نرمی سے وعظ و نصیحت کی تعلیم جب پیغمبروں کو ہوتی ہے تو عام داعی و مبلغوں اور واعظوں کو عام مخالفوں مجرموں اور سرکشوں کے ساتھ بدرجہا زیادہ رفق و ملاطفت سے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔

اعراض اور قولِ بلیغ

آنحضرت ﷺ کو ان منافقوں کے بارہ میں جو آپ ﷺ کی نافرمانی کے جرم کے مرتکب ہوئے

تھے یہ حکم ہوتا ہے:

﴿ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ﴾ (٤/ النسآء:٦٣)

''تو ان سے درگزر کر اور ان کو یہ نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو ان کے دلوں میں اثر کرے۔''

اس تعلیم میں تین ہدایتیں ہیں

اول یہ کہ دعوت و تبلیغ میں مخالفت کی بدسلیقگی، بدتہذیبی اور درشتی سے ان کو درگزر اور برداشت کرنا چاہیے دوسرے یہ کہ ان کو نصیحت کرنا اور سمجھانا چاہیے اور تیسرے یہ کہ گفتگو کا وہ مؤثر طرز و انداز اختیار کرنا چاہیے جو دل میں گھر کرے۔

تیسیر و تبشیر

انہیں ربانی ہدایتوں کی تعمیل میں جب آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو یمن میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے متعین فرمایا تو رخصت کرتے وقت یہ نصیحت فرمائی ((يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا)) [1] ''دینِ الٰہی کو آسان کر کے پیش کرنا سخت بنا کر نہیں، لوگوں کو خوشخبری سنانا نفرت نہ دلانا۔'' یہ وہ تبلیغی اصول ہیں جو ایک داعی و مبلغ کی کامیابی کی جان ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کے سامنے اور صحابہ نے عام مسلمانوں کے سامنے اسی اصول کے مطابق دین الٰہی پیش کیا اور کامیابی حاصل کی۔ دین کی جائز آسانی اور سہولت کو پیش کرنا اور اس کو سخت، درشت اور مشکل نہ بنانا ہی اس کے قبول عام کی راہ ہے، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے لطف و شفقت، رحم و کرم اور مہر و محبت کی دلنواز صداؤں سے دلوں کو پرامید اور مسرور بنانا، اس سے بہتر ہے کہ بات بات پر خدا کی قہاری و جباری اور ہیبت و جلال کا ذکر کر کے دلوں کو خوف زدہ اور مایوس بنایا جائے۔

تدریج

تبلیغ کا ایک اور اصول آنحضرت ﷺ نے یہ تعلیم فرمایا کہ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک دفعہ اس کی گردن پر نہ ڈالا جائے بلکہ رفتہ رفتہ وہ اس کے سامنے پیش کیے جائیں پہلے توحید اور رسالت کو پیش کرنا چاہیے، اس کے بعد عبادات کو، عبادات میں بھی اہم پھر اہم کے اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے، عبادات میں سب سے اہم نماز ہے پھر زکوٰۃ ہے پھر دوسرے فرائض ہیں، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے وقت آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے تو ان کو پہلے اس کی دعوت دینا کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمد ﷺ اس کا رسول ہے۔ جب وہ یہ مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں اور جب وہ یہ بھی مان لیں تو

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، بعث ابی موسی ومعاذ الی الیمن قبل حجة الوداع: ٤٣٤١، ٤٣٤٢۔

ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے یہ صدقہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دیا جائے جب وہ اس کو تسلیم کرلیں تو دیکھو صدقہ میں چن چن کر ان کے بہترین مال کو نہ لینا اور ہاں مظلوم کی بددعا سے ڈرتے رہنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔'' ❶

تالیفِ قلب

تبلیغ ودعوت کے سلسلہ میں اسلام نے ایک اور طریقہ کو بھی پیش کیا ہے جس کو تالیفِ قلب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ﴿ وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ ﴾ (۹/ توبہ: ۶۰) اس کے لفظی معنی ہیں ''دلوں کو ملانا'' اور اس سے مقصود اس شخص کے ساتھ جس کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہو لطف ومحبت اور امداد واعانت اور غم خواری وہمدردی کرنا ہے کیونکہ انسان طبعاً شریفانہ جذبات کا ممنون ہوتا ہے، یہ ممنونیت عناد اور ضد کے خیالات کو دور کر کے قبولِ حق کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بہت سے لوگوں کو اپنے اس اعجاز سے اسلام کا حلقہ بگوش بنالیا تھا، چنانچہ مکہ کے بعض رئیس اسی جذبہ سے متاثر ہو کر اسلام لائے تھے، آنحضرت ﷺ نے حنین کی غنیمت کا سارا مال انہیں کو تقسیم کر دیا تھا نتیجہ یہ نکلا کر پھر حق کے خلاف ان کی گردنیں نہ اٹھ سکیں۔ صفوان جو اسلام کے سخت مخالف اور آنحضرت ﷺ سے نہایت بغض رکھتے تھے وہ کہتے ہیں کہ ''مجھ کو آنحضرت ﷺ نے دیا، جتنا دیا اور مجھے ان سے سخت بغض تھا لیکن آپ کے ان احسانات نے مجھے ایسا متاثر کیا کہ اب میری نگاہ میں ان سے زیادہ کوئی پیارا نہیں۔'' ❷ ایک دفعہ ایک بدو نے آکر کہا کہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بکریوں کے جتنے ریوڑ ہیں وہ مجھ کو عنایت کیجئے، آپ ﷺ نے وہ سب اس کو دے دیے یہ فیاضی دیکھ کر اس پر اتنا اثر پڑا کہ اس نے اپنے پورے قبیلہ کو آکر کہا: ''بھائیو! اسلام قبول کرو کہ محمد اتنا دیتے ہیں کہ ان کو اپنے فقر وافلاس کا ڈر ہی نہیں رہتا۔'' ❸

ایک یہودی لڑکا آنحضرت ﷺ کی خدمت کرتا تھا وہ بیمار پڑا تو آنحضرت ﷺ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور جا کر اس کے سرہانے بیٹھے، پھر فرمایا کہ لڑکے اسلام قبول کر لے اس نے مستفسرانہ نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا، اس نے کہا ابوالقاسم (آپ ﷺ کی کنیت) کی بات مان لے، چنانچہ وہ مسلمان ہوگیا اور جب آنحضرت ﷺ وہاں سے اٹھے تو زبان مبارک پر یہ فقرہ تھا کہ ''اس خدا کی حمد جس نے اس کو دوزخ سے بچالیا۔'' ❹

دعوتِ عقل

اسلام نے تبلیغ ودعوت کے جو اصول بتائے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک استدلالی اور عقلی مذہب ہو، کہ بغیر اس کے حکمت ودانشمندی، وعظ ونصیحت اور جدال ومناظرہ کی بنیاد قائم نہیں رہ سکتی، اس بنا پر

❶ صحیح بخاری۔ باب مذکور: ۴۳۴۷۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی سخائہ ﷺ: ۶۰۲۲۔
❸ ایضا: ۶۰۲۰۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی ... الخ: ۱۳۵۶۔

مذاہب عالم کی تاریخ میں نبوت محمدیہ ﷺ یہ سب سے پہلی ربانی آواز ہے جس نے حاکمانہ قانون (توراۃ) یا صرف لفظوں کے الٹ پھیر (انجیل) یا راجاؤں کے احکام (وید) کے بجائے عقل انسانی کو مخاطب کیا، غور وفکر کی دعوت دی، فہم وتدبر کا مطالبہ کیا اس نے اپنی ہر تعلیم کی خوبی مصلحت اور حکمت خود ظاہر کی اور بار بار مخالفوں کو آیات الٰہی میں غور وفکر کی ہدایت کی۔ فرمایا:

﴿ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ ﴾ (٦/ الانعام:١٤٨۔١٤٩)

''کہہ اے پیغمبر کہ تمہارے پاس کوئی (یقینی) علم ہے کہ اس کو تم ہمارے لیے ظاہر کرو، تم گمان ہی کے پیچھے چلتے ہو اور تم تو اٹکل ہی کرتے ہو کہہ کہ اللہ ہی کی ہے پہنچتی ہوئی دلیل۔''

نیز ارشاد ہوا:

﴿ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ﴾

(٨/ الانفال:٤٢)

''تا کہ جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جو جیتا رہے وہ دلیل سے جئے اور اللہ ہی سننے والا جاننے والا ہے۔''

غفلت شعار کافروں کی نسبت فرمایا:

﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝ ﴾

(١٢/ یوسف:١٠٥)

''اور آسمانوں میں اور زمین میں خدا کی توحید کی کتنی نشانیاں (دلیلیں) ہیں جن پر وہ گزر جاتے ہیں اور ان پر غور نہیں کرتے۔''

غور وفکر کرنے والے اہل ایمان کی تعریف میں فرمایا:

﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ۙ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ ﴾ (٣/ آل عمران:١٩٠، ١٩١)

''بے شبہ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں، جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اپنی کروٹوں پر یاد کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار تو نے یہ (عالم) بیکار نہیں بنایا۔''

اس سے زیادہ عقلی اور علمی استدلال کی دعوت اور کیا ہوگی مگر بہر حال یہ خارجی استدلال تھا اندرونی

استدلال کی بھی اس نے دعوت دی۔ فرمایا:

﴿ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ؀ ﴾ (۵۱/ الذاریات:۲۱)

''اور خود تمہارے اندر نشانیاں ہیں تم دیکھتے نہیں۔''

صحیفہ محمدی ﷺ کی نسبت ہر جگہ یہ الفاظ فرمائے:

﴿ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ؀ ﴾ (۵۰/ ق:۸)

''یہ بصیرت اور نصیحت ہے ہر رجوع ہونے والے بندہ کے لیے۔''

﴿ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ﴾ (۷/ الاعراف:۲۰۳)

''یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے بصیرتیں ہیں۔''

﴿ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ لِلنَّاسِ ﴾ (۴۵/ الجاثیۃ:۲۰) ''یہ لوگوں کے لیے بصیرتیں ہیں۔''

﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ ﴾ (۴/ النسآ:۸۲) ''کیا یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔''

﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰي قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ؀ ﴾ (۴۷/ محمد:۲۴)

''کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے ہیں۔''

﴿ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ۙ ﴾ (۳۶/ یٰسٓ:۲) ''حکمت والے قرآن کی قسم۔''

﴿ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ؀ ﴾ (۱۰/ یونس:۱، ۳۱/ لقمان:۲)

''یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔''

نہ صرف اسی قدر بلکہ خدا کا وجود، توحید، رسالت، قیامت، جزا، سزا، عبادات، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اخلاق وغیرہ ہر تعلیم کی تلقین کرتے وقت اس نے اس کی صداقت کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں اور ہر مسئلہ کی مصلحتیں اور حکمتیں علی الاعلان ظاہر کی ہیں آیندہ صفحوں میں ہر قدم پر اس کی دلیلیں آپ کو ملیں گی۔

مذہب میں زبردستی نہیں

یہ وہ حقیقت ہے جس کی صدا آج ہر در و دیوار سے آتی ہے، لیکن شاید لوگوں کو معلوم نہیں کہ دنیا میں اس حقیقت کا اعلان سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی زبان، مبارک سے ہوا، اور ظاہر ہے کہ جو مذہب اپنی اشاعت کے لیے صرف دعوت و تبلیغ کا راستہ رکھتا ہو جس نے اس کے اصول بتائے ہوں، جس نے عقل و بصیرت اور فہم و تدبر کے ہر معاملہ میں لوگوں سے مطالبہ کیا ہو، ہر قدم پر عقلی استدلال اور مصلحت و حکمت کا اظہار کیا ہو، وہ کیونکر جبر و اکراہ اور زور و زبردستی کے طریقہ کو اختیار کر سکتا تھا، اسلام نے نہ صرف یہ کہ مذہب کی جبری اشاعت کو ناپسند کیا بلکہ اس کا فلسفہ بتایا کہ مذہب زبردستی کی چیز نہیں۔ اسلام میں مذہب کا اولین جزو ایمان ہے ایمان یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرہ بھی بہ زور پیدا نہیں کر

سکتی، بلکہ تیز سے تیز تلوار کی نوک بھی کسی لوحِ دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کر سکتی۔'' فرمایا:

﴿ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۵۶)

''دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی۔''

یہ وہ عظیم الشان حقیقت ہے جس کی تلقین انسانوں کو صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے ہوئی۔ دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۗ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ ﴾

(۱۸/ الکھف:۲۹)

''اور کہہ دے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے، تو جو چاہے قبول کرے اور جو چاہے انکار کرے۔''

ایمان اور کفران دو میں سے کسی ایک کو اختیار پر کوئی زبردستی نہیں ہے عقل و بصیرت والے اسے خود قبول کریں گے اور نافہم اس سے محروم رہیں گے اس لیے بار بار یہ واضح کیا گیا کہ رسول کا کام لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے زبردستی منوانا نہیں:

﴿ اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۹۲)

''ہمارے رسول پر تو یہی فرض ہے کہ وہ صاف صاف ہمارا پیغام پہنچا دے۔''

آنحضرت ﷺ کو جو قریش کے اعراض و مخالفت سے حد درجہ غمگین تھے، تسکین دی گئی:

﴿ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۴۸)

''اے پیغمبر ﷺ تیرا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔''

﴿ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝ ﴾ (۸۸/ الغاشیۃ: ۲۱، ۲۲)

''اے پیغمبر ﷺ! تو، تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، تو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔''

﴿ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۭ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ ﴾

(۴۲/ شوریٰ:۴۸)

''پھر اگر وہ (اسلام کی دعوت سے) انکار کریں تو اے پیغمبر ﷺ! ہم نے تجھ کو ان پر گماشتہ بنا کر نہیں بھیجا، تیرے ذمہ صرف پیغام کا پہنچا دینا ہے۔''

کسی دین کو زبردستی پھیلانا اسلام کی نگاہ میں ایک ایسا فعل ہے جس سے رسول کی شان کو اس نے بہت بلند سمجھا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا

مُؤْمِنِيْنَ﴾ (۱۰/ یونس:۹۹)

''اور اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ لوگوں کو زبردستی مومن بنادے تو زمین کے سب لوگ ایمان لے آتے ،تو کیا اے پیغمبر ﷺ تو لوگوں پر زبردستی کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں ۔''

اسلام میں حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لیے لڑنا جائز ہے، اور آنحضرت ﷺ کو بھی مجبوراً لڑنا پڑا۔ اس سے مخالفوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ لڑائی صرف اس لیے تھی کہ اسلام کو تلوار کے زور سے لوگوں میں پھیلایا جائے، حالانکہ قرآن میں ایک بھی آیت ایسی نہیں جس میں کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم ہو اور نہ آنحضرت ﷺ کی سیرت میں کوئی واقعہ ایسا ہے جس میں کسی کافر کو زبردستی تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو، بلکہ اگر ہے تو یہ ہے:

﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (۹/ التوبة:۶)

''اور اگر لڑائی میں کوئی مشرک تجھ سے پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اس کو وہاں پہنچا دے جہاں وہ بے خوف ہو کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔''

یہ نہیں کہا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے اس کو پناہ نہ دو، بلکہ یہ فرمایا کہ اس کو پناہ دے کر اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے، اور اس کو کلامِ الٰہی سنایا جائے، تاکہ اس کو غور وفکر کرنے کا موقع ملے، ظاہر ہے کہ جو مشرک اس طرح مسلمان ہوگا اس کے تبدیلِ مذہب کا محرک تلوار کے بجائے کوئی اور چیز (پیامِ حق) ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی مشروعیت، مظلوموں کی حمایت، جلاوطنوں کے حق دلانے، حج کا راستہ کھولنے اور عقیدہ کی آزادی حاصل کرنے کے لیے ہوئی تھی، جیسا کہ اس کا مفصل بیان کتاب میں کہیں آئے گا، قرآن کی اس آیت میں:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (۸/ الانفال:۳۹)

''اور ان کافروں سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔''

''فتنہ'' سے مراد عقیدہ اور مذہب کی آزادی نہ ہونا ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما صحابہ کی خانہ جنگیوں میں شریک نہ تھے۔ ایک شخص نے آکر ان سے کہا کہ خدا نے فتنہ کے مٹانے کے لیے لڑنے کا حکم نہیں دیا؟ اور اوپر کی آیت پیش کی انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہ فرض آنحضرت کے زمانہ میں ادا کر چکے ہیں جب مسلمان کم تھے تو انسان اپنے دین کے سبب سے فتنہ میں مبتلا کیا جاتا تھا یا اس کو لوگ مار ڈالتے تھے یا قید کر لیتے تھے یہاں تک کہ مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو پھر فتنہ باقی نہ رہا۔ [1]

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورة الانفال، باب قوله تعالىٰ ﴿وقاتلوهم حتى لاتكون فتنة﴾ الاٰية: ٤٦٥٠۔

میدان جنگ میں تبلیغ

ناواقفوں نے ایک اور مسئلہ کی غلط تعبیر کی ہے، اسلام کی امن پسندی نے یہ قانون بنایا ہے کہ اگر کسی مخالف قوم سے لڑائی آپڑے تو میدان جنگ میں پہنچ کر بھی صلح و آشتی کا خیال دور نہ کیا جائے بلکہ تلوار کے فیصلہ سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کرنی چاہئیں، اوّل یہ کہ تم بھی کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاؤ اور لڑائی سے ہاتھ اٹھا کر ہمارے بھائی بن جاؤ، اگر ایسا کرو تو تم دین، حکومت اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو جاؤ گے، اگر یہ منظور نہ ہو تو اپنے مذہب پر قائم رہ کر ہماری سیاسی حکومت کو قبول کر لو اس حالت میں تمہاری حفاظت کی ہر قسم کی ذمہ داری ہمارے سر ہوگی، اگر وہ ان دو میں سے کسی بات کو قبول کر لیں تو ان سے لڑنا جائز نہیں، اسلام کی تاریخ میں ایسے کتنے منظر ہیں کہ کسی دشمن سے دشمن قوم نے اسلام یا محض اطاعت قبول کر لی ہے اور خونریزی رک گئی ہے اور لڑائی کا میدان محبت و آشتی کی بزم بن گئی ہے۔

یہ قانون جو سرتاپا امن پسندی، سلامت طلبی اور خونریزی سے بچنے کی آخری کوشش پر مبنی ہے اس کو مخالفوں نے اس صورت میں پیش کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی تعلیم دی، آنحضرت ﷺ کا دستور تھا کہ جب آپ کسی فوج کو متعین کرتے تو اس کے سردار کو یہ ہدایت فرماتے:

> ''جب تو مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابل ہو تو اس کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دے، ان میں سے جو بات بھی وہ مان لے اس کو قبول کر لے اور اس پر حملہ کرنے سے رک جا، اس کو اسلام کی دعوت دے اگر وہ قبول کر لے تو پھر اس سے رک جا، اس کے بعد اس سے خواہش کر کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں آ جائے تو اس کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے اگر وہ نہ مانے تو اس کی حالت بدو مسلمانوں کی سی ہوگی قانون اس پر مسلمانوں کا جاری ہوگا لیکن غنیمت اور فئی میں اس کا حصہ نہ ہوگا جب تک وہ جہاد میں شرکت نہ کرے، اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو اس کو جزیہ دے کر ذمی بننے کو کہہ، اگر وہ اس کو مان لے تو اس سے بھی رک جاؤ، اگر وہ اس کو بھی نہ مانے تو پھر خدا کی مدد مانگ اور لڑائی شروع کر دے۔'' [1]

یہ وہ اصول جنگ تھے جس سے خونریزی کی روک تھام مقصود تھی نہ یہ کہ کسی مجبور کو بزور شمشیر مسلمان بنالینا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں ایرانیوں سے جب لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے تین روز تک میدانِ جنگ میں تلوار نہیں اٹھائی، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ تین روز تک ان کو سمجھاتے رہے اور کہتے رہے کہ ''میں تمہاری قوم سے ہوں لیکن دیکھتے ہو کہ عرب میرے زیر فرمان ہیں'' اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو تم کو بھی وہی حقوق ملیں گے جو ہمارے ہیں اور اگر تم اپنے مذہب ہی پر رہنا چاہو تو جزیہ دے کر رہ سکتے ہو لیکن محکوم ہو کر رہو گے۔'' [2] اس سے

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب تأمیر الامام الامراء علی البعوث: ٤٥٢٢۔

[2] جامع ترمذی، ابواب السیر، باب ما جاء فی الدعوة قبل القتال: ١٥٤٨۔

معلوم ہوا کہ جنگ میں دشمن کو بھی تبدیل مذہب پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ اس کے سامنے دوسری راہیں بھی کھلی تھیں۔

ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ قبیلہ بنی حنیفہ میں سے تھے اور یمامہ کے رئیس تھے۔ یہ وہ قبیلہ ہے جو آخر تک سرکش رہا اور اسی میں آنحضرت ﷺ کے آخر زمانہ میں مسیلمہ پیدا ہوا تھا۔ ثمامہ اتفاق سے مسلمانوں کے ایک لشکر کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے اور مدینہ لا کر مسجد نبوی کے کھمبے میں باندھ دیے گئے، آنحضرت ﷺ نماز کے لیے تشریف لائے تو پوچھا: ''ثمامہ تمہاری کیا رائے ہے؟'' جواب دیا: محمد میری رائے اچھی ہے، اگر مجھے قتل کرو گے تو ایک خون والے کو قتل کرو گے اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکر گزار پر احسان ہو گا اور اگر زر فدیہ چاہتے ہو تو مانگو جو مانگو گے دیا جائے گا، آنحضرت ﷺ نے کچھ نہیں فرمایا پھر اسی طرح دوسرے دن سوال و جواب ہوا پھر تیسرے دن۔ تیسرے دن آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''ثمامہ کو چھوڑ دو۔'' لوگوں نے کھول دیا وہ رسی سے کھل کر آزاد ہو گئے مگر سچائی کی زنجیر ان کے پاؤں میں پڑ گئی، مسجد نبوی کے قریب ایک نخلستان میں جا کر خود بخود غسل کیا اور پھر مسجد میں آ کر کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئے [1] کیا کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کے لیے اس سے بہتر موقع ہو سکتا تھا؟ بدر کے قیدی گرفتار ہو کر آئے لیکن انہیں یہ نہیں کہا گیا کہ تلوار یا اسلام اسی طرح جنگ کے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ رہا۔ قرآن پاک نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق کہا: ﴿ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً ﴾ (٤٧/ محمد: ٤) ''لڑائی ختم ہونے کے بعد ان قیدیوں کو احسان دھر کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔'' یہ ارشاد نہ ہوا کہ اسلام یا تلوار۔

غزوۂ خیبر میں مسلمان روزانہ بعض قلعوں پر حملہ کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں، بالآخر شیر خدا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کو حکم ہوتا ہے کہ فوج لے کر جاؤ وہ پوچھتے ہیں: یا رسول اللہ! کیا میں ان سے لڑوں یہاں تک کہ وہ ہماری طرح ہو جائیں؟ فرمایا: ''آہستگی سے روانہ ہو، یہاں تک کہ ان کے میدان میں پہنچ جاؤ پھر ان کو اسلام کی طرف بلاؤ اور اس میں ان کا جو حق ہو گا وہ ان کو بتاؤ خدا کی قسم! اگر ایک شخص کو بھی خدا تمہارے ذریعہ سے ہدایت دے دے تو اس سے بہتر ہے کہ تمہاری ملکیت میں سرخ اونٹ ہوں۔'' [2] چنانچہ خیبر کے یہود نے اسلام کا مذہب قبول نہیں کیا لیکن اسلام کی حکومت قبول کر لی اور مصالحت ہو کر تلوار نیام میں کر لی گئی۔

اسی طرح کسی مسلمان کے لیے کسی دوسرے مسلمان پر ہتھیار اٹھانا جائز نہیں بلکہ کفر کا موجب ہے۔ کفار کو مسلمانوں کا یہ طرز عمل معلوم تھا۔ اکثر لڑائیوں میں جب مشرک حملہ آور اپنی کمزوری محسوس کرتا تھا تو اپنی جان بچانے کے لیے کلمہ توحید پڑھ دیتا تھا اور ایک بپھرے ہوئے مسلمان کو مجبوراً اپنے غصہ کو ضبط کر کے ہاتھ روک لینا پڑتا تھا۔

ایک دفعہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ اگر لڑائی میں میرا حریف اپنی تلوار سے میرا ہاتھ اڑا دے اور

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب وفد بنی حنیفة وحدیث ثمامة بن اثال: ٤٣٧٢؛ ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی الأسیر یوثق: ٢٦٧٩۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة خیبر: ٤٢١٠۔

جب میرے حملہ کی باری آئی تو درخت کی آڑ پکڑ کر کہے "میں مسلمان ہوتا ہوں" تو اے خدا کے رسول! میں کیا کروں اس کو قتل کروں؟ فرمایا: "نہیں اس کا قتل جائز نہیں۔" عرض کیا، یا رسول اللہ! میرا ہاتھ اس نے کاٹ ڈالا۔ فرمایا: "پھر بھی اس کا قتل جائز نہیں کہ اگر تم نے اب اس کو قتل کیا تو وہ، وہ ہو گیا جو تم اس کے قتل سے پہلے تھے اور تم وہ ہو جاؤ گے جو وہ اس اقرارِ توحید سے پہلے تھا۔" ❶

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ آپ کے بڑے چہیتے خادم تھے، وہ ایک فوجی دستہ کے سپہ سالار بنا کر ایک لڑائی میں بھیجے گئے، جب گھمسان کا رن پڑا تو ایک کافر ان کی زد میں آیا، انہوں نے حملہ کا قصد کیا تو وہ لا الہ الا اللہ پکار اٹھا، ایک انصاری جو پہلے اس پر جھپٹے تھے وہ تو رک گئے مگر اسامہ نے اس کافر کے اس کلمہ پڑھنے کو اس کی جان بچانے کے فریب پر محمول کر کے اس کا کچھ خیال نہ کیا اور نیزہ سے اس کا کام تمام کر دیا، آنحضرت ﷺ کو یہ خبر ہوئی تو اسامہ سے سخت آزردہ ہوئے، اسامہ نے عرض کی، یا رسول اللہ! اس نے صرف تلوار کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا، فرمایا اور کتنا بلیغ فقرہ فرمایا: "اے اسامہ! تم نے کیا اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟" پھر برابر یہ فرماتے رہے: "اے اسامہ! تم قیامت میں اس کے لا الہ الا اللہ کا کیا جواب دو گے؟" اسامہ کہتے ہیں کہ مجھ کو اتنی ندامت ہوئی کہ میں نے دل میں آرزو کی کہ کاش! میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا۔ ❷

دیکھو کہ واقعہ کی تصویر کتنی الٹ دی گئی ہے واقعہ تو یہ تھا کہ اپنی حملہ آورانہ لڑائی کے گھمسان میں بعض کفار و مشرکین جن کو یہ معلوم تھا کہ کسی کلمہ گو کو مسلمان اپنے مذہب کے حکم کے بموجب قتل نہیں کرتے وہ جب مسلمانوں کی زد میں پڑتے تھے تو اپنی جان بچانے کے لیے فوراً کلمہ شہادت پڑھ دیتے تھے اور بیان اس صورت میں کیا جاتا ہے کہ اسلام نے کفار کو تلوار کی نوک سے کلمہ پڑھنے پر مجبور کیا۔ کیا یہ صداقت ہے؟

اسی طرح آنحضرت ﷺ کا ایک اور اعلان ہے جس کو اکثر غلط معنی میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ)) "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑائی کروں جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کریں جب وہ اقرار کر لیں تو انہوں نے اپنے جان و مال کو مجھ سے بچا لیا اور ان کی نیت کی پرسش خدا کا کام ہے۔" ❸ اس حدیث کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ مسلمان سے لڑنا جائز نہیں لیکن کسی غیر مسلم قوم سے بھی لڑنا اسی وقت جائز ہے جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کرے اور جب اس نے یہ کر لیا تو پھر اس سے بھی لڑنا روا نہیں خواہ وہ حملہ کے ڈر سے لا الہ الا اللہ پڑھے یا سچے دل سے اس نے یہ اقرار کیا ہو، اس کی تحقیق کہ کس نیت سے اس نے کلمہ پڑھا انسان کا فرض نہیں خدا کا ہے۔ یہ بالکل ایک مصالحانہ اعلان ہے لیکن لوگ اس کو اس معنی میں پیش کرتے ہیں کہ گویا یہ اسلام کا حکم تھا کہ

❶ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم قتل الکافر بعد قولہ لا الہ الا اللہ: ۲۷۴۔
❷ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ایضاً: ۲۷۸، ۲۷۹۔
❸ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الأمر بقتال الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ: ۱۲۴۔

مسلمان دیوانہ وار تلوار لیے پھرتے اور جس کو پاتے اس کو ڈرا دھمکا کر کہتے کہ کلمہ پڑھو ورنہ سر قلم کر دیں گے، غور کرو اگر یہ حکم ہوتا تو قیدی اقرارِ توحید کیے بغیر اس آسانی سے چھوڑے جاتے اور ہاری ہوئی قوموں سے اسلام نہیں، صرف چند درہم کا جزیہ لے کر ان کو آزاد کر دیا جاتا اور کیا مسلمانوں کو یہ اجازت ملتی کہ

﴿ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا ﴾ (۸/ الانفال:٦١)

''اگر کفار کا محارب فریق صلح کے لیے جھکے تو، تو بھی جھک جا۔''

بلکہ اس کے بجائے یہ حکم ہوتا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں ان سے صلح نہ کرنا اور نیز کیا مسلمانوں کو یہ حکم ہو سکتا تھا کہ

﴿ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:٦)

''اور اگر لڑائی کے میدان میں مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دے یہ اس لیے کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔''

بلکہ یہ ہوتا کہ پناہ ملنے اور کلامِ الٰہی سننے کے بعد وہ مسلمان نہ ہوتا تو اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچانے کے بجائے اس کو قتل کر کے جہنم میں پہنچا دو مگر ایسا نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی امن پسندی اور رواداری کے مفہوم کو کس طرح الٹ کر بیان کیا جاتا ہے حالانکہ اسلام نے ان مشرکوں سے بھی جو ہمارے کسی دوست مشرک قبیلہ کے دوست ہوں اور ہم سے صلح و آشتی سے رہنا چاہتے ہوں لڑنے کو منع کیا ہے:

﴿ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء:٩٠)

''تو اگر وہ تم سے کنارہ پکڑیں پھر نہ لڑیں اور تمہارے سامنے صلح کی طرح ڈالیں تو اللہ نے تم کو ان پر حملہ کرنے کی راہ نہیں دی۔''

یعنی پھر ان پر تلوار اٹھانا درست نہیں، حالانکہ اگر اسلام کی مذہبی جنگ جوئی کے وہی معنی ہوتے کہ یا تلوار یا اسلام تو کیا اس امن پسندی اس صلح جوئی اور اس ترکِ جنگ کی صورت ممکن ہو سکتی تھی؟

مسلح تبلیغی جماعتیں

غلط فہمی پھیلانے کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کے لیے جو جماعتیں ملک میں بھیجی جاتی تھیں وہ مسلح ہوتی تھیں لیکن یہ حقیقت بھلا دی جاتی ہے کہ یہ عرب کا واقعہ ہے جہاں کوئی منظم اور باضابطہ حکومت نہ تھی جس پر تمام رعایا کی حفاظت کی ذمہ داری ہو، ایک ایک وادی میں ایک ایک قبیلہ اپنی اپنی الگ ریاست قائم

کیے ہوئے تھا اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے برسر پیکار تھا، راستوں پر رہزنوں اور ڈاکوؤں کا قبضہ تھا جن سے اکا دکا آدمی کا صحیح وسالم بچنا ناممکن تھا، اس لیے جب کہیں کوئی تبلیغی مہم بھیجی جاتی تھی، تو بدامنی کے ملک میں رہنے والوں کے عام دستور کے مطابق وہ اپنی ممکن حفاظت کے لیے مسلح جاتی تھی اور اس بات کی دلیل کہ اس مسلح جماعت کا تبلیغ ودعوت کے سوا کوئی مقصد نہ تھا اس سے ظاہر ہے کہ ان کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی جو فوجی حملہ کے لیے کافی نہیں ہوسکتی تھی۔

غزوۂ بدر کے بعد جب قریش کا زور ٹوٹ گیا اور ملک میں اسلام بھی ایک قوت شمار ہونے لگا تو آنحضرت ﷺ نے بعض بعض قبیلوں کی درخواست پر مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تبلیغ وتعلیم کے لیے ادھر ادھر بھیجا تب وہ بھی اکثر راستہ میں جان سے ماری گئیں۔ واقعہ رجیع میں ستر (۷۰) داعیوں کا مارا جانا، واقعہ بیر معونہ میں چھ یا دس داعی مسلمانوں کا قتل ہونا، سریہ ابن ابی العوجاء میں پچاس مسلمانوں کی شہادت کا واقعہ، ذات اطلاح میں چودہ داعی مسلمانوں کا تیروں سے مارا جانا، عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ کا تیروں سے چھد جانا اس دعویٰ کی شہادت ہے۔

تبلیغ ودعوت کی تنظیم

آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں تشریف فرما رہے، بنفسِ نفیس اس فرض کو انجام دیتے رہے ایک ایک کے پاس جاتے اور حق کا پیغام سناتے، شہر سے نکل کر مکہ کے آس پاس آجاتے تھے اور آنے جانے والوں کو بشارت سناتے۔ مکہ سے نکل کر طائف گئے اور وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا، یہ بھی خدا کی مصلحت تھی کہ اس نے اپنے آخری دین کا مرکز مکہ معظمہ کو قرار دیا جو عرب کا مرکزی شہر تھا اور حج کے موسم میں تمام قبیلے یہاں آجاتے تھے، آپ سالہا سال حج کے موسم میں ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور خدا کی دعوت پیش کرتے، اسی سالانہ تبلیغ سے اسلام کو وہ جماعت ہاتھ آئی جس کا نام انصار ہے۔ الغرض ان تبلیغی سرگرمیوں سے مکہ میں سینکڑوں آدمی مسلمان ہوچکے تھے، مگر قریش کے ظلم سے وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور آنحضرت ﷺ کے مشورہ سے وہ حبشہ کی طرف روانہ ہوئے، اس سفر کی مصلحت عجیب وغریب تھی ان مظلوم مسلمانوں کی ہجرت نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ وہ اس مسافرت میں جہاں جہاں سے گزرے، اسلام کی آواز پہنچاتے گئے اور اس طرح یمن اور حبشہ دونوں ملکوں میں اسلام کی تحریک روشناس ہوگئی۔

مکہ میں آنحضرت ﷺ کے بعد عام مسلمانوں میں سب سے پہلے مبلغ اور داعی حق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ مکہ کے بہت سے معزز گھرانوں کے پرجوش نوجوان انہیں کی تبلیغ سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے، حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہم، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کی کوششوں سے دائرہ اسلام میں آئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد اسلام کے دوسرے مبلغ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ تھے جن کے مؤثر وعظوں کو سن کر

آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کے گھرانے کے گھرانے توحید کے پرستار ہو گئے تھے۔ مدینہ منورہ آ کر اسلام نے امن و اطمینان کی سانس لی تو آنحضرت ﷺ نے ان نومسلموں کی تعلیم کے لیے جو اطرافِ ملک سے دار السلام میں آتے تھے نیز ملک کے مختلف گوشوں میں اسلام کی تبلیغ کے لیے ایک جماعت قائم کی جس کا نام عام طور سے اصحابِ صفہ (چبوترہ والے) مشہور ہے، اس میں وقتاً فوقتاً سو سے زیادہ آدمی داخل رہے ہیں، یہ لوگ ملک میں اسلام کی دعوت کے لیے بھیجے جاتے اور خود نومسلموں کو تعلیم دیتے۔ بیر معونہ میں ستر کے قریب جو داعی اور مبلغ راہ میں بیدردانہ قتل ہوئے وہ اسی جماعت کے ارکان تھے۔ ان کے علاوہ وہ اکابر صحابہ جو وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں، بادشاہوں، قوموں اور قبیلوں میں اسلام کی دعوت لے کر پھیلے، احادیث و سیر کی کتابوں میں ان کے نام متفرق طور سے ملتے ہیں۔ میں نے تھوڑی سی کوشش سے اس قسم کے پینتیس (۳۵) صحابیوں کے نام جمع کیے ہیں جنہوں نے از خود آنحضرت ﷺ کے مشورہ سے اس فرض کو انجام دیا، ان کے نام یہ ہیں: ابوذر غفاری، طفیل بن عمرو دوسی، جعفر طیار، عمرو بن عنبسہ سلمی، ضماد بن ثعلبہ، خالد بن ولید، علی بن ابی طالب، مہاجر بن ابی امیہ، زیاد بن لبید، خالد بن سعید، عدی بن حاتم، علاء بن حضرمی، ابوموسیٰ اشعری، معاذ بن جبل، جریر بن عبداللہ بجلی، دحیہ کلبی، عمرو بن امیہ ضمری، مغیرہ بن شعبہ، عمرو بن العاص، وبر بن نخیس، عروہ بن مسعود ثقفی، عامر بن شہر، منقذ بن حبان، ثمامہ بن اثال، محیصہ بن مسعود، احنف، ابوزید انصاری، عمرو بن مرہ، عیاش بن ربیع مخزومی، واثلہ بن اسقع، عبداللہ بن حذافہ سہمی، حاطب بن ابی بلتعہ، سلیط بن عمرو بن عبد شمس، شجاع بن وہب اسدی رضی اللہ عنہم۔ انہیں مبلغوں اور داعیوں اور قاصدوں کی پکار تھی جس نے یمن، یمامہ، بحرین، حجاز، نجد غرض پورے عرب کو بیدار کر دیا اور عرب سے باہر ایران، شام، مصر، حبش ہر جگہ اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔

مبلغوں کی تعلیم و تربیت

سیرت کی دوسری جلد کے آغاز میں اشاعتِ اسلام کی تاریخ اور دعاۃ معلمین کی تعلیم و تربیت کا حال لکھا جا چکا ہے، سلسلہ بیان کے لیے یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ ان کو سب سے پہلے قرآن پاک کی سورتیں یاد کرائی جاتی تھیں، لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا، آنحضرت ﷺ کے شب و روز کے ارشادات سننے کا موقع بھی ان کو ملتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تبلیغ کا درسِ اولین قرآن اور صرف قرآن تھا۔

دعوت بالقرآن

قرآن پاک اسلام کے دعویٰ اور دلیل دونوں کا مجموعہ ہے اور وہی اس کے مذہب کا صحیفہ ہے، خود آنحضرت ﷺ اور دوسرے مبلغ صحابہ بھی تبلیغ و دعوت میں صرف قرآن کی سورتیں پڑھ کر سناتے تھے اور جہاں ان کو اس کا موقع مل جاتا وہاں اس کی تاثیر اپنا کام کر جاتی تھی اور یہ فرض خود قرآن نے اپنا آپ قرار دیا

تھا،اس کی تبلیغ کے لیے جہاد کی ضرورت تھی مگر اس جہاد کا ہتھیار لوہے کی تلوار نہیں، بلکہ قرآن کی تلوار تھی جس کی ضرب کی روک ڈھال اور سپر سے بھی ممکن نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اسی تلوار سے جہاد کا حکم دیا۔فرمایا:

﴿ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴾ (۲۵/ الفرقان:۵۲)

''تو اے پیغمبر! منکروں کا کہنا نہ مان اور اس قرآن سے ان کے ساتھ بڑے زور وشور سے جہاد کر۔''

اس پیغام الٰہی کے زمین میں اترنے کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ خدا کے بھولے ہوئے بندوں کو ان کا عہد یاد دلائے۔فرمایا:

﴿ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴾ (۵۰/ ق:۴۵)

''تو اے پیغمبر ان کو جو میری دھمکی سے ڈرتے ہوں قرآن کے ذریعہ سے یاد دلا۔''

قرآن رحمتِ عالم کا پیامِ عمومی ہے اور یہی اس کے نزول کی غرض و غایت ہے۔فرمایا:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ﴾ (۲۵/ الفرقان:۱)

''برکت والا ہے وہ جس نے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب اپنے بندہ پر اس لیے اتاری تا کہ تمام دنیا کو بیدار اور ہشیار کر دے۔''

یہی قرآن اسلام کی طاقت اور محمد رسول اللہ ﷺ کا اصلی ہتھیار تھا جس کی کاٹ نے کبھی خطا نہ کی۔

اشاعتِ اسلام کی قدرتی ترتیب

عرب میں صرف تین قومیں تھیں جن کا اسلام لانا گویا تمام جزیرہ نمائے عرب کا اسلام لانا تھا یعنی مشرکین، یہود اور نصاریٰ مشرکینِ عرب کا مرکز خانہ کعبہ تھا اور ان کے مذہبی پیشوا قریش تھے، یہود کا صدر مقام مدینہ اور خیبر تھا، نصاریٰ اور مجوس شام اور یمن کے اطراف میں پھیلے تھے۔اس بنا پر الاقرب فالاقرب کے لحاظ سے اشاعتِ اسلام کی قدرتی ترتیب یہ تھی کہ قریش اور کفارِ مکہ کو پہلے دعوتِ توحید دی جاتی پھر یہود کو حلقہ بگوشِ اسلام بنایا جاتا اور اس کے بعد نصاریٰ اور مجوس کو دعوت دی جاتی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اسی ترتیب کے ساتھ اسلام کی اشاعت کی اور اسی بنا پر قرآن مجید کا طریق دعوت مختلف نظر آتا ہے، تمام مکی سورتوں کے مخاطب کفار مکہ تھے اس لیے ان میں بت پرستی کی مذمت، توحید کی ترغیب، عجائب قدرت کا بیان، عذابِ الٰہی سے تخویف اور صنادید قریش کی مخالفت کے جواب کے سوا کچھ نہیں لیکن جب آنحضرت ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو یہود سے سابقہ پڑا اور اب قرآن کا طرزِ خطاب بدل گیا، چنانچہ ابتدائی مدنی سورتیں زیادہ تر یہود کی مذہبی تاریخ، ان کی تحریفات اور ان کی اخلاقی کمزوریوں اور قصص بنی اسرائیل پر مشتمل ہیں۔سب سے اخیر میں نصاریٰ کی باری آئی اور فتح مکہ کے بعد قبائلِ عرب کے وفود کے سلسلہ میں نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا اسی زمانہ میں سورۂ آل عمران نازل ہوئی جس میں نصاریٰ کا ذکر ہے۔

مجوس عرب میں بہت کم تھے، بحرین اور یمن میں خال خال وہ پائے جاتے تھے وہ بھی ایرانی النسل تھے، خالص عرب نہ تھے، اس لیے قرآن مجید نے خاص طور پر کسی سورۂ میں ان کے ساتھ خطاب نہیں کیا ہے، البتہ جا بجا مناسب موقعوں پر ان کا نام لیا ہے اور ان کے عقائد کی تردید اور ان کو ثنویت یعنی دو خداؤں کی پرستش کے بجائے توحید کی دعوت دی ہے۔

قبول اسلام کے لیے کیا چیز درکار تھی

اگرچہ یورپ کا یہ عام دعویٰ ہے کہ عرب میں اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیلا لیکن ابتدا میں جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو قبول کیا ان کے اوصاف پیشِ نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لیے صرف اثر پذیر دل کا جویا تھا اور جب یہ آشیانہ مل جاتا تھا تو اس کے سامنے یہ طائرِ قدس اپنے پر ڈال دیتا تھا۔ چنانچہ ابتدائی بعثت میں جن اشخاص نے اسلام کو قبول کیا وہ وہی تھے جو نیک طبع، ایماندار، راستی پسند اور حق جو تھے اور جو نبوت کے اوصاف وخصائص سے واقف تھے گزشتہ آسمانی مذاہب سے کچھ نہ کچھ آگاہ تھے اور معاشرت اور تمدن سے بہرہ ور تھے۔ اشخاص کے علاوہ جن قبائل اور آبادیوں نے اسلام کے قبول کرنے میں پیش دستی کی وہ بھی وہی تھے جن میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی تھیں۔ عرب کے دو مختلف حصوں جنوبی و شمالی میں سب سے زیادہ اسلام کو کامیابی عرب کے جنوبی حصہ یعنی یمن، عمان، بحرین، یمامہ میں ہوئی اور شمالی حصہ میں سے مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں ہوئی کیونکہ وہ تمدنی حیثیت سے دنیا کی دو ممتاز متمدن قوموں ایرانیوں اور رومیوں سے متاثر تھے اور مذہبی حیثیت سے یہودیوں اور عیسائیوں سے ان کا میل جول اور خلا ملا تھا، اہلِ مدینہ بھی یہودیوں کے تمدن ومعاشرت روایات اور رسم ورواج سے بہت کچھ متاثر تھے۔ [1]

اسلام کو عربوں سے جس قدر لڑائیاں پیش آئیں وہ سب نجد اور حجاز میں پیش آئیں لیکن مسلمانوں کی کوئی جرار فوج مدینہ، یمن، عمان، یمامہ اور بحرین فتح کرنے کے لیے نہیں بھیجی گئی۔ انصارِ مدینہ نے خود آ کر اسلام کو لبیک کہا، اطرافِ مدینہ کے قبائل میں غفار نے خود مکہ آ کر قریش کی تلوار کی آگ میں کھڑے ہو کر لا الٰہ الا اللہ پڑھا، یمن سے دوس کے قبیلہ کے آدمیوں نے خود مکہ معظمہ پہنچ کر ایمان کی دولت حاصل کی اور اس کے بعد انہوں نے اپنا قلعہ اسلام کی پناہ کے لیے پیش کیا۔ اشعر کا قبیلہ بھی اسی زمانہ میں غائبانہ مشرف بہ اسلام ہوا۔ ہمدان کا قبیلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دعوت پر ایک دن میں مسلمان ہو گیا۔

عمان کا بھی یہی حال ہوا وہاں بھی اسلام نے صرف اپنی تبلیغی کوششوں کے ذریعہ سے اقتدار حاصل کیا۔ ایک بار آپ نے عرب کے کسی قبیلہ کے پاس ایک آدمی کو بھیجا، وہ لوگ اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے اور اس کو زد وکوب کیا، اس نے آ کر آپ ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر اہلِ عمان

[1] مستدرك حاكم، كتاب النكاح، ج۲، ص: ۱۹۵۔

ہوتے تو تم کو نہ گالیاں دیتے نہ مارتے۔'' ❶

یمامہ کے رئیس ثمامہ رضی اللہ عنہ قید ہو کر مدینہ آئے، یہاں آزاد کر دیے گئے مگر مدینہ کی مسجد میں جو جلوہ انہوں نے دیکھا اپنی ظاہری مادی آزادی کے بعد بھی اس کی نورانی زنجیر سے انہوں نے رہائی نہ پائی، خود بخود مسلمان ہو گئے اور اپنے قبیلہ میں جا کر اسلام کے داعی بن گئے اور آخر خون کا ایک قطرہ گرے بغیر اسلام نے وہاں اکثریت حاصل کر لی۔

دیہاتوں میں سب سے پہلے قریہ جواثی نے صدائے توحید پر لبیک کہا جو مضافات بحرین میں تھا، اسی قریہ جواثی کے باشندے فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، چنانچہ مسجد نبوی کے بعد عرب کے دیہاتوں میں سب سے پہلا جمعہ اسی گاؤں میں پڑھا گیا ❷ بارگاہِ نبوت میں عرب کے وفود اگرچہ فتحِ مکہ کے بعد حاضر ہوئے، لیکن بحرین کے لوگوں نے اس میں تمام قبائل عرب پر پیش دستی کی، چنانچہ ۵ھ میں سب سے پہلا وفد جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا وہ قبیلہ عبدالقیس کا تھا جو بحرین میں سکونت گزین تھا۔ ❸

اہلِ یمن کا شمار اگرچہ مہاجرینِ اولین میں نہیں کیا جاتا لیکن جب آنحضرت ﷺ کی ہجرت کا حال معلوم ہوا تو اسی وقت حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی یمن سے ۵۲ آدمیوں کو لے کر مدینہ کی طرف ہجرت کی غرض سے روانہ ہو گئے، بحری سفر تھا وہ لوگ کشتی میں سوار ہوئے تو بادِ مخالف کے جھونکوں نے ان کو حبشہ میں پہنچا دیا جو مسلمانوں کا سب سے پہلا دارالہجرۃ تھا، وہاں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو یہیں اقامت کا حکم دیا ہے تم لوگوں کو بھی یہیں ٹھہر جانا چاہیے، چنانچہ وہ لوگ وہیں مقیم ہو گئے اور فتح خیبر کے زمانے میں مہاجرینِ حبشہ کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ❹

یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جہالت اور وحشت تھی اور اس کی اشاعت کی سب سے بڑی محرک چیز تمدن، معاشرت اور اخلاق کی بلندی اور کتبِ آسمانی اور دیگر مذاہب سے واقفیت تھی، خود قرآن مجید نے اس کو ظاہر کیا ہے:

﴿ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ۝ ﴾ (۹/ التوبة:۹۷)

''دیہاتی بدوی کفر اور نفاق میں سب سے زیادہ سخت ہیں اور زیادہ اس کے اہل ہیں کہ وہ ان احکام کو نہ جانیں جو خدا نے اپنے رسول پر اتارا ہے اور اللہ جانتا اور حکمت والا ہے۔''

❶ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضل اهل عمان:٦٤٩٥۔
❷ صحیح بخاری، کتاب الجمعة، باب الجمعة فی القری والمدن:٨٩٢۔
❸ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الامر بالایمان باللّٰه:١١٥، ١١٦۔
❹ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل جعفر بن ابی طالب:٦٤١٠۔

اور بھی اس قسم کی آیتیں ہیں، جولوگ بادیہ سے آ کر اسلام لائے تھے اور کچھ مسائل سیکھ کر واپس چلے جاتے تھے ان سے جو بیعت لی جاتی تھی اس کا نام ''بیعتِ اعرابی'' تھا جو کم درجہ سمجھی جاتی تھی اس بنا پر بادیہ میں الگ تھلگ رہنا صحابہ کے زمانہ میں معیوب سمجھا جاتا تھا بلکہ بعض لوگ اس کو ارتداد کی علامت سمجھتے تھے۔ ❶

اشاعتِ اسلام کے اسباب وذرائع

گزشتہ مباحث پر ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد خود بخود یہ عقدہ کھل جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دینِ حق کو عربوں میں کس طرح پھیلایا اور آپ کو کیونکر کامیابی حاصل ہوئی تاہم اگر واقعات کی روشنی میں ایک ایک صحابی کے قبولِ اسلام کے اسباب کی تلاش کی جائے تو حسب ذیل اسباب سامنے آئیں گے:

① اسلام کے نشرو اشاعت کا سب سے مقدم اور اصلی سبب معجزۂ قرآنی تھا، قرآنِ مجید جس مؤثر اور دل کپکپا دینے والے طریقہ سے عقائد و معارف و اخلاق کی تلقین کرتا تھا اس کے سامنے وہ تمام عوائق اور موانع جن کا اوپر ذکر ہو چکا فنا ہو جاتے تھے۔ جولوگ سرے سے خدا کے وجود کے منکر تھے قرآن مجید ان کے سامنے عالم کی بوقلمونی، مظاہرِ قدرت کی بوالعجبی، کائنات کی نیرنگی، اجرام فلکی کی جلوہ گری اور عناصر کی نگار آرائی سے اس طرح استدلال کرتا تھا:

﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۸)

''تم خدا کا انکار کس طرح کرتے ہو حالانکہ تم کبھی بے جان تھے تو اس نے تم کو زندگی بخشی، پھر ایک دن تم کو مردہ بنا دے گا پھر زندہ کرے گا اور پھر اس کے پاس واپس کیے جاؤ گے۔''

﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۶٤)

''آسمان و زمین کی پیدائش میں، شب و روز کے اختلاف میں، ان کشتیوں میں جو سمندر میں انسانوں کے لیے سودمند چیزوں کو لے کر چلتی ہیں، بادلوں سے پانی برسانے میں، اس پانی سے مردہ زمین کو زندہ کرنے میں اور اس زمین میں ہر قسم کے جانداروں کو پھیلانے میں، ہواؤں کے چلانے میں، ان بادلوں میں جو فضائے آسمانی سے مسخر ہیں دانشمندوں کے لیے یقیناً بڑی نشانیاں ہیں۔''

❶ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب تحریم رجوع المهاجر إلی استیطان وطنه:٤٨٢٥؛ سنن نسائی، کتاب البیعة، باب المرتد اعرابیا بعد الهجرۃ:٤١٩١۔

﴿ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۸۳)

''آسمان وزمین میں جو بھی ہے، برضا یا مجبوراً اسی کا اطاعت گزار ہے، اور اسی کی طرف ایک دن سب لوٹائے جائیں گے۔''

﴿ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۝ۚۙ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۹۰، ۱۹۱)

''آسمان وزمین کی خلقت، اور شب وروز کے الٹ پھیر میں، ان ارباب عقل کے لیے بے شبہ بڑی نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھے، لیٹتے (ہر حال میں) خدا کو یاد کرتے ہیں، اور آسمان و زمین کی خلقت پر غور کرتے ہیں، کہ خدایا تو نے یہ بیکار پیدا نہیں کیا۔''

﴿ هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ ﴾ (۱۰/ یونس:۲۲)

''وہ وہ ہے جو تم کو خشکی اور دریا میں سفر کراتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور موافق ہوا کشتی والوں کو خوب لیے جا رہی ہے اور لوگ خوش ہو رہے ہیں کہ (دفعتہً) زور کا جھکڑ آیا اور ہر طرف سے موجیں آ گئیں اور لوگوں کو یقین ہو چلا کہ اب وہ گھر گئے اس وقت وہ خالص خدا کو پکارنے لگتے ہیں۔''

﴿ وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۝ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ۝ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ۝ ﴾ (۳۰/ الروم:۲۱۔۲۳)

''اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے لیے تم ہی سے جوڑے بنائے کہ تم کو ان سے تسلی ہو اور تم میں باہمی محبت اور ہمدردی پیدا کی، اس بات میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا پیدا کرنا ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا ہے، اس بات میں جاننے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خدا کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا اور خدا کے فضل (روزی) کو ڈھونڈنا ہے اس میں سننے والوں کے

لیے نشانیاں ہیں۔''

خدا، یا ایک قوت اعظم کا اعتراف خود انسان کی فطرت ہے، لیکن غفلت شعاری اور آبائی اثر اور دیگر اسباب سے یہ فطرت کبھی کبھی مردہ اور بے حس ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید اسی خفتہ حس کو بیدار کرتا ہے:

﴿ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ﴾ (١٤/ ابراهيم:١٠)

''کیا خدا میں شک ہے، جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔''

﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ﴾

(٢/ البقرة:٢٨)

''اور کیسے تم خدا کا انکار کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے اور اس نے تم کو زندگی دی اور پھر وہ تم کو موت دے گا، پھر وہ تم کو زندہ کرے گا، پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

عرب میں ملحد کم تھے زیادہ تر بلکہ قریبا تمام تر مشرکین تھے جو خدا کو اگرچہ مانتے تھے، لیکن یہ بھی مانتے تھے کہ اس کے سوا اور بھی خدا ہیں جو خدا کے شریک ہیں اور نظام عالم انہی کے ہاتھ سے انجام پاتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ جس سے براہِ راست اس کو کام پڑتا ہے اس کو زیادہ مانتا ہے، اسی سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اسی کی زیادہ پرستش کرتا ہے، چونکہ مشرکین کا اعتقاد تھا کہ بادلوں کی بارش، غلہ کی پیداوار، نباتات کی روئیدگی، سب اجرامِ فلکی یا اصنام کا کام ہے، اس لیے ان کو عبدیت کا جو کچھ تعلق تھا انہیں معبودوں سے تھا، وہ انہی کی عبادت کرتے تھے، انہیں سے محبت رکھتے تھے، انہیں پر نذر چڑھاتے تھے، انہی کے سامنے قربانیاں کرتے تھے، معرکوں میں انہیں کے نام کی جے پکارتے تھے۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ کا اصلی کام اسی شرک اور اصنام پرستی کو مٹانا تھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اصلی وجود باری کے متعلق بہت کم استدلال ہے، زیادہ تر شرک کا ابطال اور اس کی تحقیر اور تہجین ہے۔

قرآن مجید طرح طرح سے نہایت مؤثر پیرایوں میں شرک کی لغویت کا اظہار کرتا ہے:

﴿ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْۗءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاۗءَ الْاَرْضِ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ (٢٧/ النمل:٦١-٦٤)

''کیا وہ جس نے زمین کو قرار گاہ بنایا اور اس کے بیچ میں نہریں بہائیں اور اس کے لیے

پہاڑوں کی میخیں گاڑیں اور دونوں دریاؤں میں اوٹ رکھا، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ جانتے نہیں، کیا وہ جو پریشان خاطروں کی سنتا ہے، جب وہ اس کو پکارتے ہیں اور بلا کو ہٹا دیتا ہے اور تم کو دنیا کا حکمران بناتا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے تم بہت کم سوچتے ہو، کیا وہ جو تم کو خشکی اور تری کی اندھیریوں میں راستہ دکھاتا ہے اور وہ جو کہ اپنی رحمت (بارش) کے آگے ہواؤں کو بھیجتا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے، مشرکین جن کو خدا کا شریک کہتے ہیں خدا ان سے برتر ہے۔ آیا کون ہے جو آفرینش کا آغاز کرتا ہے؟ پھر اس کو لوٹا لاتا ہے اور وہ کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے تو کہہ دے کہ اگر سچے ہو تو دلیل لاؤ۔''

کفار اور مشرک عموماً قیامت کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ ﴿ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ ﴾ (۳٦/ یٰسٓ:۷۸) یعنی ''ہڈیاں گل سڑ چکیں تو اب کون ان کو جلائے گا۔'' قرآن مجید ان سے خطاب کرتا تھا:

﴿ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِ َۧ الْمَوْتٰى ۝ ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۳۷_۴۰)

''کیا انسان پہلے منی نہیں تھا، پھر گوشت کا لوتھڑا بنا، پھر خدا نے اس کو ٹھیک کیا اور اس سے دو جوڑ مرد اور عورت بنائے، کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ کر دے؟''

غرض عقائد، عبادات، اخلاق، اعمال ہر چیز کو قرآن اس مؤثر اور دل نشین طریقہ سے ادا کرتا تھا کہ دل میں گھر کر جاتا تھا اور رسم و عادات کا بند اس سیلاب کو کسی طرح روک نہیں سکتا تھا، اس پر بھی جو کفر پر ثابت قدم رہے وہ ذاتی اغراض کا اثر تھا حقیقی جحود و انکار نہ تھا۔

تمام بڑے بڑے صحابہ، بڑے بڑے رؤسائے قبائل، بڑے بڑے شعرا اور خطبا قرآن ہی سن کر ایمان لائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کس ارادہ سے چلے تھے، لیکن جب قرآن مجید کی آیتیں سنیں تو کانپ اٹھے اور اسلام قبول کر لیا، عتبہ جو رئیس قریش اور علوم عرب کا ماہر تھا جب اس نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر کہا کہ تم نبوت کی دعوت سے باز آؤ ہم تمہارے لیے سب کچھ مہیا کر دیتے ہیں، آپ نے حٰمٓ کی ابتدائی آیتیں پڑھیں، جب یہ آیت آئی:

﴿ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ۝ ﴾

(۴۱/ حٰمٓ السجدۃ:۱۳)

''تو اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دے کہ میں تم کو اس کڑک سے ڈراتا ہوں جو عاد و ثمود کی کڑک کی طرح ہے۔''

تو عتبہ نے بیتاب ہو کر آنحضرت ﷺ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ خدا کے لیے بس، تم کو قرابت کی قسم دلاتا ہوں، پھر واپس جا کر قریش سے کہہ دیا محمد ﷺ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ شعر ہے نہ جادو، نہ کہانت ہے ❶ (بلکہ کوئی اور چیز ہے) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے سے پہلے اپنے بھائی انیس کو جو شعرائے عرب میں تھے، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں تحقیق حال کے لیے بھیجا تھا، وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور قرآن مجید سنا تو جا کر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ لوگ ان کو کاہن اور شاعر کہتے ہیں، لیکن میں کاہنوں اور شعرا دونوں کے کلام سے واقف ہوں اور ان کا کلام دونوں سے الگ ہے، انیس کے بعد حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ خود گئے اور واپس آئے تو ان کا آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہو گیا۔ ❷

ولید بن مغیرہ (حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا باپ) جو اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا، جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ نے یہ آیتیں پڑھیں:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ ﴾ (۱٦/ النحل: ۹۰)

''خدا عدل کا، احسان کا اور رشتہ داروں کو عطا کرنے کا حکم دیتا ہے اور فحش سے، بری بات سے اور ظلم سے منع کرتا ہے، وہ تم کو سمجھاتا ہے کہ شاید تم سمجھ جاؤ۔''

ولید نے کہا پھر پڑھنا، آپ نے دوبارہ پڑھا، وہ واپس گیا اور قریش سے جا کر کہا کہ یہ انسان کا کلام نہیں۔ ❸

عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ بڑے پایہ کے صحابی اور سابقین اسلام میں ہیں، یہی آیتیں ہیں جن کو سن کر ان کے دل نے سب سے پہلے اسلام کا جلوہ دیکھا، وہ خانہ کعبہ کو جا رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے راستہ میں اپنے پاس بٹھا لیا، پھر فرمایا: ''ابھی مجھ پر یہ کلام اترا ہے۔'' یہ کہہ کر آپ نے اوپر والی آیتیں پڑھیں عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پہلا موقع تھا کہ اسلام نے میرے دل میں گھر کیا۔ ❹

جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے کفر کے زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو سورۂ طور پڑھتے سنا جب اس آیت پر پہنچے:

﴿ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ۝ ﴾ (۵۲/ الطور: ۳۵۔۳۷)

''کیا یہ لوگ از خود پیدا ہو گئے یا خود خالق ہیں، کیا آسمان اور زمین کو انہیں لوگوں نے پیدا کیا بلکہ (واقعہ یہ ہے کہ) ان میں ایمان نہیں، کیا ان کے پاس خدا کے خزانے ہیں۔ کیا یہی لوگ

❶ علامہ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح، ج ٤، ص: ٤٤ میں مسند ابویعلیٰ وغیرہ سے یہ روایت نقل کی ہے نیز یہ روایت مستدرک حاکم میں بھی ہے۔ سیرۃ سوم، میں مصنف نے اس کے لیے کتاب التفسیر ابن مردویہ، مسند ابی یعلیٰ و سیرۃ ابن اسحاق کا حوالہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ اخیر فقرہ صرف سیرۃ ابن اسحاق میں ہے۔ دیکھیے سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۱۸۰۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل ابی ذر: ٦٣٥٩۔ ❸ الجواب الصحیح، ج ٤، ص: ٤٦ بحوالہ عبدالرزاق۔

❹ مسند احمد، ج ۱، ص ۳۱۸ وادب المفرد امام بخاری باب البغی: ۸۹۳۔

سربراہ کار ہیں۔"

تو خود جبیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل اڑنے لگا۔ ❶

طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ الدوسی مشہور شاعر اور شرفائے عرب میں تھے، ہجرت سے پہلے وہ مکہ گئے لوگوں کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو ان کے پاس گئے اور آنحضرت ﷺ کی نسبت کہا کہ ان کے پاس نہ جانا، وہ لوگوں پر جادو کر دیتے ہیں لیکن جب حرم میں اتفاقیہ آنحضرت ﷺ کی زبان سے قرآن سنا تو ضبط نہ کر سکے اور مسلمان ہو گئے۔ ❷

ہجرت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے جب طائف کا سفر کیا اور مشرکین کو اسلام کی دعوت دی تو اگرچہ ادھر سے جواب ڈھیلا اور پتھر تھا، تاہم خالد العدوانی نے جو طائف کے رہنے والے تھے آپ کو ﴿ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴾ (٨٦/ الطارق:١) "قسم ہے آسمان کی اور رات کے چلنے والے ستارہ کی۔" پڑھتے سنا تو اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسی حالت کفر میں پوری سورہ یاد کر لی ❸ اور آخر اسلام لائے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو قیام مکہ کے زمانہ میں بعض مشرکین نے اپنی پناہ میں لے لیا تھا اس زمانہ میں حضرت موصوف نے ایک مسجد بنوائی تھی اور اس میں نماز پڑھا کرتے تھے، لیکن نماز باآواز بلند پڑھتے تھے آواز سن کر محلّہ کے نوجوان اور عورتیں جمع ہو جاتیں اور قرآن سنتیں تو ان کا دل خود بخود اسلام کی طرف کھنچتا، چنانچہ اسی بنا پر کفار نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی قرآن پکار کر نہ پڑھا کرو، اس سے ہمارے بچے اور عورتیں مفتون ہوتی جاتی ہیں ❹ انصار اول اول جب مقام عقبہ میں اسلام لائے تو قرآن ہی سن کر لائے تھے، جو لوگ داعی بنا کر بھیجے جاتے ان کو قرآن یاد کرایا جاتا اور وہ جہاں جاتے یہی کارگر آلۂ تسخیر لے کر جاتے، نجاشی کے دربار میں کفار قریش جب سفیر بن کر گئے اور ان کی شکایت پر نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر باز پرس کی تو حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں، نجاشی بے اختیار رو پڑا اور کہا کہ خدا کی قسم! یہ کلام اور انجیل ایک ہی چشمہ سے نکلے ہیں۔ ❺

حبش میں جب آپ ﷺ کی بعثت کا چرچا ہوا تو بیس شخص جو مذہباً عیسائی تھے، تحقیق حال کے لیے مکہ میں آئے اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے ان کے سامنے قرآن مجید کی آیتیں پڑھیں، ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اسی وقت اسلام لائے، آنحضرت ﷺ کے پاس سے یہ لوگ اٹھے تو ابوجہل نے ان سے مل کر کہا کہ تم سخت احمق ہو اتنے دور سے سفر کر کے آئے اور دم بھر میں اپنا

---

❶ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ والطور: ٤٨٥٤۔ ❷ ان کے اسلام کا حال ابن القیم (زاد المعاد) نے بہ تفصیل لکھا ہے اور ابن اسحاق، ج ٢، ص: ٣٤ کے حوالہ سے لکھا ہے۔ طبقات ابن سعد، ج ٤، ص: ٢٣٧؛ الاصابة، ج ٣، ص: ٤٢٢؛ تاریخ دمشق، ج ٢٧، ص: ٩۔ ❸ مسند احمد، ج ٤، ص: ٣٣٥۔

❹ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الی المدینة: ٣٩٠٥۔

❺ مسند احمد، ج ٥، ص: ٢٩١ مسند کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ان هذا والذی جاء به موسی لیخرج من مشكاة واحدة، لیکن سیرت ابن ہشام میں وہ الفاظ ہیں جن کا ترجمہ مصنف نے کیا ہے۔ "ض"

مذہب بدل لیا۔ انہوں نے کہا: ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے۔ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلَنَا دِيْنُنَا۔ [1]

قرآن کی پیشین گوئیوں کی صداقت نے بھی لوگوں کے دلوں کو کھینچا، چنانچہ اہل ایران کے مقابلہ میں رومیوں کی فتح کی جو پیشین گوئی کی تھی جس دن یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی صدہا کافر مسلمان تھے۔ [2]

ایک ضروری نکتہ

عام خیال یہ ہے کہ اہلِ عرب جو قرآنِ مجید سن کر اسلام قبول کر لیتے تھے، وہ صرف فصاحت و بلاغت کی بنا پر، یعنی چونکہ عرب میں شعر و خطابت کا بہت چرچا تھا اور تمام ملک میں شاعری کا مذاق سرایت کر گیا تھا اس لیے جب وہ دیکھتے تھے کہ اور کسی شاعر یا خطیب کا کلام ایسا فصیح و بلیغ نہیں ہے تو وہ اسلام قبول کر لیتے تھے۔ بے شبہ قرآنِ مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے لیکن اس کا اعجاز جس قدر عبارت و انشا میں ہے اس سے کہیں زیادہ معنی و مطالب میں ہے۔

فرض کرو کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایسا ہی معجز ہوتا جیسا اب ہے لیکن اس میں صرف تاریخی واقعات یا اسی قسم کی اور کوئی بات ہوتی تو کیا یہی اثر پیدا ہو سکتا تھا قرآن مجید ایک طرف تو فصاحت و بلاغت کے بنا پر اعجاز کا کام دیتا تھا۔ دوسری طرف جو مطالب اور مقاصد ادا کرتا تھا وہ اسلام ہی کے مقاصد اور مطالب تھے وہ خدا کی عظمت و جلالت اصنام کی تحقیر و تذلیل، انسان کا عجز و تعبد، سزا و جزا، بعث و نشر، جور و ظلم کی تقبیح، اخلاقِ حسنہ کی تحسین، ان مطالب کو اس طرح ادا کرتا تھا کہ خود بخود وہ دل میں گھر کرتے جاتے تھے ان کو یہ نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ان باتوں کو اس لیے مان رہے ہیں کہ مسلمان ہو چکے ہیں بلکہ یہ باتیں براہ راست ان کے دل میں اتر جاتی تھیں اور وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔

موانع کا ازالہ

عرب کو جو چیزیں اسلام سے روکتی تھیں ان میں سب سے اہم (جیسا کہ اوپر لکھ آئے ہیں) ان کے اوہام و اعتقادات باطلہ تھے جو سینکڑوں ہزاروں برس سے چلے آتے تھے یا سیاسی و معاشی ضرورتیں تھیں۔ مقدم الذکر باتوں کا قرآن مجید اور اعجاز نبوی ﷺ نے استیصال کر دیا، عرب میں جو لوگ صاحب فہم اور ذی اثر تھے اور سیاسی اسباب سے مجبور نہ تھے یہ ناممکن تھا کہ وہ قرآن سنتے اور ان کے تمام عقائد اور اوہام دفعتہً فنا نہ ہو جاتے یہ اربابِ اثر جب خود متاثر ہو جاتے تھے تو ان میں سے ایک ایک شخص کے اثر سے ہزاروں اشخاص مسلمان ہو جاتے تھے کیونکہ قبائل پرستی کی بنا پر قبیلہ کا ایک معزز اور رئیس اپنے پورے قبیلہ کے دل و دماغ کا مالک ہوتا تھا۔

البتہ جو لوگ سیاسی اسباب سے مطلقاً دعوتِ اسلام کی طرف متوجہ ہی ہونا نہیں چاہتے تھے، انہوں نے

---

[1] ابن هشام حديث نقض الصحيفة، ج۱، ص: ۲۳۷۔

[2] جامع ترمذي، ابواب التفسير، تفسير سورة الروم: ۳۱۹۴۔

بار بار دار النبوۃ (مدینہ منورہ) پر چڑھائیاں کیں، لیکن نصرت ایزدی نے ان کو اس قدر شکستیں دیں کہ بالآخر مجبور ہو کر بیٹھ گئے، ان میں سے کچھ فنا ہو گئے کچھ چار ونا چار اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے جن میں سے اکثر رفتہ رفتہ بالآخر دل سے مسلمان بن گئے۔

① قبائل کی ریاست سیاسی حیثیت سے گو اسلام کے مخالف تھی لیکن بعض وجوہ سے اسلام کو تائید بھی پہنچاتی تھی، اسلام کی جمہوریت جس قدر ریاست کی مخالف تھی اسی قدر عام جماعت کی حامی تھی، اسلام سے اگر ایک رئیس کی شان، ریاست وخود سری کو نقصان پہنچتا تھا تو ہزاروں آدمیوں کو نظر آتا تھا کہ اسلام قبول کر لینے سے ہر شخص رئیس کا ہمسر ہو جاتا ہے، غرض اسلام اگر ایک رئیس کو مٹاتا تھا تو سینکڑوں کو رئیس بنا دیتا تھا۔

اس کے ساتھ رؤسا کی ریاست بالکل زائل نہیں ہو جاتی تھی بلکہ اسلام قبول کرنے پر وہ اپنے قبیلہ کے رئیس باقی رہتے تھے صرف اتنا ہوتا تھا کہ ان کی بے قید مطلق العنانی قائم نہیں رہتی تھی اور اسلامی احکام کا پابند رہنا پڑتا تھا، اس لیے اگر کوئی خود غرضی کرنا بھی چاہتا تھا تو اس کو بھی یہ سودا گراں نہیں پڑتا تھا، مؤلفۃ القلوب کا گروہ اس کی ایک صریح نظیر تھا۔

اب صرف معاشی ضرورت سدراہ ہو سکتی تھی لیکن لوگوں کو نظر آتا تھا کہ جن حدود میں اسلام کی حکومت قائم ہو جاتی ہے وہاں امن وامان قائم ہونے کی وجہ سے تجارت اور دیگر ذرائع معاش کثرت سے ترقی کر جاتے ہیں۔

② نبوت کے متعلق ان کو جو شکوک تھے مشاہدہ اور تجربہ نے ان کا پردہ چاک کر دیا، بڑی سے بڑی انسانیت اور پاک سے پاک زندگی کا جو تخیل ایک انسان کے ذہن میں آ سکتا تھا، محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس سے بھی بدرجہا بالاتر اور ارفع تھی، ان کو نظر آتا تھا کہ گو مدعی نبوت بظاہر جامۂ بشریت میں تھے لیکن اپنی معنوی زندگی، اپنے معجزانہ اخلاق اور اپنے مافوق الفطرت علم ومعرفت اور اپنے ربانی کرشموں کی بنا پر بشریت سے کوئی بالاتر مخلوق ہے۔ ﴿مَا هٰذَا بَشَرًا ۖ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ (۱۲/ یوسف: ۳۱) قرآن مجید نے آنحضرت ﷺ کے صدق نبوت پر اسی مقدس ومعصوم زندگی سے استدلال کیا ہے:

﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (۱۰/ یونس: ۱۶)

''اے قریش! نبوت سے پہلے بھی میں نے تم میں ایک مدت دراز تک زندگی بسر کی ہے کیا تم نہیں سمجھتے۔''

زندگی کا یہی اعجاز تھا جس سے ظہور نبوت سے پہلے ہی ''امین'' کا خطاب آپ نے حاصل کر لیا تھا، بیوی کے برابر انسان کے اصلی حالات واخلاق کا واقف کار کوئی اور نہیں، نبوتِ محمدی کا معتقدِ اولین دنیا میں کون تھا، ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا بنت خویلد، لیکن ان کی اس زود اعتقادی کا راز کیا تھا، ۴۰ برس کے معجزانہ

اخلاق اور مافوق الفطرت اوصاف وحالات کا تجربہ، وہ خود پیغمبر کو خطاب کر کے نبوت کی تسکین ان الفاظ میں دیتی ہیں ''محمد ﷺ! خدا کبھی تمہیں رسوا نہ کرے گا، تم رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرتے ہو، ناداروں کی طرف سے قرض ادا کرتے ہو، محتاجوں کی خبر لیتے ہو، مہمانوں کے ساتھ بہ مدارات پیش آتے ہو، جو لوگ حقیقت میں مبتلائے آلام ہیں ان کی اعانت کرتے ہو۔'' ❶

سن چکے ہو کہ عرب میں آپ کی نبوت کا جب چرچا پھیلا تو ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے انیس اپنے بھائی کو تحقیقِ حال کے لیے بھیجا، انہوں نے واپس آ کر پیکرِ نبوت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا، میں ایک ایسے شخص کو دیکھ کر آیا ہوں جو بھلائیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔ ❷

نبوت کے بعد قریش نے ذات نبوی ﷺ کے ساتھ گو عداوت اور کینہ پروری کا کوئی پہلو اٹھا نہیں رکھا تاہم کوئی ادنیٰ اخلاقی جرم بھی اس کے ساتھ منسوب نہ کر سکے۔ اسلام کے سب سے اول اعلانِ دعوت کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر قریش کے مجمع کو طلب کیا اور پوچھا: ''اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک فوج گراں تم پر حملہ آور ہونے کو تیار ہے تو کیا سچ مانو گے؟'' سب نے بیک آواز کہا: محمد ﷺ! تیری بات آج تک ہم نے کبھی جھوٹ نہ پائی ❸ ابوسفیان جو ہجرت کے آٹھویں سال تک اسلام کے سخت ترین دشمن تھے، ۶ھ میں ہرقل قیصرِ روم کے دربار میں کفارِ قریش کی ایک جماعت کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کے اخلاق واوصاف کے متعلق شہادتیں پیش کر رہے تھے، تاہم وہ ایک حرف بھی صداقت کے خلاف نہ کہہ سکے، انہوں نے شہادت دی کہ ''محمد ﷺ کبھی جھوٹ نہیں بولتے، انہوں نے کبھی بدعہدی نہ کی، شرک سے روکتے ہیں، توحید کی تعلیم دیتے ہیں، عبادت، صدق، عفت صلہ رحمی کی تاکید کرتے ہیں۔'' ہرقل ہر فقرہ پر کہتا جاتا تھا کہ ''نبوت کے یہی آثار و دلائل ہیں'' یہ سب سے پہلا دن تھا کہ ابوسفیان کے دل نے آنحضرت ﷺ کی کامیابی کا یقین کیا۔ ❹

کتاب کی دوسری جلد میں آپ کے تمام محاسن اخلاق یعنی رفق، ملاطفت، حسن معاملت، جود وسخا، عدم تشدد، عفو و درگزر وغیرہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس پر مجموعی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ درحقیقت آنحضرت ﷺ کا ایک معجزہ تھا اور یہ معجزہ تسخیر قلوب ہی کے لیے عطا ہوا تھا۔ قرآن مجید اس نکتہ کو خود بتاتا ہے:

﴿ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۹)

''اور محمد (ﷺ) اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے۔''

---

❶ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی:۳۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، اسلام ابی ذر: ۳۸۶۱۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ تبت:۴۹۷۱؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان. باب ﴿وانذر عشیرتك الاقربین﴾: ۵۰۸۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی:۷۔

آپ کی یہی معجزانہ کشش تھی جو لوگوں کو کھینچ کھینچ کر دائرہ اسلام میں داخل کرتی تھی اور کفار کے جاہلانہ شکوک واوہام کو دم کی دم میں مٹا دیتی تھی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے بہت سی بکریاں مانگیں آپ نے دے دیں اس پر آپ کی فیاضی کا اس قدر اثر پڑا کہ اپنے قبیلہ میں آ کر اس نے کہا: ''لوگو مسلمان ہو جاؤ کیونکہ محمد ﷺ اس قدر دیتے ہیں کہ خود ان کو اپنے تنگ دست ہونے کا مطلق خوف نہیں ہوتا۔'' [1]

فتح مکہ میں جب صفوان بن اُمیہ رضی اللہ عنہ مجبوراً اسلام لایا تو آنحضرت ﷺ نے اس کو تین سو اونٹ دے دیے۔ خود صفوان کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو اس قدر دے دیا کہ آپ پہلے میرے نزدیک مبغوض ترین خلق تھے لیکن اس فیاضی سے محبوب ترین شخص بن گئے۔ [2] ہندہ خاندان نبوت کی قدیم ترین دشمن تھی، جنگِ احد میں قوتِ بازوئے اسلام حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسی نے آپ کے دل کو چاک کیا تھا، اسی نے ان کا جگر نکال کر چبایا تھا لیکن اس کو نگل نہ سکی اور پھر اگل دیا تھا اور اسی نے ان کے ناک کان کاٹ کر گلے کا ہار بنایا تھا، فتح مکہ میں بھیس بدل کر آپ کی خدمت میں اسلام لانے کے لیے حاضر ہوئی، تب بھی گستاخی سے باز نہیں آئی، لیکن دربارِ رسالت میں پہنچ کر آپ کے حسن خلق سے اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار بول پڑی، یارسول اللہ ﷺ! سطح زمین پر آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانا مجھے مبغوض نہ تھا لیکن آج آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانا محبوب نہیں، آپ نے یہ سن کر فرمایا: ''خدا کی قسم! ہمارا بھی یہی حال تھا۔'' [3]

آپ پر ایک یہودی عالم کا قرض آتا تھا اس نے تقاضا کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس وقت میرے پاس کچھ نہیں۔'' اس نے کہا کہ میں تو لے کے ہی ٹلوں گا۔ آپ نے کہا: ''تو اب میں تمہارے ساتھ بیٹھتا ہوں۔'' چنانچہ آپ ظہر سے لے کر فجر کی نماز تک اس کے ساتھ بیٹھ رہے صحابہ نے اس کی اس گستاخی پر ناراضگی ظاہر کی اور خدمتِ اقدس میں عرض کی کہ یارسول اللہ! آپ کو ایک یہودی نے روک رکھا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں لیکن مجھے خدا نے اس سے منع کیا ہے کہ میں کسی ذمی یا اور کسی شخص پر ظلم کروں۔'' دن چڑھا تو یہودی نے کلمہ پڑھا اور کہا کہ ''میرا نصف مال خدا کی راہ میں صدقہ ہے میں نے یہ گستاخی صرف اس لیے کی کہ توراۃ میں پیغمبر کے جو اوصاف مذکور ہیں ان کا تجربہ کروں۔ [4]

ثمامہ بن اثال یمامہ کا ایک رئیس تھا جو اسلام کا مجرم تھا صحابہ کا ایک دستہ نجد کے اطراف میں بھیجا گیا حسن اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا گرفتار ہو کر مدینہ آیا اور مسجد نبوی کے ایک ستون میں باندھ دیا گیا، آنحضرت ﷺ نماز کے لیے تشریف لائے تو اس پر نظر پڑی آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ ''ثمامہ تمہارے

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی سخائہ ﷺ: ۶۰۲۰، ۶۰۲۱۔

[2] صحیح مسلم، باب مذکور: ۶۰۲۲۔ [3] مسلم، کتاب الأقضیۃ، باب قضیۃ ھند: ۴۴۸۰۔

[4] رواہ البیہقی فی دلائل النبوۃ، ج ۶، ص: ۲۸۰؛ مشکوۃ کتاب الفضائل، باب فی اخلاقہ ﷺ: ۵۸۳۲۔

ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔'' اس نے کہا کہ اگر مجھے قتل کرنا چاہیں تو ایک خونی مجرم کو آپ قتل کریں گے اور اگر عفو فرمائیں گے تو یہ احسان ایک احسان شناس کی گردن پر ہوگا، اگر مال کی خواہش ہے تو فرمایئے جو ارشاد ہوگا حاضر کیا جائے گا۔ یہ سن کر آپ اسی حالت میں اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ دوسرے دن پھر اسی قسم کا سوال و جواب ہوا، تیسرے دن پھر یہی گفتگو کی، آنحضرت ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اس کے بند گرہ کھول دیے اور رہا کر دیا۔ اس پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ مسجد سے نکل کر ایک کھجور کے درخت کی آڑ میں گیا اور وہاں غسل کیا اور غسل کر کے مسجد میں آیا اور کلمہ توحید پڑھ کر آنحضرت ﷺ کو مخاطب ہوا: ''محمد ﷺ! زمین پر آپ کے چہرے سے زیادہ کوئی چیز مجھ کو مبغوض نہ تھی لیکن آج وہ مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے مجھ کو آپ کے دین سے زیادہ کسی دین سے عداوت نہ تھی لیکن آج وہ میرے لیے تمام مذاہب سے عزیز تر ہو گیا ہے مجھے آپ کے شہر سے زیادہ کسی شہر سے دشمنی نہ تھی لیکن وہ آج مجھ کو تمام شہروں سے زیادہ خوش نما نظر آتا ہے۔'' [1]

ایک بار آپ ﷺ کسی سفر میں تھے اور ساتھ میں مطلق پانی نہ تھا۔ صحابہ نے پیاس کی شکایت کی آپ نے ایک صحابی کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پانی کی جستجو میں روانہ فرمایا، راہ میں ایک عورت اونٹ پر پانی کی دو مشکیں بھرے ہوئے لیے جا رہی تھی دونوں صاحب اس کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے آئے آپ ﷺ نے برتن منگوائے اور مشکوں کے منہ کھول دیے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے باری باری سے پینا شروع کر دیا، وہ کھڑی تماشا دیکھتی رہی، فراغت کے بعد اس کے صلہ میں آنحضرت ﷺ نے کھجور، آٹا اور ستو تھوڑا تھوڑا لوگوں سے جمع کر کے ایک کپڑے میں باندھ کر اس کے اونٹ پر رکھوا دیا وہ گھر پہنچی تو لوگوں نے تاخیر کا سبب پوچھا اس نے کہا، راہ میں مجھ کو دو آدمی ملے اور وہ مجھ کو اس شخص کے پاس لے گئے جس کو لوگ بددین کہا کرتے ہیں، خدا کی قسم! وہ یا تو اس آسمان و زمین کے درمیان سب سے بڑا جادوگر ہے یا وہ واقعی خدا کا رسول ہے۔

لیکن اسلام کا یہ اثر صرف اسی کی ذات تک محدود نہ رہا بلکہ تربیت یافتگان نبوت کے فیض اثر سے اس کے تمام قبیلے تک وسیع ہو گیا۔ [2]

نبوت کے امتیاز و شناخت کا ذریعہ صرف اخلاق ہی کا اعجاز نہیں، اس کی زبان کا ایک ایک حرف اس کی معصوم شکل و صورت کی ایک ایک ادا، اعجاز اور سرتاپا اعجاز ہوتی ہے۔

روئے و آوازِ پیمبر معجزہ است (رومیؒ)

آپ کی صداقت سے لبریز تقریر کا ایک ایک حرف دل میں اتر جاتا تھا اور نبوت کا اصلی معیار سامع کے سامنے روشن ہو جاتا تھا۔

جب آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو تمام مدینہ میں غل ہو گیا، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب ربط الاسیر وحبسه: ٤٥٨٩۔

[2] بخاری، کتاب التیمم، باب الصعید الطیب وضوء المسلم یکفیه عن الماء: ٣٤٤۔

سلام جو مدینہ کے مشہور یہودی عالم تھے، اپنے نخلستان میں کھجور توڑ رہے تھے، آمد آمد کی خبران کے کان میں پہنچی تو فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ فرمارہے تھے:((افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا الارحام وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنة بسلام)) [1] واپس گئے تو اس قدر متاثر تھے کہ آنحضرت ﷺ اٹھ کر ابوایوب انصاری کے مکان میں جونہی پہنچے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بھی آئے اور کہا کہ میں آپ کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں اور نیز یہ شہادت دیتا ہوں کہ آپ ایک حق مذہب لے کر آئے ہیں۔ [2]

ضماد ایک شخص تھے جن کے ساتھ زمانہ جاہلیت میں آپ کے دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے، وہ جنون کا علاج کرتے تھے، اتفاق سے وہ مکہ میں آئے تو کفار سے سنا کہ آپ (نعوذ باللہ) مجنون ہو گئے ہیں، وہ آپ کے پاس گئے اور کہا ''محمد ﷺ! میں جنون کا علاج کرتا ہوں'' اس کے جواب میں آپ ﷺ نے ایک تقریر کی اور اس کو ان الفاظ سے شروع کیا:

((الحمد لله نحمده ونستعينه من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادى له واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له واشهد ان محمدا عبده ورسوله))

''تمام تعریفیں خدا کے لیے ہیں، میں اس کی حمد کرتا ہوں اس سے مدد چاہتا ہوں، خدا جس کو ہدایت دیتا ہے اس کو کوئی شخص گمراہ نہیں کرسکتا، جس کو گمراہ کرتا ہے اس کو کوئی ہدایت نہیں کرسکتا، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔''

ان پر ان فقروں کا یہ اثر پڑا کہ وہ مکرر سننے کے مشتاق ہوئے، آپ ﷺ نے تین بار یہ کلمات اعادہ فرمائے تو انہوں نے کہا کہ میں نے کاہنوں جادوگروں اور شاعروں کا کلام سنا ہے، لیکن آپ کے اس کلام کی طرح مؤثر کبھی نہیں سنا، وہ سمندر تک پہنچ جائے گا، ہاتھ لائیے، میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں۔ [3]

حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر حارث رضی اللہ عنہ یعنی آپ کے رضاعی باپ جب مکہ میں تشریف لائے تو قریش نے کہا کچھ سنا ہے کہ تمہارا بیٹا کہتا ہے کہ لوگ مر کر پھر زندہ ہوں گے، انہوں نے آپ سے کہا کہ بیٹا یہ کیا کہتے ہو؟ آپ نے نہایت زوردار لہجہ میں فرمایا: ''ہاں اگر وہ دن آیا تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر بتادوں گا کہ جو کچھ میں کہتا تھا سچ تھا۔'' ان پر اس کا یہ اثر پڑا کہ فوراً مسلمان ہو گئے اور یہ اثر اس قدر دیرپا ہوا کہ وہ کہا کرتے

---

[1] مسند احمد، ج ۵، ص: ۴۵۱۔

[2] بخاری، کتاب مناقب الانصار۔ باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الی المدینة: ۳۹۱۱۔

[3] مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفیف الصلوة والخطبة: ۲۰۰۸۔

تھے کہ اگر میرا بیٹا ہاتھ پکڑے گا تو جنت میں پہنچا کر ہی چھوڑے گا۔ ❶

انسان کا چہرہ حقیقت کا آئینہ ہے، آپ کی ایک ایک ادا صداقت اور معصومیت کا پیکر تھی، آپ کی شکل نہایت پرجلال تھی، چہرہ پرنور تھا، آواز موقر اور پررعب تھی اور ان تمام چیزوں کا مجموعی اثر پیغمبرانہ اعجاز کے ساتھ دلوں کو اپنی طرف جذب کر لیتا تھا اسی اثر سے متاثر ہو کر حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نومسلم یہودی عالم آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک کو دیکھ کر بے اختیار بول اٹھے تھے:

وجهه ليس بوجه كذاب. ❷

''جھوٹے آدمی کا یہ چہرہ نہیں ہو سکتا۔''

اور یہی کشش تھی جس کا اظہار حجۃ الوداع میں اعرابِ بادیہ کی زبان سے ان الفاظ میں ہوتا تھا:

هذا وجه مبارك ❸ ''یہ مبارک چہرہ ہے۔''

بارگاہِ نبوت میں پہنچنے کے ساتھ ہی یہ اثر آنکھوں کی راہ سے دل میں پہنچ جاتا تھا ابورافع نام ایک شخص قریش کی طرف سے قاصد بن کر آپ ﷺ کی خدمت میں آئے تھے جوں ہی چہرۂ اقدس پر نظر پڑی وہ بہزار جان شیدا تھے، اسلام قبول کیا ❹ اور آپ ﷺ کی غلامی کو فخر سمجھا۔ ❺

---

❶ اصابه، ج ۱، ص: ۲۹۶ تذکرة حارث ابن عبد العزى۔

❷ جامع ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب حدیث: أفشوا السلام ... :۲٤۸۵۔

❸ ابوداود، کتاب المناسك، باب المواقيت:۱۷٤۲۔

❹ ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی الامام يستجن به فی العهود: ۲۷۵۸۔

❺ اصابه:۶۵، ۶۶ واستیعاب، ج ۲، ص:۶۶۸۔

اسلام
یا
محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ کام

آنحضرت ﷺ جس عظیم الشان پیغام کو لے کر آئے تھے اور جس مہتم بالشان کام کو انجام دینے کے لیے دنیا میں بھیجے گئے تھے، نیک دل اور حقیقت شناس لوگ تو سننے اور دیکھنے کے ساتھ اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے وہ بھی جن کے دل کے آئینے زنگ آلود تھے، پیغام کی سچائی، وحی کی تاثیر، پیغمبر کی پُر اثر دعوت، اعجازِ معصومیت اور اخلاق کے پرتو سے صاف و شفاف ہوتے گئے اور عوائق، موانع، شبہات اور شکوک کی تو بر تو ظلمتیں اور تاریکیاں رفتہ رفتہ چھٹتی چلی گئیں اور اسلام کا نور روز بروز زیادہ صفائی اور چمک کے ساتھ عرب کے افق پر درخشاں و تاباں ہوتا گیا یہاں تک کہ ۲۳ برس کی مدت میں ایک متحدہ قومیت، ایک متحدہ سلطنت، ایک متحدہ اخلاقی نظام، ایک کامل قانون اور ایک کامل شریعت، ایک ابدی مذہب اور عملی جماعت خدا پرستی، اخلاص، ایثار، دین، تقویٰ، ایمانداری، اخلاق اور سچائی کا ایک مجسم عہد یعنی ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان پیدا ہو گیا وہ گویہی حقیقت تھی جس کی طرف آپ نے اپنی امت کے سب سے بڑے مجمع (حجۃ الوداع) میں اپنی وفات سے تقریباً دو ماہ پیشتر یہ ارشاد فرمایا:

((الا ان الزمان قد استدار کھیئته یوم خلق اللّٰه السموات والارض)) [1]

''ہاں اب زمانہ کا دور اپنی اسی حالت پر آ گیا جس حالت پر اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔''

اور یہی حقیقت تھی جس کی نسبت آپ ﷺ نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پیشتر ایک نہایت پُر درد الوداعی تقریر کے آخر میں یہ الفاظ فرمائے: [2]

((قد ترکتکم علی مثل البیضاء لیلها ونهارها سواء))

''میں تم کو ایک روشن راستہ پر چھوڑے جاتا ہوں جس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ اس کی رات بھی دن کے مانند ہے۔''

اور آخر حجۃ الوداع کے مجمع عام میں تکمیل کی بشارت آئی کہ

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ﴾ (۵/ المآئدة:۳)

''آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر ختم کر دی۔''

پروفیسر مارگولیتھ، جن کی تائیدی شہادت بہت کم مل سکتی ہے، لکھتے ہیں:

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب حجة الوداع:٤٤٠٦۔ [2] سنن ابن ماجه، کتاب السنة، باب اتباع السنة:٥؛ مستدرك حاکم، ج ١، ص ٩٦؛ مسند احمد، ج ٤، ص: ١٢٦۔

''محمد ﷺ کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا، آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی ومذہبی دارالسلطنت مقرر کیا گیا تھا، بنیاد ڈال چکے تھے، آپ ﷺ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، آپ ﷺ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔'' ❶

ایک (دور) یورپ کے بیگانہ مستشرق کی نسبت جس کا علم، عرب اور اسلام کے متعلق صرف چند کتابوں سے مستعار ہے، خود ایک عرب عیسائی اہل قلم کو فیصلہ کا زیادہ حق ہے، بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے، اس کے جواب میں ایک عیسائی عالم (داور مجاعص) نے لکھا:

''دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس ❷ کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفہ، ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی، جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ اُمی اور ناخواندہ تھا وہ کون؟ محمد بن عبداللہ قریشی عرب اور اسلام کا پیغمبر۔ اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لیے اور اس سلطنت کے لیے جس کو اس نے قائم کیا ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دیے اس طرح کہ قرآن اور احادیث کے اندر وہ تمام ہدایات موجود ہیں جن کی ضرورت ایک مسلمان کو اس کے دینی یا دنیاوی معاملات میں پیش آ سکتی ہیں۔ حج کا ایک سالانہ اجتماع فرض قرار دیا، تاکہ اقوام اسلامی میں اہل استطاعت ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنے دینی وقومی معاملات میں باہم مشورے کر سکیں، اپنی امت پر زکوۃ فرض کر کے قوم کے غریب طبقہ کی حاجت پوری کی۔ قرآن کی زبان کو دنیا کی دائمی اور عالم گیر زبان بنا دیا کہ وہ مسلمان اقوام کے باہمی تعارف کا ذریعہ بن جائے۔ قوم کے ہر فرد کو ترقی کا موقع اس طرح عنایت کیا کہ یہ کہہ دیا کہ ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر صرف تقویٰ کی بنا پر بزرگی حاصل ہے اس بنا پر اسلام ایک حقیقی جمہوریت بن گیا جس کا رئیس قوم کی پسند سے منتخب ہوتا ہے مسلمانوں نے ایک مدت تک اس اصول پر عمل کیا، یہ کہہ کر عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں، اسلام میں داخل ہونا ہر شخص کے لیے آسان کر دیا، نامسلموں کے لیے اسلامی ملکوں میں عیش وآرام اور امن واطمینان سے سکونت کی ذمہ داری یہ کہہ کر اپنے اوپر لے لی کہ تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے تو خدا کا سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی اولاد کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے، خاندانی ازدواجی اصلاحات بھی اس کی

❶ لائف آف محمد مارگولیتھ صفحہ ۴۷۱۔ ❷ مدینہ منورہ میں آپ دس برس زندہ رہے تھے۔

نظر سے پوشیدہ نہ رہیں اس نے نکاح و وراثت کے احکام مقرر کیے، عورت کا مرتبہ بلند کیا، نزاعات اور مقدمات کے فیصلہ کے قوانین بنائے۔ بیت المال کا نظام قائم کر کے قومی دولت کو بیکار نہ ہونے دیا، علم کی اشاعت اور تعلیم اس کی کوششوں کا بڑا حصہ رہی، اس نے حکمت کو ایک مومن کا گم شدہ مال قرار دیا اسی سبب سے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے زمانہ میں ہر دروازہ سے علم حاصل کیا، کیا ان کارناموں کا انسان دنیا کی سب سے بڑی ہستی قرار نہ پائے گا۔"

انگلستان کا مشہور انشا پرداز کارلائل نے اپنے "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں لاکھوں پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں میں صرف محمد عربی ﷺ ہی کے وجود گرامی کو اس قابل سمجھا کہ وہ آپ کو نبوت کا ہیرو قرار دے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار "محمد" آپ ﷺ کی نسبت کہتا ہے:

"قرآن سے اس شخص کے روحانی ارتقا کا پتہ چلتا ہے جو تمام نبیوں اور مذہبی لوگوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔" ❶

الغرض دوست و دشمن سب کو اس کا اعتراف ہے کہ انبیا میں یہی برگزیدہ ہستی ہے جس نے کم سے کم مدت میں اپنی بعثت اور رسالت کے زیادہ سے زیادہ فرائض ادا کیے اور اصلاحاتِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا، جس کی تکمیل اس کی تعلیم اور عمل سے نہ ہوگئی ہو اور یہ اس لیے کہ تمام انبیا علیہم السلام میں خاتمِ نبوت، مکمل دین اور آخری معلم کی حیثیت آپ ہی کو عطا ہوئی تھی اگر انسان کی عملی و اخلاقی و دینی ضرورتوں کا کوئی گوشہ آپ کے فیض سے محروم رہ کر تکمیل کا محتاج ہوتا تو آپ کے بعد بھی کسی آنے والے کی حاجت باقی رہ جاتی حالانکہ آپ ﷺ نے فرمادیا کہ "میرے بعد کوئی نبی نہیں میں نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ ہوں۔" ❷

آپ کی تعلیمات کی یہی ہمہ گیری ہے جس پر کوتاہ بینوں کو آج نہیں بلکہ خود صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد میں بھی تعجب آتا تھا، بعض مشرکوں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مذاقاً کہا کہ تمہارے پیغمبر تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں یہاں تک کہ اس کی بھی کہ تم کو قضائے حاجت کیونکر کرنی چاہیے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں یہ سچ ہے آپ ﷺ نے ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم ایسی حالت میں قبلہ رخ نہ بیٹھیں اور اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت نہ کریں اور نہ تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں، ان میں کوئی ہڈی اور گوبر نہ ہو۔ ❸ نبوت محمدی ﷺ کی تعلیمات کی یہ ہمہ گیری ہی اس کی تکمیل کی دلیل ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پست سے پست اور غیر متمدن اقوام سے لے کر بلند سے بلند اور متمدن سے متمدن قوموں تک کے لیے یکساں تعلیمات اور ہدایات رکھتا ہے، عرب کے بدوؤں اور قریش کے رئیسوں دونوں کے لیے آپ کی بعثت تھی، اس لیے آپ کی

❶ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون قرآن، ج۱۵، صفحہ:۵۹۸۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین:۳۵۳۵ وجامع ترمذی، کتاب الامثال، باب ما جاء فی مثل النبی والانبیاء:۲۸۶۲۔

❸ جامع ترمذی، ابواب الطهارة، باب الاستنجاء بالحجارة:۱۶؛ سنن ابن ماجه کتاب الطهارة، باب الاستنجاء بالحجارة والنهی عن الروث:۳۱۶۔

تعلیمات میں پست کو بلند اور بلند کو بلند تر بنانے کی برابر ہدایات ہیں، آج یہی چیز ہے کہ افریقہ کے وحشیوں میں اسلام اپنی تعلیمات کے ساتھ تنہا جاتا ہے اور ان کو متمدن اور مہذب بنانے کے لیے مذہب سے باہر کسی تعلیم کی اس کو ضرورت پیش نہیں آتی لیکن عیسوی مذہب کو چند اخلاقیات چھوڑ کر جن کا ماخذ انجیل ہے، عقائد پادریوں کی کونسلوں سے، دعائیں اور عبادات کلیساؤں کے حکمرانوں سے اور تہذیب وتمدن کی تعلیمات یورپ کے بے دینوں اور ملحدوں سے حاصل کرنی پڑتی ہیں لیکن اسلام میں محمد رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کچھ نہیں، عقائد ہوں کہ عبادات اور دعائیں، اخلاق ہوں کہ آدابِ تمدن، خانگی معاملات ہوں یا لین دین کا کاروبار، انسانوں کے ساتھ، معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ، سب کا ماخذ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی ہمہ گیر تعلیمات ہیں۔

آپ ﷺ کی ان ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے چار ابواب پر منقسم ہے اور انہیں کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

آپ ﷺ نے بتایا کہ ہر انسان کا ایک تعلق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے خالق کی دوسری مخلوقات کے ساتھ۔ اسی مفہوم کو دوسری عبارت میں یوں کہو کہ اس کا ایک تعلق اپنے آقا اور مالک کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے آقا اور مالک کے غلاموں کے ساتھ، یا یوں کہو کہ اس کا ایک رخ تو آسمان کی طرف ہے اور دوسرا زمین کی سمت اس کو ایک لگاؤ تو عالم غیب سے ہے اور دوسرا عالمِ شہود سے، پہلے کے ساتھ اس کا تعلق ایک مہربان آقا اور فرمانبردار غلام کا ہے اور دوسروں کے ساتھ اس کا تعلق برادری اور بھائی چارے کا ہے، خالق اور مخلوق یا خدا اور بندہ کے درمیان جو علاقہ اور رابطہ ہے اس کا تعلق اگر صرف ہمارے ذہنی قویٰ اور قلبی حالات سے ہے تو اس کا نام عقیدہ ہے اور اگر ان قلبی حالات کے ساتھ ہمارے جسم و جان اور مال و جائداد سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے، باہم انسانوں میں یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ و رابطہ ہے اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہیں اگر ان کی حیثیت محض قانون کی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے اور اگر ان کی حیثیت قانون کی نہیں بلکہ روحانی نصیحتوں اور برادرانہ ہدایتوں کی ہے تو اس کا نام اخلاق ہے۔

قرآن پاک کی اصطلاح میں پہلے تعلقات کی مضبوطی اور استحکام کا نام ایمان ہے اور دوسرے تیسرے اور چوتھے کی بجا آوری کا نام عمل صالح ہے اور انہیں دونوں کے مجموعہ پر کامل نجات کا انحصار ہے۔ عمل صالح کی تین قسمیں ہیں: خدا کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار اور اس کے احکام کی تعمیل، بندوں کے ساتھ کاروبار اور معاملہ میں قانونِ الٰہی کی پابندی اور ان کے ساتھ محبت، الفت نیکی اور بھلائی کا برتاؤ اور گو اس لحاظ سے کہ ان میں سے ہر ایک عمل کو جس میں خدا کی خوشنودی اور رضامندی مقصود ہو اسلام عبادت کہتا ہے، لیکن اصطلاح میں پہلے کا نام عبادات اور دوسرے کا نام معاملات اور تیسرے کا نام اخلاق ہے۔ الغرض محمد رسول اللہ ﷺ جو عالمگیر شریعت اور دائمی ہدایت لے کر آئے، وہ انہیں چاروں عنوانوں کا مجموعہ ہے، یعنی عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق، انہیں کی اصلاح، تعلیم اور تکمیل کے لیے آپ کی بعثت ہوئی اور یہی آپ کے پیغمبرانہ فرائض کے اصلی کارنامے ہیں۔

عقائد

عقائد کی حقیقت اور اہمیت

انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں، یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں، یہ عام خیالات درحقیقت اس کے چند پختہ غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں، ان ہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں، یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرۂ حیات کا ہر خط اسی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں، ہمارے ارادہ کا محرک ہمارے خیالات اور جذبات ہیں اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں، عام بول چال میں انہیں چیزوں کی تعبیر ہم ''دل'' کے لفظ سے کرتے ہیں، اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے، فرمایا:

((الا وان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وهی القلب)) [1]

''انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا، خبردار کہ وہ ٹکڑا دل ہے۔''

قرآنِ پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں، سب سے پہلے ''قَلْبٌ سَلِيْمٌ'' [2] (سلامت رو دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے، دوسرا اس کے مقابل ''قَلْبٌ اٰثِمٌ'' ﴿فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۳) (گناہگار دل) یہ وہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے اور تیسرا ''قَلْبٌ مُّنِيْبٌ'' (رجوع ہونے والا دل) یہ وہ ہے جو اگر کبھی بھٹکتا ہے اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہوتا ہے، غرض یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں جس کا نام دل ہے، ہمارے اعمال کا ہر محرک ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے، اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا:

((انما الاعمال بالنیات)) [2]

''تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے۔''

اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں آپ ﷺ نے یوں ادا فرمایا:

((انما لکل امریء ما نوی فمن کانت هجرته الی دنیا یصیبها او الی امرأة ینکحها فهجرته الی ما هاجر الیه)) [3]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینه: ۵۲۔
[2] قرآن پاک کی آیت میں یہ ہے: ﴿فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ (بقرہ: ۲۸۳)
[2] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول الله ﷺ: ۱۔ [3] ایضاً۔

''ہر شخص کے کام کا ثمرہ وہی ہے جس کی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت کی غرض دنیا کا حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہے تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی (یعنی اس سے اس کو ثواب حاصل نہ ہوگا)۔''

آج کل علم نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بداہتہً ثابت کردیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لیے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے۔ اب صحیح اور صالح عمل کے لیے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائے اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت میں ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔ جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کے ماننے بغیر نہ بن سکتی ہے نہ ثابت ہوسکتی ہے اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں ہوسکتا ہے جب تک اس کے لیے بھی چند مبادی اور چند اصول موضوعہ ہم پہلے تسلیم نہ کرلیں۔

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لیے ہم کو راہنما نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لیے پابہ زنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پاسکتے، اگر پاسکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینیات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعہ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ عملِ صالح کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کرنے کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہوجاتا ہے جس پر حسنِ عمل کا دارومدار ہے۔ عبداللہ بن جدعان ایک قریشی تھا جس نے جاہلیت میں بہت سے نیکی کے کام کیے تھے مگر بایں ہمہ مشرک تھا اس کی نسبت آنحضرت ﷺ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! عبداللہ بن جدعان نے جاہلیت میں جو نیکی کے کام کیے ان کا ثواب اس کو ملے گا؟ فرمایا: ''نہیں اے عائشہ! کیونکہ کسی دن اس نے یہ نہیں کہا کہ ''بارِ الٰہا! میرے گناہوں کو قیامت میں بخش دے۔'' [1]

بدر کی لڑائی کے موقع پر ایک مشرک نے جس کی بہادری کی دھوم تھی حاضر ہوکر کہا کہ ''اے محمد ﷺ! میں بھی تمہاری طرف سے لڑنے کے لیے چلنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی مال غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے'' فرمایا: ''کیا تم اللہ عزوجل اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو؟'' اس نے جواب دیا، نہیں۔ فرمایا: ''واپس جاؤ کہ میں اہل شرک سے مدد کا خواستگار نہیں۔'' دوسری دفعہ وہ پھر آیا اور وہی پہلی درخواست پیش کی مسلمانوں کو اس کی شجاعت و بہادری کی وجہ سے اس کی اس درخواست سے بڑی خوشی ہوئی اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ وہ ان

[1] احمد، ج ٦، ص: ٩٣، ١٢٠۔

کی فوج میں شریک ہو جائے لیکن آنحضرت ﷺ نے اس سے پھر وہی سوال کیا کہ ''کیا تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان ہے؟'' اس نے پھر نفی میں جواب دیا، آنحضرت ﷺ نے پھر وہی فرمایا: ''میں کسی مشرک سے مدد نہ لوں گا۔'' غالباً مسلمانوں کی تعداد کی کمی اور اس کی بہادری کے باوجود اس سے آپ کی بے نیازی کی کیفیت نے اس کے دل پر اثر کیا تیسری دفعہ جب اس نے اپنی درخواست پیش کی اور آپ نے دریافت فرمایا: ''تم کو خدا اور رسول پر ایمان ہے؟'' تو اس نے اثبات میں جواب دیا اور نورِ اسلام سے منور ہو کر لڑائی کی صف میں داخل ہوا۔ [1]

قرآنِ پاک نے ان لوگوں کے کارناموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں، اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا۔ اسی طرح اس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہے بے بنیاد اور بے اصل ہیں:

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ﹰ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۝ ﴾ (۱۴/ ابراهیم:۱۸)

''جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا، ان کے کاموں کی مثال اس راکھ کی ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی، وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے، یہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔''

سورۂ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے کہ اس کے وجود کی حقیقت فریب نظر سے زیادہ نہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا ﴾ (۲۴/ النور:۳۹)

''جنہوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام اس سراب کی طرح ہیں، جو میدان میں ہو، جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود اس کو نظر نہ آئے۔''

اس کی ایک اور مثال ایسی سخت تاریکی سے دی گئی ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا اور جس میں ہوش وحواس اور اعضاء کی سلامتی کے باوجود ان سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہے:

﴿ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝ ﴾

(۲۴/ النور:۴۰)

[1] صحیح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب كراهة الاستعانة في الغزو بكافر: ۴۷۰۰۔

’’یا ان کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گہرے سمندر میں سخت اندھیرا ہو، اس کے اوپر موج اور موج پر پھر موج ہے اور اس کے اوپر بادل گھرا ہو یہ تو اندھیرا ہے کہ اس میں ہاتھ نکالے تو وہ بھی سوجھائی نہ دے، جس کو خدا نے نور نہ دیا اس کے لیے نور نہیں۔‘‘

الغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح تخیل پر قائم نہیں ہو سکتی، اس لیے ریا، نمائش اور خود غرضی کے کاموں کو کوئی عزت نہیں دی جا سکتی، وہ کام گو بظاہر نیک ہوں لیکن نیکی کرنے والے کا ان سے اصلی مقصد نام و نمود پیدا کرنا ہوتا ہے، اخلاقی نقطہ نظر سے تمام دنیا ان کو بے وقعت اور ہیچ سمجھتی ہے۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا اور فرمایا:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰی ۙ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ: ۲٦٤)

’’اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو احسان رکھ کر اور دکھ دے کر اس طرح نہ برباد کرو جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھانے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور خدا پر (جو نیکیوں کی جزا دیتا ہے) اور قیامت پر (جس میں نیکیوں کی جزا ملے گی) یقین نہیں کرتا پس اس کی خیرات کی مثال اس چٹان جیسی ہے جس پر کچھ مٹی پڑی ہو اور اس پر پانی برسا تو مٹی ڈھل گئی اور پتھر رہ گیا جس پر جو کچھ بویا جائے گا وہ اگے گا نہیں۔‘‘

غرض ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے وہ ہماری سیرابی کا اصل سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی کہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ، خدا کے وجود کا اقرار اور اس کی رضامندی کا حصول ہمارے اعمال کی غرض و غایت ہے، یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں، وہ ہمارے دل کا نور ہے، وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک نظر آئے، اور ہمارے تمام کاموں کی بنیاد ریا، نمائش، جاہ پسندی خود غرضی اور شہرت طلبی وغیرہ کے دلی جذبات اور پست محرکات کے سوا کچھ اور نہ رہ جائے۔

توراۃ میں بعض عقیدوں کا ذکر ہے، مگر ایمان کی حقیقت اور اس کی اہمیت کی تعلیم سے وہ خالی ہے۔ انجیل میں ایمان کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے، مگر اخلاق کی سچائی، اعمال کی راستی اور دل کے اخلاص کے لیے نہیں، بلکہ معجزوں اور کرامتوں کے ظاہر کرنے کے لیے اور خوارقِ عادت پر قدرت اور اختیار پانے کے لیے [1] اس کے برخلاف فلسفۂ یونان کے بہت سے پیروؤں اور ہندوستان کے بہت سے مذہبوں نے محض ذہنی جولانی،

[1] متی: ۱۷۔۲۰

مراقبہ، تصور، دھیان اور علم کو انسان کی نجات کا ذریعہ قرار دیا اور اخلاق و عمل سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ عیسائیوں زردشتیوں اور برہمنوں نے عقائد کو یہ وسعت دی اور ان کی ایسی تفصیل کی کہ وہ سرتاپا خیالی فلسفہ بن گئے، جس سے تصوریت ان کی عملیت پر غالب آ گئی اور انسانوں کے قوائے عمل سرد ہو گئے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے علم و عمل، تصور اور فعل، عقلیت اور عملیت میں لزوم ثابت کیا، مگر اصلی زور انسان کی عملیت پر صرف کیا اور عقائد کے اتنے ہی حصہ کا یقین و اقرار ضروری قرار دیا، جو دل کی اصلاح کرے اور عمل کی بنیاد اور اخلاق و عبادات کی اساس قرار پا سکے، عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ، اور تصورات اور نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا، چند سیدھے سادے اصول جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں، ان کا نام عقیدہ اور ان پر یقین کرنے کا نام ایمان رکھا، آپ نے صریح الفاظ میں عقائد کے صرف پانچ اصول تلقین کیے، خدا پر ایمان، خدا کے فرشتوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال جزا و سزا کے دن پر ایمان۔

یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا ضروری ہے، ان کے بغیر خالص عمل کا وجود نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس دنیا کا تنہا خالق اور مالک ہے اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے، تاکہ وہی ہمارے تمام کاموں کا قبلہ مقصود قرار پا سکے اور اسی کی رضا جوئی اور اس کی مرضی کی تعمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و غایت ہو اور ہم جلوت کے سوا خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں اور نیکی کو اس لیے کریں اور ہر برائی سے اس لیے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اس کی مرضی ہے، اس طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے مبرا ہو کر خالص ہو سکیں اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضاء گناہوں سے پاک ہوں ہمارا دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا و ہوس کی آمیزش سے پاک ہو اور اس کے احکام اور اس کے پیغمبر کی سچائی پر ایسا دل سے یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات ہمارے غلط استدلالات ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک اور تذبذب پیدا نہ کر سکیں۔ خدا کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے احکام اور ہدایات اور اس کی مرضی کا علم انہیں کے واسطہ سے انسانوں کو پہنچا ہے اگر ان کی صداقت، سچائی اور راستبازی کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغامِ ربانی اور احکامِ الٰہی کی صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جائے اور انسانوں کے سامنے نیکی اور نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے، جو انسانوں کے قوائے عملی کی تحریک کا باعث بن سکے، پھر اچھے اور برے، صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری راہنمائی کے لیے نہیں ہوگی۔

خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں اور جو مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں اور مخلوقات کو قانونِ الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں اور

ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لحظہ محفوظ کرتے جاتے ہیں، تاکہ ہم کو ان کا اچھا یا بُرا معاوضہ مل سکے۔ خدا کے احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے ان کو دور دراز ملکوں اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لیے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکل اور کتابوں اور صحیفوں کی صورت میں یا لفظ و آواز سے مرکب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں اس لیے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہو اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود ہو جائے اور ہمارے لیے نیکی و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے، جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل و عالم، بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں۔

اعمال کی باز پرس اور جواب دہی کا خطرہ نہ ہو اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیائے انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے، یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت و خلوت میں ان کی ذمہ داری کو محسوس کراتا ہے اس لیے روزِ جزا اور یومِ آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے اور اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس پر بے حد زور دیا ہے بلکہ مکی وحی کی تلقین کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے۔

یہی پانچ باتیں اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ پر، اس کے تمام رسولوں پر، اس کی کتابوں اور اس کے فرشتوں پر اور روزِ جزا پر ایمان لانا، یہ عقائدِ خمسہ یک جا طور پر سورۂ بقرہ میں متعدد دفعہ کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان ہوئے ہیں:

﴿ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ ﴾ (۲/ البقرة:۳، ٤)

”جو لوگ غیب (خدا) خدا کی صفات اور ملائکہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر اے محمد ﷺ اترا اور تم سے پہلے پیغمبروں پر اترا اس پر یقین رکھتے ہیں (یعنی انبیا علیہم السلام اور ان کی کتابوں پر)۔“

﴿ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرة:٤)

”اور آخرت (روز) جزا پر یقین رکھتے ہیں۔“

یہ تو سورہ کے آغاز کی آیتیں ہیں، سورہ کے بیچ میں پھر ارشاد ہوا:

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ ﴾

(۲/ البقرة:۱۷۷)

”لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر، آخری دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لائے۔“

سورہ کے آخر میں ہے:

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۸۵)

''پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا اور تمام مومن اس پر ایمان لائے سب خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔''

سورۂ نساء میں انہیں عقائد کی تعلیم ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء: ١٣٦)

''اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو! ایمان لاؤ خدا پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر، جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری اور جو شخص خدا کا اور اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے پیغمبروں کا اور روزِ آخرت کا انکار کرے گا وہ سخت گمراہ ہوا۔''

اللہ تعالیٰ پر ایمان

﴿ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۸۵)

ایک قادر مطلق اور بہمہ صفت موصوف ہستی پر یقین اور اس کو ایک جاننا تعلیم محمدی ﷺ کی پہلی ابجد ہے، اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے باوجود اس کے کہ خدا کی توحید اور صفات پر ایمان رکھنا ان کے اصول میں بھی داخل تھا مگر ان کی تعلیمات میں ترتیب مفقود تھی اور یہ نہیں معلوم ہوتا، کہ ان کی نگاہ میں توحید کا مسئلہ اہمیت کے کس درجہ پر ہے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے اس مسئلہ کی اصلی اہمیت محسوس کی اور اس کو اپنے نصاب درس کا پہلا سبق اور معارف وحقائق اور جسمانی اعمال واخلاق کا سر بنیاد قرار دیا۔ خدا اگر چاہے تو انسان کے تمام گناہوں سے درگزر کر سکتا ہے، مگر اسی ایک حقیقت سے انکار وہ جرم ہے جس کو وہ کبھی معاف نہ فرمائے گا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ (٤/ النسآء:١١٦)

''یقیناً خدا شرک کو معاف نہ کرے گا اور اس کے سوا جس کے جو گناہ چاہے معاف کر دے۔''

پھر اس کے ساتھ خالص توحید کا بیان، اسماء وصفات کی تشریح، شرک کے ہر پہلو کی نفی اور توحید کے ہر پہلو کی تکمیل، تعلیم محمدی ﷺ کی امتیازی شان ہے۔ معلوم ہو چکا ہے کہ نبوت محمدیہ ﷺ کی غرض وغایت صرف تخیل پر نظریہ آرائی اور الٰہیاتی فلسفہ نہ تھا، بلکہ ایک زندہ قوم، جدوجہد اور عمل والی قوم، اخلاص وایثار اور نیکی اور تقویٰ والی قوم کو پیدا کرنا تھا اس کو تمام دنیا کی پیشوائی کے لیے نمونہ عمل بنانا تھا اس لیے سب سے پہلے اہل عرب کو جو اس کے مخاطب اول تھے رموز اور اسرار توحید کا اس طرح حامل بنانا تھا کہ ان کے رگ وریشہ میں ولولہ اور جوش کا ایک نشہ پیدا ہو جائے، اس کے لیے ضرورت تھی کہ سب سے پہلے زمین کو ہموار کیا جائے، شرک کے وہ تمام عقائد جو عربوں میں پھیلے ہوئے تھے ان کو مٹا دیا جائے اور جن وجوہ اور اسباب سے شرک کے یہ عقائد پیدا ہوتے ہیں ان کی بیخ کنی کی جائے۔

اصلاح عقائد

معلوم ہو چکا ہے کہ عرب میں جہالت اور وحشت کی وجہ سے سینکڑوں غلط عقائد اور توہمات پھیل گئے تھے اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے عقائد میں بھی بہت سی غلطیاں داخل ہو گئی تھیں ان میں سب سے زیادہ بدتر اور تمام برائیوں کا اصلی محور شرک تھا، اس لیے سب سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اس کی اصلاح سے آغاز کیا۔

شرک اور بت پرستی کا اصلی زینہ اسباب ومؤثرات کا وجود ہے، خدا نے عالم میں ایک سلسلہ اسباب قائم کر دیا ہے اور عالم کے تمام واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، لیکن یہ تمام سلسلہ ایک قادر مطلق کے دست قدرت میں ہے اور اس سلسلہ کی ایک کڑی بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی، شرک اس طرح شروع ہوتا

ہے کہ پہلے انسان ان اسباب وعلل میں سے بعض نمایاں اور قوی الاثر اسباب سے متاثر ہوتا ہے، اجرام فلکی کی عظمت، آفتاب و ماہتاب کی نور افشانی، سمندر کا پرزور تلاطم، عناصر کی نیرنگ آرائیاں، انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں، وہ ان کی عظمت و تاثیر سے متاثر، پھر منفعل اور بالآخر ان کا غلام بن جاتا ہے، اعتقاد کے پہلے مرحلہ میں انسان، غور رسی کے دعویٰ سے اس قدر امتیاز اور تفریق کرتا ہے کہ یہ چیزیں خود خدا یا معبود نہیں ہیں، لیکن یہ تمیز آخر تک قائم نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آتا جاتا ہے اور یہ چیزیں خدا کی شریک بنتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ اصلی مسبب الاسباب نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے۔ شرک کی جو گوناگوں صورتیں دنیا میں موجود تھیں اور جس طرح آنحضرت ﷺ نے ان کا استیصال کیا اور ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

تعدد خدا کا ابطال

① دنیا کی مشہور قوموں میں سے عیسائی اور مجوسی علانیہ مشرک تھے یعنی تین اور دو خدا مانتے تھے، ہندو بھی اسی کے قریب تھے، ان مذہبوں کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ خدا کے جو مختلف نمایاں اور اہم اوصاف ہیں، ان کا مستقل اور مجسم وجود قائم ہو گیا، مثلاً: صفتِ خلق اور احیا و اماتت، برہما، بشن، مہیش کے نام سے موسوم ہیں، مجوسیوں نے دیکھا کہ دنیا میں جس قدر اشیاء اور افعال و حرکات ہیں سب باہم متضاد ہیں، نور و ظلمت، پستی و بلندی یمین و شمال، نرم و سخت، رات و دن، خیر و شر، حلم و غضب، غرور و خاکساری، فسق و صلاح، کوئی چیز مقابلہ اور تضادات سے خالی نہیں، اس لیے ایسے دو متضاد عالم کا خالق ایک نہیں ہو سکتا، اس بنا پر انہوں نے دو خدا تسلیم کیے اور ان کا نام یزداں اور اہرمن یا نور و ظلمت رکھا۔

قرآن مجید میں تمام احکام نہایت تدریج کے ساتھ نازل ہوئے ہیں، یہاں تک کہ ۱۳ برس کی وسیع مدت تک، روزہ، زکوٰۃ اور حج کچھ فرض نہیں ہوتا تھا لیکن شرک کا استیصالِ کلی نبوت کا پہلا سبق تھا۔

سورۂ زمر مکہ میں نازل ہوئی اور اسی سورہ میں شرک کی تمام صورتیں مٹا دی گئیں، تمام دیگر سورتوں میں نہایت کثرت سے اس قسم کے شرک کا ابطال اور رد کیا ہے، اس لیے ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

مجوسیوں کے شرک کی بنیاد اس پر تھی کہ افعالِ خیر و شر کا ایک خالق نہیں ہو سکتا ورنہ لازم آئے گا کہ خدا شر کو پیدا کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص برائی کے پیدا ہونے کو جائز رکھتا ہے وہ خود اچھا نہیں ہو سکتا، اس لیے قرآن مجید میں نہایت کثرت سے تصریحات آئیں کہ جن کو ہم خیر و شر کہتے ہیں سب کا فاعل خدا ہے، آنحضرت ﷺ نے نہایت تصریح و تاکید کے ساتھ تعلیم کی کہ جو کچھ ہوتا ہے، سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے، باقی یہ مسئلہ کہ بری چیز کا خالق اچھا نہیں ہو سکتا، اولاً تو یہ مغالطہ آمیز غلطی ہے، ایک صناع مصور اگر ایک نہایت بدصورت جانور کی تصویر نہایت اچھی کھینچے تو اس کے کمالِ مصوری میں اس سے کچھ داغ نہیں آئے گا کہ جانور خود برا ہے، دوسرے یہ کہ اسلام نے اس مسئلہ کی جس اصلی گرہ کو کھولا ہے وہ یہ ہے کہ اشیاء بذاتہ خیر و شر نہیں ہیں بلکہ وہ

اپنے صحیح یا غلط طریقۂ استعمال سے خیر یا شر ہو جاتی ہیں، آگ بجائے خود نہ خیر ہے نہ شر، اگر اس سے اچھا کام لیا جائے تو خیر ہے اور برا لیا جائے تو شر ہے، زہر نہ اچھا ہے نہ برا، اگر اس کو بیماریوں کے استیصال میں استعمال کیا جائے تو خیر ہے اور کسی بے گناہ کے قتل میں استعمال کرو تو شر ہے، اسی طرح دوسری اشیاء کے بھی خیر وشر کے دونوں پہلو ہیں، نہ کوئی شئے دنیا میں خیرِ مطلق ہے، نہ کوئی شرِ محض، اسی لیے قرآن نے شر کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی ہے، بلکہ خود انسان کی طرف کی ہے:

﴿ أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَن فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ﴾ (۷۲/ الجن:۱۰)

''آیا اہل زمین کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے پروردگار نے ان کو راہ پر لانا چاہا ہے۔''

﴿ مَّا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ۖ وَمَا أَصَابَكَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفْسِكَ ۚ ﴾ (٤/ النسآء:٧٩)

''تجھ کو جو نیکی پہنچی تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو مصیبت پہنچی وہ خود تیری طرف سے ہے۔''

﴿ أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا ۖ قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾ (۳/ آل عمران:١٦٥)

''کیا جب تم کو کوئی مصیبت پہنچی، جس کے برابر تم ان کو پہنچا چکے ہو تو تم نے کہا یہ کہاں سے آئی کہہ دے کہ خود تمہاری طرف سے ہے خدا ہر بات پر قدرت رکھتا ہے۔''

الغرض کسی شے کا ایسا پیدا کرنا جس میں خیر وشر کے دونوں پہلو ہیں، شر نہیں ہے ان میں سے اس کے شر کے پہلو کو استعمال کرنا اور کام میں لانا شر ہے، ڈاکٹر بہت سی بیماریوں کے لیے زہریلی دوائیں بناتے ہیں مگر یہ شر نہیں البتہ جو کوئی شریر ان داؤں سے ان امراض کے ازالہ کے بجائے کسی کی جان لے لیتا ہے تو وہ شر ہے حاصل یہ کہ اس دنیا میں جب خیر وشر اشیاء میں بذاتہ نہیں ہے تو اچھی چیزوں کے لیے الگ اور بُری چیزوں کے لیے الگ خالق تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خالق ایک ہی ہے دو نہیں:

﴿ وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۖ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ۝ وَلَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ﴾ (١٦/ النحل:٥١، ٥٢)

''اور خدا نے کہا کہ دو خدا نہ بناؤ، وہ ایک ہی خدا ہے، تو مجھی سے ڈرو، اور اسی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔''

② بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا

شرک کا بہت بڑا ذریعہ کسی خاص شخص یا کسی شے کی تعظیم مفرط ہے جس کو شخص پرستی یا یادگار پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام، رام چندر، کرشن، کو اسی خوش اعتقادی نے آدمی سے خدا بنا دیا، اس بنا پر

قرآن مجید میں نہایت پرزور اور پر رعب الفاظ میں شخص پرستی کی تحقیر کی گئی:

﴿ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لَا تَغْلُوا۟ فِى دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا۟ عَلَى ٱللَّهِ إِلَّا ٱلْحَقَّ ۚ إِنَّمَا ٱلْمَسِيحُ عِيسَى ٱبْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ ٱللَّهِ ﴾ (٤/ النسآء:١٧١)

''اے اہل کتاب! اپنے دین میں حد سے زیادہ نہ بڑھ جاؤ اور خدا کی نسبت وہی کہو جو حق ہے، مسیح یعنی عیسیٰ ابن مریم صرف خدا کے پیغمبر ہیں۔''

﴿ لَّن يَسْتَنكِفَ ٱلْمَسِيحُ أَن يَكُونَ عَبْدًا لِّلَّهِ وَلَا ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ ٱلْمُقَرَّبُونَ ۚ وَمَن يَسْتَنكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِۦ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا ﴾ (٤/ النسآء:١٧٢)

''مسیح کو خدا کا بندہ ہونے سے ہرگز عار نہیں اور نہ مقرب فرشتوں کو (عار ہے) اور جس شخص کو خدا کی بندگی سے عار ہوگا اور بڑائی کی لے گا تو خدا سب کو عنقریب اپنے حضور میں بلائے گا۔''

﴿ لَّقَدْ كَفَرَ ٱلَّذِينَ قَالُوٓا۟ إِنَّ ٱللَّهَ هُوَ ٱلْمَسِيحُ ٱبْنُ مَرْيَمَ ۚ قُلْ فَمَن يَمْلِكُ مِنَ ٱللَّهِ شَيْـًٔا إِنْ أَرَادَ أَن يُهْلِكَ ٱلْمَسِيحَ ٱبْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُۥ وَمَن فِى ٱلْأَرْضِ جَمِيعًا ۗ وَلِلَّهِ مُلْكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴾ (٥/ المآئدۃ:١٧)

''وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ عیسیٰ بن مریم خدا ہیں کہہ دو کہ اگر خدا یہ چاہے کہ مسیح ابن مریم کو اس کی ماں کو اور دنیا میں جو کچھ ہے سب کو برباد کردے تو کون ہے جو خدا کو روک لے خدا ہی کے لیے آسمان و زمین اور جو چیزیں ان دونوں میں ہیں ان کی حکومت ہے اور خدا تمام چیزوں پر قادر ہے۔''

﴿ وَإِذْ قَالَ ٱللَّهُ يَٰعِيسَى ٱبْنَ مَرْيَمَ ءَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ ٱتَّخِذُونِى وَأُمِّىَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ ٱللَّهِ ۖ قَالَ سُبْحَٰنَكَ مَا يَكُونُ لِىٓ أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِى بِحَقٍّ ۚ إِن كُنتُ قُلْتُهُۥ فَقَدْ عَلِمْتَهُۥ ۚ تَعْلَمُ مَا فِى نَفْسِى وَلَآ أَعْلَمُ مَا فِى نَفْسِكَ ۚ إِنَّكَ أَنتَ عَلَّٰمُ ٱلْغُيُوبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَآ أَمَرْتَنِى بِهِۦٓ أَنِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ رَبِّى وَرَبَّكُمْ ۚ ﴾ (٥/ المآئدۃ:١١٦، ١١٧)

''اور جب خدا کہے گا کہ کیوں عیسیٰ (علیہ السلام)! تم نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا کہو عیسیٰ عرض کریں گے کہ سبحان اللہ! میری یہ مجال ہے کہ میں کوئی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھ کو حق نہیں اگر میں نے کہا ہوگا تو، تو جانتا ہوگا تو میرے دل کی بات جانتا ہے اور میں تیرے دل کی بات نہیں جانتا، تو بڑا غیب دان ہے میں نے لوگوں سے صرف وہی کہا تھا جس کا حکم تو نے مجھ کو دیا تھا یعنی یہ کہ خدا کی عبادت جو میرا بھی خدا ہے اور تمہارا بھی۔''

آنحضرت ﷺ باوجود اس کے کہ حاصلِ کون و مکاں تھے لیکن بار بار قرآن مجید میں تاکید آتی تھی:

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ (١٨/ الکھف:١١٠)

''کہہ دے اے پیغمبر کہ میں تو تمہاری ہی طرح آدمی ہوں، لیکن یہ کہ میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے۔''

ایک خاص نکتہ غور کے قابل ہے جس قدر جلیل القدر انبیا علیہم السلام گزرے ہیں، ان کے خاص خاص لقب ہیں، مثلاً: حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا لقب خلیل اللہ تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ تھے لیکن آنحضرت ﷺ باوجود اس کے کہ اشرف انبیا تھے آپ نے کیا لقب پسند کیا؟ اور کلمۂ توحید میں، نماز میں، درود میں آنحضرت ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ کیا امتیازی وصف شامل کیا گیا؟ صرف رسالت اور عبدیت کا

(اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ)

''میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد خدا کے بندے اور رسول ہیں۔''

اس میں بھی عبدیت کا وصف رسالت پر مقدم ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ بعض کفار کے حق میں دعائے بدکی اس پر یہ آیت اتری: ❶

﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾

(٣/ آل عمران:١٢٨)

''تم کو کچھ اختیار نہیں ہے خدا چاہے گا تو ان پر توجہ کرے گا یا ان کو عذاب دے گا کہ وہ ظالم ہیں۔''

آنحضرت ﷺ بعض کفار کی ہدایت پانے اور اسلام کے قبول کرنے کے نہایت خواہش مند تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ ﴾ (٢٨/ القصص:٥٦) ❷

''تم جس کو چاہتے ہو اس کو ہدایت نہیں دے سکتے۔''

آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن ابی کے لیے دعائے مغفرت کی، اس پر قرآن مجید میں آیا: ❸

﴿ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ ﴾

(٩/ التوبة:٨٠)

''تم ان کے لیے مغفرت چاہو یا نہ چاہو اگر تم ان کے لیے ستر دفعہ بھی مغفرت چاہو گے تو خدا ان کی مغفرت نہ کرے گا۔''

آنحضرت ﷺ ہمیشہ ہر موقع پر اس امر کی تاکید اور اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ لوگ آپ کی زائد از

---

❶ صحيح بخاری، كتاب المغازی، غزوة احد، باب ليس لك من الامر شيء: ٤٠٦٩، ٤٠٧٠ یہ حدیث صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں مذکور ہے۔ ❷ صحيح بخاری، كتاب التفسير، سورة القصص: ٤٧٧٢۔

❸ صحيح بخاری كتاب التفسير، سورة التوبة: ٤٦٧٠، ٤٦٧١۔

اعتدال مدح نہ کریں جو منجر ہو کر شرک تک پہنچ جائے، بار بار فرماتے تھے:

((لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ ابن مریم)) ❶

''میری شان میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنے پیغمبروں کی شان میں کیا۔''

ایک دفعہ آپ ﷺ راستہ میں جا رہے تھے ایک شخص نے دفعۃً آپ کو دیکھا اور اس پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا آپ ﷺ نے فرمایا: ''ڈرو نہیں میں ایک قریشی خاتون کا بیٹا ہوں جو گوشت کو خشک کر کے کھایا کرتی تھی۔'' ❷

بنو عامر کا وفد جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ آپ ہمارے سید (آقا) ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: ''سید خدا ہے۔'' لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہم سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اچھا یہ کہو، لیکن دیکھو تم کو شیطان اپنا وکیل نہ بنا لے۔'' ❸ اصلی الفاظ یہ ہیں: ((قولوا بقولکم و لا یستجرینکم الشیطان))

ایک دفعہ ایک شخص نے ان الفاظ میں آپ کو مخاطب کیا اے ہمارے آقا! اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے فرزند! آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگو! پرہیزگاری اختیار کرو شیطان تمہیں گرا نہ دے میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا ہے مجھے پسند نہیں کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔'' ❹

غور کرو کہ رسول کی شان میں یہ الفاظ ناجائز نہیں مگر توحید کو شرک کے ہر شائبہ سے بچانے کا خیال ہر خیال پر غالب تھا۔

③ درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد

شرک کا اصلی ضرر یہ ہے کہ خدا سے انسان کو جس درجہ کا تعلق، جس قسم کا عجز و نیاز، جس مرتبہ کی محبت، جس درجہ کی التجا درکار ہے اس کا رخ دوسری طرف بدل جاتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوتا کائنات اور زمین و آسمان کے خالق نہیں ہیں، تاہم وہ ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں انہیں دیوتاؤں اور معبودوں سے مانگتے ہیں، انہیں کو حاجت روا جانتے ہیں، اٹھتے بیٹھتے انہیں کا نام لیتے ہیں، انہی پر نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، غرض براہ راست ان کو جو تعلق ہوتا ہے انہیں معبودوں سے ہوتا ہے خود مسلمانوں میں

---

❶ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب واذکر فی الکتاب مریم: ٣٤٤٥۔

❷ مستدرک حاکم، ج٣، ص: ٤٨ علی شرط الشیخین؛ ابن ماجه، ابواب الاطعمة، باب القدید: ٣٣١٢۔

❸ ادب المفرد امام بخاری، باب هل یقول سیدی: ٢١١ وابوداود، کتاب الادب، باب فی کراهة التماد، ح: ٤٨٠٦۔ ❹ مسند احمد، ج ٣، ص: ١٥٣۔

ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا طرزِ عمل انبیا و صلحا بلکہ مزارات کی نسبت اس کے قریب قریب ہے۔اس بنا پر مقدم ترین امر یہ ہے کہ معبودین کی نسبت اس قسم کا خیال نہ پیدا ہونے پائے اور صاف بتا دیا جائے کہ خدا کے آگے کسی کی کچھ نہیں چل سکتی، اس کی مرضی میں کوئی دست اندازی نہیں کرسکتا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے طلب مغفرت کا وعدہ کیا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا:

﴿ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ﴾ (٦٠/ الممتحنة:٤)

’’میں آپ کے لیے مغفرت کی درخواست ضرور کروں گا لیکن مجھ کو خدا کے سامنے آپ کی نسبت کوئی اختیار نہیں۔‘‘

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’میں نے اپنی والدہ کے لیے استغفار کی درخواست کی تھی وہ نہیں قبول ہوئی، البتہ یہ درخواست ضرور قبول ہوئی کہ میں ان کی قبر کی زیارت کرلوں۔‘‘ [1]

قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری کہ ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ (٢٦/ الشعرآء:٢١٤) تو آپ نے خاندان کے لوگوں کو جمع کرکے فرمایا: ’’اے قریشیو! اے اولادِ عبدالمطلب! اے عباس! اے صفیہ! اے فاطمہ! میرے مال میں سے جو مانگو میں دے سکتا ہوں لیکن خدا کے ہاں میں تمھارے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔‘‘ [2]

قرآن مجید میں نہایت کثرت اور نہایت تشدد کے ساتھ اس مضمون کو ادا کیا گیا کہ تم لوگ جن کو حاجت روا سمجھتے ہو اور جن سے حاجتیں مانگتے ہو، ان کو کارخانۂ ہستی میں کسی قسم کا اختیار نہیں:

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۝ ﴾ (١٧/ بنی اسرآئیل: ٥٦، ٥٧)

’’کہہ دو کہ خدا کے علاوہ تم جن کو پکارتے ہو وہ تمھاری مصیبت کے ہٹانے یا بدلنے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے جن کو تم پکارتے ہو ان میں جو خدا کے مقرب ترین ہیں وہ خود خدا کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں بے شبہ تیرے خدا کا عذاب ڈرنے ہی کے قابل ہے۔‘‘

④ خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں

شرک کا ایک بڑا ذریعہ خوارقِ عادات کی نسبت غلط فہمی ہے، جن اشخاص سے خوارق عادات سرزد ہوتے ہیں ان کی نسبت لوگوں کو پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ خود خدا نہیں ہیں، لیکن ان میں خدائی کا شائبہ ضرور ہے ورنہ ایسے افعال کیونکر سرزد ہوتے جو قدرتِ انسانی سے بالاتر ہیں، یہی خیال رفتہ رفتہ دیوتاؤں اور اوتار

[1] صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب استئذان النبی ﷺ ربه فی زیارة قبر امه:٢٢٥٨، ٢٢٥٩۔

[2] یہ روایت اس آیت کی تفسیر میں تمام تفسیروں اور حدیث کی کتابوں میں منقول ہے۔

تک ترقی کرتا ہے اور بالآخر خدائی تک پہنچا دیتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی بنا پر آج چالیس کروڑ آدمیوں کے خدا یا خدا کے بیٹے ہیں۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ انبیا علیہم السلام سے معجزات صادر ہوتے ہیں اور یہ امر خصائص نبوت میں ہے کہ یہ مسئلہ اسلام کے زمانہ تک مشتبہ اور مجمل رہا۔ قرآن مجید میں خرقِ عادات کے متعلق حسب ذیل امور بیان کیے گئے:

① معجزات صادر ہو سکتے ہیں اور خدا اپنے مقبول بندوں کو معجزات عطا کرتا ہے:

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓي اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (٦/ الانعام:٣٧)

''اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرت ﷺ) پر کوئی معجزہ خدا کے یہاں سے کیوں نہیں اترا کہہ دو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ معجزہ نازل کرے لیکن لوگ نہیں جانتے۔''

② باوجود اس کے کفار کو معجزہ طلبی سے روکا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ نبوت اور رسالت معجزہ پر موقوف نہیں:

﴿ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾

(١٣/ رعد: ٧)

''اور کفار کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ پر کوئی معجزہ خدا کے ہاں سے کیوں نہیں اترا، بے شک آپ ﷺ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے راہ دکھانے والے ہیں۔''

﴿ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَاۗءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ قَبِيْلًا ۙ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَاۗءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴾

(١٧/ بنیٓ اسرآئیل: ٩٠۔٩٣)

''اور کفار کہتے ہیں کہ ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم زمین سے چشمہ نہ نکال دو یا تمہارے پاس کھجوروں یا انگوروں کا باغ نہ ہو کہ جس کے بیچ میں تم نہریں جاری کر دو یا آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرا دو جیسا کہ تمہارا گمان تھا یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نہ لے آؤ، یا تمہارا گھر سونے کا نہ بن جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تو اس چڑھنے پر بھی یقین نہ لائیں گے جب تک ہم پر کوئی کتاب نہ اتارو جس کو ہم خود پڑھیں، کہہ دو کہ سبحان اللہ! میں تو صرف بشر ہوں اور رسول ہوں۔''

③ جو معجزے اس آیت میں کفار نے طلب کیے وہ ناممکن باتیں نہ تھیں، تاہم خدا نے آنحضرت ﷺ کو جو جواب تلقین کیا وہ یہ تھا کہ میں بشر ہوں، دوسری جگہ اس کا جواب یہ دیا کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں یعنی معجزے صادر ہوں گے تو یہ میرا فعل نہ ہوگا بلکہ خدا کا ہوگا:

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾ (۲۹/ العنکبوت: ۵۰، ۵۱)

’’اور کفار کہتے ہیں کہ ان پر خدا کے یہاں سے معجزے کیوں نہیں اترے کہہ دو کہ معجزے تو خدا کے ہاں ہیں اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں، کیا ان کفار کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تمہارے اوپر کتاب (قرآن) اتاری جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے، اس میں بے شبہ ایمان لانے والوں کے لیے رحمت اور یاد رکھنے کی چیز ہے۔‘‘

اسی لیے معجزات کے ذکر میں ہمیشہ باذن اللہ (خدا کی اجازت) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

⑤ حرام و حلال کرنا خدا کا کام ہے

شرک کی ایک قسم یہ تھی کہ انبیاء علیہم السلام یا پیشوایانِ مذہبی کو تحریم و تحلیل کا مجاز سمجھتے تھے یعنی وہ جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرا دیں، قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا ﴾ (۹/ التوبۃ: ۳۱)

’’ان لوگوں نے اپنے علما اور درویشوں کو رب بنا لیا ہے۔‘‘

تو حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے جو حاتم طائی کے فرزند اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے، آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ ہم لوگ اپنے پیشوایانِ مذہبی کو اپنا رب تو نہیں سمجھتے تھے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’’کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال اور جس کو چاہیں حرام کر دیں؟‘‘ عرض کی کہ ’’ہاں‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’یہی رب بنانا ہے۔‘‘ [1] عموماً اہل مذاہب پیغمبروں کو شارعِ مستقل سمجھتے تھے لیکن یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے، شریعت کی تاسیس، حلال و حرام کی تعیین، جائز و ناجائز کی تفریق، امر و نہی کے احکام یہ سب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، پیغمبر صرف مبلغ اور پیغام رساں اور تعلیمِ الٰہی سے ان احکام کے شارح اور بیان کرنے والے ہیں، اسی بنا پر قرآن مجید میں ذاتِ نبوی ﷺ کی صفتِ رسالت کو بار بار تاکید اور اصرار کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے:

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۴۴)

---

[1] جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب و من سورۃ التوبۃ: ۳۰۹۵ وابن کثیر تفسیر آیت مذکور، ج۲، ص: ۳۴۸۔

''محمد (ﷺ) تو صرف ایک رسول ہے اس سے پہلے اور رسول گزر چکے ہیں۔''

﴿ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﴾ (٤/ النسآء:١٧١)

''مریم کا بیٹا عیسیٰ ، اللہ کا صرف رسول تھا۔''

اس حصر سے یہ مقصود تھا کہ انبیا میں خدائی کی کوئی صفت نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ ان میں ہے وہ رسالت و نبوت کے اوصاف ہیں۔

⑥ غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم

شرک کا ایک بڑا ذریعہ یہ تھا کہ جو اعمال اور آداب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں وہ اوروں کے ساتھ بھی برتے جاتے تھے، یہ اگرچہ شرک فی العبادۃ یا شرک فی الصفات تھا لیکن رفتہ رفتہ شرک فی الذات تک منجر ہوتا ہے۔ سجدۂ عبادت خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن کفار اور دیگر اہل مذاہب بتوں اور مقتدایانِ دینی کو بھی سجدہ کرتے تھے اور سلاطین و امرا کو سجدہ کرنا عام طور سے رائج تھا۔ آنحضرت ﷺ نے نہایت سختی سے اس کو روکا، بنو اسرائیل میں سجدۂ تعظیمی یا سجدۂ محبت جائز تھا چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین نے سجدہ کیا تھا لیکن چونکہ اسلام میں توحید کو انتہائے کمال تک پہنچانا تھا سجدۂ تعظیمی بھی منع کر دیا گیا۔ ایک دفعہ ایک صحابی خدمتِ اقدس میں آئے اور عرض کی کہ میں نے اہلِ عجم کو دیکھا ہے، وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں آپ اجازت دیں تو ہم آپ کو سجدہ کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو کیا میری قبر پر گزرو گے تو اس کو سجدہ کرو گے؟'' عرض کی کہ نہیں، فرمایا: ''تو اب بھی نہ کرو اگر میں کسی کو دوسرے کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دے سکتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔'' [1] اسی طرح ایک اور صحابی ملک شام سے آئے تو آپ کو سجدہ کیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''یہ تم نے کیا کیا؟'' عرض کی کہ میں نے شام میں رومیوں کو دیکھا وہ اپنے مذہبی افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو میرا جی چاہا کہ میں بھی آپ کو سجدہ کروں، فرمایا: ''ایسا نہ کرو اگر میں کسی کو خدا کے سوا سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔'' [2]

⑦ صفاتِ الٰہی کی توحید

شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہیں وہ اوروں میں تسلیم کیے جائیں جس کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ شرکت وصف کی بنا پر، خدا کے شریک اور ہمسر بن جائیں ان میں سے ایک وصف علمِ غیب ہے۔ اکثر اہل مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں کہ انبیا اور اولیا کو علمِ غیب ہوتا ہے، بنی اسرائیل کے زمانہ میں کاہنوں کا یہی کام تھا کہ وہ آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے۔ عرب میں بھی کاہن

---

[1] ابوداود، کتاب النکاح، حق الزوج علی المرأۃ:٢١٤٠۔

[2] ابن ماجہ، ابواب النکاح، حق الزوج علی المرأۃ:١٨٥٣۔

یہی پیشہ کرتے تھے اور مختلف طریقوں سے پیشین گوئی کرتے تھے۔ کبھی فال سے، کبھی پانسے پھینک کر، کبھی یہ ظاہر کرتے تھے کہ ان کو جنات غیب کا حال بتاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے نہایت تاکید اور استقصا کے ساتھ اس اعتقاد کو مٹایا اور علم غیب کی تمام صورتیں باطل کیں۔ خود قرآن مجید میں نہایت کثرت سے اس کے متعلق آیتیں نازل ہوئیں:

﴿ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ﴾ (٦/ الانعام:٥٩)

''اور خدا کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

آنحضرت ﷺ نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی اور فرمایا: ''مفاتح غیب پانچ ہیں، جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ [1]

① حمل یعنی لڑکا ہوگا یا لڑکی۔ ② کل کیا ہوگا۔

③ بارش کب ہوگی۔ ④ کس جگہ موت آئے گی۔

⑤ قیامت کب آئے گی۔''

اگرچہ علم غیب کی اور بھی صورتیں ہیں، لیکن زیادہ تر انہیں امور کی نسبت لوگ علم غیب کے مدعی تھے اور ان ہی باتوں کو لوگ پہلے سے جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے بھی علم غیب کی نفی کی، ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے انصار کی چند لڑکیاں گا رہی تھیں گاتے گاتے انہوں نے یہ گانا شروع کیا:

((وفينا رسول يعلم ما في غد)) [2]

''اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔''

آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا: ''یہ نہ کہو وہی کہو جو پہلے گا رہی تھیں۔'' اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو خاص حکم دیا کہ آپ اس حقیقت کو واضح کر دیں:

﴿ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ ﴾ (٦/ الانعام:٥٠)

''کہہ دو کہ اے پیغمبر کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔''

اور غیب کا علم صرف خدا کی صفت ہے:

﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ ﴾ (٢٧/ النمل:٦٥)

[1] صحيح بخاري، كتاب التوحيد، باب قول الله: عالم الغيب فلا يظهر على غيبه احدا: ٧٣٧٩، میں یہ تفصیل مذکور ہے۔ [2] صحيح بخاري، كتاب النكاح، باب ضرب الدف في النكاح والوليمة: ٥١٤٧؛ ابوداود، كتاب الادب: ٤٩٢٢؛ ترمذي، ابواب النكاح: ١٠٩٠۔

''کہہ دوا ے پیغمبر کہ خدا کے سوا آسمانوں میں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا۔''

غیب دانی کے مدعی کاہن جو عرب کی گلی گلی میں خدع وفریب کا جال پھیلائے بیٹھے رہتے تھے اور بت خانوں میں خدائی کرتے تھے، ان کی سطوت خاک میں مل گئی، بت خانے ویران ہو گئے تو ان کے یہ پجاری بھی فنا ہو گئے۔ صحابہ نے آکر پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! ہم جاہلیت میں کاہنوں کے پاس جایا کرتے تھے فرمایا: ''اب نہ جایا کرو۔'' عرض کی: ہم پرندوں سے فال لیا کرتے تھے فرمایا: ''یہ تمہارا وہم تھا اس کے سبب سے اپنے ارادہ سے باز نہ رہا کرو۔'' بعض لوگوں کے سوال کے جواب میں فرمایا: ''کاہن کچھ نہیں۔'' انہوں نے کہا: یارسول اللہ! ان کی بعض باتیں سچی بھی نکل آتی ہیں، فرمایا: ''شیطان ایک آدھ بات سن لیتا ہے اور مرغی کی طرح قرقر قرکر کے اپنے دوست کے کانوں میں ڈالتا ہے اور وہ اس میں سو جھوٹ ملا دیتا ہے۔'' کبھی فرمایا کہ ''فرشتوں کی زبان سے شیاطین فضائے آسمانی میں چوری چھپے کچھ سن لیتے ہیں اور کاہن اس میں سینکڑوں جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر بیان کرتے ہیں۔'' جاہلوں میں کچھ ایسے مکار ہوتے ہیں جو چوری کا غائبانہ پتہ بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں عرب ان کو عراف کہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی کسی مال کا پتہ پوچھنے کے لیے کسی عراف کے پاس جائے گا اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہ ہوگی۔'' علم نجوم جس کے زور سے لوگ غیب کا حال دریافت کر لینے کے مدعی بنتے تھے اس کا سیکھنا بھی جادو کی طرح گناہ قرار دیا اور فرمایا:

''جو کسی کاہن کے پاس جا کر اس کی باتوں کو سچ سمجھے وہ محمد پر جو کچھ اترا ہے اس کا انکار کرتا ہے۔'' [1]

ان تعلیمات نے خدا کے علاوہ دوسروں کی غیب دانی کے عقیدہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔ کہانت کی گرم بازاری سرد ہو گئی، فال، شگونِ بد، نجوم اور غیب دانی کے دوسرے خدَاعانہ طریقے مٹ گئے، پرندوں اور پانسوں کے ذریعہ سے غیب کا حال دریافت کرنا وہم و وسوسہ قرار پایا اور غیب کی مملکت پر خدا کے سوا کسی اور کی حکومت قائم نہ رہی۔

⑧ مخفی قوتوں کا ابطال

کائنات میں خدا کے سوا جن غیبی اسباب وعلل یعنی سحر وطلسم، جنات وشیاطین اور ارواح خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت وتصرف کا اعتقاد تھا اور ان سے بچنے کے لیے ان کی دہائی پکاری جاتی تھی، نذر چڑھائی جاتی تھی، قربانی کی جاتی تھی۔ آنحضرت ﷺ کی تعلیم اور وحی نے ان تمام خرافات کا قلع قمع کر دیا اور خدا کے سوا تمام دوسری مخفی وپوشیدہ قوتوں کا ڈر انسان کے سینوں سے ہمیشہ کے لیے نکال کر پھینک دیا اور دعا وکلماتِ الٰہی کے سوا ہر نوع کے جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ، گنڈے ٹوٹکے، جن میں کسی غیر خدا سے غیبی استعداد یا شرک کا کلمہ ہو کفر قرار پایا اسی قسم کے فاسد خیالات کے استیصال کے لیے ہر نماز میں اور نماز کی ہر

[1] مشکوٰۃ باب الکھانۃ میں صحیحین سے یہ حدیثیں نقل کی ہیں، علم نجوم کی حرمت والی حدیث، ابوداود، کتاب الکھانۃ، باب فی الکھان: ۳۹۰٤؛ ابن ماجہ، کتاب الطھارۃ، باب النھی عن اتیان الحائض: ٦۳۹؛ مسند احمد، ج ۲، ص: ٤۲۹، ٤۷٦ سے لی ہیں۔

رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ضمن میں اس آیت کے پڑھنے کا حکم دیا گیا:

﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ (۱/ الفاتحۃ:۵)

''(اے عالم کے پروردگار) ہم تیرے ہی آگے سر جھکاتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔''

سحر و طلسم و جادو اور ٹوٹکے کے متعلق ارشاد خداوندی ہوا:

﴿ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۰۲)

''یہ جادو اور ٹوٹکے کرنے والے کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن خدا کے حکم سے اور یہ یہود وہ (جادو اور ٹوٹکے) سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان رساں ہیں نفع بخش نہیں اور یقیناً ان کو علم ہے کہ جو ان کو حاصل کرتا ہے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔''

یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ سحر و جادو کی حقیقت وہم و تخیل سے زیادہ نہیں۔ فرمایا:

﴿ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۶۶)

''مصری جادوگروں کے جادو سے اس کو یہ خیال ہوتا تھا کہ وہ دوڑ رہی ہیں۔''

بلکہ بعض صحابہ نے ان مکار جادوگروں کے قلع قمع کے لیے ان کے قتل تک کا حکم دے دیا [1] تاکہ انسانوں کے دلوں میں ان کا جو خوف و ہراس بیٹھا ہوا ہے وہ دور ہو اور ان کے اس عاجزانہ قتل ہونے سے یہ ثابت ہو کہ ان میں کوئی غیر معمولی طاقت نہیں بالکل وہ بے بس ہیں۔

ابوداؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے اب آپ کیا فرماتے ہیں؟ ارشاد فرمایا: ''تم اپنے جھاڑ منتر ہمارے سامنے پیش کرو اگر ان میں شرک کی کوئی بات نہیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔'' [2] ایک اور صحابی نے ایک بیمار یا پاگل کو سورۂ فاتحہ پڑھ کر چند روز پھونکا وہ اچھا ہو گیا اس نے ان کو انعام دیا، انہوں نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے واقعہ عرض کیا تو فرمایا ''میری عمر کی قسم! ہر جھاڑ پھونک باطل ہے لیکن تم نے سچے جھاڑ کی روزی کھائی۔'' [3]

ایک اور صحابی روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((ان الرقى والتمائم والتولة شرك)) [4]

''بے شک جھاڑ پھونک گنڈے اور میاں بیوی کے چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں۔''

---

[1] جامع ترمذی، ابواب الحدود، ماجاء فی حد الساحر:۱۴۶۰ وابوداود، کتاب الخراج، باب فی اخذ الجزیۃ من المجوس:۳۰۴۳۔ [2] ابوداود، کتاب الطب، باب فی الرقی:۳۸۸۶۔

[3] ابوداود، کتاب الطب، باب کیف الرقی:۳۸۹۶۔

[4] ابوداود، کتاب الطب، باب فی تعلیق التمائم:۳۸۸۳؛ ابن ماجہ، ابواب الطب:۳۵۳۰۔

انہیں صحابی کے گھر میں ایک بڑھیا آیا کرتی تھی گھر والوں نے اس سے کسی بیماری کا کوئی ٹوٹکا کرایا، ایک دھاگا پڑھ کر اس نے باندھ دیا تھا وہ گھر آئے تو اس دھاگے پر ان کی نظر پڑی انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کو توڑ کر پھینک دیا اور فرمایا کہ عبداللہ کا خاندان شرک کی باتوں سے مستغنی ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ ''جھاڑ، پھونک گنڈے اور میاں بیوی کو چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں۔'' ان کی بیوی نے کہا: کیا وجہ ہے کہ ایک دفعہ میری آنکھ میں کچھ پڑ گیا، جب میں جھاڑتی تھی تو پانی رُک جاتا تھا اور جب چھوڑ دیتی تھی تو پانی بھر آتا تھا، انہوں نے جواب دیا یہ شیطانی بات ہے تم نے کیوں نہ وہ کیا جو رسول اللہ ﷺ کرتے تھے آنکھوں میں پانی ڈالتیں اور یہ دعا پڑھتیں: ''اے لوگوں کے پروردگار! اس بیماری کو دور کر، تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری شفا بخشی کے سوا کوئی شفا نہیں ایسی شفا دے کہ پھر کوئی بیماری نہ رہے۔'' ❶

⑩ اوہام وخرافات کا ابطال

وہ تمام اوہام وخرافات جن سے شرک پرست اہل عرب لرزہ براندام رہتے تھے اور جن کو وہ بالذات مؤثر اور متصرف سمجھتے تھے آنحضرت ﷺ نے ان کا طلسم توڑ دیا اور اعلان فرمادیا کہ ان کی کوئی اصل نہیں۔ فرمایا:

((لا عدوی ولا طیرۃ ولا صفر ولا ھامۃ)) ❷

''نہ چھوت ہے، نہ بدفالی ہے، نہ پیٹ میں بھوک کا سانپ ہے، نہ مردہ کی کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے۔''

ایک اور صحابی کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((العیافۃ والطیرۃ والطرق من الجبت)) ❸

''پرندوں کی بولی سے فال لینا، ان کے اڑنے سے فال لینا اور کنکری پھینک کر یا خط کھینچ کر حال بتانا شیطانی کام ہے۔''

ایک اور صحابی آپ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ ''فال نکالنا شرک ہے۔'' پھر ان صحابی نے کہا کہ ہم صحابہ میں کوئی نہیں جو اس کو برا نہ سمجھتا ہو بلکہ خدا پر بھروسہ ❹ رکھنا چاہیے یہ بھی آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''بچھتر'' (نو) کچھ نہیں۔'' ❺ یعنی پانی کی بارش میں اس کو بالذات کوئی دخل نہیں۔ اسی طرح غول بیابانی کے متعلق عربوں کے جو خیالات تھے ان کو آپ ﷺ نے ایک لفظ سے باطل کردیا۔ فرمایا:

((لاغول)) ❻ ''غول بیابانی کچھ نہیں۔''

---

❶ ابوداود، کتاب الطب، باب فی تعلیق التمائم:۳۸۸۳؛ ابن ماجہ، کتاب الطب، باب فی تعلیق التمائم:۳۵۳۰۔ ❷ ابوداود، کتاب الطب، باب فی الطیرۃ:۳۹۱۱؛ ابن ماجہ، کتاب الطب، باب من کان یعجبہ الفال ویکرہ الطیرۃ:۳۵۳۹۔ ❸ ابوداود، کتاب الکہانۃ والتطیر، باب فی الخط وزجر الطیر:۳۹۰۷۔

❹ ابن ماجہ، کتاب الطب، باب من کان یعجبہ الفال ویکرہ الطیرۃ:۳۵۳۸۔

❺ ابوداود، کتاب الکہانۃ والتطیر، باب فی الطیرۃ:۳۹۱۲۔

❻ ابوداود، کتاب الکہانۃ والتطیر، باب فی الطیرۃ:۳۹۱۳۔

اسی طرح بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جانوروں کے متعلق ان کے خیالات فاسدہ کا قرآن نے ابطال کیا، سورۂ انعام میں ان کے ان مشرکانہ عقائد اور اعمال کی بتصریح تردید کی گئی اور سورۂ مائدہ میں فرمایا گیا:

﴿ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ﴾ (٥/ المآئدة:١٠٣)

''خدا نے بحیرہ، اور سائبہ اور وصیلہ اور حام نہیں ٹھہرایا۔''

بحیرہ، اس بچہ کو کہتے تھے جس کا کان پھاڑ کر بتوں کی نذر کرتے تھے۔

سائبہ، اس جانور کو کہتے تھے جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیے جاتے تھے۔

وصیلہ، بعض لوگ نذر مانتے تھے کہ اگر بچہ نر ہو تو اس کو بت پر چڑھائیں گے اور اگر مادہ ہوئی تو ہم رکھیں گے پھر اگر نر و مادہ ملے ہوتے تو مادہ کے ساتھ نر بھی رکھ لیتے تھے یہ وصیلہ تھا۔

حام، وہ اونٹ جس کے دس بچے بوجھ اٹھانے اور سواری کے لائق ہو چکتے تو دیوتا کے نام پر آزاد کر دیا جاتا۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوہام جو عرب میں پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کا استیصال فرمایا:

یہ اوہام پرستی حقیقت میں قوموں کی تباہی کا ایک بڑا سبب ہوتی ہے۔ یہ اوہام حقیقت کے خلاف ہونے کے علاوہ بہت سے کاموں میں خلل انداز ہوتے ہیں اور غور سے دیکھو تو ان کا سلسلہ بالآخر کسی نہ کسی شرک پر منجر ہوتا ہے اور انسان کو صحیح طریقِ عمل سے روک دیتے ہیں، مثلاً: بیماری میں طب کے قاعدہ کے موافق علاج کیا جائے تو مفید ہوگا لیکن بہت سے لوگ وہم پرستی کی بنا پر ٹونے ٹوٹکے کو دافع مرض سمجھتے ہیں اس قسم کے اوہام عرب میں نہایت کثرت سے پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان تمام اوہام کو تصریح اور تعیین کے ساتھ باطل قرار دیا، مثلاً:

① عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے تو چاند یا سورج میں گرہن لگتا ہے، آپ کے صاحب زادہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب انتقال کیا تو سورج میں گرہن لگا ہوا تھا۔ لوگوں نے خیال کیا کہ انہی کے مرنے کا اثر ہے، آنحضرت ﷺ نے جب سنا تو مسجد میں جا کر خطبہ دیا کہ ''چاند اور سورج خدا کی قدرت کے مظاہر ہیں کسی کے مرنے سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔'' ❶

② یہ خیال تھا کہ سانپ اگر مارا جائے تو اس کا جوڑا آتا ہے اور انسان کو ہلاک کرتا ہے۔

③ ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف رکھتے تھے ایک ستارہ ٹوٹا آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''جاہلیت میں تم لوگ اس کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے تھے۔'' لوگوں نے عرض کی کہ ہمارا یہ اعتقاد تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا یا کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا ہے تو ستارے ٹوٹتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: ''کسی کے مرنے یا پیدا ہونے سے ستارے نہیں ٹوٹتے۔'' ❷

❶ صحیح بخاری، کتاب الکسوف، باب صلوٰۃ الکسوف جماعة: ١٠٥٢۔

❷ مسند احمد بن حنبل، ج ١، ص: ٢١٨۔

④ شیر خوار بچوں کے سرہانے استرا رکھ دیا کرتے تھے کہ جن ان کو نہ ستانے آئیں ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا تو اٹھا کر پھینک دیا اور کہا کہ آنحضرت ﷺ ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے۔ ❶

⑤ نظر بد سے بچنے کے لیے اونٹوں کے گلے میں قلادہ لٹکاتے تھے آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ کسی اونٹ کے گلے میں قلادہ نہ رہنے پائے۔ ❷

الغرض توحید کامل کی تعلیم نے عربوں کے تمام مشرکانہ اوہام وخرافات کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔ اسلام کی اس اصلاح کی اہمیت کا اندازہ عیسائیت کی ان مقدس روایات وحکایات سے کرو، جنہوں نے صدیوں تک دنیا کو دیوؤں، بھوتوں، چڑیلوں کے تسلط اور عذاب کے شکنجہ میں مبتلا رکھا اور ان کو نکالنا اور بھگانا عیسائیت کا کمال اور اعجاز سمجھا جاتا رہا۔

⑩ کفارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید

شرک کے اسباب میں ایک بڑا سبب کفارہ اور شفاعت کے وہ غلط معنی تھے، جو عربوں اور عیسائیوں وغیرہ میں رائج تھے، عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنی سمجھ لیے تھے اس کا اصلی سبب ان کا وہ تخیل تھا جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا، وہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہر وجابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں، اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ اس کے دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے، اسی لیے وہ ان درمیانی ہستیوں کے بھی خوش رکھنے کی ضرورت کے معتقد تھے، چنانچہ وہ اپنے بتوں، دیوتاؤں اور فرشتوں کو اسی نیت سے پوجتے تھے اور کہتے تھے:

﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ﴾ (۱۰/ یونس:۱۸)

''یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔''

آنحضرت ﷺ نے جب ان کی اس بت پرستی پر ان کو ملامت کی تو انہوں نے صاف کہا:

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ﴾ (۳۹/ الزمر:۳)

''ہم ان کو اسی لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے تقرب میں نزدیک کر دیں۔''

یہودیوں میں بھی اسی قسم کی دوسری غلط فہمی تھی اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھرانا خدا کا خاص کنبہ اور خاندان ہے اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور نبی چونکہ خدا کے پیارے اور محبوب ہیں اس لیے ان کی اولاد اور نسل بھی دنیا اور آخرت میں یہی درجہ رکھتی ہے، اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی تو ان کے خاندان کے

❶ ادب المفرد، باب الطیرة من الجن: ۹۱۲۔ ❷ مؤطا امام مالك، كتاب صفة النبی ﷺ، باب ما جاء فی نزع المعالیق والجرس من العنق: ۷۴۲؛ بخاری: ۳۰۰۵، مسلم: ۲۱۱۵۔

بزرگ جو خدا کے مقرب اور برگزیدہ ہیں وہ ہر طرح ان کو اس سے بچالیں گے ان کا دعویٰ تھا کہ

﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۸)

''ہم خدا کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں۔''

قرآن نے کہا:

﴿ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۸)

''بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہو، یہ اسی کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے سزا دے۔''

اور اسی بنا پر ان کا دعویٰ تھا:

﴿ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ ﴾ (۳/ آل عمران:۲۴)

''ہم کو دوزخ صرف چند گنتی کے دن چھو کر چھوڑ دے گی۔''

قرآن نے کہا:

﴿ وَّغَرَّهُمْ فِیْ دِیْنِهِمْ مَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۲۴)

''اور یہ جھوٹ اپنے دل سے بنا کر جو عقیدہ گھڑ چکے ہیں، وہ ان کے مذہب میں ان کو دھوکا دے رہا ہے۔''

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا اور ہے کہ باپ (خدا) نے تمام انسانوں کی طرف سے جو موروثی و طبعی طور سے گناہگار ہیں اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو قربانی دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ دے دیا اور وہ گناہوں سے پاک و صاف ہو گئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد ان کے جانشین پوپوں کو گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ جو وہ زمین پر کھولیں گے وہ آسمان پر کھولا جائے گا، اسی لیے پوپوں کے سامنے اعترافِ گناہ کا عقیدہ عیسائیوں میں پیدا ہوا اور ان کو بندوں کے گناہوں کے معاف کرنے کا دنیا میں حق ملا۔

پیغام محمدی ﷺ نے ان کو ملزم قرار دیا اور کہا:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ (۹/ التوبۃ:۳۱)

''انہوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو، خدا کو چھوڑ کر اپنا خدا بنا رکھا ہے۔''

اور اصولی طور سے اس نے یہ بتا دیا کہ

﴿ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۳۵)

''خدا کے سوا کون گناہوں کو معاف کر سکتا ہے۔''

ان کا عقیدہ تھا کہ بیٹا قیامت کے دن باپ کے داہنے بازو پر، برابر بیٹھ کر خلق کا عدل وانصاف کرے گا

قرآن پاک نے ایک بڑے مؤثر طرز میں اس کی تردید کی ہے۔ قیامت کے دن خدا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھے گا:

﴿ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۱۶)

''اے عیسیٰ علیہ السلام! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا بناؤ۔''

وہ کہیں گے بارِالٰہا! میں نے تو ان سے وہی کہا، جو تو نے کہا: میں نے ان کو یہ تعلیم نہیں دی، میں نے ان سے یہی کہا کہ صرف ایک خدا کو پوجو، اب

﴿ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۱۸)

''اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو بخش دے تو، تو سب کچھ کر سکتا ہے کہ تو غالب اور حکمت والا ہے۔''

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ گناہوں کی مغفرت اور معافی یا گناہوں پر سزا اور عذاب دینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ بت پرست عربوں کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ یہ دیوتا اور ان کے یہ بت خدا کی طرف سے دونوں عالم میں مختار کل ہیں، وہ یہاں دینے نہ دینے کا اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں اور اس عقیدہ کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا اور یہ دیوتا ان کے شفیع تھے، قرآن مجید نے کفارہ، غیر خدا کے اختیار مغفرت اور بت پرستانہ طریقۂ اشاعت کے عقائدِ باطلہ کی ہر طرح تردید کی اور بتایا کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی اور کو نہیں، سب اس کی عظمت اور جلال کے سامنے عاجز اور درماندہ ہیں:

﴿ وَلَا یَمْلِكُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴾

(۴۳/ الزخرف:۸۶)

''یہ کافر خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، لیکن وہ جس نے حق کی شہادت دی اور وہ جانتے بھی ہوں۔''

﴿ لَا یَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴾ (۱۹/ مریم:۸۷)

''یہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن جس نے رحم والے خدا سے اقرار لے لیا۔''

﴿ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنْ یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْـًٔا وَّلَا یُنْقِذُوْنِ ﴾

(۳۶/ یٰسٓ:۲۳)

''کیا خدائے برحق کو چھوڑ کر جھوٹے معبودوں کو خدا بناؤں، اگر رحمٰن مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی شفاعت مجھے ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں۔''

کفار فرشتوں کو بھی اسی غرض سے پوجتے تھے، حکم ہوا:

﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ۝﴾ (۵۳/ النجم:۲۶)

''اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت کچھ فائدہ نہیں پہنچاتی لیکن اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لیے چاہے اور پسند کرے۔''

﴿ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۝﴾

(۳۹/ الزمر:۴۳)

''کیا ان کافروں نے خدا کے سوا کسی کو شفیع بنایا ہے، کہہ دے کہ اگر چہ یہ کچھ اختیار اور سمجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں تو بھی؟ (شفیع بننے کے قابل ہیں)''

خدا قیامت میں ان سے کہے گا:

﴿ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ﴾

(۶/ الانعام:۹۴)

''اور ہم دیکھتے نہیں کہ تمہارے ساتھ ان شفیعوں کو جن کو تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہاری ملکیت میں خدا کے ساتھ شریک ہیں۔''

﴿ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا ﴾

(۳۰/ الروم:۱۲۔۱۳)

''اور جب قیامت قائم ہوگی، تو مشرکین ناامید ہوں گے، جن کو وہ خدا کا شریک کار بتاتے تھے ان میں سے کوئی ان کا شفیع نہ ہوا۔''

خاص یہود کو مخاطب کر کے ان کے عقیدہ کی تردید میں کہا گیا:

﴿ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝﴾ (۲/ البقرۃ:۴۷، ۴۸)

''اے فرزندانِ اسرائیل......! اور ڈرو اس دن سے، جس میں کوئی ایک دوسرے کے ذرا کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ کچھ اس کے بدلہ میں لیا جائے گا اور نہ کوئی ان کو مدد پہنچائی جائے گی۔''

پھر اسی معنی کی آیت اسی سورۃ میں دوسری جگہ ہے:

﴿ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوْا

یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۲۲۔۱۲۳)

’’اے فرزندانِ اسرائیل……! اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی کسی کے ذرا بھی کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی بدلہ قبول ہوگا اور نہ شفاعت فائدہ دے گی۔‘‘

اور اسی معنی میں مسلمانوں سے بھی کہا گیا کہ وہ عمل پیش کریں، شفاعت کے بھروسے میں نہ رہیں:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۵۴)

’’اے مسلمانو! جو کچھ ہم نے تم کو روزی دے رکھی ہے اس میں سے کچھ خرچ کر دیا کرو، اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ لین دین ہے نہ دوستی ہے، نہ شفاعت ہے۔‘‘

غرض آپ ﷺ کے پیغام نے ان معنوں میں شفاعت کے عقیدہ باطل کی ہر جگہ تردید کی ہے اور اعلان کیا ہے کہ اس شفاعت کا اختیار صرف خدا کے ہاتھ میں ہے:

﴿ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا یَمْلِكُوْنَ شَیْـًٔا وَّلَا یَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ﴾

(۳۹/ الزمر:۴۳، ۴۴)

’’کیا انہوں نے خدا کے سوا اوروں کو شفیع بنا رکھا ہے کہہ دے کہ اگر چہ ان کو کسی چیز کا اختیار نہیں اور نہ ان کو سمجھ ہے تو بھی کہہ دے کہ شفاعت کا کل اختیار خدا ہی کو ہے اسی کا راج آسمانوں اور زمین میں ہے پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔‘‘

اس آیتِ پاک نے کفار و مشرکین کے عقیدۂ شفاعت کی قطعی طور سے تردید کی، دوسری آیت میں یہود و نصاریٰ کے عقیدہ شفاعت کا اتنا حصہ صرف تسلیم کیا کہ خدا کے نیک بندے اپنے دوسرے بھائیوں کے حق میں شفاعت کریں گے:

﴿ وَلَا یَمْلِكُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

(۴۳/ الزخرف:۸۶)

’’اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں، وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، لیکن وہ جنہوں نے حق کی گواہی دی اور وہ دانش رکھتے ہیں۔‘‘

دوسری جگہ اسی شہادت کو اقرار لینا کہا گیا ہے:

﴿ لَا یَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ ﴾ (۱۹/ مریم:۸۷)

''یہ لوگ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جو خدا کے نزدیک (دنیا میں اپنے عمل کے ذریعے سے) اقرار لے چکا ہے۔''

لیکن اس شہادتِ حق اور عہد الٰہی کے باوجود اس اختیار کے استعمال کے لیے اللہ تعالیٰ کی اجازت اور رضامندی شرط ہے:

﴿ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ﴾ (۱۰/ یونس:۳)

''(خدا کی بارگاہ میں) کوئی شفیع نہیں لیکن اس کی اجازت کے بعد۔''

﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۵۵)

''وہ کون ہے جو خدا کے سامنے کسی کی شفاعت کر سکے لیکن اسکی اجازت سے۔''

﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَرْضٰى ﴾ (۵۳/ النجم:۲۶)

''اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت ذرا بھی کام نہیں آ سکتی البتہ اس کے بعد کہ خدا اجازت دے جس کو چاہے اور پسند کرے۔''

﴿ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴾ (۷۸/ النبا:۳۷)

''یہ فرشتے اور روح کوئی خدا سے اس دن بات نہ کر سکے گا لیکن جس کو وہ رحم والا اجازت دے اور ٹھیک کہے۔''

پھر یہ شفاعت بھی ان ہی لوگوں کے حق میں ہو سکے گی، جس کے حق میں اللہ تعالیٰ انبیا اور صالحین کو شفاعت کی اجازت دے گا، فرمایا:

﴿ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ﴾ (۳۴/ سبا:۲۳)

''اور شفاعت خدا کے نزدیک نفع نہ دے گی، لیکن اس کے لیے جس کے لیے وہ شفاعت کی اجازت دے۔''

﴿ يَوْمَىِٕذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴾

(۲۰/ طٰہٰ:۱۰۹)

''اس دن شفاعت نفع نہ دے گی لیکن اس کو جس کے لیے خدا اجازت دے اور اس کے لیے بات کرنا پسند کرے۔''

بلکہ خود انبیا علیہم السلام بھی سفارش انہیں کی کریں گے جن کی خود خدا چاہے گا، فرمایا:

﴿ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۲۸)

''اور وہ شفاعت نہیں کریں گے، لیکن اس کی جس کے لیے خدا اپنی خوشنودی ظاہر کرے اور ان

کے خوف سے ترساں ہونگے۔''

پھر ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کے افراد کے لیے ازل ہی سے یہ اعلان عام ہو چکا ہے کہ ان کے لیے مغفرت اور شفاعت کا دروازہ بند ہے اور یہ وہ مجرم ہیں جن کے دل حق کی شہادت سے محروم رہ گئے:

﴿ فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ﴾ (۷۴/ المدثر:۴۸)

''تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہ دے گی۔''

﴿ مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ ﴾ (۴۰/ المؤمن:۱۸)

''اور ظالموں (مشرکوں کا) [1] نہ کوئی دوست اس دن ہوگا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔''

اور وہ بدنصیب گروہ جس کے حق میں رحمت کا یہ دروازہ بند رہے گا مشرکین ہیں جیسا کہ ذیل کی آیت سے ظاہر ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ﴾

(۴/ النسآء:۱۱۶)

''اللہ اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ کوئی شریک ٹھہرایا جائے نہیں بخشتا اور اس سے نیچے کے گناہ جس کو چاہے بخش دے۔''

لیکن اب ایسی حالت میں جب کہ وہی شفاعت کریں گے جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دے گا اور وہ بھی انہیں کی شفاعت کریں گے جن کی شفاعت کرانا خود خدا کو منظور ہوگا تو حقیقت میں خود اللہ ہی اپنے دربار میں اپنا آپ شفیع ہوگا، صوفیانہ اصطلاح میں یوں کہو کہ جلالِ الٰہی کی بارگاہ میں اس کی صفتِ کریمی اور رحیمی خود شفیع بن کر کھڑی ہوگی، اس لیے ارشاد ہوا:

﴿ وَأَنذِرْ بِهِ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَن يُحْشَرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُم مِّن دُونِهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴾ (۶/ الانعام:۵۱)

''اور اس قرآن کے ذریعہ (اے پیغمبر!) ان لوگوں کو ہشیار کر دے جو اس سے ڈرتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جمع کیے جائیں گے ان کے لیے ان کے رب کے سوا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں شاید وہ بچتے رہیں۔''

﴿ مَا لَكُم مِّن دُونِهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ ۚ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ﴾ (۳۲/ السجدہ:۴)

''خدا کے سوا تمہارا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں پھر کیا تم سوچتے نہیں۔''

[1] ﴿ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴾ (۳۱/ لقمان:۱۳) ''بے شک شرک بڑا ظلم ہے۔'' صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء: ۳۴۲۸، ۳۴۲۹۔

خدا کی اس صفت کریمی ورحیمی کے مظہر اس دنیا میں بھی وہی ہوں گے جو اس دنیا میں اس کے مظہر بن کر آئے تھے اور وہ انبیائے کرام ہیں کہ خدا کے رحم وکرم ہی کے سبب سے جو اس کو اس دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ ہے ان کی بعثت ہوئی اور وہ اپنی اپنی امت پر شاہد قرار پائے اسی طرح خدا کی اجازت کے بعد اس دنیا میں بھی وہی خدا کے اس رحم وکرم اور فضلِ عمیم کے مظہر قرار پائیں گے، نیز رحمت کے فرشتے اور امت کے نیکو کار اور صالح افراد بھی جن کو رحمتِ الٰہی نے چنا ہو، اس منصب پر ممتاز ہوسکیں گے، خصوصاً وہ سراپا رحمت نبی جو دنیا میں رحمۃ للعلمین اور خدا کی صفتِ رحیمی کا مظہر بن کر آیا۔

⑪ اجرام سماوی کی قدرت کا انکار

بظاہر اس دنیا میں بہت سی باتیں آفتاب و ماہتاب کی گردش اور ان کے سبب سے اختلاف موسم کے اثرات سے ہوتی ہیں، اس لیے ستارہ پرست قوموں میں یہ اعتقاد پیدا ہوگیا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ستاروں کی گردش کے اثر سے ہوتا ہے، یہی اعتقاد عرب کے مشرکوں میں بھی پھیلا تھا، وہ سورج اور چاند کو سجدے کرتے تھے، اسلام نے ان کو اس شرک سے روکا اور کہا:

﴿ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ ﴾ (۴۱/ فصلت:۳۷)

''سورج اور چاند کو سجدے نہ کیا کرو۔''

اسی طرح وہ زمانہ کو دنیا کے کاروبار میں حقیقی مؤثر جانتے تھے اور یہ کہتے تھے:

﴿ وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ﴾ (۴۵/ الجاثیة:۲۴) ''ہم کو تو زمانہ مارتا ہے۔''

اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں ''فلک کج رفتار'' اور ''دہر ناہنجار'' کی شکایت اب تک چلی آتی ہے، عرب کے مشرکین بھی اسی طرح بولا کرتے تھے، ان کو جب کوئی خلاف توقع تکلیف پہنچتی تھی تو زمانہ کی شکایت کرتے تھے اور اس کو برا کہتے تھے [1] آنحضرت ﷺ نے اس سے منع کیا اور فرمایا کہ ''زمانہ کو گالی نہ دیا کرو کہ زمانہ خود خدا ہے۔'' [2] اور فرمایا ''خدا ارشاد فرماتا ہے کہ آدم کا بیٹا مجھے تکلیف پہنچاتا ہے، وہ زمانہ کو برا کہتا ہے، زمانہ میں ہوں، میرے ہاتھ میں وہ تمام کام ہیں، میں شب و روز کا انقلاب کرتا ہوں۔'' [3] یعنی جن تکلیفوں اور مصیبتوں کا خالق سمجھ کر لوگ اس زمانہ کو برا کہتے ہیں، حقیقت میں ان کا پیدا کرنے والا خدا ہی ہے اس لیے یہ گالی حقیقت میں خدا کو دی جاتی ہے۔

اس خیال کا یہ بھی اثر تھا کہ اہل عرب بارش کو پچھتر کی طرف منسوب کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ فلاں پچھتر کے سبب سے ہم پر پانی برسایا گیا۔ حدیبیہ کے موقع پر اتفاق سے رات کو بارش ہوئی اور صبح کو نماز

---

[1] فتح الباری شرح بخاری، ج ۸، ص: ۴۴۱ وکتاب الاسماء والصفات بیهقی، ص: ۱۱۵۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الالفاظ من الادب، باب النهی عن سب الدهر: ۵۸۶۶۔

[3] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورة الجاثية: ۴۸۲۶ وکتاب التوحید: ۷۴۹۱۔

کے بعد حضور صحابہ کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا: ''تم جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا۔'' صحابہ نے عرض کی، خدا اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے۔ ارشاد ہوا: ''اس نے فرمایا: آج صبح کو میرے بندوں میں سے کچھ مومن ہو کر اٹھے کچھ کافر ہو کر، جنہوں نے یہ کہا کہ خدا کے فضل و رحمت سے ہم پر پانی برسا وہ تو خدا پر ایمان لانے والے اور ستارہ کے انکار کرنے والے ہیں اور جنہوں نے یہ کہا کہ فلاں پچھتر سے پانی ہم پر برسا تو وہ خدا کے انکار کرنے والے اور ستارہ پر ایمان لانے والے ہیں۔'' [1]

سورج گرہن اور چاند گرہن کو بھی لوگ عظیم الشان واقعات اور انقلابات کی علامت سمجھتے تھے۔ کم وبیش دنیا کی تمام قوموں میں وہ آسمانی دیوتاؤں کے غیظ و غضب کے مظہر یقین کیے جاتے تھے۔ ۹ھ میں اتفاق سے ایک دن سورج میں گرہن لگا اور اسی دن آپ کے صاحب زادے ابراہیم نے وفات پائی۔ صحابہ نے خیال کیا کہ یہ سورج میں گرہن لگنے کا سبب حضرت ابراہیم کی موت ہے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سنا تو تمام مسلمانوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا اور ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اس خیال کی تردید کی، فرمایا: ''کسوف و خسوف اور گرہن کو کسی کے جینے مرنے سے کوئی تعلق نہیں یہ بھی خدا کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے۔'' [2]

⑫ غیر خدا کی قسم سے روکنا

شرک کی ایک نہایت ہی باریک صورت یہ تھی کہ لوگ غیر خدا کی قسمیں کھاتے تھے۔ قسم کھانے کے معنی حقیقت میں شہادت کے ہیں جس کی قسم کھائی جاتی ہے اس کو دراصل واقعہ پر گواہ بنایا جاتا ہے، عربوں میں بت پرستی کے رواج کے باعث بتوں اور دیوتاؤں کی قسمیں کھائی جاتی تھیں جو صریح کفر تھا قریش اپنے دیوتا لات اور عزیٰ کی قسمیں کھایا کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا [3] لیکن رواج اور عادت کے باعث مسلمان ہونے کے بعد بھی بے اختیار ان کی زبان سے ان کی قسمیں نکل جاتی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص کی زبان سے لات اور عزیٰ کی قسم نکل جائے تو وہ فوراً لا الہ الا اللہ کہہ دے یہ گویا اس کفر کے کلمہ سے توبہ ہے۔'' قریش میں باپ کی قسم کھانے کا بھی رواج تھا، اس سے بھی آپ نے منع فرمایا۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ نے باپ کی قسم کھاتے ہوئے سنا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے منع کیا ہے کہ اپنے باپ کی قسم کھایا کرو جس کو قسم کھانی ہو یا تو خدا کی قسم کھائے ورنہ چپ رہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور کے ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ اس وقت سے آج تک میں نے نہ تو خود اور نہ کسی کی بات دہرانے میں کبھی باپ کی قسم کھائی [4] ماں کی قسم بھی لوگ کھایا کرتے تھے اس سے بھی آپ نے منع فرمایا۔ اسی

[1] صحیح بخاری، کتاب الاستسقاء: ۱۰۳۸ و کتاب الاذان: ۸٤٦؛ و صحیح مسلم، کتاب الایمان: ۲۳۱۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الکسوف: ۱۰٤٦۔ [3] سنن نسائی، کتاب الایمان والنذور، باب الحلف باللات والعزی: ۳۸۰۷۔ [4] یہ تمام واقعات صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب لا تحلفوا بآبائکم: ٦٦٤٧؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب من حلف باللات والعزی: ٤٢٦٠، ٤٢٥٤؛ سنن النسائی، کتاب الایمان والنذور، باب الحلف بالآباء: ۳۷۹۷، ۳۸۰٦ میں مذکور ہیں۔

طرح کعبہ کی بھی قسم لوگ کھایا کرتے تھے اس پر ایک یہودی نے آ کر مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تم بھی شرک کرتے ہو کعبہ کی قسم کھاتے ہو۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو فرمایا: ''کعبہ کی نہیں بلکہ کعبہ والے (خدا) کی قسم کھایا کرو۔'' 1 ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کسی کو کعبہ کی قسم کھاتے سنا تو اس کو منع کیا اور کہا کہ غیر خدا کی قسم نہ کھائی جائے میں نے رسول خدا ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ جس نے غیر خدا کی قسم کھائی اس نے کفر کیا یا شرک کیا 2 دوسری روایت میں ہے کہ ''ہر وہ قسم جو غیر خدا کی کھائی جائے شرک ہے۔'' 3

⑬ خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں

اکثر لوگوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیت عین خدا کی مشیت ہے اس میں نہ صرف بد عقیدہ لوگ بلکہ اہل توحید بھی غلطی سے مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے انسانوں کو اس دقیق غلطی سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ دنیا میں مشیت صرف خدا کی ہے اسی کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہے تمام مشیتیں اور خواہشیں اسی کی مشیت اور خواہش کے ماتحت ہیں خدا کے ساتھ اور کسی مخلوق کی مشیت عالم کے کاروبار میں شریک نہیں لیکن لوگوں نے خدا کی مشیت کے ساتھ اوروں کی مشیت کو بھی شریک کر لیا تھا توحیدِ کامل کے معلم ﷺ نے اس خیال کی سختی سے تردید کی اور قرآن مجید نے جا بجا اس حقیقت کو واضح کیا کہ مشیت الٰہی کے علاوہ کوئی اور حقیقی مشیت نہیں، تمام دیگر مشیتیں اس کی تابع اور ماتحت ہیں۔ عقیدہ کی یہ غلطی اس قدر عام تھی کہ جو لوگ یہ عقیدہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی سلاطین، حکام اور بزرگوں کے ساتھ گفتگو میں یہ کہنا حسن ادب سمجھتے تھے کہ جو خدا چاہے اور جو حضور چاہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس طرز کلام سے منع فرمایا، یہاں تک کہ خدا کی مشیت کے ساتھ برابری سے خود اپنی مشیت کے ذکر سے بھی صحابہ کو روکا۔ اس قسم کا طرزِ کلام لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گیا تھا اس میں یہ تصحیح فرمائی کہ خدا اور غیر کی مشیت کے درمیان عطف کا واؤ (اور) نہ لایا جائے کہ اس سے برابری کا شائبہ نکلے بلکہ پھر کا لفظ بولا جائے، تاکہ معلوم ہو کہ خدا کی مشیت کے بعد اوروں کی مشیت کا درجہ ہے۔

نسائی میں ہے کہ ایک یہودی نے خدمتِ نبوی میں آ کر مسلمانوں سے کہا کہ ''تم لوگ شرک کرتے ہو کہ جو خدا چاہے اور جو محمد ﷺ چاہیں۔'' آپ نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یوں کہو کہ ''وہ ایک ہے جو چاہے پھر جو آپ چاہیں۔'' 4 یہی واقعہ ابن ماجہ میں اس طرح ہے کہ ایک صحابی نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک یہودی یا عیسائی ان سے کہہ رہا ہے کہ تم مسلمان بڑے اچھے لوگ ہوتے اگر شرک نہ کیا کرتے تم کہا کرتے ہو کہ جو خدا چاہے اور محمد ﷺ چاہیں ان صحابی نے خدمت اقدس میں آ کر اپنا یہ خواب بیان کیا آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں اس فقرہ کی برائی جانتا تھا یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو محمد چاہیں۔'' 5 ابوداؤد میں یہی تعلیم اس

---

1 نسائی، کتاب الایمان والنذور، الحلف بالکعبۃ: ۳۸۰۴۔ 2 جامع ترمذی، ابواب النذور والایمان: ۱۵۳۵ ومستدرك حاکم، ج ۱، ص ۱۸ کتاب الایمان۔ 3 مستدرك حاکم بحوالہ مذکور۔ 4 نسائی، کتاب الایمان والنذور، باب الحلف بالکعبۃ: ۳۸۰۴۔ 5 ابن ماجہ، کتاب الکفارات، باب النھی ان یقال ماشاء اللہ وشئت: ۲۱۱۸۔

واقعہ کی تقریب کے بغیر اس طرح مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ ''یہ نہ کہا کرو کہ جو خدا چاہے اور جو فلاں چاہے بلکہ یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو فلاں چاہے۔'' ❶ لیکن امام بخاری نے ادب المفرد میں اور بیہقی نے کتاب الاسماء میں جو روایت کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی اور کی مشیت کا نام بھی نہ لینا چاہیے ایک شخص نے خدمت والا میں حاضر ہو کر سلسلۂ کلام میں کہا کہ ''جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں'' ارشاد ہوا کہ ''تم نے خدا کا ہمسر اور مقابل ٹھہرایا جو خدا تنہا چاہے'' ❷ ((مَا شَآءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ))

اس سلسلہ میں یہاں تک اہتمام مدنظر تھا کہ اس سے بھی منع فرمایا کہ خدا اور رسول کی طرف ایک ضمیر پھیر کر ایک فعل لایا جائے، تاکہ یہ سمجھا جائے کہ خدا اور رسول کا درجہ برابر ہے، ایک دفعہ آپ کے سامنے کسی شخص نے خطبہ کے اثنا میں یہ فقرہ کہا جس نے خدا اور رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پائی اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی...... یہاں تک اس نے کہا تھا کہ آپ نے اس کو روک دیا اور فرمایا: ''اٹھ جاؤ تم برے خطیب ہو۔'' ❸ آپ ﷺ نے آزردگی کا اظہار اس لیے فرمایا کہ ''ان دونوں'' کو ساتھ کہنے سے سامعین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ خدا کی اور رسول کی نافرمانی کا حکم برابر ہے اور اس میں شرک کا شائبہ ہے، اس لیے خطیب کو یوں کہنا چاہیے تھا کہ اور جو خدا اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ...... جیسا کہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے اور ماثورہ خطبوں میں منقول ہے۔

⑭ مشتبہاتِ شرک کی ممانعت

جن باتوں میں شرک کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا تھا ان سے بالکل منع کر دیا۔ لوگ اولاد کا نام آفتاب ماہتاب وغیرہ کی عبدیت کے ساتھ رکھتے تھے مثلاً: عبدالشمس، عبدمناف ان ناموں سے سخت منع فرمایا اور فرمایا: ''بہترین نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔'' ❹ اہلِ عجم اپنے سلاطین کو شاہنشاہ یعنی تمام بادشاہوں کا بادشاہ کہتے تھے چونکہ اس میں شرک کا احتمال تھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''یہ نام خدا کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔'' ❺ دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس شخص پر اللہ کا بے حد غضب ہوا جس نے اپنے کو شہنشاہ کہا خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہیں۔'' ❻

غلاموں کو لوگ عبد یعنی بندہ کہتے تھے، حالانکہ انسان خدا کا بندہ ہے آدمیوں کا نہیں، اسی طرح غلام اپنے مالک کو رب کہتے تھے حالانکہ رب خدا ہے اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے قطعاً منع فرمایا: ''کوئی شخص

❶ ابوداود، کتاب الادب، ۴۹۸۰۔ ❷ ادب المفرد امام بخاری، باب قول الرجل: ماشاء اللہ وشئت: ۷۸۳ وکتاب الاسماء والصفات امام بیہقی، ص: ۱۱۰ مطبوعہ الہ آباد۔

❸ ابوداود، کتاب الادب، باب لا یقال خبثت نفسی: ۴۹۸۱۔

❹ ابوداود، کتاب الادب، باب فی تغییر الاسماء: ۴۹۴۹۔ ❺ ابوداود، کتاب الادب، ۴۹۶۰۔

❻ مستدرك حاکم، کتاب الادب، باب النهی عن التسمیة بملك الاملاك، ج ۴، ص: ۲۷۵۔

غلاموں کو عبد یعنی بندہ نہ کہنے پائے بلکہ یوں کہے کہ میرا ''بچہ یا بچی'' اوراسی طرح غلام اور باندیاں اپنے آقا کو رب نہ کہیں مالک کہیں کہ تم سب غلام ہو اور رب، اللہ ہے۔'' ❶ ہانی ایک صحابی تھے جن کی کنیت ابوالحکم تھی وہ جب خدمت اقدس میں اپنی قوم کے ساتھ آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''حکم خدا ہے اور خدا ہی حکم دینے والا ہے تم کو لوگ ابوالحکم کیوں کہتے ہیں۔'' عرض کی کہ میرے قبیلہ میں جب کوئی نزاع ہوتی ہے تو لوگ مجھ کو حکم یعنی ثالث بناتے ہیں اور میں جو فیصلہ کرتا ہوں اس کو سب تسلیم کر لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے بچوں کے کیا نام ہیں۔'' بولے: شریح، مسلم، عبداللہ۔ آپ نے پوچھا: ''سب میں بڑا کون ہے؟'' عرض کی: شریح۔ فرمایا: ''تو تمہاری کنیت ابوشریح ہے۔'' ❷

اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی برا کام کرتے ہیں تو شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں گویا اس نے برائی کرائی۔ ایک دفعہ ایک صاحب آنحضرت ﷺ کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی انہوں نے کہا، شیطان کا برا ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یوں نہ کہو ورنہ شیطان غرور سے پھول جائے گا اور کہے گا میری قوت سے یہ ہوا، خدا کا نام لو تو شیطان دب کر مکھی کے برابر ہو جائے گا۔'' ❸

تصویر بنانے سے سخت منع کیا اس کی وجہ تھی کہ اوّل اوّل لوگ کسی بزرگ اور مقتدا کی تصویر گھر میں رکھتے تھے تو محبت یا یادگار کے طور پر رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ انہی تصویروں کی پرستش ہونے لگی تھی چنانچہ ہندوؤں اور رومن کیتھولک عیسائیوں میں اسی طرح تصویر پرستی اور اس سے بڑھ کر بت پرستی کا رواج ہوا۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے سرے سے تصویر کھینچنے سے منع فرمایا۔

⑮ قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا

شرک کا بڑا ذریعہ قبر پرستی اور یادگار پرستی ہے۔ قبروں اور یادگاروں کو لوگ عبادت گاہ بنا لیتے ہیں، سالانہ مجمع کرتے ہیں، دور دور سے سفر کر کے آتے ہیں، قبروں پر مسجدیں بناتے ہیں، منتیں مانتے ہیں، نذریں چڑھاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان تمام افعال سے منع کیا۔ وفات سے پانچ دن پہلے آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجد بنا لیتے تھے دیکھو میں تم کو منع کرتا ہوں کہ قبروں کو مسجد نہ بنانا۔'' ❹ عین وفات کے وقت چہرہ سے چادر الٹ دی اور فرمایا: ''خدا یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنا لیا۔'' ❺

---

❶ ابوداود، کتاب الادب، باب لایقول المملوك ربی وربتی: ٤٩٧٥۔

❷ ابوداود، کتاب الادب، باب فی تغییر الاسم القبیح: ٤٩٥٥۔

❸ ابوداود، کتاب الادب، باب لایقول خبثت نفسی: ٤٩٨٢۔

❹ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النهی عن بناء المساجد علی القبور: ١١٨٨۔

❺ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النهی عن بناء المساجد علی القبور: ١١٨٤۔

⑯ ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے

یہ توحید کے متعلق وہ اصلاحات تھیں جن کا تعلق زیادہ تر اعمال اور روزمرہ کی بول چال سے تھا لیکن حقیقی اصلاح جس سے توحید کی تکمیل ہوتی ہے، وہ قلب وروح کی توحید ہے، انسان کے تمام کاموں کا کوئی نہ کوئی نفسیاتی محرک ہوتا ہے۔ کوئی طلب شہرت کے لیے کام کرتا ہے، کوئی دنیاوی معاوضہ کے لیے کرتا ہے، کوئی نمائش اور دکھاوے کے لیے کرتا ہے، کوئی غیر کی محبت یا عداوت میں کرتا ہے۔ ان تمام کاموں کا محرک درحقیقت غیر خدا ہے جس نے خدا کی جگہ لے لی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے کہا:

﴿ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۴۳)

''تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنا خدا خود اپنی نفسانی خواہش کو بنالیا۔''

اسی لیے بڑا بت وہی ہے جس کو انسان نے خود اپنے دل کے بت خانے میں چھپا رکھا ہے اس بت کو توڑنا توحید کی اصلی تکمیل ہے۔ آپ ﷺ نے بتایا کہ انسان کے تمام کاموں کا دارومدار خود اس کے دل کے عمل پر ہے:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)) ❶

اسی لیے ایک مسلمان کے ہر قسم کے کاموں کا اصلی محرک صرف خدا کا حکم، خدا کا خوف، خدا کی اطاعت، خدا کی خوشنودی، خدا کی محبت، غرض صرف خدا ہونا چاہیے، جس درجہ تک ایک مومن کی اس قلبی کیفیت میں ترقی ہوگی اس کے ایمان وتوحید کی تکمیل بھی پایہ کمال کو پہنچتی جائے گی، اسی بنا پر وحی محمدی ﷺ نے ہر جگہ اور ہر موقع پر انسان کو اس کے عمل کی غرض وغایت مرضاۃ اللہ اللہ کی خوشنودی ﴿مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ مخلص اور ﴿وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى﴾ ذات خدا قرار دینے کی تعلیم دی ہے، اس بنا پر انسان جو کام خدا کے علاوہ کسی اور غرض ونیت سے کرے درحقیقت اس کام کے لیے اس نے ایک موقت خدا الگ بنالیا اور وہ گو اس وقت لفظی اور قانونی نہیں، لیکن معنوی ونفسی شرک کے ارتکاب کا یقیناً مجرم ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے خدا کے لیے دیا اور خدا ہی کے لیے رد کیا، خدا کے لیے چاہا اور خدا ہی کے لیے عداوت کی اور خدا ہی کے لیے بیاہ کیا اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔'' ❷

متعدد صحابیوں ❸ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ریا چھپا ہوا شرک ہے۔'' حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''چھپا ہوا شرک یہ ہے کہ انسان کوئی کام دوسرے

---

❶ صحيح بخاری، كتاب بدء الوحی:١۔

❷ ترمذی، ابواب صفة القيامة: ٢٥٢١، ترمذی کے دو نسخوں میں اس حدیث کے متعلق دو تنقیدیں درج ہیں، ایک میں منکر لکھا ہے اور دوسرے میں حسن اور اس کے ایک راوی اجلح کی نسبت لوگوں نے کلام کیا ہے مگر حدیث کا نفس مضمون تمام اسلامی روایات اور احکام کے عین مطابق ہے۔ ❸ حضرت ابوسعید خدری، معاذ بن جبل، ابوہریرہ، شداد بن اوس، محمود بن لبید، ابوسعید بن ابی فضالہ رضی اللہ عنہم ان صحابیوں کی روایتیں، مسند احمد، ابن ماجہ مستدرک وغیرہ میں ہیں۔

کی موجودگی کے سبب سے کرے۔'' [1] حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کی خیرات کی اس نے شرک کیا۔'' [2] یہی صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں آپ ﷺ فرمارہے تھے ''مجھے اپنی امت کے لوگوں پر سب سے زیادہ جس کا خوف ہے وہ شرک کا ہے ہاں میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ چاند یا سورج کو سجدہ کریں گے یا بتوں کو پوجیں گے بلکہ یہ ہے کہ وہ غیر خدا کے لیے عمل نہ کرنے لگیں اور چھپی نفسانی خواہش میں نہ مبتلا ہوں۔'' [3] حضرت محمود بن لبید انصاری رضی اللہ عنہ آپ کا قول نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ ''مجھ کو سب سے زیادہ جس کا تم پر خوف ہے وہ شرکِ اصغر ہے۔'' صحابہ نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! شرک اصغر کیا ہے؟ فرمایا: ''ریا'' قیامت کے دن جب لوگوں کے اپنے اپنے عمل کا بدلہ مل رہا ہوگا خدا ریاکار لوگوں سے کہے گا کہ تمہارے لیے ہمارے ہاں کچھ نہیں تم انہیں کے پاس جاؤ جن کے دکھانے کو دنیا میں یہ کام کیا کرتے تھے۔'' [4] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ''ایک موقعہ پر ہم لوگ دجال کے متعلق آپس میں باتیں کررہے تھے کہ اسی اثنا میں آنحضرت ﷺ تشریف لے آئے اور فرمایا: ''کیا دجال سے بڑھ کر جو خوفناک چیز میرے نزدیک ہے میں تم کو اس سے آگاہ نہ کروں؟'' ہم سب نے عرض کی، ہاں یارسول اللہ ﷺ! فرمایا: ''وہ شرکِ خفی ہے یعنی یہ کہ مثلاً: کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے تو وہ نماز کو محض اس لیے درست کرکے پڑھے کہ کوئی دوسرا شخص اس کو دیکھ رہا ہے۔'' [5] ابوسعید بن ابی فضالہ انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''قیامت میں جب خدا اگلوں اور پچھلوں کو یکجا کرے گا، تو ایک منادی آکر پکارے گا کہ جس کسی نے اپنے عمل میں خدا کے ساتھ کسی غیر کو بھی شریک بنالیا ہو تو وہ اپنا ثواب اس غیر سے مانگے، کہ خدا سا جھے سے بے نیاز ہے۔'' [6] ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد کیا ''خدا فرماتا ہے کہ میں تمام شریکوں میں سب سے زیادہ شرکت سے بے نیاز ہوں تو جس نے اپنے کسی کام میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کرلیا تو میں اس سے الگ ہوں اور وہ اسی کا ہے جس کو اس نے میرا شریک بنایا۔'' [7]

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ صحابہ اپنے ہر عمل میں اس شرک خفی سے ڈرتے تھے۔ شداد بن اوس کہتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے زمانہ حیات میں ریا کو شرکِ اصغر گنا کرتے تھے۔ [8] ایک دفعہ حضرت عمر

---

[1] مستدرك حاكم، كتاب الرقاق، ج٤، ص: ٣٢٩ (صحيح) [2] مستدرك، ج٤، ص: ٣٣٠؛ مسند احمد مسند شداد بن اوس، ج٤، ص: ١٢٦۔ [3] سنن ابن ماجه، ابواب الزهد، باب الرياء والسمعة: ٤٢٠٥۔
[4] مسند احمد حديث محمود بن لبيد انصارى، ج٥، ص: ٤٢٧۔ [5] سنن ابن ماجه، ابواب الزهد، باب الرياء والسمعة: ٤٢٠٤۔ [6] سنن ابن ماجه، ابواب الزهد، باب الرياء والسمعة: ٤٢٠٣ ومسند احمد، ج٤، ص: ٢١٥۔ [7] ابن ماجه، ابواب الزهد، باب الرياء والسمعة: ٤٢٠٢۔
[8] مستدرك حاكم، كتاب الرقاق، ج٤، ص: ٣٢٩ (صحيح)

فاروق رضی اللہ عنہ جا رہے تھے دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے قبر مبارک کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس قبر میں مدفون ہستی نے کہا تھا کہ ''ریا کا ادنیٰ شائبہ بھی شرک ہے۔'' [1] اسی طرح ایک دفعہ عبادہ تابعی رحمہ اللہ علیہ نے دیکھا کہ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ صحابی اپنی جائے نماز پر بیٹھے زار وقطار رو رہے ہیں رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس پر غم و ملال کے آثار دیکھے، عرض کی، میرے ماں باپ حضور پر فدا ہوں! اس حزن و ملال کا سبب کیا ہے؟ ارشاد ہوا: ''میں اپنے بعد اپنی امت پر ایک چیز سے ڈرتا ہوں۔'' عرض کیا، یا رسول اللہ! وہ کیا ہے؟ فرمایا: ''شرک اور چھپی نفسانی خواہش۔'' میں نے دوبارہ گزارش کی، یا رسول اللہ! کیا آپ کی اُمت آپ کے بعد شرک میں مبتلا ہوگی؟ فرمایا: ''اے شداد! میری امت یقیناً سورج یا چاند یا بت اور پتھر کی پرستش نہیں کرے گی لیکن وہ اپنے عمل کی نمائش اور ریا کرے گی۔'' عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا ریا شرک ہے؟ فرمایا: ''ہاں۔'' [2]

ان واقعات اور تعلیمات کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح ہر پہلو سے شرک کی تردید اور توحید کی تکمیل فرمائی ہے وہی عرب جو پہلے خدا کے سوا ہر چیز کی پرستش کرتے تھے انہوں نے آپ کی تعلیم کے اثر سے خدا پرستی اور توحید کی انتہائی معراج حاصل کر لی۔

---

[1] مستدرك حاكم، ج ٤، ص: ٣٢٨ (صحيح) [2] مسند حاکم، ج ۴، ص: ۳۳۰، حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد لکھا ہے، مگر ذہبی نے تصریح کی ہے کہ ''اس کا ایک راوی عبدالواحد بن زید متروک ہے'' تاہم چونکہ حدیث کا نفسِ مضمون مسند احمد، (ج ٤، ص: ١٢٦) اور سنن ابن ماجه، (باب الرياء: ٤٢٠٥) میں ایسے سلسلوں سے مذکور ہے، جن میں یہ عبدالواحد نہیں پڑتا، اس لیے ہم نے اس حدیث کو یہاں درج کیا ہے۔

توحید

اور

اس کے ایجابی اصول وارکان

یہ تو توحید کے سلبی اجزا تھے، یعنی توحید کے مخالف عقائد اور خیالات کی نفی اور تردید، لیکن نبوتِ محمدی کا کارنامہ اس سے بالاتر ہے اور وہ توحید کی اصل بنیاد کی استواری، اس کے اصول کی تعیین، امور ایمان کی تفصیل اور اس کے اجزا کی تکمیل ہے۔ عرب میں شرک و بت پرستی بھی تھی اور کہیں کہیں آسمانی مذاہب کی محرف صورتیں بھی موجود تھیں مگر ایک صحیح مذہب کا تخیل ان کے سامنے مطلق نہ تھا، اس بنا پر عقائد اور ایمان کی کوئی صحیح اور مرتب صورت بھی ان کے ذہن میں نہیں ہوسکتی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے تمام پچھلے خرافات اور اوہام کو، جن کو دین کا درجہ دیا گیا تھا، یک قلم محو کردیا بت پرستی، فرشتہ پرستی، ستارہ پرستی، فطرت پرستی، انسان پرستی غرض شرک کی تمام صورتیں قطعاً مٹا دیں اور ان کی جگہ مرتب متیقن، سنجیدہ عقائد اور سچائیوں سے معمور چند حقائق کی تعلیم دی جو انسان کے تمام اعمال اور اخلاق کے لیے بنیادی پتھر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز خدا کی ہستی کا یقین اور پھر اس کی توحید پر ایمان ہے، دنیا میں جتنے پیغمبر آئے ان میں سے ہر ایک نے اس قادر مطلق کی طرف لوگوں کو دعوت دی مگر یہ دعوت ان کے ایک مسلّم دعویٰ کی حیثیت سے تھی، انہوں نے اس دعویٰ کو دلائل کا محتاج نہ سمجھا اور حقیقت میں جن محدود زمانوں میں قوموں کے لیے ان کی بعثت ہوئی ان کے لیے دلیل اور برہان کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ ان کے زمانوں میں بت پرستی، ستارہ پرستی اور فطرت پرستی کا رواج تھا، الحاد کا وجود نہ تھا لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت عمومی تھی جو آخری زمانہ تک کے لیے اور تمام قوموں کے لیے تھی اور علم الٰہی میں یہ تھا کہ بعثت محمدی ﷺ کے بعد عقل انسانی تحقیق وتلاش کے آخری مراحل طے کرنا چاہے گی اور قدرت کے سربمہر خزانے وقفِ عام ہوں گے اور عقلیت کا دور دورہ ہوگا اور ہر شے دلیل وثبوت کی محتاج قرار پائے گی، اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ کو دلائل و براہین ثبوت اور شواہد کی بھی تلقین کی گئی۔

ایک اور سبب یہ ہے کہ انبیائے سابقین صرف اپنی قوموں کی دعوت پر مامور ہوئے تھے جن میں مشرکین کا وجود تھا، ملحدین کا نہ تھا، لیکن خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت تمام قوموں اور طبقوں کے لیے ہوئی اس لیے آپ کی دعوت میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ آپ انسانی عقل کی ہر صنف کو مخاطب کررہے ہیں اور ان کے معیار اور سطح کے مطابق اس قادرِ مطلق کی ہستی اور وجود پر دلیلیں بھی پیش کررہے ہیں اس لیے آپ نے دوسرے پیغمبروں کی طرح صرف مشرکوں کو مخاطب نہیں فرمایا بلکہ مشرکوں، کافروں، ملحدوں، مشککوں، دہریوں،

ہر ایک کو مخاطب فرمایا اور ان میں سے ہر ایک کی تسکین و تشفی کا سامان بہم پہنچایا۔ ایک قادر مطلق، خالقِ عالم اور صانعِ کائنات کی ہستی کے ثبوت اور انکار پر جب سے فلسفہ کا وجود ہے، ہمیشہ بحثیں پیدا ہوتی رہی ہیں اور دلیلیں پیش کی جاتی رہی ہیں۔ مصر، یونان، ہندوستان اسلامی ممالک اور آج یورپ میں بھی اس مسئلہ پر عقلائے زمانہ نے اپنی جودتِ ذہن، نکتہ رسی اور دقیقہ فہمی کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے مگر غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ دلائل کی زبان اور طرزِ تعبیر میں گو تبدیلی ہوتی رہی ہے، مگر اصل مغزِ سخن صرف ایک ہے اس بنا پر وحی محمدی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر جو دلیل قائم کی اس میں اسی ایک مغزِ سخن کو لے لیا ہے اور نہایت مؤثر طرزِ ادا میں اس کو بار بار دہرایا ہے اور انسانوں کو متنبہ کیا ہے۔

وحی محمدی ﷺ کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادرِ مطلق، خالق عالم اور صانعِ کائنات ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے، متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے، آثار قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مردہ اور گمنام قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا، جن میں سامانِ تمدن، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہے مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی ان میں نظر نہیں آتی ان کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے، آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہیں، غرض جماعتِ انسانی کا کوئی حصہ، زمین کا کوئی گوشہ، زمانہ کا کوئی عہد اس تخیل سے خالی نہیں ملتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف بھی انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے، اسی لیے وحی محمدی نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے:

﴿ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (۳۰/ الروم: ۳۰)

''اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر، یہ خدا کی وہ فطرت ہے، جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا، خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں، یہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ)) [1] ''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔''

اسی لیے خدا کا اعتراف روزِ ازل کا وہ عہد و پیمان ہے جو خالق و مخلوق میں ہوا تھا اور یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نمایاں ہو جاتا ہے، قرآن پاک نے اس واقعہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:

[1] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب ما قیل فی اولاد المشرکین: ۱۳۸۵۔

﴿ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۷۲)

''اور جبکہ تیرے خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے ان کی نسل کو لیا اور خود ان کو ان ہی پر گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا، ہاں ہم گواہ ہیں۔''

انسان کا یہ جذبہ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے۔ وحی محمدی نے بار بار انسان کے اسی دبے ہوئے جذبہ کو ابھارا ہے اور اسی خاکستر آگ کو ہوا دی ہے اور انسان کو اس کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلایا ہے۔ وہ انسانوں سے پوچھتا ہے:

﴿ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ﴾ (۱۴/ ابراھیم:۱۰)

''کیا آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے؟''

ایک اور مقام پر اس نے کہا:

﴿ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۭ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۭ ﴾

(۵۲/ الطور:۳۵، ۳۶)

''کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے یا وہی اپنے آپ خالق ہیں یا انہی نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا (یہ کوئی بات نہیں) بلکہ ان کو یقین نہیں۔''

دنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے اور جو اپنی عقل اور فہم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے، بہر حال موجود ہے اور اس کے اس وجود میں کوئی شک نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کسی کے بن بنائے وہ آپ بن گئی یا خود اس نے اپنے آپ کو بنالیا ہے ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی ہے اور نہ کوئی مفعول اپنا فاعل آپ ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی بے وقوف یہ کہے کہ نر و مادہ مل کر اپنا بچہ پیدا کرتے ہیں تو سلسلۂ توالد و تناسل کا آغاز کیونکر ہوا اور اولین نر و مادہ کا اور مادہ تخلیق و روح کا خالق کون ہے؟

یہ گوناگوں عالم، یہ رنگارنگ کائنات، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں جاندار اور بے جان اشیاء، یہ علل و اسباب کا تسلسل، یہ تغیر و انقلاب کا نظام، یہ کائنات کا نظام اور اس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون، انسان کے اندرونی قویٰ اور ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار خواص و قویٰ کے رموز، انسان کی خیالی بلند پروازی اور عملی عجز و درماندگی، یہ تمام باتیں ایک خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں، یہ نیلگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالق کل کا پتہ دیتا ہے:

﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۙ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۹۰)

''آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

یہ شب وروز کا نور وظلمت اور سورج اور چاند کی روشنی اس کی مقررہ رفتار با قاعدہ طلوع وغروب اس کی دلیل ہے کہ اس ابلقِ ایام پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں اس کا سیاہ وسپید ہے:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴾ (۴۱/ فصلت:۳۷)

''اور اس کی نشانیوں میں سے رات دن اور سورج اور چاند ہیں۔''

آسمان اور زمین کی پیدائش، دن اور رات کا الٹ پھیر تو ہے، دیکھو کہ خطرناک سمندروں میں کس طرح لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک کو تجارت کا سامان لے کر دوڑے پھرتے ہیں، اگر پانی میں مٹی اور لوہے کا ایک ذرہ بھی ڈالو تو فوراً ڈوب جائے گا مگر لاکھوں من کے لدے ہوئے جہاز کیسے پھول کی طرح پانی پر تیر رہے ہیں جس فطری قائدہ کے بموجب یہ عمل ظہور میں آ رہا ہے، وہ جس کے حکم سے بنا ہے، اس کا کتنا احسان ہے پھر ان سمندروں سے بخارات اٹھتے ہیں وہ اوپر جا کر بادل بنتے ہیں اور وہ وہیں جا کر برستے ہیں جہاں پیداوار اور زمین کی نشو ونما کی حاجت ہو اور پھر وہ بادل ہواؤں کے تخت پر بیٹھ کر کیسے ادھر ادھر ضرورت کے مطابق اڑتے پھرتے ہیں:

﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ؁ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۶۴)

''بے شبہ آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور دن رات کے الٹ پھیر میں اور ان جہازوں میں جو انسانوں کے لیے فائدہ رساں سامان لے کر سمندر میں چلتے ہیں اور آسمان سے اس کے پانی برسانے میں اور پھر اس پانی کے ذریعہ مردے پیچھے زمین کو زندگی بخشنے میں اور زمین میں ہر طرح کے چلنے والوں پھیلانے میں اور ہواؤں کے کبھی اِدھر اُدھر بدلنے میں اور آسمان اور زمین کے بیچ میں جو بادل کام میں لگے ہیں، ان سب میں سمجھ بوجھ والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔''

آسمان اور زمین کی عجیب وغریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی اپنی پیدائش کی حکایت کتنی عجیب ہے:

﴿ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ ﴾ (۴۵/ الجاثیۃ:۳، ۴)

''بیشک آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری پیدائش میں اور جو چلنے والے پھیلائے ان میں یقین کرنے والے کے لیے دلیلیں ہیں۔''

• سورۂ انعام میں نباتات اور اس کی نیرنگیوں کو اپنی ہستی کی دلیل میں پیش کیا، یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک ہی زمین ہے، جس میں سے وہ اُگتے ہیں، ایک پانی ہے جس سے وہ سینچے جاتے ہیں، ایک ہی ہوا ہے جس میں وہ سانس لیتے ہیں مگر کتنے رنگ برنگ کے پھل پھول میوے اور درخت لگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا رنگ، ہر ایک کا مزہ، ہر ایک کی پتی، ہر ایک کا قد و قامت، ہر ایک کے خواص اور فائدے، دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾ (٦/ الانعام:٩٩)

''اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس سے اُگنے والی ہر چیز نکالی، پھر اس سے سبز خوشے نکالے، جن سے ہم جڑے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے گابھے میں سے لٹکتے گچھے اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار ہم شکل اور جدی جدی شکل کے، جب وہ پھلیں تو ان کے پھل اور پکنے کو دیکھو، ان میں ایمان والے لوگوں کے لیے دلیلیں ہیں۔''

سورۂ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدائش کو، پھر اس میں عورت مرد کے جوڑے ہونے کو اور ان کے درمیان مہر و محبت کے جذبات کے ظہور کو، اپنی ہستی کی دلیل بتایا ہے۔ پھر اپنی قدرت کے دوسرے عجائبات کو جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں ایک ایک کر کے پیش کیا ہے۔ اول تو خود انسان کی پیدائش پھر ان میں عورت مرد ہونا اور ان کے درمیان جذبات کی لہر پھر مختلف قوموں کی بولیوں، شکلوں اور رنگوں کو دیکھ کہ ایک ایک سے الگ ہے پھر خود انسانوں کے اندر کے اعمال دیکھو، ایک نیند ہی کی حقیقت پر غور کرو، یہی تمہاری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاۗؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

﴿يَعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ۭ﴾

(۳۰/ الروم:۲۱۔۲۵)

’’اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر تم آدمی بن کر چلتے پھرتے ہو اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے بنائے کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم سب کے درمیان پیار اور مہر رکھا، اس میں ان لوگوں کے لیے جو سوچتے ہیں، دلیلیں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں کی اور زمین کی بناوٹ اور تمہاری بولیوں اور رنگوں کی بوقلمونی ہے، اس میں جاننے والوں کے لیے یقیناً دلیلیں ہیں اور اس کی عجیب قدرتوں میں سے تمہاری رات اور دن میں نیند ہے اور تمہاری اس کی مہربانیوں کی تلاش ہے، اس میں ان کے لیے جو سنتے ہیں، دلیلیں ہیں اور اس کے عجائبِ قدرت میں سے یہ ہے کہ تمہیں وہ بجلی کی چمک دکھاتا ہے جس سے تم کبھی ڈرتے ہو اور کبھی رحمت کی بارش کی امید باندھتے ہو اور وہ آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس سے زمین کو اس کے مرے پیچھے زندہ کرتا ہے، اس میں ان کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں، دلیلیں ہیں اور اس کی دلیلوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔‘‘

اس اخیر آیت میں آسمان و زمین کے اس کے حکم سے قائم رہنے کا ذکر ہے۔ تم کہتے ہو کہ یہ باہمی جذب وکشش سے قائم ہیں۔ لیکن خود یہ جذب وکشش کس کی کشش کا نتیجہ ہے؟ یہ خود حیرت انگیز ہے، سورۂ لقمان میں آسمانوں کے کسی نظر نہ آنے والے کے سہارے کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھہرے ہونے کا ذکر ہے۔ یہ نظر نہ آنے والا سہارا قوتِ کشش ہی سہی وہ بھی تو اسی کے اسرار میں سے ہے۔ اس کے بعد ایک جان دار اور بے حیات مردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کے ساتھ انواع واقسام کی زندگی کے نمونوں کا ابھر آنا کتنا حیرت انگیز ہے، یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَاۗبَّةٍ ۭ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝﴾

(۳۱/ لقمان:۱۰)

’’اس نے آسمانوں کی چھت کو کسی ایسے ستونوں کے بغیر کھڑا کیا ہے، جو تم کو نظر آتے ہوں اور زمین میں ایسے کھونٹے ڈال دیے کہ وہ تم کو لے کر ہل نہ جائے اور اس نے اس زمین پر ہر قسم کے چلنے پھرنے والے پھیلائے اور آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اسی زمین سے ہرا چھے جوڑے پیدا کیے۔‘‘

سورۂ سجدہ میں انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز، پھر قطرہ آب (نطفہ) کے ذریعہ توالد وتناسل، پھر اس کے سڈول جسم کا بن جانا، پھر اس مٹی کے مردہ قالب میں دفعتہً کہیں سے زندگی آ جانا اور اس میں روح پھک جانا اور اس میں علم وحواس کے حیرت انگیز آلات کا پیدا ہو جانا، ان سب کو اپنی صفت میں پیش کیا ہے:

﴿ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ ﴾ (۳۲/ السجدۃ:۷۔۹)

’’وہ جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی، پھر اس کی نسل ذلیل سے نچڑے پانی سے بنائی، پھر اس کو سڈول کیا اور اُس میں اپنی جان سے کچھ پھونک دیا، اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیے تم ان احسانوں کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔‘‘

مردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتیں ودیعت ہیں اور خود انسانوں کے جسم وجان میں عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے لیکن کوئی صاحب نظر ادھر نہیں دیکھتا، انسان کی زندگی اس کے اندرونی جذبات، حواس، ذہنی قویٰ اور دماغی حرکات ان میں سے ہر شے معمہ ہے:

﴿ وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ ﴾

(۵۱/ الذاریات:۲۰۔۲۱)

’’اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری جانوں کے اندر کیا تم نظر نہیں کرتے۔‘‘

جانوروں کے جسموں کے اندر جو عجیب وغریب نظام ہے وہ بھی غور کے قابل ہے ایک ہی گھاس پھوس کی غذا ان کے پیٹ میں جاتی ہے۔ پھر اسی کا کچھ حصہ لید اور گوبر کچھ خون اور کچھ دودھ بن جاتا ہے اور اسی لید اور گوبر کے باہر آنے کے راستوں اور سرخ خون کی رگوں کے درمیان سے خالص، سپید، شیریں دودھ کی دھاروں کا نکلنا کتنا عجیب ہے!

﴿ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَاۗىِٕغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ ﴾ (۱۶/ النحل:۶۶)

’’اور تمہارے لیے جانوروں میں عبرت ہے، ہم تمہیں ان کے پیٹوں کے اندر سے لید اور خون کے بیچ سے خالص اور پینے والوں کے لیے خوشگوار دودھ پلاتے ہیں۔‘‘

ایک ہی قسم کے پھل ہیں اگر ان کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمہاری عقل اور قوت کو بڑھاتے ہیں اور دوسرے طرح کھاؤ تو وہ ان کو ضائع کر دیں۔

﴿ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ ﴾ (١٦/ النحل:٦٧)

''اور چھوہاروں اور انگوروں کے پھلوں کو دیکھو کہ ان میں سے تم نشہ اور اچھی روزی حاصل کرتے ہو، اس میں سمجھ والوں کے لیے دلیل ہے۔''

زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو چھوڑ کر اوپر آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ، سورج کا روشن چراغ اور چاند کی خوشنما قندیل کتنی عجیب ہے۔ پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے بارہ برجوں کو طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسم اور زمانے کو نمایاں کرتا ہے:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝ ﴾ (٢٥/ الفرقان:٦١)

''بابرکت ہے وہ ہستی جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور ان میں ایک چراغ اور چمکانے والا چاند بنایا۔''

انہیں چند چیزوں میں اس کی قدرت کے عجائبات محدود نہیں، بلکہ ہر شے اپنی خلقت، اپنی محکم روش اور اپنے قانون فطرت سے اس کی گواہی دیتی ہے:

﴿ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ ﴾ (٢٧/ النمل:٨٨)

''اس ہستی کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو مضبوط نظام پر بنایا۔''

اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے، اس میں مستحکم نظم ونسق کی بندش نظر آتی ہے:

﴿ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝ ﴾ (٦٧/ الملك٣۔٤)

''تجھے مہر والے خدا کی بناوٹ میں کوئی بے برابری نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر کیا، کوئی فتور دکھائی پڑتا ہے، پھر دہرا کر، دوبارہ نظر کر، تیری نگاہ رد ہو کر تھک کر تجھ تک پلٹ آئے گی، (مگر کوئی نقص نہ پائے گی)۔''

اس قسم کی اور سینکڑوں آیتیں ہیں جن کا استقصا بھی مشکل ہے، ان آیتوں میں تین قسم کے دلائل ہیں:

① قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔

② عالم کا نظم ونسق اور اس کا مرتب سلسلہ۔

③ کائنات اور سلسلہ عالم کی ہر کڑی میں بے انتہا مصلحتوں، حکمتوں اور فائدوں کا ہونا۔

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظم علل واسباب، خود بخود بخت واتفاق سے نہیں بن گئے بلکہ کسی حکیم ودانا اور قادر مطلق صانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان

کو بنایا ہے۔

اہلِ فلسفہ اور متکلمین عالم کے وجود پر عموماً یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ ہم بداہۃً دیکھتے ہیں کہ عالم میں ہر چیز کے لیے علل واسباب ہے، یہ سلسلہ یا تو کہیں جا کر ختم ہوگا یا یوں ہی مسلسل چلا جائے گا۔ اگر یہ یوں ہی مسلسل چلا جائے گا تو لازم آتا ہے کہ ہر چیز کے پیدا ہونے پر غیر متناہی علل گزر جائیں اور غیر متناہی علل کا خاتمہ نہیں ہوسکتا اور نہ کہیں اس کا آغاز ہوسکتا ہے۔ اس لیے کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہوسکتی۔ تسلسل عقلاً بھی محال ہے بلکہ انسان اس کے تخیل سے بھی عاجز ہے اس بنا پر لامحالہ سلسلہ علل کا کہیں خاتمہ ہونا ضروری ہے۔ جس علتِ کل پر تمام علتیں ختم ہوجاتی ہیں وہی خلق وپیدائش اور وجود وکون کی اصلی علت العلل ہے۔

یہ دلیل گو بہت کچھ پیچیدہ اور اصلاحات سے لبریز اور بہت سے محذوف مقدمات پر مبنی ہے، تاہم وہ انسانی عقل میں آتی ہے اور بہتوں کے لیے تسکین کا باعث ہے۔ قرآن پاک کی ایک دو آیتوں میں بھی اس دلیل کا ماخذ مذکورہ ہے۔ سورۂ ہود کے آخر میں ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾

(۱۱ ھود:۱۲۳)

''اور خدا ہی کے پاس ہے آسمانوں اور زمین کی چھپی بات اور اسی کی طرف ہر بات لوٹائی جاتی ہے تو اس کو پوجو اور اس پر بھروسہ رکھو۔''

﴿ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴾ (۵۳/ النجم:۴۲)

''اور یہ کہ تیرے رب کی طرف ہے سب کی انتہا۔''

آنحضرت ﷺ انسانی کمزوریوں سے واقف تھے۔ چند صحابیوں نے آکر عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! کبھی کبھی ہمارے دلوں میں ایسے خیالات اور وسوسے آتے ہیں جن کو ہم زبان سے ادا نہیں کر سکتے۔ فرمایا: ''کیا تم کو یہ کیفیت حاصل ہوگئی؟'' گزارش کی، ہاں یارسول اللہ ﷺ! فرمایا: ''یہ تو خالص ایمان ہے۔'' [1] مقصود یہ ہے دل میں وسوسوں کا آنا اور پھر ان وسوسوں کا اتنا بدتر جاننا کہ ان کا زبان پر لانا بھی وہ گناہ سمجھے یہ کیفیت ایمانی کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگ علم ودانش کا سوال کرتے ہیں کہتے ہیں کہ خیر اس کو تو خدا نے پیدا کیا اور پھر اس خدا کو کس نے پیدا کیا؟ آسمان کو خدا نے بنایا زمین کو خدا نے بنایا یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے پھر پوچھتے ہیں اچھا تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا؟'' فرمایا: ''یہ شیطانی وسوسہ ہے جب یہ حالت کسی کو پیش آئے تو کہہ دے ((اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ)) میں اللہ پر ایمان لایا۔'' [2]

یہ تعلیم درحقیقت اسی مسئلہ کی ہے کہ خدا پر تمام علتوں کی انتہا ہے اور اس کے بعد کوئی علت نہیں اس لیے

---

[1] یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الوسوسة فی الایمان: ۳۴۰ میں متعدد روایتوں سے مذکور ہیں۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ایضًا: ۳۴۳۔

یہ وسوسہ لائق جواب نہیں یہ جہالت اور نادانی کا سوال ہے۔

توحید پر عقلی دلیلیں

اگر کوئی عالم کا خالق وصانع ہے تو وہ یقیناً ایک ہے دو نہیں، تاہم دنیا میں ایسے عقلمند بھی ہیں، جو دو تین بلکہ متعدد خداؤں کے قائل ہیں اور عالم کی ایک مملکت کو سینکڑوں حصوں میں تقسیم کر کے ان کو مختلف خداؤں کی حکومتیں قرار دیتے ہیں۔ وحی محمدی ﷺ نے اس شرک کے ابطال پر سب سے زیادہ جس دلیل کو پیش کیا ہے وہ نظام عالم کی یکسانی اور وحدت اور کائنات کے علل واسباب کا باہم توافق، تعاون، اشتراک اور اتحاد ہے۔ دنیا میں ایک ذرہ بھی اس وقت تک پیدا ہو نہیں سکتا جب تک آسمان سے لے کر زمین تک کی تمام کارکن قوتیں اور اسباب ایک دوسرے سے موافق ومناسب نہ ہوں اور باہم ان میں اشتراکِ عمل پیدا نہ ہو، ایک دانہ زمین سے اس وقت تک اگ نہیں سکتا جب تک دانہ اگنے کے لائق نہ ہو۔ زمین میں اگانے کی صلاحیت نہ ہو، موسم اس کے مناسب نہ ہو، بارش موافق نہ ہو، آفتاب سے اس کو گرمی اور روشنی اس کے مزاج کے مطابق بہم نہ پہنچے پھر اس کے اگنے کے موانع اور عوائق ایک ایک کر کے دفع نہ ہوں، ان سب کے بعد وہ دانہ اگے گا اور پھل لائے گا، قرآن پاک نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿ لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ ﴾

(۲۱/ الانبیآء:۲۲)

"اگر زمین وآسمان میں اس ایک خدائے برحق کے سوا چند اور خدا بھی ہوتے، تو زمین وآسمان برباد ہو جاتے، تو پاک ہے عرش والا خدا ان باتوں سے جو یہ مشرک کہتے ہیں۔"

آسمان وزمین کا یہ تمام کاروبار، یہ تمام قوانین قدرت اگر ایک کے بجائے دو طاقتوں کے ہاتھوں میں ہوتے تو یہ باہمی تصادم میں ایک لمحہ کے لیے بھی قائم نہ رہتے۔ فلسفیانہ اصطلاحات میں اس مطلب کو ادا کرو تو یوں ہوگا کہ عالمِ کائنات معلول ہے۔ اس کی کوئی علتِ تامہ ہوگی۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک معلول کی دو علت تامہ نہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ علتِ تامہ اس کو کہتے ہیں جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود میں کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو اب عالم کے علت تامہ اگر ایک نہ ہو بلکہ دو ہوں تو سوال یہ ہے کہ ایک علت تامہ کے وجود کے بعد عالم کے وجود میں دوسری علت تامہ کا انتظار رہے گا یا نہیں، اگر رہے گا تو پہلی شے علتِ تامہ نہیں رہے گی اور اگر انتظار نہ رہے گا، تو دوسرے شے علتِ تامہ نہ ہوگی۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ عالم کی علت تامہ ایک ہی ہوسکتی ہے۔

توحید کے ثبوت اور شرک کے ابطال کی دوسری دلیل نظام عالم کی وحدت ہے، سورج چاند اور تاروں سے لے کر انسان حیوان، ہوا، پانی، درخت گھاس پات تک دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ سب ایک مقررہ نظام اور بندھے اصول کے ماتحت ہیں جن میں کبھی سرموفرق نہیں ہوتا۔ ہر شے اپنے ایک اصول کی پابند اور ایک

عادتِ جاریہ کے مطابق چل رہی ہے، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت قائم ہے اور وہ سب کسی ایک ہستی کے اشارے پر چل رہے ہیں:

﴿ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾

(۲۳/ المؤمنون:۹۱)

''اور نہ اس خدائے برحق کے ساتھ کوئی اور خدا ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ لے جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھ جاتا۔''

﴿ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا۝ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا۝ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآء یل:۴۲۔۴۴)

''کہہ اگر خدائے برحق کے ساتھ اور خدا ہوتے جیسا کہ یہ مشرکین کہتے ہیں، تو ایسی حالت میں وہ تخت والے (حکمران) خدا سے حکومت چھیننے کا راستہ ڈھونڈ تے، پاک اور بلند ہے (خدا) اس بات سے، جس کو یہ (مشرک) کہتے ہیں، اس خدائے برحق کی پاکی ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان کے اندر ہے بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی پاکی کی گواہی نہ دیتی ہو۔''

اسی وحدت نظام کے استدلال کو ایک اور آیت میں خدا نے بیان فرمایا ہے:

﴿ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ۝ ﴾ (۲۷/ الملك:۳۔۴)

''تو خدا کے بنائے میں کوئی فرق نہیں دیکھتا، پھر نگاہ کر، کیا کوئی فتور تجھ کو دکھائی دیتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر دوڑا، تیری نظر تھک کر واپس آجائے گی۔''

اس واقعاتی استدلال سے بڑھ کر جو بالکل نظمِ فطرت پر مبنی ہے کوئی دوسری دلیل نہیں ہوسکتی اسی لیے قرآن پاک نے اس کو اختیار کیا ہے۔ یہ دنیا وحدتِ نظام ہی کے ماتحت چل رہی ہے ورنہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی چل نہ سکے۔ اسی سے اس دنیا کے حاکم و فرمانروائے مطلق کی وحدت بخوبی ثابت ہے۔

توحید کی تکمیل

توحید خواہ کسی قدر محرف، شرک آمیز اور ناقص شکل میں ہو، دنیا کے تمام مذاہب اور ادیان کی مشترک اور اولین تعلیم ہے۔ لیکن ان مذاہب میں وہ کسی بنیادی اصل پر مبنی نہ تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس عمارت کو چند بنیادی اصول کے پتھروں پر قائم کیا، یہ پتھر کیا ہیں یہ پتھر خدا کی حقیقی عظمت کی شناخت اور اس عالم کائنات میں انسان کی اصلی حیثیت اور مرتبہ کی تعیین ہے۔

خدا کی حقیقی عظمت

اہلِ عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے مگر اس کو قدرت کے کارخانہ کا تنہا مالک نہیں سمجھتے تھے۔ یہودیوں کا خدا ایک خاندانی خدا تھا، جس نے ساری دنیا صرف بنی اسرائیل کے لیے پیدا کی تھی اور اس کو بنا کر ساتویں دن وہ تھک کر بیٹھ گیا۔ وہ انسانوں سے کشتی لڑتا تھا۔ اس کی اولادیں تھیں۔ عیسائیوں کا خدا سب کچھ مسیح ابن مریم کو دے کر خود معطل ہو گیا تھا۔ ایرانیوں کے خدا کی خدائی نیکی و بدی کی دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ہندوؤں کا خدا اوتاروں کا بھیس بدل کر لاکھوں خدا بن گیا تھا اور برہما، مہیش اور بشن تینوں نے مل کر خدائی کے کاروبار کی باہم تقسیم کر لی تھی۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے اس خدا کا جلوہ نمایاں کیا، جو آسمان کے اوپر سے لے کر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے۔ اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ اس کی شاہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں۔ اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں۔ کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں۔ دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں۔ شجر، حجر، جنگل، دریا، پہاڑ، صحرا، سورج، چاند، زمین و آسمان، انسان، حیوان، زبان والے اور بے زبان سب اس کے آگے سربسجود اور اس کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں۔ سب کمزور ہیں وہی ایک قوت والا ہے، سب جاہل ہیں اسی ایک کو علم ہے، سب فانی ہیں اسی ایک کو بقا ہے، سب محتاج ہیں وہی ایک بے نیاز ہے، سب اس کے بندے ہیں وہی ایک شہنشاہ ہے، غرض عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اس پر صرف اسی کی حکمرانی ہے وہ ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے۔ وہ ہر قسم کے صفاتِ عالیہ، اوصافِ کمالیہ اور محامدِ جمیلہ سے متصف ہے، اس کے مانند کوئی نہیں، کوئی اس کی شبیہ و مثال نہیں، وہ تشبیہ و تمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتے ناتے سے پاک ہے:

﴿ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ ﴾ (۳۹/ الزمر:٦)

''وہ ہے اللہ تمہارا رب، اسی کی بادشاہی ہے، اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔''

﴿ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ﴾ (۳۹/ الزمر:٤٤)

''آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔''

﴿ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (٦/ الانعام:١٤)

''آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا۔''

﴿ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۭ ﴾ (٦/ الانعام:٧٣) ''چھپی اور کھلی کا جاننے والا۔''

﴿ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۭ لَهُ الْحُكْمُ ﴾ (٢٨/ القصص:٨٨)

''اس کی ذات کے سوا، ہر چیز فانی ہے، اسی کے ہاتھ میں فیصلہ کی طاقت ہے۔''

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ:١١)

''اسکے مانند کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''

﴿ هُوَ الْحَيُّ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ﴾ (٤٠/ المؤمن:٦٥)

''وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔''

﴿ وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ ﴾ (٦/ الانعام:٥٩)

''غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا، خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اس کو جانتا ہے۔ درخت کا کوئی پتا نہیں گرتا اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہے لیکن وہ اس کے علم میں ہے۔''

﴿ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ ۖ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾ (٣/ آل عمران:٢٦)

''اے اللہ! اے بادشاہی کے مالک! تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت نصیب کرے، تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے تو ہر بات پر قادر ہے۔''

﴿ وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ ۚ يُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴾ (١٠/ یونس:١٠٧)

''اور اگر اللہ تجھے مصیبت پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کرنا چاہے تو اس کے فضل و کرم کا کوئی روکنے والا نہیں، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اپنے فضل سے ممتاز کرے اور وہی گناہوں کو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

﴿ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۖ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ۖ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴾ (٢/ البقرة:٢٥٥)

''اس اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہیں، وہی جیتا ہے اور سب اس کے سہارے جیتے ہیں، اس کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند، آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے کون ایسا ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے، جو خلق کے روبرو ہے اور جو ان کے پیچھے ہے سب کو جانتا ہے

اور وہ اس کے علم کے کسی حصہ کا احاطہ نہیں کر سکتے ،مگر وہ جو چاہے اس کا تخت آسمانوں کو اور زمین کو سمائے ہے ،ان آسمانوں کی اور زمین کی نگرانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی او پر اور بڑا ہے۔''

﴿ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ؕ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۝ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ۝ ﴾ (۵۷/ الحدید: ۴، ۵)

''جو زمین میں گھستا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے وہ سب جانتا ہے اور تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ کرو، اللہ اس کو دیکھتا ہے، آسمان اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور تمام کاموں کا مرجع وہی ہے۔''

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ ﴾ (۱/ الفاتحہ: ۲)

''سب تعریف اسی کے لیے ہے جو تمام عالم کا پالنے والا ہے۔''

﴿ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (۳/ آل عمران: ۸۳)

''اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کے زیر فرمان ہے۔''

﴿ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ۝ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ۝ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ۝ ﴾

(۸۵/ البروج: ۱۴۔۱۶)

''وہی گناہوں کا بخشنے والا ہے، بندوں سے محبت کرنے والا ہے، تخت کا مالک ہے، بڑی شان والا ہے، جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔''

﴿ يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ (۶۲/ الجمعة: ۱)

''آسمانوں میں اور زمین میں جو ہے سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں۔''

﴿ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۴۴)

''اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔''

ان معنوں کی ہزاروں آیتیں قرآنِ پاک میں ہیں، ان تعلیمات نے خدا کی عظمت، جلالت اور کبریائی کا وہ جلوہ پیش کیا جس کے سامنے معبودانِ باطل کی عزت خاک میں مل گی، بتوں کی بڑائی کا طلسم ٹوٹ گیا، سورج، چاند، تاروں کی خدائی کا چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا، جن وانس، شجر وحجر، بحر و بر، سب اس کے جلال و جبروت کے سامنے سربسجود نظر آئے، پھر اس کے سوا کون تھا جو نیرنگِ وجود کے ساز سے ﴿اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ (میں ہوں خدا جس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں) کی صدا بلند کر سکتا۔

انسان کا مرتبہ

توحیدِ محمدی کا دوسرا بنیادی اصول اس عالمِ خلق میں انسان کی حیثیت اور درجہ ہے جو لوگ بتوں کو سجدہ

کرتے ہیں، پتھروں کو پوجتے ہیں، درختوں کے آگے جھکتے ہیں، جانوروں کو دیوتا جانتے ہیں، جنات اور ارواح خبیثہ کے نام کی دہائی پکارتے ہیں۔انسانی مخلوقات کو ارباب جانتے ہیں، انسانوں کو خدا سمجھتے ہیں۔وہ حقیقت میں انسان کے مرتبہ سے ناواقف ہیں، وہ دراصل اس طرح انسان کو پتھروں سے، درختوں سے، جانوروں سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے اور چاند تاروں سے کم تر جانتے ہیں۔انہوں نے درحقیقت انسان کے اصلی رتبہ اور حیثیت کو نہیں پہچانا۔آنحضرت ﷺ نے اپنی وحی کی زبان سے جاہل عربوں کو یہ نکتہ سوجھایا کہ انسان اس عالمِ خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے۔وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے۔قرآن کی ابتدائی سورہ میں آدم علیہ السلام کی خلافت کا قصہ محض داستان نہیں، بلکہ انسان کی اصلی حیثیت کو عیاں اور نمایاں کرنے والی تعلیم کا اولین دیباچہ ہے۔اس کو فرشتوں کا مسجود بنانا گویا تمام کائنات کا مسجود بنانا تھا۔اس کو تمام اسماء کا علم عطا کرنا گویا تمام اشیاء کو اس کے تصرف میں دینا تھا وہ ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ کے فرمان کی رو سے اس عالم میں خدا کا نائب ہے اور اس کا سر خلافتِ الٰہی کے تاج سے ممتاز ہے، کروڑوں مخلوقاتِ الٰہی میں خدا کی امانت کا حامل وہی منتخب ہوا۔یہ منصبِ اعلیٰ نہ فرشتوں کو ملا، نہ آسمان کو، نہ زمین کو، نہ پہاڑ کو، صرف انسان ہی کا سینہ اس امانت کا خزانہ قرار پایا اور اسی کی گردن اس بوجھ کے قابل نظر آئی۔فرمایا:

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۷۲)

''ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی۔سب نے اس بارِ (امانت) کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔''

وحی محمدی ﷺ نے انسان کا رتبہ یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بزرگیوں سے سرفراز فرمایا، عالم مخلوقات میں برتر بتایا اور انعام واکرام سے معزز کیا ہے:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۷۰)

''ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے خشکی اور تری میں ان کو سواری دی اور ستھری چیزوں کی ان کو روزی بخشی اور اپنی بہت سی پیدا کی ہوئی چیزوں پر ان کو فضیلت عطا کی۔''

انسان ہی وہ ہستی ہے جو سب سے معتدل قویٰ اور بہترین اندازہ کے ساتھ دنیا میں مخلوق ہوئی:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝﴾ (۹۵/ التین:٤)

''البتہ ہم نے انسان کو بہتر اندازہ پر پیدا کیا۔''

یہاں تک کہ انسان خدا کی صورت کا عکس قرار پایا متعدد حدیثوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔'' 1 اسی بنا پر آپ نے تعلیم دی کہ غلام کو سزا دو تو اس کے چہرہ پر نہ مارو 2 کہ وہ صورتِ الٰہی کا عکس ہے۔ عین میدان جنگ میں اگر تلواریں برس رہی ہوں تو حریف کے چہرہ پر وار نہ کرنا چاہیے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔ 3 غصہ میں یہ بھی نہ کہنا چاہیے کہ خدا تیرے چہرہ کو اور تیرے جیسے چہرہ کو بگاڑ دے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر خلق کیا۔ 4 ان حدیثوں کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کی طرح خدا کی کوئی خاص جسمانی شکل ہے اور آدم کی شکل اس کی نقل ہے کہ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (٤٢/ الشوری:١١) بلکہ یہ مطلب ہے کہ انسان میں خدا کی صفاتِ کاملہ کی ایک دھندلی سی جھلک موجود ہے۔ علم، قدرت، حیات، سمع، بصر، ارادہ، غضب، رحم، سخا وغیرہ تمام صفاتِ رحمانی کی ناقص مثالیں اس کے اندر اللہ نے ودیعت کر رکھی ہیں اور چونکہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا چہرہ ہی اس کی شخصیت کا آئینہ دار اور اس کے اکثر حواس کا مصدر ہے جن سے اس کے تمام اوصاف کا ظہور ہوتا ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے انسان کے اعضاء میں اسی کو فیضِ رحمانی کا مورد ظاہر کیا۔ 5 اب غور کرو کہ وہ چہرہ جس کو خدا سے نسبت ہو اس لائق ہے کہ وہ غیر خدا کے آگے زمین پر رکھا جائے اور اس کی زبان سے غیر خدا کی حمد کا ترانہ نکلے۔

انسان تو کائنات میں خلیفۃ اللہ بن کر آیا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ﴾ (٦/ الانعام:١٦٥)

''اور اسی نے تم کو زمین کا نائب بنایا۔''

تو اب وہ عالمِ کائنات میں خدا کے سوا کس کو سجدہ کرے۔

روئے زمین کی تمام چیزیں اس کی خاطر بنیں وہ روئے زمین کی خاطر نہیں بنا ہے:

﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ (٢/ البقرۃ:٢٩)

''جو کچھ زمین میں ہے خدا نے (اے انسانو!) تمہارے لیے بنایا۔''

﴿اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ﴾ (٢٢/ الحج:٦٥)

---

1 صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب بدء السلام:٦٢٢٧؛ مسند احمد، ٢/ ٢٥١؛ ادب المفرد بخاری لا تقل قبح اللہ وجهه:١٧٢ وصحیح مسلم، کتاب البر والصلة، ٦٦٥٥ نیز تورات میں بھی یہ فقرہ ان الفاظ میں ہے: ''جس دن خدا نے آدم کو پیدا کیا خدا کی صورت پر اسے بنایا۔'' (پیدائش ٥۔٢)

2 صحیح بخاری، کتاب العتق، باب اذا ضرب العبد فلیجتنب الوجه:٢٥٥٩ وصحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب النهی عن ضرب الوجه:٦٦٥١ تا ٦٦٥٦۔ 3 صحیح مسلم، کتاب البر والصلة: ٦٦٥٥ آخری ٹکڑا صرف مسلم میں ہے۔ 4 الادب المفرد امام بخاری، باب لا تقل قبح اللہ وجهه:١٧٣۔

5 اس حدیث کی شرح میں فتح الباری شرح بخاری، ج ٥، ص:١٣٢ میں یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

”زمین میں جو کچھ ہے، خدا نے اس کو تمہارے بس میں دے دیا ہے۔“

تو اب وہ روئے زمین کی کس ہستی کے سامنے سر جھکائے۔

مشرک، بت پرست، ستارہ پرست، فطرت پرست، حقیقت میں غیروں کے آگے جھک کر یہ ثبوت دیتے ہیں کہ یہ ان کے لیے نہیں بلکہ وہ ان کے لیے بنے ہیں۔ جو چاند اور سورج کو پوجتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چاند اور سورج ان کے لیے نہیں بلکہ وہ چاند اور سورج کے لیے بنے ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی وحی اور تعلیم کے ذریعہ سے یہ بتایا کہ کائنات کی ہر چیز انسان کے لیے بنی ہے اور انسان خدا کے لیے، اس لیے کائنات کا ہر ذرہ انسان کی خدمت گزاری میں مصروف ہے تو انسان کو بھی خدا ہی کی خدمت گزاری میں لگنا چاہیے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکارند

تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نہ خوری

انسانوں نے آسمانی مخلوقات کو اپنا معبود بنایا تو وحی محمدی ﷺ نے انسانوں سے کہا:

﴿ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ ﴾

(۱۶/ النحل:۱۲)

”اور خدا نے رات دن اور چاند اور سورج کو تمہارے لیے کام میں لگایا اور ستارے اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔“

انسانوں نے جانوروں کو پوجا تو پیغامِ محمدی ﷺ نے ان انجانوں کو بتایا کہ یہ تمہارے ہیں، تم ان کے نہیں ہو:

﴿ وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ ﴾ (۱۶/ النحل:۵)

”اور جانوروں کو اس نے پیدا کیا تمہارے لیے اس میں اون کی گرمی اور دوسرے فائدے ہیں۔“

انسانوں نے دریا اور سمندر کو دیوی اور دیوتا بنایا، حالانکہ وہ بھی انہی کی خاطر عدم سے وجود میں آئے ہیں:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ (۱۶/ النحل:۱۴)

”اور وہی خدا ہے جس نے دریا کو کام میں لگایا، تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور، تاکہ تم اس میں سے آرائش کے موتی پہننے کو نکالو اور دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر کو پھاڑتے پھرتے ہیں، تاکہ تم خدا کے فضل و کرم (روزی) کی تلاش کرو۔“

آگ بھی انسانوں کی مسجود بنی حالانکہ وہ خود انہی کی محبت میں جل رہی ہے:

﴿ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۝ ﴾

(۳۶/ یٰس:۸۰)

''جس نے تمہارے واسطے ہرے درخت سے آگ پیدا کی، پس اس وقت تم اس سے اور آگ روشن کرتے ہو۔''

الغرض زمین سے لے کر آسمان تک جو بھی مخلوق ہے انسان اس سے اشرف اور بلند تر ہے اور سب اسی کے لیے ہے پھر اس انسان سے بڑھ کر اور کون نادان ہے جو مخلوقات میں سے کسی کو اپنا معبود اور مسجود بنائے، اس حقیقت کے آشکارا ہونے کے بعد شرک کا کوئی پہلو بھی ایسا ہے جس میں کوئی سچا مسلمان گرفتار ہو سکے اور ایک آستانہ کو چھوڑ کر وہ کسی اور چوکھٹ پر اپنا سر جھکا سکے؟

الغرض محمد رسول اللہ ﷺ نے جس توحید کی تلقین کی۔ وہ انہیں دو اصولوں پر قائم ہے ایک یہ کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے۔ اس لیے کسی مخلوق کے سامنے اس کا سر نہ جھکنا چاہیے اور دوسرا یہ کہ ہر قسم کی قوت، ہر قسم کی قدرت اور تمام اوصاف کمالیہ صرف ایک بزرگ و برتر ہستی کے لیے ہیں جو ماورائے عرش سے زیر فرش تک ہر ذرہ پر حکمران ہے اس کی اطاعت کے دائرہ سے کوئی نقطہ باہر نہیں۔ انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اٹھ کر صرف اسی کے آستانہ پر جھکنا چاہیے۔ ہماری تمام عقیدت، ہماری تمام محبت، ہمارا تمام خوف، ہماری تمام امیدیں، ہماری تمام دعائیں، ہماری تمام التجائیں اور ہماری تمام عاجزیاں صرف اسی ایک درگاہ پر نثار ہوں اور اسی کے رحم و کرم کے سہارے ہماری زندگی کا ہر لمحہ بسر ہو۔ وہ بزرگ و برتر ہستی کیا ہے؟ اور اس کی نسبت ہمارا کیا تخیل ہو؟ تعلیم محمدی نے اس کا بھی جواب دیا ہے۔

خدا کا جامع اور مانع تخیل

قرآن پاک کی آیات، جاہلیت کے اشعار، اسلام سے پہلے عربوں کے واقعات بلکہ عرب کے آثار قدیمہ کے کتبات سے یہ واضح طور پر ثابت ہے کہ عربوں کے ذہن میں ایک بالاتر ہستی کا تخیل ضرور موجود تھا۔ جس کا نام ان کے ہاں اللہ تھا مگر وہ کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟ اس کے صفات کیا ہیں؟ اس کی طرف کیا کیا باتیں منسوب کی جاسکتی ہیں؟ کن کن باتوں سے پاک ہے؟ اس کا تعلق اپنے بندوں کے ساتھ کیسا ہے؟ ہم کو اس کے آگے کیسے جھکنا چاہیے اور اس سے کیا کیا مانگنا چاہیے اور کیونکر مانگنا چاہیے، اس کے حضور میں دعائیں کیونکر کی جائیں؟ ہم اس سے کیوں ڈریں اور کیونکر ڈریں؟ اور اس سے ڈرنے کی کیا حقیقت ہے؟ اور اس سے محبت بھی کی جاسکتی ہے یا نہیں اور اگر کی جاسکتی ہے تو کیونکر؟ اس سے محبت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی قدرت کہاں تک ہے؟ اس کے علم کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ ہم سے دور ہے یا بالکل قریب؟ اس کے تقدس، بڑائی اور عظمت کی کوئی حد ہے؟ اس پر ہم توکل اور بھروسہ کیونکر کریں؟ کیا وہ انسانوں کی کسی صنف سے کلام بھی کرتا ہے؟ کیا اس کے کچھ احکام بھی ہیں؟ کیا اس کے احکام واجب الاطاعۃ بھی ہیں؟ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے اور کن سے ناخوش؟ کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازوں سے بھی آگاہ ہے؟ کیا اس کی اجازت کے بغیر زمین کا ایک

ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت کرسکتا ہے، اس کی مشیت اور اس کا ارادہ کیونکر آسمان سے زمین تک ہر چیز کو محیط ہے، کیا اس کے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون بھی ہیں، کیا وہ انسانوں کی تعلیم اور اصلاح کے لیے پیغمبروں کو بھی معبوث کرتا ہے کیا ہم اس کے نزدیک اپنے اعمال کے جواب دہ بھی ہیں؟ ہم سے وہ کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا مؤاخذہ کرے گا؟ یہ وہ باتیں ہیں، جن سے عرب جاہلیت کا دل و دماغ بالکل عاری اور خالی تھا اور ان چیزوں کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی تخیل نہ تھا۔ جاہلیت کا ایک ایک شعر پڑھ جاؤ، ان کے مذاہب و اعتقادات کا ایک ایک حرف تلاش کرلو، اس سے زیادہ کچھ نہ پاؤ گے کہ وہ ایک طاقتور اعلیٰ ہستی ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور مصیبتوں اور بلاؤں میں اس کو پکارنا چاہیے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی ربانی تعلیمات سے ان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا، اسکی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا اسکی مشیت و ارادہ اور قدرت و وسعت سے آگاہ کیا، ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی ان کو تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہا، جس کی وسعت غیر محدود، جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرہ میں نافذ، جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل، دلوں کے اسرار، زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو، اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جواب دہ اور ذمہ دار، اس کے مؤاخذہ کا خوف اور اسکی رحمت کی امید ہے، وہ محبوب ازل ہے اور اس کی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہشیاری ہے، اس کے فضل و کرم اور محبت کی نیرنگیاں اوپر سے نیچے تک پھیلی ہیں، اس کی قوت ہر قوت پر غالب، اس کا ارادہ ہر ارادہ پر نافذ، اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر، اسکی عبادت ہر مخلوق پر فرض اور اس کی اطاعت ہر مکلّف پر واجب ہے، وہ ہر عیب سے پاک و منزہ اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیہ اور اصلاح کے لیے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا، اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے۔ وہ اندھیرے کی روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسوں کی امید، زخمیوں کا مرہم، بے قراروں کا قرار اور بے کسوں کا سہارا ہے، وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے بھی قریب تر ہے، ہم اس کو جب پکاریں وہ سنتا ہے، وہ نیکیوں کو پسند اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے، وہ جب چاہے آسمان و زمین کو فنا کردے اور جب چاہے ان کو پھر رچا دے، اس کی محبت دنیا کا حاصل ہے، اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے:

﴿ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (۱۳/ الرعد:۲۸)

''ہاں خدا کی یاد سے دلوں کو اطمینان کی دولت ملتی ہے۔''

ان تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ وہ لوگ جن کو بھولے سے بھی خدا کا نام یاد نہ آتا تھا وہ اس کے سوا سب کچھ بھول گئے اور اس کی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہوگئے، وہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر

حال میں اس کی یاد میں سرمست وسرشار ہو گئے:

﴿ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۹۱)

''وہ خدا کو اٹھتے ، بیٹھتے اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔''

اس سرمستی وسرشاری میں بھی انہوں نے جنگلوں میں راہبانہ زندگی بسر نہیں کی ، دولتمندوں کی بھیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا، دنیا کی کشمکشوں سے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دے کر اختیار نہیں کیا، بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جدوجہد اور سعی وکوشش کو اپنا مذہب سمجھا اور خدا کا حکم جان کر اس کو پوری مستعدی کے ساتھ بجا لائے ،اوران تمام ہنگاموں کے ساتھ دل کا معاملہ دلدارازل کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا،خدانے ان کی مدح کی کہ

﴿ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ (۲٤/ النور:۳۷)

''وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید وفروخت ،خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔''

ان کی محبتِ الٰہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آ گیا۔خدا نے ان کی توصیف کی کہ

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱٦۵)

''ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔''

ان کا توکل، ان کا صبر، ان کا استقلال، ان کی استقامت، ان کی بہادری، ان کی بے خوفی وصداقت، ان کی راستبازی، ان کی اطاعت،غرض ان کی ہر چیز ان کے اسی جذبہ ایمان کا پرتو تھی اور ہر وقت ان کے پیش نظر یہ تعلیم رہتی تھی کہ

﴿ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ ﴾ (٦۵/ الطلاق:۳)

''جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے،تو خدا اس کو بس کرتا ہے۔''

﴿ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ۭ ﴾ (۳۹/ الزمر:۳٦)

''کیا خدا اپنے بندہ کو کافی نہیں۔''

﴿ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰـىهُ ۭ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۳۷)

''اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے، حالانکہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرنا چاہیے۔''

ان میں یہ تمام روحانی واخلاقی جوہر اسی ایمان باللہ کے بدولت پیدا ہوئے۔

اسماء وصفات

دنیا کے آغاز میں خدا نے کہا تھا کہ ہم نے آدم کو سب نام سکھائے ، دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی اور علم کی وسعت کہاں سے کہاں پہنچ گئی ،مگر غور کیجئے تو ناموں کے ہیر پھیر سے ہم اب تک آگے نہیں بڑھے یہی ہماری حقیقت رسی ہے اور یہی ہمارا فلسفہ ہے،ہم اپنے مفروضہ اصولِ منطقی کی بنا پر ذاتیات اور حقائق کے ذریعہ سے

اشیاء کی تعریف کے مدعی بن گئے لیکن ہزاروں صدیاں گزرنے پر بھی ذاتی اور حقیقی تعریف (حدِ منطقی) کی ایک بھی مثال پیش نہ کر سکے، جو کچھ کر سکے وہ یہ کہ صفات، عوارض اور خواص کے مختلف رنگوں سے نئی نئی طفلانہ شکلیں بناتے اور بگاڑتے ہیں، جب مادیت کا یہ علم ہے تو وراء الوراہستی میں ہماری بشری طاقت اس سے زیادہ کا تحمل کیونکر کر سکتی، تجلی گاہِ طور اسی رمز کی آتشیں تصویر ہے۔

ہم خدا کو بھی اس کے ناموں، اس کے کاموں اور اس کی صفتوں ہی سے جان سکتے ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ نے عرب کے جاہلوں کو اسی نصاب انسانی کے مطابق تعلیم دی عرب کا جاہل اللہ نام کی ایک اعلیٰ ہستی سے واقف تھا لیکن اس کے ناموں اور کاموں کے تخیل سے بڑی حد تک ناآشنا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے بھی وہ قطعی بیگانہ تھا۔ دیوان عرب یعنی ان کی شاعری کے دفتر میں کہیں کہیں اللہ کا نام آتا ہے مگر کہیں اس کی صفت کا ذکر نہیں آتا۔ قرآن پاک میں ان کے خیالات کا پورا عکس اتارا گیا ہے لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے بھی آگاہ تھے۔ بعض عیسائی عربوں میں اللہ کے ساتھ ساتھ ''الرحمٰن'' کا لفظ بھی استعمال ہوتا تھا۔ جس کے معنی رحم کرنے والے کے ہیں۔ اصحاب الفیل کے رئیس عیسائی ابرہہ کے نام سے سدِ عرم (یمن) پر جو کتبہ لگا ہے اور جس کو جرمن فاضل گلازر نے شائع کیا ہے، اس میں بھی دو جگہ ''رحمٰن'' کا لفظ آیا ہے۔ عرب عیسائی شعراء کے کلام میں بھی یہ لفظ ملتا ہے۔ عیسائیوں میں اس کے استعمال کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب مشرکین کو اس لفظ سے چڑ ہوگئی تھی، اسی لیے جب اسلام نے اس لفظ کو اختیار کیا تو مشرکین نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضرت ﷺ نے معاہدہ کے کاغذ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھوائی تو قریش کے نمائندہ نے کہا کہ ''قسم ہے اللہ کی مجھے نہیں معلوم کہ رحمٰن کیا ہے؟'' [1]

محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے اور قرآن مجید میں بار بار خدا کے لیے رحمٰن کے لفظ کے استعمال سے مشرکوں کو برہمی ہوتی تھی اور کہتے تھے کہ ہم کبھی رحمٰن کے آگے سرنگوں نہیں ہو سکتے، قرآن نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے:

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۚ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ۩ ﴾

(۲۵/ الفرقان: ٦٠)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہے، کیا تم جس کو کہو اس کو ہم سجدہ کریں، رحمٰن کا نام ان کی نفرت اور بڑھا دیتا ہے۔''

مشرکین کو یہ برا لگتا تھا کہ محمد ﷺ ایک طرف تو ان کے بتوں اور دیوتاؤں کی مذمت کرتے ہیں اور دوسری طرف عیسائیوں کے رحمٰن کی مدح وستائش کرتے ہیں:

[1] صحیح بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد و المصالحة مع اهل الحرب وکتابة الشروط ۲۷۳۱، ۲۷۳۲۔

﴿ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۳۶)

''(مشرک آپ کو مذاق سے کہتے ہیں کہ) یہی وہ ہے جو تمہارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے اور وہی مشرک رحمان کے ذکر سے انکار کرتے ہیں۔''

تعلیم محمدی نے عرب کے ناآشنایانِ حقیقت کو بالآخر آگاہ کیا کہ خدا کے اسماء وصفات کی کوئی حد نہیں اس کو سب ہی اچھے ناموں سے پکارا جا سکتا ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآءیل:۱۱۰)

''کہہ دو (اے پیغمبر کہ) خدا کو اللہ کہہ کر پکارو، یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا مسئلہ اسلام کی ان اہم مذہبی اصلاحات میں سے ہے جن سے نہ صرف عرب کے جاہل ناآشنا تھے، بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے پیرو بھی ان کے متعلق غلطیوں میں مبتلا تھے۔ یہودیوں کے اسفار اور صحیفوں میں خدائے برحق کا اصلی نام ''یہوا'' تھا مگر کبھی عام یہودیوں کو اس مقدس نام کے زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی دوسرا عام نام ''امیم'' ہے جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے، ان کے علاوہ اس کے بیسیوں نام اور اسماء جو درحقیقت اس کے اوصاف ذاتی اور اعمال ربانی کے ترجمان ہیں۔ تورات کا دفتر ان سے خالی ہے۔ صفات الٰہی میں سے جو صفت یہودی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ فوجوں والے خداوند یعنی رب الافواج کا لفظ ہے جو اس کی صفاتِ جلالی کا مظہر ہے۔

عیسائیوں کی انجیل اور مذہبی کتابوں میں ''باپ'' کا لفظ خدا کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کی حقیقت اور خدا پر اس لفظ کے اطلاق سے مقصود کیا ہے اور گوشت پوست اور مادیت سے بھرے ہوئے لفظ کا خدا پر مجازی استعمال بھی کہاں تک جائز ہے؟ اس سے اس مذہب میں کہاں تک غلطیاں پھیلیں۔ ان باتوں کو چھوڑ کر بھی دیکھئے تو یہ خدا کی صرف جمالی صفات کی ناقص اور مادی تعبیر ہے۔ عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث کے اختراعی عقیدہ کو اسی مسئلہ صفات کے پردہ میں چھپا لیا اور یہ تاویل کی گئی کہ تثلیث کے اقانیم ثلثہ باپ (خدا) بیٹا (حضرت عیسیٰ) اور روح القدس، حیات، خلق اور علم تین صفتوں سے عبارت ہیں۔ باپ، حیات، بیٹا خلق اور روح القدس علم ہے اور یہ تینوں ایک ہیں اور یہ تینوں وجود میں الگ الگ ہیں، اس تشریح سے صفاتِ الٰہی کے تجسم کے مسئلہ نے جنم لیا اور ایک خدائی خداؤں کا مجموعہ بن گیا۔

ہندوؤں میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی نیرنگی نظر آتی ہے، لیکن ہر صفت نے ان کے ہاں ایک مستقل وجود حاصل کر لیا ہے اور خود خدا ہر قسم کی صفات سے خالی اور مجرد رہ گیا ہے۔ اسی لیے ہندوستان کے

تمام مذاہب اسی تجسم صفات کے جلوہ گاہ ہو کر رہ گئے ہیں، برہما، مہیش، وشنو، تین صفات خالق، ممیت (مارنے والا) اور قیوم کے مجسمے ہیں، غلط تعبیر نے وحدت کی جگہ یہاں بھی تثلیث پیدا کر دی، شنکر آچاریہ نے خدا کے صرف تین اصلی صفات تسلیم کیے، حیات، علم اور سرور یا آنند، جین مذہب اور بعض ہندو فرقوں میں ایک خالقیت کی صفت کے تجسم نے اعضائے تناسل کی پرستش کی گمراہی پیدا کی، عام ہندوؤں میں ۳۳ کروڑ عجیب الخلقت دیوتاؤں کی عظیم الشان بھیڑ بھی صفات واسمائے الٰہی کی تجسیم اور مستقل وجود کے غلط فلسفہ نے پیدا کی اور اسی نے بت پرستیوں کی نت نئی صورتیں نمایاں کیں، مجوسیوں میں یزدان اور اہرمن کی ثنویت اور دوئی بھی، خدا کی دو صفتوں، ہادی اور مضل کو دو مستقل ہستیوں میں منقسم کر دینے کا نتیجہ ہے، اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اس مسئلہ کی غلط تعبیر نے دنیا میں کتنی گمراہیاں پیدا کی ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کے ان تمام فاسد تخیلات کو باطل ٹھہرایا، ان کے غلط عقیدوں کی تصحیح کی، اور ربانی ہدایت کے نور سے سراج منیر بن کر جس طرح اس حقیقت کو روشن کیا وہ نبوت محمدی کے عظیم الشان کارناموں میں ہے۔ آپ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں اور اس کی باتوں کی کوئی انتہا نہیں، آپ ﷺ نے یہ دعا سکھائی: ''اے خداوند! تیرے ہر اس نام کے وسیلہ سے، جو تو نے اپنا رکھا، یا اپنی کتاب میں اتارا، یا کسی مخلوق کو سکھایا، یا اپنے لیے اپنے علم غیب میں اس کو چھپا رکھا، میں تجھ سے مانگتا ہوں۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ الہامی دعا تعلیم ہوئی: ''خداوندا! میں تیرے سب اچھے ناموں کے وسیلہ سے جن میں سے کچھ کو ہم نے جانا اور جن کو نہیں جانا تجھ سے درخواست کرتا ہوں۔'' [1] قرآن پاک کے ذریعہ بتایا گیا:

﴿ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴾ (۱۸/ الکھف:۱۰۹)

''کہہ دے (اے پیغمبر!) کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لیے سیاہی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے لیکن میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہوں گی اگرچہ ہم ایسا ایک اور سمندر بھی کیوں نہ لے آئیں۔''

دوسری جگہ کہا گیا:

﴿ وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ﴾ (۳۱/ لقمان:۲۷)

''اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں وہ قلم ہو جائیں اور سمندر اور اس کے بعد سات سمندروں کا پانی سیاہی ہو جائے تو بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔''

[1] یہ تینوں دعائیں امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات، باب البیان ان للہ جل ثناء ہ اسماء اخر، ص:۴۔۵ میں نقل کی ہیں اور پہلی روایت مسند احمد، ج۱، ص: ۳۹۱ میں بھی (بسند عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) ہے۔

الغرض تمام اچھے اور کمالی نام اسی کے لیے ہیں اور اسی کو زیبا ہیں:

﴿ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۸)

''نہیں ہے کوئی معبود، لیکن وہی اللہ، اسی کے لیے ہیں سب اچھے نام۔''

بڑائی کا ہر نام اور خوبی کا ہر وصف اسی ذات بے ہمتا کے لیے ہے خواہ اس کو خدا کہو یا اللہ کہو لغت اور زبان کا کوئی فرق اس میں خلل انداز نہیں:

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآءیل: ۱۱۰)

''کہہ دے (اے پیغمبر!) اس کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جو چاہے کہہ کر پکارو کہ سب اچھے نام اسی کے ہیں۔''

لیکن مشرکوں کی طرح اس کو ایسے ناموں سے نہ پکارو، جو اس کے کمال اور بڑائی کے منافی ہیں اور بتوں اور دیوتاؤں کے ناموں سے بھی اسکو یاد نہ کرو:

﴿ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْۤ اَسْمَآىِٕهٖ ؕ ﴾

(۷/ الاعراف: ۱۸۰)

''اور اللہ ہی کے لیے ہیں سب اچھے نام، اس کو ان ناموں سے پکارو اور ان لوگوں سے علیحدہ رہو، جو اس کے ناموں میں کجی کرتے ہیں۔''

تعلیم محمدی کا صحیفہ وحی اللہ تعالیٰ کے تمام اوصاف حمیدہ اور اسمائے حسنیٰ سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس کا صفحہ صفحہ اس کے اسماء وصفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے۔ قرآن پاک کا کم کوئی ایسا رکوع ہوگا جس کا خاتمہ خدا کی توصیف اور حمد پر نہ ہو اور یہ تمام اوصاف اور نام اس عشق ومحبت کو نمایاں کرتے ہیں جو اس محبوبِ ازل اور نورِ عالم کے ساتھ قرآن کے ہر پیرو کے دل میں ہونا چاہیے:

﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ﴾ (۲۴/ النور: ۳۵)

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال یہ ہے کہ ایک طاق ہو جس میں چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو، شیشہ اتنا صاف ہو کہ گویا ایک چمکتا ستارہ ہے، وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے جلایا گیا ہو، نہ وہ پورب ہے نہ وہ پچھم ہے، اس کا تیل

اتنا صاف ہے کہ آگ کے چھوئے بغیر وہ آپ سے آپ جلنے کو ہو، روشنی پر روشنی، خدا اپنی روشنی تک جس کو چاہے پہنچا دے اور خدا لوگوں کے سمجھانے کے لیے یہ مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔''

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ۬ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ۝﴾ (۲/ البقرۃ:۲۵۵)

''اللہ، نہیں ہے اس کے سوا کوئی اور معبود، وہ ہمیشہ زندہ تمام دنیا کو سنبھالے ہے، اس کو اونگھ اور نیند نہیں آتی آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے کون ہے جو اس کی مرضی کے بغیر اس کے سامنے سفارش کرنے کو کھڑا ہو، انسانوں کے سامنے اور پیچھے جو کچھ ہے اس کو جانتا ہے اور وہ لوگ اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے لیکن جتنے کا وہ چاہے، اس کا تخت آسمانوں اور زمین کو سمائے ہوئے ہے، اس آسمان اور زمین کی نگہبانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اونچا اور بڑا ہے۔''

﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۝﴾ (۵۹/ الحشر:۲۲۔۲۴)

''وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں، چھپے اور کھلے کا علم رکھنے والا، وہی رحم کرنے والا اور مہربانی والا ہے، وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں، سب کا بادشاہ، پاک، پوری سلامتی امن والا، ہر شے پر گواہ، غالب، سب پر قابو والا، بڑائی والا، ہر اس چیز سے پاک ہے جس کو یہ مشرک خدا کا شریک بناتے ہیں، وہی اللہ پیدا کرنے والا، بنانے والا، ہر چیز کی صورت کھینچنے والا، اسی کے لیے سب اچھے نام ہیں، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں وہی سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔''

﴿ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۝ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۝ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۝ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَهُوَ

مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۞ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۞ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ ۚ وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۞ ﴾

(٥٧/ الحديد:١ـ٦)

''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں، وہی غالب اور دانا ہے، آسمانوں کی اور زمین کی حکومت اسی کی ہے، وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے، وہی پہلا اور وہی پچھلا ہے، وہی کھلا ہے اور وہی چھپا ہے اور ہر بات کو جانتا ہے، وہی ہے جس نے آسمان کو اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر تخت پر برابر ہوا، وہ جانتا ہے جو زمین میں گھستا ہے، اور جو زمین میں سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو آسمان میں چڑھتا ہے اور جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور اللہ تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے اسی کی آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ ہی تمام چیزوں کا مرجع ہے وہ رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، وہ سینوں کے سب بھیدوں سے واقف ہے۔''

خدا کے متعلق اہل عرب کا جو پست تخیل تھا اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس کو مٹا کر ان کے سامنے جو بلند تخیل پیش کیا اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے ہوسکتا ہے۔ آپ نے جب توحید کا آوازہ بلند کیا تو مشرکین جو اپنے دیوتاؤں کے آل واولاد اور بیویوں اور گوپیوں کی حمد کے ترانے گاتے تھے، آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمائش کی کہ ذرا اپنے خدا کا نسب تو ہمارے سامنے بیان کرو یعنی گویا وہ اپنے دیوتاؤں سے اسلام کے خدا کا مقابلہ کر کے بتانا چاہتے تھے کہ اس حیثیت سے اسلام کا خدا ہمارے دیوتاؤں کی ہمسری نہیں کرسکتا، اس کے جواب میں وحی محمدی نے اپنے خدا کی حقیقت قرآن پاک کی اس سب سے مختصر سورہ میں پیش کی: [1]

﴿ قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۞ اللَّهُ الصَّمَدُ ۞ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۞ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۞ ﴾

(١١٢/ الاخلاص ١ـ٤)

''کہہ دے (اے پیغمبر) وہ اللہ ایک ہے، وہ تنہا اور بزرگ اور بے نیاز اور عالم کا مرجع اور جاپناہ ہے، نہ اس کے کوئی اولاد ہے اور نہ اسکے کوئی ماں باپ ہیں، (جنہوں نے اس کو جنا ہو) اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے (جو اس کی بیوی ہو)۔''

یہ روایت حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت ابی رضی اللہ عنہ صحابہ میں سب سے زیادہ قرآن کے ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ اس کے بعد اس سورہ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ ''صمد'' وہ ہے جو نہ جنتا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا ہو کیونکہ جو جنا جاتا ہے وہ مرتا بھی ہے اور جو مرتا ہے وہ اپنے وارث و جانشین بھی ضرور چھوڑتا

[1] مستدرك حاكم، تفسير سورة اخلاص (صحيح) ج ٢، ص:٥٤٠ وجامع ترمذى، ابواب التفسير: ٣٣٦٤ وكتاب الاسماء بيهقى ابواب ذكر الاسماء التى تتبع نفى التشبيه، ص:٢٣ (اله آباد)

ہے اور خدا نہ مرتا ہے نہ اسکا کوئی جانشین ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے یعنی کوئی اس کے برابر نہیں اور نہ کوئی اس کے مثل ہے۔'' غور کرو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے پہلے اہلِ عرب میں خدا کا کتنا پست و ذلیل تخیل تھا جس کا اندازہ تم ان کے سوال سے کر سکتے ہو اور آپ کی تعلیم کے بعد وہ تخیل کتنا پاک، اعلیٰ اور بلند ہو گیا، جس کا اندازہ حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی تفسیر سے ہو سکتا ہے جو اسی عرب نژاد قبیلہ کے ایک فرد ہیں لیکن ان کا دل اب محمد رسول اللہ ﷺ کے فیض سے منور ہو چکا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آپ سے سن کر کہتے ہیں کہ ''خدا فرماتا ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھ کو جھٹلایا اور آدم کے بیٹے نے مجھ کو گالی دی اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا دوبارہ پیدا نہیں کرے گا، حالانکہ پہلی بار کے پیدا کرنے سے دوسری بار کا پیدا کرنا زیادہ آسان ہے اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا کی اولاد ہے حالانکہ میں ایک اور صمد ہوں جس نے نہ کسی کو جنا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا ہے اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔'' [1] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یمنی عرب ہیں یعنی اس عرب کے ایک فرد جو تعلیم محمدی سے پہلے ان حقائق سے بے بہرہ تھا اور اب وہ اس تنزیہ و تقدیس کے موتی اپنے منہ سے اگل رہے ہیں۔

اس مختصر سورہ میں سب سے چھوٹا لفظ ''صمد'' کا ہے لیکن در حقیقت قرآن کی بلاغت نے اس ایک لفظ میں صفات الٰہی کا بے پایاں دفتر چھپا رکھا ہے۔ ''صمد'' کے معنی لغت میں اونچی پتھریلی زمین یا چٹان کے ہیں جو کسی ایسی وادی میں ہو جہاں سیلاب آتا ہو تو اس پر نہ چڑھتا ہو اور لوگ اس وقت دوڑ دوڑ کر اسی پر چڑھ کر اپنے کو بچائیں، پھر صمد کے اس لغوی معنی سے اس سردار کے معنی پیدا ہوئے جو بزرگی اور شرافت میں انتہائی معراجِ کمال پر ہو اور اس سردار کو بھی کہنے لگے جس کی موجودگی کے بغیر مجلس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا ہو اور اس سردار کو کہتے ہیں جس کے اوپر کوئی سردار نہ ہو اور اس جائے پناہ کے معنی میں بھی مستعمل ہوا جو سب کو مصیبت کے وقت اپنے دامن میں پناہ دے سکے اور اس مرجع و مرکز کے معنی میں بھی آیا ہے جس کی طرف ہر شخص دوڑ دوڑ کر جاتا ہے، صمد ٹھوس کو بھی کہتے ہیں جس کے اندر خول نہ ہو، اس لیے اس کو بھی کہتے ہیں جو کھاتا پیتا نہ ہو اور جس کے آل اولاد نہ ہو، اس کو بھی کہتے ہیں جس سے کوئی بے نیاز نہ ہو، اس بہادر کو بھی کہتے ہیں جس کو لڑائی میں بھوک اور پیاس نہ لگتی ہو ''صَمَدَةٌ'' اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے حمل نہ رہا ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ صمد وہ سردار ہے جو اپنی بزرگی اور سرداری میں کمال درجہ پر ہو وہ شریف جس کی شرافت کمال ہو، وہ بڑا جس کی بڑائی میں کوئی نقص نہ ہو، وہ بردبار جس کی بردباری بدرجہ اتم ہو، وہ بے پروا و بے نیاز جس کی بے پروائی و بے نیازی کی کوئی حد نہ ہو، وہ زبردست جس کے جبروت کی انتہا نہ ہو، وہ علم والا جس کا علم بدرجۂ اتم ہو، وہ حکیم جس کی دانائی کامل کے درجہ تک ہو یعنی وہ جو بڑائی اور بزرگی کی ہر صنف میں کامل ہو۔'' [2]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورة اخلاص: ٤٩٧٥۔

[2] کتاب الاسماء والصفات، امام بیهقی ص: ٤٣۔

ان معنوں کے علاوہ صحابہ اور تابعین نے اس کی تفسیر میں حسب ذیل معانی بھی لکھے ہیں:

ابن عباس رضی اللہ عنہما: وہ جس کی طرف مصیبت کے وقت لوگ رجوع کریں۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ: وہ حی و قیوم جس کو زوال نہ ہو اور جو باقی ہو۔

ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ: جس کے نہ اولاد ہو، نہ ماں باپ۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ: جس کے اندر معدہ وغیرہ جسمانی اعضا نہ ہوں۔

بریدہ رضی اللہ عنہ: جس میں خوف نہ ہو۔

عکرمہ و شعبی: جو کھاتا نہ ہو۔

عکرمہ رضی اللہ عنہ: جس میں سے کوئی دوسری چیز نہ نکلے۔

قتادہ رضی اللہ عنہ: باقی، غیر فانی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معنی [1] اس ایک لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں اور یہ سب صرف ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں، تاہم اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس کے اصلی معنی چٹان کے ہیں جو لڑائی اور مصیبتوں کے وقت جائے پناہ کا کام دے۔ اسرائیلی الٰہیات میں بھی یہ لفظ یہی اہمیت رکھتا ہے اور بنی اسرائیل کے صحیفوں میں جائے پناہ کے لیے چٹان کا لفظ آیا ہے استثناء (۳۲۔۳۱۔۳۰) میں ہے۔

''اگر ان کی چٹان ان کو بیچ نہ ڈالتی اور خداوند ان کو اسیر نہ کرواتا کیونکہ ان کی چٹان ایسی نہیں جیسی ہماری چٹان۔''

''یہ چٹان'' اس موقع پر حقیقت میں خدا کی مدد و نصرت سے کنایہ ہے۔ سموال کے پہلے صحیفہ میں یہ کنایہ تصریح سے بدل جاتا ہے ''خداوند کے مانند کوئی قدوس نہیں تیرے سوا کوئی نہیں، کوئی چٹان ہمارے خدا کے مانند نہیں۔'' (۲۔۲)

اس سورہ میں خدا کی صفت میں دو (۲) لفظ ہیں احد (ایک) اور صمد (جائے پناہ) یہ دونوں خدا کے دو متضاد کمالی اوصاف کو حاوی ہیں، اس کی یکتائی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں، نہ اس کو کسی کی حاجت، نہ اس کو کسی سے غرض۔ وہ یکتا و تنہا، اکیلا بے ہمتا، بے نیاز، بے پروا، سب سے مستغنی اور سب سے الگ ہے لیکن اسی کمال یکتائی کے ساتھ وہ سب کے ساتھ، سب کا دستگیر، سب کی جائے پناہ، سب کا محتاج الیہ، سب کا مرکز، سب کا مرجع، سب کا ماویٰ، سب کا ملجا یعنی سب کی چٹان، مصیبتوں میں سہارا، بلاؤں میں تسلی اور اضطرابوں میں تشفی ہے۔

﴿فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ﴾ (۵۱/ الذاریات: ۵۰)

''ہر جگہ سے بھاگ کر اللہ کے ہاں پناہ لو۔''

[1] ان معانی کے لیے دیکھو کتاب الاسماء بیہقی، ص: ۴۳؛ مفردات القرآن راغب اصفہانی، ص: ۲۸۸ ابن جریر طبری، جز ۳۰، ص: ۱۹۶، ۱۹۷؛ ابن کثیر، ج ۴، ص: ۵۷۰ اور تفسیر سورۃ اخلاص لابن تیمیۃ، ص: ۳۔

یہ سورۂ پاک توحیدِ اسلامی کے ہر شعبہ کو حاوی ہے اور اسی لیے اس کو ثلث القرآن (تہائی قرآن) کا درجہ دیا گیا ہے، ایک صحابی تھے جو نماز کی ہر دو رکعت میں قراءت کے آخر میں اس سورہ کو پڑھا کرتے تھے لوگوں نے یہ واقعہ آنحضرت ﷺ سے بیان کیا، آپ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کرائی، انہوں نے کہا، اس میں میرے رب کی صفتیں بیان کی گئی ہیں جو مجھ کو بہت محبوب ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''بشارت ہو کہ خدا بھی تم سے محبت کرتا ہے۔'' [1] ایک اور انصاری تھے جو قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے ان کا یہ حال تھا کہ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد اس سورہ کو پڑھ لیتے تھے، تب کوئی دوسری سورہ پڑھتے تھے ان کے مقتدی صحابہ نے اس پر اعتراض کیا تو انہوں نے کہا، مجھے امامت چھوڑنی منظور ہے مگر اپنی روش چھوڑنی منظور نہیں۔ لوگوں نے اس واقعہ کا تذکرہ آنحضرت ﷺ سے کیا۔ آپ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو گزارش کی کہ یارسول اللہ ﷺ! مجھے یہ سورہ بہت محبوب ہے۔ ارشاد ہوا: ''یہ محبت تم کو جنت میں لے جائے گی۔'' [2] قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ صحابی تھے، جو رات بھر اسی ایک سورہ کو دہراتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ لوگوں نے آپ ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا: ''یہ سورہ قرآن کا تہائی حصہ ہے۔'' [3] اس گمراہی اور تاریکی کا اندازہ جو آنحضرت ﷺ سے پہلے عرب پر چھائی ہوئی تھی۔ اس روحانی لطف اور نورانی فیض سے کرو جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس کے حصہ میں آیا۔

قرآن مجید اور حدیث میں اللہ تعالیٰ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آتے ہیں۔ صحیح حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو ان کو محفوظ رکھے یا نگاہ میں رکھے۔ وہ جنت میں داخل ہوگا۔ خدا طاق ہے وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہے۔'' [4] آخری فقرہ اس علت کو ظاہر کرتا ہے کہ ۹۹ نام کیوں رکھے گئے۔ پورے سو کیوں نہ مقرر کیے۔ یہ اس لیے کہ اگر پورے سو ہوتے تو عدد طاق نہ رہتا اور اس سے توحید کا رمز آشکارانہ ہوتا۔ صحیح احادیث میں اسی قدر ہے یعنی ان ۹۹ ناموں کی تصریح نہیں ہے۔ مگر ترمذی ابواب الدعوات میں اور بعض کم درجہ حدیثوں میں ان ناموں کو گنایا بھی ہے۔ لیکن محدثین نے عموماً یہاں تک کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے کہ ''یہ روایتیں ضعیف اور کمزور ہیں۔'' پھر ان روایتوں میں بعض ناموں کا ادل بدل اور الٹ پھیر بھی ہے اور بعض ایسے نام بھی ان میں ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں ہیں اور بعض ایسے نام جو قرآن میں ہیں ان میں نہیں ہیں اسی لیے علما کا فیصلہ یہ ہے کہ ان روایتوں میں ان ناموں کا انتخاب

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ما جاء فی دعاء النبی ﷺ امته الی التوحید: ۷۳۷۵۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الجمع بین السورتین فی رکعة: ۷۷٤۔

[3] مسند احمد، ج۳، ص: ۱۵، ۲۳۔

[4] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب مقلب القلوب: ۷۳۹۲ وصحیح مسلم، کتاب الذکر، باب اسماء اللہ تعالیٰ وفضل من احصاها: ٦٨٠٩ ومسند احمد، ج۲، ص: ۲۵۸ وجامع ترمذی: ۳۵۰٦؛ نسائی: ۱٦۷٦۔

راویوں نے خود اپنی تلاش و تفحص سے کیا ہے، اس لیے ان روایتوں سے یہ شبہ نہ ہو کہ اسمائے الٰہی ان ننانوے میں محدود ہے۔ بلکہ بڑے بڑے ائمہ اور محدثین مثلاً: عبدالعزیز بن یحییٰ، ابوبکر بن عربی، امام نووی، حافظ ابن حجر، امام خطابی، ابن تیمیہ اور قرطبی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ اسمائے الٰہی ان ننانوے میں محصور نہیں اور یہ بھی تصریحات ملتی ہیں کہ اسماء اور صفات الٰہی کی کوئی حد و پایاں نہیں ہے [1] اور اس پر محدثین نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایتوں سے جو آغاز مضمون میں اوپر گزر چکی ہیں استدلال کیا ہے۔

بہر حال قرآن پاک اور احادیثِ صحیحہ کے تتبع سے علما نے ننانوے ناموں کا پتہ چلایا ہے اور ان کو الگ الگ ایک ایک کر کے گنایا ہے۔ یہ تمام نام وہ ہیں جو بطورِ علم اور بطور صفت کے قرآن پاک میں آئے ہیں یا وہ افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں یا آنحضرت ﷺ نے دعاؤں میں ان کی تعلیم کی ہے ہم ذیل میں بہ ترتیب ایک ایک نام لکھتے ہیں اور اس کی مختصر لغوی تشریح کرتے ہیں، تاکہ معلوم ہو سکے کہ آنحضرت ﷺ نے خدا کا جو تخیل اور عقیدہ اپنے پیروؤں کو سکھایا وہ کتنا وسیع، کتنا بلند، کتنا منزہ اور پاکیزہ ہے۔ علما نے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبتوں سے ترتیب دیا ہے۔ لیکن ہم نے ان کے صرف تین مرتبے قرار دیے ہیں۔ ایک وہ جن سے اس کے رحم و کرم، عفو و درگزر یعنی صفات جمالی ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جن سے اس کی شاہنشاہی، جلال و جبروت اور حکومت و استیلا کا اظہار ہوتا ہے ہم ان کو صفاتِ جلالی کہتے ہیں۔ تیسرے وہ اسماء اور صفات جن سے اس کی تنزیہہ، بلندی، کمالات کی جامعیت اور ہر قسم کے اوصافِ حسنہ اور محامدِ عالیہ کا ثبوت ہوتا ہے ان کو ہم صفات کمالی سے تعبیر کرتے ہیں۔ الغرض خدا کے تمام اسماء و صفات انہیں تین عنوانوں کی تشریح ہیں یعنی یا تو ان سے خدا کی رحیمی و کریمی ظاہر ہوتی ہے یا اس کے جاہ و جلال کا اظہار ہوتا ہے یا اس کی تنزیہہ و کمال کا اثبات ہوتا ہے۔

صفاتِ جمالی: یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کے رحم و کرم اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے:

اَللّٰہ: یہ خدا کا نام ہے جو قرآنِ پاک میں بطورِ خاص علم کے ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں ''خدائے برحق'' کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس لفظ کی لغوی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی اس ہستی کے ہیں جس کی پرستش کی جائے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ وہ جس کی حقیقت و معرفت میں عقل انسانی حیران و سرگرداں ہو۔ دوسروں کی تحقیق ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت اور محبت رکھے جو ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس اخیر تعبیر کی بنا پر اللہ کے معنی پیار کرنے والے یا پیارے کے ہیں۔

اَلرَّحْمٰنُ: اللہ کے بعد یہ دوسرا لفظ ہے۔ جس کو علم کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے معنی رحم والے کے ہیں۔

---

[1] تمہید ابی شکور سالمی الباب الخامس القول الثالث فی عدد الاسماء، ص:٦١ یہ ماتریدیہ کی مشہور مستند کتاب ہے۔

یہ گزر چکا ہے کہ رحمٰن کا لفظ اسلام سے پہلے صرف عیسائی عربوں میں مستعمل تھا۔ عام اہلِ عرب میں اللہ کا لفظ مستعمل تھا۔ قرآن مجید نے ہر سورہ کے شروع میں نیز اور مقامات میں اللہ کو الرحمٰن کہہ کر سینکڑوں جگہ استعمال کیا ہے۔ بظاہر تو یہ وصف موصوف کی معمولی ترکیب ہے۔ مگر درحقیقت یہ بدل ومبدل منہ ہیں اور اس سے اس رمز کی طرف اشارہ ہے کہ عام عربوں کا اللہ اور عرب عیسائیوں کا رحمٰن دو اجنبی صفتیں اور دو بیگانہ ہستیاں نہیں۔ بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں اور ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں اور اس طرح ان دو مختلف قوموں کو وحدتِ الٰہی کی دعوت دی گئی جو ناموں کے تعدد کو حقیقت کے تعدد کا مرادف سمجھتی تھیں اور کہا گیا:

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۚ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآئیل: ۱۱۰)

''اللہ کہو یا رحمٰن کہو، جو چاہے کہو اسی کے لیے سب اچھے نام ہیں۔''

الرَّحِیْمُ: رحم کرنے والا، رحم کا لفظ اس رحم سے نکلا ہے۔ جس سے بچہ کی پیدائش ہوتی ہے۔ اس لیے اصل لغت کے لحاظ سے اس لفظ میں بھی مربیانہ محبت کا جذبہ نمایاں ہے۔

الرحمٰن اور الرحیم خدا کی وہ دو صفتیں ہیں۔ جن سے قرآن کا صفحہ صفحہ منور ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہوا، جو کچھ ہے، جو کچھ ہوگا وہ اس کی رحمانی اور رحیمی انہیں دو صفتوں کا ظہور ہے۔ اس عالم اور اُس عالم دونوں میں اس کی انہیں دونوں شانوں کا ظہور ہے اور ہوگا۔

الـــرَّبُّ: پرورش کرنے والا، یعنی ہستی کے اول نقطہ سے لے کر آخر منزل تک ہر لمحہ اور ہر لحظہ مخلوقات کی نشو ونما اور ظہور و ترقی کا ذمہ دار۔

اَللَّطِیْفُ: لطف والا مہربان۔

اَلْعَفُوُّ: معاف کرنے والا، درگزر کرنے والا۔

اَلْوَدُوْدُ: محبوب، محبت کرنے والا، پیار کرنے والا۔

اَلسَّلَامُ: امن وسلامتی، صلح وآشتی، ہر عیب سے پاک وصاف۔

اَلْمُحِبُّ: محبت والا، پیار والا، چاہنے والا۔

اَلْمُؤْمِنُ: امان دینے والا، امن بخشنے والا، ہر خوف سے بچانے والا اور ہر مصیبت سے نجات دینے والا۔

اَلشَّکُوْرُ: اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول اور پسند کرنے والا۔

اَلْغَفُوْرُ وَالْغَفَّارُ: معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگزر کرنے والا۔

اَلْحَفِیْظُ وَالْحَافِظُ: حفاظت کرنے والا، نگہبان، نگہبانی کرنے والا، بچانے والا۔

اَلْوَهَّابُ: دینے والا، عطا کرنے والا، بخشنے والا۔

اَلرَّازِقُ وَالرَّزَّاقُ: روزی دینے والا، نشو ونما کا سامان بہم پہنچانے والا۔

اَلْوَلِیُّ: دوست، حمایتی، طرفدار۔

اَلرَّءُوْفُ: مہربان، نرمی اور شفقت کرنے والا۔

اَلْمُقْسِطُ: انصاف والا، عادل۔

اَلْهَادِیْ: راہ دکھانے والا، رہنما۔

اَلْکَافِیْ: اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لیے کافی۔

اَلْمُجِیْبُ: قبول کرنے والا، دعاؤں کا سننے والا۔

اَلْحَلِیْمُ: بردبار، بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرنے والا۔

اَلتَّوَّابُ وَقَابِلِ التَّوْبِ: توبہ قبول کرنے والا، گناہگار کے گناہوں سے درگزر کر کے دوبارہ اس کی طرف رجوع ہونے والا۔

اَلْحَنَّانُ: ماں کی طرح بچوں پر شفقت کرنے والا۔

اَلْمَنَّانُ: احسان کرنے والا۔

اَلنَّصِیْرُ: مدد کرنے والا۔

ذُو الطَّوْلِ: کرم والا۔

ذُو الْفَضْلِ: فضل والا۔

اَلْکَفِیْلُ: بندوں کی کفالت کرنے والا۔

اَلْوَکِیْلُ: بندوں کی ضرورتوں کا ذمہ لینے والا، سامان کرنے والا۔

اَلْمُقِیْتُ: روزی پہنچانے والا۔

اَلْمُغِیْثُ: فریاد کو پہنچنے والا، فریاد سننے والا۔

اَلْمُجِیْرُ: پناہ دینے والا۔

اَلْمُغْنِی: بندوں کو اپنے سوا ہر چیز سے بے نیاز کرنے والا۔

صفاتِ جلالی:

یعنی وہ اسماء وصفات جن سے خدا کی بڑائی، کبریائی، شہنشاہی اور قدرت کا اظہار ہوتا ہے:

اَلْمَلِكُ وَالْمَلِيْكُ: بادشاہ، فرمانروا۔

اَلْعَزِیْزُ: غالب، جس پر کوئی دسترس نہ پائے۔

اَلْقَاهِرُ وَالْقَهَّارُ: جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جا سکتا۔ سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا۔

اَلْمُنْتَقِمُ : سزا دینے والا، برائیوں کی جزا دینے والا۔

اَلْجَبَّارُ: جبروت والا جس کے سامنے کوئی دوسرا دم نہ مار سکے۔ جس سے کوئی سرتابی نہ کر سکے۔

اَلْمُهَيْمِنُ : سب پر شاہد اور گواہ اور دلیل۔

اَلْمُتَكَبِّرُ: اپنی بڑائی دکھانے والا، کبریائی والا، سخت سزا دینے والا۔

شَدِيْدُ الْعِقَابِ: سخت سزا والا۔

شَدِيْدُالْبَطْشِ : بڑی گرفت والا جس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

نکتہ: خدا کے صفاتِ جلالی کا ذکر زیادہ تر تورات میں ہے۔لیکن صحیفہ محمدی میں جہاں کہیں خدا کی ان جلالی صفتوں کا ذکر آتا ہے۔ ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کے عادل حکیم اور علیم ہونے کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ جس سے انسان کی اس غلط فہمی کا مٹانا مقصود ہے کہ خدا کی ان جلالی صفتوں کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک لاابالی کی طرح دم کے دم میں جو چاہے کر گزرتا ہے۔ بلکہ اس کا قہر، اس کا غلبہ، اس کا انتقام اور اس کی گرفت، عدل وانصاف اور حکمت ومصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور اس طرح ان جلالی ناموں سے بے رحمی اور ظالمانہ سخت گیری کا جو شبہ پیدا ہو سکتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے:

﴿ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ (۳/ آل عمران:۱۸۲)

''بے شک خدا بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔''

اس لیے اللہ تعالیٰ کے وصف میں عَزِيْزٌ (غالب) کے ساتھ حَكِيْمٌ (حکمت والا) ہمیشہ قرآن میں آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا کے عذاب کے ذکر کے ساتھ اس کی رحمت کا تذکرہ بھی ہمیشہ قرآن میں کیا جاتا ہے اور دوزخ کے بیان کے ساتھ جنت کا سماں بھی لازمی طور پر دکھایا جاتا ہے۔

جہاں یہ کہا گیا کہ ﴿ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ ساتھ ہی کہا گیا ﴿ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ﴾ (۳۸/ صٓ:۶۵۔۶۶) قوموں کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا گیا تو فرما دیا گیا:

﴿ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ﴾ (۴۰/ المؤمن:۳۱)

''اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔''

اس کی صفت ﴿ ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ﴾ دردناک عذاب دینے والا جہاں بیان کی گئی تو اس سے معاً پہلے ﴿لَذُوْ مَغْفِرَةٍ﴾ (۴۱/ حٰمٓ السجدۃ:۴۳) یقینی بخشش والا بھی فرما دیا گیا۔ غرض صفاتِ جلالی کے بیان میں یہ رعایت پیش نظر رکھی گئی ہے کہ اس کے ساتھ یا آگے پیچھے اس کی صفات جمالی کا بھی ذکر ہو، تا کہ خوف و خشیت کے ساتھ اس کی محبت اور لطف وکرم کے جذبات بھی نمایاں ہوں۔

صفاتِ کمالی: وہ اسماء وصفات جن سے اس کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر

ہوتا ہے۔اس طرح کے اسماء وصفات پانچ قسم کے ہیں۔ایک وہ جو اس کی وحدانیت سے متعلق ہیں۔دوسرے وہ جو اس کے وجود سے تعلق رکھتے ہیں اور تیسرے اس کے علم سے، چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تنزیہہ اور پاکی سے۔

☆ صفاتِ وحدانیت: یعنی وہ صفتیں جو اس کی یکتائی اور بے مثالی کو ظاہر کرتی ہیں اور وہ یہ ہیں:

اَلْوَاحِدُ: ایک۔

اَلْاَحَدُ: ایک۔

اَلْوِتْرُ: طاق جس کا کوئی جوڑا نہیں۔

☆ صفات وجودی: یعنی وہ صفتیں جن سے اس کا وجود، بقا، دوام، ازلیت اور بے زوالی ظاہر ہوتی ہے۔

اَلْمَوْجُوْدُ: وجود والا، ہست۔

اَلْحَیُّ: ہمیشہ زندہ، غیر فانی۔

اَلْقَدِیْمُ: وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہ ہو، جو ہمیشہ سے ہے۔

اَلْقَیُّوْمُ: جو اپنے سہارے تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔

اَلْبَاقِیُّ: جس کو ہمیشہ بقا ہے۔

اَلدَّآئِمُ: ہمیشہ رہنے والا۔

اَلْاَوَّلُ: وہ پہلا جس سے پہلے کوئی نہیں۔

اَلْاٰخِرُ: وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔

اَلْمُقَدِّمُ: جو سب کے آگے سے ہے۔

اَلْمُؤَخِّرُ: جو سب پیچھے رہ جائے۔

اَلظَّاهِرُ: جس کا وجود کھلا اور نمایاں ہے (یعنی جو اپنے کاموں اور قدرتوں کے لحاظ سے ظاہر ہے)

اَلْبَاطِنُ: جو چھپا اور مخفی ہے۔ (یعنی جو اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہے)

☆ علم: وہ صفتیں جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں:

اَلْخَبِیْرُ: خبر رکھنے والا۔

اَلْعَلِیْمُ: جاننے والا۔

عَلَّامُ الْغُیُوْبِ: جو باتیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا۔

عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: دلوں کے چھپے ہوئے بھید کو جاننے والا۔

اَلسَّمِیْعُ: سننے والا۔

اَلْبَصِیْرُ : دیکھنے والا۔
اَلْمُتَکَلِّمُ: بولنے والا ، اپنے علم اور ارادہ کا ظاہر کرنے والا۔
اَلْوَاجِدُ: پانے والا ، جس کے علم کے سامنے کوئی چیز گم نہ ہو۔
اَلشَّهِیْدُ: حاضر ، جس کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہ ہو۔
اَلْحَسِیْبُ: حساب کرنے والا یعنی جن چیزوں کا علم حساب کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یعنی وزن اور مقدار ان کا بھی جاننے والا۔
اَلْمُحْصِیْ: گننے والا یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے۔ یعنی اعداد کا بھی جاننے والا۔
اَلْمُدَبِّرُ: تدبیر کرنے والا ، انتظام کرنے والا۔
اَلْحَکِیْمُ : حکمت والا ، عقل والا ، سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا۔
اَلْمُرِیْدُ: ارادہ کرنے والا ، مشیت والا۔
اَلْقَرِیْبُ : نزدیک ، جو اپنے علم کے لحاظ سے گویا سب کے پاس ہے۔

☆ قدرت: یعنی وہ صفتیں جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے:

اَلْفَاتِحُ وَالْفَتَّاحُ: ہر مشکل کو کھولنے والا۔
اَلْقَدِیْرُ وَالْقَادِرُ: قادر ، قدرت والا۔
اَلْمُقْتَدِرُ: اقتدار والا ، جس کے سامنے کوئی چوں و چرا نہیں کر سکتا۔
اَلْقَوِیُّ: زبردست ، جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔
اَلْمَتِیْنُ : مضبوط ، جس میں کوئی کمزوری نہیں۔
اَلْجَامِعُ: جمع کرنے والا ، متفرق اور پراگندہ چیزوں کو اکٹھا کرنے والا۔
اَلْبَاعِثُ : اٹھانے والا ، مردوں کو قبروں سے اٹھانے والا یا دنیا میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ کا محرکِ اول۔
مَالِكُ الْمُلْكِ: سلطنت کا مالک جس کے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہیں۔
اَلْبَدِیْعُ: نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے والا۔
اَلْوَاسِعُ : سمانے والا جو ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔
اَلْمُحِیْطُ : جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ کوئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔
اَلْمُحْیِیْ وَالْمُمِیْتُ: جلانے والا اور مارنے والا۔
اَلْقَابِضُ وَالْبَاسِطُ: سمیٹنے والا اور پھیلانے والا۔
اَلْمُعِزُّ وَالْمُذِلُّ: عزت دینے والا اور ذلت دینے والا۔

اَلْخَافِضُ وَالرَّافِعُ : نیچا کرنے والا اور اونچا کرنے والا۔

اَلْمُعْطِي وَالْمَانِعُ : دینے والا اور روک لینے والا۔

اَلنَّافِعُ وَالضَّارُّ: نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا یعنی نفع وضرر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

اَلْمُبْدِئُ وَالْمُعِيْدُ: جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کو وجود میں لانے والا اور جو ہو کر فنا کر دی گئی ہو اس کو پھر دوبارہ وجود میں لانے والا۔

نکتہ: اس قسم کی صفتیں جن میں بظاہر قبح نظر آتا ہے۔ جیسے اَلضَّارُّ (نقصان پہنچانے والا) اَلْمُذِلُّ (ذلت دینے والا) اَلْخَافِضُ (پست کرنے والا) اَلْمَانِعُ (روکنے والا) وغیرہ ان کا تنہا استعمال چونکہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس لیے جب تک ان کے ساتھ ان کے مقابل کی صفت نہ بولی جائے۔ ان کا استعمال جائز نہیں رکھا گیا۔ یعنی خدا کو صرف اَلضَّارُّ، اَلْخَافِضُ، اَلْمَانِعُ اور اَلْمُذِلُّ کہنا درست نہیں۔ جب تک اس کے ساتھ اس کے دوسرے پہلو کو بھی نہ ملا لیا جائے۔ یعنی اَلضَّارُّ کے ساتھ اَلنَّافِعُ، اَلْخَافِضُ کے ساتھ اَلرَّافِعُ، اَلْمَانِعُ کے ساتھ اَلْمُعْطِي اور اَلْمُذِلُّ کے ساتھ اَلْمُعِزُّ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ قرآن پاک اور احادیث دونوں میں ان صفات کے استعمال میں یہ رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے کیونکہ تنہا نقصان پہنچانے والا، ذلت دینے والا اور روکنے والا کوئی خوبی نہیں بلکہ ایک طرح کی برائی ہے۔ ہاں نقصان ونفع پہنچانے والا، عزت وذلت دینے والا اور دینے والا اور روکنے والا، دونوں کو ملا کر کہا جائے تو جائز ہوگا کہ اس سے مقصود اس کی قدرت کی وسعت ہے کہ اگر کوئی ایسا نفع پہنچانے والا ہے جس میں نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہیں یا ایسا عزت دینے والا ہے جس میں ذلیل کرنے کی استطاعت ہی نہیں تو اس کے اس عزت دینے اور نفع پہنچانے پر اس کا مجبور ومضطر ہونا لازم آتا ہے اور اس کی قدرت کا یہ کمال نمایاں نہیں ہوتا البتہ جو نقصان پہنچانے کی طاقت رکھنے کے باوجود نفع پہنچاتا اور ذلت دے سکنے کے باوصف عزت دیتا ہے، اس کا کمال ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

تنزیہہ: وہ صفات جو اس کی بڑائی، کبریائی، پاکی اور نیکی اور ہر عیب اور نقصان سے اس کی براءت کو ظاہر کرتی ہیں:

اَلْغَنِيُّ :	بے نیاز	اَلصَّادِقُ :	سچا، راست باز
اَلْعَلِيُّ :	مرتبہ والا	اَلْمَاجِدُ :	عزت والا
اَلْعَظِيْمُ :	عظمت والا	اَلْحَمِيْدُ :	تعریف والا
اَلْكَبِيْرُ :	بڑا	اَلْقُدُّوْسُ :	پاک
اَلرَّفِيْعُ :	بلند	اَلْحَقُّ :	سچا اور اصل، یعنی یہ کہ اس کے سوا سب باطل ہیں۔
اَلْجَلِيْلُ :	بزرگ	اَلْجَمِيْلُ :	اچھا

اَلْعَدْلُ: عادل اَلْبَرُّ: نیک
اَلْکَرِیْمُ: شریف سُبُّوْحٌ: ہر عیب سے پاک
اَلصَّمَدُ: جو بزرگی کی ہر صفت میں کامل ہے۔ اَلرَّشِیْدُ: سیدھی راہ چلنے والا، نہ بھٹکنے والا

ان تعلیمات کا اثر اخلاقِ انسانی پر

اللہ تعالیٰ کے ان اسماء وصفات کا عقیدہ دین محمدی میں محض نظری نہیں بلکہ عملی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہ محامد واوصاف، اخلاقِ انسانی کا معیار ہیں۔ ان اوصاف کو چھوڑ کر جو اس ذوالجلال کے لیے خاص ہیں کہ وہ بندہ کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ ہیں۔ بقیہ اوصاف ومحامد انسان کے لیے قابل نقل ہیں کہ وہ خدا کے محامد واوصاف سے دور کی نسبت رکھتے ہیں اس لیے انسان پر فرض ہے کہ اگر وہ خدا سے نسبت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اپنے اندر اس کے محامد واوصاف سے نسبت پیدا کرے اور خدا کے ان اسماء وصفات کو محامد ومحاسن اور خوبیوں کا انتہائی معیار جان کر ان کی نقل اور پیروی کی کوشش کرے۔ محامد الٰہی گویا استاد اعلیٰ کی وصلی ہے جس کو دیکھ کر شاگرد کو اپنے خط کی خوبی میں ترقی کرنی چاہیے، اس لیے انسان کو بھی اپنے اور ہر حرف کے لکھنے (محامدِ الٰہی کی نقل اتارنے) میں ایک نظر اس استادِ ازل کی وصلی پر بھی ڈال لینی چاہیے، تاکہ معلوم ہو کہ اس کی ذاتی مشق کہاں تک اصلی وصلی کے مطابق ہے۔

گزر چکا کہ قرآن کا پہلا سبق یہ ہے کہ بحکم:

﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ (۲/ البقرۃ:۳۰)

''آدم کا بیٹا زمین میں خدا کا خلیفہ اور نائب بنایا گیا ہے۔''

خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف ومحامد کا پرتو جتنا زیادہ نمایاں ہوگا۔ اتنا ہی وہ اپنے اندر اس منصب کا استحقاق زیادہ ثابت کرے گا اور اتنا ہی وہ اصل سے زیادہ قریب ہوگا اور نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کرے گا۔ یہاں تک کہ اس میں وہ جلوہ بھی نمایاں ہوگا۔ جب وہ سرتاپا خدائی رنگ میں رنگ کر نکھر جائے گا:

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫﴾ (۲/ البقرۃ:۱۳۸)

''خدا کا رنگ اور خدا کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے؟''

تمام اہل تفسیر متفق ہیں کہ اس ''خدائی رنگ'' سے مقصود خدا کا ''دین فطرت'' ہے۔

یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے کہ ((اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ)) [1] ''خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا'' اور ساتھ ہی اس کی تشریح بھی گزری کہ اس صورت سے مقصود جسمانی نہیں معنوی شکل و صورت ہے۔ یعنی یہ کہ خدا نے انسان میں اپنے صفات کاملہ کا عکس جلوہ گر کیا ہے اور ان کے قبول کرنے کی

[1] صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب بدء السلام: ٦٢٢٧۔

صلاحیت عطا کی ہے اور ان میں انسانی حد تک ترقی کی استعداد بخشی ہے اور اخلاق وصفات میں ملائے اعلیٰ سے تشبہ اور ہم شکلی کا جوہر مرحمت فرمایا ہے اور یہی صوفیہ اور خاصان خدا کے اس مقولہ کا کہ

"تخلقوا باخلاق اللّٰه۔" "خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو۔"

مطلب ہے حدیث میں یہی مفہوم بروایتِ طبرانی ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ

((حسن الخلق خلق اللّٰه الاعظم)) "حسنِ خلق خدا تعالیٰ کا خلق عظیم ہے۔" ❶

اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کی چار قسمیں اوپر بیان ہوئی ہیں۔ جلالی، تنزیہی، کمالی اور جمالی، صفات جلالی جن میں کبریائی، عظمت، شہنشاہی اور بڑائی کے اوصاف ہیں، خالقِ تعالیٰ کے سوا مخلوقات ان کی مستحق نہیں اور نہ یہ اوصاف بندگی اور عبودیت کے رتبہ کے سزاوار ہیں۔ ان کا انعکاس یہ ہے کہ بندوں میں ان کے مقابل کے صفات پیدا ہوں، یعنی عاجزی، تواضع، فروتنی اور خاکساری، اسی لیے ترفع، تکبر اور بڑائی کا اظہار منع ہے اور اسی لیے آدمی جس نے فروتنی اختیار کی اور عجز وقصور کا اعتراف کیا، وہ مغفرت کی خلعت سے سرفراز ہوا اور شیطان جس نے ترفع اور غرور کیا، دائمی لعنت کا مستحق ٹھہرا:

﴿ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ۝۳۴ ﴾ (۲/ البقرۃ:۳٤)

"اس نے (آدم کے سجدہ سے) انکار کیا اور غرور کیا، اور کافروں میں سے ہو گیا۔"

قرآن پاک میں ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف خدا کے لیے ہے، اس کے سوا کوئی اور اس کا مستحق نہیں:

﴿ وَلَهُ الْكِبْرِيَاۗءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (٤٥/ الجاثیۃ:۳۷)

"اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے بڑائی ہے۔"

صحیح مسلم ❷ میں ابوسعید خدری اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما دو صحابیوں سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "عزت اس کا لباس اور کبریائی اس کی چادر ہے، (خدا فرماتا ہے) تو جو کوئی عزت اور کبریائی میں میرا حریف بنے گا میں اسے سزا دوں گا۔" دوسری جگہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "خدا کے نزدیک سب سے براوہ ہے جو اپنا نام بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہ رکھتا ہے، خدا کے سوا کوئی بادشاہ اور مالک نہیں۔" ❸ ﴿ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ ﴾ (۵۹/ الحشر:۲۳) اسی کی شان ہے، البتہ اللہ تعالیٰ اپنی عزت جلال اور قوت و جبروت کا فیضان بعض بندوں اور امتوں پر نازل کرتا ہے اور ان کو طاقت اور قوت اور بادشاہی عطا کرتا ہے مگر اس نوازش پر بھی نیک بندوں اور صالح امتوں کا فرض یہی ہے کہ عین اس وقت جب ان کے دست و بازو سے قوتِ حق اور ربانی جاہ وجلال کا اظہار ہو رہا ہو، ان کی پیشانیاں فرطِ عبودیت سے اس کے آگے جھکی ہوں اور سر

❶ کنز العمال، ج ۲، ص: ٤ بروایت عمار بن یاسر۔

❷ کتاب البر والصلة، باب تحریم الکبر: ٦٦٨٠۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ابغض الاسماء الی اللّٰه تبارك وتعالیٰ: ٦٢٠٥ ومسلم، کتاب الآداب، باب تحریم التسمی بملك الاملاك: ٥٦١٠، ٥٦١١۔

نیاز اظہارِ بندگی کے لیے اس کے سامنے خم ہوں کہ عزت وجلال خاص خدا کی شان تھی جس کا فیضان رسول اللہ پر ہوا اور رسول کی وساطت سے مومنوں پر ہوا۔ یہ ترتیب خود قرآن میں ملحوظ رکھی گئی ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (٦٣/ المنافقون:٨)

''اور عزت خدا کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنوں کے لیے ہے۔''

حاکم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے تین کپڑے ہیں وہ اپنی عزت وجلال کا ازار باندھتا ہے اور اپنی رحمت کا جامہ پہنتا ہے اور اپنی کبریائی کی چادر اوڑھتا ہے تو جو شخص اس عزت کے سوا جو خدا کی طرف سے اس کو عنایت ہوئی ہو معزز بننا چاہتا ہے تو وہی شخص ہے جس کو قیامت میں یہ کہا جائے گا ''اس کا مزہ چکھ تو معزز اور شریف بنتا تھا۔'' (۴۴/ الدخان:۴۹) ''اور جو انسانوں پر رحم کرتا ہے خدا اس پر رحم کرتا ہے۔'' کہ اس نے وہ جامہ پہنا جس کا پہننا اس کو روا تھا اور جو کبریائی کرتا ہے تو اس نے خدا کی اس چادر کو اتارنا چاہا جو خدا ہی کے لیے تھی۔'' [1]

خدا کے صفات کمالی میں سے وحدانیت اور بقائے ازلی وابدی کے سوا کہ ان سے تمام مخلوقات اور ممکنات طبعاً محروم ہیں، بقیہ اوصاف کے فیضان سے انسان مشرف ہوتا ہے صفات تنزیہی، مثلاً: قدرت، علم، سمع، بصر، کلام وغیرہ سے بھی مخلوقات تمام تر محروم ہیں ان کی تنزیہہ یہی ہے کہ وہ خدا کے عصیان، نافرمانی اور گناہگاری کے عیب سے بری اور پاک ہوں۔ صفات جمالی وہ اصلی اوصاف ہیں جن کے فیضان کا دروازہ ہر صاحبِ توفیق کے لیے حسب استعداد کھلا ہوا ہے، ان صفات جمالی کا سب سے بڑا مظہر عفوو درگزر ہے۔ عیسائیوں کی عام دعا میں ایک فقرہ ہے کہ ''خداوند! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں۔'' اسلام نے اس الٹی تشبیہ کو جائز نہیں رکھا ہے۔ اس کے ہاں یہ ہے کہ اے انسان! تو اپنے مجرموں کو معاف کر کہ خدا تیرے گناہوں کو معاف کرے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی اپنے بھائی کے گناہ پر پردہ ڈال دے گا، خدا اس کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا۔'' [2] قرآن کہتا ہے کہ ''تم دوسروں کو معاف کرو کہ خدا تم کو معاف کرتا ہے۔''

﴿ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء:١٤٩)

''اگر تم کوئی نیکی دکھا کر یا چھپا کر کرو یا کسی کی برائی کو معاف کرو تو اللہ (بھی) معاف کرنے والا، قدرت والا ہے۔''

ایک دفعہ عہد نبوت میں بارگاہِ عدالت قائم تھی۔ ایک مجرم کو سزا دی جا رہی تھی۔ مگر اس منظر کو دیکھ کر حضور ﷺ کے چہرہ کا، رنگ متغیر تھا اداشناسوں نے سبب دریافت کیا۔ فرمایا: ''امام تک معاملہ پہنچنے سے

---

[1] كنز العمال، ج٢، ص: ١٠٩؛ مستدرك حاكم، كتاب التفسير، سورة دخان، ج٢، ص: ٤٥١۔

[2] صحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم الظلم:٦٥٧٨۔

پہلے اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا کرو۔ خدا معاف کرنے والا ہے اور عفو و درگزر کو پسند کرتا ہے تو تم بھی معاف اور درگزر کیا کرو، کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ خدا تمہیں بھی معاف کرے۔ وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' ❶

آنحضرت ﷺ ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں فرما رہے تھے کہ ''جس کے دل میں غرور کا ایک ذرہ بھی ہو گا وہ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔'' ایک صحابی نے عرض کی، یا رسول اللہ! انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو کیا یہ بھی غرور ہے؟ فرمایا:

((ان اللّٰہ عزوجل جمیل یحب الجمال)) ❷

''اللہ تعالیٰ اچھا ہے اور جمال والا ہے اچھائی اور جمال کو پسند کرتا ہے۔''

یہ غرور نہیں، غرور حق کو پامال کرنا اور انسانوں کو دبانا ہے۔ یہی روایت حدیث کی دوسری کتابوں میں ان الفاظ کے ساتھ ہے: ''خدا جمال والا ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بندہ پر اس کی نعمت کا اثر ظاہر ہو۔'' ❸ یہ روایت بھی ہے: ''خدا جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے، وہ سخی ہے سخاوت کو پسند کرتا ہے، وہ صاف ستھرا ہے صفائی اور ستھرے پن کو پسند کرتا ہے۔'' ❹ روایت کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ''وہ جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے، اخلاق عالیہ سے محبت اور بداخلاقیوں سے نفرت رکھتا ہے۔'' ❺ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نصیحت فرماتے ہیں: ''اے عائشہ! خدا نرمی والا ہے وہ ہر بات میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔'' ❻ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا: ''لوگو! خدا پاک ہے اور پاک ہی کو قبول کرتا ہے۔'' ❼ عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا: ''اے قرآن کے ماننے والو! وتر نماز پڑھا کرو کہ خدا یکتا (وتر) ہے، وہ یکتا (وتر) کو پسند کرتا ہے۔'' ❽

رحمت و شفقت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے۔ مگر خدا کی رحمت و شفقت کے وہی مستحق ہیں جو دوسروں پر رحمت و شفقت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''رحم کرنے والوں پر وہ رحم کرنے والا بھی رحم کرتا ہے۔ لوگو! تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔'' ❾ رشتہ داری اور قرابت کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا

---

❶ مستدرك حاكم، ج ٤، ص:٣٨٢، كتاب الحدود۔ ❷ صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب تحريم الكبر و بيانه:٢٦٥؛ ترمذى، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فى الكبر:١٩٩٩۔

❸ كنز العمال كتاب الزينة، ج٣، ص:٣٢٦ بحواله شعب الايمان بيهقى۔ ❹ كنز العمال كتاب الزينة، ج٣، ص:٣٢٦، بحواله كامل لابن عدى۔ ❺ ايضًا بحواله معجم اوسط طبرانى۔

❻ صحيح مسلم، كتاب السلام، باب النهى عن ابتداء اهل الكتاب بالسلام:٥٦٥٦؛ ابوداود، كتاب الادب، باب فى الرفق:٤٨٠٨؛ ابن ماجه، ابواب الادب، باب الرفق:٣٦٨٩۔ ❼ صحيح مسلم، كتاب الزكوٰة، باب قبول الصدقة من الكسب الطيب:٢٣٤٦؛ ترمذى، ابواب التفسير، تفسير سورة البقرة:٢٩٨٩۔

❽ ابوداود، كتاب الوتر:١٤١٦۔ ❾ ابوداود، كتاب الادب، باب فى الرحمة:٤٩٤١۔

گیا ہے تمام رشتہ داریاں اور قرابتیں رحم کے تعلق پر قائم ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''رحم کی جڑ رحمٰن سے ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ اے رحم! جو تجھ کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا۔ جو تجھ کو ملائے گا اس کو میں بھی ملاؤں گا۔'' ❶ ترمذی میں یہی تعلیم ان الفاظ میں ہے: ''میں خدا ہوں، میں رحمٰن ہوں، میں نے رحم کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام (رحمٰن) سے اس کا نام (رحم) مشتق کیا ہے تو جو اس کو ملائے گا میں اس کو ملاؤں گا۔ جو اس کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کرونگا۔'' ❷ پھر فرمایا: ''جو انسان پر رحم نہیں کرتا خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔'' ❸ بخاری میں اس روایت کے یہ الفاظ ہیں: ''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔'' ❹ آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدا نے رحم کے سو حصے کیے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ زمین والوں کو عنایت کیا۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ باہم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رحم و شفقت سے پیش آتے ہیں۔ یہاں تک کہ گھوڑی بھی اپنے بچہ کے لیے اس خوف سے پاؤں اٹھا لیتی ہے کہ اس کو صدمہ نہ پہنچے۔'' ❺

بخل خدا کی صفت نہیں مگر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اپنی تھیلی کے منہ نہ بند کرو ورنہ تم پر بھی تھیلی کا منہ بند کیا جائے گا۔'' ❻ یہ نصیحت بھی فرمائی کہ ''جو بندہ دوسرے بندے کی پردہ پوشی کرے گا، قیامت میں اس کی پردہ پوشی خدا کرے گا۔'' ❼ یہ نصیحت بھی فرمائی کہ ''جب تک تم اپنے بھائی کی مدد میں ہو خدا تمہاری مدد میں ہے۔'' ❽

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدا سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں۔ اسی لیے اس نے فحش باتوں کو حرام کیا ہے۔'' ❾

اسی کی تفسیر دوسری حدیث میں ہے، آپ نے فرمایا ''کہ خدا بھی غیرت کرتا ہے اور مومن بھی غیرت کرتا ہے اور خدا کی غیرت یہی ہے کہ اس نے اپنے مومن پر جس بات کو حرام کیا ہے اگر کوئی اس کا ارتکاب کرے تو وہ اس پر خفا ہو۔'' ❿ اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہے:

﴿وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۸۲)

''اور خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔''

اس لیے اس کے بندوں کا فرض ہے کہ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے اللہ تعالیٰ کی اس عملی تعلیم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا:

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من وصل وصله الله: ۵۹۸۸، ۵۹۸۹۔

❷ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی قطیعة الرحم: ۱۹۰۷۔ ❸ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة الولد: ۱۹۱۱۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الولد: ۵۹۹۷۔

❺ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب جعل الله الرحمة فی مائة جزء: ۶۰۰۰۔ ❻ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی السخاء: ۱۹۶۰۔ ❼ مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم: ۶۵۷۸۔

❽ ابو داود، کتاب الادب باب فی المعونة للمسلم: ۴۹۴۶۔

❾ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب الغیرة: ۵۲۲۰۔

❿ جامع ترمذی، ابواب الرضاع باب ماجاء فی الغیرة: ۱۱۶۸۔

((یا عبادی انی حرمت الظلم علی نفسی وجعلته بینکم محرما فلا تظالموا)) ❶

''اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے، ہاں تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔''

پاکیزگی اور لطافت خدا کی صفتیں ہیں، اس لیے خدا کے ہر بندہ کو بھی پاک وصاف رہنا چاہیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((ان اللّٰه طیب یحب الطیب ونظیف یحب النظافة فتنظفوا ولا تشبهوا الیهود)) ❷

''خدا پاکیزہ ہے، پاکیزگی کو پسند کرتا ہے اور پاک وصاف ہے پاکی اور صفائی کو پسند کرتا ہے، تم پاک وصاف رہا کرو اور یہودیوں کی طرح گندے نہ بنو۔''

یہ توحید کا ایک رخ تھا۔ اب اس کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کے قابل ہے۔

وہ قومیں جو توحید سے آشنا نہ تھیں انہوں نے انسانیت کا مرتبہ بھی نہیں پہچانا تھا۔ وہ انسان کو فطرت کے ہر مظہر کا غلام سمجھتی تھیں۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم توحید ہی تھی جس نے خدا کے سوا ہر شے کا خوف انسانوں کے دلوں سے نکال دیا۔ سورج سے لے کر زمین کے دریا اور تالاب تک ہر چیز آقا ہونے کے بجائے انسانوں کی غلام بن کر ان کے سامنے آئی۔ بادشاہوں کے جلال وجبروت کا طلسم ٹوٹ گیا اور وہ بابل (ومصر) ہندوایران کے خدا اور ''ربکم الاعلی'' ہونے کے بجائے انسانوں کے خادم، راعی اور چوکیدار کی صورت میں نظر آئے۔ جن کا عزل ونصب دیوتاؤں اور فرشتوں کے ہاتھ میں نہ تھا بلکہ انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔

تمام انسانی برادری جس کو دیوتاؤں کی حکومتوں نے اونچے نیچے، بلند وپست، شریف وذلیل مختلف طبقوں اور ذاتوں میں منقسم کر دیا تھا اور جن میں سے کچھ کی پیدائش پرمیشور کے منہ، کچھ کی اس کے ہاتھ، اور کچھ کی اس کے پاؤں سے تسلیم کی جاتی تھی، اس عقیدے کی وجہ سے ایسی مختلف جنسوں میں بٹ گئی تھی، جن کو کسی طرح متفق نہیں کر سکتے تھے اور اس طرح مساوات انسانی کی دولت دنیا سے گم تھی اور زمین قوموں اور ذاتوں کے ظلم وجبر اور غرور وفخر کا دنگل بن گئی تھی۔ توحید نے آ کر اس اونچائی، نیچائی، بلندی و پستی اور نشیب وفراز کو برابر کیا۔ سب انسان خدا کے بندے، سب اس کے سامنے برابر، سب باہم بھائی

---

❶ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم:٦٥٧٢؛ مسند احمد، ج ٥، ص: ١٦٠ وادب المفرد امام بخاری باب الظلم ظلمات: ٤٩٠۔

❷ جامع ترمذی، ابواب الادب، باب ماجاء فی النظافة:٢٧٩٩۔

بھائی اور سب حقوق کے لحاظ سے یکساں قرار پائے۔ ان تعلیمات نے دنیا کی معاشرتی اخلاقی اور سیاسی اصلاحات میں جو کام کیا اس کے نتائج تاریخ کے صفحوں میں ثبت ہیں اور بالآخر اس اصول کی صداقت کو انہوں نے بھی تسلیم کرلیا۔ جو حقیقی توحید سے ناآشنا ہیں اور اسی لیے وہ مساواتِ انسانی کے حقیقی جوہر سے بھی اب تک آشنا ہیں اور انتہا یہ ہے کہ خدا کے گھر میں جا کر بھی تفاوت درجہ کا خیال ان کے دل سے دور نہیں ہوتا۔ دولت وفقر اور رنگ وقومیت کے امتیازات خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر بھی وہ نہیں بھولتے۔ مسلمانوں کو تیرہ سو برس سے اس مساوات کی دولت اسی توحید کامل کی بدولت حاصل ہے اور وہ ہر قسم کے ان مصنوعی امتیازات سے پاک ہیں، اسلام کی نظر میں سب ایک خدا کے بندے ہیں اور سب یکساں اس کے سامنے سرافگندہ ہیں، دولت وفقر، رنگ روپ اور نسل وقومیت کا کوئی امتیاز ان کو منقسم نہیں کرتا۔ اگر کوئی امتیاز ہے تو صرف تقویٰ اور خدا کی فرمانبرداری کا ہے:

﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ ﴾ (۴۹/ الحجرات:۱۳)

''تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے تقویٰ کرتا ہو۔''

خدا کا ڈر اور پیار

اس سلسلہ میں ایک اور اہم مسئلہ خدا سے ڈرنے اور اس سے محبت کرنے کا ہے۔ عام طور سے مخالفوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے جس خدا کی تعلیم دی ہے وہ فقط قہار، جبار اور مہیب شہنشاہ مطلق ہے۔ جس کی ہیبت وجلال سے تمام بندوں کو صرف ڈرتے اور کانپتے رہنا چاہیے۔ اس کے گوشۂ چشم میں لطف وعنایت کا گزر نہیں۔ محبت اور پیار کا نذرانہ اس کے دربار میں قبول نہیں۔ نہ وہ اپنے کمزور بندوں پر خود محبت کی نظر رکھتا ہے اور نہ وہ اپنے بندوں سے اپنے لیے محبت کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تعلیم محمدی ﷺ کی بالکل غلط تصویر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جو اسماء اور صفات اوپر گزر چکے ہیں ان پر ایک ایک کر کے نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس کے چند پُر جلال ناموں کو چھوڑ کر جو اس کی قدرتِ تامہ اور مالکیتِ عام کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں بقیہ تمام تر نام صرف محبت اور پیار، لطف اور کرم، رحمت اور مہر کی تجلی گاہ ہیں۔ مخالفوں کو اس حقیقت کے سمجھنے میں دو وجوہات کے سبب مغالطہ ہوا:

① آنحضرت ﷺ نے اللہ سے خوف اور خشیت کی بھی انسانوں کو دعوت دی۔

② دوسرے مذہبوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے اظہار کی جو اصطلاحیں مقرر کی تھیں، آپ ﷺ نے شدت کے ساتھ ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔

محبت کے ساتھ خوف وخشیت کی تعلیم

یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیم میں خدا کی محبت اور پیار کے ساتھ خدا کے خوف وخشیت کو بھی جگہ دی ہے۔ غور کرو کہ انسانوں میں تمام کاموں کے محرک دو ہی جذبے ہیں۔ خوف اور محبت، یہ دونوں

جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ یا آگے پیچھے بھی اور ان دونوں جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہیں۔ ادعائے محبت کا نتیجہ ناز وتبختر اور کبھی گستاخی اور کبھی اپنے مہربان ومحبوب پر غایت اعتماد کی بنا پر نافرمانی بھی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جذبہ محبت کے ان لوازم اور اثرات کا انسداد خوف ہی کے جذبہ سے ہوسکتا ہے اس لیے خالق ومخلوق کے درمیانی رابطہ کی تکمیل کا تعلق نہ تنہا خوف سے ہوسکتا ہے اور نہ تنہا محبت سے انجام پاسکتا ہے بلکہ ان دونوں کے اشتراک، امتزاج اور اعتدال سے اور یہی نبوتِ محمدی ﷺ کی تعلیم ہے۔

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب قائم تھے ان میں اس مسئلہ میں بھی افراط وتفریط پیدا ہوگئی تھی اور صراطِ مستقیم سے وہ تمام ترہٹ گئے تھے۔ یہودی مذہب کی بنا سرتاپا خوف وخشیت اور سخت گیری پر تھی۔ اس کا خدا فوجوں کا سپہ سالار [1] اور باپ کا بدلہ پشت ہاپشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا۔ [2] حالانکہ یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم وکرم اور محبت وشفقت کا ذکر کہیں کہیں موجود ہے۔ [3] اس کے برعکس عیسائیت زیادہ تر خدا کے رحم وکرم اور محبت وشفقت کے تذکروں سے معمور تھی تو ایسا نہیں ہے کہ اس میں خدا کے خوف وخشیت کی مطلق تعلیم نہیں۔ بلکہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی تاکید ہے۔ [4] مگر ان دونوں مذہبوں کے پیروؤں نے ان دو متقابل تعلیموں کے درمیان اعتدال ملحوظ نہیں رکھا تھا۔ اسلام نے اسی نقطۂ اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے وہ نہ تو خدا کو محض جبار، قہار، رب الافواج اور صرف بنی اسرائیل یا بنی اسمٰعیل کا خدا مانتا ہے، نہ اس کو مجسم انسان، انسانوں کا باپ، یا محمد ﷺ کا باپ سمجھتا ہے اور نہ تنہا رحم وکرم اور محبت وشفقت کی صفات سے اس کو متصف کرتا ہے بلکہ وہ خدا کی نسبت یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے اور رحمان و کریم بھی۔ وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور ورحیم بھی، وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے۔ خفا بھی ہوتا ہے اور نوازتا بھی ہے۔ اس سے ڈرنا چاہیے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہیے:

﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ؀ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ؀ ﴾

(۷/ الاعراف: ۵۵، ۵۶)

''(لوگو)! اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر چپکے چپکے پکارا کرو۔ وہ حد سے بڑھ جانے والوں کو پیار نہیں کرتا اور زمین کی درستی کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ اور اس کو اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اور اس کے فضل وکرم کی لولگاتے ہوئے پکارا کرو، بے شک خدا کی رحمت اچھے کام

[1] یرمیاہ ۳۲، ۱٤، ۱۵ وغیرہ۔ [2] خروج ۲۰، ۵، ص: ۱۱۹ و ۳٤، ۷ واستثناء ٤، ۳٤، ۷: ۱٤٤ استثناء: ٤، ۳۲: ص ۲۸۵، ٦، ۱۵ ص: ۲۸۹، ۲۹۰ وغیرہ۔ [3] خروج ۲۰، ۷: ص: ۱۱۹ و ۳٤، وزبور ۵٦۔۱ ص: ۱۰، ۳، ۱، ۸، ص: ٤، ۱۵۰ و ۱۰۳، ۸، وغیرہ میں خدا کے پیار اور رحم وکرم کا ذکر ہے۔

[4] لوقا کی انجیل ۱۲، ۵ ص: ۱۱۷ اول پطرس ۱۷، ص: ۳۷۷ دوم قرنتھون ۷۔۱۔ افسیون ۵، ۲۱ ص: ۱۳۱۷ الغرض خدا سے ڈرنے کی تعلیم عیسائیت میں بھی دی گئی ہے۔

کرنے والوں کے قریب رہتی ہے۔''

چند نیک بندوں کی مدح میں فرمایا:

﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۹۰)

''وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہم کو امید اور ڈر کے ساتھ پکارتے تھے۔''

اس سے زیادہ پُر لطف بات یہ ہے کہ اسلام خدا سے لوگوں کو ڈراتا ہے۔ مگر اس کو جبار اور قہار کہہ کر نہیں بلکہ مہربان اور رحیم کہہ کر۔ چنانچہ خدا کے سعید بندوں کی صفت یہ ہے کہ

﴿ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ﴾ (۳۶/ یٰسٓ:۱۱)

''اور رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔''

﴿ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ﴾ (۵۰/ قٓ:۳۳)

''اور جو رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔''

نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کی زبانیں اس مہربان کے جلال کے سامنے گنگ ہیں:

﴿ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۰۸)

''اور رحم والے کے ادب سے تمام آوازیں پست ہو گئیں۔''

دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے، وہ دو قسم کے تھے، ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ تھا۔ اس لیے وہ صرف خدا کے خوف وخشیت کی تعلیم دیتے تھے۔ مثلاً: حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السلام دوسرے وہ جو محبتِ الٰہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی خم خانہ عشق کی طرف بلاتے تھے۔ مثلاً: حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام۔

لیکن پیغمبروں میں ایک ایسی ہستی بھی آئی۔ جو ان دونوں صفتوں کی برزخ کبریٰ، جلال و جمال دونوں کا مظہر اور پیار اور ادب ولحاظ دونوں کی جامع تھی۔ یعنی محمد رسول اللہ ﷺ۔ ایک طرف آپ کی آنکھیں خوفِ الٰہی سے اشک بار رہتی تھیں دوسری طرف آپ کا دل خدا کی محبت اور رحم وکرم کے سرور سے سرشار رہتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں یہ دونوں منظر آپ ﷺ کے چہرہ انور پر لوگوں کو نظر آجاتے۔ چنانچہ جب راتوں کو آپ شوق وولولہ کے عالم میں نماز کے لیے کھڑے ہوتے۔ قرآن مجید کی لمبی لمبی سورتیں زبانِ مبارک پر ہوتیں اور ہر معنی کی آیتیں گزرتی جاتیں جب کوئی خوف وخشیت کی آیت آتی پناہ مانگتے اور جب کوئی مہر ومحبت اور رحم وبشارت کی آیت آتی تو اس کے حصول کی دعا کرتے تھے۔ [1]

الغرض اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ خوف اور محبت کے کناروں سے ہٹا کر جہاں سے ہر وقت نیچے

[1] مسند احمد، ج ۶، ص: ۹۳۔

گرنے کا خطرہ ہے۔خوف وخشیت اور رحم ومحبت کے بیچ کے شاہراہ میں وہ انسانوں کو کھڑا کرے۔اس لیے کہا گیا ہے کہ ((الایمان بین الخوف والرجاء)) ''ایمان کامل خوف اور امید کے درمیان ہے۔'' کہ تنہا خوف لوگوں کو خدا کے رحم وکرم سے ناامید اور محض رحم وکرم پر بھروسہ لوگوں کو خودسر اور گستاخ بنا دیتا ہے۔جیسا کہ اس عملی دنیا کے روزانہ کے کاروبار میں نظر آتا ہے اور مذہبی حیثیت سے اس کے نتائج کا مشاہدہ عملاً یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا جا سکتا ہے، اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی تعلیم میں ان دونوں متضاد کیفیتوں کو ایمان اور عقیدہ کی رو سے برابر کا درجہ دیا۔لیکن ساتھ ہی عاجز ودرماندہ انسانوں کو یہ بھی بشارت سنائی کہ خدا کی رحمت کا دائرہ اس کے غضب کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے۔فرمایا:

﴿ وَرَحْمَتِىْ وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ ۭ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵٦)

''اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔''

اور اس کی تفسیر خود صاحب قرآن ﷺ نے ان الفاظ میں کی:

((رحمتی سبقت غضبی)) [1]

''میرے غضب سے میری رحمت آگے بڑھ گئی۔''

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا اور اپنے کو فرزند الٰہی کا لقب دیا، بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا خانوادہ اور محبوب ٹھہرایا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جوڑ پر حضرت عزیر علیہ السلام کو فرزند الٰہی کا رتبہ دیا۔لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان یا خاص قوم کو عطا نہیں کرتا، بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی اور اطاعت کی ایک سطح پر لاکر کھڑا کرتا ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو دعویٰ تھا:

﴿ نَحْنُ اَبْنٰۗؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ ۭ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۸)

''ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔''

قرآن مجید نے اس کے جواب میں کہا:

﴿ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۭ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۸)

''اگر ایسا ہے تو خدا تمہارے گناہوں کے بدلہ تم کو عذاب کیوں دیتا ہے، (اس لیے تمہارا دعویٰ صحیح نہیں) بلکہ تم بھی انہیں انسانوں میں سے ہو جس کو اس نے پیدا کیا۔''

دوسری جگہ قرآن نے تنہا یہودیوں کے جواب میں کہا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَاۗءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ Ǻ﴾ (٦٢/ الجمعۃ:٦)

[1] بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللّٰہ: بل ھو قرآن مجید:۷۵۵٤۔

"اے وہ جو یہودی ہو، اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ تمام انسانوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے خاص چہیتے ہو، تو موت (یعنی خدا کی ملاقات) کی تمنا کیوں نہیں کرتے۔"

اسلام رحمتِ الٰہی کے دائرہ کو کسی خاندان اور قوم تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ وہ اس کی وسعت میں انسانوں کی ہر برادری کو داخل کرتا ہے۔ ایک شخص نے مسجد نبوی میں آ کر دعا کی کہ "خدایا مجھ کو اور محمد ﷺ کو مغفرت عطا کر، آپ نے فرمایا: "خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا۔" [1] ایک اور اعرابی نے مسجد میں دعا مانگی کہ خدایا مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحمت بھیج اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ کر، آپ نے صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرمایا: "یہ زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ۔" [2]

محبت کی جسمانی اصطلاحات کی ممانعت

اس سلسلہ میں تعلیمِ محمدی ﷺ کے متعلق غلط فہمی کا دوسرا سبب جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ ہے کہ بعض مذاہب نے خدا کی محبت وکرم کی تعبیر کے لیے جو مادی اور جسمانی اصطلاحیں قائم کی تھیں اسلام نے ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اسلام کا خدا رحم وکرم اور محبت اور پیار کے اوصاف سے معرا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان دوسرے غیر مادی خیالات کی طرح خدا اور بندہ کے باہمی مہر ومحبت کے جذبات کو بھی اپنی ہی انسانی بول چال میں ادا کر سکتا ہے۔ محبت اور پیار کے یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی مادی اور جسمانی رشتوں کے ذریعہ سے نمایاں ہوتے ہیں، اس بنا پر بعض مذاہب نے اس طریقہ ادا کو خالق ومخلوق کے ربط وتعلق کے اظہار کے لیے بھی بہترین اسلوب سمجھا، چنانچہ کسی نے خالق اور مخلوق کے درمیان باپ اور بیٹے کا تعلق پیدا کیا، جیسا کہ عیسائیوں میں ہے دوسرے نے ماں کی محبت کا بڑا درجہ سمجھا، اس لیے اس تعلق کو ماں اور بیٹے کی اصطلاح سے واضح کیا اور دیویاں انسانوں کی ماتائیں بنیں۔ جیسا کہ ہندوؤں کا عام مذہبی تخیل ہے۔ خاص ہندوستان کی خاک میں زن وشو کی باہمی محبت کا امتیازی خاصہ ہے جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی ہے، اس کی نگاہ میں محبت کا اس سے زیادہ پر اثر منظر اور ناقابل شکست پیمان کوئی دوسرا نہیں۔ اس لیے یہاں کے بعض فرقوں میں خالق ومخلوق کی باہمی محبت کے تعلق کو زن وشو کی اصطلاح سے ادا کیا گیا، "سدا سہاگ"، فقرا اس تخیل کی مضحکہ انگیز تصویر ہیں۔

یہ تمام فرقے جنہوں نے خدا اور بندہ کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا وہ راہ سے بے راہ ہو گئے اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام کو بلکہ خواص تک کو گمراہ کر دیا اور لفظ کی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ٦٠١٠؛ ابوداود، کتاب الصلوة، باب الدعاء فی الصلوٰة: ٨٨٢؛ مسند امام احمد، ج ٢، ص: ١٧٠، ١٧١۔

[2] ابوداود، کتاب الادب، باب من ليست له غيبة: ٤٨٨٥؛ مستدرك حاكم، ج ٤، ص: ٢٤٨۔

اصلی روح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں گرفتار ہو گئے۔ عیسائیوں نے واقعی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا سمجھ لیا۔ ہندوستان کے بیٹوں نے ماتاؤں کی پوجا شروع کر دی۔ سدا سہاگ فقیروں نے چوڑیاں اور ساڑیاں پہن لیں اور خدائے قادر سے شوخیاں کرنے لگے۔ اسی لیے اسلام نے جو توحید خالص کا مبلغ تھا۔ ان جسمانی اصطلاحات کی سخت مخالفت کی اور خدا کے لیے ان الفاظ کا استعمال اس نے ضلالت اور گمراہی قرار دیا۔ لیکن وہ ان الفاظ کے اصلی معنی اور منشا کو اس مجاز کے پردہ میں جو حقیقت مستور ہے اس کا انکار نہیں کرتا۔ بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق ومخلوق اور عبد ومعبود کے ربط وتعلق کے اظہار کے لیے ناکافی اور غیر مکمل سمجھتا ہے اور وہ ان سے بھی زیادہ وسیع وکامل معنی کا طالب ہے:

﴿ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۰۰)

''تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔''

دیکھو کہ باپ کی طرح محبت کو وہ اپنے پروردگار کی محبت کے لیے ناکافی قرار دیتا ہے اور عبد ومعبود کے درمیان محبت کے رشتہ کو اس سے اور زیادہ مضبوط کرنا چاہتا ہے۔

الغرض رحمت ومحبت کے اس جسمانی طریقہ تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا، کہ اسلام سرے سے خالق ومخلوق اور عبد ومعبود کے درمیان محبت اور پیار کے جذبات سے خالی ہے، اتنا کون نہیں سمجھتا کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بولی میں اتری ہیں۔ ان کے تمام خیالات وتصورات اسی مادی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں اس لیے ان کے ذہن میں کوئی غیر مادی اور غیر جسمانی تصور کسی مادی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہِ راست پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے لیے ان کے لغت میں کوئی ایسا لفظ مل سکتا ہے جو غیر کسی مادی اور غیر جسمانی مفہوم کو اس قدر منزہ اور بلند طریقہ سے بیان کرے، جس میں مادیت اور جسمانیت کا مطلق شائبہ نہ ہو، انسان ان دیکھی چیزوں کا تصور صرف دیکھی ہوئی چیزوں کی تشبیہ سے کرتا ہے اور اس طرح ان دیکھی چیزوں کا ایک دھندلا سا عکس ذہن کے آئینہ میں اتر جاتا ہے۔

اس ''ان دیکھی ہستی'' کی ذات وصفات کے متعلق جس کو تم خدا کہتے ہو ہر مذہب میں ایک تخیل ہے غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ تخیل بھی اس مذہب کے پیروؤں کے گرد وپیش کی اشیاء سے ماخوذ ہے لیکن ایک بلند تر اور کامل تر مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس تخیل کو مادیت، جسمانیت اور انسانیت کی آلائشوں سے اس حد تک پاک ومنزہ کر دے جہاں تک بنی نوع انسان کے لیے ممکن ہے خدا کے متعلق باپ، ماں اور شوہر کا تخیل اس درجہ مادی، جسمانی اور انسانی ہے کہ اس تخیل کے معتقد کے لیے ناممکن ہے کہ وہ خالص توحید کے صراط مستقیم پر قائم رہ سکے، اسی لیے نبوتِ محمدی ﷺ نے ان مادی تعلقات اور جسمانی رشتوں کے ظاہر کرنے والے الفاظ کو خالق ومخلوق کے اظہار ربط وتعلق کے باب میں یک قلم ترک کر دیا بلکہ ان کا استعمال بھی شرک

قرار دیا، تاہم چونکہ روحانی حقائق کا اظہار بھی انسانوں ہی کی مادی بولی میں کرنا ہے۔اس لیے اس نے جسمانی و مادی رشتہ کے بجائے جس کو دوسرے مذاہب نے منتخب کیا تھا اس رشتہ کے محض جذبات، احساسات اور عواطف کو خالق ومخلوق کے تعلقات باہمی کے اظہار کے لیے اسلام نے مستعار لے لیا اس طرح خالق ومخلوق کے درمیان کوئی جسمانی رشتہ قائم کیے بغیر اس نے ربط وتعلق کا اظہار کیا اور انسانوں کے استعمالات کی لفظی غلطی سے جو گمراہیاں پہلے پیش آچکی تھیں ان سے ان کو محفوظ رکھا۔ ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لیے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں جن کو کسی خاص تخیل اور نصب العین کی بنا پر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے۔ اور گو ان کی حیثیت اب علم اور نام کی ہے، تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھ کر استعمال کیے گئے ہیں ہر قوم نے اس علم اور نام کے لیے اسی وصف کو پسند کیا ہے جو اس کے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہوسکتی ہے۔

اسلام نے خالق کے لیے جو نام اور عَـلَـم اختیار کیا ہے وہ لفظ اللہ ہے اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے اس میں اہلِ لغت کا یقیناً اختلاف ہے۔مگر ایک گروہ کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہ وَلَاہٌ سے نکلا ہے اور وَلَہٌ کے اصل معنی عربی میں اس ''غم محبت'' اور ''تعلقِ خاطر'' کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے، اسی سے بعد میں مطلق ''عشق ومحبت'' کے معنی پیدا ہوگئے، اور اسی سے ہماری زبان میں لفظ والہ (شیدا) مستعمل ہے۔اس لیے اللہ کے معنی محبوب اور پیارے کے ہیں جس کے عشق ومحبت میں نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات کے دل سرگرداں متحیر اور پریشان ہیں۔حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ گنج مراد آبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے، اللہ کا ترجمہ ہندی میں وہ (من موہن) یعنی ''دلوں کا محبوب'' کیا کرتے تھے۔

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتوں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے وہ رحمٰن اور رحیم ہیں۔ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں یعنی ''رحم والا'' ''مہربان'' لطف وکرم والا'' ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' (یعنی مہربان محبوب رحم والا) کے ضمن میں قرآن مجید کے ہر سورہ کے آغاز میں انہیں صفات ربانی کے بار بار دہرانے کی تاکید کی گئی ہے، ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے کیا اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح کرنے کے لیے کوئی دلیل مطلوب ہے۔لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں دوسرا علم یہی لفظ رحمٰن ہے جو رحم وکرم اور لطف ومہر کے معنی میں صفت مبالغہ کا صیغہ ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۚ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآئیل: ۱۱۰)

''اس کو ''محبوب'' (اللہ) کہو یا ''مہربان'' (رحمٰن) کہو جو کہہ کر اس کو پکارو سب اچھے نام اسی

کے ہیں۔"

قرآن مجید نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی صد ہا بار کی تکرار کو چھوڑ کر ۵۳ موقعوں پر خدا کو اس رحمٰن کے نام سے یاد کیا ہے۔

ابھی اس سے پہلے باب میں اسمائے الٰہی کا ایک ایک حرف ہماری نظر کے سامنے سے گزر چکا ہے۔ ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے ہر قسم کے جلالی و جمالی اوصاف آ گئے ہیں، استقصا کرو تو معلوم ہوگا کہ ان میں بڑی تعداد انہی ناموں کی ہے جن سے اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم اور مہر ومحبت کا اظہار ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام یا ایک وصف الودود (سورۂ ذات البروج میں) آیا ہے، جس کے معنی "محبوب" اور "پیارے" کے ہیں کہ وہ سرتاپا مہر ومحبت اور عشق اور پیار ہے۔ اس کے سوا خدا کا ایک اور نام الولی ہے جس کے لفظی معنی "یار" اور "دوست" کے ہیں، خدا کا ایک اور نام قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے، وہ "الرؤف" ہے "رؤف" کا لفظ "رافت" سے نکلا ہے "رافت" کے معنی اس محبت اور تعلقِ خاطر کے ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے، اسی طرح خدا کا ایک اور نام حنان "حن" سے مشتق ہے "حن" اور "حنین" اس سوزِ دل اور محبت کو کہتے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، یہ الفاظ ان مجازی اور ان مستعار معانی کو ظاہر کرتے ہیں جو اسلام نے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط وتعلق کے اظہار کے لیے اختیار کیے ہیں، دیکھو کہ وہ ان رشتوں کا نام نہیں لیتا لیکن ان رشتوں کے درمیان محبت اور پیار کے جو خاص جذبات ہیں ان کو خدا کے لیے بے تکلف استعمال کرتا ہے۔ اس طرح مادیت اور جسمانیات کا تخیل آئے بغیر وہ ان روحانی معنوں کی تلقین کر رہا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ وہ غفار (بخشش کرنے والا) اور غفور (بخشنے والا) ہے۔ یعنی بندوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا، وہ سلام (امن وسلامتی) ہے کہ وہ سرتاپا اپنے بے پناہ بندوں کے لیے امن اور سلامتی ہے، پھر وہ مؤمن (امن دینے والا) ہے۔ وہ العدل یعنی سرتاپا انصاف ہے، وہ **العفو** (معاف کرنیوالا) ہے۔ **الوھاب** (عطا کرنے والا) **الحلیم** (بردبار) **الصبور** (بندوں کی گستاخیوں پر صبر کرنے والا) **التواب** (بندوں کے حال پر رجوع کرنیوالا) **البر** (نیک اور مجسم خیر) اور **المقسط** (منصف اور عادل ہے) ان میں ہر لفظ پر ٹھہر کر ذرا غور کرو کہ اسلام کا تخیل کس قدر بلند اور برتر ہے۔

تورات کے اسفار، انجیل کے صحیفوں اور ہندوؤں کے ویدوں کے حصص کا ایک ایک ورق پڑھ جاؤ، کیا اللہ تعالیٰ کے لیے ایسے پرمحبت اور سراپا مہر وکرم اسماء وصفات کی یہ کثرت تم کو وہاں ملے گی؟ یہ سچ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کے لیے ماں اور باپ کا لفظ یہود ونصاریٰ اور ہنود کی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا، مگر اس سے یہ قیاس کرنا غلطی ہے کہ وہ اس لطفِ احساس اور مہر وکرم کے جذبات وعواطف سے خالی ہے جن کو یہ فرقے اپنا مخصوص سرمایہ سمجھتے ہیں مگر بات یہ ہے کہ ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات کے ساتھ وہ شرک وکفر کی اس ضلالت اور گمراہی سے بھی انسانوں کو بچانا چاہتا ہے جو ذرا سی لفظی غلط فہمی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو

اصلیت سمجھ کر پاک اور سرتا پا روحانی معنوں کو مادی اور مجسم یقین کر لیتے ہیں اور اس لیے وہ اس بلند تر توحید کی سطح سے بہت نیچے گر کر سر رشتہ حقیقت کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ متکلم ازل کا آخری پیغام لے کر آئے تھے، اس لیے ضرورت تھی کہ آپ کی تعلیم اس قسم کی لغزشوں سے پاک ومبرا ہو، روحانی حقائق کی تعبیر کے لیے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا یقیناً مادی اور جسمانی استعارات اور مجازات سے چارہ نہیں، تاہم ایک دائمی تعلیم کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنی تعلیم کو استعمالات کی غلطیوں اور مجازات کی غلط فہمیوں سے محفوظ رکھے، چنانچہ اسلام نے اسی بنا پر ان استعارات اور مجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہے اور خدا کے مہر وکرم اور عشق ومحبت کے تذکروں کے ساتھ ادب ولحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کیا ہے، قرآن مجید اور احادیث، روحانی عشق ومحبت کے ان دلآویز اور ولولہ انگیز حکایات سے معمور ہیں، بااں ہمہ اسلام انسان کو بیٹا اور خدا کو (باپ) نہیں کہتا کہ عبد ومعبود کے تعلقات کے اظہار کے لیے اس کے نزدیک یہ کوئی بلند تر تعبیر نہیں، وہ خدا کو اب باپ کی بجائے ''رب'' کہہ کر پکارتا ہے وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے۔

''اَبٌ اور رَبٌّ'' ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل اسلام کے مطمح نظر سے کس درجہ پست ہے، اَبْ یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بنا پر ایک خاص لحظہ میں قائم ہوتا ہے، اور پھر اس کی حیثیت بدل کر، پرورش اور حفاظت کی صورت میں وہ بچپن کے ایک محدود عرصے تک قائم رہتا ہے، اس طرح گو باپ کو بیٹے کے وجود میں یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے، مگر یہ تعلق حد درجہ ناقص، محدود، اور فانی ہوتا ہے، بیٹے کے وجود، قیام وبقا، ضروریاتِ زندگی، سامانِ حیات، نشو ونما اور ارتقا کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اپنے باپ سے الگ، مستقل، اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے، مگر ذرا غور کرو، کیا عبد ومعبود اور خالق ومخلوق کے درمیان جو ربط وتعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے؟ کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کے لیے بھی، بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے؟ کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے؟

ربوبیت (پرورش) عبد ومعبود اور خالق ومخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک اور پیدائش سے وفات تک، بلکہ وفات کے بعد سے ابد تک قائم رہتا ہے جو ایک لمحہ کے لیے منقطع نہیں ہو سکتا، جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے، وہ گہوارہ عدم سے لے کر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے انسان ذرہ ہو، یا بصورت غذا، قطرہ آب ہو، یا قطرہ خون، مضغہ گوشت ہو یا مشتِ استخوان، شکمِ مادر میں ہو یا اس سے باہر، بچہ ہو یا جوان، ادھیڑ عمر ہو یا بوڑھا، کوئی آن، کوئی لمحہ، رب کے مہر وکرم اور لطف ومحبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت، جسمانیت، ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے،

اس سے لفظ ''رب'' یک قلم پاک ہے، اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں جن میں نصرانیت اور ہندویت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے۔

ان آیتوں اور حدیثوں کو دیکھو جن سے یہ روشن ہوتا ہے کہ اسلام کا سینہ اس ازلی وابدی عشق ومحبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے، اور وہ خمخانہ اَلَسْتُ کی سرشاری کی یاد بھکے ہوئے انسانوں کو کس کس طرح دلا رہا ہے، اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے، ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت ''حبِ الٰہی'' ہے اور یہ وہ دولت ہے جو اہلِ ایمان کی پہلی جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی، زبانِ الٰہی نے شہادت دی:

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ ﴾ (۲/ البقرة:۱٦٥)

''جو ایمان لائے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں۔''

اس نشہ محبت کے سامنے باپ، ماں، اولاد، بھائی، بیوی، جان ومال، خاندان سب قربان اور نثار ہو جانا چاہیے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰي يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ ﴾ (۹/ التوبة:۲٤)

''اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ دولت جو تم نے کمائی ہے اور وہ سوداگری جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو خدا اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ محبوب اور پیارے ہیں تو اس وقت تک انتظار کرو کہ خدا اپنا فیصلہ لے آئے۔''

ایمان کے بعد بھی اگر نشہ محبت کی سرشاری نہیں ملی تو وہ بھی جادۂ حق سے دوری ہے۔ چنانچہ جو لوگ کہ راہ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے ان کو پکار کر سنا دیا گیا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ ﴾

(۵/ المآئدة:۵٤)

''مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین اسلام سے پھر جائے گا تو خدا کو اس کی کچھ پروا نہیں، وہ ایسے لوگوں کو لا کھڑا کرے گا، جن کو وہ پیار کرے گا اور وہ اس کو پیار کریں گے۔''

حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا: ''درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔'' ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے۔ تم کو زید کی محبت کا دعویٰ ہے۔ مگر نہ تمہارے دل میں اس کے دیدار کی تڑپ ہے، نہ تمہارے سینہ میں صدمہ فراق کی جلن ہے اور نہ آنکھوں میں ہجر وجدائی کے آنسو ہیں، تو

کون تمہارے دعویٰ کی تصدیق کرے گا، اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعوے دار تو بہتیرے ہو سکتے ہیں۔ مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی نشانیاں اور ظاہری علامتیں، اس کے احکام کی پیروی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ خدا کے رسول کو اس اعلان کا حکم ہے:

﴿ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾ (۳/ آل عمران:۳۱)

''اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو کہ خدا بھی تم کو پیار کرے گا۔''

محبت کیونکر حاصل ہو، وحی محمدی نے اس رتبہ بلند کے حصول کی تدبیر بھی بتا دی۔ فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴾

(۱۹/ مریم:۹۶)

''جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے رحمت والا خدا، ان کے لیے محبت پیدا کرے گا۔''

اس آیت میں محبت کے حصول کے ذریعے دو بتائے گئے ہیں ایمان اور عملِ صالح، یعنی نیک کام۔ چنانچہ طبقات انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں جن کو ان ذریعوں سے خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۳)

''خدا نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۲)

''خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۹)

''خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۲۔ ۴۹/ الحجرات:۹)

''خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (۹/ التوبۃ:۴)

''خدا پرہیز گاروں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ ﴾ (۶۱/ الصف:۴)

''خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کے راستہ میں لڑتے ہیں۔''

﴿ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۴۶)

''اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۰۸)

''اور خدا پاک صاف لوگوں کو پیار کرتا ہے۔''

مسند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ تین قسم کے آدمیوں سے محبت کرتا ہے اور تین قسم کے آدمیوں کو پیار نہیں کرتا، محبت ان سے کرتا ہے، جو خدا کی راہ میں خلوص نیت کے ساتھ اپنی جان فدا کرتے ہیں اور ان کو جو اپنے پڑوسی کے ظلم پر صبر کرتے ہیں اور ان سے جو وضو کر کے خدا کی یاد کے لیے اس وقت اٹھتے ہیں جب قافلہ رات کے سفر سے تھک کر آرام کے لیے بستر لگاتا ہے اور خدا کی محبت سے محروم یہ تین ہیں۔ اترانے والا مغرور، احسان دھرنے والا بخیل، جھوٹی قسمیں کھا کھا کر مال بیچنے والا سوداگر۔'' [1]

دنیا کے عیش و مسرت میں اگر کوئی خیال کا کانٹا سا چبھتا ہے اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدر اور مبغض بنا کر بے فکری کی بہشت کو فکر و غم کی جہنم بنا دیتا ہے تو وہ ماضی اور حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہے۔ پہلے کا نام حزن و غم ہے اور دوسرے کا نام خوف و دہشت ہے۔ غرض غم اور خوف یہی دو کانٹے ہیں جو عاجز و درماندہ انسانیت کے پہلو میں ہمیشہ چبھتے رہے ہیں، لیکن جو محبوب حقیقی کے طلب گار اور اس کے والہ و شیدا ہیں ان کو بشارت ہے کہ ان کے عیش کا چمن زار ان کانٹوں سے پاک و صاف ہوگا:

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ﴾ (۱۰/ یونس:۶۲)

''ہاں خدا کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہے، اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

محبت کا جو جذبہ بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان، نیکی، درگزر اور عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کا نام ''رحم'' اور ''رحمت'' ہے۔ اسلام کا خدا تمام تر رحم ہے۔ اس کی رحمت کے فیض سے عرصۂ کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے۔ اس کا نام رحمٰن و رحیم ہے، جو کچھ یہاں ہے سب اس کی رحمت کا ظہور ہے وہ نہ ہو تو کچھ نہ ہو۔ اسی لیے اس کی رحمت سے ناامیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے۔ مجرم سے مجرم اور گناہگار سے گناہگار کو وہ نوازنے کے لیے ہمہ وقت آمادہ و تیار ہے۔ گناہگاروں اور مجرموں کو وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے میرے بندے کہہ کر تسلی کا یہ پیام بھیجتا ہے:

﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ ﴾ (۳۹/ الزمر:۵۳)

''اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو پیام پہنچا دے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اللہ یقیناً تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے کہ بے شک وہی بخشش کرنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔''

فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت سناتے ہیں تو کہتے ہیں:

[1] مسند احمد، ج ۵، ص: ۱۷۶؛ جامع ترمذی، ابواب صفۃ الجنۃ: ۲۵۶۸۔

﴿ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ۝ ﴾ (۱۵/ الحجر:۵۵) ''ناامیدوں میں سے نہ ہو۔''

خلیل اللہ اس رمز سے ناآشنا نہ تھے کہ مرتبہ خلت، محبت سے مافوق ہے، جواب دیا:

﴿ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ۝ ﴾ (۱۵/ الحجر:۵۶)

''اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے سوا اور کوئی مایوس نہیں ہوتا۔''

بندوں کی جانب سے خدا پر کوئی پابندی عائد نہیں مگر اس نے خود اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر کچھ چیزیں فرض کر لی ہیں، من جملہ ان کے ایک رحمت بھی ہے۔ خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے، وہ گنہگاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے، وہ سیہ کاروں کو ان کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے۔ وہ غالب ہے، وہ قاہر ہے، وہ جبار ہے، وہ منتقم ہے، لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور بھی ہے۔ رحمان و رحیم بھی ہے، رؤف و عفو ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود بخود عائد کر لی ہے اور اپنے اوپر اس کو فرض گردان لیا ہے۔

﴿ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ ﴾ (۶/ الانعام:۵۴)

''اللہ نے از خود اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔''

قاصدِ خاص کو حکم ہوتا ہے کہ ہمارے گناہ گار بندوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچاؤ اور تسلی کا یہ پیام دو کہ اس کا بابِ رحمت ہر وقت کھلا ہے:

﴿ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝ ﴾ (۶/ الانعام:۵۴)

''اے پیغمبر! جب تیرے پاس وہ آئیں جو میری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں تو ان کو کہہ، کہ تم پر سلامتی ہو، تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر از خود اپنے بندوں پر مہربان ہونا لازم کر لیا ہے، کہ جو کوئی تم میں سے براہِ نادانی برائی کر بیٹھے، پھر اس کے بعد بارگاہِ الٰہی کی طرف رجوع کرے اور نیک بنے، تو بے شک وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصہ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایہ رحمت سے محروم نہیں:

﴿ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵۶)

''اور میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔''

بخاری و ترمذی وغیرہ کی صحیح حدیثوں میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا تو اس نے اپنے دستِ خاص سے اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کر لی۔'' [1] جامع ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ماجاء فی قولہ: ((وھو الذی یبدء الخلق: ۳۱۹۴؛ صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی سعۃ رحمۃ اللّٰہ: ۶۹۷۱؛ جامع ترمذی، ابواب الدعوات: ۳۵۴۳۔

نے فرمایا: ''کہ اگر مومن کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کے پاس کتنا عتاب ہے تو وہ جنت کی طمع نہ کرتا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے، تو وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا۔'' [1] یہ اسلام کے تخیل کی صحیح تعبیر ہے بارگاہ احدیت کا آخری قاصد اپنے دربار کی جانب سے گناہگاروں کو بشارت سناتا ہے کہ اے آدم کے بیٹو! جب تک تم مجھے پکارتے رہو گے اور مجھ سے آس لگائے رہو گے میں تمہیں بخشتا رہوں گا خواہ تم میں کتنے ہی عیب ہوں، مجھے پروانہیں، اے آدم کے بیٹو! اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں اور پھر تم مجھ سے معافی مانگو تو میں معاف کردوں خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں مجھے پروانہیں۔ اے آدم کے بیٹو! اگر پوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو، پھر تم میرے پاس آؤ اس حال میں کہ کسی کو میرا شریک نہ بناتے ہو، تو میں بھی تمہارے پاس پوری سطح زمین بھر مغفرت لے کر تمہارے پاس آؤں، [2] کیا انسانوں کے کانوں نے اس رحمت، اس محبت، اس عفو عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سنی ہے؟

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ صحابی کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر تم گناہ نہ کرتے تو خدا اور مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور وہ اس کو بخشتا۔'' [3] یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رحم و کرم کے اظہار کے لیے گناہگاروں ہی کی تلاش ہے کہ نیکوکاروں کو تو سب ڈھونڈتے ہیں، مگر گناہگاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے۔

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم و کرم اور مہر و محبت کے عناصر پائے جاتے ہیں، جن کی بنا پر دوستوں، عزیزوں، قرابت داروں اور اولادوں میں میل ملاپ اور رسم و محبت ہے اور جس کی بنا پر دنیا میں عشق و محبت کے یہ شاندار مناظر نظر آتے ہیں، تم کو معلوم ہے کہ یہ اس شاہد حقیقی کے سرمایہ محبت کا کون سا حصہ ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کیے ان میں سے ایک حصہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا، جس کے اثر سے وہ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں باقی ننانوے حصے خدا کے پاس ہیں۔'' [4] اس لطف و کرم اور مہر و محبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سنائی ہیں اور کس نے گناہگار انسانوں کے مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے؟ صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک شخص شراب خواری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا، صحابہ نے تنگ آ کر کہا، یا اللہ! تو اپنی لعنت اس پر نازل کر کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے۔ رحمۃ للعالمین کو لوگوں کی یہ بات ناپسند آئی۔ فرمایا: ''اس پر لعنت نہ کرو کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت ہے۔'' [5] تم نے دیکھا کہ اسلام نے گناہگاروں کے لیے بھی خدا کی محبت کا دروازہ کھول رکھا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی سعة رحمة اللّٰه: ٦٩٧٩؛ جامع ترمذی، ابواب الدعوات: ٣٥٤٢ دیگر کتب احادیث (صحیح) [2] جامع ترمذی، ابواب الدعوات: ٣٥٤٠۔ [3] مسند احمد، ج ٥، ص: ٤١٤۔

[4] بخاری، کتاب الادب، باب جعل اللّٰه الرحمة فی مائة جزء: ٦٠٠٠۔

[5] بخاری، کتاب الحدود، باب مایکره من لعن شارب الخمر: ٦٧٨٠۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے ان عربوں کو جو خدا کی محبت کیا، خدا کی معرفت سے بھی ناآشنا تھے۔ کس طرح آشنائے حقیقت کر دیا، اور اس ذات الٰہی کے ساتھ اپنی وابستگی، محبت اور سرشاری کے لطف سے ان کو کس درجہ بہرہ اندوز کر دیا۔ بلال رضی اللہ عنہ کو دیکھو ٹھیک دوپہر کو عرب کی جلتی ہوئی ریت میں ان کو لٹایا جاتا ہے۔ ایک گرم پتھر ان کے سینہ پر رکھا جاتا ہے اور خدائے واحد سے انحراف کے لیے ان کو مجبور کیا جاتا ہے اور وہ یہ سب تکلیفیں اٹھا رہے ہیں مگر زبان پر صرف احد احد وہی ایک وہی ایک کا ترانہ ہے۔ [1] مکہ کا ذرہ ذرہ صدائے حق کا دشمن ہے۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ یہ جان کر بھی صحنِ مکہ میں جوشِ وحدت سے سرشار ہو کر کلمۂ توحید کا با آواز بلند اعلان کرتے ہیں، ہر طرف سے پتھروں اور ہڈیوں کی بارش ہوتی ہے۔ بعض لوگ آ کر چھڑا دیتے ہیں، دوسری صبح نمودار ہوتی ہے تو پھر وہی سرشاری ہوتی ہے اور مشرکین کی طرف سے وہی سزا ملتی ہے۔ [2]

ایک صحابی جورات کو میدان جنگ میں ایک پہاڑ پر پہرہ دینے پر متعین تھے۔ وہ اپنی نیند ٹالنے کے لیے خدا کی یاد کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، دشمن پے در پے تین دفعہ تیر مارتا ہے جو بدن میں پیوست ہو جاتا ہے اور وہ بدستور محو نماز ہیں۔ ان کے ساتھی پوچھتے ہیں کہ تم نے نماز کیوں نہیں توڑی کہتے ہیں کہ ''جو سورہ شروع کی تھی جی نہ چاہا کہ اس کو تمام کیے بغیر چھوڑ دوں۔'' [3]

محمد رسول اللہ ﷺ کے دو جانشین عین نماز میں زخم کھا کر گرتے ہیں، مگر مقتدیوں کی صف اس حیّ و باقی کے سامنے کھڑی ہو کر ہر فانی و میت ہستی کی محبت سے بے نیاز رہتی ہے۔ اسی لیے خدا نے بشارت دی کہ ان کا محبوب خدا اور وہ خود خدا کے محبوب تھے۔ یعنی رضی اللہ عنهم و رضوا عنه ۔مدینہ میں ایک اللہ والے مسلمان نے وفات پائی، اس کا جنازہ اٹھا تو فرمایا: ''اس کے ساتھ نرمی کرو کہ اللہ نے بھی اس کے ساتھ نرمی کی ہے، کیونکہ اس کو اللہ اور اس کے رسول سے محبت تھی۔'' قبر کھودی جانے لگی۔ فرمایا: ''اس کی قبر کشادہ رکھو کہ خدا نے اس کے ساتھ کشادگی فرمائی۔'' اس بار بار کے اہتمام کو دیکھ کر صحابہ نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ! آپ کو اس مرنے والے کی موت کا غم ہے؟ فرمایا: ''ہاں اس کو خدا اور رسول سے پیار تھا۔'' [4]

ایک دفعہ آپ نے ایک صحابی کو کسی جماعت کا افسر بنا کر بھیجا وہ جب نماز پڑھاتے تو ہر نماز میں ہر سورہ کے آخر میں قل ھو اللہ ضرور پڑھتے جب یہ جماعت سفر سے لوٹ کر آئی تو خدمت اقدس ﷺ میں یہ واقعہ عرض کیا۔ فرمایا: ''ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟'' لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا کہ یہ میں اس لیے کرتا ہوں کہ اس سورہ میں رحم والے خدا کی صفت کا بیان ہے تو مجھ کو اس کے پڑھنے سے محبت ہے۔ فرمایا: ''ان کو

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ذکر عدوان المشرکین، ج ۱، ص: ۱۹۵؛ اسد الغابۃ، ج ۱، ص: ۲۰۶، مصر۔

[2] طبقات ابن سعد جزء رابع، ص: ۱۶۵؛ تذکرۃ ابی ذر غفاری و صحیح بخاری، قصۃ اسلام ابی ذر: ۳۸۶۱۔

[3] سنن ابی داود، کتاب الطہارۃ، باب الوضوء من الدم: ۱۹۸؛ احمد، ۳/ ۳۴۴؛ صحیح ابن خزیمہ: ۳۶؛ حاکم، ۱/ /۱۵۶۔ [4] ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی حفر القبر: ۱۵۵۹۔

بشارت دو کہ وہ رحم والا خدا بھی ان سے محبت کرتا ہے۔'' [1] یہ بشارت محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک کے سوا کسی اور نے بھی سنائی ہے؟

صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمت والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! قیامت کب آئے گی؟ فرمایا: ''تم نے اس کے لیے کیا سامان کر رکھا ہے؟'' نادم ہو کر شکستہ دلی سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! میرے پاس نہ تو نمازوں کا نہ روزوں کا اور نہ صدقات وخیرات کا بڑا ذخیرہ ہے جو کچھ سرمایہ ہے وہ خدا اور رسول کی محبت کا ہے اور بس۔ فرمایا: ''تو انسان جس سے محبت کرے گا اسی کے ساتھ رہے گا۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس بشارت کو سن کر اس دن بڑی خوشی منائی۔ [2]

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب خدا کسی بندہ کو چاہتا ہے تو فرشتہ خاص جبریل علیہ السلام سے کہتا ہے کہ میں فلاں بندہ کو پیار کرتا ہوں تم بھی اس کو پیار کرو تو جبریل علیہ السلام بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور پھر زمین میں اس کو ہر دلعزیزی اور حسن قبول بخشا جاتا ہے۔'' [3]

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے راوی ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو بندہ اپنی اطاعتوں سے میری قربت کو تلاش کرتا رہتا ہے۔ تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اس کا وہ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، وراس کی وہ آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور وہ پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔'' [4] یہ دولت، یہ نعمت، یہ سعادت آستانہ محمدی ﷺ کے سوا کہیں اور نہیں بٹتی۔

امام بزار نے مسند میں حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نبی ہیں اور نہ شہید ہیں۔ لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیا اور شہدا بھی رشک کریں گے یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے اور اچھی باتیں بتاتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔'' [5] یہ قابل رشک رتبہ محمد رسول اللہ ﷺ کے سوا اور کس کے ذریعہ عطا ہوا۔

امام مالک نے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ خداوند تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ ان کا پیار کرنا مجھ پر لازم ہے جو آپس میں ایک دوسرے کو میری محبت کے سبب سے پیار کرتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور میری محبت میں ایک

---

[1] مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین باب فضل قراءۃ قل هو الله احد، : ۱۸۹۰ یہ واقعہ بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الجمع بین السورتین فی رکعة: ۷۷٤ میں دوسری طرح مروی ہے اور اس میں رسول اللہ ﷺ کے الفاظ بھی دوسرے ہیں۔

[2] مسلم، کتاب البر والصلة، باب المرء مع من احب: ٦٧١٦؛ بخاری، کتاب الادب، باب ماجاء فی قول الرجل ویلك: ٦١٦٧۔ [3] مسلم، کتاب البر والصلة، باب اذا احب الله عبدا...... : ٦٧٠٥۔

[4] بخاری، کتاب الرقاق باب التواضع: ٦٥٠٢۔ [5] اس کے ہم معنی حدیثیں ترمذی، مالک اور شعب الایمان بیہقی میں بھی ہیں: دیکھو مشکوۃ، کتاب الادب، باب الحب فی اللہ، فصل ثانی: ٥٠١١؛ شرح السنة: ٣٤٦٤۔

دوسرے کے لیے اپنی جان و مال وقف کرتے ہیں۔" ❶

یہ محبتِ الٰہی کی نیرنگیاں اسلام ہی کے پردہ میں نظر آتی ہیں۔

ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "لوگو! خدا سے محبت کرو کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے اور خدا کی محبت کے سبب مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کے سبب میرے اہل بیت سے محبت کرو۔" ❷ یہ عشق و محبت کی دعوت محبوب ازل کے سوا اور کون دے سکتا ہے؟

عام مسلمانوں میں پیغمبر اسلام کا لقب حبیب خدا ہے، دیکھو کہ حبیب و محبوب میں خلت و محبت کے کیا کیا ناز و نیاز ہیں۔ آپ خشوع و خضوع کی دعاؤں میں اور خلوت و تنہائی کی روحانی ملاقاتوں میں کیا ڈھونڈتے اور کیا مانگتے تھے۔ کیا چاہتے اور کیا سوال کرتے تھے؟ امام احمد اور بزار نے اپنی اپنی مسندوں میں، ترمذی نے جامع میں، حاکم نے مستدرک میں اور طبرانی نے معجم میں متعدد صحابیوں سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی دعاؤں میں محبت الٰہی کی دولت مانگا کرتے تھے۔ انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان ہے۔ لیکن محبوب خدا کی نگاہ میں یہ چیزیں ہیچ تھیں۔ دعا فرماتے تھے: "خداوندا!

((اسئل حبك وحب من يحبك وحب عمل يقرب الى حبك)) ❸

"میں تیری محبت مانگتا ہوں اور جو تجھ سے محبت کرتا ہے اس کی محبت اور اس کام کی محبت جو تیری محبت سے قریب کردے۔"

((اللّٰهم اجعل حبك احب الى من نفسي واهلي ومن الماء البارد)) ❹

"الٰہی تو اپنی محبت کو میری جان سے، اہل و عیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا۔"

عرب میں ٹھنڈا پانی دنیا کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہے۔ لیکن حضور کی پیاس اس مادی پانی کی خنکی سے نہیں سیر ہوتی تھی۔ وہ صرف محبت الٰہی کا زلال خالص تھا جو اس تشنگی کو تسکین دے سکتا تھا۔ عام انسان روٹی سے جیتے ہیں مگر ایک عاشق الٰہی (مسیح علیہ السلام) کا قول ہے کہ "انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا" پھر وہ کون سی روٹی ہے جس کو کھا کر انسان پھر کبھی بھوکا نہیں ہوتا حضور ﷺ دعا فرماتے ہیں:

((اللّٰهم ارزقني حبك وحب من ينفعني في حبك)) ❺

"خداوندا! تو اپنی محبت اور اس کی محبت جو تیری محبت کی راہ میں نافع ہے مجھے روزی کر۔"

---

❶ مستدرك حاكم، ج ٤، ص: ١٦٨، ١٦٩۔

❷ ترمذی، ابواب المناقب، باب في مناقب اهل بيت النبي ﷺ: ٣٧٨٩۔

❸ ترمذی، ابواب الدعوات: ٣٤٩٠؛ مستدرك حاكم، ١/ ٥٢٧۔ ❹ ایضًا۔

❺ ترمذی، ابواب الدعوات: ٣٤٩١۔

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرنا ہے۔ مگر جانتے ہو کہ اس راہ کی آخری منزل کیا ہے؟ صحیحین میں ہے:

((من كان الله ورسوله احب اليه مما سواهما)) [1]

''یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے تمام ماسوا کی محبتیں ہیچ ہو جائیں۔''

بعض مذاہب کو اپنی اس تعلیم پر ناز ہے کہ وہ انسانوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ اپنے خدا کو ماں باپ سمجھیں اور اس سے اسی طرح محبت کریں جس طرح وہ اپنے والدین سے کرتے ہیں اور چونکہ اسلام نے اس طریقۂ تعبیر کو اس بنا پر کہ وہ شرک کا راستہ ہے ممنوع قرار دیا ہے اس لیے ان مذاہب کے بہت سے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم محبت الٰہی کے مقدس جذبات سے محروم ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ دعویٰ سرتا پا بے بنیاد ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تعلیم محمدی کی بلندی نظر اور محبت کا علوئے معیار دونوں ان مذاہب کے پیش کردہ نظر و معیار سے بہت بالاتر ہیں قرآن مجید کی یہ آیت پاک بھی اس دعویٰ کے ثبوت میں پہلے پیش کی جا چکی ہے:

﴿ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۰۰)

''تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بہت زیادہ یاد کرو۔''

لیکن احادیث سے ہمارا یہ دعویٰ اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے، لڑائی کا میدان ہے، دشمنوں میں بھاگ دوڑ مچی ہے، جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آتا ہے اپنی جان بچا رہا ہے۔ بھائی بھائی سے، ماں بچہ سے، بچہ ماں سے الگ ہے۔ اسی حال میں ایک عورت آتی ہے۔ جس کا بچہ میدان حشر میں گم ہو گیا ہے۔ محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ جو بچہ بھی اس کے سامنے آجاتا ہے۔ اپنے بچہ کے جوشِ محبت میں اس کو چھاتی سے لگا لیتی ہے اور اس کو دودھ پلا دیتی ہے۔ رحمۃ للعالمین کی نظر پڑتی ہے۔ صحابہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: ''کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو اپنے ہاتھ سے دہکتی آگ میں ڈال دے۔'' لوگوں نے عرض کی، ہرگز نہیں۔'' فرمایا: ''تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچہ سے ہے خدا کو اپنے بندوں سے اس سے بہت زیادہ محبت ہے۔'' [2]

ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپ واپس تشریف لا رہے ہیں۔ ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لے کر سامنے آتی ہے اور عرض کرتی ہے۔ یا رسول اللہ ﷺ! ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے۔ کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟ فرمایا: ''ہاں بے شک اس سے زیادہ ہے۔'' بولی، تو کوئی ماں تو اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارا نہ کرے گی۔ یہ سن کر فرط اثر سے آپ پر گریہ طاری ہو گیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا: ''خدا صرف اس بندہ کو عذاب دیتا ہے جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے۔'' [3]

---

[1] مسلم، كتاب الايمان، باب بيان خصال من اتصف بهن وجد حلاوة الايمان: ١٦٥، ١٦٦؛ بخاری، كتاب الايمان، باب حلاوة الايمان: ١٦۔ [2] صحیح بخاری، كتاب الادب، باب رحمة الولد: ٥٩٩٩۔

[3] ابن ماجه، ابواب الزهد، باب ما يرجى من رحمة الله: ٤٢٩٧۔

آپ ﷺ ایک مجلس میں تشریف فرما ہیں، ایک صحابی چادر میں ایک پرند کو مع اس کے بچوں کے باندھ کر لاتے ہیں اور واقعہ عرض کرتے ہیں، کہ ''یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا، ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی، میں نے ذرا سا کپڑے کو کھول دیا تو وہ فوراً آ کر میرے ہاتھ پر بچوں پر گر پڑی'' ارشاد ہوا: ''کیا بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے، قسم ہے، اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ معبوث کیا، جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے۔'' [1]

ایک صاحب ایک چھوٹے بچہ کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوتے ہیں، محبت کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار اس کو گلے سے لگائے جاتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا: ''کیا تم کو اس بچہ سے محبت ہے؟'' انہوں نے کہا، ہاں، فرمایا: ''تو اللہ کو تم سے اس سے زیادہ محبت ہے، جتنی تم کو اس بچہ سے ہے، وہ سب رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والے ہے۔'' [2]

جمالِ حقیقت کا پہلا مشتاق، اور مستورِ ازل کے زیر نقاب چہرہ کا پہلا بند کشا، زندگی کے آخری مرحلوں میں ہے، مرض کی شدت ہے، بدن بخار سے تپ رہا ہے، اٹھ کر چل نہیں سکتا لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلان خاص کی طاقت پاتا ہے، مسجد نبوی میں جان نثار حاضر ہوتے ہیں، سب کی نظریں حضور کی طرف لگی ہیں، نبوت کا آخری پیغام سننے کی آرزو ہے، دفعتہً لب مبارک ہلتے ہیں تو یہ آواز آتی ہے۔ ''لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی براءت کرتا ہوں کہ انسانوں میں میرا کوئی دوست ہے، مجھ کو خدا نے اپنا پیارا بنایا ہے، جیسے ابراہیم کو اس نے اپنا پیارا بنایا تھا'' [3] یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا، عین حالتِ نزع میں زبانِ مبارک پر یہ کلمہ تھا: ''خداوندا! بہترین رفیق۔'' [4]

اللہ تعالیٰ کی کریمی و رحیمی، اس کی بیچارہ نوازی، عاجزوں اور درماندوں کی دستگیری اور اپنے گناہگار بندوں کے ساتھ اس کی شانِ بخشش کا ترانہ خود محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے کانوں سے سنا اور نادم و متاسف سیہ کاروں تک اس مژدہ کو پہنچا کر ان کے شکستہ اور زخمی دلوں پر مرہم رکھا، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت رحمۃ للعالمین نے یہ پیامِ ربانی ہم کو سنایا:

> ''میرے بندو! میں نے اپنے اوپر بھی اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کیا ہے، تو ایک دوسرے پر تم ظلم نہ کیا کرو، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک گمراہ تھا، لیکن جس کو میں نے راہ دکھائی، تو مجھ سے راستہ پوچھو، میں بتاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک بھوکا تھا، لیکن

[1] ابوداود، کتاب الجنائز، باب الامراض المکفرة للذنوب: ۳۰۸۹۔ [2] ادب المفرد امام بخاری، باب رحمة العیال: ۳۷۷۔ [3] صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النهی عن بناء المساجد علی القبور: ۱۱۸۸۔
[4] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب آخر ما تکلم به النبی ﷺ: ٤٤٦٣۔

جس کو میں نے کھلایا، تو مجھ سے کھانا مانگو میں تم کو کھلاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک پیاسا تھا، لیکن جس کو میں نے پلایا، تو مجھ سے پانی مانگو، میں تم کو پلاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم میں ہر ایک ننگا تھا، لیکن جس کو میں نے پہنایا، تو مجھ سے کپڑا مانگو، میں تم کو پہناؤں گا، اے میرے بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں سب گناہوں کو معاف کرتا ہوں، تم مجھ سے معافی مانگو، میں تم کو معاف کروں گا، اے میرے بندو! مجھے نقصان پہنچانا تمہاری طاقت میں نہیں اور نہ مجھے نفع پہنچانا تمہاری قدرت میں ہے، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے، جن اور انس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت، دنیا کے سب سے بڑے پرہیزگار کے دل کے برابر ہو جائیں تو میری شہنشاہی میں ایک ذرہ اضافہ نہ ہوگا۔ اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، جن وانس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت سب دنیا کے سب سے بڑے گناہگاروں کے برابر ہو جائیں، تو بھی میری شہنشاہی میں ایک ذرہ کمی نہ ہوگی، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور جن وانس، سب کسی ایک زمین میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں سب کے سوال کو پورا کروں، تو میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ ہوگی، لیکن اتنی جتنی ایک سوئی سمندر کے پانی میں ڈال کر نکالی جائے، اے میرے بندو! تمہارے ہی عمل ہوں گے جن کو میں گن گن کر تم کو واپس کروں گا اور پورا کروں گا، تو جس کو بھلائی ملے وہ خدا کا شکر ادا کرے، اور جس کو برائی ملے وہ اپنے ہی کو ملامت کرے۔'' [1]

محبت کا یہ پُر کیف نغمہ دنیا نے محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی زبان مبارک سے سنا، یہ تسلی و تشفی کا پیام انہیں کے مبارک لبوں سے ادا ہوا، یہ عفو و کرم کے بحرِ بیکراں کا ساحلِ امید انہیں کے دکھانے سے ہم کو نظر آیا، اور گناہگاروں کو ''میرے بندو'' کہہ کر پکارے جانے کی عزت آپ ہی کے وسیلہ سے میسر آئی۔ (ﷺ)

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم: ٦٥٧٢؛ ترمذی ابواب الزھد: ٢٤٩٥؛ مسند احمد بن حنبل، ج ٥، ص ١٦٠ و ١٧٧؛ ادب المفرد امام بخاری، باب الظلم: ٤٩٠ میں نے صحیح مسلم کی روایت سامنے رکھی ہے، لیکن بعض الفاظ مسند سے لے کر بڑھا دیے ہیں، اس کے بعض بعض ٹکڑے انجیل میں بھی ملتے ہیں، (دیکھو متی ۲۵: ۲۵ تا ۴۵ ص: ۴۷، ۴۸) مگر دونوں کے ملانے سے ناقص و کامل کا فرق نمایاں ہوتا ہے جو ناقص اور کامل میں ہونا چاہیے۔

فرشتوں پر ایمان

﴿وَمَلٰٓئِكَتِهٖ﴾

ملائکہ کا لفظ جمع ہے، اس کا واحد۔ ملک، ملاک اور مالک تین طرح سے مستعمل ہے اس کے لغوی معنی قاصد اور رسول کے ہیں اسی لیے قرآن پاک میں ملائکہ کے لیے رسل کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی قاصد اور ''پیام رساں'' کے ہیں، ان سے مراد وہ غیر مادی مگر مخلوق نیک ہستیاں یا ارواح ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق عالم اور اس کے اسباب وعلل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں، اگر یہ عالم ایک مشین ہے تو ملائکہ اس کے انجن اور اس کے کل پرزوں کو حرکت دینے والی قوتیں ہیں۔ جو خدا کے مقررہ احکام اور قوانین کے مطابق ان کو حرکت دے رہے ہیں اور چلا رہے ہیں۔ یعنی وہ خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان اس حیثیت سے پیام رسانی اور سفارت کی خدمت انجام دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القا کرتا ہے اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس کو مخلوقات میں جاری اور نافذ کرتے ہیں ان کو خود نہ کوئی ذاتی اختیار ہے اور نہ ان کا کوئی ذاتی ارادہ ہے۔ وہ سرتاپا اطاعت ہیں اور خدا کے حکم سے سرمو تجاوز نہیں کرتے، گویا، ان کی خلقت ہی صرف اطاعت اور فرمانبرداری کے لیے کی گئی ہے، دنیا پر رحمت یا عتاب جو کچھ نازل ہوتا ہے، وہ انہیں کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور خدا انبیا پر اپنے جو احکام اتارتا ہے، یا ان سے ہم کلام ہوتا ہے، وہ انہیں کی وساطت سے کرتا ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب، بلکہ قدیم یونانی مصری فلسفہ میں بھی اس قسم کی ہستیوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے، صابی مذہب میں یہ ستاروں اور سیاروں کی صورت میں مانے گئے ہیں۔ یونانی، مصری (سکندری) فلسفہ میں ان کا نام ''عقولِ عشرہ'' (دس عقلیں) رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی نو آسمانوں میں بھی الگ الگ ذی ارادہ نفوس تسلیم کیے گئے ہیں، بلکہ خالص یونانی فلسفہ میں بھی بعض غیر مادی ارواح مجردہ کا پتہ لگتا ہے، جن میں سے سب سے اہم لوگس کا تخیل ہے، جس سے مقصود وہ اولین ہستی ہے جس کو خدا نے تمام کائنات کی خلق کا ذریعہ اور واسطہ قرار دیا ہے اور جس کو اہلِ فلسفہ عقلِ اول سے تعبیر کرتے ہیں، پارسیوں میں ان ہستیوں کا نام ''امشا سپند'' ہے اور ان کی بے شمار تعداد قرار دی گئی ہے، یہودی ان کو ''وہیم'' کہتے ہیں اور ان میں سے خاص خاص کے نام جبریل اور میکائیل وغیرہ رکھے ہیں، عیسائی بھی ان کو انہیں ناموں سے یاد کرتے ہیں اور جبریل وروح القدس وغیرہ سے ان میں سے بعض کی تعبیر کرتے ہیں، ہندوؤں میں وہ دیوتاؤں اور دیویوں کے نام سے روشناس ہیں، جاہل عرب ان کو خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے تھے، بہرحال یہ تمام مختلف صحیح اور غلط نام اور تعبیریں ایک ہی حقیقت کی ہیں اور جس سے مراد وہ روحانی وسائط ہیں جو صانع ومصنوعات اور خالق ومخلوقات کے درمیان اس

کے حکم سے عمل پیرا اور کارفرما ہیں۔

مذاہب سابقہ میں ان غیر مادی ذی روح مخلوق ہستیوں کی حیثیت نہایت مشتبہ تھی، وہ کبھی مخلوق بھی کہی جاتی تھیں اور کبھی وہ خدائی کے مرتبہ پر بھی بلند کر دی جاتی تھیں، ہندوؤں کے دیوتاؤں اور دیویوں کی یہی صورت تھی، پارسیوں میں امشاسپند کا بھی یہی حال تھا، کہ کبھی ان کی حیثیت فرشتوں کی تھی، کبھی وہ خدا کے مقابل بن جاتی تھیں اور کبھی خدا امشاسپندوں میں سے ایک ہو جاتا تھا، ہندوؤں کی طرح پارسیوں میں بھی وہ قابل پرستش سمجھی جاتی تھیں، ان کے نزدیک سب سے عالی رتبہ امشاسپند (۶) تھے اور ان کے تحت میں ۳۳ تھے، پھر ان میں سے ہر ایک کے ماتحت ہزاروں تھے اور چونکہ پارسی نیکی اور بدی کے دو متقابل خداؤں کے قائل تھے، اس لیے دونوں کے ماتحت اچھے اور برے فرشتوں کی بے شمار تعداد تھی، نیکی کے فرشتے براہ راست نیکی کی چیزوں کو اور برائی کے فرشتے مصیبتوں، ہلاکتوں اور بدیوں کو دنیا میں خلق کرتے تھے اور اپنے اپنے خدا کی طرف سے وہ ان اشیاء کے حاکم سمجھے جاتے تھے اور دونوں خدا اپنی اپنی فوجوں اور لشکروں کے پروں کو لے کر باہم نبرد آزما رہتے تھے، یہ بھی ان کا اعتقاد تھا کہ ہر امشاسپند یا نر فرشتہ کے ساتھ ایک یزدیعنی مادہ فرشتہ بھی ہوتی تھی، جو اس کی بیوی ہوتی تھی، ہندوؤں میں نر دیوتاؤں اور مادہ دیویوں کا تصور تھا، مگر ان نر و مادہ ہستیوں میں کسی نر کو کسی مادہ سے خصوصیت خاص نہ تھی، بلکہ ہر ایک جنس کا ہر فرد دوسری جنس کے ہر فرد سے لطف اندوز ہو سکتا تھا، یہودیوں میں ان فرشتوں کی حیثیت ایسی تھی کہ ان کی تقدیس اور ثنا وصفت خدا سے مشتبہ ہو جاتی تھی، نظر آنے والے فرشتہ کی تعظیم کی جاتی تھی، اس کے آگے جھکا جاتا تھا اور اس کو خداوند کہہ کر خطاب اس طرح کیا جاتا تھا کہ کہیں کہیں یہ شبہہ ہو جاتا ہے کہ خدا مخاطب ہے یا فرشتہ، (تکوین ۱۶، ۱۳ و ۱۸، ۲، ۳، ۲۲) وہ کبھی کبھی خدا کے بیٹے بھی کہے جاتے تھے، (تکوین ۶۔۲)، عیسائیوں میں ان میں سے بعض مثلاً: روح القدس خدا کا ایک جزو تسلیم ہو کر تثلیث کا رکن ہے۔

صابیوں میں ان فرشتوں کی قربانی کی جاتی تھی، ان کے ہیکل بنائے جاتے تھے اور ان کو مظہر خدا تسلیم کیا جاتا تھا، عربوں میں فرشتے مادہ سمجھے جاتے تھے، وہ خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارے جاتے تھے اور ان کی پرستش ہوتی تھی اور سمجھا جاتا تھا کہ وہ خدا کے دربار میں سفارشی ہوں گے، یونانیوں میں عقلِ اول اور عقولِ عشرہ تمام عالم کے خالق و کارفرما و مرجعِ کل مانے گئے اور خدا کو معطل ٹھہرایا گیا۔

اسلام نے آکر ان تمام عقائد کو مٹا دیا، خدائی اور ربوبیت کی ہر صفت سے وہ محروم بنائے گئے، ان کی پرستش و عبادت قطعاً ناجائز کی گئی، نر و مادہ کی مادی جنسیت سے پاک کیے گئے اور انسانوں کو ان پاک مخلوقات کی غلامی و بندگی سے آزاد کیا گیا، ان کی تعداد و شمار و درجات بندی کا کوئی تخیل باقی نہیں رکھا گیا، ان کی ہستی خدائے تعالیٰ کے سامنے ایک سراپا مطیع و فرمانبردار غلام کی قرار دی گئی جس کا شب و روز کام صرف آقا کا حکم بجا

لانا ہے، عالم میں ان کا کسی قسم کا تصرف نہیں مانا گیا اور نہ نیکی و بدی کی دو تقسیمیں کی گئیں، نہ وہ الگ الگ جنس مخلوقات کے حاکم و منتظم قرار دیے گئے، قرآن میں ان کی ہستی صرف اس حیثیت سے تسلیم کی گئی کہ یہ غیر مادی ذی روح مخلوقات ہیں، جن کا کام خدا کی حمد وثنا، اطاعت وفرمانبرداری ہے اور خالق اور اس کے مخلوقات کے درمیان وہ پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں اور اس کے حکم کے مطابق وہ اس کی مخلوقات کے اس کارخانہ کو چلا رہے ہیں، لیکن اس چلانے میں خود ان کی ذاتی مرضی اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے، اسی لیے قرآن پاک نے ان کا خطاب یہودیوں کی طرح ''خداوند'' نہیں مقرر کیا، نہ پارسیوں کی طرح ان کو ''قابل پرستش'' کے لقب سے ملقب کیا، نہ ہندوؤں کی طرح دیو اور دیوتا اور دیوی کہا، بلکہ صرف ''ملک'' اور ''رسول'' کے الفاظ استعمال کیے جن کے لفظی معنی فرستادہ، قاصد، پیغام رساں اور ایلچی کے ہیں، بلکہ قرآن نے آغازِ خلقتِ انسانی کے قصہ میں یہ حقیقت واضح کر دی کہ ملائکہ اس لائق نہیں کہ آدم ان کو سجدہ کرے، بلکہ آدم میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ملائکہ کا مسجود بنے اور وہ مرتبہ علم میں ان سے فوق ٹھہرایا گیا، خدا کی جس تسبیح وتقدیس کا ان کو دعویٰ تھا، اس کے باوجود جب انسان کا جوہر طبیعت انہوں نے پہچانا تو یہ تسلیم کرنا پڑا:

﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾

(۲/ البقرۃ:۳۲)

''تو پاک ہے ہم کو کوئی علم نہیں، لیکن وہ جو تو نے ہم کو سکھایا، بے شک تو جاننے والا اور حکمت والا ہے۔''

اس قصہ نے شروع ہی میں یہ واضح کر دیا کہ وہ ہستیاں جن کو دوسرے مذاہب نے انسانوں کا دیوتا، انسانوں کا خداوند اور کبھی خدا کا ہمسر اور متصرفِ مطلق قرار دیا تھا، اسلام میں ان کی حیثیت انسان کے مقابلہ میں کیا ہے؟ انسان اور فرشتے خدا کے سامنے برابر کے مخلوق و بندہ اور عاجز و درماندہ ہیں، انسانوں کو مادی اشیاء پر حکومت خاص بخشی گئی کہ اپنے نفع ونقصان کے لیے ان سے کام لے سکیں اور ملائکہ کو اپنے حضور میں متعین فرمایا کہ وہ آسمان وزمین اور پوری مملکت الٰہی میں اس کے احکام کی تعمیل وتنفیذ کریں۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اسباب وعلل کا ایک سلسلہ پیدا کیا ہے جو ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے لوگ انہیں ظاہری اسباب وعلل کو دیکھ کر دھوکا کھاتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں، مثلاً: آگ جلاتی اور روشن کرتی ہے، اس کو دیکھ کر آتش پرست اور مادہ پرست یقین کرتے ہیں کہ خود اس آگ میں جلانے کی طاقت ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ آتش پرست اس کے آگے سجدہ میں گر پڑتے ہیں، مادہ پرست گو اپنا سر اس کے آگے نہیں جھکاتے مگر ان کا دل جھک جاتا ہے اور یہ ایمان رکھتے ہیں کہ یہ طاقت خود اسی آگ کے اندر ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ جلانے کی طاقت آگ میں نہیں بلکہ اس کا ایک مستقل دیوتا یا فرشتہ ہے جو اس پر حکمران ہے،

یہ لوگ اس آگ کے فرمانروا کے سامنے جھک جاتے ہیں، اسلام کے نظریہ توحید نے اس شرک کو بھی مٹایا اور بتایا کہ آگ اور آگ کا اگر کوئی فرشتہ ہے تو وہ کل کے کل اسی ایک رب العالمین اور فرمانروائے ارض وسماء کے حکم کے تابع ہیں، اسی کے آگے جھکنا چاہیے اور اسی کی بندگی کرنی چاہیے۔

اسلام میں فرشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب ان نصوص سے مل سکتا ہے، جو ان کے کاموں کے متعلق قرآن میں مذکور ہیں، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے مراد وہ غیر مادی ذی روح ہستیاں ہیں جو احکام اور پیغام الٰہی کو دنیائے خلق تک پہنچاتے اور نافذ کرتے ہیں اور ان اسباب وعلل کو جن کو مادہ پرست ذاتی طور پر موثر جانتے ہیں اور جن کو بت پرست، دیوتاؤں کا کرشمہ سمجھتے ہیں، ان کو فرشتے احکام الٰہی کے مطابق کام میں لگاتے ہیں اور مرضی الٰہی کو پورا کرتے ہیں۔

عقلی حیثیت سے یہ عقیدہ بھی اسی طرح قبول اور انکار کے قابل ہے جس طرح عقلیات کے دوسرے عقائد اور نظریے ہیں، جن کی تصدیق یا تکذیب، عقل کی دسترس سے باہر ہے، اس لیے اس عقیدہ کو یہ کہہ کر کوئی رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ خلاف عقل ہے، بلکہ جس طرح قیاسات اور عقلی نکتہ پردازی سے دوسرے عقلی مباحث کا فیصلہ کیا جاتا ہے، وہی یہاں بھی کارگر ہے، اشیاء میں خصائص اور لوازم کے وجود اور ان کے اسباب وعلل کا مسئلہ عقلا میں ہمیشہ اختلافات کا دنگل رہا ہے اور یہ معمہ آج بھی اسی طرح لاینحل ہے، جس طرح پہلے دن تھا، اس کا حل سائنس کی مادی تحقیقات اور تجربوں کی طاقت سے باہر ہے اور فلسفہ بھی اس کی گتھی کے سلجھانے سے عاجز ہے، اس لیے اگر حکمائے ملحدین کی شاہراہ سے الگ ہٹ کر اس کے حل کی کوئی صورت ارباب مذاہب نے نکالی ہے، تو وہ محل اعتراض نہیں ہو سکتی اور نہ وہ خلاف عقل کہی جا سکتی ہے، کائنات کے حوادث میں جس طرح مادی علل واسباب کارفرما ہیں، اسی طرح ان سے بالاتر روحانی علل واسباب بھی ساتھ ساتھ کارفرما ہیں، ان دونوں قسم کے توافق سے حوادث کا وجود ہوتا ہے، یہی سبب ہے کہ انسان اکثر مادی علل و اسباب موجود ہونے یا نہ ہونے کے باوجود کامیاب یا ناکام ہوتا ہے اور اس کا نام ''بخت واتفاق'' رکھتا ہے، حالانکہ مسئلہ علل واسباب کو ماننے کے بعد بخت واتفاق کوئی چیز نہیں، رہ جاتا۔ یہی روحانی علل واسباب ہیں جن کا سررشتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے ان فرشتوں کو سپرد کیا ہے، جو فرمانبردار چاکروں کی حیثیت سے اس نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں، ہمارے اور دوسرے متکلمین اور حکماء کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہ ملائکہ کی تعبیر اسباب وعلل کے ''قوائے طبعی'' سے کرتے ہیں اور ہم ان کے ''قوائے روحانی'' سے۔ اس تقریر کا یہ منشا نہیں ہے کہ اشیاء میں خواص اور طبائع اور اس مادہ کی ملکیت میں مقررہ طبعی اصول وقوانین موجود نہیں ہیں اور نہ یہ منشا ہے کہ خود اشیاء اور مادہ کے ذرات کے اندر کوئی خواص وطبائع اور مادہ کے اجزائے عنصری کے اندر بالطبع کوئی اصول ودیعت نہیں، بلکہ یہ مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی اندازہ (تقدیر) کے مطابق ہر چیز کے خصائص وطبائع اور

اصول وقوانین مقرر کر کے ملائکہ کو حکم دیا ہے کہ وہ ان کو انہیں اصول وطبائع مقررہ کے مطابق چلاتے رہیں۔ سمجھنے کے لیے اس کی صحیح مثال خود انسان بلکہ ہر جاندار ہستی ہے، مخلوقات کی دو قسمیں ہیں، ذی روح اور غیر ذی روح، ذی روح مخلوقات کے اکثر افعال وحرکات، اس کی روح کی ارادی قوت کی وساطت سے انجام پاتے ہیں، وہی روح اس کے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضاء بلکہ ہر عضو کے ایک ایک رگ وریشہ پر حکمران اور مسلط ہے، بایں ہمہ وہ روح اصولِ مقررہ کے تحت ہی ان اعضاء سے کام لیتی ہے اور ان اصول سے باہر نہیں جاتی، اسی طرح غیر ذی روح اشیاء میں ابر و باد سے لے کر دریا اور پہاڑ اور سورج اور چاند تک پر ارواح مقرر ہیں، جو ان اشیاء سے خدا کے اصولِ مقررہ کے اندر یکساں افعال وحرکات کا صدور کراتی ہیں، جس طرح ہماری روح اپنے اعضاء اور اعضاء کے ذریعہ سے مادہ میں جو تغیرات پیدا کرتی ہے، وہ اشیاء کے مقررہ خواص وطبائع ہی کے سہارے کرتی ہے، اسی طرح ملائکہ بھی انہیں مقررہ خواص وطبائع کے ذریعہ ہی اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتے ہیں۔

الغرض جس طرح ہمارے ارادی افعال اور حکمِ الٰہی کے درمیان ہماری انسانی ارواح ونفوس واسطہ ہیں، اسی طرح تمام عالمِ مخلوقات اور کائنات کے افعال اور حکمِ الٰہی کے درمیان یہ ملکوتی ارواح اور نفوسِ مجردہ واسطہ ہیں اور جس طرح ہماری انسانی ارواح کی اس وساطت سے خدا کی حکومت علی الاطلاق پر کوئی اعتراض نہیں واقع ہوتا، اسی طرح ان ملکوتی ارواح کی وساطت سے بھی خدا کی علی الاطلاق حکومت میں کوئی نقص نہیں واقع ہوتا، یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے، کہ ہمارے ارادی افعال میں اختلافات کی اتنی نیرنگیاں نظر آتی ہیں، مگر ہمارے اور عالمِ کائنات کے تمام نوعی افعال میں اختلافات اور نیرنگیوں کے بجائے یکسانی، ہم رنگی اور عدمِ اختلاف پایا جاتا ہے، کیونکہ انسان نے ارادہ پا کر کسی قدر ذاتی اختیار پالیا ہے اور یہی ذاتی اختیار اس کے افعالِ اختیاری کی ذمہ داری، باز پرس اور مؤاخذہ کی بنیاد ہے اور جس کی بنا پر وہ اپنی اطاعت کے ذریعہ سے ثواب اور عصیان کر کے عتاب کا مستحق ہو جاتا ہے، مگر دنیا کی یہ ملکوتی ارواح مجردہ یعنی یہ ملائکہ، ذاتی ارادہ اور اختیار سے تمام تر محروم ہو کر صرف اطاعت، فرمانبرداری اور انقیاد کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اس لیے ان میں عصیان، تمرد، سرکشی اور حکمِ الٰہی سے انحراف کی کوئی صلاحیت نہیں ہے، اسی بنا پر اشیاء کے تمام نوعی افعال و حرکات وخصائص میں یکسانی، ہم رنگی اور عدمِ اختلاف پایا جاتا ہے اور یہی فطرت، طبیعت اور نوعی خاصیت کی اصطلاحات کی صورت میں ہمارے لیے دھوکے اور اشتباہ کا باعث بن گئی ہے۔

① اب ہم کو تعلیماتِ نبوی ﷺ یعنی آیات واحادیث سے ملائکہ کی حقیقت کو روشن کرنا چاہیے، ملائکہ کی سفارت و پیام رسانی، یعنی خالق کے احکام اور مرضی کو مخلوقات تک پہنچانا اور ان میں ان کا بے اختیار ہونا، ان دو آیتوں سے ثابت ہوتا ہے:

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ

أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۗ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝﴾ (۲۲/ الحج:۷۵۔۷۶)

''خدا ہی ہے جو فرشتوں اور آدمیوں میں سے پیام رساں اور قاصد منتخب کرتا ہے، بے شک خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے اور ان کے آگے اور پیچھے کا حال جانتا ہے اور تمام کاموں کا مرجع خدا ہی ہے۔''

یعنی پیام رسانی اور سفارت کے سوا ان کو اصل حکم میں کوئی دخل نہیں، اختیارات سب خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی تمام امور وانتظامات کا مرجع کل ہے، دوسری جگہ ہے:

﴿ الْحَمْدُ لِلَّهِ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا أُولِي أَجْنِحَةٍ مَّثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۚ يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ مَّا يَفْتَحِ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِن رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۖ وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِن بَعْدِهِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝﴾

(۳۵/ فاطر:۱، ۲)

''حمد ہو اس خدا کی جو آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا اور فرشتوں کو دو دو تین تین اور چار چار شہپر بازوؤں والے پیام رساں بنانے والا ہے، وہ پیدائش میں جو چاہے بڑھا دے، وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ لوگوں کے لیے رحمت کھولے تو کوئی اس کا روکنے والا نہیں اور جو روک دے تو اس کے سوا کوئی چھوڑنے والا نہیں اور وہ غالب و دانا ہے۔''

اس آیت پاک میں بھی یہی حقیقت ظاہر کی گئی ہے، کہ یہ ملائکہ سفارت اور درمیانگی کے علاوہ اور کوئی اختیار نہیں رکھتے، رحمت کے دروازوں کا کھولنے والا اور بند کرنے والا صرف خدا ہی ہے، یہ تعلیم اس غلط عقیدہ کی تردید میں ہے کہ ان فرشتوں کو دنیا کی حکمرانی اور انتظامات میں کوئی ذاتی دخل ہے، یا ان میں الوہیت اور ربوبیت کا کوئی شائبہ بھی ہے، یا وہ پرستش کے قابل بھی ہیں، یا ان کی دہائی بھی مانگنی چاہیے۔

② ملائکہ خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتے ہیں، سورۂ انفال میں ہے:

﴿ إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ ﴾ (۸/ الانفال:۱۲)

''(یاد کر) جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔''

﴿ تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ ۝﴾ (۹۷/ القدر:۴)

''اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے ہر کام کو لے کر نیچے اترتے ہیں۔''

وہ جس طرح احکام لے کر اترتے ہیں، اسی طرح دربار الٰہی تک عروج بھی کرتے ہیں:

﴿ تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ ﴾ (۷۰/ المعارج:۴)

’’فرشتے اور روح اس تک چڑھتے ہیں۔‘‘

موت کے وقت روح کا قبض کرنا انہی سے متعلق ہے:

﴿ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ﴾ (۳۲/ السجدة:۱۱)

’’کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے، وہ تم پر موت طاری کرے گا۔‘‘

﴿ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ﴾

(٦/ الانعام:٩٣)

’’اور اگر دیکھو تم جب گناہ گار موت کے سکرات میں ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوں کہ نکالو اپنی جانوں کو۔‘‘

﴿ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ﴾ (٨/ الانفال:٥٠)

’’اور اگر دیکھو جب فرشتے کافروں کو موت دے رہے ہوں۔‘‘

اس کے ہم معانی اور بھی کئی آیتیں ہیں، ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ حکم الٰہی کے مطابق موت و فنا کی تدبیر انہیں روحانی علل و اسباب کی ہستیوں سے متعلق ہے۔

دنیا میں کسی شے کے وجود، انقلاب اور فنا کے لیے کسی ایک علت وسبب کا وجود کافی نہیں ہے، بلکہ ضروری ہے کہ اس کے متعلقہ علل واسباب کی تمام کڑیاں باہم پیوستہ اور ایک دوسرے کی معاون ہوں اور موانع اور عوائق معدوم ہوں، یہ متعلقہ علل واسباب کا توافق اور موانع کا انسداد تدبیر ہے، جو بحکم الٰہی ان ملائکہ کے سپرد ہے، [1] اسی لیے کبھی اس تدبیر کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے، ﴿ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ﴾ ’’وہ کام کی تدبیر کرتا ہے۔‘‘ اور کبھی اس کو ملائکہ کی طرح منسوب کرتا ہے:

﴿ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۘ ﴾ (٧٩/ النازعات:١-٥)

’’ڈوب کر (روحوں کے) کھینچنے والوں کی قسم ہے (رگوں کی) گرہوں کو کھولنے والوں کی قسم ہے، (اس فضائے آسمانی میں) تیرنے والوں کی، پھر دوڑ کر (مادی اسباب وعلل پر) آگے بڑھ جانے والوں کی، پھر کام کی تدبیر کرنے والوں کی۔‘‘

③ یہی ملائکہ خدا اور رسولوں کے درمیان بھی سفیر ہیں:

﴿ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَاۗءُ ۭ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ:٥١)

’’یا خدا آدمی سے اس طرح باتیں کرتا ہے، کہ اپنا ایک سفیر بھیجتا ہے، تو وہ (اس خدا کی اجازت

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکة:٣٢٠٨ میں ہے کہ رحم نسوانی پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو بچہ کی نسبت قضائے الٰہی کو تحریر کرتا ہے۔

سے جو) وہ (خدا) چاہتا ہے، وحی کرتا ہے۔''

دوسری جگہ ہے:

﴿ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ ﴾ (١٦/ النحل:٢)

''خدا روح کے ساتھ فرشتوں کو اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے۔''

خاص آنحضرت ﷺ کے متعلق ہے:

﴿ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (٢/ البقرۃ:٩٧)

''بس اس (جبریل فرشتہ) نے اس قرآن کو خدا کے حکم سے تمہارے دل پر اتارا۔''

④ یہ لوگوں پر بشارت اور عذاب لے کر بھی اترتے ہیں:

﴿ وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ﴾ (١١/ ھود:٦٩)

''ہمارے سفیر ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت لے کر اترے۔''

اسی طرح حضرت زکریا اور مریم علیہما السلام کو انہوں نے بشارت دی:

﴿ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝ ﴾ (١٩/ مریم:١٩)

''میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں کہ تجھے ایک پاک لڑکا بخشوں۔''

حضرت لوط علیہ السلام کے پاس ان کی قوم کی بربادی کے لیے جاتے ہیں۔

﴿ قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ ﴾ (١١/ ھود:٨١)

''انہوں نے کہا، اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔''

اس کے بعد یہ فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر کوہ آتش فشاں کا منہ کھول دیتے ہیں اور تمام قوم برباد ہو جاتی ہے، یہ کام اگرچہ فرشتوں نے انجام دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ فرشتوں کے اس فعل کو خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے، کہ وہ فرشتوں کے ذاتی اختیار کے بجائے خدا ہی کے حکم سے ہوا تھا:

﴿ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ۝ ﴾

(١١/ ھود:٨٢)

''جب ہمارا حکم آیا، تو ہم نے اس کے اوپر کو نیچے اور نیچے کو اوپر کر دیا (یعنی زمین الٹ دی) اور اس پر تہ بہ تہ پتھروں کی بارش کی۔''

⑤ فرشتے انسانوں کے اعمال کی نگہبانی اور نگرانی کرتے ہیں اور ان کے ثواب اور گناہ کے کاموں کو محفوظ رکھتے ہیں:

﴿ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾

(٨٢/ الانفطار:١٠-١٢)

’’بے شک تم پرنگہبان ہیں، جو بزرگ ہیں، لکھنے والے ہیں، جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس کو جانتے ہیں۔‘‘

﴿ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝ ﴾ (۵۰/ ق:۱۸)

’’کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا لیکن اس کے پاس ایک نگہبان حاضر ہے۔‘‘

﴿ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ (۱۳/ الرعد:۱۰، ۱۱)

’’تم میں سے کوئی بات چھپا کر کہے، یا زور سے کہے، یا وہ رات میں چھپے، یا دن کو کرے، خدا کے تعاقب کرنے والے اس کے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے، خدا کے حکم سے اس کی نگرانی کرتے ہیں۔‘‘

﴿ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ۝ ﴾

(۶/ الانعام:۶۱)

’’اور وہ خدا تم پر نگران بھیجتا ہے، یہاں تک کہ تم میں سے جب کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے قاصد اس کی عمر پوری کرتے ہیں اور وہ اپنے اس کام میں کمی نہیں کرتے۔‘‘

⑥ وہ انسانوں کے اعمال کے مطابق ان پر خدا کی رحمت یا لعنت کے نزول کا ذریعہ اور واسطے ہیں:

﴿ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ ﴾

(۲۱/ الانبیآء:۱۰۳)

’’نیکوکاروں کو وہ بڑی گھبراہٹ (قیامت) غمگین نہ کرے گی اور فرشتے ان کا آگے بڑھ کر استقبال کریں گے، کہ یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔‘‘

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ ﴾

(۴۱/ فصلت:۳۰، ۳۱)

’’جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے اتریں گے کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کی خوش خبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، ہم ہیں جو تمہاری پہلی اور دوسری زندگی میں تمہارے رفیق ہیں۔‘‘

﴿ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۴۳)

’’وہی خدا تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے۔‘‘

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵۶)

''اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔''

﴿ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ:٥)

''اور جو زمین میں ہیں، ان کے لیے وہ خدا سے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔''

اسی طرح وہ بدکاروں پر لعنت بھی کرتے ہیں:

﴿ أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴾

(٣/ آل عمران: ٨٧)

''ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔''

﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴾

(٢/ البقرۃ:١٦١)

''جو کفر کی حالت میں مر گئے، ان پر اللہ اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔''

⑦ جنت اور دوزخ کا کاروبار بھی ملائکہ کے زیر اہتمام ہوگا:

﴿ وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ ﴾ (٣٩/ الزمر:٧١)

''اور کفر کرنے والے گروہ در گروہ کر کے دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچیں گے، تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے چوکیدار (فرشتے) کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے پیغمبر نہیں آئے۔''

﴿ وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ﴾ (٣٩/ الزمر:٧٣)

''اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے تھے وہ گروہ در گروہ جنت میں لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے پاسبان کہیں گے، تم پر سلامتی ہو، خوش خوش جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔''

﴿ وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِم مِّن كُلِّ بَابٍ ۝ سَلَامٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ ۚ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾

(١٣/ الرعد:٢٣، ٢٤)

''اور جنتیوں پر فرشتے ہر دروازہ سے داخل ہو ہو کر کہیں گے، تم پر سلامتی ہو، یہ تمہارے صبر کا بدلہ ہے، یہ کیسا اچھا عاقبت کا گھر ہے۔''

﴿ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ ﴾ (٦٦/ التحریم:٦)

''دوزخ پر سخت دل طاقتور فرشتے مقرر ہیں۔''

﴿ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ﴾ (٨٤/ المدثر:٣١)

''ہم نے دوزخ کا اہل کار فرشتوں ہی کو بنایا ہے۔''

⑧ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ قدس کے حاضر باش ہیں:

﴿ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ﴾

(٣٩/ الزمر:٧٥)

''اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے اردگرد احاطہ کیے ہوئے اپنے پروردگار کی حمد وثنا میں مصروف ہوں گے۔''

﴿ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى ﴾ (٣٧/ الصّافات:٨)

''اعلیٰ اہل دربار کی باتیں وہ (شیاطین) نہیں سن سکتے۔''

﴿ مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍۭ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝ ﴾ (٣٨/ صٓ:٦٩)

''مجھے خدا کے بلند درباریوں کا علم نہیں جب وہ باتیں کرتے ہیں۔''

قیامت کے دن بھی یہ تخت الٰہی کے حامل اور اس بارگاہ کے حاضر باش ہوں گے، جو ہر وقت اس کے ہر حکم کو بجالانے کے لیے تیار رہیں گے:

﴿ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ۭ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۝ ﴾

(٦٩/ الحآقة:١٧)

''اور فرشتے زمین کے کناروں پر کھڑے ہوں گے اور تیرے پروردگار کے تخت کو آٹھ (فرشتے) اس دن اپنے اپنے اٹھائے ہوں گے۔''

﴿ كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ ﴾

(٨٩/ الفجر:٢١، ٢٢)

''ہرگز نہیں، جب زمین ریزہ ریزہ کردی جائے گی اور تیرا رب تشریف فرما ہوگا اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے۔''

﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ﴾ (٧٨/ النبا:٣٨)

''جس دن روح اور فرشتے صف باندھے کھڑے ہوں گے۔''

⑨ فرشتے خدا سے سرکشی اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور ہمیشہ اس کی تہلیل وتقدیس اور حمد وثنا میں مصروف رہتے ہیں اور اس کے جلال وجبروت سے ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں اور خدا کے حضور میں اہل

زمین کے لیے عموماً اور نیکوکاروں کے لیے خصوصاً مغفرت کی دعا مانگا کرتے ہیں:

﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ ﴾ (٤٢/ الشورىٰ:٥)

''اور فرشتے حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور زمین والوں کی بخشائش کی دعا مانگا کرتے ہیں، ہشیار کہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا خدا ہی ہے۔''

یعنی یہ دھوکا نہ ہو کہ ان کی دعا ہی رحمت و برکت کا ذاتی سبب ہے، بلکہ بخشش اور رحمت کرنے والا صرف وہی خدائے واحد ہے اور یہ بخشش و رحمت اسی کے دست اختیار میں ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ ﴾ (٤٠/ المؤمن:٧)

''جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہیں اور جو اس کے پاس ہیں، وہ سب اپنے پروردگار کی حمد اور تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کی بخشائش کی دعا کرتے ہیں۔''

﴿ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۝ۚ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ۝ ﴾ (٢١/ الانبيآء:١٩، ٢٠)

''آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے اور جو اس کے پاس ہیں (یعنی فرشتے) وہ اس کے سامنے اپنی عبودیت کے اظہار سے غرور نہیں کرتے اور نہ اس کی عبادت سے تھکتے ہیں، وہ رات دن خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اور سست نہیں پڑتے۔''

﴿ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ۙ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝ ﴾

(٢١/ الانبيآء:٢٦ـ٢٨)

''بلکہ وہ بزرگ بندے ہیں، جو بات میں اس (خدا) پر پیش دستی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں............ اور وہ اس کے خوف سے ترساں رہتے ہیں۔''

﴿ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ ﴾ (٦٦/ التحريم:٦)

''خدا ان کو جس بات کا حکم دیتا ہے، وہ اس میں خدا کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔''

﴿ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ ﴾ (١٣/ الرعد:١٣)

’’اور بجلی کی کڑک اور فرشتے خدا کے ڈر سے اس کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔‘‘

﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَاۗبَّةٍ وَّالْمَلٰۗىِٕكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ ﴾

(۱٦/ النحل:٤٩ ، ٥٠)

’’اور آسمانوں میں اور زمین میں جو چار پائے اور فرشتے ہیں، وہ سب خدا کو سجدہ کرتے ہیں اور اس کے سامنے اپنی بڑائی نہیں کرتے، وہ اپنے مالک سے جو ان کے اوپر ہے ڈرتے رہتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔‘‘

گزر چکا ہے کہ ملائکہ کا اعتقاد دنیا کے تمام مذاہب اور قوموں میں کسی نہ کسی طرح رہا ہے،لیکن ان کے اس اعتقاد میں بہت سی باتیں ایسی داخل تھیں جو توحید کامل کے منافی تھیں، اسکندریہ کے نو افلاطونی فلسفہ کی رو سے عقلِ اوّل کی اضطراری پیدائش اور وجود کے بعد خدا کو معطل ٹھہرا کر فرشتوں کو عقول کی صورت میں اصلی کارفرما قرار دیا گیا تھا،عراق کے صابی اجرام سماوی کی شکل میں ان کی پرستش کرتے تھے اور انہیں کو عالم میں فرمانروا جانتے تھے، یہود بھی ان کو کسی قدر صاحبِ اختیار تصور کرتے تھے اور ان کو کبھی کبھی خداؤں کا درجہ دے دیتے تھے، جیسا کہ توراۃ (صحیفۂ تکوین ۱٦، ۱۳و۱۸، ۲و۳، ۲۲) کے قصوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے، ان کو وہ ’’خدا کے بیٹوں‘‘ کے خطاب سے بھی کبھی کبھی یاد کرتے تھے، (تکوین ٦، ۲) ہندوؤں میں وہ دیوتا اور دیوی بن کر ایک طرف انسانی خصائص سے ملوث تھے اور دوسری طرف وہ اپنے ذاتی اختیارات کے لحاظ سے ’’چھوٹے خداؤں‘‘ کے مرتبہ پر بھی فائز تھے، عیسائیوں میں ان میں سے بعض مثلاً: روح القدس خدا کا ایک جزو تسلیم ہوتی تھی اور ان کی تثلیث کا ایک رکن تھی، عربوں میں وہ خدا کی بیٹیوں کا درجہ رکھتے تھے، وہ ان کی پوجا کرتے تھے اور ان کو اپنے گناہوں کا شفیع سمجھتے تھے، تعلیم محمدی نے ان تمام عقائد باطلہ کو مٹا دیا اور ایک ایک کر کے ان میں سے ہر عقیدہ کی تردید کردی اور بتایا کہ فرشتے بھی خدا کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں، ان کو خدائی کا کوئی اختیار حاصل نہیں، وہ صرف خدا کی اطاعت اور عبادت اور اسی کے احکام کی بجا آوری میں مصروف رہتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کو جو کام سپرد ہے، وہ اسی کو انجام دیتا ہے، وہ ہماری ہی طرح بندۂ محض ہیں، وہ نہ عبادت کے مستحق ہیں اور نہ خدا کے بلا اذن وہ شفاعت کا ایک حرف زبان سے نکال سکتے ہیں اور نہ خدا کے سامنے وہ کچھ عرض کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں، یہودی ان کو خدا کے بیٹے اور عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، قرآن نے ان دونوں کی تردید کی اور بتایا کہ وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں، نہ وہ مرد ہیں، نہ عورت ہیں، نہ وہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، نہ وہ خدائی کا دعویٰ کر سکتے ہیں، وہ خدا کے خوف سے ہمیشہ کانپتے اور لرزتے رہتے ہیں:

﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ

يَعْمَلُوْنَ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ۝ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّىْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۲۶۔۲۹)

''مشرکوں نے کہا کہ مہربان خدا نے اپنا لڑکا بنایا ہے اور وہ اس سے پاک ہے، بلکہ یہ (فرشتے) اس کے معزز بندے ہیں، جو بات میں اس پر پیش دستی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں، خدا اس سے جو ان کے آگے اور پیچھے ہوتا ہے، واقف ہے، وہ شفاعت نہیں کرتے، لیکن اسی کی جس کے لیے خدا پسند کرتا ہے اور وہ خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں، ان میں سے جو یہ کہے کہ میں خدا ہوں تو اس کو بھی اسی طرح ہم جہنم کی سزا دیں گے ایسی ہی ہم ظالموں کو سزا دیتے ہیں۔''

﴿ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۡ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا۝ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا۝ ﴾ (۴/ النسآء:۱۷۱، ۱۷۲)

''خدا تو ایک ہی ہے وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو، آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اس کی ملکیت ہے اور خدا کافی وکیل ہے، مسیح کو اس سے عار نہ ہوگا کہ وہ خدا کا بندہ ہے اور نہ مقرب فرشتوں کو اس سے عار ہے اور جو لوگ اس کی عبادت سے عار اور غرور کریں گے تو ان سب کو وہ اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔''

﴿ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۸۰)

''خدا اس کا حکم تم کو نہیں دیتا کہ تم فرشتوں کو اور پیغمبروں کو خدا بناؤ، کیا تم کو مسلمان ہونے کے بعد کفر کرنے کا حکم دے گا۔''

﴿ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ۝ ﴾

(۳۴/ سبا:۴۰، ۴۱)

''اور جس دن وہ سب کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ مشرکین تمہیں کو پوجتے

تھے، وہ کہیں گے پاک ہے تو، تو ہمارا والی ہے، وہ نہیں ہیں، بلکہ وہ جنوں کو پوجتے تھے، اکثر انہیں جنوں پر ایمان لائے۔"

﴿ يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۖ لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝ ﴾

(۷۸/ النبا:۳۸)

"جس دن روح اور فرشتے صف بستہ خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے، تو کچھ نہ بول سکیں گے لیکن وہ جس کو وہ مہربان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے۔"

﴿ وَكَمْ مِّن مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا إِلَّا مِنۢ بَعْدِ أَن يَأْذَنَ اللّٰهُ لِمَن يَشَآءُ وَيَرْضٰى ۝ ﴾ (۵۳/ النجم:۲۶)

"اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، لیکن اس کے بعد کہ خدا جس کو اجازت دے اور پسند کرے۔"

﴿ أَفَأَصْفٰكُمْ رَبُّكُم بِالْبَنِينَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ إِنَاثًا ۚ إِنَّكُمْ لَتَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا ۝ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوا ۖ وَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا نُفُورًا ۝ قُل لَّوْ كَانَ مَعَهُۥٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَّابْتَغَوْا إِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا ۝ سُبْحٰنَهُۥ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا ۝ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ ۚ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۴۰۔۴۴)

"کیا تمہارے لیے خدا نے بیٹوں کو پسند کیا اور خود فرشتوں میں سے لڑکیاں اپنے لیے پسند کیں، تم یقیناً بہت بڑی بات منہ سے نکالتے ہو اور ہم نے قرآن میں پھیر پھیر کر سمجھنے کی باتیں بیان کی ہیں، لیکن یہ ان کی نفرت کو اور بڑھاتا ہے، کہہ دو اے پیغمبر! کہ اگر اس ایک خدائے برحق کے ساتھ اور بھی چند خدا ہوتے، تو اس تخت والے خدا کی طرف وہ راستہ ڈھونڈتے (کہ اس کے ہاتھ سے حکومت چھین کر خود قبضہ کرلیں) یہ مشرک جو کہتے ہیں خدا اس سے بلند و برتر ہے ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے، وہ اس کی تسبیح پڑھتے ہیں۔"

﴿ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ إِنَاثًا ۚ أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ ۚ سَتُكْتَبُ شَهٰدَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُونَ ۝ وَقَالُوا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُم ۗ مَّا لَهُم بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ۝ ﴾ (۴۳/ الزخرف:۱۹، ۲۰)

"اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں، عورتیں بنا دیا، کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے؟ ہم ان کی گواہی لکھیں گے اور ان سے اس کی باز پرس کی جائے گی اور انہوں نے کہا کہ اگر خدا چاہتا تو ہم ان فرشتوں کو نہ پوجتے انہیں اس کا تحقیقی علم نہیں، وہ

صرف اٹکل لگاتے ہیں۔"

قرآن پاک میں اس مفہوم کی اور بہت سی آیتیں ہیں، مگر یہاں استقصا مقصود نہیں۔

یہودیوں کا خیال تھا کہ فرشتے کھاتے پیتے بھی ہیں، چنانچہ توراۃ میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے، یہ بھی مذکور ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے دعوت کا سامان کیا "اور انہوں نے کھایا" (تکوین ۱۸، ۸) لیکن قرآن پاک نے اسی قصہ کو دہرا کر یہ تصریح کر دی کہ وہ ان انسانی ضرورتوں سے پاک ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے دعوت کا سامان کیا، مگر:

﴿ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۚ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۞ ﴾ (۱۱/ ھود:۷۰)

"جب ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے، تو اس کو وہ انجان معلوم ہوئے اور دل میں ڈرا، انہوں نے کہا ڈر نہیں، ہم لوط کی قوم کی طرف (ان کے تباہ کرنے کے لیے) بھیجے گئے ہیں۔"

کفار قریش کا مطالبہ تھا، کہ انسان کے بجائے کوئی فرشتہ پیغمبر بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا، اس کے جواب میں کہا گیا:

﴿ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۞ ﴾ (۶/ الانعام:۹)

"اگر ہم پیغمبر کو فرشتہ بنا کر بھیجتے تو (آدمیوں کے لیے) اس کو آدمی ہی بناتے، تو جس شبہ میں اب ہم نے ان کو ڈالا ہے اسی میں وہ پھر بھی پڑے رہتے، (یعنی یہی کہتے کہ تم فرشتہ نہیں ہو بلکہ آدمی ہو)"

اس آیت اور دوسری آیتوں میں سے ملکوتیت اور بشریت کی قوتوں کا اختلاف ظاہر ہے، تاہم وہ کبھی کبھی عارضی طور سے انسان کے مثالی لباس میں بھی جلوہ گر ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت مریم علیہا السلام وغیرہ کے قصوں میں ہے:

﴿ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۞ ﴾ (۱۹/ مریم:۱۷)

"وہ فرشتہ ایک اچھے خاصے بشر کی مثالی صورت میں ظاہر ہوا۔"

اور یہی وہ صورت تھی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے انسان ہونے کا دھوکا ہوا اور ان کے لیے دعوت کا سامان کیا، مگر یہ دھوکا جلد دفع ہو گیا کہ وہ انسان کی مثالی صورت میں فرشتے ہیں۔ ان تمام تفصیلات کے بعد یہ غور کرنا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانے سے اسلام کا کیا مقصود ہے؟ حقیقت میں اس سے دو باتیں مقصود ہیں۔

① ایک یہ کہ اسلام سے پہلے بت پرست اقوام اور دوسرے اہل مذاہب میں ان فرشتوں کو خدائی کا جو مرتبہ دیا گیا تھا، اس غلط عقیدہ کو مٹا کر یہ حقیقت ظاہر کی جائے کہ ان کی حیثیت بے اختیار محکوم بندہ کی ہے، جب تک اس کی تصریح نہ ہوئی، کلمہ توحید کی تکمیل ممکن نہ تھی۔

② دوسرا مقصد یہ ہے کہ مادہ کے خواص وطبائع کو دیکھ کر مادہ پرست انہیں مادی خواص وطبائع کی بالذات کارفرمائی کا اہل یقین کرتے ہیں، اس کا ازالہ کیا جائے کیونکہ یہی پتھران کی ٹھوکر کا باعث ہوتا ہے اور بالآخر خدا کے انکار تک ان کو لے جاتا ہے اور حقیقت ان مادی خواص وطبائع پر روحانی اسباب مسلط ہیں، جو خدا کے حکم سے اس کے مقررہ اصول کے مطابق نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں، مادہ اور اس کے خواص بالذات مؤثر نہیں، بلکہ کوئی دوسرا ہے جو اپنے ارواح مجردہ کے ذریعہ ان کو مؤثر بناتا ہے، اس عقیدہ سے مادیت کا بت ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے، غرض منزہ خالق اور مادی مخلوق کے درمیان احکام وشرائع کا نزول اور قدرتِ الٰہی کے افعال کا صدور ان محکوم ارواح مجردہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔

رسولوں پر ایمان

﴿وَرُسُلِهٖ﴾

یہ عقیدہ اسلام کی ان خصوصیات میں سے ہے جن کی تکمیل صرف اسی کے ذریعہ سے انجام کو پہنچتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے وجود مبارک سے پہلے دنیا کی ہر قوم کو بجائے خود یہ خیال تھا کہ وہی اللہ تعالیٰ کی خاص محبوب اور پیاری ہے، تمام دنیا کی قوموں میں ہدایت ربانی کے لیے وہی منتخب کی گئی ہے اور اس کے علاوہ دنیا کی تمام قومیں اس فیض سے قطعاً محروم ہیں اور رہیں گی، اسی کی سرزمین دیوتاؤں اور دیویوں کا مسکن اور ہماری زبان خدا کی خاص مقدس زبان ہے، بابل و نینوا ہو یا مصر و یونان، ایران ہو یا آریہ ورت ہندوستان، ہر ملک اور ہر قوم کو بجائے خود تنہا خدا کی مقدس اور برگزیدہ مخلوق ہونے کا دعویٰ تھا اور وہ صرف اپنے ہی کو خدا کے پیغام اور خطاب سے مشرف ہونے کا مستحق جانتے تھے لیکن تعلیم محمدی نے تنگ خیالی کے اس محدود دائرہ کو دنیا کی عظیم الشان وسعت میں بدل دیا۔ آپ ﷺ نے یہ سکھایا کہ ''دنیا کی تمام قومیں خدا کی نظر میں یکساں ہیں نہ عرب کو عجم پر اور نہ عجم کو عرب پر فضیلت ہے اور نہ کالے کو گورے پر اور نہ گورے کو کالے پر کوئی تقدم حاصل ہے۔'' [1] ساری زمین خدا کی ہے اور تمام قومیں ایک خدا کی مخلوق ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگو! تم سب ایک ہی باپ (آدم) کی اولاد ہو اور وہ مٹی سے پیدا ہوا تھا۔'' [2] اسی طرح یہ بھی تعلیم دی کہ انسانوں اور قوموں کا امتیاز رنگ روپ ملک و مرز بوم اور زبان سے نہیں ہے بلکہ صرف تقویٰ اور نیکوکاری سے ہے۔ [3] اس تعلیم کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ قوموں اور ملکوں کی فطری فضیلت کی پرانی داستان فراموش ہوگئی، دنیا کی تمام قومیں ایک سطح پر آ گئیں اور مساواتِ انسانی کا راستہ صاف ہوگیا، بنی اسرائیل جن کو اپنے خدا کا کنبہ ہونے پر ناز تھا۔ وحی محمدی ﷺ نے ان کی اس حیثیت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا:

﴿بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۸)

''بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے بشر ہو۔''

بنی اسرائیل کو دعویٰ تھا کہ نبوت اور پیغمبری صرف ہمارے ہی خاندان کا ورثہ ہے جس طرح اس آریہ ورت کا دعویٰ ہے کہ خدا کی بولی صرف یہیں کے رشیوں اور نبیوں نے سنی اور وہ صرف وید کے اوراق میں محفوظ ہے، اسی طرح دوسری قوموں کو بھی اپنی جگہ یہی خیال تھا۔ اسلام نے اس تخصیص کو خدا کے انصاف، عدل و کرم اور اس کی رحمتِ عام کے منافی قرار دیا اور کہہ دیا:

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۝﴾ (۶۲/ الجمعۃ:۴)

---

[1] مسند احمد بن حنبل، ج ۵، ص: ۴۱۱۔ [2] جامع ترمذی، ابواب المناقب: ۳۹۵۵۔

[3] قرآن میں ہے: ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ (۴۹/ الحجرات:۱۳)

''یہ نبوت اللہ کی مہربانی ہے، جس کو چاہے دے اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے۔''

﴿ قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللَّهِ أَن يُؤْتَىٰ أَحَدٌ مِّثْلَ مَا أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِندَ رَبِّكُمْ ۗ قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۷۳، ۷۴)

''کہہ دو کہ ہدایت، اللہ کی ہے (اسرائیلی علما اپنے ہم مذہبوں سے کہتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ) جیسا دین تم کو دیا گیا ہے کسی اور کو دیا جائے یا یہ نئے دین والے تم سے خدا کے آگے جھگڑ سکیں کہہ دو کہ یہ (نبوت کا فضل) اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے اس سے نوازتا ہے اور اللہ کی رحمت سب پر عام ہے اور وہ اپنی مصلحتوں کو اچھی طرح جانتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ مخصوص کرتا ہے، وہ بڑا فضل والا ہے۔''

﴿ مَّا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَن يُنَزَّلَ عَلَيْكُم مِّنْ خَيْرٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۰۵)

''اہل کتاب میں جو منکر ہیں وہ یہ نہیں پسند کرتے اور نہ مشرکین پسند کرتے ہیں کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے مخصوص کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''

اس نے یہ تعلیم دی کہ روئے زمین کی ہر آبادی میں، ہر قوم میں اور ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی راہ دکھانے والے، اس کی آواز پہنچانے والے اور انسانوں کو ان کی غفلت سے چونکانے والے پیغمبر یا نائب پیغمبر بن کر آئے اور یہ سلسلہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک برابر جاری رہا۔ بعثتِ محمدی ﷺ سے پہلے دنیا کی کل آبادی مختلف گھرانوں میں بٹی ہوئی اور ایک دوسرے سے ناآشنا تھی۔ ہندوستان کے رشیوں اور منیوں نے آریہ ورت سے باہر کی دنیا کو خدا کی آواز سننے کا کبھی مستحق نہیں سمجھا تھا، ان کے نزدیک پرمیشور صرف آریہ ورت کی ہدایت اور راہنمائی کا خواہاں تھا۔ زردشت نے پاک نژادانِ ایران کے سوا سب کو یزداں کے جلوہ نورانی سے محروم یقین کیا۔ بنی اسرائیل اپنے خانوادہ کے سوا کہیں اور کسی نبی یا رسول کی بعثت کا تصور بھی نہیں کرتے تھے۔ عیسائی صرف اپنے کو خدا کی فرزندی کا مستحق سمجھتے تھے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے آکر بتایا کہ خدا کی ہدایت اور راہنمائی کے ظہور کے لیے کسی ملک، قوم اور زبان کی تخصیص نہیں اس کی نگاہ میں عرب و عجم اور شام و ہند سب برابر ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ کی ہمہ بین آنکھوں نے پورب، پچھم، اتر، دکھن ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کا نور دیکھا اور ہر زبان میں اس کی آواز سنی۔

﴿ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ﴾ (١٠/ يونس:٤٧)

''اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔''

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا ﴾ (١٦/ النحل:٣٦)

''اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا۔''

﴿ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ ﴾ (٣٠/ الروم:٤٧)

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کتنے رسول ان کی اپنی اپنی قوم میں بھیجے۔''

﴿ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾ (١٣/ الرعد:٧)

''اور ہر قوم کے لیے ایک راہنما آیا۔''

﴿ وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ﴾ (٣٥/ فاطر:٢٤)

''کوئی قوم نہیں جس میں ایک ہشیار کرنے والا نہ آیا ہو۔''

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ﴾ (١٤/ ابراهيم:٤)

''اور ہم نے پہلی قوموں میں کتنے پیغمبر بھیجے اور ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی بولی میں بھیجا، تاکہ وہ ان کو بتا سکے۔''

اس آخری آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول کی یہ تعلیم الٰہی تشریح و بیان کے لیے مامور ہے۔

ایک یہود کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی اور کو پیغمبر ماننا ضروری نہیں، ایک عیسائی تمام دوسرے پیغمبروں کا انکار کر کے بھی عیسائی رہ سکتا ہے، ایک ہندو تمام دنیا کو ملیچھ، شودر اور چنڈال کہہ کر بھی پکا ہندو رہ سکتا ہے، ایک زردشتی تمام عالم کو سحرِ ظلمات کہہ کر بھی نورانی رہ سکتا ہے اور وہ ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا کہہ کر بھی دین داری کا دعویٰ کر سکتا ہے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ ناممکن کر دیا ہے کہ کوئی ان کی پیروی کا دعویٰ کر کے ان سے پہلے کے کسی پیغمبر کا انکار کر سکے۔ آنحضرت ﷺ تہجد میں جو دعا پڑھتے تھے، اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا ((وَالنَّبِيُّونَ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ)) [1] ''سب نبی برحق تھے اور محمد بھی برحق ہے۔'' غرض کوئی شخص اس وقت تک محمدی نہیں ہو سکتا جب تک اس سے پہلے وہ موسوی یا عیسوی اور سلیمانی داؤدی نہ بن لے اور کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ دنیا کے تمام پیغمبروں کی یکساں صداقت، حقانیت، راست بازی اور معصومیت کا اقرار نہ کرے اور یہ یقین نہ کرے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب کی طرح ہر قوم کو اپنی ہدایت اور راہنمائی سے سرفراز کیا ہے، ان کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا خدا کا ماننا:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ

[1] صحیح بخاری، کتاب التهجد، باب التهجد بالليل: ١١٢٠۔

بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء:١٥٠-١٥٢)

''بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے اور بعض کو نہیں مانیں گے اور چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ بیچ میں کوئی راستہ پکڑیں وہی حقیقت میں کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے اہانت والا عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان رسولوں میں سے کسی کو الگ نہیں کیا وہ ان کی مزدوری ان کو دے گا اور اللہ بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔''

﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ ﴾ (٢/ البقرۃ:١٧٧)

''اور فرشتوں پر، کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لانا نیکی ہے۔''

﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء:١٣٦)

''اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں اور قیامت کا انکار کیا، وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔''

سورۂ بقرہ کے خاتمہ میں ہے:

﴿ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ ﴾

(٢/ البقرۃ:٢٨٥)

''ہر ایک خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا، ہم خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔''

﴿ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ ﴾ (٢/ البقرۃ:٢٨٥)

''ہم ان پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔''

پیغمبروں میں تفریق کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ان میں سے بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں، اسلام نے اس کی ممانعت کی اور عام حکم دیا کہ دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں خدا کا رسول، صادق اور راست باز تسلیم کیا جائے۔

یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا اور کاذب سمجھتے تھے اور ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے اور اب بھی ان کا یہی عقیدہ ہے۔ یہودیت اور اسلام میں جو اشتراک ہے وہ مسیحیت سے زیادہ ہے اس لیے اگر اسلام کی راہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کا نام نہ آئے تو بہت سے یہود مسلمان ہونے کو تیار ہو جائیں، مگر اسلام نے کبھی یہ ننگ گوارا نہیں کیا اور جب تک کسی یہودی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت، معصومیت اور تقدس کا اقرار نہیں لے لیا، اس کو اپنے دائرہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی، چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بہت سے یہود آپ کی رسالت اور شریعت پر ایمان لانے کو تیار تھے، مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کی دوستی کے عظیم الشان فائدوں سے محرومی قبول کی، مگر مسیح علیہ السلام کی سچائی سے محرومی قبول نہ فرمائی [1] اور ان سے صاف کہا:

﴿ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ۝ ﴾ (٥/ المآئدة:٥٩)

''اے یہود! کیا بیر ہے تم کو ہم سے مگر یہی کہ ہم خدا پر، اور جو ہماری طرف اتارا گیا ہے اور جو پہلے اتارا گیا اس پر ایمان رکھتے ہیں تم میں اکثر بے حکم ہیں۔''

خود قریش کا یہ حال تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام سے چڑکتے تھے، مگر ان کی خاطر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت، تقدس اور معصومیت سے انکار نہیں کیا گیا، قرآن نے کہا:

﴿ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ۝ وَقَالُوْۤا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ؕ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ ﴾

(٤٣/ الزخرف:٥٧۔٥٩)

''اور جب مریم کے بیٹے کی کہاوت بیان کی گئی تب ہی تیری قوم اس سے چلانے لگتی ہے اور بولی کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ، یہ نام جو تجھ پر دھرتے ہیں صرف جھگڑنے کو بلکہ وہ جھگڑالو ہیں، وہ تو ایک بندہ ہے جس پر ہم نے فضل کیا۔''

قریش کو معلوم تھا کہ اسلام عیسیٰ ابن مریم کو بندہ اور رسول مانتا ہے خدا نہیں، باوجود اس کے عیسائیوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے کی وجہ سے عیسیٰ پرست تصور کر کے الزام دھرتے تھے، قرآن نے ان کے اس بے معنی اعتراض کی تردید کی۔

اسلام میں پیغمبروں کی کوئی تعداد محدود نہیں، طبرانی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا مبعوث ہوئے، ایک دوسری روایت میں اس سے کم تعداد بھی مروی ہے۔ قرآن پاک میں نام کے ساتھ

[1] تفسیر ابن جریر طبری، ج٦، ص: ١٦٧، مصر۔

صرف انہیں انبیا علیہم السلام کا ذکر ہے جن سے عرب مانوس تھے یا ان کے ہمسایہ یہود و نصاریٰ کے صحیفوں میں جن کے تذکرے تھے۔ قرآن میں بعض ایسے انبیا بھی مذکور ہیں جن سے صرف عرب واقف تھے مگر یہود و نصاریٰ بے خبر تھے، مثلاً: حضرت ہود اور حضرت شعیب علیہما السلام بعض ایسے ہیں جن کو وہ جانتے تھے لیکن ان کو پیغمبر تسلیم نہیں کرتے تھے، مثلاً: حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام۔ وحی محمدی نے ان سب کو پیغمبر تسلیم کیا اور ان کی صداقت و عظمت کا اقرار کیا۔

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعیت کی طرف اشارہ کر دینا مناسب ہے۔ اسلام سے پہلے نبوت و رسالت اور پیغمبری کی کوئی خاص، واضح اور غیر مشتبہ حقیقت دنیا کے سامنے نہ تھی۔ یہود کے ہاں نبوت کے معنی صرف پیشین گوئی کرنے کے تھے اور نبی پیشین گو کو کہتے تھے اور جس کے متعلق یقین رکھتے تھے کہ اس کی دعا یا بد دعا فوراً قبول ہو جاتی ہے [1] اسی لیے حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام کی نبوت اور رسالت کا محض دھندلا سا خاکہ ان کے ہاں موجود ہے بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقابلہ میں شام کے کاہن مالک کی پیغمبرانہ شان ان کے نزدیک زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے [2] حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی حیثیت بھی ان کے ہاں صرف بادشاہ کی ہے اور ان کے زمانہ کے پیشین گوئی کرنے والے پیغمبر اور ہیں، یہی سبب ہے کہ یہود کے قصوں اور کتابوں میں اسرائیلی پیغمبروں کی طرف نہایت نحیف باتیں بے تامل منسوب کی گئی ہیں اسی طرح عیسائیوں میں بھی رسالت اور نبوت کی کوئی واضح حقیقت نہیں ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ ''مجھ سے پہلے جو آئے وہ چور اور ڈاکو تھے۔'' [3] موجودہ انجیلوں میں نہ خدا کے رسولوں کی تعریف ہے، نہ ان کے تذکرے ہیں، نہ ان کی سچائی اور صداقت کی گواہی ہے۔ حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام جن کے تذکرے انجیل میں ہیں وہ بھی پیغمبرانہ شان کے ساتھ ان کے ہاں مسلم نہیں لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے آ کر اس جلیل القدر منصب کی حقیقت ظاہر کی اور اس کے فرائض بتائے اور اس کی خصوصیات کا اظہار کیا اور ان سب پر ایمان لانا نجات کا ضروری ذریعہ قرار دیا، آپ ﷺ نے بتایا کہ نبوت و رسالت خاص خاص انسانوں کو خدا کا بخشا ہوا ایک منصب ہے جس کو دے کر وہ دنیا میں اس غرض سے بھیجے گئے ہیں کہ وہ خدا کے احکام لوگوں کو بتائیں اور سچائی اور نیکی کا راستہ ان کو دکھائیں وہ ہادی (راہنما) **نذیر** (ہشیار کرنے والے) **داعی** (خدا کی طرف بلانے والے) **مبشر** (خوش خبری سنانے والے) **معلم** (سکھانے والے) **مبلغ** (خدا کے احکام پہنچانے والے) اور **نور** (روشنی) تھے۔ خدا ان سے ہم کلام ہوتا تھا اور اپنی باتوں سے ان کو مطلع کرتا تھا اور وہ ان سے دوسرے انسانوں کو آگاہ کرتے تھے، وہ گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ تھے، وہ خدا کے نیک اور مقبول بندے تھے اور اپنے عہد کے سب سے بہترین انسان تھے، ان کے سب کام خدا کے لیے تھے اور خدا ان کے لیے تھا۔ یہ ہستیاں اپنے فرائض کو انجام دینے کے لیے ہر قوم میں پیدا ہوئیں

[1] دیکھو: تورات صحیفہ تکوین، باب: ۲۰۔۷۔ [2] سفر تکوین: ۱۴۔۱۸۔ [3] انجیل۔

جنہوں نے ان کو مانا انہوں نے نجات پائی اور جنہوں نے جھٹلایا ہلاک و برباد ہوئے، قرآن پاک نے ان کی زندگی کے سوانح، ان کی تبلیغ کی روداد، ان کے اخلاق کی بلند مثالیں اور ان کی خدا پرستی کا اخلاص اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کے پڑھنے اور سننے سے ان کی پیروی کا جذبہ، ان کی اتباع کا شوق اور ان کی صداقت کا یقین دلوں میں پیدا ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی ان کی طرف شان نبوت کے خلاف جو غلط باتیں دوسرے صحیفوں میں منسوب ہیں ان کو چھوڑ دیا ہے یا ان کی تردید کردی ہے۔

الغرض نبوت اور رسالت کی سب سے اہم خصوصیت اسلام نے جو یہ قرار دی کہ نبی و رسول گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں بنی اسرائیل کو نبوت اور رسالت کے اس بلند تخیل کی ہوا بھی نہیں لگی تھی اس لیے انہوں نے نہایت بے باکی سے اپنے پیغمبروں کی طرف ہر قسم کے گناہ منسوب کردیے، عیسائی ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو معصوم کہتے ہیں باقی سب کی گناہگاری کے قائل ہیں لیکن اسلام نے دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کی عظمت کی ایک ہی سطح قائم کی ہے، اس کے نزدیک گناہوں سے پاکی اور عصمت تمام انبیا اور مرسلین کا مشترکہ وصف ہے کہ جو خود گناہگار ہے وہ گناہگاروں کی راہنمائی کا مستحق نہیں کہ اندھا اندھے کو راہ نہیں دکھا سکتا اس بنا پر محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی و تعلیم نے خدا کے تمام معصوم رسولوں کی عظمت و جلالت دنیا میں قائم کی اور جن کور باطنوں نے ان کی عصمت و بے گناہی کے دامن پر اپنے وہم و نادانی سے داغ لگائے تھے ان کو دھو کر پاک و صاف کیا اور یہ رسالت محمدی ﷺ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

خود انجیل کے طرز سے ظاہر تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام احکام عشرہ کے برخلاف اپنی ماں کی عزت نہیں کرتے تھے تو قرآن نے اس کی تردید کی اور خود حضرت عیسیٰ کی زبان سے کہلوایا:

﴿ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ ۡ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ۝﴾ (۱۹/ مریم : ۳۲)

''اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنے والا اور مجھ کو خدا نے جبار و بدبخت نہیں بنایا۔''

کیونکہ احکام عشرہ کے مطابق ماں باپ کا ادب نہ کرنا بدبختی تھی، اسی طرح موجودہ انجیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سر پر تھوپا ہے کہ وہ نماز و روزہ کی پروانہ کرتے تھے، قرآن نے ان کی زبان سے کہلوایا:

﴿ وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ ۝﴾ (٦٦/ التحریم:١٢)

''اور مریم بنت عمران جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے اپنے پروردگار کی باتوں اور اس کی کتابوں کو سچ جانا اور وہ بندگی کرنے والوں میں تھی۔''

یہود حضرت سلیمان علیہ السلام کو گنڈہ، تعویذ اور عملیات وغیرہ کا موجد سمجھتے تھے، حالانکہ سحر و جادو وغیرہ توراۃ میں شرک قرار دیا جاچکا تھا اور قرآن نے اعلانیہ یہودیوں کے اس الزام کی تردید کی:

﴿ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۰۲)

''اور سلیمان نے کفر کا کام نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے کیا، لوگوں کو وہ جادو سکھاتے تھے۔''

اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام پر بدکاری کا جو الزام یہود لگاتے ہیں، اس کی تردید کی۔

اوپر گزر چکا ہے کہ قرآن نے یا آنحضرت ﷺ نے دنیا کے تمام پیغمبروں کے نام نہیں لیے ہیں کہ صرف ناموں کی فہرست یا نامعلوم اشخاص کے نام لینے سے دلوں میں جوش عقیدت پیدا نہیں ہوسکتا، تاہم معلوم تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی صدائے دعوت ایک دن دنیا کے کناروں تک پہنچے گی اور بہت سی غیر قومیں اور دوسرے انبیا علیہم السلام کی امتیں اس حلقہ میں داخل ہوں گی اور اپنے اپنے انبیا علیہم السلام کا نام ونشان صحیفہ محمدی ﷺ میں تلاش کریں گی، اس لیے ایک جامع آیت میں تمام انبیا کا تذکرہ کر دیا گیا اور ان کی صداقت کی پہچان بتادی گئی، فرمایا:

﴿ اِنَّاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ كَمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء:١٦٣-١٦٥)

''ہم نے (اے محمد ﷺ) تمہارے پاس وحی بھیجی جس طرح نوح علیہ السلام اور ان کے بعد کے پیغمبروں کو بھیجی، ہم نے ابراہیم کو اور اسماعیل کو اور اسحاق کو اور یعقوب کو اور ان کے خاندان کو اور عیسیٰ کو اور ایوب کو اور یونس کو اور ہارون کو اور سلیمان کو، وحی بھیجی اور داؤد کو زبور عطا کی اور دوسرے رسولوں کو بھیجا، جن کا حال تم سے ہم نے پہلے بیان کیا ہے اور ان رسولوں کو جن کا حال ہم نے تم سے بیان نہیں کیا اور خدا نے موسیٰ سے بات کی اور ان رسولوں کو خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا، تاکہ لوگوں کو رسولوں کے آجانے کے بعد خدا کے آگے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور خدا غالب اور دانا ہے۔''

انبیا کے متعلق یہی حقیقت سورۂ مومن میں دوبارہ بیان کی گئی ہے:

﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ؕ ﴾ (٤٠/ المؤمن:٧٨)

''اور ہم نے یقیناً تم سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے، ان میں کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان کیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا۔''

تعلیم محمدی ﷺ کے اصول کے مطابق یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قوموں اور ملکوں جیسے چین، ایران اور ہندوستان میں بھی آنحضرت ﷺ سے پہلے خدا کے انبیا مبعوث ہو چکے ہیں اس لیے یہ تمام قومیں اپنے جن بزرگوں کی عزت وعظمت کرتی ہیں اور اپنے دین ومذہب کو ان کی طرف منسوب کرتی ہیں ان کی صداقت اور راستبازی کا قطعی انکار کوئی مسلمان نہیں کرسکتا، اسی بنا پر بعض علما نے ہندوستان کے کرشن اور رام [1] کو بلکہ ایران کے زردشت [2] کو بھی اور بعض صاحبوں نے تو بودھ تک کو بھی پیغمبر کہا ہے، بہرحال امکان میں تو شک ہی نہیں لیکن یقین کے ساتھ ان ناموں کی تعیین بھی حد سے تجاوز کرنا ہے، اصل یہ ہے کہ قرآن نے انبیا کی دو قسمیں کی ہیں، ایک وہ جن کے ناموں کی اس نے تصریح کی ہے اور دوسرے وہ جن کے نام اس نے بیان نہیں کیے، اس لیے صحیح یہ ہے کہ جن انبیا علیہم السلام کے نام مذکور ہیں تمام مسلمانوں کو ان پر نام بنام ایمان لانا چاہیے اور جن کے نام مذکور نہیں ان کی نسبت صرف یہ اجمالی ایمان کافی ہے کہ ان قوموں میں بھی خدا کے فرستادہ اور پیغمبر آئے لیکن بہ تخصیص ان کے نام نہیں معلوم، وہ قومیں جن کا نام لیتی ہیں ان کی زندگی اور ان کی تعلیم نبوت اور رسالت کی شان کے مطابق ہے تو ان کی نبوت اور رسالت کی طرف رجحان اور میلان بلکہ قرینہ غالب ہوسکتا ہے لیکن یقین اس لیے نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے پاس ان باتوں پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف وحی محمدی ہے اور وہ اس تخصیص وتعیین سے خاموش ہے۔ اس قسم کے انبیا علیہم السلام جن کے نام گو قرآن میں مذکور نہیں مگر وہ آنحضرت ﷺ سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان کے پیرو ان کو اپنے ہاں نبوت ورسالت کا یہ درجہ دیتے ہیں، ان کی شناخت اور پہچان کا ایک اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دی ہے:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِىْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ ﴾

(١٦/ النحل:٣٦)

''اور ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی پرستش کرو اور جھوٹے معبود سے بچے رہو۔''

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِىْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ ﴾

(٢١/ الانبیآء:٢٥)

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں بھیجا لیکن اس کو یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں، مجھ کو پوجو۔''

اس لیے وہ تمام قدیم رہبران انسانی اور راہنمایانِ عالم جو دنیا میں کسی مذہب کو لائے ہوں اور جن کی

[1] کلمات طیبات حضرت شاہ مرزا مظہر جان جاناں رحمہ اللہ ۔ مکتوب چہارم ص:٣٧ تا ٤٠۔

[2] ملل و نحل لابن حزم، الکلام علی الیہود، ج:١، ص: ١١٣۔

تبلیغ اور تعلیم توحید کی دعوت اور بت پرستی سے اجتناب تھی اور ان کی زندگی اس تعلیم کے شایان شان تھی ان کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی قوم کے اور اپنے وقت کے رسول اور پیغمبر نہ تھے کہ اتنی بڑی بڑی قومیں خود قرآن کے اصول کی بنا پر انبیا اور رسولوں کے وجود سے خالی نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس بنا پر اسلام کی ان تلقینات میں سے جن کے تسلیم کیے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا ایک یہ ہے کہ وہ تمام ملکوں کے پیغمبروں اور تمام قوموں کے رسولوں کو جو حضرت خاتم نبوت ﷺ کے زمانے سے پہلے پیدا ہوئے یکساں صداقت کے ساتھ تسلیم کرے، ان سب نے تمام دنیا کو ایک ہی تعلیم دی ہے اور وہ توحید ہے البتہ ان انبیا علیہم السلام میں سے ایک کو دوسرے پر بعض بعض حیثیتوں سے ترجیح ہے:

﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ ﴾ (۲/ بقرہ: ۲۵۳)

”ان رسولوں میں سے کسی کو کسی پر فضیلت دی، ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام کیا اور کسی کے بہت درجے بڑھائے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو نشانیاں دیں اور سچائی کی روح سے ہم نے اس کی تائید کی۔“

آپ نے دوسرے انبیا علیہم السلام کی جائز تعظیم و تکریم یہاں تک کی کہ ان کے مقابلہ میں کبھی کبھی اپنی ہستی بھی فراموش کر دی ہے۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے آپ کو خیر البریہ اے بہترین خلق! کہہ کر خطاب کیا۔ فرمایا: ”وہ تو ابراہیم علیہ السلام تھے۔“ [1] ایک دفعہ ایک صاحب نے دریافت کیا کہ سب سے بزرگ عالی خاندان کون تھا، فرمایا: ”یوسف علیہ السلام پیغمبر بن پیغمبر بن پیغمبر بن خلیل اللہ۔“ [2] ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک یہودی مدینہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو بشر پر فضیلت دی ایک مسلمان کھڑے یہ سن رہے تھے ان کو غصہ آیا کہ ہمارے پیغمبر کی موجودگی میں تم یہ کہہ رہے ہو اور اس کو ایک تھپڑ کھینچ مارا، اس نے دربار نبوی میں جا کر شکایت کی آپ نے ان صحابی کو بلا بھیجا اور مقدمہ کی روداد سنی اور نہایت برہم ہو کر فرمایا: ”پیغمبروں میں باہم ایک کو دوسرے پر فضیلت نہ دو۔“ [3] یعنی ایسی فضیلت جس سے کسی دوسرے نبی کی تنقیص ہو۔

یہی وہ تعلیمات محمدی ہیں جن کے ذریعہ سے دنیا میں وحدتِ مذاہب، روحانی مساوات اور انسانی اخوت اور تمام انبیا علیہم السلام اور پیغمبروں کے ادب و احترام کے جذبات پیدا ہوئے، بنی اسرائیل کے وہ پیغمبر جن کو ماننے والے تمام دنیا میں چند لاکھوں سے زیادہ نہ تھے محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ان کی عظمت، جلالت اور ادب و احترام کرنے والے چالیس کروڑ سے زیادہ ہو گئے۔ وہ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام جو چھ سو برس

---

[1] مسند احمد، ج ۳، ص: ۱۷۸، ۱۸٤۔ [2] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ عزوجل: ﴿لقد كان في يوسف واخوته......﴾: ۳۳۹۰۔

[3] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالی: ﴿وإنّ يونس لمن المرسلين﴾: ۳٤۱٤۔

تک یہودیوں کی جھوٹی تہمت سہتے رہے، محمد رسول اللہ ﷺ نے آ کر اس کو مٹایا اور ان کی پاکی کی گواہی دی، جس کی بدولت آج چالیس کروڑ زبانیں ان کی عصمت کی شہادت دے رہی ہیں۔ ہندوستان، ایران، چین جن کے سچے راہنماؤں کا ان کے ملک سے باہر کوئی ادب واحترام نہ تھا، جہاں جہاں مسلمان گئے ان کے جائز ادب واحترام کو اپنے ساتھ لے گئے۔

وہ عرب جو پیغمبروں کے ناموں تک سے ناواقف تھے، جو نبوت اور رسالت کے خصائص کے علم سے محروم تھے، جو انبیا علیہم السلام اور رسولوں کی سیرتوں سے ناآشنا تھے، جو ان کے ادب واحترام اور تصدیق واعتراف سے بیگانہ تھے اور جن کو اپنے دیوتاؤں کے سامنے عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام پر تحقیرانہ ہنسی آتی تھی، [1] اور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کا ذکر سن کر اپنے غصہ کو ضبط نہ کر سکتے تھے [2] محمد رسول اللہ کی تعلیم سے ان کا یہ حال ہوا کہ وہ ایک ایک پیغمبر کے نام ونشان اور تاریخ وسیرت سے واقف ہوگئے اور تبرکاً ان کے ناموں پر اپنی اولادوں کے نام رکھنے اور آج تمام مسلمانوں میں وہ نام شائع اور ذائع ہیں، ان کی صداقت اور سچائی کی گواہی دی اور ان کے ادب واحترام کو اپنے سینوں میں جگہ دی، ان کی تعظیم وتکریم کو اپنے دین وایمان کا جزو بنالیا، دنیا کی کسی قوم میں یہ رواج نہیں ہے کہ انبیا علیہم السلام کے نام ادب سے لیے جائیں، مگر ایک مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ جب کسی پیغمبر کا نام لے تو ادب سے لے اور ان پر درود وسلام پڑھے۔

---

[1] قرآن پاك سورة زخرف، آیت نمبر:۵۷۔

[2] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ﴿ان یونس لمن المرسلین﴾: ٣٤١٤۔

کتبِ الٰہی پر ایمان

﴿ وَكُتُبِهٖ ﴾

ایک مسلمان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے صحیفۂ وحی پر ایمان لائے۔ ہر چند یہ عقیدہ پچھلے عقیدہ رسالت کا لازمی نتیجہ ہے یعنی رسول کو رسول مان لینا، اس کی تعلیمات کو اور وحی کو مان لینے کے مترادف ہے۔ تاہم یہ تصریح اس لیے کی گئی ہے، تا کہ یہ پوری طرح صاف اور واضح ہو جائے کہ رسول کو رسول مان لینے کے بعد اس کے صحیفۂ وحی کو مان کر اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے۔ سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں سچے مومنوں کی تعریف میں کہا گیا ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ﴾ (۲/ البقرۃ:٤)

''اور جو اس (کتاب یا وحی) پر ایمان رکھتے ہیں جو تجھ پر (اے محمد) اتاری گئی۔''

کتابِ الٰہی پر ایمان لانے سے مقصود ان تمام صداقتوں اور حکموں کو بہ دل و جان قبول کرنا ہے جو اس میں مذکور ہیں، یہ گویا پوری شریعتِ مطہرہ کے قبول کر لینے کا مختصر ترین طریقہ تعبیر ہے اور اس لیے ایمانیات کی بہت سی دوسری باتیں جن کی تفصیل ہر موقع پر ضروری نہیں، اس ایک فقرہ کے تحت میں آ جاتی ہیں، اس لیے قرآن پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام کی باتیں ہیں ان سب کو بے کم و کاست ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر کوئی سرے سے ان کو تسلیم ہی نہیں کرتا تو ان کی تعمیل و پیروی کا اس سے کیونکر مطالبہ ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر اس کی تشریح آنحضرت ﷺ نے کبھی ان الفاظ میں فرمائی کہ ((بِمَا جِئْتُ بِهٖ)) ''جو کچھ میں لے کر آیا اس پر ایمان لاؤ۔'' قرآن نے کہا:

﴿ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ ﴾ (٤٧/ محمد:٢)

''اور جو ایمان لائے اس پر جو محمد پر اتارا گیا۔''

لیکن قرآن اگر اتنا ہی کہتا کہ میرے پیرو صرف مجھ پر ایمان لائیں تو یہ کوئی اہم بات نہ ہوتی کہ ہر صاحبِ مذہب کی یہی تعلیم ہوتی ہے، قرآن نے اپنے عقائد کی اس دفعہ میں بھی اپنے تکمیلی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے اور قرار دیا کہ اہلِ قرآن، قرآن کے ساتھ ہی دوسری آسمانی کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کریں یعنی کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک صحیفہ محمدی ﷺ کے ساتھ ساتھ دوسرے پیغمبروں کے صحیفوں کو بھی من جانب اللہ تسلیم نہ کرے، چنانچہ سورۂ بقرہ کے شروع والی مذکورہ آیت کے ساتھ یہ بھی فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ﴾ (۲/ البقرۃ:٤)

''اور جو ایمان لائے اس پر جو تجھ پر اترا اور جو تجھ سے پہلے اترا۔''

پھر اسی سورہ کے آخر میں فرمایا:

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۸۵)

''رسول ایمان لایا اس پر جو خدا کی طرف سے اس پر اترا اور اہل ایمان بھی، ہر ایک، خدا پر، اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر ایمان لایا۔''

بقرہ کی آیتوں میں بعض انبیا علیہم السلام کا تفصیلی درجہ اور بقیہ تمام انبیا علیہم السلام کا اجمالی ذکر کر کے ان کی کتابوں اور وحیوں کی تصدیق کا حکم دیا گیا ہے:

﴿ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۳۶)

''(اے مسلمانو!) تم کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور خاندانِ یعقوب کی طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر اور جو کچھ سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، ان سب پر ایمان لائے۔''

آل عمران میں کسی قدر اور تفصیل ہے:

﴿ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ ﴾

(۳/ آل عمران:۸۴)

''کہہ کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا اس پر اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور خاندان یعقوب پر اتارا گیا اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر، اور دوسرے سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے جو کچھ دیا گیا ہم ان سب پر ایمان لائے۔''

سورۂ نساء میں اس پر ایمان لانے کے حکم کے ساتھ ساتھ اس کے انکار کو کفر قرار دیا گیا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝ ﴾ (۴/ النسآء:۱۳۶)

''اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو ایمان لاؤ خدا پر، اس کے رسول پر اور اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں

کا اور اس کی کتابوں کا............ انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔''

سورۂ مومن میں ان منکروں، کو عذاب کی بھی دھمکی دی گئی ہے جو کسی پیغمبر کے پیغام کی بھی تکذیب کریں:

﴿ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۛ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۙ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ۭ يُسْحَبُوْنَ ۙ ﴾ (٤٠/ المؤمن: ٧٠، ٧١)

''جن لوگوں نے کتاب کو اور جو پیغام دے کر ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا، ان کو جھٹلایا وہ عنقریب جانیں گے جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی اور وہ کھینچے جائیں گے۔''

نام کی تخصیص کے ساتھ قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے تو راۃ جس کو ایک جگہ صحف موسیٰ بھی کہا گیا ہے اور حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل اور خود قرآن۔ ان کے علاوہ ایک موقع پر صحف ابراہیم کا بھی تذکرہ ہے:

﴿ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۙ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۧ ﴾

(٨٧/ الاعلیٰ: ١٨، ١٩)

''یہ باتیں گزشتہ صحیفوں میں بھی ہیں، ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں بھی۔''

ان کے ماسوا اجمال کے ساتھ دو موقعوں پر گزشتہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے الفاظ ہیں:

﴿ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴾ (٢٠/ طٰہٰ: ١٣٣)

''کیا اگلے صحیفوں میں جو کچھ ہے اس کی گواہی ان کو نہیں پہنچی؟''

﴿ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ (٢٦/ الشعرآء: ١٩٦)

''اور بے شبہ یہ پہلوں کی کتابوں میں مذکور ہے۔''

اس بنا پر انبیا علیہم السلام کی طرح ان کتابوں پر بھی اسی طرح تفصیلی اور اجمالی ایمان ہر مسلمان کا ہے، جن کتابوں کے نام مذکور ہیں ان ناموں کے ساتھ اور جن کے نام مذکور نہیں ان پر بالا جمال ایمان ضروری ہے۔ کسی قوم میں اگر کوئی ایسی آسمانی کتاب ہے جس کا وجود قرآن سے پہلے ہے لیکن اس کا تصریحی نام قرآن میں مذکور نہیں ہے اور اس میں توحید کی دعوت اور طاغوت سے بچنے کی نصیحت ہے تو اگر چہ ہم اس کو بتصریح خدا کی کتاب قبول نہیں کر سکتے، تاہم بالتصریح اس کو رد بھی نہیں کر سکتے اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ ''اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب۔'' [1] یہی حال دوسری مشکوک کتابوں کا ہے۔ یہود تو راۃ کے سوا کچھ نہیں مانتے، عیسائی تو راۃ کے احکام نہیں مانتے لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں مگر انجیل سے پہلے کی دوسری زبانوں اور ملکوں کی آسمانی کتابوں کی نسبت مسلمانوں کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب یجوز من تفسیر التوراۃ: ٧٥٤٢ وکتاب التفسیر: ٤٤٨٥۔

کرتے، پارسی اوستا کے باہر خدا کے کلام ہونے کا شبہ بھی نہیں کر سکتے اور برہمن ویدوں کے باہر خدا کے فیضان کا تصور بھی نہیں کر سکتے، لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ صحیفہ ابراہیم، توراۃ، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں یقین کرے اور دوسری پیشتر آسمانی کتابوں کی جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں تکذیب نہ کرے کہ ان کا کتب الٰہی ہونا ممکن ہے۔

حقیقت میں اسلام کی یہ تعلیم دنیا کی مہتم بالشان تعلیمات میں سے ہے، جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہ تھا یہ رواداری، بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے، یہود اپنی کتاب کو چھوڑ کر تمام دوسری آسمانی کتابوں سے انکار کر کے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے، عیسائی توراۃ اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کر کے بھی آسمانی بادشاہی کا متوقع ہوسکتا ہے، پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابوں کو باطل مان کر بھی مینو (جنت) کا استحقاق پیدا کرسکتا ہے، ہندو اپنے ویدوں کے سوا دنیا کی ہر آسمانی کتاب کو دجل و فریب مان کر بھی آواگون سے نجات حاصل کرسکتا ہے، بودھ مت والے اپنے سوا تمام دنیا کی وحیوں کا انکار کر کے بھی نروان کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں، مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابوں کو منجانب اللہ نہ تسلیم کریں جنت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

یہ تعلیم صرف نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ عملاً اس پر اسلامی حکومت کے قوانین اور احکام مبنی ہیں، یہودیوں کی نظر میں دنیا میں صرف دو ہی قومیں ہیں، بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل یا اسرائیل کا گھرانہ اور ''غیر قومیں'' یا مختون اور غیر مختون اور ان ہی دونوں تقسیموں پر ان کے قانون کی بنیاد ہے۔ عیسائیوں میں مذہبی حیثیت سے مسیحی اور یہود اور بت پرستی گو تین قومیں مانیں جاتی ہیں مگر چونکہ ان کے مذہب میں قانون نہیں، اس لیے وہ اکثر امور میں رومن لا کے ماتحت رہے ہیں لیکن رومن عیسائیوں میں بھی ملکی حیثیت سے دو ہی تقسیمیں ہیں رومی اور غیر رومی اور ایک رومی ملک میں غیر رومی کا کوئی حق نہیں کہ رومی حکومت کے لیے اور غیر رومی غلامی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ پارسیوں میں پاک نژادان ایران اور بیرونی لوگ، دنیا کی دو ہی حیثیتیں ہیں، ہندوؤں میں اونچی ذاتیں اور اچھوت اور ملیچھ قوموں کی دو ہی صورتیں ہیں۔

مگر اسلام کے گزشتہ عقیدہ کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے قانون کی حیثیت سے دنیا کی قوموں کو چار حصوں میں تقسیم فرمایا اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق قرار دیے اور اسلام کی تیرہ صدیوں میں ان پر برابر عمل ہوتا رہا یہ تقسیمیں حسب ذیل ہیں:

① مسلمان

جو قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں کو کتابِ الٰہی یقین کرتے ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بھائی اور ہر اچھائی اور برائی میں وہ ایک دوسرے کا شریک ہے وہ آپس میں ایک دوسرے سے شادی بیاہ

کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے ہاتھ سے ذبح کیے ہوئے جانور کھا سکتے ہیں اور اسلام کی سلطنت میں ان کے حقوق یکساں ہیں۔

② اہل کتاب

یعنی ان کتابوں کے پیرو جن کے نام قرآن میں مذکور ہیں، یا یوں کہو کہ جو قرآن کو گو آسمانی کتاب نہیں مانتے مگر ان کتابوں میں سے جن کا نام قرآن میں مذکور ہے کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتے ہیں وہ اپنی حفاظت کا مالی ٹیکس (جزیہ) ادا کر کے اسلامی حکومتوں کے دور میں رہ سکتے ہیں ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رہیں گی، ان کو اپنے مذہب کے بدلنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، ان کی جان و مال اور عزت کے مسلمان محافظ رہیں گے، ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں اور ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں ان کا جائز کھانا ہم کھا سکتے ہیں اور ہم اپنا کھانا ان کو کھلا سکتے ہیں۔

③ شبہ اہل کتاب

یعنی وہ لوگ جو قرآن اور توراۃ اور انجیل و زبور کو نہیں مانتے مگر وہ خود اپنے لیے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں، جیسے صابی جو ایک آسمانی کتاب کے دعویٰ کے باوجود ستاروں کو پوجتے تھے اور مجوس یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے تھے اور ساتھ ہی سورج اور آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں، ترکستان اور سندھ کی فتح کے موقع پر علمائے اسلام نے انہیں پر قیاس کر کے ہندوؤں اور بودھوں وغیرہ کو بھی اس صف میں داخل کیا۔ مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے اور ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے ان دو باتوں کے علاوہ اہل کتاب کے بقیہ تمام حقوق آنحضرت ﷺ نے ان کو عطا کیے اور وہ اسلامی حکومتوں میں ادائے جزیہ کے بعد ہر قسم کے ملکی حقوق میں شریک ہیں اور ان کی جان و مال و آبرو اور ان کے معبدوں کی حفاظت اسلامی حکومتوں کا فرض ہے۔

④ کفار اور مشرکین

یعنی وہ لوگ جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ کسی دینِ الٰہی کی طرف منسوب ہیں ان کو چند شرائط کے ساتھ امن دیا جا سکتا ہے، لیکن حقوق کے حصول کے لیے ان کو کہا جائے گا کہ وہ کسی نہ کسی آسمانی دین کے اندر اپنے کو داخل کر لیں جیسا کہ عباسیوں کے ابتدائی زمانہ میں حرانی عراقیوں نے اپنے کو صابیوں میں داخل کر کے اپنے حقوق حاصل کر لیے تھے۔

اس تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی اس تعلیم نے دنیا میں امن و امان اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری کے پیدا کرنے میں کتنا عظیم الشان حصہ لیا ہے یہی وہ نظریہ تھا جس نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقائد و شریعت کی سخت پیروی کے باوجود دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت اور میل جول کے

لیے آمادہ کیا اور مجوسیوں اور صابیوں اور یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مختلف ملکوں میں ان ملکوں کے مناسب مختلف تمدنوں کی بنیاد رکھنے کی قوت پیدا کی۔

وحدۃ الادیان

تمام رسولوں اور ان کے صحیفوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہو کہ آدم علیہ السلام سے لے کر محمد تک جتنے سچے مذہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے۔ چنانچہ درحقیقت آپ کی تعلیم یہی تھی اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے جو آدم علیہ السلام سے محمد تک باری باری سے پیغمبروں کے ذریعہ آتارہا اور انسانوں کو اس کی تعلیم دی جاتی رہی۔

صحیفۂ محمدی نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کیے ہیں ایک دین اور دوسرا شرعۃ، منسک اور منہاج۔ شرعۃ اور منہاج کے معنی راستہ کے ہیں اور منسک کے معنی طریقِ عبادت کے ہیں۔ دنیا میں یہ راز سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب پاک پر منکشف ہوا کہ دینِ الٰہی ہمیشہ ایک تھا ایک رہا اور ایک رہے گا، نورِ معرفت ایک ہے خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکل و رنگ کی قندیلوں میں روشن ہوا، اصل دین میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی، ایک ہی دین تھا جس کو لے کر اول سے آخر تک تمام انبیا آتے رہے، اس میں زمان و مکان کے تغیر کو کوئی دخل نہیں اور نہ قوم و ملک کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا، وہ ہر زمانہ میں اور ہر مقام میں یکساں آیا اور وہاں کے پیغمبروں نے اس کی یکساں تعلیم دی۔

یہ دائمی حقیقت اور یکساں تعلیم کیا ہے؟ یہ مذہب کے اصل اصول ہیں، یعنی خدا کی ہستی اور اس کی توحید، اس کے صفاتِ کاملہ انبیا اور مرسلین کی بعثت، خدا کی خالص عبادت، حقوق انسانی اور اخلاقِ فاضلہ اور اچھے اور برے اعمال کی باز پرس اور جزا و سزا یہ تمام مذاہب کے وہ بنیادی امور ہیں جن پر جملہ مذاہب حقہ کا اتفاق ہے اگر ان میں سے کسی جہت سے کوئی اختلاف ہے تو یا تو طریقہ تعبیر کی غلطی ہے یا باہر سے آ کر اس تعلیم میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے۔ دوسری چیز جس کو آنحضرت ﷺ کی زبان وحی ترجمان نے شرعہ منہاج اور منسک کہا ہے اور وہ جزئیات احکام اور متفقہ حصول مقصد کے جدا جدا راستے ہیں جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہے ہیں، مثلاً: عبادتِ الٰہی ہر مذہب کا جزو لازم ہے لیکن طریقِ عبادت میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہر مذہب میں موجود ہے، عبادت کی کوئی خاص سمت ہر مذہب میں ہے مگر وہ سمت ہر مذہب نے اپنی اپنی مصلحت سے الگ مقرر کی ہے اسی طرح اعمالِ فاسدہ کا انسداد ہر مذہب کا متفقہ نصب العین ہے مگر اس انسداد کے راستے اور طریقے جدا جدا ہیں، غرض یہ راستے اور طریقے مختلف پیغمبروں کے زمانوں میں اگر اصلاح اور تبدیل کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہے، مگر اصلِ دین جو از کی سچائی اور ابدی صداقت ہے نا قابل تبدیل اور نا قابل تغیر رہا ہے۔

انبیا علیہم السلام کا دنیا میں وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا کہ وہ اسی ازلی و ابدی صداقت کو ہمیشہ اہل دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں اور دین کو اپنے اصل مرکز پر ہمیشہ قائم رکھیں اور ساتھ ہی اپنی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو ان کے لیے مناسب حال ہوں وہ ان کو بتائیں اور سکھائیں۔

انبیا علیہم السلام کے سوانح پر نظر کرنے سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ ایک صاحب شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحبِ شریعت نبی اسی وقت مبعوث ہوا ہے جب اس کا صحیفۂ وحی جو اس کے دین و شریعت کا محافظ ہوتا ہے کھو گیا ہے یا انسانی دست برد سے ایسا بدل گیا ہے کہ اصلیت مشتبہ ہو گئی ہے، صحیفۂ ابراہیم کے گم ہو جانے کے بعد جس کا نہایت ناقص خلاصہ توراۃ کے سفر تکوین میں ہے صحیفۂ موسیٰ نازل ہوا۔ صحیفۂ موسیٰ کے اختلاف کو دور کرنے کے لیے زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے پھر اس کی تکمیل کے لیے انجیل آئی اور انجیل میں انسانی تصرفات کے راہ پانے کے بعد قرآن آیا اور چونکہ وہ دنیا کے آخر تک کے لیے آیا اس لیے ہر تحریف اور انسانی تصرف سے اس کی حفاظت کی گئی اور قیامت تک کی جائے گی اسی لیے اس کے بعد کسی اور صحیفہ کی ضرورت نہیں اور نہ کسی پیغمبر کی بعثت کی حاجت ہے، البتہ اس کے معانی کی صحیح تشریح اور بدعات و احداثات کے انسداد کے لیے ائمہ، خلفا، مجددین، محدثین اور علمائے راسخین پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے اور ان کی اصلاح کی صداقت کی پہچان سنت محمدی ﷺ کا احیا اور بدعات کا قلع قمع ہے۔

اب ہم کو پھر اوپر سے چلنا ہے اور اپنے ایک ایک دعویٰ کو وحی محمدی ﷺ کی روشنی میں دیکھنا ہے۔

''وحدت دین'' کی حقیقت کو وحی اسلامی کے آخری ترجمان نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ﭔ﴾ (٤٢/ الشوریٰ:١٣، ١٥)

''اس نے دین میں تمہارے لیے وہی راہ مقرر کی جو اس نے نوح سے کہی تھی اور جو ہم نے حکم بھیجا تم کو اور جو کہہ دیا ہم نے ابراہیم سے اور موسیٰ کو اور عیسیٰ سے یہ کہ ''دین'' کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو، مشرکوں کو جدھر تو بلاتا ہے وہ ان پر گراں گزرتا ہے اور خدا اپنی طرف جس

کو چاہتا ہے چن لیتا ہے اور اپنی طرف اس کو راہ دیتا ہے جو (اس کی طرف) رجوع ہوتا ہے اور یہ تفرقے انہوں نے وحی کے علم (حقیقی) ملنے کے بعد آپس کی ضد اور تعصب سے پیدا کیے اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات وقت مقررہ تک کے لیے نہ ہو چکی ہوتی تو (کشفِ حقیقت کر کے) ان کے اختلافات کا فیصلہ کر دیا جاتا اور جن کو ان اگلوں کے بعد کتاب وراثت میں ملی وہ اس امرِ حق کی طرف سے ایسے شک میں ہیں جو ان کو چین نہیں لینے دیتا سو تو سب کو اسی حقیقت کی طرف بلا اور اسی پر استواری سے قائم رہ جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے اور ان تفرقہ اندازوں کی غلط خواہشوں کی پیروی نہ کر اور کہہ کہ میں ایمان لایا ہر اس کتاب پر جو خدا نے اتاری اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں، ہمارا رب اور تمہارا رب وہی ایک اللہ ہے، ہم کو ہمارے کام کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمہارے کام کا، ہم میں کچھ جھگڑا نہیں اللہ ہم سب کو اکٹھا کرے گا اور اسی کی طرف پھر جانا ہے۔''

ان آیاتِ مبارکہ میں کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہی ایک دین ہے جو نوح کو ابراہیم کو موسیٰ کو اور عیسیٰ علیہم السلام کو اور تم کو اے محمد ﷺ عطا کیا گیا ہے اگلوں کے بعد پچھلوں نے جن کو یہ کتاب ملی اپنے ذہنی تحریفات اور ذہنی تصرفات سے اس میں تفرقے پیدا کیے اور آپس کی ضد اور تعصبات سے الگ الگ فرقہ واری کی راہیں نکالیں، پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس وحدت دین کی حقیقت کا یقین اہل کتاب کو نہیں ہے حالانکہ وہ شکوک وشبہات کے دلدل میں پھنسے ہیں پھر حکم ہوتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ ﷺ! تم اس حقیقت کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور استواری کے ساتھ اپنی اس دعوت اور دعویٰ پر قائم رہو اور یہ اعلان کر دو کہ میرا مسلک یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کتاب بھی دنیا میں آئی ہے میں اس کی صداقت کو تسلیم کرتا ہوں اور تم سے اے اہل کتاب! جو مختلف فرقوں اور مذہبوں میں بٹ گئے ہو تمہارے ساتھ انصاف کروں یعنی جس میں جو سچائی ہے اس کو قبول کروں یا معاملات میں ان کے ساتھ عدل وانصاف کروں پھر فرمایا ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے دو نہیں، اگر اتحاد چاہو تو اس نقطہ پر ہم تم متحد ہو سکتے ہیں البتہ ہمارے اور تمہارے راستوں میں جو اختلاف ہے، اس کے ذمہ دار ہم اور تم خود ہیں، ہمارے کام کے تم جواب دہ نہیں اور تمہارے کام کے ہم نہیں، اب ہمارے تمہارے درمیان یہاں کوئی جھگڑا نہیں۔

اسی وحدت کی دعوت محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانِ وحی نے ایک اور آیت میں دی ہے:

﴿ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝﴾

(۳/ آل عمران: ٦٤)

”اے کتاب والو! آؤ ہم تم ایک بات پر جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے۔ متفق ہو جائیں، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک بنائیں اور نہ آپس میں ایک کو خدا کو چھوڑ کر رب بنائیں، اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو کہہ دے کہ تم گواہ رہو کہ ہم حکمِ الٰہی کے تابع (مسلم) ہیں۔“

یہود و نصاریٰ جنہوں نے اپنی فرقہ داریوں سے اصل دین میں تفریقیں پیدا کر دی تھیں، ان کی طرف اشارہ کر کے محمد رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۭ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝﴾ (٦/ الانعام:١٥٩)

”بے شک وہ جنہوں نے اپنے دین میں الگ الگ راہیں نکالیں اور کئی فرقے ہو گئے، تجھ کو ان سے کوئی کام نہیں، ان کا کام اللہ کے حوالے ہے، وہی ان کو جتادے گا جیسا کچھ وہ کرتے تھے۔“

پھر دونوں کو اس کے بعد ہی اصل ”دین قیم“ جو ابراہیم علیہ السلام کا تھا، اس کی دعوت دی گئی:

﴿ قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ڬ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾ (٦/ الانعام:١٦١)

”کہہ دے کہ میرے خدا نے اس سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کی جو دینِ صحیح ہے، ابراہیم حنیف کا مذہب اور وہ (ابراہیم علیہ السلام) مشرکوں میں سے نہ تھے۔“

غرض اسلام وہ ”دینِ قیم“ ہے جو ہمیشہ سے انبیا کا دین رہا اور موجودہ دین اسلام یہود و نصاریٰ کی تحریفات اور تصرفات اور فرقہ پروریوں کو مٹا کر اسی ایک متحدہ دین کی پکار ہے، جس کی طرف انبیا علیہم السلام اپنے اپنے زمانوں میں ہمیشہ لوگوں کو پکارتے رہے، اسی لیے اکثر انبیا علیہم السلام کے ناموں کو گنانے کے بعد محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ ہدایت فرمائی گئی:

﴿ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۭ﴾ (٦/ الانعام:٩١)

”یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی، سو تو انہیں کی راہ پر چل۔“

بعض اسلامی حدود و شرائع کے بعد فرمایا گیا:

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ (٤/ النسآء:٢٦)

”خدا چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے بیان کرے اور تم کو ان کے راستے دکھائے جو تم سے پہلے تھے۔“

اس کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام اپنے حدود و شرائع میں بھی اگلے پیغمبروں کی تعلیمات کے ساتھ اتحاد رکھتا

ہے اور یہ امر واقعہ ہے، جو لوگ قرآن کا اس لیے انکار کرتے تھے کہ یہ کوئی الگ صحیفہ ہے، ان سے یہ کہا گیا:

﴿ اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝ ﴾

(۸۷/ الاعلیٰ:۱۸، ۱۹)

''بے شبہ یہ بات اگلے صحیفوں میں بھی تھی، یعنی ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں۔''

ایک اور آیت میں کہا گیا:

﴿ وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ۝ ﴾ (۲۶/ الشعرآء:۱۹۶)

''اور یہی پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں تھا۔''

ایک مقام پر یہ فرمایا گیا:

﴿ مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ۭ ﴾ (۴۱/ حٰمٓ السجدۃ:۴۳)

''(اے محمد ﷺ) تجھ سے (اس کتاب میں) وہی کہا گیا ہے جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا۔''

اس اعلان میں یہ ظاہر کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو وہی کہا گیا جو اگلے پیغمبروں سے کہا جا چکا تھا، ان معنوں میں قرآن کوئی نئی دعوت لے کر نہیں آیا ہے بلکہ اسی پرانی دعوت کی یہ تکرار ہے، جس کی آواز دنیا سے گم ہو چکی تھی یا دب گئی تھی، اگر فرق ہے تو اجمال و تفصیل یا نقص و تکمیل کا کہ اسلام گزشتہ اجمال کی تفصیل اور دین سابق کی تکمیل ہے۔

اس لیے اسلام یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وحی کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا اور ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا اور ایک ہی حقیقت تھی جو دہرائی جاتی رہی، لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف و تحریف سے بدلتی اور گم ہوتی رہی اور آخری دفعہ دنیا کے کمالِ بلوغ کے زمانے میں وہ پوری طاقت کے وعدہ کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے مفصل اور کامل ہو کر نازل ہوئی اور وہ قیامت تک محفوظ اور باقی رہے گی۔

دوسری چیز جس کی مذہب میں ثانوی حیثیت ہے اور جو اصل مقصد نہیں ذریعہ ہے، وہ بدلتی رہتی ہے اور عہد محمدی تک برابر بدلتی رہی ہے، اس کا نام شرعہ، منہاج اور منسک ہے۔ یہودیوں کو آنحضرت ﷺ پر اعتراض تھا کہ وہ یہودی شریعت کے جزئیات میں کیوں تبدیلی کرتے ہیں؟ قرآن نے اس کے جواب میں ہمیشہ یہی کہا کہ یہ مقصود نہیں ذرائع ہیں، اصول نہیں فروع ہیں، ہر قوم کی مناسبت سے ان میں تغیر ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اس کی ایک مثال قبلہ ہے کہ مقصودِ اصلی نماز ہے اور سمت کا تعین ایک فرعی اور ثانوی چیز ہے، حضرت داؤد کی اولاد بنی اسرائیل کو اپنی آبائی مسجد (بیت المقدس) سے گرویدگی تھی وہ ان کا قبلہ ہوئی، ابراہیمی

عربوں کو اپنی مرکزی مسجد (کعبہ) سے وہی وابستگی اور لگاؤ تھا، اس لیے یہ ان کا قبلہ بنی۔ چنانچہ قرآن نے تعیین قبلہ کے موقع پر کہا:

﴿ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱٤۸)

''اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جدھر وہ منہ کرتا ہے، سوتم نیکیوں کی طرف سبقت کرو۔''

یعنی سمتوں اور جہتوں کی تعیین کو اہمیت کی چیز نہ سمجھو بلکہ نیکیوں کو اصلی اہمیت دو اسی لیے فرمایا:

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۷۷)

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم پورب یا پچھم کی طرف رخ کرو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو ایمان لائے (اور دوسرے نیک کام کرے)۔''

اسی طرح خانہ کعبہ کا حج یہودیوں میں نہ تھا، اسلام نے جب اس کو رائج کیا تو کہا، ہر مذہب نے اپنے لیے عام مذہبی اجتماع اور قومی عبادت کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ مقرر کیا ہے، اسلام نے خانہ کعبہ کے حج کو اس کے لیے متعین کیا:

﴿ لِّكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ ۖ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ ۚ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ۝ وَإِن جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ ﴾

(۲۲/ الحج:٦۷، ٦۸)

''ہر قوم کے لیے ہم نے عبادت کا ایک طریقہ بنایا جس کی اس قوم کے لوگ مذہبًا پابندی کرتے ہیں سو اس بات میں وہ تجھ سے جھگڑا نہ کریں، تو اپنے رب کی طرف بلائے جا، تو بے شک سوجھ کی سیدھی راہ پر ہے اور اگر وہ تجھ سے جھگڑنے لگیں تو کہہ دے کہ اللہ بہتر جانتا ہے، جو تم کرتے ہو۔''

سورہ مائدہ میں عدل و انصاف اور قانونی جزا و سزا کے طریقوں کے ضمن میں ان یہودیوں اور عیسائیوں کو جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا یہی کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی کتابوں ہی کے احکام پر عمل کریں، جن کو وہ چھوڑ بیٹھے ہیں۔ پہلے یہودیوں سے کہا:

﴿ إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ ۚ ﴾

(۵/ المآئدۃ:٤٤)

''ہم نے تورات اتاری، اس میں ہدایت اور روشنی تھی، پیغمبر جو حکم بردار تھے وہ یہود کا فیصلہ

کرتے اوران کے عالم اورفقیہ کہ اللہ کی کتاب پر وہ نگہبان تھے اور وہ تھے اس پر خبردار۔"

پھر عیسائی شریعت کی نسبت کہا:

﴿ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ ۖ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۝ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنجِيلِ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فِيهِ ۚ ﴾ (٥/ المآئدة:٤٦، ٤٧)

"اور ہم نے ان پیغمبروں کے پیچھے مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا سچ بتا تا ہوا اس کو جو اس کے پہلے تھا یعنی تورات اور ہم نے انجیل دی، اس میں ہدایت اور روشنی اور تصدیق کرتی ہوئی اپنے سے پہلے کی یعنی تورات کی اور ہدایت اور نصیحت پرہیز گاروں کے لیے اور چاہیے کہ انجیل والے اس کا حکم دیں جو اس میں اترا۔"

اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے کہا:

﴿ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ ۖ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۚ ﴾

(٥/ المآئدة:٤٨)

"اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب سچائی کے ساتھ اتاری، جو اپنے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور امانت کے ساتھ اس پر شامل ہے، سو تو ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر، جو خدا نے اتارا اور تیرے پاس جو سچائی آئی ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔"

دیکھو کہ کس خوبی کے ساتھ صحیفۂ محمدی ﷺ نے اگلی کتابوں کی تصدیق اور مدح وتعریف کی اور ان اہل مذاہب کو جو اسلام پر ایمان نہیں لائے اپنی اپنی کتب منزلہ پر عمل کرنے کی دعوت دی اور پھر یہ دعویٰ کیا کہ قرآن تمام گزشتہ کتابوں پر امین ومحافظ بن کر آیا ہے اور اس میں ان سب کتابوں کی سچائیاں یک جا ہیں لیکن ان لوگوں نے اپنی اپنی کتابوں کو چھوڑ کر اہوا (غلط خواہشوں) کی پیروی شروع کر دی۔ یہ اہوا کیا ہیں؟ کتابِ الٰہی میں تحریف وتصرف کر کے آسانیاں پیدا کرنا اور احکامِ الٰہی کے مقابلہ میں انسانی اجتہادات کی آمیزش:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ ﴾

(٢/ البقرة:٧٩)

"افسوس ہے ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب بناتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔"

آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ اپنی شریعتِ الٰہی کو چھوڑ کر ان اہلِ کتاب کی اہوا کی پیروی نہ کر،

اس کے بعد حدود اور جزا و سزا میں ان خفیف اختلافات اور تبدیلیوں کو جو تورات انجیل اور قرآن میں ہیں غیر اہم بتایا گیا فرمایا:

﴿ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۸)

''ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک دستور اور ایک راستہ بنا دیا۔''

انہی اختلافات کی بنا پر یہود اور نصاریٰ دونوں ایک دوسرے کو برسرِ باطل کہتے تھے:

﴿ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۱۳)

''اور یہود نے کہا نصاریٰ کچھ راہ پر نہیں اور نصاریٰ نے کہا: یہود کچھ حق پر نہیں، حالانکہ وہ دونوں خدا کی کتاب پڑھتے ہیں۔''

دونوں مل کر مسلمانوں سے کہتے تھے:

﴿ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۳۵)

''اور انہوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔''

ارشاد ہوا کہ تم دونوں اپنے الگ الگ راستوں کو چھوڑ کر آؤ اور اصل دین ابراہیمی پر متفق ہو جاؤ:

﴿ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۳۵۔۱۳۷)

''کہہ بلکہ ابراہیم علیہ السلام کے دین کی پیروی کرو، جو موحد تھا مشرک نہ تھا اور کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اترا اور جو ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو دیا گیا اور جو سب نبیوں کو ان کے خدا کی طرف سے دیا گیا، سب پر ایمان لائے ہم ان رسولوں میں فرق نہیں کرتے اور ہم اس ایک خدا کے تابع ہیں تو اگر یہ بھی اسی طرح ایمان لائیں، جس طرح تم ایمان لائے تو انہوں نے ہدایت پائی اور اگر روگردانی کریں تو وہی ہیں ضد اور مخالفت پر۔''

یہود و نصاریٰ کو یہ دعویٰ تھا:

﴿ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۱۱)

''یہود اور نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا۔''

جواب دیا گیا:

﴿ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ۗ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۱۱) ''یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں۔''

﴿ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۱۲)

''ہاں جس نے بھی اپنے کو خدا کا مطیع بنایا اور وہ نیکو کار ہے، تو اس کی مزدوری اس کے خدا کے پاس ہے، نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غم۔''

تمام اہل مذاہب کو یکساں خطاب کر کے فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۶۲)

''بے شک جو ایمان لائے (یعنی مسلمان) اور جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی جو بھی خدا پر اور آخری دن پر ایمان لایا اور نیک عمل کیا تو ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس ہے نہ ان پر خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

اب جو ایمان لائے یعنی مسلمان اور جو یہودی ہے اور نصاریٰ اور صابئین ان میں سے جو بھی اپنے اپنے دور نبوت میں خدا کی توحید پر، روزِ آخر کی صداقت پر ایمان لایا اور اچھے عمل کیے ان کو اپنے کام کا پورا پورا ثواب ملے گا۔ یعنی جس نے بھی اپنے اپنے پیغمبر کی اصلی تعلیم اور سچی شریعت کے مطابق جو شرک و کفر و بت پرستی سے یقیناً پاک تھی عمل کیا اس کو اس کا ثواب ملے گا، خدا کی توحید اور روزِ آخر کی صداقت پر ایمان لانا اور اچھے کام کرنا صرف عقل کی ہدایت سے نہیں ہو سکتا، بلکہ کسی رسول کی تعلیم ہی سے ہو سکتا ہے، جیسا کہ تمام اہل مذاہب کا متفقہ مسئلہ ہے، اس لیے رسالت کی تصدیق بھی اس کے ضمن میں داخل ہے کہ

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓىِٕكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾

(۴/ النسآء:۱۵۰۔۱۵۲)

''بے شک جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں جدائی کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں

کہ وہ اس میں درمیان کا راستہ اختیار کریں، وہی حقیقی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے اہانت کرنے والا عذاب تیار کیا ہے اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کا بھی انکار نہیں کیا، یہ وہ ہیں جن کو ان کی مزدوریاں خدا دے گا اور خدا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

دوسری آیت میں ہے:

﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ﴾ (٢٤/ النور:٦٢)

''مومن وہی ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔''

اس بنا پر ان آیتوں سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ قبولِ عمل کے لیے ایمان مشروط ہے اور دوسرے یہ کہ ایمان و عمل کے علم کے لیے نبی کی تصدیق ضروری ہے، اسی لیے اوپر جن چار فرقوں کا ذکر ہوا ہے وہ چاروں وہ ہیں جو کسی نہ کسی پیغمبر کو ماننے والے ہیں، اس بنا پر کامل اسلام یہ ہے کہ تمام رسولوں کو صادق مانا جائے۔ چنانچہ اس کی تفصیل سورۂ مائدہ میں ہے:

﴿ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ ۗ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۖ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ ﴾

(٥/ المآئدۃ:٦٧۔٦٩)

''کہہ دے اے کتاب والو! تم کچھ نہیں جب تک تم توراۃ اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف اتارا گیا اس کو قائم نہ کرو اور (اے پیغمبر ﷺ) جو تیری طرف اُترا ہے وہ ان کی سرکشی اور انکار کو اور بڑھائے گا، تو ان منکروں کا غم نہ کر و اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے اور صابی اور عیسائی جو خدا پر اور روزِ قیامت پر ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو ان پر، کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

اس کے بعد ہی اس کا ذکر ہے کہ یہودیوں نے ہمیشہ رسولوں کا انکار کیا اور نصاریٰ توحید کو چھوڑ کر تثلیث اور الوہیتِ مسیح میں مبتلا ہو گئے اس لیے اصل اسلام سے یہ دونوں ہٹ گئے۔ فرمایا:

﴿ لَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَأَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ رُسُلًا ۖ كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ ۝ وَحَسِبُوا أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُوا وَصَمُّوا ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوا وَصَمُّوا كَثِيرٌ مِّنْهُمْ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ

اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِیْحُ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ ؕ اِنَّہٗ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰہِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىہُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّآ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ؕ وَاِنْ لَّمْ یَنْتَھُوْا عَمَّا یَقُوْلُوْنَ لَیَمَسَّنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ ﴾ (۵/ المآئدة: ۷۰-۷۳)

''بے شک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف کئی رسول بھیجے جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی نفسانی خواہشوں کے خلاف احکام لے کر آیا تو کتنوں کو جھٹلایا اور کتنوں کا خون کرنے لگے اور خیال کیا کہ اس سے کچھ خرابی نہ ہوگی سو اندھے ہو گئے اور بہرے، پھر خدا ان پر رجوع ہوا اور ان میں بہتیرے اندھے اور بہرے ہوئے اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں، بے شبہ وہ کافر ہوئے جنہوں نے یہ کہا کہ مریم کا بیٹا مسیح علیہ السلام ہی اللہ ہے مسیح علیہ السلام نے تو یہ کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کو پوجو جو میرا اور تمہارا رب ہے بے شک جو اللہ کو شریک بنائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور گناہگاروں کی کوئی مدد کرنے والا نہیں بے شبہ وہ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں تیسرا ہے، حالانکہ کوئی اللہ نہیں، مگر وہی ایک، اگر وہ اپنے اس قول سے باز نہ آئے تو ان میں سے کافروں کو یقیناً دردناک عذاب چھوئے گا۔''

یہ تو ان یہود و نصاریٰ کے ایمان کا حال تھا اس کے بعد اسی رکوع میں ان کے ''حسن عمل'' کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے بعد ہی ان سے کہا گیا ہے:

﴿ وَلَوْ کَانُوْا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالنَّبِیِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مَا اتَّخَذُوْھُمْ اَوْلِیَآءَ وَلٰکِنَّ کَثِیْرًا مِّنْھُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ ﴾ (۵/ المآئدة: ۸۱)

''اور اگر اللہ اور اس نبی پر اور جو اس نبی پر اترا اس پر یہ ایمان لے آتے، تو ان مشرکوں کو وہ اپنا دوست نہ بناتے لیکن ان میں اکثر نافرمان ہیں۔''

اسلام یعنی تمام نبیوں اور رسولوں کے واحد مشترکہ دین کا اصل الاصول دو باتیں ہیں توحید کامل اور رسالت عمومی، یعنی اللہ تعالیٰ کو توحید کی تمام صفتوں میں کامل بلاشریک ماننا اور اس کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں صادق اور راست باز تسلیم کرنا، چنانچہ فرمایا:

﴿ اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا وَّاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ ۝ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّھِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ

مِنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۝ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۝﴾ (۳/ آل عمران:۸۳۔۸۵)

''کیا وہ دین الٰہی کے سوا اور کوئی دین چاہتے ہیں، حالانکہ جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خوشی سے یا مجبوراً خدا کا مسلم یعنی فرمانبردار ہے اور اسی کی طرف سب لوٹائیں جائیں گے (اے پیغمبر!) کہہ کہ ہم اللہ پر اور جو اس نے ہم پر اتارا اور جو ابراہیم اور اسمٰعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور ان کی اولادوں پر اُترا اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور سب پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے ملا، ہم سب کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں، ان میں سے کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا تو وہ اس سے قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔''

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا پر اور تمام رسولوں پر ایمان لانا دین اللہ ہے اور اسی کا نام اسلام ہے جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا۔ آل عمران میں ہے کہ یہود ونصاریٰ تاویلاتِ باطلہ اور اتباعِ متشابہات کی وجہ سے گمراہ ہو گئے، یعنی دین اسلام سے روگرداں ہو گئے اور اختلافات میں پڑ گئے، فرمایا:

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَھُمْ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۝ فَاِنْ حَاۗجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۭ﴾ (۳/ آل عمران:۱۹، ۲۰)

''بے شک دین خدا کے نزدیک اسلام ہے اور جن کو کتاب دی گئی انہوں نے علم آنے کے بعد اس میں آپس کی ضد کے سبب سے اختلاف کیا اور جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرے گا تو اللہ، جلد حساب لینے والا ہے، تو اگر اے پیغمبر! یہ تجھ سے پھر کج بحثی کریں، تو کہہ دے کہ میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اپنے کو خدا کا تابع فرمان (مسلم) کر دیا ہے۔''

اسی کے بعد آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ وہ یہود ونصاریٰ سے سوال کریں کہ وہ اس اسلام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں؟

﴿وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۭ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اھْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ۝﴾ (۳/ آل عمران:۲۰)

''اور اے پیغمبر! ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ دے کہ کیا تم نے بھی اسلام قبول کیا، اگر کیا تو انہوں نے سیدھی راہ پائی اور اگر انکار کیا تو تجھ پر صرف پہنچا دینا ہے

اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہے۔''

یہود و نصاریٰ کو اس اسلام کے قبول کرنے پر ہدایت نامہ ملنے کی بشارت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ''ہدایت نامہ'' ہے کہ وہ دینِ اسلام جس کو یہود و نصاریٰ اور تمام اہل مذاہب نے جو کسی گزشتہ پیغمبر کی اُمت ہوں کھو دیا تھا اور اب جس کو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دوبارہ دنیا میں پیش کیا گیا ہے، اس لیے جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی وہ ناقص تھی اور اسلام جس کو لے کر آیا وہ کامل ہے، نیز یہ معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ اب جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور نصرانی اور صابی جو بھی خدا اور یوم آخر پر ایمان لایا اور اس نے نیک کام کیا اس کو خوف و غم نہ ہوگا ان میں خدا پر ایمان لانے سے مقصود ''توحید کامل'' ہے اور اس کا یہ منشا نہیں کہ یہود و نصاریٰ اور صابی وغیرہ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کلی کے مستحق ہیں یہود و نصاریٰ کیا، مسلمان بھی اس توحید کامل کے بغیر نجات کلی کے مستحق نہیں جب تک مسلمانوں کا ایمان اور عمل صالح ٹھیک اس تعلیم کے مطابق نہ ہوں جو ان کے رسول کے ذریعہ دنیا میں آئی ہے یہ اصول ہر ایک کے لیے ہے خواہ وہ مسلمان ہو، یا یہودی، عیسائی ہو یا صابی، غرض کسی نبی کی پیروکاری کا مدعی ہو۔

نبوت محمدی ﷺ کا دعویٰ یہ نہیں کہ وہی ایک ہدایت ہے اور اس کے سوا سب ضلالت ہے بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہی ایک کامل ہدایت ہے اور بقیہ مذاہب سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ ابدی کامل ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب نبی لے کر آتے رہے اور ان کے پیرو، اپنے تاویلات، تحریفات، تصرفات اور اختلافات سے اس کو برباد کر چکے تھے اسی کو لے کر آخری دفعہ محمد رسول اللہ ﷺ آئے اور اب وہ ہدایت ہمیشہ کامل رہے گی، پھر کبھی ناقص نہ ہوگی کہ اس کا صحیفہ ہدایت (قرآن) تحریف و اختلاف و تصرف سے محفوظ و پاک رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو نبوت محمدی ﷺ کی دعوت جہاں دی گئی ہے، ہدایت کی بشارت سنائی گئی ہے، چنانچہ اسی آیت میں جو ابھی اوپر گزری یہ ہے:

﴿ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۭ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ ﴾

(۳/ آل عمران: ۲۰)

''اور اے پیغمبر! ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ کیا وہ اسلام لائے اگر اسلام لائے، تو انہوں نے سیدھی راہ پائی۔''

سورۂ بقرہ میں ہے:

﴿ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا

هُمْ فِىْ شِقَاقٍ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۳۶، ۱۳۷)

''(اے مسلمانو)! کہو کہ ہم اللہ پر اور جو ہم پر اترا اور جو ابراہیم اور اسمٰعیل پر اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام پر اور ان کی اولاد پر اترا اور جو موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، سب پر ایمان لائے اور ہم ان میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں، تو اگر یہ بھی اسی طرح مانیں جس طرح تم نے مانا تو انھوں نے سیدھی راہ پائی اور اگر وہ اس سے باز رہیں تو وہ محض ضد میں ہیں۔''

یہود و نصاریٰ اور اہلِ کتاب کو تعلیمِ محمدی ﷺ کی طرف دعوت اسی ''ہدایت'' کے پانے کے لیے ہے جو اسلام یعنی انبیا کے دینِ ازلی سے عبارت ہے اور جس کو لے کر محمد رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے اور فلاح و نجاتِ کامل اب اسی کے ماننے پر منحصر ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۴، ۵)

''جو اس کو جو تیری طرف (اے پیغمبر)! اترا اور جو تجھ سے پہلے اترا دونوں کو مانتے ہیں اور پچھلی زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور وہی اپنے پروردگار کی ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کے بعد فرمایا کہ رحمتِ الٰہی گو عام ہے مگر یہ نعمت خاص طور سے ان کا حصہ ہے جو تعلیمِ محمدی ﷺ کو قبول کریں اور وہی نجاتِ کامل کے مستحق ہیں:

﴿ وَرَحْمَتِىْ وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ ۚ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِىَّ الْاُمِّىَّ الَّذِىْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِى التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِىْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِىِّ الْاُمِّىِّ الَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵۶۔۱۵۸)

''اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہے پھر اس رحمت کو میں ان کے لیے لکھ دوں گا جو پرہیزگار ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور جو ہمارے حکموں کو مانتے ہیں جو اس ان پڑھ فرستادہ پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں جو ان کو نیکی کا حکم دیتا

ہے اور برائی سے باز رکھتا ہے اچھی چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتا ہے اور بری چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان کے بندھن کو اور ان زنجیروں کو جو ان پر پڑی تھیں اتارتا ہے تو جنھوں نے اس پیغمبر کو مانا اور اس کی تائید کی اور اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے چلے جو اس کے ساتھ اُتری وہی کامیاب ہیں کہہ دے (اے پیغمبر!) کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں جس کی آسمانوں اور زمین کی شہنشاہی ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں وہی جلاتا اور وہی مارتا ہے سو اللہ اور اس کے اس ان پڑھ پیغام رساں رسول پر ایمان لاؤ جو اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس رسول کی پیروی کرو تا کہ تم سیدھی راہ پاؤ۔''

ان آیات میں صاف ظاہر کر دیا گیا کہ گزشتہ مذاہب کے پیرووں کو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا اس لیے ضروری ہے کہ وہ دینِ خالص جو انسانی تصرفات اور آمیزشوں سے مکدر ہو گیا تھا وہ صحفِ الٰہی کی پیشین گوئیوں کے مطابق آپ کے ذریعہ پھر نکھارا گیا ہے اور جن اضافوں اور جزئیات احکام کی سختیوں کو انسانوں نے اس میں شامل کر دیا تھا وہ آپ کے ذریعہ دور کی گئیں اور نیز آپ عالمگیر پیغمبر بن کر مبعوث ہوئے، اس لیے ہدایت نامہ نبوتِ عمومی اور نجاتِ کامل اور فلاحِ عام اب صرف وحی محمدی ﷺ کے اندر محدود ہے۔

الغرض دین محمدی ﷺ کو قبول کرنا اس لیے تمام انسانوں پر ضروری ہے کہ وہ دینِ ازلی جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اس کے پیرووں کی تحریف و تصرف سے برباد ہو گیا تھا اسی کو صحیفۂ محمدی ﷺ لے کر آیا اور اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا کیونکہ اس کا نبی خاتم النبیین، اس کا دین کامل دین اور اس کا صحیفہ تمام صحفِ الٰہی پر مہیمن اور حاوی ہے اور قیامت تک خدا کی طرف سے اس کی پوری حفاظت اور بقا کا وعدہ کیا گیا ہے، یہ چاروں دعوے یعنی تکمیلِ دین، قرآن کا مہیمن ہونا، قیامت تک اس کا محفوظ و باقی رکھنا اور ختمِ نبوت حسب ذیل دلائل سے ثابت ہیں:

تکمیلِ دین

قرآن کے سوا کسی اور صحیفہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے اور اس کے ذریعہ دینِ الٰہی اپنے تمام اصول اور فروع (مناسک و مناہج و شرائع) کی حیثیت سے تکمیل کو پہنچ گیا، بلکہ گزشتہ مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے وقت میں یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور نبوت آئے گی، جو اس کے کام کی تکمیل کرے گی۔ خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

''میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔'' (استثنا ۱۸۔۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے مانند ایک اور نبی آنے والا تھا جس کے منہ میں

اللہ تعالیٰ خود اپنا کلام ڈالے گا، اس سے ثابت ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کی طرح ایک اور صاحب شریعت نبی خدا کے نئے کلام کے ساتھ آئے گا اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی کہا:

''لیکن وہ فارقلیط (احمد) پاکیزگی کی روح ہے جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں، تمہیں یاد دلائے گا۔'' (یوحنا ۱۴۔۲۶)

''اور وہ فارقلیط (احمد) آ کر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصوروار ٹھہرائے گا، گناہ اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے، میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے، لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی اس لیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ وہ سنے گی، سو کہے گی، میری بزرگی کرے گی۔'' (یوحنا ۱۶۔۸)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے کلام کو ہنوز ناتمام ہی فرمایا اور ایک آئندہ آنے والے کا پتہ دیا جو اس کی تکمیل کرے گا۔

آخر وہ موعود الامم ﷺ آیا اور دعویٰ کیا کہ میں موسیٰ علیہ السلام کے مانند بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے آیا ہوں اور میرے منہ میں خدا نے اپنی بولی ڈالی ہے اور یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی سچائی کی روح ہوں جو مسیح کی اصلی بڑائی ظاہر کرنے، سچائی کی راہ بتانے اور مسیح کی ادھوری بات کو کامل کرنے کے لیے آیا ہوں، میں اپنی نہیں کہتا بلکہ وہی کہتا ہوں جو اوپر سے سنتا ہوں اور آخر منصب نبوت کے ختم پر وحی الٰہی نے آپ ﷺ کی زبان سے یہ اعلان عام کیا:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کا دین پسند کیا۔''

اسی تکمیل کا یہ اثر تھا کہ اس نے یہود کے بعض سخت فقہی احکام جو ان کی سخت گیری کے لیے ان پر عائد تھے اور اصل دین ابراہیمی میں داخل نہ تھے [1] یا انسانوں کے اضافے اور تصرفات تھے۔ بدل کر ایسے مناسب اور آسان احکام نازل کیے جو ہر زمانہ کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں، اسی لیے قرآن نے کسی اپنے بعد میں آنے والے پیغمبر کی پیش گوئی نہیں کی، نہ کسی کلام کے نزول کی خبر دی، نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا کہ تکمیل کے بعد اب کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کا موقع کہاں اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ ﴿وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ (جو محمد ﷺ سے پہلے نازل کیا گیا) پر ایمان لانے کی تاکید کی، لیکن وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِكَ کے

[1] دیکھو آیت: ﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ﴾ الآیۃ (۳/ آل عمران:۹۳)

قبول کرنے کا کہیں شائبہ بھی نہیں۔

قرآن مہیمن کتب ہے

اس دین کامل کا صحیفہ تمام اگلی کتابوں کا مصدّق ہے:

﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ (۵/ المآئدۃ:٤٨)

''اپنے آگے کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا۔''

وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے، اس لیے جو کوئی اس صحیفہ کو قبول کرتا ہے، وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کر لیتا ہے، یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسرے صحیفہ کو حاصل نہیں۔ فرمایا:

﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ ﴾

(۵/ المآئدۃ:٤٨)

''اور ہم نے (اے محمد) تیری طرف سچائی کے ساتھ یہ کتاب اتاری جو اپنے سے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور اس پر شاہد و حاوی ہے۔''

لفظ ''مہیمن'' کی تفسیر اہلِ زبان مفسروں نے یہ کی ہے:

ابن عباس رضی اللہ عنہما: شاہد اور امین، قرآن اپنے سے پہلے کی ہر کتاب کا امین ہے۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ: قرآن سے پہلے جو کتابیں بھی تھیں، قرآن ان کا امین اور شاہد ہے۔

غرض قرآن اگلی کتابوں کی صداقتوں اور سچی تعلیموں کی امانت اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآن محفوظ ہے اور رہے گا

پیغمبر کی تعلیم کی حفاظت اس کے صحیفۂ الٰہی کی حفاظت پر موقوف ہے، قرآن سے پہلے کوئی کتابِ الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے تمام تر بری نہیں رہی۔ لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں اور جو باقی ہے وہ فنا ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا رہا ہے۔ تورات جل جل کر خاک ہوئی اور پھر ان سوختہ اوراق سے، تحریر ہوئی پھر ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی، انجیل میں تحریف وجعل تو اسی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا پھر مترجموں کی کتر بیونت نے حقیقت مشتبہ کر دی۔ زردشت کا صحیفہ سکندر کی نذر ہوا اور اب صرف گاتھا کا ایک حصہ بچا، کھچا رہ گیا ہے۔ ان کتابوں کا یہ حال اس لیے ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دائمی اور آخری مذہب بنا کر نہیں بھیجا تھا اسی بنا پر ان کی دائمی حفاظت کا وعدہ نہ تھا، لیکن قرآن کی نسبت یہ وعدہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے باقی اور محفوظ رہے گا اسکی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی اور فرمایا اور پھر کس وثوق سے فرمایا:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝ ﴾ (۱۵/ الحجر:۹)

''ہم نے اس نصیحت کی کتاب کو اتارا اور بے شبہ ہم ہیں اس کی حفاظت کرنے والے۔''

یہ وعدہ الٰہی ایک اور آیت میں ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے:

﴿ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۞ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۞ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۞ ﴾

(۷۵/ القيامة:۱۶۔۱۹)

''بے شک ہمارے ذمہ ہے اس (قرآن) کو سمیٹ کر رکھنا اور اس کا پڑھنا، پھر جب ہم پڑھیں تو تو اس کے پڑھنے کے ساتھ رہ، پھر بے شبہ ہم پر ہے اس کو کھول کر بتانا۔''

اس آیت میں قرآن کی قراءت یعنی لفظ وعبارت اور بیان یعنی معنی دونوں کی ذمہ داری خدائے تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے۔ ایک تیسری آیت میں اس کی تصریح ہے کہ اس حق میں باطل کی آمیزش کبھی راہ نہ پا سکے گی، فرمایا:

﴿ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ۞ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۞ ﴾ (۴۱/ حٰمٓ السجدة:۴۱، ۴۲)

''اور بے شک، یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو غالب ہے، باطل نہ اس کے سامنے سے اور نہ اس کے پیچھے سے اس کے پاس آئے گا، ایک حکمت والے اور خوبیوں والے کی طرف سے اُترا۔''

اس کتاب کو غالب فرمایا گیا ہے یعنی جو اپنے ہر حریف کو اپنے دلائل کے زور سے پست کرے گی، باطل نہ اس کے سامنے سے اس میں مل سکتا ہے اور نہ پیچھے سے، یعنی نہ لفظ وعبارت کی طرف سے اور نہ حقیقت ومعنی کی جہت سے کیونکہ وہ ایک حکمت والے کی طرف سے اتری ہے، اس لیے وہ اپنی حکمت ودانائی کی تعلیم سے غالب رہے گی اور چونکہ وہ ایک سراسر خوبیوں والے کی جانب سے عطا ہوئی ہے اس لیے یہ بھی ہر باطل کے عیب سے پاک رہے گی۔ یہ قرآن کا اپنا دعویٰ ہے اور ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔

ختم نبوت

مقدمات بالا کا نتیجہ گو خود یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی نبی کی، قرآن کے بعد کسی صحیفہ کی اور اسلام کے بعد کسی دین کی ضرورت نہ ہو، لیکن وحی محمدی ﷺ نے ہر شک کے ازالہ کے لیے آگے بڑھ کر یہ تصریح بھی کر دی کہ اب نبوت ورسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اب آپ کے بعد کسی نبی کی حاجت نہیں کہ دین کامل اور صحیفہ الٰہی محفوظ ہو چکا اور ہدایت ربانی کے دروازہ کے بند ہونے کا خطرہ دور ہو گیا اور خود تاریخِ انسانی گواہ ہے کہ بعثت محمدی ﷺ کے بعد سے دنیا کی حالت بدل گئی متفرق قومیں پیوستہ ہو گئیں۔ زمین کے کونے ایک دوسرے سے مل گئے اور توحیدِ کامل کا غلغلہ عرش سے فرش تک بلند ہو گیا اور خدا کے تمام رسولوں کو سچا اور

صادق ماننے کا ولولہ آہستہ آہستہ ترقی پانے لگا یہاں تک کہ ان قوموں نے بھی جو مسلمان نہیں ہوئیں ان دونوں صداقتوں کو اصولاً تسلیم کر لیا۔

وحدت ادیان اور دینِ اسلام

تفصیل بالا کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ وحدت ادیان کا منشا کیا ہے یعنی یہ کہ اصل میں ایک ہی دین ہے جو تمام انبیا کا مذہب رہا لیکن وہ بعد کو ان کے پیروؤں کے صحائف میں تحریف وتصرف کے سبب سے بگڑتا رہا، اسی دین ازلی کو لے کر محمد رسول اللہ ﷺ آئے اور اسی کا نام اسلام ہے، جو اپنے صحیفہ کی بقا اور حفاظت اور دین کی تکمیل اور نبوت کے اتمام کے سبب سے ہمیشہ قائم و باقی رہے گا، اگر تمام مذاہب سابقہ اپنے اپنے اس اصلِ دین پر آ جائیں جس کی تعلیم ان کے پیغمبروں نے دی تھی تو وہ وہی دینِ ازلی ہوگا جس کا نام ''اسلام'' ہے اور نوحی اور ابراہیمی اور موسوی، عیسوی اور محمدی دینوں میں سوائے اجمال و تفصیل کے کوئی فرق نہ رہے گا، اسی لیے فرمایا گیا:

﴿ يَاۤ أَيُّهَا الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى أَدْبَارِهَاۤ أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ أَصْحٰبَ السَّبْتِ ﴾ (٤/ النسآء:٤٧)

''اے وہ لوگو! جن کو پہلے کتاب دی گئی، اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور ان کو پیٹھ کی طرف پھیر دیں یا سبت کے گنا ہگاروں پر جس طرح لعنت کی تھی ہم ان پر لعنت کریں، اس وحی پر ایمان لاؤ جو ہم نے اب اتاری، قرآن (جو) ان تعلیمات کی جو تمہارے پاس ہیں، تصدیق کرتی ہے۔''

مشرکینِ عرب سے زیادہ اہلِ کتاب ہی کو اس حقیقت کے سمجھنے کا زیادہ استحقاق تھا، اس لیے انہی کو سب سے پہلے اس کا منکر نہ ہونا چاہیے:

﴿ وَاٰمِنُوْا بِمَاۤ أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْۤا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ ﴾

(٢/ البقرة:٤١)

''اور جو کتاب ہم نے اب اتاری جو تمہارے پاس والی کتاب کو سچا بتاتی ہے، اس پر ایمان لاؤ اور تم ہی پہلے کافر نہ بنو۔''

لیکن ان کی حالت یہ ہوئی کہ

﴿ وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ﴾ (٢/ البقرة:٩١)

''اور جب ان سے کہا گیا کہ خدا نے جو بھی اتارا اس پر ایمان لاؤ، تو جواب دیا کہ جو ہم پر اترا ہم اس کو مانتے ہیں اور اس کے سوا کا انکار کرتے ہیں حالانکہ یہی قرآن حق ہے اور جو ان کے

پاس ہے اس کی تصدیق کرتا ہے۔''

اس کے برخلاف محمد رسول اللہ ﷺ نے جس دین کو پیش کیا اس کی بنیاد تمام اگلی نبوتوں اور کتابوں کی صداقت کے تسلیم کرنے پر رکھی گئی، یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی مسلمان کے مسلمان ہونے کے لیے صرف یہی نہیں فرمایا کہ وہ تنہا آپ کی نبوت پر ایمان لائے، بلکہ یہ بھی فرمایا کہ وہ تمام نبوتوں اور صحیفوں پر ایمان لائے۔ چنانچہ خود قرآن کی شہادت ہے کہ آنحضرت ﷺ کو صرف اسی کی تکلیف نہ تھی کہ آپ کے ہم وطن آپ کے صحیفہ کو نہیں مانتے، بلکہ اس کی بھی تھی کہ وہ اگلے صحیفوں کو بھی نہیں مانتے، سورۂ سبا میں ہے:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ (۳٤/ سبا:۳۱)

''اور منکروں نے کہا کہ ہم اس قرآن پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے اور نہ اس سے اگلی کتاب (یعنی تورات) پر۔''

اور اسی لیے آنحضرت ﷺ نے تصریح کے ساتھ یہ فرمایا کہ ''جو میری عبودیت اور رسالت کے ساتھ عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو بھی خدا کا بندہ اور اس کا رسول اور کلمہ اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی روح تسلیم کرے گا وہ جنت میں جائے گا۔'' [1] الغرض وہ ازلی و ابدی دین صرف ایک ہی تھا اور تمام انبیا علیہم السلام اسی ایک پیغام کو لے کر دنیا میں آئے، یہی وحدتِ دین کی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے اپنے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۵۱۔۵۳)

''اے پیغمبرو! ستھری چیزیں کھاؤ اور بھلا کام کرو میں تمہارے کاموں سے آگاہ ہوں اور بے شک تم سب کی امت ایک امت ہے اور میں تم سب کا (ایک) پروردگار ہوں تو مجھ سے ڈرتے رہو تو ان کے پیروؤں نے اپنے مذہب کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، ہر فرقہ اپنے پاس کے خیال پر نازاں ہے۔''

اس حقیقت کی مزید تشریح آنحضرت ﷺ نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی:

((اَلْاَنْبِيَاءُ اِخْوَةٌ لِّعَلَّاتٍ، اُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ)) [2]

''تمام انبیا ایسے بھائی ہیں، جن کا باپ ایک ہے اور مائیں مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔''

---

[1] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قوله: یآ اهل الکتاب لا تغلوا......: ۳٤۳۵۔

[2] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قوله: واذکر فی الکتاب مریم......: ۳٤٤۳۔

پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان

﴿وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (٢/ البقرة:١٧٧) ﴿وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ﴾

(٢/ البقرة:٤)

اسلام کے سلسلہ ایمانیات کی آخری کڑی [1] ایک پچھلے دن اور پچھلی زندگی یا پچھلی دنیا پر یقین کرنا ہے، سورۂ بقرہ کے پہلے ہی رکوع میں ہدایت یاب اور کامیاب انسانوں کے ایمانیات کی آخری دفعہ یہ بیان کی گئی ہے:

﴿وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ﴾ (٢/ البقرة:٤) ''اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔''

﴿مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (٩/ التوبة:١٨)

''جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لایا۔''

﴿الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (٩/ التوبة:٤٥) (٢/ البقره:١٧٧)

''جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں۔''

''آخرہ'' کے معنی پچھلی کے ہیں اور یہ لفظاً صفت ہے، عربی میں اوصاف کو موصوف کا قائم مقام کر کے اکثر موصوف کو حذف کر دیتے ہیں، مثلاً: ''دنیا'' کے لفظی معنی ''قریب ترین'' کے ہیں اور یہ صفت ہے، اسکا موصوف الحیاۃ (زندگی) یا الدّار (گھر) ہے، اس لیے الدنیا کا مفہوم اَلْحَيَاةُ الدُّنْيَا (قریب ترین زندگی یعنی اس عالم کی موجودہ زندگی) یا اَلدَّارُ الدُّنْيَا (قریب ترین گھر یعنی موجودہ عالم ہے) اسی طرح الآخر اور الآخرۃ کا مفہوم اَلْيَوْمُ الْآخِرُ وَالْحَيٰوةُ الْآخِرَةُ وَالدَّارُ الْآخِرَةُ (پچھلا دن اور پچھلی زندگی اور پچھلا آنے والا گھر ہے) یعنی موجودہ زندگی کے بعد آنے والی دوسری دنیا کی زندگی اور گھر اور قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنوں میں ایک سوتیرہ مقام پر آیا ہے اور ہر جگہ اس کا محذوف موصوف حَيَاة (زندگی) یا دار (گھر) ہے۔

چنانچہ حسب ذیل آیتوں کے پڑھنے سے یہ حقیقت منکشف ہوگی:

﴿وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ﴾ (٢٩/ العنكبوت:٦٤)

''بے شک آخری گھر اصلی زندگی ہے۔''

﴿وَلَلدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ﴾ (٦/ الانعام:٣٢)

''اور بے شک آخری گھر بہتر ہے۔''

ان دونوں آیتوں میں (دار) یعنی گھر کا لفظ موجود ہے۔

﴿أَرَضِيتُم بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ﴾ (٩/ التوبة:٣٨)

''کیا پچھلی زندگی کو چھوڑ کر اس موجودہ زندگی پر تم راضی ہو گئے۔''

[1] قرآن پاک میں جہاں جہاں ایمان کے تفصیلات ذکر کیے گئے ہیں وہاں وہاں یوم آخرت پر ایمان سب سے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔

﴿ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَ اَتْرَفْنٰهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۙ﴾

(۲۳/ المؤمنون:۳۳)

''جنہوں نے انکار کیا اور پچھلی زندگی کی ملاقات کو جھٹلایا، اور ہم نے موجودہ زندگی میں ان کو نعمت دی۔''

ان آیتوں میں الحیاۃ الدنیا یعنی موجودہ دنیا کے تقابل سے ظاہر ہے، کہ الاخرۃ سے مراد الحیاۃ الاخرۃ یعنی پچھلی زندگی ہے۔ 1 اور اس لفظ کے عموم میں وہ تمام منازل ومقامات داخل ہیں جو ابتدائے موت سے لیکر حشر ونشر اور اس کے بعد پیش آتے ہیں، یا آئیں گے، چنانچہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ اس آیت میں:

﴿ یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ ۚ﴾ (۱٤/ ابراھیم:۲۷)

''جو ایمان لائے ان کو اللہ حیاتِ دنیا میں اور آخرت میں اس کی پکی بات کلمہ توحید پر مضبوط رکھے گا۔''

اس آیت میں ''آخرت سے مراد'' عالم برزخ'' ہے اور قرائن بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت میں قولِ ثابت پر قائم رہنا کونسی بڑی بات ہوگی، جبکہ ہر چیز اس وقت واضح اور نمایاں ہوگی۔ اس لیے اس آیت میں "آخرۃ" سے مراد عالم برزخ کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا، ایک اور حدیث میں تصریحاً بیان ہے کہ ''قبر (یعنی برزخ) آخرت کی منزلوں میں سب سے پہلی منزل ہے۔'' 2

یومِ آخر اور حیات آخر ایمان، اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے، اور قرآنِ پاک میں ایمان باللہ کے بعد اسی کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آیندہ دنیا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے، اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمالِ انسانی کے نتائج کا رشتہ

---

1 دنیا اور آخرت کا یہ تقابل قرآن پاک کی بے شمار آیتوں میں مذکور ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے: ﴿ وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ﴾ (۳/ آل عمران:٤۵) ''دنیا اور آخرت میں معزز۔'' سلسلۂ دعا میں ہے:

﴿ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۰۱)

''پروردگار ہم کو دنیا میں نیکی اور آخرت میں نیکی دے۔'' کفار کے بطلانِ عمل کے ذکر میں ہے:

﴿ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱۷) ''ان کے عمل دنیا اور آخرت میں گر گئے۔''

﴿ اسْتَحَبُّوا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ﴾ (۱٦/ النحل:۱۰۷) ''انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی۔''

﴿ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ ۚ﴾ (٤۱/ حم السجدۃ:۳۱)

''ہم تمہاری قریب کی زندگی اور پچھلی زندگی کے دوست ہیں۔''

اور کبھی دنیا کے بجائے ''اولیٰ'' (پہلی زندگی) کا لفظ اختیار کیا گیا ہے فرمایا:

﴿ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَ الْاُوْلٰى ؕ﴾ (۷۹/ النازعات:۲۵) ''تو خدا نے اس کو پچھلی زندگی اور پہلی زندگی کی سزا بنایا۔''

﴿ وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَ الْاُوْلٰى ۝﴾ (۹۲/ الیل:۱۳) ''اور ہمارے ہی لیے ہے، پچھلی اور پہلی زندگی۔''

2 ترمذی، ابواب الزھد، باب ماجاء فی فظاعة القبر:۲۳۰۸؛ ابن ماجه، ابواب الزھد، باب القبر والبلی: ٤۲٦۷؛ مسند أحمد، ج ۱، ص: ٦۳؛ کنز العمال، ج۸، ص: ۹۵۔

ریشہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے، اسی لیے تمام مذاہب نے کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی اصطلاح میں دوسری زندگی کو متفقاً تسلیم کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے اس آئندہ زندگی کو دو دوروں میں تقسیم کیا ہے، ایک موت سے لے کر قیامت تک اور دوسرا قیامت سے لے کر ابد (ہمیشہ) تک جس میں پھر موت وفنا نہیں، پہلے دور کا نام ''برزخ'' اور دوسرے کا نام ''بعث'' یا حشر ونشر اور قیامت ہے اور ان سب کے معنی اُٹھنے، اکٹھے کیے جانے اور کھڑے ہونے کے ہیں۔ لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے اور اسی لیے اس دوسری زندگی یا اس عالم کا نام قرآن میں ﴿الدَّارُ الْاٰخِرَةُ﴾ اور ﴿عُقْبَى الدَّارِ﴾ وغیرہ ہے۔ جس کے معنی دوسرے یا پچھلے گھر کے ہیں۔

توراۃ وانجیل میں برزخ وقیامت کی تفصیل نیز یہ کہ مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے انسان کی روح کس حالت اور کیفیت میں رہے گی، مذکور نہیں ہے۔ لیکن اسلام میں یہاں بھی گنجلک اور ابہام نہیں، بلکہ اس نے اس کی پوری تفصیل کی ہے اور بتایا ہے کہ موجودہ عالم کے علاوہ عالمِ برزخ اور میدانِ قیامت ہمارے سزا و جزا کے دو مقام ہیں شخصی موت کے بعد ہر شخص عالمِ برزخ میں داخل ہو جاتا ہے اور وہاں اس کے معاملات شروع ہو جاتے ہیں، پھر اپنے مقررہ وقت پر جس کو خدا نے اپنی مصلحتوں اور حکمتوں کے لحاظ سے طے کر لیا ہے، سلسلہ خلق کے خاتمہ پر جب موجودہ دنیا پر عام موت اور فنا طاری ہوگی دوسری زندگی کی دنیا شروع ہوگی جو تمام تر ہماری پہلی دنیا میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا سراپا عکس اور ظل ہوگی، چنانچہ سورۂ توبہ کی حسب ذیل آیت میں ہمارے ان تینوں دور ہائے حیات کا ذکر ہے:

﴿ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۝﴾ (۹/ التوبۃ:۱۰۱)

''ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔''

عذاب کی یہ تین منزلیں دنیا، برزخ اور قیامت ہیں۔

اُن تینوں عالموں میں جو فرق ہے، وہ یہ ہے کہ اس موجودہ دنیا میں جسم (مادہ) نمایاں اور روح پوشیدہ ہے اور روح کو جو کچھ مسرت وتکلیف یہاں پہنچتی ہے، وہ صرف اس مادی جسم کے واسطے سے پہنچتی ہے، ورنہ درحقیقت اس کی براہ راست راحت ولذت کا اس مادی دنیا میں کوئی امکان نہیں، دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہا گیا ہے، روح نمایاں ہوگی اور جسم چھپ جائے گا وہاں جو راحت وتکلیف پہنچے گی، وہ دراصل روح کو پہنچے گی اور جسم اس کی تبعیت میں ضمناً اس سے متاثر ہوگا، لیکن اس تیسرے عالم میں جہاں سے حقیقی اور غیر فانی زندگی شروع ہوتی ہے، روح اور جسم دونوں نمایاں ہوں گے اور دونوں کی لذت وتکلیف کے مظاہر بالکل الگ الگ ہوں گے۔

برزخ

''برزخ'' کا لفظ قرآن پاک میں تین دفعہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے دو چیزوں کے درمیان کا پردہ حاجب اور حائل مراد ہے، چنانچہ سورۂ رحمٰن میں دو دریاؤں کا ذکر ہے جن میں ایک میٹھا اور دوسرا کھاری ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ حائل ہے جو انکو آپس میں ملنے نہیں دیتا:

﴿ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝ ﴾ (۵۵/ الرحمٰن:۲۰)

''ان دونوں کے بیچ میں ایک پردہ ہے جس سے ایک دوسرے پر بڑھ کر نہیں جاتا۔''

اسی عجیب وغریب بحری منظر کا ذکر سورۂ فرقان میں ہے اور وہاں بھی یہی لفظ واقع ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۵۳)

''اور اسی نے دو دریاؤں کو ملا کے چلایا اور یہ میٹھا اور پیاس بجھاتا ہے اور وہ کھاری کڑوا ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ اور روکی ہوئی اوٹ بنائی ہے۔''

اسی بنا پر موجودہ زندگی اور آیندہ زندگی کے درمیان جو مقام حائل اور حاجب ہے اس کا نام ''برزخ'' ہے سورۂ مومنون میں نزع کے وقت کے بیان میں ہے کہ

﴿ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۱۰۰)

''اور ان مرنے والوں کے پیچھے ایک پردہ ہے اس دن تک جب کہ وہ قیامت میں اٹھائے جائیں گے۔''

عربوں بلکہ کل سامی قوموں کے رسم ورواج اور مشاہدات کی بنا پر اسی درمیانی منزل (برزخ) کا نام ''قبر'' ہے، خواہ وہ خاک کے اندر ہو یا قعر دریا میں یا کسی درندہ یا پرندہ کے پیٹ میں، اسی لیے فرمایا:

﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝ ﴾ (۲۲/ حج:۷)

''بے شبہ اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں اٹھائے گا۔''

اب ظاہر ہے کہ یہ ''بعث'' صرف انہی مردوں کے لیے مخصوص نہیں جو تو دہ خاک کے اندر دفن ہوں بلکہ ہر میت کے لیے خواہ وہ کسی حالت اور کسی عالم میں ہو، اسی لیے قبر سے مقصود ہر وہ مقام ہے، جہاں مرنے کے بعد جسم خاکی نے جگہ حاصل کی۔

موت وحیات کی منزلیں

قرآن پاک میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر ہے، ایک جگہ دوزخیوں کی زبان سے کہا گیا ہے:

﴿ قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ ﴾

(۴۰/ المؤمن:۱۱)

''ہمارے پروردگار تو نے ہم کو دو دفعہ مارا اور دو دفعہ جلایا ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا پھر کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے۔''

ان دو موتوں اور دو حیاتوں کی تفصیل خود اللہ نے سورۂ بقرہ میں فرمائی ہے:

﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۸)

''کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم پہلے مردہ تھے پھر تم کو اس نے زندہ کیا، انسان بنا کر پیدا کیا تم کو مار دے گا پھر تم کو جلائے گا، پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

پہلی موت تو ہر انسان کی خلقت سے پہلے کی ہے جب وہ مادہ یا عنصر کی صورت میں تھا، پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں پیدا ہوا یہ اس کی پہلی زندگی ہے، پھر موت آئی، روح نے مفارقت کی اور جسم اپنی اگلی مادی صورت میں منتقل ہو گیا، یہ دوسری موت ہوئی، پھر خدا اس کی روح کو جسم سے ملا کر زندہ کرے گا، یہ اس کی دوسری زندگی ہوئی جس کے بعد پھر موت نہیں۔ قرآن پاک میں خود رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا گیا:

﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴾

(۳۹/ الزمر:۳۰، ۳۱)

''بیشک تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں پھر تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کے سامنے دعویٰ پیش کرو گے۔''

﴿ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۱۵، ۱۶)

''پھر تم اس کے بعد مر جانے والے ہو پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔''

اب سوال یہ ہے کہ برزخ کے عالم میں کیا کیفیت ہوگی، اس کے سمجھنے کے لیے ایک مختصر تمہید کی ضرورت ہے۔

نیند اور موت کی مشابہت

اللہ تعالیٰ نے اس مادی دنیا میں روحانی عالم کی باتوں کے سمجھنے کے لیے اپنی عجیب وغریب قدرت سے ہم کو ایک چیز عنایت کی ہے جس کو ہم نیند کہتے ہیں۔ روح کو اپنے جسم سے دو قسم کا تعلق ہے ایک ادراک واحساس کا اور دوسرے تدبیر وتغذیہ کا، نیند کا وہ عالم جس میں ہمارے تمام آلات ادراک واحساس اس دنیا سے بے خبر ہو کر اپنے گردش کی مادی دنیا سے یک سر بیگانہ بن جاتے ہیں، تاہم ہمارے نفس یا روح کا تعلق ہمارے جسم سے باقی رہتا ہے اور وہ اس حالت میں بھی جسم کی مادی زندگی، نشو ونما اور بقا کی تدبیروں اور دل ودماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ کے غذا رسانی اور خون کے دوران میں مصروف رہتی ہے، اسی کا نام روح کا جسم سے تدبیری

تعلق ہے اب نیند اور موت میں فرق ہے تو یہ ہے کہ نیند کی حالت میں جسم سے نفس کا تدبیری تعلق قائم رہتا ہے اس لیے جسم باقی اور زندہ رہتا ہے لیکن موت کی حالت میں جسم سے روح کا تدبیری تعلق بھی اکثر منقطع ہو جاتا ہے اس لیے جسم کے اجزا کچھ دنوں میں منتشر ہو جاتے ہیں، موت اور نیند کی یہی مشابہت ہے جس کی بنا پر تمام انسانوں کی زبانوں میں موت کو نیند سے تشبیہ دیتے ہیں اور دنیا بھر کی زبانوں کا یہ توافق الہام طبعی کی خبر دیتا ہے قرآن پاک میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ﴾ (٦/ الانعام:٦٠)

''اور وہی ہے جو تم کو رات میں مارتا ہے اور جلاتا ہے جو تم نے دن میں کمایا پھر تم کو دن میں جلاتا ہے، تاکہ مقررہ وقت پورا کیا جائے۔''

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ زمر میں ہے:

﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ ﴾

(٣٩/ الزمر:٤٢)

''وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے اور جو نہیں مری ہیں ان کو ان کی نیند میں وفات دیتا ہے تو جس پر موت کا حکم اس نے جاری کیا اس کو روک لیتا ہے اور دوسری روح کو جس پر موت کا حکم نہیں یعنی نیند والی کو ایک مدتِ معینہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے بیشک اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی نے ''برزخ'' کی زندگی کو نیند کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، قرآن پاک میں ہے کہ قیامت میں جب لوگ دوسری زندگی پا کر قبروں سے اٹھیں گے تو گناہگاروں کی زبانوں پر یہ فقرہ ہوگا:

﴿ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ ﴾ (٣٦/ يٰس:٥٢)

''اے ہماری خرابی! کس نے ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے اٹھا دیا۔''

غزوۂ احد کے موقع پر ہے کہ جن کو مرنا تھا، ان کی موت ٹل نہیں سکتی تھی، اگر وہ میدان جنگ کے بجائے گھروں میں بھی ہوتے تو نکل کر اپنے مقتل میں خود آ جاتے، اس مفہوم کو قرآن نے یوں ادا کیا ہے:

﴿ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ ﴾

(٣/ آل عمران:١٥٤)

''کہہ دے کہ اگر وہ گھروں میں بھی ہوتے تو جن کے لیے مارا جانا لکھا گیا تھا وہ خود نکل کر اپنی سونے کی جگہوں میں چلے آتے۔''

اسی لیے قرآن پاک میں دوسری زندگی کے لیے اکثر لفظ ''بعث'' استعمال ہوا ہے جس کے معنی جگانے اور بیدار کرنے کے بھی ہیں [1] جیسا کہ اوپر کی اس آیت میں ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّىٰكُم بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ ﴾ (٦/ الانعام:٦٠)

''اور وہی ہے جو تم کو رات میں موت دیتا ہے اور دن کو جو تم کرتے ہو اس کو جانتا ہے پھر تم کو دن میں جگاتا ہے۔''

﴿ وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِي الْقُبُورِ ﴾ (٢٢/ الحج:٧)

''اور بے شک اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں، جگا لے گا۔''

احادیث میں ہے کہ قبر میں سوال و جواب کے بعد نیکوکاروں سے کہا جاتا ہے کہ ((نَمْ كَنَوْمَةِ الْعُرُوْسِ)) ''دلہن کی نیند سو جاؤ۔'' جس کو وہی جگاتا ہے، جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہے یہاں تک کہ خدا اس کو اس خواب سے اٹھائے گا۔ [2]

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ برزخ کی زندگی جس میں روح جسم سے الگ ہوتی ہے، روح کی ایک طویل و عمیق [3] نیند کے مشابہ ہے۔

خواب میں لذت والم

انسان جب سوتا ہے تو اس کے ادراک واحساس کے آلات اپنی مادی دنیا سے عارضی طور پر بے خبر ہو جاتے ہیں مگر اس کے ادراک واحساس کی تخیلی، تمثالی یا ذہنی دنیا اس کے سامنے بالکل اسی مادی دنیا کی طرح متشکل ہو جاتی ہے، اس میں وہ خود اپنے جسم سے الگ مگر ہو بہو وہی جسم کو دیکھتا ہے جو آتا جاتا، چلتا پھرتا اور دیکھتا سنتا سب کچھ ہے اس کے سامنے کھانے پینے اور لطف انگیزی کے سب سامان ہوتے ہیں نیز اس میں درد، رنج اور تکلیف کی تمام وہی صورتیں ہوتی ہیں جو مادی دنیا میں ہیں اس کے خیالی جسم کو اگر اس عالم میں

[1] صحیح بخاری، کتاب التھجد، باب تحریض النبی ﷺ علی قیام اللیل:١١٢٧ میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نماز تہجد کے لیے اس وقت تک بیدار نہ ہونے پر سوال فرمایا، تو حضرت ممدوح نے ان لفظوں میں معذرت پیش کی کہ یارسول اللہ ﷺ! انفسنا بیداللّٰه فاذا شاء ان یبعثنا بعثنا۔ ''ہماری روحیں خدا کے ہاتھ میں ہیں وہ جب جگانا چاہتا ہے جگاتا ہے۔'' اس حدیث میں بھی بعث جگانے کے معنوں میں آیا ہے۔ [2] جامع ترمذی، ابواب الجنائز، باب ما جاء عذاب القبر: ١٠٧١ حدیث حسن غریب۔ [3] شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں: فهذا المبتلی فی الرؤیا غیر انها رؤیا لا یقظة منها الی یوم القیمة۔ (باب اختلاف احوال الناس فی البرزخ، ج١، ص:٢٧) یعنی ''یہ عذاب قبر کا گرفتار خواب میں ہے لیکن یہ کہ یہ ایسا خواب ہے، جس سے قیامت تک جاگنا نہیں ہے۔''

تکلیف ہوتی ہے تو وہ خود چیخ اٹھتا ہے اور اگر اس میں لذت ملتی ہے، تو لطف اندوز ہوتا ہے اور ان دونوں کے اثرات اس کو اپنے مادی جسم میں جاگنے کے بعد بھی نظر آتے ہیں غرض عالم خواب کی خیالی دنیا اور اس کی شادی و رنج اور لذت والم اور اس مادی دنیا کے جسمانی و مادی، شادی و رنج اور لذت والم میں فرق نہیں ہوتا اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ عالم خواب کی لذت و تکلیف بیداری کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور مادی بیداری والی لذت و تکلیف احساس وادراک کے وجود تک قائم رہتی ہے اور جس طرح مادی بیداری والی لذت و تکلیف خواب میں معدوم ہوتی ہے، اسی طرح خواب والی لذت و تکلیف بیداری میں رخصت ہو جاتی ہے۔

خواب والے لذائذ و آلام کے مختلف مناظر کے حقائق اور اسباب و علل پر اگر فلسفیانہ حیثیت سے غور کیا جائے تو عجیب و غریب معاملات سامنے آتے ہیں، کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام احساسات و معلومات جو کبھی بھی ذہن انسانی میں آئے ہوں اور ان کو بحالت بیداری مادی دنیا کے مشاغل اور زمانہ کے امتداد کے سبب سے انسان کتنا ہی فراموش کر چکا ہو، وہ خواب میں مادی گراں باری سے آزادی کے بعد سامنے مجسم شکلوں میں نمودار ہو جاتے ہیں اور بیچ کی کڑیوں کے بھول جانے کی وجہ سے وہ اس کو بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ انسان جن چیزوں کو بھول جاتا ہے وہ اس کے حافظہ سے حقیقت میں معدوم نہیں ہو جاتیں، بلکہ دماغی حجرہ (ذہن) کے منتشر اسباب کے ذخیرہ (معلومات) میں چھپ کر گم ہو جاتی ہیں اور پھر بعد کو مل جاتی ہیں اس لیے وہ تمام اچھے اور برے اعمال جو انسان نے عمر بھر کیے ہیں خواہ وہ ان کو آج بھول گیا ہو مگر ان کی یاد ذہن کے گوشوں میں پڑی ہے، معدوم و مفقود نہیں ہوگئی۔

خواب کی عجیب و غریب صورت وہ ہے، جس کو تمثیلی کہتے ہیں، جیسے ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کے خدمتِ کعبہ پر وقف کرنے کو قربانی کی شکل میں اور حضرت یوسف علیہ السلام نے والدین کو سورج اور چاند اور گیارہ بھائیوں کو گیارہ سیاروں کی صورت میں دیکھا، شاہ مصر کے سولی پانے والے مصاحب نے اپنے سولی پانے کو اس رنگ میں دیکھا کہ اس کے سر پر خوان ہے اور بڑے بڑے پرندے اس میں چونچ مار مار کر کھاتے ہیں، شاہ مصر نے مصر کی ہفت (سات) سالہ قحط سالی کو سات دبلی گایوں کی صورت میں دیکھا۔ [1] آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کو اس شکل میں دیکھا کہ مسلمان سر منڈوائے اور بال ترشوائے حج کر رہے ہیں، مسیلمہ اور اسود عنسی دو کذابوں کو سونے کے دو کنگنوں کی صورت میں دیکھا، شہدائے اُحد کو موٹی گائے کی صورت میں ملاحظہ کیا، مدینہ کی وبا ایک پریشان مو، کالی عورت کی صورت میں نظر آئی، خلافت کو ڈول کھینچنے کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علم کو دودھ کی اور ان کی دینداری کو لمبی قمیض کی شکل میں دیکھا۔ [2] ان کے علاوہ ہر شخص

---

[1] یہ کل تمثیلی خواب قرآن پاک میں مذکور ہیں۔ دیکھئے سورۂ الصّٰفّٰت وسورۂ یوسف۔

[2] ان خوابوں کو صحیح بخاری، کتاب التعبیر: ۷۰۰۷، ۷۰۰۸، ۷۰۳۵، ۷۰۳۷، ۷۰۳۹، میں دیکھو۔

کے ذاتی تجربوں سے بھی اس کی بے شمار مثالیں فراہم کی جاسکتی ہیں۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ انسان کے جسم میں اگر کسی قسم کا مادہ بڑھ جاتا ہے تو خواب میں اس کے مناسب مجسم شکلیں نظر آتی ہیں مثلاً: اگر بلغم کی زیادتی ہو تو پانی دریا اور سمندر نظر آئیں گے اگر سودا بڑھ جائے تو ہاتھی اور کالی صورتیں نظر آئیں گی۔ اسی طرح دوسرے تغیرات خلطی بھی اپنے مناسب جسمانی ہیئت میں خواب میں مجسم اور متشکل ہو کر دکھائی دیتے ہیں۔ [1]

اسی طرح اعمال جو جسم و مادہ سے بالکل الگ ہیں، خواب میں اپنے مناسب قالب میں مجسم ہو جاتے ہیں اگر کسی بھائی کا حقِ واجب کسی نے ادا نہیں کیا تو خواب میں اس کو نظر آئے گا کہ وہ اس کا گلا کاٹ رہا ہے، اگر کسی کی غیبت کی ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ مردار کھا رہا ہے، سونے چاندی کے خزانوں کو جمع کر کے اگر بخل کا اژدھا ان کی حفاظت میں بٹھایا ہے تو سانپ بن کر وہ اس کی گردن میں لپٹتا اور کاٹتا ہے، ذلت اور خواری کتے کی، حماقت گدھے کی اور شجاعت شیر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے، شبِ معراج میں آنحضرت ﷺ کے سامنے فطرت دودھ کی اور غیر فطرت شراب کی شکل میں پیش ہوئی، اسی طرح کہن سال دنیا ایک بڑھیا کی شکل میں نظر آئی [2]۔ اس قسم کی تمثیلات قرآن مجید میں بھی آئی ہیں، مثلاً: غیبت کی نسبت فرمایا:

﴿ وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ ﴾

(٤٩/ الحجرات:١٢)

''اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو برا نہ کہے، کیا تم میں سے کوئی پسند کرسکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کی بوٹی نوچ نوچ کر کھائے سو گھن آئی تم کو۔''

اور پاگل پن کی شکل میں ظاہر کیا:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ﴾

(٢/ البقرة:٢٧٥)

''جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے (یا نہیں اٹھتے) لیکن جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے حواس شیطان نے چھو کر کھو دیئے ہوں۔''

یتیموں کا مال ناجائز طریق سے کھانے کو پیٹ میں آگ بھرنا فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء:١٠)

''وہ لوگ جو یتیموں کا مال ظلم کر کے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور جہنم کی

[1] حجۃ اللہ البالغۃ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ذکر برزخ، ج ۱، ص: ۲۷۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء: ۳۴۹۔

آگ میں داخل ہوں گے۔“

وہ خود غرض لوگ جو بیکسوں کے کام نہیں آتے، قیامت میں ان کے بھی کوئی کام نہ آئے گا اور جو خود سیر ہو کر کھاتے ہیں اور غریبوں کے درد گرسنگی سے بے خبر رہ کر اپنے مال کا میل کچیل (زکوۃ) بھی ان کو کھانے کو نہیں دیتے دوزخ میں ان کو زخموں کا دھوون کھانے کو ملے گا، فرمایا:

﴿ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِۙ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِؕ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌۙ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍۙ لَّا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ﴾ (۶۹/ الحآقة:۳۳-۳۷)

”بے شک وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور مسکین کو کھانا کھلانے پر آمادہ نہیں کرتا تھا، تو آج اس کا بھی یہاں کوئی دوست نہیں اور نہ زخموں کے سوا کوئی کھانا ہے، اس کو وہی گناہگار کھائیں گے۔“

بے لوث مخلصانہ فیاضی کی تمثیل سرسبز و شاداب باغ سے دی:

﴿ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ ﴾ (۲/ البقرة:۲۶۵)

”اور ان کی مثال جو اپنی دولت خدا کی خوشنودی چاہنے اور اپنے دلوں کی مضبوطی کے لیے خرچ کرتے ہیں ایک باغ کی ہے جو ایک ٹیلہ پر ہے۔“

خدا کی راہ میں جان دینے والوں اور مرجانے والوں کو جان نو اور حیات جاوداں کی خوشخبری دی گئی۔ فرمایا:

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌؕ بَلْ اَحْيَآءٌ ﴾ (۲/ البقرة:۱۵۴)

”جو خدا کی راہ میں مارا جائے اس کو مردہ نہ کہو، وہ لوگ زندہ ہیں۔“

اسی طرح یہ ہے کہ جو خدا کو قرض دے گا خدا اس کو بڑھا کر دے گا۔ جو دوسروں کو معاف کرے گا خدا اس کو معاف کرے گا۔ جو دوسروں کی عیب پوشی کرے گا اللہ اس کی ستاری کرے گا۔ قرآن واحادیث اس قسم کی بالمعاوضہ جزا اور سزا کے ذکر سے لبریز ہیں۔

جو لوگ راہ خدا میں اپنا مال نہیں دیتے، ان کی نسبت فرمایا:

﴿ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِؕ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۸۰)

”جس مال کا بخل کیا تھا قیامت میں اس کا ان کے گلے میں طوق پڑے گا۔“

﴿ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴾ (۹/ التوبة:۳۵)

”جس دن اس سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر ان سے ان کی

پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لیے گاڑ رکھا تھا تو اب تم اس کا مزہ چکھو جس کو تم گاڑ کر رکھتے تھے۔''

دنیا میں اللہ کے نور بصیرت سے روگردانی آخرت میں ظاہری نابینائی کی صورت میں رونما ہوگی اور اسی طرح جو خدا کو یہاں بھولے گا، خدا اس کو وہاں بھلائے گا، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام سے جنت سے نکلتے وقت یہ فرمایا گیا تھا:

﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْۤ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۱۲۴، ۱۲۶)

''اور جس نے میری یاد سے روگردانی کی تو اس کے لیے تنگ گزران اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں گے وہ کہے گا، میرے پروردگار! تو نے مجھے اندھا بنا کر کیوں اٹھایا میں تو دنیا میں آنکھوں والا تھا۔ خدا کہے گا، اسی طرح تیرے پاس ہماری نشانیاں آتی رہیں تو ان کو تو نے بھلا دیا اور اسی طرح آج تو بھلایا جائے گا۔''

یہی مفہوم اور زیادہ اختصار کے ساتھ اس آیت میں ہے:

﴿ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۷۲)

''جو کوئی دنیا میں (دل کا) اندھا تھا وہ آخرت میں اندھا ہے اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا۔''

اس باب میں سب سے زیادہ صریح وہ حدیث صحیح ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ بخیل کا مال سانپ کی صورت میں گلے کا ہار ہو کر نظر آئے گا یعنی وہ مال سونے اور چاندی کے سانپ کی صورت میں ہوگا:

قال رسول اللہ ﷺ ((من اتاه الله مالا فلم يؤدّ زكاته مثل له ماله شجاعا اقرع له زبيبتان يطوقه يوم القيامة ياخذ بلهز متيه اى شدقيه يقول انا مالك انا كنزك))

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو اللہ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو اس کا مال اس کو اچھل کر ڈسنے والے سانپ کی صورت میں دکھایا جائے گا، جس کا سر زہر کی شدت سے گنجا ہوگا اور اس کے منہ میں دو دانت ہوں گے وہ اس کے گلے میں قیامت کے دن پڑا ہوگا اور وہ اس کے دونوں جبڑوں کو کاٹے گا اور کہے گا، میں ہوں تیرا مال، میں ہوں تیرا خزانہ۔'' [1]

[1] بخاری، کتاب التفسیر، باب و لا یحسبن الذین یبخلون بما.....: ۴۵۶۵۔

اسی طرح دو حدیثیں ہیں جن میں مختلف اعمال کا مختلف شکلوں میں آنا بیان کیا گیا ہے، مثلاً: یہ کہ مرنے کے بعد قبر میں نماز روزہ وغیرہ اعمال، عذاب سے بچنے کے لیے ڈھال بن کر داہنے بائیں سے نمودار ہوں گے ❶ یہ بھی حدیث میں ہے کہ "مرنے کے بعد جب ایک دفعہ فرشتہ الٰہی مردہ کو بیدار کرتا ہے تو اس کو آفتاب ڈوبتا ہوا دکھایا جاتا ہے مُثِّلَتِ الشَّمْسُ عِنْدَ غُرُوْبِهَا نیک مرد و مسلمان اس تنگ وقت کو دیکھ کر نماز کی تیاری کرنا چاہتا ہے۔" ❷ یہ ظاہر ہے کہ دنیا والا آفتاب وہاں نہیں بلکہ اس کی تمثیل ہوئی ہے جیسا کہ حدیث کے الفاظ میں ہے یعنی یہ کہ اس مردہ کو ایسا نظر آتا ہے اور وہ درحقیقت آفتاب نہیں بلکہ آفتاب کی مثالی صورت ہوتی ہے۔

گناہوں کی تمثیلی سزائیں

اوپر کے بیانات سے ہویدا ہے کہ غیر مجسم اعمال اور معانی اپنے جن تمثیلی پیکروں میں نظر آتے ہیں وہ درحقیقت ان اعمال و معانی سے تمثیلی مشابہت رکھتے ہیں، مثلاً: ایک صحیح حدیث میں ہے کہ مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ایک صحابی نے خواب میں دیکھا کہ ان کے لیے ایک نہر بہہ رہی ہے اور جب اس کا ذکر آنحضرت ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے اس کی تعبیر میں فرمایا:

((ذٰلِكَ عمله)) ❸ "یہ نہر، ان کا (نیک) عمل ہے۔"

اس تمہید کے بعد آنحضرت ﷺ کے اس رؤیائے صادقہ پر غور کرو، جو ظاہر ہے کہ قیامت کا نہیں کہ ابھی وہ آئی نہیں بلکہ برزخ ہی کا مرقع پیش کرتا ہے جواب بھی قائم ہے، آپ ﷺ نے ایک صبح کو فرمایا: "رات میں نے دیکھا کہ دو آنے والے آئے اور انہوں نے مجھے جگا دیا میں ان کے ساتھ چل کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی لیٹا ہے اور دوسرا اس کے سر پر ایک بڑا پتھر لیے کھڑا ہے اور وہ اس پتھر کو اس کے سر پر اس طرح دے مارتا ہے کہ اس کا سر چکنا چور ہو جاتا ہے اور پتھر لڑھکنے لگتا ہے وہ اس کے پیچھے جا کر اس کو اٹھا لاتا ہے اور اتنی دیر میں اس کا سر درست ہو جاتا ہے اور پھر وہ مارتا ہے اور پھر وہی صورت پیش آتی ہے ہم آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۲) ایک شخص اوندھا پڑا ہے اور دوسرا لوہے کا ایک آنکس لیے کھڑا ہے اور وہ اس سے اس کے جبڑے کو پھر نتھنے کو پھر آنکھوں کو گدی تک چیر ڈالتا ہے پہلے ایک طرف بعد ازیں دوسری طرف پھر آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۳) تنور کی قسم کی ایک چیز دہک رہی ہے اور کچھ مرد اور عورت اس میں ننگے پڑے ہیں اور اس کے شعلے بھڑک کر ان تک پہنچتے ہیں اور وہ چیختے ہیں آگے بڑھے تو نظر آیا کہ (۴) ایک خون کی جیسی سرخ نہر بہہ رہی ہے اور ایک آدمی اس میں تیر رہا ہے نہر کے کنارے ایک آدمی کھڑا ہے جس کے پاس بہت سے پتھر رکھے ہیں، وہ تیرنے والا آدمی تیر کر جب اس شخص کے قریب آتا ہے تو یہ ایک پتھر اٹھا کر اس زور سے

❶ مسند احمد بن حنبل، ج٦، ص:٣٥٢۔ ❷ سنن ابن ماجه، ابواب الزهد، باب ذكر القبر والبلى: ٤٢٧٢۔
❸ صحيح بخاري، كتاب التعبير، باب رؤيا النساء: ٧٠٠٤۔

مارتا ہے کہ وہ پتھر اس کے منہ میں جا کر پیٹ میں اتر جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم آگے بڑھے تو ایک سرسبز و شاداب چمن نظر آیا جس میں بہار کی ہر کلی کھل رہی تھی، باغ کے سامنے ایک دراز قد آدمی کو دیکھا جس کا سر آسمان میں تھا اور اس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے تھے آگے بڑھے تو ایک بہت بڑا باغ دیکھا جس سے زیادہ بڑا اور خوبصورت باغ میں نے نہیں دیکھا تھا، یہاں پہنچ کر اپنے دونوں ہمراہیوں کے کہنے سے اوپر چڑھا تو ایک شہر ملا جس کی دیوار میں سونے کی ایک ایک اور چاندی کی ایک ایک اینٹ لگی تھی ہم لوگ دروازہ کے پھاٹک پر پہنچے دروازہ کھلوایا، دروازہ کھلا تو اس کے اندر گھسے، تو اس میں کچھ لوگ ملے جن کا آدھا دھڑ نہایت ہی خوبصورت اور آدھا بہت ہی بدصورت تھا میرے ہمراہیوں نے ان سے ایک نہر کی طرف جو بیچ میں نہایت صاف و شفاف بہہ رہی تھی اشارہ کر کے کہا کہ اس میں جا کر غوطہ لگاؤ وہ غوطہ لگا کر آئے تو ان کی بدصورتی کا حصہ جاتا رہا اور وہ پورے دھڑ سے خوبصورت ہو گئے میرے ہمراہیوں نے مجھ سے کہا کہ یہ "جنت عدن" ہے اور وہ آپ کا دولت خانہ ہے میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، سپید لکۂ ابر کی طرح ایک محل دکھائی دیا۔ پھر میں نے ان ہمراہیوں سے کہا کہ آج تو میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں تو بتاؤ میں نے کیا کیا دیکھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ پہلا شخص جس کا سر پتھر سے کچلا جا رہا تھا وہ ہے جو قرآن پڑھ کر اس کی تعمیل سے انکار کرتا ہے اور صبح کی مفروضہ نماز سے غافل ہو کر سو رہتا ہے اور دوسرا شخص جس کے گلپھڑے اور نتھنے اور آنکھیں پھاڑی جاتی تھیں وہ ہے جو جھوٹ بول کر تمام دنیا میں اس کو پھیلاتا ہے اور تنور میں جو مرد اور عورتیں ننگی جل رہی تھیں، وہ بدکار مرد اور عورتیں ہیں اور جو شخص خون کی نہر میں تیر رہا تھا وہ منہ سے پتھر نگلتا تھا وہ سود خوار ہے اور اس سدا بہار چمن میں جو دراز قد آدمی آپ نے دیکھا وہ ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کے گرد جو بچے تھے وہ کمسن بچے تھے جو فطرت پر مرے تھے۔" کسی صحابی نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! مشرکوں کے بچے؟ فرمایا: "اور مشرکوں کے بچے بھی، وہ لوگ جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا وہ ہیں جنہوں نے کچھ اچھے کام بھی کیے تھے، تو خدا نے ان کے گناہ دھو دیے۔" [1]

برزخ کی ان تمام سزاؤں پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ ان کی نوعیت اور کیفیت ان کے اعمال کے بالکل مناسب اور مشابہ قرار دی گئی ہے، نمازِ صبح سے غافل ہو کر بالینِ راحت سے سر نہ اٹھانے والے کا سر کچلا جانا، جھوٹے کا گلپھڑا اپھاڑا جانا، زانی اور زانیہ کا برہنہ تنور کی آگ میں جلنا، خون چوسنے والے سود خوار کا انسانوں کے خون کے دریا میں تیرنا اپنا دو بالشت کا پیٹ بھرنے کے لیے سارے غریبوں کی روزی چھین چھین کر جمع کرنے والے کا پتھر کے لقمے کھانا، سراسر ان کے دنیاوی اعمال کی تمثیل و تصویر ہے اور آخر میں نصف حسنِ عمل سے آدھے دھڑ کی خوبصورتی اور نصف سوئے عمل سے آدھے دھڑ کی بدصورتی پوری مشابہ ہے اور

[1] صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب تعبیر الرؤیا بعد صلوٰۃ الصبح: ۷۰۴۷۔

صاف وشفاف نہر کی صورت میں رحمت ومغفرتِ الٰہی کا ظہور بھی اسی قیاس پر ہے۔ [1] ابھی تک دنیا نے جو کچھ ترقی کی ہے وہ نفس سے باہر ''آفاقی'' یعنی اپنے سے باہر کی بیرونی مادی دنیا کی اشیاء کے خواص وصفات کے جاننے میں کی ہے جن سے سائنس کی ایجادات واختراعات کا تعلق ہے لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ ایک وسیع دنیا اپنے اندر کی پڑی ہے جس کو قرآن نے انفس کہا ہے ان انفس یا ارواح کے اوصاف وخصائص کا ابھی تک بہت کم علم ہوا ہے۔ ہماری سائیکالوجی علم النفس ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے، اور اس پر پچویلزم (علمِ ارواح) ابھی طلسم وفریب کے عجائبات میں اسی طرح گرفتار ہے جس طرح موجودہ عہد سے پہلے آج کے معمولی سائنٹفک تجربے سحر وجادو کے نقش ونگار بنے ہوئے تھے بہر حال ابھی تک علم نفس وروح کے عجائبات پر پردے پڑے ہوئے ہیں، ایک یہی مسئلہ کہ شے کے یقین اور اس کے خارجی وجود میں کیا تعلق ہے؟ ایک معما ہے بہت سے ہندو اہلِ فلسفہ اور بعض مسلمان صوفیوں اور موجودہ زمانہ کے مشہور فلاسفر برکلے کے نزدیک تو کسی شے کے یقین اور وجود یا یوں کہو کہ ذہنی اور خارجی وجود میں بہت کم فرق ہے، بلکہ گویا نہیں ہے۔ بہر حال نفسِ انسانی کے اندرونی قویٰ کا علم گو ابھی بہت کچھ محتاجِ تکمیل ہے، تاہم اتنا ثابت ہے کہ کسی شے کے تصوری یقین اور خارجی وجود میں بہت سا شدید تعلق ہے، مسمریزم نے جو سراسر اسی اصول پر مبنی ہے، اس حقیقت کو کسی قدر واضح کر دیا ہے اسی سے معلوم ہوگا کہ مذاہب نے سب سے زیادہ ایمان پر جو یقین ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس قدر زور بے سبب نہیں دیا ہے۔

قرآنِ پاک نے یقین کی دو قسمیں کی ہیں، علم الیقین اور عین الیقین۔ کسی شے کی دلیلوں کو سن کر یا بعض علامتوں کو دیکھ کر اس کے وجود کا اقرار کر لو، تو یہ علم الیقین (یقین جاننا) ہے اور اگر وہ شے خود تمہارے احساس اور مشاہدہ کے سامنے آجائے جس میں پھر شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہوسکتی تو وہ عین الیقین (خود یقین) ہے۔ قرآنِ پاک نے یقین کی ان دونوں صورتوں کو سورۃ التکاثر میں بیان کیا ہے:

﴿ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝ ﴾

(۱۰۲/ التکاثر: ۱۔۷)

''تم کو دولت ونعمت کی بہتات نے غفلت میں مبتلا کر دیا یہاں تک کہ تم نے قبروں کو جا دیکھا ابھی نہیں تم آگے جان لو گے پھر ابھی نہیں تم آگے جان لو گے ہر گز نہیں اگر تم یقین کا جاننا جانتے تو البتہ دوزخ کو دیکھ لیتے پھر البتہ عین الیقین سے اس کو دیکھ لو گے۔''

بنا بریں اگر انسان اپنے اندر علمِ یقین حاصل کرے جو کمالِ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے تو وہ اپنے باطن کی

[1] حجة الله البالغة شاه ولى الله رحمه الله ذكر واقعات حشر، ج ۱، ص: ۲۸، ۲۹۔

آنکھوں سے اپنی دوزخ یہیں دیکھ لے:

﴿ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ ﴾ (۱۰۲/ التکاثر:۵، ٦)

''نہیں یہ بات نہیں اگر تم کو علم یقین ہو، تو دوزخ کو بے شبہ دیکھ لو گے۔''

کفار آنحضرت ﷺ سے عذاب کے عینی مشاہدہ کا فوری مطالبہ کرتے تھے وحیِ الٰہی نے اس کے جواب میں کہا:

﴿ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾ (۲۹/ العنکبوت:۵٤)

''وہ تجھ سے جلد عذاب مانگتے ہیں، حالانکہ دوزخ گھیر رہی ہے منکروں کو۔''

ایک دوسری آیت میں ہے کہ منافقین بزعم خود آزمائش کے ڈر سے جہاد کی شرکت سے عذر کرتے ہیں اس کے جواب میں ان میں سے فرمایا گیا کہ وہ تو ابھی آزمائش میں مبتلا ہیں اور دوزخ ان کو گھیرے ہوئے ہے:

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:٤۹)

''اور ان کا کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ مجھے (جہاد میں عدم شرکت کی) اجازت دیجئے اور آزمائش میں نہ ڈالیے ہاں وہ تو آزمائش میں پڑ چکے اور دوزخ منکروں کو گھیر رہی ہے۔''

لیکن یہ علم الیقین جس کے حصول کا ذریعہ صرف ایمان ہے، ہر شخص اس سے اس دنیا میں بہرہ ور نہیں ہوتا بلکہ بہتیرے اس کے منکر ہیں اس لیے ان کو یہ اپنے پاس کی دوزخ اس وقت نظر نہیں آتی، لیکن موت جس کا آنا ایک دن یقینی ہے جب وہ آئے گی تو مادہ کا یہ حجاب جو آنکھوں پر پڑا ہے، اٹھ جائے گا اس وقت اس عالمِ غیب کے کچھ اسرار ان پر منکشف ہو جائیں گے اور اعمال کے تمثیلی نتائج اور ثواب وعذاب اور جنت ودوزخ کے بعض مناظر ان کے سامنے آجائیں گے اور اسی وقت وہ اپنے یقین کی آنکھوں سے کسی قدر واقعات کا مشاہدہ کر لیں گے:

﴿ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝ ﴾ (۱۰۲/ التکاثر:۷)

''پھر تم دوزخ کو عینِ یقین سے دیکھ لو گے۔''

یہ موت کے بعد کا سماں ہوگا جس کو برزخ کا عالم کہتے ہیں اس کے بعد جب قیامت آئے گی تو ہر راز فاش ہو جائے گا:

﴿ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝ ﴾ (۸٦/ الطارق:۹) ''جس دن تمام بھید کھل جائیں گے۔''

اور بہشت ودوزخ اپنی ظاہری صورتوں میں اس طرح سامنے آجائیں گی کہ پھر شک وشبہ کا شائبہ بھی باقی نہ رہے گا وہ علمِ حقیقی اور یقینِ تحقیقی کا دن ہوگا، قرآن میں قیامت کے موقع پر ہے:

﴿ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيدِ ۝ وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ ۝ لَّقَدْ كُنتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ۝ ﴾

(۵۰/ ق:۲۰۔۲۲)

''اور نرسنگا پھونکا گیا، یہ ہے ڈر کا دن۔ تو ہم نے تیرا پردہ تجھ سے کھول دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔''

اس پردہ کے ہٹتے ہی اس دن انسان کے تمام اعمال ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ جائیں گے اور دوزخ منظر عام پر آ جائے گی، فرمایا:

﴿ فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ ۝ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ مَا سَعَىٰ ۝ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ ۝ ﴾ (۷۹/ النازعات:۳۴۔۳۶)

''جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا جس دن انسان کو جو کچھ اس نے کیا ہے یاد آ جائے گا اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے باہر لائی جائے گی۔''

احوال برزخ کا عین الیقین

ایک طرف شاعر (ابوالعتاہیہ [1]) نے حیرت کے عالم میں کیا خوب کہا ہے:

الموت باب وکل الناس داخله   یلیت شعری بعدالباب ماالدار

''موت کا ایک دروازہ ہے اور تمام انسان اس دروازہ میں داخل ہوں گے کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازہ کے بعد کون سا گھر ہے۔''

یہ علم جس کی حسرت اس شاعر نے ظاہر کی ہے، اس زندگی میں صرف علم الیقین کے ذریعہ سے حاصل ہوسکتا ہے البتہ موت کے وقت جب وہ دوسرے عالم کے دروازہ پر کھڑا ہوگا تو اس کو پس پردہ کا نظارہ تھوڑا بہت ہو جائے گا اور وہی برزخ کا عالم ہے۔ فرمایا:

﴿ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ۝ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ ۚ كَلَّا ۚ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ۖ وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ ﴾

(۲۳/ المؤمنون:۹۹، ۱۰۰)

''جب ان گناہگاروں میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے تو وہ زندگی کے پس پردہ کے بعض مناظر کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار! مجھے ایک بار اور دنیا میں لوٹا دے، تاکہ دنیا میں جو مال چھوڑ کر آیا ہوں اس سے شاید کوئی نیک کام کروں ہرگز نہیں یہ بات ہی بات ہے۔ جو وہ کہتا ہے اور اب ان گناہگاروں کے پیچھے اس دن تک ایک پردہ (برزخ) ہے جب وہ موت

[1] الانوار الزاهية فی دیوان ابی العتاهية، ص: ۹۶۔

کے بستر سے جگا کر اٹھائے جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ اگر موت کے وقت اور بعد کوئی نئی غیبی کیفیت اس کے مشاہدہ میں نہیں آجاتی، تو اس کا شک وشبہ دفعۃً یقین سے کیسے بدل جاتا ہے، فرمایا:

﴿ وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۖ ذَٰلِكَ مَا كُنتَ مِنْهُ تَحِيدُ ﴾ (۵۰/ ق:۱۹)

''اور موت کی بے ہوشی حقیقت کو لے کر آ گئی یہی ہے وہ جس سے تو ہٹا کرتا تھا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ سکرات کے وقت ''حقیقت'' کا کوئی منظر سامنے ضرور آجاتا ہے، اہل تفسیر نے بھی اس آیت سے یہی سمجھا ہے، ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

بالحق من امر الاخرة فتبينه للانسان حتى تثبته وعرفه. ❶

''حق یعنی آخرت کا کچھ حال تو موت کی سکرات انسان پر کھول دیتی ہے، یہاں تک کہ انسان اسکو یقین کر لیتا ہے اور جان لیتا ہے۔''

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ محدث اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

يقول عزوجل وجاءت ايها الانسان سكرة الموت بالحق اى كشفت لك عن اليقين الذى كنت تمترى فيه. ❷

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان! موت کی بے ہوشی حق کو لے کر آگئی یعنی تیرے اس یقین کے پردہ کو کھول دیا، جس میں تو شک کرتا تھا۔''

قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ محدث کی تفسیر میں ہے:

ومعنى بالحق انه عند الموت يتضح له الحق ويظهر له صدق ماجاءت به الرسل من الاخبار بالبعث والوعد والوعيد. ❸

''اور حق لے کر آنے کے معنی یہ ہیں کہ موت کے وقت حق بات کھل جاتی ہے اور پیغمبر جس قیامت اور جزاوسزا کی خبریں لے کر آئے تھے۔ ان کی سچائی ہویدا ہو جاتی ہے۔''

مفتی آلوسی حنفی کی تفسیر (ج ۲۶، ص:۱۶۵) کی عبارت یہ ہے:

والمعنى احضرت سكرة الموت حقيقة الامر الذى نطقت به كتب الله تعالى ورسله عليهم السلام.

''اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ موت کی مدہوشی اس حقیقتِ امر کو سامنے کر دیتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور اس کے رسولوں نے بیان کیا ہے۔''

❶ تفسیر ابن جریر، طبری، ج۲۶، ص:۹۱۔ ❷ تفسیر ابن کثیر بر فتح البیان، ج۹، ص:۲۹۸۔
❸ تفسیر شوکانی، ج:۵، ص:۷۳۔

زمخشری معتزلی کی تفسیر (کشاف ج ۲ ص ۱۴۰۲، کلکتہ) اور ابوحیان اندلسی مالکی کی تفسیر (بحرِ محیط ج ۸ ص ۱۲۴ مصر) میں بھی یہی ہے۔

یہ مفسرین مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان سب کی متفقہ تفسیر یہی ہے، اس تفسیر کی صحت کی مزید دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد ہی قیامت کے ذکر میں ہے:

﴿ فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝﴾ (۵۰/ ق:۲۲)

''ہم نے آج تجھ سے تیرا پردہ کھول دیا تو آج تیری نظر تیز ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ موت کے وقت کسی قدر انکشاف ہوتا ہے اور قیامت کے دن انکشاف تام ہو جاتا ہے لیکن بہر حال موت کے وقت یقین کا پردہ بالکل کھل جاتا ہے۔

موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت

موت کے لیے قرآن میں اکثر ''خدا کی طرف بازگشت'' یعنی اللہ کی طرف لوٹ جانے کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے:

﴿ قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَإِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ إِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (۶۲/ الجمعة:۸)

''کہہ دو بیشک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو اس سے ملنا ہی ہے پھر تم اس (خدا) کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو حاضر و غائب کا جاننے والا ہے۔ تو وہ تم کو تمہارے کرتوت بتائے گا۔''

﴿ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝﴾ (۲/ البقرة:۱۵۶)

''ہم سب خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔''

﴿ إِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ﴾ (۵/ المائدہ:۱۰۵)

''تم سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

یہ طرز ادا بیسیوں آیات میں اختیار کیا گیا ہے، یہ بالکل بدیہی ہے کہ ہر رجوع و بازگشت کے مفہوم میں ورود اور آمد داخل ہے، اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ارواحِ انسانی خدا کے یہاں سے اس جسم و قالب کی قید میں آئی ہیں اور موت کے وقت اس عناصر کی چہار دیواری سے نکل کر پھر ان کو وہیں واپس جانا ہے جہاں سے آئی تھیں، اس بازگشت کے سفر میں ان کا زادِ راہ صرف وہی ہوگا جو اس دنیا کے دار العمل میں انہوں نے کمایا ہے یعنی ان کے اندرونی و بیرونی اعمال اور اس کے بعد جو زندگی ہوگی وہ ان کے ان ہی اعمال کی نوعیت پر منحصر ہوگی:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى أَجَلٌ

مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (٦/ الانعام:٦٠)

''اور وہی (خدا) ہے جو تمہیں رات کو موت (نیند) دیتا ہے اور دن کو جو کما چکے اس کو جانتا ہے پھر تم کو دن میں جگا اٹھاتا ہے، تاکہ مقررہ وقت (اصلی موت) پورا ہو، پھر اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تم کو تمہارے اعمال جتائے گا۔''

ایک اور آیت میں ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (١٠/ یونس:٢٣)

''اے انسانو! تمہاری بغاوت کا نتیجہ تمہیں پر ہے دنیا کی زندگی سے کچھ فائدہ اٹھانا پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے تو ہم تم کو تمہارے اعمال جتائیں گے۔''

اس میں دنیا کی زندگی کے بعد ہی خدا نے اپنی طرف واپس آ جانے کی اطلاع دی ہے اور اہل تفسیر نے بھی اس رجوع الی اللہ سے موت ہی کے معنی سمجھے ہیں (طبری جلد ۱۱ ص ۶۴ مصر) اب ہم ایک ایسی آیت پیش کرتے ہیں جس میں موت کا پورا نقشہ ہے اور اس کے بعد بیان ہے کہ اس دن مرنے کے بعد ہی خدا کے ہاں ہنکا کر لائے جاؤ گے گویا جس طرح جانور ہنکا کر لائے جاتے ہیں، ویسے ہی گناہگاروں کی روحیں موت کے بعد نکال کر لائی جاتی ہیں، فرمایا:

﴿ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۙ وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ۙ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۙ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۙ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ ﴾ (٧٥/ القیامۃ:٢٧-٣٠)

''ہرگز نہیں جب روح ہانس (ہنسلی) تک آ پہنچے اور لوگ کہیں اب کون ہے جھاڑ پھونک کر کے بچانے والا اور سمجھا کہ اب جدائی کا وقت آ گیا اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ گئی اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے ہانکا جانا۔''

لیکن سعید اور نیکوکار روحوں کو موت کے وقت یہ محبت بھری صدائے غیب سنائی دیتی ہے:

﴿ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۙ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴾

(٨٩/ الفجر:٢٧، ٢٨)

''اے مطمئن روح! تو اپنے مالک سے خوش اور تیرا مالک تجھ سے خوش تو اپنے مالک کے پاس چلی جا۔''

یہ کیسی دلآویز صدا اور کیسی واپسی ہوگی۔

اس وقت کا سماں

وہ لمحہ جب اس روح کی مہلت کا زمانہ اور عمل کی فہرست ختم ہوتی ہے، کتنا دردناک ہے، اس وقت سے اس کی زندگی صرف اس کے گزشتہ اعمال کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے، ہر عمل کی صورت اس کو اپنے سامنے کھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور غیب کی کارکن صورتیں چلتی پھرتی دکھائی اور بولتی چالتی سنائی دیتی ہیں:

﴿ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ ﴾

(٦/ الانعام:٩٣، ٩٤)

’’اور کبھی تو دیکھے جس وقت گناہگار موت کی بیہوشی میں ہوں اور فرشتے ہاتھ کھولے ہوں کہ نکالو (اپنے جسموں کے اندر سے) اپنی روحوں کو آج تم کو اس پر ذلت کی سزا ملے گی کہ تم خدا کی شان میں جھوٹ باتیں کہتے تھے اور اس کے حکموں کے ماننے سے غرور کرتے تھے اور تم ایک ایک کر کے (تنہا) جیسے ہم نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا، ہمارے پاس آئے اور جو سامان واسباب تم کو دیا تھا جس نے تم کو مغرور بنایا تھا اس کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے۔‘‘

ان آیات سے ظاہر ہے کہ موت کے وقت کس طرح فرشتے سامنے آتے ہیں اور روح جسم سے جس وقت الگ ہوتی ہے اس کے گناہوں کی سزا کا دور شروع ہو جاتا ہے، یہی بات ایک اور موقع پر مذکور ہے:

﴿ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝ ﴾

(٨/ الانفال:٥٠، ٥١)

’’اور کبھی تو دیکھے جس وقت فرشتے کافروں کی جان لیتے ہیں ان کے منہ پر اور پیچھے مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو یہ تمہارے ہاتھوں کے پہلے کیے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔‘‘

اس سے واضح ہے کہ یہ سزا موت ہی کے عالم سے شروع ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ سزا نعوذ باللہ کسی انتقام کے سبب سے نہیں دیتا بلکہ وہ درحقیقت قانون عمل کے مطابق خود انسان کے کاموں کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔

نیکوکاروں کا نقشہ اس سے بالکل الگ ہے ان کو ہر طرف سے بشارتیں سنائی دیتی ہیں اور ہر سمت خوشی وشادمانی کا سماں سامنے ہوتا ہے:

﴿ فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۝ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۝ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا

﴿ تُبْصِرُوْنَ ۝ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ۝ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ۝ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ۝ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ۝ ﴾

(۵۶/ الواقعۃ:۸۳۔۹۵)

’’پھر کیوں نہیں جس وقت روح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو اور ہم اس سے تمہاری نسبت زیادہ تر نزدیک ہوتے ہیں لیکن تم کو دکھائی نہیں دیتا تو اگر تم کسی اور کے حکم کے نیچے نہیں ہو تو کیوں نہیں اس روح کو پھر پلٹا دیتے ہو اگر تم اپنے انکار و تکذیب میں سچے ہو تو اگر وہ (مرنے والا) مقرب بندوں میں سے ہوا تو خوشی و آرام اور نعمت کی بہشت ہے اور اگر وہ اس سے کچھ کم درجہ رہنے والوں میں ہوا تو تجھ پر سلامتی داہنے والوں میں سے اور اگر وہ حق کو جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہوا تو گرم پانی کی مہمانی اور دوزخ میں بیٹھنا ہے بے شبہ یہ بات یقین کے لائق ہے۔‘‘

یہ تمام سماں موت کے بعد اور عالمِ برزخ ہی کے مناظر ہیں۔

برزخ کا عذاب وراحت

اوپر کی آیتوں سے پوری طرح ہویدا ہے کہ روح و جسم کی مفارقت کے بعد اچھی روحوں کے سامنے رحمت کے اور بری روحوں کے روبرو عذاب کے منظر گزرتے ہیں، قرآن پاک میں کچھ اور آیتیں ہیں جن سے ثابت ہے کہ یہ منظر نہ صرف روح کے سامنے ہی سے گزرتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی وہ اپنے اعمال کے مدارج کے مطابق رحمت یا زحمت کے اندر بھی داخل کر دی جاتی ہے، منافقین کی نسبت قرآن میں ہے:

﴿ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۰۱)

’’ہم ان کو دو دو دفعہ عذاب دیں گے، پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔‘‘

﴿ عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴾ سے ظاہر ہے کہ دوزخ کا عذاب مراد ہے اب اس عذاب دوزخ سے پہلے عذاب کے دو دوران پڑاور گزر چکے ہوں گے، ایک تو یہ دنیاوی عذاب ہے اور دوسرا موت کے بعد ہی کا ہو سکتا ہے قرآن میں آل فرعون کے ذکر میں ہے:

﴿ وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝ ﴾ (۴۰/ المؤمن:۴۵، ۴۶)

’’اور فرعون والوں پر بری طرح عذاب الٹ پڑا آگ کہ اس پر وہ صبح اور شام پیش کیے جاتے

ہیں اور جس دن سے قیامت کی گھڑی کھڑی ہوگی (ندا ہوگی کہ) فرعون والوں کو پہلے سے بھی بڑھ کر عذاب میں ڈالو۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ گناہگاروں کو قیامت سے پہلے برزخ کے عالم میں بھی عذاب کا کچھ نہ کچھ مزہ چکھایا جاتا ہے ایسا ہی نیکوکاروں کو بہشت کے عیش و آرام کا منظر دکھایا جاتا ہے اسی آیت پاک کی تشریح میں گویا آنحضرت نے فرمایا ہے: ''تم میں سے جب کوئی مرتا ہے تو اس پر صبح و شام اس کا اصلی مقام پیش کیا جاتا ہے اگر وہ اہل جنت میں سے ہوتا ہے تو جنت اور اہل دوزخ سے ہوتا ہے تو دوزخ پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیرا مقام، اس وقت تک کے لیے کہ جب تو قیامت کے دن اٹھایا جائے۔ [1] ایک اور صحیح حدیث میں ہے: ''جنتی مردہ کے سامنے جنت و دوزخ دونوں کے منظر سامنے کر کے کہتے ہیں کہ اگر تو اچھے عمل نہ کرتا تو تیرا یہ مقام ہوتا مگر تیرے نیک عمل کے سبب سے اب یہ جنت تیرا مقام ہے [2] اور اس دن تک کے لیے کہ لوگ اٹھائے جائیں اس پر سرسبزی بھر دی جاتی ہے۔'' [3]

مشرکوں اور قیامت کے منکروں کا سوال تھا کہ اگر یہ پیغام الٰہی سچ ہے تم ہم کو فرشتے یا خدا نظر کیوں نہیں آتے۔ جواب میں کہا گیا کہ فرشتے جس دن نظر آئیں گے، اس دن ایمان بالغیب کہاں؟ اور اوپر آیتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے موت کے وقت نظر آتے ہیں یا پھر قیامت میں نظر آئیں گے اس لیے ارشاد ہے:

﴿ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۝ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ۝ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ۝ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ١لْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۭ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ۝ ﴾

(۲۵/ الفرقان:۲۲۔۲۶)

''جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن ان گناہگاروں کو کوئی خوشخبری نہیں اور کہیں گے (کہ یہ ڈراؤنا منظر جو ہم کو نظر آ رہا ہے) اب اوٹ میں روکا جائے اور ہمارا خدا فرماتا ہے ان کے کیے ہوئے کاموں کے پاس پہنچے اور ان کو اڑتا غبار بنا دیا (یعنی بیکار بے سود معدوم) جنت والے لوگ یعنی جنت جن کو ملنے والی ہے اس دن ان کے لیے خوب ٹھکانا اور دوپہر کے سونے کا مقام ہوگا اور جس دن آسمان بادل سے پھٹ جائے گا اور فرشتے آہستہ آہستہ اتارے

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجنة والنار، باب عرض مقعد المیت: ۷۲۱۱، ۷۲۱۲؛ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، باب عذاب القبر: ۱۰۷۲ حدیث حسن صحیح؛ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب المیت یعرض علیه مقعده بالغداة والعشی: ۱۳۷۹ وکتاب الرقاق، باب سکرات الموت: ٦٥١٥۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی عذاب القبر: ۱۳۷٤۔ [3] صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب عرض مقعد المیت: ۷۲۱٦۔

جائیں گے اس دن راج سچے خدا کا ہوگا اور وہ دن کافروں پر سخت ہوگا۔"

کھلی بات ہے کہ آسمان کا بادل سے پھٹنا اور فرشتوں کا اترنا قیامت کا نقشہ ہے اب اس سے پہلے فرشتوں کے دکھائی دینے کا وہ دن جس میں گناہگاروں کے لیے خوشخبری نہیں اور وہ کہیں گے کہ کاش یہ ڈراؤنا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے نہ ہوتا اور جنت کے مستحقین کو ایک اچھا مستقر قرارگاہ اور دوپہر کی دھوپ سے بچانے والی خواب گاہ بنی ہوگی، قیامت سے پہلے اور موت کے بعد ہی کی کیفیت ہے۔

سورۂ محمد ﷺ میں موت کے وقت کا حال بیان ہوتا ہے کہ جب فرشتے ان گناہگاروں کی روحوں کو قبض کرتے ہیں تو ان کے چہروں پر اور پیٹھوں پر ضرب لگاتے ہیں۔ فرمایا:

﴿ فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَٰٓئِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَٰرَهُمْ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اتَّبَعُوا مَآ أَسْخَطَ اللَّهَ وَكَرِهُوا رِضْوَٰنَهُۥ فَأَحْبَطَ أَعْمَٰلَهُمْ ۝ ﴾ (٤٧/ محمد: ٢٧، ٢٨)

"پھر کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کو وفات دیں گے ان کے چہروں اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے یہ اس لیے کہ انہوں نے اس کی پیروی کی جس نے خدا کو ان سے ناخوش کر دیا اور جنہوں نے خدا کی خوشنودی کو پسند نہ کیا تو خدا نے ان کے کاموں کو بے نتیجہ کر دیا۔"

یہ غیبی ضرب خواہ اسی مادی جسم پر پڑتی ہو یا اس کے مثالی جسم پر یا روح پر جو بھی کہیے، بہر حال اس سے یہ ثابت ہے کہ گناہگار مردہ پر موت کے وقت ہی سے عذاب کا ایک رنگ شروع ہوتا ہے۔ سورۂ انعام میں اس سے زیادہ ہے:

﴿ وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذِ الظَّٰلِمُونَ فِى غَمَرَٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَٰٓئِكَةُ بَاسِطُوٓا أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوٓا أَنفُسَكُمُ ۖ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ ﴾ (٦/ الانعام: ٩٣)

"اور اگر تو دیکھے جب گناہگار موت کی سکرات میں ہوں اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوں کہ نکالو اپنے جسم کے اندر سے اپنی روحوں کو آج تم کو ذلت کی سزا ملے گی۔"

اَلْیَوْمَ جس کے معنی آج کے ہیں، ظاہر ہے کہ اس سے وہی زمانہ مراد ہے، جس وقت سے فرشتے بدن سے روح نکالتے ہیں، اس "آج" سے مقصود ہمارا دنیاوی آج نہیں ہے جو ۲۴ گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے، بلکہ برزخ کا پورا زمانہ ہے (دیکھو فتح القدیر شوکانی وتفسیر ابوالسعود وتفسیر روح المعانی آلوسی) قوم نوح کے غرق ہونے کے بعد ہی دوزخ میں جانے کا حکم ہے:

﴿ أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوا لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَنصَارًا ۝ ﴾ (٧١/ نوح: ٢٥)

"وہ ڈبو دیے گئے، پھر وہ آگ میں داخل کیے گئے، تو انہوں نے خدا کے سوا مددگار نہیں پائے۔"

حضرت لوط اور حضرت نوح علیہما السلام کی کافر بیویوں کی موت کے بعد ہی عذاب کا ذکر ہے:

﴿ وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّٰخِلِينَ ۝ ﴾ (٦٦/ التحریم: ١٠)

''اور کہا گیا کہ داخل ہونے والوں کے ساتھ تم دونوں بھی آگ میں داخل ہو جاؤ۔''

یہ قیامت سے پہلے اور دنیا کے عذاب ہلاکت کے بعد کے واقعات ہیں اور اسی وقفہ کا نام ''برزخ'' ہے۔

سورۂ یٰس میں ایک ''خیر خواہ'' قوم کا ذکر ہے جو عمر بھر اپنی قوم کو حق کی تبلیغ کرتا رہا تھا اور پھر وہ غالباً اسی حق کی راہ میں شہید ہوا۔ مرنے کے بعد جب اس کو بہشت ملی، تو اس نے بڑی حسرت سے کہا کہ کاش میری قوم کو معلوم ہوتا، کہ مرنے کے بعد خدا نے کس طرح مجھے معاف فرمایا اور عزت بخشی، تاکہ وہ بھی ایمان سے میری طرح بہرہ ور ہو کر اس مغفرت اور عزت سے سرفراز ہوتی:

﴿قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۖ قَالَ يَا لَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ ۝ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ ۝ وَمَا أَنزَلْنَا عَلَىٰ قَوْمِهِ مِن بَعْدِهِ مِن جُندٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَمَا كُنَّا مُنزِلِينَ ۝﴾

(۳۶/ یٰس:۲۶۔۲۸)

''کہا گیا جنت میں داخل ہو، اس نے کہا، اے کاش میری قوم کو یہ معلوم ہوتا، کہ میرے پروردگار نے میری مغفرت کی اور مجھے عزت والوں میں سے بنایا اور ہم نے اس کے مرنے کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی فوج نہیں اتاری اور نہ ہم اتارا کرتے ہیں۔''

شہیدوں کی نسبت تو خاص طور پر ہے:

﴿بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ۝﴾ (۳/ آل عمران:۱۶۹)

''بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ شہدا کو برزخ ہی میں کامل زندگی کے ساتھ جنت کی روزی ملتی ہے اور عام نیکوکاروں کا یہ حال ہے کہ ان کو فرشتے اس وقت سلامتی اور جنت کی خوشخبری سناتے ہیں، فرمایا:

﴿الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ ۙ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝﴾

(۱۶/ النحل:۳۲)

''جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک وصاف حالت میں وفات دیتے ہیں کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ۔''

قبر کی اصطلاح

سطور بالا میں عالم برزخ کے وہ مناظر دکھائے گئے ہیں، جو قرآن کی آیتوں میں نظر آتے ہیں اور احادیث صحیحہ میں اس عالم کے حالات کی جو تفصیلیں مذکور ہیں۔ وہ عموماً قبر [1] کی اصطلاح کے ساتھ بیان

[1] بعض معتزلہ عذاب قبر کے قائل نہ تھے اور ان کی دلیل یہ تھی کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں، یہ غلط فہمی ان کو اس لیے پیش آئی کہ قرآن میں لفظ قبر وقبور کے ساتھ عذاب کا ذکر نہیں لیکن اگر وہ دیکھتے کہ قرآن میں بعد موت اور قبل قیامت ارواح انسانی کے عذاب وثواب اور رحمت ولعنت کا ذکر موجود ہے تو ان کو اس انکار کی جرأت نہ ہوتی اور قرآن میں اس قسم کی متعدد آیتیں موجود ہیں۔

ہوئی ہیں لیکن، اس لفظ ''قبر'' سے درحقیقت مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں جس کے نیچے کسی مردہ کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں بلکہ وہ عالم ہے جس میں یہ مناظر پیش آتے ہیں اور وہ ارواح ونفوس کی دنیا ہے، مادی عناصر کی نہیں، اسی لیے قرآن پاک نے اس عالم کے تعلق سے ہمیشہ ہمیشہ نفس اور نفوس کو خطاب کیا ہے اور ان ہی کے عذاب وثواب اور رحمت ولعنت کا ذکر ہے اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے وہ مرنے والوں کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے جو ہو بہو اس کے خاکی جسم کا مثنیٰ ہوتا ہے۔ تم نیند میں ہو اور تمہارا نیم مردہ وہ بے حس جسم بستر پر دراز ہے مگر تم خواب میں دیکھ رہے ہو کہ بعینہٖ تمہارا جسم آگ میں جل رہا ہے یا باغ وبہار کی لذتوں میں مصروف ہے اور تم کو اس سے وہی تکلیف اور راحت مل رہی ہے جو بیداری میں اپنے بستر پر پڑے ہوئے جسم کی تکلیف وراحت سے مل سکتی ہے اس خواب میں جس طرح تمہارے مادی جسم کے علاوہ تم کو اپنا ایک خیالی جسم نظر آتا ہے جو ہو بہو تمہارا مادی جسم ہے اسی طرح موت کے خواب میں بھی تم کو اپنا ایک مثالی جسم نظر آئے گا جو اکثر حالتوں میں ہو بہو تمہارے اس خاکی جسم کے مطابق ہوگا [1] اور تمہاری روح اسی جسمِ مثالی کے عذاب وراحت سے متاثر ہوگی کہ اعمال کی اصل ذمہ دار روح انسانی ہے، جسم خاکی نہیں فرمایا: ﴿ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝ ﴾ (۷۴/ المدثر :۳۸) یعنی ''ہر روح اور جان اپنے اعمال کے ہاتھوں گرو ہوگی۔'' اس لیے اصل مکلف روح ہے جسم نہیں، جسم صرف بمنزلۂ آلہ کے ہے۔ دنیا میں اس کا ایک جسم خاکی تھا، برزخ میں اس کا ایک اور جسم ہوگا جو مادہ یا مادیات سے پاک وبری ہوگا، تاہم اس کو اپنے خاکی جسم سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہوگی اور اتنی ہی نسبت کی بنا پر قبر کی اصطلاح عام بول چال میں جاری ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے مسلمان مردوں کو اسی قبر میں جاتے دیکھتے ہیں، قرآن پاک کی یہ آیت اوپر گزر چکی ہے:

﴿ وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذْ يَتَوَفَّى ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ۙ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَٰرَهُمْ ۚ وَذُوقُوا۟ عَذَابَ ٱلْحَرِيقِ ۝ ﴾ (۸/ الانفال: ۵۰)

''اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں، مارتے ہیں ان کے منہ پر اور پیٹھ پر اور کہتے ہیں چکھو جلنے کا مزہ۔''

اس آیت سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ گناہگاروں پر موت کے بعد ہی سے عذاب شروع ہو جاتا ہے، وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مار ان کے منہ اور پیٹھ پر پڑتی ہے مگر یہ منہ اور یہ پیٹھ وہ نہیں ہے جو بے جان لاشہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے، بلکہ اس آیت میں کافر کی روح کو جانور سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جانور کو تیز ہنکاتے وقت کبھی آگے (منہ) پر اور کبھی پیچھے (پیٹھ پر) مارتے ہیں اسی طرح گویا کافر روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے اور ہنکاتے ہوئے لے چلیں گے اور کہیں گے کہ چلو عذاب کا مزہ چکھو،

[1] اس سے اس شبہ کا ازالہ ہوتا ہے کہ ہم کو مردہ کا جسم سامنے پڑا نظر آتا ہے، لیکن اس پر عذاب کا کوئی نشان نظر نہیں آتا اور نیز اس شبہ کا بھی ازالہ ہوتا ہے کہ قبر میں جب جسم گل سڑ جاتا ہے تو پھر عذاب وثواب کا احساس اس کو کیسے ہوتا ہے۔

یہی مفہوم صاف لفظوں میں اسی آیت میں ہے:

﴿ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۨالْمَسَاقُ ۝ ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۳۰)

''اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے، ہنکایا جانا۔''

بعض ایسی سعید روحیں بھی ہوتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس برزخ میں ان کے جسم خاکی کی شکل وصورت کی قید سے بھی آزاد کر کے دوسرا مناسب مثالی جسم عطا کرتا ہے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ ''مومنِ کامل کی روح پرندوں کی شکل میں جنت میں اڑتی پھرتی ہے۔'' [1] اور خصوصاً شہدا کے متعلق آیا ہے کہ وہ سبز پرندوں کی شکل میں ہوں گے اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں ان کا آشیانہ ہوں گی۔ اسی طرح دوزخ و بہشت سے متعلق آنحضرت ﷺ کا جو رؤیائے صادقہ پہلے گزرا ہے اس میں جن جسمانی قالبوں میں گناہگاروں کی سزا و تکلیف کی صورتیں دکھائی گئی ہیں وہ تمام تر مثالی ہیں، ظاہر ہے کہ مومنِ سعید اور شہدا کے وہ مثالی قالب اور ان گناہگاروں کے یہ مثالی اجسام ان کے وہ قالب واجسام نہیں ہیں جو ان کی قبروں میں گل سڑ کر فنا ہو گئے یا وہ آگ میں جل کر خاکستر ہوئے اور ذرے ہوا میں اُڑ کر منتشر ہو گئے، یا کسی جانور کے پیٹ میں جا کر اس کے جزوِ بدن بن گئے۔

بعض حدیثوں میں آنحضرت ﷺ سے ان مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات ومسموعات کا تذکرہ ہے تو ظاہر ہے کہ مادی زبان ومنظر میں ان قوموں کے نزدیک جو مردوں کو گاڑتی ہیں اس میت کی یادگار اس دنیا میں اس کے اس مٹی کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا سکے، ایک صحیح حدیث میں اس نیک مرد کا ذکر ہے جس نے خدا کے خوف سے یہ وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کا جسم جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی جائے، تاکہ وہ خدا کے سامنے حاضر نہ کیا جا سکے، مگر قدرت الٰہی نے اس کو مجسم کر کے کھڑا کر دیا اور اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں سے نوازا۔ [2]

سوال وجواب

احادیث صحیحہ میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اور وہ مردوں سے توحید ورسالت کی نسبت سوال وجواب کرتے ہیں۔''

اس کی تصدیق قرآن پاک کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے:

﴿ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ (۱٦/ النحل:۳۲)

''جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک وصاف حالت میں وفات دیتے ہیں کہتے ہیں کہ تم پر

---

[1] سنن ابن ماجه، كتاب الجنائز، باب ما جاء فيما يقال عند المريض اذا حضر: ۱٤٤٩۔

[2] صحيح بخاري، كتاب الرقاق باب الخوف من الله: ٦٤٨٠۔٦٤٨١۔

سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ۔‘‘

﴿ إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ ﴾

(٤/ النسآء:٩٧)

’’بیشک فرشتوں نے جن کی روحوں کو اس حالت میں قبض کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے، وہ ان سے کہتے ہیں، تم کس بات میں تھے وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم ملک میں بے یار و مددگار تھے وہ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلے جاتے۔‘‘

ایک اور آیت ہے:

﴿ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوا أَيْنَ مَا كُنتُمْ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ ۝ قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ فِي النَّارِ ۖ ﴾ (٧/ الاعراف:٣٧، ٣٨)

’’یہاں تک کہ جب ان جھٹلانے والوں کے پاس ہمارے فرشتے ان کی روحوں کو قبض کرنے آئیں گے اور کہیں گے کہاں ہیں وہ جن کو تم خدا کے علاوہ پکارتے تھے (اس وقت وہ مشرک کہیں گے کہ ہمارے وہ دیوتا ہم سے کنارہ کش ہو گئے اور انہوں نے اپنے اوپر آپ گواہی دی کہ وہ کافر تھے، تب خدا فرمائے گا کہ تم بھی ان لوگوں میں جا ملو جو جن و انس میں سے تم سے پہلے آگ میں جا چکے ہیں۔‘‘

پہلی آیت میں عدمِ ہجرت کے گناہ کے مرتکب مسلمانوں کا اور دوسری میں کافروں کا حال بیان کیا ہے، کہ ان سے ان کی موت کے بعد ہی یہ سوال کیا جائے گا، بہر حال یہ تو خاص خاص گناہوں کے مجرموں کا حال تھا، اب عام لوگوں سے جو سوال ہو سکتا ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے، یعنی یہ کہ توحید و رسالت کی معرفت کا ان سے سوال ہوگا۔

قرآن پاک میں ایک جگہ کلمہ طیبہ (اچھی بات یعنی کلمہ توحید) اور کلمہ خبیثہ (بری بات یعنی کلمہ کفر) کی ایک ایک مثال ہے، کلمہ طیبہ کی مثال اس درخت کی ہے، جس کی جڑیں زمین میں مضبوط گڑی ہیں، اس کی شاخیں آسمانوں تک پھیلی ہیں، اس میں سدا بہار میوے لگے ہیں اور کلمہ خبیثہ کی مثال اس درخت کی ہے، جس کی جڑ زمین سے اکھڑی پڑی ہے، وہ اب گرا اور تب گرا، اس کے بعد قرآن میں ہے:

﴿ يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ۚ ﴾ (١٤/ ابراهيم:٢٧)

''اللہ ایمان والوں کو پکی بات پر اس دنیا میں مضبوط رکھے گا اور آخرت میں بھی اور اللہ ظالموں کو بچلاتا ہے۔''

اس کی تفسیر صحیح حدیثوں میں یہ ہے کہ یہ برزخ کے اسی سوال وجواب سے متعلق ہے کہ صاحب ایمان جس طرح اپنی اس زندگی میں ایمان کی بات پر قائم تھا، اسی طرح برزخ میں بھی اس پر قائم رہے گا اور جو کافر و مشرک یہاں اس پر قائم نہ تھا، وہ وہاں بھی قائم نہ رہے گا اور بہک جائے گا۔ ہرچند کہ رسول کریم ﷺ سے صحیح تفسیر کے ہوتے ہوئے کسی اور استدلال کی حاجت نہیں، تاہم تائیداً یہ عرض ہے کہ اس آیت میں اہل ایمان کے آخرت میں بھی ''قولِ ثابت'' پر ثابت قدم رکھے جانے کی بشارت ہے، ظاہر ہے کہ اس سے آخرت قیامت اور بہشت ودوزخ کا دن تو مراد نہیں ہوسکتا کہ وہ تو کشفِ راز کا دن ہے، اس دن تو کافر بھی اس قول ثابت سے پلٹنے کی جرأت نہیں کرسکتا، پھر یہ اہلِ ایمان کے لیے کوئی خاص بشارت نہ ہوگی اور نہ یہ اس اظہارِ احسان کا مناسب وقت ہوسکتا ہے، البتہ اس بشارت اور احسان کا اعلان واظہار، آخرت کے اس حصہ میں موزوں ہوسکتا تھا، جہاں ہنوز اسرار پس پردہ کی پوری نقاب کشائی نہیں ہوتی اور وہ برزخ کا عالم ہے۔ اس آیتِ مبارکہ کی اس تفسیر سے جو احادیث صحیحہ پر مبنی ہے، یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آخرت کی وسعت مفہوم میں برزخ کا میدان بھی داخل ہے۔ حقیقت میں اس عالمِ برزخ کا سوال وجواب کوئی نیا واقعہ نہ ہوگا، بلکہ ہر روح کی پہلی زندگی کی ایمانی کیفیت اقرار وانکار کی مثال ہوگی یا یوں کہو کہ آج کے آئینہ میں کل کا عکس نمایاں ہوگا، یعنی اقرار وانکار کی جس کیفیت پر زندگی کا خاتمہ ہوا ہوگا، وہی بعد کو سوال وجواب میں نمایاں ہوگی۔

برزخ میں ارواح کا مسکن

آخری سوال یہ ہے کہ موت اور قیامت کی اس بیچ کی منزل (برزخ) میں ارواح انسانی کا مسکن کہاں ہوگا؟ قرآن پاک میں اس کا جواب متعدد آیتوں میں ملتا ہے، سب سے پہلی آیت تو ان مذکورہ بالا آیات کے بعد ہے، جس میں ذکر ہے کہ فرشتے جب منکرین سے سوال وجواب کرچکیں گے تو خدا ان کی روحوں کو حکم دے گا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عذاب کی آگ میں داخل ہوجائیں، اس کے بعد ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ﴾ (۷/ الاعراف: ۴۰)

''بے شک جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے غرور کیا، ان کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے، تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے (یعنی کبھی نہیں)۔''

اس سے معلوم ہوا کہ آیات الٰہی کے منکروں اور جھٹلانے والوں کی روحیں مرنے کے بعد آسمانی بادشاہی

کے حدود میں قدم نہ رکھ سکیں گی اور وہ فضائے زمین میں آوارہ پھریں گی یا اپنے جسم خاکی کے لگاؤ سے جہاں وہ سپرد خاک ہوئے ہوں منڈلاتی رہیں گی اور وہیں سے دوزخ کا منظر دیکھیں گی اور تکلیف اٹھائیں گی۔

اس کے برخلاف ہمہ تن پاکباز مومن روح کا یہ حال ہوتا ہے کہ موت ہی کے وقت رحمت الٰہی کا فرشتہ بلکہ خود زبانِ رحمت اس کے کانوں میں صدا دیتی ہے:

﴿ يَآأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِىٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِى فِى عِبَٰدِى ۝ وَادْخُلِى جَنَّتِى ۝ ﴾ (۸۹/ الفجر:۲۷۔۳۰)

''اے مطمئن روح! اپنے پروردگار کے پاس واپس چلی جاؤ، تیرا پروردگار تجھ سے خوش اور تو اپنے پروردگار سے خوش، تو میرے بندوں میں شامل اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔''

ان سے بڑھ کر وہ پاکباز روحیں ہیں، جنھوں نے اپنے خاکی جسموں، فانی زندگیوں، مادی خوشیوں اور زوال پذیر عشرتوں کو خدا کی راہ میں قربان کیا تو ان کو خدا کی طرف سے ایک تمثالی جسم، غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و مسرت کی لازوال دولت اسی وقت عنایت کر دی جائے گی۔ فرمایا:

﴿ وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِى سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَٰتٌۢ ۚ بَلْ أَحْيَآءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۵٤)

''جو خدا کی راہ میں مارے جائیں، ان کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں کر سکتے۔''

یہ پر مسرت زندگی کیسی ہوگی اس کی تفصیل دوسری سورہ میں ہے:

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِى سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَٰتًۢا ۚ بَلْ أَحْيَآءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ۝ فَرِحِينَ بِمَآ ءَاتَىٰهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِۦ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱٦۹، ۱۷۰)

''اور تو ان کو جو خدا کی راہ میں مارے گئے، مردہ نہ گمان کر بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، ان کو روزی دی جاتی ہے خدا نے اپنی مہربانی سے ان کو جو دیا ہے اس پر خوش ہیں اور جو ابھی ان کے پیچھے سے ان تک نہیں پہنچے ہیں ان کی طرف سے بھی خوش ہیں، کہ ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے وہ اللہ کے مہر و کرم سے مسرور ہیں اور اللہ ایمان والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔''

یہ پر مسرت زندگی شہدا کو ملے گی اس زندگی کا مقام ''خدا کے پاس'' بتایا گیا ہے، احادیث صحیحہ میں ہے کہ ان زندہ شہیدوں کی روحیں قفسِ عنصری سے پرواز کر کے جب اڑتی ہیں تو وہ سبز پرندوں کی صورت میں

جنت کی سیر کرتی ہیں اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں ان کا نشیمن بنتی ہیں اس کے بعد غالباً اتنا ہر ذی عقل تسلیم کرے گا کہ انبیا علیہم السلام کے روحانی مدارج و مراتب شہدا سے بہر حال اعلیٰ اور برتر ہیں اس لیے ان کا مقام بھی اسی احاطہ قدس کے اندر ہوگا، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے سیرِ معراج اور اپنے رؤیائے صادقہ میں بعض پیغمبروں کو آسمان اور بہشت کے مختلف مدارج میں دیکھا۔ بعض وہ سعید روحیں ہوں گی جو یہاں سے نکل کر فرشتوں کی صف میں داخل ہو جاتی ہیں، جیسا کہ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے متعلق احادیثِ صحیحہ میں آیا ہے کہ وہ شہادت کے بعد اپنے دونوں بازوؤں سے فرشتوں کے ساتھ عالم ملکوت میں اڑ رہے تھے، [1] عالم برزخ کے یہ دو اڑنے والے بازو درحقیقت ان کے دونوں جسمانی بازوؤں کی مثال ہیں جو اس جنگ میں ان کے جسم سے کٹ کر گر گئے تھے اور وہ اس پر بھی اسلام کے علم کو اپنے بقیہ کٹے ہوئے بازو اور گردن کے سہارے سے پکڑے تھے، عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیت ایسے ہی لوگوں کی شان میں ہو:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ۝ ﴾ (٤١/ حٰمٓ السجدة: ٣٠، ٣١)

''بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر ثابت قدم رہے ان پر فرشتے یہ خوشخبری لے کر اترتے ہیں کہ خوف نہ کھاؤ اور غمگین نہ ہو اور اس جنت کی بشارت سنو، جس کا تم سے وعدہ کیا تھا، ہم دنیا کی زندگی میں تمہارے رفیق ہیں اور آخرت میں بھی۔''

یہ آوازۂ بشارت اور فرشتوں کی رفاقت اسی برزخ کا دلکش سماں ہو سکتا ہے۔

---

[1] جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب جعفر بن ابی طالب: ٣٧٦٣۔

❷ آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل

قیامت اور جزائے اعمال

موت تو افراد کا معاملہ ہے، ایک مرتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ پیدا ہوتا ہے۔ قومیں بھی باری باری اس بازی گاہ کے تختہ پر آتی ہیں اور ایک قوم اپنا کھیل ختم کر کے کسی دوسری کے لیے جگہ خالی کر جاتی ہے یہ سلسلہ ازل سے قائم ہے اور اب تک چل رہا ہے کائنات جس نظام پر پیدا ہوئی تھی وہ بعینہٖ قائم ہے اور اس محفل کی جو رونق اول روز تھی وہ اب تک اسی طرح باقی ہے۔ غرض ؎

ہزار شمع بکشتند وانجمن

باقی است

لیکن کیا کوئی ایسا دن بھی آئے گا جب یہ ساری بساطِ ہستی الٹ جائے گی۔ کائنات کی یہ مجلس درہم برہم ہو جائے گی اور آسمان وزمین کے کُرّے ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے اور پھر وہ خلاقِ عالم اپنی صفتِ خلق و احسان و جزا کے نئے منظر دکھائے گا اور نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو کر، ایک اور عالم کسی نئے نظام پر وجود پذیر ہوگا۔

دنیا کے وہ تمام لوگ جو حال کو دیکھ کر مستقبل کا پتہ لگاتے ہیں کسی نہ کسی طرح اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح یہ افراد آتے اور فنا ہوتے ہیں اسی طرح ایک دن آئے گا جب اس پوری دنیائے حیات پر موت طاری ہوگی، سب سے زیادہ اس سوال کے جواب میں کرید بلکہ انکار کا حق فلسفہ اور سائنس کے محققوں (سائنٹسٹوں) کو ہوسکتا ہے مگر اہل فلسفہ کا بڑا گروہ بھی اس امکان پر یقین رکھتا ہے اور اہل سائنس بھی اس امکان کو بہر حال محال نہیں سمجھتے بلکہ طبعیات وہیئتِ جدید کے مختلف محققوں کے خیالات اس باب میں امکان سے آگے بڑھ کر وقوع کی سرحد تک پہنچ چکے ہیں اور اس ہولناک دن کی آمد کے متعلق اپنے علم کے زور سے پیشین گوئیاں کرتے رہتے ہیں اور اس عالمگیر موت کے مختلف اسباب ظاہر کرتے ہیں کوئی کہتا ہے اس نظام عالم کی پوری گاڑی جس انجن سے چل رہی ہے وہ یہ گرم آفتاب ہے اور اس کی یہ گرمی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے آخر ایک دن آئے گا جب یہ انجن بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا اور یہ ساری گاڑی ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پورا نظام کائنات جذب وکشش کے ستون پر قائم ہے اور فضائے ہستی کے یہ تمام سیارے روز بروز کھنچے چلے آتے ہیں تو ایک دن وہ بھی آئے گا جب یہ باہمی توازن باقی نہ رہے گا اور اس وقت تمام کرّے ایک دوسرے سے قریب ہو کر ٹکرا جائیں گے اور یہ تصادم ان کو چور چور کر دے گا۔

ایک اور خیال یہ ہے کہ اس فضا میں کروڑوں ستارے تیر رہے ہیں، ان میں سے بہت کم کا علم ہم کو ہوا ہے

ہے، بہت ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں ہماری زمین کسی نئے ستارے سے ٹکرا کر چور چور ہو جائے اور اس کی ساری آبادی ھباءً منثورًا ہو کر رہ جائے۔

بہر حال اسبابِ طبعی کچھ ہوں مگر ایسا ہونا اہلِ سائنس کے نزدیک بھی امکان، بلکہ وقوع کی امید سے خالی نہیں۔

اہلِ مذاہب میں یہ عقیدہ کسی نہ کسی نوع سے ہر جگہ موجود ہے اور اس کا مجمل تذکرہ تمام آسمانی کتابوں میں ہے، تورات میں اس کے اشارے پائے جاتے ہیں، زبور میں اس کی تصریحات موجود ہیں اور اس میں اس کو "عدالت کا دن" کہا گیا ہے۔ [1] حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں یہود کے دو فرقے تھے ایک "صدوقی" جو یونانیوں کے اثر سے آزاد خیال ہو گیا تھا اور قیامت کا منکر تھا مگر دوسرا فرقہ جو "فریسی" کہلاتا تھا بدستور اپنے پرانے عقیدہ پر قائم تھا [2] آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بھی جو یہود تھے وہ قیامت اور حشر ونشر اور بہشت و دوزخ کے قائل تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ جب قیامت آئے گی تو اللہ تعالیٰ ایک انگلی پر آسمانوں کو، دوسری پر زمینوں کو اور تیسری پر درختوں کو، چوتھی پر پانی کو اور اندر کی نرم مٹی کو اور پانچویں پر تمام مخلوقات کو رکھے گا اور ندا دے گا کہ "میں ہوں بادشاہ۔" [3] انجیل میں یہ عقیدہ پوری تصریح کے ساتھ مذکور ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صدوقیوں کے مقابلہ میں تورات کی ایک آیت سے حیاتِ اخروی کا ثبوت پیش کیا ہے [4] اور مکاشفاتِ یوحنا میں قیامت کے احوال واہوال کی پوری تفصیل وتشریح مذکور ہے۔ ہندو "پرلے" کے نام سے اس عقیدہ (فنائے عالم) پر یقین رکھتے ہیں لیکن اس حقیقت کی کامل تشریح خاتم انبیا محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے۔

قیامت کے نام

کسی شے کی حقیقت کی اولین گرہ کشائی اس کے ناموں کی تشریح سے ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں قیامت کو بیسیوں ناموں سے یاد کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر ایک نام اس کے ایک خاص پہلو کو نمایاں اور ظاہر کرتا ہے۔ قرآن میں اس کا سب سے پہلا نام جو قرآن کی سب سے پہلی سورۂ میں ہے، وہ یوم الدین ہے یعنی "جزا کا دن" جس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ عمومی جزا اور ربانی عدالت کا دن ہوگا، اس کے علاوہ اس کے اور بھی بہت سے نام قرآن میں جابجا آئے ہیں:

اَلسَّاعَةَ وہ گھڑی (وہ مقررہ وقت)

يَوْمُ الْقِيَامَةِ کھڑے ہونے کا دن (مُردوں کے کھڑے ہونے کا دن)

اَلْيَوْمُ الْحَقُّ سچا دن (نہ جس کے آنے میں کوئی شک ہے اور نہ جس کے فیصلہ میں کوئی غلطی ہوگی)

---

[1] زبور: ۹، ۱۶، ۱۷، و ۲۲، ۱، ۲ و باب: ۴۹ و ۵۰۔ [2] انجیل مرقس: ۱۲، ۲۴ واعمال: ۲۳۔

[3] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ زمر: ۴۸۱۱، ۴۸۱۲۔

[4] متی: ۲۲، ۳۱، ۳۲؛ لوقا: ۲۰۔۲۷؛ مرقس: ۱۲۔۱۸۔

يَوْمٌ مَّعْلُوْمٌ	جانا ہوا دن یا مقررہ دن
اَلْوَقْتُ الْمَعْلُوْمُ	جانا ہوا وقت یا مقررہ وقت
اَلْيَوْمُ الْمَوْعُوْدُ	موعودہ دن
اَلْيَوْمُ الْاٰخِرُ	پچھلا دن
يَوْمُ الْاٰزِفَةِ	قریب آنے والی مصیبت کا دن
يَوْمٌ عَسِيْرٌ	ایک سخت دن
يَوْمٌ عَظِيْمٌ	ایک بڑا دن
يَوْمٌ عَصِيْبٌ	سخت دن
يَوْمَ الْبَعْثِ	جی اٹھنے کا دن
يَوْمَ التَّغَابُنِ	افسوس کا دن [1]
يَوْمُ التَّلَاقِ	باہم ملنے کا دن
يَوْمُ التَّنَادِ	پکار کا دن
يَوْمُ الْجَمْعِ	اکٹھے ہونے کا دن
يَوْمُ الْحِسَابِ	حساب کا دن
يَوْمَ الْحَسْرَةِ	حسرت کا دن
يَوْمُ الْخُرُوْجِ	قبروں سے نکلنے کا دن
يَوْمُ الْفَصْلِ	فیصلہ کا دن
اَلْقَارِعَةُ	کھڑکھڑانے والی
اَلْغَاشِيَةُ	چھا جانے والی
اَلطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى	بڑی مصیبت
اَلنَّبَاُ الْعَظِيْمُ	بڑی خبر
اَلْحَآقَّةُ	ضرور آنے والی گھڑی
اَلْوَعْدُ	وعدہ
اَلْوَاقِعَةُ	وقوع پذیر
اَمْرُ اللّٰهِ	خدا کی بات

[1] عام مترجمین نے ہار جیت کا دن لکھا ہے اور شاہ عبدالقادر صاحب نے نقصان اٹھانے کا دن لکھا ہے اسی سے اس میں حسرت وافسوس کا مفہوم بھی شامل ہوا۔

اَلصَّآخَّةُ بہرا کرنے والی گھڑی

قیامت کے اوصاف

یہ تو وہ نام ہیں جو اسم مفرد یا اضافت یا صفت کی صورت میں ہیں، ان کے علاوہ فقروں اور جملوں کی ترکیبوں کے ساتھ اس کے اور بھی بکثرت نام قرآن میں آئے ہیں، مثلاً:

﴿ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ﴾ (٦/ الانعام:٧٣_ ٢٠/ طٰهٰ:١٠٢_ ٢٧/ النمل:٨٧)

”جس دن نرسنگا پھونکا جائے گا۔“

﴿ يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ﴾ (٥/ المائدہ:١١٩)

”جس دن سچوں کو ان کی سچائی کام دے گی۔“

﴿ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴾ (٢٦/ الشعرآء:٨٨)

”جس دن نہ مال کام آئے گا نہ اولاد۔“

﴿ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ ﴾ (٢٥/ الفرقان:٢٧)

”جس دن گناہگار اپنے دونوں ہاتھ چبائے گا۔“

﴿ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ ﴾ (٢٥/ الفرقان:٢٥) ”جس دن آسمان پھٹے گا۔“

﴿ وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ (٤٠/ المؤمن:٥١) ”اور جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔“

﴿ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ (٣/ آل عمران:٩) ”جس دن میں کوئی شک نہیں۔“

﴿ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا ﴾ (٢٧/ النمل:٨٣)

”جس دن ہر قوم سے ایک گروہ کو اکٹھا کریں گے۔“

﴿ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (٨٣/ المطففین:٦)

”جس دن لوگ جہان کے پروردگار کے لیے کھڑے ہوں گے۔“

﴿ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ ﴾ (٥٤/ القمر:٧)

”(جس دن) لوگ قبروں سے نکلیں گے۔“

﴿ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝ ﴾

(٨٠/ عبس:٣٤_٣٦)

”جس دن آدمی اپنے بھائی اور ماں اور باپ اور بیوی اور بیٹوں سے بھاگے گا۔“

﴿ يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا ﴾ (٢/ البقرۃ:١٢٣)

”جس دن کوئی کسی دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گا۔“

﴿ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ ﴾ (٢٤/ النور:٢٤)

''جس دن ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔''

﴿ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ﴾ (٨٢/ الانفطار:١٩)

''جس دن کوئی کسی دوسرے کے لیے کچھ بھلا نہ کر سکے گا۔''

﴿ يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَن مَّوْلًى شَيْـًٔا ﴾ (٤٤/ الدخان:٤١)

''جس دن کوئی دوست کسی دوسرے دوست کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔''

الغرض یہ اور اسی قسم کے اور دوسرے اوصاف اس ہولناک دن کے بیان کیے گئے ہیں جن سے اس عظیم الشان دن میں انسان کی بے کسی، عاجزی اور اپنے اعمال کے سوا کسی دوسری چیز کے کام آنے سے قطعی مایوسی ظاہر کی گئی ہے۔

قیامت میں فسادِ نظام ہوگا

قیامت کے متعلق بعض متکلمین کو یہ شبہ ہوا ہے کہ وہ مادہ کے فنائے محض، یا عدم محض کا نام ہے، حالانکہ یہ بات قرآنی تصریحات کے خلاف ہے۔ قرآن پاک کی بیسیوں آیتوں میں قیامت کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ تمام تر فنائے حیات اور آسمان و زمین کے نظام کی برہمی اور ان کی تباہی کے خاکہ کے سوا کچھ اور نہیں ہے چنانچہ حسب ذیل آیات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ خود بخود سامنے آ جائے گا:

﴿ الْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝ يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ۝ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنفُوشِ ۝ ﴾ (١٠١/ القارعة:١-٥)

''متنبہ کرنے والی اور کیا چیز ہے متنبہ کرنے والی اور تم کو کس نے بتایا کہ کیا چیز ہے متنبہ کرنے والی، یہ وہ دن ہے جب لوگ پریشان پروانوں کی طرح اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہوں گے۔''

﴿ إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝ ﴾ (٩٩/ الزلزال:١-٤)

''جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور زمین اپنا بوجھ نکالے گی اور انسان کہے گا، زمین کو کیا ہوا، اس دن زمین اپنی حالت بیان کرے گی۔''

﴿ إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ ۝ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۝ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۝ ﴾ (٨٤/ الانشقاق:١-٤)

''جب آسمان پھٹ جائیں گے اور وہ اپنے مالک کی فرمانبرداری کریں گے اور وہ فرمانبرداری

کے لائق ہیں، جب زمین پھیلائی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے وہ ڈال دے گی اور وہ خالی ہو جائے گی۔"

﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۙ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۙ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۙ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۙ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ؕ ﴾ (۸۲/ الانفطار:۱۔۵)

"جب آسمان پھٹ جائیں گے اور جب ستارے بکھر جائیں گے اور جب دریا چلائے جائیں گے اور جب قبر کے لوگ زندہ کیے جائیں گے، روحوں نے جو پہلے اور پیچھے بھیجا ہے اس وقت جان لیں گی۔"

﴿ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۙ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۙ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۙ ﴾

(۸۱/ التکویر:۱، ۳)

"جب آفتاب اندھیر کیا جائے گا، جب ستارے تاریک ہو جائیں گے، جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔"

﴿ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ؕ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۙ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۙ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۙ ﴾

(۷۷/ المرسلات:۷۔۱۰)

"جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً ہونے والا ہے، جب ستارے ماند کر دیے جائیں گے، جب آسمان کھول دیا جائے گا، جب پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔"

﴿ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۙ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۙ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۙ ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۷۔۹)

"جب نگاہ ماند ہو جائے گی، جب ماہتاب بے نور ہو جائے گا اور آفتاب و ماہتاب اکٹھے کر دیئے جائیں گے۔"

﴿ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۙ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۙ ﴾ (۷۰/ المعارج:۸، ۹)

"جب آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح اور جب پہاڑ روئی کے گالوں کی مانند ہو جائیں گے۔"

﴿ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۙ ﴾

(۶۹/ الحاقۃ:۱۳۔۱۶)

"جب صور میں ایک پھونک پھونکی جائے گی، جب زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور دونوں ٹکڑے ہو جائیں گے، اس دن ہونے والی بات ہو جائے گی اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس

دن کمزور ہو جائے گا۔"

﴿ يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ۝ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا ۝ فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ۝ السَّمَاءُ مُنفَطِرٌ بِهِ ۚ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا ۝ ﴾ (۷۳/ المزمل:۱۴...... ۱۶، ۱۷)

"جب زمین اور پہاڑوں میں لرزہ ہوگا اور پہاڑ پگھلا ہوا تانبا ہو جائیں گے............ کیونکر متقی ہو سکتے ہے، جب اس دن کا انکار کرتے ہو، جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا، آسمان اس دن پھٹ جائے گا اور خدا کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔"

﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ ﴾ (۱۴/ ابراھیم:۴۸)

"جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی۔"

﴿ فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۝ ﴾ (۵۵/ الرحمٰن:۳۷)

"جب آسمان پھٹ جائیں گے اور سرخ تلچھٹ کی طرح ہو جائیں گے۔"

﴿ إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝ إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا ۝ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنبَثًّا ۝ ﴾ (۵۶/ الوقعہ:۱۔۶)

"جب ہونے والی بات ہو جائے گی، جس کے ہونے میں جھوٹ نہیں ہے، زیروزبر کر دینے والی، جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور پہاڑ پراگندہ کیے جائیں گے اس وقت وہ پریشان ذرات کی طرح ہو جائیں گے۔"

﴿ وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ۝ وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝ ﴾

(۷۸/ النبا:۱۹، ۲۰)

"اور آسمان کھول دیے جائیں گے اور وہ دروازے ہو جائیں گے اور پہاڑ چلائے جائیں گے، تو وہ سراب ہو جائیں گے۔"

غرض اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت صرف نظامِ عالم کی درہمی اور دنیا کی حیاتِ موجودہ کی تباہی کا نام ہے جس کے بعد ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان بنے گا اور پچھلی دنیا کے اعمال کے نتائج پر اس دنیا کی حکومت کا قانون جاری ہوگا:

﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَاوَاتُ ۖ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ ﴾

(۱۴/ ابراھیم:۴۸)

''جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی بدل دیے جائیں گے اور سب لوگ اس ایک، سب پر قابو رکھنے والے خدا کے سامنے نکل کر آئیں گے۔''

قیامت کی حقیقت

اگرچہ قرآن پاک میں متفرق طور پر اس ہولناک دن کے احوال و کیفیات کا ذکر گوناگوں طریقوں سے کیا گیا ہے، تاہم ایک خاص سورہ بھی اس نام سے اس میں موجود ہے جس میں نہایت اختصار و ایجاز کے باوجود انتہائی بلیغانہ وسعت ہے، چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑے سے بڑے اور اہم سے اہم مطالب کو اس طرح بیان کیا ہے کہ عقل ساکت اور قلب مطمئن ہو جاتا ہے، اس سورہ کا آغاز ان آیتوں سے ہوتا ہے:

﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۝ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ الْمُسْتَقَرُّ ۝ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝﴾

(۷۵/ القيامة: ۱۔۱۵)

''میں قیامت کے دن کی اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں، کیا وہ (انسان) سمجھتا ہے کہ ہم اس کے مرنے کے بعد اس کی ہڈیوں کو اکٹھا نہیں کر سکتے، کیوں نہیں ہم تو اس کے پوروں کو درست کر سکتے ہیں، یہ نہیں بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ انسان چاہتا یہ ہے کہ خدا کے سامنے ڈھٹائی کرے، پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہے؟ تو جب نگاہ چوندھانے لگے اور چاند بے نور ہو جائے اور سورج اور چاند ایک جگہ کر دیے جائیں گے، انسان اس دن کہے گا، اب کہاں ہے بھاگنے کی جگہ، ہرگز نہیں، کہیں بچاؤ نہیں، اس دن تیرے رب کے پاس ہے جا ٹھہرنا، اس دن انسان کو جو آگے بھیجا (عمل) اور جو پیچھے چھوڑا (مال و دولت) وہ بتایا جائے گا بلکہ انسان اپنے حال کو آپ دیکھتا ہے اگرچہ وہ زبان سے بہانے تراشا کرے۔''

ان میں سے پہلی ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے روزِ قیامت اور نفسِ لوّامہ کی یکے بعد دیگرے قسم کھائی ہے، نفس لوامہ ''یعنی ملامت کرنے والے نفس سے'' مقصود انسان کا اندر کا ضمیر ہے جو انسان کے ہر برے کام کے وقت اندر سے غمگین و نادم ہوتا ہے اور اس کو اس کے اس کام پر ملامت کرتا ہے آخری آیت میں اسی کیفیت ضمیر کو ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے کہ ''بلکہ انسان اپنے حال کو آپ خوب جانتا ہے اگرچہ وہ زبان سے

اپنی برائیوں اور کوتاہیوں کے لیے سینکڑوں بہانے تراشے'' انسان کی اسی قلبی کیفیت کا نام نفس لوّامہ ہے۔

① اجتماعیات کے عالم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرد اور جماعت کے احوال میں ایک خاص قسم کی مناسبت ہے جس طرح آدمی پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے، بیمار ہوتا ہے، تندرست ہوتا ہے، گناہگار ہوتا ہے، نیکوکار ہوتا ہے، پشیمان ہوتا ہے، محنت کرتا ہے، نیک نام ہوتا ہے، بدنام ہوتا ہے، خاص طبعی قوانین کی مطابقت سے وہ قوت حاصل کرتا ہے اور ان کی مخالفت سے وہ بیمار اور کمزور ہوتا ہے اور پھر ایک خاص عمر کو پہنچ کر رفتہ رفتہ اس کے قوائے عمل سرد پڑتے جاتے ہیں اور وہ مر جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی تمام احوال جماعتوں اور قوموں کو بھی پیش آتے ہیں وہ بھی پیدا ہوتی ہیں، بڑھتی ہیں، تندرست ہوتی ہیں، کمزور ہو جاتی ہیں، گناہگار ہوتی ہیں، نیکوکار بنتی ہیں اور ایک خاص وقت اور عمر کو پہنچ کر ان کے عملی قویٰ کمزور و مضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ فنا ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں اسی اصول پر ہزاروں قومیں پیدا ہو کر فنا ہو چکی ہیں، جن کے نام بھی تاریخ کے صفحوں پر اب موجود نہیں ہیں تو جس اصول پر اشخاص اور اشخاص کا مجموعہ، جماعتیں اور جماعتوں کا مجموعہ اقوام پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہیں، کیا اسی اصول پر تمام اقوام عالم کا مجموعہ جو پیدا ہوتا، بڑھتا اور ترقی کرتا چلا جاتا ہے، وہ ایک دن فنائے محض کے آغوش میں جا کر سو نہ جائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے قیامت کے ثبوت میں اکثر عاد و ثمود و آلِ فرعون وغیرہ کی تباہی سے قیامت کی عمومی تباہی پر استدلال کیا ہے، اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

بہر حال اب جس طرح شخص کے اندر ایک نفسِ لوّامہ یا ضمیر یا احساس ہے جو اس کے ہر برے فعل کے وقت اس کو ملامت کرتا ہے اور اس کو گناہگار ٹھہرتا ہے اور جب کبھی وہ اپنے تمام مجموعی کارناموں پر نگاہ ڈالتا ہے تو اپنے کو قصوروار جانتا ہے اور گناہگار ٹھہراتا ہے اسی طرح قوموں کا ضمیر بھی اپنے گناہوں پر پچھتاتا اور اپنی تقصیروں پر نادم اور اپنی کوتاہیوں سے شرمندہ ہوتا ہے، اسی طرح یہ پوری انسانیت بھی ایک دن اپنے افراد کے مجموعی کارناموں پر نادم و پشیمان ہو گی اور اس کا ضمیر و نفس لوّامہ اس کو ملامت کرے گا۔ کائنات انسانی سے بڑھ کر خود کائناتِ ہستی بھی اس پر جو اس کے اندر کیا گیا اپنے خالق کے سامنے اپنی پشیمانی و ندامت کا اظہار کرے گی اسی عمومی اعتراف قصور اور کلی ندامت و پشیمانی کا نام قیامت ہے اور اسی مناسبت سے اس سورۂ بالا میں نفس لوّامہ اور قیامت کو باہم ایک قسم میں یعنی شہادت میں یکجا کیا گیا ہے اب اس تفصیل کی روشنی میں سورۂ مذکور کی آیتوں کو دوبارہ پڑھیے۔ [1]

② اس عالم کی ہر چیز پر اگر غور سے نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ وہ متضاد عناصر و قویٰ کا مجموعہ ہے اس میں سردی و گرمی، بیماری و تندرستی، بقا و فنا اور دیگر ہر قسم کی متضاد قوتیں ودیعت رکھی گئی ہیں، ان متضاد قوتوں میں جب تک اعتدال قائم رہتا ہے وہ زندہ رہتی ہے اور جس وقت یہ اعتدال جاتا رہتا ہے اسی لمحہ وہ فنا ہو جاتی ہے۔ ایک

[1] مستفاد از تفسیر سورۂ قیامہ، مولانا حمید الدین رحمہ اللہ ص: ۱۳، ۱۴۔

درخت میں ایک پھول کھلا، سردی و گرمی اور موسم کی تاثیر نے اس پر عمل کیا جب تک ان متضاد تاثیرات و استعدادات میں اعتدال کی کیفیت رہی وہ پھول شگفتہ رہا جس آن کسی ایک قوت نے شکست کھائی پھول کی ہستی معرض فنا میں آ گئی، یہی حال دنیا کی ہر چیز کا ہے اور اسی اصول پر افراد، خاندان، جماعتیں، قومیں بلکہ حیوانات، شجر، حجر غرض دنیا کی ہر چیز چل رہی ہے۔ پوری کائنات ہستی کو لیجئے اس کو خلاق عالم نے انہیں متضاد عناصر و اخلاط کے اصول پر قائم فرمایا ہے۔ دن رات، روشنی تاریکی، سردی اور گرمی، پانی اور آگ، بہار و خزاں، تندرستی اور بیماری، دولت اور افلاس، حیات اور موت، آسمان و زمین، نیکی و بدی، خیر و شر، غرض جدھر بھی دیکھو یہی معلوم ہوگا کہ یہ اربع عناصر کی چہار دیواری، انہیں متضاد قویٰ اور حالات کی بنیادوں پر قائم ہے۔ ان میں جب تک اعتدال قائم ہے یہ دنیا کی ہستی چل رہی ہے۔ جس دن ان کے اعتدال میں فرق آئے گا وہی دن اس کی فنا کا ہوگا۔ لیکن جس طرح افراد و اشخاص میں جہاں بیماری کے بعد تندرستی اور تندرستی کے بعد بیماری کی صلاحیت موجود ہے اسی طرح اس نظام کائنات میں بھی تندرستی کے بعد بیماری اور بیماری کے بعد تندرستی کی صلاحیتیں موجود ہیں، کتنی دفعہ یہ واقعہ پیش آیا کہ دنیا ظلم و جور سے لبریز ہوگئی اور کشت و خون کے سیلاب نے اس کے امن و امان کو غرق کر دیا کہ دفعتہً وہ پھر ابھری اور اس کا غرق شدہ امن و امان کشتی نوح بن کر کرۂ ارضی کو بچا لے گیا۔ بارہا اس باغ ہستی میں خزاں آئی اور پھر بہار کا موسم اس پر چھا گیا۔ اجرام سماوی کی باہمی مسابقت میں ہماری زمین کئی دفعہ ٹکرانے کے قریب پہنچی اور پھر بال بال بچ گئی۔ یہ کرّے اپنی رفتار میں بسا اوقات گرنے کے قریب پہنچے کہ پھر سنبھل گئے مگر فساد و صلاح کا یہ اصول اسی وقت تک چل رہا ہے جب تک ان متضاد قویٰ اور کائنات کے استعدادات میں یہ اعتدال قائم ہے، جس دن یہ اعتدال فنا ہوگا، نظام ارضی کا یہ پورا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا اور اس وقت زمین اپنی عمر کی پوری تاریخ اور کارناموں کے ساتھ اپنے خالق کے سامنے کھڑی ہوگی اور اپنے اوپر کی ہر کوتاہی و قصور کی شہادت اپنی زبان سے سنائے گی:

﴿ إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۝ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝ ﴾

(۹۹/ الزلزال: ۱ تا ۸)

”جس وقت پوری زمین ہلائی جائے گی اور جب زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو اگل دے گی اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے اس دن وہ اپنی باتیں بیان کرے گی کہ اس کے پروردگار نے حکم دیا ہے، اس دن لوگ لوٹیں گے کہ اپنے عمل دیکھیں، تو جس کسی نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہے تو اس کو بھی دیکھ لے گا۔“

صورِ قیامت

قرآن میں قیامت کے ذکر میں صور پھونکنے کا بار بار ذکر آیا ہے ﴿فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ﴾ ''پھر جب صور پھونکا جائے گا'' صور کے لفظی معنی نرسنگھا کے ہیں اصل یہ ہے کہ قدیم الایام میں بابلیوں، کنعانیوں، آرامیوں اور عبرانیوں وغیرہ تمام پرانی قوموں میں بادشاہی جلال وجلوس اور اعلان جنگ کے موقعوں پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا، اس لیے نرسنگھا پھونکنے کے معنی شاہی جلال کے اظہار اور غیر معمولی خطرہ کا اعلان ہے، چنانچہ توراۃ میں یہ محاورہ بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن میں ہے کہ اس دن ندا ہوگی کہ ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ ''آج کس کی بادشاہی ہے'' پھر اللہ تعالیٰ خود ہی جواب دے گا ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ ''اس ایک سب پر غالب آنے والے کی۔'' غرض وہ دن آسمان وزمین اور نظم کائنات کے شہنشاہِ مطلق کے اظہارِ جلال وشدید خطرۂ جنگ کے اعلان کا ہوگا اس لیے اس کے لیے نفخ، صور اور نرسنگھا پھونکنے کا قدیم محاورہ استعمال کیا گیا ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ لفظی معنوں میں بھی اس دن اپنی شہنشاہی کے نرسنگھا پھونکنے کا حکم دے اور اس کی تعمیل ہو، جیسا کہ صور کے لفظی معنی دلالت کرتے ہیں۔

عربوں کا انکار

اس تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ قیامت اپنے اندر کتنی عظیم الشان حقیقت رکھتی ہے لیکن اہل عرب کو توحید کے بعد جس عقیدہ سے شدت کے ساتھ انکار تھا اور جس کے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے تھے اور جو ان کی عقل میں کسی طرح نہیں سماتا تھا وہ یہی قیامت اور حشر ونشر کا مسئلہ ہے۔ جاہلی عرب حیات بعد الموت اور خدا کے آگے اپنے اعمال کے مؤاخذہ اور پرستش اور جزا وسزا سے قطعًا لاعلم تھے اور اس لیے ان میں اعمال کے خیر وشر اور نیکی بدی کی وہ تمیز نہ تھی جن پر تمام اخلاق ومعاملات کا دار ومدار ہے، عرب کا شاعر آپ کی اس تعلیم کو سن کر تعجب سے کہتا ہے:

اموت ثم بعث حشر
حديث خرافة يا ام عمر!

''کیا موت ہے پھر جی اٹھنا ہے پھر اکٹھا ہونا ہے اے ام عمر! (شاعر کی بیوی کا نام) یہ سب خرافات باتیں ہیں۔''

قریش کے ایک دوسرے شاعر نے کہا:

يحدثنا الرسول بان سنحيي
وكيف حياة اصداء وهام [1]

''رسول ہم سے کہتا ہے کہ ہم پھر زندہ کیے جائیں گے حالانکہ صدا اور ہام ہو کر پھر زندگی کیسی؟''

[1] صحيح بخاري، كتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبي ﷺ واصحابه الى المدينة: ٣٩٢١۔

(ان کا عقیدہ تھا کہ انسان مرکر پرندہ ہو جاتا ہے اور آواز دیتا پھرتا ہے، اسی کا نام ان کے ہاں صدیٰ اور ہام تھا)

قرآن مجید میں بھی ان کے یہ اقوال بکثرت نقل کیے گئے ہیں، مثلاً:

﴿ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝ ﴾ (۵۰/ ق:۳)

''کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے، یہ لوٹنا بہت دور ہے۔''

﴿ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ۝ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝ ﴾

(۷۹/ النازعات:۱۰، ۱۱)

''کیا ہم دوبارہ الٹے پاؤں لوٹائے جائیں گے، کیا جب ہم سڑی ہوئی ہڈیاں ہو جائیں گے۔''

﴿ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۴۹)

''کیا جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو ہم نئے بنا کر پھر اٹھائے جانے والے ہیں۔''

﴿ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ ﴾ (۳۶/ یٰسٓ:۷۸)

''ان سڑی گلی ہڈیوں کو کون جلائے گا۔''

ان میں بعضوں کا عقیدہ دہریوں کی طرح تھا کہ یہ دنیا اسی طرح قائم رہے گی، موت و حیات کا بھی سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہے گا اور اس دنیاوی زندگی کے علاوہ کوئی دوسری زندگی نہیں:

﴿ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ ﴾

(۴۵/ الجاثیۃ:۲۴)

''انہوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے، دوسری نہیں، مرتے اور جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو مارتا ہے۔''

﴿ وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝ ﴾ (۶/ الانعام:۲۹)

''اور انہوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے، ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔''

انہیں اپنے اعمال کے حساب و مواخذہ کا بھی یقین نہ تھا:

﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ۝ ﴾ (۷۸/ النبا:۲۷)

''وہ حساب کی امید نہیں رکھتے تھے۔''

خباب بن الارت، ابتدائی مسلمانوں میں ہیں، یہ لوہاری کا پیشہ کرتے تھے، ان کے کچھ دام قریش کے ایک رئیس عاص بن وائل پر واجب الادا تھے، وہ جب جا کر تقاضا کرتے تو عاص کہتا جب تک تم محمد ﷺ کا انکار نہ کرو گے میں تم کو کچھ نہ دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ ''یہ اس وقت نہیں ہو سکتا جب تک تم مرکر پھر جیو نہیں۔'' اس نے کہا، کیا مرکر مجھے پھر جینا ہے؟ انہوں نے کہا: ''بے شک۔'' اس نے مذاق سے کہا، اچھا تو پھر وہیں میرا

مال و دولت اور سرو سامان ہوگا وہیں تم دام بھی لے لینا۔ [1] اس سے اندازہ ہوگا کہ اس بارہ میں ان کا کفر کتنا شدید تھا۔اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کے سامنے توحید کے بعد جس عقیدہ کو سب سے زیادہ شدت کے ساتھ پیش کیا وہ یہی تھا، قرآن مجید کی مکی سورتوں میں سب سے زیادہ اسی مضمون کو مختلف تعبیروں اور مؤثر طریقوں سے روزمرہ کے عینی مشاہدات اور دلائل کے ساتھ بتکرار بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ہیبت الٰہی، ہنگامۂ قیامت اور حشر ونشر کے رستخیز کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ سننے والا سرتاپا اثر ہو جائے۔ انسان کے عجز، عقل کے قصور، خدا کی عظمت وقدرت اور کائنات کی حیرت انگیز خلقت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سامع ہر قدم پر لرزہ براندام ہو جاتا ہے پھر ایک طرف حیاتِ ابدی، نعیم جنت اور بہشت کی مسرتوں کا اور دوسری طرف موت کی بے بسی، دنیا کی فنا، دوزخ کی دہشت اور عذاب الٰہی کی تہدید کا ایسا ہولناک نقشہ کھینچا ہے کہ نفس انسانی اپنے تاثر کو چھپانے پر قادر نہیں رہتا۔

وحی الٰہی نے قیامت اور بہشت ودوزخ کے حالات ومناظر کو سب سے پہلے جن اسباب سے پیش کیا ہے ان سے اہل نظر صحابہ رضی اللہ عنہم ناواقف نہ تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، پہلے ایک بڑی سورت نازل ہوئی جس میں جنت ودوزخ کا بیان ہے یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے تب حلال وحرام کے احکام نازل ہوئے اور اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو، بدکاری نہ کرو تو لوگ نہ مانتے۔ یہ آیت کہ ﴿ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ﴾ (٥٤/ القمر:٤٦) ''بلکہ ان کے وعدہ کا وقت قیامت کی گھڑی ہے اور قیامت کی گھڑی نہایت مصیبت کی اور تلخ ہوگی۔'' مکہ معظّمہ میں اتری اور میں اس وقت کمسن بچی تھی کھیلتی تھی۔ بقرہ اور نساء کی سورتیں (جن میں احکام ہیں) اس وقت اتریں، جب میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ [2]

اس تشریح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم محمدی ﷺ نے اس حقیقت کو ایمان کے اصول واساس میں کیوں داخل کیا ہے کہ اگر یہ تعلیم عقائد میں شامل نہ ہوتی تو دلوں میں اعمال کی جزاوسزا کی ہیبت اور عظمت نہ بیٹھتی اور نہ احکام الٰہی کی تعمیل میں دلی رجحان اور میلان پیدا ہوتا اور یہودیوں کی طرح جن کے صحیفوں میں زیادہ تر دنیاوی ہی جزاوسزا کا ذکر باقی ہے دوسرے اہل ایمان کے دل بھی سخت اور تاثر سے خالی ہو جاتے، چنانچہ اس فلسفہ کو خود قرآن نے بیان کیا ہے:

﴿ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ (١٦/ النحل:٢٢)

''تو جو لوگ آخرت کا یقین نہیں کرتے، ان کے دل نہیں مانتے اور وہ غرور میں مبتلا ہیں۔''

اس لیے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ تلاوت کریں، جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے: ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ ''روز جزا کا مالک۔'' اسلام چاہتا ہے کہ یہ حقیقت اس کے پیرووں کے دلوں میں

---

[1] صحيح بخاري، كتاب التفسير تفسير سورة كهيعص: ٤٧٣٤۔

[2] صحيح بخاري، كتاب فضائل القرآن، باب تاليف القرآن: ٤٩٩٣۔

پوری طرح گھر کر لے۔

قیامت پر قرآنی دلائل

قرآن نے قیامت کی ضرورت پر تمام دوسری دلیلوں سے قطع نظر کر کے عموماً دو باتوں سے استدلال کیا ہے۔ اول یہ کہ انسان بے کار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا گیا اگر اس کے اعمال کا مؤاخذہ اور جزا و سزا نہ ہوتی تو خیر و شر اور نیکی و بدی کا فطری امتیاز لغو اور انسانی زندگی تمام تر بے مقصد اور اس کے تمام کام بے نتیجہ ہو جائیں:

﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۱۱۵)

''(اے لوگو) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے۔''

﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى۝ ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۳۶)

''کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔''

دوسری بات جو اس روز جزا کی ضرورت کے ثبوت میں قرآن نے پیش کی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا عادل اور منصف ہونا ہے، اگر اچھے برے انسانوں کے اعمال کی جزا و سزا نہ ہو تو دونوں کا درجہ برابر ہو جائے اور نیکی و بدی اور گناہ و ثواب کے کوئی معنی نہ رہیں، بلکہ نعوذ باللہ خدا ظالم اور غیر منصف قرار پائے، اس موجودہ مادی دنیا میں بھی انسانوں کو اپنے اعمال کی کچھ نہ کچھ جزا ملتی ہے، مگر تاہم یہ صاف نظر آتا ہے کہ بہت سے گنہگار، سیہ کار اور ظالم یہاں آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بہت سے نیکوکار، پرہیزگار اور اچھے لوگ مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلتے ہیں، اس لیے یقیناً یہ موجودہ زندگی اعمال کی جزا و سزا کی اصلی جگہ نہیں ہو سکتی، اس بنا پر دوسری زندگی کا ماننا ضروری ہے جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا نتیجہ مل سکے، اس موجودہ دنیا میں دنیاوی حکام اپنے ناقص علم کے مطابق اچھوں اور بروں کو ان کے اعمال کی جزا و سزا دیتے رہتے ہیں پھر کتنا ضروری ہے کہ پوری دنیا کا عالم الغیب حاکم اپنے صحیح علم کے مطابق لوگوں کو جزا و سزا دے کر اپنے عدل و انصاف کا ثبوت دے۔ سورۂ والتین میں اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے:

﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ۝ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ۝ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ۝ ﴾ (۹۵/ التین:۶۔۸)

''لیکن جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے، ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے، پھر اس کے بعد تجھ کو کیا چیز جزا پر یقین لانے نہیں دیتی، کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں (تمام فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا نہیں)۔''

اسی لیے قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ نیک و بد کا نتیجۂ عمل یکساں نہیں ہو سکتا، ایک جگہ خدا فرماتا ہے:

﴿ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴾ (۳۸/ ص: ۲۸)

''کیا ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کی طرح کر دیں، جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴾ (۴۵/ الجاثیۃ: ۲۱)

''کیا انہوں نے جنہوں نے گناہ کمائے یہ خیال کیا کہ ہم ان کو ان کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے، ان دونوں کی زندگی اور موت برابر ہوگی؟ ان کا یہ خیال برا ہے۔''

لوگوں کو روزِ جزا اور قیامت پر یقین کرنے سے جو وہم مانع تھا وہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر کوئی جیتا نہیں تو قیامت کے دن کیونکر جلائے جائیں گے، یہ حقیقت میں استبعادی شبہ ہے یعنی چونکہ مر کر دوبارہ جینا اب تک انسان کے تجربہ میں نہیں آیا، اس لیے اس کو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے، ورنہ اس کے انہونی اور محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے، وحی محمدی ﷺ نے اس گتھی کو اس طرح سلجھایا کہ کفار کے اس استبعاد کے وہم کو حسب ذیل مختلف طریقوں سے دور کر دیا:

① مر کر جینے کی بعض تاریخی مثالیں پیش کیں، جیسا کہ حضرت ابراہیم، حضرت عزیر علیہم السلام اور اصحابِ کہف کے قصوں میں مذکور ہیں اور ان سے استدلال کیا کہ جب چند آدمی یا پرند مر کر جی سکتے ہیں تو پوری دنیا بھی مر کر جی سکتی ہے۔

② جس طرح زمین گرمیوں میں خشک اور بے حیات ہو جاتی ہے اور پھر دفعۃً بارش کے ایک چھینٹے سے اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے سبزے نکل آتے ہیں، کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں، اسی طرح قدرت الٰہی کی ایک بارش زمین سے انسانی دفینوں کو اگلوا دے گی ﴿ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ﴾ ''اور زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو باہر نکال دے گی۔'' اور دوبارہ نئی زندگی پیدا کر دے گی۔

③ دوبارہ زندگی پر تعجب اور استبعاد اس لیے ہے کہ خدا کے دائرہ قدرت کی پوری وسعت ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ جس نے آسمان بنائے، زمین بنائی، آسمان سے پانی برسایا، مردہ زمین سے زندہ کھیتیاں، سبزے اور درخت اگائے اور پانی کے ایک قطرہ سے انسان بنایا، کیا وہ ان کے فنا کے بعد دوبارہ ان کی ایجاد پر قادر نہیں؟

④ حیات کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا خدا نے اس کو ہست و موجود کیا پھر رفتہ رفتہ اس کو معدوم کر دیا، تو جس نے پہلے بغیر کسی مثال کے اس کارخانہ کو پیدا کیا وہ کیا دوبارہ اس کو پیدا نہیں کر سکتا جس نے نقشِ

اول بنایا، کیا نقشِ ثانی کھینچنے پر اس کو قدرت نہیں؟

⑤ دنیا میں باری باری بہت سی قومیں وجود میں آئیں اور قوانین الٰہی کے مطابق انہوں نے جسمانی زور و طاقت، مالی وسعت، اجتماعی اور تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی، بڑی بڑی عمارتیں بنائیں، عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی، قوموں کو اپنا محکوم بنا کر حکومت وسلطنت قائم کی پھر جب انہوں نے غرور ونخوت، ظلم وستم اور دوسرے قوانین الٰہی کی جو قوموں کی ہستی اور عظمت کی بقا کے لیے ضروری ہیں، مخالفت کی تو وہ فنا کر دی گئیں اور ان کا نام ونشان بھی صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔ عربوں سے سوال کیا کہ تمہارے عاد وثمود جو کبھی بنو سام کے ممالک عراق وشام ومصر وعرب پر چھائے ہوئے تھے، کیا ہوئے؟ سبا اور تبع کی عظیم الشان حکومتیں کیا ہوئیں؟ فرعون اور اس کی سلطنت کا کیا حال ہوا؟ قومِ لوط اور قومِ مدین کو زمین کیونکر نگل گئی؟ قرآن نے اہل عرب سے خطاب کر کے کہا:

﴿ اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ کَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ کَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِی الْاَرْضِ ﴾ (٤٠/ المؤمن:٢١)

''کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان سے پہلوں کا کیسا انجام ہوا، جو ان سے قوت اور زمین میں یادگاروں کے لحاظ سے کہیں بڑھ کر تھے۔''

﴿ اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۬ؕ وَالَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ ﴾ (١٤/ ابراهيم:٩)

''کیا تم کو نوح کی قوم اور عاد وثمود کی اور جو ان کے بعد آئے، جن کو خدا ہی جانتا ہے، ان کی خبر تم کو معلوم نہ ہوئی۔''

یہ تو وہ قومیں ہیں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ دنیا کی تاریخ میں کتنی قوموں کے عروج وفنا کی داستانیں محفوظ ہیں، بابلی، اسیری، اکادی اور مصری قومیں جو کبھی روئے زمین پر کوس لِمَنِ الْمُلْكُ بجاتی تھیں، ہزار ہا سال سے بے نشان ہیں۔ نارمن جیسے فاتح کیا ہوئے، یونانی اور رومی جو کبھی دنیا کے تنہا مالک بن گئے تھے اب ان کا کہیں وجود ہے؟ مجوس جو روم کے مقابل صدیوں تک برسرِ پیکار رہے ان کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں رہی، امریکہ کے قدیم باشندے جو کبھی اس براعظم کے واحد مالک تھے اب فنا کے قریب ہیں۔

الغرض جس طرح افراد جی کر مر جاتے ہیں۔ جماعتیں وجود میں آ کر مٹ جاتی ہیں، قومیں پیدا ہو کر فنا ہو جاتی ہیں، اسی طرح پوری دنیائے مخلوقات بھی ایک دن آئے گا جب قانون الٰہی کے مطابق معدوم ہو جائے گی۔ جس طرح عوام جو قوموں کی تاریخ سے واقف نہیں، صرف افراد کو جیتے اور مرتے دیکھتے ہیں وہ گو افراد کی فنا کا یقین رکھتے ہیں لیکن قوموں کی فنا کے مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے اور اس میں شک کرتے ہیں اسی طرح جن کی نظر دنیائے خلق کی تاریخ پر نہیں وہ اس کے فنائے کامل پر اپنی جہالت اور نادانی سے اعتبار نہیں کرتے حالانکہ ایک

دن وہ آئے گا جب پوری دنیا اپنے وجود کی صلاحیت سے معرا ہو کر فنا ہو جائے گی اور کائنات کا یہ نظام بدل جائے گا اور اس میں موجودہ عالم کا قانونِ طبعی ایک دوسرے طبعی قانون سے منسوخ ہو جائے گا اور جیسا کہ سائنس کہتی ہے اور قرآن نے نقشہ کھینچا ہے، آفتاب و ماہتاب اور ستارے اور تمام اجرامِ فلکی ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے اور پوری دنیا کی عدالت قائم ہو کر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا:

﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ ﴾

(١٤/ ابراھیم:٤٨)

''جس دن یہ زمین اور زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی اور مخلوق اکیلے زبردست خدا کے سامنے نکل کھڑی ہوگی۔''

سورۂ ق میں قیامت پر استدلال انہیں دلیلوں سے کیا گیا ہے:

﴿ قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۝ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۭ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ۝ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ۝ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۭ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ۝ اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ۭ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ ﴾

(٥٠/ ق:١۔١٥)

''قسم ہے اس بڑی شان والے قرآن کی (جو مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے ان کافروں کو عقلی انکار نہیں ہے) بلکہ ان کو اس سے تعجب ہے کہ ان میں کا ایک آدمی آ کر ان کو (قیامت کا) ڈرسنا تا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ تعجب کی بات ہے، کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو پھر زندہ ہوں گے) یہ دوبارہ لوٹنا تو دور از عقل ہے، (خدا کہتا ہے یہ تعجب کی کیا بات ہے) ہم کو معلوم ہے کہ زمین ان مردہ جسموں میں جو کمی کرتی ہے اور ہمارے پاس محفوظ ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ ان کافروں نے سچائی جھٹلا دی جب وہ ان کے پاس آئی انہوں نے جھٹلا دیا تو وہ الجھی باتوں میں پڑ گئے کیا انہوں نے اپنے اوپر کے آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا بنایا اور

کس طرح اس کو سجایا ہے کہ اس میں کہیں سوراخ نہیں اور زمین کو پھیلایا ہے اور اس میں پہاڑ کے لنگر ڈالے اور اس میں قسم قسم کی رونق کی چیزیں اُگائیں کہ ہر رجوع ہونے والے بندہ کو اس سے سوجھ ہو اور یاد آئے اور آسمان سے برکت کا پانی برسایا پھر اس سے باغ اور کٹنے کھیت کے اناج اُگائے اور کھجوروں کے لمبے درخت جن کے خوشے اوپر تلے ہیں، یہ بندوں کو روزی پہنچانے کے لیے ہے اور اس پانی سے مردہ آبادی کو ہم زندہ کرتے ہیں اسی طرح (قبروں سے) نکلنا ہوگا، ان کافروں سے پہلے نوح کی قوم، رس والے اور ثمود اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائیوں نے اور جنگل والوں نے اور تبع کی قوم نے اس کو جھٹلایا ان میں سے ہر ایک نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو میری دھمکی پوری اتری، کیا ہم پہلے پیدا کر کے تھک گئے جو دوبارہ پیدا نہیں کر سکتے، بات یہ ہے کہ ان کافروں کو از سرنو پیدائش میں شک ہے۔''

سورۂ قیامۃ میں بھی اس کا بیان ہے اس کی آخری آیتیں یہ ہیں:

﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۝ ﴾

(۷۵/ القیامۃ:۳۶ـ۴۰)

''کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یونہی بیکار چھوڑ دیا جائے گا، کیا وہ پانی کی ایک ٹپکی ہوئی بوند نہ تھا، پھر وہ بندھا ہوا خون ہوا، پھر خدا نے اس کو بنایا اور اس کو ٹھیک کیا، پھر اس کو جوڑا، یعنی نر اور مادہ کیا یہ خدا اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ جلائے؟''

﴿ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآءیل:۹۸، ۹۹)

''اور وہ بولے کہ جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے، تو کیا پھر نئے بنا کر اٹھائے جائیں گے؟ کیا یہ نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں کو اور زمین کو بنایا وہ ان لوگوں کے مثل کو دوبارہ بھی بنا سکتا ہے۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ﴾ (۳۰/ الروم:۲۷)

''اور خدا وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے، پھر اس کو دوبارہ خلق کرے گا، یہ دوبارہ خلق کرنا اس کے لیے بہت آسان ہے۔''

﴿ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ﴾ (۲۲/ الحج:۵)

''(لوگو) اگر تم کو دوبارہ زندگی میں شک ہے تو (پہلے) تم کو اسی مردہ مٹی سے پیدا کر چکے ہیں، (پھر دوبارہ کیوں نہیں پیدا کر سکتے۔)''

قیامت کے متعلق تمام دور دراز اور طول طویل شکوک و شبہات کا کتنا مختصر جواب ہے:

﴿ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ﴾

(۳۶/ یٰسٓ:۷۸، ۷۹)

''وہ بولا کہ کون ان سڑی کھوکھلی ہڈیوں کو جلائے گا، کہہ دے وہی جس نے پہلی دفعہ ان کو بنایا۔''

غرض وحی محمدی نے ہر پہلو سے کفار کے اس استعجاب اور استبعاد کو دور کیا اور ان کو دوبارہ زندگی کا یقین دلایا۔

حشر جسمانی

اس بحث پر لوگوں نے قیامت برپا کر رکھی ہے کہ یہ دوبارہ زندگی آیا اسی گوشت پوست کے ساتھ ہوگی یا صرف روحانی ہوگی اور جہاں جسم و جسمانیت کا مطلق گزر نہ ہوگا۔ گو قرآن پاک کی مختلف آیتیں مختلف پہلوؤں کو پیش کرتی ہیں جن میں اشارۃً ہر قسم کی باتیں آجاتی ہیں، تاہم قیامت کے متعلق اوپر کی آیتوں میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو۔ کفار کو تعجب ہے کہ کیا ہمارا یہ جسم مر کر پھر جیئے گا؟ کیا ہماری ان سڑی گلی ہڈیوں میں دوبارہ جان پڑے گی اور ہم قبروں سے نکل کر پھر اٹھ کھڑے ہوں گے؟ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی زندگی کے علاوہ زندگی کا کوئی دوسرا مفہوم ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا، مگر اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم تعجب نہ کرو اور انکار پر آمادہ نہ ہو کہ تمہارے یہ فنا شدہ جسم نہیں اٹھائے جائیں گے اور نہ تمہاری ان بوسیدہ ہڈیوں میں روح پھونکی جائے گی بلکہ وہ تو سراسر روحانی زندگی ہوگی کیونکہ جب دوبارہ جسمانی زندگی کا تخیل ان کے لیے ناقابل فہم تھا تو خالص روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی ان کے فہم سے دور تھا اور اب بھی ہے کہ ہم اس مادی زندگی کے جاننے والے سرتاپا روحانی زندگی کے تصور سے بالکل عاجز ہیں اس لیے مصلحت الٰہی اسی کی مقتضی تھی کہ وہ اصل واقعہ پر زور دے اور کیسے اور کیوں سے تعرض نہ کرے اور صاحب فہم کو اس کے فہم کے مطابق اس راز کو سمجھنے دے، چنانچہ قرآن پاک کے اس اسلوب بیان کو اگر سمجھنا ہے تو ان آیتوں پر غور کرنا چاہیے:

﴿ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ڛ بَلْ هُمْ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ۝ ﴾

(۳۲/ السجدۃ:۱۰)

''اور انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم زمین میں کھو جائیں گے کیا ہم نئی پیدائش میں پھر ہوں گے (خدا فرماتا ہے یہ کچھ نہیں) بلکہ یہ اپنے پروردگار کی ملاقات کے منکر ہیں۔''

غور کرو کہ ان مادی معدومیت کے بعد مادی پیدائش کے پُر تعجب انکار پر اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ یہ شکوک و شبہات اس لیے ان کو پیش آتے ہیں کہ مرنے کے بعد خدا کی ملاقات اور اس کے سامنے ہونے سے

ان کو انکار ہے اور حواشی کو چھوڑ کر اصل مقصود یہی ہے کہ موت کے بعد اور آخرت میں خدا کے سامنے ہونے پر یقین رکھا جائے، اس سے ان کو کیا مطلب کہ وہ کس طرح ہوگا، چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا:

﴿ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴾

(۳۲/ السجدة:۱۱)

"جواب میں کہہ دے کہ ملک الموت جو تم پر متعین ہے وہ تم کو موت دے گا، پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے۔"

یہی ملاقات اور رجوع الی اللہ اس عقیدۂ حشر کی اصلی روح ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم انہیں باتوں کو سمجھ بوجھ سکتے ہیں جن کی مثالیں اور نظیریں اس مادی دنیا میں ہماری نگاہوں سے گزرتی رہتی ہیں اور وہ عالم جو نگاہوں سے مستور بلکہ تصور سے بھی دور ہے اس کی باتوں کو اس طرح سمجھنا کہ ہر سوال اور تکرار سوال سے وہ بے نیاز ہو جائیں، تقریباً ناممکن ہے ان کے متعلق جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس دیدہ شہرستان وجود یعنی دنیا کے قیاس ہی پر اس نادیدہ شہرستانِ بقا کا ہر نقشہ اور خاکہ بتایا اور سمجھایا جائے اور یہی محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے کیا ہے۔ جو لوگ کہ اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی قدرت پر یقین رکھتے ہیں ان سے تو کچھ کہنا ہی نہیں، لیکن اگر کوئی شخص جسمانی حشر کا تصور اس لیے محال سمجھتا ہے کہ عام انسانوں نے کسی مردہ جسم کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا اس کے نزدیک تنہا روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی زیادہ محال ہوتا ہے کیونکہ کسی انسان نے آج تک کسی انسان کو روحانی وجود میں نہیں دیکھا، بلکہ وہ اس کا تصور تک بھی نہیں کر سکا ہے وہ جب انسانی زندگی کا تصور کرے گا تو جسم و شکل و اعضا کے ساتھ ہی کرے گا، ان سے مجرد ہو کر نہیں کرے گا۔

موت جسم سے روح کی مفارقت کا نام ہے اس لیے اگر یہ سچ ہے کہ قیامت میں نئی زندگی ملے گی، تو ظاہر ہے کہ موت آنے کے بعد کیفیت اور صورت سے کوئی الگ صورت و کیفیت ہوگی جس کا نام حیات ثانیہ رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ روح کا دوبارہ تعلق جسم سے تسلیم کیا جائے ورنہ غیر جسمانی زندگی تو قیامت کے پہلے بھی تھی اب نئی بات کیا بڑھ گئی، جس کا نام حیات ثانیہ رکھ دیا گیا۔

گو روح انسانی جسم کے اندر ہر فعل کی فاعل ہے مگر ہر فاعل کے فاعل بننے کے لیے آلات و اوزار کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جن کے بغیر وہ اپنے فعل کے بجا لانے سے مجبور رہتا ہے اسی طرح روح اپنے فعلِ لذت والم کے انجام دینے کے لیے جسمانی آلات اور اوزار کی محتاج ہے کہ لذت والم کا کوئی روحانی احساس جسمانیت کے شائبہ سے مبرا ہو کر ہو ہی نہیں سکتا، اس بنا پر روح کا محض جنت کی لذتوں سے متمتع یا دوزخ کی تکلیفوں سے متالم ہونا کسی جسمانی وساطت کے بغیر تصور میں نہیں آتا، خواب میں دیکھو کہ روح کو جو لذت یا تکلیف پہنچتی ہے اس میں بھی جسمانی پیکر و ہیکل کی صورت نمودار ہوتی ہے۔

جسم وجسد

حشرِ جسمانی کے ماننے کے بعد یہ بحث بے سود ہے کہ آیا وہی جسم دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا جس کے قالب میں وہ روح پہلے دنیا میں رہی تھی یا کسی دوسرے نئے جسمانی پیکر میں وہ روح پھونکی جائے گی یا یہ کہ آیندہ جسم اپنی مادیت اور ترکیب میں اس دنیاوی جسم کے مماثل ہوگا، جب کہ یہ حقیقت ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اعمال کی ذمہ داری روح پر ہے، جسم پر نہیں اور اسی طرح جزا وسزا کی راحت وتکلیف کا اصلی مورد روح ہے، جسم نہیں تو پھر اب وہ کسی قالب میں بھی ہو اور کسی رنگ میں بھی ہو روح پر مؤاخذہ اور ثواب وعذاب کی لذت والم کا احساس یکساں ہوگا البتہ یہ ضروری ہے کہ جو جسم ہم کو دوسری دنیا میں ملے گا، اس کی خصوصیات ولوازم اس خاکی جسم کے خصوصیات ولوازم سے بالکل الگ ہوں گے، چنانچہ خود ہمارے تخیل اور تصور اور نیز خواب ورؤیا میں جو جسم ہم کو نظر آتا ہے وہ جسم ہو کر نظر آنے کے باوجود مادی جسمانیت سے سراسر پاک ہوتا ہے اس لیے لفظ جسم کے بولنے سے انہیں خصوصیات کا جسم سمجھ لینا ضروری نہیں ہے اور نہ اس جسم پر قیاس کر کے اس جسم پر اشکالات پیش کیے جاسکتے ہیں۔

خلق جدید

چنانچہ جو جسم قیامت میں عنایت ہوگا وہ نئی خلقت اور نئی آفرینش کا ممنون ہوگا، اسی لیے قرآن نے منکروں کے جواب میں یہ کہا ہے:

﴿ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴾ (۵۰/ ق:۱۵)

”بلکہ یہ لوگ نئی آفرینش سے شک میں ہیں۔“

منکرین کی زبان سے کہلوایا:

﴿ ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴾ (۱۷/ الاسرآء:۹۸)

”کیا ہم درحقیقت نئی آفرینش کر کے اٹھائے جائیں گے۔“

ایک دوسری سورۂ میں یہ تلقین ہے:

﴿ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴾ (۳۴/ سبا:۷)

”بے شک تم ایک نئی آفرینش میں ہونے والے ہو۔“

پھر تمثیل دے کر فرمایا:

﴿ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۱۰۴)

”جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کا آغاز کیا اسی طرح ہم اس کو دوبارہ بنائیں گے۔“

اسی لیے اس عالم کی اس نئی خلقت و پیدائش والے جسم کو بعینہٖ اسی جسم کے مطابق سمجھنا صحیح نہیں ہے اور

نہ اس خاکی جسم کی تمام خصوصیات کا بعینہٖ اس جسم میں ہونا ضروری ہے اس کو اگر اس عالم کے لفظ ''جسم'' سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس لیے کہ ہماری زبان میں روح کے غلاف وقالب کے لیے جسم سے بہتر، قریب تر اور مشابہ تر کوئی دوسرا لفظ نہیں۔

یہ بات کہ حشر میں بعینہٖ گزشتہ گوشت و پوست کا ہونا اس لیے ضروری سمجھا جائے کہ وہ بھی عذاب و ثواب میں شریک ہوں، تصریحِ قرآنی پر اضافہ ہے، قرآن میں تو یہ تصریح ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَيْرَھَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴾ (٤/ النسآء:٥٦)

''بے شبہ جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہوئے، ہم ان کو آگ میں ڈالیں گے، جب ان کی کھالیں پک جائیں گی، ہم ان کو اور کھالیں دیں گے، جو پہلی کھالوں کی غیر ہوں گی، تاکہ وہ عذاب چکھیں، بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔''

جب کھالیں یکے بعد دیگرے بدلتی جائیں گی تو وہ پہلا اصلی حصہ جسم کا جو گناہ میں شریک تھا، کہاں باقی رہا؟ اسی طرح یہ تصریح ہے کہ انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھالیں اس کے اعمال کی شہادت دیں گی، اس سے معلوم ہوگا کہ وہ اصلی مجرم جو ان اعمال کا ذمہ دار اور اس مقدمہ کا مدعا علیہ ہے ان جسمانی اعضا کے علاوہ ہے اور وہ روح انسانی ہے۔

ذمہ داری روح پر ہے

یہی سبب ہے کہ موت وحیات، عذاب وثواب اور اعمال کے مؤاخذہ کا اسلام نے جس سے تعلق بتایا وہ نفس یعنی روح ہے:

﴿ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰي مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ ﴾ (٣٩/ الزمر:٥٦)

''تو (قیامت میں) کوئی نفس یہ کہنے لگے، کہ اے افسوس اس پر کہ میں نے اللہ کے پہلو میں کمی کی۔''

﴿ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ ﴾ (٥٩/ الحشر:١٨)

''اور چاہیے کہ ہر نفس دیکھے کہ اس نے کل (قیامت) کے لیے کیا آگے بھیجا۔''

﴿ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ۝ۭ ﴾ (٨١/ التكوير:١٤)

''(اس دن) ہر نفس جان لے گا جو اس نے حاضر کیا۔''

﴿ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۝ۭ ﴾ (٨٢/ الانفطار:٥)

''اس دن ہر نفس جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا۔''

﴿ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَـيْـــًٔا ۭ ﴾ (٢١/ الانبيآء:٤٧)

''تو اس دن کسی نفس پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔''

جنت کی نسبت ہے:

﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ ﴾ (۳۲/ السجدۃ:۱۷)

''کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کے لیے (جنت میں) کیا آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے؟''

ان آیتوں میں دیکھو کہ عمل کی ذمہ داری اور اس کے اچھے اور برے نتیجوں کا بار جسم پر نہیں، بلکہ روح اور نفس پر ڈالا گیا اور اسی کو تکلیف ولذت سے آشنا کیا گیا ہے، جنت میں داخلہ کی خوش خبری بھی اسی کو دی گئی ہے:

﴿ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۙ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۧ ﴾ (۸۹/ الفجر:۲۹، ۳۰)

''اے مطمئن روح! میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا۔''

دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے

غرض اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی ذمہ دار اور جنت ودوزخ کی لذت والم کی اصل احساس کرنے والی ہستی صرف روح ہے اور جسم کی حیثیت صرف ایک لباس وآلہ احساس کی ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ جسم لاکھ بار بدلے مگر روح اگر وہی ہے تو وہ انسان وہی ہے اور اسی کو اپنی ذمہ داری کی جزا وسزا مل رہی ہے۔

لوگ اپنی ظاہر بینی سے اصل زور جسم پر دیتے ہیں حالانکہ اس مٹی کے ڈھیر میں اگر روح کا خزانہ نہ چھپا ہوتو اس مشت خاک میں دھرا کیا ہے، دیکھو کہ انسان بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہی ایک شخص ہے جو پہلے تھا، حالانکہ اس کی جسمانی ہیئت اور اس کے جسم کا مادہ ہر آن اور ہر لحہ فنا ہو کر بدلتا رہتا ہے اور بیماریوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا پھر تندرستی کے بعد نئے ذرات داخل ہو کر لہلہائے۔ تم غلطی سے یہ سمجھتے ہو کہ ہر حال میں وہی جسم یکساں طور پر قائم ہے حالانکہ حکیم سے پوچھو تو وہ بتائے گا کہ اس کے ذرے کیونکر ہر آن میں جھڑتے اور گھٹتے رہے اور جو خوراک وہ کھاتا ہے وہ خون ہو کر کیونکر بدل ما تحلل بن کر ان کی جگہ لیتی رہی پھر کیا ایسے ہر آن فنا ہوتے رہنے والے اور چند سال کے بعد بالکل بدل جانے والے کو دائم الوجود اعمال کا ذمہ دار اور ان کے نیک وبد کی اصلی جزا یا سزا پانے کا مستحق ٹھہرایا جا سکتا ہے، لیکن جس طرح دنیا میں اگر کوئی مجرم آج بھاگ گیا اور چند سال کے بعد پکڑ کر جب لایا گیا تو وہ یہ عذر نہیں کر سکتا کہ چونکہ وہ ہاتھ جس سے اس نے چوری کی تھی اور وہ پاؤں جن سے وہ مال لے کر بھاگا تھا اس عرصہ دراز میں بدل گئے ہیں اس لیے وہ لائق تعزیر نہیں، کیونکہ وہ روح جس نے اپنے ارادہ ونیت سے اس کام کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے ذریعہ کرایا تھا وہ جس طرح کل تھی بعینہٖ آج بھی ہے اور جو تکلیف اس کو اپنے پہلے جسم کے ذریعے کل پہنچ سکتی تھی آج بھی بعینہٖ وہی اس کو پہنچ سکتی ہے اور اس جسمانی تغیر سے اس کی روحانی شخصیت میں اصلاً کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، اس لیے پہلے ہی جسم کے ضروری ہونے پر زور دینا بے سود ہے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ جسم اگر بدل بھی جائے تو اعضا

کی شہادت کا مسئلہ اپنی جگہ پر صحیح ہوگا۔ جسم کے اجزا دنیا میں بدلتے جاتے ہیں، مگر جو بیماری اگلے اجزا میں پیدا ہوگئی تھی وہ ان کے فنا ہوجانے کے بعد بھی قائم رہتی ہے مٹ نہیں جاتی، بلکہ وہی ان کے بعد کے آنے والے اجزا میں برابر سرایت کرتی رہتی ہے۔

اخروی جسم کیسا ہوگا

روحوں کو آخرت میں جو جسم ملیں گے وہ حقیقت میں ان کے اعمال ہی کے ظل وعکس ہوں گے، یعنی جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی ان کو جسم عنایت ہوں گے۔ چنانچہ اس دنیا کے جسمانی رنگ کے لحاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا گورا، مگر اس دنیا میں اس کا یہ کالا پن اور گورا پن اعمال کی سیاسی وسپیدی کی صورت میں بدل جائے گا۔ خدا نے فرمایا:

﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ مُّسْفِرَةٌ ۙ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۚ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۙ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۭ ﴾ (۸۰/ عبس:۳۸۔۴۱)

''کتنے چہرے اس دن روشن ہنستے اور شاد ہوں گے اور کتنے چہروں پر اس دن کدورت ہوگی ان پر سیاہی چھائی ہوگی۔''

﴿ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۰۶، ۱۰۷)

''جس دن کتنے چہرے سپید ہوں گے اور کتنے کالے، لیکن جن کے چہرے کالے ہوئے کیا تم وہ ہو جو ایمان کے بعد پھر کافر ہوگئے تھے، تو اپنے کفر کرنے کے بدلہ عذاب کا مزہ چکھو اور لیکن جن کے چہرے سپید ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اسی میں سدا رہیں گے۔''

صحیح حدیثوں میں ہے کہ ''جنت میں سب لوگ جوان بن کر داخل ہوں گے اور جسم پر کبھی بڑھاپا نہیں آئے گا، ان کا قد حضرت آدم علیہ السلام کے اولین بہشتی قد کے مطابق ہوگا، [1] دوزخیوں میں سے کسی کا سر پہاڑ کے برابر ہوگا، کسی کا ایک پہلو مفلوج ہوگا، کسی کے ہونٹ لٹکے ہوں گے، دل کے اندھے آنکھوں کے اندھے بن کر اٹھیں گے، سزاؤں کے بعد جب ان کے جسم چور چور ہوجائیں گے، تو پھر ان کے جسم صحیح وسالم نمودار ہوں گے پھر ان کی وہی کیفیت ہوگی۔'' یہ بھی آیا ہے کہ ''جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں وہ چیونٹی بن کر قیامت میں اٹھیں گے۔'' ان تمام شواہد سے ہویدا ہے کہ اس دنیا کے جسمانی قالب ہمارے اس دنیاوی جسم کے مطابق نہیں بلکہ ہمارے دنیاوی اعمال کے مطابق ہوں گے۔

[1] جامع ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ما جاء فی صفة ثیاب اهل الجنة:۲۵۳۹ و باب ماجاء فی سن اهل الجنة: ۲۵۴۵؛ دارمی، کتاب الرقاق، باب فی اهل الجنة و نعیمها: ۲۸۲۸؛ مسند أحمد، ج۲، ص: ۲۹۵، ۳۴۳۔

جزا اور سزا

''یوم آخر'' یا ''یوم دین'' پر ایمان لانے سے اسلام کا حقیقی منشا یہ ہے کہ لوگ اس کا یقین کریں کہ ان کے ہر عمل کا بدلہ ہے، کچھ اس دنیا میں اور پورا دوسری دنیا میں، اسی کا نام جزا و سزا ہے اور دنیا کے دوسرے مذاہب بھی اس مسئلہ میں اسلام کے ہم نوا ہیں۔

جزا و سزا دیگر مذاہب میں

درحقیقت مذاہب کا حقیقی تعلق اسی عقیدہ سے ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور اچھا یا برا جیسا کام اس سے صادر ہوتا ہے، اس کے مطابق اس کا اچھا یا برا معاوضہ اس کو دوسری دنیا میں ضرور ملے گا، اس عقیدہ کا نشان مصر و بابل جیسی دنیا کی قدیم قوموں میں بھی ملتا ہے، ہندوستان کے مذاہب میں اس دوسری دنیا کو دوسرے جنم سے تعبیر کیا گیا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ انسان جب مرتا ہے تو اس کے اچھے یا برے کاموں کے مطابق اس کی روح کسی جانور یا گھاس پھوس یا درخت کے قالب میں جا کر اپنے عمل کا نتیجہ بھگتتی ہے اور پھر انسانوں کے قالب میں لائی جاتی ہے اور کام کرتی ہے اس کے بعد جس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اس کو ''یم لوک'' میں جانا پڑتا ہے، جہاں نرک (دوزخ) ہیں وہاں وہ ہر قسم کی سزا بھگتتی ہے بعد ازیں اپنے بعض اچھے کاموں کی بدولت چندر لوک (چاند کی دنیا) میں جاتی ہے جس روح کے کچھ کام اب بھی باقی ہیں وہ اس دنیا میں ہوا، بادل اور بارش کے ذریعہ سے زمین میں دوبارہ آتی ہے اور اپنے کام کے مطابق حیوانات یا نباتات کے روپ میں سزا پاتی ہے اور پھر چھوٹ کر انسان بنتی ہے یہاں تک کہ اس کے کام اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قابل قرار نہ پائے اس وقت وہ مادی قالبوں کی قید سے نجات پا کر سورج لوک اور چندر لوک وغیرہ اجرام سماوی کی دنیاؤں میں جا کر آرام کرتی ہے اور پھر اپنے علم و عمل کی کسی کمی کے سبب سے بادل ہوا اناج یا کسی دوسری مخلوقات کے قالب میں ہو کر اس کو اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے اور پھر وہی عمل شروع ہوتا ہے یعنی وہ نئے نئے جنموں میں پیدا ہو کر سزا بھگتتی ہے اور اس وقت تک اس آمد و رفت اور آواگون کے چکروں میں پھنسی رہتی ہے جب تک اس سے، اچھے یا برے کاموں کا صدور ہوتا رہتا ہے اس لیے کامل اور دائمی نجات کی صورت یہ ہے کہ انسان سے اچھا یا برا کوئی کام ہی صادر نہ ہو یہی ترک عمل روح کو مادہ کی قید سے آزاد کر کے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا (موکش) دلاتا ہے یہاں تک کہ یہ موجودہ مادی دنیا پرلے (قیامت) کے بعد جب پھر نئے سرے سے بنے گی تو پھر وہی عمل اور سزا اور جنم کے آواگون کا چکر شروع ہوگا اور پھر اسی طرح چھٹکارا پائے گی اور پھر دوسری پرلے کے بعد نیا دور اسی طرح شروع ہوگا، یہ چکر اسی طرح ہمیشہ جاری رہے گا۔

یہ وہ چکر ہے جس سے انسان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا الا یہ کہ ہمالہ کی چوٹی یا غار میں بیٹھ کر ترک عمل کے ذریعہ خود اپنے وجود سے ہاتھ دھو لیا جائے، لیکن اگر اس اصول نجات پر دنیا عمل کرے تو یہ بہارستان دم

کے دم میں خارستان بن جائے اور ہر قسم کا کاروبار بند ہو کر دنیا آپ سے آپ فنا کے قریب آ جائے اور بدی کے ساتھ نیکی کا وجود بھی دنیا سے مٹ جائے اور با ایں ہمہ دائمی و ابدی نجات میسر نہ ہو کیونکہ ہر پر لے کے بعد وہی جنم اور کرم اور آواگون پھر شروع ہوتا ہے۔ ❶

لیکن دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس چکر اور بے عملی سے انسانوں کو نجات دلائی ہے، انہوں نے اس موجودہ دنیا کے بعد ایک ہی دنیا اور تسلیم کی ہے جس میں انسانوں کو اپنے اچھے اور برے اعمال کی پوری پوری جزا ملے گی، مختلف زردشتی فرقوں نے آرین نسل ہونے کے باوجود ہندوؤں کے تناسخ کے بجائے مختلف سامی مذاہب کے خیالات کی نقالی کی ہے اور خصوصاً بعد والوں نے اسلام کے عقائد کو ''ارواے ویراف'' کے عجیب و غریب مشاہدات کا رنگ دے کر اور اس کی کتاب کو اسلام سے بھی پہلے قرار دے کر تمام تر قبول کر لیا ہے۔ ❷

صحیفۂ ابراہیم یعنی سفرِ تکوین میں دنیا کی محنت و مشقت اٹھانے کے بعد پھر جنت میں داخلہ کا اشارہ ہے (تکوین ۲۔۱۹) علی ھذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں اخروی جزا و سزا کے اصول مذکور ہیں۔ نیکوکاروں کے لیے ایک ''ستھری آبادی'' کا ذکر ہے جس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں مذکور ہے اور بدکاروں کے لیے ہلاکت اور بربادی اور دردناک عذابوں کی بھی خبر ہے مگر مترجموں نے ہر جگہ اس کو دنیاوی ثواب و عذاب بلکہ ارض موعودہ کی ظاہری سلطنت کے معنوں میں کر کے دکھایا ہے حالانکہ بعض مقامات میں یہ بے جوڑ سی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی جنت عدن اور اس کے چار دریاؤں کا ذکر تکوین کے دوسرے باب میں ہے، علاوہ ازیں تورات میں موت کے بعد کی زندگی کی تصریح ملتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام (پیدائش ۲۵۔۱۸) اور یعقوب علیہ السلام (پیدائش ۴۹۔۳۳) کی موت کی تعبیر ان لفظوں میں کی گئی ہے کہ ''جان بحق ہوا اور وہ اپنے لوگوں میں جا ملا ساتھ ہی ہمیشہ کی بھلائی (استثناء ۶۔۲۴) کا بھی تذکرہ ہے اور جہنم کی آگ (استثنا ۳۲۔۲۲) کا بھی بیان ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دیے جانے کی بھی تصریح ہے (یرمیاہ ۱۷۔۱۱) روح کی بقا اور آسمان پر چڑھنے کی تعلیم بھی ان کے صحیفوں میں موجود ہے (واعظ ۳۔۲۱) مرنے کے بعد روح کے خدا کے پاس واپس پھر جانے کا بھی ذکر ہے (واعظ ۱۲۔۷) اور انسان کے اپنے ابدی مکان میں جانے کا بھی تذکرہ ہے آخر میں خدا سے ڈر اور اس کے حکموں کو مان کہ انسان کا فرض کلی یہی ہے کیونکہ خدا ہر ایک فعل کو ہر ایک پوشیدہ چیز کے ساتھ خواہ بھلی ہو خواہ بری عدالت میں لائے گا۔ (واعظ ۱۲۔۱۳۔۱۴) زبور میں خدا کی عدالت کے دن کی تصریحات بار بار ہیں اور امثالِ سلیمانی میں ہے کہ ''انسان کی راہیں خداوند کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور وہ اس کی ساری روشوں کو جانتا ہے شریر کی بدکاریاں اس کو پکڑ لیں گی اور وہ اپنے ہی گناہوں کی رسیوں سے جکڑا جائے گا، وہ بے تربیت پائے مر جائے گا اور اپنی جہالت کی شدت میں بھٹکتا

---

❶ تناسخ کے رد میں الندوہ مئی، جون ۱۹۰۶ء میں مولانا عبدالسلام ندوی کا ایک مضمون ہے۔ ❷ دبستان المذاہب کا مصنف جو زردشتی مذاہب سے پوری واقفیت رکھتا تھا، اس نے اپنی کتاب میں اس کی پوری تفصیل درج کی ہے۔

پھرے گا (۵۔۲۱) دانیال میں ہے کہ اس وقت بہتیرے جو زمین میں خاک پر سو رہے ہیں جاگ اٹھیں گے، بعضے حیاتِ ابدی کے لیے اور بعضے رسوائی اور ذلت کے لیے (۱۲۔۲) حزقیال (۲۸) جنت کی طلائی اور جواہرات کی بنی ہوئی عمارتوں کے اشارات ہیں۔

حضرت مسیح سے پہلے یہودیوں میں ''صدوقی'' نام ایک فرقہ پیدا ہوا، جس نے حکمران یونانیوں کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ان کی بعض باتیں قبول کر کے یہودی تعلیم میں شامل کیں [1] منجملہ ان کے وہ قیامت اور حیاتِ اخروی کا بھی منکر ہوا، مگر اس کے مقابل کا دوسرا فرقہ جس نے اپنے کو فریسی (علیحدہ رہنے والا) کہا اپنے پرانے عقیدہ پر قائم رہا اور قیامت، حیاتِ اخروی اور جنت و دوزخ کے عقائد کو بدستور مانتا رہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں فریسی یہی اعتقاد رکھتے تھے کہ جنت مادی ہوگی اور وہاں بہشتیوں کو ان کی بیویاں واپس ملیں گی۔ (مرقس ۱۲۔۲۴) یہودیوں کی پچھلی کتابوں میں جزا وسزا کی تفصیل موجود ہے، چنانچہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب کے یہودی اس پر ایمان رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہود کیسے ہی گنا ہگار ہوں گے مگر چند روز سے زیادہ وہ دوزخ میں نہیں رہیں گے (۲/ بقرہ:۸۰، ۳/عمران:۲۴) یہ چند روز باختلاف روایت تین روز، چالیس روز [2] یا گیارہ مہینے ہیں۔ [3] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں یہودیوں کے ان دونوں فرقوں کے درمیان سخت اختلافات برپا تھے اور دونوں ایک دوسرے کی تردید وابطال میں مصروف تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آ کر صدوقیوں کے اس عقیدہ کی تردید کی اور قیامت اور جزا وسزا پر ایمان لانے کی تعلیم دی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری یوحنا نے اپنے مکاشفہ میں جنت اور دوزخ کی پوری تصویر کھینچی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس جواب سے جو انہوں نے ایک صدوقی کے سوال کا جواب دیا کہ اس دنیا میں لوگ شادی اور بیاہ نہیں کریں گے بلکہ فرشتوں کے مانند رہیں گے۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جنت کو صرف روحانی وجود بخشا ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی کی آخری شب میں اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ کر جب انگور کا افشردہ پیتے ہیں تو کہتے ہیں: ''میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کے پھل کا رس پھر نہ پیوں گا، اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہت میں نیا نہ بنوں''۔ (متی ۲۶۔۲۹، ۴۹) [4]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہودی علما کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:

''اے سانپو اور اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے۔'' (متی ۲۳۔۳۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے ایک وعظ میں دوزخ کا ایک منظر دکھاتے ہیں اور فرماتے ہیں:

''اس نے دوزخ کے درمیان عذاب میں ہو کے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور ابراہام (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کو دور سے دیکھا اور اس کی گود میں لعزر کو اور اس نے پکار کر کہا کہ اے باپ

---

[1] برٹش انسائیکلوپیڈیا مضمون صدوقین (صدوکیز)۔ [2] کتب تفسیر میں ان آیتوں کی تفسیر دیکھو۔

[3] سیل کا ترجمہ قرآن مجید حاشیہ زیر ترجمہ آیت بقرہ رکوع ۸۔

[4] اس کے اور آگے کے حوالوں کے لیے دیکھئے: الکتاب المقدس، کتاب العہد الجدید۔

ابراہام! مجھ پر رحم کر اور لعزر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی سے بھگو کر میری زبان ٹھنڈی کرے، کیونکہ میں اس لو میں تڑپتا ہوں۔'' (لوقا ۱۶۔۲۴)

مکاشفاتِ یوحنا میں دوزخ کو ''آگ اور گندھک'' کہا گیا ہے۔ (۱۴۔۱۰) اور متی کی انجیل میں اس کے دروازے بھی بتائے گئے ہیں۔ (متی ۱۶۔۱۸) اسی طرح جنت اور اس کی طلائی و جواہراتی تعمیر اور نہر آب حیات کا ذکر مکاشفات کے اکیسویں باب میں ہے اور وہاں کے انگوری افشردہ کا بیان متی میں ہے۔ (متی ۲۶۔۱۹) وہاں کے آب سرد کا ذکر بھی انجیل میں آتا ہے۔ (لوقا۔۱۶۔۲۴)

اسی طرح ہر ایک کے عمل کا حساب لیے جانے اور عمل کے مطابق بدلہ ملنے کا ذکر بھی حواریوں کے خطوط میں موجود ہے۔

''مبارک وہ مرد ہے جس کے گناہوں کا حساب خداوند نہ لے گا۔'' (رومیون ۲۔۸۰)

''سو ہر ایک ہم میں سے خدا کو اپنا حساب آپ دے گا۔'' (رومیون ۱۴۔۱۱)

''لیکن دے اس کو جو زندوں اور مردوں کا انصاف کرنے پر تیار ہے حساب دیں گیا۔'' (اول پطرس ۴۔۵)

اس باب میں اسلام کا تکمیلی پہلو یہ ہے کہ اس نے اس عقیدہ کو نہ صرف پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہی کیا، بلکہ اس کے تمام ضروری اجزا فراہم کیے گزشتہ مذاہب کے تشنہ بیانات پر سیر حاصل بحثیں کیں اور ان کے نقائص کی تکمیل کی اور جزا و سزا کے اصول اس طرح بیان کیے کہ اس عقیدہ کا ہر پہلو شکوک و شبہات سے پاک ہو گیا۔

آیندہ مباحث کے سمجھنے کے لیے پہلے چند اصول ذہن نشین کر لینے چاہییں۔

عالم آخرت کا فہم و ادراک

اس عالم آخر میں جو کچھ ہوگا وہ اگرچہ ہمارے اس زیر تجربہ و زیرِ مشاہدہ مادی عالم سے بالکل الگ ہوگا تاہم چونکہ انسانی فہم کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان و محاورات میں ادا کیا گیا ہے، جو اس مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہے، اس لیے ان الفاظ کے ساتھ جو مادی خصائص و لوازم مستلزم ہو گئے ہیں یا ہم ان کے دیکھنے اور سننے کے اس دنیا میں عادی ہو گئے ہیں ان لفظوں کو سن کر ہم بعینہ وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو اس دنیا میں ان لفظوں سے سمجھتے رہے ہیں اور اسی سبب سے بعض کم فہم وہاں کے وقائع و احوال کا بیان سن کر ان میں سے بعض امور کو محال اور ناممکن کہہ اٹھتے ہیں اور بعضے ان کی تشریح و تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ لفظ و معنی میں ادنیٰ اشتراک بھی باقی نہیں رہتا، یہ دونوں راستے سخت خطرناک ہیں، اسی لیے وحی محمدی ﷺ نے ان نازک و دقیق اسرار کے بیان میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کا پورا لحاظ کیا ہے، اس نے نہ تو یہودیوں کی طرح ان واقعات کو سرتاپا مادی کہہ کر اس عالمِ آخرت کو بھی سرتاپا عالم آب و گل بنا دیا ہے اور نہ عقل و خرد کے بعض نادان

مدعیوں کی طرح ان کو مادہ سے اتنا بلند و برتر کیا ہے کہ ان کا وجود ہی موہوم و فرضی ہو گیا ہے بلکہ انسانی عقلوں کے اختلاف مراتب کالحاظ کر کے بزم کے اہلِ نظر تماشائیوں اور دونوں کی تشفی اور تسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

ان اخروی وقائع کے مختلف الخیال مفہوموں اور مصداقوں کالحاظ کر کے وحی محمدی ﷺ نے ایسے جچے تلے الفاظ اختیار کیے ہیں جن سے ایک فلسفی بھی بہرہ یاب ہو سکتا ہے اور ایک عامی بھی اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے ایمان کا لطف اٹھا سکتے ہیں اور ایک ایسے مذہب کے لیے جو سارے انسانی طبقوں کو اپنا مخاطب بنانے کا دعویٰ کرتا ہے ایسی ہی وسعت کی ضرورت تھی، تاکہ وہ سب کے لیے اپنی اپنی جگہ پر تشفی کا باعث ہو سکے ان تمام اخروی واقعات کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ ظاہر ہے کہ طبعاً وہی الفاظ ہو سکتے ہیں جن کے چاروں طرف اس دنیا میں تمام تر مادی ماحول، مادی مفہوم و مصداق اور جسمانی تخیلات ہر چار طرف سے لپٹے ہیں، ان لفظوں کے سننے کے ساتھ جو مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ سرتاپا انہی مادی قیود و لوازم کے ساتھ آتا ہے، ہم جب ''آگ'' کا لفظ سنتے ہیں تو معاً اس دنیاوی آگ کا مفہوم ذہن میں آتا ہے جس کو ہم یہاں دیکھتے ہیں جو انسانوں اور درختوں کو اور ہر چیز کو جو اس کے اندر ہوتی ہے بلاتمیز یکساں جلا دیتی ہے مگر اخروی آگ ایسی نہ ہوگی اس کے اندر بعض درخت ہوں گے جو نہیں جلیں گے وہ صرف گناہگار انسانوں کو جلائے گی، کسی کے پاؤں چھوئے گی، کسی کی کمر تک آئے گی، کسی کے گلے تک پہنچے گی، وہ ایسی تیز و گرم ہوگی کہ یہ دنیاوی آگ، اس کے مقابلہ میں ٹھنڈک ہے۔ ''وزن'' کا لفظ سننے کے ساتھ ہمارے سامنے اس عالم میں تولنے کی ساری خصوصیتیں آجاتی ہیں ترازو، پاسنگ، پلڑے ڈنڈی اور تولی جانے والی چیز میں جسمیت اور ثقل کا ہونا۔ اسی طرح نامہ عمل کے لکھنے کا مفہوم جب ہم سمجھنا چاہیں گے تو کاتب کی انگلیاں، قلم، دوات، سیاہی، کاغذ اور حروف کی ساری قیدیں ہمارے ذہن میں آئیں گی اس بنا پر ان الفاظ کے سراسر لغوی معنوں اور اس کے قریب الفہم مجازی معنوں کے سمجھنے میں اختلاف آراء کی بڑی گنجائش ہے اس لیے حق تو یہ ہے کہ ان پر بلا مزید تشریح اس طرح ایمان لایا جائے، کہ ہماری تشریح سے ان کے الفاظ کے مفہوم کی وسعت تنگ نہ ہو جائے بایں ہمہ ان لوگوں کو بھی دائرہ سے خارج نہ کیا جائے جو ان الفاظ سے وہ مفہوم سمجھ کر تسلی پانا چاہتے ہیں، جن کے وہ الفاظ متحمل ہو سکتے ہیں اگر مرادِ الٰہی یہی تنگی ہوتی تو اللہ تعالیٰ انسانی عقلوں کے اس اختلافِ مراتب کالحاظ کیے بغیر اپنے مفہوم کو اس وسعت کے بجائے تنگ سے تنگ الفاظ میں ظاہر فرما سکتا تھا مگر ایسا نہیں کیا، تاکہ اسلام تمام مختلف العقول انسانوں کے لیے عالم گیر ثابت ہو سکے۔

ایک دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ عالمِ آخرت کے وقائع اور حالات کے سمجھنے میں اشکالات و اعتراضات اس لیے پیش آتے ہیں کہ ہم وجود اور اس کے موجودہ قوانین فطرت کو اس طرح لازم و ملزوم سمجھتے ہیں کہ جب کسی شے کے وجود کا تذکرہ کیا جائے گا تو معاً اس کے وہی خصوصیات و لوازم سامنے آئیں گے جن

کے دیکھنے کے ہم اس دنیا میں عادی ہیں حالانکہ اربابِ عقل نے یہ طے کر دیا ہے کہ اس موجودہ دنیا کے معلومات و مسببات اور ان کے موجودہ علل و اسباب میں جو لزوم ہیں وہ محض عادی ہیں یعنی اس لیے ایسا ہے کہ ہم ایسا دیکھتے ہیں یہ نہیں کہ اس لیے ایسا ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس بنا پر اگر صرف اتنی سی بات ذہن نشین کر لی جائے کہ موجودہ مادی دنیا میں جو قوانینِ فطرت اور علل و اسباب اور ان کے نتائج کارفرما ہیں وہ صرف اسی عالم اور موجودہ دنیا کے قوانین ہیں اگر خدا تعالیٰ کوئی نئی دنیا بنائے یا نیا عالم خلق کرے تو ضروری نہیں کہ یہی موجودہ قوانین فطرت وہاں بھی کارفرما ہوں، بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اس نئے عالم میں نئے قوانین پر عمل رہے، نئی خصوصیات کے جسم ہوں، نئی قسم کی زندگیاں ہوں، نئی قسم کی آگ ہو، نئی قسم کے باغ اور ان کے پھل ہوں، نئی قسم کے موجودات و مخلوقات ہوں، نئے علل و اسباب ہوں اور نئے قوانین فطرت ہوں وحی محمدی ﷺ نے اسی نئے عالم کے متعلق کہا ہے:

﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ ﴾ (١٤/ ابراهيم: ٤٨)

''جس دن یہ زمین نئی زمین سے بدل جائے گی اور آسمان (نئے آسمان سے)۔''

تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس نئی زمین اور نئے آسمان میں بھی وہی مادی قانون جاری ہوں گے، جو اس موجودہ زمین و آسمان میں جاری تھے اس بنا پر جسمانیت و مادیت کے وہ تمام اعتراضات اور آئندہ حیات کے متعلق اشکالات جو اس دنیا اور اس کے قوانین کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں۔ اس ضروری تمہید کے بعد جزا و سزا کی اسلامی تشریحات کی جانب قدم اٹھایا جاتا ہے، وھوا لھادی الی الصواب.

اصولِ جزا

اللہ تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے، جس کو اہلِ فلسفہ قانونِ قدرت اور اہل مذہب تقدیر اور اندازۂ الٰہی کہتے ہیں، اسی طرح اس نے اپنے ہر عالم کے لیے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے، جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار انجام پاتا ہے، انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ اصولِ فطرت صرف مادیات تک محدود ہیں، حالانکہ مادیات ہوں یا روحانیات، ذہنیات ہوں یا علمیات، ہر ایک میں یہ یکساں جاری و ساری ہیں جس طرح یہ قانونِ فطرت ہے کہ زہر کھانے سے انسان کا جسم مر جاتا ہے اسی طرح یہ بھی اصول فطرت ہے کہ گناہ سے اس کی روح مر جاتی ہے اور جس طرح اصولِ حفظانِ صحت کی عدم پیروی سے انسان بیمار ہو جاتا ہے اسی طرح اصول تزکیہ نفس کی عدم متابعت سے بھی وہ مریض ہو جاتا ہے پھر جس طرح دوا اصولِ حفظانِ صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی بیماری کے آلام سے نجات پاتا ہے ایسا ہی روحانی تدابیر علاج کے ذریعہ بھی وہ شفایاب ہوتا ہے۔

اعمال کے لوازم و نتائج

غرض جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے غرور اور خاکساری، بخل اور فیاضی، انتقام اور عفو، شجاعت اور بزدلی، تقویٰ اور فسق، ایمان اور کفر، ہر ایک کا ایک اثر و نتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں، جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے سَمِّیَّتْ، شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی اور ان معنوی روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی مادی اور طبیعاتی اشیاء میں ہے۔

اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد اور سعادت و شقاوت پر بھی حاوی ہیں، جس طرح ایک سائنٹسٹ (حکیم) کا کام ان مادی فزیکل اصول کو جاننا اور بتانا ہے اور اس کی اس تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت (سائنس) ہے، اسی طرح ان روحانی اسباب و علل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا انبیا علیہم السلام کا کام ہے اور ان کی اس تعلیم کا نام ''شریعت'' ہے، انبیا علیہم السلام کی اس تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے روحانی آثار و نتائج کے متعلق وہی یقین ہونا چاہیے جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیاء کے خواص اور آثار کے متعلق ہوتا ہے، سائیکالوجی (علم النفس) اور سوشیالوجی (علم الاجتماع) کی وسعتِ تحقیق نے اس مفہوم کے سمجھنے میں اب بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے۔

عقاب و ثواب ردِ عمل ہے

الغرض یہ مادی و جسمانی دنیا علت و معلول، عمل اور ردِ عمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرہ میں انسان کا ہر قول اور انسان کا ہر عمل شامل اور داخل ہے یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام میں عقاب اور اعمالِ صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے۔ قرآن نے انہیں دونوں اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے، عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لیے عقاب اس اثر کا نام ہے جو کسی فعل کے کرنے کے بعد لازم آ جاتا ہے اور ثواب کا لفظ ثوب سے لیا گیا ہے، جس کے معنی لوٹنے کے ہیں، اس لیے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجہ اور جزا کے معنی میں بولا گیا ہے۔ اسی ایک مسئلہ کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو جزا اور سزا کے شرعی اصول کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ چنانچہ قرآن پاک میں یہ کئی دفعہ فرمایا گیا ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ (٤٥/ الجاثیہ:٢٨)

''جو تم کرتے تھے، آج وہی بدلہ پاؤ گے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ یہ جزا وسزا ہمارے ہی اعمال کے ردِ عمل (ری ایکشن) کا نام ہے۔ ایک اور جگہ ہے:

﴿ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۵)

''تا کہ ہر جان کو اس کا بدلہ دیا جائے، جو وہ کرتی تھی۔''

ان آیتوں میں یہ صاف تصریح ہے کہ یہ جزا وسزا اتمام تر ہمارے دنیاوی اعمال کے آثار ولوازم ہیں:

﴿ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ﴾

(۱٦/ النحل:۳٤)

''تو ان کے برے کام ان پر پڑے اور ان کا ٹھٹھا کرنا ان پر الٹ پڑا۔''

غرض جزا وسزا انہیں اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے گویا اسی اصول کی تشریح میں یہ اشارہ فرمایا کہ ''قیامت میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں جو میں تم کو لوٹا کر یہاں دے رہا ہوں، تو جو کوئی جزائے خیر پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے وہ خود کو ملامت کرے۔'' [1]

حصولِ راحت کا اصول

یہ فطری قانون ہے کہ ہم کسی بڑی تکلیف سے اسی وقت بچ سکتے ہیں جب اس کی خاطر ہم اس سے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو برداشت کریں اور کسی بڑی خوشی کے حصول کے لیے ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو قربان کرتے رہیں۔ عاجلہ یعنی موجودہ اور آخرہ یعنی آیندہ ان دونوں کا جب کبھی تقابل پیش آتا ہے تو دون ہمت اور پست خیال لوگ عموماً موجودہ (عاجلہ) راحت کو پسند کر کے آیندہ راحت کی فکر نہیں کرتے کہ ان کی نگاہ میں موجودہ راحت گو چھوٹی مگر نقد ہے اور آیندہ کی راحت گو بڑی اور خوش آیند ہو مگر وہ نسیہ ہے اور ان کا اصول یہ ہے کہ ''نقد را بہ نسیہ مگزار'' لیکن بلند ہمت اور عالی حوصلہ طبائع کا طریق عمل اس کے بالکل برخلاف ہے۔ فاتح اور کشور کشا آج اپنی جانوں کو جوکھم میں ڈالتے ہیں، تا کہ کل سلطنت ان کے ہاتھ آئے۔ تاجر اور سوداگر آج اپنے سرمایہ کو بازار کے سپرد کر دیتے ہیں، تا کہ دولت فردا سے وہ بہرہ مند ہوں ہر مہذب انسان اپنے بچہ کو بیس پچیس برس تک تعلیم وتربیت اور مشق وامتحان کی مصیبتوں کی آگ میں بے تامل جھونک دیتا ہے، تا کہ اس کی آیندہ کی زندگی راحت ومسرت میں بسر ہو۔ لوگ اپنے سرمایۂ عزیز کو تکلیفیں اٹھا اٹھا کر جمع کرتے جاتے ہیں، تا کہ کل اس سے زیادہ ضروری موقع پر اس کو کام میں لا سکیں اور تنگ دستی کی بڑی تکلیف سے بچ سکیں۔

غرض اگر انسانوں کی تمام کوششوں پر ایک غائر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ کامیابی کے حصول کا یہی اصول ان کے اندر جاری وساری ہے کہ تھوڑی سی تکلیف کو اس لیے برداشت کر لیا جائے کہ کسی بڑی تکلیف

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم: ٦٥٧٢ وادب المفرد وبخاری، باب الظلم ظلمات: ٤٩٥۔

سے رہائی ملے اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اس لیے برباد کر دیا جائے کہ کوئی بڑی خوشی حاصل ہو اور عارضی کامیابیوں کو اس غرض سے قربان کیا جائے کہ کوئی پائدار اور دائمی کامیابی نصیب ہو مگر یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ آیندہ کی خوشی و کامیابی کی فراوانی اور اس کے دوام و پائداری کا ہم کو یقین ہو کہ اگر ایسا یقین نہ ہو تو ہم کبھی اس ایثار وقربانی پر آمادہ نہ ہوں، اسی لیے ایمان کی ضرورت ہے، تا کہ ہمارے اندر یہ یقین پیدا ہو جائے اور ہم اس ایثار وقربانی کو خوشی خوشی گوارا کر لیں۔ جن لوگوں میں یہ یقین پیدا نہ ہوگا ان سے یہ عظیم الشان قربانی بھی نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے گناہگار انسانوں کی یہ کیفیت قرآن نے بیان کی ہے:

﴿ كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۝ ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۲۰، ۲۱)

''ہرگز نہیں بات یہ ہے کہ تم موجودہ زندگی سے محبت رکھتے ہو اور آیندہ زندگی کو چھوڑ تے ہو۔''

حالانکہ انسان اسی اصولِ کار کو اگر دنیا کی طرح آخرت کے معاملات میں بھی برتے تو اس کی کامیابی میں کوئی شک نہ رہے، آیندہ کا خیال کر کے موجودہ سے دست بردار ہو جانا یہی کامیابی کی کنجی ہے اور اسی اصول کے تحت میں دین ودنیا کی تمام نیکیوں اور کامیابیوں کا راز پوشیدہ ہے، موجودہ عارضی لذت کو آیندہ کی دائمی لذت پر اور حال کی معمولی راحت کو مستقبل کی دیرپا راحت پر قربان کر دینا وہ سچائی ہے جس کے تسلیم کرنے سے کوئی انحراف نہیں کر سکتا۔ تم صبح خیزی کی معمولی تکلیف کو صحت کی دیرپا راحت کی خاطر قربان کرتے ہو۔ ورزش اور دوڑ دھوپ کی محنت کو اس لیے قبول کرتے ہو کہ کل کی پیری اور بیماری کی تکلیف سے تم کو وہ بچائے۔ غرض آج کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو اٹھاؤ گے تو کل کی بڑی تکلیف سے تم کو نجات مل سکے گی اور آج کی عارضی خوشیوں کو قربان کرو گے تو کل کی دائمی خوشی نصیب ہوگی۔ یہی وہ فلسفہ ہے جس کو قرآن نے اس آیت میں ادا کیا ہے:

﴿ وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝ ﴾ (۷۶/ الدھر:۱۲)

''اور خدا نے ان کے صبر کرنے پر ان کو باغ اور ریشم کے کپڑے اور مزدوری دی۔''

یہ صبر کیا تھا؟ دنیا کی عارضی خوشیوں کی قربانی، تا کہ آخرت کی بڑی تکلیف سے نجات ملے، یہی سبب ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ

((حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ)) [1]

''یعنی جنت دنیاوی تکلیفوں سے اور دوزخ دنیا کی معمولی خوشیوں سے گھری ہوئی ہے۔''

نادان تقویٰ اور نیکی کی ان معمولی قیدوں سے گھبراتے ہیں اور گناہ کی عارضی وفانی لذتوں کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اس لیے آخرت کی بڑی تکلیف میں گرفتار ہوں گے اور وہاں کی ابدی لذت سے محروم رہیں گے اور جو دین و دیانت اور نیکی و تقویٰ کی ان معمولی تکلیفوں کو گوارا کریں گے اور گناہ کی عارضی لذتوں سے بچیں گے وہ آخرت کی لاانتہا لذتوں سے شادکام ہوں گے۔ یہی فلسفہ قرآنِ پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے:

[1] جامع ترمذی، ابواب صفۃ الجنۃ، باب ماجاء حفت الجنۃ بالمکارہ:۲۵۵۹۔

﴿ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىۙ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰىؕ۝ ﴾

(۷۹/ النازعات: ۴۰، ۴۱)

’’لیکن جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو ناجائز لذتوں اور خوشیوں سے باز رکھا، تو جنت اس کا ٹھکانا ہے۔‘‘

نامۂ عمل

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز بھی ایک دفعہ پیدا ہو جاتی ہے پھر وہ بلا حکم خدا فنا نہیں ہوتی۔ اسی طرح افعال و اعمال بھی جو انسان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ فنا نہیں ہوتے۔ موجودہ سائنس جس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بھی پیدا ہو کر فنا نہیں ہوتی یہاں تک کہ فضا میں ہر آواز اور ہر صدا بھی جو کبھی بلند ہوئی ہے، آج موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی اور ہم اس کو پکڑ پائیں تو سن سکتے ہیں، وہ اعمال و افعال کے دوامِ وجود کے اسلامی عقیدہ کے قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کر سکتی، دنیا کے ریکارڈ میں انسان کا ہر عمل و فعل ہمیشہ کے لیے گویا بھرا ہوا ہے۔ قرآن پاک نے اسی اصول کو اپنی ان آیتوں میں بیان کیا ہے:

﴿ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ ﴾ (۱۰/ یونس: ۳۰)

’’اس وقت ہر جان جو اس نے پہلے کیا اس کو آزمالے گی۔‘‘

﴿ كُلُّ امْرِیءٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ۝ ﴾ (۵۲/ الطور: ۲۱)

’’ہر آدمی اپنے عمل کے بدلہ گرو ہے۔‘‘

﴿ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌۙ۝ ﴾ (۷۴/ المدثر: ۳۸)

’’ہر جان اپنے عمل کے بدلہ گرو ہے۔‘‘

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗؕ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۝ ﴾

(۹۹/ الزلزال: ۷، ۸)

’’تو جو کوئی ایک چیونٹی بھر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھے گا اور جو چیونٹی برابر بدی کرے گا، وہ اس کو بھی دیکھے گا۔‘‘

﴿ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ ﴾

(۳/ آل عمران: ۳۰)

’’جس دن ہر جان جو اس نے اچھے کام کیے، ان کو موجود پائے گی اور جو برے کام کیے وہ بھی۔‘‘

یہ بات کہ انسان کا ہر عمل و فعل صحیفۂ عالم پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جاتا ہے، اس کو قرآن نے کئی طریقوں سے ادا کیا ہے۔

ایک اس طرح کہ انسان کی زبان سے جب کبھی کوئی لفظ نکلتا ہے خواہ وہ کتنا ہی تنہائی میں بولا جائے، خدائی شاہد اس کے سننے کو موجود رہتے ہیں اور وہ اس کو سن کر محفوظ کر لیتے ہیں:

﴿ إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۝ ﴾ (۵۰/ ق:۱۷، ۱۸)

''جب دو لینے والے داہنے اور بائیں بیٹھے لیتے جاتے ہیں، کوئی بات وہ نہیں بولتا، مگر ایک نگران اس کے پاس حاضر رہتا ہے۔''

کبھی اس کو اعمال کی تحریر و کتابت کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:

﴿ أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ ۚ بَلَىٰ وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ ۝ ﴾

(۴۳/ الزخرف:۸۰)

''کیا یہ منکر سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور ان کی کانا پھوسی نہیں سنتے، کیوں نہیں، بلکہ ہمارے فرستادہ ان کے پاس اعمال لکھتے ہیں۔''

﴿ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ۝ ﴾ (۱۰/ یونس:۲۱)

''بے شک ہمارے فرستادہ تمہاری چالوں کو لکھتے رہتے ہیں۔''

کبھی اللہ تعالیٰ ہر عمل کے موقع پر خود اپنی حاضری اور دائمی علم و شہادت کو ظاہر کرتا ہے:

﴿ وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُو مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ ۚ ﴾ (۱۰/ یونس:۶۱)

''اور تو کسی کام میں نہیں ہوتا اور نہ قرآن سے کچھ پڑھتا ہے اور نہ تم لوگ کوئی کام کرتے ہو، لیکن ہم موجود ہوتے ہیں، جب تم اس میں لگے ہوتے ہو۔''

کبھی یہ کہا کہ ہر انسان کا نامۂ عمل اس کی گردن میں لٹکا ہے، قیامت کے دن وہی فرد عمل کی صورت میں انسان کے سامنے پھیلا دیا جائے گا کہ اپنا اعمال نامہ تم خود پڑھ لو۔ فرمایا:

﴿ وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ ۖ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنْشُورًا ۝ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل:۱۳، ۱۴)

''اور ہم نے ہر انسان کا نتیجۂ عمل اس کی گردن میں چپکا دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو دفتر کر کے نکالیں گے، جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا، اپنا دفتر پڑھ لے آج تیرا نفس خود ہی محاسب ہو تو کافی ہے۔''

اس آیت کا ایسا محمل ہے کہ نامۂ عمل کو اگر کوئی واقعی کاغذ کا دفتر یا حساب و کتاب کا رجسٹر نہ سمجھے تو سمجھ سکتا

ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یہ تعبیر اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ جس طرح کاغذ اور رجسٹر میں قلم بند حساب کوئی بھول نہیں سکتا اور ایک ایک چیز اس میں درج ہوتی ہے اسی طرح یہ اعمالِ انسانی فراموش نہ ہوں گے بلکہ لکھے ہوئے رجسٹر کی طرح محفوظ رہیں گے، فرمایا:

﴿ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴾ (١٨/ الکهف:٤٩)

''اور نامہ اعمال رکھا جائے گا تو، تو دیکھے گا گنہگاروں کو، اس میں جو لکھا ہے اس سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے کہ ہائے افسوس کہ اس کاغذ کو کیا ہے کہ کوئی چھوٹی بڑی بات نہیں چھوڑتا، لیکن اس کو شمار کر لیا ہے اور جو کچھ انہوں نے زندگی میں کیا اس کو سامنے پائیں گے اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہ کرے گا۔''

بایں ہمہ اگر کوئی ٹھیٹ لفظوں کا پابند ہو کر نامۂ اعمال کو واقعی کاغذوں کا دفتر سمجھتا ہے تو اس میں شک نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معنی اس کی تائید کریں گے مگر کون سمجھا سکتا ہے کہ یہ کیونکر ہوگا اسی لیے اس پر بحث فضول ہے کہ یہ کیونکر ہوگا، چاہے یہ ہو یا وہ، بہر حال ہمارے اعمال کا ایک ایک نقطہ محفوظ رہے گا اور وہ خدا کے سامنے پیش ہوگا اور یہی اس عقیدہ کا اصل مقصد ہے۔

اعضا کی شہادت

انسان کا ہر عمل اپنے پیچھے اپنے کرنے والے کے اندر اپنا اچھا یا بُرا اثر چھوڑ جاتا ہے، اگر دل کا آئینہ صاف ہو تو اس کو اپنے عمل کا چہرہ اس میں صاف دکھائی دے، فرمایا:

﴿ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۭ ﴾ (٧٥/ القیامه:١٤، ١٥)

''بلکہ انسان کو اپنے نفس کا حال آپ دکھائی دیتا ہے، اگر چہ وہ اپنے عذر تراشتا ہے۔''

یہی وہ آئینہ ہے جو گناہ کے میل سے زنگ آلود ہو جاتا ہے:

﴿ كَلَّا بَلْ ۫ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ﴾ (٨٣/ المطففین:١٤)

''نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔''

اسی آیت کی تفسیر میں گویا آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ ''جب انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے اور اگر وہ توبہ و انابت کرتا ہے اور آیندہ اس سے باز رہتا ہے تو وہ مٹ جاتا ہے اور اگر اسی طرح گناہ کیے جاتا ہے تو اس نقطہ کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک دن پورے دل پر چھا جاتا ہے۔'' [1]

[1] ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة ویل للمطففین: ٣٣٣٤۔

اسی طرح سے وہ اپنے اعضا سے جو برا کام کرتا ہے اس کا اثر ان پر چھا جاتا ہے، یہاں تک کہ چہروں پر اس اثر کے نقوش ابھر آتے ہیں، آنکھوں میں اس کی لکیریں پڑ جاتی ہیں اور ہاتھ پر اس کے نشان نمایاں ہو جاتے ہیں، عالم غیب کو چھوڑو، اسی عالمِ ظاہر میں تاڑنے والوں کی نگاہیں انسانوں کے چہروں آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کے عنوان بیان سے انسان کے اندر کی تحریریں پڑھ لیتی ہیں، اسی طرح قیامت میں ان کے اعمال کے آثار ونتائج ان کے ایک ایک عضو سے نمایاں ہوں گے:

﴿ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ ﴾ (۵۵/ الرحمن:۴۱)

''گنہگار اپنی پیشانی سے پہچان لیے جائیں گے۔''

ایسی حالت میں اس وقت جب انسان کی زبان قال پر خداوند عدالت کے رعب وجلال سے مہرِ سکوت پڑ جائے گی اگر انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھال تک نفسِ انسانی کے اعمالِ بد پر گواہی دے دیں تو تعجب کی کیا بات ہے، فرمایا:

﴿ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ۝ أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ وَأَنِ اعْبُدُونِي ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝ وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا ۖ أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ۝ هَٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ۝ اصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ ﴾ (۳۶/ یٰسٓ:۵۹۔۶۵)

''اے گناہگارو! آج نیکوکاروں سے الگ ہو کر پہچان میں آ جاؤ......... آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔''

﴿ وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ۝ حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ (۴۱/ حٰمٓ السجدة:۱۹۔۲۱)

''اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے اور وہ درجہ بدرجہ بانٹے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو ان کے کانوں، ان کی آنکھوں اور ان کی کھالوں نے ان پر ان کے کرتوتوں کی گواہی دی اور انہوں نے کہا تم نے ہم پر کیوں گواہی دی، کہا کہ جس خدا نے ہر چیز کو گویا کیا اسی نے ہم کو بھی گویا کیا۔''

اس لیے ان اعضا کی گویائی بھی اسی نوع کی ہوگی جس نوع کی گویائی دنیا کی ہر چیز کو حاصل ہے، لیکن

اس گویائی سے اگر کوئی حقیقی زبان کی گویائی مراد لے کر تشفی پاتا ہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے۔

میزان

اکثر انسانوں کے اچھے یا برے دونوں قسم کے اعمال ہوتے ہیں، ایک قسم کا عمل کم ہوگا اور دوسرا زیادہ یا دونوں برابر دو مادی چیزوں کے درمیان تفاضل اور گھٹ بڑھ کا علم ہم کو تولنے یا گننے سے ہوتا ہے، اس لیے وزن اور حساب سے عموماً عدل، وانصاف، حق اور ٹھیک ٹھیک کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے۔ اعمالِ انسانی کے متعلق خدا نے فرمایا۔ ہے کہ انسان کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ ملے گا، فرمایا:

﴿ جَزَآءً وِّفَاقًا ۝﴾ (۷۸/ النبآء:۲٦) ''پورا پورا بدلہ۔''

اس برابری اور کمال عدل وانصاف کے مفہوم کو ترازو کی ناپ اور عدالت کی میزان کے استعارہ سے ادا کیا، فرمایا:

﴿ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ﴾

(۷/ الاعراف:۷۔۹)

''پھر ہم احوال سنائیں گے اور ہم کہیں غائب نہ تھے اور وزن اس دن حق ہے، پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں تو وہ ہیں جن کا بھلا ہوا اور جس کی تولیں ہلکی پڑیں سو وہی ہیں جو اپنی جانیں ہار بیٹھے۔''

﴿ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝﴾

(۱۰۱/ القارعۃ:٦۔۹)

''تو جس کی تول بھاری ہوئی، تو وہ خوش خوش عیش میں ہوگا اور جس کی تول ہلکی ہوئی تو اس کی ماں دوزخ ہوگی۔''

ان دونوں آیتوں میں تول کے بھاری اور ہلکے ہونے سے مقصود اعمال خیر کی کمی وبیشی ہے۔ پہلی آیت میں اس کا اشارہ موجود ہے کہ وزن سے مراد حق وعدل ہے اور یہ کہ انسان کا ہر عمل علمِ الٰہی میں موجود ہوگا اور وہ کسی طرح کم وبیش نہ ہوگا۔

اس مفہوم میں یہ استعارہ قرآن میں بکثرت مستعمل ہوا ہے۔ ایک جگہ ہے:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۱۷)

''وہ اللہ جس نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا اور میزان کو۔''

یعنی کتاب الٰہی حقانیت کے ساتھ اُتری ہے اور اسی کے ساتھ میزان بھی، جس سے مراد عدل ہے،

(طبری تفسیر آیت مذکورہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام کائنات کی ہر چیز میں جو اعتدال کامل رکھا ہے اس کو بھی میزان ہی کے لفظ سے ادا فرمایا ہے:

﴿ وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ ﴾ (۵۵/ الرحمان:۷) ''اور خدا نے ترازو رکھی ہے۔''

حساب

کمی بیشی کے علم کا دوسرا طریقہ حساب کرنے کا ہے، دوسری آسمانی کتابوں کی طرح قرآن میں بھی یہ استعارہ استعمال ہوا ہے اور بار بار فرمایا ہے کہ ہم قیامت میں تمہارے عمل کا حساب لیں گے، مگر اس حساب سے بھی وہی مقصود ہے جو وزن سے ہے، چنانچہ سورۂ انبیاء میں یہ مفہوم مزید تصریح کے ساتھ مذکور ہے اور جس سے میزان کی حقیقت بھی پوری طرح سمجھ میں آتی ہے، فرمایا:

﴿ وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۖ وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا ۗ وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۴۷)

''اور ہم قیامت کے دن کے لیے ترازوئیں یعنی انصاف رکھیں گے، پھر کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا، اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کچھ ہوگا، تو ہم لے آئیں گے اور ہم کافی ہیں، حساب کرنے والے۔''

اس آیت سے دو باتیں سمجھی جا سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ وزن سے مقصود انصاف اور عدم ظلم ہے اور دوسری یہ کہ حساب سے مقصود یہ ہے کہ عمل انسانی کا کوئی ذرہ بھی معاوضہ میں چھوٹنے نہ پائے گا اور نہ وہ خدا کے علم سے غائب ہے، لیکن بہر حال وزن وحساب کے مادی ہی مفہوموں کو اگر صحیح باور کرتا ہے تو وہ بھی حق پر ہے۔

جنت ودوزخ

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اعمال کی تکلیف اور ذمہ داری سے مقصود الٰہی کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ ارواح انسانی کو سعادت ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی عطا کی جائیں مگر اس سعادت وترقی کی بنیاد خدا نے اعمال نیک کے حصول اور اعمالِ بد سے پرہیز پر رکھی ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ خلقت انسانی کی غرض یہ ہے کہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل کرے، تاکہ وہ اپنی مقررہ سعادت اور موعودہ ترقی کو حاصل کرے اور اسی عالم کا نام جہاں یہ سعادت ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی ملتی ہیں بہشت ہے اور اس عالم کا نام جہاں جاکر دنیاوی کمیوں کی تلافی اور گزشتہ حیاتِ فانی کے اعمالِ بد کے نتائج سے پاکی حاصل ہوگی دوزخ ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ جنت ہی انسان کا اصلی گھر ہے۔ مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

جنت انسان کی وراثت ہے

حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ جو توراۃ اور قرآن پاک میں مذکور ہے، وہ آغاز خلقت کی محض تاریخ نہیں، بلکہ وہ حقیقتِ انسانی کی سچی اور حقیقی تفسیر ہے، عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو

اپنے فضل سے جس جنت میں جگہ دی تھی وہ پہلے ان کو اور ان کی نسل کو ہمیشہ کے لیے دے دی گئی تھی مگر چونکہ اتفاقاً ان سے گناہ سرزد ہوا اس لیے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیے گئے، مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کا زمین میں آنا تو ان کی پیدائش سے پہلے ہی مقرر ہو چکا تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی خلقت سے پہلے ہی فرشتوں پر یہ ظاہر کر چکا تھا کہ

﴿ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ ﴾ (۲/ البقرة:۳۰)

''میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

حضرت آدم علیہ السلام کا زمین میں خلیفہ ہونا ان کے زمین میں سکونت پذیر ہونے کی پیشین گوئی ہے، مگر زمین میں بھیجنے سے پہلے ان کو جنت میں رکھنا پھر گناہ کے بعد وہاں سے ان کو نکال کر زمین میں بھیجنا یہ اشارہ رکھتا ہے کہ آدم علیہ السلام اور ان کی نسل کی اصلی جگہ یہی جنت ہے، مگر اس سے دُوری اس کے گناہ کی وجہ سے ہے اور اس کا حصول خدا کی اطاعت اور نیکوکاری کے ذریعہ ہوگا، چنانچہ ان کے زمین میں اترتے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمادیا:

﴿ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴾

(۲/ البقرة:۳۸، ۳۹)

''ہم نے کہا، تم سب اس جنت سے اترو، پھر کبھی تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے، تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی، تو اس کو نہ ڈر ہوگا نہ غم اور جنھوں نے نہ مانا اور ہمارے حکموں کو جھٹلایا تو وہی ہیں دوزخ والے اور وہ اس میں رہا کریں گے۔''

﴿ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِیْعًۢا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی ۝ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ۝ ﴾ (۲۰/ طٰه:۱۲۳، ۱۲۴)

''خدا نے کہا کہ اس جنت سے تم دونوں ایک ساتھ اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی راہنمائی آئے، تو جس نے میری راہنمائی کی پیروی کی، تو وہ گمراہ نہ ہوگا اور نہ بدبخت ہوگا اور جس نے میری یاد سے منہ پھیرا، تو اس کے لیے تنگ معاش ہوگی اور قیامت میں ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔''

تورات میں ہے کہ جنت میں دو درخت تھے، ایک نیک و بد کی پہچان کا اور دوسرا زندگی جاوید کا، توراۃ کی رو سے آدم علیہ السلام کو اسی نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا ہے لیکن آدم نے

اس کو کھالیا اور اس کی وجہ سے سب سے پہلے ان کو اپنی برہنگی کا علم ہوا، آخر خدا نے ان کو جنت سے نکال دیا کہ وہ زندگی کے درخت کا پھل کھا کر خدائی کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں، جب وہ جنت سے نکالے گئے، تو ان سے کہا گیا (سفر تکوین۔۲)

''اور اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھ سے حکم کیا کہ اس سے مت کھانا، زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا اور وہ تیرے لیے کانٹے اور اونٹ کٹارے اگائے گی اور تو کھیت کی نبات کھائے گا اور تو اپنے منہ کے پسینہ کی روٹی کھائے گا، جب تک کہ زمین میں پھر نہ جائے۔''

قرآن پاک میں اس درخت کا نام جس کے پھل کھانے سے آدم کو روکا گیا تھا تصریحًا مذکور نہیں، لیکن ایک آیت سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک و بد کی شناخت کا درخت تھا اور شیطان نے یہ کہہ کر ان کو کھلایا کہ ''یہ حیاتِ جاوید اور ملک جاوداں کا درخت ہے۔'' مگر اس کے کھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو ''برہنگی کا علم'' ہو گیا جو نیک و بد کی تمیز کا نتیجہ ہے۔ فرمایا:

﴿ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا ﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۱۲۰، ۱۲۱)

''شیطان نے آدم کو وسوسہ دیا اور کہا اے آدم! کیا میں تجھے حیات جاودانی اور سلطنت غیر فانی کا درخت بتاؤں تو (آدم اور حوا) دونوں نے اس درخت کا پھل کھایا تو ان کی بری چیزیں ان پر کھل گئیں۔''

اب سوال یہ ہے کہ ''حیاتِ جاوداں'' اور ''غیر فانی بادشاہی'' سے مقصود کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ جنت ہے، شیطان کا مقصود یہ تھا کہ اس جنت میں جس میں تم اب ہو، بے دردسر ہمیشہ رہنے کا نسخہ تم کو بتاؤں؟ انسان نے خواہش کی تو اس نے نیک و بد کی تمیز کے درخت کا پھل بتا دیا، یہ بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نیک و بد کی تمیز ہی پر انسان کی شرعی تکلیف اور مؤاخذہ کی بنیاد ہے۔ ہر وہ مخلوق بلکہ ہر وہ انسان جو اس ادراک سے خالی ہے وہ شرعی تکلیف اور مؤاخذہ سے بھی گرانبار نہیں ہے، غرض اس خیر و شر کی معرفت کا لازمی نتیجہ شریعت کی تکلیف تھی، چنانچہ وہ اس کے سر ڈالی گئی اور پھر نسل آدم میں یہ نیک و بد کی تمیز فطری الہام کے ذریعہ عنایت ہوئی، فرمایا:

﴿ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ ﴾ (۹۱/ الشمس: ۷، ۸)

''اور نفس اور اس کی بناوٹ کی قسم، پھر نفس میں اس کی بدی اور نیکی کو الہام کیا۔''

عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیتیں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہوں:

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا

وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝ لِّيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۷۲، ۷۳)

''ہم نے اپنی امانت (تکلیفِ شرعی) آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور انسان نے اس کو اٹھا لیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا، تاکہ اللہ نفاق والوں اور نفاق والیوں، شرک والوں اور شرک والیوں کو سزا دے اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر رجوع ہو اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

انسان نے اپنی جہالت سے اس تکلیف شرعی کی امانت کو اٹھا لیا جو نیک و بد کی معرفت کا لازمی نتیجہ تھا اور اس تکلیف شرعی کا لازمی نتیجہ جزا اور سزا تھی لیکن خدا کی رضامندی یہی تھی کہ اس کے سب بندے اس کی رحمت اور مغفرت کے مستحق ٹھہریں کہ اس کی رحمت و شفقت کا اقتضا یہی ہے کہ گناہگاروں کو معاف کرے اور نیکوکاروں پر اپنی خاص رحمت نازل کرے لیکن اگر کاشت کار اپنے کھیتوں کو ابر رحمت سے مستفید ہونے کے قابل نہ بنائے تو وہ اس کی برکت سے مستفید نہ ہوگا، اسی طرح جو بندہ شرک و نفاق میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو اس کی رحمت کے قابل نہ بنائے تو وہ بھی اس کی رحمت کی بارش سے سیراب نہ ہو سکے گا۔

غرض اس طرح وہ مصلحت الٰہی جو انسان کی پیدائش سے تھی اس صورت سے پوری ہوئی اور وہ حیات جاوید اور غیر فانی بادشاہی جس کا حصول قضائے الٰہی نے انسان کی محنت، جدوجہد اور سعی و عمل پر موقوف رکھا تھا اور جیسے شیطان نے آدم کو بلا سعی و محنت محض بخت و اتفاق سے دلوا دینا چاہا تھا بالآخر اس کا ملنا تقدیر الٰہی اور نظام ربانی کے مطابق شریعت کی پیروی وجدوجہد اور اس کے مطابق سعی و عمل کے ذریعہ سے مقرر ہوا جیسا کہ پہلے سے طے شدہ تھا، فرمان آیا:

﴿ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۳۸)

''یہاں سے تم سب اترو پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی راہنمائی آئے تو جس نے میری راہنمائی کی پیروی کی، تو ان کو نہ ڈر ہوگا نہ غم۔''

﴿ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۲۳)

''تم دونوں یہاں سے نیچے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے راہنمائی آئے، تو جس نے میری راہنمائی کی پیروی کی، تو وہ گمراہ نہ ہوگا اور نہ

بد بخت۔"

جب انسان کا اصل مقام، وہی حیات جاوید اور مملکت ابد ہے تو اسی کا حصول اس کی تمام کوششوں کا محور ہونا چاہیے اور اس کو اپنی اس فانی زندگی اور زوال پذیر بادشاہی کے تمام کاموں کے ذریعہ اسی حیاتِ باقی اور لازوال بادشاہی کی دولت کو مزدو معاوضہ میں حاصل کرنا چاہیے، تاکہ وہ اپنے باپ کی اس آسمانی بادشاہی کو پالے جس کی صفت یہ تھی:

﴿ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ۝ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰهٰ:۱۱۷، ۱۱۹)

"تو شیطان تم کو جنت سے باہر نہ کردے تو پھر تم مشقت میں پڑ جاؤ اور جنت میں تجھ کو یہ ملا ہے کہ اس میں تو نہ بھوکا ہوگا، نہ ننگا، نہ پیاسا ہوگا اور نہ دھوپ کی تپش اٹھائے گا۔"

آدم علیہ السلام اس جنت سے نکلے تو ان کو بھوک بھی لگی اور ننگے بھی ہوئے پیاس بھی ان کو معلوم ہوئی اور دھوپ کی تپش کی تکلیف بھی ہوئی اور زمین میں آکر ان ہی چار چیزوں کی مشقت میں گرفتار ہوئے، کھانا، پینا، پہننا، رہنا۔ یہی انسان کی چار مختصر ضروریات ہیں اور انہیں کو اپنی ہوا و ہوس سے پھیلا کر اس نے ضروریات کا ایک عالم پیدا کر لیا اور انہیں کے تیار کرنے، ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی موجودہ زندگی کی تمام تر توجہ کو مصروف کر دیا اور اصل جنت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہیں سے شریعت کی تکلیف عائد ہوئی اور جائز اکل، جائز شرب، جائز لباس اور جائز مسکن کے حصول کے طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے احتراز کا حکم ہوا، اسی سے شریعت کے اصولِ معاملات اور اخلاقِ انسانی کی ذمہ داریاں پیدا ہوئیں اور پھر اس لیے، تاکہ اس حیات فانی میں پھنس کر حیاتِ غیر فانی کی طلب کو بھول نہ جائے، عرفانِ الٰہی (عقائدِ صحیحہ) اور عبادت واطاعتِ الٰہی کی تلقین ہوئی، جو جنت کی اصلی غذا اور روزی ہے:

﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴾

(۲۳/ المؤمنون:۱۰، ۱۱)

"یہی وہ میراث لینے والے ہیں، جو سایہ دار باغ کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔"

لیکن یہ وراثت انسان کو اپنے اعمال خیر ہی کے ذریعہ ملے گی۔ چنانچہ اہل جنت کو جنت کے داخلہ کے وقت یہ بشارت ملے گی:

﴿ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ (۴۳/ الزخرف:۷۱، ۷۲)

’’اور اس (جنت) میں وہ کچھ ہے، جس کو دل چاہے اور آنکھوں کو لطف ملے اور تم کو اس میں ہمیشہ رہنا ہے اور یہی وہ جنت ہے، جس کے تم اپنے کاموں کے بدلہ میں جن کو تم کرتے تھے، وارث بنائے گئے۔‘‘

اور ان ہی کو منادی غیب یہ ندا دے گا:

﴿ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۴۳)

’’اور ان کو پکار کر کہے گا کہ یہی وہ جنت ہے، جس کے تم اپنے ان کاموں کے بدلہ میں جو تم کرتے تھے، وارث بنائے گئے۔‘‘

ملت توحید کے مبلغ اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا ایک فقرہ یہ بھی تھا:

﴿ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ۝ ﴾ (۲۶/ الشعرآء:۸۵)

’’اور مجھے باغ نعمت کے وارثوں میں کر۔‘‘

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام نے انسان کا اصلی مقام وہی قرار دیا ہے، جہاں نہ بھوک ہے، نہ پیاس، نہ برہنگی ہے، نہ دھوپ کی تکلیف، جہاں کی بادشاہی لازوال اور جہاں کی زندگی غیر فانی ہے، لیکن اس کے حصول کا ذریعہ صرف انسان کا نیک عمل اور صحیح عرفان ہے، جن کے مجموعہ کا نام ’’تقویٰ‘‘ ہے۔

﴿ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا۝ ﴾ (۱۹/ مریم:۶۳)

’’یہ وہ بہشت ہے، جس کا وارث اپنے بندوں میں سے ہم اس کو بنائیں گے، جو تقویٰ والا ہوگا۔‘‘

انسانی جزا وسزا کے تین گھر

انسان کے تین گھر ہیں، ایک موجودہ فانی عالم جس کو دنیا کہتے ہیں اور دوسرا درمیانی عالمِ موت یا عالمِ قبر جس کا نام برزخ ہے اور تیسرا اس غیر فانی زندگی کا گھر جس کو دارِ آخرت کہتے ہیں، یہودیوں کے یہاں اصلی زور اسی دنیا کی جزا وسزا پر ہے، ان کے ہاں تیسرے کا ذکر بہت کم، اور دوسرے کا مطلق نہیں اور عیسائیوں میں پورا زور تیسری منزل کی سزا و جزا پر ہے اور پہلی اور دوسری منزلوں کے ذکر سے خاموشی ہے لیکن وحی محمدی ﷺ کی تکمیل نے ان تینوں گھروں کو انسانی سزا و جزا کا مقام قرار دیا ہے، انسان کو اپنے اعمال کی پہلی جزا وسزا تو اسی دنیا میں کامیابی وناکامی کی صورت میں ملتی ہے گو اس کامیابی وناکامی کے سمجھنے کا معیار مختلف ہو، اس کے بعد جب انسانی روح دوسری منزل میں قدم رکھتی ہے تو یہاں بھی وہ اپنے اعمال کی تھوڑی بہت جزا و سزا کا منظر دیکھ لیتی ہے، اس کے بعد جب موجودہ دنیا کے پورے کاروبار کا خاتمہ ہو کر اس فانی کائنات کا ہر نقش ونگار مٹ جائے گا اور پھر نئی زمین اور نیا آسمان بنائے گا تو فانی انسانوں کو دائمی زندگی کے لیے پیدا کیا

جائے گا اور اس وقت وہ اپنے اعمال کی پوری جزا و سزا پائیں گے۔

انسان کا پہلا دار الجزاء

غرض انسان کا پہلا دار الجزاء یہی دنیا ہے انسان کے ہر نیک و بد فعل کا جو اثر دوسری دنیا کی زندگی پر پڑتا ہے اسی کے مشابہ خود اس موجودہ دنیا کی زندگی میں بھی ملا کرتا ہے، انسان کی عزت، شہرت، ناموری، ہر دلعزیزی، محبوبیت، تسکین، اطمینان، سرور، فارغ البالی، حکومت یہ تمام اس زندگی کے اعمالِ خیر کے نتائج ہیں، ان کے برخلاف، ذلت، رسوائی، بے عزتی، کسمپرسی، پریشان حالی، بے اطمینانی، غم، خوف، محکومیت ہمارے اعمال بد کے اثرات ہیں۔

یہودیوں کی تورات میں اعمال کے نتائج میں زیادہ اہمیت اسی دنیاوی دار الجزاء کو دی گئی ہے، بلکہ یہی خیال تورات میں سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ خدا کی فرمانبرداری اور نافرمانی کی جزا اسی دنیا کی رنج و راحت کی صورت میں اسی زندگی میں ملتی ہے، مثلاً: خدا کے حکموں پر عمل کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری کھیتیاں سرسبز ہوں گی، تمہاری اولادیں آبرومند ہوں گی، تمہارے جانور جنیں گے، تمہارے درخت پھل دیں گے اور تمہارے دشمن مغلوب ہوں گے اور اگر خدا کی نافرمانی کرو گے تو تم پر وبائیں آئیں گی، قحط پڑیں گے، تمہاری اولادیں جیتی نہ رہیں گی، تمہارے جانور مر جائیں گے، تمہارے شہر تباہ ہو جائیں گے، تمہارے باغ پھل نہ دیں گے اور تمہارے دشمن تم پر چھا جائیں گے۔ عیسائیت نے اس کے بالمقابل سارا زور زمین کی مملکت پر نہیں بلکہ آسمان کی بادشاہت پر دیا ہے اور اس ظاہری زندگی کے فوز و فلاح کو اپنے مقصد سے خارج قرار دیا ہے، آنحضرت ﷺ جس دعوت کو لے کر آئے وہ یہودیت و عیسائیت کی اس افراط و تفریط دونوں سے پاک ہے اس نے ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ اس دنیا کی بادشاہی بھی قرار دی اور اس دنیا کی بھی، زمین کی حکومت بھی اور آسمان کی جنت بھی، یہاں کی سرسبزی و شادابی بھی اور وہاں کے باغ و بہار بھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نیکوکار مسلمانوں کے ذکر میں فرمایا:

﴿ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۴۸)

’’تو خدا نے ان کو دنیا کا بدلہ بھی دیا اور آخرت کے ثواب کی خوبی بھی اور اللہ نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔‘‘

ایمان اور عمل صالح والوں سے یہ وعدہ تھا کہ

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴾

(۴۸/ الفتح:۲۹)

''خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، گناہوں کی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا۔''

یہ بھی انہیں سے وعدہ ہے:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ (۲۴/ النور: ۵۵)

''خدا نے ان سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وعدہ کیا ہے وہ ان کو ملک میں حاکم بنائے گا، جس طرح ان سے اگلوں کو حاکم بنایا تھا۔''

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جس طرح اس دنیا کی فانی زندگی سے اس دنیا کی باقی زندگی زیادہ پائدار ہے، اسی طرح اس دنیا کے ثواب سے اس دنیا کے ثواب کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہے اور اسی دنیا کے حسنِ عمل کی کوشش سے اس دنیا کی بہتری بھی ملتی ہے، فرمایا:

﴿ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۭ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ﴾

(۱۶/ النحل: ۳۰)

''جنہوں نے نیک کام کیے، اس دنیا میں ان کے لیے بھلائی ہے اور بے شبہ آخرت کا گھر بہتر ہے اور پرہیز گاروں کا گھر کیا اچھا ہے۔''

اسی طرح بدکاروں کی جزا جہاں اس دنیا کی دوزخ اور آگ کے عذاب کو فرمایا، اسی طرح اس دنیا کی ذلت و خواری اور رسوائی کو بھی، فرمایا:

﴿ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ﴾ (۲۲/ الحج: ۱۱)

''اس نے دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا۔''

﴿ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۱۴)

''ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑی مار ہے۔''

﴿ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۱۷)

''ان کے کام دنیا اور آخرت میں برباد ہوئے۔''

اور ان کے متعلق یہ بھی فرمایا:

﴿ فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ ﴾ (۳/ آل عمران: ۵۶)

''تو میں ان کو دنیا اور آخرت میں سخت سزا دوں گا۔''

تنگی اور بدحالی کی سزا بھی یہیں ملتی ہے:

﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ۝ ﴾

(۲۰/ طٰہٰ: ۱۲۴)

’’اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو اس کے لیے تنگ گزران ہے اور قیامت میں اس کو اندھا اٹھاؤں گا کہ دنیا میں وہ دل کا اندھا بنا تھا۔‘‘

انتہا یہ ہے خود صحابہ کو جنگِ احد میں جو فتح نہیں ملی، اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی ان کی بعض فروگزاشتوں کا ثمرہ بتایا:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۵۵)

’’تم میں سے بعض لوگ اس دن جب دونوں فوجیں بھڑیں جو پیچھے ہٹے ان کے بعض کاموں کی وجہ سے شیطان نے ان کو پھسلا دیا۔‘‘

ایک اور مقام پر عام طور سے فرمایا گیا:

﴿ وَمَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ كَثِیْرٍ ۝ ﴾

(۴۲/ الشوریٰ: ۳۰)

’’جو مصیبت تم کو پہنچی وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث اور وہ بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے۔‘‘

یہود کے ذکر میں قرآن نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے، عذاب کے موقع پر فرمایا:

﴿ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ اَیْنَ مَا ثُقِفُوْۤا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۱۲)

’’ان پر ذلت ماری گئی، جہاں پائے گئے، لیکن (جہاں عزت حاصل ہے،) وہ خدا کے ذریعہ اور لوگوں کے سہارے اور اللہ کا غصہ کما لائے اور ان پر (قومی) محتاجی ماری گئی، یہ اس لیے کہ وہ خدا کے حکموں کا انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو مار ڈالتے تھے، یہ اس لیے کہ وہ نافرمان ہیں اور حدود الٰہی سے آگے بڑھتے ہیں۔‘‘

اس کے بالمقابل عام اہل کتاب سے کہا گیا:

﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ ﴾ (۵/ المآئدۃ: ۶۶)

’’اور اگر یہ تورات اور انجیل کو اور جو ان کی طرف ان کے پروردگار کی طرف سے (اب) اتارا گیا اس کو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر (برکاتِ آسمانی) سے کھاتے اور اپنے پاؤں کے نیچے

(ارضی خیر و برکت) سے کھاتے۔''

ایک اور موقع پر ارشاد ہے:

﴿ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۹۶)

''اور ان آبادیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور پرہیز گاری کے کام کرتے تو ہم ان پر آسمان سے اور زمین سے برکتوں کو کھولتے لیکن انہوں نے خدا کے احکام کو جھٹلایا تو ہم نے ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا۔''

مگر یہ دار الجزاء فانی ہے

لیکن یہاں ایک لغزش گاہ بھی ہے، جس سے اہل ہوش کو باخبر رہنا چاہیے، اس دنیا میں گو انسان کو اعمال کی جزا و سزا کسی نہ کسی رنگ میں ضرور ملتی ہے، مگر اس نکتہ کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ کیا شخصی زندگی اور کیا جماعتی حیات کے لحاظ سے یہ دار الجزاء جس کا نام دنیا ہے عارضی اور فانی ہے، یہاں کا غم بھی فانی اور یہاں کی خوشی بھی عارضی ہے اس لیے صرف اسی دنیا کی کامیابی کو اپنی زندگی کا اصل مطلوب و مقصود اور غایت و منتہا نہیں بنانا چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اس سے بھی زیادہ ایک اور وسیع آسمانی مملکت اور لازوال ربانی سلطنت ہے جو فنا و زوال کے ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے اور جہاں کی نعمتیں اس دنیا کی نعمتوں سے کہیں زیادہ بہتر اور غیر فانی ہیں، اس لیے اس فانی دنیا کی لذتوں میں پڑ کر اس کو نہ بھول جانا چاہیے، اس مسافر کی عقلِ سلیم کی داد کون دے گا جو راستہ کی عارضی خوش منظریوں اور سفر کی فانی دلچسپیوں میں پڑ کر اپنے خوش سواد اور سدابہار وطن کو فراموش کر بیٹھے:

﴿ بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۝ ﴾ (۸۷/ الاعلیٰ:۱۶، ۱۷)

''بلکہ تم دنیاوی زندگی کو بڑھ کر چاہتے ہو حالانکہ آخرت کی زندگی اس سے بہتر اور اس سے زیادہ پائندار ہے۔''

﴿ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ﴾ (۱۲/ یوسف:۵۷)

''اور بے شک آخرت کی مزدوری (یہاں کی مزدوری سے) بہتر ہے۔''

اور اسی طرح گنہگاروں کے لیے یہاں کی ذلت و رسوائی سے بڑھ کر ایک اور ذلت و رسوائی کا مقام ہے:

﴿ فَأَذَاقَهُمُ اللَّهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ ﴾

(۳۹/ الزمر:۲۶)

''تو خدا نے ان کو اس دنیاوی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا اور شبہ نہیں کہ آخرت کا عذاب

اس سے بھی بڑا ہے اگر وہ جانتے۔‘‘

اس دنیا کی ذلت ورسوائی تو شاید سہہ لی جائے مگر وہاں کے عذاب کی سختی کو کون سہہ سکتا ہے کہ

﴿ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴾ (۲۰/ طٰهٰ:۱۲۷)

’’آخرت کا عذاب البتہ زیادہ سخت اور زیادہ دیر رہنے والا ہے۔‘‘

اس لیے اس فانی دنیا میں انسان کو اپنے حسن عمل کی بدولت جو زور وقوت، جاہ وجلال، نعمت و مال اور حکومت وسروری ملے ان کو بھی آخرت کی لازوال نعمتوں اور وہاں کی غیر فانی بادشاہی کے حصول میں صرف کرنا چاہیے کہ اس سے خود ان دنیاوی نعمتوں کو بھی بقا اور پائداری حاصل ہوگی، اسی فلسفہ کو محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی حقیقت طراز نے قارون کی نصیحت کے ضمن میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

﴿ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ﴾ (۲۸/ القصص:۷۷)

’’اور خدا نے جو تجھ کو دیا ہے اس سے آخرت کا گھر تلاش کر اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول اور جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی (خدا کے بندوں پر) احسان کر اور اس دولت سے زمین میں خرابی نہ چاہ۔‘‘

چنانچہ ناخلف یہود پر تباہی اسی لیے آئی کہ وہ دنیاوی زندگی کی دولت و جائداد کی محبت میں ایسے پھنسے کہ ان کو اپنے کاروبار میں آخرت کے سودا کا خیال بھول کر بھی نہ آیا:

﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۭ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾

(۷/ الاعراف: ۱۶۹)

’’تو ان کے بعد کچھ ناخلف کتاب کے وارث ہوئے، جو اس دنیا کے سامان واسباب کو لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف ہوگا اور اگر ویسا ہی سامان واسباب پھر آئے تو پھر لیں کیا ان سے کتاب کے حق میں یہ عہد نہیں لیا گیا، کہ وہ خدا پر حق کے سوا کچھ اور نہ بولیں، حالانکہ جو اس میں ہے وہ اس کو پڑھ چکے ہیں اور آخرت کا گھر پرہیز گاروں کے لیے بہتر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں۔‘‘

یہ دار الجزاء اور دار الاصلاح بھی ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت وشفقت سے انسان کو پیدا کیا اور اسے ہمیشہ کی زندگی کا مقام بھی دکھایا اور بتایا کہ اس مقام کا دائمی وابدی استحقاق خود تمہارے عمل سے تم کو ہوسکتا ہے اور یہ دنیاوی زندگی اسی لیے اس کو دی

گئی کہ وہ اس زمانہ میں اس سدابہار سرزمین کی ملکیت کو اپنے عمل کی قیمت سے خرید سکے مگر چونکہ انسان دوسری مصلحتوں کے لحاظ سے طبعاً کمزور، زود فراموش اور بھولنے والا بھی پیدا ہوا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی اسی مستعار زندگی میں بار بار اپنے سنبھلنے، سدھرنے اور کامیاب بننے کے موقع عنایت کیے اور رسولوں کی بعثت، معلموں کی آمد، شریعت کی تعلیم، پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ اور گناہوں پر جسمانی سزا و تعزیر اور عمل خیر پر روحانی لذت اور عمل شر پر روحانی غبار و کدورت کے لوازم اسی لیے مقرر ہوئے کہ اس کو ہر قدم پر اپنے اعمال پر تنبیہ اور اپنی غلط روی کا احساس ہو اور ان سب کے علاوہ اس نے اپنی غایت رحمت سے انسانوں کی تنبیہ اور اصلاح کے لیے حسب ذیل مراتب مقرر کیے۔

① نیکی سے برائی کا کفارہ: چونکہ انسان کتنی ہی کوشش کرے، اپنی فطری کمزوریوں کی حد سے باہر نہیں نکل سکتا، اس لیے جس طرح اس دنیا میں اس نے انسانوں کے دلوں میں یہ فطری اصول ودیعت کر دیا ہے کہ جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو اس کی معمولی برائیوں سے چشم پوشی کی جاتی ہے یا یہ کہ آخر میں اس کا کوئی ایک نیک کام اتنا زبردست ہو جاتا ہے کہ اس سے اس کی تمام اگلی برائیوں کی فرد دھل جاتی ہے اسی کا نام کفارۂ عمل ہے، چنانچہ وحی محمدی ﷺ نے اصولی طور پر یہ حقیقت ان الفاظ میں تلقین کی کہ

﴿ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ﴾ (١١/ هود: ١١٤)

''بے شبہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔''

اس آیت کا یہ بھی منشا ہے کہ نیکیوں کی تدریجی ترقی بالآخر برائیوں کو کم کرتی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ پورا نیکوکار انسان بن جاتا ہے اور یہ بھی خوش خبری اس میں پوشیدہ ہے کہ یہی نیکیاں اس کی پہلی برائیوں کے نتیجہ کو بھی ان شاء اللہ مٹا دیں گی، اس معنی کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں:

﴿ إِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء: ٣١)

''تم کو جن باتوں سے منع کیا گیا ہے، اگر ان میں کی بری باتوں سے تم بچتے رہو گے تو ہم تمہاری تقصیریں تم سے اتار دیں گے اور تم کو عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔''

﴿ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾

(٥/ المآئدة: ١٢)

''البتہ اگر تم نماز کھڑی کرو اور زکوٰۃ دو اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور ان کی مدد کرو گے اور اللہ کو اچھی طرح قرض دو گے، تو میں تمہارے گناہوں کو اتار دوں گا اور تم کو ان جنتوں میں

داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔''

﴿ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ ۖ ﴾

(٤٦/ الاحقاف: ١٦)

''یہ وہ ہیں جن کے اچھے عمل کو (اور) جنتیوں کے (شمول) میں ہم قبول اوران کی برائیوں سے درگزر کریں گے اوریہی ہیں رہنے والے جنت کے۔''

② توبہ کفارہ ہے: انسان کے تمام کاروبار میں اصل شے اس کا دل ہے، اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے ناپاک بنتا ہے، انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگزاشتوں پر اس کی بارگاہ میں نادم وشرمسار ہوکر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہوکر آیندہ کے لیے نیکوکاری کا خدا سے مستحکم وعدہ کرلے تو اس کا نام توبہ ہے، یہ توبہ گناہگار سے گناہگار انسان کو بھی خدا کے آغوشِ محبت میں لاکر ڈال دیتی ہے، آدم علیہ السلام کا قصور اور پھر ان کی توبہ اور رحمت الٰہی کے رجوع کے واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی صورت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوشِ رحمت کس طرح گناہگار انسان کو واپس لینے کے لیے ہمیشہ وارہتی ہے، رحمت الٰہی کے اس پرجوش نظارہ کی جو کیفیت محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفہ وحی اور پیام نبوت میں نظر آتی ہے اس سے ہندوستان کا ہرمت اور دھرم قطعاً محروم، تورات خاموش، زبور کی سریلی آواز مدھم اور انجیل کی خوش خبری مبہم ہے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے پیام ربانی میں اس کی کیفیات اور اصول وشرائط کو جس شرح وبسط کے ساتھ بیان فرمایا وہ گویا ربُ العالمین کی طرف سے رحمۃ العالمین کا خاص حصہ تھا، فرمایا:

﴿ إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا ۝ ﴾

(١٩/ مریم: ٦٠)

''مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے، تو وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا۔''

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک توبہ کی بھلائی اس کے گناہوں کے سارے دفتر دھوکر ان کی جگہ آپ لے لے گی:

﴿ إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ ﴾ (٢٥/ الفرقان: ٧٠)

''مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو یہ وہ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔''

اور یہی اس کی شانِ رحمت کا اقتضا ہے یہاں تک کہ چور اور ڈاکو بھی اپنے گناہوں سے توبہ کریں تو ان

کو بھی بشارت ہے:

﴿ فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٣٩، ٤٠)

''تو جس نے اپنے پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کی اور اپنے کو سدھارا، تو بے شک اللہ اس پر رجوع ہوگا کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے، کیا تجھے نہیں معلوم کہ آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے جس کو چاہے سزا دے اور جس کو چاہے معاف کرے، اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قطعی اصول ظاہر فرمادیا کہ

﴿ وَاِنِّىْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۝ ﴾ (٢٠/ طٰہٰ:٨٢)

''اور بے شک میں اس کو بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے اور پھر راہ پر چلا۔''

لیکن یہ توبہ کس لیے ہے اور کس شرط کے ساتھ ہے:

﴿ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَي اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْۗءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰۗىِٕكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّـيِّاٰتِ ۚ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَھُمْ كُفَّارٌ ۭ ﴾

(٤/ النسآء:١٧، ١٨)

''اللہ کو ان کی توبہ قبول ضرور کرنی ہے جو نادانی سے برا کام کرتے ہیں، پھر جلد توبہ کرتے ہیں، تو یہی وہ ہیں جن کو اللہ معاف کرتا ہے اور اللہ سب جانتا ہے اور حکمت والا ہے اور ان کی توبہ نہیں ہے جو برے کام کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئی تو اس نے کہا کہ اب میں نے توبہ کی اور نہ ان کی توبہ ہے جو کافر ہو کر مریں۔''

مقصود یہ ہے کہ توبہ کے بعد اس بندہ کے دل میں آیندہ تلافی اور تدارک کا احساس بھی موجود ہو اور ظاہر ہے کہ موت کے وقت یہ احساس ممکن ہی نہیں، ہاں اگر وہ توبہ اپنے احساس کے اثر سے کرے اور اس کے بعد اتفاقاً موت آجائے تو یقیناً رحمت الٰہی اس کے قبول کرنے میں تامل نہ کرے گی:

﴿ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ۡ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

(٧/ الاعراف:١٥٣)

''اور جنہوں نے برے کام کیے، پھر اس کے بعد باز آئے (توبہ کی) اور یقین کیا، تو بے شک

تیرا پروردگار اس کے بعد اس کو بخشنے والا اور اس پر رحم کرنے والا ہے۔''

﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء: ١١٠)

''اور جو کوئی برا کام کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے پھر اللہ سے اپنے گناہ کی معافی چاہے، تو وہ اللہ کو بخشش والا رحم کرنے والا پائے گا۔''

③ مصائب کی تنبیہ اور کفارہ: دنیا میں مصائب سے زیادہ بری اور تکلیف دہ چیز انسان کو کوئی دوسری نہیں معلوم ہوتی، لیکن یہ حقیقت بھلانے کے لائق نہیں کہ افراد بلکہ جماعتیں اور قومیں بھی مصائب ہی کی تنبیہ اور سرزنش سے متنبہ اور ہشیار ہو کر آمادۂ اصلاح ہوتی ہیں، چنانچہ اکثر اخلاقی محاسن کے جوہر کو مصیبتوں ہی کی آگ نکھار کر کندن بناتی ہے صبر، استقلال، تواضع، شکر، محبت اور رحم ان تمام اخلاقی فضائل کی تربیت انہیں مصائب کے زیر سایہ ہوتی ہے، مغرور سے مغرور انسان بھی جب کسی اتفاقی مصیبت کی ٹھوکر کھاتا ہے تو سنبھل جاتا ہے، اس لیے غافل انسانوں اور خود فراموش سرمستوں کو ہوش میں لانے کے لیے کبھی کبھی کی مصیبتوں سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہیں کہ ان کی بدولت ملحد سے ملحد انسان بھی ایک دفعہ بے قرار ہو کر خدا کا نام لے ہی لیتا ہے۔

دولت ونعمت کامیابی ومسرت وہ شراب ہے جس کے نشہ کا اتار اتفاقی مصائب ہی کی ترشی سے ہوسکتا ہے، انسان خدا کو کتنا ہی بھولا ہوا اور اپنی دولت وثروت پر کتنا ہی نازاں ہو لیکن جب وہ کسی افتاد سے دوچار ہوتا ہے تو دفعتہً اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، بیماری، تنگ دستی، عزیزوں کی موت، آرزوؤں کی ناکامی، ان میں سے ہر چیز وہ ٹھوکر ہے جس کو کھا کر سرمست سے سرمست راہ گیر بھی ایک دفعہ چونک کر ہشیار ہو جاتا ہے اور اس کو اپنے راستہ کی غلطی معلوم ہو جاتی ہے، اس لیے ان مصائب میں انسانوں کے اعمال بد اور گناہوں کا کفارہ بننے کی صلاحیت پوری طرح موجود ہے کہ اس تھوڑی سی تکلیف سے بندہ میں جو روحانی احساس پیدا ہوتا ہے وہ بڑی بیش قیمت چیز ہے۔

قرآن پاک نے اس نکتہ کو جابجا بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہگاروں کو، اس سے پہلے کہ ان کو ہلاک کرے، مصائب کی آزمائشوں میں ڈالتا ہے، تا کہ شاید وہ اپنے بھولے ہوئے مالک کو یاد کریں اور اپنی غلط روی پر متنبہ ہو کر اپنی ہدایت وصلاح کی فکر کریں، فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ ﴾

(٧/ الاعراف: ١٣٠)

''اور بے شک ہم نے فرعون والوں کو قحطوں اور پھلوں کی کمی کی مصیبت میں گرفتار کیا، تا کہ وہ نصیحت پکڑیں۔''

بنی اسرائیل کے متعلق ہے:

﴿ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۱٦۸)

''اور ہم نے ان کو نعمتوں اور مصیبتوں کے ساتھ آزمایا، تا کہ وہ شاید باز آئیں۔''

اسی سورۃ میں ایک اور جگہ اس اصول کو ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ۝ ﴾

(۷/ الاعراف:۹٤)

''اور ہم نے کسی آبادی میں کوئی نبی نہیں بھیجا، لیکن وہاں کے رہنے والوں کو سختیوں اور مصیبتوں میں گرفتار کیا، تا کہ شاید وہ گڑگڑائیں۔''

مسلمانوں سے فرمایا گیا:

﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ۝ۙ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۝ؕ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۵۵۔۱۵۷)

''اور البتہ ہم تم کو تھوڑے خوف، بھوک اور دولت کی اور جانوں کی اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے اوران صابروں کو خوش خبری سنا کہ جن کو جب کوئی مصیبت ستاتی ہے تو کہتے ہیں ہم خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، یہ وہ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی برکتیں اور رحمتیں ہوں گی اور یہی سیدھی راہ پائے ہوئے ہیں۔''

اسی اصول کے تحت میں احادیث صحیحہ میں آنحضرت ﷺ نے اس کے متعدد جزئیات بیان فرمائے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری ﴿ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ ﴾ (٤/ النسآء:۱۲۳) ''جو کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ اس کو دیا جائے گا۔'' تو میں نے آنحضرت ﷺ سے اس کا مطلب پوچھا فرمایا کہ ''یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے عتاب ہے اس کا بدلہ دنیا میں بندہ کی ہر تکلیف سے پورا ہو جاتا ہے، جیسے اس کو بخار آجائے یا وہ کسی مصیبت سے دوچار ہو جائے یہاں تک کہ جیب میں کوئی چیز رکھ کر بھول جائے اور اس سے جو تکلیف اس کو پہنچے وہ تکلیف بھی کفارہ بن جاتی ہے یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے اس طرح صاف ستھرا ہو کر نکلتا ہے جیسے بھٹی سے سونا۔'' [1] دوسری حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مسلمان کو کوئی مصیبت پیش نہیں آتی لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے یہاں تک کہ اگر اس کے

[1] یہ اوراس کی ہم معنی حدیثیں اکثر کتب حدیث میں ہیں مثلاً: ترمذی، ابواب التفسیر ومن سورۃ النساء:۳۰۳۸؛ سنن ابی داود، کتاب الجنائز، باب عیادۃ النساء:۳۰۹۳؛ ابن کثیر، ۲/ ۳۸۲۔

کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی کفارہ بن جاتا ہے۔'' ❶ تیسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان کو کوئی تکلیف یا بیماری یا غم یا اذیت نہیں پہنچتی لیکن یہ کہ وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی۔'' ❷ چوتھی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کسی مسلمان کو کوئی تکلیف کانٹا چبھنے سے لے کر اوپر تک جتنی بھی پہنچے اللہ تعالیٰ اس سے اس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے جیسے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔'' ❸ پانچویں روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''دنیا میں جو مسلمان کسی جرم کا مرتکب ہوا اور اس کی سزا اس کو یہیں مل گئی تو وہ اس کے لیے کفارہ اور اس کو اس گناہ سے پاک وصاف بنانے والی ہے۔'' ❹

سطورِ بالا سے ہویدا ہے کہ کوئی انسان جو اقرارِ توحید کے بعد گناہ سے ملوث ہو گیا ہو دنیا میں توبہ، اعمال نیک اور مصائب پر صبر وشکر کے ذریعہ سے نجات پا سکتا ہے اور اس دنیا سے اسی طرح پاک وصاف ہو کر نکل سکتا ہے کہ موت کے بعد اس کو کسی نئے کفارہ گناہ کی ضرورت پیش نہ آئے۔

اسی لیے قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ ﴾

(۳۲/ السجدۃ:۲۱)

''اور ہم البتہ ان کو بڑے عذاب کے پہلے ادنیٰ عذاب کا کچھ مزہ چکھاتے ہیں، تا کہ وہ اب بھی باز آئیں۔''

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ عذابِ الٰہی کا مقصد انتقام اور نفسِ سزا اور عقوبت نہیں بلکہ شریر نفس کو راہ راست پر لانا ہے، اسی لیے ایک اور آیت میں فرمایا:

﴿ مَّا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنتُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا ۝ ﴾

(۴/ النسآء:۱۴۷)

''اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا (نیکیوں) کا قبول کرنے والا اور (تمہارے ہر عمل کو) جاننے والا ہے۔''

الغرض یہ عذاب اس دنیا میں آئندہ گناہوں سے بچانے اور گزشتہ گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ہوتا ہے اور عالم برزخ اور عالمِ بعث میں چونکہ نئے عمل کے محل نہیں اس لیے ان دونوں مقاموں میں آئندہ کا کوئی سوال

❶ صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب ماجاء فی کفارۃ المرض:۵۶۴۰۔
❷ صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب ماجاء فی کفارۃ المرض:۵۶۴۱، ۵۶۴۲۔
❸ صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب شدہ المرض:۵۶۴۷۔
❹ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب فی المشیۃ والارادۃ:۷۴۶۸۔

نہیں پیدا ہو سکتا، صرف گزشتہ بداعمالیوں کی سزا بھگت کر ان کے نتائج سے نجات مل سکتی ہے اور یہی عالمِ برزخ اور عالمِ بعث کے عذابوں کا مقصد ہے الاّ یہ کہ پروردگارِ عالم خود اپنی رحمت سے نوازے اور معاف فرمائے۔

عذابِ برزخ بھی کفارہ ہے

لیکن اگر کسی انسان کے اندر گناہوں کی ناپاکیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اس کی دنیاوی زندگی کے تمام کفارے بھی اس کو دھو کر پاک وصاف نہ بنا سکے تو اس کو اپنے مرنے کے بعد بھی عالمِ برزخ میں اپنے اعمالِ بد کی مناسب سزاؤں کی صورتوں میں تکلیفیں اٹھا کر پاک وصاف بننا پڑے گا، یہی عالمِ برزخ کا عذاب ہے اس سے ظاہر ہوگا کہ عالم برزخ کی یہ سزائیں اس لیے ہیں کہ ہم نے دنیا میں اپنی ناپاک خواہشوں اور ناپاک کاموں سے احتراز کرنے کی جو زحمت نہیں اٹھائی اور اچھے کاموں کے کرنے میں جو تھوڑی تکلیف پیش آتی ہے اس کو برداشت کر کے اچھے کام جو نہیں کیے ان دونوں کے معاوضہ میں عالم برزخ میں آ کر عذاب کی تکلیفیں اٹھائیں، تاکہ حیاتِ ثانی کے دروازہ پر پہنچ کر بھی اگر ہم ان سزاؤں کے ذریعہ پاک وصاف ہو سکیں تو پاک وصاف ہو کر اپنی موروثی بہشت کے قابل بن سکیں جو صرف پاکوں اور بے گناہوں کی جگہ ہے، یعنی ان کی جگہ ہے جو سرے سے کسی گناہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں یا یہ کہ گناہ کے مرتکب ہوئے مگر اعمال نیک، توبہ اور مصائب میں صبر وشکر کر کے یا برزخ میں سزا پا کر وہ گناہوں کے داغ سے نجات پا سکے۔

یہ بات کہ عذابِ برزخ بھی ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے، قرآن پاک کی متعدد آیتوں سے نکلتی ہے اور یہ اسلام کے اس اصول سے مترشح ہے کہ ایک مسلمان کی ہر تکلیف اس کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ ہے، اس بنا پر عذاب برزخ بھی اس کے گناہ کا کفارہ ہوگا، قرآن پاک کی اس آیت سے بھی یہ بات کنایۃً نکلتی ہے۔ گنہگار حشر کے دن کہیں گے:

﴿ وَبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِیْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ﴾ (٦/ الانعام:١٢٩)

''اور ہم مقررہ وقت جس کو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا پہنچ چکے۔''

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حشر سے پہلے عذاب کے ایک دورے کو ختم کر چکے۔

بعض حدیثوں میں بھی اس کنایہ کی تصریح ملتی ہے۔ کنز العمال میں ایک حدیث ہے:

عن ابن عمر ((ان طول مقام امتی فی قبورھم تمحیض لذنوبھم)) [1]

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کے لوگوں کا اپنی قبروں میں طول قیام ان کو گناہوں سے خالص کرنا ہے۔''

ایک اور حدیث میں ہے:

((الضمۃ فی قبر کفارۃ لکل مومن لکل ذنب بقی علیہ ولم یغفرلہ)) [2]

---

[1] کنز العمال، باب عذاب القبر، ج ٨، ص: ٩٦۔ [2] ایضًا۔

''یعنی قبر کی تنگی مومن کے گناہ کا کفارہ ہے۔''

اسی لیے ایک اور حدیث میں آیا ہے:

((اکثر عذاب امتی فی قبورھم)) [1]

''میری امت (کے لوگوں) کو زیادہ تر عذاب ان کی قبروں میں ہوگا۔''

اس حدیث کا (اگر وہ ثابت ہو تو) منشا یہ ہے کہ امت محمدیہ کے اکثر افراد اسی برزخ کے محدود زمانہ عذاب میں نکھر کر اور پاک وصاف ہو کر جنت کے قابل ہو جائیں گے اور عذاب دوزخ کی ضرورت ان کو پیش نہ آئے گی، حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ ایک موقع پر لکھتے ہیں:

فان وفت بالخلاص منها فی هذه الدار والافغی البرزخ فان وفی بالخلاص والا ففی موقف القیامة واهوالها ما یخلصهم من تلك البقیة. [2]

''اگر ان بیماریوں کا یہ علاج اس دنیا میں نجات کے لیے پورا ہو گیا تو خیر ورنہ برزخ کی سزا سے اس کا علاج کیا جائے گا تو اگر یہ نجات کے لیے کافی ہو گیا تو خیر ورنہ پھر قیامت کا مقام اور اس کی ہولناکیاں باقی بیماریوں سے نجات دلوائیں گی۔''

رؤیائے برزخ کی حدیث میں جو پہلے مفصل گزر چکی ہے، وہ منظر بھی دکھایا گیا ہے جس میں گناہگار عذاب کے دور سے نکل کر اور نہر حیات میں نئی زندگی پا کر بہشت کے مستحق قرار پائے ہیں غالباً انہی نجات پانے والے مومنوں کو دیکھ کر مشرکین بھی قیامت میں یہ کہیں گے:

﴿ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ۚ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُم مِّنَ الْإِنسِ ۖ وَقَالَ أَوْلِيَاؤُهُم مِّنَ الْإِنسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتَ لَنَا ۚ ﴾

(٦/ الانعام:١٢٩)

''اور جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا، اے گروہ جن، تم نے بہت سے انسانوں کو اپنا بنا لیا اور ان کے دوست انسان کہیں گے کہ ہمارے پروردگار ہم میں سے ایک نے دوسرے سے کام نکالا اور ہم مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لیے ٹھہرایا تھا پہنچ چکے۔''

یہ الفاظ کہ ''ہم اپنے مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا پہنچ چکے'' یہ معنی رکھتے ہیں کہ عالم برزخ کا مقررہ دورۂ عذاب ہم ختم کر چکے اور اب حشر ونشر کے عذاب کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، اس لیے بعض دوسرے نیک بختوں کی طرح ہم کو بھی اب چھٹکارا ملے۔ جواب ملے گا:

[1] اس حدیث کو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ، باب الوقائع الحشریہ، ج ا، ص: ۲۹ میں نقل کیا ہے، لیکن ہمیں اس کا اصل ماخذ معلوم نہ ہوسکا۔

[2] شفاء العلیل لابن القیم مطبعه حسینیه مصر، ص: ٢٢٤۔

﴿ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴾

(٦/ الانعام:١٢٩)

''فرمائے گا آتشِ دوزخ تمہارا ٹھکانا ہوا، اس میں سدا رہو گے، لیکن یہ کہ جو اللہ چاہے، بے شک تیرا رب حکمت والا اور علم والا ہے۔''

اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تمہارا دورۂ عذاب ختم نہیں ہوا ہے اور تمہاری پاکیزگی ابھی تمام نہیں ہوئی اس لیے ابھی اس دوسرے عالم کا عذاب بھی تم کو سہنا ہے پھر جب خدا چاہے گا تم کو اس سے نجات دے گا اس کا ہر کام علم و حکمت پر مبنی ہے اس کے علم و حکمت اور مشیت کا جب تقاضا ہو گا تم کو نجات ملے گی۔ [1]

عذاب دوزخ کفارۂ گناہ ہے

ابھی یہ آیت اوپر گزر چکی ہے کہ

﴿ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴾

(٤/ النسآء:١٤٧)

''خدا کو تمہارے عذاب سے کیا کام اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ تو خدا تمہاری شکر گزاری کو قبول کرنے والا (اور تمہارے دلوں کے حال کو) جاننے والا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ گناہگار کو جو عذاب ملے گا اس میں اللہ کو کوئی خوشی نہیں حاصل ہوتی نہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے گناہگار بندے اس عذاب میں مبتلا ہوں، لیکن ازل سے اس نے اپنے جو قانون مقرر کر دیے ہیں وہ ان کو توڑتا بھی نہیں۔ جس وقت آدم علیہ السلام کو جنت کی سرزمین سے نکال کر اس دنیا میں اس لیے بھیجا گیا کہ وہ اپنے عمل کے استحقاق سے اس جنت کو دوبارہ ہمیشہ کے لیے حاصل کریں، اسی وقت یہ قانون بھی ان کو سنا دیا گیا تھا:

﴿ اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴾

(٢/ البقرة:٣٨، ٣٩)

''یہاں سے تم سب اُترو، تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت اترے، تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جنہوں نے ناشکری کی اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو وہی دوزخ والے ہوں گے۔''

اس آیت میں مستحق دوزخ ہونے کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں ایک کفران اور دوسری تکذیب۔ دیکھو کہ اوپر کی نساء والی آیت میں عذابِ دوزخ سے نجات پانے کی دو شرطیں شکر اور ایمان ان کے بالمقابل ہیں

[1] حسب تفسیر ابن عباس؛ ابن جریر طبری، ج ٨، ص: ٢٤ مصر۔

اس سے ظاہر ہوا کہ شکر اور ایمان استحقاقِ جنت کی شرطیں اور کفران اور تکذیب استحقاقِ دوزخ کے اسباب ہیں، بقیہ تمام نیکیاں شکر اور ایمان کے فروغ اور تمام برائیاں کفران اور تکذیب کی شاخیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس لیے نہیں بنایا کہ وہ ان کو پیدا کر کے دوزخ کا ایندھن بنائے بلکہ اس نے تو ان کو اپنی رحمت کے ظہور کے لیے پیدا کیا غیظ وغضب کے اظہار کے لیے نہیں۔ فرمایا:

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۷۲، ۷۳)

''ہم نے یہ امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی، تو ان سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا، تاکہ اللہ نفاق کرنے والوں اور نفاق کرنے والیوں اور شرک کرنے والوں اور شرک کرنے والیوں کو سزا دے اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر وہ اپنی رحمت کے ساتھ رجوع ہو اور اللہ تو بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔''

اس آیت پاک سے ہویدا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اصلی صفت یہی ہے کہ وہ غفور و رحیم ہے یعنی بخشش و رحمت اس کی صفتِ ذاتی ہے، اب اگر کوئی اپنے آپ پر ظلم کر کے گناہ کرتا ہے اور اس لیے وہ اپنے کو رحمتِ الٰہی سے دور کر لیتا ہے تو یہ خود انسان کا فعل ہے:

﴿ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾ (۹/ التوبۃ: ۷۰)

''اللہ نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا، لیکن وہ اپنی جانوں پر آپ ظلم کرتے ہیں۔''

﴿ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴾ (۴۰/ المؤمن: ۳۱)

''اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔''

غرض جو کچھ ہے وہ اپنے اعمال کا نتیجہ ہے:

﴿ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۱۵)

''کہ ہر جان کو اپنے ہی کیے کا بدلہ دیا جائے گا۔''

اس لیے بہشت ہو یا دوزخ جو کچھ ہے انسان کے اپنے ہی عمل کا لازمی نتیجہ ہے، جس طرح دنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے، مثلاً: کھانے کا نتیجہ شکم سیری، پینے کا نتیجہ سیرابی، بھوک کا نتیجہ تکلیف، بیماری کا نتیجہ بے آرامی، گرنے کا نتیجہ چوٹ، زہر کا نتیجہ موت، شہد کا نتیجہ مٹھاس، غرض ہر اچھے یا برے فعل کا ایک لازمی

جسمانی نتیجہ ہے، جو دنیا میں ہمارے عمل کے بعد ہم کو ملتا رہتا ہے، اسی طرح ہم کو اپنے اعمال کا ایک اور روحانی نتیجہ بھی لازمی ملنے والا ہے، جو ہم کو اس دوسرے عالم میں ملے گا، تو جس طرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر کیوں مر گئے یا گرنے سے ہم کو چوٹ کیوں آئی، اسی طرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ ہم کو ان اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی کہ دونوں یکساں ہمارے اعمال کے لازمی نتیجے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی غایت رحمت سے ہم کو اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع فرما دیا تھا ہم کو اس نے نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشا، عقل عنایت کی، ضمیر عطا کیا، پھر نبی اور رسول بھیجے، شریعت دی، کتاب مرحمت فرمائی اس پر بھی اگر ہم باز نہ آئے اور ان اعمال کا ارتکاب کیا تو اب ہم کو ان اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے:

﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ ﴾

(٤/ النسآء:١٦٥)

''یہ رسول بھیجے، نیکوں کو خوش خبری سنانے والے اور بدکاروں کو ہشیار کرنے والے، تاکہ خدا پر انسان کی حجت باقی نہ رہے۔''

پھر اپنی رحمت سے سب سے آخر میں اپنی رحمت کے کامل مظہر کو دنیا میں بھیجا:

﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝ ﴾ (٢١/ الانبیآء:١٠٧)

''ہم نے تجھ کو (اے پیغمبر) ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔''

لیکن ظالم و نادان انسانوں نے اس رحمت کے قبول کرنے سے انکار کیا اور طرح طرح کی بداعتقادیوں اور بداعمالیوں سے اپنے کو برباد کیا اور جس غرض سے خدا نے ان کو پیدا کیا تھا اس سے اعراض کیا اور اپنے کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے ہلاکت و بربادی میں مبتلا کیا:

﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ۝ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ ﴾

(١١/ ھود:١١٧۔١١٩)

''اور نہ تھا تیرا رب جو آبادیوں کو ظلم سے ہلاک و برباد کرتا اور درآنحالیکہ ان کے رہنے والے نیکوکار ہوتے اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو (زبردستی) ایک راہ پر کر دیتا (لیکن وہ ایسی زبردستی نہیں کرتا) اور وہ یوں ہی ہمیشہ اختلافات میں رہتے ہیں، مگر جن پر تیرے رب کا رحم ہو اور اسی واسطے ان کو پیدا کیا تھا۔''

اس آیت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو رحمت کی خاطر بنایا ہے عذاب کے لیے نہیں، لیکن وہ

خود انسان ہے جو اپنے عمل سے خدا کی رحمت کے بجائے اس کے عذاب کا اپنے کو سزاوار ٹھہرا لیتا ہے، اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

لِلرَّحْمَةِ خَلَقَهُمْ وَلَمْ يَخْلُقْهُمْ لِلْعَذَابِ. [1]

"خدا نے انسانوں کو رحمت کے لیے پیدا کیا، عذاب کے لیے نہیں۔"

لیکن اگر ظالم و نادان انسان نے خدا کی ان پے در پے رحمتوں کے باوجود اپنے کو اس کی رحمت کا مستحق نہ بنایا تو کیا وہ خدائے رحمٰن و رحیم جس کا یہ اعلان ہے:

﴿ كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ (٦/ الانعام:١٢)

"اس (خدا) نے (مخلوقات پر) رحمت کو اپنے اوپر واجب کر لیا۔"

﴿ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ (٦/ الانعام:٥٤)

"تم پر سلامتی ہو، تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر فرض ٹھہرا لیا ہے۔"

﴿ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ (٧/ الاعراف:١٥٦)

"اور میری رحمت نے ہر چیز کو سما لیا ہے۔"

﴿ وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ﴾ (١٨/ الكهف:٥٨)

"اور تیرا پروردگار بخشنے والا رحمت والا ہے۔"

((رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي)) [2]

"اور میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی۔"

وہ اپنے گناہ گار و سیہ کار بندوں سے ہمیشہ کے لیے اپنا منہ موڑ لے گا، حالانکہ اس کی رحمت کسی غرض سے نہیں، بلکہ بے غرض ہے، فرمایا:

﴿ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ﴾ (٦/ الانعام:١٣٤) "اور تیرا رب بے نیاز رحمت والا ہے۔"

اور تسلی دی ہے:

﴿ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴾ (٣٩/ الزمر:٥٣)

"اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے، خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو، خدا سب گناہوں کو معاف کرتا ہے، بے شک وہی بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔"

اس کی رحمت کا ظہور جس طرح اس دنیا میں ہوا ہے، اس دنیا میں بھی ہوگا اور وہاں اس کی رحمت کا سب

---

[1] طبری، ج ١٢، ص: ٨١ مصر۔ [2] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قوله تعالیٰ: ولقد سبقت كلمتنا..... : ٧٤٥٣۔

سے بڑا مظہر اس کے مقام لعنت (دوزخ) سے دوری اور اس کے مقام رحمت (بہشت) سے قرب ہے، فرمایا:

﴿مَنْ يُصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ ۚ وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ﴾ (٦/ الانعام:١٦)

''جس سے خدا کا عذاب ہٹایا گیا تو وہ وہی ہے جس پر اس نے اپنی رحمت کی اور اس کی رحمت کا یہ حصول ہی کھلی کامیابی ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی ان پے در پے رحمتوں کا تقاضا ہے کہ وہ گناہگاروں کو زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان کے نتائج عمل کے بھگت لینے کے بعد بالآخر اپنی رحمت کے سایہ میں لے اور ان کو اپنی بخششوں سے سرفراز فرمائے۔

دوزخ قید خانہ نہیں شفا خانہ ہے

انسان جب عدم حفظ صحت کی غلط کاریوں کے سبب سے بیمار ہو جاتا ہے تو اکثر یہی سمجھا جاتا ہے کہ فطرت نے اس کو ان کے معاوضہ میں بیماری کی تکالیف کی سزائیں دی ہیں، مگر واقعہ یہ نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان غلط کاریوں کے جو نتائج بد انسان کے جسم کے اندر پیدا ہو گئے ہیں ان کو دور کرنے کے لیے جسم انسانی جدوجہد کرتا ہے اور اس کی اس لڑائی کا نام بیماری ہے اور اس لڑائی کی کشمکش کا نام بیماری کی تکالیف و آلام ہے، جن کو ہم دردسر، دردشکم، اعضا شکنی، بے خوابی وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، یہی روحانی بیماریوں کا حال ہے، جن کو ہم اصطلاح شرعی میں ''گناہ'' کہتے ہیں اور جن کے نتائج بد کو عذاب کہتے ہیں اور یہ نتائج جو آتش دوزخ اور اس کے شدائد و آلام کی صورت میں ظاہر ہوں گے اور جن کا منشا یہ ہوگا کہ روح انسانی اپنی غلط کاریوں کے نتائج بد کو دور کرنے کے لیے جدوجہد میں مصروف ہوگی اور جونہی وہ ان سے عہدہ برآ ہوگی خدا کی رحمت سے سرفرازی پا کر اس عذاب سے نکل کر اپنی موروثی بہشت میں داخل ہوگی۔

اس تمہید سے یہ ظاہر ہے کہ دوزخ کی مثال یہ نہیں کہ وہ مجرموں کے لیے قید خانہ ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ بیماروں کے لیے شفا خانہ ہے، بیمار کو شفا خانہ کے اندر بھی ہر قسم کی تکلیفیں محسوس ہوتی ہیں درد، اعضا شکنی، شدتِ تشنگی، سوزش جسم، ان کو وہاں کڑوی سے کڑوی دوا پلائی جاتی ہے، بدمزہ سے بدمزہ کھانا کھلایا جاتا ہے، ضرورت ہوتی ہے تو اس کو نشتر دیا جاتا ہے، اس کا کوئی عضو کاٹا جاتا ہے، کوئی داغا جاتا ہے اور ان سب کی تکلیفیں اس کو اٹھانی پڑتی ہیں مگر یہ ساری ایذا رسانی کسی انتقام اور تکلیف دہی کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے عدم صحت کی غلط کاریوں کے نتائج بد سے اس کے جسم کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کی جاتی ہے اور جو تکلیفیں اس کو وہاں محسوس ہوتی ہیں وہ گو شفا خانہ کے اندر ہی محسوس ہوتی ہیں مگر ان کا سبب شفا خانہ نہیں، بلکہ خود اس بیمار کا اصول صحت سے دانستہ یا نادانستہ انحراف کرنا اور اس کی وجہ سے ان بیماریوں میں مبتلا ہونا ہے۔

یہ اصول ان آیات اور ان احادیث صحیحہ سے پوری طرح سمجھ میں آتا ہے جن میں بالآخر عذابِ دوزخ سے نجات پانے کی کیفیت بیان کی گئی ہے، دنیاوی آلام و تکالیف کی نسبت قرآن نے یہ اصول پیش کیا ہے:

﴿ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱٤۱)

''اور تا کہ خدا ایمان والوں کو پاک وخالص کرے اور کافروں کو مٹائے۔''

یہی اصول عذابِ اخروی پر صادق آتا ہے کہ اس سے بھی مقصود گناہگار اہل ایمان کی پاکی وصفائی ہے، چنانچہ حدیث صحیح میں ہے کہ حقوق عباد کے بعد: ((حَتّٰى اِذَا هُذِّبُوْا وَنُقُّوْا اُذِنَ لَهُمْ فِيْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ)) ❶ ''یہاں تک کہ جب گناہگار چھٹ جائیں گے اور پاک وصاف ہوجائیں گے تب ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملے گی۔''

اس حدیث میں یہ دو لفظ ((هُذِّبُوْا وَنُقُّوْا)) ذرا تشریح طلب ہے۔ ((هُذِّبُوْا)) کا مصدر تہذیب ہے، تہذیب کے لغوی معنی یہ ہیں کہ درختوں کی خراب شاخیں اس لیے چھانٹ دی جائیں، تاکہ درخت میں سرسبزی وشادابی پیدا ہوکر ترقی کی نئی زندگی اس کو مل جائے اور ((نُقُّوْا)) کا مصدر تنقیہ ہے، تنقیہ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے اندر سے خراب وفاسد مادہ کو الگ کردیا جائے، تاکہ وہ پوری طرح نکھر جائے، اس تشریح سے صاف کھل گیا کہ گناہگاروں کو جنت کے داخلہ کے لیے کیا درکار ہے، اسی لیے قرآن پاک میں ہے کہ اہل جنت جب جنت کے قریب پہنچیں گے تو ندا آئے گی:

﴿ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ۝ ﴾ (۳۹/ الزمر:۷۳)

''تم پاک وصاف ہوچکے تو جنت میں ہمیشہ کے لیے آجاؤ۔''

الغرض جب اس طیب وپاکیزگی کا دور آئے گا تو گناہگاروں کو بھی نجات ملے گی، اسی لیے ہر گناہ گار کے لیے دوزخ سے نکلنے کی مدت خواہ کتنی ہی طویل ہو مگر بہرحال اس کی انتہا ہے، فرمایا:

﴿ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا۝ ﴾ (۷۸/ النبا:۲۳)

''دوزخ میں وہ صدہا سال تک پڑے رہیں گے۔''

لیکن بالآخران صدہا سال کا بھی ایک دن خاتمہ ہوگا اور خدا نے چاہا تو ان کو نجات ملے گی۔

حدیث رؤیائے برزخ میں ہے کہ ''آپ ﷺ نے دوزخ میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جنہوں نے کچھ اچھے اور کچھ برے کام کیے تھے، ان کا آدھا دھڑ تو نہایت خوبصورت اور آدھا سخت بدصورت تھا، جب ان کی سزا کی مدت ختم ہوئی تو فرشتوں نے ان سے کہا کہ جاؤ اور اس نہر میں جا کر پڑ جاؤ، سامنے وہ نہر تھی جس میں خالص سفید پانی بہہ رہا تھا وہ اس میں جا کر پڑ گئے، پھر نکل آئے تو ان کی بدصورتی جاتی رہی اور نہایت خوبصورت ہوگئے۔'' ❷ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت کیونکر گناہگاروں کو سرفراز فرمائے گی۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصاص یوم القیامۃ: ٦٥٣٥۔

❷ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب تعبیر الرؤیا بعد الصبح: ٧٠٤٧۔

کیا دوزخ بھی ایک نعمت ہے

اس تفصیل کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ قیامت اور دوزخ کی ہولناکیاں اور سزائیں بھی گناہگاروں کے لیے اللہ تعالیٰ کی اسی طرح نعمت ہیں جس طرح اس دنیا میں شفا خانوں کا وجود بیماروں کے لیے نعمت ہے، اگر دوزخ نہ ہوتی تو گناہگاروں کی پاکیزگی اور پاکوں کی جنت میں ان کے داخل ہونے کی کوئی صورت نہ تھی اس رحمٰن ورحیم کی رحمت وکرم نے گوارا نہ کیا کہ ان بدبختوں کو ان کی نافرمانیوں کے باوجود ہمیشہ کے لیے محروم رکھا جائے اس لیے ان کی صفائی کے لیے پہلے برزخ کا حمام مقرر کیا اور جو اس سے بھی پاک نہ ہوسکیں ان کے لیے دوزخ کی آگ مقرر کی کہ وہ اپنی ہر قسم کی بداعمالیوں کے میل کچیل کو جلا کر نکھر کر پاک ہو جائیں اور کندن بن کر بالآخر اپنی آبائی اور فطری وراثت (جنت) پائیں اس نظریہ کو پیش نظر رکھ کر قرآن پاک کی ان آیتوں کو پڑھیے جن میں قیامت اور دوزخ کی ہولناکیوں اور مصیبتوں کو بھی نعمت سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَاۗءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَاۗنٌّ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ ﴾

(٥٥/ الرحمٰن:٣٥۔٤٥)

''تم پر آگ کے صاف اور دھواں ملے شعلے چھوٹیں گے، پھر کوئی تمہاری مدد نہ کر سکے گا، تو اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، پھر جب آسمان پھٹ کر تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا، تو اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، پھر اس دن کسی انس وجن سے اس کے گناہ کی نسبت نہ پوچھا جائے گا، تو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، گناہگار اپنی نشانیوں سے پہچان لیے جائیں گے، پھر وہ اپنی پیشانیوں کے بال اور پاؤں سے پکڑے جائیں گے تو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے یہ وہ دوزخ ہے جس کو گناہ گار جھٹلاتے ہیں وہ اس دوزخ اور گرم پانی کے بیچ میں گشت کریں گے تو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔''

ان آیتوں کی تفسیر کسی بھی پہلو سے کیجئے یہ بات بہرحال ماننی پڑے گی کہ قیامت اور دوزخ کے ہولناک احوال مجرموں کے حق میں نعمت ہیں اس لیے بھی کہ دنیا میں وہ ان کے ڈر سے برائیوں کو چھوڑ کر راہ راست پر آتے ہیں اور اس لیے بھی کہ آخرت میں وہ انہیں کے ذریعہ سے اپنے گناہوں کے نتائج بد سے بری ہو کر بہشت ربانی کے لائق بن سکیں گے۔

دوزخ میں رحمتِ الٰہی کا ظہور اور نجات

انسان اور وہ بھی اللہ کی توحید کا اور رسول کی صداقت کا معترف خواہ کسی قدر گمراہ اور گناہگار ہو، تاہم اس کے نامۂ اعمال میں کچھ نہ کچھ نیکیاں ضرور ہوں گی، قیامت گو اللہ تعالیٰ کے عتاب وجلال کا روز ہوگا، جس میں ہر گناہگار کو اپنی گناہگاری کا ملزم ہونا پڑے گا مگر بالآخر اس رحمٰن ورحیم کی شان رحیمی کا ظہور ہوگا اور ((رحمتی سبقت غضبی)) [1] (اور میرے غصہ سے میری رحمت سبقت لے گئی ہے) کے اعلان کے مصداق شفاعت کی صورت میں جلوہ گر ہوگا اور گناہگاروں کو اس کی بدولت گناہوں کے داغ سے پاک و صاف کرکے پاکوں کو بہشت میں داخلہ کی اجازت ملے گی، فرمایا:

﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ ﴾(٦٤/ التغابن:٩)

"اور جو اللہ پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے اس سے اس کی برائیاں جھاڑ دے گا اور اس کو جنت میں داخل کرے گا۔"

﴿ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (٩/ التوبة:١٠٢)

"اور دوسرے لوگ جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور ملایا ایک کام نیک اور دوسرا بد، شاید اللہ ان کو معاف کرے، بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم والا ہے۔"

اس معافی کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ وہ بالکلیہ یعنی عذاب کے بغیر ہی معاف کر دے، دوسری یہ کہ وہ دوزخ میں کچھ دن جا کر خدا کی معافی سے سرفراز ہو کر اس سے نکلیں، فرمایا:

﴿ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۚ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴾ (١٩/ مريم:٧١، ٧٢)

"اور تم میں کوئی نہیں جو جہنم میں وارد نہ ہو، تیرے رب کا یہ ضروری فیصلہ ہے، پھر ہم ان کو جو خدا سے ڈرے، نجات دیں گے اور مشرکوں اور کافروں کو ہم اس میں گھٹنے کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔"

احادیث صحیحہ میں اس کے متعلق آنحضرت ﷺ کی حسب ذیل تصریحات مذکور ہیں:

① حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "شفاعت کے ذریعہ لوگ دوزخ سے چھوٹی ککڑیوں کے مانند نکلیں گے۔" [2]

---

[1] صحيح بخاری، كتاب التوحيد: ٧٤٥٣۔

[2] صحيح بخاری، كتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ٦٥٥٨۔

② حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''دوزخ سے کچھ لوگ اس کی جھلس کھا کر نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے''۔ ❶

③ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو خدا فرمائے گا جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو تو وہ کوئلے ہو کر نکلیں گے پھر وہ نہر حیات میں ڈال دیے جائیں گے، تو وہ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے۔'' ❷

④ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے قیامت کے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''پھر میں سجدہ میں گر پڑوں گا تو آواز آئے گی اے محمد (ﷺ)! سر اٹھا، مانگ، دیا جائے گا تو میں سر اٹھاؤں گا اور اس حمد سے جو خدا مجھے سکھائے گا، اس کی حمد کروں گا اور سفارش کروں گا، تو خدا ایک حد مقرر فرمائے گا تو میں ان کو دوزخ سے نکالوں گا اور جنت میں داخل کروں گا، پھر لوٹ کر آؤں گا اور سجدہ میں گر پڑوں گا پھر وہ کچھ لوگوں کو بخش دے گا اسی طرح تیسری پھر چوتھی بار کروں گا، یہاں تک کہ دوزخ میں پھر وہی رہ جائے گا، جس کو قرآن نے روک رکھا ہے۔'' ❸

⑤ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''محمد ﷺ کی شفاعت سے کچھ ایسے لوگ دوزخ سے نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے جن کا نام جہنم والوں میں ہوگا۔'' ❹

⑥ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے سوال پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میری سفارش سے سرفراز ہونے کی خوش قسمتی اس کو حاصل ہوگی جس نے خلوص قلب سے اللہ کی توحید کا اقرار کیا ہو۔'' ❺

⑦ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلہ سے فراغت پائے گا اور چاہے گا کہ ان کو جنہوں نے اس کی توحید کی گواہی دی تھی دوزخ سے نکالے تو فرشتوں کو ان کے نکالنے کا حکم دے گا، فرشتے ان توحید والوں کو اس علامت سے پہچانیں گے کہ ان کی پیشانیوں میں سجدہ کے نشان ہوں گے کہ خدا نے آدم کے بیٹے کی پیشانی کے نشان سجدہ کو دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا ہے، تو وہ ان کو جلا نہ سکے گی، فرشتے جب ان کو نکالیں گے تو وہ جلے جھلسے ہوں گے پھر ان پر آب حیات چھڑکا جائے گا تو وہ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے۔'' ❻

⑧ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جنت والے جنت اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ دیکھو جس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر

---

❶ صحيح بخاري، كتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ٦٥٥٩ـ ❷ ايضًا: ٦٥٦٠ـ
❸ ايضًا: ٦٥٦٥ـ ❹ ايضًا: ٦٥٦٦ـ ❺ ايضًا: ٦٥٧٠ـ ❻ ايضًا: باب الصراط جسر جهنم: ٦٥٧٣ـ

بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو تو وہ جل کر کوئلہ ہو کر نکلیں گے پھر وہ نہرِ حیات میں ڈال دیے جائیں گے تو اس طرح وہ اگیں گے جس طرح سیل آب کے کنارے جنگلی دانہ اُگتا ہے۔“ ❶

⑨ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ اہل دوزخ جو دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے وہ اس میں نہ مریں گے اور نہ جئیں گے، لیکن وہ لوگ جن کو دوزخ کی آگ بعض گناہوں کی وجہ سے چھوئے گی، تو وہ اس میں کچھ دیر کے لیے مر جائیں گے، یہاں تک کہ وہ جل جائیں گے، پھر ان کے حق میں شفاعت کی اجازت ہوگی تو وہ تھوڑے تھوڑے کر کے آئیں گے اور جنت کی نہروں میں پھیل جائیں گے اور اہلِ جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی بہاؤ تو وہ اس طرح اگیں گے جیسے سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانے۔“ ❷

⑩ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”سب سے آخر میں جو شخص دوزخ سے نجات پا کر نکلے گا وہ گھسٹتا ہوا نکلے گا اور اس کو جنت بھری معلوم ہوگی۔“ ❸

⑪ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں روایت ہے کہ ”خدا فرمائے گا کہ ملائکہ نے سفارش کی اور پیغمبروں نے سفارش کی اور اہل ایمان نے سفارش کی اور اب صرف وہ رہ گیا جو تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے، یعنی خود وہ رحمٰن و رحیم دوزخ سے مٹھی بھر کر ان لوگوں کو نکالے گا جنھوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی۔“ ❹

⑫ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”حکم ہوگا کہ جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا ہو اور اس کے دل میں جَو برابر بھی نیکی رہی ہو اس کو دوزخ سے باہر کرو جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا ہو اور گیہوں کے دانہ کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو اور جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا ہو اور جوار کے دانہ کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو، اس کو دوزخ سے الگ کرو۔“ ❺

احادیث کی کتابوں میں ان معنوں کی اور بہت سی حدیثیں ہیں، جن کا استقصا یہاں مقصود نہیں، ان تمام حدیثوں میں قرآن پاک کی اس اہم آیت کا جلوہ موجود ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ ﴾ (٤/ النسآء:١١٦)

”بے شک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا جو گناہ ہے وہ اس کو جس کے لیے چاہے گا معاف کر دے گا۔“

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب تفاضل أهل الایمان فی الأعمال: ٢٢۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ٦٥٦٠۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ٦٥٧١؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب اخر اهل النار...... ٤٦١۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قول الله: وجوه یومئذ ناضرة: ٧٤٣٩۔ ❺ ترمذی، ابواب صفة جهنم، باب ما جآء ان للنار نفسين: ٢٥٩٣، حدیث حسن صحیح، یہ روایت صحیح بخاری میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی کے واسطہ سے ہے مگر کسی قدر فرق کے ساتھ اور اس میں صیغہ یُخرَجُ مجہول آیا ہے۔ دیکھیے: کتاب الایمان، باب زیادة الایمان ونقصانه: ٤٤۔ ”ض“

اس آیت میں تصریح ہے کہ شرک کے علاوہ ہر گناہ کے نتیجہ سے براءت کی جاسکتی ہے مگر شرک وہ بیماری ہے، جس کے نتائج سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں اس لیے ان کے نتائج بدبھگتے بغیر نجات کا تصور بھی خدا کے قانون ابدی کے خلاف ہے۔

شرک وکفر کی بخشائش نہیں

احکام الٰہی اور شریعت ربانی کی کھلی ہوئی دو قسمیں ہیں ایک کا تعلق دل اور قلب سے ہے اور جو بمنزلہ اصل کے ہے اس کو مذہب کی زبان میں ایمان، فلسفہ کی اصطلاح میں علم اور تصوف کی بولی میں عرفان کہتے ہیں اور دوسری قسم وہ ہے جو اس عقیدۂ اول کی فرع اور نتیجہ ہے اور جس کا تعلق اعضا اور جوارح سے ہے اس کو ہم مختصراً عمل اور تفصیلاً عبادات ومعاملات اور اخلاق کہتے ہیں، شرک وکفر کے گناہ کا تعلق قسم اول سے اور دوسرے گناہوں کا تعلق قسم دوم سے ہے، دلوں میں ایمان وعمل وعرفان کی اگر ایک کرن بھی ہو تو اس ظلمت کدہ کی روشنی کی امید کسی طرح کی جاسکتی ہے، مگر جس کاشانۂ دل میں اس نور کا ایک ذرہ بھی نہ ہو اس کی روشنی سے ہمیشہ کے لیے ناامیدی ہے، اسی لیے ایمان کے بغیر اعمال بھی کالعدم ہو جاتے ہیں اور جہاں ایمان کچھ بھی موجود ہے اعمال خیر کا کچھ نہ کچھ وجود ضروری ہے، البتہ اعمال شر کا بھی ساتھ ساتھ وجود ہے، جن کی تلافی عذاب دوزخ کے بعد یا اللہ کی رحمت سے ہو سکتی ہے اور نجات مل سکتی ہے، ایمان وعلم وعرفان جس کی حقیقت ایمان بالغیب ہے، اس کا حصول موت کے بعد جب حقائق خود بخود ہمارے سامنے آتے جاتے ہیں، ہماری وسعت کا نتیجہ نہیں، بلکہ خود ان حقائق کے ظہور کا نتیجہ ہوگا، اس بنا پر شرک وکفر کے گناہ کی مغفرت کی امید قانون الٰہی میں ناممکن ہے، البتہ عمل کی کمی کی تلافی جو دوسری قسم کا گناہ ہے، خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہے۔

سمجھنے کے لیے ان دونوں کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ دنیا میں تعلیمی امتحان کے لیے ۳۳ نمبر کم از کم فرض کیا گیا ہے اب اگر کسی کا پرچہ بالکل سادہ ہے اور اس لیے اس کا نمبر صفر محض ہے تو رحم دل سے رحم دل ممتحن کے لیے بھی یہ ناممکن ہے کہ اس کو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی کامیاب کر سکے، لیکن جس نے کچھ جوابات لکھے ہیں اور کچھ چھوڑ دیے ہیں اور کچھ غلط لکھے ہیں تو اگر وہ ۲۹، ۳۰ کے قریب بھی پہنچ گیا ہے تو رحمدل ممتحن ۳۳ تک اس کو پہنچا کر ادنیٰ درجہ میں کامیاب بنا سکتا ہے۔

الغرض ایمان وعلم وعرفان کے مجرم جن کا نام مشرک وکافر ہے، اپنے ناقابل تلافی نتیجہ کے بھگتے بغیر عذاب دوزخ سے رہائی کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کی دنیاوی زندگی کا عرفانی فقدان رحمت الٰہی کو اپنی طرف جذب کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا، مگر کیا شرک وکفر کے گناہگاروں کے لیے شرک وکفر کے دورۂ عذاب کے طے کر لینے کے بعد بھی رہائی کا تصور کیا جاسکتا ہے، اس کا جواب آئندہ سطروں میں ملے گا۔

کیا دوزخ کی انتہا ہے؟

دوزخ جو عتابِ الٰہی کا گھر ہے، کیا ہمیشہ آباد رہے گا؟ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عمومی کے قائلوں کے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے [1] ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ مدتِ دراز کے بعد ایک دن آئے گا جب جہنم کی آگ رحمت الٰہی کے چھینٹوں سے بالآخر سرد ہو جائے گی، حدیث صحیح میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنت میری رحمت اور دوزخ میرا عذاب ہے۔'' [2] اسی کے ساتھ یہ بھی حدیث صحیح میں وارد ہے کہ ''جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کا فیصلہ کیا اسی وقت اس نے اپنے عرش کے اوپر یہ لکھ دیا کہ ((رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي)) [3] ''میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی ہے۔'' اب اگر دوزخ جو اس کے غضب کا مظہر ہے، اس کی جنت ہی کی طرح دائمی و ابدی ہو تو اس کا غضب اس کی رحمت پر سبقت لے جاتا ہے، یا برابر ہو جاتا ہے اور اس کا تخیل بھی اس رحمان و رحیم کی نسبت نہیں ہو سکتا، اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصوں میں سے

---

[1] ابتدائی اسلامی فرقوں میں جہنم کی ابدیت اور غیر ابدیت پر بہت سے مناظرے ہو چکے ہیں جن کی تفصیل ملل ونحل کی کتابوں میں موجود ہے، ایک دو کو چھوڑ کر اس پر تو بے شبہ قطعیت کے ساتھ سب کا اتفاق ہے کہ جنت کا وجود دائمی اور ابدی ہے، لیکن جہنم کے دوام اور ابدیت میں کسی قدر اختلاف ہے، عام اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ جہنم اور جنت دونوں کا دائمی وجود ہے گنا ہگار مومن اپنے گناہ کے بقدر عذاب اٹھا کر یا خدا کی رحمت سے معاف ہو کر بالآخر جنت میں داخل کیے جائیں گے لیکن مشرک و کافر کے گناہ کبھی معاف نہ ہوں گے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں جلیں گے۔ فقہا اور محدثین کا ایک گروہ جو مرجیہ کہلاتا ہے اس بات کا قائل ہے کہ جو مومن ہوگا وہ گناہگار بھی ہوگا تو بھی دوزخ میں نہ جائے گا بلکہ معافی سے سرفراز ہو کر شروع ہی سے جنت میں داخل ہوگا اس کے برخلاف خوارج اور معتزلہ کا یہ عقیدہ ہے کہ مومن بھی اگر گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا تو وہ بھی کفار کی طرح ہمیشہ دوزخ میں ہی رہے گا اور بھی اس بارہ میں لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔

اہل سنت کے ایک مختصر گروہ کا جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے نام بھی ہیں اور متاخرین میں جن کے پرجوش حامی حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ ہیں نے بیچ کا مسلک اختیار کیا ہے چنانچہ علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور ایک زیدی یمنی عالم شیخ مقبلی نے بھی اس کو قبول کیا ہے، العلم الشامخ فی ایثار الحق علی الاباء والمشائخ (صفحہ ۱۲۲) نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ جب گنہگار اپنے اپنے گناہوں کے بقدر عذاب پا چکیں گے تو جہنم فنا کر دی جائے گی اور جنت کو بقائے دوام بخشا جائے گا، حافظ ابن قیم نے اپنی دو کتابوں شفاء العلیل اور حادی الارواح میں (دونوں مطبوعہ ہیں، حادی الارواح اعلام الموقعین کے ساتھ چھپی ہے، میں قرآن اور احادیث اور آثار اور عقل کی پچیس دلیلوں سے اپنے مسلک کو مبرہن کیا ہے (دیکھو شفاء العلیل ص: ۲۵۲ تا ۲۶۴؛ حسینیہ مصر اور حادی الارواح از ص: ۱۶۷ تا ۲۲۵ مطبعہ جدیدہ مصر) علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس نظریہ کو سلف اہل سنت کے ایک فریق کا مسلک تسلیم کیا ہے، (حادی الارواح ابن قیم جلد دوم، صفحہ: ۱۶۷) صوفیہ میں شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کے متبعین یہ فرماتے ہیں کہ کافر و مشرک جن پر خلود نار کا حکم ہے وہ بالآخر دوزخ میں رہتے رہتے ایسے ہو جائیں گے کہ ان کو اسی دوزخ میں راحت اور لذت معلوم ہونے لگے گی جیسے بعض کیڑے غلاظتوں ہی کو پسند کرتے ہیں اور انہیں میں لطف اٹھاتے ہیں، میں نے اس باب کو بہت ڈرتے ڈرتے لکھا ہے کہ اس میں اجمال الٰہی کی تصریح کا جرم عائد ہوتا ہے۔ اگر یہ اختیار کردہ پہلو حق نہ ہو تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے اور توبہ کی توفیق بخشے اور اپنی مراد کا دروازہ مجھ پر کھول دے۔،،

[2] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ما جاء فی قول اللّٰہ تعالیٰ ﴿إن رحمت اللّٰہ قریب من المحسنین﴾: ۷۴۴۹؛ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا واھلھا، باب النار یدخلھا الجبارون...... ۷۱۷۳۔

[3] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللّٰہ ولقد سبقت کلمتنا ...: ۷۴۵۳؛ صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی سعۃ رحمۃ اللّٰہ: ۶۹۷۰۔

صرف ایک حصہ دنیا میں اتارا اور ننانوے حصے قیامت کے دن کے لیے رکھے ہیں۔'' [1] اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ ایک دن آئے گا جب اس کے غضب پر اس کی رحمت غالب آ جائے گی اور اس کی رحمت کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور یہ وہ دن ہوگا جب گناہگار اپنے گناہوں کی ناپاکیوں اور نجاستوں سے اپنے اپنے مقررہ وقت پر پاک ہو کر اس کی رحمت کی سرفرازی کے قابل بن جائیں گے۔ اسلام کی رو سے سب سے بڑے مجرم مشرک و کافر ہیں اور جو اس وقت تک نجات نہ پاسکیں گے، جب تک دوزخ کے تنور میں ایک گرم کوئلہ بھی باقی ہے، تاہم ان کے عذاب کی مدت کی نسبت قرآن میں حسب ذیل تین تصریحات ہیں:

١۔ ﴿ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۝ ﴾ (۷۸/ النبا:۲۳)

''وہ دوزخ میں صد ہزار سال ٹھہریں گے۔''

صد ہا ہزار ہا سال کی مدت کسی قدر بڑی ہو پھر بھی ایک دن ان کا خاتمہ ہوگا، دوسری آیت جو صریحاً کفار و مشرکین کے حق میں ہے، یہ ہے:

٢۔﴿ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾

(۶/ الانعام:۱۲۹)

''دوزخ ہے تمہارا ٹھکانا، اس میں تم سدا رہنے والے ہو، لیکن یہ کہ اللہ جو چاہے، بے شک تیرا رب حکیم و علیم ہے۔''

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ شرک و کفر کی سزا تو اصل میں قانوناً یہی ہے کہ دوزخ میں دائمی سزا دی جاتی رہے مگر اس کی رحمت کا اقتضا کچھ اور ہے، لیکن وہ حکیم و علیم ہے، اس لیے وہ اپنا ہر کام اپنی حکمت و مصلحت اور علم کے مطابق کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس کے حق میں کیا کرنا چاہیے اور کب کرنا چاہیے۔

تیسری آیت میں ہے:

٣۔﴿ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝ ﴾

(۱۱/ ھود:۱۰۷)

''وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، جب تک آسمان و زمین قائم ہیں، لیکن یہ کہ جو تیرا رب چاہے، بے شک تیرا رب جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔''

دوسری اور تیسری دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں اپنی مشیت کو عذاب کی انتہا بتایا ہے اور اپنے کو ''رب'' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اس کی مشیت سے بالآخر اس عذاب کا ختم ہونا اس کی ربوبیت کا اقتضا ہے۔ قرآن پاک میں کوئی ایسی صاف و صریح آیت موجود نہیں ہے جس سے دوزخ کی بقائے دوام عدم انتہا اور تسلسلِ وجود پر بتصریح استدلال کیا جا سکے، حالانکہ اس کے برخلاف بہشت

[1] صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی سعۃ رحمۃ اللہ: ۶۹۷۳ تا ۶۹۷۵۔

کی ہمیشگی و بقا اور عدمِ انقطاع و عدمِ فنا کی بیسیوں آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں۔ چنانچہ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس اوپر والی آیت کو ہم تمام و کمال یہاں نقل کرتے ہیں، فرمایا:

﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ۝ ﴾

(۱۱/ ھود:۱۰۶۔۱۰۸)

''تو لیکن جو بد بخت ہوئے وہ دوزخ میں ہوں گے، اس میں ان کو گدھوں کی طرح چلانا اور رینگنا ہے جب تک آسمان اور زمین ہیں وہ اس دوزخ میں رہیں گے، مگر جو چاہے تیرا رب، بے شک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے اور لیکن وہ جو خوش قسمت ہوئے، تو وہ جنت میں ہوں گے، ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم رہیں، مگر جو چاہے تیرا رب، یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔''

دیکھو کہ اہل جنت اور اہل دوزخ دونوں کے لیے خلود و دوام فرمایا، پھر ان دونوں میں اس کے بعد اپنی مشیّت سے استثنا فرمایا، مگر اہل دوزخ کے دوام کے ذکر میں فرمایا کہ ''مگر جو چاہے تیرا رب بے شک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے'' اس سے معلوم ہوا کہ وہ چاہے تو دوزخ کے عذاب کو ختم کر دے اور چاہے تو قائم رکھے، لیکن اہلِ جنت کے دوام کے ذکر میں بتصریح فرمایا: ''مگر جو چاہے تیرا رب یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اہل جنت کے حق میں اس کی مشیت یہی ہوگی کہ وہ بے انقطاع اور غیر منتہی دوام و تسلسل کے ساتھ ہمیشہ قائم و باقی رہے۔ اس آیت کی تفسیر میں متعدد ائمہ سلف مثلاً: ابن زید اور شعبی وغیرہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے بارہ میں تو اپنی مشیت ظاہر فرما دی کہ وہ مسلسل اور غیر منقطع ہے، لیکن اہل دوزخ کی نسبت اپنی مشیت کو کسی مصلحت سے مخفی رکھا ہے۔ [1]

ایک اور مقام پر خاص طور پر کفار و مشرکین کا نام لے کر اس طرح فرمایا گیا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ﴾ (۹۸/ البینۃ:۶۔۸)

''بے شک اہل کتاب اور مشرکوں میں سے جنھوں نے کفر کیا، وہ جہنم کی آگ میں (خالد) پڑے رہیں، یہ بدترین لوگ ہیں، بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ بہترین لوگ ہیں، ان کی جزا ان کے پروردگار کے نزدیک بسنے کے باغ ہیں، جن میں نہریں بہتی ہوں گی

[1] تفسیر طبری، ج ۱۲، ص: ٦٦، ٦٧؛ درمنثور سیوطی تفسیر آیات ھود، ج ۳، ص: ۳۵۰۔

وہ اس میں ہمیشہ (خالد) رہیں گے۔"

غور سے دیکھو کہ اس میں اہل دوزخ کے مقابلہ میں اہل جنت کے دوام میں کتنی تاکید پر تاکید ہے، پہلے عدن فرمایا، جس کے معنی قیام اور بسنے کے ہیں، پھر خالدین کہا کہ وہ اس میں رہا کریں گے، بعد ازیں اَبَدًا ، فرمایا کہ وہ جنت میں ابدی طور سے قیام کریں گے۔

اسی طرح ایک اور سورۃ میں ہے:

﴿ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۝ ﴾

(٦٤/ التغابن:٩، ١٠)

"اور اس کو ان باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے اور وہی بڑی کامیابی ہے اور جنہوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں وہ اس میں رہا کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔"

دیکھو کہ تقابلاً دونوں میں ﴿خالدین﴾ (رہا کریں گے) اور ﴿خالدين فيها ابدا﴾ (ہمیشہ رہا کریں گے) کا فرق کتنا نمایاں ہے، کہیں یہ کہا گیا ہے کہ کفار کے عذاب میں مدت کے تعین سے سرے سے خاموشی برتی گئی ہے اور جنت میں خلود کی تصریح فرمادی گئی ہے، مثلاً:

﴿ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُھُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُھُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ ھُمْ فِيْھَا خٰلِدُوْنَ۝ ﴾ (٣/ آل عمران:١٠٦، ١٠٧)

"جس دن کچھ منہ سفید ہوں گے اور کچھ سیاہ، تو جو سیاہ ہوئے، تو کیا ایمان کے بعد کافر ہو گئے تھے، تو اپنے کفر کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو اور جن کے منہ سفید ہوئے، تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور اس رحمت میں سدا رہیں گے۔"

آیتِ بالا میں عذاب کے ذکر میں مدت کی تصریح سے سراسر خاموشی ہے اور رحمت کے ذکر میں خلود کی تصریح تمام ہے۔

انہیں آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایتیں ہیں کہ ایک دن آئے گا، جب دوزخ کے میدان میں ہُو کا عالم ہوگا اور کوئی ایک متنفس بھی وہاں نظر نہیں آئے گا، چنانچہ

① طبرانی میں حضرت ابوامامہ صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جہنم پر ایک ایسا دن آئے گا جب وہ خزاں رسیدہ پتے کے مانند ہو جائے گی اور اس کے دروازے کھل جائیں گے۔"

② حضرت جابر رضی اللہ عنہ یا کسی اور صحابی سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جہنم پر ایک دن ایسا آئے گا جس میں اس کے دروازے کھل جائیں گے اور اس میں کوئی نہ ہوگا۔''

③ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''میں جو کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہنم پر ایک دن آئے گا جب اس میں کوئی نہ ہوگا۔''

④ تفسیر عبد بن حمید میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ''اہلِ دوزخ ریگستانِ عالج کے ذرات کے بقدر شمار بھی دوزخ میں رہیں پھر بھی ایک دن آئے گا جب وہ اس سے نکلیں گے۔''

⑤ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''جہنم پر ایک دن آئے گا کہ جب اس کے خالی دروازے بھڑ بھڑائیں گے اور اس میں کوئی نہ ہوگا اور یہ اس وقت ہوگا جب لوگ اس میں صدہا ہزار سال (احقاب) کی مدت پوری کرلیں گے۔''

⑥ عبدالرزاق، ابن منذر، طبرانی اور بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات میں ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ صحابی یا ابو سعید خدری صحابی یا کسی اور صحابی نے یہ فرمایا کہ ﴿اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ﴾ کا استثنا پورے قرآن پر حاوی ہے، یعنی جہاں جہاں قرآن میں ﴿خالدین فیها﴾ (سدا اس میں رہیں گے) وہاں یہ مشیت الٰہی کا استثنا قائم ہے۔

⑦ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دوزخ پر ایک زمانہ آئے گا، [1] جب اس کے خالی دروازے کھڑکھڑائیں گے۔

دفعِ شبہ

قرآن پاک میں ایسی بھی چند آیتیں ہیں جن سے لوگوں کو دوزخ کے دوام کا خیال ہوا ہے، مثلاً: وہ تین آیتیں جن میں کفار کو خلدین فیها ابدا ہمیشہ کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے:

۱۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾

(۳۳/ الاحزاب: ٦٤، ٦٥)

''بے شک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لیے وہ آگ مہیا کی جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔''

۲۔ ﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۝﴾

[1] حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے شفاء العلیل، (ص: ۲۵۸) میں ان روایات کو غیر مطبوعہ کتب تفسیر وحدیث سے نقل کیا ہے، ان میں سے بعض ابن جریر طبری میں بھی آیات مذکور کی تفسیر میں خصوصاً تفسیر سورۂ ہود، جلد ۱۲، ص: ٦٦ میں مذکور ہیں اور حافظ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے بھی تفسیر درمنثور تفسیر سورۂ ہود، جلد ۳، ص: ۳۵۰ میں زیر آیت مذکورہ ہود ذکر کیا ہے اور کتاب الاسماء والصفات بیہقی، ص: ۱۲۳ مطبوعہ الہ آباد (حیدر آباد) میں چھٹی روایت ہے۔

(۷۲/ الجن:۲۳)

''اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، تو اس کے لیے جہنم کی وہ آگ ہے، جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا۔''

۳۔ ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۙ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴾ (۴/ النسآء:۱۶۸، ۱۶۹)

''بے شک جنہوں نے کفر کیا اور حد سے آگے بڑھے نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے لیکن جہنم کی راہ جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔''

ان تینوں آیتوں میں ﴿ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴾ (دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے) کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جن کے حق میں یہ آیتیں آئی ہیں وہ اس وقت دوزخ میں ہمیشہ قائم رہیں گے جب تک حسب مشیت الٰہی دوزخ کے خاتمہ کا دور نہیں آئے گا۔ باقی چند آیتوں میں ﴿ اَبَدًا ﴾ (ہمیشہ) کے بغیر صرف خالد ہے، جیسے ﴿ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ وہ اس میں ''خالد'' رہیں گے۔ یا ایک جگہ ہے:

﴿ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ (۳۲/ السجدۃ:۱۴)

''اور ''خلود'' کے عذاب کا مزہ چکھو۔''

تو یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ خلود کے دو معنی ہیں، ایک حقیقی دوام اور دوسرے قیام طویل، ان دو میں سے کسی ایک معنی کی تخصیص بقرائن ہوگی، اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے عربی اشعار میں پہاڑوں اور بدویانہ چولھوں کے پتھروں کے لیے خوالد اور خالدات کے لفظ صفت میں آتے ہیں، کیونکہ وہ تادیر اور زمانہ دراز تک باقی رہنے والے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ تنہا ﴿ خَالِدِيْنَ ﴾ کا لفظ ابدیت کے مفہوم میں صریح نہیں، جب تک اس کے ساتھ کوئی اور قرینہ قائم نہ ہو جو دوام کے معنی کی تخصیص کر دے، جیسا کہ یہ قرینہ ان آیتوں میں ہے جہاں اہل جنت کو ﴿ خٰلِدِيْنَ ﴾ کہا گیا ہے کہ تقریباً بیس آیتوں میں اس خلود کے معنی دوام اور عدم انقطاع کے بتائے گئے ہیں، اس لیے جنت کے سلسلہ میں جہاں صرف ﴿ خٰلِدِيْنَ ﴾ بھی ہے وہاں ہمیشگی اور دوام ہی کے معنی لیے جائیں گے برخلاف اس کے جہاں دوزخ کے ساتھ ﴿ خٰلِدِيْنَ ﴾ کا لفظ ہے وہاں دوام کے مفہوم کے لیے کوئی قرینہ موجود نہیں اس لیے دوزخ والی آیتوں میں خلود سے مقصود یہ ہے کہ گنا ہگار زمانہ دراز تک دوزخ میں رہیں گے، غالباً یہی وجہ ہے کہ گنا ہگار اہلِ ایمان کی سزا میں کبھی خلدین کے ساتھ ﴿ اَبَدًا ﴾ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ گنا ہگار اہل ایمان میں سے سب سے بڑی دھمکی اس کو دی گئی ہے جس نے کسی مسلمان کا خون بے سبب بہایا ہو مگر اس کے سامنے بھی خلدین کے ساتھ اَبَدًا استعمال نہیں کیا گیا، فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا ﴾ (۴/ النسآء:۹۳) ''اور جو کوئی کسی باایمان کو

قصداً قتل کردے گا تو اس کا بدلہ دوزخ ہے، جس میں وہ ﴿خَالِدًا﴾ (یعنی مدت دراز تک) پڑا رہے گا۔''

یہی سبب ہے کہ معتزلہ اور خوارج کے سوا تمام اہل اسلام اس بے گناہ مسلمان مقتول کے قاتل کی بالآخر بخشائش کے قائل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان آیتوں میں ''خلود'' سے مراد ہمیشگی نہیں ہے بلکہ زمانہ دراز ہے کہ اہلِ توحید کی بالآخر نجات قرآن و حدیث کی متفقہ تعلیم ہے اور اس لیے مومن کے لیے اس کے کسی جرم کی سزا میں ہمیشگی کا مفہوم داخل ہی نہیں ہوسکتا، بنابریں ان آیتوں میں خلود کے معنی منطقی دوام نہیں بلکہ عرفی دوام یعنی مدت دراز کے ہیں ہم عام طور سے مجرم کے لیے حبسِ دوام کی قانونی اصطلاح بولتے ہیں جس سے مراد کبھی ابد تک کیا، قیامت تک کا زمانہ بھی نہیں ہوسکتا بلکہ عمر بھر بھی نہیں، بلکہ صرف اس سے قانونی قید کی دراز ترین مدت مراد ہے جس کا قانونی اندازہ بیس سال کیا گیا ہے۔ کتنے مجرم ہیں جو اس مدت کو کاٹ کر آزادی حاصل کرتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو کسی شاہی عفو عام کے سلسلہ میں قبل از مدت رہائی پا جاتے ہیں۔

دو چار آیتیں ایسی بھی ہیں جن میں مذکور ہے کہ یہ گناہگار دوزخ سے الگ نہ ہوں گے۔ چنانچہ وہ آیتیں حسب ذیل ہیں:

(۱) ﴿ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۝ يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ۝ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ۝ ﴾

(۸۲/ الانفطار:۱۴۔۱۶)

''بے شک گناہگار دوزخ میں ہیں وہ انصاف کے دن اس میں داخل ہوں گے اور وہ اس سے چھپے نہیں رہ سکتے۔''

(۲) ﴿ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۶۷)

''اور کہیں گے کہ کاش ہم کو دوبارہ دنیا کی زندگی ملتی تو ہم اپنے پیشواؤں سے ہی الگ ہو جاتے، جیسے وہ ہم سے یہاں الگ ہو گئے، اللہ ان کے کاموں کو ایسے ہی حسرتیں بنا کر ان کو دکھائے گا اور وہ دوزخ سے نکلنے والے نہیں۔''

(۳) ﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ يُرِيدُونَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُقِيمٌ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۳۶، ۳۷)

''بے شک جنہوں نے کفر کیا اگر ان کی ملکیت میں کل روئے زمین ہو اور اتنا ہی اور ہو، تا کہ اس کو فدیہ دے کر قیامت کے عذاب سے رہائی پائیں، تو وہ ان کی طرف سے قبول نہ ہو اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں، لیکن وہ اس سے

نکلنے والے نہیں اور ان کے لیے قائم عذاب ہے۔''

(٤) ﴿ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴾

(۲۲/ الحج:۲۲)

''وہ جب چاہیں کہ اس دوزخ سے غم کی وجہ سے نکل پڑیں وہ اس میں لوٹا دیئے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ جلنے کی سزا چکھو۔''

(٥) ﴿ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴾ (۳۲/ السجدة:۲۰)

''اور لیکن جنہوں نے نافرمانی کی تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، جب وہ چاہیں گے کہ وہ اس سے نکل جائیں اس میں لوٹا دیے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ دوزخ کی اس مار کا مزہ چکھو، جس کو تم جھٹلاتے تھے۔''

یہ وہ پانچ آیتیں ہیں جن سے بعضوں کو عذابِ دوزخ کے دوام اور غیر منقطع بقا کا خیال پیدا ہوا ہے، مگر ان میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو تو ان کے خیال کی غلطی فوراً معلوم ہو جائے گی، پہلی آیت کا منشا اسی قدر ہے کہ کوئی گناہگار اگر یہ سمجھے کہ وہ کسی جگہ چھپ کر دوزخ کے عذاب سے بچ جائے گا تو یہ محال ہے کہ خدا سے چھپ کر بچ جانا کسی طرح ممکن نہیں۔ دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوزخی کہیں گے کہ ہم کو دوزخ سے نکل کر دوبارہ دنیا میں جانے دیا جائے تو اب کی بار ہم نیکی کے کام کریں گے، اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اب یہاں سے نکل کر دنیا میں دوبارہ جانا نہیں، تیسری آیت میں ہے کہ پورے روئے زمین کی دولت دے کر بھی آخرت میں نجات خریدی نہیں جا سکتی اور نہ وہاں سے کوئی نکل کر بھاگ سکتا ہے، چوتھی اور پانچویں آیت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی دوزخی دوزخ کے عذاب سے گھبرا کر اس سے نکل بھاگنا چاہے گا تو وہ پکڑ کر پھر اسی میں ڈال دیا جائے گا، ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ گناہگار از خود دوزخ سے نکل نہ سکیں گے اور نہ مدت عذاب کے اندر وہ خلاصی پا سکتے ہیں مگر اس سے خدا تعالیٰ کے حکم و اجازت سے بالآخر اس سے نجات پانے کی نفی نہیں نکلتی اور نہ اس کی کہ بقدر گناہ عذاب کی مدت بسر کرنے کے بعد بھی نجات نہیں مل سکتی اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بہشت کی طرح دوزخ کو بھی غیر متناہی دوام بخشا گیا ہے۔

یہی وہ آیتیں ہیں جن سے گناہگاروں کے لیے دوام عذاب کا مفہوم نکالا جا سکتا ہے، مگر ایک ایک آیت کو غور سے پڑھو کہ ان میں سے کسی میں بھی دوزخ کے دوام، بقا اور عدم فنا یا اس کے عذاب کے عدم انتہا کی تصریح ہے؟ حالانکہ اس کے بالمقابل جنت کی بقائے دوام اور عدم انقطاع کی تصریح بار بار اور بتکرار ہے۔

ایک اور نکتہ لحاظ کے قابل ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خدا نے گناہگاروں کو عذاب دوزخ کی ابدیت اور

دوام کی دھمکی دی ہے، تاہم اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے کہ نیکی کا بدلہ نہ دینا، یقیناً برائی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی قدوسیت کا دامن تمام تر پاک ہے کہ ﴿ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴾ (۳/ آل عمران: ۹) ''تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔'' ﴿ إِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًّا ﴾ (۱۹/ مریم: ٦١) ''اس کا وعدہ جنت پورا ہی ہوگا۔'' لیکن اگر برائی کا بدلہ حسب تہدید، سابق برائی کے ساتھ نہ دیا جائے تو یہ حقیقت میں خلاف وعدگی نہیں جو قابل ملامت ہو بلکہ اس کا نام مغفرت، کرم، عطا اور عفو ہے جس کا اہل اس رحمٰن ورحیم اور عفو اور غفور سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں، اس لیے گنا ہگاروں کے ساتھ جیسا کہ اس نے فرمایا اپنی حکمت ومصلحت کی بنا پر وہ جو چاہے کرسکتا ہے، چنانچہ مسند ابویعلیٰ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''خدا نے کسی نیک کام پر جس ثواب کا وعدہ فرمایا ہے وہ اس کو ضرور ہی پورا کرے گا لیکن جس کسی کو اس نے کسی کام پر عذاب کی دھمکی دی ہے تو اس کو اختیار حاصل ہے۔'' [1]

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر بالآخر گناہوں کی مغفرت اور خدا کی رحمت میں یہ وسعت اور عموم ہے کہ بڑے سے بڑے گنا ہگار بھی دوزخ کی آگ میں جل کر بالآخر پاک وصاف اور جنت میں داخل ہونے کے قابل ہوجائیں گے تو اشارات وکنایات کے بجائے ان کی معافی کی صریح تصریح کیوں نہیں کردی گئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ ان مجرموں اور گنا ہگاروں کے حق میں اچھا نہ ہوتا کہ اس سے ان کے نادم و تائب ہونے کے بجائے ان میں اور خودسری، گستاخی اور شوخی پیدا ہوتی اور ان[illegible] آیندہ کے نتائج بد سے نڈرپن اور بے خوفی آجاتی اور ایسا ہونا تنبیہ واصلاح وتدارک کی مصلحتوں کے سراسر منافی ہوتا، اس لیے ان کی قانونی سزا تو دائمی عقاب مقرر فرمائی اور بالآخر ان کی نجات کو اپنی مشیت اور علم ومصلحت کے سپرد فرما کر ان کو ایک گونہ اپنے سے ناامید بھی نہیں ہونے دیا اور امید وبیم کی حالت میں رکھ کر اپنے سامنے جھکنے اور محبت کرنے کا جذبہ بھی پیدا کردیا اور یہ اس باب میں وہ عظیم الشان اصلاح ہے، جس کو ایک طرف عیسائیوں نے کفارہ کی اور دوسری طرف ہندو مذاہب نے کرم کی تعلیم دے کر غارت کردیا تھا۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہو کر جی اٹھنے پر ایمان لانے سے تمام گناہ دفعتہً معاف ہوجاتے ہیں، اس تعلیم نے اعمال کو غیر ضروری چیز ٹھہرا دیا تھا اس کے برخلاف ہندو مذاہب نے تو خدا کو اتنا بے اختیار ٹھہرایا کہ اعمال بد کے نتائج جن کو کرم کہتے ہیں، خدا چاہے بھی تو وہ کبھی معاف نہیں ہوسکتے لیکن اسلام نے آکر ترازو کے ان دونوں پلوں کو برابر کردیا ایک طرف فرمایا: ﴿ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴾ (۷٤/ المدثر: ۳۸) ''ہر نفس اپنے عمل کے ہاتھ میں گرو ہے۔'' اور دوسری طرف فرمایا: ﴿ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ ﴾ (٥/ المآئدۃ: ٤٠) ''خدا جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے۔''

[1] بحوالہ حادی الارواح ابن قیم رحمہ اللہ ص: ۲۲۲، مصر۔

یعنی قانوناً ہر انسان اپنے عمل کے نتائج کا یقیناً پابند ہے، مگر خدا تعالیٰ کی قدرت اور رحمت اس قانون کے باوجود جو چاہے کرسکتی ہے۔ جس طرح اس دنیا کا حال ہے کہ گو خدا کے بنائے ہوئے قانون یہاں جاری ہیں، جن کو آپ قانون فطرت کہتے ہیں مگر بااین ہمہ اس حکم اور اس کی خواہش اور مصلحت ان پر بھی حاکم ہے اور وہ جو چاہے کرسکتا ہے، اس تعلیم نے ایک طرف اعمال کو غیر ضروری ہونے سے بچالیا اور دوسری طرف خدا کی قدرت تام اور رحمت کا دروازہ بھی کھلا رکھا۔

عذابِ طویل کا سبب

بعض کم فہم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کا گناہ جو ایک لمحہ کا کام ہے اس کا عقاب اتنا طویل کیوں رکھا گیا ہے، اسی طرح سال دو سال یا عمر بھر کے گناہ کی سزا صدہا اور ہزارہا سال کے عقاب سے دینا مناسب نہیں، حالانکہ یہ لوگ اگر دنیاوی ہی واقعات پر غور کرتے تو وہ ان کی تسکین کے لیے کافی ہوتے، دنیا کا ہر بڑے سے بڑا قانونی گناہ ایک لمحہ میں انجام پاتا ہے، چوری، عمل خلاف قانون، یا کسی کو قتل کرتے کتنی دیر لگتی ہے مگر اس کے معاوضہ میں سالہا سال کی قید ہم خود اپنی انسانی عدالت گاہوں میں تجویز کرتے ہیں اور اس کو خلاف عقل نہیں کہتے۔

دوسری صحیح تر مثال یہ ہے کہ انسان کو دیکھو کہ ذراسی جسمانی بد پرہیزی اور اصول صحت کی معمولی سی غلطی کی پاداش میں وہ کبھی ہفتوں مہینوں بلکہ سالہا سال بیمار رہتا ہے اور ایک مدت دراز میں جاکر کہیں ان چند لمحوں کی غلطی کی تلافی کر پاتا ہے اور کبھی اس معمولی غلطی کی بدولت عمر بھر اس کے روگ میں مبتلا رہتا ہے اور آخر میں جان دے دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اس کی تلافی کی مدت یکساں نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلہ میں اس کی تلافی کی مدت صدہا اور ہزارہا گنا زیادہ ہوتی ہے کیونکہ طبیعت پر جو اثر پڑ جاتا ہے اس کی تلافی کی مدت غلطی کی نوعیت، طبیعت کی صلاحیت اور خلاق عالم کی مصلحت کی بنا پر کی جاسکتی ہے اسی لیے عقاب طویل سے رہائی یا شفایابی کی مدت بھی ہر گناہگار کے لیے یکساں نہیں ہوتی۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِحَقِيقَةِ الْحَالِ.

مشرک و کافر کا آخرانجام؟

اگر یہ صحیح ہے کہ بالآخر ایک دن جہنم کی آگ سرد ہو جائے گی، تو کیا اہل کفر و شرک بھی اپنے گناہوں سے پاک ہو کر رحم و کرم کے سزاوار ہو جائیں گے، جواب یہ ہے کہ

قرآن پاک میں اس کی تصریح موجود ہے کہ شرک و کفر کا گناہ معاف نہ ہوگا، یعنی اس کے اخروی نتائج کی پاداش ضروری ہے اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ شرک و کفر کی جزا دوام عذاب اور خلود نار ﴿ خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴾ ہے، یعنی جب تک دوزخ قائم ہے اس سے ان کو نجات نہیں مل سکتی مگر جب حسب مشیت الٰہی وہ دن آئے کہ خود دوزخ کی مدتِ حیات ختم ہو جائے تو اس وقت عجب نہیں کہ ان کو بھی اس سے رہائی مل سکے۔

چنانچہ مشرکین وکافرین کے ذکر میں خدا فرماتا ہے:

﴿قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ﴾

(٦/ الانعام:١٢٨)

''فرمائے گا، دوزخ کی آگ تمہارا ٹھکانا ہے، اس میں ہمیشہ رہو گے، مگر یہ کہ جو چاہے اللہ، بے شک تیرا پروردگار حکمت اور علم والا ہے۔''

اس آیت کا آخری ٹکڑا خاص طور سے قابل ذکر ہے تیرا رب حکمت اور علم والا ہے۔ اس موقع پر خدا کے لیے خاص طور پر رب کا لفظ لانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی شانِ ربوبیت اگر چاہے گی تو اس کے غیر محدود علم و حکمت کا اقتضا ہوگا تو دوزخ کے خاتمہ پر ان کو رہائی مل سکے گی۔

لیکن اس میں شک ہے کہ آیا اس کے بعد بھی وہ جنت میں داخل ہوسکیں گے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے قرآن میں یہ تصریح الٰہی ہے:

﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ﴾ (٥/ المآئدۃ:٧٢)

''یہ کہ بے شبہ اللہ کا جو شریک بنائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کردی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔''

نیز ایک اور آیت میں ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَاۗءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰي يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ۭ﴾ (٧/ الاعراف:٤٠)

''بے شک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے غرور کیا تو ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے، تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو جائے۔''

الغرض خدا کے اعلان کردہ قانون جزا کا اقتضا تو یہی ہے کہ گو ان کے لیے کبھی دوزخ کا خاتمہ بھی ہو جائے مگر پھر بھی جنت کے احاطہ میں ان کا گزر نہ ہو لیکن اس کی رحمت و مغفرت کا دائرہ اس سے بڑھ کر ہے جیسا کہ خود اس نے اہل دوزخ کی نسبت کہا ہے کہ

﴿اِلَّا مَا شَاۗءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ (١١/ ھود:١٠٧)

''وہ سدا دوزخ میں رہیں گے، لیکن تیرا رب جو چاہے، بے شک تیرا رب جو چاہے کر گزرتا ہے۔''

ں دائرہ کی وسعت کو کون کم کرسکتا ہے، پھر اس کا یہ بھی اعلان ہے کہ

﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ﴾ (٧/ الاعراف:١٥٦)

’’اور میری رحمت ہر شے کو اپنی گنجائش میں لیے ہے۔‘‘

اس رحمت عام کی وسعت سے آسمان و زمین کا کون سا گوشہ محروم ہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ پیغمبر کے جھٹلانے والوں کو کہا جاتا ہے کہ

﴿ فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ﴾

(٦/ الانعام:١٤٧)

’’اے پیغمبر! اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے کہ تمہارا پروردگار وسیع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب گناہگاروں سے لوٹایا نہیں جاسکتا۔‘‘

یعنی کسی دوسرے میں یہ طاقت نہیں کہ اس کے بھیجے ہوئے عذاب کو گناہگاروں کے سر سے ٹال دے لیکن خود اس کی رحمت بڑی وسیع ہے، وہ چاہے تو ان کو دنیا ہی میں ہدایت دے کر جنت نصیب کرے یا آخرت میں عذاب دینے کے بعد درگزر کر دے اور اس کی اصلی رحمت کا محل وہی ہے، جہاں کسی دوسری رحمت کا وجود نہ ہوگا، فرمایا:

﴿ مَنْ يُصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ ۚ ﴾ (٦/ الانعام:١٦)

’’جس سے اس دن عذاب ہٹایا گیا، تو خدا نے اس پر رحم کیا۔‘‘

صحیح بخاری ومسلم، ترمذی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ’’اگر مومن کو معلوم ہو کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے تو وہ جنت سے مایوس ہو جائے گا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہو کہ اس کی رحمت کتنی وسیع ہے تو وہ بھی جنت سے ناامید نہ ہوگا۔‘‘ [1] مصلح الدین سعدی شیرازی نے غالباً اسی حقیقت کو اپنے دو شعروں میں ادا کیا ہے:

به تهدید اگر بر کشد تیغ حکم	بماننند کر وبیان صم وبکم
ودگر درد هدیك صلائے کرم	عزازیل گوید نصیبے برم [2]

خود اس رحمٰن ورحیم کا ارشاد ہے کہ جس کی بادشاہی آسمان و زمین کو محیط ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے:

﴿ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴾ (٥/ المآئدة:١٨)

’’جس کو چاہتا ہے، بخش دیتا ہے اور جس کو چاہے عذاب دیتا ہے اور اسی اللہ کی آسمانوں کی اور زمین کی اور ان کے بیچ کی بادشاہی ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔‘‘

لیکن یہ اس کی مشیت جیسا کہ اس نے (٦/ انعام:١٢٨) میں فرمایا ہے کہ اس کی وسیع حکمت ومصلحت

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب الرجاء مع الخوف: ٦٤٦٩؛ صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی سعة رحمة الله: ٦٩٧٩؛ جامع ترمذی، ابواب الدعوات: ٣٥٤٢؛ مسند احمد، ج٢، ص:٣٣٤، ٤٨٤۔

[2] بوستان، ص:٥۔

پر مبنی ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے مگر کرتا وہی ہے جو اس کی مصلحت وحکمت کا تقاضا ہے۔

اس سے زیادہ اس باب میں کچھ اور کہنا حد سے آگے بڑھنا ہے کہ جس کی تصریح خود خدائے تعالیٰ نے نہیں فرمائی اس کی تصریح کا حق کسی کو کیا ہے۔ اس لیے مشرک وکافر کے آخر انجام کے سوال کا جواب صرف مشیت الٰہی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:

﴿ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾

(٦/ الانعام:١٢٨)

’’دوزخ تمہارا ٹھکانا ہے، اس میں سدا رہو گے، لیکن جو چاہے اللہ بے شک تیرا پروردگار حکمت والا اور علم والا ہے۔‘‘

جمہور کا مسلک خلود نار

جو کچھ کہا گیا وہ اس جماعت کا خیال ہے، جو اللہ تعالیٰ کی رحمت عمومی کی معتقد ہے، جمہور کا مسلک اس سے کچھ مختلف ہے، اس کے نزدیک بہشت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ باقی رہے گی اور ان لوگوں کو جو شرک اور کفر کے مرتکب ہوں گے، کبھی دوزخ سے نجات نہیں ملے گی۔ اس عقیدہ کے مطابق گناہگاروں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو گناہگار تھے مگر ایمان رکھتے تھے، ایسے لوگ عذاب کے بغیر ہی یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے عفوو کرم سے سرفراز ہو کر بالآخر جنت میں داخل ہوں گے، دوسرے وہ جو ہمیشہ شرک وکفر میں مبتلا رہے اور اس سے توبہ کیے اور ایمان لائے بغیر مر گئے، ایسے لوگوں کی بخشش کبھی نہ ہوگی اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل کر دیے جائیں گے، ان کی گناہگاری اس درجہ ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف کسی طرح جذب نہ کر سکیں گے، وہ زمین شور ہوں گے جس میں اس رحمت عام کی بارش بھی کوئی روئیدگی پیدا نہ کر سکے گی۔ رحمتِ عمومی کے معتقدین گزشتہ آیتوں سے جو معنی نکالتے ہیں، وہ جمہور کے نزدیک صحیح نہیں، وہ ان کے بیان کردہ مطالب کو تاویلات کا درجہ دیتے اور ان کی پیش کردہ روایات کو صحت اور قوت سے خالی جانتے اور قرآن مجید کی حسب ذیل آیتوں سے اپنے دعویٰ پر استدلال کرتے ہیں:

١۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ ﴾

(٣٣/ الاحزاب:٦٤، ٦٥)

’’بے شک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لیے وہ آگ مہیا کی، جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔‘‘

٢۔ ﴿ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ﴾

(٧٢/ الجن:٢٣)

''اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے، اس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔''

۳۔ ﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ۝ إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ﴾ (٤/ النسآء:١٦٨، ١٦٩)

''بے شک جنہوں نے کفر کیا اور حد سے آگے بڑھے نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے، لیکن جہنم کی راہ، اس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔''

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ ان پر ہمیشہ عذاب ہوگا اور جب عذاب ہمیشہ ہوگا، تو عذاب کی جگہ یعنی دوزخ بھی ہمیشہ قائم رہے گی۔

ان آیتوں کے علاوہ اور بھی دوسری آیتیں ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کا عذاب کافر سے کبھی دور نہ ہوگا:

۱۔ ﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ يُرِيدُونَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُقِيمٌ ۝ ﴾ (٥/ المآئدة:٣٦، ٣٧)

''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، اگر بالفرض ان کے پاس ساری زمین کا خزانہ ہو اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور کہ وہ اس کو فدیہ دے کر قیامت کے دن اس عذاب سے چھٹ جائیں تو ان سے یہ فدیہ قبول نہ کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں اور وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے۔''

۲۔ ﴿ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ۝ ﴾ (٢/ البقرة:١٦٧)

''وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے۔''

قیامت کے منکروں کی نسبت فرمایا:

۳۔ ﴿ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ۝ ﴾ (٤٥/ الجاثية:٣٥)

''تو آج اس دوزخ سے وہ نہیں نکالے جائیں گے اور نہ ان کا عذر سنا جائے گا۔''

٤۔ ﴿ أَلَا إِنَّ الظَّالِمِينَ فِي عَذَابٍ مُقِيمٍ ۝ ﴾ (٤٢/ الشورىٰ:٤٥)

''ہاں کافر اور مشرک قائم رہنے والے عذاب میں ہوں گے۔''

ظلم کا اطلاق قرآن میں شرک پر کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ شرک کا عذاب قائم رہے گا:

۵۔ ﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ

أَجْمَعِينَ ۝ خٰلِدِينَ فِيهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۶۱، ۱۶۲)

’’بے شک جنہوں نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے، ان پر اللہ کی فرشتوں کی اور آدمیوں کی، سب کی لعنت ہے، اس میں وہ سدا رہیں گے، ان کے عذاب میں کمی نہیں کی جائے گی اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔‘‘

۶۔ ﴿ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۭ ﴾ (۳۵/ فاطر: ۳۶)

’’اور ان کے لیے جنہوں نے کفر کیا، جہنم کی آگ ہے، نہ تو ان کا فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ سزا میں کچھ کمی کی جائے گی۔‘‘

شرک وکفر والوں کی مغفرت کسی حال میں نہ ہوگی، فرمایا:

۷۔ ﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ ﴾ (۴/ النسآء:۱۱۶)

’’بے شک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔‘‘

۸۔ ﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۝ ﴾

(۴۷/ محمد:۳۴)

’’بے شبہ جنہوں نے کفر کیا اور خدا کے راستے سے روکا اور اسی کفر کی حالت میں وہ مر گئے، تو ان کو ہرگز معاف نہ کیا جائے گا۔‘‘

ان کے لیے جنت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہے:

۹۔ ﴿ إِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوٰىهُ النَّارُ ۭ ﴾

(۵/ المآئدۃ:۷۲)

’’یقیناً جو خدا کے ساتھ شرک کرے گا، تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔‘‘

۱۰۔ ﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۭ ﴾ (۷/ الاعراف:۴۰)

’’بے شک جنہوں نے ہمارے حکموں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے سرکشی کی، ان کے لیے آسمان کے دروازے کھولے نہ جائیں گے اور نہ جنت میں وہ داخل ہوں گے، تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے۔‘‘

۱۱۔ ﴿ وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ ۚ إِنَّهُمْ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ۗ يُرِيدُ اللَّهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْآخِرَةِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۷۶)

''اور اے پیغمبر! تجھے وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں غم میں نہ ڈالیں، وہ ہرگز خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، خدا چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ بنائے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔''

اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ مرتے دم تک شرک و کفر میں مبتلا رہے اور توبہ نہیں کی ان کا گناہ بخشا نہ جائے گا اور وہ جنت میں کبھی داخل نہ ہو سکیں گے، بلکہ ہمیشہ دوزخ کے عذاب میں پڑے رہیں گے، جہاں نہ ان کے عذاب میں کبھی تخفیف ہوگی اور نہ ان کو موت آئے گی۔ تصویر کے دونوں رخ آپ کے سامنے آ گئے۔

بیا کایں داور یہارابہ پیش داور اندازیم

بہشت ودوزخ کی جزاوسزا بھی تمثیلی ہے

اوپر عالم برزخ کے ذکر میں ہم بہ تفصیل بتا چکے ہیں کہ آخرت میں جزاوسزا تمام تر تمثیلی ہوگی۔ اس تمثیلی کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ جیسا عمل ہوگا اسی کے مناسب ومشابہ اس کی جزا یا سزا ہوگی، مثلاً: قرآن میں ہے کہ جو زکوۃ یعنی اپنے مال کا میل کچیل [1] مستحقین کو کھانے کے لیے نہ دے گا تو اس کو دوزخ میں زخموں کا دھوون کھانے کو ملے گا۔ (۶۹/ الحاقۃ: ۳۴۔۳۶) یا یہ کہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان دے گا مرنے کے بعد اس کو جان تازہ اور حیات نو بخشی جائے گی۔ (۳/ آل عمران: ۱۶۹) وہ دولت مند جس کو دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے قصر ومحل اور پینے کے لیے ٹھنڈے سے ٹھنڈا پانی اور عزت کی جگہ عنایت کی گئی تھی اگر اس نے دنیا میں ان نعمتوں کے ملنے کا حق اس دنیا میں ادا نہ کیا تو دوسری دنیا میں اس کو یہ سامان ملے گا:

﴿ فِي سَمُومٍ وَحَمِيمٍ ۝ وَظِلٍّ مِنْ يَحْمُومٍ ۝ لَا بَارِدٍ وَلَا كَرِيمٍ ۝ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُتْرَفِينَ ۝ ﴾ (۵۶/ الواقعۃ: ۴۲۔۴۵)

''وہ لو اور کھولتے پانی میں، دھوئیں کے سایہ میں، نہ ٹھنڈا، نہ باعزت، بے شک وہ پہلے نازو نعمت میں تھے۔''

رؤیائے برزخ کی حدیث میں ہے کہ آپ نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور

---

[1] حدیث میں ہے کہ زکوۃ مسلمانوں کی دولت کا میل ہے۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب ترک استعمال آل النبی ﷺ علی الصدقۃ: ۲۴۸۲؛ ابوداود، کتاب الامارۃ، باب فی بیان مواضع قسم الخمس: ۲۹۸۵۔

آدھا بدصورت تھا، یہ وہ تھے جن کے کچھ کام اچھے اور کچھ برے تھے [1] اس لیے بداعمالی بدصورتی اور نیکی خوبصورتی کے رنگ میں نمایاں ہوئی، صریح طور سے یہ اصول ان حدیثوں میں مستنبط ہوتا ہے:

① حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''جو مومن خود بھوکا رہ کر کسی دوسرے بھوکے مومن کو کھلائے گا، تو خدا اس کو جنت کے پھل کھلائے گا اور جو پیاسا ہو کر کسی دوسرے پیاسے کو پلائے گا تو خدا اس کو جنت میں شراب طہور پلائے گا اور جو کوئی کپڑوں کا حاجت مند ہو کر ننگے کو پہنائے گا، تو خدا اس کو جنت کے سبز جوڑے پہنائے گا۔'' [2]

② حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جو کوئی کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی کوئی تکلیف دور فرمائے گا اور جو کوئی کسی نادار کو یہاں کسی مصیبت میں پھنسائے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کو مصیبت میں مبتلا فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی ستر پوشی کرے گا تو خدا دنیا و آخرت میں اس کی ستر پوشی کرے گا اور جو کوئی اپنے بھائی کی مدد میں جب تک رہے گا خدا اس وقت تک اس کی مدد میں رہے گا۔'' [3]

③ ''جو انسانوں پر رحم کرے گا، خدا اس پر رحم فرمائے گا۔'' [4]

تمثیل کے دوسرے معنی یہ ہیں، کہ جو امور معنوی اور غیر مجسم ہیں وہ اپنی مثالی شکل و صورت میں ظاہر ہوں گے، مثلاً:

① قرآن میں ہے کہ جو اس دنیا میں حقیقت بینی سے اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ (۱۷/ الاسراء ۷۲) دیکھو کہ دنیا کی معنوی و قلبی نابینائی دوسرے عالم میں ظاہری و جسمانی نابینائی کی شکل میں ظاہر ہوگی۔

② حدیث میں ہے کہ اہلِ تکبر قیامت کے دن چیونٹیاں بنا کر اٹھائے جائیں گے جن پر ہر طرف سے ذلت و خواری چھائی پھرے گی۔ [5] دیکھو کہ تکبر کی جزا ذلت و خواری سے ملے گی اور چونٹیوں سے زیادہ حقیر و ذلیل کوئی ہستی نہیں، اس لیے ان کی بڑائی اور تکبر کا معاوضہ یہ ہوگا کہ وہ چیونٹی بن کر اٹھیں۔

③ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو بخل کرے گا، قیامت میں اس کا مال سانپ بن کر اس کو ڈسے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب تعبیر الرؤیا بعد صلاۃ الصبح: ۷۰۴۷۔

[2] ترمذی، ابواب صفة القیامة، باب فی ثواب الاطعام: ۲۴۴۹۔

[3] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الستر علی المسلمین: ۱۹۳۰۔

[4] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة الناس: ۱۹۲۴۔

[5] ترمذی، ابواب صفة القیامة، باب ماجاء فی شدة الوعید للمتکبرین: ۲۴۹۲۔

گا۔'' [1] صفتِ بخل اس کے حق میں اسی سانپ کی صورت اختیار کر کے اس کی تکلیف کا باعث ہوگی، آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ ''جو شخص بلاوجہ بھیک مانگ کر اپنی آبروریزی کرتا ہے، قیامت میں وہ اٹھے گا تو اس کے منہ پر گوشت نہ ہوگا۔'' [2] دیکھو کہ دنیاوی بے شرمی و بے حیائی بے گوشت چہرہ کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ ''دو بیبیوں کا وہ شوہر جو ایک کا حق ادا کرتا اور دوسری سے غفلت برتتا تھا، قیامت میں اس طرح آئے گا کہ اس کا ایک پہلو (گویا مفلوج ہو کر) جھک گیا ہوگا۔'' [3] ایک پہلو کا عدم ادائی حق اپنی تمثیلی صورت ایک پہلو کی مفلوجی کیفیت میں نمودار ہوگا، یہ چند حوالے ذکر کیے گئے ہیں، انہیں پر جزا و سزا کے اور دوسرے جزئیات کو قیاس کرنا چاہیے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے سے حسب ذیل آیتوں پر غور کرنا چاہیے:

﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۱۲۴، ۱۲۶)

''جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس کو تنگ گزران ملتی ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے، وہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا، میں تو دیکھتا تھا، فرمائے گا اسی طرح میری آیتیں تیرے پاس آئیں تو، تو نے ان کو بھلا دیا ایسے ہی آج تو بھلایا جائے گا۔''

دیکھو کہ دل کی نابینائی قیامت میں ظاہری نابینائی اور یہاں خدا کو بھولنا اور اس کے احکام کو یاد نہ کرنا، وہاں رحمت الٰہی کی یاد سے بھول کی شکل میں نمودار ہوگا۔

دوزخ کی جسمانی سزائیں

دوزخ میں جسمانی اور روحانی دونوں سزائیں ملیں گی، قرآن پاک میں جن جسمانی سزاؤں کا ذکر ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

① آتشِ دوزخ اور اس کی سوزش کا ذکر بار بار آیا ہے بلکہ اَلنَّارُ یعنی آگ گویا دوزخ کا دوسرا نام ہے، انہیں معنوں میں اَلسَّعِیْرُ یعنی جلتی آگ بھی بارہا مستعمل ہوا ہے اور عَذَابَ الْحَرِيْقِ جلن کا عذاب بھی دو چار جگہ کہا گیا ہے اور ایک جگہ یہ بھی ہے کہ

---

[1] صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں: ((مثل له ماله شجاعا اقرع)) کتاب الزکوٰۃ، باب اثم مانع الزکوٰۃ: ۱۴۰۳ وکتاب التفسیر: ۴۵۶۵۔ [2] ترمذی، ابواب الزکوٰۃ، باب ما جاء من نخل الزکوٰۃ: ۶۵۰؛ بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب من سال الناس تکثرا: ۱۴۷۴؛ یہ روایت سنن نسائی، کتاب الزکوٰۃ، باب المسالۃ: ۲۵۸۶ وباب حد الغنی: ۲۵۹۳؛ مسند احمد، ج ۲، ص: ۱۵ میں بھی ہے اور سب میں یہ الفاظ ملتے ہیں ''لیس فی وجهه مزعة'' لیکن ترمذی جس کا مصنف نے حوالہ دیا ہے اس میں ''و مسئلته فی وجهه خموش اوخروش اوکدوح'' وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں۔ ''ض''

[3] ترمذی، ابواب النکاح، باب ماجاء فی التسویة بین الضرائر: ۱۱۴۱۔

﴿ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۱۰۴)

''ان کے چہروں کو دوزخ کی آگ جھلس دے گی اور ان کی صورتیں بگڑ جائیں گی۔''

دوزخ کا ایک اور نام سقر ہے، جس کے متعلق یہ ہے کہ

﴿ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ۝ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ۝ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۝ ﴾ (۷۴/ المدثر:۲۷-۲۹)

''اور تمہیں کیا معلوم، سقر کیا ہے، نہ وہ رحم کھائے گی، نہ چھوڑے گی، چہروں کو جھلس دینے والی۔''

﴿ كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝ ﴾ (۷۰/ المعارج:۱۵، ۱۶)

''ہرگز نہیں، وہ شعلہ والی آگ ہے، منہ کی کھال ادھیڑنے والی۔''

﴿ اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۝ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ۝ ﴾ (۷۷/ المرسلات:۳۲، ۳۳)

''دوزخ محل کے برابر اونچی چنگاریاں اتنی بڑی پھینکے گی جیسے زرد رنگ کے اونٹ۔''

② وہاں سایہ نہ ہوگا، بلکہ یہ حکم ہوگا:

﴿ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ۝ ﴾

(۷۷/ المرسلات:۳۰، ۳۱)

''چلو ایک چھاؤں کی طرف جس کی تین پھانکیں ہوں گی، نہ گھنی کی چھاؤں اور نہ تپش میں کام آسکے۔''

③ وہاں ٹھنڈک نہ ہوگی:

﴿ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ۝ ﴾ (۷۸/ النبا:۲۴)

''اس میں وہ نہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ کسی پینے کی چیز کا۔''

④ دوزخ میں نہ موت آئے گی کہ چین آجائے اور نہ ایسی زندگی ہی ہوگی جس میں کوئی مسرت ہو، دو جگہ فرمایا:

﴿ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۷۴، ۸۷/ اعلی:۱۳)

''وہاں وہ نہ مرے گا نہ جیے گا۔''

⑤ پینے کو گرم پانی ملے گا، جس سے آنتیں نکل پڑیں گی:

﴿ وَسُقُوْا مَاۗءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَاۗءَهُمْ ۝ ﴾ (۴۷/ محمد:۱۵)

''اور وہ گرم پانی پلائے جائیں گے تو وہ پانی ان کی آنتوں کو ٹکڑے کردے گا۔''

⑥ اور پیپ پئیں گے:

﴿ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ۝ ﴾ (۷۸/ النبا:۲۵) ''لیکن کھولتا پانی اور پیپ۔''

⑦ ان کے اوپر سے گرم پانی چھوڑا جائے گا:

﴿ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ ۝ ﴾ (۲۲/ الحج:۱۹)

''ان کے سروں کے اوپر سے گرم پانی ڈالا جائے گا۔''

⑧ کھانے کو سینڈ ھے کا پھل ملے گا:

﴿ أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ ۝ إِنَّا جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً لِّلظَّالِمِينَ ۝ إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ ۝ طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ ۝ فَإِنَّهُمْ لَآكِلُونَ مِنْهَا فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ ۝ ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيمٍ ۝ ﴾ (۳۷/ والصفت:۶۲۔۶۷)

''یا سینڈھے کا پھل .... وہ ایک درخت ہے دوزخ کی جڑ میں، اس کے شگوفے جیسے شیطانوں کے سر، تو وہ کھائیں گے اور اس سے پیٹ بھریں گے، پھر اس پر گرم پانی کی ملونی ہوگی۔''

﴿ إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ ۝ طَعَامُ الْأَثِيمِ ۝ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ۝ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ ۝ ﴾

(۴۴/ الدخان:۴۳۔۴۶)

''سینڈھے کا درخت گناہگار کی غذا ہے، جیسے پگھلا ہوا تانبا، وہ پیٹیوں میں کھولتا ہے، جیسے کھولتا پانی۔''

⑨ خاردار جھاڑی کی خوراک ہوگی جس سے بدن کو کوئی فائدہ نہ ہوگا:

﴿ لَّيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِن ضَرِيعٍ ۝ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِن جُوعٍ ۝ ﴾

(۸۸/ الغاشیۃ:۶، ۷)

''اور ان کے لیے کوئی کھانا نہ ہوگا، لیکن خاردار جھاڑی، جو نہ موٹا کرے گی اور نہ بھوک سے بے پروا کرے گی۔''

⑩ زخموں کے دھوون کی خوراک ملے گی:

﴿ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ ۝ ﴾ (۶۹/ الحآقۃ:۳۶)

''اور نہ کوئی کھانا، مگر زخموں کا دھوون۔''

⑪ کھانا نگلا نہ جائے گا:

﴿ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ ﴾ (۷۳/ المزمل:۱۳) ''اور گلے میں اٹکنے والا کھانا۔''

⑫ آگ کے کپڑوں کا لباس ہوگا:

﴿ فَالَّذِينَ كَفَرُوا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّن نَّارٍ ﴾ (۲۲/ الحج:۱۹)

''کافروں کے لیے آگ کے کپڑے قطع ہوں گے۔''

⑬ لوہے کے ہتھوڑے پڑیں گے:

﴿ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ۝ ﴾ (۲۲/ الحج: ۲۱)

''اوران کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہیں۔''

⑭ گلے میں طوق اور زنجیریں:

﴿ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ۭ يُسْحَبُوْنَ ۝ ﴾ (۴۰/ المؤمن: ۷۱)

''جب انکی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی وہ کھینچے جائیں گے۔''

﴿ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۟ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ۝ ﴾ (۷۶/ الدھر: ۴)

''ہم (خدا) نے کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور آگ تیار کر رکھی ہے۔''

﴿ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ۝ ﴾ (۱۴/ ابراھیم: ۴۹)

''وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔''

دوزخ میں روحانی سزائیں

ان جسمانی سزاؤں کے ساتھ روحانی سزائیں بھی ہوں گی، جو اہل نظر کی نگاہوں میں ان سے بڑھ کر ہوں گی، چنانچہ دوزخ کی وہ آگ جس کی گرمی اور سوزش کا حال اوپر گزر چکا ہے، وہ دل کو جا کر جھانکے گی، فرمایا:

﴿ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝ ﴾ (۱۰۴/ الھمزۃ: ۶، ۷)

''سلگائی ہوئی اللہ کی آگ جو دلوں کو جھانکے گی۔''

﴿ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ ﴾ (۱۰/ یونس: ۵۴)

''اور جب عذاب کو دیکھیں گے، تو اپنی پشیمانی کو چھپائیں گے۔''

﴿ يٰحَسْرَتٰى عَلٰي مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ ﴾ (۳۹/ الزمر: ۵۶)

''اے حسرت اس پر کہ میں نے خدا کے پہلو میں کمی کی۔''

﴿ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ ﴾ (۲۲/ الحج: ۲۲)

''وہ جب دوزخ سے غم کی وجہ سے نکلنا چاہیں گے۔''

ذلت کا عذاب

﴿ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ ﴾ (۴۶/ الاحقاف: ۲۰)

''تو آج ذلت کے عذاب کا بدلہ دیے جاؤ گے۔''

اس افسوس وحسرت وندامت سے بڑھ کر یہ کہ ان کو معذرت پیش کرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی:

﴿ لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۖ ﴾ (٦٦/ التحریم:٧) ''آج معذرت نہ پیش کرو۔''

اللہ عزوجل سے مکالمہ کا شرف ان کو نہ ملے گا، جب وہ بات کرنا چاہیں گے، تو وہ فرمائے گا:

﴿ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ۝ ﴾ (٢٣/ المؤمنون:١٠٨)

''ذلیل ہو اس دوزخ میں اور مجھ سے بات نہ کرو۔''

سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے جلوہ سے محروم رہیں گے:

﴿ كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ۝ ﴾ (٨٣/ التطفیف:١٥)

''ہرگز نہیں، وہ اس دن اپنے رب سے پردہ میں ہوں گے۔''

اُن میں سے وہ جنہوں نے اس دنیا میں اپنے پروردگار کو بھلا دیا تھا، پروردگار بھی اس دن ان کو اپنی رحمت وشفقت کی یاد سے بھلا دے گا، فرمایا:

﴿ كَذَٰلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا ۖ وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنسَىٰ ۝ ﴾ (٢٠/ طٰہٰ:١٢٦)

''اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو، تو نے ان کو بھلا دیا، ایسے ہی آج تو بھی بھلایا جائے گا۔''

بلکہ وہ دوزخی بھی ہوں گے، جو اللہ تعالیٰ کی نگاہِ کرم سے بھی محروم رہیں گے، وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا اور نہ اُن سے کچھ بات کرے گا اور نہ اُن کی اصلاح حال کی کوئی فکر کرے گا، یہ حقیقت میں شفیق ومہربان رب کی انتہائی ناراضی کی تصویر ہے، اس درد کے احساس کو وہی کچھ سمجھ سکتے ہیں جو عشق ومحبت کے زخم خوردہ ہیں، فرمایا:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ ﴾

(٣/ آل عمران:٧٧)

''جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی جھوٹی قسموں کے ذریعہ سے تھوڑی سی دولت خریدا کرتے ہیں، وہ یہ ہیں جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور نہ قیامت میں خدا ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو سنوارے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

جنت

جنت کے نام

اس مقام کا نام جو نیکو کار انسانوں کا دائمی گھر ہوگا، قرآن پاک میں عموماً ﴿اَلْجَنَّةُ﴾ (باغ) بتایا گیا ہے اور کبھی کبھی اس کو مناسب اضافتوں کے ساتھ بھی ادا کیا گیا، مثلاً: ﴿جَنَّةُ النَّعِيْمِ﴾ (نعمت کا باغ) ﴿جَنَّةُ الْخُلْدِ﴾ (بقائے دوام کا باغ) ﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ﴾ (دائمی سکونت کے باغ) ﴿جَنَّةُ الْمَاْوٰى﴾ (پناہ کا باغ) ان کے علاوہ اور دوسرے لفظوں سے اس کی تعبیر کی گئی ہے مثلاً: فِرْدَوْسٌ (باغ) رَوْضَةٌ (چمن) ﴿دَارُ الْخُلْدِ﴾ (ہمیشگی کا گھر) ﴿دَارُ الْمُقَامَةِ﴾ (قیام کا گھر) ﴿دَارُ السَّلَامِ﴾ (امن وسلامتی کا گھر)

جنت کا دوام

اس موجودہ دنیا میں بھی گو لذتیں اور مسرتیں ہیں مگر جو چیز یہاں نہیں ہے وہ بقائے دوام ہے یہاں کی ہر لذت عارضی اور ہر مسرت فانی ہے یہاں خوشی کا کوئی ترانہ نہیں جس کے بعد غم و ماتم کا نالہ نہ ہو، یہاں ہر پھول کے ساتھ کانٹے، ہر روشنی کے ساتھ تاریکی، ہر وجود کے ساتھ فنا، ہر سیری کے بعد بھوک، ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے۔ انسان ہزاروں مشکلیں اٹھانے اور ہزاروں صدمے سہنے کے بعد ایک مسرت کا پیام سنتا اور خوشی کا منظر دیکھتا ہے، مگر ابھی اس سے سیر ہونے کی بھی نوبت نہیں آتی کہ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے، غرض اس موجودہ عالم فانی کی ہر شے آنی جانی ہے اور یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے۔

لیکن جنت اس مملکت کا نام ہے، جہاں کی لذتیں جاودانی اور جہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں، جہاں حیات ہے مگر موت نہیں، راحت ہے مگر تکلیف نہیں، لذت ہے مگر الم نہیں، مسرت ہے مگر غم نہیں، جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں، وہ شادمانی ہے جس کے بعد حزن واندوہ نہیں، شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے جس جنت کا نقشہ کھینچا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔ اس نے کہا: اے آدم!

﴿هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۲۰)

"کیا میں تجھے سدا جینے کا درخت اور وہ بادشاہی بتاؤں جس کو فنا نہیں۔"

مگر جنت کا یہ وصف سنا کر ان کو جدھر کا راستہ بتایا وہ موت کے درخت اور فنا کے ملک کی طرف کا تھا اور یہی وہ فریب تھا جس میں آدم گرفتار ہوئے، چنانچہ اسی جنتی زندگی کی تلاش میں وہ چیز کھالی جو ان کے حق میں زہر تھی یعنی گناہ کا پھل، نتیجہ یہ ہوا کہ جنۃ الخلد اور غیر فانی ملک سے نکل کر ان کو اس فنا کے ملک میں آنا پڑا اور پھر اس کا استحقاق ان کے اور ان کی نسل کے اعمال کا صلہ قرار پایا، چنانچہ فرمایا:

﴿اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً وَّمَصِيْرًا﴾

(۲۵/ الفرقان:۱۵)

''یا ہمیشگی کا باغ جس کا وعدہ پرہیز گاروں سے کیا گیا، جوان کا صلہ ہوگا اور واپسی کی جگہ۔''

یہ ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہے جہاں کا آرام دائم اور جہاں کی سلامتی ہمیشہ، جہاں کی لذت بے انتہا، جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاوداں ہے۔ چنانچہ اس کی تصریح قرآن پاک کی سولہ آیتوں میں مختلف طریقوں سے کی گئی ہے، فرمایا:

۱۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ؀ ﴾ (٤/ النسآء: ١٢٢)

''اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں گے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان میں وہ ہمیشہ کے لیے رہ پڑیں گے، اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی۔''

اس تاکید پر تاکید اور پرزور طریقۂ تعبیر پر نظر ڈالیے کہ صرف خلود پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی اَبَدًا فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا، اس پر بھی بس نہ کی بلکہ یہ بھی اضافہ کیا کہ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اس پر بھی مزید تاکید کا اضافہ کیا کہ اور اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خلودِ جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے:

۲۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ﴾ (٤/ النسآء: ٥٧)

''اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں گے، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔''

۳۔ ﴿ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ﴾ (٥/ المآئدۃ: ١١٩)

''ان کے لیے وہ باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔''

٤۔ ﴿ وَجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ؀ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ﴾ (٩/ التوبۃ: ٢١، ٢٢)

''اور (اللہ ان کو خوشخبری دیتا ہے) کہ ان کے لیے وہ باغ ہیں، جن میں ہمیشہ کا آرام ہے اور جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔''

٥۔ ﴿ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ﴾ (٩/ التوبۃ: ٨٩)

''اور ان کے لیے وہ باغ مہیا کیے ہیں، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔''

٦۔ ﴿ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴾

(٦٤/ التغابن:٩)

''اس کو ان باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔''

٧۔ ﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ؀ ﴾ (٦٥/ الطلاق:١١)

''اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک کام کرے اس کو وہ ان باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے، اللہ نے اس کو روزی خوب دی۔''

٨۔ ﴿ جَزَاۗؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ﴾

(٩٨/ البينة:٨)

''ان کی مزدوری ان کے رب کے حضور میں بسنے کے وہ باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔''

یہ آیتیں وہ ہیں جن میں اہل جنت کو جنت میں خلود ابدی کی قطعی بشارت سنائی گئی ہے، ان کے علاوہ وہ آیتیں ہیں، جن میں جنت کی راحتوں اور لذتوں کی ابدیت اور دوام کی خبر دی گئی ہے، فرمایا:

٩۔ ﴿ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَـنًا ۝ مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝ ﴾

(١٨/ الكهف:٢۔٣)

''اور ان مومنوں کو بشارت دُوں گا، جنہوں نے اچھے کام کیے کہ ان کے لیے اچھی مزدوری ہے، جس میں وہ ہمیشہ قیام پذیر رہیں گے۔''

سورۂ صٓ میں جنت کی اکثر نعمتوں کے بیان کے بعد ہے:

١٠ ۔ ﴿ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ۝ ﴾

(٣٨/ صٓ:٥٣، ٥٤)

''یہ وہ ہے، جس کا حساب کے دن تم کو دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے، بے شبہ یہ ہماری وہ روزی ہوگی، جس کو ختم ہونا نہیں ہے۔''

١١ ۔ ﴿ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَاۗءَ رَبُّكَ ۭ عَطَاۗءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ۝ ﴾ (١١/ هود:١٠٨)

''اور لیکن جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں رہا کریں گے، جب تک آسمان اور زمین ہیں،

لیکن جو تیرا رب چاہے وہ بخشش ہوگی جو منقطع نہ ہوگی۔''

یعنی خدا کی مشیت کے سوا ان کو اس جنت سے کوئی الگ نہ کر سکے گا لیکن اس کی مشیت یہی ہوگی کہ ان کے لیے اس کی یہ بخشش دائمی اور غیر منقطع طریقہ سے ہمیشہ قائم رہے، پھر جس کے متعلق اس کی مشیت کا یہ اعلان، ہے وہ فنا کیونکر ہوگی:

۱۲۔ ﴿ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴾ (۹/ التوبة:۲۱)

''اور وہ باغ، جن میں ان کے لیے قائم رہنے والی نعمت ہوگی۔''

۱۳۔ ﴿ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ﴾ (۱۳/ الرعد:۳۵)

''جنت کا میوہ اور اس کا سایہ دائمی ہے۔''

۱٤۔ ﴿ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ﴾ (۵٦/ الواقعه:۳۲، ۳۳)

''اور بہت سے میوے، جن کا نہ انقطاع ہوگا اور نہ جن کی روک ہوگی۔''

۱۵۔ ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴾ (۹۵/ التین:٦)

''لیکن جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کے لیے وہ مزدوری ہے، جس کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔''

فنائے راحت اور انقطاع مسرت کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ راحت و مسرت کے اسباب کا خاتمہ ہو جائے اور دوسرے یہ کہ خود لذت اٹھانے والے کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے، پہلی صورت کی نفی تو گزشتہ آیتوں میں کر دی گئی ہے کہ راحت و مسرت کے اسباب کا وہاں خاتمہ نہ ہوگا، اب رہ گئی دوسری صورت تو گو ﴿خالدین ابدا﴾ کہہ کر اس کی نفی بار بار کی جا چکی ہے مگر ایک جگہ بتصریح یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اس احاطہ میں موت کا گزر نہ ہوگا، فرمایا:

۱٦۔ ﴿ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ﴾ (٤٤/ الدخان:۵٦)

''جنت میں جنت والے پہلی موت کے سوا پھر موت کا مزہ نہیں چکھیں گے۔''

لیکن ایک تیسری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ مسرت کے اسباب بھی قائم رہیں اور اہل جنت کی زندگی بھی دائم ہو مگر کچھ دنوں کے بعد ان کو وہاں سے نکال کر الگ کر دیا جائے تو اس کی تصریح بھی فرما دی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا کہ کوئی اہلِ جنت کو ان کے عیش و راحت کی منزل گاہوں سے باہر نکال سکے، فرمایا:

﴿ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴾ (۱۵/ الحجر:٤۸)

''وہاں ان کو کوئی غم نہ چھوئے گا اور نہ وہ اس میں سے نکالے جائیں گے۔''

یہ بھی ممکن ہے، کہ خود اہل جنت اس سے گھبرا کر نکل آئیں، تو فرمایا کہ ان کی جبلت و فطرت ایسی ہوگی

کہ وہ خود بھی اس مہمان خانہ الٰہی سے نکلنا پسند نہیں کریں گے، فرمایا:

﴿ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ۝﴾ (۱۸/ الکھف:۱۰۸)

''سدا رہیں گے اس میں، اس سے منتقل ہونا نہ چاہیں گے۔''

دوام و بقا اور تسلسل و عدم انقطاع کی اس تو بر تو تاکید اور اصرار سے اندازہ ہوگا کہ اسباب مسرت کی بقا راحت دوام اور زندگی کا تسلسل جنت کی اصلی خصوصیت ہوگی، یہی وہ حقیقت ہے جس کی لالچ شیطان نے

﴿ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۲۰) ''اور غیر فانی سلطنت۔''

کہہ کر آدم کو دلائی تھی اور اس بہانہ سے اس عالم بقا سے ان کو اس عالم فنا میں بھجوا دیا، آخر وہ زمانہ آئے گا جب آدم کی اولاد کو ان کے نیک اعمال کی بدولت اس غیر فانی بادشاہی کی وراثت ہمیشہ کے لیے حاصل ہوگی۔

غیر فانی بادشاہی

دنیا میں شخصی راحت و آرام کا بلند سے بلند تخیل، ایک لفظ ''بادشاہی'' کے اندر بخوبی ادا ہو سکتا ہے اگر انسان کو اس کی انتہائی آرزوؤں کے برآنے کی خوشخبری کے دینے کے لیے کوئی لفظ استعمال ہو سکتا ہے تو یہی ہے، گویا بادشاہی اس کیفیت کا نام ہے جس میں انسان کی کوئی آرزو کامیابی سے محروم نہ رہے، سامان راحت اور اسباب شادمانی کی فراوانی سے اس کی مسرت میں کسی غم کا شائبہ نہ ہو۔ اونچے اونچے محل، ہرے بھرے باغ، بہتی نہریں، سرسبز و شاداب تختے، سونے چاندی کے اسباب، زر و جواہر کے برتن، زریں کمر غلام و خدام، ریشمی لباس، طلائی تخت، موتیوں کے ہار، سونے کے کنگن، شراب کے زمردیں اور بلوریں پیالے، حسین دمہ جبیں بیگمات، غرض ایک لفظ بادشاہی کے یہ تمام ضروری لوازمے ہیں۔ جنت کی مختصر ترین لیکن سچی تعریف آدم کے دشمن نے، آدم کے سامنے کی تھی:

﴿ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۲۰) ''اور غیر فانی بادشاہی۔''

آنے والی زندگی کے اس غیر فانی عیش و مسرت کے لیے، مختلف پیغمبروں نے مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کے لیے آسمانی بادشاہی کی اصطلاح قائم فرمائی ہے اور اپنی گفتگو کے تمام استعاروں میں اس مفہوم کو اسی لفظ سے ادا کیا ہے، مگر جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے کہ انسانی لغت کے الفاظ سے جو مادیت کی گودوں میں پلے اور مادیت کے ماحول میں پھلے پھولے ہیں، کسی خالص روحانی مفہوم کی تعبیر ناممکن ہے کہ اس کے ہر لفظ کے مفہوم کو انہیں لوازم اور خیالات کے ساتھ انسان سمجھنے پر مجبور ہے، جو ہمیشہ سے اس لفظ کے ساتھ وابستہ چلے آتے ہیں، آپ بادشاہی کو آسمانی کہہ کر کسی قدر مادہ سے بلند کریں، مگر بادشاہی کے مفہوم کے ساتھ جو موروثی خیالات و لوازم وابستہ ہیں وہ دور نہیں ہو سکتے، چنانچہ خود حضرت

عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی کی آخری شب میں شاگردوں کو جب شراب کا پیالہ بھر کر دیتے ہیں تو آسمانی بادشاہی کے مادی لطف ومسرت کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں:

''میں پھر تمہیں کہتا ہوں کہ انگور کا شیرہ پھر نہ پیوں گا اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہی میں اسے نیا نہ پیوں۔'' (متی ۲۶۔۲۹)

آپ نے دیکھا کہ ''باپ'' کی ''آسمانی بادشاہی'' میں بھی انگور ہی کا شیرہ پینے کو ملے گا،

اور یوحنا حواری نے جب اس آسمانی بادشاہی کا خواب دیکھا، تو وہ اس کو اسی سونے چاندی کے محل، آب حیات کی نہر اور جواہرات کی دیواروں میں نظر آئی۔ (مکاشفات یوحنا باب (۲۲و۲۱) اور پھر

''وہاں رات نہ ہوگی اور وہ چراغ اور سورج کی روشنی کے محتاج نہیں، کیونکہ خداوند ان کو روشن کرتا ہے اور وہ ابدالآباد بادشاہی کریں گے۔'' (۲۲۔۵)

لیکن یہ ''بادشاہی'' عیسوی پیغام میں ہنوز تفسیر کی محتاج ہے، نبوت کے آخری پیغام نے اس اجمال کی تفصیل ان لفظوں میں کی ہے:

﴿ فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۝ وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآىِٕكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ۝ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ۝ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ۝ قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ۝ وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ۝ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ۝ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ۝ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ۝ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۡ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ ﴾ (۷۶/ الدھر: ۱۱۔۲۲)

''تو اللہ نے اہل جنت کو اس دن کی تکلیف سے بچا لیا اور ان کو تروتازگی اور شادکامی سے ملایا اور ان کے صبر کے بدلہ میں ان کو رہنے کے لیے باغ اور پہننے کے لیے ریشمی کپڑے دیے، وہ ان باغوں میں تختوں پر تکیے لگائے ہوں گے، ان میں نہ دھوپ ہوگی نہ ٹھنڈ اور ان کے سایے ان پر جھکے ہوں گے، ان کے خوشے پست ہو کر لٹکے ہوں گے، چاندی کے برتن اور نقرائی شیشوں کے آبخورے جو ناپ کر بنائے گئے ہیں ان کو لوگ ان کے پاس لیے پھریں گے اور ان کو وہاں وہ پیالہ پلایا جائے گا جس میں سونٹھ ملی ہوگی اس میں ایک چشمہ کا نام، سلسبیل ہے اور سدا رہنے والے کمسن غلام ان کی خدمت میں گھوم رہے ہوں گے اور تو انہیں دیکھے تو سمجھے

کہ موتی بکھرے ہیں اور جب تو یہ سب دیکھے تو وہاں نعمت وعیش اور بڑی بادشاہی دیکھے، انکی پوشاک سبز نرم ریشم اور دبیز ریشم ہو اور ان کو نقرئی کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا پروردگار ان کو پاک شراب پلائے گا، یہ تمہاری مزدوری ہوگی اور تمہاری محنت کی قدر کی جائے گی۔''

یہ پورا نقشہ اس عیش ومسرت کا ہے جو اس دنیا کے شاہانہ محلوں کے متعلق تخیل میں آتا ہے۔ اس بیان کی تائید وتصدیق اس صحیح حدیث سے ہوگی جو جامع ترمذی میں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ صحابی سے مروی ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے پوچھا کہ اے پروردگار! جنت والوں میں سب سے کم رتبہ کون ہوگا، فرمایا کہ وہ شخص جو جنت والوں کے جنت میں داخل ہو چکنے کے بعد آخر میں آئے گا، تو اس سے کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ وہ کہے گا کہ اب میں کہاں جاؤں کہ لوگ اپنے اپنے مقام پر جا چکے ہیں اور ربانی نوازشوں پر قابض ہو چکے ہیں، اس سے کہا جائے گا کہ کیا تو اس پر راضی ہے کہ تجھے وہ ملے جو دنیا کے بادشاہوں میں سے کسی کے پاس نہ تھا، عرض کرے گا خداوندا! میں راضی ہوں، فرمائے گا: تیرے لیے اتنا اور اس سے دوگنا اور اس سے تین گنا اور چوگنا ہے، کہے گا: خداوندا! میں راضی ہو گیا۔ خدا فرمائے گا: تیرے لیے وہ اور اس کا دس گنا ہے۔ عرض کرے گا، میں راضی ہو گیا۔ فرمائے گا: اس کے ساتھ یہ بھی کہ جو تیرا دل آرزو کرے اور جو تیری آنکھ کو لذت بخشے۔'' [1]

باغ کا استعارہ

آخرت کے خانۂ عیش وراحت کے لیے قرآن پاک نے عموماً جنت اور کہیں روضہ کے لفظ کا استعمال کیا ہے، نادان اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ عرب کے شور و بے حاصل اور خشک صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز وشاداب باغوں ہی کی ہو سکتی ہے اس لیے ان کے لیے یہ لفظ اس مقام آخرت کے لیے قرآن نے استعمال کیا ہے، مگر یہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں، بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے، اس لیے عرب کی تخصیص بے معنی ہے، کیا دنیا کے سرسبز وشاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیل میں باغ وراغ اور رنگ وگل کی بہار پسندیدہ نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ یہاں بیابان وگلستان کی تخصیص نہیں، یہ فطرتِ انسانی کی تصویر ہے، انسان کسی خطہ ارضی میں آباد ہو، مگر وہ سرسبز وشاداب قطعات، باغ وبہار اور کنارِ آب ونہر کو عیش ومسرت کا مقام سمجھتا ہے اور ان کو دیکھ کر اندر سے اس کی روح وجد کرتی ہے۔

اس استعارہ کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجہ کے قابل ہے، انسان کا گھر وہ عیش خانہ ہوتا ہے جس میں حزن وغم کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے، اہل وعیال اور دولت ومال کے متعلق ہر قسم کی فکریں اس کے دل کے دامن سے لپٹی ہوتی ہیں مگر جب انسان سیر وتفریح کے لیے باغ وچمن کا رخ کرتا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے

[1] جامع ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، ومن سورة السجدة: ٣١٩٨ (حديث حسن صحيح)

وہ ہر غم کو فراموش اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے اور ایسا شاداں و فرحاں بن جاتا ہے کہ غم والم اس کے ہر گوشہ خاطر سے دور ہو جاتے ہیں، وحی محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام نے اس لفظ کو اسی لیے استعمال کیا ہے، تاکہ اس سے اخروی عیش و مسرت، شادی و خوشی اور فراغ خاطر کی پوری تصویر کھنچ جائے گی۔

سامانِ جنت کے دنیاوی نام

یہ حقیقت بار بار دہرائی گئی ہے کہ عالمِ آخرت کی اشیاء کو جن دنیاوی الفاظ سے ادا کیا گیا ہے ان سے مقصود بالکل وہی نہیں ہیں جو ان لفظوں سے سمجھنے کے ہم عادی ہیں، بلکہ ان اخروی اشیاء کو ان دنیاوی الفاظ سے اس لیے ادا کیا گیا ہے کہ وہ ان سے خاص مناسبت رکھتی ہیں، ورنہ از روئے حقیقت ان الفاظ کے لغوی مفہوم و معنی سے اُن کی اخروی حقیقتیں بدرجہا بلند واتم ہوں گی، چنانچہ قرآن مجید کی ان آیتوں میں:

﴿ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۵، ۲۶)

''اور ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے یہ خوشخبری سنا کہ ان کے لیے وہ باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ، جب ان باغوں سے کوئی پھل دیے جائیں گے، کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا اور وہ ان کو ایک دوسرے کے مشابہ دیا جائے گا اور ان باغوں میں انکی صاف ستھری بیویاں ہوں گی اور وہ ان باغوں میں رہا کریں گے بے شبہ خدا اس سے شرمندہ نہیں کہ وہ ایک مچھر کی یا اس سے بھی کم رتبہ چیز کی مثال بیان کرے۔''

ان آیتوں کے سیاق و سباق اور نظم و ترتیب پر لحاظ کر کے میرے ذہن میں یہی معنی آتے ہیں کہ ان میں دنیاوی الفاظ اور ان کے اخروی مفہوم کے درمیان تشابہ کا بیان ہے ورنہ حقیقت کی رو سے ان الفاظ کے دنیاوی ولغوی معانی اور اخروی معنوں میں وہی نسبت ہے جو مچھر اور کسی عظیم الجثہ شے کے درمیان ہو سکتی ہے، یہی سبب ہے کہ جنت کی لذتوں اور نعمتوں کی نسبت قرآن نے یہ بھی کہا ہے:

﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾

(۳۲/ السجدۃ:۱۷)

''تو کسی نفس کو معلوم نہیں کہ ان کے لیے ان کے (اچھے) اعمال کے بدلہ میں آنکھوں کی جو ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔''

اس آنکھوں کی ٹھنڈک ''یعنی لذت وراحت'' کی کیفیت دنیاوی تخیل سے چونکہ بہت بلند ہے اس

لیے یہ فرمایا گیا کہ جنت کی راحت ولذت کی حقیقت علم وفہم سے پوشیدہ اور مخفی ہے، آنحضرت ﷺ نے اسی مفہوم کو اپنے ان مبارک الفاظ سے واضح فرمادیا:

((قال اللّٰہ اعددت لعبادی الصلحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر)) [1]

''خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ مہیا کیا ہے، جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال آیا۔''

اگر جنت کے باغوں، نہروں، میووں، غلاموں، شرابوں، ریشمی کپڑوں اور طلائی زیوروں کی وہی اخروی حقیقت ہے جو ان لفظوں سے لغوی طور پر ہم اس دنیا میں سمجھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بہشت کی لذتوں اور مسرتوں کو ایک مخفی حقیقت نہ فرماتا اور نہ آنحضرت ﷺ اس کی توضیح میں اس درجہ بلندی کرتے کہ وہ ایسی چیزیں ہیں، جن کو آنکھوں نے دیکھا، نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی انسان کے خیال میں گزریں، مزید تاکید روایت کے دوسرے الفاظ میں ہے:

((بلہ ما أطلعتم علیہ)) [2] ''جو تم جانتے ہو اس کو چھوڑ دو۔''

صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ((بلہ ما اطلعکم اللّٰہ علیہ)) [3] اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ ''بلکہ خدا نے تم کو اس پر مطلع بھی نہیں کیا ہے۔'' دوسرے یہ ''خدا نے اس کا جو حال بتایا ہے، اس سے بھی درگزر کرو۔''

غرض ان لفظوں سے جو بھی تم سمجھ سکتے ہو، اس کو چھوڑ کر آگے بڑھو، اصحابِ تفسیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بسند نقل کیا ہے:

وقال السفیان الثوری عن الاعمش عن ابی ظبیان عن ابن عباس لا یشبہ شیء مما فی الجنۃ مافی الدنیا الا فی الاسماء.

''سفیان ثوری اعمش سے اور وہ ابوظبیان سے اور وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جنت میں جو کچھ ہے وہ دنیا کی چیزوں سے ناموں کے سوا اور کسی بات میں مشابہ نہیں۔''

دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں:

((لیس فی الدنیا مما فی الجنۃ الا الاسماء)) [4]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید: ۷۴۹۸ وکتاب التفسیر: ۴۷۷۹؛ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ: ۷۱۳۴ وترمذی ابواب التفسیر: ۳۱۹۷۔ [2] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ السجدۃ: ۴۷۸۰۔

[3] صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا: ۷۱۳۳۔ [4] تفسیر ابن جریر طبری، ج ۱، ص: ۱۳۳ وبیہقی فی البعث کما فی الدر المنثور للسیوطی تفسیر آیت مذکورہ، ج ۱، ص: ۳۸۔

”جنت میں جو کچھ ہے وہ ناموں کے سوا دنیا میں نہیں۔“

غرض ان الفاظ سے انہی دنیاوی مشاہدات کی چیزوں کو سمجھنا ضروری نہیں بلکہ ان سے بدر جہا بلند لذائذ اور مسرتیں مراد ہیں، جن کی تعبیر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کسی وجہ مناسب کے سبب سے ان کو ان دنیاوی لفظوں سے ادا کیا جائے اور اس پر بھی مفہوم ادا نہ ہو سکے، اس میں اشکال نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی عدمِ قدرتِ کلام کے سبب سے نہیں ہے بلکہ عاجز انسانوں کی ذہنی درماندگی کے سبب سے ہے کہ نادیدہ و ناشنیدہ اور در دل ناخلیدہ مفاہیم کے لیے ان کی زبان ولغت میں کوئی لفظ ہی نہیں۔

جنت کی مسرتیں اعمال کی تمثیل ہیں

یہ اصول بارہا بیان میں آچکا ہے کہ دوزخ کی تکلیفیں ہوں یا جنت کی مسرتیں، دونوں اعمالِ انسانی کی تمثیلیں ہیں، اسی لیے قرآن پاک نے بتصریح تمام یہ کہا ہے:

﴿ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ ﴾ (۵۲/ الطور:۱۶)

”وہی بدلہ پاؤ گے، جو تم کرتے تھے۔“

حدیث میں آتا ہے کہ ”قیامت میں خدا فرمائے گا: اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی عمل ہیں، جو تم کو واپس مل رہے ہیں تو جو نیکی پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جو برائی پائے وہ اپنے آپ کو ملامت کرے۔“ [1]

مثلاً: وہ نیکوکار جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہمیشہ ترساں ولرزاں رہتے تھے، ان کو جنت میں امن وامان اور سلامتی کے ساتھ وہاں کی تمام راحتیں ملیں گی تو:

﴿ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ۝ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ۝ ﴾

(۵۲/ الطور:۲۶، ۲۷)

”کہیں گے ہم اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرتے تھے، تو خدا نے ہم پر مہربانی فرمائی اور ہم کو دوزخ کی لو کے عذاب سے بچالیا۔“

اس آیت سے صاف نمایاں ہے کہ جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر وغضب سے ڈرتے تھے وہ قیامت میں گرم لو کے عذاب سے بچائے جائیں گے قہر وغضب کی تمثیل شعلہ آتش، لو وغیرہ گرم چیزوں سے ہے، تو جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر وغضب سے ترساں تھے دیکھو کہ قیامت میں ان کو بادِ سموم یا گرم ہوا کی لو سے بچائے جانے کی بشارت ملی۔

دولتمند وقوی دست منکرین، کمزور اور غریب مسلمانوں کو دیکھ کر دنیا میں ان پر تحقیرانہ ہنستے تھے۔ قیامت میں اس کا الٹا ہوگا یہ ان پر ہنسیں گے۔ فرمایا:

---

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم: ٦٥٧٢۔

﴿ إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ۝ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ۝ وَإِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انقَلَبُوا فَكِهِينَ ۝ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ۝ وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ ۝ فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ۝ ﴾

(٨٣/ التطفيف:٢٩_٣٤)

''بے شک گناہگار، ایمان والوں پر ہنستے تھے......... تو آج ایمان والے کافروں پر ہنسیں گے۔''

نیکو کاروں کے دنیا کے آنسو یہاں تبسم اور خندہ مسرت میں بدل گئے اور گناہگاروں کی وہاں کی ہنسی یہاں آنسوؤں کا تار بن کر ظاہر ہوئی۔

گناہگار جو دنیا میں اپنی دولت وقوت کے نشہ میں چور اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ خوش اور مسرور رہتے تھے، وہ یہاں غمگین ہوں گے اور جو وہاں غمگین تھے وہ یہاں خوش اور مسرور ہوں گے:

﴿ فَسَوْفَ يَدْعُو ثُبُورًا ۝ وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا ۝ إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝ ﴾

(٨٤/ الانشقاق:١١_١٣)

''تو وہ موت کو پکارے گا اور دوزخ میں داخل ہوگا کیونکہ وہ اپنے اہل وعیال میں (مغرورانہ) خوش تھا۔''

اور غریب ومسکین جو وہاں اہل وعیال میں بیٹھ کر بھی مسرت سے نا آشنا تھے، ان کا یہ حال ہوگا کہ

﴿ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ۝ وَيَنقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝ ﴾

(٨٤/ الانشقاق:٨، ٩)

''تو اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ خوش خوش اپنے لوگوں کے پاس لوٹے گا۔''

قرآن پاک میں بارہا یہ آیتیں یا بعینہٖ انہی معنوں کی آیتیں آئی ہیں:

﴿ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ﴾

(٢/ البقرة:٢٥)

''اور ایمان والوں اور اچھے کام کرنے والوں کو باغ کی خوش خبری سنا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔''

ان آیتوں میں ایمان اور عمل صالح کے بالمقابل باغ اور اس کی نہروں کا ذکر پابندی کے ساتھ آتا ہے، اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی خاص تمثیلی تعلق ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ درخت اصلی چیزیں ہیں جن کی ترقی اور نشو ونما پانی سے ہوتی ہے بعینہٖ اسی طرح ایمان اصل ہے جس کی جڑوں کی سیرابی اعمال کی آبیاری سے ہوتی ہے اگر ایمان ہو اور اعمال صالح نہ ہوں تو وہ ایک ایسا درخت ہوگا جس کی ترقی اور نشو ونما کی امید نہیں اور اگر صرف عمل صالح ہے اور ایمان نہیں، تو ریگ میں پانی کی روانی ہے جس کا وجود وعدم یکساں ہے، اس تمثیل کے ذہن میں آنے کے ساتھ قرآن پاک کی یہ آیت سامنے آتی ہے:

﴿ وَأُدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۖ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۝ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۝ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝ ﴾ (۱۴/ ابراھیم:۲۳_۲۵)

''اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ ان باغوں میں داخل کیے گئے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ان میں سدا رہیں گے، وہاں سلامتی کی مبارکباد ہے، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے کیسی ایک مثال بیان کی، نیک بات ایک ستھرے درخت کی طرح ہے، جس کی جڑ مضبوط ہو اور ٹہنی آسمان میں ہو، اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ہمہ وقت پھل لایا کرتا ہے اور خدا مثالیں بیان کرتا ہے کہ لوگ شاید سوچیں۔''

اس آیت میں جنت اور کلمہ طیبہ کے درخت کی پوری تمثیل ہے، یہاں تک تقابل ہے کہ پہلے میں جب یہ کہا گیا کہ ''اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ان باغوں میں سدا رہیں گے۔'' تو دوسرے میں ہے کہ ''وہ درخت اپنے پروردگار کے حکم سے سدا پھل دیتا رہے گا۔'' کلمہ طیبہ سے یہاں مراد ایمان ہے، جس [1] کی جڑ مضبوط و مستحکم اور اس کی شاخیں آسمان میں اور اس کے پھل سدا پھلنے والے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ صحابی کی وفات کے بعد ان کی ایک ہمسایہ صحابیہ رضی اللہ عنہا نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہر بہہ رہی ہے اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی ہے، انھوں نے آ کر یہ خواب آنحضرت ﷺ سے بیان کیا، آپ نے اسکی تعبیر میں فرمایا: ((ذلك عمله يجرى له)) ''یعنی یہ نہر ان کا عمل ہے جو ان کے لیے بہہ رہی ہے۔'' [2]

ان دونوں سابقہ حوالوں سے یہ ہویدا ہوتا ہے کہ ایمان کی تمثیل سدا بہار درخت سے اور عمل کی تمثیل نہر رواں سے ہے، اس بنا پر اہلِ جنت کے لیے بار بار جس باغ اور نہر جاری کی بشارت دی گئی ہے، وہ حقیقت میں ان کے ایمان اور عمل صالح کی تمثیلی شکلیں ہوں گی، ان کا ایمان خوشنما اور سدا بہار باغ اور ان کے اعمالِ صالحہ صاف و شفاف نہر کی صورت میں نمایاں ہوں گے اور وہ ان سے لطف و لذت اٹھائیں گے۔

اسی قیاس پر جنت کی دوسری لذتوں اور مسرتوں کی حقیقت کی تشریح کی جا سکتی ہے، علومِ نبوی کے ایک بڑے واقف کار اور اسرار شریعت کے ایک بڑے دانائے راز شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

واكثر الوقائع الحشرية من هذا القبيل .... وبالجملة فتشبحات

[1] تفسیر ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکورہ، ج ۱۳، ص: ۱۲۰۔

[2] صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب العین الجاریۃ فی المنام: ۷۰۱۸۔

وتمثلات لما عندها .... وتتشبع النعمة بمطعم هنئى ومشرب مرئى ومنكح شهى وملبس رضى ومسكن بهى۔ [1]

''حشر کے واقعات از قبیل تمثیل ہیں .... حاصل یہ کہ یہ تمام امور معانی کا جسمانی قالبوں میں اور مثالی صورتوں میں ظاہر ہونا ہے .... اللہ تعالیٰ کی عنایت ومہربانی خوش مزہ کھانے، خوش گوار پینے کی چیزوں، رغبت انگیز لذتِ نکاح، دل پسند لباس اور عمدہ مسکن کی صورتوں میں نمایاں ہوگی۔''

ہم نے آیات واحادیث کے حوالوں سے پہلے کئی دفعہ یہ دکھایا ہے کہ اس تمثیل وتشبیہ کے کیا معنی ہیں اور کیونکر غیر مجسم معانی اپنے مناسب قالبوں میں مجسم ہو کر وجود پذیر ہوتے ہیں۔ دنیا کے تمام اعمال صالحہ کی اگر تحلیل کی جائے تو ان کی اولاً دو قسمیں نکلیں گی، خدا پر ایمان اور خلوصِ دل سے اس کی اطاعت، جس کو حقوق اللہ کہتے ہیں اور دوسری بندگانِ الٰہی کے ساتھ حسن سلوک، بندگان الٰہی کے ساتھ جو نیک سلوک کیا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ ان کی عزت وآبرو کا پاس کیا جائے، جس کو عفت وعصمت کہتے ہیں اور ان کی ضروریات زندگی کے مہیا کرنے میں امداد کی جائے اور ضروریات زندگی یہی کھانا، پینا، پہننا اور رہنا ہیں انہیں کی نسبت ہم ان کے ساتھ حسن سلوک کر سکتے ہیں، اب یہ پانچ قسمیں ہوئیں، جنت کی نعمتیں انہیں پانچ قسموں میں منحصر ہیں۔ ایمان واخلاص واطاعت کی جزا وہ خود تبارک وتعالیٰ ہے، وہ اپنے دیدار سے نوازے گا، عفت وعصمت کی جزا حسین ومہ جبیں بیویوں کی صورت میں نمایاں ہوگی، دوسروں کے کھلانے کی جزا جنت کے باغ اور پھل اور قسم قسم کے الوانِ طعام ہیں، دوسروں کو پلانے کی جزا خوش مزہ وخوشگوار پینے کی مختلف چیزوں کی فراوانی ہے، پہنانے کی جزا ریشم وحریر ودیبا واطلس اور بہتر سے بہتر خوشنما لباس ہے اور رہنے اور رکھنے میں حسنِ سلوک کی جزا، خوش منظر مکان وقیام گاہ ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی بہشت کی صفت یہ بیان فرمائی ہے:

﴿ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝ ﴾

(۲۰/ طٰہٰ:۱۱۸، ۱۱۹)

''بے شک تیرے لیے اس بہشت میں نہ بھوکا ہونا ہے، نہ ننگا اور پیاسا ہونا، نہ دھوپ میں رہنا۔''

یہی چار مختصر انسانی ضرورتیں ہیں جو پھیل کر ایک دنیا ہوگئی ہیں، جب آدم کی اولاد کو اپنے اعمال صالحہ کی بدولت نجات ملے گی تو پھر ان کے لیے وہی بہشت ہے، جس میں نہ بھوکا ہونا ہے، نہ پیاسا ہونا ہے، نہ ننگا ہونا، نہ گرمی اور نہ دھوپ کی تکلیف میں گرفتار ہونا، اس حقیقت کی تعبیر دو طرح سے کی جا سکتی ہے، یا تو یہ کہ بہشت

---

[1] حجة الله البالغة، ص:۳٦۔

میں اہل بہشت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ان تمام انسانی ضرورتوں سے یکسر پاک و بے نیاز ہو جاتے ہیں، اس لیے وہاں نہ کوئی بھوکا ہوگا نہ پیاسا ہوگا اور نہ ننگا ہوگا اور نہ دھوپ اور لو کی محنت میں گرفتار، دوسرے یہ کہ بہشت میں اہل بہشت کو کھانے کے لیے ایسے الوان نعمت ملیں گے جن کو کھا کر انسان پھر بھوکا نہ ہوگا اور پینے کے لیے شراب و شربت کی وہ نہریں بہیں گی جن کو پی کر پیاسا نہ ہوگا اور پہننے کو وہ کپڑے ملیں گے جو پھر نہ میلے ہوں گے اور نہ بوسیدہ ہو کر پھٹیں گے اور رہنے کے لیے ایسے گھنے باغ اور بلند مکانات ملیں گے جہاں دھوپ کا گزر نہ ہوگا۔ یہ اصول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے جو لطف و لذت ہے، وہ تھوڑی سی تکلیف کا نتیجہ ہے۔ انسانی اصول یہ ہے کہ بڑی لذت کے حصول کے لیے تھوڑی تکلیف گوارہ کرتا ہے اور بڑی مسرت پر چھوٹی مسرت کو قربان کرتا ہے، اسی اصول پر اس کے تمام اعمال کی کامیابی و ناکامیابی کی بنا ہے، اعمال صالحہ کے بجالانے میں انسان کو اس دنیا میں چھوٹی چھوٹی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور اپنی عارضی خوشیوں اور لذتوں کو ان پر قربان کرنا ہوتا ہے۔ صبح کے نمازی کو خواب سحر کی لذت کو خیر باد کہنا اور دوپہر کی جلتی دھوپ میں ظہر کے لیے مسجد میں جانا پڑتا ہے، خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانا پڑتا ہے اور اپنی بہت سی ناجائز مگر بظاہر دلچسپ خوشیوں کا ایثار کرنا پڑتا ہے، اسی طرح پاکیزہ زندگی گزارنے پر اس کو آخرت کی غیر فانی دولت اور ابدی سعادت میسر آتی ہے۔

انسان کو دنیا میں ان اعمال صالحہ کی خاطر جن چیزوں کو قربان کرنا پڑتا ہے ان میں پہلی چیز تو خود اس کی زندگی ہے، پھر انسانی زندگی کی وہ چار قسمیں ہیں، جن کا نام، کھانا، پینا، پہننا، رہنا ہے اس لیے آخرت میں ان قربانیوں کی جزا میں انہیں کی مناسب و مماثل چیزیں جو ملیں گی وہ غیر فانی زندگی، الوانِ طعام، اقسام شراب و شربت، انواع لباس اور بہترین مسکن ہیں، قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَأَمَّا مَن طَغَىٰ ۝ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝ فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝ ﴾ (۷۹/ النازعات:۳۷۔۴۱)

''پس جس نے خدا سے سرکشی کی اور دنیاوی زندگی کے ناجائز لطف و آرام کو ترجیح دی، تو دوزخ اس کا ٹھکانا ہے، لیکن جو خدا کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو ناجائز خواہشوں سے روکا تو اس کا ٹھکانہ بہشت ہے۔''

گو اس کی جزئی نیکیوں کی جزا تو وقتاً فوقتاً اس دنیا میں تھوڑی تھوڑی کر کے شہرت، تعریف، ہردلعزیزی اور دولت کی صورت میں ملتی رہتی ہے، مگر پوری زندگی کی مجموعی جزا دوسری زندگی ہی میں اس کو ملے گی۔

﴿ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۸۵)

''اور تمہاری مزدوری قیامت کے دن پوری ادا کی جائے گی۔''

لطف ومسرت کا تصور

مسرت ایک نفسی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو اپنی کسی خواہش کے پورے ہوتے وقت حاصل ہوتی ہے، اس بنا پر مسرت کے وجود کے لیے کسی خواہش کی تکمیل ضروری ہے، اب انسانی خواہشوں کی تحلیل کرو، تو بالآخران کی انتہا انہیں باتوں پر ہوگی جن کی طلب اس کی فطرت کے اندر ودیعت کردی گئی ہے، اب غور کرو کہ وہ کیا چیزیں ہیں یا کیا چیزیں اس کے فہم میں آ سکتی ہیں، وہ یہی ہیں باغ و بہار، لباس وطعام، حور وقصور، خدم و حشم، سامان واسباب اور زر و جواہر، مسرت اور راحت کا جب کبھی تخیل آئے گا اور جب کبھی ہم ان کو سمجھنا چاہیں گے اور کہنا چاہیں گے تو ہم کو انہیں چیزوں کا نقشہ کھینچنا پڑے گا اور ہماری انسانی فطرت انہیں مسرتوں اور خوشیوں کو ڈھونڈنے کی عادی ہے اور انہیں کے حصول کی خاطر دنیا میں ہر طرح کی سیہ کاری اور گناہگاری کی مرتکب ہوتی ہے اس لیے ان سے احتراز کرنے پر جو چیزیں ہم کو وہاں ملیں گی، وہ ہمارے انہیں عادی و مانوس اسبابِ مسرت کی صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہوں گی اور ہم ان سے لطف اندوز ہوں گے۔

لطف ومسرت کا اعلیٰ ترین تخیل

اس دنیائے کون وفساد میں ہم ایک عجیب قسم کی مصیبت میں مبتلا ہیں ہم کو تخیل کے لحاظ سے اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی وسیع اور غیر محدود دنیا بخشی گئی ہے لیکن عملاً اپنی اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے مطابق اپنی دنیا بنا لینے پر قدرت نہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم نے صبر وشکر کا دامن نہیں پکڑا تو ہم سے زیادہ اس دنیا میں تصور وتخیل کی تکلیف میں کوئی اور گرفتار نہیں، جنت آخرت کی اس دنیا کا نام ہے، جو ہمارے اعلیٰ ترین تخیل اور ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کے مطابق ہوگی:

﴿ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ (١٦/ النحل:٣١)

''رہنے کے باغ، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں ان کے لیے ان باغوں میں وہ ہے، جو وہ چاہیں، اللہ اسی طرح پرہیز گاروں کو بدلہ دے گا۔''

﴿ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ ﴾ (٤١/ حٰمٓ السجدة:٣١)

''اور تمہارے لیے جنت میں وہی ہے، جو تمہارے دل چاہیں اور تمہارے لیے اس میں وہ ہے، جو تم مانگو۔''

﴿ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ۝ ﴾ (٥٠/ ق:٣٥)

''ان کے لیے جنت میں وہ ہے، جو وہ چاہیں اور ہمارے پاس اس سے بھی بڑھ کر ہے۔''

﴿ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ ۖ ﴾ (٤٣/ الزخرف:٧١)

’’اور جنت میں وہ ہے، جس کی دل خواہش کریں اور جو آنکھوں کو لذت دے۔‘‘

﴿ لَّهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ خَالِدِينَ ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُولًا ﴾ (٢٥/ الفرقان:١٦)

’’ان کے لیے جنت میں وہ ہے، جو وہ چاہا کریں گے ہمیشہ، یہ وعدہ ہے تیرے رب کے ذمہ۔‘‘

﴿ لَهُم مَّا يَشَاءُونَ عِندَ رَبِّهِمْ ۚ ﴾ (٣٩/ الزمر:٣٤)

’’ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے، جو وہ چاہیں گے۔‘‘

الغرض جنت وہ مقام ہے جہاں ہم کو وہ کچھ ملے گا جہاں تک ہمارا مرغ خیال اڑ کر پہنچ سکتا ہے، لطف و مسرت کا وہ بلند سے بلند تخیل جو تصور میں آ سکتا ہے وہاں ہمارے لیے مہیا ہوگا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہر قسم کے لوگ تھے جنت کے سامان مسرت کے متعلق وہ اپنی اپنی پسند اور آرزو کے مطابق آپ سے پوچھتے رہتے تھے اور آپ جواب دیتے تھے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’’جنت میں جو سب سے کم رتبہ ہوگا اس کی کیفیت بھی یہ ہوگی کہ خدا تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ تو اپنی انتہائی آرزو دل میں خیال کر وہ کرے گا تو اللہ فرمائے گا کہ تجھ کو وہ سب دیا گیا جس کی تو نے آرزو کی تھی اور اس کے برابر [1] یہاں تک کہ بازار کا شوق ہوگا تو بازار بھی لگے گا، لیکن وہ حقیقی خرید وفروخت نہ ہوگی کہ ہاں کسی چیز کی کمی ہوگی بلکہ وہ مثالی صورتوں میں ہوگی۔ (الا الصور من الرجال) [2]

کسی کو جنت میں کھیتی کا شوق ہوگا تو دانہ، سبزہ، غلہ اور پھر تیاری یہ سب کام منٹوں میں انجام پا جائے گا، [3] ایک بدوی نے پوچھا، یارسول اللہ ﷺ! وہاں گھوڑے بھی ہوں گے؟ فرمایا کہ ’’اگر تم کو جنت ملی تو اگر تم یہ بھی چاہو گے کہ سرخ یاقوت کا گھوڑا ہو جو تم کو جہاں چاہو بہشت میں لیے پھرے تو وہ بھی ہوگا۔‘‘ دوسرے نے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! اونٹ بھی ہوگا؟ فرمایا: ’’اگر تم جنت میں گئے تو تمہارے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو تمہارا دل چاہے گا اور جو تمہاری آنکھیں پسند کریں گی۔‘‘ [4]

جنت میں اہل جنت کے مختلف رتبے ہوں گے۔ اس لیے اعلیٰ کے لباس وسامان کو دیکھ کر ادنیٰ کو اپنی کمی کا خیال ہوگا تو اس کے تصور میں یہ پیدا کر دے گا (حتی یتخیل الیه) [5] کہ خود اس کا لباس وسامان اس سے بہتر ہے اور یہ اس لیے ہوگا کہ جنت میں کسی کو غم ہونا ممکن نہیں۔ [6]

جنت جہاں کوئی جسمانی وروحانی آزار نہیں

کسی صاحب دل نے جنت کی یہ تعریف خوب کی ہے کہ

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب آخر اهل النار: ٤٦٢۔ [2] ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ما جاء فی سوق الجنة: ٢٥٥٠۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الحرث والمزارعة: ٢٣٤٨۔

[4] ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ما جاء فی صفة خیل الجنة: ٢٥٤٣۔ [5] ترمذی، میں ”الیه“ کے بجائے ”علیه“ کے الفاظ ہیں۔ [6] ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ما جاء فی سوق الجنة: ٢٥٤٩۔

ع بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد

دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی مسرور زندگی بھی ایسی نہیں مل سکتی جس کے پہلو میں مسرت کے پھول کے ساتھ غم کا کوئی کانٹا نہ چبھ رہا ہو یا تو موجودہ مسرت کے آیندہ ختم ہونے کا خوف ہے اور یا گزشتہ ناکامی کا افسوس ہے، اس بنا پر یہاں کوئی خوشی بھی کامل نہیں، مگر جنت وہ مقام ہوگا، جہاں نہ ماضی وحال کا غم ہوگا اور نہ مستقبل کا خوف ہوگا، چنانچہ اہل جنت کے متعلق بار بار ارشاد ہوا:

﴿ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾ (۱۰/ یونس:۶۲)

''نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

اور یہی بہشت کی سب سے بڑی نعمت ہوگی اس میں جسمانی وروحانی ہر قسم کی نعمتیں داخل ہیں۔

دنیا میں کوئی انسان اس وقت تک کوئی لقمہ گلے سے نہیں اتار سکتا اور نہ کوئی چیتھڑا بدن پر رکھ سکتا ہے جب تک اس کے سر کا پسینہ اس کے پاؤں تک نہ آئے، دنیا کی تمام فانی مسرتیں ہماری فانی کوشش کا فانی نتیجہ ہیں، مگر جنت کی خوشیاں بے غم وتکلیف ہماری گزشتہ فانی نیکیوں کا غیر فانی نتیجہ ہیں اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا رحم و کرم ہے کہ وہاں ہم کو ہماری آسائش کا تمام سامان اس قسم کی ادنیٰ زحمت ومشقت اٹھائے بغیر میسر آئے گا جس کے بغیر دنیا میں کوئی انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا اور جس کی کشمکش سے یہ دنیا ہر انسان کے لیے دوزخ بنی ہے، چنانچہ اہل جنت، جنت میں داخل ہو کر اور شاہانہ تزک واحتشام اور لباس وزیور سے آراستہ ہو کر خدا کی حمد وتعریف کا ترانہ ان لفظوں میں گائیں گے:

﴿ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۝ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُۨ ۝ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ۝﴾

(۳۵/ فاطر:۳۳۔۳۵)

''رہنے کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے اور ان میں وہ سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کی پوشاک ان میں ریشم ہوگی اور وہ کہیں گے کہ پاک ہے وہ جس نے ہم سے غم دور کر دیا بے شک ہمارا پروردگار گناہوں کا معاف کرنے والا اور نیکیوں کی قدر کرنے والا ہے، وہ جس نے ہم کو اپنی مہربانی سے رہنے کے گھر میں اتارا اور ہم کو وہاں نہ مشقت پہنچی اور نہ اس میں ہم کو تھکنا ہے۔''

﴿ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۝﴾ (۱۵/ الحجر:۴۸)

''اس میں ان کو کوئی آزار نہ ہوگا اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔''

جنت جہاں رشک وحسد نہیں

موجودہ دنیا خیر وشر کے متضاد عناصر سے بنی ہے، یہاں ثواب کے ساتھ گناہ، رحم دلی کے ساتھ سنگدلی، محبت کے ساتھ کینہ ہے، یہ گناہ وکینہ اور بغض وحسد، وہ آگ ہے جس نے یہاں کے قلبی امن وامان کے خرمن میں آگ لگا رکھی ہے، ہر شخص یہاں دوسروں کو اچھی حالت میں دیکھ کر جلتا ہے اور دوسروں پر غصہ کے جوش و خروش سے ابلتا ہے، جنت وہ عالم ہے جہاں اس آگ اور سیلاب کا وجود نہ ہوگا ہر قسم کے گناہ، سنگدلی، عداوت اور بغض وحسد کا خاتمہ ہوگا اور خالص محبت والفت کے دریا موجزن ہوں گے۔ فرمایا:

﴿ لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ﴾ (۱۹/ مریم:۶۲)

''اس میں امن وسلامتی کے سوا کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے۔''

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ﴾ (۷/ الاعراف:۴۳)

''اور ہم نے ان کے سینوں سے کینہ کھینچ لیا، ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔''

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ﴾ (۱۵/ الحجر:۴۷)

''اور ہم نے ان کے سینے سے کینہ کھینچ لیا، بھائی بھائی بن کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔''

اس کی تفسیر میں حدیث صحیح میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''وہاں نہ دلوں کا اختلاف ہوگا نہ باہم بغض وکینہ سب کے دل ایک دل کی طرح متحد ہوں گے۔'' [1]

وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی؟

بہشت میں زندگی کی جو لذتیں ہوں گی ان کی تعبیر الوان نعمت اور انواع شربت وشراب اور دوسرے مادی لذائذ سے ہوسکتی ہے مگر وہ حظ ومسرت اور اطمینان وسکون وسکینت کے علاوہ کسی معنی میں بھی مادی خصوصیات سے آلودہ نہ ہوگی یہاں ہر کھانے پینے کے ساتھ بول وبراز، پسینہ اور سوئے ہضم کی علت لگی ہوئی ہے اور بغیر اس کے انسان یہاں زندہ نہیں رہ سکتا مگر وہاں یہ کچھ نہ ہوگا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''اہلِ جنت کھائیں گے اور پئیں گے لیکن نہ تھوکیں گے نہ وہاں بول وبراز کی حاجت ہوگی نہ وہاں ناک سے رطوبت نکلے گی، نہ بلغم اور کھکھار جیسی گھناؤنی چیزیں ہوں گی، کھانا ایک ڈکار میں ہضم ہوگا، وہاں کے پسینہ میں مشک کی خوشبو ہوگی، جو بہشت میں داخل ہوگا اس کو وہ نعمت ملے گی کہ پھر کبھی تکلیف نہ ہوگی، نہ ان کے کپڑے بوسیدہ ہوں گے اور نہ ان کی جوانی زائل ہوگی۔ وہاں منادی غیب یہ پکار کر کہہ دے گا یہاں وہ تندرستی ہے کہ بیمار نہ پڑو گے، وہ زندگی ہے کہ پھر موت نہ آئے گی، وہ جوانی ہے کہ پھر بوڑھے نہ ہو گے اور وہ آرام ہے کہ پھر تکلیف نہ پاؤ گے، لوگوں کے چہرے اپنے اپنے اعمال کے مطابق چمکیں گے، کوئی ستارہ کی طرح، کوئی

[1] صحیح مسلم، کتاب صفة الجنة، باب فی صفات الجنة واهلها:۷۱۵۱۔

چودھویں کے چاند کی طرح۔‘‘ [1]

غور کرو کہ وہ جسمانی زندگی، ہماری موجودہ جسمانی زندگی سے کتنی مختلف ہوگی، اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے انسان کبھی شکم مادر میں ایک بچہ کی صورت میں زندہ تھا مگر وہاں اس کی زندگی، اس کی غذا، اس کی سانس اور دوسرے لوازم حیات بیرون شکم کے دنیاوی اصول حیات وقوانین زندگی سے بالکل مختلف تھے۔ اور جس طرح شکم مادر میں بچہ کا اس بیرونی زندگی کے حکایات کو تعجب کے ساتھ سن کر آمادہ انکار ہونا دانشمندی نہ ہوگی، ایسے ہی اس مادی زندگی کے خوگر اور اس عالم آب وگل کے باشندے اس دوسری زندگی کے اصولِ حیات، طرز غذا اور دوسرے لوازم حیات کو سن کر آمادہ انکار ہوں تو ان کا بھی یہ فعل دانش مندی کے خلاف ہوگا۔

جنت ارتقائے روحانی ہے

مادی وجسمانی خلقت وفطرت کی لاکھوں برس کی تاریخ کے مطالعہ اور تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ مادہ نے لاکھوں برس کے تغیرات کے بعد اس انسانی جسمانیت تک ترقی کی ہے، وہ پہلے جماد بنا، پھر نبات کی شکل میں آیا، پھر حیوان کا قالب اختیار کیا، پھر جسم انسانی کی صورت میں نمودار ہوا اور یہ مادیت کی معراج ترقی ہے، جمادیت مٹ کر نباتیت پیدا ہوئی اور نباتیت فنا ہو کر حیوانیت نمودار ہوئی، پھر حیوانیت معدوم ہو کر انسانیت ظہور پذیر ہوئی اور ارتقائے انسانی کا جسمانی پہلو تکمیل کو پہنچ گیا، لیکن انسانیت کا دوسرا رخ جو روحانیت سے عبارت ہے، ہنوز اپنے آغاز طفولیت میں ہے، کیا اس پر بھی اسی ارتقائی دور کے مدارج نہیں آئیں گے، ایک مادہ پرست صرف بام ارتقا تک زینہ بزینہ چڑھ کر ٹھہر جاتا ہے، لیکن مذہب اس سے بھی آگے لے چلتا ہے اور یہاں سے وہ اڑ کر سقف آسمان تک پہنچتا ہے اور ملکوتیت کی سرحد کی ترقی شروع کرتا ہے، قرآن پاک کی ان آیتوں پر غور کرنے سے اس نظریہ کے اشارات نکلتے ہیں:

﴿ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۝ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۱۱۔۱۴)

’’جو فردوس کی وراثت پائیں گے اور وہ اس میں صدا رہیں گے اور ہم (خدا) نے انسان کو مٹی کی کشید سے بنایا، پھر اس کو (رحم نسوانی کے) ایک ٹھہراؤ کی جگہ میں ایک بوند بنایا پھر اس بوند کو بندھا ہوا خون بنایا، پھر اس خون کو لوتھڑا بنایا، پھر ہڈیوں کو گوشت پہنایا، پھر اس کو ایک نئی صورت میں اٹھا کر کھڑا کیا، تو برکت والا سب سے بہتر بنانے والا (خدا)۔‘‘

[1] یہ احادیث صحیح مسلم، کتاب صفة الجنة، باب فی صفات الجنة وأهلها: ۷۱۵۲ تا ۷۱۵۶ میں ہیں۔

لیکن یہ ترقی یہیں تک پہنچ کر رک نہیں جائے گی بلکہ آگے بھی ہوگی اس لیے جس طرح ماں کے پیٹ کی تنگ و تاریک دنیا میں زیست وحیات کے کچھ قواعد تھے پھر عالم کی اس سے بھی وسیع تر دنیا میں اس نے قدم رکھا جہاں ترقی وحیات کے دوسرے ہی اصول ہیں اس طرح اس مادی دنیا سے نکل کر اس وسیع تر دنیا میں قدم رکھے گا جہاں ترقی اور سعادت کے اور دوسرے اصول ہوں گے، چنانچہ اس کے بعد، فرمایا:

﴿ ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ۝ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ۝ ﴾

(۲۳/ المؤمنون:۱۵، ۱۶)

''پھر بے شک تم اس کے بعد مرنے والے ہو اور پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔''

جس طرح انسانیت سے پہلے لاکھوں برس میں ایک نوع کی کیفیت مٹ کر دوسری نوع کی کیفیتیں پیدا ہوتے ہوتے انسانیت تک نوبت پہنچی، موت کے معنی یہ ہیں کہ اب نوع انسانی کی تمام کیفیتیں مٹ کر ایک بلند تر نوع کی کیفیتوں کی تیاری شروع ہوئی، صدہا ہزار ہا سال کے بعد قیامت سے دوسری نوع ملکوتی کا ظہور ہوگا۔ یہاں مسئلہ ارتقا کا دوسرا اصول سامنے آتا ہے جس کو بقائے اصلح کہتے ہیں، ان مدارج ترقی کے اثنا میں ہزاروں وہ نوعیں فنا ہوتی رہتی ہیں جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور وہی باقی رہ جاتی ہیں جن میں آئندہ بقا کی پوری استعداد ہوتی ہے۔ جس طرح پچھلی استعداد سے آئندہ کی استعداد پیدا ہوتی ہے، اسی طرح اس دوسری ملکوتی نوع کی استعداد انہی کو ملتی ہے جن کے اندر اپنی پچھلی مادی وجسمانی زندگی میں اس کی استعداد پیدا ہو چکی تھی دوزخ کے درجے ان لوگوں کے مقامات ہیں جو گویا ہنوز جمادی ونباتی وحیوانی منزلوں میں ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس دارالامتحان میں اپنی کی استعداد کے بقدر رہ کر آگے کی استعداد پیدا کرلیں اور ملکوتیت کی ترقی حاصل کرسکیں۔ بہشت کے مختلف مدارج ان کی استعدادوں کے مقامات ہیں جو اپنی پہلی زندگی میں اس ترقی کی استعداد پیدا کر چکے تھے، لیکن یہاں پہنچ کر بھی ان کی روحانی ترقی کا دروازہ بند نہ ہوگا، بلکہ وہ بقدر استعداد وتکمیل کے مدارج طے کرتے چلے جائیں گے، شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝ ﴾ (۹۵/ التین:۶)

''ان بہشتیوں کے لیے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے۔''

ایک دوسری آیت میں ہے کہ نشاۃِ ثانیہ میں اہل ایمان کے آگے پیچھے، داہنے بائیں نور ہوگا پھر بھی دعا کریں گے:

﴿ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ ﴾ (۶۶/ التحریم:۸)

''ان کا نور ان کے سامنے اور داہنے دوڑے گا اور وہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے

نور کو کامل کر اور ہم کو معاف کر، تو ہر بات کر سکتا ہے۔"

مومنوں کے لبوں پر اللہ کے بخشے ہوئے نور کی مزید تکمیل اور اتمام کی دعا ادھر اشارہ کر رہی ہے کہ ان کے مدارج میں ترقی ہوتی رہے جس کا اقتضا خدا کی ربوبیت کا منشا ہے۔

امن وسلامتی کا گھر

انسان امن وسلامتی کا بھوکا ہے، لیکن وہ اس امن وسلامتی کو اسبابِ راحت کے انبار میں تلاش کرتا ہے اور نہیں پاتا، وہ دنیا میں امن کا گوشہ ڈھونڈتا ہے اور وہ اس کو نہیں ملتا لیکن یہاں آ کر اس کو نہ صرف امن کا گوشہ بلکہ امن وسلامتی کی ایک دنیا ملے گی وہ پرندہ جو عمر بھر چار عناصر کے قفس میں گرفتار رہا، یہاں وہ سدرۃ المنتہٰی کی ہر شاخ پر آزادانہ پرواز کرے گا، جنت کے جہاں وحی محمدی ﷺ نے اور بہت سے نام بتائے ہیں وہاں اس کا ایک نام دارالسلام بھی بتایا، جس کے معنی امن وسلامتی کے گھر ہیں۔

اہل جنت کی نسبت ارشاد فرمایا:

﴿ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ (٦/ الانعام:١٢٧)

"ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس سلامتی کا گھر ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے جس شریعت کو دے کر اپنے پیغمبر علیہ السلام کو مبعوث فرمایا، وہ حقیقت میں اسی امن وسلامتی کی نویدِ بشارت ہے، اسی لیے فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ ﴾ (١٠/ يونس:٢٥)

"اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔"

آنحضرت ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے امن وسلامتی کے گھر کی دعوت پیش فرمائی، عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو ایک یہودی عالم تھے، آنحضرت ﷺ کی جس صدائے نبوت نے سب سے پہلے ان کے دل میں گھر کیا وہ یہ تھی "لوگو! سلامتی پھیلاؤ، بھوکوں کو کھلاؤ، جب دنیا غفلت کی نیند سوئے تو تم اٹھ کر خدا کی عبادت کرو، امن وسلامتی کے گھر میں رہنا تم کو نصیب ہوگا۔" [1] جنت کے ذکر میں امن وسلامتی کا تذکرہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے در و دیوار سے امن وسلامتی کے ترانے سنائی دیں گے:

﴿ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝ ﴾

(١٣/ الرعد:٢٣، ٢٤)

"اور فرشتے ہر دروازہ سے ان کے سامنے یہ کہتے ہوئے آئیں گے کہ تم پر سلامتی ہو کہ تم نے

[1] مسند احمد، ج ٢، ص:٣٢٣، ٤٩٣۔

صبر کیا تھا تو کیسا اچھا پچھلا گھر ہے۔"

وہاں امن وسلامتی کے سوا کچھ اور سنائی نہ دے گا:

﴿ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا۝ ﴾ (٥٦/ الواقعة:٢٦) "لیکن سلامتی سلامتی کی پکار۔"

فرشتے اہل جنت کو یوں کہیں گے:

﴿ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ۝ ﴾ (٥٠/ ق:٣٤)

"اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو، یہ زندگی جاوید کا دن ہے۔"

﴿ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ۭ ﴾ (١٩/ مريم:٦٢)

"اس میں سلامتی کے سوا اور کوئی بے ہودہ بات نہ سنیں گے۔"

جنت کا ایک اور نام قرآن میں مقام امین (امن والا مقام) بتایا گیا ہے، فرمایا:

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ۝ ﴾ (٤٤/ الدخان:٥١)

"بے شک پرہیز گار لوگ امن والے مقام میں ہوں گے۔"

مقام رحمت

خدا کی رحمت کب نہیں؟ اور کہاں نہیں؟ مگر دنیا کے فطری قوانین کے بموجب اس دنیا میں ایسے واقعات اور حادثے بھی پیش آ جاتے ہیں، جن کو ہم رحمت کے بجائے قہر الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں، پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ خود ہم کو ہمارے اعمال کی بدولت خداوند تعالیٰ کے قہر وغضب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے لیکن ایک عالم وہ ہے جہاں اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر وغضب کا نام ونشان نہ ہوگا، اس کی رحمت اور فیض وکرم کی وہاں بارش ہوگی اور اس کی رحمت کے سوا کوئی اور منظر کہیں اور کبھی دکھائی نہ دے گا:

﴿ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ۝ ﴾

(٩/ التوبة:٢١)

"ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت، خوشنودی اور ان باغوں کی خوشخبری دیتا ہے، جن میں ان کے لیے ہمیشہ کا آرام ہے۔"

اہل جنت کے چہرے خوشی سے دمکتے ہوں گے، یہ آواز سنائی دے گی:

﴿ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝ ﴾

(٣/ آل عمران:١٠٧)

"لیکن جن کے چہرے روشن ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اس میں وہ سدا رہیں گے۔"

مقام نور

جنت کا نور وہ مقام ہے، جہاں ظلمت وتاریکی کا نام ونشان نہ ہوگا، جنتیوں کے چہرے روشن ہوں گے،

کوئی ستاروں کی طرح چمکے گا اور کوئی چاند کی طرح، ہر طرف ان کے انوار کی بارش ہوگی، آگے پیچھے، داہنے بائیں ہر سمت سے نور درخشاں ہوگا، فرمایا:

﴿ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ ﴾ (٦٦/ التحریم:٨)

''ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے دوڑے گا۔''

اس دن اہل ایمان کے نور ایمان کی بجلیاں ہر طرف کوندیں گی:

﴿ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾

(٥٧/ الحدید:١٢)

''جس دن تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے چمکے گا، آج تم کو خوشخبری ہو، وہ باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہا کرو گے، یہی بڑی کامیابی ہے۔''

اس دن اہل نفاق اہل ایمان سے آرزو کریں گے کہ ذرا ٹھہر جایئے کہ ہمارے ظلمت کدہ میں بھی ایک دم کے لیے روشنی ہو جائے:

﴿ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ ﴾

(٥٧/ الحدید:١٣)

''جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اہل ایمان سے کہیں گی کہ ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی کر لیں۔''

مقامِ رضوان

جنت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز مقامِ رضوان ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے راضی اور خوش ہونا اس کے بعد نہ کبھی وہ اپنے اس بندہ پر عتاب فرمائے گا اور نہ اس سے ناراض ہوگا، بلکہ اس کو اپنی رضامندی اور خوشنودی کی لازوال دولت عطا فرمائے گا، متقیوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں رکھی ہیں ان میں جنت، نہریں، پاک بیویاں اور ان سب کے بعد روح کی مسرت رکھی ہے، لیکن ان سب کے بعد بھی اپنی سب سے آخری نعمت اپنی اسی رضامندی کو ظاہر فرماتا ہے، چنانچہ سورۂ توبہ میں رحمت اور رضوان کے بعد جنت کے ذکر کو جگہ دی گئی ہے:

﴿ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴾

(٩/ التوبة:٢١)

’’انکا پروردگار ان کو اپنی رحمت اور خوشنودی (رضوان) کی خوشخبری دیتا ہے اور ان باغوں کو جن میں نعمت الٰہی قائم رہے گی۔‘‘

سورۂ حدید میں بھی اسی طرح مغفرت اور رضائے الٰہی کے بعد بطور تکملہ کے جنت کا ذکر آتا ہے، فرمایا:

﴿ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ ﴾

(۵۷/ الحدید:۲۰، ۲۱)

’’اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور خدا کی بخشش اور رضامندی بھی ہے اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے، اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو، جس کا پھیلاؤ آسمان اور زمین کے پھیلاؤ کے برابر ہے، یہ ان کے لیے بنائی گئی ہے، جو اللہ اور اس کے رسولوں پر یقین رکھتے ہیں، یہ اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑا مہربانی والا ہے۔‘‘

سورۂ آل عمران میں جنت کی تمام نعمتوں کو گنا کر ان کا خاتمہ رضوان کی عظیم الشان بشارت پر کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵)

’’جنہوں نے پرہیزگاری کی، ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس ایسے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ سدا رہیں گے اور پاک بیویاں اور اللہ کی خوشنودی۔‘‘

سورۂ توبہ میں جنت کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر نعمت رضوانِ الٰہی کو قرار دیا ہے:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ ﴾

(۹/ التوبة:۷۲)

’’اللہ نے باایمان مردوں اور عورتوں سے ان باغوں کا وعدہ کیا ہے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں سدا رہیں گے اور رہنے کے ستھرے گھر اور اللہ کی رضامندی، سب سے بڑی ہے وہی بڑی کامیابی ہے۔‘‘

بہشت کی مطمئن روحوں کو اس دنیا سے رخصت ہوتے ہی یہ نوید مسرت سنائی جاتی ہے:

﴿ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ۝ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ ﴾

(۸۹/ الفجر:۲۷۔۲۸)

''اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کے پاس اس طرح واپس جا کہ تو اس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی ہو۔''

اہل جنت کی یہ صفت آئی ہے:

﴿ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۱۹)

''خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش۔''

انہیں آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے یہ بشارت سنائی ہے کہ ''خداوند تعالیٰ اہل جنت کو آواز دے گا کہ اے جنت والو! وہ جواب دیں گے اے خداوند! ہم حاضر ہیں سب بھلائیاں تیرے پاس ہیں فرمائے گا (جنت کی نعمتیں پا کر) اب تم خوش ہوئے۔ عرض کریں گے، پروردگار کیوں خوش نہ ہوں کہ تم نے ہم کو وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا، فرمائے گا کہ میں ان تمام گزشتہ نعمتوں سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ تم کو نہ دوں؟ کہیں گے، اے پروردگار! ان سے بہتر کیا ہے؟ فرمائے گا یہ کہ اپنی رضامندی و خوشی تم پر اتاروں، پھر اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔'' [1]

مقامِ طیب وطاہر

موجودہ دنیا کی ہر چیز آلودگیوں اور نجاستوں سے بھری ہے، لیکن بہشت وہ مقام ہے جو پاکی، ستھرائی، لطافت اور طہارت کا مظہر ہے، اس میں وہی داخل ہوں گے جو گناہوں سے پاک ہو چکے ہوں، فرمایا:

﴿ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴾ (۳۹/ الزمر:۷۳)

''تم پاک ہو چکے تو جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔''

جو زندگی وہاں ملے گی وہ بھی پاک وصاف ستھری اور ہر جسمانی وروحانی آلائش سے بری ہوگی، فرمایا:

﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ (۱۶/ النحل:۹۷)

''مرد ہو یا عورت جس نے مومن بن کر اچھے کام کیے ہم اس کو ایک پاک زندگی دے کر جلائیں گے اور ان کو ہم ان کے سب سے بہتر عمل کے مطابق بدلہ دیں گے۔''

جو گھر وہاں ملیں گے، وہ بھی پاک وصاف اور ستھرے ہوں گے:

﴿ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً ﴾ (۶۱/ الصف:۱۲) ''اور پاک گھر''

جو بیویاں ملیں گی، وہ بھی پاک ہوں گی:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ۶۵۴۹؛ صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها وأهلها، باب احلال الرضوان......: ۷۱۴۰۔

﴿ وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۵) ''اور پاک بیویاں۔''

وہاں کی جو باتیں ہوں گی وہ بھی پاک ہوں گی۔

﴿ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ ﴾ (۲۲/ الحج: ۲٤)

''اور اہل جنت کو پاکیزہ گفتگو کی طرف راہنمائی کی جائے گی۔''

ان کو پینے کی جو چیز ملے گی وہ بھی پاک ہوگی:

﴿ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝ ﴾ (۷٦/ الدهر: ۲۱) ''پینے کی پاک چیز۔''

غرض کہ ہر چیز وہاں پاک وصاف، طیب وطاہر اور تمام روحانی وجسمانی آلودگیوں سے مبرا ہوگی۔

مقامِ تسبیح وتہلیل

اس آرام ولطف کے بعد اہل جنت کی روحانی لذت اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور تسبیح وتہلیل ہوگی، یہ ان کی روحانی غذا ہوگی، وہ عالم جہاں ہر طرف انوار الٰہی برستے ہیں، جہاں صفائی اور ستھرائی کے سوا کوئی اور منظر نہیں، جہاں قدس ونزاہت کی ہر طرف صورتیں نظر آئیں گی وہاں حمد وثنا کے روح افزا ترانے بھی ہر طرف سے بلند ہوں گے:

﴿ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (۱۰/ یونس: ۱۰)

''جنت میں ان کی ندا یہ ہوگی کہ اے میرے اللہ! تیری پاکی اور ان کی آپس کی دعا، سلامتی ہوگی اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ دنیا کے پروردگار اللہ (تعالیٰ) کی حمد ہو۔''

جنت کی تمام شاہانہ نعمتوں کے بعد بڑی نعمت یہ ہوگی کہ خدا کی تسبیح وتہلیل کی نئی نئی پرلطف راہیں وہاں ان پر کھلیں گی، فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۭ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۝ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ۝ ﴾ (۲۲/ الحج: ۲۳، ۲٤)

''بے شک اللہ ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، ان باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، ان میں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کی پوشاک اُن میں ریشم کی ہوگی اور وہ راہ دکھائے جائیں اچھی بات کی اور وہ دکھائے جائیں گے اس سراپا حمد (ذات) کی راہ۔''

وہ اپنے ہر سرور اور نعمت کے شکریہ میں فرشتوں کے ساتھ مل کر حمدِ الٰہی کا سرودِ سرمدی گائیں گے اور یہ

وہ وقت ہوگا، جب عالم وجود کے ہر گوشہ سے اس کی حمد کا ترانہ بلند ہوگا، فرمایا:

﴿ وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ۝ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ۝ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ ﴾ (۳۹/ الزمر:۷۳_۷۵)

''جنت کے نگہبان ان سے کہیں گے، تم پر سلامتی ہو تم پاک ہو چکے، تو جنت میں چلے جاؤ، اہل جنت کہیں گے اس اللہ کی حمد ہو جس نے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہم کو اس سرزمین کا مالک کیا کہ جنت میں جہاں چاہیں رہیں تو کام کرنے والوں کی کیسی اچھی مزدوری ہے اور یہ دیکھے گا کہ فرشتے عرش الٰہی کو گھیرے اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر رہے ہوں گے اور سب لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ حمد ہو سارے عالم کے پروردگار کی۔''

اہل جنت کے متعلق قرآن پاک میں ایک جگہ ہے:

﴿ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ۭ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا۝ ﴾ (۱۹/ مریم:۶۲)

''وہ نہ سنیں گے وہاں بیکار بات، مگر سلام اور ان کی روزی اس میں صبح اور شام ہوگی۔''

اس صبح و شام کی روزی سے مقصود کیا جنت کے کھانے کے الوانِ نعمت ہیں، اگر ایسا ہوتا تو صبح و شام کی تخصیص کیا تھی وہ تو ہر وقت سامنے ہوں گے، میرا گمان یہ ہے کہ اس روزی سے خدا کی تسبیح و تہلیل کی روحانی روزی اور ربانی غذا مراد ہے اور حدیث کے ان لفظوں کو اسی کی تفسیر سے جانتا ہوں، صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے جنت کی نعمتوں کے سلسلہ میں فرمایا:

((يُسَبِّحُوْنَ اللّٰهَ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا)) [1]

''وہ صبح اور شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کریں گے۔''

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اہل جنت کو خدا کی تسبیح و تقدیس کا الہام ہوا کرے گا۔'' [2] اور شاید قرآن پاک کی اس آیت کے یہی معنی ہوں:

﴿ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ۝ ﴾ (۲۲/ الحج:۲٤)

''اور اچھی بات کی طرف ان کی راہنمائی کی جائے گی اور اس سراپا حمد کا راستہ ان کو بتایا جائے گا۔''

مقامِ قرب

اہلِ جنت کو جو کچھ نصیب ہوگا، ان سب کے سوا سب سے اعلیٰ مرتبہ قرب خاص کا مقام ہوگا، بندے

[1] صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب فی صفات الجنة: ۷۱۵۱۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب فی صفات الجنة: ۷۱۵۵؛ سنن دارمی، کتاب الرقاق، باب فی اهل الجنة ونعیمها: ۲۸۲۸۔

اپنے پروردگار کی حضوری کا شرف پائیں گے، قرآن پاک میں جابجا ان کے لیے یہ آتا ہے کہ ﴿ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ ''ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس ہے۔'' یہ قرب خاص کے اشارے ہیں اور ایک جگہ یہ اشارہ اس تصریح سے بدل جاتا ہے:

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ۙ۝ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝ ﴾

(٥٤/ القمر:٥٤، ٥٥)

''بے شک پرہیزگار، باغوں میں اور نہروں میں، سچائی کی نشست گاہ میں، اس بادشاہ کے حضور جس کا سب پر قبضہ ہے۔''

دیدار

جنت کی سب سے آخری لیکن بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی تجلی کا نظارہ ہے، کون ہے جو اس مطلعِ انوار کے دیدار کی تاب لا سکے، تاہم یا تو یہ آنکھیں اور ہوں گی یا وہ نورِ مطلق کسی خاص شان میں نمایاں ہوگا، اس وقت یہ عالم ہوگا کہ وہ نور کا مرکز بن کر نمودار ہوگا اور اہل جنت کی مشتاق آنکھیں اس کی طرف اٹھی ہوں گی:

﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ ﴾ (٧٥/ القیامۃ:٢٢، ٢٣)

''کتنے چہرے اس دن تروتازہ اور اپنے پروردگار کی سمت دیکھ رہے ہوں گے۔''

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ صحابی روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم اپنے پروردگار کو بالمشاہدہ دیکھو گے۔'' دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جیسے چاند کو تم دیکھ رہے ہو ایسے ہی تم اپنے پروردگار کو دیکھو گے اس دیدار و رویت میں کوئی ایک دوسرے کا مزاحم نہ ہوگا۔'' [1] اس تمثیل سے رسول اللہ ﷺ کے دو مقصود ہیں ایک تو شدتِ یقین کا اظہار کہ جس طرح تم اس روشن چاند کو بے شک وشبہ دیکھ رہے ہو اسی طرح بے شک وشبہ اپنے پروردگار کو دیکھو گے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ جس طرح لاکھوں کا مجمع بھی ہو تو سب لوگ ایک چاند کو یکساں حیثیت سے باطمینان اس طرح دیکھ سکتے ہیں کہ ایک کا دیکھنا دوسرے کے دیکھنے میں عائق نہیں ہوتا، اسی طرح دیدار الٰہی میں کروڑوں کا ہجوم مانع نہ ہوگا، اتنا ہی نہیں بلکہ جس دن جنتی اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے ان کی زبان پر سلامتی کی دعا ہوگی:

﴿ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚ ﴾ (٣٣/ الاحزاب:٤٤)

''ان کی دعا جب وہ اپنے پروردگار سے ملیں گے، سلامتی ہوگی۔''

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ سراپا رحمت پروردگار خود اپنے بندہ کو اپنی زبان سے سلامتی کا پیام دے گا:

﴿ سَلٰمٌ ۣ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ۝ ﴾ (٣٦/ یٰسٓ:٥٨)

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ: وجوہ یومئذ ناضرۃ:٧٤٣٦۔

''رحمت والے پروردگار کی طرف سے پیام سلامتی ہوگا۔''

بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''خداوند تعالیٰ اپنے بندوں سے ترجمان کے بغیر خود کلام فرمائے گا۔'' [1]

یہ روایت کیونکر ہوگی؟ اہل روایت لفظ کے قائل ہیں، اہلِ عقل زیادتِ ایمان کی تاویل کرتے ہیں، اہلِ حقیقت اس کو اسماء وصفات کی نا قابل بیان جلوہ انگیزی سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن فیصلہ یہ ہے کہ

ع بیاکیں داوریہارابہ پیش داور اندازیم

ان تعلیمات کا عملی اثر

اوپر کے صفحوں میں قیامت، حشر ونشر اور جنت و دوزخ کے پورے مناظر گزر چکے ہیں، یہ ایمان بالغیب مذہب کی حقیقت کا اصلی جوہر ہے اور اسی کے یقین میں مذہب کی اصلی طاقت پوشیدہ ہے، معلوم ہو چکا ہے کہ اہل عرب کو ان حقائق کی تسلیم سے کس قدر انکار تھا، بلکہ مرکر جی اٹھنا اور اس موت کے بعد دوبارہ زندگی ان کے نزدیک کس قدر مستبعد تھی، قرآن پاک کا بڑا حصہ شرک کے ابطال اور توحید کے اثبات کے بعد اسی حیات بعد الموت کی تلقین اور اس پر ایمان کی دعوت پر مشتمل ہے، آنحضرت ﷺ اپنے اکثر خطبوں میں اس کا حال بیان کیا کرتے تھے اور جمعہ کے خطبوں میں خصوصیت کے ساتھ سورۂ قٓ کی تلاوت فرماتے تھے، جس میں قیامت کے حالات ہیں، مگر دیکھو کہ ۲۳ برس کی مسلسل تعلیمِ قرآن پاک کی تاثیر اور محمد رسول اللہ ﷺ کے فیضِ ہدایت سے نہ صرف انکا انکار اقرار سے بدل گیا بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مناظر ان کے دل ودماغ کی لوح میں منقوش ہو گئے تھے۔ یاد ہوگا کہ اسلام کے آغاز میں ایک عرب شاعر نے طنزاً کہا تھا:

امـوت ثم بعث ثم حشر حديث خرافة يا ام عمرو

''کیا مرنا ہے پھر جینا اور پھر اکٹھا ہونا اے عمرو کی ماں یہ خرافات باتیں ہیں۔''

لیکن چند ہی سال کے بعد یہ طنز وانکار، رمز یقین سے بدل گیا اور اس وقت عرب کا شاعر یہ کہنے لگا:

''ہم آسمان تک پہنچ گئے اور خدا سے امید ہے کہ ہم اس سے بھی اونچے ہو جائیں گے۔'' [2]

وانا لنرجوا فوق ذَالِكَ مَظْهَرًا

''اور ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ اس سے بھی بلند مقام میں ظہور کریں۔''

آنحضرت ﷺ استفسار فرماتے ہیں کہ آسمان سے بھی بلند مقام اور کیا ہے؟ عرض کرتا ہے کہ ''جنت یا رسول اللہ؟'' آپ ﷺ فرماتے ہیں: ''ان شاء اللہ دیکھو کہ جن کی نظریں زمین سے اونچی نہیں جا پاتی تھیں

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب کلام الرب یوم القیامة مع الانبیاء وغیرهم:۷۵۱۲۔

[2] اصابه، ج٦، ص:۲۱۹؛ استیعاب ذکر نابغة جعدی، ج۱، ص:۳۲۱۔

ان کا تخیل آسمان سے بھی اونچا جانے لگا'' جن کو مر کر پھر جینا دوراز عقل معلوم ہوتا تھا، جن کو آخرت کے مؤاخذہ کا کوئی ڈر نہ تھا جن کو اپنے اعمال کی جواب دہی کی پروانہ تھی، جو سزا و جزا کے مفہوم سے بیگانہ تھے، جو جنت اور دوزخ کے تخیل سے نا آشنا تھے، وہ اس ہولناک منظر سے ڈرنے لگے، دوسری زندگی پر ان کو اسی طرح یقین آ گیا جس طرح آج کی زندگی پر تھا، آخرت کے مؤاخذہ سے وہ بید کی طرح کانپنے لگے، اعمال کی جواب دہی سے ترساں ولرزاں رہنے لگے، سزا و جزا کے خوف سے وہ اپنے ہر عمل کی باز پرس خود کرنے لگے، جنت کا اشتیاق ان کو بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ کر دیتا تھا، دوزخ کا ڈر ان کے دل کے اندر کے ہر تار کو چھیڑا کرتا تھا، ان کی آنکھوں کو اشک بار رکھتا تھا، فرائض اور ذمہ داری کی دیانت داری کے ساتھ ادا کرنے پر ہر لحظہ ان کو آمادہ کرتا رہتا تھا، راحت کا خواب اور آرام کے بستر سے ان کو چونکا کر عمل کے میدان میں تنہا لے آتا تھا اور ہر نیک کام اور عمدہ عمل کے لیے ان کو ہمہ تن سرگرم اور سرتاپا مصروف جدوجہد بنا دیتا تھا، تنہائی اور تاریکی میں بھی ان کے دل اور بدن کو برائیوں اور بداعمالیوں سے باز رکھتا تھا، ان کے ضمیر اور دل کے مخفی گوشوں کو ہر وقت خدا کی آنکھوں کے سامنے کھلا رکھتا تھا۔

ایک دفعہ دو صحابیوں میں کسی حقیقت کے متعلق جھگڑا تھا آنحضرت ﷺ نے فریقین کی باتیں سن کر ایک کے حق میں اس کا فیصلہ دے دیا پھر فرمایا: ''میں بھی ایک آدمی ہوں، مدعی اور مدعا علیہ میں سے ممکن ہے کہ کوئی زیادہ اچھا بولنے والا ہو جو اپنے دعویٰ کو خوبی کے ساتھ بیان کرے اور میں اس کے موافق اس کا فیصلہ دوں لیکن درحقیقت وہ چیز اس کی نہ ہو تو گویا میں اس کے گلے میں آگ کا ایک طوق پہنا رہا ہوں۔'' یہ سن کر فریقین پر یہ اثر ہوا کہ دونوں رونے لگے اور ہر ایک اپنا حصہ دوسرے کو دینے لگا۔ [1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ خدا کے مطیع و فرمانبردار تھے، رسول کے عاشق و شیدا تھے، نیکیوں سے مالا مال جنت کی بشارت سے سرفراز تھے، تاہم آخرت کے مؤاخذہ اور جواب دہی سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ ایک دفعہ انہوں نے کہا کہ ''اگر وصال نبوی کے بعد میرے اچھے اور برے اعمال برابر رہیں تو میں بھی خوش ہوں [2] اگر جنت نہ ملے تو پروا نہیں مگر الٰہی دوزخ نہ ملے۔'' وہ نزع کے حال میں بہت بے چین تھے، بعض صحابہ ان کے اچھے اعمال گنا کر ان کو تسلی دینے لگے تو جواب میں کہا: ''خدا کی قسم! اگر کل زمین میرے لیے سونا ہو جاتی تو اس کو دے کر عذاب الٰہی سے بچ سکتا تو میں دے دیتا۔'' [3] ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی تھیں: ''اے کاش میں جنگل کی گھاس ہوتی [4] اے کاش میں کچھ نہ ہوتی'' [5]

---

[1] سنن ابی داود، کتاب القضاء، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ: ٣٥٨٤۔

[2] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار: ٣٩١٥۔ [3] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عمر: ٣٦٩٢۔ [4] ابن سعد جزء النساء، ج٨، ص: ٥١۔

[5] مستدرك حاكم، ج٤، ص:٩؛ مسند احمد، ج١، ص: ٢٧٦۔

قیامت کے متعلق قرآن پاک کی یہ عجیب مؤثر آیت:

﴿ يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۝ ﴾ (۲۲/ الحج:۱، ۲)

''لوگو! اپنے رب سے ڈرو، قیامت کا بھونچال ایک بڑی چیز ہے، جس دن اس کو دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی عورت اپنے دودھ پیتے بچہ کو بھول جائے گی اور پیٹ والی اپنا پیٹ ڈال دے گی اور لوگوں کو نشہ میں دیکھو گے، لیکن وہ نشہ میں نہ ہوں گے، بلکہ خدا کا سخت عذاب ہوگا۔''

جب اتری اور آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو سنایا اور اس کی تفسیر کی تو ان کے چہروں کا رنگ بدل گیا [1] اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، [2] ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے قبر کا ذکر کیا اور موت کے بعد عذاب کا حال بیان کیا تو صحابہ چیخیں مار مار کر رونے لگے، [3] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ایک بار قیامت کے ایک منظر کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اثنائے روایت میں وہ تین دفعہ بے ہوش ہو کر گرے اور جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ روایت دہرائی گئی تو ان پر بھی گریہ طاری ہوگیا۔ [4]

اس یقین وایمان کا دوسرا سماں یہ ہے کہ بدر کا میدان جنگ ہے، مشرکین کی ایک ہزار لوہے میں ڈوبی ہوئی فوج کا سیلاب امنڈا آرہا ہے، ادھر تین سو نہتے مسلمان صف باندھے کھڑے ہیں کہ آپ ﷺ صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرماتے ہیں: ''لو اس جنت کا موقع سامنے ہے جس کی وسعت آسمان وزمین کے برابر ہے۔'' ایک انصاری حیرت سے پوچھتے ہیں کہ کیا آسمان وزمین کے برابر؟ آپ فرماتے ہیں ''ہاں۔'' وہ خوشی سے واہ واہ کہہ اٹھتے ہیں آپ دریافت فرماتے ہیں کہ ''تم نے واہ واہ کیوں کہا؟'' عرض کی، اس امید سے کہ شاید میں بھی اس میں ہوں۔ فرمایا: ''تم اس میں ہو۔'' یہ سن کر وہ کھجور نکال نکال کر جلدی جلدی کھانے لگے بالآخر جنت کے جانے میں اتنا توقف بھی شاق گزرا بولے، اتنی دیر بھی کیوں کی جائے، یہ کہہ کر کھجوریں پھینک دیں اور تلوار کھینچ کر آگے بڑھے اور شہید ہوئے۔ [5]

غزوۂ احد میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا احد کے میدان میں دار وگیر کا شور برپا تھا، لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں کہ ایک صحابی نے آگے بڑھ کر پوچھا، یارسول اللہ ﷺ! اگر میں خدا کی راہ میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا؟ فرمایا: ''جنت میں۔'' وہ کھجور کھا رہے تھے ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیں اور لڑ کر جان دے دی، [6] قیس ایک

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الحج: ٤٧٤١۔ [2] جامع ترمذی، ابواب التفسیر: ٣١٦٨۔

[3] سنن نسائی، کتاب الجنائز، باب التعوذ من القبر: ٢٠٦٤۔

[4] جامع ترمذی، ابواب الزهد، باب ماجاء فی الریاء والسمعة: ٢٣٨٢۔

[5] صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب ثبوت الجنة للشهید: ٤٩١٥۔ [6] صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب ثبوت الجنة للشهید: ٤٩١٣؛ سنن نسائی، کتاب الجهاد، باب ثواب من قتل فی سبیل الله: ٣١٥٦،

صحابی تھے وہ ایک جہاد میں شریک تھے انہوں نے اسلامی فوج کے سپاہیوں کے سامنے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جنت کے دروازے تلواروں کے سایہ کے نیچے ہیں۔'' ایک معمولی سا مسلمان پاس کھڑا تھا اس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ کیا آپ نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے؟ انہوں نے کہا ''ہاں'' یہ سن کر وہ اپنے دوستوں کے پاس آیا اور سلام کر کے رخصت ہوا، میان توڑ کر پھینک دی اور تلوار لے کر دشمن کی صف پر جا پڑا اور شہادت حاصل کی۔ [1]

ان حیرت انگیز واقعات میں سے ہر ایک واقعہ پر غور کرو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے منکر و کافر عرب کے دل و دماغ اور ذہن و اعتقاد کو کس طرح آن کی آن میں بدل دیا اور دم کے دم میں عربوں کے عقائد اخلاق اور کارناموں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

[1] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب ثبوت الجنۃ للشهيد:٤٩١٦۔

قضا وقدر

﴿ إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ﴾ (٥٤/ القمر:٤٩)

اگر چہ قرآن پاک میں ایمان کے سلسلہ میں اس کا ذکر نہیں آیا مگر اس کا اعادہ بار بار قرآن پاک میں اتنی دفعہ ہوا ہے کہ اس کی اہمیت اس کی مقتضی ہے کہ اس کو بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دی جائے، چنانچہ بعض صحیح حدیثوں ❶ میں یہ ایمانیات کی آخری کڑی قرار بھی دی گئی ہے اور سلسلۂ توحید میں اسلام نے اللہ تعالیٰ کی وسعت قدرت اور مشیت مطلقہ کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کا لازمی نتیجہ بھی یہی ہونا چاہیے۔

اس عقیدہ کا ماحصل یہ ہے کہ دنیا میں اب تک جو کچھ ہوا ہے جو کچھ اب ہو رہا ہے اور جو کچھ آئندہ ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کے علم سابق اور فیصلہ ازلی کے مطابق ہوا ہے، ہوتا ہے اور ہوگا جس طرح مہندس اور انجینئر مکان بنانے سے پہلے مکان کی تمام جزئیات پر غور کر کے پہلے ہی سے نقشہ تیار کر لیتے ہیں اور اسی مجوزہ نقشہ کے مطابق معمار اور مزدور اس کی تعمیر کو مکمل کرتے ہیں، اسی طرح اس مہندس ازل، خالق کائنات نے کائنات کی پیدائش سے پہلے اس کے تمام اصول وقواعد اور دوسرے اہم جزئیات طے کر کے ہر چیز کی نسبت فیصلہ کر دیا تھا اب اسی فیصلہ کے مطابق یہ کائنات اور اس کے تمام حوادث و واقعات انجام پا رہے ہیں، موت وحیات، فقر وغنا، کامیابی وناکامی، تکلیف وراحت ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے اور اسی کے مطابق وہ ظہور پذیر ہوتی ہے۔ نفس یہ عقیدہ بھی اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، جو کچھ مخصوص ہے، وہ اس کی تکمیلی تعلیم ہے۔

توراۃ میں حضرت آدم علیہ السلام وشیطان اور ہابیل وقابیل کے قصوں میں اس عقیدہ کے اشارات پائے جاتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب اسی حقیقت کی تعبیر ہے، مگر ان اشارات سے گزر کر زبور میں اس کی کھلی کھلی تعلیم بھی ملتی ہے، زبور ۱۳۸۔۱۴ تا ۱۶ (کتاب مقدس عہد نامہ قدیم ص:۹۹) میں ہے:

> ”تیرے کام حیرت افزا ہیں، اس کا میرے جی کو بڑا یقین ہے، جب کہ میں پردے میں بنایا جاتا تھا اور زمین کے اسفل میں منقوش ہوتا تھا، تو میرے جسم کی صورت تجھ سے چھپی نہ تھی، تیری آنکھوں نے میرے بے ترتیب مادہ کو دیکھا اور تیرے دفتر میں یہ سب چیزیں تحریر کی گئیں اور ان کے دلوں کا حال بھی کہ کب بنیں گی، جب ہنوز ان میں سے کوئی بھی نہ تھی۔“

اس کے بعد زبور ۱۴۸:۱ تا ۶، (کتاب مقدس عہد نامہ قدیم ص:۱۰۴) کا ترانہ حمد اسی لَے میں شروع ہوتا ہے:

> ....”خداوند کے نام کی ستائش کریں کہ اس (خدا) نے حکم دیا اور وہ (مخلوقات) موجود ہو گئے، اس نے ان کو ابدی پائیداری بخشی اس نے ایک تقدیر مقرر کی جو ٹل نہیں سکتی۔“

انجیل میں اس کی تعلیم ”خدا کی مرضی“ کے عنوان سے ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندگی کی آخری شب کی

❶ صحیح مسلم، کتاب الایمان: ۹۳۔

دعا میں فرماتے ہیں: ''میری مرضی نہیں تیری مرضی پوری ہو۔'' (متی ۲۶۔۳۹) اور اسی ''مرضی'' کا ذکر یوحنا (۵۔۳۰و۶۔۳۸) اور خطوط (فلپون ۲۔۱۳) میں ہے اور رومیوں کے نویں باب میں اس کی پوری تفصیل ہے، مگر خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم نے اول یہ کیا کہ اس مسئلہ کی مجمل حقیقت کی توضیح کی اور اسکی حکمت ومصلحت کی تشریح کی اور دوسری بات یہ کی کہ گزشتہ مذاہب کی طرح اپنے دفتر کے کسی ایک گوشہ میں بطور ایک حقیقت ثانیہ کے اس کو کہہ کر خاموشی اختیار نہیں کر لی بلکہ بار بار اتنی دفعہ دہرایا کہ سننے والوں کے دلوں میں اس کی عقیدت نے گھر پیدا کر لیا اور یہ تلقین کی صورت میں ان کی رگ وریشہ میں پیوست ہوگئی اور ایسا اس نے اس لیے کیا، تاکہ صبر وشکر کی اخلاقی تعلیم صرف نظریہ کی صورت میں نہ رہ جائے، بلکہ عملی حیثیت میں اس کے پیروؤں کے اندر استقلال وثبات کی روح اور دنیا کے مصائب وحوادث میں تسلی وتشفی کی قوت پیدا کرے اور اس طرح یہ عقیدہ پہلے کی طرح صرف ایک مذہبی تلقین یا فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت میں نہ رہے بلکہ ایک مفید عملی تعلیم کی شکل اختیار کر لے۔

وحی محمدی ﷺ نے اس اصطلاح کے لیے دو لفظ اختیار کیے ہیں ایک ''قدر'' ہے جس کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں اور دوسرا ''قضا'' جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں:

﴿ اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝ ﴾ (٥٤/ القمر:٤٩)

''ہم نے ہر چیز کو اندازہ سے پیدا کیا۔''

﴿ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ﴾ (٦/ الانعام:٢)

''وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے بنایا پھر ایک وقت کا فیصلہ کیا۔''

یہ دونوں لفظ بجائے خود اس عقیدہ کی اسلامی حقیقت کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ کائنات کی پیدائش سے پہلے کائنات کی ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے اندازہ اور تقدیر سے ہر ایک کا فیصلہ فرما دیا ہے اور متعین کر دیا ہے، اسی کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے اس میں خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرہ کا بھی تغیر نہیں ہو سکتا، آسمان کو جس طرح بنایا، آفتاب کو جس طرح روشن کیا، چاند کے متعلق جو اصول مقرر فرمایا، ستاروں کے نکلنے اور ڈوبنے کے جو احکام دے دیے، موت وحیات، فنا وبقا اور عروج وزوال، غرض کائنات کی ہر شق اور پہلو کے متعلق جو اصول متعین فرما دیے انہیں پر وہ چل رہی ہے۔ قرآن پاک میں کائنات کے بہت سے حالات کے بیان کرنے کے بعد ہے:

﴿ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝ ﴾ (٣٦/ یٰسٓ:٣٨۔٤٠)

''اور سورج اپنے ٹھہراؤ پر چل رہا ہے، یہ ہے غالب اور علم والے کی تقدیر (اندازہ) اور چاند کو ہم نے تقدیر (اندازہ) کر دی ہیں منزلیں، یہاں تک کہ وہ پرانی ٹہنی کی طرح (خمیدہ ہو کر) لوٹتا ہے، نہ تو سورج کی قدرت میں ہے کہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے آگے بڑھے، ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔''

یہ تو آسمان کی بات تھی، زمین کے متعلق ارشاد ہوا:

﴿ وَقَدَّرَ فِيهَآ أَقْوَاتَهَا ﴾ (٤١/ حٰمٓ سجدة:١٠)

''اور زمین میں اس کی روزیاں اندازہ کر دیں۔''

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ دنیا کی ہر چیز میں اس نے ایک اندازہ مقرر کر دیا:

﴿ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ﴾ (٦٥/ الطلاق:٣)

''اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ بنایا ہے۔''

موت وحیات بھی اسی اندازہ کے مطابق ہے، فرمایا:

﴿ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ ﴾ (٥٦/ الواقعة:٦٠)

''ہم نے تمہارے درمیان موت کا اندازہ کر دیا۔''

ہر شے میں اللہ نے جو اندازہ لگایا ہے وہ وہی چیز ہے جس کو لوگ قانونِ فطرت کہتے ہیں اور جس پر دنیا چل رہی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ہر حصہ اور ہر پہلو کے متعلق اپنے احکام متعین فرما دیے ہیں، جن کی اطاعت اس پر واجب ہے، علیٰ ہذا انسانوں کی ترقی وزوال، موت وحیات، بیماری وصحت، دولت و افلاس، آرام وتکلیف، سعادت وشقاوت، ہر ایک کے اصول وقواعد مقرر فرما دیے ہیں، غرض ان کو آرام و تکلیف جو کچھ بھی پیش آتی ہے، خدا کے علم اور اجازت سے پیش آتی ہے:

﴿ مَآ أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (٦٤/ التغابن:١١)

''نہیں پہنچی تم کو کوئی مصیبت، لیکن اللہ کے حکم سے۔''

اور چونکہ تقدیر سے کوئی چیز ہٹ نہیں سکتی اس لیے مقدرات کو نوشتۂ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں کہ جس طرح لکھی ہوئی بات قائم رہتی ہے مٹتی اور بھولتی نہیں، ایسے ہی یہ باتیں بھی مٹتیں اور بھولتیں نہیں:

﴿ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثٰى وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهٖ ۚ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ إِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۚ إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ ﴾ (٣٥/ فاطر:١١)

''اور کوئی عورت حمل میں نہیں رکھتی اور نہ جنتی ہے، لیکن خدا کے علم سے اور نہ کسی دراز عمر کو عمر کی درازی ملتی ہے، یا اس کی عمر کم ہو جاتی ہے لیکن وہ کتاب میں ہے، بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔''

اس آیت پاک میں دو ٹکڑے ہیں، ایک یہ کہ جو عورت بھی اپنے پیٹ میں بچہ رکھتی ہے یا جو بچہ جنتی ہے، وہ خدائے پاک کے علم سے ہے، دوسرا ٹکڑا یہ ہے کہ جس کو چھوٹی بڑی عمر بھی ملتی ہے وہ کتابِ الٰہی میں پہلے سے لکھی ہوتی ہے، ان دونوں ٹکڑوں کے ملانے سے معلوم ہوگا کہ کتاب الٰہی میں ہونا اور علم الٰہی میں ہونا دونوں ہم معنی ہیں۔

قرآن پاک نے اس کو بھی ظاہر کیا ہے کہ قضا وقدر کے عقیدہ کی فلسفیانہ حقیقت سے زیادہ اس کی نظر اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت پر ہے، انسان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی ناچیز کوشش کی ذرا سی کامیابی پر فخر وغرور کے نشہ میں چور ہو جاتا ہے اور ذرا سی ناکامی پر وہ دل شکستہ ہو کر ہمت ہار بیٹھتا ہے، یہ دونوں مختلف اخلاقی بیماریاں اس لیے اس کو لاحق ہوتی ہیں کہ وہ اپنے کام کے اچھے یا برے نتیجے کو خود اپنے کام کا لازمی نتیجہ جانتا ہے، اس لیے وہ کبھی اپنے کیے پر مغرور اور کبھی ملول ہوتا ہے اور یہ دونوں کیفیتیں افراد اور اقوام کی متانت، استقلال اور صبر وثبات کے جوہر کو برباد کرتی ہیں، اس لیے ایک ایسے عقیدہ کی ضرورت تھی جو کامیابی کے فخر ومسرت اور ناکامی کے افسوس وحسرت دونوں موقعوں پر عاجز انسانوں کی دستگیری کرے اور وہ یہی عقیدہ قضا وقدر ہے۔ اس عقیدہ کا منشا یہ ہے کہ ہم کو جو کامیابی ہوتی ہے وہ ہماری کوشش کا براہِ راست نتیجہ نہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا نتیجہ ہے، اس لیے اس پر ہمارا فخر وغرور کرنا بے جا ہے، اسی طرح ہم کو جو ناکامی پیش آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حکمت ومصلحت کا نتیجہ ہے اور ہمارے کام سے پہلے ہی ہمارے کاموں کے نتیجے اس علام الغیوب کے علم میں مقرر ہو چکے تھے، اس لیے ہم کو دل شکستہ اور مایوس نہ ہونا چاہیے بلکہ اسی جوش وخروش اور سرگرمی سے پھر از سرِ نو جدوجہد میں مصروف ہو جانا چاہیے۔

اس مسئلہ کی یہ پوری توضیح سورۂ حدید میں ان لفظوں میں مذکور ہے:

﴿مَآ أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِيٓ أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَٰبٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَآ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿٢٢﴾ لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَآ ءَاتَىٰكُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴿٢٣﴾﴾ (۵۷/ الحدید:۲۲، ۲۳)

''کوئی مصیبت نہیں آتی ملک میں اور نہ خود تم (اس ملک کے بسنے والوں) میں لیکن یہ کہ وہ ایک کتاب (الٰہی) میں اپنی پیدائش سے پہلے درج ہوتی ہے، یہ اللہ پر آسان ہے، ایسا اس لیے کیا گیا، تاکہ تم اس پر جو تم سے جاتا رہے، غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو (اللہ) دے اس پر اترایا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے، بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا۔''

اس آیت کریمہ نے مسئلہ قضا وقدر کے فلسفہ کو اس خوبی سے واضح کیا ہے کہ اس کی تائید کے لیے کسی مزید تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی، یہ اسی عقیدہ کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گردنیں عین کامیابی و

فتوحات کی حالت میں خداوند قادر مطلق کے آگے جھک جاتی تھیں اور ناکامی کی حالت میں ان کے دل یاس و ناامیدی سے دوچار نہیں ہوتے تھے اور ان کی عملی زندگی کا جو نتیجہ بھی پیش آتا تھا وہ اس کو اپنی طرف سے نہیں بلکہ خداوند عالم کی طرف سے سمجھ کر خاموش رہتے تھے، مالی بے چارگی، سیاسی مصیبت، عزیزوں کی مفارقت، لڑائیوں کی ناکامی کسی موقع پر وہ رحمتِ الٰہی سے مایوس ہونا نہیں جانتے تھے اور ہر خطرناک سے خطرناک کام کے لیے وہ قدم اٹھا بیٹھتے تھے کہ ان کا یقین تھا کہ موت اپنے وقت پر آئے گی اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہوکر رہے گا، اسی لیے ان کے دلوں میں وہ عزم ہوتا تھا کہ نہ اس کو پہاڑ روک سکتے تھے، نہ سمندر بہا لے جاسکتے تھے، نہ حوادث کا طوفان اس کو اکھاڑ سکتا تھا اور نہ بھڑکتی آگ کے شعلے اس کو جلا سکتے تھے:

﴿ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَھُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۴۵، ۱۴۶)

’’کسی کے اختیار میں نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر مر سکے، یہ لکھا ہوا مقرر ہے (انسان کے ہاتھ میں صرف اچھا یا برا ارادہ و نیت ہے، اس نیت کے مطابق کام کا نتیجہ ظاہر ہونا اس کے اختیار میں نہیں) جو کوئی دنیا کا معاوضہ چاہے گا تو ہم اس کو اس میں سے کچھ دیں گے اور جو آخرت کا معاوضہ چاہے گا اس میں سے کچھ (یہاں) دیں گے اور پورا معاوضہ شکر کرنے والوں کو آئندہ (وہاں) دیں گے، کتنے پیغمبر تھے جو لڑے ہیں، ان کے ساتھ بہت سے خدا کے طالب تھے، تو خدا کی راہ میں ان کو جو مصیبت پیش آئی اس کی وجہ سے نہ دل ہارے، نہ سست ہوئے اور نہ دب گئے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔‘‘

ان آیتوں نے یہ واضح کر دیا کہ قضا و قدر کے عقیدہ کا نتیجہ پستی، سستی اور دوں ہمتی نہیں، بلکہ بلندی استقلال اور صبر و ثبات ہے اور یہی وہ چیز ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کارناموں میں ہر دیکھنے والے کو صاف نظر آتی ہے، ان کو صاحب وحی کی یہ تعلیم تھی کہ وہ دشمنوں سے کہہ دیں کہ ہمیں ڈر نہیں کیوں کہ

﴿ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾

(۹/ التوبۃ:۵۱)

’’ہم پر کوئی آفت آ ہی نہیں سکتی، لیکن جو خدا نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے، وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ ہی پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔‘‘

خطرات اور مشکلات کی ان کو پروا نہیں کہ جن کے لیے موت لکھی ہے وہ میدان جنگ میں بھی مریں

گے اور بستر راحت پر بھی اور جن کی موت کا مقررہ وقت نہیں آیا وہ تلواروں کی دھاروں اور سمندروں کے طوفانوں سے بھی سلامت بچ کر نکل آئیں گے:

﴿ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا ۗ قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵٤)

''منافق کہتے ہیں کہ اگر ہماری بات مان لی جاتی تو ہم یہاں مارے نہ جاتے، کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن پر یہاں مرنا لکھا جا چکا تھا وہ ازخود اپنے مقتل میں نکل کر چلے جاتے۔''

﴿ أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۗ ﴾(٤/ النسآء:۷۸)

''تم جہاں بھی رہو تم کو موت آ کر پالے گی اگر چہ تم مضبوط و مستحکم قلعوں میں ہو۔''

یہی وہ عقیدہ ہے جو مسلمان کی ناقابل ہزیمت، جرأت اور غیر شکست پذیر عزیمت اور بے خوف بہادری کا راز ہے، کچھ لوگوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ مسئلہ تقدیر کے ماننے سے انسان کا مجبور محض ہونا لازم آتا ہے اور اس سے یہ تعلیم نکلتی ہے کہ انسان اپنی تقدیر پر صابر و شاکر ہو کر سست و غافل بن کر بیٹھ رہے، حالانکہ اگر یہ صحیح ہوتا تو نہ رسولوں کی بعثت کی ضرورت تھی، نہ ربانی کتابوں کے اترنے کی حاجت ہوتی، نہ تبلیغ وارشاد کی تاکید ہوتی اور نہ اصلاح و ہدایت کا حکم ہوتا اور خدا کی مخلوق اپنے حال پر چھوڑ دی جاتی مگر ایسا نہیں کیا گیا، لاکھوں پیغمبر بھیجے گئے، کتنی کتابیں اتریں، کروڑوں مبلغ اور مرشد بنا کر پھیلائے گئے، ہدایت وارشاد کی تاکید پر تاکید آئی، لوگوں کی دعوت و اصلاح ہر مسلمان کا فرض ٹھہرایا گیا، کوشش و محنت سعی و تلاش اور جدوجہد کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی اور محمد رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد سے معمور زندگی ہمارے لیے نمونہ ٹھہرائی گئی اور خلفائے راشدین اور عام صحابہ نے اپنے کارناموں سے اس نمونہ کی کامیابی کی تصدیق کی۔ اب کیا محمد رسول اللہ ﷺ کی تلقین اور آپ کا عمل دو متضاد چیزیں تھیں؟ نہیں، یہ دونوں ایک دوسرے کی مؤید تھیں اور اس طرح ایک دوسرے کی تصدیق تھیں کہ ((اعملوا فكل ميسر لما خلق)) [1] ''لوگو! اپنے اپنے کام کیے جاؤ کہ تم میں سے ہر شخص سے وہی کام صادر ہوں گے جن کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔'' کام کرنا انسان کا فرض ہے اور اس کے نتیجہ کے مطابق جزا دینا خدا کا کام ہے اور یہ تقدیر ہے، فرمایا:

﴿ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ۝ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۝ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ۝ وَأَمَّا مَن بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۝ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ۝ وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ۝ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ۝ ﴾ (۹۲/ الیل:٤-۱۳)

[1] صحيح بخاري، كتاب التفسير، تفسير والليل اذا يغشى:٤٩٤٩۔

''بے شبہ تمہاری کوششیں مختلف رُخ کی ہیں تو جس نے دیا اور پرہیزگاری کی اور نیکی کو سچ کر دکھایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ آسانی کی طرف لے چلیں گے اور جس نے نہ دیا اور بے پروائی برتی اور نیکی کو جھٹلایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ سختی کی طرف لے چلیں گے اور اسکی دولت مندی اس کو گڑھے میں گرنے سے نہیں بچاسکتی ہے، بیشک راہ سوجھانا ہمارا فرض ہے اور آخر اور اول ہمارے لیے ہے۔''

یہ ہے قضا وقدر اور سعی وعمل کی باہمی تطبیق جس کی ژولیدگی نے اسلام سے پہلے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا تھا۔ کام کرنا اور عمل کر دکھانا انسان کا فرض ہے اور اس کے مطابق اس کی جزا کا ملنا جو اس کام کے لیے پہلے سے مقدر ہو چکی ہے خدا کا کام ہے۔ نیکوں کو آہستہ آہستہ نیکی کے مزید راستہ کے دکھانے کا نام توفیق وہدایت ہے اور بروں کو خدا کی طرف سے اس توفیق وہدایت کے نہ ملنے کا نام عدمِ توفیق وضلالت ہے اور ان دونوں میں سے ایک کا ملنا انسان کی ابتدائی کوشش ہے، خدا فرماتا ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ﴾ (۲۹/ العنکبوت:۶۹)

''اور جو ہماری بات میں کوشش کرتے ہیں البتہ ہم ان کو اپنا راستہ سوجھاتے ہیں۔''

خدا کی طرف سے توفیق وضلالت کا ملنا خود انسان کے اچھے یا برے عمل کا لازمی نتیجہ ہے:

﴿ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴾ (۲/ البقرہ:۲۶)

''اور ہم اس سے گمراہ نہیں بناتے، لیکن انہیں کو جو ہمارا حکم نہیں مانتے۔''

غرض پہلے فسق، عدم اطاعت اور نافرمانی ہوتی ہے، تب اس کے نتیجہ کے طور پر خدا کی طرف سے ضلالت کا ظہور ہوتا ہے:

﴿ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝ ﴾

(۵۳/ النجم:۳۹، ۴۰)

''اور انسان کے لیے نہیں، لیکن وہی جس کی اس نے کوشش کی اور بے شک اس کی کوشش (خدا کے حضور) دیکھی جائے گی۔''

اس کی مثال بالکل بچہ کی سی ہے، بچہ چلنا یا بولنا کیونکر سیکھتا ہے، وہ پہلے چلنے اور بولنے کی خود کچھ کوشش کرتا ہے، تو اس کے والدین اس کو چلنا اور بولنا سکھاتے ہیں، بچہ پاؤں اٹھاتا ہے اور والدین اس کے ہاتھ پکڑ کر اس کو دو چار قدم چلاتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ چلنا سیکھتا ہے، وہ پہلے زبان ہلاتا ہے اور مبہم آوازیں نکالتا ہے تو والدین اس کو بامعنی الفاظ کی تلقین کرتے ہیں اور اس طرح دونوں کوششیں مل کر بار آور ہوتی ہیں، اسی طرح تقدیر الٰہی اور عمل انسان باہم مل کر انسانوں کی عملی تاریخ تیار کرتے ہیں۔

جبر وقدر

عموماً لوگ اسی موقع پر جبر وقدر کے مسئلہ کو چھیڑتے ہیں یعنی یہ کہ انسان اپنے عمل میں مجبور ہے یا مختار؟ حالانکہ یہ رشتۂ کائنات کا وہ عقدہ ہے جس کا حل نہ صرف یہ کہ مذہب کے ناخن سے نہیں ہوتا بلکہ عقل کے ناخن سے بھی نہیں ہوسکتا جس طرح اہل مذہب ارادہ الٰہی اور ارادہ انسانی کی باہمی تطبیق میں حیران ہیں اسی طرح فلسفۂ الٰہیات کے معلم علم الٰہی اور انسان کی عملی آزادی کے درمیان اور فلسفہ اخلاق والے انسان کی آزادی عمل اور اس کے موروثی اثرات، فطری جذبات اور ماحول کی تاثیرات کی مجبوریوں کے درمیان جو تصادم ہے، اس کو بمشکل بچا سکتے ہیں۔ دنیا کے عام مذاہب کا بھی یہی حال تھا ہر دھاگے میں یہ گرہ اسی طرح پڑی ہوئی تھی اور اس کے حل کی صورتیں دو ہی انہوں نے نکالی تھیں یا تو سرے سے اس سے خاموشی برتی جائے اور دبے پاؤں اس راستہ سے گزر جایا جائے یا بحث چھڑی تو جبر ہی کی طرف ان کا میلان نمایاں تھا چنانچہ یہی جبر ہندو مذاہب میں تناسخ آواگون اور کرم کی صورت میں ہے۔ عیسائیوں میں حضرت آدم علیہ السلام کے گناہ اور خدا کی [1] مرضی کے پیرایہ میں ہے اور یہودیوں کے مجموعۂ تورات میں حضرت ایوب کا صحیفہ ادھر ہی رہبری کرتا ہے۔ دوسری طرف مجوسی تھے، جنہوں نے انسانی اختیار و آزادی کو یہاں تک بڑھا دیا تھا کہ خود خدا بھی اس کے آگے مجبور تھا خدا کو نہ صرف انسانوں کے بلکہ فرشتوں کے کاموں پر کوئی قابو حاصل نہ تھا۔ [2] غرض آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے مذاہب کی یہی دونوعیتیں تھیں یعنی یا تو ان کو اس مشکل کی خبر ہی نہیں تھی یا تھی تو خدا کی قدرت مطلقہ اور مشیت عامہ کی اس طرح تعبیر کرتے تھے کہ انسان بالکل بےبس اور مجبور نظر آتا تھا یا یہ کہ تناسخ کے چکر میں اس کو پھنسا کر اس کی زندگی کو اس کے پچھلے جنم کے کرموں کے ہاتھوں گرو کر دیتے تھے یا پھر اس سے بچے تو انسان کو کامل خود مختار بنا کر خود خدا کو مجبور بنا دیا۔

تمام انبیا میں آنحضرت ﷺ ہی کی شخصیت وہ نمایاں شخصیت ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس دیرینہ راز کے چہرہ سے پردہ ہٹایا، حقیقت یہ ہے کہ یہ دو صداقتیں ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا اور اس کے ذرہ ذرہ پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے اور آسمان و زمین، بر و بحر اور انسان و حیوان کوئی چیز نہیں، جو اس کے ارادہ اور مشیت کے بغیر حرکت بھی کر سکے، اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اس کی قدرت اور مشیت کے ماتحت ہیں، یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی اور خصوصاً اسلام کی جان ہے، اگر یہ نہ ہو تو مذہب کی قوت بے اثر ہو کر رہ جائے اور ایک ایسا خدا ماننا لازم آ جائے جس کے

---

[1] انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی گرفتاری کی رات کو دعا میں فرمایا: ''اے خدا! اگر تو اس پیالہ کو ہٹا سکتا ہے تو ہٹا دے، لیکن میری نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو'' ۔ (کتاب مقدس عہد جدید، متی، ۲۶: ۳۹، ص: ۵۰) عیسائیوں کے جبری و قدری فرقوں کی معرکہ آرائی کا حال فرنچ فاضل موسیو دی کانت کی کتاب الاسلام (ترجمۂ عربی) صفحہ ۷ سے کسی قدر معلوم ہوسکتا ہے۔

[2] شفاء العليل في القضاء والقدر والتعليل مقدمة الكتاب، ص: ۳ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ۔

اختیارات محدود، جس کی قدرتیں ناقص اور جس کی شہنشاہی ناتمام ہو۔

۲۔ دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ دوسری مخلوقات کو نہ سہی مگر انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح کوئی اختیار ضرور بخشا گیا ہے کہ اگر یہ اختیار نہ تسلیم کیا جائے اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کیا جائے جس طرح دوسری مخلوقات ہیں تو پھر انسان کے لیے خیر وشر کا امتیاز، جزا وسزا، شریعت، کتاب، تعلیم اور انبیا کی بعثت یہ تمام چیزیں بیکار محض ہو جائیں، ظلم وانصاف دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے، انسان کا اپنے کسی فعل پر قابل مدح یا قابل ملامت ہونا بے معنی ہو جائے، کسی اچھے کام پر خدا کا اس کو انعام دینا اور بلاسبب بُرے کام پر اس کو عذاب دینا سراسر ظلم بن جائے بلکہ اس دنیا کی عدالت میں بھی وہ اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہ ٹھہرے۔

الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت وارادہ ہر جزو وکل پر حاوی ہے اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے، نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا اور بدی کے کاموں پر وہ ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہے اور اسی کی بنا پر وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے فعل کی جزا وسزا پانے کا مستحق ٹھہرے گا، اسی پر وہ فطرت کے سامنے دنیا کی عدالت میں اور آخرت میں بھی مواخذہ اور باز پرس کی ذمہ داری میں گرفتار ہے اور اسی کے لیے خدا کی طرف سے اس کے پاس ہدایت کی کتاب اور راستہ دکھانے والے رسول اور نبی آتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا صحیفۂ ربانی پہلی اور آخری آسمانی کتاب ہے جس نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر تسلیم کیا ہے اور ان کی تبلیغ کی ہے ایک طرف وہ کہتا ہے کہ ”خدا کی اجازت کے بغیر درخت کا ایک پتہ بھی گر نہیں سکتا۔“ (۶/ الانعام:۵۹) اور دوسری طرف وہ کہتا ہے: ”ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہے۔“ (۷۴/ المدثر:۳۸) یعنی خدا کی ہمہ گیر قدرت، وسیع اختیار اور ناقابلِ ردمشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادہ کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی، یہی ارادہ اور اعضا کو اس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود قدرت اس کی ذمہ داری، تکلیف، باز پرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے اور اسی پر اس کے اعمال، اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے، اس لیے انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً اور شرعاً نہیں جو اس کے ارادہ اور نیت سے صادر نہ ہوئی ہو بلکہ اس کے کرنے یا نہ کرنے میں وہ مجبور و بے اختیار رہا ہو ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ)) [1] اس تطبیق سے نہ تو خدائے پاک کی قدرت واختیار کی

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی: ۱۔

وسعت میں فرق آتا ہے اور نہ انسان کا تمام تر مجبور ہونا لازم آتا ہے خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیے ہوئے اختیار اور بخشی ہوئی قدرت کو چھین لے، مگر ایک وقت مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون اور فرمائے ہوئے وعدہ کے مطابق وہ اس کو اس اختیار اور قدرت سے محروم نہیں کرتا۔ فرمایا:

﴿ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾ (۱۸/ الکہف:۲۹)

''تو جو چاہے مومن بن جائے اور جو چاہے کافر ہو جائے۔''

اس لیے ہر انسان اپنی جنت آپ بناتا ہے اور اپنی دوزخ آپ مہیا کرتا ہے:

﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝ ﴾

(۴۱/ فصلت:۴۶)

''جس نے نیک کام کیا تو اپنے لیے کیا اور برا کام کیا تو اپنے لیے کیا، تیرا پروردگار بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔''

کہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ ظلم ہو جس سے اللہ تعالیٰ کی جناب پاک و برتر ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ سے ارشاد ہے:

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۗ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۗ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ ﴾ (۱۰/ یونس:۴۲۔۴۴)

''اے پیغمبر! ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف کان لگاتے ہیں، تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے، اگر چہ وہ سمجھتے نہ ہوں اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف دیکھتے ہیں، تو کیا تم اندھوں کو سوجھاؤ گے اور اگر چہ وہ نہ دیکھیں، بے شک اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا، بلکہ لوگ ہیں جو اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں۔''

وہ انسان جو اندھا اور بہرہ بنتا ہے اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے، خدا اس کو اندھا اور بہرا بنا کر پھر اس کو دیکھنے اور سننے کی تکلیف نہیں دیتا کہ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ اس کا ظلم ہوتا اور ظلم کے ہر شائبہ سے اس کا ہر حکم اور ہر کام بری ہے۔ لوگوں کو قرآن کی ہدایت وضلالت کے الفاظ سے بھی دھوکہ ہوا ہے حالانکہ ہدایت اور ضلالت خدا کا وہ فیضان ہے جو انسان کے اچھے یا برے کام کے جواب میں خدا کی طرف سے ہوتا ہے، ضلالت کی نسبت فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۗ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ﴾ (۲/ البقرۃ:۶، ۷)

”بے شک جنھوں نے (اسلام کی تعلیمات کے قبول) سے انکار کیا ان کو تمہارا تنبیہ کرنا یا نہ کرنا دونوں برابر ہیں، وہ ایمان نہ لائیں گے خدا نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کردی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔“

دیکھو جب انسان سے کفر کا صدور پہلے ہو چکا تب خدا کی طرف سے ضلالت کا فیضان ہوا اور اس کو تشبیہًا یوں ادا کیا کہ ان کے دلوں پر مہر پڑ گئی کہ سمجھتے نہیں، کانوں پر مہر پڑ گئی کہ سنتے نہیں اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہے کہ دیکھتے نہیں، دوسری جگہ فرمایا:

﴿ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ ﴾ (٤/ النسآء:١٥٥)

”بلکہ خدا نے ان کے کفر کے سبب سے ان کے دلوں پر مہر کردی۔“

یہاں بھی ان کا کفر خدا کی مہر پر مقدم ہے، مقصد یہ ہے کہ جب کفر کا صدور ہوتا رہتا ہے تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو جاتا ہے اور یہی خدا کی مہر ہے۔ [1]

برخلاف اس کے اگر لوگ کانوں سے پیغامِ حق کے سننے اور آنکھوں سے دیکھنے اور دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ اپنی توفیق وہدایت سے سرفراز فرمائے۔ ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ ﴾ (١٠/ يونس:٩)

”بے شک جو ایمان لائے اور نیک کام کیے، ان کو ان کا پروردگار ان کے ایمان کے سبب ہدایت دے گا۔“

﴿ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى ﴾ (٤٧/ محمد:١٧)

”اور جنھوں نے ہدایت قبول کی، ان کو ہدایت میں اور بڑھایا۔“

ایرانی فلسفۂ خیر وشر کی آمیزش نے اس مسئلہ کو اور زیادہ اُلجھا دیا، حالانکہ عربی الفاظ خیر وشر کو اعمال خیر و شر سے بحث نہیں، عربی میں مطلق خیر کے معنی دولت ونعمت وآرام کے اور شر کے معنی غربت وتکلیف ومصیبت کے ہیں، قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ انہی معنوں میں آئے ہیں، البتہ جب ان کے ساتھ لفظ عمل شریک ہوگا، تو عملِ خیر اور عملِ شر کے معنوں میں یہ استعمال ہوگا، جیسے:

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۚ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ ﴾

(٩٩/ الزلزال:٧، ٨)

”تو جو کوئی چیونٹی برابر نیکی کرے گا، اس کو دیکھے گا اور جو برائی کرے گا وہ بھی دیکھے گا۔“

اس لیے حدیثوں کے ان الفاظ میں:

---

[1] قرآن پاک میں جہاں خدا کی اس مہر کا یا کسی کو ہدایت نہ دیے جانے کا ذکر ہے، وہاں اس کے کفر وفسق کی علت ہمیشہ پہلے ذکر کر دی گئی ہے، اس لیے ان آیتوں سے جبر پر استدلال صحیح نہیں۔

((وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى)) [1]

''اوراس پر ایمان کہ خیر اور شر کی تقدیر خدا کی طرف سے ہے۔''

کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کے اچھے اور برے کام سب خدا کی طرف سے ہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ انسانوں کو راحت و رنج، مسرت و تکلیف، دولت و افلاس اور صحت و مرض وغیرہ اچھائی اور برائی سب خدا کی طرف سے پہنچتی ہے اور اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر ہوسکتا ہے؟

بعض لوگوں کو صحیح مفہوم کے سمجھنے میں ان آیتوں سے بھی شبہ ہوتا ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ ''اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت دے دیتا'' اس سے وہ غلطی سے یہ سمجھے ہیں کہ وہ خود خداوند تعالیٰ ہی ہے جو ان کافروں کو ہدایت سے جبراً روکے ہوئے ہے حالانکہ ان آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ازخود اسلام قبول نہیں کر سکتے الا یہ کہ خود خدا زبردستی ان کو مسلمان بنا دینا چاہے مگر ایسے زبردستی سے مسلمان یا کافر اور نیک یا بد بنا دینا اللہ تعالیٰ کے جاری قانون کے خلاف ہے، چنانچہ ان آیتوں کا یہی مطلب ہے:

﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾ (۷٦/ الدھر:۳۰)

''تم نہیں چاہو گے الا یہ کہ خود خدا چاہے اور (تم کو زبردستی مسلمان بنا دے)۔''

﴿ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ ﴾ (٦/ الانعام:۱۱۱)

''وہ نہیں ہیں کہ ایمان لے آئیں الا یہ کہ خدا چاہے۔''

﴿ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى ﴾ (٦/ الانعام:۳۵)

''اور اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت پر متفق کر دیتا۔''

﴿ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ (٦/ الانعام:۱٤۹)

''تو اگر وہ (خدا) چاہتا تو البتہ ان سب کو وہ (خود) ہدایت دے دیتا۔''

﴿ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ (۱٦/ النحل:۹)

''اور اگر وہ (خدا) چاہتا البتہ ان سب کو ہدایت دے دیتا۔''

مگر اس کی عادت نہیں کہ وہ بندے کے ارادہ اور کوشش کے بغیر ازخود کسی کو ہدایت دے دے، اس لیے اس مشیتِ الٰہی کے ساتھ قرآن پاک کی وہ آیتیں مطابق ہوں گی، جن میں بندوں کی مشیت کا بھی اعتبار کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾ (۱۸/ الکھف:۲۹)

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان:۹۳؛ ابوداود، کتاب السنۃ، باب فی القدر:٤٦۹۵؛ ترمذی، ابواب الایمان، باب ما جاء فی وصف جبریل للنبی ﷺ الایمان والاسلام:۲٦۱۰۔

''تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔''

﴿ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴾ (۷۳/ المزمل:۱۹ و ۷۶/ الدھر:۲۹)

''تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ قبول کرے۔''

﴿ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴾ (۷۸/ النبا:۳۹)

''سو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف بازگشت پکڑے۔''

﴿ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴾ (۲۵/ الفرقان:۵۷)

''لیکن جو اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرنا چاہے۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے گمراہی بھی اترتی ہے، مگر کن کے لیے، بتصریح فرمایا:

۱۔ ﴿ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶)

''اور اللہ اس سے گمراہ نہیں کرتا، مگر نافرمانوں کو۔''

۲۔ ﴿ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾

(۶۱/ الصف:۵)

''جب وہ کج ہوئے تو اللہ نے انکے دلوں کو کج کر دیا اور اللہ بے حکم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔''

۳۔ ﴿ بَلْ ٚ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ (۸۳/ التطفیف:۱۴)

''بلکہ ان کے کام ان کے دلوں پر زنگ بن گئے۔''

۴۔ ﴿ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ ﴾ (۴/ النسآء:۱۵۶)

''بلکہ ان کے کفر کے سبب سے اللہ نے ان پر مہر کر دی۔''

۵۔ ﴿ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۲۷)

''وہ پھر گئے اللہ نے ان کے دلوں کو اس لیے پھیر دیا کہ وہ لوگ سمجھتے نہ تھے۔''

۶۔ ﴿ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۰۱)

''اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔''

۷۔ ﴿ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۰)

''ان کے دلوں میں (پہلے سے) (نفاق کی) بیماری تھی تو خدا نے بیماری بڑھا دی۔''

ان آیتوں میں سے ہر ایک پر غور کرو ہر ایک سے یہ صاف و صریح معلوم ہوگا کہ انسان کی بداعمالی مقدم ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے ضلالت، گمراہی، زنگ، مہر اور بیماری فرمانا مؤخر ہے اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضلالت، زنگ، مہر اور بیماری کا اترنا علت اور انسانوں کا کفر و گناہ و

نفاق معلول نہیں بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی انسان کا فسق، کجی، زنگ، کفر، انصراف، (پھر جانا) نادانی اور قلب کی بیماری پہلے ہوتی ہے اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں ضلالت و گمراہی اور دل پر مہر بعد کو ہوتی ہے اور یہی طبعی اصول بھی ہے، انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غمگین ہوتا ہے تب آنسو کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ اگر کوئی اس کو الٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی سخت نادانی ہوگی۔

بہر حال اس مسئلہ میں مہبطِ وحی و رسالت محمد رسول اللہ ﷺ کی عجیب مصلحت بینی یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی امت کو اس پر جس شدت سے ایمان لانے کی تلقین فرمائی اسی شدت سے اس میں بحث و مناقشہ سے منع فرمایا [1] اور در حقیقت اس نظریہ سے اسی طرح فائدہ اٹھانے میں راز ہے، یہ کلی جہاں چٹکی کہ خوشبو اڑ گئی۔ اس عقیدہ کے تمام وسیع اطراف اور گوشوں کو چھوڑ کر جن کو متکلمین کی مجادلانہ کاوشوں نے پیدا کیا ہے، قرآن حکیم کی صرف اس آیت کو سمجھ لینا کافی ہے:

﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا۝ ﴾

(۲۵/ الفرقان:۲)

''اور خدا کی سلطنت میں اس کا کوئی شریک نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا ایک اندازہ (تقدیر) لگا دیا۔''

---

[1] ترمذی، ابواب القدر، باب ماجاء من التشدید فی الخوض فی القدر:۲۱۳۳۔

ایمان کے نتائج

گزشتہ صفحوں میں ایمان کی حقیقت اور اس کی چھ شاخوں خدا، فرشتے، رسول، کتاب، یوم آخر اور قدر کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور دکھایا گیا ہے کہ ان میں سے ہر عقیدہ کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی صداقت کی دلیلیں کیا ہیں؟ اور اس کی تعلیم میں شارع علیہ السلام نے کیا مصلحتیں رکھیں ہیں اور شروع میں یہ بحث بھی کی جاچکی ہے کہ ہر مذہب میں اور خصوصاً مذہب اسلام میں ایمان کو اولین اہمیت کیوں دی گئی ہے، وہ بحثیں اصول کی تھیں یہاں خاتمہ میں نتائج کی حیثیت سے پھر اسی دعویٰ کی تکرار کی جاتی ہے یعنی یہ کہ درحقیقت ایمانیات اسی لائق ہیں کہ ان کو مذہب میں یہی اولین درجہ دیا جائے کیونکہ مذہب جن نتائج تک پہنچنا چاہتا ہے وہاں ایمان کی روشنی کے بغیر پہنچنا ممکن ہی نہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم کسی دستور پر عمل کریں یہ ضروری ہے کہ ہم اس دستور کی خوبی اور سچائی کا یقین کریں کہ اگر ایسا نہ ہو تو ہم اس پر ایمانداری کے ساتھ نہ تو عمل کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے نفس وضمیر پر اس کا اثر ہوسکتا ہے یہ حقیقت ہر دلیل سے ثابت ہے کہ ہمارے تمام اعمال، ہمارے دل کے تابع ہیں، اس لیے جب تک دل نہ بدلے گا ہمارے اعمال میں تغیر نہیں ہوسکتا یعنی ہمارے اعمال کی اصلاح تمام تر ہمارے دل کی اصلاح کے زیر اثر ہے اور ایمان کا مقصد اسی دل کی اصلاح ہے کہ اگر یہ درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو گیا۔

یہاں ایک خاص نکتہ ہے جس کو سمجھے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہیے، یہودیوں نے سب سے زیادہ اہمیت عملی رسم ورواج کو دی تھی اور عیسائیوں نے اس کے برخلاف صرف ایمان پر نجات وفلاح کا دارومدار رکھا، چنانچہ حواریوں کے خطوط وملفوظات میں اس تعلیم کو بہت کچھ نمایاں کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ عملیات نہیں بلکہ صرف ایمان نجات کا ذریعہ ہے، اسلام کی پہلی تکمیلی شان اس بارہ میں یہ ہے کہ وہ دونوں کی اصلاح کر کے ان دونوں کو جمع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نجات نہ تنہا ایمان پر اور نہ عمل پر، بلکہ ایمانِ صحیح اور عملِ صالح کی جامعیت پر موقوف ہے ﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے۔'' دوسری بات یہ ہے کہ وہ ایمان کو محض ایمان کی بنا پر اہمیت نہیں دیتا بلکہ اس لیے اہمیت دیتا ہے کہ وہ عملِ صالح کی علت وسبب ہے، یعنی وہ عمل صالح کے لیے راستہ بناتا اور تخم ریزی کے لیے زمین درست کرتا ہے۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اس لیے نخلِ ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل ہی سے ہوسکتی ہے، اب اگر ایسا کوئی شخص تم کو نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال میں اس ایمان کے مطابق کوئی بہتر تغیر نہیں آتا تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ایمان نے اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ وبار پیدا نہیں کیا، یہی سبب ہے کہ قرآنِ پاک ہر نیکی اور ہر خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصف لازم بتاتا ہے، ہر اہم موقع پر اس نے مسلمانوں کو ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اے وہ

لوگو! جو ایمان لائے۔'' کی ندا سے خطاب کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل کر سکتے ہیں جو ایمان سے متصف ہیں، بہت سے موقعوں پر ہے ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ ''اگر تم ایمان والے ہو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات ایمان والوں ہی کے لیے خاص ہے اور وہی اس کے اہل وسزاوار ہیں، فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۶۵)

''ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ محبت الٰہی ایمان کی بہت بڑی علامت ہے، ایک اور سورہ میں ہے:

﴿اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝﴾ (۲۴/ النور:۵۱)

''ایمان والوں کی بات یہ ہے کہ جب ان کو فیصلہ کرنے کے لیے اللہ اور رسول کی طرف بلایا جائے، تو کہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے مانا اور انہیں لوگوں کا بھلا ہے۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ ایمان کا ایک نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلہ کے آگے سر جھکانا ہے، دوسری آیت میں فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ (۴۹/ الحجرات:۱۰)

''ایمان والے تو آپس میں بھائی ہیں۔''

اس سے نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں میں باہمی محبت اور شفقت کا ہونا بھی ایمان کی نشانی ہے، ایک اور آیت میں ہے:

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۝﴾ (۳/ آل عمران:۱۶۰)

''اور خدا ہی پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔''

معلوم ہوا کہ خدا پر بھروسہ اور توکل اہلِ ایمان کی شان ہے اور سورۂ مومنون میں اہل ایمان کے اوصاف یہ بتائے گئے ہیں:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ۝ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ۝ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ۝ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ۝ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ۝...... وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۝ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ۝ۘ﴾

(۲۳/ المؤمنون:۱۔۵، ۸، ۹)

''بے شبہ اہل ایمان نے بھلائی پائی جو اپنی نماز میں ادب سے جھکے رہتے ہیں اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں دیتے اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں......

اور جو اپنی امانتوں اور وعدوں کی نگرانی رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔‘‘

ان آیتوں سے اہل ایمان کے ضروری اوصاف یہ معلوم ہوئے ،نماز میں خضوع وخشوع ،بے کار باتوں سے احتراز ،زکوٰۃ وخیرات دینا ،عفت و پاک دامنی ،امانت ،ایفائے عہد ،نمازوں کی پابندی ،ان آیتوں میں ایک عجیب رمز ہے دیکھو کہ اہل ایمان کے اوصاف کا آغاز بھی نماز سے کیا گیا اور انجام بھی نماز پر رکھا گیا ،اس سے اشارہ نکلا کہ نماز ایمان کی اولین وآخرین نشانی ہے اور اسی لیے ایمان کے بعد سب سے زیادہ اس پر زور دیا گیا ہے۔ ہم نے یہ چند آیتیں یہاں مثالاً نقل کی ہیں ورنہ اگر کوئی استقصا کرے تو قرآن میں ایمان کے اثرات و نتائج اور بہت سے ملیں گے، احادیث میں بھی اس مضمون کی کمی نہیں، صحیح حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ’’ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں۔‘‘ ❶ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب شعب الایمان میں مختلف حدیثوں سے ایمان کی ان ستر شاخوں کو ایک ایک کرکے گنایا ہے ،اس کتاب کا خلاصہ مختصر شعب الایمان کے نام سے چھپ بھی گیا ہے۔

ایک اور حدیث میں ایمان کی شناخت ،اخلاق کی پاکیزگی کو بتایا گیا ہے ،آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا)) ❷

’’مومنوں میں اس کا ایمان سب سے زیادہ کامل ہے ،جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔‘‘

حسن اخلاق کا اساسی مرکز محبت ہے ،یہ محبت سب سے پہلے تو اس ہستی سے ہونی چاہیے جو تمام محبتوں کا مرجع ومرکز ہے یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے بعد اسی محبت الٰہی کے ضمن اور تبعیت میں اس ہستی سے بھی محبت کرنا ضروری ہے ،جس کی ہدایت اور تعلیم کے وسیلہ سے یہ جوہر ایمانی ہم کو ہاتھ آیا ،اس محبت کے سامنے دوسری تمام دنیاوی محبتیں اور قرابت اور رشتہ داری کے علائق ہیچ ہیں ،فرمایا:

((لا يؤمن احدكم حتى اكون احب اليه من ولده ووالده والناس اجمعين)) ❸

’’تم میں سے کوئی اس وقت تک ایمان میں کامل نہیں ،جب تک کہ اس کے دل میں میری محبت ،اس کی اولاد اور والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو۔‘‘

ایمان کا تیسرا تاثر یہ ہے کہ اس کو اپنی ہم جنس برادری اور پڑوسی سے بھی اسی طرح محبت ،پیار اور اخلاص ہو جس طرح خود اپنے آپ سے ،فرمایا:

((والذى نفسى بيده لا يؤمن احدكم حتى يحب لاخيه اولجاره مايحب

---

❶ صحيح بخارى ، كتاب الايمان ، باب امور الايمان ، :٩؛ صحيح مسلم ، كتاب الايمان ، باب بيان عدد شعب الايمان:١٥٢۔ ❷ سنن ابوداود ، كتاب السنة ، باب الدليل على زيادة الايمان و نقصانه: ٤٦٨٢۔

❸ بخارى ، كتاب الايمان ، باب حب الرسول: ١٤ ، ١٥؛ مسلم ، كتاب الايمان ، باب وجوب محبة رسول الله ﷺ ...... : ١٦٩۔

لنفسہ)) ❶

''قسم ہے اس ذات کی، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں، جب تک کہ وہ اپنے بھائی یا پڑوسی (راوی کو شک ہے) کے لیے وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔''

آپ نے ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا: ''جب تک تم مومن نہ بنو گے جنت میں داخل نہ ہو سکو گے اور مومن نہ بنو گے، جب تک تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو گے تمہیں بتاؤں کہ تم میں آپس میں محبت کیونکر ہو سکتی ہے آپس میں سلام پھیلاؤ۔'' ❷

یہ محبت کسی نمائش، ریا، یا ذاتی نفع و نقصان کے لیے نہ ہو، بلکہ خدا اور صرف خدا کے لیے ہو فرمایا: ''تین باتیں جس میں ہیں اس نے ایمان کا مزہ پالیا، اول یہ کہ اس کے دل میں خدا اور رسول سے بڑھ کر کسی اور کی محبت نہ ہو، دوسری یہ کہ بندگانِ خدا سے صرف خدا کے لیے محبت کرتا ہو، تیسری یہ کہ کفر سے نجات پانے کے بعد پھر اس میں آلودہ ہونا اس کے لیے اتنا ہی تکلیف دہ ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا۔'' ❸ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! کامل اسلام کس مسلمان میں ہے؟ فرمایا: ''اس مسلمان میں جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔'' ❹ فرمایا: ''ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں جن میں سے ایک شرم و حیا ہے۔'' ❺ یہ بھی تعلیم دی کہ ''جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ زبان سے بات نکالے تو اچھی، ورنہ چپ رہے جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کو دکھ نہ پہنچائے جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ مہمان کی عزت کرے۔'' ❻ ایک صحابی آپ کے اس ارشاد کو نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے اگر کوئی برائی دیکھے تو اس کو ہاتھ سے مٹا دے یہ نہ ہو سکے تو زبان سے ٹوک دے یہ بھی نہ ہو سکے تو اپنے دل میں اس کو بُرا سمجھے اور یہ ایمان کا آخری درجہ ہے۔'' ❼

اس کے بالمقابل آپ ﷺ نے متنبہ فرمایا: ''نفاق کی چار (۴) نشانیاں ہیں جس میں ان میں سے ایک بھی پائی جائے اس میں اتنا نفاق کا عنصر موجود ہے اگر چہ وہ نماز گزار اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو اور اپنے کو وہ مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو، ایک یہ کہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو توڑ دے، امانت سپرد کی

---

❶ مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من خصال الایمان: ۱۷۰، ۱۷۱۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان انه لا یدخل الجنة......: ۱۹٤۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب من کره ان یعود......: ۲۱؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان خصال من......: ۱٦٦۔ ❹ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان تفاضل الاسلام: ۱٦۱ تا ۱٦۳۔ ❺ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان: ۱٥۲۔

❻ یہ تمام روایتیں صحیحین، کتاب الایمان میں ہیں، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الحث علی اکرام الجار: ۱۷۳۔ ❼ صحیح بخاری، کتاب الایمان، پیش نظر مسلم ہے۔باب بیان کون النهی عن المنکر: ۱۷۷۔

جائے تو خیانت کرے، غصہ آئے تو گالی بکے۔'' [1]

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ تمام نیکیاں اور ہر قسم کی بھلائیاں اور خوبیاں جس ایک جڑ کی شاخیں ہیں وہ ایمان ہے اور اسی لیے وہ مذہب کا اصل الاصول ہے وہ نہ ہو تو انسانی نیکیوں کی ساری عمارت بے بنیاد ہے لیکن اس سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ایمان کے بعد عمل کی ضرورت نہیں کہ اسلام نے اسی نکتہ کو بار بار ادا کیا ہے کہ نجات کا مدار ایمان اور عملِ صالح دونوں پر ہے، اسی لیے ﴿اٰمَنُوْا﴾ کے ساتھ ساتھ ﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ پر بھی اس نے ہمیشہ زور دیا ہے بلکہ اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ ان دونوں میں ایمان اصل اور عمل اس کی فرع ہے، ایمان ملزوم اور اعمال حسنہ اس کے خصوصیات اور لوازم ہیں، یعنی ان دونوں میں اصل وفرع اور لازم وملزوم کا تعلق ہے جو ایک دوسرے سے الگ اور جدا نہیں ہو سکتے، اس لیے جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں رہ سکتا اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے برگ و بار درخت ہے، جس کا فائدہ کے لحاظ سے عدم ووجود برابر ہے، اس بنا پر جہاں ایمان ہے، اس کے عملی نتائج وآثار کا وجود بھی ضروری ہے۔

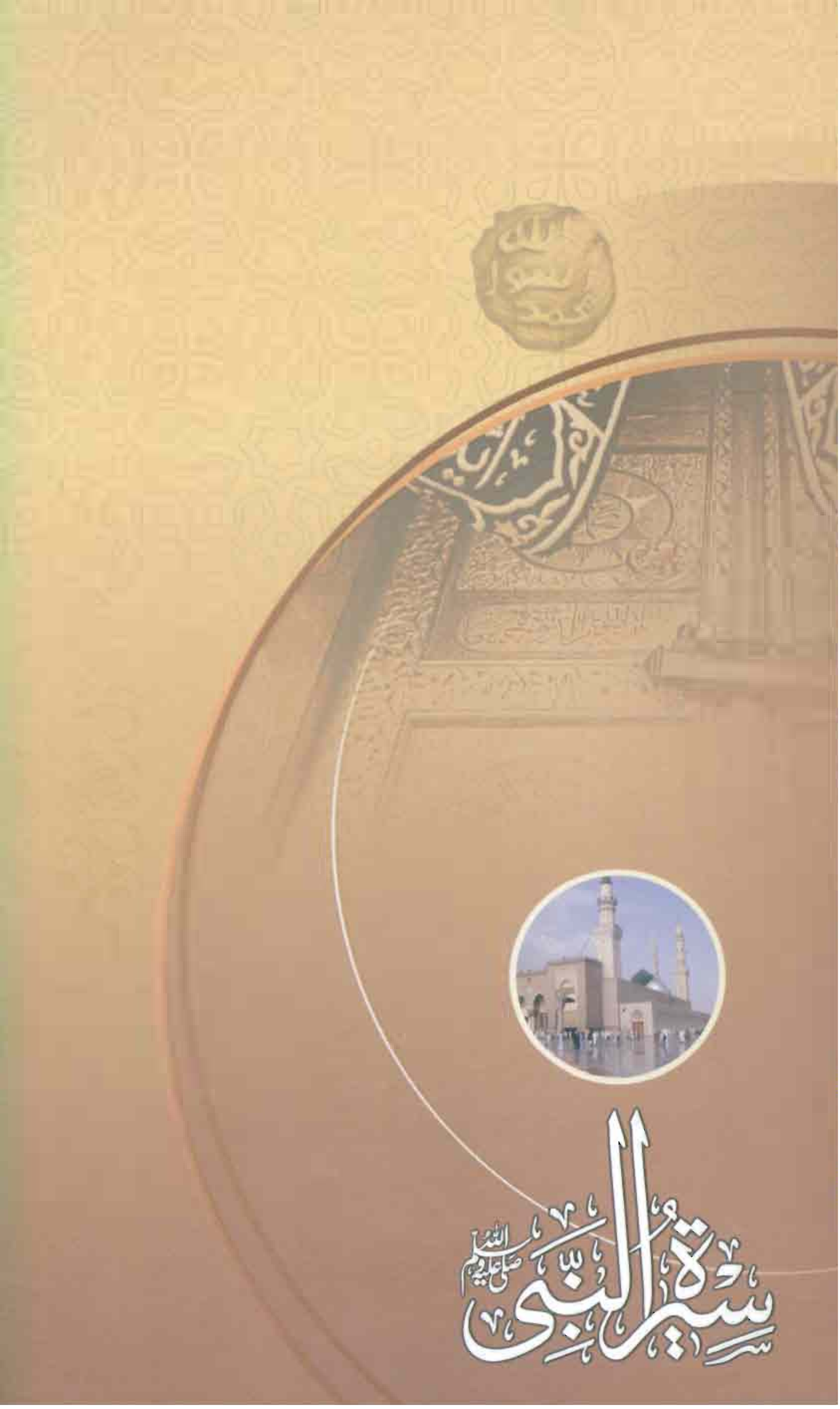
کاغذ کے پانچ سو چوراسی (584) [2] صفحے سیاہ ہو چکے ہیں، ناظرین کے ہاتھ ان اوراق کی گراں باری سے اور آنکھیں ان سطور کی کم سوادی سے تھک چکی ہوں گی، اس لیے بہتر ہے کہ رہرو قلم کے ساتھ قافلہ نظر کے دوسرے رفقا بھی کچھ دیر آرام کریں ہر چند کہ

رہ روانِ راخستگی راہ نیست ۔۔۔ عشق ہم راہ است وہم خود منزل است

سید سلیمان ندوی
دار المصنفین
رمضان ۱۳۵۰ھ

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب خصال المنافق: ۲۱۰؛ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق: ۳۴۔ [2] موجودہ ایڈیشن کے لحاظ سے۔


سیرۃ النبی
صلی اللہ علیہ وسلم

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

تخریج شدہ ایڈیشن

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب



سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

تالیف

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ اسلامیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

حصہ پنجم

تخریج شدہ ایڈیشن

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب

اس میں عبادات مثلاً نماز، اوقاتِ نماز، زکوٰۃ، حج، جہاد، تقویٰ، اخلاق، توکل، صبر اور شکر جیسے اہم امور کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔

تالیف
علامہ شبلی نعمانی
علامہ سید سلیمان ندوی

مکتبہ اسلامیہ

کتاب ---------------- سیرۃ النبی ﷺ

تالیف ---------- علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی

ناشر ---------------------- محمد سرور عاصم

اشاعت ------------------ اکتوبر 2012ء

قیمت --------------------------

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون: 37244973-042 فیکس: 37232369-042

بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد۔ پاکستان فون: 2631204, 2034256-041

E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

فہرست مضامین سیرۃ النبی ﷺ حصہ پنجم

فہرست مضامین سیرۃ النبی ﷺ حصہ ششم

فہرست مضامین سیرۃ النبی ﷺ حصہ ہفتم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع دوم

سیرۃ النبی ﷺ کی یہ پانچویں جلد رجب ۱۳۵۴ھ میں بڑی تقطیع پر چھپی تھی، اس وقت سے لوگوں کا تقاضا تھا کہ اس کی چھوٹی تقطیع بھی جلد شائع ہو، مگر نظرِ ثانی کے لیے مجھے وقت نہیں ملتا تھا، اس لیے یہ کام جلد از جلد انجام نہ پا سکا، اب جب اس سے فرصت ملی اور بعض دوستوں نے اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا، تو تین برس میں یہ کام انجام کو پہنچا، بعض فروگزاشتیں جو طبع اول میں ہوگئی تھیں، ان کی اصلاح کر دی گئی ہے پھر بھی عصمت کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری لغزشوں سے درگزر فرمائے اور میری لغزشوں کو دوسروں کی لغزشوں کا سبب نہ بنائے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

داعی

سید سلیمان ندوی

دار المصنفین، اعظم گڑھ

۲۴/ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

دیباچہ

سیرۃ النبی ﷺ کی چوتھی جلد ربیع الاول ۱۳۵۱ھ میں شائع ہوئی تھی، آج تین سال کے بعد اس کی پانچویں جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہ اپنے ایک گناہ گار بندہ سے اپنے دین کا ایک کام لے رہا ہے اور اپنے بندوں کے دلوں کو اس کے حسن قبول کے لئے کھول دیا ہے۔

موضوع

اس جلد کا موضوع عبادت ہے، اس میں عبادت کی وہ حقیقت اور اسلام میں اس کے وہ اقسام وانواع اور ان میں سے ہر ایک کی وہ مصلحت وحکمت اور اس باب میں گزشتہ مذاہب کے اسباق کی وہ تکمیل جو ذات پاک محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دنیا پر ظاہر ہوئی، ایک خطا کار قلم نے لکھی اور بیان کی ہے۔ اپنی کوشش تو یہی رہی ہے کہ قدم اس راستہ سے نہ ہٹے جو صراط مستقیم ہے اور وہ سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹے جو ہر مسلمان کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔ تاہم وہی کہتا ہوں جو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور اکابر نے (خدا ان سے راضی ہو) فرمایا کہ ''جو بات کہی گئی ہے، اگر صحیح ہے تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور غلط ہے تو نفس خطا کار کا قصور ہے۔''

ان جلدوں کا سیرت سے تعلق

ہر چند کہ اس کتاب کے ضمن میں یہ بات کئی دفعہ دہرائی گئی ہے کہ اس سلسلہ کا تعلق صرف مغازی اور سیرت کے واقعات سے نہیں، جن کو عام طور سے سیرت کہتے ہیں۔ بلکہ اسلام کے پیغام اور اسلام کے پیغام لانے والے دونوں سے یکساں ہے، صاف لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اس سلسلہ کا مقصد ان دو سوالوں کا جواب ہے، اسلام کا پیغمبر کون تھا؟ اور وہ کیا لایا تھا؟ سیرت کی شروع کی تین جلدیں پہلے سوال کا جواب تھیں اور باقی جلدیں دوسرے سوال کا جواب ہیں۔ اس سلسلہ کی ترتیب اور تکمیل میں میں نے امکان بھر اس خاکہ کی پیروی کی ہے جس کا خیال حضرۃ الاستاد علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو تھا۔ ان زبانی بیانوں اور تلقینوں کے علاوہ جو اپنی مجلس کی گفتگو میں فرمایا کرتے تھے، وہ خود اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں:

''چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مباحث سیرت میں آجائیں۔ یعنی تمام مہمات مسائل پر ریویو، قرآن مجید پر پوری نظر، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلوپیڈیا اور نام بھی دائرۃ المعارف النبویہ موزوں ہوگا۔ گو لمبا ہے اور ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا۔'' (بنام مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی صفحہ نمبر ۱۰۴)

سیرۃ جلد اوّل کے مقدمہ میں انہوں نے ان حصوں کا عنوان منصبِ نبوت رکھا تھا اور لکھا تھا:

دوسرا حصہ منصبِ نبوت کے متعلق ہے۔ نبوت کا فرض تعلیم عقائد اور امر و نواہی اصلاح اعمال اور اخلاق ہے۔ اس بنا پر منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے، اس حصہ میں فرائض خمسہ اور تمام اوامر و نواہی کی ابتدا اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ اور موازنہ ہے۔ اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں۔ نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا اور کیونکر وہ تمام عالم کے لئے کافی ہوسکتا ہے۔'' (جلد اول طبع اول صفحہ ۷۴ وطبع دوم صفحہ ۹۷)

گزشتہ چوتھی جلد یا پانچویں جلد اور آیندہ دو جلدیں درحقیقت اسی منصب نبوت کے مباحث کی تفصیل وتشریح ہیں۔ منصب نبوت، عرب کی گزشتہ حالت اور تعلیم عقائد چوتھی جلد کا موضوع تھی اور فرائض خمسہ، ان کی مصلحتیں اور حکمتیں اس جلد کا عنوان ہیں۔ اخلاق و معاشرت کے نقطوں کے لئے چھٹی جلد اور بقیہ اوامر و نواہی کے لئے جو معاملات سے متعلق ہیں ساتویں جلد ہوگی۔ ان میں سے ہر موضوع کی تفصیل وتشریح میں مصنفِ اول کے ایما کے مطابق قرآن مجید پر پوری نظر رکھی جاتی ہے، ان کی تدریجی تاریخ پیش نظر رہتی ہے۔ ان کی مصلحتوں اور حکمتوں سے پردہ اٹھایا جاتا ہے، دوسرے مذہبوں سے مناظرانہ پہلو کو بچا بچا کر مقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ہے اور ہر ایک بحث کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اسلام نے اس باب میں کیا تعلیم پیش کی ہے اور وہ کیوں کر تمام عالم کی اصلاح کے لئے کافی ہے:

؎ درپسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد '' مرا '' گفت بماں می گویم

حسن قبول

اللہ پاک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے اس سلسلہ کو حسنِ قبول کی سند عطا فرمائی:

ع قبولِ خاطر دلہا خداداد است می دانم

اس کتاب کی پہلی ہی جلد شائع ہوئی تھی کہ ایک مقدس بزرگ نے جن کے ساتھ مجھے پوری عقیدت تھی اور جن کی زبان سے استحقاق کے باوجود کبھی مدّعیانہ فقرہ نہیں نکلا، مجھ سے فرمایا: ''یہ کتاب وہاں قبول ہوگئی۔'' ان کے اس ارشاد کی تصدیق زمانہ کے واقعات سے ہوگئی۔ علاوہ اس کے کہ اس کی ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوچکے۔ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے مسلمانوں میں اس کے ساتھ خاص شیفتگی اور عقیدت پیدا ہوگئی۔ ترکی میں اس کی تین جلدوں کا ترجمہ قسطنطنیہ سے شائع ہوا۔ فارسی میں اس کی چند جلدیں کابل میں ترجمہ کی گئیں اور اب تک منتظرِ طبع ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عربی میں مکہ معظّمہ میں اس کے ترجمہ کا خیال

پیدا ہوا ہے۔

اس کی قبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کی پہلی اشاعت کے وقت سے لے کر آج تک اس زبان میں جس میں اس موضوع پر کوئی قابل توجہ کتاب نہ تھی، چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابیں نئے نئے دعووں کے ساتھ اس کو سامنے رکھ رکھ کر لوگ لکھ رہے ہیں اور سیرت کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہماری زبان میں بحمد اللہ پیدا ہو گیا ہے اور اس کی تعلیم و مطالعہ اور اشاعت کی طرف مسلمانوں کا عام رجحان ہو گیا ہے۔

امرائے اسلام کی امداد

اس کتاب کے حسن قبول کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ مصنف مرحوم نے اس کی تصنیف کا خاکہ جونہی شائع کیا اس کی خدمت کے لئے لبیک کی سب سے پہلی آواز اس محترمہ کی زبان سے نکلی، جس کا ہر تار نفس محبت رسول ﷺ کے دامن سے وابستہ تھا یعنی ملت محمدی کی خادمہ اور امت محمدی کی مخدومہ تاج الہند نواب سلطان جہاں بیگم سابق فرمانروائے کشور بھوپال (خدا ان پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے) نومبر ۱۹۱۴ء میں مصنف کی وفات پر خیال گزرا کہ شاید یہ توجہ ہمایونی باقی نہ رہے۔ مگر فرمایا کہ یہ کام اس مصنف کے لئے نہ تھا جو مر چکا۔ بلکہ اس خدا کے لئے تھا جس کو موت نہیں۔ اس لئے اپنی شاہانہ ماہوار امداد برابر جاری رکھی۔ مصنف نے سیرت کی تصنیف کے متعلق ایک قطعہ لکھا تھا:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت ۔۔۔ کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی ۔۔۔ تو اس کے واسطے حاضر میرا دل ہے میری جاں ہے
عرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل ۔۔۔ کہ جن میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

جب اس ''فقیر بے نوا'' کی وفات ہوئی تو سرکار عالیہ نے بڑے درد سے فرمایا تھا کہ ''فقیر بے نوا تو چل بسا۔ اب سلطان کی باری ہے۔'' آخر یہ سلطان بھی چل بسی اور تالیف و تنقید روایت کے ساتھ ساتھ زر افشانی کے کام کی ناتمامی کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ فردوس مکانی نے اپنا سچا جانشین یادگار چھوڑا، وہ تاج و تخت ایک ایسے جواں بخت کے سپرد کر گئیں، جس نے فرائض حکومت کی گرانباری کے ساتھ ساتھ ان کے ناتمام کارناموں کی تکمیل کا بوجھ بھی اٹھا لیا اور سیرۃ النبی ﷺ کی تالیف کی امداد میں وہی توجہ مبذول رکھی۔ سکندر صولت افتخار الملک حضور نواب حاجی حمید اللہ خان بہادر فرمانروائے بھوپال کی عمر و دولت و اقبال میں اللہ تبارک و تعالیٰ شانہ برکت عطا فرمائے کہ ان کے زیر سایہ امت و ملت کی سینکڑوں آرزوئیں پرورش پا رہی ہیں۔ خلد اللہ ملکہ

۱۹۱۸ء (۱۳۳۶ھ) میں سیرت کی پہلی جلد جب چھپ کر شائع ہوئی تو جامع نے اس کا ایک نسخہ اعلیٰ حضرت آصفجاہ سابع مظفر الملک والممالک نظام الدولہ نظام الملک سلطان دکن خلد اللہ ملکہ پیشگاہ خسروی میں

پیش کیا۔ حضور ممدوح کو اپنے مولیٰ و آقا حضرت سرور کائنات فخر موجودات سید المرسلین محبوب العٰلمین احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ علیہ الوف التحیات والصلوٰت کی ذات قدسی آیات سے والہانہ عقیدت ہے۔ سیرت کی پہلی جلد پڑھ کر بہت مسرور و محظوظ ہوئے اور دوسری جلدوں کے جلد چھپ جانے کی غرض سے دو دو برس کے لئے تین دفعہ اور تین برس کے لئے ایک دفعہ دو سو ماہوار جاری فرمائے، جن سے پچھلے برسوں میں جب ملک کی اقتصادی حالت نے ہم کو خطرہ میں پھنسا دیا تھا، بیحد مدد ملی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہِ بے نیاز میں التجا ہے کہ وہ باقی جلدوں کی جلد تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ عمر کا رہوار زندگی کی پچاس سے زیادہ منزلیں طے کر چکا جو کچھ باقی ہے دعا ہے کہ وہ بھی اسی سفر میں گزر جائے اور آخر میں خوش قسمت سعدیؔ کی طرح ہمیں بھی یہ کہنے کا موقع ملے۔

منزل تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر
ما ہم چناں در اول وصف تو ماندہ ایم

مؤلف
سید سلیمان ندوی
شبلی منزل، اعظم گڑھ
۲۳ رجب ۱۳۵٤ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عمل صالح

﴿ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ (۱۰۳/ العصر: ۳)

محمد رسول اللہ ﷺ جس تعلیم کو لے کر آئے۔اس کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی نجات دو چیزوں پر موقوف ہے۔ایک ایمان اور دوسری عمل صالح۔کتاب سیرۃ النبی ﷺ کی گزشتہ چوتھی جلد ایمان کی شرح و توضیح میں تھی۔اب یہ پیش نظر حصہ عمل صالح کی تشریح و بیان میں ہے۔ایمان بنیادی اصولوں پر یقین کامل رکھنے کا نام ہے اور عمل صالح ان اصولوں کے مطابق عمل کا، کسی بات کا تنہا علم و یقین کامیابی کے لئے کافی نہیں۔جب تک اس علم و یقین کے مطابق عمل بھی نہ ہو۔اسلام نے انسان کی نجات اور فلاح کو ان ہی دو چیزوں یعنی ایمان و عمل صالح پر مبنی قرار دیا ہے۔لیکن افسوس ہے کہ عوام میں ایمان کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ عمل صالح کو نہیں۔حالانکہ یہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت سے عملاً یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ ایمان بنیاد ہے اور عمل صالح اس پر قائم شدہ دیوار یا ستون جس طرح کوئی عمارت بنیاد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح وہ دیوار یا ستون کے بغیر کھڑی بھی نہیں ہو سکتی۔

ان دونوں کی بہترین مثال اقلیدس کے اصول اور اشکال کی ہے۔ایمان کی حیثیت اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کی ہے جن کو صحیح مانے بغیر اقلیدس کی شکلوں کا اصول محال ہے۔لیکن اگر صرف اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کو تسلیم کر لیا جائے اور ان کے مطابق شکلوں کا عمل نہ کیا جائے تو فن تعمیر و ہندسہ اور مساحت و پیمائش میں اقلیدس کا فن ایک ذرہ کار آمد نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے انسان کو وہ فائدے حاصل ہو سکتے ہیں جو اس فن سے اصل مقصود ہیں۔عوام کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اس بارہ میں قرآن پاک کی تعلیم کو تفصیلاً پیش کیا جائے۔قرآن پاک نے انسان کی فلاح و کامیابی کے ذریعہ کو بیسیوں آیتوں میں بیان کیا ہے۔مگر ہر جگہ بلا استثنا ایمان اور عمل صالح دونوں پر اس کو مبنی قرار دیا ہے اور ہر جگہ ایمان کو پہلی اور عمل صالح کو دوسری مگر ضروری حیثیت دی ہے۔فرمایا:

﴿ وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾

(۱۰۳/ العصر: ۳)

”زمانہ (مع اپنی پوری انسانی تاریخ کے) گواہ ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے۔لیکن وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے۔“

زمانہ کی پوری انسانی تاریخ اس حقیقت پر شاہد عدل ہے کہ انہیں افراد اور قوموں پر فوز و فلاح اور

کامیابی کے دروازے کھلے ہیں۔جنہیں ربانی حقائق کا یقین تھا اور اس یقین کے مطابق ان کے عمل بھی نیک ہوتے رہے۔ایک دوسری آیت میں فرمایا:

﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ ﴾. (۹۵/التین :٤_٦)

''بے شک ہم نے انسان کو بہترین حالت درستی میں پیدا کیا۔پھر اس کو سب سے نیچوں کے نیچے لوٹا دیا۔لیکن جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ان کے لئے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے۔''

اس آیت میں انسانی فطرت کی بہترین صلاحیت کو پھر خود انسانوں کے ہاتھوں سے اس کی بدترین منزل تک پہنچ جانے کو بیان کیا گیا ہے۔لیکن اس بدترین منزل کی پستی سے کون لوگ بچائے جاتے ہیں۔وہ جن میں ایمان کی رفعت اور عمل صالح کی بلندی ہے۔یہود سے جن کو یہ دعویٰ تھا کہ بہشت انہیں کے ٹھیکہ میں ہے، یہ فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۲)

''اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے وہی جنت والے ہیں۔''

یعنی جنت کا حصول نسل اور قومیت پر موقوف نہیں۔بلکہ ایمان اور عمل صالح پر ہے۔جو شخص جنت کی یہ قیمت ادا کرے گا وہ اسی کی ملکیت ہے فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ﴾ (۵۵/ المآئدۃ:٦٩)

''بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہود ہیں اور صابئین اور نصاریٰ جو کوئی اللہ پر اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے نہ تو ان پر ڈر ہے، نہ وہ غم کھائیں گے۔''

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ فلاح ونجات کا حصول کسی نسل وقومیت پر موقوف نہیں اور نہ کسی مذہب و ملت کی طرف رسمی نسبت پر ہے بلکہ احکام الٰہی پر یقین لانے اور ان کے مطابق عمل کرنے پر ہے۔عدمِ ایمان اور بدکاری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی تباہی اور ایمان اور نیکوکاری کا نتیجہ دین ودنیا کی بہتری، اللہ تعالیٰ کا وہ طبعی قانون ہے جس میں نہ کبھی بال برابر فرق ہوا اور نہ ہوگا۔چنانچہ ذوالقرنین کی زبانی یہ فرمایا:

﴿ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ اِۨلْحُسْنٰى ﴾ (۱۸/ الکہف:۸۷_۸۸)

''اس نے کہا جو کوئی گناہ کا کام کرے گا تو ہم اس کو (دنیا میں) سزا دیں گے پھر وہ اپنے رب

کے پاس لوٹا کر جائے گا تو اس کو بری طرح سزا دے گا اور جو کوئی ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو اس کے لیے بھلائی کا بدلہ ہے۔''

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ۝ ﴾ .

(۲۱/ الانبیآء:۹٤)

''تو جو کوئی نیک عمل کرے اور وہ مومن بھی ہو تو اس کی کوشش اکارت نہ ہوگی اور ہم اس کے (نیک عمل) کو لکھتے جاتے ہیں۔''

﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۝ ﴾ .

(۱۹/ مریم:۵۹۔۶۰)

''تو ان کے بعد ان کے ایسے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو برباد کیا اور نفسانی خواہشوں کی پیروی کی تو وہ گمراہی سے ملیں گے۔ لیکن جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کا ذرا سا حق بھی مارا نہ جائے گا۔''

اس سے اور اسی قسم کی دوسری آیتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ جنت کا استحقاق دراصل انہی کو ہے جو ایمان اور پھر ایمان کے مطابق عمل سے بھی آراستہ ہیں اور جو عمل سے محروم ہیں، وہ اس استحقاق سے بھی محروم ہیں۔ الا یہ کہ اللہ تعالیٰ بخشش فرمائے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ۝ ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ ﴾

(٤۲/ الشوریٰ:۲۲۔۲۳)

''اور جو ایمان لائے اور نیک کام کیے وہ جنت کے باغوں میں ہوں گے، ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں۔ یہی بڑی مہربانی ہے یہی وہ ہے جس کی خوشخبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝ ﴾

(۱۸/ الکهف:۱۰۷)

''بے شک جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کی مہمانی کے لیے باغ فردوس ہیں۔''

پھر آگے چل کر فرمایا:

﴿ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴾

(۱۸/ الکھف: ۱۱۰)

''تو جس کو اپنے پروردگار سے ملنے کی امید ہو تو چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے اور کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ بنائے۔''

ایمان کے ہوتے عمل سے محرومی تو محض فرض ہے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں عمل کی کمی ہے، اسی کے بقدر ایمان میں بھی کمزوری ہے، کسی چیز پر پورا پورا یقین آ جانے کے بعد اس کے برخلاف عمل کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ آگ کو جلانے والی آگ یقین کر لینے کے بعد پھر کون اس میں اپنے ہاتھ کو ڈالنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ لیکن نادان بچہ جو ابھی آگ کو جلانے والی آگ نہیں جانتا وہ بارہا اس میں ہاتھ ڈالنے کو آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے عمل کا قصور ہمارے یقین کی کمزوری کا راز فاش کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ تنہا ایمان یا تنہا عمل کو نہیں، بلکہ ہر جگہ دونوں کو ملا کر نجات کا ذریعہ بتایا ہے:

﴿ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴾ (۲۲/الحج: ۵٦)

''تو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے وہ آرام کے باغوں میں ہوں گے۔''

اسی طرح قرآن پاک میں تھوڑے تھوڑے تغیر سے ۴۵ موقعوں پر یہ آیت ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾

''جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے۔''

اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایمان اور عمل باہم ایسے لازم و ملزوم ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے اور نجات اور فوز و فلاح کا مدار ان دونوں پر یکساں ہے۔ البتہ اس قدر فرق ہے کہ رتبہ میں پہلے کو دوسرے پر تقدم حاصل ہے۔ جن مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے دنیاوی حکومت و سلطنت کا وعدہ فرمایا ہے وہ بھی وہی ہیں، جن میں ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ ﴾

(۲۴/النور: ۵۵)

''تم میں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے خدا نے وعدہ کیا کہ ان کو زمین کا مالک بنائے گا۔''

آخرت کی مغفرت اور روزی کا وعدہ بھی انہیں سے تھا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴾

(۴۸/ الفتح: ۲۹)

''اللہ نے ان میں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے بخشائش اور بڑی روزی کا وعدہ کیا۔''

بعض آیتوں میں ایمان کے بجائے اسلام یعنی اطاعت مندی اور عمل صالح کی جگہ احسان یعنی نیکو کاری کو جگہ دی گئی ہے مثلاً: ایک آیت میں یہود ونصاریٰ کے اس دعویٰ کی تردید میں کہ بہشت میں صرف وہی جائیں گے، فرمایا:

﴿ بَلٰی ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۱۲)

''کیوں نہیں جس نے اپنے آپ کو اللہ کے تابع کیا اور وہ نیکو کار ہے تو اس کی مزدوری اس کے پروردگار کے پاس ہے۔ نہ ڈر ہے ان کو اور نہ غم۔''

ان تمام آیتوں سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے کہ نجات کا مدار صرف ایمان پر نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح پر ہے اور یہی وہ سب سے بڑی صداقت ہے، جس سے اسلام سے پیشتر مذاہب میں افراط اور تفریط نمایاں تھی۔ عیسائیوں میں جیسا کہ پال کے خطوط [1] میں ہی صرف ایمان پر نجات کا مدار ہے اور بودھ دھرم میں صرف نیکو کاری سے نروان کا درجہ ملتا ہے اور کہیں صرف گیان اور دھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے۔ مگر پیغمبر اسلام ﷺ کے پیغام نے انسان کی نجات کا ذریعہ ذہنی (ایمان) اور جسمانی (عمل صالح) دونوں اعمال کو ملا کر قرار دیا ہے۔ یعنی پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہو اس کو ایمان کہتے ہیں۔ پھر یہ کہ ان اصولوں کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو، یہ عمل صالح ہے اور ہر قسم کی کامیابیوں کا مدار انہی دو باتوں پر ہے۔ کوئی مریض صرف کسی اصول طبّی کو صحیح ماننے سے بیماریوں سے نجات نہیں پا سکتا، جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے۔ اسی طرح صرف اصول ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز وفلاح کے لیے کافی نہیں۔ جب تک ان اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۱۔۱۰)

''وہ ایمان والے مراد کو پہنچے جو نماز میں عاجزی کرتے ہیں، جو نکمی باتوں کی طرف رخ نہیں کرتے، جو زکوۃ دیتے ہیں، جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں، یہی بہشت کے وارث ہیں۔''

[1] رومیوں کے نام ۳:۲۸ الکتاب المقدس کتاب العہد الجدید، ص: ۳۴۹، ۳۵۰۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ہمارے مادی علل واسباب کے تابع فرمایا ہے۔ یہاں کی کامیابی اور فوز وفلاح بھی صرف ذہنی عقیدہ اور ایمان سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ جب تک اس عقیدہ کے مطابق عمل بھی نہ کیا جائے۔صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری بھوک کا قطعی علاج ہے۔ ہماری بھوک دفع نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس کے لیے ہم کو جدوجہد کر کے روٹی حاصل کرنا اور اس کو چبا کر اپنے پیٹ میں نگلنا بھی پڑے گا۔اس عقیدہ سے کہ ہم کو ہماری ٹانگیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ نہیں سکتے۔ جب تک اس یقین کے ساتھ ہم اپنی ٹانگوں کو بھی خاص طور سے حرکت نہ دیں۔یہی صورت ہمارے دوسرے دنیاوی اعمال کی ہے۔اسی طرح اس دنیا میں عمل کے بغیر تنہا ایمان کامیابی کے حصول کے لیے بیکار ہے۔البتہ اس قدر صحیح ہے کہ جو ان اصولوں کو صرف صحیح باور کرتا ہے وہ اس سے بہرحال بہتر ہے۔ جو ان کو سرے سے نہیں مانتا کیوں کہ اول الذکر کے کبھی نہ کبھی راہ راست پر آ جانے اور نیک عمل بن جانے کی امید ہوسکتی ہے اور دوسرے کے لیے تو اوّل پہلی ہی منزل باقی ہے۔اس لیے آخرت میں بھی وہ منکر کے مقابلہ میں شاید اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا زیادہ مستحق قرار پائے کہ کم از کم وہ اس کے فرمان کو صحیح باور تو کرتا تھا۔

اعمالِ صالحہ کی قسمیں

''عمل صالح'' کا مفہوم بہت وسیع ہے،اس کے اندر انسانی اعمالِ خیر کے تمام جزئیات داخل ہیں، تاہم ان کی جلی تقسیمات حسب ذیل ہیں۔عبادات اخلاق، معاملات۔ اسلام میں لفظ عبادت کو بڑی وسعت حاصل ہے۔اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہے، جس کی غرض خدا کی خوشنودی ہو۔اس لیے اخلاق ومعاملات بھی اگر اس خوش نیتی کے ساتھ کیے جائیں تو وہ عبادات میں داخل ہیں۔مگر فقہا نے اصطلاحًا یہ تین الگ الگ اور مستقل ابواب قرار دیے ہیں۔جن کی تفصیل یوں کی جاسکتی ہے کہ اولاً اعمالِ صالحہ کی دو قسمیں ہیں۔ایک وہ جس کا تعلق خاص خدا سے ہے،اس کو عبادت کہتے ہیں۔ دوسری وہ جس کا تعلق بندوں سے ہے،اس کی بھی دو قسمیں ہیں،ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسانی فرض کی ہوتی ہے اور دوسری وہ جس میں قانونی ذمہ داری کی حیثیت ملحوظ ہوتی ہے۔ پہلے کا نام اخلاق اور دوسرے کا معاملات ہے۔

اعمال صالحہ کی انہیں تینوں قسموں کی تفصیل وتشریح سیرۃ النبی ﷺ کی موجودہ اور آیندہ جلدوں کا موضوع ہے۔

عبادات

﴿ يَآأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱)

عبادت کے معنی عام طور سے وہ چند مخصوص اعمال سمجھے جاتے ہیں، جن کو انسان خدا کی عظمت اور کبریائی کی بارگاہ میں بجالاتا ہے۔لیکن یہ عبادات کا نہایت تنگ مفہوم ہے۔اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے انسانوں پر جو حقیقت ظاہر فرمائی۔اس کا اصل جوہر یہ نہیں ہے کہ گزشتہ مذاہب کی عبادت کے طریقوں کے بجائے اسلام میں عبادت کے دوسرے طریقے مقرر ہوئے۔بلکہ یہ ہے کہ انسانوں کو یہ بتایا گیا کہ عبادت کی حقیقت اور غایت کیا ہے۔ساتھ ہی عبادات کے گزشتہ ناقص طریقوں کی تکمیل،مبہم بیانات کی تشریح اور مجمل تعلیمات کی تفصیل کی گئی۔اہل عرب جہاں آسمانی مذہب کی دوسری حقیقتوں سے بے خبر تھے۔وہاں عبادت کے مفہوم و معنی اور اس کے صحیح طریقوں سے بھی ناواقف تھے۔عرب میں جو یہود اور عیسائی تھے،وہ بھی اس کے متعلق اپنے عمل اور تعلیم سے کوئی واضح حقیقت ان کے سامنے پیش نہ کر سکے تھے۔اس عہد میں جو عیسائی فرقے عرب میں تھے۔عقائد میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کو تسلیم کرتے تھے اور عبادات میں یہ تھا کہ تمام دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر کے عرب کے سنسان بیابانوں اور پہاڑوں میں انہوں نے اپنی عبادت گاہیں اور خانقاہیں بنالی تھیں اور ان میں بیٹھ کر تمام دنیا کی جدوجہد اور سعی و کوشش کے میدانوں سے ہٹ کر مجرد اور متقشفانہ زندگی بسر کرتے تھے۔اسی لیے عربوں کی شاعری میں عیسائیت کا تخیل ایک ''راہب متبتل'' کی صورت میں تھا۔عرب کا سب سے بڑا شاعر امراء القیس کہتا ہے:

ع منارة ممسى راهبٍ متبتل ❶ ''دنیا سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنے والے راہب کے نام کا چراغ۔''

عرب میں یہود اپنی اخلاقی اور مذہبی بدعملیوں کے سبب سے سخت بدنام تھے۔ان میں روحانی خلوص و ایثار اور خدا پرستی نام کو نہ تھی۔وہ صرف سبت (سنیچر) کے دن تورات کے حکم کے مطابق تعطیل منانا اور اس دن کوئی کام نہ کرنا بڑی عبادت سمجھتے تھے۔قرآن پاک نے ان دونوں فرقوں کی اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔یہودیوں پر اس نے بے حکمی،نافرمانی،اکل حرام اور طاغوت کی پرستش کا اور عیسائیوں پر غلو فی الدین کا صحیح الزام قائم کیا ہے۔ ❷ یہودی جادو ٹوٹکا اور عملیات کے توہمات میں گرفتار تھے اور جب کبھی موقع ملتا غیر قوموں کے بتوں کے سامنے بھی سر جھکا لیتے تھے۔عیسائی حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مسیحی اولیا اور شہیدوں کی تصویروں،مجسموں،یادگاروں اور مقبروں کو پوجتے تھے۔انہوں نے راہبانہ عبادت کے نئے

❶ دیوان امرء القیس، ص:۱۷ دار المعارف القاهرة۔ ❷ دیکھو۵/ المائدۃ:۶۲۔۷۷، اور ۵۷/ الحدید:۱۶۔۲۷۔

نئے اور جسم کو سخت تکلیف اور آزار پہنچانے والے طریقے ایجاد کیے تھے اور ان کا نام انہوں نے دینداری رکھا تھا۔ سورۂ حدید میں قرآن پاک نے یہود اور نصاریٰ دونوں کو فاسق کہا ہے، لیکن ان دونوں کے فسق میں نہایت نازک فرق ہے۔ یہود کا فسق دین میں کمی اور سستی کرنا اور نصاریٰ کا فسق دین میں زیادتی اور غلو کرنا تھا اور خدا کے مشروع دین میں کمی اور زیادتی دونوں گناہ ہیں۔ اسی لیے قرآن نے دونوں کو برابر کا فسق قرار دیا:

﴿ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ فَمِنْهُمْ مُهْتَدٍ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ۝ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ۝ ﴾ (۵۷/ الحدید:۲۶-۲۷)

''اور ہم نے نوح اور ابراہیم علیہما السلام کو بھیجا اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھی تو ان میں سے کچھ راہ پر ہیں اور اکثر نافرمان ہیں۔ پھر ان کے بعد ان کے پیچھے ہم نے اپنے اور پیغمبر بھیجے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا اور ان کو انجیل عنایت فرمائی اور جنہوں نے عیسیٰ کی پیروی کی ان کے دل میں نرمی اور رحم دلی بنائی اور ایک رہبانیت انہوں نے نئی چیز نکالی جو ہم نے ان پر نہیں لکھی تھی۔ لیکن خدا کی خوشنودی حاصل کرنا تو انہوں نے اس رہبانیت کو بھی جیسا بنانا چاہیے تھا نہیں بنایا۔ تو ان میں جو ایماندار تھے ان کو ہم نے ان کی مزدوری دی اور ان میں بہت سے نافرمان ہیں۔''

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ عیسائی دین میں اضافہ اور افراط کے مرتکب ہوئے۔ اسی لیے قرآن نے ان کو بار بار کہا:

﴿ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ ﴾ (۴/ النسآء:۱۷۱ و ۵/ المآئدۃ:۷۷)

''اپنے دین میں غلو نہ کرو۔''

ان کا سب سے بڑا غلو یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جن کو صرف رسول اللہ ماننے کا حکم دیا گیا تھا۔ وہ ابن اللہ ماننے لگے اور یہود کا یہ حال تھا کہ وہ خدا کے رسولوں کو رسول بھی ماننا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ ان کو قتل کرتے تھے ﴿ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ ﴾ (۲/ بقرۃ:۶۱، ۳/ آل عمران:۲۱) ساتھ ہی وہ خدائے برحق کو چھوڑ کر بت پرست ہمسایہ قوموں کے بتوں کو پوجنے لگے تھے۔ چنانچہ تورات میں یہودیوں کی بت پرستی اور غیر خداؤں کے آگے سر جھکانے کا بار بار تذکرہ ہے اور قرآن میں ان کے متعلق ہے:

﴿ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۶۰)

"اور جنھوں نے شیطان کو (یا بتوں کو) پوجا۔"

آنحضرت ﷺ نے عیسائیوں کو تبلیغ کی:

﴿ مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۖ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ۗ انظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ۞ قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۚ وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۞ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِن قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ ۞ ﴾. (۵/ المآئدۃ: ۷۵_۷۷)

"مریم کا بیٹا مسیح ایک پیغمبر ہے اور بس اس سے پہلے اور پیغمبر گزر چکے اور اس کی ماں ولی تھی دونوں (انسان تھے) کھانا کھاتے تھے (خدا نہ تھے) دیکھ ہم ان (عیسائیوں) کے لیے اس طرح کھول کر دلیلیں بیان کرتے ہیں، پھر بھی دیکھ وہ کدھر الٹے جاتے ہیں۔ (ان سے) کہہ کہ کیا تم خدا کو چھوڑ کر ان (انسانوں) کو پوجتے ہو جن کے ہاتھ میں نہ نقصان ہے نہ نفع، اللہ ہی سننے والا اور جاننے والا ہے جو نفع نقصان پہنچا سکتا ہے۔ کہ اے کتاب والو! اپنے دین میں ناحق زیادتی نہ کرو اور ان لوگوں کے خیال پر نہ چلو جو بہک گئے اور بہتوں کو بہکایا اور سیدھے راستہ سے بھٹک گئے۔"

ان کی حالت یہ تھی:

﴿ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ﴾. (۹/التوبۃ: ۳۱)

"خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا بنالیا تھا۔"

اس زمانہ میں عیسائیوں کے جو گرجے اور پرستش گاہیں عرب میں اور خصوصاً ملک حبش میں تھیں، ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام اور حواریوں، ولیوں اور شہیدوں کی تصویریں اور مجسمے نصب تھے۔ عبادت گزار ان کے آگے دھیان اور مراقبہ میں سربسجود رہتے تھے۔ صحابہ میں سے جن لوگوں کو حبشہ کی ہجرت کے اثنا میں ان معبدوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان میں سے شاید بعض بیبیوں کی نگاہ میں ان بزرگوں کی تعظیم و تکریم کی یہ مناسب صورت معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے مرض الموت میں بعض ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا اور ان کی تصویروں اور مجسموں کے حسن و خوبی کو بیان کیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت بھیجے، انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا۔ تم ایسا نہ کرنا ان میں سے جب کوئی نیک آدمی مرجاتا تھا تو وہ اس کی قبر کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے اور اس میں اس کی تصویریں کھڑی کر دیتے تھے۔" [1]

[1] صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النهي عن بناء المساجد على القبور: ۱۱۸۱ تا ۱۱۸۸۔

ایڈورڈ گبن نے تاریخِ ترقی و زوال روم کی متعدد جلدوں کے خاص ابواب میں عیسوی مذہب کے عبادات کے جو حالات بیان کیے ہیں، وہ تمام تر حدیث مذکور کی تصدیق و تائید میں ہیں۔ خصوصاً تیسری اور پانچویں جلد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت مریم علیہا السلام، سینٹ پال اور متعدد ولیوں اور شہیدوں کی پرستش کی جو کیفیت درج ہے، وہ بالکل اس کے مطابق ہے اور آج تک رومن کیتھولک اور قدیم مسیحی فرقوں کی پرستش گاہوں کے درو دیوار سے قرآن پاک کی صداقت کی آوازیں آ رہی ہیں اور آج بھی دین دار عیسائی دن رات موم بتیوں کی روشنی میں ان کے آگے مراقبوں اور تسبیحوں میں سرنگوں نظر آتے ہیں۔ روم (اٹلی) کے تاریخی گرجاؤں میں یہ منظر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس وقت محمد رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کی اصلی تشریح میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو چھوڑ کر خاص عرب کے لوگ اللہ نام ایک ہستی سے واقف ضرور تھے۔ مگر اس کی عبادت اور پرستش کے مفہوم سے بے خبر تھے۔ لات، عزیٰ، ہبل اور اپنے اپنے قبیلہ کے جن بتوں کو حاجت روا اور پرستش کے قابل سمجھتے تھے۔ ان پر جانور کی قربانی کرتے اور اپنی اولادوں کو بھینٹ چڑھاتے تھے۔ سال کے مختلف اوقات میں مختلف بت خانوں کے میلوں میں شریک ہوتے تھے اور پتھروں کے ڈھیروں کے سامنے بعض مشرکانہ رسوم ادا کرتے تھے۔ خانہ کعبہ یعنی خلیل علیہ السلام بت شکن کا معبد تین سو ساٹھ بتوں کا مرکز تھا اور ان کی نماز یہ تھی کہ خانہ کعبہ کے صحن میں جمع ہو کر سیٹی اور تالی بجا بجا کر بتوں کو خوش اور راضی رکھیں۔ قریش کا موحد زید بن عمرو جو آنحضرت ﷺ کی نبوت سے پہلے بت پرستی سے تائب ہو چکا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ''اے خدا مجھے نہیں معلوم کہ میں تجھ کو کس طرح پوجوں اگر جانتا تو اسی طرح عبادت کرتا۔'' [1]

ایک صحابی شاعر عامر بن اکوع خیبر کے سفر میں ترانہ گا رہے تھے اور آنحضرت ﷺ سن رہے تھے: [2]

والله لو لا انت ما اهتدينا   ولا تصدقنا و لا صلينا

''خدا کی قسم! اگر تو نہ ہوتا تو نہ ہم راستہ پاتے   نہ خیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے۔''

اس شعر میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی تعلیم تھی، جس نے اہل عرب کو عبادت کے صحیح طریقوں سے آشنا کیا۔

عرب سے باہر بھی کہیں خدائے واحد کی پرستش نہ تھی۔ بت پرست یونانی اپنے بادشاہوں اور ہیروؤں کے مجسمے اور ستاروں کے ہیکل پوجتے تھے۔ روم، ایشیائے کوچک، یورپ، افریقہ، مصر، بربر، حبشہ وغیرہ عیسائی ملکوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام اور سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی مورتیاں اور ہڈیاں اور ان کی مصنوعی یادگاریں پوجی جا رہی تھیں۔ زردشت کی مملکت میں آگ کی پرستش جاری تھی۔ ہندوستان سے لے کر کابل و ترکستان اور چین اور جزائر ہند تک بودھ کی مورتوں، سادھوں اور اس کی جلی ہوئی ہڈیوں کی راکھ کی پوجا

[1] سيرة ابن هشام ذكر ورقة وزيد بن عمر، ج١، ص:١٤٤۔

[2] صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب غزوة خيبر: ٤٦٦٩ شعر کا پہلا لفظ مختلف روایتوں میں مختلف ہے۔

ہو رہی تھی۔ چین کے کنفوش اپنے باپ دادوں کی مورتوں کے آگے خم تھے۔ خاص ہندوستان میں سورج دیوتا گنگا مائی اور اوتاروں کی پوجا ہو رہی تھی۔ عراق کے صابی سبع سیارہ کی پرستش کی تاریکی میں مبتلا تھے۔ باقی تمام دنیا درختوں، پتھروں، جانوروں، بھوتوں اور دیوتاؤں کی پرستش کر رہی تھی۔ غرض عین اس وقت جب تمام دنیا خدائے واحد کو چھوڑ کر آسمان سے زمین تک کی مخلوقات کی پرستش میں مصروف تھی۔ ایک بے آب و گیاہ ملک کے ایک گوشہ سے آواز آئی:

﴿ يَآأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ (۲/ البقرة:۲۱)

''لوگو! اپنے اس پروردگار کی پرستش کرو، جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا۔''

سابق کتب الٰہی کے ایمان داروں کو آواز دی گئی:

﴿ يَآأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ ﴾.

(۳/ آل عمران:٦٤)

''اے کتاب والو! آؤ ہم تم اس بات پر عملاً متحد ہو جائیں، جس میں ہم تم عقیدۃً متفق ہیں کہ ہم خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کریں۔''

مگر یہ آواز ریگستان عرب کے صرف چند حق پرستوں نے سنی اور پکار اٹھے:

﴿ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا ﴾

(۳/ آل عمران:۱۹۳)

''خداوندا! ہم نے ایمان کی منادی کی آواز سنی کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لے آئے تو اے پروردگار ہمارے گناہ معاف کر۔''

ان واقعات کو سامنے رکھ کر آنحضرت ﷺ کی اس دعا کی صداقت کا اندازہ کرو جو بدر کے امتحان گاہ میں آپ کی زبان عبودیت ترجمان سے بارگاہ الٰہی میں کی گئی تھی:

''یا الٰہی! تیرے پوجنے والوں کی یہ مٹھی بھر جماعت آج تیرے لیے لڑنے پر آمادہ ہے۔ الٰہی! آج اگر یہ مٹ گئی تو پھر زمین میں تیری کبھی پرستش نہ ہوگی۔'' [1]

خدا نے اپنے نبی ﷺ کی دعا سنی اور قبول فرمائی کیوں کہ خاتم الانبیاء کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ تھا۔ جو غافل دنیا کو خدا کی یاد دلاتا اور خدا کی سچی اور مخلصانہ عبادت کی تعلیم دیتا۔

صرف ایک خدا کی عبادت

مذہب کی تکمیل اور اصلاح کے سلسلہ میں نبوتِ محمدی ﷺ کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کے

[1] صحيح مسلم، كتاب الجهاد، باب الامداد بالملائكة في غزوة بدر:٤٥٨٨؛ جامع ترمذي، كتاب التفسير، ومن سورة الانفال:٣٠٨١؛ مسند أحمد، ج١، ص:٣٠، ٣٢، ١١٧۔

معبدوں سے تمام باطل معبودوں کو باہر نکال کر پھینک دیا۔ باطل معبودوں کی عبادت اور پرستش یک قلم محو کر دی اور صرف اس ایک خدا کے سامنے خدا کی تمام مخلوقات کی گردنیں جھکا دیں اور صاف اعلان کر دیا کہ

﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝ ﴾ (۱۹/ مریم:۹۳)

''آسمان وزمین کی تمام مخلوق اس مہربان خدا کے سامنے غلام ہی بن کر آنے والی ہے۔''

خدا کے سوا نہ تو آسمان میں نہ زمین میں نہ آسمان کے اوپر اور نہ زمین کے نیچے کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے سجدہ اور رکوع وقیام کی مستحق ہے اور نہ ہی اس کے سوا کسی اور کے نام پر کسی جاندار کا خون بہایا جا سکتا ہے اور نہ اس کی پرستش کے لیے گھر کی کوئی دیوار اٹھائی جا سکتی ہے اور نہ اس کی نذر مانی جا سکتی ہے اور نہ اس سے دعا مانگی جا سکتی ہے۔ ہر عبادت صرف اسی کے لیے اور ہر پرستش صرف اسی کی خاطر ہے:

﴿ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (٦/ الانعام:١٦٢)

''بے شبہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اسی ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لیے ہے۔''

کفار کو بتوں، دیوتاؤں، ستاروں اور دوسری مخلوقات کی پرستش سے ہر طرح منع کیا گیا اور انہیں ہر دلیل سے سمجھایا گیا کہ خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہیں، لیکن جب ان پر اس سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا تو اسلام کے پیغمبر کو اس انقطاع کے اعلان کا حکم ہوا:

﴿ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝ ﴾ (۱۰۹/ الکفرون)

''اے کافرو! جس کو تم پوجتے ہو اس کو میں نہیں پوجتا اور نہ تم اس کو پوجنے والے ہو، جس کو میں پوجتا ہوں اور نہ میں اسکو پوجنے والا ہوں، جس کو تم نے پوجا اور نہ تم اس کو پوجنے والے ہو، جس کو میں پوجتا ہوں، تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے۔''

خارجی رسوم کا وجود نہیں

خدا کی عبادت اور پرستش کے وقت جسم وجان سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ نہ سورج کے نکلنے اور اس کی طرف دیکھنے کی حاجت، نہ دریا میں جا کر اس کا پانی اچھالنے سے مطلب ❶ نہ سامنے آگ کا الاؤ جلانے کی ضرورت ❷ نہ دیوتاؤں، دیبیوں، بزرگوں اور ولیوں کے مجسموں کو پیش نظر رکھنے کی اجازت ❸ نہ سامنے موم بتیوں کے روشن کرنے کا حکم ❹ نہ گھنٹوں اور ناقوسوں کی ضرورت نہ لوبان اور دوسرے بخورات جلانے کی رسم، نہ سونے چاندی کے خاص خاص ظروف اور برتنوں کے رکھنے کا طریقہ، نہ کسی خاص قسم کے

❶ جیسا کہ ہندوؤں میں ہے۔ ❷ جیسا کہ پارسیوں میں ہے۔

❸ جیسا کہ ہندوؤں، عام بت پرستوں اور رومن کیتھولک میں ہے۔

❹ جیسا کہ رومن کیتھولک عیسائیوں میں ہے۔

کپڑوں کی قید [1] ان تمام بیرونی رسوم اور قیود سے اسلام کی عبادت پاک اور آزاد ہے۔ اس کے لیے صرف ایک پاک ستر پوش لباس، پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہے، اگر جسم ولباس کی پاکی سے کبھی مجبوری ہو جائے تو یہ بھی معاف ہے۔

درمیانی، آدمی کی ضرورت نہیں

اسلام میں عبادت کے لیے خدا اور بندہ کے درمیان کسی خاص خاندان اور کسی خاص شخصیت کی وساطت اور درمیانگی کی حاجت نہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے دین میں ہندوؤں کی طرح نہ برہمن ہیں، نہ پروہت ہیں، نہ پجاری ہیں۔ نہ یہودیوں کی طرح کاہن ہیں نہ ربی ہیں۔ نہ حاخام ہیں نہ حضرت ہارون علیہ السلام کے خاندان کی وساطت کی قید ہے، نہ عیسائیوں کی طرح عبادتوں کی بجا آوری کے لیے پادریوں اور مختلف مذہبی عہدہ داروں کی ضرورت ہے اور نہ پارسیوں کی طرح دستوروں اور موبدوں کی حاجت۔ یہاں ہر بندہ اپنے خدا سے آپ مخاطب ہوتا ہے، آپ باتیں کرتا ہے، آپ عرض حال کرتا ہے، ہر مسلمان اپنا آپ برہمن، اپنا آپ کاہن، اپنا آپ پادری اور اپنا آپ دستور ہے، یہاں یہ حکم ہے کہ تم مجھے براہ راست پکارو میں جواب دوں گا:

﴿ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (٤٠/ المؤمن: ٦٠)

''تم مجھے پکارو میں تم کو جواب دوں گا۔''

خارجی کشش کی کوئی چیز نہیں

اکثر مذاہب نے اپنی عبادتوں کو دلکش دلفریب مؤثر اور بارعب بنانے کے لیے خارجی تاثیرات سے کام لیا تھا۔ کہیں ناقوس اور قرنا کی پر رعب آوازیں تھیں، کہیں ساز وترنم اور نغمہ و بربط کی دلکش صدائیں تھیں، کہیں جرس اور گھنٹے کا غلغلہ انداز شور لیکن دین محمدی ﷺ کی سادگی نے ان میں سے ہر ایک سے احتراز کیا اور انسانی قلوب کو متاثر کرنے کے لیے دل کے ساز اور روح کی صدا کے سوا کسی اور خارجی اور بناوٹی تدبیر کا سہارا نہیں لیا، تاکہ خدا اور بندہ کا راز و نیاز اپنی اصلی اور فطری سادگی کے ساتھ خلوص واثر کے مناظر پیدا کرے۔

مکان کی قید نہیں

ہر مذہب نے اپنی عبادت کو اینٹ اور چونے کی چہار دیواری میں محدود کیا ہے۔ بت خانوں سے باہر پوجا نہیں۔ آتش خانوں سے الگ کوئی نماز نہیں، گرجوں کے سوا کہیں دعا نہیں اور صومعوں سے نکل کر کوئی پرستش نہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے طریقہ میں نہ کسی در و دیوار کی ضرورت نہ محراب و منبر کی حاجت، وہ دیر و حرم، معبد و صومعہ اور مسجد و کنیسہ سب سے بے نیاز ہے۔ زمین کا ہر گوشہ بلکہ پہنائے کائنات کا ہر حصہ اس کا معبد اور عبادت خانہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: '' مجھے اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی خصوصیتیں عنایت کیں جو مجھ سے پہلے پیغمبروں کو نہیں دی گئیں، منجملہ ان کے ایک یہ ہے:

[1] یہ چیزیں یہودیوں کے ہاں ہیں پارسیوں میں سفید کپڑوں کی اکثر ضرورت ہے۔

((وجعلت لی الارض مسجدا)) ❶

''اور میرے لیے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنادی گئی۔''

تم سوار ہو کہ پیادہ، گلگشت چمن میں ہو کہ ہنگامہ کارزار میں، خشکی میں ہو کہ تری میں، ہوا میں ہو کہ زمین پر، جہاز میں ہو کہ ریل پر ہر جگہ خدا کی عبادت کر سکتے ہو اور اس کے سامنے سجدہ نیاز بجالا سکتے ہو۔ یہاں تک کہ اگر تم کسی غیر مذہب کے ایسے معبد میں ہو، جس میں سامنے بت اور مجسمے نہ ہوں تو وہاں بھی اپنا فریضہ عبادت ادا کر سکتے ہو۔ ❷ خاص خاص عبادتوں کے وقت مختلف سمتوں اور چیزوں کی طرف رخ کرنا بھی ہر مذہب میں ضروری سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ تمام مسلمانوں کو ایک واحد رخ پر مجتمع کرنے کے لیے، تاکہ ان میں وحدت کی شان نمایاں ہو، مسلمانوں کے لیے بھی کسی ایک سمت خاص کی حاجت تھی اور اس کے لیے اسلام میں مسجد ابراہیمی کی تخصیص کی گئی ہے کہ وہ دنیا میں خدائے واحد کی پرستش کا پہلا مقام ہے۔ لیکن اس کی حیثیت وہ نہیں قائم کی گئی جو دوسرے مذاہب کے قبلوں کی ہے۔ اسلام کا قبلہ شمال وجنوب اور مشرق ومغرب کی حدود سے پاک ہے۔ وہ ستاروں کے رخ یا چاند اور سورج کے مواجہ کا قائل نہیں اور دنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمان ہر سمت اور ہر جہت سے اس کی طرف رخ کرتے ہیں۔ مغرب سے بھی مشرق سے بھی شمال سے بھی اور جنوب سے بھی کسی ایک سمت کی تخصیص نہیں اور خود خانہ کعبہ کے صحن میں بیک وقت ہر جہت اور ہر سمت سے اس کی طرف رخ کیا جاتا ہے۔ اگر کسی سبب سے اس رخ کا بھی پتہ نہ لگ سکے تو جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی خدا ہے۔ چنانچہ کسی چلتی ہوئی سواری پر سفر کرنے کی حالت میں اور عام نفل نمازوں کی درستی کے لیے قبلہ کی بھی تخصیص نہیں۔ جدھر سواری کا رخ ہو ادھر ہی سجدہ کیا جا سکتا ہے۔ لڑائیوں میں ہر رخ پر نماز برابر ادا کی جا سکتی ہے۔ اگر خدانخواستہ کعبہ کی عمارت باقی نہ رہے تب بھی اس رخ کھڑا ہو جانا کافی ہے۔ کعبہ کے اندر کھڑے ہو کر جدھر چاہو سر جھکا دو۔

انسانی قربانی کی ممانعت

بعض مذاہب میں خدا کی سب سے مرغوب عبادت یہ سمجھی جاتی تھی کہ انسان اپنی یا اپنی اولاد کی جان کو خواہ گلا کاٹ کر یا دریا میں ڈبا کر یا آگ میں جلا کر یا کسی اور طرح بھینٹ چڑھا دے۔ اسلام نے اس عبادت کا قطعی استیصال کر دیا اور بتایا کہ خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کرنا اصل میں یہ ہے کہ کسی سچائی کی حمایت میں یا کمزوروں کی مدد کی خاطر اپنی جان کی پروانہ کرے اور مارا جائے، یہ نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ لیا جائے یا دریا میں ڈوب مرا جائے یا آگ میں اپنے کو جلا دیا جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص جس چیز سے اپنے آپ کو قتل کرے گا، اس کو جہنم میں اسی چیز سے سزا دی جائے گی۔'' ❸

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ باب قول النبی ﷺ: ((جعلت لی الارض مسجدا وطھورا)): ۴۳۸۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ فی البیعۃ رقم الباب: ۵۴۔

❸ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من اکفر أخاہ بغیر تأویل فھو کما قال: ۶۱۰۵۔

حیوانی قربانی میں اصلاح

کسی حیوان کی قربانی کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ اکثر مذاہب میں رائج تھا۔عرب میں اس کا طریقہ یہ تھا کہ لوگ جانور ذبح کر کے بتوں پر چڑھا دیتے تھے۔کبھی یہ کرتے تھے کہ مردہ کی قبر پر کوئی جانور لا کر باندھ دیتے تھے اور اس کو چارہ گھاس نہیں دیتے تھے، وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا۔اہل عرب یہ سمجھتے تھے کہ خدا خون کے نذرانہ سے خوش ہوتا ہے۔چنانچہ قربانی ذبح کر کے معبد کی دیوار پر اس کے خون کا چھاپ دیتے تھے۔یہودیوں میں یہ طریقہ تھا کہ جانور قربانی کر کے اس کا گوشت جلا دیتے تھے اور اس کے متعلق وہ جو رسوم ادا کرتے تھے ان کی تفصیل صفحوں میں بھی نہیں سما سکتی۔ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ یہ قربانی خدا کی غذا ہے۔ [1] بعض مذاہب میں یہ تھا کہ اس کا گوشت چیل اور کوؤں کو کھلا دیتے تھے۔پیغام محمدی ﷺ نے ان سب طریقوں کو مٹا دیا۔اس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ اس قربانی سے مقصود خون اور گوشت کی نہیں، بلکہ تمہارے دلوں کی غذا مطلوب ہے۔فرمایا:

﴿ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ﴾ (۲۲/ الحج :۳۷)

”اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، بلکہ تمہارے دل کی پرہیز گاری پہنچتی ہے۔“

اسلام نے تمام عبادات میں صرف ایک حج کے موقع پر قربانی واجب کی ہے اور اہلِ استطاعت کے لیے جو موقعہ حج پر نہ گئے ہوں، مقام حج کی یاد کے لیے قربانی مسنون کی گئی ہے، تا کہ اس واقعہ کی یاد تازہ ہو جب ملتِ حنفی کے سب سے پہلے داعی نے اپنے خواب کی تعبیر میں اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کے سامنے قربان کرنا چاہا تھا اور خدا نے اس کو آزمائش میں پورا ہوتا دیکھ کر اس کی چھری کے نیچے بیٹے کی بجائے دنبے کی گردن رکھ دی اور اس کے پیروؤں میں اس عظیم الشان واقعہ کی سالانہ یادگار قائم ہو گئی۔

اسی کے ساتھ پیام محمدی ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ اس قربانی کا منشا ارواح کو خوش کرنا، مصیبتوں کو دور کرنا، جان کا فدیہ دینا یا صرف خون کا بہانا اور گردن کا کاٹنا نہیں، بلکہ اس سے دو مقصد ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کیا جائے کہ اس نے جانوروں کو ہماری ضرورتوں میں لگایا اور ان کو ہماری غذا کے لیے مہیا کیا اور دوسرا یہ کہ ان کا گوشت غریبوں مسکینوں اور فقیروں کو کھلا کر خدا کی خوشنودی حاصل کی جائے۔چنانچہ فرمایا:

﴿ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۗ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴾ (۲۲/ الحج :۳٤)

”ہم نے ہر قوم کے لیے قربانی مقرر کی، تا کہ وہ ان جانوروں پر خدا کے نام کی یاد کریں، جو ہم نے ان کو روزی کی تو تمہارا خدا ایک خدا ہے، اسی کے آگے سر جھکاؤ اور عاجزی کرنے والے

[1] احبار: ۲۱۔٦۔

بندوں کو خوشخبری سنا دے۔''

﴿ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ (۲۲/ الحج:۳۶)

''اور قربانی کے جانور کو خدا کی نشانیاں بنایا ہے۔ تمہارے لیے ان میں بہت فائدے ہیں، ان کو قطار میں کھڑا کر کے تم ان پر خدا کا نام لو تو جب وہ پہلو کے بل جھکیں (یعنی ذبح ہو چکیں) تو ان میں سے کچھ خود کھاؤ اور باقی قناعت پسند فقیروں اور محتاجوں کو کھلا دو، اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے کام میں لگایا ہے کہ خدا کا شکر ادا کرو۔''

یہی وجہ ہے کہ خدا کے نام کے سوا کسی اور کے نام پر اگر جانور کو ذبح کیا جائے تو محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں یہ فعل شرک اور ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے۔ ﴿وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ عرب میں دستور تھا کہ خاص رجب کے مہینہ میں قربانی کرتے تھے۔ اسلام کے بعد لوگوں نے اس کے متعلق آپ سے پوچھا آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدا کے نام سے جس مہینہ میں چاہو ذبح کرو، نیک کام خدا کے لیے کرو اور (غریبوں کو) کھلاؤ۔'' [1] غرض قربانی کی یہی دو حقیقتیں ہیں۔ صرف خون بہانے کے لیے خون بہانا قربانی کی حقیقت نہیں اور نہ یہ خون بہانا مشرکوں کی دیبیوں اور دیوتاؤں کی طرح اسلام کے خدا کو خوش آتا ہے۔

مشرکانہ قربانیوں کی ممانعت

اسی لیے وہ تمام مشرکانہ قربانیاں جو عرب میں جاری تھیں بند کر دی گئیں۔ عرب میں جانوروں کے قربانی کرنے اور ان کو بتوں پر چڑھانے کے مختلف طریقے تھے۔ اونٹنی کا پہلا بچہ جو پیدا ہوتا تھا، بتوں کے نام پر عموماً اس کی قربانی کر دیتے تھے اور اس کی کھال کو درخت پر لٹکا دیتے تھے۔ اس قسم کے بچے کو فرع کہتے تھے۔ رجب کے پہلے عشرہ میں ایک قسم کی قربانی کی جاتی تھی۔ جس کا نام عتیرہ تھا اسلام نے ان دونوں قربانیوں کو ناجائز قرار دیا اور رجب کی تخصیص باطل کر دی۔

قال: ((لا فرع ولا عتيرة)) [2]

آپ ﷺ نے فرمایا: ''فرع اور عتیرہ جائز نہیں ہے۔''

بتوں کے نام پر مختلف ناموں سے زندہ جانور چھوڑے جاتے تھے اور ان کو کوئی شخص کسی دوسرے کام میں استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کے متعلق خاص طور پر ایک آیت نازل ہوئی:

﴿ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۰۳)

---

[1] ابو داود، کتاب الضحایا، باب فی العتیرۃ: ۲۸۳۰۔

[2] ایضاً: ۲۸۳۱۔

''نہ تو خدا نے بحیرہ، نہ سائبہ، نہ وصیلہ اور نہ حام بنایا۔''

مردوں کی قبر کے پاس گائے یا بکری ذبح کرتے تھے لیکن اسلام نے مراسم ماتم کی جو اصلاحیں کیں اس کے سلسلہ میں اس کو بھی ناجائز قرار دیا۔ فرمایا:

((لا عقر في الاسلام)) ❶

''اسلام میں قبر کے پاس جانوروں کا ذبح کرنا جائز نہیں۔''

عرب جاہلیت میں یہ بھی دستور تھا کہ لوگ اپنی فیاضی وسخاوت کی نمائش اس طرح کرتے تھے کہ دو آدمی مقابل ہو کر جانوروں کے ذبح کی بازی لگاتے تھے۔ اپنا ایک اونٹ یہ ذبح کرتا پھر اس کے مقابل میں دوسرا ذبح کرتا۔ اسی طرح یہ مقابلہ قائم رہتا جس کے اونٹ ختم ہو جاتے یا ذبح کرنے سے انکار کر دیتا وہ ہار جاتا۔ اسلام نے اس جان ومال کے اتلاف کو روک دیا۔ ❷

تجرد، ترکِ لذائذ، ریاضات اور تکالیفِ شاقہ عبادت نہیں

عام خیال یہ تھا کہ بندہ جس قدر اپنے اوپر تکلیف اٹھاتا ہے۔ اسی قدر خدا خوش ہوتا ہے اور وہ اس کی بڑی عبادت شمار ہوتی ہے۔ اسی لیے لوگ اپنے جسم کو بڑی بڑی تکلیفیں دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جس قدر جسم کو آزار زیادہ دیا جائے گا اسی قدر روح میں زیادہ صفائی اور پاکیزگی آئے گی۔ چنانچہ یونانی فلسفیوں میں اشراقیت، عیسائیوں میں رہبانیت اور ہندوؤں میں جوگ اس اعتقاد کا نتیجہ تھا۔ کوئی گوشت نہ کھانے کا عہد کر لیتا۔ کوئی ہفتہ میں یا چالیس دن میں ایک دفعہ غذا کرتا تھا۔ کوئی سرتاپا برہنہ رہتا اور ہر قسم کے لباس کو تقدس کا ننگ سمجھتا تھا۔ کوئی چلہ کی سردی میں اپنے بدن کو ننگا رکھتا تھا۔ کوئی عمر بھر یا سالہا سال تک اپنے کو کھڑا رکھتا تھا یا بیٹھا رہتا تھا اور سونے اور لیٹنے سے قطعاً پرہیز کرتا تھا۔ کوئی اپنا ایک ہاتھ کھڑا رکھتا کہ سوکھ جائے، کوئی عمر بھر تاریک تہ خانوں اور غاروں میں چھپ کر خدا کی روشنی تلاش کرتا تھا۔ کوئی تجرد اور ترک دنیا کر کے اہل وعیال اور زن وفرزند کے تعلق سے نفرت رکھ کر خدا کی محبت کا غلط مدعی بنتا تھا۔ لیکن نبوت محمدی ﷺ نے راز آشکار کیا کہ ان میں سے کوئی چیز عبادت نہیں، نہ ترک لذائذ سے حق کی لذت ملتی ہے، نہ ہماری غمگینی خدا کی خوشنودی کا باعث ہے اور نہ بندوں کی اس غیر معمولی تکلیف سے خدا کو آرام ملتا ہے، نہ زن وفرزند کی نفرت سے خدا کی محبت نصیب ہوتی ہے، نہ ترک دنیا سے دین کی دولت ملتی ہے۔ خدا کا دین اتنا ہی ہے جو بندہ کی استطاعت کے اندر ہے۔ اس نے کہا:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (۲/ البقرة:۲۸۶)

''خدا کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ کی تکلیف (کا حکم) نہیں دیتا۔''

---

❶ ابوداود، كتاب الجنائز، باب كراهية الذبح عندالقبر: ۳۲۲۲۔

❷ ابوداود، كتاب الاضاحي، باب ما جاء في اكل معاقرة الاعراب: ۲۸۲۰۔

اسلام میں روزہ ایک ایسی چیز تھی جس کو بعضوں کے لیے غیر معمولی تکلیف کہہ سکتے ہیں۔ اسلام نے اس میں متعدد آسانیاں پیدا کر کے کہا:

﴿ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں۔''

حج بھی سب لوگوں پر مشکل تھا تو ساتھ ہی فرمادیا:

﴿ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ﴾ (۳/ آل عمران:۹۷)

''جس کو (زادراہ اور چلنے کی) استطاعت ہو اسی پر حج فرض ہے۔''

﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ (۲۲/ الحج:۷۸)

''تمہارے لیے دین میں اس (خدا نے) تنگی نہیں کی۔''

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((ان هذا الدین یسر ولن یشاد الدین احد الا غلبه)) [1]

''یہ دین آسان ہے جو کوئی شخص دین سے سختی میں مقابلہ کرے گا تو دین اس کو مغلوب کردے گا۔''

اور فرمایا:

((انما انا بعثت بالملة السمحة او السهلة الحنیفیة البیضاء)) [2]

''میں تو سہل اور آسان روشن حنیفی دین دے کر بھیجا گیا ہوں۔''

مذہب میں رہبانیت اور جوگ کا جو طریقہ ایجاد کیا گیا خواہ وہ کتنی ہی خوش نیتی سے کیا گیا ہو، تاہم وہ دین حق کی اصلی تعلیم نہ تھی، اسی لیے اسلام کے صحیفہ نے اس کو بدعت سے تعبیر کیا اور کہا:

﴿ وَرَهْبَانِیَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَایَتِهَا ﴾

(۵۷/ الحدید:۲۷)

''اور عیسائیوں نے ایک رہبانیت کی بدعت نکالی اور ہم نے ان کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا اس کا حکم نہیں دیا تھا تو جیسا چاہیے اس رہبانیت کا حق ادا نہ کیا۔''

ان لوگوں سے جنہوں نے اچھے کھانوں اور زیب و زینت کی جائز چیزوں کو بھی اس لیے اوپر حرام کر لیا تھا کہ اس سے خدا خوش ہوگا۔ یہ سوال کیا:

﴿ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ﴾ (۷/ الاعراف:۳۲)

''پوچھ اے پیغمبر ﷺ! کہ اس زیب و زینت اور رزق کی اچھی چیزوں کو جن کو خدا نے اپنے

[1] جمع الفوائد طبع میرٹھ، ج ۱، ص:۲ باب الاقتصاد فی الاعمال بحوالہ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب الدین یسر: ۳۹؛ نسائی: ۵۰۳۷۔ [2] مسند احمد، ج ۵، ص: ۲۶۶ الفاظ قدرے مختلف ہیں۔

بندوں کے لیے بنایا، کس نے حرام کیا؟''

اسلام نے اس مسئلہ میں یہاں تک سختی کی کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے بعض بی بیوں کی خوشنودی مزاج کے لیے شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی، اس پر عتاب آیا۔ خدا نے فرمایا:

﴿ يَآيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

(٦٦/ التحریم:١)

''اے پیغمبر ﷺ! خدا نے جس چیز کو تیرے لیے حلال کیا تو اس کو اپنی بیویوں کی خوشی کی خاطر اپنے اوپر حرام کیوں کرتا ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم میں بعض ایسے لوگ تھے جو عیسائی راہبوں کے اثر یا ذاتی میلان طبع کے سبب سے تجرد، ترک لذائذ اور ریاضات شاقہ کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو اس سے باز رکھا اور فرمایا کہ ''میں یہ شریعت لے کر نہیں آیا۔'' قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ اور ان کے ایک رفیق نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم میں سے ایک نے عمر بھر مجرد رہنے اور شادی نہ کرنے کا اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تو دونوں باتیں کرتا ہوں۔'' یہ سن کر دونوں صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے۔ [1]

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے جو ایک نہایت عابد و زاہد صحابی تھے، یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن کو روزے رکھیں گے اور رات بھر عبادت کریں گے۔ آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ نے ان سے فرمایا کہ ''اے عبداللہ! تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے۔ تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، مہینہ میں تین دن روزے رکھ لینا کافی ہے۔ [2] اسی قسم کی نصیحت آپ ﷺ نے ایک دوسرے تقشّف پسند صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو فرمائی۔ آپ کو ان کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ شب و روز عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، دن کو روزے رکھتے ہیں، رات کو سوتے نہیں۔ آپ نے ان کو بلا کر پوچھا کہ ''کیوں عثمان! تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے؟ عرض کی، خدا کی قسم! میں نہیں ہٹا ہوں، میں آپ ہی کے طریقہ کا طلب گار ہوں۔ فرمایا: ''میں سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں اے عثمان! خدا سے ڈرو کہ تمہارے اہل و عیال کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی حق ہے، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تو روزے بھی رکھو، افطار بھی کرو نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔'' [3]

قبیلۂ باہلہ کے ایک صحابی جب اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے تو انہوں نے دن کا کھانا چھوڑ دیا

---

[1] فتح الباری، کتاب النکاح، باب ترغیب النکاح، ج٩، ص: ١٣٢ طبع دارالسلام۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب حق الجسم فی الصوم:١٩٧٥۔

[3] ابوداود، کتاب التطوع، مایؤمر بہ من القصد فی الصلوۃ:١٣٦٩۔

اور مسلسل روزے رکھنے لگے۔ ایک سال کے بعد جب وہ پھر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو ان کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ آپ ﷺ ان کو پہچان نہ سکے۔ انہوں نے اپنا نام بتایا تو فرمایا: ''تم خوش رو تھے تمہاری صورت کیوں ایسی ہوگئی۔'' عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! جب سے آپ سے مل کر گیا ہوں متصل روزے رکھتا ہوں۔ فرمایا: ''تم نے اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالا رمضان کے علاوہ ہر مہینہ میں ایک روزہ کافی ہے۔'' انہوں نے اس سے زیادہ کی طاقت ظاہر کی تو آپ نے مہینہ میں دو روزوں کی اجازت دی۔ انہوں نے اس سے زیادہ کی اجازت چاہی تو آپ نے مہینہ میں تین روزے کر دیے۔ انہوں نے اس سے بھی زیادہ اضافہ کی درخواست کی، تو آپ نے ماہ حرام کے روزوں کی اجازت دی۔ [1] ایک دفعہ چند صحابہ رضی اللہ عنہم نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کی دن رات کی عبادت و ریاضت کا حال دریافت کیا وہ سمجھتے تھے کہ رسول خدا ﷺ کو دن رات سوا عبادت کے اور کوئی کام نہ ہوگا۔ انہوں نے آپ کی عبادت کا حال سنا تو بولے ہم کو رسول اللہ ﷺ سے کیا نسبت؟ آپ تو معصوم ہیں، ان میں سے ایک صاحب نے کہا، میں تو رات بھر نمازیں پڑھوں گا۔ دوسرے صاحب بولے، میں عمر بھر روزے رکھوں گا۔ تیسرے صاحب نے اپنا ارادہ یہ ظاہر کیا کہ میں عمر بھر مجرد رہوں گا۔ کبھی نکاح نہ کروں گا۔ آنحضرت ﷺ ان کی یہ گفتگو سن رہے تھے۔ ان کو خطاب کر کے فرمایا: ''خدا کی قسم! میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں، تاہم میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں جو میرے طریقہ پر نہیں چلتا، وہ میری جماعت میں نہیں۔'' [2]

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو افلاس اور غربت کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے تھے اور ضبط نفس پر بھی قادر نہ تھے چاہا کہ اپنا عضو قطع کرا دیں۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس رہبانیت کی اجازت چاہی تو آپ نے سخت برہمی ظاہر فرمائی، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کہتے ہیں، اگر حضور اس کی اجازت دیتے تو بہت سے لوگ اس پر عمل کرنے کے لیے تیار تھے۔ [3]

ان واقعات سے اندازہ ہوگا کہ آپ نے کس اہتمام بلیغ کے ساتھ لوگوں کو عبادت کا صحیح مفہوم و مقصود تعلیم فرمایا۔

آپ نے کبھی کبھی بذات خاص کئی کئی دن تک متصل روزے رکھے۔ صحابہ نے بھی آپ کی پیروی میں اس قسم کے روزے رکھنے چاہے آپ نے منع فرمایا۔ لیکن وہ یہ سمجھے کہ آپ صرف اپنی شفقت کی بنا پر منع فرماتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے افطار نہ کیا آپ نے دو دن روزے رکھے تھے کہ اتفاق سے چاند نکل آیا

[1] ابوداود، کتاب الصیام، باب صوم اشھر الحرم: ۲۴۲۸۔

[2] صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب ترغیب النکاح: ۵۰۶۳۔ [3] صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب مایکرہ من التبتل والخصاء: ۵۰۷۳؛ مسلم، کتاب النکاح: ۳۴۰۴، ۳۴۰۵۔

آپ نے افطار کرلیا اور فرمایا: ''اگر مہینہ بڑھ سکتا تو میں اتنے روزے رکھتا کہ ان مذہب میں غلو کرنے والوں کا سارا غلو رہ جاتا۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! پھر آپ کیوں کئی کئی دن کے روزے رکھتے ہیں؟ فرمایا: ''تم میں سے کون میری طرح ہے، مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا رہتا ہے۔'' ❶ اسی لیے اسلام میں عام امت کے لیے یہ روزے نہیں ہیں۔

ایک دفعہ ایک مسجد میں آپ کا گزر ہوا دیکھا، تو ایک ستون میں ایک رسی لٹک رہی ہے، دریافت کیا تو لوگوں نے کہا یہ زینب نے باندھی ہے۔ رات کو نماز میں جب وہ کھڑی کھڑی تھک جاتی ہیں تو اسی کے سہارا کھڑی ہوتی ہیں، یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ رسی کھول دو لوگو! تم اسی وقت تک نماز پڑھو، جب تک تم میں نشاط باقی رہے۔ جب کوئی تھک جائے تو بیٹھ جائے۔'' ❷

ایک دفعہ ایک عورت سامنے سے گزری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا، یہ خولاء ہے، لوگ کہتے ہیں کہ یہ رات بھر نہیں سوتی اور عبادت میں مصروف رہتی ہے۔ فرمایا کہ ''یہ رات بھر نہیں سوتی! لوگو! اسی قدر کرو جتنی طاقت ہے۔'' ❸

جو لوگ اپنی قوت اور استطاعت سے زیادہ رات بھر نمازوں میں مشغول رہتے تھے، ان کو مخاطب کرکے فرمایا:

((اکلفوا من العمل ماتطیقون فان اللّٰہ لا یملّ حتّٰی تملوا فان احبّ العمل الی اللّٰہ ادومہ وَاِنْ قلّ)) ❹

''اتنے ہی کام کی تکلیف اٹھاؤ جس کو کرسکو۔ کیونکہ جب تک تم نہ اُکتا جاؤ خدا نہیں اکتاتا، خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ وہی کام ہے جس کو تم ہمیشہ کرسکو اگرچہ وہ تھوڑا ہی ہو۔''

حج میں رہبانیت کی بہت سی باتیں عرب میں جاری تھیں۔ بعض حاجی یہ عہد کرلیتے تھے کہ وہ اس سفر میں زبان سے کچھ نہ بولیں گے یا سواری کی استطاعت کے باوجود وہ پیادہ سفر کریں گے اور کسی سواری پر نہ چڑھیں گے یا اس سفر میں کسی سایہ کے بغیر دھوپ ہی میں چلیں گے۔ بعض لوگ اپنی گنہگاری کے اظہار کے لیے اپنی ناک میں نکیل ڈال کر طواف کرتے تھے اور اس کو ثواب جانتے تھے۔ اسلام نے ان تمام طریقوں کو منسوخ کردیا کہ خواہ مخواہ کی تکلیف خدا کی خوشنودی کا باعث نہیں۔ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی بہن نے یہ نذر مانی تھی کہ وہ پیدل حج کریں گی۔ عقبہ نے آکر آنحضرت ﷺ سے فتویٰ پوچھا، آپ نے جواب دیا: ''خدا کو تمہاری بہن کی اس نذر کی حاجت نہیں۔ ان سے کہو کہ وہ سوار ہوکر حج کریں۔'' ❺ اسی طرح آپ

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب النھی عن الوصال: ۲۵٦٦۔ ❷ بخاری، کتاب التھجد، باب ما یکرہ من التشدید فی العبادۃ: ۱۱۵۰؛ مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین، باب فضیلۃ العمل الدائم...: ۱۸۳۱؛ نسائی، کتاب قیام اللیل: ۱٦٤٤۔ ❸ بخاری، ایضًا: ۱۱۵۱؛ مسلم، ایضًا: ۱۸۳۳، ۱۸۳٤؛ نسائی: ۱٦٤۳۔
❹ ابوداود، کتاب التطوع، باب ما یؤمر بہ من القصد...: ۱۳٦۸۔ ❺ ابوداود، کتاب الایمان والنذور، باب من رأی علیہ کفارۃ...: ۳۲۹۳ ومسند ابن جاردو کتاب الایمان والنذور۔

نے ایک اور شخص کو دیکھا کہ قربانی کے اونٹ ساتھ ہونے کے باوجود پیدل چل رہا ہے۔ آپ نے اس کو سوار ہونے کا حکم دیا۔ اس نے معذرت کی کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں یہ جانتا ہوں کہ یہ قربانی کا جانور ہے، لیکن تم اس پر سوار ہو لو۔'' ❶ ایک دفعہ حج کے سفر میں آپ نے ایک بڈھے کو دیکھا جو خود نہیں چل سکتا تھا، اس کے بیٹے اس کو دونوں طرف سے پکڑ کر چلا رہے تھے، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ اس نے پیدل حج کی نیت کی ہے۔ فرمایا: ''خدا کو اس کی حاجت نہیں کہ یہ اپنی جان کو اس طرح عذاب میں ڈالے اس کو سوار کر دو''۔ ❷ ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے دیکھا کہ ایک شخص چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ننگے سر کھڑا ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: یہ کون شخص ہے اور اس کی یہ کیا حالت ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اس کا نام ابواسرائیل ہے۔ اس نے نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا رہے گا بیٹھے گا نہیں اور نہ سایہ میں آرام کرے گا اور نہ بات کرے گا اور برابر روزے رکھے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس سے کہو کہ باتیں کرے، بیٹھے، سایہ میں آرام لے اور اپنا روزہ پورا کرے۔'' ❸ حج میں دیکھا کہ ایک شخص اپنی ناک میں نکیل ڈالے ہوئے ہے اور دوسرا اس کو جانور کی طرح اس کی نکیل پکڑ کر کھینچ رہا ہے، آپ نے جا کر نکیل کاٹ دی اور فرمایا کہ ''اگر ضرورت ہو تو ہاتھ پکڑ کر اس کو طواف کراؤ۔'' ❹

اس قسم کی غیر ضروری ریاضتوں کے متعلق عیسائی راہبوں کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا:

((لا تشددوا علی انفسکم فانما هلك من کان قبلکم بتشدید هم علی انفسهم و ستجدون بقایا هم فی الصوامع والدیارات)) ❺

''اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ تم سے پہلی قومیں اپنی جانوں پر سختی کرنے سے تباہ ہوئیں اور ان کی بقیہ نسلیں آج بھی گرجوں اور دیروں میں تم کو ملیں گی۔''

خاتم الانبیاء ﷺ نے عبادت کے ان تمام غلط راہبانہ طریقوں کا اپنے ایک مختصر فقرہ سے ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا، آپ ﷺ نے فرمایا:

((لا صرورۃ فی الاسلام)) ❻

''اسلام میں رہبانیت نہیں۔''

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب رکوب البدن: ۱٦۸۹-۱٦۹۰۔

❷ ابوداود، کتاب الایمان والنذور، باب من رأی کفارة......: ۳۳۰۱؛ ترمذی، ابواب الایمان والنذور، باب ما جاء فیمن یحلف بالمشی ولا یستطیع: ۱۵۳۷۔

❸ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب النذر فیما لا یملك: ٦۷۰٤؛ ابوداود، کتاب الایمان والنذور، باب النذر فی المعصیة: ۳۳۰۰۔ ❹ صحیح بخاری، ایضًا: ٦۷۰۳۔

❺ طبرانی اوسط: ۳۰۷۸؛ ابوداود، کتاب الادب: ٤۹۰٤۔

❻ ابوداود، کتاب المناسك، باب لا صرورة فی الاسلام: ۱۷۲۹۔

عزلت نشینی اور قطع علائق عبادت نہیں

اکثر مذاہب نے دینداری اور خدا پرستی کا کمال یہ سمجھا تھا کہ انسان کسی غار، کھوہ یا جنگل میں بیٹھ جائے اور تمام دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلے۔ اسلام نے اس کو عبادت کا صحیح طریقہ نہیں قرار دیا۔ عبادت درحقیقت خدا اور اس کے بندوں کے حقوق کے ادا کرنے کا نام ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا اس بنا پر وہ شخص جو اپنے تمام ہم جنسوں سے الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ جاتا ہے، وہ درحقیقت ابنائے جنس کے حقوق سے قاصر رہتا ہے۔ اس لیے وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں۔ اسلام کا صحیح تخیل یہ ہے کہ انسان تعلقات کے اژدحام اور علائق کے ہجوم میں گرفتار ہو کر ان میں سے ہر ایک کے متعلق جو اس کا فرض ہے اس کو بخوبی ادا کرے، جو شخص ان تعلقات و علائق اور حقوق و فرائض کے ہجوم سے گھبرا کر کسی گوشہ عافیت کو تلاش کرتا ہے، وہ دنیا کے کارزار کا نامرد اور بزدل سپاہی ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں کو جوانمرد سپاہی دیکھنا چاہتا ہے۔ جو ان سب جھمیلوں کو اٹھا کر بھی خدا کو نہ بھولیں۔ غرض اسلام کے نزدیک عبادت کا مفہوم ترک فرض نہیں، بلکہ ادائے فرض ہے۔ ترک عمل نہیں بلکہ عمل کچھ نہ کرنا نہیں بلکہ کرنا ہے۔ ابھی تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ آنحضرت ﷺ نے بعض ان صحابہ کو جو اہل و عیال اور دوست واحباب سب کو چھوڑ کر دن بھر روزہ رکھتے تھے اور راتوں کو عبادت کرتے تھے۔ فرمایا: ''اے فلاں تم ایسا نہ کرو کہ تم پر تمہاری بیوی بچوں کا بھی حق ہے۔ تمہارے مہمان کا بھی حق ہے، تمہاری جان کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے''۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام کی نظر میں عبادت ان حقوق کو بجا لانا ہے۔ ان حقوق کو ترک کر دینا نہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ کسی غزوہ میں ایک صحابی کا گزر ایک ایسے مقام پر ہوا۔ جس میں موقع سے ایک غار تھا۔ قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا۔ آس پاس کچھ جنگل کی بوٹیاں بھی تھیں۔ ان کو اپنی عزلت نشینی کے لیے یہ جگہ بہت پسند آئی۔ خدمت بابرکت میں آکر عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! مجھ کو ایک غار ہاتھ آگیا ہے۔ جہاں ضرورت کی سب چیزیں ہیں جی چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ گیر ہو کر ترک دنیا کر لوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں یہودیت اور عیسائیت لے کر دنیا میں نہیں آیا ہوں، میں آسان اور سہل اور روشن ابراہیمی مذہب لے کر آیا ہوں۔'' [1]

اسلام سے پہلے آنحضرت ﷺ غار حرا میں کئی کئی دن جا کر رہا کرتے تھے اور عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن جب سے وحی کا پہلا پیام آپ کے پاس آیا اور دعوت و تبلیغ کا بار آپ کے مبارک کندھوں پر رکھا گیا۔ شب و روز میں رات کی چند ساعتیں اور سال میں رمضان کے چند اخیر دن، گوشہ عزلت اور زاویہ تنہائی میں بسر ہوتے تھے، ورنہ تمام دن پوری جماعت کے ساتھ مل کر خالق کی عبادت اور پھر مخلوق کی خدمت میں صرف ہوتے تھے اور یہی تمام خلفا اور عام صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرز عمل رہا اور یہی اسلام کی عملی اور سیدھی

---

[1] مسند احمد، ج ۵، ص: ۲۶۶۔

سادی عبادت تھی۔ [1]

اسلام میں عبادت کا مفہوم

اوپر کی تفصیلات سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ اسلام میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں، جو دوسرے مذہبوں میں پایا جاتا ہے۔ عبادت کے لفظی معنی اپنی عاجزی اور درماندگی کا اظہار ہے اور اصطلاح شریعت میں خدائے عزوجل کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے نذرانہ کو پیش کرنا اور اس کے احکام کو بجا لانا ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں عبادت کا مقابل اور بالضد لفظ استکبار اور غرور استعمال ہوا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴾ (۴۰/ المؤمن: ۶۰)

''جو میری عبادت سے غرور کرتے ہیں وہ جہنم میں جائیں گے۔''

فرشتوں کے متعلق فرمایا:

﴿ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ ﴾ (۲۱/ الانبیآء: ۱۹)

''جو اس کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے غرور نہیں کرتے۔''

سعادت مند اور باایمان مسلمانوں کے متعلق فرمایا:

﴿ اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا

[1] اسلام میں گوشہ گیری اور عزلت نشینی کی اجازت صرف دو موقعوں پر ہے ایک اس شخص کے لیے جس میں فطرۃً بدی ہے جس کی سرشت دوسروں کو نفع پہنچانا نہیں بلکہ تکلیف دینا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو برائی سے بچنے کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ وہ لوگوں سے قطع تعلق کر لے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک بدو نے آکر آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ سب سے بہتر شخص کون ہے؟ فرمایا: ''ایک تو وہ جو اپنی جان و مال کو خدا کی راہ میں قربان کرتا ہے دوسرے وہ جو کسی گھاٹی میں بیٹھ کر اپنے رب کی عبادت کرے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رہنے دے۔'' (صحیح بخاری، کتاب الادب، باب العزلة راحة من خلاط السوء: ۶۴۹۴) اس تعلیم نبوی نے انسانوں کی دو قسمیں کر دیں، ایک وہ جن کو خلق اللہ کی ہدایت اور خدمت کی فطری توفیق ملی ہے تو ان پر یہ فرض ہے کہ وہ مجمع اور ہجوم میں رہ کر ان کی بھلائی کا فرض انجام دیں، یہاں تک کہ اس راہ میں ان کی دولت بھی خرچ ہو جائے اور ان کی جان بھی کام آجائے، دوسرے وہ لوگ ہیں جن میں طبعاً مردم آزاری اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کا مادہ ہے ان کی اخلاقی اور روحانی اصلاح اسی میں ہے کہ وہ اپنے کو مجمع سے الگ رکھ کر خدا کی عبادت میں اپنا وقت صرف کریں، تاکہ وہ گناہ کے بار سے اور لوگ ان کے آزار سے محفوظ رہیں۔ دوسرا موقع جس میں آنحضرت ﷺ نے عزلت نشینی کی اجازت دی ہے وہ ہے جب مجمع و آبادی یا قوم و ملک میں فتنہ و فساد کا بازار اس طرح گرم ہو کہ وہ اس کی روک تھام سے عاجز اور اس کی اصلاح سے قاصر ہو تو ایسے موقع پر اس کے لیے پسندیدہ یہی ہے کہ وہ جماعت سے ہٹ کر گوشہ گیر ہو جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ ''ایک ایسا زمانہ لوگوں پر آئے گا جس میں ایک مسلمان کی بہترین دولت بکری ہوگی جس کو لے کر وہ بارش کی جگہوں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں کو تلاش کرے گا، تاکہ وہ اپنے دین و ایمان کو فتنوں سے بچا سکے۔'' (صحیح بخاری، کتاب الادب، باب العزلة راحة من خلاط السوء: ۶۴۹۵) گوشہ گیری اور عزلت کے یہ دو موقع بھی درحقیقت نہایت صحیح اصول پر مبنی ہیں، پہلے موقع میں ایسے فرد کا جس سے جماعت اور مخلوق کو فائدہ کے بجائے نقصان کا اندیشہ ہو، الگ رہنا جماعت اور فرد دونوں کے لیے فائدہ مند ہے اور دوسرے موقع پر جب کہ جماعت کا نظام ابتر ہو گیا ہو اور کوئی فرد جو بجائے خود نیک اور سعید ہو، لیکن اپنی کمزوری کے باعث وہ اس جماعت کی اصلاح پر قادر نہ ہو تو اس کے لیے جماعت کے دائرہ اثر سے اپنے کو باہر رکھ کر ہی اپنی نیکی اور سعادت کی تکمیل مناسب ہے۔

يَسْتَكْبِرُوْنَ۩ ﴾ (۳۲/ السجدة:۱۵)

''میری آیتوں پر وہی ایمان لاتے ہیں، جن کو ان آیتوں سے سمجھایا جائے تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پاکی بیان کرتے ہیں اور غرور نہیں کرتے۔''

اس قسم کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت اور غرور واستکبار باہم مقابل کے متضاد معنی ہیں۔ اس بناپر اگر غرور واستکبار کے معنی خدا کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا سمجھنا، اپنی ہستی کو بھی کوئی چیز جاننا اور خدا کے سامنے اپنی گردن جھکانے سے عار کرنا ہے تو عبادت کے معنی خدا کے آگے اپنی عاجزی وبندگی کا اظہار اور اس کے احکام کے سامنے اپنی گردنِ اطاعت کو خم کرنا ہے، اس بناپر صحیفۂ محمدی ﷺ کی زبان میں عبادت بندہ کا ہر ایک وہ کام ہے جس سے مقصود خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کی اطاعت ہو۔ اگر کوئی انسان بظاہر کیسا ہی اچھے سے اچھا کام کرے۔ لیکن اس سے اس کا مقصود اپنی بندگی کا اظہار اور خدا کے حکم کی اطاعت نہ ہو تو وہ عبادت نہ ہوگا۔ اس سے ثابت ہوا کہ کسی اچھے کام کو عبادت میں داخل کرنے کے لیے پاک اور خالص نیت کا ہونا شرط ہے اور یہی چیز عبادت اور غیر عبادت کے درمیان امرِ فارق ہے۔ قرآن پاک میں یہ نکتہ جابجا ادا ہوا ہے:

﴿ وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۙ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ۚ وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعْمَةٍ تُجْزَى ۙ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى ۚ وَلَسَوْفَ يَرْضَى ۚ ﴾ (۹۲/ اللیل:۱۷۔۲۱)

''دوزخ سے وہ پرہیزگار بچالیا جائے گا جو اپنا مال دل کی پاکی حاصل کرنے کو دیتا ہے۔ اس پر کسی کا احسان باقی نہیں۔ جس کا بدلہ اس کو دینا ہو۔ بلکہ صرف خدائے برتر کی ذات اس کا مقصود ہے وہ خوش ہوگا۔''

﴿ وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ ۚ ﴾ (۲/ البقرة:۲۷۲)

''صرف خدا کی ذات کی طلب کے لیے جو تم خرچ کرو۔''

﴿ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ ﴾ (۷٦/ الدهر:۹)

''ہم تو صرف خدا کے لیے تم کو کھلاتے ہیں۔''

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۙ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۙ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۙ ﴾

(۱۰۷/ الماعون:٤۔٦)

''پھٹکار ہو ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل رہتے ہیں اور جو دکھاوے کے لیے کام کرتے ہیں۔''

قرآن کی ان آیتوں کی جامع ومانع تفسیر آنحضرت ﷺ نے ان مختصر لیکن بلیغ فقروں میں فرمادی ہے کہ

((انما الا عمال بالنیات)) ❶

''اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے۔''

اسی کی تشریح آپ ﷺ نے ان لوگوں سے کی جو اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ رہے تھے:

((لکل امرء مانوٰی فمن کانت ھجرتہ الی اللّٰہ و رسولہ فاجرہ علی اللّٰہ و من کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امرأۃ ینکحھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ)) ❷

''ہر شخص کو وہی ملے گا، جس کی اس نے نیت کی۔ اگر ہجرت سے مقصود خدا اور رسول تک پہنچنا ہے تو اس کا ثواب خدا دے گا۔ اگر کسی دنیاوی غرض کے لیے ہے یا کسی عورت کے لیے ہے تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے، جس کی نیت سے اس نے ہجرت کی۔''

اس تشریح سے یہ ثابت ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے عبادت کا جو مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، اس میں پہلی چیز دل کی نیت اور اخلاص ہے۔ اس میں کسی خاص کام اور طرز و طریقہ کی تخصیص نہیں ہے۔ بلکہ انسان کا ہر وہ کام جس سے مقصود خدا کی خوشنودی اور اس کے احکام کی اطاعت ہے، عبادت ہے، اگر تم اپنی شہرت کے لیے کسی کو لاکھوں دے ڈالو تو وہ عبادت نہیں، لیکن خدا کی رضا جوئی اور اس کے حکم کی بجا آوری کے لیے چند کوڑیاں بھی کسی کو دو تو یہ بڑی عبادت ہے۔ تعلیم محمدی ﷺ کی اس نکتہ رسی نے عبادت کو درحقیقت دل کی پاکیزگی، روح کی صفائی اور عمل کے اخلاص کی غرض و غایت بنا دیا ہے اور یہی عبادت سے اسلام کا اصلی مقصود ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۱)

''اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا، تا کہ تم کو تقویٰ حاصل ہو۔''

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ عبادت کی غرض و غایت محض حصولِ تقویٰ ہے۔ تقویٰ انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے، جس سے دل میں تمام نیک کاموں کی تحریک اور برے کاموں سے نفرت ہوتی ہے۔ آپ نے ایک دفعہ سینہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ''تقویٰ کی جگہ یہ ہے۔'' ❸ اور قرآن نے بھی ﴿تقوی القلوب﴾ ❹ ''دلوں کا تقویٰ'' کہہ کر اسی نکتہ کو کھولا ہے۔ اسی کیفیت کا پیدا کرنا اسلام میں عبادت کی اصلی غرض ہے۔ نماز روزہ اور تمام عبادتیں سب اسی کے حصول کی خاطر ہیں۔ اس بنا پر انسان کے وہ تمام مشروع افعال و اعمال جن سے شریعت کی نظر میں یہ غرض حاصل ہو، سب عبادت ہیں۔ اسی مفہوم کو ہم دوسری عبارت میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبادت صرف چندان مخصوص اعمال کا نام ہے، جن کو انسان خدا کے لیے

---

❶ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی:۱۔ ❷ ایضاً۔

❸ مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم ظلم المسلم:۶۵۴۱۔ ❹ ۲۲/ الحج: ۳۲۔

کرتا ہے، مثلاً: نماز دعا قربانی لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس تنگ دائرہ کو بیحد وسیع کر دیا۔ اس تعلیم کی رو سے ہر ایک وہ نیک کام جو خاص خدا کے لیے اور اس کی مخلوقات کے فائدہ کے لیے ہو اور جس کو صرف خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیے کیا جائے عبادت ہے۔ اسلام میں خدا کے لیے کسی کام کے کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کام خواہ خدا کی بڑائی اور پاکی کے لیے ہو یا کسی انسان یا حیوان کے فائدہ کے لیے ہو، لیکن اس کام کے کرنے سے اس کام کے کرنے والے کا مقصود نمائش، دکھاوا، حصول شہرت یا دوسروں کو احسان مند بنانا وغیرہ کوئی دنیاوی اور مادی غرض نہ ہو، بلکہ محض خدا کی محبت، خوشنودی اور رضا مندی ہو۔ اس تشریح کی رو سے وہ عظیم الشان تفرقہ جو دین اور دنیا کے نام سے مذاہب نے قائم کر رکھا تھا۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس کو دفعتہً مٹا دیا۔ دین اور دنیا کی حیثیت اسلام میں دو حریف کی نہیں رہتی، بلکہ دو دوست کی ہو جاتی ہے۔ دنیا کے وہ تمام کام جن کو دوسرے مذاہب دنیا کے کام کہتے ہیں، اسلام کی نظر میں اگر وہ کام اسی طرح کیے جائیں، لیکن ان کی غرض و غایت کوئی مادی خود غرضی و نمائش نہ ہو، بلکہ خدا کی رضا اور اس کے احکام کی اطاعت ہو تو وہ دنیا کے نہیں دین کے کام ہیں، اس لیے دین اور دنیا کے کاموں میں کام کا تفرقہ نہیں، بلکہ غرض و غایت اور نیت کا تفرقہ ہے۔ تم نے اوپر پڑھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان صحابہ کو جو دن رات خدا کی عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ فرمایا کہ ''تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو آرام دو، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو کچھ دیر سونے دو۔ تمہاری بیوی کا بھی حق ہے کہ اس کی تسلی کرو اور تمھارے مہمان کا بھی حق ہے۔ [1] کہ اس کی خدمت کے لیے کچھ وقت نکالو۔'' غرض ان حقوق کو بھی ادا کرنا خدا کے احکام کی اطاعت اور اس کی عبادت ہے۔ چنانچہ پاک روزی کھانا اور اس کا شکر ادا کرنا بھی عبادت ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ۝ ﴾

(٢/ البقرة:١٧٢)

''اے ایمان والو! ہم نے جو تم کو پاک اور ستھری چیزیں روزی کی ہیں ان کو کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پاک روزی ڈھونڈھنا اور کھانا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرنا عبادت ہے، ایک اور آیت میں توکل یعنی کاموں کے لیے کوشش کر کے نتیجہ کو خدا کے سپرد کر دینا بھی عبادت قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَیْهِ ﴾ (١١/ هود:١٢٣)

''اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسہ رکھو۔''

اسی طرح مشکلات میں صبر و استقلال بھی عبادت ہے۔ فرمایا:

﴿ فَاعْبُدْهُ وَ اصْطَبِرْ ﴾ (١٩/ مريم:٦٥)

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب حق الضيف:٦١٣٤۔

''اس کی عبادت کر اور صبر کر۔''

کسی شکستہ دل سے اس کی تسکین وتشفی کی بات کرنا اور کسی گناہگار کو معاف کرنا بھی عبادت ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶۳)

''اچھی بات کہنا اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے ستانا ہو۔''

اسی آیت پاک کی تشریح محمد رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

((کُلّ معروف صدقة)) ❶

''ہر نیکی کا کام خیرات ہے۔''

((تبسمك فی وجه اخيك صدقة))

''تمہارا کسی بھائی کو دیکھ کر مسکرانا بھی خیرات ہے۔''

((واماطة الاذی عن الطريق صدقة)) ❷

''راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا بھی خیرات ہے۔''

غریب اور بیوہ کی مدد بھی عبادت، بلکہ بہت سی عبادتوں سے بڑھ کر ہے، فرمایا:

((الساعی علی الارملة والمسکين کالمجاهد فی سبيل الله وکالذی يصوم النهار ويقوم الليل)) ❸

''بیوہ اور غریب کے لیے کوشش کرنے والے کا مرتبہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے برابر ہے اور اس کے برابر ہے جو دن بھر روزہ رکھے اور رات بھر نماز پڑھتا ہو۔''

باہم لوگوں کے درمیان سے بغض وفساد کے اسباب کو دور کرنا اور محبت پھیلانا ایسی عبادت ہے، جس کا درجہ نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے بڑھ کر ہے، آپ ﷺ نے ایک دن صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

((الا اخبرکم بافضل من درجة الصيام والصلوٰة والصدقة))

''کیا میں تم کو روزہ، نماز اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر درجہ کی چیز نہ بتاؤں؟''

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، یارسول اللہ! ارشاد فرمائیے۔ فرمایا:

((اصلاح ذات البين)) ❹

''وہ آپس کے تعلقات کا درست کرنا ہے۔''

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایک دوسرے صحابی حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے ملنے گئے تو دیکھا کہ ان کی

❶ صحيح بخاری، کتاب الادب، باب کل معروف صدقة:۶۰۲۱۔ ❷ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی صنائع المعروف:۱۹۵۶۔ ❸ بخاری، کتاب الادب، باب الساعی علی الارملة:۶۰۰۶۔
❹ سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی اصلاح ذات البين:۴۹۱۹۔

بیوی نہایت معمولی اور میلے کپڑے پہنے ہیں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے وجہ دریافت کی تو بولیں کہ تمہارے بھائی کو دنیا کی خواہش نہیں ہے۔ اس کے بعد مہمان کے لیے کھانا آیا تو ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کہا، میں روزے سے ہوں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا، میں تو تمہارے بغیر نہیں کھاؤں گا۔ آخر انہوں نے افطار کیا رات ہوئی تو ابودرداء رضی اللہ عنہ نماز کو کھڑے ہونے لگے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا، ابھی سو رہو۔ پچھلی پہر کو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ان کو جگایا اور کہا اب نماز پڑھو۔ چنانچہ دونوں نے تہجد کی نماز ادا کی پھر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا، اے ابودرداء رضی اللہ عنہ! تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے تو جس جس کا حق تم پر ہے سب کو ادا کرو"۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی یہ تقریر نقل کی۔ آپ نے فرمایا کہ "سلمان نے سچ کہا۔" ❶ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! تمام کاموں میں سب سے بہتر کونسا کام ہے؟ فرمایا: "خدا پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا۔" لوگوں نے پوچھا کس غلام کے آزاد کرنے میں زیادہ ثواب ہے؟ ارشاد ہوا: "جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اپنے مالک کو زیادہ پسند ہو۔" انہوں نے کہا، اگر یہ کام ہم سے نہ ہو سکے تو؟ فرمایا: "پھر ثواب کا کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کی مدد کر دیا جس سے کوئی کام بن نہ آتا ہو۔ اس کا کام کر دو"۔ پھر سوال ہوا کہ اگر یہ بھی نہ ہو سکے؟ فرمایا: "تو پھر یہ کہ لوگوں کے ساتھ کوئی برائی نہ کرو۔ یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے جو خود تم اپنے اوپر کر سکتے ہو۔" ❷

ایک دفعہ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: "خدا اپنے بندوں سے کہے گا کہ میں نے تم سے کھانا مانگا تم نے نہ کھلایا۔ وہ عرض کریں گے، خداوند! تو نے کیسے کھانا مانگا تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے۔ فرمائے گا، کیا تم کو معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تم سے کھانا مانگا تم نے کھانا اس کو نہ کھلایا، اگر تم اس کو کھلاتے تو اس کو تم میرے پاس پاتے۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہ پلایا وہ کہے گا کہ اے پروردگار! میں تجھ کو کیسے پانی پلاؤں تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے۔ وہ فرمائے گا، تم کو معلوم نہ تھا کہ میرے فلاں بندہ نے پیاس میں تجھ سے پانی مانگا تو نے اس کو پانی نہ پلایا۔ اگر پلاتا تو اس کو میرے پاس پاتا۔ اے ابن آدم! میں بیمار رہا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی وہ کہے گا، اے پروردگار! میں کیونکر تیری بیمار پرسی کروں، تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے۔ فرمائے گا، تجھ کو خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر کرتا تو تُو اس کو میرے پاس پاتا یا مجھے اس کے پاس پاتا۔" ❸ اس مؤثر طریقہ ادا نے خدا شناسی اور خدا آگاہی کے کتنے تو بر تو پردے چاک کر دیے اور دکھا دیا کہ خدا کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے حصول کے کیا کیا طریقے ہیں؟ حضرت سعد رضی اللہ عنہ جو چاہتے تھے کہ اپنی کل دولت خدا کی راہ میں دے دیں

❶ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب صنع الطعام و التکلف للضیف: ٦١٣٩۔

❷ ادب المفرد امام بخاری، باب معونۃ الرجل اخاہ: ٢٢٠۔ ❸ ایضًا، باب عیادۃ المرضی: ٥١٧۔

آپ ﷺ نے انہیں بتایا کہ ''اے سعد! جو کچھ اس نیت سے خرچ کرو کہ اس سے خداوند تعالیٰ کی ذات مطلوب ہے۔اس کا تم کو ثواب ملے گا، یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں بھی دو، اس کا بھی ثواب ہے۔'' ❶ ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: ''مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہے۔'' ❷ غریب و نادار صحابہ رضی اللہ عنہم نے دربار رسالت میں ایک دن شکایت کی کہ یارسول اللہ ﷺ! دولت مند لوگ ثواب میں بڑھ گئے۔ہماری طرح وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، وہ بھی روزے رکھتے ہیں، ان کے علاوہ وہ مالی عبادت بھی بجالاتے ہیں، جو ہم نہیں بجالا سکتے۔فرمایا: ''کیا تم کو اللہ نے وہ دولت نہیں دی ہے جس کو صدقہ کر سکو، تمہارا سبحان اللہ اور بحمد اللہ کہنا بھی صدقہ ہے۔یہاں تک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقہ سے پوری کرتا ہے وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے۔''لوگوں نے کہا، یارسول اللہ ﷺ! وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لیے یہ کرتا ہے۔فرمایا کہ ''اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا اس کو گناہ نہ ہوتا؟ پھر اسکو جائز طریقہ سے پورا کرنے کا ثواب کیوں نہ ملے گا۔'' ❸ محمد رسول اللہ ﷺ کی ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ حسنِ عمل ثواب اور عبادت کے مفہوم میں اسلام نے کتنی وسعت پیدا کی ہے اور کتنی توبرتو انسانی غلطیوں کا ازالہ کیا ہے، اس تشریح کے بعد روشن ہو جائے گا کہ وحی محمدی نے بالکل صحیح طور سے خلقت انسانی کی غرض وغایت عبادت الٰہی قرار دی ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ ﴾ (٥١/ الذاريت:٥٦)

''میں نے انسانوں کو اور جنوں کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

اس آیت پاک میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے، بلکہ وہ تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں تک وسیع ہے، جن کے کرنے کا مقصد خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار، اس کی اطاعت اور اس کی خوشنودی کی طلب ہو۔اس وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہیں۔جن کے بحسن و خوبی انجام دینے کے لیے اس کی خلقت ہوئی ہے۔یہ روحانیت کا وہ راز ہے جو صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے دنیا کو معلوم ہوا۔عام طور سے مشہور ہے کہ شریعت میں چار عبادتیں فرض ہیں، یعنی نماز، روزہ، زکوۃ اور حج۔اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ ان فرائض کی تخصیص نے عبادت کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیا ہے۔درحقیقت یہ چاروں فریضے عبادت کے سینکڑوں وسیع معنوں اور ان کے جزئیات کے بے پایاں دفتر کو چار مختلف بابوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔جن میں سے ہر ایک فریضہ عبادت اپنے افراد اور جزئیات پر مشتمل اور ان سب کے بیان کا مختصر عنوان باب ہے۔جس طرح کسی وسیع مضمون کو کسی ایک مختصر سے لفظ یا فقروں میں ادا کر کے اس وسیع مضمون کے سرے پر لکھ دیتے ہیں۔اسی طرح یہ چاروں فرائض درحقیقت انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے

❶ ادب المفرد، باب یوجر فی کل شيء: ٧٥٢۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب النفقات، باب فضل النفقة علی الاهل: ٥٣٥١۔ ❸ ادب المفرد امام بخاری، باب ان کل معروف صدقة: ٢٢٧۔

کاموں کو چار مختلف عنوانوں میں الگ الگ تقسیم کر دیتے ہیں، اس لیے ان چار فرضوں کو بجا طور سے انسان کے اچھے اعمال اور کاموں کے چار اصول ہم کہہ سکتے ہیں:

① بندوں کے وہ تمام اچھے کام اور نیک اعمال جن کا تعلق تنہا خالق اور مخلوق سے ہے۔ایک مستقل باب ہے جس کا عنوان نماز ہے۔

② وہ تمام اچھے اور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدہ اور آرام کے لیے کرتا ہے۔صدقہ اور زکوۃ ہے۔

③ خدا کی راہ میں ہر قسم کی جسمانی اور جانی قربانی کرنا، کسی اچھے مقصد کے حصول کے لیے تکلیف اور مشقت جھیلنا اور نفس کو اس تن پروری اور مادی خواہشوں کو نجاست اور آلودگی سے پاک رکھنا جو کسی اعلیٰ مقصد کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔روزہ ہے یا یوں کہو کہ ایثار و قربانی کے تمام جزئیات کی سرخی روزہ ہے۔

④ دنیائے اسلام میں ملت ابراہیمی کی برادری اور اخوت کی مجسم تشکیل و تنظیم، مرکزی رشتہ اتحاد کا قیام اور اس مرکز کی آبادی اور کسب روزی کے لیے ذاتی کوشش اور محنت کے باب کا سرِ عنوان حج ہے۔

غور کر کے دیکھو انسان کے تمام اعمال اور اچھے کام انہی اصول چہارگانہ کے تحت میں داخل ہیں، اس لیے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر قائم ہے (۱) توحید و رسالت کا اقرار کرنا (۲) نماز پڑھنا (۳) روزہ رکھنا (۴) زکوۃ دینا (۵) حج کرنا۔'' [1] پہلی چیز میں عقائد کا تمام دفتر سمٹ جاتا ہے اور بقیہ چار چیزیں ایک مسلمان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں کو محیط ہیں۔انہی ستونوں پر اسلام کی وسیع اور عظیم الشان عمارت قائم ہے۔اس تقریر کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ یہ چاروں فرض عبادتیں نماز زکوۃ، روزہ اور حج اصل مطلوب بالذات نہیں ہیں، بلکہ یہ مقصد ہے کہ یہ چاروں عبادتیں اپنے تمام جزئیات باب اور محتویات کے ساتھ فرض ہیں۔جو شخص صرف ان چاروں فرائض کو جو عنوان باب ہیں ادا کرتا ہے اور اس باب کے نیچے کے مندرجہ جزئیات سے پہلوتہی کرتا ہے، اس کی عبادت ناقص اور اس کی اطاعت نامکمل ہے اور اس کے لیے دین و دنیا کی وہ فلاح و کامیابی جس کا خدائے تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے، مشکوک ہے، یہیں سے یہ شبہ زائل ہوتا ہے کہ ہماری نمازیں ہم کو برائیوں سے کیوں باز نہیں رکھتیں، ہمارے روزے ہم کو تقویٰ کی دولت کیوں نہیں بخشتے، ہماری زکوۃ ہمارے دلوں کو پاک وصاف کیوں نہیں کرتی۔ہمارا حج ہمارے گناہوں کی مغفرت کا باعث کیوں نہیں بنتا اور قرنِ اوّل کی طرح ہماری نمازیں ملکوں کو فتح اور ہماری زکوتیں ہمارے قومی افلاس کو دور کیوں نہیں کرتیں اور ہمارے سامنے دین و دنیا کے موعودہ برکات کا انبار کیوں نہیں لگ جاتا، لیکن خدا کا وعدہ یہ ہے:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ ﴾ (۲۴/ النور:۵۵)

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب دعاؤکم ایمانکم :۸؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ارکان الاسلام:۱۱۱ تا ۱۱۴۔

''اللہ نے ان سے جو ایمان رکھتے ہیں اور تمام نیک کام کرتے ہیں، یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا۔''

اسی لیے ایمان کامل اور اعمال نیک کے بغیر اس وعدہ کی ایفا کی توقع رکھنا حماقت ہے۔

اسی طرح ان چاروں جلی عنوانات کے احکام سے قطع نظر کر کے صرف مندرجۂ تحت جزئیات کی تعمیل ممکن ہے کہ دنیائے فانی کی بادشاہی کا اہل بنا دے۔ مگر آسمان کی بادشاہت میں اس کو کوئی حصہ نہیں ملے گا اور اسلام اس لیے آیا ہے کہ اپنے پیروؤں کے پاؤں کے نیچے دونوں جہانوں کی بادشاہیاں رکھ دے [1] اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب عبادات کے مفہوم کو اس وسعت کے ساتھ سمجھا جائے جو اسلام کا منشا ہے اور اسی وسعت کے ساتھ اس کو ادا کیا جائے جو اسلام کا مطالبہ ہے۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام وفد قریش عند النبی ﷺ ج ١ ، ص: ٢٥٢ مطبع محمد علی مصر ، کلمة واحدة یعطونیها تملکون بها العرب وتدین لکم بها العجم۔

نماز

﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ﴾

اسلام کی عبادت کا یہ پہلا رکن ہے جو امیر و غریب، بوڑھے، جوان، عورت، مرد، بیمار و تندرست سب پر یکساں فرض ہے۔ یہی وہ عبادت ہے جو کسی شخص سے کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی۔ اگر اس فرض کو کھڑے ہو کر نہیں ادا کر سکتے تو بیٹھ کر ادا کرو اور اگر اس کی بھی قدرت نہیں ہے تو لیٹ کر کر سکتے ہو۔ اگر منہ سے نہیں بول سکتے تو اشاروں سے ادا کرو۔ [1] اگر کسی سخت مجبوری میں رک کر نہیں پڑھ سکتے تو چلتے ہوئے پڑھو۔ [2] اگر کسی سواری پر ہو تو جس طرف وہ چلے اسی رخ پڑھو۔ [3]

نماز کیا ہے؟

مخلوق کا اپنے دل زبان اور ہاتھ سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار، اس رحمٰن و رحیم کی یاد اور اس کے بے انتہا احسانات کا شکریہ، حسن ازل کی حمد و ثنا اور اس کی یکتائی اور بڑائی کا اقرار یہ اپنے محبوب سے مہجور روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم و جان کی بندگی ہے۔ یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرض نیاز ہے، یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے۔ یہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے۔ یہ بے قرار روح کی تسکین، مضطرب قلب کی تشفی اور مایوس دل کی دوا ہے۔ یہ فطرت کی آواز ہے، یہ حساس و اثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل اور ہستی کا خلاصہ ہے۔ کسی غیر مرئی طاقت کے آگے سرنگوں ہونا، اس کے حضور میں دعا و فریاد کرنا اور اس سے مشکلوں میں تسلی پانا انسان کی فطرت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں کوئی ساز ہے، جو نامعلوم انگلیوں کے چھونے سے بجتا رہتا ہے، یہی ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ کا فطری جواب ہے۔ قرآن نے جا بجا انسانوں کی اس فطری حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور پوچھا ہے کہ جب تم پر مصیبتیں آتی ہیں۔ جب سمندر میں طوفان اٹھتا ہے اور تمہارا جہاز بھنور میں پھنستا ہے تو خدا کے سوا کون ہوتا ہے جس کو تم پکارتے ہو؟ غرض انسان کی پیشانی کو خود بخود ایک مسجود کی تلاش رہتی ہے، جس کے سامنے وہ جھکے، اندرون دل کی عرض و نیاز کرے اور اپنی دلی تمناؤں کو اس کے سامنے پیش کرے، غرض عبادت، روح کے اسی فطری مطالبہ کا جواب ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسانی روح کے جوش جنون کا علاج ممکن نہیں۔ وحشی سے وحشی مذہب میں بھی عبادت کے کچھ رسوم اس ندائے فطرت کی تسلی کے لئے موجود ہیں، پھر آسمانی مذاہب اس سے کیوں کر خالی ہو سکتے ہیں؟ چنانچہ دنیا کے ہر آسمانی مذہب میں خدا کی یاد کا حکم اور اس یاد کے کچھ مراسم موجود ہیں۔ اسلام میں اگر حمد و تسبیح ہے تو یہودیوں میں مزمور، عیسائیوں میں دعا،

---

[1] نیل الاوطار، ج۲، ص: ۲۸ بروایت موقوف از دارقطنی۔ [2] ابوداود، کتاب صلاۃ السفر، باب صلوۃ الطالب: ۱۲۴۹۔ [3] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ البقرۃ باب قولہ: فان خفتم فرجالا……: ۴۵۳۵؛ مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب جواز صلاۃ النافلۃ علی الدابۃ فی السفر حیث توجہت: ۱۶۱۰، ۱۶۱۱۔

پارسیوں میں زمزمہ اور ہندوؤں میں بھجن ہیں اور دن رات میں اس فریضہ کے ادا کرنے کے لئے ہر ایک میں بعض اوقات کا تعین بھی ہے۔ اس بنا پر یہ یقین کرنا چاہیے کہ نماز مذہب کے ان اصول میں سے ہے جن پر تمام دنیا کے مذہب متفق ہیں۔ قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے اپنی امت کو نماز کی تعلیم نہ دی ہو اور اس کی تاکید نہ کی ہو۔ خصوصاً ملت ابراہیمی میں اس کی حیثیت سب [1] سے زیادہ نمایاں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکہ کی ویران سرزمین میں آباد کرتے ہیں تو اس کی غرض یہ بتاتے ہیں کہ ﴿ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ ﴾ (۱۴/ ابراہیم۔۶) ''اے ہمارے پروردگار! تاکہ وہ نماز کھڑی کریں۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اور اپنی نسل کے لئے دعا کرتے ہیں کہ ﴿ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي ﴾ (۱۴/ ابراہیم۔۴۰) ''اے میرے پروردگار! مجھ کو اور میری نسل میں سے لوگوں کو نماز کھڑی کرنے والا بنا۔'' حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسبت قرآن پاک کی شہادت ہے: ﴿ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ ﴾ (۱۹/ مریم:۵۵) ''اور وہ اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم دیتے تھے۔'' حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کے ہم قوم طعنہ دیتے ہیں: ﴿ أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا ﴾ (۱۱/ ھود۔۸۷) ''کیا تمہاری نماز تم کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جس کو پوجتے آئے ہیں اس کو چھوڑ دیں۔'' حضرت لوط علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی نسل کے پیغمبروں کے متعلق قرآن کا بیان ہے: ﴿ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَإِقَامَ الصَّلٰوةِ ﴾ (۲۱/ الانبیاء:۷۳) ''اور ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے اور نماز کھڑی کرنے کی وحی کی۔'' حضرت لقمان علیہ السلام اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں: ﴿ يٰبُنَيَّ أَقِمِ الصَّلٰوةَ ﴾ (۳۱/ لقمان۔۱۷) ''اے میرے بیٹے! نماز کھڑی کر۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا: ﴿ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِي ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۴) ''اور میری یاد کے لیے نماز کھڑی کر۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے: ﴿ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ ﴾ (۱۰/ یونس:۸۷) ''اور نماز کھڑی کیا کرو۔'' بنی اسرائیل سے وعدہ تھا: ﴿ إِنِّي مَعَكُمْ لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۲) ''میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز کھڑی کیا کرو۔'' حضرت زکریا علیہ السلام کی نسبت ہے: ﴿ وَهُوَ قَائِمٌ يُّصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ ﴾ (۳/ آل عمران:۳۹) ''وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔'' حضرت

[1] قرآن کی تائید تورات اور زبور سے بھی ہوتی ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے پرانے صحیفوں میں نماز کے لیے اصطلاحی لفظ خدا کا نام لینا تھا، چنانچہ تورات اور زبور میں نماز کا ذکر اسی نام سے آیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پاس ایک قربان گاہ بنائی اور خدا کا نام لیا۔ (پیدائش ۱۲۔۶، ص:۱۸) حضرت اسحٰق علیہ السلام نے خدا کا نام لیا (پیدائش ۲۶۔۲۵ ص:۴۱) حضرت داؤد علیہ السلام نے خدا کا نام لیا (زبور:۱۷۔۱۱۶) اور یہ اصطلاح قرآن میں بھی مستعمل ہوئی ہے: ﴿ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلّٰى ﴾ (۸۷/ الاعلیٰ:۱۵) ''اور اپنے رب کا نام لیا، پس نماز پڑھی۔'' اس معنی کی اور بھی آیتیں قرآن پاک میں مذکور ہیں، یہودیوں کے پچھلے صحیفوں سفر دانیال وغیرہ اور عیسائیوں کے تمام صحیفوں میں نماز کے لیے دعا کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عربی لفظ صلوٰۃ کے ہم معنی ہے۔ اس لیے انجیل کے اردو مترجموں نے اس کا ترجمہ نماز کیا ہے۔ (متی:۱۷۔۲۱ اور متی:۲۳۔۱۴، ص:۴۲ ص:۴۲)

عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں: ﴿ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ ﴾ (۱۹/مریم:۳۱) ''اور خدا نے مجھ کو نماز کا حکم دیا ہے۔''

آیات بالا کے علاوہ قرآن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب میں بعض یہود اور عیسائی نماز پڑھا کرتے تھے:

﴿ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَهُمْ یَسْجُدُوْنَ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۱۳)

''اہل کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راتوں کو کھڑے ہو کر خدا کی آیتیں پڑھتے ہیں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔''

حدیث میں بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے تذکرے ہیں۔ مثلاً: آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جب نماز پڑھو تو تہبند باندھ لو یا چادر اوڑھ لو۔ یہودیوں کی طرح (ننگے) نہ پڑھو۔'' (ص۴۷) ''تم یہودیوں کی طرح صرف اوپر سے نماز میں چادر مت ڈال لو بلکہ اس کو باندھ لیا کرو۔'' (ص۴۷) ''نماز میں یہودیوں کی طرح مت جھومو۔'' (ص۱۱۲) ''تم یہودیوں کے برخلاف نماز میں موزے اور جوتے پہنے رہو۔'' (ص۱۱۴) ''میری امت میں اس وقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر رہے گا جب تک لوگ یہودیوں کی تقلید میں مغرب کی نماز میں ستاروں کے نکلنے کا اور عیسائیوں کی تقلید میں صبح کی نماز میں ستاروں کے ڈوبنے کا انتظار نہ کریں گے۔'' (ص ۸۴) [1] ان حوالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے یہود و نصاریٰ میں کچھ لوگ ایسے تھے جو نماز ادا کرتے تھے۔ عرب میں جو لوگ اپنے کو دین ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے، ان میں بعض تو ایسے تھے کہ وہ کسی خاص طریقہ عبادت سے واقف نہ تھے۔ چنانچہ زید بن عمرو کا واقعہ گزر چکا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اے خدا! مجھے معلوم نہیں کہ میں تجھ کو کیسے پوجوں؟ یہ کہہ کر ہتھیلی اٹھاتے تھے اور اسی پر سجدہ کر لیتے تھے۔ [2] لیکن ایک دو ایسے بھی تھے جو کسی نہ کسی صورت سے نماز پڑھتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی ملاقات اور اپنے اسلام لانے کے تین برس پہلے سے رات کو نماز پڑھ لیتے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ اس وقت آپ کس رخ نماز پڑھتے تھے کہنے لگے جدھر رخ کر لیا۔ [3] عرب کا ایک جاہلی شاعر جران العود کہتا ہے: [4]

وادرکن اعجازا من اللیل بعدما　　　اقام الصلوٰۃ العابد المتحنف

''اور ان سواریوں نے رات کے پچھلے حصہ کو پالیا اس وقت کے بعد جب کہ عبادت گزار حنفی نماز پڑھ چکا تھا۔''

اس شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں مذہب حنفی کے پیرو پچھلی رات میں نماز ادا کرتے تھے۔

---

[1] کنز العمال جلد چہارم طبع حیدر آباد کے مختلف ابواب سے یہ حدیثیں نقل کی گئی ہیں اور متن میں اس جلد کے صرف صفحات لکھ دیے گئے ہیں۔

[2] ابن ہشام ذکر زید بن عمرو بن نفیل، ص:۱٤٤۔ [3] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل ابی ذر: ٦٣٥٩۔ [4] لسان العرب لفظ حنف، ج۱، ص:۷۳۹۔

یہود کی بڑی جماعت نے نماز کو بھلا دیا تھا اور ان کی نماز صرف چند رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی اور نماز سے زیادہ انہوں نے قربانی اور نذرانوں پر زور دیا تھا، جن میں خلوص اور خدا پرستی کا شائبہ تک نہ تھا۔ عیسائیوں نے خدا کی نماز کے ساتھ ساتھ انسانوں کی نمازیں بھی شروع کر دی تھیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے علاوہ اور بھی سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی عبادت میں مصروف ہو گئے تھے۔ [1] دین ابراہیمی کی پیروی کے مدعی صرف اپنے قیاس سے کچھ ارکان ادا کر لیتے تھے، الغرض آپ کی بعثت سے پہلے نماز کی خالص اور موحدانہ حقیقت دنیا سے عموماً گم ہو چکی تھی۔ اس کی شکل وصورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ آج بھی ان کے صحیفوں میں اس کی اصل شکل نظر نہیں آتی، نہ اس کے ارکان کا پتہ لگتا ہے نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان الہامی صحیفوں کے حامل اور امانت دار اس فرض کو کس طرح ادا کرتے تھے، کن مؤثر دعاؤں کو پڑھتے تھے اور اس کی ادائیگی کے کیا اوقات تھے۔ جو کچھ ان میں رہ گیا تھا وہ صرف عملی رسم ورواج اور بعد کے مذہبی مقتداؤں کی کچھ تجویزیں جن پر مذہبی فریضہ سمجھ کر عمل کیا جا رہا تھا۔ سجدہ جو نماز کی روح اور نیازِ الٰہی کی انتہائی منزل ہے۔ اس کو یہود ونصاریٰ دونوں نے مشکل اور باعث تکلیف سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور اس طرح نماز کی ظاہری شکل وصورت بھی انہوں نے بگاڑ دی تھی۔ قرآن مجید میں ان کی اس صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۭ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝ ﴾

(۷/ الاعراف: ۱۶۹۔۱۷۰)

''ان کے بعد ان کے وہ جانشین ہوئے جن کو خدا کی کتاب باپ دادوں سے وراثت میں ملی وہ صرف اس دنیاوی زندگی کا فائدہ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف کر دیا جائے گا اور اگر ایسا ہی فائدہ اب بھی ان کے سامنے آئے تو لے لیں (اور مذہب کی پروا نہ کریں) کیا ان سے کتاب کا معاہدہ نہیں لیا گیا کہ وہ خدا کے متعلق سچ کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے اور ان لوگوں نے جو کچھ اس (کتاب) میں ہے، اس کو پڑھا اور آخرت کا گھر ان لوگوں کے لئے ہے جو پرہیز گار ہیں کیا تم نہیں سمجھتے؟ اور وہ لوگ جو کتاب کو مضبوطی سے پکڑیں اور انہوں نے نماز کو قائم کیا تو ہم اپنی حالت درست کرنے والوں کی مزدوری کو برباد نہیں کرتے۔''

سورۂ مریم میں تمام انبیائے صادقین کے ذکر کے بعد خدا فرماتا ہے:

[1] دیکھو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم لفظ عبادت (ورشپ)۔

﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ ﴾ (۱۹/ مریم:۵۹)

''ان کے بعد ان کے جانشین ایسے ہوئے جنھوں نے نماز کو برباد کر دیا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی۔''

نماز کے ضائع اور برباد کرنے سے مقصود نماز کو صرف چھوڑ دینا نہیں ہے، بلکہ زیادہ تر اس کی حقیقت اور اس کی روح کو گم کر دینا ہے۔ مسلمان جب اپنی نماز کے لئے حی علی الصلوٰۃ (نماز کے لئے آؤ) کا ترانہ بلند کرتے ہیں تو یہود و نصاریٰ اس کا مذاق اڑاتے تھے، اس پر قرآن نے ان کی نسبت یہ شہادت دی کہ ان کی خدا پرستی کی روح اتنی مردہ ہو چکی ہے کہ جب دوسرے لوگ خدا پرستی کے جذبہ میں سرشار ہوتے ہیں تو وہ اس کو ہنسی کھیل بنا لیتے ہیں:

﴿ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴾

(۵/ المآئدہ:۵۸)

''اور جب تم نماز کے لئے آواز دیتے ہو تو وہ اس کو ہنسی کھیل بنا لیتے ہیں، یہ اس لئے کہ وہ عقل سے خالی ہو چکے ہیں۔''

اہل عرب اور قریش جو اپنے آبائی مذہب پر تھے وہ گو نماز کی صورت سے کسی حد تک واقف تھے، مگر بھولے سے بھی اس فرض کو ادا نہیں کرتے تھے۔ بتوں کی پوجا، جنات کی دہائی، فرشتون کی خوشامد، یہ ان کی عبادت کا خلاصہ تھا۔ حج و طواف یا دوسرے موقعوں پر وہ خدا سے دعائیں مانگتے تو ان میں بھی بتوں کے نام لے لیتے اور شرک کے فقرے ملا دیتے تھے۔ موحدانہ خضوع و خشوع کا ان کی دعاؤں میں شائبہ تک نہ تھا۔ مسلمانوں کو جب کبھی نماز پڑھتے دیکھ لیتے تو ان کا منہ چڑھاتے تھے، دِق کرتے تھے، دھکیل دیتے تھے، شور کرتے تھے، سیٹی اور تالی بجاتے تھے، چنانچہ ان کے متعلق قرآن نے کہا:

﴿ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاۗءً وَّتَصْدِيَةً ۭ ﴾ (۸/ الانفال:۳۵)

''اور ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹی اور تالی بجانا ہے۔''

اگلے مفسروں نے اس آیت پاک کے دو مطلب لئے ہیں، ایک یہ کہ واقعاً وہ جو نماز پڑھتے تھے اس میں سیٹی اور تالی بجایا کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ مسلمان جب نماز پڑھتے تھے تو وہ سیٹی اور تالی بجا کر ان کی نماز خراب کرنی چاہتے تھے اور گویا یہی ان کی نماز تھی۔ ❶ پہلے معنی کی بنا پر تو ان کی نماز محض ایک قسم کا کھیل کود اور لہو و لعب تھا اور دوسرے معنی کی رو سے سرے سے ان کے ہاں نماز ہی نہ تھی، بلکہ دوسروں کو نماز سے روکنا یہی ان کی نماز تھی۔ ایک اور آیت میں ہے:

﴿ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۝ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝ ﴾ (۹۶/ العلق ۹۔۱۰)

❶ ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکور، ج۹، ص:۱۴۷، ۱۴۸۔

''کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔''

ایک بندہ سے مراد خود آنحضرت ﷺ کی ذات ہے آپ جب صحن حرم میں نماز پڑھتے تو قریش جو بے فکری کے ساتھ ادھر ادھر بیٹھے رہتے کبھی آپ کی ہنسی اڑاتے اور کبھی دق کرتے، [1] کبھی آپ کی گردن میں پھندا ڈال دیتے [2] اور کبھی جب آپ سجدہ میں جاتے پشت مبارک پر نجاست لا کر ڈال دیتے تھے اور جب آنحضرت ﷺ کو اس بار نجاست سے اٹھنے میں تکلیف ہوتی تو ہنستے اور قہقہہ لگاتے تھے۔ [3] اسی لئے آنحضرت ﷺ اسلام کے آغاز میں تو اخفا کے خیال سے اور اس کے بعد ان کے ان حرکات کی وجہ سے عموماً رات کو اور دن کو کسی غار یا درہ میں چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے اور مسلمان بھی عموماً ادھر ادھر چھپ کر ہی نماز پڑھتے تھے یا پھر رات کے سناٹے میں اس فرض کو ادا کرتے تھے۔ مشرکین اگر کبھی اس حالت میں ان کو دیکھ پاتے تو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ ابن اسحٰق میں ہے کہ صحابہ جب نماز پڑھنا چاہتے تو گھاٹیوں میں چھپ کر نماز پڑھتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص چند مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کی ایک جماعت آ گئی، اس نے اس نماز کو بدعت (نیا کام) سمجھا اور مسلمانوں کو برا بھلا کہا اور ان سے لڑنے پر آمادہ ہو گئی۔ [4] الغرض جب محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کو خدا کے آگے سربسجود ہونے کی دعوت دی تو اس وقت تین قسم کے لوگ تھے، ایک وہ (یعنی یہود) جو نماز تو پڑھتے تھے لیکن عموماً اس کی حقیقت سے بیگانہ تھے، ان کی نمازیں بالعموم اخلاص واثر، سکون ودلجمعی، خشوع وخضوع اور خوف وخشیت سے بالکل خالی تھیں، دوسرے وہ (یعنی عیسائی) جو خدا کی نماز کے ساتھ انسانوں کو بھی اپنے سجدہ کے قابل سمجھتے تھے اور ان کی عبادتیں کرتے تھے اور وہ چیز جو توحید کا آئینہ تھی، ان کے ہاں شرک کا مظہر بن گئی تھی۔ تیسرے وہ (یعنی عرب بت پرست) جنہوں نے نہ کبھی خدا کا نام لیا اور نہ کبھی خدا کے آگے سر جھکایا وہ اس روحانی لذت سے آشنا ہی نہ تھے۔

توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم

آنحضرت ﷺ جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو آپ کو ملا وہ نماز کا تھا۔ ﴿ يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ ﴾ (۷۴/ المدثر: ۱۔۳) ''اے لحاف میں لپٹے ہوئے اٹھ اور ہشیار کر اور اپنے رب کی بڑائی بول۔'' رب کی بڑائی بولنا یہی نماز کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ نماز تکمیل کے مدراج طے کرتے ہوئی اس لفظ پر پہنچ گئی جو روحانی معراج کی آخری سرحد ہے۔ آپ نے سونے والوں کو جگایا، بھولے ہوؤں کو بتایا، انجانوں کو سکھایا اور خدا اور بندے کے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑا، گوشت پوست

---

[1] ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکور، ج ۳۰، ص: ۱۴۰، ۱۴۱۔ [2] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ: ۳۶۷۸۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب المراۃ تطرح عن المصلی شیئا من الاذی: ۵۲۰۔

[4] سیرۃ ابن ہشام (ابتداء ما افترض اللہ سبحانہ من الصلوٰۃ)، ج ۱، ص: ۱۶۲۔

کے، سونے چاندی کے اور اینٹ اور پتھر کے ان بتوں کو جو خدا کی جگہ کھڑے تھے دھکیل کر نیچے گرا دیا۔ صرف ایک خدا کی نماز دنیا میں باقی رکھی اور خدا کے سوا ہر ایک کے سجدہ کو حرام کر دیا، اس طرح آپ کی تعلیم کے ذریعہ سے نماز کی اصل حقیقت دنیا میں ظاہر ہوئی۔ آپ نے اہل عرب اور دنیا کی بت پرست قوموں کو نماز کا طریقہ بتایا، اس کے ارکان و آداب سکھائے، مؤثر دعائیں تعلیم کیں، عیسائیوں کو مخلصانہ عبادت اور ایک خدا کی پرستش کا سبق دیا۔ یہودیوں کو نماز کے خضوع وخشوع راز و نیاز اور اخلاص واثر سے باخبر کیا اور انبیائے عالم کی نماز کو اپنے عمل کے ذریعہ سے شکل وصورت اور روح وحقیقت دونوں کے ساتھ ناقابل تحریف اور غیر متغیر وجود بخش دیا۔ حکم ہوتا ہے کہ

﴿ حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۳۸)

''نمازوں کی نگہداشت کرو۔''

یہ نماز کی ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے نگہداشت کا حکم ہے اور مسلمان کی پہچان یہ مقرر ہوئی کہ

﴿ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ۝ ﴾ (۶/ الانعام:۹۲)

''اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہیں۔''

﴿ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ۝ ﴾ (۷۰/ المعارج:۲۳)

''جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔''

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۹)

''اور (کامیاب ہیں) وہ جو اپنی نمازوں کی نگہداشت کرتے ہیں۔''

خود آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ خود بھی نماز پڑھو اور اپنے اہل وعیال کو بھی اس کا حکم دو اور اس نماز پر جس کا مکہ کے قیام کے زمانہ میں ادا کرنا بہت مشکل ہے، پوری پابندی اور مضبوطی کے ساتھ جمے رہو۔ فرمایا:

﴿ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۳۲)

''اور اپنے گھر والوں پر نماز کی تاکید رکھو اور خود بھی اس کے اوپر جمے (پابند) رہو۔''

نماز کیسی ہونی چاہیے؟ فرمایا:

﴿ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۳۸)

''اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے رہو۔''

تعریف کی گئی کہ

﴿ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۲)

''کامیاب ہیں وہ مومن جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں۔''

حکم ہوا کہ

﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ﴾ (۷/ الاعراف:۵۵)

''تم اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو۔''

﴿ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ﴾ (۷/ الاعراف:۵۶)

''اور اس (خدا) کو ڈر اور امید کے ساتھ پکارو۔''

﴿ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ (۷/ الاعراف:۲۹)

''اور خدا کو پکارو اس حال میں کہ تم دین کو اسی کے لئے خالص کرنے والے ہو۔''

اس اجمال کے بعد نماز کے تمام مباحث پر ایک تفصیلی نگاہ کی ضرورت ہے۔

اسلام میں نماز کا مرتبہ

اسلام سے پہلے بھی دنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں آیا جس میں نماز کو اہمیت نہ دی گئی ہو، لیکن چونکہ وہ مذہب خاص خاص قوموں اور وقتوں تک محدود تھے، اس لئے ان کے اندر سے عملاً اس کی اہمیت جاتی رہی۔ چنانچہ اسلام سے پہلے کی دنیا کے کسی مذہب میں آج نماز یعنی خدا کے سامنے اقرارِ عبودیت اور اس کی حمد وثنا کو واضح معین اور تاکیدی حیثیت حاصل نہیں۔ یعنی کسی مذہب کے پیرووں بلکہ معلموں کے عمل سے بھی اس کی یہ صورت نمایاں نہیں ہوتی۔ ورنہ جیسا کہ گزر چکا قرآن کے رو سے تو دنیا میں کوئی ایسا پیغمبر نہیں آیا، جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور اس نے اپنی امت کو اس کی تاکید نہ کی ہو، مگر موجودہ حیثیت یہ ہے کہ اسلام کے سوا وہ کہیں نمایاں واضح اور مؤکد صورت میں باقی نہیں رہی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ محمد رسول اللہ ﷺ خاتم الانبیاء اور قرآن پاک خاتم الکتب ہو کر آیا ہے، اس لئے اس فریضہ الٰہی کو دینِ کامل میں ایسی منظم، واضح مؤکد اور نمایاں صورت دی گئی ہے کہ وہ قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے۔ یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان متنفس جب تک اس میں کچھ بھی ہوش وحواس باقی ہے، کسی حالت میں بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک میں سو مرتبہ سے زیادہ اس کی تعریف، اس کی بجا آوری کا حکم اور اس کی تاکید آئی ہے۔ اس کے ادا کرنے میں سستی اور کاہلی نفاق کی علامت [1] اور اس کا ترک کفر کی نشانی [2] بتائی گئی ہے، یہ وہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ پیدا اور اس کی تکمیل اس شبستان قدس میں ہوئی جس کو معراج کہتے ہیں۔ [3]

---

[1] منافقین کی صفت میں ہے: ﴿ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ﴾ (۴/ النسآء:۱۴۲) ''جب وہ نماز کو اٹھتے ہیں تو سست وکاہل ہو کر اٹھتے ہیں۔'' ﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴾ (۱۰۷/ الماعون:۴۔۵) ''افسوس ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں۔'' [2] کفار کے بارے میں ہے: ﴿ لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴾ (۷۴/ المدثر ۴۳) ''ہم نمازیوں میں نہ تھے۔'' یہ وہ اس وقت کہیں گے جب ان سے پوچھا جائیگا کہ تم دوزخ میں کیوں ہو۔ [3] کتب صحاح واقعات معراج واسراء وصحیح بخاری، کتاب الصلوۃ، باب کیف فرضت الصلوۃ فی الاسراء: ۳۴۹۔

اسلام میں پہلا فرض ایمان اور اس کے لوازم ہیں اور اس کے بعد دوسرا فرض نماز ہے۔ چنانچہ سورۂ روم (رکوع ۴) میں پہلا حکم یہ دیا گیا: ﴿ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ ﴾ (۳۰/الروم:۳۰) ''اپنا منہ ہر طرف سے پھیر کر دین توحید پر سیدھا رکھو وہی اللہ کی فطرت ہے، جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے۔'' اس کے بعد دوسرا حکم اسی سے ملحق یہ ہے:

﴿ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴾ (۳۰/ الروم:۳۱)

''اور نماز کو کھڑا رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔''

اس آیت پاک سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے اور دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترکِ نماز سے کفر و شرک میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے، کیونکہ جب تک دل کی کیفیت کو ہم بیرونی اعمال کے ذریعہ سے بڑھاتے نہ رہیں، خود اس کیفیت کے زائل ہو جانے کا خوف لگا رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے اور اس کے تارک کے متعلق شرک اور کفر کا ڈر ظاہر فرماتے رہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''نماز دین کا ستون ہے۔'' جس طرح ستون گر جانے سے عمارت گر جاتی ہے، اسی طرح نماز کے ترک کرنے سے دل کی دینداری بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ طائف کے وفد نے جب مدینہ منورہ آ کر صلح کی بات چیت شروع کی تو نماز، جہاد اور صدقات سے مستثنیٰ ہونا چاہا آپ نے دو پچھلی باتوں سے مستثنیٰ کر دیا۔ لیکن نماز کے متعلق فرمایا: ''جس دین میں خدا کے سامنے جھکنا نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں۔'' آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''نماز دل کی روشنی ہے۔'' اپنی نسبت فرمایا ہے: ''نماز میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے۔'' ایک تمثیل میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''انسان آگ میں جلتا رہتا ہے اور نماز سے وہ آگ بجھ جاتی ہے'' یہ محبوبِ ازل کے ہجر و فراق کی آگ ہے اور نماز آبِ زلال ہے جو اس آگ کو سرد کر دیتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کفر اور ایمان کے درمیان امتیاز نماز ہی سے ہے۔'' کیونکہ ایمان اور کفر دونوں انسان کی اندرونی حالت سے تعلق رکھتے ہیں، جس کا اظہار اس کے اعمال ہی سے ہو سکتا ہے۔ مسلمان کا وہ عمل جس کے دیکھنے کا دن میں متعدد دفعہ لوگوں کو موقع ملے نماز ہی ہے عین اس وقت جب جنابِ رسالت پناہ کی زندگی کے اخیر لمحے تھے اور فرض نبوت کے آخری حروف زبان مبارک سے ادا ہو رہے تھے، آپ ﷺ فرما رہے تھے: ''نماز اور غلام۔'' [1]

نماز کی حقیقت

نماز کے لیے اصل عربی لفظ صلوٰۃ ہے۔ صلوٰۃ کے معنی عربی اور عبرانی زبانوں میں دعا کے ہیں، اس لیے نماز کی لفظی حقیقت خدا سے درخواست اور التجا ہے اور اس کی معنوی حقیقت بھی یہی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے

---

[1] یہ تمام حدیثیں کنز العمال، (کتاب الصلوۃ، ج ٤) میں مختلف کتب حدیث کے حوالوں سے درج ہیں۔

بھی نماز کی یہی تشریح فرمائی ہے۔ معاویہ بن حکم سلمی ایک نو مسلم صحابی تھے، ان کو اسلام کے جو آداب بتائے گئے ان میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ ''جب کبھی کسی مسلمان کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو اس کے جواب میں تم یرحمک اللہ کہو۔'' اتفاق سے ایک دفعہ نماز باجماعت ہو رہی تھی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اس میں شریک تھے، ان کے پاس کسی مسلمان کو چھینک آئی، انہوں نے نماز کی حالت میں یرحمک اللہ کہہ دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کو گھورنا شروع کیا۔ معاویہ نے نماز ہی میں کہا تم سب مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے زانو پر ہاتھ مارے اور سبحان اللہ کہا، اب وہ سمجھے کہ بولنے سے منع کیا جا رہا ہے۔ نماز ہو چکی تو آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ ''نماز میں کون باتیں کرتا تھا۔'' لوگوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے ان کو پاس بلا کر نہایت نرمی سے سمجھایا کہ ''نماز قرآن پڑھنے اور اللہ کو یاد کرنے اور اس کی پاکی اور بڑائی بیان کرنے کا نام ہے، اس میں انسان کو باتیں کرنا مناسب نہیں۔'' [1] حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا: ((الدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) ''دعا عبادت کا مغز ہے۔'' اور حضرت نعمان بن بشیر انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((الدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) ''دعا ہی عبادت ہے۔'' اس کے بعد آپ نے یہ کہہ کر کہ تمہارا پروردگار فرماتا ہے اس تفسیر کی تائید میں یہ آیت پڑھی۔ [2]

جس میں دعا ہی کا نام عبادت بتایا گیا ہے:

﴿ ادْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ۝ ﴾

(٤٠/ المؤمن:٦٠)

''مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا، جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں، وہ عنقریب جہنم میں جائیں گے۔''

مستدرک حاکم (کتاب الدعاء) میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بہترین عبادت دعا ہے''۔ اس کے بعد آیت مذکور تلاوت فرمائی۔ قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کے ضمن میں نماز کی حقیقت صرف ایک لفظ میں ظاہر کی گئی ہے۔ یعنی خدا کی یاد فرمایا:

﴿ وَأَقِمِ الصَّلَوٰةَ لِذِكْرِيٓ ۝ ﴾ (٢٠/ طٰهٰ:١٤)

''اور میری یاد کے لیے نماز کھڑی کر۔''

کامیابی اسی کے لیے ہے جو خدا کو یاد کر کے نماز ادا کرتا ہے:

---

[1] سنن ابی داود، کتاب الصلوة، باب تشمیت العاطس فی الصلوة: ٩٣٠، ٩٣١ یہ دو روایتیں ہیں ہم نے ان دونوں کو جمع کر لیا ہے۔ [2] یہ دونوں حدیثیں جامع ترمذی، کتاب الدعوات، باب الدعاء مخ العبادة: ٣٣٧١، ٣٣٧٢ میں ہیں؛ ابوداود، کتاب الوتر، باب الدعاء: ١٤٧٩؛ مستدرك حاكم، كتاب الدعاء، ج١، ص: ٤٩١۔

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ ﴾ (۸۷/ الاعلیٰ:۱۴۔۱۵)

''کامیاب وہ ہوا جس نے پاکی حاصل کی اور خدا کا نام یاد کیا پس نماز پڑھی۔''

انسان کو اپنی روحانی تڑپ، دلی بے چینی، قلبی اضطراب اور ذہنی شورش کے عالم میں جب دنیا اور دنیا کی ہر چیز فانی، عقل کی ہر تدبیر درماندہ، جسم کی ہر قوت عاجز اور سلامتی کا ہر راستہ بند نظر آتا ہے تو سکون واطمینان کی راحت اس کو صرف اسی ایک قادر مطلق کی پکار، دعا اور التجا میں ملتی ہے۔ وحی الٰہی نے اس نکتہ کو ان الفاظ میں ادا کیا:

﴿ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۝ ﴾ (۱۳/ الرعد:۲۸)

''ہاں! خدا ہی کی یاد سے دلی تسکین پاتے ہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ مصیبتوں کے ہجوم اور تکلیفوں کی شدت کے وقت ثبات قدم اور دعا ہی چارہ کار بنتے ہیں

﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۴۵)

''ثابت قدمی اور نماز (یا دعا) کے ذریعہ سے اپنی مصیبتوں میں مدد چاہو۔''

زمین سے لے کر آسمان تک کائنات کا ذرہ ذرہ خدائے قادر وتوانا کے سامنے سرنگوں ہے، آسمان، زمین، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ، جنگل، جھاڑ، چرند، پرند سب اس کے آگے سربسجود ہیں اور اس کے مقرر کردہ احکام وقوانین کی بے چون وچرا اطاعت کررہے ہیں، یہی ان کی تسبیح ونماز ہے:

﴿ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآءیل:۴۴)

''اور (دنیا میں) کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ اس (خدا) کی حمد کی تسبیح پڑھتی ہے، البتہ تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔''

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ ﴾

(۲۲/ الحج:۱۸)

''کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج چاند تارے پہاڑ درخت جانور اور بہت سے آدمی اس کو سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے آدمیوں پر اس کا عذاب ثابت ہو چکا (یوں کہ وہ اس کو سجدہ نہیں کرتے تھے)۔''

غور کرو! کائنات کا ذرہ ذرہ بلا استثنا خدا کے سامنے سرنگوں ہے۔ لیکن استثنا ہے تو صرف انسان میں کہ بہتیرے اس کو سجدہ کرتے ہیں اور بہتیرے اس سے روگرداں ہیں، اسی لیے وہ عذاب کے مستحق ہو چکے۔ انسان کے علاوہ تمام مخلوقات بلا استثنا اطاعت گزار ہے، کیونکہ وہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے سرفراز نہیں، خدا کے حکم

کے مطابق وہ ازل سے اپنے کام میں مصروف ہے اور قیامت تک مصروف رہے گی، لیکن انسان ذاتی ارادہ و اختیار کا ایک ذرہ پا کر سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہے، اسلام کی نماز انہیں سرکش اور باغی انسانوں کو دوسری مطیع و فرمانبردار مخلوقات کی طرح اطاعت وانقیاد اور بندگی وسرافگندگی کی دعوت دیتی ہے۔ جب دنیا کی تمام مخلوقات اپنی اپنی طرز اور اپنی اپنی بولیوں میں خدا کی حمد وثنا اور تسبیح وتہلیل میں مصروف ہے تو انسان کیوں نہ اپنے خدا کی تقدیس کا ترانہ گا کر اپنی اطاعت کا ثبوت پیش کرے اور یہی نماز ہے۔

نماز کی روحانی غرض وغایت

نماز کی روحانی غرض وغایت یہ ہے کہ اس خالقِ کل، رازقِ عالم، مالک الملک، منعمِ اعظم کی بے غایت بخششوں اور بے پایاں احسانوں کا شکر ہم اپنے دل اور زبان سے ادا کریں تاکہ نفس وروح اور دل ودماغ پر اس کی عظمت وکبریائی اور اپنی عاجزی وبے چارگی کا نقش بیٹھ جائے۔ اس کی محبت کا نشہ رگ رگ میں سرایت کر جائے، اس کے حاضر وناظر ہونے کا تصور ناقابل زوال یقین کی صورت میں اس طرح قائم ہو جائے کہ ہم اپنے ہر دلی ارادہ ونیت اور ہر جسمانی فعل وعمل کے وقت اس کی ہوشیار اور بیدار آنکھوں کو اپنی طرف اٹھا ہوا دیکھیں، جس سے اپنے برے ارادوں پر شرمائیں اور ناپاک کاموں کو کرتے ہوئے جھجکیں اور بالآخر ان سے بالکل باز آئیں۔ صحیحین کی کتاب الایمان میں ہے کہ ایک روز آنحضرت ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مجمع میں تشریف فرما تھے، ایک شخص نے سائل کی صورت میں آ کر ایمان اسلام کی حقیقت دریافت کی۔ آپ نے اس کی تشریح فرمائی پھر پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ احسان کیا ہے؟ فرمایا: ''یہ کہ تم اپنے پروردگار کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیوں کہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے۔'' اسی طرح ایک اور شخص کو نماز کے آداب کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ ''نماز کی حالت میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کیوں کہ اس وقت وہ اپنے رب کے ساتھ راز ونیاز کی باتوں میں مصروف ہوتا ہے۔'' [1] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک رات جب آپ اعتکاف میں بیٹھے تھے اور شاید لوگ الگ الگ تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے تو آپ ﷺ نے سر مبارک باہر نکال کر فرمایا: ''لوگو! نمازی جب نماز پڑھتا ہے تو اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے، اس کو جاننا چاہیے کہ وہ کیا عرض معروض کر رہا ہے، نماز میں ایک دوسرے کی آواز کو مت دباؤ۔'' [2] ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ نماز کی عادت سے ایک مخلص نمازی کے دل ودماغ پر کیسے نفسیاتی اثرات طاری ہو سکتے ہیں اور اس کے اخلاق وعادات پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں اس نکتہ کی شرح اس طرح کی گئی:

[1] صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ، باب حك البزاق بالید من المسجد: ٤٠٥؛ مسلم، باب المساجد، باب النهی عن البصاق فی المسجد: ١٢٣٠؛ مسند احمد، ج٢، ص: ٣٤۔

[2] مسند احمد، ج٢، ص: ٣٦، ٦٧، ١٢٩۔

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ﴾

(۲۹/ العنکبوت:۴۵)

''اور نماز کھڑی کیا کر کہ نماز بے حیائی اور برائی کی باتوں سے روکتی ہے اور البتہ خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے۔''

اس آیت میں نماز کی دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں ایک تو یہ کہ نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روکتی ہے اور دوسری اس سے بڑھ کر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے اور خدا کی یاد سے بڑھ کر کوئی بات نہیں، بے حیائی اور برائی کی باتوں سے بچنے کا نام تزکیہ اور صفائی ہے یعنی اس سلبی حالت کی یہ ایجابی صورت ہے جس کا حصول انسان کی منزلِ مقصود اور حقیقی کامیابی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۭ ﴾ (۸۷/ الاعلیٰ:۱۴۔۱۵)

''کامیاب ہوا وہ جس نے صفائی حاصل کی اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح اور پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا نام لے یعنی نماز پڑھے اس سے زیادہ واضح یہ آیت پاک ہے:

﴿ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴾ (۳۵/ فاطر:۱۸)

''تو انہیں کو تو ہشیار کر سکتا ہے جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور نماز کھڑی کیا کرتے ہیں اور جو تزکیہ اور دل کی صفائی حاصل کرتا ہے وہ اپنے ہی لیے حاصل کرتا ہے اور (آخر) خدا ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ نماز انسان کو اس کی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی، نفسانی برائیوں سے ہٹاتی اور اس کی روحانی ترقیوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے۔ فرمایا:

﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۙ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۙ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۙ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰي صَلَاتِهِمْ دَاۗىِٕمُوْنَ ۽ ﴾ (۷۰/ المعارج:۲۰۔۲۳)

''بے شک انسان بے صبرا بنا ہے جب اس پر مصیبت آئے تو گھبرایا اور جب کوئی دولت ملے تو بخیل لیکن وہ نمازی (ان باتوں سے پاک ہیں) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔''

آپ نے دیکھا کہ پابندی سے نماز ادا کرنے والے کے لیے قرآن نے کن اخلاقی برکتوں کی بشارت سنائی ہے۔

نماز کے انہیں ثمرات اور برکات کی بنا پر ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک تمثیل میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے

فرمایا کہ "اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے ایک صاف وشفاف نہر بہتی ہو جس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس پر میل رہ سکتا ہے؟" صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی! نہیں یارسول اللہ ﷺ! ارشاد ہوا کہ "نماز بھی اسی طرح گناہوں کو دھو دیتی ہے جس طرح پانی میل کو۔" [1] ایک دفعہ ایک بدوی مسلمان نے آ کر اپنے ایک گناہ کی معافی کی تدبیر پوچھی اس پر یہ آیت نازل ہوئی: [2]

﴿وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۚ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ﴾ (۱۱/ ھود:۱۱٤)

"اور دن کے دونوں کناروں پر اور رات کے کچھ ٹکڑوں میں نماز کھڑی کیا کرو، بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے یاد رکھنے والوں کے لیے۔"

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ مذہب اپنے پیرووں میں جس قسم کے جذبات اور محرکات پیدا کرنا چاہتا ہے ان کا اصلی سرچشمہ یہی نماز ہے جو اپنے صحیح آداب وشرائط کے ساتھ بجا لائی گئی ہو یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نماز کو دین کی عمارت کا اصلی ستون قرار دیا ہے جس کے گر جانے سے پوری عمارت کا گر جانا یقینی ہے۔

نماز کے لیے کچھ آداب وشرائط کی ضرورت

جس طرح مادی عالم کے کچھ قانون ہیں جن کی پابندی اور رعایت سے ہمارے اعمال کے صحیح نتائج پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی دنیا جس کو مذہب "قلب کا عالم" اور فلسفہ نفسیات یا "دماغی کیفیات" کہتا ہے اس کے لیے بھی کچھ قانون اور اسباب ہیں جن کی پابندی اور رعایت سے قلب ودماغ اور نفس وروح کے مطلوبہ اعمال وافعال سامنے آتے اور ان کے صحیح نتیجے مرتب ہوتے ہیں۔ سائیکالوجی (علم نفسیات) کے انکشاف اور ترقی نے اب اس گرہ کو بالکل کھول دیا ہے اس نے بتایا ہے کہ ہم اپنے یا دوسروں کے اندر جس قسم کے جذبات اور ولولے پیدا کرنا چاہیں اور ان کے مناسب شکل وصورت اور ماحول (گرد وپیش) نہ اختیار کریں تو ہم کو ان کے پیدا کرنے میں کامیابی نہیں ہوسکتی۔ ہمارے تمام تمدنی اجتماعی اور معاشرتی قوانین اسی اصول کے تحت میں وضع ہوئے ہیں اور اسی اصول کی بنا پر ہر قسم کے مذہبی، سیاسی اور اجتماعی مقاصد کے حصول کے لیے رواجی رسوم وآداب اور قواعد وضوابط مقرر ہیں۔ معبدوں، ہیکلوں اور گرجوں میں جہاں مذہبی عظمت وتقدس پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، پجاریوں اور کاہنوں کے خاص لباس، خاص رسوم وآداب، سکون وخاموشی، ادب ولحاظ، گھنٹوں کی پرشکوہ آواز اور نشست وبرخاست کے خاص طریقے ضروری سمجھے گئے ہیں شاہانہ رعب

[1] یہ حدیث مختلف کتابوں میں مختلف روایتوں کے ساتھ آئی ہے کنز العمال، (ج٤، ص: ٦٧ و ٦٨) میں حاکم، ١/ ٢٠٠؛ احمد، ١/ ١٧٧؛ ابن خزیمۃ: ٥٢٨ وطبرانی کبیر: ٧٥٨٤ اور بیھقی کے حوالوں سے یہ تمام روایتیں یکجا مذکور ہیں۔

[2] صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوۃ، باب الصلوۃ کفارۃ: ٥٢٦ وکتاب التفسیر: ٤٦٨٧۔

وداب کے اثرات پیدا کرنے کے لیے شاہی جلوسوں اور سلطانی درباروں میں فوجوں کے پرے قوی ہیکل چوبدار عصابردار نقیب و چاؤش خدام کی زرق برق پوشاکیں، ننگی تلواریں، بلند نیزے، تخت وتاج، علم و پرچم، ماہی مراتب، نوبت ونقارہ اور دمبدم دور باش اور نگاہ روبرو کی پررعب صدائیں ضروری ہیں، کسی تعلیمی یا علمی میلان پیدا کرنے کے لیے فضا کا سکون و خاموشی، مقام کی سادگی وصفائی، شوروغوغا اور شہر و بازار سے دوری، ضروری چیزیں ہیں، بزمِ عروسی کے لیے رنگ وبو، نوروسرور، گانا بجانا اور عیش ونشاط کا اظہار طبعی ہے۔ انہی طبعی ونفسی اصول کی بنا پر مذہبی اعمال میں بھی ان محرکات وآداب وقوانین کی رعایت رکھی گئی ہے۔ نماز سے مقصود دل کے خضوع وخشوع، توبہ وانابت، پشیمانی وشرمندگی، اطاعت وبندگی اور خدا کی عظمت وکبریائی اور اپنی عاجزی ودرماندگی کا اظہار نیز دل ودماغ اور نفس وروح میں پاکی صفائی اور طہارت پیدا کرنا ہے اس بنا پر نماز کے لیے بھی ایسے آداب وشرائط اور ارکان مقرر کیے گئے جن سے انسان کے اندر اس قسم کے جذبات کو تحریک اور نشوونما ہو۔ مثلاً: نماز پڑھنے والا یہ سمجھ کر کہ وہ اب شہنشاہِ عالم کے دربار میں کھڑا ہے، ہاتھ باندھے رہے، نظر نیچے کیے رہے، طور وطریق اور حرکات وسکنات میں ادب واحترام کا لحاظ رکھے، نماز کی جگہ پاک ہو، بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہوں، ادب سے اس کی بارگاہ میں اپنی دعاؤں اور التجاؤں کو پیش کرے، اس ظاہری مجموعی ہیئت کا اثر انسان کی باطنی کیفیت پر پڑتا ہے اور اس میں روحانی فیوض وبرکات کی استعداد وصلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ظاہری صفائی وپاکیزگی کا لحاظ نہ رکھا جائے تو دل کی صفائی وپاکیزگی کا تصور اس کے اندر مؤثر انداز میں کیوں کر پیدا ہوگا، یہی نفسی اصول ہے جو انسان کے ہر نظام اور ارادہ میں جاری وساری ہے۔ اندر بنانے کے لیے باہر کا بنانا بھی ایک حد تک ضروری ہے۔

اسی اصول کی بنا پر تنہائی کی فرض نمازوں سے جماعت کی نماز اور گھر کی نمازوں سے مسجد کی نماز بہتر ہے کہ جماعت کا ماحول اور مسجد کا منظر دلوں کی کیفیت کو دوبالا کردے گا۔ اسی بنا پر تمام بڑے بڑے کاموں میں اجتماعیت اور نظام کی وحدت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اسی اصول کے ماتحت اسکولوں کی تنظیم اور ان کی درجہ بندی، کھیل میں فریقین کی ہم رنگی وہم لباسی، فوجوں میں وردی اور حرکت وعمل کی یکسانی کی ضرورت سمجھی گئی ہے اور یکساں اسلحہ اور ہتھیار اور ہمقدم سکون ورفتار کی بھی ضرورت ہے کہ ان ظاہری محرکات کا اثر پوری جماعت کے اندرونی تخیل پر پڑتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت میں چند اشخاص ایسے ہوں جو اصلی کیفیت سے متکیف ہوں ان کی یہ حقیقی کیفیت اپنے اثر سے دوسروں کو بھی پرکیف بناتی ہے اور ان سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا متاثر ہوکر کم وبیش پوری جماعت متاثر ہوجاتی ہے، اسی لیے جلسوں میں ایک کی ہنسی سے سب کو ہنسی اور ایک کے رونے سے بہتوں کو رونا آجاتا ہے۔ نفسیاتِ اجتماع میں یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہے، غرض اسی سے اسلام نے اپنی عبادت کے لیے ان طبعی ونفسی اصول کا بڑا لحاظ رکھا ہے نماز کے

آداب شرائط اور ارکان انہی کا نام ہے۔

ذکرودعاوتسبیح کے دوطریقے

یہ بار بار دہرایا جا چکا ہے کہ نماز سے مقصود خضوع وخشوع، ذکر الٰہی، حمد وثنا، اپنے گناہوں پر ندامت و استغفار اور اسی قسم کے دوسرے پاک جذبات کی تحریک ہے۔ یہ تمام باتیں درحقیقت انسان کے دل سے تعلق رکھتی ہیں جن کے لیے ظاہری ارکان کی حاجت نہیں ہے۔ اسی لیے اسلام نے اپنی عبادتوں کی دو قسمیں کی ہیں ایک تو وہ جن کو انسان ہر حال اور ہر صورت میں کسی قید وشرط کے بغیر ادا کر سکے اس کا نام عام تسبیح وتہلیل اور ذکرِ الٰہی ہے جس کے لیے نہ زمانہ کی قید ہے نہ مکان کی شرط ہے، نہ اٹھنے بیٹھنے کی پابندی ہے، یہ عبادت ہر لحظہ اور ہر صورت میں انجام پا سکتی ہے۔ چنانچہ خدا نے فرمایا:

﴿ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ﴾ (٤/ النسآء:١٠٣)

''پس تم اللہ کو کھڑے بیٹھے اور لیٹے یاد کرو۔''

اور محمد رسول اللہ ﷺ کے فیض صحبت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہی حالت تھی، خدا نے ان کی مدح فرمائی:

﴿ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ ﴾ (٣/ آل عمران:١٩١)

''جو کھڑے بیٹھے لیٹے خدا کو یاد کرتے ہیں۔''

دنیاوی مشاغل اور ظاہری کاروبار بھی ان کو اس فرض سے غافل نہیں کرتے۔ فرمایا:

﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ (٢٤/ النور:٣٧)

''ایسے لوگ ہیں جن کو تجارتی کاروبار اور خرید وفروخت کے مشاغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔''

نماز متحدہ طریقہ عبادت کا نام ہے

دوسری عبادت وہ ہے جو خاص شکل وصورت کے ساتھ خاص اوقات میں اور خاص دعاؤں کے ذریعہ ادا کی جائے اس کا نام نماز ہے۔ پہلا طرز عبادت انفرادی چیز ہے اور وہ ہر فرد کے جداگانہ انتخاب پر منحصر ہے۔ اس کو جماعتی حیثیت حاصل نہیں ہے اور نہ اسلام میں اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا مسنون بتایا گیا ہے وہ تنہائی کا راز ہے جس کو اس طرح خاموشی سے ادا کرنا چاہیے کہ ریا اور نمائش کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو سکے لیکن دوسری قسم کی عبادت درحقیقت جماعتی صورت رکھتی ہے اور اسی لیے اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے اور اس کے انکار پر قتل تک جائز ہو سکتا ہے۔ اگر اس کو جماعت کے ساتھ کوئی شخص ادا نہ کرے تو اگرچہ وہ ادا ہو جائے گی لیکن جماعت کے ثواب اور برکات سے اس شخص کو محرومی رہے گی۔ دوسرے لفظوں میں ہم اس کو یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ عام ذکر وفکر اور تسبیح وتہلیل انفرادی طریقہ عبادت ہے اور نماز ایک جماعتی

شعار ہے جو خاص ارکان اور شرائط کے ساتھ اوقات مقررہ پر ادا ہوتی ہے اور جس کے ادا کرنے کا جماعت کے ہر فرد کو ہر حالت میں حکم ہے البتہ اگر کسی عذر کی بنا پر جماعت کے ساتھ ادا نہ ہو سکے تو تنہا بھی اس کو ادا کرنا ضروری ہے۔ اس کی مثال اس سپاہی کی سی ہے جو کسی منزل میں اپنی فوج سے جس کے ساتھ اس کو چلنا تھا کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا اب تنہا رہ کر بھی اس کو وہی فرض ادا کرنا ہے جو پوری فوج کے ساتھ اس کو ادا کرنا پڑتا۔

نماز میں نظامِ وحدت کا اصول

اسلام کے عام فرائض و احکام اور خصوصاً نماز اور اس کے متعلقات کی نسبت غور کرتے وقت ایک خاص اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ وہی اصول درحقیقت اسلام کا اصلی راز بلکہ سر الاسرار ہے۔ اسلام کی اصل حقیقت صرف ایک ہے اور وہ توحید ہے یہ توحید نہ صرف ایک فلسفیانہ موشگافی اور صوفیانہ نکتہ پروری ہے بلکہ وہ عملی کیفیت ہے جس کو اسلام کے ایک ایک حکم سے آشکارا ہونا چاہیے۔ اسلام کے دوسرے احکام کی طرح نماز بھی اس حقیقت اور کیفیت کا مظہر ہے نماز کی ایک ایک حرکت، ایک ایک جنبش، ایک ایک لفظ، ایک ایک اشارہ اور ایک ایک طرز سے اس حقیقت و کیفیت کو تراوش کرنا چاہیے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک نماز کی کوئی خاص شکل و صورت آئین و طریق اور سمت و وقت مقرر نہ کیا جاتا جماعتیں اس کو ایک متحدہ نظام میں ادا نہیں کر سکتی تھیں، نماز لاکھوں کروڑوں مسلمانوں پر جنہوں نے دعوت محمدی ﷺ کو قبول کیا فرض تھی اب اگر ان میں سے ہر ایک کو یہ اجازت ہوتی کہ جیسے چاہے جب چاہے جدھر منہ کر کے چاہے ادا کر لے تو اسلام کی وحدت کا نظام قائم نہ رہتا اور نہ اس کے دل کی طرح اس کی جسمانی اداؤں سے بھی توحید کا راز آشکار ہوتا اور نہ کل روئے زمین کے لاکھوں کروڑوں مسلمان واحد جماعت کی مجسم صورت بن سکتے۔ غرض اس نظام وحدت کا آشکارا و ہویدا کرنا توحید کا سب سے بڑا رمز اور شعار ہے اور کروڑوں دلوں کو جو کروڑوں اشباح و اجسام میں ہیں ایک متحد جسم اور واحد قالب ظاہر کرنا صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ان سے واحد نظام کے ماتحت واحد صورت و شکل میں واحد اعمال و افعال کا صدور کرایا جائے چنانچہ انسان کے تمام جماعتی نظام کی وحدت اسی اصول پر مبنی ہے قوم کی وحدت، فوج کی وحدت، کسی بزم و انجمن کی وحدت، کسی مملکت و سلطنت کی وحدت، غرض ہر ایک نظام وحدت اسی اصول پر قائم ہے اور اسی طرح قائم ہو سکتا ہے۔

نماز میں جسمانی حرکات

یہ بھی ظاہر ہے کہ نماز کی اصل غرض و غایت چند پاکیزہ جذبات کا اظہار ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان کے اندر کوئی خاص جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے حسب حال اس سے کوئی فعل یا حرکت بھی صادر ہوتی ہے غصہ کی حالت میں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، خوف میں زرد پڑ جاتا ہے، خوشی میں کھل اٹھتا ہے، غم میں سکڑ جاتا ہے، جب وہ کسی سے سوال کرتا ہے تو اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیتا ہے، کسی کی تعظیم کرتا ہے تو

اس کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، کسی سے عاجزی کا اظہار کرتا ہے تو اس کے آگے جھک جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ اپنا تذلل، فروتنی اور خوشامد مقصود ہو تو منہ کے بل گرتا ہے اور پاؤں پر سر رکھ دیتا ہے۔ یہ جذبات کے اظہار کے فطری طریقے ہیں جو ہر قوم میں تقریباً یکساں رائج ہیں۔ اس تشریح کے بعد اب یہ سمجھنا چاہیے کہ جس طرح نماز کی دعائیں انسانی طرز بیان میں ادا کی گئی ہیں اس کے ارکان بھی انسان کے فطری افعال و حرکات کی صورت میں رکھے گئے ہیں۔ انسان کے قلبی افعال و اعمال کے مظاہر اس کے جسمانی اعضاء ہیں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے ارادہ و نیت اور اس کے دلی جذبات و احساسات کے متعلق اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتا جب تک اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان سے ان کے مطابق کوئی عمل یا حرکت ظاہر نہ ہو اگر ایسا نہ ہو تو ہر انسان اپنی نسبت ولایت اور خیر کل ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے اور سوسائٹی کا کوئی ممبر اس کی تکذیب نہیں کر سکتا لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح سوسائٹی کی بنیاد ہی سرے سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے اگرچہ انسان کے اندر کی ہر چیز اسی طرح خدا کے سامنے ہے جس طرح باہر کی اور اس لیے خدا کو ظاہری اعمال کی ضرورت نہیں مگر خود بندوں کو ان کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے عرض و التجا اور تذلل و عاجزی کی تصویر بن جائیں۔ انسان اپنے جسم اور روح دونوں کے لحاظ سے خدا کا مخلوق ہے اس کی زندگی کے دونوں جزو خدا کے احسانات و انعامات سے یکساں گراں بار ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ اس خالق و رازق اور اس ارحم الراحمین کے سامنے روح اور جسم دونوں جھک کر سجدہ نیاز ادا کریں۔ غرض یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر شریعت نے جسم و جان دونوں کی رعایت کرتے ہوئے نماز کے ارکان مقرر کیے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ انسان کے فطری اعمال و حرکات کے قالب میں نماز کا پیکر تیار کیا گیا ہے۔ جسمانی طریقے سے ہم کسی بڑے محسن کی تعظیم اور اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار تین طریقوں سے کرتے ہیں، کھڑے ہو جاتے ہیں، جھک جاتے ہیں، زمین پر سر رکھ دیتے ہیں۔ نماز کے بھی یہ تین رکن ہیں چنانچہ آغاز عالم سے انبیائے کرام علیہم السلام نے جس نماز کی تعلیم انسانوں کو دی وہ انہیں تین اجزاء سے مرکب تھی کھڑے ہو جانا (قیام) جھک جانا (رکوع) اور زمین پر سر رکھ دینا (سجدہ)

ارکان نماز

معلوم ہو چکا ہے کہ نماز ملتِ ابراہیمی کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب خدا کے گھر کی تعمیر و تطہیر کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اس کی غرض بھی بتائی گئی:

﴿ وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۝ ﴾ (۲۲/ الحج:۲۶)

''اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، کھڑے ہونے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک وصاف کر۔''

اس حکم میں نماز کے تینوں ارکان قیام، رکوع اور سجود کا مفصل اور بہ ترتیب ذکر ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام

کا زمانہ سلسلہ اسرائیلی کا آخری عہد تھا ان کو خطاب ہوا:

﴿ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران :۴۳)

''اے مریم! اپنے رب کے حضور میں کھڑے ہو کر بندگی کر اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔''

اس نماز مریمی میں بھی نماز کے تینوں ارکان موجود ہیں۔

ان ارکان کی ترتیب

جب کوئی حقیقت تین مرتب ارکان سے مرکب ہو اور اس میں سے ایک کا اول ہونا اور دوسرے کا سب سے مؤخر ہونا ثابت ہو جائے تو تیسرے کا وسط میں ہونا خود بخود ثابت ہو جائے گا۔ چنانچہ نماز کی ہر رکعت قیام اور رکوع اور سجدہ سے مرکب ہے اور قیام کا اول اور سجود کا آخر ہونا قرآن پاک کی حسب ذیل آیت سے ثابت ہے تو رکوع کا ان دونوں کے بیچ میں ہونا خود بخود ثابت ہو جائے گا:

﴿ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ﴾ (۴/ النسآء:۱۰۲)

''جب تو ان میں ہے تو ان کے لیے نماز کھڑی کرے تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ کے لوگ تیرے ساتھ کھڑے ہوں اور اپنے ہتھیار لیے رہیں، پھر جب یہ سجدہ کر لیں تو یہ تمہارے پیچھے چلے جائیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ایک رکعت میں پہلے کھڑا ہونا ہے اور آخر میں سجدہ پر ایک رکعت تمام ہوئی ہے پس لامحالہ رکوع، قیام و سجود کے بیچ میں ہوگا اور ہر رکعت کے ارکان سہ گانہ کی ترتیب یہ ہوگی کہ اول قیام پھر رکوع، پھر سجود۔

صحف سابقہ میں نماز کے ارکان

تورات کے حوالوں سے بھی نماز کے مختلف ارکان کا پتہ چلتا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ مترجموں نے عبرانی اور یونانی لفظ کے ترجمے اپنے خیالات اور رسم و رواج کے مطابق کر دیے ہیں جس سے حقیقت کے چہرہ پر بڑی حد تک پردہ پڑ جاتا ہے۔ بہر حال عبادت اور تعظیم کے یہ تینوں طریقے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت اور ان کی نسل میں جاری تھے۔ ذیل میں ہم ان میں سے ہر ایک کا حوالہ تورات کے مجموعہ سے نقل کرتے ہیں۔

قیام

''پر ابرہام (ابراہیم) ہنوز خداوند کے حضور میں کھڑا رہا۔'' (پیدائش ۱۸۔۲۲)

رکوع

''اور (ابراہیم) زمین تک ان کے آگے جھکا اور بولا اے خداوند۔'' (پیدائش ۱۸۔۲)

سجدہ

''اور یہ سن کے کہ خداوند نے بنی اسرائیل کی خبر گیری کی اور ان کے دکھوں پر نظر کی انہوں نے اپنے سر جھکائے اور سجدے کیے'' (خروج ۴۔۳۱)

''تب ابرہام (ابرہیم) منہ کے بل گرا اور خدا اس سے ہم کلام ہو کر بولا۔'' (پیدائش ۱۷۔۳)

''تب ابرہام (ابرہیم) نے اپنے جوانوں سے کہا: تم یہاں گدھے کے پاس رہو میں اس لڑکے کے ساتھ (اپنے فرزند کی قربانی کے لیے) وہاں تک جاؤں گا اور سجدہ کر کے پھر تمہارے پاس آؤں گا۔'' (پیدائش ۲۲۔۵)

''تب اس مرد (حضرت اسحاق علیہ السلام کا ایلچی) نے سر جھکایا اور خداوند کو سجدہ کیا اور اس نے کہا میرے خداوند ابرہام کا خدا مبارک ہے۔'' (پیدائش ۲۴۔۲۶)

''اور ایسا ہوا کہ جب داود علیہ السلام، پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا جہاں اس نے خدا کو سجدہ کیا۔'' (۲ سموال ۱۵۔۳۲)

زبور میں حضرت داود علیہ السلام خدا تعالیٰ سے کہتے ہیں:

''اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کروں گا۔'' (زبور ۵۔۷)

ان حوالوں سے بخوبی ثابت ہے کہ ابراہیمی ملت میں عبادت اور تعظیم الٰہی کے یہ تینوں ارکان موجود تھے اور اسلام نے اسی کی پیروی کی ہے۔ موجود انجیل میں دعا اور نماز کا ذکر (متی ۶۔۵ و ۱۷۔۲۱ و ۲۶، ۳۶۔ مرقس ۱۴۔۳۳ ولوقا ۲۲۔۴۱) وغیرہ میں ہے۔ طریقہ نماز میں ایک انجیل میں ایک ہی موقع کے لیے گھٹنا ٹیکنا (جو گویا رکوع ہے) (لوقا ۲۲۔۴۱) اور دوسری میں (متی ۲۶۔۳۹) منہ کے بل گرنا یعنی سجدہ کرنا لکھا ہے اور بقیہ انجیلوں میں خاموشی ہے۔ عہد بعثت میں یہود و نصاریٰ میں جو لوگ نماز کے پابند تھے وہ بھی ان ارکان کو ادا کرتے تھے۔ کھڑے ہو کر توراۃ یا زبور کی آیتیں تلاوت کرتے تھے۔ اور سجدہ بھی کرتے تھے قرآن پاک کی شہادت ہے:

﴿ لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۱۳)

''وہ برابر نہیں ہیں اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں جو رات کو خدا کی آیتیں کھڑے ہو کر پڑھتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں۔''

روایات میں ہے کہ رکوع میں یہودیوں کی طرح دونوں ہاتھ جڑے نہ رہیں۔ [1] اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے یہود بھی نماز کے یہ مختلف ارکان ادا کرتے تھے۔ اسلام کی نماز بھی انہیں قدیم ارکان اور فطری شکل وصورت کے ساتھ فرض ہوئی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے اب تک چلی آ رہی تھی چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مصنفین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسلامی نماز اپنی ترکیب میں بہت حد تک یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے مشابہ ہے۔'' [2]

[1] فتح الباری ابن حجر، ج ۲، ص: ۲۲۷ مصر۔ [2] مضمون صلوۃ، ج ٤، ص: ٩٦۔

اسلام نے صرف یہ کیا کہ اس خزانہ کو وقف عام کر دیا۔ انسانی آمیزشوں کو نکال کر بھلائے ہوئے فریضوں کو دوبارہ یاد دلایا، مٹے ہوئے نقش کو ابھار دیا، نماز کے بے جان پیکر میں حقیقت کی روح پھونک دی اس میں اخلاص کا جوہر پیدا کیا اس کو دین کا ستون بنایا اور اپنی متواتر تعلیم وعمل سے اس کی ظاہری شکل و صورت کو بھی ہر انسانی تغیر سے محفوظ کر دیا اس طرح اس نے اس تکمیل کا فرض انجام دیا جس کے لیے وہ ازل سے منتخب تھا۔ یہ مسئلہ کہ نماز مطلق تسبیح وتہلیل اور ذکر الٰہی کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ کچھ ارکان بھی ہیں، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل متواتر کے علاوہ خود قرآن پاک سے بھی ثابت ہے۔ خوف اور جنگ میں نماز کے قصر اور ارکان کی تخفیف کی اجازت دی گئی ہے اس کے بعد ہے کہ جب خطرہ جاتا رہے تو نماز کو اس طرح ادا کرو جس طرح تم کو سکھایا گیا ہے۔

﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۳۸۔۲۳۹)

''نمازوں کی اور بیچ کی نماز کی نگہداشت کرو اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو پھر اگر خوف ہو تو پیادہ یا سوار ہو کر (پڑھو) پھر جب خوف جاتا رہے تو اللہ کو ویسے یاد کرو جیسے اس نے تم کو بتایا جو تم نہیں جانتے تھے۔''

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ذکر الٰہی کا کوئی خاص طریقہ تھا جس کی عملی شکل نماز ہے اور اس کی تفصیل سورۂ نساء میں ہے۔ اس طرح جنگ کی نماز میں ایک رکعت امام کے ساتھ باقاعدہ ادا کرنے کے بعد دوسری رکعت [1] کے متعلق کہا گیا ہے:

﴿ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ ﴾ (۴/ النسآء:۱۰۳)

''پس جب نماز (ایک رکعت) ادا کر چکو تو اللہ کو اٹھتے بیٹھتے اور پہلوؤں پر یاد کرو پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو۔''

اس آیت میں غور کرنے کی دو باتیں ہیں: اول یہ ہے کہ ایک رکعت جو باقاعدہ ادا ہوئی اس کو الصلوٰۃ (نماز) کہا گیا اور دوسری رکعت جو خدا کا نام اٹھ کر، بیٹھ کر، جھک کر، لیٹے اور لڑائی، حملہ اور مدافعت کی حالت میں پوری ہوئی اس کو صرف ذکر اللہ کہا گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جنگ کی اس عارضی مخفف نماز کو اقامت صلوٰۃ (نماز کھڑی کرنا) کے لفظ سے ادا نہیں کیا گیا حالانکہ ذکر الٰہی تسبیح وتہلیل اور بعض ارکان بھی اس میں

[1] اس کی تشریح میں فقہا کا اختلاف ہے، میں نے یہاں وہ لکھا ہے جو میرے نزدیک صحیح ہے۔

موجود تھے بلکہ یہ فرمایا گیا کہ پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ (نماز کھڑی کرنے) کے معنی مطلق ذکر وفکر، تسبیح وتہلیل، حمد وثنا اور تلاوت قرآن سے جداگانہ ہیں یعنی اقامتِ صلوٰۃ کے ضمن میں ذکر وفکر، تسبیح وتہلیل، حمد وثنا اور قراءت کے علاوہ کچھ اور ارکان بھی داخل ہیں جو جنگ کی حالت میں کم یا موقوف ہو گئے تھے اب اس عارضی مانع کے دور ہو جانے کے بعد پھر بدستور نماز میں ان کی بجا آوری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے یہی وہ ارکان تھے جن کے متعلق سورۂ بقرہ میں یہ کہا گیا تھا کہ جب خوف جاتا رہے تو پھر خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے بتایا ہے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اسلام میں نماز کن ارکان کے ساتھ مقرر ہوئی ہے۔ گو اس کے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تمام عمر خود کس طرح نماز پڑھی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو کس طرح کی نماز سکھائی کیوں کہ نماز کی یہ عملی کیفیت پورے تواتر کے ساتھ اس عہد سے لے کر آج تک موجود ہے اور دوست ودشمن اور مخالف وموافق کو معلوم ہے اور اسلام کے ہر فرقہ میں یکساں طور سے عملاً بلا اختلاف مسلّم ہے، تاہم نظریہ پسند لوگوں کے لیے قرآن پاک سے ان کا ثبوت پہنچا دینا زیادہ مناسب ہوگا:

ہم پہلے رب العزت کی بارگاہ میں مؤدب کھڑے ہوتے ہیں:

﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴾ (۲/ البقرہ:۲۳۸)

''نمازوں پر (عموماً) اور بیچ کی نماز پر (خصوصاً) نگاہ رکھو اور خدا کے آگے مؤدب کھڑے ہو۔''

نماز کا آغاز خدا کا نام لے کر کرتے ہیں کہ

﴿ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴾ (۸۷/ الاعلیٰ:۱۵)

''اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی۔''

﴿ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴾ (۷۴/ المدثر:۳)

''اور اپنے رب کی بڑائی کر۔''

لفظ اللہ اکبر جس کی نماز میں بار بار تکرار کی جاتی ہے اسی حکم کی تعمیل ہے۔

اس کے بعد خدا کی حمد وثنا کرتے اور اس سے اپنے گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں:

﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴾ (۵۲/ الطور:۴۸)

''اور جب تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر۔''

پھر قرآن پڑھتے ہیں:

﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ﴾ (۷۳/ المزمل:۲۰)

''قرآن میں سے جتنا ہو سکے پڑھو۔''

قرآن کی ان آیتوں میں خدا کے اسماء اور صفات کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس کی حمد خصوصیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں جس سے اس کی بڑائی (تکبیر) ظاہر ہوتی ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآء یل :۱۱۰۔۱۱۱)

’’کہہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو پکارو جو کہہ کر پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں اپنی نماز نہ بہت زور سے پڑھ اور نہ بہت چپکے بیچ کی راہ تلاش کر اور کہہ کہ حمد اس اللہ کی جس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور نہ سلطنت میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ درماندگی کے سبب سے اس کا کوئی مددگار ہے اور اس کی بڑائی کر بڑی بڑائی۔‘‘

چونکہ اس کی یہ حمد سورۂ فاتحہ میں بہ تمام وکمال مذکور ہے اس لیے اس سورہ کو ہر نماز میں پہلے پڑھتے ہیں اس کے بعد قرآن میں جتنا پڑھنا ممکن اور آسان ہوتا ہے اس کو پڑھتے ہیں۔ پھر خدا کے سامنے ادب سے جھک جاتے یعنی رکوع کرتے ہیں:

﴿ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۴۳)

’’اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔‘‘

پھر اس سے آگے پیشانی کو زمین پر رکھ دیتے یعنی سجدہ کرتے ہیں:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾

(الحج :۲۲)

’’اے ایمان والو! جھکو (رکوع کرو) اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی پرستش کرو اور نیک کام کرو تاکہ کامیاب ہو۔‘‘

ان دونوں (رکوع وسجدہ) میں خدا کی تسبیح وتحمید کرتے ہیں:

﴿ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۝ ﴾ (۵۶/ الواقعہ:۷۴و۹۶)

’’تو اپنے بزرگ پروردگار (ربِّ عظیم) کے نام کی تسبیح کر۔‘‘

﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ ﴾ (۸۷/ الاعلیٰ :۱)

’’اپنے برتر رب (ربِّ اعلیٰ) کی تسبیح کر۔‘‘

آنحضرت ﷺ کی ربانی تعلیم کے مطابق پہلا حکم رکوع میں اور دوسرا سجدے میں ادا ہوتا ہے۔ [1]

---

[1] ابن ماجہ، ابواب اقامۃ الصلوٰۃ، باب التسبیح فی الرکوع والسجود:۸۸۷۔

قیام، رکوع اور سجود کی یہ ترتیب سورۂ حج (۴۔ ذکر ابراہیم علیہ السلام) اور آل عمران (۵۔ ذکر مریم) سے اور یہ امر کہ سجدہ پر ایک رکعت تمام ہو جاتی ہے سورۂ نساء (۱۵ ذکر نمازِ خوف) سے ثابت ہے۔ درحقیقت ارکان کی یہ ترتیب بالکل فطری اور عقلی ہے، پہلے کھڑا ہونا، پھر جھک جانا، پھر سجدہ میں گر پڑنا، اس میں خود طبعی اور فطری ترتیب ہے۔ تعظیم کی ابتدائی اور کثیر الوقوع شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی کھڑا ہو جاتا ہے۔ جب کیفیات اور جذبات میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ جھک جاتا ہے اور جب فرطِ بے خودی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اپنے بلند ترین حصۂ جسم (یعنی پیشانی) کو اپنے محسن اور معظم کے پست ترین حصۂ جسم (یعنی پاؤں) پر رکھ دیتا ہے یہی سبب ہے کہ سجدہ نماز کی کیفیات کی انتہائی صورت ہے۔ قرآن نے کہا ہے:

﴿ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴾ (۹۲/ العلق :۱۹)

''اور سجدہ کر اور قریب ہو جا۔''

گویا سجدہ قربت الٰہی کی اخیر منزل ہے شاید اسی لیے وہ ہر رکعت میں مکرر ادا کیا جاتا ہے۔

نماز تمام جسمانی احکامِ عبادت کا مجموعہ ہے

قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں ہم کو مختلف قسم کی جسمانی، لسانی اور قلبی عبادتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ جسم کو ادب سے کھڑا رکھنے، پھر جھکانے اور سرنگوں کرنے کا حکم ہے۔ مختلف دعاؤں کے پڑھنے کی تاکید ہے۔ خدا کی تسبیح وتحمید کا ارشاد ہے۔ دعا اور استغفار کی تعلیم ہے۔ دل کے خضوع وخشوع کا فرمان ہے۔ رسول پر درود بھیجنے کا امر ہے۔ اس لیے نماز کی تشکیل اس طرح کی گئی کہ اس ایک عبادت کے اندر قرآن پاک کی تمام جسمانی، لسانی اور روحانی عبادتوں کے احکام یکجا ہو گئے۔ اسی لیے ایک نماز قرآن کے تمام گوناگوں جسمانی، لسانی اور روحانی عبادات کا مجموعہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن پاک میں مسلمانوں کو قیام، رکوع، سجود، تہلیل، تسبیح، تکبیر، قراءت، قرآن، ذکرِ الٰہی اور درود پڑھنے کے جو احکام عطا کیے گئے ہیں ان کی مجموعی تعمیل کا نام نماز ہے۔ جس میں یہ تمام منفرد احکام مجموعی حیثیت سے انجام پاتے ہیں۔ دوسری طرف ان احکام کی بجا آوری میں ایک ترتیب پیدا کی گئی ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی اور یہ کام انسانوں کے ذاتی انتخاب پر چھوڑ دیا جاتا کہ جو چاہے رکوع کر لے، جو چاہے سجدہ کر لے، جو چاہے صرف قیام کر لے، جو چاہے زبان ہی سے ذکر وقراءت پر اکتفا کر لے اور جو چاہے صرف دل سے دھیان کر کے اس فرض سے ادا ہو جائے تو ہر فرد سے فرائضِ الٰہی کے متعدد ارکان چھوٹ جاتے، جن پر کبھی عمل نہ ہوتا اور عجب نہیں کہ افراد کی طبعی سستی اور سہل انگاری ان پورے احکام کی تعمیل میں مانع آتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مسلمانوں کی عبادت کی واحد اور منظم شکل پیدا نہ ہوتی نہ جماعت ہو سکتی اور نہ نماز کو ایک مذہب کی عبادتِ خاص کہا جا سکتا اور نہ جماعتی رمز وشعار کی وحدت کی شان اس سے پیدا ہو کر مسلمانوں کو واحد امت بناتی اور بتاتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کے

ذریعہ اپنے رسول کو اس عبادت کی عملاً تعلیم دی۔ [1] اور رسول نے امت کو سکھایا اور امت نے نسلاً بعد نسل موجودہ اور آیندہ نسل کو سکھایا اور اس پورے تواترِ عمل کے ساتھ جن میں ذرا بھی شک وشبہ نہیں، وہ آج تک محفوظ ہے۔

نماز کی دعا

نماز کی مختلف حالتوں میں ان حالتوں کے مطابق دعائیں پڑھی جاتی ہیں اور پڑھی جا سکتی ہیں۔ خود آنحضرت ﷺ سے نماز کی مختلف حالتوں کی بیسیوں مختلف دعائیں مروی ہیں اور ہر مسلمان ان میں سے جو چاہے پڑھ سکتا ہے۔ لیکن نماز کی وہ اصلی دعا جس سے ہمارے قرآن کا آغاز ہوتا ہے، جس کو نماز میں پڑھنے کی تاکید آنحضرت ﷺ نے فرمائی ہے۔ جس کو آپ نے تمام عمر نماز کی ہر رکعت میں پڑھا ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک تمام مسلمان پڑھتے آئے ہیں، وہ سورۂ فاتحہ ہے، جو مقاصدِ نماز کے ہر پہلو پر حاوی اور محیط ہے، اسی لیے وہ اسلام میں نماز کی اصلی دعا ہے۔ یہ وہ دعا ہے جو خدا نے بندوں کی بولی میں اپنے منہ سے ادا کی۔

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِۙ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِؕ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُؕ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ (۱/ الفاتحۃ: ۱ تا ۷)

''حمد ہو اس اللہ کی جو سب جہانوں کا پروردگار ہے رحم والا مہربان ہے، ہمارے عمل کے بدلے کے دن کا مالک (ہے) (اے آقا) ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں، تو ہم کو سیدھے راستہ پر چلا، ان کا راستہ جن پر تو نے فضل کیا، ان کا راستہ نہیں جن پر غضب آیا اور نہ ان کا جو بہک گئے۔''

(اس دعا کو ختم کر کے آمین کہتے ہیں۔ یعنی اے خدا! تو اس کو قبول کر)

یہ وہ دعا ہے جس کو ہر مسلمان ہر نماز میں دہراتا ہے، جس کے بغیر ہر نماز ناتمام اور ادھوری رہتی ہے۔ [2] یہ دعا اسلام کی تمام تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے، خدا کی حمد وستائش ہے، توحید ہے، اعمال کی جزا وسزا کا یقین ہے، عبادت کے مخلصانہ ادا کا اقرار ہے، توفیق وہدایت کی طلب ہے، اچھوں کی تقلید کی آرزو اور بروں کی پیروی سے بچنے کی تمنا ہے۔ جس وقت اس حمد میں خدا کی پہلی صفت کل جہانوں کا پروردگار زبان پر آتی ہے تو اس کی تمام قدرتیں اور بخششیں جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں، سب سامنے آ جاتی ہیں۔ جہانوں کی وسعت کے تخیل سے اس کی عظمت اور کبریائی کی وسعت کا تخیل پیدا ہوتا ہے۔ سارے جہانوں کے ایک ہی

---

[1] مؤطا امام مالك، كتاب وقوت الصلوٰة، باب وقوت الصلوٰة: ۱؛ صحيح بخاري، كتاب مواقيت الصلوٰة، باب مواقيت الصلوٰة: ۵۲۱؛ صحيح مسلم، كتاب المساجد، باب أوقات الصلوات الخمس: ۱۳۸۰۔

[2] جامع ترمذي، ابواب الصلاة، باب ما جاء انه لا صلاة الا بفاتحة الكتاب: ۲۴۷۔

پروردگار کے تصور سے کل کائناتِ ہستی کی برادری کا مفہوم ذہن میں آتا ہے۔ انسان ہوں کہ حیوان، چرند ہوں کہ پرند، پھر انسانوں میں امیر ہوں یا غریب، مخدوم ہوں یا خادم، بادشاہ ہوں یا گدا، کالے ہوں یا گورے، عرب ہوں یا عجم، کل مخلوقات خلقت کی برادری کی حیثیت سے یکساں معلوم ہوتی ہے۔ خدا کو رحمٰن و رحیم کہہ کر پکارنے سے اس کی بے انتہا رحمت، بے پایاں شفقت، غیر محدود بخشش اور نا قابل بیان کیف، محبت کا سمندر دل کے کوزہ میں موجیں مارنے لگتا ہے۔ روز جزا کے مالک کا خیال ہم کو اپنے اپنے اعمال کی ذمہ داری اور مواخذہ سے باخبر اور خدا کے جلال و جبروت سے مرعوب کر دیتا ہے۔ ''ہم تجھی کو پوجتے ہیں'' کہہ کر ہم اپنے دل کی زمین سے ہر قسم کے شرک کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتے ہیں ''ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں'' بول کر ہم تمام دنیاوی سہاروں اور بھروسوں کو ناچیز سمجھتے اور صرف خدا کی طاقت کا سہارا ڈھونڈتے اور سب سے بے نیاز ہو کر اسی ایک کے نیازمند بن جاتے ہیں۔ سب سے آخر میں ہم اس سے سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہیں۔ یہ سیدھی راہ (راہ مستقیم) کیا ہے؟ اس کی شریعت کے احکام ہیں:

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ﴾

(٦/ الانعام: ١٥١-١٥٣)

''کہہ دے (اے پیغمبر) آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے۔ یہ کہ اس کے ساتھ شرک نہ کرو، ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، غربت کے سبب اپنی اولاد کو قتل مت کرو، ہم تم کو اور ان کو روزی دیتے ہیں، بے حیائی کی باتوں کے نزدیک نہ جاؤ، خواہ وہ ظاہر میں (فحش) ہوں یا باطن میں، جس جان کو خدا نے محترم کیا ہے اس کو مت مارو، لیکن انصاف کے ساتھ، یہ وہ باتیں ہیں جن کا حکم خدا نے تم کو دیا ہے۔ شاید کہ تم سمجھو اور یتیم کے مال کے پاس مت جاؤ، لیکن اچھی نیت سے یہاں تک کہ وہ اپنی قوت کو پہنچ جائے اور ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا رکھو، ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کا حکم نہیں دیتے۔ جب تم بات بولو تو انصاف کی گو تمہارا عزیز ہی کیوں نہ ہو اور خدا کے عہد کو پورا کرو یہ وہ باتیں ہیں جن کا خدا نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو اور بے شبہ یہی ہے میرا سیدھا راستہ (صراط مستقیم) تو تم

اسی کی پیروی کرو۔“

ان آیات نے واضح کر دیا کہ وحی محمدی ﷺ کی اصطلاح میں صراط مستقیم کیا ہے، یعنی شرک نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک، اولاد کے ساتھ اچھا برتاؤ، ظاہری و باطنی ہر قسم کی برائیوں سے بچنا، معصوم اور بے گناہ جانوں کی عزت کرنا (ناحق قتل نہ کرنا)، یتیم کے ساتھ احسان، ناپ تول میں ایمانداری، بلا رو رعایت سچ بولنا اور عہد کا پورا کرنا، یہ وہ صفات عالیہ ہیں جن کو صراطِ مستقیم کی مختصری ترکیب توصیفی میں ہم خدا سے روزانہ مانگتے ہیں، جو اخلاق کا جوہر اور نیکی کی روح ہیں۔

یہی وہ صفاتِ حسنہ ہیں جن سے خدا کے وہ خاص بندے متصف تھے۔ جن پر اس کا فضل و انعام ہوا۔ یہ خاص بندے کون ہیں؟ قرآن پاک نے اس کی تشریح بھی خود کر دی ہے:

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴾ (٤/ النسآء:٦٩)

”اور جو خدا اور رسول کے حکم پر چلتے ہیں تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں، جن پر خدا کا فضل اور انعام ہوا یعنی نبی، صدیق، شہید اور صالح لوگ ان کی رفاقت کیسی اچھی ہے۔“

اس بنا پر ہر نمازی جس صراط مستقیم اور راہ راست کے لیے دعا کرتا ہے، وہ نیکی کی وہ شاہراہ ہے جس پر خدا کے تمام نیک بندے (انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین) علیٰ قدر مراتب چل سکے۔

سیدھے راستہ سے ہٹنا دو طرح سے ہوتا ہے (۱) افراط (زیادتی) کے سبب سے اور (۲) تفریط (کمی) کے سبب سے، افراط یہ ہے کہ خدا کی شریعت میں ہم اپنی طرف سے بدعتوں کا اضافہ کریں یہ گمراہی ہے اور تفریط یہ ہے کہ خدا کے احکام پر عمل چھوڑ دیں، اس سے خدا کا غضب قوم پر نازل ہوتا ہے اور ہر قسم کا انعام و اکرام چھین لیا جاتا ہے۔ پہلی صورت کی مثال نصاریٰ ہیں، جنہوں نے دین میں اپنی طرف سے ہزاروں باتیں اضافہ کر دیں۔ دوسری کا نمونہ یہود ہیں، جنہوں نے احکامِ الٰہی کو پس پشت ڈال دیا اور ہر قسم کے انعام و اکرام سے محروم ہو گئے۔ مسلمانوں کی دعا یہ ہے کہ الٰہی ہم کو ان دونوں غلط راستوں سے بچانا اور اعتدال کی شاہراہ پر قائم رکھنا۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی یہ دعا (سورۂ فاتحہ) دین و دنیا کی دعاؤں کی جامع، جسم و روح کی نیکیوں پر مشتمل اور اخلاق و ایمان کی تعلیمات کو محیط ہے۔ اس میں خدا کی حمد بھی ہے اور بندے کی التجا بھی۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس کی نسبت فرمایا:

”جو نماز میں اس سورہ کو نہ پڑھے، اس کی نماز ناقص اور نامکمل ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ آدھی میرے لیے ہے اور آدھی اس کے لیے، بندہ

جب ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (حمد ہو سارے جہانوں کے پروردگار کی) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے: میرے بندہ نے میری ستائش کی پھر جب وہ ﴿ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ ﴾ (مہربان رحم والا) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے: میرے بندہ نے میری تعریف کی۔ پھر وہ کہتا ہے: ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ ﴾ (نیک و بد کی جزا کے دن کا مالک) تو خدا فرماتا ہے: میرے بندہ نے میری بڑائی ظاہر کی۔ اتنا میرا حصہ ہے اور میرے اور میرے بندہ کے درمیان مشترک یہ ہے کہ ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ ﴾۔ (ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں) اس کے بعد آخر تک (کہ ہم کو صراط مستقیم دکھا) میرے بندہ کی دعا ہے اور میرے بندہ نے جو مانگا وہ اس کو ملا۔ [1]

اس حدیث قدسی کے آئینہ میں اسلامی نماز کی اس دعا کا جو دلکش و دلفریب نظارہ نظر آتا ہے، وہ روح میں نشاط اور دل میں سرور پیدا کرتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جس کا ایک دھندلا سا تصور ایک عیسائی یورپین فاضل اے جی وینسنک (A-G-Wensinck) کو بھی جس نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اسلامی نماز پر ایک پُر معلومات مضمون لکھا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے ہو جاتا ہے، وہ لکھتا ہے:

"(اسلام کی رو سے) نماز حضورِ قلب کے ساتھ ادا ہونی چاہیے۔ ایک دفعہ محمد ﷺ نے ایک پر نقش و نگار کپڑے کو اس لیے اتار دیا کہ اس سے نماز میں توجہ بٹتی ہے۔ یہ واقعہ کہ نماز صرف ظاہری رسوم ادا کرنے کا نام نہیں، بلکہ اس میں دلی خضوع و خشوع کی بھی ضرورت ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے جس میں محمد ﷺ نے کہا ہے کہ مجھے تمہاری دنیا کی دو چیزیں پسند ہیں، خوشبو اور عورت اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے۔ محمد ﷺ پر نمازوں میں گریہ طاری ہو جانا بھی بعض اوقات منقول ہے۔ نماز کی ایک سب سے اعلیٰ خصوصیت وہ ہے جس کو ہم ان دو حدیثوں میں پاتے ہیں، جن میں بیان ہے کہ "نماز خدا سے سرگوشی اور مکالمہ ہے۔" اور اس کی تشریح ہم کو اس حدیث قدسی میں ملتی ہے کہ سورۂ الحمد میرے اور میرے بندہ کے درمیان بٹی ہوئی ہے۔ [2]

اس دعائے محمد ﷺ کا موازنہ دوسرے انبیا علیہم السلام کی منصوص دعاؤں سے

دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور نماز میں پڑھنے کے لیے کوئی دعا تعلیم نہ کی گئی ہو۔ کوہ طور پر جلوۂ ربانی کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نماز میں جو دعا پڑھی تھی وہ توراۃ کی کتاب خروج میں موجود ہے۔ زبور تو شروع سے آخر تک دعاؤں کا مجموعہ ہی ہے، مگر اس میں ایک خاص دعا پر یہ عنوان بھی لکھا نظر آتا ہے کہ "داؤد کی نماز" انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی وداعی شب میں حواریوں کو ایک خاص دعا کی تعلیم دیتے ہیں جو آج تک عیسائیوں کی نماز کا اصلی جزو ہے۔ ان دعاؤں کو سامنے رکھ کر محمد رسول

[1] جامع ترمذی، ابواب التفسير، باب ومن سورة فاتحة الكتاب: ٢٩٥٣ ومسند احمد، ج ٢، ص: ٤٦٠۔

[2] یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے۔

اللہ ﷺ کی زبان وحی ترجمان کے ذریعہ سے آئی ہوئی دعا کی تاثیری کیفیت، حسنِ تعبیر، جامعیت، پاکیزگی اور اختصار کا اندازہ ہوگا اور پتہ چلے گا کہ اس کی کیا بے مثالی ہے، جس کے سبب سے نمازوں میں پڑھنے کے لیے اسی کا انتخاب ہوا؟ اسی لیے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے اس کی نسبت اپنے ایک صحابی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ ''نماز میں جو سورہ تم پڑھتے ہو یعنی ام القرآن، قسم ہے، اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ وہ نہ توراۃ میں اتری نہ انجیل میں نہ زبور میں اور نہ اس کے مثل کوئی دوسری چیز خود قرآن میں موجود ہے۔'' [1] اس حدیث کی صحت اور صداقت کا یقین خود ان دعاؤں پر ایک نظر ڈالنے سے ہوگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نماز کی دعا

توراۃ کی کتاب الخروج میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام توراۃ لینے اور ربانی تجلی کا ایک تماشا دیکھنے کے لیے کوہ طور پر چڑھے اور تجلی نظر آئی تو فوراً خدا کا نام لیتے ہوئے سجدہ میں گر پڑے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دعا تعلیم کی:

> ''خداوند، خداوند، خدا، رحیم اور مہربان، قہر میں دھیما اور رب الفیض و وفا، ہزار پشتوں کے لیے فضل رکھنے والا، گناہ اور تقصیر اور خطا کا بخشنے والا، لیکن وہ ہر حال میں معاف نہ کرے گا، بلکہ باپوں کے گناہ کا بدلہ ان کے فرزندوں سے اور فرزندوں کے فرزندوں سے تیسری اور چوتھی پشت تک لے گا''۔ (۳۴۔۶)

اس دعا کے ابتدائی فقرے اگرچہ نہایت مؤثر ہیں، لیکن خاتمہ نہایت مایوس کن ہے۔ پہلے فضل و رحمت کی امید دلا کر آخر میں بابِ اجابت پر قفل چڑھا دیا ہے۔

زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز کی دعا: زبور باب ۸۶۔

[1] جامع ترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل فاتحۃ الکتاب: ۲۸۷۵۔

داؤد علیہ السلام کی نماز

''اے خداوند! اپنا کان جھکا اور میری سن کہ میں پریشان اور مسکین ہوں، میری جان کی حفاظت کر کہ میں دین دار ہوں، اے تو کہ میرا خدا ہے اپنے بندہ کو کہ جس کا توکل تجھ پر ہے رہائی دے۔ اے خداوند! مجھ پر رحم کر کہ میں تمام دن تیرے آگے نالہ کرتا ہوں اپنے بندہ کے جی کو خوش کر کہ اے خداوند! میں اپنے دل کو تیری طرف اٹھاتا ہوں، کیونکہ تو اے خداوند بھلا ہے اور بخشنے والا ہے اور تیری رحمت ان سب پر جو تجھ کو پکارتے ہیں وافر ہے۔ اے خداوند! میری دعا سن اور میری مناجات کی آواز پر کان دھر، میں اپنے بپت کے دن تجھ کو پکاروں گا کہ تو میری سنے گا معبودوں کے درمیان اے خداوند! تجھ سا کوئی نہیں اور تیری صفتیں کہیں نہیں۔ اے خداوند! ساری قومیں جنھیں تو نے خلق کیا آئیں گی اور تیرے آگے سجدہ کریں گی اور تیرے نام کی بزرگی کریں گی کہ تو بزرگ ہے اور عجائب کام کرتا ہے تو ہی اکیلا خدا ہے۔

اے خداوند! مجھ کو اپنی راہ بتا میں تیری سچائی میں چلوں گا، میرے دل کو یک طرفہ کر تاکہ میں تیرے نام سے ڈروں اے خداوند! میرے خدا میں اپنے سارے دل سے تیری ستائش کروں گا اور ابد تک تیرے نام کی بزرگی کروں گا کہ تیری رحمت مجھ پر بہت ہے اور میری روح کو اسفل پاتال سے نجات دلا۔

اے خدا! مغروروں نے مجھ پر چڑھائی کی ہے اور کٹر لوگوں کی جماعت میری جان کے پیچھے پڑی ہے اور انہوں نے مجھ کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں رکھا لیکن تو اے خداوند! خدا رحیم و کریم اور برداشت کرنے والا ہے اور شفقت اور وفا میں بڑھ کر ہے، میری طرف متوجہ ہو اور مجھ پر رحم کر، اپنے بندہ کو اپنی توانائی بخش اور اپنی لونڈی کے بیٹے کو نجات دے، مجھے بھلائی کا کوئی نشان دکھا تاکہ وہ جو میرا کینہ رکھتے ہیں، دیکھیں اور شرمندہ ہوں، کیوں کہ تو نے اے خداوند میری مدد کی اور مجھے تسلی دی۔''

اس دعا میں بھی وہی خدا کی حمد وصفت اور توحید وعبادت کا ذکر، راہ راست کی ہدایت کی طلب اور شریروں اور گمراہوں سے بچائے جانے کی درخواست ہے، لیکن طول تکرار اور دعا مانگنے والے کی شخصیت کا رنگ غالب ہونے کے سبب سے یہ ہر انسان کی دعا نہیں بن سکتی اور نہ اس کا طول اس کو ہر وقت کی نماز میں پڑھے جانے کی سفارش کرتا ہے۔

انجیل میں نماز کی دعا

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام حواریوں کو دعا اور نماز کے آداب بتا کر یہ دعا تعلیم کرتے ہیں:

''اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے تیرا نام مقدس ہو، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر ہے زمین پر بھی پوری ہو، ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہمارے قرض ہمیں

معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قرض داروں کو معاف کرتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں مت ڈال بلکہ برائی سے بچا، کیوں کہ بادشاہت اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرا ہی ہے۔ آمین“

نام کی تقدیس ”خدا کی حمد“ ہے بادشاہت کے آنے سے مقصود شاید قیامت اور اعمال کے فیصلہ کا دن ہے، جو دعائے قرآنی میں ﴿ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ ﴾ کے لفظ سے ادا ہوا ہے۔ نیز استعارہ کی زبان میں روز کی روٹی سے مراد دنیاوی روٹی نہ لی جائے۔ بلکہ روح کی غذا یا صراط مستقیم لی جائے اور قرض سے مراد فرائض اور حقوق لئے جائیں، جو خدا کی طرف سے انسانوں پر عائد ہیں، آزمائش میں نہ پڑنے اور برائی سے بچنے کے معنی وہی لئے جا سکتے ہیں جو اسلامی دعا کے خاتمہ میں مذکور ہے کہ ”یہ ان کا راستہ ہے جن پر تیرا غضب آیا اور جو سیدھے راستہ سے بہک گئے ہیں۔“ اس تشریح سے مقصود یہ ہے کہ یہ چاروں دعائیں جو چار اولوالعزم پیغمبروں کی زبانِ نبوت سے ادا ہوئیں، کسی قدر معنوی اشتراک کی وجہ سے باہم وہی نسبت رکھتی ہیں جو تکمیل دین کے مختلف مدارج میں کسی کو نظر آ سکتی ہے۔ دعائے محمدی ﷺ تکمیلی شکل کی آئینہ دار ہے، وہ مختصر ہے، تاثیر سے لبریز ہے خدا کی تمام صفات کاملہ کا مرقع ہے، تمام مقاصد اور احکام شریعت کی جامع ہے، اس کے الفاظ میں ایسی عالمگیری ہے جو ہر وقت اور ہر حالت میں ہر انسان کے دل کی نمائندگی کر سکتی ہے، وہ ایسے استعارات سے پاک ہے جو ظاہر بینوں کی لغزش کا باعث ہوں اور خدا کو انسانوں سے رحم و کرم کی صفت قرض لینے پر آمادہ کرتے ہیں۔ نیز وہ خدا کی رحمت عام کو ایسے عنوان سے ادا کرتی ہے، جس میں کائنات کا ایک ایک ذرہ داخل ہے خدا کی وہ تین صفتیں جن کا تصور کیے بغیر خدا کا تصور پورا نہیں ہو سکتا۔ (یعنی ربوبیت، رحمت اور مالکیت) یہ سورہ ان سب کی جامع ہے، ربوبیت میں وہ تمام صفتیں داخل ہیں جن کا تعلق پیدائش سے لے کر موت تک ہر مخلوق کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ رحمت اس کی وہ عالمگیر صفت ہے جس میں اس کی تمام جمالی صفتوں کی نیرنگیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ مالکیت اس کی تمام جلالی صفتوں کا مظہر ہے اور پوری سورہ دعا کے اغراض ثلاثہ حمد اچھائیوں کے لئے درخواست اور برائیوں سے بچانے کی التجا پر مشتمل ہے۔ طرز بیان خدا اور بندہ کے شایان شان ہے۔ درخواستیں حد درجہ مؤدبانہ ہیں۔ اوصاف الٰہی وہی ہیں جو ایک دعا کے مناسب ہو سکتے ہیں۔ دعا میں عموم ہے، وہ ذاتیات تک محدود نہیں ہے۔ للّٰہیت اور روحانیت کا کمال منتہائے نظر ہے، اس لئے دنیاوی چیزوں کا ذکر نظر انداز کیا گیا ہے۔ خدا کے اوصاف اور بندہ کی التجاؤں میں کمیت اور کیفیت دونوں حیثیتوں سے تناسب موجود ہے۔ یعنی دونوں حصوں نے مناسبت کے ساتھ جگہ گھیری ہے اور دونوں ٹکڑوں کے مضامین میں ربط اور تعلق قائم ہے، خدا کے عظمت وجلال، رحم وکرم، قدرت وشوکت، شفقت ورافت اور بندہ کے خشوع وخضوع، بلند حوصلگی، صداقت طلبی کا ایسا جامع مختصر اور پراثر بیان سورۂ فاتحہ کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے۔

نماز کے لیے تعینِ اوقات کی ضرورت

نماز کے سلسلہ میں اسلام کا ایک اور تکمیلی کارنامہ اوقات نماز کی تعیین ہے، ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی کام وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد نہیں ہوسکتا، اس لیے کسی کام کے کرنے کے لیے وقت سے بے نیازی ممکن نہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا نماز کے لیے خاص خاص اوقات کی تعیین ضروری ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ جس دین کامل کو لے کر مبعوث ہوئے اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عملی ہے، محض نظری نہیں، اس نے نماز کی تعلیم دی تو محض اصول اور نظریات کے لحاظ سے نہیں، بلکہ اس لیے کہ انسان روزانہ مختلف اوقات میں اس فرض کو ادا بھی کرے، انسان کی نفسی (سائیکولوجیکل) خصوصیت یہ ہے کہ جو کام مداومت کے ساتھ اس کو کرنا ہوتا ہے، جب تک وہ اس کے اوقات نہ مقرر کر لے، کبھی وہ اس کو مستعدی کے ساتھ بلا ناغہ انجام نہیں دے سکتا اسی لیے ہر منظم باقاعدہ اور دائمی عمل کے لیے اوقات کی تعیین ضروری ہے اور یہی طریقہ تمام دنیا نے اپنے باقاعدہ اور منظم کاموں کے لیے اختیار کیا ہے، اس میں اصلی راز یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی کام کے کرنے کے لیے ۲۴ گھنٹوں کی مہلت ہے تو وہ ہمیشہ سستی اور کاہلی سے اس کام کو ایک وقت سے دوسرے وقت پر ٹالتا جاتا ہے، یہاں تک کہ دن تمام ہو جاتا ہے اور آخری گھڑی بھی گزر جاتی ہے اور وہ اس کام کو انجام نہیں دیتا لیکن جب کاموں کے لیے اوقات متعین ہو جاتے ہیں تو ہر مقررہ وقت کی آمد انسان کو اس وقت کا کام یاد دلاتی ہے اور وہ وقت گزرنے نہیں پاتا کہ دوسرے کام کا وقت آجاتا ہے، اس طرح وقت کا فرشتہ ہر وقت انسان کے فرائض کو یاد دلاتا رہتا ہے اور تمام کام پابندی کے ساتھ بلا ناغہ انجام پاتے ہیں۔

اوقاتِ نماز کے تقرر میں وہ چیز بھی مدنظر ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، یعنی اصول وحدت جو اسلام کا اصلی رمز اور شعار ہے۔ مسلمان مختلف شہروں، ملکوں اور اقلیتوں میں ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں آباد ہیں، مگر یہ کثرت ایک خاص وقت اور ایک خاص حالت میں وحدت کا مرقع بن جاتی ہے۔ کرۂ ہوا میں لگی ہوئی دوربین سے اگر زمین کی طرف دیکھو تو ایک خاص وقت میں لاکھوں، کروڑوں انسانوں کو ایک ہی وضع میں، ایک ہی شکل میں خالق عالم کے سامنے سرنگوں پاؤ گے اور جہاں تک مطلع و مغرب میں نمایاں فرق نہ ہوگا یہی منظر آنکھوں کے سامنے رہے گا مختلف ملکوں میں طلوع وغروب کا اختلاف اگر اس وحدت کے رنگ کو کامل نہیں ہونے دیتا تو کم از کم اتنی وحدت تو یقینی ہے کہ جس حالت میں ایک جگہ آفتاب ہوتا ہے، جب دوسری جگہ بھی اسی حالت میں ہوتا ہے تو نماز کا فرض اس وقت وہاں ادا ہوتا ہے۔ یہ وحدت ظاہر ہے کہ اوقات کے تقرر کے بغیر ممکن نہ تھی، اگر ایسا نہ ہوتا تو صفحۂ ارضی تو کجا ایک محلّہ، ایک گھر کے مسلمان بھی ایک جگہ اور ایک حالت میں نظر نہیں آسکتے تھے۔

نماز کے اوقات دوسرے مذہبوں میں

اسی لیے اوقات کے تقرر اور تعین کی اس مصلحت کو دنیا کے تمام مذہبوں نے یکساں تسلیم کیا ہے اور اپنے اپنے نظریوں اور اصولوں کے مطابق عبادتوں کے مختلف اوقات مقرر کر رکھے ہیں، ہندو آفتاب کے طلوع و غروب کے وقت پوجا پاٹ کرتے ہیں، زردشتی صرف طلوع آفتاب کے وقت زمزمہ خواں ہوتے ہیں، رومن کیتھولک عیسائی صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے، پھر شام کو، پھر رات کو سوتے وقت دعا مانگتے ہیں، یہودیوں میں تین وقت کی نمازیں ہیں جن کو ''تیفلاّ'' کہتے ہیں، دانیال نبی کی کتاب میں ہے:

''جب دانیال کو معلوم ہوا کہ نوشتہ پر دستخط ہو گئے تو وہ اپنے گھر آیا اور اپنی کوٹھڑی کا دروازہ جو بیت المقدس کی طرف تھا، کھول کر اور دن بھر میں تین مرتبہ گھٹنے ٹیک کر خدا کے حضور میں جس طرح سے پہلے کرتا تھا، دعا اور شکر گزاری (حمد) کرتا رہا...... پر ہر روز وہ تین بار دعا مانگتا ہے۔''
(۶۔۱۰تا۱۴)

حضرت داوٗد علیہ السلام کی زبور میں ان تین وقتوں کی تعیین ان لفظوں میں ملتی ہے:

''پر میں خدا کو پکاروں گا، تب خدا مجھے بچالے گا، شام کو اور صبح کو اور دوپہر کو میں فریاد کروں گا اور نالہ کروں گا، سو وہ میری آواز سن لے گا۔'' (۵۵۔۱۶۔۱۷)

اسلامی اصطلاح میں ہم ان کو فجر، ظہر اور مغرب کی نمازیں کہہ سکتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعاؤں اور نمازوں کی اہمیت اور زیادہ بڑھائی، لوقا کی انجیل میں ہے:

''پھر اس نے (حضرت عیسیٰ نے) اس لیے کہ ان کو ہمیشہ دعا میں لگے رہنا اور سستی نہ کرنا، ضرور ہے ایک تمثیل کہی۔'' (۱۸۔۱)

حواریوں کے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی نماز کے کچھ اوقات وہی تھے جو یہودیوں میں تھے اور کچھ اور زیادہ تھے، ظہر کی نماز ان کے ہاں بھی تھی، چنانچہ اعمال میں ہے:

''پطرس دوپہر کے قریب کوٹھے پر دعا مانگنے گیا۔'' (اعمال ۱۰۔۹)

لیکن ان کے علاوہ بعض اوقات بڑھائے بھی گئے۔ ایک جگہ ہے:

''پس پطرس اور یوحنا ایک ساتھ دعا کے وقت تیسرے پہر ہیکل کو چلے۔'' (اعمال ۳۔۱)

یونانی میں تیسرے پہر کی بجائے نویں گھڑی کو لکھا ہے جس کو ہم عصر کہتے ہیں، پھر اسی وقت کی نماز کا ذکر اعمال ۱۰۔۳ میں بھی ہے۔

ایک دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کسی شاگرد نے نماز کی خاص دعا دریافت کی، آپ نے بتائی اور فرمایا کہ دعا کا بہترین وقت آدھی رات ہے۔

اور ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگ رہا تھا جب مانگ چکا، ایک نے اس کے شاگردوں میں سے اس سے کہا کہ اے خداوند! ہم کو دعا مانگنا سکھا، جیسا کہ یوحنا (حضرت یحییٰ علیہ السلام) نے اپنے شاگردوں کو سکھایا اس نے ان سے کہا، جب تم دعا مانگو تو کہو...... اس نے ان سے کہا، تم میں سے کون ہے، جس کا ایک دوست ہو اور وہ آدھی رات کو اس کے پاس آ کر کہے، اے دوست! مجھے تین روٹی ادھار دے۔'' (لوقا۔۱۱)

اس تمثیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رات کی نماز کی تعلیم دی ہے، چنانچہ جس شب کو انہیں گرفتار کیا گیا وہ ایک جماعت کے ساتھ اسی نماز تہجد میں مصروف تھے۔ (لوقا۔۲۲۔۳۹)

صبح کی نماز کا ذکر بھی انجیل میں موجود ہے، مرقس کے پہلے باب کی ۳۵ آیت میں ہے: ''اور بڑے تڑکے پو پھٹنے سے پہلے وہ اٹھ کے نکلا اور ایک ویران جگہ میں گیا اور وہاں دعا مانگی۔'' ❶ بلکہ عربی ترجمہ سے جو براہ راست یونانی سے ہوا ہے۔ ❷ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دواما اس وقت نماز پڑھا کرتے تھے، چنانچہ اس میں اس آیت کا عربی ترجمہ یہ ہے: ''وفي الصبح باكرا جدا قام وخرج ومضى الى موضع خلاء وكان يصلي هُنَاكَ'' یعنی وہ وہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔ اب ان اوقات کو جو یہودی اور عیسوی کتابوں میں مذکور ہیں ہم جمع کر لیں، تو وہی اسلامی نماز کے اوقات ہو جائیں گے جن میں سے صبح (فجر) دوپہر (ظہر) اور شام (مغرب) کا ذکر زبور (۵۵۔۱۶۔۱۷) میں، صبح کا مرقس (۱۔۳۵) میں عصر کا اعمال (۳۔۱، ۱۰، ۳۔۳۰) میں ہے اور عشاء (رات) کی نماز کا لوقا (۱۱، ۲۲، ۳۹) میں۔

نماز کے لیے مناسب فطری اوقات

اصل یہ ہے کہ حق تو یہ تھا کہ انسان بھی فرشتوں کی طرح شب و روز صرف دعا و نماز میں مصروف رہتا، مگر انسان کی فطری و نوعی ضرورتوں کے سبب سے ایسا ہونا ممکن اور مناسب نہ تھا، اس لیے شریعت نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ اس کے لیے چند مناسب اوقات مقرر کر دیے، ہر انسان ہر روز مختلف قسم کے کاموں میں اپنی عمر کے یہ ۲۴ گھنٹے بسر کرتا ہے، صبح کو بیدار ہوتا ہے، دوپہر تک کام کر کے تھوڑی دیر سستاتا ہے، پھر سہ پہر تک وہ اپنا بقیہ کام انجام دیتا ہے اور اس کو تمام کر کے سیر و تفریح اور دلچسپ مشاغل میں دل بہلاتا ہے، شام ہوتی ہے تو گھر آ کر خانگی زندگی کا آغاز کرتا ہے اور کھا پی کر تھوڑی دیر کے بعد طویل آرام اور غفلت کی نیند کے لیے تیار ہوتا ہے، اسلامی نمازوں کے اوقات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے روزانہ کے ان مختلف انسانی مشاغل کے ہر آغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے، تاکہ پورے اوقات خدا کی یاد ہی میں محسوب ہوں، نور ظہور کے وقت جب صبح کی نسیم سحری حیّ علی الصلوٰۃ کا نغمہ جانفزا سناتی ہے اور ہر شے کی زبان سے عالم کے صانع کی تسبیح و تحمید کا ترانہ بلند ہوتا ہے تو یہ وقت غافل انسانوں کے سر جھکانے کے لیے بھی

❶ مطبوعہ لندن ۱۸۶۵ء۔ ❷ مطبوعہ مطبع ادبیہ بیروت ۱۸۸۶ء و مطبع آکسفورڈ ۱۸۹۰ء۔

نہایت موزوں ہے کہ کتاب زندگی میں حیاۃ امروزہ کا ایک نیا ورق اس وقت کھلتا ہے، اس لیے مناسب ہے کہ اس دن کے، کارناموں کی لوح پر سب سے پہلے سجدۂ نیاز کا طغرا نقش ہو، اس کے بعد انسان اپنی محنت و مشقت کا آغاز کرتا ہے اور دوپہر تک اس میں مصروف رہتا ہے، دوپہر کو روزانہ کاروبار کا نصف حصہ ختم کر کے آدمی تھوڑی دیر کے لیے آرام کرتا ہے، اس موقع پر بھی اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ دن کا آدھا کام بخیر و خوبی ختم ہوگیا، پھر سہ پہر کے بعد جب اپنے اس دن کا کام ختم کر کے سیر وتفریح اور ذاتی آرام کے کام شروع ہوتے ہیں۔ تو یہ وقت بھی ایک دفعہ خدا کا نام لینے کا ہے، اس کے بعد شام ہوتی ہے اور دنیا کے انقلاب کا دوسرا منظر پیش کرتی ہے، دن بھر کے کاموں کے بعد اب آرام وسکون کا دور شروع ہوتا ہے، اس لیے ضرور ہے کہ اس کا سرنامہ بھی عبودیت کا سجدہ ہو، پھر سوتے وقت جب انسان اپنی یا احساس زندگی سے کچھ دیر کے لیے بے خبر ہونے لگتا ہے تو مناسب ہے کہ وہ خدا کا نام لے کر اس جہان سے بے خبر ہو، کیونکہ اسے کیا معلوم کہ اس وقت کی ان بند ہونے والی آنکھوں کو پھر کبھی کھلنا بھی نصیب ہوگا۔ اسی طرح آخر عمر تک روزانہ کام کے یہ پہیے اپنی جگہ پر گھومتے رہتے ہیں۔ صبح سے دوپہر تک انسان کی مصروفیت کے اصلی گھنٹے ہیں، اسی لیے صبح سے زوال تک کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی، اسی طرح عشا سے لے کر صبح تک کوئی فرض نماز نہیں ہے، یہ وقت صرف خوابِ راحت کے لیے موزوں ہے، ان خاص اوقات کو چھوڑ کر بقیہ اوقات تمام تر انسان کے کام کے ہیں، انھیں کام کے اوقات کے شروع میں نمازِ پنجگانہ مقرر ہوئی ہے۔

اسلامی اوقاتِ نماز میں ایک نکتہ

اوقاتِ نماز کی تعیین میں اسلام کے لیے ایک اور اصول کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے، دنیا کے مشرکانہ مذاہب کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے شرک کا سب سے بڑا مظہر جسدِ کائنات کا سب سے زیادہ تابناک چہرہ (آفتاب) ہے ہندوستان، ایران، بابل، عرب، مصر، شام، روم، یونان ہر جگہ سورج کی پرستش کی جاتی تھی، جس کی روشنی قلوبِ انسانی کی تاریکی کا سب سے بڑا سبب بنتی تھی، آفتاب پرست قوموں میں آفتاب کی پرستش کے خاص اوقات تھے، جب وہ صبح کو اپنے شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ نمودار ہوتا ہے، پھر جب وہ آہستہ آہستہ مملکت نیمروز کو فتح کر کے دنیا پر اپنے فاتحانہ تسلط کا اعلان کرتا ہے، پھر شام کو جب وہ عالمِ کائنات سے رخصت ہو کر نقابِ شب میں اپنا چہرہ چھپالیتا ہے۔ سب سے پہلا موحد جس نے آفتاب پرستی کو گل کیا [1] حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے۔ ملتِ ابراہیمی میں نماز کے وہ اوقات مقرر کیے گئے، جب ستارہ پرستوں کے خدائے اعظم (آفتاب) کے ظہور اور عروج کا نہیں بلکہ اس کے زوال اور غروب کا وقت ہوتا ہے، تا کہ یہ اوقات خود زبان حال سے شہادت دیں کہ یہ آفتاب پرستی کے باطل عقیدہ کے خلاف اس خدائے برحق

[1] ٦/ الانعام: ٧٩۔

کی عبادت ہے، جس کے آستانۂ کمال کے سجدہ سے خود آفتاب کی پیشانی بھی داغدار ہے، دینِ محمدی، ملتِ ابراہیمی کا دوسرا نام ہے، اس لیے اس میں بھی نماز کے اوقات وہی رکھے گئے جو ملتِ ابراہیمی میں تھے، دن نکلنے سے پہلے جب باطل پرستی کا یہ دیوتا (آفتاب) پردۂ عدم میں روپوش ہوتا ہے، دوپہر کے بعد جب یہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچ کر انحطاط اور تنزل کی طرف جھکتا ہے، اس انحطاط اور تنزل کے بھی دو تین دور ہوتے ہیں جب سر (سمت الراس) سے نیچے اُترتا ہے، جس کو زوال کہتے ہیں، جب آنکھوں کے دائرہ تقابل سے نیچے اترتا ہے جس کو عصر کہتے ہیں اور پھر جب دائرہ نظر (افق) سے نیچے گرتا ہے جس کو مغرب کہتے ہیں، آفتاب کے ان تینوں اوقاتِ انحطاط میں ایک نماز ادا ہوتی ہے، خوب اچھی طرح ڈوبنے کے بعد جب وہ تاریکی کی قبر میں مدفون ہو جاتا ہے، اس وقت عشاء کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں نماز کے اوقات کے ذکر میں آفتاب کے ڈھلنے اور تاریک ہونے کا خاص طور سے ذکر آیا ہے:

﴿ أَقِمِ الصَّلَوٰةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَىٰ غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْءَانَ الْفَجْرِ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآءیل:۷۸)

''نماز کھڑی کر آفتاب کے انحطاط کے وقت، رات کی تاریکی تک، (ظہر، عصر، مغرب، عشاء) اور فجر کی نماز۔''

تفصیل آگے آتی ہے۔

غرض یہی سبب ہے کہ اسلام میں کوئی فرض نماز صبح سے دوپہر تک نہیں رکھی گئی کہ یہ آفتاب کے عروج کا وقت ہے، بلکہ تمام نمازیں آفتاب کے ہر تدریجی انحطاط، تنزل اور روپوشی کے اوقات میں ہیں، نیز یہی سبب ہے کہ اسلام میں آفتاب نکلتے وقت، اس کے عروج و کمال کے وقت اور اس کے ٹھیک ٹھیک غروب کے وقت نماز پڑھنا منع ہے [1] کہ یہ آفتاب پرستوں کی عبادت کے خاص اوقات ہیں۔

اسلام میں طریق واوقاتِ نماز

نماز کس طرح اور کن کن اوقات میں ادا کرے اور کتنی کتنی رکعتیں کر کے پڑھنی چاہیے اور اس کے کیا آداب وشرائط ہیں، ان سب کے لیے قرآن پاک میں ایک جامع آیت ہے جو لڑائی کی حالت میں نماز ادا کرنے کی تفصیل کے سلسلہ میں مذکور ہے:

﴿ حَٰفِظُوا۟ عَلَى الصَّلَوَٰتِ وَالصَّلَوٰةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا۟ لِلَّهِ قَٰنِتِينَ ۝ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ۖ فَإِذَآ أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا۟ اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا۟ تَعْلَمُونَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۳۸۔۲۳۹)

''نمازوں پر اور بیچ کی نماز پر پابندی کرو اللہ کے لیے (نماز میں) ادب سے کھڑے ہو، پھر اگر

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب الاوقات التی نهی عن الصلوۃ فیها: ۱۹۲۰تا۱۹۲۶۔

دشمنوں کا خوف ہو یا تو پیادہ ہو کر یا سوار ہو کر (نماز پڑھو) پھر جب تم کو امن ہو جائے تو خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا جس سے تم پہلے واقف نہ تھے۔''

اس آیت پاک سے یہ بات بتصریح ظاہر ہوتی ہے کہ ان باتوں کی کہ ہم کو نماز کس طرح اور کن اوقات میں اور کتنی رکعتوں کے ساتھ پڑھنی چاہیے، خود اللہ تعالیٰ نے اسی طرح تعلیم فرمائی ہے جس طرح خود قرآن پاک کی، اس اجمال کی تفصیل سنت نبوی کے ذریعہ احادیث میں تحریر، اور مسلمانوں کے نسلاً بعد نسلٍ متفقہ تواتر عمل میں عملاً موجود ہے اور قرآن پاک میں اس کے عملی حوالے اور متعلقہ احکام مذکور ہیں۔

نمازوں کی پابندی ونگرانی

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نمازوں کو پابندی سے ادا کریں، ان کی نگہداشت رکھیں، اور ان پر مداومت کریں۔ قرآنِ پاک میں نماز کی پابندی، نگہداشت اور مداومت کے لیے ایک خاص لفظ ''محافظت'' کا استعمال کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی نگرانی کے ہیں اور جس کی وسعت میں پابندی سے ادا کرنا، وقت پر ادا کرنا اور بشرائط ادا کرنا سب داخل ہیں۔ فرمایا:

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۳۸)

''نمازوں کی نگرانی رکھو۔''

﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ﴾ (۷۰/ المعارج:۳۴)

''اور جو اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہیں۔''

﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۹)

''اور جو لوگ اپنی نمازوں کی نگرانی رکھتے ہیں۔''

﴿وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ﴾ (۶/ الانعام:۹۳)

''اور وہ اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہیں۔''

ایک آیت میں یہ بھی فرمایا:

﴿الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ﴾ (۷۰/ المعارج:۲۳)

''جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔''

ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ نماز ایسا فرض ہے جو کسی مسلمان سے کسی حال میں معاف نہیں ہو سکتا اور اس کو ہمیشہ پابندی کے ساتھ وقت پر اور اس کے سارے شرائط کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔

نماز کے اوقات مقرر ہیں

اس کے بعد یہ مسئلہ ہے کہ نماز کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ اوقات مخصوص فرمائے ہیں۔ ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۝ ﴾ (٤/ النسآء: ١٠٣)

''بے شبہ نماز مسلمانوں پر مقررہ اوقات میں فرض ہے۔''

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ہماری فرض نمازوں کے لیے اوقات مخصوص ہیں۔

وہ اوقات کیا ہیں؟

ادائے نماز کے لیے قرآن نے زیادہ تر تین لفظ استعمال کیے ہیں صلوٰۃ یا اقامتِ صلوٰۃ، تسبیح اور ذکر اللہ۔ پہلا لفظ اقامتِ صلوٰۃ نماز کے لیے مخصوص ہے، لیکن دوسرا اور تیسرا لفظ عام تسبیح وتحمید اور یادِ الٰہی کے لیے بولا جاتا ہے، جس کا جزو اعظم تسبیح وتحمید ہے، احادیث میں بھی تسبیح کے معنی نماز پڑھنے کے ہیں۔ [1] اور اشعار عرب [2] ولغت عرب [3] سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ قرآن میں جب اس لفظ (تسبیح) کے ساتھ وقت کی تخصیص ہوگی تو اس سے کسی شبہ کے بغیر نماز کے علاوہ کوئی اور چیز مراد نہیں ہوسکتی، کیونکہ وقتِ مخصوص کے ساتھ اسلام میں نماز کے علاوہ کوئی عام تسبیح فرض نہیں ہے البتہ اوقات کی تخصیص کے بغیر قرآن نے جہاں تسبیح کا حکم دیا ہے، اس سے خدا کی عام یاد وتوصیف مراد ہوسکتی ہے۔ اس تمہید کے بعد حسب ذیل آیتوں پر نظر کرنی چاہیے:

1. ﴿ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا۝ ﴾ (٧٣/ المزمل: ٢۔٤)

''رات کو کھڑا رہا کر مگر کچھ کم یا آدھی رات یا اس سے کچھ گھٹا دے یا بڑھا لے اور قرآن (اس میں) ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔''

2. ﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ۝ ﴾ (٤٠/ المؤمن: ٥٥)

''اور اپنے رب کی حمد سہ پہر اور صبح کو کر۔''

3. ﴿ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا۝ ﴾ (٣٣/ الاحزاب: ٤٢)

''اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو کیا کرو۔''

4. ﴿ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا۝ ﴾ (٤٨/ الفتح: ٩)

''اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو بیان کرو۔''

5. ﴿ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ۝ ﴾ (٧/ الاعراف: ٢٠٥)

---

[1] صحیح مسلم، باب استحباب صلوٰۃ الضحی: ١٦٦٢ "ما رایت رسول اللہ ﷺ یصلی سبحة الضحی قط وانی لا سبحها" نیز صحیح مسلم، باب جواز صلاة النافلة علی الدابة، ١٦١٠، ١٦١٨، ١٦١٩؛ مسند احمد، ٦/ ١١٨۔ [2] اعشی وائل کا شعر ہے: وسبح علی حین العشیات والضحیٰ۔ ولا تحمد الشیطان واللہ فاحمدا (شعراء الجاهلیة ج٣، ص: ٣٦٥ وکتاب شعراء النصرانیة (قسم ثالث فی شعراء بکر بن وائل من بنی عدنان) ص: ٣٦٥ بیروت)۔ [3] لسان العرب، ج٢، ص: ٨٢، مصر۔

''اور تو اپنے پروردگار کو اپنے دل میں گڑگڑا کر اور پست آواز میں، صبح کو اور دو پہر کو یاد کر اور بھولنے والوں میں سے نہ ہو۔''

6 ﴿ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ ﴾ (٦/ الانعام:٥٢)

''اے رسول! ان کو مت نکال جو اپنے پروردگار کو صبح کو اور سہ پہر کو پکارتے ہیں۔''

7 ﴿ فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَن تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ ﴾

(٢٤/ النور:٣٦)

''ان گھروں میں جن کو بلند کرنے کا حکم خدا نے دیا ہے اور ان میں خدا کا نام لیا جاتا ہے اور ان میں وہ لوگ جن کو دنیا کا کاروبار خدا سے غافل نہیں کرتا، صبح اور سہ پہر کو خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں۔''

8 ﴿ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ ﴾ (١٨/ الكهف:٢٨)

''اور تو (اے رسول) اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رہ جو اپنے پروردگار کو صبح اور سہ پہر کے وقت پکارتے ہیں۔''

9 ﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ ۝ ﴾

(٥٢/ الطور:٤٨ـ٤٩)

''اور تو اپنے پروردگار کی حمد کی پاکی بیان کر، جب تو اٹھتا ہے اور رات کے کچھ حصے میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پیٹھ پھیرتے وقت۔''

10 ﴿ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ ﴾ (١١/ هود:١١٤)

''اور نماز کو قائم کر دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے کچھ ٹکڑوں میں۔''

11 ﴿ أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَىٰ غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ ۖ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ ﴾ (١٧/ بنی اسرآئیل:٧٨ـ٧٩)

''نماز قائم کر آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی ابتدائی تاریکی تک اور فجر کا پڑھنا، بیشک فجر کا پڑھنا پر حضور ہے اور رات کو کچھ دیر جاگ کر مزید نماز پڑھ (تہجد)۔''

12 ﴿ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ۝ ﴾

(٧٦/ الدهر:٢٥ـ٢٦)

''اور اپنے پروردگار کا نام یاد کر صبح کو اور سہ پہر کو اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر اور بڑی رات تک اس کی تسبیح کر۔''

13 ﴿ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا ۖ وَمِنْ

أٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۳۰)

''کافروں کے کہے پر صبر کر اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اور رات کے کچھ حصوں میں اس کی تسبیح پڑھ اور دن کے کناروں میں تاکہ تو خوش رہے۔''

14 ﴿ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ۝ ﴾ (۳۰/ الروم:۱۷۔۱۸)

''تو خدا کی تسبیح پڑھو، جب شام کرو اور جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمانوں اور زمین میں اور دوپہر کو اور جب تم دوپہر کرو۔''

15 ﴿ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُوْدِ۝ ﴾ (۵۰/ ق:۳۹)

''تو ان کافروں کے کہے پر صبر کر اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور ڈوبنے سے پہلے اور کچھ رات میں تسبیح پڑھ اور ڈوبنے کے بعد۔'' [1]

16 ﴿ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ﴾ (۲۴/ النور:۵۸)

''فجر کی نماز سے پہلے اور جب دوپہر کی گرمی کے سبب سے کپڑے اتارتے ہو اور عشا کی نماز کے بعد۔''

ان اوپر کی آیتوں میں نماز کے مختلف اوقات کا ذکر ہے، ان میں سے بعض مکرر ہیں اور بعض نہیں۔ مکرر اوقات کو ملا دینے کے بعد یہ وہی پانچ وقت ہو جاتے ہیں، جن میں رسول اللہ ﷺ تمام عمر نماز ادا فرماتے رہے اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ اور اس وقت سے لے کر آج تک تمام روئے زمین کے مسلمان نسلاً بعد نسلٍ ادا کرتے آئے ہیں اور جن کے مشہور نام، فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء ہیں، غدو ، غداة ، بكرة ، فجر، قبل طلوع شمس اور حين تصبحون کے معنی صبح کی نماز، اصيل ، عشی اور قبل غروب الشمس سے مراد عصر، دلوك الشمس (زوال) اور حين تظهرون (جب دوپہر کرو) سے مقصد ظہر، طرف النهار دن کا کنارہ اور تمسون (جب شام کرو) سے مراد مغرب اور من آناء الليل (کچھ رات گزرے) غسق الليل (رات کی ابتدائی تاریکی) اور صلوٰة العشاء سے مقصود عشاء کی نماز ہے اور یہی نماز کے پانچ اوقات ہیں، جن میں خدا کی یاد اور تسبیح و تحمید کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔

[1] جمہور کے نزدیک اس کا ترجمہ ہوگا سجدہ کے بعد اور عام اہل تفسیر نے اس سے فرض نمازوں کے بعد کی تسبیح وتہلیل مراد لی ہے۔

اوقات کی تکمیل

نمازوں کے اوقات کی تدریجی تکمیل

اسلام کا آغاز سب کو معلوم ہے کہ کس غربت، مظلومی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا تھا، اس لیے ابتدائی زمانہ میں دن کے وقت کوئی نماز نہ تھی، لوگ صرف رات کو کہیں ادھر ادھر چھپ کر دیر تک نماز پڑھا کرتے تھے۔ سورۂ مزمل میں جو مکہ کی نہایت ابتدائی سورتوں میں ہے، یہ آیتیں ہیں:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُۙ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًاۙ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًاۙ اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًاؕ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِیْلًاؕ اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًاؕ ﴾ (۷۳/ المزمل:۱ـ۷)

''اے کملی اوڑھ کر سونے والے، تھوڑی دیر کے علاوہ ساری رات اٹھ کر نماز پڑھا کر، آدھی رات تک یا اس سے کچھ کم یا اس سے (کچھ) زیادہ اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ ہم تجھ پر عنقریب ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ یعنی (شریعت کے مفصل احکام اتارنے والے ہیں) بے شک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنے میں طمانیتِ قلب کا زیادہ موقع ہے اور قرآن سمجھ کر پڑھنے کے لیے زیادہ مناسب ہے، بے شبہ تجھ کو دن کے وقت آرام کی فرصت حاصل ہے۔''

نماز کا یہ طریقہ غالباً ان تین برسوں تک رہا جب اسلام کی دعوت برملا نہیں دی جا سکتی تھی، کیونکہ جہاں

﴿ وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَۙ ﴾ (۲۶/ الشعرآء:۲۱٤)

''اپنے قریب کے اہل خاندان کو ہشیار کرو۔''

کے ذریعہ سے دعوت کے اعلان کا حکم آیا ہے، وہیں یہ بھی اسی کے بعد مذکور ہے:

﴿ وَ تَوَكَّلْ عَلَی الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِۙ الَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُۙ وَ تَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴾ (۲٦/ الشعرآء:۲۱۷ـ۲۲۰)

''اور غالب مہربان پر بھروسہ رکھ جو تجھ کو اس وقت دیکھتا ہے جب تو (نماز کے لیے) اٹھتا ہے اور نمازیوں میں تیرا پھرنا (دیکھتا ہے) بے شک وہی سنتا اور جانتا ہے۔''

اس کا مقصد یہ ہے کہ اعلانِ دعوت کا حکم ملنے سے پہلے آنحضرت ﷺ ان دشمنوں کے بیچ میں راتوں کو اٹھ کر خود نماز پڑھتے تھے اور مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے کہ کون نماز میں مصروف ہے اور کون سویا ہوا ہے جس کو نماز کے لیے جگانا چاہیے۔ ایسی پر خطر حالت میں آپ کا راتوں کو تن تنہا یہ فرض انجام دینے کے لیے نکلنا اس اعتماد پر تھا کہ خدا آپ ﷺ کو خود دیکھ رہا ہے اور آپ کی حفاظت کر رہا ہے، اس کے بعد جب نسبتاً اطمینان حاصل ہوا اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم تکمیل کی طرف بڑھا اور رات کی طویل نماز (تہجد) کے علاوہ رات کے ابتدائی حصہ (عشاء) اور تاروں کے جھلملاتے وقت بھی ایک نماز

(فجر) اضافہ کی گئی۔

﴿ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ ۝ ﴾ (٥٢/ الطور:٤٨_٤٩)

''اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کھینچ، بے شک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور اپنے رب کی تعریف کی تسبیح کر جب تو (رات کو تہجد کے وقت) اٹھتا ہے اور کچھ رات کے حصہ میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پیٹھ پھیرتے وقت۔''

یہ آیت سورۂ طور کے آخر میں ہے اور سورۂ طور کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی تھی [1] اور شاید اس وقت جب قریش نے آنحضرت ﷺ کو ایذا دینا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ اسی سورہ میں اس آیت سے پہلے آپ کے مصائب اور ان پر صبر کرنے اور فیصلہ الٰہی کے انتظار کا حکم اور آپ کی ہر قسم کی حفاظت کی خوشخبری ہے، ابھی تک یہ رات کی نمازوں کی تفریق ہے۔ سورۂ دہر میں جو جمہور کے نزدیک مکی ہے اور غالباً سورۂ طور کے بعد اتری ہے، انہی معنوں کی ایک اور آیت ہے جس میں ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ کے قریب کی ایک نماز جس کو عصر کہیے اور بڑھتی ہے:

﴿ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ۝ ﴾ (٧٦/ الدهر :٢٤_٢٧)

''تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا انتظار کر اور ان مخالفوں میں سے کسی گناہ گار یا اللہ کے ناشکر گزار کا کہنا نہ مان اور صبح کو اور تیسرے پہر کو اپنے پروردگار کا نام لیا کر اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر اور رات کو دیر تک اس کی تسبیح کیا کر۔''

اب رات کی دیر تک کی نمازِ تہجد کے علاوہ تین وقتوں کی تصریح ہے، یعنی صبح، اخیر دن اور ابتدائی شب مگر ہنوز اصیل [2] میں ظہر وعصر اور من الیل (رات) میں مغرب اور عشاء کی تفریق نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ کل تین نمازیں تھیں ایک فجر کے وقت ایک سہ پہر کو اور ایک رات کو، اسی لیے ابھی تک باقی دو نمازوں کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا، جیسا کہ آیت بالا سے ظاہر ہے۔

اب یہ ان تین وقتوں کی تسبیح وتحمید باقاعدہ نماز کا قالب اختیار کرتی ہے حکم ہوتا ہے:

﴿ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ [3] النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ ﴾ (١١/ هود:١١٤)

---

[1] صحیح بخاری، تفسیر طور واقعة جبیر بن مطعم:٤٨٥٤۔

[2] اصیل دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں، عام کتب لغت میں لکھا ہے کہ وہ وقت جو عصر کے بعد سے مغرب تک ہو اس کو اصیل کہتے ہیں، لسان العرب میں اصیل کے معنی عشی لکھے ہیں، جو عصر کے لیے سورۂ روم میں استعمال ہوا ہے۔

[3] طرفی النهار کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں ادا کیا گیا ہے قبل طلوع الشمس وقبل غروبها، بالعشی والابكار بالغدو والاصال۔ اس میں پہلا طرف فجر، بکرۃ اور غدو ہے دوسرا طرف عصر عشی اور اصیل ہے۔

”دن کے دونوں کناروں میں (یعنی فجر اور عصر) اور رات کے ایک ٹکڑے میں نماز پڑھا کر۔“

یہ آیت سورۂ ہود کی ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں اکثر انبیا علیہم السلام کے متعلق یہ بیان کر کے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت کو خدائے برحق کی عبادت کی دعوت دی۔ آنحضرت ﷺ کو بھی نماز کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے اور غالباً نماز کے اوقات کے سلسلہ میں یہ پہلی آیت ہے۔ جس میں تسبیح کی بجائے باقاعدہ صلوٰۃ کی اقامت کا حکم آیا ہے، اس وقت مسلمانوں کی خاصی تعداد تھی جیسا کہ اس سے پہلے کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے:

﴿ فَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ﴾ (۱۱/ ہود:۱۱۲)

”پس تو سیدھا چلا چل جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ جنھوں نے تیرے ساتھ توبہ کی (وہ بھی سیدھے چلیں) اور تم لوگ حد سے آگے نہ بڑھو۔“

اب رات کی طویل نماز کو چھوڑ کر تین نمازیں باقاعدہ فرض ہوتی ہیں۔ ایک دن کے ایک کنارہ میں یعنی رات کے خاتمہ کے قریب تاروں کے جھلملاتے وقت، دوسری دن کے دوسرے کنارے میں دن کے خاتمہ کے قریب اور تیسری رات کے ابتدائی حصہ میں۔ پہلی سے صبح کی نماز، دوسری سے عصر کی جس کو پہلے اصیل کہا گیا تھا اور تیسری سے عشاء کی نماز مراد ہے۔ ابھی تک دن اور رات کی نمازوں میں اجمال اور ابہام تھا، دوسری میں ظہر وعصر اور تیسری میں مغرب وعشاء کی نمازیں چھپی ہوئی تھیں۔ اب رات کی نمازیں سب سے پہلے علیحدہ ہوتی ہیں۔ سورۂ ق میں جو مکی سورہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اوقاتِ خلق کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے:

﴿ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ ۝ ﴾ (۵۰/ ق:۳۹)

”پس ان (مخالفوں) کے کہنے پر (اے رسول) صبر کر اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے (صبح) اور اس کے ڈوبنے سے پہلے (عصر) اپنے پروردگار کی حمد وتسبیح کر اور کچھ رات گئے پر (عشاء) اس کی تسبیح کر اور (آفتاب کے) [1] سجدہ کرنے کے بعد یعنی مغرب کے وقت اس کی تسبیح کر۔“

صبر کی تلقین سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت کا ہے جب کفار قریش ہنوز آپ کی ایذا وتحقیر کے درپے تھے۔ اس آیت پاک میں رات کی نماز کا ابہام دور کر کے مغرب اور عشاء کی تعیین کر دی گئی۔ ایک کی

[1] آفتاب کا لفظ چونکہ پہلے آچکا ہے، اس لیے ادبار السجود سے ادبار الشمس مراد ہے۔ جیسا کہ قبل الغروب سے قبل غروب الشمس مقصود ہے۔ آفتاب کے سجدہ کرنے سے مراد اس کا ڈوب جانا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ کی احادیث میں ہے کہ ”غروب کے بعد آفتاب خدا کو سجدہ کرتا ہے۔“ چونکہ آفتاب کے ڈوبنے کے لیے غروب کا لفظ پہلے آچکا تھا۔ اس لیے کلام کی فصاحت کا اقتضا یہ تھا کہ اب اس کے لیے دوسرا لفظ لایا جائے۔ چنانچہ اس معنی کے لیے سجود کا لفظ استعارۃً لایا گیا۔ سجود اصل میں زمین پر پیشانی رکھنے کو کہتے ہیں اور غروب کے وقت آفتاب کی یہی حالت ہوتی ہے، اس طرز ادا سے آفتاب پرستوں کی تردید مقصود ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نماز کے لیے سجود شمس کا ذکر کیا کہ جس وقت آفتاب کا سر بہ خالق کے آگے سجدہ میں ہو، تم بھی اپنا سر اپنے خالق کے آگے جھکاؤ۔ تفسیروں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایتیں ہیں کہ اس سے مراد مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعتیں ہیں۔

نسبت کہا گیا ﴿وَمِنَ الَّيْلِ﴾ (کچھ رات گئے) اور دوسری کی نسبت کہا گیا: ﴿وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ﴾ (آفتاب کے ڈوبنے پر) اوقات نماز کی تفصیل کے سلسلہ میں رات سے آغاز اس لیے کیا گیا کہ یہ نسبتۂ کفار سے محفوظ رہنے کا وقت تھا۔ زوال کے بعد سے غروب تک کی نماز جس کو پہلے اصیل اور پھر طرفی النہار (دن کے دونوں کناروں میں) اور یہاں قبلِ غروب کی نماز کہا گیا ہے۔ ہنوز تفصیل طلب ہے جس کے اندر ظہر وعصر دونوں نمازیں داخل ہیں۔ چنانچہ سورۂ روم میں جو مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل کی گئی ہے۔ اس سورہ کے اترنے کا وقت تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ رومیوں کی شکستِ کامل کے بعد جس کا زمانہ نبوت کے پانچویں چھٹے سال سے لے کر آٹھویں نویں سال تک ہے۔

﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ۝﴾ (۳۰/ الروم: ۱۷۔۱۸)

''اللہ کی تسبیح کرو، جب شام (یارات) کرو اور جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمان اور زمین میں ہے اور اخیر دن کو اس کی تسبیح کرو اور جب ظہر کرو۔''

اس آیت پاک میں زوال کے بعد (ظہر) اور غروب سے قبل (عصر) کی مبہم نمازوں کی توضیح کی گئی ہے۔ ایک کو عشی (عصر) اور دوسری کو ظہر کہا گیا ہے۔ تمام آیتوں کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز فجر کا بالتصریح ذکر طٰہٰ، طور، دہر، ہود، قٓ، روم اور نور میں۔ ظہر کا بالا جمال، دہر، قٓ، طٰہٰ اور اسراء میں اور بالتصریح اسراء اور روم میں، عصر کا بقرہ، دہر ہود، طٰہٰ، قٓ اور روم میں، مغرب کا بالا جمال ہود، طٰہٰ اور روم میں اور بالتصریح قٓ میں عشاء کا بصورتِ صلوٰۃ اللیل مزمل، طور اور دہر میں اور بصورت عشاء، بالا جمال طٰہٰ، ہود اور روم میں اور بالتصریح قٓ اور ہود میں ہے۔ تمام نمازوں کا بالا جمال تذکرہ بقرہ اسراء، اور طٰہٰ میں ہے۔ طور سے فجر اور عشاء دو وقتوں کی نماز اسراء، ہود اور طٰہٰ سے کم از کم بظاہر تین وقتوں کی، روم سے چار وقتوں کی (اگر مساء سے صرف مغرب مراد لیں) اور طٰہٰ اور روم سے پانچ وقتوں کی نماز ثابت ہے۔

ایک نکتہ

جمع بین الصلوتین

اوپر کی آیتوں پر غور کی نظر ڈالنے سے ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے۔ پہلی آیتوں میں ظہر اور عصر کی نمازیں مجمل ہیں، یعنی دونوں کو ایک لفظ قبل الغروب یا اصیل یا طرفی النہار کے ذریعہ سے بیان کیا گیا ہے، آخر آیت میں جو سورۂ روم کی ہے ظہر وعصر کی نمازوں کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے۔ مگر شام کی نماز میں اجمال ہے۔ یعنی مغرب وعشاء دونوں کو ﴿حِينَ تُمْسُونَ﴾ (جب رات کرو) کے ذریعہ سے ادا کر دیا گیا ہے۔ اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں مل کر ایک بھی ہیں اور علیحدہ بھی ہیں، اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر وعصر کو ایک ساتھ اور مغرب وعشاء کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے ہیں [1] اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں ہمیشہ علیحدہ ذکر کی گئی ہے۔ اس لیے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں ہے۔ احادیث میں جمع بین الصلوتین کے عنوان سے آنحضرت ﷺ کی عملی مثالیں اس نکتہ قرآنی کی تشریح میں موجود ہیں۔

اوقات پنجگانہ اور آیتِ اسراء

محدثین اور مؤرخین کا اتفاق عام ہے کہ نماز کے اوقات پنجگانہ کی تعیین معراج میں ہوئی ہے۔ جو ہماری تحقیق کے مطابق بعثت کے بارہویں سال اور ہجرت سے ایک سال پہلے واقع ہوئی تھی۔ گو اوقات پنجگانہ کا ذکر سورۂ ق اور روم میں موجود ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں۔ لیکن اقامتِ صلوٰۃ کے امر کے ساتھ سب سے پہلے اسی سورۂ اسراء (معراج) میں نماز پنجگانہ کا حکم ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ کی تکمیل بصورتِ صلوٰۃ اسی معراج میں ہوئی، جس طرح وضو پر عمل گو پہلے سے تھا، مگر اس کا حکم قرآن میں مدنی سورتوں کے اندر نازل ہوا ہے۔ سورۂ اسراء (معراج) کی وہ آیت جس میں نماز پنجگانہ کا ذکر ہے، حسب ذیل ہے:

---

[1] مؤطا امام مالك، كتاب قصر الصلاة فی السفر، باب الجمع بین الصلوتین فی السفر والحضر: ۳۲۹، ۳۳۰؛ مسلم، كتاب صلاة المسافرین، باب جواز الجمع بین الصلوتین فی السفر: ۱۶۲۱ تا ۱۶۲۷؛ ترمذی، باب ما جاء فی الجمع بین الصلوتین: ۵۵۳۔ بعض مستشرقین کو جمع بین الصلوتین کی حدیثیں دیکھ کر یہ شبہ پیدا ہوا ہے کہ زمانہ نبوی میں شاید تین وقت کی نمازیں ادا ہوتی تھیں۔ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں فاضل وینسک کو بھی یہی شبہ ہوا ہے دیکھو اس کا مضمون صلوٰۃ) مگر حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ نمازیں ہمیشہ پانچ وقتوں کی ہوتی ہیں البتہ بضرورت ظہر وعصر کو ایک ساتھ اور مغرب وعشاء کو ایک ساتھ ملا کر پڑھ لیتے تھے۔ رکعتیں اتنی ہی رہتی تھیں۔ صرف وقت میں کمی ہو جاتی تھی۔ فقہا میں باہم اس کے متعلق اختلاف ہے کہ دو دو نمازوں کو یکجا کن صورتوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ احناف کے نزدیک حقیقی طور سے صرف ایک موقع پر حج میں عرفات میں ۹ ذی الحجہ کو ظہر اور عصر دونوں ظہر کے وقت ادا کی جاتی ہیں۔ کیونکہ اس دن عصر کا وقت خاص حج کی دعاؤں کے لیے ہے۔ بقیہ نمازوں میں حنفیہ کے نزدیک حقیقی یکجا نہیں بلکہ محض صورۃً دو دو نمازیں ایک ساتھ ادا کی جا سکتی ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک نماز اخیر وقت میں اور دوسری اول وقت میں پڑھی جائے حنفیہ کے علاوہ دوسرے فقہا کے نزدیک سفر میں حقیقۃً دو نمازیں یکجا ایک وقت میں پڑھی جا سکتی ہیں اور آنحضرت ﷺ نے ایسا کیا ہے۔ شیعوں میں دو دو نمازوں کے ایک ساتھ پڑھنے کا عام رواج ہے۔

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآء یل:۷۸)

''آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی تاریکی تک نماز کھڑی کر اور فجر کی قراءت قائم کر بے شک فجر کی قراءت میں حضور ہوتا ہے۔''

یہ آیت کریمہ اوقات پنجگانہ کی تعیین اور اس کے سبب کو پوری طرح بیان کرتی ہے۔ اس میں سب سے اہم اور تشریح کے قابل لفظ دلوک ہے، دلوك کے اصلی معنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں ،لیکن تحقیق طلب یہ ہے کہ دلوك الشمس یعنی آفتاب کے جھکنے سے کیا مراد ہے؟ اور اہلِ عرب اس کو کن معنوں میں بولتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی میں اس لفظ کا اطلاق تین اوقات یا آفتاب کی تین حالتوں پر ہوتا ہے۔ زوال پر، مقابل نقطۂ نگاہ سے آفتاب کے ہٹ جانے پر اور غروب پر اور جب آیت مذکورہ میں یہ کہا گیا کہ آفتاب کے دلوك (جھکاؤ) پر نماز پڑھو، تو ان تینوں دلوکات یعنی آفتاب کے تینوں جھکاؤ پر ایک ایک نماز لازم آئی۔ غرض یہ ہے کہ اوج کمال پر پہنچنے کے بعد جب آفتاب ڈھلنا شروع ہوتا ہے تو اس کے تین دلوک یا جھکاؤ ہوتے ہیں۔ ایک نقطہ سمت الراس سے، دوسرا نقطۂ تقابل سے اور تیسرا دائرہ افق سے، پہلا ظہر کا وقت ہے، دوسرا عصر کا اور تیسرا مغرب کا اور اس کے ہر دلوک یعنی انحطاط پر اس کی خدائی کی نفی وتردید اور خدائے برحق کی الوہیت کے اقرار و اعلان کے لیے ایک ایک نماز رکھی گئی ہے، اس طرح ''دلـــوك'' کے لفظ کے اندر تین نمازوں کے وقت بتائے گئے ہیں، چوتھی نماز کا وقت غسق اللیل (رات کی تاریکی) ہے، یہ عشاء کی نماز ہے اور اس کو حقیقت میں نصف شب کو ادا ہونا چاہیے، جب آفتاب کا چہرہ نورانی تو بر تو حجابات ظلمت میں چھپ جاتا ہے۔ لیکن لوگوں کی تکلیف کے خیال سے وہ سونے سے پہلے رکھی گئی ،تا کہ خواب کی غفلت کی تلافی اس سے ہو جائے اور پانچویں نماز کا وقت قرآن الفجر (صبح کا پڑھنا) بتایا گیا ہے، یہ آفتاب کے طلوع سے پہلے اس لیے ادا کی جاتی ہے کہ عنقریب وہ ظاہر ہو کر اپنے پرستاروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا، اس لیے ضروری ہے کہ دنیا اس کے طلوع سے پہلے ہی خالقِ اکبر کا نام لے اور اس باطل پرستی سے جس میں آفتاب پرست عنقریب مبتلا ہونے والے ہیں۔ تبری ظاہر کرے۔ غرض اس آیت پاک سے اقامت صلوٰۃ کے اوقات پنجگانہ کا ثبوت ملتا ہے۔ اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ کلام عرب میں آفتاب کے ان تینوں جھکاؤ یا میلانات پر دلوک کا اطلاق ہوتا ہے۔ اگر کلام عرب سے یہ ثابت ہو جائے تو اس آیت سے اوقات پنجگانہ کی تشریح کے قبول کرنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا۔

دلوک کی تحقیق

مفسرین میں سے بعض نے دلوک سے زوال کا وقت اور بعض نے غروب کا وقت مراد لیا ہے اور اہل لغت نے بھی اس کے یہ دونوں معنی لکھے ہیں اور ایک تیسرے معنی اور بھی بیان کیے ہیں، یعنی مقابل نقطۂ نگاہ

سے ہٹ جانا اور اس کے ثبوت میں ایک جاہلی شاعر کا شعر بھی پیش کیا ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے:

ودلكت الشمس تدلك دلوكًا غربت وقيل: اصفرت ومالت للغروب وفي التنزيل العزيز ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ﴾ وقد دلكت زالت عن كبدالسماء ـــ وقال الفراء عن ابن عباس في دلوك الشمس انه زوالها الظهر قال ورأيت العرب يذهبون بالدلوك الى غياب الشمس قال الشاعر:

هـــذا مـــقـــام قـــدمـــي ربـــاح
ذبـــب حتـــى دلـــكـــت بـــراح

يعني الشمس قال ابومنصور: وقد روينا عن ابن مسعود انه قال دلوك الشمس غروبها وروى ابن هانيء عن الا خفش انه قال: دلوك الشمس من زوالها الى غروبها . وقال الزجاج: دلوك الشمس زوالهافي وقت الظهر و ذالك ميلها للغروب وهو دلوكها ايضًا يقال قد دلكت براح و براح اى قدمالت للزوال حتى كادالناظر يحتاج اذاتبصر ها ان يكسر الشعاع عن بصره براحته...... فان قيل مامعنى الدلوك في كلام العرب قيل الدلوك الزوال و لذالك قيل للشمس اذازالت نصف النهار دالكة و قيل لها اذا افلت دالكة لا نها في الحالتين زائلة ـــ قال الفراء في قوله براح جمع راحة و هي الكف يقول يضع كفه على عينيه ينظر هل غربت الشمس بعد۔ [1]

”آفتاب کا دلوک ہوا یعنی وہ (۱) غروب ہوا اور کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ (۲) آفتاب زرد ہوگیا اور غروب کے لیے جھک گیا اور قرآن میں ہے کہ دلوک شمس کے وقت رات کی تاریکی تک نماز کھڑی کر اور آفتاب کو دلوک ہوا یعنی (۳) وہ آسمان کے بیچ سے ہٹ گیا...... اور فراء نے کہا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ دلوکِ شمس کے معنی ظہر کے وقت آفتاب کے زوال کے ہیں اور اس نے بیان کیا کہ میں نے اہلِ عرب کو دلوک سے آفتاب کا غروب مراد لیتے دیکھا ہے، شاعر کہتا ہے: یہ وہ جگہ ہے جہاں لڑائی میں رباح کے دونوں قدم جمے تھے، اس نے دشمنوں سے اپنی عزت کی حفاظت کی، یہاں تک کہ سورج ہتھیلی سے جھک گیا، ابو منصور نے کہا کہ ہم نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ دلوک شمس آفتاب کا غروب ہے اور ابن ہانی نے اخفش سے نقل کیا کہ دلوکِ شمس ظہر کے وقت آفتاب کا زوال ہے اور اس کے معنی غروب کے لیے جھکنا بھی ہیں اور یہ بھی اس کا دلوک ہے۔ محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ دلکت براح وبراح یعنی آفتاب زوال کے لیے جھک گیا۔ یہاں تک کہ دیکھنے والا

[1] لسان العرب، ج۱، ص:۱۰۰۵۔

جب اس کی کو دیکھنا چاہے تو اس کرن کی شدت کو توڑنے کے لیے اس کو آنکھ پر ہتھیلی رکھنے کی ضرورت ہے..... تو اگر کہا جائے کہ عرب کے محاورہ میں دلوک کے کیا معنی ہیں؟ تو جواب دیا جائے گا کہ دلوک کے معنی زوال کے ہیں اور اسی لیے آفتاب کو دالکۃ کہتے ہیں۔ جب وہ دوپہر کو جھک جائے اور جب آفتاب ڈوب جاتا ہے تب بھی اس کو دالکۃ کہتے ہیں کیوں کہ ان دونوں حالتوں میں وہ جھک جاتا ہے۔ فراء نے کہا کہ اس قول (شعر یا محاورہ) میں جو براح کا لفظ ہے، یہ راحۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہتھیلی کے ہیں، کہنے والے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کر دیکھتا ہے کہ آفتاب ابھی غروب ہوا یا نہیں۔''

شعرائے عرب نے آفتاب کے ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آجانے کے وقت آنکھوں پر ہتھیلی رکھنے کا اکثر ذکر کیا ہے۔ عجاج کہتا ہے:

والشمس قد كادت تكون دلفًا ادفعها بالراح كي تزحلفا [1]

''اور آفتاب قریب تھا کہ بیمار ہو کر دبلا ہو جائے میں اس کو ہتھیلی سے ہٹاتا تھا، تاکہ وہ ہٹ جائے۔''

اس دوسرے شعر سے پہلے شعر کے معنی کھل جاتے ہیں کہ اس میں دلوک سے زوال اور غروب کے بجائے وہ وقت مراد ہے، جب آفتاب ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور یہ عصر کا وقت ہوتا ہے۔ الغرض دلوک کا لفظ آفتاب کے ہر جھکاؤ پر برابر بولا جاتا ہے، اس کا پہلا جھکاؤ زوال کے وقت ہوتا ہے، جب وہ سمت الراس سے ہٹتا ہے دوسرا جھکاؤ عصر کے وقت ہوتا ہے جب وہ مقابل کی سمت نظر سے ہٹتا ہے اور مغرب کی طرف چلنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پڑتا ہے، اس وقت شعاعوں کی تیزی سے بچنے کے لیے آدمی کو آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھنے یا کسی اور چیز سے آڑ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور اس کا تیسرا جھکاؤ غروب کے وقت ہوتا ہے، جب وہ سمت افق سے نیچے ہو کر ڈوب جاتا ہے۔ ان ہی تین مسلسل اوقات کی وجہ سے جو زوال سے لے کر غروب تک کے زمانہ پر مشتمل ہیں، بعض اہل لغت نے جیسا کہ اوپر گزرا تسامحاً یہ کہہ دیا ہے کہ دلوک زوال سے غروب تک کے وقت کو کہتے ہیں حالانکہ اس کا اطلاق تحقیقی طور سے آفتاب کے تین میلانات پر کیا جاتا ہے اول اس میلان پر جو سمت الراس سے ہوتا ہے، پھر اس میلان پر جو سمتِ نظر سے ہوتا ہے اور بالآخر اس کامل میلان پر جو سمت افق سے ہوتا ہے اور یہ اوقات زوال سے غروب تک مسلسل یکے بعد دیگرے چند چند گھنٹوں کے بعد آتے ہیں، اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۷۸)

''آفتاب کے دلوک کے وقت نماز کھڑی کر۔''

[1] یہ شعر تفسیر طبری میں آیت مذکورہ کے تحت میں اور لسان العرب میں دلف ج ۱۱، ص: ۱۰۱۹ اور زحلف، ج ۲، ص: ۱۶ کے تحت میں مذکور ہے۔

سے مراد تین نمازیں ہیں، کیوں کہ تین دلوک ہوتے ہیں: ظہر (۱) جب آفتاب کا دلوک (جھکاؤ) سمت الراس سے ہوتا ہے، (۲) عصر جب اس کا دلوک سمتِ نظر سے ہوتا ہے اور مغرب (۳) جب اس کا کامل دلوک سمتِ افق سے ہوتا ہے [1] اس کے بعد غسق اللیل (رات کی تاریکی) اور قرآن الفجر (فجر کی قراءت) سے ظاہر ہے کہ عشا اور فجر کی نمازیں مراد ہیں، اس طرح اس آیت سے جو سورۂ اسراء میں واقع ہے اوقات پنجگانہ میں اقامتِ صلوٰۃ کے اوقات کی تشریح ہو جاتی ہے۔

اوقاتِ نماز کا ایک اور راز

اس آیت کریمہ کو ایک دفعہ اور پڑھو تو معلوم ہوگا کہ نماز کے اوقات کا آغاز ظہر (میلان اول آفتاب) سے ہوتا ہے اور یہی اس حدیث سے بھی ثابت ہے، جس میں بذریعہ جبریل نماز کے اوقات پنجگانہ کی تعلیم کا ذکر [2] ہے اس میں پہلے ظہر کا نام آتا ہے پھر بہ ترتیب اور چاروں نمازوں کا، ظہر کے بعد عصر پھر مغرب پھر سونے سے پہلے عشاء یہ چار نمازیں تقریباً دو تین گھنٹوں کے فاصلہ سے ہیں، اس کے بعد صبح کی نماز ہے، جو عشاء سے تقریباً سات آٹھ گھنٹوں کا فصل رکھتی ہے اور پھر صبح سے ظہر تک تقریباً اس قدر فصل ہے۔ چنانچہ اس آیت میں ظہر سے عشاء تک ایک ساتھ نماز کا مسلسل حکم ہے، چند گھنٹے ٹھہر کر صبح کا حکم ہوتا ہے، پھر خاموشی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ آفتاب طلوع ہو کر ایک لمبے وقفے کے بعد پھر ظہر کا وقت آتا ہے اور اسی طرح دور قائم ہو جاتا ہے غرض ظہر سے عصر، عصر سے مغرب اور مغرب سے عشاء تک مسلسل نمازیں ہیں، پھر صبح تک استراحت کا طویل وقفہ ہے، صبح اٹھ کر خدا کی یاد ہوتی ہے اور پھر انسانی کاروبار کے لیے ایک طویل وقفہ رکھا گیا ہے، جو صبح سے ظہر تک ہے اور اس میں کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی ہے۔

اوقاتِ پنجگانہ کی ایک اور آیت

سورۂ اسراء کی آیت کی طرح سورۂ طٰہٰ میں بھی ایک آیت ہے جس میں اوقات پنجگانہ کی تفصیل ہے، وہ یہ ہے:

﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۱۳۰)

''اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور اس (آفتاب کے) ڈوبنے سے پہلے اور رات کے کچھ وقت میں تسبیح پڑھ اور دن کے کناروں میں۔''

---

[1] تفسیروں میں بھی صحابہ کی روایتوں سے انہیں نمازوں کا باختلافِ روایت مراد ہونا مذکور ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ دلوک سے غروب آفتاب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما زوالِ آفتاب مراد لیتے ہیں۔ اسی طرح غسق اللیل کو بعض لوگ مغرب اور بعض عشاء سمجھتے ہیں اور فیصلہ یہ کرتے ہیں کہ دلوک شمس سے ظہر اور عصر اور غسق اللیل سے مغرب اور عشاء اور قرآن الفجر سے نمازِ صبح مراد ہے اور اس طرح ان کے نزدیک بھی یہ آیت اوقاتِ پنجگانہ کو بتاتی ہے۔

[2] سیرت ابن ہشام، باب ابتداء فرضیت صلوۃ، ج ۱، ص: ۱۵٦۔

آفتاب نکلنے سے پہلے فجر ہے، ڈوبنے سے پہلے عصر ہے، رات کے کچھ وقت سے عشاء مراد ہے اور دن کے کناروں میں ظہر اور مغرب ہے۔

اطراف النہار کی تحقیق

یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ اطراف کا لفظ جمع ہے، جو کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے، اس بنا پر دن کے تین طرف (کنارے) ہونے چاہئیں، دن کے کنارے یا تو دو ہی ہیں، صبح اور شام یا تین ہیں، اگر وسط کا بھی اعتبار کیا جائے۔ یعنی صبح دوپہر اور شام۔ پہلی شق لی جائے تو صبح کا ذکر مکرر ہو جاتا ہے اور ظہر غائب ہو جاتی ہے، دوسری شق اختیار کی جائے تو گو ظہر آ جاتی ہے، مگر پھر بھی صبح مکرر ہی رہتی ہے۔

اس لفظی اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اطراف گو جمع ہے، مگر کلام عرب میں تثنیہ یعنی دو پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے اور خود قرآن مجید میں اس کے استعمالات موجود ہیں، مثلاً: ایک جگہ مشرقین اور مغربین دو مشرق اور دو مغرب ہے۔ دوسری جگہ انہیں کو مشارق اور مغارب کہا گیا ہے سورۂ تحریم میں ہے ﴿فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا﴾ (تم دونوں کے قلوب) ظاہر ہے کہ دو آدمیوں کے دو قلب ہوں گے، قلوب (بصیغہ جمع) نہیں ہو سکتا، مگر یہ زبان کا محاورہ اور بول چال ہے۔ اس میں قیاس اور عقلیت کو دخل نہیں، اس بنا پر اطراف سے مراد صرف دو طرف ہیں۔ یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ دن کے دو ہی ممتاز حصے ہیں، ایک صبح سے دوپہر تک اور دوسرا دوپہر سے شام تک، اطراف سے انہیں دونوں حصوں کے آخری کنارے یہاں مراد ہیں۔ صبح سے مراد دوپہر تک کے حصہ کا آخری کنارا ظہر ہے اور دوپہر سے غروب تک کے حصہ کا آخری کنارا عصر یا مغرب ہے، لیکن چونکہ عصر کا ذکر قبل غروبہا کے اندر مستقل موجود ہے، اس لیے متعین ہو گیا کہ یہاں اس سے مراد مغرب ہے۔

ایک اور طریقۂ ثبوت

اگر ہم قرآن پاک کی علیحدہ علیحدہ آیتوں سے اوقات پنجگانہ پر استدلال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ مثلاً:

1. ﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۷۸)

"زوال آفتاب کے وقت نماز کھڑی کر۔"

یہ ظہر کی نماز ہے۔

2. ﴿وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ﴾ (۵۰/ ق: ۳۹)

"اور غروب آفتاب سے پہلے خدا کی تسبیح کرو۔"

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّأَصِيْلًا﴾ (۷۶/ الدھر: ۲۵)

"اپنے پروردگار کا نام لو صبح کو اور عصر [1] کو۔"

---

[1] الاصيل الوقت بعد العصر الى المغرب (صحاح جوهری ولسان العرب، ج ۱، ص: ۶۹)۔

یہ عصر کی نماز ہوئی اور اسی کو

﴿ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ﴾ (۲/ البقرۃ :۲۳۸)

''بیچ کی نماز۔''

سورۂ بقرہ میں اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ دن کی نمازوں میں ظہر اور مغرب کے بیچ میں واقع ہے۔

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ ﴾ (۱۱/ هود :۱۱٤)

''اور دن کے دونوں (ابتدائی اور انتہائی) کناروں میں نماز کھڑی کر۔''

دن کا ابتدائی کنارہ صبح اور انتہائی کنارہ مغرب ہے۔

سورۂ نور میں ہے کہ صبح کی نماز سے پہلے بے پکارے زنانہ کمرہ یا مکان میں نہ جایا کرو۔

﴿ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ ﴾ (۲٤/ النور :۵۸)

''صبح کی نماز سے پہلے۔''

اس سے نمازِ صبح کا عملی ثبوت بھی ملا، پھر اسی میں اسی موقع پر ہے۔

﴿ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ﴾ (۲٤/ النور :۵۸)

''اور عشاء کی نماز کے بعد۔''

اس کی رو سے مسلمانوں کو عشاء کی نماز کے بعد جو سونے اور کپڑے اُتار دینے کا وقت ہے، کسی کے مکان میں بلا اجازت اندر جانے کا حکم نہیں، یہ بھی نماز عشاء کا عملی ثبوت ہے اور یہی پانچوں اوقاتِ نماز ہیں۔

نماز پنجگانہ احادیث وسنت میں

تمام انبیا علیہم السلام میں آنحضرت ﷺ کو جو خاص تفوق وامتیاز حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ آپ جو شریعت لے کر آئے، اس کی صورت صرف نظری اور خیالی نہ تھی اور نہ وہ کسی حیثیت سے مبہم اور مجمل رہی، بلکہ آپ نے اپنے عمل اور طریق سے اس کی پوری تشریح فرما دی اور خود عمل فرما کر اور اپنے تمام پیرووں سے اس کی تعمیل کروا کر اس کے متعلق ہر قسم کے پیدا ہونے والے شک وشبہ کی جڑ کاٹ دی۔ اسلام نے جس روزانہ طریق عبادت کو پیش کیا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے عمل سے اس کے تمام ارکان وآداب وشرائط واوقات وتعداد کی پوری تشریح فرما دی اور ان میں سے ہر چیز ناقابل شک قولی وعملی تواتر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی۔ نماز کس طرح پڑھنی چاہیے؟ اس میں کیا کیا پڑھنا چاہیے؟ کن کن وقتوں میں پڑھنی چاہیے؟ کس وقت کی نماز کی کتنی رکعتیں ہیں؟ ان میں سے ہر چیز کی آپ نے زبانی تشریح فرمائی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو تلقین کی اور عملاً نبوت کی پوری زندگی میں جو حکمِ نماز کے بعد گزری ایک دن دو دن نہیں کم از کم مدینہ میں متصل دس برس تک ہر روز پانچ دفعہ تمام جماعت مسلمین کے سامنے پورے اعلان کے ساتھ ادا فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ مرض الموت میں بھی اس میں تخلف نہ ہوا اور

آخری سانس تک اسی طرح بدستور اس پر عمل ہوتا رہا۔ مدینہ کی مسجدِ نبوی اور تمام اسلامی مسجدوں میں پنج وقتہ اعلانِ نماز کی آوازیں بلند ہوئیں اور ہر روز پانچ دفعہ ہر جگہ جہاں اسلام کا کلمہ پڑھا جاتا تھا، یہ فرض ادا ہوتا تھا آپ کے بعد تمام خلفائے راشدین اور تمام پیروانِ محمدی جہاں بھی رہے اور جہاں بھی پہنچے، اسی طرح دن میں پانچ بار علی الاشہاد سفر و حضر میں تمام عمر ادا کرتے رہے۔ کیا ایسی مستمر علی الاعلان متواتر اور دائمی چیز میں کسی کو شک واقع ہوسکتا ہے، یہ اہتمام، یہ علانیہ استمرار اور یہ تاکید بلیغ اس لیے فرمائی، تاکہ جس طرح دوسرے پیغمبروں کا طریق عبادت بعد کے پیروؤں کے ترک عمل سے مشتبہ اور عدم صحت نقل سے مشکوک ہوگیا۔ خاتم الانبیا ﷺ کی شریعتِ آخرین کا طریق عبادت اس سے محفوظ رہے، کیوں کہ اگر اب اس شریعت میں شک پڑ جاتا تو پھر کوئی دوسری نبوت آ کر اس کی تجدید و اصلاح کرنے والی نہ تھی۔ چنانچہ اسی بنا پر آج تک تمام پیروانِ محمدی ﷺ میں آپ کی یہ نماز اور اس کے ضروری اور اہم متعلقہ ارکان و شرائط و احکام روایۃً متواتر اور عملاً محفوظ و قائم ہیں۔ نماز وہ فریضۂ الٰہی ہے جس کی فرضیتِ خمسہ کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس ساعت سعید میں دیا، جب آنحضرت ﷺ معراج کے تقربِ خاص سے ممتاز ہوئے۔ حکم ہوا کہ شب و روز میں پانچ نمازیں تم پر اور تمہاری امت پر لکھی گئیں جو پچاس نمازوں کے حکم میں ہیں۔ 1 قرآن پاک سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ارشاد ہے کہ ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ﴾ (٦/ الانعام: ١٦٠) یعنی ''جو ایک نیکی کرے گا اس کو دس گنا ثواب ملے گا۔'' اس لیے پانچ نمازیں یقیناً پچاس کے حکم میں ہیں۔ نماز کی فرضیت کے بعد فرشتۂ الٰہی نے اتر کر خود نماز کے طریقِ ادا اور اس کے اوقات خمسہ کی تعلیم کی اور ہر وقت کی ابتدا اور انتہا پر ایک ایک نماز پڑھا کر عملاً ہر چیز کی تلقین کی 2 اور وہی آپ نے اپنے پیروؤں کو بتایا اور اس پر ان سے عمل کرایا۔ چنانچہ آپ نے شیوعِ اسلام کے بعد ہر جگہ احکامِ شریعت کی تبلیغ و اعلان کے مبلغ جب متعین فرمائے تو ایک بدوی نے جو نجد کے دور دراز راستہ سے سفر کر کے آیا تھا، خدمتِ اقدس میں آ کر عرض کی، یارسول اللہ! آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں کیا یہ سچ ہے؟ فرمایا: ''ہاں سچ ہے۔'' عرض کی کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا: ''ہاں''۔ 3

خود آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ ''جبریل اترے اور انہوں نے میری امامت کی تو میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی یہ فقرے منہ سے کہتے جاتے تھے اور انگلی سے ایک دو تین چار پانچ گنتے جاتے تھے۔'' 4 ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ ''اگر کسی کے گھر کے

1 صحیح بخاری، کتاب الصلوة، باب کیف فرضت الصلوة فی الاسراء: ٣٤٩؛ مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء برسول اللّٰہ: ٤١١۔ 2 صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوة، باب مواقیت الصلوة وفضلها: ٥٢١؛ مسلم، کتاب المساجد، باب أوقات الصلوات الخمس: ١٣٨٠۔ 3 صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب الزکوٰة من الاسلام: ٤٦ وکتاب العلم: ٦٣؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان: ١٠٢۔

4 صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب أوقات الصلوات الخمس: ١٣٧٩۔

سامنے کوئی صاف شفاف نہر جاری ہو اور وہ اس میں دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس کے بدن پر کچھ میل رہ سکتا ہے؟'' سب نے عرض کی نہیں، نہیں رہے گا فرمایا: ''تو یہی مثال پانچوں وقت کی نمازوں کی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو دھو دیتا ہے۔'' 1 اوقات کی تعیین میں فرمایا کہ ''جب صبح کی نماز پڑھو تو اس کا وقت اس وقت تک ہے جب تک سورج کی پہلی کرن نہ نکل آئے، پھر جب ظہر پڑھو تو اس وقت تک اس کا وقت ہے جب تک عصر کا وقت نہ آ جائے، پھر جب عصر کی نماز پڑھو تو اس کا موقع اس وقت تک ہے کہ آفتاب زرد پڑ جائے۔ پھر جب مغرب پڑھو تو شفق ڈوب جانے تک اس کا وقت ہے، پھر جب عشاء پڑھو تو آدھی رات تک اس کا وقت ہے۔'' 2 ابو برزہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی کہتے ہیں کہ حضور صبح کی نماز میں ساٹھ سے سو آیتیں تک قراءت کرتے تھے اور ظہر زوال کے بعد ادا کرتے تھے اور عصر اس وقت پڑھتے تھے کہ ایک آدمی مدینہ کے آخری کنارہ تک جا کر لوٹ آتا تھا، پھر بھی آفتاب میں جان رہتی تھی، مغرب کی بابت راوی کو سنا ہوا بیان یاد نہیں رہا اور عشاء کو تہائی رات تک ادا کرنے میں آپ تامل نہیں فرماتے تھے 3 حضرت جابر رضی اللہ عنہ دوسرے صحابی سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ظہر کی نماز دوپہر میں پڑھا کرتے تھے اور عصر اس وقت جب سورج باقی رہتا تھا اور مغرب جب سورج ڈوب جاتا تھا اور عشاء میں کبھی دیر کرتے اور کبھی عجلت اور صبح اندھیرے میں پڑھتے تھے۔ 4 صحابہ کہتے ہیں کہ حضور ظہر اور عصر کی نمازوں کی دو پہلی رکعتوں میں آہستہ آہستہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورہ پڑھتے تھے کبھی کبھی کوئی آیت سنائی بھی دیتی تھی۔ مغرب میں سورۃ المرسلٰت پڑھی اور کبھی سورۂ طور پڑھی۔ عشاء میں ﴿اذا السماء انشقت﴾ اور ﴿والتین و الزیتون﴾ قراءت کی ہے اور صبح میں سورۂ طور پڑھی ہے۔ 5 اس قسم کی اور بیسیوں روایتیں ہیں اور روایتوں پر کیا موقوف ہے، اس وقت سے آج تک تمام اتباعِ محمد رسول اللہ ﷺ کا عملی تواتر دوست و دشمن سب کے نزدیک ناقابل تردید حجت ہے۔ 6

تہجد اب نفل ہو گئی لیکن کیوں؟

ان نماز پنجگانہ کی تکمیل کے بعد صلوٰۃ اللیل (تہجد کی نماز) جو پہلے فرض تھی، عام امت کے لیے نفل ہو گئی، چنانچہ پوری آیت یہ ہے:

---

1 صحیح بخاری، کتاب الصلوة، باب الصلوات الخمس کفارة: ٥٢٨۔

2 صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰة، باب اوقات صلوات الخمس: ١٣٨٦۔

3 صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلاة، باب وقت الظهر عند الزوال: ٥٤١۔

4 صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلاة، باب وقت العشاء اذا اجتمع الناس او تأخروا: ٥٦٥۔

5 صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب القراءة فی الظهر و العصر و المغرب و العشاء و الفجر بروایات متعددة: ٧٥٨ تا ٧٧١۔

6 چونکہ بعض مستشرقین نے (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ صلوٰۃ) دانستہ یا نادانستہ طور پر اوقاتِ نماز میں غلط فہمی پھیلانی چاہی ہے۔ اس لیے اتنی تفصیل کی ضرورت پڑی، تا کہ ان کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآء یل:۷۸-۷۹)

''نماز کو آفتاب کے جھکاؤ کے بعد کھڑی کر (ظہر عصر مغرب) رات کی تاریکی تک اور صبح کی قراءت قائم کر، بے شک صبح کی قراءت میں حضور ہوتا ہے اور رات کے حصہ میں تو اٹھ کر (اوقات مقررہ سے) زیادہ نماز پڑھ شاید کہ تجھ کو تیرا رب قابل تعریف مقام میں اٹھائے۔''

غور کرو کہ جب تک اوقات مقرر نہ ہوئے تھے، رات کو دیر تک نماز اور نماز میں جتنا زیادہ قرآن پڑھا جا سکے، پڑھنے کا حکم تھا، گویا یہ پانچوں وقت کی ایک ہی وقت میں نماز تھی یعنی نماز کی پانچ پتیوں والا پھول ابھی تک غنچہ کی طرح ورق بر ورق تھا، جب دو اور تین وقتوں کی نمازیں الگ الگ ہوئیں تو ان کے بقدر رات کی طویل نماز میں تخفیف ہوگئی اور حکم آیا کہ ﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ ﴾ (۷۳/ المزمل:۲۰) یعنی ''قرآن سے اس قدر حصہ پڑھو جتنا آسانی سے پڑھ سکو۔'' [1] اس کے بعد اس آیت پاک میں جب اقامت صلوٰۃ کے اوقات پنجگانہ کا ذکر آیا تو رات کی نماز تہجد کی فرضیت ساقط ہوگئی۔ یہاں ایک قابل ذکر بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ شاید یہ آیت پاک اوقات نماز کی تکمیل کی آخری اطلاع ہے، کیوں کہ اس کے نازل ہونے سے پیشتر قدیم فرض نماز تہجد نفل نہ تھی اور اب نفل ہوگئی۔

قبلہ

انسان کا کوئی کام جس طرح زمانہ سے خالی نہیں ہوسکتا۔ جس کی بنا پر اوقات نماز کی تعیین کی گئی ہے، اسی طرح مکان سے بھی خالی نہیں ہوسکتا۔ جب انسان کوئی کام کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا منہ کسی نہ کسی سمت ہو گا۔ اگر نماز میں کسی خاص سمت کا تعین نہ ہوتا اور یہ عام اجازت دے دی جاتی کہ جس کا جدھر جی چاہے منہ کر کے نماز ادا کرے تو جماعت کی یکسانی کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا اور نمازیوں کی وحدت صوری قائم نہ رہتی بلکہ اگر ایک ہی مسجد میں ایک ہی وقت میں کوئی پورب، کوئی پچھم کوئی اتر اور کوئی دکھن رخ کر کے کھڑا ہوتا تو یہ وحدت نظام کے خلاف ہونے کے علاوہ اچھا خاصہ مضحکہ انگیز تماشا بن جاتا، اس لیے ہر مذہب میں عبادت کے لیے کوئی نہ کوئی سمت خاص کر لی گئی ہے۔ صابی (ستارہ پرست) قطب شمالی کی طرف منہ کرتے تھے کہ ستاروں میں وہی ہے، جو نظر آنے کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا، بلکہ برقرار رہتا ہے۔ [2] آفتاب پرست سورج کی طرف منہ کرتے ہیں، آتش پرست آگ کو سامنے رکھتے ہیں اور بت پرست کوئی نہ کوئی بت آگے رکھ لیتے ہیں۔ اکثر شامی قومیں مشرق کی طرف رخ کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ یہودیوں کے ایک فرقہ

[1] صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ: ۸۸۵، نیز دیکھو فتح الباری، ج ۱، ص: ۳۹۳۔

[2] الرد علی المنطقیین لابن تیمیۃ ومجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ج۹، ص: ۲۱۶۔

الیسینی نے آفتاب کے مطلع کو قبلہ بنالیا تھا۔ شامی عیسائی بھی اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے [1] بنی اسرائیل میں بھی قبلہ ضروری تھا، توراۃ سے حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کا یہ دستور معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں عبادت کرنا چاہتے تھے، اس جگہ کو چند پتھروں سے گھیر کر خدا کا گھر ''بیت ایل'' [2] بنا لیتے تھے قرآن مجید میں ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے ان کو حکم ہوا تھا کہ گھروں کو قبلہ رخ بنائیں اور نماز ادا کریں:

﴿ وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۭ ﴾ (۱۰/ یونس:۸۷)

''اور اپنے گھروں کو قبلہ رخ کرلو اور نماز کھڑی کرو۔''

بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا ذکر عہد قدیم کے مجموعہ صحف میں متعدد موقعوں پر آیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے زبور میں ہے۔

''لیکن میں جو ہوں سو تیری رحمت کی کثرت سے تیرے گھر میں آؤں گا اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کروں گا۔'' (۵۔۷)

سلاطین اوّل میں ہے:

''جب تیرا گروہ لڑائی کے لیے اپنے دشمن کے برخلاف نکلے، جہاں کہیں تو انہیں بھیج دے اور خداوند کے آگے دعا مانگے، اس شہر کی طرف جس کو تو نے پسند کیا اور اس گھر کی طرف جسے میں نے تیرے نام کے لیے بنایا۔'' (۷۔۴۴)

اسی صحیفہ میں آگے چل کر ہے:

''اور اس زمین کی طرف جس کو تو نے ان کے باپ دادوں کو دی اور اس شہر کی طرف جسے تو نے چن لیا اور اس گھر کی طرف جو میں نے تیرے نام کے لیے بنایا تجھ سے دعا مانگیں۔'' (۴۸)

اہل عرب میں کعبہ کو وہی حیثیت حاصل تھی جو بنی اسرائیل میں بیت المقدس کو تھی، اس لیے اہل عرب کا قبلہ کعبہ تھا، اس تمام تفصیل سے قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح ہوتی ہے:

﴿ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۴۸)

''اور ہر ایک امت کا ایک قبلہ ہے، جدھر وہ منہ پھیرتی ہے، تو اے مسلمانو! نیکیوں کی طرف دوڑو۔''

اوپر کے بیان سے واضح ہوا ہوگا کہ دنیا کے تین مذاہب میں تین قسم کے قبلے تھے، ستارہ پرست یا ستارہ پرستی سے متاثر، پرستش کے لیے کسی وقت کسی ستارہ کو قبلہ بناتے تھے، مثلاً: آفتاب پرست آفتاب کے طلوع کے رخ یعنی مشرق کو اور صابئ (ستارہ پرست) قطب شمالی کو، عناصر پرست یا بت پرست اپنی پرستش کے عنصر

---

[1] یہ تفصیلات انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لفظ ''قبلہ'' میں ہیں ج ۲۸، ص: ۹۸۵۔

[2] سفر تکوین باب: ۱۲۔ ۸ عہد نامہ قدیم، ص: ۱۹ و ۱۳۔ ۴ و ۲۸۔ ۱۷، ۱۸۔ ۱۹ ایضاً، ص: ۴۵ و ۳۱۔ ۱۳۔

یعنی آگ یا کسی دریا یا کسی بت کو قبلہ قرار دیتے تھے، موحدین اپنی مرکزی مسجد کو قبلہ سمجھتے تھے۔
ابراہیمی قوموں میں اسی قسم کی مرکزی مسجدیں دو تھیں، مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور مسجد حرام (خانہ کعبہ) پہلی مسجد کی تولیت حضرت اسحاق اور ان کی اولاد کے سپرد ہوئی تھی، اس لیے وہ ان کا قبلہ تھی۔ دوسری مسجد کے متولی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کے بیٹے تھے، جنہوں نے اس قبلہ کو بنایا تھا۔ آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں رہے، خانہ کعبہ کی طرف اس طرح منہ کر کے کھڑے ہوتے تھے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں سامنے پڑ جاتے تھے، لیکن جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ صورت ممکن نہ تھی، کیونکہ بیت المقدس مدینہ سے شمال اور خانہ کعبہ جنوب کی طرف واقع تھا، تاہم کعبہ کے قبلہ ہونے کی اب تک چونکہ اجازت نازل نہیں ہوئی تھی، آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف رُخ کرتے تھے، کہ وہی انبیائے بنی اسرائیل کا قبلہ گاہ تھا لیکن آپ ﷺ کی طبعی خواہش یہ تھی کہ اس تازہ ملت ابراہیمی کے لیے وہی ابراہیمی مسجد (خانہ کعبہ) قبلہ قرار پائے، جس کی تولیت اس کے بانی (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کی طرف سے بنی اسماعیل کے سپرد ہوئی تھی، چنانچہ سورۂ بقرہ کے وسط میں اس کے متعلق احکام نازل ہوئے جن میں سب سے پہلے بتایا گیا کہ خدا کو کسی جہت اور سمت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ بے سمت ہے اور سب سمتیں اسی کی ہیں:

﴿ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۱۵)

”اور خدا ہی کے لیے ہے پورب اور پچھم، تو جدھر رخ کرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے، بیشک اللہ بڑی گنجائش، اور وسعت والا اور بڑے علم والا ہے۔“

اس کی گنجائش اور وسعت میں ہر سمت داخل ہے اور ہر جہت کی اس کو خبر ہے، یہ آیت کریمہ قبلہ کے تعین کی کسی ایسی تشریح کو جس سے شرک کا شائبہ پیدا ہو سکے قطعاً غلط قرار دیتی ہے اور دوسری آیت میں بھی یہی مضمون ادا ہوا ہے:

﴿ سَيَقُوْلُ السُّفَهَاۗءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِىْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۴۲)

”بے وقوف لوگ کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے اس قبلہ سے کس نے ہٹا دیا، جس پر وہ تھے، کہہ دے کہ پورب اور پچھم دونوں خدا کے ہیں، وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔“

یہود جن کو سب سے زیادہ اعتراض یہ تھا کہ مشرقی مسجد یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر، مغربی مسجد یعنی خانہ کعبہ کو کیوں قبلہ قرار دیا گیا، ان کو خطاب کر کے فرمایا:

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (٢/ البقرة:١٧٧)

''نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو، والبتہ نیکی یہ ہے کہ خدا، قیامت، فرشتوں، کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور اپنی دولت کو اس کی محبت کے باوجود (یا خدا کی محبت پر) رشتہ داروں، یتیموں، غریبوں، مسافروں، سائلوں اور غلاموں کو (آزاد کرانے میں) دے اور نماز پڑھے اور زکوۃ دے اور (نیکی یہ ہے) جو اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور سختی اور تکلیف اور جنگ میں صبر کرتے ہیں، یہی وہ ہیں جو سچے ہوئے اور یہی پرہیز گار ہیں۔''

اس تصریح سے یہ اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام میں قبلہ کی کیا حیثیت ہے، قبلہ یعنی وہ سمت یا جگہ جس کا رخ کیا جائے، عبادت کے لیے کوئی ضروری چیز نہیں ہے، لیکن چونکہ نمازوں میں امت کے نظام وحدت کو قائم رکھنے کے لیے کسی ایک رخ کی تخصیص کی حاجت تھی، اسی لیے ۲ھ میں خانہ کعبہ کے قبلہ بنانے کا حکم ہوا:

﴿ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ ﴾

(٢/ البقرة:١٤٤)

''پس تو اپنا منہ مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف پھیر اور تم لوگ جہاں بھی ہو اسی کی طرف اپنے منہ پھیرو۔''

اسلام نے قبلہ کے لیے کسی خاص سمت کا نہیں، بلکہ ایک مرکزی مسجد کا انتخاب کیا، جس کے چاروں طرف چاروں سمتوں سے نماز پڑھی جا سکے، اس طرح مشرق، مغرب، جنوب، شمال، سب بہ یک وقت مسلمانانِ عالم کا قبلہ ہیں، جس سے ایک لطیف رمز یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے خدا کی طرح ان کا قبلہ بھی بے جہت ہے اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سمت کے تعین سے اس سمت کی مرکزی چیز (مثلاً: آفتاب یا قطب شمالی وغیرہ) کی مسجودیت اور معبودیت کا جو تخیل پیدا ہوتا تھا اور جس سے بت پرستی اور ستارہ پرستی کا رواج ہو گیا تھا اس کا کلیتہ خاتمہ ہو گیا۔

لیکن یہ مرکزی مسجد بیت المقدس کی بجائے مسجد حرام (کعبہ) قرار دی گئی، جس میں بہت سی مصلحتیں تھیں:

❶ یہ ضرور تھا کہ کوئی ایسی چیز ہو جس کی طرف ہر شخص ہر جگہ سے ہر ملک میں منہ پھیر سکے، ایسی چیز یا تو کوئی

مصنوعی شے ہوسکتی تھی، مثلاً: چراغ، کوئی موی شمع، کوئی تصویر، کوئی مجسمہ، کوئی کتاب، جیسا کہ اوپر گزرا بعض اہل مذاہب ان چیزوں کو سامنے رکھتے تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے، مثلاً: بت، مجسمہ، آگ، پانی، آفتاب، وغیرہ اشیاء وعناصر وکواکب، ظاہر ہے کہ اسلام اگر ایسا کرتا تو وہ بھی کھلی ہوئی بت پرستی میں گرفتار ہوجاتا، دوسری صورت یہ تھی کہ اشیاء کو نہیں بلکہ سمت کو خاص کیا جاتا مثلاً: شمال یا مشرق کہ پہلی سمت میں جگہ سے نہ ٹلنے والا قطب تھا اور دوسری چہرہ خورشید کا مطلع اور بیاض سحر کا دیباچہ تھی، دین توحید کے لیے یہ بالکل ناممکن تھا کہ ستارہ پرستی کے ابطال کے ساتھ ساتھ ستارہ پرستی کے علامات اور امتیازات کو قائم رکھے۔

2 یہ کہنا ممکن ہے کہ شمال اور مشرق کو چھوڑ کر جن کی طرف منہ کرنا ستارہ پرستی ہوتی، کسی اور سمت کا انتخاب کیا جاسکتا تھا مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ چار سمتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کسی نہ کسی مرجح سبب ہی کی بنا پر ہو سکتا ہے، ورنہ خدا کے لحاظ سے تو ہر سمت برابر تھی اب جو بھی سمت اختیار کی جاتی اس کے لیے ضروری تھا کہ اس کی تخصیص کی کوئی مناسب وجہ بھی ہوتی، سمت کی تعیین آفتاب یا دوسرے ممتاز ستاروں کا طلوع وغروب کا لحاظ کیے بغیر ممکن ہی نہیں، کیونکہ ہر سمت میں کوئی نہ کوئی مشہور ستارہ ہے، جس کی سیدھ سے وہ سمت متعین کی گئی ہے، اس لیے جو سمت بھی اختیار کی جاتی اس سے اس سمت کا خاص ستارہ کے تعلق وجوہ ترجیح کا پیدا کرنا ضروری تھا اور اس ترجیح سے دین توحید کا دین شرک بن جانا لازمی تھا۔

3 اسی لیے ملت ابراہیمی نے ان صورتوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کسی قربان گاہ یا مسجد کو اپنا قبلہ بنایا، تاکہ شرک کے ہر قسم کے شائبہ سے اس کی نماز محفوظ رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجدوں میں ان کی نسل نے دو مرکزی مسجدوں کو محفوظ رکھا تھا، ایک بیت المقدس جس کو حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے اپنے زمانوں میں بڑے اہتمام سے تیار کرایا اور یہ بنی اسرائیل کا قبلہ بنی، دوسری مسجد کعبہ جو بنی اسماعیل کا مذہبی مرکز تھی۔

4 اسلام کا دعویٰ ہے کہ خانہ کعبہ، بیت المقدس سے پہلے بنا تھا، وہ دنیا میں پہلا گھر تھا جو خدا کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا اور اس کے معمار خود حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے:

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا ﴾ (۳/ آل عمران:۹٦)

''بے شک سب سے پہلا مبارک گھر جو انسانوں کے لیے (خدا کا) بنا، وہ ہے جو مکہ میں ہے۔''

﴿ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۲۷)

''اور جبکہ ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کے کھمبے اٹھا رہے تھے۔''

خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار عہد اسلام کے یہود کو بھی نہ تھا، چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱٤٤)

''اور جن کو کتاب دی گئی وہ جانتے ہیں کہ خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا حق ہے (اور وہ) ان کے پروردگار کی طرف سے (ہے)۔''

پولوس (پال) ایک خط میں جوگلتیوں کے نام ہے لکھتا ہے:

کہ یہ لکھا ہے ابرہام (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی (ہاجرہ) سے دوسرا آزاد (سارہ) سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا (اسماعیل علیہ السلام) جسم کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد سے تھا (اسحٰق علیہ السلام) سو وعدہ کے طور پر یہ باتیں تمثیلی بھی مانی جاتی ہیں، اس لیے کہ یہ عورتیں وہ عہد ہیں، ایک تو سینا پہاڑ (حضرت ہاجرہ مصری تھیں اور سینا مصر کے راستہ میں ہے) پر سے جو ہوا وہ نرے غلام جنتی ہیں، یہ ہاجرہ ہے کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم (بیت المقدس) کا جواب ہے اور یہی اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے پر اوپر کا یروشلم آزاد ہے۔ (گلتیوں کے نام ۲۲۔۲۶ باب ۴)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوگا کہ عیسائیت کا بانی بھی اس بھید سے آگاہ تھا کہ یروشلم اور بیت اللہ (یا عرب کا کوہ سینا) ایک دوسرے کا جواب ہیں ''اب کے یروشلم'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلم نیا ہے اور بیت اللہ پرانا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عورتیں دو عہد تھیں، یعنی ان کی اولاد کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خدا نے دو وعدے کیے تھے، ہاجرہ کا وعدہ کوہ سینا پر ہوا تھا، جب وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مصر سے آرہی تھیں اور راستہ میں سینا پڑتا تھا، اس وعدہ کے مطابق ہاجرہ کی غلام اولاد نے عرب میں عبادت کا ایک مرکزی گھر تعمیر کیا تھا اور یہ غلام اس پرانے مرکزی گھر کے متولی ہوگئے، یہ گھر بعد کو بنی اسرائیل کے نزدیک ان کے نئے مرکزی عبادت گاہ بیت المقدس کا پورا جواب تھا، سارہ کے وعدہ کا یہاں ذکر نہیں ہے، لیکن یہ معلوم ہے کہ بیت المقدس کی تولیت بنی اسرائیل کو عطا ہوئی تھی، گویا حضور انور ﷺ کے پیشتر تک خدا کا عہد بیت المقدس اور بنی اسرائیل کے ساتھ تھا، چونکہ بنی اسرائیل نے اپنی بغاوت، تمرد، سرکشی، اور قساوت کے سبب سے اس عہد کو توڑ دیا تھا، اس لیے آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد خدا نے ان کو متنبہ کیا جس کا ذکر سورۂ اسراء کی آیتوں میں ہے اور جب بنی اسرائیل پر اس تنبیہ کا کچھ اثر نہ ہوا تو خدا نے ان سے اپنا عہد توڑ کر اسماعیل کا وہ عہد شروع کیا جو سینا پر ہاجرہ کے متعلق باندھا گیا تھا۔

معراج میں آنحضرت ﷺ کا بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) میں نماز ادا کرنا اور اس سے چند سال بعد خانہ کعبہ کا قبلہ بن جانا، گویا بنی اسرائیل کے عہد کی شکست اور بنو اسماعیل کے عہد کی ابتدا کا اعلان تھا، جیسا کہ اس کتاب کی تیسری جلد میں بسلسلہ معراج:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۱)

''پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو رات کے وقت مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے اس مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے گیا جس کے چاروں طرف ہم نے برکت دی ہے۔''

کی تفسیر میں لکھا گیا ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ بیت المقدس جو عہد اسرائیل کا نشان تھا، اسلام کے بعد اس میں قبلہ ہونے کی شان باقی نہیں رہی، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ مسجد قبلہ بنائی گئی جس کا تعلق عہد اسماعیل سے تھا (یعنی خانہ کعبہ) وہ عہد کیا تھا؟ اس کی تفصیل یہ ہے:

﴿ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۲۵)

''اور جب خدا نے چند باتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا تو اس نے ان باتوں کو پورا کیا۔ خدا نے کہا: میں تجھ کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں (ابراہیم نے) کہا: اور میری نسل میں سے (خدا نے) فرمایا: میرا عہد ظالموں کو شامل نہ ہوگا اور جب ہم نے گھر (کعبہ) کو لوگوں کے اجتماع کی جگہ اور امن بنایا اور تم ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام سے عہد کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔''

غرض یہ رمز الٰہی تھا جو ہزاروں برس پہلے سے خدا کے علم میں تھا اور جس کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد عالم کا روحانی مرکز بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ قرار پایا، جو تاریخی حیثیت سے وہ گھر تھا جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید کی آواز بلند کی تھی اور دنیا میں اس لحاظ سے خدا کا سب سے پہلا گھر تھا اور روحانی حیثیت سے وہ گھر قبلہ قرار پایا، جو اس دنیا میں عرش الٰہی کا سایہ اور زمین پر حظیرۃ القدس کا عکس تھا، اس لیے حکم ہوا:

﴿ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۴۹)

''اور تو جہاں بھی نکلے مسجد حرام ہی کی طرف منہ کر۔''

درحقیقت ہر مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ بھی اسی طرح کھڑا ہو کر فریضۂ عبودیت ادا کرے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے، لیکن چونکہ ہر مسلمان کو ہر جگہ اور ہر وقت ایسا کرنا ممکن نہیں تو کم از کم نماز کے وقت ادھر رخ ہی کر لے، ورنہ ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت اور اس کی توجہ ہر طرف برابر ہے، اسی لیے قبلہ

کی تعیین کے موقع پر فرمایا:

﴿ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۱۵)

''پس جدھر منہ پھیرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے۔''

خانہ کعبہ کی دیواریں اور اس کی چھت کسی مسلمان کا معبود و مسجود نہیں، نہ مشرکوں، بت پرستوں اور ستارہ پرستوں کی طرح نماز و دعا میں قبلہ سے خطاب ہوتا ہے، نہ اس سے کچھ مانگا جاتا ہے، نہ اس کی دہائی دی جاتی ہے نہ اس کو خدا سمجھا جاتا ہے اور نہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا اس کے اندر بیٹھا ہے، خانہ کعبہ کی دیواریں اگر (بالفرض) ٹوٹ جائیں، اس کی چھت گر جائے اور صرف فضا باقی رہ جائے تب بھی کعبہ قبلہ رہے گا، اسی طرح خود خانہ کعبہ کے اندر جا کر بلکہ اس کی چھت پر کھڑے ہو کر بھی نماز پڑھی جاسکتی ہے، اگر سمت قبلہ کا پتہ نہ لگ سکے تو جدھر قبلہ کا گمان ہو ادھر ہی نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ [1] سواری میں نفل نماز ہر سمت جدھر سواری جارہی ہو پڑھ سکتے ہیں، گھمسان کی لڑائیوں میں بھی ایسا کیا جاسکتا ہے یہ باتیں ان تمام مشرکانہ غلط فہمیوں کی جو خانہ کعبہ کے قبلہ ہونے سے پیدا ہوسکتی ہیں، قطعی تردید کرتی ہیں اور یہی اس باب میں دین محمدی ﷺ کی تکمیلی حیثیت ہے۔

یہ قبلہ گویا مسلمانوں کا ارضی مرکز، ملت ابراہیمی کے پیرو ہونے کا عملی ثبوت، دنیا کے قدیم موحدوں کی پہلی یادگار، محمد رسول اللہ ﷺ کے پیرو ہونے کا شعار اور مسلمانان عالم کی وحدیت کا شیرازہ ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے اس کی طرف رخ کرنے کو قبول اسلام کی علامت قرار دیا اور فرمایا کہ جو ہمارے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے اور ہمارے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھائے، وہ مسلمان [2] ہے، اگر خیال کے پر پرواز سے اڑ کر اور فضائے آسمانی کی نیلگوں سطح پر کھڑے ہو کر دنیا کے مسلمانوں کو نماز کی حالت میں کوئی شخص دیکھے تو نظر آئے گا کہ قبلہ ایک مرکزی نقطہ ہے، جس کے چاروں طرف تمام مسلمانانِ عالم دائرہ کی صورت میں خدا کے آگے صف بستہ اور سربسجود ہیں۔

رکعتوں کی تعداد

ایک قیام، اس کے بعد رکوع، پھر سجدہ، اس مرتب صورت کا نام ایک رکعت ہے، نماز میں کم از کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ چار مقرر کی گئیں، صبح کو دو، ظہر، عصر، اور عشاء کے وقت چار چار اور مغرب میں تین، ایک رکعت کی مستقل نماز نہیں رکھی گئی اور نہ چار سے زیادہ رکعتیں رکھی گئیں، کیونکہ مصلحت یہ تھی کہ نماز نہ اتنی مختصر ہو کہ دل میں ذرا اثر بھی پیدا نہ ہو کر سکے، نہ اتنی لمبی کہ انسان کو بددل بنادے، ایک رکعت کی نماز اتنی مختصر تھی کہ اس سے قلب میں خضوع و خشوع پیدا نہ ہوتا، کیونکہ صرف چند سیکنڈ میں تمام ہو جاتی اور چار سے زیادہ رکعتوں کی نماز بددلی کا باعث ہوتی، کیونکہ دیر لگنے کی وجہ سے جی گھبراتا، اس لیے فرض نماز کی رکعتیں دو سے

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ بقرۃ: ٤٥٣٥۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل استقبال القبلۃ:٣٩١۔

زیادہ نہیں رکھی گئیں۔

مکہ میں مسلمانوں کو جو بے اطمینانی اور بے سروسامانی تھی اور جس طرح کفار کے ڈر سے چھپ کر وہ نماز پڑھتے تھے، اس لحاظ سے اسوقت نماز میں زیادہ رکعتیں ہونا ممکن نہ تھا، اسی لیے مکہ معظمہ میں ہر نماز صرف دو رکعتوں کی تھی، جب مدینہ آکر اطمینان نصیب ہوا تو ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں، کردی گئیں لیکن مسافر کے لیے وہی دو رکعتیں ❶ قائم رہیں، کیونکہ اس کی عارضی پریشان حالی باقی رہتی ہے، جو اس تخفیف کی علت تھی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ مقیم کے لیے چار رکعتیں ہیں، مسافر کے لیے دو اور بحالت خوف ایک ❷ اس سے ظاہر ہوا کہ اطمینان کی زیادتی اور کمی کی بنا پر ان رکعتوں کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی ہے۔

مغرب اور صبح کی نمازیں قیام وسفر دونوں حالتوں میں یکساں ہیں، مغرب کی تین رکعتوں کا آدھا ممکن نہیں اور صبح میں کچھ دو رکعتیں ہیں ان میں کیا کمی ہوسکتی ہے؟ لیکن مغرب اور صبح میں یہ تین اور دو رکعتیں کیوں ہیں؟ اس کی گرہ کشائی ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمائی ہے: ''مغرب میں تین اس لیے ہیں کہ وہ دن کا وتر ہے اور صبح میں دو اس لیے کہ اس میں دو رکعتوں کے بڑھانے کے بجائے قراءت لمبی کردی گئی ہے۔'' ❸

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ارشاد میں تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔ گزر چکا ہے عین طلوع اور غروب کے وقت نماز کی ممانعت اس لیے کی گئی ہے کہ یہ کفار (آفتاب پرستوں) کی عبادت کا وقت تھا ❹ مغرب کی نماز غروب آفتاب کے بعد فوراً ہوتی ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ اہل توحید آفتاب پرستی کے شرک سے پوری براءت ظاہر کریں اسی لیے اس وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد وہ رہ گئی جس سے خدا کے واحد اور وتر ہونے کا ثبوت مل سکے۔ ❺ یہ عدد واحد تو ہو نہیں سکتا کہ اس سے خضوع وخشوع اور تاثر کا مقصد فوت ہوتا، دو کا عدد بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ زوج اور جوڑا ہے، طاق نہیں، بنابریں توحید کا رمز آشکارا کرنے والا سب سے قریب ترین طاق عدد تین ہی ہے، جس سے خدا کا واحد ہونا اور وتر ہونا دونوں باتیں ثابت ہوتی ہیں، نیز نماز کے خشوع وخضوع کا کمال بھی فوت نہیں ہوتا جو ایک رکعت ہونے میں فوت ہو جاتا ہے، اس لیے مغرب میں رکعتوں کی تعداد تین رکھی گئی اور چونکہ آفتاب کا کامل زوال وانحطاط جس کو غروب کہتے ہیں، اسی وقت ہوتا ہے، اس لیے اس توحید کے رمز کو اسی وقت آشکارا ہونا چاہیے، اس مفہوم کی تشریح اس حدیث کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے وتر نماز کی تاکید فرمائی ہے:

❶ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی ...: ٣٩٣٥؛ صحیح مسلم، کتاب صلوٰة المسافرین: ١٥٧٠، ١٥٧١؛ مسند احمد، ج٦، ص: ٢٤١ وابن خزیمة وابن حبان والبیهقی (فتح الباری، ج١، ص: ٣٩٣)۔

❷ صحیح مسلم، کتاب صلوٰة المسافرین: ١٥٧٥۔ ❸ مسند احمد بن حنبل، ج٦، ص: ٢٤١۔

❹ صحیح مسلم، کتاب صلوة المسافرین، باب اسلام عمرو بن عبسة: ١٩٣٠۔

❺ عشاء کے بعد وتر نماز کو بھی وتر اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ طاق ہوتی ہے یعنی جورات کی نماز ہے۔

((اوتروا یا اهل القرآن فان الله وتر یحب الوتر)) ❶

"اے قرآن والو! وتر (طاق) پڑھا کرو، کیونکہ خدا بھی وتر (طاق) ہے اور وہ وتر (طاق) کو پسند کرتا ہے۔"

صبح کا وقت وہ دلکش وقت ہے جب انسان پورے آرام وسکون کے بعد بیدار ہوتا ہے، یہ بڑا سہانا وقت ہوتا ہے، طبیعت موزوں ہوتی ہے، دل مطمئن ہوتا ہے، تمام عالم اس وقت سراپا اثر مجسم کیف نظر آتا ہے، اس لیے یہ وقت نماز ودعا کے لیے خاص طرح سے موزوں ہے اور قرآن مجید میں اس کے اس خاص امتیاز کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا ہے:

﴿ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۷۸)

"صبح کی نماز کی قراءت کا وقت حضوری کا ہوتا ہے۔"

اس بنا پر شریعت محمدیہ ﷺ نے اس وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد کے بجائے اس کی اصل کیفیت کو پیش نظر رکھا، یعنی رکعتیں تو دو ہی رہیں، مگر حکم دیا گیا کہ قرأت لمبی کردی جائے اور سورتیں بڑی بڑی پڑھی جائیں، چنانچہ خود آنحضرت ﷺ اور نمازوں میں ایک رکعت میں تقریباً پندرہ آیتیں تلاوت فرماتے تھے، مگر صبح کی نماز میں ساٹھ آیتوں سے لیکر سو آیتوں تک قراءت کرتے تھے ❷ اور اسی نسبت سے رکوع وسجود بھی ہوتا تھا۔ ❸ رکعتوں کی تعداد اگرچہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کی سنتِ متواترہ سے ثابت ہے اور تمام مسلمان اس تواتر پر بلا استثنا عامل بھی ہیں، تاہم اس کا عملی اشارہ قرآن پاک میں نمازِ خوف سے ظاہر ہوتا ہے، جس میں یہ حکم ہے کہ اسلامی فوج کے دو حصے ہوجائیں، پہلے اگلا حصہ امام کے پیچھے کھڑا ہوکر ایک رکعت ادا کرے او ردوسرا دشمن کے مقابل کھڑا رہے، پھر اگلا حصہ امام کے سامنے کھڑا ہوجائے اور دوسرا امام کے پیچھے آکر ایک رکعت ادا کرے، اس طرح امام کی دو رکعتیں ہوجاتی ہیں اور مقتدیوں کی جماعت کے ساتھ ایک ایک اور اگر دوسری رکعت کا موقع ملتا ہے، تو وہ ارکان کے ساتھ اور یہ ممکن نہ ہو تو اشاروں سے علیحدہ علیحدہ ادا کرتے ہیں، ❹ جب نمازِ خوف میں قصر کی دو رکعتیں ثابت ہوئیں تو اصل رکعتیں چار ہوں گی، اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ قصر چار ہی رکعت والی نمازوں میں ہے، نمازِ قصر کی آیات سورۂ نساء کے پندرھویں رکوع میں ہیں۔

نماز کے آداب باطنی

قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں نماز کے لیے متعدد لفظ آئے ہیں۔ مثلاً صلوٰۃ، دعا، تسبیح اور ذکر الٰہی

---

❶ ابوداود، کتاب الوتر، باب استحباب الوتر: ۱۴۱٦۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب القراءۃ فی الصبح: ۱۰۳۲۔ ❸ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب اعتدال ارکان الصلوٰۃ: ۱۰۵۸۔

❹ حدیث میں نماز خوف کی بہت سی صورتیں ہیں جن میں سے ہر مجتہد نے اپنی اپنی دلیل کی رو سے ایک ایک صورت کو مخصوص کرلیا ہے۔ مگر محدثین میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ سب صورتیں جائز ہیں، میرا ناقص خیال یہ ہے کہ یہ سب مختلف صورتیں لڑائی کے مختلف حالات کی بنا پر ہیں۔ جب جیسی صورت پیش آئی اس کے مطابق نماز ادا کی گئی۔ جنگ میں اشاروں سے نماز ادا کرنے کا مسئلہ امام بخاری اور بعض محدثین کا ہے۔

اور یہ الفاظ خود نماز کے روحانی خصوصیات وآداب ظاہر کرتے ہیں۔ نماز جسم وروح دونوں کی عبادت ہے، اگر اس میں جسم کی حرکت کے ساتھ دل کی جنبش شامل نہ ہو اور روح میں اہتزاز پیدا نہ ہو جائے تو ایسی نماز گلِ بے رنگ اور شرابِ بے کیف سے زیادہ نہ ہوگی۔

اقامت صلوٰۃ

نماز پڑھنے کے لیے قرآن پاک میں جابجا اقامت صلوٰۃ (نماز کو قائم کرنا) کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی صرف نماز پڑھنے کے نہیں، بلکہ نماز کو اس کے آداب اور ارکان وسنن کے ساتھ ادا کرنے کے ہیں چنانچہ خوف کی حالت میں جہاں نماز کے بعض آداب وارکان وشرائط کو معاف کر دیا گیا ہے، اس کے بعد ہی یہ کہا گیا ہے: ﴿ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ﴾ (٤/ النسآء:١٠٣) ''پھر جب تم کو اطمینان ہو جائے تو نماز کو قائم کرو۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ یعنی نماز کو قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نماز کو اس کے آداب وارکان وشرائط کے ساتھ بجالایا جائے، اس بنا پر نماز میں اطمینان، ارکان کا اعتدال، باطنی خضوع وخشوع ملحوظ رہنا چاہیے، جس کے بغیر نماز ناقص رہتی ہے۔

قنوت

نماز کے آداب باطنی میں دوسری چیز قنوت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴾ (٢/ البقرۃ:٢٣٨)

''اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو۔''

صحابہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ پہلے نماز میں باتیں کر لیا کرتے تھے، لیکن جب یہ آیت اتری تو آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمادیا کہ یہ یکسوئی اور نماز کے باطنی آداب کے خلاف تھا۔ قرآن پاک میں جس قنوت کا حکم دیا گیا ہے، وہ عجیب جامع لفظ ہے، لغت میں (دیکھو لسان العرب) اس کے حسب ذیل معنی ہیں: چپ رہنا، بندگی کرنا، دعا مانگنا، عبادت کرنا، کھڑے رہنا، دیر تک کھڑے رہنا، عاجزی کرنا، نماز کے جس قنوت کا اس آیت میں ذکر ہے اس کے متعدد معنوں میں سے ہر معنی نماز میں مقصود ہے، کیوں کہ نماز میں ذکر وقراءت تسبیح واستغفار سلام وتشہد کے سوا تمام انسانی ضرورتوں اور باتوں سے خاموشی ہوتی ہے، وہ خدا کی بندگی بھی ہے، دعا بھی ہے، عبادت بھی ہے، اس میں دیر تک قیام بھی ہے اور عاجزی کا اظہار بھی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی کسی نماز میں کم ہو تو اس قدر نماز کے اوصاف میں بھی کمی ہو جائے گی۔

خشوع

تیسری چیز خشوع ہے، چنانچہ قرآن پاک میں نمازیوں کی یہ صفت آئی ہے:

﴿ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴾ (٢٣/ المؤمنون:٢)

''(وہ مومنین کامیاب ہیں) جو اپنی نماز میں خشوع وخضوع کرتے ہیں۔''

خشوع کے لغوی معنی یہ ہیں: بدن جھکا ہونا، آواز پست ہونا، آنکھیں نیچی ہونا یعنی ہر ادا سے مسکنت عاجزی اور تواضع ظاہر ہونا (لسان العرب) اس لیے نماز خدا کے سامنے اپنی مسکینی، بیچارگی اور افتادگی کا اظہار ہے، اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو گویا نماز کی اصلی غرض فوت ہو گئی۔

تبتل

تبتل کے اصلی معنی کٹ جانے کے ہیں اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں خدا کے سوا ہر چیز سے کٹ کر صرف خدا کا ہو جانا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مسلمان کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے۔ مگر قرآن پاک میں جہاں اس کا حکم ہے۔ سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی حالت سے متعلق ہے، چنانچہ سورۂ مزمل میں ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۭ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِىَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۭ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۭ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۭ﴾

(۷۳/ المزمل:۱۔۸)

''اے کملی اوڑھنے والے! تھوڑی دیر کے سوا تمام رات اٹھ کر نماز پڑھ، آدھی رات یا اس سے کچھ کم و بیش اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر ایک بھاری بات اتارنے والے ہیں بے شک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنا نفس کو خوب زیر کرتا ہے اور مؤثر ہوتا ہے، تیرے لیے دن کو بڑی فرصت ہے اپنے پروردگار کا نام لے اور ہر چیز سے کٹ کر اس کی طرف ہو جا۔''

یعنی نماز کی حالت میں خدا کا ذکر کرتے وقت اس کی عظمت اور اپنی عاجزی کے سوا ذہن سے تمام خیالات نکل جانے چاہئیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عبسہ سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے آنحضرت ﷺ نے جو نماز سکھائی اس کے متعلق یہ فرمایا کہ ''وضو کر کے جب کوئی نماز کے لیے کھڑا ہوا پھر خدا کی حمد کی، ثنا کی اور خدا کی اس بزرگی کا اظہار کیا، جس کا وہ سزاوار ہے اور اپنے دل کو خدا کے لیے ہر چیز سے خالی کر لیا (وَفَرَّغَ قَلْبَهٗ لِلّٰهِ) تو وہ نماز کے بعد ایسا ہو جاتا ہے، جیسے اس کی ماں نے اس کو اسی وقت [1] پیدا کیا ہو'' یہ حدیث گویا اسی آیت کی تفسیر ہے۔

تضرّع

تضرّع کے معنی زاری اور عاجزی اور عاجزی کے ساتھ درخواست کرنے کے ہیں (لسان العرب) نماز میں بندہ پر عاجزی، زاری اور عجز والحاح کے ساتھ سوال کرنے کی کیفیت طاری ہونی چاہیے، ورنہ اس حکم پر عمل نہ ہوگا:

﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۭ﴾ (۷/ الاعراف:۵۵)

[1] صحیح مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین، باب اسلام عمرو بن عبسة:۱۹۳۰۔

''تم اپنے پروردگار کو مسکنت اور زاری کے ساتھ اور دھیمی آواز سے پکارو۔''

اخلاص

نماز کے باطنی سنن وآداب کا اصلی جوہر اخلاص ہے، یعنی یہ کہ نماز سے مقصود خدا کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو، کیوں کہ اگر ایسا نہیں ہے تو نماز نماز نہیں بلکہ ریا اور نمائش ہوگی اور بعض اہلِ حق کے نزدیک شرک لازم آئے گا۔ فرمایا:

﴿ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۬ ﴾

(۷/ الاعراف :۲۹)

''اور تم ہر نماز کے وقت اپنے رخ کو ٹھیک رکھو اور خدا کو اخلاص کے ساتھ پکارو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں اخلاص کا پیدا کرنا اس کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔

ذکر

نماز خدا کی یاد کے لیے ہے، اگر دل میں کچھ اور زبان پر کچھ، ہو تو خدا کی حقیقی یاد نہ ہوگی۔ اس لیے فرمایا:

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝ ﴾ (۲/ طٰہٰ :۱٤)

''میری یاد کے لیے نماز کھڑی کر۔''

ظاہر ہے کہ یاد صرف زبان سے الفاظ ادا کرنے کا نام نہیں ہے، اس کے ساتھ دل کی معیت اور قلب کا حضور بھی ہونا چاہیے اور یہی نماز کی بڑی غرض ہے۔

فہم وتدبّر

نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر بے پروائی کی وجہ سے معنوں کی طرف دل متوجہ نہ ہوا تو اس سے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا، اسی لیے نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے کہ اس حالت میں سمجھنے والا دل شرابی کے پہلو میں نہیں۔ فرمایا:

﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ (٤/ النسآء :٤٣)

''نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تم نشہ میں ہو، یہاں تک کہ (اتنا ہوش آجائے کہ) جو تم کہو اس کو سمجھو۔''

اس آیت پاک نے یہ واضح کیا کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے، اسی بنا پر آپ نے نیند کے غلبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے کہ اس میں بھی انسان فہم اور تدبر سے عاری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ'' نماز میں جب تم پر نیند غالب آئے تو سو جاؤ، کیوں کہ اگر نیند کی حالت میں نماز پڑھو گے تو ممکن ہے کہ دعا کی بجائے اپنے آپ کو برا بھلا

کہنے لگو۔'' ❶ دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا: ''نمازی کو جب نیند آئے تو سو جانا چاہیے، تاکہ وہ جو کہتا ہے وہ سمجھے۔'' ❷ حاکم کی مستدرک میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اچھی طرح وضو کرے پھر اس طرح نماز پڑھے کہ جو وہ کہتا ہے اس کو سمجھتا بھی ہے، یہاں تک کہ نماز ختم کر لے تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اسی دن وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔'' ❸

یہ نماز کے وہ باطنی آداب ہیں جن کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی، جس طرح نماز کے ظاہری شرائط سے غفلت برتنا نماز سے غفلت ہے، اسی طرح نماز کے ان باطنی آداب کا لحاظ نہ کرنا بھی نماز سے غفلت ہے اور اس لیے اس آیت ذیل کے مصداق دونوں ہیں:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۙ ﴾

(۱۰۷/ الماعون: ۴۔۶)

''پھٹکار ہو ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں، جو دکھاوے کی نماز پڑھتے ہیں۔''

ذرا ان الفاظ پر غور کیجیے ''ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل ہیں پھٹکار ہو'' نمازی ہونے کے باوجود نماز سے غافل ہونے کے یہی معنی ہیں کہ نماز کے لیے جو ظاہری آداب مثلاً: وقت کا لحاظ اور ادائے ارکان میں اعتدال وغیرہ اور جو باطنی آداب مثلاً: خشوع وخضوع، تضرع وزاری اور فہم وتدبر وغیرہ ضروری ہیں، ان سے نماز میں تغافل برتا جائے۔ نماز کے گزشتہ آداب کے مطابق آنحضرت ﷺ کی ہدایات، تعلیمات اور عملی مثالیں ہیں، جن میں آپ نے نماز کی اصلی حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔ ایک دفعہ مسجد نبوی ﷺ میں ایک شخص نے آ کر نہایت عجلت میں نماز پڑھی آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے شخص اپنی نماز پھر پڑھ کیوں کہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔'' اس نے دوبارہ اسی طرح نماز ادا کی آپ نے پھر وہی ارشاد فرمایا جب تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! کیسے نماز پڑھوں؟ فرمایا: ''اس طرح کھڑے ہو، اس طرح قراءت کرو، اس طرح اطمینان وسکون کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرو۔'' ❹ نماز میں نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنا خشوع کے خلاف ہے اس سے انسان کی توجہ ہٹتی اور حضور قلب میں خلل پڑتا ہے، اس لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''نماز میں ادھر ادھر نہ دیکھا کرو، کیا تمہیں یہ ڈر نہیں کہ تمہاری نظر واپس نہ آ سکے۔'' ❺ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ ''جب

---

❶ مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب امر من نعس فی صلاتہ: ۱۸۳۵۔

❷ بخاری، کتاب الصلوۃ، باب الوضوء من النوم: ۲۱۳۔

❸ مستدرک، کتاب الطھارۃ، ج ۱، ص: ۱۳۱ (ترغیب وترھیب حافظ منذری، ج ۱، ص: ۷۳ مصر) اس سے ان مسلمانوں کو جو عربی زبان نہیں سمجھتے عبرت حاصل کرنی چاہیے ورنہ چاہیے کہ نماز میں جو سورتیں اور دعائیں وہ پڑھتے ہیں ان کے معنی ذہن نشین کریں اور یہ ہر مسلمان کے لیے بہت آسانی سے ممکن ہے۔ بشرطیکہ وہ تھوڑی توجہ کرے۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب وجوب القراءۃ للامام والمأموم فی الصلوات: ۷۵۷؛ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ: ۸۸۵؛ ابوداود، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ من لا یقیم صلبہ فی الرکوع والسجود: ۸۵۶۔ ❺ مسند احمد عن جابر بن سمرۃ، ج ۵، ص: ۹۳۔

تک بندہ نماز میں دوسری طرف ملتفت نہیں ہوتا خدا اس کی طرف ملتفت رہتا ہے اور جب وہ خدا کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے تو خدا بھی اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیتا ہے۔'' (1) طبرانی میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص نماز کے لیے کھڑا ہو تو وہ خدا کی طرف پوری طرح متوجہ رہے، یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو جائے اور نماز میں منہ پھیر کر ادھر ادھر نہ دیکھو کیوں کہ جب تک تم نماز میں ہو خدا سے باتیں کر رہے ہو۔'' (2) مسند بزار میں ہے کہ ''جب بندہ نماز میں ادھر ادھر دیکھتا ہے تو خدا فرماتا ہے تو کدھر دیکھتا ہے؟ کیا تیرے نزدیک مجھ سے بھی بہتر کوئی چیز ہے تو میری طرف دیکھ دوسری دفعہ بھی خدا یہی فرماتا ہے پھر تیسری دفعہ جب اس سے یہ حرکت صادر ہوتی ہے تو خدا اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیتا ہے۔'' (3)

ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سب سے بڑا چور وہ ہے جو نماز کی چوری کرتا ہے۔'' صحابہ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! نماز کی چوری کیا ہے؟ فرمایا: ''رکوع اور سجدہ اچھی طرح نہ کرنا اور خشوع نہ ہونا۔'' (4) ایک دفعہ آپ نے نماز سے فارغ ہو کر آخری صف کے ایک شخص کو آواز دی کہ ''اے فلاں تو خدا سے نہیں ڈرتا کس طرح نماز پڑھتا ہے، جب کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو اپنے رب سے باتیں کرتا ہے، پس سوچنا چاہیے کہ اس سے کس طرح باتیں کرے۔'' (5) صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کیا تو نماز بھی اچھی طرح نہیں پڑھتا کیا نماز پڑھنے والا جب نماز پڑھتا ہے تو نہیں سمجھتا کہ وہ کس طرح نماز پڑھ رہا ہے، تو اپنے ہی فائدہ کے لیے نماز پڑھتا ہے۔'' (6) نماز کی حالت میں تھوکنا اور خصوصاً سامنے تھوکنا ادب کے خلاف ہے۔ آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ ''نماز کی حالت میں خدا تمہارے سامنے ہوتا ہے تو کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اس کے سامنے تھوکو۔'' (7) دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نماز میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کہ اس وقت وہ خدا سے باتیں کرتا ہوتا ہے۔'' (8) مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نماز میں خدا تمہارے منہ کے سامنے ہوتا ہے۔'' (9)

نماز میں سکون اور اطمینان پیدا کرنے کی بھی آپ نے ہدایتیں فرمائی ہیں ارشاد ہوا کہ ''جب نماز ہو رہی ہو اور تم باہر سے آؤ تو دوڑ کر مت آؤ بلکہ اس طرح آؤ کہ تم پر سکون ہو اور وقار طاری ہو۔'' (10) اس سے

---

(1) مسند احمد، ج ٥، ص: ١٧٢؛ ابوداود، باب الالتفات فی الصلوٰۃ: ٩٠٩؛ مستدرك، ج ١، ص: ٢٣٦۔
(2) طبرانی فی الاوسط عن ابی هريرة بحواله كنزالعمال، ج ٤، ص: ١٠٨۔ (3) كنز العمال، ج ٤، ص: ١٠٨۔
(4) مسند احمد، ج٥، ص: ٣١٠ ودارمی، كتاب الصلاة، باب من لايتم الركوع والسجود: ١٣٢٨ وابن ابی شيبة وابن خزيمة وابن حبان وعبد بن حميد وعبدالرزاق وطبرانی فی الاوسط اخیر لفظ بعض روایتوں میں نہیں ہے۔
(5) مستدرك حاكم، ج ١، ص: ٢٣٦ (علی شرط مسلم)۔ (6) صحيح مسلم، كتاب الصلوٰة، باب الامر بتحسين الصلوٰة: ٩٥٧۔ (7) صحيح مسلم، كتاب المساجد، باب النهی عن البصاق فيها: ١٢٢٣ وحاكم فی المستدرك، ج ١، ص: ٢٥٧؛ ابوداود، باب كراهية البزاق فی المسجد: ٤٧٨۔
(8) صحيح بخاری، كتاب مواقيت الصلاة، باب المصلی يناجی ربه: ٥٣١؛ مسلم، كتاب المساجد: ١٢٣٠۔
(9) مسلم، باب النهی عن البصاق فيها: ١٢٢٣۔ (10) صحيح مسلم، باب استحباب اتيان الصلوٰة بوقار: ١٣٥٩۔

اول تو یہ مقصود ہے کہ خود اس شخص پر سکون واطمینان طاری رہے، دوسرے یہ کہ اس کی دوڑ یا چال سے دوسرے نمازیوں کے سکون میں خلل نہ آئے، اسی طرح بے اطمینانی کے اگر طبعی اسباب ہوں تو نماز سے پہلے ان سے بھی فراغت کر لی جائے۔ مثلاً: بھوک ہو اور کھانا رکھا ہو اور ادھر جماعت کھڑی ہو رہی ہو تو پہلے کھانا کھا لینا چاہیے، تاکہ نماز اطمینان سے ادا ہو۔ [1] اسی طرح اگر استنجا یا قضائے حاجت کی ضرورت ہو تو پہلے اس سے فراغت کر لی جائے تب نماز پڑھی جائے۔ [2]

آغاز اسلام میں لوگ نماز کی حالت میں ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیتے تھے۔ لیکن مدینہ آ کر یہ اجازت منسوخ ہو گئی، ایک صحابی نے جن کو اس کی خبر نہ تھی۔ آنحضرت ﷺ کو کوئی دفعہ نماز میں سلام کیا اور جب آپ نے جواب نہ دیا تو نماز کے بعد انہوں نے اس کا ذکر کیا فرمایا: [3]

((ان فی الصلوٰۃ لشغلا))

''نماز میں اور ہی مصروفیت ہوتی ہے۔''

نماز پڑھتے وقت ایسے کپڑے پہننا یا سامنے ایسا پردہ لٹکانا جن کے نقش ونگار میں دل محو ہو جائے اور توجہ ہٹ جائے، مکروہ ہے، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے گل بوٹوں کی ایک چادر اوڑھ کر نماز پڑھی پھر فرمایا: ''اس کے گل بوٹوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا اس کو ابوجہم (تاجر کا نام) کے پاس لے جاؤ اور انبجانی سادہ چادر لے آؤ۔'' [4] اسی طرح ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سامنے دیوار پر ایک منقش پردہ لٹکا دیا تھا، آپ نے نماز پڑھی تو خیالات میں یکسوئی نہ رہی، آپ نے اس کو اتروا دیا۔ [5]

نماز کے اوقات کی تعیین میں بھی یہ اصول مدنظر رکھا گیا ہے کہ وہ ایسے ہونے چاہئیں جن میں نسبتاً سکون میسر ہوتا ہو، اسی لیے ظہر کی نماز کا اصلی وقت اگرچہ فوراً بعد زوال ہونا چاہیے، تاہم چونکہ اس وقت گرمی سخت ہوتی ہے، اس لیے توقف کا حکم دیا گیا۔ گرمی کے دنوں میں چونکہ اور بھی زیادہ شدت ہوتی ہے، اس لیے فرمایا کہ یہ دوپہر کی گرمی (گویا) جہنم کی آگ ہے، اس لیے ذرا ٹھنڈک کے بعد ظہر کی نماز پڑھو۔

((فان الصلوۃ مشھودۃ محضورۃ)) [6]

''کیونکہ نماز میں حضور ہوتا ہے۔'' [7]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب اذا حضر الطعام واقیمت الصلوۃ: ٦٧١ تا ٦٧٤؛ صحیح مسلم، باب کراھۃ الصلوۃ بحضرۃ الطعام: ١٢٤١؛ ابوداود، کتاب الطھارۃ: ٨٩؛ ترمذی، ابواب الصلاۃ، باب ماجاء اذا حضر...... : ٣٥٣۔ [2] مسلم، کتاب المساجد، ایضاً: ١٢٤٦؛ ابوداود، باب یصلی الرجل وھو حاقن: ٩١، ١٠؛ موطا امام مالك، النھی عن الصلوۃ والانسان یرید...... : ٣٨٠۔ [3] صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب تحریم الکلام فی الصلوٰۃ: ١٢٠١۔ [4] صحیح مسلم، باب کراھۃ الصلوٰۃ فی ثوب له اعلام: ١٢٣٨۔

[5] صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب الأکسیة والخمائص: ٥٨١٧ ومسلم کتاب اللباس، باب تحریم تصویر...... : ٥٥٢٩۔ [6] صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب اسلام عمرو بن عبسة: ١٩٣٠۔

[7] محدثین نے اس حضور سے فرشتوں کا حاضر ہونا مراد لیا ہے۔

نماز کی روحانی کیفیت کا سب سے اعلیٰ منظر یہ ہے کہ انسان پر ایسی حالت طاری ہو جائے کہ اسے معلوم ہو کہ وہ اس وقت خدا کے سامنے کھڑا ہے۔ گزر چکا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ احسان کیا ہے؟ فرمایا: ''یہ ہے کہ جب تم عبادت کرو تو تم کو یہ معلوم ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو۔ کیوں کہ اگر تم خدا کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو بہر حال دیکھ رہا ہے۔'' ❶ کبھی کبھی آنحضرت ﷺ پر نماز میں رقت طاری ہو جاتی تھی اور چشم مبارک سے آنسو نکلنے لگتے تھے۔ ایک صحابی جنھوں نے آنحضرت ﷺ کی اس کیفیت کو ایک دفعہ دیکھا تھا، کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ نماز میں ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا چکی چل رہی ہے یا ہانڈی ابل رہی ہے۔ ❷ رات کی نمازوں میں آنحضرت ﷺ پر عجیب ذوق وشوق کا عالم طاری ہوتا تھا۔ قرآن پڑھتے چلے جاتے، جب خدا کی عظمت و کبریائی کا ذکر آتا پناہ مانگتے، جب رحم وکرم کی آیتیں آتیں تو دعا کرتے۔ ❸ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''نماز دو دو رکعت کر کے ہے اور ہر دوسری رکعت میں تشہد ہے اور تضرع وزاری ہے، خشوع اور خضوع ہے، عاجزی اور مسکنت ہے اور ہاتھ اٹھا کر اے رب، اے رب کہنا ہے، جس نے ایسا نہ کیا تو اس کی نماز ناقص ہے۔'' ❹

ایک دفعہ آپ اعتکاف میں تھے اور لوگ مسجد میں زور زور سے قراءت کر رہے تھے آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگو تم میں سے ہر ایک خدا سے مناجات کر رہا ہے تو وہ سمجھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور ایک دوسرے کی مناجات میں اپنی آواز سے خلل انداز نہ ہو۔'' ❺

ایک صحابی نے درخواست کی کہ یارسول اللہ ﷺ! مجھے کچھ ہدایت فرمایئے ارشاد ہوا کہ ''جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو تمہاری نماز ایسی ہونی چاہیے کہ یہ معلوم ہو کہ تم اس وقت مر رہے ہو اور دنیا کو چھوڑ رہے ہو۔'' ❻ تمہاری نماز کی اس کیفیت کا کوئی شخص اندازہ کر سکتا ہے؟ اس پوری تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی نماز کیا ہے؟ قرآن کس نماز کو لے کر اترا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے کس نماز کی تعلیم دی ہے؟ اور اس کی اصلی کیفیتیں کیا کیا ہیں؟ اور اگر نماز یہ نماز ہو تو وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاحات کا کتنا مؤثر ذریعہ ہے۔ اسی لیے قرآن پاک نے نماز کی محافظت یعنی پابندی اور آداب کے ساتھ ادا کرنے کو ایمان کا نتیجہ بتایا ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ۝ ﴾

(٦/ الانعام: ٩٢)

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبرئیل النبی ﷺ: ٥٠۔ ❷ ترمذی فی "الشمائل": ٣٢١ وابوداود، کتاب الصلاۃ، باب البکاء فی الصلوٰۃ: ٩٠٥۔ ❸ مسند احمد بن حنبل، ج ٦، ص: ٩٢۔ ❹ ابوداود، کتاب التطوع، باب صلوٰۃ النہار: ١٢٩٦ وترمذی، ابواب الصلاۃ، باب ما جاء فی التخشع فی الصلوٰۃ: ٣٨٥۔ ❺ ابوداود، کتاب التطوع، باب رفع الصوت...: ١٣٣٢۔
❻ مسند احمد، ج ٥، ص: ٤١٢ عن ابی ایوب۔

”اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن کو مانتے ہیں اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہیں۔“

نماز کی اس نگہداشت اور محافظت کے دو معنی ہیں اور دونوں یہاں مقصود ہیں، یعنی ایک تو اس کے ظاہری شرائط کی تعمیل اور دوسرے اس کے باطنی آداب کی رعایت۔

نماز کے اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی فائدے

نماز تو درحقیقت ایمان کا ذائقہ، روح کی غذا اور دل کی تسکین کا سامان ہے، مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے اجتماعی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی اصلاحات کا بھی کارگر آلہ ہے، آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اخلاق وتمدن ومعاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں، ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا، اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسے بدوی، وحشی اور غیر متمدن ملک کو جس کو پہننے اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا، چند سال میں ادب وتہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا، اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے، تو وہ کسی بیرونی تعلیم کے بغیر صرف مذہب کے اثر سے، مہذب ومتمدن ہو جاتا ہے، متمدن قوموں میں جب وہ پہنچ جاتا ہے، تو ان کے تخیل کو بلند سے بلند تر، پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنا دیتا ہے اور ان کو اخلاص کی وہ تعلیم دیتا ہے، جس کے سبب سے ان کا وہی کام جو پہلے مٹی تھا، اب اکسیر بن جاتا ہے۔

❶ ستر پوشی: نماز کے ان معاشرتی فائدوں میں بالکل ابتدائی چیز ستر پوشی کا خیال ہے، انسان کا شرم وحیا کی نگہداشت کے لیے، اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانا نہایت ضروری ہے، عرب کے بدو اس تہذیب سے ناواقف تھے، بلکہ شہروں کے باشندے بھی اس سے بے پروا تھے، یہاں تک کہ غیر قریشی عورتیں جب حج کے لیے آتی تھیں تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھی اور اکثر ننگی ہو کر طواف کرتی تھیں، اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کو ضروری قرار دیا، یہاں تک کہ بغیر اس ستر پوشی کے اس کے نزدیک نماز ہی درست نہیں، آیت نازل ہوئی:

﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ (۷/ الاعراف: ۳۱)

”ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔“

مردوں کے لیے کم از کم ناف سے گھٹنے تک اور عورتوں کے لیے پیشانی سے لے کر پاؤں تک چھپانا نماز میں ضروری قرار پایا، اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربوں کو اور جہاں جہاں اسلام گیا، وہاں کے برہنہ باشندوں کو ستر عورت پر مجبور کیا، اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ دفعہ ان کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کے لیے ان کو ستر پوش بنا دیا، افریقہ اور ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے لباسوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے تمدن کے اس ابتدائی سبق میں دنیا کی کتنی بڑی مدد کی ہے، دوسری طرف متمدن قومیں، زیب وزینت اور حسن وآرائش اور تمدن کی بے اعتدالی سے بے حیائی پر اتر آتی

ہیں، مرد گھٹنوں سے اونچا لباس اور عورتیں نیم برہنہ یا نہایت باریک لباس پہنتی ہیں، نماز ان کی بھی اصلاح کرتی ہے اور ان متمدن قوموں کو اعتدال سے تجاوز نہیں کرنے دیتی، چنانچہ عورتوں کو تیز خوشبو لگا کر مسجد میں جانے سے منع فرمایا اور بے حیائی کے کپڑوں کے پہننے سے عموماً روک دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ ستر عورت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

❷ طہارت: اس کے بعد تمدن کا دوسرا ابتدائی سبق طہارت اور پاکیزگی ہے، جو اسلام کے اولین احکام میں سے ہے، اقرأ کے بعد دوسری ہی وحی میں جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی اس میں یہ حکم تھا:

﴿ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ ﴾ (۷۴/ المدثر:٤)

''اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ۔''

چنانچہ اسلام نے اس طہارت اور پاکیزگی کے اصول مقرر کیے اور آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیمات سے اس کے حدود متعین فرمائے اور نماز کی درستی کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ انسان کا بدن، اس کے کپڑے اور اس کی نماز پڑھنے کی جگہ نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک ہو، اہل عرب کو دوسری وحشی قوموں کی طرح طہارت و نظافت کی مطلق تمیز نہ تھی، یہاں تک کہ ایک بدو نے مسجد نبوی ﷺ میں آ کر سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کر دیا، صحابہ رضی اللہ عنہم اس کو مارنے کو دوڑے، آپ نے ان کو روکا، اور اس بدو کو اپنے پاس بلا کر نہایت مہربانی سے فرمایا کہ ''یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے، اس قسم کی نجاستوں کے لیے یہ موزوں نہیں ہے۔'' اور صحابہ سے فرمایا کہ ''اس نجاست پر پانی بہا دو۔'' ❶ ایک دفعہ ایک قبر کے پاس سے آپ گزرے تو فرمایا کہ ''اس قبر والے پر اس لیے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا۔'' ❷ غرض اس تعلیم نے جو صرف نماز کے لیے تھی، اہل عرب اور عام مسلمانوں کو پاک و صاف رہنے کا خوگر بنایا، اور استنجا، بیت الخلا اور طہارت کے وہ آداب سکھائے جن سے آج کی بڑی بڑی متمدن قومیں بھی ناآشنا ہیں۔ نجاستوں سے اپنے بدن، کپڑے، اور مکان کو صاف رکھنے کی تعلیم دی، جو صحابہ طہارت کا اہتمام کرتے تھے، خدا نے ان کی مدح فرمائی:

﴿ فِيهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبة:۱۰۸)

''اس مسجد میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو پسند کرتے ہیں، کہ وہ پاک و صاف رہیں اور اللہ تعالیٰ پاک و صاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

جب اسلام نے طہارت و پاکیزگی کو خدا کے پیار کرنے کا ذریعہ ٹھہرایا تو اس نعمت سے محرومی کو کون پسند کر سکتا ہے؟

❸ صفائی: نماز کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے جسم اور اعضا کے پاک اور ستھرا رکھنے پر مجبور کرتی

❶ صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب صب الماء علی البول: ۲۲۰۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب من الکبائر ان لا یستتر من بوله...۔

ہے، دن میں عموماً پانچ دفعہ ہر نمازی کو منہ ہاتھ پاؤں جو اکثر کھلے رہتے ہیں، ان کے دھونے کی ضرورت پیش آتی ہے، ناک میں پانی ڈال کر ناک صاف کرنی ہوتی ہے، ایک بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے یہ کہا کہ آج کل کے جراثیم کے نظریہ کی بنا پر بہت سی بیماریاں ناک کی سانس کے ذریعہ جراثیم کے بدن کے اندر جانے سے پیدا ہوتی ہیں اور ناک کے نتھنوں کو پانی ڈال کر صاف کرنے سے یہ جراثیم دور ہوتے ہیں۔

دنیا میں اسلام کے سوا اور کوئی مذہب نہیں ہے جس نے ناک میں پانی ڈالنا ضروری قرار دیا ہو، حالانکہ طبی حیثیت سے یہ سب سے زیادہ ضروری چیز ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام کس قدر طبی اصول پر مبنی ہیں، نمازیوں کو پنج وقتہ وضو کی ہدایت کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے، جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم نازل ہوا، اس ملک میں جہاں پانی سب سے زیادہ کمیاب ہے۔

اہل عرب اور خصوصاً بدو دانتوں کو بہت کم صاف کرتے ہیں، جس سے گندہ دہنی اور بدنمائی کے علاوہ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، آنحضرت ﷺ نے ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کی اتنی تاکید فرمائی ہے کہ گویا وجوب کے قریب پہنچ گئی اور فرمایا کہ ''اگر میری امت پر یہ شاق نہ گزرتا تو میں اس کو ضروری قرار دیتا۔'' [1] اسی پانی کی کمی کی وجہ سے اہل عرب نہاتے کم تھے، ان کے کپڑے عموماً اون کے ہوا کرتے تھے، وہ محنت مزدوری کرتے تھے، جس سے پسینہ میں شرابور ہو جاتے تھے اور چونکہ ایک ایک کپڑے کو ہفتوں پہنے رکھتے تھے، اس لیے جب مسجد میں نماز پڑھنے آتے، تو ان کے بدن اور کپڑوں سے بدبو آتی تھی، اس بنا پر اسلام نے ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ جمعہ کو نماز سے پہلے غسل کرنا اور نہانا سب پر واجب کر دیا آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((غسل يوم الجمعة واجب على كل محتلم)) [2]

''جمعہ کے دن نہانا ہر بالغ پر ضروری ہے۔''

اسی کے ساتھ اس دن دھلے ہوئے کپڑے پہننا، خوشبو ملنا اور صفائی و نظافت کے دوسرے امور کو مستحسن قرار دیا، بعض حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا، جس کے بغیر کوئی نماز ممکن ہی نہیں، فرمایا:

﴿وَإِن كُنتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا﴾ (٥/ المآئدة:٦)

''اور اگر تم ناپاک ہو گئے ہو تو نہا کر اچھی طرح پاک ہو جاؤ۔''

4 پابندی وقت

انسان کی کامیاب عملی زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس کے تمام کام مقررہ اوقات پر انجام پائیں، انسان فطرتاً آرام پسند اور راحت طلب پیدا ہوا ہے، اس کو پابند اوقات بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے

---

[1] صحيح بخاری، كتاب الجمعة، باب السواك يوم الجمعة:٨٨٧۔

[2] صحيح بخاری، كتاب الجمعة، باب فضل الغسل يوم الجمعة:٨٧٩۔

بعض کاموں کے اوقات جبراً مقرر کر دیے جائیں، جیسا کہ کاروبار کے کاموں میں آپ کو یہ اصول نظر آتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوسرے کاموں کے اوقات بھی ان کی خاطر مقرر کر لیتا ہے اور اس طرح اس کی زندگی باقاعدہ ہو جاتی ہے اور اس کا وقت فضول برباد نہیں ہوتا، نماز کے اوقات چونکہ مقرر ہیں، اس لیے وہ لوگ جو نماز کے پابند ہیں، خصوصاً نماز باجماعت کے، ان کے اوقات خود بخود منظم ہو جاتے ہیں، ان کے دن رات کے کام باقاعدہ انجام پاتے ہیں اور نماز کے اوقات ان کے کاموں کا معیار ہو جاتے ہیں، وقت پر سونا اور وقت پر اٹھنا ان کے لیے ضروری ہو جاتا ہے، مشہور صحابی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مقولہ ہے:

((الصلوة مكيال فمن اوفى اوفي به ومن طفف فقد علمتم ماللمطففين)) [1]

''نماز ایک پیمانہ ہے، جس نے اس کو پورا ناپا، اس کو پورا ناپ کر دیا جائے گا اور جس نے ناپنے میں کمی کی تو تمہیں کم ناپنے والوں کی سزا معلوم ہے۔''

اس قول کے جہاں اور مطلب ہو سکتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نماز ہر مسلمان کے کام کا پیمانہ ہے، اسی سے اس کی ہر چیز ناپی جا سکتی ہے۔

5 صبح خیزی

طب اور حفظان صحت کے اصول سے رات کو سویرے سونا اور صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے بیدار ہونا جس درجہ ضروری ہے، وہ مخفی نہیں، جو لوگ نماز کے پابند ہیں، وہ اس اصول کی خلاف ورزی کبھی نہیں کر سکتے، جب تک رات کو وقت پر سویا نہ جائے گا، صبح کو وقت پر آنکھ نہیں کھل سکتی، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے رات کو نماز عشاء کے بعد بے کار باتیں کرنے سے اور قصہ کہانی سے منع فرمایا ہے [2] تاکہ وقت پر سونے سے وقت پر آنکھ کھل سکے اور صبح خیزی مسلمانوں کی عادت ہو جائے اور صبح کو مؤذن کی پر تاثیر آواز۔

((اَلصَّلٰوةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ))

''سونے سے نماز بہتر ہے۔''

ان کو بے تابانہ اپنے خواب کے بستر سے اٹھا دے۔

6 اللہ کا خوف

ایک مسلمان جو نماز پڑھتا ہے، جب کبھی غلطی سے یا بشری کمزوری سے اس کا قدم ڈگمگاتا ہے، تو رحمت الٰہی اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے، اس کو اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے، اس کو اپنے خدا کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے، اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے، وہ لوگوں سے اس بنا پر شرماتا ہے کہ وہ کہیں گے کہ یہ نمازی ہو کر اس قسم کے افعال کا مرتکب ہوتا ہے، کہ اس کے پاؤں بدی کے راستہ پر پڑتے وقت کانپتے ہیں، غرض نماز انسان

[1] کنز العمال مندوبات الصلوٰۃ، ج ٤، ص: ٢٣٠ بحوالہ مصنف عبدالرزاق۔

[2] بخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ، باب مایکرہ من السمر بعد العشاء: ٥٩٩۔

کے اخلاقی حاسہ کو بیدار کرتی ہے اور برائیوں سے بچاتی ہے اور خود خدا نے نماز کا وصف یہ بیان کیا ہے:

﴿ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ﴾ (۲۹/ العنکبوت: ٤٥)

''بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔''

7 ہشیاری

نماز عقل، ہوش، بیداری اور آیاتِ الٰہی میں تدبر اور غور، خدا کی تسبیح و تہلیل اور اپنے لیے دعائے مغفرت کا نام ہے، اس لیے وہ تمام چیزیں جو انسان کی عقل و ہوش اور فہم اور احساس کو کھو دیں، نماز کی حقیقت کے منافی ہیں، اسی لیے اس وقت بھی جب شراب کی ممانعت نہیں ہوئی تھی، اس کو پی کر نشہ کی حالت میں نماز پڑھنا جائز نہ تھا:

﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ (٤/ النسآء: ٤٣)

''نشہ کی حالت میں تم نماز کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو کچھ کہتے ہو۔''

اس بنا پر ایک نماز کا پابند تمام ایسی چیزوں سے جو اس کی عقل و ہوش کو گم کر دیں، قطعاً پرہیز کرے گا۔

8 مسلمان کا امتیازی نشان

مذہبی بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی اسلام کو سب سے زیادہ مخلصین اور منافقین کے امتیاز کی ضرورت تھی، قانون ان دونوں گروہوں میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتا تھا، احکام میں حج ایک ایسی چیز ہے، جس کے اہل عرب مدت سے خوگر تھے، اس کے ساتھ وہ ان کے مذاق کی چیز تھی، خلائق کا اجتماع ایک میلے کی صورت اختیار کر لیتا تھا، جو عرب کے تمدن کا ایک لازمی جزو تھا، فخر و امتیاز کے موقعے بھی اس میں حاصل ہو سکتے تھے، گو اسلام نے اس کی اصلاح کر دی، زکوۃ بھی کوئی حد فاصل نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ اکثر منافقین متمول تھے اور یہ جاہ و فخر کا بھی ذریعہ ہو سکتی تھی، اس کے ساتھ یہ عرب کی فیاض طبیعت پر بھی گراں نہیں ہو سکتی تھی، فقرا کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی فطری ہے، صرف معمولی تحریک کی ضرورت تھی، روزہ بھی اس کا معیار نہیں قرار دیا جا سکتا، کیونکہ روزہ میں چھپے چوری کھا پی لینے کا موقع بہ آسانی حاصل ہو سکتا ہے، صرف نماز ایک ایسی چیز ہے، جو ان دونوں گروہوں میں حد فاصل ہو سکتی ہے، چنانچہ قرآن پاک نے اسی فریضہ میں سستی کو منافقین کی خاص پہچان قرار دیا:

﴿ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ﴾ (٤/ النسآء: ١٤٣)

''اور جب وہ نماز پڑھنے کو اٹھتے ہیں تو کسل مندی کے ساتھ اٹھتے ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ: ٤٥)

''خضوع و خشوع والوں کے علاوہ نماز سب پر گراں ہے۔''

خصوصاً عشاء اور فجر کی نماز کی نسبت کہ یہ راحت کے اوقات ہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((لیس صلاۃ اثقل علی المنافقین من الفجر و العشاء)) ❶

''منافقین پر فجر و عشاء سے زیادہ کوئی نماز گراں نہیں ہے۔''

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ''جب ہم (صحابہ) کسی کو عشاء اور صبح کی نمازوں میں غیر حاضر پاتے تھے تو ہم اس سے بدگمان ہو جاتے تھے۔ ❷ مدینہ آ کر نماز میں قبلہ کی تبدیلی جہاں اور مصلحتوں سے تھی، وہاں ایک مصلحت یہ بھی تھی، کہ اس سے مخلصین اور منافقین کی تمیز ہو سکے، مکہ معظّمہ کے لوگ جو کعبہ کی عظمت کے قائل تھے، بیت المقدس کی طرف منہ کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے، مدینہ میں یہود آباد تھے، جن میں کچھ مسلمان ہو گئے تھے، وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور کعبہ کی عظمت تسلیم نہیں کرتے تھے، اس لیے عرب منافقین کی پہچان بیت المقدس کے قبلہ بنانے سے اور یہود منافقین کی پہچان کعبہ قبلہ بنانے سے ہو سکتی تھی، چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۴۳)

''اور جس قبلہ پر تم تھے اس کو ہم نے قبلہ نہیں بنایا، لیکن اس لیے، تاکہ ہم ان کو جو رسول کی پیروی کرتے ہیں، ان سے الگ کر دیں جو الٹے پاؤں پھر جائیں گے اور یہ قبلہ گراں ہوا، لیکن ان پر جن کو خدا نے راہ دکھائی۔''

یہ پہچان اور شناخت اب قیامت تک قائم رہے گی، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، وہ مسلمان ہے۔'' ❸

❾ باطل کی شکست اور حق کی خاطر لڑنا انسان کا فرض ہے، اس فرض کے انجام دینے کے لیے انسان کو ہر وقت تیار رہنا چاہیے، اس تیاری کا نقشہ ہماری روزانہ کی نمازیں ہیں، چنانچہ ابوداؤد میں ہے:

کان النبی ﷺ و جیوشه اذا علوا الثنا یا کبروا و اذا هبطوا سبحوا فوضعت الصلوۃ علی ذلك۔ ❹

''آنحضرت ﷺ اور آپ کا لشکر جب پہاڑی پر چڑھتا تھا تو تکبیر اور جب نیچے اترتا تھا، تو تسبیح کہتا تھا، نماز اسی طریقے پر قائم کی گئی۔''

---

❶ بخاری، کتاب الاذان، باب فضل صلاۃ العشاء فی الجماعۃ: ۶۵۷۔
❷ مستدرك حاکم (علی شرط الشیخین) ج۱، ص: ۲۱۱۔
❸ بخاری، کتاب الصلاۃ، باب فضل استقبال القبلۃ: ۳۹۱۔
❹ ابوداود، کتاب الجهاد، باب ما یقول الرجل اذا سافر: ۲۵۹۹۔

صف بندی، ایک افسر (امام) کی اطاعت، تمام سپاہیوں (نمازیوں) کی باہم محبت اور دستگیری اور ایک تکبیر کی آواز پر پوری صفوف کی حرکت اور نشست و برخاست مسلمانوں کو صفِ جنگ کے اوصاف سکھاتی ہے اور ان کے قوائے عمل کو بیدار کرتی ہے، جاڑوں میں پانچ وقت وضو کرنا، ظہر کے وقت دھوپ کی شدت میں گھر سے نکل کر مسجد کو جانا، عصر کے وقت لہو ولعب کی دلچسپیوں سے وقت نکال کر خدا کو یاد کرنا، رات کو سونے سے پہلے دعا وزاری کر لینا، صبح کو خواب سحر کی لذت کو چھوڑ کر حمدِ باری میں مصروف ہونا، اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم فرضی راحت و تکلیف سے بے پروا ہو کر، عمل کی طاقت اپنے میں پیدا کریں اور کام کی ضرورت کے وقت احساسِ فرض کے تقاضے کو بجالانا ضروری سمجھیں اور اس کے لیے عارضی تکلیفوں کی برداشت کا اپنے کو خوگر بنائیں، ہفتہ میں ایک دن نماز جمعہ کے لیے شہر کے سب مسلمانوں کا ایک جگہ جمع ہونا، دن رات کے پُر آرام سے پُر آرام وقت میں ممکن تھا، مگر اس کے لیے بھی دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا تا کہ اس اجتماع اور مظاہرہ میں بھی مسلمان سپاہیانہ خصائص کے خوگر رہیں اور نماز جمعہ کا ہر پابند شہادت دے گا کہ اس کی اتنی سی یہ عادت مشکلات وقت کے اتفاقات میں اس کے لیے کس قدر ممد ثابت ہوتی ہے۔

10 تمام عبادات، بلکہ تمام مذاہب کا اصل مقصد تکمیل اخلاق ہے، لیکن اصلاح اخلاق کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ نفس ہر وقت بیدار اور اثر قبول کرنے کے لیے آمادہ رہے، تمام عبادات میں صرف نماز ہی ایک ایسی چیز ہے جو نفس کو بیدار رکھ سکتی ہے، روزہ، حج، زکوٰۃ اولاً تو ہر شخص پر فرض نہیں ہیں، اس کے ساتھ روزہ سال میں ایک بار فرض ہوتا ہے، زکوٰۃ کا بھی یہی حال ہے، حج عمر میں ایک بار ادا کرنا پڑتا ہے، اس لیے یہ فرائض نفس کے تنبہ اور بیداری کا دائمی اور ہر روزہ ذریعہ نہیں ہو سکتے، برخلاف ان کے نماز دن میں پانچ بار ادا کرنی ہوتی ہے، ہر وقت وضو کرنا پڑتا ہے، سجدہ، رکوع، قیام وقعود، جہر، خفا، تسبیح وتہلیل، تکبیر وتشہد نے اس کے ارکان و اعمال میں تنوع و امتیاز پیدا کر دیا ہے، جن میں ہر چیز نفس میں تدریجی اثر پذیری کی قابلیت پیدا کرتی ہے اور ہر چوبیس گھنٹہ میں چند گھنٹوں کے وقفہ سے نفس انسانی کو ہشیار اور قلب خفتہ کو بیدار کرتی ہے، اس طرح نفس کو رات دن تنبہ ہوا کرتا ہے۔

11 الفت ومحبت

نماز مسلمانوں میں باہمی الفت ومحبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، محلہ کے تمام مسلمان جب کسی ایک جگہ دن میں پانچ دفعہ جمع ہوں اور باہم ایک دوسرے سے ملیں تو ان کی بیگانگی دور ہوگی، ان میں آپس میں محبت اور الفت پیدا ہوگی، اس طرح وہ ایک دوسرے کی امداد کے لیے ہر وقت تیار رہیں گے، قرآن پاک نے نماز کے اس وصف اور اثر کی طرف خود اشارہ کیا ہے:

﴿وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا

﴿ شِيَعًا ﴾ (۳۰/ الروم:۳۱-۳۲)

''خدا سے ڈرتے رہو اور نماز کھڑی رکھو اور مشرکوں میں سے نہ بنو، ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالی اور بہت سے جتھے ہو گئے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا اجتماع مسلمانوں کو جتھا بندی اور فرقہ آرائی سے بھی روک سکتا ہے، کہ جب ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی رہے گی، تو غلط فہمیوں کا موقع کم ملے گا۔

⑫ غمخواری

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نماز مسلمانوں میں باہمی ہمدردی اور غمخواری کا ذریعہ بھی بنتی ہے، جب امیر و غریب سب ایک جگہ ہوں گے اور امرا اپنی آنکھ سے غریبوں کو دیکھیں گے تو ان کی فیاضی کو تحریک ہوگی، ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر ہوگی اور اس کی تلافی کی صورت پیدا ہوگی۔ ابتدائے اسلام میں اصحاب صفہ کا ایک گروہ تھا، جو سب سے زیادہ مستحقِ اعانت تھا، یہ گروہ مسجد میں رہتا تھا، صحابہ نماز کو جاتے تو ان کو دیکھ کر خود بخود ہمدردی پیدا ہوتی تھی، چنانچہ اکثر صحابہ کھجور کے خوشے لے جا کر مسجد میں لٹکا دیتے تھے، جس پر یہ گروہ گزر اوقات کرتا تھا، اکثر صحابہ اور خود آنحضرت ﷺ نماز سے فارغ ہو کر ان لوگوں کو ساتھ لاتے اور اپنے گھروں میں کھانا کھلاتے تھے، اب بھی مساجد خیرات وصدقات کا ذریعہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے:

﴿ وَيُقِيمُونَ الصَّلَوٰةَ وَمِمَّا رَزَقْنَٰهُمْ يُنفِقُونَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۳)

''اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے صرف کرتے ہیں۔''

⑬ اجتماعیت

اجتماعیت چونکہ ایک فطری چیز ہے، اس لیے تمام قوموں نے اس کے لیے مختلف اوقات اور تہوار مقرر کیے ہیں، جن قوموں کو مذہبی قیود سے آزاد کہا جاتا ہے، ان میں بھی اس اجتماعیت کی نمائش کلبوں، کانفرسوں، آٹیوریوں اور دوسرے جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں سے کی جاتی ہے، لیکن یہ اجتماعیت جہاں فائدے پہنچاتی ہے، وہاں اپنے مضر اثرات بھی ضرور پیش کرتی ہے، اجتماعیت کام چاہتی ہے، اگر مفید کام پیش نظر نہ ہو تو وہی رنگ رلیوں، رقص وسرود، شراب خوری، قمار بازی، چوری، بدنظری، بدکاری، رشک وحسد، بلکہ قتل و غارت تک پہنچ جاتی ہے، میلے ٹھیلے، عرس، ہولی، تہوار جن کی مثالیں عرب مشرکوں میں بھی ملتی تھیں اور اب بھی ملتی ہیں، قبور پر ناجائز اجتماع، غرض تمام اجتماعی بدعات بدترین گناہوں اور فسادوں کا مرکز بن جاتے ہیں، اب اگر ان خطرناک رسوم کا صرف انسداد ہی کیا جاتا اور ان کی جگہ اسلام ان کے سامنے کوئی دوسری چیز پیش نہ کرتا، تو محض یہ سلبی علاج کافی نہ ہوتا، ضرورت تھی کہ وہ اپنے قومی اجتماع کے لیے کوئی مشغلہ مقرر کرے، جس

سے قلبِ انسانی اپنی فطری پیاس کو بجھا سکے اور اجتماعیت پیدا ہو کر بدی کی بجائے نیکی کے رخ کی طرف بہے، چنانچہ اسلام نے اسی لیے روزانہ جماعت کی عام نمازیں، ہفتہ میں جمعہ کی نماز اور سال میں دو دفعہ عیدین کی نمازیں مقرر کیں، کہ اجتماعیت کا فطری تقاضا بھی پورا ہو اور مشرکانہ بدیوں اور اخلاقی برائیوں سے بھی احتراز ہو کہ اس اجتماع کی بنیادی دعوت خیر پر رکھی گئی ہے، حج کے عالمگیر مذہبی اجتماع میں دوسرے اجتماعی اور اقتصادی مقاصد کے برقرار رکھنے کے ساتھ اس کے مشاغل بھی خدا کے ذکر اور اس کی بارگاہ میں توبہ و انابت کو قرار دیا، اس طرح اسلام کا ہر اجتماع پاکیزگی خیال اور اخلاص عمل کی بنیاد پر قائم ہے۔

14 کاموں کا تنوع

انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہے کہ وہ ہمرنگی کے باوجود تفنن اور تجدد کا طالب ہے، لیکن اگر انسان کے دل و دماغ، اعضاء و جوارح ہر وقت اسی ایک کام میں مصروف رہیں، تو سکون و اطمینان، عیش و راحت اور دلچسپی کی لذت، جو ہر عمل کا آخری نتیجہ ہے، مفقود ہو جائے، مفید سے مفید کام سے بھی دنیا چیخ اٹھے، اسی لیے قدرت نے اوقات کی تقسیم ایسے مناسب طریقے پر کی ہے، جس میں انسان کو حرکت و سکون دونوں کا یکساں موقع ملتا رہتا ہے، رات اور دن کا اختلاف اسی بنا پر آیاتِ الٰہی میں شمار کیا گیا ہے، کہ اس تغیر و تبدل سے نظامِ عالم میں نیرنگی پیدا ہوتی ہے اور اس تقسیم سے انسانوں میں اپنے ہر کام کی لذت قائم رہتی ہے، نماز ایک ایسا فریضہ ہے جو نہ تو ہر لمحہ اور لحظہ انسان پر فرض ہے اور نہ سال میں ایک دفعہ یا عمر بھر میں صرف ایک دفعہ فرض ہے، بلکہ ہر روز پانچ دفعہ اس کو ادا کرنا پڑتا ہے، صبح سے کام شروع کیا تو ظہر پر آ کر توڑ دیا، پھر مشغولیت ہوئی اور عصر پر پہنچ کر ختم ہوئی، پھر جو سلسلہ چھڑا اس کا مغرب پر خاتمہ ہوا، بعد ازیں خانگی مصروفیت شروع ہوئی اور عشاء پر جا کر منتہی ہوئی، اب نیند آ گئی اور صبح تک بے خبری رہی، اٹھے تو دعاؤں کے افتتاح سے پھر اپنا کاروبار شروع کیا، وہ دولت مند جو جسمانی یا دماغی محنت و مشقت اور مزدوری سے اپنی روزی نہیں حاصل کرتے، وہ اس روحانی ''انٹرول'' (وقفہ) کے لطف سے آگاہ نہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان چند گھنٹوں تک ایک ہی قسم کی محنت کے بوجھ سے جو دبا جاتا تھا، وہ چند منٹ میں، ہاتھ منہ دھو کر دعا و تسبیح اور نشست و برخاست کے ذریعہ اس سے ہلکا ہو گیا اور پھر سے اس نے اپنے کام کے لیے نئی قوت پیدا کر لی۔

15 تربیت

انسان کی عملی کامیابی، استقلال اور مواظبت پر موقوف ہے، کہ جس کام کو اس نے شروع کیا، پھر اس پر عمر بھر قائم رہے، اسی کا نام عادات و اخلاق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی ہے، جس کام میں اس خلق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی کی تربیت ہو وہ ضروری ہے کہ روزانہ ہو، بلکہ دن میں کئی دفعہ ہو نماز ایک ایسا فریضہ ہے، جس کے بارے عہدہ برآ ہونے کے لیے انسان میں، استقلال، مواظبت اور مداومت شرط ہے،

اس لیے انسان میں اس اخلاقی خوبی کے پیدا کرنے کا ذریعہ نماز سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں ہوسکتی، اس لیے قرآن پاک نے صحابہ کی مدح میں فرمایا:

﴿ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ﴾ (۷۰/ المعارج:۲۳)

''وہ جو اپنی نماز مداومت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((احب العمل الی اللّٰہ ادومہ و انْ قَلّ)) ❶

''محبوب ترین عمل خدا کے نزدیک وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے گو وہ کم ہو۔''

⑯ نظم جماعت

کسی قوم کی زندگی، اس کی نظمِ جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہو جاتا ہے، اسلام میں نماز باجماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے، محمد رسول اللہ ﷺ نے اسی عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے ان کی زندگی کا خاکہ کھینچا اور بتایا کہ مسلمانوں کا یہ صف بہ صف کھڑا ہونا، ایک دوسرے سے شانہ سے شانہ ملانا اور یکساں حرکت و جنبش کرنا، ان کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ ہے، جس طرح نماز کی درستی اس صف اور نظامِ جماعت کی درستی پر موقوف ہے، اسی طرح پوری قوم کی زندگی اسی باہمی تعاون، تضامن، مشارکت، میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ صفوف کی درستی پر بہت زور دیتے تھے اور فرماتے تھے، کہ ''جب تک تم خوب مل کر کھڑے نہ ہو گے تمہارے دل بھی آپس میں نہ ملیں گے۔'' ❷

⑰ مساوات

یہی جماعت کی نماز مسلمانوں میں برادرانہ مساوات اور انسانی برابری کی درس گاہ ہے، یہاں امیر و غریب، کالے گورے، رومی، حبشی، عرب و عجم کی کوئی تمیز نہیں ہے، سب ایک ساتھ ایک درجہ اور ایک صف میں کھڑے ہو کر خدا کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں، جماعت کی امامت کے لیے حسب و نسب، نسل و خاندان، رنگ و روپ، قومیت اور جنسیت، عہدہ اور منصب کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ علم و دانش، فضل و کمال، تقویٰ و طہارت کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں شاہ و گدا اور شریف و رذیل کی تفریق نہیں، سب ہی ایک زمین پر، ایک امام کے پیچھے، ایک صف میں دوش بدوش کھڑے ہوتے ہیں اور کوئی کسی کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا اور اس برادرانہ مساوات اور انسانی برادری کی مشق دن میں پانچ دفعہ ہوتی ہے، کیا مسلمانوں کی معاشرتی جمہوریت کی یہ درس گاہ کہیں اور بھی قائم ہے؟

---

❶ ابوداود، کتاب التطوع، باب ما یؤمر بہ من القصد فی الصلوٰۃ: ۱۳۶۸۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب تسویۃ الصفوف عندالاقامۃ و بعد ھا: ۷۱۷؛ ابوداود، کتاب الصلوٰۃ، باب تسویۃ الصفوف: ۶۶۳۔

18 اطاعت

جماعت کی سلامتی بغیر ایک مفترض الطاعۃ امام کے ناممکن ہے، جس کے اشارہ پر تمام قوم حرکت کرے، نماز با جماعت مسلمانوں کی اس زندگی کا رمز ہے، کہ جس طرح ان کی اس عبادت کا ایک امام ہے، جس کے اشارہ پر وہ حرکت کرتے ہیں، اسی طرح قوم کی پوری زندگی کا بھی ایک امام ہونا چاہیے، جس کے اللہ اکبر کی آواز قوم کے کاروان کے لیے بانگ درا اور صدائے جرس ثابت ہو۔

اطاعت امام کے لیے ایک طرف تو قوم میں فرمانبرداری کی قابلیت موجود ہونی چاہیے، جس کی تعلیم مقتدیوں کو نماز میں ہوتی ہے، دوسری طرف امام کو اخلاق صالحہ کی ایک ایسی مثال پیش کرنی چاہیے جو ہمیشہ لوگوں کے پیشِ نظر رہے، نماز ان دونوں چیزوں کا مجموعہ ہے، وہ ایک دائمی حرکت ہے، جو قوم کے اعضاء و جوارح کو ہر وقت اطاعت گزاری کے لیے تیار رکھتی ہے، اس کے ساتھ نمازِ پنجگانہ اور جمعہ وعیدین کی امامت خاص امام کا حق ہے، اس لیے ہر وقت قوم کو اس کے اعمال کے احتساب، اس پر نکتہ چینی، اس سے اثر پذیری کا موقع ملتا ہے، نماز کے اوقات خاص طور پر ایسے موزوں ہیں جو ایک عیاش اور راحت طلب شخص کا پردہ فاش کر دیتے ہیں، ایک ایسا شخص جو شب بھر عیش وعشرت میں مصروف ہو، نماز صبح میں شریک نہیں ہوسکتا، ایک راحت طلب آدمی ظہر کے وقت دھوپ کی شدت برداشت کر کے شریک جماعت ہونا پسند نہیں کرسکتا، چنانچہ خلافت راشدہ کے بعد جب بنوامیہ کا زمانہ آیا تو صحابہ کو خاص طور پر اس کا احساس ہوا اور بے خوف نگاہوں نے ان پر نکتہ چینیاں کیں، احادیث میں بھی خاص طور پر اس زمانہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس میں ائمہ وقت پر نماز ادا کرنے میں غفلت کریں گے۔

19 معیارِ فضیلت

نماز کی امامت کے لیے چونکہ سوائے علم وفضل اور تقویٰ کے کوئی اور قید نہیں ہے، اس لیے امامت کے رتبہ اور درجہ کو حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے ہر وقت ممکن ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جماعت میں جو سب سے زیادہ صاحب علم (اقرا) ہے وہ امام بننے کا سب سے زیادہ مستحق ہے، ایک دفعہ ایک مقام سے کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لیے آئے، دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ان میں سے جو صاحب سب سے زیادہ کمسن ہیں، انہیں قرآن زیادہ یاد ہے، چنانچہ آپ نے انہیں کم سن صحابی کو ان کا امام مقرر فرمایا [1] اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں میں اس کے ذریعہ سے علمی وعملی فضائل کے حاصل کرنے کی تشویق وترغیب بھی پیدا ہوتی ہے۔

20 روزانہ کی مجلس عمومی

آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا، یا کوئی

---

[1] ابوداود، کتاب الصلوۃ، باب من احق بالامامۃ: ۵۸۵، ۵۸۷۔

سیاسی وقومی مشکل پیدا ہوتی، یا کوئی مذہبی بات سنانی ہوتی، تو مسلمانوں میں منادی کرائی جاتی تھی کہ الصلوٰۃ جامعۃ ''نماز جمع کرنے والی ہے'' سب لوگ وقت پر جمع ہو جاتے اور اس امرِ اہم سے اطلاع پاتے، یا اس کے متعلق اپنے مشورے عرض کرتے، یہ گویا مسلمانوں کے مذہبی، اجتماعی، سیاسی مسائل کے مخلصانہ حل کا بھی ذریعہ تھا، جس کے لیے نماز کے تعلق سے ہر مسلمان کا کسل وستی کے بہانہ بغیر جمع ہونا ضروری تھا۔

ان تمام امور کو سامنے رکھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام کا اولین شعار اور اس کے مذہبی و اجتماعی وتمدنی وسیاسی واخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے، اسی کی شیرازہ بندی سے مسلمانوں کا شیرازہ بندھا تھا اور اسی کی گرہ کھل جانے سے اس کی نظم و جماعت کی ہر گرہ کھل گئی ہے، مسجد مسلمانوں کے ہر قومی اجتماع کا مرکز اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی، جس طرح آج ہر جلسہ کا افتتاح اس کے نصب العین کے اظہار و تعیین کے لیے صدارتی خطبات سے ہوتا ہے، اسی طرح مسلمان جب زندہ تھے، ان کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا، ان کی ہر چیز اس کے تابع اور اسی کے زیر نظر ہوتی تھی، ان کی نماز کا گھر ہی ان کا دارالامارۃ تھا، وہی دارالشوریٰ تھا، وہی بیت المال تھا، وہی صیغۂ جنگ کا دفتر تھا، وہی درس گاہ اور وہی معبد تھا۔

جماعت کی ہر ترقی کی بنیاد، افراد کے باہمی نظم وارتباط پر ہے اور جماعت کے فائدہ کے لیے افراد کا اپنے ہر آرام وعیش اور فائدہ کو قربان کر دینا اور اختلاف باہمی کو تہ کر کے صرف ایک مرکز پر جمع ہو کر جماعتی ہستی کی وحدت میں فنا ہو جانا، اس کے حصول کی لازمی شرط ہے، اسی کی خاطر کسی ایک کو امام وقائد وسرلشکر مان کر اس کی اطاعت وفرمانبرداری کا عہد کر لینا ضروری ہے، اسلام کی نماز انہی رموز واسرار کا گنجینہ ہے، یہ مسلمانوں کا نظم وجماعت، اطاعت پذیری وفرمانبرداری اور وحدت قوت کا سبق دن میں پانچ بار سکھاتی ہے، اسی لیے اس کے بغیر مسلمان، مسلمان نہیں اور نہ اس کی کوئی اجتماعی وحدت ہے، نہ انقیاد امامت ہے، نہ زندگی ہے اور نہ زندگی کا نصب العین ہے، اسی بنا پر داعی اسلام علیہ السلام نے یہ فرما دیا:

((العهد الذي بيننا وبينهم الصلوٰة فمن تركها فقد كفر)) [1]

''ہمارے اور ان کے درمیان جو معاہدہ ہے، وہ نماز ہے، تو جس نے اس کو چھوڑا، اس نے کفر کا کام کیا۔''

کہ نماز کو چھوڑ کر مسلمان صرف قالب بے جان، شراب بے نشہ اور گلِ بے رنگ وبو ہو کر رہ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کا ایک ایک شعار اور ایک ایک امتیازی خصوصیت اس سے رخصت ہو جاتی ہے اسی لیے نماز اسلام کا اولین شعار ہے اور اسی کی زندگی سے اسلام کی زندگی ہے۔

---

[1] ترمذی، ابواب الایمان، باب ما جاء في ترك الصلوة: ۲۶۲۱؛ نسائی، کتاب الصلوة، باب الحکم في تارك الصلوة: ٤٦٤؛ ابن ماجه، ابواب اقامة الصلوة، باب ما جاء في من ترك الصلوة: ۱۰۷۹؛ مسند أحمد، ج ٥، ص: ٣٤٦۔

عرب کی روحانی کایا پلٹ

وہ عرب جو خدا کی عبادت سے بیگانہ تھا، وہ جس کی پیشانی خدا کے سامنے کبھی جھکی نہ تھی، وہ جس کا دل خدا کی پرستش سے لذت آشنا نہ تھا، وہ جس کی زبان خدا کی تسبیح و تحمید کے ذائقہ سے واقف نہ تھی، وہ جس کی آنکھوں نے شب بیداری کا اضطراب انگیز منظر نہیں دیکھا تھا، وہ جس کی روح ربانی تسکین و تسلی کے احساس سے خالی تھی۔محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے دفعتاً کیا ہو گیا؟ اب عبادت الٰہی اسکے ہر کام کا مقصد بن گئی۔اب اس کو اپنے ہر کام میں اخلاص کے سوا اور کوئی چیز مطلوب نہ تھی۔اس کی پیشانی خدا کے سامنے جھک کر پھر اٹھنا نہیں چاہتی تھی، اس کے دل کو اس لذت کے سوا دنیا کی کوئی لذت پسند نہیں آتی تھی، اس کی زبان کو اس مزہ کے سوا اور کوئی مزہ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔اس کی آنکھیں اس منظر کے سوا اور کسی منظر کی طالب نہ تھیں اس کی روح یاد الٰہی کی تڑپ اور ذکر الٰہی کی بے قراری کے سوا کسی اور چیز سے تسلی نہ پاتی تھی۔

وہ عرب جن کی حالت یہ تھی کہ

﴿ وَلَا يَذْكُرُونَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ (٤/ النسآء:١٤٢)

''اور جو خدا کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔''

دعوتِ حق اور فیض نبوت کے اثر و برکت نے انکی یہ شان نمایاں کی کہ دنیا کی کاروباری مشغولیتیں بھی ان کو ذکر الٰہی سے غافل نہ کر سکیں:

﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ (٢٤/ النور:٣٧)

''ایسے لوگ جن کو کاروبار اور خرید و فروخت کا شغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتا۔''

اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، غرض ہر حال میں ان کے اندر خدا کی یاد کے لیے بے قراری تھی:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ ﴾ (٣/ آل عمران:١٩١)

''جو خدا کو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے یاد کرتے ہیں۔''

راتوں کو جب غافل دنیا نیند کے خمار میں ہوتی، وہ بستروں سے اٹھ کر خدا کے سامنے سربسجود اور راز و نیاز میں مصروف ہوتے تھے:

﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ﴾ (٣٢/ السجدہ:١٦)

''جن کے پہلو (رات کو) خواب گاہوں سے علیحدہ رہتے ہیں، وہ خوف اور امید کے ساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔''

وہ جن کا یہ حال تھا کہ

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴾ (٧٧/ المرسلات:٤٨)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے آگے جھکو تو نہیں جھکتے۔''

اب ان کی یہ صورت ہوگئی کہ

﴿ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ﴾ (٤٨/ الفتح:٢٩)

''تم ان کو دیکھو گے کہ رکوع میں جھکے ہوئے اور سجدہ میں پڑے ہوئے خدا کے فضل اور خوشنودی کو تلاش کرتے ہیں۔''

وہ جن کے دلوں کی یہ کیفیت تھی کہ

﴿ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ﴾ (٣٩/ الزمر:٤٥)

''اور جب تنہا خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، مکدر ہو جاتے ہیں۔''

آفتاب نبوت کے پرتو نے ان مکدر آئینوں میں خشیت الٰہی کا جوہر پیدا کر دیا:

﴿ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ ﴾ (٨/ الانفال:٢ و ٢٢/ الحج:٣٥)

''وہ لوگ کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں۔''

یہ خود قرآن پاک کی شہادتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے عمل اور تعلیم نے عرب کی روحانی کائنات میں کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ وہ تمام لوگ جو حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے خواہ وہ کھیتی کرتے ہوں یا تجارت یا محنت مزدوری، مگر ان میں سے کوئی چیز ان کو خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی تھی، قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ (صحابہ) خرید و فروخت اور تجارت کرتے تھے۔ لیکن جب خدا کا کوئی معاملہ پیش آتا تھا تو یہ شغل و عمل ان کو یاد الٰہی سے غافل نہیں کرتا تھا، بلکہ وہ اس کو پوری طرح ادا کرتے تھے۔ [1] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ بازار میں تھے، نماز کی تکبیر ہوئی دیکھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے فوراً دکانیں بند کر دیں اور مسجد میں داخل ہو گئے۔ [2] صحابہ رضی اللہ عنہم تمام تر راتیں خدا کی یاد میں جاگ کر بسر کرتے تھے یہاں تک کہ مکہ معظمہ کی غیر مطمئن راتوں میں بھی وہ عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ خدا نے گواہی دی:

﴿ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ﴾ (٢٠/ المزمل:٢٠)

''بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تو دو تہائی رات کے قریب اور آدھی رات اور تہائی رات کے بعد اٹھتا ہے اور تیرے ساتھ ایک جماعت بھی اٹھ کر نماز پڑھتی ہے۔''

---

[1] صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب التجارة فی البز وغیره، رقم الباب: ٨ مرسلاً۔

[2] فتح الباری، ج ٤، ص: ٢٥٣ بحوالہ عبدالرزاق۔

اس زمانہ میں صحابہ کو راتوں کے سوا خدا کے یاد کرنے کا موقع کہاں ملتا تھا، جلوہ دیدار کے مشتاق دن بھر کے انتظار کے بعد رات کو کہیں کسی مخفی گوشہ میں جمع ہوتے تھے۔ ذوق وشوق سے اپنی پیشانی خدا کے سامنے زمین پر رکھ دیتے تھے۔ دیر تک سجدہ میں پڑے رہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ ان کے اس والہانہ انداز عبادت کو دیکھتے پھرتے تھے۔ قرآن پاک نے اس نظارہ کی کیفیت اپنے الفاظ میں اس طرح ادا کی ہے:

﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝ الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ ۝ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ ۝ ﴾

(۲۶/ الشعرآء:۲۱۷۔۲۱۹)

''اور اس غالب رحم والے پر بھروسہ کر جو رات کو جب تو نماز کے لیے اٹھتا ہے اور سجدہ میں پڑے رہنے والوں کے درمیان آنا جانا تیرا دیکھتا ہے۔''

مدینہ منورہ میں آکر سب سے پہلا فقرہ جو آپ کی زبان مبارک سے نکلا وہ یہ تھا:

((يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَأَفْشُوا السَّلَامَ وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ)) ❶

''اے لوگو! غریبوں کو کھانا کھلاؤ اور سلام کو پھیلاؤ اور نماز پڑھو جب لوگ سوتے ہوں۔''

بعض صحابہ نے اس حکم پر اس شدت سے عمل کیا کہ انہوں نے راتوں کا سونا چھوڑ دیا۔ آخر آنحضرت ﷺ کو ان لوگوں کو اعتدال اور میانہ روی کا حکم دینا پڑا۔ چنانچہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ رات بھر نماز میں مصروف رہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ''عثمان تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔'' ❷ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ صحابہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر نماز پڑھتے تھے اور بہت کم سوتے تھے۔ ❸ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رات کے تین حصے کر دیے تھے ایک میں خود نماز پڑھتے تھے دوسرے میں ان کی بیوی اور تیسرے میں ان کا غلام اور باری باری سے ایک دوسرے کو جگاتا تھا۔ ❹ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ ساری رات نماز پڑھا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو ان کو جا کر نصیحت فرمائی۔ ❺ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ صحابی کا بھی یہی حال تھا کہ وہ رات رات بھر نماز میں گزار دیتے تھے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ان کے اسلامی بھائی تھے، ایک شب وہ ان کے ہاں جا کر مہمان ہوئے جب رات کو حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ عبادت کے لیے اٹھنے لگے تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے منع کیا۔ پچھلے پہر جب سناٹا چھایا ہوا تھا حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ان کو جگایا کہ اب نماز کا وقت ہے۔ ❻ کوئی صحابی ایسا نہ تھا جس نے اسلام لانے کے بعد پھر ایک وقت کی بھی نماز عمداً قضا کی ہو یہاں تک کہ لڑائی اور خطرہ کی حالت میں بھی وہ اس فرض سے

---

❶ ترمذی، ابواب صفة القيامة: ٢٤٨٥۔ الفاظ قدرے مختلف ہیں۔ ❷ ابوداود، كتاب التطوع، باب ما يؤمر به من القصد في الصلوة: ١٣٦٩۔ ❸ ابوداود، كتاب التطوع، باب نسخ قيام الليل والتيسير فيه: ١٣٠٥۔
❹ صحيح بخاري، كتاب الاطعمة، باب: ٥٤٤١۔ ❺ صحيح بخاري، كتاب الصوم، باب حق الجسم في الصوم: ١٩٧٥۔ ❻ صحيح بخاري، كتاب الصوم، باب من اقسم على اخيه ليفطر في التطوع: ١٩٦٨۔

غافل نہیں رہتے تھے۔ایک صحابی کو آنحضرت ﷺ نے ایک پر خطر کام کے لیے کہیں بھیجا تھا۔جب وہ منزل مقصود کے قریب پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ان کو خوف تھا کہ اگر کہیں ٹھہر کر عصر پڑھنے کا اہتمام کیا جائے گا تو وقت نکل جائے گا اور اگر عصر میں تاخیر کی جائے تو حکم الٰہی کی تعمیل میں دیر ہو جائے گی اس مشکل کا حل انہوں نے اس طرح کیا کہ وہ اشاروں میں نماز پڑھتے جاتے اور چلتے جاتے تھے۔ (1) سخت سے سخت مجبوری کی حالت میں بھی نماز ان سے ترک نہیں ہوتی تھی۔چنانچہ بیماری کی حالت میں وہ دوسروں کا سہارا لے کر مسجد میں حاضر ہوتے تھے۔ (2) پھر وہ جس خضوع وخشوع ،محویت اور استغراق کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے اس کا نظارہ بڑا پر اثر ہوتا تھا۔چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو ان پر اس شدت سے رقت طاری ہوتی کہ کافر عورتوں اور بچوں تک پر بھی اس کا اثر ہوتا تھا۔ (3) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز میں اس زور سے روتے تھے کہ ان کے رونے کی آواز پچھلی صف تک جاتی تھی۔ (4) حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ ایک رات تہجد کے لیے کھڑے ہوئے تو صرف ایک آیت کی تلاوت میں صبح کر دی بار بار اس کو دہراتے تھے اور مزے لیتے تھے۔ (5)

؎ شب شود صبح و ہماں محو تماشا باشم

حضرت انس رضی اللہ عنہ قیام اور سجدہ میں اتنی دیر لگاتے تھے کہ لوگ سمجھتے کہ کچھ بھول گئے ہیں۔ (6) حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما جب نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو کئی کئی سورتیں پڑھ ڈالتے تھے اور اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ستون کھڑا ہے اور جب سجدہ میں جاتے تو اتنی دیر تک سجدہ کرتے تھے کہ حرم محترم کے کبوتر ایک سطح جامد سمجھ کر ان کی پیٹھ پر آکر بیٹھ جاتے تھے۔ (7) ایک رات میدان جنگ میں ایک پہاڑی پر دو صحابی پہرہ دینے کے لیے متعین ہوتے ہیں۔ایک صاحب سو جاتے ہیں اور دوسرے نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔دشمن ان کو تاک کر تیر مارتا ہے جو بدن میں ترازو ہو جاتا ہے کپڑے خون سے تر بتر ہو جاتے ہیں مگر نماز کا استغراق اسی طرح قائم رہتا ہے۔نماز تمام کر کے اپنے رفیق کو بیدار کرتے اور واقعہ سناتے ہیں۔ساتھی کہتے ہیں کہ تم نے اس وقت مجھے کیوں نہ جگایا جواب ملتا ہے میں نے ایک پیاری سورہ شروع کی تھی پسند نہ آیا کہ اس کو ختم کیے بغیر نماز توڑ دوں۔ (8) اس سے بھی زیادہ پُر اثر منظر یہ ہے کہ دشمنوں کی فوجیں مقابل کھڑی ہیں تیروں کا مینہ برس رہا ہے نیزوں اور تلواروں کی بجلیاں ہر طرف کوندرہی ہیں سر و گردن، دست و بازو کٹ کٹ کر گر رہے ہیں کہ دفعتاً نماز کا وقت آجاتا ہے فوراً جنگ کی صفیں نماز کی صفیں بن جاتی ہیں

---

(1) ابوداود، کتاب صلاۃ السفر، باب صلوۃ الطالب: ۱۲۴۹۔ (2) نسائی، کتاب الامامۃ، باب المحافظة علی الصلوات حدیث ینادی بھن: ۸۵۰۔ (3) صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب المسجد یکون فی الطریق من غیر ضرر الناس: ۴۷۶، باب ہجرۃ النبی ﷺ: ۳۹۰۵۔ (4) صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب اذا بکی الامام فی الصلوٰۃ، رقم الباب: ۷۰۔ (5) اسدالغابۃ تذکرۃ تمیم داری، ج۱، ص:۲۱۵۔ (6) صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب المکث بین السجدتین: ۸۲۱۔ (7) حالات عبداللہ بن زبیر اصابۃ، ج۴، ص: ۷۰ واسد الغابۃ: ج۳، ص: ۱۶۲ وغیرہ۔ (8) ابوداود، کتاب الطہارۃ، باب الوضوء من الدم: ۱۹۸۔

اور ایک اللہ اکبر کی آواز کے ساتھ موت وحیات سے بے پروا ہو کر گردنیں جھکنے اور اٹھنے لگتی ہیں۔ نور کا تڑکا ہے اسلام کے دائرہ کا مرکز فاروق اعظم رضی اللہ عنہ امامِ نماز ہے۔ پیچھے صحابہ کی صفیں قائم ہیں۔ دفعتاً ایک شقی خنجر بکف آگے بڑھتا ہے اور خلیفہ پر حملہ آور ہو کر شکم مبارک کو چاک چاک کر دیتا ہے۔ آپ غش کھا کر گر پڑتے ہیں خون کا فوارہ جاری ہو جاتا ہے یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر نماز کی صفیں اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نماز پڑھانے کو آگے بڑھتے ہیں پہلے صبح کا دوگانہ ادا ہو لیتا ہے تب خلیفہ، وقت کو اٹھایا جاتا ہے۔ [1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جس صبح کی نماز میں زخم لگا اس کے بعد کی صبح کو لوگوں نے ان کو نماز کے لیے جگایا تو بولے، ہاں جو شخص نماز چھوڑ دے اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ چنانچہ اسی حالت میں کہ زخم سے خون جاری تھا، آپ نے نماز پڑھی۔ [2]

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ صبح کی نماز کے لیے مسجد میں داخل ہوتے ہیں یا صبح کی نماز میں ہوتے ہیں [3] کہ ابن ملجم کی تلوار ان کو گھائل کر دیتی ہے اور کچھ دیر کے بعد وہ داعی اجل کو لبیک کہتے ہیں۔ امام مظلوم حسین بن علی رضی اللہ عنہما کربلا کے میدان میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ عزیزوں اور دوستوں کی لاشیں میدانِ جنگ میں نظر کے سامنے پڑی ہوتی ہیں، ہزاروں اشقیاء آپ کو نرغہ میں لیے ہوتے ہیں، اتنے میں ظہر کا وقت آ جاتا ہے، آپ دشمنوں سے اجازت چاہتے ہیں کہ وہ اتنا موقع دیں کہ آپ ظہر کی نماز ادا کر سکیں۔ [4] نماز میں جس خضوع اور خشوع کا حکم ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کے یہ نمونے پیش کیے کہ عزیز سے عزیز چیز بھی اگر ان کے اس روحانی ذوق وشوق میں خلل انداز ہوئی تو انہوں نے اس کو اس ذوق پر نثار کر دیا۔ حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے، ایک خوشنما چڑیا نے سامنے آ کر چہچہانا شروع کیا۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ دیر تک ادھر ادھر دیکھتے رہے، پھر جب نماز کا خیال آیا تو رکعت یاد نہ رہی دل میں کہا اس باغ نے یہ فتنہ برپا کیا یہ کہہ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا اور کہا کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ باغ راہ خدا میں نذر ہے۔ [5] اسی طرح ایک اور صحابی اپنے باغ میں نماز میں مشغول تھے۔ باغ اس وقت نہایت سرسبز وشاداب اور پھلوں سے لدا ہوا تھا پھلوں کی طرف نظر اٹھ گئی تو نماز یاد نہ رہی، جب اس کا خیال آیا تو دل میں نادم ہوئے کہ دنیا کے مال ودولت نے اپنی طرف متوجہ کر لیا، یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا دور تھا، ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یہ باغ جس نے مجھے فتنہ میں مبتلا کر دیا راہ خدا میں دیتا ہوں، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو بیت المال کی طرف سے بیچا تو ۵۰ ہزار میں فروخت ہوا۔ [6]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قصة اهل البیعة والاتفاق علی عثمان بن عفان: ۳۷۰۰۔
[2] مؤطا امام مالك، کتاب الطهارة، باب العمل فیمن غلب علیه الدم: ۸٤۔ [3] الریاض النضرة فی مناقب العشرة للمحب الطبری، ج ۲، ص: ۲٤٦ مصر۔ [4] تاریخ طبری کبیر، ج ۷، ص: ۳٤۷ واقعات ٦۱ ھ۔
[5] مؤطا امام مالك، کتاب الصلوٰة، باب النظر فی الصلاة الی مایشغلك عنها: ۲۲۲۔
[6] مؤطا امام مالك، ایضًا: ۲۲۳۔

زکوٰۃ

﴿ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۴۳)

زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم

نماز کے بعد جس کا اصل تعلق خالق و مخلوق کے باہمی سلسلہ اور رابطہ سے ہے اور جس کا ایک بڑا فائدہ نظام جماعت کا قیام ہے، اسلامی عبادت کا دوسرا رکن زکوٰۃ ہے، جو آپس میں انسانوں کے درمیان ہمدردی اور باہم ایک دوسرے کی امداد اور معاونت کا نام ہے اور جس کا اہم فائدہ نظام جماعت کے قیام کے لئے مالی سرمایہ بہم پہنچانا ہے۔ زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے، جس کا اطلاق تعمیم کے ساتھ ہر مالی اور جسمانی امداد اور نیکی پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن فقہی اصطلاح میں ''زکوٰۃ'' صرف اس مالی امداد کو کہتے ہیں جو ہر اس مسلمان پر واجب ہے جو دولت کی ایک مخصوص مقدار کا مالک ہو۔

زکوٰۃ گزشتہ مذاہب میں

زکوٰۃ بھی ان عبادات میں سے ہے جو تمام آسمانی مذاہب کے صحیفوں میں فرض بتائی گئی ہے، لیکن ان کے پیروؤں نے اس فرض کو اس حد تک بھلا دیا تھا کہ بظاہر ان کے مذہبی احکام کی فہرست میں اس کا نام بھی نظر نہیں آتا۔ حالانکہ قرآن پاک کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفوں سے ہوتی ہے کہ جس طرح نماز ہر مذہب کا جزو لاینفک تھی، اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جزو رہی ہے۔ بنی اسرائیل سے خدا کا جو عہد تھا اس میں نماز اور زکوٰۃ دونوں تھیں:

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۴۳)

''(ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا تھا) کہ کھڑی رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ۔''

﴿ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ ﴾ (۵/ المآئدۃ: ۱۲)

''(اے بنی اسرائیل) اگر تم کھڑی رکھتے نماز اور دیتے رہتے زکوٰۃ۔''

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذکر میں ہے:

﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۚ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴾ (۱۹/ مریم: ۵۴۔۵۵)

''اور قرآن میں اسماعیل کا ذکر کر، بے شک وہ عہد کا سچا تھا اور وہ خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر تھا اور وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتا تھا اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں:

﴿ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴾ (۱۹/ مریم: ۳۱)

''اور خدا نے مجھ کو زندگی بھر نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی تاکید کی ہے۔''

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر زمین کی پیداوار اور جانوروں میں ایک عشر یعنی دسواں حصہ (احبار ۲۷۔۳۰۔۳۲) نیز ہر بیس برس یا اس سے زیادہ عمر والے پر خواہ امیر ہو یا غریب آدھا مثقال دینا واجب تھا۔ (خروج ۳۰۔۱۳۔۱۵) ساتھ ہی غلہ کاٹتے وقت گرا پڑا اناج، کھلیان کی منتشر بالیں اور پھل والے درختوں میں کچھ پھل چھوڑ دیتے تھے جو مال کی زکوٰۃ تھی اور یہ عملاً ہر تیسرے سال واجب الادا ہوتی تھی۔ یہ رقم بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کی جاتی تھی، اس کا ساٹھواں حصہ مذہبی عہدہ دار پاتے تھے، دسواں حصہ حضرت ہارون کی اولاد (لاویین) قومی خاندانی کاہن ہونے کی حیثیت سے لیتی تھی اور ہر تیسرے سال میں دسواں حصہ بیت المقدس کے حاجیوں کی مہمانی کے لئے رکھا جاتا تھا۔ ❶ اسی مد سے عام مسافروں، غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کو روزانہ کھانا پکا کر تقسیم کیا جاتا تھا۔ ❷ اور نقد آدھے مثقال والی زکوٰۃ کی رقم جماعت کے خیمہ (یا مسجد بیت المقدس) اور قربانی کے ظروف و آلات کی خریداری کے خرچ کے لئے رہتی تھی۔ ❸

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شریعت موسوی کے ان ظاہری قواعد میں کوئی ترمیم نہیں کی، بلکہ ان کی روحانی کیفیت پر زیادہ زور دیا۔ انجیل لوقا ((۱۸۔۱۰) میں ہے کہ جو اپنا عشر (زکوٰۃ) ریا، نمائش اور فخر کے لئے دیتا ہے، اس سے وہ شخص بہتر ہے جو اپنے قصور پر نادم ہے۔ اسی انجیل کے ۲۱ ویں باب کی پہلی آیت میں ہے:

> ''اگر کوئی دولت مند ہیکل کے خزانہ میں اپنی زکوٰۃ کی بڑی رقم ڈالے اور اس کے مقابلہ میں کوئی غریب بیوہ خلوص دل سے دو دمڑی ڈالے تو اس کی زکوٰۃ کا رتبہ اس دولتمند کی زکوٰۃ سے کہیں بڑھ کر ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو ترغیب دی کہ جس کے پاس جو کچھ ہو وہ خدا کی راہ میں لٹا دے:

> ''کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزر جانا آسان ہے، مگر دولت مند کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے۔'' (متی ۱۹۔۲۴)

ساتھ ہی انہوں نے خود اپنی طرف سے نیز اپنے رفیق کی طرف سے اپنی ناداری کے باوجود آدھے مثقال والی زکوٰۃ ادا کی ہے۔ (متی ۱۷۔۲۴)

توراۃ کے زمانہ میں چونکہ دولت زیادہ تر صرف زمین کی پیداوار اور جانوروں کے گلوں تک محدود تھی اس لئے انہیں دونوں چیزوں کی زکوٰۃ کا زیادہ ذکر آیا ہے۔ سونا چاندی اور ان کے سکوں کی چونکہ قلت تھی، اس لئے ان کی زکوٰۃ کا ذکر ایک دو جگہ ہے۔ اسی بنا پر یہودیوں نے نقد زکوٰۃ کی اہمیت محسوس نہیں کی علاوہ بریں زکوٰۃ کی مدت کی تعیین کہ وہ ہر سال یا دوسرے یا تیسرے سال واجب الادا ہے۔ تصریحاً معلوم نہیں ہوتی، نیز

❶ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون ''خیرات'' (CHARITY) باب ''یہودیوں میں خیرات''۔

❷ توراۃ خروج ۳۰۔۱۶ العهد القديم، ص: ۱۳۷ و ۳۸۔۲۶، ص: ۱۵۳۔

❸ توراۃ خروج، ۳۰۔۱۶ العهد القديم، ص: ۱۳۷ و ۳۳۸۔۲۶، ص: ۱۵۳۔

یہ کہ اس زکوٰۃ کا مصرف کیا ہے یعنی وہ کہاں خرچ کی جائے، اس کی تفصیل بھی خود توراۃ کی زبان سے کم سنائی دیتی ہے۔

غرض وجوہ جو کچھ ہوں، مگر حالت یہ تھی کہ یہود نے اس فرض کو بھلا دیا تھا اور خصوصاً عرب میں جہاں کی دولت کے وہ تنہا مالک بن بیٹھے تھے، چند کے سوا اکثر کو اس فرض کا دھیان بھی نہ تھا، قرآن نے ان کو یاد دلایا کہ

﴿ وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۸۳)

''(اور تم بنی اسرائیل سے معاہدہ تھا کہ) نماز کھڑی رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا، پھر تم پھر گئے مگر تم میں سے تھوڑے اور تم دھیان نہیں دیتے۔''

عیسوی مذہب میں گو سب کچھ دینے کا حکم تھا، مگر یہ حکم ہر ایک کے لئے موزوں نہیں ہوسکتا تھا اور نہ ہر شخص اس پر عمل کرسکتا تھا، دوسرے مذہبوں میں بھی اگرچہ خیرات اور دان کرنے کے احکام موجود تھے، تاہم ان کے لئے کوئی نظام اور اصول مقرر نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہر شخص پر قانوناً کوئی رقم واجب الاداتھی جس کے ادا کرنے پر وہ مجبور ہوسکتا تھا۔

اسلام کی اس راہ میں تکمیل

محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت نے اس بارے میں بھی اپنا تکمیلی کارنامہ انجام دیا۔ اس نے نہایت خوبی اور دقتِ نظر کے ساتھ زکوٰۃ کا پورا نظام تیار کیا۔ انسان کے مالی کاروبار کا معیار عموماً سالانہ آمدنی سے قائم ہوتا ہے۔ اس لئے اسلام نے زکوٰۃ کی مدت سال بھر کے بعد مقرر کی اور ہر سال اس کا ادا کرنا ضروری قرار دیا۔ ساتھ ہی اس نے دولت کے تین سرچشمے قرار دیئے سونا چاندی اور جانور اور پیداوار اور ان میں سے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ شرحیں مقرر کیں۔ سونے چاندی میں سے چالیسواں حصہ اور پیداوار میں دسواں حصہ متعین کیا۔ جانوروں کی مختلف قسموں میں ان کی مختلف تعداد پر ان کی قدر و قیمت کی کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف شرحیں قرار دیں۔ پھر اس زکوٰۃ سے ہر قسم کے مصارف کی تعیین و تحدید کی اور اس کی تحصیل وصول اور جمع و خرچ کا کام بیت المال سے متعلق کیا۔

یہ تو اجمال تھا اب تفصیلی حیثیت سے ان میں سے ہر ایک پہلو پر شریعت محمدی ﷺ کی تکمیلی حیثیت کو نمایاں کرنا ہے۔

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت

اسلام کی تعلیم اور محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفۂ وحی میں نماز کے ساتھ ساتھ جو فریضہ سب سے اہم نظر آتا ہے، وہ زکوٰۃ ہے، نماز حقوق الٰہی میں سے ہے اور زکوٰۃ حقوق عباد میں سے، ان دونوں فریضوں کا باہم

لازم وملزوم اور مربوط ہونا اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ اسلام میں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق عباد کا بھی یکساں لحاظ رکھا گیا ہے۔ قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز کا ذکر ہے، اس سے متصل ہی ہمیشہ زکوٰۃ کا بھی بیان ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں بیس مقامات پر اقام الصلوۃ کے بعد ایتاء الزکوۃ آیا ہے۔ مثلاً:

﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (یا) ﴿اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾

اور زکوٰۃ ادا کرنے کی مدح یا اس کے دینے اور نہ دینے والوں کا تذکرہ اس کے علاوہ ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں زکوٰۃ کی کیا اہمیت ہے۔ بارگاہ نبوی میں آ کر جب کسی نے اسلام کے احکام دریافت کیے ہیں تو ہمیشہ آپ نے نماز کے بعد زکوٰۃ کو پہلا درجہ دیا ہے۔ صحیحین کی کتاب الایمان میں اس قسم کی متعدد حدیثیں ہیں جن میں یہ ترتیب ملحوظ رہی ہے، بلکہ کبھی کبھی وہ اسلام کے شرائط بیعت میں داخل کی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت تین باتوں پر کی تھی نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۔ [1] وفد عبدالقیس نے ۵ ھ میں نبوت کے آستانہ پر حاضر ہو کر جب اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو آپ ﷺ نے اعمال میں پہلے نماز پھر زکوٰۃ کو جگہ دی۔ [2]

۹ ھ میں جب آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو اسلام کا داعی بنا کر یمن بھیجا ہے تو اسلام کے مذہبی فرائض کی یہ ترتیب بتائی کہ پہلے ان کو توحید کی دعوت دینا، جب وہ یہ جان لیں تو ان کو بتانا کہ دن میں پانچ وقت کی نماز ان پر فرض ہے جب وہ نماز پڑھ لیں تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دی جائے گی۔ [3]

صحابہ رضی اللہ عنہم میں جو لوگ شریعت کے راز دان تھے وہ اس نکتہ سے اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جب اہل عرب نے بغاوت کی اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف تلوار کھینچ لی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ جو توحید کا قائل ہو اس کا خون روا نہیں، اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا خدا کی قسم! جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا، میں اس سے لڑوں گا کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، خدا کی قسم! جو رسول اللہ کے زمانہ میں بھیڑ کا ایک بچہ بھی دیتا تھا وہ اس کو دینا پڑے گا [4] حقیقت میں یہ ایک لطیف نکتہ تھا جس کو صرف شریعت کا محرم اسرار سمجھ سکتا تھا۔ [5] اس نے سمجھا اور امت کو سمجھایا اور سب نے اس کے سامنے اطاعت کی گردن جھکا دی۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الزکوۃ، باب البیعة علی ایتاء الزکوۃ: ۱۴۰۱۔ [2] ایضا، باب وجوب الزکوۃ: ۱۳۹۵۔ [3] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ماجاء فی دعاء النبی ﷺ امته الی توحید اللہ: ۷۳۷۲۔

[4] صحیح بخاری، کتاب الزکوۃ، باب وجوب الزکوۃ: ۱۳۹۹، ۱۴۰۰۔ [5] درحقیقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے طرز عمل کا ماخذ قرآن پاک کی یہ آیت تھی: ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ...... فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ﴾ (۹/ التوبہ۔۵) ''ان مشرکوں کو مارو جہاں پاؤ...... تو اگر وہ توبہ کریں اور نماز کھڑی کریں اور زکوۃ دیں تو ان کو آزادی دے دو۔'' نیز دیکھو صحیح بخاری، کتاب الاعتصام، باب قول اللہ امرھم شوریٰ بینھم ترجمة الباب: ۲۸۔

نماز اور زکوۃ کے باہمی ارتباط کی ایک اور وجہ بھی ہے اسلام کی تنظیمی زندگی صرف دو بنیادوں پر قائم ہے۔جن میں سے ایک روحانی اور دوسری مادی ہے۔اسلام کا نظام روحانی نماز باجماعت سے جو کسی مسجد میں ادا ہو، قائم ہوتا ہے اور نظام مادی زکوۃ سے جو کسی بیت المال میں جمع ہو کر تقسیم ہو، مرتب ہوتا ہے، اسی لئے یہ دونوں چیزیں اسلام میں ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں اور ان کی انفرادی حیثیت کے ساتھ ان کی اجتماعی حیثیت پر بھی شریعت محمدی ﷺ نے خاص زور دیا ہے۔نماز جس طرح جماعت اور مسجد کے بغیر بھی انجام پا جاتی ہے۔لیکن اپنی فرضیت کے بعض مقاصد سے دور ہو جاتی ہے۔اسی طرح زکوۃ بیت المال کی مجتمع صورت کے علاوہ بھی ادا ہو جاتی ہے۔مگر اس کی فرضیت کے بعض اہم مقاصد فوت ہو جاتے ہیں۔یہی سبب ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب بعض قبیلوں نے یہ کہا کہ وہ زکوۃ بیت المال میں داخل نہ کریں گے، بلکہ بطور خود اس کو صرف کر دیں گے تو شریعت محمدی ﷺ کے شناسائے راز نے ان کی اس تجویز کو قبول نہیں کیا اور بزور ان کو بیت المال میں زکوۃ داخل کرنے پر مجبور کیا کہ اگر ان کی یہ بات تسلیم کر لی جاتی تو اسلام کی وحدت کا سررشتہ اسی وقت پارہ پارہ اور مسلمانوں کی امامت و جماعت کا نظام اسی وقت درہم برہم ہو جاتا۔الغرض زکوۃ یا دوسرے الفاظ میں غریبوں کی چارہ گری، مسکینوں کی دست گیری، مسافروں کی امداد، یتیموں کی خبر گیری، بیواؤں کی نصرت، غلاموں اور قیدیوں کی اعانت نماز کے بعد اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے اور اس فریضہ کی یہ سب سے پہلی اہمیت ہے جو مذاہب کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔

زکوۃ کا آغاز اور تدریجی تکمیل

جس طرح عام نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا اور مدینہ آ کر وہ رفتہ رفتہ تکمیل کو پہنچی۔اسی طرح زکوۃ یعنی مطلق مالی خیرات کی ترغیب بھی ابتدائے اسلام ہی سے شروع ہوئی، لیکن اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا۔بعض مؤرخوں اور محدثوں کو اس بنا پر کہ ۸ ھ میں زکوۃ کی فرضیت کی تصریح ملتی ہے، اس سے پہلے کے واقعات میں جو زکوۃ کا لفظ آیا ہے، اس سے پریشانی ہوئی ہے۔حالانکہ شروع اسلام میں زکوۃ کا لفظ صرف خیرات کا مترادف تھا۔اس کی مقدار، نصاب، سال اور دوسری خصوصیتیں جو زکوۃ کی حقیقت میں داخل ہیں، وہ بعد کو رفتہ رفتہ مناسب حالات کے پیدا ہونے کے ساتھ تکمیل کو پہنچیں۔محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغام صرف دو لفظوں سے مرکب ہے۔خدا کا حق اور بھائیوں کا حق، پہلے لفظ کا مظہر اعظم نماز اور دوسرے کا زکوۃ ہے۔اس لئے محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت حق جب بلند ہوئی تو اس پکار کی ہر آواز ان ہی دو لفظوں کی تفصیل و تشریح تھی، آنحضرت ﷺ جس طرح بعثت سے پہلے غار حرا میں چھپ کر خدا کی یاد (نماز) میں مصروف رہتے تھے، اسی طرح بیکس اور لاچار انسانوں کی دستگیری (زکوۃ) بھی فرمایا کرتے تھے۔حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے بعثت کے وقت آپ ﷺ کی نسبت فرمایا، آپ قرابتداروں کا حق پورا کرتے

ہیں، قرضداروں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریب کو کما کر دیتے ہیں، مہمان کو کھلاتے ہیں، لوگوں کو مصیبتوں میں مدد دیتے ہیں۔ ❶ غور کرو، کیا زکوۃ انہیں فرائض کے مجموعہ کا نام نہیں ہے؟ اس بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ نماز اور زکوۃ توام ہیں اور ان ہی دو اجمالی حقیقتوں کی تشریح کا نام اسلام ہے۔ سورۂ مدثر اگرچہ وحی کی ابتدائی سورہ ہے، لیکن اس سرزمین میں وہ تمام بیج موجود ہیں، جن سے آگے چل کر رفتہ رفتہ احکام اسلامی کا عظیم الشان تناور درخت تیار ہوا۔ اس میں نماز کی تمام تفصیلات کو صرف ایک لفظ میں ادا کیا گیا ہے:

﴿ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴾ (۷۴/ المدثر:۳)

''اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر۔''

پروردگار کی بڑائی نماز کی روح ہے، جو اس سورہ میں موجود ہے، اس کے بعد ہے:

﴿ وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ ﴾ (۷۴/ المدثر:۶)

''اور بدلہ بہت چاہنے کے لئے کسی پر احسان نہ کر۔''

یہی وہ بیج ہے جس سے مسائل زکوۃ کے تمام برگ و بار پیدا ہوئے ہیں۔ مدثر کے بعد سورۂ مزمل اتری اس میں بہ تصریح دونوں حکم موجود ہیں اور زکوۃ کی کسی قدر تفصیل بھی کی گئی ہے:

﴿ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا ۚ ﴾ (۷۳/ المزمل:۲۰)

''اور نماز کھڑی کرو اور زکوۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دو اور جو تم آگے بھیجو گے اپنے واسطے اس کو خدا کے پاس بہتر اور ثواب میں زیادہ پاؤ گے۔''

بعثت کے پانچویں سال جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ وغیرہ ہجرت کر کے حبشہ گئے ہیں اور نجاشی نے اپنے دربار میں بلا کر ان سے اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات دریافت کی ہیں اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں جو تقریر کی ہے اس میں ہے: ''اور وہ پیغمبر ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں، روزے رکھیں اور زکوۃ دیں۔'' ❷ اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوۃ یا مالی خیرات کا آغاز اسلام کی ابتدا ہی میں ہو چکا تھا اور وفد عبدالقیس کے (جو تقریباً ۵ ھ میں آیا تھا) سوال کے جواب میں آپ نے جن احکام کی تعلیم دی، ان میں ایک زکوۃ بھی تھی۔ ❸ ۶ ھ میں جب نجاشی نے نامہ مبارک پہنچنے کے بعد ابوسفیان سے جو اس وقت تک کافر تھے اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو انہوں نے دوسری چیزوں کے ساتھ زکوۃ و صدقہ کا ❹ بھی تذکرہ کیا ان واقعات سے بخوبی واضح ہے کہ ۸ ھ سے پہلے بلکہ ہجرت سے بھی پہلے بعثت کے بعد ہی نماز کے ساتھ ساتھ زکوۃ کی تعلیم بھی موجود تھی۔ لیکن چونکہ محمد رسول اللہ ﷺ کا طریقہ تعلیم صرف نظریوں کا پیش کرنا نہ تھا بلکہ

---

❶ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی:۳۔ ❷ مسند احمد، ج ۱، ص: ۲۰۲۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الزکوۃ، باب وجوب الزکوۃ: ۱۳۹۸۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب التفسیر: ۴۵۵۳۔

امت کو عملاً اسلام کی تعلیمات پر کاربند بنانا تھا۔اس لئے حالات کے اقتضا اور مناسبت کے ساتھ ساتھ تعلیمات کے تفصیلی اجزاء اور ان کے متعلقہ احکام کی تشریح آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچائی گئی۔مکہ معظمہ میں مسلمانوں کی پریشانی، پراگندگی،شکستہ حالی اورغربت ومسکینی کی جو کیفیت تھی،اس کی بنا پر اتنا ہی ان کے لئے بہت تھا کہ وہ کسی یتیم ومسکین اور بھوکے کو کھانا کھلا دیں،چنانچہ اس زمانہ میں اسی قسم کے خیرات کی تعلیم دی گئی:

﴿ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ﴾ (۹۰/ البلد:۱۲۔۱۶)

''اورتو کیا سمجھا کہ وہ گھاٹی کیا ہے،کسی (قرض دار یا قیدی یا غلام) کی گردن چھڑانا یا بھوک کے دن میں ناتے کے کسی بن باپ کے بچہ کو یا خاک میں پڑے ہوئے کسی محتاج کو کھانا کھلانا،عام قریش پر جنھوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کی اس انسانی ہمدردی کی پکار کو نہیں سنا،عتاب آیا۔''

﴿ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ ﴾(۱۰۷/ الماعون: ۲۔۳)

''وہی ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے اور غریب کے کھلانے پر اپنے کو آمادہ نہیں کرتا۔''

﴿ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ ﴾ (فجر: ۱)

''یہ بات نہیں بلکہ بن باپ کے بچہ کی تم عزت نہیں کرتے اور آپس میں محتاج کے کھلانے کی تاکید نہیں کرتے۔''

اور مسلمانوں کے اخلاص،باہمی ہمدردی اور ان کے جذبہ ترحم کی تعریف فرمائی کہ

﴿ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ ﴾ (۷۶/ الدھر :۸۔۹)

''اور وہ (حاجت مند ہونے کے باوجود) محتاج،یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تم کو صرف خدا کے لیے کھلاتے ہیں،تم سے نہ بدلا چاہتے ہیں،نہ شکریہ۔''

مدینہ منورہ آکر جب مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان ہوا اور انہوں نے کچھ اپنا کاروبار شروع کیا تو روزہ کے ساتھ ساتھ ۲ھ میں صدقۃ الفطر واجب ہوا [1] یعنی یہ کہ سال میں ایک دفعہ عید کے دن نماز سے پہلے ہر مسلمان سیر سوا سیر غلہ خدا کی راہ میں خیرات کرے،تاکہ غریب ومحتاج بھی اپنی عید کا دن پیٹ بھر کر خوشی اور مسرت سے گزاریں۔اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کی گئی،انہوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ ﷺ! ہم کیا خیرات کریں؟

﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱۹)

---

[1] تاریخ طبری، ج۳، ص: ۱۲۸۱۔

''وہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خیرات کریں۔''

ارشاد ہوا:

﴿ قُلِ الْعَفْوَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱۹)

''کہہ دو (اے پیغمبر) کہ تمہاری ضرورت سے جو کچھ بچ رہے (اس کو خیرات کرو)۔''

یہ زکوٰۃ کی تعیین کی راہ میں اسلام کا پہلا قدم ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار ونصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ میں خیرات کردیں۔ آیندہ کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھیں۔ [1] کہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی حالت اسی کی مقتضی تھی، کچھ دنوں کے بعد جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں، زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں، تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم ہوا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۶۷)

''اے مسلمانو! اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں اور جو ہم تمہارے لئے زمین سے پیدا کریں اس میں سے کچھ خیرات میں دو۔''

مسلمانوں نے اس کی تعمیل کی تو خدا نے ان کی تعریف کی کہ

﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۳)

''اور ہم نے ان کو جو روزی دی ہے، اس میں سے وہ کچھ خرچ (خیرات) کرتے ہیں۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا کہ وہ بھی جن کے پاس کچھ نہ تھا خدا کی راہ میں کچھ نہ کچھ دینے کے لئے بے قرار رہتے تھے۔ چنانچہ جب یہ حکم ہوا کہ ہر مسلمان پر صدقہ دینا فرض ہے تو غریب ونادار صحابہ رضی اللہ عنہم نے آ کر عرض کی اے خدا کے رسول! جس کے پاس کچھ نہ ہو وہ کیا کرے؟ فرمایا: ''وہ محنت مزدوری کر کے اپنے ہاتھ سے پیدا کرے، خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی صدقہ دے۔'' انہوں نے پھر گزارش کی کہ جس میں اس کی بھی طاقت نہ ہو وہ کیا کرے؟ فرمایا کہ ''وہ فریاد خواہ حاجت مند کی مدد کرے۔'' انہوں نے پھر دریافت کیا کہ اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو؟ ارشاد ہوا: ''تو وہ نیکی کا کام کرے اور برائی سے بچے، یہی اس کا صدقہ ہے۔'' [2] آنحضرت ﷺ کی ان پر اثر تعلیمات اور نصیحتوں کا صحابہ پر یہ اثر ہوا کہ وہ اس غرض کے لئے بازار جا کر بوجھ اٹھاتے تھے اور اس سے جو کچھ ملتا تھا، اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے تھے۔ [3] لیکن

[1] كتاب الزكوٰة، باب ما ادي زكاته فليس بكنز: ١٤٠٤، مع فتح الباري، ج٣، ص: ٢١٦۔

[2] صحيح بخاري، كتاب الزكوٰة، باب على كل مسلم صدقة......: ١٤٤٥۔

[3] صحيح بخاري، كتاب الزكوٰة، باب اتقوا النار ولو بشق تمرة: ١٤١٥، ١٤١٦۔

بایں ہمہ اب تک تمام عرب اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع نہیں ہوا تھا اور اس لئے اس کا کوئی مرتب قومی نظام بھی قائم نہ تھا۔ رمضان ۸ ھ میں مکہ کی فتح نے تمام عرب کو ایک سررشتہ میں منسلک کر دیا اور اب وہ وقت آیا کہ اسلام اپنا خاص نظام قائم کرے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا ﴾ (۹/ التوبة: ۱۰۳)

''(اے محمد رسول اللہ ﷺ) ان کے مال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو کہ اس کے ذریعہ سے تم ان کو پاک وصاف کرسکو۔''

چنانچہ اس کے بعد نئے سال یعنی محرم ۹ ھ میں زکوٰۃ کے تمام احکام وقوانین مرتب ہوئے اس کی وصولی کے لئے تمام عرب میں محصلوں اور عاملوں کا تقرر ہوا۔ ❶ اور باقاعدہ ایک بیت المال کی صورت پیدا ہوئی۔ یہ تمام احکام وقوانین سورۂ براءت میں مذکور ہیں جو ۸ ھ کے آخر میں نازل ہوئی ہے۔

زکوٰۃ کی مدت کی تعیین

اسلام سے پہلے زکوٰۃ کی مدت کی تعیین میں بڑی افراط وتفریط تھی، توراۃ میں جو عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا گیا تھا، وہ تین سال میں ایک دفعہ واجب ہوتا تھا۔ (استثنا ۱۴۔ ۲۸) اور انجیل میں کسی مدت اور زمانہ کی تعیین ہی نہ تھی۔ اس بنا پر زکوٰۃ کی تنظیم کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز اس کی مدت کا تعین تھا کہ وہ نہ تو اس قدر قریب اور مختصر زمانہ میں واجب الادا ہو کہ انسان بار بار کے دینے سے اکتا جائے اور بجائے خوشی اور دلی رغبت کے اس کو ناگوار اور جبر معلوم ہو اور نہ اس قدر لمبی مدت ہو کہ غریبوں، مسکینوں اور قابل امداد لوگوں کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے طویل انتظار کی سخت تکلیف اٹھانی پڑے، اسلام نے اس معاملہ میں دنیا کے دوسرے مالی کاروبار کو دیکھ کر ایک سال کی مدت مقرر کی۔ کیوں کہ تمام متمدن دنیا نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے کاروبار کے لئے ۱۲ مہینوں کا سال مقرر کیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ آمدنی کا اصلی سرچشمہ زمین کی پیداوار ہے اور اس کے بعد اس پیداوار کی خود یا اس کی بدلی ہوئی شکلوں کی صنعتی صورت کا بنانا اور ان کا بیوپار کرنا ہے آمدنی کے ان تمام ذریعوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ سال کے مختلف موسم اور فصلیں، جاڑا، گرمی، برسات، ربیع اور خریف گزر جائیں، تاکہ پورے سال کے آمد وخرچ اور نفع ونقصان کی میزان لگ سکے اور زمیندار، کاشتکار، تاجر، نوکر، صناع، ہر ایک اپنی آمدنی وسرمایہ کا حساب کتاب کر کے اپنی مالی حالت کا اندازہ لگا سکے بڑے جانوروں کی پیدائش اور نسل کی افزائش میں بھی اوسطاً ایک سال لگتا ہے ❷ ان تمام وجوہات سے ہر منظم جماعت ہر حکومت اور ہر قومی نظام نے محصول اور ٹیکس وصول کرنے کی مدت ایک سال مقرر کی ہے۔ شریعت محمدی ﷺ نے بھی اس بارہ میں اسی طبعی اصول کا اتباع کیا ہے اور ایک سال کی مدت کی آمدنی

❶ ابن سعد؛ جلد مغازی، جز ثانی، قسم اول، ص: ۱۱۵ وتاریخ طبری، ج ٤، ص: ۱۷۲۲ مطبوعہ یورپ۔

❷ بکری کی مدت حمل چھ مہینے، گائے کی نو، اونٹ کی گیارہ اور بھینس کی بارہ مہینے ہے۔

پر ایک دفعہ اس نے زکوٰۃ کی رقم عائد کی ہے۔ چنانچہ اس کا کھلا ہوا ارشاد سورۂ توبہ میں موجود ہے، جس میں زکوٰۃ کے تمام احکام بیان ہوئے ہیں۔ زکوٰۃ کے بیان کے بعد ہی ہے:

﴿ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ﴾

(۹/ التوبة :۳۶)

''مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں، جس دن اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا۔''

زکوٰۃ کی مقدار

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں زکوٰۃ کی مقدار پیداوار کا دسواں حصہ تھا اور نقد میں آدھا مثقال جو امیر وغریب سب پر یکساں فرض تھا۔ لیکن زمین کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں، کہیں زمین صرف بارش سے سیراب ہوتی ہے اور کہیں نہر کے پانی سے جہاں مزدوری اور محنت کا اضافہ ہو جاتا ہے، نقد دولت کے بھی مختلف اصناف ہیں، بعض مرتبہ دولت بے محنت مفت ہاتھ آجاتی ہے اور بعض اوقات سخت محنت کرنی پڑتی ہے اس لئے سب کا یکساں حال نہیں ہو سکتا۔ انجیل نے حسب دستور اس مشکل کا کوئی حل نہیں کیا۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کاملہ نے علم اقتصاد سیاسی (پولیٹیکل اکانومی) کے نہایت صحیح اصول کے مطابق دولت کے فطری اور طبعی ذرائع کی تعیین کی اور ہر ایک کے لئے زکوٰۃ کی مناسب شرح مقرر کر دی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شریعت محمدیہ ﷺ نے توراۃ کی قانونی تعیین اور انجیل کی اخلاقی عدم تعیین، دونوں حقیقتوں کو اپنے نظام میں جمع کر لیا، اس نے اخلاقی طور پر ہر شخص کو اجازت دے دی کہ وہ اپنا کل مال یا نصف مال یا کم وبیش جو وہ چاہے خدا کی راہ میں دے دے، اس کا نام انفاق یا عام خیرات وصدقہ ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرض کر دیا کہ ہر شخص کی دولت میں غریبوں اور محتاجوں اور دوسرے نیک کاموں کے لئے بھی ایک مقررہ سالانہ حصہ ہے اور اس کا نام زکوٰۃ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:

﴿ اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ وَ الَّذِیْنَ فِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ۝ ﴾ (۷۰/ المعارج :۲۵)

''جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں اور جن کے مالوں میں مانگنے اور محروم کا معلوم حصہ ہے۔''

اس آیت سے صاف وصریح طریقہ سے یہ ثابت ہے کہ مسلمانوں کی دولت میں غریبوں کا جو حصہ ہے وہ متعین، مقرر، معلوم اور عملاً رائج ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں مَعْلُوْمٌ اور مَعْلُوْمَاتٌ کے الفاظ جہاں آئے ہیں، وہاں یہی مقصود ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ عرب میں جو قوم کسی نہ کسی طرح زکوٰۃ ادا کرتی تھی، اس کی جو شرح متعین اور رواج پذیر تھی، اس کو اسلام نے کسی قدر اصلاح کے بعد قبول کر لیا تھا۔ عرب میں اس قسم کی زکوٰۃ صرف بنی اسرائیل ادا کرتے تھے۔ جس کا حکم توراۃ میں مذکور ہے اور اس کی شرح بھی اس میں مقرر

ہے۔یعنی پیداوار میں دسواں حصہ اور نقد میں نصف مثقال۔آنحضرت ﷺ نے اپنی حکمت ربانی سے اجناس زکوٰۃ پر مختلف شرحیں مقرر فرمائیں، جو قیمت کے لحاظ سے اسی شرح معلوم کے مساوی ہیں اور ان شرحوں کو فرامین کی صورت میں لکھوا کر اپنے عمال کے پاس بھجوایا، یہی تحریری فرامین تدوین حدیث کے زمانہ تک بعینہٖ محفوظ تھے اور تدوین حدیث کے بعد ان کو بعینہٖ کتب حدیث میں درج کیا گیا جو آج تک موجود ہیں۔اس تمام تفصیل کا مخرج قرآن پاک میں بھی ایک حیثیت سے مذکور ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی دولت صرف اس کی محنت اور سرمایہ کی پیداوار ہے۔اس لئے اصول کا اقتضا یہ ہے کہ جس حد تک محنت اور سرمایہ کم لگتا ہو۔زکوٰۃ کی مقدار اسی قدر زیادہ رکھی جائے اور جیسے جیسے محنت بڑھتی اور سرمایہ کا اضافہ ہوتا جائے زکوٰۃ کی شرح کم ہوتی جائے،عرب میں یہ دستور تھا کہ قبیلوں کے سردار چوتھ وصول کرتے تھے۔اسی لئے وہ اپنے سرداروں کو مرباع (یعنی چوتھ والا) کہا کرتے تھے۔شاید دوسری پرانی قوموں میں بھی یہ دستور ہو۔ہندوستان میں مرہٹوں نے بھی چوتھ ہی کو رائج کیا تھا۔مگر چونکہ اسلام کو محکوموں اور سپاہیوں کے ساتھ زیادہ رعایت مدِّ نظر تھی۔اس لئے اس نے چار کو پانچ کر دیا۔اس طرح چوتھ (۱/۴) کے بجائے دولت کا پانچواں حصہ خدا اور رسول کا حصہ قرار پایا،جس کو رسول اور ان کے بعد ان کے نائب اپنی ذاتی ضروریات،اہل وعیال کے نان ونفقہ اور نادار مسلمانوں کی امداد یا حکومت اور جماعت کی کسی اور ضروری مد میں صرف کر سکیں۔

اس زکوٰۃ کا نام جو غنیمت کے مال پر عائد ہوتی ہے،خُمس ہے،قرآن نے کہا:

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ﴾ (۸/ الانفال:٤١)

''اور جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے اس کا پانچواں حصہ خدا کے لئے اور رسول کے لئے اور قرابت مندوں کے لئے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لئے ہے۔''

نکتہ

اس موقع پر ایک خاص بات سمجھنے کے لائق ہے،جہاد یا دشمنوں سے لڑائی کا اصلی مقصد دین کی حمایت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔غنیمت کا مال حاصل کرنا نہیں اور اگر کوئی صرف حصول غنیمت کی نیت سے دشمن سے لڑے،تو اس کی یہ لڑائی اسلام کی نگاہ میں جہاد نہ ہوگی اور نہ اس کا کوئی ثواب ملے گا۔اس کی طرف خود قرآن پاک میں اشارہ موجود ہے اور آنحضرت ﷺ نے بھی متعدد حدیثوں میں اس کی تشریح فرما دی ہے۔اس بنا پر درحقیقت وہ مال غنیمت جو لڑائی میں دشمنوں سے ہاتھ آتا ہے۔ایک ایسا سرمایہ ہے جو بلا قصد اور بلا محنت اتفاقاً مسلمانوں کو مل جاتا ہے،اس سے یہ نکتہ حل ہو جاتا ہے کہ جو سرمایہ کسی محنت کے بغیر اتفاقاً ہاتھ آئے اس

میں پانچواں حصہ نظام جماعت کا حق ہے یا حکومت کے مقررہ بالا مصارف کے لئے ہے۔ یہ اصول کہ جو سرمایہ بلا کسی محنت کے اتفاقاً کسی مسلمان کے ہاتھ آ جائے، اس میں سے پانچواں حصہ خدا اور رسول کا ہے تا کہ وہ جماعت کے مشترکہ مقاصد کے صرف میں آئے، وہی ہے جس کی بنا پر ''رکاز'' یعنی دفینہ میں جو کسی کو بلا محنت اتفاقاً غیب سے ہاتھ آ جائے خمس (یعنی پانچواں حصہ) جماعت کے بیت المال کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔

محنت اور سرمایہ سے جو دولت پیدا ہوتی ہے، اس میں سب سے پہلی چیز زمین کی پیداوار ہے۔ توراۃ نے ہر قسم کی پیداوار پر عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا تھا۔ شریعت محمدیہ نے نہایت نکتہ سنجی کے ساتھ پیداوار کی مختلف قسموں پر مختلف شرح زکوٰۃ کی تفصیل کی۔ سب سے پہلے پیداوار کے ان اصناف پر زکوٰۃ مقرر ہوئی جو کچھ زمانہ تک محفوظ رہ سکتے ہیں، تا کہ ان سے حسب منشا خانگی اور تجارتی فائدہ اٹھایا جا سکے اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو، اسی بنا پر سبزیوں اور ترکاریوں پر جو ایک دو روز سے زیادہ نہیں رہ سکتیں کوئی زکوٰۃ مقرر نہیں فرمائی گئی، اسی طرح اس مالیت پر جس میں نشو ونما اور ترقی کی صلاحیت نہیں، مثلاً: آلات، مکان، لباس، سامان، اسباب، سواری، قیمتی [1] پتھر ان پر بھی زکوٰۃ نہیں رکھی گئی، کچھ دنوں تک باقی رہنے والی اور نشو ونما پانے والی چیزیں چار ہیں زمین، جانور، سونا، چاندی یا ان کے سکے اور تجارتی مال، چنانچہ ان چاروں چیزوں پر زکوٰۃ مقرر ہوئی۔ زمین کی دو قسمیں کی گئیں ایک وہ جس کے جوتنے اور بونے کی محنت اور مزدوری کا خرچ گو کاشتکار کرتا ہے، مگر موسمی اور اقلیمی خصوصیت کی وجہ سے اس کے سیراب کرنے میں کاشتکار کی کسی بڑی محنت اور مزدوری کو دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی نمی اور شبنم سے آپ سے آپ سیراب ہوتی ہے، اس پر بلا محنت والی اتفاقی دولت سے آدھی زکوٰۃ یعنی عشر (۱\۱۰) مقرر کیا گیا۔ زمین کی دوسری قسم یعنی وہ جس کی سیرابی کاشتکار کی خاصی محنت اور مزدوری سے ہو۔ مثلاً: کنوئیں سے پانی نکال کر لانا یا نہر بنا کر پانی لانا، تو اس میں قسم اول سے بھی

---

[1] قیمتی پتھروں سے مراد جواہرات اور موتی وغیرہ ہیں، ان پر اس لئے زکوٰۃ نہیں ہے کہ اسلام نے ان کو صرف اسباب زینت قرار دیا ہے، فرمایا: ﴿حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا﴾ (۱۶/ النحل: ۱۴؛ ۳۵/ فاطر: ۱۲) ''زیور جن کو تم پہنتے ہو'' یہ ایسے ہی ہیں جیسے بعض فقہا کے نزدیک سونے چاندی کے استعمالی زیوروں پر زکوٰۃ نہیں کہ یہ بھی ان کے نزدیک اسباب زینت میں ہیں، اب اگر کوئی شخص ہزاروں اور لاکھوں روپے کے جواہرات جمع کر لے تو اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو تجارت کے لئے ہیں، تو ان پر مال تجارت کی حیثیت سے ان کی قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی دوسری یہ کہ کوئی بدنصیب زکوٰۃ سے بچنے کے لیے اپنی دولت کو جواہرات کی صورت میں منتقل کرتا ہے تو گو قانوناً اس سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی، لیکن دیانۃً وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت گناہ گار ہوگا اور تیسری صورت یہ ہے کہ وہ محض سامان تعیش اور فخر ومباہات کے لیے جمع کرتا ہے، تو اس کی حالت وہی ہوگی جو بیش قیمت لباسوں اور سامانوں کا ذخیرہ جمع کر لے اس کا شمار اسراف میں ہوگا اور اس پر وعید ہے۔ اصل یہ ہے کہ جواہرات کی قیمت کی گرانی نقدین (یعنی سونے چاندی) کی طرح طبعی نہیں ہے، بلکہ محض فرضی ہے، نہ وہ خود ضروریات زندگی میں ہیں، نہ ان سے ضروریات زندگی کا مبادلہ یا خریداری معمولاً کی جاتی ہے، چند دولت مندوں کی طلب اور مانگ نے ان کی فرضی قیمت بنا رکھی ہے، اگر ان جواہرات کی آب جاتی رہی یا وہ ٹوٹ جائیں یا ان میں بال پڑ جائے تو ان کی قیمت فوراً گر جائے گی، بخلاف سونے چاندی کے کہ ان کی قیمت کی گرانی طبعی اسباب سے ہے اور وہ ضروریات زندگی کے لیے زر مبادلہ ہے، وہ بھی ٹوٹ جائے یا میلا بھی ہو جائے تو بھی اس کی قیمت ہر حال میں باقی ہے، اسی لئے وہ معیار زر ہیں۔

نصف یعنی بیسواں حصہ (۱\۲۰) مقرر ہوا۔ نقدی سرمایہ جس کی ترقی ،حفاظت ،نشوونما اور افزائش میں انسان کو شب وروز کی سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور جس کی افزائش کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے اور جس میں ہر قدم پر چوری، گم شدگی ،لوٹ اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے، زمین کی دوسری قسم کا بھی آدھا یعنی چالیسواں (۱\۴۰) حصہ مقرر ہوا۔ ❶ (جانوروں کا ذکر آگے آتا ہے)۔

زمینی پیداوار اور نقد سرمایہ میں شرح زکوۃ کی کمی بیشی کی ایک دقیق اقتصادی علت اور بھی ہے، انسان کی اصلی ضرورت جس پر اس کا جینا منحصر ہے، صرف غذا ہے، زمین کے مالکوں کو یہ چیز براہ راست خود اپنی محنت سے حاصل ہوتی جاتی ہے اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت سے وہ بے پروا ہو جاتے ہیں، لیکن سونے چاندی کے مالکوں اور تاجروں کی جو دولت ہے، وہ براہ راست ان کی زندگی کی اصلی ضرورت کے کام میں نہیں آتی ، بلکہ مبادلہ اور خرید وفروخت کے ذریعہ سے وہ اس کو حاصل کرتے ہیں، وہ کاشتکاروں کی پیداوار کو خرید کر ان کو نقد روپے دیتے ہیں، جس سے ان کی دوسری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، پھر وہ اس پیداوار کو لے کر گاؤں گاؤں ،شہر شہر، ملک بملک پھرتے ہیں اور اس کی بھی اجرت ادا کرتے ہیں، نیز جو محنت زمین کی پیداوار حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے اس سے بدر جہا زیادہ نقد کے حصول میں صرف کرنی پڑتی ہے۔ سونا چاندی صدیوں کے فطری انقلابات کے بعد کہیں پیدا ہوتی ہے اور غلہ ہر سال اور سال کی ہر فصل میں انسان کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے سونا چاندی کی قیمت کا معیار غلہ سے گراں تر ہے، ایک اور بات یہ ہے کہ کاشتکار اور زمینوں کے مالک عموماً دیہاتوں میں رہتے اور شہروں سے دور ہوتے ہیں، نیز وہ عموماً سونا چاندی اور سکوں سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اس لئے نسبتاً وہ قومی ضروریات، دین کی مالی خدمات اور مستحقین کی امداد میں اس انفاق یعنی اخلاقی خیرات کی گرفت سے آزاد رہتے ہیں، جن کو عموماً نقد صورت میں دولت کے مالک اور تاجر پورا کیا کرتے ہیں، اس بنا پر بھی سخت ضرورت تھی کہ ان کے لئے قانونی خیرات کی شرح اہل زمین سے مختلف رکھی جائے۔ زکوۃ کی شرح مقدار کی تعیین میں اس خمس والی آیت سے ایک اور نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ خمس میں چونکہ امامت وحکومت کے تمام ذاتی وقومی مصارف شامل ہیں، اس لئے وہ کل کا خمس یعنی ۱\۵ مقرر ہوا اور زکوۃ کے مصارف جیسا کہ سورۂ توبہ رکوع ۸ میں مذکور ہیں صرف آٹھ ہیں، اس بنا پر ان آٹھ مصرفوں کے لئے مجموعی رقم چالیسواں حصہ رکھی گئی، پھر غور کیجئے کہ سونا چاندی کی شرح ۲۰۰ درم یا اس کے مماثل سونا ہے ان دوسو درہموں کو ۵ پر تقسیم کر دیجئے تو ۴۰ ہو جائے گا یہ کل زکوۃ کی شرحیں ۱\۵ و ۱\۱۰ و ۱\۲۰ و ۱\۴۰ ایک دوسرے کا نصف یا ایک دوسرے کا مضاعف ہوتی چلی گئی ہیں اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ یہ تقسیم وتحدید حساب اور اقتصادیات کے خاص اصول پر مبنی ہے۔

جانوروں پر زکوۃ

توراۃ میں ہر قسم کے جانوروں میں دسواں حصہ زکوۃ کا تھا۔ ❷ لیکن چونکہ ہر قسم کے جانوروں میں

❶ یہ نکتہ حافظ ابن القیم نے زاد المعاد، ج۱ص:۱۵۲ میں بیان کیا ہے۔ ❷ احبار: ۲۷۔ ۳۳؛ العهد القديم، ص: ۲۰۵۔

نسل کی افزائش کی صلاحیت اور مدت افزائش (زمانہ حمل) یکساں نہیں ہوتی، نیز جانوروں میں دسویں بیسویں کا حصہ، مشاع ہر تعداد پر چسپاں نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ان میں دسویں بیسویں کے بجائے تعداد کے تعین کی ضرورت تھی۔ شریعتِ محمدیہ نے اس نقص کو پورا کیا۔ چنانچہ اسی پہلے اصول (پیدائش اور افزائش کی مدت کیفیت اور کمیت) کی بنا پر اولاً بے نسل یا کم نسل کے جانوروں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا۔ مثلاً خچر گھوڑے [1] پر کوئی زکوٰۃ نہیں، دوسرے جانوروں کی مالیت اور قوت و کیفیت افزائش کے لحاظ سے حسب ذیل شرح معین ہوئی، یہ وہ شرح نامہ ہے، جو خود آنحضرت ﷺ نے اپنی حکمت ربانی سے فیصلہ فرما کر طے کیا اور زبانی نہیں، بلکہ فرامین کی صورت میں لکھوا کر عمال کو عنایت فرمایا تھا اور خلفائے راشدین نے اسی کی نقلیں حدود حکومت میں بھجوائیں اور جس کی تعمیل آج تک برابر بلا اختلاف ہوتی آئی ہے:

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ	نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	ایک سے چار تک	کچھ نہیں	اونٹ	۲۰ سے ۲۴ تک	چار بکریاں
اونٹ	۵ سے ۹ تک	ایک بکری	//	۲۵ سے ۳۵ تک	اونٹ کا ایک سال کا بچہ
//	۱۰ سے ۱۴ تک	دو بکریاں	//	۳۶ سے ۴۵ تک	اونٹ کا دو سالہ بچہ
//	۱۵ سے ۱۹ تک	تین بکریاں	//	۴۶ سے ۶۰ تک	اونٹ کا تین سالہ بچہ
	۶۱ سے ۷۵ تک	چار سال کا اونٹ کا بچہ			
	۷۶ سے ۹۰ تک	دو سال کے دو بچے			
	۹۱ سے ۱۲۰ تک	تین سال کے دو بچے	گائے، بیل، بھینس	ایک سے ۲۹ تک	کچھ نہیں
	۱۲۰ کے بعد ہر چالیس پر	دو سال کا ایک بچہ	//	۳۰ تک	ایک دو سالہ بچھڑا [2]
	اور ہر پچاس پر	تین سال کا ایک بچہ	//	۴۰ تک	تین سال کا ایک بچھڑا [3]
بکری	ایک سے ۳۹ تک	کچھ نہیں	//	۶۰ تک	دو سال کے دو بچھڑے
	۴۰ سے ۱۲۰ تک	ایک بکری	//	۷۰ تک	ایک تین سال اور ایک دو سال کا بچھڑا
	۱۲۱ سے ۲۰۰ تک	دو بکریاں	//	۸۰ تک	تین سال کے دو بچھڑے
	۲۰۰ سے ۳۰۰ تک	تین بکریاں	//	۹۰ تک	تین سال کے تین

[1] حنفیہ کے نزدیک خیل متناسلہ اور تجارت کے گھوڑوں میں زکوٰۃ ہے، سواری اور جہاد کے گھوڑوں میں نہیں۔

[2] یعنی جس کا دوسرا سال شروع ہو۔ [3] جس کا تیسرا سال شروع ہو۔

	پھر ہر سو پر	ایک ایک بکری	//	۱۰۰ تک	دو سال کے دو اور تین سال کا ایک
			//	پھر ہر دس پر	ایک دو سالہ

غرض اصول یہ ہے کہ ہر تیس بننے والے عدد پر ایک دو سالہ اور ہر چالیس بننے والے عدد پر ایک سہ سالہ۔

نصاب مال کی تعیین

شرح زکوٰۃ کے تعین کے سلسلہ میں شرائع سابقہ میں ایک اور کمی تھی، جس کی تکمیل محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت نے کر دی، جن دوسری شریعتوں میں قانونی خیرات کی تعیین ہے۔ ان میں امیر وغریب اور کم اور زیادہ دولت والوں کی تفریق نہیں کی گئی تھی۔ مثلاً: اگر دس بیس روپے والوں یا دس پانچ گائے اور بکری والوں سے یہ زکوٰۃ وصول کی جاتی تو ان پر ظلم ہوتا، توراۃ میں غلہ اور مویشی پر جو عشر اور نقد پر جو آدھا مثقال مقرر کیا گیا ہے، اس میں اس کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ آدھے مثقال کی زکوٰۃ میں تو یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ

"خداوند کے لئے نذر کرتے وقت آدھے مثقال سے امیر زیادہ نہ دے اور غریب کم نہ دے"۔ (خروج ۳۰۔۱۵)

لیکن شریعت محمدی ﷺ نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا اور غریبوں، ناداروں، مقروضوں اور ان غلاموں کو جو سرمایہ نہیں رکھتے یا اپنی آزادی کے لئے سرمایہ جمع کر رہے ہیں، اس سے بالکل مستثنیٰ کر دیا، نیز دولت کی کم مقدار رکھنے والوں پر بھی ان کی اپنی حسب خواہش اخلاقی خیرات کے علاوہ کوئی باقاعدہ زکوٰۃ عائد نہیں کی اور کم مقدار کی دولت کا معیار بھی اس نے خود مقرر کر دیا۔ سونے کی زکوٰۃ وہی آدھا مثقال رکھا، لیکن بتا دیا کہ یہ آدھا مثقال اسی سے لیا جائے گا جو کم از کم پانچ اوقیہ یعنی بیس مثقال [1] سونے کا مالک ہو اور ۵ اوقیہ یعنی ۲۰ مثقال سونے کی متوسط قیمت دو سو درہم چاندی کے سکے ہیں یعنی ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہے۔ [2] وہ کم سے کم معیار دولت جس پر زکوٰۃ نہیں حسب ذیل ہے:

نام	اس تعداد سے کم پر زکوٰۃ نہیں
غلہ اور پھل	پانچ وسق [3] سے کم پر زکوٰۃ نہیں
اونٹ	پانچ عدد
گائے، بیل، بھینس	۳۰ عدد
بھیڑ، بکری	۴۰ عدد

[1] موجودہ انگریزی حساب سے بیس مثقال سونا ساڑھے سات تولہ کے اور دو سو درہم چاندی ۵۲ روپے تولے کے برابر ہے۔ مگر یہ کتاب کی تصنیف کے وقت انگریزی دور کے لحاظ سے ہے۔ اب ایک تولہ یعنی انگریزی سکہ تقریباً سو روپے کے برابر ہے اس فرق کو ملحوظ رکھا جائے۔

[2] سنن ابی داود، کتاب الزکوۃ، باب من یعطی من الصدقة وحد الغنی: ۱۶۲۸۔

[3] ایک وسق وہ بوجھ ہے جس کو عادتاً ایک اونٹ اٹھا سکتا ہو۔

سونا	پانچ اوقیہ (بیس مثقال) سے کم پر زکوٰۃ نہیں
چاندی	۲۰۰ درہم سے کم پر زکوٰۃ نہیں

اس معیار سے امیر و غریب کی سطحوں میں جو یکساں زکوٰۃ کی ناہمواری تھی، وہ دور ہوگئی اور جو غریب خود زکوٰۃ کے مستحق تھے، وہ اس قومی محصول سے بری ہو گئے۔ ان مذکورہ بالا اشیاء کی تعداد جنسیت کے اختلاف کی وجہ سے گو مختلف ہے۔ مگر مالی اعتبار سے وہ ایک ہی معیار پر مبنی ہیں۔ پانچ وسق غلہ، دوسو درہم چاندی اور پانچ اوقیہ سونا درحقیقت ایک ہی معیار ہے۔ ایک اوقیہ جیسا کہ معلوم ہو چکا چالیس درہم کے برابر ہے۔ اس بنا پر پانچ اوقیہ اور دوسو درہم برابر ہیں۔ اسی طرح ایک وسق غلہ کی قیمت اس زمانہ میں چالیس [1] درہم یا ۴ مثقال تھی یعنی پانچ اوقیہ اور پانچ وسق کی قیمت وہی دوسو درہم یا ۲۰ مثقال ہوگی۔

زکوٰۃ کے مصارف اور ان میں اصلاحات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں تین قسم کی زکوٰۃ تھی، ایک آدھے مثقال سونے چاندی کی یہ رقم جماعت کے خیمہ یا پھر بیت المقدس کی تعمیر و مرمت اور قربانی کے طلائی و نقرئی ظروف و سامان کے بنانے میں خرچ کی جاتی تھی۔ (خروج ۳۰۔۱۳) دوسری خیرات یہ تھی کہ کھیت کاٹتے اور پھل توڑتے وقت حکم تھا کہ جا بجا کونوں اور گوشوں میں کچھ دانے اور پھل چھوڑ دیئے جائیں وہ غریبوں اور مسافروں کا حصہ تھا۔ (احبار ۱۹۔ ۱۰) اور سوم یہ تھی کہ ہر تیسرے سال کے بعد پیداوار اور جانوروں کا دسواں حصہ خدا کے نام پر نکالا جائے، اس کے مصارف یہ تھے کہ دینے والا مع اہل و عیال کے بیت المقدس جا کر جشن منائے اور کھائے اور کھلائے اور لادیوں میں، جو موروثی کاہن اور خدا کے گھر کے خدمت گزار ہیں، نام بنام تقسیم کیا جائے (اس کے بدلے میں وہ خاندانی وراثت سے محروم رکھے گئے تھے) اس کے بعد یہ چیزیں بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کر دی جاتی تھیں کہ ان سے مسافروں یتیموں اور بیواؤں کو کھانا کھلایا جائے۔ (استثناء ۱۴۔ ۲۶ سے ۲۹ تک)

شریعت محمدیہ نے مذہب کی حقیقت میں سب سے بڑی جو اصلاح کی:

1. وہ عبادت میں خدا اور بندہ کے درمیان سے واسطوں کا حذف کرنا تھا، یہاں ہر شخص اپنا آپ امام اور کاہن ہے۔ اس بنا پر مفت خور کاہنوں اور عبادت گاہوں کے خادموں کی ضرورت ساقط ہوگئی اور اس لئے زکوٰۃ کا یہ مصرف جو قطعاً بیکار تھا کلیتہً اڑ گیا۔
2. عبادت میں سادگی پیدا کر کے ظاہری رسموں اور نمائشوں سے اس کو پاک کر دیا گیا، اس لئے سونے چاندی کے سامانوں، قربانی کے برتنوں اور محرابوں کے طلائی شمع دانوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔
3. حج ان ہی پر واجب کیا گیا جن کے پاس زادراہ ہو، اس لئے ہر شخص کو خواہ مخواہ بیت اللہ جانے کی حاجت نہ رہی اور اس لئے یہ رقم بھی خارج ہوگئی۔

---

[1] هداية، باب الزكوة في التجارة، فصل في العروض، ج ۱، ص: ۸۰۔

4 زکوٰۃ کی چیز کو مالک کی ذاتی ضروریات اور کھانے میں صرف ہونے کی ممانعت کر دی گئی کہ اگر وہ مالک ہی کے ضروریات میں خرچ ہوگئی تو اس میں ایثار کیا ہوا۔

5 اس طرح وہ تمام سامان اور رقمیں جو ان مدوں سے بچیں غریبوں، مسکینوں اور مسافروں وغیرہ کو دے دی گئیں۔

گزشتہ اصلاحات کے علاوہ شریعت محمدیہ نے زکوٰۃ کے سلسلہ میں بعض اور اصلاحیں بھی کی ہیں مثلاً:

6 شریعت سابقہ میں ایک بڑی تنگی یہ تھی کہ زکوٰۃ خود مستحقین کے حوالہ نہیں کی جاتی تھی۔ بلکہ ذخیرہ میں جمع ہو کر اس کا کھانا پک کر غربا میں تقسیم ہوتا تھا، لیکن عام انسانی ضرورتیں صرف کھانے تک محدود نہیں ہیں۔ اس لئے شریعت محمدیہ نے اس رسم میں یہ اصلاح کی کہ غلہ یا رقم خود مستحقین کو دے دی جائے، تا کہ وہ جس طرح چاہیں اپنی ضروریات میں صرف کریں۔

7 ایک بڑی کمی یہ تھی کہ نقد زکوٰۃ جو آدھے مثقال والی تھی، وہ بیت المقدس کے خرچ کیلئے مخصوص تھی، اس کے علاوہ کوئی دوسری نقد زکوٰۃ نہ تھی۔ شریعت محمدیہ نے بیس مثقال پر آدھا مثقال نقد زکوٰۃ فرض کر کے اس کو بھی تمام تر مستحقین کے ہاتھوں میں دے دیا۔

8 غلہ کی صورت یہ تھی کہ سارے کا سارا بیت المقدس چلا جاتا تھا اور وہیں سے وہ پکوا کر تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہ انتظام بنی اسرائیل کی ایک چھوٹی سی قوم کے لئے تو شاید موزوں ہوسکتا ہو، مگر ایک عالمگیر مذہب کے تمام عالم میں منتشر پیروؤں کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ اسی مقام کے مستحقین میں صرف کی جائے۔

9 بعض منافقین اور دیہاتی بدوؤں کی یہ حالت تھی کہ وہ اس قسم کے صدقات کی لالچ کرتے تھے۔ جب تک ان کو امداد ملتی رہتی خوش اور مطمئن رہتے اور جب نہ ملتی تو طعن وطنز کرنے لگتے۔ اسلام نے ایسے لوگوں کا منہ بند کرنے اور ان کی مفت خوری کی عادتِ بد کی اصلاح کے لئے زکوٰۃ کے جملہ مصارف کی تعیین کر دی اور بتا دیا کہ اس کے مستحق کون لوگ ہیں اور اس رقم سے کس کس کو مدد دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ سورۂ توبہ کے ساتویں رکوع میں اس کا مفصل ذکر ہے۔

10 اگر زکوٰۃ کے مصارف کی تعیین نہ کی جاتی اور اس کے مستحقین کے اوصاف نہ بتا دیئے جاتے تو یہ تمام سرمایہ خلفا اور سلاطین کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتا اور سلطنت کی دوسری آمدنیوں کی طرح یہ بھی ان کے عیش وعشرت کے پرتکلف سامانوں کے نذر ہو جاتا، اس لئے تاکید کر دی گئی کہ جو غیر مستحق اس کو لے گا، اس کے لئے یہ حرام ہے اور جو شخص کسی غیر مستحق کو اپنی زکوٰۃ جان بوجھ کر دے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اسی بندش کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں زکوٰۃ تا بامکان اب تک صحیح مصارف میں خرچ ہوتی ہے۔

11 اس قسم کی مالی رقوم جب کوئی اپنے پیرووں پر عائد کرتا ہے تو اس کی نہایت قوی بدگمانی ہو سکتی ہے کہ وہ اس طرح اپنے اور اپنے خاندان کے لئے ایک دائمی آمدنی کا سلسلہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ حضرت موسیٰ کی شریعت میں زکوٰۃ کا مستحق حضرت ہارون اور ان کی اولاد (بنولادی) کو ٹھہرایا گیا تھا کہ وہ خاندانی کاہن مقرر ہوئے تھے۔ مگر آنحضرت ﷺ نے اس قسم کی بدگمانیوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور اپنے خاندان کے لئے قیامت تک زکوٰۃ کی ہر مد قطعی طور پر حرام قرار دی۔

12 قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف قرار دیئے گئے:

﴿ إِنَّمَا الصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَٰكِينِ وَالْعَٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَٰرِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ ﴾

(۹/ التوبہ:۶۰)

”زکوٰۃ کا مال تو غریبوں مسکینوں اور زکوٰۃ کے صیغہ میں کام کرنے والوں اور ان لوگوں کے لئے ہے جن کے دلوں کو اسلام کی طرف ملانا ہے اور گردن چھڑانے میں جو تاوان بھریں، ان میں اور خدا کی راہ میں اور مسافر کے بارہ میں یہ خدا کی طرف سے ٹھہرایا ہوا ہے اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ (اس لئے اس کی یہ تقسیم علم و حکمت پر مبنی ہے)۔“

فقرا میں ان خوددار اور مستور الحال شرفا، کو ترجیح دی ہے جو دین اور مسلمانوں کے کسی کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے کوئی نوکری چاکری یا بیوپار نہیں کر سکتے اور حاجت مند ہونے کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور اپنی آبرو اور خودداری کو ہر حال میں قائم رکھتے ہیں، چنانچہ فرمایا:

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُم بِسِيمَٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا ۗ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۳)

”ان مفلسوں کو دینا ہے جو اللہ کی راہ میں اٹک رہے ہیں اور زمین میں (روزی حاصل کرنے کے لئے) چل پھر نہیں سکتے، ناواقف ان کے نہ مانگنے کی وجہ سے ان کو بے احتیاج سمجھتے ہیں، تم ان کو ان کے چہرہ سے پہچانتے ہو کہ وہ حاجتمند ہیں وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔“

تمام مستحقین کو درجہ بدرجہ ان کی اہمیت اور اپنے تعلق کے لحاظ سے دینا چاہیے، چنانچہ اسی سورہ میں فرمایا:

﴿ وَءَاتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِۦ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَٰمَىٰ وَالْمَسَٰكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّآئِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

”اور جس نے خدا کی محبت پر (یا مال کی محبت کے باوجود) قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں اور (غلاموں یا مقروضوں کی) گردن چھڑانے میں مال دیا۔“

اس کے تین چار رکوع کے بعد ہے۔

﴿ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ ﴾

(۲/ البقرہ: ۲۱۵)

''کہو جو تم مال خرچ کرو، وہ اپنے ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے۔''

ضرورت مندوں میں ترجیح

اسلام سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ قرابت مندوں اور رشتہ داروں کے دینے سے اجنبی بیگانہ اور بے تعلق لوگوں کو دینا زیادہ ثواب کا کام ہے اور اس کی وجہ یہ سمجھی جاتی تھی کہ اپنے لوگوں کے دینے میں کچھ نہ کچھ نفسانیت کا اور ایک حیثیت سے خود غرضی کا شائبہ ہوتا ہے، کیوں کہ وہ اپنے ہی رشتہ دار ہیں اور ان کا نفع و نقصان اپنا ہی نفع و نقصان ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کا اخلاقی مغالطہ اور فریب تھا۔ ایک انسان پر دوسرے انسان کے جو حقوق ہیں، وہ تمام تر تعلقات کی کمی وبیشی پر مبنی ہیں۔ جو جتنا قریب ہے اتنا ہی زیادہ آپ کے حقوق اس پر اور اس کے حقوق آپ پر ہیں، اگر یہ نہ ہو تو رشتہ داری اور قرابت مندی کے فطری تعلقات بالکل لغو اور مہمل ہو جائیں، انسان پر سب سے پہلے اس کا اپنا حق ہے۔ پھر اہل وعیال کا، ان کے جائز حقوق ادا کرنے کے بعد اگر سال میں کچھ بچ رہے تو اس میں حصہ پانے کے سب سے زیادہ مستحق قرابت دار ہیں۔ چنانچہ وراثت اور ترکہ کی تقسیم میں اس اصول کی رعایت کی گئی ہے۔

یہ سمجھنا بھی کہ اگر قرابت داروں کو ترجیح دی جائے تو دوسرے غریبوں کا حق کون ادا کرے گا، ایک قسم کا مغالطہ ہے، دنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی کا رشتہ دار ضرور ہے، اس بنا پر اگر ہر شخص اپنے رشتہ داروں کی خبر گیری کرے تو کل انسانوں کی خبر گیری ہو جائے گی، اس کے علاوہ اس مقام پر ایک اور غلط فہمی بھی ہے، جس کو دور ہو جانا چاہیے، مستحقین میں باہم ایک کو دوسرے پر جو فوقیت ہے، اس کا مدار دو چیزوں پر ہے، ایک تو دینے والوں سے ان اشخاص کے قرب وبعد کی نسبت، دوسرے ان اشخاص کو حاجتوں اور ضرورتوں کی کمی وبیشی، قرابت مندوں کی ترجیح کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خواہ ان کی ضرورت کتنی ہی کم اور معمولی ہو ان کو ان لوگوں پر ترجیح ہے جن کی ضرورت اور حاجتمندی ان سے کہیں زیادہ ہے، بلکہ مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ اگر دو ضرورت مند برابر کے حاجت مند ہوں اور ان میں سے ایک آپ کا عزیز یا دوست یا ہمسایہ ہو تو وہ آپ کی امداد کا زیادہ مستحق ہو گا۔ یعنی ضرورت اور حاجت کی مساوات کے بعد تعلقات کی کمی وبیشی ترجیح کا دوسرا سبب بنے گی نہ کہ پہلا سبب؟ اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ ایسی حالت میں وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو ترجیح دے۔ فقرا اور مساکین میں سے ان لوگوں پر جو بے حیائی کے ساتھ دربدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں، ان کو ترجیح دی گئی ہے جو

فقروفاقہ کی ہر قسم کی تکلیف گوارا کرتے ہیں، لیکن اپنی عزت وآبرو اور خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے ہیں۔ یہ تعلیم خود قرآن پاک نے دی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا نیز آنحضرت ﷺ نے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''مسکین وہ نہیں ہے جس کو ایک دو لقمے در بدر پھرایا کرتے ہیں۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا پھر کون مسکین ہے؟ ارشاد ہوا: ''وہ جس کو حاجت ہے لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا اور وہ کسی سے مانگتا نہیں۔'' [1] اس تعلیم کے دو مقصد ہیں، ایک تو یہ کہ ان بھیک مانگنے والوں کو تو کوئی نہ کوئی دے ہی دے گا اور وہ کہیں نہ کہیں سے پا ہی جائیں گے، اس لئے ان کی طرف اس قدر اعتنا ضروری نہیں، اصلی توجہ ان مستور الحال مسکینوں کی طرف ہونی چاہیے جو صبر وقناعت کے ساتھ فقروفاقہ کی تکلیف برداشت کررہے ہیں کہ ان کی خبر اکثریت کو نہیں ہوسکتی اور اکثر وہ امداد سے محروم رہ جاتے ہیں دوسرا مقصد یہ ہے کہ شریعت اپنی تعلیم اور عمل سے یہ ثابت کردے کہ بے حیا گداگروں کی عزت اس کی نگاہ میں نہایت کم ہے اور وہ ہر حال میں اس بے حیائی کو ناپسند کرتی ہے۔ شریعت نے مصارف زکوٰۃ کی تعیین و تحدید اس غرض سے بھی کی ہے، تاکہ ہر شخص کو مانگنے کی ہمت نہ ہو اور ہر کس و ناکس اس کو اپنی آمدنی کا ایک آسان ذریعہ نہ سمجھ لے۔ جیسا کہ بعض منافقین اور اہل بادیہ نے اس کو اپنے ایمان واسلام کی قیمت سمجھ رکھا تھا۔ چنانچہ وحی الٰہی نے ان کی پردہ دری ان الفاظ میں کی:

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ ﴾ (۹/ التوبۃ: ۵۸۔۶۰)

''اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جو تجھ کو (پیغمبر کو) زکوٰۃ بانٹنے میں طعن دیتے ہیں، اگر ان کو اس میں سے ملے تو راضی ہوں اور اگر نہ ملے تو وہ ناخوش ہوجائیں اور کیا خوب تھا اگر وہ اس پر راضی رہتے جو خدا اور اس کے رسول نے ان کو دیا اور کہتے کہ ہم کو اللہ بس ہے، ان کو اللہ اپنی مہربانی سے اور اس کا رسول دیں گے، ہم کو تو خدا ہی چاہیے، زکوٰۃ تو حق ہے غریبوں کا، مسکینوں کا اور اس کا کام کرنے والوں کا اور ان کا جن کا دل (اسلام کی طرف) پر چانا ہے اور گردن چھڑانے میں اور خدا کی راہ میں اور مسافر میں، یہ حصے خدا کی طرف سے ٹھہرائے ہوئے ہیں۔''

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ پانے کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے شخص! اللہ تعالیٰ نے مالِ زکوٰۃ کی تقسیم میں کسی انسان کو بلکہ پیغمبر تک کو کوئی اختیار

[1] صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب المسکین الذی لایجد غنی ولا یفطن له فیتصدق علیه: ۲۳۹۳، ۲۳۹۴۔

نہیں دیا ہے۔ بلکہ اس کی تقسیم خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اور اس کے آٹھ مصرف بیان کر دیئے ہیں، اگر تم ان آٹھ میں سے ہو تو میں تم کو دے سکتا ہوں۔'' ❶

اسلام میں زکوۃ کے مصارف ہشتگانہ

یہ آٹھوں مصارف نیکی، بھلائی اور خیر وفلاح کی ہر قسم اور ہر صنف کو محیط ہیں فقرا اور مساکین میں وہ تمام اہل حاجت داخل ہیں جو اپنی محنت وکوشش سے اپنی روزی کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، جیسے بوڑھے، بیمار، اندھے، لولے لنگڑے، مفلوج، کوڑھی، یا وہ محنت کر سکتے ہیں، لیکن موجودہ حالت میں دین وملّت کی کسی ایسی ضروری خدمت میں مصروف ہیں کہ وہ اپنی روزی کمانے کی فرصت نہیں پاتے، جیسے مبلغین، مذہبی بالغ طالب العلم جو ﴿ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۳) میں اسی طرح داخل ہیں، جس طرح آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک میں اصحاب صفہ داخل تھے اور وہ کم نصیب بھی داخل ہیں جو اپنی پوری محنت اور کوشش کے باوجود اپنی روزی کا سامان پیدا کرنے سے اب تک قاصر رہے ہیں اور فاقہ کرتے ہیں۔ ﴿ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا ﴾ یعنی امام کی طرف سے صدقہ کی تحصیل وصول کا کام کرنے والے بھی اس میں سے اپنے کام کی اجرت پا سکتے ہیں اور ﴿ وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ ﴾ (یعنی جن کی تالیف قلوب کی جائے) میں وہ لوگ داخل ہیں جن کو ابھی اسلام کی طرف مائل کرنا ہے یا جن کو اسلام پر مضبوط کرنا ہے ﴿ وَفِي الرِّقَابِ ﴾ (گردن کے چھڑانے میں) اس سے مقصود وہ غلام ہیں، جن کی گردنیں دوسروں کے قبضہ میں ہیں اور ان کو خرید کر آزاد کرنا ہے اور وہ مقروض ہیں جو اپنا قرض آپ کسی طرح ادا نہیں کر سکتے، ﴿ وَالْغَارِمِيْنَ ﴾ (تاوان اٹھانے والوں) سے مراد وہ نیک لوگ ہیں، جنہوں نے دوسرے لوگوں اور قبیلوں میں مصالحت کرانے کے لئے کسی مالی ضمانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے، یہ مالی ضمانت ایک قومی نظام کی حیثیت سے زکوۃ کے بیت المال سے ادا کی جا سکتی ہے۔ ﴿ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ (خدا کی راہ میں) ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے نیک کاموں کو شامل ہے۔ ❷ اور حسب ضرورت کبھی اس سے مذہبی لڑائی یا سفر حج یا اور دوسرے نیک کام مراد لئے جا سکتے ہیں اور ﴿ وَابْنِ السَّبِيْلِ ﴾ (مسافر میں) اس میں مسافروں کی ذاتی مدد کے علاوہ مسافروں کی راحت رسانی کے سامان کی تیاری مثلاً: راستوں کی درستی، پلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر بھی داخل ہو سکتی ہے۔ ❸ یہ ہیں زکوۃ کے وہ آٹھ مقررہ مصارف جن میں اسلام نے اس قومی و مذہبی رقم

---

❶ ابوداود، وكتاب الزكوة باب من يعطى من الصدقة وحد الغنى: ۱۶۳۰۔ ❷ اکثر فقہا نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد لیا ہے، مگر یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی، آیت گزر چکی ﴿ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ یہاں فی سبیل اللہ سے بالاتفاق صرف جہاد ہی نہیں بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے، اکثر فقہا نے یہ بھی کہا ہے کہ زکوۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملکیت بنانا ضروری ہے، مگر ان کا استدلال جو للفقراء کے لام تملیک پر مبنی ہے، بہت کچھ مشتبہ ہے ہوسکتا ہے کہ لام انتفاع ہو جیسے ﴿ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾

❸ كتاب الخراج قاضى ابويوسف فصل فى الصدقات باب فى النقصان والزيادة والضياع، ص: ٤٦۔

کو خرچ کرنے کی تاکید کی ہے۔

مسکینوں، فقیروں اور معذوروں کی امداد

زکوٰۃ کا سب سے اہم مصرف یہ ہے کہ اس سے لنگڑے، لولے، اندھے، بوڑھے، کوڑھی مفلوج اور دوسرے معذور لوگوں کی امداد کی جائے۔ نادار، یتیموں، بیواؤں اور ان لوگوں کی خبر گیری کی جائے جو اپنی کوشش اور جد وجہد کے باوجود روزی کا سامان نہیں کر پاتے یہ زکوٰۃ کا وہ مصرف ہے جو تقریباً ہر قوم میں اور ہر مذہب میں ضروری خیال کیا گیا ہے اور ان مستحقین کی یہ قابل افسوس حالت خود کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں۔ لیکن اسلام نے ان کے علاوہ زکوٰۃ کے چند اور ایسے مصارف مقرر کیے ہیں، جن کی اہمیت کو خاص طور سے صرف اسلام ہی نے محسوس کیا ہے۔

غلامی کا انسداد

غلامی انسان کے قدیم تمدن کی سب سے بوجھل زنجیر تھی، یہ زنجیر انسانیت کی نازک گردن سے صرف اسلام نے کاٹ کر الگ کی، غلاموں کے آزاد کرنے کے فضائل بتائے، ان کے ساتھ نیکی، احسان اور حسن سلوک کی تاکید کی اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ زکوٰۃ کی آمدنی کا ایک خاص حصہ اس کے لئے نامزد فرمایا کہ اس سے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جائے، لیکن چونکہ غلاموں کو آزاد کرنے کی پوری قیمت یا اس کی آزادی کا پورا زر فدیہ ہر ایک شخص برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے زکوٰۃ کی مجموعی رقم سے اجتماعی طور سے اس فرض کو ادا کرنے کی صورت تجویز کی، انسانوں کے اس درماندہ طبقہ پر یہ اتنا بڑا عظیم الشان احسان کیا گیا ہے کہ جس کی نظیر دنیا کے محسنین کی فہرست میں نظر نہیں آ سکتی۔ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی شریعت نے صرف اس لئے کہ انسانوں کے اس واجب الرحم فرقہ کو اپنی کھوئی ہوئی آزادی واپس ملے، اپنی امت پر ایک دائمی رقم واجب ٹھہرا دی کہ اس کے ذریعہ سے نیکی کے اس سلسلہ کو اس وقت تک قائم رکھا جائے جب تک دنیا کے تمام غلام آزاد نہ ہو جائیں یا اس رسم کا دنیا کی تمام قوموں سے خاتمہ نہ ہو جائے۔

مسافر

گزشتہ زمانہ میں سفر کی مشکلات اور دقتوں کو پیش نظر رکھ کر یہ بہ آسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ مسافروں کی امداد اور ان کے لئے سفر کے وسائل و ذرائع کی آسانی کی کتنی ضرورت تھی۔ صحرا اور بیابان، جنگل اور میدان، آبادی اور ویرانی ہر جگہ آنے جانے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا اور اب تک یہ سلسلہ قائم ہے، یہ وہ ہیں جو اپنے اہل وعیال، عزیز و اقارب، دوست و احباب، مال و دولت سے الگ ہو کر اتفاقات اور حوادث کے سیلاب سے بہہ کر کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں، ان کے پاس کھانے کے لئے کھانا، پینے کے لئے پانی، سونے کے لئے بستر، اوڑھنے کے لئے چادر نہیں ہوتی اور یہ حالت ہر انسان کو کسی نہ کسی وقت پیش آ جاتی ہے۔ اس لئے

ضرورت تھی کہ ان کے آرام و آسائش کا سامان کیا جائے، اسی اصول پر سرائیں، کنوئیں، مسافر خانے پہلے بھی بنوائے جاتے تھے اور اب بھی بنوائے جاتے ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اب اس اسٹیم اور بجلی کے عہد میں یہ تمام مشکلیں افسانہ کہن اور داستان پارینہ ہوگئی ہیں، اب ہر جگہ اچھے سے اچھے ہوٹل، تیز سے تیز سواریاں، بڑے سے بڑے بنک اور آمدورفت کا سامان کرنے والی کمپنیاں قائم ہوگئی ہیں اور سفر و حضر میں کوئی فرق نہیں رہا ہے۔ مگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہوا ہے یہ صرف دولتمندوں اور سرمایہ داروں کی راحت و آسائش کے لئے ہوا اور ان کے ان نئے طریقوں نے پرانے طریقوں کے پرانے آثار کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے۔ آج متمدن دنیا کے بڑے سے بڑے پررونق شہروں سے لے کر معمولی دیہاتوں تک میں جہاں امیر اور دولتمند مسافروں کے لئے قدم قدم پر ہوٹل، ریستوران، قہوہ خانے اور آرام خانے موجود ہیں، وہاں اس پورے مسیحی ملک میں حضرت مسیح کی طرح ایک غریب مسافر کے لئے کہیں سر رکھنے کی جگہ نہیں۔ کسی کی جیب میں جب تک کسی بنک کا نوٹ اور چیک نہیں اس کے لئے ہوٹلوں اور اقامت خانوں کے تمام دروازے بند ہیں۔ کیا یہ انسانیت کے لئے رحم ہے؟ کیا یہ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی ہے؟ لیکن ان تمام ملکوں کے طول و عرض میں جو محمد رسول اللہ ﷺ کے غلاموں کے قبضہ میں آئے سراؤں، مسافر خانوں، کنوؤں اور مہمان خانوں کا وہ وسیع سلسلہ قائم ہوگیا کہ ایک غریب مسلمان اسپین کے کنارہ سے چل کر کاشغر کے ایک گاؤں میں بہ آرام و آسائش پہنچ جاتا تھا اور ہندوستان کے اس سرے سے روم کے اس سرے تک اهلًا باهل و اوطانًا باوطانٍ کہتا ہوا بے خطر چلا جاتا تھا اور آج بھی اس نظام کی بدولت ان اسلامی ملکوں میں جو ابھی یورپ کے سرمایہ دارانہ طور و طریق سے واقف نہیں ہیں۔ غریب مسافروں کو وہی آرام و آسائش حاصل ہے اور امراء اور دولتمندوں کے لئے کیا کہنا کہ ایک پرانے جہاں گرد سیاح بزرگ (سعدی) کے مقولہ کے مطابق

منعم بکوہ و دشت و بیابان غریب نیست ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

جماعتی کاموں کے اخراجات

جب تک منتشر افراد ایک شیرازہ میں نہیں بندھ جاتے، حقیقت میں جماعت کا وجود نہیں ہوتا، لیکن جماعت کے وجود کے ساتھ ہی افراد کی طرح جماعت کو بھی ضروریات پیش آتی ہیں، جماعت کے کمزوروں، معذوروں اور مفلسوں کی مدد جماعت اور اس کے اصول کی حفاظت کے لئے سرفروشانہ مجاہدہ کی صورت میں اس کے اخراجات کی کفالت، جماعت کی آمدورفت اور سفر کے وسائل کی ترقی و تعمیر، جماعت کی خاطر جماعت کے مالی نقصان اٹھانے والوں اور مقروضوں کی امداد کرنا، جماعت کے ان کارکنوں کو معاوضہ دینا جو جماعت کی مذہبی، علمی، تعلیمی، خدمات بجالائیں اور اس رقم کی فراہمی اور نظم و نسق کے فرائض انجام دیں، زکوۃ اسی نظام جماعت کا سرمایہ دولت ہے۔

زکوۃ کے مقاصد، فوائد اور اصلاحات

زکوۃ کا اصلی اور مرکزی مقصد وہی ہے جو خود لفظ ''زکوۃ'' کے اندر ہے، زکوۃ کے لفظی معنی پاکی اور صفائی کے ہیں، یعنی گناہ اور دوسری روحانی قلبی اور اخلاقی برائیوں سے پاک وصاف ہونا، قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنی میں بار بار آیا ہے۔ سورۂ والشمس میں ہے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ ﴾ (۹۱/ الشمس:۹۔۱۰)

''مراد پایا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک وصاف کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو میلا اور گندہ کیا۔''

ایک اور سورہ میں ہے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ ﴾ (۸۷/ الاعلی:۱٤)

''مراد پایا وہ جو پاک وصاف ہوا۔''

یہ تزکیہ اور پاکی وصفائی نبوت کی ان تین عظیم الشان خصوصیتوں میں سے ایک ہے، جن کا ذکر قرآن پاک کی تین چار آیتوں میں آیا ہے:

﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۲۹ و ۶۲/ الجمعۃ:۲)

''وہ نبی خدا کی آیتیں پڑھ کر ان کو سناتا ہے اور ان کو گناہوں سے پاک وصاف کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔''

تزکیہ نفس

ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ زکوۃ اور تزکیہ یعنی پاکی وصفائی کی اہمیت اسلام اور شریعت محمدی ﷺ میں کتنی ہے؟ یہ دل کی پاکی، روح کی صفائی اور نفس کی طہارت مذہب کی اصل غایت اور نبوتوں کا اصل مقصد ہے۔ انسانوں کی روحانی ونفسانی بیماریوں کے بڑے حصہ کا سبب تو خدا سے خوف ورجا اور تعلق ومحبت کا نہ ہونا ہے اور اس کی اصلاح نماز سے ہوتی ہے۔ لیکن دوسرا بڑا سبب غیر اللہ کی محبت اور مال ودولت اور دیگر اسباب دنیا سے دل کا تعلق ہے۔ زکوۃ اسی دوسری بیماری کا علاج ہے، غزوۂ تبوک کے موقع پر جب بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے باغ وبستان کی محبت کے سبب سے، جو ان کی دولت تھی، غزوہ میں عدم شرکت کا جرم ثابت ہوا ہے اور پھر ان کی صداقت اور سچائی کے باعث خدا نے ان کو معاف کیا ہے، وہاں محمد رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا ﴾ (۹/ التوبہ:۱۰۳)

''ان کے مالوں میں سے زکوۃ لے کر ان کو پاک وصاف بنا۔''

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اپنے محبوب مال میں سے کچھ نہ کچھ خدا کی راہ میں دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینہ کا سب سے بڑا زنگ جس کا نام محبت مال ہے، دل سے دور ہو جاتا ہے، بخل کی بیماری کا اس سے علاج ہو جاتا ہے۔ مال کی حرص بھی کم ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ شخصی خودغرضی کی بجائے جماعتی اغراض کے لئے اپنے اوپر ایثار کرنا انسان سیکھتا ہے اور یہی وہ دیواریں ہیں، جن پر تہذیب نفس اور حسن خلق کی عمارت قائم اور جماعتی زندگی کا نظام ہے۔

قرآن مجید میں سود اور صدقہ میں جو حد فاصل قرار دی گئی ہے، وہ یہ ہے:

﴿ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۶)

''خدا سود کو گھٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے۔''

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ درحقیقت سود میں نقصان اور صدقہ کے مال میں اضافہ ہوتا ہے، کیوں کہ مشاہدہ بالکل برعکس ہے۔ بلکہ اخروی ثواب و گناہ اور برکت و بے برکتی کے فرق کے علاوہ اصلی مقصد اس سے یہ ہے کہ سود گو شخصی دولت میں اضافہ کرتا ہے۔ لیکن جماعتی دولت کو برباد کر دیتا ہے۔ جس سے پوری قوم مفلس ہو جاتی ہے اور آخر وہ شخص بھی تباہ ہو جاتا ہے اور قومی صدقہ وعطا سے قوم کے نہ کمانے والے افراد کی امداد ہو کر قومی دولت کا معتدل نظام باقی رہتا ہے اور ساری قوم خوشی اور برکت کی زندگی بسر کرتی ہے۔ اگر سود لینے والا کبھی اتفاقی مالی خطرہ میں پڑ جاتا ہے تو اس کی مدد کے لئے جماعت ایک انگلی تک نہیں ہلاتی۔ لیکن صدقہ دینے والے کی امداد کے لئے پوری قوم کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ سود خوار اس قدر حریص اور طماع ہو جاتے ہیں کہ ان کو مال کی کثیر مقدار بھی کم نظر آتی ہے اور جو لوگ صدقہ اور زکوۃ دینے کے خوگر ہوتے ہیں وہ اس قدر مستغنی اور قانع ہو جاتے ہیں کہ ان کے لئے تھوڑا مال بھی کافی ہوتا ہے۔ سود خوار اپنے مال کے اضافہ اور ترقی کی حرص میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ جس تلوار سے دوسروں کو قتل کر کے اس کی دولت پر قبضہ کرتا ہے۔ آخر اسی تلوار سے دوسرا اس کو قتل کر کے اس کے تمام اصل ومنافع پر بیک دفعہ قبضہ کر لیتا ہے۔ لیکن صدقہ وخیرات دینے والا جو دوسروں کی دولت ناجائز طریق سے نہیں لوٹتا، بلکہ خود دوسروں کو اپنے مال سے دیتا ہے اور سلامت روی کے ساتھ اپنے کاروبار کو چلاتا ہے۔ اس کو کوئی دوسرا بھی نہیں لوٹتا وہ اپنے سرمایہ اور قلیل منافع کو محفوظ رکھتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے تجارتی شہروں کی منڈیاں اور کوٹھیاں اس عبرت انگیز واقعہ کی پوری تصویریں ہیں اور یہ ہر روز کا مشاہدہ ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ استغنا اور قناعت ایسی چیز ہے، جو تمام اخلاقی محاسن کا سنگ بنیاد ہے، بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ نے نہایت بلیغ وحکیمانہ طریق سے یہ ارشاد فرمایا کہ

((ليس الغنى عن كثرة العرض ولكن الغنى غنى النفس)) [1]

''تونگری دولت کی کثرت کا نام نہیں ہے، بلکہ مال کی بے نیازی کا نام ہے۔''

[1] بخاري، كتاب الرقاق، باب الغنى غنى النفس:٦٤٤٦۔

اس حدیث کا ترجمہ سعدی نے ان لفظوں میں کیا ہے، تونگری بدل ست نہ بمال، دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ دولت آمدنی کی زیادتی کا نام نہیں بلکہ ضروریات کی کمی کا نام ہے، لیکن یہ غیر فانی دولت حرص وطمع سے نہیں، بلکہ صبر وقناعت کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ اس بنا پر کیا کسی کو زکوٰۃ وصدقہ کے مطہر مزکی اور مصلح اخلاق ہونے میں شبہ ہوسکتا ہے؟ سود خور کو دوسروں کو لوٹنے سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کا فرض ادا کرے، وہ تو ہمیشہ اس تاک میں رہتا ہے کہ دوسرے مصیبتوں اور دقتوں میں پھنسیں اور وہ ان کی اس حالت سے فائدہ اٹھائے۔ لیکن جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، وہ ہمیشہ قابل ہمدردی اشخاص کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں، تاکہ وہ اپنے مال ودولت سے اس کی مدد کرکے ان کے زخمِ دل پر مرہم رکھ سکیں۔

باہمی اعانت کی عملی تدبیر

زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف کا بڑا حصہ غریبوں اور حاجت مندوں کی امداد ہے۔ انسانیت کا یہ وہ طبقہ ہے، جس کے ساتھ تمام مذہبوں نے ہمدردی کی ہے اور اس کی تسلی اور تسکین کے لئے دوسری دنیا کی توقع اور امید کے بڑے بڑے خوش آئند الفاظ استعمال کئے ہیں، لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی زندگی کی یہ تلخی محض اہل مذاہب کی شیریں کلامی سے دور نہیں ہوسکتی۔ محمد رسول اللہ ﷺ دنیا کے پہلے اور وہی پچھلے پیغمبر ہیں جنہوں نے اس طبقہ کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا ثبوت دیا اور اس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کے لئے عملی تدبیر جاری اور نافذ فرمائی۔ خود اپنی زندگی غریبوں اور مسکینوں کی صورت سے بسر کی اور دعا فرمائی کہ ''خداوندا! مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینوں ہی کے زمرہ میں میرا حشر کر۔'' آپ کے گھر کا چبوترہ (صفہ) غریبوں اور مسکینوں کی پناہ کا سایہ تھا، وہی آپ کی بزمِ قدس کے مقرب درباری اور اسلام کے معرکوں کے مخلص جانباز تھے۔ آپ کی نظر میں کسی انسان کی غربت اور تنگ دستی اس کی ذلت اور رسوائی کے ہم معنی نہ تھی۔ نہ دولت وامارت عزت ووقار کے مترادف تھی، بلکہ صرف نیکی اور پرہیزگاری فضیلت وبزرگی کا اصلی معیار تھی۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ ''مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، کیوں کہ آسمان کی بادشاہت انہیں کی ہے۔'' [1] آنحضرت ﷺ نے اس سے زیادہ اختصار وایجاز کے ساتھ اس مطلب کو ادا فرمایا:

((ان المکثرین هم المقلّون)) [2]

''جو دولت مند ہیں وہی غریب ہیں۔''

اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ جو غریب ہیں وہی دولت مند ہوں گے۔ پھر انہیں خوشخبری دی کہ غریب جن کو خدا کے آگے اپنی کسی دولت کا حساب نہیں دینا ہے، دولت والوں سے ۴۰ سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ [3] اسلام نے ان روحانی تسلیوں اور بشارتوں کے ساتھ جو مزید کام کیا، وہ ان کی دنیاوی

[1] متی: ٥ ـ ٣؛ العہد الجدید، ص: ٧ـ [2] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب المکثرون هم المقلون: ٦٤٤٣ـ

[3] جامع ترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء ان فقراء المهاجرین یدخلون الجنة قبل اغنیاء هم: ٢٣٥٥ـ

تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کی عملی تدبیریں ہیں۔ جن کا نام صدقہ اور زکوۃ ہے، اس کی تعلیم نے اس عملی ہمدردی اور اعانت کو صرف اخلاقی ترغیب وتشویق تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اس کے لئے دو قسم کی تدبیریں اختیار کیں۔ ایک یہ کہ ہر مسلمان کو نصیحت کی جس سے جتنا ہو اپنی دولت سے ان کی مدد کرے۔ یہ اخلاقی خیرات ہے جس کا نام قرآن کی اصطلاح میں انفاق ہے، لیکن چونکہ یہ اخلاقی خیرات ہر شخص کو اس ضروری نیکی پر مجبور نہیں کرتی اس لئے ایک مقدار معین کے مالک پر ایک ایسا قانونی محصول عائد کیا، جس کا سالانہ ادا کرنا اس کا مذہبی فرض ہے اور اس مجموعی رقم کا بڑا حصہ غریبوں اور محتاجوں کی امداد واعانت کے لئے مخصوص کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس تعلیم کو ایک نا قابل تغیر دستور العمل کے طور پر اپنی امت کو ہمیشہ کے لئے سپرد فرمایا۔ چنانچہ آپ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا کر یمن بھیجا تو توحید اور نماز کے بعد جس چیز کا حکم دیا وہ یہی زکوۃ ہے۔ پھر اس کی نسبت ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ

((تؤخذ من اغنياء هم وترد على فقرائهم)) [1]

''وہ ان کے دولتمندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو لوٹا دیا جائے۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کی ہدایت کے بموجب ان دونوں قسموں کی خیراتوں پر اس شدت سے عمل کیا کہ جو استطاعت نہ بھی رکھتے تھے، وہ بازار جا کر مزدوری کرتے تھے، تاکہ جو رقم ہاتھ آئے وہ غریب ومعذور بھائیوں کی اخلاقی اعانت میں خرچ کریں اور اس معاملہ میں خود آپ نے یہاں تک اس طبقہ کی دلجوئی کی فرمایا: ''اگر کسی کے پاس کچھ اور نہ ہو تو لطف ومہربانی سے بات کرنا ہی اس کا صدقہ ہے۔'' اس سے زیادہ یہ کہ اس کی بھی ممانعت کی گئی کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے، اس کو سختی سے واپس نہ کیا کرو خدا نے تعلیم دی:

﴿ فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝﴾ (۹۳/ الضحیٰ:۹۔۱۰)

''تو یتیم کو دبایا نہ کرو اور نہ مانگنے والے کو جھڑک۔''

ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ اگر تم کسی حاجت مند کی مدد کرو تو اس پر احسان مت دھرو کہ وہ شرمندہ ہو، بلکہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو یہ نعمت دی اور اس کی توفیق عنایت کی۔ احسان دھرنے سے وہ نیکی کا پیالہ حباب کی طرح ٹوٹ کر بیٹھ جائے گا فرمایا:

﴿ لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲٦٤)

''تم اپنی خیرات کو احسان دھر کر یا طعنہ دے کر برباد نہ کرو۔''

اس لطف، اس مدارات اور اس دلجوئی کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ نے خدا کے حکم سے انسانیت کے قابل رحم طبقہ کی چارہ نوازی فرمائی اور ہم کو باہمی انسانی محبت اور ایک دوسرے کی مدد کا سبق پڑھایا۔ اگر یہ حکم

---

[1] صحيح بخاري، كتاب التوحيد، باب ماجاء في دعاء النبي ﷺ امته الى توحيد الله تبارك وتعالى: ٧٣٧٢ وكتاب الزكاة: ١٣٩٥۔

صرف اخلاقی حیثیت سے یا صرف مبہم طریقہ سے ہوتا یا سب کو سب کچھ دے ڈالنے کا عام حکم دے دیا جاتا تو کبھی اس پر اس خوبی اس نظام اور اس پابندی کے ساتھ عمل نہ ہو سکتا اور آج بھی مسلمانوں کے سامنے یہ راہ کھلی ہوئی ہے اور کچھ نہ کچھ ہر جگہ اس پر عمل بھی ہے، یہی سبب ہے کہ مسلمانوں میں اگر امیر کم ہیں تو ویسے غریب محتاج بھی کم ہیں۔ جیسے دوسری قوموں میں نظر آتے ہیں، تاہم افسوس ہے کہ ایک مدت سے مسلمانوں کا یہ نظام سخت ابتری کی حالت میں ہے اور اس کی تنظیم کی طرف سے غفلت بڑھتی جا رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ہر قسم کا جماعتی کام منتشر و پراگندہ ہے۔

دولت مندی کی بیماریوں کا علاج

دولت مندی اور تمول کا مسئلہ ہمیشہ سے دنیا کے مذاہب میں ایک معرکۃ الآراء بحث کی حیثیت سے چلا آ رہا ہے، یہودیت کی طرح بعض ایسے مذہب ہیں جن میں نہ تو دولت مندی کی کوئی تحقیر کی گئی اور نہ مفلسی و غربت کو سراہا گیا ہے۔ بلکہ گویا اس بحث کو نامفصل چھوڑ دیا گیا ہے، لیکن عیسائیت اور بودھ مت دو ایسے مذہب ہیں، جن میں دولت کی پوری تحقیر کی گئی ہے۔ عیسائیت کی نظر میں دولت مندی اور تمول نجات کی راہ کا کانٹا ہے، بلکہ کوئی انسان اس وقت تک نجات نہیں پا سکتا، جب تک وہ سب کچھ جو اس کے پاس ہے، خدا کی راہ میں لٹا نہ دے۔ انجیل میں ہے کہ ایک نیکوکار دولت مند نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے نجات کا طریقہ دریافت کیا تو جواب میں فرمایا:

> ''اگر تو کامل ہوا چاہتا ہے تو جا کے سب کچھ جو تیرا ہے، بیچ ڈال اور محتاجوں کو دے کہ تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا تب آ کے میرے پیچھے ہو لے۔''

وہ دولت مند یہ تعلیم سن کر غمگین ہو کر چلا گیا۔ تب انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

> ''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے، بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزر جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔'' (متی ۱۹۔۲۱۔۲۴)

بودھ مت نے نیک لوگوں کو ترک دنیا کی تلقین کی ہے اور ہر قسم کی دولت سے پاک رہنے کی ہدایت کی ہے اور ایسے لوگوں کے لئے یہ سامان کیا ہے کہ جب وہ بھوکے ہوں تو بھیک کا پیالہ لے کر لوگوں کے دروازوں پر کھڑے ہو جائیں۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں طریقوں کو ناپسند فرمایا، اصل یہ ہے کہ اگر دولت ایسی بری چیز ہے تو اس برائی کو دوسروں کی طرف منتقل کر دینا ان کی خیر خواہی نہ ہوئی، دشمنی ہوئی اور اگر غربت کوئی برائی کی چیز ہے تو سب کچھ دوسروں کو دے کر خود اسی حال میں بن جانا کہاں کی دانشمندی اور اصلاح ہے، اس لئے یہ طریقہ ہر شخص کے لئے یکساں مفید نہیں ہے۔ نہ نفس دولت فرشتہ کو شیطان اور نہ نفس غربت

شیطان کو فرشتہ بناتی ہے، جس طرح دولت مندی دنیا میں ہزاروں سیہ کاریوں کی محرک ہے، اسی طرح غربت بھی دنیا کے ہزاروں جرائم کا باعث ہے اور ان دونوں خرابیوں سے انسانوں کو بچانا ایک نبوت عظمیٰ کا فرض تھا۔ دولت بہ حیثیت دولت اور غربت بہ حیثیت غربت نیک و بد اور خیر و شر دونوں صفتوں سے پاک ہے۔ بلکہ نیکی کرنے کی عام صلاحیت اور اہلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک نیکوکار دولت مند ایک نیکوکار غریب سے بدرجہا نیکی کے مواقع زیادہ رکھتا ہے، اسی لئے دولت اسلام کی نگاہ میں خدا کی ایک نعمت ہے۔ لعنت نہیں، ہنر ہے عیب نہیں، خیر ہے شر نہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں متعدد موقوں پر دولت کو خیر اور فضل سے تعبیر کیا گیا ہے اور احادیث سے بھی دولت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ کے ایک صحابی نے مرتے وقت یہ چاہا کہ اپنا سارا مال و اسباب خدا کی راہ میں دے دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”تم اہل و عیال کو غنی چھوڑ جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔“ [1] آپ کے حلقہ بگوشوں میں دولت مند بھی تھے اور غریب بھی اور دونوں آپ کے دربار میں برابر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک دفعہ غریبوں نے آکر عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ! ہمارے دولت مند بھائی تو ہم سے سبقت لئے جاتے ہیں، ہم جو نیکی کے کام کرتے ہیں وہ، وہ بھی کرتے ہیں اور اس کے علاوہ وہ خیرات بھی کرتے ہیں، جو ہم نہیں کر پاتے۔ آپ نے ان کو ایک دعا سکھائی کہ یہ پڑھ لیا کرو۔ دولت مند صحابیوں نے یہ سنا تو وہ بھی وہ دعا پڑھنے لگے۔ غریبوں نے پھر جا کر عرض کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہیے دے۔“ [2]

آنحضرت ﷺ نے اس عظیم الشان مسئلہ کو جو دنیا میں ہمیشہ سے غیر منفصل اور ناطے شدہ چلا آرہا تھا۔ اپنی روشن تعلیم اور تلقین کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لئے حل کر دیا۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے تقریر میں فرمایا کہ ”لوگو! مجھے تمہاری نسبت جو ڈر ہے، وہ دنیا کے خیر و برکت کا ہے“۔ صحابہ نے پوچھا، یارسول اللہ! دنیا کے خیر و برکت سے آپ کا کیا مقصود ہے؟ فرمایا: ”دنیا کا باغ و بہار“ (عیش و نشاط اور مال و دولت) ایک شخص نے کہا، یارسول اللہ ﷺ! کیا بھلائی سے بھی برائی پیدا ہوتی ہے؟ سائل کا منشا یہ تھا کہ دولت جو خیر و برکت ہے، وہ فتنہ کیوں کر ہو سکتی ہے۔ آپ نے سوال سن کر ذرا تامل کیا پھر پیشانی سے پسینہ کے قطرے پونچھے پھر فرمایا: ”بھلائی سے بھلائی ہی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن دولت کی مثال ایک ہرے بھرے چراگاہ کی ہے، جس کو موسم بہار نے سرسبز و شاداب بنایا ہو، جب بعض جانور حرص و طمع میں آکر حد اعتدال سے زیادہ کھا لیتے ہیں، تو دیکھو وہی خیر و برکت کی چیز ان کی ہلاکت اور موت کا باعث ہو جاتا ہے، لیکن جو جانور اس کو اعتدال سے چرتا ہے، جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ دھوپ کے سامنے ہو جاتی ہے اور کچھ دیر جگالی کرتا ہے فضلہ باہر پھینک دیتا ہے اور

[1] بخاری، کتاب الوصایا، باب ان یترک ورثة اغنیاء خیر من ان یتکففوا الناس:۲۷۴۲۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الذکر بعد الصلوة:۸۴۳؛ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب استحباب الذکر بعد الصلوة: ۱۳۴۷۔

پھر چرنے لگتا ہے، دولت ایک خوشگوار چیز ہے تو جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے خرچ کرے تو یہ دولت اس کے لئے بہترین مددگار ہے، لیکن جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے حاصل نہیں کرتا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کھاتا چلا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا۔'' [1] اس تقریر میں آنحضرت ﷺ نے مسئلہ کے اہم نکتہ کو واضح فرما دیا اور بتا دیا کہ نفس دولت خیر و شر نہیں ہے۔ بلکہ اس کا درست و نادرست طریقہ حصول اور جائز و ناجائز مصرف خیر و شر ہے۔ اگر درست طریقہ سے وہ حاصل کی جائے اور صحیح طریقہ سے خرچ کی جائے، تو وہ نیکیوں اور بھلائیوں کا بہتر سے بہتر ذریعہ ہے، اگر اس کے حصول و صرف کا طریقہ صحیح نہیں تو وہ بری اور شر انگیز ہے۔ اخلاقی محاسن و معائب امیر و غریب دونوں کے لئے یکساں ہیں۔ ایک سخی و فیاض و متواضع امیر اور ایک قناعت پسند اور صابر و شاکر غریب اسلام کی نظر میں فضیلت کے ایک ہی درجہ پر ہیں، اسی طرح ایک متکبر، بخیل، امیر اور خوشامدی اور لالچی فقیر پستی کی ایک ہی سطح پر ہیں۔ اس لئے ضرورت تھی کہ دولت کی اجازت کے ساتھ ساتھ ایک طرف امرا اور دولت مندوں کے اخلاق کی اصلاح کی جائے اور دوسری طرف غریبوں اور فقیروں کی امداد اور دستگیری کے ساتھ ان کے اخلاق و عادات کو بھی درست کیا جائے، اسلام میں زکوۃ اسی عظیم الشان دو طرفہ اصلاح کا نام ہے۔

اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے سب سے پہلے حصول دولت کے ناجائز طریقوں دھوکا، فریب، خیانت، لوٹ مار، جوا، سود وغیرہ کی سخت سے سخت ممانعت کی۔ سرمایہ داری کے اصول کی حمایت نہیں کی اور اس کا سب سے آسان ترین ذریعہ اور غریبوں کے لوٹنے کے سب سے عام طریقہ سود کو حرامِ مطلق اور خدا اور رسول سے لڑائی کے ہم معنی فرمایا۔ جو زمین یونہی پڑی ہوئی ہے اس کو جو بھی اپنی کوشش سے آباد و سیراب کرے اسی کی ملکیت قرار دی۔ چنانچہ فرمایا: ''زمین خدا کی ہے اور سب بندے خدا کے بندے ہیں، جو کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ہے۔'' [2] متروکہ جائیداد کا مالک کسی ایک کو نہیں بلکہ بقدرِ استحقاق تمام عزیزوں کو اس کا حصہ دار بنا دیا۔ ممالک مفتوحہ کو امیر اسلام کی شخصی ملکیت نہیں بلکہ پوری جماعت کی ملکیت قرار دیا۔ فطرت کی ان بخششوں کو جو انسانی محنت کی ممنون نہیں، جیسے پانی، تالاب، گھاس، چراگاہ، نمک کی کان، معدنیات وغیرہ جماعتی تصرف میں دیا اور بن لڑائی کے دشمنوں سے حاصل کی ہوئی زمینوں کو امراء اور دولت مندوں کے بجائے خالص غریبوں اور بیکسوں کا حق قرار دیا اور اس کی وجہ بھی ظاہر کر دی، فرمایا:

﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ﴾ (۵۹/ الحشر :۷)

''بستیوں والوں کی ملکیت سے اللہ جو اپنے رسول کو ہاتھ لگا دے، وہ خدا اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافروں کا حق ہے، تاکہ وہ اُلٹ پھر کر تم میں سے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الزکوۃ، باب الصدقة علی الیتامی: ۱۴۶۵؛ کتاب الرقاق، باب مایحذر من زهرة الدنیا: ۶۴۲۷۔ [2] مسند ابی داود الطیالسی، ص: ۲۰۴، الجزء السادس۔

دولتمندوں ہی کے لینے دینے میں نہ رہ جائے۔''

اس کے بعد اس سلسلہ میں دولت مندی کی سب سے بڑی بیماری بخل کو دنیا میں انسانیت کا بدترین مظہر اور آخرت میں بڑی سے بڑی سزا کا مستوجب قرار دیا اور جو اس گناہ سے پاک ہو، اسی کو کامیابی کی بشارت دی، فرمایا:

﴿ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (۵۹/ الحشر: ۹)

''اور جو اپنے جی کے لالچ سے بچایا گیا وہی لوگ ہیں مراد پانے والے۔''

بخل کا مبتلا دوسروں کے ساتھ بخل نہیں کرتا، بلکہ درحقیقت وہ خود اپنے ساتھ بخل کرتا ہے، وہ اس کی بدولت اس دنیا میں اپنے آپ کو ہر دلعزیزی اور نیک نامی بلکہ جائز آرام و راحت تک سے اور آخرت میں ثواب کی نعمت سے محروم رکھتا ہے، فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ ﴾ (۴۷/ محمد: ۳۸)

''اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے، اللہ تو غنی ہے اور تم ہی محتاج ہو۔''

اس آیت پاک میں در پردہ یہ بھی واضح کر دیا کہ جس دولت کو تم اپنی سمجھتے ہو، وہ درحقیقت تمہاری نہیں، اصل مالک خدا ہے اور تم خود اس کے محتاج ہو، پھر جو شخص مال کا اصلی مالک نہ ہو، بلکہ محض امین ہو، وہ اصلی مالک کے حکم کے مطابق اس کو صرف نہ کرے اور یہ سمجھے کہ یہ خود اس کی ملکیت ہے اور اس کو اپنی ملکیت میں سے کسی کو کچھ دینے نہ دینے کا اختیار ہے، خائن اور بے ایمان نہ کہا جائے گا؟ درحقیقت یہی تصور کہ یہ مال میرا ہے اور میری شخصیت اور انانیت کی طرف اس کی نسبت ہے۔ دنیا کی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے، اس آیت پاک کی یہ تعلیم اسی جڑ کو کھودتی اور بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔ پھر دولت کے ان مجازی مالکوں اور امینوں کو یہ بتا دیا گیا کہ ان کو خدا کی عدالت میں اپنی دولت کے ایک ایک ذرہ کا حساب دینا پڑے گا، فرمایا:

﴿ ثُمَّ لَتُسْـَٔـلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ﴾ (۱۰۲/ التکاثر: ۸)

''پھر اس دن تم سے تمہاری نعمت کا حساب پوچھا جائے گا۔''

اس لئے ان کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنی دولت کو کہاں اور کس طرح صرف کرتے ہیں، ان لوگوں کو جو اپنے روپے کی تھیلیوں کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں، تنبیہ کی:

﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ ۝ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ﴾ (۱۰۴/ الهمزہ: ۱۔۴)

''برائی ہو اس کی جو طعنہ دیتا اور عیب چنتا ہے، جو مال کو سینت کر رکھتا ہے اور اس کو گن گن کر وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کے ساتھ سدا رہے گا ہرگز نہیں۔''

فرمایا: ''رشک کرنا صرف دو آدمیوں پر جائز ہے ایک تو اس پر جس کو خدا نے علم دیا ہے اور وہ اس کے

مطابق شب و روز عمل کرتا ہے اور دوسرے اس پر جس کو خدا نے دولت دی ہے اور وہ اس کو دن رات خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔'' [1] جو لوگ سونے چاندی کو زمین میں گاڑ کر رکھتے ہوں اور کار خیر میں خرچ نہ کرتے ہوں ان کو خطاب کیا:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴾ (۹/ التوبۃ:۳٤)

''وہ لوگ جو سونا اور چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔''

اس آیت پاک نے صحابہ میں دو فریق پیدا کر دیے، ایک کہتا تھا کہ جو کچھ ملے سب خدا کی راہ میں خرچ کر دینا چاہیے۔ کل کے لئے کچھ نہ رکھنا چاہیے، ورنہ جو شخص ایسا نہ کرے گا وہ اس آیت کے تحت میں عذاب کا مستحق ہوگا۔ دوسرا کہتا تھا، خدا نے ہماری دولت میں جو حق واجب ٹھہرایا ہے (یعنی زکوٰۃ) اس کے ادا کرنے کے بعد سرمایہ جمع کرنا عذاب کا مستوجب نہیں۔ لیکن اہل راز صحابہ اور علمائے امت نے اپنے قول و عمل سے اس مشکل کی پوری گرہ کھول دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توراۃ میں مقررہ زکوٰۃ ادا کرنے کے سوا مال کی خیرات کی کوئی تعلیم نہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل میں آسمانی بادشاہی کی کنجیاں اسی کے حوالہ کی گئی ہیں جو سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دے۔ یہ دونوں تعلیمات اپنی اپنی جگہ پر صحیح و درست ہیں، لیکن جس طرح پہلی تعلیم بعض بلند ہمت حوصلہ مندوں کے حوصلہ سے کم ہے، اسی طرح دوسری تعلیم جو یقیناً ایک بلند روحانی تخیل ہے، مگر وہ عملاً عام انسانوں کے حوصلہ سے بہت زیادہ ہے۔ اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک گونہ انسانی فطرت کے دائرہ سے باہر ہے اور اسی لئے بہت کم لوگ اس پر عمل کر سکے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم موسوی اور عیسوی دونوں شریعتوں کی جامع ہے۔ اسلام نے خیرات کے درجے مقرر کر دیے، ایک قانونی اور دوسری اخلاقی، قانونی خیرات کی وہی مقدار باقی رکھی جو موسوی شریعت میں ملحوظ تھی۔ یعنی نصف مثقال نقد میں اور عشر پیداوار میں، یہ وہ کم سے کم خیرات ہے جس کا سالانہ ادا کرنا ہر مستطیع اور صاحب نصاب پر واجب ہے اور اس کا وصول اور خرچ کرنا جماعت کا فرض ہے اور اخلاقی خیرات جس کو ہر انسان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا ہے۔ اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کی طرح بلند سے بلند روحانی تخیل کے مطابق قرار دیا اور بلند ہمت انسانوں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں دونوں قسم کے لوگ تھے، وہ بھی تھے جو کل کے لئے آج اٹھا کر رکھنا حرام سمجھتے تھے۔ جیسے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ [2] اور وہ بھی تھے جو وقت پر اپنی تمام دولت اسلام کے قدموں پر لا کر ڈال دیتے تھے۔ جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ [3] اور ایسے بھی تھے جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ خدا کی راہ میں بیک

[1] بخاری، کتاب العلم، باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ: ۷۳۔

[2] بخاری، کتاب الزکوۃ، باب ما ادی زکوتہ فلیس بکنز: ۱٤۰٦۔ [3] ترمذی، ابواب المناقب: ۳٦۷۵۔

وقت لٹا دیتے تھے، جیسے حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ [1] اور وہ بھی تھے جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا دیتے تھے۔ اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتے تھے۔ جیسے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور بعض انصار کرام، خدا نے ان کی مدح فرمائی:

﴿ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ ﴾ (۷۶/ الدھر: ۸)

''اور وہ اپنی ذاتی حاجت کے باوجود اپنا کھانا مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔''

﴿ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ ﴾ (۵۹/ الحشر: ۹)

''اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، اگر چہ وہ خود حاجت مند ہوں۔''

غرض محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم مختلف انسانی طبیعتوں کے موافق اور فطرتِ سلیمہ کے مطابق ہے اور ہر ایک کے لئے اس کی استعداد اور اہلیت کے مطابق نجات کا دروازہ کھولتی ہے۔ اس نے وہ طریقہ سکھایا ہے جس سے اہل حاجت اور نیک کاموں کے لئے عملاً ہر وقت امداد مل سکے اور ساتھ ہی اہل دل اور اہل استعداد کے مرتبہ کمال کے لئے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت اور ترغیب بھی پیش کر دی ہے اور اس کی خوبیاں اور برائیاں بھی بیان کر دی ہیں، تاکہ امت کے باحوصلہ افراد ہمت کے شہپروں سے اڑ کر اس سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں اسلام کے اس آخری مرتبہ کمال کی تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

وایں طائفہ، جان و مال درباختہ اند و باہیچ کس ماسوا اللّٰہ نہ پر داختہ اند گفتۂ ایشاں است الفقیر مالُھم مباح و دمہ ھدر یعنی درویش صادق آن بود کہ بخون و مال ادعوی نبود ... اگر مالش برند خوش گرد گوید الحمد للہ کہ حجابے از پیش من برداشتند تا گفتہ اند زکوٰۃ نعمت دنیا نزدیک ایں طائفہ محمود نبا شد از آنکہ بخل ناستودہ است، و بخلی تمام باید درم را دربند کند، ویکسال محبوس دارد آنگاہ پنج درم ازاں بد ہد.

''اس فرقہ نے اپنی جان اور مال کو ہار دیا ہے اور خدا کے سوا کسی سے دل نہیں لگایا۔ اس کا مقولہ ہے کہ درویش وہ ہے جس کا مال وقف اور جس کا خون معاف ہو۔ اس کو اپنی جان و مال پر کوئی دعویٰ نہ ہو۔ اگر لوگ اس کا مال اُٹھا لے جائیں تو خوش ہو کہ الحمد للہ، اس کے اور خدا کے درمیان جو ایک پردہ پڑا تھا وہ اٹھ گیا۔ یہاں تک کہ ان کا کہنا یہ ہے کہ دنیا کی دولت کو جمع کر

[1] اسد الغابۃ، ج۳، ص: ۳۱۶۔

کے زکوۃ دینا کچھ اچھا نہیں ہے۔ کیوں کہ بخالت تعریف کے قابل نہیں اور اس کے لئے کہ سال میں دو سو درہم جمع ہوں اور پھر وہ ایک سال تک بند پڑے رہیں، تب جا کر ایک سال کے بعد پانچ درہم ان میں سے خدا کی راہ میں دے، بڑی بخالت کی ضرورت ہے۔''

اس کے بعد حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے:

یکے از فقہا برسبیل آزمائش شبلی رحمۃ اللہ علیہ را پرسید کہ زکوٰۃ درچند لازم آید گفت جواب بر مذہب فقیہاں خواہی، یابر مذہب فقیراں؟ گفت بر ہر دو جواب فرما، شبلی رحمۃ اللہ علیہ گفت بر مذہب فقیہاں از دویست درم بعد از حولان حول پنجدرم باید داد و بر مذہب فقیراں درحال ہر دویست درم باید داد و جان بشکرانہ برسر بایدنہاد فقیہ گفت ما ایں مذہب از ائمہ دین گرفتیم شبلی گفت ما ایں مذہب از صادق رب العالمین گرفتیم یعنی ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ او ہر چہ داشت پیش سید عالم ﷺ نہاد و جگر گوشہ خویشتن بشکرانہ داد۔ [1]

''کسی نے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے امتحاناً پوچھا کہ زکوۃ کتنے پر ہوتی ہے، فرمایا فقہا کے مسلک پر جواب چاہتے ہو یا فقرا کے؟ کہا دونوں کے، فرمایا: فقہا کے مذہب کے مطابق ایک سال گزرنے پر دو سو درہم میں سے پانچ درہم اور فقرا کے مسلک پر فوراً پورے کے پورے دو سو اور اس نذرانہ کی خوشی میں اپنی جان بھی سر پر رکھ کر پیش کرنی چاہیے۔ فقیہ نے کہا: ہم نے یہ مذہب ائمۂ دین سے حاصل کیا ہے، فرمایا: ہم نے یہ مسلک صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے حاصل کیا ہے کہ جو کچھ تھا وہ سب سرور عالم ﷺ کے سامنے رکھ دیا اور اپنی جگر گوشہ (حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا) کو شکرانہ میں دیا۔''

محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتی مثال اسی دوسرے فریق کے مطابق تھی۔ آپ کے پاس عمر بھر کبھی اتنا جمع نہ ہوا کہ زکوۃ کی نوبت آئے، جو کچھ ہوتا وہ اسی دن اہل استحقاق میں تقسیم ہو جاتا۔ اگر گھر میں رات کو سونے چاندی کے چند خزف ریزے بھی پڑے رہتے، تو گھر میں آرام نہ فرماتے۔ مگر عام امت کے لئے اپنے مسلک کو فرض نہیں قرار دیا، بلکہ اتنا ہی ان کے لئے مقرر کیا گیا جو ان کی قوت، استطاعت اور ہمت کے مطابق ہو، تاکہ نجات کا دروازہ غریبوں اور دولت مندوں کے ہر طبقہ کے لئے یکساں کھلا رہے اور اس لئے، تاکہ بے

[1] مکتوب: ۳٤؛ سہ صدی، ص: ۹۱، ۹۲۔

قیدی وعدم پابندی لوگوں کی سستی اور عدم عمل کا باعث نہ ہو۔ مقدار معین کے مالک پر ایک رقم قانوناً فرض کی گئی، تا کہ جماعت کے مجبور ومعذور افراد کی لازمی طور سے دستگیری ہوتی رہے۔

اشتراکیت کا علاج

دنیا میں امیر وغریب کی جنگ ہمیشہ سے قائم ہے۔ ہر تمدن کے آخری دور میں قوم کے مختلف افراد کے درمیان دولت کی غیر مساوی صورت یقینی طور سے پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض طبقے نہایت دولت مند ہو جاتے ہیں جن کے خزانوں کے لئے زمین کا پورا طبقہ بھی کافی نہیں ہوتا اور دوسری طرف وہ غریب ہوتے ہیں جن کے پاس کھانے کے لئے ایک سوکھا ٹکڑا اور سونے کے لئے ایک بالشت زمین بھی نہیں ہوتی اور دولت مند طبقوں کی خودغرضی، خود پسندی اور عیاشی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے بھوکے اور ننگے بھائیوں کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا اور کپڑے کا ایک چیتھڑا تک دینے کے روادار نہیں ہوتے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اتفاقی دولت خدا کی طرف سے نہیں، بلکہ ان کے علم و ہنر، سعی وکوشش اور دست و بازو سے حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے ان سست و ناکارہ افراد کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ قارون کو جب زکوۃ وخیرات کا حکم ہوا تو اس نے جواب میں یہی کہا:

﴿ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ۭ ﴾ (۲۸/ القصص: ۷۸)

''مجھ کو تو ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے یہ سب ملا ہے۔''

چنانچہ ہر زمانہ کے قارونوں کا اپنی دولت کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد ہوتا ہے۔

یونان کے آخری دور میں یہی صورت پیدا ہوئی، ایران کے انتہائی زمانہ میں یہی شکل نمودار ہوئی، یورپ کی موجودہ فضا میں یہی آب وہوا اقتصادی مشکلات کی ابر وباد کا طوفان اور سیلاب پیدا کر رہی ہے۔ مزدور سرمایہ دار کی جنگ پورے زور پر قائم ہے اور سوشلزم، کمیونزم، انارکزم اور بالشوزم کے طوفان جگہ جگہ اٹھ رہے ہیں، لیکن دنیا میں مساوات اور برابری پیدا کرنے کے لئے یہ دنیا کے نئے خاکے تیار کرنے والے جو نقشے بنا رہے ہیں وہ انسانی فطرت وتربیت کے اس درجہ مخالف ہیں کہ ان کی دائمی کامیابی حد درجہ مشکوک ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے دنیا کی اس مشکل کا اندازہ کر لیا تھا اور اس نے اسی کے حل کرنے کے لئے یہ اصول مقرر کر دیا کہ ذاتی وشخصی ملکیت کے جواز کے ساتھ جس کی انسانی فطرت متقاضی ہے، دولت و سرمایہ کو چند اشخاص کے ہاتھوں میں جانے سے روکا جائے۔ سود کو حرام قرار دیا، متروکہ جائداد کو صرف ایک ہی شخص کی ملکیت قرار نہیں دیا۔ نفع عام کی چیزیں اشخاص کے بجائے جماعت کی ملکیت قرار دیں۔ قیصریت اور شہنشاہیت کی بجائے جماعت کی حکومت قائم کی۔ زمینداری کا پرانا اصول جن میں کاشتکار غلام کی حیثیت رکھتا تھا، بدل دیا اور اس کی حیثیت اجیر اور مزدور کی رکھی۔ انسانی فطرت کے خلاف یہ نہیں کیا کہ سرمایہ کو لے کر تمام انسانوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے، تا کہ دنیا میں کوئی ننگا اور بھوکا باقی نہ رہے، بلکہ یہ کیا کہ ہر سرمایہ دار پر جس

کے پاس سال کے مصارف کے بعد مقررہ رقم باقی بچ جائے اس کے غریب بھائیوں کی امداد کے لئے ایک سالانہ رقم قانونی طور سے مقرر کردی، تاکہ وہ اس کے ادا کرنے پر مجبور ہو اور جماعت کا فرض قرار دیا کہ وہ اس رقم سے قابل اعانت لوگوں کی دستگیری کرے، یہی وہ راز ہے، جس کی بنا پر اسلام کے تمدن کا دور اس قسم کی اقتصادی مصیبتوں سے محفوظ رہا اور آج بھی اگر اسلامی ممالک میں اس پر عمل درآمد ہو تو یہ فتنے زمین کے اتنے رقبہ میں، جتنے میں محمد رسول اللہ ﷺ کی روحانی حکومت ہے پیدا نہیں ہو سکتے، خلافت راشدہ کے عہد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے جب عرب میں دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے شام میں قرآن پاک کی اس آیت کے مطابق کہ ''جو لوگ سونا چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے'' یہ فتویٰ دیا کہ دولت کا جمع کرنا حرام ہے۔ [1] اور ہر شخص کے پاس جو کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ ہو وہ خدا کی راہ میں دے دے اور شام کے دولت مند صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کی مخالفت کی اور فرمایا کہ ہم خدا کی راہ میں دے کر بچاتے ہیں تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی یہ آواز عام پسند نہ ہو سکی اور نہ عوام میں کوئی فتنہ پیدا کر سکی، کیوں کہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا اور عرب کے آرام و آسائش کا یہ حال تھا کہ ایک زمانہ میں کوئی خیرات کا قبول کرنے والا باقی نہیں رہا۔ [2]

اقتصادی اور تجارتی فائدے

زکوٰۃ میں ان روحانی اور اخلاقی فائدوں کے ساتھ اقتصادی حیثیت سے دنیاوی فائدے کے پہلو بھی ملحوظ ہیں، اوپر گزر چکا ہے کہ زکوٰۃ انہیں چیزوں میں واجب ہوتی ہے جن میں دو صفتیں پائی جائیں، یعنی بقا اور نمو۔ بقا سے یہ مقصود ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکیں، کیوں کہ ہر چیز ایسی نہ ہوگی اس کی تجارت میں نہ چنداں فائدہ ہے اور نہ دوسروں کے استعمال کے لئے دیر تک ذخیرہ بن سکتی ہے، اسی لئے سبزیوں اور ترکاریوں پر زکوٰۃ نہیں ہے اور نمو سے یہ مقصد ہے کہ ان میں یا تو پیداوار یا تناسل یا مبادلہ کی بنا پر افزائش کی صلاحیت ہو۔ اسی لئے جواہرات اور دیگر قیمتی معدنی پتھروں میں یا غیر مزروعہ زمین اور مکان میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے، ان دونوں نکتوں سے یہ بات حل ہوتی ہے کہ شریعت نے زکوٰۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بیکار نہ رکھیں، بلکہ محنت، کوشش اور جدوجہد سے اس کو ترقی دیں ورنہ اصل سرمایہ میں سال بسال کمی ہوتی جائے گی جس کو فطرتاً کوئی برداشت نہیں کر سکتا، اس طرح زکوٰۃ کا ایک بالواسطہ مقصد یہ بھی ہے کہ تجارت وزراعت کو جو دولت کا اصل سرچشمہ ہیں ترقی دی جائے، کیوں کہ جب ہر شخص کو لازمی طور پر سال میں ایک خاص رقم ادا کرنا پڑے گی تو وہ کوشش کرے گا کہ جہاں تک ہو یہ رقم منافع سے ادا کرے اور اصل سرمایہ محفوظ رکھے، اسی بنا پر اسلام نے زکوٰۃ کو انہیں چیزوں کے ساتھ مخصوص کیا ہے جن

---

[1] مسند ابن حنبل، ج٥، ص: ١٧٦۔ [2] فتح الباری شرح بخاری، ج٦، ص: ٤٥١ و طبقات ابن سعد، ترجمة عمر بن عبدالعزیز، ص: ٢٥٦ جزء خامس فی اهل المدینة من التابعین۔

میں نمو اور اضافہ کی قابلیت ہو اور اسی بنا پر زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لئے ایک سال کی وسیع مدت مقرر کی، تاکہ ہر شخص اپنے مال یا جائیداد سے کامل طور پر فائدہ اٹھا سکے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس نکتہ کو سمجھ کر ہمیشہ تجارت اور کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان لوگوں کو جو یتیموں کے سرمایوں کے متولی تھے، ہدایت کی کہ وہ ان کو تجارت میں لگائیں، تاکہ ان کے بالغ ہونے تک ان کا اصل سرمایہ زکوٰۃ میں سب صرف نہ ہو جائے۔

یورپ نے بڑی تحقیق کے بعد ایشیا کے تجارتی اور تمدنی تنزل کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہاں مال کا اکثر حصہ بیکار زمین میں مدفون رکھا جاتا ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانِ وحی ترجمان نے آج سے تیرہ سو برس پہلے زکوٰۃ کو فرض کر کے یہ نکتہ بتا دیا تھا:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴾ (۹/ التوبة: ۳٤)

''اور جو لوگ چاندی اور سونے کو گاڑ کر رکھتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں نہیں صرف کرتے، ان کو سخت دردناک عذاب کی بشارت دو۔''

یہ دردناک عذاب قیامت میں تو جو کچھ ہوگا، وہ ہوگا اس دنیا میں بھی ان کے لئے اقتصادی دردناک عذاب یہ ہے کہ وہ اس مدفون سرمایہ کو دبا کر ملک کی دولت کو تباہ کرتے ہیں اور اس سے دولت کی افزائش اور ترقی کا کام لینے کے بجائے اس کو بیکار اور معدوم کر کے ملک کو فقر و محتاجی کے عذابِ الیم میں مبتلا کرتے ہیں اور بالآخر خود مبتلا ہوتے ہیں، اس لئے امرا کی اخلاقی اصلاح اور مالی ترقی اسی میں ہے کہ وہ اپنی دولت کو مناسب طور سے صرف کریں۔

فقرا کی اصلاح

اب دوسری طرف فقرا کا گروہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے تمام شارعین مذاہب نے انسانوں کے اس قابل رحم فرقہ کی جانب ہمدردی اور ترحم کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اس کی طرف امداد و اعانت کا ہاتھ بڑھایا ہے، مگر درحقیقت ان کے رحم، ہمدردی اور محبت کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی کے پھوڑا یا زخم ہوا اور اس کا دوست اس کی محبت اور خیر خواہی کی بنا پر ہمیشہ اس کے پھوڑے اور زخم کی حفاظت کرتا ہے کہ اس کو ٹھیس نہ لگے اور ٹوٹنے نہ پائے اور نہ کسی جراح کا نشتر اس کو چیرے کہ ان باتوں سے ان کو تکلیف ہوگی، کیا کوئی عقل مند کہہ سکتا ہے کہ اس نادان دوست کا یہ عمل اس کے ساتھ دوستی کا ثبوت ہوگا؟

گزشتہ مصلحین نے عموماً اس میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ بعض نے تو اس زخم میں صرف نشتر ہی لگایا ہے اور مرہم کا کوئی پھایا نہیں رکھا۔ چنانچہ زردشتی مذہب میں سوال قطعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے اور اس کے

بالمقابل بودھ مذہب میں اس زخم کو سرتاپا مادہ فاسد بننے دیا گیا ہے اور بھکشوؤں کا ایک مذہبی گروہ ہی سوال اور بھیک کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے نہایت حکمت کے ساتھ اس زخم کو بھرنے اور پھوڑے کو دور کرنے کے لئے ایک تجربہ کار اور ماہر جراح کی طرح دونوں عمل کئے ہیں۔ اس نے اس غمگین اور دردمند طبقہ کے زخم میں نشتر بھی لگایا ہے اور اس پر مرہم بھی رکھا ہے، یہ مرہم اس کی وہ مہربانیاں، تسلیاں، بشارتیں اور عملی امداد واعانت کی تدبیریں ہیں، جو اس کے دل کی ڈھارس اور اس کی امیدوں کا سہارا ہیں اور نشتر اس کی وہ اصلاحات ہیں جو اس نے اس طبقہ کو دنائت، پستی، کم ہمتی، لالچ، دوسروں کی دست نگری اور ان کے سہارے جینے کی ذلت سے بچانے کے لئے جاری کیں، اس نے اہل حاجت کے لئے دوسروں سے سوال اور مانگنے کی قانونی ممانعت نہیں کی۔ لیکن ہر اخلاقی طریق سے ان کو اس ذلت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کی کفالت کا بار خود جماعت کے سر پر ڈالا ہے۔ عام طور سے اس قسم کا وعظ جیسا کہ عیسائی مذہب میں ہے کہ جو کچھ ہے لٹادو اور غریبوں اور مسکینوں کو دے ڈالو۔ نہایت اعلیٰ اخلاقی تعلیم اور رحم ومحبت کا نہایت بلند مظہر نظر آتا ہے، لیکن غور سے تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جس شدت سے آپ دولت مندوں کو سب کچھ غریبوں اور مسکینوں کو دے دینے کی ترغیب دے رہے ہیں اور اس سے دینے والوں کے جذبہ ایثار اور ان کے جود وسخا اور فیاضی کے جوہر کو ترقی دے رہے ہیں، اسی شدت سے آپ انسانیت کے کثیر التعداد طبقے کو گداگری کی لعنت، بھیک مانگنے کی پستی اور دوسرے کے سہارے جینے کی ذلت کا خوگر بنا رہے ہیں اور بے محنت کھانے اور بے تلاش پانے کا سبق پڑھا رہے ہیں، اس طرح ان کے لیے گداگری، دنائت، پستی، ذلت، سفلہ پن، کم ہمتی، نامردی اور تمام رذیل پست اخلاق کا گڑھا تیار کر رہے ہیں، جہاں یہ تمام نجاستیں آکر جمع ہوں گی، کیا یہ انسانیت کے ساتھ رحم ہے؟ کیا یہ نوع بشر کے ساتھ محبت ہے؟ کیا یہ جنسِ بنی آدم کے ساتھ ہمدردی ہے؟

پیغمبر اسلام علیہ السلام کی بعثت کسی ایک طبقہ کی اصلاح کے لئے نہیں ہوئی، وہ انسانوں کے ہر طبقہ کے مصلح اور معلم بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ غریب وامیر اور مسکین ودولت مند دونوں آپ کی نگاہ میں یکساں ہیں، اس لیے آپ نے کسی ایک ہی طبقہ کی اصلاح کا فرض انجام نہیں دیا۔ بلکہ دونوں طبقوں کو ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ کر برابر باٹ سے ناپا ہے اور اپنی تعلیمات اور اصلاحات میں سے دونوں کو مساوی حصہ دیا ہے۔ یہ اخلاقی اصلاح کی وہ نازک پل صراط ہے، جس پر نبیوں کے خاتم اور دینوں کے مکمل کے سوا دنیا کے کسی اخلاقی معلم اور روحانی مصلح کے قدم نہ جم سکے اور نہ وہ اپنے ہاتھ میں ترازو کے دونوں پلڑوں کو برابر رکھ سکا۔ اگر غریبوں کی اصلاح کی خاطر صدقہ اور خیرات اور دوسروں کی اعانت وہمدردی کے تمام دروازے بند کردیے جائیں تو انسانی جوہر شرافت کی بربادی کے ساتھ امرا کا طبقہ اپنے اخلاقی معائب کی فراوانی اور کثرت سے ہلاک اور اخلاقی محاسن سے تمام تر تہی مایہ ہو جائے گا اور اگر غربا اور فقرا کو ہر قسم کی گداگری اور دریوزہ گری کی اجازت دے دی

جائے تو انسانوں کی وسیع آبادی کی اخلاقی زندگی تباہ و برباد ہو جائے گی۔اسی لیے داعی اسلام ﷺ نے انسانوں کے دونوں طبقوں کے سامنے خدا کی بتائی ہوئی وہ تعلیم پیش کی، جس سے دونوں طبقوں کو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے اخلاقی معیار کی ترقی کا موقع مل گیا اور دونوں کو اپنی اپنی شرافت کے جوہر کو پیش اور اپنے اپنے نقائص اور کمزوریوں کو دور کرنے کی صورت ہاتھ آئی۔ایک طرف تو اسلام نے امرا اور دولتمندوں کے طبقہ کو خطاب کر کے کہا:

﴿ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴾ (۹۳/ الضحیٰ:۱۰)

''مانگنے والے کو جھڑک نہ دے۔''

دوسری طرف خوددار و بے نیاز فقرا اور غریبوں کے طبقہ کی مدح فرمائی:

﴿ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۷۳)

''ناواقف ان کی خودداری اور سوال کی ذلت سے بچنے کے سبب سے ان کو دولت مند سمجھتے ہیں تو ان کو ان کی پیشانی سے پہچانتا ہے، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔''

اور بھیک مانگنے کو خلافِ تقویٰ قرار دیا، جو لوگ بھیک مانگ کر حج کرتے تھے ان کو خطاب کر کے کہا:

﴿ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۷)

''اور زادراہ لے کر چلو کہ بہترین زادراہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے۔''

ایک طرف دولتمندوں کو فرمایا کہ تمہارا احسن اخلاق یہ ہے کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو خالی مت لوٹاؤ ((وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ)) [1] ''اگرچہ چھوہارے کی ایک پھانک ہی کیوں نہ ہو۔'' دوسری طرف فقیروں کو فرمایا کہ ''تمہاری خودداری یہی ہونی چاہیے کہ کسی کے سامنے کبھی ہاتھ نہ پھیلاؤ کہ ((اليد العليا خير من اليد السفلى)) [2] ''اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔'' (یعنی لینے والے ہاتھ سے دینے والا ہاتھ بہتر ہے) یہ ہے وہ تعلیم جس نے انسانوں کے دونوں طبقوں کو اپنے فیض سے معمور کیا اور دونوں کے لئے اپنے اخلاق کی اصلاح کا موقع بہم پہنچایا۔صدقہ و خیرات درحقیقت وہ پانی ہے، جو دینے والوں کے قلوب و نفوس کے تمام میل اور گندہ پن کو چھانٹ کر ان کو پاک و صاف بنا دیتا ہے۔لیکن وہ خود جب اس میل اور گندہ پن کو لے کر باہر نکلتا ہے تو حرص و طمع کے پیاسے اس کو چلو میں لے کر پینے لگتے ہیں، اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((ان هذه الصدقات انما هي اوساخ الناس)) [3]

---

[1] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب اتقوا النار ولو بشق تمرة:۱۴۱۷۔ [2] ایضًا، باب لا صدقة الا عن ظهر غنیٰ:۱۴۲۹۔ [3] مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب ترك استعمال آل النبی ﷺ علی الصدقة:۲۴۸۲۔

''یہ صدقہ تو لوگوں کا میل ہے۔''

اگر آج ان فقیروں اور گداگروں کی صورتوں اور سیرتوں پر نظر ڈالو جو استحقاق شرعی کے بغیر اس مال سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو نظر آ جائے گا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے اس کو لوگوں کے دلوں کا میل کہہ کر کتنی بڑی حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔

حرص، طمع، لالچ، فریب، بے حیائی، بے غیرتی اور وہ تمام باتیں جو ان کے لازمی اخلاقی نتائج ہیں، ان میں سے کونسی چیز ہے۔ جو غیر مستحق ابناء السبیل، فقرا اور مہذب گداگروں کا تمغائے امتیاز نہیں اور در حقیقت یہی وہ میل ہے جو زکوۃ دینے والوں کے دامن سے چھٹ کر فقرا اور گداگروں کے دامن دل کو نجس بنا دیتا ہے۔ تاہم اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بعض دفعہ قدرتاً ایسی مجبوریاں پیش آ جاتی ہیں، جب نفیس الطبع سے نفیس الطبع انسان کو اپنی جان بچانے کے لئے گندے سے گندہ اور میلے سے میلا پانی کے پی لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اور اس وقت اس اجازت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ایسے مجبور اشخاص کو شخصی طور سے صدقہ و خیرات کے قبول کرنے کی اجازت دی جائے۔ شریعتِ محمدیہ نے اسی اصول پر اسی حیثیت سے لوگوں کو اس کے قبول کرنے کی اجازت دی ہے اور اس مجبورانہ قبول سے اس گروہ کے اخلاق و عادات پر جو برے اثرات طاری ہو سکتے ہیں، ان کے انسداد اور دفعیہ یا ان کو کم سے کم مضر بنانے کے لئے مفید تدابیر اختیار کی ہیں اور چند نہایت مناسب احکام جاری کئے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1 اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ صدقہ اور زکوۃ کو خالصتاً لوجہ اللہ ادا کیا جائے، یعنی لینے والے پر نہ کسی قسم کا احسان کا بار رکھا جائے نہ اس کو ممنون کرم بنایا جائے، نہ عام مجمع میں اس کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے دیا جائے، کیوں کہ اس سے ایک طرف اگر دینے والے کی اخلاقی پستی اور دنائت ظاہر ہوتی ہے تو دوسری طرف خود اس طرح کے لینے والے کی خودداری کی روح اور اخلاقی غیرت کی حس کو صدمہ پہنچتا ہے اور بجائے اس کے کہ لینے والا اس طرح دینے والے کا ممنون ہو، اس کو اس کے اس فعل سے پہلے تو نفرت ہوگی، پھر رفتہ رفتہ شائد اس کی یہ اخلاقی حس غیرت اور شرمندگی کا شریفانہ جوہر ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے یا ان میں بڑے ظرف کے شریف النفس لوگ ہوں، وہ اپنی نظر میں اپنی ذلت آپ محسوس کر کے اپنی جان پر کھیل نہ جائیں۔

اسلام نے انہیں باتوں کو سامنے رکھ کر یہ تعلیم دی کہ دینے والوں کے سامنے یہ نظریہ ہو کہ

﴿ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝ ﴾ (۷۶/ الدھر: ۹)

''ہم تم کو خدا کے لئے کھلاتے ہیں، ہم تم سے کوئی بدلہ اور شکریہ نہیں چاہتے۔''

اس شریفانہ تعلیم کو دیکھو کہ بدلہ تو کجا ہم کو تمہاری احسان مندی اور شکر گزاری بھی نہیں چاہیے۔ پھر صدقہ دینے والوں کو بہ تصریح بتا دیا کہ تمہارے احسان دھرنے، طعنہ دینے یا لینے والے کو ذلیل و رسوا کرنے سے

تمہارے اس عظیم الشان کارنامہ کی حقیقت باطل ہو جائے گی اور تمام ثواب حرف غلط کی طرح تمہارے نامہ اعمال سے مٹ جائے گا۔ فرمایا:

﴿ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۝ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَاۤ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ۝ ﴾ (۲/ البقرة :۲٦۳)

''جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور اس کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں، نہ طعنہ دیتے ہیں، ان کا اجران کے خدا کے پاس امانت ہے اور نہ ان کو قیامت میں کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے، کچھ نرمی کی بات کہہ کر اور چشم پوشی کر کے سائل کو ٹال دینا اس صدقہ سے بہتر ہے، جس کے بعد طعنہ دیا جائے یا احسان جتایا جائے، خدا تمہاری ایسی خیرات سے بے نیاز ہے اور تمہارے ایسے کاموں پر بردباری سے درگزر کرنے والا ہے۔''

اس حقیقت کو قرآن پاک نے ایک دل نشین تشبیہ سے واضح کیا ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ۝ ﴾

(۲/ البقرة:۲٦٤)

''مسلمانو! اپنے صدقوں کو احسان جتا کر اور طعنہ دے کر، برباد نہ کرو، جیسے کہ وہ اپنے صدقوں کو برباد کرتا ہے، جو محض لوگوں کے دکھلانے کو دیتا ہے اور خدا پر اور قیامت پر ایمان نہیں لاتا اس قسم کی خیرات کی مثال اس چٹان کی ہے جس پر کچھ گرد پڑی ہوئی ہو اور اس پر ایک پانی پڑ گیا ہو جس نے اس کو صاف اور چٹیل کر دیا کہ اب اس پر کوئی چیز جم نہیں سکتی ہے، ان لوگوں نے جو کام کیا اس سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکے، خدا کافروں کو ہدایت یاب نہیں کرتا۔''

منجملہ اور اسباب کے یہ بھی ایک سبب ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ مقرر کیا کہ دینے والے خود کسی کو نہ دیں، بلکہ وہ اس کو امیر جماعت کے بیت المال میں جمع کریں اور وہ امیر حسب ضرورت مستحقین کو بانٹ دے، تا کہ اس طرح غریب لینے والا مگر شریف مسلمان ذاتی طور سے کسی دوسرے شخص کا ممنون احسان بن کر اپنی ذلت نہ محسوس کرے اور دینے والے کو ذاتی طور سے کسی پر منت رکھنے کا موقع نہ ملے اور اس طرح پوری قوم کا اخلاقی معیار اپنی پوری بلندی پر قائم رہے، ساتھ ہی یہ کہ فقرا اور معذوروں کو دربدر کی ٹھوکر کھانے کی رسوائی اور ہر ضرورت کے لئے ایک ایک پیسہ کی بھیک جمع کرنے کی ذلت سے بچایا جائے۔

2 اسی لیے صدقہ دینے کا دوسرا اصول اسلام نے یہ بتایا کہ صدقہ چھپا کر دیا جائے۔ کہ علانیہ دینے میں بھی سائل بے حیائی اور بے غیرتی کا عادی ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ جب کسی کی ذلت اور فقر و فاقہ کی داستان عام ہو جاتی ہے تو پھر اپنے فعل سے اس کو غیرت اور شرم نہیں آتی اور اس لئے اس کا ڈر تھا کہ اگر اس کا انسداد نہ کیا جائے تو اظہار و اعلان کا یہ طریقہ دنیا میں گداگری، دریوزہ گری اور بھیک مانگنے کے پیشہ کی اشاعت کا سبب بن جائے گا اور یہ اخفا اور چھپا کر دینے کی صورت اس لئے بھی اچھی ہے کہ دینے والا نمائش اور شہرت طلبی کی آلائشوں سے اپنے اخلاق کو محفوظ رکھ سکے گا۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”بہتر صدقہ وہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔“ 1 لیکن بعض موقعے ایسے بھی ہیں کہ جہاں صدقہ خیرات اور زکوٰۃ کے اعلان کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ دوسروں کو ترغیب اور تشویق دلانے کی خالص نیت ہو، یا خود سائل پیش دستی کر کے مجمع میں سوال کر بیٹھے یا اور کوئی نیک غرض شامل ہو۔ چنانچہ قرآن پاک نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا:

﴿ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ ﴾

(۲/ البقرۃ: ۲۷۱)

”اگر تم صدقہ کو کھلم کھلا دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر تم اس کو چھپا کر فقرا کو دو تو یہ بہت ہی بہتر ہے۔“

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں صدقہ کے اخفا کو عام خیرات کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ مگر فرض زکوٰۃ کے لئے اس بنا پر اظہار و اعلان کو مستحق قرار دیا ہے کہ اس سے اسلام کے ایک رُکن کی اشاعت اور تبلیغ اور دوسروں میں اس کی پیروی کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے اور زکوٰۃ دینے والے عدم ادائے زکوٰۃ کی تہمت سے بری خیال کئے جاتے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک آیتِ کریمہ کا مفہوم صاف ہے۔ زکوٰۃ کے ادا کرنے کا اصلی طریقہ تو وہی ہے جو عہدِ نبوی میں تھا، یعنی یہ کہ زکوٰۃ کی رقم بیت المال یا بیت المال کے عاملوں کے سپرد کی جائے، اس لئے اخفا کا جو فائدہ فقرا کے حق میں ہے، وہ اس طرح خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن آیت کا اشارہ یہ ہے کہ اگر تم خود براہ راست فقیروں کو دو تو چھپا کر دینا بہتر ہے کہ لینے والے کی عزت سلامت رہے اسی لئے جس آیت میں اعلان کی اجازت ہے، اس میں فقرا کو براہ راست دینے کا حکم نہیں اور جہاں اخفا کے ساتھ دینے کا ذکر ہے، وہاں فقرا کو دینے کی تصریح ہے۔ اس لئے اعلان اور اخفا کا اصلی فرق زکوٰۃ اور عام خیرات کے درمیان نہیں ہے، بلکہ ادا کرنے کے طریقہ میں ہے کہ اگر بیت المال اور نائبین بیت المال کے ذریعہ سے ادا کرو تو ظاہر کر کے دو کہ دینے والے اور وصول کرنے والے دونوں کا حساب پاک رہے اور تہمت اور بدگمانی کا موقع نہ ملے۔ لیکن اگر کسی سبب سے تم کو براہِ راست مستحقین کو دینا پڑے، جس میں حساب کتاب

1 صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب فضل اخفاء الصدقۃ: ۲۳۸۰۔

کی ضرورت نہیں اور براہ راست آپ ہی کو ان کو دینا ہے۔ بیت المال کا پردہ بیچ میں نہیں ہے، اس لئے تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ چھپا کر دو، تاکہ دینے والا نمائش سے اور لینے والا ذلت وخواری سے محفوظ رہے۔ پھر ترغیبِ اعلان اور اظہار کی ضرورت اس وقت ہے جب مسلمان کا مذہبی احساس اس قدر کمزور ہو جائے کہ حقوقِ اسلام ادا کرنے میں اس قسم کی فقیہانہ ٹھوکروں کی ضرورت ہو، ورنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ترغیب کے لئے صرف اسلام کا خالص جوش کافی تھا۔ مگر آج تو یہ حالت ہے کہ معمولی سی معمولی رقم کے لئے جب تک اخباروں کے پورے کالم سیاہ نہ کر دیے جائیں، دینے والوں کے نزدیک خدا کو ان کے عطیہ کی خبر ہی نہیں ہوتی۔

3 تمام اخلاقی اور تمدنی ترقی کا دار ومدار صرف بلند ہمتی اور عالی خیالی پر ہے۔ بلند ہمتی کا اقتضا یہ ہے کہ مسلمان کی نگاہ بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچ کر نہ ٹھہرے اور اس کو دنیا کی تمام چیزیں ہیچ نظر آئیں، اس بنا پر اسلام نے یہ اصول قرار دیا کہ زکوۃ وصدقہ میں مال کا عمدہ اور بہتر حصہ دیا جائے، تاکہ مبتذل اور ادنیٰ درجہ کی چیزوں کے دینے اور لینے سے دینے والے اور لینے والے کے اندر پستی اور دنائت نہ پیدا ہو۔ کیوں کہ اس سے لینے والے کے اندر حد درجہ کا لالچ اور چھچھورپن پیدا ہوگا کہ معمولی اور سڑی گلی چیز تک اس کے لالچ سے نہیں بچ سکتی اور دوسری طرف دینے والے کی روح میں بھی اس قسم کی خیرات سے بلندی اور علو کے بجائے بخالت حرص اور کینہ پن اور تزکیہ کے بجائے اور زیادہ نجاست اور گندگی پیدا ہوگی، کیوں کہ کوئی بری چیز کسی کو دے دینے کا منشا دوسرے کی مدد اور خدا کی خوشنودی کا خیال نہیں ہوتا۔ بلکہ اس بیکار اور سڑی گلی چیز سے اپنے دامن اور صحن خانہ کو صاف کرنا ہوتا ہے، اس لئے اس سے دینے والے کے دل میں صفائی کی بجائے اور گندگی پیدا ہوتی ہے۔ روایتوں میں ہے کہ اصحاب صفہ کو جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد صرف اسلام کی خدمت اور خدا کی عبادت قرار دیا تھا، کسب معاش کا موقع نہیں ملتا تھا، اس لئے لوگ کھجوروں کے بدمزہ خوشے لاکر مسجدوں میں لٹکا دیتے تھے اور جب وہ گروہ بھوک کی شدت سے بے تاب ہو جاتا تھا تو مجبوراً ان میں سے دو چار کھجوریں توڑ کر کھا لیتا تھا، چونکہ یہ نہایت ذلیل حرکت تھی، اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶۷)

''مسلمانو! اپنی کمائی سے اور اس چیز سے جو تمہارے لئے ہم نے زمین سے نکالی ہے۔ بہتر حصہ خیرات کرو اور ان میں سے ردّی مال کی خیرات کا قصد نہ کرو۔ حالانکہ اگر وہی تم کو دیا جائے تو خود تم نہ لو گے، لیکن یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ اور یقین کرو کہ خدا تمہاری اس قسم کی خیرات سے بے نیاز ہے اور وہ خوبیوں والا ہے۔ (خوبیوں ہی والی چیز پسند کرتا ہے)۔''

❹ فقرا اور مساکین کی دنائت اور حرص وطمع کے زائل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں لوگوں کو زکوٰۃ اور صدقہ کا حقیقی مستحق قرار دیا جائے جو باوجود تنگ دستی اور بے بضاعتی کے خودداری اور قناعت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، کیوں کہ جب قوم کی توجہ اس قسم کے اشخاص کی طرف مبذول ہوگی تو ہر شخص خود بخود ان اخلاق کی تقلید پر مجبور ہوگا، صحابہ کرام میں سب سے زیادہ مفلس اور نادار اصحاب صفہ تھے۔ لیکن ان کی خودداری اور قناعت کا یہ حال تھا کہ پریشانی صورت کے علاوہ کوئی چیز ان کے فقر وفاقہ کا راز فاش نہیں کرسکتی تھی۔ اس بنا پر اسلام نے ان کو زکوٰۃ کا بہترین مستحق قرار دیا:

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۳)

''صدقہ ان فقرا کے لئے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں۔ (بغرضِ معاش وتجارت) سفر کی قدرت نہیں رکھتے جو لوگ ان سے ناواقف ہیں، خودداری اور عدم سوال کی وجہ سے ان کو مالدار سمجھتے ہیں، تم صرف ان کے بشرہ سے ان کو پہچانتے ہو، وہ لوگوں سے گڑگڑا کر کچھ نہیں مانگتے۔''

آج مسلمانوں نے اس اصول کو چھوڑ دیا ہے، جس کا یہ نتیجہ ہے کہ سینکڑوں شریف آدمی در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں اور قوم اور خاندان کا نام بیچتے ہیں۔

❺ لیکن بایں ہمہ جزم واحتیاط گداگری درحقیقت ایک نہایت مبتذل شیوہ ہے، اس بنا پر اسلام نے سخت مجبوری کی حالت میں اس کی اجازت دی اور جہاں تک ممکن ہوا لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بعضوں سے اس کی بیعت بھی لی کہ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگیں گے انہوں نے اس بیعت کی اس شدت سے پابندی کی کہ راستہ میں اگر ان میں سے کسی کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھی وہ کسی سے نہیں کہتے تھے کہ اٹھا دو۔ [1] ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص مجھ سے یہ ضمانت کرے کہ وہ کسی سے مانگے گا نہیں تو میں اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں۔'' آپ کے آزاد کردہ غلام ثوبان بولے، میں یہ ضمانت کرتا ہوں۔ چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے۔ [2]

حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ سے سوال کیا، آپ نے عنایت کیا، پھر مانگا، پھر دیا، پھر تیسری دفعہ یہ صورت پیش آئی تو فرمایا: ''اے حکیم! یہ مال بظاہر نہایت شیریں اور خوش رنگ چیز ہے، جو اس کو شرافت کے ساتھ لے گا اس کو اس میں برکت دی جائے گی اور جو لالچ کے ساتھ لے گا اس کو برکت نہ ملے گی اور اس کی حالت ایسی ہوگی جیسے کوئی کھاتا چلا جائے اور اس کا پیٹ نہ بھرے، اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔'' حکیم نے کہا، یا رسول اللہ! آج سے میں پھر کسی سے کچھ نہ

[1] ابوداود، کتاب الزکوٰۃ، باب کراھیۃ المسئلۃ:۱٦٤٢۔ [2] ایضا: ١٦٤٣۔

مانگوں گا۔اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں خلفا ان کو اپنا وظیفہ لینے کے لئے بلاتے تھے اور وہ انکار کرتے رہے اور آخر تک اس انکار پر قائم رہے۔ ❶

اس کی اور متعدد مثالیں ہیں اس عمومی ممانعت کے ساتھ خصوصیت سے ان تمام لوگوں کے لئے جو صاحب دست و بازو ہوں، یعنی جن کے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں صحیح و سالم ہوں، بھیک مانگنے سے سخت ممانعت کر دی گئی، فرمایا کہ

((لا تحل الصدقة لغنی ولا لذی مِرّة سوِیٍّ)) ❷

''غیر محتاج اور صحیح و سالم آدمی کے لئے بھیک مانگنا حلال نہیں۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ، آپ ﷺ نے فرمایا:

((والذی نفسی بیده لأن یاخذ احدکم حبله فیحتطب علی ظهره خیر له من ان یأتی رجلاً فیسأله أعطاه او منعه)) ❸

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم میں کسی کا رسی لے کر اپنی پیٹھ پر لکڑی کا بوجھ اٹھانا، اس سے بہتر ہے کہ دوسرے سے بھیک مانگے وہ اسے دے یا نہ دے۔''

آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانہ میں اس پر عمل بھی فرمایا۔ایک دست نگر صحابی نے خیرات مانگی آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے پاس کچھ ہے؟'' عرض کی، ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے۔آپ نے ان کو منگوا کر نیلام کیا اور ان کی قیمت سے ایک کلہاڑی خرید دی اور فرمایا کہ ''جنگل سے لکڑی کاٹ لاؤ اور بیچو۔'' انہوں نے اس پر عمل کیا تو خدا نے ان کو یہ برکت دی کہ وہ گداگری کی ذلت سے ہمیشہ کے لئے بچ گئے۔ ❹

❻ لیکن جو لوگ بدقسمتی سے کسب معاش نہیں کر سکتے۔ان کو بھی الحاح، کثرت سوال، لجاجت اور گڑگڑا کر زبردستی مانگنے کی نہایت سختی کے ساتھ ممانعت کی، آپ ﷺ نے فرمایا:

((لیس المسکین الذی ترده الا کلة والا کلتان ولکن المسکین الذی لیس له غنی ویستحی او لا یسأل الناس الحافا)) ❺

''مسکین وہ نہیں ہے جس کو لقمہ دو لقمے دروازوں سے واپس لوٹا دیتے ہیں۔مسکین وہ ہے جو گو بے نیاز نہیں ہے، لیکن حیا کرتا ہے اور لوگوں سے گڑگڑا کر نہیں مانگتا۔''

پھر یہ بھی بتا دیا کہ گداگری اور بھیک کا طریقہ جو سخت مجبوری کی حالت کے علاوہ ہو، وہ ہر حال میں

❶ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب الاستعفاف عن المسئلة: ١٤٧٢۔ ❷ ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، باب ماجاء من لا تحل له الصدقه:٦٥٢۔ ❸ کتاب الزکوٰۃ، باب الا ستعفاف عن المسئلة: ١٤٧٠۔

❹ ابوداود، کتاب الزکوٰۃ، باب ماتجوز فيه المسئلة:١٦٤١۔

❺ بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب قول الله عزوجل: لا یسألون الناس الحافا: ١٤٧٦۔

انسان کی شرم وحیا اور غیرت وآبرو کو برباد کر دیتا ہے، فرمایا:

((ما زال الرجل یسئل الناس حتی یأتی یوم القیامة لیس فی وجهه مزعة لحم)) ❶

"آدمی ہمیشہ مانگتا پھرتا ہے، یہاں تک کہ وہ قیامت کے روز اس طرح آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا نہ ہوگا۔"

یہ اس کی سزا ہوگی کہ اس نے دنیا میں مانگ مانگ کر اپنے چہرہ سے عزت وآبرو کی رونق خود دھو دی تھی۔

ان ضروری اصلاحات کے ساتھ اسلام نے زکوٰۃ کے نظام کو قائم کیا اور ان تمام برائیوں اور بداخلاقیوں کی جڑ کاٹ دی جو اس مفت خوری سے انسانوں میں پیدا ہو سکتی تھیں اور ساتھ ہی انسانی برادری کے دونوں طبقوں کو ترازو کے پلڑے میں برابر رکھ کر ان کو باہمی معاونت، باہمی مشارکت، باہمی ہمدردی اور امداد کا سبق سکھایا اور اس طرح پوری جماعت انسانی کو باہم جوڑ کر ایک کر دیا۔ پست وبلند کے تفرقے ممکن حد تک کم کر دیے اور اس اقتصادی بربادی سے جماعت کو محفوظ رکھنے کا طریقہ بتا دیا جو اکثر اپنی بھیانک شکلوں سے اس کو ڈرایا کرتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت مند صحابہ رضی اللہ عنہم میں یہ فیاضی آ گئی کہ وہ دین وملت کی خدمت کے لئے اپنی ساری دولت لٹا کر بھی سیر نہ ہوتے تھے اور غریب صحابیوں میں یہ قناعت اور خودداری پیدا ہوگئی کہ وہ کسی سے کسی کام کا سوال کرنا بھی عیب سمجھتے تھے۔ دولت مند اپنی زکوٰۃ آپ لے کر بیت المال کے دروازوں تک خود آتے تھے اور غریب اپنے افلاس وحاجت کو خدا کے سوا دوسروں کے سامنے پیش کرنا توکل کے منافی سمجھتے تھے اور تیسری طرف آنحضرت ﷺ کے بعد جب فراغت آئی تو جماعت کے بیت المال میں اتنا سرمایہ رہتا تھا کہ زکوٰۃ کے کسی مصرحہ مصرف کے لئے کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ضرورت مندوں کو اسی رقم سے قرض بھی دیا جاتا تھا ❷ اس طرح یہ ایک ایسا مالی واقتصادی نظام تھا کہ بلانفع قرض دینے میں افراد کو جو تامل ہوتا ہے، وہ اس جماعتی نظام کے ماتحت آسان تھا اور سود کی لعنت کے بغیر داد وستد کا راستہ کھلا ہوا تھا۔

❶ بخاری، کتاب الزکوٰة، باب من سأل الناس تکثرا: ١٤٧٤۔

❷ تفسیر کبیر، سورة توبة، ج ٤، ص: ٦٨١۔

روزہ

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۳)

روزہ کا مفہوم

روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے، عربی میں اس کو صوم کہتے ہیں، جس کے لفظی معنی رکنے اور چپ رہنے کے ہیں۔ بعض مفسرین کی تفسیروں کے مطابق قرآن پاک میں اس کو کہیں کہیں ''صبر'' بھی کہا گیا ہے، جس کے معنی ضبط نفس، ثابت قدمی اور استقلال کے ہیں۔ ان معنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی زبان میں روزہ کا کیا مفہوم ہے؟ وہ درحقیقت نفسانی ہوا و ہوس اور بہیمی خواہشوں سے اپنے آپ کو روکنے اور حرص و ہوا کے ڈگمگا دینے والے موقعوں میں اپنے آپ کو ضابط اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے۔ روزانہ استعمال میں عام طور سے نفسانی خواہشوں اور انسانی حرص و ہوا کا مظہر تین چیزیں ہیں، یعنی کھانا، پینا اور عورت و مرد کے جنسی تعلقات، انہیں سے ایک مدت متعینہ تک رکے رہنے کا نام شرعاً روزہ ہے۔ لیکن دراصل ان ظاہری خواہشوں کے ساتھ باطنی خواہشوں اور برائیوں سے دل اور زبان کا محفوظ رکھنا بھی خواص کے نزدیک روزہ کی حقیقت میں داخل ہے۔

روزہ کی ابتدائی تاریخ

روزہ کی ابتدائی تاریخ معلوم نہیں۔ انگلستان کا مشہور حکیم ہربرٹ اسپنسر اپنی تصنیف پرنسپلز آف سوشیالوجی (اصول معاشرت) میں چند وحشی قبائل کی تمثیل اور استقرا کی بنا پر قیاس کرتا ہے کہ روزہ کی ابتدا اصل میں اسی طرح ہوئی ہوگی کہ لوگ وحشت کے زمانہ میں خود بھوکے رہتے ہوں گے اور سمجھتے ہوں گے کہ ہمارے بدلہ ہمارا کھانا اس طرح مردوزن کو پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ قیاس ارباب خرد کی نگاہ میں سند قبول حاصل نہ کر سکا۔ [1] بہرحال مشرکانہ مذاہب میں روزہ کی ابتدا اور حقیقت کے خواہ کچھ ہی اسباب ہوں، لیکن اسلام کا روزہ اپنی ابتدا اور غایت کی تشریح میں اپنے پیروؤں کی وکالت کا محتاج نہیں، وہ بہ آواز بلند مدعی ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۳)

''مسلمانو! روزہ تم پر اسی طرح فرض ہوا جس طرح تم سے پہلی قوموں پر فرض کیا گیا، تاکہ تم پرہیزگار بنو۔''

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ج ۱۰، ص: ۱۹۴ طبع ۱۱۔

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

’’ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو انسانوں کے لیے سرتاپا ہدایت، ہدایت کی دلیلیں اور حق و باطل میں فارق بن کے آیا تو جو اس رمضان کو پائے وہ اس مہینہ بھر کے روزہ رکھے، اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو وہ دوسرے دنوں میں رکھ لے۔ خدا آسانی چاہتا ہے سختی نہیں، تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور (یہ روزہ اس لیے فرض ہوا) تاکہ تم خدا کے اس ہدایت دینے پر اس کی بڑائی کرو اور تاکہ تم شکر بجالاؤ۔‘‘

ان آیات پاک میں نہ صرف روزہ کے چند احکام بلکہ روزہ کی تاریخ، روزہ کی حقیقت، رمضان کی ہیئت اور روزہ پر اعتراض کا جواب یہ تمام امور مفصل بیان ہوئے ہیں، ذیل کے صفحات میں بہ ترتیب ہم ان پر روشنی ڈالتے ہیں۔

روزہ کی مذہبی تاریخ

قرآن پاک نے ان آیتوں میں تصریح کی ہے کہ روزہ اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اسلام سے پہلے بھی وہ کل مذاہب کے مجموعہ احکام کا ایک جزو رہا ہے۔ جاہل عرب کا پیغمبر امی ﷺ جو بقول مخالفین عالم کی تاریخ سے ناواقف تھا، وہ مدعی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ فرض عبادت رہا ہے۔ اگر یہ دعویٰ تمام تر صحت پر مبنی ہے تو اس کے علم کے مافوق ذرائع میں کیا شک رہ جاتا ہے؟ اس دعویٰ کی تصدیق میں یورپ کے محقق ترین ماخذ کا ہم حوالہ دیتے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار روزہ (فاسٹنگ) کے بارے میں لکھتا ہے:

’’روزہ کے اصول اور طریقے گو آب و ہوا قومیت و تہذیب اور گرد و پیش کے حالات کے اختلاف سے بہت کچھ مختلف ہیں، لیکن بہ مشکل کسی ایسے مذہب کا نام ہم لے سکتے ہیں، جس کے مذہبی نظام میں روزہ مطلقاً تسلیم نہ کیا گیا ہو۔‘‘

آگے چل کر لکھتا ہے:

’’گو کہ روزہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے۔‘‘

ہندوستان کو سب سے زیادہ قدامت کا دعویٰ ہے، لیکن برت یعنی روزہ سے وہ بھی آزاد نہیں، ہر ہندی مہینہ کی گیارہ بارہ کو برہمنوں پر اکاوشی کا روزہ ہے۔ اس حساب سے سال میں چوبیس روزے ہوئے۔ بعض برہمن کاتک کے مہینہ میں، ہر دوشنبہ کو روزہ رکھتے ہیں۔ ہندو جوگی چلہ کشی کرتے ہیں، یعنی چالیس دن تک اکل و شرب سے احتراز کرتے ہیں۔ ہندوستان کے تمام مذاہب میں جینی دھرم میں روزہ کے سخت شرائط ہیں۔ چالیس چالیس دن تک کا ان کے یہاں ایک روزہ ہوتا ہے۔ گجرات و دکن میں ہر سال جینی کئی کئی ہفتہ کا

روزہ رکھتے ہیں۔قدیم مصریوں کے ہاں بھی روزہ دیگر مذہبی تہواروں کے شمول میں نظر آتا ہے۔یونان میں صرف عورتیں تھموفیریا کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی ہیں، پارسی مذہب میں گو عام پیروؤں پر روزہ فرض نہیں لیکن ان کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم ان کے ہاں موجود تھا،خصوصاً مذہبی پیشواؤں کے لیے تو پنج سالہ روزہ ضروری تھا۔ ❶ یہودیوں میں بھی روزہ فریضۂ الٰہی ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر چالیس دن بھوکے پیاسے گزارے۔(خروج ۳۴۔۲۸ العہد القدیم،ص:۱۴۵) چنانچہ عام طور سے یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی میں چالیس دن روزہ رکھنا اچھا سمجھتے ہیں۔لیکن چالیس دن کا روزہ ان پر فرض ہے۔جو ان کے ساتویں مہینہ (تشرین) کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے اور اسی لیے اس کو عاشورہ (دسواں) کہتے ہیں یہی عاشورا کا دن وہ دن تھا،جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات کے دس احکام عنایت ہوئے تھے۔اسی لیے تورات میں اس دن کے روزہ کی نہایت تاکید آئی ہے۔ ❷ اس کے علاوہ یہودی صحیفوں میں اور دوسرے روزوں کے احکام بھی بتصریح مذکور ہیں۔ ❸

عیسائی مذہب میں آکر بھی ہم کو روزوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی چالیس دن تک جنگل میں روزہ رکھا۔ ❹ حضرت یحییٰ علیہ السلام جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گویا پیشرو تھے، وہ بھی روزے رکھتے تھے اور ان کی امت بھی روزہ دار تھی۔ ❺ یہود نے مختلف زمانوں میں مختلف واقعات کی یادگار میں بہت سے روزے بڑھا لیے تھے اور وہ زیادہ تر،غم کے روزے تھے اور اس غم کو ظاہر کرنے کے لیے اپنی ظاہری صورت کو بھی وہ اداس اور غمگین بنا لیتے تھے ❻ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانے میں غم کے ان مصنوعی روزوں کو منع کر دیا۔غالباً اسی قسم کے کسی روزہ کا موقع تھا کہ بعض یہودیوں نے آکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اعتراض کیا کہ بڑے شاگرد کیوں روزہ نہیں رکھتے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا:

> ''کیا براتی جب تک دولہا ان کے ساتھ ہے،روزہ رکھ سکتے ہیں، جب تک دولہا ان کے پاس ہے،روزہ نہیں رکھ سکتے پر وہ دن آئیں گے کہ جب دولھا ان سے جدا کیا جائے گا،تب انہیں دنوں میں روزہ رکھیں گے۔'' (مرقس ۲۔۱۸۔۱۹و۲۰ العهد الجديد، ص: ۵۹)

اس تلمیح میں دولہا سے مقصود خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذاتِ مبارک اور براتی سے مقصود ان کے پیرو اور حواری ہیں،ظاہر ہے کہ جب تک پیغمبر علیہ السلام اپنی امت میں موجود ہے،امت کو غم منانے کی ضرورت نہیں۔ انہیں فقروں سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے موسوی شریعت کے فرض و مستحب روزوں کو نہیں بلکہ غم کے

❶ ان تمام حوالوں کے لیے دیکھو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا،جلد۱۰،صفحہ:۱۹۳،۱۹۴طبع یازدہم۔ ❷ تورات، سفر الاحبار: ۱۶۔۲۹۔۳۴ و ۲۳۔۲۷، ص: ۱۹٦ (لاويين) العهد القديم، ص: ۱۷۵۔ ❸ سموایل اول: ۷۔٦؛ العهد القديم، ص: ٤٣٦؛ ويرميا: ٣٦۔٦، ص: ۱۱۳٤۔ ❹ متی: ٤۔۲؛ العهد الجديد، ص: ٦۔
❺ مرقس: ۲۔۱۸؛ العهد الجديد، ص: ۵۹۔ ❻ قضاة: ۲۰۔۲٦ ص: ٤۱٦؛ العهد القديم سموائيل اول: ۷۔٦؛ العهد القديم، ص: ٤٣٦ و۳۱۔۱۳ ص: ٤۸۱ ولوقا ٦۔۱٦ وغيره۔

مبتدعانہ روزوں کو منع فرمایا۔ انہوں نے خود اپنے پیروؤں کو بے ریا اور مخلصانہ روزہ رکھنے کی نصیحت فرمائی ہے، چنانچہ آپ اپنے حواریوں کو فرماتے ہیں:

''پھر جب تم روزہ رکھو ریا کاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ، کیوں کہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ٹھہریں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے، پر جب تم روزہ رکھو اپنے سر میں تیل لگاؤ اور منہ دھوؤ، تاکہ تم آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھ کو آشکارا بدلہ دے۔'' (متی ٦۔ ١٦ و ١٧ العهد الجديد، ص: ١١)

ایک دوسرے مقام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ان کے شاگرد پوچھتے ہیں کہ ہم پلید روحوں کو کس طرح نکال سکتے ہیں۔ وہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

''یہ جنس سوائے دعا اور روزہ کے کسی اور طرح سے نہیں نکل سکتی۔'' (متی ١٧۔ ٢١ العهد الجديد: ٣٢)

اہل عرب بھی اسلام کے پہلے سے روزہ سے کچھ نہ کچھ مانوس تھے۔ مکہ کے قریش جاہلیت کے دنوں میں عاشورا (یعنی دسویں محرم کو) اس لیے روزہ رکھتے تھے کہ اس دن خانہ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا۔ [1] مدینہ میں یہود اپنا عاشورا الگ مناتے تھے۔ [2] یعنی وہ اپنے ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھتے تھے۔

ان تصریحات سے ثابت ہوگا کہ قرآن کی یہ آیت:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ (٢/ البقرة:١٨٣)

''مسلمانو! تم پر روزہ اس طرح لکھا گیا جس طرح تم سے پہلوں پر لکھا گیا۔''

کس قدر تاریخی صداقت پر مبنی ہے۔

روزہ کی حقیقت

انسان کی ہر قسم کی روحانی بدبختیوں اور ناکامیوں کے علل واسباب کی اگر تحلیل کی جائے تو آخری نتیجہ یہ نکلے گا وہ دنیا میں مختلف ضرورتوں کا محتاج ہے۔ وہ مختلف اغراض کا پابند ہے۔ اس کے دل کی کوئی جنبش اور اس کے عضو کی کوئی کوشش ضرورت اور غرض سے خالی نہیں۔ اخلاق جس کا ایک حد تک روحانیت سے تعلق ہے۔ اگر تحقیق کی جائے تو اس کی بنیاد بھی عموماً کسی ضرورت یا غرض نفسانی پر مبنی نظر آئے گی، اس لیے ہماری ہر قسم کی بدبختیاں اور آلودگیاں صرف ایک ہی علت کا نتیجہ ہیں، ضرورت اور غرض۔ اگر انسان ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے تو وہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔ قابلِ غور امر یہ ہے کہ انسان کی ضرورتوں اور اس کے مختلف اغراض و مقاصد کا جو ایک وسیع اور غیر متناہی سلسلہ نظر آتا ہے، اس کی اصل حقیقت کتنی ہے؟ ہمارے دل میں آرزوؤں کا ایک ڈھیر ہے۔ تمناؤں کی ایک بھیڑ ہے اور خود ساختہ ضرورتوں کا ایک انبار ہے۔ لیکن کیا خوشنما کپڑوں، عالی

[1] مسند احمد، ج٦، ص: ٢٤٤۔ [2] صحيح بخاري، كتاب الصوم، باب صوم يوم عاشوراء: ٢٠٠٤، ٢٠٠٥۔

شان عمارتوں لذیذ غذاؤں اور تیز رفتار سواریوں کے بغیر ہم جی نہیں سکتے؟ فرزند وعیال، زر و مال اور خدم وحشم سے اگر ہمارے کاشانے خالی ہوں تو کیا ہماری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا؟ بادشاہوں نے فقیروں کی زندگی بسر کی اور زندہ رہے ہیں، بروایتِ عام ابراہیم ادہم بادشاہ سے فقیر ہو گئے اور نہایت پر مسرت روحانی زندگی بسر کی۔

خود ساختہ ضرورتوں کی نفی اور تحلیل کے بعد شاید انسانی حقیقی ضرورتوں کا وسیع دائرہ ایک دو لفظوں میں محدود ہو کر رہ جائے اور وہ مایۂ قوت وغذا یعنی کھانا اور پینا ہے جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، روح اور جان کا جسم میں باقی رہنا صرف سدِ رمق پر موقوف ہے اور سدِ رمق صرف کھانے کے چند لقموں اور پانی کے چند گھونٹوں پر موقوف ہے اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد کی تمام انسانی ضرورتوں کا مولد ومنشا انہیں چند لقموں اور چند گھونٹوں میں افراط و وسعت تفنن اور تعیش کا نتیجہ ہے۔ اس بنا پر ایک انسان اور ایک فرشتہ یعنی عالم ناسوت اور عالم ملکوت کے دو باشندوں میں اگر فرق وامتیاز کی دیوار قائم کی جائے تو صرف یہی چیز تمام فروق وامتیاز کو محیط ہو گی۔ انسان کے تمام جرائم اور گناہوں کی فہرست اگر تیار کی جائے اور اس کی حرص وہوس اور قتل وخونریزی کے آخری اسباب ڈھونڈھے جائیں تو انہیں دو چیزوں کے افراط اور تعیش کی مزید طلب اس سلسلہ کی آخری کڑی ہو گی۔ اس بنا پر دنیا کے تمام مذاہب میں مادیات کی کثافتوں سے بری اور پاک ہونے کے لیے اکل و شرب سے ایک حد تک امتناع اور پرہیز سب سے پہلی شرط رکھی گئی ہے، جس سے اصل مقصود یہ ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضرورتوں کا دائرہ کم کر دے اور آخر یہ کہ قوت وغذا کی طلب وحرص سے بھی بے نیازی کے لیے متواتر کوشش جاری رکھے کہ انسانوں کے تمام گناہ اور جرائم صرف اسی ایک قوت کے نتائج مابعد ہیں، اگر یہ طلب وضرورت فنا ہو جائے تو ہم کو دفعتاً عالمِ ناسوت میں عالم ملکوت کی جھلک نظر آنے لگے، لیکن جب تک انسان انسان ہے، اس کو غذا سے قطعی بے نیازی ہونی ناممکن ہے۔ اسی بنا پر تمام مذاہب نے اس سے اجتناب اور بے نیازی کی ایک مدت محدود کر دی ہے، اس مدت کے اندر انسانوں کو ایسے تمام انسانی ضروریات سے جن سے استغنا کسی تھوڑے زمانہ تک ممکن ہے۔ مجتنب ہو کر تھوڑی دیر کے لیے ملائے اعلیٰ کی مقدس مخلوقات میں داخل ہو جانا چاہیے اور چونکہ ان مخلوقات کا فرض زندگی محض خدائے پاک کی اطاعت وعبادت ہے، اس لیے انسان بھی اتنی دیر تک اپنی زندگی کا حتی الامکان یہی فرض قرار دے۔

قرآن مجید نے ان تمام حقائق ورموز کو صرف ایک لفظ تقویٰ سے بے نقاب کر دیا ہے اور چونکہ روزہ کی یہ حقیقت تمام مذاہب میں مشترک تھی، اس بنا پر قرآن مجید نے دیگر مذاہب کو بھی اشارتاً اس حقیقت میں شریک کر لیا ہے:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۸۳)

''مسلمانو! تم پر روزہ لکھا گیا جس طرح تم سے پہلی امتوں پر لکھا گیا، تا کہ تم تقویٰ حاصل کرو۔''

روزہ کی غرض وغایت تقویٰ ہے، یعنی اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھنا اور جذبات کے تلاطم سے اپنے کو بچا لینا، اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ ہمارے لیے ایک قسم کے روحانی علاج کے طور پر فرض ہوا۔ لیکن آگے چل کر قرآن پاک اسلامی روزہ کی دو اور مخصوص حقیقتوں کو بھی واضح کرتا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''تا کہ خدا نے جو تم کو راہ دکھائی اس پر تم اس کی بڑائی کرو اور شکر ادا کرو۔''

اس مفہوم کی توضیح کے لیے ہم کو رمضان مبارک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

رمضان کی حقیقت

یہ مادّی عالم جس طرح مادّی نظام اور قانون کا پابند ہے، خدائے پاک نے عالمِ روحانی میں بھی اسی قسم کا ایک اور نظام، قانون اور علل واسباب کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے، جس طرح یقین کے ساتھ آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہو کہ زہر انسان کے لیے قاتل ہے۔ اسی یقین کے ساتھ طبِّ روحانی کا واقف کار کہتا ہے کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے۔ پیغمبر فیضان نبوت کے قبول کے لیے اپنی روح میں کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے۔ دنیا میں کب مبعوث ہوتا ہے۔ معجزات کا ظہور اس سے کن اوقات میں ہوتا ہے اور اپنے دعویٰ کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے۔ انکار و مزاحمت پر وہ کیونکر مہاجرۃ الی اللہ کرتا ہے اور پھر کیوں کر دعوت کے منکر نا کام وخاسر اور اہل ایمان فلاح یاب وکامیاب ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک چیز مرتب اور منظّم قواعد کے مطابق بہ ترتیب ظہور میں آتی ہے۔ قرآن مجید میں تیرہ مقام پر سنة الله کا لفظ آیا ہے۔ لیکن ان میں زیادہ تر اسی روحانی نظام وترتیب کی طرف اشارہ ہے۔ فلسفہ تاریخ جس طرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار اعادہ سے اصول اور نتائج تک پہنچ کر ایک عام تاریخی قانون بنا لیتا ہے۔ بالکل اسی طرح انبیا علیہم السلام کے سوانح اور تاریخیں بھی اپنے واقعات کے بار بار کے اعادہ سے خصائص نبوت کا اصولِ قانون ہمارے لیے مرتب کرتی ہیں۔ پیغمبرانہ تاریخ کے انہیں اصول وقوانین میں سے ایک یہ ہے کہ نبی جب اپنے کمال انسانیت کو پہنچ کر فیضانِ نبوت کے قبول اور استعداد کا انتظار کرتا ہے تو وہ ایک مدت تک کے لیے عالمِ انسانی سے الگ ہو کر ملکوتی خصائص میں جلوہ گر ہوتا ہے، اسی وقت سے اس کے دل ودماغ میں وحی الٰہی کا سرچشمہ موجیں مارنے لگتا ہے۔ کوہ سینا کا پرجلال پیغمبر (حضرت موسیٰ علیہ السلام) جب توراۃ لینے جاتا ہے تو چالیس شبانہ روز بھوکا اور پیاسا رہتا ہے۔ [1] کوہ سعیر کا مقدس آنے والا (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) اس سے پہلے کہ اس کے منہ میں انجیل کی زبان گویا ہو، وہ چالیس روز وشب بھوکا اور پیاسا رہا۔ [2] اسی طرح فاران کا آتشین شریعت والا پیغمبر (آنحضرت ﷺ) نزول قرآن

---

[1] خروج: ۳۴۔ ۲۸، ص: ۱۴۵۔ [2] متی: ۴۔ ۲؛ العهد الجديد، ص: ۶۔

سے پہلے پورا ایک مہینہ حرا نام مکہ کے ایک غار میں ہر قسم کی عبادتوں میں مصروف رہتا ہے اور بالآخر اسی اثنا میں ناموسِ اکبر ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ ﴾ کا مژدۂ جانفزا لے کر نمودار ہوتا ہے۔ [1]

یہ واقعہ کس ماہ مبارک کا تھا؟

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''رمضان کا وہ مہینہ جس میں قرآن اترا۔''

یہ کس شبِ اقدس کی داستان ہے؟

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾ (٤٤/ الدخان :۳)

''ہم نے قرآن کو ایک برکت والی رات میں اتارا۔''

اس مبارک شب کو ہم کس نام سے جانتے ہیں؟

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۚ ﴾ (۹۷/ القدر :۱)

''ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں اتارا۔''

ان آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے، جس میں قرآن سب سے پہلی بار دنیا میں نازل ہوا اور پیغمبرِ امی علیہ السلام کو عالم کی راہنمائی اور انسانوں کی دستگیری کے لیے دستور نامہ الٰہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا۔ قرآن کا حامل اور اس وحی الٰہی کا مہبط۔ ان دنوں ایک غار کے کونے میں یکہ وتنہا بھوکا اور پیاسا [2] سربہ زانو تھا۔ اس بنا پر اس ماہ مقدس میں بھوکا اور پیاسا رہنا (روزہ) کسی عبادت گاہ میں یکہ وتنہا رہنا (اعتکاف) نزول وحی کی رات میں (لیلۃ القدر) بیدار و سربسجود رہنا تمام پیروانِ محمدی ﷺ کے لیے ضروری تھا کہ

﴿ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾ (۳/ ال عمران :۳۱)

''اگر تم خدا کو پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تمہیں پیار کرے گا۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ، اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت اسلام میں کیا ہے؟ اور رمضان مبارک میں روزوں کی تخصیص اسلام میں کس بنا پر ہے؟ اس لیے اس ماہِ اقدس میں بقدرِ امکان انہیں حالات وجذبات میں متکیف ہونا چاہیے، جس میں وہ حامل قرآن متکیف تھا، تاکہ وہ دنیا کی ہدایت یابی اور راہنمائی کی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی : ۳ ایک ماہ کا بیان صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بدء الوحی: ۴۰۳، ۴۰۹ میں اور سیرۃ ابن ہشام بدء بعثۃ، ج ۱، ص: ۱۵۰ میں ہے۔

[2] روایت سے اگرچہ بتصریح یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپ غارِ حرا میں روزے رکھتے تھے، تاہم قرائن واشارات سے سمجھا جاتا ہے کہ آپ اور عبادات کے ساتھ غار حرا میں روزے بھی رکھتے تھے۔ جیسا کہ بخاری (بدء الوحی) اور سیرۃ ابن ہشام سے واضح ہے کہ آپ ان دنوں میں تحنث اور اعتکاف کرتے تھے جس کا ایک جز روزہ ہے۔ آج کل کے بعض علمائے مصنفین نے بھی ان قرائن سے یہی سمجھا ہے کہ آپ ان دنوں روزہ سے رہتے تھے۔ (دیکھو خضری مصری کی تاریخ التشریع الاسلامی، صفحہ:۶ و صفحہ ۳۱)۔

یادگار تاریخ ہو۔ یہ جذبات دحالات جن کو قرآن کے مبلغ کی پیروی میں ہم اپنے اوپر طاری کرتے ہیں، یہی اس ہدایت کے ملنے پر ہماری شکر گزاری اور خدا کی بڑائی ہے۔

فرضیت صیام کا مناسب موقع ۲ھ

اگر اسلامی عبادات کا قالب روح سے خالی ہوتا اور ان سے صرف جسم کی ریاضت مقصود ہوتی تو نماز سے پہلے روزہ فرض کیا جاتا، روزہ عرف عام میں فاقہ کشی کا نام ہے اور عرب کو ملک کی اقتصادی حالت کی وجہ سے اکثر یہ سعادت نصیب ہو جایا کرتی ہے۔ ظہورِ اسلام کے بعد کفار نے مسلمانوں کو جن پریشانیوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے ان کو عرب کے معمولی طریقہ کسبِ معاش کی طرف سے بھی غیر مطمئن کر دیا تھا، جن لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی حمایت کی تھی تمام قبائل نے ان سے تمدنی تعلقات منقطع کر لیے تھے، اس حالت میں صرف روزہ ایک ایسا فریضہ تھا، جو عرب کی عام حالت اور مسلمانوں کی موجودہ زندگی کے لیے موزوں ہوسکتا تھا۔ نماز و حج کی طرح اس میں کسی قسم کی مزاحمت کا بھی اندیشہ نہ تھا، وہ ایک خاموش طریقہ عبادت تھا، جو بلا روک ٹوک جاری رہ سکتا تھا۔ لیکن اسلام نے عبادات کو امراضِ روحانی کی دوا قرار دیا ہے، جن کا استعمال صرف اس وقت ہوسکتا ہے جب امراض روحانیہ پیدا ہو جاتے ہیں یا ان کے پیدا ہونے کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ قوائے شہوانیہ اور زخارف دنیا کی شیفتگی اور لذات حسیہ کے انہماک و توغل سے جو روحانی مرض پیدا ہو سکتے تھے، مکہ میں یہ تمام ساز وسامان مفقود تھے۔ بلکہ خود کفار کے جور وستم نے ان جذبات کا استیصال کر دیا تھا۔ اس لیے وہاں اس روحانی علاج کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو کفار کے مظالم سے نجات ملی۔ انصار کی ایثار نفسی نے مسلمانوں کو بوجہ کفاف سے بے نیاز کر دیا۔ فتوحات کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور اس میں روز بروز وسعت پیدا ہوتی گئی، اب وہ وقت آ گیا یا عنقریب آنے والا تھا کہ دنیا اپنی اصلی صورت میں مسلمانوں کے سامنے آ کر ان کو اپنا فریضہ بتائے اس لیے درحقیقت یہ تداخل کا موسم تھا، جس میں مرض کے پیدا ہونے سے پیشتر پرہیز کی ضرورت تھی اور وہ پرہیز روزہ تھا جو ۲ھ میں فرض ہوا۔ ❶ اس سے یہ شبہ دور ہو جاتا ہے جو بعض ناواقفوں کو ہوا ہے کہ چونکہ آغازِ اسلام میں مسلمانوں کو اکثر فاقوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا، اس لیے ان کو روزہ کا خوگر کیا گیا، حالانکہ اصولِ اسلام کی رو سے فاقہ مستوں کو روزہ کی جتنی ضرورت ہے۔ شکم سیروں کے لیے وہ اس سے زیادہ ضروری ہے۔ علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ مرغوباتِ شہوانیہ کا ترک کرنا نہایت مشکل کام تھا، اس لیے روزہ وسط اسلام میں فرض کیا گیا جب کہ لوگ توحید نماز اور احکام قرآنی کے خوگر ہو چکے تھے۔ اس لیے احکام کا یہ اضافہ اسی زمانے کے لیے موزوں تھا۔ ❷

---

❶ تاریخ ابن جریر طبری واقعات ۲ھ ج ۳ ص: ۱۲۸۱ اور زرقانی بر مواہب ج ۱ ص: ۲۷۰ مصر، وزاد المعاد ابن قیم ج ۱ ص: ۱۵۸۔

❷ زاد المعاد، ج ۱، ص: ۱۵۸۔

ایام روزہ کی تحدید

روزہ ایک قسم کی دوا ہے اور دوا کو بقدر دوا ہی ہونا چاہیے تھا، اگر پورا سال اس دوا میں صرف کر دیا جاتا تو یہ ایک غیر طبعی علاج ہوتا اور مسلمانوں کی جسمانی جدوجہد کا خاتمہ ہو جاتا اور ان کی شگفتگی مزاج مٹ جاتی جو عبادات کا اثر قبول کرتی ہے، لیکن اگر ایک دو روز کا تنگ اور محدود زمانہ رکھا جاتا تو یہ اتنی کم مدت تھی کہ اس میں دوا کا فائدہ بھی ظاہر نہ ہوتا، اس لیے اسلام نے روزہ کے لیے سال کے ۱۲ مہینوں میں سے صرف ایک مہینہ کا زمانہ اس کے لیے مقرر کیا اس ایک مہینہ کی تخصیص کی بھی ضرورت تھی، تا کہ تمام افرادِ امت بیک وقت اس فرض کو ادا کر کے اسلام کے نظام وحدت کا مظاہرہ کریں اور اس کے لیے وہی زمانہ موزوں تھا، جس میں خود قرآن نازل ہونا شروع ہوا۔ یعنی رمضان چنانچہ آنحضرت ﷺ اس کے بعد جب تک زندہ رہے اور تمام صحابہ نے یہ مہینہ ہمیشہ روزہ میں گزارا اور آج تک کل امت محمدیہ پوری دنیا میں اسی مہینہ کو ماہ صیام مانتی ہے اور پورے مہینہ بھر حسبِ توفیق روزہ رکھتی ہے۔ چونکہ روزہ بہر حال مشقت کی چیز ہے، اس لیے قرآن پاک میں ماہ رمضان کے روزوں کی تحدید اور، فرضیت نہایت بلاغت کے ساتھ تدریجی طور سے کی گئی ہے، تا کہ نفس انسانی آہستہ آہستہ اس اہم ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل ہو۔ پہلے تو زمانہ کی تخصیص کے بغیر یہ کہا گیا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۳)

''اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے۔''

اس کے بعد تسلی دی گئی کہ یہ کچھ تم ہی پر اکیلے فرض نہیں کیا گیا بلکہ

﴿ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۳)

''جیسا کہ تم سے پہلی قوموں پر بھی فرض کیا گیا تھا''

اب بھی مدت نہیں بتائی گئی، اس کے بعد فرمایا گیا:

﴿ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸٤)

''چند گنے ہوئے دن۔''

مدت کی تعیین اب بھی نہیں، البتہ اس بلیغ انداز سے زمانہ صیام کی تخفیف کا ذکر کیا گیا، جس سے سننے والے پر فوراً بوجھ نہ پڑ جائے اور فرمایا چند گنے ہوئے دن۔ اس کے بعد اسلامی روزوں کی آسانیوں کا ذکر شروع کر دیا گیا، تا کہ طبیعت متوجہ رہے۔ فرمایا:

﴿ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸٤)

''تو جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں کی گنتی۔''

مگر اسی طرز ادا سے معلوم ہو گیا کہ یہ روزے کسی ایک خاص زمانہ میں فرض ہوں گے کہ اگر خاص زمانہ نہ ہوتا

تو یہ کہنا بے کار ہوتا کہ اگر تم بیمار یا مسافر ہو تو دوسرے دنوں میں رکھو، نیز یہ بھی اشارتاً پتہ چلتا ہے کہ جو دن ہوں گے وہ گنے ہوئے مقرر ہوں گے، ورنہ ﴿مَعْدُوْدَاتٍ﴾ (گنے ہوئے) ﴿عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ (دوسرے دنوں کی گنتی) اور پھر آگے چل کر ﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ (تاکہ تم شمار کو پورا کرلو) نہ کہا جاتا، پھر اس کے بعد دوسری آسانی بتائی:

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ط﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۴)

''اور جو بمشکل روزہ رکھ سکتا ہو وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے۔''

اب کہا جاتا ہے کہ مگر اس اجازت کے بعد بھی روزہ ہی رکھو تو بہتر ہے:

﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ط وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝﴾

(۲/ البقرۃ:۱۸۴)

''تو جو کوئی شوق سے کوئی نیکی کرے، تو یہ بہتر ہے اس کے لیے اور روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانو۔''

ان آیتوں میں دیکھیے کہ قضا اور کفارہ کی اجازت کے باوجود روزہ رکھنا مستحسن فرمایا اور روزہ کی اہمیت ظاہر کی اتنی تمہیدوں کے بعد روزہ کے گنے ہوئے دنوں کی تعیین کی جاتی ہے کہ وہ ایک مہینہ ہے اور جس کو ہلکا کرکے دکھانے کے لیے فرمایا گیا تھا کہ ﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ﴾ چند گنے ہوئے دن ظاہر ہے کہ سال کے ۳۶۵ دنوں میں انتیس اور تیس دنوں کے روزے چند گنتی کے دن ہی تو ہیں۔ [1] بہرحال رمضان کو ماہِ صیام قرار دینے سے پہلے اس مہینہ کی عظمت اور اہمیت بتائی گئی فرمایا:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''وہ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور

---

[1] عربی زبان سے کوئی ناواقف اگر یہ کہے کہ ایام جمع قلت ہے، جس کا اطلاق دس دنوں سے زیادہ پر نہیں ہوتا تو اس کو چاہیے کہ ایامُ العرب کو جو تعداد میں سینکڑوں ہیں، زیادہ سے زیادہ نو لڑائیوں میں محدود کردے، اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جہاں دنیا کے اور ہزارہا انقلابات کو ایامُ اللہ کہا ہے (۱۴/ ابراہیم۔۵) ان کو نو تک کے انقلابات عالم میں محدود کردے، یمن سے شام تک کے سرسبز راستہ کو جو مہینوں میں طے ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ نے احسان کے موقع پر چند دن اور چند راتیں فرمایا: ﴿سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ۝﴾ (۳۴/ السبا:۱۸) اور ﴿فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ۝﴾ (۶۹/ الحاقۃ:۲۴) ''گزرے ہوئے دن۔'' جن کا اطلاق قرآن نے پوری انسانی عمر پر اور ﴿وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ﴾ (۳/ ال عمران:۱۴۰) کو زمانہ کے برسوں اور صدیوں پر کیا ہے، وہ نو دن سے زیادہ نہ بڑھ سکیں، جمع قلت وکثرت کا یہ قاعدہ وہ بھی کلی نہیں، بلکہ عمومی ان الفاظ کے لیے ہے جن کی جمع قلت وکثرت دونوں مستعمل ہیں، ایام کا لفظ ان میں نہیں، اس کی صرف ایک ہی جمع آتی ہے اور وہ ایوام ہے، جو تعلیل کے بعد ایام بولا جاتا ہے، سند کے لیے دیکھو رضی شرح کافیہ، جلد دوم، ص:۱۵۴، ۱۵۵ بحث جمع مکسر اور لسان العرب لفظ یوم، ج ۳، ص: ۱۰۲۱۔

ہدایت اور حق و باطل کی تمیز کی دلیلیں ہیں۔''

اب وہ مناسب موقع آیا جس میں یہ فرمایا جائے کہ ان چند دنوں کے روزے اسی رمضان میں، جس کی یہ عظمت ہے، تم پر فرض کیے گئے، ارشاد ہوا:

﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''تو جو اس مہینہ کو پائے تو اس مہینہ بھر کے روزہ رکھے۔''

اب پورے ماہ رمضان کے روزوں کی تعیین و تحدید اور ایاماً معدودات کی تشریح ہوگئی، عربی کا محاورہ یہ ہے کہ جو ظرف زمان [1] ترکیب نحوی میں اپنے فعل کا مفعول فیہ ہوتا ہے، وہ فعل اس ظرفِ زمان کو محیط ہوتا ہے۔ مثلاً: اگر یہ کہنا ہو کہ اس نے مہینے بھر روزہ رکھا تو کہیں گے: صَامَ شَهْرًا۔ اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ مہینہ میں چند دن روزے رکھے، بلکہ ایک مہینہ پورا سمجھا جائے گا اور اگر یوں کہنا ہو کہ اس نے ایک سال روزہ رکھا تو عربی میں یوں کہیں گے: صَامَ سَنَةً (سال بھر روزہ رکھا) اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس آیت پاک میں پورے رمضان بھر روزہ رکھنے کا ذکر ہے اور چونکہ لفظ شہر یعنی مہینہ کہا گیا ہے، اس لیے مہینہ کے شروع سے ان روزوں کا آغاز اور مہینہ کے ختم پر ان کا خاتمہ ہوگا، قمری سال جس کا عرب میں رواج تھا، [2] اس کے مہینے کبھی تیس اور کبھی ۲۹ دن کے ہوئے ہیں، جیسی روایت ہو وہی ماہ صیام پر بھی صادق آئے گا۔ جیسا کہ سرور کائنات ﷺ، تمام صحابہ کرام خلفائے راشدین اور جمیع فرق اسلام کے عمل اور تواتر سے ثابت اور واضح ہے اور احادیثِ صحیحہ میں اس کی پوری تصریحات مذکور ہیں۔

ایک نکتہ

قرآن پاک نے اس رمضان کے روزہ کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے:

﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''تو جو اس مہینہ کو پائے تو اس مہینہ بھر کے روزہ رکھے۔''

لفظ شَهِدَ کے لغوی معنی کسی مقام یا زمانہ میں موجود اور حاضر رہنے کے ہیں، اسی سے شہادت اور شاہد کے الفاظ نکلے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ روزے اسی پر واجب ہیں، جو اس ماہ صیام میں موجود اور حاضر ہو اس ماہِ صیام میں غیر موجود اور غیر حاضر ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ماہ صیام آئے اور شخص غیر حاضر ہو یعنی اس دنیا میں موجود نہ ہو، جس میں وہ ماہ صیام آیا یا دوسری صورت یہ ہے شخص اپنی جگہ پر موجود ہو، مگر ماہِ صیام کا وہاں گزر نہ ہو، یہ صورت ان قطعات ارضی میں پیش آئے گی، جہاں شب و روز کا وہ نظام موجود نہیں، جو باقی متمدن

[1] تفصیل کے لیے دیکھو رضی جلد اول بحث مفعول فیہ وظرف زمان صفحہ:۱۶۲ مطبع نولکشور ۱۸۶۸ء) [2] جیسا کہ قرآن پاک کی اس آیتِ کریمہ سے ثابت ہے ﴿ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۹) ''لوگ آپ سے پوچھتے ہیں پہلی رات کے چاندوں (ہلال) کے بارے میں کہہ دیجیے کہ وہ لوگوں کو وقت اور حج کی تاریخ بتانے کے لیے ہے۔''

دنیا میں ہے۔مثلاً: جن مقامات میں کئی مہینوں کے دن اور کئی مہینوں کی راتیں ہوتی ہیں کہ وہاں رمضان کی آمد کا سوال ہی نہیں۔ہاں اگر وہاں کے مسلمان چاہیں تو بقیہ متمدن ممالک کے کیلنڈر (تقویم) کو معیار مان کر روزے رکھیں اور کھولیں (جیسا کہ حدیث دجّال سے جو صحاح میں ہے ثابت ہے۔ [1] لیکن جہاں اٹھارہ اٹھارہ اور بیس بیس گھنٹوں کے دن ہوتے ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ وہاں موسم ٹھنڈا اور بارد بنایا ہے، تاکہ روزہ کی تکلیف دن کی مدت بڑھنے سے جو ہوسکتی تھی، وہ موسم کی برودت سے کم ہو جائے، چنانچہ انگلستان میں مجھے خود اور بہت سے مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا اتفاق ہوا اور بالکل تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ [2]

معذورین

جو لوگ حقیقت میں اس فریضہ صیام کے ادا کرنے سے معذور ہوں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے آسانیاں رکھی ہیں، اس لیے ارشاد ہے:

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ (۲/ البقرة:۱۸۵)

''اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور سختی تمہارے ساتھ نہیں چاہتا۔''

اس اصولی تمہید کے بعد مسافر اور بیمار کو رخصت عطا فرمائی ہے کہ رمضان کے کسی روزہ کے یا پورے رمضان کے روزوں میں اگر کوئی سفر یا بیماری کے عذر کی بنا پر روزہ نہ رکھ سکے تو وہ اس عذر کے دفع ہونے کے بعد قضا روزے کو پورا کرلے۔

بیمار کے دو معنی ہیں، یا تو وہ فعلاً بیمار ہو یا یہ کہ کسی مسلمان متقی طبیب کا مشورہ ہو کہ اگر یہ شخص روزے رکھے گا تو بیمار ہو جائے گا یا بار بار کے تجربوں کے بعد، شخص کو خود غالب گمان ہو جائے کہ وہ اس سے بیمار ہو جاتا ہے، تو اس کے لیے مناسب ہے کہ رمضان کا روزہ عذر کی موجودگی تک قضا کرے اور اس کے بجائے دوسرے مناسب موقع پر قضا رکھے، فرمایا:

﴿ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ﴾ (۲/ البقرة:۱۸٤)

''تو جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں روزہ کی گنتی پوری کرے۔''

اسی سلسلہ میں ایک اور آیت ہے جس کی تفسیر اور تاویل میں صحابہ کے عہد سے اختلاف ہے، وہ آیت یہ ہے:

﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ﴾ (۲/ البقرة:۱۸٤)

''اور جن لوگوں کو روزہ کی طاقت نہ ہو فدیہ ادا کریں ایک مسکین کا کھانا۔''

① بعض صحابہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اول رمضان سے پہلے چند روزے فرض ہوئے تھے، ان

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب ذکر الرجال: ۷۳۷۳۔

[2] پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں اس موقع پر ان لوگوں کے لیے جو اتنی مدت کے دن میں روزہ کے بجائے کفارہ کی اجازت لکھی گئی تھی وہ میری غلطی تھی جس سے میں رجوع کرتا ہوں۔''س''

روزوں کے متعلق یہ اجازت تھی کہ چاہے روزے رکھیں، چاہے روزے کے بجائے ایک مسکین کا کھانا ہر روزہ کی جگہ دیں، رمضان کی فرضیت کے بعد یہ اجازت منسوخ ہوگئی۔

② دوسری روایت یہ ہے کہ ﴿یطیقونہ﴾ کی ضمیر صوم کی طرف نہیں بلکہ طعام کی طرف ہے اس صورت میں آیت کا یہ مطلب ہوا کہ جو لوگ فدیہ کی طاقت رکھتے ہوں، وہ روزہ کے ساتھ ایک مسکین کا کھانا بھی فدیۃً ادا کریں، بعد کو یہ حکم منسوخ ہوگیا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس طعام مسکین کے فدیہ سے صدقۃ الفطر مراد لیا ہے جو رمضان کے بعد ہر مستطیع روزہ دار اپنی اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے ادا کرتا ہے۔ [1]

③ تیسری روایت یہ ہے کہ یہ حکم غیر منسوخ ہے اور یہ اجازت ان لوگوں کے لیے ہے جو روزوں سے معذور ہوں، جیسے بڈھے اور حاملہ۔

اصل یہ ہے کہ لفظ ﴿يُطِيقُونَ﴾ کے لغوی معنی کی تحقیق نہیں کی گئی ہے، اطاقت کو وسعٌ کے معنی میں سمجھا گیا ہے اور یطیقون کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ جو روزہ رکھ سکتے ہیں، وہ ایک مسکین کا کھانا دیں، تو اس ترجمہ کے مطابق یا تو نسخ ماننا پڑے گا اور یا آج کل کے بعض آزاد خیالوں کی رائے کے مطابق یہ کہنا پڑے گا کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں، وہ بھی روزہ کے بجائے فدیہ دے کر روزہ سے بچ سکتے ہیں، حالانکہ یہ صریح غلط ہے اس کے معنی تو ہوں گے کہ غربا روزے رکھیں اور امرا فدیہ دے کر روزہ سے مستثنیٰ ہو جائیں، ایسی تفریق اسلام کے فرائض میں کبھی روا نہیں رکھی گئی ہے اور اسلام کا تواتر عمل اس کے بالکل خلاف ہے اور آیت مابعد کہ ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵) ''جو رمضان کے مہینہ میں ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے۔'' کے سراسر منافی ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ اطاقت کے معنی کسی کام کو مشکل کے ساتھ کر سکنے کے ہیں اس لیے یطیقون کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جو بمشکل روزے رکھ سکتے ہیں، وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے دیں۔ [2] اب روزہ کے سلسلے میں معذوروں کی دو صورتیں ہوئیں، ایک یہ کہ یہ عذر ہنگامی اور عارضی ہو، جیسے مرض یا خوف یا سفر تو ان

---

[1] الفوز الکبیر، باب ناسخ ومنسوخ، ص:۱۹۔ [2] اطاقہ طاقۃ کا باب افعال سے مصدر ہے اس کے ثلاثی مصدر سے فعل نہیں بنتا فعل بنانے کے لیے باب افعال مستعمل ہے اور طاقۃ کے معنی لسان العرب (ج ۲ ص:۶۲۸) اور تاج العروس (ج ۶ ص:۴۲۷) وغیرہ میں یہ لکھے ہیں: والطوق الطاقۃ ای اقصی غایتہ وھو اسم لمقدار ما یمکن ان یفعلہ بہ بمشقۃ منہ طوق کے معنی طاقت کے ہیں یعنی قوت کی انتہائی غایت اور وہ اس مقدار کا نام ہے جس کو کوئی مشقت ومشکل کے ساتھ کر سکے۔ طاقت کے اس معنی کی تائید قرآن پاک سے بھی ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۶) ''اے ہمارے پروردگار! اور ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ جسکی ہم کو طاقت نہیں ہے۔'' ''جس کی ہم کو طاقت نہیں'' کے یہ معنی ہیں جس کی ہم کو وسعت نہیں، یعنی جس کو ہم کر ہی نہیں سکتے، کیونکہ قرآن پاک کے نص سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کو کوئی حکم ایسا نہیں دیتے جس کو وہ کر ہی نہیں سکتا، فرمایا:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۶)

''اللہ کسی نفس کو حکم نہیں دیتا، لیکن اس کا جو اس کی وسعت میں ہو۔''

اس سے ظاہر ہے کہ اب یہ دعا کہ اے اللہ! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کو ہم اٹھا ہی نہیں سکتے ہوں، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے لیے یہ آیت ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۴)

''تو جو تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی ہے۔''

یعنی عذر کے وقت وہ روزہ نہ رکھے اور اس چھوڑے ہوئے روزے کی گنتی دوسرے مناسب وقت قضا رکھ کر پوری کرلے، اس میں حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی عورت) بھی داخل ہوگئی۔ اگر حاملہ یا مرضعہ کو اپنی بیماری یا بچہ کی بیماری...... کا خوف ہو تو وہ عذر کی موجودگی تک روزہ نہ رکھے اور اس عذر کے دُور ہونے کے بعد قضا رکھ لے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ عذر دائمی ہو اور ناقابل ازالہ ہو، جیسے کوئی دائم المرض ہو، بہت ہی کمزور ہو اور بوڑھا (شیخ فانی) ہو جو بہ مشکل روزہ رکھتا ہو، تو وہ روزہ قضا کرے اور ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کا کھانا دے دے، اس کے لیے یہ آیت ہے:

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۴)

''اور ان پر جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے۔''

(❁❁ گزشتہ سے پیوستہ) صحیح نہ ہوگا بلکہ اس دعا میں طاقت نہ ہونے کے معنی یہ ہوں گے جس کو ہم بمشکل اٹھا سکتے ہوں، اسی طرح طالوت کے لشکریوں کا یہ کہنا کہ

﴿لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۴۹)

''آج ہم میں جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔''

اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ ہم بمشکل مقابلہ کر سکتے ہیں۔ حدیثوں سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے ابو داؤد، كتاب الصيام، باب من قال مثبتة للشيخ والحبلى: ۲۳۱۸۔ میں ہے:

((عن ابن جبير عن ابن عباس ﴿وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين﴾ قال كانت رخصة للشيخ الكبير والمرأة الكبيرة وهما يطيقان الصيام ان يفطرا ويطعما مكان كل يوم مسكينا))

''ابن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو روزہ بہ مشکل رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے، فرمایا کہ یہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لیے اجازت ہے کہ وہ دونوں بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہیں اور وہ روزہ نہ رکھیں اور ہر دن کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔''

اس حدیث میں ظاہر ہے کہ يطيقان الصيام کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں کہ استطاعت کے ساتھ اجازت جمع نہیں ہو سکتی، اس کے معنی یہی ہوں گے کہ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

پہلا ایڈیشن لکھتے وقت دوسرے علما کی تائید مجھے نہیں مل سکی اب الحمد للہ یہ تائید بھی ہاتھ آگئی ہے، سرآمد علمائے اہل حدیث شارح عون المعبود، شرح ابی داؤد، ج ۲ ص:۲۶۶ میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

لكن مع شدة وتعب ومشقة عظيمة، اسی طرح محدثینِ حنفیہ کے سب سے وسیع النظر شیخ الحدیث مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کے متعدد تلامذہ نے اس کی تصدیق کی کہ شاہ صاحب کی یہی تحقیق تھی، فالحمد للہ۔

ان وجوہ سے ﴿وعلى الذين يطيقونه فدية﴾ کا ترجمہ یہ نہ ہوگا کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں، بلکہ یہ ہوگا کہ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

اور ظاہر ہے کہ جب یہ مشکل روزہ پر قادر ہو، اس کو فدیہ کی اجازت ہے تو جو بالکل قادر نہ ہو تو اس کو تو بالاولیٰ فدیہ کی اجازت ہوگی ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۶)

روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب

علم اور فطرت شناسی کے بعض مدعی جو عام عبادات و پرستش کی غرض و غایت یہ قرار دیتے ہیں کہ وحشی انسانوں کا تخیل یہ ہے کہ خدا ہماری جسمانی تکلیف اٹھانے سے خوش ہوتا ہے، وہ روزہ کی حقیقت بھی صرف اسی قدر سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی خوشنودی کے لیے جسمانی زحمت کشی ہے اور ان غلط فہمیوں کے لیے دیگر مذاہب میں گو لغزش گاہیں موجود ہیں، چنانچہ جوگیوں اور جینیوں میں روزہ کی غیر معمولی مدت اور اس کی سختیاں اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، یہودیوں کی اصطلاح میں روزہ کے لیے نفس کو دکھ دینے کی اصطلاح جاری ہے۔ چنانچہ توراۃ میں روزہ کے لیے اکثر اسی قسم کا فقرہ مستعمل ہے۔ سفر الاحبار (۱۶۔۲۹ العہد القدیم ص:۱۸۵) میں ہے:

''اور یہ تمہارے لیے قانون دائمی ہوگا کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ میں تم سے ہر ایک خواہ وہ تمہارے دیس کا ہو خواہ پردیسی، جس کی بود و باش تم میں ہے، اپنی جان کو دکھ دے۔''

توارت کے سفر العدد (۲۹۔۷ العہد القدیم ص:۲۶۳) میں ہے:

''اور اس ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ مقدس جماعت ہوگی اور تم اپنی جانوں کو دکھ دو اور کچھ کام نہ کرو۔''

یہ اصطلاح توراۃ کے اور مقامات میں بھی مذکور ہے، لیکن قرآن مجید نے اس کے لیے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ صوم ہے۔ صوم کے لغوی معنی احتراز و اجتناب اور خاموشی کے ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا روزہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے، خدا نے قرآن پاک میں مسلمانوں کو جہاں روزہ کا حکم دیا ہے، وہاں یہ الفاظ بھی اضافہ فرما دیے ہیں:

﴿ يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''خدا تمہارے ساتھ نرمی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا۔''

اسلام کا عام قانون ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۶)

''خدا کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

قرآن نے اپنے مبلغ کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے:

﴿ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵۷)

''وہ ان کو نیکیوں کا حکم دیتا ہے برائیوں سے روکتا ہے اور گندی چیزوں کو حرام کرتا ہے اور اس طوق اور زنجیروں کو جو ان کے اوپر پڑی ہیں، ان سے اتارتا ہے۔''

ان امور کا منشا یہ ہے کہ اسلامی عبادات واحکام میں کوئی چیز بھی اس غرض سے نہیں رکھی گئی کہ اس سے انسان کی جان کو دکھ پہنچایا جائے، روزہ بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے اور اسی لیے اسلام نے روزہ کی ان سختیوں کو جو لوگوں نے بڑھا رکھی تھیں بتدریج کم کر دیا۔

روزہ میں اصلاحات

اسلام نے روزہ کی سختیوں کو جس حد تک کم کیا اور اس میں جو سہولتیں پیدا کیں وہ حسب ذیل ہیں:

① سب سے اول یہ کہ اسلام سے پہلے جو الہامی یا غیر الہامی مذاہب تھے۔ ان میں اکثر روزہ صرف پیرووں کی کسی خاص جماعت پر فرض تھا۔ مثلاً: ہندووں میں غیر برہمن کے لیے کوئی روزہ ضروری نہیں پارسیوں کے یہاں صرف دستور اور پیشوا کے لیے روزہ ہے۔ یونانیوں میں صرف عورتوں کے لیے روزہ تھا لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روزہ کوئی اچھی چیز ہے تو تمام پیروانِ مذہب کے لیے برابر طور سے ضروری ہے۔ اسلام میں پیشوا غیر پیشوا، عورت، مرد کی کوئی تخصیص نہیں، اس نے تمام پیرووں کو عام حکم دیا اور اس میں کسی چیز کی کوئی تخصیص نہیں کی۔

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ط﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''اس مہینہ میں جو موجود ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے۔''

② اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں عموماً شمسی سال معتبر ہے۔ شمسی سال میں روزہ کی جو تاریخیں جن موسموں میں متعین ہوں گی، ان میں تغیر وتبدل ناممکن ہے، اس بنا پر اگر وہ گرمی یا سردی کے موسم میں چھوٹے یا بڑے دنوں میں واقع ہوتے ہیں، تو یہ تو وہ مختلف ملکوں میں ہمیشہ کے لیے تکلیف دہ یا ہمیشہ کے لیے آرام دہ ہیں۔ اسلام کے روزوں کی تاریخیں قمری مہینوں سے ہیں، جو موسم اور چھوٹے اور بڑے دنوں کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ اس سے اسلامی روزہ کا مہینہ ہر ملک میں ہر موسم میں آتا ہے اور اس بنا پر اس کی سختی ونرمی بدلتی رہتی ہے۔

③ جہاں تک دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں کے پڑھنے کا موقع ملا ہے، روزہ کی تاکید اور حکم کے متعلق کسی حالت انسانی کی تخصیص واستثنا نظر سے نہیں گزری، توراۃ میں تو یقیناً مذکور نہیں، بلکہ یہاں تک ہے کہ اگر کسی وجہ سے روزہ نہ رکھے تو وہ کٹ جائے گا یا قتل ہو جائے گا، بلکہ یہ ہے کہ اس پردیسی پر بھی روزہ فرض ہوگا جو گو یہودی نہیں، مگر یہودیوں کے پاس آ کر رہا ہو۔ [1] لیکن قرآن مجید نے نہایت فطرت شناسی کے ساتھ ہر قسم کے معذور ومجبور لوگوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا۔ بچے مستثنیٰ ہیں، عورتیں ایام حمل ورضاعت اور دیگر مخصوص

[1] سفر الاحبار: ١٦-٢٩؛ العہد القدیم، ص: ١٨٥۔

ایام میں روزہ سے مستثنیٰ ہیں۔ بڈھے، بیمار اور مسافر مستثنیٰ ہیں، کمزور اشخاص جو روزہ پر فطرتاً قادر نہیں، مستثنیٰ ہیں بیمار و مسافر اور عارضی معذور، بیماری، حالت سفر اور عذر کے دفع ہونے کے بعد اتنے دنوں کی قضا بعد کو رکھیں اور جو دائمی طور سے معذور ہیں، وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں، فرمایا:

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۴)

''اگر تم میں کوئی بیمار ہو یا مسافر ہو وہ رمضان کے بعد اور دنوں میں روزہ رکھ لے اور وہ لوگ جو بمشکل روزے رکھ سکتے ہوں، ان پر ایک مسکین کا کھانا ہے۔''

ترمذی میں ہے:

عن انس قال النبی ﷺ: ((ان اللّٰہ وضع عن الحامل والمرضع الصوم)) ❶

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا نبی ﷺ نے کہ خدا نے حاملہ اور دودھ پلانے والی سے روزہ اتار لیا۔''

یعنی رمضان میں روزہ رکھنے سے ان کو اپنی یا بچہ کی جان کا خطرہ ہو تو روزہ قضا کر کے رفعِ عذر کے بعد قضا رکھیں۔

④ اور مذہبوں میں روزہ کے ایام نہایت غیر معتدلانہ تھے، یا تو چالیس چالیس روزہ کا فاقہ تھا یا روزہ کے دنوں میں غلہ اور گوشت کے علاوہ پھل تک کھانے کی اجازت تھی، اسلام نے اس میں بھی توسط اختیار کیا یعنی روزہ کے اوقات میں گو ہر قسم کے کھانے پینے سے روک دیا، مگر اس کی مدت ایک مہینہ تک صرف آفتاب ❷ کے طلوع سے غروب تک چند گھنٹوں کی رکھی۔

⑤ جینیوں کے یہاں ایک ایک روزہ ہفتوں کا ہوتا تھا، عرب کے عیسائی راہب کئی کئی روز کا روزہ رکھتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں پورے چوبیس گھنٹے کا روزہ تھا۔ اسلام نے صرف صبح سے شام تک کا ایک روزہ قرار دیا۔

﴿ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۷)

''پھر روزہ کو رات تک ختم کرو۔''

⑥ یہودیوں کے ہاں یہ روزہ تھا کہ روزہ کھولنے کے وقت ایک دفعہ جو کھا لیتے، کھا لیتے، پھر نہیں کھا سکتے تھے یعنی اسی وقت سے دوسرا روزہ شروع ہو جاتا، عرب میں یہ رواج تھا کہ سونے سے پہلے جو کھا لیتے، کھا لیتے سو جانے کے بعد کھانا پھر نا جائز تھا۔ ابتدا اسلام میں بھی یہی قاعدہ تھا۔ ایک دفعہ رمضان کا زمانہ تھا، ایک صحابی کے گھر میں شام کا کھانا نہیں تیار ہوا تھا، ان کی بیوی کھانا پکا رہی تھیں، وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے، کھانا پک

---

❶ ترمذی، ابواب الصوم:۷۱۵ معناہ۔ ❷ مصنف کی مراد طلوع فجر سے ہے۔

چکا تو ان کی بیوی کھانا لے کر آئی، وہ سو چکے تھے۔اس لیے کھانا نہیں کھا سکتے تھے، دوسرے روز پھر روزہ کا دن تھا ان کو غش آ گیا۔اس پر یہ آیت اتری:

﴿ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۸۷)

''اور اس وقت تک کھاؤ اور پیو جب تک رات کا تاریک خط صبح کے سپید خط سے ممتاز نہ ہو جائے۔''

⑦ جاہلیت میں دستور تھا کہ روزہ کے دنوں میں راتوں کو بھی میاں بیوی علیحدہ رہتے تھے، لیکن چونکہ یہ مدت غیر فطری تھی، اکثر لوگ اس میں مجبور ہو کر نفسانی خیانت کے مرتکب ہو جاتے تھے۔اس لیے اسلام نے صرف روزہ کی حالت تک کے لیے یہ ممانعت محدود کر دی اور رات کو اجازت دے دی:

﴿ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ۭ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۷)

''روزہ کی شب میں بیویوں سے مقاربت تمہارے لیے حلال کی گئی، وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی، خدا جانتا تھا کہ تم اپنے نفس سے خیانت کرتے تھے تو اس نے معاف کیا، اب بیوی سے ملو جلو اور خدا نے تمہارے مقدر میں جو کچھ رکھا ہے (یعنی اولاد) اس کی تلاش کرو۔''

⑧ بھول چوک اور خطا و نسیان اسلام میں معاف ہے، اس بنا پر اگر بھولے سے روزہ دار کچھ کھا پی لے یا کوئی اور کام بھول کر ایسا کر بیٹھے جو روزہ کے خلاف ہے، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

عن ابی ھریرۃ ((من أکل او شرب ناسیا فلا یفطر فانما ھو رزق رزقه الله)) [1]

''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو بھول کر کھائے یا پئے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا کہ یہ تو خدا کی روزی ہی تھی۔''

⑨ اسی طرح ان افعال سے جو گو روزہ کے منافی ہیں، لیکن وہ قصداً سرزد نہیں ہوئے، بلکہ بلا ارادہ از خود سرزد ہوئے ہیں، روزہ نہیں ٹوٹتا۔

قال النبی ﷺ: ((الا لا یفطر من قاء ولا من احتلم)) [2]

''پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا: جس کو قے ہوگئی [3] یا سوتے میں غسل کی ضرورت پیش آ گئی اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔''

[1] ترمذی، ابواب الصوم، باب ماجاء فی الصائم یأکل او یشرب ناسیا:۷۲۱۔

[2] ابوداود، کتاب الصیام، باب فی الصائم یحتلم نهارا فی رمضان:۲۳۷٦۔

[3] قے ہونے کی فقہ حنفی میں کئی صورتیں ہیں ان میں سے بعض میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور بعض میں نہیں۔

⑩ یہودیوں میں اکثر روزے چونکہ مصائب کی یادگار اور غم کی علامت تھے، اس لیے روزہ کی حالت میں وہ زیب وزینت نہیں کرتے تھے اور غم کی صورت بنائے رہتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

''پھر جب تم روزہ رکھو، ریاکاروں کے مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ کیوں کہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ظاہر ہوں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے، پر جب تو روزہ رکھے اپنے سر پر چکنا لگا اور منہ دھوتا کہ تو آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے روزہ دار ظاہر ہو اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، آشکارا تجھے بدلہ دے۔'' (متی ٦۔ ١٦ تا ١٨ العهد الجدید، ص: ١١)

اسلام میں بھی روزہ کی اصل خوبی یہی ہے۔ اس لیے روزہ کی حالت میں سر میں تیل ڈالنا، سرمہ لگانا، خوشبو ملنا اسلام میں روزہ کے منافی نہیں، منہ دھونے اور مسواک کرنے کی بھی تاکید ہے۔ اس سے طہارت اور پاکی کے علاوہ یہ غرض بھی ہے کہ روزہ دار ظاہری پریشان حالی اور پراگندگی کی نمائش کر کے ریا میں گرفتار نہ ہو اور نہ یہ ظاہر ہو کہ وہ اس فرض کے ادا کرنے میں اور خدا کے اس حکم کے بجالانے میں نہایت تکلیف، مشقت اور کوفت برداشت کر رہا ہے، بلکہ ہنسی، خوشی رضامندی اور مسرت ظاہر ہو۔

⑪ روزہ دوسری عبادتوں کے مقابلہ میں ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ تکلیف اور مشقت کی چیز ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ عام افراد امت کو اس میں غلو اور تعمق سے باز رکھا جائے، خود آنحضرت ﷺ اکثر و بیشتر روزے رکھتے تھے۔ مہینوں میں کچھ دن مقرر تھے، ہفتوں میں بھی کچھ دن مقرر تھے، ان کے علاوہ کبھی کبھی رات دن کا متصل روزہ بھی رکھتے تھے۔ لیکن دوسرے روزوں کو صرف استحباب تک رکھا اور رات دن کے متصل روزہ کی تو مطلقاً ممانعت فرمائی۔ بعض صحابہ نے سبب دریافت کیا تو فرمایا:

((ایکم مثلی انی ابیت یطعمنی ربی ویسقینی))

''تم میں مجھ سا کون ہے؟ مجھے تو میرا خدا کھلاتا پلاتا ہے (یعنی روحانی غذا)۔''

لوگوں نے اصرار کیا تو آپ نے کئی کئی دن تک متصل روزے رکھنے شروع کیے۔ جب مہینہ گزر گیا تو بطور سرزنش کے فرمایا کہ اگر مہینہ ختم نہ ہو گیا ہوتا تو میں اس سلسلہ کو اور بھی بڑھاتا۔ [1]

روزہ کے مقاصد

اس تفصیل کے بعد ہم کو غور کرنا ہے کہ اسلام میں روزہ کے کیا مقاصد ہیں، گو سطورِ بالا سے کسی قدر ان کا انکشاف ہو چکا ہے۔ مگر ہم مزید تفصیل سے ان کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی کوئی تعلیم ربانی محض حکم کے طور پر نہیں ہے۔ بلکہ وہ سرتاپا حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے اس کے فرائض کی عمارت روحانی، اخلاقی، اجتماعی اور مادی فوائد اور منفعتوں کے چہارگانہ ستونوں پر

[1] بخاري، كتاب الصوم، باب التنكيل لمن اكثر الوصال: ١٩٦٥۔

قائم ہے اور ان مصلحتوں ان منفعتوں کے اصول اور جوہر کو خود محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفہ الہامی نے ظاہر کر دیا ہے اور بتا دیا ہے۔ چنانچہ روزہ کے مقاصد اور اس کے اغراض بھی اس نے جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے، تین مختصر فقروں میں بیان کر دیے ہیں:

﴿ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''تاکہ خدا نے جو تم کو ہدایت کی ہے، اس پر اس کی بڑائی اور عظمت ظاہر کرو۔''

﴿ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''تاکہ اس ہدایت کے ملنے پر تم خدا کا شکر کرو۔''

﴿ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۳)

''تاکہ تم پرہیزگار بنو (یا تم میں تقویٰ پیدا ہو)۔''

اوپر گزر چکا ہے کہ شریعت والے پیغمبروں کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے شریعت کے اترنے سے پہلے ایک مدت متعینہ تک ملکوتی زندگی بسر کی اور تا بہ امکان کھانے پینے کی انسانی ضرورتوں سے وہ پاک رہے اور انہوں نے اس طرح اپنی روح کو عالم بالا سے اتصال کے لائق بنایا۔ یہاں تک کہ وہ مکالمۂ الٰہی سے سرفراز ہوئے اور پیغام ربانی نے ان پر نزول کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس روز اسی طرح بسر کیے، تب توراۃ کی لوحیں ان کے سپرد ہوئیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی چالیس روز اسی طرح گزارے، تب حکمت کا سرچشمہ ان کی زبان اور سینہ سے اُبلا۔ محمد رسول اللہ ﷺ غار حرا میں ایک مہینہ یعنی ۳۰ دن مصروف عبادت رہے، اس کے بعد فیضان الٰہی کا نور اس غار کے دہانہ سے طلوع ہوا۔

حاملِ قرآن کی پیروی

اس سے معلوم ہوا کہ اس روزہ کی فرضیت سے سب سے پہلا مقصد انبیا علیہم السلام کے ان متبرک و مقدس ایام کی تقلید اور پیروی ہے۔ یہودی بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی میں ۴۰ دنوں کا روزہ مناسب اور صرف چالیسویں دن کا روزہ فرض سمجھتے ہیں۔ عیسائیوں کو بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقلید اور پیروی میں یہی چاہیے تھا۔ مگر انہوں نے پال کی پیروی میں جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور احکام و سنن کی اتباع نہیں کی اس کی بھی نہ کی۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے رسول ﷺ کی پیروی میں یہ چند دن اسی طرح گزاریں، چنانچہ فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۸۳)

''اے مسلمانو! جیسے تم سے پہلے لوگوں پر (ان کے رسولوں کی پیروی اور ہدایت ملنے کے شکریہ

میں) روزہ فرض کیا گیا تھا تم پر بھی فرض کیا گیا۔“

دین الٰہی کی تکمیل، نبوت کے اختتام اور تعلیم محمدی ﷺ کے کمال کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ گزشتہ امتوں نے اپنے اپنے پیغمبروں کی تقلید اور پیروی کے جس سبق کو چند ہی روز میں بھلا دیا۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی لاکھوں اور کروڑوں امت اس کو اب تک یاد رکھے ہوئے ہے اور اپنے رسول کی پیروی میں وہ بھی ایک مہینہ تک اسی طرح دن کو کھانے پینے اور دوسرے نفسانی خواہشوں سے اپنے کو پاک رکھتی اور ملکوتی زندگی بسر کرتی ہے۔

شکریہ

یہ روزہ انبیا علیہم السلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان احسان کا جو اس نے اپنے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانوں پر کیا شکریہ ہے اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے۔ وہ کتاب الٰہی، وہ تعلیم ربانی، وہ ہدایت روحانی جو ان ایام میں انسانوں کو عنایت ہوئی، جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ اور ظلماتی سے نورانی بنایا، پستی و ذلت کے عمیق غار سے نکال کر ان کو اوج کمال تک پہنچایا، ان کی وحشت کو تہذیب و اخلاق سے، ان کی جہالت کو علم و معرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا، جس نے ان کی قسمتوں کے پانسے الٹ دیئے اور فضل و دولت اور خیر و برکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو معمور کر دیا، جس نے ذرہ بے مقدار کو آفتاب اور مشت خاک کو ہم دوش ثریا بنا دیا۔ قرآن پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

﴿ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

”اور (یہ رمضان کا روزہ) اس لیے (فرض ہوا) تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی اور تاکہ تم اس کا شکریہ ادا کرو۔“

اس ہدایتِ ربانی اور کتاب الٰہی کے عطیہ پر شکر گزاری کا یہ رمز و اشارہ ہے کہ اس مہینہ کی راتوں میں مسلمان اس پوری کتاب کو نمازوں (تراویح) میں پڑھتے اور سنتے ہیں اور اس مہینہ کے خاتمہ پر اللہ اکبر، اللہ اکبر کا ترانہ بلند کرتے ہوئے، عیدگاہوں میں جاتے اور خوشی و مسرت کے ولولوں کے ساتھ عید کا دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں۔

تقویٰ

روزہ کا سب سے بڑا معنوی مقصد تقویٰ اور دل کی پرہیزگاری اور صفائی ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ فرمایا گیا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

﴿تَتَّقُوْنَ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۳)

''اے ایمان والو! تم پر بھی اسی طرح روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا، تا کہ تم تقویٰ حاصل کرو۔''

① تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجک معلوم ہونے لگتی اور نیک باتوں کی طرف اس کو بے تابانہ تڑپ ہوتی ہے اور روزہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو، بات یہ ہے کہ انسانوں کے دلوں میں گناہوں کے اکثر جذبات بہیمی قوت کی افراط سے پیدا ہوتے ہیں، روزہ انسان کے ان جذبات کی شدت کو کمزور کرتا ہے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ان نوجوانوں کا علاج جو اپنی مالی مجبوریوں کے سبب نکاح کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور ساتھ ہی اپنے نفس پر بھی قابو نہیں رکھتے روزہ بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ ''روزہ شہوت کو توڑنے اور کم کرنے کے لیے بہترین چیز ہے۔'' [1]

② اسلام کے مختلف احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی مشروعیت میں ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ اس میں اس بات کا خاص اشارہ ہے کہ ۱۲ مہینوں میں ایک مہینہ ہر مسلمان کو اس طرح بسر کرنا چاہیے کہ دن رات میں ایک وقت کھانا کھائے اور ہو سکے تو ایک وقت کا کھانا اپنے فاقہ زدہ محتاج اور غریب بھائیوں کو کھلا دے۔ ان تمام احکام پر نظر ڈالیے جو فدیہ اور کفارہ سے متعلق ہیں تو معلوم ہوگا کہ ان سب مواقع میں روزہ کا بدل غریبوں کو کھانا کھلانا قرار دیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ اور غریبوں کو کھانا کھلانا یہ دونوں باہم ایک دوسرے کے قائم مقام ہیں، ایسے لوگ جو فطرتاً کمزور یا دائم المرض یا بہت بڈھے ہیں اور جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں ان کو روزہ کے بجائے حکم ہوتا ہے:

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸٤)

''اور جو لوگ مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہوں، وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں۔''

حج میں اگر کسی عذر یا بیماری کے سبب سے احرام سے پہلے سر منڈانا پڑے:

﴿فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹٦)

''تو روزہ یا خیرات یا قربانی فدیہ دے۔''

جو لوگ حج اور عمرہ ایک احرام میں ادا کریں، جس کو تمتع کہتے ہیں، ان پر قربانی واجب ہے جو غریبوں ہی میں تقسیم کی جاتی ہے، اگر یہ نہ ہو سکے تو:

﴿فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹٦)

''تو دس روزے رکھیں، تین حج میں اور سات گھر آ کر۔''

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب الصوم لمن خاف علی نفسه العزبة: ۱۹۰۵۔

حج میں جانور کا شکار منع ہے، اگر کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے تو اس پر اسی جانور کے مثل کی قربانی لازم آتی ہے، جو منیٰ لے جا کر ذبح کی جائے، اگر یہ نہ ہو سکے تو:

﴿ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا ﴾ (٥/ المآئدة:٩٥)

''یا چند مسکینوں کا کھانا یا اسی کے برابر روزے۔''

اگر کوئی بالا رادہ قسم کھا کر توڑ دے تو اس پر دس مسکینوں کا کھانا واجب ہے یا ایک غلام کو آزاد کرنا، اگر یہ نہ ہو سکے:

﴿ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ﴾ (٥/ المآئدة:٨٩)

''تو تین دن کے روزے۔''

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دے کر اس کو اپنے اوپر حرام کر لے اور پھر اس کی طرف رغبت کرے تو اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا لازم ہے، لیکن اگر یہ اس کی قدرت میں نہ ہو:

﴿ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ﴾ (٥٨/ المجادله:٤)

''تو دو مہینے متواتر روزہ رکھے۔''

اور یہ بھی ممکن نہ ہو:

﴿ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ﴾ (٥٨/ المجادلة:٤)

''تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔''

ان احکام سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ روزہ درحقیقت صدقہ وخیرات غریبوں کے کھلانے بلکہ غلاموں کو آزاد کرنے کا قائم مقام ہے۔

③ روزہ ہی امیروں اور پیٹ بھروں کو بتاتا ہے کہ فاقہ میں کیسی اذیت اور بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے اور اسی وقت اس کو اپنے غریب اور فاقہ سے نڈھال بھائیوں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ چند لقموں سے ان کی تکلیف کو دور کرنا کتنا بڑا ثواب ہے۔ جو خود بھوکا نہ ہو اس کو بھوک کی اور جو خود پیاسا نہ ہو اس کو پیاس کی تکلیف کا احساس کیوں کر ہوگا۔ بقول حافظ ابن قیم رحمہ اللہ سوز جگر کے سمجھنے کے لیے پہلے سوختہ جگر ہونا ضروری ہے۔ روزہ اسی احساس کو زندہ اور ایثار، رحم اور ہمدردی کے جذبہ کو بیدار کرتا ہے۔ چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کا حال یہ تھا کہ بعض صحابہ کہتے ہیں کہ رمضان میں آپ کی سخاوت بادِ رواں کی طرح ہوتی تھی [1] اور اسی کا اثر ہے کہ آج تک مسلمانوں کے ہاں اس مہینہ میں غریبوں اور فقیروں کی امداد واعانت اور ان کو شکم سیر کیا جاتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی: ٦، وکتاب الصوم، باب اجود ماکان النبی ﷺ یکون فی رمضان: ١٩٠٢۔

④ انسان گو کتنا ہی نعمت وناز کے گودوں میں پلا ہو اور مال و دولت سے مالا مال ہو، تاہم زمانہ کا انقلاب اور زندگی کی کشمکش اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے جسم کو مشکلات کا عادی اور سختیوں کا خوگر بنائے، جہاد کے ہر متوقع میدان کے لیے بھوک اور پیاس کے تحمل اور صبر اور ضبط سے اپنے آپ کو آشنا رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہی سبب ہے کہ مسلمان مجاہد اور سپاہی میدان جنگ میں بھوک اور پیاس کی تکلیف کو جس طرح ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے، دوسرا نہیں کرتا، یہ گویا ایک قسم کی جبری فوجی ورزش ہے جو ہر مسلمان کو سال میں ایک مہینہ کرائی جاتی ہے، تا کہ وہ ہر قسم کے جسمانی مشکلات کے اٹھانے کے لیے ہر وقت تیار رہے اور دنیا کی کشمکش، جدوجہد، سختی ومحنت کا پوری طرح مقابلہ کر سکے، اسی لیے روزہ کو قرآن پاک نے کبھی صبر کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے، تا کہ اس سے روزہ کی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے۔

⑤ جس طرح حد سے زیادہ فاقہ اور بھوک انسان کے جسم کو کمزور کر دیتی ہے، اس سے کہیں زیادہ، حد سے زیادہ کھانا انسان کے جسم کو مختلف امراض اور بیماریوں کا نشانہ بنا دیتا ہے۔ طب کے تجربے اور مشاہدے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اکثر حالتوں میں انسان کا بھوکا رہنا اس کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ مختلف بیماریوں کا یہ قطعی علاج ہے۔ طبی ہدایت ہے کہ کم از کم ہفتہ میں ایک وقت کھانا کا ناغہ کیا جائے، اسلام میں ہفتہ وار مسنون ومستحب روزے بھی ہیں، مگر اسی کے ساتھ سال میں ایک دفعہ جسمانی فضلہ کی تخفیف کے لیے فرضاً روزہ رکھنا نہایت نفع بخش ہے، جو مسلمان رمضان کے روزے رکھتے ہیں، ان کو ذاتی تجربہ ہوگا کہ ایک مہینہ کا روزہ کتنی بیماریوں کو دور کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ انہوں نے از خود کھانے پینے اور افطار وسحور میں بے اعتدالی نہ کی ہو، اس لیے یہ ایک قسم کا سالانہ جبری جسمانی علاج بھی ہے۔

⑥ انسان اگر اپنے دن رات کے اشغال اور مصروفیتوں پر غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کے وقت کا ایک اچھا خاصہ حصہ محض کھانے پینے اور اس کے اہتمام میں صرف ہو جاتا ہے۔ اگر انسان ایک وقت کا کھانا پینا کم کر دے تو اس کے وقت کا بڑا حصہ بچ جائے، یہ وقت خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت میں صرف کیا جا سکتا ہے، اگر ہمیشہ نہیں تو کم از کم سال میں ایک دفعہ تو اس غیر ضروری ضرورت کو کم کر کے یہ سعادت حاصل کی جائے۔

⑦ انسان کی دماغی اور روحانی یکسوئی اور صفائی کے لیے مناسب فاقہ بہترین علاج ہے۔ جب انسان کا معدہ ہضم اور فتور سے خالی اور دل ودماغ تبخیرہ معدہ کی مصیبت سے پاک ہو، چنانچہ بڑے بڑے اکابر کا تجربہ اس حقیقت پر گواہ صادق ہے۔

⑧ روزہ بہت سے گناہوں سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے، اس لیے یہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔ چنانچہ اوپر جہاں روزہ اور خیرات کی یکسوئی اور باہم بدل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، وہیں سے یہ بھی ظاہر

ہوتا ہے کہ وہ گناہوں اور غلطیوں کا کفارہ بھی ہے۔ بلکہ توراۃ میں تو اس کو خاص کفارہ ہی کہا گیا ہے۔ [1] اور اسلام میں بھی بہت سے موقعوں میں یہ کفارہ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ اگر قسم کھا کر کوئی اس کو توڑنے کا گناہ کرے تو اس گناہ کی معافی کی یہ صورت ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے اگر اس کی سکت نہ ہو:

﴿ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ؕ ﴾

(۵/ المآئدۃ:۸۹)

''تو تین دنوں کے روزے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے، جب قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کا لحاظ رکھو۔''

اسی طرح حج کی حالت میں شکار کرنے پر اگر قربانی نہ ہو سکے اور چند مسکینوں کو کھانا نہ کھلایا جا سکے تو:

﴿ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۹۵)

''یا اس کے برابر روزہ تاکہ وہ اپنے گناہ کی سزا چکھے اللہ نے معاف کیا جو ہو چکا۔''

علیٰ ہذا اگر کوئی ذمی کسی مسلمان کے ہاتھ سے غلطی سے قتل ہو جائے تو اس مسلمان پر خون بہا یعنی ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا لازم آتا ہے، اگر غلام آزاد کرنے کی صلاحیت نہ ہو:

﴿ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ؗ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ ﴾ (۴/ النسآء:۹۲)

''تو اس گناہ کو اللہ سے بخشوانے کے لیے دو مہینے کے لگاتار روزے رکھے۔''

اس سے اندازہ ہوگا کہ روزہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔

⑨ اس حقیقت کو ایک اور روشنی میں دیکھیے تو روزہ کی یہ امتیازی خصوصیت نمایاں ہو جائے گی روزہ کی بھوک اور فاقہ ہمارے گرم و مشتعل قویٰ کو تھوڑی دیر کے لیے سرد کر دیتا ہے۔ کھانے اور پینے کی مصروفیت سے ہم آزاد ہوتے ہیں، دوسرے سخت کاموں سے بھی ہم اس وقت پرہیز کرتے ہیں، دل و دماغ شکم سیر معدہ کے فاسد بخارات کی پریشانی سے محفوظ ہوتے ہیں۔ ہمارے اندرونی جذبات میں ایک قسم کا سکون ہوتا ہے، یہ فرصت کی گھڑیاں، یہ قویٰ کے اعتدال کی کیفیت، یہ دل و دماغ کی جمعیت خاطر، یہ جذبات کا سکون ہونا۔ ہمارے غور و فکر، اپنے اعمال کے محاسبہ، اپنے کاموں کے انجام پر نظر اور اپنے کیے پر ندامت اور پشیمانی اور خدائے تعالیٰ کی باز پرس سے ڈر کے لیے بالکل موزوں ہے اور گناہوں سے توبہ اور ندامت کے احساس کے لیے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کر دیتا ہے اور نیکی اور نیک کاموں کے لیے ہمارے وجدانی ذوق و شوق کو ابھارتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ رمضان کا زمانہ تمام تر عبادتوں اور نیکیوں کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ اس میں تراویح ہے۔ اس میں اعتکاف رکھا گیا ہے۔ اس میں زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے اور خیرات کرنا سب سے بہتر

[1] احبار ۱۶۔ ۳۰ سے ۳۴ تک العہد القدیم، ص: ۸۵ و ۲۳۔ ۲۷، ص: ۱۹۶۔

ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی فیاضی تو گو سدا بہار تھی لیکن، رمضان کے موسم میں وہ تیز ہواؤں سے بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔ ❶

⑩ ان باتوں کو سامنے رکھ کر یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ درحقیقت دل اور روح کی بھوک اور پیاس کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کی متوقع غرض و غایت تقویٰ قرار دی ہے، اگر روزہ سے روزہ کی یہ غرض و غایت حاصل نہ ہو تو یہ کہنا چاہیے کہ گویا روزہ ہی نہیں رکھا گیا یا یوں کہنا چاہیے کہ جسم کا روزہ ہو گیا، لیکن روح کا روزہ نہ ہوا۔ اسی کی تشریح محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ "روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔" ❷ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "روزہ برائیوں سے روکنے کی ڈھال ہے تو جو روزہ رکھے اس کو چاہیے کہ لغو اور فحش باتیں نہ کہے اور نہ جہالت (غصہ) کرے، یہاں تک کہ اگر کوئی اس سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو اور گالی بھی دے تو یہی کہے کہ میں روزہ سے ہوں۔" ❸ بعض حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "روزہ اس وقت تک ڈھال ہے، جب تک اس میں سوراخ نہ کرو۔" ❹ صحابہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ! اس میں سوراخ کس چیز سے ہو جاتا ہے فرمایا: "جھوٹ اور غیبت سے۔" ❺ چنانچہ بعض علما کی رائے میں جس طرح کھانے اور پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ❻

⑪ تمام عبادات میں روزہ کو تقویٰ کی اصل اور بنیاد اس لیے بھی قرار دیا گیا ہے کہ یہ ایک مخفی خاموش عبادت ہے، جو ریا اور نمائش سے بری ہے، جب تک خود انسان اس کا اظہار نہ کرے، دوسروں پر اس کا راز افشا نہیں ہو سکتا اور یہی چیز تمام عبادات کی جڑ اور اخلاق کی بنیاد ہے۔

⑫ اسی اخلاص اور بے ریائی کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت فرمایا کہ روزہ دار میرے لیے اپنا کھانا پینا اور ملذذات کو چھوڑتا ہے، اس لیے:

((الصوم لی وانا اجزی به)) ❼

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب اجود ما کان...... : ۱۹۰۲۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الصیام، باب من لم یدع قول الزور: ۱۹۰۳؛ ترمذی، ابواب الصوم، باب ما جاء فی التشدید فی الغیبة: ۷۰۷؛ ابوداود، کتاب الصیام، باب الغیبة للصائم: ۲۳۶۲؛ ابن ماجه، ابواب الصیام، باب ماجاء فی الغیبة والرفث للصائم: ۱۶۸۹۔

❸ صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب هل یقول انی صائم اذا شتم: ۱۹۰۴؛ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب حفظ اللسان للصائم: ۲۷۰۳؛ نسائی، کتاب الصیام: ۲۲۱۸، ۲۲۱۹؛ ابوداود، باب الغیبة للصائم: ۲۳۶۳؛ مؤطا امام مالك، کتاب الصیام، باب جامع الصیام: ۶۸۹۔ ❹ سنن دارمی، کتاب الصوم، باب الصائم یغتاب فیخرق صومه: ۱۷۳۲؛ نسائی، کتاب الصیام: ۲۲۳۵، ۲۲۳۷۔

❺ طبرانی فی الاوسط: ٤٥٣٦۔ ❻ فتح الباری، ج ٤، ص: ۸۸۔

❼ صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب هل یقول انی صائم: ۱۹۰٤ ومؤطا امام مالك: ٦۹۰۔

''روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا۔''

جزا تو ہر کام کی وہی دیتا ہے، لیکن صرف اس کی عظمت اور بڑائی کو ظاہر کرنے کے لیے اس کی جزا کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا اور بعض علما کے نزدیک اسی کا اشارہ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے:

﴿ اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۝ ﴾ (۳۹/ الزمر: ۱۰)

''صبر کرنے والوں کو مزدوری بے حساب پوری کی جائے گی۔''

اور اتنا ظاہر ہے کہ روزہ کی مشقت اٹھانا بھی صبر کی ایک قسم ہے، اس لیے روزہ دار بھی ''صابرین'' کی جماعت میں داخل ہو کر اجر بے حساب کے مستحق ہوں گے۔

⑬ روزہ بھی چونکہ صبر کی ایک قسم ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ صبر اور تحمل و برداشت کی مشق اور ورزش کی ایک بہترین اور آسان ترین صورت ہے، اسی لیے مشکلات کے حل کرنے کے لیے دعا اور صبر کرنے کی خاص ہدایت ہوئی ہے:

﴿ وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۴۵)

''اور (مشکلات پر) دعا اور صبر کے ذریعہ سے مدد حاصل کرو۔''

دعا مانگنے کی ریاضت تو ہر وقت ممکن ہے کہ وہ انسان کی اختیاری چیز ہے، لیکن صبر کرنے کی مشق کرنا اختیاری نہیں، کیوں کہ قدرتی مشکلات اور مصائب کا پیش آنا انسان کے اختیار میں نہیں، اس لیے اس کی مہارت اور مشق کے لیے شریعت نے روزہ رکھا ہے، اسی لیے اس آیت بالا کی تفسیر میں صبر کے معنی روزہ کے بھی لیے گئے ہیں۔ [1]

⑭ یہی وجہ ہے کہ روزہ بھی ان اعمال حسنہ میں سے ہے، جن کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے خطا پوشی، گناہوں کی معافی اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا۝ ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۳۵)

''اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور خدا کو زیادہ یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، ان کے لیے اللہ نے تیار رکھی ہے معافی اور بڑی مزدوری۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ جس طرح ہمارے بعض مادی جرائم کا کفارہ ہے۔ اسی طرح ہمارے روحانی گناہوں کا بھی کفارہ ہے۔

[1] تفسیر ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکورہ، ج ۱، ص: ۱۹۹ مصر۔

حج

﴿ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ ﴾ (۳/ آل عمران: ۹۷)

حج اسلام کی عبادت کا چوتھا رکن اور انسان کی خدا پرستی اور عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے۔ اس کے لفظی معنی ''قصد اور ارادہ'' کے ہیں اور اس سے مقصود خاص مذہبی قصد اور ارادہ سے کسی مقدس مقام کا سفر ہے لیکن اسلام میں یہ ملک عرب کے شہر مکہ میں جا کر وہاں کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد خانہ کعبہ کے گرد چکر لگانے اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہو کر کچھ آداب اور اعمال بجالانے کا نام ہے۔

انسانی تمدن کی ابتدائی تاریخ پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ انسانی جماعت کی ابتدائی شکل خاندان اور خانوادہ کی صورت میں تھی، اس سے آگے بڑھی تو چند خیموں اور جھونپڑیوں کی ایک مختصر سی آبادی بنی۔ پھر وہ شہر کی صورت میں منتقل ہوئی، اس سے ترقی کر کے اس نے ایک قوم ایک ملک کا قالب اختیار کیا اور بالآخر وہ تمام دنیا پر چھا گئی۔ مکہ اس انسانی ترقی کے تمام مدارج اور مراتب کی ایک مرتب تاریخ ہے، وہ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے عہد میں ایک خاندان کا تبلیغی مستقر بنا۔ پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانہ میں وہ چند خیموں اور جھونپڑیوں کی مختصر سی آبادی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے عرب کے مذہبی شہر کی جگہ حاصل کر لی اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد وہ اسلامی دنیا کا مذہبی مرکز قرار پایا۔ دنیا کی ابتدائی آبادی کے عہد میں یہ دستور تھا کہ ہر آبادی کے محصورانہ احاطہ میں دو خاص باعظمت مکان بنائے جاتے تھے۔ ایک اس آبادی کے بادشاہ کا محل یا قلعہ اور دوسرے اس آبادی کے کاہن کا معبد ہوتا تھا۔ عموماً ہر آبادی کسی نہ کسی دیوتا یا ستارہ کی طرف منسوب ہو کر اس کی حفاظت اور پناہ میں ہوتی تھی اور اسی محافظ دیوتا یا ستارہ کی وہاں پوجا ہوتی تھی۔ اس کے معبد کا صحن دارالامن ہوتا تھا۔ نذرانہ کی تمام رقمیں اور پیداواریں اس میں جمع ہوتی تھیں اور جیسے جیسے اس آبادی کی بادشاہی اور حکمرانی بڑھتی جاتی تھی، اس دیوتا کی حکومت کا رقبہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔ [1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آبائی وطن عراق تھا، جہاں کلدانیوں کی آبادی اور حکومت تھی۔ یہاں بھی بدستور ستاروں کی پوجا ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نبوت پا کر ستارہ پرستی کے خلاف دنیا میں سب سے پہلی آواز بلند کی اور ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی، ان کے خاندان اور قوم کے لوگوں نے ان کو اس کے لیے تکلیفیں دیں اور بالآخر ان کو اپنا وطن چھوڑ کر شام مصر اور عرب کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ یہ تمام وہ مقامات تھے، جن میں سام کی اولاد پھیلی ہوئی تھی اور مختلف ناموں سے ان کی حکومتیں قائم تھیں، آثار، قومیات، لسانیات اور دوسرے تاریخی قرائن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کا ملک سامی اقوام کا پہلا مسکن اور پہلی آبادی تھی اور یہیں سے نکل کر وہ یمن اور خلیج فارس کے سواحل سے عراق پہنچی تھیں اور شام و فلسطین گئی تھیں اور مصر میں ہکسوس یا چرواہے (بدو) بادشاہوں کے نام سے حکمران تھیں۔ [2]

---

[1] توراۃ اور بابل، کلدان و یونان وغیرہ کی پرانی تاریخوں اور آثار قدیمہ میں اس بیان کے شواہد ملیں گے اور میری تصنیف ''ارض القرآن'' میں ان کے اقتباسات مذکور ہیں۔ [2] میری تصنیف ارض القرآن، ج ۱، ص: ۷۰ و مابعدہ میں اس پر مفصل بحث ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مختلف شہروں کے سفر کے بعد عرب و شام کی سرحد کا رخ کیا اور بحر میت کے پاس اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو آباد کیا۔ اپنے بیٹے حضرت اسحاق، کو کنعان (فلسطین) میں بسایا۔ اپنے دوسرے بیٹوں مدین وغیرہ کو حجاز کی طرف بحر احمر کے ساحل پر اس مقام پر جگہ دی، جس کو ان کے انتساب سے آج تک مدین کہتے ہیں اور اس سے آگے بڑھ کر فاران کی وادی میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سکونت مقرر کی۔ یہ تمام مقامات وہ شاہراہ تھی، جس پر سے مصر و شام سے حجاز و یمن اور حجاز و یمن سے مصر و شام آنے جانے والے تاجروں سوداگروں اور قافلوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ اپنی اولاد کو اس خاص سلسلہ سے آباد کرنے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو مقصد تھے، ایک یہ کہ تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کی بنا پر اس کو غلہ اور ضروری سامان کے ملنے میں تکلیف نہ ہو اور ساتھ ہی وہ بھی اس سوداگری میں بہ آسانی شریک ہو سکے اور دوسرا یہ کہ خدا کی خالص توحید کی تبلیغ کے لیے قوموں کے یہ گزرگاہ بہترین تبلیغی مرکز تھے، یہاں وہ عراق و شام کی جبار و قہار قوموں کے حدود سے جو مشہور بت پرست اور ستارہ پرست تھیں، علیحدہ رہ کر لوگوں میں دین حق کو پھیلا سکتی تھی۔

بیت اللہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دستور یہ تھا کہ جہاں کہیں ان کو روحانیت کا کوئی جلوہ نظر آتا، وہاں خدا کے نام سے ایک پتھر کھڑا کر کے خدا کا گھر اور قربان گاہ بنا لیتے تھے۔ چنانچہ تورات کتاب پیدائش میں ان کی تین قربانگاہوں یا خدا کا گھر بنانے کے واقعات مذکور ہیں۔

''تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کے کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اس نے وہاں خداوند کے لیے جو اس پر ظاہر ہوا ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے روانہ ہو کے اس نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ کھڑا کیا، بیت ایل اس کے پچھم اور عئی اس کے پورب تھا اور وہاں اس نے خدا کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا، (۱۲۔۷و۸العہد القدیم ،ص:۱۹)

اس کے بعد ہے۔

> ''اور وہ (ابراہیم) سفر کرتا ہوا دکھن سے بیت اللہ میں اس مقام تک پہنچا، جہاں اس نے شروع میں ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں ابراہیم نے خدا کا نام لیا۔'' (۱۳۔۳،۴،ص:۲۰)

پھر ایک اور جگہ پہنچے جہاں ان کو خدا کی وحی اور برکت کا پیام پہنچا اور حکم ہوا:

> ''اٹھ اور اس ملک کے طول و عرض میں پھر کہ میں اسے تجھ کو دوں گا اور ابراہیم نے اپنا ڈیرہ اٹھایا اور ممرے کے بلوطوں میں جو جبروں میں ہیں، جا رہا اور وہاں ایک قربان گاہ بنائی۔''
> (۱۳۔۱۷۔۱۸،ص:۲۰)

اسی قسم کی قربان گاہیں اور خدا کے گھر حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، اور حضرت موسیٰ علیہم السلام نے بھی

بنائے اور آخر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کی تعمیر کی جو بنی اسرائیل کا کعبہ اور قبلہ قرار پایا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے حال میں ہے کہ جہاں ان پر وحی اور وعدہ کی بشارت نازل ہوئی:

''اور اس نے وہاں مذبح بنایا اور خداوند کا نام لیا اور وہاں اپنا خیمہ کھڑا کیا اور وہاں اسحاق علیہ السلام کے نوکروں نے کنواں کھودا۔'' (پیدائش ۲۶۔۲۵، ص:۴۱)

حضرت یعقوب علیہ السلام کو جہاں مقدس رؤیا ہوئی، وہاں:

''اور یعقوب صبح سویرے اٹھا اور اس پتھر کو جسے اس نے اپنا تکیہ کیا تھا، کھڑا کیا اور اس کے سرے پر تیل ڈالا اور اس مقام کا نام بیت ایل رکھا اور یہ پتھر جو میں نے ستون کھڑا کیا خدا کا گھر ہوگا اور سب میں سے جو تو مجھے دے گا دسواں حصہ (عشر) تجھے (خدا کو) دوں گا۔''

(۲۸۔۱۸۔۲۲، ص:۴۵)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے:

''اور اگر تو میرے لیے پتھر کی قربان گاہ بنائے، تو تراشے ہوئے پتھر کی مت بنائیو، کیونکہ اگر تو اس کے لیے اوزار لگائے گا تو اسے ناپاک کرے گا اور تو میری قربان گاہ پر سیڑھی سے ہرگز مت چڑھیو، تاکہ تیری برہنگی اس پر ظاہر نہ ہو۔'' (خروج ۲۰۔۲۵۔۲۶، ص: ۱۲۰)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حکم کے بموجب

''اور پہاڑ کے تلے ایک قربان گاہ اور بنی اسرائیل کے بارہ فرقوں کے لیے بارہ ستون بنائے اور سلامتی کے ذبیحے بیلوں سے خداوند کے لیے ذبح کیے اور موسیٰ علیہ السلام نے آدھا خون لے کے باسنوں میں رکھا اور آدھا قربان گاہ پر چھڑکا۔'' (خروج ۲۴۔۴۔۶ و ۷، ص:۱۲۵)

اوپر کے اقتباسات میں اس قسم کی تعمیر یا مکان کا ایک نام (مذبح، قربان گاہ) بتایا گیا ہے اور دوسرا بیت ایل یعنی بیت اللہ اور خدا کا گھر، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی نسل میں اس قسم کی قربان گاہ اور بیت اللہ بنانے کا دستور تھا، اسی قسم کا وہ گھر ہے جو مکہ معظمہ میں، کعبہ، مسجد حرام اور مسجد ابراہیم کے نام سے آج تک قائم ہے، بلکہ اس کی نسبت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں خدا کا پہلا گھر ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی اور اس کے شرائط

اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں یہ بحث تفصیل سے آ چکی ہے کہ قرآن پاک کے بموجب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے جس محبوب اور اکلوتے بیٹے کی قربانی کا خواب دیکھا تھا اور توراۃ کے مطابق جس کی قربانی کا حکم ہوا تھا، وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے اور یہ بحث بھی وہیں گزر چکی ہے کہ قربانی کرنے سے توراۃ کے محاورہ میں یہ مقصود ہے کہ وہ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لیے نذر کر دیا جائے، وہ نذر کردہ،

جانوروں پر ہاتھ رکھ دیتا تھا اور وہ جانور اس کی طرف قربانی کیے جاتے تھے، جو لوگ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لیے نذر کیے جاتے تھے، وہ نذر کے دنوں میں سرنہیں منڈاتے تھے، جب نذر کے دن پورے ہو جاتے تھے تب ان کا سر مونڈا جاتا تھا، جو قربانی یا نذر پیش کی جاتی تھی وہ پہلے قربان گاہ پر ہلائی یا پھرائی جاتی تھی، اس کے بعد وہ قربانی کی جاتی یا جلائی جاتی تھی۔

ملّت ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے

توراۃ اور قرآن پاک دونوں سے یہ ثابت ہے کہ ملت ابراہیمی کی اصلی بنیاد قربانی تھی اور یہی قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کی اصلی خصوصیت تھی اور اسی امتحان اور آزمائش میں پورے اترنے کے سبب سے وہ اور ان کی اولاد ہر قسم کی نعمتوں اور برکتوں سے مالا مال کی گئی، توراۃ کی کتاب پیدائش میں ہے:

''خداوند فرماتا ہے، اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا ہاں اپنا اکلوتا بیٹا دریغ نہ رکھا، میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا اور بڑھاتے ہی تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور دریا کے کنارے کے ریت کے مانند بڑھاؤں گا اور تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازوں پر قابض ہو جائے گی اور تیری نسل سے زمین کی ساری قوم برکت پائے گی، کیونکہ تو نے میری بات مانی''۔ (۲۲۔۱۶۔۱۷۔۱۸، ص:۲۳)

قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَإِذِ ابْتَلَىٰٓ إِبْرَٰهِـۧمَ رَبُّهُۥ بِكَلِمَـٰتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّى جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۲۴)

''اور جب ابراہیم کے پروردگار نے چند باتوں میں اس کی آزمائش کی، پھر اس نے ان کو پورا کیا، تو خدا نے اس سے کہا، کہ میں تجھ کو لوگوں کے لیے پیشوا بنانے والا ہوں۔''

﴿ وَلَقَدِ ٱصْطَفَيْنَـٰهُ فِى ٱلدُّنْيَا ۖ وَإِنَّهُۥ فِى ٱلْـَٔاخِرَةِ لَمِنَ ٱلصَّـٰلِحِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُۥ رَبُّهُۥٓ أَسْلِمْ ۖ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ ٱلْعَـٰلَمِينَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۳۰۔۱۳۱)

''اور ہم نے ابراہیم کو دنیا میں چنا اور وہ آخرت میں یقیناً نیکوں میں سے ہے، جب اس کے خدا نے اس سے کہا کہ اپنے کو سپرد کر دے، اس نے کہا میں نے اپنے کو دنیا کے پروردگار کے سپرد کر دیا۔''

﴿ يَـٰٓإِبْرَٰهِيمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ ٱلرُّءْيَآ ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِى ٱلْمُحْسِنِينَ ۝ ﴾

(۳۷/ الصّٰفّٰت:۱۰۴۔۱۰۵)

''اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم یونہی اچھے کام کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔''

یہی وہ برکت ہے جس کو مسلمان دن میں پانچ مرتبہ خدا کے سامنے یاد کرتے ہیں:

((اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ))

''خدایا! تو محمد اور محمد ﷺ کی (جسمانی وروحانی) نسل پر برکت نازل کر، جس طرح تو نے ابراہیم اور ابراہیم کی (جسمانی وروحانی) نسل پر برکت نازل کی۔''

لیکن یہ قربانی کیا تھی؟ یہ محض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی، بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی، یہ ماسوی اللہ اور غیر کی محبت کی قربانی خدا کی راہ میں تھی، یہ اپنی عزیز ترین متاع کو خدا کے سامنے پیش کر دینے کی نذر تھی، یہ خدا کی اطاعت، عبودیت اور کامل بندگی کا بے مثال منظر تھا، یہ تسلیم ورضا اور صبر وشکر کا وہ امتحان تھا، جس کو پورا کیے بغیر دنیا کی ''پیشوائی'' اور آخرت کی ''نیکی'' نہیں مل سکتی، یہ باپ کا اپنے اکلوتے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین کر دینا نہ تھا، بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشوں، تمناؤں اور آرزوؤں کی قربانی تھی اور خدا کے حکم کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کر دینا تھا اور جانور کی ظاہری قربانی اس اندرونی نقش کا ظاہری عکس اور اس خورشید حقیقت کا ظلِ مجاز تھا۔

اسلام قربانی ہے

اسلام کے لفظی معنی ''اپنے کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا اور اطاعت اور بندگی کے لیے گردن جھکا دینا ہے'' اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابراہیم اور اسماعیل ﷤ کے اس ایثار اور قربانی سے ظاہر ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ ان باپ بیٹوں کی اس اطاعت اور فرمانبرداری کے جذبہ کو صحیفہ محمدی ﷺ میں اسلام کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴾ (۳۷/ الصّٰفّٰت ۳۷:۱۰۳)

''جب ابراہیم ﷤ اور اسماعیل اسلام لائے، (یا فرمانبرداری کی یا اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا) اور ابراہیم نے اپنے بیٹے (اسماعیل) کو پیشانی کے بل زمین پر لٹایا۔''

﴿ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۳۰۔۱۳۱)

''اور کون ابراہیم کی ملت کو پسند نہ کرے گا، لیکن وہ جو خود بیوقوف بنے، ہم نے اس کو دنیا میں مقبول کیا اور وہ آخرت میں بھی نیکوں میں سے ہوگا، جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ اسلام لا، (یا فرمانبرداری کر یا اپنے کو سپرد کر دے) اس نے کہا: میں نے پروردگار عالم کی فرمانبرداری کی، (یا اپنے کو اس کے سپرد کر دیا)۔''

الغرض ملت ابراہیمی کی حقیقت یہی اسلام ہے کہ انہوں نے اپنے کو خدا کے ہاتھ میں سونپ دیا اور اس کے آستانہ پر اپنا سر جھکا دیا تھا، یہی اسلام کی حقیقت ہے اور یہی ابراہیمی ملت ہے اور اسی بارِ امانت کو اٹھانے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام بار بار خدا سے دعا فرماتے تھے، کہ ان کی نسل میں اس بوجھ کے اٹھانے والے ہر زمانہ میں موجود رہیں اور بالآخران کی نسل میں وہ امین پیدا ہو، جو اس امانت کو لے کر تمام دنیا میں وقف عام کر دے، چنانچہ دعا فرمائی تو یہ فرمائی:

﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۞ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۞ ﴾ (۸/ البقرۃ:۱۲۸۔۱۲۹)

''ہمارے پروردگار! ہم کو مسلمان (یا اپنا فرماں بردار) بنا اور ہماری نسل میں سے ایک مسلمان (یا اپنی فرمانبردار) جماعت بنا اور ہم کو مناسک (حج کے دستور) بتا اور ہم کو معاف کر، بے شک تو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے، ہمارے پروردگار! اس میں اپنا ایک رسول بھیج جو تیری آیتیں ان کو پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو پاک اور صاف کرے، تو غالب اور حکمت والا ہے۔''

یہ رسول محمد رسول اللہ ﷺ تھے، یہ کتاب قرآن پاک تھی، یہ حکمت سینہ محمدی ﷺ کا خزانہ علمی وعملی تھا اور یہ مناسک اسلام کے ارکان حج تھے۔

یہ قربانی کہاں ہوئی؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کہاں کی، توراۃ میں اس مقام کا نام مورہ یا موریہ بتایا گیا ہے، بعض بے احتیاط مترجموں نے اس نام کا بھی ترجمہ کر دیا ہے اور بلوطون کے جھنڈ، یا بلند زمین اس کا ترجمہ کیا ہے، لیکن محتاط مترجموں نے اصل عبری نام کو قائم رکھا ہے، چنانچہ اس وقت ہمارے پیش نظر توراۃ کا وہ عربی ترجمہ ہے، جو عبرانی، کلدانی اور یونانی زبانوں کے مقابلہ میں ۱۸۹۰ء میں اوکسفورڈ یونیورسٹی کے مطبع میں چھپا ہے، اس میں اس مقام کا نام ''مُریا'' لکھا ہے اور اس کے فارسی ترجمہ میں جو انہی زبانوں کے مقابلہ سے بائبل سوسائٹی لندن کی طرف سے ۱۸۸۵ء میں لندن میں چھپا ہے، اس کا تلفظ ''موریا'' کیا ہے اور درحقیقت یہ لفظ مروہ ہے جو مکہ میں بیت اللہ کعبہ کے پاس ایک پہاڑی کا نام ہے، اس فارسی ترجمہ کی عبارت یہ ہے:

''خدا ابراہیم را امتحان کردہ بدو گفت اے ابراہیم! عرض کرد لبیک، گفت کہ اکنون پسر خودرا کہ یگانہ تست و اورا دوست می داری یعنی اسحاق رابردار و بزمین موریا برد، و اور ادر آن جابریکے از کوہ ہائے کہ بتونشان می دہم برائے قربانی سوختنی بگذران،

بامدادان (صبح) ابراہیم برخاستہ الاغ (گدہا) خودرا بیاراست و دونفراز نوکران خودرا باپسر خویش "اسحاق" برداشتہ و ہیزم برائے قربانی سوختنی شکستہ روانہ شد، و بسوئے آں مکانی کہ خدا اوررا فرمودہ بود، رفت، و در روز سوم ابراہیم چشماں خودرا بلند کردہ آن مکان را از دوردید، آنگاہ ابراہیم بخادمان گفت شما ایں جابمانید، تامن باپسر بد انجا رویم، و عبادت (دوسرے ترجموں میں سجدہ ہے) کردہ نزد وشما باز آئیم" (پیدائش ۲۲)

اس عبارت میں اسحاق کا نام یہود کی تحریف اور اضافہ ہے اور مسلمان متکلمین نے قطعی دلیلوں سے اس تحریف واضافہ کو ثابت کیا ہے، اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں اس پر مختصر بحث گزر چکی ہے اور ہماری جماعت میں سے، جناب مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے "الرای الصحیح فی من ھو الذبیح" نام ایک عربی رسالہ خاص اس مسئلہ پر مدلل ومفصل لکھا ہے، اس لیے یہاں بحث بے محل ہے، بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے لیے جو مقام بتایا گیا تھا، وہ سرزمین مروہ تھی، وہ اس مقام سے جہاں وہ قیام پذیر تھے، چند روز کی مسافت پر تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعتوں کے مطابق ضروری تھا کہ جس مقام پر قربانی گزاری جائے، وہ کوئی قربان گاہ اور بیت اللہ ہو، خاص کر اس لیے بھی کہ وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کی عبادت کی اور سجدہ کیا اور وہ قربان گاہ یا بیت اللہ ایسا معروف و مشہور ہو کہ ساتھ کے نوکروں کو یہ کہا جا سکے کہ "میں وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں"۔ یہ خصوصیتیں کعبہ کے سوا کہیں اور نہیں پائی جاتیں اور نہ یہود ونصاریٰ اس کے لیے کسی دوسرے مقام کو ثابت کر سکے اور نہ عظیم الشان واقعہ کی کسی قسم کی بھی یادگار حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل (بنی اسرائیل) میں موجود تھی اور نہ ہے اور نہ بیت المقدس یا مسیح علیہ السلام کی ولادت گاہ سے اس واقعہ کے کسی یادگاری اثر کا تعلق پہلے تھا، نہ اب ہے۔

برخلاف اس کے بنو اسماعیل یعنی اسماعیلی عربوں میں اس قربانی اور اس کے خصوصیات کی ایک ایک یادگار ہزار ہا برس سے محفوظ چلی آئی تھی اور گو اس میں امتداد زمانہ اور تغیرات کے سبب سے کسی قدر کمی بیشی، یا بعد کی گمراہیوں کے سبب سے اس میں بعض مشرکانہ رسوم کی آمیزش ہوگئی تھی، تاہم اصل شے باقی تھی، عرب میں بت پرست بھی تھے، ستارہ پرست بھی تھے، کافر بھی تھے، مشرک بھی تھے، بلکہ عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی تھے، مگر عربوں کے قدیم اشعار سے ثابت ہے، کہ ان سب کو خانہ کعبہ اور حج کے مراسم کی اہمیت کا یکساں اعتراف تھا، یہاں تک کہ عیسائی عرب بھی اس کی قسمیں کھاتے تھے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ میں جہاں مشرکوں کے بتوں کی صفیں تھیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی تصویریں بھی تھیں۔ [1]

[1] اخبار مکہ للازرقی، ج ۱، ص:۱۰۴ وفتح الباری ابن حجر، کتاب المغازی، باب این رکز النبی ﷺ، ج ۸، ص:۱۴ وسیرۃ ابن ہشام، ذکر الاسباب الموجبۃ للمسیر الی مکۃ وفتح مکۃ، ج ۲، ص:۲۷۳۔

مکہ اور کعبہ

کعبہ وہ مقام ہے جو مسلمان عرفا کے خیال کے مطابق عرشِ الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا ''سمت القدم'' ہے، وہ ازل سے اس دنیا میں خدا کا معبد اور خدا پرستی کا مرکز تھا، سب بڑے بڑے پیغمبروں نے اس کی زیارت کی اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتوں کی سمت اس کو قرار دیا کہ

﴿ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ ﴾ (۳/ ال عمران: ۹٦)

''سب سے پہلا خدا کا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا۔''

وہ وہی تھا، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گمراہیوں میں اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمت کدہ میں توحید کا چراغ پھر روشن کیا، تو حکم ہوا کہ اس گھر کی چہار دیواری بلند کر کے، دنیا میں توحید کا پتھر پھر نصب کیا جائے، چنانچہ قرآن پاک کے بیان کے مطابق کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں بھی ﴿ بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴾ (۲۲/ الحج: ۲۹) (پرانا گھر) تھا، کوئی نیا گھر نہ تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے مل کر، اس گھر کی پرانی بنیادوں کو ڈھونڈ کر، پھر نئے سرے سے ان پر چہار دیواری کھڑی کی، فرمایا ﴿ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۲۷) (ابراہیم علیہ السلام جب اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے) اس سے معلوم ہوا کہ بنیاد پہلے سے پڑی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام نے اس افتادہ بنیاد کو از سر نو بلند کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عراق، شام، مصر، ہر جگہ پھر کر، آخر اسی گمنام گوشہ کو منتخب کیا، جو باسطوت جباروں اور بت پرست اور ستارہ پرست قوموں کے حدود سے دور ایک بے نام و نشان صحرا میں ہر چار طرف سے پہاڑیوں سے گھرا تھا، اس لیے قرآن پاک نے کہا:

﴿ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا ﴾ (۲۲/ الحج: ۲٦)

''اور ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر کی جگہ کو ٹھکانا بنایا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ گھر کی جگہ تو پہلے سے متعین تھی، البتہ دیواریں بے نشان تھیں، تو ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسی گھر کی جگہ بتا دی اور اس کو ان کی جائے پناہ اور ٹھکانا بنا دیا کہ بت پرستوں کے شر اور فتنہ سے محفوظ رہ کر دین حق کی تبلیغ کریں۔ تورات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے یہ معبد موجود تھا، کیوں کہ سامی دستور کے مطابق یہ ضروری تھا کہ جس مقام پر خدا کی قربانی یا نذر یا عبادت کی جائے وہ کوئی معبد یا قربان گاہ ہو، اس بنا پر وہ مقام جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اسماعیل علیہ السلام کو قربانی کرنے کے لیے لائے تھے اور جس کے متعلق اپنے خادموں سے کہا تھا کہ وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں، ضروری ہے کہ وہ کوئی معبد ہو، اسی لیے قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اس گھر کی ایجاد نہیں، بلکہ تجدید اور تطہیر کی نسبت کی ہے۔ ﴿ وَطَهِّرْ بَيْتِيَ ﴾ ''اور میرے گھر کو عبادت گاہوں کے لیے پاک و صاف کر۔'' اس وقت تک اس

سرزمین کے لیے عرب کا لفظ بھی پیدا نہیں ہوا تھا، یہ لفظ تو مجموعہ توراۃ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ سے ملتا ہے، اس سے پہلے اس کا نام پورب یا دکھن کا ملک تھا کہ یہ شام کے جنوبی و مشرقی سمت میں واقع تھا اور کبھی اس کا نام بیابان تھا اور آخر یہی بیابان اس کا نام پڑ گیا لفظ عرب (عربیہ) کے اصلی معنی بیابان و صحرا ہی کے ہیں۔ ❶ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت یہ فرمایا تھا:

﴿ رَبَّنَآ إِنِّيٓ أَسۡكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيۡرِ ذِي زَرۡعٍ ﴾ (١٤/ ابراهيم:٣٧)

''خداوندا! میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بن کھیتی کی ترائی میں لاکر بسایا ہے۔''

تو حقیقت میں یہ بن کھیتی کی ترائی اور بے آب و گیاہ میدان اس وقت اس کی ایک امتیازی صفت تھی اور آخر یہی صفت اس ملک کا خاص نام بن گئی اور اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو آباد کرتے ہوئے یہ دعا مانگی تھی:

﴿ وَٱرۡزُقۡ أَهۡلَهُۥ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ ﴾ (٢/ البقرة:١٢٦)

''اور خداوندا! یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں کی روزی پہنچا۔''

مکہ قدیم زبانوں کے بعض محققوں کے نزدیک بابلی یا کلدانی لفظ ہے، جس کے اصلی معنی ''گھر'' کے ہیں ❷ اس سے دو حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ یہ آبادی اس وقت قائم ہوئی، جب بابل و کلدان کے قافلے ادھر سے گزرتے تھے اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اور لغوی دلیل ہے۔ دوسرے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہری آبادی اسی گھر کے تعلق سے وجود میں آئی اور یہ اس خانہ کعبہ کی قدامت اور تقدس اور اہل عرب کی روایات کی صحت پر دلیل قاطع ہے۔ مکہ کا بکہ نام حضرت داود علیہ السلام کی زبور میں سب سے پہلے نظر آتا ہے۔ پہلی جلد کے مقدمہ میں اس کا حوالہ گزر چکا ہے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا ہے کہ قدیم شامی زبان میں بک کے معنی آبادی یا شہر کے ہیں، جیسا کہ آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام بعلبک ہے، یعنی بعل کا شہر (بعل دیوتا کا نام ہے) یہ اس آبادی کی قدامت کی دوسری لغوی شہادت ہے اور کعبہ کی ابتدائی تعمیر کے وقت یہی نام قرآن پاک میں آیا ہے:

﴿ إِنَّ أَوَّلَ بَيۡتٖ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ ﴾ (٣/ ال عمران:٩٦)

''پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لیے بنایا گیا، وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے۔''

کعبہ کے لغوی معنی چوکھونٹے کے ہیں، چونکہ یہ گھر چوکھونٹا بنا تھا اور اب بھی اسی طرح ہے اس لیے کعبہ کے نام سے بھی مشہور ہوا۔

❶ اس تحقیق پر مفصل بحث میری تصنیف ارض القرآن کی پہلی جلد میں ہے از صفحہ: ٥٧ تا صفحہ: ٦٠ طبع اول۔

❷ تاريخ العرب قبل الاسلام جرجی زیدان، ص: ٢٤٤ مصر۔

یونانی تاریخوں میں بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے، یونان کا مشہور مؤرخ ڈیوڈورس جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک صدی پہلے گزرا ہے، وہ عرب کے ذکر میں کہتا ہے:

''ثمودیوں اور سبا والوں کے درمیان ایک مشہور معبد ہے، جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت کرتے ہیں۔ ❶

ثمود کا مقام شام و حجاز کے حدود میں تھا اور سبا کا یمن میں، ظاہر ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان حجاز ہی ہے اور وہاں کا مشہور معبد جس کی عزت سارے عرب کرتے ہوں، خانہ کعبہ ہے، رومیوں کی تاریخ میں بھی خانہ کعبہ کا ذکر ملتا ہے، پروکوپس مؤرخ لکھتا ہے کہ ۵۴۱ء میں رومی سپہ سالار ریلز یرنے اپنے تمام فوجی افسروں کا ایک جلسہ مشاورت کیا، اس میں شام کے دو افسروں نے اٹھ کر کہا کہ وہ آئندہ لڑائی میں شریک نہیں ہوسکتے، کیوں کہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذر سوم فوراً حملہ کر دے گا، اس پر سپہ سالار نے کہا:

''تمہارا یہ خطرہ صحیح نہیں ہے کہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے، جس میں عرب اپنے دو مہینے عبادت کے لیے خاص کرتے ہیں اور اس زمانہ میں ہر قسم کے ہتھیاروں سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔'' ❷

ظاہر ہے کہ یہ صاف حج کا بیان ہے۔

ان تمام شہادتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل عرب یا بنی اسماعیل ہمیشہ سے اپنے ان موروثی مراسم کو ادا کرتے تھے اور اس کی اکثر خصوصیات کو پوری حفاظت کے ساتھ باقی رکھے ہوئے تھے۔ جاہلیت کے اشعار میں حج اور ارکان حج کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ ❸ یہاں تک کہ عیسائی عرب شعرا بھی عزت کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے تھے۔ عرب کے بازاروں اور میلوں کی روایات کے قائم رکھنے میں بھی اس موسمِ حج کا اچھا خاصہ حصہ تھا۔ ❹ اور اسی کے سبب سے محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو ہجرت سے پہلے ہی عرب کے دور دراز گوشوں میں یہاں تک کہ یمن و بحرین تک میں پہنچنے میں کامیابی ہوئی، کیوں کہ حج کے موسم میں عرب کے تمام قبیلے مکہ کی وادی میں اس موروثی رسم کو ادا کرنے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔

حج ابراہیمی یادگار ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کی قربانی کا جو خواب دیکھا اور اس پر لبیک کہا تھا اور جس کی تعمیل کے لیے وہ اس دور دراز مقام میں آئے تھے اور عین اس وقت جب چھری لے کر بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنا چاہا تھا اور بیٹے نے بھی خدا کا حکم سن کر گردن جھکا دی تھی، تو آواز آئی تھی:

❶ گبن کی تاریخ عروج و زوال روم، باب: ۵۰۔ ❷ نتائج الافهام فی تقویم العرب قبل الاسلام محمود پاشا فلکی مطبع امیریہ بولاق مصر، ص: ۳۵ بحوالہ (فرنچ) ایشیاٹک جرنل اپریل ۱۸۸۳ء۔
❸ مولانا حمید الدین صاحب نے اپنے تصنیف الامعان فی اقسام القرآن، ص: ۳۶تا۳۸ میں اس قسم کے اشعار جمع کر دیے ہیں۔ ❹ کتاب الامکنة والازمنة امام مرزوقی طبع حیدرآباد، ج۲، ص: ۱۶۱ باب: ۴۰۔

﴿ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ ﴾ (۳۷/ الصّٰفّٰت: ۱۰۴-۱۰۷)

''یہ کہ اے ابراہیم علیہ السلام! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم ایسا ہی نیکو کاروں کو بدلہ دیتے ہیں...... اور ایک بڑی قربانی دے کر ہم نے اس کے بیٹے کو چھڑا لیا۔''

اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اس خواب کی تعبیر بیٹے کو خدا کے گھر کی خدمت اور توحید کی دعوت کے لیے مخصوص کر دینا اور اس کے ذریعہ سے اس گھر کو دائرہ ارضی میں خدا پرستی کا مرکز بنانا ہے:

﴿ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۲۵-۱۳۱)

''اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کا مرجع اور امن بنایا اور (کہا کہ) ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ اور ابراہیم و اسماعیل سے عہد لیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف اور قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کرو اور یاد کرو جب ابراہیم نے کہا کہ میرے پروردگار! اس کو امن والا شہر بنا اور اس کے بسنے والوں کو کچھ پھلوں کی روزی دے جو ان میں سے خدا اور پچھلے دن پر ایمان لائے، خدا نے کہا اور جس نے انکار کیا اس کو تھوڑا فائدہ پہنچاؤں گا، پھر اس کو دوزخ کے عذاب کے حوالہ کروں گا اور وہ کتنی بری بازگشت ہے اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (اور یہ دعا مانگ رہے تھے کہ) ہمارے رب! (ہماری اس تعمیر کو) ہم سے قبول فرما بے شک تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! اور ہم کو اپنا ایک تابع دار (مسلم) فرقہ بنا اور ہم کو اپنے حج کے ارکان بتا اور ہم پر اپنی رحمت رجوع کر (ہماری توبہ قبول کر) تو توبہ قبول کرنے والا اور رحم والا ہے،

اے ہمارے رب! ان میں انہیں میں سے ایک کو رسول بنا کر بھیج جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک وصاف بنائے، بے شک تو غالب اور دانا ہے اور ابراہیم علیہ السلام کے دین سے کون منہ پھیرے گا، بجز اس کے جو اپنے آپ کو نادان بنائے، حالانکہ ہم نے اس کو (ابراہیم کو) دنیا میں چنا اور آخرت میں وہ نیکوکاروں میں سے ہوگا یاد کرو جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ تابعدار (مسلم) بن جا، اس نے کہا کہ عالم کے پروردگار کا میں تابع دار (مسلم) بن گیا۔''

﴿ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ۝ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝ ذٰلِكَ ۤ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ﴾

(۲۲/ الحج:۲۶۔۳۰)

''اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر کی جگہ کو ٹھکانا بنایا کہ کسی کو میرا ساجھی نہ بنانا اور میرے گھر کو طواف قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کر اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے، وہ تیرے پاس پیادہ اور (دور کے سفر سے تھکی ماندی) دبلی سواریوں پر ہر دور دراز راستہ سے آئیں گے، تاکہ وہ اپنے نفع کی جگہوں پر حاضر ہوں اور ہم نے ان کو جو چوپائے جانور روزی دیے ہیں، ان پر ان (کی قربانی) پر چند جانے ہوئے دنوں میں خدا کا نام لیں تو ان میں سے کچھ تم کھاؤ اور بدحال فقیر کو کھلاؤ، اس کے بعد اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی منتیں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا چکر لگائیں، یہ سن چکے اور جو کوئی اللہ کے آداب کی بڑائی رکھے تو وہ اس کے لیے اس کے رب کے پاس بہتر ہے۔''

﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝ ﴾ (۱۴/ ابراهيم:۳۵۔۳۹)

''اور یاد کرو جب ابراہیم نے یہ دعا کی کہ، اے میرے پروردگار! اس شہر کو امن والا بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچا، میرے پروردگار! ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کیا ہے تو جو میری پیروی کرے گا، وہ مجھ سے ہوگا اور جو میری نافرمانی کرے گا تو، تو بخشنے والا مہربان ہے، اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی کچھ اولاد کو اس بن کھیتی کی ترائی میں تیرے مقدس گھر کے پاس بسایا ہے، اے ہمارے پروردگار! یہ اس لیے، تاکہ یہ تیری نماز کھڑی کریں، تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ایسا بنا کہ وہ ان کی طرف مائل ہوں اور ان کو کچھ پھلوں کی روزی دے، تاکہ یہ تیرے شکر گزار رہیں، اے ہمارے پروردگار! تجھے معلوم ہے جو ہم چھپائیں اور جو ظاہر کریں اور اللہ سے زمین میں اور نہ آسمان میں کچھ چھپا ہے۔''

﴿ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۫ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ فِيْهِ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۹۵۔۹۷)

''کہہ کہ خدا نے سچ فرمایا، تو ابراہیم کے دین کی پیروی کر، شرک سے منہ موڑ کر اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا، بے شک وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا، وہی ہے جو مکہ میں ہے بابرکت اور دنیا کے لیے راہ نما اس میں کچھ کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ اور جو اس میں داخل ہوا وہ امن پا جائے اور خدا کا لوگوں پر اس گھر کا قصد کرنا فرض ہے، جس کو اس کے راستہ (سفر) کی طاقت ہو اور جو اس قدرت کے باوجود اس سے باز رہے، تو خدا دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔''

یہ وہ آیتیں ہیں جن کا تعلق اس موضوع سے ہے، ان میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بت پرست اور ستارہ پرست ملکوں سے ہٹا کر جن میں وہ سرگرداں اور آوارہ پھر رہے تھے اور ایک امن کے سنسان مقام کی تلاش میں تھے، تاکہ وہ خدائے واحد کی پرستش کے لیے ایک گھر بنائیں، یہ ٹھکانا عنایت کیا، جو ازل سے اس کام کے لیے منتخب تھا، تاکہ وہ یہاں خدا کے گھر کی منہدم چہار دیواری کو کھڑی کریں اور پھر اس کو توحید کا مرکز اور عبادت گزاروں کا مسکن بنائیں۔

یہ مقام ویران اور پیداوار سے خالی تھا، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی کہ خداوند! یہاں تیرے مقدس گھر کے پڑوس میں اپنی کچھ اولاد بساتا ہوں، ان کو روزی پہنچانا اور لوگوں کے دلوں کو مائل کرنا کہ وہ ادھر آتے رہیں اور ان کو اس لیے یہاں بساتا ہوں، تاکہ وہ آس پاس کی بت پرست قوموں کی بت پرستی

سے بچے رہیں اور تیری خالص عبادت بجالائیں، ان میں جو نیکوکار ہوں، وہ میرے ہیں اور جو بدکار اور گمراہ ہوں ان کا تو مالک ہے، تو رحم والا اور معاف کرنے والا ہے اور خداوند! میری اولاد میں ایک رسول بھیجنا، جوان کو نیک تعلیم دے۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس مقام اور اس گھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بہت سی یادگار نشانیاں ہیں اور ان کے کھڑے ہونے اور نماز پڑھنے کی جگہ اور قربانی کا مقام ہے، اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ دور دور سے یہاں آئیں اور اپنے دینی و دنیاوی فائدوں کو حاصل کریں اور اس قدیم خانہ خدا کا طواف کریں اور یہاں اسماعیل علیہ السلام کی یادگار میں قربانی کر کے غریبوں کو کھلائیں اپنی نذر پوری کریں اور اس حالت میں وہ امن و سلامتی کے مجسم پیکر ہوں، نہ وہ کسی پر ہتھیار اٹھا سکتے ہوں، نہ ایک چیونٹی تک کو مار سکتے ہوں اور وہ اس حالت میں ظاہری زیبائش و آرائش اور عیش و آرام اور پر تکلف مصنوعی زندگی سے بھی پاک ہوں اور چند روز یہاں ابراہیمی یادگاروں پر ٹھہر ٹھہر کر ابراہیمی زندگی بسر کر کے ابراہیمی طریقہ پر خدا کو یاد کریں۔

اوپر توراۃ کے حوالوں سے گزر چکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کا دستور تھا کہ وہ جہاں کہیں کوئی ربانی کرشمہ دیکھتے تھے، تمدن کے اس ابتدائی عہد میں کسی بڑی تعمیر کے بجائے وہ بن گھڑے پتھر کو کھڑا کر کے خدا کا گھر بنا لیتے، وہاں قربانی کرتے اور خدا کی عبادت کرتے تھے۔ اس قسم کا گھر یہ خانہ کعبہ تھا، یہ بھی توراۃ کے حوالوں سے گزر چکا ہے کہ خدا کے گھر کی خدمت اور عبادت کے لیے جو شخص نذر کیا جاتا تھا، وہ اتنے دنوں تک سر نہیں منڈاتا تھا، نذر پوری کر لینے کے بعد وہ سر پر استرا لگاتا تھا، پھر جہاں یہ مذکور ہے کہ اس گھر کی چھت پر نہ چڑھنا کہ تیری برہنگی نہ ظاہر ہو۔ (خروج ۲-۲۶) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بن سلا کپڑا پہنتے تھے اور کمر میں تہ بند باندھتے تھے۔ توراۃ کے فارسی اقتباس میں جو اوپر نقل ہوا ہے، مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے لیے آواز دی تو حضرت ابراہیم، نے جواب میں "لبیک" کہا اور اردو میں ہے کہ "میں حاضر ہوں" کہا یہی صدا لبيك اللهم لبيك اسلامی حج میں اٹھتے بیٹھتے لگائی جاتی ہے، یہ بھی گزر چکا ہے کہ جس کو نذر یا قربانی کرتے تھے، اس کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھراتے تھے یا نثار کرتے تھے۔ حج میں یہ طواف کہلاتا ہے، غرض ان ہی سب ابراہیمی مراسم کے مجموعہ کا نام اسلام میں حج ہے۔

حج کی حقیقت

ان تفصیلات کے بعد معلوم ہوا ہوگا کہ حج کی حقیقت خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مورد خاص میں حاضری، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے، یعنی ان دو برگزیدہ بندوں کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم و رضا اور فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اور اس معاہدہ کو اور عبودیت کے اظہار کو اسی طرح بجالانا جس طرح

وہ ہزاروں برس پہلے بجالائے اور خدا کی نوازشوں اور بخششوں سے مالا مال ہوئے، یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے، یہی روح اور یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے جس کو حاجی ان بزرگوں کے مقدس اعمال اور قدیم دستوروں کے مطابق حج میں اپنے عمل اور کیفیت سے مجسم کر کے ظاہر کرتے ہیں، تمدن کے اسی ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنوں بن سلے اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں، وہ خود اپنے کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح خدا کے حضور میں نذر کرنے جاتے ہیں، اس لیے اتنے دنوں تک سر کے بال نہ منڈاتے ہیں، نہ ترشواتے ہیں، دنیا کے عیش ونشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں، نہ خوشبو لگاتے ہیں، نہ رنگین کپڑے پہنتے ہیں، نہ سر چھپاتے ہیں اور اسی والہانہ انداز سے جس طرح ابراہیم واسماعیل علیہما السلام تین دن کے سفر کے گرد وغبار میں اٹے ہوئے دوڑے ہوئے خدا کے گھر میں آئے تھے، آتے ہیں اور جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا، وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ ان کی زبانوں پر ہوتا ہے:

((لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ)) [1]

”میں حاضر ہوں اے اللہ! میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، سب خوبیاں اور سب نعمتیں تیری ہی ہیں اور سلطنت تیری ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔“

یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ اور یہ توحید کی صدا ان تمام مقامات اور حدود میں بلند کرتے پھرتے ہیں جہاں جہاں ان دونوں بزرگوں کے نقش قدم پڑے تھے اور چونکہ وہ خود اپنے آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربان گاہ پر نذر کرنے چلتے ہیں۔ اس لیے اپنے آپ کو سات دفعہ اس بیت ایل یا بیت اللہ کے چاروں طرف پھرا کر تصدیق کرتے ہیں، پھر جہاں سے جہاں تک (صفا سے مروہ تک) حضرت ابراہیم علیہ السلام دوڑ کر گئے تھے کہ مروہ پر پہنچ کر بیٹے کی قربانی کریں گے، وہاں ہم دوڑتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اور گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں اور عرفات کے سب سے بڑے میدان میں جمع ہو کر اپنی تمام گزشتہ عمر کے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں، خدا کے حضور میں گڑگڑاتے ہیں، روتے ہیں، قصور معاف کراتے ہیں اور آیندہ زندگی کے لیے خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت، بندگی اور اطاعت کا نیا عہد و پیمان باندھتے ہیں اور یہی درحقیقت حج کا اصلی رکن ہے [2] یہ تاریخی میدان اس تاریخی عہد کی یاد ان بزرگوں کے نقش قدم اور ان کی دعا کے مقامات اور تجلیات ربانی کے مناظر دور دراز سفر اور ہر قسم کی محنت کے بعد اکثروں کو عمر میں ایک دفعہ اس مقام پر آسکنے کا موقع اور لاکھوں بندگان خدا کا ایک ہی وحدت کے رنگ میں، ایک ہی لباس اور شکل وصورت ایک ہی حالت

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب التلبیۃ وصفتها ووقتها: ۲۸۱۱۔

[2] ترمذی، ابواب الحج، باب ما جاء فی من ادرك الامام بجمع فقد ادرك الحج: ۸۸۹۔

اور جذبہ میں سرشار ایک بے آب وگیاہ اور خشک میدان اور جلے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں اکٹھے ہو کر دعاو مغفرت کی پکار، گزشتہ عمر کی کوتاہیوں اور بربادیوں کا ماتم، اپنی بدکاریوں کا اقرار اور پھر اس احساس کے ساتھ کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک بہت سے انبیا اسی حالت اور اسی صورت میں اور یہیں پر کھڑے ہوئے تھے۔ یہ روحانی منظر، ایسا کیف، ایسا اثر، ایسا گداز، ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے جس کی لذت تمام عمر فراموش نہیں ہوتی، پھر اپنی نذر کے دن پورے کر کے اپنی طرف سے ایک جانور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل میں جسمانی طور سے ذبح کرتے ہیں اور اس وقت اسی اطاعت، اسی فدویت، اسی سرفروشی اور اسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں، جو کبھی اسی میدان میں اسی موقع پر اور اسی حالت اور اسی شکل میں دنیا کے سب سے پہلے داعی توحید نے اپنے عمل اور اپنی زبان سے ظاہر کی تھی اور وہی جذبات اس وقت حاجیوں کے دلوں میں موجزن ہوتے ہیں اور ان کی زبانوں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں: [1]

﴿ اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾

(٦/ الانعام: ٨٠)

''میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اس کی طرف منہ کیا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا، موحد بن کر اور میں ان میں نہیں جو خدا کا شریک بناتے ہیں۔''

﴿ اِنَّ صَلَاتِىْ وَنُسُكِىْ وَمَحْيَاىَ وَمَمَاتِىْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ (٦/ الانعام: ١٦٢۔١٦٣)

''میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے، جو تمام دنیا کا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی حکم مجھ کو ہوا ہے، میں سب سے پہلے فرمانبرداری (اسلام کا) اقرار کرتا ہوں۔''

یہی حج کی حقیقت اور یہی اس عظیم الشان عبادت کے مراسم و ارکان ہیں۔

حج کی اصلاحات

حج کی فرضیت دوسری عبادات سے بالکل مختلف تھی، عام اہل عرب نماز کے اوقات، ارکان اور خصوصیات سے عملاً نابلد تھے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کو تعلیم دی اور بتدریج ان کو ترقی دی، زکوٰۃ ان میں سرے سے موجود نہ تھی۔ اس لیے عام صدقہ اور خیرات کے آغاز سے زکوٰۃ کی عملی فرضیت تک متعدد منزلیں طے کرنی پڑیں، روزے نے بھی یوم عاشورا سے لے کر رمضان تک مختلف قالب بدلے، لیکن حج

[1] صحیح مسلم، کتاب الحج، مختلف ابواب۔

عرب کا ایک ایسا عام شعار تھا، جس کے تمام اصول وارکان پہلے سے موجود تھے، صرف ان کا محل اور طریقہ استعمال بدل گیا تھا، یا ان میں بعض مشرکانہ رسوم داخل ہوگئی تھیں، اسلام نے ان مفاسد کی اصلاح کر کے بہ یک دفعہ حج کے فرض ہونے کا اعلان کر دیا۔

ان اصلاحات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① ہر عبادت کی اصلی غرض ذکر الٰہی، طلب مغفرت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے، لیکن اہل عرب نے حج کو ذاتی وخاندانی نام ونمود کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ جب تمام مناسکِ حج سے فارغ ہو چکتے تھے تو تمام قبائل منیٰ میں آ کر قیام کرتے تھے، مفاخرت عرب کا ایک قومی خاصہ تھا اور اس مجمع عام سے بڑھ کر اس کے لیے کوئی موقع نہیں مل سکتا تھا، اس بنا پر ہر قبیلہ ذکر الٰہی کی جگہ اپنے اپنے آباء واجداد کے کارنامے اور محاسن بیان کرتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۰۰)

''جس طرح اپنے باپ دادوں کا ذکر کرتے ہو، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ خدا کی یاد کرو۔''

② قربانی کرتے تھے تو اس کے خون کو خانہ کعبہ کی دیواروں پر لگاتے تھے کہ خدا سے تقرب حاصل ہو جائے، یہود میں بھی یہ رسم تھی کہ قربانی کے خون کا چھینٹا قربان گاہ پر دیتے تھے اور قربانی کا گوشت جلا دیتے تھے، محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ یہ دونوں باتیں مٹا دی گئیں اور یہ آیت اتری:

﴿ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ﴾ (۲۲/ الحج: ۳۷)

'' خدا کے پاس قربانیوں کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا، اس کے پاس صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔''

اور آگے چل کر یہ بھی بتا دیا کہ اس قربانی کا مقصد یہ ہے کہ غریبوں کی ضیافت کی جائے اور اس جشنِ ابراہیمی کے موقع پر ان کو شکم سیر کیا جائے۔

③ اہلِ یمن کا دستور تھا کہ جب حج کی غرض سے سفر کرتے تھے تو زادِ راہ لے کر نہیں چلتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل علی اللہ ہیں، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب مکہ میں پہنچتے تھے تو بھیک مانگنے کی نوبت آتی تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: [1]

﴿ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۷)

''زاد راہ ساتھ لے کر چلو کیوں کہ بہترین زاد راہ پرہیزگاری ہے۔''

[1] بخاری، کتاب الحج، باب قول اللّٰہ: وتزوّدوا......: ۱۵۲۳۔

④ قریش نے عرب کے دوسرے قبیلوں کے مقابل میں جو امتیازات قائم کر لیے تھے ان کی بنا پر قریش کے سوا تمام قبیلے ننگے ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ اس غرض سے خانہ کعبہ میں لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا، جس پر تمام لوگ کپڑے اتار اتار کر رکھ دیتے تھے۔ ❶ ان لوگوں کی ستر پوشی صرف قریش کی فیاضی کر سکتی تھی، یعنی اس موقع پر قریش کی طرف سے حسبةً للہ کپڑا تقسیم کیا جاتا تھا اور مرد مردوں کو اور عورتیں عورتوں کو خاص طواف کے لیے کپڑا مستعار دیتی تھیں اور وہ لوگ اسی کپڑے میں طواف کرتے تھے، لیکن جو لوگ اس فیاضی سے محروم رہ جاتے تھے، ان کو برہنہ طواف کرنا پڑتا تھا۔ ❷ اسلام نے اس بے حیائی کے کام کو قطعاً موقوف کر دیا اور یہ آیت اتری:

﴿ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ (۷/ الاعراف: ۳۱)

''ہر عبادت کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔''

اور ۹ ھ کے موسم حج میں آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس اعلان کے لیے بھیجا کہ آئندہ کوئی ننگا ہو کر طواف نہ کرنے پائے، چنانچہ اس کا اعلان کیا گیا اور اس وقت سے یہ رسم اٹھ گئی۔ ❸

⑤ قریش کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اور تمام قبائل عرفات میں قیام کرتے تھے، لیکن وہ خود حدود حرم کے اندر سے باہر نکلنا اپنے مذہبی منصب کے خلاف سمجھتے تھے، اس لیے مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے، اسلام نے قریش کے اس امتیاز کا خاتمہ کر دیا۔ چنانچہ یہ آیت اتری: ❹

﴿ ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ ﴾ (۲/ البقرة: ۱۹۹)

''کوچ وہیں سے کرو جہاں سے تمام لوگ کرتے ہیں۔''

⑥ صفا اور مروہ کے درمیان میں جو وادی ہے، اس سے تیزی کے ساتھ دوڑ کر گزرتے تھے اور یہ ایک مذہبی سنت قرار پا گئی تھی، لیکن اسلام نے اس کو کوئی سنت نہیں قرار دیا۔ ❺ یعنی اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

⑦ جاہلیت کے زمانہ میں حج کی مذہبی حیثیت تو یوں ہی سی رہ گئی تھی، ورنہ اس نے درحقیقت ایک بڑے میلہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی، جس میں ہر طرف سے ہر قماش کے لوگ جمع ہوتے تھے اور وہ سب کچھ ہوتا تھا جو میلوں میں ہوتا ہے، شور و غل ہوتا تھا، دنگا فساد ہوتا تھا، عورتوں سے چھیڑ خانی ہوتی تھی، غرض فسق و فجور کا ہر تماشا وہاں ہوتا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے یک لخت ان باتوں کو بند کر دیا اور حج کو تقدس، تورّع، نیکی اور ذکرِ الٰہی کا سر تا پا مرقع بنا دیا، حکم آیا:

❶ طبقات ابن سعد تذکرة حمزة سید الشهداء، القسم الاول، ج۳، ص:٦۔

❷ بخاري، كتاب الحج، باب الوقوف بعرفة: ١٦٦٥۔ ❸ بخاري، كتاب الحج، باب لا يطوف بالبيت عريان: ١٦٢٢۔ ❹ بخاري، كتاب الحج، باب الوقوف بعرفة: ١٦٦٥۔ ❺ صحيح بخاري، كتاب الحج، باب ما جاء في السعي بين الصفا والمروة: ١٦٤٤۔

﴿ فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۷)

''پھر جس نے ان مہینوں میں حج کی نیت کی تو پھر حج میں عورت سے نہ چھیڑ چھاڑ ہے، نہ فحاشی ہے، نہ لڑائی دنگا ہے اور تم جو نیکی کرو گے، اللہ کو معلوم ہوگی۔''

⑧ مناسکِ حج کے بعد جو لوگ واپس آنا چاہتے تھے، ان میں دو گروہ ہو گئے تھے، ایک کہتا تھا کہ جو لوگ ایام تشریق ہی میں واپس آتے ہیں وہ گناہگار ہیں، دوسرا ان لوگوں کو الزام لگاتا تھا، جو دیر میں واپس ہوتے تھے چونکہ ان میں درحقیقت کوئی گروہ گناہگار نہ تھا، اس لیے قرآن مجید نے دونوں کو جائز رکھا:

﴿ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ ۗ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۰۳)

''جو شخص عجلت کر کے ایام تشریق کے دو ہی دنوں میں واپس آیا اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے اور جس نے دیر کی اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے، بشرطیکہ اس نے تقویٰ اختیار کیا۔''

⑨ ایک خاموش حج ایجاد کر لیا تھا، یعنی حج کا احرام باندھتے تھے تو چپ رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کو خاموش دیکھا تو وجہ پوچھی، معلوم ہوا کہ اس نے خاموش حج کا احرام باندھا ہے، انہوں نے اس کو منع کیا اور کہا کہ یہ جاہلیت کا کام ہے۔ ❶

⑩ خانہ کعبہ تک پیادہ پا جانے کی نذر کرتے تھے اور اس کو بڑا ثواب کا کام سمجھتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ایک بڈھے کو دیکھا کہ اپنے دو بیٹوں کے سہارے پیادہ جا رہا ہے، وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ اس نے پیادہ پا چلنے کی نذر مانی ہے۔ ارشاد ہوا کہ ''خدا اس سے بے نیاز ہے کہ یہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالے۔'' چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو سواری پر جانے کا حکم دیا۔ ❷ اسی طرح عورتیں خانہ کعبہ تک کھلے سر اور برہنہ پا جانے کی نذر مانتی تھیں، آپ نے ایک بار اسی قسم کی ایک عورت کو دیکھا تو فرمایا کہ ''خدا اس پریشان حالی کا کوئی معاوضہ نہ دے گا، اس کو سوار ہونا اور دوپٹہ اوڑھنا چاہیے۔'' ❸ اسی سبب سے قربانی کے لیے گھر سے جو جانور لاتے تھے، اس پر صرف اس خیال سے کہ وہ قربانی کا جانور ہے، سوار نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک بار آپ نے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ ہانکے ہوئے لے جا رہا ہے۔ فرمایا کہ ''اس پر سوار ہو لو۔'' اس نے جواب دیا کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے تین بار اس کو اونٹ پر سوار ہونے کی تاکید کی۔ ❹

⑪ انصار حج کر کے واپس آتے تھے تو دروازے کی راہ سے گھر میں نہیں داخل ہوتے تھے، بلکہ پچھواڑے

❶ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ایام الجاهلیة: ۳۸۳٤۔ ❷ ترمذی، ابواب النذور والایمان، باب ما جاء فی من یحلف بالمشی ولا یستطیع: ۱۵۳۷۔ ❸ ایضًا: ۱۵۳٦۔

❹ بخاری، کتاب الحج، باب رکوب البدن: ۱٦۸۹، ۱٦۹۰۔

سے کود کر آتے تھے اور اس کو کارِ ثواب سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص حج کر کے آیا اور دستور کے خلاف دروازے سے گھر میں گھس آیا تو لوگوں نے اس کو بڑی لعنت وملامت کی، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی: [1]

﴿ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَى ۗ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۹)

''گھر کے پچھواڑے سے آنا کوئی نیکی نہیں ہے، نیکی صرف اس کی ہے جس نے تقویٰ حاصل کیا اور گھروں میں دروازے کی راہ سے آؤ۔''

⑫ بعض لوگ طواف کرتے تھے تو اپنے گنہگار اور مجرم ہونے کی حیثیت کو مختلف نامناسب طریقوں سے ظاہر کرتے تھے، کچھ لوگ ناک میں نکیل ڈلوا لیتے تھے اور اس کو پکڑ کر ایک شخص کھینچتا پھرتا تھا، آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اسی طریقہ سے طواف کر رہا ہے تو اس کی نکیل کٹوا دی۔ [2] اسی طرح آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے رسی سے اپنا ہاتھ ایک شخص سے باندھ دیا ہے اور وہ اس کو طواف کرا رہا ہے، آپ نے رسی کاٹ دی اور فرمایا کہ ''اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف کراؤ۔'' [3] ایک بار آپ نے دیکھا کہ دو شخص ایک رسی میں جڑے ہوئے ہیں، وجہ پوچھی تو دونوں نے کہا کہ ہم نے یہ نذر مانی ہے کہ اسی طرح جڑے ہوئے خانہ کعبہ کا حج کریں گے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس شکنجے کو دور کرو، یہ نذر نہیں ہے، نذر وہ ہے جس سے خدا کی ذات مقصود ہو۔'' [4]

⑬ اہل عرب ایام حج میں عمرہ نہیں کرتے تھے، کہتے تھے کہ جب سواریاں حج سے واپس آ جائیں اور ان کی پیٹھ کے زخم اچھے ہو جائیں اس وقت عمرہ جائز ہو سکتا ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے خاص ایامِ حج میں عمرہ کیا اور عملاً اس بے ضرورت رسم کو مٹا دیا۔ [5]

⑭ جاہلیت کے زمانہ میں کچھ لوگ تو حج کی نیت کرتے تھے۔ وہ ان دنوں تجارت نہیں کرتے تھے اور اس کو طریقہ حج کے خلاف سمجھتے تھے، اس لیے اکثر لوگ جو صرف تجارت اور بیوپار کے لیے آتے تھے، وہ حج میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ وہ صرف میلہ کی خاطر جمع ہوتے تھے، ان کو حج سے کوئی سروکار نہ تھا، وہ عکاظ اور ذوالمجاز وغیرہ بازاروں میں جمع ہو کر صرف تجارت اور بیوپار کرتے تھے۔ اسلام آیا تو یہ دونوں طریقے الگ الگ جاری تھے۔ اس کا نقصان یہ تھا کہ حاجی تجارت کے منافع سے محروم رہتے تھے اور غیر حاجیوں کا جو مجمع ہوتا تھا وہ صرف تماشائیوں کی بھیڑ ہوتی تھی، بازاری مقصد کے لوگ ہوتے تھے، جن میں ہر قسم کی برائیاں جاری ہوتی تھیں۔ اسلام نے اس تفریق کو مٹا دیا اور کہہ دیا کہ تجارت اور بیوپار حج کے تقدس وحرمت کے خلاف

---

[1] بخاری، کتاب الحج، باب قول الله تعالیٰ: واتوا البیوت من ابوابها: ۱۸۰۳۔

[2] نسائی، کتاب مناسك الحج، باب الكلام في الطواف: ۲۹۲۳۔

[3] بخاری، کتاب الحج، باب الكلام في الطواف: ۱۶۲۰۔ [4] فتح الباری، ج ۳، ص: ۳۸۶۔

[5] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ایام الجاهلیة: ۳۸۳۲۔

نہیں، اس لیے یہ دونوں فریضے ایک ساتھ ادا ہو سکتے ہیں۔ فرمایا: [1]

﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۸)

"تمہارے لیے یہ گناہ نہیں کہ (حج کے زمانہ میں) فضلِ الٰہی (تجارت) کی تلاش کرو۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص جو اس موقع پر جمع ہوتا تھا، حج کی نیت سے جمع ہوتا تھا، اس سے جاہلیت کے زمانہ کے اجتماعی مفاسد کا خاتمہ ہو گیا اور ساتھ ہی اس اجتماع کے جائز تجارتی مشاغل کی ترقی ہو گئی۔

⑮ صفا و مروہ کے طواف کے متعلق پہلے ہی دو گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ انصار مناۃ کا احرام باندھتے تھے۔ جو مشلّل میں قائم کیا گیا تھا اور طواف نہیں کرتے تھے، ان کے علاوہ تمام عرب صفا و مروہ کا طواف کرتے تھے، خدا نے جب پہلے خانہ کعبہ کے طواف کا حکم دیا اور صفا و مروہ کے متعلق کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تو آخر الذکر گروہ نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا کہ یہ کوئی ناجائز فعل ہے؟ انصار نے بھی اس کے متعلق استفسار کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: [2]

﴿ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۵۷)

"صفا و مروہ خدا کا شعار ہیں، پس جو شخص حج یا عمرہ کرے، اس کے لیے ان دونوں کا پھیرا لگانا گناہ نہیں ہے۔"

حج کے ارکان

اب اس اصلاحِ ترمیم و اضافہ کے بعد حج کی حقیقت جن ارکان سے مرکب ہوئی، ان کی تفصیل اور ان کی مشروعیت کی مصلحتیں حسب ذیل ہیں:

احرام

تمام اعمال اگرچہ نیت پر مبنی ہوتے ہیں، لیکن نیت کا اظہار عمل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ نماز کے لیے تکبیر اسی نیت کا اعلان ہے۔ احرام بھی حج کی تکبیر ہے۔ احرام باندھنے کے ساتھ انسان اپنی معمولی زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت میں آ جاتا ہے۔ اس لیے اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہو جاتی ہیں، جو دنیوی عیش و نشاط، زیب و زینت اور تفریحِ طبع کا ذریعہ تھیں، وہ شکار نہیں کر سکتا کہ محض کام و دہن کی لذت کے لیے کسی جاندار کی

---

[1] اس آیت کے شان نزول میں روایتیں مختلف ہیں، کچھ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے، اہل عرب حج میں تجارت کرنا برا جانتے تھے اس لیے یہ آیت اتری۔ دوسری روایتوں میں ہے کہ اہل عرب ان دنوں تجارت کرتے تھے، اسلام جب آیا تو صحابہ نے یہ سمجھا کہ اب حج خالص خدا کے لیے ہو گیا، اس لیے اب اس میں تجارت مناسب نہیں یہ آیت اس خیال کی تردید کے لیے اتری، لیکن تمام روایتوں کے جمع کرنے سے وہ حقیقت معلوم ہوتی ہے، جو اوپر متن کتاب میں لکھی گئی ہے اور روایتوں کے جمع کرنے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے (دیکھو تفسیر طبری، الجزء الثانی، ص:۱۵۸ تا ۱۶۰ اور اسباب النزول واحدی میں آیت مذکورہ)۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الحج، باب وجوب الصفا و المروۃ:۱۶۴۳

جان لینا بہر حال خود غرضی ہے۔ بیوی سے متمتع نہیں ہو سکتا کہ یہ نفسانی وشہوانی لذتوں سے احتراز کا موقع ہے۔ سلے ہوئے کپڑے نہیں پہن سکتا کہ یہ جاہ وجلال کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اسی بنا پر اہل عرب برہنہ طواف کرتے تھے۔ لیکن خدا کی بارہ گاہ میں یہ بھی ایک بے ادبی تھی۔ اس لیے اسلام نے اس کو جائز نہیں رکھا اور یہ مقرر کیا کہ احرام کی نیت کے ساتھ شاہ وگدا اپنے اپنے سلے ہوئے کپڑوں کو اتار دیں اور انسان کے ابتدائی دور کا بن سلا کپڑا زیب بر کیا جائے، ایک چادر کمر سے لپیٹ لی جائے اور دوسری سر کھول کر گردن سے اس طرح لپیٹ لی جائے کہ داہنا ہاتھ ضروری کاموں کے لیے باہر رہے۔ یہ عہد ابراہیمی کے لباس کی تمثیل ہے، جو اس لیے اس وقت کے لیے پسند کیا گیا تاکہ اس مبارک عہد کی کیفیت ہماری ظاہری شکل وصورت سے بھی ظاہر ہو، یہ گویا شہنشاہ عالم وعالمیان کے دربار میں حاضری کی وردی ہے جو بالکل سادہ، بے تکلف اور زیب وزینت سے خالی مقرر کی گئی ہے۔

طواف

یعنی خانہ کعبہ کے چاروں طرف گھوم کر اور پھر کر دعائیں مانگنا، اس رسم کو ادا کرنا ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں نذر اور قربانی کی قربان گاہ کے چاروں طرف پھرا کر ادا کی جاتی تھی، چنانچہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھاتا ہے، اس لیے وہ اس کے چاروں طرف پھرتا ہے اور اس گردش کی حالت میں وہ اپنی مغفرت کی دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے جس کا ایک ضروری ٹکڑا آخر میں یہ ہوتا ہے کہ ﴿ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾(۲/ البقرۃ:۲۰۱) ”خداوندا ہم کو دنیا میں نیکی دے اور آخرت میں نیکی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔“

طواف حقیقت میں ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے، جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”خانہ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے، صرف فرق یہ ہے کہ تم اس میں بول سکتے ہو، مگر نیک بات کے سوا اس حالت میں کچھ اور نہ بولو۔“ [1] اور حکم ہوا کہ

﴿ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴾ (۲۲/ الحج:۲۹)

”اور اس پرانے گھر کا طواف کریں۔“

حجرِ اسود کا استلام

حجر اسود کے لفظی معنی کالے پتھر کے ہیں، یہ کالے رنگ کا ایک پتھر ہے، جو خانہ کعبہ کی دیوار کے ایک گوشہ میں قد آدم بلند لگا دیا گیا ہے۔ خانہ کعبہ بیسیوں دفعہ گرا اور بنا، کبھی سیلاب میں بہہ گیا اور کبھی آگ میں

[1] ترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء فی الکلام فی الطواف:۹۶۰؛ نسائی، کتاب مناسك الحج، باب اباحة الکلام فی الطواف:۲۹۲۵؛ دارمی، کتاب المناسك، باب الکلام فی الطواف:۱۸۴۷؛ مستدرك حاکم، کتاب المناسك، ج۱، ص:۴۵۹۔

جل گیا، اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں پڑی تھی، ایک پتھر بھی اس میں باقی نہیں، مگر اس عہد عتیق کی یادگار صرف ایک پتھر رہ گیا تھا، جس کو اہل عرب نے جاہلیت میں بھی بڑی حفاظت سے قائم رکھا اور ساڑھے تیرہ سو برس سے اسلام میں وہ اسی طرح نصب ہے (الا یہ کہ ۳۱۷ھ میں باطنیہ اس کو کچھ دنوں کے لیے نکال کر لے گئے اور پھر واپس کر گئے) یہ پتھر کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگا ہے، جس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑے گا اور اسی لیے حجر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رکن شامی ہے، اس گوشہ کی تخصیص سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمر ہے، اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے طواف کے شروع اور ختم کرنے کے لیے وہ ایک نشان کا کام دے، ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دے سکتے ہیں۔ سینہ سے بھی لگا سکتے ہیں، ہاتھ یا کسی لکڑی یا اور کسی چیز سے اس کو چھو کر اس چیز کو چوم سکتے ہیں۔ یہ نہ سہی تو اس کی طرف صرف اشارہ پر بھی قناعت کر سکتے ہیں اور یہ پتھر کہنے کے لیے تو ایک معمولی پتھر ہے، جس میں نہ کوئی آسمانی کرامت ہے نہ کوئی غیبی طاقت ہے۔ صرف ایک یادگاری پتھر ہے۔ مگر ایک مشتاق زیارت کی نگاہ میں اس تخیل کے ساتھ کہ تمام دنیا بدل گئی، شہر مکہ کا ذرہ ذرہ بدل گیا، کعبہ کی ایک ایک اینٹ بدل گئی، مگر یہ وہ پتھر ہے جس پر ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک کے مقدس لب یا مبارک ہاتھ بالیقین پڑے ہیں اور پھر تمام خلفائے راشدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ائمہ اعلام، اکابر اسلام اور حکمائے عظام رحمہم اللہ کے ہاتھوں نے اس کو مس کیا ہے اور آج ہمارے گناہگار لب اور ہاتھ بھی اس کو مس کر رہے ہیں۔ ہمارے دلوں اور آنکھوں میں تاثیر اور کیفیت کی ایک عجیب لہر پیدا کر دیتا ہے اور بااین ہمہ ہم مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک پتھر ہے جس میں کوئی قدرت نہیں اور جیسا کہ بادہ توحید کے ایک ہشیار متوالے [1] نے اس کو چوم کر کہا: اے کالے پتھر! میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک معمولی پتھر ہے، نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، لیکن میں اس لیے تجھے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے محمد رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا تھا۔ [2] الغرض یہ بوسہ تعظیم کا نہیں، بلکہ اس محبت کا نتیجہ ہے جو اس یادگار کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی روحانی اولاد کو ہے، ورنہ اگر کوئی نہ اس کو چھوئے اور نہ بوسہ دے نہ اشارہ کرے تو اس سے اس کے ادائے حج میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا۔

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا

صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں تھیں، جو گو اب برائے نام رہ گئی ہیں، تاہم کچھ کچھ ان کے نشانات باقی ہیں، صفا وہ پہاڑی معلوم ہوتی ہے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی سواری کے گدھوں اور نوکروں کو چھوڑ

---

[1] یعنی حضرت عمر بن خطاب۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب استحباب تقبیل الحجر: ۳۰۶۹؛ ترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء فی تقبیل الحجر: ۸۶۰؛ بخاری، کتاب الحج: ۱۵۹۷؛ نسائی: ۲۹۴۰؛ ابن ماجہ: ۲۹۴۳۔

کرا کیلے حضرت اسماعیل کو لے کر آگے بڑھے تھے اور مروہ وہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کرنی چاہی اور آخر منادی غیب کی آواز سے رک گئے اور اسماعیل علیہ السلام کی جگہ مینڈھا قربانی کیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت حاجرہ علیہا السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لے کر جب یہاں آئی تھیں اور وہ پیاس سے بے تاب ہو گئے تھے تو حضرت ہاجرہ علیہا السلام صفا و مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں اور آخر زمزم کا چشمہ ان کو نظر آیا، یہ صفا مروہ کی سعی انہیں کی اس مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے، بہر حال حج میں پہلے صفا پر پھر مروہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا کی حمد کرتے اور دعا مانگتے ہیں، پھر اس سے اتر کر دعائیں مانگتے ہوئے مروہ پر آتے ہیں۔ وہاں بھی دعائیں مانگتے ہیں کہ یہ دونوں مقامات ہیں، جہاں ربانی کرشمے کے عظیم الشان جلوے حضرت ابراہیم اور ہاجرہ علیہا السلام کو نظر آئے۔

﴿ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ ﴾ (۲/ البقرة:۱۵۸)

''بے شک صفا اور مروہ خدا کا شعار ہیں تو جو خانہ کعبہ کا حج کرے یا عمرہ کرے، اس پر اس کا پھیرے لگانا گناہ نہیں۔''

وقوفِ عرفہ

عرفات میں نویں ذوالحجہ کو تمام حاجیوں کو ٹھہرنا اور زوال کے بعد سے غروب تک یہاں دعا اور خدا کی حمد میں مصروف رہنا پڑتا ہے اور اصل حج اسی کا نام ہے، یہاں کوسوں تک جہاں تک نظر کام کرتی ہے، ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس میں کھڑے ہو کر رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہیں، یہیں جبل رحمت کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دنیا کے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبہ عام دیتا ہے اور انہیں ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے۔ عرفات کے اس وقوف میں ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمائش ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ اجتماع عظیم روز حشر کی یاد دلاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ سورۂ حج کا آغاز حشر کے بیان سے ہوتا ہے، یہ اجتماع اور اس کے بے نظیر مؤثر منظر دلوں میں مغفرت اور رحمت الٰہی کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے، ہر شخص کو داہنے بائیں آگے پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے، تو وہ خود اثر میں ایسا ڈوب جاتا ہے کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہ جاتی ہے۔

قیام مزدلفہ

حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے، عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے ہیں، اسی حالت میں اگر منیٰ کو براہ راست چلے جاتے تو راستہ کی خستگی سے چور ہو جاتے، اسی لیے انہوں نے ذرا سا سکون اور آرام اٹھانے کے لیے مزدلفہ کو ایک بیچ کی منزل قرار دے لیا تھا، اسلام نے اس کو اس لیے باقی رکھا کہ یہیں

وہ مسجد واقع ہے، جس کو مشعر حرام کہتے ہیں اور یہ عبادت کا خاص مقام تھا، اس لیے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوع فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا:

﴿ فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَٰتٍ فَٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ عِندَ ٱلْمَشْعَرِ ٱلْحَرَامِ ۖ وَٱذْكُرُوهُ كَمَا هَدَىٰكُمْ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِۦ لَمِنَ ٱلضَّآلِّينَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۸)

''تو جب عرفات سے چلو تو مشعر حرام کے پاس خدا کو یاد کرو اور اس کو یاد کرو جس طرح اس نے تم کو بتایا اور تم اس سے پہلے حق کی راہ کو بھولے ہوئے تھے۔''

منیٰ کا قیام

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قربانی کا اصلی مقام مروہ کی پہاڑی ہے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قربانی پیش کی تھی، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''قربان گاہ مروہ اور پھر مکہ کی تمام گلیاں ہیں۔'' [1] رفتہ رفتہ جب مسلمانوں کی کثرت سے حج کے دائرہ نے مکانی وسعت حاصل کی اور قربانیوں کی کوئی حد نہ رہی، ادھر مروہ اور مکہ کا تمام میدان شہر اور آبادی کی صورت میں بدل چکا تھا، اس لیے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر ایک میدان کو اس کے لیے منتخب کیا جس کا نام منیٰ ہے، یہاں تمام حاجی دو تین دن ٹھہر کر باہم ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہیں، یہیں قربانی کی جاتی ہے، باہم دعوتیں ہوتی ہیں، بازار لگتے ہیں، خرید و فروخت ہوتی ہے۔

جاہلیت میں عرب کے لوگ یہاں جمع ہو کر اپنے اپنے باپ دادوں کی بزرگی پر فخاری کیا کرتے تھے جو اکثر لڑائی بھڑائی کی صورت اختیار کر لیتی تھی، اس بیہودہ رسم کے روکنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ بجائے اس کے خدا کی حمد و عبادت کا حکم دیا جائے اور اس مقام کو قوموں اور خاندانوں کی مفاخرت کی بجائے مسلمانوں کے باہم تعارف، محبت، مساوات اور یکجہتی کا مقام قرار دیا جائے فرمایا:

﴿ وَٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ فِىٓ أَيَّامٍ مَّعْدُودَٰتٍ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۰۳)

''خدا کو چند گنتی کے دنوں میں یاد کرو۔''

قربانی

یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ منیٰ کے سہ روزہ قیام میں یہ قومی عید کی عمومی دعوت بن جائے جس میں لوگ ایک دوسرے کو، دوست احباب کو اور فقرا اور مساکین کو کھانا کھلائیں:

﴿ وَيَذْكُرُوا۟ ٱسْمَ ٱللَّهِ فِىٓ أَيَّامٍ مَّعْلُومَٰتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّنۢ بَهِيمَةِ ٱلْأَنْعَٰمِ ۖ فَكُلُوا۟ مِنْهَا وَأَطْعِمُوا۟ ٱلْبَآئِسَ ٱلْفَقِيرَ ﴾ (۲۲/ الحج:۲۸)

---

[1] مؤطا امام مالك، كتاب الحج، باب ماجاء فى النحر فى الحج: ۸۹۵؛ ابو داود، كتاب المناسك، باب الصلوة بجمع: ۱۹۳۷؛ ابن ماجه، كتاب مناسك، باب الذبح: ۳۰۴۸۔

''اور مقررہ دنوں میں خدا کا نام اس پر لیا جائے جو جانور خدا نے روزی میں دیا تو اس میں سے کچھ خود کھاؤ اور مصیبت کے مارے فقیر کو کھلاؤ۔''

اگر بعض حالات میں قربانی نہ ہو سکے تو دس روزے رکھ لیں کہ یہ بھی ذاتی ایثار ہی کی تمثیل ہے:

﴿ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۗ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۶)

''تو جو عمرہ اور حج دونوں کا ایک ساتھ فائدہ اٹھائے تو جو قربانی اس سے ممکن ہو وہ کرے جس کو یہ بھی میسر نہ ہو تو تین دن کے روزے حج میں اور سات دن واپس ہو کر۔''

حلق راس

منیٰ میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہیں، یہ اس پرانی رسم کی تعمیل ہے کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈواتے۔ ❶ ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یادگار کا اشارہ چھپا ہے، تمدن کے ابتدائی عہد میں دستور تھا کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا اس کے سر کے بال منڈا دیے جاتے تھے۔ یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ ❷ چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار و اعتراف ہے۔ اس لیے انسانیت کی یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی:

﴿ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ ۙ ﴾ (٤٨/ الفتح:٢٧)

''اپنے سروں کو منڈا کر یا بال ترشوا کر۔''

﴿ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ ۗ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۶)

''اور اپنے سر نہ منڈاؤ جب تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے۔''

رمی جمار

منیٰ ہی کے میدان میں پتھر کے تین ستون کھڑے ہیں، کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربانی کے لیے لے چلے تو شیطان نے ان موقعوں پر ان کے دل میں وسوسہ ڈالا انہوں نے اس کو یہاں رجم کیا۔ جس کے لفظی معنی کنکریاں مارنے کے ہیں اور جو پہلے زمانہ میں لعنت کے اظہار کا طریقہ تھا اور اسی لیے شیطان کو ''رجیم'' یعنی ''کنکری مارا گیا'' کہتے ہیں۔ صاحب نظام القرآن ❸ کا نظریہ ہے کہ ابرہہ کے لشکر نے مکہ پر جب چڑھائی کی تھی تو چند غدار ثقفی عربوں نے اس کی راہنمائی کی، باقی عربوں نے اس ناگہانی حملہ کا بدویانہ سنگ اندازی سے مقابلہ کیا۔ جس کا ذکر سورۂ فیل کی آیت ﴿ تَرْمِيهِمْ

---

❶ تورات عہد قدیم قاضی اصحاح: ١٣ آیت: ٥ ۔ گنتی اصحاح: ص: ٤٠٣ ، ٦ آیت: ٥ ، ص: ٢١٨۔

❷ ابن سعد جز ثانی قسم اول ، ص: ٣٧ سریه المنذر بن عمرو وسیرة ابن هشام ذکر بیر معونه واقعه عمرو بن امیه و جزنا صیة وا عتقه ، ج٢ ، ص: ١٤٠۔ ❸ مولانا حمید الدین فراهی المتوفی: ١٩٣٠ء۔

﴿بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ﴾ (١٠٥/ الفيل: ٤) میں ہے، اس سے اللہ تعالیٰ نے اس لشکر کو تباہ کیا اور وہ غدار بھی ہلاک ہوئے یہ کنکریوں کا پھینکنا اسی "ترمیھم" کی سنگ باری کی یادگار ہے۔ خدا کی تسبیح اور حمد پڑھ کر ان کنکریوں کو ان ستونوں پر پھینکتے ہیں اور شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہیں، چونکہ کنکری مارنا یا پھینکنا بظاہر ایک بیکار کام معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے اس کی تصریح فرمادی کہ اس کنکری پھینکنے سے مقصود اس بہانہ سے خدا کی یاد کو قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ [1] قرآن پاک نے بھی اسی حقیقت کی طرف اپنے الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

﴿فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا﴾

(٢/ البقرة: ٢٠٠)

"جب سب ارکان ادا کر چکو تو اپنے باپ دادوں کو جیسے یاد کرتے تھے ویسے ہی خدا کو یاد کرو بلکہ اس سے بڑھ کر۔"

اسی رمی جمار پر مراسم حج کا خاتمہ ہوتا ہے۔

ان رسوم کی غایت

اُوپر کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ حج کے تمام مراسم اس پرانے عہد کے طریق عبادت کی یادگار ہیں جس کا باقی رہنا اس لیے ضروری ہے تاکہ انسانیت کے روحانی دور ترقی کا عہدِ آغاز ہماری نگاہوں کے سامنے ہمیشہ قائم رہے اور ہمارے جذبات واحساسات کو یہ تاریخ کی یاد سے پہلے کے واقعات ہمیشہ متحرک کرتے رہیں اور خدا کی یاد اپنے گناہوں کی مغفرت اور آئندہ اپنی نیک زندگی گزارنے کا عہد ہماری حج سے پہلے اور حج کے بعد کی زندگیوں میں جوڑ پیدا کر کے تغیر واصلاح کا ایک نیا باب کھولنے کا موقع دے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ "کنکری مارنے، صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے اور خانہ کعبہ کے طواف کرنے کا مقصد خدا کی یاد قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔" [2] اور قرآن پاک کا اشارہ بھی اسی طرف ہے:

﴿وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ﴾ (٢٢/ الحج: ٢٨)

"اور تاکہ ان مقررہ دنوں میں خدا کا نام یاد کرو۔"

حج کے مقامات عموماً پیغمبرانہ شان اور ربانی نشان کے جلوہ گاہ ہیں جہاں پہنچ کر اور جن کو دیکھ کر وہ خدائی رحمت و برکت کے واقعات یاد آتے ہیں اور اسی لیے قرآن پاک کی اصطلاح میں ان کا نام شعائر اللہ اور

[1] ترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء کیف ترمی الجمار: ٩٠٢ قال الترمذی حدیث حسن صحیح۔

[2] ترمذی، ابواب الحج، باب کیف ترمی الجمار: ٩٠٢؛ دارمی، کتاب المناسك، باب الذکر فی الطواف: ١٨٥٣؛ مستدرك حاکم، کتاب المناسك، ج١، ص: ٤٥٩۔

حرمت اللہ ہے یعنی خدا کے نشانات اور خدا کی محترم باتیں اور چیزیں اور انہیں شعائر اللہ اور حرمت اللہ کی تعظیم وزیارت کا نام ارکانِ حج ہے۔ سورۂ حج میں حج کے بعض ارکان کی تفصیل کے بعد ہے:

﴿ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ﴾ (۲۲/ الحج: ۳۰)

''اور جو اللہ کی محترم چیزوں کا ادب کرے تو وہ اس کے پروردگار کے نزدیک بہتر ہے۔''

صفا ومروہ کی نسبت ہے:

﴿ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۵۸)

''اور صفا اور مروہ خدا کا شعار ہیں۔''

اور سورۂ حج میں فرمایا:

﴿ ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴾ (۲۲/ الحج: ۳۲)

''یہ ہے اور جو اللہ کے شعائر کا ادب کرے تو یہ دلوں کی پرہیزگاری ہے۔''

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حج کا ایک بڑا مقصد ان محترم مقامات کا ادب واحترام ہے، تاکہ ان مقامات سے جو مقدس روایتیں وابستہ ہیں ان کی یاد قائم رہے اور دلوں میں تاثیر کی کیفیت پیدا کرتا رہے۔

حج کے آداب

حج کے لیے یہ ضروری ہے کہ احرام باندھنے سے لے کر احرام اتارنے تک ہر حاجی نیکی و پاک بازی اور امن وسلامتی کی پوری تصویر ہو وہ لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد نہ کرے، کسی کو تکلیف نہ دے، یہاں تک کہ کسی چیونٹی تک کو بھی نہ مارے، شکار تک اس کے لیے جائز نہیں۔ کیوں کہ وہ اس وقت ہمہ تن صلح وآشتی اور امن و امان ہوتا ہے:

﴿ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۹۷)

''تو جو ان مہینوں میں حج اپنے اوپر فرض کرے تو حج میں نہ عورت کے ساتھ بے پردہ ہونا اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا ہے اور جو بھی نیک کام کرو اللہ اس کو جانتا ہے۔''

﴿ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ﴾ (۵/ المآئدۃ: ۱)

''حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت میں۔''

اسی طرح جو لوگ حج کی نیت سے روانہ ہوں ان کو راستہ میں تکلیف دینا یا ان کے مال اور سامان کو لوٹنا یا چرانا بھی خاص طور سے منع کیا گیا کہ یہ اس خانہ الٰہی کے پاس ادب کے خلاف ہے، تاکہ عرب جیسے بے امن ملک میں ان ڈاکوؤں اور رہزنوں اور بدمعاشوں کی وجہ سے قافلوں کا آنا جانا نہ رکے۔

﴿ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ﴾ (۵/ المآئدۃ: ۲)

''اور نہ اس ادب کے گھر کے قصد کرنے والوں کو حلال سمجھو جو اپنے پروردگار کی مہربانی اور خوشنودی کو تلاش کرنے نکلے ہیں۔''

اگر کسی حاجی سے کسی جانور کے قتل کی حرکت قصداً صادر ہو تو اس پر اس کا خون بہا لازم آتا ہے، جس کا نام کفارہ ہے یعنی اس مقتول جانور کے برابر کسی حلال جانور کی قربانی یا چند محتاجوں کو کھانا کھلانا یا اتنا ہی روزہ رکھنا فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَــزَاۗءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ﴾ (۵/ المآئدۃ: ۹۵)

''اے ایمان والو! جب تم احرام میں ہو تو شکار کو مت مارو اور تم میں جو جان کر مارے گا تو اس کے مارے ہوئے کے برابر بدلہ ہے مویشی میں سے اس کا فیصلہ تم میں سے دو بہتر آدمی کریں کہ اس کو کعبہ تک پہنچا کر قربانی کی جائے یا اس کے گناہ کا اتار ہے کچھ محتاجوں کو کھانا کھلانا یا اسی کے برابر روزے، تاکہ وہ مجرم اپنے جرم کی سزا چکھے۔''

اس سے ثابت ہوا کہ حج تمام تر صلح وسلامتی اور امن و آشتی ہے اس مقصد کے خلاف حاجی سے اگر کوئی حرکت ہو جائے تو اس کا کفارہ اس پر واجب آجاتا ہے۔

حج کی مصلحتیں اور حکمتیں

محمد رسول اللہ ﷺ جس شریعت کا تکمیلی صحیفہ لے کر آئے اس کی سب سے بڑی خصوصیات یہی ہیں کہ وہ دین و دنیا کی جامع ہے اور اس کا ایک ایک حرف مصلحتوں اور حکمتوں کے دفتروں سے معمور ہے وہ اپنے احکام اور عبادات کے فائدہ و منفعت اور غرض و غایت کے بتانے کے لیے کسی باہر کی امداد کا محتاج نہیں۔ بلکہ اس نے ان اسرار کے چہرہ سے خود اپنے ہاتھ سے پردہ ہٹایا ہے۔ نماز، زکوٰۃ اور روزہ کی طرح حج کے مقاصد اور فوائد بھی خود اسلام کے صحیفہ ربانی میں مذکور ہیں۔

قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے خانہ کعبہ کی تعمیر اور اسماعیل علیہ السلام کی نذر اور مکہ میں ان کے قیام کے سلسلہ میں جو دعا مانگی وہ تمام تر ان فوائد و مقاصد کی جامع ہے۔ آئیں ان آیتوں پر ایک دفعہ اور نظر ڈال لیں:

﴿ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاِذْ قَالَ

إِبْرٰهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ أَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۲۵۔۱۲۶)

''اور جب ہم نے اس گھر (کعبہ) کو لوگوں کا مرجع ومرکز اور امن بنایا اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بنایا اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل، کے یہ ذمہ کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور کھڑے ہونے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک وصاف کرو اور جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا: میرے پروردگار! اس کو امن والا شہر بنا اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں میں سے روزی دے۔''

﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۖ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۲۸۔۱۲۹)

''اے ہمارے پروردگار! اور ہم کو اپنا تابع دار گروہ بنا اور ہماری اولاد میں سے کچھ کو اپنا فرماں بردار گروہ بنا اور ہم کو ہمارے حج کے دستور بتا اور ہم کو معاف کر، تو بے شک معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے اور ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجنا۔''

﴿ وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرٰهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِينَ وَالْقَآئِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۝ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ۝ لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۚ ﴾ (۲۲/ الحج :۲۶۔۲۷)

''اور جب ہم نے ابراہیم کو یہ گھر کی جگہ ٹھکانا دی، کہ میرا شریک نہ بنانا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، کھڑے ہونے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک وصاف کر اور لوگوں میں حج کا اعلان کردے وہ تیرے پاس پیادہ اور سفر کی ماری دبلی پتلی ہو جانے والی اونٹنیوں پر سوار ہو کر اور دور دراز راستہ سے آئیں گے، تاکہ فائدے کی جگہوں میں آکر جمع ہوں اور چند مقررہ دنوں میں اس بات پر خدا کا نام یاد کریں کہ ہم نے ان کو جانور روزی کیے۔''

﴿ وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ ۝ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهٗ مِنِّي ۚ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ۝ ﴾

(۱۴/ ابراھیم: ۳۵۔۳۷)

''جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا: میرے پروردگار! اس آبادی کو امن والی بنا اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی پوجا کریں، میرے پروردگار! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا، تو جس نے میرا کہا مانا وہ مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد اس بن کھیتی کی ترائی میں تیرے مقدس گھر کے پاس آبادی کی ہے۔ ہمارے پروردگار! تا کہ وہ نماز کھڑی رکھیں تو لوگوں کے کچھ دلوں کو ایسا بنا کہ وہ ان کی طرف جھکیں اور ان کو پھلوں کی روزی دے، تا کہ شکرگزار رہوں۔''

ان آیتوں میں حسب ذیل باتوں کی تصریح ہے:

① خانہ کعبہ اہل توحید کا ایک مرکز ومرجع اور ملت ابراہیمی کا موطن ومسکن ہے۔

② حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں اپنی اولاد کو اس غرض سے بسایا کہ اس مقدس گھر کی خدمت گزاری اور خدائے واحد کی عبادت کرتی رہے اور بت پرست قوموں کے میل جول اور اختلاط سے وہ محفوظ رہے، تا کہ پہلے کی طرح یہ گھر پھر بے نشان نہ ہو جائے اور آخر ان میں وہ رسول مبعوث ہو جس کی صفتیں ایسی ہوں۔

③ یہ لوگ ایک ویرانہ میں جس میں کھیتی نہیں آباد ہوئے ہیں اور صرف اس غرض سے آباد ہوئے ہیں کہ تیرے گھر کو آباد رکھیں تو تو اس بے ثمر اور شورزمین میں ان کی روزی کا سامان کرنا اور لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکانا کہ وہ ان سے محبت کریں۔

④ حکم ہوا کہ لوگوں میں اس گھر کے حج کا اعلان عام کر ہر قریب اور دور کے راستہ سے لوگ لبیک کہیں گے، تا کہ یہاں آکر دین ودنیا کا فائدہ حاصل کریں اور چند مقررہ ایام میں خدا کا نام لیں۔

⑤ جو لوگ یہاں عبادت اور حج کی نیت سے آئیں خداوندا! تو ان کے گناہ معاف کر تو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔

⑥ خداوندا! میری اولاد وہی ہے جو میرے مشرب ومذہب اور میرے راستہ پر چلے، اس لیے تمام وہ لوگ جو ملت ابراہیمی کے پابند ہوں آل ابراہیم ہیں اور وہی حضرت ابراہیم کی دعاؤں اور برکتوں کے مستحق ہیں۔

الغرض حج کے یہی منافع اور مقاصد ہیں جن میں سے ہر ایک کے ماتحت متعدد فوائد اور اغراض ہیں۔

مرکزیت

خانہ کعبہ اس دنیا میں عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا نقطہ قدم ہے یہ وہ آئینہ ہے جس میں اس کی رحمت وغفاری کی صفتیں اپنا عکس ڈال کر تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں۔ یہ وہ منبع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ اُبلا اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا۔ یہ روحانی علم ومعرفت کا وہ مطلع ہے جن

کی کرنوں نے زمین کے ذرّہ ذرّہ کو درخشاں کیا۔ یہ وہ جغرافیائی شیرازہ ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں جو مختلف ملکوں اور اقلیتوں میں بستے ہیں۔ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ مختلف لباس پہنتے ہیں۔ مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں مگر وہ سب ہی کے سب باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں اور ایک ہی مقام کو ام القریٰ مان کر وطنیت، قومیت، تمدن و معاشرت، رنگ روپ اور دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن ایک ہی قومیت (آل ابراہیم) ایک ہی تمدن و معاشرت (ملّت ابراہیمی) اور ایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہو جاتے ہیں اور یہ وہ برادری ہے جس میں دنیا کی تمام قومیں اور مختلف ملکوں کے بسنے والے جو وطنیت اور قومیت کی لعنتوں میں گرفتار ہیں ایک لمحہ اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں، جس سے انسانیت کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں اور تھوڑے دن کے لیے عرصہ حج میں تمام قومیں ایک ملک میں، ایک لباس احرام میں، ایک وضع میں دوش بدوش ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں اور ایک ہی بولی میں خدا سے باتیں کرتی ہیں یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے جو انسانوں میں جنگ وجدل اور فتنہ وفساد کے اسباب ہیں، اس لیے یہ حرم ربّانی نہ صرف اسی معنی میں امن کا گھر ہے کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم وستم ناروا ہے۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی ایک برادری قائم کر کے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہیں مٹا دیتا ہے۔

لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہیں کہ قومیّت اور وطنیت کی تنگنائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کے وسعت آباد میں داخل ہوں، مگر ملّت ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملتِ محمدی ﷺ کی تجدیدی پکار نے سینکڑوں ہزاروں برس پہلے اس خواب کو دیکھا اور دنیا کے سامنے اس کی تعبیر پیش کی، لوگ آج تمام دنیا کے لیے ایک واحد زبان (اسپرنٹو) کی ایجاد وکوشش میں مصروف ہیں، مگر خانہ کعبہ کے مرکزیت کے فیصلہ نے آل ابراہیم کے لیے مدت دراز سے اس مشکل کو حل کر دیا ہے۔ لوگ آج دنیا کی قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ایک ورلڈ کانفرنس یا عالمگیر مجلس کے انعقاد کے درپے ہیں لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ساڑھے تیرہ سو برس سے یہ مجلس دنیا میں قائم ہے اور اسلام کے علم، تمدّن، مذہب اور اخلاق کی وحدت کی علمبردار ہے۔ آج دنیا کی قومیں ''ہیگ'' (ہولینڈ) میں اقوام عالم کی مشترکہ عدالت گاہ کی بنیاد ڈالتے ہیں لیکن اس کے فیصلوں کو کسی طاقت سے منوا نہیں سکتیں لیکن مسلمان اقوام عالم کے لیے یہ مشترکہ عدالت گاہ ہمیشہ سے قائم ہے جس کی عدالت کا حقیقی کرسی نشین خود احکم الحاکمین ہے جس کے فیصلہ سے کسی کو سرتابی کی مجال نہیں۔

مسلمان ڈیڑھ سو برس تک جب تک ایک نظم حکومت یا خلافت کے ماتحت رہے یہ حج کا موسم ان کے سیاسی اور تنظیمی ادارہ کا سب سے بڑا عنصر رہا۔ یہ وہ زمانہ ہوتا تھا جس میں امور خلافت کے تمام اہم معاملات

طے پاتے تھے۔ اسپین سے لے کر سندھ تک مختلف ملکوں کے حکام اور والی جمع ہوتے تھے اور خلیفہ کے سامنے مسائل پر بحث کرتے تھے اور طریق عمل طے کرتے تھے اور مختلف ملکوں کی رعایا آ کر اگر اپنے والیوں اور حاکموں سے کچھ شکایتیں ہوتی تھیں تو ان کو خلیفہ کی عدالت میں پیش کرتی تھی اور انصاف پاتی تھی۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ مسائل حج کے فوراً ہی بعد اللہ تعالیٰ نے ملک میں فساد اور بے امنی کی برائی کی اور فرمایا:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۰۴_۲۰۵)

''بعض آدمی ایسے ہیں کہ ان کی بات دنیا کی زندگی میں بھلی معلوم ہوتی ہے اور جو اس کے دل میں ہے اس پر وہ خدا کو گواہ بناتے ہیں حالانکہ وہ پرلے درجہ کے جھگڑالو ہیں اور جب پیٹھ پھیریں تو ملک میں دوڑتے پھرتے ہیں کہ اس میں بے امنی برپا ہو اور، تاکہ کھیتیاں اور جانیں تلف ہوں اور اللہ فساد کرنے کو پسند نہیں کرتا۔''

پھر دو آیتوں کے بعد فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۰۸)

''اے ایمان والو! تم سب کے سب امن میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

اسلام کے احکام اور مسائل جو دم کے دم میں اور سال بسال دور دراز اقلیموں ملکوں اور شہروں میں اس وقت پھیل سکے، جب سفر اور آمد و رفت کا مسئلہ آسان نہ تھا اس کا اصلی راز یہی سالانہ حج کا اجتماع ہے اور خود رسول اللہ ﷺ نے اپنا سب سے آخری حج جو ''حجۃ الوداع'' کہلاتا ہے اسی اصول پر کیا، وہ انسان جو تیرہ برس تک مکہ میں یکہ وتنہا رہا، ۲۳ برس کے بعد وہ موقع آیا جب اس نے تقریباً ایک لاکھ کے مجمع کو بیک دفعہ خطاب کیا اور سب نے سمعًا وطاعةً کہا، آپ کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور دوسرے خلفائے زمانہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ائمہ اعلام نے اسی طرح سال بسال جمع ہو کر احکام اسلام کی تلقین و تبلیغ کی خدمت ادا کی، اسی کا نتیجہ تھا کہ نت نئے واقعات اور مسائل کے متعلق دنیا کے مختلف گوشوں میں اسلام کے جوابی احکام اور فتوے پہنچتے رہے اور پہنچتے رہتے ہیں۔

یہ اسی مرکزیت کا اثر ہے کہ بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم اور عالم، محدث، مفسر اور فقیہ جو اسلامی فتوحات اور نو آبادیوں کے سلسلہ میں تمام دنیا میں پھیل گئے تھے وہ سال بسال پھر آ کر یہاں سمٹ جاتے تھے اور تمام دنیا کے گوشوں سے آ کر حرم ابراہیم علیہ السلام میں جمع ہو جاتے تھے اور باہم ایک دوسرے سے مل کر اس علم کو جو بھی

دنیا میں متفرق و پراگندہ تھا ابراہیمی درسگاہ کے صحن میں ایک دفتر میں جمع کر دیتے تھے۔ یہیں آ کر بخارا کا باشندہ اسپین اور مراکش کے رہنے والوں سے، شامی عراقی اور مصری حجازی سے، بصری کوفی سے، کوفی بصری سے، ترمذی نیشاپوری سے، اندلسی، سندھی (ہندوستان) سے، رومی یمنی سے فیض پاتا تھا اور دم کے دم میں سندھ کا علم اسپین میں اور اسپین کی تحقیق سندھ میں پہنچ جاتی تھی۔ مصر کی تصنیف و روایت ترکستان میں اور ترکستان کا فیصلہ مصر و شام میں پہنچ جاتا تھا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد ابن عمر رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے تلامذہ سے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے مسترشد ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے مستفیدوں سے اور انس رضی اللہ عنہ کے حلقہ کے فیض یاب علی رضی اللہ عنہ کے شاگردوں سے مستفید و سیراب ہوتے تھے۔ یہی وہ مرکز تھا جہاں ائمہ مجتہدین باہم ایک دوسرے سے ملتے اور ایک دوسرے کے علم سے فیضیاب ہوتے تھے اور یہی تعارف وہ اصلی ذریعہ تھا جس کی بنا پر صحابہ کرام اور ان کے تلامذہ اور مستفیدین کے تمام دنیا میں پھیل جانے کے باوجود بھی محمد رسول اللہ ﷺ کے حالات و واقعات و مغازی اور احکام و فرامین و وصایا کا سارا دفتر پھر سمٹ کر ایک ہو گیا اور آپ کے سیر و مغازی اور احادیث و تعلیمات مرتب و مدون ہو کر ہر مسلمان کے سامنے آ گئیں اور موطا، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی اور احادیث کے متعدد دفاتر عالم وجود میں آئے اور ائمہ مجتہدین کے لیے یہ ممکن ہو سکا کہ مسائل کے متعلق دوسرے اماموں کے خیالات و معلومات سے مستفید ہو کر اجتماعی مسائل کو الگ کر سکیں اور اس سے پہلے کہ کتابیں مدون ہوں اور پھیلیں ہر ملک اور ہر شہر کے علما دوسرے ملک اور شہر کے علما کے خیالات و معلومات سے واقف ہو سکیں اور زمانہ کے حالات کے زیر اثر آج تک کم و بیش یہ سلسلہ قائم ہے۔ یہ اسی کی مرکزیت کا نتیجہ ہے کہ عام مسلمان جو اپنے اپنے ملکوں میں اپنے اپنے حالات میں گرفتار ہیں وہ دور دراز مسافتوں کو طے کر کے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیل کر دریا، پہاڑ، جنگل، آبادی اور صحرا کو عبور کر کے یہاں جمع ہوتے۔ ایک دوسرے سے ملتے ایک دوسرے کے درد و غم سے واقف اور حالات سے آشنا ہوتے ہیں جس سے ان میں باہمی اتحاد اور تعاون کی روح پیدا ہوتی ہے۔ یہیں آ کر چینی مراکش سے، تونسی ہندی سے، تاتاری حبشی سے، فرنگی زنگی سے، عجمی عربی سے، یمنی نجدی سے، ترکی افغانی سے، مصری ترکستانی سے، روسی الجزائری سے، افریقی یورپین سے اور جاوی بلغاری سے ملتا ہے اور سب مل کر باہم ایک قوم، ایک نسل، ایک خاندان کے افراد نظر آتے ہیں۔ اسی کا اثر تھا اور ہے کہ معمولی سے معمولی مسلمان بھی اپنے ملک سے باہر کی کچھ دنیا دیکھ آتا ہے زمانہ کے رنگ کو پہچاننے اور سیاسیات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے لگتا ہے بین الاقوامی معاملات سے دلچسپی لیتا ہے اور دنیا کے ہر اس گوشہ کے حالات سے جس کے منارہ سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہو اس کو خاص ذوق ہوتا ہے اور اسی کا اثر ہے کہ ہر مسلمان دنیائے اسلام اور اسلامی ملکوں کے حالات و واقعات کے لیے بے چین نظر آتا ہے پھر اسی کا نتیجہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ایسی ملے گی جس کو دنیا کے سفر کا کچھ تجربہ

ہوگا اور خشکی و تری سے اس کو کچھ واقفیت ہوگی دنیا کے جغرافیائی معلومات کے بڑھانے اور ترقی دینے میں سفر حج نے بہت کچھ مدد کی ہے مسلمانوں میں بکثرت ایسے جغرافیہ نویس اور سیاح گزرے ہیں جنہوں نے اصل میں حج کی نیت سے سفر کیا اور بالآخر اس سفر نے دنیا کی ایک عام سیاحت کی حیثیت اختیار کر لی۔ یاقوت رومی نے اپنے جغرافیہ تقویم البلدان کے مقدمہ میں مسلمانوں میں جغرافی معلومات کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ اسی سفر حج کو قرار دیا ہے۔

رزقِ ثمرات

اس مرکز کو قائم اور آباد رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس شور ویرانے میں بسنے والوں کے لیے رزق کا کوئی سامان کیا جائے۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ خداوندا! میں نے اپنی اولاد کو اس بے حاصل اور بے آب و گیاہ سرزمین میں آباد کیا ہے، تو لوگوں کے دل ان کی طرف جھکانا اور ان کے رزق کا سامان کرنا اور ان کو پھل کی روزی دینا، اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی، اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ یہاں کے بسنے والوں کے لیے زکوۃ و خیرات کی کوئی رقم خاص کی جاتی، لیکن یہ ان لوگوں کی اخلاقی پستی اور دون فطرتی کا سبب ہوجاتی، وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار ہوجاتے جو ان کے منصب کی عزت اور شرف کے مناسب نہ ہوتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ تدبیر کی کہ ان کے دلوں میں تجارت کا شوق پیدا کیا اور اس کو ان کی روزی کا سامان بنا دیا۔ حضرت اسماعیل کی اولاد کا جہاں کہیں پرانی تاریخوں میں وجود نظر آتا ہے، وہ تجارت اور سوداگری کے بھیس میں ملتی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام ہی کے زمانہ میں جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بھتیجے اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے تھے، بنی اسماعیل کا تجارتی قافلہ عرب سے مصر کو جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ (تکوین ۳۷۔ ۲۸ سے ۳۶ تک) توراۃ کے متعدد مقامات میں عرب سوداگروں اور تاجروں کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے۔ خود قریش بھی اپنے زمانہ کے بڑے تاجر اور سوداگر تھے۔ جس کا ذکر سورۂ لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ میں ہے، وہ ایک طرف یمن اور حبشہ تک اور دوسری طرف شام و مصر و روم تک جاتے تھے۔ [1]

لیکن چونکہ یہ تجارت بھی مکہ معظمہ کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی شکم سیری کے لیے کافی نہ تھی، اس لیے خود مکہ کی سرزمین کو اور حج کے مقام کو تجارت کی منڈی بنانے کی ضرورت تھی، چنانچہ اسلام سے پہلے بھی حج کا موسم عرب کا ایک بڑا میلہ تھا اور عکاظ وغیرہ کا بڑا بازار لگتا تھا۔ اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا کہ یہ دعائے ابراہیمی کا مصداق اور اس شور و بے حاصل زمین کے بسنے والوں کے لیے روزی کا سامان تھا۔ اسلام کے بعد تمام دنیا سے مسلمان یہاں آنے لگے، چنانچہ سال کے دو تین مہینے میں یہاں کے رہنے والے تجارت اور سوداگری سے اس قدر مال کما لیتے ہیں کہ وہ سال بھر کھا پی سکیں۔ مکہ سے مدینہ کو جب قافلہ جاتا ہے تو پورے راستہ اور منزلوں

[1] تفصیل اور حوالوں کے لیے دیکھو میری تالیف ارض القرآن، جلد دوم، باب تجارات العرب قبل الاسلام۔

کے بدّو اپنے پھل اور پیداوار لے کر آتے ہیں اور خرید و فروخت سے اپنی زندگی کا سامان حاصل کرتے ہیں کھانا پینا، مکان، سواری اور دوسری ضروریات اسی شہر اور اس کے آس پاس سے تمام حاجی حاصل کرتے ہیں اور اس کا معاوضہ ادا کرتے ہیں اور آخر یہی زرِ معاوضہ اہل مکہ کے قوتِ لا یموت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

قربانی کی اقتصادی حیثیت

اس ملک کی فطری پیداواروں میں اگر کوئی چیز ہے تو وہ جانوروں کی پیداوار ہے، اس بنا پر قربانی کے فریضہ نے بھی ان اہل عرب اور اہل بادیہ کے لیے ان جانوروں سے اپنی روزی کے پیدا کرنے کا سامان کر دیا۔ ہر سال تقریباً ایک لاکھ حاجی قربانی کرتے ہیں، جن میں سے بعض کئی کئی کرتے ہیں، اس حساب سے سالانہ دو لاکھ جانوروں سے کم کی قربانی نہیں ہوتی اور عموماً دنبہ کی قیمت آٹھ روپے اور بکری کی چار روپے وہاں ہوتی ہے [1] تو اس تقریب سے کم و بیش دس بارہ لاکھ روپے ہر سال اہل بادیہ کو اپنے جانوروں کی فروخت سے ملتے ہیں اور یہ اس بے آب و گیاہ اور ویران ملک کے باشندوں کی بہت بڑی مدد ہے۔

ابراہیمی دعا کی مقبولیت

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں خاص طور سے پھلوں کا ذکر کیا تھا:

﴿ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۲۶)

''اور یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں میں سے روزی دینا۔''

اس دعا کا یہ اثر ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کے بازاروں میں ہر وقت تازہ سے تازہ پھل، میوے، سبزی اور ترکاریاں نظر آتی ہیں اور دعائے ابراہیمی کا وہ جلوہ دکھاتی ہیں کہ زبان کے ذائقہ کے ساتھ ایمان کی حلاوت کا مزا بھی ملنے لگتا ہے۔

تجارت

قرآن پاک کے محاورہ میں خدا کا فضل تلاش کرنے سے مقصود تجارت اور روزی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حج کا ایک صریح مقصد تجارت اور حصول رزق کو بھی قرار دیا ہے، چنانچہ سورۂ مائدہ میں ہے:

﴿ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ﴾ (۵/ المائدۃ:۲)

''اور نہ ان کو (ستاؤ) جو اس ادب والے گھر کے قصد سے جا رہے ہوں، اپنے پروردگار کا فضل اور خوشنودی تلاش کرتے ہوئے۔''

---

[1] یہ تخمینہ میں نے اپنے پہلے سفر حج کے تجربہ کی بنا پر ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۶ء میں کیا تھا، مگر اس کے ۲۴ برس بعد ۱۳۶۸ھ/ ۱۹۴۹ء میں جب دوبارہ حج کی توفیق ملی تو زمانہ کے اقتصادی تغیرات نے پچھلے تخمینہ کو یک قلم بدل دیا، اب ہر چیز کی قیمت گرانی کی طرف مائل ہے جانوروں کی قیمت بھی چوگنی نظر آئی، بکری کی قیمت کم از کم سولہ سترہ روپے دنبہ کی قیمت تیس، بتیس روپے گائے، بیل کی قیمت اسّی سے سو روپے تک اور اونٹ کی ڈیڑھ دو سو تک نظر آئی۔ اب اس تخمینہ کی بنا پر ہر چیز کی قیمت چوگنی ہوگئی ہے ''س'' ۲۰ محرم ۱۳۷۱ھ اور اب ۱۴۰۴ھ میں تو قیمت کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں ہے۔ (ناشر)

یعنی ان کے مال واسباب کو لوٹنا جائز نہیں کہ اس بے اطمینانی سے حج کا ایک بڑا مقصد فوت ہو جائے گا۔

تجارت اور روزی حاصل کرنا بظاہر دنیا کا ایک کام معلوم ہوتا ہے، اس لیے اسلام کے بعد بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے اس خالص مذہبی سفر میں تجارت وغیرہ جیسی کسی دنیاوی غرض کو شامل کرنا اچھا نہیں سمجھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ لوگوں سے بھیک مانگ مانگ کر حج کرنا اچھا نہیں کہ یہ تقویٰ کے خلاف ہے، بلکہ تجارت کرتے ہوئے چلو تو بہتر ہے اور فرمایا:

﴿ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۖ وَاتَّقُونِ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ ۞ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۹۷۔۱۹۸)

''اور راہ کا توشہ (خرچ) لے کر چلو کہ راستہ کا سب سے اچھا توشہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے تم پر گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرتے ہوئے چلو (یعنی بیوپار کرتے ہوئے)۔''

یہ اندیشہ کہ یہ دنیا کا کام ہے جو دین کے سفر میں جائز نہیں۔ درست نہ تھا کہ اول تو طلب رزق ہر حال میں بجائے خود اسلام میں عبادت اور نیکی کا کام ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی بنا پر یہ خود حج کے مقاصد میں ہے کہ اس کے بغیر اس شہر کی آبادی کی ترقی اور بقا ممکن نہیں، یعنی حج کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خانہ کعبہ کی حفاظت اور خدمت کے لیے اس شہر کی آبادی اور رونق قائم رہے۔ جس کا بڑا ذریعہ تجارت ہے۔ یہ مقام گویا مسلمانوں کے عالمگیر تجارتی کاروبار کا مرکز اور ممالک اسلامیہ کی صنعتوں کی سالانہ نمائش گاہ ہے۔ جس کا پچھلا بقیہ نمونہ آج بھی موجود ہے، وہ کون سا اسلامی ملک ہے، جہاں کی صنعت کا نمونہ یہاں دیکھنے والے کو نظر نہیں آ سکتا، لیکن افسوس ہے کہ آج کل کے مسلمانوں نے حج کے اس اہم نکتہ کی اہمیت کو کچھ تو بھلا دیا ہے اور کچھ غیر مسلمانوں کی تجارتی چیرہ دستی سے وہ دبے بھی ہیں اور آج وہ مرکز جو اسلامی ملکوں کا مرکزی بازار تھا، یورپ کے مصنوعات کا مرکزی بازار بن رہا ہے۔ اس جنگ عظیم کے بعد سے حالات اور بھی زیادہ انحطاط پذیر ہیں۔

روحانیت

روحانیت سے مقصود وہ تاثرات اور کیفیتیں ہیں جو ان مقامات کی زیارت اور ان ارکانِ حج کے ادا کرنے سے قلب وروح میں پیدا ہوتی ہیں، ان کی ایک حیثیت تو وطنی، دوسری تاریخی اور تیسری خالص روحانی ہے۔ وطنی ہونے کے یہ معنی کہ گو مسلمان دنیا کے ہر ملک میں رہتے، ہر زبان بولتے اور ہر لباس پہنتے ہیں، تاہم ان کے اندر یہ احساس باقی رہتا ہے کہ وہ جسمانی طور سے کہیں ہوں تاہم روحانی طور سے ان کا مسکن عرب ہی کی سرزمین ہے۔ وہی ملّت ابراہیمی کا مقام۔ اسلام کا مولد اور قرآن کی مہبط ہے، اس لیے دور دراز مسافتوں سے ولولہ اور شوق کے بازاروں سے اڑ کر جب لوگ یہاں پہنچتے ہیں تو اس ریگستان اور پہاڑ کو دیکھ کر ان کی

محبت کا سرچشمہ ابلنے لگتا ہے اور ان کے دل میں اسلام کے وطن اور قرآن کی سرزمین کے مشاہدہ سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے، مسلمان جس ملک میں بھی ہے، اس کو وہاں اسلام اپنے خالص وطن میں نظر نہیں آتا ہر جگہ اس کو اپنے ساتھ دوسری قومیں بھی نظر آتی ہیں۔ اپنے مذہب کے ساتھ اس کو دوسرے مذہب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے تمدن کے ساتھ دوسرے تمدنوں کا بھی منظر سامنے ہوتا ہے، لیکن یہاں اسلام اس کو اپنے خالص رنگ میں جلوہ گر معلوم ہوتا ہے، گردوپیش، آگے پیچھے، داہنے بائیں، ہر طرف اور ہر سمت اس کو اسلام ہی کا مجسم پیکر دکھائی دیتا ہے اور اس وقت سرزمین حجاز اور دنیا کے کل ممالک کا تعلق اس کی نگاہ میں ایسا نظر آتا ہے، جس طرح نو آبادیوں کے رہنے والوں کی نگاہ میں اپنی مادر وطن (مدر لینڈ) کی حیثیت۔ آج انگریز ہندوستان، عراق، مصر، فلسطین، سائپرس، جبل الطارق، نیوزی لینڈ، سنگاپور، آسٹریلیا، یوگنڈا، ٹرنسوال، زنجبار، افریقہ اور کینڈا (امریکہ) کے متفرق ملکوں میں آباد ہیں، تاہم انگلینڈ کا چھوٹا سا جزیرہ ان کی نگاہ میں اس وسیع برطانوی مملکت کا جس میں آفتاب نہیں غروب ہوتا مرکز ہے۔ وہ ان کا اصلی آبائی وطن اور مسکن ہے، وہ تمدن، معاشرت، اخلاق، تعلیم، لٹریچر، ہر چیز میں اپنے اس آبائی وطن و مسکن کی پیروی کرتے ہیں، جب ان کی آنکھیں اس کے دیدار سے مشرف ہوتی ہیں تو اپنی خالص اور بے میل تہذیب اخلاق اور تمدن کے ملک کو دیکھ کر مسرت اور خوشی سے روشن ہو جاتی ہیں، وہ اس کے ایک ایک در و دیوار کو عزت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس وقت ان کے دل میں وہ احساسات پیدا ہوتے ہیں جو دوسرے ملکوں قوموں اور تمدنوں میں رہنے کی وجہ سے ان کی فرسودہ اور پژمردہ ہو جانے والی فکر اور عمل کی قوتوں کو بیدار کر دیتے ہیں اور وہ یہاں آ کر اپنی خالص تہذیب و تمدن کے پاک و صاف چشمہ حیات میں نہا کر نئے سرے سے پھر جوان ہو جاتے ہیں۔ بلاتشبیہ اس قسم کی کیفیت اور لذت ان مسلمانوں کی ہے، جو عرب کو اپنا، اپنے مذہب کا، اپنی قومیت کا، اپنے تمدن کا، اپنے علوم وفنون کا مولد و مسکن سمجھتے ہیں، ان میں سے جب کسی کو اس ملک اور اس شہر کی زیارت کا موقع ملتا ہے تو اس کا ذرہ ذرہ اس زائر کے دامن دل سے لپٹ جاتا ہے اور وہ چلا اٹھتا ہے:

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

یہی فلسفہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ وصیت فرمائی کہ اس ملک میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب، کعبہ کے سوا کوئی دوسرا قبلہ اور قرآن کے سوا کوئی دوسرا صحیفہ نہ رہنے دیا جائے اور قرآن نے حکم دیا کہ مشرک و کافر اس ادب والی مسجد کے قریب بھی نہ آنے پائیں، تاکہ یہاں اسلام کا سرچشمہ ہر طرح پاک و صاف اور کفر و شرک کی ہر قسم کی نجاستوں سے محفوظ رہے، تاکہ ہر گوشہ اور ہر سمت سے یہاں آ کر مسلمان خالص پاکیزگی حاصل اور روح ایمانی کو تازہ کر سکیں۔ قرآن پاک نے مکہ معظمہ کو اُمّ القریٰ یعنی آبادیوں کی ماں کہا ہے، اگر مکہ معظمہ تمام دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اصل نہ بھی ہو تو اسلامی دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اصل و مرجع اور ماویٰ تو ضرور ہے۔

تاریخیت

اسلام کی ابتدائی تاریخ کا حرف حرف اسی عرب اور حرم پاک کے ذرہ ذرہ سے مرتب ہوا ہے آدم علیہ السلام سے لے کر ابراہیم علیہ السلام تک اور ابراہیم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک جو کچھ ہوا ہے اس کا تمام تر تعلق ارض حرم کے کوہ و صحرا اور درودیوار سے ہے۔ یہیں حضرت آدم علیہ السلام نے سکونت کی اور عرش کے سایہ میں خدا کا گھر بنایا۔ یہیں حوا علیہا السلام نے آ کر ان سے ملاقات کی۔ یہیں نوح علیہ السلام کی کشتی نے آ کر دم لیا۔ حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام نے یہاں پناہ لی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، نے یہاں ہجرت کی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے یہیں سکونت اختیار کی۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے یہاں ولادت پائی۔ یہیں وہ پہاڑی ہے (صفا) جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے گدھے چھوڑ کر اترے، یہیں وہ دوسری پہاڑی ہے (مروہ) جس پر باپ نے بیٹے کی قربانی کرنی چاہی۔ یہیں وہ چشمہ ہے (زمزم) جو حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو پیاس کے عالم میں نظر آیا۔ یہیں وہ خانہ خدا ہے جس کی چہار دیواری کو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے بلند کیا۔ یہیں وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر انہوں نے خدا کے آگے سر جھکائے۔ اسی کے قریب منیٰ، مشعر حرام اور عرفات ہیں، جو شعائر اللہ ہیں۔ یہیں وہ پتھر (حجر اسود) ہے جو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کے مقدس ہاتھوں سے مس ہوا۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں ملت ابراہیمی کی بنیاد پڑی، یہی وہ آبادی ہے جہاں اسلام کا آفتاب طلوع ہوا۔ یہی وہ گلیاں اور راستے ہیں، جو جبریل امین کی گزرگاہ تھے، یہیں وہ غار حرا ہے جس سے قرآن کی پہلی کرن پھوٹی تھی، یہی وہ صحنِ حرم ہے جس میں محمد رسول اللہ ﷺ نے ترپن سال بسر کیے اور یہی وہ مقام ہے، جہاں براق کے قدم پڑے تھے اور یہی وہ مکانات ہیں، جن کی ایک ایک اینٹ اسلام کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ہے، کیا قرآن پاک کا اشارہ انہیں مناظر اور مشاہد کی طرف نہیں، جہاں اس نے کہا:

﴿ فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ ﴾ (۳/ آل عمران: ۹۷)

''اس حرم میں کھلے کھلے (ربانی) نشانات ہیں ابراہیم کے قیام کی جگہ۔''

ان مقامات اور مناظر میں کسی زائر کا قدم پہنچتا ہے تو اس کے ادب کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں، اس کی عقیدت کا سر جھک جاتا ہے، اس کے ایمان کا خون جوش مارنے لگتا ہے، اس کے جذبات کا سمندر متلاطم ہو جاتا ہے، جگہ جگہ اس کی پیشانی زمین سے لگتی جاتی ہے اور محبت کی روح اس کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں تڑپنے لگتی ہے، جدھر نظر ڈالتا ہے دل وجد کرتا ہے، آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں اور زبان تسبیح وتہلیل میں مصروف ہو جاتی ہے اور یہی وہ لذت اور لطف ہے جو ایمان کو تازہ، عقیدت کو مضبوط اور شعائر اللہ کی محبت کو زندہ کرتا ہے:

﴿ وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ ﴾ (۲۲/ الحج: ۳۲)

''اور جو خدا کی نشانیوں اور یادگاروں کی عظمت کرتا ہے، تو وہ دلوں کے تقویٰ کے سبب سے ہے۔''

﴿ وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ﴾ (۲۲/ الحج: ۳۰)

''اور جو خدا کی حرمتوں کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس کے لیے اس کے خدا کے نزدیک بہتر ہے۔''

خالص روحانیت

حج کی حقیقت میں گزر چکا ہے کہ وہ دراصل اس رسمی قربانی اور اس دوڑ دھوپ کا نام نہیں یہ تو حج کی روحانیت کی صرف جسمانی اور مادی شکل ہے۔ حج کے یہ ارکان ہمارے اندرونی احساسات، کیفیات اور تاثرات کے مظاہر اور تمثیلیں ہیں، اسی لیے سرورِ کائنات علیہ السلام نے اصلی اور صحیح حج کا نام صرف حج نہیں بلکہ حج مبرور رکھا ہے، یعنی وہ حج جو سراپا نیکی ہو اور یہی حج ان تمام برکات اور رحمتوں کا خزانہ ہے، جو عرفات کے سائلوں کے لیے خاص ہے۔ حج کی روحانیت درحقیقت توبہ، انابت اور گزشتہ ضائع اور کھوئی ہوئی عمر کی تلافی کے عہد اور آئندہ کے لیے اطاعت اور فرمانبرداری کے اعتراف اور اقرار کا نام ہے اور اس کا اشارہ خود دعائے ابراہیمی میں مذکور ہے:

﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۲۸)

''اے ہمارے پروردگار! ہم کو اپنا فرمانبردار (مسلم) بنا اور ہماری اولاد میں سے اپنا ایک فرمانبردار گروہ بنا اور ہم کو اپنے حج کے احکام اور دستور سکھا اور ہم پر رجوع ہو (یا ہم کو معاف کر) تو (بندوں کی طرف) رجوع ہونے والا (یا انکو معاف کرنے والا) اور رحم کرنے والا ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا بھی ان کی دوسری دعاؤں کی طرح ضرور قبول کی گئی ہے، اس سے ظاہر ہوا کہ حج درحقیقت خدا کے سامنے اس سرزمین میں حاضر ہو کر، جہاں اکثر نبیوں، رسولوں اور برگزیدوں نے حاضر ہو کر اپنی اطاعت اور فرمان برداری کا اعتراف کیا، اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد و اقرار کرنا ہے اور ان مقامات میں کھڑے ہو کر اور چل کر خدا کی بارگاہ میں اپنی سیہ کاریوں سے توبہ کرنا اور اپنے روٹھے ہوئے مولیٰ کو منانا ہے، تاکہ وہ ہماری طرف پھر رجوع ہو کہ وہ تو اپنے تائب گناہگاروں کی طرف رجوع ہونے کے لیے ہر وقت تیار ہے، وہ تو رحم و کرم، لطف و عنایت کا بحر بیکراں ہے۔ یہی سبب ہے کہ شفیع المذنبین ﷺ نے فرمایا کہ ''حج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح صاف کر دیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے اور جو مومن اس دن (یعنی عرفہ کے دن) احرام کی حالت میں گزارتا ہے، اس کا سورج ڈوبتا ہے تو اس کے گناہوں کو لے کر ڈوبتا ہے۔'' [1] صحیح مسلم اور نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بشارت دی کہ ''عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہیں جس میں خدا اپنے

[1] ترمذی، ابواب الحج، باب ما جاء فی ثواب الحج والعمرۃ: ۸۱۰، ۸۱۱؛ نسائی، کتاب المناسك، باب فضل المتابعة بين الحج والعمرة: ۲۶۳۱، ۲۶۳۲ وبزار وطبرانی کبیر بحواله جمع الفوائد، کتاب المناسك، فضل الحج ووجوبه، ج ۱، ص: ۱۶۳ میرٹھ۔

بندوں کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کرتا ہے، وہ اس دن اپنے بندوں سے قریب ہو کر جلوہ گر ہوتا ہے اور اپنے ان بندوں پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے ❶ اور کہتا ہے جو انہوں نے مانگا (وہ ہم نے قبول کیا)۔'' موطا امام مالک میں ہے کہ آپ ﷺ نے یہ خوشخبری سنائی کہ ''بدر کے دن کے سوا عرفہ کے دن سے زیادہ شیطان کسی دن ذلیل، رسوا اور غضبناک نہیں ہوتا، کیوں کہ اس دن وہ دیکھتا ہے کہ خدا کی رحمت برس رہی ہے اور گناہ معاف ہو رہے ہیں۔'' ❷ اسی طرح اور بہت سی حدیثیں ہیں جن میں مخلصانہ حج ادا کرنے والوں کو رحمت اور مغفرت کی نوید سنائی گئی ہے۔ یہ تمام حدیثیں درحقیقت اسی دعائے ابراہیمی ﴿وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا﴾ ''اور ہمارے حج کے دستور ہم کو سوجھا اور ہماری توبہ قبول فرما'' کی تفسیریں ہیں۔ ان تمام بشارتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج درحقیقت توبہ اور انابت ہے، اسی لیے احرام باندھنے کے ساتھ ((لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ)) ''خداوندا! میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں'' کا ترانہ دم بدم اس کی زبان سے بلند ہونے لگتا ہے۔ طواف میں، سعی میں، کوہ صفا پر، کوہ مروہ پر، عرفات میں، مزدلفہ میں، منیٰ میں اور ہر جگہ جو دعائیں مانگی جاتی ہیں، ان کا بڑا حصہ توبہ اور استغفار کا ہوتا ہے اور اس بنا پر کہ ((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ)) ❸ ''گناہ سے بصدق دل توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسا وہ جس کا کوئی گناہ نہیں ہے'' اس لیے حج مبرور والوں کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ گو کہ توبہ سے ہر جگہ گناہ معاف ہو سکتے ہیں، اس کے لیے کعبہ اور عرفات کی کچھ تخصیص نہیں۔ لیکن حج کے مشاعر، مقامات اور ارکان اپنے گونا گوں تاثرات کی بنا پر دوسرے فوائد و برکات کے علاوہ جو یہاں کے سوا اور کہیں نہیں صدق توبہ کے لیے بہتر سے بہتر موقع پیدا کرتے ہیں۔ ان مقامات کا جو تقدس اور عظمت ایک مسلمان کے قلب میں ہے، اس کا نفسیاتی اثر دل پر بڑا گہرا پڑتا ہے، وہ مقامات جہاں انبیا علیہم السلام پر برکتوں اور رحمتوں کا نزول اور انوار الٰہی کی بارش ہوئی، وہ ماحول، وہ فضا، وہ تمام گناہگاروں کا ایک جگہ اکٹھا ہو کر دعا وزاری، فریاد و بکا اور آہ و نالہ وہ قدم قدم پر نبوی مناظر اور ربانی مشاہد جہاں خدا اور اس کے برگزیدہ بندوں کے بیسیوں ناز و نیاز کے معاملات گزر چکے ہیں، دعا اور اس کے تاثر اور اس کے قبول کے بہترین مواقع ہیں، جہاں حضرت آدم علیہ السلام و حوا علیہا السلام نے اپنے گناہوں کی معافی کی دعا کی۔ جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی اور اپنی اولاد کے لیے دعا مانگی، جہاں حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد اپنی پناہ ڈھونڈھی، جہاں دوسرے پیغمبروں نے دعائیں کیں، جہاں محمد رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر اپنی اور اپنی امت کے لیے دعائیں مانگیں، وہی مقامات، وہی مشاہد اور دعاؤں کے وہی ارکان، ہم گناہگاروں کی دعائے مغفرت کے لیے کس قدر موزوں اور مناسب ہیں کہ پتھر سے پتھر دل بھی ان حالات اور ان مشاہد کے درمیان موم بننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور انسان اس ابر کرم کی چھینٹوں سے سیراب ہو جاتا ہے، جو وقتاً فوقتاً یہاں

---

❶ صحيح مسلم، كتاب الحج، باب فضل يوم عرفة: ٣٢٨٨؛ نسائي، كتاب المناسك، باب ما ذكر في يوم عرفة: ٣٠٠٦۔ ❷ موطا امام مالك، كتاب الحج، باب جامع الحج: ٩٦٢۔

❸ سنن ابن ماجه، ابواب الزهد، باب ذكر التوبة: ٤٢٥٠۔

برگزیدگانِ الٰہی پر عرشِ الٰہی سے برستا رہا ہے اور ہنوز آں ابرِ رحمت درفشان است۔ انسان کی نفسیات (سائیکالوجی) یہ ہے اور روزمرہ کا تجربہ اس کا شاہد ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کسی بڑے اور اہم تغیر کے لیے ہمیشہ زندگی کے کسی موڑ اور حدفاصل کی تلاش کرتا ہے۔ جہاں پہنچ کر اس کی گزشتہ اور آئندہ زندگی کے دو ممتاز حصے پیدا ہو جائیں، اسی لیے لوگ اپنے تغیر کے لیے جاڑا، گرمی یا برسات کا انتظار کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ شادی کے بعد یا صاحب اولاد ہونے کے بعد یا تعلیم سے فراغت کے بعد یا کسی نوکری کے بعد یا کسی بڑی کامیابی یا کسی خاص مہم اور سفر کے بعد یا کسی سے مرید ہو جانے کے بعد بدل جاتے ہیں یا اپنے کو بدل لینے پر قادر ہو جاتے ہیں کیوں کہ ان کی زندگی کے یہ اہم واقعات اور سوانح ان کی اگلی اور پچھلی زندگی میں فصل اور امتیاز کا خط ڈال دیتے ہیں، جہاں سے ادھر یا ادھر مڑ جانا ناممکن ہو جاتا ہے، حج درحقیقت اسی طرح انسان کی گزشتہ اور آئندہ زندگی کے درمیان ایک حدفاصل کا کام دیتا ہے اور اصلاح اور تغیر کی جانب اپنی زندگی کو پھیر دینے کا موقع بہم پہنچاتا ہے، یہاں سے انسان اپنی پچھلی زندگی جیسی بھی ہو اس کو ختم کر کے نئی زندگی شروع کرتا ہے، ان بابرکت مقاموں پر حاضر اور وہاں کھڑے ہو کر جہاں جلیل القدر انبیائے کرام اور خاصان الٰہی کھڑے ہوئے خدا کے گھر کے سامنے قبلہ کے روبرو جو اس کی نمازوں اور عقیدتوں اور مناجاتوں کی غائبانہ سمت ہے، اپنی پچھلی زندگی کی کوتاہیوں پر ندامت اور اپنے گناہوں کا اعتراف اور آئندہ اطاعت اور فرمانبرداری کا وعدہ اور اقرار وہ اثر پیدا کرتا ہے کہ شر سے خیر کی طرف خیر سے اور زیادہ خیر کی طرف زندگی کا رخ بدل جاتا ہے اور زندگی کا گزشتہ باب بند ہو کر اس کا دوسرا باب کھل جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اس کے بعد اپنے نئے اعمال کے لیے نئے سرے سے پیدا ہوتا ہے، اسی لیے سرور کائنات علیہ السلام نے یہ فرمایا:

((مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ)) [1]

”جس نے خدا کے لیے حج کیا اور اس میں ہوس رانی نہ کی اور نہ گناہ کیا تو وہ ایسا ہو کر لوٹتا ہے، جیسے اس دن تھا جس دن اسکی ماں نے اس کو جنا۔“

یعنی ایک نئی زندگی ایک نئی حیات اور ایک نیا دور شروع کرتا ہے، جس میں دین اور دنیا دونوں کی بھلائیاں جمع اور دونوں کی کامیابیاں شامل ہوں گی، یہ فلسفہ خود قرآن پاک کی ان آیتوں کا خلاصہ ہے جو حج کے باب میں ہیں اور جس کی آخری آیتیں طواف کی دعا کا آخری ٹکڑا ہیں:

﴿ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي

[1] سنن ابی داؤد کے علاوہ بقیہ تمام کتب صحاح کی کتاب الحج میں یہ حدیث موجود ہے مثلاً: صحیح بخاری، کتاب الحج، باب فضل الحج المبرور: ۱۵۲۱؛ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل الحج والعمرة: ۳۲۹۱؛ ترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء فی ثواب الحج والعمرة: ۸۱۱؛ سنن نسائی، کتاب مناسك الحج، باب فضل الحج: ۲۶۲۸؛ سنن ابن ماجه، ابواب المناسك، باب فضل الحج: ۲۸۸۹۔

الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ: ۱۹۹۔۲۰۲)

’’پھر طواف کے لیے وہیں سے چلو، جہاں سے لوگ چلے اور خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگو بے شک خدا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے اور جب حج کے تمام ارکان ادا کر چکو تو اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے ہو، یا ان سے بھی زیادہ تو بعض لوگ (حج کی دعا میں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں دے اور ایسوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، یہ وہ ہیں جن کو اپنی کمائی کا حصہ ملے گا اور اللہ تمہارے اعمال کا تم سے جلد حساب لینے والا ہے۔‘‘

حج کے بعض اور چھوٹے چھوٹے اخلاقی مصالح بھی ہیں، مثلاً:

① حج کے ذریعہ سے انسان اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس کر سکتا ہے۔ حج اس وقت فرض ہوتا ہے جب اہل وعیال کے نفقہ سے کچھ رقم بچتی ہے، اس لیے آدمی حج کے لیے اس وقت نکلتا ہے جب اہل وعیال کی ضرورتوں کا سامان کر لیتا ہے، اس لیے اس کو اہل وعیال کے مصارف کی ذمہ داریاں خود بخود محسوس ہو جاتی ہیں، معاملات میں قرض انسان کے سر کا بوجھ ہے اور حج وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو اس سے سبکدوش ہو جائے، اس لیے معاملات پر اس کا نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے۔ عام طرز معاشرت اور دنیوی کاموں میں آدمی اپنے سینکڑوں دشمن پیدا کر لیتا ہے، لیکن جب خدا کی بارگاہ میں جانے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے بری الذمہ ہو کے جانا چاہتا ہے، اس لیے رخصت کے وقت ہر قسم کے بغض وحسد سے اپنے دل کو صاف کر لیتا ہے، لوگوں سے اپنے قصور معاف کراتا ہے، روٹھوں کو مناتا ہے، قرض خواہوں کے قرض ادا کرتا ہے، اس لحاظ سے حج معاشرتی، اخلاقی اور روحانی اصلاح کا بھی ایک ذریعہ ہے۔

② اسلام آج ہر ملک میں ہے، اس لیے ہر ملک کی زبان اس کی زبان ہے تاہم اس کی ایک عمومی زبان بھی ہے، جو اس ملک کی زبان ہے، جہاں دنیا کے ہر ملک سے مسلمان آتے جاتے رہتے ہیں اور اس زبان کے بولنے اور سیکھنے پر اس سفر میں کچھ نہ کچھ مجبور ہوتے ہیں، اس کا اثر یہ ہے کہ ہر مسلمان قوم جو کوئی بھی بولی بولتی ہو وہ اس ملک کی زبان سے اور زبان سے نہ سہی تو الفاظ سے آشنا ہوتی ہے اور یہ اسلام کی عالمگیر اخوت کی ایک مضبوط کڑی ہے۔

③ مساوات اسلام کا سنگ بنیاد ہے، اگرچہ نماز بھی محدود طریقہ پر اس مساوات کو قائم کرتی ہے، لیکن پوری وسعت کے ساتھ اس کی اصلی نمائش حج کے زمانہ میں ہوتی ہے جب امیر وغریب، جاہل وعالم، بادشاہ ورعایا

ایک لباس میں، ایک صورت میں، ایک میدان میں، ایک ہی طرح خدا کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں، نہ کسی کے لیے جگہ کی خصوصیت ہوتی ہے، نہ آگے پیچھے کی قید۔

④ بہت سی اخلاقی خوبیوں کا سرچشمہ کسب حلال ہے، چونکہ ہر شخص حج کے مصارف میں مال حلال صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لیے اس کو خود حلال وحرام کی تفریق کرنی پڑتی ہے اور اس کا جو اثر انسان کی روحانی حالت پر پڑ سکتا ہے، وہ ظاہر ہے۔

الغرض حج اسلام کا صرف مذہبی رکن نہیں، بلکہ وہ اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی یعنی قومی وملی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو پر حاوی اور ہر مسلمان کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند منارہ ہے۔

جہاد

﴿ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾ (۲۲/ الحج :۷۸)

عام طور سے اسلام کے سلسلہ عبادات میں جہاد کا نام فقہا کی تحریروں میں نہیں آتا مگر قرآن پاک اور احادیث نبوی میں اس کی فرضیت اور اہمیت بہت سے دوسرے فقہی احکام اور عبادات سے بدر جہا زیادہ ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اس فریضۂ عبادت کو اپنے موقع پر جگہ دی جائے اور اس کی حقیقت پر ناواقفیت کے جو توبرتو پردے پڑ گئے ہیں، ان کو اٹھایا جائے۔

جہاد کے معنی عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے۔ جہاد کا لفظ جہد سے نکلا ہے، جہاد اور مجاہدہ فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں اور لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں، اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنی بھی ہیں یعنی حق کی بلندی اور اس کی اشاعت اور حفاظت کے لیے ہر قسم کی جدوجہد، قربانی اور ایثار گوارا کرنا اور ان تمام جسمانی و مالی و دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں اس راہ میں صرف کرنا یہاں تک کہ اس کے لیے اپنی، اپنے عزیز واقارب کی، اہل وعیال کی، خاندان وقوم کی جان تک کو قربان کر دینا اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو رائیگاں کرنا، ان کے حملوں کو روکنا اور اس کے لیے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا پڑے تو اس کے لیے بھی پوری طرح تیار رہنا، یہی جہاد ہے اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔

افسوس ہے کہ مخالفوں نے اتنے اہم اور اتنے ضروری اور اتنے وسیع مفہوم کو جس کے بغیر دنیا میں کوئی تحریک نہ کبھی سرسبز ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے، صرف دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کے تنگ میدان میں محصور کر دیا ہے۔ یہ بات بار بار کہی اور دکھائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ جس تعلیم اور شریعت کو لے کر دنیا میں آئے وہ محض نظریہ اور فلسفہ نہیں بلکہ عمل اور سرتاپا عمل ہے۔ آپ کے مذہب میں نجات کا استحقاق گوشہ گیری، رہبانیت، نظری مراقبہ، دھیان اور الٰہیات کی فلسفیانہ خیال آرائی پر موقوف نہیں، بلکہ خدا کی توحید، رسولوں اور کتابوں اور فرشتوں کی سچائی، قیامت اور جزا وسزا کے اعتقاد کے بعد انہیں کے مطابق عمل خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے، اسی لیے قرآن پاک میں جہاد کا مقابل لفظ قعود (بیٹھنا یا بیٹھ رہنا) استعمال کیا گیا ہے جس سے مقصود سستی، تغافل اور ترکِ فرض ہے۔ سورۂ نساء میں ہے:

﴿ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾

(٤/ النسآء :٩٥)

''مسلمانوں میں سے وہ جن کو کوئی جسمانی معذوری نہ ہو اور پھر بیٹھے رہیں اور وہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کر رہے ہوں، برابر نہیں اللہ نے اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر درجہ کی فضیلت عطا کی ہے اور ہر ایک سے خدا نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر بڑے اجر کی فضیلت بخشی ہے۔''

اس بیٹھنے اور جہاد کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے، سستی کرنے اور آرام ڈھونڈھنے کے سراسر خلاف ہے۔

یہاں ایک شبہ کا ازالہ کرنا ضروری ہے اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاد اور قتال دونوں ہم معنی ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن پاک میں دونوں لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہیں۔ اس لیے جہاد فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں جہاد کرنا) اور قتال فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں لڑنا) ان دونوں لفظوں کے ایک معنی نہیں ہیں، بلکہ ان دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے۔ یعنی ہر جہاد قتال نہیں ہے۔ بلکہ جہاد کی مختلف قسموں میں سے ایک قتال اور دشمنوں سے لڑنا بھی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں ان دونوں لفظوں کے استعمال میں ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اسی سورۂ نساء کے اوپر کی آیت میں اور دوسری آیتوں میں جہاد کی دو صریح قسمیں بیان کی گئی ہیں: جہاد بالنفس اور جہاد بالمال یعنی اپنی جان کے ذریعہ جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کرنا، جان کے ذریعہ جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حمایت کے لیے ہر قسم کی جسمانی تکلیف بے خطر اٹھائی جائے۔ یہاں تک کہ اپنی جان تک کو جوکھوں میں ڈال دینے، آگ میں جلائے جانے، سولی پر لٹکائے جانے، تیر اور نیزے میں چھد جانے اور تلوار سے کٹ جانے کے لیے ہر وقت آمادہ اور مستعد رہے، مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کو کامیاب اور سر بلند کرنے کے لیے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو نثار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کے لیے تیار رہے۔ اسی جان اور مال کی باطل محبت شخص اور قوم دونوں کی ترقی و سعادت کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اگر یہ دونوں بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائیں تو ہم کامل موحد ہو جائیں اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی، جسمانی اور روحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے اس کے سوا کچھ اور نہیں۔

ترقی و سعادت کا یہ گر صرف محمد رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا اور آپ ہی نے یہ نکتہ اپنی امت کو سکھایا اسی جہاد کا جذبہ اور اسی کے حصول ثواب کی آرزو تھی جس کے سبب سے مکہ میں مسلمانوں نے تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفوں کا بہادرانہ مقابلہ کیا، ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھر کی بھاری سل، طوق و زنجیر کی گراں باری، بھوک کی تکلیف، پیاس کی شدت، نیزہ کی انی، تلوار کی دھار، بال بچوں سے علیحدگی، مال و دولت سے دست برداری اور گھر بار سے دوری کوئی چیز بھی ان کے استقلال کے قدم کو ڈگمگا نہ سکی اور پھر دس برس تک مدینہ منورہ میں انہوں نے تلوار کی چھاؤں میں جس طرح گزارے وہ دنیا کو معلوم ہے۔

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۝ ﴾ (۴۹/ الحجرات: ۱۵)

''مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر اس میں وہ ڈگمگائے نہیں اور خدا کے راستہ میں اپنی جان سے اور اپنے مال سے جہاد کیا، یہی سچے اترنے والے لوگ ہیں۔''

﴿ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ ۔الآیہ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۹۵)

''پھر جنھوں نے اپنا گھر بار چھوڑا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے، میں ان کے گناہوں کو اتار دوں گا اور ان کو بہشت میں داخل کروں گا۔''

جہاد کی قسمیں

① جب جہاد کے معنی محنت، سعی بلیغ اور جدوجہد کے ہیں تو ہر نیک کام اس کے تحت میں داخل ہوسکتا ہے۔ علمائے دل کی اصطلاح میں جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے اور اسی کا نام ان کے ہاں جہاد اکبر ہے۔ خطیب نے تاریخ میں حضرت جابر صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے ان صحابہ سے جو ابھی لڑائی کے میدان سے واپس آئے تھے فرمایا: ''تمہارا آنا مبارک تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہوائے نفس سے لڑنا ہے۔'' حدیث کی دوسری کتابوں میں اس قسم کی اور بعض روایتیں بھی ہیں۔ [1] چنانچہ ابن نجار نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرے''۔ یہی روایت دیلمی میں ان الفاظ میں ہے کہ ''بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کے لیے اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرو۔'' یہ تینوں روایتیں گو فن کے لحاظ سے چنداں مستند نہیں ہیں مگر وہ درحقیقت بعض حدیثوں کی تائید اور قرآن پاک کی اس آیت کی تفسیر ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۝ ﴾

(۲۹/ العنکبوت: ۶۹)

''اور جنھوں نے ہمارے بارے میں جہاد کیا (یعنی محنت اور تکلیف اٹھائی) ہم ان کو اپنا راستہ آپ دکھائیں گے اور بے شبہ خدا نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔''

اس پوری سورہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حق کے لیے ہر مصیبت و تکلیف میں ثابت قدم اور بے خوف رہنے کی تعلیم دی ہے اور اگلے پیغمبروں کے کارناموں کا ذکر کیا ہے کہ وہ ان مشکلات میں کیسے ثابت قدم

[1] بحوالہ کنز العمال، کتاب الجہاد، ج ۲، ص: ۲۸۵ حیدر آباد دکن۔

رہے اور بالآخر خدا نے ان کو کامیاب اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا۔ سورہ کے آغاز میں ہے:

﴿ وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۝ ﴾

(۲۹/ العنکبوت :٦)

''اور جو کوئی جہاد کرتا ہے (یعنی محنت اٹھاتا ہے) وہ اپنے ہی نفس کے لیے جہاد کرتا ہے، اللہ تو جہان والوں سے بے نیاز ہے۔''

اور سورہ کے آخر میں فرمایا کہ ہمارے کام میں یا خود ہماری ذات کے حصول میں یا ہماری خوشنودی کی طلب میں جو جہاد کرے گا اور محنت اٹھائے گا ہم اس کے لیے اپنے تک پہنچنے کا راستہ آپ صاف کر دیں گے اور اس کو اپنی راہ آپ دکھائیں گے۔ یہی مجاہدہ، کامیابی کا زینہ اور روحانی ترقیوں کا وسیلہ ہے، سورۂ حج میں ارشاد ہوا:

﴿ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ﴾ (۲۲/ الحج :۷۸)

''اور محنت کرو اللہ میں پوری محنت، اس نے تم کو چنا ہے اور تمہارے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی، تمہارے باپ ابراہیم کا دین۔''

''یہ اللہ کی راہ میں محنت اور جہاد کرنا'' وہی جہاد اکبر ہے جس پر ملت ابراہیمی کی بنا ہے یعنی حق کی راہ میں عیش و آرام، اہل و عیال اور جان و مال ہر چیز کو قربان کر دینا۔ ترمذی، طبرانی، حاکم اور صحیح ابن حبان میں ہے، کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ: ((المجاهد من جاهد نفسه)) یعنی ''مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔'' [1] صحیح مسلم میں ہے ایک دفعہ آپ ﷺ نے صحابہ سے پوچھا کہ ''تم پہلوان کس کو کہتے ہو؟'' عرض کیا، جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں۔ فرمایا: ''نہیں پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔'' [2] یعنی جو اس پہلوان کو پچھاڑ سکے اور اس حریف کو زیر کر سکے جس کا اکھاڑہ خود اس کے سینہ میں ہے۔

② جہاد کی ایک اور قسم جہاد بالعلم ہے، دنیا کا تمام شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے، اس کا دور کرنا ہر حق طلب کے لیے ضروری ہے، ایک انسان کے پاس اگر عقل و معرفت اور علم و دانش کی روشنی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے تاریک دلوں کو فائدہ پہنچائے۔ تلوار کی دلیل سے قلب میں وہ طمانیت نہیں پیدا ہو سکتی جو دلیل و برہان کی قوت سے لوگوں کے سینوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے ارشاد ہوا کہ:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ ۭ﴾

---

[1] ترمذی، ابواب فضائل الجهاد، باب ما جاء فی فضل من مات مرابطا: ۱۶۲۱؛ صحیح ابن حبان، کتاب السیر، باب فضل الجهاد: ٤٦٠٥؛ طبرانی کبیر: ۱۵۱۹۲؛ کنز العمال کتاب الایمان، ج ۱، ص: ۳۹۔

[2] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل من یملك نفسه عند الغضب: ٦٦٤١۔

(۱۶/ النحل:۱۲۵)

''تو لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف آنے کا بلاوا حکمت ودانائی کی باتوں کے ذریعہ سے اور اچھی طرح سمجھا کردے اور مناظرہ کرنا ہو تو وہ بھی اچھے اسلوب سے کر۔''

دین کی یہ تبلیغ ودعوت بھی جو سراسر علمی طریق سے ہے۔ جہاد کی ایک قسم ہے اور اسی طریقہ دعوت کا نام ''جہاد بالقرآن'' ہے کہ قرآن خود اپنی آپ دلیل اپنی آپ موعظت اور اپنے لیے آپ مناظرہ ہے۔ قرآن کے ایک سچے عالم کو قرآن کی صداقت اور سچائی کے لیے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ کو روحانی جہاد یعنی روحانی بیماریوں کی فوجوں کو شکست دینے کے لیے اسی قرآن کی تلوار ہاتھ میں دی گئی اور اسی سے کفار ومنافقین کے شکوک وشبہات کے پروں کو ہزیمت دینے کا حکم دیا گیا۔ ارشاد ہوا:

﴿ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴾ (۲۵/ الفرقان:۵۲)

''تو کافروں کا کہا نہ مان اور بذریعہ قرآن کے تو ان سے جہاد کر بڑا جہاد۔''

بذریعہ قرآن کے جہاد کر یعنی قرآن کے ذریعہ سے تو ان کا مقابلہ کر، اس قرآنی جہاد ومقابلہ کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کبیر ''بڑا جہاد'' اور بڑا زور کا مقابلہ فرمایا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اس جہاد بالعلم کی اہمیت قرآن پاک کی نظر میں کتنی ہے، علما نے بھی اس اہمیت کو محسوس کیا ہے اور اس کو جہاد کا مہتم بالشان درجہ قرار دیا ہے، امام ابوبکر رازی حنفی نے احکام القرآن میں اس پر لطیف بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ جہاد بالعلم کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں سے بڑھ کر ہے [1] ایک مسلمان کا فرض ہے کہ حق کی حمایت اور دین کی نصرت کے لیے عقل، فہم، علم اور بصیرت حاصل کرے اور ان کو اس راہ میں صرف کرے اور وہ تمام علوم جو اس راہ میں کام آسکتے ہوں، ان کو اس لیے حاصل کرے کہ ان سے حق کی اشاعت اور دین کی مدافعت کا فریضہ انجام پائے گا، یہ علم کا جہاد ہے، جو اہل علم پر فرض ہے۔

جہاد بالمال

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال ودولت عطا کی ہے اس کا منشا بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستوں میں خرچ کیا جائے، یہاں تک کہ اس کو اپنے اور اپنے اہل وعیال کے آرام وآسائش کے لیے بھی خرچ کیا جائے تو اسی کی مرضی کے لیے، دنیا کا ہر کام روپیہ کا محتاج ہے، چنانچہ حق کی حمایت اور نصرت کے کام بھی اکثر روپے پر موقوف ہیں، اس لیے اس جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہیں ہے، دوسری اجتماعی تحریکوں کی طرح اسلام کو بھی اپنی ہر قسم کی تحریکات اور جدوجہد میں سرمایہ کی ضرورت ہے، اس سرمایہ کا فراہم کرنا اور اس کے لیے مسلمانوں کا اپنے اوپر ہر طرح کا ایثار گوارا کرنا جہاد بالمال ہے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم وصحبت کی برکت سے صحابہ کرام نے اپنی عام غربت اور ناداری کے باوجود اسلام کی سخت سے سخت گھڑیوں میں جس

[1] احکام القرآن رازی قسطنطنیہ، ج۳، ص:۱۱۹۔

طرح مالی جہاد کیا ہے، وہ اسلام کی تاریخ کے روشن کارنامے ہیں اور انہیں سیرابیوں سے دین حق کا باغ چمن آرائے نبوت کے ہاتھوں سرسبز وشاداب ہوا اور اسی لیے اسلام میں ان بزرگوں کا بہت بڑا رتبہ ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾

(۸/ الانفال: ۷۲)

''بے شک وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال اور جان سے جہاد کیا۔''

قرآن پاک میں مالی جہاد کی تنبیہ وتاکید کے متعلق بکثرت آیتیں ہیں، بلکہ بہ مشکل کہیں جہاد کا حکم ہو گا، جہاں اس جہاد بالمال کا ذکر نہ ہو اور قابل لحاظ یہ امر ہے کہ ان میں سے ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو تقدم بخشا گیا ہے، جیسے:

﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝ ﴾ (۹/ التوبة: ٤١)

''ہلکے یا بھاری ہو کر جس طرح ہو نکلو اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کے راستے میں جہاد کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم کو معلوم ہو۔''

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۝ ﴾ (٤٩/ الحجرات: ١٥)

''مومن وہی ہیں، جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے، پھر اس میں شک نہیں کیا اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کے راستہ میں جہاد کیا، یہی سچے اترنے والے ہیں۔''

﴿ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ ﴾

(٤/ النسآء: ٩٥)

''اپنے مال اور نفس سے جہاد کرنے والوں کو اللہ نے بیٹھ رہنے والوں پر ایک درجہ کی فضیلت دی ہے۔''

اس تقدم کے کئی اسباب اور مصلحتیں ہیں۔

میدانِ جنگ میں ذاتی اور جسمانی شرکت ہر شخص کے لیے ممکن نہیں، لیکن مالی شرکت ہر ایک کے لیے آسان ہے، جسمانی جہاد یعنی لڑائی کی ضرورت ہر وقت پیش نہیں آتی ہے، لیکن مالی جہاد کی ضرورت ہر وقت اور ہر آن ہوتی ہے، انسانی کمزوری یہ ہے کہ مال کی محبت، اس کی جان کی محبت پر اکثر غالب آ جاتی ہے۔

گر جان طلبی مضایقہ نیست ۔۔۔ گر زر طلبی سخن دریں است

اس لیے مال کو جان پر مقدم رکھ کر ہر قدم پر انسان کو اس کی اس کمزوری پر ہشیار کیا گیا ہے،

④ جہاد کی ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادا میں اپنی جان و مال و دماغ کی قوت صرف کرنے کا نام بھی اسلام میں جہاد ہے، عورتیں حضور انور ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کرتی ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہم کو غزوات کے جہاد میں شرکت کی اجازت دی جائے، ارشاد ہوا کہ ”تمہارا جہاد نیک حج ہے۔“ ❶ کہ اس مقدس سفر کے لیے سفر کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرنا، صنف نازک کا ایک جہاد ہی ہے، اسی طرح ایک صحابی یمن سے چل کر خدمت اقدس میں اس غرض سے حاضر ہوتے ہیں کہ کسی لڑائی کے جہاد میں شرکت کریں، آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا کہ ”کیا تمہارے ماں باپ ہیں؟“ عرض کی، جی ہاں، فرمایا: ((ففیهما فجاهد)) ”تو تم انہیں کی خدمت میں جہاد کرو۔“ ❷ یعنی ماں باپ کی خدمت کرنا بھی جہاد ہے، اسی طرح خطرناک سے خطرناک موقع پر حق کے اظہار میں بے باک ہونا بھی جہاد ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

((ان من اعظم الجهاد کلمة عدلٍ عند سلطانٍ جائرٍ)) ❸
”ایک بڑا جہاد کسی ظالم قوت کے سامنے، انصاف کی بات کہہ دینا ہے۔“

⑤ اس سے ظاہر ہوا کہ جہاد بالنفس، یعنی اپنے جسم و جان سے جہاد کرنا جہاد کے ان تمام اقسام کو شامل ہے، جن میں انسان کی کوئی جسمانی محنت صرف ہو اور اس کی آخری حد خطرات سے بے پروا ہو کر اپنی زندگی کو بھی خدا کی راہ میں نثار کر دینا ہے، نیز دین کے دشمنوں سے اگر مقابلہ آ پڑے اور وہ حق کی مخالفت پر تل جائیں تو ان کو راستہ سے ہٹانا اور اس صورت میں ان کی جان لینا یا اپنی جان دینا جہاد بالنفس کا انتہائی جذبہ کمال ہے، ایسے جان نثار اور جانباز بندے کا انعام یہ ہے کہ اس نے اپنی جس عزیز ترین متاع کو خدا کی راہ میں قربان کیا، وہ ہمیشہ کے لیے اس کو بخش دی جائے، یعنی فانی حیات کے بدلہ اس کو ابدی حیات عطا کر دی جائے، اسی لیے ارشاد ہوا:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۝﴾

(۲/ البقرة: ۱۵٤)

”جو خدا کی راہ میں مارے گئے، ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تم کو اس کا احساس نہیں۔“

آل عمران میں ان جانبازوں کی قدر افزائی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝﴾ (۳/ آل عمران: ۱٦۹ـ۱۷۰)

❶ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب جهاد النسآء: ۲۸۷٦ـ ❷ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب بر الوالدین: ٦٥۰٤؛ ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی الرجل یغزو: ۲٥۲۹ـ
❸ جامع ترمذی، ابواب الفتن، باب ما جاء افضل الجهاد کلمة عدل: ۲۱۷٤ـ

''جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ گمان نہ کرو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے پاس ان کو روزی دی جا رہی ہے، خدا نے ان کو اپنی جو مہربانی عطا کی ہے، اس پر وہ خوش ہیں اور جو اب تک ان سے اس زندگی میں ہونے کی وجہ سے نہیں ملے ہیں، ان کو خوش خبری دیتے ہیں کہ ان کو نہ کوئی خوف ہے، نہ وہ غم میں ہیں۔''

ان جان نثاروں کا نام شریعت کی اصطلاح میں ''شہید'' ہے، یہ عشق و محبت کی راہ کے شہید زندہ و جاوید ہیں۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ اپنے اسی خونی گلگوں پیراہن میں قیامت کے دن اٹھیں گے، [1] اور حق کی جو عملی شہادت اس زندگی میں انہوں نے ادا کی تھی، اس کا صلہ اس زندگی میں پائیں گے، ﴿ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۴۰) اسی کے ساتھ وہ جانباز بھی جو گو اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اترے تھے، لیکن ان کے سر کا ہدیہ دربارِ الٰہی میں اس وقت اس لیے قبول نہ ہوا کہ ابھی ان کی دنیاوی زندگی کا کارنامہ ختم نہیں ہوا تھا، وہ بھی اپنے حسنِ نیت کی بدولت رضائے الٰہی کی سند پائیں گے، اسی لیے ان کو عام مسلمان ادب و تعظیم کے لیے ''غازی'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں:

﴿ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء: ٧٤)

''اور جو خدا کی راہ میں لڑتا ہے، پھر وہ مارا جاتا ہے یا وہ غالب آتا ہے، تو ہم اس کو بڑا بدلہ عنایت کریں گے۔''

﴿ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۹۵)

''تو جنہوں نے میری خاطر گھر بار چھوڑا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ان کو میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں، وہ لڑے اور مارے گئے، ہم ان کے گناہوں کو چھپا دیں گے اور ان کو جنت میں داخل کریں گے، جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، خدا کی طرف سے ان کو یہ بدلہ ملے گا اور خدا کے پاس اچھا بدلہ ہے۔''

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الجہاد والخروج فی سبیل اللّٰہ: ٤٨٦٢ میں یہ الفاظ ہیں: ((لا یکلم احد فی سبیل اللّٰہ، واللّٰہ اعلم بمن یکلم فی سبیلہ الاجاء یوم القیامۃ وجرحہ یثعب اللون لون دم والریح ریح مسك)) اور سنن ابوداود، کتاب الجنائز، باب ما یستحب من تطہیر ثیاب المیت: ٣١١٤ میں یہ الفاظ ہیں ((المیت یبعث فی ثیابہ التی یموت فیہا))۔

ان آیات کی تفسیر وتشریح میں آنحضرت ﷺ نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ احادیث میں مذکور ہے، جس میں شہیدوں کی فضیلتیں اوران کی اخروی نعمتوں کی تفصیل نہایت مؤثر الفاظ میں ہے، اسی شہادت اور غزا کے عقیدے نے مسلمانوں میں مشکلات کے مقابلہ اور دشمنوں سے بے خوفی کی وہ روح پیدا کردی جس کی زندگی اور تازگی کا ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی وہی عالم ہے، یہی وہ جذبہ ہے جو مسلمانوں کو دین کی خاطر جان دینے پر اس قدر جلد آمادہ کردیتا ہے اور اس حیات جاوید کی تلاش میں ہر مسلمان بے تاب نظر آتا ہے، یہ وہ رتبہ ہے جس کی تمنا خود آنحضرت ﷺ نے ظاہر کی اور فرمایا کہ ''مجھے آرزو ہے کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں اور دوبارہ مجھے زندگی ملے اور میں اس کو بھی قربان کردوں اور پھر تیسری زندگی ملے اور اس کو بھی میں خدا کی راہ میں نثار کردوں'' [1]، ذرا ان فقروں پر ایک بار اور نگاہ ڈال لیجئے، ان میں یہ نہیں ہے کہ میں دوسرے کو مار ڈالوں، بلکہ یہ ہے حق کی راہ میں، میں مارا جاؤں اور پھر زندگی ملے، پھر مارا جاؤں، پھر زندگی ملے اور پھر مارا جاؤں۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را — ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

دائمی جہاد

یہ تو وہ جہاد ہے جس کا موقع ہر مسلمان کو پیش نہیں آتا اور جس کو آتا بھی ہے تو عمر میں ایک آدھ ہی دفعہ آتا ہے، مگر حق کی راہ میں دائمی جہاد وہ جہاد ہے جو ہر مسلمان کو ہر وقت پیش آسکتا ہے، اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ کے ہر اُمتی پر یہ فرض ہے کہ دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبوں کی مدد، زیردستوں کی امداد، سیہ کاروں کی ہدایت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامتِ عدل، ردِ ظلم اور احکامِ الٰہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے، یہاں تک کہ اس کی زندگی کی ہر جنبش وسکون، ایک جہاد بن جائے اور اس کی پوری زندگی جہاد کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آئے، سورۂ آل عمران کی جس میں جہاد کے مسلسل احکام ہیں آخری آیت ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ ﴾

(۳/ آل عمران: ۲۰۰)

''اے ایمان والو! مشکلات میں ثابت قدم رہو اور مقابلہ میں مضبوطی دکھاؤ اور کام میں لگے رہو اور خدا سے ڈرو، شاید کہ تم مراد کو پہنچو۔''

یہی وہ جہادِ محمدی ﷺ ہے جو مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی اور فتح وفیروزی کا نشان ہے۔

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب فضل الجهاد والخروج فی سبیل الله: ۴۸۵۹۔

عبادات قلبی

یہ اسلام کی ان عبادات کا بیان تھا، جو جسمانی و مالی کہلاتی ہیں، گو کہ دل کے اخلاص کا شمول ان میں بھی ہے، لیکن اسلام میں بعض ایسی عبادات بھی ہیں، جن کا تعلق تمام تر قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے، پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام میں ہر نیکی کا کام عبادت ہے، اس لیے تمام امور خیر، خواہ وہ جسمانی، یا مالی، یا قلبی ہوں عبادات کے اندر داخل ہیں، فقہا نے صرف جسمانی و مالی عبادات سے بحث کی ہے، لیکن حضرات صوفیا نے جسمانی و مالی عبادات کے ساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کر لیا ہے، اصل یہ ہے کہ فقہا نے اپنا فرض منصب صرف جسمانی اور مالی فریضوں تک محدود رکھا ہے اور صوفیا نے ان سارے فریضوں کو یکجا کیا ہے، جن سے اسلام نے انسان کے قلب و روح کی درستی کا کام لیا ہے، پیش نظر تصنیف نہ تو فقہ کی کوئی کتاب ہے اور نہ تصوف کی، اس کا مقصود ان فرائض کو بتانا ہے، جن کی تاکید و توصیف قرآن پاک نے بار بار کی ہے اور اسی تاکید و توصیف سے ہم کو اسلام میں ان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس قسم کے چند فرائض جن کا مرتبہ عبادات پنجگانہ کے بعد قرآن پاک میں سب سے زیادہ نظر آتا ہے، تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر اور شکر ہیں، یہ وہ فرائض ہیں، جن کا تعلق انسان کے قلب سے ہے اور اسی لیے ان کا نام ''قلبی عبادات'' رکھا جا سکتا ہے، یہ وہ فرائض یا قلبی عبادات ہیں جو اسلام کی روح اور ہمارے تمام اعمال کا اصلی جوہر ہیں، جن کے الگ کر دینے سے وہ عبادات پنجگانہ بھی جن پر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے، جسد بے روح بن جاتے ہیں، یہ بات گو یہاں بے محل ہے، مگر کہنے کے قابل ہے، کہ فقہ اور تصوف کی ایک دوسرے سے علیحدگی نے ایک طرف عبادات کو خشک و بے روح اور دوسری طرف اعمال تصوف کو آزاد اور بے قید کر دیا ہے۔ ہر اچھے کام کے کرنے اور برائی سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس بیدار اور دل میں خیر و شر کی تمیز کے لیے خلش ہو، یہ تقویٰ ہے اور پھر کام کو خدائے واحد کی رضا مندی کے سوا ہر غرض و غایت سے پاک رکھا جائے، یہ اخلاص ہے، پھر اس کام کے کرنے میں صرف خدا کی نصرت پر بھروسہ رہے، یہ توکل ہے، اس کام میں رکاوٹیں اور دقتیں پیش آئیں، یا نتیجہ مناسب حال برآمد نہ ہو تو دل کو مضبوط رکھا جائے اور خدا سے آس نہ توڑی جائے اور اس راہ میں اپنے برا چاہنے والوں کا بھی برا نہ چاہا جائے، یہ صبر ہے اور اگر کامیابی کی نعمت ملے، تو اس پر مغرور ہونے کے بجائے اس کو خدا کا فضل و کرم سمجھا جائے اور جسم و جان و زبان سے اس کا اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کاموں کے کرنے میں اور زیادہ انہماک صرف کیا جائے یہ شکر ہے۔

ذیل کی سطروں میں اسی اجمال کی تفصیل آتی ہے۔

تقویٰ

تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے

اگر محمد رسول اللہ ﷺ کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں، اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے، قرآن پاک نے اپنی دوسری ہی سورہ میں یہ اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو تقویٰ والے ہیں:

﴿ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲)

''یہ کتاب تقویٰ والوں کو راہ دکھاتی ہے۔''

اسلام کی ساری عبادتوں کا منشا اسی تقویٰ کا حصول ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۱)

''اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی جس نے تم کو اور تمہارے پہلوں کو پیدا کیا، عبادت کرو، تاکہ تم تقویٰ پاؤ۔''

روزہ سے بھی یہی مقصد ہے:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾

(۲/ البقرۃ : ۱۸۳)

''تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔''

حج کا منشا بھی یہی ہے:

﴿ وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ ﴾ (۲۲/ الحج:۳۲)

''اور جو اللہ کے شعائر (حج کے ارکان و مقامات) کی عزت کرتا ہے، تو وہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔''

قربانی بھی اسی غرض سے ہے:

﴿ لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ ﴾ (۲۲/ الحج:۳۷)

''خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، لیکن تمہارا تقویٰ اس کو پہنچتا ہے۔''

ایک مسلمان کی پیشانی جس جگہ خدا کے لیے جھکتی ہے، اس کی بنیاد بھی تقویٰ پر ہونی چاہیے۔

﴿ أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۰۹)

''جس نے اس کی عمارت خدا سے تقویٰ پر کھڑی کی۔''

﴿ لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۰۸)

''البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر قائم کی گئی۔''

حج کے سفر اور زندگی کے مرحلہ میں راستہ کا توشہ مال و دولت اور ساز و سامان سے زیادہ تقویٰ ہے:

﴿ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۷)

''اور سفر میں زدِراہ لے کر چلو اور سب سے اچھا زادراہ تقویٰ ہے۔''

ہمارے زیب و زینت کا سامان ظاہری لباس سے بڑھ کر تقویٰ کا لباس ہے:

﴿ وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ ﴾ (۷/ الاعراف:۲۶)

''اور تقویٰ کا لباس، وہ سب سے اچھا ہے۔''

اسلام کا تمام اخلاقی نظام بھی اسی تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہے:

﴿ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۳۷)

''اور معاف کر دینا تقویٰ سے قریب تر ہے۔''

﴿ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ﴾ (۵/ المائدۃ:۸)

''انصاف کرنا تقویٰ سے قریب تر ہے۔''

﴿ وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۸۶)

''اور اگر صبر کرو اور تقویٰ کرو تو یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔''

﴿ وَتَتَّقُوا وَتُصْلِحُوا بَيْنَ النَّاسِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۴)

''اور تقویٰ کرو اور لوگوں کے درمیان صلح کراؤ۔''

﴿ وَإِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴾ (۴/ النسآء:۱۲۸)

''اور اگر اچھے کام کرو اور تقویٰ کرو، تو اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے۔''

اہل تقویٰ تمام اخروی نعمتوں کے مستحق ہیں

آخرت کی ہر قسم کی نعمتیں انہیں تقویٰ والوں کا حصہ ہے:

﴿ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ ﴾ (۴۴/ الدخان:۵۱)

''بے شبہ تقویٰ والے امن و امان کی جگہ میں ہوں گے۔''

﴿ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَعِيمٍ ﴾ (۵۲/ الطور:۱۷)

''بے شک تقویٰ والے باغوں میں اور نعمت میں ہوں گے۔''

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴾ (٥١/ الذاریات:١٥)

''شک نہیں کہ تقویٰ والے باغوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔''

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ﴾ (٥٤/ القمر:٥٤)

''بلاشبہ تقویٰ والے باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے۔''

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ ظِلٰلٍ وَّعُیُوْنٍ ﴾ (٧٧/ المرسلات:٤١)

''بلاشک تقویٰ والے سایوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔''

﴿ اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ﴾ (٦٨/ القلم:٣٤)

''یقیناً تقویٰ والوں کے لیے ان کے پروردگار کے پاس نعمت کے باغ ہیں۔''

﴿ اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ مَفَازًا ﴾ (٧٨/ النبا:٣١)

''بے شبہ تقویٰ والوں کے لیے کامیابی ہے۔''

﴿ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴾ (٣٨/ صٓ:٤٩)

''لاریب تقویٰ والوں کے لیے بازگشت کی اچھائی ہے۔''

کامیابی اہل تقویٰ کے لیے ہے

گو بظاہر ابتدا میں اہل تقویٰ کو کسی قدر مصیبتیں اور بلائیں پیش آئیں، یا بہت سی حرام اور مشتبہ لیکن بظاہر بہت سی عمدہ چیزوں سے محروم ہونا پڑے، ظاہری کامیابی کی بہت سی ناجائز کوششوں اور ناروا راستوں سے پرہیز کرنا پڑے اور اس سے یہ سمجھا جائے کہ ان کو مال و دولت، عزت و شہرت اور جاہ و منصب سے محرومی رہی، لیکن دنیا کے تنگ نظر صرف فوری اور عاجل کامیابی ہی کو کامیابی سمجھتے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسی دنیا کے ظاہری ثمروں کی بنا پر کام کے اچھے برے نتیجوں کا فیصلہ کر لینا چاہیے، حالانکہ جو جتنا دوربین ہے، اسی قدر وہ اپنے کام کے فوری نہیں بلکہ آخری نتیجہ پر نگاہ رکھتا ہے، حقیقی دوربین اور عاقبت اندیش وہ ہیں، جو کام کی اچھائی برائی کا فیصلہ دنیا کے ظاہری چندروزہ اور فوری فائدہ کے لحاظ سے نہیں، بلکہ آخرت کے دائمی اور دیرپا فائدہ کی بنا پر کرتے ہیں اور جب ان کی نظر آخرت کے ثمروں پر رہتی ہے، تو دنیا بھی ان کی بن جاتی ہے اور یہاں اور وہاں دونوں جگہ کامیابی اور فوز و فلاح انہیں کی قسمت میں ہوتی ہے، فرمایا:

﴿ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴾ (٧/ الاعراف:١٢٨)

''اور آخری انجام تقویٰ والوں کے لیے ہے۔''

﴿ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴾ (١١/ هود:٤٩)

''بے شبہ انجام کار تقویٰ والوں کے لیے ہے۔''

﴿ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ (۴۳/ الزخرف:۳۵)

''اور آخرت تیرے پروردگار کے نزدیک تقویٰ والوں کے لیے ہے۔''

﴿ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴾ (۲۰/ طٰهٰ:۱۳۲)

''اور انجام کار تقویٰ والوں کے لیے ہے۔''

اہل تقویٰ اللہ کے محبوب ہیں

یہی متقی اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے سزاوار ہیں، جب وہ ہر کام میں خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں اور اپنے کسی کام کا بدلہ کسی انسان سے تعریف، یا انعام یا ہر دلعزیزی کی صورت میں نہیں چاہتے، تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور محبت کا صلہ عطا فرماتا ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں میں بھی ان کے ساتھ عقیدت، محبت اور ہر دلعزیزی پیدا ہوتی ہے:

﴿ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (۸/ الانفال:۳۴)

''تقویٰ والے ہی خدا کے دوست ہیں۔''

﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (۳/ آل عمران:۷۶)

''تو اللہ بے شک تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (۹/ التوبة:۷)

''اللہ بلاشبہ تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (۴۵/ الجاثية:۱۹)

''اور اللہ تقویٰ والوں کا دوست ہے۔''

معیتِ الٰہی سے سرفراز ہیں

یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معیت کے شرف سے ممتاز اور اس کی نصرت و مدد سے سرفراز ہوتے ہیں اور جس کے ساتھ اللہ ہو اس کو کون شکست دے سکتا ہے:

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (۲/ البقرة:۱۹۴)

''اور جان لو کہ بے شبہ اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے۔''

قبولیت اہل تقویٰ ہی کو حاصل ہے

ایک کام ہزاروں اغراض اور سینکڑوں مقاصد کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے، مگر ان میں اللہ تعالیٰ صرف انہیں کے کاموں کی پیشکش کو قبول فرماتا ہے، جو تقویٰ کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے ہیں، فرمایا:

﴿ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۲۷)

''اللہ تو تقویٰ والوں ہی سے قبول فرماتا ہے۔''

اسی لیے انہیں کے کاموں کو دنیا میں بھی بقا، قیام اور ہر دلعزیزی نصیب ہوتی ہے اور آخرت میں بھی۔

تقویٰ والے کون ہیں

یہ جان لینے کے بعد کہ تقویٰ ہی اسلام کی تعلیم کی اصلی غایت اور وہی ساری اسلامی تعلیمات کی روح ہے اور دین و دنیا کی تمام نعمتیں اہل تقویٰ ہی کے لیے ہیں، یہ جاننا ہے کہ تقویٰ والے کون ہیں، قرآن پاک نے اس سوال کا بھی جواب دے دیا ہے، چنانچہ اس کا مختصر جواب تو وہ ہے جو سورۂ زمر میں ہے:

﴿ وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۝ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ۝ۚ ﴾ (۳۹/ الزمر:۳٤)

''اور جو سچائی لے کر آیا اور اس کو سچ مانا، وہی لوگ ہیں تقویٰ والے، ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ ہے، جو وہ چاہیں، یہ ہے بدلہ نیکی والوں کا۔''

یعنی تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ اور کام کے ہر پہلو میں سچائی لے کر آئے اور اس ابدی سچائی کو سچ مانے، وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت اور جاہ و عزت کے نقطہ پر نہیں، بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور خواہ کسی قدر بظاہر اس کا نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ سے بال بھر ہٹنا نہیں چاہتا، لیکن اہل تقویٰ کا پورا حلیہ سورۃ البقرہ میں ہے:

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

''لیکن نیکی یہ ہے کہ جو خدا پر اور پچھلے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور پیغمبروں پر، ایمان لایا اور اپنا مال اس کی محبت پر رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافر اور مانگنے والوں اور گردنوں کے آزاد کرانے میں دیا اور نماز کو برپا کیا اور زکوٰۃ ادا کی اور جو وعدہ کر کے اپنے وعدہ کو ایفا کرنے والے ہیں اور سختی، تکلیف اور لڑائی میں صبر کرنے والے ہیں، یہی وہ ہیں، جو سچے ٹھہرے اور یہی تقویٰ والے ہیں۔''

ان آیتوں میں تقویٰ والوں کا نہ صرف عام حلیہ، بلکہ ایک ایک خط و خال نمایاں کر دیا گیا اور بتا دیا گیا ہے کہ یہی خدا کی نگاہ میں سچے ٹھہرنے والے اور تقویٰ والے ہیں۔

تقویٰ کی حقیقت کیا ہے

تقویٰ اصل میں وقوی ہے، عربی زبان میں اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں، لیکن وحی محمدی ﷺ کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے، دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے، جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے، یہ بات کہ تقویٰ اصل میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے، قرآن پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے جو ارکانِ حج کے بیان کے موقع پر ہے:

﴿ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ۝ ﴾ (۲۲/ الحج:۳۲)

''اور جو شعائرِ الٰہی کی تعظیم کرتا ہے، تو وہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔''

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کا اصلی تعلق دل سے ہے اور وہ سلبی کیفیت (بچنا) کے بجائے ایجابی اور ثبوتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے، وہ امورِ خیر کی طرف دلوں میں تحریک پیدا اور شعائر الٰہی کی تعظیم سے ان کو معمور کرتا ہے، ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ۝ ﴾ (۴۹/ الحجرات:۳)

''بے شک جو لوگ رسول اللہ کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں، وہی ہیں، جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے واسطے جانچا ہے، ان کو معافی ہے اور بڑا بدلہ۔''

اس آیت میں بھی تقویٰ کا مرکز دل ہی کو قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ رسول کی تعظیم کا احساس تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے، ایک اور تیسری آیت میں تقویٰ کے فطری الہام ہونے کی طرف اشارہ ہے:

﴿ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۝ ﴾ (۹۱/ الشمس:۹)

''تو ہر نفس میں اس کا فجور اور اس کا تقویٰ الہام کر دیا۔''

فجور تو ظاہر ہے کہ گناہگاری اور نافرمانی کی جڑ ہے، ٹھیک اسی طرح تقویٰ تمام نیکیوں کی بنیاد اور اصل الاصول ہے اور دونوں بندہ کو فطرتاً ودیعت ہیں، اب بندہ اپنے عمل اور کوشش سے ایک کو چھوڑتا اور دوسرے کو اختیار کرتا ہے، مگر بہرحال یہ دونوں الہام ربانی ہیں اور سب کو معلوم ہے کہ الہام کا ربانی مرکز دل ہے، اس لیے یہی تقویٰ کا مقام ہے۔

تقویٰ کا لفظ جس طرح اس دلی کیفیت پر بولا جاتا ہے، اس کیفیت کے اثر اور نتیجہ پر بھی اطلاع پاتا

ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے کفار کے اشتعال دلانے اور ان سے بدلہ لینے پر پوری قوت رکھنے کے باوجود حدیبیہ کی صلح کو تسلیم کر لیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس مستحسن روش کو تقویٰ فرمایا:

﴿ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ﴾

(٤٨/ الفتح :٢٦)

’’اور جب کفار نے اپنے دلوں میں پچ رکھی، نادانی کی پچ، تو اللہ نے اپنا چین اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر اتارا اور ان کو تقویٰ کی بات پر لگا رکھا اور وہی تھے اس کے لائق اور اس کے اہل۔‘‘

یہاں جنگ وخونریزی سے احتراز، خانہ کعبہ کے ادب اور کفار قریش کی جاہلانہ عصبیت سے چشم پوشی کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک اور دوسری آیت میں دشمنوں کے ساتھ ایفائے عہد اور حتی الامکان جنگ سے پرہیز کرنے والوں کو متقی یعنی تقویٰ والے فرمایا ہے اور ان کے ساتھ اپنی محبت ظاہر فرمائی ہے:

﴿ فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ (٩/ التوبۃ:٤)

’’تو تم ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو، خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔‘‘

﴿ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ (٩/ التوبۃ:٧)

’’تو وہ جب تک تم سے سیدھے رہیں، تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو، خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔‘‘

جس طرح انسان کا فجور، بری تعلیم، بری صحبت اور برے کاموں کی مشق اور کثرت سے بڑھتا جاتا ہے، اس طرح اچھے کاموں کے شوق اور عمل سے نیکی کا ذوق بھی پرورش پاتا ہے اور اس کی قلبی کیفیت میں ترقی ہوتی ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ۝ ﴾ (٤٧/ محمد :١٧)

’’جو لوگ راہ پر آئے، خدا نے ان کی سوجھ اور بڑھائی اور ان کو ان کا تقویٰ عنایت کیا۔‘‘

اس سے عیاں ہے کہ ’’تقویٰ‘‘ ایک ایجابی اور ثبوتی کیفیت ہے، جو انسان کو خدا عنایت فرماتا ہے اور جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہدایت پر ہدایت اور فطری تقویٰ پر، مزید دولتِ تقویٰ مرحمت ہوتی ہے۔

تقویٰ کی یہ حقیقت کہ وہ دل کی خاص کیفیت کا نام ہے، ایک صحیح حدیث سے تصریحاً معلوم ہوتی ہے، صحابہ کے مجمع میں ارشاد فرمایا:

((التقویٰ ھٰھُنَا)) [1]

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم ظلم المسلم و خذله......: ٦٥٤١۔

''تقویٰ یہاں ہے۔''

اور یہ کہہ کر دل کی طرف اشارہ فرمایا، جس سے بے شک وشبہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تقویٰ دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے، جو تمام نیکیوں کی محرک ہے اور وہی مذہب کی جان اور دینداری کی روح ہے، یہی سبب ہے کہ وہ قرآن پاک کی راہنمائی کی غایت، ساری ربانی عبادتوں کا مقصد اور تمام اخلاقی تعلیموں کا ماحصل قرار پایا۔

اسلام میں برتری کا معیار

اسلام میں تقویٰ کو جو اہمیت حاصل ہے، اس کا اثر یہ ہے کہ تعلیم محمدی ﷺ نے نسل، رنگ، وطن، خاندان، دولت، حسب نسب، غرض نوع انسانی کے ان صدہا خود ساختہ اعزازی مرتبوں کو مٹا کر صرف ایک ہی امتیازی معیار قائم کر دیا، جس کا نام تقویٰ ہے اور جو ساری نیکیوں کی جان ہے اور اس لیے وہی معیاری امتیاز بننے کے لائق ہے، چنانچہ قرآن پاک نے بہ آواز بلند یہ اعلان کیا:

﴿ وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ ﴾

(٤٩/ الحجرات:١٣)

''ہم نے تم کو مختلف خاندان اور قبیلے صرف اس لیے بنایا کہ باہم شناخت ہو سکے، تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے، جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔''

اس اعلان کو آنحضرت ﷺ نے ان دو مختصر لفظوں میں ادا فرمایا، الکرم ، التقویٰ [1] یعنی بزرگی و شرافت تقویٰ کا نام ہے اور اسی کے لیے حجۃ الوداع کے اعلان عام میں پکار کر فرمایا کہ ''عرب کو عجم پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں، برتر وہ ہے، جس میں سب سے زیادہ تقویٰ ہے۔'' [2]

---

[1] ترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورۃ الحجرات: ٣٢٧١؛ مسند احمد، ج ٥، ص: ١٠؛ مستدرك حاکم، کتاب الرقاق، ج ٤، ص: ٣٢٥۔ [2] مسند أحمد، ج ٥، ص: ٤١١۔

اخلاص

﴿ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ ۝ ﴾ (۳۹/ الزمر:۲)

مذہب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کو مخاطب کرتا ہے، اس کا سارا کاروبار صرف اسی ایک مضغہ گوشت سے وابستہ ہے، عقائد ہوں یا عبادات، اخلاق ہوں یا معاملات، انسانی اعمال کے ہر گوشہ میں اس کی نظر اسی ایک آئینہ پر رہتی ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت ﷺ نے ایک مشہور حدیث میں یوں ظاہر فرمایا ہے:

((الا وانّ فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وھی القلب)) [1]

''ہشیار رہو کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہو تو سارا بدن درست ہوتا ہے اور وہ خراب ہو تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے، ہشیار رہو کہ وہ دل ہے۔''

دل ہی کی تحریک انسان کے ہر اچھے اور برے فعل کی بنیاد اور اساس ہے، اس لیے مذہب کی ہر عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام بھی کیا جائے، اس کی محرک کوئی دنیاوی غرض نہ ہو اور نہ اس سے مقصود ریا ونمائش، جلبِ منفعت، طلبِ شہرت یا طلب معاوضہ وغیرہ ہو، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو، اسی کا نام اخلاص ہے، رسول کو حکم ہوتا ہے:

﴿ فَاعۡبُدِ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيۡنُ الۡخَالِصُ ؕ ﴾ (۳۹/ الزمر:۲۔۳)

''تو اللہ کی عبادت کر خالص کرتے ہوئے اطاعت گزاری کو اسی کے لیے، ہشیار ہو کہ اللہ ہی کے لیے ہے، خالص اطاعت گزاری۔''

مقصود یہ ہے کہ خدا کی اطاعت گزاری میں خدا کے سوا کسی اور چیز کو اس کا شریک نہ بنایا جائے، وہ چیز خواہ پتھر، یا مٹی کی مورت، یا آسمان وزمین کی کوئی مخلوق، یا دل کا تراشا ہوا کوئی باطل مقصود ہو، اسی لیے قرآن پاک نے انسانی اعمال کی نفسانی غرض وغایت کو بھی بت پرستی قرار دیا ہے، فرمایا:

﴿ اَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۴۳)

''کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔''

چنانچہ اسلام کی یہ اہم ترین تعلیم ہے کہ انسان کا کام ہر قسم کی ظاہری و باطنی بت پرستی سے پاک ہو، رسول کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے:

﴿ قُلۡ اِنِّيۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ ۝ وَاُمِرۡتُ لِاَنۡ اَكُوۡنَ اَوَّلَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۝

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب من فضل استبرأ لدینه: ۵۲؛ صحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب اخذ الحلال وترک الشبھات: ۴۰۹۴۔

﴿قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۝ قُلِ اللّٰہَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّہٗ دِیْنِیْ۝ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ﴾ (۳۹/ الزمر:۱۱۔۱۵)

''کہہ دے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اطاعت گزاری کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی عبادت کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں پہلا فرمانبردار بنوں، کہہ دے کہ میں ڈرتا ہوں اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں، بڑے دن کے عذاب سے، کہہ دے کہ اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں، اپنی اطاعت گزاری کو اس کے لیے خالص کر کے تو تم (اے کفار) خدا کو چھوڑ کر جس کی عبادت چاہے کرو۔''

قرآن پاک کے سات موقعوں پر یہ آیت ہے:

﴿مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ۝﴾

''اطاعت گزاری کو خدا کے لیے خالص کر کے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت اور عمل کا پہلا رکن یہ ہے کہ وہ خالص خدا کے لیے ہو، یعنی اس میں کسی ظاہری و باطنی بت پرستی اور خواہش نفسانی کو دخل نہ ہو اور ﴿اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ رَبِّہِ الْاَعْلٰی۝﴾ (۹۲/ اللیل:۲۰) یعنی خدائے برتر کی ذات کی خوشنودی کے سوا کوئی اور غرض نہ ہو۔

انبیا علیہم السلام نے اپنی دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں ہمیشہ یہ اعلان کیا ہے ہم جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے ہم کو کوئی دنیاوی غرض اور ذاتی معاوضہ مطلوب نہیں:

﴿وَمَآ اَسْـَٔلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝﴾

(۲٦/ الشعرآء:۱۰۹، ۱٤٥، ۱٦٤، ۱۸۰)

''اور میں اس پر کوئی مزدوری تم سے نہیں چاہتا، میری مزدوری تو اسی پر ہے، جو ساری دنیا کا پروردگار ہے۔''

حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے بھی یہی فرمایا گیا:

﴿وَیٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُکُمْ عَلَیْہِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ﴾ (۱۱/ ھود:۲۹)

''اے میری قوم! میں تم سے اس پر دولت کا خواہاں نہیں، میری مزدوری تو خدا ہی پر ہے۔''

خود ہمارے رسول ﷺ کو یہ کہہ دینے کا فرمان ہوا، میں تم سے اپنے لیے کوئی مزدوری و اجرت نہیں چاہتا، اگر چاہتا بھی ہوں تو تمہارے ہی لیے:

﴿قُلْ مَا سَاَلْتُکُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَھُوَ لَکُمْ ۭ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ ۚ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ۝﴾

(۳٤/ سبا:٤۷)

’’کہہ دے کہ میں نے تم سے جو اجرت چاہی تو وہ تمہارے ہی لیے، میری اجرت تو اللہ پر ہے، وہ ہر بات پر گواہ ہے۔‘‘

یعنی وہ ہر بات کا عالم اور نیتوں سے واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ میری ہر کوشش بے غرض اور صرف خدا کے لیے ہے، دوسری جگہ فرمایا:

﴿لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۭ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۲۳)

’’میں اس پر تم سے کوئی مزدوری نہیں چاہتا، مگر قرابت داروں میں محبت رکھنا۔‘‘

یعنی رسول نے اپنی بے غرض کوششوں سے امت کو جو دینی و دنیاوی فائدے پہنچائے، اس کے لیے وہ تم سے کسی ذاتی منفعت کا خواہاں نہیں، اگر وہ اس کے معاوضہ میں کچھ چاہتا ہے تو یہ ہے کہ قرابت داروں کا حق ادا کرو اور آپس میں محبت رکھو، اسی قسم کی بات ایک اور آیت میں ظاہر کی گئی ہے:

﴿قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝﴾

(۲۵/ الفرقان:۵۷)

’’کہہ دے کہ میں تمہاری اس راہنمائی پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، مگر یہی کہ جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ پکڑے۔‘‘

یعنی میری اس محنت کی مزدوری یہی ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ حق کو قبول کر لیں۔

دنیا میں بھی اخلاص ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہے، کوئی بظاہر نیکی کا کتنا ہی بڑا کام کرے، لیکن اگر اس کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مقصد اس کام سے کوئی ذاتی غرض، یا محض دکھاوا اور نمائش تھا، تو اس کام کی قدر و قیمت فوراً نگاہوں سے گر جائے گی، اسی طرح روحانی عالم میں بھی خدا کی نگاہ میں اس چیز کی کوئی قدر نہیں جو اس کی بارگاہ بے نیاز کے علاوہ کسی اور کے لیے پیش کی گئی ہو، مقصود اس سے یہ ہے کہ نیکی کا ہر کام دنیاوی لحاظ سے بے غرض و بے منت اور بلا خیال مزد و اجرت اور تحسین و شہرت کی طلب سے بالاتر ہو، یہ تحسین و شہرت کا معاوضہ بھی دین تو الگ رہا دنیا بھی انہیں کو عطا کرتی ہے، جن کی نسبت اس کو یقین ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا کام انہیں شرائط کے ساتھ انجام دیا ہے۔

ہم جو کام بھی کرتے ہیں، اس کی دو شکلیں پیدا ہوتی ہیں، ایک مادی جو ہمارے ظاہری جسمانی اعضا کی حرکت و جنبش سے پیدا ہوتی ہے، دوسری روحانی، جس کا ہیولیٰ ہمارے دل کے ارادہ و نیت اور کام کی اندرونی غرض و غایت سے تیار ہوتا ہے، کام کی بقا اور برکت دین اور دنیا دونوں میں اسی روحانی پیکر کے حسن و قبح اور ضعف و قوت کی بنا پر ہوتی ہے، انسانی اعمال کی پوری تاریخ اس دعویٰ کے ثبوت میں ہے، اسی لیے اس اخلاص کے بغیر اسلام میں نہ تو عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ اخلاق و معاملات عبادت کا درجہ پاتے ہیں، اس لیے

ضرورت ہے کہ ہر کام کے شروع کرتے وقت ہم اپنی نیت کو ہر غیر مخلصانہ غرض و غایت سے بالا اور ہر دنیاوی مزد و اجرت سے پاک رکھیں، تورات اور قرآن دونوں میں ہابیل اور قابیل آدم کے دو بیٹوں کا قصہ ہے، دونوں نے خدا کے حضور میں اپنی اپنی پیداوار کی قربانیاں پیش کیں، خدا نے ان میں سے صرف ایک کی قربانی قبول کی اور اسی کی زبان سے اپنا یہ ابدی اصول بھی ظاہر فرما دیا:

﴿ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۲۷)

''خدا تو متقیوں ہی سے قبول کرتا ہے۔''

متقی بھی وہی ہوتے ہیں، جو دل کے اخلاص کے ساتھ رب کی خوشنودی کے لیے کام کرتے ہیں، انہیں کا کام قبول ہوتا ہے اور ان کو دین و دنیا میں فوز و فلاح بخشا جاتا ہے، ان کو خدا کے ہاں محبوبیّت کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور دنیا میں ان کو ہر دلعزیزی ملتی ہے، ان کے کاموں کو شہرت نصیب ہوتی ہے اور ان کے کارناموں کو زندگی بخشی جاتی ہے، وہ جماعتوں اور قوموں کے محسن ہوتے ہیں، لوگ ان کے ان کاموں سے نسلاً بعد نسل فیضیاب ہوتے ہیں اور ان کے لیے رحمت کی دعائیں مانگتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں فرعونیوں کو ایک پیغمبر اور جادوگر کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، کہ ان دونوں سے انہوں نے عجائب و غرائب امور کا یکساں مشاہدہ کیا، خدا نے فرمایا ان دونوں کے عجائب و غرائب میں ظاہری نہیں، باطنی صورت کا فرق ہے، ایک کے کام کی غرض صرف تماشا اور بازی گری ہے اور دوسرے کا نتیجہ ایک پوری قوم کی اخلاقی و روحانی زندگی کا انقلاب ہے، اسی لیے یہ فیصلہ ہے کہ

﴿ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى۝ ﴾ (۲۰/ طٰهٰ:۶۹)

''اور جادوگر جدھر سے بھی آئے فلاح نہیں پائے گا۔''

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ مصر کے جادوگروں کے حیرت انگیز کرتب صرف کہانی بن کر رہ گئے اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزات نے ایک نئی قوم، ایک نئی شریعت، ایک نئی زندگی، ایک نئی سلطنت پیدا کی، جو مدتوں تک دنیا میں قائم رہی۔ غرض عمل کا اصلی پیکر وہی ہے، جو دل کے کارخانہ میں تیار ہوتا ہے، اسی لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر کام سے پہلے دل کی نیت کا جائزہ لے لیا جائے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ نکتہ خود بخود حل ہو جائے گا کہ اسلام نے ہر عبادت کے صحیح ہونے کے لیے ارادہ اور نیت کو کیوں ضروری قرار دیا ہے۔

توکل

﴿ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۹)

توکل قرآن پاک کی اصطلاح کا اہم لفظ ہے، عام لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کے لیے جدوجہد وکوشش نہ کی جائے، بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں توڑے کسی حجرہ یا خانقاہ میں بیٹھ رہا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے، وہ خود کر دے گا، یعنی تقدیر میں جو کچھ ہے وہ ہو رہے گا، اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہیں، لیکن یہ سراسر وہم ہے اور مذہبی اپاہجوں کا دل خوش کن فلسفہ ہے، جس کو اسلام سے ذرہ بھر بھی تعلق نہیں۔ توکل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں، لیکن کس بات میں بھروسہ کرنا، کسی کام کے کرنے میں یا نہ کرنے میں؟ جھوٹے صوفیوں نے ترک عمل، اسباب و تدابیر سے بے پروائی اور خود کام نہ کر کے دوسروں کے سہارے جینے کا نام توکل رکھا ہے، حالانکہ توکل نام ہے کسی کام کو پورے ارادہ وعزم اور تدبیر وکوشش کے ساتھ انجام دینے اور یہ یقین رکھنے کا کہ اگر اس کام میں بھلائی ہے، تو اللہ تعالیٰ اس میں ضرور ہی ہم کو کامیاب فرمائے گا۔

اگر تدبیر اور جدوجہد وکوشش کا ترک ہی توکل ہوتا، تو دنیا میں لوگوں کے سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو مبعوث نہ کرتا اور نہ ان کو اپنی تبلیغ رسالت کے لیے جدوجہد اور سعی وسرگرمی کی تاکید فرماتا اور نہ اس راہ میں جان و مال کی قربانی کا حکم دیتا، نہ بدر و اُحد اور خندق وحنین میں سواروں، تیراندازوں، زرہ پوشوں اور تیغ آزماؤں کی ضرورت پڑتی اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ کے پاس جا جا کر حق کی دعوت کا پیغام سنانے کی حاجت ہوتی۔ توکل مسلمانوں کی کامیابی کا اہم راز ہے، حکم ہوتا ہے کہ جب لڑائی یا کوئی اور مشکل کام پیش آئے، تو سب سے پہلے اس کے متعلق لوگوں سے مشورہ لے لو، مشورہ کے بعد جب رائے ایک نقطہ پر ٹھہر جائے تو اس کے انجام دینے کا عزم کر لو اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کرنا شروع کر دو اور خدا پر توکل اور بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا حسب خواہ نتیجہ پیدا کرے گا، اگر ایسا نتیجہ نہ نکلے تو اس کو خدا کی حکمت و مصلحت اور مشیت سمجھو اور اس سے مایوس اور بودے نہ بنو اور جب نتیجہ خاطر خواہ نکلے تو یہ غرور نہ ہو کہ یہ تمہاری تدبیر اور جدوجہد کا نتیجہ اور اثر ہے، بلکہ یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ کا تم پر فضل و کرم ہوا اور اسی نے تم کو کامیاب اور بامراد کیا، آل عمران میں ہے:

﴿ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝ إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۹۔۱۶۰)

’’اور کام (یا لڑائی) میں ان سے مشورہ لے لو، پھر جب پکا ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھو، بے

شک اللہ (اللہ پر) بھروسہ رکھنے والوں کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمہارا مددگار ہو تو کوئی تم پر غالب نہ آ سکے گا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے اور اللہ ہی پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ رکھیں۔''

ان آیات نے توکل کی پوری اہمیت اور حقیقت ظاہر کر دی، کہ توکل بے دست و پائی اور ترک عمل کا نہیں، بلکہ اس کا نام ہے کہ پورے عزم وارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اثر اور نتیجہ کو خدا کے بھروسہ پر چھوڑ دیا جائے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ خدا مددگار ہے، تو کوئی ہم کو ناکام نہیں کر سکتا اور اگر وہی نہ چاہے تو کسی کی کوشش و مدد کارآمد نہیں ہو سکتی، اس لیے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے کام میں خدا پر بھروسہ رکھے۔ منافق اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور راتوں کو جوڑ توڑ کرتے ہیں، حکم ہوتا ہے کہ ان کی ان مخالفانہ چالوں کی پروا نہ کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو، وہی تمہارے کاموں کو بنائے گا:

﴿ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:٨١)

''تو ان منافقوں سے درگزر کر اور خدا پر بھروسہ رکھ اور اللہ ہے کام بنانے والا۔''

آغاز اسلام کے شروع میں تین برس کی مخفی دعوت کے بعد جب اسلام کی علانیہ دعوت کا حکم ہوتا ہے، تو مخالفوں کی کثرت اور دشمنوں کی قوت سے بے خوف ہونے کی تعلیم دی جاتی ہے اور فرمایا جاتا ہے کہ ان مشکلات کی پروا کیے بغیر خدا پر توکل اور بھروسہ کر کے کام شروع کر دو:

﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ۙ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ۚ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّىْ بَرِىْۗءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ۚ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ۙ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝ۙ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ۝ ﴾ (٢٦/ الشعرآء:٢١٤-٢١٩)

''اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ہشیار کر اور مومنوں میں سے جو تیری پیروی کرے اس کے لیے اپنی (شفقت) کا بازو جھکا، پھر اگر وہ تیرا کہنا نہ مانیں تو کہہ دے کہ میں تمہارے کاموں سے الگ ہوں اور اس غالب رحمت والے پر بھروسہ رکھ جو تجھ کو دیکھتا ہے، جب تو (رات کو) اٹھتا ہے اور نمازیوں میں تیری آمد ورفت کو ملاحظہ کرتا ہے۔''

دشمنوں کے نرغہ میں ہونے کے باوجود آنحضرت ﷺ تنہائی میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر عبادت گزار مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے، یہ جرأت اور بے خوفی اسی توکل کا نتیجہ تھی، مشکلات میں اسی توکل اور اللہ پر اعتماد کی تعلیم مسلمانوں کو دی گئی ہے، احزاب میں منافقوں اور کافروں کی مخالفانہ کوششوں سے بے پروا ہو کر اپنے کام میں لگے رہنے کا جہاں حکم دیا گیا ہے، وہاں اسی توکل کا سبق پڑھایا گیا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ۙ وَّاتَّبِعْ مَا

يُوْحَى إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۱۔۳)

’’اے پیغمبر! خدا سے ڈر اور کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ مان، بے شک اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے اور جو تیرے پاس تیرے پروردگار کی طرف سے وحی کی جاتی ہے، اس کے پیچھے چل، بے شک خدا تمہارے کاموں سے خبردار ہے اور اللہ پر بھروسہ رکھ اور اللہ کام بنانے کو کافی ہے۔‘‘

کفار سے مسلسل لڑائیوں کے پیش آنے کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر اب بھی یہ لوگ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ اور مصالحت کرلو اور یہ خیال نہ کرو کہ یہ بدعہد کہیں دھوکا نہ دیں، خدا پر بھروسہ رکھو تو ان کے فریب کا داؤ کامیاب نہ ہوگا:

﴿ وَإِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ وَإِنْ يُّرِيْدُوْٓا أَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ أَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ۙ﴾

(۸/ الانفال:۶۱۔۶۲)

’’اور اگر وہ صلح کے لیے جھکیں، تو تو بھی جھک جا اور خدا پر بھروسہ رکھ، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے اور اگر وہ تجھے دھوکا دینا چاہیں تو کچھ پروا نہیں کہ تجھے اللہ کافی ہے، اُسی نے تجھ کو اپنی اور مسلمانوں کی نصرت سے تیری تائید کی۔‘‘

یہود جن کو اپنی دولت، ثروت اور علم پر ناز تھا، ان سے بھی بے خوف وخطر ہوکر اللہ کے بھروسہ پر مسلمانوں کو حق کی تائید کے لیے کھڑے ہوجانے کا حکم ہوتا ہے:

﴿ إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ أَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ وَإِنَّهُ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝ ۚ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ۝ ﴾ (۲۷/ النمل:۷۶۔۷۹)

’’بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل سے اکثر وہ باتیں ظاہر کر دیتا ہے، جن میں وہ مختلف ہیں اور بے شک یہ قرآن مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے، بے شک تیرا پروردگار ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کردے گا اور وہی غالب اور جاننے والا ہے، تو تو خدا پر بھروسہ رکھ بے شک تو کھلے حق پر ہے۔‘‘

اسلام کی تبلیغ اور دعوت کی مشکلوں میں بھی خدا ہی کے اعتماد اور بھروسہ پر کام کرنے کی ہدایت ہے کہ وہ ایسی طاقت ہے جس کو زوال نہیں اور ایسی ہستی ہے جس کو فنا نہیں، فرمایا:

﴿ وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ قُلْ مَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَآءَ أَنْ يَّتَّخِذَ إِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۵۶۔۵۸)

''اور میں نے تو (اے رسول) تجھے خوش خبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے، کہہ دے کہ میں تم سے اسکے سوا (اپنے کام کی) کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ جو چاہے اپنے پروردگار کا راستہ قبول کرے اور اس زندہ رہنے والے پر بھروسہ کر جس کو موت نہیں۔''

رسول کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم اپنا کام کیے جاؤ، مخالفین کی پروانہ کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو، جس کے سوا کوئی دوسرا با اختیار نہیں:

﴿ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴾

(۹/ التوبۃ:۱۲۹)

''تو اگر یہ (مخالفین) کہا نہ مانیں، تو (ان سے) کہہ دو کہ مجھے اللہ بس ہے، نہیں کوئی معبود، لیکن وہی، اسی پر میں نے بھروسہ کیا، وہ بڑے تخت کا مالک ہے۔''

آپس کے اختلافات میں اللہ کا فیصلہ چاہیے، اس حالت میں بھی اسی پر بھروسہ ہے:

﴿ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۱۰)

''اور جس چیز میں تم میں رائے کا اختلاف ہے، تو اس کا فیصلہ خدا کی طرف ہے، وہی اللہ ہے میرا پروردگار، اسی پر میں بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔''

رسول کو خدا کی آیتیں پڑھ کر اپنی نادان قوم کو سنانے کا حکم ہوتا ہے اور تسلی دی جاتی ہے کہ ان کے کفر و نافرمانی کی پروانہ کرو اور اپنی کامیابی کے لیے خدا پر بھروسہ رکھو:

﴿ كَذَٰلِكَ أَرْسَلْنَاكَ فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا أُمَمٌ لِتَتْلُوَ عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَٰنِ ۚ قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ ﴾

(۱۳/ الرعد:۳۰)

''ایسا ہی ہم نے تجھے اس قوم میں بھیجا ہے جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکیں، تا کہ تو ان کو وہ پیام سنائے جو میں نے تجھ پر وحی کیا ہے اور وہ رحمٰن کے ماننے سے انکار کرتے ہیں، کہہ دے کہ وہ میرا پروردگار ہے کوئی معبود نہیں لیکن وہی، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم پر ہمیشہ ایک مسلمان کو بھروسہ رکھنا چاہیے اور گمراہوں کی ہدایت کا فرض ادا کرنے کے بعد ان کی شرارتوں سے پراگندہ خاطر نہ ہونا چاہیے، کفار کو یہ آیت سنا دینی چاہیے:

﴿ قُلْ هُوَ الرَّحْمَٰنُ آمَنَّا بِهِ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۖ فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴾

(۶۷/ الملک:۲۹)

''کہہ دے وہی رحم والا ہے، ہم اس پر ایمان لائے اور اسی پر بھروسہ کیا، تو تم جان لوگے کہ کون کھلی گمراہی میں ہے۔''

جس طرح ہمارے رسول ﷺ کو اور عام مسلمانوں کو ہر قسم کی مصیبتوں، مخالفتوں اور مشکلوں میں خدا پر توکل اور اعتماد رکھنے کی ہدایت بار بار ہوئی ہے، آپ سے پہلے پیغمبروں کو بھی اس قسم کے موقعوں پر اسی کی تعلیم دی گئی ہے اور خود اولوالعزم رسولوں کی زبان سے عملاً اس تعلیم کا اعلان ہوتا رہا ہے، حضرت نوح علیہ السلام جب تن تنہا سالہا سال تک کافروں کے نرغہ میں پھنسے رہے، تو انہوں نے پوری بلند آہنگی کے ساتھ اپنے دشمنوں کو یہ اعلان فرمادیا:

﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَاۗءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴾ (۱۰/ یونس:۷۱)

''(اے پیغمبر)! ان کو نوح کا حال سنا جب اس نے اپنی قوم سے کہا، اے میرے لوگو! اگر میرا رہنا اور اللہ کی نشانیوں کے ساتھ میرا نصیحت کرنا، تم پر شاق گزرتا ہے تو اللہ پر میں نے بھروسہ کرلیا ہے، تو تم اپنی تدبیر کو اور اپنے شریکوں کو خوب مضبوط کرلو پھر تم پر تمہاری تدبیر چھپی نہ رہے، پھر اس کو مجھ پر پورا کرلو اور مجھے مہلت نہ دو۔''

غور کیجئے کہ حضرت نوح علیہ السلام دشمنوں کے ہر قسم کے مکر و فریب، سازش اور لڑائی بھڑائی کے مقابلہ میں استقلال اور عزیمت کے ساتھ خدا پر توکل اور اعتماد کا اظہار کس پیغمبرانہ شان سے فرمارہے ہیں۔ حضرت ہود علیہ السلام کو ان کی قوم جب اپنے دیوتاؤں کے قہر اور غضب سے ڈراتی ہے، تو وہ جواب میں فرماتے ہیں:

﴿ اِنِّىْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝ اِنِّىْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ۭ ﴾ (۱۱/ ھود:۵۴۔۵۶)

''میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں ان سے بیزار ہوں جن کو تم خدا کے سوا شریک ٹھہراتے ہو، پھر تم سب مل کر میرے ساتھ داؤ کرلو، پھر مجھے مہلت نہ دو، میں نے اللہ پر جو میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار ہے بھروسہ کرلیا ہے۔''

حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ مجھے تمہاری مخالفتوں کی پروانہیں، مجھے جو اصلاح کا کام کرنا ہے، وہ کروں گا، میرا تکیہ خدا پر ہے:

﴿ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴾

(۱۱/ ھود:۸۸)

''میں تو جب تک مجھ میں طاقت ہے، کام سدھارنا چاہتا ہوں، میری توفیق اللہ ہی سے ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے، اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔''

ان پیغمبروں کی اس استقامت، صبر اور توکل کے واقعات سنانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی جاتی ہے، کہ آپ کو بھی اپنے کاموں کے مشکلات میں اسی طرح خدا پر توکل کرنا چاہیے:

﴿ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۝ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۭ ﴾

(۱۱/ ھود: ۱۲۱۔۱۲۳)

''کہہ دو ان سے جو ایمان نہیں لاتے کہ تم اپنی جگہ کام کرو، ہم بھی کرتے ہیں اور تم بھی (نتیجہ کا) انتظار کرو، ہم بھی کرتے ہیں اور اللہ ہی کے قبضہ میں ہے، آسمانوں کا اور زمین کا چھپا بھید اور اسی کی طرف سارے کاموں کا فیصلہ لوٹایا جاتا ہے، پھر اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسہ کر۔''

مسلمانوں کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے پیرووں کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے، کہ وہ صرف خدا کے بھروسہ پر عزیز و اقارب سب کو چھوڑ کر الگ ہو گئے اور خدا کی راہ میں کسی کی دوستی اور محبت کی پروا نہ کی:

﴿ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰۗؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۡ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاۗءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ ﴾ (۶۰/ الممتحنہ: ۴)

''تمہارے لیے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور خدا کے سوا جن کو تم پوجتے ہو ان سے بیزار ہیں، ہم نے تمہارے مسلک کا انکار کر دیا اور ہم میں اور تم میں دشمنی اور نفرت ہمیشہ کے لیے کھل گئی، جب تک تم ایک خدا پر ایمان نہ لے آؤ، مگر ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ میں تمہارے لیے خدا سے دعا کروں گا اور مجھے خدا کے کام میں کوئی اختیار نہیں، اے ہمارے پروردگار! تجھی پر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کیا اور تیرے ہی پاس لوٹ کر جانا ہے۔''

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے عزیز بیٹوں کو مصر بھیجتے ہیں، لیکن فرطِ محبت سے ڈرتے ہیں کہ یوسف کی طرح ان کو بھی کوئی مصیبت نہ پیش آئے، بیٹوں کو کہتے ہیں کہ تم سب شہر کے ایک دروازہ سے نہیں، بلکہ متفرق دروازوں سے اندر جانا، اس ظاہری تدبیر کے بعد خیال آتا ہے کہ کارسازِ حقیقی تو خدا ہے، ان تدبیروں سے اس کا حکم ٹل تھوڑا ہی سکتا ہے، اس لیے بھروسہ تدبیر پر نہیں، بلکہ خدا کی کارسازی پر ہے:

﴿ وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ

مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُۚ وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ۝﴾

(۱۲/ یوسف:٦٧)

''اور (یعقوب علیہ السلام نے) کہا، اے میرے بیٹو! ایک دروازہ سے نہ جانا، بلکہ الگ الگ دروازوں سے جانا اور میں تم کو خدا سے ذرا بھی بچا نہیں سکتا، فیصلہ اسی کا ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی پر چاہیے کہ بھروسہ کرنے والے بھروسہ کریں۔''

حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ظاہری تدبیر شانِ توکل کے منافی نہیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں جب ان کی قوم ان کو زبردستی بت پرست بن جانے پر مجبور کرتی ہے، ورنہ ان کو گھر سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیتی ہے، تو اس کے جواب میں وہ پوری استقامت کے ساتھ فرماتے ہیں:

﴿قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَاؕ وَمَا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَاؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًاؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَاؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ۝﴾ (۷/ الاعراف:۸۹)

''اگر ہم پھر تمہارے مذہب میں آ جائیں جب ہم کو خدا اس سے بچا چکا، تو ہم نے خدا پر جھوٹ باندھا اور یہ ہم سے نہیں ہو سکتا کہ ہم پھر اس میں لوٹ کر جائیں، مگر یہ کہ ہمارا پروردگار خدا ہی چاہے، ہمارا پروردگار اپنے علم سے ہر چیز کو سمائے ہے، ہم نے خدا پر بھروسہ کیا، اے ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے بیچ میں تو حق کا فیصلہ کر دے اور تو ہی سب فیصلہ کرنے والوں میں سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دل بادل لشکر اور شاہانہ زور و قوت کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کو خدا ہی پر توکل کی تعلیم دی، فرمایا:

﴿یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَیْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ۝﴾ (۱۰/ یونس:۸۵)

''اے میرے لوگو! اگر تم خدا پر ایمان لا چکے ہو، تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم فرمانبردار ہو۔''

ان کی قوم نے بھی پوری ایمانی جرأت کے ساتھ جواب دیا:

﴿عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَاۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَۙ۝﴾ (۱۰/ یونس:۸٦)

''ہم نے خدا ہی پر بھروسہ کیا، ہمارے پروردگار ہم کو ظالم قوم کے لیے آزمائش نہ بنا۔''

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہر تدبیر کو جس طرح کامیاب بنایا اور ان کو اپنی خاص خاص نوازشوں سے جس طرح سرفراز کیا، اس سے ہر شخص واقف ہے، یہ سب کچھ ان کے اسی توکل کے صدقہ میں

ہوا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنا یہ اصول ہی ظاہر فرما دیا ہے:

﴿ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ﴾ (۶۵/ الطلاق: ۳)

''جو خدا پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو کافی ہے۔''

یہ آیت پاک خانگی و معاشرتی مشکلات کے موقع کی ہے، کہ اگر میاں بیوی میں نباہ کسی طرح نہ ہو سکے اور دونوں میں قطعی علیحدگی (طلاق) ہو جائے تو پھر عورت کو اس سے ڈرنا نہ چاہیے کہ ہمارا سامان کیا ہوگا اور ہم کہاں سے کھائیں گے؟

ع خدا خود میر سامان است ارباب توکل را

توکل کے متعلق قرآن پاک کی جس قدر آیتیں ہیں اور وہ ایک ایک کر کے آپ کے سامنے ہیں، ہر ایک پر غور کی نظر ڈالیے کہ ان میں سے کوئی بھی ان معنوں میں ہے جن میں ہم اپنی جہالت سے اس کو سمجھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا مفہوم یہ ہے کہ ہم مشکلات کے ہجوم، موانع کی کثرت اور پرزور مخالفتوں کی تدبیروں سے نڈر ہو کر استحکام، عزم اور استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہ کر خدا کی مدد سے کام کے حسب خواہ نتیجہ پیدا ہونے کا دل میں یقین رکھیں۔ احادیث میں ہے کہ ایک بدوی اونٹ پر سوار ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں اونٹ کو یونہی چھوڑ کر خدا پر توکل کروں کہ میرا اونٹ مجھ کو مل جائے گا یا اس کو باندھ کر، ارشاد ہوا: ''اس کو باندھ کر خدا پر توکل کرو۔'' [1] اسی واقعہ کو مولانا رومی نے اس مصرع میں ادا کیا ہے:

ع برتوکل زانوے اشتر بہ بند

یہ روایت سند کے لحاظ سے قوی نہیں، تاہم حقیقت کی رو سے اس کا مفہوم قرآن پاک کے عین منشا کے مطابق ہے۔

بعض لوگ تعویذ گنڈا، غیر شرعی [2] جھاڑ پھونک، ٹوٹکے اور منتر پر یقین رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مادی اسباب و تدابیر کو چھوڑ کر ان چیزوں سے مطلب برآری کرنا ہی توکل ہے، جاہلیت کے وہم پرست بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کے اس خیال کی تردید کر دی اور فرمایا کہ ''خدا نے وعدہ کیا ہے کہ میری امت سے ستر ہزار اشخاص حساب کتاب کے بغیر جنت میں داخل کر دیے جائیں گے، یہ وہ ہوں گے جو تعویذ گنڈا نہیں کرتے، جو بدشگونی کے قائل نہیں، جو داغ نہیں کرتے، بلکہ اپنے پروردگار پر توکل اور

---

[1] یہ حدیث بلفظ "اعقلها وتوكل" ترمذی (آخر ابواب صفة القيامة: ۲۵۱۷) میں اور "قيده وتوكل" شعب الايمان بیہقی میں اور "قيدها وتوكل" خطیب کی روایت مالک اور ابن عساکر میں ہے (کنز العمال، ج ۲، ص: ۲۳ حیدر آباد)۔

[2] شرعی کلمات حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں ہیں اور اس کے کلام پاک سے تبرک حاصل کرنا ہے، لیکن آیات اور دعاؤں کو لکھ کر بدن میں لٹکانا یا گھول کر پینا، یا خاص قیود کے ساتھ اعداد میں ان کو لکھنا ثابت نہیں۔

اعتماد رکھتے ہیں۔'' ❶ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ ''جو دغواتے اور تعویذ گنڈا کراتے ہیں، وہ توکل سے محروم ہیں۔'' ❷ اس سے مقصود نفس تدبیر کی ممانعت نہیں، بلکہ جاہلانہ اوہام کی بیخ کنی ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ''اگر تم خدا پر توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو خدا تم کو ویسے روزی پہنچاتا، جیسے پرندوں کو پہنچاتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں۔'' ❸ اس حدیث سے بھی مقصود ترک عمل اور ترک تدبیر نہیں، کیونکہ پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں بیٹھا کر یہ روزی نہیں پہنچائی جاتی ہے، بلکہ ان کو بھی اڑ کر کھیتوں اور باغوں میں جانے اور رزق کے تلاش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ خدا پر توکل اور اعتماد سے محروم ہیں، وہ روزی کے لیے دل تنگ اور کبیدہ خاطر ہوتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے ہر قسم کی بدی اور برائی کا ارتکاب کرتے ہیں، حالانکہ انہیں اگر یہ یقین ہو کہ

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ﴾ (۱۱/ ھود:٦)

''زمین میں کوئی رینگنے والا نہیں، لیکن اس کی روزی خدا کے ذمہ ہے۔''

تو وہ اس کے لیے چوری، ڈاکہ، قتل، بے ایمانی اور خیانت وغیرہ کے مرتکب نہ ہوتے اور نہ ان کو دلی تنگی اور مایوسی ہوا کرتی، بلکہ صحیح طور سے وہ کوشش کرتے اور روزی پاتے، ان حدیثوں کا یہی مفہوم ہے، جو قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے:

﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝ ﴾

(٦٥/ الطلاق:٢۔٣)

''اور جو کوئی اللہ سے ڈرے، وہ اس کے لیے مشکل سے نکلنے کا راستہ کر دے گا اور اس کو وہاں سے روزی دے گا، جہاں سے اس کو گمان نہ ہوگا اور جو اللہ پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو بس ہے، بے شک اللہ اپنے ارادہ کو پہنچ کر رہتا ہے، اس نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔''

اوپر کی تفصیلوں سے ہویدا ہے کہ توکل جس قلبی یقین کا نام ہے، اسی کے قریب قریب آج کل کے اخلاقیات میں ''خود اعتمادی'' کا لفظ بولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہیں، جن میں یہ جوہر پایا جاتا ہے، لیکن اس خود اعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب غرور اور فریب نفس کے گڑھے بھی ہیں، اس لیے اسلام نے انانیت کی خود اعتمادی کے بجائے ''خدا اعتمادی'' کا نظریہ پیش کیا ہے، جو ان خطروں سے محفوظ ہے۔

❶ صحیح بخاری، کتاب الطب، باب من لم یرق: ٥٧٥٢ وكتاب الرقاق، باب ومن یتوکل علی الله فهو حسبه......: ٦٤٧٢؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدليل على دخول طوائف من المسلمين...... ٥٢٤ جاہلیت میں اکثر بیماریوں کا علاج آگ سے داغ کر کرتے تھے۔ ❷ جامع ترمذی، ابواب الطب باب ماجاء مافی کراهية الرقية: ٢٠٥٥۔ اصل الفاظ یہ ہیں، من اکتوی اواسترقی فقد بریء من التوكل۔ ❸ جامع ترمذی، ابواب الزهد، باب فی التوكل على الله: ٢٣٤٤؛ مستدرك حاكم، كتاب الرقاق، ج ٤، ص: ٣١٨۔

صبر

﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ﴾ (٤٦/ الاحقاف :٣٥)

صبر کی حقیقت پر عوام کی غلط فہمی نے تو برتو پردے ڈال رکھے ہیں، وہ ان کے نزدیک بے بسی و بے کسی کی تصویر ہے اور اس کے معنی اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لے سکنا ہیں، لیکن کیا واقعی یہی ہے؟

صبر کے لغوی معنی

''صبر'' کے لغوی معنی ''روکنے'' اور ''سہارے'' کے ہیں، یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے، یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں، بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی اور اخلاقی جرأت اور ثبات قدم کے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کے قصہ میں ایک ہی آیت میں تین جگہ یہ لفظ آیا ہے اور ہر جگہ یہی معنی مراد ہیں، حضرت خضر علیہ السلام کہتے ہیں:

﴿ إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ۝ ﴾

(١٨/ الكهف: ٦٧ـ٦٨)

''تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے اور کیسے اس بات پر صبر کر سکتے ہو، جس کا علم تمہیں نہیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام جواب میں فرماتے ہیں:

﴿ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا ﴾ (١٨/ الكهف :٦٩)

''اگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔''

اس صبر سے مقصود لاعلمی کی حالت میں غیر معمولی واقعات کے پیش آنے سے دل میں اضطراب اور بے چینی کا پیدا نہ ہونا ہے۔

کفار، اپنے پیغمبروں کے سمجھانے کے باوجود، پوری تندہی اور مضبوطی کے ساتھ اپنی بت پرستی پر قائم رہتے ہیں، تو اس کی حکایت ان کی زبان سے قرآن یوں بیان کرتا ہے:

﴿ إِن كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ آلِهَتِنَا لَوْلَا أَن صَبَرْنَا عَلَيْهَا ﴾ (٢٥/ الفرقان :٤٢)

''یہ شخص (پیغمبری کا مدعی) تو ہم کو اپنے خداؤں (بتوں) سے ہٹا ہی چکا تھا، اگر ہم ان پر صابر (ثابت) نہ رہتے۔''

یہی مفہوم ایک اور آیت میں ہے، کفار آپس میں کہتے ہیں:

﴿ أَنِ امْشُوا وَاصْبِرُوا عَلَىٰ آلِهَتِكُمْ ﴾ (٣٨/ ص: ٦) ''چلو اور اپنے خداؤں پر صبر کرو، (یعنی مضبوطی کے ساتھ قائم رہو۔''

عرب کے بعض گنوار آنحضرت ﷺ کے حجرہ کے سامنے آ کر بدتمیزی سے آپ کو پکارتے تھے، ان

سے کہا گیا کہ اتنی گھبراہٹ کیا تھی! ذرا ٹھہر جاتے۔

﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴾ (٤٩/ الحجرات: ٥)

''اور اگر وہ ذرا صبر کرتے (یعنی ٹھہر جاتے) یہاں تک کہ تم (اے رسول) نکل کر ان کے پاس آتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔''

قرآن پاک میں صبر کا لفظ اسی ایک معنی میں مستعمل ہوا ہے، گو حالات کے تغیر سے اس کے مفہوم میں کہیں کہیں ذرا ذرا فرق پیدا ہو گیا ہے، بااین ہمہ ان سب کا مرجع ایک ہی ہے، یعنی ثابت قدمی اور استقامت، صبر کے یہ مختلف مفہوم جن میں قرآن پاک نے اس کو استعمال کیا ہے، حسب ذیل ہیں:

وقتِ مناسب کا انتظار کرنا

پہلا یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا، آنحضرت ﷺ نے جب شروع میں لوگوں کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام کی تبلیغ پیش کی، تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپ کی مخالفت میں سرگرم جولان ہو گیا، ہر طرف سے عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مخالفتیں اور رکاوٹیں پیش کی جانے لگیں، تو اس وقت بشریت کے اقتضا سے آپ کو اضطراب ہوا اور کامیابی کی منزل دور نظر آنے لگی اور اس وقت تسلی کا یہ پیام آیا کہ اضطراب اور گھبراہٹ کی ضرورت نہیں، آپ مستعدی سے اپنے کام میں لگے رہیں، خدا آپ کا نگہبان ہے، خدا کا فیصلہ اپنے وقت پر آئے گا، فرمایا:

﴿ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا ﴾ (٥٢/ الطور: ٤٨)

''(اے رسول ﷺ) تو اپنے پروردگار کے فیصلہ پر ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔''

﴿ فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ﴾ (٧/ الاعراف: ٨٧)

''تو ثابت قدم رہ کر منتظر رہو، یہاں تک کہ خدا ہمارے درمیان فیصلہ کر دے۔''

﴿ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴾ (١٠/ یونس: ١٠٩)

''اور ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، یہاں تک کہ خدا فیصلہ کر دے، وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں بہتر ہے۔''

﴿ فَاصْبِرْ ۚ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ (١١/ ہود: ٤٩)

''ثابت قدم رہ کر وقت کا منتظر رہ، بے شبہ آخر کار کامیابی پرہیزگاروں ہی کی ہے۔''

اس انتظار کی کشمکش کی حالت میں جب ایک طرف حق کی بے کسی، بیچارگی اور بے بسی پاؤں کو ڈگمگا رہی ہو اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورش اور ہنگامی غلبہ دلوں کو کمزور کر رہا ہو، حق پر قائم رہ کر اس کی کامیابی کی

پوری توقع رکھنی چاہیے:

﴿ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ﴾ (۳۰/ الروم:۶۰؛ ۴۰/ المؤمن:۷۷)

''ثابت قدمی کے ساتھ منتظر رہ، بے شک خدا کا وعدہ سچا ہے۔''

ایسا نہ ہو کہ وعدہ الٰہی کے ظہور میں اگر ذرا دیر ہو تو مشکلات سے گھبرا کر حق کا ساتھ چھوڑ دو اور باطل کے گروہ میں مل جاؤ:

﴿ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴾ (۷۶/ الدھر:۲۴)

''اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی سے منتظر رہ اور ان (مخالفین میں) سے کسی گناہگار یا کافر کا کہنا نہ مان لے۔''

آنحضرت ﷺ کو حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ سنایا گیا کہ ان کو خیال ہوا کہ ان کی نافرمان قوم پر عذاب آنے میں تاخیر ہو رہی ہے، اس لیے وہ بھاگ کھڑے ہوئے، حالانکہ ان کی قوم دل میں مسلمان ہو چکی تھی، اس لیے وہ عذاب اس سے ٹل گیا تھا، ارشاد ہوا، کہ اے پیغمبر اس طرح تیرے ہاتھ سے صبر کا رشتہ چھوٹنے نہ پائے:

﴿ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ﴾ (۶۸/ القلم:۴۸)

''اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی کے ساتھ انتظار کر اور مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ ہو۔''

بے قرار نہ ہونا

صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مصیبتوں اور مشکلوں میں اضطراب اور بے قراری نہ ہو، بلکہ ان کو خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی جھیلا جائے اور یہ یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود ان کو دور فرما دے گا، اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مدح فرمائی:

﴿ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ ﴾ (۲۲/ الحج:۳۵)

''اور جو مصیبت میں صبر کریں۔''

حضرت یعقوب علیہ السلام بیٹوں سے یہ جھوٹی خبر سن کر کہ بھیڑیے نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کھالیا، فرماتے ہیں:

﴿ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴾

(۱۲/ یوسف:۱۸)

''بلکہ تمہارے دلوں نے ایک بات گھڑ لی ہے، تو بہتر صبر ہے اور خدا سے اس پر مدد چاہی جاتی ہے، جو تم بیان کرتے ہو۔''

پھر اپنے دوسرے بیٹے کے مصر میں روک لیے جانے کا حال سن کر کہتے ہیں:

﴿ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۭ ﴾

(۱۲/ یوسف:۸۳)

''بلکہ تمہارے دلوں نے گھڑ لیا ہے، تو بہتر صبر ہے، عنقریب خدا ان سب کو ساتھ لائے گا۔''

حضرت ایوب علیہ السلام نے جسمانی اور مالی مصیبتوں کو جس رضا و تسلیم کے ساتھ پامردی سے برداشت کیا، اس کی مدح خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی:

﴿ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝ ﴾ (۳۸/ صٓ:٤٤)

''ہم نے بے شک ایوب کو صابر پایا، کیسا اچھا بندہ، وہ خدا کی طرف رجوع ہونے والا ہے۔''

حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے شفیق اور مہربان باپ کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ کر فرماتے ہیں:

﴿ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ ﴾ (۳۷/ الصافات:۱۰۲)

''اے باپ جو تجھے کہا جاتا ہے، وہ کر گزر، خدا نے چاہا، تو تو مجھے صابروں میں سے پائے گا۔''

مشکلات کو خاطر میں نہ لانا

صبر کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ منزل مقصود کی راہ میں جو مشکلیں اور خطرے پیش آئیں، دشمن جو تکلیفیں پہنچائیں اور مخالفین جو طعن وطنز کریں، ان میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لایا جائے اور ان سے بددل اور پست ہمت ہونے کے بجائے اور زیادہ استقلال اور استواری پیدا ہو، بڑے بڑے کام کرنے والوں کی راہ میں یہ روڑے اکثر اٹکائے گئے، مگر انہوں نے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے، آنحضرت ﷺ کو اسی لیے دوسری وحی میں جب تبلیغ اور دعوت کا حکم ہوا، تو ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آپ ﷺ کو باخبر کر دیا گیا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ .... وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝ ﴾ (۷٤/ المدثر:۱۔۷)

''اے چادر پوش! اٹھ اور لوگوں کو ہشیار کر...... اور اپنے پروردگار کے لیے پامردی (صبر) کر۔''

اس قسم کے مواقع اکثر انبیا علیہم السلام کو پیش آئے، چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کو نبوت کی اس اعلیٰ مثال کی پیروی کا حکم ہوا:

﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۭ ﴾ (٤٦/ الاحقاف:۳۵)

''(اے محمد ﷺ!) تو بھی اسی طرح پامردی کر جس طرح پختہ ارادہ والے پیغمبروں نے کی اور ان (مخالفوں) کے لیے جلدی نہ کر۔''

حضرت لقمان علیہ السلام کی زبان سے بیٹے کو یہ نصیحت سنائی گئی کہ حق کی دعوت وتبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض پوری استواری سے ادا کر اور اس راہ میں جو مصیبتیں پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کر:

﴿ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَى مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴾

(۳۱/ لقمان:۱۷)

''نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک اور جو مصیبت پیش آئے، اس کو برداشت کر، یہ بڑی پختہ باتوں میں سے ہے۔''

کفار عذاب الٰہی کے جلد نہ آنے، یا حق کی ظاہری بے کسی و بے بسی کے سبب سے آنحضرت ﷺ کو اپنے دلدوز طعنوں سے تکلیفیں پہنچاتے تھے، حکم ہوا کہ ان طعنوں کی پروانہ کر اور نہ ان سے دل کو اداس کر، بلکہ اپنی دھن میں لگا رہ اور دیکھ کہ تجھ سے پہلے پیغمبروں نے کیا کیا:

﴿ اصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُودَ ﴾ (۳۸/ ص:۱۷)

''ان کے کہے پر صبر کر اور ہمارے بندہ داؤد کو یاد کر۔''

اس قوت صبر کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ خدا سے لو لگائی جائے اور اس کی طاقت پر بھروسہ کیا جائے:

﴿ فَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ ﴾

(۲۰/ طٰہٰ:۱۳۰ و ۵۰/ ق:۳۹)

''تو ان کے کہنے پر صبر کر اور صبح شام اپنے پروردگار کی حمد کر۔''

نہ صرف یہ کہ مخالفوں کے اس طعن وطنز کا دھیان نہ کیا جائے، بلکہ اس کے جواب میں اُن سے لطف و مروت برتا جائے، فرمایا:

﴿ وَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۝ ﴾ (۷۳/ المزمل:۱۰)

''تو ان کے کہے پر صبر کر اور ان سے خوبصورتی سے الگ ہو جا۔''

درگزر کرنا

صبر کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ برائی کرنے والوں کی برائی کو نظر انداز اور جو بدخواہی سے پیش آئے اور تکلیفیں دے، اس کے قصور کو معاف کیا جائے یعنی تحمل اور برداشت میں اخلاقی پامردی دکھائی جائے۔ قرآن پاک کی کئی آیتوں میں صبر اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ۝ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ ۝ ﴾

(۱۶/ نحل:۱۲۶۔۱۲۷)

''اور اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تم کو تکلیف دی گئی اور البتہ اگر صبر (برداشت) کرو تو صبر کرنے والوں کے لیے یہ بہتر ہے اور تو صبر کر اور تیرا صبر کرنا نہیں، لیکن خدا کی مدد سے اور ان کا غم نہ کر اور نہ ان کی سازشوں سے دل تنگ ہو۔''

یہ صبر کی وہ قسم ہے جو اخلاقی حیثیت سے بہت بڑی بہادری ہے، مسلمانوں کو اس بہادری کی تعلیم بار بار دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ صبر و برداشت کمزوری سے یا دشمن کے خوف سے، یا کسی اور سبب سے نہ ہو، بلکہ صرف خدا کے لیے ہو:

﴿ وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً وَّیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ (١٣/ الرعد:٢٢)

''اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی ذات کے لیے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور جو ہم نے ان کو روزی دی اس میں سے چھپے اور علانیہ (راہ خدا میں) خرچ کیا اور برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں، ان کے لیے آخرت کا انجام ہے۔''

فرشتے ان کو مبارکباد دیں گے اور کہیں گے:

﴿ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ (١٣/ الرعد:٢٤)

''تم پر سلامتی ہو کیونکہ تم نے صبر کیا تھا، تو آخرت کا انجام کیا اچھا ہوا۔''

ایک خاص بات اس آیت میں خیال کرنے کے لائق ہے، کہ اس کے شروع میں چند نیکیوں کا ذکر ہے، صبر، نماز، خیرات، برائی کی جگہ بھلائی، مگر فرشتوں نے اس مومن کے جس خاص وصف پر اس کو سلامتی کی دعا دی، وہ صرف صبر یعنی برداشت کی صفت ہے، کیونکہ یہی اصل ہے، جس میں یہ جوہر ہوگا، وہ عبادات کی تکلیف بھی اٹھائے گا، مصیبتوں کو بھی جھیلے گا اور دشمنوں کی بدی کا جواب بھی نیکی سے دے گا، چنانچہ ایک اور آیت میں اس کی تشریح بھی کر دی گئی ہے، کہ درگزر اور بدی کے بدلہ نیکی کی صفت اس میں ہوگی، جس میں صبر ہوگا:

﴿ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝ وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ۝ ﴾

(٤١/ فصلت:٣٤ـ٣٥)

''بھلائی اور برائی برابر نہیں، برائی کا جواب اچھائی سے دو، تو یکبارگی جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے، وہ قریبی دوست سا ہو جائے گا اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ اسی کو ملتی ہے جو بڑی قسمت والا ہے۔''

جو لوگوں پر ظلم کرتے پھرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد برپا کرتے رہتے ہیں، ان پر خدا کا عذاب ہو

گا، اس لیے ایک صاحب عزم مسلمان کا فرض یہ ہے کہ دوسرے اس پر ظلم کریں تو بہادری سے اس کو برداشت کرے اور معاف کردے، فرمایا:

﴿ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ۝ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ: ۴۲۔۴۳)

''راستہ انہیں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد کرتے ہیں، یہی ہیں جن کے لیے پردرد عذاب ہے اور البتہ جس نے برداشت کیا اور بخش دیا، بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔''

ثابت قدمی

صبر کا پانچواں اہم مفہوم لڑائی پیش آ جانے کی صورت میں میدانِ جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی ہے، قرآن پاک نے اس لفظ کو اس مفہوم میں بارہا استعمال کیا ہے اور ایسے لوگوں کو جو اس وصف سے متصف ہوئے، صادق القول اور راستباز ٹھہرایا ہے، کہ انہوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا پورا کیا، فرمایا:

﴿ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۷۷)

''اور صبر کرنے والے، ثابت قدمی دکھانے والے مصیبت میں اور نقصان میں اور لڑائی کے وقت، وہی ہیں جو سچ بولے اور وہی پرہیز گار ہیں۔''

اگر لڑائی آ پڑے تو اس میں کامیابی کی چار شرطیں ہیں، خدا کی یاد، امام وقت کی اطاعت، آپس میں اتحاد و موافقت اور میدان جنگ میں بہادرانہ صبر و استقامت:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ ۖ وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ ﴾

(۸/ الانفال: ۴۵۔۴۶)

''اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو، تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو، تا کہ فلاح پاؤ اور خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تم سست ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر دکھاؤ، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

حق کے مددگاروں کی ظاہری قلت تعداد کی تلافی اسی صبر و ثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے، تاریخ کی نظر سے یہ مشاہدے اکثر گزرے ہیں کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادروں نے فوج کی فوج کو

شکست دے دی ہے، اسلام نے یہ نکتہ اسی وقت اپنے جان نثاروں کو سکھا دیا تھا، جب ان کی تعداد تھوڑی اور دشمنوں کی بڑی تھی:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۭ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ ﴾

(٨/ الانفال: ٦٥-٦٦)

''اے پیغمبر! ایمان والوں کو (دشمنوں کی) لڑائی پر ابھار اگر یہ بیس صبر کرنے والے (ثابت قدم) ہوں تو دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر سو ہوں تو کافروں میں سے ہزار پر غالب ہوں گے، کیونکہ وہ لوگ سمجھتے نہیں، اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی اور اس کو معلوم ہے کہ تم میں کمزوری ہے، تو اگر سو صبر کرنے والے (ثابت قدم) ہوں تو دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر ہزار (صبر والے) ہوں تو دو ہزار پر خدا کے حکم سے غالب ہوں گے اور اللہ صبر کرنے والوں (ثابت قدموں) کے ساتھ ہے۔''

میدان کارزار میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تعدادی قلت کی پروانہ کریں اور صبر و ثبات کے ساتھ اپنے سے دو چند کا مقابلہ کریں اور تسلی دی گئی کہ اللہ کی مدد انہیں لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے، جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں، حضرت طالوت اور جالوت کے قصہ میں بھی اسی نکتہ کو ان لفظوں میں ادا کیا گیا ہے:

﴿ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾

(٢/ البقرة: ٢٤٩-٢٥٠)

''طالوت کے ساتھیوں نے کہا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں، انہوں نے جن کو خیال تھا کہ خدا سے ملنا ہے، یہ کہا کہ بسا اوقات تھوڑی تعداد کے لوگ خدا کے حکم سے بڑی تعداد کے لوگوں پر غالب آتے ہیں اور خدا صبر و ثبات دکھانے والوں کے ساتھ ہے اور جب یہ جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ میں آئے، تو بولے اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر بہا اور ہم کو ثابت قدمی بخش اور ان کافروں کے مقابلہ میں ہم کو نصرت عطا کر۔''

اللہ نے کمزور اور قلیل التعداد مسلمانوں کی کامیابی کی بھی یہی شرط رکھی ہے اور بتا دیا کہ خدا انہیں کا ہے،

جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں اور خدا کے بھروسہ پر مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں:

﴿ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَ صَبَرُوْۤا ﴾ (١٦/ النحل:١١٠)

''پھر تیرا پروردگار ان کے لیے ہے، جنہوں نے ایذا پانے کے بعد گھر بار چھوڑا، پھر لڑتے رہے اور صبر و ثبات کے ساتھ ٹھہرے رہے۔''

دنیا کی سلطنت و حکومت ملنے کے لیے بھی اسی صبر و استقامت کے جوہر پیدا کرنے کی ضرورت ہے، بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکلنے کے بعد اطراف ملک کے کفار سے جب مقابلہ آ پڑا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو پہلا سبق یہ سکھایا:

﴿ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۫ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ۝ ﴾ (٧/ الاعراف:١٢٨)

''موسیٰ نے اپنے لوگوں سے کہا کہ خدا سے مدد چاہو اور صبر و استقامت سے کام لو، بے شک زمین خدا کی ہے، وہ جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اس کا مالک بناتا ہے اور انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔''

چنانچہ بنی اسرائیل مصر و شام و کنعان کی آس پاس بسنے والی بت پرست قوموں سے تعداد میں بہت کم تھے، لیکن جب انہوں نے ہمت دکھائی اور بہادرانہ استقامت اور صبر اور ثابت قدمی سے مقابلے کیے تو ان کی ساری مشکلیں حل ہوگئیں اور کثیر التعداد دشمنوں کے نرغہ میں پھنسے رہنے کے باوجود ایک مدت تک خود مختار سلطنت پر قابض اور دوسری قوموں پر حکومت کرتے رہے، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اس کامیابی کا راز اسی ایک لفظ صبر میں ظاہر کیا ہے، فرمایا:

﴿ وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ۝ ﴾ (٧/ الاعراف:١٣٧)

''اور ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس زمین کی وراثت بخشی جس میں ہم نے برکت نازل کی ہے اور تیرے پروردگار کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر و ثبات کے سبب سے پوری ہوئی اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے کاموں کو اور تعمیروں کو برباد کر دیا۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ بنی اسرائیل جیسی کمزور قوم فرعون جیسی طاقت کے سامنے اس لیے سر بلند ہوئی کہ اس نے صبر و ثابت قدمی سے کام لیا اور اسی کے نتیجہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کو شام کی بابرکت زمین کی حکومت عطا فرمائی، چنانچہ اسی کی تصریح اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے موقع پر فرمائی:

﴿ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ۟ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ۝ ﴾

(۳۲/ السجدة: ۲٤)

’’اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے ایسے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے، جب انہوں نے صبر کیا اور ہمارے حکموں پر یقین رکھتے تھے۔‘‘

آیت بالا نے بنی اسرائیل کی گزشتہ پیشوائی کے دو سبب بیان کیے ہیں، ایک احکام الٰہی پر یقین اور دوسرے ان احکام کی بجا آوری میں صبر اور ثباتِ قدم، یہی دو باتیں دنیا کی ہر قوم کی ترقی کا سنگ بنیاد ہیں، پہلے اپنے اصول کے صحیح ہونے کا بشدت یقین اور پھر ان اصولوں کی تعمیل میں ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو خوشی خوشی جھیل لینا۔

غزوۂ احد میں مسلمانوں کو فتح نہیں ہوتی، بلکہ ستر مسلمان خاک وخون میں لتھڑ کر راہِ خدا میں جانیں دیتے ہیں، بعض مسلمانوں میں اس سے افسردگی پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے اس حزن وملال کے ازالہ کے لیے پچھلے پیغمبروں کی زندگی کی روداد ان کو سناتا ہے:

﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْۤ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۝ ﴾

(۳/ آل عمران: ۱٤٦۔۱٤٧)

’’اور کتنے پیغمبر ہیں، جن کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا کے طالب لڑے ہیں، پھر خدا کی راہ میں تکلیف اٹھا کر انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور نہ ان کے دل بودے ہوئے اور اللہ ثابت رہنے والوں (صابرین) کو دوست رکھتا ہے اور وہ یہی کہتے رہے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو اور کام میں ہماری زیادتی کو معاف کر اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔‘‘

اس آیت پاک نے غلط فہمیوں کے اُن توبرتو پردوں کو چاک کر دیا ہے جو صبر کی اصل حقیقت کے چہرہ پر پڑے ہیں اور بتا دیا کہ صبر دل کی کمزوری، بے بسی کی خاموشی اور بے کسی کے مجبورانہ درگزر کا نہیں، بلکہ دل کی انتہائی قوت وہمت کی بلندی، عزم کی استواری اور مشکلات اور مصائب کو خدا کے بھروسہ پر خاطر میں نہ لانے کا نام ہے، ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثوں کے پیش آ جانے پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہو، ہمت نہ ہارے اور اپنے مقصد پر جما رہے اور خدا سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گزشتہ ناکامی کے قصور کو جو اس کی کمی (ذنب) یا زیادتی (اسراف) سے سرزد ہوا ہے، معاف فرمائے اور اس کو مزید ثبات قدم عطا کر کے حق کے

دشمنوں پر کامیابی بخشے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے حصول کے لیے مسلمانوں کو دو باتوں کی تاکید فرمائی، ایک تو خدا کی طرف دل لگانا اور دوسرے مشکلات پر صبر و استقامت سے قابو پانا۔

دنیا کی فتح یابی کے ساتھ آخرت کا عیش بھی جس کا نام جنت ہے، انہیں کے حصہ میں ہے، جن کو یہ پامردی، دل کی مضبوطی اور حق پر ثبات قدم کی دولت ملی، حق کی راہ میں مشکلات کے پیش آنے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ ان سے کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے اور دونوں الگ الگ معلوم ہونے لگتے ہیں، چنانچہ فرمایا:

﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۴۲)

''کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی اللہ نے (آزما کر) ان کو الگ نہیں کر دیا جو لڑنے والے ہیں اور جو ثابت قدم (صابر) ہیں۔''

ضبط نفس

اشخاص اور قوموں کی زندگی میں سب سے نازک موقع وہ آتا ہے، جب وہ کسی بڑی کامیابی یا ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں، اس وقت نفس پر قابو رکھنا اور ضبط سے کام لینا مشکل ہوتا ہے، مگر یہی نفس کا اصلی موقع ہوتا ہے اور اسی سے اشخاص اور قوموں میں سنجیدگی، متانت، وقار اور کیرکٹر کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔ دنیا میں غم و مسرت اور رنج و راحت تو اُم ہیں، ان دونوں موقعوں پر انسان کو ضبطِ نفس اور اپنے آپ پر قابو کی ضرورت ہے، یعنی نفس پر اتنا قابو ہو کہ مسرت اور خوشی کے نشہ میں اس میں فخر و غرور پیدا نہ ہو اور غم و تکلیف میں وہ اداس اور بددل نہ ہو، دل کے ان دونوں عیبوں کا علاج صبر و ثبات اور ضبطِ نفس ہے، انسانی فطرت کے رازدار کا کہنا ہے:

﴿ وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ۝ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ۝ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ۝ ﴾ (۱۱/ هود:۹۔۱۱)

''اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے کسی مہربانی کا مزہ چکھائیں، پھر اس سے اس کو اتار لیں تو وہ ناامید اور ناشکرا ہو جاتا ہے اور اگر کوئی مصیبت کے بعد اس کو نعمت کا مزہ چکھائیں، تو کہتا ہے کہ برائیاں مجھ سے دور ہو گئیں، بے شک وہ شاداں اور نازاں ہے، لیکن وہ جنھوں نے صبر (یعنی نفس پر قابو) رکھا اور اچھے کام کیے، یہ لوگ ہیں جن کے لیے معافی اور بڑا انعام ہے۔''

ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا

ہنگامی واقعات اور وقتی مشکلات پر صبر و پامردی سے ایک معنی بڑھ کر وہ صبر ہے جو کسی فرض کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی سے ادا کرنے میں ظاہر ہوتا ہے، اسی لیے مذہبی فرائض و احکام کو جو بہر حال نفس پر

سخت گزرتے ہیں، عمر بھر پوری مضبوطی سے ادا کرتے رہنا بھی صبر ہے، ہر حال اور ہر کام میں خدا کے حکم کی فرمانبرداری اور عبودیت پر ثبات، نفس انسانی کا سب سے بڑا امتحان ہے، اسی لیے حکم ہوا:

﴿ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ﴾ (۱۹/ مریم :۶۵)

''آسمانوں کا پروردگار اور زمین کا اور جو ان دونوں کے بیچ میں ہے سب کا، تو اس کی بندگی کر اور اس کی بندگی پر ٹھہرا رہ (صبر کر)۔''

ایک اور آیت میں نماز پڑھتے رہنے اور اپنے اہل و عیال پر بھی اس کی تاکید رکھنے کے سلسلہ میں ہے:

﴿ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۳۲)

''اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کر اور آپ اس پر قائم رہ۔''

یعنی تمام عمر یہ فریضہ پابندی کے ساتھ ادا ہوتا رہے۔

حسبِ ذیل آیتوں میں غالباً صبر اسی مفہوم میں ہے، وہ لوگ جو خدا کے سامنے حاضری کے دن سے ڈرا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو خوشخبری سناتا ہے:

﴿ فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۝ وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝ ﴾

(۷۶/ الدھر:۱۱۔۱۲)

''تو اللہ نے ان کو اس دن کی برائی سے بچا لیا اور ان کو تر و تازگی و شادمانی سے ملایا اور ان کے صبر کرنے (یعنی احکامِ الٰہی پر ٹھہرے رہنے) کے سبب سے باغ اور ریشمی لباس بدلہ میں دیا۔''

وہ لوگ جو خدا کی بارگاہ میں توبہ کریں، ایمان لائیں، نیک کام کریں، فریب کے کاموں میں شریک نہ ہوں، بے ہودہ اور لغو کاموں کے سامنے سے ان کو گزرنا پڑے تو بزرگی کے رکھ رکھاؤ سے گزر جائیں اور خدا کی باتوں کو سن کر اطاعت مندی سے اس کو قبول کریں اور اپنی اور اپنی اولاد کی بہتری اور پیشوائی کی دعائیں مانگیں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی یہ بشارت سناتا ہے:

﴿ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا ﴾ (۲۵/ الفرقان :۷۵)

''ان کو بہشت کا جھروکہ بدلہ میں ملے گا کہ وہ صبر کرتے رہے۔''

ان دونوں آیتوں میں صبر کا مفہوم یہی ہے کہ نیک کاموں کو بار خاطر، خلافِ طبع اور تکلیف و مشقت ہونے کے باوجود خوشی خوشی عمر بھر کرتے رہے اور بری باتوں سے باوجود اس کے کہ ان میں ظاہری خوشی اور آرام ہے، بچتے رہے، راتوں کو نرم بستروں سے اٹھ کر خدا کے آگے سربسجود ہونا، صبح کو خوابِ سحر کی لذت سے کنارہ کش ہو کر دوگانہ ادا کرنا، الوانِ نعمت کی لذتوں سے محروم ہو کر روزے رکھنا، تکلیف و مشقت ہونے کے باوجود خطرناک موقعوں پر بھی سچائی سے باز نہ آنا، قبول حق کی راہ میں شدائد کو آرام و راحت جان کر جھیل لینا،

سود کی دولت سے ہاتھ اٹھالینا، حسن و جمال کی بے قید لذت سے متمتع نہ ہونا، غرض شریعت کے احکام کی بجا آوری اور پھر اس پر عمر بھر، استواری اور پائیداری، صبر کی بہت ہی کڑی منزل ہے اور اسی لیے ایسے صابروں کی جزا بھی خدا کے ہاں بھاری ہے۔

ان آیاتِ پاک کی اس تشریح میں وہ حدیث یاد آتی ہے، جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((حُجِبَتْ (حُفّت) الجنّة بالمكارهِ وَحُجِبَتْ (حُفَّتِ) النَّارُ بالشّهواتِ)). [1]

''جنت ناخوشی کے کاموں اور دوزخ نفسانی لذتوں کے کاموں سے ڈھانپی گئی ہے۔''

یعنی نیکی کے ان کاموں کا کرنا جن کا معاوضہ جنت ہے، اس وقت دنیا میں نفس پر شاق گزرتا ہے اور گناہوں کے وہ کام جن کی سزا دوزخ ہے، اس وقت دنیا میں بڑے پُر لطف اور لذت بخش معلوم ہوتے ہیں اور اس عارضی و ہنگامی ناخوشی یا خوشی کی پروا کیے بغیر احکام الٰہی کرنا بڑے صبر اور برداشت کا کام ہے، کسی قارون کے خزانہ، مال و دولت کی فراوانی اور اسبابِ عیش کی بہتات کو دیکھ کر، اگر کسی کے منہ میں پانی نہ بھر آئے اور اس وقت بھی مالِ حرام کی کثرت کے لالچ کے بجائے، مالِ حلال کی قلت کو صبر کر کے خوشی کے ساتھ برداشت کرلے، تو یہ بڑی قوت کا کام ہے، جو صرف صابروں کو ملی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جو قارون تھا، اس کے مال و دولت کو دیکھ کر بہت سے ظاہر پرست لالچ میں پڑ گئے، لیکن جن میں صبر و برداشت کا جوہر تھا، ان کی چشم بینا اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی اور ان کو نظر آتا تھا کہ یہ فانی اور آنی جانی چیز کے دن کی ہے، خدا کی وہ دولت جو نیکوکاروں کو بہشت میں ملے گی، وہ لازوال، غیر فانی اور جاودانی ہے:

﴿ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝ ﴾ (۲۸/ القصص:۷۹۔۸۰)

''جو لوگ حیات دنیاوی کی آرائش کے خواہاں تھے، وہ بولے اے کاش! ہمارے پاس بھی وہ ہوتا جو قارون کو دیا گیا، وہ بڑا خوش قسمت ہے اور جنہیں علم ملا تھا، انہوں نے کہا، تمہارا بُرا ہے، اللہ کی جزا ان کے لیے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے سب سے اچھی چیز ہے اور اس حقیقت کو وہی پاسکتے ہیں جو صابر ہیں۔''

یہ اجر اور جزا بہتر سے بہتر ہوگی، کیونکہ یہ اس خزانے سے ملے گی جو لازوال اور باقی ہے:

﴿ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۭ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا

[1] صحيح بخاري، كتاب الرقاق، باب حجبت النار بالشهوات: ٦٤٨٧؛ مسند أحمد، ج ٢، ص: ٣٣٣۔

﴿يَعْمَلُوْنَ﴾ (۱۶/ النحل:۹۶)

''جو تمہارے پاس ہے، وہ ختم ہو جائے گا اور جو خدا کے پاس ہے وہ رہ جانے والا ہے اور یقیناً ہم ان کو جنہوں نے صبر کیا ان کی مزدوری ان کے بہتر کاموں پر دیں گے۔''

ایک اور جگہ فرمایا کہ نمازیں ادا کیا کرو، کہ نیکیاں بدیوں کو دھو دیتی ہیں، اس پیغام میں نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے، اس کے بعد ہے:

﴿وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (۱۱/ ہود:۱۱۵)

''اور صبر کر، کہ بے شبہ اللہ نیک کام کرنے والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔''

صبر کے فضائل اور انعامات

یہ مزدوری کیا ہوگی؟ یہ حد اور شمار سے باہر ہوگی:

﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (۳۹/ الزمر:۱۰)

''صبر کرنے والوں کو تو ان کی مزدوری بے حساب ملے گی۔''

جن محاسن اور محامدِ صفات اور اعلیٰ اخلاق کا درجہ اس دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ ہے، ان میں صبر و برداشت کا بھی شمار ہے:

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّأَجْرًا عَظِيْمًا﴾ (۳۳/ الاحزاب:۳۵)

''بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے والی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور محنت سہنے والے مرد (صابرین) اور محنت سہنے والی عورتیں (صابرات) اور (خدا کے سامنے) جھکنے والے مرد اور جھکنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور خدا کو بہت یاد کرنے والے مرد اور بہت یاد کرنے والی عورتیں، اللہ نے ان کے لیے تیار رکھی ہے معافی اور بڑی مزدوری۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صبر کا مرتبہ بڑی بڑی نیکیوں کے برابر ہے، اس سے انسان کی پچھلی غلطیاں حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہیں اور دین و دنیا کی بڑی سے بڑی مزدوری اس کے معاوضہ میں ملتی ہے، یہی

بشارت ایک اور آیت میں بھی ہے:

﴿ اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۞ اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ۞ ﴾ (۳/ ال عمران :۱٦-۱۷)

''(جنت اور خدا کی خوشنودی اُن کو حاصل ہوگی) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لا چکے، ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا اور صبر کرنے والے (یعنی مشکلات کی محنت کو اٹھا لینے والے) اور سچ بولنے والے اور بندگی میں لگے رہنے والے اور (خدا کی راہ میں) خرچ کرنے والے اور پچھلی راتوں کو خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے والے۔''

اس آیت میں ایک عجیب نکتہ ہے، اس خوش قسمت جماعت کے اوصاف کا آغاز بھی دعا سے اور خاتمہ بھی دعا پر ہے اور ان دونوں کے بیچ میں ان کے چار اوصاف گنائے ہیں، جس میں پہلا درجہ صبر، یعنی محنت سہارنے، تکلیف جھیلنے اور پامردی دکھانے کا ہے، دوسرا راستی اور راست بازی کا، تیسرا خدا کی بندگی و عبودیت کا اور چوتھا راہ خدا میں خرچ کرنے کا۔

فتحِ مشکلات کی کنجی صبر اور دعا

بعض آیتوں میں ان تمام اوصاف کو صرف دو لفظوں میں سمیٹ لیا گیا ہے، دعا اور صبر اور فرمایا گیا ہے کہ یہی دو چیزیں مشکلات کے طلسم کی کنجی ہیں، یہود جو آنحضرت ﷺ کے پیغام کو قبول نہیں کرتے تھے، اس کے دو سبب تھے، ایک یہ کہ ان کے دلوں میں گداز اور تاثر نہیں رہا تھا اور دوسرے یہ کہ پیغامِ حق قبول کرنے کے ساتھ ان کو جو جانی و مالی دشواریاں پیش آئیں، یہ عیش و عشرت اور ناز و نعمت کے خوگر ہو کر، ان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ کی طب روحانی نے ان کی بیماری کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا:

﴿ وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ﴾ (۲/ البقرۃ:٤٥)

''اور صبر (محنت اٹھانے) اور دعا مانگنے سے قوت پکڑو۔''

دعا سے ان کے دل میں اثر اور طبیعت میں گداز پیدا ہوگا اور صبر کی عادت سے قبولِ حق کی راہ کی مشکلیں دور ہوں گی، ہجرت کے بعد جب قریش نے مسلمانوں کے برخلاف تلواریں اٹھائیں اور مسلمانوں کے ایمان کے لیے اخلاص کی ترازو میں تلنے کا وقت آیا تو یہ آیتیں نازل ہوئیں:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۞ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۞ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۞ الَّذِیْنَ اِذَآ

اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِيۡبَةٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ ؕ اُولٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۵۳ـ۱۵۷)

''اے ایمان والو! صبر (ثابت قدمی) اور دعا سے قوت پکڑو، بے شک اللہ صبر والوں (ثابت قدم رہنے والوں) کے ساتھ ہے اور جو خدا کی راہ میں مارے جاتے ہیں، ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ زندہ ہیں، لیکن تم کو خبر نہیں اور ہم تم کو کسی قدر خطرہ اور بھوک اور مال و جان اور پیداوار کے کچھ نقصان سے آزمائیں گے اور صبر والوں (یعنی ثابت قدم رہنے والوں) کو خوش خبری سنا دو، جن کو جب کوئی مصیبت پیش آئے تو کہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور ہم کو اللہ ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے، یہ لوگ ہیں، ان پر ان کے پروردگار کی شاباشیں اور مہربانیاں ہیں اور یہی ہیں ٹھیک راہ پر۔''

ان آیات نے بتایا کہ مسلمانوں کو کیونکر زندہ رہنا چاہیے، جان و مال کی جو مصیبت پیش آئے اس کو صبر، ضبط نفس اور ثابت قدمی سے برداشت کریں اور یہ سمجھیں کہ ہم خدا کے محکوم ہیں، آخر بازگشت اسی کی طرف ہو گی، اس لیے حق کی راہ میں مرنے اور مال و دولت کو لٹانے سے ہم کو دریغ نہ ہونا چاہیے، اگر اس راہ میں موت بھی آ جائے تو وہ حیاتِ جاوید کی بشارت ہی ہے۔

شکر

﴿ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ۝ ﴾ (۷/ الاعراف: ۱٤٤)

لغت میں شکر کے اصلی معنی یہ ہیں کہ "جانور میں تھوڑے سے چارہ ملنے پر بھی تروتازگی پوری ہو اور ودھ زیادہ دے"۔ اس سے انسانوں کے محاورہ میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کر دے تو وسرا اس کی پوری قدر کرے، یہ قدر شناسی تین طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ دل سے، زبان سے اور ہاتھ پاؤں سے یعنی دل میں اس کی قدر شناسی کا جذبہ ہو۔ زبان سے اس کے کاموں کا اقرار ہو اور ہاتھ پاؤں سے اس کے ان کاموں کے جواب میں ایسے افعال صادر ہوں جو کام کرنے والے کی بڑائی کو ظاہر کریں۔

شکر کی نسبت جس طرح بندوں کی طرف کی جاتی ہے۔ خدا نے قرآن پاک میں اپنی طرف بھی کی ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ذرا ذرا سے نیک کاموں کی پوری قدر کرتا ہے اور ان کو ان کا پورا بدلہ عطا فرماتا ہے۔

شکر کا الٹ کفر ہے۔ اس کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں اور محاورہ میں کسی کے کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل سے اس کے اقرار اور عمل سے اس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں، اسی سے ہماری زبان میں "کفرانِ نعمت" کا لفظ استعمال میں ہے۔

یہی کفر وہ لفظ ہے جس سے زیادہ کوئی برا لفظ اسلام کی لغت میں نہیں، اللہ پاک کے احسانوں اور نعمتوں کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا، زبان سے ان کا اقرار اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا کفر ہے، جس کے مرتکب کا نام کافر ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح کفر اسلام کی نگاہ میں بدترین خصلت ہے، اس کے بالمقابل شکر سب سے بہتر اور اعلیٰ صفت ہے، قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ اسی طرح ایک دوسرے کے بالمقابل بولے گئے ہیں:

﴿ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا۝ ﴾ (۷٦/ الدهر: ۳)

"ہم نے انسان کو راستہ بتا دیا (اب وہ) یا شکر گزار (شاکر) ہوا یا ناشکرا (کافر) ہو گیا۔"

﴿ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ۝ ﴾ (۱٤/ ابراهيم: ۷)

"اگر تم نے شکر کیا تو ہم تمہیں بڑھائیں گے اور اگر ناشکری (کفر) کی تو بے شک میرا عذاب بہت سخت ہے۔"

اس تقابل سے معلوم ہوا کہ اگر کفر اللہ تعالیٰ کے احسانوں اور نعمتوں کی ناقدری کر کے اس کی نافرمانی کا نام ہے تو اس کے مقابلہ میں شکر کی حقیقت یہ ہو گی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے

احکام کی اطاعت اور دل سے فرمانبرداری کی جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت اللہ پاک کی شہادت ہے:

﴿ إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ ۚ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ ﴾ (١٦/ النحل: ١٢٠-١٢١)

''دراصل ابراہیم دین کی راہ ڈالنے والا اور اللہ کا فرمانبردار اس کو ایک ماننے والا تھا اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ اللہ کے احسانوں اور نعمتوں کا شکر گزار اللہ نے اس کو چن لیا اور اس کو سیدھی راہ دکھائی۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانوں کی شکر گزاری یہ ہے کہ دین کی راہ اختیار کی جائے، احکام الٰہی کی پیروی کی جائے اور شرک سے پرہیز کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا ہم کو قبول فرمائے گا اور ہر علم و عمل میں ہم کو سیدھی راہ دکھائے گا۔

اس تفصیل سے پتہ چلا کہ شکر ایمان کی جڑ، دین کی اصل اور اطاعتِ الٰہی کی بنیاد ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت اور محبت پیدا ہونی چاہیے اور اسی قدر و عظمت اور محبت کے قولی و عملی اظہار کا نام شکر ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَّا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنتُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء: ١٤٧)

''اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ تو خدا تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اور اللہ تو قدر پہچاننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف دو باتیں چاہتا ہے۔ شکر اور ایمان، ایمان کی حقیقت تو معلوم ہے۔ اب رہا شکر تو شریعت میں جو کچھ ہے، وہ شکر کے دائرہ میں داخل ہے۔ ساری عبادتیں شکر ہیں۔ بندوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہی ہے۔ دولت مند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہے تو یہ دولت کا شکر ہے۔ صاحب علم اپنے علم سے بندگان الٰہی کو فائدہ پہنچاتا ہے تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے۔ طاقتور کمزوروں کی امداد اور اعانت کرتا ہے تو یہ بھی قوت و طاقت کی نعمت کا شکرانہ ہے۔ الغرض شریعت کی اکثر باتیں اسی ایک شکر کی تفصیلیں ہیں، اسی لیے شیطان نے جب خدا سے یہ کہنا چاہا کہ تیرے اکثر بندے تیرے حکموں کے نافرمان ہوں گے تو یہ کہا:

﴿ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ۝ ﴾ (٧/ الاعراف: ١٧)

''تو ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والا نہ پائے گا۔''

خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو جزا دیتے ہوئے اسی لفظ سے یاد فرمایا:

﴿ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران :۱۴۵)

''اور ہم شکر کرنے والے کو جزا دیں گے۔''

پوری شریعت کا حکم اللہ تعالیٰ ان لفظوں میں دیتا ہے:

﴿ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ۝ ﴾ (۳۹/ الزمر:۶۶)

''بلکہ اللہ کی بندگی کر اور شکر گزاروں میں سے ہو۔''

شکر: اس جذبہ کو ہم کبھی زبان سے ادا کرتے ہیں، کبھی اپنے ہاتھ پاؤں سے پورا کرتے ہیں، کبھی اس کا بدلہ دے کر اس قرض کو اتارتے ہیں، زبان سے اس فرض کے ادا کرنے کا نام اللہ تعالیٰ کے تعلق سے قرآن کی اصطلاح میں حمد ہے۔ جس کے مطالبہ سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے اور یہی سبب ہے کہ حمد الٰہی میں اللہ تعالیٰ کے ان صفات کاملہ کا ذکر ہوتا ہے جو ان احسانوں اور نعمتوں کی پہلی اور اصلی محرک ہیں اور اسی لیے یہ کہنا چاہیے کہ جس طرح سارے قرآن کا نچوڑ سورۂ فاتحہ ہے، سورۂ فاتحہ کا نچوڑ خدا کی حمد ہے، اسی بنا پر قرآن پاک کا آغاز سورۂ فاتحہ سے اور سورۂ فاتحہ کا آغاز الحمدُ سے ہے:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ ﴾ (۱/ الفاتحة: ۱)

''سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے۔''

جہان اور جہان میں جو کچھ رنگ برنگ کی مخلوقات اور عجائبات ہیں، سب کی پرورش اور زندگی اور بقا اسی ایک کا کام ہے، اسی کے سہارے وہ جی رہے ہیں اور نکھر رہے ہیں، اس لیے حمد اسی ایک کی ہے، یہ تو دنیا کے نیرنگ قدرت کا آغاز ہے، لیکن دنیا جب اپنی تمام منازل حیات کو طے کر کے فنا ہو چکے گی اور یہ موجودہ زمین اور آسمان اپنا فرض ادا کر کے نئی زمین اور نئے آسمان کی صورت میں ظاہر ہو چکیں گے، پہلی دنیا کے عمل کے مطابق ہر شخص اس دوسری دنیا میں اپنی زندگی پا چکے گا۔ یعنی نیک اپنی نیکی کی جزا اور بد اپنی بدی کی سزا پا چکیں گے اور اہل جنت، جنت میں اور اہل دوزخ دوزخ میں جا چکیں گے، وہ، وہ وقت ہوگا جب دنیا اپنے اس نظام یا دورہ کو پورا کر چکی ہوگی، جس کے لیے خدا نے اس کو بنایا تھا۔ اس وقت عالمِ امکان کے ہر گوشہ سے یہ سریلی آواز بلند ہوگی:

﴿ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ ﴾ (۳۹/ الزمر :۷۵)

''سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے۔''

حمد کا ترانہ موجودہ دنیا کے ایک ایک ذرہ سے آج بھی بلند ہے:

﴿ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (۳۰/ الروم :۱۸)

''اسی کی حمد آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔''

فرشتے بھی اسی حمد میں مشغول ہیں:

﴿ اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ﴾ (٤٠/ المؤمن:٧)

''جو عرش کو اٹھائے ہیں اور جو اس کے چاروں طرف ہیں، وہ اپنے پروردگار کے حمد کی تسبیح کرتے ہیں۔''

بلکہ عرصہ وجود کی ہر چیز اسی کی حمد و تسبیح میں لگی ہوئی ہے:

﴿ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ﴾ (١٧/ بنی اسرآء یل :٤٤)

''اور کوئی چیز نہیں جو اس (خدا) کی حمد کی تسبیح نہ کرتی ہو۔''

یہی شکرانہ کی حمد و تسبیح ہے، جس کا مطالبہ انسانوں سے ہے:

﴿ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ ﴾ (٤٠/ المؤمن:٥٥، ٥٢/ الطور:٤٨)

''اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر۔''

آنحضرت ﷺ کے سنن اور شمائل میں ہر وقت اور ہر موقع کی اس کثرت سے جو دعائیں ہیں۔ مثلاً: کھانا کھانے کی، نئے کپڑے پہننے کی، سونے کی، سو کر جاگنے کی، نئے پھل کھانے کی، مسجد میں جانے کی، طہارت خانہ سے نکلنے کی، وغیرہ وغیرہ، ان سب کا منشا اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی حمد اور زبان سے اس کا شکریہ ادا کرنا ہے، لیکن زبان کا یہ شکریہ دل کا ترجمان اور قلبی کیفیت کا بیان ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو جسمانی نعمتیں عنایت فرمائی ہیں، ان کا شکریہ، یہ ہے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں کو خدا کے حکموں کی تعمیل میں لگا رکھیں اور ان سے ان کی خدمت کریں جو اس جسمانی نعمت کے کسی جزو سے محروم ہیں مثلاً: جو اپاہج اور معذور ہوں، بیمار ہوں، کسی جسمانی قوت سے محروم ہوں یا کسی عضو سے بیکار ہوں، مالی نعمتوں کا شکریہ، یہ ہے کہ جو اس نعمت سے بے نصیب ہوں ان کو اس سے حصہ دیا جائے۔ بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے۔ پیاسوں کو پانی پلایا جائے۔ ننگوں کو کپڑا پہنایا جائے، بے سرمایوں کو سرمایہ دیا جائے۔

قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں مختلف نعمتوں کے ذکر کے بعد شکر الٰہی کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس لیے ہر آیت میں اس شکر کے ادا کرنے کی نوعیت اسی نعمت کے مناسب ہوگی، مثلاً: ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ۝ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۝ ﴾ (٢٥/ الفرقان :٦١۔٦٢)

''بڑی برکت اس کی ہے، جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور اجالا کرنے والا چاند رکھا اور اسی نے رات اور دن بنایا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے، اس کے واسطے جو دھیان رکھنا یا شکر کرنا چاہے۔''

اس میں اپنی قدرت کی نعمتوں کا ذکر کر کے شکر کی ہدایت ہے۔ یہ شکر اسی طرح ادا ہوسکتا ہے کہ اس قدرت والے کی قدرت تسلیم کریں اور دن کی روشنی اور چاند کے اجالے اور رات کے سکون میں ہم وہ فرض ادا کریں جس کے لیے یہ چیزیں ہم کو بنا کر دی گئی ہیں، دوسری آیتوں میں ہے:

﴿ الرَّحِيمُ ۝ الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ ۝ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝ ﴾ (۳۲/ السجدۃ:۶۔۸)

''بڑے رحم والا جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی اور انسان کی پیدائش ایک گارے سے شروع کی، پھر اس کی اولاد کو بے قدر نچڑے ہوئے پانی سے بنایا، پھر اس کو درست کیا اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونکا اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تم کم شکر کرتے ہو۔''

﴿ وَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ ﴾ (۱۶/ النحل:۷۸)

''اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے باہر نکالا، تم کچھ جانتے نہ تھے اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔''

ان آیتوں میں خلقت جسمانی کی نعمت کا بیان اور اس پر شکر کرنے کی دعوت ہے۔ یعنی دل سے خدا کے ان احسانات کو مان کر اس کی ربوبیت و کبریائی اور یکتائی کو تسلیم کریں اور یہ سمجھیں کہ جس نے یہ زندگی دی اور اس زندگی میں ہم کو یوں بنا دیا۔ وہ ہمارے مرنے کے بعد دوسری زندگی بھی ہم کو دے سکتا ہے اور اس میں بھی ہم کو یہ کچھ عنایت کر سکتا ہے اور پھر ہاتھ پاؤں سے اور آنکھ کان سے اس کے ان احسانات کا جسمانی حق ادا کریں، بعض اور آیتوں میں ہے:

﴿ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ ﴾

(۲۲/ الحج:۳۶)

''تو ان جانوروں کے گوشت میں سے کچھ آپ کھاؤ اور کچھ ان کو کھلاؤ جو صبر سے بیٹھا ہے یا محتاجی سے بے قرار ہے، اسی طرح ہم نے وہ جانور تمہارے قابو میں دیے ہیں، تاکہ تم شکر کرو۔''

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۲)

''اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو روزی دی پاک چیزوں میں کھاؤ اور خدا کا شکر کرو۔''

﴿ فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۝ ﴾

(۱۶/ النحل:۱۱۴)

”تو خدا نے تم کو جو حلال اور پاک چیزیں روزی کیں، ان کو کھاؤ اور اس کی نعمت کا شکر کرو اگر تم اسی کو پوجتے ہو۔“

یہ مالی نعمت کا بیان تھا، اس کا شکریہ بھی خدا کو مان کر مال کے ذریعہ ادا کریں۔

دنیا میں شکریہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی محسن نے جس قسم کا احسان ہمارے ساتھ کیا ہو، اسی قسم کا احسان ہم اس کے ساتھ کریں۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کے ساتھ اس قسم کا کوئی شکریہ ادا نہیں کیا جاسکتا اس تیسری قسم کے شکریہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جو احسان فرمایا ہو۔ اسی قسم کا احسان ہم اس کے بندوں کے ساتھ کریں۔ اسی نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ علیہ السلام کے ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے:

﴿ وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ﴾ (۲۸/ القصص: ۷۷)

”اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی تو بھی بھلائی کر۔“

اسی کا نام خدا کو قرضہ دینا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا نعوذ باللہ محتاج نہیں کہ اس کو کوئی قرضہ دے۔ خدا کو قرض دینا یہی ہے کہ اس کے ضرورت مند بندوں کو یا قابلِ ضرورت کاموں میں روپیہ دیا جائے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا ﴾ (۵۷/ الحديد: ۱۱)

”کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دیتا ہے۔“

﴿ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۭ ﴾ (۷۳/ المزمل: ۲۰)

”اور خدا کو قرض حسنہ دو۔“

﴿ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ (٦٤/ التغابن: ۱۷)

”اگر خدا کو قرض حسنہ دو گے۔“

خدا کو قرض حسنہ دینے کی جو تفسیر اوپر کی گئی، اس کی روشنی میں اس حدیث کو پڑھنا چاہیے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”قیامت کے دن خدا فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ کہے گا: اے میرے پروردگار! تو، تو جہان کا پروردگار ہے میں تیری بیمار پرسی کیسے کرتا، فرمائے گا کہ تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی پرسش نہ کی اور اگر کرتا تو، تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ پھر خدا فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار! تو، تو سارے جہان کا رب ہے میں تجھے کیسے کھلاتا، فرمائے گا تجھے معلوم نہ ہوا کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے اس کو نہیں کھلایا اگر تو اس کو کھلاتا تو اس کا بدلہ آج میرے پاس پاتا، اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو، تو نے مجھے پانی نہیں پلایا، بندہ کہے گا: اے میرے پروردگار! تو، تو سارے عالم کا پروردگار ہے، میں تجھے کیسے پانی پلاتا،

فرمائے گا: میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا تو نے اس کو نہیں پلایا، اگر تو اس کو پلاتا تو آج تو اس کو میرے پاس پاتا۔'' [1] اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا جانی اور مالی شکریہ ہم کو کس طرح ادا کرنا؟ اور اس کا قرض ہم کو کیوں کر اتارنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا بار بار تقاضا اس لیے بھی کیا ہے کہ ہم یہ نہ سمجھنے لگیں کہ خدا کے فضل و کرم کے سوا ہم ان نعمتوں کا کوئی استحقاق خود بھی رکھتے تھے۔ حالانکہ ان کے لیے نہ کوئی ہمارا خاندانی استحقاق تھا نہ کوئی ہمارا ذاتی علمی یا عملی۔ جو کچھ ملا اس کے فضل و کرم سے ملا اور جو کچھ ملے گا، وہ اسی کی عطا اور بخشش ہوگی۔ انسان اپنی روز مرہ کی متواتر بخششوں کو جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں، دیکھ کر اور ان کے دیکھنے کا عادی ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ کی یہ کوئی بخشش نہیں۔ بلکہ فطرت کی عام بخشش ہے، جس کے شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر خوب سمجھنا چاہیے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے کفر اور الحاد کی کونپلیں نکلتی ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی ایک ایک عنایت اور بخشش کو گنوایا ہے اور اس پر شکر ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے، تاکہ ربوبیت الٰہی کا یقین اس کے ایمان کے بیج کو سیراب کرے اور بار آور بنائے۔ دولت و نعمت پانے کے بعد انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ عام انسانوں سے کوئی بلند تر ہے اور جو اس کو ملا ہے، وہ اس کا خاندانی حق تھا یا اس کے یہ ذاتی علم و ہنر کا نتیجہ تھا۔ جیسا کہ قارون نے کہا تھا، یہی غرور ہے، جو ترقی کر کے بخل اور ظلم کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت فرمائی اور ارشاد ہوا:

﴿ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ ؀ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ؀ ﴾ (۵۷/ الحدید: ۲۳۔۲۴)

''(اور تاکہ) جو خدا نے تم کو دیا اس پر اتراؤ نہیں اور اللہ کسی اترانے والے، بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا جو خود کنجوس ہیں اور لوگوں کو بھی کنجوس بننے کو کہتے ہیں اور جو (اللہ کی بات سے) منہ موڑے گا (تو اللہ کو کیا پروا) وہ تو دولت سے بھرپور اور حمد (یعنی حسن و خوبی) سے مالا مال ہے۔''

وہ اپنی ذات سے نہ تو انسانوں کی دولت کا بھوکا ہے کہ وہ تو غنی ہے اور نہ ان کے شکرانہ کی حمد کا ترسا ہے کہ وہ تو حمید یعنی حمد سے بھرا ہوا ہے۔ خدا نے انسانوں پر جو تو برتو نعمتیں اتاری ہیں اور اپنی لگاتار بخششوں سے ان کو جو نوازا ہے، اس سے یہی مقصود ہے کہ وہ اپنے اس محسن کی قدر پہچانے، اس کے مرتبہ کو جانے، اس کے حق کو مانے اور اس کی نعمت و بخشش کا مناسب شکر اپنے جان و مال و دل سے ادا کرے:

﴿ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ؀ ﴾ (۸/ الانفال: ۲۶)

''اور اس نے تم کو پاک چیزیں روزی دیں، تاکہ تم شکر کرو۔''

---

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل عيادة المريض: ٦٥٥٦۔

﴿ وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴾ (۱٦/ النحل:۱٤)

''اوراسی نے سمندر کوتمہارے بس میں کردیا کہ تم اس سے تازہ گوشت (مچھلی) کھاؤ اوراس سے آرائش کی وہ چیز نکالو جس کو تم پہنتے ہو (یعنی موتی) اورتم جہازوں کو دیکھتے ہو کہ وہ اس میں پانی کو پھاڑتے رہتے ہیں اور، تاکہ تم خدا کی مہربانی ڈھونڈو اور، تاکہ تم شکر کرو۔''

﴿ كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴾ (۲۲/ الحج:۳٦)

''اوراسی طرح ہم نے ان جانوروں کوتمہارے بس میں کردیا کہ تم شکر کرو۔''

﴿ وَمِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴾ (۲۸/ القصص:۷۳)

''اوراس کی رحمت سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اوردن بنایا کہ تم (رات کو) آرام اور (دن کو) اس کے فضل وکرم کی تلاش کرو اور، تاکہ تم شکر کرو۔''

ان کے علاوہ اوربھی بہت سی آیتیں ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ ان ساری نعمتوں کا منشا یہ ہے کہ بندہ اپنے آقا کو پہچانے اوردل سے اس کے احسان کو مانے، لیکن گناہگار انسان کا کیا حال ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ ﴾ (۱۰/ یونس:٦۰)

''اللہ نے انسانوں پر بڑے بڑے فضل کیے، لیکن ان میں سے بہت کم شکر کرتے ہیں۔''

﴿ وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ۗ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ ﴾

(۷/ الاعراف:۱۰)

''اورہم نے تم کو زمین میں قوت بخشی اوراس میں تمہارے لیے بسر اوقات کے بہت سے ذریعے بنائے، تم بہت کم شکر کرتے ہو۔''

ایک موقع پر تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس ناشکری پر، پُرمحبت غضب کا اظہار بھی فرمایا:

﴿ قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ﴾ (۸۰/ عبس:۱۷)

''مارے جائیو، انسان کتنا بڑا ناشکرا ہے۔''

شکر کے باب میں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے زبان سے الحمدللہ پڑھ دیا تو مالک کا شکر ادا ہوگیا۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے شکر دراصل دل کے اس لطیف احساس کا نام ہے، جس کے سبب سے ہم اپنے محسن سے محبت رکھتے ہیں، ہر موقع پر اس کے احسان کا اعتراف کرتے ہیں اوراس کے لیے سراپا سپاس بنتے ہیں اورکوشش کرتے ہیں کہ ہم اس کو خوش رکھ سکیں اوراس کی فرمائشوں کو پورا کرتے رہیں، اگر ہم

صرف زبان سے شکر کا لفظ ادا کریں، لیکن دل میں احسان مندی اور منت پذیری کا کوئی اثر اور کیف نہ ہو اور اس اثر کے مطابق ہمارا عمل نہ ہو تو ہم اس محسن کی احسان مندی کے اظہار میں جھوٹے ہیں اور وہ شکر خدا کی بارگاہ میں قبول نہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو اپنے پے در پے احسانات سے جس طرح نوازا، اس کے بیان کرنے کے بعد ان کو خطاب کر کے فرماتا ہے:

﴿ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ ﴾ (٣٤/ سبا:١٣)

''اے داؤد کے گھر والو! شکر ادا کرنے کے لیے نیک عمل کرو۔''

اس آیت پاک نے بتایا کہ شکر کا اثر زبان تک محدود نہ ہو، بلکہ عمل سے بھی ظاہر ہونا چاہیے۔ اسی لیے حضرت سلیمان علیہ السلام خدا سے دعا کرتے ہیں:

﴿ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ ﴾ (٢٧/ النمل:١٩)

''اے میرے پروردگار! مجھے نصیب کر کہ میں تیرے اس احسان کا جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا ہے، شکر کروں اور وہ نیک کام کروں جو تجھے پسند ہو''

اس دعا میں یہ بھی اشارہ ہے کہ شکر میں شکر کے دلی جذبہ کے ساتھ اسی کے مطابق اور مناسب نیک عمل بھی ہو۔

دل میں یہ بات آتی ہے کہ خدا نے اپنے شکر گزار بندوں کے حق میں جو یہ فرمایا ہے کہ وہ جیسے جیسے شکر کرتے جائیں گے، میں ان کے لیے اپنی نعمتوں کی تعداد اور کیفیت بھی بڑھاتا جاؤں گا، اس کی تاویل یہ ہے کہ بندہ جیسے جیسے مالک کے شکر کے لیے اپنے عمل میں سرگرم ہوتا جاتا ہے، اس کی طرف سے شکرانہ عمل کی ہر نئی سرگرمی کے جواب میں اس کو کوئی نئی نئی نعمتیں عنایت ہوتی جاتی ہیں، اسی لیے فرمایا:

﴿ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝ ﴾ (١٤/ ابراهيم:٧)

''اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تم کو اور بڑھاؤں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا ہی سخت ہے۔''

﴿ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ۝ ﴾ (٥٤/ القمر:٣٥)

''ہم اسی طرح اس کو جزا دیتے ہیں جس نے شکر کیا۔''

﴿ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝ ﴾ (٣/ آل عمران:١٤٥)

''اور ہم شکر کرنے والوں کو جزا دیں گے۔''

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے دل میں ایک شکر ہی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو دین و دنیا میں بھلائی کے

لیے اس کو کسی اور تنبیہ کی ضرورت نہ ہو، وہ خدا کی نعمتوں کی قدر جان کر اس کو مانے گا اور اس کے حکموں پر چلے گا اور اسی کے بندوں کے ساتھ شکرانہ میں بھلائی کرے گا اور خود بندوں کے احسانات کے جواب میں بھی ان کے ساتھ نیکی اور خیر خواہی کرے گا۔ بلکہ آنحضرت ﷺ نے خود آپس میں ایک انسان کی دوسرے انسان کے ساتھ شکر گزاری کے جذبہ کو اللہ تعالیٰ کے احسانات کی شکر گزاری کا معیار مقرر فرمایا ہے، ارشاد ہوا:

((مَنْ لَّا يَشْكُرِ النَّاسَ لَا يَشْكُرِ اللّٰهَ)) [1]

''جو انسانوں کا شکر ادا نہ کرے گا وہ خدا کا بھی شکر ادا نہ کرے گا۔''

اس حدیث کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ جو انسانوں کے احسانوں کا شکریہ ادا نہ کرے گا، تو خدا بھی اپنے احسانوں کا شکریہ اس سے قبول نہ فرمائے گا۔

[1] جامع ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء في الشكر لمن أحسن اليك: ١٩٥٤۔

خاتمہ

کتاب کی پانچویں جلد جو عبادات کے مباحث پر مشتمل تھی ختم ہوگئی، ان صفحات میں آنحضرت ﷺ کی ان تعلیمات کا بیان تھا، جو عبادات کے باب میں آپ نے فرمائی ہیں، ان تعلیمات کے ایک ایک آیت حرف پر غور کیجئے کہ انہوں نے وہم پرستیوں اور غلط فہمیوں کے کتنے تو برتو پردے چاک کر دیے اور عبادت جو ہر مذہب کا اہم جزو ہے اس کی حقیقت کتنی واضح کر دی۔ عبادات کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھائے اور آپ نے وہ انسانوں کو بتائے وہ کتنے مکمل اور ان میں کا ایک ایک آئین آپ کے عمل اور قول کی سند سے کس قدر متعین اور مفصل اور دین و دنیا کی مصلحتوں اور فائدوں پر مشتمل ہے اور آپ نے ان کے ذریعہ انسانی دلوں کی کمزوریوں اور روح کی بیماریوں کا کس طرح علاج فرمایا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے پیغمبرانہ امتیازات کی کوئی حد نہیں ہے اور انہیں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کی ہر تعلیم جس میں عبادت بھی داخل ہے، عملاً: صاف واضح اور متعین ہے اور زمانہ مابعد میں انسانی تاویلات کی آمیزش اور قیاس آرائیوں سے مبرا ہے اور اس کا اس طرح ہونا اس لیے ضروری تھا کہ اس پر نوع انسان کی پیغمبرانہ تعلیم کے درس کا خاتمہ ہوا ہے۔ اس لیے اس کے ہر پہلو کو ایسا واضح ہونا چاہیے تھا کہ وہ پھر کسی پیغمبر کی آمد اور تشریح و توضیح کی محتاج نہ رہے، نبوت و رسالت کے آخری معلم نے (خدا ان پر اپنی رحمتیں اور برکتیں اتارے) اس فرض کو اس خوبی سے انجام دیا جس سے زیادہ کا تصور نہیں ہو سکتا۔

صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَبَرَكَاتُهُ۔

مغفرت کا طلبگار
سید سلیمان ندوی
۱۲ جمادی الثانیہ ۱۳۵۴ھ





سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

محمد رسول اللہ

تخریج شدہ ایڈیشن

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب



سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

تالیف

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ
علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ اسلامیہ

حصہ ششم

تخریج شدہ ایڈیشن

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب

اس حصے میں اخلاق، فلسفۂ اخلاق، حقوق و فرائض، رذائل اور آدابِ زندگی کے بارے میں قرآن و حدیث کی روشنی میں رہنمائی کی گئی ہے۔

تالیف
علامہ شبلی نعمانی
علامہ سید سلیمان ندوی

مکتبہ اسلامیہ

کتاب ---------- سیرۃ النبی ﷺ

تالیف ---------- علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی

ناشر ---------- محمد سرور عاصم

اشاعت ---------- اکتوبر 2012ء

قیمت ----------

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون: 042-37244973 فیکس: 042-37232369

بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد۔ پاکستان فون: 041-2631204, 2034256

E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع ثانی

اللہ تعالیٰ کا ہزار شکر ہے کہ اس نے اپنے ایک حقیر بندہ کی خدمت کو عام مسلمانوں میں اور مخصوص اہل علم کی نگاہوں میں مقبولیت کی نعمت عطا فرمائی: ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (١٤/ ابراھیم: ٣٤) ''خدا کی نعمتوں کا شمار کون کرسکتا ہے۔''

قدر دانوں کا تقاضہ تھا کہ اس کی چھوٹی جلد جلد شائع ہو، مگر کتاب کی ضخامت اور کاغذ کی گرانی کے سبب سے اس میں رکاوٹوں پر رکاوٹیں پیش آتی رہیں، اور آخر کئی برسوں کے بعد وہ دن آیا کہ پوری کتاب دوبارہ چھپ کر ختم ہوئی اور اب وہ آپ کے سامنے ہے۔

اب ساتویں جلد (معاملات) کا معاملہ درپیش ہے، بقدرِ توفیق اس کے کچھ صفحات لکھے بھی گئے ہیں، مگر ابھی کام بہت باقی ہے، احباب سے اس کے حسن انجام کی دعا کا خواستگار ہوں۔

والسلام

ہیچ مداں	۲۹/شوال ۱۳۶۰ھ
سلیمان	۱۹/نومبر ۱۹۴۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ الذی انزل الکتاب والحکمۃ والصلوۃ والسلام علی رسولہ نبی الرحمۃ۔
وعلی الہ واصحابہ اولی العزم والھمۃ۔

اے تو بہمیں صفت سزاوار | نام تو گرہ کشائے ہر کار
اے کردہ ز گنج خانہ راز | بر آدمیاں در سخن باز
عالم ز تو شد بحکمت آباد | حکمت ز تو یافت آدمی زاد

☆☆☆☆☆☆☆

در قربت حضرت مقدس | پیغمبرؐ پاک، رہبرم، بس
گنجینۂ کیمیائے عالم | پیش از ہمہ پیشوائے عالم
نامش بسریر پادشاہی | توقیع سپیدی و سیاہی (خسرو)

سیرتِ نبوی ﷺ کے سلسلہ کی چھٹی جلد آج ناظرین کے سامنے ہے، یہ ان اخلاقی تعلیمات کی تفصیل اور تشریح میں ہے، جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے مسلمانوں کو بتائی اور سکھائی گئیں، یہ عجیب بات ہے کہ مذہب کے ضروری اور مفید ہونے کے ثبوت میں اخلاقی تعلیم کی نظری حیثیت سے جتنی اہمیت ہے، عملی حیثیت سے عام لوگ اس کو اتنا ہی کم درجہ دیتے ہیں۔ اسی لیے عوام کے اس وہم کو دور اور قوموں کی ترقی و تہذیب میں اخلاق کی صحیح اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ان اوراق میں اس باب کے ہر گوشہ پر اچھی طرح روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ملت کی تعمیر کا اہم جزو اخلاق کی صحیح تربیت ہے۔

کتاب میں اس نکتہ کی طرف کہ اخلاق حسنہ ''اسمائے حسنیٰ'' کا پرتو ہیں۔ بار بار اشارہ کیا گیا ہے، لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ کوئی مخلوق، خالق کی کسی صفت میں برابر کی شریک نہیں ہو سکتی۔ ایسا سمجھنا سراسر شرک ہے، بات اتنی ہے کہ بندہ کے جس وصف کو خدائے تعالیٰ کی جس صفت سے مناسبت ہوتی ہے، اس پر اس صفت کا اطلاق مجازاً کر دیتے ہیں، جیسے اللہ کے علم کے سامنے بندہ کے علم کا مرتبہ اتنا بھی نہیں ہے، جتنا سمندر کے سامنے قطرہ کا ہے۔ مگر اللہ کی اس صفت علم کے ساتھ ساتھ بندہ کے اس وصف کو بھی علم کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ حقیقی صفتِ علم اللہ میں ہے، بندہ میں نہیں، لیکن چونکہ خدائے تعالیٰ اپنی صفتِ علم سے بندہ میں ایک انکشافی شان پیدا کر دیتا ہے، اس لیے بندہ کی اس ادنیٰ انکشافی شان کو بھی علم کہہ دیتے ہیں۔ [1] ورنہ درحقیقت ان دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں، یہی حال اللہ تعالیٰ اور بندہ کے دوسرے صفات اور اوصاف کے اشتراک کا ہے، اسی لیے بہت سے اہل حق اور اہل تحقیق کے نزدیک ان دونوں میں اوصاف کا اشتراک،

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے معارف لدنیہ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ ص ۲۴۔ مطبوعہ مدینہ بجنور۔

اشتراک بادنیٰ مناسبت ہے اور بس، ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ (۴۲/ الشوری: ۱۱)

کتاب میں چند موقعوں پر مختلف مذہبوں سے اسلام کا موازنہ آ گیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی تعلیمات کا ذکر بھی آیا ہے۔ اس سے مقصود وہ تعلیمات و ہدایات ہیں جو آج ان کی طرف منسوب صحیفوں میں پائی جاتی ہیں، یا ان کے موجودہ پیروان کی طرف منسوب کرتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ ہر پیغمبر صادق کی تعلیم ہر اعتراض سے بلند اور ہر خردہ گیری سے پاک ہے اور نبوت کے جس دور میں جو ربانی تعلیم آئی، وہ اس کے لیے بالکل مناسب تھی۔ یہاں تک کہ خاتم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس کی ہمیشہ کے لیے تکمیل فرمادی گئی۔ کتاب میں کہیں کہیں فقہی مسئلے آ گئے ہیں۔ چونکہ اس کتاب کا اصل موضوع احکام کا اخلاقی پہلو ہے، اس لیے فقہی جزئیات اور تفصیلات میں الجھا نہیں گیا ہے، ایسے موقع پر اگر شک وشبہ ہو تو ضروری ہے کہ ان جزئیات اور تفصیلات کو فقہ کی کتابوں میں دیکھ لیا جائے۔

کتاب کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے ایک مقدمہ ہے جس میں اخلاق کی مذہبی اہمیت ظاہر کی گئی ہے پھر کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی اخلاق کا ایک فلسفہ مرتب کیا جائے، اس کے بعد آنحضرت ﷺ کے طریقہ تعلیم کی کچھ خصوصیتیں گنائی گئی ہیں۔ پھر حقوق، فضائل، رذائل اور آداب کے مختلف عنوانوں سے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل کی گئی ہے۔

فضائل، رذائل اور آداب کے بعض بعض عنوان میرے رفیق کار مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے لکھے ہیں، جن کو میں نے گھٹا بڑھا کر شامل کر لیا ہے۔ موصوف کی اس قلمی اعانت کا شکر گزار رہوں۔

آیات واحادیث سے احکام کے استنباط اور مصالح وحکم کی تشریح میں اپنے ذوق وفکر کی رہبری سے چارہ نہ تھا۔ سہو وخطا انسان کی فطرت ہے، پھر کیونکر دعویٰ کروں کہ اس میں میرا فکر و ذوق آزاد رہا ہے۔

سلسلہ سیرت کے بانی حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو مدت سے خواب میں نہیں دیکھا تھا۔ اس حصہ کے جب آخری ابواب زیر ترتیب تھے، تو میں نے ان کو خواب میں دیکھا کہ ان کے سامنے اس کے بعض اجزا پڑے ہیں اور وہ اس کا کوئی صفحہ پڑھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔ (رحمۃ اللہ علیہ)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اوراق کو قبول فرمائے اور ابنائے ملت میں اس آئینہ محمدی کو دیکھ کر اپنی اخلاقی شکل وصورت کی تزئین وآرائش کا ذوق پیدا کرے اور وہ سمجھیں کہ ایمان وعبادت کی درستی کی بڑی عملی نشانی اسلام کی روشنی میں اخلاق وعادات کی درستی ہے۔

طالب رحمت
سید سلیمان ندوی
(۴ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

تعلیمات نبوی ﷺ کا تیسرا باب

اخلاق

عقائد اور عبادات کے بعد تعلیمات نبوی ﷺ کی کتاب کا تیسرا باب اخلاق ہے، اخلاق سے مقصود باہم بندوں کے حقوق وفرائض کے وہ تعلقات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لیے مناسب بلکہ ضروری ہے، انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی ہر شے سے تھوڑا بہت اس کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، اسی تعلق کے فرض کو بحسن وخوبی انجام دینا اخلاق ہے، اس کے اپنے ماں باپ، اہل وعیال، عزیز ورشتہ دار، دوست واحباب، سب سے تعلقات ہیں، بلکہ ہر اس انسان کے ساتھ اس کا تعلق ہے جس سے وہ محلّہ، وطن، قومیت، جنسیت یا اور کسی نوع کا علاقہ رکھتا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حیوانات تک سے اس کے تعلقات ہیں اور ان تعلقات کے سبب سے اس پر کچھ فرائض عائد ہیں۔

دنیا کی ساری خوشی، خوشحالی اور امن وامان اسی اخلاق کی دولت سے ہے، اسی دولت کی کمی کو حکومت و جماعت اپنے طاقت وقوت کے قانون سے پورا کرتی ہے، اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح از خود انجام دیں، تو حکومتوں کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو، اس لیے بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں پر اتنا ہو کہ وہ ان کے قدم کو سیدھے راستہ سے بھٹکنے نہ دے، دنیا کے سارے مذہبوں نے کم وبیش اسی کی کوشش کی ہے اور دنیا کے آخری مذہب ''اسلام'' نے بھی یہی کیا ہے، آیندہ ابواب میں اسلام کی انہی کوششوں کا جائزہ لینا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اور کیا ہے، اس کو تفصیل سے بتانا ہے۔

اسلام اور اخلاقِ حسنہ

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے سارے مذہبوں کی بنیاد اخلاق ہی پر ہے، چنانچہ اس عرصۂ ہستی میں جس قدر پیغمبر اور مصلح آئے، سب کی یہی تعلیم رہی کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا برا ہے، انصاف بھلائی اور ظلم برائی ہے، خیرات نیکی اور چوری بدی ہے، لیکن مذہب کے دوسرے ابواب کی طرح اس باب میں بھی محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تکمیلی حیثیت رکھتی ہے، خود آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((بُعِثْتُ لِاُ تَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ)) ❶

''میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔''

یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مؤطا کی روایت ہے، مسند احمد، بیہقی اور ابن سعد وغیرہ میں اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُ تَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ)) ❷

''میں تو اسی لیے بھیجا گیا کہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کروں۔''

چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی اس فرض کو انجام دینا شروع کر دیا، ابھی آپ ﷺ مکہ ہی میں تھے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی کو اس نئے پیغمبر کے حالات اور تعلیمات کی تحقیق کے لیے مکہ بھیجا، انہوں نے واپس آ کر اس کی نسبت اپنے بھائی کو جن الفاظ میں اطلاع دی، وہ یہ تھے:

رَاَيْتُهٗ يَاْمُرُ بِمَكَارِمِ الْاَخْلَاقِ۔ ❸

''میں نے اس کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتا ہے۔''

حبشہ کی ہجرت کے زمانہ میں نجاشی نے جب مسلمانوں کو بلوا کر اسلام کی نسبت تحقیقات کی، اس وقت حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے جو تقریر کی اس کے چند فقرے یہ ہیں:

''اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، زبردست، زیردستوں کو کھا جاتے تھے، اس اثنا میں ایک شخص ہم میں پیدا ہو...... اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں۔'' ❹

---

❶ مؤطا امام مالك، كتاب حسن الخلق، باب ماجاء فى حسن الخلق: ١٦٧٧؛ كنز العمال، ج٢، ص: ٥ وزرقانى شرح مؤطا، ج٤، ص: ٩٢ مطبع كستليه مصر: ١٢٨٠ ھ۔ ❷ سنن الكبرى بيهقى، ١٠/ ١٩٢؛ مسند الشهاب: ١٠٨٠؛ احمد، ٢/ ٣٨١؛ ابن سعد، ١/ ١٩٢۔ نوٹ: احمد اور ابن سعد میں "صالح الاخلاق" کے الفاظ ہیں۔ ❸ صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابى ذر: ٦٣٦٢۔

❹ مسند احمد، ج ١، ص: ٢٠٢؛ مستدرك حاكم، ج ٢، ص: ٣١٠؛ ابن هشام ذكر واقعه هجرت، ج١، ص: ٢٠٦۔

اسی طرح قیصر روم کے دربار میں ابوسفیان نے جو ابھی تک کافر تھے، آنحضرت ﷺ کی اصلاحی دعوت کا جو مختصر خاکہ کھینچا اس میں یہ تسلیم کیا کہ وہ اللہ کی توحید اور عبادت کے ساتھ لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ ''وہ پاک دامنی اختیار کریں، سچ بولیں اور قرابت کا حق ادا کریں۔'' [1]

قرآن مجید نے جابجا آنحضرت ﷺ کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ

﴿ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ ﴾ (٦٢ / الجمعة: ٢)

''یہ پیغمبر اُن ان پڑھ جاہلوں کو پاک وصاف کرتا اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔''

اس آیت میں دو لفظ فیصلہ کے قابل ہیں، ایک پاک وصاف کرنا، جس کو قرآن پاک نے تزکیہ کہا ہے اور دوسرا حکمت۔

① تزکیہ

کے لفظی معنی پاک وصاف کرنا، نکھارنا، میل کچیل دور کرنا ہیں، قرآن پاک نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے کہ نفس انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور آلودگیوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے، یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کر کے اس میں صیقل اور جلا پیدا کر دی جائے، سورۂ والشمس میں ہے:

﴿ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۙ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۙ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۙ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۗ ﴾ (٩١/ الشمس:٧۔١٠)

''قسم ہے نفس کی اور جیسا اس کو ٹھیک کیا، پھر اس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی، بے شبہ جس نے اس نفس کو صاف ستھرا بنایا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا وہ ناکام رہا۔''

دوسری جگہ ہے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۗ ﴾ (٨٧/ الاعلیٰ:١٤۔١٥)

''بے شبہ وہ جیتا جس نے اپنے کو پاک وصاف کیا اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔''

ایک جگہ اسلام کی دعوت کے نتیجہ کو تزکیہ اور تزکی کے لفظ سے ادا کیا ہے:

﴿ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۙ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۗ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۙ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۗ ﴾ (٨٠/ عبس:١۔٤)

''پیغمبر ﷺ نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا، کہ اس کے پاس وہ اندھا آیا اور تجھے کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنور جاتا، یا وہ سوچتا تو تیرا سمجھانا اس کے کام آتا۔''

[1] صحیح بخاری، کتاب الوحی، باب کیف کان بدء الوحی: ٧ وکتاب الجهاد، باب دُعاء النبی ﷺ الی الاسلام: ٢٩٤١۔

ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ قرآن پاک میں اس ''تزکیہ'' کا مفہوم کیا ہے، جس کو اس نے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی خاص خصوصیت قرار دیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ نفوس انسانی کو جلا دیں، ان کو برائیوں اور نجاستوں کی آلودگیوں سے پاک کریں اور ان کے اخلاق واعمال کو درست اور صاف ستھرا بنائیں، چنانچہ جو واقعات اوپر بیان کئے گئے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ دوست اور دشمن دونوں آپ ﷺ کی اس خصوصیت کے قائل تھے۔

② حکمت

اس کے بعد دوسرا لفظ حکمت کا ہے، گو اس لفظ کی پوری تشریح اس سے پہلے چوتھے حصہ میں کی جا چکی ہے، مگر اس موقع کے لحاظ سے یہ کہنا ہے کہ حکمت کا لفظ قرآن پاک میں جہاں اس علم و عرفان کے معنی میں ہے، جو نور الٰہی کی صورت میں نبی ﷺ کے سینہ میں ودیعت رکھا جاتا ہے اور جس کے آثار و مظاہر رسول کی زبان سے کبھی مصالح و اسرار اور کبھی سنن و احکام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، وہیں اس کا دوسرا اطلاق اس علم و عرفان کے ان عملی آثار و نتائج پر بھی ہوتا ہے، جن میں بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات کا ہے، قرآن میں دو موقعوں پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس دوسرے معنی کی حکمت میں کون کونسی باتیں داخل ہیں، سورہ بنی اسرائیل میں توحید، والدین کی اطاعت و تعظیم، قرابت داروں اور محتاجوں کی امداد کی نصیحت اور فضول خرچی، بخل، اولاد کشی، بدکاری، کسی بے گناہ کی جان لینے اور یتیموں کے ستانے کی ممانعت کے بعد ایفائے عہد کرنے ٹھیک ناپنے اور تولنے اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنے کی تاکید کی گئی ہے، اس کے بعد ارشاد ہے:

﴿ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ ﴾ (۱۷/ الاسراء:۳۹)

''یہ حکمت کی ان باتوں میں ہے جن کو تیرے رب نے تجھ پر وحی کیا۔''

سورۂ لقمان میں ہے کہ

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ ﴾ (۳۱/ لقمان:۱۲)

''اور ہم نے لقمان کو حکمت کی باتیں سکھائیں، کہ اللہ کا شکر ادا کر۔''

اس کے بعد حکمت کی ان باتوں کی مزید تشریح کی گئی ہے، کہ ''کسی کو اللہ کا شریک نہ بنا، والدین کے ساتھ مہربانی سے پیش آ، نماز پڑھا کر، لوگوں کو بھلی بات کرنے کو کہہ اور بری بات سے باز رکھ، مصیبتوں میں استواری اور مضبوطی دکھا، مغرور نہ بن، زمین پر اکڑ کر نہ چل، نیچی آواز میں باتیں کر۔'' ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں ان فطری امور خیر کو بھی جن کا خیر ہونا فطرۃً تمام قوموں اور مذہبوں میں مسلم ہے اور جن کو دوسرے معنی میں اخلاق کہہ سکتے ہیں، ''حکمت'' کہا گیا ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں اخلاق کا مرتبہ اور پایہ، یہ ہے کہ ان کو ''حکمت'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور

قرآن پاک کے اس اظہار حقیقت سے کہ وحی محمدی ﷺ کتاب اور حکمت دونوں پر برابر مشتمل ہے، یہ راز ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں عبادات اور دوسرے احکام کو جو اہمیت حاصل ہے، اس سے کم اخلاق کی اہمیت اس کی نگاہ میں نہیں، خود قرآن پاک نے اس کی تصریح کی ہے، فرمایا:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱرْكَعُوا۟ وَٱسْجُدُوا۟ وَٱعْبُدُوا۟ رَبَّكُمْ وَٱفْعَلُوا۟ ٱلْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۩ ﴾

(۲۲/ الحج :۷۷)

''اے ایمان والو! رکوع کرو، سجدہ کرو، اپنے رب کو پوجو اور نیکی کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

گویا ایمان کی روح کے بعد دعوت محمدی ﷺ کے جسم کے دو بازو ہیں، ایک عبادت اور دوسرا اخلاق، ایک خالق کا حق اور دوسرا مخلوق کا اور انہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

حقوقِ عباد کی اہمیت

ایک اور نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیمِ محمدی ﷺ نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہے، اخلاق حقوقِ عباد، یعنی باہم انسانوں کے معاملات اور تعلقات کا نام ہے اور عبادات حقوق اللہ یعنی اللہ کے فرائض ہیں، اللہ تعالیٰ نے جو ارحم الراحمین ہے اور جس کی رحمت کا دروازہ کسی نیک و بد پر بند نہیں ہے، شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کو اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق معافی کے قابل قرار دیا ہے، مگر حقوقِ عباد یعنی باہم انسانوں کے اخلاقی فرائض کی کوتاہی اور تقصیر کی معافی اللہ نے اپنے ہاتھ میں نہیں بلکہ ان بندوں کے ہاتھوں میں رکھی ہے، جن کے حق میں وہ ظلم اور تعدی ہوئی ہو اور ظاہر ہے کہ ان سے اس رحم و کرم کی توقع نہیں ہوسکتی، جو اس ارحم الراحمین کی بے نیاز ذات سے ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا ہو، تو اس (ظالم بھائی) کو چاہیے کہ اسی دنیا میں وہ اس (مظلوم بھائی) سے اس کو معاف کرالے، ورنہ وہاں تاوان ادا کرنے کے لیے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا، صرف اعمال ہوں گے، ظالم کی نیکیاں مظلوم کو مل جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں، ظالم کے نامہ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔'' [1] ایک اور حدیث میں ہے کہ ''قیامت میں نامہ اعمال کی تین فردیں ہوں گی، ایک وہ جس کی کوئی پروا اللہ نہ کرے گا، دوسری وہ جس میں سے اللہ ایک حرف کو بھی نہ چھوڑے گا اور تیسری وہ جس میں سے کچھ نہ معاف فرمائے گا، جس فرد کے گناہ معاف نہ ہوں گے وہ شرک ہے اور جس فرد کی کوئی پروا اس کو نہ ہوگی تو وہ ظلم ہے، جو انسان نے خود اپنے اوپر کیا ہے اور جس کا معاملہ خود اس بندہ اور اس کے اللہ کے درمیان ہے، جیسے اس نے روزہ نہ رکھا ہو، یا نماز نہ پڑھی ہو، تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اس کے اس فرد کے گناہ کو معاف کردے گا اور بخش دے گا، لیکن وہ فرد جس کا ایک حرف بھی چھوٹ نہیں سکتا وہ ظلم ہے جو ایک بندہ نے

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصاص یوم القیامة: ٦٥٣٤۔

دوسرے بندہ پر کیا ہے۔'' [1] اس سے معلوم ہوا کہ معاملات انسانی میں جو تجاوز اور ظلم ہوگا، اس کی اہمیت کتنی زیادہ ہے؟ [2] چنانچہ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت اس وقت تک بندہ پر عائد نہیں کی ہے، جب تک وہ اپنے اہل وعیال کے نفقہ کا پورا سامان نہ کرلے اور زکوٰۃ بندہ کے اسی مال میں فرض کی ہے، جو اس کے اور اس کے اہل وعیال کے مصارف سے زیادہ ہو، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا حق اس وقت تک بندہ پر واجب نہیں کیا، جب تک وہ بندوں کے حقوق سے عہدہ برآ نہ ہولے۔

اسلام کے ارکان پنجگانہ اور اخلاق

بعض ان حدیثوں کی بنا پر جن میں اسلام کی عمارت کو ایمان کے بعد نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے چار ستونوں پر قائم بتایا گیا ہے، بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کی اس عمارت میں اخلاق حسنہ کو کوئی جگہ ہی نہیں دی گئی ہے اور بے سمجھ واعظوں کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی میں اور اضافہ ہوگیا ہے، حالانکہ جیسا کہ عبادات کے شروع میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاقِ حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے، قرآن پاک میں یہ نکتہ ہر جگہ نمایاں طریقہ سے واضح کر دیا گیا ہے، چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بری باتوں سے باز رکھتی ہے، روزہ کی نسبت بتایا ہے، کہ وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے، زکوٰۃ سرتاپا انسانی ہمدری اور غمخواری کا سبق ہے اور حج بھی مختلف طریقوں سے ہماری اخلاقی اصلاح وترقی کا ذریعہ اور اپنی اور دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چاروں ارکان کے نام الگ الگ جو کچھ ہوں، مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے، اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ احکامِ الٰہی کی محض لفظی تعمیل اور عبادت کے جوہر ومعنی سے یکسر خالی اور معرا ہیں، وہ درخت ہیں جن میں پھل نہیں، وہ پھول ہیں جن میں خوشبو نہیں اور وہ قالب ہیں جن میں روح نہیں، قرآن پاک اور تعلیمِ نبوی ﷺ کے جو اشارات اس باب میں ہیں، حضرات صوفیہ نے اپنی تالیفات میں ان کی پوری تشریح کر دی ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:

> ''اللہ فرماتا ہے کہ نماز کو میری یاد کے لیے کھڑی کرو اور فرمایا کہ بھولنے والوں میں نہ ہو اور فرمایا کہ نشہ کی حالت میں اس وقت تک نماز نہ پڑھو، جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، کتنے نمازی ہیں جنھوں نے گو شراب نہیں پی، مگر جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت بھی نماز ایسی ادا کرے جن میں کسی

---

[1] مسند احمد، ج ٦، ص: ٢٤٠؛ مستدرك حاكم عن عائشة، ج ٤، ص: ٥٧٥۔

[2] یہ اصول فقہ کا مسئلہ ہے، دیکھو هدايه، كتاب الحج، ص: ٢١٣ مرتبہ مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ۔

دنیاوی چیز کا دھیان نہ آئے تو اللہ اس کے گناہ کو معاف کر دے گا، پھر فرمایا کہ ''نماز عاجزی، فروتنی، زاری، دردمندی اور شرمندگی کا نام ہے۔'' اور یہ کہ ہاتھ باندھ کر کہو کہ ''اے میرے اللہ!'' جس نے یہ بات نہیں پیدا کی، اس کی نماز ناقص ہے اور اگلی کتابوں میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہر ایک کی نماز قبول نہیں کرتا، میں اس کی نماز قبول کرتا ہوں، جو میری بڑائی کے سامنے سرنگوں ہے، میرے بندوں پر اپنی بڑائی نہیں جتاتا اور بھوکے محتاج کو میرے لیے کھانا کھلاتا ہے۔'' اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''نماز اسی لیے فرض کی گئی اور اسی لیے حج کے ارکان بنائے گئے، تاکہ اللہ کی یاد کی جائے۔'' تو اگر دل میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو جو مقصود ہے، تو اس یادِ الٰہی کی قدر و قیمت کیا ہے؟ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس کی نماز اس کو برائی اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو اللہ سے اور دور کر دیتی ہے۔'' [1]

اس اخیر حدیث کو ابن جریر، ابن ابی حاتم اور دوسرے اہلِ تفسیر محدثوں نے اپنی کتابوں میں بسند ذکر کیا ہے اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر (سورۂ عنکبوت) میں ان تمام روایتوں کو یکجا کر دیا ہے، اس حدیث کی دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں، کہ ''جس کو اس کی نماز برائی اور بدی سے باز نہ رکھے، اس کی نماز ہی نہیں'' [2] اسی قسم کے الفاظ روزوں کے متعلق آپ ﷺ نے فرمائے، ارشاد ہوا کہ ''روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کو نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی ضرورت نہیں کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔'' [3] ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ عبادات کا ایک اہم مقصد اخلاق کا تزکیہ بھی ہے۔

اخلاقِ حسنہ اور ایمان

اس سے بھی زیادہ مقدم یہ بات ہے کہ ایمان جو گو مذہب کا اصل الاصول ہے، لیکن اس بنا پر کہ وہ دل کے اندر کی بات ہے جس کو کوئی دوسرا جانتا نہیں اور زبان سے ظاہری اقرار ہر شخص کر سکتا ہے، اس لیے اس ایمان کی پہچان اس کے نتائج و آثار یعنی اخلاقِ حسنہ کو قرار دیا گیا ہے، چنانچہ سورۂ مومنون میں عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی اہلِ ایمان کی ان ضروری صفات میں گنایا گیا ہے، جن پر ان کی کامیابی کا مدار ہے، فرمایا:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

---

[1] احیاء العلوم، جلد اول، باب فضیلۃ الخشوع، ص: ۹۵۔ [2] تفسیر ابن کثیر، سورۃ عنکبوت، آیت مذکورہ، ج ۳، ص: ۴۱۴۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب من لم یدع قول الزور: ۱۹۰۳؛ ابوداود، کتاب الصیام، باب الغیبۃ للصائم: ۲۳۶۲؛ جامع ترمذی، ابواب الصوم، باب ماجاء فی التشدید فی الغیبۃ للصائم: ۷۰۷؛ ابن ماجہ، ابواب الصیام، باب ماجاء فی الغیبۃ والرفث: ۱۶۸۹۔

الْعٰدُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۞﴾ (۲۳/ المؤمنون:۱۔۹)

''بے شبہ وہ ایمان والے کامیاب ہوئے جو اپنی نماز میں خضوع وخشوع کرتے ہیں اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں کرتے اور جو زکوۃ دیا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں..... اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔''

ان آیتوں میں اہلِ ایمان کی کامیابی جن اوصاف کا نتیجہ بتائی گئی ہے، ان میں وقار وتمکنت (لغویات سے اعراض) فیاضی (زکوۃ) پاکدامنی اور ایفائے عہد کو خاص رتبہ دیا گیا ہے۔

اخلاق حسنہ اور تقویٰ

اسلام کی اصطلاح میں انسان کی اس قلبی کیفیت کا نام جو ہر قسم کی نیکیوں کی محرک ہے، تقویٰ ہے، وحی محمدی ﷺ نے تصریح کردی ہے کہ تقویٰ والے لوگ وہی ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۞﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم نماز میں اپنا منہ پورب یا پچھم کی طرف کرو، بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ پر، قیامت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور مال کی خواہش کے باوجود (یا اللہ کی محبت کے سبب سے) اپنا مال رشتہ داروں کو، یتیموں کو، غریبوں کو، مسافر کو، مانگنے والوں کو اور غلاموں کے آزاد کرنے میں دیا اور نماز ادا کرتا رہا اور زکوۃ دیتا رہا اور جو وعدہ کرکے اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور جو مصیبت، تکلیف اور لڑائی میں ثابت قدم رہتے ہیں، وہی ہیں جو راستباز ہیں اور یہی تقویٰ والے ہیں۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ راستبازی اور تقویٰ کا پہلا نتیجہ جس طرح ایمان ہے، اسی طرح ان کا دوسرا لازمی نتیجہ اخلاق کے بہترین اوصاف فیاضی، ایفائے عہد اور صبر وثبات وغیرہ بھی ہیں۔

اخلاقِ حسنہ اور اللہ کے نیک بندہ ہونے کا شرف

محمد رسول اللہ ﷺ کی پاک تعلیم میں اللہ کے نیک اور مقبول بندے وہی قرار دیے گئے، جن کے

اخلاق بھی اچھے ہوں اور وہی باتیں اللہ کے نزدیک ان کے مقبول ہونے کی نشانی ہیں، چنانچہ سورۂ فرقان میں ارشاد ہوا:

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۝ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا۝ اِنَّهَا سَاۗءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا۝ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۝ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا۝ ....
وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۝ ﴾

(۲۵/ الفرقان:٦٣_٦٨ و ٧٣_٧٤)

''اور رحم والے اللہ کے بندے وہ ہیں، جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب ناسمجھ لوگ ان سے بات کریں تو وہ سلام کہیں اور جو اپنے پروردگار کی عبادت کی خاطر قیام اور سجدہ میں رات گزارتے ہیں اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم سے جہنم کا عذاب دور کر، کہ اس کا عذاب بڑا تاوان ہے اور جہنم برا ٹھکانا اور مقام ہے اور جو خرچ جب کرتے ہیں، تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں، بلکہ ان دونوں کے بیچ سے وہ سیدھے گزریں اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور اللہ کو نہیں پکارتے اور جو کسی جان کا بے گناہ خون نہیں کرتے، جس کو اللہ نے منع کیا ہے اور نہ بدکاری کرتے ہیں، کہ جو ایسا کرے گا وہ گناہ سے پیوستہ ہوگا......اور جو جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے اور جب کسی لغو بات پر سے گزرتے ہیں تو سنجیدگی اور وقار سے گزر جاتے ہیں اور جب اللہ کی نشانیاں ان کو سنائی جائیں تو وہ اندھے اور بہرے نہ ہو پڑیں اور یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہمارے بیوی بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک بخش اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔''

دیکھو کہ ایک ایمان کی حقیقت میں عفو و درگزر و میانہ روی اور قتل و خونریزی اور بدکاری نہ کرنا اور مکر و زور میں شریک نہ ہونا وغیرہ، اخلاق کے کتنے مظاہر پوشیدہ ہیں۔

اہلِ ایمان کے اخلاقی اوصاف

وہ لوگ جو اللہ کے پیارے اور مقبول بندے ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانی ان کے اخلاق اوصاف یہ بیان ہوئے ہیں:

﴿ وَعَلٰی رَبِّهِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ ۚ وَالَّذِیۡنَ یَجۡتَنِبُوۡنَ کَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَالۡفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوۡا هُمۡ یَغۡفِرُوۡنَ ۚ وَالَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّهِمۡ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ۪ وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ ۪ وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ۚ وَالَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَهُمُ الۡبَغۡیُ هُمۡ یَنۡتَصِرُوۡنَ ﴿﴾ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثۡلُهَا ۚ فَمَنۡ عَفَا وَاَصۡلَحَ فَاَجۡرُهٗ عَلَی اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿﴾ وَلَمَنِ انۡتَصَرَ بَعۡدَ ظُلۡمِهٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیۡهِمۡ مِّنۡ سَبِیۡلٍ ؕ اِنَّمَا السَّبِیۡلُ عَلَی الَّذِیۡنَ یَظۡلِمُوۡنَ النَّاسَ وَیَبۡغُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ اُولٰٓئِکَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿﴾ وَلَمَنۡ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿﴾ ﴾

(٤٢/ الشوریٰ:٣٦۔٤٣)

”اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جو غصہ کی حالت میں معاف کرتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پکار کا جواب دیتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں اور انکے کام باہم مشورہ سے ہوتے ہیں اور ہم نے ان کو جو دیا ہے، اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دیتے ہیں اور جب ان پر چڑھائی ہوتو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، تو جو کوئی معاف کردے اور نیکی کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے، وہ ظلم کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا اور اگر کوئی مظلوم ہوکر بدلہ لے لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں، ملامت تو ان پر ہے جو لوگوں پر ازخود ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فساد مچاتے ہیں، ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے اور بے شبہ جو (مظلوم ہونے پر بھی) ظالم کو معاف کردے اور سہہ لے تو یہ ہمت کے کام ہیں۔“

﴿ اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَالۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ۚ ﴾ (٣/ آل عمران:١٣٣۔١٣٤)

”جنت ان پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے، جو خوشی اور تکلیف دونوں حالتوں میں اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرتے ہیں اور جو غصہ کو دباتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿ اُولٰٓئِکَ یُؤۡتَوۡنَ اَجۡرَهُمۡ مَّرَّتَیۡنِ بِمَا صَبَرُوۡا وَیَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ﴿﴾ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغۡوَ اَعۡرَضُوۡا عَنۡهُ وَقَالُوۡا لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَلَکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ ۫ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ ۫ لَا نَبۡتَغِی الۡجٰهِلِیۡنَ ﴿﴾ ﴾ (٢٨/ قصص:٥٤۔٥٥)

”یہ وہ ہیں جن کو دوہرا ثواب ملے گا۔ اس لیے کہ انہوں نے صبر کیا اور وہ برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں اور جو ہم نے دیا ہے اس سے کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جب کوئی

بیہودہ بات سنتے ہیں، تو اس سے کنارہ کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارا عمل اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے، تم سلامت رہو، ہم ناسمجھوں کو نہیں چاہتے۔"

﴿ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ ﴾ (۷۶/ الدھر:۸)

"اور کھانے کی خود ضرورت ہوتے ہوئے، مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔"

ان آیتوں کی اور اسی قسم کی دوسری آیتوں کی جو تشریح آنحضرت ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے فرمائی، وہ احادیث میں محفوظ ہے، ہم ان حدیثوں کو مختلف عنوانوں کے نیچے یہاں لکھتے ہیں، تا کہ معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ ﷺ کے تعلیمی نصاب میں اخلاق کے سبق کی کیا اہمیت اور کیا رتبہ ہے؟

اخلاق حسنہ کا درجہ اسلام میں

اسلام میں اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز میں جو دعا مانگتے تھے، اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا:

((واهدني لأحسن الاخلاق لا يهدي لأحسنها الّا انت واصرف عني سيّئاتها لا يصرف عني سيّئاتها الّا انت)) [1]

"اور اے میرے اللہ! تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی راہنمائی کر، تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا اور برے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور ان کو کوئی نہیں پھیر سکتا، لیکن تو۔"

ان الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ایک پیغمبر اپنے تقرب اور استجابت کے بہترین موقع پر بارگاہِ الٰہی سے جو چیز مانگتا ہے، وہ حسن اخلاق ہے۔

ایمان سے بڑھ کر اسلام میں کوئی چیز نہیں، لیکن اس کی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہے، فرمایا:

((اكمل المؤمنين ايمانًا أحسنهم خلقًا)) [2]

"مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔"

یہ حدیث ترمذی، ابن حنبل، ابوداود، حاکم اور ابن حبان میں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایمان کے کمال کا معیار جس چیز کو ٹھہرایا گیا ہے وہ حسن اخلاق ہے، کہ یہی وہ پھل ہے، جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے۔

اسلام میں نماز اور روزہ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے، لیکن اخلاق حسنہ کو بھی ان کی قائم مقامی کا شرف

---

[1] صحیح مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین، باب صلوۃ النبی ﷺ ودعاءہ باللیل: ۱۸۱۲۔

[2] ابوداود، کتاب السنۃ، باب الدلیل علی زیادۃ الایمان ونقصانہ: ۴۶۸۲؛ جامع ترمذی، ابواب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأۃ علی زوجھا: ۱۱۶۲؛ مسند أحمد، ج ۲، ص: ۲۵۰؛ صحیح ابن حبان: ۴۷۹۔

کبھی کبھی حاصل ہو جاتا ہے، ارشاد ہوا:

((ان الرجل ليدرك بحسن خلق درجة قائم الليل و صائم النهار))

''انسان حسن اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔'' ❶

یہ حدیث چند ہم معنی لفظوں کے الٹ پھیر سے ابوداؤد، ابن حنبل، حاکم، ابن حبان اور طبرانی میں ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفل نمازوں میں رات بھر کی شب بیداری اور نفل روزوں میں دن بھر کی بھوک پیاس سے جو درجہ حاصل ہوسکتا ہے، وہی درجہ حسنِ خلق سے بھی حاصل ہوسکتا ہے، حسنِ اخلاق کی یہ حیثیت اس کو یک گونہ عبادات کی کثرت سے بڑھا دیتی ہے۔

اسلام میں اخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانوں میں درجہ اور رتبہ کا فرق نمایاں ہوتا ہے، فرمایا:

((خياركم احسنكم اخلاقًا)) ❷

''تم میں سب سے اچھا وہ ہے، جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔''

ایک اور حدیث میں ہے:

((مامن شيء يوضع في الميزان اثقل من حسن الخلق فان صاحب حسن الخلق ليبلغ به درجة صاحب الصوم و الصلوٰة)) ❸

''(قیامت کی) ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی، کہ حسن اخلاق والا، اپنے حسن خلق سے ہمیشہ کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔''

یہ حدیث ترمذی میں انہی الفاظ کے ساتھ ہے، لیکن حدیث کی دوسری کتابوں (حاکم، ابن حبان، ابن حنبل، ابوداؤد) میں مختصراً صرف پہلا ٹکڑا ہے، یعنی یہ کہ ''حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز ترازو میں نہیں۔'' ❹ اس حدیث نبوی ﷺ نے پوری طرح واضح کر دیا کہ اسلام کی میزان میں حسن اخلاق سے زیادہ گراں کوئی چیز نہیں، ایک اور حدیث میں ہے کہ بندہ کو اللہ کی طرف سے جو کچھ ملا ہے، اس میں حسنِ اخلاق کا عطیہ سب سے بڑھ کر ہے:

((خير ما اعطى الناس خلق حسن))

''لوگوں کو قدرت الٰہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئیں ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں۔''

❶ ابوداود، کتاب الادب، باب فی حسن الخلق:٤٧٩٨؛ صحیح ابن حبان:٤٨٠؛ مستدرك حاکم، ١/ ٦٠۔
❷ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب صفة النبی ﷺ: ٣٥٥٩؛ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب کثرة حیائه: ٦٠٣٣؛ مسند أحمد، ج٢، ص:١٦١۔ ❸ جامع ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی حسن الخلق:٢٠٠٣۔ ❹ ابو داود، کتاب الادب، باب فی حسن الخلق: ٤٧٩٩؛ مسند احمد، ٦/ ٤٤٢؛ مسند عبد بن حمید: ٢٠٤؛ صحیح ابن حبان: ٤٨١۔

مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث حاکم، نسائی، ابن ماجہ، ابن حنبل، طبرانی اور ابن ابی شیبہ میں ہے، [1] اس بشارت نے اخلاقِ حسنہ کی نعمت کو تمام انسانی نعمتوں سے بالاتر بنا دیا، ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((احب عباداللّٰہ الی اللّٰہ احسنھم اخلاقًا)) [2]

''اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ حسن خلق اللہ کی محبت کا ذریعہ ہے اور درحقیقت رسول کی محبت کا بھی یہی ذریعہ ہے، فرمایا:

((ان احبّکم الیّ و اقربکم منی فی الآخرۃ مجالس محاسنکم اخلاقاً و ان ابغضکم الیّ و ابعدکم منی فی الآخرۃ مساویکم اخلاقا)) [3]

''تم میں میرا سب سے پیارا اور نشست میں مجھ سے سب سے نزدیک وہ ہیں جو تم میں خوش خلق ہیں اور مجھے ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں بداخلاق ہیں۔''

آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں ایک صحابی کی دو بیویاں تھیں، ایک رات بھر نماز پڑھتیں، دن کو روزہ رکھتیں اور صدقہ دیتیں، مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کی ناک میں دم کیے رکھتی تھیں، دوسری بیوی صرف فرض نماز پڑھتیں اور غریبوں کو چند کپڑے بانٹ دیتیں، مگر کسی کو تکلیف نہ دیتیں، آنحضرت ﷺ سے ان دونوں کی نسبت پوچھا گیا، تو آپ ﷺ نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ ''اس میں کوئی نیکی نہیں، وہ اپنی اس بدخلقی کی سزا بھگتے گی۔'' اور دوسری کی نسبت فرمایا کہ ''وہ جنتی ہوگی۔'' [4] ان دونوں بیویوں کی سیرتوں کے جو مختلف نتیجے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی زبانِ فیض ترجمان سے ظاہر ہوئے ہیں، وہ اسلام میں اخلاق کی حیثیت کو پوری طرح نمایاں کر دیتے ہیں۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک بدوی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھائیے جو مجھے جنت کو لے جائے، فرمایا: ''انسان کو غلامی سے آزاد کر، انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے چھڑا اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑ، اگر تو یہ نہ کر سکے، تو بھوکے کو کھلا اور پیاسے کو پلا اور نیکی بتا اور برائی سے روک، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان روک۔'' [5] غور کیجئے کہ یہ حدیث

[1] ابن ماجه، ابواب الطب، باب ما انزل اللّٰه ... : ٣٤٣٦؛ نسائی، الکبریٰ: ٧٥١٢؛ مستدرك حاکم، ٤/ ٣٩٩؛ احمد، ٤/ ٢٧٨؛ صحيح ابن حبان: ٦٠٢٩۔ [2] معجم الكبير للطبرانی: ٤٧١۔

[3] صحيح ابن حبان: ٤٨٢؛ مسند أحمد، ج ٤، ص: ١٩٣ نیز الفاظ کے اختلاف کے ساتھ اس مفہوم کی روایت جامع ترمذی، کتاب البر والصلة: ٢٠١٨ میں بھی ہے۔نوٹ: یہ تمام حدیثیں کنز العمال، ج ٢، کتاب الاخلاق باب اوّل سے ماخوذ ہیں۔ [4] ادب المفرد، امام بخاری، باب لا یوذی جاره: ١١٩۔

[5] مشکل الآثار امام طحاوی، ج ٤، ص: ٢، حیدر آباد دکن۔

اخلاقی عظمت کو کہاں تک بڑھا رہی ہے۔

ایمان کے اوصاف ولوازم

ان کے علاوہ کثرت سے ایسی حدیثیں ہیں جن میں آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلاں فلاں اوصاف واخلاق، ایمان کے لوازم اور خصوصیات ہیں، جس قدر ان لوازم اور خصوصیات میں زیادتی اور کمی ہوگی، گویا اسی قدر اس ایمان کے منشا میں زیادتی وکمی ہوگی یعنی ہمارے یہ ظاہری اخلاق، ہماری اندرونی ایمانی کیفیت کا معیار اور پیمانہ ہیں، ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغ زیرِ دامن ہے، جس کی چمک دمک اور روشنی کا اندازہ اس کی باہر نکلنے والی شعاعوں سے کیا جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا:

① ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں جن میں سے ایک حیا ہے۔ ❶

② ایمان کی بہت سی شاخیں ہیں جن میں سب سے بڑھ کر توحید کا اقرار ہے اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ تم راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دو، (تاکہ تمہارے دوسرے بھائی کو تکلیف نہ ہو) ❷

③ جس میں تین باتیں ہوں، اس نے ایمان کا مزہ پایا، جس کو اللہ اور اس کا رسول سب سے پیارا ہو، جو دوسرے سے صرف اللہ کے لیے پیار کرے اور جس کو ایمان کے بعد پھر کفر میں مبتلا ہو جانے سے اتنا ہی دکھ ہو جتنا آگ میں پڑنے سے۔ ❸

④ جس میں یہ تین باتیں ہوں، اس نے ایمان کا مزہ پایا، حق بات کے سامنے جھگڑنے سے باز رہنا، مزاحمت کے باوجود جھوٹ نہ بولنا اور یقین کرنا کہ جو کچھ پیش آیا وہ ہٹ نہیں سکتا تھا۔

⑤ تین باتیں ایمان کا جزو ہیں، مفلسی میں بھی اللہ کی راہ میں دینا، دنیا میں امن اور سلامتی پھیلانا اور خود اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی انصاف کرنا۔ ❹

⑥ تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا ہے، جب تک اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔ ❺

⑦ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں اور مومن وہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسہ کریں کہ اپنی جان ومال اس کی امانت میں دے دیں۔ ❻

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب امور الایمان:۹؛ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان:۱۵۲۔ ❷ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان:۱۵۳۔

❸ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب حلاوۃ الایمان:۱۶؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان خصال...: ۱۶۵۔ ❹ کنز العمال: ۸۸، ۸۹۔

❺ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیه......:۱۳۔

❻ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون:۱۰۔

⑧ ایک شخص آ کر پوچھتا ہے کہ یارسول اللہ ﷺ! کونسا اسلام سب سے بہتر ہے؟ فرمایا: ”(بھوکوں کو) کھانا کھلانا اور جانے انجانے ہر ایک کو سلامتی کی دعا دینا۔“ (سلام کرنا) ❶

⑨ ایک شخص پوچھتا ہے کہ اے اللہ کے رسول! اسلام کیا ہے، فرمایا: ”اچھی بات بولنا اور کھانا کھلانا۔“ پھر پوچھا: ایمان کیا ہے؟ فرمایا: ”صبر کرنا اور اخلاقی جوانمردی دکھانا۔“ (سماحت)

⑩ مومن وہ ہے جو دوسروں سے الفت کرتا ہے اور جو نہ دوسرے سے الفت کرتا اور نہ کوئی اس سے الفت کرتا ہے، اس میں کوئی بھلائی نہیں۔

⑪ مومن نہ تو کسی پر طعن کرتا ہے، نہ کسی کو بددعا دیتا ہے، نہ گالی دیتا ہے اور نہ بدزبان ہوتا ہے۔ ❷

⑫ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر وہ ظلم کرے اور نہ اس کو گالی دے، جو اپنے کسی بھائی کی مدد میں ہوگا، اللہ اس کی مدد میں ہوگا، جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا، تو اللہ اس کی مصیبت دور فرمائے گا۔ ❸

⑬ مومن وہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں، مسلم وہ ہیں، جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں، مہاجر وہ ہے جس نے بدی کو چھوڑ دیا ہے، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کوئی اس وقت تک جنت میں نہیں جا سکتا، جب تک اس کا پڑوسی اس کے غصہ سے محفوظ نہ رہا ہو۔ ❹

⑭ جو صاحب ایمان ہے اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔ ❺

⑮ بے ایمان (منافق) کی نشانیاں تین ہیں، بولے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف کرے، اس کو امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔ ❻

ان مذکورہ بالا حدیثوں میں سے ایک ایک حدیث پر غور کرنا چاہیے، کہ اسلام اور ایمان کا اخلاقی تخیل کتنا اونچا اور کتنا بلند ہے۔

اخلاق حسنہ، صفات الٰہی کا سایہ ہیں

لیکن اسلام نے اخلاقِ حسنہ کا اس سے بھی ایک اور بلند تخیل پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اخلاق حسنہ درحقیقت صفات الٰہی کا سایہ اور ظل ہیں اور اسی کی صفات کاملہ کے ادنیٰ ترین مظاہر ہیں، حدیث میں ہے کہ

❶ بخاری، کتاب الایمان، باب اطعام الطعام: ۱۲؛ مسلم، کتاب الایمان: ۱۶۰۔
❷ ادب المفرد: ۳۱۲۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب لا یظلم المسلم المسلم: ۲۴۴۲۔
❹ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان تحریم ایذاء الجار: ۱۷۲۔ ❺ صحیح مسلم، باب الحث علی اکرام الجار و الضیف: ۱۷۳۔ ❻ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق: ۳۳؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب خصال المنافق: ۲۱۱ یہ تمام حدیثیں معتبر و مستند کتب حدیث کی کتاب الایمان میں موجود ہیں، ہم نے ان کو مجمع الفوائد، ص: ۲۰ تا ۲۲ و ما بعد اور کنز العمال، جلد اول، کتاب الایمان، ص: ۶ تا ۱۱ سے لیا ہے، کنز العمال میں ہر قسم کی حدیثیں ہیں مگر ہم نے ان کے انتخاب میں مشہور و معتبر حدیثوں کو ترجیح دی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

((حسن الخلق خلق الله الاعظم)) [1]

(طبرانی) یعنی ”خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلقِ عظیم ہے۔“

ہم انہی اخلاق کو اچھا کہتے ہیں، جو صفات ربانی کا عکس ہیں اور انہی کو برا کہتے ہیں جو اللہ کی صفات کے منافی ہیں، البتہ یہ ظاہر ہے کہ اللہ کی بعض خاص صفتیں ایسی بھی ہیں، جو اسی کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کا تصور بھی دوسرے میں نہیں کیا جا سکتا، جیسے اس کا واحد ہونا، خالق ہونا، نیز بعض ایسی پر جلال صفتیں بھی ہیں جو صرف اللہ ہی کو زیبا ہیں، جیسے اس کی کبریائی اور بڑائی وغیرہ، اس قسم کی صفات کا بندہ میں کمال یہ ہے، کہ ان کی مقابل کی صفتیں اس میں پیدا ہوں، اللہ کی کبریائی کے مقابلہ میں بندہ میں خاکساری اور تواضع ہو اور اللہ کی بلندی کے مقابلہ میں بندہ میں پستی اور فروتنی ہو، الغرض اسلام نے انسان کی روحانی تکمیل کا ذریعہ اخلاق کو اسی لیے قرار دیا ہے کہ وہ صفاتِ الٰہی کے انوار کے کسب وفیض کا سبب ہے، ہم جس حد تک اس کسب وفیض میں ترقی کریں گے، ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا اور یہی ہماری زندگی کی روحانی سیر کی آخری منزل ہے، [2] اخلاق کا اس سے بلند تر تخیل ممکن نہیں۔

---

[1] طبرانی فی الاوسط: ٨٣٤٤۔

[2] ہم نے اسمائے الٰہی کی بحث میں اس اجمال کی پوری تفصیل بیان کر دی ہے۔ دیکھو سیرت جلد چہارم طبع اول صفحات ۳۸۴، ۴۰۵۔ [وطبع ہذا ۲۰۱۲ء ج ۴، ص: ۳۳۴ تا ۳۵۱]

اخلاقی معلّموں میں آنحضرت ﷺ کا امتیاز

دنیا میں اخلاق کے بڑے بڑے معلم پیدا ہوئے، جن کے مکتب میں آ کر بڑی بڑی قوموں نے ادب کا زانو تہ کیا اور آداب واخلاق کے وہ سبق اس سے حاصل کیے جو سینکڑوں اور ہزاروں برس گزر جانے کے بعد بھی اب تک ان کو یاد ہیں اور سچ یہ ہے کہ آج جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کا کوئی نمونہ ہے، وہ انہی کے صحیفۂ تعلیم کا ایک ورق ہے، مگر ایک تنقیدی نظریہ بتادے گی کہ ان اخلاقی استادوں میں باہمی نسبت کیا ہے؟ ان کے تعلیمی نصاب کی ترتیب کن کن اصولوں پر مبنی ہے اور ان میں درسگاہ عالم کے سب سے آخری معلم ﷺ کو کیا امتیاز حاصل ہے۔ آنحضرت ﷺ سے پہلے نوعِ انسانی کے اخلاقی معلّمین کی دو جماعتیں ہیں، ایک وہ جس نے اپنی تعلیم کی بنیاد کسی اخروی مذہب پر رکھی، جیسے عام انبیا علیہم السلام، بعض مذہبوں کے بانی، دوسری وہ ہے، جس نے اپنے فلسفہ وحکمت اور عقل ودانائی کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی، ہم ان میں سے اول کو انبیا اور مصلحینِ دین اور دوسری کو حکما کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں، ان دونوں جماعتوں نے اپنے درس وتعلیم کے اصول اور طریقے الگ الگ اختیار کیے، پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں نے اپنی تعلیمات کا ماخذ ''حکم خداوندی'' کو قرار دیا، اس حکم وفرمان الٰہی کے سوا ان کی تعلیم کی کوئی اور بنیاد نہیں، نہ ان کی تعلیمات میں علت ومعلول کا سلسلہ ہے، نہ اخلاق کے دقیق نکتوں کی گرہ کشائی ہے اور نہ ان احکام وتعلیمات کی اخلاقی مصلحتوں اور عقلی حکمتوں کی تصریح ہے، دوسرے فریق کی تعلیمات میں علت ومعلول کی تحقیق، نفسیاتی خواص کی بحث، اخلاق کی غرض وغایت کی تعیین، قوائے عملی کی تحدید، یہ سب کچھ ہے، مگر بحث ونظر سے آگے عمل کا درجہ صفر محض ہے، اگر ہے تو بے کیف اور بے لذت مگر

ع یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

دنیا کے آخری معلم کی تعلیم میں حکم خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، فرمان الٰہی اور اخلاقی نکتہ وری، امر ربانی اور حکمِ فطرت، کتاب اور حکمت دونوں کی آمیزش ہے۔ انبیا اور حکما میں جو اصلی فرق اور امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ انبیا کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ان کی معصوم زندگی اور ان کے مقدس کارنامے اور ان کے پاک اثرات ہوتے ہیں، جن کا فیض ان کے ہر بن مو سے خیر وبرکت کی سلسبیل بن کر نکلتا ہے اور پیاسوں کو سیراب کرتا ہے، لیکن بلند سے بلند حکیم اور اخلاق کا دانائے رموز فلسفی جس کی اخلاقی سخن طرازی اور نکتہ پروری سے دنیا محوِ حیرت ہے اور جس نے انسان کے ایک ایک اندرونی جذبہ، باطنی قوت اور اخلاقی فطرت کا سراغ لگایا ہے، عمل کے لحاظ سے دیکھو تو اس کی زندگی ایک معمولی بازاری سے ایک انچ بلند نہ ہوگی، وہ گو دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے، مگر خود تاریکی سے باہر نہیں آتا، وہ دوسروں کی راہنمائی کا مدعی بنتا ہے، مگر خود عمل کی ہر راہ میں بھٹکتا پھرتا ہے، وہ رحم ومحبت کے طلسمات کے ایک ایک راز سے واقف ہے، مگر غریبوں پر رحم کھانا اور دشمنوں سے محبت کرنا وہ نہیں

جانتا، وہ سچائی اور راستبازی کی حقیقت پر بہترین خطبہ دے سکتا ہے، مگر وہ خود سچا اور راستباز نہیں ہوتا۔

اس واقعہ کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ محض زبان یا دماغ ہوتا ہے، دل اور ہاتھ نہیں، اس لیے اس کے منہ کی آواز کسی دل کی لوح پر کوئی نقش نہیں بناتی، بلکہ ہوا کے تموج میں مل کر بے نشان ہو جاتی ہے اور انبیا علیہم السلام چونکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں، جو ان کی تعلیم ہے، وہی ان کا عمل ہے، جو ان کے منہ پر ہے وہی دل میں ہے، اس لیے ان کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوشبو بن کر اڑتا اور ہم نشینوں کو معطر بنا دیتا ہے، یہی وہ فرق ہے جو انبیا اور حکما، یعنی موسیٰ، عیسیٰ، محمد رسول اللہ علیہم السلام، سقراط، افلاطون اور ارسطو میں نمایاں ہے، سقراط اور افلاطون کے مکالمات اور ارسطو کے اخلاقیات کو پڑھ کر ایک شخص بھی صاحب اخلاق نہ بن سکا، مگر یہاں قوموں کی قومیں ہیں، جو موسیٰ، عیسیٰ اور محمد رسول اللہ علیہم السلام کی تعلیم وتلقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج اور مراتب پر پہنچیں اور آج زمین کے کرہ پر جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کی کوئی کرن ہے، وہ نبوت ہی کے کسی مطلع انوار سے چھن کر نکل رہی ہے۔ مگر اس وصف میں سارے انبیا علیہم السلام یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان کے مختلف مدارج ہیں، ان کی عملی حیثیت کے کامل ہونے کے ساتھ ضرورت یہ ہے کہ ان کے اس درجہ کمال کی ایک ایک ادا عمل کی صورت میں نمایاں ہو، تاکہ ہر ذوق اور ہر رنگ کے رفیق اور اہلِ صحبت اپنی اپنی استعداد کے مطابق ان کی عملی مثالوں سے متاثر ہوں اور پھر وہ روایتوں کے اوراق میں محفوظ رہیں، تاکہ بعد کے آنے والے بھی اس نشان قدم پر چل کر مقصود کی منزل تک پہنچ سکیں، الغرض ایک کامل ومکمل اور آخری معلم کے لیے حسب ذیل معیاروں پر پورا اترنا نہایت ضروری ہے۔

① اس کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہ ہو۔

② اس کی ہر زبانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو۔

③ اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کارآمد گروہ کے لیے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو۔

بے پردہ زندگی

تنقید کے ان معیاروں پر اگر ہم سارے انبیا اور مذہبوں کے بانیوں کی زندگیوں کو جانچیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کسی کی زندگی بھی پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات پاک کے برابر جامع کمالات نہیں، دنیا کا کوئی پیغمبر یا بانی مذہب ایسا نہیں ہے، جس کی اخلاقی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے اس طرح بے نقاب ہو کہ گویا وہ خود ہمارے سامنے موجود ہے، توراۃ کے پیغمبروں میں سے کون سا پیغمبر ہے، جس کے اخلاقی کمالات ہمارے علم میں ہیں، ان غیر اخلاقی قصوں کا ذکر فضول ہے، جن کو توراۃ کے راویوں نے ان معصوم بزرگوں کے حالات میں شامل کر دیا ہے اور قرآن نے ہر جگہ ان کو ان بیہودہ الزامات سے پاک اور بری قرار دیا ہے، حضرت نوح علیہ السلام

سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک توراۃ کے ایک ایک پیغمبر پر نگاہ ڈال جاؤ، ان کی معصوم زندگی کے حالات کی کتنی سطریں تمہارے سامنے ہیں اور کیا ان کی اخلاقی شکل وصورت کی پوری شبیہ دنیا کے سامنے کبھی موجود رہی؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تینتیس (۳۳) برس کی زندگی میں سے صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے اور ان تین برسوں کے حالات میں سے بھی معجزات وخوارق کے سوا کوئی اور حال بہت کم معلوم ہے، ایسی صورت میں کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی اخلاقی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہیں؟

ان انبیا علیہم السلام کے علاوہ ہندوستان، ایران اور چین کے بانیانِ مذاہب کی اخلاقی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہو تو معلوم ہوگا کہ اس کے لیے دنیا میں کوئی سامان ہی موجود نہیں، کیونکہ ان کی اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر ناواقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے، صرف اسلام ہی کے ایک معلم کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف حرف دنیا میں محفوظ اور سب کو معلوم ہے اور بقول باسورتھ اسمتھ کے کہ ''یہاں (سیرت محمدی) پورے دن کی روشنی ہے، جس میں محمد ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو روز روشن کی طرح نمایاں ہے'' [1] آنحضرت ﷺ کا خود یہ حکم تھا کہ میرے ہر قول اور عمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچاؤ، محرمان راز کو اجازت تھی کہ جو مجھے خلوت میں کرتے دیکھو، اس کو جلوت میں برملا بیان کرو، جو حجرہ میں کہتے سنو اس کو چھتوں پر چڑھ کر پکارو، ((الا فلیبلغ الشاهد الغائب)) [2]

قول کے ساتھ عمل

اب دوسری حیثیت سے غور کیجیے ان مقدس ہستیوں کی تعلیم کی اچھائی، اخلاقی احکام کی خوبی اور مواعظ ونصائح کی عمدگی میں کوئی شبہ نہیں، لیکن کیا دنیا کو خود ان بزرگوں کے عملی اخلاق کا بھی تجربہ اور علم ہے؟ کوہ زیتون کے پرتاثیر واعظ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی معصومانہ باتیں، سچائی اور راستبازی کی نصیحتیں اور لفظی صنائع وبدائع اور دلکش تمثیلوں سے بھری ہوئی تقریریں دنیا نے سنیں اور ان کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام ودہن میں ہے، مگر کیا اس کی آنکھوں نے اس معصوم واعظ کی عملی مثالیں بھی دیکھیں؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''سب کچھ جو تمہارے پاس ہے، جب تک اس کو اللہ کی راہ میں لٹا نہ دو، آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہو گے۔'' [3] کیا اس نے اپنا بھی سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹایا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''شریروں کا مقابلہ نہ کرو۔'' کیا اس نے خود بھی شریروں کا مقابلہ نہیں کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''دشمنوں کو بھی پیار کرو۔'' [4] کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان ومال سے پیار کر۔'' کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''اگر تمہارے داہنے گال پر کوئی تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو۔'' [5] کیا اس نے خود بھی ایسا کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''تم سے اگر کوئی تمہارا کرتہ مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کر دو۔'' [6]

---

[1] باسورتھ اسمتھ کی کتاب سیرت محمد ﷺ ص:۱۰۸۔ [2] صحیح بخاری، کتاب العلم، باب قول النبی ﷺ رب مبلغ: ۶۷۔ [3] انجیل، متی باب، ۱۹، ۲۳۔ [4] انجیل متی باب: ۵۔٤٤ ولوقا باب٦، ۲۷۔
[5] متی باب، ۵، ۳۹۔ [6] ایضاً ۴۱۔

کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور میں آئی؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیح علیہ السلام میں یہ صفتیں موجود نہ تھیں، بلکہ یہ کہنا ہے کہ انجیل نے ان کی اس حیثیت کو محفوظ نہیں رکھا ہے۔

مگر اسلام کے اخلاقی معلم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے، اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کر کے دکھایا، اس کا جو قول تھا وہی اس کا عمل تھا، اس نے یہودیوں کو طعنہ دیا، کہ ﴿ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ: ٤٤) ''کیا اوروں کو نیکی کی بات بتاتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔'' اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ ﴿ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝ ﴾ (٦١/ الصف: ٢۔٣) ''تم کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں، بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ جو نہ کرو۔''

ایک شخص نے آ کرام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا: ''کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ کان خُلُقُهُ القران۔'' [1] جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے، وہی حامل قرآن کی سیرت میں بصورت عمل تھا، اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد و اعانت کا حکم دیا، تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا، خود بھوکے رہے اور دوسروں کو کھلایا، اگر آپ ﷺ نے اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا، کھانے میں زہر دینے والوں سے درگزر کیا، اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا، جنہوں نے آپ ﷺ پر تیر برسائے اور تلواریں چلائیں، مسلح ہو کر بھی کبھی ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا، کپڑوں کی شدید ضرورت کے وقت میں بھی جس نے آپ سے کپڑا مانگا، خود اپنی چادر اتار کر اس کے حوالہ کر دی، سیرت کی دوسری جلد میں یہ واقعات پوری شرح و تفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں، الغرض یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور راہنماؤں کے صرف تعلیمات اور اقوال سناتے ہیں اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں اور مسلمان اپنے پیغمبر کے نہ صرف اقوال و نصائح کو بلکہ اس کے عملی نمونوں اور کارناموں کو بھی پیش کرتے اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں، دنیا کے کسی پیغمبر اور بانی دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیت کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اس کے ہمعصروں کے سامنے پیش نہیں کیا، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلا خوف و خطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیت کو خود اس کے معاصرین کے سامنے نقد و تبصرہ کے لیے پیش کیا۔ فرمایا:

﴿ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝ ﴾ (١٠/ یونس: ١٦)

''(اے منکرو!) میں تو تمہارے درمیان اس سے پہلے ایک زمانہ بسر کر چکا ہوں، کیا تم نہیں سمجھتے۔''

[1] ابوداود، کتاب التطوع، باب فی صلوۃ اللیل: ١٣٤٢؛ صحیح ابن حبان، کتاب الصلاۃ، باب فی قیام اللیل: ٢٥٤٢۔

پھر آپ ﷺ کو خطاب کر کے خود آپ سے فرمایا:

﴿ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ ﴾ (٦٨/ القلم:٤)

''(اے محمد ﷺ !) بیشک آپ تو اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو۔''

کامل و مکمل

اخلاقی معلم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے، یعنی وہ خود کامل ہو اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو، وہ خود پاک ہو اور دوسرے ناپاکوں کو بھی دھو کر پاک وصاف کر دیتا ہو، اخلاق کے سارے معلموں کی فہرست پر ایک نظر ڈال جاؤ کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس میں تھی؟ کیا اس میں جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگدلی اور کجروی کا گلہ کرنا پڑا ہے، کیا اس میں جن کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اتر سکے، یا اس میں تھی جس کی نسبت اس کے صحیفۂ وحی نے بار بار اعلان کیا:

﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ ﴾ (٦٢/ الجمعة:٢)

''وہ ان کو اللہ کی باتیں سناتا اور ان کو پاک وصاف بناتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔''

اس تحدی اور اعلان میں یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے، کہ اس میں اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہی دعویٰ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا اور اللہ کے احکام سناتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کو اپنے فیض واثر سے پاک وصاف ومصفا بنا بھی دیتا ہے، وہ ناقصوں کو کامل، گناہگاروں کو نیک، اندھوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن دل بنا دیتا ہے، چنانچہ جس وقت اس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا، کم از کم ایک لاکھ انسان اس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے تھے اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا، تیس برس کے بعد وہ اخلاق کے اس اوج کمال پر پہنچا جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا۔

تعلیمِ اخلاق کا تنوع

اگر کسی معلم میں تکمیل کی یہ تاثیر ہو، پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اس عالم کی تکمیل اور نظم ونسق کے لیے ایک ہی قوت کے انسانوں کی نہیں، بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں کے انسانوں کی ضرورت ہے، اخلاق کے دوسرے معلمین کی درسگاہوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہاں صرف ایک فن کے طالب علم تعلیم پاتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایاں نہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مکتب میں عفو ودرگزر کے سوا کوئی اور سبق نہیں، بودھ کے وہار اور خانقاہ میں دربدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی درسگاہِ اعظم میں آ کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے، جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشو ونما پا رہی ہے، خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے، جس

کے اندر علم وفن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب علم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسبِ کمال کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار، ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد وعابد اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے، یہ تمام انسانی طبقے آپ کے سامنے آ کر زانوئے ادب تہ کرتے ہیں اور اپنے اپنے پیشہ وفن کے مطابق آپ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں، مدینۃ النبی ﷺ کی اس درسگاہ اعظم کو غور سے دیکھو، جس کی چھت کھجوروں کے پتوں سے اور ستون کھجور کے تنوں سے بنائے گئے تھے اور جس کا نام مسجد نبوی ﷺ تھا، اس کے الگ الگ گوشوں میں ان انسانی جماعتوں کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے ہیں، کہیں ابوبکر وعمر عثمان وعلی رضی اللہ عنہم جیسے فرمانروا زیر تعلیم ہیں، کہیں طلحہ وزبیر ومعاویہ وسعد بن معاذ وسعد بن زبیر رضی اللہ عنہم جیسے ارباب رائے وتدبیر ہیں، کہیں خالد ابوعبیدہ، سعد بن وقاص اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم جیسے سپہ سالار ہیں، کہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمران، عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنن بنے، کہیں ان زہاد وعباد کا مجمع ہے، جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹتی تھیں، کہیں ابوذر وسلمان وابودرداء رضی اللہ عنہم جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو ''مسیح اسلام'' کہلاتے تھے، کہیں وہ صفہ والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑی لا کر بیچتے اور گزارہ کرتے اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے، کہیں حضرت علی، حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم جیسے فقیہ ومحدث تھے، جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا، ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے، تو دوسری جگہ آقاؤں کی محفل ہے، کہیں غریبوں کی نشست ہے اور کہیں دولتمندوں کی مجلس ہے، مگر ان میں ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی، سب مساوات کی ایک ہی سطح پر اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہیں، سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا ہے اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجیں لے رہا ہے اور سب اخلاق واعمال کے ایک ہی آئینہ قدس کا عکس بننے کی کوشش میں لگے ہیں۔ [1]

---

[1] اس موقع پر مدراس والے میرے چھ خطبوں پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

اسلام کا فلسفہ اخلاق

ان اصولوں کی تفصیل وتشریح کے لیے ہم کو تھوڑی دیر کے لیے فلسفہ اخلاق کے کانٹوں میں الجھنا ہوگا، اخلاق کا وجود تو یقیناً اس وقت سے ہے، جب سے انسان کی زندگی اور اس کے ذہنی وجسمانی اعمال کا وجود ہے، مگر ان اعمال کی حقیقت پر بحث، ان کے اسباب وعلل کی تلاش، ان کے اصول وقوانین کی تحقیق اور ان کی غرض وغایت کی تعیین، یونانیوں کے عہد میں شروع ہوئی اور موجودہ عہد میں علم نفسیات کے زیر سایہ پرانے نظریوں پر نظر ثانی کی گئی، ان اسباب وعلل، اصول وقوانین اور غرض وغایت کی تحقیق میں شروع سے آج تک فلسفیوں میں قدم قدم پر اختلافات رونما ہوئے، ہر سوال کے جواب میں متعدد نظریے بنتے اور بگڑتے رہے اور نئے نئے فرقے اور اسکول پیدا ہوتے رہے اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام پڑ چکا ہے، تاہم اگر ان سب کو سمیٹنا چاہیں تو اساسی اور کلی طور پر یہ تمام مذاہب انہی دو قدیم مسلکوں کی تشریح ہیں، جنھیں یونانی اصطلاح میں ''رواقیہ'' اور ''لذتیہ'' کہا گیا ہے، موجودہ اصطلاح میں پہلے کو ''ضمیریہ'' اور دوسرے کو ''افادیہ'' کہہ لیجئے، یا ایک اور تعبیر کے لحاظ سے یوں کہیے، پہلا فریق اخلاق کی بنا ''جذبات'' پر قرار دیتا ہے اور دوسرا ''عقل'' پر، پھر اس منشائے اختلاف کے تحت میں تعبیر کے اختلاف سے اور بہت سے فرقے پیدا ہوگئے، ارسطو اور اس کے متبعین نے اخلاق کا مبنیٰ نفس کی تکمیل کو قرار دیا ہے۔

اخلاقی قوانین کی حقیقت اور اصل مآخذ کی نسبت بھی بے انتہا اختلافات ہیں، علمائے اخلاق کے مختلف فرقوں نے بادشاہ کا قانون، اللہ کا قانون، فطرت کا قانون، حاسۂ اخلاق کی آواز، ضمیر کا قانون، وجدانیت اور پھر بالآخر عقل کا قانون، کہہ کر الگ الگ اپنے نظریوں کی بنیاد ڈالی ہے، لیکن درحقیقت ان کی بھی دو ہی اصلی تقسیمیں ہیں، یعنی یہ کہ یہ قوانینِ اخلاق کسی وحی والہام سے ماخوذ ہیں، یا کسی بیرونی ماخذ سے، جو لوگ وحی و الہام پر ایمان نہ لاسکے، انھوں نے ان قوانین کا کوئی بیرونی ماخذ قرار دینا چاہا، پھر کسی نے اس بیرونی ماخذ کو خود انسان کے اندر تلاش کیا اور کسی نے اس سے باہر، جنھوں نے خود انسان کے اندر تلاش کیا، انھوں نے بہ اختلاف مذاق انسان کی اصل فطرت کو انسان میں ایک خاص حاسۂ اخلاقی کو، انسان کے وجدان کو، انسان میں ضمیر کو اور آخری طور پر خود انسان کی عقل کو ان کا ماخذ قرار دیا، جنہوں نے انسان سے باہر ڈھونڈا، انھوں نے قبیلہ کے سردار اور بادشاہ کے حکم اور سوسائٹی کے رسم ورواج کو ان کا ماخذ قرار دیا، مگر سوال تو یہ ہے کہ قبیلہ کے سردار کا حکم، یا بادشاہ کا حکم، یا سوسائٹی کے رسم ورواج کی بنیاد خود کس اصول پر پڑی؟ اس لیے لامحالہ اس بیرونی ماخذ کو چھوڑ کر پھر کسی اندرونی ہی ماخذ کو اصل مبنیٰ قرار دینا ہوگا، ورنہ اخلاقی اصول کو فطری ہونے کے بجائے، مصنوعی اور ساختہ وپرداختہ بتانا پڑے گا، جو اخلاق کے امہاتِ مسائل میں کبھی قبول نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو اخلاق کا ماخذ اللہ کے حکم کے سوا کسی اور شے کو تسلیم کرتا ہو، لیکن اسلام اس کے ساتھ یہ کہتا

ہے کہ اللہ نے اپنے ان احکام کو وحی کے الفاظ میں بیان بھی کیا ہے اور اپنے بندوں کی فطرت میں ودیعت بھی رکھا ہے، تاکہ فطرت اگر کسی سبب سے خاموش رہے تو احکامِ الٰہی کی آواز اس کو پکار کر ہشیار کر دے، فلسفیانہ کاوشوں اور موشگافیوں کو چھوڑ کر عملی حیثیت سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریے باہم کسی قدر متخالف ہونے کے باوجود بھی باہم اس قدر متضاد نہیں کہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہوسکیں، ہوسکتا ہے کہ ہمارے اخلاق کا ماخذ اللہ کا حکم ہونے کے ساتھ اس کے تائیدی ماخذ اور محرکات، ضمیر، فطرت، وجدان اور عقل سب ہوں، اسی طرح معیار اخلاق کے اختلافات میں بھی توافق ممکن ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انسان بغیر کسی ذاتی غرض و غایت کو خیال میں لائے ہوئے، محض اپنی فطرت کے اصرار یا ضمیر کی پکار سے مجبور ہو کر ایک کام کو انجام دے، یا اپنا فرض سمجھ کر اس کو پورا کرے، یا اس کے ساتھ کسی مصلحت عامہ کی افادی حیثیت بھی اس میں ملحوظ ہو اور وہ روحانی تکمیل کا بھی ذریعہ ہو، اسلام کے اخلاقی فلسفہ میں یہ سب جہتیں ایک کام میں مجتمع ہوسکتی ہیں۔

فرض کیجئے کہ ایک مظلوم کی امداد، اللہ کا حکم بھی ہے اور ہماری فطرت کے اندر بھی یہ ودیعت ہے، ہمارے ضمیر کا بھی یہی تقاضا ہے اور وجدان بھی اسی طرح اس کام کو اچھا کہتا ہے، جس طرح وہ ایک خوبصورت چیز کو خوبصورت یقین کرنے پر مجبور ہے، ساتھ ہی اس کے اندر عام فائدے اور مصلحتیں بھی ہیں اور ہم کو اس سے مسرت بھی ہوتی ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بہت سے ایسے مواقع بھی ہو سکتے ہیں، جہاں خدا، ضمیر، فطرت، جذبات اور وجدان کا ایک حکم ہو اور ہماری خود پسند اور مصلحت شناس عقل دوسری طرف جا رہی ہو، اسی لیے اخلاق کے باب میں وہ عقل جو ہمارے قویٰ کے مجموعی احکام کے خلاف جانا چاہتی ہے، اصلاح کے لائق ہے۔

الغرض اللہ کے حکم ہونے کے ساتھ اسلام ان کو انسان کے اندر کی آواز بھی کہتا ہے، اس اندر کی آواز کو خواہ فطرت کہیے، وجدان کہیے، حاسۂ اخلاقی کہیے، ضمیر کہیے، اس فلسفیانہ تشقیق سے اس کو بحث نہیں اور باوجود اس کے وہ ان کو عقل اور مصلحت اور فوائد پر بھی مبنی سمجھتا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بات بدیہی طور سے ثابت ہے، کہ انسان میں زیادہ تر اخلاقی اصول ایسے ہیں، جن کی اچھائی یا برائی پر آب وہوا، خصوصیاتِ اقلیم، زبان، مذہب، رسم و رواج، طرزِ حکومت وغیرہ، صدہا اختلافات کے باوجود دنیا کی ساری قومیں بلا دلیل متفق اور متحد ہیں، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اخلاقی حس ہمارے اندر اسی طرح فطرۃً ودیعت ہے، جس طرح دوسرے قویٰ اور حواس ودیعت ہیں، اب یہ کاوش کہ جس طرح مرئیات، مسموعات اور ملموسات وغیرہ کے لیے ہمارے اندر باصرہ، سامعہ اور لامسہ کے نام سے الگ الگ حاسے ہیں، اسی طرح اخلاقی تمیز کے لیے ہمارے اندر کوئی خاص اخلاقی حاسہ ہے، جس سے ہم اخلاق کی اچھائی اور برائی کا احساس اور تمیز کرتے ہیں، یا کوئی اخلاقی وجدان ہمارے اندر ہے، جس کے ذریعہ سے ہم اس طرح اس کا احساس کرتے ہیں، جس طرح

ہم دوسرے وجدانیات جیسے حسن وقبح، خوبصورتی اور بدصورتی کا، یا یہ کہ ہمارے اندر کوئی روحانی آواز ہے جو ہم کو بروقت ہمارے فرائض یاد دلاتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ اچھا ہے یا برا، عملی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ تعلیم محمدی ﷺ نے گو اخلاق کے ان اصول ومبانی کی طرف کہیں تفصیلی اور کہیں اجمالی اشارات کیے ہیں، مگر اس نے اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے کہ اخلاق کی خوبی ان کے علم وفلسفہ میں نہیں، بلکہ ان کے عمل میں ہے، اس لیے ''علم بلاعمل'' کی کوئی قدر وقیمت اس کی نگاہ میں نہیں، لیکن اسی کے ساتھ ''عمل بلاعلم'' کو بھی اس نے پسندیدہ نہیں سمجھا ہے، اسی بنا پر اس نے ان اصولوں کی طرف اشارے تو کیے ہیں، مگر اخلاق کے باب میں ان کی عالمانہ تحقیق وتلاش کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔

اسلام نے اخلاق کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر ادا کیے جائیں کہ یہ اللہ کے احکام ہیں، وہ اللہ کے دوسرے فطری احکام کی طرح ہمارے اندر ودیعت ہیں، انہی احکام الٰہی کے مطابق ہمارا ضمیر، وجدان، اخلاقی حاسہ اور عقل میں سے جس ایک کو یا سب کو اصل کہیے ہونا چاہیے، ان میں باہم جس حد تک باہمی مطابقت و موافقت زیادہ ہوگی، اسی قدر انسان کا روحانی کمال بلند ہوگا اور جس حد تک ان میں کمی ہوگی اسی حد تک اس کے کمال میں نقص ہوگا۔ ایک مسافر کی امداد یا ایک بیمار کی تیمارداری یہ سمجھ کر کی جائے کہ یہ اللہ کا حکم ہے، پھر کرنے والے کے ضمیر کی آواز بھی یہی ہونی چاہیے، اس کا وجدان بھی یہی ہو، اس کو وہ اپنا فرض بھی جانے، اس کے کرنے میں وہ اپنے اندر روحانی مسرت بھی محسوس کرے اور اسی کی پیروی میں نوع انسان کی کثیر جماعت کا فائدہ بھی سمجھے، الغرض جس حد تک اس کے ان تمام قویٰ میں اس بارہ میں باہم موافقت اور یکسانی ہوگی، اتنا ہی اس کا روحانی کمال بلند ہوگا اور جس قدر اس توفیق میں کمی ہوگی کہ اللہ کا حکم سمجھ کر بھی اس کے اندر کے ضمیر اور وجدان کی یہ آواز نہ ہو، یا وہ اس کو اپنا انسانی فرض نہ سمجھے، یا اس سے اس کو روحانی مسرت اور انبساط پیدا نہ ہو، اسی قدر اس کے روحانی وایمانی کمال میں نقص پیدا ہے، کتنا ہی نیک کام ہم اللہ کا حکم سمجھ کر انجام دیں، لیکن اگر ہمارا اندرونی احساس اور ضمیر اس کو نیک نہیں سمجھتا اور ہماری عقل اس کے خلاف ہم کو راہ سمجھاتی ہے، تو اس کے یہ صاف معنی ہیں کہ ابھی تک اس کے اللہ کے حکم ہونے پر ہمارا یقین پختہ نہیں ہوا ہے، جس کے دوسرے معنی ایمان اور روحانی تکمیل کا نقص ہے، اسی طرح اگر کسی نیک سے نیک کام کو کوئی انسان صرف اپنے ضمیر کی آواز یا صرف فرض یا وجدان یا حصولِ مسرت یا افادہ عام کی غرض سے انجام دے، مگر اللہ کے حکم کی حیثیت اس میں ملحوظ نہ رکھے، تو وہ کام بھی اسلام کی نظر میں ثواب اور تزکیہ روح کا ذریعہ نہیں۔

بے غرضی

چونکہ اسلام میں اخلاق بھی دوسری مذہبی چیزوں کی طرح عبادت ہے، اس لیے اس کی غرض وغایت بھی ہر قسم کی دنیاوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہیے، اگر ایسا نہیں ہے تو ان کاموں میں کوئی

نیکی اور ثواب نہیں اور نہ ان کی حیثیت عبادت کی باقی رہے گی، مذہبی کاموں کو چھوڑ کر، دنیاوی کاموں پر بھی نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے کام میں جس قدر اخلاص کا حصہ شامل ہوتا ہے، اسی قدر وہ قابل قدر رہتا ہے، ہم کسی مہمان کی کتنی ہی خاطر کریں اور اس کے سامنے کتنے ہی الوان نعمت چن دیں، لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس خاطر داری کی تہ میں ذاتی نفع، یا ریاکاری یا نمائش یا خوشامد یا کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے، تو ہماری یہ تمام خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم اس کی نگاہ میں بے قیمت ہو جاتی ہے، لیکن اگر ہم کسی کے سامنے اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ نان و نمک ہی رکھ دیں، تو اس کی وقعت اور قدر و قیمت کی کوئی انتہا نہ رہے گی، تو جب دنیاوی کاموں میں اخلاص اور عدم اخلاص کے یہ اثرات ہیں، تو روحانی عالم میں ان کے نتائج کہاں تک ہوں گے۔

نیت

اسی لیے آنحضرت نے اپنی تعلیمات میں نیت یعنی قلبی ارادہ اور انسان کی اندرونی غرض و غایت کو ہر اچھے اور برے کام کی بنیاد قرار دیا ہے، بلکہ حقیقت میں روحانی حیثیت سے کوئی کام اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا یا برا نہیں ہوتا، جتنا قلب کی کیفیت اور اس کی اندرونی نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے، ایک دو مثالوں سے یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائے گی، ایک شخص نے نہایت اصرار سے کسی کو رات کی تاریکی میں اپنے گھر اس لیے بلایا کہ اس کو یقین تھا کہ راہ کے ڈاکو اس کو مار ڈالیں گے، یا سخت تکلیف پہنچائیں گے، اتفاق یہ کہ وہ اندھیرے میں بھٹک کر دوسرے راستہ پر جا پڑا اور وہاں اس کو اشرفیوں کی تھیلی راستہ میں پڑی ملی، تو گو اس سفر کا نتیجہ کتنا ہی اچھا ہو، مگر اس بلانے والے کی نیت کی برائی میں اب بھی کوئی شک نہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے رات کو اندھیرے میں بلوا کر اس پر احسان کیا، لیکن ایک اور شخص نے اس کو رات کے اندھیرے میں درحقیقت اس کے ساتھ احسان کرنے ہی کی نیت سے اس کو بلوایا، لیکن اتفاق سے وہ راستہ میں کسی گڑھے یا کنویں میں گر کر مر گیا، تو وہ بلانے والا بدی کے گناہ کا مرتکب نہ ہوگا، کہ گو جانے والے کے سفر کا نتیجہ خراب نکلا، مگر پہلے شخص کی طرح اس دوسرے شخص کی نیت بری نہ تھی۔

ایک دوسری مثال فرض کیجئے، میری جیب میں روپیوں کا ایک بٹوا تھا، اتفاق سے وہ راستہ میں گر گیا جب میں راستہ سے واپس پلٹا، تو ایک بٹوا پڑا دیکھا اور دل میں یہ خیال کر کے کہ یہ کسی دوسرے کا ہے، چپکے سے اٹھا لیا، تو اگرچہ واقعہ کے لحاظ سے میں کسی برائی کا مرتکب نہیں ہوا، مگر اپنے ارادہ اور نیت کے لحاظ سے برائی کر چکا، لیکن فرض کیجئے کہ کسی دوسرے موقع پر اسی قسم کا بٹوا مجھ کو سڑک پر پڑا ملا اور میں نے اس کو اپنا سمجھ کر اٹھا لیا، تو گو واقعہ کتنا ہی مختلف ہو، پھر بھی میرا دامن گناہ کی برائی سے پاک ہے، راستہ میں کوئی چل رہا ہو اور ایک عورت سامنے سے نظر آئے، اس نے اس کو بیگانہ اور غیر سمجھ کر کسی بری نیت سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا،

مگر درحقیقت وہ اس کی بیوی تھی، یا اس نے کسی غیر عورت کی طرف یہ سمجھ کر ہاتھ بڑھایا کہ وہ اس کی بیوی ہے، حالانکہ یہ واقعہ نہ تھا، تو پہلی صورت میں اس کا دل گناہگار ہو چکا اور دوسری صورت میں اس کی بے گناہی بالکل ظاہر ہے، نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہو سکتا ہے، لیکن اگر وہ بھی فخر، نمائش، ریا اور دکھاوے کی خاطر سے کیا جائے تو وہ ثواب کے بجائے الٹا عذاب کا باعث ہوگا، اسی طرح آپ اگر کسی معذور کی امداد اس لیے کریں کہ لوگ آپ کی تعریف کریں گے، تو اسلام کی نگاہ میں یہ نیکی کا کام شمار نہ ہوگا، سورۂ آل عمران میں ہے:

﴿ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ ﴾

(۳/ آل عمران:۱٤٥)

''اور جو دنیا کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے، جو آخرت کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے۔''

ایک اور آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ جس کام کا مقصد صرف نمائش اور دکھاوا ہو اسکی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں، فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ﴾ (۲/ البقرة:۲٦٤)

''اے ایمان والو! تم اپنی خیراتوں کو احسان دھر کر اور ستا کر برباد نہ کرو، جس طرح وہ اپنے مال کو برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور قیامت پر یقین نہیں رکھتا۔''

اسی قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں، جن کی تفسیر میں آنحضرت نے یہ مختصر لیکن جامع و مانع الفاظ فرمائے ہیں:

((انما الاعمال بالنيات)) [1]

''انسان کے اعمال اس کی نیت پر موقوف ہیں۔''

اور اس کی مزید تصریح کے لیے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

((ولكل امرئ مانوى فمن كانت هجرته الى الله ورسوله فهجرته الى الله ورسوله و من كانت هجرته الى دنيا يصيبها اوامراة يتزوجها فهجرته الى ما هاجر اليه)) [2]

''ہر شخص کے لیے وہی ہے، جس کی وہ نیت کرے، تو جس کی ہجرت اللہ و رسول کی طرف ہے، تو اس کی ہجرت اللہ و رسول کی طرف ہے اور جس کی ہجرت کی غرض دنیا کمانا ہو، یا کسی عورت کو پانا ہو کہ اس سے نکاح کرے، تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے، جس کی غرض سے اس نے ہجرت کی۔''

الغرض عمل کا نیک و بد ہونا تمام تر نیت اور ارادہ پر موقوف ہے اور اسی لیے اخلاق کی بحث میں اس کو

[1] صحيح بخاري، كتاب بدء الوحي:١ وكتاب الايمان، باب ان الاعمال بالنية والحسبة:٥٤۔ [2] ايضًا۔

خاص اہمیت حاصل ہے، حسن نیت نہ ہو تو اخلاق کا بڑے سے بڑا کام بھی حسنِ خلق کے دائرہ سے خارج، دنیاوی تعریف وستائش کے حدود سے باہر اور روحانی خیر و برکت اور ثواب سے محروم رہ جاتا ہے۔

فلسفہ اخلاق کی تائید

آنحضرت کی اخلاقی تعلیم کا یہ وہ اصول ہے، جس کی حرف بحرف تائید جدید فلسفہ اخلاق سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ جان ایس میکنزی، اپنی تصنیف ''مینول آف ایتھکس'' کی پہلی کتاب کے چھٹے باب میں لکھتا ہے:

جس چیز پر حکم لگایا جاتا ہے، وہ صاف ہے، یعنی فعل ارادی، جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے، یہی وہ چیز ہے جس سے اخلاقیات میں شروع سے آخر تک بحث ہوتی ہے، اس کا کام تمام تر ارادہ کی صحیح جہت ہی کا بتلانا ہے، جو اخلاقی احکام ہم لگاتے ہیں، ان کا تعلق بھی ارادہ ہی سے ہوتا ہے، جس فعل میں ارادہ شامل نہیں اس کی اخلاقی حیثیت نہیں۔

اس مسئلہ کی ایک دو مثالیں دے کر کینٹ کی رائے نقل کی ہیں:

> ''اسی لیے کینٹ نے اپنی اخلاقیات کی کتاب کو جس مشہور ومعروف دعویٰ کے ساتھ شروع کیا ہے، اس کی ہم کو تصدیق کرنی پڑتی ہے، وہ کہتا ہے کہ ''بجز اچھے ارادہ کے دنیا بھر میں بلکہ دنیا کے باہر بھی کوئی ایسی شئے نہیں ہے، جس کو علی الاطلاق بلا کسی قید وشرط کے اچھا کہا جا سکے۔'' [1]

اخلاق کے لیے ایمان کی شرط

جب یہ ظاہر ہو چکا کہ اخلاق کی تمام تر بنا، ارادہ ونیت، یعنی قلب کے عمل پر ہے، تو قلب کی اندرونی کیفیت اور حالت کی درستی کے لیے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہے، جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے، ہم مجمع میں ہوں یا تنہائی میں، اندھیرے میں ہوں یا روشنی میں، تاہم کوئی ہے، جس کی آنکھیں اس کے دل کی تہ کو ہزار پردوں میں بھی دیکھ رہی ہیں، دنیا کی تمام قوتیں صرف جسم پر حکمران ہیں، مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمران ہے، پھر یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ ہم کو اس ہستی کے آگے اپنے تمام کاموں کا جواب دہ ہونا ہے اور ایک دن آئے گا، جب ہم کو اپنے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی، جب تک یہ دو خیال دل و دماغ میں جاگزیں نہ ہوں گے، اچھے اعمال کا اچھے ارادہ سے وجود قطعی محال ہے، اسی لیے وحی محمدی نے اللہ اور قیامت پر ایمان لانا، ہر نیک عمل کی بنیاد قرار دی ہے، کہ بے اس کے ہر کام محض ریا اور نمائش بن جاتا ہے، فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ﴾ (۲/ البقرة: ۲٦٤)

---

[1] علم اخلاق، کتاب اول باب ششم ص: ۱۱۰ مترجم پروفیسر عبدالباری ندوی، شائع کردہ جامعہ عثمانیہ: ۱۳۴۱ھ۔

''اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو جتا کر یا ستا کر برباد نہ کرو، جس طرح وہ برباد کرتا ہے، جو اپنے مال کو لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخری دن پر یقین نہیں رکھتا۔''

یہی ایمانِ صحیح جس سے حسنِ نیت پیدا ہوتا ہے، آبِ حیات کا وہ سرچشمہ ہے، جو نہ ہو تو ہمارے اعمال سراب سے زیادہ بے حقیقت ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــًٔا ﴾ (۲۴/ النور:۳۹)

''اور جو اللہ اور قیامت کو نہیں مانتے، ان کے کام ایسے ہیں، جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے، جب وہاں جائے تو اس کو کچھ نہ پائے۔''

یہی وہ مشعل ہے، جو ہماری تیرہ و تار زندگی کی روشنی ہے، یہ نہ ہو تو ہم کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے اور اپنے کسی کام کی کوئی غایت معلوم نہ ہو:

﴿ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰـىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾

(۲۴/ النور:۴۰)

''یا (اللہ اور قیامت کے) نہ ماننے والوں کے کاموں کی مثال ایسی ہے کہ اندھیرے میں گہرے دریا میں اس کو لہر ڈھانکے ہے، اس لہر پر دوسری لہر ہے، اس پر گھٹا چھائی ہے، تاریکیاں ہیں ایک پر ایک جب اپنا ہاتھ نکالے تو سوجھتا نہیں اور جس کو اللہ نے روشنی نہیں دی اس کو کہیں روشنی نہیں۔''

جب تک کسی واقفِ اسرار، عالم الغیب، دانائے راز اور دل کی ہر جنبش اور ہر حرکت سے باخبر ہستی کا اور اس کے سامنے عمل کے مواخذہ، باز پرس اور جواب دہی کا یقین نہ ہوگا، دل میں اخلاص اور نفس میں دنیاوی اغراض سے پاکی پیدا نہیں ہوسکتی اور نہ بے غرضانہ بلند پایہ اخلاق کا وجود ہوسکتا ہے۔

غرض و غایت

اسی لیے آنحضرت ﷺ کی شریعتِ کاملہ میں نفسِ عمل مطلوب نہیں، بلکہ وہ عمل مطلوب ہے، جس کی غرض و غایت صحیح ہو، عمل قالب ہے، تو صحیح غرض و غایت اس کی روح ہے، روح نہیں تو بے جان قالب کس کام آسکتا ہے، حکمائے اخلاق کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انسان کا کوئی فعل غرض و غایت سے خالی نہیں ہوتا، لیکن یہ غرض و غایت ہے کیا؟ اس پر آج تک وہ متفق نہیں ہوسکے، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے زمانہ سے لے کر آج تک بیسیوں نظریے قائم ہوچکے ہیں، لیکن حقیقت کا راز اب تک آشکارا نہیں۔

اسلام کو اس سے بحث نہیں کہ اخلاق کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے، بلکہ اس سے بحث ہے کہ اخلاص کی غرض و غایت کیا ہونی چاہیے، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے کام کی ادنیٰ اور اعلیٰ، پست اور بلند متعدد غرضیں اور رعایتیں ہوسکتی ہیں، ہم راہ میں ایک بوڑھے کی گردن سے بوجھ اتار کر خود اٹھا لیتے ہیں اور اس کو اس کے گھر تک باآرام پہنچا دیتے ہیں، ہمارے اس کام کی غرض یہ ہوسکتی ہے کہ گھر پہنچ کے بڈھا خوش ہو کر ہم کو مزدوری اور انعام دے گا، یہ بھی مقصد ہوسکتا ہے کہ لوگ ہم کو دیکھ کر ہماری تعریف کریں گے اور کسی پبلک منصب اور عہدہ کے انتخاب میں وہ ہم کو اپنی رائے دیں گے، یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ راستہ چلتے لوگ ہم کو اس حالت میں دیکھ کر ہمیں بڑا نیک اور دیندار سمجھیں گے، یہ بھی غرض ہوسکتی ہے کہ آج اگر ہم جوانی میں اس بوڑھے کی مدد کریں گے، تو کل ہمارے بڑھاپے میں کل کے نوجوان ہماری مدد کریں گے، بعض نیک لوگوں کو ایسے کاموں کے کرنے سے طبعاً خوشی ہوتی ہے، وہ اپنی اس خوشی کے لیے اس قسم کے کاموں کو کرتے ہیں، بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک بوڑھے کو اس حال میں دیکھ کر ترس کھاتے ہیں اور اس سے متاثر ہو کر یہ کام کرتے ہیں، غرض ایک ہی قسم کے کام کے یہ تمام مختلف اغراض، مختلف اشخاص کے کاموں کی غایت اور محرک ہوسکتے ہیں، لیکن اس فہرست پر دوبارہ غور کی نظر ڈالیے، تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام اغراض بتدریج پستی سے بلندی کی طرف جارہے ہیں اور جس حد تک جو غرض فاعل کی ذاتی و نفسانی غرض و غایت سے پاک ہے، اسی قدر وہ بلند اور قابل قدر ہے، کسی مالی یا جسمانی معاوضہ کی خاطر کوئی نیک کام کرنا سب سے پست مقصد ہے، اس کے بعد عزت و شہرت کی طلب اور نیک نامی کے حصول کے لیے کرنا بھی گو پست مقصد ہے، مگر پہلے سے بلند ہے، پھر روحانی خوشی اور ضمیر کی فطری خواہش کی تسلی کرنا پہلے سے اعلیٰ مقصد ہے، مگر پھر بھی ذاتی منفعت اور اس دنیا کا لگاؤ باقی ہے، یہ بالکل فطری بات ہے، کوئی انسان کسی کے ساتھ کتنا ہی عمدہ برتاؤ کرے، مگر جب اس کو معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کی تہ میں اس کی فلاں ذاتی غرض تھی تو اس کام کی قدر و قیمت اس کی نگاہوں سے گر جاتی ہے اور یہ سارا جادو بے اثر ہوجاتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر مذہبی لوگ اپنے کاموں کی غرض و غایت جنت کی طلب قرار دے سکتے ہیں، لیکن درحقیقت اس میں بھی گو اس دنیا کی نہیں، لیکن اس دنیا کی ذاتی غرض و غایت شامل ہے، اس لیے یہ اعلیٰ ترین مقصد ہونے کے باوجود بھی ہنوز پست ہے، اس لیے یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعلیم محمدی ﷺ میں بہشت کو ایک مومن کے نیک کام کا لازمی نتیجہ بتایا ضرور گیا ہے، مگر اس کو نیک کام کی غرض و غایت قرار نہیں دیا گیا ہے، یہاں تک کہ ایک بادہ خوار مسلمان شاعر بھی اس نکتہ سے بےخبر نہیں:

؎ طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں لے کے ڈال دے کوئی بہشت کو

ضمیر کی آواز

یعنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس جس کے ذریعہ سے وہ برائی اور بھلائی میں تمیز کرلیتا

ہے اور جس کے سبب سے اس کے دل کے اندر سے خود نیکی کی دعوت کی آواز اٹھتی ہے، غریب ولاچار آدمی کو دیکھ کر ہر شخص پر فطرۃً رحم کا جذبہ طاری ہوتا ہے، قاتل اور ظالم سے طبعاً ہر شخص کو نفرت ہوتی ہے، یہ قلب کی فطری صلاحیت ہر انسان کے ضمیر میں ہے، ہر اچھے یا برے کام کے کرتے وقت اس کے دل کے پردہ سے تحسین یا نفرین کی آواز آتی ہے، لیکن بری صحبت، بری تربیت، یا کسی خاص شدید جذبہ کے اثر سے یہ آواز اور اس کا اثر دب بھی جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ ہر گناہ کے پہلے پہل کرنے میں انسان خوف کھاتا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں لرزتے ہیں، وہ اپنی گناہ گاری کے تخیل سے شدید ذہنی اذیت محسوس کرتا ہے، وہ کبھی کبھی ندامت کے دریائے احساس میں غرق ہو جاتا ہے، اس کے ذکر سے اس کی خجالت کی پیشانی عرق عرق ہو جاتی ہے، لیکن جب وہ بار بار اپنے ضمیر کی اس آواز کو دباتا رہتا ہے تو وہ دب کر رہ جاتی ہے اور اس کی پشیمانی اور ندامت کے احساس کا شیشہ اس ٹھوکر سے چور چور ہو جاتا ہے۔ یہ اثرات کس چیز کا نتیجہ ہیں؟ اسلام کے اصول اخلاق کی بنا پر اس کا جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں نیکی وبدی کے جو فطری الہامات ودیعت رکھے ہیں، یہ اس کے نتائج ہیں، قرآن کہتا ہے:

﴿ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۝ ﴾ (۹۱/ الشمس :۸)

''ہر نفس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی ہے۔''

وہ جذبہ جس کا نام ضمیر ہے اور جو ہم کو ہمارے ہر برے کام کے وقت ہشیار کرتا ہے، وحی محمدی کی اصطلاح میں اس کا نام ''نفس لوامہ'' (ملامت کرنے والا نفس) ہے اور یہ خود ہمارے دل کے اندر ہے، سورۂ قیامہ میں ہے:

﴿ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۲)

''اور قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جو انسان کو اس کی برائیوں پر ملامت کرتا ہے۔''

آگے چل کر فرمایا:

﴿ بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ۝ ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۱۴۔۱۵)

''بلکہ انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بوجھ ہے، اگرچہ وہ اپنے اوپر طرح طرح کے بہانوں کے پردے ڈال لیتا ہے۔''

نواس بن سمعان انصاری رضی اللہ عنہ ایک سال تک اس انتظار میں مدینہ میں ٹھہرے رہے کہ آنحضرت سے نیکی اور گناہ کی حقیقت سمجھیں، آخر ایک دن ان کو موقع مل گیا اور انھوں نے دریافت کیا، فرمایا: ''نیکی حسن اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹک جائے اور تجھ کو پسند نہ ہو کہ تیرے اس کام کو لوگ جانیں۔'' [1] اسی طرح وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ نام ایک صاحب خدمت نبوی میں نیکی اور گناہ کی حقیقت

[1] مسلم، کتاب البر والصلة، باب تفسیر البر والاثم: ۶۵۱۶، ۶۵۱۷؛ مسند احمد، ج ٤، ص: ۱۸۲۔

دریافت کرنے کی غرض سے آئے چاروں طرف جان نثاروں کا ہجوم تھا اور وہ شوق و ذوق میں سب کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے، لوگ ان کو روک رہے تھے، مگر وہ آگے بڑھتے ہی گئے، آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: ''وابصہ قریب آ جاؤ۔'' جب وہ قریب جا کر بیٹھے تو فرمایا: ''اے وابصہ! میں بتاؤں کہ تم کیوں آئے ہو، یا تم بتاؤ گے''؟ عرض کی، حضور ہی ارشاد فرمائیں، فرمایا: ''وابصہ! تم مجھ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے آئے ہو۔'' عرض کی سچ ہے یارسول اللہ ﷺ فرمایا:

((یاوابصة! استفت قلبك واستفت نفسك البر مااطمأن الیه القلب واطمأنت الیه النفس والاثم ماحاك فی القلب و تردد فی النفس و ان افتاك الناس)) [1]

''اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھا کر، اپنے نفس سے فتویٰ لیا کر، نیکی وہ ہے جس سے دل اور نفس میں طمانیت پیدا ہو اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور نفس کو ادھیڑ بن میں ڈالے، اگرچہ لوگ تجھے اس کا کرنا جائز ہی کیوں نہ بتائیں۔''

یہی وہ حاسۂ اخلاق ہے، جس کا نام لوگوں نے ضمیر کی آواز رکھا ہے۔

پہلے پہل جب انسان اپنی ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اس کے دل کی صاف و سادہ لوح پر داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، اگرچہ ہوش میں آ کر جب توبہ واستغفار کرتا ہے اور پشیمان و نادم ہوتا ہے، تو وہ داغ مٹ جاتا ہے، لیکن پھر اگر وہی گناہ بار بار اسی طرح کرتا رہے تو وہ داغ بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ پورے دل کو سیاہ کر کے ضمیر کے ہر قسم کے احساس سے اس کو محروم کر دیتا ہے، اسی مفہوم کو آنحضرت نے ان الفاظ میں ادا فرمایا:

((ان العبد اذا اخطأ خطیئة نکتت فی قلبه نکتة سوداء فاذاهو نزع واستغفر وتاب صقل قلبه وان عادزید فیها حتیٰ تعلو قلبه))

''بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، تو اگر اس نے پھر اپنے کو علیحدہ کر لیا اور اللہ سے مغفرت مانگی اور توبہ کی، تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا تو وہ داغ بڑھایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔''

اس کے بعد فرمایا: ''یہی وہ دل کا زنگ ہے، جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

﴿ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ ﴾ [2] (۸۳/ المطففین:۱٤)

''کبھی نہیں، بلکہ ان کے (برے) کاموں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چھا گیا تھا۔''

آنحضرت ﷺ نے ایک تمثیل میں فرمایا: ''منزل مقصود کی جانب ایک سیدھا راستہ جاتا ہے، راستہ

[1] مسند احمد، ج ٤، ص: ٢٢٨۔ الفاظ قدرے مختلف ہیں۔

[2] جامع ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر آیت مذکور: ٣٣٣٤۔

کے ادھر ادھر دونوں طرف دو دیواریں کھنچی ہیں اور ان دونوں میں کچھ دروازے کھلے ہیں، لیکن ان پر پردے پڑے ہیں، راستہ کے سرے پر ایک آواز دینے والا آواز دے رہا ہے کہ راستہ پر سیدھے چلے چلو اور ادھر ادھر مڑو نہیں جب کوئی راہ گیر اللہ کا بندہ چاہتا ہے، کہ ان دائیں بائیں کے دروازوں میں سے کسی ایک دروازے کا پردہ اٹھائے تو اوپر سے ایک منادی والا پکار کر کہتا ہے: ''خبردار پردہ نہ اٹھانا، اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے۔'' پھر فرمایا: ''یہ راستہ اسلام ہے اور یہ دروازے اللہ تعالیٰ کے ممنوعات ہیں اور یہ پردے اس کے حدود ہیں اور راستہ کے سرے پر پکارنے والا القرآن ہے اور اوپر کا منادی جو پکارتا ہے..........۔''

((هو واعظ الله في قلب كل مؤمن)) [1]

''وہ اللہ کا وہ واعظ ہے جو ہر مومن کے قلب میں ہے۔''

کیا کسی بڑے سے بڑے ضمیری نے بھی اخلاقی ضمیر کی اس سے بہتر تشریح کی ہے۔

مسرت وانبساط

یہ بات کہ نیکی کے کاموں سے کرنے والے کو جو خوشی اور برائی کی باتوں سے اس کو جو رنج ہوتا ہے، وہی اس کو نیکی کے حصول کی ترغیب دیتا اور برائیوں سے بچنے پر آمادہ کرتا ہے، گو تمام تر صحیح نہیں ہے، تاہم اتنا درست ہے کہ نیکی کے کاموں سے حقیقتاً کرنے والے کے دل کو انشراح اور خوشی ہوتی ہے اور برائی سے اس کو انقباض اور غم ہوتا ہے، لیکن یہ نیکی اور بدی کے محرک نہیں اور نہ ان کو ہمارے کاموں کی غرض و غایت ہونی چاہیے کہ یہ بھی مادی خودغرضی ہے، بلکہ درحقیقت یہ نیکی اور بدی کے فطری اور طبعی نتائج ہیں، ایک غریب و لاچار کی امداد سے بے شبہ ہم کو خوشی ہوتی ہے، لیکن یہ خوشی ہماری مخلصانہ کوشش کا طبعی اور لازمی نتیجہ ہے، لیکن وہ اس کی محرک، علت اور غرض و غایت نہیں، اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کے کاموں کی غرض و غایت تو صرف ایک ہی ہوتی ہے اور وہ اللہ اور اس کی رضا مندی کا حصول۔ اس تشریح کے بعد معلوم ہوگا کہ سرور کائنات ﷺ کی تعلیم نے حکمائے اخلاق کی اس جماعت کے نظریہ میں جو اخلاق کی بنیاد اسی خوشی اور رنج یا روحانی لذت والم کے اصول پر قائم کرتی ہے، تھوڑی سی ترمیم کر دی ہے اور وہ یہ کہ خوشی حاصل کرنا اور قلبی غم سے بچنا، نیکی کی غرض و غایت نہیں، بلکہ اس کا لازمی اور طبعی نتیجہ ہے، علمائے اخلاق میں بڑی جماعت کا آج کل یہی مسلک ہے کہ مسرت نیکی کی غرض نہیں، اسی نکتہ کو اسلام کے صحیفۂ الٰہی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝ﶫ﴾ (٤٩/ الحجرات:٧)

''لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں اچھا کر کے دکھایا اور کفر

---

[1] مشکوۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنة:١٩١ بحواله احمد، ٤ ص:١٨٢ وبیهقی فی شعب الایمان: ٦٨٢١؛ ترمذی: ٢٨٥٩ مختصراً۔

اور گناہ اور نافرمانی سے گھن لگادی، یہی لوگ نیک چلن ہیں۔"

اسی آیت پاک کی تفصیل محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے الفاظ میں اس طرح فرمائی:

((اذا سرتك حسنتك وساء تك سيئتك فانت مؤمن)) 1

"جب تمھاری نیکی تم کو خوشی بخشے اور تمھاری بدی تم کو غمگین کردے تو تم مومن ہو۔"

((من سرّته حسنة وساء ته سيئة فهو مؤمن)) 2

"جس کو نیکی خوش اور برائی غمزدہ بنادے وہ مومن ہے۔"

((من عمل سيئة فكرهها حين يعمل، وعمل حسنة فسّر فهو مؤمن)) 3

"جس نے جب کوئی برائی کی، تو اس کو اس سے سخت نفرت آئی اور جب کوئی اچھا کام کیا تو اس کو مسرت ہوئی وہ مومن ہے۔"

غرض نیکی پر مسرت وانبساط اور انشراحِ خاطر کی لذت کو اسلام نے ایمان کی پہچان مقرر کیا ہے اور اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام کے اصول اخلاق میں سابق الذکر ترمیم کے ساتھ فرقہ، لذتیہ کے لیے بھی قدم رکھنے کی گنجائش باقی رکھی ہے اور پیغمبر اسلام کی پیغمبرانہ نظر سے یہ نکتہ بھی پوشیدہ نہیں رہا ہے، بلکہ اس نظریہ میں جس حد تک غلطی تھی، اس کی تصحیح فرمادی ہے۔

رضائے الٰہی

اسلام میں ہر قسم کے نیک کاموں کی غرض وغایت صرف ایک ہی قرار دی گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی ہے، ایک سچے مسلمان کو صرف اسی کی خاطر کام کرنا چاہیے اور اس کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے، یہیں آکر فلسفہ اخلاق اور اسلامی اخلاق کے اصول کا فرق نمایاں ہوتا ہے، حکمائے اخلاق یہ ڈھونڈتے ہیں کہ انسانی اخلاق کی غرض وغایت کیا ہوتی ہے اور معلمِ حکمت علیہ السلام یہ تعلیم دیتے ہیں کہ انسان کو اپنے اخلاق کی غرض وغایت کیا قرار دینی چاہیے، انسان کے پاس دو ہی دولتیں ہیں، جان اور مال اور انہی دونوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، ایثار اور حسن عمل ہے، پہلے ایک مومن کی جان کے متعلق فرمایا:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴾

(٢/ البقرة:٢٠٧)

"بعض ایسے ہیں، جو اپنی جان کو اللہ کی خوشنودی چاہنے کے لیے بیچتے ہیں اور اللہ بندوں پر

---

1 مسند احمد بن حنبل، ج٥، ص: ٢٥١، ٢٥٢ ومستدرك حاكم، كتاب الايمان، ج١، ص: ١٤ ومختصر شعب الايمان بيهقى، ص: ٥٢ مطبع سعادت مصر، وابن حبان: ٧٢٥٤؛ ترمذى: ٢١٦٥ وابو داود، وعن عمر بن الخطاب۔ 2 طبرانى فى الكبير عن ابى موسى، كنز العمال، ج١، ص: ٣٧۔

3 مستدرك حاكم، كتاب الايمان، ج١، ص: ١٣۔

مہربان ہے۔"

پھر مال کے متعلق فرمایا:

﴿ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲٦٥)

"اوران کی مثال جو اپنی دولت اللہ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں۔"

﴿ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۲)

"اورتم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔"

﴿ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾

(٤/ النسآ:١١٤)

"اور جو یہ تمام کام اللہ کی خوشنودی کے لیے کرے گا، تو ہم اس کو بڑا اجر دیں گے۔"

﴿ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ (۱۳/ الرعد:۲۲)

"اور جنہوں نے اللہ کے لیے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور ہم نے جو ان کو دیا ہے، اس میں کچھ چھپے اور کھلے طریقہ سے خرچ کیا۔ اور برائی کو نیکی سے دور کرتے ہیں، انہی کے لیے ہے پچھلا گھر۔"

سب سے صاف اور واضح طور سے یہ حقیقت سورۂ لیل میں کھولی گئی ہے:

﴿ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ ﴾

(۹۲/ اللیل:۱۸۔۲۰)

"جو اپنا مال صفائی اور پاکی حاصل کرتے ہوئے دیتا ہے، کسی کا اس پر احسان نہیں ہے، جس کو ادا کرنے کے لیے دیتا ہو، بلکہ وہ اللہ کی ذات کی طلب کے لیے دیتا ہے۔"

ان آیات کی تفسیر وتوضیح آنحضرت ﷺ نے متعدد احادیث میں فرمائی ہے، ایک صحابی پوچھتے ہیں: یارسول اللہ ﷺ! کوئی اس لیے لڑتا ہے کہ غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے، کوئی اس لیے کہ وہ بہادر کہلائے، کوئی اس لیے کہ اس کو شہرت حاصل ہو، تو ان میں سے راہ خدا میں لڑنا کس کو کہیں گے، فرمایا: "اس کو جو اس لیے لڑتا ہو کہ اللہ کی بات بلند ہو۔" [1] ایک دفعہ ارشاد فرمایا: "گھوڑا باندھنا کسی کے لیے اجر کا موجب، کسی کے لیے پردہ پوش اور کسی کے لیے گناہ ہے، اجر کا موجب اس کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں اس کو باندھتا ہے، تو اس کے چرنے اور پانی پینے کا بھی اس کو ثواب ملتا ہے، پردہ پوش اس کے لیے ہے جو ضرورۃً اس لیے باندھتا ہے کہ اللہ نے اس کو دولت دی ہے تو اس کو اپنی ضرورت کی چیز دوسروں سے مانگنی نہ پڑے، تو وہ رحم وشفقت کے ساتھ

[1] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب من قاتل لتکون کلمة الله هی العلیا: ۲۸۱۰۔

اس سے کام لیتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے اور گناہ اس کے لیے ہے جو فخر اور نمائش کے لیے باندھتا ہے۔“ [1]

اس تعلیم کا سب سے مؤثر بیان وہ ہے جس کو ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اور جس کو دہراتے ہوئے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ تین دفعہ غش کھا کر گرے اور جس کو سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ زار زار روئے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدالت کے لیے اترے گا اور ہر امت اپنی جگہ پر گھٹنے ٹیکے ہوگی، اس وقت سب سے پہلے ان کی پیشی کا حکم ہوگا جو قرآن کے عالم تھے اور جو جہاد میں مارے گئے تھے اور جو دولت والے تھے، پھر اللہ تعالیٰ عالم سے پوچھے گا، کیا میں نے تجھ کو وہ سب نہیں سکھایا جو اپنے پیغمبر پر اتارا تھا تو تم نے اس پر کیا عمل کیا؟ وہ عرض کرے گا ”بارالٰہا! میں شب و روز نماز میں قرآن پڑھتا تھا، اللہ فرمائے گا تو جھوٹا ہے، فرشتے کہیں گے: یہ جھوٹا ہے، پھر اللہ فرمائے گا تو تو اس لیے یہ کرتا تھا، تاکہ لوگ کہیں کہ تو بڑا عالم اور قرآن خواں ہے، تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا، (یعنی تو اپنا بدلہ پا چکا) پھر دولتمند سے اللہ فرمائے گا: کیا میں نے تجھ پر دنیا کو کشادہ نہیں کیا، یہاں تک کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا؟ عرض کرے گا کیوں نہیں اے میرے رب! دریافت کرے گا، تو میں نے جو کچھ تجھ کو دیا اس میں تو نے کیا کیا؟ جواب دے گا میں اہل استحقاق کا حق ادا کرتا تھا اور خیرات دیتا تھا، ارشاد ہوگا، تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے: یہ جھوٹا ہے، پھر اللہ فرمائے گا تو تو اس لیے یہ کرتا تھا، تاکہ لوگ کہیں کہ تو بڑا سخی ہے، تو یہ تجھ کو دنیا میں کہا جا چکا، (تو اپنا بدلہ پا چکا) اس کے بعد وہ لایا جائے گا جو جہاد میں مارا گیا، تو اللہ اس سے دریافت کرے گا، تو کس بات کے لیے مارا گیا؟ کہے گا اے اللہ! تو نے اپنی راہ میں جہاد کا حکم دیا تھا تو میں لڑا، یہاں تک کہ مارا گیا، اللہ فرمائے گا: تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے: یہ جھوٹا ہے، اللہ کہے گا تو تو اس لیے لڑا تھا کہ لوگ تجھ کو بہادر کہیں، تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا۔“ پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”یہ وہ لوگ ہیں جو سب سے پہلے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔“ [2] حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس حدیث کو سن کر بہت روئے، پھر بولے اللہ اور اس کا رسول سچا ہے اور اس حدیث کی تائید میں قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی:

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ ﴾ (١١/ ھود:١٥-١٦)

”جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی رونق چاہتا ہو تو ہم اس کا عمل اسی دنیا میں پورا کر دیں گے،

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب الخیل ثلاثة:٢٨٦٠ وکتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الاسلام:٣٦٤٦ وکتاب الاعتصام بالکتاب والسنة باب الاحکام التی تعرف بالدلائل ٧٣٥٦؛ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰة، باب اثم مانع الزکاة:٢٢٩٠، ٢٢٩٢۔

[2] جامع ترمذی، ابواب الزهد باب ماجاء فی الریاء والسمعة:٢٣٨٢۔

بے کم وکاست، ان لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، مگر دوزخ، اس دنیا میں انھوں نے جو بنایا وہ مٹ گیا اور جو کیا وہ برباد گیا۔''

غرض اگر ہمارے اخلاق و اعمال کی غایت، خودغرضی اور کسی نہ کسی طرح کی ذاتی منفعت ہے تو وہ ثواب کی روح سے خالی ہے اور اسلام کی اخلاقی تعلیم اس پستی سے بہت بلند ہے، بلکہ ایک مقام اس کا وہ بھی ہے جہاں اس کی منزل رضائے الٰہی کی طلب نہیں، بلکہ خود ذات الٰہی ہو جاتی ہے:

﴿ وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۲)

''اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔''

﴿ وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ ﴾ (۱۳/ الرعد:۲۲)

''اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی طلب کے لیے صبر کیا۔''

﴿ وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعْمَةٍ تُجْزَىٰ ۞ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ۞ ﴾

(۹۲/ الیل:۱۹۔۲۰)

''اور جو کسی کے احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے نہیں، بلکہ اپنے برتر پروردگار کی طلب کے لیے کرتا ہے۔''

اخلاقی احکام کی تعمیل اور ادائے حقوق کی تاکید کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا:

﴿ فَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۞ ﴾ (۳۰/ الروم:۳۸)

''تو رشتہ دار کا حق ادا کر اور غریب کا اور مسافر کا، ایسا کرنا ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ کی ذات کو چاہتے ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔''

مذاہب میں اخلاق کا بنیادی اصول

آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اصولِ اخلاق کی جو تکمیل ہوئی اس کا پتہ اخلاق کے بنیادی اصول سے چلتا ہے، توراۃ نے اپنی اخلاقی تعلیمات میں شاہی احکام کی شان رکھی ہے، جس میں کسی اصول اور غرض و غایت اور علت و مصلحت کی کوئی تشریح نہیں کی جاتی، انجیل میں لفظی صناعیوں کے سوا ان اخلاقی احکام کی کوئی دوسری بنیاد ہی قائم نہیں کی گئی ہے، تاہم عیسائی مذہب میں کچھ اصول ضرور موجود ہیں، مگر ان کی بنیاد حد درجہ کمزور ہے، ان میں سے پہلا مسئلہ خود اصل خلقتِ انسانی کا ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان کی ہستی کا صحیفہ اپنی اصل خلقت میں سادہ ہے، یا گناہوں سے داغدار ہے، عیسائیت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اصل میں گناہگار پیدا ہوتا ہے، گناہ اس کا مایۂ خمیر ہے، کیونکہ اس کے باپ

اور ماں حضرت آدم اور حوا گناہگار تھے اور یہ موروثی گناہ ہر انسان کی فطرت میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے، جس سے بچنا انسان کے لیے ممکن نہیں، اس مسئلہ میں مسیحی تعلیم کا غلو اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ اس کے نزدیک ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ جب تک بپتسمہ نہ پالے پاک نہیں ہوتا، اگر کسی عیسائی کا بچہ بھی اس سے پہلے مر جائے تو وہ گناہگار مرا اور آسمانی بادشاہی کے حدود میں وہ داخل نہ ہوگا، بلکہ وہ جہنم میں جھونکا جائے گا، کیونکہ مسیح علیہ السلام کے نام سے اس نے نجات نہیں پائی تھی۔ لیکن اسلام کا اصول اس سے بالکل جداگانہ ہے، اس کے نزدیک توحید اصل فطرت ہے: ﴿ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ﴾ (۳۰/ الروم: ۳۰) ''اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔'' پھر اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے ازلی سوال کے جواب میں بَلٰی یعنی اللہ کا اعتراف، ہر انسان روز ازل کر چکا ہے، اس لیے اس دنیا میں آکر جس نے اپنے فطری اور ازلی اعتراف کے بعد اس کا انکار نہیں کیا، اس کا وہ اقرار و اعتراف اس کی بے گناہی کے لیے کافی ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی لوحِ فطرت پر جو زریں حروف لکھے ہیں، وہ اپنے ہوش و تمیز کے بعد یا اس کو ابھار کر چمکا دیتا ہے، یا مٹا ڈالتا ہے، فرمایا:

﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴾ (۹۵/ التین: ٤)

''ہم نے انسان کو اچھی سے اچھی راستی پر پیدا کیا۔''

یعنی ہم نے اس کی خلقت بہترین تقویم اور راستی پر بنائی ہے، دوسری جگہ ارشاد ہوا:

﴿ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَاۗءَ رَكَّبَكَ ﴾ (۸۲/ الانفطار: ۷۔۸)

''جس اللہ نے تجھ کو بنایا، پھر تجھ کو برابر کیا، پھر تجھ کو ٹھیک کیا، پھر جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا۔''

یہ آیت سورۂ انفطار کی ہے، اس میں قیامت اور حشر و نشر یعنی انسان کی جزا و سزا کے مقررہ دن کا بیان ہے، اس کے بعد یہ آیت ہے، جس لفظ کا ترجمہ ہم نے ''ٹھیک کیا'' کیا ہے، اس کے لفظی معنی ''معتدل کیا'' کے ہیں، یعنی اس کو قویٰ کا ہر قسم کا اعتدال بخشا، نیشاپوری وغیرہ مفسرین نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس میں کمالات کے حصول کی پوری استعداد عنایت کی، اس سے ثابت ہوا کہ اعتدال کے عموم میں اس کے جسمانی اور روحانی دونوں قویٰ کا اعتدال داخل ہے، دوسری آیتوں میں یہ مفہوم اور زیادہ واضح بیان کیا گیا ہے، سورۂ اعلیٰ میں ہے:

﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ﴾

(۸۷/ الاعلی: ۱۔۳)

''اپنے بلند و برتر پروردگار کی پاکی بیان کر، جس نے پیدا کیا، پھر برابر کیا اور جس نے ہر قسم کا اندازہ درست کیا پھر راہ دکھائی۔''

راہ دیکھنا، یعنی ہدایت، انسان کی فطرت میں اس نے اسی طرح ودیعت رکھا ہے، جس طرح اس میں دوسرے بیسیوں قویٰ اس نے ودیعت رکھے ہیں، سورۂ دہر میں اس سے بھی زیادہ صاف ہے:

﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ۝ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ ﴾ (۷۶/ الدھر:۲۔۳)

''ہم نے انسان کو ایک بوند کے لچھے سے پیدا کیا، پلٹتے رہے اس کو، پھر کر دیا اس کو سنتا دیکھتا، ہم نے اس کو راہ سوجھادی تو وہ یا شکر گزار (نیکوکار) ہوتا ہے، یا ناشکرا (بدکردار)۔''

غرض اس کو یہ راہنمائی اور ہدایت پہلے ہی دن دے دی گئی، اب عقل وتمیز آنے کے بعد اللہ کا شکرگزار یا ناشکرا، نیکوکار یا بدکردار، اچھا یا برا ہو جانا خود اس کا کام ہے، سورۂ شمس میں اس سے بھی زیادہ واضح ہے:

﴿ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ ﴾ (۹۱/ الشمس:۷۔۱۰)

''قسم ہے ہر نفس کی اور اس کو ٹھیک بنانے کی، پھر ہم نے اس کو الہام کر دیا (یا سوجھا دیا) اس کی نیکی اور بدی، تو کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک وصاف رکھا اور ناکام ہوا، وہ جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا، (گندا کر دیا)۔''

الغرض محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کی رو سے انسانی فطرت کو پیدائش کے ساتھ ہی گناہگار اور عصیان کار نہیں ٹھہرایا گیا ہے، بلکہ اس کی اصل فطرت میں ہدایت اور صحیح الہام ودیعت ہے، اس لیے یہ کہا گیا:

﴿ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (۳۰/ الروم:۳۰)

''سو تو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھ، وہی اللہ کی فطرت، جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا، اللہ کے بنانے میں بدلنا نہیں، یہی سیدھا دین ہے، لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔''

یہ دین فطرت، اسلام اور اس کی تعلیمات ہیں، جن کی بنیادی چیز توحید ہے، آنحضرت ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: ''ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، جس طرح ہر جانور کا بچہ اصل میں صحیح وسالم پیدا ہوتا ہے، وہ کن کٹا نہیں پیدا ہوتا۔'' [1]

اسی طرح انسان کا بچہ بھی اپنی صحیح فطرت اور صالح خلقت پر پیدا ہوتا ہے۔ وحی محمدی ﷺ نے اسی مسئلہ کو ایک اور ازلی مکالمہ کی صورت میں بیان کیا ہے، انسان کی موجودہ جسمانی پیدائش کے سلسلہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے

[1] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی: ۱۳۵۸، ۱۳۵۹؛ مسلم، کتاب القدر، باب معنی کل مولود یولد علی الفطرۃ: ۶۷۵۵۔

انسانی ارواح سے دریافت فرمایا: ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ﴾ ''کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟'' انھوں نے اپنی زبان حال یا قال سے بالاتفاق جواب دیا، ﴿ بَلٰى ﴾ ''ہاں بیشک تو ہمارا پروردگار ہے۔'' یہی ازلی اور فطری اعتراف انسان کا وہ عہد ہے، جس کو قرآن نے بار بار یاد دلایا ہے اور کہا ہے کہ ''دیکھو شیطان نے تمہارے باپ آدم کو بہکایا تھا، تو تم اس کے بہکانے میں نہ آؤ۔''

ان تعلیمات کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنی اصل فطرت سے معصوم اور بے داغ پیدا ہوتا ہے، وہ پیدا ہونے کے ساتھ اپنے باپ کے موروثی گناہ کا پشتارہ اپنی پیٹھ پر لاد کر نہیں آتا، قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ

﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ ﴾ (۳۵/ فاطر:۱۸)

''اور ایک کے گناہ کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا۔''

﴿ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝ ﴾ (۵۲/ الطور:۲۱)

''ہر نفس اپنے ہی عمل میں گروی ہے۔''

اور اسی کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((الا لایجنی جان علٰی ولدہ ولا مولود علٰی والدہ)) ❶

''ہاں! باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں اور نہ بیٹے کے جرم کا باپ۔''

اسی طرح ان مذہبوں نے بھی جنھوں نے انسانوں کو آواگون اور تناسخ کے چکر میں پھنسا رکھا ہے، انسانیت کی پیدائش کو ایک طرح سے گناہ گار اور داغدار ہی ٹھہرایا ہے، انھوں نے انسانیت کی پیٹھ پر ایک بڑا بھاری بوجھ رکھ دیا ہے، اس کی ہر پیدائش کو دوسری پیدائش کا، ہر زندگی کو دوسری زندگی کا اور ہر جنم کو دوسرے جنم کا نتیجہ بتا کر اس کو اپنے پچھلے کرموں کے ہاتھوں میں مقید کر رکھا ہے، یعنی اس سے پہلے کہ وہ پیدا ہو اس کے اعمال کا دفتر سیاہ ہو چکا ہے۔ اب غور کیجیے کہ آنحضرت ﷺ کی یہ تعلیم کہ انسان اصل فطرت میں بے گناہ اور بے داغ ہے، غمگین دنیا کے لیے کتنی بڑی عظیم الشان خوشخبری ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم اس سراسر ظلم اور بے انصافی کے عقیدہ سے پاک ہے کہ معصوم اور ناکردہ گناہ بچہ بھی گناہگار اور جہنم کا ایندھن ہے، آپ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ ہر بچہ اپنے ہوش وحواس اور عقل وتمیز سے پہلے تک معصوم اور بے گناہ ہے، فرمایا کہ ''اللہ کا قلم بچہ سے اس وقت تک کے لیے اٹھا دیا گیا جب تک وہ عقل وتمیز کو نہ پہنچے۔'' ❷

باغِ ہستی کی یہ انسانی کلیاں جو بن کھلے مرجھا گئیں، اسلام کی نگاہ میں جنت کے پھول ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس مسلمان کے تین بچے بچپن میں مر گئے، وہ اللہ کے دربار میں اپنے ماں باپ کے شفیع ہوں گے اور

❶ سنن ابن ماجہ، ابواب المناسك، باب الخطبة يوم النحر:۳۰۵۵۔

❷ صحیح بخاری، كتاب الطلاق، باب الطلاق في الاغلاق والكره، رقم الباب:۱۱؛ كتاب الحدود، رقم الباب:۲۲ و ترمذی، ابواب الحدود ما جاء في من لايجب عليه الحد:۱۴۲۳۔

ان کو جنت میں لے جائیں گے۔'' ❶ آنحضرت ﷺ کے شیر خوار صاحبزادہ نے جب وفات پائی، تو فرمایا: ''یہ جنت میں جا کر جنتی دایوں کا دودھ پیئے گا۔'' ❷ اس سے زیادہ یہ کہ مشرکین کے کم سن بچوں کی نسبت آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ یہ بے گناہ کہاں رہیں گے؟ فرمایا: ''اللہ کو علم ہے کہ یہ کیا ہوتے۔'' ❸ لیکن دوسرے موقع پر اس کی تصریح فرما دی، ایک دفعہ رؤیا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ جنت میں بیٹھے ہیں اور ان کے چاروں طرف کمسن بچوں کا ہجوم تھا، فرمایا: ''یہ وہ کمسن بچے تھے جو دین فطرت پر مر گئے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! اور مشرکوں کے بچے؟ فرمایا: ''اور مشرکوں کے بچے بھی۔'' ❹ ان تصریحات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض صحابہ کمسنی میں مر جانے والے بچہ کو بہ تخصیص جنتی کہہ اٹھتے تھے، لیکن چونکہ غیب پر حکم لگانا صرف اللہ کا کام ہے، اس لیے تصریحاً کسی خاص بچہ کی نسبت ایسا کہہ دینا آپ نے مناسب نہیں سمجھا، ایک دفعہ ایک صحابی کا بچہ مر گیا تھا، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس سانحہ کو سن کر آنحضرت ﷺ سے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! اس کو مبارک ہو یہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا تھی، نہ گناہ کیا نہ گناہ کرنے کا زمانہ پایا۔ فرمایا: ''اے عائشہ! اللہ تعالیٰ نے جنت کے لیے کچھ لوگ پیدا کیے ہیں اور جہنم کے لیے کچھ لوگ۔'' ❺ ایک طرف عیسائیت ہے جو بپتسمہ پانے سے پہلے مر جانے والے کمسن بچوں کو جہنم میں جھونکتی ہے، دوسری طرف اسلام ہے جو ان کے لیے جنت کا دروازہ کھولتا ہے اور ان کے جنازہ کی نماز میں یہ دعا مانگنے کی تعلیم دیتا ہے، ''اے اللہ! اس کو میرے لیے پیشگی کا ذخیرہ بنانا، اس کو میرا ایسا شافع بنانا جس کی شفاعت تیری بارگاہ میں مقبول ہو۔'' احادیث میں ایسے موقعوں پر جب کسی ایک نیک عمل سے سارے گناہوں کے معاف ہو جانے کا ذکر آتا ہے، اکثر آنحضرت ﷺ نے یہ فقرہ استعمال کیا ہے کہ ''وہ پھر ایسا معصوم ہو جاتا ہے کہ گویا اس کی ماں نے اس کو آج ہی جنا ہے۔'' ❻

خوف ورجا

اسی مسئلہ کے قریب قریب ایک اور مسئلہ ہے، یونان کے فلسفیوں میں دو گروہ گزرے ہیں، ایک کو رونے والے فلسفی، دوسرے کو ہنسنے والے فلسفی کہتے ہیں، پہلا گروہ وہ ہے جو ہر واقعہ سے ناامیدی اور مایوسی کا نتیجہ پیدا کرتا ہے، اس کو دنیا تمام تر تاریک اور خارزار نظر آتی ہے، دوسرا گروہ وہ ہے، جس کو دنیا میں چہل پہل،

---

❶ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل من یموت له ولد: ٦٦٩٦۔ ❷ ابن ماجه، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی الصلاة علی ابن رسول اللہ ﷺ: ١٥١١۔ ❸ صحیح مسلم، کتاب القدر: ٦٧٦٢۔
❹ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب تعبیر الرؤیا بعد صلوة الصبح: ٧٠٤٧۔ ❺ یہ حدیثیں صحیح مسلم، کتاب القدر: ٦٧٦٨ میں ہیں، نیز امام نووی کی شرح مسلم میں بھی یہ باب دیکھو اور باب فضل من یموت له ولد (ج ٢، ص: ٤٠٢، ٤٠٣) ❻ صحیح مسلم، کتاب صلوة المسافرین، باب اسلام عمرو بن عبسه: ١٩٣٠؛ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب فضل حج المبرور: ١٥٢١؛ ترمذی ابواب الحج، باب ماجاء فی فضل الطواف: ٨٦٦۔

عیش و آرام اور بہار و رونق کے سوا کچھ سوجھائی نہیں دیتا، پہلے گروہ کی تعلیم یہ ہے کہ خاموش رہو اور زندگی میں موت کی صورت بنالو، کہ دنیا کی آخری منزل یہی ہے، دوسرے کا نظریہ یہ ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو اور کل کے غم کی فکر نہ کرو، اخلاقی لحاظ سے یہ دونوں رائیں ترمیم کے قابل ہیں، پہلے نظریہ پر اگر یقین ہو تو انسان کے تمام قویٰ سرد ہو کر رہ جاتے ہیں اور وہ دنیا میں کسی کام کے سرانجام دینے کا اہل نہیں باقی رہتا اور جو دوسرے عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے، وہ بادۂ غفلت میں مست و سرشار ہوتا ہے اور اس کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی، اسلام کی تعلیم کی شاہراہ ان دونوں گلیوں کے بیچ سے نکلی ہے، وہ ایک طرف دنیا کی فنا اور زوال کا قصہ بار بار سناتا ہے، کہ دل بادۂ غفلت میں سرشار نہ ہو اور دوسری طرف وہ اس کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونے دیتا، وہ اخیر اخیر وقت تک اللہ کے سہارے جینے کی تعلیم کرتا، اس کی شریعت میں اللہ سے ناامیدی اور کفر ایک ہے، وہ ایک مسلمان کے دل کو مشکل سے مشکل اوقات میں بھی ناامید بنا کر بے سہارا نہیں ہونے دیتا، قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتہ کی زبانی کہا گیا:

﴿ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ۝ ﴾ (۱۵/ الحجر:۵۵)

”(ابراہیم) ناامیدوں میں سے نہ بن۔“

پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبانی تعلیم ملی:

﴿ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ ﴾

(۱۲/ یوسف:۸۷)

”اور اللہ کے فیض سے ناامید مت ہو، اللہ کے فیض سے ناامید وہی ہیں جو اللہ کے منکر ہیں۔“

اس امت کے گناہگاروں کو کس پیار سے خطاب ہوتا ہے:

﴿ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ ﴾ (۳۹/ الزمر:۵۳)

”اے میرے وہ بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر آپ ظلم کیا، تم اللہ کی رحمت سے ناامید مت بنو۔“

اسی لیے آنحضرت ﷺ نے احادیث میں انسان کو ہمیشہ پُر امید رہنے کی تاکید کی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں اپنے بندہ کے گمان کے پاس رہتا ہوں۔“ [1] یعنی جیسا وہ میری نسبت گمان کرتا ہے، وہی اس کے لیے ہو جاتا ہے، اس بارہ میں اسلام کے عقیدہ کی صحیح آئینہ دار یہ آیت کریمہ ہے:

﴿ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَاۗىِٕمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ۭ ﴾

(۳۹/ الزمر:۹)

---

[1] جامع ترمذی، کتاب الزھد، باب ما جاء فی حسن الظن باللّٰہ تعالٰی: ۲۳۸۸۔

”بھلا ایک وہ جو بندگی میں لگا ہے، رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتا ہے اور کھڑا ہوتا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہے۔“

یعنی اس کے دل میں یہ دونوں کیفیتیں یکجا ہیں، گناہوں اور تقصیروں کے مواخذہ اور باز پرس کا ڈر بھی ہے اور اللہ کی رحمت کی امید کا سہارا بھی ہے، اللہ کے غضب سے ڈرنا اور اس کی رحمت کا امیدوار رہنا یہی اسلام کی تعلیم ہے، یہ ڈر اس کو غافل، بیباک اور گستاخ نہیں ہونے دیتا اور یہ امید اس کو مایوس، غمزدہ اور شکستہ خاطر نہیں ہونے دیتی، اسی لیے ایک مسلمان کا دل ہمیشہ سوئے انجام سے خائف لیکن توقعات سے لبریز رہتا ہے، اسی کی طرف اشارہ کرکے قرآن اہل ایمان سے کہتا ہے:

﴿ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۚ ﴾ (٤/ النسآء:١٠٤)

”اور تم کو اللہ سے وہ امید ہے جو کافروں کو نہیں۔“

یہی وہ ذہنی فرق ہے جو مشکلات کے عالم میں ایک مومن اور ایک کافر کے دل میں پیدا ہوتا ہے، کافر اپنے ہر کام اور ہر عمل کی دنیاوی جزا کا خواہاں ہے اور جب وہ اس کو نہیں پاتا، تو دل شکستہ ہو جاتا ہے، وہ کامیابی صرف مادی ہی کامیابی کو سمجھتا ہے اور جب وہ نہیں ملتی تو افسردہ ہو جاتا ہے، لیکن مومن اگر ظاہری اور دنیا کی مادی کامیابی سے ہم آغوش نہیں بھی ہوتا، تب بھی اس کا دل شاداں اور فرحاں رہتا ہے کہ اس نے نیکی کا کام کیا اور بہر حال اس نیکی کا یہاں نہیں تو وہاں معاوضہ ضرور ملے گا، اگر دنیا کی کامیابی نصیب نہ ہوئی تو نہ ہو، اللہ کی خوشنودی اور ثواب تو بہر حال ملے گا، اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو ہر نیک کام میں جری اور بہادر بنا دیا ہے اور ان کو بغیر کسی مادی غرض کے اخلاص کے ساتھ کام کرنا سکھا دیا ہے، اسی کا اثر ہے کہ دنیا کی تمام غیر اسلامی قوموں میں ناکامی اور ناامیدی کی خودکشیوں کا عام طور سے رواج ہے، ہندوستان میں ہندو عورتوں کے جان دینے کے واقعات ہر روز اخبارات میں پڑھے جاتے ہیں، یورپ اور امریکہ کے متمدن ملکوں میں ذرا ذرا سی ناامیدی پر خودکشی کر لینا ایک معمولی واقعہ بن گیا ہے، جس وقت یہ سطریں لکھ رہا ہوں وارسا (پولینڈ) میں ناکام نوجوان لڑکیوں کو خودکشی پر آمادہ کرنے کی ایک مجلس کے قیام کی خبریں اخباروں میں چھپ رہی ہیں، مگر کسی مسلمان میں اخیر سے اخیر لمحہ میں بھی ناامیدی کا یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور اللہ کے فضل و کرم سے اس کی آس نہیں ٹوٹتی، امیر ہو کہ غریب، تندرست ہو کہ بیمار، اولاد والا ہو کہ بے اولاد، کامیاب ہو یا ناکام، دولتمند ہو یا دیوالیہ، ہر حالت میں وہ پر امید رہتا ہے، مشکلات میں، بیماریوں میں، محتاجیوں میں، ناکامیوں میں، ہر وقت وہ ہمت کے ساتھ اللہ کی رحمت کا امیدوار ہے اور یقین رکھتا ہے کہ ناامیدی اور کفر دونوں اس کے مذہب میں ایک ہیں اور اس کے عمل کا معاوضہ اگر یہاں نہیں، تو وہاں ضرور ہے کہ اس کے اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ

﴿ اَنِّىْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ ﴾ (٣/ آل عمران:١٩٥)

"میں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا۔"

اخلاق اور رہبانیت

اخلاق درحقیقت انسانوں کے باہمی تعلقات میں خوش نیتی اور اچھائی برتنے کا نام ہے، یا یوں کہیے کہ ایک دوسرے پر جو انسانی فرائض عائد ہیں، ان کو ادا کرنے کو کہتے ہیں، اخلاق کی اس حقیقت ہی سے یہ واضح ہے کہ اخلاق کے وجود کے لیے باہم انسانوں میں تعلقات اور وابستگی کا وجود ضروری ہے، جو رہبانیت، تجرد اور جوگی پن میں نہیں پائی جاتی ہے، اسی لیے گوشہ نشینی، عزلت گزینی، خلق سے کم آمیزی، جماعت سے علیحدگی، اہل وعیال، عزیز واقارب اور دوست واحباب کے تعلقات سے آزادی، اخلاق کے استعمال کے موقع ہی کو کھو دیتی ہے، یا کم کر دیتی ہے۔

اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت اس لیے ہے کہ خلق سے قطع تعلق اور گوشہ نشینی نے مذہب میں اکثر نیکی اور دین داری کی بہترین شکل کی حیثیت حاصل کر لی ہے، اسلام سے پہلے راہب اور جوگی اسی اصول پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے اور وہ خود اور ان کے عقیدت مند بھی اس کو ان کی انتہائی نیکوکاری اور دین داری قرار دیتے تھے، لیکن حقیقتاً ان مذہبی افراد اور جماعتوں نے زیادہ تر اس پردہ اور حجاب کو اس لیے اختیار کیا کہ اس سے ایک طرف اپنے کو عام نظروں سے چھپا کر بادشاہوں کی طرح اپنے رعب واثر کو نمایاں کرنے اور اپنے کو بالاتر ہستی تصور کرانے میں مدد ملے اور دوسری طرف اپنی زندگی کو زیر پردہ رکھ کر جھوٹا تقدس اور جھوٹی دین داری کا ڈھونگ کھڑا کر سکیں اور تیسری طرف اپنی اس عزلت نشینی کے جھوٹے عذر کی بنا پر کسی ملامت کا نشانہ بنے بغیر اہل وعیال، اعزہ واقارب، دوست واحباب اور قوم وملک وملت کے فرائض وحقوق بجالانے کی تکلیف سے بچ جائیں، اسی لیے اسلام نے اپنے اصولِ اخلاق میں راہبانہ، جوگیانہ اور مجردانہ زندگی کی ہمت افزائی نہیں کی ہے، نبوت کے بعد آنحضرت ﷺ نے اپنی پوری ۲۳ برس کی زندگی اسی مجمعِ انسانی میں رہ کر اور تمام تر انسانی جدوجہد میں شریک ہو کر گزاری ہے، یہی طرزِ عمل خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور چند کے سوا تمام اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کا تھا اور پورا قرآن پاک اسی انسانی جدوجہد اور انسانی مجمع کے ساتھ عمل صالح کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے، تجرد، علیحدگی، خلوت نشینی، ترکِ عمل اور ترکِ جماعت کے لیے ایک اشارہ بھی پورے قرآن میں موجود نہیں ہے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ جماعتی حقوق اور فرائض جماعتوں کے اندر ہی رہ کر ادا ہو سکتے ہیں، ان سے ہٹ کر نہیں، وہ لوگ جو آبادی سے دور کسی جنگل یا ویرانہ میں گوشہ گیر اور عزلت نشین ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں، کیا وہ جماعتی مشکلات کو حل کرتے ہیں؟ کیا وہ قوم کی اخلاقی نگرانی کا فرض انجام دیتے ہیں؟ کیا وہ غریبوں کا سہارا بنتے ہیں؟ کیا وہ یتیموں کے سرپرست ہیں؟ کیا وہ خلق الٰہی کی کوئی خدمت کرتے ہیں؟ کیا وہ لوگوں کو گمراہی اور ضلالت سے بچاتے ہیں؟ کیا اپنے دست وبازو سے اپنی روزی کماتے ہیں؟ کیا وہ تبلیغ ودعوت، تعلیم وموعظت، امر بالمعروف، نہی

عن المنکر اور جہاد جیسے فریضوں سے عہدہ برآ ہیں؟ حالانکہ اخلاقی عبادتوں کے یہی بہترین مواقع ہیں، اسی لیے اسلام کی نظر میں نجات طلبی کا عموماً یہ مستحسن طریقہ نہیں، قرآن پاک میں ہے:

﴿ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ﴾ (٦٦/ التحریم:٦)

''تم اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو بھی دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔''

یعنی انسان کا فرض اپنے ہی کو آگ سے بچانا نہیں، بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بچانا ہے، آنحضرت ﷺ نے صریح طور سے تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا: ((**کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ**)) ''تم میں سے ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار اور نگران ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری اور نگرانی میں آئے ہوئے لوگوں کی نسبت پوچھا جائے گا، امیر اپنی رعیت کا چرواہا، مرد اپنے اہل وعیال کا رکھوالا اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے۔'' ❶

جماعتی مصیبتیں جب آتی ہیں تو کنارہ گیر اشخاص کو بھی نہیں چھوڑتیں، یہ آگ اندر اور باہر سب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، اس لیے وحی محمدی ﷺ نے اس نکتہ کو علی الاعلان ظاہر کر دیا اور کہا:

﴿ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ ﴾ (٨/ الانفال:٢٥)

''اور اس فساد سے بچو جو چن کر صرف گناہگاروں ہی پر نہیں پڑے گا۔''

بلکہ اس کی لپیٹ گناہگار و بے گناہ سب تک پہنچے گی، کہ اگر جماعت اپنے تمرد کی مجرم ہوئی ہے تو کنارہ گیر اپنے تبلیغ کے فرض سے غافل رہے، چنانچہ قرآن پاک میں اصحاب سبت کے قصہ میں ان کنارہ گیر اور فرض تبلیغ سے بے پروا رہنے والے اشخاص کو بھی گناہگاروں ہی میں شامل کیا ہے۔ دنیا درحقیقت جدوجہد اور دار و گیر کا ایک میدان ہے، جس میں تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا راستہ طے کر رہے ہیں، راستہ میں سب لوگوں کے ساتھ چلنے میں یقیناً بہت کچھ تکلیفیں ہیں، ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف و آرام کا خیال ولحاظ کرنا پڑتا ہے، اسی لیے وہ شخص جو ان جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہو جاتا ہے اور صرف اپنا بوجھ اپنے کندھے پر رکھ کر چل کھڑا ہوتا ہے، دنیا کے معرکہ کا ایک نامرد سپاہی ہے، بیہقی نے شعب الایمان میں اور ترمذی نے جامع میں آنحضرت ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے:

((ان المسلم الذی یخالط الناس ویصبر علی أذا هم خیر من المسلم الذی لا یخالط الناس ولا یصبر علی أذا هم)) ❷

''وہ مسلمان جو لوگوں میں مل جل کر رہتا ہے اور ان کی تکلیف دہی پر صبر کرتا ہے، اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے نہیں ملتا اور ان کی تکلیف دہی پر صبر نہیں کرتا۔''

---

❶ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب المرأۃ راعیۃ فی بیت زوجها: ٥٢٠٠۔ ❷ شعب الایمان بیهقی، ٦/ ٢٦٦/ ٨١٠٢ وجامع ترمذی، ابواب صفة القیامة، باب فی فضل المخالطة مع الصبر علی أذی الناس: ٢٥٠٧؛ ادب المفرد، باب الذی یصبر علی اذی الناس: ٣٨٨؛ ابن ماجه، کتاب الفتن: ٤٠٣٢؛ احمد، ٢/ ٤٣۔

گوشہ گیری اور جماعت سے علیحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے کہ جماعت کا قوام اتنا بگڑ جائے کہ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہے اور فتنہ وفساد کے شعلے اتنے بھڑک چکے ہوں کہ ان کا بجھانا قابو سے باہر ہو جائے، تو ایسے وقت میں وہ اشخاص جو اس فساد کے روکنے اور اس آگ کے بجھانے کی طاقت اپنے میں نہ پائیں وہ مجمع سے الگ ہو جائیں، فتنہ میں عزلت نشینی کی حدیثیں اسی موقع سے تعلق رکھتی ہیں، ورنہ ہر قوی ہمت مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس حالت میں تبلیغ اور امر بالمعروف کے فرض کو ادا کر کے جماعت کے بچانے میں پوری کوشش صرف کر دے یہی وہ نمونہ ہے، جس کو آنحضرت ﷺ نے دنیا میں پیش کیا اور تمام بڑے بڑے صحابہ نے اپنے اپنے دائرہ میں اسی کی پیروی کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''بدی کو اپنے ہاتھ سے روکنا اور مٹانا ہر مسلمان کا فرض ہے، اگر ہاتھ سے نہ مٹا سکے تو زبان سے مٹائے، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس کو دل سے برا سمجھے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔'' [1]

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اسلام کے اس اصولِ اخلاق کو پیش نظر رکھنے سے اسلام کا ایک دوسرا اخلاقی اصول بھی خود بخود سامنے آجاتا ہے کہ تعلیم محمدی میں جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے، اسی اخلاقی فرض کا دوسرا شرعی نام ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' (یعنی اچھی باتوں کے لیے کہنا اور بری باتوں سے روکنا) ہے، قرآن پاک نے مسلمانوں کا یہ ممتاز وصف قرار دیا ہے:

﴿ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۱۰)

''تم سب سے بہتر امت ہو، جو لوگوں کے لیے باہر لائی گئی ہو، اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بری بات سے روکتے ہو۔''

﴿ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ﴾ (۹/ التوبۃ:۷۱)

''وہ اچھی بات کا حکم دیتے ہیں اور بری بات سے باز رکھتے ہیں۔''

پھر خاص طور سے حکم ہوا:

﴿ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ ﴾ (۳۱/ لقمان:۱۷)

''اچھی بات کا حکم دے اور بری بات سے روک۔''

مسلمانوں کی تصویر یہ ہے کہ

﴿ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴾ (۱۰۳/ العصر:۳)

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان: ۱۷۷۔

''اور وہ آپس میں سچائی اور ثابت قدمی کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔''

﴿ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴾ (۹۰/ البلد:۱۷)

''اور آپس میں ثابت قدم رہنے اور مہربانی کرنے کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔''

یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اصول کو نمایاں کرتی ہے اور قوی دل اور قوی ہمت افراد کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوام کی نگہبانی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔

توراۃ میں قابیل کا یہ فقرہ کہ ''کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں؟'' ❶ عیسائی مذہب کے اخلاق کا ایک اصول بن گیا ہے۔ اسی اخلاقی اصول نے یورپ کے اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے جس کا نام ''شخصی آزادی کی بحالی'' ہے۔ لیکن اسلام کے قانون میں اس کے برخلاف واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا گیا ہے، آنحضرت ﷺ نے صاف طور پر فرمایا جیسا کہ ابھی گزرا کہ ((کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ)) ''تم میں ہر شخص سے اس کے زیر ذمہ داری لوگوں کی نسبت باز پرس ہوگی'' ❷ قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرنے اور بدی سے بچنے اور باز رکھنے کا فرض مسلمانوں پر واجب ٹھہرایا گیا ہے، تاکہ سوسائٹی کی شرم اور جماعت کا خوف، لوگوں کی نیک چلنی کا ضامن ہو سکے اور ساتھ ہی جماعت کا ہر فرد اپنے دوسرے بھائی کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانے کا ذمہ دار ٹھہرے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کے لیے سبت کے دن کسی قسم کا دنیاوی کام کرنا حرام تھا۔ بنی اسرائیل کی ایک آبادی سمندر کے کنارے آباد تھی۔ وہ حیلہ کر کے سبت کے دن مچھلی پکڑ لیتی تھی۔ اس موقع پر اس آبادی میں تین گروہ ہو گئے۔ ایک وہ جو اس گناہ کا اعلانیہ مرتکب ہوتا تھا، دوسرا وہ جو اس فعل سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کو سمجھاتا تھا، تیسرا وہ جو گو اس فعل میں شریک نہ تھا لیکن ان کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا بلکہ خود سمجھانے والوں سے کہتا تھا کہ ایسے لوگوں کو سمجھانے سے کیا فائدہ؟ جن کو اللہ تعالیٰ ان کے اس جرم کی پاداش میں ہلاک کرنیوالا ہے؟ لیکن ان پر جب عذاب الٰہی آیا تو صرف دوسرا گروہ بچ گیا جو اپنے تبلیغ کے فرض کو ادا کر رہا تھا۔ بقیہ پہلا اور تیسرا گروہ برباد ہو گیا، پہلا تو اپنے گناہ کی بدولت اور دوسرا اپنے فرضِ تبلیغ کو ترک کرنے کے سبب سے، سورۂ اعراف کے بیسویں رکوع میں یہ پورا قصہ مذکور ہے، آخر میں ہے:

﴿ وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ۙ اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ

❶ سفر تکوین: ٤-٩۔ ❷ بخاری، کتاب النکاح، باب المراۃ راعیہ فی بیت زوجھا: ٥٢٠٠۔

﴿وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾

(۷/ الاعراف: ۱۶۴۔۱۶۵)

''اور جب ان میں سے ایک فرقہ بولا کہ تم کیوں ایسے لوگوں کو نصیحت کرتے ہو جن کو خدا برباد کرنیوالا یا سزا دینے والا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم تمہارے رب کے آگے اپنے سے الزام اتارنے کے لیے ان کو نصیحت کرتے ہیں اور شاید کہ یہ نیک بن جائیں تو جب وہ بھول گئے جو ان کو سمجھایا گیا تھا تو ہم نے ان کو جو منع کرتے تھے بچالیا اور گناہگاروں کو ان کی بے حکمی کے سبب بڑے عذاب میں پکڑا۔''

یہ قصہ بتاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں اپنے دوسرے بھائیوں کو گرنے سے بچانا اور گرتوں کو سنبھالنا اور سہارا دینا کتنا اہم ہے اور اس کے اخلاقی فرائض کا یہ کیسا ضروری حصہ ہے کہ اگر اس کو ادا نہ کیا جائے تو وہ بھی ایسا ہی گناہگار ہے جیسا وہ جو اس فعل کا مرتکب ہوا، البتہ بھائی کا فرض اس کو سمجھا دینے اور بتا دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے، زبردستی منوا دینا اس کا فرض نہیں اور اس کا کیا بلکہ رسول کا بھی یہ فرض نہیں۔ فرمایا:

﴿مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلٰغُ﴾ (۵/ المآئدۃ: ۹۹، ۲۴/ النور: ۵۴)

''رسول کا کام فقط پیام پہنچا دینا ہے۔''

اگر یہ فرض ادا ہو گیا تو اس کے سر سے ذمہ داری اتر گئی، اسی لیے سورۂ مائدہ میں فرمایا:

﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾

(۵/ المآئدۃ: ۱۰۵)

''اے ایمان والو! تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے۔ تم اگر سیدھے راستے پر ہو تو جو کوئی بھٹکا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو پڑھ کر لوگوں سے کہا کہ ''لوگو! تم کو اس آیت کے ظاہری معنی دھوکے میں نہ ڈالیں، کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے اگر ظالم کو ظلم کرتے لوگ دیکھیں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ نہ لیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ سب کے سب عذاب میں گرفتار ہو جائیں''۔ [1] ایک دوسرے صحابی ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے معنی پوچھے گئے تو جواب دیا کہ میں نے خود آنحضرت ﷺ سے اس کے معنی دریافت کیے تو فرمایا کہ ''نہیں بلکہ نیکی کا باہم حکم کرو اور بدی سے ایک دوسرے کو روکو لیکن جب دیکھو کہ حرص اور بخل کی اطاعت ہے اور خواہش نفسانی کی پیروی ہے اور دنیا کو دین پر ترجیح دی جارہی ہے اور ہر ایک اپنی رائے پر آپ مغرور ہے تو اس وقت عوام کو چھوڑ کر اپنی خبر لو کہ تمہارے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے

[1] جامع ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورۃ المائدۃ: ۳۰۵۷۔

جس میں ثابت قدم رہنا شعلہ کو ہاتھ سے پکڑنا ہے‘‘۔ [1]

ان تعلیمات نے اخلاق کے اس غلط اصول کو کہ ’’کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں؟‘‘ [2] منسوخ کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک اخلاقی تعلیمات کو جماعت اپنے ہاتھ میں نہیں رکھے گی، ان کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ قوموں کے رسوم وآداب اور ایٹی کیٹس اسی اصول پر قائم ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بظاہر اخلاقی امور سے ہر شخص کے پرائیویٹ اور نج کی باتیں معلوم ہوتی ہیں، جن کا نفع ونقصان کرنے والے کی ذات تک محدود ہے مگر ذرا گہری نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اثرات اور نتائج پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کا اثر ایک سے دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچتا ہے اور اسی طرح رفتہ رفتہ پوری سوسائٹی میں پھیل جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو ان برائیوں کی برائی نہایت ہلکی ہو کر رہ جاتی ہے اور لوگ اس کو ایک معمولی بات سمجھنے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ زہر اتنا پھیلتا ہے کہ ان برائیوں کا برا ہونا بھی مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز میں پوری قوم کا اخلاقی مزاج فاسد ہو جاتا ہے اور وہ اپنی بلندی کے معیار سے نیچے گر جاتی ہے۔ ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کی مجلس میں فرمایا کہ ’’بنی اسرائیل میں اخلاقی تنزل اسی طرح شروع ہوا کہ جب ان میں برائی پھیلنے لگی تو پہلے تو ان کے علما نے منع کیا لیکن جب وہ نہ رکے تو وہ ان کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے اور کھانے پینے لگے۔ صحبت کے اثر سے وہ بھی ایسے ہی ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے داؤد اور عیسیٰ علیہما السلام کی معرفت ان پر لعنت کی‘‘۔ اس کے بعد آپ ﷺ سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا: ’’نہیں جب تک تم ظالم کا ہاتھ نہ پکڑو اور اس کو حق پر نہ جھکا دو‘‘۔ [3]

یہ ہے اس باب میں محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم۔

اس کے چند شرائط

لیکن یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر جاہل وعامی کا فرض نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ اس کے بہانہ سے فتنہ وفساد پیدا کر دے گا۔ یہ حق سب سے اول اسی شخص کو حاصل ہے جو خود ان برائیوں سے بچا ہے۔ قرآن نے کہا:

﴿ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:٤٤)

’’کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔‘‘

اسی طرح یہ ضروری ہے کہ نصیحت اور فہمائش، خوش اسلوبی، نرمی اور مصلحت کیساتھ کی جائے، خود آنحضرت ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾ (١٦/ النحل:١٢٥)

---

[1] جامع ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورۃ المائدۃ: ۳۰۵۸۔ [2] سفر تکوین، ٤۔۹۔

[3] جامع ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورۃ المائدۃ: ۳۰٤۸۔

''تو اپنے رب کے راستہ کی طرف دانائی سے اور اچھی نصیحت سے بلا۔''

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تو کہہ دیا گیا:

﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا ﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ٤٤)

''تم دونوں اس سے نرمی سے باتیں کرنا۔''

ایک اور جگہ تعلیم دی گئی:

﴿ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا ﴾ (٤/ النسآء: ٦٣)

''اور تو ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ ان کے دل تک پہنچ جانیوالی بات۔''

یہ تمام احتیاطیں اور تاکیدیں اس لیے ہیں کہ لوگوں میں ضد اور کد نہ ہونے پائے اور نیکی کی بجائے برائی کا اندیشہ نہ پیدا ہو جائے۔

امن وامان کا قائم رکھنا، امام کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ایسے فوج دارانہ اور زبردستی کے تحکمانہ انتظامات جن کے لیے تنفیذی قوت درکار ہے، صرف حکومت کا فرض ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک برائی کے روکنے کے لیے دوسری قسم کی اور بیسیوں برائیوں کا ارتکاب ہو جائے۔

تجسس اور غیبت کی ممانعت

یہ بات کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصل مقصد سوسائٹی کی اصلاح اور جماعت کی اخلاقی حفاظت ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ذاتی معائب کی تحقیق وتفتیش کی جس کا نام تجسس اور ٹوہ لگانا ہے، ممانعت کی ہے۔ کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کے گھر گھس کر اس کی حالت وکیفیت کی جستجو کرے، یہاں تک کہ اسلام کے لٹریچر کا یہ عام محاورہ بن گیا ہے کہ ''محتسب را درون خانہ چہ کار؟''

اس کا سبب یہی ہے کہ اس طریقہ اصلاح سے فتنہ وفساد کا دروازہ کھل جاتا اور کوئی شخص اپنے گھر میں بھی محفوظ نہ رہتا۔ لیکن اس کی ممانعت کا اصلی راز یہ ہے کہ جو شخص گھر میں چھپ کر کوئی برا کام کرتا ہے اس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود رہتا ہے، جماعت تک اس کا اثر نہیں پہنچتا، اس لیے جماعت کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں اور اسی کے ساتھ اور ایک نکتہ یہ ہے کہ جو شخص کوئی مخفی گناہ کرتا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں شرم وحیا کا جوہر ابھی موجود ہے۔ جو ممکن ہے کہ آگے چل کر اس کی ہدایت کا سبب بن جائے لیکن اگر لوگ اس کو چھپ چھپ کر دیکھتے پھریں تو ڈر ہے کہ ضد اور ہٹ کی بادتند سے اس کے دل کی یہ دھندلی روشنی بھی گل نہ ہو جائے۔ اسلام میں کسی گھر یا کمرہ میں بے اجازت داخلہ کی جو ممانعت ہے اس کی علت بھی یہی

ہے جیسا کہ خود آنحضرت ﷺ نے اس کو ظاہر فرما دیا ہے کہ ((انما الاذن لاجل الرؤية)) [1] یعنی ''کسی کے گھر میں داخلہ کی اجازت مانگنا اسی لیے ہے کہ وہ اس کو نہ دیکھے۔'' اس سلسلہ میں ایک اور اصول یہ ہے کہ اس کی غیبت نہ کی جائے یعنی اس کی برائی اس کے پیچھے دوسروں سے نہ کی جائے کہ یہ اصلاح کی تدبیر نہیں بلکہ ممکن ہے کہ اس کو جب یہ معلوم ہو تو واعظ و ناصح کی طرف سے اس کو ملال ہو اور اس میں مخالفت کی ضد پیدا ہو جائے اور پھر اس کی اصلاح کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے چنانچہ وحی محمدی ﷺ نے اسی لیے تجسس اور غیبت ان دونوں چیزوں کی قطعی طور پر ممانعت کی، فرمایا:

﴿ يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (٤٩/ الحجرات:١٢)

''اے ایمان والو! بہت سارے گمانوں سے بچتے رہو، کہ بے شک بعض گمان گناہ ہے اور نہ کسی کا اندر کا ٹٹولا کرو اور نہ پیٹھ پیچھے کسی کو برا کہو۔ بھلا تم میں سے کوئی یہ پسند کر سکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ سو تم کو گھن آئے، اللہ سے ڈرو، بے شبہ اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔''

پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مردہ لاش کا گوشت اپنے دانتوں سے نوچنا کہ جس طرح مردہ اپنے اس جسم کی حفاظت نہیں کر سکتا، وہ بھی جس کو تم اس کی غیر حاضری میں برا کہہ رہے ہو، اپنے الزام کی مدافعت نہیں کر سکتا، اس غیبت کی ایسے قابل نفرت کام سے تشبیہ جس سے ہر انسان کو فطرتاً گھن آ جائے، اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہو سکتی، اس کی کراہت کی یہ شدت اسی لیے اختیار کی گئی ہے کہ اس طریقہ سے امر بالمعروف کا فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ اس شخص کی جس کی غیبت کی جائے، اصلاح ہو سکتی ہے اور نیز اس سے غیبت کرنے والے شخص کی اخلاقی کمزوری برملا ظاہر ہو جاتی ہے، جو ایک مسلمان کی شان ایمان کے شایاں نہیں، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اگر تم لوگوں کی کمزوریوں کی ٹوہ لگاتے پھرو گے تو ان کو برباد کر دو گے''۔ [2]

غور کیجیے کہ آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات میں اخلاق کے کتنے لطیف نکتے پنہاں ہیں۔

توسط اور اعتدال

آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے یہودیت اور نصرانیت کا دور گزر چکا تھا اور دنیا ایک ایسے مذہب کا

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب الاستئذان من اجل :٦٢٤١؛ صحیح مسلم، کتاب الادب، باب تحریم النظر فی بیت غیرہ:٥٦٣٨؛ جامع ترمذی، ابواب الاستئذان، باب من اطلع فی دار قوم :٢٧٠٩۔

[2] سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی التجسس: ٤٨٨٨۔

انتظار کر رہی تھی جو ان دونوں کا جامع ہو، اسلام دنیا کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آیا اور سلسلۂ نبوت کی ان دونوں بکھری ہوئی کڑیوں کو باہم ملا دیا۔ عدل وانصاف ایک ایسی چیز ہے جس نے دنیا کے نظام کو قائم رکھا ہے اور احسان ورفق وملاطفت کی آمیزش نے اس کو اور بھی خوش نما بنا دیا ہے، لیکن اسلام سے پہلے مذہبی سیاست کے یہ دونوں جزو بالکل الگ الگ تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اب تک دنیا کا نظام غیر مکمل تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت مجسم عدل ہے۔ اس میں احسان ودرگزر کی اخلاقی کشش بہت کم رکھی گئی ہے۔ ❶ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام مجسم رحمت کا پیام بن کر آئے، ان کی شریعت میں عدل وانصاف کے قائم کرنے کی روح بہت کم پائی جاتی ہے۔ ❷ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت نے دنیا کے لئے عدل وانصاف کے جو اصول قائم کر دیے تھے، اس کے مقابل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اخلاقی تعلیم کا اعلان ان لفظوں میں فرمایا:

”تم نے یہ سنا ہوگا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ ❸ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ برائی کا برائی کے ساتھ مقابلہ نہ کرو بلکہ جو شخص تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی حاضر کر دو۔ جو شخص لڑنے جھگڑنے میں تمہارے کپڑے پکڑ لے اس کو چادر بھی دے دو۔ جو شخص تم کو ایک میل تک بیگاری پکڑ لے جائے اس کے ساتھ دو میل تک چلے جاؤ۔ جو تم سے مانگے اس کو دو، جو تم سے قرض لینا چاہے اس کو واپس نہ کرو۔

تم نے یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ اپنے عزیزوں سے محبت اور اپنے دشمنوں سے بغض رکھو، لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو“۔ ❹

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے دنیا سے جو کچھ کہا یا سنا گیا تھا۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قانون تھا جو بالکل عدل وانصاف پر مبنی تھا لیکن اب جو کچھ دنیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان مبارک سے سن رہی تھی وہ سراسر اخلاق، رحمت اور احسان تھا لیکن اسلام نے عدل واحسان دونوں میں امتزاج پیدا کر کے دنیا کے نظام حکومت کو کامل تر کر دیا:

﴿ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ ﴾ (١٦/ النحل: ٩٠)

”بے شبہ خدا عدل اور احسان (دونوں کا) حکم دیتا ہے۔“

یہ ایک اصولی تعلیم تھی جس نے شریعت موسوی وعیسوی کی دو الگ الگ خصوصیتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

عدل واحسان

”عدل اور احسان“ کے صحیح مفہوم کے سمجھنے کے لیے تھوڑی تفصیل کی ضرورت ہے۔ قانون کی بنیاد

---

❶ یہود کی سنگدلی کے سبب سے۔ ❷ یہود کی قانونی لفظ پرستی کی اصلاح کے لئے۔

❸ یہ موسوی شریعت کی طرف اشارہ ہے۔ ❹ متی، باب ۵، آیت: ۳۸۔

درحقیقت ''عدل'' پر ہے۔ ''عدل'' کے معنی ''برابر'' کے ہیں، جو شخص کسی کے ساتھ برائی کرے، اس کے ساتھ اتنی ہی برائی کی جائے۔ یہ ''عدل'' ہے اور اس کو چھوڑ دینا اور معاف کر دینا اور درگزر کرنا یہ ''احسان'' ہے، اسلام میں ان دونوں کے الگ الگ مراتب ہیں، قانون عدل کو جماعت اور سلطنت کے ہاتھ میں اس نے دیا ہے یہ کسی ایک شخص کا کام نہیں ہے اور احسان ہر شخص کے ہاتھ میں ہے اور یہ محض شخصی معاملہ ہے۔ قانون عدل ہی پر جماعت اور حکومت کا نظام قائم ہے۔ اگر اس کو مٹا دیا جائے تو جماعت اور حکومت کا شیرازہ بکھر جائے اور کسی کی جان و مال و آبرو سلامت نہ رہے۔ اس لیے حکومت کو سرے سے مٹانا جیسا کہ پال نے عیسائیت کو اس رنگ میں پیش کر کے ہمیشہ کے لیے توراۃ کے قانون عدل کا خاتمہ کر دیا، کبھی دنیا کے لیے قابل عمل نہیں رہا۔ خود عیسائی سلطنتوں کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ کسی قانونِ عدل کے بغیر صرف اخلاق کے بھروسہ پر زمین کے ایک چپہ پر بھی امن وامان قائم نہیں رہ سکا اور نہ برائیوں کی روک تھام ہو سکی۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ایک شخص جب جماعت کے کسی فرد کا کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ گناہ درحقیقت اس شخص کا نہیں ہوتا بلکہ پوری جماعت کے نظام کا ہوتا ہے، اب اگر پہلی ہی دفعہ اس کی باز پرس نہ کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ جرأت پا کر اسی گناہ کا ارتکاب جماعت کے کسی دوسرے فرد کے ساتھ کرے۔ اس لیے کسی مظلوم کو اپنے ظالم کے معاف کر دینے کا پورا پورا حق نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اس طرح ایک فرد کے ساتھ نیکی کر کے جماعت کے ہزاروں لاکھوں افراد کے ساتھ گویا برائی کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اس لیے اخلاق کو قانون عدل کی جگہ دینے میں بہت کچھ غور و فکر اور احتیاط کی ضرورت ہے جو شریعت محمدی ﷺ میں پوری طرح برتی گئی کیونکہ وہ دنیا کی دائمی شریعت بننے والی تھی۔ پھر سب لوگ دنیا میں ایک طبیعت اور فطرت کے پیدا نہیں ہوئے۔ بعض نیک، نرم مزاج، صابر اور متحمل پیدا ہوئے ہیں جن کے لیے معاف کر دینا، درگزر کرنا اور بدلہ نہ لینا آسان ہے اور بعض غصہ ور، سخت مزاج اور تندخو پیدا ہوئے ہیں جو بدلہ اور بدلہ سے زیادہ لیے بغیر چین نہیں لے سکتے۔ ان کے لیے اتنی ہی اصلاح بہت ہے کہ بدلہ سے زیادہ کرنے سے ان کو روک دیا جائے اور ''برائی، برائی کے بقدر'' کے اصول پر عمل کرنے کے لیے ان کو رضامند کر لیا جائے۔ اس لیے ایک عالمگیر شریعت کے لیے جو تمام دنیا کی اصلاح کے لیے آئی ہو، عدل اور احسان دونوں اصولوں کی جامعیت کی ضرورت تھی۔

قانون اور اخلاق

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا میں امن و امان اور عدل وانصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور برائیوں کے انسداد کے لیے دو چیزیں ہیں۔ قانون اور اخلاق اور گوان دونوں کا منشا ایک ہی ہے مگر ان کے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے۔ جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیوں کو تو روک دیتا ہے مگر دل میں اس برائی کی طرف

سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا جو انسانیت کی جان ہے اور اخلاق پر عمل کرنے کے لیے ہر شخص کو بزور مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس کے ذریعہ عدل وانصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال کلیتاً نہیں ہو سکتا، توراۃ محض قانون ہے اور انجیل محض اخلاق، اسی لیے یہ دونوں الگ الگ امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام اور فتنہ وفساد اور بدیوں اور برائیوں کے انسداد کے لیے پوری طرح کافی نہیں۔ آنحضرت ﷺ ایک ایسی کامل شریعت لے کر آئے جو عدل واحسان اور قانون واخلاق دونوں کی جامع ہے۔

اس جامعیت کا اصول، شریعت محمدی میں دو حیثیتوں سے پایا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو بھی قانون کی شکل دے دی اور نہ عیسائیت کی طرح قانون کو مذہب کے ہر حصہ سے خارج کر کے قانون کو بھی اخلاق بنا دیا بلکہ اس نے قانون اور اخلاق دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کر کے ہر ایک کی حد مقرر کر دی اور اپنی شریعت کی کتاب میں قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ اسلام نے ان برائیوں کے انسداد کو جن کا اثر براہ راست دوسروں تک پہنچتا ہے، قانون کے تحت میں رکھا۔ مثلاً: قتل، سرقہ، رہزنی، تہمت لگانا۔ چنانچہ ان جرائم کے لیے قرآن نے سزا مقرر کی ہے جو حکومتِ اسلام کی طرف سے دی جا سکتی ہے اور جو باتیں ایک انسان کی ذاتی تکمیلِ نفس کے متعلق تھیں، ان کو اخلاق کے دائرہ میں رکھا۔ مثلاً: جھوٹ نہ بولنا، رحم کھانا، غریبوں کی امداد وغیرہ۔ اسی طرح شریعتِ محمدی ﷺ اس حیثیت سے قانون اور اخلاق دونوں کا مجموعہ ہے۔

اسلام ایک اور حیثیت سے بھی قانون اور اخلاق کا مجموعہ ہے۔ قانوناً اس نے ہر مظلوم اور صاحب حق کو یہ اختیار بخشا ہے کہ وہ چاہے تو توراۃ کے حکم کے مطابق اس کا بدلہ لے لیکن اس سے بلند تر بات یہ رکھی ہے کہ وہ انجیل کے مطابق اس ظالم کو معاف کر دے بلکہ برائی کے بجائے اس کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرے۔ اس مجموعی تعلیم نے حکومت کے قانون انتظام وعدل اور شخص کی اخلاقی روحانیت کی تکمیل دونوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہے اور اس لیے وہ نسل انسانی کی حفاظت، ترقی اور نشو ونما کی پوری طرح متکفل ہے۔ وہ عدل وانصاف کے بزور قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے اور ذاتی اخلاق کے ذریعہ سے لوگوں کی روحانی تکمیل میں بھی کسی طرح حارج نہیں۔ وہ نہ یہودیوں کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے اور نہ عیسائیوں کی تعلیم کی طرح غیر محسوس روح ہے بلکہ وہ جسم وجان کا مجموعہ اور زندہ ومحسوس پیکر ہے۔

عفو وانتقام

موسوی، عیسوی اور محمدی اخلاقی تعلیمات میں باہم جو باریک فرق ہے، وہ اسی قانون اور اخلاق کی علیحدگی اور ترکیب کا نتیجہ ہے۔ اسلامی قوانین کو پیش نظر رکھ کر مخالفین نے اکثر کہا ہے کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم میں اخلاقی روح نہیں۔ لیکن اگر وہ قانون محمدی ﷺ کے ساتھ ساتھ اخلاقِ محمدی کو بھی سامنے رکھتے تو ان کو یہ شبہ

پیش نہ آتا۔ معلوم ہو چکا کہ توراۃ کا اصول عادلانہ انتقام پر مبنی ہے۔ اس کا حکم ہے:

''اور جو انسان کو مار ڈالے گا سو مار ڈالا جائے گا...... اور اگر کوئی اپنے ہمسایہ کو چوٹ لگائے، سو جیسا کرے گا ویسا پائے گا، توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت۔'' (احبار ۲۴۔ ۱۷ خروج ۲۱۔ ۱۲۔ گنتی ۳۵۔ ۳۱۔ استثناء ۱۹۔ ۱۱۔ ۱۲)

انجیل کی تعلیم سراسر عفو ہے۔ اس کا حکیمانہ وعظ یہ ہے:

''تم سن چکے کہ کہا گیا، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو تیرے داہنے گال پر تھپڑ مارے، دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے۔'' (متی ۵۔ ۳۸)

لیکن اس سرتاپا روحانی اخلاقیت پر ایک دن بھی دنیا کا نظام قائم رہ سکتا ہے؟ اور کبھی کوئی عیسائی قوم اور عیسائی ملک اس رحیمانہ وعظ پر عمل کر سکا؟ محمد رسول اللہ ﷺ نے جو تعلیم پیش کی وہ عفو اور عادلانہ انتقام یعنی اخلاق اور قانون دونوں کا مجموعہ ہے۔ عدل قانون ہے اور احسان اخلاق ہے، اسلام کے تمام احکام میں یہ دونوں اصول جاری ہیں اور جس مسئلہ کے متعلق توراۃ اور انجیل کے احکام نقل کیے گئے ہیں اس کی نسبت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ یہ تعلیم ہم کو ملی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۸)

''اے ایمان والو! تم پر مقتولوں میں برابری کے بدلے کا حکم ہوا، آقا کے بدلے آقا، غلام کے بدلے غلام، عورت کے بدلے عورت''۔

یہ تو معاوضہ کا عادلانہ قانون تھا اس کے بعد ہی اخلاق کا حکم ہے:

﴿ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۗءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ۭ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۷۸)

''تو اگر اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا تو دستور کے مطابق اس کی پیروی کرنا اور نیکی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے، یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہوئی تو جو کوئی (مقتول کے رشتہ داروں میں سے) اس (معافی یا خون بہا لینے) کے بعد پھر زیادتی کرے تو اس کے لیے دکھ کی سزا ہے۔''

ان آیتوں کی بلاغت پر غور کیجئے کہ قاتل اور مقتول کے رشتہ داروں کے درمیان کھلی دشمنی کے بعد ان کے جذبۂ رحم کی تحریک کی غرض سے قاتل کو مقتول کے رشتہ داروں کا بھائی کہہ کر بتایا گیا، ساتھ ہی چونکہ توراۃ

کے حکم میں خون بہا لے کر معافی کی دفعہ نہ تھی اس لیے اس عفو کو آسانی اور رحمت سے تعبیر کیا گیا اور قاتل کو نیکی اور احسان کی یاد دلائی گئی اور مقتول کے رشتہ داروں کو معاف کر دینے یا خون بہا لے لینے کے بعد انتقام لینے پر عذابِ الٰہی کا ڈر سنایا گیا، دیکھو کہ اسلام کا حکم توراۃ اور انجیل، قانون اور اخلاق، انتقام اور عفو دونوں کو کس خوبی سے یکجا کرتا ہے۔

قرآن نے اسی جامعیت کو دوسری جگہ ظاہر کیا ہے:

﴿ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِۦ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُۥ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الظَّٰلِمُونَ ۝ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰٓ ءَاثَٰرِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَىٰةِ ۖ وَءَاتَيْنَٰهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَىٰةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۝ ﴾ (٥/ المآئدۃ: ٤٥۔٤٦)

''اور ہم نے بنی اسرائیل پر توراۃ میں یہ حکم لکھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں برابر کا بدلہ، تو جس نے بخش دیا تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جس نے خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کیا تو وہی ظالم ہیں اور ہم نے بنی اسرائیل کے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتا تھا اور اس کو انجیل دی جس میں راہنمائی اور روشنی ہے اور جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتی ہے اور جو پرہیز گاروں کے لیے ہدایت اور وعظ و نصیحت ہے۔''

② یہ فوجداری کے سب سے سخت گناہ کے متعلق قانون و اخلاقی احکام تھے۔ مالی معاملات کے متعلق بھی اسلام اسی جامعیت کے نکتہ کو پیش نظر رکھتا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَٰلِكُمْ ﴾ (٢/ البقرۃ: ٢٧٩)

''اور اگر تم سود سے باز آ گئے تو تمہارا وہی حق ہے جو اصل سرمایہ تم نے دیا تھا۔''

یہ تو قانون تھا، اب اخلاق دیکھئے:

﴿ وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ ﴾

(٢/ البقرۃ: ٢٨٠)

''اور اگر قرضدار تنگ دست ہو تو اس کو اس وقت تک مہلت ہے جب تک اس کو کشائش ہو اور بالکل معاف کر دینا تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے اگر تم کو سمجھ ہے۔''

جزئیات کو چھوڑ کر اصولی طور سے بھی اس جامعیت کو قائم رکھا ہے، فرمایا:

﴿ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝ ﴾

(١٦/ النحل:١٢٦)

''اور اگر سزا دو تو اتنی ہی جتنی تکلیف تم کو دی گئی ہے اور اگر صبر کرلو تو یہ صبر کرنیوالوں کے لیے بہت بہتر ہے۔''

اسی مفہوم کو ایک اور آیت میں اس طرح ادا کیا گیا:

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ:٣٩۔٤٠)

''اور وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہو، تب وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے تو اگر معاف کردیا اور نیکی کی تو اس کا ثواب دینا خدا پر ہے۔ وہ ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔''

آیت کے پہلے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان از خود کسی پر ظلم کرنے میں پہل اور سبقت نہ کریں لیکن اگر کوئی ان پر ظلم کرے تو وہ اس ظلم کا قانوناً اتنا ہی بدلہ لے سکتے ہیں جتنا ان پر کیا گیا۔ کیونکہ قانون یہی ہے کہ برائی کا بدلہ اتنی ہی برائی ہے جیسا کہ تورات میں بیان ہوا ہے لیکن اگر کوئی مسلمان اخلاقاً اس ظلم کو معاف کردے اور نہ صرف معاف ہی بلکہ اس برائی کی جگہ کچھ نیکی اور بھلائی بھی کرے (وَاَصْلَحَ) تو اس کو خدا کی طرف سے ثواب ملے گا اور بلاغت یہ ہے کہ اس صابر مظلوم کی تسکین کی خاطر فرمایا کہ اس کو ثواب اور اجر دینا خدا پر ہے۔

الغرض عفو اور انتقام میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا، دنیا کی جسمانی یا روحانی نظام کا نقص ہے۔ اگر انتقام اور سزا کا اصول نہ ہو تو جماعت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا اور نہ ملک میں امن وامان رہ سکتا ہے اور نہ افراد کے بڑے حصہ کو برائیوں سے باز رہنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے اور اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی کوئی چیز نہ رہے۔ حالانکہ وہی ایک سچے مذہب کا مطلوب ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا نظام ہستی کو آدھا رکھنا اور آدھا مٹا دینا ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ ایک ایسی تعلیم کو لیکر آئے، جس کی نظر انسانی ہستی کے پورے نظام پر ہے۔ اس نے یہ کہا کہ سزا اور انتقام کو تو جماعت اور حکومت کے ہاتھ میں دے دیا اور اس حکم کے ساتھ دیا کہ اس کے اجرا میں کوئی رحم نہ کیا جائے اور نہ اس میں بڑے چھوٹے، امیر وغریب اور اپنے اور غیر میں کوئی فرق کیا جائے، تاکہ جماعت اور ملک کا نظام قائم رہے۔ دوسری طرف عفو کو شخصیت کے مدارج کمال کا ذریعہ بتایا تاکہ اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاقی بلندی برابر ترقی کرتی جائے۔

جماعتی انتظامات کے قیام کے لیے سختی کا یہ عالم ہے کہ ایک خاص سزا کے اجرا کے وقت حکم ہوتا ہے:

﴿ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ﴾

(۲۴/ النور:۲)

''اور تم کو اللہ کے حکم چلانے میں ان دونوں گناہگاروں پر ترس نہ آئے۔ اگر تم کو خدا پر اور قیامت پر ایمان ہے۔''

یعنی اس گناہ کی جو سزا خدا کے ہاں ہے اور جو قیامت میں ہوگی، وہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہوگی، اس لیے اس گناہ کی سزا دنیا میں ہی دے دینا درحقیقت اپنے گناہگار بھائی پر احسان کرنا ہے۔ اس لیے اس سزا کے دینے میں نرمی نہ کی جائے۔

کسی سزا کے جاری کرنے میں اونچے نیچے اور امیر وغریب کے فرق نہ کرنے کا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ جب ایک شریف مسلمان عورت سرقہ کے جرم میں گرفتار ہوئی اور قریش نے چاہا کہ اس کو سزا نہ دی جائے اور اس کے لیے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سفارشیں پہنچائی گئیں تو فرمایا: ''اے لوگو! تم سے پہلے قومیں اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی معمولی آدمی اسی کام کو کرتا تو اس کو سزا دیتے۔ خدا کی قسم! اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹتا۔'' [1]

دوسری طرف عفو کا یہ حال ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ''آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام نہیں لیا۔ الا یہ کہ اس نے خدا کے کسی حکم کو توڑا ہے۔ [2] تو اس کو (قانوناً) سزا ملی ہو''۔ یہ عمل تھا۔ تعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ''میں نے آپ ﷺ کی خدمت میں قصاص کا کوئی مقدمہ پیش ہوتے نہیں دیکھا لیکن یہ کہ اس میں آپ نے معاف اور درگزر کرنے کا مشورہ دیا۔'' [3] یعنی قصاص کے بجائے بالکل معافی یا دیت (زرتاوان یا خون بہا) لے کر معاف کر دینے کو فرمایا۔ معمولی چھوٹے جرائم کی نسبت صحابہ سے فرمایا: ''آپس میں گناہوں کو معاف کر دیا کرو لیکن مجھ تک جب وہ واقعہ پہنچے گا تو سزا ضروری ہو جائے گی'' [4] یعنی جب مرافعہ اور استغاثہ حکومت کے سامنے پیش ہو جائے گا تو پھر سزا ہونا واجب ہے، تاکہ حکومت کا رعب دلوں پر قائم رہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب ایک چادر اوڑھے سو رہے تھے۔ ایک شخص نے چپکے سے چادر اتار لی، وہ پکڑا گیا اور عدالت نبوی ﷺ میں پیش کیا گیا، آپ ﷺ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ جن صاحب کی چادر تھی انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! کیا تمیں

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب کراهية الشفاعة فی الحد:٦٧٨٨۔ [2] ایضاً، باب اقامة الحدود والانتقام لحرمات اللّٰه: ٦٧٨٦۔ [3] ابوداود، کتاب الدیات، باب الامام یأمر بالعفو فی الدم: ٤٤٩٧؛ نسائی، کتاب الدیات، باب الامر بالعفو عن القصاص: ٤٧٨٧، ٤٧٨٨۔

[4] ابو داود، کتاب الحدود، باب یعفی عن الحدود ما لم تبلغ السلطان: ٤٣٧٦۔

درہم کی ایک چادر کے لیے ایک انسان کا ہاتھ کاٹا جائے گا، میں یہ چادر اس کے ہاتھ ادھار فروخت کر دیتا ہوں۔ فرمایا کہ ''میرے پاس لانے سے پہلے یہ کیوں نہیں کر لیا۔'' [1] یہ تو اس عفو کا حال ہے جس کو ایک حد تک قانونی جرائم کی صورت حاصل ہے اور اس لحاظ سے قانونِ محمدی ﷺ، موجودہ سلطنتوں کے قوانین سے زیادہ نرم ہے، زیادہ منصفانہ اور عقل کے زیادہ مطابق ہے، لیکن عفو کی عام اخلاقی تعلیم کا دائرہ اسلام میں اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

عفوو درگزر کی تعلیم

اخلاق کی سب سے بھاری اور دشوار ترین تعلیم جو اکثر نفوس پر نہایت شاق گزرتی ہے، وہ عفو، درگزر، ضبط نفس، تحمل اور برداشت کی ہے لیکن اسلام نے اس سنگلاخ زمین کو بھی نہایت آسانی سے طے کیا ہے، سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں شرک اور بت پرستی سے کتنی شدید نفرت ظاہر کی گئی ہے اور خدائے تعالیٰ کی توحید اور عظمت وجلالت کا کتنا اعلیٰ اور ناقابل تبدیل تصور اس نے پیش کیا ہے، جو خاص اسلام کا امتیازی حصہ ہے، تاہم مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ ''تم مشرکوں کے بتوں کو برا بھلا نہ کہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ چڑ میں تمہارے خدا کو برا کہہ بیٹھیں۔''

﴿ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ ﴾

(٦/ الانعام:١٠٨)

''اور جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہو کہ وہ اللہ کو بے ادبی سے نادانستہ برا کہہ بیٹھیں۔''

یہ برداشت کی کتنی انتہائی تعلیم ہے۔ پیغمبر کو خطاب ہوا کہ کفار اور مشرکین کے ظلم وستم اور گالی گلوچ پر صبر کرو اور ان کو معاف کرو اور اسی کی پیروی کا حکم عام مسلمانوں کو ہو رہا ہے:

﴿ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾ (٧/ الاعراف:١٩٩۔٢٠٠)

''معاف کرنے کی خو پکڑ اور نیک کام کو کہہ اور جاہلوں سے کنارہ کر اور اگر تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ ابھار دے (یعنی غصہ آجائے) تو خدا کی پناہ پکڑ وہ ہے سنتا جانتا۔''

سکون کی حالت میں عفوو درگزر آسان ہے، مگر ضرورت ہے کہ انسان غصہ میں بھی بے قابو نہ ہونے پائے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعریف میں فرمایا:

---

[1] ابو داود، کتاب الحدود، باب فی من سرق من حرز: ٤٣٩٤۔

﴿ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ:٣٧)

''اور جب غصہ آئے جب بھی وہ معاف کر دیتے ہیں۔''

نیکو کاروں کی تعریف میں ایک اور جگہ یہ فرمایا گیا کہ اپنے غصہ کو دبانا اور معاف کرنا خدا کا پیارا بننے کا ذریعہ ہے:

﴿ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴾

(٣/ آل عمران: ١٣٤)

''اور جو غصہ کو دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

انتقام کی قدرت ہونے اور استطاعت رکھنے کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا بہت بڑی بلند ہمتی کا کام ہے۔فرمایا:

﴿ وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴾ (٤٢/ اسوریٰ:٤٣)

''اورالبتہ جس نے برداشت کیا اور معاف کیا تو وہ بے شک ہمت کے کام ہیں۔''

اس برداشت اور عفو کو وحی محمدی ﷺ نے اپنے الفاظ میں ''عزم'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو خاص انبیا علیہم السلام اور پیغمبروں کی توصیف میں آیا ہے۔فرمایا:

﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ﴾ (٤٦/ الاحقاف:٣٥)

''اور برداشت کر، جس طرح ہمت اور عزم والے پیغمبروں نے برداشت کیا۔''

نیکی کے پھیلانے اور بدی کے روکنے میں ایک مسلمان کو ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنی چاہیے کہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔فرمایا:

﴿ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴾

(٣١/ لقمان:١٧)

''اچھی بات بتا اور بری بات سے روک اور جو تجھ پر پڑے اس کو سہار لے کہ یہ ہمت کے کام ہیں۔''

کفار اور مشرکین کی بدگوئیوں کو اور ان کی لائی ہوئی مصیبتوں کو برداشت کر لینا بھی بہادری ہے۔فرمایا:

﴿ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴾ (٣/ آل عمران :١٨٦)

''اور اگر صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑے ہمت کے کام ہیں۔''

اوپر کی تمام آیتوں میں صبر، برداشت، تحمل اور عفو و درگزر کو بڑی ہمت اور اخلاقی بہادری کا کام بلکہ خدا

کی محبوبی کا سبب بتایا گیا اور مسلمان کو اس پر عمل کرنیکی دعوت دی گئی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر دیکھئے کہ حسب ذیل آیت میں ایمان والوں کو دشمنوں کو بھی معاف کرنیکا حکم دیا گیا ہے:

﴿ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ ﴾ (٤٥/ الجاثية: ١٤)

''(اے پیغمبر!) ایمان والوں سے کہہ دو کہ ان کو جو ایام اللہ کی امید نہیں رکھتے، معاف کریں۔''

ایام اللہ (خدا کی گرفت اور شہنشاہی کے دن) کی جو امید نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی کافر ہیں جو کافر و مشرک ہیں اب دیکھئے کہ کافر و مشرک کے خلاف اسلام کو جو شدید بیزاری ہے اس کے باوجود مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ وہ ان کو معاف کریں اور ان کی خطاؤں سے درگزر کریں، کیا اس سے زیادہ اسلام سے کسی نرمی کا مطالبہ ہے؟ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی ترغیب کی خاطر اس عفوو درگزر اور معافی کو اپنا خاص وصف بتا کر ان کو اپنی پیروی کی تلقین فرماتا ہے:

﴿ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴾

(٤/ النسآء: ١٤٩)

''اگر کسی نیکی کے کام کو کھلے طور سے کرو یا چھپا کر کرو یا کسی برائی کو معاف کرو (تو یہ مسلمان کی شان ہے) کیونکہ خدا معاف کرنے والا، قدرت والا ہے۔''

یعنی جب گناہگاروں اور بدکاروں کو معاف کرنا خدا کی صفت ہے تو بندوں میں بھی خدا کی اس صفت کا جلوہ پیدا ہونا چاہیے اور اس تعلیم میں قرآن پاک یہ بلاغت اختیار کرتا ہے کہ فرماتا ہے کہ تمہارا خداوند تعالیٰ تو ہر قسم کی قدرت علی الاطلاق رکھنے کے باوجود اپنے بندوں کو معاف کرتا ہے تو انسان جس کی قدرت محدود ہے اور جس کا اختیار مشروط ہے اور جس کی عاجزی و درماندگی ظاہر ہے اس کو تو بہر حال معاف ہی کرنا چاہیے، اسی کے قریب قریب یہ آیت پاک بھی ہے:

﴿ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

(٢٤/ النور: ٢٢)

''اور چاہیے کہ معاف کریں اور درگزر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے، اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

یعنی تم دوسروں کو معاف کرو تو اللہ تم کو معاف کرے گا اس میں عفوو درگزر کی کتنی عظیم الشان ترغیب ہے۔

برائی کی جگہ نیکی

عفوو درگزر کے بعد اس سے زیادہ اہم تعلیم یہ ہے کہ جو برائی کرے، نہ صرف یہ کہ اس کو معاف کرو، بلکہ اس کے ساتھ بھلائی کرو اور جو عداوت رکھے اس کے ساتھ حسن سلوک کرو، اس تعلیم ربانی پر عمل کرنے

والوں کا نام خدا نے صابر اور ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ یعنی ''بڑا خوش قسمت'' رکھا ہے اور بتایا ہے کہ دشمن کو دوست بنا لینے کی یہ بہترین تدبیر ہے۔ فرمایا:

﴿ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۝ ﴾

(۴۱/ حٰمٓ السجدۃ:۳۵۔۳۶)

''نیکی اور بدی برابر نہیں، تو برائی کا جواب بہتری سے دے پھر دیکھ کہ وہ جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائے گا جیسا ناتے دار دوست اور یہ بات انہی کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت (صبر) رکھتے ہیں اور جس کی بڑی قسمت ہے۔''

اس عظیم الشان تعلیم کو اللہ تعالیٰ نے ''بڑی خوش قسمتی'' سے تعبیر کیا ہے، اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پھر دوسری جگہ فرمایا مشرکوں اور کافروں کے طعنوں کا برا نہ مانو۔ کیونکہ دینی معاملہ میں بھی غصہ سے کوئی بے جا حرکت کر بیٹھنا شیطان کا کام ہے، اگر ایسا موقع پیش آئے تو خدا سے دعا مانگنی چاہیے کہ وہ شیطان کے پھندے سے بچالے اور غصہ سے محفوظ رکھے:

﴿ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۚ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ ۝ وَقُلْ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ ۝ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُونِ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۹۶۔۹۸)

''مشرکوں کی برائی کا جواب بھلائی سے دے، ہم جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور کہہ کہ اے میرے پروردگار! میں شیطانوں کی چھیڑ سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور اے رب! اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔''

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز، خیرات، صبر اور عفو کا ذکر فرمایا ہے اور ان کاموں کے بدلہ میں جنت کا وعدہ کیا ہے۔ مگر تمام مذکورہ بالا نیکیوں میں سے دوبارہ صرف صبر ہی کو خصوصیت کے ساتھ اس جنت کے ملنے کا سبب قرار دیا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ ۝ وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ جَنَّاتُ عَدْنٍ ﴾

(۱۳/ الرعد:۲۱۔۲۳)

''جو لوگ اس کو جوڑتے ہیں جس کے جوڑنے کا حکم ان کو اللہ نے دیا ہے (یعنی ایک دوسرے کا حق) اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور حساب کے برے انجام سے خوف کھاتے ہیں اور جو

اپنے پروردگار کی خوشی کے لیے صبر کرتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے چھپے اور کھلے خیرات کرتے ہیں اور برائی کے بدلہ بھلائی کرتے ہیں، انہی کے لیے ہے پچھلا گھر، ہمیشہ رہنے کے باغ۔''

ان سے کہا جائیگا: ﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ (۱۳/ الرعد: ۲٤) ''تم پر سلامتی ہو اس کے بدلے میں کہ تم نے صبر کیا، سو خوب ملا پچھلا گھر۔'' آپ نے دیکھا کہ جنت کی اس بشارت غیبی میں نہ تو نماز کا ذکر ہے نہ خیرات کا اور نہ خوف خدا کا۔ صرف ایک صبر کی جزا کی خوش خبری ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ برائی کے بدلہ نیکی کرنا ایسی اہم چیز ہے کہ نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض کے پہلو بہ پہلو اس کا بھی ذکر کیا جائے۔ ایک اور آیت میں نومسلم یہودیوں کو اپنے برخلاف اپنی ہم قوموں سے جو دلآزار فقرے اور اعتراضات سننے پڑتے ہیں اور وہ اس پر صبر کرتے ہیں اس کی تعریف کی گئی ہے کہ اسلام کے اثر سے اب ان کا یہ حال ہوگیا ہے کہ وہ برائی کی جگہ بھلائی کرتے ہیں:

﴿ أُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ۝ ﴾ (۲۸/ القصص: ٥٤۔٥٥)

''وہ لوگ صبر کے سبب سے اپنا حق دہرا پائیں گے اور وہ برائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں اور ہمارا دیا کچھ خیرات کرتے ہیں اور جب کوئی نکمی بات سنتے ہیں تو اس سے درگزر کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے کام ہیں اور تمہارے لیے تمہارے کام، سلامت رہو، ہم کو بے سمجھوں سے مطلب نہیں۔''

ان آیتوں کے ایک ایک ٹکڑے پر غور کیجئے۔ نہ صرف یہ کہ برائی کا بدلہ نیکی کے ساتھ دیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں بلکہ ان کے حق میں سلامتی کی دعائے خیر بھی کرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''قرابت کا حق ادا کرنے والا وہ نہیں ہے جو احسان کے بدلہ میں احسان کرتا ہو بلکہ وہ ہے جو بدسلوکی پر سلوک کرتا ہو۔'' [1] ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر عرض کی کہ اے خدا کے پیغمبر ﷺ! میرے کچھ رشتہ دار ہیں جن کے ساتھ میں تو سلوک کرتا ہوں مگر وہ بدسلوکی کرتے ہیں۔ میں نیکی کرتا ہوں اور وہ بدی کرتے ہیں۔ میں حلم اور بردباری سے پیش آتا ہوں اور وہ جہالت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو تو تم ان کے منہ میں مٹی بھر رہے ہو، یعنی نیکی کے لقمہ سے ان کا منہ بند کر رہے ہو اور جب تک تم اس روش پر قائم رہو گے، خدا کی مدد شامل رہے گی۔'' [2] حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب لیس الواصل بالمکافی: ٥٩٩١۔

[2] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب صلة الرحم: ٦٥٢٥؛ احمد، ۲/ ۳۰۰۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ’’تم ہر ایک کے پیچھے نہ چلو، تم کہتے ہو کہ اگر لوگ تیرے ساتھ بھلائی کریں گے تو ہم بھی کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں گے تو ہم بھی کریں گے، یہ نہیں بلکہ اپنے کو پرسکون اور مطمئن رکھو۔ لوگ تمہارے ساتھ بھلائی کریں تو بھلائی کرو اور اگر برائی کریں تو بھی ظلم نہ کرو‘‘۔ [1]

وہ لوگ جو اسلام اور مسلمانوں کو اپنی فریب کاریوں، جھوٹے وعدوں، خیانت کارانہ معاہدوں اور پرفریب صلحوں سے دھوکا دیا کرتے تھے ان کے متعلق بھی آنحضرت ﷺ کو یہی ہدایت ہوئی:

﴿ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۳)

’’اور ان میں سے چند کے سوا اوروں کی کسی نہ کسی خیانت سے تو ہمیشہ مطلع ہوتا رہتا ہے تو تو ان کو معاف کر اور ان کے قصور سے درگزر کر کہ اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔‘‘

غور کا مقام ہے کہ ایسی خیانت کار قوم کو بھی معاف کرنا اور ان کے قصوروں سے درگزر کرنا، اسلام میں وہ نیکی ہے جس کے سبب سے خدا ان نیکی کرنیوالوں کو اپنے پیار اور محبت کی خوش خبری دیتا ہے۔

ان تمام تفصیلات سے واضح ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم اس باب میں کس قدر اہم اور کامل ہے۔

[1] جامع ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ما جاء فی الاحسان والعفو: ۲۰۰۷ (غریب)۔

اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ

تمدن کے زمانہ میں نظامِ حکومت میں جو ترقیاں ہو جاتی ہیں، ان کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ تمدن اصول قانون میں کوئی جدید اضافہ کر دیتا ہے، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ تمدنی نظام حکومت میں قانون کے نفاذ میں ان وسیع اور ہمہ گیر دفعات کا لحاظ رکھا جاتا ہے، جو اس کے اثر کو اس قدر عام کر دیتا ہے کہ دنیا کا ایک ذرہ بھی ان کے حدود سے باہر نہیں جا سکتا، لیکن وحشت کے زمانہ میں صرف سادہ قانون نافذ کر دیا جاتا ہے اور گرد و پیش اور اطراف و جوانب کے حالات پر نظر نہیں کی جاتی، ہر سلطنت نے چوری کو ایک جرم قرار دیا ہے اور اس لحاظ سے ایک غیر متمدن سلطنت بھی ایک اعلیٰ سے اعلیٰ مہذب حکومت کی ہم پلہ ہے، لیکن اس جرم کے کلی استیصال کے لیے اسی قدر کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا استیصال صرف اس وقت ہو سکتا ہے، جب وہ تمام لوگ مجرم قرار دیے جائیں جو اس جرم میں اعانت کرتے ہیں، موقعِ واردات کا سراغ دیتے ہیں، مال مسروقہ کو بیچتے یا خریدتے ہیں، وغیرہ وغیرہ بہر حال تمدنی نظام حکومت کو ایک غیر متمدن سلطنت پر جو ترجیح و امتیاز ہے، وہ صرف اس بنا پر ہے کہ تمدن نے اس کے اصول و آئین کو نہایت وسیع اور عام کر دیا ہے اور وحشیانہ نظام حکومت میں یہ وسعت اور ہمہ گیری نہیں پائی جاتی، تمدن کے زمانہ میں انسانی ضروریات میں جو غیر محدود اضافہ ہو جاتا ہے اس کا راز بھی تمدن کی اسی خصوصیت کے اندر مضمر ہے۔

تفصیل اور ہمہ گیری

مذہب بھی ایک عظیم الشان روحانی سلطنت ہے اور جس اصول کی بنا پر ایک دنیوی حکومت کو دوسری حکومت پر ترجیح دی جا سکتی ہے، اسی کو مختلف مذاہب کے موازنہ و مقابلہ کا بھی معیار قرار دیا جا سکتا ہے، مثلاً: اصولِ شریعت میں دنیا کے اکثر مذاہب میں اشتراک و اتحاد پایا جاتا ہے، اس لحاظ سے عقائد میں، اعمال میں، عبادات میں، معاملات میں، اخلاق میں، جو چیزیں ناجائز اور مصلحتِ عامہ کے مخالف تھیں، ان کی سرسری طور سے سب نے ممانعت کی اور جو چیزیں جائز اور مصالح عامہ کے موافق تھیں، ان کی ترغیب دی، لیکن امر و نہی کے طریقے اور ان کی جزئیات کے احاطہ میں کمی و بیشی ہے اور اسی نے ان مذاہب کے احکام و شرائع میں باہم امتیاز پیدا کر دیا ہے، اس بنا پر جس طرح اس حکومت کے قانون کو سب سے بہتر کہا جاتا ہے، جس سے برائیوں کا تمام تر سدّ باب ہوتا ہے اور جس کے اندر تمام جزئیات کا احاطہ کر لیا گیا ہو، اسی طرح بہترین اخلاقی تعلیم وہ ہے، جس نے محاسن اور مفاسد کا سب سے زیادہ استقصا کیا ہو اور عام انسانوں کے لیے کھول کر ان کو اچھی طرح بیان کر دیا ہو اور اس کے ہر ہر گوشہ کو اس قدر روشن کر دیا ہو کہ غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے، اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو ترجیح و امتیاز ہے، اس کا ایک سبب اس کے احکام کی تفصیل، ہمہ گیری اور انضباط ہے، یعنی اسلام نے اپنے اصول و احکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیوں کا کلی استیصال ہو گیا

ہے اور نیکیوں کے مظاہر عام ہو گئے ہیں، اس کے بخلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کے جزئیات کی نہایت نامکمل اور اجمالی تشریح کی ہے، مثلاً: توحید تمام مذاہب کا امّ الاصول ہے لیکن کامل طور پر کسی مذہب نے اس کی حقیقت اور اس کے مظاہر کی تعیین نہیں کی، اس بنا پر ہر مذہب میں شرک کسی نہ کسی صورت میں شامل ہو گیا، صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے شرک کے تمام علل واسباب اور عواقب ونتائج کی تحدید کی اور ان کا کلی استیصال کیا، شرک کا ایک متداول طریقہ بت پرستی تھا، اس کے انسداد کا سادہ طریقہ یہ تھا کہ تمام قوم کو توحید کی دعوت دی جاتی اور عرب کے تمام بت توڑ دیے جاتے، لیکن اسلام نے صرف اس سادہ طریقہ پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان تمام چیزوں کو ناجائز قرار دیا جو ان بتوں کی یاد کو تازہ کر سکتی تھیں، تصویر بجائے خود کوئی بری چیز نہ تھی، تاہم وہ بت پرستی کا ایک عام مظہر تھی، اس لیے اسلام نے اس کو ناجائز قرار دیا، کسی کی مدح میں غلو و اغراق اگرچہ ایک قسم کی بداخلاقی ہے، تاہم اس سے اشخاص کے اثر اور ان کے نفوذ و طاقت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے، اگر اس سے کوئی نیک کام لیا جائے تو وہ نہایت مفید چیز ہو سکتا ہے، اسلام اپنے عالمگیر اثر کی وسعت کے لیے اس سے کام لے سکتا تھا، تاہم چونکہ اس سے شخص پرستی کی بنیاد قائم ہوتی ہے، جس نے امم قدیمہ میں شرک کی صورت اختیار کر لی تھی، اس لیے آنحضرت ﷺ نے برسر منبر سختی کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی:

((لا تطرونی کما اطرت النصاری ابن مریم فانما انا عبده فقولوا عبدالله ورسوله)) [1]

''میری شان میں مبالغہ نہ کرو، جس طرح نصاریٰ نے ابن مریم کی شان میں کیا میں تو اللہ کا بندہ ہوں، تو کہو کہ اللہ کا بندہ اور رسول۔''

یہ ایک کلی حکم تھا اور آنحضرت ﷺ نے ہر موقع پر اس کی پابندی کرائی، اسی طرح شرک کے ایک ایک ریشہ کو بتا بتا کر اس کی بیخ کنی کی، یہی حال عبادات کا بھی ہے، اس کے ایک ایک رکن اور طریقہ کو اسلام نے پوری تفصیل سے واضح کر دیا اور یہی روش اس کے اخلاقی تعلیمات کی بھی ہے، اخلاق کے تمام جزئیات کا پوری طرح احاطہ کر کے اپنے پیرووں کو ان سے ہر طرح آگاہ فرما دیا اور کوئی بات سوال و جواب کے لیے باقی نہیں رکھی، یہی معنی اس تکمیل کے ہیں، جس کے لیے آپ کی بعثت ہوئی۔

آنحضرت ﷺ نے اخلاق کی تکمیل، تین حیثیتوں سے فرمائی ہے:

① تمام اخلاقی تعلیمات کا احاطہ۔

② ہر برائی اور بھلائی کے سارے جزئیات کا احاطہ۔

[1] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول الله تعالیٰ: ﴿واذكر في الكتاب مريم......﴾ ٣٤٤٥۔

③ نرمی وگرمی، عاجزی و بلند ہمتی دونوں قسم کے اخلاق کی تفصیل اوران کے مواقع کی تحدید۔

اخلاقی تعلیمات کا احاطہ

یہودی وعیسائی اور دوسرے اخلاقی معلمین کی تعلیمات کی فہرست پر ایک استقصائی نظر ڈال لینا، اس راز کو فاش کر دے گا کہ انسان کے تمام اخلاقی احوال اور کیفیات کا احاطہ ان میں سے کسی نے نہیں کیا ہے، بلکہ صرف اپنے زمانہ اور اپنی قوم کے حالات کو سامنے رکھ کر اپنی اخلاقی اصلاحات کی فہرست بنالی گئی ہے اور ان میں سے بھی صرف چند اصول کو سب سے زیادہ اہمیت دے کران کو ہر جگہ اپنی تعلیم میں نمایاں کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفہ میں سب سے زیادہ اہمیت احکام عشرہ کی ہے، یعنی وہ دس احکام جو بنی اسرائیل کو کوہِ سینا کے دامن میں سنائے گئے تھے، ان دس احکام میں سے پہلا حکم توحید، دوسرا تصویر اور مجسمہ بنانے کی ممانعت، تیسرا اللہ کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی کراہت اور چوتھا سبت کے دن آرام کرنے کی ہدایت پر مشتمل ہے، باقی اخلاقی احکام صرف چھ ہیں، جو حسب ذیل ہیں: (دیکھو خروج باب ۲۰ آیت: ۱۲ تا ۳۰)

تورات کے اخلاقی احکام

① تو اپنے ماں اور باپ کو عزت دے۔

② تو خون مت کر۔

③ تو زنا مت کر۔

④ تو چوری مت کر۔

⑤ تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے۔

⑥ تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور اس کی کسی چیز پر جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ مت کر۔

یہ گویا انسان کے اخلاقی سبق کی ابجد ہے، اس کے بعد خروج باب ۲۲ اور ۲۳ میں قانونی احکام کے ساتھ ساتھ دو تین باتیں اور آ گئی ہیں، یعنی مسافر، بیوہ اور یتیم کے ساتھ سلوک کا حکم اور جھوٹی گواہی کی ممانعت، پھر احبار باب ۱۹ میں انہی احکام کی حسب ذیل مزید تفصیل ہے:

① تم میں سے ہر شخص اپنی ماں اور باپ سے ڈرتا رہے۔

② تم چوری نہ کرو، نہ جھوٹا معاملہ کرو، ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولو۔

③ تم میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھاؤ۔

④ تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے، تو مزدور کی مزدوری چاہیے کہ ساری رات صبح تک تیرے پاس نہ رہ جائے۔

⑤ تو بہرے کو مت کوس، تو وہ چیز جس سے اندھے کو ٹھوکر لگے، اندھے کے آگے مت رکھ۔

⑥ تو حکومت میں بے انصافی نہ کر، غریب وامیر کو نہ دیکھ، بلکہ انصاف سے اپنے بھائی کی عدالت کر۔

⑦ تو عیب جوؤں کے مانند اپنی قوم میں آیا جایا نہ کر اور اپنے بھائی کے خون پر کمر نہ باندھ۔

⑧ تو اپنے بھائی سے بغض اپنے دل میں نہ رکھ۔

⑨ تو اپنی قوم کے فرزندوں سے بدلہ مت لے اور نہ ان کی طرف سے کینہ رکھ۔

⑩ تو اس کے آگے جس کا سر سفید ہے، اٹھ کھڑا ہو اور بوڑھے مرد کو عزت دے۔

⑪ اگر کوئی مسافر تمہاری زمین پر تمہارے ساتھ سکونت کرے، تم اس کو مت ستاؤ، بلکہ مسافر کو جو تمہارے ساتھ رہتا ہے، ایسا جانو جیسے وہ تم میں پیدا ہوا ہے، بلکہ تم اس کو ایسا پیار کرو، جیسا آپ کو کرتے ہو۔

⑫ تم حکومت کرنے میں، پیمائش کرنے میں، تولنے میں، ناپنے میں بے انصافی نہ کرو۔

انجیل کے اخلاقی احکام

انجیل نے اخلاقی تعلیمات کا نہ صرف یہ کہ احاطہ نہیں کیا ہے، بلکہ ان کی تفصیل بھی نہیں کی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد درحقیقت بنی اسرائیل کی رسم پرستی اور شریعت کی ظاہری پابندی کے خلاف معنی اور روح کی طرف دعوت تھی، یہ حقیقت جس طرح احکام میں نظر آتی ہے، اخلاق میں بھی جھلکتی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اخلاقی تجدید و اصلاح یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توراۃ، حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور، حضرت سلیمان علیہ السلام کے امثال اور دوسرے اسرائیلی صحیفوں میں جو خالص بلند اخلاقی تعلیمات منتشر تھیں اور جن کو بنی اسرائیل اپنے قانونی احکام کے سامنے بھلا بیٹھے تھے، ان کو یک جا اپنے مشہور وعظ میں ان کے سامنے پیش کیا، اس مشہور اخلاقی وعظ میں بہ ترتیب حسب ذیل باتیں بیان کی گئی ہیں۔ دل کی غریبی، غمگینی، حلم و بردباری، راست بازی، رحم دلی، پاک دلی، صلح جوئی، صبر، عفو و درگزر، پاک دامنی، قسم کھانے کی ممانعت، ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، قرض معاف کرنا، دشمنوں کو پیار کرنا، ریا کی ممانعت، توکل، عیب نہ لگانا، جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں، ایسا تم بھی ان کے ساتھ کرو۔ یہ اخلاقی تعلیمات بیشتر انہی لفظوں کے ساتھ جو انجیل میں ہیں، بنی اسرائیل کے مختلف صحیفوں میں مذکور ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خاص طور سے ان اخلاقیات کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنے سے مقصود ان میں اخلاقی توازن کا قائم کرنا اور رسمی اخلاق اور لفظی شریعت کے اصل روح و معنی کو جلوہ گر کرنا تھا۔

اسلام میں اخلاقی احکام کا استقصا

محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کسی خاص قوم یا زمانہ تک محدود نہیں، اس لیے آپ کو اخلاقی تعلیمات کا جو صحیفہ عنایت ہوا اس کو صرف ایک قوم یا زمانہ کی اخلاقی اصلاح تک محدود نہیں رکھا گیا، بلکہ تمام قوموں اور

زمانوں تک وسیع کیا گیا، اس لیے تمام قوموں اور زمانوں میں جو برائیاں پائی جاتیں یا پائی جانے والی تھیں، ان سب کو استقصا کر کے منع کیا گیا اور اسی طرح تمام انسانی اخلاقی محاسن کو بھی کھول کر بیان کیا گیا اور ان کے حصول کی تاکید کی گئی، گزشتہ صحیفوں میں جن برائیوں سے روکا گیا تھا، یا جن نیکیوں کی تعلیم دی گئی تھی، آنحضرت ﷺ کی وحی مبارک نے ان کی تمام جزئیات کا استقصا کیا اور ان کے گوشہ گوشہ کو کھول کر روشن کر دیا، ذیل میں ہم ان اخلاقی تعلیمات کی ایک مجمل فہرست درج کرتے ہیں، جن کی تعلیم یا ممانعت قرآن پاک نے کی ہے۔

قرآنی اخلاق کی فہرست

سچ بولنا، جھوٹ کی برائی، علم بے عمل کی مذمت، عام عفو و درگزر، توکل، صبر، شکر، حق پر استقامت، اللہ کی راہ میں جان دینا، سخاوت اور خیرات کا حکم، بخل کی برائی، اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت، میانہ روی کی تاکید، عزیزوں، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور پڑوسیوں کے ساتھ نیکی، مسافروں، سائلوں اور غریبوں کی امداد، غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ احسان، فخر و غرور کی برائی، امانت داری، وعدہ کا ایفا کرنا، عہد کا پورا کرنا، معاہدوں کا لحاظ رکھنا، صدقہ و خیرات، نیکی اور بھلائی کی بات کرنا، آپس میں لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا، کسی کو برا بھلا نہ کہنا، کسی کو نہ چڑانا، نہ برے ناموں سے یاد کرنا، والدین کی خدمت اور اطاعت، ملاقاتوں میں باہم بھلائی اور سلامتی کی دعا دینا، حق گوئی، انصاف پسندی، سچی گواہی دینا، گواہی کو نہ چھپانا، جھوٹی گواہی کا دل کی گناہگاری پر اثر، نرمی سے بات کرنا، زمین پر اکڑ کر نہ چلنا، صلح جوئی، اتحاد و اتفاق، ایمانی برادری، انسانی برادری، اکل حلال، روزی خود حاصل کرنا، تجارت کرنا، گداگری کی ممانعت، لوگوں کو اچھی بات کی تعلیم دینا اور بری بات سے روکنا، اولاد کشی، خودکشی اور کسی دوسرے کی ناحق جان لینے کی ممانعت، یتیم کی کفالت، اس کے مال و جائیداد کی نیک نیتی کے ساتھ حفاظت، ناپ اور تول میں بے ایمانی نہ کرنا، ملک میں فساد برپا نہ کرنا، بے شرمی کی بات سے روکنا، زنا کی حرمت، آنکھیں نیچی رکھنا، کسی کے گھر میں بے اجازت داخل نہ ہونا، ستر اور حجاب، خیانت کی برائی، آنکھ، کان اور دل کی باز پرس، نیکی کے کام کرنا، لغو سے اعراض، امانت اور عہد کی رعایت، ایثار، تحمل، دوسروں کو معاف کرنا، دشمنوں سے درگزر، بدی کے بدلہ نیکی کرنا، غصہ کی برائی، مناظروں اور مخالفوں سے گفتگو میں آداب کا لحاظ، مشرکوں کے بتوں تک کو برا نہ کہنا، فیصلہ میں عدل و انصاف، دشمنوں تک سے عدل و انصاف، صدقہ و خیرات کے بعد لوگوں پر احسان دھرنے کی برائی، اُلاہنے کی مذمت، فسق و فجور سے نفرت، چوری، ڈاکہ، رہزنی اور دوسرے کے مال کو بے ایمانی سے لے لینے کی ممانعت، دل کا تقویٰ اور پاکیزگی، پاکبازی جتانے کی برائی، رفتار میں وقار و متانت، مجالس میں حسنِ اخلاق، ضعیفوں، کمزوروں اور عورتوں کے ساتھ نیکی، شوہر کی اطاعت، بیوی کا حق ادا کرنا، ناحق قسم کھانے کی

برائی، چغل خوری، طعنہ زنی اور تہمت دھرنے کی ممانعت، جسم و جان اور کپڑوں کی پاکیزگی اور طہارت، شرم گاہوں کی ستر پوشی، سائل کو نہ جھڑکنا، یتیم کو نہ دبانا، اللہ کی نعمت کو ظاہر کرنا، غیبت نہ کرنا، بدگمانی نہ کرنا، سب پر رحم کرنا، ریا اور نمائش کی ناپسندیدگی، قرض دینا، قرض معاف کرنا، سود اور رشوت کی ممانعت، ثبات قدم، استقلال اور شجاعت و بہادری کی خوبی، لڑائی کے گھمسان سے نامردی سے بھاگ کھڑے ہونے کی برائی، شراب پینے اور جوا کھیلنے کی ممانعت، بھوکوں کو کھانا کھلانا، ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شرمی کی باتوں سے پرہیز، بے غرض نیکی کرنا، مال و دولت سے محبت نہ ہونا، ظلم سے منع کرنا، لوگوں سے بے رخی نہ کرنا، گناہ سے بچنا، ایک دوسرے کو حق پر قائم رکھنے کی فہمائش، معاملات میں سچائی اور دیانتداری۔

احادیث کے اخلاقیات کی فہرست

یہ وہ تعلیمات ہیں، جن کا ماخذ قرآن پاک ہے، ان کے علاوہ اسلام کی اخلاقیات کا بڑا ذخیرہ آنحضرت ﷺ کے ان اقوال میں ہے جو ان کی تفسیر و تشریح میں احادیث میں مذکور ہیں، ان کی کثرت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ کنز العمال میں جو ہر قسم کی حدیثوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے، آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات باریک ٹائپ کے بڑی تقطیع کے ۱۸۷ صفحوں میں ہیں جن میں سے ہر صفحہ میں ۳۷ سطریں ہیں اور تعداد کے اعتبار سے یہ تین ہزار نو سو چھ حدیثیں ہیں، جو ڈھائی سو کے قریب مختلف اخلاقی ابواب و عنوانات میں منقسم ہیں، ان میں سے بعض مکرر باتیں بھی ہیں تاہم ان سے اندازہ ہوگا کہ انسان کی اخلاقی و نفسانی کیفیات و حالات کا کوئی ایسا جزو نہ ہوگا جو داعی اسلام ﷺ کی تلقینات کی فہرست سے رہ گیا ہو اور جس پر دنیا کے اس سب سے بڑے اور سب سے آخری اخلاقی معلم کی نگاہ نہ پڑی ہو، ہم ذیل میں آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات کے صرف وہ عنوانات لکھتے ہیں، جو صحیح بخاری، جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں مذکور ہیں۔ صلہ رحمی، ماں باپ کے ساتھ سلوک، بچوں سے محبت، چھوٹوں کی محبت اور بڑوں کی عزت، اپنے بھائی کو اپنے ہی مانند چاہنا، ہمسایوں کے ساتھ سلوک، غلاموں کے ساتھ سلوک، غلاموں کا قصور معاف کرنا، اہل و عیال کی پرورش، یتیموں کی پرورش، بیوہ کی خبر گیری، حاجت مندوں کی امداد، اندھوں کی دست گیری، عام انسانوں کے ساتھ ہمدردی، قرض داروں پر احسان، فریادیوں کی فریاد رسی، خلق کو نفع رسانی، مسلمانوں کی خیر خواہی، جانوروں پر شفقت اور رحم، محسنوں کی شکر گزاری، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق، بیماروں کی خدمت و عیادت، رشک و حسد کی ممانعت، دوسروں کی مصیبت پر خوش ہونے کی ممانعت، شجاعت و بہادری، لڑائی کے میدان سے بھاگنے کی برائی، امیر و امام کی اطاعت، مداومت عمل، اپنے ہاتھ سے کام کرنا، شیریں کلامی، خوش خلقی، فیاضی، بدزبانی سے اجتناب، مہمان نوازی، شرم و حیا، حلم و وقار، غصہ کو ضبط کرنا، عفو و درگزر، صبر و تحمل، حسب و نسب پر فخاری کی مذمت، بدگمانی کی برائی، کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل ہونا، دوسروں کے گھر جا کر ادھر ادھر نہ دیکھنا، دوسرے بھائی کے لیے پیٹھ پیچھے دعا کرنا، رفق و نرمی، قناعت اور

استغنا، گداگری کی ممانعت، اپنے گناہوں کی پردہ پوشی، اپنے بھائیوں کے عیوب پر پردہ ڈالنا، چغل خوری کی ممانعت، تہمت لگانے کی برائی، غیبت کی ممانعت، بغض وکینہ کی ممانعت، دوسروں کی ٹوہ لگانے کی ممانعت، رازداری، تواضع وخاکساری، امانت داری، گالی کی ممانعت، منہ پر مدح وستائش کی ممانعت، لعنت کرنے کی ممانعت، بخل کی ممانعت، فضول گوئی کی ممانعت، فضول خرچی کی ممانعت، کبروغرور کی مذمت، ہنسی مذاق کی برائی، نفس انسانی کا احترام، ظلم کی ممانعت، عدل وانصاف، تعصب کی ممانعت، سخت گیری کی ممانعت، غم خواری وغم گساری، توکل، لالچ کی برائی، رضا بالقضاء، ماتم کی ممانعت، قمار بازی کی ممانعت، سچائی کی ہدایت اور جھوٹ کی ممانعت، جھوٹی گواہی کی ممانعت، جھگڑا فساد کرنے کی ممانعت، باہم مصالحت کرانا، ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراض نہ رہے، منافقت اور دورخی چال کی مذمت، وعدہ خلافی کی ممانعت، خیانت اور فریب کی ممانعت، شراب خوری، زنا کاری اور چوری کی ممانعت، طہارت وصفائی، دوست واحباب کی ملاقات، سلام وتحیت، مصافحہ ومعانقہ، دیگر آدابِ ملاقات، آدابِ مجلس، آدابِ طعام، آدابِ لباس، آدابِ نشست وبرخاست، خانہ داری کے آداب، سونے جاگنے کے آداب، عورتوں کے متعلق خاص آداب واخلاق وسلوک کے احکام۔

ان تفصیلات سے قیاس ہو سکے گا کہ آنحضرت ﷺ کے ذریعہ اخلاقیات کا کتنا عظیم الشان ذخیرہ انسانوں کو عطا کیا گیا ہے۔

اخلاقی جزئیات کا استقصا

انسان بڑا بہانہ جو اور حیلہ طلب واقع ہوا ہے، اس کے لیے اخلاقیات کے صرف کلی اصول کافی نہیں کہ وہ لفظوں کے ہیرپھیر کے سایہ میں پناہ لے اور صرف چند رسوم کی لفظی تقلید پر قناعت کر لے، اس کے لیے ضرورت ہے کہ ہر خوش اخلاقی یا بداخلاقی کے ایک ایک جزئیہ کا استقصا کیا جائے اور اس کے ایک ایک ریشہ کو کھول دیا جائے اور اس کی تہ کی اصلی گہرائیوں تک پہنچا جائے، اس کے وسائل اور ذرائع کا بھی پتہ لگایا جائے اور ان کے متعلق صریح احکام دیے جائیں، آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات نے اس نکتہ کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے، اس کی توضیح کے لیے امرونہی دونوں کی ایک ایک دو دو مثالیں کافی ہوں گی۔

صدقہ وخیرات تمام مذہبوں میں ثواب کا سب سے بڑا کام سمجھا گیا ہے، لیکن توراۃ نے اس کو صرف عشر اور زکوٰۃ تک محدود رکھا ہے، ان کے علاوہ کسی اور قسم کی خیرات کا ذکر اس میں نہیں ملتا، انجیل نے سب کچھ غریبوں کو دے کر خود غریب بن جانے کو اچھا سمجھا ہے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے اور ہر ایک کے ایک ایک جزو کی تفصیل کر دی، توراۃ میں یہ مبہم تھا، کہ کتنے غلہ یا سونے چاندی کے مالک پر عشر یا زکوٰۃ فرض اور کن کن چیزوں میں فرض ہے، شریعت محمدی ﷺ نے اس کے متعلق مقدار اور تعداد اور زمانہ کی

پوری پوری تعیین کردی، وہ اجناس مقرر کر دیے جن میں عشر یا زکوۃ واجب ہے، ان کی تحصیل کا طریقہ بتا دیا، ان کے اخراجات اور مصارف کی نوعیتوں کی تشریح کردی، اس نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا کر خود مفلس اور کنگال بن جاؤ بلکہ یہ کہا:

﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ ٱلْعَفْوَ ۗ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱۹)

''لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، کہہ دے کہ جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔''

مگر اخلاقی حیثیت سے اس نے یہ تلقین ضرور کی کہ تم خود اپنی ضرورت روک کر اور اپنے اوپر تھوڑی تکلیف اٹھا کر، دوسروں کی حاجت پوری کرو، تو یہ تمہارے کمالِ خلق کی دلیل ہے، انصار جنہوں نے خود تکلیفیں اٹھا کر مہاجرین کی مصیبتیں دور کیں، ان کی تعریف میں اللہ نے فرمایا:

﴿ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ ﴾ (۵۹/ الحشر ۹)

''وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، اگر چہ خود ان کو حاجت ہو۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم کی مدح میں فرمایا:

﴿ يُطْعِمُونَ ٱلطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِۦ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ ﴾ (۷۶/ الدھر:۸)

''خود کھانے کی خواہش کے باوجود مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلا دیتے ہیں۔''

قرآن پاک سراپا انفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہدایت سے بھرا ہوا ہے۔

اکثر لوگ وہ چیز اللہ کی راہ میں دوسروں کو دیتے ہیں، جو سڑی، گلی، خراب اور نکمی ہو، قرآن پاک نے اس سے روکا کہ یہ نفس کے تزکیہ اور صفائی کے بجائے جو اس خیرات کا مقصد ہے، نفس کی اور دنایت اور آلودگی ظاہر کرتا ہے، فرمایا:

﴿ لَن تَنَالُوا۟ ٱلْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا۟ مِمَّا تُحِبُّونَ ۚ وَمَا تُنفِقُوا۟ مِن شَىْءٍ فَإِنَّ ٱللَّهَ بِهِۦ عَلِيمٌ ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۹۲)

''تم ہرگز پوری نیکی کو نہ پاؤ گے، جب تک اس میں سے تم نہ خرچ کرو، جو تم کو محبوب ہے اور جو بھی تم خرچ کرو، اللہ کو اس کا علم ہے۔''

پھر فرمایا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَنفِقُوا۟ مِن طَيِّبَـٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ ٱلْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا۟ ٱلْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِـَٔاخِذِيهِ إِلَّآ أَن تُغْمِضُوا۟ فِيهِ ۚ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ غَنِىٌّ حَمِيدٌ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶۷)

''اے ایمان والو! جو تم کماتے ہو، اس میں کی اچھی چیزیں اور جو ہم تمہارے لیے زمین

سے نکالتے ہیں، اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دو اور اس میں سے خراب چیز دینے کا قصد بھی نہ کرو کہ تم کو کوئی ایسی چیز دے تو نہ لو، مگر یہ کہ چشم پوشی کر لو اور یقین کرو کہ اللہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے۔''

اس آیت پاک کے خاتمہ کی بلاغت پر غور کرو، کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت فرمایا کہ ''وہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے۔'' یعنی اس نے اپنے بندوں کو مال کے بہترین حصہ کے خیرات کرنے کی جو ہدایت فرمائی، اس کا یہ سبب نہیں کہ نعوذ باللہ خود اللہ کو اپنے بندوں کی اچھی چیزوں کی ضرورت ہے، کہ وہ ہماری ہر اچھی سے اچھی چیز سے بے نیاز اور بے پروا ہے، بلکہ یہ سبب ہے کہ وہ خوبیوں والا ہے، اس لیے خوبی ہی والی چیز کو قبول کرتا ہے۔ سب سے پہلے تمہاری امداد کے محتاج خود وہ ہیں، جن کی کفالت کا بار تم پر ہے، اہل وعیال، دست نگر عزیز وقریب، پھر دوسرے محتاج ومسکین اور یتیم اور مسافر۔

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۱۵)

''لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات کریں، کہہ دے، جو کچھ تم نیکی کا مال خرچ کرو، وہ ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافر کے لیے اور جو بھی تم نیکی کا کام کرو، اللہ اس سے واقف ہے۔''

اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو خیرات کیا دے؟ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا کہ ''ہر مسلمان پر صدقہ دینا واجب ہے۔'' لوگوں نے عرض کی کہ اگر اس کی قدرت نہ ہو، تو فرمایا: ''مزدوری کرے اور جو ملے اس میں کچھ خود کھائے، کچھ محتاجوں کو کھلائے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، اگر مزدوری کرنے کی بھی قوت نہ ہو، فرمایا: ''تو غم رسیدہ حاجت مند کی کوئی جسمانی خدمت کرے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو نیکی کی تعلیم دے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو برائی کرنے سے بچے یہ بھی صدقہ ہے۔'' [1] دوسرے موقع پر فرمایا: ''اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھولے بھٹکے مسافر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کی دست گیری بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر، کانٹا اور ہڈی کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے اور اپنے ڈول کا پانی اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔'' [2] غور کیجئے کہ یہ صدقہ اور خیرات کا کتنا وسیع مفہوم ہے۔

کسی کے ساتھ کوئی نیکی کر کے اس کو یاد مت دلاؤ، نہ اپنا احسان اس پر جتاؤ، نہ اس سے اس کے شکریہ کے طالب ہو، نہ نمائش مقصود ہو، کہ اس سے خود نیکی برباد ہو جاتی ہے، آنحضرت ﷺ کو دوسری ہی وحی میں یہ نکتہ بتایا گیا، فرمایا:

[1] ادب المفرد امام بخاری، باب ان کل معروف صدقة: ۲۲۵۔

[2] جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی صنائع المعروف: ۱۹۵۶۔

﴿ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ﴾ (۷۴/ المدثر: ٦)

''اور اپنا احسان نہ جتا کہ تو اور زیادہ چاہے۔''

عام مسلمانوں کو تاکید کی گئی:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ (۲/ البقرۃ: ٢٦٤)

''اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان رکھ کر اور جتا کر برباد مت کرو، جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور پچھلے دن پر یقین نہیں رکھتا۔''

پھر فرمایا کہ ایسی خیرات سے تو معمولی سی نیکی بہتر ہے:

﴿ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴾

(۲/ البقرۃ: ٢٦٣)

''اچھی بات کہنی اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے، جس کے پیچھے احسان جتا کر دینے والے کے دل کو صدمہ پہنچایا جائے اور اللہ بے نیاز اور بردبار ہے۔''

ریا اور نمائش سے بچنا ہو تو چھپا کر دو اور اگر لوگوں کی تشویق وترغیب مقصود ہو تو دکھا کر کے بھی دے سکتے ہو:

﴿ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾ (۲/ البقرۃ: ٢٧١)

''اگر تم خیرات کھول کر دو تو بھی اچھا ہے اور اگر چھپا کر غریبوں کو دو تو وہ تمہارے لیے سب سے بہتر ہے اور اللہ تمہاری برائیوں کا کفارہ کر دے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔''

﴿ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ: ٢٧٤)

''جو لوگ اپنا مال رات اور دن، چھپے اور کھلے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، تو ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے، نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غم۔''

صدقہ اور خیرات کھلے دل سے ہنسی اور خوشی ہونی چاہیے، جبر وکراہت سے نہ ہو، کہ یہ منافقت کی نشانی ہے:

﴿ وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴾ (۹/ التوبۃ: ٥٤)

''اور وہ اللہ کی راہ میں نہیں خرچ کرتے لیکن کڑھ کر۔''

صدقہ وخیرات پکے دل سے اور صرف اللہ کے لیے ہونی چاہیے:

﴿ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲٦٥)

''اور ان کی مثال جو اپنا مال اللہ کی خوشنودی چاہ کر اور اپنا دل پکا کر کے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اس باغ کے مانند ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو۔''

بلکہ اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس سے مقصود خود اللہ ہو:

﴿ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۷۲)

''اور تم تو خرچ نہیں کرتے، مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر اور جو خیرات کرو گے، وہ تم کو پوری ملے گی تمہارا حق کچھ دبا نہ رہے گا۔''

صدقہ وخیرات کی ان تمام تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ اسلام نے اس ایک تعلیم کے کتنے گوشوں کا احاطہ کیا ہے۔

مسکرات کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ

احکام میں یہ وسعت اور ہمہ گیری اور بھی زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے، مثلاً: مسکرات کو تمام مذاہب نے صاف صاف حرام نہیں کیا ہے، مگر اچھا کسی نے نہیں سمجھا ہے، اسلام پہلا مذہب ہے، جس نے تذبذب اور شک اور ہاں اور نہیں کے تمام پہلوؤں کو دور کر کے اس بارہ میں ایک قطعی اور آخری فیصلہ نافذ کر دیا، اسلام سے پہلے گو بعض نیک لوگوں نے شراب کا پینا چھوڑ دیا تھا، لیکن یہ حرمت صرف اشخاص تک محدود تھی، اس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو ان کے نقصانات سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا اور خود اشخاص بھی اس کے اثر سے کلیتہً محفوظ نہیں رہ سکتے، مثلاً: ایک شخص شراب نہیں پیتا، لیکن اس کی تجارت کرتا ہے، ایک شخص ان دونوں چیزوں سے احتراز کرتا ہے، لیکن ان برتنوں کو استعمال میں لاتا ہے، جن میں شراب رکھی یا بنائی جاتی ہے، لیکن اسلام نے شراب کی حرمت کا اعلان اس جامعیت کے ساتھ کیا ہے کہ ان احکام کی مراعات کے ساتھ کوئی شخص شراب کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

قال رسول اللہ ﷺ: ((لعن اللّٰه الخمر وشاربها وساقيها، وبائعها ومبتاعها وعاصرها ومعتصرها وحاملها والمحمولة اليه)) [1]

آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ شراب پر، اس کے پینے والے پر، اس کے پلانے والے پر، اس

[1] ابوداود، کتاب الاشربة، باب العصير للخمر: ٣٦٧٤۔

کے بیچنے والے پر، اس کے خریدنے والے پر، اس کے نچوڑنے والے پر، اس سے اپنے لیے نچڑوانے والے پر، اس کے لے جانے والے پر اور اس شخص پر جس کے پاس وہ لے جائی جائے، لعنت کرتا ہے۔''

مہذب قانون کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ جس چیز سے لوگوں کو روکتا ہے، سب سے پہلے اس کی منطقی حقیقت (تعریف) بتائے، عرب میں شراب مختلف چیزوں سے بنتی تھی، اس کے مختلف نام تھے اور ان کا اثر بھی مختلف تھا، قرآن مجید میں حرمت شراب کے متعلق جو آیت نازل ہوئی ہے، اس میں خمر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس بنا پر خمر کی حقیقت کی تعیین نہایت ضروری تھی، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کی تعیین فرمادی۔

قال رسول اللہ ﷺ: ((ان من العنب خمرا وان من التّمر خمرا وان من العسل خمرا وان من البر خمرا وان من الشعير خمرا)) ❶

آپ ﷺ نے فرمایا: ''انگور سے بھی شراب بنتی ہے، کھجور سے بھی، شہد سے بھی، گیہوں سے بھی اور جو سے بھی۔''

قال سمعت رسول اللہ ﷺ يقول ((ان الخمر من العصير والزبيب والتمر والحنطة والشعير والذرة و انى انهاكم عن كل مسكر)) ❷

راوی کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ ''شراب انگور، منقی، کھجور، گیہوں، جو، جوار اور ہر چیز کے نچوڑ سے بنتی ہے اور میں تم کو ہر نشہ آور چیز سے منع کرتا ہوں۔''

عرب کے مختلف حصوں میں انہی چیزوں کی شراب بنتی تھی، اس لیے یہ تعریف عرب کے تمام اصناف شراب کو حاوی تھی، لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا اور یہ ممکن تھا کہ دنیا کے اور حصوں میں شراب کی دوسری قسمیں استعمال کی جائیں اور تحدید ان کو شامل نہ ہو، اس لیے آپ ﷺ نے شراب کی ایک کلی تعریف کی جو تمام اقسام شراب پر حاوی تھی:

((كل مسكرٍ خمر و كل مسكر حرام)) ❸

''ہر نشہ آور چیز شراب ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔''

((كل شراب اسكر فهو حرام)) ❹

---

❶ ابوداود، كتاب الاشربة، باب الخمر مماهي:٣٦٧٦۔ ❷ ايضا:٣٦٧٧۔ ❸ ابوداود، كتاب الاشربة، باب ماجاء في السكر:٣٦٧٩؛ صحيح مسلم، كتاب الاشربة، باب بيان ان كل مسكر خمر:٥٢١٨، ٥٢١٩؛ ترمذى، كتاب الاشربة، باب ما جاء في شارب الخمر: ١٨٦١؛ نسائى، كتاب الاشربة: ٥٥٨٩؛ أحمد، ج١، ص:٢٨٩۔ ❹ ابوداود، كتاب الاشربة، باب ماجاء في السكر: ٣٦٨٢؛ بخارى، كتاب الاشربة، باب الخمر من العسل:٥٥٨٥؛ مسلم، كتاب الاشربة، باب بيان ان كل مسكر خمر: ٥٢١٢۔

''ہر پینے کی چیز جو نشہ لائے وہ حرام ہے۔''

لیکن حیلہ جو لوگوں کے لیے اب بھی حیلہ جوئی کا موقع باقی تھا، حرمت شراب کی اصل وجہ جو اس تعریف سے مستنبط ہوتی ہے، نشہ ہے، لیکن یہ ممکن تھا کہ شراب کی اس قدر کم مقدار استعمال کی جائے کہ نشہ نہ آئے، اس لیے فرمایا:

((ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام)) ❶

''جو چیز زیادہ مقدار میں نشہ لائے، اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔''

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں؛ جو نشہ نہیں لاتیں، تاہم اعصاب میں ایک خدر کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں، جو نشہ کا ابتدائی مقدمہ ہوتی ہے، بھنگ وغیرہ اسی قسم کی چیزیں ہیں اور تمدن کے زمانہ میں مہذب اور حیلہ جو لوگ اکثر اس قسم کے مفرحات کا استعمال کرتے ہیں، اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کی بھی ممانعت فرمائی:

نھیٰ رسول اللّٰہ عن کل مسکرٍ و مفترٍ. ❷

''آنحضرت ﷺ نے ہر منشی و مخدر چیز سے منع فرمایا۔''

لیکن اس تفصیل و جامعیت کے بعد بھی یہ ممکن تھا کہ لوگ اس قسم کی منشی چیزیں استعمال کریں، جن پر عرفاً خمر کا اطلاق نہ کیا جاتا ہو، عرب میں اس قسم کی ایک مصنوعی چیز تھی، جس کو داوی کہتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو بھی خمریات میں داخل فرمایا:

((لیشربنّ ناس من امتی الخمر یسمونھا بغیر اسمھا)) ❸

آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت میں کچھ لوگ نام بدل کر شراب کا استعمال کریں گے۔''

اس کے علاوہ عرب میں جن برتنوں میں شراب رکھی جاتی تھی، شروع میں ان کے استعمال کی بھی ممانعت فرمائی:

نھی عن الدباء والحنتم والمزفت والنقیر۔ ❹

''آپ ﷺ نے کدو، سبز و سیاہ رنگ کے مرتبان اور کھجور کی جڑ سے جس میں سوراخ کر کے شراب رکھی جاتی منع فرمایا۔''

لیکن چونکہ یہ ایک قسم کی سخت گیری تھی، اس لیے آپ ﷺ نے آخر میں اس حکم کو منسوخ فرما دیا، اب صرف شراب کے استعمال کی دو صورتیں باقی رہ گئی تھیں، ایک یہ کہ اس کی حقیقت بدل دی جائے، دوسرے یہ کہ سخت مجبوری کی حالت میں استعمال کی جائے، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان دونوں صورتوں میں بھی شراب

❶ ابوداود، ایضا: ۳۶۸۱۔ ❷ ایضا: ۳۶۸۶۔ ❸ ایضا، باب فی الداذی: ۳۶۸۸، ۳۶۸۹۔

❹ ابوداود، کتاب الاشربۃ، باب فی الاوعیۃ: ۳۶۹۰۔

کی ممانعت فرمائی، چنانچہ چند یتیم بچوں نے وراثت میں شراب پائی تھی، حرمت خمر کے بعد وہ بیکار چیز ہوگئی، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ سے سوال کیا کہ اس کا سرکہ کیوں نہ بنا لیا جائے، لیکن آپ ﷺ نے اجازت نہ دی۔ ❶

ایک بار دیلم حمیری نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کی، کہ ہم سرد ملک میں رہتے ہیں اور سخت کام کرتے ہیں، اس لیے گیہوں کی شراب پیتے ہیں کہ محنت اور سردی برداشت کرنے کی طاقت قائم رہے، آپ نے فرمایا: ''کیا اس سے نشہ بھی ہوتا ہے۔'' انھوں نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو اس کو چھوڑ دو۔'' انھوں نے کہا: لیکن اور لوگ نہیں چھوڑیں گے، ارشاد ہوا کہ ''اگر نہ چھوڑیں، تو ان سے جہاد کرو۔'' ❷ اسلام سے پہلے توراۃ نے بھی بنی اسرائیل کو اپنے بھائیوں سے سود لینے کی ممانعت کی تھی، انجیل نے بھی ''ناروا نفع'' سے لوگوں کو روکا ہے، تاہم یہ ممانعت بہت مجمل ہے، لیکن اسلام نے جب اس کو حرام کیا تو ربا کی حقیقت، ربا کے اقسام، کن کن چیزوں میں کس کس قسم کا ربا ناجائز ہے، اس کی پوری تفصیل کی، اس کے مشابہ اور مبہم معاملات سے بھی باز رکھا، اس ظلم میں جو لوگ کسی طرح بھی شریک ہوں، ان سب کو شریک جرم ٹھہرایا۔

لعن رسول اللہ ﷺ اکل الربو وموکله وشاهده وکاتبه. ❸

''آنحضرت ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، اس پر گواہی دینے والے اور اس کے لکھنے والے پر لعنت بھیجی۔''

رشوت کی حرمت میں استقصا

لعن رسول اللہ ﷺ الراشی والمرتشی. ❹

''آنحضرت ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے۔''

اسلام کی دوسری اخلاقی تعلیمات میں بھی اس قسم کی تفصیل، استقصا اور تمام جزئیات کا احاطہ پایا جاتا ہے، کیونکہ جس چیز کا عام رواج پیدا ہو جاتا ہے، اس کی نہایت کثرت سے مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس لیے جب تک ان تمام صورتوں کو مٹا نہ دیا جائے اس چیز کا کلیتہً قلع وقمع نہیں ہوسکتا۔

مسیحی اخلاق کی کمزوری

مسیحی فلسفۂ اخلاق نے دنیا میں ایک بڑی غلط فہمی یہ پیدا کر دی تھی، کہ اس نے حسن اخلاق کا انحصار

---

❶ ابو داود، کتاب الاشربة، باب ماجاء فی الخمر تخلل: ٣٦٧٥۔ اس سرکہ کے جواز وعدم جواز میں فقہا کا اختلاف ہے۔
❷ ابو داود، کتاب الاشربة، باب ماجاء فی السکر: ٣٦٨٣۔ ❸ ابو داود، کتاب البیوع، باب فی اکل الربوا: ٣٣٣٣۔ ❹ ابو داود، کتاب القضاء، باب فی کراهية الرشوة: ٣٥٨٠۔

اخلاق کی صرف منفعل اور ہر دو قسم میں کر دیا تھا، یعنی تواضع، خاکساری، فروتنی، عاجزی، خواری، بردباری، مسکینی، غریبی، غمگینی، وغیرہ منفعل قوتوں کو اخلاق کا درجہ دیا تھا اور اس کے مقابل کی قوتوں کی سخت توہین کی تھی، حالانکہ دنیا کی امن و سلامتی اور ترقی و خوشحالی کے لیے دونوں قسم کی مناسب قوتوں کے امتزاج کی ضرورت ہے، جس قدر ایک مقام پر تواضع و خاکساری کی ضرورت ہے، اسی قدر دوسرے مقام پر خودداری اور عزت نفس کی حاجت ہے، جس طرح عفوودرگزر بلند ہمتی کا کام ہے، اسی طرح عدل اور مناسب قانونی انتقام بھی بسا ضروری ہے، محکومانہ اخلاق کی خوگیری کا وعظ قناعت پسندوں کے لیے ضروری سہی، مگر حاکمانہ روح بھی قوم کے اندر موجود رہنی چاہیے، کہ دنیا کے عدل کی میزان قائم رہے۔

نٹشے کا اعتراض مسیحی اخلاق پر

جرمن فلاسفر نٹشے نے مسیحی اخلاق پر جا و بیجا اعتراضات کے جو تیر برسائے اور ان مسیحی اخلاقی تعلیمات کو جس طرح انسانی چہرہ کا داغ ٹھہرایا ہے، وہ اسی لیے ہے کہ وہ صرف کمزوری، عاجزی، خواری اور مسکینی کی تعلیم دیتے ہیں، جن سے لوگوں میں عزم، بلند ہمتی، استقلال، ثبات قدم، عزت نفس اور خودداری کے جوہر پیدا نہیں ہو سکتے، وہ کہتا ہے:

> ''مسیحیت نے ہمیشہ کمزور، پست اور بوسیدہ اشیاء کا ساتھ دیا ہے، مسیحیت نے طبائع انسانی کی تمام خوددارانہ قوتوں کا استیصال کر دینا، اپنا مسلک قرار دیا ہے، مسیحیت نے زبردست دماغوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔'' [1]

اسلامی اخلاق کا اعتدال

لیکن اس کو معلوم نہ تھا کہ مسیح علیہ السلام کے ۵۷۵ برس بعد اس نبی آخر الزماں کا ظہور ہوا ہے، جس نے مسیحی نظامِ اخلاق کی غلطیوں کی تصحیح کر دی اور انسانی اخلاق کا ایسا معتدل نظام پیدا کر دیا، جو ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مناسب ہے، اسی کا اثر یہ ہوا کہ ابھی اس کی تعلیم پر دس سال کی مدت بھی نہیں گزری تھی، کہ محکوموں نے حاکموں کی، پست نے بلند کی، ادنیٰ نے اعلیٰ کی اور تنزل نے ترقی کی جگہ حاصل کر لی، مسیحی یورپ کو ان میں سے ایک چیز بھی اس وقت تک نہ مل سکی، جب تک اصلاح و تجدید کے نام سے اسلامی اصول کو اس نے عاریۃً قبول نہیں کیا۔

نفوس کا اختلافِ استعداد

اخلاقی تعلیم کوئی ایک ایسی طب نہیں ہے، جس کا ایک ہی نسخہ ہر بیمار کی اندرونی بیماریوں کا علاج ہو، تمام انسانوں کی اندرونی کیفیتیں، اخلاقی استعدادیں اور نفسانی قوتیں یکساں نہیں ہیں، انسانوں میں کمزور و پست ہمت بھی ہیں اور قوی و بلند حوصلہ بھی، خاکسار و متواضع بھی ہیں اور مغرور و خوددار بھی، بزدل بھی ہیں اور

[1] نٹشے از ایم اے مگے، مترجم مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم اے باب سوم ص: ٦٧۔

بہادر بھی، بردبار بھی ہیں اور غضبناک بھی، بخیل بھی ہیں اور فضول خرچ بھی، گداگر بھی ہیں اور فیاض بھی، ناامید بھی ہیں اور پرامید بھی، ضعیف الارادہ بھی ہیں اور قوی دل بھی، ظالم و زبردست بھی ہیں اور ذلیل و خوار بھی، الغرض امراض کے اس قدر متفاوت اور مختلف درجات اور مراتب ہیں کہ سب کے لیے ایک دوا کبھی کارآمد نہیں ہوسکتی، بہترین اخلاقی معالج وہ ہے، جس نے ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مطابق اپنے نسخے ترتیب دیے ہوں اور ہر قسم کے مریضوں کو صحیح و تندرست بنانے کی قدرت رکھتا ہو۔

ہر شخص کی حسبِ ضرورت اصلاح

صحیح اخلاقی تعلیم و تربیت کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص یا ہر قوم کی نفسانی کیفیت کو دیکھ کر جو عنصر کم ہو، اس کو زیادہ اور جو زیادہ ہو اس کو کم کر کے قوتوں میں مناسب اعتدال پیدا کرے، وہ کمزور کو بہادر اور بہادر کو عادل، پست ہمت کو بلند ارادہ اور بلند ارادہ کو دوسروں کے حقوق کو نہ غصب کرنے والا بنائے، وہ ناامید کو پرامید کرے اور امید سے بھرے ہوئے کو یہ سمجھائے، کہ جو کچھ تم کو مل رہا ہے، وہ اللہ سے مل رہا ہے، وہ قانع کو بلند ارادہ اور حریص کو دوسروں سے بے نیاز کر کے اللہ سے مانگنے والا کر دے، وہ ذلیل و خوار کو خوددار اور خوددار کو غیر مغرور بنا دے، وہ اچھی قوتوں کو نشو و نما دے اور بری قوتوں کا رخ اچھے مقصدوں کی طرف پھیر کر ان کی برائی کو کم سے کم کر دے۔

قدیم فلسفہ اخلاق کے واقف کار جانتے ہیں کہ انسان کے تمام اخلاق کی بنیاد اس کی دو قوتوں پر ہے، قوت غضب اور قوت شہوت، غضب نام ہے اپنے نفس کے نامناسب امور کے پیش آنے پر ان کی مدافعت کی قوت کا اور شہوت نام ہے نفس کے مناسب امور کے حصول اور طلب کی قوت کا، ان دونوں قوتوں کی افراط و تفریط اور اعتدال اور ان کے مختلف مراتب سے سینکڑوں اچھے برے اخلاقی جزئیات پیدا ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام ہے، غضب کی قوت اگر افراط و تفریط سے پاک ہو اور عقل کے قابو میں ہو، تو اس کا نام شجاعت ہے اور وہ حالات و کیفیات کے لحاظ سے مختلف پیکروں میں جلوہ گر ہوتی ہے، مثلاً: خودداری، دلیری، آزادی، حق گوئی، بلند ہمتی، بردباری، استقلال، ثبات قدم، وقار، صبر و سکون، مطالبہ حق، جد و جہد، سعی و محنت، جہاد پھر جب یہی قوت اعتدال سے ہٹ کر افراط کی طرف مائل ہوتی، تو تہور بن جاتی ہے اور اس سے سلسلہ بہ سلسلہ غرور، نخوت، خود پرستی، تکبر، ترفع، دوسروں کی تحقیر، ظلم، قتل نفس وغیرہ کی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور جب یہ قوت تفریط کی طرف جھکتی ہے، تو ذلت پسندی، کم حوصلگی، بے طاقتی، خوف اور دنائت کے قالب میں ظہور کرتی ہے، اسی طرح شہوت کی قوت میں جب کامل اعتدال ہوتا ہے، تو اس کو عفت کہتے ہیں، یہی صفت مختلف سانچوں میں ڈھل کر مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے، یعنی پاک دامنی، پرہیزگاری، جود و سخا، شرم و حیا، صبر و شکر، قناعت، بے طمعی، خوش طبعی، ترقی کی خواہش، نسل و اولاد کی آرزو، خانگی مسرت کی مناسب

طلب وغیرہ، پھر یہ صفت جب افراط وتفریط کی طرف مائل ہوتی ہے، تو اس سے حرص وطمع، بے شرمی، فضول خرچی، بخل، ریا، اوباشی، تملق، حسد، رشک وغیرہ اوصافِ ذمیمہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

مسیحی اور اسلامی اخلاقیات کا فرق

مسیحیت کی تعلیم کا منشا انسان کی ان دونوں غضبی اور شہوی قوتوں کا استیصال ہے اور اسلامی تعلیم کی غرض ان دونوں کو افراط وتفریط سے ہٹا کر ان میں توسط اور اعتدال پیدا کرنا ہے، مسیحیت کے نزدیک نفس کی یہ دونوں قوتیں بذاتہٖ بری ہیں اور اسلام کے نزدیک یہ دونوں قوتیں بجائے خود بری نہیں ہیں بلکہ کبھی کبھی ان کے استعمال کا موقع ومحل برا ہوتا ہے، اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ اپنی قوت غضب کو فنا کر کے ''دشمن کو پیار کرو'' اور نہ یہ کہ اپنی قوت خواہش کو فنا کر کے مجرد رہو اور مفلس وغمگین بن کر زندگی گزار دو، بلکہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی دشمنوں کو بہتر یہ ہے کہ معاف کرو اور خدائی دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کرو کہ انھیں ہدایت ملے اور اللہ کے حلال کئے ہوئے طیبات اور لذائذ سے لطف اٹھاؤ، لیکن شریعت کے مقرر کردہ حدود سے کبھی آگے نہ بڑھو، امام غزالی کے بقول اسلام نے غصہ کے دبانے والے کی تعریف کی ہے، غصہ کے مٹانے والے کی نہیں، اس نے ﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ کہا ہے، وَالْفَاقِدِيْنَ الْغَيْظَ نہیں کہا۔ [1]

مسیحی اخلاق کی کمزوریاں

دنیا میں علم وہنر، خوشی ومسرت، ولولہ وانبساط، رونق وترقی، جدوجہد جو کچھ ہے، وہ انہی دونوں قوتوں کی جلوہ آرائیاں ہیں، اگر یہ دونوں قوتیں یک قلم مٹ جائیں، یا ان میں افراط وتفریط پیدا ہو جائے تو نیکی، سعادت اور خوش بختی کی آدھی دنیا مر جائے، نہ عفت کا کوئی مفہوم ہو، نہ عصمت کے کوئی معنی ہوں، نہ عدل کا وجود ہو، نہ امن وامان کا نشان ملے، نہ کسی کی ملک محفوظ اور نہ کسی کی جان سلامت رہے، نہ انسان کی بلند ہمتی، استقلال، ثبات قدم اور سعی ومحنت کے جوہر نمایاں ہوں، قوموں کی ترقی اور ملکوں کا نظام درہم برہم ہو جائے اور اللہ کی یہ دنیا ایک ایسا ویرانہ بن جائے جس میں حرکت وجنبش کا نام نہ رہے۔ مسیحی اخلاقی تعلیم میں یہ نکتہ ملحوظ نہیں رہا ہے کہ نفس غصہ اور خواہش بری چیز نہیں ہے، بلکہ بے جا غصہ اور ناجائز خواہش بری چیز ہے، نیز یہ کہ جس طرح غصہ اور خواہش بری چیزیں ہیں، اسی قدر وہ معائب بھی جو ان دونوں قوتوں کی تفریط اور کمی سے پیدا ہو جاتے ہیں، مثلاً: بے آبروئی، بے غیرتی، ذلت پسندی، دنائت، بے طاقتی، تملق، کم حوصلگی، بے عملی، سستی، فاقہ زدگی بھی برے ہیں، اسلام نے اپنے پیروؤں میں ان دونوں قوتوں کو اعتدال کے ساتھ جمع کیا ہے، اس نے جہاں ان کو ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ (٤٨/ الفتح:٢٩) ''آپس میں رحمدل'' اور ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (٥/ المآئدۃ:٥٤) ''مومنوں کے فرمانبردار'' کی تعلیم دی وہیں ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾

---

[1] احیاء العلوم، ج٣، ص:١٢١ مطبوعہ مصر۔

(۴۸/ الفتح:۲۹) ''کافروں پر بھاری''اور﴿ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾(۵/ المآئدۃ:۵۴)''کافروں پر گراں'' بننے کی بھی تعلیم دی اور ان کو بتایا کہ عزت صرف اللہ اور رسول اور ان کے فرمانبرداروں کے حصہ میں ہے،﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (۶۳/ المنافقون:۸) مسیحی قوموں کو اس وقت تک ترقی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا، جب تک اسلامی فلسفہ اخلاق کی ان تعلیمات سے پروٹسٹنٹ بن کر انھوں نے فائدہ نہیں اٹھایا۔

لیکی کا اعتراض مسیحی اخلاق پر

لیکی تاریخِ اخلاقِ یورپ کی دوسری جلد میں کہتا ہے:

''لیکن انکسار اور فروتنی کا وصف تمام تر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے......اور گو یہ وصف بھی ایک زمانہ تک نہایت موزوں ومناسب رہا، تاہم تمدن کی روز افزوں ترقی کی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا، ترقی تمدن کے لیے لازمی ہے کہ قوم میں خودداری ہو اور حریت کے جذبات موجود ہوں اور انکسار وتواضع اس کے دشمن ہیں، خانقاہانہ طرز زندگی کا مثل، فوجی طرز زندگی کے اقتضا یہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو، تاہم سپاہیوں میں تو پھر بھی فی الجملہ خودی وخودداری موجود ہوتی ہے، لیکن اسے بالکل مٹا دینا جو خانقاہانہ زندگی کا مطمع نظر ہے، کسی طرح ترقی تمدن کے حق میں مفید نہیں پڑ سکتا تھا اور پھر بڑے بڑے زاہدوں میں تو اس جذبہ سے اور فضائل پیدا ہوتے بھی رہتے ہیں، لیکن عوام میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مترادف ہو جاتا ہے، اسی کو دیکھ کر متاخرین حکمائے اخلاق نے بجائے انکسار کے خودی پر زیادہ زور دیا اور اس کے دو مظاہر ہیں، ایک مردانگی اور دوسرے خودداری، انہی پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروٹسٹنٹ ممالک میں جو صاف گوئی، آزاد خیالی، خوش معاملگی، بلند حوصلگی، غیرت وحمیت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے، وہ کیتھولک علاقوں میں نہیں پائی جاتی، بلکہ ان کے بجائے دنائت، پست ہمتی، کم ظرفی، بزدلی اور گداگری کے مناظر سامنے آتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اول الذکر میں سیاسی حریت کی جو جلوہ آرائیاں ہیں ان سے آخر الذکر یکسر خالی ہیں۔'' [1]

اسلام اور بلند اخلاق

لیکن اس کے بالمقابل معلمِ اسلام ﷺ کی تعلیم جو کچھ ہے اس کا اندازہ آپ ﷺ کے صرف ایک سبق سے ہو سکتا ہے، فرمایا:

((ان اللّٰه يحب معالى الامور ويبغض سفسافها)) [2]

''بیشک اللہ معالی امور کو پسند اور محقرات امور کو ناپسند کرتا ہے''

---

[1] فصل:۱۱، ص:۱۲۴، مترجمہ عبدالماجد دریا آبادی۔

[2] مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، ج۸، ص:۱۸۸ بروایت طبرانی۔

”معالی امور“ سے مقصود عالی حوصلگی کے بڑے کام اور محقرات سے مراد چھوٹی اور ادنیٰ باتیں ہیں، اس حدیث میں گویا ارشاد ہوا کہ ایک مسلمان کو اللہ کا دوست بننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی نظر ہمیشہ اونچی اور مقصد ہمیشہ بلند رہے اور دنائت کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے الگ رہے۔ اسی کے ساتھ آنحضرت کی ایک اور تعلیم کا حوالہ دینا بھی اس باب میں اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((المؤمن القوی خیر واحب الی اللّٰہ من المؤمن الضعیف وفی کل خیر احرص علی ماینفعك واستعن باللّٰہ ولا تعجز وان اصابك شيء فلا تقل لو انی فعلت کان کذا وکذا ولکن قل قدر اللّٰہ وما شاء فعل فان لو تفتح عمل الشیطان)) [1]

”کمزور مسلمان سے قوت ور مسلمان زیادہ بہتر اور اللہ کے نزدیک پیارا ہے اور ہر ایک میں بھلائی ہے، ہر وہ چیز جو تجھے نفع دے اس کی پوری خواہش کر اور اللہ سے مدد چاہ اس راہ میں کمزوری نہ دکھا اور اگر تجھے اس میں کچھ تکلیف پہنچ جائے تو یہ نہ کہہ ”اگر میں یوں کرتا تو یوں ہوتا“ بلکہ یہ کہہ کہ اللہ نے مقدر کر دیا ہے اور جو چاہا اس نے کیا، کیونکہ یہ اگر (اور مگر) شیطان کا کاروبار کھولتا ہے۔“

تقدیر، توکل، صبر اور شکر

یہ حدیث ان تمام مسائل کی شرح کرتی ہے، جن کو اسلام کی اصطلاح میں تقدیر، توکل، صبر اور شکر سے ادا کیا جاتا ہے اور جن کی پوری تفصیل مسئلہ قضا وقدر کے ضمن میں جلد چہارم میں اور عبادات قلبی کے تحت عنوان جلد پنجم میں کی جا چکی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ چاروں تعلیمات اسی لیے ہیں کہ مسلمانوں میں حوصلہ مندی، پر امیدی، استقلال اور ثبات قدم پیدا ہو، مسلمان میں سب سے پہلے بڑے کام کا عزم پیدا ہونا چاہیے، پھر اس عزم کے پیدا ہونے کے ساتھ اللہ پر بھروسہ اور توکل کر کے کام شروع کر دینا چاہیے، اگر کام میں کامیابی ہوئی تو فخر وغرور کے بجائے دل سے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اسی کے فضل و کرم سے ہوا اور اگر ناکامی ہو تو دل میں یاس اور ناامیدی کے بجائے صبر وثبات پیدا ہونا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ اللہ کا منشا یہی تھا، (یہی تقدیر ہے)

حدیث بالا میں جو کچھ فرمایا گیا وہ درحقیقت قرآن پاک کی ان آیتوں کی تشریح ہے:

﴿ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝ إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ

[1] صحیح مسلم، کتاب القدر، باب الایمان بالقدر والإذعان له:٦٧٧٤۔

لَكُمْ ۚ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۞ ﴾

(۳/ آل عمران :۱۵۹۔۱۶۰)

''جب تو پکا ارادہ کر لے، پھر اللہ پر بھروسہ کر، بیشک اللہ متوکلوں کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غلبہ پانے والا نہیں اور اگر وہ چھوڑ دے تو پھر اس کے بعد کون تمہاری مدد کر سکتا ہے، اللہ ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔''

﴿ مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۞ لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۞ ﴾ (۵۷/ الحديد :۲۲۔۲۳)

''کوئی مصیبت نہیں آتی زمین پر اور نہ تم پر لیکن یہ کہ وہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے کتاب (الٰہی) میں درج ہوتی ہے یہ اللہ پر آسان ہے، یہ اس لیے، تاکہ اس پر جو تم سے جاتا رہے غم نہ کرو اور جو تم کو اللہ دے اس پر اترایا نہ کرو، اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا۔''

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ تقدیر، توکل اور صبر وشکر کی تعلیم اسلام میں پستی اور دنائت کے لیے نہیں، بلکہ مسلمانوں میں ہمت، جرأت، بہادری اور ثابت قدمی پیدا کرنے کے لیے ہے، اسی تعلیم کا اثر تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے تمام خطرات سے نڈر ہو کر بڑی بڑی سلطنتوں اور فوجوں کا مقابلہ کیا اور کامیاب رہے، ان کو مشکلات میں اللہ کے دوسرے برگزیدوں کی یہ دعا سنائی گئی:

﴿ رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۞ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۵۰)

''اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر وثبات کا پانی بہا اور ہمارے پاؤں کو مضبوط گاڑ اور ہم کو کافر لوگوں پر فتح یاب کر۔''

اور بتایا کہ مشکلات میں دوسرے پیغمبروں کے ساتھیوں نے کیا کیا:

﴿ وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ۞ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۞ ﴾

(۳/ آل عمران :۱۴۶۔۱۴۷)

''اور کتنے نبی تھے کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے لڑائی لڑی، تو اللہ کی راہ میں جو

مشکل یا مصیبت پیش آئی اس سے وہ سست نہ ہوئے اور نہ کمزور ہوئے اور اللہ ثابت رہنے والوں کو پیار فرماتا ہے اور ان کا کہنا نہ تھا، لیکن یہی کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ اور ہمارا حد سے بڑھ جانا معاف فرما اور ہمارے پاؤں مضبوط رکھ اور ہم کو کافروں پر فتح دے۔''

پھر خاص طور سے حکم ہوتا ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾

(۳/ آل عمران: ۲۰۰)

''اے وہ جو ایمان لائے، ثابت قدم رہو اور دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم اور بہادر ثابت ہو اور اللہ سے تقویٰ کرو، تا کہ کامیاب ہو۔''

ان آیتوں سے معلوم ہوگا کہ اسلام نے اخلاق کی بلندی، عالی حوصلگی، بلند ہمتی اور مشکلات میں صبر و ثباتِ قدم کی کیسی اچھی تعلیم دی ہے، یعنی جس طرح اس کے نزدیک تواضع، فروتنی اور عاجزی اپنے موقع پر پسندیدہ ہے، اس طرح سطوت اور بہادری وحکومت کا رعب بھی اپنی جگہ پر محبوب ہے۔

اپنے دشمنوں سے پیار کرو

مسیحی اخلاقی تعلیم کا سب سے زریں اصول یہ ہے کہ اپنے دشمنوں کو پیار کرو، اس میں شک نہیں کہ اس اصول کی ظاہری چمک دمک ایسی ہے کہ ظاہر بینوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں لیکن اہل معنی نے اس کے منطقی تضاد کو اچھی طرح سمجھا ہے، یہی سبب ہے کہ خود انجیل کے مفسروں [1] نے اس حکم کو ناممکن العمل بتایا ہے، تم دشمن کو معاف کر سکتے ہو، دشمن کے ساتھ نیک سلوک کر سکتے ہو، دشمن کے حق میں دعائے خیر کر سکتے ہو، مگر تم دشمن سے پیار اور محبت نہیں کر سکتے کہ یہ دل کا فعل ہے، جس پر تم کو قدرت نہیں۔

اخلاقِ محمدی نے اس کے بجائے وہ تعلیم دی، جس پر ہر خوش نصیب سے عمل ممکن ہے اور اللہ کے بندوں نے ہمیشہ اس پر عمل کیا ہے، یعنی دشمنوں کے ساتھ نیک سلوک کرو، برا چاہنے والوں کے ساتھ بھلائی کرو، جو تم کو بددعائیں دیں، ان کو دعا دو، جو تمہارا قصور کریں، ان کو معاف کرو اور جو تم پر ظلم کریں، ان کے ساتھ انصاف کرو، فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۗ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾

(۵/ المآئدۃ: ۸)

''اے ایمان والو! اللہ کے لیے کھڑے ہو جایا کرو، انصاف کے ساتھ گواہ بن کر اور کسی قوم کی دشمنی تم کو عدل وانصاف کرنے سے باز نہ رکھے، انصاف کرو، کہ انصاف کرنا پرہیز گاری سے

[1] اسکاٹ صاحب کی تفسیر متی۔

بہت نزدیک ہے اور اللہ سے ڈرو کہ اس کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔“

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۝ وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝﴾ (حم السجدة:٣٦)

”اور بھلائی اور برائی برابر نہیں، برائی کو بھلائی سے دفع کرو، تو دفعۃً وہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے، رشتہ دار دوست کے مانند ہو جائے گا اور اس پر عمل کی توفیق انہی کو ہوتی ہے، جو صبر کرتے ہیں اور انہی کو یہ سعادت ملتی ہے، جو بڑی قسمت والے ہیں اور اگر شیطان تم کو اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو کہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔“

① اس آیت پاک میں شروع ہی میں ایک اصول بتا دیا گیا ہے کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں، ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہے۔

② اس آیت پاک میں جس نیکی اور حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے، وہ ان لوگوں کے ساتھ کرنے کی ہے جو تمھارے دشمن ہیں، کیونکہ اس کے بعد ہی ہے کہ تمہارے اس نیک طرزِ عمل سے تمہارا دشمن تمہارا دوست بن جائے گا۔

③ دشمن کے ساتھ اس نیکی کرنے کو صبر کا انتہائی درجہ کہا گیا اور اس کو عظیم الشان خوش قسمتی سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اخلاقِ محمدی ﷺ کے صحیفہ میں اس کا کیا درجہ ہے؟

④ دشمن کے ساتھ برائی کرنے کو اس میں شیطانی تحریک بتایا گیا ہے اور اس سے خوش قسمت مسلمانوں کو اللہ کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جو صحابہ میں بڑے مفسر ہیں، اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں: [1]

”اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غیظ و غضب کی حالت میں صبر کا اور کسی کی برائی کرنے پر حلم اور عفو و درگزر کرنے کا حکم دیا ہے، وہ ایسا کریں گے، تو اللہ ان کو شیطان کے پنجہ سے چھڑائے گا اور ان کا دشمن بھی دوست کی طرح ان کے آگے سر جھکا دے گا۔“

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جو آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے تھے گالی دی، وہ سن کر چپ رہے، اس نے دوبارہ وہی حرکت کی، وہ پھر بھی چپ رہے، اس نے پھر تیسری دفعہ بدزبانی کی، تو وہ چپ نہ رہ سکے اور کچھ بول اٹھے، یہ دیکھ کر آنحضرت ﷺ فوراً اٹھ گئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یارسول اللہ! کیا آپ ﷺ مجھ سے خفا ہوئے، فرمایا: ”اے ابوبکر! جب تک تم چپ تھے، اللہ کا فرشتہ تمہاری

[1] صحيح بخاري، كتاب التفسير، تفسير سورة حم السجدة في ترجمة الباب؛ وابن جرير، ج ٢٤، ص: ٦٨ مصر۔

طرف سے کھڑا تھا، جب تم نے جواب دیا تو وہ ہٹ گیا۔'' [1]

آپ ﷺ نے فرمایا: ''صلہ رحم یہ نہیں ہے کہ صلہ رحم کرنے والوں کے ساتھ صلہ رحم کرو، بلکہ یہ ہے کہ جو قطعِ رحم کرے اس کے ساتھ صلہ رحم کرو۔'' [2] یعنی دوستوں کے ساتھ دوستی کوئی بات نہیں، بلکہ دشمنوں کے ساتھ دوستی اصلی خوبی ہے۔

ایک دفعہ ایک اعرابی نے خدمت نبوی میں آ کر عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے وہ بات بتائیے، جس کے کرنے سے جنت مل جائے، آپ ﷺ نے اس کو چند باتیں بتائیں، منجملہ ان کے فرمایا: ''ظالم رشتہ دار پر اپنی عنایتوں کی بارش کرو۔'' [3]

اسلام کی نظر میں کافر و مشرک سے بڑھ کر تو کوئی مذہب دشمن نہیں ہو سکتا، لیکن دیکھو کہ قرآن پاک مسلمانوں کو اپنے ایسے دشمنوں کے ساتھ بھی عفو و درگزر کی کیسی صریح تعلیم دیتا ہے:

﴿ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ ﴾ (٤٥/ الجاثیہ:١٤)

''(اے پیغمبر!) مسلمانوں سے کہہ دے کہ ان کو جو اللہ کے دنوں پر یقین نہیں رکھتے، معاف کر دیا کریں، تا کہ اللہ ایسے لوگوں کو ان کے کرتوتوں کا بدلہ دے۔''

اگر عملی مثالیں چاہتے ہو تو وہ ''ریاکار فریسیوں'' اور سانپوں'' سانپوں کے بچوں'' [4] والی مسیحیت کے واعظ میں نہیں بلکہ اسلام کے اس اولین داعی و واعظ میں ہے، جس نے فاتح بن کر، مفتوح ہو کر نہیں، حاکم ہو کر محکوم بن کر نہیں، یک دفعہ مکہ کے ان ہزاروں دشمنوں کو معاف کر دیا، جن میں سے ہر ایک اس کے خون کا پیاسا رہ چکا تھا، [5] جس نے اس کو معاف کیا، جس نے اس کے قتل یا گرفتاری کے لیے اہلِ مکہ کا اشتہار و انعام سن کر اس کا تعاقب کیا تھا، [6] جس نے خیبر میں اپنے زہر دینے والی یہودیہ کو معاف کیا تھا، [7] جس نے اپنے چچا کے قاتل کو معاف کیا تھا، [8] جس نے حمزہ کی لاش کو بے حرمت کرنے والی اور ان کے جگر کو چبانے والی کو معاف کیا، [9] جس نے اپنی قرۃ العین کے ایک طرح کے قاتل کو معاف کیا، [10] جس نے تنعیم کی وادی میں قریش کے اس گرفتار دستہ کو معاف کیا، [11] جو اس کے قتل کے ارادہ سے آیا تھا، جس نے نجد کے ایک

[1] سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی الانتصار:٤٨٩٦۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب لیس الواصل بالمکافی:٥٩٩١۔ [3] مستدرك حاكم، كتاب المكاتب، ج٢، ص: ٢١٧ حيدر آباد دكن۔

[4] انجیل متی: ٢٣، ٢٥، ٣٣۔ [5] مسلم، كتاب الجهاد، باب فتح مكة: ٤٦٢٢ تا ٤٦٢٤؛ سنن الكبرىٰ للنسائي: ١١٢٣٤ نیز دیکھیں کتب سیر کے ابواب فتح مکہ۔ [6] صحيح بخاري، كتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبي ﷺ واصحابه الى المدينة : ٣٩٠٦۔ [7] صحيح بخاري، كتاب الهبة، باب قبول الهدية من المشركين: ٢٦١٧، ٥٧٧٧۔ [8] صحيح بخاري، كتاب المغازي، باب قتل حمزه بن عبدالمطلب: ٤٠٧٢۔ [9] صحيح بخاري، كتاب مناقب الانصار، باب ذكر هند بنت عتبة: ٣٨٢٥۔

[10] کتب سیر و طبقات صحابه ذکر اشتهاريان فتح مكة واصابة ذكر هبار بن اسود، ج٦، ص:٢٧٩ وزرقانی، ج٣، ص: ٣٣٣۔ [11] جامع ترمذی، ابواب التفسير، باب ومن سورة الفتح: ٣٢٦٤۔

نخلستان میں جب وہ محوِ خواب تھا، اپنے ایک تیغ بکف حملہ آور کو قابو میں پا کر معاف کیا، ❶ جس نے ان طائف والوں کے حق میں دعائے خیر ❷ کی جنھوں نے اس پر کبھی پتھروں کی وہ بارش کی تھی، جس سے اس کے پاؤں خون آلود ہو گئے تھے، جس نے احد کے میدان میں اپنے چہرہ کے زخمی کرنے والوں کو نیک دعا دی، ❸ جس نے دشمنوں کے حق میں بددعا کرانے والوں کو کہا کہ میں دنیا میں لعنت کے لیے نہیں، بلکہ رحمت کے لیے آیا ہوں، ❹ انتہا یہ ہے کہ کفار اور مشرکین کے ساتھ معاہدہ کو پورا کرنا تقویٰ (پرہیزگاری) کی شان بتائی گئی:

﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (۹/ التوبة: ٤)

"لیکن جن مشرکوں سے تم نے عہد باندھا پھر انھوں نے تم سے کچھ کم نہ کیا اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کا عہد ان کی مدت مقرر تک پورا کرو، اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔"

کفار و مشرکین سے عدم موالات

اس موقع پر اکثر معترض اسلام کے ان احکام کو پیش کرتے ہیں، جن میں مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں کی رفاقت اور موالات سے منع کیا گیا ہے، حالانکہ یہ بالکل علیحدہ چیز ہے، یقیناً ہر نیک تحریک کے بانی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تحریک کے قیام و بقا اور حفاظت کی خاطر اس تحریک کے پیروؤں کو اس کے ان مخالفوں کے میل جول، رازداری اور رفاقت سے روک دے، جو زور یا سازش سے اس کے مٹانے اور برباد کر دینے کے درپے ہوں، خصوصاً ایسے وقت میں جب اس تحریک کو تیغ و خنجر اور فوج و لشکر سے مٹا دینے کی کوششیں ہو رہی ہوں اور طرفین میں لڑائی کی سی حالت قائم ہو، یا غلط شبہے اور افواہیں پھیلا کر اس کے پیروؤں کو وہ برگشتہ کرنا چاہتے ہوں، چنانچہ اس قسم کی آیتیں:

﴿ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰىةً ۭ ﴾ (۳/ آل عمران: ۲۸)

"ایمان والے مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں، تو جو ایسا کرے گا تو اس کو اللہ سے کوئی علاقہ نہیں، مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ چاہو۔"

﴿ يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَاۗءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَاۗءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَي الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّھُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ (۹/ التوبة: ۲۳)

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب تفرق الناس عن الامام: ۲۹۱۳۔ ❷ ابن سعد غزوۃ طائف مغازی، قسم اول، جزء ثانی، ص: ۱۱٤؛ تفسیر ابو حیان تفسیر سورہ الفتح، ج۸، ص: ۹۸۔ ❸ فتح الباری، ج ۷، ص: ۲۸٦ باب احد۔ ❹ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب النهی عن لعن الدواب: ٦٦١٣۔

''اے ایمان والو! اپنے باپ اور بھائیوں کو اگر وہ ایمان کے برخلاف کفر سے محبت رکھیں، اپنا دوست نہ بناؤ اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا، تو وہی حد سے گزرنے والے ہوں گے۔''

اسی موقع کی ہیں، ایک اور بات یہ بھی ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آرا ہوں تو اہل حق کے درمیان اسی حق کی خاطر جس قدر محبت ہوگی، فطرۃً ان اہلِ باطل سے اسی قدر بیزاری اور علیحدگی ہوگی، جو اس حق کے مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں، اس لیے حق کی حفاظت کی خاطر اہلِ حق کو اہلِ باطل سے اس قسم کی محبت اور موالات سے اسلام نے روکا ہے، اسلام کے اس قسم کے احکام کے معنی وہی ہیں جو ''شہزادہ امن'' کے اس اعلان کے ہیں:

''یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صلح کروانے آیا، صلح کروانے نہیں، بلکہ تلوار چلانے کو آیا ہوں، کیونکہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اس کے باپ اور بیٹے کو اس کی ماں اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کروں، آدمی کے دشمن اس کے گھر کے لوگ ہوں گے، جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے، وہ میرے لائق نہیں۔'' (متی کی انجیل باب ۱۰۔۳۴)

یہی سبب ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اخلاق میں یہودیوں کے ساتھ وہ نرمی، رحم دلی اور رقیق القلبی نہ تھی، جو دوسرے نادان بت پرستوں اور گناہگاروں کے ساتھ تھی، وہ یہودیوں کو بے تکلف سخت سے سخت الفاظ سے خطاب کرتے تھے، جب حجاز کے یہودیوں اور سرحد شام کے عیسائیوں سے مسلمانوں کی جنگ چھڑی اور بظاہر مال و دولت، ساز و سامان، اسلحہ اور مستحکم قلعوں کے سبب سے ان کا پلہ مسلمانوں سے زیادہ بھاری نظر آتا تھا، تو مدینہ کے منافقوں اور کمزور دلوں کی عاقبت بینی اور دور اندیشی ان کو اس پر مجبور کرتی تھی، کہ وہ اسلام کے ان دشمنوں سے ساز باز رکھیں، تاکہ ان کے مقابلہ میں اگر مسلمانوں کو شکست ہو تو ان کو پناہ مل سکے، اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو دین اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو ان اہل کتاب سے رازدارانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے منع کر دیا، فرمایا:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤی اَوْلِیَآءَ ؔۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۝ فَتَرَی الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یُّسَارِعُوْنَ فِیْهِمْ یَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤی اَنْ تُصِیْبَنَا دَآىِٕرَةٌ ؕ فَعَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَیُصْبِحُوْا عَلٰی مَاۤ اَسَرُّوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِیْنَ۝ وَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِیْنَ۝ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ

عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِينَ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۵۱۔۵۴)

''اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو رفیق نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو کوئی تم میں سے ان سے رفاقت کرے، وہ انہی میں سے ہے، اللہ بے انصاف لوگوں کو راہ نہیں دیتا، اب تو ان کو دیکھتا ہے، جن کے دل میں بیماری ہے کہ وہ دوڑ کر ان سے ملے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ آ جائے، تو اللہ شاید جلد (مسلمانوں کی) فتح یا (ان کی کامیابی کی) کوئی اور بات اپنے پاس سے بھیجے، تو پھر وہ اپنے دل کی چھپی بات پر پچھتانے لگیں اور مسلمان کہیں کہ یہ وہی لوگ ہیں، جو اللہ کی پکی قسم کھاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، خراب گئے ان کے عمل، پھر رہ گئے نقصان میں، اے ایمان والو! اگر تم سے کوئی اپنے دین سے پھرے گا تو اللہ کا کچھ حرج نہیں، اللہ اپنے دین کے لیے اور دوسرے لوگوں کو لائے گا، جن سے اللہ راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے، جو ایمان والوں کے فرمانبردار اور کافروں پر بھاری ہوں گے۔''

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ مِن قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۵۷)

''اے ایمان والو! اہل کتاب اور کفار میں سے ان کو جو تمہارے دین کو ہنسی مذاق بناتے ہیں اپنا رفیق نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو، اگر یقین رکھتے ہو۔''

ان آیتوں میں پوری تصریح ہے کہ کن لوگوں کو اور کن حالات میں اپنا رفیقِ کار، محرم اسرار اور مددگار نہ بناؤ اور اس ممانعت کا منشا کیا ہے؟ مزید تصریح آل عمران کی اس آیت میں ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيٰتِ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۱۸)

''اے ایمان والو! اپنے غیر کو اپنا بھیدی نہ بناؤ، وہ تمہاری خرابی میں کمی نہیں کرتے، جتنی تم کو تکلیف پہنچے، ان کو خوشی ہے، دشمنی ان کی زبان سے نکلی پڑتی ہے اور جو ان کے جی میں چھپا ہے، وہ اس سے زیادہ ہے، ہم نے تم کو باتیں جتا دیں، اگر تم کو عقل ہے۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کمزور مسلمانوں کو ملا ملا کر مسلمانوں کے منصوبوں اور نقشوں کی جاسوسی کرتے تھے اور بھیدوں کا پتہ چلاتے تھے، جس کی روک تھام کے لیے مسلمانوں کو ان کی رفاقت اور ساز باز سے روکا گیا ہے، سب سے زیادہ تصریح سورۂ ممتحنہ میں ہے، فرمایا:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي تُسِرُّونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝ إِنْ يَثْقَفُوكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً وَيَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوءِ وَوَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ ۝ لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ﴾ (٦٠/ الممتحنة: ١-٣)

''اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ کہ تم ان کو دوستی کا پیغام بھیجو اور وہ اس سچائی کے جو تم کو ملی، منکر ہیں، وہ رسول کو اور تم کو اس لیے گھر سے نکالتے ہیں کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے، اگر تم میری راہ میں لڑائی اور میری خوشنودی کی طلب میں نکلو، تو تم ان کو دوستی کے چھپے پیغام بھیجو اور مجھے خوب معلوم ہے، جو تم چھپاتے اور جو تم ظاہر کرتے ہو، جو تم میں سے ایسا کرتا ہے، وہ سیدھی راہ بھولا ہے، اگر وہ (جن کو تم دوستی کا چھپا پیغام بھیجتے ہو) تم کو موقع سے پائیں، تو تمہارے دشمن ہوں اور تمہیں تکلیف پہنچانے کے لیے اپنے ہاتھ بڑھائیں اور برائی کے ساتھ اپنی زبانیں کھولیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی کسی طرح دین کے منکر ہو جاؤ تم کو تمہاری قرابت اور تمہاری اولاد قیامت کے دن نفع نہیں پہنچائے گی۔''

آگے اس سے بڑھ کر تصریح سنیے:

﴿ لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَى إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ ﴾ (٦٠/ الممتحنة: ٨-٩)

''اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے سے باز نہیں رکھتا، جو تم سے مذہب میں لڑائی نہیں کرتے اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالتے ہیں، اللہ انصاف والوں کو پیار کرتا ہے، وہ انہی سے دوستی کرنے کو منع کرتا ہے، جو تم سے مذہب میں لڑائی لڑیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالیں اور تمہارے نکالنے پر ایک دوسرے کے مددگار بنیں، جو ان سے دوستی کا دم بھرے گا، تو وہی بے انصاف ہوں گے۔''

اس کے ساتھ یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ عنقریب تمہاری فتح ہوگی اور اس وقت یہ دشمنی محبت سے بدل جائے گی، فرمایا:

﴿ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ۭ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ﴾

(٦٠/ الممتحنة :٧)

''امید ہے کہ اللہ تمہارے اور تمہارے دشمنوں کے درمیان دوستی پیدا کر دے اور اللہ قدرت والا ہے۔''

ان آیتوں کا مطلب ان کے شانِ نزول کے جاننے کے بعد بالکل صاف ہو جاتا ہے، انہی میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ مسلمان قریش کی بے خبری میں مکہ پر قبضہ کر لینا چاہتے تھے، تیاریاں ہو رہی تھیں، کہ ایک مسلمان حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ نے اپنی ذاتی منفعت کے لیے چپکے سے ایک خط لکھ کر اور ایک عورت کو دے کر مکہ کی سمت روانہ کر دیا، کہ قریش خبردار ہو جائیں، آنحضرت ﷺ کو خبر ہو گئی، آپ ﷺ نے دو سواروں کو بھیجا کہ راستہ سے وہ خط اس سے واپس لے آئیں، وہ خط آیا تو آپ نے حاطب سے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟'' عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! جلدی نہ فرمایئے، بات یہ ہے کہ میں قریش میں رہتا ہوں، لیکن ان سے میرا کوئی نسبی تعلق نہیں اور جس قدر مہاجر ہیں، وہاں ان کی قرابتیں اور رشتہ داریاں ہیں، جن کے سبب سے ان کے خاندان کے لوگ محفوظ ہیں، میری وہاں کوئی قرابت نہ تھی، جس کا مکہ والے لحاظ کرتے، تو میں نے چاہا کہ میں ان پر یہ احسان کروں، تاکہ وہ میرا کچھ لحاظ کریں، میں نے دینِ حق سے مرتد ہو کر ایسا نہیں کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''بدر والے لوگ ہو اللہ نے تمہارے گناہ معاف کیے ہیں۔'' اس پر یہ آیت اتری [1] ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا ﴾ ''اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔'' یہ احکام اسی قسم کے ہیں جو عہد عتیق میں بھی مذکور ہیں، زبور میں ہے:

''اے خدا! تو یقیناً شریروں کو قتل کرے گا، پس اے خونیو! میرے پاس سے دور ہو جاؤ، کیونکہ وہ تیری بابت شرارت سے باتیں کرتے ہیں، تیرے دشمن تیرا نام عبث لیتے ہیں، اے خداوند! کیا میں ان کا کینہ نہیں رکھتا، جو تیرا کینہ رکھتے ہیں، کیا میں ان سے جو تیرے مخالف ہو کے روٹھے ہیں، بیزار نہیں، میں شدت سے ان کا کینہ رکھتا ہوں، میں انھیں اپنے دشمنوں میں گنتا ہوں۔'' (۱۳۹۔۱۹۔۲۲)

یشوع کے صحیفہ میں ہے:

''اگر تم کسی طرح سے برگشتہ ہو اور ان لوگوں کے بقیہ سے لپٹو جو تمہارے درمیان باقی ہیں اور ان کے ساتھ نسبتیں کرو اور ان سے ملو اور وہ تم سے ملیں تو یقین جانو کہ خداوند تمہارا خدا پھر ان گروہوں کو تمہارے سامنے سے دفع نہ کرے گا، بلکہ وہ تمہارے لیے پھندے اور دام اور

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الممتحنۃ: ۴۸۹۰۔

تمہاری بغلوں کے لیے کوڑے اور تمہاری آنکھوں میں کانٹے ہوں گے، یہاں تک کہ تم اس اچھی سرزمین پر سے جو خداوند تمہارے خدا نے عنایت کی ہے، نابود ہو جاؤ گے۔،، (یشوع باب ۲۳۔۱۲)

قرآن پاک اور احادیث میں بعض احکام ایسے بھی ہیں، جن میں منکروں، ظالموں، بدکاروں اور گناہگاروں سے علیحدہ رہنے کی نصیحت ہے:

﴿ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ (٤/ النسآء: ٨٩)

''وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو، جس طرح انھوں نے کفر کیا، تو ان میں سے اپنے دوست نہ بناؤ، یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ اختیار کریں۔''

﴿ وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾

(٦/ الانعام: ٦٨)

''اور جب تو ان کو دیکھے، کہ جو میری آیتوں کی شان میں لغو بکتے ہیں، تو ان سے کنارہ کر لے، یہاں تک کہ وہ اس کے سوا دوسری بات میں لگ جائیں اور اگر تجھ کو شیطان بھلا دے، تو یاد آنے کے بعد پھر ان گناہگار لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھ۔''

﴿ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ڮ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ ﴾

(٤/ النسآء: ١٤٠)

''اور تم پر کتاب میں یہ حکم اتار چکا کہ جب سنو اللہ کی آیتوں سے انکار ہوتے اور ان پر ہنسی ہوتے، تو ان کے ساتھ جب تک وہ دوسری بات نہ کرنے لگیں نہ بیٹھو، ورنہ تم بھی ان ہی کے جیسے ہو جاؤ گے۔''

یہ احکام اس لیے ہیں، تاکہ بری صحبت کا برا اثر مسلمانوں پر نہ پڑے، ان کے معنی قریب قریب وہی ہیں، جو سینٹ پال کے ان فقروں کے ہیں:

''میں نے خط میں تم کو لکھا کہ حرام کاروں میں مت ملے رہو، لیکن نہ یہ کہ بالکل دنیا کے حرام کاروں یا لالچیوں یا لٹیروں یا بت پرستوں سے نہ ملو نہیں تو تمھیں دنیا سے نکلنا ضرور ہوتا، پر میں نے اب تمھیں یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی بھائی کہلا کے حرام کار، یا لالچی، یا بت پرست، یا گالی

دینے والا، یا شرابی، یا لٹیرا ہو تو اس سے صحبت نہ رکھنا، بلکہ ایسے کے ساتھ کھانا تک نہ کھانا ...... غرض کہ تم اس برے آدمی کو اپنے درمیان سے نکال دو۔" (اول قرنیتون ۵)

"اور تم بے ایمانوں کے ساتھ نالائق جوئے میں مت جٹے جاؤ کہ راستی اور ناراستی میں کونسا ساجھا ہے اور روشنی اور تاریکی میں کونسا میل ہے، ایمان دار کا بے ایمان کے ساتھ کیا حصہ ہے، اللہ کی ہیکل کو بتوں سے کون سی موافقت ہے...... اس واسطے اللہ یہ کہتا ہے کہ تم ان کے درمیان سے نکل آؤ اور جدا ہو اور ناپاک کو مت چھوؤ۔" (قرنیتون ۶)

کفار و مشرکین کے ساتھ دلی بیگانگی اور روحانی غیرت کے باوجود اسلام دنیاوی معاملات اور اخلاق میں مسلمانوں کو ان سے عدل و انصاف اور رواداری کی تاکید کرتا ہے، عین لڑائی کی حالت میں بھی یہ حکم ہے:

﴿ وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ ﴾ (۹/ توبۃ:٦)

"اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے، تو اس کو پناہ دے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے کلام کو سن لے، پھر اس کو تو اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دے، یہ اس لیے کہ وہ نادان لوگ ہیں۔"

کیا ایک جنگجو مذہبی دشمن کے ساتھ اس سے زیادہ بھی حسن سلوک ہو سکتا ہے؟ کفار سے دلی بے تعلقی کے باوجود قرآن پاک میں یہ صریح حکم ہے کہ اگر کسی مسلمان کے ماں باپ مشرک و کافر ہوں تو بھی ان کی خدمت بجالانا اور دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ان کی مسلمان اولاد پر فرض ہے، فرمایا:

﴿ وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۖ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ۖ وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ۚ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴾

(۳۱/ لقمان:۱۵)

"اور اگر وہ دونوں (والدین) اس پر ضد کریں کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھے علم نہیں، تو ان کی بات نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کر اور اس کی راہ چل جو میری طرف جھکا، پھر تم سب کو میری طرف آنا ہے، پھر میں تم کو جتاؤں گا، جو تم کرتے تھے۔"

مذہبی دشمنوں کے ساتھ اس سے زیادہ رواداری اور کیا ہو سکتی ہے کہ مذہبی مخالفت کے باوجود ان کی دنیاوی خدمت اور ان کے ساتھ نیک برتاؤ میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے۔

سختی کا جائز موقع

اس میں شک نہیں کہ اسلام میں نہ صرف کفار بلکہ ان کے ساتھ بھی جن کو قرآن کی اصطلاح میں

''منافقین'' کہتے ہیں، بعض موقعوں پر سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسے کسی قوم کے ساتھ مسلمانوں کو لڑائی درپیش ہو اور اس وقت خطرہ ہو کہ جو کافر یا منافق مسلمانوں کے ساتھ آباد ہیں، وہ دھوکے سے دشمنوں کے ساتھ میل اور سازش نہ کر لیں، یا لڑائی کے بغیر بھی وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر ان کی جماعت میں تفرقہ پردازی کریں اور طرح طرح کے شبہوں اور افواہوں سے مسلمانوں کی جمعیت میں پریشانی پیدا کریں، اس حالت میں ان کافروں اور منافقوں کی سختی کے ساتھ نگرانی اور دیکھ بھال کی جائے اور مسلمانوں کو ان کے میل جول سے روک دیا جائے اور اگر وہ لڑ پڑیں تو بہادری کے ساتھ ان سے لڑا جائے، یہاں تک کہ وہ اپنی اس مذموم حرکت سے باز نہ آ جائیں، ان تمام امور کے فیصلہ کا حق امامِ وقت کو حاصل ہے، اس موقع کی دو آیتیں سورۂ توبہ میں ہیں:

﴿ يَآيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۭ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝ ﴾

(٩/ التوبة:٧٣۔٧٤)

''اے پیغمبر! ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور ان کی جائے پناہ دوزخ ہے اور وہ کتنی بری بازگشت کی جگہ ہے، یہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انھوں نے ایسا نہیں کہا، حالانکہ انھوں نے یقیناً کفر کی بات کہی اور اسلام کے اظہار کے بعد کفر کیا اور اس بات کا قصد کیا تھا، جس کو وہ پا نہ سکے اور انھوں نے عیب نہیں کیا، لیکن یہی کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنی مہربانی سے ان کو دولتمند کر دیا، تو اگر وہ باز آ جائیں، تو ان کے لیے یہ بہت اچھا ہے اور اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ انکو اس دنیا میں اور آخرت میں دردناک سزا دے گا اور زمین میں نہ ان کا کوئی دوست ہوگا نہ مددگار۔''

یہ آیتیں اس سختی کے موقع کو خود اپنے الفاظ سے ظاہر کر رہی ہیں اور ان کے آگے اور پیچھے جو اور آیتیں ہیں، وہ اور اس کی وضاحت کرتی ہیں، تین رکوع کے بعد سورہ کے خاتمہ میں مسلمانوں کو رومیوں [1] کے مقابلہ میں اپنی پوری سختی کے مظاہرہ کی ہدایت کی گئی ہے:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ (٩/ التوبة:١٢٣)

''اے ایمان والو! ان کافروں سے لڑو جو تمہارے ہم سرحد ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر

---

[1] تفسیر ابن جریر، طبری، ج ١٠، ص: ٤٦۔ مصر۔

سختی پائیں اور یقین کرو کہ اللہ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔"

اس سختی کے مظاہرہ کا حکم اس لیے ہے، تاکہ وہ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر ان پر حملہ کی نیت نہ کریں۔

تحریم اور ایلاء کے موقع پر بھی جب بعض منافق اہلِ بیتِ نبوی میں پھوٹ ڈال کر مسلمانوں کی جماعت میں افتراق اور انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے، کفار اور منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم ہوا:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ ﴾

(٦٦/ التحریم:٩)

"اے پیغمبر! ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بازگشت کی کتنی بری جگہ ہے۔"

یہ تمام مواقع سیاسی انتظام اور جماعتی نظام کی برقراری سے متعلق ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کفار اور منافقین کے زمرہ میں وہ کمزور مسلمان بھی شمار کیے گئے ہیں جو اس انتظام و نظام کی بربادی میں کفار و منافقین کے ساتھ عملاً شریک ہو گئے تھے۔

قرآن پاک میں ایک اور ایسی آیت ہے، جس سے مخالف جو اسلام پر سنگدلی و بے رحمی کا الزام لگاتے ہیں اپنے مدعا پر غلط استدلال کر سکتے ہیں اور وہ سورۂ فتح کی حسب ذیل آیت ہے، جس میں ایک طرف صحابہ رضی اللہ عنہم کی بہادری اور دوسری طرف ان کی باہمی محبت اور رحمدلی کی تعریف ہے:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ (٤٨/ الفتح:٢٩)

"محمد اللہ کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت (بھاری) ہیں اور آپس میں مہر و محبت رکھتے ہیں۔"

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کا یہ ترجمہ کہ "وہ کافروں پر سخت ہیں۔" اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ سنگ دلی، بے رحمی اور بداخلاقی کے ساتھ پیش آتے ہیں، بلکہ اس معنی میں ہے کہ یہ مسلمان اپنی ہمت، استقلال، باہمی اتحاد اور شدتِ ایمان کے سبب سے ایسے سخت ہیں، کہ کفار ان سے مرعوب ہیں اور مقابلہ میں مسلمان ان پر ایسے بھاری ہیں، کہ کفار ان پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے محاورہ کے مطابق اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں، بلکہ یہ کرنا چاہیے کہ وہ کفار پر بھاری ہیں، یعنی ان پر غالب اور ان کے مقابل میں کافی مضبوط ہیں، ان سے کسی طرح دبتے نہیں، چنانچہ علامہ زمخشری نے کشاف میں، ابن حیان اندلسی نے بحر المحیط میں، قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اس آیت کے وہی معنی قرار دیے ہیں، جو سورۂ مائدہ کی اس آیت کے ہیں:

﴿ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ (٥/ المآئدة:٥٤)

''فرمانبردار ہیں مسلمانوں کے اور بھاری ہیں کافروں پر۔''

یہ محاورہ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے، مثلاً سورۂ ہود میں ہے:

﴿ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ﴾ (۱۱/ هود:۹۲)

''اے لوگو! کیا میرا خاندان تم پر اللہ سے زیادہ بھاری (مضبوط) ہے۔''

دوسری آیت میں ہے:

﴿ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ ﴾ (۹/ التوبة:۱۲۹)

''تمہاری تکلیف رسول پر گراں ہے۔''

لسان العرب میں ہے:

وَرَجُلٌ شَدِيْدٌ قَوِیٌّ وَالْجَمْعُ اَشِدَّآءُ۔ ❶

مرد شدید، یعنی قوی اور اس کی جمع اشداء ہے۔

قرآن پاک میں ﴿اَشَدُّ قُوَّةً، اَشَدُّ خَلْقًا، اَشَدُّ تَثْبِيْتًا، اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا﴾ وغیرہ متعدد آیتوں میں استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ قوی اور مضبوط کے معنی میں آیا ہے، دوسرے مشتقات میں بھی یہ معنی مراد لیے گئے ہیں:

﴿ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۙ ﴾ (۲۰/ طٰه:۳۱)

''اس سے میری کمر کو مضبوط کر۔''

﴿ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۙ ﴾ (۷۸/ النبا:۱۲)

''اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔''

﴿ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ ﴾ (۳۸/ صٓ:۲۰)

''اور ہم نے ان کی سلطنت مضبوط کی۔''

﴿ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ﴾ (۴۷/ محمد:۴)

''پھر مضبوط باندھو۔''

شَدِيْدٌ کے مشترک معنی یہ ہیں کہ جو اپنی مخالف قوت کے سامنے نہ جھکے، بلکہ اس کے مقابلہ میں مضبوط اور سخت رہے اور یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صفت تھی، انھوں نے کفار کی بڑی بڑی مخالفتوں کی پروا نہ کی، تکلیفوں اور مزاحمتوں کا پرزور مقابلہ کیا، دشمنوں کی تلوار کے نیچے سر رکھ دیا، ان کے نیزوں کو سینوں میں جگہ دی، ان کے تیروں کی بوچھاڑ سے لہولہان ہوئے، مگر جس کو ایک کہا تھا، پھر اس کو دو نہ کہا اور جس کی تصدیق کر چکے تھے، پھر اس سے انکار نہ کیا، آخر یہ ہوا کہ کفار اپنی تعداد کی کثرت کے باوجود ان سے دبنے لگے اور مسلمانوں کی ایمانی

❶ ج ٤، ص: ٢١٨ مصر۔

قوت کا رعب ان پر بیٹھ گیا، قرآن نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ ﴿ سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۱ ، ۸/ الانفال:۱۲) کہ ''میں ان کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب بٹھا دوں گا۔'' وہ بالآخر پوری ہوئی اور فرمایا: ﴿ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ ﴾ (الاحزاب ، الحشر ـ۱) ''ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا۔''

مخالفوں کے دلوں میں اسی رعب بٹھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہمیشہ سامانِ جنگ مہیا رکھنے کا حکم دیا ہے:

﴿ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ ﴾

(۸/ الانفال :۶۰)

''ان کے لیے تم سے جو طاقت ہو سکے اور گھوڑوں کا باندھنا وہ تم تیار رکھو کہ اس سے دشمنوں کو مرعوب کرو۔''

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو ڈرایا کرو، بلکہ یہ ہے کہ تمہارا ساز وسامان اور جنگی تیاری اتنی ہو کہ دشمن تمہارے مقابل آنے سے رعب کھائے، اسی لیے جہاد کا پورا سامان ہر وقت تیار رکھنا مسلمانوں پر فرض ہے اور آنحضرت ﷺ نے جہاد کی غرض سے گھوڑوں کے رکھنے کو ثواب کا کام بتایا ہے، فرمایا: ''جو شخص گھوڑا اللہ کی راہ میں باندھتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے وہ اس کے لیے ثواب کا موجب ہے، جو ضرورت کے لیے باندھتا ہے، اس کے لیے پردہ پوش ہے اور جو نمائش کے لیے باندھتا ہے، وہ اس کے لیے عذاب ہے۔'' [1]

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعتِ محمدیہ میں نیت کا سوال سب سے اہم ہے، اسی لیے ضروری ہے کہ حق کے مخالفوں کے ساتھ ایک مسلمان کو جس عدم موالات کا حکم دیا گیا ہے، اس کا منشا ذاتی وقومی نفرت اور بیزاری نہ ہو، بلکہ وہ صرف حق کی نصرت کی خاطر اور اللہ کے لیے ہو، لیکن اس کے باوجود ان باطل کے حامیوں کے ساتھ عدل وانصاف اور نیک برتاؤ سے اسلام نے اپنے پیرووں کو نہیں روکا ہے۔

اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے ناراضی

یہاں کوئی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے سرے سے نفرت اور بیزاری کے جذبات ہی کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیا، لیکن ایسا کہنا فطرت کے قوانین سے چشم پوشی کرنا ہے، محبت اور عداوت، موافقت اور مخالفت، رضامندی اور ناراضی انسان کے فطری جذبات ہیں اور دنیا کے تمام کام، تمام تحریکیں اور تمام جدوجہد، انہی دو برابر کے جذبات کے نتیجے ہیں، اگر انسان کو ان دونوں جذبات سے پاک کر دیا جائے تو اس کی نیک وبد ہر قسم کی گرم جوشیاں سرد پڑ جائیں اور یہ آگ کا شعلہ جس سے انسان کا دل عبارت ہے، برف کا تودہ بن جائے، اس لیے یہ ناممکن ہے اور نامناسب ہے، کہ اس کے محبت اور ناراضی کے جذبات کو سرے سے

[1] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب الخیل لثلاثة: ۲۸۶۰ ـ

فنا کر دیا جائے، بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے ذاتی رجحانات اور شخصی میلانات کا عنصر علیحدہ کر دیا جائے، محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ نہیں کہ نفس غیظ وغضب اور ناراضی کے فطری جذبات کو نکال کر پھینک دو، جو یقیناً ناممکن ہے بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کے استعمال کا صحیح موقع ومحل متعین کیا جائے، چنانچہ اسلام نے ان موقعوں کی تعیین کی ہے اور بتایا ہے کہ کسی سے مخالفت اور آزردگی، ذاتی خود غرضی اور شخصی نفع ونقصان کے لیے نہ ہو، بلکہ اگر یہ ہو تو صرف حق کی حمایت، نیکی کی اعانت اور اللہ کی خوشنودی کے لیے ہو، دوستی ودشمنی، رضامندی وناراضی اور محبت وعداوت جو کچھ ہو، وہ اللہ کے لیے ہو، ''الحب فی اللہ والبغض فی اللہ۔'' [1]

یہ کہنا بظاہر بہت خوشنما ہے کہ ہر قسم کی ناخوشی وناراضی کے جذبات سے انسان کو پاک کر دینا ایک اچھے مذہب کا فرض ہے، مگر یہ فرض فطرت کے خلاف ہے، ناخوشی وناراضی کو سرے سے فنا نہیں کیا جا سکتا ہے، بلکہ جو ہو سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس ناخوشی وناراضی کے موقع ومحل کی اصلاح کی جائے، یہ ناممکن ہے کہ انسان کسی شے سے اور اس کی ضد سے بھی برابر کی محبت کرے، وہ جب خیر سے محبت کرے گا تو شر سے نفرت بھی کرے گا، وہ ایمان کو چاہے گا تو کفر سے بیزار بھی ہوگا، وہ نیکوں سے دوستی کرے گا، تو شریروں سے علیحدہ بھی ہوگا، مومن سے خوش ہوگا تو منافق سے ناخوش بھی ہوگا، انسان کے سینہ میں صرف ایک دل ہے اور ایک ہی دل میں ایک شے کی اور پھر اسی کی ضد کی دونوں کی محبت یکجا نہیں ہو سکتی، جیسا کہ قرآن نے کہا:

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ﴾ (۳۳/ الاحزاب:٤)

''اللہ نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے۔''

ع سینہ میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

اسی مفہوم کو حضرت مسیح علیہ السلام نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

''کوئی آدمی دو آقاؤں کی خدمت نہیں کر سکتا، اس لیے کہ یا ایک سے دشمنی رکھے گا یا دوسرے سے دوستی یا ایک کو مانے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا، تم اللہ اور مال دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔'' (متی ٦۔٢٤)

انجیل کے اسی فقرہ کی تشریح مختلف عیسائی رسولوں نے اپنے اپنے طور پر کی ہے، پولوس [2] نے اللہ اور آدمی، یعقوب [3] نے اللہ اور دنیا، یوحنا [4] نے اللہ اور دنیا کے برے کاموں کو باہم مقابل ٹھہرا کر کہا ہے کہ جو ایک سے محبت کرے گا، وہ دوسرے سے نہیں۔

یہی مفہوم احادیث کا ان الفاظ میں ہے کہ محبت اور عداوت دونوں صرف اللہ کے لیے ہونی چاہیے، اپنی ذات کے لیے نہیں، بیہقی کی شعب الایمان میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ایمان کی کونسی زنجیر زیادہ مضبوط ہے؟ عرض کی: اللہ اور اس کے رسول کو بہتر علم ہے۔ فرمایا یہ کہ ''باہمی میل جول

[1] ابوداود، کتاب السنة، باب مجانبة اهل الاهواء: ٤٥٩٩؛ احمد، ٥/ ١٤٦۔

[2] گلتیوں کے نام (١۔١٠)۔ [3] یعقوب (٣۔٤)۔ [4] یوحنا (٢۔١٥)۔

اللہ میں ہو، محبت بھی اللہ ہی میں ہو اور ناراضی بھی ہو تو اللہ ہی میں ہے۔'' [1] مسند احمد میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا کہ ''کون سی نیکی اللہ کو زیادہ پیاری ہے؟'' کسی نے نماز کہا، کسی نے زکوٰۃ کہا، کسی نے جہاد بتایا، آپ نے فرمایا: ''تمام نیکیوں میں سب سے زیادہ اللہ کو یہ نیکی پسند ہے کہ اللہ ہی کے لیے محبت اور اللہ ہی کے لیے مخالفت ہو۔'' [2]

اسلام میں کسی سے دائمی یا موروثی نفرت کی تعلیم نہیں

اللہ کے لیے کسی سے ناخوشی یا مخالفت یا ناراضامندی کے یہ معنی ہیں کہ نفسانی غرض و غایت کو اس جذبہ میں کوئی دخل نہ ہو، نیز یہ کہ شخص سے شخص کی حیثیت سے مخالفت یا بیزاری نہ ہو، بلکہ دراصل اس کے افعال، اعمال اور اخلاق سے مخالفت یا بیزاری ہو اور اس کے سبب سے اس شخص سے علیحدگی و بیزاری ہو، جس میں یہ صفتیں پائی جاتی ہوں، قرآن پاک کی ایک آیت ہے:

﴿ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ﴾

(۴۹/ الحجرات: ۷)

''اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں مزین کیا اور کفر اور بے حکمی اور نافرمانی کو تمہارے نزدیک مکروہ بنایا۔''

اس آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے خود مومن یا فاسق و عاصی کی ذات کو نہیں بلکہ ایمان کو محبت کا اور فسق و فجور اور عصیان کو نفرت و کراہت کا مورد قرار دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی بیزاری و ناراضامندی کا بنیادی سبب کافر و منافق کا کفر و نفاق ہے، یہ دور ہو جائے تو وہ بھی برابر کا بھائی ہے، فرمایا:

﴿ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ﴾ (۹/ التوبۃ: ۱۱)

''تو اگر وہ کفر سے توبہ کر لیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔''

یہی سبب ہے کہ ان صفات کے ازالہ کے بعد ہی دفعتہً کراہت محبت سے دشمنی دوستی سے اور ناراضامندی رضامندی سے بدل جاتی ہے، کیونکہ اسلام میں شخصی یا نسلی یا وطنی کسی پیدائشی یا دائمی نفرت و کراہت کا وجود نہیں، نہ ہندوؤں کی طرح اس کی نظر میں کوئی قابل نفرت اچھوت ہے، نہ ملچھ ہے نہ چنڈال ہے، نہ یہودیوں کی طرح کوئی ناپاک غیر مختون ہے اور نہ غیر قوم ہے اور نہ مجوسیوں کی طرح کوئی پاک نژاد اور بدگہر کی تفریق ہے اور نہ عیسائیوں کی طرح کوئی کالے گورے اور یورپین غیر یورپین کی تقسیم ہے، جو کچھ ہے وہ کفر و ایمان اور شرک و توحید کا فرق ہے، ایک خالص عرب اور قریشی کافر ہو کر ابوجہل و ابولہب ہو سکتا ہے اور ایک معمولی حبشی و عجمی، مومن و موحد ہو کر بلال حبشی، صہیب رومی اور سلمان فارسی کا رتبہ پا سکتا ہے، وہی عمر، وہی سفیان، وہی عکرمہ، وہی خالد رضی اللہ عنہم جو کل تک کفر کے علمبردار بن کر مسلمانوں کے سخت ترین دشمن تھے،

[1] شعب الایمان بیھقی: ۹۵۱۴؛ مشکوۃ المصابیح، کتاب الادب، باب الحب فی: ۵۰۱۴۔

[2] مسند امام احمد، ج ۵، ص: ۱۴۶۔

بیک نظر ان کی وہ کایا پلٹ ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے سرگروہ ہو گئے اور مسلمان ان کے فدائی بن گئے اور سب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان جتایا:

﴿ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ﴾ (۳/ آل عمران:۱۰۳)

''(یاد کرو) جب تم باہم دشمن تھے، تو اس نے تمہارے دلوں میں باہم الفت پیدا کر دی اور تم اسکے فضل و کرم سے بھائی بھائی بن گئے۔''

ناپسندیدگی و بیزاری کا دوسرا جذبہ وہ ہے، جس کی بنا کسی انسان کی گناہگاری اور عصیان کاری پر ہے، توبہ و ندامت کے ایک حرف سے یہ جذبہ رحمت و شفقت سے مبدل ہو جاتا ہے، مبشرِ عالم، نے ایسے گناہگاروں کو اللہ کی زبان سے یہ مژدہ سنایا کہ

﴿ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ (۳۹/ الزمر:۵۳)

''اے میرے وہ بندو جنھوں نے گناہ کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ سب گناہوں کو معاف کر سکتا ہے، وہ بخشنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ)) [1] ''گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا وہ جس کا گناہ نہ ہو۔'' یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گناہگاروں کے ساتھ بھی شفقت فرمائی اور ان کی طرف ترحم کی نظر سے دیکھا اور ان کو رضائے الٰہی کی بشارت سنائی، ایک صاحب کو شراب پینے کی عادت تھی، وہ اس کی سزا بار بار بھگتتے تھے، ایک دفعہ جب وہ اسی جرم میں پکڑے آئے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: اللہ اس کو رسوا کرے کہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے، آنحضرت نے یہ الفاظ سنے تو فرمایا: ''تم اپنے بھائی کے خلاف شیطان کی مدد نہ کرو، مجھے اس کے متعلق جو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کو پیار کرتا ہے۔'' [2] اس واقعہ سے علما نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے، کہ گناہگار پر بددعا نہ کی جائے۔ [3] ماعز بن مالک ایک صاحب تھے، جو بشری کمزوری سے زنا کے مرتکب ہوئے، واقعہ کے بعد ان کا روحانی احساس بیدار ہوا، وہ جانتے تھے کہ اس کی سزا موت ہے، تاہم انھوں نے خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر اپنی حالت عرض کی اور سزا کی درخواست کی، آنحضرت نے کئی دفعہ ان کی درخواست رد کی، لوگوں سے تحقیق کی یہ پاگل تو نہیں؟ سب نے کہا: ایسا تو نہیں ہے، اس کے بعد ان پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، وہ میدان میں کھڑے کیے گئے اور ان پر سنگ باری کی گئی اور اسی حال میں انھوں نے جان دی، صحابہ میں بعض ایسے تھے جو اس بہادرانہ سزا پانے کے

[1] ابن ماجہ، ابواب الزهد، باب ذكر التوبة:۴۲۵۰۔

[2] صحیح بخاری، كتاب الحدود، باب مايكره من لعن شارب الخمر:۶۷۸۰، ۶۷۸۱۔

[3] فتح الباری، كتاب الحدود، باب ما يكره من ...، شرح حديث مذكور، ج ۱۲، ص:۶۸۔

باوجود ماعز کو برا کہتے تھے، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو فرمایا: ''ماعز کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا مانگو کہ اس نے وہ توبہ کی کہ اگر وہ کسی پوری قوم میں بانٹی جائے تو اس میں سب کی گنجائش ہو سکتی ہے۔'' [1]

اسی طرح قبیلہ غامد کی ایک حاملہ عورت نے آ کر خود اپنے جرم کا اقرار کیا اور سزا کی درخواست کی، آپ نے فرمایا: ''وضع حمل کے بعد آنا'' وہ اس کے بعد آئی، فرمایا: ''بچہ کی پرورش کرلو، جب بچہ دودھ چھوڑ دے تب آنا'' وہ کچھ زمانہ کے بعد اس فرض سے بھی سبک دوش ہو کر آئی اور اب بھی اس کے احساس گناہ کا جذبہ کم نہیں ہوا تھا، آپ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، اس کو سنگسار کیا گیا تو اس کے خون کی چھینٹیں اڑ کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے منہ پر پڑیں، انھوں نے عورت کو برا کہا، آنحضرت ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ ''خالد چپ رہو، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس نے وہ توبہ کی ہے کہ اگر شاہی محصول لینے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخشا جاتا۔'' [2]

ترک ھویٰ

آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے یہ نکتہ سکھایا ہے، کہ انسان کے نیک سے نیک فعل کی اچھائی بھی اس کی غرض و غایت پر موقوف ہے، یعنی یہ کہ اگر وہ اللہ کی خوشنودی اور رضامندی کے لیے ہے تو وہ نیک اور اچھا ہے اور اگر اس کے علاوہ کسی اور فاسد غرض کے لیے ہے تو وہ نیکی نہیں، اسی فاسد غرض اور باطل خواہش کا نام قرآن پاک میں ھویٰ ہے، ضروری ہے کہ انسان اپنے تمام افعال و اعمال و اخلاق کو ھویٰ سے پاک رکھے، کہ انسان کا حقیقی اللہ وہی ہے، جس کے لیے وہ کام کرتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو دین حق کے پیرو نہیں اور اپنے کاموں کی بنیاد اخلاص پر نہیں رکھتے، یہ کہا کہ ان کا دین و مذہب اپنی خواہش نفسانی کی پیروی ہے اور ان کے سینوں کے اندر اغراض نفسانی اور خواہش و ھویٰ کے بت چھپے ہیں، قرآن نے فرقان اور جاثیہ دو سورتوں میں متنبہ کیا:

﴿ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ﴾ (٤٥/ الجاثية:٢٣)

''اے پیغمبر کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا الٰہ بنا رکھا ہے۔''

اسی لیے نفس کے تزکیہ و صفائی اور روح کی بلندی و پاکی کے لیے شریعت محمدی ﷺ نے ترک ھویٰ کا طریقہ پیش کیا، بودھ کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان ہر خواہش سے پاک ہو جائے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ انسان ہر بری خواہش سے پاک ہو جائے، کیونکہ انسان اگر اچھی اور بری خواہش سے پاک ہو جائے تو اس کے فعل کی کوئی غرض و غایت نہ ٹھہرے گی اور نہ اس کا کوئی محرک باقی رہے گا، اسی لیے اسلام کی تعلیم میں ہر خواہش کے ترک کرنے کا مطالبہ نہیں، بلکہ ہر بری خواہش، ہر باطل غرض اور ہر نفسانی ہوا و ہوس کے ترک کا مطالبہ ہے، کیونکہ اسی کی پیروی سے گمراہی و ضلالت پیدا ہوتی ہے، وحی محمدی نے فرمایا:

﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ﴾ (٢٨/ القصص:٥٠)

[1] صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسه بالزنی: ٤٤٣١۔ [2] ایضا: ٤٤٣٢۔

''اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جس نے اللہ کی راہنمائی کے بغیر اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کی۔''

پھر فرمایا:

﴿ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ ﴾ (۳۸/ صٓ:۲۶)

''اور خواہش نفسانی کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دے گی۔''

عدل وراستی جو ہر اچھائی اور نیکی کی روح ہے، وہ اسی ھویٰ کے زہر قاتل سے مر جاتی ہے، فرمایا:

﴿ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ ﴾ (۴/ النساء:۱۳۵)

''عدل میں نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو۔''

ہوائے نفسانی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے، جس نے اپنے آپ کو اس سے بچایا، وہ ہر برائی اور بدی سے پاک ہوا اور اس کے امن کی جگہ جنت ہے، فرمایا:

﴿ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۭ ﴾

(۷۹/ النازعات:۴۰۔۴۱)

''اور لیکن جو کوئی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو بری خواہش سے روکا تو بیشک جنت ہے اس کے امن سے رہنے کی جگہ۔''

اخلاق اور محبت الٰہی

دین ودنیا کی سب سے بڑی نعمت محبت اور پیار ہے، خاص کر وہ محبت اور پیار جو اللہ کو اپنے بندہ کے ساتھ ہو، یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن ذریعوں سے انسان کو حاصل ہو سکتی ہے، ان میں دیگر ضروریات دین کے بعد سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسنِ اخلاق ہے، عقائد کے باب میں محبت الٰہی کے زیرِ عنوان اس کی طرف مجمل اشارہ ہو چکا ہے، مگر اس کی تفصیل کا موقع اب ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور تو راۃ اور انجیل میں بھی ہے، مگر اصل سوال یہ ہے کہ اللہ کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے اور یہ دولت انسان کو کیونکر مل سکتی ہے، اس کا جواب صرف قرآن نے دیا ہے، مختصراً یہ کہ ہر کام اور ہر چیز میں داعی خیر کی پیروی محبتِ الٰہی کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کی زبان سے فرمایا:

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾ (۳/ آل عمران:۳۱)

''کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

اس لیے آنحضرت کی تعلیمات، ارشادات، احکام، اخلاق اور اعمال کی پیروی محبت الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، لیکن قرآن پاک نے اس مختصر جواب پر قناعت نہیں کی ہے، بلکہ نام بنام اس نے بتایا ہے کہ اللہ

کی محبت کے مستحق اور سزاوار کون کون ہیں اور اس دولت سے محروم کون ہیں؟ اس سے اسلامی اصولِ اخلاق کا یہ مسئلہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کاموں سے جو اللہ کی محبت کا ذریعہ ہیں، حسن خلق بھی ہے اور ان امور میں سے جن سے یہ نعمت چھن جاتی ہے، بداخلاقی اور بدکرداری بھی ہے۔

پہلی صف میں حسب ذیل خوش قسمت انسانی جماعتیں داخل ہیں:

﴿ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران :۶۸)

''اور اللہ ایمان والوں کا دوست ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۵ والمآئدۃ:۱۳)

''اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ :۲۲۲)

''اللہ توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۹)

''اللہ توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۲ حجرات ۷)

''اللہ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۴)

''اللہ تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۴۶)

''اور اللہ صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۰۸)

''اور اللہ پاک وصاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ ﴾ (۶۱/ الصف:۴)

''اللہ ان کو پیار کرتا ہے، جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں۔''

ان آیات پاک میں نو باتیں ایسی بیان کی گئی ہیں جو محبت الٰہی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، ایمان، احسان، توبہ، توکل، انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی، جہاد۔

حسب ذیل صفتیں وہ ہیں جو محبت الٰہی کے فیضان سے انسان کو محروم کرتی ہیں:

﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران: ۳۲)

''تو اللہ کافروں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۰)

''اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:٣٦)

''اللہ اس کو پیار نہیں کرتا، جو اترانے والا ہو شیخی مارنے والا ہو۔''

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:١٠٧)

''اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جو خیانت کار اور گناہگار ہو۔''

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِينَ ۝ ﴾ (٨/ الانفال:٥٨)

''اللہ خیانت کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ ۝ ﴾ (٢٢/ الحج:٣٨)

''اللہ کسی خیانت کار ناشکرے کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ۝ ﴾ (٢٨/ القصص:٧٦)

''اللہ اترانے والوں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۝ ﴾ (٢٨/ القصص:٧٧)

''اللہ فساد کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۝ ﴾ (٦/ الانعام:١٤١)

''اللہ فضول خرچ لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ ۝ ﴾ (١٦/ النحل:٢٣)

''اللہ مغروروں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِينَ ۝ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ:٤٠)

''اللہ ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ۝ ﴾ (٢/ البقرۃ:٢٧٦)

''اللہ ناشکر گناہگاروں کو پیار نہیں کرتا۔''

کفر، بدگوئی، بدلہ لینے میں حد سے آگے بڑھ جانے، فخر، غرور، شیخی، خیانت، ناشکری، فساد، اسراف، ظلم، گناہ، وہ بداخلاقیاں ہیں، جو انسان کو محبت الٰہی کے سایہ سے دور کرتی ہیں۔

اوپر کی تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی اخلاق کی ترکیب میں محبت الٰہی کا کتنا بڑا عنصر شامل ہے۔

تعلیم اخلاق کے طریقے اور اسلوب

آنحضرت ﷺ کی بعثت تعلیم اور تزکیہ کے لیے ہوئی، یعنی لوگوں کو سکھانا اور بتانا اور نہ صرف سکھانا اور بتانا بلکہ عملاً بھی ان کو اچھی باتوں کا پابند اور بری باتوں سے روک کر، آراستہ و پیراستہ بنانا، اسی لیے آپ کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ

﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ﴾ (۲/ البقرة:۱۲۹)

''وہ (رسول) ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا اور پاک وصاف کر کے نکھارتا ہے۔''

اور اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ

((وَاِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا)) ❶

''اور میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس معلم ربانی نے کن طریقوں سے اپنی اخلاقی تعلیم کے فرض کو انجام دیا۔

ایک کامیاب معلم کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں اپنے اپنے موقع پر سختی اور نرمی دونوں ہوں، وہ ایک جراح ہے جس کے ایک ہاتھ میں نشتر ہو، جس سے زخم کو چیر کر فاسد مواد کو باہر نکال دے اور دوسرے ہاتھ میں مرہم ہو، جس سے زخم میں ٹھنڈک پڑ جائے اور تندرست گوشت اور چمڑے کی پرورش ہو، اگر کسی جراح کے پاس ان دو میں سے صرف ایک ہی چیز ہو تو وہ نہ زخم کو پاک کر سکتا ہے اور نہ فاسد گوشت پوست کی جگہ تندرست گوشت و پوست پیدا کر سکتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی تعلیمِ اخلاق کے طریقوں پر غور کی ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی تعلیم میں سختی اور نرمی کے موقع و محل کو خوب پہچانتے تھے اور اس پر عمل فرماتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ آپ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلہ نہیں لیا، مگر یہ کہ کوئی شریعت کے حدود کو توڑے تو اس کو سزا دیتے تھے، ❷ قریش کی ایک بی بی چوری کے جرم میں پکڑی گئی، بعض مسلمانوں نے ان کی سفارش کرنی چاہی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں معمولی لوگ گناہ کرتے تھے تو ان کو سزا دیتے تھے اور جب بڑے لوگ کرتے تھے تو ان کے احکام ٹال جاتے تھے۔'' ❸

یہ تو سختی کی مثالیں ہیں، نرمی کی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد نبوی میں ایک بدوی آیا، اتفاق سے اس کو استنجے کی ضرورت معلوم ہوئی تو وہ وہیں مسجد کے صحن میں بیٹھ گیا، صحابہ رضی اللہ عنہم یہ دیکھ کر چاروں طرف سے اس کو مارنے کو دوڑے، آپ ﷺ نے روکا اور فرمایا: ''تم سختی کے لیے نہیں بلکہ نرمی کے لیے بھیجے گئے ہو۔'' اس

---

❶ ابن ماجه، كتاب السنة، باب فضل العلماء:۲۲۹۔ ❷ صحيح بخاري، كتاب الادب باب قول النبي ﷺ: يسروا ولا تعسروا: ۶۱۲۶۔ ❸ صحيح بخاري، كتاب الحدود، باب كراهية الشفاعة في الحدود...... ۶۷۸۸۔

کے بعد اس بدوی کو بلا کر فرمایا: ''یہ عبادت کے گھر ہیں، یہ نجاست کے لیے موزوں نہیں، یہ اللہ کی یاد اور نماز اور قرآن پڑھنے کے لیے ہیں۔'' پھر لوگوں سے فرمایا: ''اس پر پانی بہا دو۔'' [1]

اسی طرح ایک دفعہ ایک صاحب سے رمضان میں بحالت روزہ ایک غلطی ہو گئی، اس نے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضور کے پاس لے چلو، انھوں نے کہا، یہ ہم سے نہ ہو گا، تو وہ اکیلا آنحضرت کے پاس پہنچا اور واقعہ عرض کیا، فرمایا: ''ایک غلام آزاد کرو۔'' عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! میرے پاس تو ایک غلام بھی نہیں، فرمایا: ''دو مہینے لگا تار روزے رکھو۔'' عرض کی، روزہ ہی میں تو یہ گناہ ہوا، فرمایا: ''تو اچھا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو۔'' عرض کی، ہم تو خود کنگال ہیں، فرمایا: ''اچھا بنی زریق کے صدقہ کے منتظم کے پاس جاؤ اور اس سے صدقہ لے کر پہلے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ اور جو بچے وہ تم اور تمہارے گھر والے کھائیں۔'' وہ خوش ہو کر اپنے قبیلہ میں آیا اور کہا کہ تم کتنے سخت تھے اور حضور ﷺ نے کتنی نرمی کی۔ [2]

یہ اور اسی قسم کے واقعات کو سامنے رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حدود الٰہی کی شکست کا خوف ہوتا تھا، وہاں نرمی نہیں برتی جاتی تھی، لیکن جن امور میں وسعت ہوتی یا جہاں مستحبات اور اخلاقی فضائل ورذائل کا موقع ہوتا تھا، آپ ﷺ نرمی سے سمجھا دیتے اور لطف ومحبت سے فرما دیتے تھے۔

ع قاہری با دلبری پیغمبری است

اخلاقی فضائل ورذائل کی تعلیم کے بھی مختلف طریقے اختیار کیے گئے، کہیں کسی اخلاقی تعلیم کو حکمِ الٰہی بتا کر، کہیں اچھی اچھی مؤثر تشبیہوں کے ذریعہ، کہیں اس کے اچھے یا برے نتیجوں کو کھول کر اس طرح بیان کیا کہ سننے والے متاثر ہو کر اس پر عمل کرنے کو فوراً تیار ہو جاتے تھے۔

چنانچہ قرآن نے اپنی تعلیم میں کہیں فرمانِ الٰہی کی صورت اختیار کی اور کہا:

﴿ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴾ (١٦/ النحل:٩٠)

''بے شک اللہ عدل اور احسان کرنے اور رشتہ دار کو دینے کا حکم کرتا ہے اور بے حیائی کی بات اور ناپسندیدہ بات اور سرکشی سے منع کرتا ہے، تمھیں وہ نصیحت فرماتا ہے، تاکہ تم نصیحت پکڑو۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک شہنشاہِ مطلق کی حیثیت سے اپنے فرمان کو نافذ فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ یہ کرو اور ان سے بچو، تمام انسانوں کا جو اس قادر مطلق کے عاجز ودرماندہ بندے ہیں، یہ فرض ہے کہ وہ اس کے حکم کی پوری پوری تعمیل کریں، اس تعمیل میں بندوں کے چون وچرا کی گنجائش نہیں۔ تعلیم کا دوسرا اسلوب یہ ہے کہ فضائل کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ اور رذائل کو قبیح مناظر اور قابل نفرت صورتوں میں اس طرح پیش کیا جائے کہ

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب یسروا ولا تعسروا:٦١٢٨ وکتاب الوضو: ٢٢٠؛ صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب وجوب غسل البول:٦٦١۔ [2] ابو داود، کتاب الطلاق، باب فی الظهار:٢٢١٣۔

سننے والا بالطبع فضائل کی طرف مائل اور رذائل سے روگرداں ہو جائے، مثلاً: اللہ کی راہ میں دینا ایک اخلاقی فضیلت ہے جس کی تصویر یوں کھینچی گئی کہ ﴿ كَمَثَلِ حَبَّةٍ ﴾ (۲/ البقرہ: ۲٦١) یہ نیکی ایک دانہ ہے، زمین سے ہر دانہ ایک بال ہو کر اگتا ہے اور ہر بال میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں، اسی طرح نیکی کا یہ ایک دانہ سینکڑوں ربانی انعامات کا باعث ہوتا ہے۔

ریاونمائش کی نیکی بے نتیجہ ہوتی ہے، نہ مخلوق پر اس کا اثر پڑتا ہے اور نہ اللہ کے ہاں اس کا کوئی بدلہ ہے، قرآن نے اس کو یوں ادا کیا ﴿ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۶۴) ''اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی کسان اپنا بیج ایسی چٹان پر چھینٹ دے، جس پر ذرا سی مٹی پڑی ہو، جہاں ذرا زور کی بارش ہوئی تو بیج اور مٹی سب بہہ گئی اور چٹان دھل کر صاف ہوگئی، اس بیج سے ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوگا۔ بے ایمانی سے یتیموں کے مال کھا جانے کو یوں ادا کیا کہ ''جو ایسا کرتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔'' (۴/ النسآء: ۱۰) پیٹھ پیچھے مسلمان کی برائی کرنے کی کراہت یوں ظاہر کی: ''کیا کوئی اپنے مردہ بھائی کی لاش کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا ہے۔'' (۴۹/ الحجرات: ۱۲) کسی کو کوئی چیز دے کر واپس لینا شرافت اور فیاضی کے خلاف ہے، آنحضرت ﷺ نے اس کی برائی کو یوں ظاہر فرمایا ہے: ''جو دے کر واپس لیتا ہے وہ گویا قے کر کے پھر چاٹتا ہے۔'' [1] اس سے زیادہ کوئی مکروہ تشبیہ اس بداخلاقی کی ہو سکتی ہے؟ قبیلہ اسلم کے ایک شخص سے ایک اخلاقی گناہ سرزد ہوا اور بعد کو اس پر یہ اثر ہوا کہ خود آ کر عدالتِ نبوی ﷺ میں اپنے گناہ کا اقرار کیا اور شریعت کی حد اپنے اوپر جاری کرنے کی درخواست کی، حضور نے تحقیقات کے بعد اس کے سنگسار کیے جانے کا حکم دیا، جب وہ سنگسار ہو چکا، تو آپ ﷺ نے ایک صاحب کو دوسرے سے یہ کہتے سنا کہ اس کو دیکھو کہ اللہ نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تھا، لیکن اس نے اپنے آپ کو نہیں چھوڑا اور کتے کی طرح سنگسار کیا گیا۔ حضور ﷺ یہ سن کر خاموش رہے، تھوڑی دور چلے تھے، کہ ایک گدھے کی لاش پڑی ملی، آپ ﷺ نے پکارا کہ ''فلاں فلاں صاحب کہاں ہیں؟'' انہوں نے کہا ہم یہ ہیں یارسول اللہ! فرمایا: ''اترو اور اس گدھے کی لاش سے کچھ کھاؤ۔'' انہوں نے عرض کی، اے اللہ کے رسول ﷺ! اس کو کون کھائے گا، فرمایا: ''تم نے ابھی اپنے بھائی کے حق میں جو کہا وہ اس لاش کے کھانے سے زیادہ گھناؤنی بات ہے۔'' [2] غیبت کی برائی کو ذہن نشین کرنے کے لیے اس سے زیادہ مؤثر طرز کوئی ہو سکتا ہے؟

تعلیم کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اچھے کاموں کے اچھے اور برے کاموں کے برے نتیجہ کو کھول کر بیان کر دیا جائے جس سے اچھے اخلاق کے اختیار اور برے کام کے ترک کا جذبہ ابھرے، اسلام نے اس طریقہ کو بھی اختیار کیا ہے، مثلاً: شراب نوشی اور قمار بازی سے روکنا تھا تو اس کے برے نتیجوں کو قرآن میں بوضاحت بیان

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الهبة، باب لا یحل لاحد أن یرجع فی هبته: ۲٦۲۱۔

[2] ابوداود، کتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالك: ٤٤۲۸۔

کیا: ''مسلمانو! شراب، جوا اور پانسے کے تیر ناپاک ہیں، شیطان کے کام، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں عداوت اور دشمنی بڑھے اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے غافل رکھے۔'' (۵/ المآئدہ: ۹۰۔۹۱) شراب اور جوئے کے برے نتیجے یہ ہیں کہ ان کا خاتمہ اکثر کھیلنے والوں کی باہمی دشمنی اور لڑائی پر بلکہ قتل اور خودکشی تک پر ہوتا ہے اور انسان ان میں پھنس کر اپنے دین ودنیا کے فرض سے غافل اور بیکار ہو جاتا ہے، نتیجہ جانی ومالی بربادی ہوتی ہے۔ اسلام نے اخلاق کی تعلیم کا ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ وہ فضائلِ اخلاق کو الوہیت، ملکوتیت اور نبوت کے محاسن میں اور رذائل کو شیطان کے خصائص میں داخل کرتا ہے، جس سے فضائل کے اختیار اور رذائل سے اجتناب کرنے کا شوق ہوتا ہے، مثلاً: عفو ودرگزر کی تعلیم دی تو یوں فرمایا:

﴿ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴾

(٤/ النسآء: ١٤٩)

''اگر تم کوئی بھلائی ظاہر کرو یا اس کو چھپاؤ یا کسی برائی کو معاف کرو تو اللہ ہے معاف کرنے والا قدرت والا۔''

قدرت کے باوجود عفو اللہ تعالیٰ کا خاص وصف ہے، بندوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی کرو، "تخلقوا باخلاق اللّٰه" گو صرف ایک مشہور مقولہ ہے، مگر اس کا استنباط اس آیت سے ہوتا ہے اور بعض مفسرین نے اس نکتہ کو یہاں بیان کیا ہے۔ [1]

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے اور سلیقہ کے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو، تو کیا یہ بھی غرور ہے؟ فرمایا: ''نہیں۔''

((اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ)) [2]

''اللہ جمال والا ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے۔''

اس لیے بندوں کو بھی چاہیے کہ اپنے طور وطریق ولباس میں سلیقہ اور جمال کا لحاظ رکھیں۔

مسلمانوں میں عزم واستقلال اور بہادری کی تعلیم دینی تھی تو اس کو قرآن نے اس طرح کہا:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ (٣٣/ الاحزاب: ٢١)

''تمہارے لیے اللہ کے رسول میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔''

حق کے مقابلہ میں ماں باپ، رشتہ دار کسی کے خیال نہ کرنے کی تعلیم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نمونہ سے دی گئی:

﴿ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ﴾ (٦٠/ الممتحنة: ٤)

---

[1] تفسیر بحر محیط، ابی حیان اندلسی زیر آیت مذکورہ ۳، ص: ۳۸۵۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر و بیانه: ٢٦٥؛ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الکبر: ١٩٩٩۔

”تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔“

ان دونوں آیتوں میں اخلاق کی بعض صفتوں کو پیغمبرانہ اوصاف سے تعبیر کر کے اس کی بڑائی ظاہر کی ہے اور ان کی پیروی کی ترغیب دی ہے۔

فضول خرچی کی بری صفت سے مسلمانوں کو بچانا تھا تو اس کی برائی کو یوں ذہن نشین کرایا:

﴿ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۲۷)

”بے شبہ فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں۔“

اب کون ہے جو شیطانوں کا بھائی ہونا پسند کرے گا۔

غرض یہ اور اسی قسم کی بلاغت کے مختلف اسلوبوں سے اسلام نے اخلاقی فضائل کی خوبی اور رذائل کی برائی جاہل عربوں کے ذہن نشین کر دی، جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ ایک صحابی دربارِ نبوت میں اپنی پہلی حاضری کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مجلس میں ایک شخص بیٹھا ہے، جو وہ کہتا ہے اس کو سب لوگ بجالاتے ہیں، میں نے پوچھا، یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا، یہ اللہ کے رسول ہیں، یہ سن کر میں نے دو دفعہ کہا، اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ پر سلام، (علیک السلام) آپ ﷺ چپ رہے، پھر فرمایا: ”علیک السلام نہ کہو، یہ مردہ کا سلام ہے، السلام علیک کہو۔“ میں نے کہا کہ کیا آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں؟ فرمایا: ”ہاں میں اس اللہ کا رسول ہوں جس کو تم تکلیف میں پکارتے ہو تو وہ اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے اور اس سے خشک سالی میں مانگتے ہو تو وہ اُگا دیتا ہے اور جس سے تم جب کسی لق ودق بے نشان بنجر میں ہو، تمہاری سواری وہاں گم ہو جائے، تم دعا کرتے ہو تو وہ اس کو تمہارے پاس لوٹا دیتا ہے۔“ میں نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے، ارشاد ہوا: ”کسی کو برا نہ کہہ۔“ جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے اس فرمان کا یہ اثر ہوا کہ میں نے پھر کسی کو شریف ہو کہ غلام، یہاں تک کہ کسی جانور کو بھی برا نہیں کہا، آپ ﷺ نے پھر یہ نصیحت فرمائی کہ ”تم کسی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ جانو یعنی اس کو کیے جاؤ اور تم کو چاہیے کہ اپنے بھائی سے جب بات کرو تو تمہارا چہرہ کھلتا رہے، یہ بھی نیکی ہے اور اپنا تہبند آدھی پنڈلی تک اونچا رکھو، اگر یہ نہیں تو ٹخنے سے اونچا ضرور رہے، کیونکہ تہبند کو بہت نیچے تک لٹکانا غرور کی نشانی ہے [1] اور اللہ غرور کو پسند نہیں فرماتا اور اگر تمہیں کوئی گالی دے اور تم میں جو برائی وہ جانتا ہے، تم کو اس کی عار دلائے، تو تم اس کی اس برائی سے جو تم جانتے ہو، اس کو عار نہ دلاؤ، کہ اس کا وبال اسی کی گردن پر ہوگا“۔ [2]

اس طریقہ تعلیم کی بلاغت پر غور کیجیے، کہ آپ ﷺ نے بدوی کو اللہ کے آگے جھکنے اور اس سے گڑگڑا کر مانگنے کے وہی موقعے یاد دلائے جو اس کی زندگی میں اللہ جانے کتنی دفعہ پیش آئے ہوں گے، اس کا اثر یہ

[1] عرب امراء فخر وغرور کے لیے ایسا کرتے تھے جیسے عبا کے دامن یا گون کو زمین پر گھسیٹ کر چلنا دوسری قوموں میں غرور کی نشانی تھی۔

[2] سنن ابی داود، کتاب اللباس، باب ما جاء فی اسبال الازار: ۴۰۸۴۔

ہوا کہ اس کا دل سچائی کو پکار اٹھا اور حضورِ اقدس سے دین و دنیا کی نصیحت چاہی، ایک حکیم کا فرض یہ ہے کہ مریض کی حالت کو دیکھ کر نسخہ تجویز کرے، یہ نہیں کہ ہر ایک کو ایک ہی نسخہ خواہ بیماری کوئی ہو پلاتا چلا جائے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مختلف پوچھنے والوں کے جواب میں ہر ایک کے مطابق الگ الگ باتیں بتائیں، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو جو تعلیم دی، اس کا نچوڑ یہ ہے کہ غرور نہ کرو اور اپنے کو بڑا نہ سمجھو، پھر اسی بیماری کے دور کرنے کی چند تدبیریں بتائیں۔

ایک اور شخص نے عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ! مجھے نصیحت فرمائیے، ارشاد ہوا کہ ''غصہ نہ کر۔'' اس نے کئی دفعہ اپنا سوال دہرایا، آپ نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ ''غصہ نہ کر۔'' [1] اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپ ہر شخص کا علاج اس کے مرض کے مطابق فرماتے تھے، اس شخص میں غصہ ہی اتنا ہوگا کہ اس سے اس کے سبب سے بہت سی برائیاں ہو جاتی ہوں گی، اس لیے آپ ﷺ نے اس کے لیے یہ علاج تجویز فرمایا، جس کو وہ بادی النظر میں معمولی سمجھا اور بار بار کسی اور علاج کی خواہش ظاہر کی، لیکن آپ نے ہر بار یہی فرمایا: ''غصہ نہ کیا کرو۔''

ایک دفعہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ صحابی نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! سب کاموں میں بہتر کام کیا ہے؟ فرمایا: ''اللہ پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا۔'' پھر پوچھا، کس غلام یا باندی کو آزاد کرنا سب سے بہتر ہے، فرمایا: ''جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اس کے مالک کی نظر میں زیادہ پسندیدہ ہو۔'' پھر دریافت کیا کہ اگر ان نیکی کے کاموں میں سے کچھ نہ کر سکوں؟ فرمایا: ''تو کسی بے کس کی مدد کرو یا کسی بدسلیقہ کا کام کر دو۔'' پوچھا: اگر یہ بھی نہ بن سکے؟ فرمایا: ''شر سے لوگوں کو بچاؤ کہ یہ بھی صدقہ ہے جو تم اپنے آپ پر کر سکتے ہو۔'' [2]

کبھی آپ ﷺ یہ کرتے کہ لوگوں سے سوال کرتے، وہ جواب دینے کی طرف توجہ کرتے، آپ ﷺ ان کی اس توجہ کو مفید پا کر وہ جواب دیتے جو ان کے دل میں اتر جاتا، ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے آپ نے پوچھا: ''کہ تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟'' لوگوں نے عرض کی، ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ روپیہ ہو، نہ سامان ہو، فرمایا: ''میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت میں گو نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی نیکیاں لے کر آئے گا، لیکن اس نے اس کو گالی دی ہوگی، اس پر تہمت لگائی ہوگی، اس کا مال کھا گیا ہوگا، اس کا خون بہایا ہوگا، اس کو مارا ہوگا، تو اس کی نیکیوں میں سے کچھ کچھ ان لوگوں کو دے دیا جائے گا، اگر اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں اور اس کے ذمہ لوگوں کا کچھ باقی رہ گیا، تو ان کی برائیاں اس کے نام لکھ دی جائیں گی، پھر وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔'' [3]

مفلس کی یہ حقیقت کیسی اثر انگیز ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ آپ ﷺ نے یہ دریافت کیا کہ ''پہلوان تم کس کو کہتے ہو؟'' لوگوں نے کہا، جس کو لوگ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب: ٦١١٦ والترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی کثرة الغضب: ٢٠٢٠۔ [2] ادب المفرد للبخاری، باب ان کل معروف صدقة: ٢٢٥۔

[3] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم: ٦٥٧٩۔

کشتی میں پچھاڑ نہ سکیں، فرمایا: ''نہیں یہ پہلوان نہیں ہے، پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس پر قابو رکھے۔'' ❶

اس شخص کو جس کے بچے نہ جیتے ہوں، صبر کی تلقین کرنی تھی، تو دریافت فرمایا کہ ''بے اولاد تم کس کو کہتے ہو؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، جس کے بچہ نہ ہو، فرمایا: ''وہ بے اولاد نہیں، بے اولاد وہ ہے جس نے اپنے سے پہلے اپنی کوئی اولاد آگے نہیں بھیجی۔'' ❷ (احادیث میں ہے کہ جو بچے کمسنی میں مر جائیں اور ان کے والدین صبر کریں تو وہ قیامت میں ان کی شفاعت کریں گے) اس طریقہ ادا نے کس خوبی سے یہ دل میں بٹھا دیا کہ بے اولادی غم کی چیز نہیں، بلکہ اگر اس پر صبر کیا جائے تو وہ قیامت میں درجہ کی بلندی کا باعث ہوگی۔

ایک دفعہ کچھ لوگ بیٹھے تھے کہ آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ ''کیا میں تمھیں بتاؤں کہ تم میں سب سے اچھا کون اور برا کون ہے؟'' حاضرین چپ رہے، (شاید یہ سمجھے ہوں کہ آپ اس جماعت کے اچھے اور برے لوگوں کے نام لیں گے) آپ ﷺ نے دوسری بار یہی سوال کیا، پھر تیسری بار پوچھا، ایک شخص نے کہا، ہاں، یا رسول اللہ! فرمائیے، ارشاد ہوا: ''تم میں سب سے اچھا وہ ہے، جس سے اچھائی کی امید کی جائے اور جس کی برائی سے لوگ امن میں ہوں اور تم میں سب سے برا وہ ہے جس سے کسی اچھائی کی امید نہ کی جائے اور جس کی برائی سے کوئی امن میں نہ ہو''۔ ❸

ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مجھ سے کون یہ باتیں سیکھ کر ان پر عمل کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے کہ وہ ان پر عمل کریں۔'' ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا، میں اے اللہ کے رسول! ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، کہ آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، پھر پانچ باتیں گن کر فرمائیں: ''گناہوں سے پرہیز کرو تو تم سب سے بڑے عبادت گزار ہو جاؤ گے، اللہ نے جو تم کو دیا ہے اس پر راضی رہو، تو سب سے بڑھ کر دولت مند ہو جاؤ گے، اپنے پڑوسی کے ساتھ احسان کرو تو مومن بنو گے، لوگوں کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے اور زیادہ ہنسا نہ کرو کہ زیادہ ہنسنے سے دل مر جاتا ہے۔'' ❹ (یعنی دل کی صلاحیت جاتی رہتی ہے)

ایک دفعہ فرمایا: ''کون مجھ سے اپنے دو جبڑوں اور دونوں پاؤں کے بیچ کی حفاظت کی ضمانت کرتا ہے، میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا ہوں''۔ ❺ کون جانتا ہے کہ کتنے مسلمان اس ضمانت کے لیے اٹھے ہوں گے، ان دو فقروں کی بلاغت پر غور کرو، دونوں جبڑوں کے بیچ میں زبان ہے، جو ہر قسم کی قولی برائیوں کی جڑ ہے اور دونوں پاؤں کے بیچ میں انسان کی شرمگاہیں ہیں، جو ہر قسم کی بے حیائیوں اور بدکاریوں کی جگہ ہیں، ان دو کی حفاظت کی جائے تو انسان کی برائیوں کے بڑے حصہ کی اصلاح ہو جائے۔

ایک دفعہ فرمایا کہ ''کون مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے، میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا

❶ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل من يملك نفسه عند الغضب: ٦٦٤١۔ ❷ ایضاً۔
❸ ترمذی، کتاب الفتن، باب حدیث خیرکم من یرجی...... ٢٢٦٣ وباب فی خیار الأمراء وشرارهم: ٢٢٦٤۔
❹ جامع ترمذی، ابواب الزهد، باب من اتقى المحارم فهوا علم الناس: ٢٣٠٥۔
❺ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان: ٦٤٧٤۔

ہوں۔'' آپ ﷺ کے غلام ثوبان نے اٹھ کر کہا، میں اے اللہ کے رسول! فرمایا: ''کسی سے کچھ مانگا نہ کرو۔'' چنانچہ انھوں نے کبھی کسی سے سوال نہیں کیا۔ ❶

سب کو معلوم ہے کہ ارض حرم کے اندر اور وہ بھی حج کے دنوں میں کسی مسلمان کا خون بہانا کتنا بڑا گناہ ہو سکتا ہے، حجۃ الوداع میں آنحضرت منیٰ میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو دریافت فرمایا: ''لوگو! آج کونسا دن ہے؟'' لوگوں نے سمجھا کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھنا چاہتے ہیں، عرض کی، اللہ اور اللہ کے رسول کو زیادہ معلوم ہے، فرمایا: ''کیا یہ قربانی کا دن نہیں۔'' سب نے کہا: جی ہاں، پھر پوچھا: ''یہ کونسا مہینہ ہے۔'' پھر سب چپ رہے، سمجھے کہ آپ ﷺ اس کا نام کچھ اور بتائیں گے، فرمایا کہ ''کیا یہ ذی الحجہ نہیں۔'' سب نے کہا، جی ہاں، پھر فرمایا: ''یہ کونسا مقام ہے۔'' پھر سب خاموش رہے، کہ آپ ﷺ کوئی اور نام بتائیں گے، فرمایا کہ ''یہ بلد الحرام نہیں ہے۔'' سب نے کہا، جی ہاں، ان سوالوں سے جب سننے والوں کے دلوں میں اس دن اس مقام اور اس مہینہ کی حرمت اور عظمت بیٹھ گئی تو فرمایا: ''مسلمانوں کا خون، مسلمانوں کا مال اور مسلمانوں کی آبرو تمہارے لیے ایسی ہی محترم ہے جیسا یہ دن، اس مقام میں اور اس مہینہ میں۔'' ❷ کبھی خاص خاص صاحبوں کو ان کی مناسبت طبع دیکھ کر خاص خاص طور کی نصیحتیں فرماتے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ گویا فطرۃً تارکِ دنیا تھے، بڑے ہی زاہد و عابد تھے، ان کے ذوق طبع کو دیکھ کر ان سے فرمایا: ''اے ابوذر! جہاں رہو اللہ سے ڈرتے رہو، برائی کے پیچھے نیکی کرو تو تم اس کو مٹا ڈالو گے اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی سے ملا کرو۔'' ❸

لوگ عام طور سے سمجھتے ہیں کہ صدقہ اللہ کی راہ میں صرف روپیہ پیسہ دینے کا نام ہے، آنحضرت ﷺ کو لوگوں کی اس تنگ خیالی کو دور کرنا تھا، تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''تمہارا اپنے بھائی سے ملتے وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھٹکے ہوئے کو راہ بتا دینا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کو راستہ دکھانا بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر، ہڈی، یا کانٹا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول میں پانی انڈیل دینا بھی صدقہ ہے۔'' ❹

صدقہ کی جو اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں تھی اس کی بنا پر ان اخلاقی نیکیوں کو صدقہ بتا کر آنحضرت ﷺ نے اس طریقہ ادا سے ان نیکیوں کی، کتنی اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں بٹھا دی۔

کبھی آپ ﷺ مسلمانوں سے مختلف اخلاقی باتوں پر بیعت لیتے تھے، چنانچہ خود قرآن پاک میں ہے کہ ''جو عورتیں ایمان لانا چاہیں وہ بیعت میں رسول سے ان باتوں کا عہد کریں کہ وہ چوری نہ کریں گی، بدکاری نہ کریں گی، اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی، بہتان نہ باندھا کریں گی اور کسی بھلے کام میں رسول کی نافرمانی نہ کریں گی۔'' (٦٠/ الممتحنۃ: ١٢)

❶ مسند احمد، ج ٥، ص: ٢٧٥۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب الخطبۃ ایام منی: ١٧٤١، ١٧٤٢۔

❸ ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی معاشرۃ الناس: ١٩٨٧۔

❹ ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ما جاء فی صنائع المعروف: ١٩٥٦۔

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ہم سے ان باتوں پر بیعت لی کہ ''ہم ہر حالت میں رسول ﷺ کی پیروی کریں گے اور ہم ہر موقع پر اپنی زبان عدل وانصاف کے ساتھ ٹھیک رکھیں گے اور اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے''۔ [1]

یہی عبادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مکہ میں ہجرت سے پہلے جب انصار اسلام لائے اور ان میں چند آدمیوں کو چن کر آپ ﷺ نے نقیب بنایا تو ان میں سے ایک میں بھی تھا، آنحضرت ﷺ نے ہم نقیبوں سے ذیل کی باتوں پر بیعت لی: ''ہم اللہ کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے، بدکاری نہ کریں گے، چوری نہ کریں گے اور ناحق کسی کی جان نہ لیں گے، لوٹ مار نہیں کریں گے اور نافرمانی نہ کریں گے، اگر ہم اس بیعت کو اپنی عملی زندگی میں پورا کر دکھائیں گے تو ہمیں جنت ملے گی اور اگر اس میں کمی کی تو اس کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے۔'' [2] اللہ جانتا ہے کہ ان خوش نصیبوں نے اپنے اس وعدہ کو کس کس طرح خوبی سے پورا کیا ہوگا۔

بعض دفعہ حضور ﷺ ایک سوال کرتے تھے، سوال سن کر لوگ متوجہ ہو جاتے تھے، مگر اس سے پہلے کہ لوگ جواب دیں، خود ہی جواب دے دیتے تھے، دریافت فرمایا کہ ''افترا کس کو کہتے ہیں؟ پھر خود ہی فرمایا: ''وہ چغلی ہے، لوگوں کے درمیان بات کو ادھر سے ادھر پہنچانا۔'' [3] ایک بار ارشاد ہوا کہ ''تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں۔'' لوگوں نے جواب دیا اللہ اور اس کا رسول جانتا ہے، فرمایا: ''تم اپنے بھائی کو اس طرح یاد کرو کہ وہ اس کو ناپسند ہو۔'' کسی نے کہا، اگر میرے بھائی میں وہ برائی واقعی موجود ہو تو، فرمایا: ''اگر اس میں ہے تب ہی تو وہ غیبت ہے، ورنہ پھر وہ بہتان ہے۔'' [4] ایک موقع پر ارشاد ہوا: ''میں تمھیں بتاؤں کہ جنت والے کون ہیں؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، ہاں یارسول اللہ! فرمایا: ''ہر کمزور نرم دل جس کو لوگ حقیر جانیں یا جو متواضع ہو، (لیکن جس کی ایمانی قوت ایسی ہو کہ) اگر وہ اللہ کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ اس کی قسم پوری کر دے۔'' پھر فرمایا: ''کیا میں تمھیں بتاؤں کہ دوزخ والے کون ہیں؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، ہاں یارسول اللہ ﷺ! فرمایا: ''ہر درشت مزاج، شیخی خور، مغرور۔'' [5]

کبھی آنحضرت ﷺ آپ ہی آپ کوئی سوال کرتے اور اس کو بار بار دہراتے، حاضرین اس بار بار کی تکرار سے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ کر لیتے اور مشتاق ہو کر پوچھتے کہ یارسول اللہ! یہ کیا بات ہے، اس وقت آپ ﷺ جواب ارشاد فرماتے جس کا اثر ان کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا، ایک دفعہ خود سے فرمایا: ''اللہ کی قسم! وہ صاحب ایمان نہ ہوا، اللہ کی قسم! وہ صاحب ایمان نہ ہوا، اللہ کی قسم! وہ صاحب ایمان نہ ہوا۔''

---

[1] مسند احمد بن حنبل، ج۵، ص: ۳۱۸۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الدیات: ۶۸۷۳۔

[3] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم النمیمة: ۶۶۳۶۔

[4] ایضًا، باب تحریم الغیبة: ۶۵۹۳۔

[5] صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب النار یدخلها الجبارون......: ۷۱۸۷۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے مشتاقانہ پوچھا، کون یارسول اللہ! فرمایا: ''جس کا پڑوسی اس کی برائیوں سے امن میں نہ ہوا۔'' [1]

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: ''دین داری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہم نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! کس کے ساتھ، فرمایا: ''اللہ کے ساتھ، اس کی کتاب کے ساتھ، اس کے رسول کے ساتھ، مسلمانوں کے سرداروں کے ساتھ اور عام مسلمانوں کے ساتھ''۔ [2]

اخلاقی تعلیمات کی قسمیں

اسلام کے اصول اخلاق کی اس تفصیل اور تشریح کے بعد یہ موقع آیا ہے کہ اس کے ان اخلاقی تعلیمات کا استقصا کیا جائے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے عالم کائنات کو ملیں، ان اخلاقی تعلیمات کو اسلام نے تین حصوں میں تقسیم کردیا ہے، حقوق، فضائل ورذائل اور آداب۔

اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے کچھ فرائض عائد ہیں اور یہ ان کے حقوق ہیں جنہیں ہر انسان کو اپنے امکان بھر ادا کرنا ضروری ہے، یہ حقوق اور فرائض اسلامی اخلاق کی پہلی قسم ہیں۔

دوسری چیز انسان کے ذاتی چال چلن اور کردار کی اچھائی اور بلندی ہے، اس کا نام فضائلِ اخلاق اور اس کے مقابل کا نام رذائل ہے، مثلاً: سچ بولنا، اخلاقی فضائل اور جھوٹ بولنا رذائل میں سے ہے۔

تیسری قسم، کاموں کو اچھے اور عمدہ طریقہ سے بجالانا ہے، اس کو آداب کہتے ہیں، مثلاً: اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا طور وطریق۔ ذیل میں اسلامی اخلاق کی ان تینوں قسموں کی الگ الگ تفصیل درج ہوتی ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب اثم من لا یأمن جارہ بوائقہ:٦٠١٦؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان تحریم إیذا الجار:١٧٢ میں ((لا یدخل الجنة من لا یأمن جاره بوائقه)) کے الفاظ ہیں۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان أن الدین النصیحة:١٩٦۔

حقوق وفرائض

حقوق کے معنی

حقوق کی مجمل تشریح تو اوپر ہو چکی ،لیکن اس موقع پر ضرورت ہے کہ اس کی مزید تفصیل کر دی جائے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

﴿ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ (۲/ البقرة: ۲۹)

''اللہ نے تمہارے (کام کے) لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔''

اس لیے انسان کو دنیا کی ہر اس چیز سے جس سے اس کے نفع کا تعلق ہے، ایک گونہ لگاؤ ہے، اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی وحفاظت میں کوشش کی جائے ، اس شے سے وہ نفع اٹھایا جائے جس کے لیے اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے اور ان موقعوں پر اس کو صرف کیا جائے جن میں اللہ نے اس کے صرف کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو ہر اس پہلو سے بچایا جائے جس سے اس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچے، اسی ذمہ داری کا نام حق ہے، جس کو از خود ادا کرنا ضروری ہے، ارشاد ہوا:

﴿ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ ﴾ (۵۱/ الذاریات: ۱۹)

''اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔''

﴿ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ ﴾ (۷۰/ المعارج: ۲۴-۲۵)

''اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا مقررہ حق ہے، جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔''

﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۲۶)

''اور قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔''

﴿ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ؕ ﴾ (۳۰/ الروم: ۳۸)

''تو قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔''

اللہ تعالیٰ نے جب کسی انسان کو دولت عطا فرمائی ہے، تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جن کو یہ چیز نہیں ملی ہے، ان کو اس میں سے تھوڑا تھوڑا دیا جائے ، یہ ان کا حق ہے اور اس میں سب سے مقدم رشتہ دار ہیں، پھر غریب، مسافر، ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت مال کی طرف کی ہے:

﴿ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ ﴾ (۶/ الانعام: ۱۴۲)

''اور پیداوار کا حق اس کے کاٹنے کے دن ادا کرو اور فضول خرچی نہ کرو۔''

یعنی جب کسی کو اللہ تعالیٰ نے زمین کا کوئی حصہ عنایت کیا اور اس نے اس میں کچھ بویا اور اللہ نے اس میں برکت دی اور پھل پھول نکلے اور ہری بھری کھیتی تیار ہوئی تو انسان کا فرض ہوا کہ اس کا حق ادا کرے اور

اس میں سے ان کو بھی کچھ دے، جن کو یہ نعمت نہیں ملی اور اس نعمت کو بے موقع خرچ نہ کرے اور ضائع نہ کرے کہ یہ بھی اس کے حق کے منافی ہے اور اس کی نفع رسانی کے ضروری موقع ومحل کو نقصان پہنچاتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے:

((ان لزوجك عليك حقا و لزورك عليك حقا)) ❶

''تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق اور تیرے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔''

((و لأهلك عليك حقا)) ❷

''تیری بیوی بچوں کا تجھ پر حق ہے۔''

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ ''بیوی کا حق شوہر پر یہ ہے کہ وہ اس کو کھانا کھلائے، کپڑے پہنائے اور اس کے چہرہ پر تھپڑ نہ مارے۔'' ❸ ان احکام سے معلوم ہوا کہ ہر انسان پر دوسرے انسان کے کچھ حقوق ہیں، بلکہ ہر انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے، اس کے ایک ایک عضو کا اس کے اوپر حق ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((فان لنفسك عليك حقًا)) ❹

''بیشک تیری جان کا تجھ پر حق ہے۔''

((فان لجسدك عليك حقًا ولعينيك عليك حقًا)) ❺

''تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔''

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں حقوق کی وسعت اس سے بہت زیادہ ہے، جتنی عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔

حقوق کی وسعت

جب انسان کا تعلق کائنات ارضی کی ایک ایک چیز سے ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی اس کی ہر چیز سے متعلق ہے، جمادات سے بھی کہ ان کو بے موقع نہ صرف کیا جائے، نباتات سے بھی کہ ان کو نشوونما اور تربیت کا موقع دیا جائے، حیوانات سے بھی کہ ان کو بے سبب تکلیف نہ پہنچائی جائے اور ان کے آرام و آسائش کا خیال کیا جائے اور انسانوں سے بھی کہ ان کی ہر ضرورت میں مدد کی جائے اور ان کے فریضہ محبت کو ادا کیا جائے اور خود انسان کا اپنے اوپر بھی حق ہے کہ اسکا ہر عضو جس غرض کیلئے پیدا کیا گیا ہے اس سے مناسب طور سے وہ کام لے۔

❶ صحيح بخاري، كتاب الصوم، باب حق الجسم في الصوم: ١٩٧٥۔ ❷ صحيح بخاري، كتاب الصوم، باب حق الاهل في الصوم: ١٩٧٧۔ ❸ ابوداود، كتاب النكاح، باب في حق المرأة على زوجها: ٢١٤٢۔ ❹ صحيح بخاري، كتاب التهجد: ١١٥٣۔

❺ صحيح بخاري، كتاب الصوم، باب حق الجسم في الصوم: ١٩٧٥۔

غرض اسلام نے ان حقوق کو تمام کائنات میں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس کا دائرہ محیط اعظم بن کر پھر آہستہ آہستہ سمٹتا ہوا بتدریج کم ہوتا ہوا مرکز پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ انسانیت کے باہمی حقوق تو بہت کچھ ظاہر ہیں، لیکن انسان کے علاوہ اس کائناتِ ارضی کی دوسری بے جان اور جاندار چیزوں کے حقوق کی طرف تھوڑا سا مزید اشارہ، توضیحِ مقصد کے لیے مفید ہے۔

انسان کے علاوہ دوسری جان دار اور بے جان چیزوں کے دو حق انسان پر ہیں، ایک یہ کہ جس غرض اور منفعت کے لیے وہ پیدا کی گئی ہیں، ان سے وہی کام لیا جائے، دوسرا یہ کہ ان کے قدرتی نشوونما، پرورش اور ترقی میں وہ رکاوٹ نہ پیدا کرے، بلکہ اس کے مناسب اسباب فراہم کرے اور اس کے مناسب غذا، سیرابی اور آرام کی فکر رکھے، یہ دونوں حقوق اصل میں قرآن پاک کی اسی حقیقت کے کہ

﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ (۲/ البقرۃ:۲۹)

''زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ نے تمہارے (یعنی انسانوں کے) لیے پیدا کیا۔''

کے صریح نتیجے ہیں، کہ جب انسان کیلئے یہ سب چیزیں پیدا ہوئیں، تو انسان کا فرض ہے کہ ان سے وہی کام لے جس کیلئے وہ بنائی گئیں اور اس لیے، تاکہ وہ وقتِ مقررہ تک انسانوں کو اپنا نفع پہنچا سکیں، ان کی پرورش و ترقی کے قدرتی اسباب کو مہیا کرنا ان پر ضروری قرار دیا گیا۔

آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے مجمع میں ایک تمثیلی حکایت میں اس نکتہ کو واضح کیا ہے، فرمایا کہ ''ایک دفعہ ایک آدمی بیل پر سوار جا رہا تھا کہ دفعتہً اس نے منہ پھیر کر سوار سے کہا کہ میں تو اس کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہوں، میں تو کھیتی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔'' ❶ اور اسی لیے درخت لگانا ثواب کا کام کہا گیا اور فرمایا گیا: ''جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے، تو جو پرندے یا جانور یا انسان اس کا پھل کھاتے ہیں، اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملتا ہے۔'' ❷ اسی سبب سے پھلدار درخت کو بے سبب کاٹنا ناپسندیدہ ہے۔ ❸ ایک اور تمثیلی حکایت میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک شخص صرف اس لیے بخشا گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی ❹ اور ایک اور شخص پر صرف اس لیے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھا اور اس کو کھانے پینے کو نہیں دیا یہاں تک کہ وہ اسی طرح سسک سسک کر مر گئی، ❺ ایک اور شخص نے چیونٹی کو جلا دیا تھا، اس پر اس سے باز پرس ہوئی۔'' ❻

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الحرث والمزارعة، باب استعمال البقر للحراثة: ۲۳۲۴۔

❷ صحیح بخاری، باب فضل الزرع والغرس: ۲۳۲۰ ومسلم کتاب المساقاة: ۳۹۶۸ تا ۳۹۷۳۔

❸ فتح الباری شرح صحیح البخاری، شرح باب مذکور، جلد خامس، ص: ۷ مصر۔

❹ صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب الآبار علی الطریق: ۲۴۶۶۔

❺ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا وقع الذباب فی : ۳۳۱۸۔ ❻ ایضًا: ۳۳۱۹۔

یہ چند اشارات اس موقع پر اس لیے بھی بیان کیے گئے ہیں، تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا دائرہ کتنا وسیع ہے، وہ صرف انسانوں تک نہیں بلکہ تمام جاندار اور بے جان چیزوں تک پھیلا ہوا ہے، جن کی تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

حقوق کی ترتیب

مگر ان تمام حقوق کی ادائیگی میں اسلام نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے، جس کی تفصیل ذیل میں ہے۔

اگر ہم اسلام کے تمام اخلاقی فرائض اور تعلیمات کو صرف ایک لفظ سے ادا کرنا چاہیں تو توراۃ وانجیل کی طرح مختصر یوں کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں سے محبت کرنا لیکن صرف ''محبت کرنا'' کہہ دینا کافی نہیں، بلکہ ان چیزوں کی تفصیل کرنی چاہیے، جو اس محبت کا تقاضا اور اس کے مظاہر ہیں، یہی تفصیل وتکمیل اسلام کی اخلاقی تعلیم کا کارنامہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ایمان کا کمال یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے لیے بھی وہی محبوب رکھو جو اپنے لیے رکھتے ہو''۔ [1] اس سے معلوم ہوا کہ جسم و جان اور مال وملکیت کے وہ تمام معاملات جو انسان اپنے جسم و جان اور مال وملکیت کے لیے چاہتا اور پسند کرتا ہے وہی دوسروں کے لیے چاہنا اور پسند کرنا توراۃ و انجیل کی طرح اسلام کی اخلاقی تعلیم کا بھی سرعنوان ہے، لیکن اسلام میں یہ سرِ عنوان تشریح کا محتاج ہے اور اس تشریح کے ضمن میں انسانی تعلیمات کی تدریجی ترتیب کی بحث آجاتی ہے، جس کو اسلام نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے اور ان فرائض کو ہر انسان کے تعلقات کی کمی بیشی اور دوری ونزدیکی کی تدریج اور ترتیب کے ساتھ متعین اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کر دیا ہے، مثلاً: ایک حیوان کے مقابلہ میں ایک انسان کی مدد، ایک اجنبی شخص کے مقابلہ میں ایک دوست کی، غیروں اور بیگانوں کے مقابلہ میں ایک عزیز کی اور ان عزیزوں میں بھی قرابت کی دوری ونزدیکی کی ترتیب اسی طرح رکھی گئی ہے، مگر یہ ترتیبی امداد حق کے ساتھ ہے، اگر کوئی عزیز سے عزیز بھی باطل پر ہو، تو اس کے مقابلہ میں اس غیر و بیگانہ کی امداد جو حق پر ہے، فرض ہے، کہ جو مدد محض قرابت اور عزیز داری کی بنا پر باطل پر کی جاتی ہے، اس کا نام اسلام کی اصطلاح میں عصبیت (تعصب) ہے، جس سے بچنے کی ہر [2] مسلمان کو تاکید کی گئی ہے۔

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں انسانی حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہیں ہے، انسان اور حیوان کے درمیان بھی خط فاصل نہیں قائم کیا گیا ہے، مثلاً: بودھ کی اخلاقی تعلیمات میں انسان وحیوان کے اور پھر انسانوں میں اہل ملک، قوم، قبیلہ اور خاندان کی کوئی تمیز نہیں، بلکہ سرے سے رشتہ اور قرابت ہی کی اس میں کوئی دفعہ نظر نہیں آتی، اسی طرح ہندو قانون میں ایک جانور اور ایک انسان کا قتل برابر درجہ رکھتا ہے اور ایک جانور بھی اپنی کسی منفعت رسانی کے باعث انسان کی ماں کا درجہ پاسکتا ہے، یہودیت اور عیسائیت میں تمام

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان......: ١٣؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان: ١٧٠، ١٧١۔

[2] سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی العصبیة: ٥١٢١۔

قرابت داروں کو چھوڑ کر صرف ماں باپ کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے برترانہ حق اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن دوسرے قرابت مندوں اور رشتہ داروں کو ان میں کوئی مرتبہ نہیں دیا گیا ہے، لیکن اسلام نے اس مسئلہ میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے۔ اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ ترتیب میں جس کا درجہ بڑھ کر ہے، اس کے ساتھ تعلقات کی وابستگی دوہری تہری ہو جاتی ہے، مثلاً: ایک شخص جو ایک وقت میں ایک ہی کی مدد کر سکتا ہے، اس کی ایک غریب بیمار ماں ہے، ایک غریب اور بیمار باپ ہے، ایک غریب اور بیمار بھائی ہے، ایک اسی طرح کا اس کا پڑوسی ہے، پھر اسی حالت میں اس کا ہم محلہ دار بھی ہے اور اسی حالت میں اس کا کوئی ہم وطن بھی ہے، تو اس کو کس کی مدد کرنی چاہیے، یہی وہ موقع ہے جس میں تدریجی تعلقات کی ترتیب کا سوال پیش آتا ہے، ظاہر ہے کہ تعلقات کے دوہرے تہرے حقوق پہلے ماں کے ہیں، پھر باپ کے ہیں، پھر بھائی کے ہیں، پھر پڑوسی کے ہیں، پھر ہم وطن کے ہیں اور اسی ترتیب سے اس کا ادا کرنا بھی ضروری ہے، یہ نیکی نہ ہوگی کہ اپنی غریب اور بیمار ماں کو چھوڑ کر کوئی اپنے غریب اور بیمار پڑوسی کی خدمت کے لیے آمادہ ہو جائے، یہ ایثار نہیں بلکہ ظلم ہے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے اوپر مزید مزاحمت گوارہ کر کے، دونوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہو، اگر ایسا وہ نہ کر سکے تو اخلاقاً اس کو معذور سمجھا جائے گا، شریعتِ محمدی ﷺ نے اسی فطری ترتیب کو ان آیتوں میں پیش کیا ہے:

﴿ وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ﴾ (٤/ النسآء: ٣٦)

''اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اور رشتہ داروں پڑوسی کے ساتھ اور بے گانہ پڑوسی کے ساتھ اور ساتھی کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور لونڈی، غلام کے ساتھ۔''

﴿ قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ ﴾ (٢/ البقرة: ٢١٥)

''اے پیغمبر ﷺ ان سے کہہ دو کہ تم جو خرچ کرو، وہ اپنے ماں باپ اور عزیزوں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافر کے لیے اور جو بھی نیکی کا کام تم کرو، اللہ اس سے آگاہ ہے۔''

﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ ﴾ (١٧/ بنی اسرآئیل: ٢٦)

''اور رشتہ دار کا حق ادا کرو اور مسکین کا اور مسافر کا اور فضول خرچی نہ کرو۔''

عام طور سے اکثر مذہبوں نے سب سے زیادہ اہمیت ماں باپ کو دی ہے اور اسلام میں بھی یہ اہمیت یہی درجہ رکھتی ہے مگر اس کی تکمیلی شان اس باب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح تعلیمات کے دوسرے ابواب ہیں۔

والدین کا حق

والدین یعنی ماں باپ کی عزت، خدمت اور اطاعت، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں یکساں ضروری قرار دی گئی ہے، بلکہ تینوں میں ان کا درجہ خدا کے بعد انسانی رشتوں میں سب سے بڑا بتایا گیا ہے اور خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے تورات میں توحید کی تعلیم کے بعد ہے:

''تو اپنے ماں باپ کو عزت دے، تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے، دراز ہو۔'' (خروج ۲۰۔۱۲)

پھر دوسری جگہ ہے:

''تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے۔'' (احبار ۱۹۔۳)

انتہا یہ ہے کہ تورات نے قانوناً یہ حکم نافذ کیا کہ

''اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کرے مار ڈالا جائے گا، اس نے اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کی ہے اس کا خون اسی پر ہے۔'' (احبار ۲۰۔۹)

''اور وہ جو اپنے ماں باپ پر لعنت کرے مار ڈالا جائے گا۔'' (خروج ۲۱۔۷)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل میں انہی احکام کو دہرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ان احکام کی صرف لفظی تعلیم نہ کی جائے، بلکہ ان کے روح و معنی کا خیال کیا جائے، فرمایا:

''کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں یا باپ پر لعنت کرے، جان سے مارا جائے پر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجھ کو دینا واجب ہے سو خدا کی نذر رہوا اور اپنے ماں باپ یا ان کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں، پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کیا۔'' [1]

نبوتِ محمدی ﷺ جس کی بعثت ہی اخلاق کی تکمیل کے لیے ہوئی ہے اس نے تورات و انجیل کی طرح نہ صرف والدین کی عزت اور ان سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی بلکہ اس مسئلہ کے ہر گوشہ کی تفصیل کی اور ہر ممکن سوال کا تشفی بخش جواب دیا۔

① اس نے سب سے پہلے ماں اور باپ کی مشترکہ حیثیت کی بھی تفصیل کی اور بتایا کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے، عورت کی فطری کمزوری، بیچارگی اور حمل، وضعِ حمل اور تربیتِ اولاد کی تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا، ماں کی بڑائی اس کی سب سے پہلے دل دہی کرنے اور اس کی فرمانبرداری کرنے کی

[1] اسکے علاوہ انجیل کے دوسرے ابواب اور صحیفوں میں تورات کے الفاظ کا بعینہ اعادہ ہے مثلاً: متی ۱۹۔۱۹ مرقس ۷۔۱۰،۱۰۔۱۹ لوقا ۱۸۔۲۰۔

سب سے بڑی دلیل ہے:

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ ﴾

(۳۱/ لقمان:۱٤)

''اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے واسطے تاکید کی، اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر اپنے پیٹ میں رکھا اور دو برس تک دودھ پلایا۔''

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ ﴾ (٤٦/ الاحقاف:١٥)

''اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ نیکی کرے، اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ جنا، پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا، پیٹ میں رکھنا اور دودھ پلا کر چھڑانا تیس مہینے ہیں۔''

آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشادات میں اس کی مزید تاکید کی، ایک شخص نے خدمت اقدس میں آ کر دریافت کیا کہ یارسول اللہ! سب سے زیادہ میرے حسنِ سلوک کا مستحق کون ہے؟ فرمایا: ''تیری ماں۔'' پوچھا، پھر کون؟ فرمایا: ''تیری ماں۔'' اس نے عرض کی، پھر کون؟ فرمایا: ''تیری ماں۔'' تین دفعہ آپ ﷺ نے یہی جواب دیا، چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہوا: ''تیرا باپ۔'' ❶ ایک دن آنحضرت ﷺ نے چار بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سرِ فہرست ماں کی نافرمانی کو قرار دیا اور فرمایا: ''تمہارے خدا نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے۔'' ❷ ایک دفعہ ایک شخص نے آ کر عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے، کیا میرے لیے کوئی توبہ ہے؟ فرمایا: ''کیا تیری ماں زندہ ہے؟'' جواب دیا نہیں۔ دریافت کیا: ''خالہ ہے؟'' گزارش کی، ہے، فرمایا: ''تو اس پر نیکی کر۔'' ❸ یہی اس کی توبہ بتائی۔ ایک اور صحابی نے دریافت کیا، یارسول اللہ ﷺ! میں نے جہاد میں شرکت کا ارادہ کیا ہے اور آپ ﷺ سے مشورہ چاہتا ہوں، فرمایا: ''کیا تمہاری ماں ہے؟'' جواب اثبات میں دیا۔ فرمایا: ''تم اسی کے ساتھ چمٹے رہو کہ جنت اس کے پاؤں کے پاس ہے۔'' ❹

ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم میں مخلوقات انسانی میں جنسِ لطیف کی ہی ایک صنف کو سب سے بڑی برتری حاصل ہے اور یہ برتری بالکل فطری ہے۔ انسان سب سے زیادہ اپنے وجود میں جن کا ممنون ہے اور جو اس کی تخلیق کی مادی علت ہیں، وہ خالق اکبر کی علت فاعلہ ذات کے بعد ماں

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من احق الناس بحسن الصحبة:٥٩٧١۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب عقوق الوالدین من الکبائر: ٥٩٧٥۔ ❸ جامع ترمذی، کتاب البر والصلة، باب فی بر الخالة: ١٩٠٤۔ ❹ سنن النسائی، کتاب الجهاد، باب الرخصة فی التخلف لمن له والدة:٣١٠٦؛ ابن ماجه، ابواب الجهاد، باب الرجل یغزو وله أبوان:٢٧٨١؛ ترغیب وترهیب منذری، ج ٢، ص: ١٢٤۔

اور باپ ہیں، لیکن باپ کی مادی علت چند لمحوں اور چند قطروں سے زیادہ نہیں، مگر ماں وہ ہستی ہے، جس نے اس کی ہستی کو اپنا خون پلا پلا کر بڑھایا اور نو مہینے تک اس کی مشکل سہہ کر اور سختی اٹھا کر اپنے پیٹ میں رکھا، پھر اس کے جننے کی ناقابل برداشت تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کیا، پھر اس نو پیدا مضغۂ گوشت کو اپنی چھاتیوں سے لگا کر اپنا خون پانی کر کے پلایا اور اس کی پرورش اور غور پرداخت میں اپنی ہر راحت قربان، اپنا ہر ایمان ترک اور اپنی ہر خوشی نثار کر دی۔ ایسی حالت میں کیا ماں سے بڑھ کر انسان اپنے وجود میں مخلوقات میں کسی اور کا محتاج ہے؟ اس لیے شریعتِ محمدی ﷺ نے اپنی تعلیم میں جو بلند سے بلند مرتبہ اس کو عنایت کیا ہے، وہ اس کی سزاوار ہے۔

② ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی بچہ کی تولید و تکوین میں شریک ہے، وہ باپ ہے اور شک نہیں کہ اس کی نشو ونما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی و مالی کوششیں شامل ہیں، اس لیے جب بچہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچتا ہے، تو اس پر فرض ہے کہ اپنی ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے، چنانچہ اسلام نے نہ صرف پہلے صحیفوں کی طرح ان کی ''عزت'' کرنے اور ان سے ڈرتے رہنے کے وعظ پر اکتفا کی، بلکہ ان کی خدمت، ان کی اطاعت، ان کی امداد اور ان کی دلدہی، ہر چیز پر فرض قرار دی، بلکہ یہاں تک تاکید کی کہ ان کی کسی بات پر اف تک نہ کرو، ان کے سامنے ادب سے جھکے رہو، ان کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو، انہی کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے، بلکہ انہی کی خوشنودی سے خدا کی خوشنودی ہے۔ قرآن پاک میں والدین کے ساتھ حسن سلوک، نیکی اور خدمت کی تاکید بارہ مختلف آیتوں میں نازل ہوئی ہے اور اکثر موقعوں پر، تعلیم، توحید اور خدا پرستی کی تعلیم کے بعد ہی آئی ہے کہ پہلی تخلیق انسانی کی علتِ فاعلی اور دوسری علت مادی ہے، سب سے پہلی آیت سورۂ بقرہ میں ہے جس میں تورات کے حکم کی طرف بھی اشارہ ہے، فرمایا:

﴿ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَاءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ﴾

(۲/ البقرۃ:۸۳)

''اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم نہ پوجو گے مگر اللہ کو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔''

یہ آیت پاک گو اس حکم کا اعادہ ہے جو توراۃ کی آیتوں میں ہے، لیکن یہاں توراۃ کی طرح صرف ماں باپ کی عزت اور ڈر کے محدود لفظ نہیں بلکہ ''نیکی کرنے'' کا وسیع المعنی لفظ رکھا گیا ہے، جس سے تعلیم کے مفہوم میں بڑی وسعت آگئی ہے اور ہر قسم کی خدمت اطاعت اور عزم کا مفہوم اس کے اندر پیدا ہے۔ اسی صورت میں دوسری جگہ والدین کی مالی خدمت اور امداد کی نصیحت ہے:

﴿ قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱۵)

''فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو، وہ ماں باپ اور رشتہ داروں (وغیرہ) کے لئے۔''

سورۂ نساء میں توحید کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد ہی والدین کے ساتھ بھلائی کی تاکید کی جاتی ہے:

﴿ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ﴾ (٤/ النسآء:٣٦)

''اور اللہ کو پوجو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔''

کفار کو جنہوں نے اپنے وہم وخیال اور رسم ورواج سے حلال وحرام کی ہزاروں رسمیں اور خیالی باتیں پیدا کر لی تھیں، اللہ تعالیٰ خطاب کر کے فرماتا ہے کہ یہ کھانے پینے کی چیزیں حرام نہیں، آؤ ہم بتائیں کہ حقیقت میں حرام چیزیں کیا ہیں، خدا کے ساتھ شرک نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش آنا:

﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ﴾

(٦/ الانعام:١٥١)

''کہہ (اے پیغمبر ﷺ!) آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔''

معراج کے احکام دوازدہ گانہ میں خدا کی توحید کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم اس اہتمام کے ساتھ دی جاتی ہے کہ ان کے سامنے اف بھی نہ کرو، عاجزی سے پیش آؤ، ان کے حق میں دعائے خیر کرو اور بڑھاپے میں ان کی خدمت کرو، فرمایا:

﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝ ﴾

(١٧/ بنیٓ اسرآئیل: ٢٣-٢٤)

''اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا، اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، تو ان کو اف بھی نہ کہو اور نہ ان پر خفا ہو اور ان سے ادب سے بولو۔ اور ان کے لیے اطاعت کا بازو محبت سے جھکاؤ اور کہو کہ اے میرے پروردگار! تو ان پر رحمت فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا۔''

اللہ اللہ! کس ادب اور محبت کی تعلیم ہے۔

خدا کی دائمی اور غیر متبدل شریعت میں شرک سے زیادہ بری چیز کوئی نہیں قرار دی گئی، اس پر بھی اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہوں تو اس حالت میں بھی ان کی خدمت سے ہاتھ اٹھانا روا نہیں، بجز اس کے کہ اگر وہ شرک کی دعوت دیں تو ان کی اس بات کو قبول نہ کیا جائے۔ ارشاد ہوا:

﴿ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ؕ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ ﴾ (۲۹/ العنکبوت:۸)

''اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور اگر وہ تجھ کو مجبور کریں کہ خدا کے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھ کو علم نہیں تو ان کا کہا نہ مان، تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے، تو میں تم کو تمہارے کرتوت سے آگاہ کروں گا۔''

اتنا ہی نہیں، بلکہ اگر تمہارے بت پرست ماں باپ تم کو بت پرستی کی دعوت دیں تو صرف ان کی دعوت کو قبول نہ کرو، لیکن ان کی دنیاوی خدمت اور حسنِ سلوک میں کوئی فرق نہ آنے پائے، بلکہ وہ اس حالت میں بھی اپنی جگہ پر قائم رہے فرمایا:

﴿ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ۝ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ﴾ (۳۱/ لقمان:۱۴۔۱۵)

''اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کر اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑایا، کہ میرا اور اپنے ماں باپ کا احسان مانے، میرے ہی پاس پھر آنا ہے، اگر وہ دونوں اس پر تجھ کو مجبور کریں کہ میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کو تو نہیں جانتا تو ان کا یہ کہنا نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی سے گزران کر۔''

اس اہتمام کو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی احسان مندی کا ذکر خود اپنی احسان پذیری کے ساتھ کرتا ہے، اور اس شرک پرستی کی دعوت اور اس دعوت کے قبول پر اولاد کو بزور مجبور کرنے کے باوجود صرف اسی قدر کہا جاتا ہے کہ مذہب کے باب میں ان کی بات اولاد نہ مانے، مگر دوسری باتوں میں ان کا ادب، ان کی اطاعت اور ان کی خدمت کا وہی عالم رہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھئے کہ باوجود اس کے کہ ان کا باپ مسلمان نہ تھا مگر اپنے وعدہ کی بنا پر خدا سے دعا مانگی جس سے غالباً ان کی دعا سے مراد یہ ہوگی کہ وہ ایمان لا کر حسنِ خاتمہ پر مرے:

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ ﴾ (۱۴/ ابراھیم:۴۱)

''اے میرے پروردگار! مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔''

حضرت نوح علیہ السلام نے بھی یہی دعا کی:

﴿ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ ﴾ (۷۱/ نوح:۲۸)

''میرے پروردگار! مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔''

اس لیے والدین کے حسن خاتمہ اور مغفرت کی دعا مانگنا انبیا علیہم السلام کی پیروی ہے، آخری بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو والدین کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں ان کی خدمت بجا لاتے ہیں اور ان کے لیے خدا سے دعائے خیر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس نیکی کے بدلہ میں ان کے سارے گناہ معاف کر دیتا اور اپنی خوشنودی کی لازوال دولت ان کو عطا فرماتا ہے:

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي ۖ إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٥﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَن سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ ۖ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿١٦﴾ ﴾

(٤٦/ الاحقاف:١٥۔١٦)

''اور ہم نے انسان کو تاکید کر کے کہہ دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اس کی ماں نے اس کو تکلیف کر کے پیٹ میں اٹھایا اور تکلیف کر کے جنا اور تیس مہینوں تک اس کو پیٹ میں رکھنا اور دودھ چھڑانا، یہاں تک کہ وہ بچہ سے بڑھ کر جوان ہوا اور چالیس برس کا ہوا، اس نے کہا کہ میرے پروردگار! مجھ کو توفیق دے کہ تیرے اس احسان کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر میرے ماں باپ پر کیا اور اس کی کہ میں وہ کام کروں جس کو تو پسند کرے اور میری اولاد نیک کر، میں تیری طرف لوٹ کر آیا اور میں تیرے فرمانبرداروں میں ہوں، یہی وہ ہیں جن کے اچھے کام ہم قبول اور ان کے برے کاموں سے درگزر کرتے ہیں، یہ جنت والوں میں ہوں گے، یہ سچائی کا وہ عہد ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا۔''

ان آیتوں نے والدین اور خصوصاً ماں کی خدمت واطاعت ورضامندی کو وہ پانی بتایا ہے جس سے گناہوں کی فرد دھل کر صاف ہو جاتی ہے، احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے اسی منشائے الٰہی کو مختلف عبارتوں اور طریقوں میں ادا فرمایا ہے، کہیں فرمایا ہے کہ ''ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔'' [1] کبھی ارشاد ہوا: ''رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے۔'' [2] کسی نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ! میرے حسن معاشرت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا: ''تیری ماں۔'' دریافت کیا، پھر کون؟ فرمایا: ''تیری ماں۔'' عرض کی، پھر کون؟ فرمایا: ''تیری ماں۔'' گزارش کی، پھر کون؟ چوتھی بار فرمایا: ''تیرا باپ اور اس کے

[1] نسائی، کتاب الجهاد، باب الرخصة فی التخلف لمن له والدة:٣١٠٦؛ مسند امام أحمد، ج٣، ص: ٤٢٩۔

[2] جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء من الفضل فی رضا الوالدین:١٨٩٩۔

بعد جو اس سے قریب ہے، پھر جو اس سے قریب ہے۔'' ❶ ایک دفعہ حضور انور ﷺ مجلس قدس میں تشریف فرما تھے، جان نثار حاضر تھے فرمایا: ''وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا۔'' صحابہ نے پوچھا، کون؟ یا رسول اللہ ﷺ! ارشاد ہوا: ''وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت حاصل کر لی۔'' ❷ ایک اور مجلس میں صحابہ نے دریافت کیا کہ تمام کاموں میں خدا کو ہمارا کون سا کام زیادہ پسند آتا ہے، فرمایا: ''وقت پر نماز پڑھنا۔'' عرض کی، پھر کون سا؟ ارشاد ہوا: ''ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔'' دریافت کیا، پھر کون؟ فرمایا: ''خدا کی راہ میں محنت اٹھانا۔'' (جہاد)۔ ❸

ایک دفعہ آپ ﷺ نے والدین کی اطاعت کے ثواب کو ایک نہایت موثر حکایت میں بیان فرمایا ارشاد ہوا کہ ''تین مسافر راہ میں چل رہے تھے، اتنے میں موسلا دھار پانی برسنے لگا، تینوں نے بھاگ کر ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی، قضارا ایک چٹان اوپر سے ایسی گری کہ اس سے اس غار کا منہ بند ہو گیا۔ اب ان کی بے کسی و بیچارگی اور اضطراب و بے قراری کا کون اندازہ کر سکتا ہے، ان کو موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی، اس وقت انہوں نے پورے خضوع و خشوع کے ساتھ دربار الٰہی میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، ہر ایک نے کہا کہ اس وقت ہر ایک کو اپنی خالص نیکی کا واسطہ خدا کو دینا چاہیے، ایک نے کہا، بار الٰہی تو جانتا ہے کہ میرے والدین بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، میں بکریاں چراتا تھا اور انہی پر ان کی روزی کا سہارا تھا، میں شام کو جب بکریاں لیکر گھر آتا تھا تو دودھ دوھ کر پہلے اپنے والدین کی خدمت میں لاتا تھا جب وہ پی چکتے تب اپنے بچوں کو پلاتا تھا، ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں بکریاں چرانے کو دور نکل گیا، لوٹا تو میرے والدین سو چکے تھے۔ میں دودھ لے کر ان کے سرہانے کھڑا ہوا، نہ ان کو جگاتا تھا کہ ان کی راحت میں خلل آجاتا اور نہ ہٹتا تھا کہ خدا جانے کس وقت ان کی آنکھیں کھلیں اور دودھ مانگیں، بچے بھوک سے بلک رہے تھے مگر مجھے گوارا نہ تھا کہ میرے والدین سے پہلے میرے بچے سیر ہوں، میں اسی طرح پیالہ میں دودھ لیے رات بھر سرہانے کھڑا رہا اور وہ آرام کرتے رہے۔ خداوند! اگر تجھے معلوم ہے کہ میں نے یہ کام تیری خوشنودی کے لیے کیا تو اس چٹان کو اس غار کے منہ سے ہٹا دے، یہ کہنا تھا کہ چٹان کو خود بخود جنبش ہوئی اور غار کے منہ سے تھوڑا سرک گئی، اس کے بعد باقی مسافروں کی باری آئی اور انہوں نے بھی اپنے نیک کاموں کو وسیلہ بنا کر دعا کی اور غار کا منہ کھل گیا۔'' ❹

اسلام میں جہاد کی اہمیت جو کچھ ہے وہ ظاہر ہے مگر والدین کی خدمت گزاری کا درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے ان کی اجازت کے بغیر جہاد بھی جائز نہیں کہ جہاد کے میدان میں سر ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہوتا ہے اور ہر

❶ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی بر الوالدین: ۱۸۹۷۔

❷ صحیح مسلم، كتاب البر والصلة، باب رغم من ادرك ابويه او احدهما عند الكبر...: ۶۵۱۰، ۶۵۱۱۔

❸ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی بر الوالدین: ۱۸۹۸۔

❹ صحیح بخاری، كتاب الادب، باب اجابة دعاء من برّ لوالديه: ۵۹۷۴۔

وقت جان جانے کا امکان رہتا ہے، اس لیے والدین کی اجازت کے بغیر ان کو اپنے جسم و جان کو کھونے کا حق نہیں، جس کو اس کی خدمت گزاری کے لیے وقف ہونا چاہیے تھا، اسی لیے ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نیک کاموں میں جہاد کا درجہ والدین کی خدمت گزاری کے بعد رکھا، ایک دفعہ ایک صحابی نے آ کر خدمت اقدس میں شرکتِ جہاد کی اجازت طلب کی۔ دریافت فرمایا: ''تمہارے ماں باپ بھی ہیں۔'' عرض کی، جی ہاں، ارشاد ہوا: ''تو پھر انہی کی خدمت کا فریضۂ جہاد ادا کرو۔'' [1]

قرآنِ پاک کی صریح آیتوں میں خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ جس طرح والدین کی اطاعت کا ذکر ہے احادیث میں بھی وہی درجہ رکھا گیا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ ''تم پر خدا نے ماؤں کی نافرمانی حرام کی ہے۔'' [2] ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو خدمت میں حاضر تھے، دریافت کیا کہ ''کیا تم کو بتاؤں کہ دنیا میں سب سے بڑے گناہ کیا ہیں؟'' انہوں نے عرض کی، ضرور یا رسول اللہ ﷺ! فرمایا کہ خدا کے ساتھ شرک کرنا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔ آپ تکیہ لگائے بیٹھے تھے سیدھے ہو کر برابر ہو گئے اور فرمانے لگے: ''اور جھوٹی گواہی۔'' [3]

توراۃ میں حقوقِ والدین کے متعلق جو بعض ایسے احکام تھے جو بے حد سخت تھے۔ وحی محمدی ﷺ نے بعض حیثیتوں سے ان میں تخفیف کر دی ہے اور بعض حیثیتوں سے اور زیادہ سخت کر دیا ہے، مثلاً: توراۃ کا یہ حکم تھا کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ پر لعنت کرے وہ قتل کر دیا جائے، اسلام نے اس گناہ کو دنیا کی قانونی سزا کے بجائے اخروی سزا کا موجب قرار دیا جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ توبہ و استغفار سے معاف ہو سکتے ہیں اور مجرم کو اپنے فعل پر نظرِ ثانی کی تا زندگی مہلت ملتی ہے، لیکن اگر اس نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر عذاب بھی ہے، جو دنیاوی سزا سے زیادہ سخت ہے، اسلام کے قانون میں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی سنگ دل باپ اپنی اولاد کے قتل کا مرتکب ہو تو بعض حالتوں میں وہ اس کے قصاص میں قتل نہ ہوگا بلکہ کسی اور سزا کا مستحق ہوگا، کیونکہ باپ کو اپنی اولاد سے جو فطری محبت ہوتی ہے اس کا مقتضا یہی ہے کہ اس کے فعل کو قتل بالقصد کے بجائے اتفاقی سمجھا جائے، تاکہ اس کے برخلاف کوئی قوی شہادت موجود نہ ہو۔ [4] اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے، تورات نے ایک طرف والدین کو یہ اہمیت دے کر دوسری طرف بیوی کے سامنے ان کو بالکل

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب لا یجاهد الاباذن الابوین:۵۹۷۲۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب عقوق الوالدین من الکبائر:۵۹۷۵۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب عقوق الوالدین من الکبائر: ۵۹۷۶۔ یہ تمام واقعات اور اقوال عام کتب حدیث میں مذکور ہیں خصوصیات کے ساتھ دیکھو، بخاری، کتاب الادب، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، جامع ترمذی کتاب البر والصلة۔ مشکوۃ باب مذکور۔ [4] فقہائے اسلام کے خیالات اس قانون کی تشریح کے متعلق مختلف ہیں، احناف اور شوافع کے نزدیک لڑکے کے قتل پر باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اگر وہ بے رحمی سے پچھاڑ کر ذبح کرے تو قصاص ہے ورنہ نہیں اور ظاہر یہ کہ اصول کے مطابق قتل عمد کی ہر صورت میں قصاص ہے اور یہی قرآن کا منشا معلوم ہوتا ہے، اصل یہ ہے کہ باپ کے وفور شفقت کی وجہ سے اس کا ہر قتل بلاقصد سمجھا گیا ہے اس لیے اکثر فقہا نے اس کو قتلِ خطا سمجھ کر قصاص کے بجائے اس پر دیت لازم کی ہے الآیہ کہ دلائل و قرائن باپ کے سوئے قصد کو ظاہر کرتے ہوں۔

بے قدر کر دیا ہے، لکھا ہے:

''اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے۔'' (پیدائش ۲۔۲۴)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی جو گو (انجیل کے بیان کے مطابق) ماں باپ اور بیوی تینوں سے نا آشنا تھے تاہم جیسا کہ انجیل کے موجودہ نسخہ میں ہے ماں باپ کے مقابلہ میں بیوی کی طرف داری اور حمایت کی اور اسی لیے طلاق کو ناجائز قرار دیا، (مرقس ۱۰۔۷۔۸) مگر سوال یہ ہے کہ اگر بیوی اور والدین کے درمیان ناقابلِ حل اختلاف ہو اور اس لیے ان دونوں میں سے کسی کو مجبوراً ترجیح دینا پڑے تو کیا صورت اختیار کی جائے، اسلام کا حکم ہے کہ اس حال میں بھی والدین کی اطاعت کرو کہ بیوی کا تعلق ایسا ہے جس کو قانون اور عہد نے پیدا کیا ہے جو ٹوٹ کر جڑ سکتا ہے اور مٹ کر بدل سکتا ہے، لیکن والدین کا فطری تعلق ناقابل شکست اور ناقابل تغیر ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک بیوی تھیں جن سے وہ راضی تھے، مگر ان کے پدر بزرگوار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بہو پسند نہ تھیں، اس اختلاف نے خانگی جھگڑے کی صورت اختیار کی، آنحضرت ﷺ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو مشورہ دیا کہ وہ باپ کی اطاعت کریں۔ [1]

[1] جامع ترمذی، کتاب الطلاق، باب ما جاء فی الرجل یسألہ أبوہ أن یطلق زوجتہ: ۱۱۸۹۔

اولاد کا حق

اصولِ تعلیم

جس طرح ماں باپ کے حقوق اولاد پر ہیں، اسی طرح اولاد کے بھی کچھ حقوق ماں باپ پر ہیں اور یہ وہ عنوان ہے، جس کا سراغ دوسری آسمانی کتابوں میں نہیں ملتا اور اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ اسلام سے پہلے والدین کو تو اپنی اولاد پر غیر محدود اختیارات حاصل تھے، مگر اولاد کا باپ پر کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا، اور اس کو والدین کی بزرگی کے خلاف سمجھا گیا تھا، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ جو مذہب لے کر تشریف لائے اس کی شریعت میں حقوق کے مسئلہ میں بڑوں چھوٹوں کی تفریق نہیں، وہ جس طرح چھوٹوں پر بڑوں کے جائز حقوق تسلیم کرتا ہے، اسی طرح وہ چھوٹوں کے بھی بڑوں پر مناسب حقوق قائم کرتا ہے، آنحضرت ﷺ نے ایک نہایت چھوٹے سے فقرہ میں وہ اصول بتا دیا ہے جو ان تمام حقوق کی نہایت جامع متن ہے، ان حقوق کی جس قدر تشریح کی جائے، یہ متن ان سب پر محیط ہے، فرمایا:

((لیس مِنّا من لم یرحم صَغِیْرنا وَلَمْ یوقر کبیرنا)) [1]

''جو ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کرے اور ہمارے بڑے کا ادب نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔''

بڑے چھوٹے کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں اور چھوٹے بڑے کا ادب اور لحاظ کریں، یہ وہ اصول ہے، جس پر چھوٹوں اور بڑوں کے باہمی حقوق کی بنیاد اسلام میں قائم کی گئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ ترازو ٹھیک اور سیدھی رہے تو ہر انسانی جماعت میں چھوٹوں، بڑوں، افسروں، ماتحتوں، آقاؤں، نوکروں اور بزرگوں اور عزیزوں کے درمیان کسی قسم کی ناگواری اور آزردگی پیدا نہ ہونے پائے، جب کبھی چھوٹوں اور بڑوں میں کسی قسم کی ناگواری پیش آئی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا ہے، کہ ترازو کے ان دونوں پلڑوں میں توازن قائم نہیں رہا ہے۔ حکیموں اور مقننوں کے بنائے ہوئے نظم و انتظام کے سارے مشرح و مفصل قانون اور قاعدوں کا بے پایاں دفتر جو کام نہیں کرسکتا وہ نبی امی ﷺ کے یہ دو مختصر سادہ فقرے بڑی خوبی سے انجام دے سکتے ہیں اور دیتے ہیں، اگر واقعتاً کسی جماعت میں یہ ترازو بے نظام ہو جائے تو بڑے بڑے قانون کا بارِ گراں بھی پھر اس کو برابر نہیں کرسکتا۔ اولاد کا سب سے پہلا حق اپنے والدین پر یہ ہے کہ جب اللہ نے ان کی اولاد کی زندگی کا واسطہ ان کو بنایا ہے تو وہ بالقصد اس کے نقش زندگی کے مٹانے کا سبب نہ بنیں، بلکہ اس کی حیات کی تکمیل اور اس کی نشو ونما کی ترقی کے وہ تمام ذریعے مہیا کریں جو ان کی قوت اور استطاعت میں ہیں، یہی سبب ہے کہ اسلام نے حمل کو بالقصد ضائع کرنے (اسقاط) کو گناہ قرار دیا ہے اور ذریعہ حمل کے ضائع کرنے (عزل) کو اچھا نہیں سمجھا ہے اور پیدا ہونے کے بعد اس کے مار ڈالنے کی جاہلانہ رسم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی ہے۔

---

[1] جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی رحمة الصبیان:۱۹۱۹۔

اولاد کشی کا انسداد

عرب کے سفاکانہ مراسم میں سب سے زیادہ بے رحمی اور سنگدلی کا کام معصوم بچوں کو مار ڈالنا اور لڑکیوں کو زندہ گاڑ دینا تھا، یہ بے رحمی کا کام والدین خود اپنی خوشی اور مرضی سے انجام دیتے تھے، اس رسم کے جاری ہونے کے کئی اسباب تھے، ایک تو مذہبی تھا، یعنی والدین اپنے بچوں کو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے خود ذبح کرکے ان پر چڑھا دیتے تھے، منت مانتے تھے کہ فلاں کام ہوگا تو اپنے بچہ کی قربانی کریں گے، [1] یہ قابل نفرت رسم نہ صرف عرب میں بلکہ بہت سی بت پرست قوموں میں جاری تھی، رومۃ الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون میں ''اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کو بالکل اختیار تھا، اس قتل کی کوئی بازپرس نہ تھی اور اولاد کشی کا علانیہ کثرت سے رواج تھا''۔ [2] اور سب سے زیادہ ہندوستان کے راجپوتوں میں یہ دردناک منظر لڑکیوں کی شادی کی شرم و عار سے بچنے اور بیواؤں کی ستی کی صورت میں اور لڑائیوں میں جوہر کی صورت میں رائج تھا، اور سب سے زیادہ یہ کہ بتوں دیوتاؤں کی خوشی اور نذرانے کے لیے ان معصوموں کی جانیں بہت آسانی سے لی جاتی تھیں، قرآن پاک کی اس آیت میں نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کی قوموں کے اسی عقیدہ کو باطل کیا گیا ہے: [3]

﴿ وَكَذَٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ ۖ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴾ (٦/ الانعام: ١٣٨)

''جس طرح کھیتوں اور جانوروں میں اللہ برحق کے ساتھ ان کے دیوتاؤں نے اپنا حصہ لگا لیا ہے، اسی طرح بہت سے مشرکوں کو ان کے دیوتاؤں نے یہ بات خوبصورت کرکے دکھائی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کردیں، تاکہ یہ دیوتا ان کو (ہمیشہ کے لیے) ہلاک کردیں اور ان کے دین کو ان پر مشتبہ کردیں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے، تو ان مشرکوں کو اور جو کچھ وہ اللہ پر افترا کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کو ایسا حکم دیا ہے اس کو چھوڑ دے۔''

اسی سلسلہ میں آگے چل کر اللہ فرماتا ہے:

﴿ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ (٦/ الانعام: ١٤١)

''گھاٹے میں ہیں وہ جنھوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے بے جانے قتل کیا۔''

اس ہولناک گناہ کے ارتکاب کا دوسرا سبب عربوں کا عام فقر و فاقہ تھا، وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہوگی تو اس کے کھانے پینے کا سامان کرنا ہوگا، اس لیے وہ اس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ کر اس فرض سے سبک دوش ہوتے

---

[1] سیرۃ ابن ہشام و طبقات ابن سعد و تاریخ طبری وغیرہ کتب سیر میں عبدالمطلب کا عبداللہ کو قربانی دینے کا واقعہ، نیز مؤطا امام مالک، کتاب النذور، باب مالایجوز من النذور فی معصیۃ اللہ: ۱۰۳۰۔

[2] لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ جلد اول ص: ۲۲۰۔ [3] کشاف زمخشری تفسیر آیت ذیل۔

تھے، نبوت محمدی ﷺ نے ان کو یہ بتایا کہ ہر بچہ اپنا رزق اور اپنی قسمت ساتھ لے کر آتا ہے، ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں کھلاتا، بلکہ وہ اللہ ہی ہے جو سب کو کھلاتا ہے اور وہی ہر جاندار کی روزی کا میر سامان ہے:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ﴾ (۱۱/ ھود: ۶)

''اور زمین پر کوئی جاندار نہیں لیکن یہ کہ اس کی روزی کا فرض اللہ ہی پر ہے۔''

اس لیے جاہل عربوں کو تعلیم دی گئی:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآئیل: ۳۱)

''اپنی اولاد کو فقر وفاقہ کے خوف سے مار نہ ڈالا کرو، ہم ہی ہیں جوان کو اور تم کو دونوں کو روزی دیتے ہیں، ان کا مار ڈالنا بے شبہ بڑا گناہ ہے۔''

قتل اولاد کے جرم کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اس کی ممانعت کو شرک کی ممانعت کے پہلو بہ پہلو جگہ دی گئی، آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کہ ان عربوں کو جنہوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزیں حرام بنا لی ہیں، بتا دو کہ اصلی چیزیں انسان پر کیا حرام ہیں؟

﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ ﴾ (۶/ الانعام: ۱۵۱)

''کہہ دے اے پیغمبر! آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے، اللہ کا کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور مفلسی کے ڈر سے اپنے بچوں کو نہ مار ڈالو، ہم تم کو اور ان کو دونوں کو روزی دیتے ہیں۔''

ایک دفعہ ایک صحابی نے دریافت کیا، یا رسول اللہ ﷺ! سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا: ''شرک۔'' پوچھا، اس کے بعد، فرمایا: ''والدین کی نافرمانی۔'' پھر عرض کی، اس کے بعد، فرمایا یہ کہ ''تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی''۔ [1] یہ جواب حقیقت میں آیت بالا کی تفسیر ہے، انہی تعلیمات اور نبوت کے اس پرتو فیض نے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا کہ رازق اللہ ہے، اسی کے ہاتھ میں رزق کی کنجی ہے، ہر بچہ اپنے رزق کا آپ سامان لے کر آتا ہے، اس ایمان اور یقین نے اس جرم کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور عرب کی سرزمین اس لعنت سے ہمیشہ کے لیے پاک ہوگئی۔ اولاد کشی کی تیسری صورت جو سب سے زیادہ قابل افسوس تھی وہ لڑکیوں کا زندہ دفن کر دینا تھا، کہ لڑکیاں شرم و عار کا باعث سمجھی جاتی تھیں، جب گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو باپ کو سخت رنج ہوتا اور وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا تھا، اہل عرب کا عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ کی

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید: ۷۵۲۰ وکتاب التفسیر: ۴۴۷۷، ۴۷۶۱ وکتاب الادب: ۶۰۰۱ وکتاب المحاربین: ۶۸۱۱؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون الشرك أقبح الذنوب: ۲۵۷۔

لڑکیاں ہیں، قرآن نے کہا کہ تم کو لڑکی ہو تو تمہاری شرم کا باعث ہو اور اللہ کو لڑکیوں کا باپ کہو تو شرم نہ آئے، فرمایا:

﴿ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ۝ ﴾

(٤٣/ الزخرف:١٧)

''اور جب ان میں کسی کو اس کے ہونے کی خوش خبری دی جائے جس کی وہ رحمت والے اللہ پر تہمت باندھتے ہیں تو اندر ہی اندر غصہ کے مارے اس کا منہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔''

رفتہ رفتہ یہ حالت پہنچی کہ اس شرم وعار کے مجسمہ کو پردہ خاک میں چھپا کر باپ اس مصیبت سے نجات پانے کی فکریں کرتے، قرآن مجید نے اہل عرب کی اس حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

﴿ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ ﴾ (١٦/ النحل :٥٨-٥٩)

''اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے، اس خوشخبری کے رنج سے وہ لوگوں سے منہ چھپاتا ہے کہ آیا ذلت اٹھا کر اس کو اپنے پاس رہنے دے یا اس کو مٹی میں چھپا دے (یعنی زندہ دفن کر دے)۔''

یوں تو اس رسم بد کا رواج تمام عرب میں تھا، مگر اخبار عرب کے بعض واقف کہتے ہیں کہ ایک خاص سبب سے بنو تمیم میں اس کا رواج سب سے زیادہ تھا، [1] بنو تمیم کے رئیس قیس بن عاصم نے خود آنحضرت ﷺ سے اقرار کیا کہ انھوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ دس لڑکیوں کو زندہ دفن کیا ہے، [2] یہ رسم جس شقاوت اور سنگدلی کے ساتھ انجام دی جاتی تھی اس کا حسرتناک نقشہ ایک صاحب نے آنحضرت ﷺ کے سامنے خود اپنی بیتی سنا کر اس طرح کھینچا کہ رحمت عالم ﷺ بے چین ہو گئے۔

دارمی میں وضین تبع تابعی سے ایک موقوف روایت ہے، [3] کہ ایک شخص نے آ کر خدمت اقدس میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم لوگ جاہلیت والے تھے، بتوں کو پوجتے تھے اور اولاد کو مار ڈالتے تھے، میری ایک لڑکی تھی جب میں اس کو بلاتا تو دوڑ کر میرے پاس آتی۔ ایک دن وہ میرے بلانے پر خوش خوش دوڑی آئی۔ میں آگے بڑھا اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ جب ایک کنوئیں کے پاس پہنچا جو میرے گھر سے کچھ دور نہ تھا اور لڑکی اس کے قریب پہنچی، تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں میں ڈال دیا، وہ ابا ابا کہہ کر پکارتی رہی اور یہی اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔ رحمت کونین ﷺ اس پُر درد افسانہ کو سن کر آنسو ضبط

---

[1] مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران، ص: ٣٤٨ وکتاب مجمع الامثال میدانی، ج ١، ص: ٢٨٧ مطبعہ خیریہ مصر، زیر مثل اضل من موؤدة۔ [2] ابن جریر، ابن کثیر ودر منثور سیوطی بحوالہ سنن بیہقی ومسند براز (مصنف عبدالرزاق زیر تفسیر سورة تکویر)۔

[3] سنن دارمی المقدمة، باب ماکان علیه الناس قبل مبعث النبی ﷺ من الجهل والضلالة: ٢، یہ روایت گو مرفوع اور قوی نہیں، لیکن اس لیے نقل کر دی ہے کہ کم از کم آج اس جرم کا تخیل ہی ہمارے سامنے آ جائے۔

نہ کر سکے، ایک صحابی نے ان صاحب کو ملامت کی کہ تم نے حضور کو غمگین کر دیا، فرمایا: ''اس کو چھوڑ دو کہ جو مصیبت اس پر پڑی ہے وہ اس کا علاج پوچھنے آیا ہے۔'' پھر ان صاحب سے فرمایا: ''ہاں میاں! تم اپنا قصہ پھر سناؤ۔'' انھوں نے دوبارہ پھر بیان کیا۔ آنحضرت ﷺ کی یہ حالت ہوئی کہ روتے روتے ریش مبارک تر ہوگئی، پھر فرمایا: ''جاؤ کہ جاہلیت کے گناہ اسلام کے بعد معاف ہوگئے، اب نئے سرے سے اپنا عمل شروع کرو۔''

قبیلہ بنی تمیم کے رئیس قیس بن عاصم جب اسلام لائے تو انھوں نے عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ! میں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کی ہیں۔ فرمایا: ''اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک غلام آزاد کرو۔'' عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! میرے پاس اونٹ ہیں، فرمایا: ''اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک اونٹ قربانی کرو۔'' ❶

مردوں کے علاوہ یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ خود عورتیں بھی اس جرم میں مردوں کی شریک تھیں، مائیں خود اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے اس قربانی کے لیے حوالہ کرتی تھیں، ابن الاعرابی جاہلیت کے ایک شاعر کا ایک شعر سناتا ہے:

مالقی الموؤد من ظلم امِّہٖ كمالقیت ذهل جمیعاً و عامر

''زندہ دفن ہونے والے بچہ نے اپنی ماں کے ظلم سے بھی وہ تکلیف نہیں اٹھائی جو ذهل اور عامر نے اٹھائی۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں ایک عورت نے آکر کہا کہ میں نے نذر مانی تھی کہ اپنے لڑکے کی قربانی کروں گی، فرمایا: ''ایسا نہ کرو، بلکہ کفارہ دے دو۔'' ❷

اسلام سے پہلے اس رسم کے انسداد کے لیے صرف اسی قدر ہوا کہ ایک دو نیک آدمیوں نے ایسی لڑکیوں کو قیمت دے کر ان کے والدین سے خرید لیا اور ان کی پرورش کی، چنانچہ مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ نے اس میں بڑا نام پیدا کیا تھا، اسلام کے بعد جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا تو عرض کی، یارسول اللہ! میں نے اسلام سے پہلے ۳۶۰ لڑکیوں کو خرید کر موت سے بچایا ہے، کیا مجھ کو اس کا ثواب ہوگا؟ فرمایا: ''ہاں تم کو اس کا ثواب ملے گا کہ اللہ نے تم کو مسلمان بنا کر تم پر احسان کیا ہے۔'' ❸ اسی طرح زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ جو بعثتِ نبوی سے پہلے دینِ ابراہیمی کے پیرو تھے، وہ بھی اس قسم کی لڑکیوں کو اپنے آغوشِ شفقت میں لیتے تھے اور ان کی پرورش کرتے تھے، جب وہ بڑی ہو جاتی تھیں تو وہ ان کے باپ کو کہتے تھے کہ کہو تو میں تم کو واپس کر دوں، چاہے ان کو میرے ہی پاس رہنے دو۔ ❹ یہ شخصی کوششیں تھیں جو ملک میں بارآور نہ ہوئیں، لیکن بعثتِ محمدی ﷺ کی رحمتِ عام کی جب بہار آئی، تو ان شقاوتوں کے موسم پر ہمیشہ کے لیے خزاں چھا گئی۔

---

❶ تفسیر ابن جریر طبری بروایت قتادہ تابعی و تفسیر ابن کثیر بحوالہ عبدالرزاق وبزار و در منثور سیوطی بحوالہ مسند بزار وحاکم فی الکنٰی وبیهقی فی السنن زیر سورۃ اذا الشمس کورت۔ ❷ مؤطا امام مالک، کتاب النذور، باب النهی عن النذور فی معصیة الله: ۱۰۳۰۔ ❸ تفسیر در منثور بحوالہ طبرانی۔ تفسیر اذا الشمس کورت۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل: ۳۸۲۸۔

لوگ عموماً لڑکیوں کے وجود کو بلا اور مصیبت سمجھتے تھے، نبوتِ محمدی ﷺ نے اس بلا اور مصیبت کو ایسی رحمت بنا دیا کہ وہ نجات اخروی کا ذریعہ بن گئیں، فرمایا: ''جو کوئی ان لڑکیوں میں سے کسی لڑکی کی مصیبت میں مبتلا ہوا اور پھر اس کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک کرے تو وہ دوزخ کے عذاب سے اس کو بچا لے گی، وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو جائے گی۔'' ❶ نیز فرمایا: ''جو دو لڑکیوں کی بھی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں، تو قیامت میں میرا اور اس کا مرتبہ دو انگلیوں کو اٹھا کر فرمایا کہ یوں برابر ہو گا۔'' ❷ غور کیجیے کہ وہی حقیر ہستی جو پہلے شرم و عار کا موجب تھی، عہدِ محمدی ﷺ میں آ کر عزت اور سعادت کا وسیلہ بن گئی۔

ان اخلاقی نصیحتوں کے علاوہ اس رسم کے انسداد کے لیے آپ ﷺ نے عورتوں اور مردوں سے بیعت لی، صلح حدیبیہ کے بعد حکم ہوا کہ جو عورتیں اسلام لائیں، ان سے توبہ کی جو بیعت لی جائے، اس میں ایک دفعہ یہ بھی ہو کہ ﴿وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ﴾ (٦٠/ ممتحنه: ١٢) کہ ''وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی''۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق آنحضرت نے عورتوں سے خصوصیت کے ساتھ اس کی بیعت لی، فتح مکہ کے دن جب عورت مرد جوق در جوق اسلام کے لیے حاضر ہو رہے تھے تو آپ نے عورتوں سے خاص طور سے اس کا اقرار لیا اور انھوں نے اقرار کیا۔ ❸ عید کے اجتماع عام میں عورتوں کے مجمع میں آپ تشریف لائے اور دوسری باتوں کے علاوہ اس کا بھی عہد ❹ لیا کہ وہ قتلِ اولاد کی مرتکب نہ ہوں گی، دوسرے موقعوں پر بھی جو خاتون دربارِ رسالت میں حاضر ہوتیں ان سے بھی اس کا عہد لیا جاتا تھا، ❺ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پیش نظر عرب کی جو ابتدائی اصلاحیں تھیں، ان میں ایک چیز یہ بھی تھی، چنانچہ بیعت عقبہ میں سب سے پہلے انصار سے جن باتوں پر عہد لیا گیا تھا، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ ''وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے۔'' ❻

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ دربارِ رسالت میں حاضر تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہم سے اس پر بیعت کرو کہ تم کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ گے، چوری نہ کرو گے، بدکاری نہ کرو گے اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، جو اس عہد کو پورا کرے گا تو اس کا معاوضہ اللہ پر ہے اور اگر کسی نے ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب کیا اور اس کو قانونی سزا دی گئی تو یہ اس کے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا اور اگر اس کا یہ گناہ دنیا میں مخفی

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الولد: ٥٩٩٥؛ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل الاحسان الى البنات: ٦٦٩٣۔ ❷ صحیح مسلم، ایضاً: ٦٦٩٥۔

❸ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورة الممتحنة: ٤٨٩٥؛ صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب کیفیة بیعة النساء: ٤٨٣٤۔

❹ صحیح بخاری، کتاب العیدین، باب موعظة الامام النساء یوم العید: ٩٧٨، ٩٧٩۔

❺ ترمذی: ١٥٩٧؛ نسائی: ٤١٨٦؛ ابن ماجه: ٢٨٧٤، ٢٨٧٥؛ مسند امام احمد حدیث امیمة بنت رقیقة، ج ٦، ص: ٣٥٧ وسلمی بنت قیس، ج ٦، ص: ٣٧٩۔

❻ تفسیر ابن کثیر، ج ٩، ص: ٤٤٣ برحاشیه فتح البیان بحواله ابن ابی حاتم۔

رہا تو اللہ کو اختیار ہے چاہے بخش دے چاہے عذاب دے"۔ ❶ صحابہ سے فرمایا کہ "اللہ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا حرام کیا ہے"۔ ❷ ان تمام تدبیروں کے علاوہ قرآنِ پاک کی ایک مختصر سی آیت نے عرب کی ان تمام قساوتوں، ان تمام سنگدلیوں اور ان تمام سفاکیوں کو مٹانے میں وہ کام کیا جو دنیا کی بڑی بڑی تصنیفات نہیں کر سکتی تھیں۔ قیامت کی عدالت گاہ قائم ہے، مجرم اپنی اپنی جگہ کھڑے ہیں، غضب الٰہی کا آفتاب اپنی پوری تمازت پر ہے، دانائے غیب قاضی اپنی معدلت کی کرسی پر ہے، اعمال نامے شہادت میں پیش ہیں کہ ایک طرف سے ننھی ننھی معصوم بے زبان ہستیاں خون سے رنگین کپڑوں میں آ کر کھڑی ہو جاتی ہیں، شہنشاہِ قہار کی طرف سے سوال ہوتا ہے، اے ننھی معصوم جانو! تم کس جرم میں ماری گئیں:

﴿ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ ﴾ (۸۱/ التکویر: ۸۔۹)

"یاد کرو جب (قیامت میں) زندہ دفن ہونے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس جرم میں ماری گئی۔"

کس درجہ بلیغ اور مؤثر طرزِ ادا ہے، اس کا یہ اثر تھا کہ یا تو لوگ لڑکیوں کو خود اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیتے تھے، یا یہ زمانہ آیا کہ ادائے عمرہ کے موقع پر آنحضرت ﷺ مکہ سے روانہ ہونے کا قصد کرتے ہیں، سید الشہداء حمزہ رضی اللہ عنہ کی یتیم بچی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھی، چچا چچا کہتی دوڑی آتی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ ہاتھوں میں اٹھا لیتے اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے حوالہ کرتے ہیں کہ یہ لو تمہارے چچا کی بیٹی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بچی مجھ کو ملنی چاہیے، کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے اور اس کی خالہ میرے گھر میں ہے، حضرت زید رضی اللہ عنہ آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ حضور! یہ لڑکی مجھ کو ملنی چاہیے کہ حمزہ میرے مذہبی بھائی تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ ہے کہ یہ میری بہن بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے، آنحضرت ﷺ اس دل خوش کن منظر کو دیکھتے ہیں، پھر سب کے دعوے مساوی دیکھ کر اس کو یہ کہہ کر اس کی خالہ کی گود میں دے دیتے ہیں کہ "خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔" ❸

کیا یہ وہی جنس نہ تھی کہ جس کی ہستی شرم و عار کا موجب تھی، جس کی پیدائش کی خبر سن کر باپ کے چہرہ کا رنگ سیاہ پڑ جاتا تھا اور وہ لوگوں کے مجمع میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا تھا یا یہ حال ہے کہ ایک لڑکی کی پرورش کے لیے دفعتہً چار چار گود خالی ہو جاتے ہیں اور فیصلہ مشکل ہوتا ہے، وہی اولاد جو پہلے بلا اور مصیبت تھی، آنکھوں کی ٹھنڈک کا ذریعہ بنتی ہے۔

❶ صحیح بخاری، کتاب الایمان: ۱۸، وکتاب مناقب الانصار: ۳۸۹۲، ۳۸۹۳؛ مسلم، کتاب الحدود: ۴۴۶۱، ۴۴۶۳ ومسند احمد، ج ۵، ص: ۳۱۴؛ مستدرك حاكم، ج ۲، ص: ۳۱۸۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الادب: ۵۹۷۵ وکتاب فی الاستقراض: ۲۴۰۸؛ صحیح مسلم، کتاب الاقضیة، باب النهی عن کثرة المسائل: ۴۴۸۳۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء: ۴۲۵۱۔

﴿ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۷۴)

’’(جنت ان کو بھی ملے گی جو……) اور جو کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار! ہماری بیویوں اور ہماری اولاد سے ہم کو آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔‘‘

اور آخروہ زمانہ آیا کہ ایک بدوی شاعر کو طنزاً کہنا پڑا:

غدا الناس مذ قام النبی الجواریا۔

’’پیغمبر کی بعثت کے بعد تو یہ کثرت ہے کہ سب لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں۔‘‘

رضاعت وحضانت

اولاد کے جینے کا حق تسلیم کرانے کے بعد پہلا فرض یہ ہے کہ اس کی نشو ونما اور دودھ پلانے کے حق کو تسلیم کیا جائے اور جب تک وہ خود سے کھانے پینے کے قابل نہ ہو جائے، اس کی خبر گیری کی جائے اور اس کے بعد اس کی نابالغی کے زمانہ تک اس کی نگرانی اور اس کے خرچ کی کفالت کی جائے، چنانچہ اسلام نے ان دونوں باتوں کا بوجھ والدین پر اور خاص طور سے جہاں تک مصارف کا تعلق ہے، تنہا باپ پر رکھا ہے، رضاعت اور حضانت کے عنوان سے اس کی تشریح فقہ کی کتابوں میں مل سکتی ہے، مختصر یہ ہے کہ بچہ کو شیر خوارگی کے عالم میں ماں دودھ پلائے اور اگر ماں نہ ہو یا ماں کسی قانون (طلاق وغیرہ) کے سبب سے شوہر سے علیحدہ ہو چکی ہو تو باپ پر اس کی رضاعت کا سامان کرنا اور اس کی اُجرت ادا کرنا فرض قرار دیا گیا اور اس شیر خوارگی کی پوری مدت بھی دو برس کی مقرر کر دی گئی ہے:

﴿ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۭ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۳۳)

’’اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں، یہ مدت اس کے لیے ہے جو چاہے کہ رضاعت کی مدت پوری کرے اور لڑکے والے (باپ) پر ان دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے۔‘‘

اور شیر خوارگی کے دنوں میں ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی اگر اپنا دودھ پلا کر اس کی زندگی کا سہارا بنے تو اسلام ہی ایک مذہب ہے، جس نے قانوناً اس اہمیت کو قبول کیا اور اس کا درجہ بھی ماں کے قریب قریب قائم کر کے اس کی اولاد کو بھی بھائی اور بہن کے رشتہ کا منصب عطا کیا ہے، فرمایا:

﴿ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ ﴾ (۴/ النسآء:۲۳)

’’اور تمہاری وہ مائیں تم پر حرام ہیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور تمہاری دودھ شریک بہنیں۔‘‘

دکھانا یہ ہے کہ ان ننھے بچوں کی نشو ونما کی خدمت اسلام میں وہ عزت اور احترام رکھتی ہے کہ نسبی رشتہ

داریوں کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے۔

اوپر کی پہلی آیت میں جب دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری باپ پر ڈالی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ بچپن تک بچہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری بھی باپ پر ہے اور باپ نہ ہو تو دادا پر اور اس کے بعد درجہ بدرجہ ورثہ پر ہے۔

تعلیم وتربیت

ظاہری اور جسمانی نشوونما کے بعد اولاد کی باطنی وروحانی تربیت کا درجہ ہے، قرآن پاک نے ایک مختصر سے مختصر فقرہ میں جو صرف چار لفظوں سے مرکب ہے، اس حق کو ایسے جامع طریقہ سے ادا کر دیا ہے، کہ اس کی تفصیل وتشریح میں دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں، فرمایا:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا ﴾ (٦٦/ التحریم: ٦)

''اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔''

اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچانا بزرگ خاندان کا فرض ہے، یہ آگ جہنم کی آگ ہے، مگر اس سے مقصود ان تمام برائیوں، خرابیوں اور ہلاکتوں سے ان کی حفاظت ہے، جو بالآخر انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنا دیتی ہیں، اس طرح گھر کے سردار پر اولاد کی اخلاقی تربیت، دینی تعلیم اور نگہداشت کا فرض عائد کیا ہے۔

اللہ نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی جو اپنے بیوی بچوں کے حق میں دعائے خیر کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''بارِالٰہی! تو ان کو ظاہر و باطن کا حسن، صورت وسیرت کی خوبی اور دین ودنیا کی بھلائی دے کر میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا، فرمایا:

﴿ وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ ﴾ (٢٥/ الفرقان: ٧٤)

''اور (جنت کے مستحق وہ بھی ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولادوں کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔''

مقصود یہ ہے کہ اولاد کو نیک اور سعادت مند بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی نیکی وسعادت مندی کی دعا بھی مانگتے رہنا چاہیے، ایک سورہ میں اللہ ارشاد فرماتا ہے کہ نیک بندے جس طرح اپنے ماں باپ کے حق میں مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور ان کی خدمت کی توفیق چاہتے ہیں، اسی طرح وہ اپنی اولاد کے حق میں اپنی کوششوں کی کامیابی کی بھی دعا کرتے ہیں:

﴿ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴾ (٤٦/ الاحقاف: ١٥)

''اور (اے اللہ)! میرے لیے میرے کاموں کو میری اولاد میں صالح بنا، میں اپنے گناہوں سے تیری طرف باز آیا اور میں فرمانبرداروں میں ہوں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کو ہر طرح صالح اور کارآمد بنانے کی تدبیر اور دعا بھی ایک اچھے باپ کا فرض ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اس باب میں وحی الٰہی کے مقصود کو تعلیم ربانی پا کر مختلف طریقوں سے واضح فرمایا۔

ایک اعرابی اقرع بن حابس دربار نبوی میں آیا، حضور ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو پیار کر رہے تھے، اس کو یہ بات ادب اور وقار کے خلاف معلوم ہوئی، اس نے کہا، کیا آپ بچوں کو پیار کرتے ہیں، میرے دس بچے ہیں، میں نے ان میں سے کسی کو پیار نہیں کیا، حضور ﷺ نے اس کی طرف نظر اٹھائی، پھر فرمایا: ''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔'' 1 دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحم وشفقت کو نکال لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔'' 2 ان دونوں کا منشا یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ محبت وشفقت سے پیش آنا چاہیے کہ جو اپنے بچوں پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر رحم نہیں کرتا۔

ایک دفعہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک غریب عورت سائل بن کر آئی، اس کے ساتھ اس کی دو کمسن بچیاں بھی تھیں، اس وقت کاشانہ نبوی ﷺ میں ایک کھجور کے سوا کھانے کو کچھ اور نہ تھا، ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے وہی ایک کھجور اس کے نذر کر دی۔

ماں کی ممتا نے گوارا نہ کیا کہ وہ کھجور آپ کھالے اور ان ننھی جانوں کو اس سد رمق سے محروم رکھے، اس نے اس کھجور کے دو آدھے ٹکڑے کر کے دونوں بچیوں کو ایک ایک ٹکڑا دے دیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو غریب ماں کی محبت کے اس منظر کو دیکھ کر تعجب ہوا، آنحضرت ﷺ جب تشریف لائے تو یہ واقعہ عرض کیا، حضور ﷺ نے سن کر فرمایا: ''جب کسی کو لڑکیوں کی کوئی مصیبت پیش آئے اور وہ ان کے ساتھ نیکی کرے تو وہ دوزخ کی آگ سے اس کے لیے آڑ بن جائیں گی۔'' 3 نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ عمر تمیز کو پہنچ جائیں تو قیامت کے دن اس کا یہ رتبہ ہوگا کہ وہ اور میں (دو انگلیوں کو جوڑ کر فرمایا) اس طرح ملے ہوئے ہوں گے۔'' 4 اس رتبہ کی بلندی کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے؟ ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''باپ کا اپنے بچہ کو کوئی ادب سکھانا ایک صاع صدقہ سے بہتر ہے۔'' 5 ایک دفعہ یہ فرمایا: ''کوئی باپ اپنے بچہ کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے۔'' 6

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لڑکے کو لڑکی پر صرف جنس کے اختلاف کے سبب سے ترجیح نہ دے،

---

1 یہ روایت صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الولد : ۵۹۹۷ میں ہے، نیز دیکھو ابو داود، کتاب الادب، باب قبلة الرجل ولده: ۵۲۱۸۔ 2 بخاری، ایضًا: ۵۹۹۸۔

3 صحیح مسلم، کتاب البر والصلة باب فضل الاحسان الی البنات: ۶۶۹۳۔ 4 ایضًا: ۶۶۹۵۔

5 ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء فی ادب الولد: ۱۹۵۱۔ 6 ایضًا: ۱۹۵۲۔

ارشاد ہوا کہ ''جس کے لڑکی ہو اور وہ اس کو زندہ باقی رہنے دے اور اس کی بے توقیری نہ کرے اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو اللہ اسے جنت میں داخل فرمائے گا''۔ [1] باہم لڑکوں میں بھی چھوٹے اور بڑے کے حقوق کا امتیاز شریعت محمدی ﷺ میں قائم نہیں، اسی لیے دنیا کی اکثر شریعتوں اور قانونوں کے خلاف اسلام میں بڑے اور پہلوٹے کے امتیازی حقوق نہیں، کہ ہر ایک کو ان میں سے اپنے باپ کے ساتھ برابر کی نسبت ہے، یہاں تک کہ اگر لڑکوں میں سے کسی ایک کو بلا وجہ کوئی ایسا عطیہ دیا جائے جو دوسرے کو نہ ملا ہو، تو آنحضرت ﷺ نے اس کو ظلم سے تعبیر فرمایا، ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنے لڑکوں میں سے کسی ایک کو ایک غلام ہبہ کیا اور چاہا کہ اس پر آنحضرت کی شہادت ہو، انہوں نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر اپنی خواہش ظاہر کی، دریافت کیا کہ ''تم نے اپنے سب بچوں کو ایک ایک غلام دیا ہے؟'' عرض کی نہیں، فرمایا: ''تو میں ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہ بنوں گا''۔ [2] اس سے اس قانون کی جو اسرائیلوں، رومیوں، ہندوؤں اور دوسری پرانی قوموں میں رائج تھا اور اب بھی ہے کہ صرف بڑا لڑکا جائیداد کا مالک بنے، یا اس کا کوئی ترجیحی حق ہو، اصلاح کر دی گئی اور باپ کی نظر میں اس کے تمام لڑکوں کو برابر کا منصب حاصل ہوا اور چھوٹوں پر ظلم کا جو مسلسل قانونی طریقہ جاری تھا اس کا خاتمہ ہوا۔

---

[1] سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فضل من عال یتامی: ٥١٤٦۔

[2] ابوداود، کتاب البیوع، باب فی الرجل یفضل بعض ولده فی النحل: ٣٥٤٢۔

حقوق زوجین

ماں باپ اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلقات کی فہرست میں تیسرا درجہ زن وشو کا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح والدین کے حقوق کی توضیح بوڑھوں کی تسکین روحانی کا ذریعہ اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر ننھے بچوں کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا، اسی طرح حقوقِ زوجین کی تشریح پر جوانوں کے بلکہ ہر گھر کے عیش و مسرت کا انحصار ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے، ان سب میں عورت کو اور عورت و مرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق و روح کی ترقی مدارج کے لیے عائق و مانع تسلیم کیا گیا تھا، ہندوستان میں بودھ، جین، ویدانت، جوگ اور سادھوپن کے تمام پیرو اسی نظریہ کے پابند تھے، عیسائی مذہب میں تجرد اور عورت سے بے تعلقی ہی کمال روحانی کا ذریعہ تھا، [1] اسلام نے آ کر اس نظریہ کو باطل کیا اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس تجرد میں ہو سکتی ہے، اس سے بدرجہا تعلق ازدواج میں ممکن ہے، کہ اخلاق نام حسن معاملہ اور حسن سلوک کا ہے، جو کسی کا شوہر نہ ہو، جو کسی کی بیوی نہ ہو، جو کسی کا باپ نہ ہو، جو کسی کی ماں نہ ہو، جو کسی کا بھائی نہ ہو اور نہ کسی کی بہن ہو، نہ کسی سے رشتہ ناطہ رکھے، اس پر دنیا کے کیا فرائض عائد ہو سکتے ہیں؟ اور اخلاق کی تکمیل کے لیے اس کو کون سے فطری مواقع مل سکتے ہیں؟ پھر دنیا میں اس عفت و عصمت کی موت جو اخلاقی قالب کی روح ہے، اس تجرد کی زندگی میں کتنی یقینی ہے، مذہبی تجرد کی وہ پوری اخلاقی تاریخ جو دنیا کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، اس دعویٰ کی پوری شہادت ہے۔

اسلام نے نکاح کو ہر عمر کے مرد و عورت بلکہ آزاد و غلام ہر ایک کے لیے بہتر بلکہ خیر و برکت کا سبب قرار دیا، حکم ہوا:

﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۭ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾ (٢٤/ النور :٣٢)

”اور اپنے میں سے بن شوہر کی عورتوں کا (خواہ وہ کنواری ہوں یا رانڈ) اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے صالحوں کا نکاح کر دیا کرو، اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ ان کو اپنی مہربانی سے غنی کر دے گا اور اللہ گنجائش رکھنے والا اور علم والا ہے۔“

اس آیت پاک کا یہ فقرہ کہ ”اگر وہ غریب و تنگ دست ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے ان کو غنی بنا دے گا۔“ یہ معنی رکھتا ہے کہ ازدواجی زندگی خیر و برکت کا ذریعہ ہے، مذہبی حیثیت سے تو اس بنا پر کہ اگر ایک کی تقدیر میں غربت ہوگی تو شاید دوسرے کی تقدیر میں فارغ البالی ہو، تو ایک کے ذریعہ سے دوسرے کو فائدہ پہنچے

[1] انجیل فرینتون، باب:٧۔

گا اور دنیاوی لحاظ سے دو سببوں سے، ایک تو یہ کہ ایک کام کرنے والے کے بجائے گھر میں دو کام کرنے والے ہوں گے اور آگے اولاد کے ذریعہ اور کام کرنے والے پیدا ہوں گے، اس فلسفہ کا راز اہل دولت نہیں، غریب ہی سمجھ سکتے ہیں، خصوصاً مزدور اور کاشت کار، دوسرا سبب یہ ہے کہ جب نکمے سے نکمے آدمی پر بھی بار پڑتا ہے تو وہ ہاتھ پاؤں ہلانے پر تیار ہوتا ہے، اس لیے جو بے کاری سے غریب ہے بیوی کے بوجھ سے مجبور ہوگا، کہ وہ کام کہیں سے پیدا کرے، خصوصاً اس لیے کہ اس کی محبت اس کو بعض ایسے بڑے بڑے کاموں پر آمادہ کردے گی، جس کے لیے وہ بغیر اس نشہ کے کبھی آمادہ نہ ہوسکتا، آخر میں فرمایا کہ اللہ بڑی وسعت والا ہے، اس کی گنجائش میں سب کچھ ہے اور پھر علم والا ہے، غیب کا علم اسی کو ہے، اس لیے اس کا یہ حکم حکمت سے خالی نہیں۔ پھر اس فرض کو یہاں تک ضروری قرار دیا کہ فرمایا: اگر کوئی غریب مسلمان کسی شریف خاتون کا خرچ نہ اٹھا سکتا ہو تو کسی مسلمان باندی ہی سے نکاح کرلے، فرمایا:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ ﴾ (٤/ النسآء: ٢٥)

''اور جو تم میں سے اس کی قدرت نہ رکھتا ہو کہ شریف مومن عورتوں سے نکاح کر سکے تو تمہاری ان مومن باندیوں میں سے کسی سے نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہو اور اللہ تمہارا ایمان زیادہ جانتا ہے، تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔''

آیت کا آخری ٹکڑا خاص غور کے قابل ہے، یہ فرمایا کہ اگر شریف و آزاد بیوی کا خرچ اٹھانے کی صلاحیت نہ ہو تو کسی باایمان باندی ہی سے نکاح کرلو، اب یہاں سے دو شبہے پیش آتے ہیں کہ یہ کیا نومسلم باندیاں پرانے مسلمانوں کے برابر ہوسکتی ہیں؟ تو فرمایا: کہ نئے اور پرانے مسلمان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا، اللہ ہی کو معلوم ہے کہ کس کا ایمان زیادہ اچھا اور اللہ کے نزدیک قبول ہے، دوسرا شبہ یہ تھا کہ یہ نومسلم عورتیں شریف خاندانوں کے ہم مرتبہ کیسے ہوں گی، تو فرمایا: یہ تفریق بھی غلط ہے، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے برابر ہے اور سارے بنی آدم ایک ہی جنس کے افراد ہیں۔ یہ اہتمام بیان اس لیے ملحوظ ہوا کہ غریب مسلمان ان وسوسوں میں پڑ کر نکاح سے باز نہ رہیں اس سے اندازہ ہوگا کہ شخصی مسرت کی تکمیل میں کسی رفیقہ حیات کی رفاقت کو اسلام نے کتنی اہمیت دی ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((اتزوج النسآء فمن رغب عن سنّتي فليس مني)) [1]

''میں تو عورتوں سے نکاح کرتا ہوں، تو جس نے میرے طریقہ سے روگردانی کی تو وہ مجھ سے نہیں۔''

---

[1] صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح: ٥٠٦٣؛ مسلم، کتاب النکاح، باب استحباب النکاح...... : ٣٤٠٣۔

اس نکاح کا مقصد صرف ایک فرض کو ادا کرنا نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی رفاقت کے لیے اپنے ایک ہم جنس کی تلاش ہوتی ہے اور یہ اللہ کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے، چنانچہ زن وشو کے باہمی اخلاص ومحبت کو اللہ نے اپنی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا ہے، فرمایا:

﴿ وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۝ ﴾ (۳۰/ الروم:۲۱)

''اور اس (اللہ کی) نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان کے پاس سکون پاؤ اور تمہارے آپس میں پیار اور مہر پیدا کر دیا، بے شک اس میں سوچنے والوں کے لیے کتنی نشانیاں ہیں۔''

قرآن پاک نے ایک لفظ ''سکون'' سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے، وہ اس ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہے، اس کا خلوت خانہ عالم کی کشاکش، دنیا کے حوادث اور مشکلات کے تلاطم میں امن اور سکون اور چین کا گوشہ ہے، اس لیے میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں اتنی خوشگواری ہونی چاہیے کہ اس سے اس تعلق کے وہ خاص اغراض جن کے لیے اللہ نے اس زناشوئی کے تعلق کو اپنے عجیب وغریب آثار قدرت میں شمار کیا ہے، پورے ہوں، یعنی باہمی اخلاص اور پیار، مہر ومحبت، سکون اور چین، اگر کسی نکاح سے قدرت کے یہ اغراض پورے نہ ہوں تو اس میں دونوں یا دونوں میں سے ایک کا قصور ہے۔

میاں بیوی کی باہمی موافقت اور میل جول کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ ان لوگوں کی سخت برائی کی ہے، جو زن وشو کے باہمی میل جول اور مہر ومحبت میں فرق ڈالیں، فرمایا:

﴿ وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۰۲)

''تو وہ (یہود) ان سے وہ سیکھتے ہیں جس سے شوہر اور اس کی بیوی میں تفرقہ ڈالتے ہیں...... اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔''

یہ باہمی میل جول کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟ اس کی صورت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ بیوی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر بیوی کی دلجوئی کرے، زن وشو باہم اپنے اپنے حقوق کے لحاظ سے گو برابر ہیں، لیکن مرد کو تھوڑا سا مرتبہ اس لیے زیادہ دیا گیا ہے، کہ وہ عورت کی دیکھ بھال اور خبر گیری کرتا ہے اور اس کے جائز مصارف کا بوجھ اٹھاتا ہے اور دوسرے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو مشکلات میں پڑنے اور عورت کی حفاظت اور بچاؤ کی خاطر اس کو جسمانی صلاحیتیں عورتوں سے کچھ زیادہ دی ہیں، فرمایا:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ

أَمْوَالِهِمْ ۚ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۚ ﴾ (٤/ النسآء: ٣٤)

''مرد عورتوں کے سردھرے ہیں، اس لیے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بزرگی دی ہے اور اس لیے کہ مرد اپنا مال ان پر خرچ کرتے ہیں، تو نیک بیبیاں فرمانبردار ہوتی ہیں اور غائبانہ نگہبانی کرتی ہیں کہ اللہ نے ان کی حفاظت کی ہے۔''

آیت کے اخیر حصہ کا یہ مطلب ذہن میں آتا ہے کہ نیک بیبیاں شوہر کی غیر حاضری میں، اپنی اور شوہر کی عزت و آبرو اور مال کا خیال رکھتی ہیں اور ان کی یہی فطرت اللہ نے بنائی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنی عصمت کا خیال اور شوہر کی وفاداری کا فطری جذبہ پیدا کر کے ان کو محفوظ کر دیا ہے، اب اگر کسی عورت سے اس کے خلاف ظہور میں آئے تو وہ فعل خلافِ فطرت ہے۔

مرد و عورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالیٰ نے دونوں کے جنسی میلان کو ان کی معاشی اور معاشرتی کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے، اس لیے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم، ایک دوسرے کی پردہ پوش، ایک دوسرے کی زینت اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں، قرآن پاک کی بلاغت دیکھئے کہ اس نے ان سارے مطالب کو صرف ایک تشبیہ میں ادا کر دیا ہے:

﴿ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۚ ﴾ (٢/ البقرۃ: ١٨٧)

''عورتیں تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔''

اس پوشاک کے پردہ میں جیسا کہ ابھی کہا گیا بیسیوں معنی پوشیدہ ہیں، تم ان کے ستر پوش ہو، وہ تمہارے لیے، تم ان کی زینت ہو، وہ تمہاری، تم ان کی خوبصورتی ہو، وہ تمہاری، تم ان کی تکمیل کا ذریعہ ہو، وہ تمہاری یہی نکاح کے اغراض ہیں اور انہی اغراض کو پورا کرنا حقوقِ زوجین کو ادا کرنا ہے:

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کی تخلیق اور ان کے باہمی فرائض کی تشریح کی ہے، فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء: ١)

''اے لوگو! اپنے اس پروردگار کا لحاظ کرو جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا، اس اللہ کا جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رحموں (رشتوں) کا لحاظ رکھو، اللہ تمہاری دیکھ بھال کر رہا ہے۔''

آنحضرت ﷺ ان آیات کو نکاح کے خطبوں میں عموماً پڑھا کرتے تھے، ان آیتوں میں انسانیت کے

پہلے جوڑے کی پیدائش کا ذکر ہے، جس سے کروڑوں مرد وعورت پیدا ہوئے اور پھر اس واقعہ کو تمہید بنا کر یہ نتیجہ ذہن نشین کرایا ہے کہ تو پھر چاہیے کہ ہم اپنے کاروبار اور معاملات میں اپنے اس خالقِ حقیقی کا اور ان رحموں (رشتوں) کا لحاظ کریں جو ہماری خلقت کا ذریعہ اور واسطہ ہیں، غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کی قرابتوں اور رشتہ داریوں کی جڑ یہی نکاح ہے، یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ پیدا نہ ہوسکتا، اس لیے دنیا کی ہر قرابت اور تعلق کا رشتہ اسی کی بدولت وجود میں آیا ہے اور اس نقطہ خیال سے بھی دنیا میں نکاح کی اہمیت بہت بڑی ہے، کہ اسی سے ساری دنیا کے عزیزانہ مہر ومحبت اور الفت ومودّت کا آغاز ہوتا ہے۔ نکاح کی اخلاقی غرض یہ ہے کہ مرد وعورت میں صلاح اور عفت پیدا ہو، قرآن نے نکاح کے سلسلہ میں کہا ہے: ﴿ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۵) ''پاک دامنی کے لیے، نہ شہوت رانی کے لیے۔'' اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ جوانوں کو خطاب کر کے فرمایا: ''اے جوانوں کے گروہ! تم میں نکاح کی جس کو طاقت ہو، وہ نکاح کر لے کہ اس سے نگاہیں نیچی اور شرم گاہیں محفوظ رہیں گی اور جس کو اس کی استطاعت نہ ہو وہ روزہ رکھے، کہ اس سے شہوت کا زور ٹوٹتا ہے۔'' [1]

نکاح کے ان اغراض کا پورا ہونا اس پر موقوف ہے کہ دونوں میں صلح اور یک جہتی کا رجحان نمایاں رہے اور ہر موقع پر جہاں تعلقات کے شیشہ کو ٹھیس لگنے کا ڈر ہو، باہم صلح کے لیے آمادہ رہنا چاہیے اور اصلاح حال کے لیے دونوں کو برابر کوشش کرنی چاہیے، اسی لیے زوجین میں مناقشہ پیش آنے کی صورت میں بھی اصلاح حال کی بار بار تاکید کی گئی ہے، فرمایا: ﴿ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۸) ''اگر یہ شوہر اصلاح چاہیں۔'' ﴿ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا ﴾ (۴/ النساء:۱۲۹) ''اگر اصلاح کرو اور تقویٰ کرو۔'' کہیں اسی اصلاح کا نام اللہ کی حدوں کو قائم کرنا کہا گیا ہے:

﴿ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۹)

''یہ کہ میاں بیوی دونوں اللہ کی حدوں کو قائم رکھیں گے۔''

جاہلیت میں دستور تھا کہ مرد قسم کھا لیتے تھے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ نہیں کریں گے اور جب انھیں کوئی سمجھاتا تو کہتے کہ ہم قسم کھا چکے ہیں، مجبور ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ نے وحی کی زبانِ مبارک سے ایسے لوگوں کو فرمایا:

﴿ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۴)

''اور اللہ کو اپنی قسموں کا ہتھکنڈا نہ بناؤ، کہ سلوک نہ کرو اور تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح جوئی نہ اختیار کرو اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔''

---

[1] ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب ما جاء فی فضل النکاح: ۱۸۴۵۔

اس آیت میں اس کے بعد عورتوں سے قسم کھا کر علیحدگی اختیار کر لینے اور طلاق دینے کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان نصیحتوں کا زیادہ تر تعلق زن وشو کے معاملہ سے ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مرد کو عورت کے ساتھ حسن سلوک (بر) پرہیز گاری کا برتاؤ (تقویٰ) اور صلح جوئی اور درستی کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

نیک بیویوں کے اوصاف قرآن پاک نے یہ بتائے ہیں:

﴿ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ ﴾ (٤/ النسآء: ٣٤)

''تو نیک بیویاں شوہروں کی فرمانبردار ہوتی ہیں اور شوہر کے پیٹھ پیچھے شوہر (کے مال و دولت اور عزت وآبرو) کی حفاظت کرتی ہیں۔''

گویا عورت کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اپنے مردوں کی فرمانبردار رہیں، ان کے مال و دولت اور ملکیت کی جن کی حفاظت ان کے سپرد ہے، پوری نگرانی رکھیں اور ان کی عزت وآبرو کی جو خود ان کی اپنی عزت وآبرو ہے، شوہر کی غیر حاضری میں بھی حفاظت کریں، مختصر لفظوں میں عورت کے سہ گانہ فرائض، اطاعت، سلیقہ مندی اور عصمت وعفت ہیں، حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''تقویٰ کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، کہ شوہر اس کو جو کہے وہ مانے، شوہر جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے اور اگر شوہر اس کو قسم دے کر کچھ کہے وہ اس کی قسم پوری کر دے اور شوہر گھر پر نہ ہو تو اپنے آپ کی اور اس کے مال کی پوری حفاظت کرے۔'' [1]

زن وشو کے باہمی حقوق کی تشریح آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں ان الفاظ میں فرمائی:

''لوگو! عورتوں کے حق میں میری نیکی کی وصیت کو مانو کہ یہ تمہارے ہاتھوں میں قید ہیں، تم سوا اس کے کسی اور بات کا حق نہیں رکھتے، لیکن یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا کام کریں، اگر ایسا کریں، تو ان کو خواب گاہ میں علیحدہ کر دو اور ان کو ہلکی مار مارو، تو اگر تمہاری بات مان لیں تو پھر ان پر الزام لگانے کے پہلو نہ ڈھونڈو، بیشک تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے، تمہارا حق تمہاری عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر کو دوسروں سے پامال نہ کرائیں جن کو تم پسند نہیں کرتے اور نہ تمہارے گھروں میں ان کو آنے کی اجازت دیں، جن کا آنا تم کو پسند نہیں، اور ہاں! ان کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کے پہنانے اور کھلانے میں نیکی کرو۔'' [2]

ایک اور موقع پر ایک شخص نے آکر دریافت کیا کہ یارسول اللہ! بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے؟ فرمایا: ''جب خود کھائے تو اس کو کھلائے، جب خود پہنے تو اس کو پہنائے، نہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے، نہ اس کو برا بھلا کہے

[1] سنن ابن ماجه، ابواب النكاح، باب افضل النساء: ١٨٥٧۔

[2] سنن ابن ماجه، ابواب النكاح، باب حق المرأة على الزوج: ١٨٥١۔

اورنہ گھر کے علاوہ اس کی سزا کے لیے اس کو علیحدہ کرے۔'' ❶ دوسری طرف آپ ﷺ نے عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے شوہروں کی پوری اطاعت کریں، یہاں تک فرمایا کہ ''اگر اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کا میں کسی کو حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔'' ❷ آپ ﷺ نے یہ طریقہ تعبیر شوہر کی اطاعت کی اہمیت کے لیے اختیار فرمایا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام میں اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز نہیں۔

ایک مشہور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((خیر کم خیر کم لاھله)) ❸

''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لیے سب سے بہتر ہے۔''

((خیار کم خیار کم لنساء ھم)) ❹

''تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لیے بہترین ہیں۔''

انسان کے بہتر اور خوب ہونے کی یہ ایک ایسی پہچان بتا دی گئی ہے کہ اس آئینہ میں ہر شخص اپنا چہرہ آپ دیکھ سکتا ہے، جو اپنوں کے ساتھ انصاف اور احسان نہیں کر سکتا وہ دوسروں کے ساتھ کیا کر سکتا ہے، کیونکہ نیکی گھر سے شروع ہونی چاہیے۔

ایک صحابی بڑے عابد و زاہد تھے، لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کا یہ حال سنا تو ان کو بلوا کر فرمایا:

((ولزوجك علیك حقًا)) ❺

''اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔''

اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں بیویوں کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی، وہ ہر وقت معمولی قصوروں پر ماری پیٹی جا سکتی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''ایک دفعہ میں نے اپنی بیوی کو ڈانٹا تو اس نے بھی برابر کا جواب دیا، پھر وہ کہتے ہیں کہ ''ہم لوگ اسلام سے پہلے عورتوں کو کسی شمار و قطار میں نہیں سمجھتے تھے، اسلام آیا تو اس نے ان کے بارہ میں احکام اتارے اور ان کے حق مقرر کیے''۔ ❻

اسلام نے ان کی قدر و منزلت کو یہاں تک بڑھایا کہ ان کو قانوناً مردوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا اور آپس کے قانونی حقوق میں ان کو برابر کا درجہ عطا کیا، البتہ اخلاقاً رتبہ میں مردوں کو تھوڑی سی اعزازی برتری

❶ سنن ابن ماجه، ابواب النکاح، باب حق المرأة علی الزوج: ۱۸۵۰۔ ❷ ابن ماجه، ابواب النکاح، باب حق الزوج علی المرأة: ۱۸۵۲۔ ❸ ترمذی، ابواب المناقب، باب فضل زواج النبی ﷺ: ۳۸۹۵؛ ابن ماجه، ابواب النکاح، باب حسن معاشرة النسآء: ۱۹۷۷؛ دارمی: ۲۲۶۰۔ ❹ ترمذی، ابواب الرضاع، باب ما جاء فی حق المرأة علی زوجها: ۱۱۶۲۔ ❺ صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب حق الجسم فی الصوم: ۱۹۷۵۔ ❻ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب موعظة الرجل ابنته لحال زوجها: ۵۱۹۱ وکتاب التفسیر، سورة التحریم: ۴۹۱۳۔

دی گئی، ارشاد ہوا:

﴿ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۸)

''اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے، جیسا مردوں کا عورتوں پر اور مردوں کو ان پر ایک منزلت حاصل ہے۔''

لیکن یہ منزلت بھی ان کو بے وجہ نہیں دی گئی ہے، یہ اس لیے ہے، تاکہ وہ عورتوں کی نگرانی اور نگہبانی کا فرض انجام دے سکیں، یعنی وہ گویا اپنی گھریلو عدالت کے اعزازی صدر بنائے گئے ہیں، یہ نکتہ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ اوپر کی آیت میاں بیوی کے خانگی جھگڑوں کے دور کرنے کے سلسلہ میں ہے، گھر کے روزمرہ کے مناقشوں کا فیصلہ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ دونوں کے قانونی حقوق یکساں ماننے کے ساتھ شوہر کو اعزازی فوقیت کا مرتبہ دیا جائے، تاکہ وہ اپنے گھر کے نظام کو اچھی طرح چلا سکے۔

اس اعزازی منصب کے لیے شوہر کا انتخاب بھی بے وجہ نہیں، قرآن پاک نے اس کی مصلحتیں بھی بتا دی ہیں، فرمایا:

﴿ الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ۚ ﴾ (۴/ النسآء:۳۴)

''مرد عورتوں کے نگران ہیں، اس سبب سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے اور اس لیے کہ انھوں نے اپنا مال خرچ کیا۔''

یعنی مردوں کی اس اعزازی ترجیح کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور سے مردوں کو عورتوں پر جسم و طاقت اور عقل و فراست وغیرہ میں جسمانی و ذہنی فوقیت اور بڑائی عطا کی ہے، طبی تحقیقات، انسانیت کی پوری تاریخ اور روزانہ کے مشاہدے دم بدم اس کی تائید میں ہیں، اس لیے اسی کو اس صدارت کا حق فطرۃً ملنا چاہیے، دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دین مہر، نان و نفقہ اور پرورش اولاد وغیرہ خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے اور وہی اس بوجھ کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہے، اس لیے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدر نشین بنایا جائے، تاکہ گھر کا نظام درست اور آپس میں تعلقات کی خوشگواری قائم رہے۔

اکثر عورتوں میں ضد اور ہٹ ہوتی ہے، جو شاید ان کی فطری کمزوری یا عدم تربیت کا نتیجہ ہو، بعض مرد یہ چاہتے ہیں کہ ان کی ضد اور ہٹ کے مقابلہ میں سختی اور درشتی سے کام لے کر ان کی یہ ٹیڑھ نکال دیں، آپ ﷺ نے ان کو ایک نہایت عمدہ تشبیہ دے کر نصیحت فرمائی کہ ''عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو، کہ ان کی پیدائش ٹیڑھی پسلی سے ہوئی جس سے اس کے اسی ٹیڑھا پن کے ساتھ تم کام لے سکو تو لے سکتے ہو اور اگر

اس کے سیدھی کرنے کی فکر کرو تو تم اس کو توڑ ڈالو گے۔'' [1] آپ نے مردوں کو بیویوں کے معاملہ میں خوش اور قانع وراضی رہنے کا ایک نہایت عمدہ نسخہ بتایا، فرمایا: ''اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو، کہ غور کرو گے تو اس میں کوئی دوسری اچھی بات بھی نکل آئے گی''۔ [2] یہ نصیحت حقیقت میں قرآن پاک کی اس آیت کی تعمیل ہے:

﴿ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴾ (٤/ النسآء: ١٩)

''اور بیویوں کے ساتھ معقول طریقہ سے گزران کرو، اگر تم کو وہ نہ بھائیں تو ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ آئے اور اللہ نے اس میں بہت خوبی رکھی ہے۔''

اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیتوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، خانگی اور بیرونی، خانگی مشغولیتوں کی ذمہ داری عورت پر اور بیرونی مشغولیتوں کا بارگراں مرد کے کندھوں پر رکھا ہے اور اس طرح انسانی زندگی کے اندرونی اور بیرونی کاموں کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون، موالات، اور یک جہتی کے ستونوں پر قائم کیا ہے، اپنے لیے خود روزی کمانا اور سرمایہ بہم پہنچانا عورت کا نہیں، بلکہ مرد کا فرض قرار دیا ہے اور مرد پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ عورت کے نان ونفقہ اور ضروریات کا کفیل ہو، اگر وہ ادا نہ کرے تو حکومت وقت کے ذریعہ عورت کو اس کی وصولی کا حق حاصل ہے، [3] اور اگر اس پر بھی مرد نہ دے تو بیوی کو اس سے علیحدگی کے دعویٰ کا اختیار حاصل ہے، انتہا یہ ہے کہ خاص خاص حالات میں عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے، جس کی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں۔

اگر کوئی مرد بخالت سے اپنی بیوی اور اولاد کی جائز ضرورتوں کے لیے اپنی حیثیت سے کم دے تو عورت کو حق ہے کہ وہ شوہر کی لاعلمی میں اس کی دولت سے اس کی حیثیت کے مطابق بقدر ضرورت لے لیا کرے، فتح مکہ کے دن ابوسفیان کی بیوی ہند آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں آ کر عرض پرداز ہوئی کہ یارسول اللہ ﷺ! ابوسفیان بخیل آدمی ہیں، وہ مجھے میری اور میرے بچوں کی ضرورت سے کم دیا کرتے ہیں، لیکن یہ کہ میں ان کے مال میں سے ان کی لاعلمی میں کچھ لے لوں، فرمایا: ''تم قاعدہ کے مطابق اتنا لے سکتی ہو، جو تم کو اور تمہارے بچوں کو کافی ہو''۔ [4]

ایک مشہور حدیث ہے جس میں مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی ذمہ داری چند ایسے مختصر لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے، جن کی تفصیل ایک دفتر میں سما سکتی ہے، فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک اپنی رعایا کا نگہبان ہے اور تم

[1] صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب الوصاۃ بالنسآء: ٥١٨٦؛ مسلم، کتاب النکاح، باب الوصیة بالنسآء: ٣٦٤٣۔ [2] مسلم، کتاب النکاح، باب الوصیة بالنساء: ٣٦٤٥۔ [3] اس اختیار کی تشریح میں فقہاء مختلف ہیں تفصیلات کیلئے فقہ کی کتابوں میں کتاب النفقہ دیکھنا چاہیے نیز دیکھو نیل الاوطار شوکانی، ج٦، ص: ٢٦٣ مصر۔

[4] صحیح بخاری، کتاب النفقات، باب اذالم ینفق الرجل ...: ٥٣٦٤۔

میں سے ہر ایک سے اس کی نسبت باز پرس ہوگی..... مرد اپنی بیوی بچوں کا رکھوالا ہے، اس سے اس کی پوچھ ہو گی اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے، اس سے اس کی پوچھ ہوگی۔'' (بخاری باب: ﴿قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ﴾) نبوت کے ان دو معجزانہ فقروں میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا۔

مرد کو کس عورت کو مارنے کا اختیار دیا گیا ہے

قرآن پاک میں ایک آیت ہے جس میں مرد کو اختیار دیا گیا ہے کہ بعض حالتوں میں وہ عورت کو مار پیٹ بھی سکتا ہے، وہ آیت یہ ہے:

﴿وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ﴾ (٤/ النسآء :٣٤)

''اور جن بیویوں کے ''نشوز'' کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ اور خواب گاہوں میں ان سے علیحدگی برتو اور ان کو مارو، تو اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں، تو پھر ان پر راہ مت تلاش کرو۔''

لغت میں ''نشوز'' کے معنی ''اٹھ جانے'' کے ہیں اور عورت کے حق میں اس کے اصطلاحی معنی جو ہیں وہ مفسر ابن جریر طبری کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں:

ومعنى ذالك اذا رأيتم منهنّ ما تخافون ان ينشزن عليكم من نظر الى مالا ينبغي لهنّ ان ينظرن اليه ويدخلن ويخرجن واستر بتم بامرهن۔ ❶

''اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم ان عورتوں کی وہ حالت دیکھو جس سے تم کو ان کے ''نشوز'' کا ڈر ہو، یعنی ادھر دیکھنا جدھر ان کو دیکھنا نہیں چاہیے اور وہ آئیں اور نکل جائیں اور تم کو ان کی بابت شک ہو جائے۔''

عن محمد بن كعب القرظي اذارای الرجل تقصيرها في حقه في مدخلها ومخرجها قال يقول لها بلسانه قد رأيتك منك كذاوكذا فانتهي. ❷

''محمد بن کعب قرظی سے ہے کہ جب مرد دیکھے کہ عورت (گھر) سے باہر آنے جانے میں اس کے حق میں قصور کر رہی ہے تو اس سے زبان سے کہے کہ میں نے تجھ سے یہ حرکت دیکھی، یہ دیکھی تو اب باز آجا۔''

فقہ کی کتابوں میں ہے:

الناشزة هي الخارجة عن منزل زوجها المانعة نفسها منه. ❸

''نشوز والی عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کے گھر سے باہر نکل جائے اور اپنے آپ کو اس کے

❶ تفسیر طبری:٥، ص:٣٨۔ اصل متن تفسیر میں واستبریتم غلط چھپا ہے۔ ❷ ایضًا۔
❸ عالمگیری، نفقات، ج١، ص: ٥٤٥۔

سپرد نہ ہونے دے۔"

غرض یہ کہ ناشزہ عورت وہ ہے جس میں بداخلاقی کی بعض مشتبہ علامتیں پائی جائیں۔

کچھ مفسروں نے اس کو اور وسعت دی ہے اور بتایا ہے کہ ناشزہ وہ عورت ہے جو اپنے شوہر پر بلندی چاہے اس کا حکم نہ مانے، اس سے بے رخی کرے اور اس سے بغض رکھے۔ (تفسیر ابن کثیر)

میرے خیال میں یہ دونوں تفسیریں درست ہیں اور درحقیقت پوری آیت پڑھنے سے نشوز کے معنی آپ کھل جاتے ہیں، آیت مذکور پوری یہ ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۭ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ ﴾

(٤/ النسآء: ٣٤)

"مرد عورتوں کے نگران ہیں (ایک) اس لیے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے، اور (دوسرے) اس لیے کہ مرد اپنا مال (ان پر) خرچ کرتے ہیں، تو نیک بیویاں فرمانبردار ہوتی ہیں اور (شوہر کے) پیٹھ پیچھے (شوہر کے گھر بار اور عزت [1] وآبرو کی) حفاظت کرتی ہیں، کہ اللہ نے ان کی (یعنی عورتوں کی) حفاظت کی ہے اور جن کے نشوز کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ اور ان کو خواب گاہوں میں علیحدہ کر دو اور ان کو مارو، تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں تو پھر ان پر راستہ تلاش نہ کرو۔"

اس آیت پاک میں مرد کی ترجیح کی جو دو باتیں بیان کی ہیں، ان کے نتیجہ پر یہ فرمایا ہے کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو اپنے شوہروں کی فرمانبردار ہیں اور ان کے پیٹھ پیچھے ان کے گھر بار اور عزت وآبرو کی حفاظت کرتی ہیں، اس کے بعد ہے کہ اب جس عورت سے تمہیں "نشوز" کا ڈر ہو تو اس کو پہلے سمجھاؤ، نہ مانے تو خلوت میں اس سے کنارہ کرو، یا اس سے بات کرنا چھوڑ دو، اس پر بھی نہ مانے تو اس کو ذرا مارو، اب بھی اگر کہا مان لے تو پھر اس کو ستانے یا طلاق وغیرہ دینے کے لیے حیلہ اور بہانہ مت ڈھونڈو۔ اب جب اوپر یہ بتایا جا چکا کہ مردوں کو عورتوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کا حق حاصل ہے، پھر یہ بھی کہا جا سکتا کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو شوہروں کی فرمانبردار ہیں اور شوہروں کے پیچھے ان کے گھر بار، مال ودولت اور عزت وآبرو کی حفاظت کرتی ہیں اور اس کے بعد یہ ہے کہ اگر تمہیں عورت کے نشوز کا ڈر ہو تو یہ یہ کرو، اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا نشوز یہ ہے، کہ اس کے جو دو فرض پہلے بتائے گئے ہیں، یعنی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر کے پیچھے اس کے گھر بار اور عزت وآبرو

[1] اس آیت کی یہ تفسیر قرآن پاک کے ارشادات اور احادیث کی تصریحات سے معلوم ہوتی ہے۔

کی حفاظت، جو عورت ان دونوں کو یا ان دونوں میں سے کسی ایک فرض کو بھی ادا نہیں کرتی وہی ناشزہ ہے اور ایسی ہی عورت کو تنبیہ کی اجازت دی گئی ہے۔

''شوہر کی عزت و آبرو کی حفاظت'' کے الفاظ سے جس طرف اشارہ ہے، اس کی تصریح احادیث میں موجود ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''سب سے بہتر عورت وہ ہے کہ جب مرد اس کو دیکھے تو خوش ہو جائے اور جب کوئی حکم دے تو وہ مان لے اور جب شوہر گھر پر موجود نہ ہو تو وہ اپنی جان اور اس کے مال کی حفاظت کرے۔'' اپنی جان کی حفاظت سے مقصود عفت و عصمت ہے۔

حجۃ الوداع کے خطبہ میں عورتوں کے حقوق کی نسبت آنحضرت ﷺ کے جو فقرے ہیں، ان میں نشوز کے اس معنی کی پوری تصریح ہے صحیح مسلم میں ہے:

((فاتقوا اللّٰہ فی النساء فانکم اخذتموھن بامان اللّٰہ ولکم علیھن ان لا یوطئن فرشکم احدًا تکرھونہ فان فعلن فاضربو ھن ضربًا غیر مبرح)) [1]

''عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، کہ وہ تمہارے بس میں ہیں، تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستر کو کسی سے نہ روندوائیں، جس کو تم ناپسند کرتے ہو، اگر وہ ایسا کریں تو ان کو اتنا مارو جو تکلیف دہ نہ ہو۔''

ابن ماجہ میں یہ الفاظ ہیں:

((استوصوا بالنساء خیرا فانھن عندکم عوان لیس تملکون منھن شیئًا غیر ذالك الا ان یأتین بفاحشۃ مبینۃ فان فعلن فاھجروھن فی المضاجع واضربوھن ضربًا غیر مبرح فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن سبیلاً)) [2]

''عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کے بارہ میں میری وصیت کو قبول کرو، وہ تمہارے قبضہ میں ہیں، تم کو اس کے سوا ان پر کوئی اختیار نہیں، مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی کا کام کریں، تو اگر ایسا کریں تو ان کو خوابگاہوں میں علیحدہ کر دو اور ان کو اتنا ہی مارو جو تکلیف دہ نہ ہو، تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں تو ان پر کوئی راستہ نہ ڈھونڈو۔''

شوہر کے بستر کو روندوانے کا کنایہ اس طرف ہے، کہ ایسے لوگ اس کے گھر میں آنے جانے نہ پائیں جن کا آنا جانا شوہر کو ناگوار یا مشکوک معلوم ہو اور ''کھلی بے حیائی'' سے جدھر اشارہ ہے وہ چھپا نہیں، لیکن بعض نے اس میں بھی توسیع کی ہے، یعنی عورت کی نافرمانی اور بدزبانی اور مشتبہ چال چلن [3] سب کو فاحشہ مبینہ کی

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبی ﷺ: ۲۹۵۰۔ [2] سنن ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب حق المراۃ علی الزوج: ۱۸۵۱۔ [3] یہ پیش نظر رہے کہ یہ خانگی سزا صرف مشکوک و مشتبہ حالت میں عورت کی اصلاح کے لیے ہے، اور نہ ثبوت کی صورت میں اس جرم کی سزا سنگساری یا تازیانہ ہے جس کا اجرا قاضی کا فرض ہے۔

تفسیر میں داخل کیا ہے، (تفسیر سورۂ نساء رکوع ۲)

الغرض آخری درجہ پر عورت کی تنبیہ کی یہ اجازت خاص حالات میں ہے اور شرع کی تصریح ہے کہ یہ ''ضرب غیر مبرح'' یعنی ایسی مار ہو جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان نہ پہنچے، بلکہ یہاں تک تصریح ہے کہ اس سے مقصود مسواک وغیرہ سے مارنا ہے۔ ❶ جس سے تنبیہ کے سوا کوئی چوٹ نہیں آ سکتی، ورنہ عورتوں کو عام طور سے یوں مارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے، یہ زمانہ جاہلیت کا دستور تھا، جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے، ایاس بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ حکم دیا کہ ''اللہ کی بندیوں (اپنی بیویوں) کو مارا نہ کرو'' تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! بیویاں اپنے شوہروں پر دلیر ہو گئیں تو آپ ﷺ نے مارنے کی رخصت عطا کی، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں اہلِ بیتِ نبوی کے سامنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئیں، یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: ''آلِ محمد کے گرد بہت سی عورتیں چکر کاٹتی رہیں جو اپنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئی تھیں، یہ (یعنی بیویوں سے ایسی بدسلوکی کرنے والے) تم میں سے اچھے لوگ نہیں۔'' ❷

ایک صحابیہ نے اپنے نکاح کے متعلق آپ سے مشورہ لیا اور ایک شخص کے پیغام کا ذکر کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے نیچے نہیں اتارتا''۔ ❸ یعنی وہ مار پیٹ کیا کرتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوتا رہتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے اس کے اس فعل کو ناپسند فرمایا۔

ایک صحابی نے آ کر شکایت کی کہ یا رسول اللہ! میری بیوی بدزبان ہے۔ فرمایا: ''طلاق دے دو۔'' عرض کی، اس سے میری اولاد ہے اور مدت سے میرے ساتھ ہے، فرمایا: ''تو اس کو سمجھایا کرو، اس میں صلاحیت ہوگی تو قبول کرے گی، لیکن اپنی بیوی کو لونڈی کی طرح مارا نہ کرو''۔ ❹ ایک دوسرے موقع پر فرمایا: ''کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے نہ مارا کرے، یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ایک وقت کوڑے مارے اور دوسرے وقت اس سے ہم بستر ہو''۔ ❺

---

❶ تفسیر طبری، ج ٥، ص: ٤١، مصر۔ ❷ ابوداود، کتاب النکاح، باب فی ضرب النساء: ٢١٤٦؛ ابن ماجه، کتاب النکاح، باب ضرب النساء: ١٩٨٥؛ سنن الکبری للنسائی، کتاب عشرة النساء: ٩١٢٢۔

❸ صحیح مسلم، باب المطلقة البائن: ٣٧١٢۔

❹ ابو داود، کتاب الطهارة، باب فی الاستنثار: ١٤٢۔

❺ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب ما یکره من ضرب النساء: ٥٢٠٤ ومسلم: ٧١٩١۔

اہل قرابت کے حقوق

ماں باپ، اولاد اور زن وشو کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے اہل قرابت کا حق ہے، عربوں کے محاورہ میں اس کا نام ''صلۂ رحم'' ہے، محمد رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیم میں صلۂ رحم اور حقوق قرابت کی اہمیت دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے، یہی سبب ہے کہ وحی محمدی ﷺ میں اس کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے، قرآن پاک میں کم از کم بارہ آیتوں میں اس کی صریح تاکید ہے اور اس کو انسان کا احسان نہیں، بلکہ اس کا فرض اور حق بتایا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ ﴾ (۳۰/ الروم:۳۸)

''تو قرابت دار کو اس کا حق ادا کر۔''

﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآءیل:۲٦)

''اور قرابت والے کو اس کا حق ادا کر۔''

دوسری جگہ یہ تصریح فرمائی کہ مال و دولت کی محبت اور ذاتی ضرورت اور خواہش کے باوجود صرف اللہ کی مرضی کے لیے تکلیف اٹھا کر اپنے قرابت مندوں کی امداد اور حاجت روائی اصلی نیکی ہے۔

﴿ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

''(اور اصل نیکی اس کی ہے جس نے......) اور مال کو اس کی محبت پر قرابت مندوں کو دیا۔''

والدین کے بعد اہل قرابت ہی ہماری مالی امداد کے مستحق ہیں، فرمایا:

﴿ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱۵)

''فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے......''

ماں باپ کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اللہ تعالیٰ کے ان خاص احکام میں ہے، جن کا انسان سے عہد لیا گیا:

﴿ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۳)

''(اور بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا کہ اللہ ہی کو پوجنا) اور ماں باپ اور رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرنا۔''

سورۂ نحل میں اہل قرابت کی امداد کو عدل اور احسان کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى ﴾ (۱٦/ النحل:۹۰)

''بے شک اللہ انصاف اور حسن سلوک اور قرابتدار کو دینے کا حکم کرتا ہے۔''

ایک مسلمان کی دولت کے بہترین مستحق والدین کے بعد اس کے قرابت والے ہیں، فرمایا:

﴿ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ ﴾

(۲/ البقرۃ: ۲۱۵)

''کہہ دے اے پیغمبر (ﷺ)! کہ فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ اپنے ماں باپ، قرابت والوں، یتیموں اور غریبوں کے لیے۔''

اگر کسی قرابت مند سے کوئی قصور ہو جائے تو اہل دولت کو زیبا نہیں کہ وہ اس کی سزا میں اپنی امداد کا ہاتھ اس سے روک لیں، ارشاد ہوا:

﴿ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ ﴾

(۲۴/ النور: ۲۲)

''اور جو لوگ تم میں بڑائی اور کشائش والے ہوں وہ قرابت مندوں اور محتاجوں کے دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں۔''

اللہ کی خالص عبادت اور توحید اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کے بعد تیسری چیز اہل قرابت کے ساتھ نیکی ہے، فرمایا:

﴿ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى ﴾ (۴/ النسآء: ۳۶)

''اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا ساتھی نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت والے کے ساتھ نیکی کرنا۔''

حق قرابت کو اسلام میں وہ اہمیت حاصل ہے کہ داعی اسلام ﷺ اپنی ان تمام محنتوں، زحمتوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کا جو تبلیغ اور دعوت حق میں ان کو پیش آئیں اور اپنے اس احسان و کرم کا جو ہدایت، تعلیم اور اصلاح کے ذریعہ ہم پر فرمایا بدل، معاوضہ اور مزدوری اپنی امت سے یہ طلب فرماتے ہیں، کہ رشتہ داروں اور قرابت مندوں کا حق ادا کرو اور ان سے لطف و محبت سے پیش آؤ، فرمایا:

﴿ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾ (۴۲/ الشورٰی: ۲۳)

''کہہ اے پیغمبر (ﷺ)! کہ میں تم سے اس پر بجز اس کے کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ ناتے میں محبت اور پیار کرو۔''

عربی زبان میں قرابت کا حق ادا کرنے کو وصلِ رحم (رحم ملانا) کہتے ہیں، اسی لفظ کی دوسری معروف شکل قطع رحم (رحم کاٹنا) کہتے ہیں، کہ رحم مادری ہی تعلقات قرابت کی جڑ ہے، کسی امر میں دو انسانوں کا اشتراک ان کے باہمی تعلقات اور حقوق محبت و اعانت کی اصلی گرہ ہے، یہ اشتراک کہیں ہم عمری، کہیں ہمدرسی، کہیں ہمسایگی، کہیں ہم مذاقی، کہیں ہم پیشگی، کہیں ہم وطنی، کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں

ہوتا ہے، اس اشتراک کے عقد محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لیے جانبین پر حقوق کی نگہداشت اور فرائض محبت کی ادائیگی واجب ہے، لیکن ان تمام بندھ کر ٹوٹ جانے والے اشتراکوں سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطن، رحم مادر ہے، یہ ہم رحمی خالقِ فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے، جو متفرق انسانی ہستیوں کو خاص اپنے دستِ قدرت سے باندھ کر ایک کر دیتی ہے اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے، اس لیے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ان لوگوں کو جو محبت کی اس فطری گرہ کو توڑنے کی کوشش کریں وحی محمدی نے ''فاسق'' کا خطاب دیا ہے اور ان کو ضلالت کا مستحق ٹھہرایا ہے:

﴿ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ ﴾ (٢/ البقرۃ: ٢٦-٢٧)

''اس سے وہ انہی کو گمراہ کرتا ہے، جو حکم نہیں مانتے جو اللہ کا عہد باندھ کر توڑتے ہیں اور اللہ نے جسکے جوڑنے کو کہا، اس کو کاٹتے ہیں۔''

ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے انسانوں کی اسی فطری گرہ کی تشریح استعارہ کے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ رحم (شکم مادر کا نام) رحمٰن (اللہ) سے مشتق ہے، اس لیے محبت والے اللہ نے رحم کو خطاب کر کے فرمایا کہ ''جس نے تجھ کو ملایا، اس کو میں نے ملایا، جس نے تجھ کو کاٹا اس کو میں نے کاٹا۔'' [1] اسی مفہوم کو استعارہ کے اور گہرے رنگ میں آنحضرت ﷺ نے یوں ادا فرمایا کہ ''رحم انسانی عرش الٰہی کو پکڑ کر کہتا ہے: جو مجھے ملائے اس کو اللہ ملائے اور جو مجھے کاٹے اس کو اللہ کاٹے۔'' [2] ایک اور موقع پر آنحضرت ﷺ نے حسنِ تعبیر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار فرمایا، ارشاد ہوا کہ ''جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو رحم انسانی نے اس رحمت والے اللہ کا دامن (اصل میں حقوہ ہے) تھام لیا، اللہ نے فرمایا: ٹھہر جا! یہ اس کا مسکن ہو گا جو تیری گرہ کاٹنے سے بچے گا، کیا تو اس سے خوش نہیں کہ جو تجھ کو ملائے اس کو میں اپنے سے ملاؤں، جو تجھ کو کاٹے اس کو میں اپنے سے کاٹوں''۔ [3] یعنی رحم مادر اور اس رحمٰن کے رحم (و کرم) کے درمیان حرفوں کا یہ اشتراک، محبت کے معنوی اشتراک کے بھید کو فاش کرتا ہے اور اس سے وہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے جو اسلام کی نظر میں اہلِ قرابت کی ہے۔

رحم اور رحمٰن کے اس جوڑ کی طرف خود قرآن پاک کی ایک آیت میں بھی اشارہ ہے، سورۂ نساء میں فرمایا:

﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ ﴾ (٤/ النسآء: ١)

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من وصل وصله الله: ٥٩٨٨، ٥٩٨٩۔

[2] صحیح بخاری، ایضا ومسلم، کتاب البر والصلة: ٦٥١٩۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الادب: ٥٩٨٧ ومسلم، کتاب البر والصلة: ٦٥١٨۔

"اور جس اللہ کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے درخواست کرتے ہو اس کا اور رشتوں کا خیال رکھو۔"

اس آیت پاک کی تشریح ذیل کی حدیث سے سمجھئے:

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جو مجھے جنت میں لے جائے، فرمایا: "اللہ کی بندگی کرو، کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ، نماز پوری طرح ادا کرو، زکوٰۃ دو اور قرابت کا حق (صلہ رحم) ادا کرو۔" [1]

جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت نے فرمایا کہ "جو صلۂ رحمی یعنی قرابت کا حق ادا نہ کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔" [2] (یعنی جنت میں اس کا داخلہ اس وقت تک رکا رہے گا، جب تک اس کا یہ گناہ معاف نہ ہو لے گا، یا وہ اس گناہ سے پاک نہ ہو چکے گا)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ "جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہیے کہ صلۂ رحمی کرے۔" [3] اس حدیث کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان نیک اعمال کا اثر اللہ نے یہ رکھا ہے کہ اس سے مال و دولت میں فراخی اور عمر میں زیادتی ہوتی ہے، کیونکہ صلہ رحم کی دو ہی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ضرورت مند رشتہ داروں کی مالی مدد کی جائے، دوسری یہ کہ اللہ کی دی ہوئی عمر میں سے کچھ حصہ ان کی خدمت میں صرف کیا جائے، پہلے کا نتیجہ اللہ کی طرف سے مالی وسعت اور کشادگی اور دوسرے کا نتیجہ عمر میں برکت اور زیادتی کی صورت میں ملتا ہے۔

اس حدیث کی تشریح مادی توجیہ سے بھی کی جا سکتی ہے، انسان کے خانگی افکار اور خاندانی جھگڑے بہت کچھ اس کے لیے اضمحلال، تکدر اور دلی پریشانی کا سبب ہوتے ہیں، لیکن جو لوگ اپنے خاندان والوں کے ساتھ نیکی کے برتاؤ صلہ رحم اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں، ان کی زندگی میں خانگی مسرت، انشراح اور طمانیت خاطر رہتی ہے، جس کی وجہ سے ان کی دولت اور عمر دونوں میں برکت اور زیادتی ہوتی ہے، ترمذی میں یہ حدیث ان لفظوں میں ہے: "صلۂ رحم سے قرابت والوں میں محبت، مال میں کثرت اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔" [4]

احادیث میں اس کی بھی تصریح ہے کہ صلۂ رحم کا کمال یہ نہیں ہے کہ جو بدلہ کے طور پر صلہ رحم کا جواب صلہ رحم سے دے بلکہ یہ ہے کہ جو قطعِ رحم کرتا ہے، اس کے ساتھ صلۂ رحم کیا جائے، [5] یعنی جو قرابت کا حق ادا نہیں کرتے ہیں، ان کا حق ادا کیا جائے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب فضل صلة الرحم: ۵۹۸۳۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب اثم القاطع: ۵۹۸۴۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من بسط له فی الرزق لصلة الرحم: ۵۹۸۵، ۵۹۸۶۔

[4] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی تعلیم النسب: ۱۹۷۹۔

[5] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب لیس الواصل بالمکافی: ۵۹۹۱۔

ہمسایہ کے حقوق

ہمسایہ اور پڑوسی وہ دو آدمی ہیں، جو ایک دوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہیں، انسانیت اور اس کے تمدن کی بنیاد باہمی اشتراک عمل، تعاون اور موالات پر قائم ہے، اس دنیا میں ہر انسان دوسرے انسان کی مدد کا محتاج ہے، اگر ایک بھوکا ہے تو دوسرے پر حق ہے کہ اپنے کھانے میں سے اس کو بھی کھلائے، اگر ایک بیمار ہے تو جو تندرست ہو اس کی تیمارداری کرے، ایک پر اگر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا اس کا شریک اور ہمدرد بنے اور اس اخلاقی نظام کے ساتھ انسانوں کی مجموعی آبادی، باہمی محبت اور حقوق کی ذمہ داریوں کی گرہ میں بندھ کر ایک ہو جائے، ہر انسان بظاہر جسمانی اور مادی حیثیت سے جتنا ایک دوسرے سے علیحدہ اور بجائے خود مستقل ہے، اخلاقی اور روحانی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے سے ملا ہو اور ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے اتنا ہی پیوستہ ہو، اسی لیے ہر مذہب نے ان دونوں انسانوں پر جو ایک دوسرے کے قریب آباد ہوں، آپس کی محبت اور امداد کی ذمہ داری رکھی ہے کہ وہی وقت پر اور دن سے پہلے ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ انسان کو اسی سے تکلیف اور دکھ پہنچنے کا اندیشہ بھی زیادہ ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، اس لیے ان کے باہمی تعلقات خوشگوار اور ایک کو دوسرے سے ملائے رکھنا ایک سچے مذہب کا سب سے بڑا فرض ہے، تاکہ برائیوں کا سدباب ہو کر یہ پڑوس دوزخ کے بجائے بہشت کا نمونہ ہو اور ایک دوسرے کی محبت اور مدد پر بھروسہ کر کے باہر نکلے اور گھر میں قدم رکھے۔

اسلام نے انہی اصولوں کو سامنے رکھ کر ہمسائیگی کے حقوق کی دفعات بنائی ہیں، عربوں میں دوسری قوموں سے زیادہ اسلام سے پہلے بھی پڑوس اور ہمسائیگی کے حقوق نہایت اہم تھے، بلکہ وہ عزت اور افتخار کا موجب تھے، اگر کسی عرب کے پڑوسی پر کوئی ظلم ہو جائے تو وہ دوسرے پڑوسی کے لیے بے غیرتی اور عار کا موجب تھا اور اس لیے اس کی خاطر لڑنے مرنے کو وہ اپنی شرافت کا نشان سمجھتا تھا، اسلام نے آ کر عربوں کے اس احساس کو چند ترمیموں اور اصلاحوں کے ساتھ اور زیادہ قوی کر دیا۔ وحی محمدی ﷺ نے ہمسایہ کے پہلو بہ پہلو ایک اور قسم کے ہمسایہ کو جگہ دی ہے، جس کو عام طور سے پڑوسی اور ہمسایہ نہیں کہتے، مگر وہ ہمسایہ ہی کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے، جیسے ایک سفر کے دو رفیق، ایک مدرسہ کے دو طالب علم، ایک کارخانہ کے دو ملازم، ایک استاد کے دو شاگرد، ایک دوکان کے دو شریک، کہ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی ہمسائیگی ہے اور اس کا دوسرا نام رفاقت اور صحبت ہے، ان سب قسموں کے ہمسایوں میں تقدم اس کو حاصل ہے، جس کو ہمسایہ ہونے کے علاوہ قرابت، یا ہم مذہبی کا، یا کوئی اور دوہرا تعلق بھی ہو، قرآن پاک نے یہ تصریح پوری طرح کی ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ ﴾ (٤/ النساء: ٣٦)

”(اور اللہ نے) ہمسایہ قریب اور ہمسایہ بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ (نیکی کا حکم دیا ہے)۔“

اس "قریب" اور "بیگانہ" کے معنوں میں اہل تفسیر نے اختلاف کیا ہے، ایک کہتا ہے کہ "قریب کے" معنی رشتہ دار و عزیز اور "بیگانہ" کے معنی غیر اور اجنبی کے ہیں، دوسرے کی رائے ہے کہ "نزدیک" کے معنی ہم مذہب کے ہیں اور "دور" سے مطلب دوسرے مذاہب والے ہیں، جیسے یہودی، عیسائی، مشرک وغیرہ، ❶ لیکن حقیقت میں یہ اختلاف بے معنی ہے، تعلیم محمدی ﷺ کا منشا یہ ہے کہ پڑوسیوں اور ہمسایوں میں ان کو ترجیح دی جائے گی، جن کے ساتھ اس پڑوس اور ہمسائیگی کے علاوہ محبت اور رابطہ کا کوئی دوسرا تعلق بھی موجود ہو، وہ خواہ قرابت اور عزیز داری ہو، یا ہم مذہبی ہو، یا کسی اور قسم کی رفاقت ہو، بہر حال حق کے ساتھ دوہرے تعلقات کو اکہرے تعلق پر ترجیح حاصل ہے۔

اس حکم الٰہی کی تفسیر آنحضرت ﷺ نے مختلف طریقوں سے فرمائی، سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ ﷺ نے اس کو ایمان کا براہ راست اثر اور نتیجہ فرمایا، ایک دن صحابہ کے مجمع میں آپ تشریف رکھتے تھے، کہ ایک خاص دلنشین انداز سے فرمایا: "اللہ کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، اللہ کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، اللہ کی قسم وہ مومن نہ ہوگا"۔ جان نثاروں نے پوچھا: کون؟ یارسول اللہ ﷺ! فرمایا: "وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں"۔ ❷ ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: "جو اللہ اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے"۔ ❸ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص اللہ اور روز جزا پر اعتقاد رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے"۔ ❹

ایک اور موقع پر اس کو تقرب الٰہی کا ذریعہ ظاہر کیا، ارشاد فرمایا: "اللہ کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہے اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہے۔" ❺ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تعلیم کی غرض سے ان سے فرمایا کہ "جبریل علیہ السلام نے مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کی کہ میں سمجھا کہ کہیں ان کو وراثت کا حق نہ دلا دیں"۔ ❻ حقیقت میں یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہمسایوں کا تعلق رشتہ داروں کے تعلق کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے۔

پڑوسیوں میں محبت کی ترقی اور تعلقات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ ہے، آنحضرت ﷺ خود اپنی بیویوں کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے، اسی بنا پر ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا، یارسول اللہ ﷺ! میرے دو پڑوسی ہیں، تو میں ان میں سے کس کے پاس بھیجوں؟ فرمایا: "جس کے گھر کا دروازہ تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو"۔ ❼

---

❶ ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکور۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب اثم من لا یأمن جارہ بوائقه: ٦٠١٦۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الادب: ٦٠١٩۔ ❹ ایضاً: ٦٠١٨۔

❺ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی حق الجوار: ١٩٤٤۔ ❻ صحیح بخاری، کتاب الادب: ٦٠١٤۔

❼ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب حق الجوار فی قرب الابواب: ٦٠٢٠۔

اس ہدیہ اور تحفہ کے لیے کسی بیش قیمت چیز کی ضرورت نہیں، بلکہ کھانے پینے کی معمولی چیزیں بھی اس کے لیے کافی ہیں، کچھ نہ ہو سکے تو گوشت کا شوربا ہی ہو اور وہ زیادہ پانی بڑھا کر ہی کیوں نہ ہو، اپنے ایک توکل پیشہ صحابی ابوذر رضی اللہ عنہ کو نصیحت فرمائی کہ ''اے ابوذر! جب شوربا پکاؤ تو پانی بڑھا دو اور اس سے اپنے ہمسایوں کی خبر گیری کرتے رہو۔'' ❶

ان تحفوں کے بھیجنے بھجانے کا زیادہ موقع عورتوں کو پیش آتا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ''اے مسلمانوں کی بیویو! تم میں کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کو حقیر نہ سمجھے، اگرچہ بکری کی کھر ہی کیوں نہ ہو''۔ ❷ یہ نصیحت دونوں بیویوں کے لیے ہے، یعنی نہ تو بھیجنے والی بیوی اپنے معمولی تحفہ کو حقیر سمجھ کر اپنی پڑوسن کو نہ بھیجے اور نہ دوسری بیوی اس معمولی تحفہ کو دیکھ کر اس کی حقارت کرے۔ ایک مسلمان کی مروت اور شرافت کا یہ اقتضا نہیں کہ خود آرام سے رہے اور اپنے پڑوسی کے رنج و تکلیف کی پروا نہ کرے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''مومن وہ نہیں جو خود سیر ہو اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے۔'' ❸

برائی برائی ہے جہاں بھی ہو اور گناہ گناہ ہے جہاں بھی سرزد ہو، لیکن اگر وہ اس جگہ ہو جہاں لازمی طور سے نیکی ہونی چاہیے تھی، تو ظاہر ہے کہ اس گناہ اور برائی کا درجہ عام گناہوں اور برائیوں سے بدرجہا زیادہ ہے، بدقسمت انسان چوری ہر جگہ کر سکتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ پڑوس کے مکان میں چوری کرنا کتنا برا ہے، بدکاری ہر جگہ اس سے ممکن ہے، مگر پڑوس کے گھر میں جہاں سے دن رات کی آمدورفت ہے اور جہاں کے مرد پڑوس کے شریف مردوں پر بھروسہ کر کے باہر جاتے ہیں، اخلاقی خیانت کس قدر شرمناک ہے، اسی لیے توراۃ میں یہ حکم تھا:

> ''تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے، تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر، تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ نہ کر''۔ (خروج ۲۰۔۱۷)
>
> ''تو اپنے پڑوسی سے، دغابازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے''۔ (احبار ۱۹۔۱۳)

اسلام نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کی زبان حکمت سے اس اگلی تعلیم کی تکمیل ان الفاظ میں فرمائی، جن میں توراۃ کی طرح صرف ممانعت پر بس نہیں کی ہے، بلکہ اس کو دس گنا زیادہ برا کر کے دکھایا، ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

''زنا حرام ہے، اللہ و رسول نے اس کو حرام کیا ہے، لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے، چوری حرام ہے، اللہ و رسول نے اس کو حرام کیا ہے، لیکن دس گھروں

❶ صحيح مسلم، كتاب البر و الصلة، باب الوصية بالجار: ٦٦٨٨۔

❷ صحيح بخاري، كتاب الادب، باب لاتحقرن جارة لجارتها: ٦٠١٧۔

❸ ادب المفرد امام بخاري، باب لا يشبع دون جاره: ١١٢؛ مسند بزار: ١١٩۔

میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرا لے''۔ ❶

دو صحابیہ تھیں جن میں سے ایک رات بھر نمازیں پڑھا کرتیں، دن کو روزے رکھتیں، صدقہ وخیرات بھی بہت کرتیں، مگر زبان کی تیز تھیں، زبان سے پڑوسیوں کو ستاتی تھیں، لوگوں نے ان کا حال آپ سے عرض کیا تو فرمایا: ''ان میں کوئی نیکی نہیں، ان کو دوزخ کی سزا ملے گی۔'' پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے دوسری بی بی کا حال سنایا جو صرف فرض نماز پڑھ لیتیں اور معمولی صدقہ دے دیتیں، مگر کسی کو ستاتی نہ تھیں، فرمایا: یہ بی بی جنتی ہوگی''۔ ❷

حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا: ''تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا کہ آپ کو۔'' (مرقس ۱۲۔۳۰)

آنحضرت ﷺ نے اپنی تکمیلی تعلیم میں نہ صرف یہ کہ پڑوسی کو خود اپنے مانند پیار کرنے پر قناعت فرمائی، بلکہ جو نہ کرے اس کی سب سے بڑی دولت، یعنی ایمان کے چھن جانے کا خطرہ ظاہر فرمایا، ارشاد ہے:

''تم میں کوئی مومن نہ ہوگا جب تک اپنے پڑوسی کی جان کے لیے وہی پیار نہ رکھے، جو خود اپنی جان کے لیے پیار رکھتا ہے''۔ ❸

اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی جان کی محبت نہیں، بلکہ اللہ اور رسول کی محبت کا اس کو معیار قرار دیا، فرمایا: ''جس کو یہ پسند ہو کہ اللہ اور اس کا رسول اس کو پیار کرے، یا جس کو اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا دعویٰ ہو، تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے''۔ ❹ اسی لیے فرمایا: ''قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں سب سے پہلے وہ دو مدعی اور مدعا علیہ پیش ہوں گے، جو پڑوسی ہوں گے۔'' ❺ انسان کی خوش خلقی اور بدخلقی کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ اس کو وہ اچھا کہے جو اس سے سب سے زیادہ قریب ہو، چنانچہ ایک دن صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھا کر رہے ہیں یا برا؟ فرمایا: ''جب اپنے پڑوسی کو تم اپنی نسبت اچھا کہتے سنو، تو سمجھو کہ اچھا کر رہے ہو اور جب برا کہتے سنو تو سمجھو کہ برا کر رہے ہو''۔ ❻

کوئی پڑوسی اگر برائی کرے تو گھر چھوڑ کر دوسرا بہتر پڑوس تلاش کرو، مگر اس کی برائی کے بدلہ میں تم اس کے ساتھ برائی نہ کرو، یہ احسان خود اس کو شرمندہ کرے گا، چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یا رسول اللہ ﷺ ! میرا پڑوسی مجھے ستاتا ہے، فرمایا: ''جاؤ صبر کرو۔'' اس کے بعد پھر شکایت لے کر آئے، پھر یہی نصیحت کی، وہ پھر آئے اور یہ عرض کی، فرمایا: ''جا کر تم اپنے گھر کا سامان راستہ میں ڈال دو'' (یعنی گھر سے منتقل ہونے کی صورت بناؤ) ان صحابی نے یہی کیا، آنے جانے والوں نے پوچھا بات کیا ہے، انھوں نے حقیقت حال بتائی، سب نے ان کے پڑوسی کو برا بھلا کہا، یہ دیکھ کہ وہ ایسا شرمندہ ہوا کہ وہ ان کو منا کر پھر گھر میں واپس لایا اور وعدہ کیا کہ وہ آیندہ نہ ستائے گا۔ ❼

---

❶ ادب المفرد امام بخاری، باب حق الجار: ۱۰۳۔ ❷ ادب المفرد امام بخاری، باب لا یؤذی جارہ: ۱۱۹۔
❸ صحیح مسلم، کتاب الایمان: ۱۷۱۔ ❹ مشکوٰۃ، کتاب الادب، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق؛ الفصل الثالث: ۴۹۹۰؛ شعب الایمان للبیہقی: ۱۵۳۳۔ ❺ مسند احمد بن حنبل، ج ۴، ص: ۱۵۱۔
❻ سنن ابن ماجہ، ابواب الزہد، باب الثناء الحسن: ۴۲۲۲۔ ❼ ادب المفرد بخاری، باب شکایۃ الجار: ۱۲۴، ۱۲۵ وابو داود، کتاب الادب، باب فی حق الجوار: ۵۱۵۳۔

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ ہر صحابی اپنے پڑوسی کا بھائی اور خدمت گزار بن گیا تھا، ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ گوشت کا بڑا لوتھڑا لٹکائے جا رہے ہیں، پوچھا کیا ہے؟ عرض کی، امیر المومنین! گوشت کھانے کو جی چاہا تھا تو ایک درہم کا گوشت خریدا ہے، فرمایا، اے جابر! کیا اپنے پڑوسی یا عزیز کو چھوڑ کر صرف اپنے پیٹ کی فکر کیا چاہتے ہو، کیا یہ آیت یاد نہ رہی: [1]

﴿ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ﴾ (٤٦/ الاحقاف: ٢٠)

''اور جس دن کافر دوزخ پر پیش ہوں گے (ان سے کہا جائے گا) تم اپنے مزے اپنی دنیا کی زندگی میں لے جا چکے اور اس سے فائدہ اٹھا چکے۔''

غور کرو کہ گوشت کا وہ لوتھڑا بھی جس میں اپنے پڑوسی اور محتاج عزیز کا حصہ نہ ہو، وہ دنیا کی مکروہ لذت قرار پاتی ہے، جسکے مواخذہ کا ان کو ڈر لگتا ہے۔ ہمسایوں میں دوست و دشمن اور مسلم و غیر مسلم کی تمیز بھی اٹھ گئی تھی، حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی، ان کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا، انھوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا؟ کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے سنا ہے کہ ''مجھے جبریل ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اس کو پڑوسی کے ترکہ کا حق دار بنا دیں گے۔'' [2]

---

[1] مؤطا امام مالک، کتاب صفة النبی ﷺ، باب ماجاء فی اکل اللحم: ١٧٤٢۔

[2] ابو داود، کتاب الادب، باب فی حق الجوار: ٥١٥٢۔

یتیموں کے حقوق

وہ کمسن بچہ جو باپ کے سایہ محبت سے محروم ہے، جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اس کو آغوش محبت میں لے، اس کو پیار کرے، اس کی ہر طرح خدمت کرے، اس کے متروکہ مال واسباب کی حفاظت کرے، اس کی تعلیم وتربیت کی فکر رکھے، عقل وشعور کے پہنچنے کے بعد اس کے باپ کی متروکہ جائیداد اس کو واپس دے اور یتیم لڑکیوں کی حفاظت اور ان کی شادی بیاہ کی مناسب فکر کرے، یہ وہ احکام ہیں جو مکہ کا یتیم پیغمبر اپنے ساتھ لایا۔ عربوں میں روزانہ کے قتل وغارت اور بدامنی کے سبب سے یتیموں کی کثرت تھی، مگر جیسا کہ چاہیے ان کے غور و پرداخت کا سامان نہ تھا، وہ اپنے باپ کی وراثت سے محروم رہتے تھے، کیونکہ چھوٹے بچوں کو وہ وراثت نہیں دیا کرتے تھے، [1] اور نہ سنگدل عربوں میں عام طور سے ان کے ساتھ رحم وشفقت کا جذبہ تھا، قرآن پاک میں ان کی اس بدسلوکی کا ذکر بار بار ہے:

﴿ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ؕ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۙ﴾

(۱۰۷/ الماعون:۱۔۲)

''کیا تو نے اس کو دیکھا جو انصاف کو جھٹلاتا ہے، سو وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔''

ایک اور آیت میں ان متولیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو یتیموں کے جوان ہو جانے کے ڈر سے ان کے باپوں کی متروکہ وراثت کو جلد جلد کھا کر ہضم کر جانا چاہتے ہیں:

﴿ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۙ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۙ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۙ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ؕ﴾ (۸۹/ الفجر :۱۷۔۲۰)

''نہیں یہ بات نہیں بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور نہ ایک دوسرے کو مسکین کے کھانے پر آمادہ کرتے ہو اور مردے کا مال پورا سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور دنیا کے مال ودولت پر جی بھر کے ریجھتے ہو۔''

اسلام سے پہلے کے مذاہب میں اس واجب الرحم فرقہ کے ساتھ رحم وشفقت اور ان کی امداد و پرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے، توراۃ میں عشر اور زکوۃ کے مستحقین میں دوسرے لوگوں کے ساتھ یتیم کا نام بھی دو ایک جگہ ملتا ہے، کہ شہر کے پھاٹک کے اندر جو یتیم ہوں ''وہ آئیں اور کھائیں اور سیر ہوں۔'' (استثناء ۱۴۔۲۹ و ۲۶۔۱۲) انجیل نے ان بیچاروں کی کوئی دادرسی نہیں کی ہے اور نہ کسی تعلیم میں ان کا ذکر کیا ہے، اس مظلوم فرقہ کی اصلی دادرسی کا وقت اس وقت آیا جب مکہ کا یتیم دین کامل کی شریعت لیکر دنیا میں آیا، وحی الہٰی نے سب سے پہلے خود اسی کو خطاب کر کے یاد دلا دیا:

[1] تفسیر ابن جریر طبری، سورۃ نساء، ج ٤، ص: ١٧٠۔

﴿ اَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی …… فَاَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡہَرۡ ﴾ (۹۳/ الضحیٰ:٦ب٩)

"کیا تجھ کو اللہ نے یتیم نہیں پایا، تو اس نے پناہ دی……تو یتیم کو نہ دبا۔"

آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں بے بسی کے عالم میں رہے، یتیموں کے متعلق اخلاقی ہدایتیں فرماتے رہے اور قریش کے جفا پیشہ رئیسوں کو اس بے کس گروہ پر رحم و کرم کی دعوت دیتے رہے، چنانچہ مکی آیتوں میں یہ تعلیمات وحی ہوتی رہیں، دولتمندوں کو غریبوں کے ساتھ فیاضی کی تلقین کے سلسلہ میں فرمایا گیا کہ انسانی زندگی کی گھاٹی کو پار کرنا اصلی کامیابی ہے، اس گھاٹی کو تم کیونکر پار کر سکتے ہو؟ ظلم وستم کے گرفتاروں کی گردنوں کو چھڑا کر، بھوکوں کو کھلا کر اور یتیموں کی خدمت کر کے:

﴿ اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَۃٍ ﴿ۙ۱۴﴾ یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَۃٍ ﴿ۙ۱۵﴾ ﴾ (۹۰/ البلد:١٤_١٥)

"یا بھوک والے دن میں کسی رشتہ داریتیم کو کھلانا۔"

نیکوں اور نیک بختوں کی تعریف میں فرمایا کہ یہ وہ ہیں جو:

﴿ وَ یُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسۡکِیۡنًا وَّ یَتِیۡمًا ﴾ (۷٦/ الدھر:٨)

"اور اس کی محبت کے ساتھ کھانا کسی غریب اور یتیم کو کھلاتے ہیں۔"

مدینہ میں آنے کے بعد ان اخلاقی ہدایتوں نے قانون کی صورت اختیار کی، سورۂ نساء میں اس بے کس گروہ کے متعلق خاص احکام آئے، ان کو وراثت کا حق دلایا گیا اور متولی جو جاہلیت میں طرح طرح کی بددیانتی کرتے تھے، ان سے کہا گیا:

﴿ وَ اٰتُوا الۡیَتٰمٰۤی اَمۡوَالَہُمۡ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الۡخَبِیۡثَ بِالطَّیِّبِ ۪ وَ لَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَہُمۡ اِلٰۤی اَمۡوَالِکُمۡ ؕ اِنَّہٗ کَانَ حُوۡبًا کَبِیۡرًا ﴿۲﴾ ﴾ (٤/ النسآء:٢)

"اور یتیموں کو ان کے وارثوں کا چھوڑا ہوا مال دے دو اور ان کے اچھے مال کو اپنے برے مال سے بدلا نہ کرو اور نہ اپنے مال کے ساتھ ملا کر ان کا مال کھا جاؤ، یہ بڑے گناہ کی بات ہے۔"

دولتمند یتیم لڑکیوں کو ان کی جائداد پر قبضہ کر لینے کی غرض سے متولی اپنے نکاح میں لے آتے تھے اور بے والی و وارث جان کر ان کو ستاتے تھے، اس پر حکم آیا:

﴿ وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ ﴾ (٤/ النسآء:٣)

"اگر تم کو ڈر ہے کہ ان یتیم بچیوں کے حق میں انصاف نہ کر سکو گے تو (ان کو چھوڑ اور) عورتوں سے جو تمہیں پسند ہو نکاح کر لو۔"

یتیم بچوں کے مال کو بددیانتی اور اسراف سے خرچ بھی نہیں کر دینا چاہیے اور نہ جب تک ان کو پورا شعور آئے، وہ ان کے سپرد کیا جائے، بلکہ ان کے سنِ رشد کو پہنچنے کے بعد ان کی عقل کو دیکھ بھال کر ان کی یہ

امانت ان کو واپس کی جائے ،فرمایا:

﴿ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۝ وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ ﴾ (٤/ النسآء:٥۔٦)

’’اور بے وقوفوں کو اپنے مال جس کو اللہ نے تمہارے قیام کا ذریعہ بنایا ہے، نہ پکڑا دو اور ان کو کھلاتے اور پہناتے رہو اور ان سے معقول بات کہو اور یتیموں کو جانچتے رہو، جب وہ نکاح کی (طبعی) عمر کو پہنچیں تو ان میں اگر ہوشیاری دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالہ کردو۔‘‘

ان آیاتِ پاک میں بلاغت کا ایک عجیب نکتہ ہے، غور کرو کہ آیت کے شروع میں جہاں متولیوں کو ناسمجھ یتیموں کے مال کو اپنے پاس سنبھال کر رکھنے کا حکم ہے، وہاں مال کی نسبت متولیوں کی طرف کی ہے، کہ تم اپنا مال ان کو نہ دو‘ اور آیت کے آخر میں جہاں بلوغ اور سن رشد کے بعد متولیوں کو یتیموں کو مال واپس کردینے کا حکم ہے، وہاں اس مال کی نسبت یتیموں کی طرف کی گئی کہ ’’تم ان کا مال ان کو واپس کردو‘‘۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک یہ امانت متولیوں کے پاس رہے تو اس کی ایسی ہی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہیے جیسی اپنے مال کی اور جب واپسی کی نوبت آئے تو اس طرح ایک ایک تنکا تک چن کر واپس کیا جائے، جیسا کسی غیر کا مال دیانت کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے، جس پر تمہارا کوئی حق نہیں، متولیوں کو جو یتیموں کے مال کو اس ڈر سے جلد جلد خرچ کر کے برابر کردیتے تھے کہ یہ بڑے ہو کر تقاضا نہ کر بیٹھیں، اس بددیانتی پر تنبیہ فرمائی گئی:

﴿ وَلَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ یَّكْبَرُوْا ؕ ﴾ (٤/ النسآء:٦)

’’اور اڑا کر اور جلدی کر کے ان کا مال نہ کھاؤ کہ کہیں یہ بڑے نہ ہو جائیں۔‘‘

صاحبِ جائداد یتیموں کے متولی اگر خود کھاتے پیتے ہوں، تو ان کے لیے ان یتیموں کی جائداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلافِ اخلاق قرار دیا گیا اور اگر تنگ دست ہوں تو منصفانہ معاوضہ لینے کی اجازت دی گئی:

﴿ وَمَنْ كَانَ غَنِیًّا فَلْیَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِیْرًا فَلْیَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ﴾ (٤/ النسآء:٦)

’’اور جو (متولی) بے نیاز ہے، اس کو چاہیے کہ بچتا رہے اور جو محتاج ہے تو منصفانہ دستور کے مطابق کھائے۔‘‘

اور آخر میں یہ جامع تعلیم دی گئی:

﴿ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ ﴾ (٤/ النسآء:١٢٧)

’’اور یہ کہ یتیموں کے لیے انصاف پر قائم رہو۔‘‘

سورۂ انعام میں یہودیوں کی ظاہری شریعت نوازی اور جانوروں کی حلت وحرمت میں بے معنی جزئیات پرستی اور روحانی گناہوں سے بے پروائی دکھا کر جن اصلی روحانی واخلاقی تعلیمات کی طرف توجہ دلائی، ان میں ایک یہ ہے کہ

﴿ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ﴾ (٦/ الانعام:١٥٢)

''اور بہتری کی غرض کے سوا یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ، یہاں تک کہ وہ اپنی طاقت کی عمر کو پہنچے۔''

سورۂ اسراء کے آٹھ اخلاقی اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سوائے بہتری کی نیت اور اصلاح کے خیال کے صاحب جائیداد کو یتیموں کی جائداد کے پاس بھی کسی اور غرض سے نہ پھٹکنا چاہیے اور دیانتداری کے ساتھ ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھنا چاہیے۔ (سورۂ اسراء)

یہ تو صاحب جائیداد یتیموں کی نسبت تعلیم ہے، جو یتیم غریب و مفلس ہوں، ان کی مناسب پرورش اور امداد عام مسلمانوں کا فرض ہے، چنانچہ قرآن پاک نے بقرہ، نساء، انفال اور حشر میں بار بار ان کی پرورش اور ان کے ساتھ نیک سلوک اور احسان کرنے کی ہدایت کی، و الْیَتٰمٰی والمساکین خیرات وصدقات کے بہترین مصرف قرار دیے گئے۔

اپنی اس متواتر وحی کی تشریح میں بے والی و وارث امت کے سرپرست نے اپنی امت کے ان نیک دلوں کو جو بے والی و وارث یتیموں کے کفیل ہوں، خود اپنے برابر جگہ دی، فرمایا: ''میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والا، جنت میں یوں دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے۔'' ❶ یہ بھی فرمایا کہ ''جو کسی یتیم بچہ کو اپنے گھر بلا کر لائے اور اس کو کھلائے پلائے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی نعمت عطا فرمائے گا، بشرطیکہ اس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو جو بخشائش کے لائق نہ ہو۔'' ❷ نیز ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ ''مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بھلائی کی جارہی ہے اور سب سے بدتر گھر وہ ہے، جس میں کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو۔'' ❸

آنحضرت ﷺ کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی، وہی دل جو بیکس و ناتواں یتیموں کے لیے پتھر سے زیادہ سخت تھے، وہ موم سے زیادہ نرم ہو گئے، ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا، ایک ایک یتیم کے لطف و شفقت کے لیے کئی کئی ہاتھ ایک ساتھ بڑھنے لگے اور ہر ایک اس کی پرورش اور کفالت کے لیے اپنے آغوش محبت کو پیش کرنے لگا، ❹ بدر کے یتیموں کے مقابلہ میں جگر گوشہ رسول فاطمہ بتول رضی اللہ عنہا اپنے

❶ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب فضل من یعول یتیمًا: ٦٠٠٥ وصحیح مسلم، کتاب الزهد، باب فضل الاحسان الی......: ٧٤٦٩۔ ❷ ترغیب وترهیب منذری، ج٢، ص: ١٣٢، ١٣٣ بحواله ترمذی: ١٩١٧ (حدیث حسن صحیح)۔ ❸ ایضًا، بحواله ابن ماجه: ٣٦٧٩ وادب المفرد، باب خیر بیت من یعول یتیمًا......: ١٣٧۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء: ٤٢٥١۔

دعویٰ کو اٹھا لیتی ہے، ❶ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنے خاندان ❷ اور انصار ❸ وغیرہ ❹ کی یتیم لڑکیوں کو اپنے گھر لے جا کر دل وجان سے پالتی ہیں، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ کسی یتیم بچہ کو ساتھ لیے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے۔ ❺

صحابہ نے صرف یہی نہیں کیا کہ یتیموں کو ان کا حصہ دینے اور ان کے مال و دولت کی تولیت اور نگرانی میں دیانت داری برتنے لگے، بلکہ ان کی جائیدادوں کی حفاظت میں فیاضی اور سیر چشمی کا پورا ثبوت دیا، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کی عدالت میں ایک یتیم نے ایک شخص پر ایک نخلستان کے متعلق دعویٰ پیش کیا، مگر وہ دعویٰ ثابت نہ ہو سکا اور آپ نے وہ نخلستان مدعا علیہ کو دلا دیا، وہ یتیم اس پر رو پڑا، آپ کو رحم آیا اور اس مدعا علیہ سے فرمایا کہ ''تم یہ نخلستان اس کو دے دو، اللہ تم کو اس کے بدلہ جنت دے گا۔'' وہ اس ایثار پر راضی نہ ہوا، ابوالدحداح صحابی حاضر تھے، انھوں نے اس شخص سے کہا، کیا تم اپنا یہ نخلستان میرے فلاں باغ سے بدلتے ہو، اس نے آمادگی ظاہر کی، انھوں نے فوراً بدل دیا اور وہ نخلستان اپنی طرف سے اس یتیم کو ہبہ کر دیا۔ ❻ آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں، مگر اگر یہ سوال کیا جائے، کیا محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا، تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملے گا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کی، عرب پہلی سرزمین ہے، جہاں کسی یتیم خانہ کی بنیاد پڑی اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا اور عرب، مصر، عراق، ہندوستان جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں، ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لیے بھی امن وراحت کے گھر بنائے، ان کے وظیفے مقرر کیے، مکتب قائم کیے، جائیدادیں وقف کیں، ❼ اور دنیا میں ایک نئے ادارے کی طرح ڈالی اور قانوناً اپنے قاضیوں کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ بے والی وسرپرست یتیموں کے سرپرست ہوں، ان کی جائیدادوں کی نگرانی، ان کے معاملات کی دیکھ بھال اور ان کی شادی بیاہ کا انتظام کریں، ❽ اور یہی وہ دستور ہے جس کی پیروی آج یورپ کے ملکوں میں کی جاتی ہے اور لندن کے لارڈ میئر یا آرفس کورٹ کے حکام مسلمان قاضیوں کے ان فرائض کی نقل کرتے ہیں۔

---

❶ ابو داود، کتاب الخراج والفيء، باب فی بيان مواضع قسم الخمس: ٢٩٨٧۔

❷ مؤطا امام مالك، كتاب الزكوٰة باب زكوٰة اموال اليتمٰى: ٥٨٧ وزكوٰة الحلی: ٥٨٤۔

❸ مسند احمد، ج٦، ص: ٢٦٩۔ ❹ تذكرة الحفاظ ذهبی ذكر مسروق بن اجدع تابعی، ج١، ص: ٤٢۔

❺ ادب المفرد امام بخاری، باب فضل من يعول يتيمًا: ١٣٦۔ ❻ استيعاب ابن عبدالبر تذكرة ابوالدحداح، ج٢، ص: ٦٦٣۔ ❼ تاریخ اسلام میں یہ واقعات مذکور ہیں۔ ❽ حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ((السلطان ولي من لاولي له)) ابو داود، كتاب النكاح، باب فی الولی: ٢٠٨٣ فقہ کی کتابوں میں قاضیوں کے یہ فرائض لکھے ہیں۔ قاضیوں کو جو شاہی فرامین تقرر کے وقت ملتے تھے۔ ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ ان کی تصریح ہوتی تھی۔

اس بے یار و مددگار طبقہ کی دوسری ضروری امداد یہ ہے کہ جس سوسائٹی سے اس کو اوروں نے نکال دیا ہے، اس میں دوبارہ اس کو عزت کے ساتھ داخلہ کا موقع دیا جائے اور کسی شریف شریک زندگی کی معیت کا شرف اس کو دوبارہ بخشا جائے اور جس مہر و عنایت کے سایہ سے وہ محروم ہوگئی ہے، وہ اس کو پھر عطا کیا جائے، قرآن نے اس کے بارہ میں صرف نصیحت و موعظت پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مسلمانوں کو صریحاً یہ حکم دیا:

﴿ وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ ﴾ (۲٤/ النور:۳۲)

''اپنے میں سے بے شوہر والی عورتوں کا نکاح کر دو۔''

اس سے پہلے کہ یہ حکم اترے، بلکہ خود نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اس بے کس فرقہ کی امداد کی طرف توجہ فرمائی اور عین اس وقت جب ایک نوجوان کے تمام ولولے برانگیختہ ہوتے ہیں اور بہتر سے بہتر اور نوجوان سے نوجوان عورت کا مشتاق ہوتا ہے، آپ ﷺ نے پچیس برس کی عمر میں چالیس برس کی ایک ادھیڑ بیوہ سے شادی کی اور پچیس برس تک اس طرح اس کے ساتھ کامل رفاقت کی کہ اس اثنا میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا، ان کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً عورتوں سے نکاح کئے، جن میں سے آٹھ حضرت سودہ، حفصہ، زینب ام المساکین، ام سلمہ، جویریہ، ام حبیبہ، میمونہ اور صفیہ رضی اللہ عنہن بیوہ تھیں، جن کی کفالت کا بار آپ نے اپنے دوش مبارک پر اٹھایا اور اس طرح اپنے پیروؤں کے لیے اس کو مستحسن اور مسنون طریقہ خود اپنے عمل سے بھی بنا دیا۔ یہ تو آپ ﷺ کا عمل تھا، قول یہ ہے کہ اس مظلوم فرقہ کی امداد کو آپ نے ایسی نیکی قرار دیا کہ رات بھر (نفل) نمازیں پڑھ پڑھ کر اور اکثر (نفل) روزے رکھ رکھ کر جو ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے، وہ اس فرقہ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا با آسانی کر سکتا ہے، فرمایا:

((السَّاعي على الارملة والمسكين كالسَّاعي في سبيل الله. واحسبه قال: كالقائم لا يفتر، وكالصائم لا يفطر)) [1]

''بیوہ اور مسکین کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے، جیسا اللہ کی راہ میں دوڑنے والا، (اور راوی کہتا ہے کہ میں گمان کرتا ہوں کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ) اور جیسا وہ نمازی جو نماز سے نہیں تھکتا اور وہ روزہ دار جو کبھی اپنا روزہ نہیں توڑتا۔''

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

((الساعي على الارملة والمسكين كالمجاهد في سبيل الله وكالذي يصوم النهار ويقوم الليل)) [2]

[1] مشکوة، كتاب الادب، باب الشفقة والرحمة على الخلق، الفصل الاول: ٤٩٥١۔

[2] صحيح بخاري، كتاب الادب، باب الساعي على المسكين: ٦٠٠٧؛ صحيح مسلم، كتاب الزهد، باب فضل الاحسان الى الارملة: ٧٤٦٨۔

اس بے یار و مددگار طبقہ کی دوسری ضروری امداد یہ ہے کہ جس سوسائٹی سے اس کو اوروں نے نکال دیا ہے، اس میں دوبارہ اس کو عزت کے ساتھ داخلہ کا موقع دیا جائے اور کسی شریف شریک زندگی کی معیت کا شرف اس کو دوبارہ بخشا جائے اور جس مہر و عنایت کے سایہ سے وہ محروم ہوگئی ہے، وہ اس کو پھر عطا کیا جائے، قرآن نے اس کے بارہ میں صرف نصیحت و موعظت پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مسلمانوں کو صریحاً یہ حکم دیا:

﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ ﴾ (۲۴/ النور:۳۲)

''اپنے میں سے بے شوہر والی عورتوں کا نکاح کردو۔''

اس سے پہلے کہ یہ حکم اترے، بلکہ خود نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اس بے کس فرقہ کی امداد کی طرف توجہ فرمائی اور عین اس وقت جب ایک نوجوان کے تمام ولولے برانگیختہ ہوتے ہیں اور بہتر سے بہتر اور نوجوان سے نوجوان عورت کا مشتاق ہوتا ہے، آپ ﷺ نے پچیس برس کی عمر میں چالیس برس کی ایک ادھیڑ بیوہ سے شادی کی اور پچیس برس تک اس طرح اس کے ساتھ کامل رفاقت کی کہ اس اثنا میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا، ان کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً عورتوں سے نکاح کیے، جن میں سے آٹھ حضرت سودہ، حفصہ، زینب ام المساکین، ام سلمہ، جویریہ، ام حبیبہ، میمونہ اور صفیہ رضی اللہ عنہن بیوہ تھیں، جن کی کفالت کا بار آپ نے اپنے دوش مبارک پر اٹھایا اور اس طرح اپنے پیروؤں کے لیے اس کو مستحسن اور مسنون طریقہ خود اپنے عمل سے بھی بنا دیا۔

یہ تو آپ ﷺ کا عمل تھا، قول یہ ہے کہ اس مظلوم فرقہ کی امداد کو آپ نے ایسی نیکی قرار دیا کہ رات بھر (نفل) نمازیں پڑھ پڑھ کر اور اکثر (نفل) روزے رکھ رکھ کر جو ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے، وہ اس فرقہ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا با آسانی کر سکتا ہے، فرمایا:

((السَّاعی علی الارملة والمسكين كالسَّاعی فی سبيل الله. واحسبه قال: كالقائم لا يفتر، وكالصائم لا يفطر)) [1]

''بیوہ اور مسکین کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے، جیسا اللہ کی راہ میں دوڑنے والا، (اور راوی کہتا ہے کہ میں گمان کرتا ہوں کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ) اور جیسا وہ نمازی جو نماز سے نہیں تھکتا اور وہ روزہ دار جو کبھی اپنا روزہ نہیں توڑتا۔''

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

((الساعی علی الارملة والمسكين كالمجاهد فی سبيل الله وكالذی يصوم النهار ويقوم الليل)) [2]

---

[1] مشکوۃ، کتاب الادب، باب الشفقة والرحمة علی الخلق، الفصل الاول: ٤٩٥١۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الساعی علی المسكين: ٦٠٠٧؛ صحیح مسلم، کتاب الزهد، باب فضل الاحسان الی الارملة: ٧٤٦٨۔

"بیوہ اورغریب کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا، اللہ کی راہ کے مجاہد کی طرح ہے اور اس کے برابر ہے، جو دن بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھا کرے۔"

ان بیواؤں کی تسکین کی خاطر جو اپنی گود میں ننھے بچے رکھتی ہوں اور اس لیے وہ تکلیف اٹھاتی ہوں لیکن ان ننھے بچوں کی پرورش کی مصروفیت کے سبب سے اپنے کو اس وقت تک دوسرے نکاح کے بندھن میں نہیں باندھتی ہیں، جب تک وہ بڑے ہو کر ان سے علیحدہ نہ ہو جائیں اور یا وہ دنیا سے رخصت نہ ہو جائیں، یہ فرمایا: "میں اور محنت ومشقت کے سبب سے وہ کالی پڑ جانے والی بیوی قیامت کے دن مرتبہ میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے، وہ حسن و جمال اور جاہ وعزت والی بیوی جو شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ ہو جائے لیکن اپنے ننھے یتیم بچوں کی خدمت کی خاطر اپنے کو روکے رہے، یہاں تک کہ وہ اس سے علیحدہ ہو جائیں، یا مر جائیں"۔ [1] اسی مقصد کی ایک روایت ابویعلیٰ کی مسند میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس طرح ایک واقعہ کی صورت میں بھی بیان فرمایا کہ "قیامت کے دن میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولوں گا تو دیکھوں گا کہ ایک عورت مجھ سے بھی پہلے اندر جانا چاہتی ہے، میں پوچھوں گا تو کون ہے؟ تو وہ کہے گی کہ میں ایک بیوہ ہوں، جس کے چند ننھے یتیم بچے تھے"۔ [2]

---

[1] سنن ابو داود، کتاب الادب، باب فی فضل من عال یتامی: ٥١٤٩۔

[2] حاشیہ سنن ابی داود بتحشیۃ ابی الحسنات محمد بن عبداللہ ابن نور الدین پنجابی، مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ۔

حاجت مندوں کے حقوق

ہر انسان خواہ وہ کسی قدر صاحب دولت اور بے نیاز ہو، کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اس کو دوسروں کا دست نگر بننا پڑتا ہے اور اس کو دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے، اس لیے انسانی جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے اور اپنی موجودہ بہتر حالت پر مغرور ہو کر کبھی کسی حاجت مند کی حاجت روائی سے بے پروائی نہ برتے اور نہ یہ سمجھے کہ اس کو کبھی کسی دوسرے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

قرآن پاک میں دو موقعوں پر ذرا سے فرق سے ایک آیت ہے:

﴿ وَفِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ لِّلسَّآئِلِ وَٱلۡمَحۡرُومِ ﴾ (۵۱/ الذاریات:۱۹)

''اور جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والوں اور محروم کے لیے حق ہے۔''

﴿ فِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ مَّعۡلُومٞ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَٱلۡمَحۡرُومِ ﴾ (۷۰/ المعارج:۲۳۔۲٤)

''اور جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والے اور محروم کے لیے مقررہ حق ہے۔''

سائل مانگنے والے کو کہتے ہیں، لیکن عام شہرت کی بنا پر سائل کے معنی صرف ''بھیک منگے'' کے لینا ٹھیک نہیں ہے، بلکہ اس سے ہر وہ ضرورت مند مراد ہو سکتا ہے، جو تم سے کسی مالی مدد کا خواست گار ہو، محروم کی تشریح میں اہل تفسیر کا اختلاف ہے، بعض اس کو محروم کہتے ہیں، جس کا مال غنیمت میں کوئی حصہ نہیں، کسی نے اس کے ظاہر معنی لیے ہیں کہ جو دولت سے محروم ہو، کوئی متعفف کے معنی لیتا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مصیبت زدہ ہے جس کی کمائی یا کھیتی پر کوئی آسمانی افتاد پڑ گئی ہو اور اب وہ دوسروں کی مدد کا محتاج ہو گیا ہو، اسی معنی کی تائید اہل لغت [1] اور بعض اہل تفسیر کے بیان اور قرآن پاک [2] سے ہوتی ہے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ اس حق سے مراد زکوٰۃ ہے، یا عام صدقہ، مفسرین دونوں آیتوں میں دونوں طرف گئے ہیں، مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذاریات میں جس میں مطلق ''حق'' کا بیان ہے، مطلق صدقہ اور مالی امداد مراد ہے اور معارج میں جس میں مطلق ''حق'' کا نہیں بلکہ ''مقررہ حق'' کا بیان ہے ''زکوٰۃ'' مراد ہو، کیونکہ ''مقررہ حق'' کا مفہوم عام صدقہ پر نہیں، بلکہ زکوٰۃ ہی پر صادق آتا ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے حاجت مندوں کی جن پر کوئی مالی مصیبت اور افتاد پڑی ہو، دونوں طرح سے مدد مسلمانوں کے حقوق میں سے ایک حق ہے۔

قرآن پاک میں دوسرے موقع پر ہے:

﴿ وَأَمَّا ٱلسَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ ﴾ (۹۳/ الضحیٰ:۱۰)

---

[1] دیکھو لسان العرب لفظ محروم و محارف (اس مفہوم کی تائید لسان العرب کے محولہ بالا مقامات پر نہیں ملے گی)۔

[2] تفسیر ابن جریر میں سورۂ ذاریات ج ۲۶، ص: ۱۱۲، معارج کی آیت مذکورہ ج ۲۹، ص: ۴۵، سورۂ قلم میں اصحاب الجنة کے قصہ میں محرومون اور سورۂ واقعہ ج ۲۷، ص: ۱۰۳ میں بل محرومون کے معنی میں ملاحظہ فرمائیں۔

''اور تو سوال کرنے والے کو جھڑکا نہ کر۔''

یہاں ''سوال کرنے والے'' کے معنی اغنی کے قرینہ سے عام طور سے بھیک مانگنے والے کے سمجھے جاتے ہیں، مگر لفظ کا عموم وسعت کو چاہتا ہے، یعنی ہر ضرورت مند جو تم سے کسی قسم کی مدد کا خواست گار ہو، خواہ وہ جسمانی ہو، مالی ہو، علمی ہو۔ [1] یہاں تک کہ کوئی لنگڑا تم سے صرف تمہارے کندھے کا سہارا چاہتا ہے، تو وہ بھی سائل کے تحت میں ہے، اس کے سوال کو بھی سختی سے رد نہ کرو، بلکہ امکان بھر اس کو پورا کرو اور نہ کر سکو تو نرمی اور خوبصورتی سے عذر کر دو۔

مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تم کسی دوسرے سے اس مستحق کی مدد کی سفارش کرو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴾ (٤/ النسآء: ٨٥)

''جو نیک بات کی سفارش کرے گا تو اس کے ثواب میں اس کا بھی حصہ ہوگا اور جو بری بات کی سفارش کرے گا تو اس کے گناہ میں وہ بھی حصہ پائے گا اور اللہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔''

اگرچہ یہ آیت عبارت کے نظم ونسق کے لحاظ سے لڑائی کے سلسلہ میں ہے، یعنی اگر کوئی کمزور قبیلہ درخواست کرے کہ طاقتور قبیلہ کے مقابلہ میں اس کی امداد کی سفارش کی جائے، تو اس نیک کام میں اس کی سفارش کی جائے اور وہ قبول کی جائے، تاہم الفاظ قرآنی کی وسعت ہر نیک کام کی سفارش تک وسیع ہے اور اس میں یہ اصول بتا دیا گیا ہے کہ کسی نیک غرض کی جدوجہد میں جتنا حصہ بھی لیا جائے، حصہ لینے والا بھی اس نیک کام کے ثواب میں شریک ہوگا، ایسا ہی برے کام کی جدوجہد میں حصہ لینا اس کے گناہ میں شریک ہونا ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوْا عَلَي الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ (٥/ المآئدۃ: ٢)

''اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار نہ بنو اور ڈرو اللہ سے، بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔''

غرض یہ ہے کہ حاجت مندوں کی حاجت برآری، ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنا اور جو جس قدر بھی مدد تم سے چاہے اگر تمہاری طاقت میں ہو تو وہ اس کو دینا، ہر مسلمان پر ایک حق کی حیثیت رکھتا ہے، جس کو ہر مسلمان کو ادا کرنا چاہیے، آنحضرت ﷺ نے گویا انہی آیات کی تشریح اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

((من کان فی حاجة اخیه کان اللّٰه فی حاجته ومن فرج عن مسلم کربة فرج

---

[1] طبری میں ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے وَاَمَّا مَنْ سَاَلَكَ مِنْ ذِىْ حَاجَةٍ فَلَا تَنْهَرْ ج ٣٠، ص: ١٢٨ از مخشری نے کشاف ج ٢، ص: ٦١٦ میں لکھا ہے کہ بعضوں نے اس سائل سے مراد طالب علم لیا ہے۔

اللّٰہ عنہ کربۃ من کربات یوم القیامۃ)) ❶

''جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا رہے گا، تو اللہ اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا اور جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا، تو اللہ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو اس سے دور فرمائے گا۔''

ایک دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا:

((واللّٰہ فی عون عبدہ ماکان العبد فی عون اخیہ)) ❷

''اللہ اپنے بندہ کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے، جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے پاس کوئی سائل یا حاجت مند آتا تو آپ صحابہ سے فرماتے: ''تم سفارش کرو تو تمہیں بھی ثواب ملے گا۔'' ❸ ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ ''اگر کچھ اور نہ ہو سکے تو بے کس حاجت مند کی مدد ہی کیا کرو۔'' ❹ یہ بھی فرمایا کہ ''بھولے بھٹکے ہوئے کو اور کسی اندھے کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے۔'' ❺ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ''جو شخص راستہ چلتے میں کوئی کانٹا راستہ سے ہٹا دے تو خداوند تعالیٰ اس کے اس کام کی قدر کرتا ہے اور اس کا گناہ معاف کرتا ہے۔'' ❻

---

❶ صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب لا یظلم المسلم.....:۲۴۴۲؛ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم:۶۵۷۸۔ ❷ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الستر علی المسلمین:۱۹۳۰۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب تعاون المؤمنین:۶۰۲۷ وباب قول اللّٰہ ﴿من یشفع شفاعة حسنة﴾:۶۰۲۸۔ ❹ ایضا باب کل معروف صدقة: ۶۰۲۲۔ ❺ ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی صنائع المعروف:۱۹۵۶۔ ❻ ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء فی اماطة الاذی عن الطریق:۱۹۵۸۔

بیمار کے حقوق

دنیا کا ایک اور کمزور طبقہ جو ہماری ہمدردیوں کا مستحق ہے، بیماروں اور مریضوں کا ہے، یہ عموماً اپنی اس حالت میں اپنی خبر گیری اور خدمت آپ نہیں کر سکتے، ان ہمدردی کے لائق انسانوں کی دیکھ بھال، خدمت، غم خواری اور تیمارداری بھی انسانیت کا ایک فرض ہے اور اس فرض کا نام عربی میں ''عیادت'' ہے۔ 1 ان بیماروں کے ساتھ اسلام نے سب سے پہلی ہمدردی تو یہ دکھائی ہے وہ بہت سے فرائض جن کے ادا کرنے سے وہ مجبور ہو رہے ہیں، یا جن کے ادا کرنے سے ان کی تکلیف کی زیادتی کا خیال ہے، ان کو یک قلم معاف یا کم کر دیا ہے اور قرآن نے اس کے لیے ایک کلی اصول بتا دیا ہے:

﴿ وَلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ﴾ (۲۴/ النور: ۶۱)

''اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے۔''

﴿ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ﴾ (۴۸/ الفتح: ۱۷)

''نہ اندھے پر تنگی ہے (کہ وہ جہاد میں شریک ہو) اور نہ لنگڑے پر اور نہ بیمار پر۔''

﴿ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى ﴾ (۹/ التوبۃ: ۹۱)

''نہ کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر (جہاد کے عدم شرکت کی باز پرس ہے)۔''

بیماروں کے لیے وضو معاف ہے، ﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى ﴾ 'یا تم بیمار ہو تو تیمم کرو' (۵/ المآئدۃ: ۶) اسی طرح ان سے تہجد کی لمبی نمازیں معاف ہیں ﴿ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ﴾ ''اللہ کو معلوم تھا کہ تم میں کچھ بیمار بھی ہوں گے۔'' (۷۳/ المزمل: ۲۰) اسی طرح حج کے احکام میں بھی بیمار کے لیے رعایت فرمائی گئی: ﴿ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا ﴾ ''تو تم میں جو بیمار ہو۔'' (۲/ البقرۃ: ۱۹۶) روزہ توڑنے کی اس

1 عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عیادۃ المریض کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہیں، یعنی کسی بیمار کو بیماری کی حالت میں دیکھنے کو جانا لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے، بیمار کی عیادت کے معنی بیمار پرسی کے بھی ہیں اور اس کی تیمارداری غم خواری اور خدمت گزاری کے بھی ہیں۔ بیمار کو بیماری کی حالت میں صرف دیکھنے کو جانا تو عیادت کی معمولی قسم ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کی غم خواری کرے، اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس کی پوری تیمارداری اور خدمت گزاری کرے۔ عرب کا ایک قدیم شاعر جو حجاج کے زمانہ میں تھا کہتا ہے:

ذهب الرقاد فما يحس رقاد مما شجاك ونامت العواد

''تجھے جو غم پہنچا اس سے نیند چلی گئی تو نیند معلوم نہیں ہوتی اور عیادت کرنے والے سو گئے۔'' قاعدہ یہ ہے کہ کسی تیماردار اور خدمت گزار اس کی آخری حالت میں شب و روز اس کی خدمت میں جاگتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی کئی کئی راتیں کٹ جاتی ہیں۔ لیکن جب بیمار سے مایوسی ہو جاتی ہے اور وہ موت کے قریب ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے، تو پھر ان پر نیند طاری ہو جاتی ہے اور وہ سو جاتے ہیں۔ اب اگر ''عیادت'' کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہوتے تو عیادت کرنے والوں کے سو جانے کا کوئی مطلب نہ ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ''عیادت'' کی وسعت میں خدمت گزاری اور تیمارداری سے لے کر بیمار پرسی تک سارے مدارج داخل ہیں اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ عیادت کے معنی صرف بیمار کو دیکھنے کو جانے ہی کے ہوں تب بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ جب صرف اس کے دیکھنے جانے کا ثواب اتنا ہے تو اس کی خدمت اور تیمارداری کا ثواب کتنا ہوگا۔

کو اجازت دی گئی، کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی قوت نہ ہو تو بیٹھ کر اور بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر نماز کی رخصت دی گئی، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب اللہ نے ان سے اپنے فرائض معاف کر دیے تو بندوں کو کس حد تک ان سے اپنے اخلاقی مطالبہ میں کمی کر دینی چاہیے۔

اسلام نے مسلمانوں کی بیماری کی تکلیف کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے کی حالت میں غم کے بجائے خوشخبری بنا دیا ہے۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مومن کو دنیا میں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے، وہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے، اگر وہ بیمار ہو جائے اور صبر کے ساتھ بیماری کی تکلیفوں کو برداشت کرے تو آخرت کے عذاب شدید سے بچانے کے لیے وہ اس کے گناہوں کا معاوضہ بن جاتی ہیں اور وہ پاک وصاف ہو جاتا ہے۔ ❶

آنحضرت ﷺ نے بیماروں کی عیادت کی خاص تاکید فرمائی ہے، اس کے آداب تعلیم کیے ہیں، اس کی دعائیں سکھائی ہیں اور اس کا ثواب بتایا ہے، فرمایا: ''جو کوئی مسلمان کے کسی غم کو ہلکا کرے گا اللہ اس کے غم کو ہلکا کرے گا۔'' ❷ اور یہ بھی فرمایا کہ ''ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں، جن میں ایک یہ ہے کہ جب وہ بیمار پڑے تو وہ اس کی عیادت کرے۔'' ❸ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ حضور نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا تھا، جن میں سے ایک بیمار کی عیادت ہے۔ ❹ ارشاد ہوا کہ ''جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اس کی مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی مغفرت کے لیے بارگاہ الٰہی میں دعا کرتے ہیں۔'' ❺ یہ بھی آیا ہے کہ ''جب کوئی کسی بیمار کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ واپسی تک جنت کے میوے چنتا رہتا ہے''۔ ❻ فرمایا کہ ''جب کوئی کسی کی عیادت کے لیے جائے تو اس کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھے اور اس کو تسلی اور دلاسا دے اور اس کو شفا پانے کے لیے اللہ سے دعا کرے۔'' ❼ آنحضرت اور آپ کی تعلیم سے صحابہ کرام کو بیماروں کی عیادت کا اس قدر اہتمام تھا کہ وہ اس کو ایک اسلامی حق جانتے تھے، بلکہ اس معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلمان کی بھی تفریق نہ تھی، آپ ﷺ نے یہودیوں کی عیادت فرمائی ہے۔ ❽ منافقوں کی عیادت کو تشریف لے گئے ہیں، ❾ اور اسی سے علما نے غیر مسلموں کی عیادت کی بھی اجازت دی ہے۔ ❿ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جب زخمی ہوئے تو آپ نے ان

❶ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب ثواب المؤمن فیما یصیبه: ٦٥٦٢ تا ٦٥٦٨؛ سنن ابی داود، کتاب الجنائز، باب الامراض المکفرة للذنوب: ٣٠٨٩۔ ❷ ابو داود، کتاب الادب، باب فی المعونة للمسلم: ٤٩٤٦۔

❸ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الامر باتباع الجنائز: ١٢٤٠۔ ❹ ایضًا: ١٢٣٩۔

❺ سنن ابی داود، کتاب الجنائز، باب فضل العیادة: ٣٠٩٨۔ ❻ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل عیادة المریض، بطریق مختلفة: ٦٥٥١، ٦٥٥٤۔ ❼ سنن ابی داود، کتاب الجنائز: ٣١٠٤۔

❽ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی: ١٣٥٦۔ ❾ ابو داود، کتاب الجنائز، باب العیادة: ٣٠٩٤۔ ❿ مجمع البحار علامه طاهر فتنی لفظ عیادة، ج ٣، ص: ٦٩٥۔

کا خیمہ مسجد میں نصب فرمایا، تاکہ بار بار ان کی عیادت کی جا سکے۔ ❶ رفیدہ رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ تھیں جو ثواب کی خاطر زخمیوں کا علاج اور ان کی خدمت کیا کرتی تھیں، ان کا خیمہ بھی اسی مسجد میں رہتا تھا، تاکہ لڑائیوں کے مسلمان زخمیوں کی تیمارداری اور مرہم پٹی کریں۔ ❷ غزوات اور لڑائیوں میں بھی بعض ایسی بیبیاں فوج کے ساتھ رہتی تھیں جو بیماروں کی خدمت اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ ❸ آپ ﷺ نے اپنے پیروؤں کو عمومیت کے ساتھ حکم دیا ہے کہ "بھوکے کو کھلاؤ، قیدی کو چھڑاؤ اور بیمار کی عیادت کرو۔" ❹

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے عیادت کی فضیلت حسب ذیل مؤثر و دلکش طرز ادا میں ظاہر فرمائی کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا، کہ "اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا تو میری عیادت تو نے نہ کی، وہ کہے گا، اے میرے پروردگار! تو، تو سارے جہان کا پروردگار ہے، میں تیری عیادت کیونکر کرتا؟ فرمائے گا: کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا بندہ بیمار رہا، مگر تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر کرتا، تو مجھے اس کے پاس پاتا"۔ ❺ تعلیم کی یہ طرز ادا، بیمار پرسی، بیماروں کی تیمارداری اور غم خواری کی کیسی دل نشین تلقین ہے اور صابر و شاکر بیمار کی کیسی ہمت افزائی ہے کہ اس کا رب گویا اس کے سرہانے کھڑا، اپنی مہربانیوں سے اسے نوازتا رہتا ہے اور اس کے درجوں اور رتبوں کو بلند کرتا رہتا ہے اور کیسے خوش قسمت وہ لوگ ہیں، جو ان بیماروں کی خدمت کر کے اللہ کا قرب پاتے ہیں۔

❶ سنن ابی داود، کتاب الجنائز، باب فی العیادة مرارًا: ۳۱۰۱۔

❷ سیرة ابن هشام، غزوة بنی قریظة، ج ۲، ص: ۷۰ وادب المفرد بخاری، باب کیف اصبحت: ۱۱۲۹ واصابه ابن حجر وغیرہ میں حضرت رفیدہ رضی اللہ عنہا کا حال پڑھیے۔

❸ صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب غزوة النساء: ٤٦٨٢۔ ❹ مسند احمد، ج ٤، ص: ۳۹٤۔

❺ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل عیادة المریض: ٦٥٥٦۔

غلاموں کے حقوق

انسانیت کے کمزور اور ناتواں طبقوں میں غلاموں کی بھی ایک جماعت ہے، ہم کو دنیا کی تاریخ جب سے معلوم ہے، یہ طبقہ موجود نظر آتا ہے، قوی اور فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوح قوم کے افراد کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہے، یعنی خود بادشاہ بن کر عیش و راحت، سیر و تفریح اور حکومت و شہنشاہی کے کام کیے اور مفتوح افراد سے کان کنی، کاشتکاری اور محنت و مزدوری کے مشقت والے کام لیے، ہندوؤں میں اچھوت قومیں اسی کی یادگار ہیں، مصریوں میں قیدی بنی اسرائیل کی یہی کیفیت تھی، رومیوں میں غیر رومی اسی غلامی اور مشقت و محنت کے کاموں میں مصروف رکھے جاتے تھے اور عربوں میں بھی ان کے ساتھ یہی برتاؤ تھا، بلکہ عربوں میں قبائلی نظام ہونے کے سبب سے ہر وہ شخص جو کسی قبیلہ سے وابستہ نہ تھا، وہ مظلوم ہر قبیلہ کے آدمیوں کے ظلم و ستم کا تختہ مشق تھا، کیوں کہ اس کو اپنی حفاظت کے لیے کسی قبیلہ کی قوت حاصل نہ تھی، چنانچہ اسلام کے آغاز میں ظالم قریشیوں نے جن لوگوں پر سب سے زیادہ ستم ڈھائے وہ یہی تھے۔ اسلام زیر دستوں کی مدد اور کمزوروں کی حمایت میں اٹھا تھا، نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے جس معاہدہ فضول میں شرکت کی تھی اور جس کو نبوت کے بعد بھی پورا کرنا اپنا فرض جانتے تھے، وہ اسی غرض سے منعقد ہوا تھا کہ ان زیر دستوں کی حفاظت اور حمایت کی جائے، اسی لیے اسلام کی آواز پر قریش کے رئیسوں سے پہلے، قریش کے غلاموں اور کنیزوں نے لبیک کہا، چنانچہ زید بن حارثہ، خباب بن الارت، بلال حبشی، یاسر یمنی، عمار، صہیب رومی، ابوفکیہہ، عامر بن فہیرہ اور سالم رضی اللہ عنہم غلاموں میں اور لبینہ، زنیرہ، نہدیہ، ام عبیس اور سمیہ رضی اللہ عنہن لونڈیوں میں سب سے پہلے اسلام کے آغوش میں آئیں اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے سوا جو آنحضرت ﷺ کے سایہ میں پرورش پا رہے تھے، سب نے اسلام کی محبت اور الفت میں سخت سے سخت کڑیاں جھیلیں اور بعض نے اسی راہ میں اپنی جانیں بھی دیں۔ اسلام نے غلاموں کی آزادی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو اپنی تحریک کا لازمی جزو بنا لیا تھا، غلاموں کی آزادی کو بڑے ثواب کا کام قرار دیا تھا، سورۂ بلد میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی، جن کاموں کو ''گھاٹی'' بتایا گیا ہے، ان میں ایک ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ﴾ گردن سے غلامی کی رسی کھولنا بھی ہے۔ چنانچہ مکہ کی پرخطر زندگی میں بھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور دوسرے اہل ثروت مسلمانوں نے بہت سے غلاموں کو کافروں سے خرید خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ مدینہ آ کر اس تحریک نے اور فروغ پایا، ﴿تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ﴾ یعنی گردن کو آزاد کرنا۔ بہت سی فروگزاشتوں کا کفارہ قرار پایا اور غلاموں کے آزاد کرنے کے لیے بہت سی ترغیبات کا اعلان کیا گیا، صحابہ نے اپنے پیغمبر کی اس آواز پر لبیک کہا اور چند روز میں غلاموں کی دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی، حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے جو فتح مکہ کے دن اسلام لائے ہیں، اسلام کے بعد سو غلام آزاد کیے [1] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے صرف ایک قسم کے کفارہ

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان حکم عمل الکافر اذا اسلم:۳۲٦۔

میں چالیس غلام آزاد کیے ❶ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک ہزار اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے تیس ہزار غلاموں کو آزادی کی نعمت عطا کی۔ ❷ شرک کی ممانعت کے بعد اللہ کا دوسرا حکم یہ ہے کہ اس کے بندوں کے ساتھ نیکی کی جائے، ان بندوں میں سرفہرست جن لوگوں کے نام ہیں، ان میں یہ مظلوم فرقہ بھی ہے، فرمایا:

﴿ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ﴾ (٤/ النسآء:٣٦)

''اور اللہ کو پوجو اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ دار کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ اور عزیز پڑوسی اور بے گانہ پڑوسی کے ساتھ اور پہلو کے رفیق کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور اس کے ساتھ جس کے تمہارے ہاتھ مالک بن گئے ہیں اور اللہ غرور اور فخاری کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔''

یہ آخری ہستی وہی ہے جس کو دنیا غلام کہہ کر پکارتی ہے، لیکن اسلام نے اس کی بھی ممانعت کر دی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''کوئی آقا اپنے غلام کو عبد نہ کہے، بلکہ فتائی میرا جوان کہے اور اسی طرح غلاموں کو ممانعت کی کہ ''وہ اپنے آقاؤں کو رب نہ کہیں، بلکہ مولیٰ کہیں۔'' ❸ اس طرح ان ذلت کے الفاظ کا بھی خاتمہ کر دیا اور فرمایا کہ ''یہ جن کو تم غلام کہتے ہو یہ بھی تمہارے بھائی ہیں، جن کو اللہ نے تمہارے تحت میں کر دیا ہے، پس جس کو اللہ نے تمہارے تحت میں کر دیا ہے، تو اس کو وہ کھلاؤ جو تم کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو اور اس کو اتنا کام نہ دے دو، جو اس پر بھاری ہو جائے اور جو بھاری کام بھی دے تو اس کے کام میں خود بھی شریک ہو کر اس کی مدد کرے۔'' ❹

حضور ﷺ کے اس حکم پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس طرح عمل کیا کہ ان کے غلاموں اور آقاؤں کے درمیان تمیز مشکل ہو گئی تھی، ❺ ان بے خانماں افراد کو ان کے آقاؤں کے گھروں کا غلام بنا کر نہیں، بلکہ ایک طرح سے ارکان اور ممبر بنا کر رکھا، کہ جس غلام کو جو آزاد کرے گا وہ اسی کے علاقہ مندوں (موالی) میں شمار ہوگا، ❻

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الهجرة.٦٠٧٣ تا٦٠٧٥۔ ❷ یہ دونوں تعدادیں امیر اسماعیل نے شرح بلوغ المرام کتاب العتق ج۲،ص:۲۳۵ میں نقل کی ہیں۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب العتق، باب کراهية التطاول على الرقيق: ٢٥٥٢۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الادب باب ما ينهى من السباب:٦٠٥٠۔

❺ صحیح بخاری، کتاب الادب باب ماينهى من السباب:٦٠٥٠۔

❻ حدیث میں ہے:((انما الولاء لمن اعتق)) ''ولاء کا حق اسی کو ہے جو آزاد کرے۔'' مسلم، کتاب العتق، باب بيان ان الولاء ...... ٣٧٧٩ دوسری حدیث میں:((او انتمى الى غير مواليه فعليه لعنة الله)) الخ ''جو غلام آزاد ہو کر اپنے غیر آقا کی طرف اپنے کو منسوب کرے تو اس پر اللہ کی لعنت۔'' امام نووی شرح میں لکھتے ہیں بل هو لحمة كلحمة النسب یعنی آزاد غلام اور آقا کے درمیان ولاء کا تعلق نسب کے تعلق کی طرح ہے (صحیح مسلم، کتاب العتق، باب تحريم تولى العتيق ...... ٣٧٩٤)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں اپنے فوجی افسروں کو حکم دیا تھا کہ رومی اور عجمی آزاد غلام جو مسلمان ہو گئے ہوں، ان کو ان کے قدیم آقاؤں کے خاندانوں میں شمار کرو، جو ان کا حق ہو وہ ان کا ہو اور اگر یہ غلام چاہیں تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ بنا لیں۔ 1 ان تعلیمات نے ان غلاموں کو غلام نہیں، بلکہ اسلام کا سردار اور مملکتوں کا بادشاہ بنا دیا، اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے، جس کی تفصیل آئندہ جلد میں اپنے مناسب موقع پر آئے گی۔

1 کتاب الاموال لابی عبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲٤ھ مطبوعہ مصر، ص: ۲۳۵۔

مہمان کے حقوق

موجودہ نظام تمدن میں گو مہمانی کی زحمت ہوٹلوں اور ریسٹورانوں نے اپنے سر لے لی ہے، مگر گزشتہ نظام تمدن میں اس کی جگہ نہایت اہم تھی اور اب بھی مہمان نوازی مشرقی تمدن کے خمیر میں داخل ہے اور مغربی تمدن نے بھی اس کی رسمی حیثیت کو باقی رکھا ہے، ہر انسان کسی نہ کسی وقت کسی کا مہمان ہوتا ہے، اس لیے یہ کہنا چاہیے کہ سوسائٹی کے نظام میں اس کی حیثیت مبادلہ اخلاق کی ہے، آج ہم اپنے مہمان کے ساتھ نیک سلوک اور عزت کا برتاؤ کریں گے، تو کل وہ ہمارے ساتھ کرے گا، گزشتہ مذاہب کے اخلاق میں مہمان نوازی کی تعلیم کا ذکر خصوصیت کے ساتھ نہیں، لیکن اہل عرب میں مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا، مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا، اسلام آیا تو اس نے اس فرض کی اہمیت کو اور بڑھا دیا۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا ذکر سورۂ ذاریات کی ان آیتوں میں آیا ہے:

﴿ هَلْ أَتٰىكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرٰهِيمَ الْمُكْرَمِينَ ۝ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلٰمًا ۖ قَالَ سَلٰمٌ قَوْمٌ مُّنكَرُونَ ۝ فَرَاغَ إِلٰى أَهْلِهِ فَجَاءَ بِعِجْلٍ سَمِينٍ ۝ فَقَرَّبَهُ إِلَيْهِمْ قَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ۝ فَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۖ قَالُوا لَا تَخَفْ ۖ وَبَشَّرُوهُ بِغُلٰمٍ عَلِيمٍ ۝ ﴾

(٥١/ الذاریات: ٢٤_٢٨)

"(اے پیغمبر ﷺ) ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تم تک پہنچی ہے؟ کہ جب (یہ لوگ) ان کے پاس آئے تو (آتے ہی) سلام علیک کی، ابراہیم نے سلام کا جواب دیا (اور دل میں کہا کہ یہ) لوگ (تو کچھ) اجنبی (سے معلوم ہوتے) ہیں، پھر جلدی سے اپنے گھر جا کر (ایک) موٹا تازہ بچھڑا (یعنی اس کا گوشت بھنوا کر مہمانوں کے لیے) لائے اور ان کے سامنے رکھا تو (انھوں نے تامل کیا، ابراہیم نے) پوچھا آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں (اس پر بھی انھوں نے کھانے سے انکار کیا تب) تو ابراہیم ان سے جی ہی جی میں ڈرے، انہوں نے (ان کی یہ حالت دیکھ کر) کہا کہ آپ (کسی طرح کا) اندیشہ نہ کریں اور ان کو ایک ہوشیار فرزند کی خوشخبری بھی دی۔"

اس حکایت سے آداب مہمان داری کے متعلق حسب ذیل نتیجے نکالے جا سکتے ہیں:

① مہمان اور میزبان میں کلام کی ابتدا باہمی سلام سے ہونا چاہیے۔

② مہمان کے کھانے پینے کا فوراً سامان کرنا چاہیے، کیوں کہ "روغان" کے معنی سرعت کے ہیں۔

③ روغان کے ایک معنی چپکے چلے جانے یا دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے کے بھی ہیں، اس لیے مہمانوں کے کھانے پینے کا سامان مخفی طور پر ان کی نگاہ بچا کر کرنا چاہیے، کیوں کہ اگر مہمانوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ

ہمارے لیے کچھ سامان کیا جا رہا ہے، تو وہ از راہِ تکلف اس کو روکیں گے، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اہل وعیال سے یہ نہیں کہا کہ کھانے پینے کا سامان کرو، بلکہ چپکے سے خود کھانے پینے کا سامان کرنے چلے گئے۔

④ کسی بہانے سے تھوڑی دیر کے لیے مہمانوں سے الگ ہو جانا چاہیے، تا کہ ان کو آرام کرنے یا دوسرے ضروریات سے فارغ ہونے میں تکلیف نہ ہو، اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کھانے پینے کا سامان کرنے کے لیے ان سے الگ ہو گئے۔

⑤ مہمانوں کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہیے، اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کیا۔

⑥ کھانا مہمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے، ان کو کھانے کا حکم نہیں دینا چاہیے، اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے کہا کہ آپ لوگ کیوں نہیں کھاتے؟ یہ نہیں کہا کہ آپ لوگ کھایئے۔

⑦ مہمانوں کے کھانے سے مسرور اور نہ کھانے سے مغموم ہونا چاہیے، کیوں کہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں، وہ کھانا تو مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں، لیکن ان کی خواہش یہی ہوتی ہے، کہ مہمان نہ کھائے یا کم کھائے، تا کہ وہ کھانا ان کے اور ان کے اہل وعیال کے کام آئے، اسی لیے جب ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو ناپسند کیا اور ان کے دل میں خطرہ پیدا ہوا کہ یہ دشمن بن کر تو نہیں آئے ہیں۔

⑧ نہ کھانے کی حالت میں مہمانوں کو عمدہ الفاظ میں عذر کرنا چاہیے، اسی لیے ان فرشتوں نے کہا کہ اگر ہم نہیں کھاتے تو آپ کو خوفزدہ نہ ہونا چاہیے، کیوں کہ ہم لوگ کھا پی نہیں سکتے، بلکہ صرف آپ کو ایک لائق فرزند کے تولد کی بشارت دینے آئے ہیں۔

سورۂ حجر میں حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان فرشتوں کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آرام وآسائش کے ساتھ میزبان، مہمان کی عزت وآبرو کا بھی محافظ ہوتا ہے، اس لیے کوئی شخص اس کے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرنا چاہے تو میزبان کا یہ فرض ہے کہ مہمان کی جانب سے مدافعت کرے، کیوں کہ اس سے خود میزبان کی توہین ہوتی ہے، اسی لیے جب قوم لوط نے ان مہمان فرشتوں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کرنا چاہا تو حضرت لوط علیہ السلام نے کہا:

﴿قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ۝ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ۝﴾ (۱۵/ الحجر:۶۸۔۶۹)

”کہا یہ میرے مہمان ہیں تو (ان کے بارے میں) مجھ کو فضیحت نہ کرو اور اللہ سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو۔“

یہ تو قرآن مجید کے ضمنی اشارات تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے مکارم اخلاق میں مہمان نوازی کو بہ

تصریح اس قدر اہمیت دی کہ اس کو ایمان کامل کا ایک جزو قرار دیا اور فرمایا کہ ''جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے اور جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کا جائزہ عزت کے ساتھ دے''۔ کہا گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اس کا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا کہ ''ایک دن اور ایک رات اور مہمانی تین دن کی ہے، اس کے آگے مہمان پر صدقہ ہوگا۔'' (1) نیز فرمایا کہ ''جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے اور جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہیے کہ اپنے قرابت کے تعلقات کو جوڑے رکھے۔'' (2)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: ''کیا مجھے یہ خبر نہیں ملی ہے کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو اور دن کو روزہ رکھتے ہو؟'' انھوں نے کہا: بے شک، فرمایا: ''ایسا نہ کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی، روزہ بھی رکھو اور بے روزہ بھی رہو، کیوں کہ تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے، تمہاری آنکھ کا حق ہے، تمہارے مہمانوں کا حق ہے اور تمہاری بی بی کا حق ہے۔'' (3) ایک حدیث میں ہے کہ ''ایک شب کی مہمانی تو واجب ہے، پھر اگر مہمان کسی کے یہاں رہ جائے تو مہمانی اس پر قرض ہے، چاہے وہ لے لے، چاہے چھوڑ دے۔'' (4)

چونکہ کہیں مہمان ہونا میزبان کے لیے بہر حال یک گونہ تکلیف کا باعث ہے اور کسی کے ہاں بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ جہاں میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم کی ہدایت کی گئی ہے، وہاں مہمان کو بھی یہ بتا دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے خوان کرم سے حد ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائے، چنانچہ احادیث میں تصریح کر دی گئی ہے کہ مہمان کو کسی کے ہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہیے، کیوں کہ اس سے صاحب خانہ کو تکلیف ہوگی اور اس پر بار پڑے گا۔ (5) اس کے علاوہ تین دن سے زیادہ کی مہمانی صدقہ ہو جائے گی، جس کو خود غیور اور خود دار مہمان پسند نہ کرے گا۔

---

(1) بخاری، کتاب الادب، باب من کان یؤمن باللّٰہ والیوم الآخر فلایؤذ جارہ: ٦٠١٨، ٦٠١٩۔

(2) بخاری، کتاب الادب، باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ: ٦١٣٨۔

(3) بخاری، کتاب الادب، باب حق الضیف: ٦١٣٤۔ (4) ابن ماجہ، کتاب الادب، باب حق الضیف: ٣٧٧٧۔

(5) بخاری، کتاب الادب، باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ: ٦١٣٥۔

مسلمانوں کے باہمی حقوق

آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے عرب کا بچہ بچہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا، ایک ایک خون کا بدلہ کئی پشتوں تک جا کر لیتے تھے، اس طرح خاندانوں میں لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا اور ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے کو ہمیشہ خطروں میں گھرا ہوا پاتا تھا اور اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے، چلتے پھرتے ہر وقت چوکنا رہتا تھا کہ کوئی اس پر حملہ نہ کر بیٹھے۔ آنحضرت ﷺ تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے اور وہ دین کا رشتہ تھا، جس نے مدت کے بچھڑوں کو ملا دیا، دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا اور خاندانی وقبائلی یگانگی سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یگانگی ان کے اندر پیدا کر دی، جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتوں کا خاتمہ کر دیا اور باہمی دشمنیوں کو ان کے دلوں سے ایسا بھلا دیا، کہ وہ حقیقت میں بھائی بھائی ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۰۲۔۱۰۳)

''اے مسلمانو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ تم مرو لیکن مسلمان اور اللہ کی رسی سب مل کر مضبوطی سے پکڑے رہو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو اور تم اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم دشمن تھے، تو اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا، پھر تم بھائی بھائی ہو گئے۔''

مسلمانوں کے اس باہمی میل ملاپ اور محبت کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل ظاہر فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی روئے زمین کا سارا خزانہ بھی لٹا دیتا تو ان دشمنوں کو باہم ملا کر ایک نہیں کر سکتا تھا:

﴿ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝ ﴾ (۸/ الانفال: ۶۳)

''اور اللہ نے مسلمانوں کے دل ملا دیے، اگر تو زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کر دیتا، تب بھی تو ان کے دلوں کو ملا نہ سکتا، لیکن اللہ نے ملا دیا، بے شک وہ (ہر مشکل پر) غالب آنے والا ہے اور مصلحت جاننے والا ہے۔''

تو اب مسلمانوں کو یہ چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر کریں اور سب مل کر اللہ کے دین کی رسی کو جو ان کی یگانگی کا اصلی رشتہ ہے اور باہم مضبوط پکڑیں اور باہم اختلاف پیدا کر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں، کیوں کہ اس رسی کی مضبوطی اسی وقت تک ہے جب تک سب مل کر اس کو پکڑے رہیں، فرمایا:

﴿ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ ﴾ (۸/ الانفال: ٤٦)

''اور اللہ اور رسول کا کہا مانو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، (کہ ایسا ہوگا تو) ہمت ہار دو گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔''

یہی باہمی اتفاق و اتحاد ملتِ اسلامیہ کی عمارت کا ستون ہے اور مسلمانوں کی جماعت کا شیرازہ، اس شیرازہ کے استحکام کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ مسلمانوں میں باہم الفت و محبت ہو، اب اگر اتفاق سے ان میں اختلاف پیش آ جائے، تو اس کے دور کرنے کی صورت یہ ہے کہ دونوں اللہ و رسول کے حکم کی طرف رجوع کریں:

﴿ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ ﴾ (٤/ النسآء:٥٩)

''تو اگر تم (مسلمانوں) میں کسی بات میں جھگڑا ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔''

اگر یہ جھگڑا بڑھتے بڑھتے جنگ تک پہنچ جائے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ جو فریق ظالم ہو سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو صلح پر مجبور کریں اور جب وہ راضی ہو جائے تو عدل و انصاف سے ان میں صلح کرا دیں:

﴿ وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۖ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ﴾

(٤٩/ الحجرات:٩۔١٠)

''اگر مسلمانوں کے دو گروہ لڑ پڑیں، تو ان میں صلح کرا دو، پھر اگر ایک دوسرے پر ظلم کرے، تو ظلم کرنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع ہو، تو اگر وہ رجوع کر لے تو ان میں عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو، اللہ منصفوں کو دوست رکھتا ہے، مومن تو آپس میں بھائی ہی ہیں، تو اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو۔''

آیت کے اخیر ٹکڑے نے بتایا کہ باہم مسلمانوں میں بھائی بھائی کا رشتہ ہے، یہ رشتہ جنگ و خونریزی کے بعد بھی نہیں کٹتا، انہی آیتوں کے تحت میں وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا)) [1]

''تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، یا رسول اللہ! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جا سکتی ہے، لیکن اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کیونکر کی جائے؟ فرمایا: ''اس طرح کہ اس کے ہاتھوں کو ظلم سے روکا جائے۔''

کیسا ہی بڑے سے بڑا کافر اور سخت سے سخت دشمن ہو، جس وقت اس نے کلمہ شہادت پڑھا اور شریعت اسلامی کو قبول کیا دفعتہً ہمارا مذہبی بھائی ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ ۗ ﴾ (٩/ التوبة:١١)

[1] صحيح بخاري، كتاب المظالم، باب أعن أخاك ظالما أو مظلوما: ٢٤٤٣۔

''تو اگر یہ کافر (کفر سے) توبہ کرلیں اور نماز کھڑی کریں اور زکوۃ دیں تو وہ تمہارے مذہبی بھائی ہیں۔''

غلام بھی اگر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے، تو وہ اسلام کے رشتہ میں داخل ہو گیا، اگر اس کے باپ کا نام و نسب نہیں معلوم تو کوئی حرج نہیں، وہ دین کے رشتہ سے ہر مسلمان کا بھائی ہے، فرمایا:

﴿ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ؕ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵)

''تو اگر تم ان کے باپوں کے نام نہ جانو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور علاقہ مند۔''

ایک مسلمان کسی مسلمان کو قتل کر دے، تب بھی اللہ تعالیٰ مقتول کے رشتہ داروں کو قاتل کا بھائی قرار دے کر اس کے جذبہ رحم کی تحریک فرماتا ہے:

﴿ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۸)

''تو اگر قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے۔''

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی غیبت حرام ہے، کیونکہ

﴿ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا ﴾ (۴۹/ الحجرات:۱۲)

''کیا تم میں کوئی پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔''

یتیموں کے مال کی دیکھ بھال اور خوبی سے اس کا انتظام کرنا، متولیوں کا فرض ہے اور اگر وہ ان کو اپنے اندر شامل کر کے نیک نیتی کے ساتھ ان کو اپنے کنبہ کا جزو بنالیں اور ملا جلا کر خرچ کریں، تو یہ بھی درست ہے، کیونکہ یہ ان کے بھائی ہیں، جن کی خیرخواہی ان کا فرض ہے، فرمایا:

﴿ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۰)

''اور اگر تم ان کو اپنے میں ملا لو تو یہ بھی جائز ہے، کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں۔''

ایک مسلمان بھائی کا دوسرے مسلمان بھائی پر یہ بھی حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حق میں دعائے خیر کریں، وہ یوں کہتے ہیں:

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ ﴾ (۵۹/ الحشر:۱۰)

''اے ہمارے پروردگار! ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے معاف کر۔''

ایک مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ ہونا ایسی برائی ہے، جس کے دور کرنے کے لیے اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگنی چاہیے اور کہنا چاہیے:

﴿ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (۵۹/ الحشر:۱۰)

''اور ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ مت رہنے دے، اے ہمارے پروردگار! تو مہربان رحم والا ہے۔''

مسلمانوں کی یہ صفت ہے کہ باہم وہ ایک دوسرے سے رحم وشفقت کے ساتھ پیش آتے ہیں، اللہ نے مدح فرمائی:

﴿ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ (٤٨/ الفتح:٢٩)

''وہ (مسلمان) آپس میں رحم وشفقت رکھتے ہیں۔''

مسلمان کی یہ صفت ہونی چاہیے کہ وہ دوسرے مسلمان سے جھک کر ملے اور نرمی کا برتاؤ کرے۔

﴿ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٥٤)

''مسلمانوں سے جھکنے اور نرمی کرنے والے۔''

مسلمانوں کی اس باہمی اخوت، محبت اور مہربانی کی مزید تشریح اور تاکید محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبانِ فیض ترجمان سے یوں فرمائی ہے: ''مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو، تو بدن کے سارے اعضاء بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔'' [1] صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ فرمایا: ''سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں، کہ اگر اس کی آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے۔'' [2] مقصود یہ ہے کہ امت مسلمہ ایک جسم ہے اور اس کے سارے افراد اس کے اعضاء ہیں۔ بدن کے ایک عضو میں اگر کوئی تکلیف ہو یا دکھ درد ہو تو سارے اعضا اس تکلیف کو محسوس کرتے ہیں اور اس دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں، یہی مسلمانوں کا حال ہونا چاہیے کہ ان میں سے ایک کو بھی تکلیف پہنچے تو سارے مسلمانوں کو وہ تکلیف محسوس ہونی چاہیے۔

ایک دوسری تمثیل میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''مسلمان باہم ایک دوسرے سے مل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہیں جیسے دیوار، کہ اس کے ایک حصہ سے اس کا دوسرا حصہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔'' [3] بخاری میں ہے کہ یہ کہہ کر آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا، کہ کیسے ایک حصہ سے دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے، اس تمثیل میں آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ ''جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر مضبوط ہو کر ناقابل تسخیر حصن و حصار بن جاتی ہے، اسی طرح جماعت

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم:٦٠١١ وصحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تراحم المؤمنين وتعاطفهم وتعاضدهم:٦٥٨٦۔ [2] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، ایضاً:٦٥٨٩۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب تعاون المؤمنين بعضهم بعضا: ٦٠٢٦ وصحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، ایضاً: ٦٥٨٥۔

اسلامیہ ایک قلعہ ہے، جس کی ایک ایک اینٹ ایک ایک مسلمان ہے، یہ قلعہ اسی وقت تک محفوظ ہے، جب تک اس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے ملی ہوئی ہے، جب یہ اینٹ اپنی جگہ سے کھسک جائے گی، تو پوری دیوار دھم سے زمین پر آ جائے گی۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ''ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرے، نہ اس کو بے مدد چھوڑے اور نہ اس کی تحقیر کرے...... انسان کے لیے یہ برائی کیا کم ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے، مسلمان کا ہر حصہ دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو۔'' ❶ یہ صحیح مسلم کی روایت ہے، ابوداؤد میں ہے کہ فرمایا: ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے تو وہ نہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کو اس کے دشمن کے حوالہ کرے، جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں رہے گا، تو اللہ اس کی ضرورت پوری کرے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پردہ رکھے گا۔'' ❷

ابوداؤد کی دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا: ''جو کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا۔ اور جو کسی تنگ دست پر آسانی کرے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس پر آسانی کرے گا اور جو کسی مسلمان کا پردہ رکھے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کا پردہ رکھے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے، جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔'' ❸

فرمایا ''مسلمان وہ جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں۔'' ❹ یہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے، دوسری میں ہے کہ لوگوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! سب سے اچھا مسلمان کون ہے؟ فرمایا: ''جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں۔'' ❺ یعنی جو مسلمان اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچاتا، وہی سب سے بہتر مسلمان ہے۔

جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ جو ایک مشہور صحابی تھے، کہتے ہیں کہ ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے تین باتوں پر بیعت کی، نماز کو قائم رکھنا، زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۔'' ❻ کئی روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان کو گالی دینا اللہ کی نافرمانی (فسوق) ہے اور اس سے لڑنا (قتال) اللہ کا انکار (کفر) ہے۔'' ❼ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں باہم برادری اور صلح و آشتی کا حکم دیا ہے، اب جو

❶ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم ظلم المسلم و خذله......: ٦٥٤١۔ ❷ سنن ابی داود، کتاب الادب، باب المؤاخاة: ٤٨٩٣۔ ❸ سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی المعونة للمسلم: ٤٩٤٦۔
❹ صحیح بخاری، کتاب الایمان: ١٠۔ ❺ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب ای الاسلام افضل: ١١؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، بیان تفاضل الاسلام: ١٦١۔ ❻ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ: الدین النصیحة: ٥٧۔ ❼ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب خوف المؤمن ان یحبط عمله......: ٤٨ وکتاب الادب باب ما ینهی عن السباب واللعن: ٦٠٤٤۔

اس کے خلاف کرتا ہے وہ اللہ کے حکم کو نہیں مانتا اور یہ ایک معنی میں اللہ کا انکار ہی ہے، چنانچہ اسی لیے قرآن پاک میں مسلمان کے ناحق اور بالارادہ قتل کرنے کی سزا وہی رکھی ہے، جو کافروں کے لیے مخصوص ہے، فرمایا: ''کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو قتل کرے، الا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے''۔

﴿ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا﴾ (٤/ النسآء:٩٣)

''اور جو کوئی کسی مسلمان کو قصداً قتل کرے گا، تو اس کا بدلہ دوزخ ہے، وہ اس میں پڑا رہے گا اور اللہ اس پر خفا ہوا اور لعنت کی اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کیا۔''

حجۃ الوداع کے نہایت اہم خطبہ میں آپ نے پہلے لوگوں کو چپ کرایا، پھر فرمایا: ''دیکھو میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔'' 1 ایک اور موقع پر فرمایا کہ ''جو ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں۔'' 2 جان تو بڑی چیز ہے کسی مسلمان کی آبرو کے پیچھے پڑنا بھی بڑا گناہ ہے، فرمایا: ''سب سے بڑا ربا کسی مسلمان کی آبرو کی طرف بے سبب ہاتھ بڑھانا ہے۔'' 3 اگر کوئی مسلمان کسی ایسے مخمصہ میں گرفتار ہو جس میں اس کی آبرو جانے کا ڈر ہو، تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کے بچانے کی کوشش کرے، ارشاد ہوا: ''جو کوئی کسی مسلمان کو کسی ایسے موقع پر بے مدد چھوڑ دے گا، جس میں اس کی عزت پر حرف آتا ہو اور اس کی آبرو جاتی ہو، تو اللہ بھی اس کو ایسی جگہ بے مدد چھوڑ دے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کی ایسے موقع پر مدد کرے گا تو اللہ بھی اس کی ایسے موقع پر مدد فرمائے گا۔'' 4

اگر دو مسلمانوں میں کسی ناراضی کے سبب سے بول چال بند ہو جائے، تو آنحضرت ﷺ نے تین روز سے زیادہ ایسا کرنے سے منع فرمایا، ارشاد ہوا کہ ''کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے، ملاقات ہو تو وہ ادھر منہ پھیر لے اور یہ ادھر منہ پھیر لے اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے کہ جو پہلے سلام کی ابتدا کرے۔'' 5 ایک اور طریقہ سے یہ روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''آپس میں کینہ نہ رکھو، حسد نہ کرو اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہو، اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ اور کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بولنا چالنا چھوڑ دے۔'' 6 ایک مسلمان کے لیے اس کی عزت و آبرو سے بڑھ کر معاملہ اس کے ایمان کا ہے، قرآن نے کہا کہ جب تم کو کوئی اپنے

---

1 صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الانصات للعلماء: ١٢١ وکتاب الدیات: ٦٨٦٧، ٦٨٦٩۔

2 صحیح بخاری، کتاب الدیات ایضًا: ٦٨٧٤ وکتاب الفتن، باب قول النبی ﷺ من حمل علینا ...: ٧٠٧٠۔

3 سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی الغیبۃ: ٤٨٧٦۔ 4 ایضا، باب الرجل یذب عن عرض اخیہ: ٤٨٨٤۔

5 صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الھجرۃ: ٦٠٧٧ وسنن ابی داود کتاب الادب، باب فی ھجرۃ الرجل اخاہ: ٤٩١١۔ 6 صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ماینھی عن التحاسد والتدابر: ٦٠٦٥۔

اظہارِ اسلام کے لیے سلام کرے تو اس کو یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں:

﴿ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ﴾ (٤/ النسآء: ٩٤)

''اس کو جو تمہاری طرف سلامتی کا کلمہ ڈالے، یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں۔''

مقصد یہ ہے کہ جو کوئی اپنے کو مسلمان کہے یا وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے، کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کہے کہ تم مسلمان نہیں، ایک لڑائی میں ایک صحابی نے ایک کافر کو زد میں پا کر حملہ کیا، اس نے فوراً کلمہ پڑھ دیا مگر اس پر بھی ان صحابی نے اس کو قتل ہی کر دیا، یہ خبر آنحضرت ﷺ تک پہنچی، آپ نے ان کو بلا کر دریافت کیا، انھوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اس نے صرف ڈر سے کلمہ پڑھا تھا، آپ ﷺ نے کس بلیغ انداز میں فرمایا، ''تم اسکے لا الہ الا اللہ کے ساتھ کیا کرو گے''۔ ایک روایت میں ہے کہ فرمایا: ''کیا تم نے اسکا سینہ چیر کر دیکھ لیا تھا؟'' ❶

ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ ''مومن کو لعنت کرنا یا اس پر کفر کی تہمت رکھنا اس کے قتل کے برابر ہے۔'' ❷ یہ بھی فرمایا کہ ''جو کوئی اپنے بھائی کو اے کافر کہے، تو وہ کفر دو میں سے ایک پر لوٹے گا۔'' ❸ یعنی اگر وہ درحقیقت کافر نہ تھا تو اس نے ایک مسلمان کو کافر کہا اور یہ خود ایک درجہ کا کفر ہے۔ جان، ایمان اور آبرو کے بعد مال کا درجہ ہے، ارشاد ہوا کہ ''جو کوئی قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارے گا تو اللہ اس کے لیے دوزخ واجب اور جنت حرام کرے گا۔'' ایک شخص نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! اگر کوئی معمولی سی چیز ہو تب بھی؟ فرمایا: ''درخت کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو۔'' ❹

فرمایا: ''ہر مسلمان پر اس کے مسلمان بھائی کے پانچ حق ہیں، سلام کا جواب دینا، اس کے چھینکنے پر اللہ تم پر رحمت کرے کہنا، اس کی دعوت کو قبول کرنا، بیمار ہو تو عیادت کرنا اور مر جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ چلنا۔'' ❺ یعنی یہ کم سے کم حقوق ہیں، جن سے دو مسلمانوں کے درمیان خوش خلقی اور حسنِ تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ ''جب کوئی مسلمان اپنے بیمار مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے، تو وہ جب تک واپس نہ ہو جنت کی روش پر ہوتا ہے۔'' ❻ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو کوئی ایمان و اخلاص کے ساتھ کسی مسلمان کے جنازہ کے پیچھے چلتا ہے، یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھتا ہے اور اس کے دفن سے فراغت پاتا ہے، تو اس کو ثواب کی دو (۲) رتی (قیراط) ملتی ہے، جن میں سے ہر رتی احد کے پہاڑ برابر ہو گی۔'' ❼ یعنی یہ رتی

---

❶ پہلی روایت صحیح بخاری، کتاب المغازی: ٤٢٦٩ اور کتاب الدیات: ٦٨٧٢ میں ہے، دوسری روایت کے لیے دیکھو فتح الباری کتاب الدیات شرح حدیث مذکور، ج ١٢، ص: ١٧٢۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما ینھی من السباب واللعن: ٦٠٤٧۔ ❸ ایضاً، باب من اکفر اخاہ ۔۔۔: ٦١٠٣؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان حال ایمان من قال لاخیہ۔۔۔۔: ٢١٥۔ ❹ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وعید من اقتطع حق مسلم۔۔۔۔: ٣٥٣تا٣٥٧۔ ❺ سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی العطاس: ٥٠٣٠۔ ❻ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فی فضل عیادۃ المریض: ٦٥٥١تا٦٥٥٤۔ ❼ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب اتباع الجنائز: ٤٧۔

دنیاوی پیمانہ کے حساب سے نہ ہوگی، بلکہ یہ اس پیمانہ سے ہوگی، جس کا ایک ذرہ اپنی بڑائی میں پہاڑ کا حکم رکھتا ہے۔ یہ تمام حقوق جن کے جزئیات کا احاطہ نہیں ہوسکتا، اس برادرانہ الفت ومحبت کے فروغ ہیں، جن کے بغیر کسی مومن کا ایمان کامل نہیں ہوتا، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ ''تم میں سے کوئی کامل مومن نہ ہوگا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔'' [1] الغرض ملّت اسلامیہ کی جماعت کا ہر رکن دوسرے کے ساتھ ایسی محبت کرے جیسی وہ خود اپنے ساتھ کرتا ہے، اس کا نفع اپنا نفع اور اس کا نقصان اپنا نقصان سمجھے، ابوداؤد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان مسلمان کا آئینہ ہے اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس کے نقصان کو دور کرتا ہے اور اس کے پیچھے میں اس کی حفاظت کرتا ہے۔'' [2] دیکھیے کہ آنحضرت ﷺ نے جماعت اسلامیہ کی عمارت کیسی مستحکم بنیادوں پر قائم فرمائی تھی، اگر آج بھی ان ہدایتوں پر عمل کیا جائے تو اس عمارت کی دیواریں ایسی شکستہ نہ رہیں، جیسی آج ہیں، ہر جماعت انہیں اصولوں پر دنیا میں بنی ہے اور آئندہ بھی بنے گی۔

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیه ما یحب لنفسه:١٣۔ [2] سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی النصیحة والحیاطة:٤٩١٨ تیسرے فقرہ کے مطلب میں شارحین کا اختلاف ہے۔

انسانی برادری کا حق

ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ فرائض ہیں، جن سے عہدہ برآ ہونا ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے، تبلیغ یعنی غیر مسلم انسانوں کو اسلام کی دعوت کا جو حکم ہے، اس کے دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے، کہ جس چیز کو ایک مسلمان سچائی سمجھتا ہے، اس کا انسانی فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے انسان کو آگاہ اور باخبر کرے اور یہ انسانی خیر خواہی کا لازمی نتیجہ ہے۔

قرآن پاک نے تورات کے بعض احکام کو دہرایا ہے، جن میں سے ایک یہ بھی ہے:

﴿ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۳)

''اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔''

لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا، انسانیت کا فرض ہے، جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص نہیں، دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ سے باز نہ رکھے، اس لیے ارشاد ہوا:

﴿ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۸)

''اور کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل اور انصاف نہ کرو، عدل اور انصاف (ہر حال میں) کرو کہ یہ بات تقویٰ کے قریب ہے۔''

ہر قسم کا برا سلوک اور بے رحمانہ برتاؤ جو ایک انسان دوسرے انسان اور ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ کرتی ہے، اس کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے حق میں عدل سے کام نہیں لیتا، بلکہ اس پر ظلم اور بے انصافی کے لیے آمادہ رہتا ہے، یہ آیت مبارکہ انسان کے اسی مادہ فاسد کے سرچشمہ کو بند کرتی ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وکونوا عباداللہ اخوانا)) [1]

''آپس میں ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے پر حسد نہ کرو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور سب مل کر اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔''

بعض روایتوں میں الفاظ یہ ہیں:

((لا تناجشوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وکونوا عباداللہ اخوانا)) [2]

''ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، نہ ایک دوسرے پر حسد کرو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور اے اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔''

اس حدیث پاک میں انسانی برادری کا وہ نقشہ کھینچا گیا ہے، جس پر سچائی سے عمل کیا جائے تو یہ شر اور

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الھجرۃ: ٦٠٧٦۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب یایھاالذین امنوا اجتنبوا ..... ٦٠٦٦۔

فساد سے بھری ہوئی دنیا دفعتہً جنت بن جائے، فرمایا:

((من لا یرحم لا یرحم)) ❶

''جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔''

جو بندوں پر رحم نہیں کرتا، اس پر اللہ رحم نہیں کرتا، یا یہ کہ جو دوسرے پر رحم نہیں کرتا دوسرا بھی اس پر رحم نہیں کرے گا، مستدرک حاکم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔'' ❷ یہ حدیث رحمۃ للعالمین کی تعلیم کی شانِ رحمت کو کتنی عمومیت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ''جو مسلمان کوئی درخت لگائے گا اس سے جو انسان یا پرندہ بھی کچھ کھائے گا، اس کا ثواب اس لگانے والے کو ملے گا۔'' ❸ اس فیض کے عموم میں انسانیت کی قید بھی نہیں ہے، ایک دفعہ آپ ﷺ نے ایک شخص کا قصہ بیان کیا، جس نے ایک جانور کے ساتھ نیک سلوک کیا تھا، کہ اس کو اس کے اس کام پر ثواب ملا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا جانوروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے؟ فرمایا: ''ہر تر جگر کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے۔'' یعنی ہر اس ہستی کے ساتھ جس میں زندگی کی تری ہے، نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے۔ ❹ اس ثواب کے دائرہ میں ہر وہ ہستی شریک ہے جو زندگی سے بہرہ ور ہے۔

جامع ترمذی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: ''جہاں بھی ہو اللہ کا خیال رکھو، برائی کے پیچھے بھلائی کرو تو اس کو مٹا دو گے اور لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آؤ۔'' ❺ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور ﷺ نے پانچ باتیں گنائیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ ((واحبّ للناس ما تُحب لنفسك)) یعنی ''تم لوگوں (ناس) کے لیے وہی چاہو جو تم اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے۔'' ❻ الناس کا لفظ عام ہے جس میں تمام انسان داخل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جب تک سارے انسانوں کی بھلائی کا جذبہ دل میں نہ ہو، انسان پورا مسلمان نہیں بنتا۔

کیونکہ دوسروں کے لیے وہی چاہنا جو اپنے لیے چاہا ہو اخلاق کی وہ تعلیم ہے جو انسانی برادری کے ہر قسم کے حقوق کی بنیاد ہے، ایک اور حدیث میں یہ تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ ''تم اپنے بھائی کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو''۔ بھائی کے لفظ سے مسلمان بھی مراد ہو سکتا ہے اور ایک عام انسان بھی، تورات اور انجیل کے اندر یہی تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ ''تم اپنے پڑوسی کو ایسا چاہو جیسا کہ تم اپنے آپ کو چاہتے ہو۔'' ❼ اسلام

❶ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ٦٠١٣۔

❷ مستدرك حاكم، كتاب البر والصلة، ج٤، ص: ١٥٩۔ ❸ صحيح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ٦٠١٢۔ ❹ ایضا: ٦٠٠٩۔ ❺ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی معاشرة الناس: ١٩٨٧۔ ❻ جامع ترمذی، ابواب الزهد، باب من اتقى المحارم فهو أعبد الناس: ٢٣٠٥۔

❼ عهد نامه جدید مرقس، ١٢، ص: ٣٠۔

میں پڑوسیوں کے حقوق کا بیان علیحدہ باب میں گزر چکا ہے، ❶ اس پر یہاں ایک نظر ڈال لینی چاہیے کہ صحابہ کرام نے اس تعلیم کی پیروی میں یہودی اور عیسائی پڑوسیوں کا حق بھی مسلمان پڑوسیوں ہی کی طرح مانا ہے۔

صدقہ وخیرات کے باب میں گو فقرا اور مساکین میں مسلمانوں کی ترجیح ایک قدرتی باب ہے، تاہم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں نامسلمان ذمی مسکینوں کے حق کو بھی تسلیم کیا، قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ایک بڈھا جو اندھا بھی تھا، ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ مارا اور پوچھا کہ تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت کیا پڑی، اس نے کہا، جزیہ ادا کرنے اور اپنی ضرورت پوری کرنے اور اپنی عمر کے سبب سے بھیک مانگتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لائے اور اپنے گھر سے اس کو کچھ دیا، پھر اس کو بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ اس کو اور اس جیسے لوگوں کو دیکھو، اللہ کی قسم! ہم انصاف نہیں کریں گے، اگر ہم اس کی جوانی کی کمائی تو کھائیں اور اس کے بوڑھے ہونے پر اس کی مدد چھوڑ دیں، قرآن میں صدقہ کی اجازت فقرا اور مساکین کے لیے ہے، فقرا تو وہی ہیں جو مسلمان ہیں اور یہ لوگ مساکینِ اہل کتاب میں ہیں، ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔ ❷

اسلام کا یہ عام فیصلہ ہے کہ زکوۃ کے علاوہ دوسرے عام صدقے غیر مسلموں کو دیئے جاسکتے ہیں، آنحضرت نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا، ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو ۳۰ ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا، امام مجاہد نے مشرک رشتہ دار کا قرض معاف کرنے کو ثواب کا کام بتایا، ابن جریج محدث کہتے ہیں کہ قرآن نے ❸ ''اسیر'' کے کھلانے کو ثواب بتایا ہے اور ظاہر ہے کہ صحابہ کے قبضہ میں مشرک ہی قید ہو کر آتے تھے، ابو میسرہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن میمون رضی اللہ عنہ اور عمرو بن شرحبیل رضی اللہ عنہ صدقہ فطر سے عیسائی راہبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ ❹ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا، ❺ اور خود حضور نے بعضوں کو ان کے مشرک والدین کے ساتھ صلہ رحمی کی اجازت دی۔ ❻ تفسیر کی روایتوں میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم جب مذہبی اختلاف کی بنا پر غریب مشرکوں کی مدد سے کنارہ کرنے لگے تو یہ آیت اتری: ❼

﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۷۲)

---

❶ دیکھیے جلد ہذا۔ ❷ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف بھامشہ الجامع الصغیر للامام محمد، ص: ۷۲، مصر۔ ❸ ۷۶/ الدھر:۸۔ ❹ کتاب الاموال امام ابو عبیدۃ، ص: ۶۱۳، ۶۱۴۔

❺ صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ، باب یلبس احسن ما یجد:۸۸۶۔ ❻ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ والصدقۃ علی الاقربین:۲۳۲۵۔ ❼ تفسیر طبری، ج ۳، ص:۵۸۔

’’ان کو راہ پر لے آنا تیرے اختیار کی بات نہیں، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے، راہ پر لے آتا ہے اور جو بھلائی سے خرچ کرو وہ تمہارے ہی لیے ہے۔‘‘

یعنی تم کو تمہاری نیکی کا ثواب بہرحال ملے گا۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا:

((لا یؤمن احدکم حتی یحب للناس ما یحب لنفسه وحتی یحب المرء لا یحبه الا للّٰه عزوجل)) [1]

’’تم میں سے کوئی اس وقت پورا مومن نہیں ہوگا جب تک وہ اور لوگوں کے لیے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور جب تک وہ آدمی کو صرف اللہ کے لیے پیار نہ کرے۔‘‘

اس حدیث میں محبتِ انسانی کی وسعت ساری انسانی برادری تک وسیع کر دی گئی ہے۔

[1] مسند امام احمد، ج۳، ص:۲۷۲۔

جانوروں کے حقوق

اسلام دنیا میں لطف و محبت کا جو عام پیغام لے کر آیا تھا، اس کا سلسلہ حیوانات تک وسیع ہے، اس نے حیوانات کے ساتھ متعدد طریقوں سے سلوک کرنے کی ہدایت کی، اہل عرب وحشت اور قساوت کی وجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے، وہ جانوروں کو اندھادھند مار کر گرا دیتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ تم ان کو کھاؤ اور اس کو فیاضی سمجھتے تھے، دو آدمی شرط باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور باری باری سے اپنا اپنا ایک اونٹ ذبح کرتا چلا جاتا تھا، جو رک جاتا وہ ہار جاتا، یہ سب جانور دوست واحباب کی دعوت میں نذر ہو جاتے تھے، یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی، ان واقعات کا ذکر اشعار عرب میں موجود ہے، ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مر جاتا، تو اس کی سواری کے جانور کو اس کی قبر پر باندھتے تھے اور اس کو دانہ گھاس اور پانی نہیں دیتے تھے اور وہ اسی حالت میں سوکھ کر مر جاتا ایسے جانور کو بلیہ کہتے تھے، اسلام آیا تو اس نے اس سنگ دلی کو مٹا دیا، عرب میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اس پر نشانہ لگاتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس قسم کے جانوروں کے گوشت کو ناجائز قرار دیا اور عام حکم دیا کہ کسی ذی روح چیز کو اس طرح نشانہ نہ بنایا جائے۔ ❶ ایک بار ایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنا رہا تھا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مرغی کو کھول دیا اور مرغی کے ساتھ اس لڑکے کو لے کر اس کے خاندان میں آئے اور کہا کہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کرو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقہ سے جانور یا اور کسی جاندار کو نشانہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے، اسی طرح کچھ اور لوگ مرغی کو باندھ کر نشانہ بنا رہے تھے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا گزر ہوا تو وہ لوگ بھاگ گئے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ایسا کس نے کیا ہے، جو لوگ ایسا کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان کو ملعون قرار دیا ہے۔ ❷ اس سے بھی زیادہ بے رحمانہ طریقہ یہ تھا کہ زندہ اونٹ کے کوہان اور دنبہ کے دم کی چکی کاٹ کر کھاتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں آ کر یہ حالت دیکھی تو فرمایا: ''اس طریقہ سے زندہ جانوروں کا جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے وہ مردار ہے۔'' ❸ یہ ایک خاص صورت تھی، لیکن عموماً زندہ جانوروں کے مثلہ کرنے یعنی ان کے کسی عضو کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی۔ ❹ بلاضرورت کسی جانور کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ قرار دیا۔ ❺ ایک حدیث میں ہے کہ ''کسی نے اگر کنجشک یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور کو اس کے حق کے بغیر ذبح کیا تو اللہ اس کے متعلق اس سے باز

---

❶ ترمذی، ابواب الصید، باب ماجاء فی کراھیة اکل المصبورة:١٤٧٣۔

❷ بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب مایکره من المثلة والمصبورة والمجثمة:٥٥١٤، ٥٥١٥۔

❸ ترمذی، ابواب الصید باب ماجاء ماقطع من الحی فهو میت:١٤٨٠۔

❹ بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب مایکره من المثلة والمصبورة والمجثمة:٥٥١٥۔

❺ مستدرك حاکم، کتاب النکاح، ج ٢، ص: ١٨٢۔

پرس کرے گا۔" صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا: "یہ کہ اس کو ذبح کرے اور کھائے، یہ نہیں کہ اس کا سر کاٹ کے پھینک دے۔" ❶ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا نہیں جاتا اور وہ درندہ بھی نہیں ان کا مارنا جائز نہیں، سنن نسائی میں ہے کہ "جو شخص کنجشک کو بلاضرورت مارے گا وہ قیامت کے دن اللہ کے یہاں فریاد کرے گی کہ فلاں نے مجھ کو بلاضرورت مارا ہے، اس سے اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔" ❷ جو جانور کوئی نقصان نہیں پہنچاتے یا ان سے انسانوں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے، ان کا مارنا بھی جائز نہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے خاص طور پر چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور صرد کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ ❸

جو جانور ضرورۃً مارے یا ذبح کیے جاتے ہیں، ان کے مارنے یا ذبح کرنے میں بھی ہر طرح کی نرمی کرنے کا حکم دیا، ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے، اس لیے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو تو اچھے طریقے سے مارو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو، تم میں ہر شخص اپنی چھری کو تیز کر لے اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے۔" ❹ ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر رحم آتا ہے، یا یہ کہ مجھے اس پر رحم آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں، فرمایا: "اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو اللہ تم پر رحم کرے گا۔" ❺ یہی وجہ ہے کہ دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دے کر جانوروں کے ذبح کرنے کی ممانعت فرمائی۔ ❻ کیونکہ اس سے جانوروں کو تکلیف ہوتی ہے، کنکر پتھر یا غلیل چلانے کی بھی ممانعت فرمائی اور فرمایا کہ اس سے نہ شکار ہو سکتا نہ دشمن شکست کھا سکتا ہے، البتہ اس سے دانت ٹوٹ سکتا ہے اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے۔ ❼ مطلب یہ کہ بلاضرورت جانوروں اور پرندوں کو جسمانی صدمہ پہنچانا جائز نہیں، جانوروں کے ساتھ جو بے رحمیاں کی جاتی تھیں، ان کا اصل سبب یہ تھا کہ اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جانوروں کو دکھ درد پہنچانا گناہ کا کام ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اہل عرب کو بتایا کہ جس طرح انسانوں کی ایذا رسانی ایک شرعی جرم ہے، اسی طرح جانوروں کی ایذا رسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے۔ چنانچہ ایک عورت کی نسبت آپ ﷺ نے فرمایا: "اس پر صرف اس لیے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا اور اس کو کھانا پانی کچھ نہ دیا اور آخر وہ اسی طرح بندھی بندھی مر گئی۔" ❽ بلکہ لوگ چونکہ انسانوں کی بہ نسبت جانوروں کو زیادہ ستاتے ہیں، اس لیے وہ اس معاملے میں بہت زیادہ گناہگار ہیں،

---

❶ نسائی، کتاب الضحایا، باب من قتل عصفورا: ٤٤٥٠؛ دارمی: ١٩٧٨؛ احمد، ٢/ ١٦٦۔

❷ نسائی، کتاب الضحایا، من قتل عصفوراً: ٤٤٥١۔

❸ ابوداود، کتاب الادب، باب فی قتل الذر: ٥٢٦٧؛ ابن ماجه: ٣٢٢٤۔

❹ مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب الامر باحسان الذبح والقتل: ٥٠٥٥۔

❺ مسند احمد، ج٣، ص: ٤٣٦۔ ❻ نسائی، کتاب الضحایا، باب النهی عن الذبح فی الظفر: ٤٤٠٨ وباب فی الذبح بالسن: ٤٤٠٩؛ بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب الخذف والبندقة: ٥٤٧٩۔

❼ بخاری، ایضا: ٥٤٧٩، ٤٨٤١۔ ❽ بخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا وقع الذباب: ٣٣١٨۔

چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگ جانوروں کے ساتھ جو بدسلوکیاں کرتے ہو، اگر اللہ ان کو معاف کر دے تو سمجھو کہ اس نے تمہارے بہ کثرت گناہ معاف کر دیئے۔'' ❶ ایک دفعہ آپ صحابہ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ میں تھے، آپ ضرورت سے کہیں تشریف لے گئے تھے، جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولھا ایسی جگہ جلایا ہے، جہاں زمین میں یا درخت پر چیونٹیوں کا سوراخ تھا، یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ ''یہ کس نے کیا ہے؟'' ان صاحب نے کہا، یا رسول اللہ! یہ میں نے کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''بجھاؤ بجھاؤ۔'' ❷ (غرض یہ تھی کہ ان چیونٹیوں کو تکلیف نہ ہو، یا جل نہ جائیں)

ایک حدیث میں ہے کہ ایک پیغمبر کسی درخت کے نیچے اترے تو ان کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا، انھوں نے پہلے اپنا سامان اس جگہ سے ہٹایا، پھر تمام چیونٹیوں کو آگ سے جلا دیا، اس پر اللہ نے ان کو وحی کے ذریعہ سے متنبہ کیا کہ صرف ایک ہی چیونٹی کو کیوں نہیں جلایا، ❸ یعنی قصاص کی مستحق صرف وہی چیونٹی تھی، جس نے کاٹا تھا، تمام چیونٹیوں کا قصور نہ تھا، ایک حدیث میں ہے کہ ''ایک سفر جہاد میں صحابہ کرام ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے، چڑیا فرط محبت سے ان کے گرد منڈلانے لگی، رسول اللہ ﷺ قضائے حاجت کے لیے گئے ہوئے تھے، واپس آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا: ''اس کے بچوں کو پکڑ کر کس نے اس کو بے قرار کیا ہے، اس کے بچوں کو چھوڑ دو۔'' صحابہ کرام نے چیونٹیوں کے ایک گھر کو بھی جلا دیا تھا، دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ یہ خود صحابہ کا فعل تھا تو فرمایا: ''آگ کی سزا دینا صرف اللہ ہی کے لیے سزاوار ہے۔'' ❹

اسی طرح اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس طرح انسانوں کے ساتھ سلوک کرنا ثواب کا کام ہے، بعینہ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کے ساتھ سلوک کرنا بھی موجب ثواب ہے، اسی عدم واقفیت کی بنا پر ایک صحابی نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں نے خاص اپنے اونٹوں کے لیے پانی کے جو حوض بنائے ہیں ان پر بھولے بھٹکے اونٹ بھی آ جاتے ہیں، اگر میں ان کو پانی پلا دوں تو کیا مجھ کو اس پر ثواب ملے گا؟ فرمایا: ''ہر پیاسے یا ہر ذی حیات کے ساتھ حسن سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے۔'' ❺

ایک حدیث میں ہے کہ ''ایک شخص راستہ میں جا رہا تھا کہ اس کو سخت پیاس لگ گئی، اتفاق سے اس کو ایک کنواں مل گیا اور اس نے کنوئیں میں اتر کر پانی پی لیا، کنوئیں سے نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے زبان نکال رہا ہے اور کیچڑ چاٹ رہا ہے، اس نے اپنی پیاس کی شدت کو یاد کر کے اس پر ترس کھایا اور کنوئیں میں اتر کر پانی لایا اور اس کو پلایا، اللہ کے نزدیک اس کا یہ عمل مقبول ہوا اور اللہ نے اس کو بخش دیا۔'' صحابہ کرام نے اس واقعہ کو سنا تو بولے کہ یا رسول اللہ! کیا جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے میں بھی ثواب ملتا ہے؟ فرمایا: ''ہر

---

❶ مسند احمد، ۲/ ۴۴۱، ۴۴۲۔ ❷ مسند ابن حنبل، ج ۱، ص: ۳۹۶ عن عبداللہ بن مسعود۔
❸ بخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا وقع الذباب: ۳۳۱۹۔ ❹ ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی کراهية حرق العدو بالنار: ۲۶۷۵۔ ❺ ابن ماجه، ابواب الادب، باب فضل صدقة الماء: ۳۶۸۶۔

ذی حیات کے ساتھ حسن سلوک کرنا موجب ثواب ہے۔'' ❶ صرف جانداروں ہی تک نہیں بلکہ نباتات تک کی خدمت اور پرورش کو بھی اجر کا موجب بتایا اور فرمایا کہ ''جو مسلمان درخت نصب کرتا ہے، یا کھیتی باڑی کرتا ہے اور اس کو چڑیا یا انسان یا جانور کھاتا ہے تو یہ ایک صدقہ یعنی ثواب کا کام ہے۔'' ❷ اس اصول کے بتانے کے بعد عملی طور پر جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے کے متعدد اصول بتائے، یعنی:

① جو جانور جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اس سے وہی کام لینا چاہیے، چنانچہ فرمایا: ''ایک شخص ایک بیل پر سوار ہو کر جا رہا تھا، بیل نے مڑ کر کہا کہ میں اس کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہوں، صرف کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔'' ❸ نیز فرمایا کہ ''اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ، اللہ نے ان کو تمہارا فرماں بردار صرف اس لیے بنایا ہے کہ وہ تم کو ایسے مقامات میں پہنچا دیں جہاں تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے تمہارے لیے اللہ نے زمین کو پیدا کیا ہے، اپنی ضرورتیں اسی پر پوری کرو۔'' ❹ اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے بعض موقعوں پر اونٹ کی پشت پر بیٹھ کر خطبہ دیا ہے، اس لیے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بلا ضرورت سواری کے جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھے رہنا مناسب نہیں کہ اس سے جانور کو غیر ضروری تکالیف ہوتی ہے، صرف سفر کی حالت میں اس پر سوار ہونا چاہیے۔

② جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیے، چنانچہ فرمایا کہ ''جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانے میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ اور جب قحط کے زمانے میں سفر کرو تو ان کو تیزی کے ساتھ چلاؤ۔'' ❺ تاکہ قحط کی وجہ سے ان کو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ میں ہوتی ہے، اس سے وہ جلد نجات پائے، ایک بار آپ ﷺ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا، فرمایا: ''ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو، ان پر سوار ہو تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر سوار ہو اور ان کو کھاؤ تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر کھاؤ۔'' ❻

ایک بار آپ ﷺ ایک انصاری کے باغ میں رفع حاجت کے لیے گئے، اس میں ایک اونٹ تھا جو رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر بلبلایا اور آب دیدہ ہو گیا، آپ اس کے پاس گئے اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: ''یہ کس کا اونٹ ہے؟'' ایک انصاری نوجوان نے آ کر کہا کہ میرا یا رسول اللہ! فرمایا: ''اس جانور کے بارے میں جس کا اللہ نے تم کو مالک بنایا ہے، اللہ سے نہیں ڈرتے، اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور اس پر جبر کرتے ہو۔'' ❼

---

❶ بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ٦٠٠٩۔

❷ بخاری، کتاب الحرث والمزارعة، باب فضل الزرع والغرس اذا كل منه: ٢٣٢٠۔

❸ بخاری، کتاب الحرث والمزارعة، باب استعمال البقر للحراثة: ٢٣٢٤۔

❹ ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی الوقوف على الدابة: ٢٥٦٧۔

❺ مسلم، کتاب الامارة، باب مراعاة مصلحة الدواب فی السیر والنهی عن التعریس فی الطریق: ٤٩٥٩، ٤٩٦٠۔

❻ ابو داود، کتاب الجهاد، باب ما یؤمر به من القیام على الدواب والبهائم: ٢٥٤٨۔ ❼ ایضاً: ٢٥٤٩۔

③ جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا۔ ❶

④ جانوروں کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا، ❷ کہ اس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہو کر تکلیف پاتے ہیں۔

پچھلے صفحوں پر پھر ایک نظر ڈال لیجئے، تا کہ معلوم ہو کہ اسلام کے سینہ میں جو دل ہے وہ کتنا نرم ہے اور کس طرح رحم و کرم سے بھرا ہوا ہے۔

❶ ابوداود، کتاب الجهاد، باب النهی عن الوسم فی الوجه والضرب فی الوجه: ٢٥٦٤۔

❷ ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی التحریش بین البهائم: ٢٥٦٢۔

فضائلِ اخلاق

اخلاق حسنہ کے جزئیات اس کثرت سے ہیں، کہ ان کا احاطہ بھی مشکل ہے، قدیم حکمائے اخلاق نے ان کی دو قسمیں کی ہیں، ایک امہات اخلاق اور دوسری فروع اخلاق، امہات اخلاق سے مراد اخلاق کے وہ جوہری ارکان ہیں، جو دوسرے اخلاق کی اصل و مرجع ہیں اور جن میں کمی بیشی سے اخلاق کی مختلف قسمیں پیدا ہوتی ہیں اور جن کے اعتدال سے فضائل اخلاق کا وجود ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کے اندر تین فطری قوتیں ہیں، قوت علمیہ، قوت شہوانیہ، قوت غضبیہ، قوت علمیہ کے اعتدال کا نام حکمت، قوت شہوانیہ کے اعتدال کا عفت اور قوت غضبیہ کے اعتدال کا شجاعت ہے اور انہی کے عدم اعتدال کو رذائل کہتے ہیں، پھر ان دونوں قسموں کے اختلاف مدارج سے اچھے اور برے اخلاق کے مختلف مراتب ظہور میں آتے ہیں۔ یہ تقسیم محض فلسفیانہ ہیں، یا یوں کہیے کہ علمی اور نظری ہیں، لیکن اسلام کے پیشِ نظر اخلاق کی علمی و نظری حیثیت نہیں، بلکہ عملی ہے، کیونکہ اس کا منشا انسان کو فقط اخلاق کا علم بخشنا نہیں، بلکہ انسان کو فضائلِ اخلاق کا عامل بنانا اور رذائلِ اخلاق سے عملاً بچانا ہے، اس لیے اس کو اس سے بحث نہیں کہ فلاں خلق کی اصلیت کیا ہے اور اس سے دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں، بلکہ اس سے بحث ہے کہ انسان کو کس طرح اچھے اخلاق کا پابند بنایا اور برے اخلاق سے بچایا جائے، اسی لیے اپنی تعلیم میں اس نے اہلِ فلسفہ کا رنگ اختیار نہیں کیا ہے اور نہ یہ طریقہ انبیا علیہم السلام کی تعلیم اور تربیت کا ہے۔

اسلام کی ہر شے میں خواہ وہ عقیدہ سے متعلق ہو یا عبادت سے یا اخلاق و معاملات سے، مرکزی چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے، ہر وہ کام اچھا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور وہ برا ہے جس کو وہ ناپسند فرمائے، گو یہ دوسری بات ہے کہ وہ جس کو پسند فرماتا ہے اس میں عقلی خوبیاں اور جمہور کا فائدہ بھی ہوتا ہے اور جس کو وہ ناپسند فرماتا ہے اس میں عقلی برائیاں اور خلق اللہ کا نقصان بھی ہوتا ہے، اس بنا پر اسلام کی نظر سے اخلاق کی یہ دو قسمیں ہیں، وہ اخلاق جن کو اللہ پسند فرماتا ہے یہ فضائل کہلاتے ہیں اور وہ کام جن کو وہ ناپسند کرتا ہے، رذائل ہیں، ہم نے اوپر ''اخلاق اور محبتِ الٰہی'' کے عنوان میں وہ آیتیں لکھ دی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف کو پسند یا ناپسند فرمایا ہے۔

جن اوصاف کو اللہ پسند فرماتا ہے ان کو ابھی ہم نے اصطلاح میں فضائل کا نام دیا ہے، یہ فضائل بہت سے ہیں اور قرآن پاک اور احادیثِ شریفہ میں جابجا ان کی تصریح ہے، لیکن ان کے بیان میں اخلاق شرعی کے مصنفوں نے کوئی خاص ترتیب نہیں رکھی ہے، اسی لیے ان کی اہمیت کے درجے اور رتبے نہیں مقرر ہوئے۔ میرا خیال یہ ہے کہ فضائل میں سب سے پہلے اس اخلاقی فضیلت کو جگہ ملنی چاہیے، جو خود اللہ تعالیٰ کا وصف ہو اور جس کے ساتھ رسولوں اور پیغمبروں کی توصیف اکثر کی گئی ہو اور مسلمانوں کو اس سے متصف ہونے پر کتاب

الٰہی اور پیام نبوی میں زیادہ زور دیا گیا ہو اور جو بجائے خود بہت سی اخلاقی خوبیوں کی بنیاد ہو۔

گو اس معیار کو سامنے رکھ کر فضائل کی ترتیب کو قائم کرنا بہت مشکل کام ہے اور غور وفکر کرنے والوں میں اس بارہ میں اختلاف بھی ممکن ہے، لیکن جہاں تک میری تلاش اور محنت کو دخل ہے، اس میں کامیابی کی کوشش کروں گا۔

فضائل کی مختصر فہرست

جن فضیلتوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور جن کو گنا کر اس نے اپنے اچھے بندوں کی توصیف کی ہے، یا ان اوصاف والوں کے لیے اپنی بخشش اور بخشائش کا وعدہ فرمایا ہے، قرآن پاک اور احادیث نبوی ﷺ میں جا بجا ان کی تفصیل ہے، جیسے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾

(۲۳/ المؤمنون:۱۔۱۱)

''ایمان والے مراد کو پہنچ گئے، جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں، جو بے کار باتوں کی طرف رخ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ دیتے اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، لیکن اپنی بیویوں سے اور اپنی (شرعی) باندیوں سے، کہ ان پر کوئی الزام نہیں، تو جو اس کے سوا کے خواہاں ہوں تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں اور وہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں، یہی اصلی وارث ہیں، جو فردوس کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

ان آیتوں میں جن اخلاقی فضائل کا بیان آیا ہے وہ یہ ہیں، نکمی اور بیکار باتوں سے کنارہ کشی، عصمت اور پاک دامنی، امانت داری اور ایفائے عہد، ایک دوسری جگہ ہے:

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

''اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ پر اور آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتاب (الٰہی) پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور اپنا مال اس کی محبت کے ساتھ رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور غریبوں کو اور مسافر کو اور مانگنے والوں کو اور گردنوں کو چھڑانے میں دیا اور نماز کھڑی کی اور زکوٰۃ دی اور اپنے قول کو جب انھوں نے اقرار کرلیا پورا کرنے والے اور مصیبت میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے ہل چل کے وقت ثابت قدم رہنے والے۔''

ان آیتوں میں جو اخلاقی اوصاف گنائے گئے ہیں وہ یہ ہیں، سخاوت، قول وقرار کو پورا کرنا اور مشکلوں میں ثابت قدمی۔ سورۂ آل عمران میں ہے:

﴿ اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۷)

''ثابت قدم رہنے والے اور سچ بولنے والے اور (اللہ کی) فرماں برداری کرنے والے اور (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے والے۔''

اس آیت میں ثابت قدمی، سچائی اور فیاضی کو سراہا گیا ہے، اسی سورہ میں ان متقیوں کا حال ہے جو اللہ کی مغفرت اور آسمان وزمین کے برابر کی جنت کے مستحق ہوں گے۔

﴿ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ۚ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۳٤)

''جو خوشحالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں (اللہ کے نام) خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو روکتے اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

اس اوپر کی آیت میں فیاضی، عفو ودرگزر اور احسان کی تعریف کی گئی ہے، سورۂ معارج میں ہے:

﴿ وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ۙ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ۙ وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ۝ۙ وَالَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ۚ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَیْرُ مَاْمُوْنٍ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ۙ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۝ۚ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ۚ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ۙ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝ۙ ﴾ (۷۰/ المعارج:۲٤ـ۳۳)

''اور جن کے مال میں مانگنے والے اور مصیبت زدہ کا حصہ مقرر ہے اور جو روز جزا کو سچ مانتے ہیں اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شبہ ان کے رب کا عذاب نڈر ہونے کی چیز نہیں اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، مگر اپنی بیویوں اور شرعی باندیوں سے کہ اس میں ان پر کوئی ملامت نہیں۔ جو اس کے علاوہ چاہیں وہ حد سے آگے بڑھنے والے ہیں اور

جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں۔"

ان آیتوں میں سخاوتِ نفس، عفت و عصمت، امانت داری، ایفائے عہد اور سچی گواہی کو ایک مومن کی ان فضیلتوں میں شمار کیا ہے، جو اس کے جنت میں جانے کی سبب ہوئی ہیں۔

سورۂ احزاب میں ان مردوں اور عورتوں کا ذکر ہے، جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی بخشائش اور بڑی مزدوری کا وعدہ فرمایا ہے:

﴿ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۳۵)

"اور سچ بولنے والے اور سچ بولنے والیاں، صبر کرنے والے اور صبر کرنے والیاں اور عاجزی کرنے والے اور عاجزی کرنے والیاں اور صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں اور روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے اور حفاظت کرنے والیاں۔"

ان میں سچائی، صبر، عاجزی اور عصمت و عفت کے اوصاف کا ذکر ہے۔

سورۂ فرقان میں اللہ کے اچھے بندوں کی پہچان یہ بتائی گئی ہے:

(۱) ﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ ﴾

(۲۵/ الفرقان:۶۳)

"اور رحم والے اللہ کے بندے وہ ہیں، جو زمین میں ہولے چلتے ہیں اور جاہل جب ان سے (جہالت کی) باتیں کریں تو وہ کہیں سلامت رہیے۔" [1]

(۲) ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ ﴾ (۲۵/ الفرقان: ۶۷)

"اور جب وہ خرچ کریں تو نہ تو فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں اور دونوں کے بیچ کی راہ ہو۔"

﴿ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۶۸)

"اور جو ناحق کسی بے گناہ کی جان نہیں لیتے اور نہ بدکاری کرتے ہیں۔"

﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ ﴾

(۲۵/ الفرقان:۷۲)

[1] یا سلام کہیں۔

''اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب وہ بے ہودہ مشغلہ کے پاس سے گزریں تو شریفانہ وضع سے گزر جائیں۔''

پہلی آیت میں عاجزی اور فروتنی اور بردباری، دوسری آیت میں اعتدال اور میانہ روی اور تیسری میں عدم ظلم اور عفت اور چوتھی میں سچائی اور متانت وسنجیدگی کی تعریف کی گئی ہے، سورہ رعد میں وہ صفتیں بتائی گئی ہیں جو عقبیٰ میں کام آئیں گی:

﴿ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ۝ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ ﴾ (۱۳/ الرعد:۲۲)

''جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور قول کو توڑتے نہیں اور جس کے جوڑنے کو اللہ نے کہا ہے اس کو جوڑے رکھتے ہیں اور اپنے مالک سے ڈرتے ہیں اور بری طرح حساب ہونے سے سہمے رہتے ہیں اور جنہوں نے اپنے مالک کی خوشی کے لیے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور ہم نے جو ان کو دیا اس سے چھپے اور کھلے (اچھے کاموں میں) خرچ کیا اور برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں، انہی کے لیے پچھلا گھر ہے۔''

اس ایفائے عہد سے وہ عہد بھی مراد ہوسکتا ہے جو بندہ اپنے اللہ سے کرتا ہے اور اس سے وہ عہد بھی سمجھا جاسکتا ہے جو اللہ کا نام لے کر بندہ بندہ سے کرتا ہے اور جس کے جوڑنے کا حکم ملا ہے، وہ اہل قرابت اور حق داروں کے حقوق ہیں، ان دو کے سوا ان آیتوں میں ان کی تعریف کی گئی ہے جو برائی کے بدلہ لوگوں سے بھلائی کرتے ہیں، یا یہ کہ بھلائی کر کے برائی کو دھو دیتے ہیں:

﴿ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ (۲۸/ القصص:۸۳)

''اس پچھلے گھر کو ہم ان کے لیے کریں گے جو زمین میں غرور اور فساد کرنا نہیں چاہتے اور آخر انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

یعنی غرور نخوت نہیں کرتے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝ ﴾

(۴۲/ الشوریٰ: ۳۷)

''اور جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو

معاف کر دیتے ہیں۔"

یعنی غصہ آنے پر بھی بے قابو نہیں ہوتے اور معاف کر دیتے ہیں۔

﴿ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۲)

"بیشک اللہ انصاف والوں کو پیار کرتا ہے۔"

عدل وانصاف کی فضیلت کے لیے اس سے بڑھ کر کیا چاہیے کہ وہ اللہ کے پیار اور محبت کا ذریعہ ہے۔

﴿ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۵)

"بیشک اللہ نیک کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔"

اس پیار اور محبت کے استحقاق میں ہر نیکی کا کام کرنے والا داخل ہے۔

حدیثوں میں جن اخلاقی فضیلتوں کا بیان ہے وہ متفرق طور سے پچھلے صفحوں میں گزر چکی ہے اور آگے بھی اپنی اپنی جگہ پر آئیں گی۔

صِدق

اوپر کے معیار کے مطابق اخلاقی خوبیوں کے سرفہرست ہونے کی حیثیت جس فضیلت کو حاصل ہے وہ میرے خیال میں سچائی ہے۔ اس ایک فضیلت کے نیچے منطقی اور نفسیاتی نتیجہ کے طور پر بہت سی اہم اخلاقی فضیلتیں آجاتی ہیں۔

انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے لیے اس کا دل اور اس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں۔ اسی کا نام صدق یا سچائی ہے، جو سچا نہیں اس کا دل ہر برائی کا گھر ہو سکتا ہے اور جو سچا ہے اس کے لیے ہر نیکی کے حصول کا راستہ آسان ہے، کہتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، یارسول اللہ! مجھ میں چار بری خصلتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بدکار ہوں، دوسری یہ کہ چوری کرتا ہوں، تیسری یہ کہ شراب پیتا ہوں، چوتھی یہ کہ جھوٹ بولتا ہوں، ان میں سے جس ایک کو فرمایئے آپ کی خاطر سے چھوڑ دوں، ارشاد یہ ہوا کہ "جھوٹ نہ بولا کرو" چنانچہ اس نے اس کا عہد کیا اب جب رات ہوئی تو شراب پینے کو اس کا جی چاہا اور پھر بدکاری کے لیے آمادہ ہوا تو اس کو خیال گزرا کہ صبح کو جب آنحضرت ﷺ پوچھیں گے کہ رات تم نے شراب پی اور بدکاری کی؟ تو کیا جواب دوں گا اگر ہاں کہوں گا تو شراب اور زنا کی سزا دی جائے گی۔ اگر نہیں کی تو عہد کے خلاف ہوگا۔ یہ سوچ کر ان دونوں سے باز رہا، جب رات زیادہ گزری اور اندھیرا خوب چھا گیا تو چوری کے لیے گھر سے نکلنا چاہا تو پھر اسی خیال نے اس کا دامن تھام لیا کہ کل پوچھ گچھ ہوئی تو کیا کہوں گا۔ ہاں کروں گا تو ہاتھ کٹیں گے اور نہیں کرتا تو بدعہدی ہوتی ہے، اس خیال کے آتے ہی اس جرم سے بھی باز آیا۔ صبح ہوئی تو وہ دوڑ کر خدمتِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوا اور عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! جھوٹ نہ بولنے سے میری چاروں بری خصلتیں مجھ سے چھوٹ گئیں، یہ سن کر آنحضرت ﷺ مسرور ہوئے۔ [1]

یہ روایت سند کی رو سے کتنی ہی کمزور ہو، مگر نتیجہ کے لحاظ سے بالکل درست ہے، سچائی کی عادت انسان کو بہت سی برائیوں سے بچاتی ہے، جو سچا ہوگا وہ ہر برائی سے پاک ہونے کی کوشش ضرور کرے گا وہ راستباز ہو گا، راست گو ہوگا، ایماندار ہوگا، وعدہ کو پورا کرے گا، عہد کو وفا کرے گا، دلیر ہوگا، دل کا صاف ہوگا، ریاکار نہ ہوگا، اس کے دل میں نفاق نہ ہوگا پیچھے کچھ اور سامنے کچھ اس کی شان نہ ہوگی، خوشامدی نہ ہوگا، سب کے بھروسہ کے قابل ہوگا، لوگوں کو اس کے قول و فعل پر اعتبار ہوگا، جو کہے گا، کرے گا غرض جس پہلو سے دیکھئے سچائی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی اصلی بنیاد قرار پائے گی۔ صدق صفاتِ ربانی میں سے بھی سب سے بڑی صفت ہے، اللہ سے بڑھ کر سچا کون ہو سکتا ہے، قیامت کے وعدہ کے سلسلہ میں اللہ آپ فرماتا ہے:

[1] اس قصہ کو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی سورۂ ن میں کتبِ سیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا ماخذ نہیں معلوم ہوا۔ (تفسیر فتح العزیز، پارہ: ۲۹، ص: ۳۳)۔

﴿ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴾ (٤/ النساء:٨٧)

''اور کون اللہ سے زیادہ سچا ہے بات میں۔''

اسی طرح بہشت کے وعدہ کی تقریب سے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴾ (٤/ النسآء:١٢٢)

''وعدہ کیا اللہ نے سچ اور کون ہے اللہ سے زیادہ سچا بات میں۔''

اللہ سچا ہے اس لیے اسی کی ساری شریعت سچی ہے فرمایا:

﴿ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴾ (٦/ الانعام:١٤٦)

''اور ہم ہیں سچے۔''

﴿ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۣ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ ﴾ (٣/ آل عمران:٩٥)

''کہہ (اے پیغمبر) اللہ نے سچ فرمایا تو ابراہیم حنیف کے دین کی پیروی کرو۔''

﴿ وَالَّذِيْ جَاۗءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (٣٩/ الزمر:٣٣)

''اور جو سچائی کو لے کر آیا اور اس سچائی کو سچ مانا وہی تو پرہیز گار ہیں۔''

اس آخری آیت میں ''سچائی'' سے مراد اللہ کی شریعت یا کتاب ہے۔ مگر لفظ کا عموم ہر سچائی تک وسیع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ پرہیز گاروں کی شان یہ ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ ہوتے ہیں، ہر سچی بات کو قبول کرتے ہیں اور اپنے ہر قول اور عمل میں سچائی کو پیش کرتے ہیں۔

اہل ایمان کا یہ حال ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسولوں کے وعدوں کو سچا ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں:

﴿ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ﴾ (٣٣/ الاحزاب:٢٢)

''اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا۔''

چونکہ رسول، اللہ سے علم پاتے ہیں، اس لیے وہ بھی سچے ہوتے ہیں:

﴿ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴾ (٣٦/ یٰس:٥٢)

''اور پیغمبروں نے سچ کہا۔''

اسی سے ظاہر ہے کہ صدق اور سچائی پیغمبروں کا سب سے پہلا وصف ہے، کیوں کہ ان کی ساری باتیں دعوے، دلیلیں اور حکم اگر نعوذ باللہ سچائی سے ذرا بھی خالی ہوں تو ان کی پیمبری اور نبوت کی ساری عمارت دھم سے زمین پر گر جائے، اللہ تعالیٰ نے کئی پیغمبروں کو اس صفت سے خاص طور سے موصوف کیا ہے، سب سے پہلے تو خود ملت حنیف کے داعی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس سے متصف فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ڛ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴾ (١٩/ مریم:٤١)

''اور کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے۔''

ایک اور پیغمبر حضرت ادریس علیہ السلام کو بھی اللہ نے اس سے نامزد کیا ہے:

﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ ﴾ (١٩/ مريم:٥٦)

''اور کتاب میں ادریس علیہ السلام کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے۔''

حضرت مریم علیہا السلام جنہوں نے اللہ کی باتوں کے سچ ماننے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ اس وصف سے ممتاز ہوئیں۔ فرمایا گیا:

﴿ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ ﴾ (٥/ المآئدة:٧٥)

''اور ان (عیسیٰ علیہ السلام) کی ماں بڑی سچی تھیں۔''

حضرت یوسف علیہ السلام جو خواب کی تعبیر میں ایسے سچے نکلے، بندوں کی زبان سے صدیق کہلائے:

﴿ يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ ﴾ (١٢/ يوسف:٤٦)

''یوسف! اے بڑے سچے!''

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنے باپ سے صبر و شکر کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا، تو اللہ سے صادق الوعد (وعدہ کا سچا) خطاب پایا:

﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ ﴾

(١٩/ مريم:٥٤)

''اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کر، بے شبہ وہ وعدہ کا سچا اور بھیجا ہوا نبی تھا۔''

اللہ کی خوشنودی والی جنت جن لوگوں کو ملے گی ان میں وہ بھی ہوں گے، جو دنیا میں دوسری صفتوں کے ساتھ سچائی اور راستبازی سے ممتاز تھے:

﴿ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ ﴾ (٣/ آل عمران:١٧)

''صبر کرنے والے اور سچے۔''

اللہ نے جن لوگوں کے لیے اپنی مغفرت اور اجر عظیم کے وعدے کیے ہیں، ان میں اسلام و ایمان اور اللہ کی فرمانبرداری کے بعد پہلا درجہ سچوں اور راستبازوں کا ہے۔ فرمایا:

﴿ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ ﴾ (٣٣/ الاحزاب:٣٥)

''بے شک اسلام قبول کرنے والے مرد اور عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور عورتیں اور فرمانبردار مرد اور عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں۔''

﴿ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۳۵)

''اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑی مزدوری رکھی ہے۔''

اس سچائی کے کاروبار کا صلہ دوسری زندگی میں ملے گا اور وہ وہاں ہماری کامیابی کا ذریعہ بنے گی، قیامت کی نسبت ہے:

﴿ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۭ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۱۹)

''یہ دن ہے کہ سچے بندوں کو ان کا سچ کام آئے گا۔''

اس امتحان میں جس سے جس قولی اور عملی سچائی کا ظہور ہوگا، اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کو انعام اور عوض بھی عطا فرمائے گا، چنانچہ فرمایا:

﴿ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۲٤)

''تاکہ اللہ سچے اترنے والوں کو ان کی سچائی کا عوض دے۔''

اسلام میں سچائی کی اہمیت اتنی بڑھائی گئی ہے کہ یہی نہیں کہ سچائی اختیار کرنے کا حکم پر حکم دیا گیا ہے، بلکہ یہ بھی تاکید آئی ہے کہ ہمیشہ سچوں کا ساتھ دو، سچوں ہی کی جماعت سے علاقہ و رابطہ رکھو اور انہیں کی صحبت میں رہو کہ ان کی سچائی کے اثر سے تم بھی سچے بنو۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے دو ساتھیوں نے جو تبوک کے سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہ جا سکے تھے، ہر قسم کی تکلیفیں سہہ کر جس سچائی کا ثبوت دیا تھا، اس کی طرف اشارہ کرکے اللہ فرماتا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۱۹)

''اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔''

اہل تفسیر کے نزدیک یہاں ان سچوں سے مراد آنحضرت ﷺ اور وہ بڑے بڑے صحابی ہیں، جن کی سچائی کا بارہا امتحان ہو چکا تھا۔ مگر بہر حال آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے بعد بھی یہ آیتِ کریمہ اپنی لفظی وسعت کے سبب سے ہر دور کے مسلمانوں کو سچوں کی معیت اور صحبت کی دعوت دیتی ہے۔ سچائی کے معنی عام طور سے صرف سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہیں، مگر اسلام کی نگاہ میں اس کے بڑے وسیع معنی ہیں، جن کے لحاظ سے اس کے اندر اکیلے قول ہی نہیں، بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے، امام غزالی رحمہ اللہ نے احیاء العلوم میں بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمیں کی ہیں اور قرآن و حدیث سے ہر ایک کے معنی بتائے ہیں۔ بات میں سچائی، ارادہ اور نیت میں سچائی، عزم میں سچائی، عزم کو پورا کرنے میں سچائی، عمل میں سچائی اور دینداری کے مقامات اور مراتب میں سچائی، لیکن ذرا معنی میں وسعت دیجیے تو اس کی تین ہی قسموں میں ساری سچائیاں آجاتی ہیں، یعنی زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی۔

زبان کی سچائی

سچی زبان سے جو بولا جائے، وہ سچ بولا جائے اور منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے، یہ سچائی کی عام اور مشہور قسم ہے، جس کی پابندی ہر مسلمان پر فرض ہے، وعدہ کو پورا کرنا اور عہد اور قول وقرار کو نباہنا بھی اسی قسم میں داخل ہے اور یہ ایمان اور اسلام کی بڑی نشانی ہے، اس کے برخلاف ہر قسم کا جھوٹ دل کے نفاق کے ہم معنی ہے، سورۂ احزاب میں ایک آیت ہے:

﴿ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۲٤)

''تا کہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کا عوض دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے۔''

اس آیت پاک میں صادق کا مقابل منافق کو قرار دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ صدق ایمان کا اور جھوٹ نفاق کا سرمایہ ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت ﷺ نے بیان کے مختلف پیرایوں میں ظاہر فرمایا ہے، صفوان بن سلیم تابعی سے مرسلاً روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا مسلمان نامرد بھی ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ''ہوسکتا ہے۔'' پھر پوچھا، کیا بخیل بھی ہوسکتا ہے؟ جواب دیا: ''ہوسکتا ہے۔'' پھر دریافت کیا، کیا جھوٹا بھی ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ''نہیں۔'' ❶ کئی صحابی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''مومن ہر خصلت پر پیدا ہوسکتا ہے، لیکن خیانت کاری اور جھوٹ پر'' (نہیں) ❷ مطلب یہ ہے کہ مومن میں ہر برائی ہوسکتی ہے، مگر خیانت کاری اور جھوٹ کی صفت نہیں ہوسکتی ہے کہ یہ ایمان کے جوہر کے سراسر خلاف ہے، اسی لیے ارشاد ہوا: ''کسی بندہ کا ایمان پورا نہیں ہوگا جب تک وہ جھوٹ کو ہر طرح سے نہ چھوڑ دے، یہاں تک کہ مذاق اور جھگڑے میں بھی اگر چہ وہ حق ہی پر کیوں نہ ہو۔'' ❸ ان روایتوں کی معنوی تائید اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے، جو صحاح کی اکثر کتابوں میں ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جس میں چار باتیں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے ایک بات ہو، تو اس میں نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے، جب تک وہ اس کو چھوڑ نہ دے، جب امانت اس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے جھوٹ بولے، جب کوئی قرار کرے تو پورا نہ کرے، جب جھگڑے تو حق کے خلاف کہے۔'' ❹ یہی روایت اس طرح بھی ہے کہ ''منافق کی علامتیں تین ہیں۔ جب کہے تو جھوٹ

❶ مؤطا امام مالك، كتاب الكلام، باب ماجاء فی الصدق والكذب: ۱۸٦۲۔ ❷ عن ابی امامة عند مسند أحمد، ج ٥، ص: ۲٥۲ وعن سعد بن ابی وقاص عندالبزار: ۱۰۲ وابی یعلی: ۷۱۱ والطبرانی فی الکبیر والبیهقی فی السنن، ۱۰/ ۱۹۷ وفی الشعب: ٤۸۰۹ وعن ابن عمر عند البیهقی فی الشعب: ٤۸۱۱ وقد روی مرفوعًا وموقوفًا۔ ❸ مسند احمد عن ابی هریرة، ج ۲، ص: ۳٥۲ وطبرانی، نیز مسند ابی یعلی عن عمر بن الخطاب، یہ حدیثیں حافظ منذری کی ترغیب وترهیب جلد دوم باب الترغیب فی الصدق، ص: ۱۹۲، ۱۹۳ سے لی گئی ہیں۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق: ۳٤ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب خصال المنافق: ۲۱۰ وابو داود، کتاب السنة، باب الدلیل علی الزیادة الایمان: ٤٦۸۸ وترمذی، ابواب الایمان، باب ما جاء فی علامة المنافق: ۲٦۳۲ ونسائی، کتاب الایمان، باب علامة المنافق: ٥۰۲۳۔

بولے، جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور جب امین بنایا جائے تو بے ایمانی کرے۔'' [1] صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے: ''اگرچہ وہ نمازی اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو اور اپنے کو مسلمان ہی کیوں نہ کہتا ہو۔'' [2]

ان روایتوں سے یہ پوری طرح معلوم ہوا کہ سچائی سے ایمان کی اور جھوٹ سے نفاق کی پرورش ہوتی ہے، یعنی صدق کی راہ سے ایمان اور نیکی کا جذبہ ابھرتا ہے اور جھوٹ کی راہ سے نفاق اور برائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''سچ بولنا نیکی کا راستہ بتاتا ہے اور نیکی جنت کو لے جاتی ہے اور آدمی سچ بولتا جاتا ہے اور سچ بولتے بولتے وہ صدیق ہو جاتا ہے اور جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتا ہے اور بدکاری دوزخ کو لے جاتی ہے اور آدمی جھوٹ بولتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جھوٹ بولتے بولتے وہ اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔'' [3]

دل کی سچائی

صدق کی دوسری قسم دل سے تعلق رکھتی ہے اور اس حیثیت سے صدق اور اخلاص دونوں ایک ہی چیز بن جاتے ہیں اور اس حالت میں بعض موقعوں پر زبان سے سچ کا اظہار بھی اس لیے جھوٹ ہو جاتا ہے کہ وہ دل کی تہ سے نہیں نکلا، منافق رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آ کر آپ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے اور آپ کی رسالت ایک بالکل سچی بات تھی، لیکن چونکہ یہ اقرار ان کے ضمیر کے خلاف تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴾ (۶۳/ المنافقون: ۱)

''اور اللہ جتائے دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔''

یعنی اپنی شہادت میں جھوٹے ہیں، زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، لیکن ان کا یہ اقرار اور ان کی یہ گواہی ان کے دل کا اقرار اور گواہی نہیں، ان کے دل میں کچھ ہے اور زبان پر کچھ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سچائی اس کا نام ہے کہ زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کی جائے، اگر ایسا نہ ہو تو اسی کا نام نفاق ہے، جس کی برائی سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، اسی طرح اگر کسی عمل کی دلی غرض کچھ اور ہو اور ظاہر کچھ اور کیا جائے تو وہ بھی جھوٹ ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ''قیامت کے دن اللہ کے سامنے تین شخص یعنی ایک عالم، ایک شہید اور ایک دولت مند پیش ہوں گے اور ہر ایک اپنے علم و دولت اور جان بازی کے کارنامے بیان کرے گا، لیکن ان کارناموں کو سن کر اللہ کہے گا کہ تم جھوٹ بکتے ہو اور فرشتے بھی یہی کہیں گے۔'' [4] یہ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات الایمان: ۳۳ وکتاب الادب، باب قول اللّٰہ: یاایھاالذین امنوا اتقوا اللّٰہ وکونوا مع الصادقین: ۶۰۹۵ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب خصال المنافق: ۲۱۱۔

[2] صحیح مسلم، ایضًا: ۲۱۳، ۲۱۴۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الادب، ایضًا: ۶۰۹۴۔

[4] ترمذی، ابواب الزھد باب الریاء والسمعۃ: ۲۳۸۲۔

کارنامے اگرچہ غلط بیان نہیں کیے گئے تھے، تاہم چونکہ ان میں اخلاص نہ تھا اور وہ محض شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کیے گئے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹ کہا، کہ ان کے ان کارناموں کی حقیقی غرض اللہ کی خوشنودی نہ تھی، بلکہ دنیا کی شہرت اور ناموری تھی، جس کا اللہ کے یہاں کوئی معاوضہ نہیں۔

عمل کی سچائی

عمل کی سچائی یہ ہے کہ جو نیک عمل ہو وہ ضمیر کے مطابق ہو، یا یوں کہیے کہ ظاہری اعمال باطنی اوصاف کے مطابق ہوں، مثلاً: ایک شخص نماز میں خشوع وخضوع کا اظہار کرتا ہے اور اس سے اس کا مقصود صرف نمائش ہے، تو یہ شخص ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ریاکار اور جھوٹا ہے، لیکن ایک عملی جھوٹ اس سے بھی بڑھ کر باریک ہے، ایک شخص نمائش کے لیے ایسا نہیں کرتا، تاہم ظاہری طور پر اس کی نماز سے جو خشوع وخضوع ظاہر ہوتا ہے، اس کے باطن میں وہ خشوع وخضوع نہیں ہے، اس لیے اس کے ظاہری اعمال اس کے باطن کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے، اس بنا پر وہ بھی اپنے ان اعمال میں صادق نہیں، اس لیے زبان کی سچائی اور دل کی سچائی کے ساتھ عمل کی سچائی بھی ضروری ہے، اسی لیے جن مسلمانوں نے غیر متزلزل ایمان کے بعد اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کیا، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سچے ٹھہرے، اللہ نے فرمایا:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴾ (٤٩/ الحجرات:١٥)

''مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (کسی طرح کا) شک (وشبہ) نہیں کیا اور اللہ کے راستے میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا یہی سچے لوگ ہیں۔''

یہ سچے اس لیے ٹھہرے کہ ان کا یہ عمل ان کی دلی کیفیت کا سچا ترجمان ہوا، زبان اور دل سے جس ایمان کا اقرار کیا تھا، عمل سے اس کی تصدیق کر دی۔ اس صدق عمل کے کئی مرتبے ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ جو ارادہ کیا جائے، اس میں کسی قسم کا ضعف وتردد نہ پیدا ہو، مثلاً: ایک شخص احکام الٰہی کی تعمیل کا ارادہ ظاہر کرتا ہے، لیکن جب اس کی آزمائش کا وقت آتا ہے تو اس کے ارادہ کا ضعف ظاہر ہو جاتا ہے، اس لیے ایسے شخص کو صادق العزم یعنی ارادہ کا پکا نہیں کہہ سکتے، اس قسم کا صادق العزم وہی شخص ہو سکتا ہے جو مومن کامل ہو، منافق لوگ اس امتحان میں پورے نہیں اتر سکتے، کیونکہ عدم یقین کی بنا پر وہ دل کے بودے ہوتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۝ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۣ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۣ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۝ ﴾

(٤٧/ محمد:٢٠۔٢١)

''اور سچے مسلمان تو یہ تمنا ظاہر کرتے ہیں کہ (جہاد کے بارے میں) کوئی سورت نازل ہو، پھر جب کوئی سورہ اترتی ہے، اس میں لڑائی کا تذکرہ ہو تو (اے پیغمبر ﷺ!) جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے، تم ان کو دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف ایسے (خوف زدہ) دیکھ رہے ہیں، جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو، تو ان پر تف ہو، (رسول کی) فرماں برداری چاہیے اور صاف و صحیح جواب دینا چاہیے اور جب بات ٹھن جائے پھر یہ لوگ اللہ سے سچے رہیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔''

اس مرتبہ سے بڑھ کر صدقِ عملی کا مرتبہ یہ ہے کہ جو قول و قرار کیا جائے اور جس قول و قرار کے پورا کرنے کا سچا عزم کیا جائے، اس کو وقت پڑنے پر پورا کر بھی دکھایا جائے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ انسان کسی موقع پر عزمِ صادق کرلے اور اس میں کسی قسم کا ضعف نہ ہو، لیکن جب اس کے پورے کرنے کا وقت آئے تو اس میں ضعف ظاہر ہو، اس لیے صحابہ کرام میں جن لوگوں نے عزم صادق کے ساتھ عملاً اپنے عزم کو پورا کر دکھایا ہے، اللہ نے ان کو سچا کہا ہے۔ چنانچہ حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کو غزوۂ بدر میں شرکت کا موقع نہیں ملا تھا، اس کی تلافی کے لیے انہوں نے کہا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ میں شرکت کا موقع ملا تو اپنی جان بازی کے جوہر دکھاؤں گا، چنانچہ اس کے بعد غزوۂ احد میں شریک ہوئے اور نیزے، تلوار اور تیر کے تقریباً اسی زخم کھا کر شہادت حاصل کی، ایفائے عزم کی یہ بہترین مثال تھی، اس لیے خداوند تعالیٰ نے ان کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی: [1]

﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۙ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۲۳۔۲۴)

''مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ کے ساتھ انہوں نے (جان نثاری کا) جو عہد کیا تھا اس میں سچے اترے سو (بعض تو) ان میں سے ایسے تھے جو اپنی پوری کر گئے، (یعنی شہید ہوئے) اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جو (شہادت کے) منتظر ہیں اور انہوں نے (اپنی بات میں) ذرا سا بھی تو ردو بدل نہیں کیا، تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کا عوض دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا ان کو معاف کردے، [2] بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

صدقِ عملی کی سب سے اعلیٰ قسم یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن یعنی اس کی زبان کا ہر حرف، دل کا ہر

[1] بخاری، کتاب الجهاد، باب قول الله عزوجل: من المؤمنين رجال.....: ۴۷۸۳۔

[2] یعنی ان منافقوں کو توبہ کی توفیق ہو اور وہ آگے چل کر سچے مومن بن جائیں تو خدا ان کو معاف فرما دے۔

ارادہ اور عمل کی ہر جنبش حق وصداقت کا پورا مظہر ہو جائے، قرآن نے ایسے ہی لوگوں کو صدیق کہا ہے، ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کچھ دل سے مانتے ہیں، عمل سے اس کی تصدیق اور زبان سے اس کا برملا اقرار اور یقین کی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، بعض بعض صحابیوں کے حالات میں اس کیفیت کا ذکر آتا ہے، ایک بار ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ میں اللہ پر سچائی کے ساتھ ایمان لایا ہوں۔ آپ نے کہا کہ ''سوچ سمجھ کر کہو کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، تو تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟'' بولے میرا دل دنیا سے پھر گیا ہے، اس لیے رات کو جاگا کرتا ہوں، (نماز) اور دن کو بھوکا پیاسا رہتا ہوں (روزہ) گویا میں علانیہ عرش الٰہی کو دیکھ رہا ہوں، گویا مجھ کو نظر آتا ہے کہ اہل جنت باہم مل جل رہے ہیں، گویا میں دوزخیوں کو واویلا کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ ''تم نے جان لیا، اسی پر قائم رہو۔'' [1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایمان کی یہی حقیقت سمجھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی خاص صحبتوں میں ان کو ایمان کا یہی درجہ حاصل ہوتا تھا، ایک بار حضرت حنظلہ اسیدی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس سے روتے ہوئے گزرے، انہوں نے پوچھا، حنظلہ کیا بات ہے؟ بولے: میں منافق ہو گیا، ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہوتے ہیں اور آپ ﷺ جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو گویا ہم ان کو علانیہ دیکھ لیتے ہیں، لیکن جب پلٹ کر بال بچوں اور دنیوی کاروبار میں مشغول ہو جاتے ہیں تو سب بھول جاتے ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہماری بھی یہی حالت ہوتی ہے، اب دونوں بزرگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور یہ واقعہ بیان کیا، ارشاد ہوا کہ ''اگر یہ حالت ہمیشہ قائم رہتی تو فرشتے تم سے تمہاری مجلسوں میں مصافحہ کرتے، یہ حالت تو کبھی کبھی پیش آ جاتی ہے۔'' [2]

قرآن پاک کی اس آیت میں گویا اسی قسم کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے، فرمایا:

﴿ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ ﴾ (۱۰۲/ التكاثر:۵)

''ہرگز نہیں اگر تم کو یقینی علم ہوتا (تو تم سے یہ غفلت نہ ہوتی)''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پختہ یقین سے اس کے نتائج الگ نہیں ہو سکتے۔

سچائی کی اسی اعلیٰ ترین قسم کا تذکرہ قرآن پاک کی ان آیتوں میں ہے:

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ

---

[1] اسد الغابة تذكرة حارث بن مالك، ج۱، ص: ۳۴۶۔

[2] ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب حديث حنظلة : ۲۵۱۴۔

اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۝﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

''نیکی یہی نہیں کہ (نماز میں) اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرلو، بلکہ نیکی تو ان کی ہے جو اللہ اور روزِ آخرت اور فرشتوں اور (آسمانی) کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور مال اللہ کی حبّ پر رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیا اور (غلامی وغیرہ کی قید سے لوگوں کی) گردنوں (کے چھڑانے) میں (دیا) اور نماز پڑھتے رہے اور زکوٰۃ دیتے رہے اور جب (کسی بات کا) اقرار کرلیا تو اپنے قول کے پورے اور تنگی اور تکلیف میں اور ہل چل کے وقت میں ثابت قدم رہے، یہی لوگ ہیں جو سچے نکلے اور یہی ہیں پرہیز گار۔''

ان آیتوں میں جن کو صادق کہا گیا ہے، ان کے تین قسم کے اوصاف بتائے گئے ہیں، اول ان کے ایمان کا کمال، دوسرے ان کے نیک عمل اور تیسرے جانچ میں ان کا ہر طرح پورا اترنا اور جو لوگ علم اور عمل کے ان تمام فضائل کے درجہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں، ان کو شریعت کی زبان میں جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا، صدیق کہتے ہیں [1] جو نبوت کے بعد انسانیت کا سب سے پہلا مرتبہ کمال ہے، چنانچہ آیت ذیل میں نبی کے بعد ہی صدیق کا نام لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس جماعت کی رفاقت اور ہم راہی کا ذریعہ اللہ اور رسول کی کامل اطاعت ہے:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۝﴾ (٤/ النسآء:٦٩)

''اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو وہ (جنت میں) ان (مقبول بندوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیے، یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور (دوسرے) نیک بندے اور یہ لوگ (کیا ہی) اچھے ساتھی ہیں۔''

سورۂ حدید میں ایمان کامل اور جانی و مالی جہاد کی بار بار دعوت کے بعد ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ﴾ (٥٧/ الحدید:١٩)

''اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی صدیق ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ صدیقیت اس کامل ایمان کے ذریعہ سے نصیب ہوتی ہے، جس سے عمل کبھی جدا نہیں ہوسکتا، یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے کہ ''انسان سچ بولتے بولتے صدیق ہوجاتا ہے''۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف ایک دو دفعہ سچ بول دینے سے یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے صداقت پر مضبوطی سے قائم

[1] الصديق الذي يصدق قوله بالعمل (مجمع البحار فتنی، ج ۳، ص:۳۰٤) ''صدیق وہ ہے جس کے قول کی تصدیق عمل سے ہو۔''

رہنے کی ضرورت ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے سچائی کی تلقین کس وسعت اور گہرائی کے ساتھ کی ہے، زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی اور جب ان تینوں میں کوئی مسلمان کامل ہو تو وہ کامل راست باز اور صادق ہے۔

سخاوت

سچائی کے بعد اسلام کی دوسری بنیادی اخلاقی تعلیم سخاوت ہے، سخاوت کے حقیقی معنی اپنے کسی حق کو خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کر دینے کے ہیں اور اس کی بہت سی صورتیں ہیں، اپنا حق کسی کو معاف کرنا، اپنا بچا ہوا مال کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کا خیال کیے بغیر کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کو روک کر کسی دوسرے کو دینا، دوسرے کے لیے اپنے جسم کی قوت کو خرچ کرنا، اپنے دماغ کی قوت کو خرچ کرنا، اپنی آبرو کو خطرہ میں ڈال دینا، اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دینا، دوسروں کو بچانے کے لیے یا حق کی حمایت میں اپنی جان دے دینا، یہ سب سخاوت کی ادنیٰ اور اعلیٰ قسمیں ہیں جن کے امتیاز کے لیے الگ الگ نام رکھے گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوگا کہ سخاوت اور فیاضی کی تعلیم کتنے وسیع معنوں کو گھیرے اور اخلاق کی کتنی ضمنی تعلیموں کو محیط ہے اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے اور ظاہر ہے کہ یہی خیال اکثر اخلاقی کاموں کی بنیاد ہے۔

سورۂ بقرہ کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندوں کے کچھ اوصاف بتائے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۳)

''اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے کچھ (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔''

بعض اہل تفسیر نے اس خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ لی ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ کے ساتھ خاص نہیں، (تفسیر ابن جریر طبری جلد اول تفسیر آیت مذکور) بلکہ یہاں جس طرح روزی کی تخصیص نہیں کی گئی، کہ کیا دی گئی، پھل کہ مویشی کہ سونا چاندی یا کوئی اور چیز، اسی طرح اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دینے کی صورت کی بھی تعیین نہیں کی گئی، اللہ نے جس بندہ کو جو کچھ اپنے فضل سے دیا ہے، اس کو اس میں سے اس شخص کو دینا چاہیے جس کو یہ نہیں ملا، یا ضرورت سے کم کم ملا ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس کو جو ملا ہے، اس میں سے کچھ ان کو دینا جو اس سے محروم رہے ہیں، یا جو اس کے محتاج ہیں، متقیوں کی نشانی ہے اور اسی کا نام اخلاق کی اصطلاح میں سخاوت اور فیاضی ہے۔ [1]

ایمان کے بعد اسلام کے دو سب سے اہم رکن، نماز اور زکوٰۃ ہیں، زکوٰۃ کی اصلی روح یہی سخاوت اور فیاضی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں اس اخلاقی تعلیم کی حیثیت بالکل بنیادی ہے، یعنی جس طرح نماز کی عبادت ہر قسم کے حقوقِ الٰہی کی بنیاد ہے، اسی طرح سخاوت اور فیاضی بندوں کے ہر قسم کے حقوق کی اساس ہے، جب تک کسی میں یہ وصف پیدا نہ ہوگا، اس میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا جذبہ

[1] تفسیر ابن جریر طبری، ج ۱، ص: ۸۰، تفسیر آیت مذکور۔

نہ ہوگا، اسی لیے اسلام نے زکوٰۃ کو فرض کر کے انسان کے اسی جذبہ کو ابھارا ہے، سارا قرآن انفاق (خرچ کرنا) اور ایتاء (دینا) کے حکم اور تعریف سے بھرا ہوا ہے، سورۂ بقرہ میں خصوصیت کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی تاکید پر تاکید آئی ہے اور کہیں کہیں اس کو جہاد کی ایک کڑی بنا دیا گیا ہے، فرمایا:

﴿ يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرة:۲۵٤)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اس میں سے کچھ خرچ کرو جو ہم نے تم کو دیا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خریدنا ہے، نہ دوستی ہے، نہ سفارش ہے اور کافر ہی ہیں ظالم۔''

اس آیت پاک کا آخری ٹکڑا (اور کافر ہی ہیں ظالم) غور کے قابل ہے، اس ٹکڑے سے قیاس ہوتا ہے کہ جو شخص روزِ جزا کے فائدہ کا خیال نہ کر کے اللہ کی راہ میں اپنی کوئی چیز خرچ نہیں کرتا وہ کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے، یا یہ کہ وہ کافرِ نعمت ہے، جو اللہ کی روزی کی نعمت پا کر اس کے شکرانہ میں اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں نہیں دیتا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کیسے پر تاثیر انداز میں بندوں کو اپنی دی ہوئی روزی میں سے خرچ کرنے پر ابھارا ہے کہ اے لوگو! اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں اللہ کی رحمت اور عذاب سے چھٹکارا نہ خرید و فروخت سے حاصل ہو سکتا ہے، نہ دوستی و محبت سے اور نہ سعی و سفارش سے، کچھ اپنی روزی میں سے جو خود تمہاری نہیں، بلکہ میری ہی دی ہوئی ہے، خرچ کر کے اللہ کی رحمت اور دوستی کو خرید لو کہ اس دن یہی کام آنے والا ہے۔

اللہ کی راہ میں جو سخاوت کی جائے ضرور ہے کہ اس میں خلوص نیت ہو، اس سے مقصود نہ تو کسی کو ممنون احسان بنانا ہو اور نہ اس کا اُلا ہنا دینا ہو، خود رسول کو فرمایا: ﴿ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ۝ ﴾ (۷٤/ المدثر:٦) ''اور احسان نہ کر (احسان نہ دھر) کہ زیادہ بدلہ چاہے۔'' اس خلوص کے ساتھ جو خرچ کیا جائے گا اس کی مزدوری اللہ دے گا اور قیامت کے غم و ملال سے اس کو ہر طرح آزاد رکھے گا، ارشاد ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝ ﴾ (٦/ البقرة:٢٦٢)

''جو اپنی دولت اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر اس کے خرچ کے پیچھے نہ تو احسان دھرتے ہیں اور نہ الاہنا دیتے ہیں، ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس دھری ہے اور نہ ان کو ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

آگے چل کر ارشاد ہے کہ جو دیا جائے وہ کوئی نکمی چیز نہ ہو کہ اس کے دینے سے نفس کی بلندی کے بجائے نفس کی دنایت ظاہر ہوتی ہے، فرمایا گیا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶۷)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اس میں سے جو تم نے کمایا اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا اچھی چیزیں خرچ کرو، اس میں سے بری چیز کے دینے کا قصد نہ کرو کہ تم دیتے ہو، حالانکہ تم اب اس کو لینے والے نہیں، مگر یہ کہ آنکھ اس کے لینے میں میچ لو۔''

مطلب یہ ہے کہ جس کو تم خوشی سے لینا پسند کرو، اس کا دینا بھی پسند کرو، جب تک ایسا نہ کرو گے اخلاق کا وہ جوہر جس کا نام نیکی اور فیاضی ہے تم کو ہاتھ نہیں آ سکتا، صاف فرمایا:

﴿ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ڛ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴾

(۳/ آل عمران:۹۲)

''ہرگز تم نیکی کو نہ پاؤ گے، جب تک تم اس میں سے خرچ نہ کرو جو تم کو پسند ہے اور جو بھی تم خرچ کرو اللہ جانتا ہے۔''

یعنی اللہ دل کے حال سے خبردار ہے، کس نیت سے اور کس طرح کا مال تم دے رہے ہو، اس کی حقیقت اوروں سے چھپی رہے تو چھپی رہے، مگر اس سب دلوں کے حال جاننے والے سے تو نہیں چھپ سکتی ہے اور اسی لیے وہ پورا پورا بدلہ بھی دے سکتا ہے اور اس طرح نیکی کے کام جو کچھ تم دیتے ہو اس کا نفع بھی لوٹ کر تم ہی کو ملے گا، دنیا میں تو اس طرح کے جماعتی کاموں کی مضبوطی اور جہاد اور محتاجوں کی مدد میں جو کچھ دیتے ہو، اس سے اس جماعت کا فائدہ بلکہ زندگی ہے، جس کے تم خود بھی ایک ممبر ہو اور دین میں تو ظاہر ہے کہ ہر کام کا بدلہ اسی کو ملے گا جو کرے گا، فرمایا:

﴿ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۲)

''اور جو بھی تم نیکی سے خرچ کرو تو وہ تمہارے ہی لیے ہے اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ کے لیے اور جو بھی تم خرچ کرو، وہ تم کو پورا دے دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ ذرا بے انصافی نہ کی جائے گی۔''

اور اسی لیے کہ دنیا میں جو کچھ دے گا، وہ آخرت میں اس کو پورا پورا بلکہ بڑھا کر ادا کر دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو قرض سے تعبیر کیا ہے اور دل بڑھانے والے انداز سے پکارا ہے:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲٤۵)

''کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض، تو اس کے واسطے وہ اس کو بہت گنا کرے۔''

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ۟ۚ ﴾

(۵۷/ الحدید:۱۱)

''کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض، تو وہ اس کو اس کے واسطے دونا کرے اور ہے اس کے لیے عزت کی مزدوری۔''

آگے چل کر پھر فرمایا:

﴿ اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ۟ ﴾

(۵۷/ الحدید:۱۸)

''بے شک خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں اور قرض دیتے ہیں اللہ کو اچھا قرض، ان کو دونا دیا جائے گا اور ان کے لیے عزت والی مزدوری ہے۔''

کہیں حکم کی صورت میں ہے:

﴿ وَاَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ ﴾ (۷۳/ المزمل:۲۰)

''اور اللہ کو اچھا قرض دو۔''

قرض حسنہ یعنی اچھا قرض اسی لیے فرمایا کہ وہ خلوص سے دیا جائے اور اس کے بدلہ میں لینے والے سے کسی دنیاوی غرض کا مطالبہ نہ ہو، نہ اس پر احسان دھرا جائے، نہ اس سے بدلہ مانگنے کی نیت ہو، بنی اسرائیل سے اللہ نے جن باتوں کا عہد لیا تھا اور ان کو قرآن میں مسلمانوں کے سامنے بھی دہرایا گیا ہے، ان میں نماز اور ایمان کے بعد زکوٰۃ کا ذکر ہے اور اس کے بعد آخری بات یہ ہے:

﴿ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۳)

''اور (اگر) تم اللہ کو اچھی طرح کا قرض دیتے رہے۔''

تو ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

﴿ لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ﴾

(۵/ المآئدۃ:۱۳)

''تو میں تم سے تمہاری برائیاں اتاروں گا اور تم کو ان باغوں میں داخل کروں گا، جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔''

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جو بدوی ایمان لائے اور خوش نیتی کے ساتھ کار خیر میں خرچ کرتے تھے، اللہ نے ان کی تعریف فرمائی:

﴿ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ ﴾ (۹/ التوبة:۹۹)

''اور بعضے بدوی ایسے ہیں، جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں اور ٹھہراتے ہیں جس کو خرچ کرتے ہیں، اللہ سے نزدیک ہونا اور رسول کی دعا لینا۔''

اللہ نے ایسے سخی داناؤں کو خوشخبری دی:

﴿ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (۹/ التوبة:۹۹)

''ہاں! وہ ان کے حق میں نزدیکی کا سبب ہے، ان کو اللہ اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

متقی سخیوں کے لیے اللہ نے اپنی بخشش اور وسیع جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور اس کی طرف جھپٹ کر جانے کی منادی کی ہے:

﴿ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۳۳۔۱۳٤)

''اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا پھیلاؤ ہے آسمان اور زمین، تیار ہوئی ہے پرہیز گاروں کے واسطے جو خوشی اور تکلیف (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں۔''

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اس خرچ کی جو اللہ کی راہ میں کیا جائے ایک مثال دی ہے، جس سے یہ اچنبھا کہ ایک معمولی سے صدقہ کا ثواب دس گنا کیونکر ہوگا، دور ہو جاتا ہے، فرمایا:

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ (۲/ البقرة:۲٦۱)

''ان کی مثال جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ایک دانہ کی سی ہے، جس سے سات بالیں اگتی ہیں، ہر بال میں سو دانے ہوتے ہیں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے اور اللہ کشائش والا ہے سب جانتا ہے۔''

جیسے یہ ایک دانہ سینکڑوں دانے بن جاتا ہے، ایسے ہی نیکی کا ایک بیج ثواب کے سینکڑوں دانے پیدا کر لیتا ہے، اللہ گنجائش اور کشائش والا ہے، اس کے ہاں ایک کا سو بن جانا کچھ مشکل نہیں ہے اور وہ جانتا بھی ہے کہ کس نے کتنی اچھی نیت سے یہ دیا ہے، اسی رکوع کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان کی جو اللہ کی خوشنودی کے

لیے اچھی نیت سے اپنا مال دیتے ہیں، ایک اور مثال دی ہے:

﴿ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶۵)

''اور ان کی مثال جو اپنا مال اللہ کی خوشنودی چاہنے کے لیے اور اپنے کو پکا کرنے کو دیتے ہیں، ایک باغ کی سی ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو، اس پر مینہ پڑا تو اس نے اپنا پھل دوگنا دیا اور اگر مینہ نہیں پڑا تو اوس ہی پڑی اور اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے''

اس مثال میں ٹیلہ کی اونچی صالح زمین سے اچھی نیت، بارش سے زیادہ اور اوس سے تھوڑا بہت خرچ کرنا اور پھل سے ثواب مراد ہے، تو جیسے باغ کسی اچھی زمین میں پانی سے اور وہ نہ ہو تو ذرا سی نمی سے بھی لہلہا اٹھتا ہے، ایسے ہی اچھی نیت سے اللہ کی راہ میں جو دیا جائے، وہ ایک کے بدلہ میں سو ہو جاتا ہے اور اللہ ہمارے ہر کام سے باخبر ہے، اس لیے ہماری نیتوں کے بھید سے بھی آگاہ ہے۔

اس دادودہش اور جودوسخا کی بلندی اور پاکیزگی کا بہت اونچا معیار سورۂ واللیل میں بیان کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝﴾ (۹۲/ اللیل:۵-۷)

''تو جس نے (راہ الٰہی میں) دیا اور پرہیز کیا اور اچھی بات کو مانا، تو ہم اس کے لیے (نیکی کی) سچ بات کا راستہ آسان کریں گے۔''

﴿ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝﴾ (۹۲/ اللیل:۱۷-۲۱)

''اور اس (دوزخ کی آگ) سے وہ پرہیزگار بچایا جائے گا، جو اپنا مال پاکیزگی چاہ کر دیتا ہے اور اس پر کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے، بلکہ اپنے پروردگارِ برتر کی خوشی کے لیے اور وہ خوش ہو جائے گا۔''

پہلی آیت بتاتی ہے کہ راہ الٰہی میں دینے کی عادت، اطاعت وعبادت، یا نیک کاموں کے کرنے کی روح پیدا کر دیتی ہے، جس سے ہر نیک کام کا کرنا اس پر آسان ہو جاتا ہے، یہ اس نیک عادت کا کتنا بڑا فائدہ ہے، دوسری آیت کہتی ہے کہ ایسے متقی پر جو دادودہش کا عادی ہے، دوزخ کی آگ حرام ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس جودوسخا کا سبب دنیاوی ناموری یا کسی کے احسان کا بدلہ اتارنا یا کوئی اور غیر مخلصانہ غرض نہ ہو۔ بلکہ مقصود صرف اللہ ہو اور یہ ہو کہ مال ودولت کے میل سے اس کا دامنِ دل پاک ہو جائے، تو اللہ بھی اس کے عمل کا وہ

بدلہ اس کو عنایت فرمائے گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا، اس دوسری آیت میں یہ اشارہ ہے کہ اس نیک عادت کا اثر یہ بھی ہے کہ اس سے دل میں پاکیزگی آتی ہے۔

کفر اور نفاق کے بعد مال و دولت کی محبت ہی وہ کثیف غبار ہے، جو دل کے آئینہ کو میلا کرتا اور حق کے قبول سے روکتا رہتا ہے، دنیا کی اصلاحات کی پوری تاریخ اس واقعہ پر گواہ ہے، اسی لیے اسلام نے جب اپنی دعوت اور اصلاح کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے دلوں کے اسی میل کو دھونا چاہا اور جود و سخا اور داد و دہش کی برملا تعریف اور جمع مال، حرص و طمع اور بخل کی بہت مذمت کی اور اس بات کی کوشش کی کہ اس کی تعلیم کا یہ اثر ہو کہ اس کے پیروؤں کے دلوں سے مال و دولت کی محبت ہمیشہ کے لیے جاتی رہے:

﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ ۝ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝ ﴾

(۱۰۳/ الھمزۃ:۱۔۳)

''پھٹکار ہو ہر غیبت کرنے والے عیب کرنے والے پر جس نے دولت اکٹھی کی اور اس کو گن گن کر رکھا، سمجھتا ہے کہ اس کی یہ دولت اس کو سدا رکھے گی۔''

ایک اور آیت میں مال کی محبت پر کافروں کو طعنہ دیا ہے:

﴿ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ ﴾ (۸۹/ الفجر:۲۰)

''اور تم مال و دولت سے بہت ہی محبت رکھتے ہو۔''

یہی محبت، سچائی اور نیکی کے راستہ پر چلنے سے روکتی ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ اگر میں نے یہ راستہ اختیار کیا تو میری یہ دولت مجھ سے چھن جائے گی اور میرا مال خرچ ہو جائے گا، اسی وسوسۂ شیطانی کو اللہ نے انفاق (اللہ کی راہ میں دینا) کے سلسلہ میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

﴿ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاۗءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶۸)

''شیطان تم کو محتاجی کا خیال دلاتا ہے اور تمھیں بے حیائی کی بات (بخل) کو کہتا ہے اور اللہ تم سے اپنی طرف سے گناہوں کی بخشائش اور فضل و کرم کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ کشائش والا ہے، جاننے والا ہے۔''

قرآن کی اصطلاح میں دین و دنیا کی ایک بہت بڑی دولت کا نام حکمت ہے، یہ دل کی وہ کنجی ہے جس سے علم اور عمل کا ہر بند خزانہ کھل جاتا ہے، حکمت کا یہ خزانہ اس وقت تک کسی کو نہیں ملتا جب تک اس کے دل سے دنیا کے مال و دولت کی محبت جاتی نہ رہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس اوپر والی آیت کے بعد ہی ارشاد فرمایا:

﴿ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۶۹)

''وہ دیتا ہے سمجھ (حکمت) جس کو چاہے اور جس کو سمجھ (حکمت) دی گئی اس کو بڑی دولت ملی۔''

یعنی یہ سمجھ لینا کہ شیطان کا یہ وہم دلانا، کہ ہم دینے سے محتاج ہو جائیں گے، اس کا سراسر دھوکا ہے اور اللہ کا یہ وعدہ کہ دینے سے اس کے فضل و کرم کا دروازہ کھلے گا، درست ہے، بہت بڑی دانائی کی بات ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے کہ مال و دولت کی محبت ایک آزمائش ہے، اس آزمائش میں پورا اترنا کامیابی کی شرط ہے، پھر فرمایا جو بخالت اور لالچ سے بچا وہی مراد کو پہنچا، کیونکہ ہر اونچے مقصد کے لیے پہلی شرط جان و مال کی بازی لگانا ہے، جس کے پاؤں اس بازی میں ٹھہر گئے وہی بامراد ہوا اور جس کے اکھڑ گئے وہ نامراد رہا:

﴿ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ ﴾

(٦٤/ التغابن:١٥-١٧)

''تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو جانچ ہے اور اللہ کے پاس بڑی مزدوری ہے، تو اللہ سے ڈرو، جتنا ہو سکے اور (اس کی باتوں کو) سنو اور مانو اور (راہ الٰہی) خرچ کرو، اپنے لیے بھلائی کرو اور جو اپنی جان کی لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں، اگر اللہ کو قرض دو اچھا قرض، تو وہ اس کو تمہارے لیے دونا کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا اور اللہ (نیکی کی) قدر پہچانتا ہے اور (برائی کا بدلہ لینے میں) بردبار ہے۔''

ان آیتوں میں انفاق اور کار خیر میں دینے کو کامیابی کی کنجی جو کہا گیا ہے، وہ انسانیت کی اصلاحی تاریخ کے حرف بحرف مطابق ہے، قوموں کی ترقی کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنی دولت کو اچھے کاموں میں لگاتی ورافراد میں بانٹتی رہیں، یعنی جماعت کے کاموں اور کمائی کے ناقابل یا کمائی سے محروم افراد کی مدد میں اپنا سرمایہ خرچ کرتے رہیں، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دولت ایک شخص کے پاس اکٹھی نہ ہونے پائے گی اور تمول کی برائیوں سے لوگ بچے رہیں گے اور بخل اور لالچ کے سبب سے اچھے کاموں کے کرنے سے ہچکچایا نہ کریں گے اور سخاوت کی تعلیم سے اسلام کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے۔

سخاوت سے جو چیز انسان کو روکتی ہے وہ اس کے دو قسم کے بیہودہ خطرے ہیں:

① میری چیز ہے، میں دوسروں کو کیوں دوں۔

② دوسروں کو دوں گا، تو میرے کمی ہو جائے گی، جس سے ضرورت کے وقت مجھے تکلیف ہوگی۔

اسلام نے اپنی تعلیم سے انسان کے ان دونوں وسوسوں کا خاتمہ کر دیا ہے، اس نے یہ بتایا اور اپنے

پیرووں کو اچھی طرح یقین دلایا ہے کہ یہ مال حقیقت میں میرا تیرا کسی کا نہیں، وہ صرف اللہ کا ہے، وہی اس کا مالک اسی کی چیز ہے اور اسی کی راہ میں دی جانی چاہیے:

﴿ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ ﴾

(۵۷/ الحدید:۱۰)

''اور تم کو کیا ہوا ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔''

بخل کی برائی میں کہا:

﴿ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۸۰)

''اور نہ سمجھیں وہ لوگ جو اس میں بخل کرتے ہیں جس کو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے، بلکہ یہ ان کے حق میں برا ہے، قیامت کے دن ان کے گلے میں اس کا طوق ڈالا جائے گا، جس کا بخل کیا تھا اور آسمانوں کی اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔''

ذرا ذرا سے فرق سے قرآن پاک میں بیسیوں جگہ یہ آیت ہے:

﴿ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۰۹)

''اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔''

اسی طرح بیسیوں مقام پر تھوڑے تھوڑے فرق سے یہ آیت آتی ہے:

﴿ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ ﴾ (۵۷/ الحدید:۲)

''آسمانوں اور زمین کی ملکیت (یا بادشاہی) اُسی کی ہے۔''

منافقوں نے سازش سے یہ طے کرنا چاہا کہ اب رسول اللہ ﷺ اور اسلام کی مالی امداد وہ نہ کریں، تاکہ جو مسلمان اکٹھے ہو گئے ہیں، وہ سرمایہ نہ ہونے پر بکھر جائیں، اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی اس سازش کی خبر اپنے رسول کو دی اور ساتھ ہی منافقوں کے اس زعم باطل کی کہ اسلام کا سرمایہ ان کے دینے سے ہوگا، تردید کی، فرمایا:

﴿ هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلَىٰ مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنْفَضُّوا ۗ وَلِلَّهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ ۝ ﴾ (۶۳/ المنافقون:۷)

''وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول کے پاس جو لوگ ہیں ان پر خرچ نہ کرو، تاکہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں [1] اور اللہ ہی کے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے اور لیکن

[1] (یا) یہاں تک کہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔

منافقین سمجھتے نہیں ہیں۔“

منافق یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ سارا سرمایہ جس سے تبلیغ نبوی ﷺ کی کل چل رہی ہے، ان کے بل بوتے سے ہے، اللہ نے فرمایا، یہ سارا خیال غلط ہے، آسمان اور زمین کے خزانہ میں جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے، وہ جہاں سے جس کو چاہے جو چاہے دے دے، دوسرے خیال کو طرح طرح سے باطل کیا، فرمایا:

﴿ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾ (٤٢/ الشورىٰ: ١٢)

”اسی کے پاس ہیں آسمانوں کی اور زمین کی کنجیاں، پھیلا دیتا ہے روزی جس کیلئے چاہے اور ناپ دیتا ہے، وہ ہر ایک چیز کی خبر رکھتا ہے۔“

یہ حقیقت ظاہر کی کہ روزی کی فراوانی اور تنگی دونوں انسان کی جانچ کے دو برابر کے راستے ہیں، اگر ایک میں انسان کی فیاضی، مال کے عدم محبت، ایثار اور جذبہ شکر کا امتحان ہے، تو دوسرے میں انسان کی قناعت پسندی بے طمعی اور جذبہ صبر کی آزمائش ہے، فرمایا:

﴿ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ڏ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ڏ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝﴾ (٨٩/ الفجر: ١٥۔١٦)

”سو آدمی جو ہے جب اس کا مالک اس کو جانچے پھر اس کو عزت دے اور نعمت دے، تو وہ کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے عزت دی اور جب اس کو جانچے تو اس کی روزی اس پر تنگ کرے، تو کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے ذلیل کیا، یہ کوئی بات نہیں۔“

غرض روزی کی کشائش اور تنگی دونوں اللہ کے کام ہیں اور مصلحت سے ہیں، دولت مند انسان یہ سمجھتا ہے کہ مجھی میں کوئی بات ہے جس سے مجھے یہ دولت ملی، یا مجھی کو کوئی ایسا ہنر یا طریقہ معلوم ہے جس سے یہ ساری دولت میرے چاروں طرف سمٹی آ رہی ہے، مذہبی تعلیم کے علاوہ دنیا کے واقعات پر گہری نظر اس یقین کے مٹانے کے لیے کافی ہے، مگر کم نگاہ لوگ ادھر دیکھتے نہیں، قرآن نے اس انسانی جبلت کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچ کر اس کی غلطی بتائی ہے:

﴿ فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۡ ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ ۭ بَلْ هِىَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۭ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (٣٩/ الزمر: ٤٩۔٥٢)

’’سو جب آدمی کو کوئی تکلیف آ لگے تو ہم کو پکارے، پھر جب ہم اپنی طرف اس کو کوئی نعمت دیں تو کہے کہ یہ تو مجھے علم پر ملا ہے، ❶ (اللہ فرماتا ہے) بلکہ یہ تو جانچ ہے، مگر بہتیرے اس کو نہیں سمجھتے، یہی بات ان کے پہلوں نے کہی تھی، ❷ تو ان کو ان کی یہ کمائی کام نہ آئی اور جو کمایا تھا اس کی برائیاں ان پر پڑیں اور جو ان میں سے گنا ہگار ہیں، ان پر بھی ان کی کمائی کی برائیاں پڑنے والی ہیں، وہ تھکا نہیں سکتے، کیا ان کو یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی روزی جس کے لیے چاہتا ہے، پھیلاتا ہے، (اور جس کو چاہتا ہے) ناپ کر دیتا ہے، اس میں ایمان والوں کے لیے البتہ نشانیاں ہیں۔‘‘

ہر جاندار کی روزی اللہ کے ذمہ ہے، اس کا یقین انسان کو آ جائے تو سخاوت اور فیاضی کا ہر راستہ اس کے لیے آسان ہو جائے، اسلام نے انسانوں کو یہی یقین دلایا ہے، اللہ نے فرمایا:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۝ ﴾ (١١/ هود:٦)

’’اور کوئی چلنے والا نہیں زمین میں، مگر یہ کہ اس کی روزی اللہ پر ہے، وہ جانتا ہے جہاں اس کو ٹھہرنا ہے، (یعنی دوزخ یا بہشت) اور جہاں اس کو سونپا جاتا ہے، (یعنی قبر) سب (علم الٰہی) کھلی کتاب میں موجود ہے۔‘‘

دوسرا یقین یہ آئے کہ ہماری روزی میں سے جو کچھ دوسرے کو مل جاتا ہے، وہ تقدیر میں اسی کا حصہ تھا، اس لیے درحقیقت وہ ہمارا تھا ہی نہیں، اسلام نے اپنے پیروؤں کے اندر سخاوت اور فیاضی کا جوہر پیدا کرنے کے لیے ان یقینیات کو مسلمانوں کے ریشہ میں رچا دینا چاہا ہے، وہی سب کو روزی پہنچاتا ہے، اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے:

﴿ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ ﴾ (٢٧/ النمل:٦٤)

’’اور تم کو کون روزی دیتا ہے، آسمان سے اور زمین سے، اللہ کے ساتھ کوئی اور اللہ بھی ہے۔‘‘

روزی دینا اسی کا کام ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ۝ ﴾ (٥١/ الذاريٰت:٥٨)

’’بے شبہ اللہ جو ہے وہی روزی دینے والا ہے، زورآور مضبوط۔‘‘

احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے طرح طرح کے پراثر انداز سے اس تعلیم کی تشریح اور تاکید کی ہے،

❶ اس کا ایک مطلب تو اہل تفسیر نے یہ لیا ہے کہ مجھے یہ پہلے سے معلوم تھا اور دوسرا یہ کہ دولت کے حصول کے طریقوں کا مجھے ہنر معلوم تھا، اس دوسرے مطلب کی تائید سورۂ قصص میں قارون کے قصہ والی آیت سے ہوتی ہے۔ (دیکھو روح المعانی، ج ٢٤، ص: ١١)۔

❷ چنانچہ قارون کو جب راہ الٰہی میں خرچ کرنے کی نصیحت کی گئی تو اس نے بھی یہی کہا تھا، ﴿ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ ﴾ (٢٨/ القصص:٧٨) ’’قارون نے کہا: یہ دولت تو مجھے ایک ہنر سے ملی ہے، جو میرے پاس ہے۔‘‘

فرمایا: ”تم باندھو نہیں، ورنہ تم پر باندھا جائے گا۔“ ❶ یعنی اگر تم اپنی تھیلی کا منہ بند کرو گے اور دوسروں کو نہ دو گے، تو اللہ بھی اپنی تھیلی کا منہ تم سے بند کر لے گا اور تم کو نہیں دے گا۔“ ایک دفعہ صحابہ سے پوچھا: ”تم میں سے کس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے؟“ لوگوں نے کہا، ہم میں کوئی ایسا نہیں جس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے، فرمایا: ”تو اس کا مال تو وہی ہے جس کو اس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا وہ تو اس کے وارث کا مال ہے۔“ ❷ ایک دفعہ آپ نے قرآن پاک میں یہ آیت پڑھی ﴿ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ﴾ (۱۰۲/ التکاثر:۱) ”تم کو مال و دولت کا اور ناز و نعمت کی بڑھوتری نے غفلت میں ڈال دیا۔“ پھر فرمایا: ”آدم کے بیٹے کا یہ حال ہے کہ کہتا ہے کہ میرا مال! میرا مال! اور تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے صدقہ کیا اور آگے چلا یا یا کھالیا تو اس کو فنا کر چکا اور پہن لیا تو اس کو پرانا کر چکا۔“ ❸

فرمایا: ”اے ابوذر! مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس احد پہاڑ برابر سونا ہو اور تیسرے دن تک اس میں سے ایک اشرفی بھی میرے پاس رہ جائے، مگر یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کو رکھ چھوڑوں، میں کہوں گا کہ اس کو اللہ کے بندوں میں ایسے ایسے داہنے بائیں پیچھے بانٹ دو۔“ پھر فرمایا: ”ہاں جن کے پاس یہاں زیادہ ہے، ان ہی کے پاس وہاں قیامت میں کم ہوگا، لیکن یہ کہ وہ کہے کہ ایسے ایسے داہنے بائیں، آگے پیچھے بانٹ دو۔“ ❹

فرمایا: ”رشک دو ہی پر روا ہے، ایک اس پر جس کو اللہ نے دولت دی ہے، تو وہ ہاتھوں سے اس کو صحیح مصرف (حق) میں لٹا رہا ہے، دوسرے اس پر جس کو اللہ نے علم دیا ہے تو وہ اس کے مطابق بتا رہا ہے اور سکھا رہا ہے۔“ ❺

اس حدیث کے پہلے ٹکڑے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت اس دینے کا نام ہے جو صحیح مصرف (حق) میں ہے اور اس میں دینا جس کا مصرف صحیح نہ ہو، یا جو اپنی حد سے زیادہ ہو اسراف اور فضول خرچی ہے، جس کی برائی قرآن پاک میں آئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان کا قدم میانہ روی اور اعتدال سے باہر نہ پڑے، اس کی تفصیل اسراف اور بخل کے بیان میں آئے گی۔

یہ بھی سخاوت نہیں کہ کوئی عمر بھر اپنی دولت کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھے اور جب موت سامنے آ کر کھڑی ہو جائے اور یقین ہو جائے کہ اب یہ عمر بھر کی ساتھی ساتھ چھوڑ رہی ہے تو ہتھیلی مل کر افسوس کرے کہ اب ذرا سا بھی موقع مل جائے تو اس کو نیک کاموں میں لٹا جاؤں، قرآن پاک نے آدمی کی اس بے بسی کا نظارہ کس پر اثر انداز میں کھینچا ہے اور مسلمانوں کو اپنی زندگی ہی میں کچھ کر جانے کی نصیحت کی ہے:

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب الحث علی الانفاق:۲۳۷۶۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب ماقدم من ماله فهوله: ٦٤٤٢۔ ❸ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة الهاكم التكاثر: ٣٣٥٤۔ حدیث حسن صحیح۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی ﷺ: ما یسرنی ان عندی...... : ٦٤٤٤۔
❺ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الاغتباط فی العلم والحکمة: ٧٣۔

﴿ وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ فَیَقُوۡلَ رَبِّ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنِیۡۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَکُنۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ۝﴾ (٦٣/ المنافقون:١٠)

''اور ہم نے تم کو جو روزی دی اس میں سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی ایک کو موت آنے لگے، تو کہے کہ اے میرے مالک! تو نے مجھے تھوڑی مہلت اور نہ دی کہ میں خیرات کرتا اور نیکوں میں سے ہو جاتا۔''

اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿ وَلَنۡ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفۡسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُہَا ؕ وَاللّٰہُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۝﴾

(٦٣/ المنافقون:١١)

''اور اللہ ہرگز کسی کو مہلت اور نہ دے گا جب اس کا وقت آ جائے اور اللہ کو خبر ہے جو کرتے ہو۔''

اس لیے جو کچھ کرنا ہے وقت پر کرنا چاہیے، ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کون سا صدقہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا: ''یہ کہ تم صدقہ کرو اور تم تندرست ہو، مال کی خواہش ہو اور جینے کی بھی امید ہو اور تم اس پر ڈھیل نہ دو کہ جب جان حلق تک آ جائے تو تم کہو کہ فلاں کو اتنا دو اور فلاں کو اتنا دو، حالانکہ وہ تو اب (تمہارے بعد) فلاں کا ہو ہی چکا۔'' [1]

فرمایا: ''اے آدم کے بیٹے! تیرا دینا تیرے لیے بہتر اور تیرا رکھ چھوڑنا تیرے لیے برا ہے۔'' [2]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب بیان ان افضل الصدقۃ: ٢٣٨٢۔

[2] ایضا، باب بیان ان الید العلیا : ٢٣٨٨۔

عفت و پاکبازی

عفت و پاکبازی ان ساری اخلاقی خوبیوں کی جان ہے، جن کا لگاؤ عزت اور آبرو سے ہے، اسی لیے اسلام نے اس کو ان اخلاقی محاسن میں گنایا ہے، جو مسلمانوں کے چہرہ کا نور ہیں، چنانچہ سورۂ مومنون میں مسلمانوں کے جو امتیازی اوصاف بتائے گئے ہیں، ان میں اس اخلاقی وصف کا بھی خاص طور پر ذکر ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۵۔۷)

''اور (وہ مسلمان) جو اپنی شرم گاہوں کی پاسبانی کرتے ہیں، مگر اپنی بیبیوں یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ (باندیوں) سے، تو ان پر کچھ الزام نہیں، لیکن جو اس کے علاوہ کے طلب گار ہوں، تو وہی لوگ حد سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔''

سورۂ معارج میں مسلمانوں کے جن اخلاقی اوصاف کی تعریف کی گئی ہے، ان میں ایک عفت اور پاکبازی بھی ہے، فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ ﴾ (۷۰/ المعارج:۲۹)

''اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہیں۔''

جن مسلمانوں کے لیے اللہ نے اپنی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا ہے، ان میں وہ بھی ہیں، جو عفیف اور پاک دامن ہیں:

﴿ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۳۵)

''اور اپنی شرم گاہوں کی پاسبانی کرنے والے مرد اور پاسبانی کرنے والی عورتیں۔''

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوگا کہ عفت اور پاک دامنی کے لیے قرآن کی اصطلاح ''حفظ فروج'' ہے، حفظ کے معنی حفاظت اور پاسبانی کے ہیں اور فروج اپنے معنی میں ایک مجازی استعمال ہے، کتنے لفظ ہیں، جو شرم کے قابل لفظوں سے بچاؤ کے لیے پہلے پہل مجاز کے طور پر بولے گئے، مگر بعد کو استعمال کی کثرت سے وہ اپنے مفہوم میں بالکل ہی بے پردہ ہو گئے، فروج کے اصلی معنی دو چیزوں کے درمیان خلا کے ہیں اور اسی لیے اس سرحدی مقام کو بھی کہتے ہیں جدھر سے دشمنوں کے حملہ کا ڈر ہو، اس بنا پر یہ انسانوں کے اعضاء میں سے اس خلا کا نام ہے جو ان کے دونوں پاؤں کے بیچ میں ہے اور جدھر سے دشمنوں کی آمد کا خطرہ ہر وقت لگا ہو اور جس پر پہرہ چوکی بٹھا کر ہر دم پاسبانی اور نگرانی کی ضرورت ہو، اس طریقہ تعبیر سے اندازہ ہوگا کہ عفت و پاکبازی کا جو تخیل ان لفظوں کے اندر پیوست ہے، وہ کتنا گہرا اور کتنا بلند ہے۔

عفت و پاکبازی کے لیے قرآن کا دوسرا لفظ احصان ہے، جو حصن سے بنا ہے، جس کے معنی قلعہ یا

محفوظ مقام کے ہیں، اس سے حِصَانٌ ، اِحْصَانٌ ، مُحْصِنٌ اور مُحْصَنٌ الفاظ بنائے گئے ہیں، پہلا لفظ قرآن میں نہیں آیا، مگر عربوں کے اشعار میں آیا ہے، اس کے معنی پاک دامن عورت کے ہیں، دوسرے کے معنی حفاظت میں لینے، یا حفاظت میں رکھنے کے ہیں، یہ قرآن میں تین موقعوں پر آیا ہے، دو دفعہ حضرت مریم علیہا السلام کی عصمت و پاک دامنی کے بیان میں، ماضی معروف کے صیغہ میں:

﴿ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِىْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا ﴾ (٦٦/ التحریم:١٢)

''اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔''

﴿ وَالَّتِىْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا ﴾ (٢١/ الانبیآء:٩١)

''اور وہ بی بی جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔''

تیسری جگہ ماضی مجہول کا صیغہ آیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ شوہر نے اس کو اپنے نکاح میں لاکر اپنی حفاظت میں لے لیا، لونڈیوں کے بیان میں ہے کہ اگر وہ کسی کے نکاح میں آکر بدکاری کریں تو ان کی سزا کیا ہے، فرمایا:

﴿ فَاِذَآ اُحْصِنَّ ﴾ (٤/ النسآء:٢٥)

''تو جب وہ نکاح کی قید میں آچکیں۔''

اسی سے اس کا فاعل مُحْصِنٌ (حفاظت میں لانے والا) اور اسم مفعول مُحْصَنَةٌ (حفاظت میں لائی گئی) نکاح کے سلسلہ میں قرآن میں آیا ہے:

﴿ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ﴾ (٤/ النسآء:٢٤)

''حفاظت میں لانے والے نہ مستی نکالنے والے۔''

﴿ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ ﴾ (٤/ النسآء:٢٥)

''حفاظت میں آنے والیاں نہ مستی نکالنے والیاں۔''

یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید میں لایا جائے، صرف حیوانی خواہش کا دفع کرنا نکاح کا مقصد نہیں، اسی لیے قرآن پاک میں اس کے علاوہ مُحْصَنٰتٌ (حفاظت میں رکھی ہوئی بیبیاں) دو معنوں میں آیا ہے، ایک بیاہی عورتوں کے معنی میں، جیسے:

﴿ وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ ﴾ (٤/ النسآء:٢٤)

''اور بیاہی عورتیں، (یعنی جو عورتیں کسی کے نکاح میں ہیں وہ دوسرے مرد پر حرام ہیں)۔''

دوسرے شریف آزاد بی بیوں کے معنی میں جیسے:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ ﴾ (٤/ النسآء:٢٥)

"اور جس کو تم میں سے مسلمان شریف و آزاد بیویوں کے نکاح کا مقدور نہ ہو، (تو مسلمان باندی سے نکاح کرے)۔"

عورتوں کی عصمت کے بیان میں قرآن پاک نے ایک اور محاورہ بھی استعمال کیا ہے:

﴿ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ ﴾ (٤/ النساء:٣٤)

"پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والیاں۔"

یعنی اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں اپنی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کرتی ہیں۔

اسلام میں عفت اور پاکبازی کا وہ رتبہ ہے کہ وہ نبوت و رسالت کا لازمی جزو ہے، نبی، نبی کے سلسلہ نسب اور نبی کے اہل بیت کا دامن اس داغ سے ہمیشہ پاک رہتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں حضرت مریم علیہا السلام کی نسبت یہود نے جو بہتان باندھا تھا، قرآن نے اس کی تردید کی اور ان کی عصمت اور پاک دامنی کی شہادت دی اور دو موقعوں پر اس شہادت کی تصریح کی:

﴿ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا ﴾ (٦٦/ التحريم:١٢)

"اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔"

﴿ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا ﴾ (٢١/ الانبياء:٩١)

"اور وہ بی بی جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔"

حضرت یوسف علیہ السلام نے جس پاکبازی کا ثبوت دیا، اس کی گواہی خود عزیز مصر کی بیوی نے دی:

﴿ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ﴾ (١٢/ يوسف:٣٢)

"اور میں نے اس کو اس سے چاہا تو وہ بچا رہا۔"

اللہ نے فرمایا میں نے ایسا اس لیے کیا:

﴿ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ (١٢/ يوسف:٢٤)

"تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو دور کریں، وہ بے شبہ ہمارے چنے بندوں میں تھا۔"

معلوم ہوا کہ خدا کے چنے ہوئے اور برگزیدہ بندے ایسی بے حیائی کی باتوں سے پاک رکھے جاتے ہیں، حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تعریف میں فرمایا گیا:

﴿ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ (٣/ آل عمران:٣٩)

"اور سردار ہوگا اور اپنی قوت شہوانی پر ضبط رکھتا ہوگا اور نبی ہوگا صالحوں میں سے۔"

اسلام میں اہل بیت نبوی ﷺ کی زندگی، جس عفت، عصمت اور پاک بازی کی تصویر تھی، غیب کے دانائے راز نے اس کی گواہی ان لفظوں میں دی:

﴿ أُولَٰٓئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ ۖ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝ ﴾ (۲۴/ النور:۲۶)

''یہ لوگ تہمت سے پاک ہیں، ان کے لیے بخشائش ہے اور عزت والی روزی ۔''

عفت و پاک دامنی کے خلاف کا نام قرآن کی زبان میں فَاحِشَةٌ 1 آیا ہے، جس کے معنی بہت بڑی برائی کے ہیں، جیسے

﴿ إِلَّآ أَن يَأْتِينَ بِفَٰحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ ﴾ (۴/ النسآء:۱۹)

''مگر یہ کہ وہ عورتیں کھلی برائی کریں۔''

﴿ وَٱلَّٰتِى يَأْتِينَ ٱلْفَٰحِشَةَ مِن نِّسَآئِكُمْ ﴾ (۴/ النسآء:۱۵)

''اور تمہاری عورتوں میں سے جو کھلی برائی کریں۔''

اس برائی کا مشہور عربی نام زنا ہے، قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں مسلمانوں کو اس برائی سے روکا گیا ہے:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا۟ ٱلزِّنَىٰٓ ۖ إِنَّهُۥ كَانَ فَٰحِشَةً وَسَآءَ سَبِيلًا ۝ ﴾ (بنی اسرآئیل:۳۲)

''اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک یہ بڑی برائی اور برا چلن ہے۔''

یہ نصیحت جس طرز سے کی گئی ہے، وہ بلاغت کی جان ہے، یہ نہیں فرمایا کہ ''تم زنا نہ کرنا'' بلکہ یہ کہا کہ ''تم زنا کے قریب نہ جانا''۔ اس طرز ادا نے نہ صرف یہ کہ اس فعل بد ہی سے بچنے کی تاکید کی، بلکہ اس سے قریب ہو کر گزرنے کی بھی ممانعت کی، اس سے یہ نکتہ پیدا ہوا کہ جس طرح اس بدکاری سے بچنا شرافت ہے، اس کی تقریب اور تمہید کے کاموں سے بھی بچنا شرافت کا اقتضا ہے، کسی غیر محرم کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے یا بے حیائی کے ارادہ سے دیکھنا، تنہائی میں ملنا جلنا، بے وجہ اس کے بدن کو چھونا، یا اور کسی طرح سے اس کی بات چیت اور آمد و رفت سے ناجائز لطف اٹھانا، یا دوسرے غیر شریفانہ حرکات کرنا، ایمانی عزت اور اخلاقی شرافت کے سراسر منافی ہے۔

اسی لیے اسلام نے ان ساری باتوں کو جو بے حیائی اور بدکاری کی تقریب اور تمہید ہیں، حرام قرار دیا، مرد و عورت کے ناجائز تعلق و محبت کا پہلا قاصد نظر ہے، مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں دونوں کو حکم دیا کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے ہوں تو اپنی نظریں نیچی رکھیں:

﴿ قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا۟ مِنْ أَبْصَٰرِهِمْ وَيَحْفَظُوا۟ فُرُوجَهُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ خَبِيرٌۢ بِمَا يَصْنَعُونَ ۝ ﴾ (۲۴/ النور:۳۰)

''اے پیغمبر ﷺ! ایمان والوں سے کہہ دے کہ وہ ذرا اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے بڑی ستھری بات ہے، اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔''

---

1 اس کا یہ منشا نہیں کہ قرآن میں ہر جگہ یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے بلکہ وہ لغت کی رو سے قول اور عمل کی ہر برائی کو شامل ہے۔

عورتوں کی ذراسی بے باکی بھی مردوں کو آگے بڑھنے کی جرأت دلاتی ہے، اس لیے ان پر شرافت کی چند پابندیاں عائد کی گئی ہیں، مثلاً: یہ کہ وہ بھی نگاہیں نیچی رکھیں، غیروں کو اپنے اندر کا بناؤ سنگار نہ دکھائیں، اپنے زیوروں کی جھنکار کسی کو نہ سنائیں، اسی لیے زمین پر ہولے چلیں، یا جھنکار کے زیور نہ پہنیں، سینہ کا پردہ رکھیں، باہر نکلیں تو سارے جسم پر چادر ڈال کر نکلیں، باہر نکلنے میں خوشبو نہ ملیں، بیچ راستہ سے کترا کر کنارہ کنارہ پر چلیں، مرد اور عورت راستہ میں باتیں نہ کریں، مرد وعورت مل جل کر نہ بیٹھیں، کسی سے کوئی تنہائی میں نہ ملے، اجازت کے بغیر گھر کے اندر کوئی اور قدم نہ رکھے، یہ تمام باتیں درحقیقت ﴿لا تقربوا الزنی﴾ زنا کے قریب بھی نہ ہو کی شرح ہیں، فرمایا:

﴿ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۠ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۭ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (۲۴/ النور: ۳۱)

''اور اے پیغمبر ﷺ! ایمان والی بیبیوں سے کہہ دے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی جگہ کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگار کھول کر نہ دکھائیں، مگر جو طبعًا کھلا رہتا ہے [1] اور اپنی اوڑھنی اپنے گریبانوں (یعنی سینوں کے مقام) پر ڈال لیں اور اپنا سنگار نہ کھولیں، مگر اپنے شوہر یا اپنے باپ کے آگے، یا اپنے شوہر کے باپ، یا اپنے بیٹوں، یا اپنے شوہر کے بیٹوں، یا اپنے بھائیوں، یا اپنے بھتیجوں، یا اپنے بھانجوں، یا اپنی عورتوں، [2] یا اپنے غلاموں یا اپنے ان مرد نوکروں کے آگے جن کو غرض نہیں، یا ان لڑکوں کے آگے جو عورتوں کے ستر کے رمز سے ابھی آگاہ نہیں اور نہ مسلمان عورتیں اپنے پاؤں سے دھمک دیں کہ جس سنگار کو وہ چھپاتی ہیں، اس کا پتہ لگ جائے اور تم سب مل کر اے مسلمانو! اللہ کے آگے توبہ کرو، شاید تم بھلائی پاؤ۔''

اور حسب ذیل ادب گو پیغمبر کی بیویوں کو خطاب کر کے سکھایا گیا ہے، مگر عام عورتوں کے لیے اس میں پیروی کا نمونہ ہے:

﴿ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى ﴾

(۳۳/ الاحزاب: ۳۲۔۳۳)

[1] جیسے آنکھوں کا سرمہ، ہاتھوں کی مہندی (یا) انگلیوں کی انگوٹھی، اس لیے چہرہ، ہتھیلیاں اور قدم ستر میں داخل نہیں۔

[2] یعنی سہیلیاں اور خادمائیں اور اکثر جن کا ساتھ رہا کرتا ہے۔ (روح المعانی، جزء ثامن عشر، ص: ۱۲۹)۔

''اے پیغمبر ﷺ کی بیویو! تم نہیں ہو جیسی ہر کوئی عورت، اگر تم (اللہ کا) ڈر رکھو، سو تم دب کر (مرد سے) بات نہ کرو کہ جس کے دل میں روگ ہے، وہ خواہش کرے، ❶ اور نیک بات کہو اور اپنے گھروں میں وقار سے رہو اور جیسے نادانی کا پہلے زمانہ میں دستور تھا ویسے اپنے کو بناؤ سنگار کر کے دکھاتی نہ پھرو۔'' ❷

کسی غیر کے گھر کے اندر اجازت کے بغیر قدم نہ رکھا جائے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵۳)

''اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں اس کے بدوں کہ تم کو اجازت دی جائے (کھانے کی دعوت کے لیے) داخل نہ ہو۔''

گویا حکم یہاں خاص واقعہ سے متعلق ہے، مگر حکم کا منشا نبی ﷺ کے گھروں کے ساتھ خاص نہیں، چنانچہ عفت و پاک دامنی ہی کے سلسلہ میں سورۂ نور میں اسی قسم کا حکم عام مسلمان گھروں کی نسبت بھی ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ ﴾ (۲٤/ النور:۲۷)

''اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں نہ جایا کرو، جب تک خبر نہ کر لو اور ان گھر والوں کو سلام نہ دے لو، یہ بہتر ہے تمہارے حق میں، شاید تم یاد رکھو۔''

کوئی غیر مرد اگر کسی غیر کے زنانہ مکان سے کوئی چیز مانگے تو چاہیے کہ پردہ کے اوٹ سے مانگے، یہ نہیں کہ دھڑ دھڑا کر اندر گھس جائے، چنانچہ کاشانہ نبوی ﷺ کے تعلق سے حکم ہوتا ہے:

﴿ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔــلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَاۗءِ حِجَابٍ ۭ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ۭ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵۳)

''اور جب تم مانگنے جاؤ ان بیویوں سے کچھ چیز کام کی تو مانگ لو پردہ کی اوٹ سے، اس میں تمہارے اور ان کے دلوں کی بڑی ستھرائی ہے۔''

یہ حکم گو شان نزول کے لحاظ سے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے سلسلہ سے ہے، مگر اس میں عام مسلمان گھروں کے لیے بھی حسن ادب کا ایک نمونہ ہے۔

مسلمان عورتیں جب گھر سے باہر نکلیں تو اپنے کو ایک چادر سے ڈھانپ لیں، تاکہ ان کی زیبائش و آرائش کا ہر نقش راہ چلتوں کی آنکھوں سے اوجھل رہے اور یہ پہچان ہو کہ یہ عزت والی شریف بی بیاں ہیں، ان کو چھیڑنا تو کجا ان کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی شریعت کا جرم ہے، فرمایا:

---

❶ یعنی تم سے جرأت کر کے تمہارا خواہاں ہو۔

❷ التبرج: اظهار والزينة للناس الاجانب (لسان العرب، ج۱، ص: ۱۸۵)۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَاۤ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵۹۔۶۰)

’’اے نبی ﷺ! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ اپنے اوپر تھوڑی سے اپنی چادریں نیچی لٹکا لیں، اس سے یہ ہوگا کہ وہ پہچان پڑیں گی (کہ یہ شریف ہیں) تو ان کو ستایا نہ جائے، اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اگر اس پر بھی منافق اور جن کے دلوں میں (بے حیائی کا) روگ ہے اور مدینہ میں جھوٹ اڑانے والے نہ رکیں، تو ہم تجھے ان پر بھڑکائیں گے پھر وہ نہ رہنے پائیں گے اس شہر میں تیرے ساتھ مگر تھوڑے دن۔‘‘

ان آیتوں میں اشارہ مدینہ کے بعض شریروں اور منافقوں کی طرف ہے، جو مسلمان بی بیوں کو جو خاص خاص ضرورتوں کے لیے اپنے گھروں سے نکلتی تھیں چھیڑتے تھے اور جب انہیں اس پر ڈانٹا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ ہم ان کو لونڈی سمجھتے تھے، اس معاشرتی برائی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو دو حکم دیے، شریروں کی نسبت فرمایا کہ اگر وہ اب اس حرکت سے باز نہ آئیں تو انہی کافی سزا دی جائے، بلکہ ان کو شہر بدر کیا جا سکتا ہے اور مسلمان بی بیوں کے لیے فرمایا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے گھروں سے باہر نکلیں تو وہ اپنی ظاہری وضع قطع سے بھی شریف معلوم ہوں اور سوسائٹی کی کم درجہ عورتوں سے اپنی پوشاک و وضع الگ رکھیں، اس کے لیے صورت یہ بتائی کہ جب گھروں سے نکلنے لگیں تو ایک بڑی چادر سر کے اوپر سے اوڑھ لیں، جس سے اندر کا بھڑکیلا لباس، زیور اور دوسرے بناؤ سنگار سب چھپ جائیں اور دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ یہ شریف گھرانوں کی بیبیاں ہیں، جن کی عزت کا احترام ہر شریف کا فرض ہے۔

عرب میں اسلام سے پہلے لونڈیوں سے عصمت فروشی کا کام لیا جاتا تھا، [1] اور لوگ اس کی کمائی کھاتے تھے اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے، مدینہ کا ایک ممتاز منافق عبداللہ بن ابی بن سلول اپنی لونڈیوں کو اس پیشہ پر مجبور کرتا تھا، مگر اس کے باوجود اسلام سے پہلے مدینہ میں وہ اس عزت کا مستحق سمجھا جاتا تھا کہ اس کے سر پر مدینہ کا تاج رکھا جائے، عورتیں بناؤ سنگار کر کے گھر سے باہر نکلا کرتی تھیں، سینوں کی پوشش کا لحاظ نہیں کرتی تھیں، بدکار عورتیں شراب کی محفل میں ساقی گری کرتی تھیں اور گریبان کھلا رکھتی تھیں کہ جو چاہے دست درازی کر سکے [2] اور نشان کے لیے اپنے گھروں پر جھنڈیاں لگاتی تھیں، اسلام نے آ کر ان مراسم کی اصلاح

[1] تفسیر طبری، تفسیر سورۃ نور، ج۱۸، ص: ۹۳ مصر وسنن ابی داود، کتاب الطلاق، باب فی تعظیم الزنا: ۲۳۱۱۔ [2] سبعہ معلقہ میں طرفہ کے قصیدے کا یہ شعر پڑھیے

رحیب قطاب الحبیب منها رقیقة   بجس الندامیٰ بضة المتجرد

(شرح المعلقات السبع، مطبعه دار الکتب العربیة مصر، ص: ۵۸)

کی، بدکاری کے انسداد اور عفت و پاکبازی کے خیالات پھیلانے کے لیے ضرورت تھی کہ اس بدترین پیشہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے، چنانچہ اس پر یہ آیت اتری:

﴿ وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾ (٢٤/ النور:٣٣)

''اور تمہاری لونڈیاں اگر کسی ایک کی ہو کر رہنا چاہیں تو ان سے دنیا کی زندگی کے عارضی فائدہ کے لیے زبردستی بدکاری نہ کروایا کرو اور جو ان کو اس پر مجبور کرے گا تو ان کی بے بسی کے پیچھے اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔''

اس لیے اسلام نے اس کو حرام کمائیوں میں سے قرار دیا ہے، ❶ اسی کے ساتھ یہ بھی کیا کہ کسی مسلمان مرد کے لیے یہ اچھا نہیں سمجھا ہے کہ ایسی پیشہ ور عورتوں کو توبہ سے پہلے اپنے نکاح میں لے، کیونکہ اس سے اسلامی معاشرت کی ساری آب و ہوا زہر آلود ہو جاتی۔ سنن ابی داود ❷ میں ہے کہ ایک صحابی نے اسی قسم کی ایک پیشہ ور عورت سے نکاح کرنا چاہا اور رسول اللہ ﷺ سے اس کی اجازت چاہی، وحی الٰہی نے ان کی اس درخواست کا یہ جواب دیا:

﴿ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۡ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ (٢٤/ النور:٣)

''بدکار مرد، بدکار ہی عورت یا مشرکہ عورت سے نکاح کرے گا اور بدکار عورت سے بدکردار ہی مرد یا مشرک نکاح کرے گی، ایمان والوں پر یہ حرام ٹھہرایا گیا ہے۔''

اس آیت میں انسانی فطرت کی تصویر ہے، کہ بدکار عورتوں کو اپنے قبضہ میں لانے کے لیے نکاح کا خیال بدکار ہی مردوں کے دل میں آ سکتا ہے، اسی لیے اس کے بعد آگے چل کر فرمایا گیا:

﴿ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ ﴾

(٢٤/ النور:٢٦)

''گندی عورتیں، گندے مردوں کے لیے ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے۔''

اسی لیے کسی بدکار مرد کا کسی عفیفہ سے اور کسی پاکباز کا بدکار عورت سے نکاح شریعت میں پسندیدہ نہیں، بلکہ بعض علما کے نزدیک سرے سے جائز نہیں، ❸ اور ان کی دلیل سورۂ نور کی اوپر والی آیت کے علاوہ اس حدیث سے ہے جس کو ابوداود اور احمد نے ثقات سے روایت کیا ہے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

---

❶ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب تحریم ثمن الکلب، وحلوان الکاھن ومھر البغی..... : ٤٠٠٩ تا ٤٠١٤۔

❷ سنن ابی داود، کتاب النکاح، باب فی قولہ: الزانی لا ینکح..... ٢٠٥١۔ ❸ جمہور کے نزدیک زانی کا غیر زانیہ سے، یا زانیہ کا غیر زانی سے قانوناً نکاح درست ہے لیکن اخلاقاً پرہیز کے قابل ہے اور اس آیت سے اس کی جو حرمت بظاہر سمجھی جاتی ہے، اس سے مراد اس کی برائی ہے، یا یہ کہ اہل ایمان کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسوں سے نکاح کریں یا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ۞۞)

نے فرمایا: ''جس پر زنا ثابت ہو اور اس کی سزا اس کو دی گئی ہو اس کا نکاح ایسے ہی سے کیا جائے۔'' ❶

غرض اہل ایمان جن کی شان ستھرائی اور پاک بازی ہے، ان کے ذہن میں بھی ایسا گندہ تصور نہیں آنا چاہیے، چنانچہ سورۂ فرقان میں اللہ نے جن کو اپنا خاص بندہ کہا ہے، ان کی تین صفتیں آخر میں یہ بتائی ہیں، جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرتے، جو کسی کا خون ناحق نہیں بہاتے اور جو بدکاری نہیں کرتے، فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۶۸)

''اور جو اللہ برحق کے ساتھ کسی اور الٰہ کو نہیں پکارتے اور کسی ایسی جان کا جس کو اللہ نے منع کیا ہے خون نہیں بہاتے اور بدکاری نہیں کرتے۔''

اس آیت میں یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ ان تین ممنوعہ باتوں میں سے پہلی اس سب سے بڑی سچائی سے متعلق ہے، جس کا انکار سراسر کفر ہے، اس کے بعد جو دو باتیں ہیں، ان میں سے ایک جان سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری عزت و آبرو سے۔

قرآن پاک میں اس عفت و عصمت کی حفاظت اور بدکاری کے اسباب اور ذریعوں کے انسداد کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں، جن کا بیان اوپر آیا ہے اور جو حقیقت میں ﴿ لاتقربوا الزنی ﴾ بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ۔ کی تشریحیں ہیں، ان کی مزید تشریح رسول اللہ ﷺ نے اپنے عام احکام اور مواعظ میں بھی فرمائی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ایک صحابی کو فرمایا: ''کسی غیر محرم پر اتفاقاً نظر پڑ جائے تو پہلی نظر تو بلا ارادہ ہونے کے سبب معاف ہے، مگر دوسری دفعہ پھر اس پر نظر ڈالنا روا نہیں۔'' ❷ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی بہن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا ایک دفعہ باریک کپڑوں میں سامنے آئیں تو فرمایا: ''اے اسماء! جب عورت بالغ ہو جائے تو چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی اور حصہ دیکھنا جائز نہیں۔'' ❸ حکم دیا کہ مخنث زنانخانوں میں نہ جانے پائیں، ❹ فرمایا: ''کسی کے گھر جاؤ تو اجازت سے پہلے پردہ اٹھا کر اس کے اندر نہ جھانکو کہ اس کے

(گزشتہ سے پیوستہ) ﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ ﴾ (۲۴/ النور:۳۲) اور ﴿ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ﴾ (۴/ النسآء:۳) سے منسوخ ہے یا مخصوص ہے، لیکن بعض صحابہ اور علما کا مسلک یہ ہے کہ زانی مرد کا عفیف عورت سے اور عفیف مرد کا بدکار عورت سے نکاح واقعی حرام ہے بلکہ اگر زن و شوہر میں سے کوئی اس برائی کا مرتکب ہو تو قاضی نکاح کو فسخ کر دے گا، چنانچہ روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں یہی فیصلہ کیا، (روح المعانی، ج ۱۸، ص:۷۹) ابوداؤد (کتاب النکاح:۲۰۵۱) کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے بعض فقہا نے یہ بھی کہا ہے کہ زن و شوہر میں کفو ہونا شرط ہے اور چونکہ عفیف بدکار کا کفو نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ نکاح فریقین میں سے جو عفیف ہے اس کے اعتراض کے بعد قائم نہیں رہ سکتا، ایک اور مسلک یہ ہے کہ یہ حرمت اس وقت ہے جب زانی یا زانیہ نے توبہ نہ کی ہو، توبہ کرنے کے بعد جائز ہے (دیکھو احکام القرآن، ج ۳، ص:۲۶۵، ۲۶۶ وجصاص رازی و تفسیرات احمدیہ ملا جیون و تفسیر کبیر رازی ج ۶، ص:۳۲۸ و بعد بھامشہ تفسیر ابی سعود اور روح المعانی تفسیر آیت مذکورہ، ج ۱۸، ص:۷۶ تا ۷۹)۔ ❶ ابو داود، کتاب النکاح، باب فی قوله: الزاني لا ينكح الا زانية: ۲۰۵۲؛ احمد، ۲/ ۳۲۴۔ ❷ ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ماجاء فی نظرة الفجاءة: ۲۷۷۶، ۲۷۷۷۔ ❸ ابو داود، کتاب اللباس، باب فیماتبدی المرأة من زينتها: ۴۱۰۴۔ ❹ ابو داود، کتاب الادب، باب الحكم فی المخنثين: ۴۹۲۹، ۴۹۳۰۔

اہل خانہ کی بے ستری ہو۔'' ❶ فرمایا کہ ''عورت تیز خوشبو لگا کر باہر نہ نکلے۔'' ❷ سبب ظاہر ہے کہ اس کی خوشبو پاس سے گزرنے والوں میں تحریک پیدا کرے گی، یہ بھی ارشاد ہوا کہ ''عورت بیچ راہ سے الگ ہو کر کنارہ کنارہ چلے۔'' ❸ تاکہ مردوں کی بھیڑ بھاڑ اور دھکوں سے بچے، یہ بھی تاکید فرمائی کہ ''کوئی مرد کسی غیر عورت کے گھر اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں اکیلا نہ جائے۔'' ❹ کہ اس سے شیطان کو موقع ہاتھ آتا ہے، یہ بھی نصیحت کی گئی کہ گھر کے دروازہ پر پردہ پڑا رہے، اگر کسی کے دروازے بند نہ ہوں یا ان پر پردہ پڑا نہ ہو اور کوئی اندر گھس گیا، تو اس کی ذمہ داری خود گھر والوں پر ہے۔ ❺

یہ ساری ہدایتیں اسی لیے دی گئی ہیں کہ مسلمان گھروں کی معاشرت عفت اور پاک دامنی کی تصویر ہو۔ لیکن صرف انہی اخلاقی ہدایتوں پر بس نہیں کہ بلکہ ان کے لیے جو سوسائٹی کی عزت وحرمت کو خطرہ میں ڈالیں، شرعی ثبوت کے بعد دنیا میں قانونی سزا بھی مقرر کی، تاکہ اس کا خوف لوگوں کو پاک زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے:

﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ﴾

(٢٤/ النور:٢)

''بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والے مرد ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔''

احادیث میں بیان ہے مردوں اور عورتوں (یعنی بیوی والے شوہر اور شوہر والی بیوی) میں سے جو بدکاری میں پکڑ کر آئیں ان کو سنگسار کرنے کا بھی حکم ہے، اس جرم میں عورتوں کی حیثیت سب سے نازک ہوتی ہے، اس لیے قرآن پاک میں ایک طرف یہ آیا کہ مسلمان عورتوں سے جن باتوں پر بیعت لی جائے، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنی عزت وآبرو کی پوری حفاظت کریں گی، فرمایا:

﴿ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ ﴾

(٦٠/ الممتحنة:١٢)

''اور وہ بدکاری نہ کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو مار ڈالا کریں گی اور نہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں بہتان باندھ کر لایا کریں گی۔''

بدکاری نہ کرنے کا مطلب تو ظاہر ہے، لیکن اولاد کے نہ مار ڈالنے کی جو بیعت خاص طور سے عورتوں سے لی گئی، حالانکہ یہ کام مردوں کا تھا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ عجب نہیں کہ اس سے حمل گرانے کی ممانعت کی

---

❶ ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی الاستئذان قبالة البیت:٢٧٠٧۔
❷ ابو داود، کتاب الترجل، باب فی طیب المرأة للخروج: ٤١٧٣ تا ٤١٧٥۔
❸ ابو داود، کتاب الادب باب فی مشی النساء مع الرجال فی الطریق:٥٢٧٢۔
❹ مسلم، کتاب السلام، باب تحریم الخلوة بالاجنبیة والدخول علیها: ٥٦٧٣تا٥٦٧٧۔
❺ ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی الاستئذان قبالة البیت:٢٧٠٧۔

طرف اشارہ ہو، ❶ یا یہ بات بھی عدم قتل کے عموم میں داخل ہو اور ہاتھ پاؤں کے بیچ میں تہمت باندھ کر لانے سے اشارہ جاہلیت کے ایک رواج کی طرف ہے، جاہلیت میں ایک عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی، جب لڑکا ہوتا تو وہی عورت بتاتی کہ یہ ان میں سے کس کا لڑکا ہے، بعض عورتیں دوسرے کے بچہ کو اپنا بنا کر اپنے شوہروں کے سر تھوپتی تھیں، یہ ساری باتیں عفت اور پاک دامنی کے خلاف تھیں، اس لیے ان سے باز رکھا گیا اور خاص طور سے ان سے عہد لیا گیا کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہیں، فتح مکہ کے وقت آپ نے قریشی بیویوں سے، ❷ اور مدینہ میں انصاری عورتوں سے بھی اس پر عہد لیا، ❸ بلکہ مسلمان مردوں سے ان باتوں کا عہد لیا گیا اور صحابہ نے آنحضرت ﷺ سے ان پر بیعت کی۔ ❹ دوسری طرف عورتوں کو مردوں کے بہتان اور تہمت سے بچانے کے لیے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جب کوئی شخص کسی عورت پر اس طرح کا الزام لگائے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ثبوت میں چار چشم دید گواہ پیش کرے، اگر نہ پیش کر سکے تو اس کو ایک شریف خاتون کے جھوٹ بدنام کرنے کے جرم میں اسی کوڑے مارے جائیں گے اور اس کی گواہی پھر کبھی معتبر نہ ہو گی اور اگر یہ الزام خود شوہر لگائے اور گواہ نہ ہوں تو مرد قسم کھائے، ورنہ عورت قسم کھائے کہ یہ الزام غلط ہے اور اگر دونوں اپنے دعووں پر قائم رہیں، تو اسلام میں دستور یہ رہا ہے کہ اپنے دعویٰ کی سچائی پر قائم رہنے کی بنا پر خود ہی نکاح کو توڑ ڈالا ہے۔ ❺

اسلام کی نظر میں حقوق اللہ میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ شرک ہے اور حقوق عباد میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ کسی کی ناحق جان لینا ہے اور اس کے بعد ہی جس برائی کا نمبر ہے وہ کسی کی عفت و پاکبازی کے پردہ کو چاک کرنا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا کہ "تم کسی کو اللہ کا شریک بناؤ حالانکہ اس نے تم کو پیدا کیا" بولے، اس کے بعد؟ فرمایا: "یہ کہ اپنے لڑکے کو اس خوف سے قتل کر ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گا" بولے، اس کے بعد؟ فرمایا: "یہ کہ اپنے پڑوسی کی بی بی کے ساتھ زنا کرو" چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کیلئے یہ آیت نازل فرمائی: ❻

﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۶۸)

❶ مفسرین میں صاحب روح المعانی کا بھی ادھر خیال گزرا ہے۔ (ج:۲۸،ص:۷۰) ❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی، فتح مکہ اس باب میں یہ روایت نہیں ملی، البتہ یہ غزوۃ الحدیبیہ: ۴۱۸۲ کی روایت سے یہ بات ثابت ہے۔

❸ تفسیر طبری، سورۃ الممتحنۃ، ج۲۸، ص: ۴۹۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الایمان: ۱۸۔

❺ اس کی تفصیل سورۂ نور میں ہے، اس کے بعد نکاح توڑنے یا ٹوٹ جانے کا حکم نہیں مگر شروع سے عمل در آمد اسی پر رہا ہے، بخاری، کتاب الطلاق، باب اللعان: ۵۳۰۸، ۵۳۰۹۔ ❻ بخاری، کتاب الادب، باب قتل الولد خشیۃ ان یاکل: ۶۰۰۱۔

''اور جو اللہ کے ساتھ (کسی) دوسرے معبود کو نہ پکاریں اور ناحق (ناروا) کسی شخص کو جان سے نہ ماریں کہ اس کو اللہ نے حرام کر رکھا ہے اور نہ زنا کے مرتکب ہوں۔''

حدیث میں اپنے لڑکے کے مار ڈالنے اور پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کی خصوصیت اس لیے کی گئی ہے کہ یہ دونوں جرم اپنی نوعیت میں بھی حد درجہ شرم کے قابل اور افسوس ناک ہیں کہ جن سے یہ امید نہیں ہو سکتی، ان سے یہ فعل ظہور میں آیا اور انسانی اعتماد و اعتبار کو صدمہ پہنچا۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''زانی جس وقت زنا کرتا ہے، شرابی جس وقت شراب پیتا ہے، چور جس وقت چوری کرتا ہے اور لوٹنے والا جس وقت سب کی آنکھوں کے سامنے لوٹتا ہے تو مسلمان نہیں رہتا۔'' ❶ کیونکہ ایمان نام یقین کا ہے اور اللہ پر اور اللہ کے احکام پر یقین رکھ کر اس کے حکم سے سرتابی نہیں کرتا، اس حالت میں ہوتا یہ ہے کہ مجرم کے ایمان کا چراغ جذبات کی آندھی میں گل ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور پھر جب اس کا نشہ ہرن ہوتا ہے، تو سب کچھ جاننے اور سمجھنے لگتا ہے۔

اسلام میں زانیوں کی سزا بعض حالتوں میں سو (۱۰۰) کوڑے مارنا اور بعض حالتوں میں سنگسار کرنا ہے، لیکن ان کو آخرت میں جو عذاب دیا جائے گا وہ اس سے بہت زیادہ سخت اور بہت زیادہ عبرت انگیز ہے، ایک روحانی خواب میں رسول اللہ ﷺ کو بہت سے لوگوں کے اخروی عذاب کی دردناک صورتیں دکھائی گئیں، ان میں بدکاروں کے عذاب کی صورت ان کے فعل قبیح کے مشابہ یہ تھی کہ تنور کے مانند ایک سوراخ تھا، جس کے اوپر کا حصہ تنگ اور نیچے کا حصہ کشادہ تھا اور اس کے نیچے آگ بھڑک رہی تھی اور اس میں بہت سے برہنہ مرد اور برہنہ عورتیں تھیں، جب اس آگ کے شعلے بلند ہوتے تھے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ اس کے اندر سے نکل آئیں گے، لیکن جب آگ بجھ جاتی تھی تو یہ لوگ پھر اس کے اندر چلے جاتے تھے، ❷ یہ عالم برزخ کا عذاب تھا جو قیامت تک جاری رہے گا۔

اس کے بخلاف پاک باز اور پاک دامن لوگوں کے فضائل بھی نہایت مؤثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ ''قیامت کے دن جبکہ اللہ کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا، جن میں ایک شخص وہ ہوگا، جس کو ایک معزز اور حسین عورت نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا، لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔'' ❸

یہ تو وہ شرف ہے جو پاک بازوں کو آخرت میں حاصل ہوگا، لیکن پاک بازی کی دنیوی برکتیں بھی کچھ کم نہیں، ایک حدیث میں آپ ﷺ نے زمانہ قدیم کے تین آدمیوں کا قصہ بیان کیا ہے، جو ایک ساتھ سفر کر رہے تھے، کہ دفعتہً پانی برسنے لگا، تینوں نے پانی سے بچنے کے لیے ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی، سوئے اتفاق

❶ بخاری، کتاب الحدود، باب الزنا وشرب الخمر: ۶۷۷۲۔ ❷ بخاری، کتاب الجنائز: ۱۳۸۶۔

❸ بخاری، کتاب الحدود، باب فضل من ترك الفواحش: ۶۸۰۶۔

سے پہاڑ کے اوپر سے ایک پتھر لڑھک آیا جس سے غار کا منہ بند ہو گیا، اب نجات کی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اپنے اپنے اعمالِ صالحہ کے واسطہ سے اللہ سے دعا کریں، چنانچہ اس طرح ہر ایک نے دعا کی اور ان اعمال کی برکت سے پتھر رفتہ رفتہ ہٹ گیا، ان میں پاک باز آدمی کی دعا یہ تھی: ''خداوندا! میری ایک چچازاد تھی جس سے میں بہت محبت رکھتا تھا، میں نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا، لیکن جب تک میں اس کو سو دینار نہ دے دوں وہ راضی نہ ہوئی، میں نے سو دینار کما کر جمع کیے اور اس کو دے کر اپنی خواہش نفسانی پوری کرنی چاہی، لیکن اس نے کہا کہ اللہ سے ڈرو، میں فوراً رک گیا، اللہ تعالیٰ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے صرف تیری مرضی کے لیے ایسا کیا ہے تو اس پتھر کو ہٹا لے، چنانچہ وہ سرک گیا۔'' [1]

یہ روایت عفت و پاکبازی کو ان اعمال میں شمار کرتی ہے، جن سے اللہ کا قرب ملتا اور دعا کو قبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

[1] بخاری، کتاب الادب، باب اجابة دعاء من بر والدیه: ۵۹۷٤۔

دیانتداری اور امانت

آپس کے لین دین کے معاملوں میں جو اخلاقی جوہر، مرکزی حیثیت رکھتا ہے، وہ دیانتداری اور امانت ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار میں ایمان دار ہو اور جس کا جس کسی پر جتنا حق ہو اس کو پوری دیانت سے رتی رتی دے دے، اسی کو عربی میں امانت کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے خود اپنی شرعی تکلیف کو جسے اس نے نوع انسانی کے سپرد کیا ہے، امانت کے لفظ سے ادا کیا ہے:

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۷۲)

''ہم نے (اپنی) امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی، تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا، بے شبہ وہ ظالم اور ناداں ہے۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ پوری شریعت ایک الٰہی امانت ہے، جو ہم انسانوں کے سپرد ہوئی ہے، اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے مطابق اپنے مالک کا پورا پورا حق ادا کریں، اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو خائن ٹھہریں گے۔

اللہ کا فرشتہ جو اللہ کا پیغام لے کر اس کے خاص بندوں پر اترتا تھا، امانت سے متصف ہوتا تھا، تاکہ بندوں کے لیے جو حکم اللہ کی جانب سے آئے وہ کمی وبیشی کے بغیر اللہ کا اصلی حکم سمجھا جائے، اسی لیے قرآن میں اس فرشتہ کا نام ''الامین'' رکھا گیا ہے:

﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۙ﴾ (۲٦/ الشعرآء:۱۹۳)

''اس پیغام کو لے کر امانت والی روح اتری۔''

﴿ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۭ﴾ (۸۱/ التکویر:۲۱)

''اس کا کہا مانا جاتا ہے، وہاں امانت والا ہے۔''

اکثر پیغمبروں کی صفت میں بھی یہ لفظ قرآن میں آیا ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت سے یہ کہا:

﴿ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۙ﴾ (۲٦/ الشعراء:۱۷۸)

''میں تمہارے لیے امانت دار قاصد ہوں۔''

یعنی اللہ سے جو پیغام مجھے ملا ہے وہ بے کم وکاست تم کو پہنچاتا ہوں، اس میں اپنی طرف سے ملاوٹ کچھ نہیں ہے۔

ہمارے رسول اکرم ﷺ کو نبوت سے پہلے مکہ والوں کی طرف سے ''امین'' کا خطاب ملا تھا، کیونکہ

آپ ﷺ اپنے کاروبار میں دیانت دار تھے اور جو لوگ جو کچھ آپ ﷺ کے پاس رکھواتے تھے وہ آپ جوں کا توں ان کو واپس کرتے تھے۔

نیک عمل مسلمانوں کی صفت یہ بتائی گئی ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۸)

''اور جو اپنی امانتوں اور وعدہ کا پاس رکھتے ہیں۔''

بعض روایتوں میں ہے کہ خانہ کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ بن عبدالدار شیبی کے پاس رہتی تھی، فتح مکہ کے وقت وہ اس کے ہاتھ سے زبردستی لے لی گئی اس پر یہ آیت اتری:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ ﴾ (٤/ النسآء:٥٨)

''بے شبہ تم کو اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کر دیا کرو۔''

اس حکم کے مطابق یہ امانت ان کو واپس کی گئی، انہوں نے سبب پوچھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ نے یہی حکم دیا ہے۔ وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، اسلام کے اس انصاف اور امانت داری کے حکم کا ان پر یہ اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گئے۔ [1] بہر حال یہ واقعہ صرف شان نزول کا حکم رکھتا ہے اور معنی کے لحاظ سے امانت کے ہر جزئیہ پر اس کا اطلاق یکساں ہوگا، اسی لیے اہل تفسیر کی تصریحات کے مطابق اس کی وسعت میں وہ امانتِ الٰہی بھی داخل ہے، جس کا نام عموم کے ساتھ تکلیف شرعی ہے، [2] اور وہ امانت بھی داخل ہے، جس کا نام عدل و انصاف ہے اور جو حاکموں کو اپنی رعایا کے حقوق کو ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے، [3] اور وہ تمام امانتیں بھی اس میں داخل ہیں، جن کو ان کے مالکوں کے سپرد کرنا ضروری ہے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے، جائداد اور مالی اشیاء تک محدود نہیں، جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ ہر مالی، قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے، اگر کسی کی کوئی چیز آپ کے پاس رکھی ہے، تو اس کے مانگنے پر یا یوں بھی اس کو جوں کا توں دے دینا امانت ہے، اگر کسی کا کوئی حق آپ پر باقی ہے تو اس کو ادا کرنا بھی امانت ہے، کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے، تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے، کسی مجلس میں آپ ہوں اور کچھ باتیں آپ دوسروں کے متعلق وہاں سن لیں تو ان کو اسی مجلس تک محدود رکھنا اور دوسروں تک پہنچا کر فتنہ اور ہنگامہ کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے، کسی نے آپ سے اپنی کسی نجی کام میں مشورہ مانگا تو اس کو سن کر اپنے ہی تک رکھنا اور اس کو اپنے جانتے صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے، اگر کوئی کسی کام پر نوکر ہے تو اس کو اس نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے وہ انجام دے تو یہ بھی امانت ہے، اگر کوئی کسی کا آٹھ گھنٹے کا نوکر ہے

[1] تفسیر کشاف زمخشری، ج ۱، ص:۲۹۷۔ [2] ایضاً۔
[3] تفسیر ابن جریر طبری، ج ۵، ص:۸٦، تفسیر آیت بالا۔

اور وہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرالیتا ہے، یا بے سبب سستی کرتا ہے، یا دیر سے آتا اور وقت سے پہلے چلا جاتا ہے تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے۔ قرآن پاک اور حدیثوں میں ان جزئیات کی تفصیل پوری طرح مذکور ہے، ان مسلمانوں میں جن کو خدا نے فلاح پانے کی خوش خبری سنائی ہے، وہ بھی ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون : ۸)

''اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول وقرار کی پاسبانی کرتے ہیں۔''

پھر جن مسلمانوں کو جنت میں عزت کی جگہ دی جانے والی ہے۔ ان میں بھی وہ داخل ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ ﴾ (۷۰/ المعارج :۳۲)

''اور جو (اپنی) امانتوں اور اپنے قول وقرار کی پاسبانی کرتے ہیں۔''

اگر کسی نے کسی کو کوئی چیز دھرنے کو دی، یا سفر میں گواہ وشاہد اور کاتب نہ ملنے کے سبب سے قرض لے کر گروی رکھی:

﴿ فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۳)

''تو جو امین بنایا گیا اس کو چاہیے کہ اپنی امانت ادا کر دے اور چاہیے کہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرے۔''

یعنی لے کر مکر نہ جائے، یا دینے میں حیلے حوالے نہ کرے، یا اس میں بلا اجازت کوئی تصرف نہ کرے، یا کسی نے ہم پر بھروسہ کر کے ہم سے کوئی بات کہی تو ہم اس کے اس بھروسہ سے غلط فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف کوئی حرکت نہ کر بیٹھیں، کہ انہی چیزوں کا نام خیانت ہے، جس کی ممانعت اسلام نے برملا کی ہے:

﴿ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (۸/ الانفال:۲۷)

''اور اپنی امانتوں میں جان بوجھ کر خیانت نہ کرو۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین کے سفر میں دو لڑکیوں کی بکریوں کے پینے کے لیے پانی بھر دیا اور اس کی کوئی مزدوری ان سے نہیں مانگی اور ان لڑکیوں میں سے ایک نے واپس جا کر اپنے بزرگ باپ سے ان کی تعریف کی اور سفارش کی کہ ان کو نوکر رکھ لیجیے، تو اس موقع پر قرآن پاک کی آیت ہے:

﴿ يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ۝ ﴾ (۲۸/ القصص:۲۶)

''اے میرے باپ! اس کو نوکر رکھ لیجیے، سب سے اچھا نوکر جس کو آپ رکھنا چاہیں وہ ہے جو طاقتور اور امانت دار ہو۔''

اس آیت میں سب سے بہتر نوکر کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جس کام کے لیے اس کو رکھا جائے اس میں اس کی پوری اہلیت اور طاقت ہو اور اس کام کو وہ پوری امانت سے ادا کرے، اس سے یہ اصول بنا کہ جس کو جس

کام کا اہل سمجھ کر رکھا جائے وہ اس کی اہلیت کا ثبوت دے اور اس کو پوری دیانت داری کے ساتھ انجام دے، اب ایک شخص جو چھ گھنٹے کا نوکر ہو، وہ ایک دو گھنٹہ سستی سے چھپے چوری بے کار بیٹھا رہے، تو گو عام لوگ اس کو خیانت کا مرتکب نہیں سمجھتے، لیکن اسلام کی دوررس نگاہوں میں وہ امین نہیں ٹھہر سکتا، یا کوئی شخص اپنے کو کسی کام کا اہل بنا کر کوئی نوکری حاصل کرے مگر حقیقت میں وہ اس کا اہل نہیں تو یہ بھی ایک طرح سے امانت کے خلاف ہے۔

حدیثوں میں امانت کے بہت سے جزئیوں کو ایک ایک کر کے گنایا گیا ہے اور بہت سی ایسی باریک باتوں کو جن کو لوگ امانت کے خلاف نہیں سمجھتے، امانت کے خلاف بتایا گیا ہے اور کوئی غور سے دیکھے تو اخلاق کی رو سے وہ یقینی طور سے امانت کے خلاف ہیں۔

جس طرح قرآن پاک کی آیت نے یہ بتایا ہے کہ اللہ کی امانت کا بوجھ انسان نے اٹھایا ہے، اسی طرح ایک حدیث بھی ادھر اشارہ کرتی ہے، رسول اللہ ﷺ کے راز دار حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے دو باتیں سنی تھیں ایک کو تو آنکھوں سے دیکھ چکا، دوسری یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''امانت داری لوگوں کے دلوں کی جڑ میں اتری ہے، (یعنی ان کی فطرت ہوتی ہے) پھر انہوں نے کچھ قرآن سے جانا، کچھ سنت سے سیکھا۔'' (یعنی فطری امانت کے جوہر میں کسب اور اچھی تعلیم سے، ترقی ہے) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر آپ نے اس امانت کے مٹ جانے کا حال بھی بتایا، فرمایا: ''پھر یہ حال ہو گا کہ آدمی سوئے گا اور امانت اس کے دل سے نکال لی جائے گی اور اس کا ایک ہلکا سا نشان رہ جائے گا اور پھر سوئے گا تو امانت چلی جائے گی اور ایک آبلہ کی طرح کا داغ رہ جائے گا، جو اٹھ تو جاتا ہے مگر اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا، لوگ ایسے ہو جائیں گے کہ لین دین کریں گے، لیکن کوئی امانت داری نہیں کرے گا، اس وقت امانتداری کی مثال ایسی کم یاب ہو جائے گی کہ لوگ مثال کے طور پر کہیں گے کہ فلاں قوم میں ایک امانت دار شخص ہے، آدمی کی تعریف ہو گی کہ کیسا عقل مند، کیسا خوش مزاج اور کیسا بہادر ہے، حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان داری نہ ہو گی۔'' [1]

حدیث کے پہلے ٹکڑے میں انسانوں میں ایمانداری کا جوہر فطری طور سے موجود ہونے کا اور پھر دین داری کی تعلیم سے اس کے بڑھنے کا ذکر ہے، اس کے بعد بری صحبت کے اثر سے اس فطری جوہر کے دب جانے اور مٹ جانے کا تذکرہ ہے اور بتایا گیا ہے، آخر زمانہ میں وہ ایسا ہی رہ جائے گا، جیسا آبلہ کا داغ رہ جائے۔

طبرانی کبیر میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس میں امانت نہیں، اس میں ایمان نہیں، جس کو عہد کا پاس نہ ہو اس میں دین نہیں، اس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے! کسی بندہ کا اس وقت تک دین

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق باب رفع الامانۃ: ٦٤٩٧ و کتاب الفتن، باب اذا بقی فی حثالۃ من الناس: ٧٠٨٦ و صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب رفع الامانۃ: ٣٦٧ و مسند احمد، ج ٥، ص: ٣٨٣ و ترمذی، ابواب الفتن، باب ما جاء فی رفع الامانۃ: ٢١٧٩ و ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب ذھاب الامانۃ: ٤٠٥٣۔

درست نہ ہوگا، جب تک اس کی زبان درست نہ ہو اور اس کی زبان درست نہ ہوگی جب تک اس کا دل درست نہ ہوگا..... اور جو کوئی کسی ناجائز راہ سے کوئی مال پائے گا اور اس میں سے خرچ کرے گا تو اس کو اس میں برکت نہیں دی جائے گی اور اگر اس میں سے خیرات کرے گا تو قبول نہیں ہوگی اور جو اس میں بچ رہے گا وہ اس کے دوزخ کی طرف سفر کا توشہ ہوگا، بری چیز بری چیز کا کفارہ نہیں بن سکتی ہے، البتہ اچھی چیز اچھی چیز کا کفارہ ہوتی ہے۔'' ❶

حدیث کی کئی کتابوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جس میں امانت نہیں، اس میں ایمان نہیں۔'' ❷ اور یہ ظاہر ہے کیونکہ جب دل نے ایک جگہ دھوکا دیا تو ہر جگہ دے سکتا ہے۔

جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اس کو چاہیے کہ اپنی رائے ایمان داری سے دے، ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے مشورہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس سے مشورہ چاہا جائے اس کو امانت سپرد کی جاتی ہے۔'' ❸ اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مجلس میں جو باتیں ہوں وہ امانت ہیں۔'' یعنی ایک جگہ کی بات دوسری جگہ پہنچا کر فتنہ کا سبب نہ بننا چاہیے، الا یہ کہ اس سے کسی فتنہ کے روکنے کا کام لیا جائے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((المجالس بالامانة)) یعنی ''نشستیں امانت کے ساتھ ہوں۔'' مگر تین موقعوں پر، کہیں کسی ❹ کے ناحق قتل کی، یا کسی کی آبرو ریزی کی، یا کسی کا مال ناجائز طور سے لے لینے کی سازش ہو، تو متعلقہ لوگوں کو اس سے آگاہ کر دینا چاہیے۔

کسی کا راز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف ہے، بلکہ میاں بیوی کے درمیان پردہ کی جو باتیں ہوتی ہیں، وہ بھی ایسے راز ہیں، جن کا عام طور سے افشا کرنا بے شرمی کے علاوہ امانت کے خلاف بھی ہے، ❺ راز کے یہی معنی نہیں ہیں کہ جس کو کہنے والا راز کہہ کر ہم سے کہے، بلکہ وہ بھی راز ہے جس سے وہ ہمارے سوا دوسرے کو آگاہ کرنا نہیں چاہتا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی شخص کسی سے بات کرے اور وہ احتیاطاً ادھر ادھر اس غرض سے دیکھے کہ کوئی سنتا نہ ہو تو وہ بات بھی امانت ہو جاتی ہے۔'' ❻ امانت میں خیانت کرنا آنحضرت ﷺ نے نفاق کی ایک نشانی بتائی ہے۔ ❼ مرد جب کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لیتا ہے تو اللہ کی مقرر کی ہوئی شرطوں کے مطابق لیتا ہے، لیکن اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لے کر اس کے حقوق ادا کرنے میں کمی کرتا ہے یا اس کے حقوق کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے، تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی

❶ کنز العمال، ج ۲، ص: ۱۵ حیدر آباد از طبرانی کبیر عن ابن مسعود۔

❷ کنز العمال، ج۲، ص: ۱۵ از طبرانی اوسط وطبرانی کبیر وابن عدی فی الکامل، وبیهقی فی شعب الایمان۔

❸ ادب المفرد بخاری، باب المستشار مؤتمن: ۲۵۶۔ ❹ ابوداود، کتاب الادب، باب فی نقل الحدیث: ۴۸۶۹۔ ❺ ایضا: ۴۸۷۰۔ ❻ ایضا: ۴۸۶۸۔

❼ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق: ۳۳، ۳۴۔

امانت میں خیانت کرتا ہے، حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ ''عورتوں کے باب میں اللہ سے ڈرو۔'' فرمایا: ''کیونکہ تم نے ان کو اللہ کی امانت اور عہد کے ساتھ اپنی زوجیت میں لیا ہے۔'' ❶

قیامت کی نشانیوں میں سے آیا ہے کہ ''سب سے پہلے اس امت سے امانت کا جوہر جاتا رہے گا اور سب سے آخر میں جو چیز رہ جائے گی وہ نماز ہوگی اور کتنے نمازی ہیں جن کی نمازوں کا کوئی حصہ اللہ کے ہاں نہیں۔'' ❷ فرمایا: ''میری امت اس وقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی، جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوۃ کو جرمانہ نہیں سمجھے گی۔'' ❸ یعنی جو امانت سپرد کی جائے گی اس کو آمدنی اور کارِ خیر میں دینے کو جرمانہ، جب تک مسلمان نہیں سمجھیں گے ان کی فطری صلاحیت باقی رہے گی۔

❶ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبی ﷺ: ۲۹۵۰۔
❷ کنز العمال، ج۲، ص: ۱۵ از طبرانی وابن مبارک وحکیم ترمذی وابن عباس۔
❸ کنز العمال، ج۲، ص: ۱۵ از سنن سعید بن منصور۔

شرم وحیا

انسان کا یہ وہ فطری وصف ہے، جس سے اس کی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی پرورش ہوتی ہے، عفت اور پاک بازی کا دامن اسی کی بدولت ہر داغ سے پاک رہتا ہے، درخواست کرنے والوں کو محروم نہ پھیرنا اسی وصف کا خاصہ ہے، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مروت اور چشم پوشی اسی کا اثر ہے اور بہت سے گناہوں سے پرہیز اسی وصف کی برکت ہے۔

اس وصف سے متصف سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ ہے، لیکن اس کے معنی یہاں وہی ہوں گے، جو اس کی ذات اقدس کے لائق ہیں، مثلاً: یہ کہ وہ اپنے بدکار بندوں کو برائی کرتے دیکھتا ہے، لیکن ان کو پکڑتا نہیں اور اس کے آگے جو بھی ہاتھ پھیلاتا ہے اس کو نامراد نہیں لوٹاتا، حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''عزت اور جلال والے اللہ کے آگے جب کوئی بندہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کچھ بھلائی مانگتا ہے تو وہ اس کو نامراد لوٹاتے ہوئے شرماتا ہے۔'' [1] ایک دفعہ تین صاحب مسجد نبوی ﷺ میں آئے، آپ کے ارد گرد صحابہ کا حلقہ تھا، ایک صاحب کو وہاں ذرا سی جگہ ملی اس میں بیٹھ گئے، دوسرے صاحب شرما کر پیچھے بیٹھ گئے، تیسرے صاحب چلے گئے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں ان صاحبوں کی خبر نہ دوں؟ جو حلقہ کی ذرا سی جگہ میں آکر بیٹھا، وہ اللہ کی پناہ میں آیا تو اللہ نے پناہ کی جگہ دی اور جو پیچھے جا کر بیٹھا، وہ شرمایا اللہ نے بھی اس سے شرم کی (یعنی معاف کیا) اور جو چلا گیا، اس نے اللہ سے منہ پھیرا، [2] تو اللہ نے بھی اس سے منہ پھیرا۔''

سورۂ بقرہ میں ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِ أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶)

''اللہ کوئی مثال بیان کرنے سے شرماتا نہیں۔''

یعنی کسی حق بات کے ظاہر کرنے میں وہ شرماتا نہیں، جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ ہے:

﴿ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵۳)

''اللہ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔''

حدیث میں بھی ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ)) [3]

''اللہ تعالیٰ حق کے اظہار سے شرماتا نہیں۔''

قرآن اور حدیث کے اس طرزِ ادا سے ظاہر ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہے، اس کی نسبت اللہ کی

[1] بیهقی، کتاب الاسماء والصفات، باب ماجاء فی الاستحیاء، ص:۳٤٠۔

[2] بخاری، کتاب العلم، باب من قعد حیث ینتهی به المجلس:٦٦ وصحیح مسلم، کتاب السلام، باب من اتی مجلسا فوجد فرجة:٥٦٨١۔ [3] بخاری، کتاب الادب، باب مالا یستحیا من الحق:٦١٢١۔

طرف اللہ کی غیرت وحیا کے خلاف ہے، حدیث میں آتا ہے: ''اللہ سب سے زیادہ غیرت مند ہے اور اسی لیے اس نے بدکاریوں کو حرام کیا ہے۔'' ❶

موسیٰ علیہ السلام کو مدین کے سفر میں جن دولڑکیوں سے سابقہ پڑا تھا، وہ اگرچہ بدویانہ زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں، تاہم یہ وصف ان میں ایسا نمایاں تھا کہ اللہ نے بھی اس کا ذکر کیا، ان کی عادت یہ تھی کہ جب تک تمام لوگ اپنے اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر پلٹ نہ جاتے، وہ اپنے مویشیوں کو پانی نہیں پلاتی تھیں، تاکہ مردوں کی کشمکش سے الگ رہیں اور جب ان کے باپ نے ان میں سے ایک کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بلانے کے لیے بھیجا۔

﴿ فَجَآءَتْهُ إِحْدٰىهُمَا تَمْشِىْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ﴾ (۲۸/ القصص:۲۵)

''تو ان دولڑکیوں میں سے ایک شرماتی ان کے پاس آئی۔''

اس آیت میں واقعہ کے اظہار کے ساتھ اس حیا والی لڑکی کی مدح وستائش بھی مقصود ہے۔

یہ وصف انسان میں بچپن ہی سے فطری ہوتا ہے اور اگر اس کی مناسب تربیت کی جائے تو وہ قائم رہتا ہے، بلکہ بڑھتا جاتا ہے اور اگر بری صحبت لگ جائے اور اچھے لوگوں کا ساتھ نہ رہے تو جاتا بھی رہتا ہے، اس لیے اسلام نے اس کی مناسب نگہداشت کا حکم دیا، سترِ عورت کا خیال، نگاہیں نیچی رکھنا، بے حیائی کی باتوں کو بولنے اور دیکھنے سے روکنا، برہنگی کو منع کرنا، یہاں تک کہ غسل خانہ اور خلوت میں بھی اس کی اجازت نہ دینا، اسی لیے ہے کہ آنکھیں شرم کے منظر سے جھینپتی رہیں، اگر تھوڑی تھوڑی بے حیائی کی جرأت بڑھتی جائے گی، تو رفتہ رفتہ انسان پکا بے حیا بن جائے گا۔

آنحضرت ﷺ جب بچہ تھے تو خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا، آپ اینٹیں اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے، آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا، تم تہبند کھول کر کندھے پر رکھ لو کہ اینٹ کی رگڑ نہ لگے، آپ نے ایسا کیا تو آپ پر بیہوشی طاری ہوگئی، ہوش آیا تو زبان مبارک پر تھا، میرا تہبند، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے تہبند باندھ دیا، ❷ نبوت کے بعد بھی آپ کا یہ حال تھا کہ صحابہ کہتے ہیں:

کان النبی ﷺ اشد حیاء من العذراء فی خدرھا. ❸

''رسول اللہ ﷺ پردہ نشین کنواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔''

بعض موقعوں پر آپ کو بڑی تکلیف ہوتی تھی، مگر شرم کے مارے زبان سے نہیں کہتے تھے، جیسا کہ سورۂ احزاب میں مذکور ہے:

﴿ إِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِى النَّبِىَّ فَيَسْتَحْىٖ مِنْكُمْ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵۳)

---

❶ صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب غیرۃ اللہ تعالی: ۶۹۹۱ تا ۶۹۹۵ عربی میں غیرت کا لفظ حیا سے خاص ہے مگر اس موقع پر اللہ کے تعلق سے اس کے معنی کچھ حیا کے قریب قریب سے ہو جاتے ہیں غیرت کے اصلی معنی رقابت سے ملتے جلتے ہیں، جو محبت میں شرکت کو نہیں چاہتی۔ ❷ بخاری، کتاب الحج، باب فضل مکۃ وبنیانھا: ۱۵۸۲۔

❸ بخاری، کتاب الادب، باب الحیاء: ۶۱۱۹۔

''تمہاری اس بات سے رسول کو ایذا پہنچتی تھی تو تم سے وہ شرماتا تھا۔''

حیا کا فطری وصف اگرچہ اپنی جگہ پر تعریف کے قابل ہے، تاہم وہ کبھی کبھی انسان کے لیے اس وقت مضر بھی ہو جاتا ہے، جب اس میں بزدلی اور خوف کا عنصر شامل ہو جاتا ہے اور وہ بہت سے اجتماعی کام محض شرم وحیا کی وجہ سے نہیں کر سکتا، بلکہ بعض حالتوں میں اس کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے، اس لیے حیا کی حقیقت میں بزدلی کا جو جزو شامل ہے، شریعت مطہرہ نے اس کی اصلاح کی ہے اور وہ یہ ہے کہ امر حق کے اظہار میں شرم و حیا دامن گیر نہ ہو، لیکن دوسروں کی مروت سے چپ رہ جانا ایک قسم کی شرافت ہے، جو ایک معنی میں تعریف کے قابل ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص نہایت شرمیلا اور حیادار تھا، اس وجہ سے نقصان اٹھاتا تھا، اس کا بھائی اس پر ناراضی کا اظہار کر رہا تھا، رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: ''اس پر غصہ نہ کرو کیونکہ حیا ایمان سے ہے۔'' [1]

یہی حیا جو ایمان کا ایک جزو ہے شرعی حیا ہے، یعنی جس طرح ایمان کا اقتضا یہ ہے کہ تمام فواحش ومنکرات سے اجتناب کیا جائے، اسی طرح حیا بھی انسان کو ان چیزوں سے روکتی ہے، اس لیے وہ دونوں ایک ہی ہیں، لیکن جن لوگوں میں فطرۃً حیا کا مادہ ہوتا ہے، ان کو اس شرعی حیا کے حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے، اس لیے بذات خود یہ فطری مادہ ملامت کے قابل نہیں، بلکہ اصلاح کے قابل ہے اور اصلاح کی صورت یہ ہے کہ جہاں تک اظہار حق، وعظ و پند، تبلیغ و دعوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ کا تعلق ہے، حیا کے طبعی ضعف کو دور کر دیا جائے اور شریعت نے ان موقعوں پر اسی ضعف کو دور کیا ہے، مثلاً: اللہ نے قرآن مجید میں جا بجا بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر کیا ہے، جس کو کفار اللہ تعالیٰ کی جلالت شان کے منافی سمجھ کر اعتراض کرتے تھے، اللہ نے فرمایا: کیسی ہی حقیر بات ہو لیکن اگر وہ بندوں کے فائدہ کی ہے تو اس کے کہنے سے اللہ نہیں شرماتا، یعنی شرم کی وجہ سے وہ اس کو نہیں چھوڑ دیتا، فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶)

''اللہ کسی مثال کے بیان کرنے میں (ذرا بھی) نہیں شرماتا (چاہے وہ مثال) مچھر کی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر (کسی اور حقیر چیز کی)۔''

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی دعوت ولیمہ میں صحابہ کرام کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، جس سے رسول اللہ ﷺ کو تکلیف تو ہو رہی تھی، لیکن فطری حیا کی بنا پر اس کا اظہار نہیں کرتے تھے، تاہم چونکہ لوگوں کا اس طرح جم کر بیٹھنا عام اخلاق بالخصوص آداب نبوت کے خلاف تھا، اس لیے خداوند تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۡ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ۭ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۵۳)

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب الحیاء:۶۱۱۸۔

''اس سے پیغمبر کو ایذا ہوتی تھی اور وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے اور اللہ تو حق (بات کے کہنے) میں (کسی کا کچھ) لحاظ کرتا نہیں۔''

اپنی ذاتی تکالیف کے لیے لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دینا، رسول اللہ ﷺ کی خوش خلقی اور مروت کے خلاف تھا، اس لیے آپ کو اس سے شرم آتی تھی، تاہم اس طرح بیٹھ جانا آدابِ مجلس کے خلاف تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ٹوکا کہ اخلاق و آداب کی تعلیم دینے میں شرم و حیا کا موقع نہیں۔ یہی حیا تھی جس نے ان مواقع پر صحابہ کرام کو نہایت دلیر، بے جھجک اور آزاد بنا دیا تھا، ایک صحابیہ آپ ﷺ سے ایک مسئلہ دریافت کرنے آتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ یہ سوال عورت کی فطری شرم و حیا کے خلاف ہے، تاہم اسی شرعی حیا کی بنا پر سوال سے پہلے کہہ دیتی ہیں کہ یا رسول اللہ! اللہ حق بات سے نہیں شرماتا، کیا عورت پر جنابت کا غسل فرض ہے؟

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان کی مثال ایک ایسے سرسبز درخت کی ہے جس پر کبھی خزاں نہیں آتی۔'' اکابر صحابہ اس درخت کا نام بتانے سے قاصر رہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سمجھ گئے کہ یہ کھجور کا درخت ہے، تاہم چونکہ کمسن تھے، اس لیے شرم سے چپ رہے، لیکن چونکہ یہ شرم و حیا کا موقع نہ تھا اور علمی مجالس میں آزادی کی ضرورت تھی، اس لیے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے انہوں نے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا، کہ اگر تم اس درخت کا نام بتا دیتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ [1] انصار یہ عورتیں رسول اللہ ﷺ سے عورتوں کے مسئلے پوچھتی تھیں اور یہ ان کا خاص اخلاقی وصف سمجھا جاتا تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

نعم النساء نسآء الانصار لم یکن یمنعهن الحیاء ان یتفقهن فی الدین. [2]

''انصار کی عورتیں کس قدر اچھی تھیں کہ دین کا علم حاصل کرنے سے ان کو حیا نہیں روکتی تھی۔''

ان موقعوں یعنی تبلیغ و دعوت، پند و نصیحت، ارشاد و ہدایت، تعلیم و تعلّم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علاوہ اور ہر جگہ حیا انسان کا ایک ایسا اخلاقی جوہر ہے جس سے اس کو فائدہ ہی فائدہ پہنچتا ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((الحیاء لایاتی الا بخیر)) [3]

''حیا سے صرف بھلائی پہنچتی ہے۔''

اور جس شخص کو کسی برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا، اس کا نام آزادی اور دلیری نہیں ہے، بلکہ بے حیائی اور بے شرمی ہے، کیونکہ یہی جذبہ حیا ہے جو انسان کو برائیوں سے باز رکھتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو پھر بے حیا ہو کر انسان جو چاہے کر سکتا ہے، کوئی روک نہیں سکتا، اس لیے فرمایا کہ

[1] بخاری، کتاب الادب، باب مالا یستحی من الحق للتفقه فی الدین: ٦١٢٢۔ [2] مسلم، کتاب الحیض، باب استحباب استعمال المغتسلة من الحیض فرصة من مسك فی موضع الدم: ٧٥٠۔

[3] بخاری، کتاب الادب، باب الحیاء: ٦١١٧۔

((ان مما ادرك الناس من كلام النبوة الاولٰى اذالم تستح فاصنع ماشئت)) ❶

''لوگوں نے پرانے پیغمبروں کی جو باتیں پائی ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ اگر تم میں شرم وحیا نہیں تو جو چاہو کرو۔''

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ ❷ نے اس حدیث کا ایک دوسرا مطلب بھی بیان کیا ہے کہ اگر تم کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو شرم کے قابل ہو تو پوری آزادی سے کر سکتے ہو۔ قرآن وحدیث میں جہاں جہاں فحش، منکر اور سوء وغیرہ کے لفظ آئے ہیں، ان سے بے حیائی کے یہی سب کام مراد ہیں اور اسلام نے اس شدت اور جامعیت کے ساتھ ان تمام کاموں سے روکا ہے کہ حیا اسلام کا ایک مخصوص اخلاقی وصف بن گیا ہے، اسی بنا پر حدیث شریف میں آیا ہے کہ ''ہر دین کا ایک خاص خلق ہوتا ہے اور اسلام کا خاص خلق حیا ہے۔'' ❸ یہ بھی فرمایا: ''ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔'' ❹ فطری مواقع کے علاوہ ایک مسلمان کو کبھی بھی یہاں تک کہ تنہائی کی حالت میں بھی شرم وحیا کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہیے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''برہنگی سے بچو، کیونکہ تمہارے ساتھ ایسے فرشتے رہتے ہیں جو صرف بول وبراز اور مباشرت کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں، تو ان سے شرماؤ اور ان کا خیال رکھو۔'' ❺ مقصد یہ ہے کہ شرم کا پانی آنکھوں سے گرنے نہ پائے۔

---

❶ بخاری، کتاب الادب، باب اذا لم تستح فا صنع ما شئت: ٦١٢٠۔ ❷ فتح الباری، ج١٠، ص: ٤٣٤۔

❸ موطا امام مالك، كتاب حسن الخلق، باب ماجاء في الحياء. ١٦٧٨۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب امور الایمان:٩۔

❺ ترمذی، ابواب الادب، باب ما جآء فی الاستتار عند الجماع: ٢٨٠٠۔

رحم

رحم بھی انسان کے بنیادی اخلاق میں سے ہے، دنیا میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ کسی معاوضہ کا خیال کیے بغیر جو کچھ نیکی کے کام کرتے ہیں، ان کو کرید کرد یکھئے تو سب کی تہہ میں رحم کا جذبہ کام کرتا نظر آئے گا، جس کے دل میں اس جذبہ کا کوئی ذرہ نہ ہوگا، اس سے دوسروں کے ساتھ بے رحمی، ظلم سنگدلی اور شقاوت جو کچھ نہ ظاہر ہو وہ کم ہے، اسی لیے اسلام کی اخلاقی تعلیم میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے اللہ کے بعد جو نام سب سے زیادہ اہم اور عام ہے، وہ رحمٰن یعنی ''بڑا رحم والا'' ہے، اسی کے ساتھ دوسرا نام ''رحیم'' آتا ہے، ''یعنی رحم سے بھرا ہوا، قرآن پاک میں پہلا نام ایک طرح سے اللہ کے علم کی حیثیت سے لیا گیا ہے اور دوسرا نام صفت کے طور پر بار بار آتا ہے، مسلمان کو حکم ہے، جب وہ کوئی اچھا کام شروع کرے تو پہلے رحمٰن ورحیم اللہ کا نام لے، ہر سورہ کا آغاز اسی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہے، دنیا میں جو کچھ ہے وہ اللہ کی رحمت کے جلوؤں کے سوا کچھ اور نہیں ہے، اللہ کے فرشتے اپنی دعاؤں میں کہتے ہیں:

﴿ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا ﴾ (٤٠/ المؤمن:٧)

''اے ہمارے پروردگار! تو نے اپنی رحمت اور علم میں ہر چیز کو سما لیا ہے۔''

اس رحمتِ الٰہی کی تفصیل سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، بلکہ

﴿ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴾ (٥٩/ الحشر:٢٢)

''وہی رحم والا مہربان ہے۔''

مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ دعاؤں میں کہیں:

﴿ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴾ (٢٣/ المؤمنون:١٠٩)

''اور تو سب رحم کرنے والوں میں سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔''

دنیا میں رحم وکرم کے جو آثار پائے جاتے ہیں، وہ اسی رحمت کے آثار اور پرتو ہیں، چنانچہ حدیث میں ہے کہ ''اللہ نے رحمت کے سو (١٠٠) ٹکڑے کیے، جن میں سے ننانوے ٹکڑے اپنے پاس رکھ لیے اور زمین پر صرف ایک ٹکڑے کو اتارا اور اسی ایک ٹکڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں، یہاں تک کہ گھوڑا اس خوف سے اپنے بچے پر پاؤں نہیں رکھتا کہ کہیں اس کو صدمہ نہ پہنچ جائے۔'' [1]

بنی نوعِ انسان میں محاسنِ اخلاق کا سب سے بڑا مظہر پیغمبروں کی ذات ہے اور پیغمبروں میں سب سے اعلیٰ واشرف ہستی رسول اللہ ﷺ کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی وصف کے ساتھ متصف کیا ہے:

﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ

[1] بخاری، کتاب الادب، باب جعل اللّٰه الرحمة فی مائة جزء: ٦٠٠٠۔

رَءُوفٌ رَّحِیْمٌ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۲۸)

''(لوگو)! تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک رسول آئے ہیں، تمہاری تکلیف ان پر شاق گزرتی ہے (اور) ان کو تمہاری بہبود کا ہوکا ہے اور مسلمانوں پر بہت شفیق (اور) رحیم ہیں۔''

پیغمبروں کے بعد اگلے پیغمبروں کی امتیں ہیں اور ان امتوں میں سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کا یہ خاص اخلاقی وصف بتایا ہے:

﴿وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً﴾ (۵۷/ الحدید:۲۷)

''اور جو لوگ ان کے پیرو ہوئے ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا۔''

اور اس وصف میں امت محمدیہ بھی ان کی شریک و سہیم ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ﴾ (۴۸/ الفتح ۲۹)

''اور جو لوگ محمد ﷺ کے ساتھ ہیں، وہ کافروں پر زور آور ہیں، آپس میں رحمدل ہیں۔''

آپس کے تعلقات میں ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کا جو برتاؤ کیا جاتا ہے، اس کو صلۂ رحم کہتے ہیں، کیونکہ قرابتوں کے سارے رشتے رحم مادری سے پیدا ہوتے ہیں اور رحم اور رحمٰن جو اللہ کا نام ہے، ایک ہی اصل سے مشتق ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رحم کا جذبہ رحمت والے (رحمٰن) اللہ کی رحمت کا پرتو ہے اور اسی سے صلۂ رحم کا جذبہ دنیا میں پیدا ہوا ہے، حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((الرحم شجنة من الرحمن)).

''رحم، رحمٰن کی جڑ سے نکلی ہوئی ایک شاخ ہے۔'' [1]

یعنی قرابت کی رحمدلی اور شفقت کے جذبہ کی جڑ خود رحمٰن کی ذات ہے اور ساری رحم دلیوں کے جذبے اس کی شاخیں ہیں، بچوں کی محبت اسی جذبہ سے پیدا ہوتی ہے، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک زانو پر مجھ کو اور دوسرے زانو پر امام حسن رضی اللہ عنہ کو بٹھا لیتے تھے، پھر دونوں کو ملا کر کہتے تھے کہ ''اللہ ان دونوں پر رحم کر کیونکہ میں ان دونوں پر رحم کرتا ہوں۔'' [2]

ایک بار ایک شخص اپنے بچے کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس کو لپٹانے لگا، آپ ﷺ نے یہ حالت دیکھ کر فرمایا کہ ''تم اس پر رحم کرتے ہو؟'' اس نے کہا: ہاں۔ ارشاد ہوا کہ ''اللہ تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، جس قدر تم اس بچے پر رحم کرتے ہو اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔'' [3]

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا بوسہ لیا، اقرع بن حابس جو ایک درشت خو بدو تھے،

[1] بخاری، کتاب الادب، باب من وصل وصله الله: ۵۹۸۸۔ [2] بخاری، کتاب الادب، باب وضع الصبی علی الفخذ: ۶۰۰۳۔ [3] ادب المفرد، باب رحمة العیال: ۳۷۷۔

پاس بیٹھے ہوئے تھے، بولے کہ میرے دس بچے ہیں، میں نے ان میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیا، آپ ﷺ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ ''جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔''

ایک اور بدو نے آپ سے کہا کہ آپ لوگ بچوں کو چومتے ہیں، لیکن ہم لوگ نہیں چومتے، ارشاد ہوا کہ ''اللہ نے جب تمہارے دل سے رحم کو نکال لیا تو میرا کیا زور ہے۔'' ❶

رحم کی یہ خاص قسم یعنی چھوٹوں پر ترس کھانا امت محمدیہ کا ایک عنصر ہے، اس لیے فرمایا کہ ''جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔'' ❷ اور اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ رحم ہمیشہ چھوٹوں اور زیر دستوں پر کھایا جاتا ہے، تو اس حدیث کی وسعت صرف عمر کے چھوٹوں تک نہیں، بلکہ ہر حیثیت کے چھوٹوں تک وسیع ہے۔ خود اپنی قوم کی ہمدردی، محبت اور اعانت کا جذبہ اسی اخلاقی وصف سے پیدا ہوتا ہے، اسی لیے قرآن مجید نے صحابہ کرام کا اخلاقی وصف یہ قرار دیا ہے: ﴿ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ یعنی ''وہ لوگ آپس میں رحم دل ہیں۔''

اور حدیث میں اس وصف کو ایک نہایت عمدہ مثال میں بیان کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ مسلمانوں کی باہمی رحم دلی وباہمی دوستی اور باہمی مہربانی کی مثال انسان کے جسم کی ہے کہ جب کسی عضو کو درد، دکھ پہنچتا ہے تو تمام جسم متاثر ہو جاتا ہے، ❸ جس کے معنی یہ ہیں کہ جذبہ رحم نے اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے مسلمانوں کو اس قدر متحد کر دیا ہے کہ مجموعی طور پر وہ ایک جسم ہو گئے ہیں اور انفرادی طور پر مسلمانوں کے تمام افراد اس جسم کے اعضاء اور جوارح ہیں، اس لیے جس طرح ایک عضو کے درد، دکھ میں تمام جسم شریک ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک مسلمان کے درد، دکھ میں تمام مسلمانوں کو شریک ہونا چاہیے۔ اسلام نے جس رحمدلی کی تعلیم دی ہے، وہ مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور اس میں تمام بنی نوع انسان شامل ہیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے متعدد حدیثوں میں عام رحم کی تعلیم دی ہے اور فرمایا ہے کہ ''جو شخص انسانوں پر رحم نہیں کرتا اللہ بھی اس پر رحم نہیں کرے گا۔'' یہ بھی فرمایا کہ ''رحم کرنے والوں پر، رحم کرنے والا اللہ رحم کرے گا، زمین والوں پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔'' ❹

رحمدلی کی یہ تعلیم صرف بنی نوع انسان ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں بے زبان جانور بھی شامل ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر کوئی شخص ذبیحہ جانور پر بھی رحم کرے گا، تو اللہ قیامت کے دن اس پر رحم کرے گا۔'' ❺ ایک شخص نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر ترس آتا ہے، یا یہ کہ مجھے اس پر ترس آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں، آپ ﷺ نے دو بار فرمایا کہ ''اگر تم بکری پر رحم کرتے

---

❶ بخاري، كتاب الادب، باب رحمة الولد و تقبيله و معانقته:٥٩٩٧، ٥٩٩٨۔

❷ ترمذي، ابواب البر والصلة، باب ماجاء في رحمة الصبيان:١٩١٩۔

❸ بخاري، كتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم:٦٠١١۔ ❹ ترمذي، ابواب البر والصلة، باب ما جاء في رحمة الناس:١٩٢٤۔ ❺ ادب المفرد، باب ارحم من في الارض:٣٧٣۔

ہو تو اللہ بھی تم پر رحم کرے گا۔'' ❶ جانوروں کے لڑانے کا جو بے رحمانہ طریقہ جاری ہو گیا تھا اور اب بھی جاری ہے، وہ اس رحم دلی کے بالکل مخالف تھا، اس لیے اسلام نے اس تفریحی مشغلہ کو ناجائز کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی۔

اس عام رحم دلی کی تعلیم رسول اللہ ﷺ نے دو ایسے مختصر اور جامع لفظوں میں دی ہے، جو بلاغت کی جان ہیں، فرمایا:

((مَنْ لَا یَرْحَمْ لَا یُرْحَمْ)) ❷

''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔''

ان دو لفظوں کی تشریح دفتروں میں نہیں سما سکتی، رحم دلی کا ہر منظر اور شفقت و کرم کا ہر جذبہ انہیں دو لفظوں سے ابھارا جا سکتا ہے، اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر اللہ بھی رحم نہیں فرمائے گا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کھاتا تو دوسرے بھی اس پر رحم نہیں کھائیں گے، محدث ابن بطال نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ ''اس میں تمام مخلوق پر رحم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، اس لیے اس میں مسلمان، کافر، مملوکہ اور غیر مملوکہ جانور سبھی داخل ہیں اور ان کے کھانے پینے کی نگرانی کرنا، ان پر ہلکا بوجھ لادنا اور ان کو بہت نہ مارنا یہ سب چیزیں اسی رحم میں شامل ہیں۔'' ❸ غرض یہی وہ چیز ہے جس سے ہم یتیموں کی غمخواری، بے کسوں کی تسکین، بیماروں کی تسلی، غریبوں کی امداد، مظلوموں کی حمایت اور زیردستوں کی اعانت کرتے ہیں اور اس حدیث کے حکم کا وسیع دائرہ ان سب کو گھیرے ہے، اس لیے مبارک ہیں وہ جو رحم کرتے ہیں، کہ ان پر رحم کیا جائے گا۔

---

❶ ادب المفرد: ۳۷۳۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الناس والبھائم: ۶۰۱۳۔

❸ فتح الباری، ج ۱۰، ص: ۳۶۸۔

عدل وانصاف

کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو، تو اس کو عربی میں ''عدل'' کہتے ہیں، [1] اور اس سے وہ معنی پیدا ہوتے ہیں جن میں ہم اس لفظ کو اپنی زبان میں بولتے ہیں، یعنی جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے اور وہی بات کہی اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اترے، اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ اخلاق کی ترازو میں عدل وانصاف کا پلہ بھی کچھ کم بھاری نہیں۔

عدل سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، جن روایتوں میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام گنائے گئے ہیں، ان میں ایک عدل (عدل والا) بھی ہے، علمانے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ ''اس کا فیصلہ حق ہوتا ہے، وہ حق بات کہتا ہے اور وہی کرتا ہے جو حق ہے۔'' [2] قرآن پاک میں کئی دفعہ یہ حقیقت مختلف لفظوں میں دہرائی گئی ہے۔ فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ يَقْضِىْ بِالْحَقِّ ۭ﴾ (۴۰/ المؤمن:۲۰)

''اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔''

یہ عدل عملی کی طرف اشارہ ہے، دوسری آیت میں ہے:

﴿وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۴)

''اور اللہ حق بات کہتا ہے۔''

یہ اللہ تعالیٰ کے عدل قولی کو ظاہر کرتا ہے اور یہ دونوں باتیں قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں یک جا ہیں:

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ﴾ (۶/ الانعام:۱۱۶)

''اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف کے ساتھ پوری ہوگئی۔''

دنیا کا یہ سارا کارخانہ جو آسمان سے لے کر زمین تک پھیلا ہے، صرف اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کے بل بوتے پر قائم ہے، وہ اپنی تمام مخلوقات میں اپنی شہنشاہی پورے انصاف کے ساتھ قائم کیے ہوئے ہے اور یہی اس کی وحدانیت کی دلیل ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَاۗىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ۭ﴾

(۳/ آل عمران:۱۸)

''اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی اور اللہ نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے، وہی اللہ

---

[1] مفردات راغب اصفهانی: ۳۲۷۔

[2] کتاب الاسماء والصفات بیهقی، ص: ٦١ اله آباد۔

انصاف کو لے کر کھڑا ہے۔''

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل و انصاف صرف نظم و سلطنت ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں عدل کی ضرورت ہے اور نظامِ عالم محض عدل کی وجہ سے قائم ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی جامع آیت میں جن اچھی باتوں کا حکم دیا ہے، ان میں سب سے پہلے عدل و انصاف ہی کرنے کا حکم ہے، فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ﴾ (١٦/ النحل:٩٠)

''بے شبہ اللہ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔''

عدل قانون کا اقتضا ہے اور احسان کرنا اور درگزر کرنا اخلاق کا مطالبہ ہے، اللہ تعالیٰ نے نظمِ عالم کو قائم رکھنے کے لیے سب سے پہلے عدل کا حکم دیا ہے اور اس کے بعد احسان کی تاکید کی ہے، جس سے اشخاص کی روحانی تکمیل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ سارے عالم کی نگہداشت کا فرض کسی شخص کی ذاتی تکمیل کے فرض سے زیادہ اہم ہے، پھر اسی مجمل تعلیم پر بس نہیں کیا ہے، بلکہ زندگی کے اہم شعبوں کو لے کر ان میں عدل و انصاف کا حکم دیا ہے۔ مثلاً: معاشرتی زندگی میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے، جو ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کرتے ہیں، اس لیے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے:

﴿ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ﴾ (٤/ النسآء:٣)

''پھر اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ (کئی بیبیوں میں) انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی (بی بی کرنا) یا جو (لونڈی) تمہارے قبضے میں ہو۔''

عورتوں کی طرح یتیموں کے حقوق کے لیے بھی عدل و انصاف کی ضرورت ہے، اس لیے فرمایا:

﴿ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ﴾ (٤/ النسآء:١٢٧)

''اور (خاص کر) یہ کہ یتیموں کے حق میں انصاف کو ملحوظ رکھو۔''

عام معاملات میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت روزانہ کی خرید و فروخت میں وزن و پیمانہ میں ہے، اس لیے فرمایا:

﴿ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ﴾ (٦/ الانعام:١٥٢)

''اور انصاف کے ساتھ (پوری پوری) ناپ کرو اور (پوری پوری) تول۔''

قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں بار بار اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ ناپ اور تول میں بے انصافی نہ کی جائے، کیونکہ خرید و فروخت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے، اس لیے وزن و پیمانہ میں کمی کرنے سے جو نقصان پہنچتا ہے، وہ نہایت عام و وسیع ہے، اس کے ساتھ نہایت حقیر مقدار میں کمی

کرنے سے انسان کی سخت دنایت ثابت ہوتی ہے اور اس سے روح میں سخت اخلاقی گندگی پیدا ہوتی ہے۔

عدل وانصاف کی ضرورت خاص طور سے عدالتی معاملات میں ہوتی ہے اور اسلام نے عدالتی کاروبار کے ہر پہلو میں عدل وانصاف کا لحاظ رکھا ہے، تحریر دستاویز کے متعلق حکم ہے کہ

﴿ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۲)

''اور (تمہارے باہمی قرارداد کو) کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھ دے۔''

﴿ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۲)

''پھر جس کے ذمہ قرض عائد ہوگا، اگر وہ کم عقل ہو یا معذور یا خود ادائے مطلب نہ کرسکتا ہو تو (جو) اس کا مختار کار (ہو وہ) انصاف کے ساتھ (دستاویز کا) مطلب بولتا جائے۔''

شہادت یا فیصلہ کے وقت دو حالتوں میں اکثر لوگوں کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ فریق مقدمہ اپنا قرابت دار ہو یا اس سے گواہ یا حاکم کو عداوت ہو، لیکن اسلام کی اخلاقی تعلیم اس حالت میں بھی عدل وانصاف سے تجاوز کرنے کو جائز نہیں رکھتی:

﴿ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ ﴾ (٦/ الانعام:١٥٢)

''اور (گواہی دینی ہو یا فیصلہ کرنا پڑے) جب بات کہو تو گو (فریق مقدمہ اپنا) قرابت مند ہی (کیوں نہ) ہو انصاف (کا پاس) کرو۔''

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ ﴾ (۵/ المائدۃ:۸)

''مسلمانو! خدا واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کو آمادہ رہو اور لوگوں کی عداوت تم کو اس جرم (کے ارتکاب) کی باعث نہ ہو کہ (معاملات میں) انصاف نہ کرو (نہیں ہر حال میں) انصاف کرو کہ (شیوہ) انصاف پرہیزگاری سے قریب تر ہے۔''

پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ تمہاری باہمی دوستی ومحبت تم کو بے انصاف نہ بنائے اور دوسری آیت میں یہ ارشاد ہے کہ کسی کی دشمنی تم کو انصاف سے باز نہ رکھے اور یہ کہ ہر حال میں عدل وانصاف کرنا تقویٰ کی نشانی ہے۔

یہود اور نصاریٰ اسلام کے کھلے ہوئے دشمن تھے، اس پر بھی رسول اسلام علیہ السلام کی زبان مبارک سے وحی الٰہی یہ کہلواتی ہے:

﴿ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ

أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴾

(۴۲/ الشوریٰ:۱۵)

''اور کہہ دے کہ میں ہر اس کتاب کو مانتا ہوں جو اللہ نے اتاری اور مجھے (اللہ سے) یہ حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں، اللہ رب ہے ہمارا اور تمہارا، ہم کو ہمارے کاموں کا بدلہ ملنا ہے اور تم کو تمہارے کاموں کا، ہم میں تم میں کچھ جھگڑا نہیں، اللہ ہی سب کو جمع کرے گا، اسی کی طرف (سب کو) پھر جانا ہے۔''

جس عدل اور برابری کا حکم اس آیت پاک میں ہے، اس کے کئی پہلو ہیں، ایک یہ کہ جو سچائی مجھ تک پہنچتی ہے، اس کو میں برابر برابر تم سب کو پہنچا دوں، دوسرا یہ کہ محض دینی مخالفت کی وجہ سے تمہارے ساتھ بے انصافی نہ کی جائے، بلکہ وہ کیا جائے جس کا تقاضا عدل وانصاف کرتا ہے اور تیسرا یہ کہ اب تک تم میں مقدمات کے فیصلہ کی جو یہ صورت جاری ہے کہ دولت مندوں اور عزت والوں کے ساتھ رعایت کا اور عام لوگوں کے ساتھ سختی کا قانون برتا جائے، میرے اللہ نے ایسا کرنے سے مجھے منع کیا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ عام وخاص اور امیر و غریب سب کے ساتھ یکساں اور برابری کا سلوک کیا جائے، کیونکہ ہمارا تمہارا سب کا رب ایک ہی ہے، ہم سب اس کے غلام ہیں، اس لیے اس کے سب غلاموں کے لیے ایک ہی قانون ہونا چاہیے، ہم کو ہمارے اعمال اور تم کو تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا، اس میں جھگڑے کی کوئی بات نہیں، سب کو قیامت میں اس مالک کے سامنے پیش ہونا ہے، جس کا کام اس کو پسند آئے گا اس کو ویسا انعام ملے گا اور اگر برا کام کیا ہو تو ویسی ہی سزا ملے گی۔

عدل وانصاف کی راہ میں ان دونوں سے بھی زیادہ ایک کٹھن منزل ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی عدل وانصاف کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، محمد رسول اللہ ﷺ کی پاک تعلیم کی روشنی میں اہل ایمان کو اس کٹھن منزل کی راہنمائی بھی پوری طرح کی گئی ہے، ارشادِ الٰہی ہوا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا ۚ وَإِن تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴾ (۴/ النساء:۱۳۵)

''اے ایمان والو! انصاف کی حمایت میں کھڑے ہو، اللہ کے لیے گواہ بنو، اگرچہ تمہارا اپنا اس میں نقصان ہی ہو، یا ماں باپ کا، یا رشتہ داروں کا اگر وہ دولت مند ہے یا محتاج ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے، تو تم انصاف کرنے میں اپنے نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرو، اگر تم زبان ملو گے یا کچھ بچاؤ گے تو اللہ تمہارے کام سے واقف ہے۔''

ان آیتوں میں عدل کے خلاف ایک ایک ریشہ کو جڑ سے نکال کر پھینک دیا گیا ہے، کہا گیا کہ معاملات

میں عدل وانصاف کی حمایت تمہارا مقصد ہو، جو کچھ کہو یا کرو خدا لگتی کہو اور اللہ واسطے کہو، عدل وانصاف کے فیصلہ اور گواہی میں نہ تو اپنے نفس کا خیال بیچ میں آئے، نہ عزیزوں اور قرابت داروں کا، نہ دولت مند کی طرف داری کا، نہ محتاج پر رحم کا، پھر اس فیصلہ اور گواہی میں کوئی بات لگی لپٹی نہ رکھی جائے، نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجھ کر بچالیا جائے، مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ اور گواہی میں دولت مند کی خاطر نہ کرو اور نہ محتاج پر ترس کھاؤ اور قرابت کو بھی نہ دیکھو، جو حق ہو وہ کرو یا کہو، پھر سچ کہنے میں کوئی توڑ مروڑ نہ کرو کہ سننے والا شبہ میں پڑ جائے، یا پوری بات نہ کہو، کچھ چھپالو، تو یہ سب باتیں عدل اور انصاف کے خلاف ہیں، کسی غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ میں ردو بدل کر دینا بظاہر نیکی کا کام دکھائی دیتا ہے، مگر درحقیقت یہ ایک مقدس فریب ہے، فیصلہ میں ترس کھا کر بے ایمانی کرنا بھی ویسا ہی ہے، جیسا کسی کی خاطر رکھ کر یا کسی کی بزرگی کو مان کر یا کسی کی بڑائی سے مرعوب ہو کر بے ایمانی کرنا ہے۔ غرض یہ ہے کہ عدل وانصاف کی راہ میں کوئی اچھا یا برا جذبہ حاکم کے لیے ٹھوکر کا پتھر نہ بنے۔

اسی طرح اس آیت کا اشارہ ادھر بھی ہوا کہ جو گواہ کسی فریق کو نفع پہنچانے کی غرض سے طرفدارانہ گواہی دیتا ہے وہ غلطی میں مبتلا ہے، اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی اس کا نگران نہیں ہو سکتا، اس لیے نہ گواہوں کو اس لیے طرف داری کرنی چاہیے اور نہ خود کسی فریق کو گواہ کی طرف داری کے ذریعہ سے اپنی منفعت کا خیال دل میں لانا چاہیے، بلکہ دونوں کو اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دینا چاہیے کہ وہی ان کا سب سے بہتر اور سب سے بڑھ کر ولی ہے۔ لوگ عدل وانصاف کے فیصلہ یا گواہی میں اسی لیے غلط بیانی کرتے ہیں کہ جس فریق کی طرف داری مقصود ہے اس کو فائدہ پہنچ جائے، تو ارشاد ہوا کہ اللہ اپنے امیر اور غریب دونوں بندوں کے حق میں تم سے زیادہ خیر خواہ ہے، تمہاری کم بین نظر تو آس پاس تک جا کر رہ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب کچھ ہے، وہ سب کچھ دیکھ کر اور سب کچھ جان کر اپنے بندوں کے ساتھ وہ کرتا ہے، جس میں ان کی بھلائی ہے، غور کیجئے کہ ان لفظوں میں عدل وانصاف کا فلسفہ کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے، کم حوصلہ انسان اپنے فیصلہ اور گواہی میں کسی خاص انسان کی بھلائی کے لیے جھوٹ بولتا ہے یا غلط فیصلہ دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو فائدہ پہنچے گا، حالانکہ عالم الغیب کے سوا یہ کس کو معلوم ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے لیے کیا چیز مفید ٹھہرے گی، پھر ایک اور حیثیت سے دیکھئے کہ بالفرض ایک خاص آدمی کو اپنی طرف داری سے فائدہ پہنچا بھی دیا تو کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اس نے اس طرح حقیقت میں سچائی کا خون کر کے نظمِ عالم کو ابتر کرنے کی کوشش کی اور ظلم کی بنیاد رکھی، جس سے عالم کے امن وامان کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ ہے۔ غلط گو انسان کی محدود نگاہ میں صرف ایک جزئی واقعہ کے نفع ونقصان کا خیال ہے اور اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کے حکم میں سارے عالم کی خیر خواہی کا بھید چھپا ہے، جس کا ایک فرد وہ خاص انسان بھی ہے۔ اسی لیے رشوت دے کر حاکموں کی رائے کو متاثر کرنا محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں گناہ ہے اور بعض مفسروں کے خیال کے مطابق قرآن پاک کی اس آیت میں:

﴿ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۸۸)

’’اور نہ مال حاکموں تک پہنچاؤ، تاکہ لوگوں کے مال میں سے گناہ کما کر کچھ کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو۔‘‘

اس رشوت کی ممانعت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ [1]

دو شخصوں یا دو گروہوں میں مصالحت کرانا بھی ایک عدالتی معاملہ ہے، اس لیے اس میں بھی عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے اور کس حالت میں دیا گیا ہے جب دونوں طرف سے تلواریں میان سے نکل چکی ہوں اور ایک دوسرے کے سر و سینہ پر تڑپ تڑپ کر گر رہی ہوں، یعنی اس وقت جب عقل کی قوت اور نیکی کی استعداد کا چراغ جذبات کی آندھیوں میں بجھ رہا ہو، اس عالم میں بھی مسلمانوں سے یہی کہا گیا کہ عدل و انصاف کا دامن ہاتھوں سے نہ چھوٹے، فرمایا:

﴿ وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ (۴۹/ الحجرات:۹)

’’اور اگر (تم) مسلمانوں کے دو فرقے آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو، پھر اگر ان میں کا ایک (فرقہ) دوسرے پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرتا ہے اس سے تم (بھی) لڑو یہاں تک کہ وہ حکم اللہ کی طرف رجوع کرے، پھر جب رجوع لائے تو دونوں میں برابری کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف کو ملحوظ رکھو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔‘‘

عدل و انصاف حکومت و سلطنت کی عمارت کا ستون ہے، اسی لیے اسلام نے ہر قسم کے مذہبی اور عدالتی فیصلے کے لیے عدل کو ضروری قرار دیا ہے کہ اگر نہ ہو تو کسی مظلوم کی دادرسی ممکن ہی نہیں، اسی لیے ایک حاکم کا پہلا فرض یہ ہے کہ عادل ہو، ارشاد ہوا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ ﴾ (۴/ النسآء:۵۸)

’’بے شک اللہ تم کو یہ حکم فرماتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچاؤ اور یہ کہ جب لوگوں کے درمیان جھگڑے فیصل کرنے لگو، تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔‘‘

اہل تفسیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس آیت پاک میں ’’امانت‘‘ سے مراد منصفانہ فیصلہ اور وہ منصفانہ حق ہے

[1] تفسیر روح المعانی، ج ۲، ص:۶۰۔

جوایک کا دوسرے پر چاہیے، اللہ نے اس آیت میں اسی منصفانہ فیصلہ اور حق کی امانت کو حق دار تک پہنچانے کا حکم دیا ہے اور منصفانہ فیصلہ کی تاکید کی ہے اور یہ فیصلہ دوست و دشمن، کافر و مسلم سب کے ساتھ یکساں عدل وانصاف کے ساتھ ہونا چاہیے، چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ کو یہودیوں کے معاملات میں حکم ہوا:

﴿ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۲)

''اور اگر فیصلہ کرو تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

عدل وانصاف کی برتری کی یہ اہمیت لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عدل وانصاف کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دو دفعہ اپنی دوستی اور محبت سے نوازنے کی بشارت سناتا ہے۔

اخلاق کے ساتھ یہ مسئلہ سیاست سے بھی تعلق رکھتا ہے، یعنی جو شخص فیصلہ کرتا ہے، اس کے لیے کن کن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے، قرآن مجید میں اگرچہ اس کی کوئی تصریح نہیں کی گئی ہے، تاہم اشارات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص فیصلہ کرتا ہے، اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آزاد ہو، اپنے فیصلہ کے نفاذ کی قدرت رکھتا ہو، قوتِ نطق سے محروم نہ ہو، صاحب علم ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰي شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰي مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾

(۱۶/ النحل:۷۶)

''اور اللہ (ایک دوسری مثال دیتا ہے کہ) دو آدمی (ہیں) ان میں کا ایک گونگا (اور گونگا ہونے کے علاوہ پرایا غلام کہ خود) کچھ نہیں کر سکتا اور (گونگے ہونے کی وجہ سے) وہ اپنے آقا کا بارِ خاطر بھی ہے کہ جہاں کہیں اس کو بھیجے اس سے کچھ بھی ٹھیک نہیں بن آتا ہے، کیا ایسا غلام اور وہ شخص (دونوں) برابر ہو سکتے ہیں جو (لوگوں کو) عدل وانصاف کی تاکید کرتا ہے اور وہ خود بھی سیدھے راستے پر ہے۔''

اور امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جو شخص عدل کا حکم دیتا ہے، اس کو صفت نطق سے متصف ہونا چاہیے، ورنہ وہ حکم نہ دے سکے گا اور قادر ہونا چاہیے کیونکہ حکم سے علوئے مرتبت کا اظہار ہوتا ہے اور جب تک وہ قادر نہ ہو علوئے مرتبت حاصل نہیں ہو سکتا اور عالم ہونا چاہیے، تاکہ ظلم وانصاف میں تمیز کر سکے، اس سے ثابت ہوا کہ عدل وانصاف کی صفت قدرت اور علم دونوں کو شامل ہے، پہلا شخص گونگا ہے تو دوسرے کو گویا ہونا چاہیے، پہلا شخص کسی قسم کی قدرت نہیں رکھتا تو دوسرے کو صاحب قدرت ہونا چاہیے، پہلے شخص سے کوئی کام ٹھیک بن نہیں آتا، اس لیے دوسرے شخص کو عالم ہونا چاہیے، تاکہ وہ ہر کام کو سلیقہ سے کر سکے۔

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے عدل و انصاف کا جو حکم دیا ہے وہ اخلاق، معاشرت اور سیاست کے ہر ایک گوشہ کو محیط ہے، یعنی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر اسلام کی یہ اخلاقی تعلیم حاوی نہ ہو۔

ان آیات کی رو سے اگرچہ ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہیے، تاہم امام و حاکمِ وقت کے لیے عادل ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے، اس لیے حدیث میں امامِ عادل کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''قیامت کے دن جبکہ اللہ کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا، سات شخصوں کو اللہ اپنے سایہ میں لے گا، جن میں ایک شخص امامِ عادل ہوگا۔'' [1]

---

[1] بخاري، كتاب المحاربين، باب فضل من ترك الفواحش:٦٨٠٦۔

عہد کی پابندی

کسی سے جو وعدہ یا کسی قسم کا قول وقرار کر لیا جائے اس کو پورا کرنا ایک راست باز کا شعار ہے، خود اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت یہ بار بار فرمایا:

﴿ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴾ (۳/ آل عمران :۹، ۱۳/ الرعد:۳۱)

''بے شبہ اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔''

﴿ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ الْمِيعَادَ ﴾ (۳۹/ الزمر :۲۰)

''اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔''

﴿ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴾ (۳/ آل عمران :۱۹٤)

''(اے ہمارے پروردگار) تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔''

﴿ وَعْدَ اللَّهِ ۖ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ ﴾ (۳۰/ الروم:٦)

''اللہ کا وعدہ ہوا ہے، اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔''

﴿ وَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ ۚ ﴾ (۲۲/ الحج:٤٧)

''اور اللہ ہرگز نہ ٹالے گا اپنا وعدہ۔''

﴿ فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۰)

''تو البتہ اللہ اپنے قول وقرار کے خلاف نہ کرے گا۔''

﴿ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۱۱)

''اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔''

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا سچا اور اپنے عہد کا پکا ہے، اسی طرح اس کے بندوں کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کریں وہ پورا کریں اور جو قول وقرار کریں اس کے پابند رہیں، سمندر اپنا رخ پھیر دے تو پھیر دے اور پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے، مگر کسی مسلمان کی یہ شان نہ ہو کہ منہ سے جو کہے وہ اس کو پورا نہ کرے اور کسی سے جو قول وقرار کرے اس کا پابند نہ رہے۔

عام طور پر لوگ عہد کے معنی صرف قول وقرار کے سمجھتے ہیں، لیکن اسلام کی نگاہ میں اس کی حقیقت بہت وسیع ہے، وہ اخلاق، معاشرت، مذہب اور معاملات کی ان تمام صورتوں پر مشتمل ہے، جن کی پابندی انسان پر عقلاً، شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً فرض ہے اور اس لحاظ سے یہ مختصر سا لفظ انسان کے بہت سے عقلی، شرعی، قانونی، اخلاقی اور معاشرتی فضائل کا مجموعہ ہے، اسی لیے قرآن مجید میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے اور مختلف حیثیتوں سے آیا ہے، ایک جگہ اصلی نیکی کے اوصاف کے تذکرہ میں ہے:

﴿ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

''اور اپنے قول وقرار کو جب قول دیں پورا کرنے والے۔''

بعض آیتوں میں اس کامل الایمان مسلمانوں کے مخصوص اوصاف میں شمار کیا گیا ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ۙ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۸)

''اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس ملحوظ رکھتے ہیں۔''

ایک دوسری سورہ میں جنتی مسلمانوں کے اوصاف کا نقشہ کھینچا گیا ہے، اس تصویر کا ایک رخ یہ ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ۙ ﴾ (۷۰/ المعارج:۳۲)

''اور وہ جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔''

کسی کی امانت کو رکھ کر بلا کم و کاست ٹھیک وقت پر ادا کر دینا، معاملاتی حیثیت سے ایک قسم کے عہد کی پابندی ہے، جو عہد کے وسیع معنی میں داخل ہے، اس لیے پہلے عہد کی اس خاص قسم کا ذکر کیا اور اس کے بعد عہد کا عام ذکر کیا، یعنی تاکیداً پہلے ایک خاص عہد کی پابندی کو مسلمانوں کا مخصوص وصف قرار دیا، اس کے بعد عام عہد کا ذکر کیا، اس کے برعکس ایک آیت میں پہلے عہد کی عام پابندی کا، اس کے بعد عہد کی ایک خاص قسم کی پابندی کا حکم دیا:

﴿ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل:۳۴۔۳۵)

''اور عہد کو پورا کیا کرو، (قیامت میں) عہد کی باز پرس ہوگی اور جب ناپ کر دو، تو پیمانہ کو پورا بھر دیا کرو اور (تول کر دینا ہو تو) ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولا کرو (معاملہ کا) یہ بہتر (طریق) ہے اور (اس کا) انجام بھی اچھا ہے۔''

قانون یا رسم و رواج سے جو وزن یا پیمانہ مقرر ہو جاتا ہے، وہ درحقیقت ایک معاہدہ ہوتا ہے، جس کی پابندی بائع اور خریدار پر فرض ہوتی ہے، اس لیے تاکیداً پابندی عہد کے عام حکم کے بعد اس خاص عہد کی پابندی کا ذکر کیا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد کے لیے زبانی قول وقرار کی ضرورت نہیں، بلکہ عرف عام کے سارے مسلمات سوسائٹی کے قول وقرار ہیں۔ تمام عہدوں میں سے سب سے پہلے انسان پر اس عہد کو پورا کرنا واجب ہے، جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے، یہ عہد ایک تو وہ فطری معاہدہ ہے جو روز اَلَسْتُ کو بندوں نے اپنے اللہ سے باندھا اور جس کا پورا کرنا ان کی زندگی کا پہلا فرض ہے اور دوسرا وہ عہد ہے جو اللہ کا نام لے کر کسی بیعت اور اقرار کی صورت میں کیا گیا ہے، تیسرا عہد وہ ہے جو عام طور سے قول وقرار کی شکل میں بندوں میں آپس میں ہوا کرتا ہے اور چوتھا عہد وہ ہے جو اہلِ حقوق کے درمیان فطرۃً قائم ہے اور جن کے ادا

کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ ﴾ (۱۳/ الرعد: ۲۰۔۲۱)

''جو اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے اقرار کو نہیں توڑتے اور اللہ نے جن تعلقات کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، ان کو جوڑے رکھتے ہیں۔''

اس آیت میں پہلے اس فطری عہد کے ایفا کا ذکر ہے جو اللہ اور بندہ کے درمیان ہے، پھر اس قول وقرار کا جو باہم انسانوں میں ہوا کرتا ہے، اس کے بعد اس فطری عہد کا ہے، جو خاص کر اہل قرابت کے درمیان قائم ہے۔ سورۂ نحل میں اللہ کے عہد کا مقدس نام اس معاہدہ کو بھی دیا گیا ہے، جو اللہ کو حاضر وناظر بتا کر یا اللہ کی قسمیں کھا کھا کر بندے آپس میں کرتے ہیں، فرمایا:

﴿ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ ﴾ (۱۶/ النحل: ۹۱)

''اور اللہ کا نام لے کر تم آپس میں ایک دوسرے سے قرار کرو تو اس کو پورا کرو اور قسموں کو پکی کر کے توڑا نہ کرو اور اللہ کو تم نے اپنے پر ضامن ٹھہرایا ہے۔''

اس معاہدہ کے عموم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وہ عہد بھی داخل ہیں، جو اسلام لاتے وقت انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے کیے اور وہ نیک معاہدے بھی اس کے اندر شامل ہیں، جو جاہلیت میں کسی اچھی غرض سے کیے گئے تھے، ساتھ ہی وہ سب معاہدے بھی اس میں آ جاتے ہیں، جو اللہ کا واسطہ دے کر اور اللہ کی قسمیں کھا کر آج بھی مسلمان ایک دوسرے سے کریں۔

سورۂ انعام میں ایک اور عہد الٰہی کے ایفا کی نصیحت کی گئی ہے، فرمایا:

﴿ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ ﴾ (۶/ الانعام: ۱۵۲)

''اور اللہ کا قرار پورا کرو، یہ اس نے تم کو نصیحت کر دی ہے، تاکہ تم دھیان رکھو۔''

اس عہدِ الٰہی میں اللہ کے وہ فطری احکام بھی داخل ہیں، جن کے بجا لانے کا اقرار تم نے اللہ سے کیا ہے، یا اللہ نے تم سے لیا ہے، اسی طرح اس نذر اور منت کو مشتمل ہے، جس کو اللہ کے مقدس نام سے تم نے مانا ہے اور انسانوں کے اس باہمی قول وقرار کو بھی شامل ہے جو اللہ کی قسمیں کھا کھا کر لوگ کیا کرتے ہیں۔

صلح حدیبیہ میں مسلمانوں نے کفار سے جو معاہدہ کیا تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کارسازی نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ فریق مخالف کی قوت روز بروز گھٹتی اور اسلام کی قوت بڑھتی گئی، اس حالت میں اس معاہدہ کو توڑ دینا کیا مشکل تھا، مگر یہی وہ وقت تھا جس میں مسلمانوں کے مذہبی اخلاق کی آزمائش کی جا سکتی تھی کہ اپنی قوت

اور دشمنوں کی کمزوری کے باوجود وہ کہاں تک اپنے معاہدہ پر قائم رہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بار بار اس معاہدہ کی استواری اور پابندی کی یاد دلائی اور فرمایا کہ تم اپنی طرف سے کسی حال میں اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرو، جن مشرکوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا ان سے لڑنے کی اجازت گو دے دی گئی تھی اور مکہ فتح بھی ہو چکا تھا، پھر بھی یہ حکم ہوا کہ ان کو چار مہینوں کی مہلت دو:

﴿ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ﴾ (۹/ التوبة:۲)

”اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو پورا جواب ہے، جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا، تو پھر لو (تم اے مشرکو)! ملک میں چار مہینے اور یقین مانو کہ تم اللہ کو تھکا نہیں سکتے۔“

آگے چل کر جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ اب ان مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کے معاہدہ کی ذمہ داری نہیں رہی، تو ساتھ ہی ان مشرکوں کے ساتھ ایفائے عہد کی تاکید کی گئی، جنھوں نے حدیبیہ کے معاہدہ کی حرمت کو قائم رکھا تھا، فرمایا:

﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبة:٤)

”مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا، پھر انھوں نے تم سے کچھ کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کو مدد دی، تو ان سے ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو، بے شک اللہ کو خوش آتے ہیں تقویٰ والے۔“

اور ان مشرکوں کے ساتھ اس ایفائے عہد کو اللہ تعالیٰ تقویٰ بتاتا ہے اور جو اس عہد کو پورا کریں ان کو متقی فرمایا اور ان سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا، آگے بڑھ کر ان مشرکوں سے اپنی براءت کا اعلان کرتے وقت جنھوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو پھر تاکید فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جوش میں ان عہد شکن مشرکوں کے ساتھ، ان مشرکوں کے ساتھ بھی خلاف ورزی کی جائے جنھوں نے اس معاہدہ کو قائم رکھا ہے:

﴿ كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾

(۹/ التوبة:۷)

”مشرکوں کو کیسے اللہ کے پاس اور اس کے رسول کے پاس کوئی عہد ہو، مگر وہ جن سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک معاہدہ کیا، جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم ان سے سیدھے رہو، بے شک اللہ کو تقویٰ والے خوش آتے ہیں۔“

''سیدھے رہنے'' کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں، تم بھی اس عہد کو پورا کرتے رہو اور جو لوگ اپنے عہد کو اس احتیاط سے پورا کریں، ان کا شمار تقویٰ والوں میں ہے، جو قرآن پاک کے محاورہ میں تعریف کا نہایت اہم لفظ ہے اور تقویٰ والے اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضا مندی کی دولت سے سرفراز ہوتے ہیں، نتیجہ یہ نکلا کہ معاہدہ کا ایفا اللہ تعالیٰ کی خوشی اور پیار کا موجب ہے اور یہ وہ آخری انعام ہے جو کسی نیک کام پر بارگاہِ الٰہی سے کسی کو مل سکتا ہے۔

قرآن مجید میں قریب قریب اسی عہد کے معنی میں ایک اور لفظ عقد کا استعمال کیا گیا ہے:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ﴾ (٥/ المآئدۃ:١)

''مسلمانو! (اپنے) قراروں کو پورا کرو۔''

عقد کے لفظی معنی گرہ اور گرہ لگانے کے ہیں اور اس سے مقصود لین دین اور معاملات کی باہمی پابندیوں کی گرہ ہے اور اصطلاح شرعی میں یہ لفظ معاملات کی ہر قسم کو شامل ہے، چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

''اوفوا بالعهد'' اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مشابہ ہے ﴿یاایھا الذین امنوا اوفوا بالعقود﴾ اور اس قول میں تمام عقد مثلاً: عقد بیع، عقد شرکت، عقد یمین، عقد نذر، عقد صلح اور عقد نکاح داخل ہیں، خلاصہ یہ کہ اس آیت کا اقتضا یہ ہے کہ دو انسانوں کے درمیان جو عقد اور جو عہد قرار پا جائے اس کے مطابق دونوں پر اس کا پورا کرنا واجب ہے۔'' ❶

لیکن عقد کا لفظ جیسا کہ کہا گیا صرف معاملات سے تعلق رکھتا ہے اور عہد کا لفظ اس سے بہت زیادہ عام ہے، یہاں تک کہ تعلقات کو اس ہمواری کے ساتھ قائم رکھنا بھی جس کی توقع ایک دوسرے سے ایک دو دفعہ ملنے جلنے سے ہو جاتی ہے، حسن عہد میں داخل ہے، صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ''مجھ کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ کسی عورت پر رشک نہیں آیا، میرے نکاح سے تین سال پیشتر ان کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ ان کا ذکر کیا کرتے تھے اور بکری ذبح کرتے تھے تو اس کا گوشت ان کی سہیلیوں کے پاس ہدیہ بھیجا کرتے تھے۔'' ❷ یعنی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد بھی ان کی سہیلیوں کے ساتھ وہی سلوک قائم رکھا جو ان کی زندگی میں جاری تھا، امام بخاری نے کتاب الادب میں ایک باب باندھا ہے جس کی سرخی یہ ہے ''حسن العهد من الايمان'' اور اس باب کے تحت میں اسی حدیث کا ذکر کیا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں حاکم اور بیہقی کے حوالہ سے یہ روایت کی ہے کہ ایک بڑھیا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، آپ ﷺ نے اس سے کہا کہ ''تم کیسی رہیں، تمہارا کیا حال

❶ تفسیر کبیر، ج ٥، ص: ٥٨٥۔ ❷ بخاری، کتاب الادب، باب حسن العهد من الايمان: ٦٠٠٤۔

ہے، ہمارے بعد تمہارا کیا حال رہا؟'' اس نے کہا کہ اچھا حال رہا، جب وہ چلی گئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ آپ نے اس بڑھیا کی طرف اس قدر توجہ فرمائی؟ فرمایا: ''عائشہ! یہ خدیجہ کے زمانہ میں ہمارے یہاں آیا کرتی تھی اور حسنِ عہد ایمان سے ہے''۔ ❶ یعنی اپنے ملنے جلنے والوں سے حسب توقع یکساں سلوک قائم رکھنا ایمان کی نشانی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک مشہور حدیث میں فرمایا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ہر خطبہ میں اس کو ضرور فرمایا کرتے تھے:

((لا دين لمن لا عهد له)) ❷

''جس میں عہد نہیں، اس میں دین نہیں۔''

یعنی اس قول وقرار کو جو بندہ اللہ سے کرتا ہے، یا بندہ بندہ سے کرتا ہے، پورا کرنا حق اللہ اور حق العباد کو ادا کرنا ہے، جس کے مجموعے کا نام دین ہے، اب جو اس عہد کو پورا نہیں کرتا، وہ دین کی روح سے محروم ہے۔

---

❶ فتح الباری، ج ۱۰، ص: ۳٦٥۔ ❷ مسند احمد، ج ۳، ص: ۱۳٥، ۱٥٤، ۲۱۰، ۲٥۱۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى ﴾ (۱۶/ النحل: ۹۰)

’’اللہ انصاف اور (لوگوں کے ساتھ) احسان کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔‘‘

انصاف تو کسی کی تکلیف وآرام اور رنج وراحت کی پروا نہیں کرتا، وہ ہر ایک کو اس کا واجبی حق دے دیتا ہے، لیکن احسان میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے عدل کے ساتھ اس کا ذکر کیا، پھر احسان کی ایک خاص اور متداول صورت یعنی قرابت داروں کی مالی امداد کا ذکر کیا، لیکن احسان مالی امداد کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ احسان کے اور بھی مختلف طریقے ہیں اور عام لوگوں کے علاوہ باپ، ماں، قرابت دار، یتیم، محتاج، قرابت دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی، آس پاس کے بیٹھنے والے، مسافر اور لونڈی غلام اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء (۴: ۳۶) کی ایک آیت میں ان لوگوں کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے اور باپ ماں کے ساتھ احسان کرنے کی متعدد آیتوں میں تاکید کی ہے۔ (بقرہ: ۸۳، انعام: ۱۵۱، بنی اسرائیل: ۲۳، احقاف: ۱۵)

بہر حال یہ احسان تو ہر شخص کے فرائض میں داخل ہے، لیکن جن کی مالی وسعت کا دائرہ جتنا بڑا ہے اسی کے مطابق اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے احسان کے دائرہ کو وسیع کرے اور ہر شخص کو اپنے جاہ و مال سے فائدہ پہنچائے، یہی وجہ ہے کہ قارون کی قوم نے اس سے یہ اخلاقی مطالبہ کیا:

﴿ وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ﴾ (۲۸/ القصص: ۷۷)

’’اور جس طرح سے اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، تو بھی (اوروں کے ساتھ) احسان کر۔‘‘

احسان کی ایک اہم صورت یہ ہے کہ کسی کو مصیبت سے نجات دلائی جائے، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ سے نجات دلائی تھی، اس کو وہ اس کا بڑا احسان سمجھتے ہیں:

﴿ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ ﴾ (۱۲/ یوسف: ۱۰۰)

’’اور (اس کے سوا) اس نے مجھ پر (اور بھی بڑے بڑے) احسان کیے ہیں کہ (بے کسی کی سفارش کے) مجھ کو قید سے نکالا۔‘‘

غرض مالی امداد دینا یا کسی کو مصیبت سے نجات دلانا احسان کی اہم صورتیں ہیں، اس کے علاوہ اور بھی سینکڑوں شریفانہ اور فیاضیانہ افعال ہیں، جن کو اللہ نے احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، مثلاً: عورتوں کو قانونی حیلے نکال نکال کر دق کرنا برا کام تھا، جس سے روکا گیا اور فرمایا گیا کہ اگر کسی عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنا پسند نہ ہو تو خوبی کے ساتھ اس کو الگ کر دو، فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی ﴾ (١٦/ النحل: ٩٠)

''اللہ انصاف اور (لوگوں کے ساتھ) احسان کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔''

انصاف تو کسی کی تکلیف وآرام اور رنج وراحت کی پروانہیں کرتا، وہ ہر ایک کو اس کا واجبی حق دے دیتا ہے، لیکن احسان میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے عدل کے ساتھ اس کا ذکر کیا، پھر احسان کی ایک خاص اور متداول صورت یعنی قرابت داروں کی مالی امداد کا ذکر کیا، لیکن احسان مالی امداد کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ احسان کے اور بھی مختلف طریقے ہیں اور عام لوگوں کے علاوہ باپ، ماں، قرابت دار، یتیم، محتاج، قرابت دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی، آس پاس کے بیٹھنے والے، مسافر اور لونڈی غلام اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء (۳۶:۴) کی ایک آیت میں ان لوگوں کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے اور باپ ماں کے ساتھ احسان کرنے کی متعدد آیتوں میں تاکید کی ہے۔ (بقرہ:۸۳، انعام:۱۵۱، بنی اسرائیل:۲۳، احقاف:۱۵)

بہر حال یہ احسان تو ہر شخص کے فرائض میں داخل ہے، لیکن جن کی مالی وسعت کا دائرہ جتنا بڑا ہے اسی کے مطابق اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے احسان کے دائرہ کو وسیع کرے اور ہر شخص کو اپنے جاہ و مال سے فائدہ پہنچائے، یہی وجہ ہے کہ قارون کی قوم نے اس سے یہ اخلاقی مطالبہ کیا:

﴿ وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ﴾ (٢٨/ القصص: ٧٧)

''اور جس طرح سے اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، تو بھی (اوروں کے ساتھ) احسان کر۔''

احسان کی ایک اہم صورت یہ ہے کہ کسی کو مصیبت سے نجات دلائی جائے، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ سے نجات دلائی تھی، اس کو وہ اس کا بڑا احسان سمجھتے ہیں:

﴿ وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْٓ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ ﴾ (١٢/ یوسف: ١٠٠)

''اور (اس کے سوا) اس نے مجھ پر (اور بھی بڑے بڑے) احسان کیے ہیں کہ (بے کسی کی سفارش کے) مجھ کو قید سے نکالا۔''

غرض مالی امداد دینا یا کسی کو مصیبت سے نجات دلانا احسان کی اہم صورتیں ہیں، اس کے علاوہ اور بھی سینکڑوں شریفانہ اور فیاضانہ افعال ہیں، جن کو اللہ نے احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، مثلاً: عورتوں کو قانونی حیلے نکال نکال کر دق کرنا برا کام تھا، جس سے روکا گیا اور فرمایا گیا کہ اگر کسی عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنا پسند نہ ہو تو خوبی کے ساتھ اس کو الگ کر دو، فرمایا:

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۹)

''طلاق (جس کے بعد رجوع بھی ہو سکتا ہے وہ تو دو ہی طلاقیں ہیں جو) دو دفعہ (کر کے دی جائیں) پھر (دو طلاقوں کے بعد یا تو) دستور کے مطابق (زوجیت میں) رکھنا ہے یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا۔''

اسی طرح اگر تم پر کسی کا کچھ واجب ہو تو اس کو بھی خوبی کے ساتھ ادا کر دو اور اس کی ادائی میں لیت ولعل اور حجت حوالہ نہ کیا کرو، فرمایا:

﴿ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۷۸)

''پھر جس (قاتل) کو اس کے بھائی (طالب قصاص) سے کوئی جزو (قصاص) معاف کر دیا جائے، تو (جان کے بدلے خون بہا اور وارث مقتول کی طرف سے اس کا) مطالبہ دستور (شرع) کے مطابق اور (قاتل کی طرف سے) وارث مقتول کو خوش معاملگی کے ساتھ (خون بہا کا) ادا کر دینا۔''

قصورواروں کے قصور کو معاف کرنا اور ان کے مقابلہ میں غصہ کو پی جانا بھی احسان ہے، اللہ تعالیٰ نے اس احسان کو یہ درجہ دیا ہے کہ جو اس صفت سے متصف ہوں وہ بھی اللہ کے محبوب بندوں میں ہوں گے:

﴿ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۳٤)

''اور اللہ ان محسنوں (یا نیکی کرنے والوں) کو پیار کرتا ہے۔''

احسان کے لیے قرآن کا ایک اور لفظ فضل ہے، اگر کوئی منکوحہ سے خلوت کیے بغیر اس کو طلاق دے دے، تو شوہر پر نصف [1] مہر واجب ہوتا ہے، یہ تو قانون ہوا، مگر اخلاقی حکم یہ ہے کہ یا تو عورت اس نصف کو بھی معاف کر دے اور کچھ نہ لے تو یہ عورت کا حسن خلق ہے اور شوہر پورا ادا کر دے اور آدھا کاٹے نہیں، تو یہ مرد کا حسن خلق ہے، اس کے بعد ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۳۷)

''اور آپس [2] میں فضل مت بھولو، بے شک اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔''

کسی غریب یا کسی عزیز و قریب سے کوئی ایسی حرکت ہو جائے جس سے ناراضی پیدا ہو جائے، تو بھی احسان والوں کا فرض یہی ہے کہ وہ معاف کریں اور اپنے احسان سے باز نہ آئیں۔ [3] فرمایا:

[1] یعنی جس حالت میں کہ مہر مقرر ہو چکا ہو، ورنہ صرف چند کپڑے لازم آتے ہیں۔

[2] سعید سے روایت ہے ''آپس میں فضل کو مت بھولو'' یعنی ''احسان کو مت بھولو'' ابن جریر طبری، ج ۲، ص: ۳۲۵ مصر۔

[3] کشاف زمخشری تفسیر آیت مذکور ج ۱، ص: ۱۹۲ بعضوں نے یہاں ''فضل'' سے فضیلت دینی اور کسی نے فضل مالی مراد لیا۔

﴿ وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ ﴾ (۲۴/ النور:۲۲)

''اور تم میں جو احسان اور کشائش والے ہیں وہ قرابت داروں، غریبوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دینے کی قسم نہ کھالیں، ان کو چاہیے کہ معاف کریں اور درگزر کریں۔''

احسان کے اسی وسیع معنی میں اسلام نے ایک جامع لفظ ''معروف'' کا استعمال کیا ہے، یعنی ہر وہ چیز جس کی خوبی عقلاً وشرعاً معلوم ہو، معروف میں داخل ہے، قرآن کریم کا حکم ہے:

﴿ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۹۹)

''اور نیکی کرنے کو کہہ۔''

اور اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ

((كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ)) [1]

''ہر نیکی ثواب کا کام ہے۔''

اور یہ ایک ایسا صدقہ ہے جس کے لیے غریب وامیر کی تخصیص نہیں، بلکہ ہر مسلمان پر فرض ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہر مسلمان پر صدقہ فرض ہے۔'' صحابہ نے عرض کیا کہ اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو کیا کرے؟ فرمایا ''کمائے اور خود فائدہ اٹھائے اور صدقہ کرے۔'' صحابہ نے عرض کیا کہ اگر اس کو کمانے کی قدرت نہ ہو یا وہ نہ کمائے؟'' فرمایا: ''غریب حاجت مند کی اعانت کرے''۔ صحابہ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کرے؟ فرمایا ''نیکی کے کرنے کا حکم دے۔'' صحابہ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کر سکے؟ ارشاد ہوا کہ ''برائی سے باز رہے، کیونکہ یہ اس کے لیے صدقہ ہے۔'' اسی معنی کے لحاظ سے حدیث میں آیا ہے کہ ''آدمی اپنے اہل وعیال پر جو کچھ صرف کرتا ہے وہ صدقہ ہے، کسی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا بھی اسی میں داخل ہے۔'' [2] اسی معنی میں قرآن مجید نے ایک اور لفظ ''بر'' کا استعمال کیا ہے اور اس وسیع دائرے میں کافر و مسلم سب کو شامل کر لیا ہے:

﴿ لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ ﴾ (۶۰/ الممتحنة:۸)

''جو لوگ تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور انھوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ان کے ساتھ احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے تو اللہ تم کو منع کرتا نہیں (کیونکہ) اللہ منصفانہ برتاؤ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم میں کچھ ایسے لوگ تھے جو نامسلموں پر صدقہ کرنا ثواب کا کام نہیں سمجھتے تھے، اس پر یہ حکم آیا

[1] صحيح بخاري، كتاب الادب، باب كل معروف صدقة:۶۰۲۱۔
[2] ايضًا:۶۰۲۳؛ فتح الباري، ج۱۰، ص:۳۷۴۔

کہ ہدایت بخشنا تمہارا نہیں، میرا کام ہے، تم کو بلا امتیاز ہر ایک مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ نیکی کرنی اور اپنی نیت ٹھیک رکھنی چاہیے، تم کو اپنی نیت کا ثواب ملے گا، [1] ارشاد ہوا:

﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۷۲)

''تیرا ذمہ نہیں ان کو راہ پر لے آنا، لیکن اللہ راہ پر لے آتا ہے، جس کو چاہے اور تم جو دو گے خیرات سو اپنے واسطے اور تم نہیں دیا کرتے لیکن اللہ کی خوشی چاہ کر اور جو دو گے خیرات وہ تم کو پوری مل جائے گی اور تمہارا حق مارا نہ جائے گا۔''

گویہ احسان کی ایک خاص صورت ہے، مگر اس کی وسعت میں ساری دنیا سمائی ہے۔ نیکی کا بدلہ نیکی سے دینا اسلام کا وہ اصول ہے جس پر ثواب و عذاب کا دارومدار ہے، جو نیک کام کریں گے ان کو اللہ کے ہاں سے نیک ہی جزا ملے گی، ارشاد ہوا:

﴿ هَلْ جَزَاۗءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴾ (۵۵/ الرحمٰن:۶۰)

''اور بھلائی کا بدلہ کیا ہے، مگر بھلائی۔''

گویہ آیت مبارکہ اپنے سیاق کے لحاظ سے آخرت میں نیک کاموں کے نیک بدلہ ملنے سے متعلق ہے، مگر لفظوں کے لحاظ سے اس اصول کی وسعت دنیا اور آخرت دونوں کو شامل ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی ضرورت قرض کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے، دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اس بوجھ کو ہلکا کیا ہے، قرضداروں پر احسان کرنا، ضرورت مندوں کو قرض دینا اور تنگ دست مقروضوں کو مہلت دینا جو قرض ادا کرنے سے بالکل مجبور ہوں، ان کا قرض معاف کر دینا ثواب کا کام بتایا ہے۔ عرب میں سود خواری نے لوگوں کو اس قدر بے رحم اور سنگ دل بنا دیا تھا کہ جو لوگ قرض ادا نہیں کر سکتے تھے، وہ غلاموں کی طرح فروخت کر دیے جاتے تھے اور جو قیمت ملتی تھی، اس سے ان کا قرض ادا کیا جاتا تھا، آج اس تمدن کے زمانہ میں قرض کی زنجیر مقروضوں کے لیے اتنی ہی بھاری ہے، بلکہ سرمایہ داری کے موجودہ نظام نے اس کو اور زیادہ بھاری بنا دیا ہے، قرآن پاک کی ایک ہی آیت اس سارے نظام کو تہ و بالا کرتی ہے:

﴿ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۸۰)

''اور اگر (کوئی) تنگ دست (تمہارا مقروض) ہو تو فراخی تک کی مہلت (دو) اور اگر سمجھو تو تمہارے حق میں یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس کو (اصل قرضہ بھی) بخش دو۔''

---

[1] ابن جریر، ج۳، ص: ۵۸، ۵۹ وابن کثیر، ج۱، ص: ۳۲۳ بحوالہ نسائی تفسیر آیت مذکورہ۔

اور رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں خود اللہ تعالیٰ کی زبان سے یہ بیان فرما کر کہ ''قیامت کے دن میں خود تین آدمیوں کا فریق ہوں گا، جن میں سے ایک وہ شخص ہے، جس نے آزاد شخص کو فروخت کیا اور اس کی قیمت کھائی۔'' 1 اس کو اور بھی مؤکد کر دیا اور قرض کے معاملے میں تنگدستوں پر احسان کرنے کی متعدد صورتیں بتائیں، یعنی مہلت دینا، قرض کا معاف کرنا اور انسانیت کے ساتھ تقاضا کرنا اور اس کو ایک ایسا ثواب کا کام بتایا کہ اگر ایک شخص اس کے سوا نیکی کا اور کوئی کام نہ کرے، تب بھی صرف یہی ایک کام اس کی مغفرت کا ذریعہ ہو سکتا ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ''ایک شخص جو نیکی کا کوئی کام نہیں کرتا تھا، لوگوں کو قرض دیتا تھا اور جب اس کو کوئی مقروض تنگ دست نظر آتا تھا تو اپنے ملازموں سے کہتا تھا کہ اس سے درگزر کرو، شاید اللہ ہم سے بھی درگزر کرے، چنانچہ اللہ نے اس کے صلہ میں اس سے درگزر کیا۔'' دوسری حدیث میں ہے کہ ''تم سے پہلے ایک شخص تھا، جس سے موت کے بعد فرشتوں نے سوال کیا کہ تم نے نیکی کا کوئی کام کیا ہے؟ اس نے کہا، کوئی نہیں، فرشتوں نے کہا، ذرا یاد کرو، اس نے کہا کہ میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا، اگر مقروض فراخ دست ہوتا تھا تو قرض کے لینے میں آسانی کرتا تھا اور اگر تنگ دست ہوتا تھا تو اس کو مہلت دیتا تھا یہ کہ فراخ دست مقروض کو مہلت دیتا تھا اور تنگ دست کا قرض چھوڑ دیتا تھا۔'' 2

اس قسم کی بہت سی روایتیں ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اللہ قیامت کی تکلیف سے اس کو نجات دے، وہ تنگ دست کو مہلت دے، یا اس کا قرض معاف کر دے۔'' 3 یہی روایت مسند ابن حنبل میں ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ ''جو شخص اپنے قرض دار کو مہلت دے گا، یا اس کا قرض معاف کر دے گا تو قیامت کے دن اللہ کے عرش کے سایہ میں ہوگا۔'' 4

غرض یہ ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کو کسی خاص معنی میں محدود نہیں کیا ہے، بلکہ اس کو نیکی کی ہر راہ میں وسیع کر دیا ہے، زندگی تو زندگی موت میں بھی اس نے اس اصول کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے ہر شے پر احسان کرنا فرض کیا ہے، تو اگر تمہیں کسی کو (کسی شرعی حکم کے سبب سے) جان سے مارنا بھی پڑے تو اس کو بھی اچھائی کے ساتھ مارو، کسی جانور کو ذبح کرنا چاہو تو بھی خوبی کے ساتھ کرو، چھرے کو خوب تیز کر لیا کرو اور اپنے ذبیحہ کو راحت دو۔'' 5

پھر یہ اصول کہ جو میرے ساتھ احسان کرے اسی کے ساتھ احسان کرنا چاہیے، محمد رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیم کے خلاف ہے، ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے آکر پوچھا کہ ''یا رسول اللہ ﷺ! میں کسی

---

1 بخاری، کتاب البیوع، باب اثم من باع حرا: ۲۲۲۷۔ 2 بخاری، کتاب البیوع، باب من انظر موسرا: ۲۰۷۷ ومسلم، کتاب المساقاۃ، باب فضل انظار المعسر: ۳۹۹۳۔

3 مسلم، کتاب المساقاۃ، باب فضل انظار المعسر: ۴۰۰۰۔ 4 مسند احمد، ج۵، ص: ۳۰۸۔

5 صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب الامر باحسان الذبح: ۵۰۵۵۔

شخص کے پاس سے گزرتا ہوں تو وہ میری مہمانی نہیں کرتا، تو کیا جب اس کا گزر مجھ پر ہو تو میں بھی اس کی کج خلقی کا بدلہ یہی دوں۔ فرمایا: ”نہیں، تم اس کی مہمانی کرو۔“ ❶

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا: ”ایسے نہ بنو کہ خود تمہاری گرہ کی عقل نہ ہو، صرف دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرو، کہتے ہو کہ اگر لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں تو ہم بھی کریں گے، بلکہ اپنے آپ کو اس پر مطمئن کرلو کہ اگر دوسرے احسان کریں تو تم احسان کرو ہی گے اور اگر وہ برائی بھی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔“ ❷

لوگ احسان کو غلطی سے دولت وتمول یا اور دوسری بڑی بڑی باتوں کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ غریب کیا احسان کا کام کر سکتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ احسان اور نیکی کا کام کرنے کے لیے دولت کی نہیں، دل کی ضرورت ہے اور اس کی وسعت بہت دور تک پھیلی ہوتی ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک بدوی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت مبارک میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جس کے کرنے سے مجھے بہشت نصیب ہو، ارشاد ہوا: ”تمہاری تقریر گو مختصر ہے، لیکن تمہارا سوال بہت بڑا ہے، تم جانوں کو آزاد کرو اور گردنوں کو چھڑاؤ“۔ اس نے کہا، یا رسول اللہ ﷺ! کیا یہ دونوں باتیں ایک ہی نہیں؟ فرمایا: ”نہیں اکیلے اگر کسی کو آزاد کرتے ہو تو یہ جان کا آزاد کرنا ہے اور دوسرے کے ساتھ شریک ہو کر کسی کی آزادی کی قیمت میں مالی مدد دینا گردن چھڑانا ہے اور لگاتار دیتے رہو اور ظالم رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرو، اگر تم یہ بھی نہ کر سکو تو بھوکے کو کھلاؤ اور پیاسے کو پلاؤ اور نیکی کے کام کرنے کو کہو اور برائی کے کام سے باز رکھو اور اگر یہ بھی نہ کر سکو تو اپنے آپ کو بھلائی کے سوا اور باتوں سے روکو۔“ ❸

ایک دفعہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ایمان کے ساتھ کوئی عمل بتایئے، فرمایا: ”جو روزی اللہ نے دی اس میں سے دوسروں کو دے۔“ عرض کی، اے اللہ کے رسول! اگر وہ خود مفلس ہو؟ فرمایا: ”اپنی زبان سے نیک کام کرے۔“ عرض کی، اگر اس کی زبان معذور ہو۔ فرمایا: ”مغلوب کی مدد کرے۔“ عرض کی، اگر وہ ضعیف ہو، مدد کی قوت نہ ہو۔ فرمایا: ”جس کو کوئی کام کرنا نہ آتا ہو اس کا کام کر دے۔“ عرض کی، اگر وہ خود ایسا ہی ناکارہ ہو۔“ فرمایا: ”اپنی ایذا رسانی سے لوگوں کو بچائے رکھے۔“ ❹

❶ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الاحسان والعفو:٢٠٠٦۔ ❷ جامع ترمذی، ایضًا: ٢٠٠٧۔
❸ مستدرك حاكم، كتاب المكاتب، ج ٢، ص:٢١٧۔ ❹ مستدرك حاكم، كتاب الايمان، ج١، ص: ٦٣۔

عفوودرگزر

عفوودرگزر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے، اگر یہ نہ ہوتو دنیا ایک لمحہ کے لیے بھی آباد نہ رہے اور دم کے دم میں یہ گناہوں سے بھری ہوئی کائنات کی بستی سونی پڑ جائے، اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے عَفُو (درگزر کرنے والا) غافر، غفور اور غفار (معاف کرنے والا ہے) اس کی شان یہ ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُوا عَنِ السَّيِّاٰتِ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ:٢٥)

''اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں کو معاف کرتا ہے۔''

وہ چاہے تو انسانوں کے گناہوں کے سبب سے ان کو ایک دم ہلاک کر دے، یا ان کو معاف کر دے، فرمایا:

﴿ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ:٣٤)

''(اگر اللہ چاہے تو) گنا ہگاروں کو ان کے کرتوت کے سبب تباہ کر دے اور بہتوں کو معاف کر دے۔''

وہ اپنے شرمندہ بندوں کو اپنی غفاری کی شان کا یقین تاکید پر تاکید کر کے یوں دلاتا ہے:

﴿ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴾ (٢٠/ طٰہٰ:٨٢)

''اور اس میں شبہ نہیں کہ میں البتہ اس کی بڑی بخشائش کرتا ہوں جو توبہ کرے اور یقین لائے اور نیک کام کرے، پھر راہ پر رہے۔''

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دو جگہ اپنے کو غافر (بخشنے والا) پانچ دفعہ غفار (بڑی بخشائش کرنے والا) اور اتنے ہی دفعہ عفو (معاف کرنے والا) اور ستر سے زیادہ آیتوں میں غفور (بخشنے والا) کہا ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ اس کے عفوودرگزر کا سمندر کس زور وشور سے جوش مار رہا ہے، اللہ نے اپنی ساری صفتوں میں سے اپنی اسی صفت کی تجلی کا پرتو اپنے بندوں میں پیدا کرنے کی بے پردہ دعوت دی ہے۔ فرماتا ہے:

﴿ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴾ (٤/ النسآء:١٤٩)

''یا کسی برائی کو معاف کرو، تو بے شک ہے اللہ معاف کرنے والا قدرت والا۔''

انسان اگر اپنے کسی قصوروار کو معاف کرتا ہے، تو اس کی قدرت بہر حال کامل نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ جس کی قدرت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں، وہ معاف فرماتا ہے تو لاچار انسان کو اپنے قصوروں کو معاف کرنا کتنا زیبا اور سزاوار ہے، تو جس طرح قدرت والا ہمارے قصوروں کو معاف فرماتا ہے، اسی طرح ہم کو چاہیے کہ ہم بھی اپنے قصورواروں کو معاف کریں۔ [1]

اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکل سکتا ہے کہ اگر ہم اپنے قصورواروں کو معاف کریں گے تو اللہ تعالیٰ

[1] تفسیر ابن جریر، پارہ ٦، ج٦، ص:٤ وبحر محیط ابن حیان تفسیر سورۃ نسآء، ج٣، ص:٣٨٥۔

ہمارے قصوروں کو بھی معاف کرے گا، ایک دوسری آیت میں اس اشارہ کی پوری تصریح ہے، فرمایا:

﴿ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

(۲۴/ النور:۲۲)

''اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے اور اللہ معاف کرنے والا اور رحم والا ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو عفو و درگزر کی تعلیم اس ترغیب کے ساتھ دی ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو تو اللہ تمہیں معاف کرے گا اور جب اللہ غفور و رحیم ہے تو تم پر بھی اس کے اس ابر کرم کی کچھ چھینٹیں پڑنی چاہییں، چنانچہ جن مومنوں کے لیے اللہ نے جزائے خیر کا وعدہ فرمایا ہے، ان کی ایک صفت یہ بتائی ہے:

﴿ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴾ (۴۲/ الشوری:۳۷)

''اور جب غصہ آئے تو وہ معاف کرتے ہیں۔''

سکون کی حالت میں معاف کرنا اتنا مشکل نہیں، جتنا غصہ کی حالت میں، جب انسان کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا، لیکن اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ جن میں یہ جوہر ہوتا ہے، وہ اس حالت میں بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں اور قصور والوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

یہ تو کسی ذاتی غیظ و غضب کی حالت ہوئی، لیکن اس سے بڑھ کر وہ موقع ہے جہاں مذہبی اختلاف درمیان میں ہے، کہ ان احمقوں کو اچھی بات بتائی جاتی ہے اور وہ نہیں مانتے، ان کے دعویٰ کی کمزوری ثابت کی جاتی ہے، مگر وہ اپنی بات پر اڑے ہیں اور حق کا جواب لایعنی گفتگو سے اور برا بھلا کہہ کر دیتے ہیں، ایسے موقع پر ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ۭ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ؀ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۹۸۔۱۹۹)

''اور اگر تم ان کو راہِ راست کی طرف بلاؤ تو (تمہاری ایک) نہ سنیں اور (بظاہر) وہ تم کو ایسے دکھائی دیتے ہیں کہ (گویا) وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں، حالانکہ وہ دیکھتے نہیں، (اے پیغمبر) درگزر (کا شیوہ) اختیار کرو اور (لوگوں سے) نیک کام (کرنے) کو کہو اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔''

کیونکہ ایسے موقع پر دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو تبلیغ و دعوت کا کام بند کر دیا جائے، یا تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں ان ناگواریوں کو برداشت کیا جائے، اللہ نے اسی دوسری صورت کے اختیار کرنے کا حکم دیا

اور فرمایا کہ ان ناگواریوں کو برداشت کرو اور نیکی کا حکم دیتے رہو، صرف یہی نہیں بلکہ اس سلسلے میں برائی کا جواب بھلائی کے ساتھ دو:

﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۹۶)

''(اگر کوئی تمہارے ساتھ بدی کرے تو) بدی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کرو جو بہت ہی اچھا ہو، جو کچھ وہ تمہاری نسبت کہا کرتے ہیں وہ ہم کو خوب معلوم ہے۔''

مذہبی جماعت کے لیے اس سے بھی زیادہ اشتعال انگیز موقع وہ ہوتا ہے، جب کچھ لوگ ان لوگوں کو بھی ان سے الگ کرنا چاہتے ہیں جو ان کی جماعت میں شامل ہو چکے ہیں، لیکن اللہ نے اس موقع پر بھی مسلمانوں کو عفو ودرگزر کا حکم دیا ہے:

﴿ وَدَّ كَثِیْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۰۹)

''(مسلمانو)! اکثر اہل کتاب باوجود یہ کہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے (پھر بھی) اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دیں، تو معاف کرو اور درگزر کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم صادر فرمائے۔''

اسی طرح مشرک بھی جو قیامت پر یقین نہیں رکھتے تھے اگر غصہ دلانے والی کوئی بات کریں تو ان نادانوں کو معاف کر دینا چاہیے کیونکہ وہ اگر نہیں، تو تم تو قیامت کی جزا وسزا کے قائل ہو، اس لیے سمجھنا چاہیے کہ اگر وہ تمہارے ساتھ برائی کرتے ہیں تو آج نہیں تو کل اس کا بدلہ ان کو مل جائے گا، فرمایا:

﴿ قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰهِ لِیَجْزِیَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ۝ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْهَا ۫ ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ۝ ﴾

(۴۵/ الجاثیۃ:۱۴۔۱۵)

''ایمان والوں سے کہہ دے کہ ان کو جو اللہ کے جزا وسزا کے واقعات پر یقین نہیں رکھتے معاف کر دیا کریں، تاکہ لوگوں کو ان کے کاموں کا بدلہ ملے، جس نے اچھا کیا اس نے اپنے بھلے کے لیے کیا اور جس نے برا کیا اس نے اپنا برا کیا، پھر تم اپنے پروردگار کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔''

اس آیت کے شان نزول میں لکھا ہے کہ کسی منافق یا کافر نے کسی مسلمان سے کوئی بدتمیزی کی بات کہی تھی اس پر بعض مسلمانوں کو طیش آیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری اور مسلمانوں کو عفو ودرگزر کی نصیحت

فرمائی، ❶ (تفسیر کبیر امام رازی زیر آیت بالا ج ۵ ص: ۵۸۹)

غم وغصہ کے اظہار کا اصلی وقت وہ آتا ہے جب انسان کی عزت وآبرو پر حملہ کیا جائے، لیکن اس حالت میں بھی اسلام نے عفو ودرگزر سے کام لینے کا حکم دیا ہے، چنانچہ حضرت مسطح رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار تھے اور وہ ان کی کفالت کرتے تھے، لیکن جب انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تہمت میں حصہ لیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی مالی امداد بند کردی، ❷ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوٓا أُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

❶ اس قسم کی آیتوں کے متعلق جن میں کفار سے عفو ودرگزر کی نصیحت ہے، عام مفسروں کا نظریہ یہ ہے کہ وہ جہاد سے پہلے کی بات ہے، جہاد نے کفار کے حق میں عفو ودرگزر کے ہر حکم کو منسوخ کر دیا ہے لیکن مفسروں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو جہاد کے حکم اور عفو ودرگزر کی نصیحت کے درمیان کوئی منافات نہیں سمجھتے اور اس لیے ایک سے دوسرے کو منسوخ نہیں جانتے، امام رازی نے اپنی تفسیر میں کئی موقعوں پر اس کی تصریح کی ہے لکھتے ہیں "اس آیت ﴿ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۹۹) میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ جاہلوں کی بد اخلاقی پر صبر کریں اور ان کی بیہودہ باتوں اور کمینہ حرکتوں کا جواب اسی قسم کی باتوں اور حرکتوں سے نہ دیا جائے اور اس میں قتال سے باز رہنے کی کوئی ہدایت نہیں کیونکہ جاہلوں سے اعراض برتنے اور مشرکوں سے قتال میں کوئی تضاد نہیں اور جب دونوں باتیں ایک ساتھ ہو سکتی ہیں، تو نسخ ماننے کی ضرورت نہیں مگر ظاہر پرست مفسرین بے ضرورت ناسخ ومنسوخ آیتوں کی تعداد بڑھانے کے عاشق ہیں۔" جلد ۴ صفحہ ۴۹۶۔

ایک اور آیت ﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ (۲۳/ المومنون:۹۶) کی تفسیر میں لکھتے ہیں: کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں کیونکہ نرمی برتنے پر ہر حال میں آمادہ کیا گیا ہے جب تک اس سے دین اور اخلاق میں کوئی نقصان نہ پیدا ہو۔ (ج ۶ صفحہ ۳۰۰)

آیت ﴿ وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۶۳) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"کلبی اور ابوالعالیہ نے کہا ہے کہ اس آیت کو قتال کے حکم نے منسوخ کر دیا لیکن اس نسخ کے ماننے کی ضرورت نہیں، کیونکہ احمقوں سے چشم پوشی کرنا اور ان کا مقابلہ نہ کرنا عقل اور شرع دونوں میں مستحسن ہے اور عزت وآبرو اور پرہیزگاری کی سلامتی کا باعث ہے۔ ج ۶ صفحہ ۴۹۷ طبع دار الطباعۃ العامرۃ مصر۔

آیت ﴿ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ ﴾ (۴۵/ جاثیہ:۱۴) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اکثر مفسروں نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے کیونکہ کفار پر عفو وکرم کے عموم میں یہ بھی داخل ہو جاتا ہے کہ ان سے قتال نہ کیا جائے لیکن جب خدا نے ان سے قتال کا حکم دیا تو عفو وکرم کے حکم کا نسخ ہو گیا، لیکن قریب بہ صحت یہ ہے کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کافروں سے جھگڑا نہ کیا جائے اور ان کی تکلیف دہ باتوں اور وحشیانہ حرکتوں سے درگزر کیا جائے۔ (جلد ۷، صفحہ ۴۸۴ طبع مذکور) میرے نزدیک اوپر کی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں اور دوسرے قصورواروں کے ان ہی قصوروں کے معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو ہے اور وہ حقوق العباد ہیں، یعنی وہ مسلمانوں کا ذاتی قصور کریں تو مسلمان معاف کر دیں اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس سے کفر وشرک اور عصیان الٰہی کے قصوروں کی معافی لازم آتی ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو سرے سے حاصل نہیں اور قتال وجہاد حقوقِ الٰہی کے مقابلہ میں مشروع ہوا ہے اس لیے جہاد کی آیتیں اس مغفرت اور عفو ودرگزر کے اخلاقی احکام میں خلل انداز نہیں، درمنثور میں ابن عساکر سے حضرت ابومسلم خولانی صحابی رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنی ایک کافرہ لونڈی کا قصور یہی آیت پڑھ کر معاف کیا تھا اس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ (ج ۶ صفحہ:۳۵ مصر)

❷ تفسیر کبیر امام رازی، ج ٤، تفسیر سورہ نور، ص: ٦٥٢۔

(۲۴/ النور:۲۲)

''اور تم میں سے جو لوگ صاحب احسان اور کشائش والے ہیں، قرابت والوں اور محتاجوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مدد خرچ) نہ دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں، بلکہ (چاہیے کہ ان کے قصور) بخش دیں اور درگزر کریں، (مسلمانو)! کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کر دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس آیت کے آخری ٹکڑے سے ظاہر ہے کہ جو دوسروں کے قصور کو معاف کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے قصور سے درگزر فرمائے گا۔

یہ اخلاقی وصف انتہا درجہ کی کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر ان اخلاقی اوصاف کے ساتھ کیا ہے جو کشادہ دلی سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کا صلہ بھی ایسا عطا فرمایا ہے جو انتہا درجہ کی وسعت رکھتا ہے:

﴿ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۳۳۔۱۳۴)

''اور اپنے پروردگار کی بخشائش اور اس جنت کی طرف لپکو جس کا پھیلاؤ (اتنا بڑا ہے) جیسے زمین و آسمان، (کا پھیلاؤ، بجی سجائی) ان پرہیزگاروں کے لیے تیار ہے، جو خوشحالی اور تنگ دستی (دونوں حالتوں) میں (اللہ کے نام پر) خرچ کرتے اور غصے کو روکتے اور لوگوں (کے قصوروں) سے درگزر کرتے ہیں اور (لوگوں کے ساتھ) نیکی کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے۔''

اوپر کی آیت میں متقیوں کے دو وصف ایک ہر حال میں راہ الٰہی میں دینا اور دوسرا لوگوں کو معاف کرنا اور درگزر کرنا اور ان کے لیے دو جزائیں، ایک اللہ کی مغفرت اور دوسری وسیع جنت بیان کی گئی ہیں، اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ہر حال میں اللہ کی راہ میں دینے کا معاوضہ تو جنت ہے، جس کی حد و پایاں آسمان و زمین ہے اور غصہ کو روکنا اور لوگوں کو معاف کرنے کی جزا یہ ہوگی کہ اللہ کی مغفرت ہمارے شامل حال ہوگی اور وہ احکم الحاکمین ہم کو بھی معاف کرے گا۔

عفو و درگزر کی اس اخلاقی تعلیم میں اگر قوت اور قدرت کا جزو شامل نہ ہو تو وہ سراسر کمزوری اور دنایت پسندی کے مترادف ہو جائے، اسی لیے اسلام نے اس اخلاقی تعلیم کے درس میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے اور موجودہ انجیل کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کر دو، جو ذلت اور پست طبعی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے، کیونکہ اسلام نے عفو درگزر کی

ایسی معتدل تعلیم دی ہے، جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی قائم رہتی ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ۝ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ۝ ﴾ (الشوریٰ:۳۹۔۴۰)

''اور جو ایسے (غیرت مند) ہیں کہ جب ان پر (کسی طرف سے) بے جا زیادتی ہوتی ہے، تو وہ (واجبی) بدلہ لے لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی، اس پر (بھی) جو معاف کردے اور صلح کرلے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے، بے شک وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

برائی کا بدلہ برائی، جماعت کا قانون ہے اور عفو ودرگزر افراد کا اخلاقی کمال ہے، جماعتی قانون کی قوت موجود ہوتے ہوئے افراد کا آپس میں عفو ودرگزر سے کام لینا ایک بلند اخلاقی مثال ہے، جس کی مزدوری کی ذمہ داری احکم الحاکمین نے اپنے ذمہ لی ہے اور بتادیا ہے کہ ظلم کرنے والے خواہ وہ ہوں جو بے سبب پہلے ظلم کر بیٹھیں، یا وہ ہوں جو انتقام کے جوش میں آگے بڑھ جائیں، اللہ کی محبت سے محروم ہیں۔

اس حق کے حاصل ہوجانے کے بعد عفو ودرگزر خودداری کے منافی نہیں ہوتا، بلکہ بڑی ہمت کا کام ہوجاتا ہے کہ قدرت کے باوجود اور اشتعال ہونے پر بھی اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر عفو ودرگزر کرتا ہے، اسی لیے فرمایا:

﴿ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۝ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۴۳)

''اور البتہ جو شخص صبر کرے اور (دوسرے کی خطا) بخش دے تو بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔''

ایک اور آیت میں اس خصلت کو بڑی خوش قسمتی سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کی تاثیر دکھائی ہے کہ اس سے کیوں کر دشمنی دوستی کی صورت میں بدل جاتی ہے:

﴿ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ۝ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ۝ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۝ ﴾

(۴۱/ حٰمٓ السجدۃ:۳۴۔۳۶)

''اور بھلائی اور برائی برابر نہیں، (اگر کوئی برائی کرے تو اس کا) جواب اچھائی سے دو پھر تو تیرے اور جس کے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہوجائے گا گویا دوست ہے، ناتے والا اور یہ بات ملتی ہے انہیں کو جن میں صبر ہے اور یہ بات ملتی ہے اس کو جس کی بڑی قسمت ہے اور اگر (اس میں) شیطان کے کونچنے سے کوئی کونچ تجھ کو لگ جائے، تو اللہ کی پناہ ڈھونڈھ، بے شک وہی ہے سنتا جانتا۔''

آیت کے اخیر ٹکڑے سے واضح ہوتا ہے کہ غصہ اور اشتعال کے سبب سے عفوو درگزر کے خلاف انسان سے جو حرکت ہو جاتی ہے، وہ شیطانی کام ہے، اس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے، کہ انہوں نے کہا:

''اللہ نے اس آیت میں ایمان والوں کو غیظ وغضب میں صبر کا اور نادانی و جہالت کے وقت حلم و بردباری کا اور برائی کے مقابلہ میں عفوو درگزر کا حکم دیا ہے، جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ ان کو شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گا۔'' ❶

ابومسعود صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی، جان لو، جان لو، مڑ کر دیکھا تو آنحضرت ﷺ تھے، فرما رہے تھے کہ ''اے ابومسعود! جتنا قابو تم کو اس غلام پر ہے، اس سے زیادہ اللہ کو تم پر ہے۔'' ابومسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی اس نصیحت کا یہ اثر مجھ پر ہوا کہ میں نے پھر کسی غلام کو نہیں مارا۔

ایک شخص نے حضور انور ﷺ سے آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے خادم کا قصور کتنا معاف کروں؟ آپ پہلے تھوڑی دیر چپ رہے، اس نے پھر یہی پوچھا، تب آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر روز ستر دفعہ۔'' ❷ اس سے مقصود نبوی ﷺ تعداد کی تحدید نہیں بلکہ عفوو درگزر کی کثرت ہے۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ عفوو درگزر سے ان کے رعب وداب اور وقار میں فرق آ جائے گا، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، انتقام سے گو فوری جذبہ کی تسکین ہو جاتی ہے اور کمزوروں پر دھاک بیٹھ جاتی ہے، مگر اس سے کسی پائیدار شریفانہ عزت کا خیال نہیں پیدا ہوتا، یہ چیز عفوو درگزر ہی سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا شریفانہ وقار بالآخر سب پر چھا جاتا ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

((وَمَا زَادَ اللّٰهُ رَجُلًا بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا)) ❸

''اور اللہ اس شخص کو جو عفوو درگزر کرتا ہے، نہیں بڑھاتا ہے مگر عزت میں۔''

---

❶ ابن کثیر تفسیر القرآن العظیم، تفسیر سورة حمٓ السجدة، ج٤، ص: ١٠١ آیت مذکور۔

❷ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب النهی عن ضرب الخدام: ١٩٤٨ اور باب ماجاء فی العفو: ١٩٤٩ میں یہ دونوں حدیثیں ہیں۔ ❸ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی التواضع: ٢٠٢٩۔

حلم وبردباری

حلم وبردباری کے معنی یہ ہیں کہ انتقام کی قدرت کے باوجود کسی ناگوار یا اشتعال انگیز بات کو برداشت کرلیا جائے اور قصوروار سے اس کے لیے کوئی تعرض نہ کیا جائے، یہ قدرت سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، لیکن اس قدرت کے باوجود وہ اکثر اپنے بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہے، انتقام نہیں لیتا اور اسی لیے اس نے اپنے آپ کو حلم کے ساتھ متصف کیا ہے اور جہاں جہاں اپنی اس صفت کا اظہار کیا ہے، ساتھ ہی اپنے علم اور اپنی بخشش کا بھی ذکر کردیا ہے، تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا یہ حلم اس کے علم کے باوجود صرف اس کی بخشش کا نتیجہ ہے، فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۵، ۵/ المائدۃ:۱۰۱)

''اور اللہ ہے بخشنے والا بردبار۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۵)

''بے شک اللہ ہے بخشنے والا بردبار۔''

﴿ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴾ (۱۷/ بنی اسرآءیل:۴۴، ۳۵/ فاطر:۵۱)

''بے شک وہ (اللہ) ہے بخشنے والا بردبار۔''

ان سب آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت حلم کے ساتھ اپنی صفت مغفرت کا ذکر کردیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اس کی یہ بردباری نعوذ باللہ کسی ضعف یا عدم قدرت کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کی شان غفاری کا نتیجہ ہے۔

دوسری جگہ حلم کے ساتھ اپنی صفت علم کو شامل کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴾ (۴/ النسآء:۱۲)

''اور اللہ ہے جاننے والا بردبار۔''

﴿ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴾ (۲۲/ الحج:۵۹)

''بے شک ہے اللہ جاننے والا بردبار۔''

﴿ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵۱)

''اور ہے اللہ جاننے والا بردبار۔''

ان آیتوں سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ انسانوں کی طرح بے جانے بوجھے، یا محدود علم کے سبب سے بردباری نہیں کرتا، بلکہ پورے علم اور ہر چیز اور ہر نتیجہ سے باخبر ہو کر بردباری فرماتا ہے، ایک جگہ اپنی بردباری کے ساتھ اپنی صفت استغنا کا بھی ذکر فرماتا ہے:

﴿ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶۳)

''اور اللہ مستغنی اور تحمل والا ہے۔''

یہ صدقہ کے موقع کی آیت ہے، اس لیے یہ ظاہر فرمادیا کہ وہ مستغنی ہے اور بردبار ہے۔

انسانوں میں بردباری اکثر کسی نہ کسی قسم کی کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہے، مثلاً: انتقام کے مقابلہ میں حلم، اگر اس برائی کرنے والے کورام کرنے کے لیے کسی کو زیادہ قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی کمزوری ہے کہ اس کو انتقام سے زیادہ حلم نفع بخش معلوم ہوتا ہے، لیکن اللہ کی ذات ہر حیثیت سے غنی ہے، اس کا حلم کامل استغنا کے ساتھ ہے۔

حلم گو اخلاقی حیثیت سے ہر حالت میں تعریف کے قابل ہے، لیکن اس کی ایک حیثیت ایسی ہے کہ اس سے بعض کم فہموں کے نزدیک حلیم اور بردبار آدمی کی کمزوری کا راز فاش ہوتا ہے اور اسی لیے اس کے مقابلہ میں ان میں سرکشی اور بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اس کمزوری سے واقف تھا، اس لیے اس نے اپنے حلم اور داروگیر دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دی ہے، تاکہ اس سخت گیری کے سبب سے بندوں میں مایوسی اور بردباری کے سبب سے سرکشی نہ پیدا ہو، فرمایا:

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۳۵)

''اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو تمہارے دلوں میں ہے، تو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ بخشش والا ہے تحمل والا۔''

یہ آیت عورت کے نکاح ثانی کے سلسلہ میں ہے، یعنی جب تک اس کی عدت کے دن پورے نہ ہوں کوئی چھپے چوری بھی اس سے نکاح کا وعدہ نہ لے اور نکاح نہ کرے، دل میں رہے تو کوئی حرج نہیں، اس کے بعد ارشاد ہے کہ اللہ کو تمہارے دل کا ہر بھید معلوم ہے، ایسے عالم الغیب سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی، اس لیے ایک طرف تو اس کی گرفت سے ہمیشہ ڈرتے رہو، دوسری طرف اس کی بخشش اور بردباری بھی عام ہے، اس لیے اس سے پرامید بھی رہنا چاہیے۔

نیکی کے کاموں میں مخلصانہ خرچ کرنے کی اللہ تعالیٰ قدر فرماتا ہے اور ایسے لوگوں کے گناہ معاف کرتا ہے، اس موقع پر اس کا ارشاد ہے:

﴿ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴾

(٦٤/ التغابن:١٧)

''اگر تم اللہ کو قرض دو اچھی طرح قرض دینا تو وہ اس کو دوگنا کردے گا اور تمہیں معاف کرے گا اور اللہ ہے قدردان اور تحمل والا۔''

اس کی قدردانی تو یہ ہے کہ وہ ایک کے بدلہ دو دے گا اور تحمل یہ ہے کہ دینے والے کے گناہ کو معاف کرے گا۔

اس آیت میں تحمل اور بردباری کا ایک فلسفیانہ نکتہ بھی چھپا ہے، کسی قصوروار کے کسی قصور پر جب ہم کو غصہ آتا ہے تو اس وقت اس عیب کے سوا اس کے سارے ہنر ہماری آنکھوں سے چھپ جاتے ہیں اور اس کی خوبیاں نظر انداز ہو جاتی ہیں، اس لیے ہمارا غصہ پوری طرح تیز ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ سامنے رہے کہ اس سے ایک غلطی ہوئی ہے۔ یا اس میں ایک عیب ہے، مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں، تو اس کی ان خوبیوں کی قدر کر کے اس کی غلطی سے درگزر کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس کی مخلصانہ خیرات کی خوبی کی قدر فرما کر وہ اس کی غلطی سے درگزر کرتا ہے۔

صفتِ حلم سے انبیائے کرام بھی متصف فرمائے گئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام جن کی بنیادوں پر محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں اسلام کی عمارت تعمیر ہوئی ہے، خاص طور سے اس وصف سے سرفراز ہوئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بت پرست باپ کو ہر طرح سے سمجھایا اور چاہا کہ وہ کسی طرح عذاب الٰہی سے بچ جائے، انہوں نے اس کافر باپ کے ہاتھوں طرح طرح کے ظلم سہے اور آخر مجبور ہو کر اس سے علیحدگی پر مجبور ہوئے، پھر بھی ان کی بردباری اور تحمل کا سررشتہ ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا اور اس وقت تک اس کے حق میں دعائے خیر کرتے رہے، جب تک ان کو پوری مایوسی نہیں ہوگئی اور ان کو قطعی طور سے معلوم نہیں ہوگیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے، اس واقعہ کے سلسلہ میں ہے:

﴿ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۱۴)

''اور (نہ تھا) ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا مانگنا، مگر ایک وعدہ (کی وجہ) سے جو ابراہیم نے اپنے باپ سے کر لیا تھا، پھر ان کو (بھی) جب معلوم ہوگیا کہ یہ اللہ کا دشمن ہے تو باپ سے (مطلقاً) دست بردار ہو گئے، بے شک ابراہیم البتہ بڑے نرم دل (اور) بردبار تھے (کہ باپ کے کافر ہونے کے باوجود اللہ سے اس کی مغفرت مانگنے کا وعدہ کر لیا تھا)۔''

دوسری آیت میں اس موقع پر جہاں قوم لوط کی بربادی کی خبر پا کر وہ اللہ تعالیٰ سے عرض معروض کرتے ہیں، ان کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴾ (۱۱/ ھود:۷۵)

''بے شک ابراہیم علیہ السلام بردبار، نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔''

قرآن مجید کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلم، عفو و درگزر، رفق و ملاطفت اور صبر و استقلال

کے مجموعہ کا نام ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی توصیف میں حلیم کے ساتھ اکثر غفور کا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وصف میں اواہ کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلم کے لیے عفو و درگزر اور رفق و ملاطفت لازمی ہیں۔ لیکن ایک اور آیت میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسبت فرمایا ہے:

﴿ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴾ (۳۷/ والصافات:۱۰۱)

''تو ہم نے ان کو (ابراہیم علیہ السلام کو) ایک بڑے بردبار لڑکے (اسماعیل علیہ السلام کے پیدا ہونے) کی خوشخبری دی۔''

اس کے بعد جب ان کی قربانی کا حکم ہوا ہے تو انہوں نے کہا:

﴿ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾

(۳۷/ والصافات:۱۰۲)

''اے باپ آپ کو جو حکم ہوا ہے (بے تامل) اس کی تعمیل کیجیے، انشاء اللہ آپ مجھ کو بھی صابر ہی پائیں گے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ صبر حلم کا ایک ضروری جزو ہے۔ حلم کی صفت اللہ کو نہایت محبوب ہے، چنانچہ ایک شخص کی نسبت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو اللہ پسند کرتا ہے، یعنی حلم اور جلد بازی نہ کرنا۔'' ❶ یعنی کوئی بات پیش آئے تو بے سوچے سمجھے غصہ میں کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا چاہیے۔

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے بار بار یہ درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے، آپ ﷺ نے ہر بار یہ جواب دیا کہ ''غصہ نہ کرو۔'' اگر غصہ آ بھی جائے تو اس کو ضبط کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''پہلوان وہ نہیں ہے جو لوگوں کو کشتی میں پچھاڑ دے، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔'' ❷ ایک اور حدیث میں ہے کہ ''جو شخص باوجود قدرت کے غصہ کو ضبط کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلا کر انعامِ خاص کا مستحق ٹھہرائے گا۔'' ❸

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرے کچھ رشتہ دار ہیں، میں ان کے ساتھ ملتا ہوں، ❹ وہ کاٹتے ہیں میں بھلائی کرتا ہوں، وہ بدی کرتے ہیں، وہ میرے ساتھ جہالت کرتے ہیں، میں تحمل کو راہ دیتا ہوں، آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ ''اگر یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تم کہتے ہو، تو تم ان کے منہ میں گرم راکھ بھرتے ہو اور جب تک اس حالت پر قائم رہو گے اللہ کی طرف سے تمہاری مدد ہوتی رہے گی''۔ ❺

---

❶ ترمذی، ابواب البرّ والصلة، باب ماجاء في التأني والعجلة:۲۰۱۱۔ ❷ بخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب:۶۱۱۴، ۶۱۱۶۔ ❸ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب في کظم الغیظ:۲۰۲۱۔ ❹ یعنی صلہ رحم کرتا ہوں۔
❺ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب صلة الرحم:۶۵۲۵ وادب المفرد امام بخاری، باب فضل صلة الرحم:۵۲۔

رفق ولطف

رفق ولطف کے معنی یہ ہیں کہ معاملات میں سختی اور سخت گیری کے بجائے نرمی اور سہولت اختیار کی جائے۔ جو بات کی جائے نرمی سے، جو سمجھایا جائے وہ سہولت سے اور جو مطالبہ کیا جائے وہ میٹھے طریقہ سے کہ دلوں کو موہ لے اور پتھر کو بھی موم کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی آیتوں میں اپنے کو ''لطیف'' فرمایا ہے، [1] اور حدیثوں میں اس کا نام رفیق آیا ہے، [2] جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے ہر قسم کے بندوں کے ساتھ ان کی خبر گیری اور رزق کا سامان پہنچانے میں رفق ولطف فرماتا ہے اور اپنے اس تلطف میں وہ ان کی اطاعت اور عدم اطاعت کی پروانہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بے سان گمان جس طرح امارت کے رتبہ تک پہنچایا اور ان کے خاندان کو جن غیر متوقع ذریعوں سے مصر لے آیا اور دشمن بھائیوں کو جس طرح ان کے سامنے نادم وشرمندہ کر کے ان کے آگے سرنگوں کر دیا، اس کو یاد کر کے وہ فرماتے ہیں:

﴿ إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَآءُ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْعَلِيمُ ٱلْحَكِيمُ ۝ ﴾ (١٢/ يوسف:١٠٠)

''بے شک میرا رب لطف کرنے والا ہے، جس بات کا چاہے، بے شک وہی علم والا حکمت والا ہے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کو جو مشکلیں پیش آئیں اور پھر وہی مشکلیں جس طرح ان کی کامیابی کا ذریعہ بنیں، ان کی حکمت کو اللہ ہی جانتا تھا اور اسی کو اس کی خبر تھی۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ رفق ولطف کا اظہار اس طرح فرماتا ہے:

﴿ ٱللَّهُ لَطِيفٌۢ بِعِبَادِهِۦ يَرْزُقُ مَن يَشَآءُ ۖ وَهُوَ ٱلْقَوِيُّ ٱلْعَزِيزُ ۝ ﴾ (٤٢/ الشورىٰ:١٩)

''اللہ اپنے بندوں پر لطف فرماتا ہے، جس کو چاہتا ہے روزی دیتا ہے اور وہی قوت والا غالب ہے۔''

اس آیت کے اوپر قیامت کے تعلق سے مومنوں اور کافروں کا ذکر ہے اور نیچے بھی ان دونوں قسموں کا تذکرہ ہے، بیچ میں یہ آیت ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لطفِ الٰہی کافر ومومن دونوں کے ساتھ ہے کہ

---

[1] راغب اصفہانی ''لطیف'' کے مختلف معنوں میں سے ایک معنی یہ بتاتے ہیں: ''وہ اپنے بندوں کی راہنمائی میں نرمی (رفق) فرماتا ہے۔'' (لفظ لطف المفردات فی غریب القرآن، لام مع الطاء ص:۴۶۶) امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں نقل کرتے ہیں: ''اللہ کا نام لطیف اس لیے ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی اور آسانی چاہتا ہے اور ان کے لیے صلاح اور نیکی کے اسباب کا فیضان کرتا ہے، لطیف اس لیے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی فرماتا ہے، ان کے ساتھ اس طرح لطف کرتا ہے جس کا علم بھی ان کو نہیں ہوتا اور اس طرح ان کی مصلحتوں کا سامان فراہم کرتا ہے جس کا گمان بھی ان کو نہیں ہوتا۔ ابن الاعرابی کا قول ہے، لطیف وہ ہے جو تمہاری ضرورت کو تم تک ملائمت (رفق) سے پہنچا دیتا ہے۔'' (صفحہ ۴۷ الٰہ آباد)۔

امام غزالی کہتے ہیں: ''اس صفت کا مستحق وہی ہے جو نازک اور باریک مصلحتوں کو جانتا ہے، پھر ان کو نرمی کے طریق سے، سختی سے نہیں، اس تک پہنچاتا ہے جس کے حق میں وہ مفید ہیں۔ جب عمل میں نرمی اور ادراک میں لطافت ہو تو لطیف کے معنی پورے ہوتے ہیں اور اس کمال کا تصور خدا ہی کے لیے ہے۔'' (روح المعانی تفسیر سورہ شوریٰ پارہ ۲۵، جزء ۲۵، ص:۲۵)

[2] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل الرفق:٦٦٠١۔

دونوں کو یکساں وہ رزق پہنچاتا ہے، ❶ اور اسی لیے قیامت کو راز رکھنا بھی اس کے الطاف بے کراں کا ایک نتیجہ ہے۔

ملت حنیف کے پیشوا حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے کافر باپ کے حق میں جب دعائے مغفرت کے طالب ہوئے تو بارگاہ الٰہی میں گو یہ دعا مستجاب نہ ہوئی، ❷ مگر ابراہیم علیہ السلام خلیل کی نرم دلی اور دردمندی کی مدح فرمائی گئی، ارشاد ہوا:

﴿ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۱۴)

''بے شک ابراہیم نرم دل بردبار تھے۔''

اسی طرح جب وہ قوم لوط کی گناہگار قوم کی سفارش کے لیے کھڑے ہوئے تو یہ درخواست بھی گو قبول نہ ہوئی، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مدح وتوصیف فرمائی گئی کہ

﴿ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝ ﴾ (۱۱/ ھود:۷۵)

''بے شک ابراہیم بردبار، نرم دل، حق کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔''

اواہ کے معنی میں مفسروں کا اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے کہ جو بہت دعائیں مانگتا ہو، دوسرا اس کے معنی نرم دل بتاتا ہے اور تیسرا دردمند کہتا ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ تینوں باتیں پوری اترتی ہوں، وہ ہر شخص کی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتے تھے، وہ دردمند تھے اور دردمندی کی راہ سے ایسا کرتے تھے، یا دل کے نرم تھے، اس لیے جلد پسیج جاتے تھے اور یہ اس لیے ایسا تھا کہ ملت حنیف کا داعی ہر ایک کو اپنے سے ملانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام فرعون جیسے سنگ دل اور ظالم بادشاہ کے دربار میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب حق کی تبلیغ کے لئے بھیجے جاتے ہیں تو ان کو تبلیغ کے یہ آداب سکھائے جاتے ہیں:

﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۴۴)

''سو تم دونوں اس سے نرم بات کہنا، شاید وہ نصیحت پائے یا (اللہ سے) ڈرے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نرمی اور نرم خوئی تبلیغ کی کامیابی کی پہلی شرط ہے اور اسی لیے دینِ حنیف کے مبلغ اعظم اور توحید کے داعی اکبر محمد رسول اللہ ﷺ کو رحمتِ الٰہی نے خاص طور سے اس کا حصہ وافر عنایت فرمایا تھا۔ خود حضور ﷺ کو خطاب کرکے ارشاد ہوتا ہے:

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۵۹)

''تو اللہ کی رحمت کے سبب سے تم ان کے لیے نرم دل ہوئے اور اگر تم مزاج کے اکھڑ اور دل

---

❶ تفسیر روح المعانی میں مقاتل کا یہی قول ہے صاحب روح المعانی اور امام فخر رازی بھی عموم کو واضح جانتے ہیں (ج ۲۵، ص: ۲۵)۔

❷ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کی حالت پر اطلاع پاکر اس کے بعد اس سے اپنی علیحدگی ظاہر کردی۔

کے سخت ہوتے، تو یہ لوگ تمہارے پاس سے تتر بتر ہو گئے ہوتے۔‘‘

اس لیے ایک پیغمبر کے لیے یہ وصف نہایت اہم ہے، تاکہ لوگوں کو اس کی تعلیم و دعوت کی طرف میلان ہو اور وہ اس کے حلقہ اطاعت سے باہر نہ ہونے پائیں اور اسی لیے رحمت عالم ﷺ کی ذاتِ پاک میں یہ وصف سب سے نمایاں طور پر ودیعت کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو خاص اپنی رحمت کا نتیجہ قرار دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حلم و بردباری، عفو و درگزر، چشم پوشی اور خوش خلقی غرض ان تمام اخلاق کے عطر کا نام جن میں شانِ جمالی پائی جاتی ہے، یہی رفق وتلطف اور نرم دلی و نرم خوئی ہے۔ جس طرح حسنِ فطرت زینت و آرائش سے دو بالا ہو جاتا ہے، اسی طرح رفق و نرمی کی خو سے انسان کا اخلاقی حسن دو چند ہو جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ حقیقت ان لفظوں میں سمجھائی، فرمایا:

((ان الرفق لایکون فی شيء الا زانه ولاینزع من شيءٍ الا شانه)) [1]

’’نرمی جس چیز میں ہو اس کو زینت دیتی ہے اور جس چیز سے الگ کر لی جاتی ہے، اس کو بدنما بنا دیتی ہے۔‘‘

’’جس چیز‘‘ کا لفظ کتنا عام ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں نرمی کام کو بنا دیتی اور سختی بگاڑتی ہے، الا یہ کہ شریعت اور قانون یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ’’اللہ نرم خو (رفیق) ہے اور نرم خوئی کو پسند کرتا ہے اور نرم خوئی پر جو کچھ دیتا ہے وہ سختی پر اس کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں دیتا۔‘‘ [2] جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’’جو نرمی سے محروم رہا، وہ بھلائی سے محروم رہا۔‘‘ [3] اور فرمایا کہ ’’تین خصلتیں جس شخص میں ہوں گی اللہ اپنے سایہ کو اس پر پھیلائے گا اور اس کو جنت میں داخل کرے گا، یعنی کمزور کے ساتھ نرمی کرنا، باپ ماں پر مہربانی کرنا اور غلام پر احسان کرنا۔‘‘ [4]

اسی اخلاقی وصف کی تعلیم آپ ﷺ نے دوسرے الفاظ میں یوں دی:

((الا اخبر کم بمن یحرم علی النّار وتحرم علیه النّار، علی کل قریب هین سهل)) [5]

’’کیا میں تم لوگوں کو بتاؤں کہ کون شخص آگ پر حرام ہے اور کس پر آگ حرام ہے، ہر اس شخص پر جو لوگوں سے قریب ہو، نرم ہو اور آسان ہو۔‘‘

---

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فی فضل الرفق: ٦٦٠٢۔

[2] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فی فضل الرفق: ٦٦٠١۔ [3] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فی فضل الرفق: ٦٥٩٨ تا ٦٦٠٠۔ [4] ترمذی، ابواب صفة القیامة، باب فیه أربعة أحادیث: ٢٤٩٤۔

[5] ترمذی، ابواب صفة القیامة، باب فضل کل قریب هین سهل: ٢٤٨٨۔

ایک بار یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ "السام علیکم" یعنی تم کو موت آئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سمجھ گئیں اور انہوں نے جواب میں کہا "وعلیکم السام واللعنة" یعنی تم کو موت آئے اور تم پر لعنت ہو، رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ "عائشہ ٹھہر جاؤ، اللہ تمام کاموں میں نرمی پسند کرتا ہے۔" بولیں، یا رسول اللہ ﷺ! انہوں نے جو کچھ کہا کیا آپ ﷺ نے نہیں سنا، فرمایا: "میں نے بھی تو کہہ دیا کہ علیکم یعنی "تم پر۔" [1]

آنحضرت ﷺ کے جواب میں یہ خوبی ہے کہ بات وہی ہوئی، مگر اس میں سختی کا نشان نہیں اور پھر اس طرح سے ہے کہ مخاطب ذرا سوچے تو خود بخود اس کا دل شرمندہ ہو۔ شریعت کا قانون اور جماعت کی مصلحت جس سختی کا مطالبہ کرتی ہے، اس کا موقع وہ ہے جب کوئی شخص حدود الٰہی میں سے کسی حد کو توڑ ڈالے اور جماعت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو، چنانچہ کفار اور منافقین جب سمجھانے سے نہ سمجھیں اور اپنی ضد پر اڑے رہیں، بلکہ مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے درپے ہوں، تو ان کے شر کو روکنے اور ان کی سازشوں کے قلع و قمع کرنے کے لیے ان پر پوری سختی کی جاسکتی ہے، فرمایا:

﴿ يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ﴾ (٦٦/ التحريم: ٩)

"اے پیغمبر ﷺ! کافروں اور دغابازوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو۔"

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ﴾

(٩/ التوبة: ١٢٣)

"اے مسلمانو! اپنے نزدیک کے کافروں سے لڑتے جاؤ اور چاہیے کہ وہ تم میں کڑا پن پائیں۔"

اسی طرح شریعت کے گناہگاروں کو جب سزا دی جائے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اس کے اجرا میں نرمی نہ برتیں، مسلمان بدکار مردوں اور بدکار عورتوں کی سزا کے متعلق فرمایا:

﴿ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ﴾

(٢٤/ النور: ٢)

"اور اللہ کے حکم چلانے میں تم کو ان دونوں پر ترس نہ آئے، اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔"

آنحضرت ﷺ کے مکارمِ اخلاق کا جو بیان حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، اس میں بھی نرمی اور

[1] بخاری، کتاب الادب، باب الرفق فی الامر کله: ٦٠٢٤۔

سختی کے مواقع میں یہی امتیاز کی حد قائم کی گئی ہے۔ام المومنین رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا، البتہ جب احکام الٰہی کی خلاف ورزی کی جاتی تو آپ اس کو سزا دیتے تھے۔" [1] امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک خاص باب میں اس قسم کی متعدد حدیثیں نقل کی ہیں، جن میں آپ ﷺ نے مسلمانوں بلکہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن تک پر کسی کسی بات میں سختی برتی ہے۔ [2] حافظ ابن حجر اس باب کی شرح میں لکھتے ہیں:

"گو امام بخاری اس باب میں یہ اشارہ کرتے ہیں کہ جس حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ تکلیفوں پر صبر کرتے تھے وہ آپ کے ذاتی حق سے متعلق ہے، لیکن اللہ کے حق میں آپ اس قدر سختی سے کام لیتے تھے جس کا اللہ نے حکم دیا تھا۔" [3]

آنحضرت ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کرتے تھے کہ "آسانی کرو، سختی نہ کرو۔" [4] شارحین حدیث نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ نوافل ومباحات میں سختی نہ برتی جائے اور شریعت نے جس حد تک گنجائش اور وسعت رکھی ہو اس میں تنگی نہ کی جائے۔ایک صحابی سے ایک دفعہ روزہ میں ایک شرعی غلطی ہوگئی، انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضور کی خدمت میں لے چلو، ان سب نے معاملہ کی اہمیت کے ڈر سے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو انہوں نے اکیلے ہی خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوکر حقیقت حال عرض کی۔ارشاد ہوا: "ایک غلام کی گردن آزاد کرو۔" وہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر بولے کہ یا رسول اللہ ﷺ! اس گردن کے سوا میری کوئی ملکیت نہیں۔فرمایا: "لگاتار دو مہینے روزے رکھو۔" گزارش کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! روزہ ہی میں تو یہ حرکت ہوئی، پھر روزہ رکھوں، فرمایا: "ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔" عرض پرداز ہوئے کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے کہ ہم نے بھوک میں رات گزاری ہے۔فرمایا کہ "صدقہ کے فلاں محصل کے پاس جاؤ اور اس سے اتنے چھوہارے لے لو، اس سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا کر جو بچ رہے وہ خود کھاؤ۔" وہ صحابی رضی اللہ عنہ ہنسی خوشی اپنی قوم میں واپس آئے اور اپنی روداد بیان کرکے بولے کہ میں نے تمہارے پاس تنگی اور بری رائے اور نبی ﷺ کے پاس کشادگی اور اچھی رائے پائی۔ [5]

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب قول النبی ﷺ: یسروا ولا تعسروا: ٦١٢٦۔ [2] باب مایجوز من الغضب والشدة لامر اللّٰه تعالیٰ، رقم الباب (٧٥)۔ [3] فتح الباری، ج ١٠، ص: ٤٢٩۔

[4] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قول النبی ﷺ: یسروا ولا تعسروا: ٦١٢٥۔

[5] سنن ابی داود، کتاب الطلاق، باب فی الظهار: ٢٢١٣۔

تواضع وخاکساری

کبریائی اللہ تعالیٰ کی صفت خاص ہے، جس میں کوئی اس کا شریک نہیں:

﴿ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۠ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ (٤٥/ الجاثية: ٣٧)

''اور اسی کو بڑائی ہے، آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی زبردست ہے حکمت والا۔''

اس لیے بندوں کی شان نہیں کہ وہ کبریائی کریں، ان کی بندگی کی شان اس میں ہے کہ وہ تواضع و خاکساری اختیار کریں اور عاجزی وفروتنی برتیں۔

تواضع و خاکساری کے بہت سے مظہر ہیں، قرآن مجید نے ان میں سے نمایاں مظاہر کو لے کر بعض موقعوں پر ان کا حکم دیا ہے اور دوسرے موقعوں پر ان کو اپنے خاص بندوں کا وصف بتایا ہے، مثلاً: رسول اللہ ﷺ کو پہلے کفار سے درگزر کا، پھر مومنوں کے ساتھ پُر محبت تواضع کا حکم دیا ہے:

﴿ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (١٥/ الحجر: ٨٨)

''اور اپنا بازو مومنوں کے لیے جھکا دے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (٢٦/ الشعرآء: ٢١٥)

''اور اپنا بازو جھکا رکھ ان کے واسطے جو تیرے ساتھ ہوئے ہیں ایمان والے۔''

اولاد کو ماں باپ کے سامنے اسی پر محبت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ پیش آنا چاہیے:

﴿ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ ﴾ (بنی اسرآئیل: ٢٤)

''اور ماں باپ کے لیے عاجزی کا بازو مہر ومحبت سے جھکا دے۔''

''خفضِ جناح'' یعنی بازو جھکا دینا، تواضع و خاکساری سے استعارہ ہے۔ جناح پرندہ کے بازو کو کہتے ہیں، پرندہ جب زمین پر اترنے لگتا ہے یا تھک کر بیٹھنا چاہتا ہے تو اپنے بازوؤں کو جھکا دیتا ہے۔ اس سے یہ استعارہ [1] کیا گیا کہ انسان بھی خاکساری اور فروتنی سے اپنے بازوؤں کو نیچے کر لیتا ہے اور تکبر اور ترفع کی بلندی کے بجائے تواضع کی پستی کی طرف اترتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کا یہ وصف بتایا ہے:

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝﴾

(٢٥/ الفرقان: ٦٣)

''اور رحمت والے (اللہ) کے (خاص) بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں اور

[1] کتاب المثل السائر، باب النوع الثانی فی التشبیہ، ص: ١٦٠ مطبوعہ مصر: ١٣١٢ھ وتفسیر کبیر رازی تفسیر آیت جناح الذل، ج٥، ص: ٥٧٤ دارالطباعۃ العامرۃ۔

جب جاہل ان سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو (ان کو) سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)۔''

قرآن کی بلاغت یہ ہے کہ بندوں کو خاکساری کی تعلیم دینی تھی تو ان کو رحمت والے اللہ کے بندے کہہ کر نصیحت فرمائی گئی کہ اللہ جب رحمت اور مہر وکرم والا ہے تو اس کے بندوں میں خلق اللہ کے ساتھ تواضع اور ملنساری ظاہر ہو۔

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو یہ اخلاقی نصیحت کی:

﴿ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ ۚ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ۝ ﴾

(۳۱/ لقمان:۱۸۔۱۹)

''اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین پر اترا کر نہ چل (کیونکہ) اللہ کسی اترانے والے شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا اور اپنی رفتار میں میانہ روی (اختیار) کر اور (کسی سے بات کرے) تو ہولے سے بول (کیونکہ) بری سے بری آواز گدھوں کی آواز ہے۔''

اس آیت میں خاکساری اور تواضع کے مختلف مظاہر بتائے ہیں، بات کرنے میں لوگوں سے بے رخی نہ کی جائے، زمین پر اکڑ کر نہ چلا جائے، چال ڈھال میں غرور کا شائبہ نہ ہو اور نہ آواز میں غرور کے مارے سختی اور کرختگی ہو۔ لیکن یہ خیال میں رہے کہ تواضع وخاکساری اور دنایت وپستی میں بڑا فرق ہے۔ تواضع وخاکساری کا منشا یہ ہے کہ انسان میں کبر وغرور پیدا نہ ہو اور ہر شخص دوسرے کی عزت کرے اور دنایت وپستی کا مطلب یہ ہے کہ بعض ذلیل اغراض کے لیے انسان اپنی خودداری کو کھودے۔ چنانچہ ایسے موقع پر جہاں خاکسارانہ روش سے انسان کا ضعف ظاہر ہو، وہاں اسلام نے عارضی اور نمائشی طور پر خوددارانہ کبر وغرور کا حکم دیا ہے۔ صحابہ جب عمرہ کے لیے آئے تو چونکہ مدینہ کے وبائی بخار نے ان کو کمزور کر رکھا تھا، اس لیے کفار نے طنز کیا کہ محمد ﷺ اور ان کے اصحاب ضعف کی وجہ سے خانہ کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے، اس پر آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ طواف کے تین چکر اکڑ کر کریں، تاکہ مشرکوں پر ان کی طاقت کا اظہار ہو۔ [1]

قوت کے اظہار کا اصلی موقع جہاد میں پیش آتا ہے اور اس موقع پر اسلام نے خاکساری کے بجائے کبر وغرور کو پسند کیا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ ''بعض غرور کو اللہ ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے، جنگ وصدقہ کے موقع پر اترانا اللہ کو پسند ہے اور ظلم وفخر پر اترانا ناپسند۔'' [2]

[1] مسلم، كتاب الحج، باب استحباب الرمل في الطواف: ٣٠٥٥ وصحيح بخاري، كتاب المغازي، باب عمرة القضاء: ٤٢٥٦۔ [2] ابو داود، كتاب الجهاد، باب ما يؤمر من انضمام...... ٢٦٢٩۔

بہر حال اسلام میں خاکساری ایک شریفانہ خلق ہے اور ضعف، ذلت، بیچارگی اور بے سروسامانی سے مختلف ہے، ضعف و ذلت سے انسان پست رتبہ ہو جاتا ہے، لیکن خاکساری اس کو بلند رتبہ بنا دیتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص اللہ کے لیے خاکساری کرتا ہے اللہ اس کو بلند کر دیتا ہے۔'' ❶ ایک اور حدیث میں فرمایا کہ ''جو شخص عمدہ کپڑے پہننے کی استطاعت رکھتا ہے، لیکن وہ خاکساری سے اس کو نہیں پہنتا تو اللہ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلائے گا اور اس کو اختیار دے گا کہ ایمان کا جو حلّہ پسند کرے اس کو پہن لے۔'' ❷

غرض یہ ہے کہ تواضع کا حکم صرف اس لیے ہے کہ کوئی شخص اپنی قوت اور دولت کا بے جا استعمال نہ کرنے پائے، جس سے غریبوں اور کم استطاعت لوگوں کا دل دکھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ وحی بھیجی ہے کہ خاکساری اختیار کرو، تاکہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور کوئی کسی کے مقابل میں فخر نہ کرے۔'' ❸ اس سے معلوم ہوا کہ تواضع کا مقصد معاشرتی زندگی میں خوشگوار لطافت پیدا کرنا ہے اور یہی لطافت ہے جو ایک خاکسار شخص کی چال ڈھال اور بات چیت تک سے ظاہر ہونی چاہیے۔

---

❶ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی التواضع: ۲۰۲۹۔ ❷ ترمذی، ابواب صفة القیامة، باب البناء كله وبال: ۲۴۸۱۔ ❸ ابو داود، کتاب الادب، باب فی التواضع: ۴۸۹۵۔

خوش کلامی

خوش کلامی سے مقصد یہ ہے کہ باہم ایک انسان دوسرے انسان سے باتیں کرنے میں ایک دوسرے کے ادب واحترام اور لطف ومحبت کا پہلو ملحوظ رکھے، تاکہ آپس میں خوشگوار تعلقات پیدا ہوں اور باہم مروت اور محبت بڑھے۔ سلام کرنا، شکریہ ادا کرنا، حال پوچھنا، ایک دوسرے کو نیک دعائیں دینا، اچھی باتیں کرنا، اچھی باتیں سمجھانا، اسی ایک صفت کے مختلف جزئیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں بنی اسرائیل کو لوگوں کے ساتھ خوش کلامی کا جو حکم دیا تھا، اس کو قرآن پاک میں بھی دہرایا ہے:

﴿ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۳)

''اور کہو لوگوں سے اچھی بات۔''

اس اچھی بات کہنے میں لوگوں کے فائدہ اور کام کی باتوں کا کہنا، نصیحت کرنا، اچھی باتوں کی تعلیم اور تلقین کرنا بھی داخل ہے۔ ایک اور آیت میں یہی حکم دوسرے لفظوں میں اس طرح دیا گیا ہے کہ یہ وصف اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی پہچان بن جاتا ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ؀ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل:۵۳)

''اور اے (پیغمبر)! میرے بندوں سے کہہ دے کہ وہ بات کہیں جو سب سے اچھی ہو، بے شک شیطان جھگڑ پواتا ہے آپس میں، بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔''

آیت کے پچھلے حصہ میں دعویٰ کی دلیل بھی دے دی گئی ہے کہ خوش گوئی اور خوش کلامی آپس میں میل ملاپ پیدا کرتی ہے اور بدگوئی و بدکلامی پھوٹ پیدا کرتی ہے، جو شیطان کا کام ہے۔ وہ اس کے ذریعہ سے لوگوں میں غصہ، نفرت، حسد اور نفاق کے بیج بوتا ہے۔ اس لیے اللہ کے بندوں کو چاہیے کہ نیک بات بولیں، نیک بات کہیں، اچھے لہجہ میں کہیں اور نرمی سے کہیں کہ آپس میں میل ملاپ اور مہر ومحبت پیدا ہو۔ اسی لیے تنابز بالالقاب یعنی ایک دوسرے کو برے لفظوں اور نفرت اور تحقیر کے خطابوں سے پکارنے کی ممانعت آئی ہے۔ کسی کو کافر یا منافق اور تحقیر وکراہت کے دوسرے القاب سے مخاطب کرنا گویا اس میں اس اچھی بات کے خلاف جو آپ اس کو سمجھانا چاہتے ہیں، پہلے ہی سے نفرت اور ضد کا جذبہ پیدا کر دینا ہے، فرمایا:

﴿ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ﴾

(۴۹/ الحجرات:۱۱)

''اور نہ تم آپس میں ایک دوسرے کو طعن دو اور نہ چڑ کا نام لے کر پکارو، ایمان کے بعد گناہگاری برا نام ہے۔''

اسی لیے برائیوں کے تذکروں اور بدگوئیوں کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے، ارشاد ہے:

﴿ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ﴾ (٤/ النسآء: ١٤٨)

''اللہ کو بری بات کا پکارنا خوش نہیں آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو، (اس کو حق ہے کہ ظالم کے ظلموں کو بیان کرے)۔''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''مسلمان نہ طعنہ دیتا ہے، نہ لعنت بھیجتا ہے، نہ بدزبانی اور فحش کلامی کرتا ہے۔'' ❶ اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی شان اس قسم کی غیر مہذبانہ باتوں سے بہت اونچی ہونی چاہیے۔ اس کی زبان سے حق وصداقت، بہبودی وخیر خواہی اور نیکی اور بھلائی کے سوا کوئی اور بات نہ نکلے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو اللہ اور روز جزا پر یقین رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ اچھی بات بولے، ورنہ چپ رہے۔'' ❷ اس حدیث پاک میں ادھر اشارہ ہے کہ اللہ اور روز جزا پر یقین رکھنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ کلمہ خیر کے سوا کچھ اور زبان سے نہ نکلے، کیونکہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنا یہ بتاتا ہے کہ جو کرے گا وہ بھرے گا۔ اگر تمہیں بھی کوئی برا کہے تو ہو سکے تو چپ رہو کہ اس کی جزا آج نہیں تو کل اس کو مل کر رہے گی۔ ایک دفعہ آپ نے بار بار دوزخ کا ذکر فرمایا اور روئے انور پر اس کی تکلیفوں کے تصور سے اثر ظاہر ہوا۔ پھر ارشاد فرمایا: ''دوزخ سے بچو، اگرچہ چھوہارے کے ایک ٹکڑے کی خیرات سے ہو، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کوئی اچھی بات سے۔'' ❸

ایک دفعہ آپ ﷺ نے جنت کا ذکر فرمایا اور اس کی خوبی اور وسعت کو بیان کیا، ایک بدوی صحابی رضی اللہ عنہ مجلس میں حاضر تھے، بے تابانہ بولے کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ جنت کس کو ملے گی؟ فرمایا: ''جس نے خوش کلامی کی، بھوکوں کو کھلایا، اکثر روزے رکھے اور اس وقت نماز پڑھے جب دنیا سوتی ہو۔'' ❹

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اچھی بات صدقہ ہے۔'' ❺ یعنی جس طرح صدقہ دے کر کسی غریب کی حاجت روائی اور دل جوئی کی جاتی ہے، اسی طرح زبان کی مٹھاس سے اس کے زخموں پر پھاہا رکھا جا سکتا ہے اور کچی سعی وسفارش سے اس کو مدد پہنچائی جا سکتی ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! نجات کیونکر ملے؟ فرمایا: ''اپنی زبان پر قابو رکھو اور تمہارے گھر میں تمہاری گنجائش ہو اور اپنے گناہوں پر رویا کرو۔'' ❻ ایک دفعہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ آپ کو مجھ پر سب سے زیادہ کس چیز کا ڈر ہے آنحضرت ﷺ نے اپنی زبان مبارک کو پکڑ کر فرمایا: ''اس کا ڈر ہے۔'' ❼

---

❶ ترمذی، ابواب البروالصلة، باب ماجاء فی اللعنة: ١٩٧٧۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الحث علی اکرام الجار...... ١٧٣۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب طیب الکلام: ٦٠٢٣۔

❹ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی قول المعروف: ١٩٨٤۔ ❺ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب فضل من حمل متاع صاحبه فی السفر: ٢٨٩١۔ ❻ ترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء فی حفظ اللسان: ٢٤٠٦۔

❼ ترمذی، ابو اب الزهد، باب ما جاء فی حفظ اللسان: ٢٤١٠۔

ایثار

یہ درحقیقت فیاضی کا سب سے بڑا اور سب سے آخری درجہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ذاتی ضرورت پر مقدم رکھا جائے، خود بھوکا رہے اور دوسرے کو کھلائے، خود تکلیف اٹھائے اور دوسروں کو آرام پہنچائے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں انصار کا سب سے بڑا اخلاقی وصف یہ تھا کہ مکہ کے مہاجر جب بے خانماں ہو کر اور اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر مدینہ آئے تو انصار نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کو اپنے گھر دیے، باغ دیے، کھیت دیے، اپنی محنتوں میں ان کو شریک کیا [1] اور خود ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا کر ان کو آرام پہنچایا۔ پھر جب بنی نضیر کی زمین مسلمانوں کے ہاتھ آئی اور آنحضرت ﷺ نے دو انصاریوں کے سوا باقی ساری زمین مہاجروں کو دے دی تو انصار نے ہنسی خوشی اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی اور ان کی مدح وستائش کی۔ [2]

﴿ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْإِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (۵۹/ الحشر: ۹)

''اور ان کے واسطے جنہوں نے ان (مہاجروں کی آمد) سے پہلے اس مقام (مدینہ) میں اور ایمان میں جگہ پکڑی اور محبت رکھتے ہیں، اس پر جو اپنا گھر چھوڑ کر ان کے پاس چلا آیا اور ان (مہاجروں) کو دیے جانے سے دل میں کوئی مطلب نہیں رکھتے اور اپنے اوپر تنگی ہی کیوں نہ ہو (ان مہاجر بھائیوں کو) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے تو ایسے ہی لوگ فلاح پائیں گے۔''

بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ ''میں اس کو انصار کی جاگیروں میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں۔'' ان ایثار کے پیکروں نے عرض کی، جب تک ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی اتنا ہی نہ ملے، ہم کو یہ منظور نہیں۔ فرمایا ''اگر یہ منظور نہیں تو صبر کرو، میرے بعد تم کو یہ تکلیف پہنچے گی کہ لوگ لے لیں گے اور تم کو نہیں پوچھیں گے۔'' [3]

ایک دفعہ ایک مسلمان خاتون نے اپنے ہاتھ سے ایک چادر بن کر آنحضرت ﷺ کی خدمت

---

[1] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اخاء النبی ﷺ بین المهاجرین ۳۷۸۰تا۳۷۸۲۔

[2] تفسیر آیت ذیل ابن جریر طبری، پارہ ۲۸، ج۲۸، ص: ۲۷۔

[3] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب قول النبی ﷺ للانصار...: ۳۷۹۴۔

میں پیش کی، آپ ﷺ نے ضرورت مند ہو کر اس کے اس تحفہ کو قبول کر لیا۔ اسی وقت ایک غریب مسلمان نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ مجھے عنایت ہو، آپ نے اسی وقت اتار کر ان کے حوالہ کر دی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کو ملامت کی کہ تم جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس کی حاجت تھی اور آپ کسی کا سوال رد نہیں فرماتے۔ تم نے کیوں مانگ لی؟ بولے، ہاں میں نے تو برکت کے لیے لی ہے کہ یہی چادر میرا کفن بنے۔ ❶

ایک دفعہ ایک بھوکا آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا۔ کاشانہ نبوی ﷺ میں اس وقت پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص آج رات اس کو اپنا مہمان بنائے گا اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا۔'' یہ سعادت ایک انصاری کو حاصل ہوئی اور وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کچھ ہے؟ بولیں، صرف بچوں کا کھانا۔ بولے، بچوں کو سلا دو اور چراغ کو بجھا دو۔ ہم دونوں رات بھر بھوکے رہیں گے، البتہ مہمان پر ظاہر کریں گے کہ کھا رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ صبح کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تمہارے اس حسن سلوک سے بہت خوش ہوا۔'' ❷

بعض روایتوں میں ہے کہ اوپر کی آیت میں انصار کے جس ایثار کی تعریف کی گئی ہے، اس کا اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے ❸ لیکن قرآن پاک کا سیاق وسباق عموم کو چاہتا ہے، جس میں یہ واقعہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعے بھی شامل ہوں گے۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب حسن الخلق والسخاء: ٦٠٣٦ وکتاب الجنائز، باب من استعد الکفن: ١٢٧٧۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب اکرام الضیف وفضل ایثارہ. ٥٣٥٩ وصحیح بخاری، کتاب التفسیر: ٤٨٨٩۔ ❸ ایضاً۔

اعتدال اور میانہ روی

یہ اسلامی اخلاق کا وہ باب ہے، جس میں وہ منفرد ہے۔ اسلام کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کا راستہ اکثر مسئلوں کے افراط وتفریط کے بیچ سے نکلا ہے۔ قرآن پاک نے مسلمانوں کو ﴿ امةً وسطًا ﴾ ''بیچ کی امت'' کا خطاب جن وجوہ سے دیا ہے، ان میں یہ بھی ہے کہ ان کا مذہب افراط وتفریط کے درمیان ہے، [1] اس لیے اس نے اکثر معاملوں میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ عبادات میں بھی اس اصول کو وہ نہیں بھولا ہے۔ دعا یا نماز میں ہماری آواز کتنی ہو، ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۱۱۰)

''اور تو نہ پکار اپنی دعا (نماز) میں اور نہ چپکے پڑھ اور ڈھونڈ لے اس کے بیچ میں راہ۔''

یعنی نہ چلا کر دعا کی جائے یا نماز پڑھی جائے کہ نمائش ہو جائے، یا مخالف اس کو سن کر برا بھلا کہے اور نہ بالکل چپکے چپکے کہ ساتھ والے بھی نہ سن سکیں، بلکہ دونوں کے بیچ کی راہ اختیار کی جائے۔

ہماری چال کیسی ہو اس کی نسبت حضرت لقمان علیہ السلام کے نصائح میں ہے:

﴿ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ ﴾ (۳۱/ لقمان: ۱۹) ''اور چل بیچ کی چال۔''

یعنی اتنی تیز نہ ہو کہ چال میں متانت اور وقار نہ باقی رہے اور نہ اتنی دھیرے ہو کہ ریا کار زاہدوں کی نمائشی چال بن جائے۔ [2]

سخاوت اور فیاضی سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ سارے مذہبوں نے اس پر تاکید کی ہے اور جو جس قدر زیادہ لٹا سکے اسی قدر وہ تعریف کے قابل سمجھا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے اس راہ میں بھی بے اعتدالی سے پرہیز کیا ہے اور اس کو اچھا نہیں سمجھا ہے کہ دوسروں کو دے کر تم خود اتنے محتاج بن جاؤ کہ بھیک مانگنے کی نوبت آ جائے اور محتاجوں میں ایک نئے محتاج کا اور اضافہ ہو جائے۔ فرمایا:

﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآئیل: ۲۹)

''اور نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن میں باندھ لے اور نہ اس کو بالکل کھول دے کہ تو بیٹھ جائے ملامت کا نشانہ بن کر تھکا ہارا۔''

مسلمانوں کی اخلاقی خصوصیتوں کے سلسلہ میں کہا:

﴿ وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا ۝ ﴾ (۲۵/ الفرقان: ۶۷)

---

[1] تفسیر کبیر رازی تفسیر آیت مذکور (بقرہ)، ج۱، ص: ۵۳۲۔ [2] ابن جریر طبری تفسیر سورۃ لقمان، ج۲۱، ص: ۴۴؛ روح المعانی تفسیر سورۃ لقمان جزء۲۱، ص: ۸۱۔

''اور جو خرچ کریں تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ بہت تنگی کریں اور ہو اس کے درمیان اعتدال سے۔''

یعنی نہ اسراف ہو، نہ بخل ہو، درمیان کی چال ہو۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اکلفوا من الاعمال ما تطیقون)) ❶

''اتنا ہی عمل کا التزام کرو جتنا تم کرسکو۔''

''عمل'' کا لفظ گو یہاں عام ہے، مگر شارحین کے نزدیک اس سے مراد نماز وروزہ وغیرہ عبادتیں ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ فرائض کے بعد نوافل کا اتنا ہی بوجھ اٹھاؤ جس کو تم آسانی سے اٹھا سکو اور آخری دم تک نباہ سکو، دوسری اور حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم صرف عبادات تک محدود نہیں، بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ تک وسیع ہے۔ مسند بزار میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ صحابی کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❷

((ما احسن القصد فی الغنی، ما احسن القصد فی الفقر ما احسن القصد فی العبادۃ))

''دولت مندی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے، محتاجی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے، عبادت میں درمیانگی کتنی اچھی ہے۔''

غرض یہ ہے کہ نہ اتنا دولت مند ہو کہ انسان قارونِ وقت بن کر حق سے غافل ہو جائے، نہ اتنا محتاج ہو کہ پریشان خاطر ہو کر حق سے محروم رہ جائے۔ لوگ دولت مند ہو کر اس قدر شان وشکوہ عز وجاہ اور عیش وتنعم کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں کہ اعتدال سے خارج ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ محتاج ہو کر اس قدر غنی اور متبذل ہو جاتے ہیں کہ صبر اور خودداری اور تمام شریفانہ اوصاف کھو دیتے ہیں اور یہ بھی بے اعتدالی ہے۔ ان دونوں حالتوں میں اسلام کی معتدل تعلیم یہ ہے کہ دولت مندی کی حالت میں نہ حد سے زیادہ بلند ہونا چاہیے، نہ محتاجی کی حالت میں اپنی حیثیت سے گر جانا چاہیے۔ عبادت سے بڑھ کر اسلام میں کوئی نیکی کا کام نہیں۔ اسلام نے اس میں بھی اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے۔ نہ اتنی زیادہ ہو کہ آدمی دوسرے دھندوں کے لائق نہ رہے اور نہ اتنی کم ہو کہ حق سے غفلت ہو جائے۔ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کا واقعہ سیرت میں کئی دفعہ گزر چکا ہے کہ انہوں نے جب راتیں نمازوں اور دن روزوں میں بسر کرنا شروع کیا تو آنحضرت ﷺ نے ان کو منع کیا اور اعتدال کی تاکید کی اور فرمایا: ''کہ تمہارے ذمہ اور بھی حق ہیں۔''

❶ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومۃ علی العمل: ٦٤٦٥ وفتح الباری، ج ١١، ص: ٢٥٦۔

❷ بروایت کنز العمال جلد ثانی، ص:٧۔

خودداری یا عزت نفس

یہ وہ اخلاقی وصف ہے جس سے انسان اپنی عزت، اپنی شان، اپنے مرتبہ اور اپنی حیثیت کی حفاظت کرتا ہے زندگی میں اس کے موقعے کثرت سے پیش آتے ہیں، اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، ملنے جلنے، کھانے پینے، اوڑھنے پہننے غرض معاشرتی زندگی کے تمام حالات میں انسان کو اپنی حیثیت اور عزت کے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے، جس میں یہ وصف نہ ہوگا، اس میں نہ نظر کی بلندی ہوگی، نہ خیال کی رفعت، نہ اخلاق کی اونچائی نہ لوگوں کی نگاہوں میں اس کی عزت ہوگی، نہ اس کی باتوں کا لحاظ کیا جائے گا اور نہ اس کی طرف لوگ متوجہ ہوں گے اور نہ اس کو کسی مجلس میں وقار حاصل ہوگا۔ یہ عزت و وقار سب سے پہلے اس بلند و برتر ذات الٰہی میں ہے جو ساری عزتوں کا مرکز ہے، چنانچہ قرآن پاک میں بہتر موقعوں پر اللہ تعالیٰ کا نام عَـزِیْزٌ لیا گیا ہے عزیز کے معنی ہیں عزت والا [1] اور غالب، کہیں کہیں عَزِیْزٌ کے ساتھ قَوِیٌّ (قوت والا) یا مُقْتَدِرٌ (اقتدار والا) بھی کہا گیا ہے۔ اس لیے اصلی عزت اسی کی ہے اور وہی سچی عزت ہے، جو اس کے وسیلہ سے حاصل ہو اسلام جب کمزور تھا تو منافق لوگ ادھر مسلمانوں کی دوستی کا دم بھرتے تھے اور کافروں کی ظاہری شان و شوکت اور جاہ و عزت کے سبب سے ان کی دوستی کے بھی طلب گار تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے خیال کے دھوکے کو اس حقیقت کی روشنی میں کھول دیا:

﴿ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴾ (٤/ النسآء:١٣٩)

''کیا ان کے پاس عزت چاہتے ہیں تو قطعی بات تو یہ ہے کہ عزت ساری خدا کے واسطے ہے۔''

فرمایا، اگر عزت کی تلاش ہے تو وہ خدا کے پاس ہے:

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ﴾ (٣٥/ فاطر:١٠)

''جو عزت چاہے تو عزت تو ساری اللہ کی ہے۔''

﴿ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ﴾ (٣/ آل عمران:٢٦)

''اے خدا! تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔''

ایک دفعہ ایک غزوہ میں منافقوں کے سردار نے یہ کہا کہ مدینہ لوٹ کر مدینہ کے معزز ان ذلیل لوگوں یعنی مسلمانوں کو یا (نعوذ باللہ) محمد ﷺ کو نکال دیں گے، [2] اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (٦٣/ المنافقون:٨)

---

[1] عزۃ کا لفظ قرآن میں شدت، غلبہ، عز و شرف اور نخوت (حمیت) کئی معنوں میں آیا ہے، اس لیے ہر جگہ اس کے وہ معنی لیے جائیں گے، جو سیاق و سباق کے مناسب ہو، اس کا اصل مفہوم جو اس کے سب معنوں میں مشترک ہے، یہ ہے: ''کسی کا ایسی حالت و منزلت میں ہونا کہ اس کو کوئی دبا نہ سکے۔'' دیکھو لسان العرب، ج ۲ ص:۷۶۴ و مفردات راغب اصفہانی ص:۳۳۶ و ابن جریر طبری آیات عزت و سورۂ بقرہ و نساء و ص و منافقون۔ [2] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ المنافقون:٤٩٠٧۔

''اور عزت تو اللہ کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے، لیکن منافق نہیں جانتے۔''

اس آیت پاک نے مسلمانوں کو ایمان کی وہ عزت بخشی ہے جو کبھی چھینی نہ جائے گی، اس لیے ہر مسلمان کا سر ہر باطل کے سامنے اونچا رہنا چاہیے۔ اور اس کو اپنی دینی خودداری کو ہر وقت محسوس کرنا چاہیے اور اسی لیے اس کو بہترین اخلاق کا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آنا چاہیے، تعلیم محمدی ﷺ کے اثر سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل اس صحیح خودداری کے احساس سے ہمیشہ معمور رہتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب کفار کے ساتھ صلح کے شرائط پر جن کو آنحضرت ﷺ نے منظور فرمایا تھا، اعتراض کرنے کی جرأت کی تو یہی جذبہ ان کے اندر کام کر رہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہم حق پر اور یہ کافر باطل پر نہیں ہیں، ارشاد ہوا: ''بے شک ایسا ہی ہے۔'' عرض کی، تو پھر ہم یہ مذہبی ذلت کیوں برداشت کریں [1] ارشاد ہوا: ''میں خدا کا رسول ہوں اور اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی محدود نظر جہاں تک کام کر رہی تھی رسولِ خدا ﷺ کی نظر اس کے بہت آگے تھی اور واقعہ نے فیصلہ کیا کہ خدا کا حکم بڑی مصلحت پر مبنی تھا۔

غزوۂ خندق میں آنحضرت ﷺ نے انصار کے سر سے جنگ کو ٹالنے کے لیے قبیلہ غطفان کو اس شرط پر واپس کرنا چاہا کہ ان کو مدینہ کی پیداوار (کھجور) کا تہائی حصہ دیا جایا کرے گا، لیکن جب انصار رضی اللہ عنہ کے سرداروں کو بلا کر آپ ﷺ نے مشورہ کیا تو انہوں نے عرض کی:

''یا رسول اللہ ﷺ! جب ہم بتوں کو پوجا کرتے تھے اور اللہ سے بے خبر تھے، تب تو ان کو ہم سے لینے کی ہمت نہیں ہوئی اور اب جب کہ خدا نے ہم کو اسلام کی عزت بخشی ہے اور اس کے اور حضور ﷺ کے بدولت ہم عزت پا چکے ہیں۔ ہم ان کو یوں اپنا مال دینا منظور کریں گے؟ خدا کی قسم! ہمیں اس معاہدہ کی ضرورت نہیں۔'' [2]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب خلافت کے زمانہ میں قیصر و کسریٰ کے مقابلہ میں صف آرا تھے، ان کی اسلامی خودداری کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے معمولی مسلمان قیصر و کسریٰ کے درباروں میں بے دھڑک چلا جاتا تھا اور دلیری و آزادی سے سوال و جواب کرتا تھا، مسلمان جب تک مسلمان رہے، یہی خیال ان کی ہر قسم کی حوصلہ مندیوں اور اولوالعزمیوں کا باعث تھا اور ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد آج بھی ہر مسلمان بحیثیت مسلمان کے اپنی مذہبی عزت اور خودداری کا احساس رکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ بحیثیت مسلمان کے اس کا پایہ بہت بلند ہے اور ہر وقت اس کے کان میں یہ آواز رہتی ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۱۰)

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد: ۲۷۳۱، ۲۷۳۲۔ [2] سیرۃ ابن ہشام، الخندق وقریظہ والنضیر، ج۲، ص: ٦١ وتاریخ طبری ذکر واقعۃ احزاب بسند، ج۳، ص: ١٤٧٤۔

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی سربراہی) کے لیے ظہور میں لائی گئی۔"

ایک شخص نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے عرض کی کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ میں غرور ہے، فرمایا: "غرور نہیں خودداری (عزت) ہے، یہ (اسلام) وہ عزت ہے جس کے ساتھ ذلت نہیں اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ مفلسی نہیں" پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (٦٣/ المنافقون:٨) ایک مسلمان صالحہ بی بی کے کپڑے پرانے تھے، تو بولیں، کیا میں مسلمان نہیں، یہ وہ عزت ہے جس کے ہوتے ذلت نہیں اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ افلاس نہیں۔

شیخ ابوحفص سہروردی کہتے ہیں کہ خودداری (عزت) غرور سے الگ چیز ہے، کیونکہ خودداری اپنی ذات کی حیثیت کو جاننے اور اس کی عزت کرنے کا نام ہے کہ وہ فانی باتوں کی پستی میں نہ پڑ جائے اور غرور اپنی ذات کی اصلی حیثیت کو فراموش کر جانے اور اس کو اس کی جگہ سے اوپر لے جانے کو کہتے ہیں۔ [1] یہ خودداری عین شرافت ہے، جس میں یہ خودداری نہیں، لوگوں کی آنکھوں میں اس کا وقار نہیں۔ اس وقار اور خودداری کے لیے اگر ہاتھ میں قدرت نہ ہو یا مصلحت نہ ہو تو بہت سی باتوں سے اعراض اور درگزر کرنا پڑتا ہے۔ قرآن میں مسلمانوں کے وصف کے سلسلہ میں ہے:

﴿ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴾ (٢٥/ الفرقان:٧٢)

"اور جب وہ ہو نکلیں بیہودہ باتوں کی طرف سے تو گزر جائیں شریفانہ۔"

یعنی اس شریفانہ انداز، رکھ رکھاؤ اور خودداری کی شان سے گزر جائیں کہ نہ وہ آپ ادھر متوجہ ہوں اور نہ ان شریروں کو انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی ہمت پڑے۔ اس اخلاقی خودداری، اور شریفانہ رکھ رکھاؤ کی حفاظت کی خاطر قدم قدم پر اپنی ایک ایک بات پر نظر رکھنی پڑتی ہے، چال ڈھال، بول چال، لباس ہر چیز سے شرافت کا اظہار ہو، لیکن اس احتیاط کے ساتھ ہو کہ اوچھا پن یا تنگ ظرفی یا غرور ونمائش کی بوتک نہ آئے، یعنی اس میں اپنی بڑائی اور دوسروں کی تحقیر کا جزو شامل نہ ہو، یہی چیز ہے جس سے خودداری، غرور اور نمائش میں فرق وامتیاز کیا جا سکتا ہے، چنانچہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔" اس پر ایک شخص نے کہا کہ مجھے اچھا کپڑا اور اچھا جوتا بہت پسند ہے، مطلب یہ کہ یہ تو غرور میں داخل نہیں، ارشاد ہوا کہ "خدا تو خود ہی جمال کو پسند کرتا ہے، غرور یہ ہے کہ حق کا انکار کیا جائے اور لوگوں کی تحقیر کی جائے۔" [2] اسلام میں صاف ستھرے رہنے کا جو حکم ہے طہارت اور پاکیزگی کے علاوہ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان دوسروں کی نظر سے گرنے نہ پائے، کیونکہ گندے آدمی سے ہر ایک کو نفرت ہوتی ہے، ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جس کے سر کے بال الجھے ہوئے تھے تو فرمایا کہ "کیا

---

[1] یہ اقوال امام رازی، تفسیر کبیر تفسیر سورۃ المنافقون، ج ٦، ص: ٢٩٧ اور صاحب روح المعانی نے سورۂ منافقون جزء ٢٨، ص: ١٠٢ کی آیت ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ﴾ کی تفسیر میں لکھے ہیں۔ [2] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الکبر: ١٩٩٩۔

اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟'' ایک شخص کے کپڑے میلے دیکھے تو فرمایا: ''کیا کپڑے دھونے کے لیے اس کو پانی میسر نہ تھا۔'' ❶ ایک شخص نہایت کم حیثیت کپڑے پہن کر آیا، فرمایا: ''تمہارے پاس کچھ مال ہے؟'' اس نے کہا، اونٹ بکری گھوڑے تمام سب کچھ ہیں۔ ارشاد ہوا کہ ''جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے فضل اور احسان کا اثر تمہارے جسم سے بھی ظاہر ہونا چاہیے۔'' ❷

خودداری کا سب سے بڑا مظہر وقار یعنی سنجیدگی اور متانت ہے، اسی لیے اسلام نے ہر حالت میں وقار کے قائم رکھنے کی ہدایت کی ہے، نماز سے زیادہ اور کون سی عبادت ضروری ہوسکتی ہے، لیکن اس کے متعلق بھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِذَا سَمِعْتُمُ الْاِقَامَةَ فَامْشُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ وَعَلَيْكُمْ بِالسَّكِيْنَةِ وَالْوَقَارِ وَلَا تُسْرِعُوْا)) ❸

''جب تم اقامت سنو تو نماز کے لیے سکون اور وقار کے ساتھ چلو، جلدی نہ کرو۔''

لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جب تکبیر سنتے یا رکوع میں جاتے ہوئے امام کو دیکھتے ہیں تو بے تحاشا بھاگتے ہیں کہ رکعت نہ چلی جائے، مگر یہ چیز متانت کے خلاف ہے اور اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ آہستہ چلنا، نگاہ کا جھکائے رکھنا، آواز کا پست کرنا اور ادھر ادھر نہ دیکھنا اس وقار میں داخل ہے۔ وقار ایک نہایت جامع لفظ ہے اور اس میں بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ ابوداود نے کتاب الادب باب الوقار میں یہ حدیث نقل کی ہے:

((الهدى الصالح والسمت الصالح والاقتصاد جزء من خمسة وعشرين جزء من النبوة)) ❹

''نیک طور طریق، نیک انداز اور میانہ روی، نبوت کے پچیس اجزا میں سے ایک جزو ہے۔''

کیونکہ ان ہی اخلاقی خوبیوں کے ذریعہ سے کسی شخص کو وقار حاصل ہوتا ہے اور وہ خود بھی ان خوبیوں کی بدولت اپنے اندر اخلاقی احساس کو بیدار کر کے خوددار بنتا ہے۔

صحیح بخاری میں ایک اور لفظ دَلّ کا ہے اور ان تمام الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ انسان رفتار، گفتار، شکل وصورت، وضع ولباس اور اپنی عام روش میں باوقار رہے اور نیک مسلمانوں کا طور وطریقہ اختیار کرے، اسلام نے خصالِ فطرت یعنی ناخن اور مونچھ کے ترشوانے اور ختنہ کرانے کا جو حکم دیا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ اس سے انسان باوقار شکل میں نظر آتا ہے سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ روش اختیار کی تو خدا سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا، وقار۔ بولے، خداوندا! میرے وقار کو اور بڑھا۔ ❺

---

❶ ابو داود، کتاب اللباس، باب فی الخلقان وفی غسل الثوب: ٤٠٦٢۔ ❷ ایضًا: ٤٠٦٣۔

❸ بخاری، کتاب الاذان، باب لا یسعی الی الصلوة ولیأتھا بالسکینة والوقار: ٦٣٦۔

❹ ابو داود، کتاب الادب، باب فی الوقار: ٤٧٧٦۔ ❺ ادب المفرد، باب الختان للکبیر: ١٢٥٠۔

فقر و فاقہ کی حالت یا حرص و طمع کے موقع پر انسان سے خودداری ظاہر ہوتی ہے، اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں تعفف اور استعفاف ہے اور شریعت میں وہ ایک قابلِ ستائش اخلاقی وصف ہے اور اسی وصف کے ساتھ متصف ہونے کی بنا پر خدا تعالیٰ نے اصحاب صفہ کی خاص طور پر تعریف کی ہے:

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۷۳)

''(خیرات تو) ان حاجت مندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھر سے بیٹھے ہیں، ملک میں کسی طرف کو جا نہیں سکتے، بے خبر ان کی خودداری (کی وجہ) سے ان کو غنی سمجھتا ہے، تو (ان کو دیکھے تو) ان کی صورت سے ان کو (صاف) پہچان جائے (کہ محتاج ہیں) وہ لپٹ کر لوگوں سے نہیں مانگتے۔''

اس آیت میں فقر و فاقہ کی حالت میں خودداری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے، اس کا اندازہ اس آیت کے بعض فقروں کی تفسیر سے ہو سکتا ہے، صاحب کشاف نے ﴿لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ''وہ سوال تو کرتے ہیں، لیکن لجاجت واصرار کے ساتھ نہیں کرتے، بلکہ نرمی کے ساتھ کرتے ہیں۔'' [1] لیکن امام رازی نے لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں، کیونکہ جب خدا نے خود ہی بیان کر دیا ہے کہ ان کی خودداری کی وجہ سے جو لوگ ان کے حال سے ناواقف ہیں، ان کو دولت مند سمجھتے ہیں تو پھر سوال کرنے کے کیا معنی، اصحاب صفہ صاحب احتیاج ہونے کے باوجود اس لیے سوال نہیں کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کر کے سوال سے باز رہنے کی طاقت رکھتے تھے، جو شخص زبان سے خاموش رہتا ہے، لیکن اپنی حاجت سے فقر و فاقہ کا اظہار کرتا ہے، تو اس کی یہی خاموشی لجاجت واصرار کا سوال ہے، کیونکہ حاجت کی علامتوں کا ظہور حاجت پر دلالت کرتا ہے اور خاموشی اسی بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے پاس حاجت کے پورا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں، اس لیے جب انسان کسی کی یہ حالت دیکھتا ہے تو ان کے لیے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کو کچھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، اس لیے یہ حالت خود لجاجت واصرار کا سوال ہے، پس جب خدا یہ کہتا ہے کہ اصحاب صفہ لوگوں سے لجاجت واصرار کے ساتھ سوال نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ زبان سے تو سوال ہی نہیں کرتے لیکن اس کے ساتھ اپنے پھٹے حال کا بھی اظہار نہیں ہونے دیتے، جو لجاجت کے ساتھ سوال کرنے کا قائم مقام ہے، بلکہ لوگوں کے سامنے نہایت اچھی حالت میں نمایاں ہوتے ہیں اور اپنے فقر و فاقہ سے خدا کے سوا کسی کو واقف نہیں ہونے دیتے۔ [2]

[1] تفسیر سورۃ بقرۃ، ج۱، ص:۱۷۹۔ [2] تفسیر کبیر جلد ثانی، ص: ۵۲۶، ۵۲۷۔

سوال کی سب سے مبتذل صورت گداگری ہے اور اسلام نے گداگری کی نہایت شدت سے ممانعت کی ایک حدیث میں ہے کہ ”جو شخص ہمیشہ بھیک مانگتا رہتا ہے وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا۔“ یہ اس کی اس حالت کی تمثیل ہوگی کہ دنیا میں اس نے اپنی خودداری کو قائم نہیں رکھا اور اپنی عزت و آبرو گنوادی ہے، چند انصار نے جو بہت ہی غریب تھے، رسول اللہ ﷺ سے کچھ مانگا آپ ﷺ نے دے دیا، پھر سوال کیا اور آپ ﷺ نے پھر دیا، لیکن جب سب مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ ”میرے پاس جو کچھ ہوگا میں تم سے بچا کر اس کو جمع نہ کروں گا، جو شخص خدا سے خودداری کی خواہش کرتا ہے، خدا اس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص خدا سے بے نیازی کی آرزو کرتا ہے، خدا اس کو بے نیاز کرتا ہے اور جو شخص صبر کرنا چاہتا ہے، خدا اس کو صبر دیتا ہے، خدا نے صبر سے بڑا عطیہ کسی کو نہیں دیا۔“

فقر و فاقہ کی حالت میں عام آدمیوں سے اعانت کی درخواست کرتے پھرنا بھی خودداری کے منافی ہے اسلام نے اس کی بھی ممانعت کی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”جو شخص محتاج ہو کر اپنی احتیاج کو انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے، اس کی احتیاج دور نہیں ہوتی، لیکن جو شخص اس کو خدا کے سامنے پیش کرتا ہے، ممکن ہے کہ خدا اس کو بے نیاز کر دے، خواہ مرگِ ناگہانی کے ذریعہ سے، خواہ فوری مال کے ذریعہ سے۔“

روزمرہ کے معمولی کاموں میں لوگ ایک دوسرے سے اعانت کی درخواست کرنا برا نہیں جانتے، لیکن کمالِ خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں میں بھی احتیاط قائم رہے، مثلاً: اگر ایک شخص کسی سے کہے کہ ٹوپی اٹھا دو، میز پر کتاب رکھ دو تو گو بظاہر یہ سوال خودداری کے منافی نہیں معلوم ہوتا، لیکن اگر وہ ناگواری یا سختی سے اس کا انکار کر دے تو یقیناً اس شخص کی خودداری کو صدمہ پہنچے گا۔ اسی لیے کمالِ خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی درخواستوں سے بھی احتراز کیا جائے۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے کچھ لوگوں سے چند باتوں پر بیعت لی جن میں ایک بات یہ تھی: ((لَا تَسْأَلُوا النَّاسَ شَيْئًا)) ”تم کسی سے کوئی چیز نہ مانگنا۔“ ان میں سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس شدت سے اس کی پابندی کی کہ زمین پر ان کا کوڑا گر جاتا تھا، تو بھی کسی سے اس کے اٹھانے کی درخواست نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایک محتاج آدمی نے آنحضرت ﷺ سے سوال کرنے کی اجازت طلب کی، آپ ﷺ نے پہلے تو اس کو اجازت ہی نہیں دی، پھر فرمایا کہ ”اگر تم کو سوال ہی کرنا ہے تو صالحین سے سوال کرو۔“ [1] صالحین کی تخصیص غالباً اسی لیے کی گئی ہے کہ یہ لوگ باعزت طریقہ پر سوال پورا کریں گے، ورنہ رفق و ملاطفت کے ساتھ اس کو رد کر دیں گے۔

ان تمام تصریحات سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اسلام اور ایمان کی نعمت وہ عزت اور وہ

[1] ابوداود، کتاب الزکوۃ، باب کراهية المسئلة: ۱٦٤۲، ۱٦٤۳ وباب فی الا ستعفاف: ۱٦٤٤ تا ۱٦٤٦ میں یہ کل حدیثیں ہیں۔

دولت ہے جس کے مقابلہ میں ساری نعمتیں اور دولتیں ہیچ ہیں، جو مسلمان ہے وہ خدا کے سوا کسی کی پروا نہیں کرتا، وہ کسی کے سامنے نہیں جھکتا، وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا اور بحیثیت مسلمان کے وہ اپنا پایہ ساری دنیا سے بلند سمجھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ عزت صرف خدا کے لیے ہے اور اس کی عطا سے رسول کے لیے ہے اور اس کے واسطے سے مسلمانوں کے لیے ہے، اس خودداری کو قائم رکھنا اسلام کی عزت کو قائم رکھنا ہے اور اسی فیض تعلیم کا یہ اثر ہے کہ آج بھی ہماری زبان پر یہ فقرہ چڑھا ہے کہ جب ہم کسی مسلمان کو عار دلانا چاہتے ہیں تو یہ کہہ کر اس کی اسلامی خودداری کو بیدار کرتے ہیں کہ مسلمان ہو کر ایسا کرتے ہو، گویا مسلمان ہونا ایک ایسی عزت ہے، جس کے برقرار رکھنے کے لیے اس کو ہر قسم کی برائی سے پاک اور ہر دنائت اور پستی کے کام سے بلند ہونا چاہیے۔ اس باب کا خاتمہ ہم ایک خاص واقعہ پر کرنا چاہتے ہیں، جس سے اسلامی خودداری کی حقیقت ظاہر ہوگی کہ وہ تزک واحتشام، تکلف وتصنع اور جاہ وحشم کی نمائش کا نام نہیں، بلکہ یہ ہے کہ نفس کے تواضع اور دل کی خاک ساری کے ساتھ اسلام کی عزت اور حق کا فخر اس کو اونچا کر دے کہ اگر وہ غریب ومفلس اور کمزور بھی ہو تو وہ ہر ظاہری قوت کے سامنے بے نیاز اور باطل طاقت کے مقابلہ میں سر بلند رہے اور اگر وہ صاحب امارت وحکومت ہو تو اپنے رعب ودبدبہ کے لیے ظاہری نمائشی چیزوں کے بجائے حق کی طاقت کو کافی سمجھے۔

بیت المقدس کی فتح کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رومیوں سے بیت المقدس کی کنجی لینے کو شام جا رہے تھے، جب شہر کے قریب پہنچے تو سپہ سالار اسلام حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کچھ مسلمانوں کو لے کر استقبال کو نکلے، جب یہ جلوس ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کچھ پانی تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ناقہ سے اتر آئے، پاؤں سے چرمی موزے نکال کر اپنے کندھے پر ڈال لیے اور ناقہ کی مہار پکڑ کر پانی میں گھسے اور اسی شان سے اسلام کا فرمانبردار رومیوں کے مقدس شہر میں داخل ہونے کے لیے بڑھا، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی، یا امیر المومنین! آپ یہ کیا کر رہے ہیں کہ موزے اتار کر آپ نے کندھے پر ڈال لیے ہیں، اونٹنی کی نکیل آپ کے ہاتھوں میں ہے اور آپ اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اس کو پانی میں لے چل رہے ہیں، یہ وہ موقع ہے کہ سارا شہر آپ کے دیکھنے کو امنڈ آیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، اے ابوعبیدہ! اگر تمہارے سوا کوئی اور یہ بات کہتا تو میں اس کو سزا دے کرامت محمد ﷺ کے لیے عبرت بناتا، ہم سب سے ذلیل قوم تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اسلام سے ہماری عزت بڑھائی تو جو عزت خدا نے ہم کو دی ہے، اس کو چھوڑ کر کسی اور چیز کے ذریعہ سے ہم عزت چاہیں گے، تو خدا ہمیں ذلیل کرے گا۔ [1]

---

[1] مستدرك حاكم، كتاب الايمان، ج ١، ص: ٦٢، على شرط الصحيحين۔

شجاعت اور بہادری

قدیر (قدرت والا) قادر، مُقْتَدِرٌ، قَوِیّ، جَبّار، (جس کو کوئی پچھاڑ نہ سکے) قاھر (جو ہر کسی کو دبادے) غَالِبٌ اور عَزِیْز اللہ تعالیٰ کے کمالی اوصاف ہیں، جب کسی بندہ میں ان اوصاف کا کچھ پرتو پڑتا ہے تو اس میں اخلاقی وجسمانی شجاعت پیدا ہوجاتی ہے۔

تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے، جس نے اپنے پیرووں میں شجاعت و بہادری کے جوہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اسلام سے پہلے دنیا کی عام حالت پر نظر کرکے لوگوں میں یہ خیال پیدا تھا کہ چونکہ ہر قسم کا ظلم وستم اور خون ریزی اسی قوت کا نتیجہ ہے، اس لیے یہ مٹانے کے قابل ہے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے یہ نکتہ سمجھایا کہ قوت بذاتہ کوئی بری چیز نہیں، بلکہ اس کے استعمال کا موقع برا ہوتا ہے، اس لیے تعلیم محمدی ﷺ نے بہادری وشجاعت کو سراہا اور اس کے موقعوں کی تعیین کی کہ اس کو حق کی مدد اور باطل کو مٹانے کے لیے کام میں لانا چاہیے، کیونکہ اگر نیکوں میں یہ قوت نہ ہو تو وہ ظلم وستم کی روک تھام اور باطل قوتوں کا بہادرانہ مقابلہ نہ کرسکیں اور نہ اسلام کا مقدس فریضہ جہاد کامیاب ہوسکے۔

ان مسلمانوں کی جو سختیوں اور مصیبتوں کا بہادرانہ مقابلہ کریں اور لڑائیوں میں دادِ مردانگی دیں، اللہ تعالیٰ تعریف فرماتا ہے:

﴿ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

''اور جو سختی اور تکلیف اور لڑائی کے وقت ثابت قدم رہیں، وہی لوگ ہیں جو سچے ہوئے اور وہی متقی ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ آپڑے تو اس میں ثابت قدمی اور بہادری وہ صفت ہے، جو اپنے موصوف کو راست باز اور متقی بننے میں مدد دیتی ہے، کیونکہ ہر وہ شخص جو کسی جماعت اور ملت کا فرد ہو، وہ زبان سے کہے یا نہ کہے، اس کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس کی حفاظت میں اپنی جان تک کی بازی لگادے اور جب وہ ایسا کر گزرتا ہے، تو وہ اللہ تعالیٰ اور ملت کی نظر میں راست باز اور سچا ٹھہرتا ہے۔ جو جذبہ اس کو اس فرض پر آمادہ کرتا ہے، وہی اتقا کا منشا ہے، ایک اور موقع پر مسلمانوں کو اس بہادری کی کھلی تعلیم ملتی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴾

(۸/ الانفال:۱۵)

''اے ایمان والو! جب تم کافروں سے میدان جنگ میں مقابل ہو تو ان کو پیٹھ مت دو۔''

یعنی جب غنیم سے مقابلہ آن پڑے تو ایمان والوں کا فرض ہے کہ وہ اس مقابلہ میں پیٹھ پھیر کر بزدلی نہ

دکھائیں، بلکہ شجاعت اور بہادری کے ساتھ میدان میں قدم جمائے ڈٹے رہیں، اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ''ایمان والے'' کہہ کر خطاب کیا ہے، اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہی ''ایمان'' مسلمانوں کی شجاعت اور بہادری کی روح ہے، کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ جو مسلمان نامرد اس دن بزدلی سے دشمن کو پیٹھ دکھائے گا، وہ خدا تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہوگا:

﴿ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ (۸/ الانفال:۱۶)

''اور جوان کو اس دن پیٹھ دے گا، مگر یہ کہ لڑائی کا کوئی پیچ کرتا ہو، یا کسی (مسلمان) دستہ سے جاملتا ہو، تو وہ اللہ کا غضب لے پھرا، اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کتنا برا ٹھکانہ ہے۔''

یہ تو سلبی تعلیم تھی، یعنی یہ کہ کسی مسلمان کو میدان جنگ میں پیٹھ نہیں دکھانی چاہیے، اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ ان کو اس کے لیے ایجابی حکم دیتا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا ﴾ (۸/ الانفال:۴۵)

''اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو۔''

یعنی اپنی جگہ پر جم کر مقابلہ کرو، کوئی تم میں سے سوائے اس کے کہ لڑائی کی مصلحت ہو اپنی جگہ سے نہ ہٹے مسلمانوں کی تعریف میں فرمایا کہ وہ کافروں کی قوت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔

﴿ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ ﴾ (۴۸/ الفتح:۲۹)

''وہ کافروں پر زور آور ہیں۔''

اَشِدَّآءُ کا ترجمہ اس آیت میں زور آور، زورمند اور قوی دست کیا جاسکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو حق کے اور خصوصاً اپنے دین کے مخالفوں کے مقابلہ میں طاقتور اور قوی دست ہونا ضروری ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

﴿ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ ﴾ (۸/ الانفال:۶۰)

''اور ان کے لیے تم سے جو ہو سکے یعنی زور و قوت اور گھوڑے باندھنا تیار رکھو، کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور دوسروں کو جنہیں تم نہیں جانتے، اللہ جانتا ہے، مرعوب کرو۔''

اس ''قوت'' کے لفظ کی تفسیر اس زمانہ کے سامان جنگ وقتال سے کی گئی ہے، مثلاً: قلعوں کی تعمیر اور تیر اندازی، مگر یہ تخصیص صرف زمانہ کے اعتبار سے ہے، ورنہ معناً مفسرین نے اس کو عام رکھا ہے اور ہر قسم کے اسلحہ اور سامان کو اس میں داخل کیا ہے۔ [1] غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سپاہیانہ جوہر پیدا کرنے

---

[1] تفسیر طبری، تفسیر سورہ انفال آیت مذکورہ پارہ، ۱۰، جزء ۱۰، ص:۱۹۔

اور جنگی سامان واسلحہ تیار رکھنے اور اس کے استعمال کے طریقوں کو جاننے کی ہدایت فرمائی ہے، تاکہ حق کے دشمن ان کی تیاری سے مرعوب اور خوف زدہ رہیں اور ان سے معاہدہ کر کے توڑنے کی ہمت نہ کر سکیں۔

برخلاف اس کے بزدلی اور کمزوری کی برائی کی گئی ہے، بدر کے موقع پر کچھ مسلمان جنگ کے نام سے جو اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ کی جارہی تھی، متوحش ہورہے تھے، اس پر وحی الٰہی نے ان کا ذکر مذمت کے ساتھ کیا:

﴿ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ ﴾ (۸/ الانفال:۶)

''گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جارہے ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں۔''

سورۂ احزاب میں منافقوں کی دلی کمزوری کا یہ نقشہ کھینچا ہے:

﴿ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۱۹)

''جب ڈر کا وقت آئے تو ان کو تو دیکھے کہ تیری طرف ٹکر ٹکر دیکھتے ہیں، ان کی آنکھیں گردش کھاتی ہیں، جیسے کسی پر موت کی غشی آجائے۔''

سورۂ محمد میں ان کی دل کی کمزوری کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے:

﴿ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۝ ﴾ (۴۷/ محمد:۲۰)

''جب اتری کوئی ثابت سورت اور مذکور ہو اس میں لڑائی تو تو ان کو جن کے دلوں میں روگ ہے، دیکھے گا کہ تکتے ہیں، تیری طرف جیسے ٹکٹکی لگائے وہ جس پر موت کی بے ہوشی ہے، سو خرابی ہو ان کی۔''

ایک اور آیت میں یہ نقشہ اس طرح کھینچا گیا:

﴿ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ۭ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۭ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ۭ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۭ ﴾ (۶۳/ المنافقون:۴)

''اور جب تو انہیں دیکھے، تو ان کے بدن اچھے معلوم ہوں اور اگر بولیں تو ان کی بات تو سنے، جیسے ٹیک سے کھڑی کی ہوئی لکڑیاں ہیں، جو کوئی چیخے سمجھیں ہم ہی پر کوئی آفت آئی۔''

اس آیت نے یہ بتایا کہ بہادری اور شجاعت بدن کی فربہی اور موٹائی سے نہیں، بلکہ دل کی طاقت سے ہے جس سے منافق محروم ہیں۔ دیکھنے میں تو ان کے بدن بڑے سجیلے اور گٹھے ہوئے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں، مگر دل کی کمزوری کا یہ حال ہے کہ اگر ذرا کوئی چیخ دے تو گھبرا اٹھیں۔ ان کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی

لٹھوں کو ٹیک لگا کر کھڑا کر دے دیکھنے میں تو یہ بڑے لمبے تڑنگے اور موٹے تازے ہیں، مگر چونکہ ان کی جڑیں مضبوط نہیں، اس لیے ذرا ٹھیلنے سے دھڑ سے زمین پر آ رہتے ہیں۔

اسلام اپنے پیروؤں میں شجاعت و بہادری کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے، گو اس میں مادی وجسمانی شجاعت سے یکسر اعراض وتغافل نہیں ہے، لیکن اس نے اپنی شجاعت و بہادری کی بنیاد اس پر کھڑی نہیں کی ہے اسی لیے اوپر کی آیت میں دیکھیے کہ منافقین کے جسمانی طول وعرض اور موٹائی کا مضحکہ اڑایا ہے، اس لیے ان میں شجاعت اور بہادری نہیں، اس بنا پر وہ اپنے پیروؤں میں شجاعت اور بہادری کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد چند مضبوط عقائد پر رکھی ہے، جو صحیح ایمان اور غیر متزلزل یقین کے لازمی نتیجے ہیں۔

① جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے، اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اس لیے تعداد کی قلت وکثرت کوئی چیز نہیں، صرف فضلِ الٰہی اور نصرتِ خداوندی چاہیے۔

② ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے، جب وہ آ جائے تو وہ کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی اور جب تک نہ آئے اس کو کوئی مار نہیں سکتا۔

③ خدا کی راہ میں مارا جانا زندگی کا بہترین مصرف ہے، اس خون کے پانی سے گناہ کا سارا دفتر دھل جاتا ہے اور جو اس غزا میں مارا نہیں گیا وہ بھی بڑے بڑے ثوابوں کا مستحق ہے۔

تعداد کی قلّت وکثرت

تعداد کی قلت وکثرت پر جدوجہد کی کامیابی وناکامی کا انحصار سراسر فریب ہے، کامیابی وناکامی تعداد کی کمیت پر نہیں، بلکہ جدوجہد کرنے والوں کی ایمانی واخلاقی کیفیت پر منحصر ہے، تعداد گو کتنی ہی چھوٹی ہو، اگر اس میں ایمان ویقین کی قوت موجود ہے تو بفضلِ خدا وہ بڑی سے بڑی تعداد پر غلبہ پا سکتی ہے، اس فلسفہ کو حضرت طالوت کے چھوٹے سے لشکر کے سلسلہ میں قرآن نے ان مختصر لفظوں میں سمجھا دیا ہے:

﴿ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۴۹)

''کتنی بار چھوٹا دستہ خدا کے حکم سے بڑی فوج پر غالب آ گیا ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو آمادۂ جہاد کرتے ہیں تو دل کے کمزور کہتے ہیں کہ ہم تو ان سے نہیں لڑیں گے:

﴿ اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۲۲)

''اس میں تو ایک زبردست قوم بستی ہے۔''

اس وقت ان کی امت کے دو مسلمان ان کو سمجھاتے ہیں:

﴿ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾

(۵/ المآئدۃ:۲۳)

''تو جب تم شہر کے پھاٹک میں گھس جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔''

بدر اور احد کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اس راز کو بار بار ظاہر فرمایا ہے، ارشاد ہوا:

﴿ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَأَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ ﴾

(۸/ الانفال:۱۹)

''اور تم کو تمہارا جتھا کچھ کام نہ آئے گا، اگرچہ تعداد میں بہت ہو اور اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔''

﴿ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝ إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۵۹۔۱۶۰)

''تو جب ارادہ پکا ہو چکا تو اللہ پر بھروسہ کر، بیشک اللہ توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ ہوگا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے گا تو اس کے بعد کون تمہاری مدد کرے گا اور مومنوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔''

فتح و شکست حکم الٰہی پر موقوف ہے اور مدد اسی طرف سے آتی ہے:

﴿ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ ﴾ (۸/ الانفال:۱۰)

''اور مدد نہیں ہے مگر اللہ ہی کی طرف سے بے شک اللہ غالب، حکمت والا ہے۔''

تعداد کی قلت کی تلافی ایمان کی قوت سے ہوتی ہے، یہ راز اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف ایک نظریہ کی حیثیت سے نہیں بتایا، بلکہ ان کو قاعدہ بنا کر ہمیشہ کے لیے خوش خبری سنادی، فرمایا کہ ایک پکا مسلمان اپنے دس گنے کے مقابل ہے، ثابت قدم دس مسلمان سو پر اور بیس ایسے مسلمان دو سو کی فوج پر بھاری ہوں گے:

﴿ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ ۚ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ۝ ﴾

(۸/ الانفال:۶۵)

''اے پیغمبر! مومنوں کو لڑائی کا شوق دلا، اگر تم مسلمانوں میں سے بیس صابر (ثابت قدم) ہوں تو وہ دو سو پر غالب ہوں، اگر تم میں سے سو ہوں تو ہزار کافروں پر غالب ہوں، کیونکہ وہ سمجھ نہیں رکھتے۔''

ثابت قدم مسلمانوں کے غالب آنے اور کافروں کی شکست کھا جانے کی وجہ بھی بتادی کہ مسلمانوں کے دل میں خدا پر صبر وتوکل کی قوت ہے اور کافروں کے دل ایمان کے اس فہم وبصیرت سے محروم ہیں۔

اس کے بعد آزمائش کی سختی میں تھوڑی نرمی کر دی گئی، پھر بھی یہ نرمی وہ ہوئی جو آج بھی مردانگی وبہادری کی کسوٹی ہے، یعنی یہ ایک مسلمان اپنے سے دوچند کا مقابلہ کرے اور اس کے قدم نہ ڈگمگائیں:

﴿ فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ ﴾ (۸/ الانفال:۶۶)

''تو اگر تم سے سو صابر (ثابت) رہیں تو دوسو پر غالب ہوں اور اگر تم سے ہزار ہوں تو دو ہزار پر بحکم خدا غالب ہوں اور اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔''

اس تعلیم کے نشہ کی تیزی اور تندی دیکھو کہ آج بھی یہ یقین بحمد اللہ مسلمانوں میں پیدا ہے کہ ایک مسلمان لڑائی میں دو کافروں پر بھاری ہے، اور وہ اپنے اس یقین وایمان کی بدولت اپنے سے دونی تعداد کی پروانہیں کرتا اور خدا کی مدد پر ہمیشہ بھروسہ رکھتا ہے، اس کا اثر یہ ہے کہ کافروں کے دلوں میں ان کا وہ رعب بیٹھا ہے، جس کا وعدہ ساڑھے تیرہ سو سال سے ہے کہ

﴿ سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۱)

''ہم کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دیں گے۔''

﴿ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ ﴾ (۸/ الانفال:۱۲)

''میں کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دوں گا۔''

خدا نے یہ وعدہ پورا بھی کیا، چنانچہ یہود جن کو اپنے قلعوں اور لڑائی کے سامانوں پر بڑا گھمنڈ تھا۔ مسلمانوں سے ایسے مرعوب ہوئے کہ بے لڑے بھڑے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہوئے۔

﴿ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۲۶)

''اوران کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔''

﴿ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ ﴾ (۵۹/ الحشر:۲)

''اوران کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔''

اور جب تک مسلمانوں میں ایمان کی یہ قوت باقی ہے اللہ کا وعدہ پورا ہوتا رہے گا۔

موت کا وقت مقرر ہے

انسان کی کمزوری کی اصل وجہ موت کا ڈر ہے، اس زہر کا تریاق اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہے، جو نہ ٹالے ٹل سکتا ہے اور نہ بلائے آ سکتا ہے، اس لیے کسی خطرہ کے مقام سے بھاگنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

وحی محمدی ﷺ نے مسلمانوں کو اس عقیدہ کی بار بار تلقین کی ہے، یہاں تک کہ یہ چیز مسلمانوں کی رگ رگ میں سرایت کر گئی ہے، غزوۂ احد میں مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور اس عقیدہ کو یاد دلایا:

﴿ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ﴾ (۳/ آل عمران:۱۴۵)

''اور کسی جان کے بس میں نہیں کہ اللہ کے حکم کے سوا وہ مر سکے، لکھا ہوا وقت مقرر ہے۔''

جب اللہ کا حکم ہوگا تب ہی کوئی مر سکتا ہے، پھر موت سے خوف کیوں ہو اور اس سے بزدلی کیوں چھائے، جنگ احزاب میں جب منافقوں کو گھبراہٹ ہوئی تو خدا نے فرمایا:

﴿ قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۱۶)

''(اے پیغمبر ﷺ! ان سے) کہہ کہ اگر تم موت سے یا مارے جانے سے بھاگے بھی تو یہ بھاگنا تم کو کام نہ آئے گا۔''

یہ خیال کرنا کہ اگر ہم اس لڑائی میں شریک نہ ہوتے تو مارے نہ جاتے، سراپا غلط ہے، جن کی قسمت میں یہاں موت لکھی تھی، وہ خود آ کر اپنے اپنے مقام پر مارے جاتے، فرمایا:

﴿ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۵۴)

''(اے پیغمبر ﷺ! ان سے) کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جس کا مارا جانا لکھا جا چکا تھا، وہ آپ نکل کے اپنے پڑاؤ پر آ جاتے۔''

یہ سمجھنا کہ چونکہ لڑائی میں شریک ہوئے اس لیے مارے گئے، یوں بھی غلط ہے کہ مارنا اور جلانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہے موت دے اور جس کو چاہے جیتا رکھے، مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم کافروں جیسا عقیدہ نہ رکھو جو یہ کہتے ہیں:

﴿ لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۶)

''اگر یہ مرنے یا مارے جانے والے ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے اور یہ خیال اس لیے ان کے دل میں آتا ہے، تاکہ اللہ ان کے اس خیال کو ان کی دلی حسرت بنائے اور واقعہ تو یہ ہے کہ اللہ جلاتا اور مارتا ہے۔''

کچھ کمزور لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر مقتول لڑائی میں نہ جاتا تو مارا نہ جاتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ان کی یہ بات سچ ہے تو وہ اپنی موت ٹال سکتے ہیں تو ٹال لیں:

﴿ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۶۸)

''اگر تم سچے ہو تو اپنی جانوں سے موت ہٹا تو لو۔''

جو مسلمان ذرا دل کے کمزور تھے، ان کے خطرہ کا ذکر کر کے ان کی تشفی کی گئی:

﴿ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۗ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۚ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۗ ﴾ (٤/ النسآء:٧٧۔٧٨)

''پھر جب ان کو لڑائی کا حکم ہوا تو ناگہاں ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے ایسے ڈرنے لگا جیسے خدا سے ڈرہو یا اس سے بھی بڑھ کر اور کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے کیوں فرض کی ہم پر لڑائی، کیوں نہ ہم کو تھوڑے دن اور مہلت دی (اے پیغمبر!) جواب دے کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور آخرت پرہیز گار کے لیے بہتر ہے اور تمہارا حق ذرا بھی دبایا نہ جائے گا جہاں تم ہو گے موت تم کو پالے گی، اگر تم مضبوط قلعوں میں ہو۔''

غرض کہیں بھی تم جا کر رہو موت سے چھٹکارا نہیں، پھر میدان جنگ سے تم کیوں گھبراؤ، بلکہ ان مجاہدوں کی طرح بنو، جن کا ایمان جہاد کا نام سن کر اور تازہ ہو جاتا ہے:

﴿ الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ۝ ﴾ (٣/ آل عمران:١٧٣)

''وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تم سے لڑنے کے لیے لوگوں نے بڑا سامان کیا ہے، سو تم ان سے خوف کرو تو اس نے ان کے ایمان کو اور بڑھا دیا اور بول اٹھے کہ ہم کو خدا کافی ہے اور وہ کیسا اچھا کارساز ہے۔''

شہادت اور غزا کا رتبہ

میدان جہاد میں شرکت سے جو دوسری چیز باز رکھ سکتی تھی، وہ دنیا کے عیش و آرام کا خیال ہے، اسلام کی تعلیم نے اس خیال کا بھی قلع قمع کر دیا ہے، اس کی تعلیم ہے کہ مجاہدوں کی جان و مال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اس کی خوشی و رضا اور جنت کے بدلہ میں بکا ہوا ہے اور وہاں ان کے لیے وہ کچھ مہیا ہے جس کے سامنے یہاں کا بڑے سے بڑا عیش و آرام بھی ہیچ ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ ﴾ (٩/ التوبة:١١١)

''اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور مالوں کو اس قیمت پر خرید لیا ہے کہ ان کے لیے

جنت ہے، اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔''

اس سے پہلے سورۂ نساء میں اہلِ ایمان کو جو آخرت کے لیے دنیا کا سودا کر چکے ہیں، اعلان ہے:

﴿ فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۚ وَمَن يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴾ (٤/ النسآء:٧٤)

''تو دنیا کی زندگی آخرت کے بدلہ بیچتے ہیں، وہ اللہ کی راہ میں لڑیں اور جو اللہ کی راہ میں لڑے پھر مارا جائے یا وہ غالب ہو تو ہم اس کو بڑی مزدوری دیں گے۔''

ان کے گناہ کے سارے دفتر دھل جائیں گے:

﴿ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ ﴾ (٣/ آل عمران:١٩٥)

''تو جو لوگ اپنے وطن سے چھوٹے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے، اتاروں گا ان سے ان کی برائیاں اور داخل کروں گا ان کو جنت میں۔''

شہیدوں نے اس راہ میں اپنی جو سب سے بڑی دولت نثار کی وہ ان کی زندگی تھی، وہ ان کو از سر نو اسی وقت دے دی جائے گی، اس عقیدہ کی تعلیم نے اس خیال باطل کا کہ شہید مر جاتے ہیں، ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ ان کو مردہ نہ خیال کرو، وہ خدا کے پاس زندہ ہیں:

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ۝ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ﴾ (٣/ آل عمران:١٦٩)

''اور جو اللہ کی راہ میں مارے گئے، ان کو مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں، خدا نے ان کو اپنی مہربانی سے جو دیا اس سے خوش ہیں۔''

ان کی اس زندگی کو گو اس دنیا کے لوگ جان نہیں سکتے، پھر بھی ان کو زبان سے بھی مردہ نہیں کہنا چاہیے۔

﴿ وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۝ ﴾ (٢/ البقرة:١٥٤)

''اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں، ان کو مردہ نہ کہو بلکہ زندہ ہیں، لیکن تم کو اس کی خبر نہیں۔''

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

لیکن جہاد کے یہ اوصاف اور انعامات ان ہی کے لیے ہیں، جو فی سبیل اللہ خدا کی راہ میں صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے لڑتے ہیں۔ اس تعلیم نے مجاہدین کی غرض وغایت کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ وہ ذاتی خود غرضیوں اور نفسانی غیظ وغضب، اور بہادری کی نیک نامی وغیرہ کے پست جذبات سے بالکل پاک کر دی گئی

ہے۔اگر کوئی مال کے لیے کسی کو قتل کرے تو یہ کافروں کی سی جاہلانہ بات ہوگی۔فرمایا:

﴿ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ﴾ (٤/ النسآء:٩٤)

''چاہتے ہو دنیا کی زندگی کا مال، سو اللہ کے پاس بڑا مال غنیمت ہے، تم (اسلام سے) پہلے ایسے ہی تھے، تو خدا نے تم پر فضل کیا (یعنی اسلام بخشا) تو اب تحقیق کر لیا کرو۔''

رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص شہرت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص اس لیے لڑتا ہے کہ خدا کی راہ میں اس کی پامردی کی نمائش ہو، ایک شخص بہادری دکھانے کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص حمیت سے لڑتا ہے، ایک شخص نمائش کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص غصہ وانتقام کے لیے لڑتا ہے، تو آپ ﷺ نے ان سب کا مشترک جواب یہ دیا ہے:

((مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) [1]

''جو شخص اللہ کی بات سب سے بالا کرنے کے لیے لڑے، اسی کا جہاد خدا کی راہ میں ہے۔''

ایک حدیث میں ہے کہ ''ایک شخص سے قیامت کے دن اس کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا تو وہ کہے گا کہ اے خدا! میں نے تیری راہ میں جہاد کیا اور شہید ہوا، خدا کہے گا کہ تم جھوٹ کہتے ہو، تم اس لیے لڑے کہ بہادر کہے جاؤ [2] سو تم اپنا اجر پا چکے اور دنیا میں تم کو بہادر کہا جا چکا۔'' غرض جس شجاعت کا مقصود اصلی ریا و نمائش ہو، اس کو اسلام نے مذموم قرار دیا ہے، لیکن اگر جہاد میں اعلائے کلمۃ اللہ کے ساتھ ضمناً فخر کا بھی اظہار ہو جائے، تو اسلام نے اس کو برا نہیں کہا ہے [3] کیونکہ اس فخر کا منشا بھی کلمۂ حق کی بلندی کا اظہار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاد کے میدان میں کبر و تبختر کے شجاعانہ پہلوؤں کو پسند کیا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ''بعض ناز و تبختر کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے، خدا جس ناز و تبختر کو پسند کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک شخص لڑائی کے وقت اترائے [4] کیوں کہ اس سے دشمنوں پر رعب وداب قائم ہوتا ہے اور دوستوں میں مستعدی و سرگرمی پیدا ہوتی ہے۔'' ایک صحابی نے ایک کافر پر حملہ کیا اور شجاعانہ فخر و غرور کے لہجہ میں کہا، لو میں ابن اکوع ہوں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس فقرے کی شرح میں لکھتے ہیں:

''یہ فقرہ اس فخر سے الگ ہے، جس کی ممانعت کی گئی ہے، کیونکہ حالت کا اقتضا یہی تھا اور وہ اس ناز و تبختر سے قریب ہے، جو لڑائی میں جائز ہے اور دوسرے موقعوں پر جائز نہیں۔'' [5]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا: ٤٩٢٠، ٤٩٢٢ وصحیح بخاری، کتاب الجھاد باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ: ٢٨١٠۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار: ٤٩٢٣؛ جامع ترمذی، ابواب الزھد، باب ما جاء فی الریاء والسمعۃ: ٢٣٨٢۔ [3] فتح الباری، ج٦، ص: ٢٢ شرح حدیث مذکور۔

[4] ابوداود، کتاب الجھاد، باب فی الخیلاء فی الحرب: ٢٦٥٩۔ [5] فتح الباری، ج٦، ص: ١١٤۔

غزوۂ حنین میں جب مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو گھیر لیا تو آپ ﷺ نے خود عزم وثبات کے عربی لہجہ میں فرمایا:

((اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ اَنَا ابْنُ عَبْدِالْمُطَّلِبْ))

''میں پیغمبر ہوں، جھوٹ نہیں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔''

یعنی میں سچا پیغمبر ہوں، اس لیے میدان سے نہ بھاگوں گا نہ ہٹوں گا، چنانچہ اس وقت غنیم کے تیروں کی بارش سے گواور لوگ ہٹ گئے، مگر آنحضرت ﷺ نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں فرمائی۔ ❶

صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہم میں سب سے بہادر وہ سمجھا جاتا تھا جو آنحضرت ﷺ کے پاس کھڑا ہوتا تھا ❷ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نہایت بہادر تھے، ایک بار اہل مدینہ کے دلوں میں کسی طرف سے حملہ کا خوف پیدا ہوا تو سب سے پہلے جو ادھر بڑھا، وہ خود سرور کائنات علیہ الصلوۃ والسلام تھے، آپ ﷺ گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا چکر لگا آئے اور واپس آ کر فرمایا: ''خوف کی کوئی بات نہیں۔'' ❸ ایک موقع پر جب بدویوں نے آپ کو عطیہ کے لیے گھیر لیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگ مجھ کو بخیل، جھوٹا اور بزدل نہ پاؤ گے۔'' ❹ بزدلی اسلام میں ایسا اخلاقی عیب ہے، جس سے پناہ مانگنی چاہیے، رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعاؤں میں جن چیزوں سے پناہ مانگی ہے ان میں بزدلی بھی ہے، چنانچہ روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیچارگی (عجز) کاہلی (کسل) بزدلی اور بڑھاپے سے کہ یہ بھی بیچارگی کی ایک قسم ہے، پناہ مانگتے تھے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ ہر نماز کے بعد ان چیزوں سے پناہ مانگتے تھے ❺ ایک روایت میں ہے کہ ''انسان میں سب سے بڑی بداخلاقی گھبرا دینے والا بخل اور دل ہلا دینے والی بزدلی ہے۔'' ❻

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ صحابی نے ایک خط لکھ کر بھیجا تھا، اس کا ایک فقرہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جب دشمن سے مقابلہ آ پڑے تو ثابت قدم رہو۔'' ❼ اسی خط میں آنحضرت ﷺ کا وہ بلیغ فقرہ بھی ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے:

((وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ)) ❽

''یقین کرو کہ بہشت تلواروں کی چھاؤں میں ہے۔''

---

❶ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قول اللہ تعالی: ویوم حنین ...: ٤٣١٥ وکتاب الجهاد، باب بغلة النبی ﷺ: ٢٨٧٤۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسير، باب غزوة حنين: ٤٦١٦۔

❸ صحیح بخاری، کتاب الجهاد وباب الحمائل وتعليق السيف بالعنق: ٢٩٠٨۔

❹ بخاری، کتاب الجهاد، باب الشجاعة فی الحرب والجبن: ٢٨٢١۔ ❺ بخاری، کتاب الجهاد، باب مايتعوذ من الجبن: ٢٨٢٢، ٢٨٢٣۔ ❻ ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی الجرأة والجبن: ٢٥١١۔

❼ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب الصبر عندالقتال: ٢٨٣٣۔ ❽ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب الجنة تحت بارقة السيوف: ٢٨١٨ وباب كان النبی ﷺ اذا لم يقاتل اول النهار اخر القتال حتى تزول الشمس: ٢٩٦٦۔

استقامت

''استقامت'' کے لفظی ''معنی سیدھا رہنے یا سیدھا چلے چلنے کے ہیں اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے، مشکلیں پیش آئیں مخالفتیں ہوں، ستایا جائے، ہر خطرہ کو برداشت کیا جائے، مگر حق سے منہ نہ پھیرا جائے اور اس راستہ پر ثابت قدمی کے ساتھ چلا جائے۔

آنحضرت ﷺ کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے:

﴿ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ؕ ﴾ (۴۱/ حٰمٓ السجدة:۶)

''تمہارا معبود ایک ہی ہے، سو اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے گناہ بخشواؤ۔''

یعنی ہماری عبادتیں اسی ایک کے لیے ہوں اور ہماری توجہات کا وہی ایک مرکز ہو، اس سے کسی حال میں ادھر ادھر نہ ہوا جائے، سیدھے اسی کی طرف چلے چلو، ایک اور آیت میں بارگاہِ الٰہی سے جنابِ رسالت مآب ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو حکم ہوتا ہے کہ اسی راہ پر سیدھے چلے چلو، نہ رہ سے بھکو نہ حکم ماننے سے سرکشی کرو:

﴿ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ ﴾

(۱۱/ ھود:۱۱۲)

''تو (اے پیغمبر!) تو سیدھا چلا چل جیسا تجھ کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ اور حد سے نہ بڑھو کہ وہ (اللہ) تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے۔''

عرب کا گرم ریگستان دینِ حق کی مخالفت میں غیظ وغضب کا بھڑکتا ہوا تنور بن گیا تھا، ذرہ ذرہ کی زبان سے رسولِ حق کی دشمنی کی آواز نکل رہی ہے اور عرب کی وسیع سرزمین مسلمانوں پر دم بدم تنگ ہوتی جاتی ہے، اس موقع پر رسولِ اسلام ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کو اعلانِ حق اور حق پر استقامت کی تاکید ہو رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''اسی دینِ حق کی طرف سب کو بلاتے رہو اور ثابت قدمی دکھاؤ اور مخالفوں کی کسی خواہش کی پیروی نہ کرو۔''

﴿ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۱۵)

''پس اسی کی طرف بلا اور قائم رہ جیسا کہ تجھے فرمادیا اور ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ چل۔''

ایسے ثابت قدموں کو جنہوں نے اللہ کو اپنا پروردگار مان کر ہر خوف وخطرہ کو اپنے دل سے نکال دیا ہے یہ خوشخبری سنائی جارہی ہے کہ کامیابی تمہارے ہی لیے ہے، وہ دن آئے گا جب نہ تمہیں کسی کا ڈر ہوگا اور نہ کسی چیز کا غم ہوگا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ﴾

(٤٦/ الاحقاف:١٣)

''بے شک جنہوں نے کہا، ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر وہ (راہ پر) جمے رہے، تو نہ ڈر ہے ان کو اور نہ وہ غم کھائیں گے۔''

اس دن جس دن ہیبت سے سب کے دل لرزتے ہوں گے، ان کو جن کو استقامت اور ثابت قدمی کا اطمینان یہاں حاصل تھا، وہاں تسکین و تسلی کا اطمینان بھی حاصل ہوگا، ایسے ثابت قدموں کے کانوں میں ان کی استقامت کی مزدوری میں فرشتوں کی بشارت سنائی دے گی:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۝ ﴾ (٤١/ حٰمٓ السجدة:٣٠)

''بے شک جنہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر جمے رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ خوف اور غم نہ کھاؤ اور اس بہشت کی خوشی سنو جس کا تم سے وعدہ ہے۔''

ان ہی آیتوں کی شرح میں اس حدیث کو سمجھئے کہ ایک صحابی دریافت کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی ایسی بات بتائیے کہ میں اس سے چمٹ جاؤں، ارشاد ہوا: ''کہو کہ میرا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر جم جاؤ۔'' [1] صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان نصیحتوں پر جس استقامت کے ساتھ عمل کیا اور اپنی ایمانی اور اخلاقی بہادری کے جو کارنامے پیش کیے ساڑھے تیرہ سو برس گزر گئے، مگر ان پر تاریخ کی زبان سے برابر حسنت اور آفرین کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں، خود اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احزاب کے سلسلہ میں ان کی استقامت کا ایک نقشہ کھینچا ہے، فرمایا:

﴿ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا۝ ﴾

(٣٣/ الاحزاب:١٠۔١١)

''جب کفار کی متحدہ فوجیں تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے آئیں اور جب ڈگنے لگیں آنکھیں اور دل گلے کو آنے لگے اور تم اللہ سے طرح طرح کے گمان کرتے تھے، وہاں ایمان والے جانچے گئے اور خوب جھڑجھڑائے گئے۔''

اس کے بعد اس موقع پر منافقوں نے جو کمزوری دکھائی اس کی تفصیل ہے، اس کے بعد ہے:

﴿ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا۝ ﴾ (٣٣/ الاحزاب:٢٢)

''اور جب ایمان والوں نے کفار کی ان متحدہ فوجوں کو دیکھا تو بولے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ

[1] ترمذی، ابواب الزهد، باب ماجاء فی حفظ اللسان: ٢٤١٠۔

ہم کو دیا تھا اللہ اور اس کے رسول نے اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا اور اس نے ان کو یقین اور اطاعت میں اور بڑھا دیا۔“

اس کے بعد جن مسلمانوں نے اس قسم کے خطروں میں اپنی کامل استقامت اور ثبات کا وعدہ کیا تھا، اور اس کو پورا کر دکھایا، ان کی تعریف فرمائی جاتی ہے:

﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۲۳)

”ایمان والوں میں بعض وہ مرد ہیں جنہوں نے خدا سے جس چیز کا عہد کیا، اس کو سچ کر دکھایا تو ان میں کوئی تو اپنا کام پورا کر چکا اور کوئی ان میں وقت کی راہ دیکھ رہا ہے اور انہوں نے ذرا بھی نہیں بدلا۔“

یعنی بعض تو خدا کی راہ میں جان دے کر اپنا فرض انجام دے چکے اور بعض ابھی زندہ ہیں اور اس دن کی راہ تک رہے ہیں، جب وہ اپنی استقامت کا امتحان دیں گے اور ان تمام خطروں کے باوجود نہ تو منافقوں کی طرح انہوں نے اپنے دین و ایمان کو بدلا اور نہ خدا سے جو عہد کر چکے تھے اس کو توڑا۔ حق کی راہ میں مشکلات کا پیش آنا اور اس میں مردان خدا کی استقامت کی آزمائش اللہ تعالیٰ کا وہ اصول ہے، جو ہمیشہ سے قائم ہے اور قائم رہے گا اور جب تک اس میں کوئی شخص یا کوئی قوم پوری نہیں اترتی کامیابی کا منہ نہیں دیکھتی، فرمایا:

﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱٤)

”کیا تم کو خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی تم پر تم سے پہلوں کے احوال نہیں آئے ان کو سختی اور تکلیف پہنچتی رہی اور جھڑ جھڑائے گئے، یہاں تک کہ رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی، سن رکھو اللہ کی مدد نزدیک ہے۔“

پہلوں کی استقامت کا جو امتحان لیا گیا اس کے دو واقعے قرآن نے بیان کیے ہیں، ایک تو طالوت کے مختصر سے لشکر کا ہے کہ اس نے تعداد کی کمی اور پیاس کے باوجود غنیم کے بہت بڑے لشکر کا مقابلہ کیا اور آخر کامیاب ہوا اور اس عالم میں اس کی زبان پر یہ دعا جاری تھی:

﴿ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۵۰)

”اے ہمارے پروردگار! ہم میں ڈال دے پوری مضبوطی اور جما ہمارے پاؤں اور اس کافر

قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔''

اور دوسرا واقعہ اصحاب الاخدود کا ہے، احادیث ❶ وسیر میں ہے کہ یمن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کے کچھ مخلص اور پکے مسلمان تھے، یہودیوں نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں اور آخر ان کو گڑھا کھود کر آگ میں جھونک دیا، مگر وہ دین حق سے برگشتہ نہ ہوئے:

﴿ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۙ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۙ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۙ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۭ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴾

(۸۵/ البروج:٤۔۸)

''مارے گئے گڑھے کھودنے والے، آگ بھری ایندھن سے جب وہ اس (گڑھے کے منہ) پر بیٹھے تھے اور جو کچھ وہ ایمان والوں کے ساتھ کر رہے تھے، دیکھ رہے تھے اور وہ ان سے بدلا نہیں لیتے تھے، مگر اسی کا کہ یہ زبردست خوبیوں والے خدا پر ایمان لے آئے تھے۔''

اگلوں کی استقامت کے ان احوال میں سے جن کو محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کیا، وہ واقعہ ہے کہ جس کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح میں نقل کیا ہے، خباب بن ارت رضی اللہ عنہ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے حضور ﷺ سے اپنی مصیبتوں کا حال عرض کیا اور درخواست کی کہ ہمارے لیے دعا کیجیے، کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی بے تابی کا اظہار تھا، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے لوگوں میں ایسا مرد بھی ہوا ہے جس کو زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اور آرے سے اس کو چیر کر دو کر دیا جاتا تھا، مگر یہ اس کو دین حق سے روگرداں نہیں کرتا تھا، اور لوہے کی کنگھیوں سے اس کا گوشت ہڈی سے نوچ کر تار تار کر دیا جاتا تھا، مگر یہ بھی اس کو اس کے دین سے ہٹاتا نہ تھا۔ ❷

رسولِ اسلام ﷺ کی ان تعلیمات اور تلقینات کا جو اثر آپ کے ساتھیوں پر ہوا وہ اہلِ تاریخ سے چھپا نہیں، ان ہی خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کا جو اس روایت کے راوی ہیں، یہ واقعہ ہے کہ اسلام کے جرم میں ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتی تھیں، آخر ایک دن زمین پر کوئلے جلا کر اس پر ان کو چت لٹا دیا گیا اور ایک شخص ان کی چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے ❸ حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے مدتوں کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی تو تائے ہوئے سونے کی طرح سنگ دل قریش کے ظلم و ستم کا یہ سکہ ان کی پیٹھ پر چمک رہا تھا۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ گرم جلتی بالو پر لٹائے جاتے، پتھر کی بھاری چٹان ان کے سینہ پر رکھی جاتی، گلے میں

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الزھد، باب قصة اصحاب الاخدود ...... ٧٥١١ وسیرت ابن ھشام قصة اصحاب الاخدود۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ما لقی النبی ﷺ واصحابه من المشرکین بمکة: ٣٨٥٢۔ ❸ ابن سعد تذکرة خباب بن ارت، ج٣، ص:١١٧۔

رسی باندھ کر زمین پر گھسیٹتے جاتے اور کہا جاتا کہ اسلام سے باز آؤ، اس وقت بھی ان کی زبان سے اَحَدْ اَحَدْ (ایک خدا ایک خدا) ہی نکلتا تھا، حضرت خبیب رضی اللہ عنہ سولی پر لٹکائے جاتے ہیں، مگر خدا کی راہ میں جان کی یہ قربانی ان کو اتنی پسند آتی ہے کہ دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں، خود آنحضرت ﷺ کا وہ فقرہ جس کو آپ ﷺ نے اپنے چچا اور ابو طالب کے جواب میں کہا تھا، اس کی تاثیر اس وقت تک کم نہ ہوگی جب تک آسمان میں سورج اور چاند کی روشنی قائم ہے، فرمایا چچا جان! اگر یہ کافر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی دے دیں تب بھی میں اس دین حق سے باز نہ آؤں گا۔

خود مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے کہ فرض کرو کہ اگر یہ رسول (ﷺ) اس راہ میں مر جائے، یا مارا جائے، تو کیا تم اس راستہ سے جس پر تم چل رہے ہو، الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ نہیں حق کسی کی موت وحیات سے وابستہ نہیں، اس کا ساتھ تم اس لیے دیتے ہو کہ وہ حق ہے:

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ ﴾ (۳/ آل عمران:۱٤٤)

’’اور محمد (ﷺ) تو ایک رسول ہے، اس سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے، پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو الٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔‘‘

پھر اگلی امتوں کا حال سنا کر تسلی دی جاتی اور صبر وثبات اور استقامت کی تعلیم دی جاتی ہے:

﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۱٤٦)

’’اور کتنے پیغمبر ہیں کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا والے لوگ لڑے، تو پھر ان کو خدا کی راہ میں کچھ دکھ پڑا تو ہمت نہیں ہارے اور نہ کمزور ہوئے اور نہ دب گئے اور اللہ ثابت رہنے والوں کو پیار کرتا ہے اور نہ تھا ان کا کہنا مگر یہی کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ اور ہم سے اپنے کام میں جو زیادتی ہوئی اس کو بخش دے اور ہمارے قدم جمائے رکھو اور ہم کو کافر قوم پر مدد دے۔‘‘

سچے اور مخلص مسلمانوں کی استقامت اور ثبات قدم کی یہی کیفیت ہونی چاہیے، اس ایمانی استقامت ہی کے برابر ایک اور چیز استقامت عمل ہے، جس کا نام مداومت ہے، یعنی جس خوبی اور بھلائی کے کام کو اختیار کیا جائے، اس پر مرتے دم تک مداومت رہے، اس کو ہمیشہ اور ہر حال میں کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ کبھی کیجئے اور کبھی نہ کیجئے کہ اس سے طبیعت کی کمزوری اور اس کام سے دل کا بے لگاؤ ہونا ظاہر ہوتا ہے، نماز پڑھنا انسان

کے سب سے اچھے کاموں میں سب سے اچھا کام ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے تعریف ان مسلمانوں کی کی ہے جو اس پر مداومت رکھتے ہیں، فرمایا:

﴿ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝ ﴾ (۷۰/ المعارج :۲۲۔۲۳)

''لیکن وہ نمازی جو اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں (یعنی ہمیشہ پڑھا کرتے ہیں)۔''

اخلاق کی یکسانی، اخلاق کا بڑا جوہر ہے اور اس کی مشق مداومت عمل سے ہوتی ہے اس لیے آنحضرت ﷺ نے بار بار اس کی تلقین فرمائی ہے، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کو کون سا عمل نیک سب سے زیادہ محبوب تھا؟ فرمایا: ''وہ نیکی جس پر مداومت کی جائے۔'' [1] خود آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''خدا کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے جس کو ہمیشہ کیا جائے، اگرچہ وہ تھوڑا ہو۔'' [2]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة العمل:٦٤٦٥۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة العمل:٦٤٦٤۔

حق گوئی

یہ اخلاقی وصف بھی درحقیقت شجاعت ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ جس طرح میدان جنگ میں دونوں طرف کی مسلح فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں ہاتھ پاؤں سے شجاعت اور پامردی کا اظہار کرتی ہیں، بعینہٖ اسی طرح جب حق و باطل کے درمیان باہم معرکہ آرائی ہوتی ہے تو دل اور زبان کی مشترکہ قوت سے حق کی حمایت میں جو آواز بلند کی جاتی ہے، اسی کا نام حق گوئی ہے۔

حق گوئی کا اظہار اس وقت سب سے زیادہ قابلِ ستائش سمجھا جاتا ہے، جب مادی طاقت کے لحاظ سے حق کمزور اور باطل طاقتور ہو اور اسلام نے اسی قابل ستائش حق گوئی کی تعلیم دی ہے اور خود رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا ہے:

﴿ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ﴾ (۱۵/ الحجر: ۹۴۔۹۶)

''پس تم کو جو حکم دیا گیا ہے، اس کو کھول کر سنا دو اور مشرکین کی مطلق پروا نہ کرو، ہم تم کو تمہاری ہنسی اڑانے والوں کے مقابلہ میں جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود قرار دیتے ہیں، کافی ہیں۔''

یعنی اب مخفی طور پر دعوتِ توحید کا زمانہ گزر گیا اور علانیہ اس کی دعوت دینے کا وقت آ گیا ہے، اس لیے کھلم کھلا اللہ کے اس حکم کو بیان کرو اور مشرکین اس کی ہنسی اڑائیں تو ان کے تمسخر و استہزا کی مطلق پروا نہ کرو، بلکہ ان کی قوت و طاقت کی بھی پروا نہ کرو، سب کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ بس ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کو جو چیز حق گوئی سے باز رکھتی ہے وہ خوف ہے، جس کی مختلف قسمیں ہیں، ایک خوف تو لعنت ملامت کا ہے، جس کو اس آیت میں بے اثر کیا گیا ہے اور ایک دوسری آیت میں اس کو مسلمانوں کا ایک معیاری اخلاقی وصف قرار دیا گیا ہے:

﴿ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ﴾ (۵/ المآئدۃ: ۵۴)

''یہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔''

یعنی اہل ایمان حق کے اظہار میں لوگوں کے لعن وطعن کی پروا نہیں کرتے۔

لعنت ملامت کے ساتھ جان و مال اور بہت سی دوسری چیزوں کا خوف بھی انسان کو حق گوئی سے باز رکھتا ہے، لیکن اسلام نے حق گوئی کے مقابل میں ہر قسم کے خوف کو بے اثر کر دیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''کسی کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو اس کے کہنے سے چاہیے کہ انسانوں کا خوف مانع نہ ہو۔'' [1] ایک بار آپ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا، یا رسول اللہ ﷺ! ہم میں کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر کیونکر سمجھ سکتا ہے؟

[1] ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر: ۴۰۰۷ ومابعد میں یہ تمام حدیثیں مذکور ہیں۔

فرمایا: ''اس طرح کہ اس کو اللہ کے بارے میں ایک بات کے کہنے کی ضرورت ہو اور وہ نہ کہے، ایسے شخص سے اللہ قیامت کے دن کہے گا کہ تم کو میرے متعلق فلاں فلاں بات کے کہنے سے کس چیز نے روکا؟ وہ کہے گا کہ انسانوں کا خوف، ارشاد ہوگا کہ تم کو سب سے زیادہ میرا خوف کرنا چاہیے تھا۔'' ❶ انسانوں کے مختلف گروہوں میں سب سے زیادہ ہیبت ناک شخصیت ظلم پیشہ بادشاہوں کی ہوتی ہے، اس لیے ان کے سامنے حق گوئی کو آپ ﷺ نے سب سے بڑا جہاد قرار دیا اور فرمایا:

((افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر)) ❷

''بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کا کہنا ہے۔''

دوسری روایت میں ''کلمہ حق'' کا لفظ ہے۔ ❸

اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جو مدارج قرار دیے گئے ہیں، ان میں دوسرا درجہ اسی حق گوئی کا ہے۔ چنانچہ ایک بار مروان نے عید کے دن منبر نکالا اور نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کیا، اس پر ایک شخص نے کہا کہ مروان تم نے سنت کی مخالفت کی، آج تم نے منبر نکالا حالانکہ آج منبر نہیں نکالا جاتا تھا، نماز سے پہلے خطبہ دیا حالانکہ نماز سے پہلے خطبہ نہیں دیا جاتا تھا، اس پر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد میں نے سنا ہے کہ ''تم میں جو شخص برائی دیکھے اور اس کو ہاتھ سے مٹانے کی طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے مٹا دے ورنہ زبان سے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے، لیکن یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔'' ❹

صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا مرتبہ حق گوئی میں بدرجہ کمال تھا، یہ وہی تھے جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفار قریش کے بھرے مجمع میں حرم میں جا کر توحید کا نعرہ بلند کیا اور اس وقت تک خاموش نہ ہوئے جب تک مار کھاتے کھاتے بے دم نہ ہو گئے، لیکن اس پر بھی ان کا نشہ نہیں اترا اور دوسرے دن پھر جا کر اعلانِ حق کیا اور وہی سزا پائی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی مدح میں فرمایا کہ ''آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابوذر رضی اللہ عنہ سے زیادہ حق گو کوئی نہیں''۔ ❺ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں وہ جب شام میں تھے تو وہاں کے مسلمانوں میں سرمایہ داری کی جو غیر اسلامی شان پیدا ہو رہی تھی اس پر انھوں نے بے محابا دار و گیر کی اور اس میں امیر معاویہ کی پروا انھوں نے ذرا بھی نہیں کی۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ ایک لمبا خطبہ دیا جس میں فرمایا: ''ہشیار رہنا کہ کسی کی ہیبت تم کو اس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے جو تم کو معلوم ہے''۔ یہ سن کر حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ روئے اور فرمایا کہ افسوس ہم نے ایسی باتیں دیکھیں اور ہیبت میں آ گئے۔ ❻

❶ ابن ماجه، ابواب الفتن، باب الامر بالمعروف: ٤٠٠٨۔ ❷ ایضا: ٤٠١١۔ ❸ ایضا: ٤٠١٢۔
❹ ایضا: ٤٠١٣۔ ❺ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب ابی ذر الغفاری: ٣٨٠١۔
❻ ترمذی، ابواب الفتن، باب ما اخبر النبی ﷺ اصحابه: ٢١٩١۔

استغنا

استغنا کے معنی بے نیازی کے ہیں اور ہر چیز سے بے نیازی ایک ایسا وصف ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے:

﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران :۹۷)

”اور جو (مقدور رکھے پیچھے نعمت کی) ناشکری کرے (اور حج کو نہ جائے) تو اللہ دنیا جہان سے بے نیاز ہے۔“

اور اس بے نیازی میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے، وہی ایک بے نیاز ہے اور ساری دنیا اس کی محتاج ہے:

﴿ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ﴾ (٤٧/ محمد:۳۸)

”اور اللہ تو بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو۔“

انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ اس ذاتِ بے نیاز کے سوا دوسروں سے بے نیاز ہو اور یہی چیز اسلامی بے نیازی کے سبق کو بے نیازی کے دوسرے اسباق سے ممتاز کرتی ہے۔ اسلام کے آئینِ اخلاق میں اس استغنا اور بے نیازی کی تعلیم دو اصولوں پر قائم ہے، اول یہ کہ جو کچھ ملتا ہے، اس کا دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے اس کے سوا کسی اور کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا جائے، قرآن مجید کی وہ سورت جس کو ہم ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں دہراتے ہیں، اس کی ایک درمیانی آیت یہ ہے:

﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ ﴾ (١/ الفاتحة: ٤)

”(اے اللہ!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔“

اللہ نے جابجا اپنے کو بندہ کا اصلی کارساز اور کارفرما بتا کر ان کے مضطرب دلوں کو تسکین دی ہے، فرمایا:

﴿ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران :۱۷۳)

”اور کیسا اچھا کارساز۔“

﴿ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل:٦٥)

”اور تیرا رب کارساز بس ہے۔“

﴿ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل:۲)

”میرے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ۔“

﴿ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:۸۱)

”اور اللہ کارساز بس ہے۔“

ایک آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے پوچھتا ہے:

﴿ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ ﴾ (۳۹/ الزمر:۳۶)

''کیا اللہ اپنے بندہ کو بس نہیں۔''

اس لیے کسی شاہ، امیر اور دولت مند کے دروازہ کو جھانکنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرا اصول جس پر اسلامی استغنا کی بنیاد ہے، وہ قناعت ہے۔ یعنی یہ کہ کم سے کم جو ملا ہے، اسی پر طمانیت حاصل کی جائے اور زیادہ کی حرص اور لالچ نہ کیا جائے:

﴿ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ ﴾ (٤/ النسآء:٣٢)

''اور جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی اس کی ہوس مت کرو۔''

﴿ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ ﴾ (٢٠/ طٰهٰ:١٣١)

''اور اپنی آنکھیں نہ پسار اس کی طرف جو ہم نے ان میں سے طرح طرح کے لوگوں کو سامان دیا ہے۔''

بعض لوگ باوجود دولت مند ہونے کے نہایت حریص ہوتے ہیں، مال و دولت سے ان کی نیت نہیں بھرتی اور اس کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرتے ہیں، اس لیے وہ باوجود دولت مند ہونے کے محتاج ہوتے ہیں، لیکن ایک شخص بہت زیادہ دولت مند نہیں ہوتا، تاہم اللہ نے جو کچھ اس کو دیا ہے، اس پر قانع رہتا ہے اور اس سے زیادہ کی حرص نہیں کرتا، اس لیے وہ باوجود مال کی کمی کے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ اس بنا پر استغنا و بے نیازی کا تعلق دولت کی کمی اور بیشی سے نہیں ہے، بلکہ روح اور قلب سے ہے اور اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

((ليس الغنى عن كثرة العرض ولكن الغنى غنى النفس)) ❶

''دولت مندی مال و اسباب کی کثرت کا نام نہیں ہے، بلکہ اصلی دولت مندی دل کی بے نیازی ہے۔''

اسی حدیث کا ترجمہ شیخ سعدی نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے ''تونگری بدل است نه به مال''

ایک اور حدیث میں اس نکتہ کو آپ ﷺ نے اور بھی زیادہ واضح طور پر بیان فرمایا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ابوذر! تمہارے خیال میں مال کی کثرت کا نام بے نیازی ہے؟'' میں نے کہا، ہاں۔ فرمایا: ''تو تمہارے خیال میں مال کی قلت کا نام محتاجی ہے؟'' میں نے کہا: ہاں۔ فرمایا: ''بے نیازی دل کی بے نیازی ہے اور محتاجی دل کی محتاجی۔'' ❷ اس بنا پر بے نیازی درحقیقت رضا و

❶ صحيح بخاري، كتاب الرقاق، باب الغنى غنى النفس:٦٤٤٦۔

❷ صحيح ابن حبان، كتاب الرقائق، باب الفقر والزهد...... : ٦٨٤۔

تسلیم سے پیدا ہوتی ہے، مال و دولت سے پیدا نہیں ہوتی، یعنی اللہ انسان کو جو کچھ دے دے اگر وہ اس پر دل سے راضی ہو جائے تو اسی کا نام بے نیازی ہے، یا کم از کم اس سے بے نیازی کا جوہر نفس میں پیدا ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہی تعلیم دی اور ان سے فرمایا کہ ''جو کچھ تمہاری قسمت میں ہے اگر تم اس پر راضی ہو جاؤ تو تم سب سے زیادہ بے نیاز ہو جاؤ گے۔'' [1] ایک بار چند انصاریوں نے آپ ﷺ سے مال کا سوال کیا اور آپ نے ان کا سوال پورا کیا، لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے اور پھر سوال کیا اور آپ نے پھر ان کا سوال پورا کیا، جب دیتے دیتے تمام مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ ''میرے پاس جو کچھ مال ہو گا تم سے بچا کر جمع نہ کروں گا، جو شخص خودداری چاہتا ہے، اللہ اس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص بے نیازی حاصل کرنا چاہتا ہے، اللہ اس کو بے نیاز کر دیتا ہے۔'' [2] اسی طرح ایک بار حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے بار بار مال کا سوال کیا اور آپ نے ہر بار ان کا سوال پورا کیا، لیکن اخیر میں فرمایا کہ ''اے حکیم یہ مال نہایت مرغوب چیز ہے، جو شخص اس کو کھلے دل سے لیتا ہے، اللہ اس میں برکت دیتا ہے اور جو شخص اس کو حرص کے ساتھ لیتا ہے، اس میں برکت نہیں ہوتی اور اس شخص کے مثل ہوتا ہے جو کھاتا ہے، لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔'' ان پر اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے اس کے بعد کسی کا عطیہ نہیں قبول کیا۔ [3]

فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خوشخبری ہو اس کو جس کو اسلام کی ہدایت ملی اور اس کی روزی ضرورت کے مطابق ہے اور اللہ نے اس کو اس پر قانع بنا دیا ہے۔'' [4] حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جبریل امین نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ ''مومن کا شرف رات کی نماز اور مومن کی عزت انسانوں سے بے نیاز ہو جانا ہے۔'' [5]

---

[1] فتح الباری، ج ١١، ص: ٢٣٤۔

[2] ابو داود، کتاب الزکوٰۃ، باب فی الاستعفاف: ١٦٤٤۔

[3] ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ، باب ان ھذا المال خضرۃ ...: ٢٤٦٣۔

[4] صحیح ابن حبان، کتاب الرقائق، باب الفقر والزھد ...: ٧٠٣۔

[5] مستدرک حاکم، کتاب الرقاق، ج ٤، ص: ٣٢٥۔

رذائل

رذائل کے معنی

رذائل (یعنی بری خصلتیں) وہ اخلاق ذمیمہ ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے۔ جن سے بچنے کا حکم اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے، جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گناہگار ٹھہرتے ہیں، جن کی برائی کو ہر عقلمند جانتا اور مانتا ہے اور جن کے بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور ان کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے، بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتے ہیں، یعنی اس کی دینی و دنیاوی ترقیوں کی راہیں مسدود اور سعادت اور اقبال کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے۔

رذائل کے قرآنی نام

اس قسم کے رذائل کے متعدد اوصافی نام قرآن پاک میں آئے ہیں، مثلاً: اکثر ان کو مُنْکَر (بری باتیں اور فحشاء (بے حیائی) اور کبھی فَاحِشَۃٌ (فحش) سَیِّئَۃٌ (برا) سُوْ (برائی) مَکْرُوْہ (ناپسندیدہ) خطأ (ناصواب یا بھول) اثم (گناہ) عُدْوَانٌ (زیادتی) وغیرہ کہا گیا ہے۔ ان ہی لفظوں سے اندازہ ہوگا کہ رذائل سے متصف ہونا کتنا گھناونا اور نفرت کے قابل ہے اور یہ کہ وہ ایسے کام ہیں، جو عقل اور شرع دونوں کی نگاہوں میں بدنما ہیں، فرمایا:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝ .... وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۳۱-۳۲-۳۷-۳۸)

”اور اپنے بچوں کو مفلسی کے ڈر سے مت مار ڈالو، ہم ہیں ان کو اور تم کو روزی پہنچاتے، بے شبہ ان کا مار ڈالنا بڑی چوک ہے اور زنا کے پاس مت جاؤ بے شبہ یہ بے حیائی اور بری راہ ہے ....اور زمین میں اترا کر نہ چل کہ تو زمین کو پھاڑ ڈالے گا اور نہ لمبائی میں پہاڑ کو پہنچ جائے گا، ان میں سے جو بری بات ہے وہ تیرے پروردگار کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔“

رذائل کے لئے قرآن پاک کا سب سے عام لفظ منکر ہے، چنانچہ سورۂ مائدہ میں جن برائیوں کی روک ٹوک نہ کرنے پر بنی اسرائیل کو ملامت کی گئی ہے، ان کو ایک ہی لفظ منکر سے ادا کیا گیا ہے:

﴿ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ: ۷۹)

”وہ ایک دوسرے کو اس منکر سے جو کرتے تھے روکتے نہ تھے، کیا برا کام ہے جو وہ کرتے تھے۔“

ایک بدکار قوم کی برائیاں گنائی جا رہی ہیں، اس سلسلہ میں ہے:

آیت میں ممانعت نہ کی ہو۔ [1] اس آیت میں منہیات کے سلسلہ میں تین لفظ آئے ہیں، فحشا اور منکر اور بغی ان میں سے ہر لفظ کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

فحشا کے معنی

ان میں پہلا لفظ فَحْشَاءَ ہے، جس کی دوسری صورت فَاحِشَۃٌ کی ہے، یہ لفظ فحش سے نکلا ہے، جس کے اصلی معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ [2] اور اس کے دوسرے لازمی معنی قبح یعنی برائی کے ہیں، کیونکہ جس چیز کی جو حد خالقِ فطرت نے مقرر کر دی ہے، اس سے آگے بڑھنا قبح یعنی برائی ہے، یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جائے وہی فحشا کہلاتی ہے، قرآن پاک نے گناہ کے معنی میں حدود الٰہی سے تعدی اور تجاوز کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوت شہوانی کی تسکین کے لئے کچھ حدیں مقرر فرما دیں، اب جو ان حدوں سے آگے بڑھتا ہے وہ تعدی حدود اور فحشا اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے، فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون: ۵۔۷)

''اور جو اپنی شرم گاہوں کی نگہبانی کرتے ہیں، لیکن اپنی بیویوں پر یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ پر، تو انھیں ملامت نہیں کی جائے گی، پھر جو کوئی اس کے سوا کوئی ڈھونڈے تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔''

اسی لیے زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا گیا ہے اور اس کے معنی ہی امرِ قبیح کے ہو گئے ہیں، قرآن نے کہا ہے:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۳۲)

''اور زنا کے نزدیک نہ جاؤ کیونکہ یہ ''فاحشہ'' (یعنی قبیح بات) اور بری راہ ہے۔''

اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے، جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو باز رہنے کی تاکید کی ہے۔

منکر کے معنی

دوسرا لفظ منکر ہے، اس کے لغوی معنی ناشناسا کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو کام لوگوں میں عام طور سے پسند کیا جاتا ہے اور جس کا کرنے والا لوگوں میں ممدوح ہوتا ہے، وہ تو جانا پہچانا کام ہے، اسی لئے اس کو معروف (شناسا) کہتے ہیں اور جو کام ہر طبقہ میں ناپسند کیا جاتا ہے اور اس کا کرنے والا سب کی نگاہ سے گر جاتا ہے، وہ منکر (ناشناسا) ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے کچھ ناشناسا مہمان آ جاتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں:

﴿ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝ ﴾ (۱۵/ الحجر: ۶۲ و ۵۱/ الذاریات: ۲۵)

---

[1] ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور جزء: ۱۴، ص: ۱۰۰۔

[2] الصحاح للجوہری لفظ فحش ولسان العرب لفظ فاحش زیر "فحش" ج ۲، ص: ۱۰۵۶۔

آیت میں ممانعت نہ کی ہو۔ ❶ اس آیت میں منہیات کے سلسلہ میں تین لفظ آئے ہیں، فحشا اور منکر اور بغی ان میں سے ہر لفظ کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

فحشا کے معنی

ان میں پہلا لفظ فَحْشَاءَ ہے، جس کی دوسری صورت فَاحِشَۃٌ کی ہے، یہ لفظ فحش سے نکلا ہے، جس کے اصلی معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ ❷ اور اس کے دوسرے لازمی معنی قبح یعنی برائی کے ہیں، کیونکہ جس چیز کی جو حد خالقِ فطرت نے مقرر کردی ہے، اس سے آگے بڑھنا قبح یعنی برائی ہے، یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جائے وہی فحشا کہلاتی ہے، قرآن پاک نے گناہ کے معنی میں حدودِ الٰہی سے تعدی اور تجاوز کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوت شہوانی کی تسکین کے لئے کچھ حدیں مقرر فرما دیں، اب جو ان حدوں سے آگے بڑھتا ہے وہ تعدی حدود اور فحشا اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے، فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون: ۵-۷)

''اور جو اپنی شرم گاہوں کی نگہبانی کرتے ہیں، لیکن اپنی بیویوں پر یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ پر، تو انھیں ملامت نہیں کی جائے گی، پھر جو کوئی اس کے سوا کوئی ڈھونڈے تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔''

اسی لیے زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا گیا ہے اور اس کے معنی ہی امرِ قبیح کے ہو گئے ہیں، قرآن نے کہا ہے:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۳۲)

''اور زنا کے نزدیک نہ جاؤ کیونکہ یہ ''فاحشہ'' (یعنی قبیح بات) اور بری راہ ہے۔''

اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے، جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو باز رہنے کی تاکید کی ہے۔

منکر کے معنی

دوسرا لفظ منکر ہے، اس کے لغوی معنی ناشناسا کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو کام لوگوں میں عام طور سے پسند کیا جاتا ہے اور جس کا کرنے والا لوگوں میں ممدوح ہوتا ہے، وہ تو جانا پہچانا کام ہے، اسی لئے اس کو معروف (شناسا) کہتے ہیں اور جو کام ہر طبقہ میں ناپسند کیا جاتا ہے اور اس کا کرنے والا سب کی نگاہ سے گر جاتا ہے، وہ منکر (ناشناسا) ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے کچھ ناشناسا مہمان آ جاتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں:

﴿ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝ ﴾ (۱۵/ الحجر: ۶۲ و ۵۱/ الذاریات: ۲۵)

---

❶ ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور جزء: ۱۴، ص: ۱۰۰۔

❷ الصحاح للجوہری لفظ فحش ولسان العرب لفظ فاحش زیر "فحش" ج ۲، ص: ۱۰۵۶۔

"لوگ ان جانے اوران پہچانے ہیں۔"

حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے جب ان کے بھائی آئے تو انھوں نے تو پہچان لیا، مگر وہ لوگ ان کو پہچان نہ سکے، اس موقع پر قرآن میں ہے:

﴿ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ۝ ﴾ (۱۲/ یوسف:۵۸)

"یوسف نے تو ان کو پہچان لیا، مگر وہ ان کو نہ پہچان سکے۔"

ناگواری کی حالت میں انسان کا چہرہ ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ وہ کس طرح بگڑ جاتا ہے اور اس کے طور و انداز سے بداہتہً ناگواری ظاہر ہونے لگتی ہے، یہ کیفیت بھی منکر ہے، فرمایا:

﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ ﴾ (۲۲/ الحج:۷۲)

"اور جب ان (کافروں) کو ہماری کھلی ہوئی آیتیں سنائی جائیں، تو کافروں کے چہروں میں تو منکر کو (بگڑی ہوئی شکل) پہچانے گا، نزدیک ہوتے ہیں کہ وہ ان پر جو ہماری آیتیں سناتے ہیں، حملہ کر بیٹھیں۔"

اس آیت میں ناخوشگواری کے اثر سے چہرہ میں جو بدنمائی پیدا ہوتی ہے، اس کو منکر کہا گیا ہے۔ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ منکر وہ کام ہیں، جن کو ہر شخص فطرۃً اور بلاشبہ ناپسند کرتا ہے اور ان کی برائی ایسی کھلی ہوتی کہ اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہی سبب ہے کہ ہر مذہب وملت اور ہر اچھے تمدن وتہذیب میں وہ یکساں برے سمجھے جاتے ہیں۔

بغی کے معنی

تیسرا لفظ بغی ہے، جس کے لفظی معنی کسی پر زیادتی یا دست درازی کرنا ہیں:

﴿ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ ﴾ (۳۸/ ص:۲۲)

"ہم دو جھگڑنے والے ہیں، ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔"

اللہ فرماتا ہے کہ اگر لوگوں کو بے انتہا دولت دے دی جائے تو وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگیں:

﴿ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۲۷)

"اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لئے روزی پھیلا دے تو وہ زمین میں زیادتی کریں۔"

اسی سورہ میں ہے:

﴿ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ﴾

(۴۲/ الشوریٰ:۴۲)

"راہ ان ہی پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زمین میں زیادتی کرتے ہیں۔"

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ بغی کے معنی دوسروں پر زیادتی اور تعدی کے ہیں۔

اخلاق ذمیمہ برے کیوں ہیں

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ رذائل تین یعنی: فحشاء ، منکر اور بغی میں منحصر ہیں۔ صفاتِ ذمیمہ فحشا یعنی حد درجہ قبیح اور بے حیائی کے کام ہیں اور ایسی باتیں ہیں، جن کو سارے انسان فطرۃً ناپسند کرتے ہیں اور ان کے جائز کر دینے سے دوسروں کے حقوق پر تعدی لازم آتی ہے۔

سورۂ اعراف کی ایک آیت ہے:

﴿ قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾

(۷/ الاعراف:۳۳)

''اے پیغمبر! کہہ دے کہ میرے پروردگار نے برائی کے سارے کاموں (فواحش) کو جو کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو منع کیا ہے۔''

اس آیت میں بھی رذائل کو تین لفظوں میں منحصر کیا ہے، ایک فواحش یعنی برائی اور بے حیائی کے سارے کام جو کھلے ہوں یا چھپے، دوسرے گناہ کے کام اور تیسرے ناحق زیادتی، ان اخلاقِ ذمیمہ کی جن کو ہر مذہب اور ہر انسانی معاشرت نے یکساں برا کہا ہے، اگر تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ درحقیقت برائی اور بے حیائی کے کام ہیں اور دین و شرافت کی نگاہ میں گناہ اور ناپسندیدہ ہیں اور اگر ان کو جائز ٹھہرایا جائے تو افراد کے باہمی حقوق سے ایمان اٹھ جائے اور کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سلامت نہ رہے۔ [1]

رذائل کی ترتیب

ان رذائل کی ترتیب دو نظریوں کے مطابق دی جاسکتی ہے، ایک یہ کہ کسی برائی کے اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدہ اور عدم رضا سے کس کو کتنا لگاؤ ہے۔ اوپر کی آیت میں ترتیب کے ساتھ رذائل کو تین بڑے عنوانوں میں گویا تقسیم کر دیا گیا ہے، سب سے پہلے فحشا پھر منکر، پھر بغی فَحْشَآء میں جس برائی کی طرف اشارہ ہے، وہ اساساً ایک فرد کی ذات تک محدود رہتی ہے، جیسے ننگے رہنا، بدکاری میں مبتلا ہونا وغیرہ۔ منکر سے پوری جماعت کی معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے، جیسے شوہر کا ظلم، باپ کی سنگدلی، اولاد کی نالائقی اور بغی جماعت سے آگے بڑھ کر پورے ملک وملت کو چھا لیتی ہے، جیسے چوری، قتل، ڈاکہ وغیرہ۔

یہ تو ایک نظریہ کے مطابق رذائل کی ترتیب ہوئی۔ دوسرے نظریہ کے رو سے پہلے صفاتِ ذمیمہ ہیں جن سے اللہ کی رحمت چھن جاتی ہے، پھر وہ برائیاں ہیں، جو اللہ کی محبت سے محروم کر دیتی ہیں اور پھر وہ ہیں جو رضائے الٰہی سے خالی ہیں۔

---

[1] منطقی اصطلاح میں فحشاء، منکر اور بغی میں مانعة الخلو ہے، یعنی کسی بداخلاقی میں ان تینوں کا اجتماع تو ہوسکتا ہے، مگر کوئی بداخلاقی ان تینوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں رہ سکتی، یعنی ہر بداخلاقی میں تینوں کا یا تینوں میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

جھوٹ

انسان کے سارے اخلاقِ ذمیمہ میں سب سے زیادہ بری اور مذموم عادت جھوٹ کی ہے۔ یہ جھوٹ خواہ زبان سے بولا جائے یا عمل سے ظاہر ہو جائے، کیونکہ ہمارے اعمال کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ واقعہ کے مطابق ہوں اور جھوٹ ٹھیک اس کی ضد ہے، اس لئے یہ برائی ہر قسم کی قولی اور عملی برائیوں کی جڑ ہے، انسان کے دل کے اندر کی بات سوا اللہ کے کوئی دوسرا نہیں جانتا، کوئی دوسرا کسی شخص کے متعلق اگر کچھ جان سکتا ہے یا باور کر سکتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص خود اپنی زبان یا عمل سے اس کو ظاہر کرے۔ اب اگر وہ اپنی اندرونی صحیح اور واقعہ کے مطابق بات جان بوجھ کر نہیں ظاہر کرتا بلکہ اس کے خلاف ظاہر کر رہا ہے تو وہ ساری دنیا کو فریب دے رہا ہے، ایسے شخص میں دنیا کی جو برائیاں بھی نہ ہوں وہ کم ہے، کیونکہ اس نے تو اسی آئینہ کو توڑ ڈالا ہے، جس میں حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے۔

اسی لئے نبی کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ صادق ہو، چنانچہ بعض پیغمبروں کے لئے یہ صفت کے طور پر بولا گیا ہے، فرمایا:

﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۙ﴾ (۱۹/ مریم:۵۶)

''اور اس کتاب میں ادریس کا ذکر کر، وہ بے شک بڑا سچا نبی تھا۔''

اسی لیے جو کاذب ہے وہ نبی نہیں ہو سکتا، کیونکہ پھر اس کے دعویٰ اور پیام پر کسی کو بھروسہ کیونکر ہوگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی نبوت کا دعویٰ فرعون کے سامنے پیش کیا اور اس نے اس کے ماننے سے انکار کیا تو اس کے ایک درباری نے جو دل میں مسلمان تھا، فرعونیوں کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صدقِ نبوت پر ان کی عام سچائی ہی سے دلیل پیش کی اور کہا کہ جھوٹا اللہ کا نبی نہیں ہو سکتا:

﴿ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴾

(۴۰/ المؤمن:۲۸)

''اگر یہ جھوٹا ہوگا تو اس کا جھوٹ اسی پر پڑے گا اور اگر سچا ہوگا تو تم پر پڑے گا کوئی وعدہ جو تم کو دیتا ہے، بے شک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو بے باک جھوٹا ہو۔''

اس میں یہ تلمیح بھی چھپی ہے کہ مدعی نبوت کے برخلاف فرعون اپنے ہر کام کر گزرنے میں بے باک اور جھوٹا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹے انبیا علیہم السلام کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں اور کفار کے طور و طریق پر چلتے ہیں۔ روم کے قیصر نے بھی اپنے دربار میں ابوسفیان سے جو باتیں پوچھی تھیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ مکہ کا مدعی اپنے دعوائے نبوت سے پہلے کیا جھوٹ بھی بولا کرتا تھا؟ ابوسفیان نے جواب دیا نہیں۔ قیصر نے کہا، جو

بندہ پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ اللہ پر جھوٹ باندھے گا؟ [1] یہ نہیں ہوسکتا۔

قرآن پاک میں نبی کی صداقت کی دلیل میں ایک اور آیت ہے:

﴿ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۙ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ۝ ﴾ (۲۶/ الشعرآء:۲۲۳)

''شیطان اترتے ہیں ہر جھوٹے گناہگار پر، لا ڈالتے ہیں سنی بات اور بہت ان میں جھوٹے ہیں۔''

اس سے بھی معلوم ہوا کہ جھوٹ انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت اور روش کے سراسر خلاف ہے، اسی لیے جو جھوٹا ہوتا ہے اس کے دل سے اللہ کی روشنی (ہدایت) بجھ جاتی ہے، ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝ ﴾ (۳۹/ الزمر:۳)

''بے شک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو جھوٹا ہے، احسان نہیں مانتا۔''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جھوٹ گناہ (فجور) کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ دوزخ میں اور جھوٹ بولتے بولتے آدمی اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔'' [2] حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! جنت میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا: ''سچ بولنا، جب بندہ سچ بولتا ہے تو نیکی کا کام کرتا ہے اور جو نیکی کا کام کرتا ہے، وہ ایمان سے بھرپور ہوتا ہے اور جو ایمان سے بھرپور ہوا وہ جنت میں داخل ہوا۔'' اس نے پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا: ''جھوٹ بولنا، جب بندہ جھوٹ بولے گا، تو گناہ کے کام کرے گا اور جب گناہ کے کام کرے تو کفر کرے گا اور جو کفر کرے گا دوزخ میں جائے گا۔'' [3]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جھوٹ کی برائی کی وسعت اتنی ہے کہ کفر بھی اس میں آ جاتا ہے، جس سے زیادہ بری چیز کوئی دوسری نہیں اور جس کے لیے نجات کا ہر دروازہ بند ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ وسیع ہے، وہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو گھیرے ہوئے ہے، اس کی رحمت کی چھاؤں میں ساری کائنات آرام کر رہی ہے، مگر رحمتِ الٰہی کے اس گھنے سایہ سے وہ باہر ہے، جس کا منہ جھوٹ کی بادِ سموم سے جھلس رہا ہے۔

اسلام کے لغت کا سخت ترین لفظ ''لعنت'' کے معنی ''اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی'' کے ہیں، قرآن پاک میں اس کا مستحق شیطان بتایا گیا ہے اور اس کے بعد یہودیوں، کافروں اور منافقوں کو اس کی وعید سنائی گئی ہے، لیکن کسی مومن کو کذب کے سوا اس کے کسی فعل کی بنا پر لعنت سے یاد نہیں کیا گیا۔ جھوٹ بولنے اور جھوٹا الزام لگانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت کی جائے مباہلہ کے موقع پر

---

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی: ۷۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قوله تعالیٰ: ﴿وكونوا مع الصادقين﴾: ۶۰۹۴ وجامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الصدق: ۱۹۷۱ وابوداود، کتاب الادب، باب التشدید فی الکذب: ۴۹۸۹۔ [3] مسند احمد، ج۲، ص:۱۷۶۔

فرمایا گیا کہ دونوں فریق خدائے تعالیٰ سے گڑ گڑا کر دعا مانگیں کہ جو ہم میں جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو:

﴿ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران :۶۱)

''پھر دعا کریں، پھر جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔''

میاں بیوی کے لعان کی صورت میں جب شوہر بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے اور شوہر کے پاس اس کا کوئی گواہ نہ ہو تو اس کو چار دفعہ اپنی سچائی کی قسم کھانے کے بعد پانچویں دفعہ یہ کہنا پڑے گا:

﴿ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ۝ ﴾ (۲٤/ النور:۷)

''اس پر اللہ کی لعنت ہو، اگر وہ جھوٹوں میں سے ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس کا مرتکب ہوتا ہے، وہ کافروں اور منافقوں کی طرح کی بددعا کا مستحق ہوتا ہے۔

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جان کر کوئی انجان بن جائے، حق کا علم رکھ کر اس کے اظہار سے باز رہے، اللہ تعالیٰ نے ایسے جھوٹوں پر بھی لعنت فرمائی ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ :۱۵۹)

''بے شک جو چھپاتے ہیں جو اتارے ہم نے صاف حکم اور راہ کے نشان، اس کے بعد کہ ہم نے کتاب میں ان کو انسانوں کے لیے کھول کر کہہ دیا ہے، ان پر اللہ لعنت بھیجتا ہے اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔''

یہ جھوٹ کی سلبی صورت ہے، کیونکہ اس خاموشی اور اخفا سے مقصود یہ ہے کہ لوگ اس حق کو باور نہ کریں اور اس کو جھوٹا سمجھیں، اس لیے وہ جھوٹ کے گو قولاً نہیں، لیکن عملاً مرتکب ہوتے ہیں اور نفاق کی پرورش کرتے ہیں۔ نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ، اس لیے جو منافق ہوگا وہ جھوٹا ہوگا، چنانچہ قرآن پاک نے بھی اس کی تصدیق کی ہے، فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ۝ ﴾ (٦٣/ المنافقون :١)

''اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔''

اسی لیے آنحضرت ﷺ نے جھوٹ کو منافق کی نشانی قرار دیا ہے، فرمایا کہ ''منافق کی پہچان تین ہے، جب کہے جھوٹ بولے، جب وعدے کرے پورا نہ کرے اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔'' [1]

لفظوں میں تو یہ باتیں تین ہیں، لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی شکل کی تین مختلف تصویریں ہیں، جھوٹ باتیں کرنا

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قوله تعالیٰ: ﴿يايها الذين امنوا اتقوا الله وكونوا مع الصادقين﴾: ٦٠٩٥۔

تو جھوٹ ہے ہی مگر وعدہ کر کے پورا نہ کرنا بھی جھوٹ ہی ہے اور اسی طرح امین بن کر خیانت کرنا بھی عملی جھوٹ ہے۔ کیونکہ جو امین بنتا ہے وہ معناً اپنی نسبت یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اس میں خیانت نہ کرے گا اور جب اس نے اس کے خلاف کیا تو وہ عملاً جھوٹ بولا۔ جھوٹ اکیلی برائی نہیں، بلکہ اس کی وجہ سے جھوٹے میں، بیسیوں قسم کی دوسری برائیاں بھی لازمی طور سے پیدا ہو جاتی ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کاذب کے ساتھ ساتھ دوسری بری صفتیں بھی ظاہر کی ہیں، جیسے:

﴿ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴾ (۲٦/ الشعرآء:۲۲۲)

''جھوٹ بولنے والا گناہگار۔''

﴿ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴾ (۳۹/ الزمر:۳)

''جھوٹ بولنے والا، احسان کا حق نہ ماننے والا۔''

﴿ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴾ (٤٠/ المؤمن:۲۸)

''بے باک جھوٹا۔''

ان آیتوں نے بتایا کہ جھوٹا گناہوں میں لت پت ہوتا ہے، کیونکہ جھوٹ کی عادت کے سبب سے وہ کسی برائی کے کرنے سے جھجکتا نہیں، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ موقع پر جھوٹ بول کر میں اس کو چھپالوں گا، اس لیے وہ ہر برائی کے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جو جھوٹا ہوگا وہ اپنے کسی محسن کا احسان بھی نہیں مانے گا، کیونکہ جو خود جھوٹا ہے وہ دوسرے کو بھی اس کے عمل اور نیت میں جھوٹا ہی سمجھے گا اور اگر وہ زبان سے کہے بھی کہ میں مانتا ہوں تو کسی کو اس بات پر یقین کاہے کو آنے لگا۔ اسی طرح جو جھوٹ بولتا ہے اس کو کسی برے سے برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا، وہ ہر گناہ پر دلیر اور حد سے بڑھ جاتا ہے۔

جھوٹ کی عام قسم تو یہی ہے کہ زبان سے وہ کہا جائے جو دل میں نہیں، یا اس کے اندرونی علم و یقین کے خلاف ہو، لیکن یہ کذبِ قولی یعنی زبان کا جھوٹ ہے۔ کذبِ عملی یعنی عمل کا جھوٹ یہ ہے کہ جو کہا جائے وہ نہ کیا جائے:

﴿ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴾ (۹/ التوبۃ:۷۷)

''اس لیے کہ اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور اس لیے کہ جھوٹ بولتے تھے۔''

اس جھوٹ کے سبب سے ان کے دلوں میں نفاق نے جگہ پکڑی، قسم کھا کر اور وعدہ کر کے کسی کام کو طاقت رکھ کر پھر نہ کرنا، ایک قسم کا فریب تو ہے ہی، مگر جھوٹ بھی ہے اور ایسا جھوٹ جو مہلک ہے:

﴿ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ (۹/ التوبۃ:٤۲)

''اور وہ قسم کھائیں گے کہ ہم کو مقدور ہوتا تو ہم تمہارے ساتھ لڑائی میں چلتے، وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں اور اللہ کو معلوم ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔''

سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے ان صادقین کا ذکر فرمایا ہے، جنھوں نے اپنی سچائی کا عملاً ثبوت دیا اور جو عملاً جھوٹے ٹھہرے ان کو منافق کا خطاب دیا ہے، فرمایا:

﴿ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۲٤)

''تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کے سبب سے اجر دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا ان پر رجوع ہو (یعنی مسلمان ہو جائیں تو معاف ہو جائے)۔''

انسان کی طرح اس کا عضو عضو بھی جھوٹ کا مرتکب ہو سکتا ہے، فرمایا:

﴿ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۚ﴾ (۹٦/ العلق:۱٦)

''جھوٹی خطا کار پیشانی۔''

ہر چند کہ اس کو استعارہ کہیے، پھر بھی پیشانی کا جھوٹ کلنک کا ٹیکا ہے، جو مٹ نہیں سکتا۔

اسی طرح ریا کاری کرنا اور جو نہیں ہے اپنے کو وہ دکھانے کی کوشش کرنا بھی عملاً جھوٹ ہے:

﴿ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ ﴾ (۳/ آل عمران:۱٦۷)

''انھوں نے کہا اگر ہم جانیں کہ لڑائی ہوگی تو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں، وہ اس وقت ایمان سے زیادہ کفر سے قریب ہیں، وہ منہ سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں۔''

دل کے ان بیماروں کے متعلق جو مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے اور مسلمانوں کو آ کر اپنی صلح پسندی کا جھوٹا یقین دلاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۚ﴾ (٤/ النسآء:٦۳)

''یہ وہ ہیں جن کے دل کا حال اللہ جانتا ہے۔''

ایسے ہی وہ شخص جو اپنے آپ کو وہ دکھانا چاہے جو وہ نہیں ہے یا اپنے میں وہ باور کرانا چاہے جو اس میں نہیں ہے جھوٹا ہے۔ ایک دفعہ ایک عورت نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ! میری ایک پڑوسن (سوتن) ہے، کیا اگر میں یہ ظاہر کروں کہ مجھے شوہر نے یہ دیا یہ دیا اور واقعہ یہ نہ ہو صرف اس کو جلانا مدنظر ہو تو کیا یہ بھی گناہ ہے؟ فرمایا: ''جو جتنا نہیں دیا گیا اتنے کا دکھاوا کرنے والا جھوٹ کے دو جامے پہننے والے کی طرح ہے۔'' [1] حدیث کے شارح کہتے ہیں کہ دو جامے یوں کہ جو اس کے پاس نہیں اس کا ہونا اپنے

---

[1] ابوداود، کتاب الادب، باب فیمن یتشبع بمالم یعط:٤۹۹۷۔

پاس بتانا جھوٹ کا ایک جامہ ہوا اور جس نے جو نہیں دیا، اس کا دینا بتانا اس پر جھوٹ باندھنا ہے، یہ جھوٹ کا دوسرا جامہ ہوا۔ اسی طرح جو عالم نہیں وہ اپنے کو عالم باور کرانے کی کوشش کرے، جو دولت مند نہیں وہ دولت مندی کا دکھاوا کرے، یعنی کسی کے پاس جو چیز نہیں اس کو اپنے پاس دکھانے کی کوشش کرنا، درحقیقت دوسروں کو فریب دینے کی کوشش ہے۔ غالباً اسی لیے اس عورت کو جس کے سر کے بال چھوٹے ہوں، اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ وہ مصنوعی بال لگا کر اپنے بالوں کو لمبا بنائے، آنحضرت ﷺ نے اس کو بھی زُوْر فرمایا ہے۔ [1]

جھوٹ کے بہت سے مرتبے ہیں، اچھے اچھے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ بے ضرر جھوٹ کو برا نہیں جانتے، جیسے اکثر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بچوں کو بہلانے کے لیے ان سے جھوٹے وعدے کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان وعدوں کو تھوڑی دیر میں بھول جائیں گے اور گو ہوتا بھی اکثر یہی ہے، مگر جھوٹ بہر حال جھوٹ ہے۔ اسلام نے اس جھوٹ کی بھی اجازت نہیں دی ہے، ایک کمسن صحابی عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میری ماں نے مجھے بلایا اور حضور انور ﷺ میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے، تو ماں نے میرے بلانے کے لیے کہا کہ یہاں آ تجھے کچھ دوں گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم کہتی ہو مگر تم اس کو کچھ دینا نہیں چاہتی ہو۔'' ماں نے کہا، اس کو کھجور دے دوں گی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں اگر تم اس کو اس وقت کچھ نہ دیتیں تو یہ جھوٹ بھی تمہارا لکھا جاتا۔'' [2]

اس تعلیم کا منشا یہ تو ہے ہی کہ مسلمان کو کسی حال میں بھی اپنے لب کو جھوٹ سے آلودہ نہیں کرنا چاہیے، لیکن اس موقع پر سچ بولنے کی تاکید فرمانا اس لیے بھی ہے کہ ماں باپ کی غلط تعلیم و تربیت سے بچے پر برا اثر پڑے گا، وہ بچپن میں جو کچھ دیکھے اور سنے گا، اسی سانچے میں ڈھلے گا۔ اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ بچوں سے بھی جھوٹ نہ بولیں۔ بعض لوگوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ جب ان کو کھانے کے لیے یا کسی اور چیز کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ تصنع اور بناوٹ سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ مجھے خواہش نہیں، حالانکہ ان کے دل میں اس کی خواہش موجود ہوتی ہے اور وہ انکار کرتے ہیں تو یہ بھی جھوٹ ہے، چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابیہ خاتون حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا، کہ ہم میں سے کوئی کسی چیز کی خواہش رکھے اور پھر کہہ دے کہ مجھے اس کی خواہش نہیں تو کیا یہ بھی جھوٹ شمار ہوگا؟ ارشاد ہوا کہ ''ہر چھوٹے سے چھوٹا جھوٹ بھی جھوٹ لکھا جاتا ہے۔'' [3] اسی طرح وہ جھوٹ ہے جو خوش گپی کے موقع پر محض لطفِ صحبت کے لیے بولا جاتا ہے، اس سے بھی اگرچہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، بلکہ بعض موقعوں پر یہ ایک دلچسپی کی چیز بن جاتا ہے، تاہم اسلام نے اس کی بھی اجازت نہیں دی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو شخص لوگوں کے ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا

[1] صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب الوصل الشعر: ٥٩٣٨۔

[2] ابوداود، کتاب الادب، باب التشدید فی الکذب: ٤٩٩١۔ [3] مسند احمد، ٦/ ٤٣٨ وطبرانی کبیر (مجمع الزوائد ہیثمی، کتاب العلم، باب فی ذم الکذب) ج ١، ص: ١٤٠۔

ہے، اس پر افسوس، اس پر افسوس۔'' ❶ کیونکہ اس سے آدمی کا وزن ہلکا ہوتا ہے اور اس کی بات بے اعتبار ہوتی ہے اور ہر شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس شخص کا سچ جھوٹ برابر ہے۔ اس صورت کے علاوہ جھوٹ کی جتنی خطرناک صورتیں ہیں، ان کے خطرات کے لحاظ سے اسلام نے ان کے مدارج مقرر کیے ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص ایک شخص کو سچا اور قابلِ اعتبار سمجھتا ہے، اس لیے اس کی ہر بات کا یقین کر لیتا ہے، لیکن وہ شخص اس کے علم و یقین سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور جھوٹ بول کر اس کو سخت فریب و نقصان میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اسلام نے اس کو سخت خیانت قرار دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''یہ ایک بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے ایک جھوٹی بات کہو درآنحالیکہ وہ تم کو سچا سمجھتا ہو۔'' ❷ اس سے بھی زیادہ خطرناک جھوٹ وہ ہے، جس سے لوگوں کے حقوق اور عزت و آبرو کو نقصان پہنچے اور اس سے معاشرتی نظام میں خلل واقع ہو، یہ جھوٹ عام جھوٹ سے اس قدر مختلف ہے کہ اسلام نے اس کا نام تک بدل دیا ہے اور اس کو زُور اور اِفک وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے، جس کے معنی منحرف ہونے اور الٹ پلٹ دینے کے ہیں۔ جھوٹ کی یہ صورت اس قدر خطرناک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرک کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا ہے اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے:

﴿ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ ۝ ﴾ (۲۲/ الحج: ۳۰)

''بتوں کی گندگی اور جھوٹی بات کے کہنے سے بچتے رہو۔''

زُور اگرچہ ایک عام لفظ ہے، جس میں کذب و بہتان وغیرہ سب شامل ہیں، لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے خاص طور پر شہادت مراد ہے۔ جامع ترمذی میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ ''کیا میں تم لوگوں کو سب سے بڑا گناہ بتاؤں؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا، ہاں یا رسول اللہ ﷺ! فرمایا کہ ''شرک اور ماں باپ کی نافرمانی''۔ راوی کا بیان ہے کہ آپ ﷺ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعۃً اٹھ بیٹھے اور کہا کہ ''جھوٹی شہادت'' یا ''جھوٹی بات۔'' اور برابر یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے کہا کہ کاش آپ ﷺ خاموش ہو جاتے۔ ❸

اس آیت پاک اور اس کی اس تشریحی حدیث میں غور کرنے سے یہ نکتہ ملتا ہے کہ شرک کے بعد ہی جو برائی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذکر کے قابل تھی وہ یہی جھوٹ ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اس کی گندگی کا کیا عالم ہوگا۔ اِفْكٌ اس سے بھی زیادہ سخت لفظ ہے، اس کے معنی ہیں کسی پر جھوٹ باندھنا۔ مشرک اللہ پر جو جھوٹ باندھا کرتے تھے، ان کو قرآن نے افک کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اس کی سرحد کبھی کبھی شرک سے مل جاتی ہے۔ منافقین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جو بہتان لگایا تھا، اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ ''افک'' سے

❶ سنن ابی داود، کتاب الادب، باب التشدید فی الکذب: ۴۹۹۰۔

❷ ادب المفرد، باب اذا کذبت لرجل هو لك مصدق: ۳۹۳۔

❸ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة باب ماجاء فی حقوق الوالدین: ۱۹۰۱۔

تعبیر کیا ہے۔(سورۃ النور) اور قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ افک بڑے خبث طینت کا کام ہے، فرمایا:

﴿ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴾ (۲٦/ الشعرآء:۲۲۲)

''اور شیطان (تو) اترا کرتے ہیں ہر جھوٹ باندھنے والے بدکردار پر۔''

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان جھوٹ سچ جو کچھ سنے اس کو بلا تحقیق دوسروں سے کہتا پھرے، ایسا شخص بے اعتبار سمجھا جاتا ہے اور سوسائٹی میں اس کی بات کی کوئی قدر نہیں ہوتی، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ)) [1]

''آدمی کو یہ جھوٹ بس ہے کہ جو سنے وہ کہتا پھرے۔''

ایسے لوگوں کو جو ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے:

﴿ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٤١)

''جھوٹ کے بڑے سننے والوں۔''

کا خطاب دیا ہے۔ یہودیوں کے ایک گروہ کی نسبت فرمایا:

﴿ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٤١)

''جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں۔''

[1] صحیح مسلم، المقدمۃ، باب النهی عن الحديث بكل ما سمع: ٧۔

جھوٹی قسمیں کھانا

قسم کھانا حقیقت میں شہادت یعنی گواہی ہے۔ جو شخص کسی بات کو اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہے، وہ اصل میں اپنے بیان کی سچائی پر اللہ کو گواہ بناتا ہے۔ ایسی حالت میں خیال کرنا چاہیے کہ اس معاملہ کی اہمیت کتنی بڑی ہے اور قسم کھانا کتنی غیر معمولی بات ہے۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور سچائی سے دور ہیں وہ بات بات پر قسم کھاتے ہیں، انھیں معلوم ہے کہ لوگ ان کے بیان کو سچا نہیں سمجھتے اس لیے وہ لوگوں کو فریب دینے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔

اول تو بے ضرورت قسم کھانا ہی برا ہے۔ پھر جھوٹی قسمیں کھانا تو اور بھی برا ہے، اسی لیے قرآن پاک میں اس قسم کے کھانے والوں کی بہت برائی آئی ہے، یہ جھوٹ کی بدترین شکل ہے، جس میں جھوٹ بولنے والا اپنے ساتھ اللہ کو بھی شریک کرتا ہے۔ اسی لیے کسی آیندہ کی بات پر اگر کوئی قسم کھالے تو اس کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور اگر کسی سبب سے پورا نہ کر سکے تو وہ گناہگار ہوتا ہے اور اس پر کفارہ لازم آتا ہے، کفارہ یہ ہے کہ وہ کوئی غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا کپڑے پہنائے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو تین روزے رکھے اور اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ کسی کو قسم کھانے کے بعد اگر دوسری شکل بہتر معلوم ہو تو وہ اپنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دے۔ [1]

﴿ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ ﴾

(٥/ المآئدة:٨٩)

''اللہ تم کو تمہاری بے فائدہ قسموں پر نہیں پکڑتا، لیکن اس قسم پر پکڑتا ہے جس کو تم نے گرہ باندھا، تو اس قسم کے توڑنے کا کفارہ دس محتاجوں کو کھلانا بیچ کا کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو دیتے ہو، یا ان کو کپڑا دینا، یا ایک غلام آزاد کرنا، تو جس کو یہ پیدا نہ ہو تو تین دنوں کا روزہ رکھنا، یہ ہے تمہاری قسموں کا اتار جب تم قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کو نگاہ رکھو۔''

قسموں کو نگاہ رکھنا یہ ہے کہ جس بات پر نیت کر کے قسم کھائی جائے، اگر وہ کوئی خلاف شرع یا غیر انسب نہ ہو تو اس کی پوری ذمہ داری محسوس کی جائے اور اس کو حتی المقدور پورا کیا جائے اور اگر پوری نہ کی جا سکے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے۔ یہ کفارہ اسی لیے مقرر کیا گیا ہے، تاکہ قسم کھا کر اس کے پورا کرنے کی ذمہ داری اور اہمیت کے خیال کو نقصان نہ پہنچے۔

---

[1] ابو داود، كتاب الايمان والنذور، باب الحنث اذا كان خيرًا: ٣٢٧٦ تا ٣٢٧٨۔

کسی خلاف شرع بات پر جو قسم کھائی جاتی ہے یا وہ بات جس پر قسم کھائی گئی ہے، بعد کو غیر انسب معلوم ہو، تو اس قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کر دینا درست ہے، اللہ نے فرمایا:

﴿ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ ﴾ (٦٦/ التحريم:٢)

''اللہ نے تم کو اپنی قسموں کا کھول ڈالنا ٹھہرا دیا ہے۔''

اور احادیث میں اس کی جزئی تصریحات مذکور ہیں۔

گزشتہ یا موجودہ واقعات پر قسم کھانا جیسا کہ کہا جا چکا حقیقت میں گواہی اور شہادت ہے اور معلوم ہو چکا ہے کہ گواہی اور شہادت میں جھوٹ بولنا کتنا بڑا گناہ ہے، اسی لیے ایسا شخص جو بات بات پر قسمیں کھاتا رہتا ہے، حد درجہ بے اعتبار اور نا قابل اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایسے شخص پر اعتبار نہ کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو انسان کا بڑا عیب بتایا ہے، رسول کو حکم ہوتا ہے:

﴿ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۙ﴾ (٦٨/ القلم:١٠)

''اور بہت قسمیں کھانے والے ذلیل کا کہنا مان۔''

سمجھنے کی بات ہے کہ قسم کھانے کا مدعا یہ ہے کہ لوگ اس کا کہنا مانیں اور اس کا اعتبار کریں، لیکن اللہ تعالیٰ سرے سے اس طرح کی قسمیں کھانے والے کی بات کے نہ ماننے کی ہدایت اور اس کی بے قدری اور بے اعتباری کا اعلان فرماتا ہے۔

چونکہ اس طرح کی قسمیں کھانے والے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں، اسی لیے یہ نفاق کی بڑی نشانی ہے اور قرآن پاک میں اسی حیثیت سے اس کا ذکر بار بار آیا ہے، منافقوں کے تذکرہ میں ہے کہ جب ان پر کوئی افتاد پڑتی ہے تو قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہمارا یہ منشا نہ تھا، ہماری نیت نیک تھی، اللہ فرماتا ہے کہ اللہ کو تمہارے دل کی بات خوب معلوم ہے:

﴿ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۤ ﴾ (٤/ النساء:٦٢)

''پھر کیسا جب ان کو اپنے ہی کرتوت سے کوئی تکلیف پہنچے، پھر تیرے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے آئیں کہ ہماری غرض بھلائی اور ملاپ کی تھی، یہ وہ ہیں جن کے دلوں کا حال اللہ کو معلوم ہے۔''

یعنی اللہ جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کچھ ہے اور زبانوں پر کچھ ہے، ایسے لوگ یہ چاہا کرتے ہیں کہ قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر متعلق اشخاص کو خوش کر دیں، اللہ فرماتا ہے کہ اگر ان کے پاس ایمان ہو تو ان کو چاہیے کہ سچائی اختیار کر کے اللہ اور رسول کو خوش کریں:

﴿ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾

(۹/ التوبة:٦٢)

’’تمہارے (مسلمانوں کے) آگے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں، تا کہ وہ تم کو راضی کر لیں اور اللہ اور رسول کو راضی کرنا زیادہ ضروری ہے، اگر وہ ایمان دار ہیں۔‘‘

ایسے منافقوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب کوئی بری بات منہ سے نکالتے ہیں اور اس پر پوچھ گچھ ہونے لگتی ہے تو فوراً مکر جاتے ہیں:

﴿ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا ۚ وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا ﴾ (۹/ التوبة:٧٤)

’’اللہ کی (جھوٹی) قسمیں کھاتے ہیں کہ انھوں نے نہیں کہا، حالانکہ انھوں نے بے شک کفر کی بات کہی۔‘‘

ایک موقع پر منافقوں نے ایک نامعقول کام کیا، اللہ نے فرمایا کہ تم جا کر ان سے پوچھو گے تو وہ اللہ کی قسم کھا جائیں گے۔ سَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ (۹/ التوبة:٩٥) چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۖ فَإِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ۝ ﴾ (۹/ التوبة:٩٦)

’’تمہارے آگے قسمیں کھاتے ہیں، تا کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، تو اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں۔‘‘

اس لیے جو لوگ اللہ کی بات دل سے مانتے نہیں اور زبان سے قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ مانتے ہیں، وہ فاسق اور نافرمان ہیں۔

اسی موقع پر کچھ منافقوں نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی نیت سے ایک مسجد الگ کھڑی کر لی تھی، اللہ نے فرمایا کہ اگر ان سے ان کی اس حرکت کا سبب پوچھو گے تو جھٹ قسم کھا بیٹھیں گے کہ ہماری نیت اچھی تھی، فرمایا:

﴿ وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ ۖ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ ﴾ (۹/ التوبة:١٠٧)

’’اور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔‘‘

اہل نفاق کی حالت قرآن نے یہ بتائی ہے:

﴿ وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ ﴾ (٥٨/ المجادلة:١٤)

’’وہ جان بوجھ کر جھوٹی باتوں پر قسمیں کھاتے ہیں۔‘‘

﴿ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً ﴾ (٥٨/ المجادلة:١٦ و ٦٣/ المنافقون:٢)

”انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنایا ہے۔“

یعنی قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ اور اس کو اپنے بچاؤ کے لیے ڈھال بنایا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعہ اس گناہ سے بچنے کی تاکید فرمائی:

﴿ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۗ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ○ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ۗ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۗ ﴾ (۱۶/ النحل:۹۱-۹۲)

”اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد توڑمت ڈالو اور تم نے اپنے پر اللہ کو ضامن بنایا ہے، بے شک اللہ تمہارے کاموں کو جانتا ہے اور اس عورت کے جیسے نہ بنو جو اپنے کاتے سوت کو محنت کیے پیچھے توڑ کر ٹکڑے کر دیتی ہے، تم اپنی قسموں کو آپس میں بیٹھنے کا بہانہ بناتے ہو کہ ایک فریق دوسرے فریق سے بڑھ چڑھ کر ہو۔“

اللہ کا نام لے کر کوئی معاہدہ کرنا اور اس کو توڑ ڈالنا اللہ کے مقدس نام کی تحقیر ہے، اسی لیے فرمایا کہ جس بات پر کسی نے قسم کھائی اس پر اس نے گویا اللہ کو ضامن ٹھہرایا، اس لیے قسم کھا کر توڑا نہ کرو اور لوگوں کو دھوکا نہ دیا کرو، پھر ایسی قسم کو توڑ ڈالنا ایسا ہی حماقت کا کام ہے، جیسا عرب کی ایک بیوقوف عورت کا تھا، جو سوت کات کات کر کھول دیتی یا ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی۔

جب ایک فریق دوسرے فریق سے اللہ کا نام لے کر معاہدہ کرتا ہے تو گویا وہ اللہ کی ضمانت پر دوسرے کو مامون بناتا ہے، اب اگر وہ کوئی قوت پا کر بدعہدی کرتا ہے اور اس فریق سے ٹوٹ کر کسی دوسرے طاقتور سے ملنے کی کوشش کرتا ہے تو بڑی اخلاقی کمزوری ظاہر کرتا ہے۔

اسی طرح جھوٹی قسم کھا کر کسی دوسرے کے مال پر دعویٰ کرنا اللہ کے نام پر جھوٹ بولنا ہے اور یہ ایک کی بجائے دو گناہوں کا مجموعہ ہے، یعنی غصب اور جھوٹ اور وہ بھی اللہ کے پاک اور مقدس نام پر، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ ﴾

(۳/ آل عمران:۷۷)

”بے شک جو لوگ اللہ کے قرار اور اپنی قسموں پر (دنیا کا) تھوڑا سا مال خریدتے ہیں، آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، نہ اللہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا قیامت میں اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

شان نزول اور آیت کے سیاق کے لحاظ سے یہ یہودیوں کی بددیانتیوں کی تصویر ہے، مگر آیت اپنے حکم

کے لحاظ سے بہر حال عام ہے۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ صحابی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جو کوئی جھوٹی قسم کھا کر کسی مسلمان کا مال لینا چاہے گا تو جب وہ اللہ کے پاس جائے گا تو اللہ اس پر غضب ناک ہوگا''۔ اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ صحابی نے کہا، اللہ کی قسم! یہ آیت میرے واقعہ میں اتری ہے۔ میرے اور ایک یہودی کے درمیان ایک زمین تھی، اس نے میری ملکیت سے انکار کیا، میں نے یہ مقدمہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا، حضور ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت یا گواہ ہے؟ میں نے کہا نہیں، تو آپ ﷺ نے اس یہودی سے فرمایا کہ ''تم قسم کھاؤ۔'' تو میں نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! وہ تو اب قسم کھا جائے گا اور میری چیز لے لے گا، اس وقت یہ آیت اتری۔ [1]

ابن جریر کی بعض روایتوں میں ہے کہ یہ آیت ان سوداگروں کی شان میں ہے جو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنا سامان بیچتے ہیں، اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے تین دفعہ فرمایا: ''تین آدمی ہیں، جن کی طرف اللہ قیامت کے دن نہ دیکھے گا، نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔ صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں نے کہا کہ وہ لوگ جو ناکام ہوئے اور خسارے میں پڑے، وہ کون ہیں؟ یا رسول اللہ ﷺ! فرمایا: ''جو اپنا لباس گھٹنوں کے نیچے تک لٹکاتا ہے، (کیونکہ یہ غرور کی علامت ہے) اور جو احسان جتاتا ہے اور جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا مال بیچتا ہے۔'' [2] بہر حال جیسا کہ معلوم ہے کہ شان نزول سے مراد وہ واقعہ ہے جس پر کوئی آیت پوری طرح صادق آ جائے، اس لیے ان تمام واقعات پر آیت کا حکم یکساں جاری ہوگا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو کسی مسلمان کے حق کو جھوٹی قسم کھا کر لینا چاہے گا تو اللہ اس پر دوزخ کی آگ کو واجب کرے گا۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ! کیا اگرچہ کوئی معمولی سی چیز ہو، فرمایا: ''درخت (اراک) کی ڈالی ہی کیوں نہ ہو۔'' [3] حضرت انس رضی اللہ عنہ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''بڑے بڑے گناہ یہ ہیں، اللہ کا شریک ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، کسی بے گناہ کی جان لینا اور جھوٹی قسم کھانا۔'' [4] ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص سے قسم کھلوائی جائے اور وہ جھوٹ قسم کھا جائے تو وہ اپنا چہرہ لے کر دوزخ میں ٹھکانا پائے گا۔'' [5] چہرہ کی

---

[1] ابوداود، کتاب الایمان والنذور، باب فی من حلف لیقتطع بھا مالا:۳۲٤۳ وابن جریر، ج۳، ص:۲۰۸ سورہ آل عمران۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان غلظ تحریم اسبال :۲۹۳؛ ابوداود، کتاب اللباس، باب ما جاء فی اسبال الازار: ٤۰۸۷؛ ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فیمن حلف علی سلعة کاذبا: ۱۲۱۱؛ نسائی، کتاب الزینة، باب اسبال الازار: ۵۳۳۵؛ ابن ماجه، ابواب التجارات:۲۲۰۸۔ [3] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین:۳۵۳۔ [4] سنن نسائی، کتاب المحاربة، باب ذکر الکبائر: ٤۰۱۵۔ [5] سنن ابی داود، کتاب الایمان والنذور، باب التغلیظ فی یمین الفاجر:۳۲٤۲۔

خصوصیت شاید اس لیے ہے کہ اس نے انسانی عزت و آبرو کے خلاف کام کیا اور بڑی ڈھٹائی دکھائی، جس کا اثر چہرہ پر نمایاں ہوتا ہے۔

عموماً تاجر اور سوداگر چیزوں کی قیمت اور مال کی اصل حقیقت بتانے میں جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، اس لیے خاص طور سے رسول اللہ ﷺ نے ان کو اس سے بچنے کی ہدایت کی ہے، فرمایا: ''جھوٹی قسم مال بکوا دیتی ہے لیکن نفع (کی برکت) کو گھٹا دیتی ہے۔'' [1] روحانی حیثیت سے جو برکت گھٹتی ہے وہ تو ہے ہی، لیکن ظاہری حیثیت سے بھی ایسے شخص کی تجارت کو آخر میں چل کر اس کی عام بے اعتباری کی وجہ سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ چنانچہ اس کی تشریح ایک دوسری روایت میں ہے، حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''تجارت میں بہت قسمیں کھانے سے پرہیز کرو، کیونکہ اس طرح پہلے کامیابی ہوتی ہے، پھر بے برکتی ہو جاتی ہے۔'' کیسے بلیغ فقرے ہیں: ((فانه ينفق ثم يمحق)) [2] جھوٹی قسموں کے علاوہ عام طور سے بے باکی کے ساتھ قسمیں کھانا بھی اسلامی شرافت کے خلاف ہے۔ قرآن پاک کی آیت اوپر گزر چکی ہے کہ بے سبب قسمیں کھانا ذلت و خواری کا سبب ہے۔

﴿ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ﴾ (٦٨/ القلم: ١٠) حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''قسمیں کھانا قسم پوری نہ کرنے کے گناہ کا سبب ہے، یا ندامت اور شرمساری کا موجب ہے۔'' [3]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب یمحق اللہ الربا: ٢٠٨٧؛ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب النھی عن الحلف فی البیع: ٤١٢٥؛ ابو داود، کتاب البیوع، باب فی کراھیة الحلف فی البیع: ٣٣٣٥؛ نسائی، کتاب البیوع، باب المنفق سلعته بالحلف: ٤٤٦٦۔

[2] صحیح مسلم، ایضًا: ٤١٢٦؛ نسائی، ایضًا: ٤٤٦٥؛ ابن ماجه، ابواب التجارات، باب ما جاء فی کراھیة الایمان: ٢٢٠٩۔ [3] ابن ماجه، ابواب الکفارات، باب الیمین حنث اوندم: ٢١٠٣؛ صحیح ابن حبان، کتاب الایمان: ٤٣٤١۔

وعدہ خلافی

وعدہ کر کے اس کے خلاف کرنا، بہت بڑی برائی ہے اور یہ بھی حقیقت میں جھوٹ کی ایک قسم ہے۔ کسی قوم اور اس کے افراد کی عزت کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنے وعدوں کے کتنے سچے اور اپنی بات کے کیسے پکے ہیں۔ جب کوئی شخص کوئی وعدہ کر لیتا ہے تو اپنے اوپر ایک ذمہ داری اوڑھ لیتا ہے، فرمایا:

﴿ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۳٤)

''بے شک وعدہ کی باز پرس ہوگی۔''

اور جس کی باز پرس اللہ فرمائے اس کی اہمیت کتنی بڑی ہوگی۔

قرآن پاک میں منافقوں کے سلسلہ میں ہے کہ ان کی بدعہدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل میں نفاق پیدا ہو گیا، فرمایا:

﴿ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبة:۷۷)

''پس اس کا اثر ان کے دل میں اللہ نے نفاق رکھا، اس دن تک جب وہ اس سے ملیں گے، اس لیے کہ انھوں نے اللہ سے وعدہ کر کے خلاف کیا اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔''

صحیحین میں ہے کہ ''منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بولے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے خلاف کرے، جب امانت دار بنایا جائے تو خیانت کرے۔'' ❶ (صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے) ''اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزے رکھتا ہو اور سمجھتا ہو کہ وہ مسلمان ہے۔'' ❷ صحیحین کی ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''یہ چار باتیں جس میں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک ہو اس میں منافق کی ایک نشانی ہے، جب تک اس کو چھوڑ نہ دے، جب امانت دار بنایا جائے خیانت کرے، جب بولے جھوٹ بولے، جب معاہدہ کرے خلاف کرے، جب جھگڑے گالی بکے۔'' ❸

ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مجھ سے تین باتوں کا ذمہ لو تو میں تمہارے لیے جنت کا ذمہ لیتا ہوں، جب بولو تو سچ بولو اور جب وعدہ کرو تو پورا کرو اور جب امین بنو تو خیانت نہ کرو۔'' ❹

❶ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق:۳۳؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب خصال المنافق:۲۱۱۔ ❷ صحیح مسلم، ایضا:۲۱۳، ۲۱٤۔ ❸ صحیح بخاری، ایضا:۳٤؛ صحیح مسلم، ایضا:۲۱۰۔ ❹ احمد، ٥/ ۳۲۳؛ حاکم، ٤/ ۳٥۸، ۳٥۹؛ ابو یعلی: ٤۲٥۷؛ بیهقی فی الشعب: ٤۳٥٥، منذری باب انجاز الوعد۔

خیانت اور بددیانتی

ایک کا جو حق دوسرے کے ذمہ واجب ہو، اس کے ادا کرنے میں ایمانداری نہ برتنا، خیانت اور بددیانتی ہے۔ اگر ایک کی چیز دوسرے کے پاس امانت ہو اور وہ اس میں بے جا تصرف کرتا یا مانگنے پر واپس نہ کرتا ہو تو یہ کھلی ہوئی خیانت ہے، یا کسی کی کوئی چھپی ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو یا کسی نے دوسرے پر بھروسہ کر کے کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اس کا کسی اور پر ظاہر کرنا بھی خیانت ہے۔ اسی طرح جو کام کسی کے سپرد ہو اس کو وہ دیانت داری کے ساتھ انجام نہ دے تو یہ بھی خیانت ہی کہلائے گا۔ علیٰ ہذا عام مسلمانوں، ائمہ وقت اور اپنے متفقہ قومی وملی مصالح کے خلاف قدم اٹھانا بھی ملت سے بددیانتی ہے، دوست ہو کر دوستی نہ نباہنا بھی خیانت ہے، بیوی میاں کی وفاداری نہ کرے تو یہ بھی خیانت ہے، دل میں کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کہنا اور عمل سے کچھ اور ثابت کرنا بھی خیانت ہے۔ اسلام کی اخلاقی شریعت میں یہ ساری خیانتیں یکساں ممنوع ہیں، فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝ ﴾

(۸/ الانفال: ۲۷)

''اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو اور نہ آپس کی امانتوں میں جان کر بددیانتی کرو۔''

اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت یہ ہے کہ اقرار کر کے پورا نہ کیا جائے، ایمان داری سے ان کے حکموں کی تعمیل نہ کی جائے، دین وملت کے مصالح کے ساتھ غداری کی جائے اور اللہ ورسول اور مسلمانوں کے دشمنوں کو چھپے چوری امداد پہنچائی جائے، یا مسلمانوں کے چھپے راز ان کو بتائے جائیں۔ اسی طرح آپس کی امانتوں میں خیانت یہ ہے کہ جو چیز جس کے پاس امانت ہو اس میں وہ ناجائز تصرف کرے اور کسی کا جو راز کسی کو معلوم ہو، اس کو دوسروں پر ظاہر کر دے۔ یہ حدیث کئی دفعہ اوپر آ چکی ہے کہ ''منافق کی تین علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے، تو وہ اس میں خیانت کرے۔'' [1] ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ اللہ کی راہ میں مارا جانا ہر گناہ کا کفارہ ہے، لیکن امانت کا، قیامت کے دن بندہ کو لایا جائے گا، اگرچہ وہ اللہ کی راہ میں شہید ہی ہوا ہو اور کہا جائے گا کہ تم امانت لاؤ اور ادا کرو، وہ کہے گا خداوندا! اب کیسے لاؤں، دنیا تو ختم ہو چکی، کہا جائے گا اس کو دوزخ کے طبقہ ہاویہ میں لے جاؤ، وہاں امانت کی چیز مثال بن کر اصل صورت میں سامنے آئے گی، تو وہ اس کو دیکھ کر پہچان جائے گا اور اس کے پیچھے گرے گا، یہاں تک کہ اس کو پکڑ لے گا اور اس کو اپنے کندھوں پر لاد کر لے چلے گا، جب دوزخ سے نکلنا چاہے گا تو وہ بوجھ اس کے کندھے سے گر پڑے گا اور وہ پھر اس کے پیچھے ہمیشہ ہمیشہ گرتا چلا جائے گا۔ پھر انھوں نے فرمایا: نماز امانت

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق: ۳۳؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب خصال المنافق: ۲۱۲۔

ہے، وضو امانت ہے، تول بھی امانت ہے، ناپ بھی امانت ہے اور بہت سی چیزیں گنا کر فرمایا اور ان سب سے زیادہ سخت معاملہ امانت کی چیزوں کا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے یہ حدیث حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ صحابی کو سنائی، انہوں نے تصدیق کی اور فرمایا کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں سنی:

﴿ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا ﴾ (٤/ النسآء:٥٨)

''بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو ادا کر دیا کرو۔'' [1]

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر جو اس کے بعد آئے گا، پھر جو اس کے بعد آئے گا، پھر ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ بن بلائے گواہی دیں گے، خیانت کریں گے، امانت داری نہیں کریں گے اور نذر مانیں گے تو پوری نہ کریں گے۔'' [2]

آنحضرت ﷺ جن بری باتوں سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے، ان میں سے ایک خیانت بھی ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ''الٰہی! مجھے خیانت سے بچائے رکھنا، کہ یہ بہت برا اندرونی ساتھی ہے۔'' [3] خیانت کے ایک معنی یہ ہیں کہ کسی جماعت میں شامل ہو کر خود اسی جماعت کو جڑ سے اکھاڑنے کی فکر میں لگے رہنا۔ چنانچہ منافقین جو دل میں کچھ رکھتے تھے اور زبان سے کچھ کہتے تھے، وہ ہمیشہ اسلام کے خلاف چھپی سازشوں میں لگے رہتے تھے، مگر ان کی یہ چال کارگر نہیں ہوتی تھی اور ہمیشہ ان کا بھید کھل جاتا تھا، فرمایا:

﴿ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ﴾ (٥/ المآئدۃ:١٣)

''اور ہمیشہ تو خبر پاتا رہتا ہے ان کی ایک خیانت کی۔''

یعنی ان کی کسی خیانت کی خبر رسول کو ملتی ہی رہتی تھی۔

جس پر کسی امر میں بھروسہ کیا جائے اس کا اس بھروسہ کو پورا نہ کرنا بھی خیانت ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے اوپر الزام کی پوری چھان بین عزیز سے کرائی، اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سب اس لیے کیا:

﴿ ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ ﴾

(١٢/ یوسف:٥٢)

''تاکہ عزیز کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے چوری چھپے اس سے خیانت نہیں کی اور بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو نہیں چلاتا۔''

حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویوں نے اپنے مقدس شوہروں سے بیوفائی کی، ان کی بیوفائی

---

[1] مسند احمد، بیهقی فی الشعب: ٥٢٦٦؛ منذری، باب الترغیب فی انجاز الوعد، ج ٢، ص: ٢٠١۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الشهادات: ٢٦٥١ وصحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة: ٦٤٧٥۔

[3] ابو داود، کتاب الوتر، باب فی الاستعاذة: ١٥٤٧؛ نسائی، کتاب الاستعاذة: ٥٤٧١۔

یہ تھی کہ وہ توقع کے خلاف اپنے شوہروں پر ایمان نہیں لائیں اور کافروں کا ساتھ دیتی رہیں، اللہ نے فرمایا:

﴿ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ﴾ (٦٦/ التحریم:١٠)

''اللہ نے کافروں کے لیے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال بیان کی، یہ دونوں عورتیں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں، تو ان دونوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی، تو یہ دونوں (پیغمبر ہو کر بھی) اپنی بیویوں کو اللہ سے ذرا نہ بچا سکے۔''

یہ دل کی خیانت تھی۔

مگر خیانت صرف دل ہی سے نہیں ہوتی ہے، بلکہ ایک ایک عضو سے ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ چشم و ابرو کے اشاروں سے ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر یہ یقین ہو کہ ایک ذات ہے جو چوری چھپی کی ہر حرکت سے ہر وقت باخبر رہتی ہے تو پھر انسان کو کسی قسم کی خیانت کاری کی جرأت نہ ہو۔ اسلام اسی یقین کو پیدا کر کے خیانتوں کا خاتمہ کرتا ہے، فرمایا:

﴿ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ۝ ﴾ (٤٠/ المؤمن:١٩)

''اللہ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کاری کو اور جو چھپا ہے سینوں میں۔''

پھر اس سے چھپ کر کیونکر کوئی کام کر سکتا ہے۔

غداری اور دغا بازی

غداری اور دغا بازی کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو زبان دے کر اطمینان دلایا جائے اور پھر موقع پا کر اس کے خلاف کیا جائے۔ قرآن پاک نے اس کو بھی خیانت کہا ہے۔ عربی میں اس کو عام طور سے غدر بھی کہتے ہیں، اسلام نے اس کی شدید برائی کی ہے۔ کفار میں سے جو بار بار امن اور صلح کے وعدے کر کے بدل جاتے تھے اور بار بار بدعہدی کرتے تھے، ان کے ذکر میں اللہ فرماتا ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ۝ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ۝ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ۝ ﴾ (٨/ الانفال: ٥٦۔٥٨)

''جن سے تو نے معاہدہ کیا، پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ تقویٰ (اللہ کا لحاظ) نہیں رکھتے، سو اگر ان کو تو کبھی لڑائی میں پائے تو ان کو ایسی سزا دے کہ ان کے پچھلے دیکھ کر بھاگیں، شاید وہ عبرت پکڑیں اور اگر تجھ کو کسی قوم کی دغا کا ڈر ہو تو ان کو تو برابر کا جواب دے، اللہ کو دغا باز خوش نہیں آتے۔''

اس آیت میں گو ان کافروں کا ذکر ہے جو ہر دفعہ عہد کر کے بدعہدی اور دغا بازی کرتے تھے، مگر دو باتیں اس میں عمومیت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں، ایک یہ کہ بدعہدی، سراسر تقویٰ کے خلاف ہے، دوسری یہ کہ یہ غداری، دغا بازی اور بدعہدی اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم کر دیتی ہے اور اس کی ناخوشی کی موجب ہے۔ بدر کے قیدیوں کو فدیہ اور وعدہ لے کر چھوڑ دینے کی اجازت جہاں دی گئی ہے، وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اگر یہ خیانت اور دغا کریں تو اللہ ان سے سمجھ لے گا، پھر ان کو دوبارہ تمہارے قابو میں لے آئے گا، فرمایا:

﴿ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝ ﴾

(٨/ الانفال: ٧١)

''اور اگر وہ تیرے ساتھ خیانت (دغا) کرنا چاہیں تو وہ اس سے پہلے اللہ سے بھی خیانت (دغا) کر چکے ہیں، تو اللہ نے ان پر قابو دے دیا اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔''

اللہ سے دغا کرنے کی صورت یہی ہے کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے، تو اللہ تو سب کا حال جانتا ہے اور ہر مصلحت اس کو معلوم ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے، اس نے ان کے چھوڑنے کی اجازت دی تو وہ بھی علم اور مصلحت سے دی ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''قیامت کے دن ہر غدار کا ایک جھنڈا ہوگا۔'' [1] یعنی اس

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب تحریم الغدر: ٤٥٢٩۔

سے اس کی بدعہدی اور غداری کی تشہیر ہو گی۔ آنحضرت ﷺ اپنی فوج کے افسروں کو جو نصیحتیں فرماتے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی ہوتی تھی کہ ''بدعہدی نہ کرنا۔'' ❶ یعنی دشمنوں سے معاہدہ کر کے پھر غداری نہ کی جائے۔ ظالم بادشاہوں، حاکموں، افسروں، سپہ سالاروں کا ایک چلتا ہوا حیلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امن وامان کا وعدہ کر کے کسی کو اپنے پاس بلاتے ہیں اور جب وہ ان کے قابو میں آ جاتا ہے تو اس کو سزا دے دیتے یا مروا دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس نے کسی کو جان کا امن دیا پھر مروا ڈالا تو میں اس سے الگ ہوں، اگرچہ مقتول کافر ہی کیوں نہ ہو''۔ ❷ اللہ فرماتا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ﴾ (٥/ المآئدۃ:١)

''اے ایمان والو! اپنی گرہوں (قول وقرار) کو پورا کرو۔''

عقود کی تعمیم میں وہ تمام شرطیں، وعدے اور معاہدے داخل ہیں جو کوئی اپنے خدا سے یا بندہ سے یا کوئی جماعت کسی دوسری جماعت سے کرے۔ یہاں تک کہ مسلمان اپنے دشمنوں سے بھی جو معاہدہ کریں اس کا حرف بحرف پورا کرنا ضروری ہے۔ ایک دفعہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے رومیوں سے مدت متعینہ کے لیے کوئی معاہدہ کیا۔ اس کے ختم ہونے کا زمانہ قریب آیا تو امیر موصوف اپنی فوجیں لے کر ان کی سرحد کے پاس پہنچ گئے کہ ادھر مدت ختم ہو اور ادھر وہ حملہ کر دیں۔ یہ دیکھ کر عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ نامی ایک صحابی سوار ہو کر نکلے اور چلائے اللہ اکبر! اللہ اکبر! بدعہدی نہیں۔ امیر معاویہ نے بلوا کر پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''جب کسی قوم سے معاہدہ کیا جائے تو اس کی کوئی گرہ نہ باندھی جائے نہ کھولی جائے۔'' (یعنی نہ اس میں سے کچھ کم کیا جائے نہ زیادہ کیا جائے) اور یا اس کو پہلے سے خبر دے کر معاہدہ کو یک قلم رد کر دیا جائے''۔ یہ سن کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ واپس چلے آئے۔ ❸ غور کی بات یہ ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے معاہدہ کے لفظوں کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہی تھی۔ لیکن ان کا یہ فعل معاہدہ کی روح اور معنی کے خلاف تھا۔ رسول اکرم ﷺ کے تربیت یافتوں نے اس کو بھی بدعہدی سمجھا اور امیر لشکر کو اس سے بھی روک دیا۔

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسير، باب تامير الامام الامراء......: ٤٥٢٢۔ ❷ سنن ابن ماجه، ابواب الديات: ٢٦٢٨ وصحيح ابن حبان؛ منذری باب الترغيب فی انجاز الوعد، ص: ٢٠٢، ٢٠٣۔

❸ سنن ابی داود، کتاب الجهاد، باب فی الامام يكون بينه وبين العدو عهد فيسير نحوه: ٢٧٥٩۔

بہتان

بہتان یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو مجرم ٹھہرایا جائے، یا اس کی طرف کوئی ناکردہ گناہ یا برائی منسوب کی جائے۔ یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے۔ بلکہ قرآن نے اس کو بھی خیانت کہا ہے۔

بعض بہتان ایسے ہوتے ہیں جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا لیکن شرارت کی راہ سے کسی بے گناہ کے سر اس لیے تھوپا جاتا ہے کہ اس کی بدنامی ہو۔ قرآن نے اس کا نام افک رکھا ہے۔ یہ دونوں باتیں جھوٹ ہونے کے علاوہ حد درجہ شرافت کے خلاف ہیں اور اسی لیے جو لوگ جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس بہتان باندھنے میں شریک ہو جاتے ہیں وہ بھی گناہگار اور خیانت کار ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں طعمہ نامی مدینہ کے ایک منافق نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے گھر میں چوری کی۔ مسلمانوں کو اس پر شبہ ہوا تو اس نے ایک مسلمان کا نام لے دیا۔ وہ تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا۔ اس منافق کے گھر والوں نے اس کا ساتھ دیا اور اس کو بری ٹھہرایا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے موافق فیصلہ کرنا چاہا تو وحی الٰہی نے دفعۃً حقیقت کا پردہ چاک کر دیا۔ [1] دوسری روایت یہ کی جاتی ہے کہ طعمہ کو ایک یہودی نے اپنی زرہ امانت رکھنے کو دی۔ اس نے خیانت کی اور واقعہ سے انکار کر دیا اور زرہ دوسرے کے گھر میں پھینک دی۔ لوگوں نے اس کو پکڑا۔ آخر معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا۔ آپ ﷺ نے ظاہر حال پر فیصلہ کرنا چاہا۔ اس وقت یہ وحی آئی۔ [2] بہرحال واقعہ جو کچھ ہوا۔ امر مشترک یہ ہے کہ گناہگار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گناہگار ٹھہرانے کے متعلق یہ آیتیں ہیں:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ۝ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِــيْمًا ۝ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَھُوَ مَعَھُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء:١٠٥۔١٠٨)

’’ہم نے تیری طرف (اے پیغمبر)! یہ سچی کتاب اتاری ہے کہ تو لوگوں کے درمیان اس کے ذریعہ جو اللہ نے تجھ کو سوجھایا انصاف کر اور خیانت کاروں کی طرف سے نہ جھگڑ اور اللہ سے قصور معاف کرا، بے شک اللہ بخشنے والا رحم والا ہے اور ان کی طرف سے نہ جھگڑ جو اپنے جی میں دغا رکھتے ہیں۔ بے شک اللہ خیانت کار گناہگاروں کو دوست نہیں رکھتا۔ وہ لوگوں سے چھپنا

[1] جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ النساء: ٣٠٣٦۔

[2] تفسیر طبری، سورۃ نساء آیت ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ﴾ ج ٥، ص: ١٥٩۔

چاہتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپنا چاہتے اور وہ ان کے ساتھ ہی ہے۔ جب رات کو وہ سازش کرتے ہیں، جو اللہ کو پسند نہیں اور اللہ ان کے کاموں کو گھیرے ہے۔"

آگے چل کر ہے:

﴿ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴾

(٤/ النسآء:١١٢)

"اور جو کوئی خطا یا گناہ کرے پھر وہ اس کی تہمت کسی بے گناہ پر دھرے۔ اس نے طوفان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا۔"

ان آیتوں میں خیانت کا راز تہمت تراشی کی برائی کس خوبی سے ظاہر کی گئی ہے۔ سب سے پہلے تو رسول ﷺ کو انصاف کی تاکید ہے۔ پھر یہ حکم ہے کہ خیانت کاروں کی حمایت اور ان کی طرف سے کوئی وکالت نہ کرے۔ پھر فرمایا: جو ایسے خائن ہیں وہ بڑے گناہگار ہیں اور اللہ کی محبت سے محروم ہیں۔ یہ لوگ دنیا کی شرم کے مارے انسانوں سے چھپنے کے لیے اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈالتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے۔ جو ہر جگہ ان کے ساتھ ہے اور ان کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے۔ اس سے کوئی حقیقت چھپائے کیسے چھپ سکتی ہے۔ اگر یہی یقین کسی کو ہو جائے تو وہ کسی پر تہمت اور بہتان باندھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد یہ سرزنش اس کو سنائی گئی کہ جس نے مجرم ہو کر اپنا جرم دوسرے کے سر تھوپا، اس نے بہتان باندھا اور گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لادا۔ پہلے عرب میں دستور تھا کہ جو عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی، وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف بچہ کو منسوب کر دیتی تھی، یا مجہول بچہ کو اپنا کہہ کر شوہر کی طرف نسبت دیتی تھی۔ اللہ نے اس کو بہتان کہا اور آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کہ جو عورت مسلمان ہونے آئے۔ اس سے یہ بیعت لی جائے کہ وہ آئندہ اس جرم سے باز رہے گی:

﴿ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ ﴾ (٦٠/ الممتحنة:١٢)

"اور یہ کہ وہ بہتان نہ باندھیں گی اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں۔"

کسی مسلمان کو معمولی تکلیف پہنچانا بھی بری بات ہے۔ پھر بن کیے اس پر جھوٹا الزام رکھ کر اس کو دلی تکلیف پہنچانا کتنی بری بات ہے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴾

(٣٣/ الاحزاب:٥٨)

"اور جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بن کیے (تہمت لگا کر) تکلیف پہنچاتے ہیں۔ انہوں نے بہتان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا۔"

شریف بیویوں پر بہتان باندھنا چونکہ ان کی عزت پر حرف رکھنا ہے۔اس لیے دنیا ہی میں اس کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ جو اس بہتان کا مرتکب ہو اور شرعی گواہی پیش نہ کر سکے۔اس کو کوڑے مارے جائیں:

﴿ وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَٰنِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَٰدَةً أَبَدًا ۚ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْفَٰسِقُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا ﴾

(۲۴/ النور:۴۔۵)

''اور جو لوگ شریف بیویوں کو عیب لگاتے ہیں پھر نہ لائے چار گواہ، تو ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی گواہی کبھی نہ مانو اور وہ فاسق ہیں، مگر جنہوں نے توبہ کی۔''

اس بہتان کی برائی کا اندازہ اس سے کرنا چاہیے کہ بہتان باندھنے والا اللہ تعالیٰ کے حضور میں فاسق ٹھہرایا گیا اور اس کی گواہی ہمیشہ کے لیے بے اعتبار ہو گئی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی اپنے غلام پر تہمت لگائے گا، حالانکہ وہ بے گناہ ہو۔یعنی اس نے وہ جرم نہیں کیا تھا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس مالک کی پیٹھ پر کوڑے مارے گا۔'' [1] یہ گویا قذف یعنی تہمت بے جا کی مثالی سزا ہو گی۔ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس میں جو برائی نہیں اس کی نسبت اس کی طرف کرنا بہتان ہے۔'' [2] یعنی اس سے بچنا چاہیے۔

---

[1] سنن ابوداود، کتاب الادب، باب فی حق المملوك:۵۱۶۵۔

[2] سنن ابوداود، کتاب الادب، باب فی الغیبة:۴۸۷۴۔

چغل خوری

چغل خور کا کام یہ ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان جھوٹی سچی باتیں بیان کر کے ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکائے اور اپنا رسوخ جتائے اور چونکہ ایسے لوگ چل پھر کر ایک کی ایسی بات دوسرے کو پہنچاتے ہیں، جس سے دوسرے کو پہلے پر غصہ آئے اور اس سے نفرت پیدا ہو، اسی لیے قرآن نے ان لوگوں کے اوصاف میں جن کی بات نہیں ماننی چاہیے یہ لفظ کہے ہیں: ﴿ مَشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ ۙ﴾ (٦٨/ القلم:١١) ''جو چغلی کھاتا پھرتا ہے۔''

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر فرما دیا کہ جب کوئی شخص کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس خبر کا لانے والا کیسا ہے؟ اگر وہ سچا مومن نہیں تو اس کی بات ہی نہ مانی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی بات مان کر جلدی میں کوئی ایسی حرکت کر لی جائے جس پر پیچھے افسوس ہو۔ فرمایا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِن جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓا۟ أَن تُصِيبُوا۟ قَوْمًۢا بِجَهَـٰلَةٍ فَتُصْبِحُوا۟ عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَـٰدِمِينَ ۝﴾ (٤٩/ الحجرات:٦)

''اے ایمان والو! اگر کوئی گناہگار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لو۔ کہیں کسی قوم پر نادانی سے جا نہ پڑو۔ پھر اپنی کیے پر پچھتانے لگو۔''

اس آیت میں غور کے قابل خاص نکتہ یہ ہے کہ جھوٹی خبریں پھیلانے والے کو اللہ نے فاسق کا خطاب دیا ہے اور چونکہ اس بداخلاقی کا مقصد زیادہ تر دو شخصوں، بالخصوص، عزیز و اقارب اور دوست واحباب میں نااتفاقی پیدا کرانا ہوتا ہے۔ اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے برے لوگ کون ہیں؟ پھر خود ہی فرمایا:

((المشاون بالنميمة المفسدون بين الاحبة)) [1]

''جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوستوں کے آپس کے تعلقات خراب کرتے ہیں۔''

صحیحین میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ ایک قبرستان کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ''ان میں سے ایک پر اس لیے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ چغلی کھاتا پھرتا تھا۔'' [2]

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((الا انبئكم ما العضة هى النميمة القالة بين الناس)) [3]

''کیا میں تم کو بتاؤں کہ غصہ کیا ہے؟ وہ چغل خوری ہے جو لوگوں کے درمیان بیان کی جاتی ہے۔''

لغت میں غصہ کے معنی تفریق اور سحر کے ہیں۔ اس لیے اگر اس حدیث میں تفریق کے معنی لیے جائیں

---

[1] مسند احمد، ج ٦، ص: ٤٥٩ عن اسماء بنت یزید۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب من الکبائر ان لایستتر من بوله: ٢١٦ وصحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب الدلیل علی نجاسة البول: ٦٧٧۔

[3] مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم النمیمة: ٦٦٣٦۔

تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دو شخصوں میں علیحدگی کرنا چغل خوری کی حقیقت میں داخل ہے۔ لیکن اگر سحر کے معنی لیے جائیں تو اس صورت میں بھی سحر اور چغل خوری میں مشابہت و مناسبت ہے۔ کیوں کہ سحر سے بھی دو شخصوں بالخصوص میاں بیوی میں علیحدگی کرائی جاتی ہے۔ چنانچہ خود قرآن مجید میں ہے:

﴿فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ط﴾ (۲/ البقرۃ:۱۰۲)

''اس پر بھی ان (ہاروت و ماروت) سے ایسی باتیں سیکھتے ہیں، جن کی وجہ سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔''

عام طور پر مفسرین اس تفریق کا ذریعہ اس سحر کو قرار دیتے ہیں، جو لوگ ہاروت و ماروت سے سیکھتے تھے۔ لیکن بعض علما کے نزدیک یہ مقصد چغل خوری سے حاصل کیا جاتا تھا۔ [1]

عام طور پر یہ مقصد اس طرح حاصل کیا جاتا ہے کہ ایک کی بات دوسرے تک پہنچائی جاتی ہے۔ مثلاً: یہ کہ فلاں شخص تمہاری نسبت یہ کہتا تھا۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ ہدایت کی تھی:

((لا یبلغنی احد من اصحابی عن احد شیئاً فانی احب ان اخرج الیکم و انا سلیم الصدر)) [2]

''میرے اصحاب میں سے کوئی مجھ تک کسی کی بات نہ پہنچائے۔ کیوں کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے پاس آؤں تو میرا دل صاف ہو۔''

لیکن اس قسم کی باتیں عام طور پر دہ ہوتی ہیں، جو معیوب اور ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہیں۔ بعض اوقات تو خود وہ شخص اس کو معیوب سمجھتا ہے جو دوسرے تک اس کو پہنچاتا ہے۔ بعض حالتوں میں جس شخص تک وہ بات پہنچائی گئی ہے، اس کو ناگوار گزرتی ہے۔ بعض موقعوں پر دوسرے لوگ اس کو برا سمجھتے ہیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی ہے اور جو لوگ اس بداخلاقی میں مبتلا ہوتے ہیں، وہ اس قسم کی ناپسندیدہ باتوں کی ٹوہ میں لگتے رہتے ہیں، تاکہ ان کو پھیلا کر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائیں۔ اسی بنا پر اہلِ عرب چغل خوروں کو ہیزم بردار کہتے ہیں۔ یعنی جس طرح لکڑیاں بیچنے والے لکڑیاں چن چن کر لاتے ہیں اور ایندھن کے لیے گھوم گھوم کر بازاروں میں فروخت کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ اس قسم کی باتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پھیلاتے ہیں اور آتشِ فتنہ و فساد کے لیے ایندھن بہم پہنچاتے ہیں۔

قرآن مجید میں ابولہب کی بی بی کو بعض مفسرین کی رائے کے مطابق ''حَمَّالَةَ الْحَطَبْ'' یعنی ہیزم بردار کا خطاب اسی لیے دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کی چغلیاں کھاتی پھرتی تھی۔ [3]

ان میں بعض لوگ استراقِ سمع کرتے ہیں۔ یعنی چھپ چھپ کر لوگوں کی باتیں سنتے ہیں اور پھر ان کو

[1] تفسیر کبیر، ج۱، ص:۴۴۳ و ما بعد۔ [2] ابوداود، کتاب الادب، باب فی رفع الحدیث:۴۸۶۰۔

[3] تفسیر کبیر، ج۶، ص:۶۷۱۔

دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو لغت میں قتات کہتے ہیں اور ان کی نسبت رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَا یَدخل الجنّة قتات)) [1]

''جنت میں چغل خور داخل نہ ہوگا۔''

اس قسم کی باتیں خوب نمک مرچ لگا کر نہایت چرب زبانی کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں، تا کہ ان کا اثر بڑھ جائے، اسی لیے عربی زبان میں چغلخوری کو ''وشایه'' کہتے ہیں جس کے معنی نقش ونگار کے ہیں اور ادھر کی اُدھر لگانے کے لیے چغل خوروں کو دوڑ دھوپ بھی کرنی پڑتی ہے۔ اسی مناسبت سے چغل خوری کو ''سعایه'' بھی کہتے ہیں جس کے معنی دوڑ دھوپ کرنے کے ہیں۔

یہ کام اگرچہ زیادہ تر زبان سے لیا جاتا ہے، لیکن وہ صرف زبان ہی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ تحریر و کتابت اور رمز واشارات سے چغل خوری کی جاسکتی ہے اور وہ صرف اقوال ہی تک محدود نہیں، بلکہ اعمال بھی اس میں داخل ہیں۔ یعنی دوسرے شخص سے صرف یہی نہیں کہا جاسکتا کہ ''فلاں شخص یہ کہتا تھا'' بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ''فلاں شخص یہ کام کرتا تھا۔''

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ''محض زبان سے ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا'' چغلی کی مکمل تعریف نہیں ہے۔ بلکہ اس کی جامع تعریف یہ ہے کہ ایک شخص کی ایسی بات یا کام کو دوسرے تک پہنچانا جس سے دوسرا پہلے سے بدگمان ہو جائے۔

اس بنا پر چغل خوری سے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ایک شخص لوگوں کے جو حالات دیکھے یا سنے ان کو بغیر جائز ضرورت کے ظاہر نہ کرے اور رسول اللہ ﷺ نے ''ترک مالا یعنی'' کی جو ہدایت مسلمانوں کو کی ہے، اس پر عمل کرنے سے یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔

چغل خوری ایک فتنہ پردازی ہے، جس کے نتائج بعض حالتوں میں نہایت خطرناک صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور قتل وخونریزی تک کی نوبت پہنچتی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ متعدد گناہوں کا مجموعہ ہے اور اس میں غیبت، بہتان، تجسس، کذب وفریب، نفاق، غرض مختلف بداخلاقیوں کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ ان نتائج اور ان عناصر کے لحاظ سے گناہ کبیرہ ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ تمدن ومعاشرت کا ایک جزو ہوگئی ہے۔ اگر امرا کے درباروں میں تملق وخوشامد کے لیے چغل خوری کی جاتی ہے تو عام صحبتوں میں اس سے تفریحِ خاطر اور لطفِ صحبت کا کام لیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ اخلاقی مرض اس کثرت سے پھیل گیا ہے کہ وہ ایک معمولی چیز بن گیا ہے اور اس کو لوگ گناہِ کبیرہ نہیں سمجھتے۔ اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ مدینہ کے کسی باغ سے نکلے تو دو

[1] ابوداود، کتاب الادب، باب فی القتات: ٤٨٧١۔

مردوں کی آواز سنی جن پر ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا تھا۔ فرمایا: ''ان پر عذاب ہو رہا ہے۔ لیکن یہ عذاب کسی بڑے گناہ پر نہیں ہوتا۔ حالانکہ وہ بڑے گناہ کے کام ہیں۔ ان میں ایک تو پیشاب آڑ میں نہیں کرتا تھا اور دوسرا لوگوں کی چغلیاں کھاتا پھرتا تھا''۔ [1]

اس حدیث شریف کی شرح میں محدثین نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ پہلے تو آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ یہ کوئی بڑا گناہ نہیں۔ پھر جب وحی کے ذریعہ سے آپ کو معلوم ہوا کہ یہ گناہِ کبیرہ ہے تو اس کو منسوخ کر دیا اور فرمایا کہ وہ بڑے گناہ کا کام ہے۔ محدثین نے اس قسم کی اور بھی بہت سی نکتہ آفرینیاں کی ہیں۔ حالانکہ حدیث کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ دونوں بداخلاقیاں اس قدر عام ہوگئی ہیں کہ ان کو لوگ معمولی چیز سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ وہ معمولی چیز نہیں بلکہ کبائر و موبقات میں داخل ہیں۔

قرآن مجید میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔ چنانچہ افک عائشہ رضی اللہ عنہا کے عام چرچے کے متعلق ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴾ (۲٤/ النور:۱۵)

''جب تم لگے اپنی زبانوں سے اس کی نقل در نقل کرنے اور اپنے منہ سے ایسی باتیں کہنے جس کی تم کو مطلق خبر نہیں اور تم نے اس کو ایسی ہلکی (سی) بات سمجھا، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی (سخت بات) ہے۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں کسی کی تشہیر و تفضیح سے تعلق رکھتی ہیں، عام دلچسپی کی وجہ سے وہ معمولی خیال کی جاتی ہیں، حالانکہ وہ معمولی نہیں ہوتیں۔ کشفِ عورت اور کشفِ عیوب میں جو مناسبت ہے وہ بھی اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بداخلاقی زیادہ تر نہایت دنی الطبع، پست حوصلہ، مبتذل اور ناقابل اعتبار اشخاص میں پائی جاتی ہے۔ بغض و انتقام لینے یا کسی ذی وجاہت شخص کے یہاں رسوخ حاصل کرنے یا سوسائٹی میں شریک ہونے کے لیے اور کوئی ذریعہ نہیں پاتے تو چغل خوری سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے ان کے شر و فساد سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان کی بات ناقابلِ اعتبار قرار دی جائے اور ان کا کہنا نہ مانا جائے اور قرآن مجید نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طریقہ کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے:

﴿ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۙ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ۙ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۙ ﴾

(٦٨/ القلم:١٠۔١٢)

''اور تو ایسے کا کہنا نہ مان جو بہت قسمیں کھاتا ہے۔ آبرو باختہ ہے (لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے۔ چغلیاں لگاتا پھرتا ہے۔ اچھے کاموں سے (لوگوں کو) روکتا رہتا ہے۔ حد سے آگے بڑھ گیا ہے۔ بدکار ہے۔''

[1] بخاری، کتاب الادب، باب النميمة من الكبائر: ٦٠٥٥۔

غیبت اور بدگوئی

شریعت کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی عزت وآبرو محفوظ رہے۔ اور ان کے باہمی تعلقات خوشگوار رہیں۔ اس بنا پر جن بداخلاقیوں سے مسلمانوں کی عزت وآبرو کو صدمہ پہنچتا ہے اور ان کے تعلقات میں ناگواری پیدا ہوتی ہے، شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مجموعی طور پر ان کو ایک جگہ بیان کر دیا ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

(٤٩/ الحجرات: ١١۔١٢)

''مسلمانو! مرد مردوں پر نہ ہنسیں، عجب نہیں کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ (اللہ کے نزدیک) ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں پر ہنسیں، عجب نہیں کہ (جن پر ہنستی ہیں) وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے کو طعنے نہ دو اور نہ ایک دوسرے کو نام دھرو۔ ایمان لائے پیچھے بدتہذیبی کا نام ہی برا ہے اور جو (ان حرکات سے) باز نہ آئیں تو وہی (اللہ کے نزدیک) ظالم ہیں۔ مسلمانو! (لوگوں کی نسبت) بہت شک کرنے سے بچتے رہو، کیوں کہ بعض شک داخل گناہ ہیں اور ایک دوسرے کی ٹٹول میں نہ رہا کرو اور تم میں سے ایک کو ایک پیٹھ پیچھے برا نہ کہے۔ بھلا تم میں سے کوئی (اس بات کو) گوارا کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، تو تم کو گھن آئے اور اللہ سے تقویٰ کرو۔ بے شک اللہ رجوع ہونے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

ان تمام اخلاقی احکام سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قول وعمل سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن ان طریقوں میں سب سے زیادہ جس طریقے سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری ہوتی ہے، وہ غیبت ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ تعریض، تصریح، رمز و اشارات، تحریر وکتابت اور محاکات ونقالی، ہر طریقہ سے دوسروں کے عیوب بیان کیے جا سکتے ہیں اور ایک شخص کے نسب اخلاق، دین ودنیا، جسم، کپڑے لتے، غرض ہر چیز میں عیب نکالا جا سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نہایت پر زور طریقہ سے اس کی ممانعت کی ہے [1] اور اس کو خود اپنے بھائی کے مردار گوشت سے تشبیہ دی ہے۔ جس میں بلاغت کے بہت سے نکتے ہیں۔

[1] احیاء علوم الدین، ج ۳، ص: ۱۰۱۔

① انسان کا گوشت محض اس کی عزت وحرمت کی وجہ سے حرام ہے۔اس لیے جو چیز اس کی عزت وحرمت کونقصان پہنچاتی ہے، وہ بھی اس کے گوشت کی طرح حرام ہے۔

② لڑائی جھگڑے میں جب باہم مقابلہ ہوتا ہے تو بعض لوگ شدت غضب میں اپنے حریف کا گوشت نوچ لیتے ہیں۔ اگر چہ یہ بھی ایک برا فعل ہے، تاہم اس میں ایک قسم کی شجاعت پائی جاتی ہے۔لیکن اگر کوئی شخص حریف کے مرجانے کے بعد اس کا گوشت نوچ لے تو مکروہ ہونے کے ساتھ یہ ایک بزدلانہ فعل بھی ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص رودررو کسی کو برا کہے تو گو یہ ایک ناپسندیدہ چیز ہے، تاہم اس میں بزدلی نہیں پائی جاتی ۔لیکن ایک شخص کی پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرنا نہایت بزدلانہ کام ہے اور بعینہ ایسا ہے جیسے کوئی اپنے حریف کے مقتول ہونے کے بعد اس کا گوشت نوچ کھائے۔

③ لوگ شدتِ محبت سے بھائی کی مردہ لاش کا دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔اس لیے جو شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ کھاتا ہے، اس سے اس کی سخت قساوت وسنگدلی اور بغض وعداوت کا اظہار ہوتا ہے اور یہ اس لطف ومحبت کے منافی ہے، جس کو اسلام مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

④ مردار گوشت کا کھانا سخت اضطرار کی حالت میں جائز ہے اور اس وقت بھی اگر کسی کو انسان کی بجائے بکری کا مردار گوشت مل جائے تو وہ انسان کا گوشت کھانا پسند نہ کرے گا۔اس لیے غیبت اس وقت تک جائز نہیں ہوسکتی، جب تک کوئی شرعی، معاشرتی، اخلاقی یا سیاسی ضرورت انسان کو مجبور نہ کرے اور اس حالت میں بھی جہاں تک ممکن ہو، علانیہ غیبت سے احتراز کرنا چاہیے اور صرف رمز واشارہ سے کام لینا چاہیے۔اسی قرآنی تشبیہ کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے متعدد حدیثوں میں نہایت بلیغ طریقہ پر غیبت کی برائی بیان کی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''شبِ معراج میں میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا، جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ ان سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔میں نے جبرائیل سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ بولے، یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے اور ان کی عزت وآبرو لوٹ لیتے تھے۔'' [1] اعمال اور اعمال کی جزاوسزا میں مناسبت ہوتی ہے۔یہ لوگ چونکہ لوگوں کا گوشت نوچ کھاتے تھے۔یعنی ان کی غیبت کرتے تھے، اس لیے عالم برزخ میں ان کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ خود اپنا گوشت نوچتے رہیں۔

ایک بار سخت بدبو پھیلی تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے کہا کہ ''جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یہ ان لوگوں کی بدبو ہے جو مسلمانوں کی غیبت کرتے ہیں۔'' [2] اس حدیث میں بھی اعمال اور جزاوسزا کی مناسبت ظاہر ہے۔مردار گوشت اکثر بدبودار ہوتا ہے اور یہ لوگ بھی گوشت کھاتے تھے۔اس لیے یہ بدبو اسی مردارخوری کا نتیجہ تھی۔اس حدیث میں ایک نکتہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ غیبت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کے عیوب

[1] ابوداود، کتاب الادب، باب فی الغیبۃ:٤٨٧٨۔ [2] ادب المفرد، باب أخطار الغیبۃ: ٧٣٢، ٧٣٣۔

کی تشہیر و تفضیح کی جائے۔اس لیے جس طرح غیبت کرنے والے لوگوں کے عیوب کو عام طور پر پھیلاتے ہیں، اسی طرح ان کے اس عمل کی نجاست و گندگی کی بو بھی دنیا میں پھیل کر لوگوں کو ان سے متنفر کرتی ہے۔اسی نکتہ کو آپ ﷺ نے دوسری حدیث میں بلاتشبیہ وتمثیل کے نہایت واضح طور پر بیان کیا اور فرمایا: ''اے وہ لوگو! جو زبان سے تو ایمان لائے ہو، لیکن ایمان تمہارے دلوں کے اندر جاگزیں نہیں ہوا ہے۔نہ مسلمانوں کی غیبت کرو نہ ان کے عیوب کی تلاش میں رہو، کیوں کہ جو شخص ان کے عیوب کی تلاش میں رہے گا، اللہ تعالیٰ بھی اس کے عیب کی تلاش کرے گا اور اللہ جس کے عیب کی تلاش کرے گا خود اس کے گھر ہی کے اندر اس کو رسوا کردے گا۔'' ❶

لغت کی رو سے غیبت کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس کی برائی کے بیان کو کہتے ہیں۔مگر مذہبی تعلیم میں شخص کی غیر موجودگی غیبت کے لیے کوئی ضروری قید نہیں۔اسی طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کی واقعی برائیاں ظاہر کی جائیں تو یہ غیبت نہیں۔لیکن آنحضرت ﷺ کے ایک ارشاد سے ان دونوں باتوں کی تردید ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ غیبت کس کو کہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارا اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرے۔'' کہا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو جس کو میں بیان کرتا ہوں؟ تو فرمایا: ''اگر وہ عیب اس میں موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔'' ❷

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنا غیبت کی تعریف کا کوئی ضروری جزو نہیں۔بلکہ اگر کسی شخص کے سامنے اس کی برائی بیان کی جائے تو یہ بھی غیبت ہوگی۔لیکن اس لفظ کے اشتقاق کی مناسبت سے اہلِ لغت کے نزدیک غیبت صرف اس بدگوئی کا نام ہے، جو کسی کے پیٹھ پیچھے یعنی اس کی عدم موجودگی میں کی جائے۔باقی کسی کے سامنے اس کے عیوب کا بیان کرنا تو یہ غیبت نہیں ہے۔بلکہ سب و شتم میں داخل ہے۔اس طرح غیبت صرف زبان تک محدود نہیں ہے۔بلکہ ہاتھ پاؤں اور آنکھ کے ذریعے بھی غیبت کی جاسکتی ہے۔کسی شخص کی نقل کرنا مثلاً: ایک شخص لنگڑا ہے تو اس کے اس عیب کے نمایاں کرنے کے لیے لنگڑا کر چلنا بھی غیبت ہے۔ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک شخص کی نقل کی تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ ❸ اس طرح چشم و ابرو کے اشارے سے کسی کے عیب کی پردہ دری کرنا بھی غیبت ہے اور قرآن مجید نے متعدد آیتوں میں غیبت کے ان ہی مخفی طریقوں کی برائی بیان کی ہے۔

﴿هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ﴾ (٦٨/ القلم:١١)

---

❶ ابوداود، کتاب الادب، باب فی الغیبة:٤٨٨٠۔

❷ ابوداود، کتاب الادب، باب فی الغیبة ٤٨٧٤۔

❸ ابوداود، کتاب الادب، باب فی الغیبة:٤٨٧٥۔

''(لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے (اِدھر کی اُدھر اُدھر کی اِدھر) چغلیاں لگاتا پھرتا ہے۔''

﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۙ﴾ (٤/ الهمزة ١:١)

''ہر شخص جو (لوگوں کی) عیب چینی کرتا (اور ان پر) آوازے کستا ہے، اس کی (بھی بڑی) تباہی ہے۔''

ان آیتوں میں غیبت کے جن مخفی اور دلخراش طریقوں کی مذمت کی گئی ہے، ان کی توضیح ترجمہ سے نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لیے اہل لغت کی تصریحات پیش نظر رکھنی چاہئیں جو حسب ذیل ہیں:

① هُمز، سامنے اور لُمز، پیٹھ پیچھے برائی کرنا۔

② هُمز، خاص طور پر لوگوں کے نسب کی برائی بیان کرنا۔

③ هُمز، ہاتھ کے اشارے سے اور لُمز، زبان سے غیبت کرنا۔

④ هُمز، زبان سے اور لُمز، آنکھ کے اشارے سے غیبت کرنا۔

⑤ هُمز، برے الفاظ سے ہم نشینوں کی دل آزاری کرنا۔

⑥ لُمز، آنکھ۔ ہاتھ۔ سر اور ابرو کے اشارے سے ہم نشینوں کی برائی بیان کرنا۔

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ غیبت کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔

کسی کی برائی بیان نہ کرنا اخلاقاً بڑی اچھی چیز ہے۔ لیکن خود اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی واقعی برائی بیان کی جائے، تاکہ ان کو تنبیہ اور ندامت و شرمندگی ہو، اگر بروں کی برائی بیان کرنے کو یک قلم بند کر دیا جائے تو ان کی برائی کی روک تھام کی کوئی صورت نہ ہو سکے گی۔ اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ قرآن پاک میں کافروں، مشرکوں اور منافقوں کی علانیہ برائیاں کی گئی ہیں، مگر کہیں کسی کا نام نہیں لیا گیا ہے، بلکہ ہمیشہ عموم کے ساتھ پردہ میں یا صیغۂ مجہول کے ساتھ یا وصف کے ساتھ یوں کہا گیا ہے کہ جو جھوٹ بولتے ہیں یا کفر کرتے ہیں، ان کا حال یہ ہے۔ اس طریقہ تعبیر میں یہ فائدہ ہے کہ بروں کی برائی کا اظہار بھی ہوتا ہے اور کسی خاص شخص کو ناگواری کا حق بھی نہیں پہنچتا اور جن بڑے بڑے کفار کے نام لیے گئے ہیں، وہ اس لیے کہ ان کی یہ برائیاں عالم آشکارا تھیں۔

لیکن معاملات میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں، جہاں تخصیص کی ضرورت پیش آتی ہے، قرآن پاک کی آیتوں اور حدیثوں سے ان موقعوں کی تعیین بھی معلوم ہوتی ہے، قرآن پاک کا چھٹا پارا اس آیت سے شروع ہوتا ہے:

﴿ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۝﴾

(٤/ النسآء:١٤٨)

''اللہ کو بد گوئی پسند نہیں آتی لیکن جس پر ظلم ہوا ہو اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔''

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں کہ کوئی کسی کی برائی کو پکار کر کہتا پھرے، لیکن مظلوم کو حق ہے کہ وہ اپنے ظلم کی داستان کو لوگوں سے بیان کرے اور ظالم کے ظالمانہ کاموں کو آشکارا کرے، اللہ تعالیٰ سنتا اور جانتا ہے، ظالم کو اس کے برے اعمال کی سزا دے گا۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں باریابی کی اجازت طلب کی، آپ ﷺ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ "یہ اپنے خاندان میں کس قدر برا شخص ہے۔" لیکن جب وہ پاس آیا تو اس سے نہایت لطف و کرم کے ساتھ گفتگو کی، [1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کو آگاہ کرنے اور بچانے کے لیے اس کے احوال واقعی کا اظہار جائز ہے، غرض جس اظہار میں دوسروں کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ شامل ہو، یا اس کے بغیر کوئی شرعی یا اخلاقی یا تمدنی مقصد حاصل نہ ہو سکتا ہو، اس کو یا تو غیبت ہی نہیں کہہ سکتے یا کہہ سکتے ہیں تو شریعت اس کو جائز رکھتی ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں ان مقاصد کو چھ صورتوں میں محدود کر دیا ہے۔

① حاکم کے مظالم کی بارگاہِ سلطانی میں فریاد کرنا، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ((لصاحب الحق مقالا)) [2]

② مذہبی اور اخلاقی برائیوں کا انسداد کرنا یعنی بغرضِ احتساب، (چنانچہ اسی بنا پر کفار اور منافقوں کی برائیاں قرآن نے طشت از بام کی ہیں)

③ فتویٰ طلب کرنا، اسی بنا پر حضرت ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے بخل کی شکایت کی، (اور آپ ﷺ نے سن کر اس کا مناسب جواب دیا) [3]

④ ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کا بچانا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسی غرض سے ایک شخص کو ((بئس ابن العشیرہ)) (قبیلہ کا برا آدمی) کہا تھا۔ [4]

⑤ ایک شخص کا کسی ایسے لقب سے مشہور ہو جانا جس سے گو اس کا عیب ظاہر ہو، مگر غایت شہرت کی وجہ سے خود اس شخص کو بھی اس سے چڑ نہ ہو، مثلاً: اعمش یا اعرج، کیونکہ یہ اس کی ایک امتیازی علامت قرار پا گیا ہے اور یہ اس کو ناگوار بھی نہیں ہوتا، رسول اللہ ﷺ نے خود ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو ذوالیدین (دو ہاتھوں والے) کے لقب سے پکارا تھا۔ [5]

⑥ علانیہ فسق و فجور کرنے والے کی برائی بیان کرنا (تاکہ اس کو تنبیہ اور دوسروں کو عبرت ہو) مثلاً: مخنث کو مخنث کہنا۔ [6]

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب مایجوز من اغتیاب اهل الفساد والریب: ٦٠٥٤۔ [2] بخاری، کتاب الاستقراض، استقراض الابل: ٢٣٩٠۔ [3] بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ذکر هند بنت عتبة: ٣٨٢٥۔ [4] ابو داود، کتاب الادب، باب فی حسن العشرة: ٤٧٩١۔ [5] بخاری، کتاب الصلاة، باب تشبیك الاصابع فی...... ٤٨٢۔ [6] احیاء العلوم الدین، ج٣، ص:١٠٦۔

دورخاپن

اگر دو شخصوں میں اختلاف ہو تو ایک شخص خلوص وصداقت کے ساتھ دونوں سے تعلقات رکھ سکتا ہے، لیکن اس قسم کے تعلقات میں دورخاپن نہیں پایا جانا چاہیے، یعنی دونوں کا دوست بن کر ایک کی بات دوسرے تک پہنچا کر دونوں کے تعلقات کو اور زیادہ خراب کرنا نہیں چاہیے۔ بلکہ یہ بداخلاقی چغل خوری سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ چغل خور صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچاتا ہے اور دورخاپن آدمی دونوں کی بات ایک دوسرے تک پہنچاتا ہے۔

دورخے پن کے لیے صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا ضروری نہیں ہے، بلکہ اگر ایک شخص سامنے ایک کی تعریف کرے اور اس کے پاس سے نکلے تو اس کی ہجو کرنے لگے تو بھی وہ دورخا کہلائے گا، نفاق میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو بھی نفاق سمجھتے تھے۔ ایک بار حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا گیا کہ ''ہم لوگ امرا اور حکام کے پاس جاتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں اور جب ان کے یہاں سے نکلتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں''۔ بولے ''ہم لوگ عہدِ رسالت میں اس کا شمار نفاق میں کرتے تھے''۔ [1] اور قرآن مجید میں بھی نفاق کی یہ خاص علامت بیان کی گئی ہے:

﴿ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ﴾ (۲/ البقرة:۱٤)

''اور جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے تو کہتے ہیں ہم (بھی تو) ایمان لا چکے ہیں اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف مسلمانوں کو بناتے ہیں۔''

معاشرتی اور دنیوی حیثیت سے اس قسم کے اخلاقی منافقوں کو اردو میں دورخا اور عربی میں ذوالوجہین کہتے ہیں اور احادیث میں اس قسم کے لوگوں کے لیے وعید شدید آئی ہے، مثلاً: فرمایا: ''قیامت کے دن اللہ کے نزدیک تم سب سے برا دورخے کو پاؤ گے جو کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا رخ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور''۔ [2]

ایک اور حدیث میں فرمایا: ''دنیا میں جس کے دورخ ہوں گے قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔'' [3] یہ گویا اس کی اس عادت ذمیمہ کی تمثیل ہوگی کہ وہ لوگوں سے دورنگ کی باتیں کیا کرتا تھا۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب مایکرہ من ثناء السلطان:۷۱۷۸۔

[2] بخاری، کتاب الادب، باب ماقیل فی ذی الوجهین:٦٠٥٨ وصحیح مسلم، کتاب البر والصلة: ٦٦٣٠ تا ٦٦٣٢ ومالك کتاب الکلام: ١٨٦٤۔ [3] ابوداود، کتاب الادب، باب فی ذی الوجهین:٤٨٧٣۔

بدگمانی

بدگمانی ایک قسم کا جھوٹا وہم ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ ایسے شخص کو ہر ایک کام میں بد نیتی ہی بد نیتی معلوم ہوتی ہے اور کسی کے کام میں اس کو حسن نیت نظر نہیں آتا۔ دوسرے کی طرف ان ہوئی باتیں منسوب کرنے لگتا ہے۔ دوسرے کو بھی اس کا خیال ہوتا ہے اور وہ بھی اس سے کترانے لگتا ہے۔ اس سے آپس میں نفرت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس سے باز رہنے کی تاکید فرمائی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ﴾

(٤٩/ الحجرات:١٢)

''اے ایمان والو! بہت بدگمانی سے بچا کرو، بے شک بعض بدگمانی گناہ ہے۔''

آنحضرت ﷺ نے جب بدگمانی سے بچنے کی تاکید کی تو اس کے ساتھ ہی ساتھ بغض و حسد اور دوسرے کے معاملات کے تجسس و تلاش کی ممانعت فرمائی، کیونکہ وہ بدگمانی کے اسباب یا لازمی نتیجے ہیں، فرمایا: ''تم بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، تم دوسروں کے ٹوہ میں نہ رہا کرو اور نہ ایک دوسرے پر بڑھنے کی بے جا ہوس کرو اور نہ آپس میں حسد اور نہ بغض رکھو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور اے اللہ کے بندو! جیسا اللہ نے فرمایا ہے کہ آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ''۔ [1] یہ بھی مناسب ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی ایسا کام کر رہا ہو، یا کسی ایسی حالت میں ہو، جس سے دوسرے کو بدگمانی کا موقع ہو تو وہ اس بدگمانی کو دور کر دے، تاکہ دوسرا فتنہ میں نہ پڑے۔ اس کی مثال خود آنحضرت ﷺ نے پیش فرمائی ہے۔ ایک دفعہ آپ ﷺ اعتکاف میں بیٹھے تھے، رات کو ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے کوئی آپ سے ملنے آئیں آپ ان کو واپس پہنچانے چلے کہ اتفاقاً راستہ میں دو انصاری آ پڑے، وہ آپ کو کسی عورت کے ساتھ دیکھ کر اپنے آنے کو بے موقع سمجھے اور واپس پھرنے لگے، آپ ﷺ نے فوراً آواز دی اور فرمایا: ''یہ میری بیوی فلاں ہیں۔'' انھوں نے عرض کی، یا رسول اللہ! اگر مجھے کسی کے ساتھ بدگمانی بھی کرنی ہوتی تو آپ ﷺ کے ساتھ کرتا؟ ارشاد ہوا: ''شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتا ہے۔'' [2]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قوله: ﴿یاایها الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن﴾: ٦٠٦٦ ومسلم: ٦٥٣٦ وابوداود: ٤٩١٧ وترمذی: ١٩٨٨ ومالك، کتاب حسن الخلق، باب ما جاء فی المهاجرة: ١٦٨٣۔

[2] صحیح مسلم، کتاب السلام، باب انه یستحب لمن رؤی خالیا بامرأة...... : ٥٦٧٨۔

مدّاحی اور خوشامد

مداحی اور خوشامد، اخلاق کی پستی، دنائت اور ذلت کی علامت ہے اور ساتھ ہی جھوٹ کی بھی ایک صورت ہے اور یہ اس کے لیے بھی تباہی کا سامان ہے جس کی مداحی اور خوشامد کی جاتی ہے۔ خوشامد اور مداحی کرنے والا تین گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے، ایک تو یہ کہ وہ ایسی تعریفیں کرتا ہے جو واقع کے مطابق نہیں ہوتیں، یہ جھوٹ ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ منہ سے جو تعریفیں کرتا ہے اس کو اپنے دل میں خود درست نہیں سمجھتا، یہ نفاق ہے۔ تیسرا یہ کہ دنیاوی فائدوں کے لیے اربابِ قدر و جاہ کی خوشامدانہ تعریف کر کے ان کی اور لوگوں کی نظروں میں اپنے کو ذلیل و رسوا کرتا ہے، جس سے اس کی دنائت اور ذلت ظاہر ہوتی ہے۔ بے جا تعریفوں سے ممدوح میں بھی دو برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، ایک غرور اور دوسری اپنی نسبت غلط فہمی تعریفیں سن کر وہ خوش ہوتا ہے اور پھر اپنے اس مفروضہ کمال یا مبالغہ آمیز بیان پر مغرور ہو کر دوسرے کو آنکھ نہیں لگاتا ہے اور پے در پے تعریفیں سن کر اس کو یقین آ جاتا ہے کہ وہ واقعی ایسا ہی ہے اور توقع رکھتا ہے کہ ہر شخص اس کو ایسا ہی سمجھے۔ بادشاہوں، امیروں، دولت مندوں اور بڑے لوگوں میں اس کے بدولت جو مضحکہ انگیز برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور جس طرح وہ بر خود غلط ہو جاتے ہیں، اس کی نظیر تاریخ کے ہر دور میں مل سکتی ہے۔

قرآن پاک میں یہودیوں اور منافقوں کے ایک گروہ کا یہ نقشہ کھینچا ہے۔ اور ان کے انجام کی یہ خبر ان کو دی ہے:

﴿ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝﴾ (۳/ آل عمران: ۱۸۸)

''اور جو اپنے کارناموں پر اتراتے ہیں اور جو انہوں نے نہیں کیا اس پر تعریف کیے جانے کو پسند کرتے ہیں، تو ان کو نہ سمجھنا، پھر نہ سمجھنا کہ وہ سزا سے بچ جائیں گے اور ان کے لیے درد ناک سزا ہے۔''

ان آیتوں کا شان نزول گو خاص ہے، مگر اپنے اثر کے لحاظ سے عام ہے۔ [1] اس سے یہ معلوم ہوا کہ اپنے کیے ہوئے کاموں پر اترانا اور بن کیے کاموں پر اپنی تعریف چاہنا اتنی بری بات ہے کہ بن توبہ کے اس کی سزا سے بچنا مشکل ہے، مگر یہ کہ مغفرت الٰہی دستگیری فرمائے اور قرآن پاک کے اس اصول کے مطابق کہ جو کام گناہ ہیں، ان کے کرنے پر اعانت اور تعاون کرنے والے بھی گناہگار ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو ایسی مداحی اور خوشامد کا ننگ گوارا کرتے ہیں، اس گناہ میں کسی نہ کسی درجہ میں شریک ہیں۔ جس کی تفصیل بہت سی حدیثوں سے معلوم ہوتی ہے۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دوسرے کی مبالغہ آمیز تعریف

[1] فتح القدیر شوکانی، ج ۱، ص: ۳۷٤۔

کرتے ہوئے سنا تو فرمایا: ''تم نے اس کو برباد کر دیا۔'' [1] ایک اور موقع پر ایک صاحب نے کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی تو فرمایا: ''تم نے اپنے ساتھی کی گردن ماردی، اگر تم کو کسی کی تعریف ہی کرنی ہو تو یوں کہو کہ میں یہ گمان کرتا ہوں بشرطیکہ اس کے علم میں وہ واقعی ایسا ہو اور قطعیت کے ساتھ غیب پر حکم نہ لگایا جائے۔'' [2]

مقصود یہ ہے کہ اگر کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی جائے گی تو وہ اس کو سن کر مغرور ہو جائے گا، اس کے بعد اس کا سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا، اسی طرح کسی کی نسبت قطعیت کے ساتھ اس لیے بھی حکم نہیں لگانا چاہیے کہ کسی کو دوسرے کا اندرونی حال اور غیب کی خبر نہیں معلوم۔ ایک اور بات یہ ہے کہ ایسی تعریفیں جو لوگوں کے منہ پر کی جاتی ہیں، ان کو سن کر ان کے نفس موٹے ہو جاتے ہیں اور ان کی اپنے عیب و ہنر پر نظر ڈالنے والی آنکھوں کی روشنی زائل ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے منہ پر ان کی تعریفیں کیں، تو حضرت مقداد رضی اللہ عنہ صحابی نے اس کے منہ میں خاک جھونک دی اور فرمایا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''مداحی کرنے والوں سے ملو تو ان کے منہ میں خاک جھونک دو۔'' [3] ادب المفرد میں ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے، آپ نے کسی سے پوچھا کہ ''یہ کون ہے؟'' تو اس نے اس کی بڑی تعریفیں شروع کیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کو سنا کر مت کہو کہ اس کو برباد ہی کر دو۔'' [4]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما یکرہ من التمادح: ٦٠٦٠۔
[2] صحیح بخاری، ایضًا: ٦٠٦١ ومسلم: ٧٥٠١ وابوداود: ٤٨٠٥۔
[3] صحیح مسلم، کتاب الزھد، باب النھی عن المدح: ٧٥٠٥ وابوداود، باب فی کراھیة التمادح: ٤٨٠٤۔
[4] باب یحثی فی وجوہ المداحین: ٣٤١؛ مسند أحمد، ج ٤، ص: ٣٣٨۔

بخل

بخل بھی اساسی بداخلاقیوں میں سے ہے، یعنی ایسی بداخلاقی جو بہت سی بداخلاقیوں کی جڑ ہے۔ خیانت، بددیانتی، بے مروتی، بعض دفعہ بے رحمی، بدسلوکی اور دنائت بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ حرص، طمع، لالچ، تنگ نظری، کم ہمتی، پست طبعی اور بہت سی برائیاں اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں۔ اسلام آیا تو جھوٹ کے بعد سب سے پہلے اسی جڑ پر اس نے کلہاڑی ماری اور بھوکوں کو کھلانا، ننگوں کو پہنانا محتاجوں کو دینا، یتیموں کی خبر گیری اور مقروضوں کی امداد مسلمانوں کا ضروری فرض قرار دیا، ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام زکوٰۃ اور اس کے مصارف ہیں، جو نماز کے بعد اسلام کا دوسرا فرض ہے۔ آنحضرت ﷺ نے جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سامنے جبریل علیہ السلام کی آمد کا حال سنایا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو آپ کی نبوت کا یقین جن دلیلوں کی بنا پر دلایا وہ یہ ہیں:

''یارسول اللہ ﷺ! آپ قرابت والوں کا حق اور مقروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریبوں کو سرمایہ دیتے ہیں، مہمانوں کو کھلاتے ہیں اور حق کے مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں''۔ [1]

غور کیجئے کہ نبوت کی ان تمام ابتدائی صفتوں کے اندر جو چیز خاص اہمیت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ نبی ''بخیل'' نہیں ہوتا، ورنہ فیاضی کے یہ اوصاف نبوت کی خصوصیات قرار نہ پاتے۔ بخالت ان بیماریوں میں سے ہے جو درحقیقت اعمال کی جزاوسزا پر دلی اعتقاد نہ رکھنے کا نتیجہ ہیں، کیونکہ جو اعمال کی پاداش کا یقین نہیں رکھتا، وہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت دوسرے کے حوالہ کرنے پر آسانی سے تیار نہیں ہوسکتا۔ سورۂ مدثر آغاز نبوت کی سورتوں میں سے ہے، اس میں دوزخیوں کے سوال و جواب کا ایک مکالمہ ہے، ان سے جب پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ڈالے گئے ہو؟ تو کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، مخالفوں کے ساتھ مل کر ہم دینِ حق پر اعتراض کیا کرتے تھے اور یہ سب اس لیے تھا کہ ہم اپنے عمل کی جزا وسزا کے دن پر یقین نہیں رکھتے تھے:

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۝ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ (۷۴/ المدثر:۴۲۔۴۶)

''تم کو دوزخ میں کیا چیز لے گئی، کہیں گے ہم نمازیوں میں سے نہ تھے اور مسکین کو کھلاتے نہ تھے اور بحث کرنے والوں کے ساتھ ہو کر ہم بھی بحث کیا کرتے تھے اور روزِ جزا کو جھٹلاتے تھے۔''

اس سے ظاہر ہوگا کہ بخل کی برائی دوزخ پہنچا کر رہتی ہے اور وہ عمل کی جزاوسزا پر یقین نہ رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے، کیونکہ جیسا کہ کہا گیا جو مذہبی جزاوسزا کا قائل نہیں، وہ اخلاص سے دوسروں کے ساتھ فیاضی بھی نہیں

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف بدء الوحی:۳۔

کرسکتا، یہی نکتہ سورۂ ماعون میں جو مکہ کی پرانی سورتوں میں سے ہے دہرایا گیا ہے، فرمایا:

﴿ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ ﴾ (۱۰۷/ الماعون:۱۔۳)

’’کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو جزا کے دن کو جھٹلاتا ہے، پس یہی وہ ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے اور فقیر کو کھانے پر آمادہ نہیں کرتا ہے۔‘‘

یہی سبب ہے کہ اعمال کی جزا کا یقین کیے بغیر اگر کوئی فیاضی کرے بھی تو وہ قبول نہیں، کیونکہ یہ فیاضی اس اخلاص اور نیک نیتی کی بنا پر نہیں ہوسکتی، جو قبولیت کی سب سے پہلی شرط ہے، بخیل آدمی اگر کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو وہ اس کا معاوضہ اس دنیا میں پانے کا متوقع رہتا ہے اور جہاں کہیں اس کو اپنی یہ توقع پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتی، وہ ایک دھیلا بھی خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کے دل میں یہ یقین نہیں کہ ہمارے ہر نیک عمل کی جزا اللہ کے پاس ہے اور وہ کبھی ضائع نہیں ہوسکتی۔

اور ایک مکی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کا تذکرہ کیا جس کی روزی زیادہ نہیں ہے، اس لیے اس کو اپنے اللہ سے گلہ رہتا ہے کہ اس نے مجھے ذلیل کیا ہے، اللہ فرماتا ہے:

﴿ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ ﴾ (۸۹/ الفجر:۱۷۔۲۰)

’’یہ خیال صحیح نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ تم بن باپ کے بچہ کی توقیر نہیں کرتے اور فقیر کے کھانے پر ایک دوسرے کو رغبت نہیں دلاتے اور مردہ کے متروکہ مال کو کھا جاتے ہو اور مال و دولت سے بڑی محبت رکھتے ہو۔‘‘

ان آیتوں میں باتیں کئی بیان کی گئی ہیں، مگر یہ سب کی سب بخل کی مختلف صورتوں کی تشریح ہیں، سورۂ ہمزہ میں اس بخیل کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو دولت کی تھیلیوں کو اپنی حیاتِ جاوید کی اکسیر جانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ان کی بدولت وہ ہمیشہ کی زندگی پائے گا اور یہ چیز اس سے کبھی علیحدہ نہ ہوگی، حالانکہ یہ کتنا خیالِ خام ہے فرمایا:

﴿ اِلَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ ﴾

(۱۰۴/ الهمزه:۲۔۴)

’’جس نے اکٹھا کیا مال کو اور گن گن کر رکھا اس کو، سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا، ہرگز یوں نہیں، وہ بالضرور دوزخ میں ڈالا جائے گا۔‘‘

اسی طرح مال و دولت کو سینت سینت کر رکھنے اور کارِ خیر میں خرچ نہ کرنے والے کو اس دوزخ کی دھمکی دی گئی ہے، جو کھال تک کھینچ لے:

﴿ كَلَّا ۖ إِنَّهَا لَظَىٰ ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوَىٰ ۝ تَدْعُو مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ ۝ وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ ۝ ﴾

(۷۰/ المعارج:۱۵۔۱۸)

''ہرگز نہیں وہ تپتی آگ ہے، کھال کھینچ لینے والی، پکارے گی اس کو جس نے (حق سے) پیٹھ دی اور پھر گیا اور اکٹھا کیا اور سینتا۔''

بخیل اس نکتہ کو بھول جاتا ہے کہ مال و دولت مقصود بالذات چیز نہیں، بلکہ وہ صرف چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔ سونے چاندی کی اینٹیں خود بخود روٹی، کپڑا اور مکان کی چہار دیواری نہیں بن سکتیں، اس لیے ان کو سمیٹ کر رکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ ان کو ضروری اور اعلیٰ مقصودوں کے حصول میں خرچ کرنا ہی ان کا صحیح مصرف ہے اور یہی اعلیٰ مقصود ہیں جن کو اللہ نے اپنی راہ کہا ہے، جو اس راہ میں خرچ نہیں کرتا، وہ اپنے لیے درہم و دینار نہیں جمع کرتا، اپنے سینہ اور پیشانی کے داغ کا سامان اکٹھا کرتا ہے، فرمایا:

﴿ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۳۴۔۳۵)

''اور جو لوگ سونے اور چاندی کو گاڑ کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو درد ناک سزا کی خوش خبری سنا دے، جس دن اس کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیاں، کروٹیں اور پیٹھیں داغی جائیں گی، (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ جس کو تم نے اپنے لیے گاڑ رکھا تھا، تو جس کو گاڑ کر رکھا کرتے تھے، اس کا مزہ چکھو۔''

یہ بخیل اس حقیقت سے بھی نا آشنا ہیں کہ یہ سونا چاندی فرد کی نہیں جماعت کی دولت ہے، اس کو چلتا پھرتا رہنا چاہیے، اس کو ایک جگہ روک کر رکھنا اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے خلاف اور اس جماعت کے لیے مضر ہے، جس کے رکن وہ خود ہیں:

﴿ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۸۰)

''اور جو لوگ اس مال کو جو اللہ نے اپنے مہربانی سے ان کو دیا ہے، روکے رکھتے ہیں، وہ اس کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں، بلکہ وہ ان کے حق میں بدتر ہے، جس مال کا وہ بخل کرتے ہیں، اس کا طوق بنا کر ان کے گلے میں قیامت کے دن پہنایا جائے گا۔''

یعنی جس دولت کو انھوں نے بخالت کے مارے دنیا میں اپنے گلے کا ہار بنا رکھا ہے، وہ قیامت کے عالم مثال واقعی ان کے گلے کا ہار بن کر نظر آئے گا، حدیث میں ہے کہ ''یہ مال زہریلے سانپ کی صورت میں

گلے میں پڑا ہوا نظر آئے گا۔'' [1]

جو بخیل ہوتا ہے، اس کو خلق اللہ اور اللہ کے کاموں سے قطعاً محبت نہیں ہوتی، اس کی محبت کا مرکز صرف دولت ہوتی ہے اور اسی کو زندگی کا مقصود جانتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے لوگ میری محبت کی دولت سے محروم رہیں گے:

﴿ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ﴾

(۵۷/ الحدید:۲۳۔۲۴)

''اور اللہ کسی اترانے والے شیخی باز سے محبت نہیں کرتا، جو آپ بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں۔''

اور جس سے اللہ محبت نہ کرے اس سے کون محبت کر سکتا ہے، اسی لیے ایسے شخص سے اور تو اور خود اس کے بال بچے اور عزیز واقربا بھی محبت نہیں کرتے اور ایسے لوگوں کو جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے، اکثر دیکھا بھی گیا ہے کہ ان کو اپنے مال ودولت پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اور اپنے سوا دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے بندوں کی نگاہوں میں بھی ذلیل وخوار ہوتے ہیں۔

قرآن پاک میں بخل کی سب سے بڑی مثال کا نام قارون بتایا گیا ہے، جس کا ذکر سورۂ قصص میں ہے، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان ہی کی قوم کا ایک آدمی تھا، اتنا مالدار تھا کہ (تمدن کے اس ابتدائی دور میں جب ایک تالے کی ایک ہی کنجی بنتی تھی اور وہ بھی اللہ جانے کتنی بھاری اور بھدی ہوتی ہوگی) خزانے تو الگ رہے خزانوں کی کنجیوں کے گچھوں کو کئی آدمی مل کر بھی مشکل سے اٹھا سکتے تھے، تو بجائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوتا، کہ اس نے اپنے فضل وکرم سے اس کو اتنا مالدار بنایا، کہتا کہ یہ مال ودولت تو میری محنت اور میرے ہنر کا نتیجہ ہے، اس کو یہ خبر نہ تھی کہ دنیا میں اس سے پہلے اس سے بھی بڑے بڑے دولت مند گزر چکے ہیں، جن کا انجام بڑا دردناک ہوا ہے، چنانچہ اس قارون اور اس کی دولت کا بھی یہ انجام ہوا کہ وہ زمین میں دھنس کر رہ گئی، اللہ نے فرمایا:

﴿ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ﴾

(۲۸/ القصص :۷۸)

''کیا وہ نہ جانا کہ اللہ اس سے پہلے قوموں میں سے اس سے زیادہ طاقتور اور اس سے زیادہ دولت مند کو تباہ کر چکا ہے۔''

زمانہ محمدی ﷺ کے قارون ابولہب کو بھی یہی بشارت سنائی گئی اور صاف کہہ دیا گیا:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب اثم مانع الزکوٰۃ:۱۴۰۳۔

﴿ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝ ﴾ (۱۱۱/ اللھب:۲)

''ابولہب کو اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا۔''

نفس کسی شخص یا کسی قوم کے چند افراد کے پاس دولت کا ہونا اس شخص یا قوم کی بھلائی کا سبب نہیں ہو سکتا، جب تک وہ دولت جماعت یا جماعت کے افراد کی ضرورتوں میں خرچ نہ کی جائے، بخیل آدمی چاہتا ہے کہ یہ کل کی کل تنہا اسی کی ضرورت میں کام آئے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت کا اتنا حصہ بے کار ہو جاتا ہے اور اس کا ضرر پوری جماعت کو پہنچتا ہے، جس کا وہ بھی ایک فرد ہے۔

﴿ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ ﴾ (۴۷/ محمد:۳۸)

''ہاں! تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو بلایا جا رہا ہے، تو تم میں کوئی بخل کرتا ہے اور جو کوئی بخل کرتا ہے سو اپنے ہی سے بخل کرتا ہے اور اللہ بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو۔''

یعنی اس کے بخل کے برے نتیجے اسی کو بھگتنے پڑیں گے۔ بخیل آدمی دنیا میں بھی طرح طرح کی مصیبتوں اور مشکلوں میں گرفتار رہتا ہے کہ سب کچھ پاس ہونے کے باوجود بھی اس کو نہ اچھا کھانا میسر آتا ہے، نہ اچھا پہننا، نہ قرینہ کا گھر، نہ عزت، نہ آبرو، ہر شخص اس کو ذلیل و خوار جانتا ہے، ہر ایک اس کے نام سے نفرت کرتا ہے، فقرا اس کے لیے بددعا کرتے ہیں، یہاں تک کہ بیوی بچے جن کے لیے وہ سب کچھ کرتا ہے، وہ بھی اس سے خوش نہیں رہتے، ہر ایک اس کی دولت کا خواہاں رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح اس خزانہ کا یہ سانپ راستہ سے ہٹ جائے تو اس پر قبضہ کر لے چور اس کے درپے، ڈاکو اس کے لاگو، زہر وہ پاتا ہے، حملے اس پر ہوتے ہیں، مگر ان تمام مصیبتوں کو وہ سہتا ہے اور اپنی زندگی بھر اس میں سے کچھ خرچ نہیں ہونے دیتا، لیکن ادھر اس کی آنکھ بند ہوئی اور ادھر اس کے وارثوں نے اللے تللے سے اس کو اڑا دیا، بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جس اولاد کے لیے وہ خود ساری عمر تکلیف اٹھا کر دولت جمع کرتا ہے، وہ اس مالِ مفت کو دم کے دم میں اڑا دیتی ہے اور ہزاروں بری عادتوں میں مبتلا اور آخر میں مفلس و قلاش ہو جاتی ہے۔ اللہ اپنے رسول ﷺ کی زبانی فرماتا ہے:

﴿ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ۝ ﴾ (۹۲/ اللیل:۸-۱۱)

''اور لیکن جس نے دینے سے بخل کیا اور (اللہ کی یا نیکی کی باتوں کی) پروانہ کی اور اچھی بات کو جھٹلایا، تو ہم اس کو سخت کام کے لیے آسان بنائیں گے اور جب وہ گرے گا تو اس کا مال اس کے کام نہ آئے گا۔''

وہ سخت کام جس کو اللہ اس کے لیے بطور سزا کے آسان کر دیتا ہے، وہ بری عادت و خصلت اور برے

کردار ہیں جن میں وہ ہمیشہ مبتلا رہتا ہے اور ان کو صرف اس لیے کہ کسی طرح اس کا مال خرچ نہ ہونے پائے، بڑی آسانی سے کر گزرتا ہے۔ بھوکا وہ رہتا ہے، ننگا وہ رہتا ہے، میلا وہ رہتا ہے، مصیبتیں وہ جھیلتا ہے، راتوں کو آرام سے سو نہیں سکتا، دنیا کی کسی چیز سے دل بھر کر لطف نہیں اٹھا سکتا، عزیز و اقارب دوست و احباب سے اس کی مسرت نہیں ہوتی، وہ سب سے نالاں اور اس سے سب نالاں رہتے ہیں، پھر جب وہ کسی افتاد یا مصیبت یا دوزخ کے گڑھے میں گرتا ہے یا گرے گا تو اس کی یہ عزیز اور محبوب دولت اس کے کچھ کام نہ آتی ہے نہ آئے گی، اس وقت افسوس آئے گا، تو اللہ تعالیٰ پہلے ہی ہشیار کر دیتا ہے:

﴿ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنِیْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ۝ ﴾ (٦٣/ المنافقون: ١٠)

''اور ہم نے تم کو جو روزی دی ہے، اس میں سے اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو، (ایسا نہ ہو کہ موت آنے لگے) تو کہے کہ میرے پروردگار تو نے مجھے تھوڑی دیر اور کہیں مہلت نہ دی کہ میں خیر خیرات کرتا اور نیکوکاروں میں سے ہو جاتا۔''

اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا، یہ وقت ٹالے ٹل نہیں سکتا، اس کے لیے سامان پہلے سے چاہیے تھا۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ غریب ہوتے ہیں تو بڑی بڑی دعائیں کرتے ہیں، خوب خوب وعدے کرتے ہیں کہ اگر اللہ نے ہمیں اپنے فضل و کرم سے دولت دی تو ہم یہ کریں گے، وہ کریں گے، مگر جب اللہ تعالیٰ ان کو دولت دے دیتا ہے تو وہ اپنے سارے وعدے بھول جاتے ہیں اور نیکی کے ہر راستہ سے منہ موڑ لیتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے ان لفظوں میں کھینچا ہے:

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىِٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ۝ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝ ﴾ (٩/ التوبة: ٧٥۔٧٦)

''اور ان میں کوئی ایسا ہے جس نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اللہ نے ہم کو اپنے فضل سے دیا تو ہم ضرور خیرات کریں گے اور نیکوکاروں میں سے ہوں گے، پھر جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا تو اس میں بخالت کرنے لگے اور ٹل کر پھر گئے۔''

اللہ فرماتا ہے کہ اس بخل کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے دل میں نفاق نے گھر کر لیا:

﴿ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ (٩/ التوبة: ٧٧)

''تو اللہ نے ان کے دلوں میں اس کا نتیجہ نفاق رکھا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ بخل کی شدت ایمان کو بھی برباد کر دیتی ہے، شاید اسی لیے آنحضرت ﷺ نے

فرمایا کہ ''دو خصلتیں سچے مومنوں میں جمع نہیں ہوتیں، بخل اور بد خلقی۔'' ❶ رسول اللہ ﷺ جن برائیوں سے بچنے کی اللہ سے دعائیں مانگا کرتے تھے، ان میں سے ایک بخل بھی ہے، فرمایا کرتے تھے کہ ''خداوندا! میں بخل، کسلمندی، کبرسنی، قبر کے عذاب اور زندگی اور موت کی آزمائش سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔'' ❷

اسلام میں زکوٰۃ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ زکوٰۃ کی فرضیت اور صدقات ومبرّات کی ترغیبات شریعت محمدی ﷺ میں اسی لیے ہیں کہ انسانوں کے دل اس بری خصلت کے میل سے ہمیشہ پاک وصاف رہیں۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ بخل صرف ظاہری مال ودولت ہی کے حق نہ ادا کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ اللہ نے اپنے فضل سے جس کو جو کچھ دیا ہے، مثلاً کسی کو علم دیا ہے، کسی کو عقل دی ہے، کسی کو جسمانی قوت دی ہے، تو جو لوگ اللہ کی ان بخششوں کا حق ادا نہیں کرتے، وہ بھی ایک قسم کے بخیل ہیں اور وہ بھی اپنے درجہ کی سزاؤں کے مستحق ہیں، جس کو علم ملا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے علم کو پھیلائے اور دوسروں کو بتائے، جو ایسا نہیں کرتا وہ علم کا بخیل ہے، اسی لیے علم کا چھپانا اور جان کر نہ بتانا گناہ ہے:

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۴۰)

''اور کون اس شخص سے زیادہ ظالم ہوگا جو اللہ کی شہادت کو جو اس کے پاس ہے چھپائے۔''

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ اور رسول کے بعد سب سے بڑا سخی وہ ہے جس نے علم کو سیکھا اور اس کو پھیلایا۔'' ❸ اس لیے لامحالہ جس نے علم رکھ کر علم کے فرض کو انجام نہیں دیا، اس کا شمار بخیلوں میں ہوگا۔

یہ کئی دفعہ کہا گیا ہے کہ ایمان کے بعد اسلام نے اعمال کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے، اللہ کے حق اور بندے کے حقوق کا اجمالی مجموعہ نماز اور بندوں کے حقوق کے مجمل مجموعہ زکوٰۃ یعنی مستحق لوگوں کے ساتھ بخشش ہے، دیکھیے کہ ذیل کی آیتوں میں ان ہی دونوں کی عدم بجا آوری کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دیا گیا ہے:

﴿ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۝ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝ ﴾

(۷۴/ المدثر: ۴۲۔۴۴)

''کیا چیز تم کو دوزخ میں لے گئی، کہیں گے کہ ہم نمازیوں میں سے نہ تھے اور نہ محتاجوں کو کھلاتے تھے۔''

پہلا گناہ حقوق الٰہی کی بجا آوری سے انحراف اور دوسرا بندوں کے حق سے تغافل ہے، یہی بات سورۂ ماعون کے آخر میں ہے:

❶ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی البخل: ۱۹۶۲۔

❷ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب التعوذ من العجز و……: ۶۸۷۶۔

❸ مشکوۃ، کتاب العلم الفصل الثالث: ۲۵۰، بحواله شعب الایمان للبیهقی: ۱۷۶۷ تحقیق ناصر الدین البانی۔

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۝ ﴾ (۱۰۶/ الماعون: ٤-٧)

’’پھر خرابی ہے ان نمازیوں کی جو اپنی نماز سے بے پروا رہتے ہیں، وہ جو دکھاوا کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو مانگے نہیں دیتے۔‘‘

پہلی بات تو نماز سے غفلت ہے کہ وقت پر نہیں ادا کرتے ہیں اور صرف دکھاوے کے لیے پڑھتے ہیں، یہ حقوقِ الٰہی سے تغافل ہے اور دوسری آپس میں مانگے کی معمولی معمولی چیزوں میں جیسے نمک، آگ، پانی اور ایسی ہی دوسری بے حقیقت چیزوں میں بخل سے کام لینا ہے، یہ بندوں کے حقوق سے غفلت ہے۔ اس تشریح سے معلوم ہوا ہوگا کہ بخل شریعت کے بہت بڑے حصہ کے عدم تعمیل کا سبب بنتا ہے اور اس لیے اس کی برائی جتنی بھی کی جائے کم ہے۔

حرص وطمع

حرص وطمع یا لالچ وہ برائی ہے، جس میں نفس کی دنائت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔خصوصاً وہ حرص وطمع جس میں بخالت کی بھی آمیزش ہو۔عربی میں اس کو شُـــحٌّ کہتے ہیں۔جس کی برائی قرآن میں کئی موقعوں پر آئی ہے۔خانگی زندگی کی ناگواری زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔گھر کا مالک زیادہ دینا نہیں چاہتا اور گھر کے لوگ زیادہ مانگتے ہیں۔شوہروں کو اپنے مال سے محبت ہوتی ہے۔اس لیے وہ زیادہ خرچ نہیں دیتے اور بیویاں لالچ سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہیں، یا ایک شخص کی کئی بیویاں ہوں تو ہر بیوی کو حرص ہوتی ہے کہ شوہر پر میرا حق زیادہ رہے اور شوہر کو اس بیوی کی حرص ہوتی ہے جس کو وہ چاہتا ہے، اس سے خانگی معاملوں میں کشمکش پیدا ہوتی ہے اور سارا گھر روحانی تکلیف میں رہتا ہے۔اس کا علاج یہ ہے کہ باہم احسان وایثار کا سلوک ہو اور ہر ایک دوسرے کے لیے اپنا آرام اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے۔تو پھر وہی گھر جو پہلے غم کدہ تھا، عشرت کدہ بن جائے گا۔میاں بیوی کے ان ہی خانگی اختلافات کے سلسلہ میں قرآن کی تعلیم ہے:

﴿ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء:١٢٨)

''اور طبیعتوں (نفوس) میں حرص دھری ہے اور اگر تم احسان کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ کو تمہارے کاموں کی ساری خبر ہے۔''

یعنی میاں بیوی دونوں حرص اور لالچ چھوڑ دیں اور احسان اور تقویٰ کی راہ اختیار کریں تو اللہ جو ہر ایک کے کاموں سے واقف ہے، سب کو ان کے کاموں کے مطابق جزا دے گا۔اس کاروباری دنیا میں ہر چیز کا ایک اقتصادی پہلو بھی ہوتا ہے۔جب تک انسان اپنی حرص وطمع کو روک کر، اچھے کاموں میں روپیہ خرچ نہیں کرے گا وہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔خواہ یہ کامیابی دین کی ہو یا دنیا کی۔فرمایا:

﴿ وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾

(٦٤/ التغابن:١٦)

''اور خرچ کرو، اپنے لیے بھلائی کرو اور جو اپنے جی کی حرص سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں۔''

ایک اور موقع پر ہے کہ ان مسلمانوں کا وصف یہ ہے کہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے ہیں:

﴿ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ڵ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾ (٥٩/ الحشر:٩)

''اور اپنے اوپر (اوروں کو) مقدم رکھتے ہیں۔اگرچہ خود ان کو ضرورت ہو اور جو اپنے جی کی

لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں۔''

اسی کا نام ایثار ہے، یہ ہر قوم کی دینی و دنیاوی کامیابی کا زینہ ہے اور یہ زینہ اس وقت تک کسی کو مل نہیں سکتا، جب تک حرص و طمع کا خاتمہ نہ ہو۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا، جو حرص و آز سے پاک ہوں گے وہی کامیاب ہوں گے۔

لالچی یہی نہیں کہ اپنے مال کو خرچ نہیں کرتا، بلکہ دوسرے کے مال پر بھی نگاہ رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ سب کا سب اسی کو مل جائے، اسلام نے ایسی آرزو کی ممانعت کی ہے۔ کیوں کہ اس میں دو اور بداخلاقیاں شامل ہیں۔ ایک بخل اور دوسری حسد۔ فرمایا:

﴿ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَاسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء:٣٢)

''اور اس کی ہوس نہ کرو جس میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے۔ مردوں کے لیے ان کی کمائی ہے اور عورتوں کے لیے ان کی اور اللہ سے مانگو، اس کے فضل میں سے حصہ، بے شک اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے کسی چیز میں کسی کو بڑائی بخشی ہے تو کوئی دوسرا اس کی ہوس اس خیال سے نہ کرے کہ اس کو یہ کیسے اور کیوں مل گئی، کاش خود اسے ملتی، بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے اس کے مطلق فیض و کرم میں سے اپنا حصہ طلب کرنے کے لیے ہاتھ پھیلانا چاہیے۔ اگر اس کی مصلحت کا اقتضا ہوگا تو وہ عنایت کرے گا۔ اس تعلیم پر عمل کرنے سے طبیعت میں قناعت پیدا ہوگی۔ ساتھ ہی دوسرے پر حسد کرنے کا جذبہ جاتا رہے گا۔ اسی لیے فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ ﴾ (١٥/ الحجر:٨٧۔٨٨)

''اور بے شک ہم نے تجھ کو دیں سات آیتیں اور قرآن جس کا درجہ بڑا ہے، تو اپنی آنکھیں ان چیزوں پر مت پسار، جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو فائدہ اٹھانے کو دی ہیں۔''

یعنی جس کو قرآن جیسی دولت ملی اس کی نظر میں دنیاوی دولت کیا چیز ہے؟ یہی حرص و طمع کا جذبہ ہے جو ایک کو دوسرے کی جان لے لینے اور مال چھین لینے پر ابھارتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ ''حرص و طمع سے بچو کہ اسی نے تم سے پہلوں کو برباد کیا۔ اسی نے ان کو آمادہ کیا کہ انہوں نے خون بہایا اور حرام کو حلال سمجھا۔'' [1] یہ صحیح مسلم کی روایت ہے۔ صحیح ابن حبان اور حاکم میں اس سے زیادہ مفصل ہے۔ فرمایا:

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم:٦٥٧٦۔

''حرص سے بچو، کیوں کہ اسی نے اگلوں کو اس کی دعوت دی کہ انھوں نے (بے گناہوں کا) خون بہایا۔ اسی نے اگلوں کو دعوت دی کہ انھوں نے رشتہ کے حق کو کاٹا اور اسی نے اگلوں کو دعوت دی کہ حرام کو حلال سمجھا۔'' ❶ آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا: ''حرص سے بچو، کیوں کہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں۔ اسی نے ان کو کہا تو انھوں نے رشتہ کے حق کو کاٹا۔ اسی نے کہا تو انھوں نے بخل کیا۔ اسی نے ان کو فسق وفجور کے لیے کہا تو انھوں نے فسق وفجور کیا''۔ ❷ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''انسان میں سب سے بری بات کڑھانے والی حرص اور گھبرا دینے والی نامردی ہے۔'' ❸ حریص آدمی اس لیے ہمیشہ غم میں کڑھتا رہتا ہے کہ یہ نہیں ملا، وہ نہیں ملا فلاں کے پاس یہ ہے، میرے پاس نہیں۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے حرص کو ہمیشہ غم اور کڑھن میں رکھنے والی فرمایا۔ نسائی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ایمان اور حرص ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔'' ❹ سبب ظاہر ہے کہ ایمان کامل کا نتیجہ صبر، توکل اور قناعت ہے اور حرص کا نتیجہ بے اطمینانی، بے صبری اور ہوس ہے۔ ایک دفعہ برائی کے لہجہ میں فرمایا کہ ''انسان بوڑھا ہوتا ہے، مگر اس کی دو چیزیں جوان رہتی ہیں، جینے کی خواہش اور مال کی حرص۔'' ❺ کئی صحابیوں کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''دو بھیڑیے جو بکریوں کے جھنڈ میں چھوڑ دیے جائیں، وہ ان کو اتنا برباد نہیں کرتے، جتنی مال اور جاہ کی حرص انسان کے دین وایمان کو برباد کر دیتی ہے۔'' ❻

❶ صحیح ابن حبان، کتاب الغضب: ٥١٥٤؛ مستدرك حاکم، کتاب الایمان، ج١، ص: ١٢۔

❷ ابوداود، کتاب الزکوٰۃ، باب فی الشح: ١٦٩٨۔

❸ ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی الجرأۃ والجبن: ٢٥١١۔ ❹ نسائی، کتاب الجهاد، باب فضل من عمل فی سبیل الله علی قدمه: ٣١١٢۔ ❺ ترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء فی قلب الشیخ شاب علی...... ٢٣٣٩ ومستدرك حاکم، کتاب الرقاق، ج٤، ص: ٣٢٨۔

❻ ترمذی، ابواب الزهد: ٢٣٧٦ احمد، ٣/ ٤٥٦؛ الترغیب والترهیب منذری، باب الترغیب فی الزهد فی الدنیا، ج٢، ص: ٢٣٨۔

بے ایمانی

دنیا کی ہر شریعت اور قانون کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہر شخص کی چیز اسی کی ملکیت ہے اور وہی اس میں تصرف کا حق رکھتا ہے۔ کسی دوسرے کو حق نہیں کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی ملکیت سے فائدہ اٹھائے۔ اسی اصول کی بنا پر ہر شخص کی ملکیتیں محفوظ اور مامون ہیں اور دنیا کے امن کا نظام قائم ہے۔ اب جو کوئی حق کے بغیر چوری سے یا دھوکے سے یا زبردستی سے کسی کی ملکیت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے، وہ فطرت کے نظامِ عدل کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے۔ اسلام نے اس نظام عدل کو اصول کی حیثیت سے ایک ہی مختصر سی آیت میں بیان کر دیا ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ﴾ (٤/ النسآء: ٢٩)

''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق طریقہ سے مت کھاؤ۔''

اس آیت نے ان تمام طریقوں کا جو ایمانداری کے خلاف ہیں اور جن کی جزئیات کی کوئی حد نہیں ہے چار لفظوں میں خاتمہ کر دیا ہے۔ یعنی خواہ کسی کی چیز کوئی دھوکا اور فریب سے لے یا زور و ظلم سے لے یا غصب کرے، یا چوری کرے یا اس میں خیانت کرے یا رشوت لے یا سود کھائے، غرض جس ناجائز طریق سے بھی کوئی دوسرے کا مال لے، اس آیت کے عموم اور اطلاق کے اندر وہ داخل ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھایا اور جس نے ہم (مسلمانوں) کو دھوکا دیا وہ ہم (مسلمانوں) سے نہیں''۔ [1] جان اور مال معاملات میں دو اہم چیزیں ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے اس مختصر سے فقرہ نے دونوں کی حفاظت کی اہمیت بتا دی۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک جگہ غلہ کا ایک ڈھیر پڑا دیکھا۔ آپ نے اس میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ اندر بھیگا اور باہر سوکھا ہے۔ آپ ﷺ نے غلہ والے سے پوچھا کہ ''یہ کیا ہے؟'' عرض کی کہ بارش سے بھیگ گیا ہے۔ فرمایا: ''تو پھر اس کو اوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ لیں۔ جو دھوکا دے وہ مجھ سے نہیں''۔ [2] یعنی رسول سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہوا: ''جو بے وجہ کسی مسلمان کا مال لینے کے لیے جھوٹی قسم کھائے گا وہ اللہ سے ملے گا تو اللہ اس پر غضب ناک ہوگا۔ [3] ایک دفعہ ایک معاملہ میں ایک شخص نے اسی طرح قسم کھانا چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر اس نے قسم کھالی، تاکہ وہ ظلم سے مال لے لے، تو اللہ سے جب وہ ملے گا تو اللہ اس سے منہ پھیر لے گا۔'' [4]

کسی کے مال و جائداد پر زبردستی قبضہ کر لینے کو ''غصب'' کہتے ہیں۔ غصب کر لینا ظالمانہ فعل

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ: من حمل علینا السلاح فلیس منا: ۲۸۰ تا ۲۸۳۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ من غش فلیس منا: ۲۸٤۔

[3] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وعید من اقتطع حق مسلم: ۳۵۵۔

[4] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وعید من اقتطع حق مسلم: ۳۵۸۔

ہے۔ حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے قصہ میں ایک بادشاہ کا ذکر ہے، جو غریب مچھیروں کی کشتیاں زبردستی چھین لیتا تھا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴾ (۱۸/ الکہف :۷۹)

''وہ جو کشتی تھی سو کچھ غریبوں کی تھی۔ جو دریا میں محنت کرتے تھے۔ تو میں نے چاہا کہ اس میں کچھ عیب کردوں اوران کے پرے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو چھین کر لیتا تھا۔''

یہ ایک ایسی کھلی ہوئی برائی تھی کہ اس کا بیان کر دینا ہی کافی تھا۔ اس برائی کو برائی کہنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی کسی کی ایک بالشت بھر زمین بھی دبائے گا ((طَوَّقَهُ اللّٰهُ فِيْ سَبْعِ اَرَضِيْنَ)) [1] تو اس کو زمین کے ساتوں طبقوں میں سے ہر ایک سے اتنے حصہ کے اٹھانے کو کہا جائے گا''۔ یا اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ اس کے گلے میں زمین کے یہ ساتوں طبق ہار کی طرح ڈالے جائیں گے۔ [2]

بے ایمانی کی سب سے عام قسم وہ ہے جو مقدمہ بازی سے متعلق ہے، کتنے لوگ ہیں جو وکیلوں کی قوت بیان اور حکام کے ناجائز فیصلوں کے زور سے غیروں کی ملکیت پر زبردستی قبضہ کر لیتے ہیں۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ان کی چیز نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''فریقین میں سے کوئی ایک زیادہ زبان آور ہوتا ہے اور وہ اپنے دعویٰ کو خوبی سے بیان کرتا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہوں، اگر میں نے اس کو کوئی ایسی چیز دلا دی جو اس کی نہیں تو وہ خود نہ لے۔ کیونکہ میں نے اس کو آگ کا ٹکڑا دیا ہے''۔ [3]

بعض ایسے بے ایمان ہوتے ہیں جو یہ دیکھ کر کہ دوسرا فریق گوحق پر ہے، مگر اس کے پاس ثبوت کی شہادت یا کوئی تحریری دستاویز نہیں، اپنا مقدمہ حاکم کے پاس لے جا کر فریق کے دعوے کو بے ثبوت ٹھہراتے اور اپنے ذمہ سے اس کے واجبی مطالبہ کو ساقط کرادیتے ہیں:

﴿ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۸)

''اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ اور نہ پہنچاؤ حاکموں تک اس کا معاملہ، تا کہ کھا جاؤ لوگوں کا کچھ مال گناہ سے اور تم جان رہے ہو''

---

[1] صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب تحریم الظلم وغصب الارض، :۴۱۳۳ یہ عبارت کئی طرح سے ہے فی سبع ارضین، من سبع ارضین، الی سبع ارضین دیکھیں صحیح مسلم: ۴۱۳۵، ۴۱۳۶۔ [2] شرح نووی برمسلم حدیث مذکور، ج ۱۱، ص: ۴۸۔ [3] ابوداود، کتاب الاقضیۃ، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ:۳۵۸۳۔

یعنی تم کو معلوم ہے کہ تمہارا دعویٰ اور تمہارے مطابق حاکم کا فیصلہ غلط ہے، اسی طرح کمزوروں کو بے بس سمجھ کر یا اپنے بس میں پا کر ان کا مال خلافِ انصاف نہیں کھانا چاہیے، جو ایسا کرتا ہے وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴾ (٤/ النسآء: ١٠)

''بے شک جو یتیموں کا مال ظلم سے کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ کھاتے ہیں اور اب وہ آگ میں بیٹھیں گے۔''

چوری

کسی کی رکھی ہوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر چھپا کر لے لینے کی سب سے کمینہ حرکت کا نام چوری ہے۔ اسی لیے اس کی سزا بھی بڑی رکھی گئی ہے۔ یعنی ہاتھ کاٹ ڈالنا:

﴿ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۳۸)

''اور جو کوئی چور ہو مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو سزا ان کی کمائی کی۔ تنبیہ اللہ کی طرف سے اور اللہ ہے زور آور حکمت والا۔''

چوری کی برائی کی وجہ یہی نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چپکے سے اپنے تصرف میں لے آتا ہے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے کما کر جو حاصل کرتا ہے، دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ اس پر قبضہ کر کے پہلے کی محنت کو اکارت کر دیتا ہے۔ اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے۔ اس کے علاوہ اس ایک برائی میں کتنی برائیاں شامل ہیں۔ بے وجہ دوسرے کے گھر میں داخل ہونا اور اس کی ملکیت کا جائزہ لینا۔ مرتکبِ فعل کے خبثِ باطن کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر اس کی بدولت ناحق خون بھی بہتا ہے۔ اور بے گناہ جانیں بھی ضائع جاتی ہیں اور چونکہ چور بڑے بڑے سرمایہ پر کسی جائز محنت کے بغیر قبضہ پالیتا ہے۔ اس لیے وہ اس کو بڑی بے دردی سے ضائع کر دیتا ہے اور خود بھی اس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے۔ بلکہ اس دولت کا بڑا حصہ اخفائے جرم کی خاطر برباد کر ڈالتا ہے۔

اہلِ عرب میں شاید عام افلاس کے سبب سے یہ بیماری اتنی پھیلی تھی کہ اسلام نے اس کے انسداد کے لیے مسلمان ہونے والوں سے اس کی بیعت لینی ضروری سمجھی۔ سورۂ ممتحنہ میں ان چند باتوں کا ذکر ہے، جن کا عہد مسلمان ہونے والی بیویوں سے لیا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ''وہ چوری نہ کریں گی۔'' فتح مکہ کے دن جب مکہ کی خواتین اسلام قبول کرنے آئیں تو آپ ﷺ نے ان سے بھی اس کا عہد لیا۔ اس موقع پر ابوسفیان کی بیوی ہند نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ! ابوسفیان بخیل آدمی ہیں وہ میرے اور میرے بچوں کے لیے پورا خرچ نہیں دیتے۔ مگر یہ کہ میں ان کے مال سے کچھ چھپا کر لے لوں۔ فرمایا: ''تم ان کے مال سے اتنا لے لیا کرو جو انصاف اور دستور کے مطابق تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے کافی ہو۔'' [1]

اس روایت سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ اسلام کا جوش مسلمانوں میں ایک اخلاقی انقلاب پیدا کر دیتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہند کو اتنی صفائی کے ساتھ اپنے گھر کا بھید کھولنے کی حاجت نہ تھی۔ دوسری یہ کہ جس کا نفقہ ہمارے ذمہ ہے، اگر ہم اس کو ادا نہ کریں اور وہ حسبِ ضرورت ہم سے پوچھے بغیر ہمارے حساب سے کچھ لے

[1] صحیح بخاری، کتاب النفقات، باب نفقۃ المرأۃ اذا غاب عنہا زوجہا ونفقۃ الولد: ۵۳۵۹۔

لے تو یہ چوری نہیں۔

یہ عہد صرف عورتوں ہی سے نہیں بلکہ مسلمان مردوں سے بھی آپ ﷺ نے لیا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہم سے عہد کرو کہ تم شرک، چوری اور بدکاری نہ کرو گے۔ پھر آیت پڑھی، جو کوئی یہ عہد پورا کرے گا تو اس کی مزدوری اللہ کے ذمہ ہے اور جو ان میں سے کسی ایک کا مرتکب ہوا اور اس کی سزا اس کو دے دی گئی تو اس کے اس گناہ کا کفارہ ہو گیا اور اگر کسی نے ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب کیا اور اللہ نے اس کو چھپا دیا تو اس کی بخشش اللہ کے ہاتھ میں ہے چاہے معاف کرے چاہے سزا دے۔'' ❶

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے چور پر لعنت بھیجی۔ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے کہ ایک معمولی خود یا رسی چراتا ہے، پھر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔'' ❷

چوری کا گناہ بھی بندہ اسی لیے کرتا ہے کہ وہ اللہ کے حاضر و ناظر ہونے پر یقین نہیں رکھتا، یا کم از کم یہ کہ فعل کے ارتکاب کے وقت اس کا یقین ماند پڑ جاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ جب بندے نہیں دیکھتے تو اللہ بھی ہم کو نہیں دیکھتا، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جب چور چوری کرتا ہے تو اس میں ایمان نہیں رہتا۔'' ❸

حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ ''تم میں سے ہر ایک کا مال دوسرے پر حرام ہے، مگر حق کے ساتھ۔'' ❹ یعنی جس کا مال ہو اس کی خوشی اور اجازت سے لو، یا اس کا کوئی کام کر کے معاوضہ میں حاصل کرو، یہی بات قرآن پاک کی اس آیت میں فرمائی گئی:

﴿ يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَـكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ‌ ﴾ (٤/ النسآء:٢٩)

''اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ، لیکن یہ کہ لین دین ہو آپس کی خوشی سے۔''

یہ آیت ایک اصولی حیثیت رکھتی ہے، جس میں ہر اس مال کو حرام بتایا گیا ہے، جو کسی سے جائز طریق سے حاصل نہ کیا گیا ہے۔

عرب میں قبیلہ مخزوم کی ایک عورت تھی، جو لوگوں سے چیزیں عاریت لے کر مکر جاتی تھی، یہ مقدمہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، یہ بڑے گھرانے کی عورت تھی، اچھے اچھے لوگوں نے اس کی سفارش کی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے قومیں اس لیے

❶ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب الحدود کفارۃ: ٦٧٨٤۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب قول اللّٰه: السارق والسارقة: ٦٧٩٩۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب مایحذر من الحدود: ٦٧٧٢۔
❹ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب الخطبة أیام منی: ١٧٣٩ تا ١٧٤٢۔

تباہ ہوئیں کہ جب معمولی لوگ قصور کرتے تو ان کو سزا دیتیں اور جب کوئی معزز آدمی وہی کام کرتا تو اس کو چھوڑ دیتیں، اللہ کی قسم! اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی یہ کام کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹتا۔'' ❶

ایک صحابی رضی اللہ عنہ ایک چادر سرھانے رکھ کر سو رہے تھے، ایک چور آیا اور اس نے چالاکی سے ان کے سرہانے سے اس کو کھینچ لیا، وہ پکڑا گیا تو صحابی موصوف نے آ کر سفارش کی کہ یا رسول اللہ! یہ چادر صرف تیس درہم کی تھی، کیا تیس درہم کے لیے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، میں نے یہ چادر اس کے ہاتھ بیچ دی اور قیمت اس کے ذمہ رہی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ تک معاملہ آنے سے پہلے تم نے یہ کیوں نہیں کر لیا۔'' ❷

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نماز میں مصروف تھے کہ عین نماز کی حالت میں آپ کو جنت اور دوزخ کا نقشہ دکھایا گیا، نماز سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں نے دوزخ میں اس کو بھی دیکھا جو اپنی آنکڑی سے حاجیوں کا سامان چرا لیتا تھا اور اگر مالک ہوشیار ہو جاتا تو کہہ دیتا تھا کہ اتفاق سے اس میں پھنس کر چلا آیا اور اگر وہ بے خبر رہتا تو لے جاتا تھا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے اس کو دیکھا کہ وہ دوزخ میں اپنی آنتیں گھسیٹتا پھرتا تھا۔'' ❸

---

❶ ابوداود، کتاب الحدود، باب فی الحد یشفع فیه: ٤٣٧٣۔

❷ ابوداود، کتاب الحدود، باب فی من سرق من حرز: ٤٣٩٤۔

❸ صحیح مسلم، کتاب الکسوف، باب ما عرض علی النبی ﷺ فی صلاة الکسوف: ٢١٠٢۔

ناپ تول میں کمی وبیشی

چوری کی عام قسم تو وہی ہے، جس کو سرقہ کہتے ہیں اور جس کی پاداش میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم شریعت نے دیا ہے اور جس کی برائی ہر مذہب اور اخلاقی مسلک نے یکساں کی ہے، لیکن اسلام کی تکمیلی تعلیم یہ ہے کہ اس نے نازک سے نازک ناجائز معاملوں کی بھی جن کو عام طور سے چوری نہیں سمجھا جاتا، تشریح کی اور ان کی برائیوں کی تشہیر کی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی عملی تعلیموں سے ان کی اہمیت کو ظاہر فرمایا اور ان سے بچنے کی تاکید کی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم چیز ناپ تول کی کمی وبیشی ہے، جس سے ہر وقت کام پڑتا ہے اور جس میں خاص طور سے تاجر اور بیوپاری مبتلا رہتے ہیں اور جس سے زیادہ غریبوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فطری قوانین میں سے ایک بڑا قانون عدل ہے، جس کا منشا یہ ہے کہ جس کی جو چیز ہو وہ اس کو دے دی جائے، یہی وہ میزان یعنی ترازو ہے، جسے اللہ نے دنیا میں قائم کیا ہے اور جس سے تول تول کر ہر شخص کو اس کا حق دینا چاہیے، جو شخص دوسرے کا جو حق ہے اس کو نہیں دیتا یا دینے میں کمی کرتا ہے، وہ اس ترازو سے کام نہیں لیتا ہے، فرمایا:

﴿ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۝ ﴾ (۵۵/ الرحمان:۶۔۹)

''اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی، کہ مت زیادتی کرو ترازو میں اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو تولو اور مت گھٹاؤ تول۔''

اس ترازو سے انسان کا ہر قول وفعل تلتا ہے اور اسی کی برابری سے عالم کا نظام قائم رہتا ہے۔

ناپ تول میں کمی بیشی کرنا، حقیقت میں دوسرے کے حق پر ہاتھ ڈالنا ہے، جو کوئی لینے میں تول کو بڑھاتا اور دینے میں گھٹاتا ہے، وہ دوسرے کی چیز پر بے ایمانی سے قبضہ کرتا ہے اور یہ بھی چوری ہی ہے، اسی لیے قرآن پاک میں اس سے بچنے کی خاص طور پر تاکیدیں آئی ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم سوداگری کرتی تھی، اسی لیے ان کی دعوت میں ناپ تول میں ایمانداری کی تاکید بار بار کی گئی ہے، حضرت شعیب علیہ السلام سمجھاتے ہیں:

﴿ أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ۝ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۝ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ ﴾

(۲۶/ الشعرآء:۱۸۱۔۱۸۳)

''اور پورا بھر دو ناپ اور نہ ہو نقصان دینے والے اور تولو سیدھی ترازو سے اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت پھرو ملک میں فساد پھیلاتے۔''

یہی حضرت شعیب علیہ السلام مدین والوں کو سمجھا کر کہتے ہیں، جو مشرق و مغرب کے تجارتی قافلوں کے رہ گزر میں آباد تھے:

﴿ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ إِنِّي أَرَاكُمْ بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُحِيطٍ ۝ وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ ﴾ (۱۱/ ھود:۸۴۔۸۵)

''اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو، میں تم کو آسودگی میں دیکھتا ہوں اور ایک گھیر لینے والے دن کی آفت کو تم پر ڈرتا ہوں اور اے میرے لوگو! ناپ اور تول کو انصاف سے پورا کرو اور لوگوں کی چیزیں ان کو گھٹا کر مت دو اور ملک میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔''

یہ آیت بتاتی ہے کہ ماپ اور تول کی بے ایمانی سے خیر و برکت جاتی رہتی ہے، یا ظاہری نظر سے دیکھئے تو یوں کہیے کہ بازار میں ایسے لوگوں کی جو ماپ تول میں کمی کرتے ہیں، ساکھ جاتی رہتی ہے اور یہ بالآخران کے بیوپار کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے یہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اس بے ایمانی سے کچھ اپنا سرمایہ اور نفع بڑھالیں گے مگر ہوتا یہ ہے کہ ان کی یہ اخلاقی برائی ان کی اقتصادی اور معاشی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی یہ نصیحت پھر سورۂ اعراف میں دہرائی گئی ہے:

﴿ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۸۵)

''تو ناپ تول پوری کرو اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد خرابی مت ڈالو، یہ تمہارے لیے بھلا ہے، اگر تم کو یقین ہو۔''

آنحضرت ﷺ کے ذریعہ حضرت شعیب علیہ السلام کی یہ پرانی تعلیم پھر زندہ ہوئی، اسلام میں جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا گیا ہے اس کے بعد ہے:

﴿ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ ﴾ (٦/ الانعام:١٥٢)

''اور ناپ تول کو پورا کرو۔''

سورۂ بنی اسرائیل میں جو اخلاقی نصیحتیں فرمائی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

﴿ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآئیل: ۳۵)

''اور جب تم ناپو تو ناپ پورا بھر دو اور سیدھی ترازو سے تولو، یہ بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے۔''

آیت کا اخیر ٹکڑا بتاتا ہے کہ بے ایمانی کی ناپ تول گو شروع میں کتنا ہی فائدہ پہنچائے، مگر آخر کار وہ بیوپار کی تباہی کا باعث ہو کر رہتی ہے۔

خوب غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس بداخلاقی کے پیدا ہونے کا اصلی سبب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دلوں سے یہ یقین گم ہو جاتا ہے کہ ان کے اس چھپے ہوئے کرتوت کی دیکھنے والی آنکھیں ہر وقت کھلی ہیں اور ایک دن آئے گا جب ان کو اللہ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ہر کام کا حساب دینا ہوگا، سورۂ مطففین میں ہے جہاں اس بداخلاقی کی ممانعت کی گئی ہے، اس بیماری کا علاج بھی بتایا گیا ہے، فرمایا:

﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (٨٣/ المطففين:١-٦)

''خرابی ہے ان گھٹا کر دینے والوں کی، جو اوروں سے جب ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ یا تول کر دیں تو گھٹا دیں، کیا ان کو یہ خیال نہیں کہ ایک بڑے بھاری دن کے لیے ان کو اٹھایا جائے گا، جس دن سب لوگ دنیا کے مالک کے لیے کھڑے ہوں گے۔''

چھپا کر لینا

جو سامان واسباب کئی آدمیوں میں ابھی تک مشترک ہو اور وہ بانٹ کر علیحدہ علیحدہ نہ کیا گیا ہو، اس سے کوئی چیز دوسرے ساتھیوں سے چھپا کر لینا غلول کہلاتا ہے، مگر زیادہ تر مال غنیمت میں جو بددیانتی اور چوری کی جائے اس کو کہتے ہیں، غنیمت کا مال کوئی بھی لوٹے مگر وہ سارے سپاہیوں کا حصہ ہے، جب تک امیر باقاعدہ بانٹ کر ہر ایک کا حصہ الگ الگ نہ کر دے، یا کسی کو خاص طور سے لے لینے کی اجازت نہ دے دے، اس میں سے کچھ چھپا کر لے لینا غلول ہے اور یہ ایسی برائی ہے جس میں بددیانتی اور چوری دونوں ملی ہوئی ہیں۔

اس فعل کے مرتکب کو خیال یہ ہوتا ہے کہ جب اس مشترک چیز میں ہر ایک کا حصہ ہے تو اس میں سے کسی کا کچھ لے لینا جائز ہونا چاہیے، لیکن یہ نکتہ نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ جب تک وہ تقسیم نہیں ہوا ہے، اس میں ہر ایک کا برابر برابر حصہ ہے اور ان سب کی اجازت کے بغیر وہ کسی کے لیے حلال نہیں ہوسکتا، دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی اس میں سے کوئی چیز چھپا کر لیتا ہے تو گویا اس کا ضمیر اس کو بتاتا ہے کہ یہ اس کی تنہا ملکیت نہیں، اسی لیے وہ دوسروں سے چھپا کر چوری کا ارتکاب کرتا ہے، تیسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کو چھپا کر لے لینے سے اس کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ وہ دوہرا حصہ پائے کہ ایک تو بے قاعدہ چھپا کر چوری سے لے اور دوسرا باقاعدہ بانٹ سے پائے اور یہ صریح بے ایمانی ہے۔

قرآن پاک نے تصریح کی ہے کہ سپاہی تو سپاہی امیرِ عسکر بھی یہ حرکت کرے تو وہ بھی گناہگار ٹھہرے گا اور چونکہ انبیا علیہم السلام بھی امیر ہوتے ہیں اور وہ گناہوں سے مبرا ہوتے ہیں، اس لیے ان کی نسبت تو کسی کو یہ وہم بھی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس کا ارتکاب کریں گے، فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۶۱)

''اور کسی نبی کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ غنیمت میں سے چھپا کر لے لے۔''

پھر فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۶۱)

''اور جو کوئی غنیمت کا مال چھپا کر لے گا تو قیامت کے دن اپنا چھپایا مال لے کر آئے گا، پھر ہر کوئی اپنا کمایا پورا پورا پائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

غزوۂ خیبر کے مال غنیمت میں سے مدعم نام ایک غلام نے ایک شملہ چرایا تھا، خیبر سے چل کر جب لوگ وادی القریٰ پہنچے تو ایک ناگہانی تیر اس غلام کو آ کر ایسا لگا کہ اس کا کام ہی تمام ہو گیا، مسلمانوں نے کہا کہ اس کو جنت مبارک ہو۔ یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان

ہے! جس شملہ کو اس نے خیبر میں تقسیم سے پہلے لے لیا تھا، وہ اس پر آگ کا شعلہ ہو رہا ہے۔'' لوگوں نے یہ سنا تو یہ اثر ہوا کہ ایک شخص نے جوتے کا تسمہ لیا تھا، اس کو بھی لا کر سامنے ڈال دیا، یہ دیکھ کر حضور ﷺ نے فرمایا: ''یہ آگ کا تسمہ ہے، آگ کا۔'' [1]

خیبر میں ایک اور واقعہ یہ گزرا کہ ایک مسلمان نے وفات پائی، جب اس کا جنازہ تیار ہوا تو آپ ﷺ سے عرض کیا گیا، آپ نے فرمایا: ''تم لوگ اپنے بھائی کے جنازہ کی نماز پڑھ لو۔'' یہ سن کر لوگوں کے چہروں کا رنگ بدل گیا اور سمجھے کہ کوئی بات ہوئی ہے، یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے بھائی نے مال غنیمت کی ایک چیز چھپا کر لی ہے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہم نے اس کے اسباب کی تلاشی لی تو جھوٹے موتیوں کا ایک ہار نکلا جو چند آنوں سے زیادہ کا نہ تھا۔ [2] قاعدہ یہ تھا کہ جب لڑائی ختم ہو چکتی تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ تین بار منادی کرتے، سب لوگ اپنا اپنا مال غنیمت لے کر آتے، پھر اس میں سے پانچواں حصہ نکالا جاتا اور اس کے بعد بانٹ دیا جاتا، اس کے بعد جو لے کر آتا وہ قبول نہ ہوتا اور وہ مجرم قرار پاتا، بلکہ کبھی سزا کے طور پر اس کا سارا سامان جلا دیا جاتا، ایک دفعہ اسی طرح تقسیم وغیرہ کے بعد ایک شخص بالوں کی ایک لگام لے کر آیا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! یہ ہم نے لوٹا تھا، فرمایا: ''کیا تم نے بلال رضی اللہ عنہ کی تین دفعہ منادی نہیں سنی تھی؟'' اس نے کہا، سنی تھی، پوچھا: ''پھر اس وقت کیوں لے کر نہیں آئے۔'' اس نے معذرت کی فرمایا: ''تم اس کو قیامت میں لے کر آنا، میں نہیں قبول کرتا۔'' [3] عمال کو ہدایت کی گئی کہ ان کو جو ملے اس کو مسلمانوں کے بیت المال میں لا کر پیش کریں، فرمایا: ''اے لوگو! جو ہمارے کسی کام پر مقرر ہو، وہ ایک سوئی بھی چھپا کر لے گا، تو وہ ''غلول'' ہے، وہ اس کو قیامت کے دن لے کر آئے گا۔'' [4]

---

[1] ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی تعظیم الغلول: ۲۷۱۱۔ [2] ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی تعظیم الغلول: ۲۷۱۰۔ [3] ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی الغلول اذا کان یسیرا: ۲۷۱۲۔

[4] سنن ابی داود، کتاب الاقضیة، باب فی هدایا العمال: ۳۵۸۱۔

رشوت

کسی کے مال سے ناجائز طریقہ سے فائدہ اٹھانے کی ایک عام صورت رشوت ہے، رشوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اپنی باطل غرض اور ناحق مطالبہ کے پورا کرنے کے لیے کسی ذی اختیار یا کارپرداز شخص کو کچھ دے کر اپنے موافق کرلے۔ [1]

پہلے عرب کے کاہن اپنی مفروضہ غیبی طاقت کی بنا پر بعض مقدموں کے فیصلے کرتے تھے، اہل غرض ان کو اس کے لیے مزدوری یا رشوت کے طور پر کچھ نذرانہ دیتے تھے، اس کو حلوان (مٹھائی) کہتے تھے، اسلام آیا تو اوہام کا یہ دفتر ہی اڑ گیا، اس پر آنحضرت ﷺ نے کاہن کے حلوان کی خاص طور سے ممانعت فرمائی۔ [2] عرب میں یہودیوں کے مقدمے ان کے احبار اور رئیس فیصل کرتے تھے اور چونکہ دولت اور تمول نے ان میں اونچ نیچ طبقے قائم کردیے تھے، اس لیے وہ قانون کی ناہمواری کے دل سے خواہشمند رہتے تھے، قانون کی زد سے بچنے کے لیے علانیہ رشوت دیتے تھے اور ان کے کاہن اور قاضی علانیہ لیتے تھے اور ایک کا حق دوسرے کو دلا دیتے تھے اور اس ذریعہ سے توراۃ کے احکام پر مصالح وضرورت کے اقتضا سے پردہ ڈال دیتے تھے۔ [3] چنانچہ توراۃ کے قوانین میں تحریف کا ایک سبب یہی رشوت خوری تھی۔ قرآن مجید کی اس آیت میں ان کے اسی گناہ کی پردہ دری کی گئی ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾

(۲/ البقرة: ۱۷٤)

''اللہ نے کتاب سے جو اتارا اس کو جو چھپاتے ہیں اور اس کے ذریعہ معمولی معاوضہ حاصل کرتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں، اللہ ان سے قیامت کے دن بات نہ کرے گا، نہ ان کو پاک صاف کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

''پیٹ میں آگ بھرنا'' اس لیے فرمایا کہ یہود دنیا کی اس معمولی دولت کے لالچ میں آکر اللہ کے احکام میں ردوبدل اور منشائے الٰہی میں تحریف پیٹ ہی کی خاطر کرتے تھے، اس لیے یہی سزا ان کو ملے گی۔ ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہودی رئیس اپنے علما کو اس لیے رشوتیں دیتے تھے کہ آنحضرت ﷺ کے جو اوصاف توراۃ میں ہیں، وہ عام لوگوں کو نہ بتائیں، لیکن قرآن پاک کے لفظ سے یہ

[1] مجمع البحار علامه فتنی، ج ۲، ص: ۳۲۹۔

[2] ترمذی، ابواب النكاح، باب ما جاء في كراهية مهر البغي: ۱۱۳۳۔

[3] صحيح بخاری، كتاب الحدود، باب الرجم بالبلاط: ٦٨١٩۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ احکامِ الٰہی میں عام طور سے ردو بدل کیا کرتے تھے اور اس کے ذریعہ سے دنیا کی دولت کماتے تھے، چنانچہ سورۂ مائدہ میں ان کی اس حرام خوری کا ذکر دو دفعہ ہے، فرمایا:

﴿ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ ﴾ (٥/ المآئدة:٦٢-٦٣)

''اور تو ان میں سے بہتوں کو دیکھے کہ وہ گناہ اور زیادتی اور حرام کھانے پر دوڑتے ہیں، کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں، ان کے درویش اور عالم ان کو گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے، کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں۔''

﴿ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۭ ﴾ (٥/ المائدہ:٤٢)

''جھوٹ کے بڑے سننے والے اور حرام کے بڑے کھانے والے۔''

قرآن پاک کی ایک اور آیت جو پہلے گزر چکی ہے یہاں پر بھی استدلال کے قابل ہے:

﴿ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (٢/ البقرة:١٨٨)

''اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ اور نہ مال کو حاکموں تک پہنچاؤ، تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ سے کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو۔''

یہ آیت اپنے اس ترجمہ کے لحاظ سے جس کو بعض مفسروں نے اختیار کیا ہے، رشوت کی ممانعت میں صاف وصریح ہے۔

آنحضرت ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ [1] رشوت دینے والے پر یوں کہ وہ جرم کی اعانت کرتا ہے اور جرم کی اعانت قانون اور اخلاق دونوں میں منع ہے۔

خیبر کے یہودیوں سے زمین کی آدھے آدھ پیداوار پر مصالحت ہوئی تھی، جب پیداوار کی تقسیم کا وقت آتا تو آنحضرت ﷺ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ صحابی کو بھیجتے، وہ ایمانداری سے پیداوار کے دو حصے کر دیتے تھے اور کہہ دیتے تھے کہ ان دو میں سے جو چاہو لے لو، یہودیوں نے اپنے دستور کے مطابق ان کو بھی رشوت دینی چاہی، آپس میں چندہ کر کے اپنی عورتوں کے کچھ زیور اکٹھے کیے اور کہا کہ یہ قبول کر و اور اس کے بدلہ تقسیم میں ہمارا حصہ بڑھا دو۔ یہ سن کر حضرت ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے یہودیو! اللہ کی قسم! تم اللہ کی ساری مخلوق میں مجھے مبغوض ہو، لیکن یہ مجھے تم پر ظلم کرنے پر آمادہ نہیں کرسکتا اور جو تم نے رشوت پیش کی ہے وہ

[1] ابوداود، کتاب الاقضیة، باب فی کراهیة الرشوة:٣٥٨٠۔

حرام ہے، ہم (مسلمان) اس کو نہیں کھاتے"۔ یہودیوں نے ان کی یہ تقریر سن کر کہا کہ "یہی وہ (انصاف) ہے جس سے آسمان اور زمین قائم ہیں۔" [1]

اسی لیے آنحضرت ﷺ نے عمال کو رعایا سے ہدیہ اور تحفہ قبول کرنے کی ممانعت فرمائی۔ [2] ایک دفعہ ایک عامل نے آ کر کہا کہ یہ صدقہ کا مال ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے، یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی، حمد وثنا کے بعد فرمایا:

"عامل کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو بھیجتے ہیں تو آ کر کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ میرا ہے، تو اپنے باپ یا ماں کے گھر میں بیٹھ کر نہیں دیکھتا کہ اس کو تحفے ملتے ہیں یا نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، وہ اس میں سے جو لے جائے گا وہ قیامت میں اپنی گردن پر لاد کر لائے گا، اونٹ گاڑی، بکری جو ہو، پھر آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر تین بار فرمایا: "میں نے پہنچا دیا۔" [3]

اس آیت میں آپ ﷺ نے جو کچھ فرمایا، وہ غلول والی آیت کی تفسیر ہے۔

---

[1] مؤطا امام مالك، كتاب المساقاة: ١٤١٢، ١٤١٣۔

[2] ابوداود، كتاب الاقضية، باب في هدايا العمال: ٣٥٨١ وكتاب الخراج، باب في هدايا العمال: ٢٩٤٦۔

[3] صحيح بخارى، كتاب الاحكام، باب هدايا العمال: ٧١٧٤۔

سود خوری

سود خوری، حرص وطمع، بخل اور ظلم کا مجموعہ ہے، حرص وطمع تو یوں کہ سود خور اس سود کے ذریعہ چاہتا ہے کہ ساری دولت سمٹ کر اس کے پاس آ جائے، بخل یوں کہ وہ کسی غریب مقروض کے ساتھ کوئی رعایت کرنا نہیں چاہتا اور نہ کسی کار خیر میں دے کر اپنے سرمایہ میں کچھ کمی پسند کرتا ہے، یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سود خوری کا ذکر زکوٰۃ اور خیرات کے مقابلہ میں کیا ہے اور ظلم یوں کہ وہ سود اور سود در سود کے ذریعہ لوگوں کو ان کی محنتوں کے پھل سے محروم کر دیتا ہے اور رحم نہیں کرتا، اسی لیے سود کی ممانعت کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے فرمایا:

﴿ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۹)

''نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔''

یعنی تم نے جتنا دیا ہے اس سے زیادہ لو، تو یہ تمہارا ظلم ہے اور جتنا تم نے دیا ہے اتنا تم کو نہ ملے تو یہ تم پر ظلم ہے۔ اس حرام خوری کی عادت بھی عرب میں یہودیوں کی بدولت پھیلی تھی، وہی سرمایہ کے مالک تھے اور غریب عرب کسان اور مزدور اکثر ان ہی سے سودی قرض لیتے تھے، یہودیوں پر نعمتوں کا دروازہ جو بند کیا گیا، اس کے اسباب کے بیان کے سلسلہ میں ہے:

﴿ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭ ﴾ (٤/ النسآء:١٦١)

''اور ان کے سود لینے کے سبب سے حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور لوگوں کے مال کو ناروا طریق سے کھانے کے سبب سے۔''

اسلام آیا تو اس نے سرمایہ داری کی اس لعنت کو جس سے دنیا دبی جا رہی تھی، ہمیشہ کے لیے دور کر دیا:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۷۵۔۲۷۶)

''جو سود کھاتے ہیں، وہ ایسے اٹھیں گے، جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے شیطان نے لپٹ کر حواس کھو دیئے ہوں، یہ اس لیے کہ انھوں نے کہا کہ خرید وفروخت کا معاملہ سود ہی کی طرح ہے اور اللہ نے خرید وفروخت کے معاملہ کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے، تو جس کے پاس اس کے پروردگار کی نصیحت پہنچی اور وہ باز رہا تو اس کا ہے جو پہلے دیا گیا اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو پھر ایسا کرے تو وہ دوزخی ہیں، وہ دوزخ میں رہیں گے، اللہ سود کو مٹاتا اور صدقہ وخیرات کو

بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گناہگار کو پیار نہیں کرتا۔‘‘

قیامت میں سود خور کا بدحواس ہو کر اٹھنا اس کی دنیاوی بدحواسی کی پوری تمثیل ہوگی، دنیا میں سود خوروں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ دن رات دوسروں کے مال و دولت کے چھیننے اور اپنی دولت کو ناجائز طریقوں سے بڑھانے میں ایسے مشغول رہتے ہیں کہ انھیں کسی کارِ خیر کا خیال نہیں آتا، تو قیامت میں بھی وہ ایسے ہی اپنے حواس کھوئے ہوئے اٹھیں گے، آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے سود خواروں کو ناشکرا گناہگار ٹھہرایا ہے، کیونکہ اللہ نے جو دولت ان کو دی تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس سے وہ کارِ خیر کرتے، غریبوں کو دیتے، مستحقوں کو بانٹتے، مگر انھوں نے اس کے بجائے غریبوں کو اور لوٹا اور ظلم سے ان کی تھوڑی بہت پونجی کو بھی چھین لیا اور یہ نعمت کی ناشکری تھی۔

یہودیوں کی دیکھا دیکھی عربوں میں بھی کچھ ایسے سرمایہ دار پیدا ہو گئے تھے، جو سودی کاروبار کرنے لگے تھے، جیسے حضرت عباس بن عبدالمطلب اور بنوعمرو بن عمیر وغیرہ، اب وہ اور ان کے مقروض جب مسلمان ہوئے اور ان میں سے قرض داروں نے مقروضوں سے پہلے کا سود مانگا، تو اس پر یہ آیتیں اتریں، جو پہلی ہی آیتوں کے سلسلہ میں ہیں:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۝ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۣ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۸۔۲۸۱)

’’اے ایمان لانے والو! اللہ کا خیال کرو اور سود جو رہ گیا ہو اس کو چھوڑ دو، اگر تم واقعی مومن ہو، تو اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کے لیے ہوشیار ہو جاؤ اور اگر تم باز آ جاؤ تو تمہارے لیے تمہارا اصل سرمایہ ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے اور اگر وہ (مقروض) تنگ دست ہو تو اس کو کشادگی تک مہلت دو اور معاف کر دینا تمہارے لیے سب سے اچھا ہے، اگر تم کو سمجھ ہو اور اس دن سے ڈرو، جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر کسی کو وہ پورا پورا دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان کا کچھ دبایا نہ جائے گا۔‘‘

ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ ایک دن آئے گا جب سب اللہ کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے اور جس نے کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا، اس کا حساب ہوگا، تو اگر تم نے نیکی کی ہوگی اور مقروضوں کو معاف کیا ہوگا، تو اللہ کے یہاں پورا پورا مل جائے گا۔

جاہلیت میں ربا کی یہ صورت تھی کہ غریب کسان اگلی پیداوار کے موقع پر ادا کر دینے کے وعدے پر مہاجنوں سے قرض لیتے تھے، جب فصل کا وقت آتا اور کسان ادا نہ کر سکتے، تو مہاجن کہتے کہ ہم مدت بڑھا دیتے ہیں تم جنس کی مقدار بڑھا دو، مثلاً: ایک روپیہ میں دس سیر کا وعدہ ہوتا تو ایک سال کی اور مہلت بڑھا کر بیس کر دیتے اور اسی طرح جب تک وہ قرض ادا نہ کر دیتے یہ مدت بڑھاتے جاتے اور جنس کی مقدار بڑھتی چلی جاتی، یہاں تک کہ اصل سے کئی گنا سود ہو جاتا، اللہ نے فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾ (۲/ آل عمران: ۱۳۰۔۱۳۱)

"اے ایمان والو! (اصل سے) دو گنا چوگنا سود مت کھاؤ اور اللہ سے تقویٰ کرو، شاید کہ تم فلاح پاؤ اور اس آگ سے بچو جو منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔"

اس آیت میں تصریح ہے کہ سود خوری کی سزا جہنم ہے، وہ جہنم جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے ایک رؤیائے صادقہ میں سود خوروں کو جس حال میں دیکھا اس کی تصویر یہ ہے فرمایا: "میں نے دیکھا کہ خون کی ایک نہر ہے، اس میں ایک آدمی تیر رہا ہے اور ایک دوسرا آدمی ہاتھ میں پتھر لیے کنارے پر کھڑا ہے، پہلا آدمی تھک کر جب کنارے پر آنا چاہتا ہے تو دوسرا آدمی ایسا تاک کر پتھر مارتا ہے کہ اس کا منہ کھل جاتا ہے اور وہ پتھر لقمہ بن کر اس کے پیٹ میں چلا جاتا ہے، وہ پتھر کھا کھا کر پھر پیچھے لوٹ جاتا ہے، جبرئیل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ جو خون کی نہر میں تیر رہا ہے، سود خور ہے۔" [1] سزا کی مماثلت ظاہر ہے، لوگ اپنا خون پسینہ ایک کر کے محنت سے جو روزی پیدا کرتے ہیں، سود خور آسانی سے اس پر قبضہ کر لیتا ہے، تو وہ انسان کے خون میں تیرتا ہے اور جو پتھر لقمہ تر بن کر اس کے منہ میں چلا جاتا ہے، تو وہ، وہ دولت ہے جس کو وہ سود سے جمع کرتا ہے۔

گناہ کے شریک وہ بھی ہیں، جو کسی گناہ کی اعانت میں شریک ہوں، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے (یعنی دینے والے) سود پر گواہ ہونے والے اور سود کی دستاویز لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی۔ [2]

[1] صحیح بخاری، کتاب الجنائز: ۱۳۸۶ وکتاب التعبیر، باب تعبیر الرؤیا بعد صلاۃ الصبح: ۷۰۴۷۔

[2] ابوداود، کتاب البیوع، باب فی اکل الربا وموکلہ: ۳۳۳۳۔

شراب خوری

شراب خوری ان عادات ذمیمہ میں سے ہے جن کی برائی کھلی ہوئی ہے، پھر بھی یہ نئی عجیب بات ہے کہ دنیا کی اکثر قومیں اس میں مبتلا نظر آتی ہیں، اسلام سے پہلے جو مذہب تھے، ان میں بھی اس کی برائی کچھ نہ کچھ بیان کی گئی ہے اور اس کا پینا اچھا نہیں سمجھا گیا ہے، ❶ لیکن اس کو حرام قطعی ٹھہرانے کی عزت صرف اسلام کو حاصل ہے۔ شراب عرب کی گھٹی میں پڑی تھی، شراب پینا، پلانا اچھے اچھے گھرانوں میں لطف اور تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، بیویاں شوہروں ❷ کو اور چھوٹے اپنے بزرگوں کو اپنے ہاتھوں سے پلاتے تھے۔ ❸

اسلام سے پہلے اگرچہ بعض نیک بخت لوگوں نے شراب چھوڑ دی تھی، مگر سارا ملک اسی مصیبت میں گرفتار تھا، لوگ شراب پیتے اور متوالے ہو کر آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کا سر پھوڑتے، جس سے دلوں میں آپس کی دشمنی بیٹھ جاتی، کبھی ترنگ میں آتے تو جو اونٹ ملتا اس کو پچھاڑ ڈالتے اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس کا ہے۔ ❹ اور ساتھیوں کو اس کے کباب بنا کر کھلا دیتے، ساتھ ہی ساتھ جوا ہوتا اور اس میں مویشیوں کی بازی لگاتے، ان کو ذبح کر کے ان کے گوشت کے حصے کیے جاتے، ان کو سب مل کر کھاتے اور بچ رہتا تو غریبوں کو بھی کھلاتے۔

اسلام آیا تو اس نے رفتہ رفتہ شراب کی چاٹ گھٹانی شروع کی، پہلے تو یہ کہا کہ نشہ کوئی اچھی چیز نہیں، اللہ نے تم کو کھجور اور انگور دیے جو بڑی نعمت ہیں، لیکن تم ان سے نشہ تیار کرتے ہو اور کھانے کے کام میں بھی لاتے ہو، فرمایا:

﴿ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ ﴾ (١٦/ النحل: ٦٧)

''اور کھجور اور انگور کے میوے دیے، تم ان سے نشہ بناتے ہو اور اچھی روزی، اس میں ان لوگوں کے لیے اللہ کی نشانی ہے جو سمجھتے ہیں۔''

اس آیت میں نشہ کو ''رزق حسن'' کے مقابل میں رکھا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نشہ ''رزق حسن'' ❺ نہیں۔ ان آیتوں میں درحقیقت خیر و باطل کے التباس کی تشبیہیں ہیں، ❻ اوپر دودھ اور گوبر اور خون اور نیچے شہد کا ذکر ہے کہ یہ بھی دودھ کی طرح آلائشوں کے اندر سے کیسا پاک و صاف نکلتا ہے، یہی حال کھجور اور انگور کا ہے کہ ان سے نشہ جیسی ناپاک اور غذا جیسی پاک چیز دونوں پیدا ہوتی ہیں۔

---

❶ لوقا ۱۔ ۱۵۔ ❷ سبعہ معلقہ میں قصیدہ عمرو بن کلثوم الاھبی بصحنک ،ص:۱۰۴۔

❸ صحيح بخاری، كتاب الاشربة، باب من رأى ان لا يخلط البسر والتمر: ٥٦٠٠۔

❹ سبعہ معلقہ میں طرفہ کا قصیدہ، ص:۶۰ اور صحیح بخاری، کتاب المغازی: ۴۰۰۳ میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا قصہ۔

❺ تفسیر کبیر امام رازی، تفسیر سورۃ نحل، ج ٤، ص ١٥٩۔ ❻ مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔

مدینہ میں آ کر شراب کی حرمت کے مسئلہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، حکم ہوا:

﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ (٤/ النسآء:٤٣)

''تم جب نشہ میں ہوتو نماز کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ تم جانو کہ تم کیا کہتے ہو۔''

اس آیت نے ہشیاروں کو چونکا دیا، کچھ لوگوں نے بالکل چھوڑ دی اور دوسروں نے اپنے پینے کا وقت نماز کے اوقات کے علاوہ مقرر کیا، اب اتنی جانچ ہو چکی تو وقت آیا کہ کنایہ تصریح کی صورت اختیار کرے، لوگوں کے دلوں میں آپ سے آپ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ شراب اور جوئے کے بارہ میں اسلام کا آخری فیصلہ کیا ہوگا:

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ ﴾ (٢/ البقرۃ:٢١٩)

''(اے پیغمبر)! تجھ سے شراب اور جوئے کے بارہ میں پوچھتے ہیں، کہہ دے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدہ کی چیزیں بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کے فائدہ سے بڑا ہے۔''

فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کا کچھ غم غلط ہوتا ہے، صحبت اور تفریحِ طبع کا لطف آتا ہے، لوگ کھاتے پیتے ہیں، دوسروں کو بھی ان کے بدولت کچھ کھانے پینے کو مل جاتا ہے، لیکن اس کی خرابیاں اس تھوڑے سے فائدہ سے بہت زیادہ ہیں۔ اس آیت نے بہت سے لوگوں کو ہشیار کر دیا اور وہ شراب سے تائب ہو گئے، لیکن چونکہ ابھی قطعی فیصلہ کا وقت نہیں آیا تھا، اس لیے اس کے فائدہ کے پہلو کو رخصت سمجھ کر کچھ لوگ پیتے بھی تھے، آخر یہ آیت اتری:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ ﴾

(٥/ المآئدۃ:٩٠۔٩١)

''اے ایمان والو! شراب اور جوا اور چڑھاوے کے بت اور پانسے، گندے کام ہیں شیطان کے، سو ان سے بچتے رہو، شاید تمہارا بھلا ہو، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں شراب اور جوئے سے دشمنی اور بیر ڈال دے اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے، پھر اب تم باز آتے ہو۔''

جب یہ حکم آیا تو بعض صحابہ نے چلا کر کہا، یا اللہ! ہم باز آ گئے۔ [1] اس دن مدینہ کا یہ حال تھا کہ ہر

[1] ابوداود، کتاب الاشربۃ، باب تحریم الخمر: ٣٦٧٠۔

طرف گلیوں میں خم الٹے جا رہے تھے اور شراب زمین پر بہائی جارہی تھی۔ [1] اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت کے اسباب بھی بتا دیئے ہیں، اول یہ کہ یہ شیطان کا کام ہے، دوسرا یہ کہ اس کو پی کر شرابی آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور تیسرا یہ کہ یہ انسان کو اس کے بہت سے ضروری کاموں سے غافل کر دیتی ہے، ان تینوں اسباب کی سچائی روزِ روشن کی طرح آج بھی آشکارا ہے۔

اوپر کی آیت میں شراب اور جوئے کو جو شیطان کا کام بتایا گیا ہے، اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک چیز تو کھلی ہوئی ہے، یعنی شراب اور جوئے کو چڑھاوے کے بتوں اور بانٹ کے پانسوں کے ساتھ ملا کر شیطان کے ناپاک اور برے کاموں میں شمار کیا ہے، اس لیے ان سب کی باطنی گندگی اور نجاست میں کوئی شک ہی نہیں، اس کے علاوہ کسی کام کے شیطان کی طرف نسبت کرنے سے مقصود حد درجہ کی برائی کا اظہار بھی ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ جب ان کے گھونسہ سے اتفاقاً ایک قبطی مر گیا تو فرمایا:

﴿ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۭ ﴾ (۲۸/ القصص:۱۵)

''یہ ہوا شیطان کے کام سے۔''

یعنی بہت ہی برا کام ہوا، اسی طرح اس آیت:

﴿ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۲۷)

''بے شبہ فضول خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔''

کی روشنی میں ادھر خیال جاتا ہے کہ شراب، جوئے، بتوں کے چڑھاوے اور جیتے ہوئے جانوروں کو بے کار ذبح کر کے پانسوں سے ان کی بانٹ میں جن کو عرب جاہلیت میں فیاضی کا کام سمجھا جاتا تھا، مال و دولت کی بے فائدہ بربادی کی طرف بھی اشارہ نکل سکتا ہے، کون نہیں جانتا شراب خوری، قمار بازی اور دکھاوے کی جھوٹی فیاضیوں نے خاندان کے خاندان اور قوم کی قوم کو تباہ کر دیا ہے، جس کی مثالیں زمانہ کے صفحوں پر لکھی آج بھی ملتی ہیں۔ اس کے بعد ان شیطانی کاموں کی دو برائیاں قرآن نے بتائی ہیں، ایک معاشرتی اور دوسری مذہبی۔ معاشرتی خرابی یہ کہ شراب سے بدمست ہو کر لوگ آپس میں لڑتے ہیں اور وہ کام کر گزرتے ہیں جن کو وہ ہوش کی حالت میں کبھی نہ کرتے۔ کتنے قتل، کتنی خودکشیاں اور کتنے سخت حادثے اس کی بدولت روزانہ پیش آتے ہیں، مذہبی برائی یہ ہے کہ انسان شراب پینے اور جوا کھیلنے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ اللہ کی یاد اور نماز سے جو زندگی کا سب سے بڑا فرض ہے، غافل ہو جاتا ہے۔ بلکہ خود اپنے مفید دنیاوی کاموں سے بھی ایسا کھویا جاتا ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا کے کام کا بھی نہیں رہ جاتا اور اس کی ساری زندگی ناکام اور نامراد ہو جاتی ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاشربة، باب نزل تحریم الخمر: ۵۵۸۲۔

شراب کے لفظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس سے مراد کوئی خاص قسم کی شراب ہے، قرآن نے اس کے لیے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے، خمر کہتے ہیں چھا جانے کو، اس لیے ہر وہ شے جس کا کھانا یا پینا عقل اور ہوش پر چھا جائے، وہ خمر میں داخل ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر نبوی پر کھڑے ہو کر فرمایا: ''شراب (خمر) وہ ہے جو عقل کو ڈھانک لے۔'' ❶ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہر وہ شے جو نشہ پیدا کرے، حرام ہے۔'' ❷ فرمایا: ''جس نے دنیا میں شراب پی اور اس سے توبہ نہ کی وہ آخرت میں اس سے محروم رہے گا۔'' ❸ آنحضرت ﷺ جب معراج میں تشریف لے گئے تو آپ کے سامنے دستِ غیب نے دو پیالے رکھے، ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب، سرور کائنات ﷺ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا، ناموس وحی حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: ''اس اللہ کی حمد جس نے آپ کو فطرت کی راہ دکھائی اگر آپ شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔'' ❹ گویا شراب مثال کی دنیا میں گمراہی کی تصویر ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی مومن جب شراب پینے لگتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان اس سے رخصت ہو جاتا ہے۔'' ❺ یہ بھی فرمایا کہ ''قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ شراب کا پینا بڑھ جائے گا۔'' ❻ اسلام نے جب شراب کو حرام کیا تو اس کے سارے لوازم اور متعلقات بھی سد ذرائع کے طور پر حرام کیے، یہاں تک کہ شروع شروع میں ان برتنوں کے استعمال کو بھی حرام کیا، جن میں شراب عموماً بنائی جاتی تھی، پھر جب لوگ شراب چھوڑنے کے عادی ہو گئے، تو اس سختی کو اٹھا دیا۔ ❼ اس اصول کا ذکر کئی دفعہ آچکا ہے کہ ﴿ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٢) ''گناہ اور تعدی میں ایک دوسرے کی اعانت نہ کرو۔'' کے اصول کی بنا پر نہ صرف شراب پینا بلکہ اس کا پلانا، بنانا، بیچنا، خریدنا، لینا، لے جانا، سب حرام ٹھہرایا گیا۔ فرمایا: ''اللہ نے شراب پر، اس کے پینے والے، پلانے والے، خریدنے والے، دوسروں کے لیے نچوڑنے والے، اپنے لیے نچوڑنے والے، اس کے لے جانے والے اور جس کے پاس لے جائی جائے، سب پر لعنت فرمائی ہے۔'' ❽ یہ بھی ارشاد ہوا کہ ''ہر نشہ کی چیز حرام ہے اور جس کے زیادہ پینے سے نشہ ہو اس کا تھوڑا بھی ویسا ہی حرام ہے۔'' ❾

❶ صحیح بخاری، کتاب الاشربۃ، باب الخمر من العنب:٥٥٨١۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الاشربۃ، باب الخمر من العسل:٥٥٨٥؛ مسلم:٥٢١١، ٥٢١٢۔ ❸ بخاری، کتاب الاشربۃ، باب قولہ تعالیٰ: انما الخمر......:٥٥٧٥؛ مسلم: ٥٢٢٤۔ ❹ بخاری، ایضًا: ٥٥٧٦۔ ❺ بخاری، ایضًا، ......: ٥٥٧٨۔
❻ ایضًا:٥٥٧٧۔ ❼ ایضًا، باب ترخیص النبی ﷺ فی الاوعیۃ:٥٥٩٣۔
❽ ابوداود، کتاب الاشربۃ، باب العصیر للخمر: ٣٦٧٤۔ ❾ ابوداود، باب ما جاء فی السکر: ٣٦٨١؛ ترمذی، کتاب الأشربۃ، باب ما جاء ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام: ١٨٦٥، ١٨٦٦۔

غیظ وغضب

غیظ وغضب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی برائی ہے بہت سے ظالمانہ اور بے دردانہ کام انسان صرف غیظ وغضب اور غصہ میں کر بیٹھتا ہے اور بعد کو اکثر نادم اور پشیمان ہوتا ہے، اس لیے ایک مسلمان کو چاہیے کہ اپنے غصہ پر قابو رکھے اور بے سبب غیظ وغضب کا اظہار نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے مسلمانوں کی تعریف کی ہے:

﴿ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۳۴)

''کہ وہ اپنے غصہ کو دبا لیتے ہیں۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ: ۳۷)

''جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔''

انسان کا سکون کی حالت میں معاف کر دینا آسان ہے، لیکن غصہ کی حالت میں جب وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے معاف کرنا آسان نہیں ہے، لیکن ایک مسلمان کی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ اس وقت بھی اپنے کو قابو میں رکھے اور معاف کر دے، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''پہلوان وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے، پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے کو قابو میں رکھے۔'' ❶

حضرت ابو ہریرہ، ❷ حضرت ابن عمر ❸ حضرت جاریہ بن قدامہ، ❹ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہم ❺ وغیرہ کئی صحابیوں سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے، ارشاد ہوا کہ ''غصہ نہ کیا کرو''۔ اس کو یہ معمولی بات معلوم ہوئی تو اس نے دوبارہ سہ بارہ عرض کی آپ ﷺ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ ''غصہ نہ کیا کرو۔'' مسند احمد میں ہے کہ ان صاحب کا بیان ہے کہ پھر میں نے دل میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ غصہ میں ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ ❻

مشہور صحابی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے عصر کی نماز کے بعد صحابہ کو کھڑے ہو کر نصیحتیں فرمائیں، جن میں سے ایک یہ تھی، فرمایا: ''آدم کے بیٹے کئی طبقوں میں پیدا کیے گئے ہیں، ان میں کوئی ایسا ہے جس کو غصہ دیر میں آتا ہے اور سکون جلد ہو جاتا ہے اور کسی کو غصہ بھی جلد آتا ہے اور دور بھی جلد ہو جاتا ہے، تو ان دونوں میں ایک بات کی دوسری بات سے اصلاح ہو جاتی ہے اور کوئی ایسا ہے کہ اس کو غصہ جلد آتا ہے اور دفع بہت دیر میں ہوتا ہے، تو ہاں! ان میں سب سے اچھا وہ ہے، جس کو غصہ دیر میں آئے اور دور جلد ہو جائے اور ان سب سے برا وہ جس کو غصہ جلد آتا ہو اور دور بہت دیر میں ہوتا ہو۔ ہاں! غصہ

❶ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة باب فضل من یملك نفسه عند الغضب: ٦٦٤٣ وبخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب: ٦١١٤۔ ❷ بخاری: ٦١١٦؛ ترمذی: ٢٠٢٠؛ احمد، ٢/ ٣٦٢، ٢/ ٤٦٦۔
❸ صحیح ابن حبان: ٢٩٦ عن عبداللہ بن عمرو۔ ❹ طبرانی الاوسط: ٧٤٩١؛ صحیح ابن حبان: ٥٦٦٠؛ احمد، ٣/ ٤٨٤۔ ❺ طبرانی الاوسط: ٢٣٥٣۔ ❻ احمد، ٥/ ٣٧٣۔

ابن آدم کے دل کی ایک چنگاری ہے، دیکھتے نہیں کہ اس کی آنکھیں لال اور اس کی رگیں پھول جاتی ہیں، تو جس کو اپنے غصہ کا احساس ہو اس کو چاہیے کہ وہ زمین سے لگ جائے۔'' ❶

ابو داؤد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''غصہ شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے بنا ہے اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتا ہے، تو جس کو غصہ آئے اس کو چاہیے کہ وہ وضو کر لے۔'' ❷ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جس کو غصہ آئے وہ کھڑا ہے تو اسے چاہیے کہ بیٹھ جائے، اگر اس سے بھی کم نہ ہو تو چاہیے کہ لیٹ جائے۔'' ❸

صحیحین میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے دو صاحبوں میں کچھ باتیں ہو گئیں، ان میں سے ایک صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ لال ہو گیا اور رگیں پھول گئیں، تو آنحضرت ﷺ نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا پھر فرمایا: ''مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ اس کو کہہ لے تو یہ غصہ جاتا رہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ کہے۔'' ❹

اس اخیر حدیث کی تائید قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے:

﴿ خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ ۝ وَإِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۚ إِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۹۹۔۲۰۰)

''معاف کرنے کی عادت ڈال، نیکی کی بات کہہ اور نادانوں سے درگزر کر اور اگر شیطان کی چھیڑ تجھ کو ابھار دے تو اللہ کی پناہ پکڑ، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

اسی قسم کی آیت سورۂ حٰمٓ السجدۃ (۴۱:۳۴۔۳۶) میں بھی ہے، جس کا ترجمہ ہے:

''نیکی اور بدی برابر نہیں، برائی کا جواب نیکی سے دے، پھر جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہو گی وہ ایسا ہو جائے گا جیسے دوست رشتہ والا اور یہ بات ملتی ہے اس کو جو بڑی قسمت والا ہے اور اگر ابھار دے تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ تو اللہ کی پناہ پکڑ، بے شک وہی سننے والا جاننے والا ہے۔''

آنحضرت ﷺ نے غصہ کے تین علاج بتائے ہیں۔ ایک روحانی اور دو ظاہری۔ روحانی تو وہی ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے، یعنی یہ کہ چونکہ یہ غصہ شیطان کا کام ہے، اس لیے جب غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہیے کہ یا اللہ! میں شیطان سے بھاگ کر تیری پناہ چاہتا ہوں (اعوذ باللہ کا یہی مطلب ہے) اللہ اس کی سنے گا اور شیطان کی اس چھیڑ سے اس کو محفوظ کر لے گا، ظاہری طور سے بھی دیکھئے کہ جب کسی مسلمان کو دل سے یقین ہو گا کہ غصہ شیطانی حرکت ہے تو اللہ کے نام لینے کے ساتھ وہ اس سے دور ہو جائے گا۔ دو ظاہری

❶ ابو داود، کتاب الادب، باب ما یقال عند الغضب: ٤٧٨٢۔ ❷ ایضًا: ٤٧٨٤۔

❸ ایضًا: ٤٧٨٢۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب: ٦١١٥ ومسلم، باب فضل من یملك نفسه عند الغضب: ٦٦٤٦۔

علاجوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے، مقصود اس سے یہ ہے کہ تبدیل ہیئت سے طبیعت بٹ جائے گی اور غصہ کم ہو جائے گا، دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کر لے، اس سے منشا یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں، چہرہ سرخ ہو جاتا ہے تو پانی پڑنے سے مزاج میں ٹھنڈک آئے گی اور غصہ کی گرمی دور ہو جائے گی۔

بغض وکینہ

دل میں کسی کی دشمنی اور عداوت کا دیر پا جذبہ رکھنا بغض اور کینہ کہلاتا ہے، یہ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس سے پاک رہنے کی دعا مانگا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ہے:

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴾ (۵۹/ الحشر:۱۰)

''اے ہمارے پروردگار! ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے آگے ایمان میں پہنچے، معاف کر اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کا کینہ مت رکھ، اے ہمارے پروردگار! تو نرمی والا مہربان ہے۔''

جنت کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں جو لوگ ہوں گے، آپس میں بھائی بھائی ہوں گے، وہاں بغض وکینہ کا گزر نہ ہوگا، فرمایا:

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴾ (۱۵/ الحجر:۴۷)

''اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا، بھائی بھائی ہو کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے۔''

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ ﴾ (۷/ الاعراف:۴۳)

''اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا، نہریں ان کے نیچے بہتی ہوں گی۔''

ان آیتوں کے اشارے سے معلوم ہوا کہ جب تک بھائیوں میں کینہ رہے گا، جنت کا تختہ ہاتھ نہ آئے گا۔

آنحضرت ﷺ نے ہم کو جو تعلیم دی ہے اس کا یہ منشا ہے کہ ہم کو دنیا ہی میں جنت کی سی زندگی بسر کرنی چاہیے۔ فرمایا:

''اے لوگو! آپس میں ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو اور ایک اللہ کے بندے بن کر آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ، کسی بھائی کے لیے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑ دے۔'' [1]

مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی کسی سبب سے دو بھائیوں میں کوئی ملال کی بات ہو جائے تو اس کو تین دنوں سے زیادہ کوئی اپنے دل میں نہ رکھے، ابوایوب صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑے، دونوں ملیں تو ایک دوسرے سے منہ

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ماینھی عن التحاسد والتدابر:۶۰۶۵؛ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة:۶۵۲۶؛ ابوداود، کتاب الادب، باب فی ھجرة الرجل اخاہ:۴۹۱۰؛ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی الحسد:۱۹۳۵، مالک، کتاب الجامع، باب ماجاء فی المھاجرة: ۱۶۸۴۔

پھیرے اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔'' [1] ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ کسی مومن کو تین دن سے زیادہ چھوڑے، تین دن جب ہو جائیں تو ان میں سے ہر ایک دوسرے سے آ کر ملے، پھر سلام کرے، تو اگر دوسرے نے جواب دیا تو دونوں کو مزدوری ملی اور اگر اس نے جواب نہیں دیا تو وہ (جواب نہ دینے والا) گناہ لے کر لوٹا۔'' [2] کئی حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر دوشنبہ اور پنجشنبہ کو انسان کے اعمال پیش ہوتے ہیں تو جس نے اللہ کے ساتھ شرک نہیں کیا اللہ اس کو معاف فرماتا ہے، لیکن جن دو آدمیوں میں آپس میں کینہ ہوتا ہے، تو اللہ فرماتا ہے کہ ان دونوں کو ابھی رہنے دو میل کر لیں۔'' [3] اس حدیث کی تشریح ایک روایت سے ہوتی ہے، فرمایا: ''دو شنبہ اور جمعرات کو اعمال پیش ہوتے ہیں تو جس نے مغفرت مانگی ہوگی اس کو مغفرت دی جاتی ہے اور جس نے توبہ کی ہوگی اس کی توبہ قبول ہوتی ہے، لیکن کینہ والوں کے اعمال ان کے کینہ کے سبب سے لوٹا دیے جاتے ہیں، جب تک وہ اس سے باز نہ آئیں۔'' [4] یہ بھی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تین شخصوں کی بخشش نہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جو اپنے بھائی سے کینہ رکھتا ہے۔'' [5] ان حدیثوں پر غور کیجئے شرک اور کینہ دونوں کو ایک خاص پہلو سے برابر کا درجہ دیا گیا ہے، دین دو چیزوں سے عبارت ہے، اللہ کا حق اور بندوں کا حق۔ جب تک شرک رہے گا اللہ کا حق ادا نہیں ہوسکتا، اسی طرح جن دو آدمیوں میں کینہ رہے گا ان میں سے کوئی ایک دوسرے کا کوئی حق ادا نہ کر سکے گا، غرض جس طرح شرک، حق اللہ سے مانع ہے، بغض و کینہ حق العباد سے باز رکھتا ہے اور انہیں دونوں حقوق سے عہدہ برآ ہونا جنت کی کنجی ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب السلام للمعرفة وغیر المعرفة:٦٢٣٧؛ مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الهجر فوق ثلاث:٦٥٣٢؛ ترمذی، ایضًا، باب ماجاء فی کراهیة الهجر للمسلم:١٩٣٢؛ ابوداود، کتاب الادب: ٤٩١١؛ موطا مالك: ١٦٨٢۔ [2] ابوداود، ایضًا:٤٩١٣۔ [3] صحیح مسلم. کتاب البر والصلة، باب النهی عن الشحناء: ٦٥٤٤؛ ابوداود: ٤٩١٦؛ ترمذی: ٢٠٢٣؛ ادب المفرد: ٤١١۔

[4] طبرانی فی الاوسط: ٧٤١٩۔ [5] ادب المفرد للبخاری، باب الشحناء:٤١٣۔

ظلم

ظلم کا لفظ قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے، یہاں تک کہ کفر و شرک اور عصیان کے معنوں میں بھی کثرت سے آیا ہے، مگر یہاں مراد اس ظلم سے ہے جو بندے بندوں پر کرتے ہیں، قرآن پاک میں اس کے لیے دو اور لفظ بَغْیٌ (سرکشی) اور عُدْوَانٌ (تعدی) آئے ہیں، یہ ظلم اسلام کی شریعت میں حرام ہے:

﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾

(۷/ الاعراف:۳۳)

''کہہ دے کہ میرے رب نے بے حیائی کے کاموں کو جو کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ اور حق کے بغیر سرکشی کو حرام ٹھہرایا ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا ہے:

﴿ وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ﴾ (۱٦/ النحل:۹۰)

''اور اللہ بے حیائی، ناپسندیدہ کام اور سرکشی سے منع کرتا ہے۔''

ان دونوں آیتوں میں سرکشی سے مراد حد سے آگے بڑھ کر دوسرے کے حقوق پر دست درازی اور ظلم ہے، جس کی روک تھام اگر نہ کی جائے تو وہ پوری قوم اور ملک کے امن و امان کو برباد کر ڈالے، اس کی روک تھام کا پہلا قدم یہ ہے کہ جس پر ظلم کیا جائے، اس کا یہ حق مانا جائے کہ وہ ظالم سے اپنا بدلہ لے سکے، تاکہ لوگ انجام کو سوچ کر ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے بچیں، گو کسی کو تکلیف پہنچانا اچھا نہیں، مگر ظالم کو اس کے ظلم کے بقدر تکلیف پہنچانے کی اجازت اس لیے دی گئی، تاکہ یہ برائی آگے نہ بڑھنے پائے، فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ﴾

(٤٢/ الشوریٰ:۳۹۔٤۰)

''اور جن پر ظلم ہو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا عوض اسی طرح کی برائی ہے۔''

یعنی جیسی برائی کوئی کرے ویسی ہی برائی اس کے ساتھ کی جائے۔

لیکن اگر کوئی مظلوم بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود ظالم کو معاف کر دے، تو مظلوم اپنا انصاف اللہ کے ہاں پائے گا اور ظالم اللہ کی محبت سے محروم رہے گا:

﴿ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ:٤۰)

''پھر جو کوئی معاف کر دے اور سنوارے، تو اس کی مزدوری اللہ کے ذمہ ہے، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔''

لیکن اگر کوئی معاف نہ کرے اور بدلہ ہی لے تو اس کو ملامت نہیں کی جاسکتی۔

﴿ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴾ (۴۲/ الشوری:۴۱)

''اور جو کوئی اپنے ظلم کیے جانے کے بعد بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت کی راہ نہیں۔''

ملامت اس پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرنے میں پہل کرے اور ملک میں ناحق فساد برپا کرے:

﴿ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (۴۲/ الشوری:۴۲)

''راہ ان پر جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق دھوم مچاتے ہیں، ان کے لیے دکھ والی سزا ہے۔''

اگر کوئی کسی کو ظلم سے مار ڈالے تو اس کے ولی کو طلب قصاص کی منصفانہ اجازت دی گئی:

﴿ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآءیل:۳۳)

''اور جو ظلم سے مارا گیا تو اس کے وارث کو ہم نے زور دیا ہے، تو وہ خون کرنے میں زیادتی نہ کرے، بے شبہ اس کو مدد دی جائے۔''

مقصود یہ ہے کہ ظالم قاتل کے خلاف مظلوم مقتول کی مدد کی جائے، تاکہ دنیا میں عدل قائم ہو، لیکن مقتول کے وارثوں کو بھی چاہیے کہ انتقام کے جوش میں حد سے آگے بڑھ کر قاتل کے ساتھ اس کے اور عزیزوں اور دوستوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگیں، ورنہ یہ سلسلہ جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی کبھی ختم نہ ہوگا۔

مظلوم کو اس کی بھی اجازت ملی ہے کہ وہ ظالم کی ظالمانہ کارروائیوں کو علانیہ بیان کرے، اس کے دو فائدے ہیں، ایک تو اس سے اپنی بدنامی کے ڈر سے ظلم کرنے میں کچھ ہچکچائیں گے، دوسرا یہ کہ اس طرح لوگوں کو مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی، فرمایا:

﴿ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَــهْرَ بِالسُّوْۗءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِــيْمًا ﴾

(۴/ النسآء:۱۴۸)

''اور اللہ کو بری بات کا پکارنا پسند نہیں آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو اور اللہ سنتا جانتا ہے۔''

اگر ظالم اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کو اجازت ملی ہے، سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو اللہ کے قانون کے آگے سرنگوں کریں:

﴿ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَي الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْۗءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ﴾

(۴۹/ الحجرات:۹)

''تو اگر ان میں سے ایک دوسرے پر چڑھ آئے تو سب لڑو اس چڑھائی والے سے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم پر پھر آئے۔''

یہ تو مسلمانوں کے آپس کی بات تھی، لیکن اگر فریق مخالف کافر ہوتو بھی اس پر زیادتی نہ کی جائے اور اگر کوئی مسلمان اس حکم کے خلاف کرے تو دوسرے مسلمانوں کو اس کا ساتھ نہیں دینا چاہیے، فرمایا:

﴿ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝﴾

(۵/ المآئدۃ:۲)

''اور کسی قوم کی دشمنی اس لیے کہ وہ تم کو مسجد حرام سے روکتی تھی، اس جرم پر تم کو آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کر بیٹھو اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور تعدی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک وہ سخت سزا والا ہے۔''

اس سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں مظالم کے انسداد کا وہ سب سے بڑا مؤثر حربہ جس کا نام آج کل عدم تعاون اور نان کواپریشن ہے، اسلام نے بہت پہلے پیش کیا ہے اور صاف وصریح حکم دیا ہے کہ گناہ اور ظلم وتعدی کے کاموں میں ظالموں کا ساتھ نہ دیا جائے اور ان کے ظلم کے کاموں میں شریک نہ ہوا جائے، البتہ اس عدم شرکت کی صورتیں زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو فرمایا کہ ''تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم''۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے، مگر ظالم کی مدد کیونکر کی جائے؟ فرمایا: ''اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے۔'' [1] اس طریقہ تعلیم کی جدت پر ایک نظر ڈالیے، ظالم کی مدد کی ترغیب دلا کر سننے والوں کے دلوں میں توجہ کی خلش پیدا کر دی اور جب بظاہر اس عجیب تعلیم کی طرف وہ بدل و جان متوجہ ہو گئے، تو اس کمال التفات سے فائدہ اٹھا کر آپ ﷺ نے یہ تلقین فرمائی کہ ظالم کی مدد کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو ظلم کی برائی سے روکا جائے۔

آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ یہ حدیث قدسی بڑے مؤثر انداز میں سنائی، فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ارشاد فرماتا ہے کہ اے میرے بندو: میں نے اپنے لیے اور تمہارے لیے آپس میں ظلم کو حرام کیا ہے تو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو۔'' [2]

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ظلم سے بچو کہ ظلم قیامت کے دن ظلمات بن جائے گا۔'' [3] ظلمات عربی میں اندھیرے کو کہتے ہیں، ظلم اور ظلمات کا مادہ عربی میں ایک ہی ہے، ہماری زبان میں اسی لفظی رعایت کے ساتھ اس کا ترجمہ یوں ہوسکتا ہے کہ اندھیر نہ کیا کرو، کہ قیامت کے دن یہ اندھیرا ہو

[1] صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب اعن اخاك ظالما أو مظلوما: ۲۴۴۴ و صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب نصر الاخ ظالمًا ومظلومًا: ۶۵۸۲۔ [2] صحیح مسلم، باب تحریم الظلم: ۶۵۷۲ ومسند احمد، ج ۵، ص: ۱۶۰ وادب المفرد بخاری، باب الظلم: ۴۹۰۔ [3] صحیح مسلم، باب تحریم الظلم: ۶۵۷۶ وصحیح بخاری، کتاب المظالم، باب الظلم ظلمات یوم القیامة: ۲۴۴۷۔

جائے گا، یہ ایک طرح کی مثالی سزا ہوگی، انسان اپنی غرض یا غصہ سے اندھا ہو کر دوسروں پر ظلم کر بیٹھتا ہے، یہ اندھا پن قیامت کے ہولناک دن میں اندھیرا بن کر نمودار ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، چاہیے کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے اور نہ اس کو بے مددگار چھوڑ دے۔'' 1 براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا اور سات باتوں سے روکا ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ مظلوم کی مدد کی جائے۔ 2 حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو امیر بنا کر جب آپ ﷺ نے یمن بھیجا، تو ان کو نصیحت فرمائی کہ ''مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا، کیونکہ اس کے اور اللہ کے بیچ میں کوئی پردہ نہیں۔'' 3 حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جس نے اپنے بھائی کی آبرو یا کسی چیز پر ظلم کیا تو اس کو چاہیے کہ آج ہی اس سے پاک ہو لے، اس دن سے پہلے کہ اس کے پاس دینے کو نہ دینار ہوگا نہ درہم، ظلم کے بدلہ ظلم کے برابر مظلوم کو ظالم کی نیکیاں دلوائی جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم پر لاد دی جائیں گی۔'' 4 فرمایا کہ ''ظالم کو اللہ مہلت دیتا ہے، پھر جب اس کو پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں۔'' 5

فرمایا: ''اہل ایمان جب دوزخ سے پاک ہو چکیں گے تو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پل کے پاس روکے جائیں گے، وہاں دنیا میں ایک نے دوسرے پر ظلم کیے تھے، ان کا بدلہ ایک دوسرے کو دلایا جائے گا، جب اس سے بھی پاک ہو جائیں گے تب ان کو بہشت میں جانے کی اجازت ملے گی۔'' 6

---

1 صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه:٢٤٤٢۔ 2 ایضاً، باب نصر المظلوم:٢٤٤٥۔ 3 صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب الاتقاء والحذر من دعوة المظلوم: ٢٤٤٨۔
4 بخاری، کتاب المظالم، باب من کانت له......: ٢٤٤٩۔ 5 صحیح مسلم، باب تحریم الظلم: ٦٥٨١۔
6 صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب قصاص المظالم:٢٤٤٠۔

فخر وغرور

انسان میں جب کوئی وصف یا کمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں اس کا خیال پیدا ہوتا ہے اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہیں، لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ اور لوگوں کو جن میں یہ وصف نہیں پایا جاتا ہے، یا کم پایا جاتا ہے، اپنے سے حقیر سمجھنے لگتا ہے تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو تکبر کہتے ہیں، دنیا میں سب سے پہلے اس بد اخلاقی کا ظہور شیطان سے ہوا، اس نے آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنے کو بالاتر سمجھا اور پکارا:

﴿ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۲)

''میں اس سے بہتر ہوں۔''

وہ مٹی سے بنا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں، اللہ تعالیٰ نے اس کی اس شیخی پر اس کو مردود قرار دیا اور فرمایا:

﴿ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝ ﴾

(۷/ الاعراف:۱۳)

''یہاں سے اتر جا، یہاں تجھے غرور کرنا زیبا نہیں، نکل جا تجھے بڑائی کے بدلہ یہاں ذلت کی چھوٹائی ملی۔''

کبر وغرور ایک اضافی اور نسبی چیز ہے، جس کے لیے محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہیں، بلکہ اس تخیل کے ساتھ دوسرے لوگوں کی تحقیر بھی ضروری ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک خوش جمال شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں ایک حسین شخص ہوں اور حسن مجھے نہایت محبوب ہے، میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی کو مجھ پر حسن میں تفوق حاصل ہو تو کیا یہ تکبر ہے؟ فرمایا: ''نہیں تکبر یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کیا جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے۔'' [1]

تکبر کی اسی اضافی حیثیت نے اس کو مذہبی، اخلاقی، معاشرتی بد اخلاقیوں کا سرچشمہ بنا دیا۔ پیغمبروں کی مزاحمت صرف وہی لوگ کرتے ہیں، جو اپنے آپ کو اور لوگوں سے بڑا سمجھتے ہیں، اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اور غریب اور عام لوگ پیغمبروں کی ہدایت کو قبول کر لیتے:

﴿ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ ﴾ (۱٤/ ابراهيم:۲۱)

''اور (قیامت کے دن) سب لوگ اللہ کے روبرو نکل کر کھڑے ہوں گے تو (جو لوگ دنیا

---

[1] ابوداود، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الکبر:۴۰۹۲۔

میں) کمزور (تھے اس وقت) ان لوگوں سے جو بڑی عزت رکھتے تھے، کہیں گے کہ ہم تو تمہارے قدم بقدم چلنے والے تھے، تو کیا (آج) تم عذاب اللہ میں سے کچھ (تھوڑا سا) ہم پر سے ہٹا سکتے ہو۔"

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو بڑی بڑی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے اعیان دولت کے پاس بھیجا، لیکن انھوں نے اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کے قبول کرنے سے اس لیے انکار کیا کہ وہ اپنے آپ کو سب سے بالاتر سمجھتے تھے:

﴿ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:٤٦)

"تو وہ سب شیخی میں آ گئے اور وہ تھے (بھی) سرکش لوگ۔"

اسی تکبر کی بنا پر وہ اپنے ہی جیسے آدمی کی جو عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہو، اطاعت کرنا پسند نہیں کرتے تھے، ان کو اس سے ننگ و عار تھا کہ جس حلقے میں عام لوگ شامل ہو گئے ہیں، اس میں وہ بھی شامل ہو جائیں:

﴿ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝ ﴾

(۱۱/ ھود:۲۷)

"اس پر ان کی قوم کے سردار جو (ان کو) نہیں مانتے تھے، لگے کہنے کہ تم تو ہمارے ہی جیسے بشر دکھائی دیتے ہو اور ہمارے نزدیک صرف وہی لوگ تمہارے پیرو ہو گئے ہیں جو ہم میں رذالے ہیں، (اور پیرو ہو بھی گئے ہیں تو بے سوچے سمجھے) سرسری نظر سے اور ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے، بلکہ ہم تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔"

غرض پیغمبروں کی دعوت کے قبول کرنے سے صرف ان ہی لوگوں کو انکار تھا جو اپنے آپ کو مذہبی، قومی، سیاسی یا اور کسی وجہ سے لوگوں سے یا خود پیغمبروں سے بڑا سمجھتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نہایت شدت سے ان لوگوں کی برائی بیان کی ہے اور مختلف الفاظ میں بیان کی ہے، تاکہ کبر و غرور کے تمام مدارج پیش نظر ہو جائیں، عام لفظ تو استکبار اور اس کے مشتقات ہیں، بعض جگہ اس کو عزت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے:

﴿ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ۝ ﴾ (۳۸/ صٓ:۲)

"لیکن جو لوگ منکر ہیں (ناحق کی) ہیکڑی اور مخالفت میں (پڑے) ہیں۔"

بعض جگہ اس سے بھی زیادہ قوی لفظ جبار اختیار کیا ہے:

﴿ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝ ﴾ (٤٠/ المؤمن:۳۵)

''جتنے مغرور اور سرکش ہیں، اللہ ان کے دلوں پر اسی طرح مہر لگا دیتا ہے۔''

دو موقعوں پر اس کے لیے مختال کا لفظ آیا ہے، یہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کو گھمنڈ ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے مغرور اور فخار میری محبت کی عزت سے محروم ہیں:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:٣٦)

''اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جو مغرور اور فخار ہو۔''

﴿ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ۝ ﴾ (١٦/ النحل:٢٣)

''اللہ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

ان کو جہنم کی خوش خبری بھی یہیں دے دی گئی ہے:

﴿ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ ﴾ (٣٩/ الزمر:٦٠)

''کیا جہنم میں مغروروں کا ٹھکانا نہیں۔''

﴿ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ ﴾ (٣٩/ الزمر:٧٢)

''تو دوزخ مغروروں کا ٹھکانا ہے۔''

مغروروں کے ساتھ یہ سختی اسی لیے ہے کہ ان کا یہ غرور ان کو حق کے قبول سے باز رکھتا ہے۔

اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے کبر وغرور کے جو ثمرات ظاہر ہوتے ہیں، ان کا کوئی شمار ہی نہیں کیا جا سکتا، مثلاً: ایک متکبر شخص عام لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، بات چیت کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں، بلکہ بہت سے لوگوں کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ان کو یہ شرف حاصل ہو، جب لوگوں سے ملتا ہے تو چاہتا ہے کہ لوگ اس کو پہلے سلام کریں، راستے میں لوگوں سے آگے چلنا چاہتا ہے، مجلسوں میں صدر بننے کی کوشش کرتا ہے، غرض اس کے ثمرات و نتائج ہزاروں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی غرور ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔'' [1] اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کا یہ فلسفہ بیان کیا ہے کہ ''مسلمانوں کے جو مخصوص اخلاق ہیں، وہی جنت کا دروازہ ہیں اور غرور ان تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے، اس لیے جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا''۔ یعنی دنیا کی طرح آخرت میں بھی مسلمانوں سے الگ تھلگ رہے گا۔ یہ بداخلاقی چونکہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں میں پائی جاتی ہے اور اس کے نتائج گوناگوں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اس لیے ان سب کا استقصا تو مشکل تھا، البتہ شریعت نے اس کے بعض نتائج ظاہر کر دیے ہیں، مثلاً: کبر وغرور کے جو مظاہر امرا و سلاطین سے تعلق رکھتے

[1] ابوداود، كتاب اللباس، باب ماجاء فی الكبر:٤٠٩١۔

ہیں، ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے سامنے لوگ کھڑے رہیں، اس کو اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالینا چاہیے“۔ ایک بار آپ ﷺ خود عصا ٹیکے ہوئے نکلے تو صحابہ کرام تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے، فرمایا کہ ”عجمیوں کی طرح تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہوا کرو۔“ [1] بڑے آداب والقاب کا اپنے ناموں کے ساتھ اضافہ کرنا، اگر وہ خلاف واقعہ ہوں تو جھوٹ ہے اور اگر واقعہ کے مطابق ہوں تو فخر و غرور کا ذریعہ ہیں، عجمی بادشاہ اپنے آپ کو فخر یہ ملک الملوک اور شہنشاہ کہلاتے تھے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”سب سے برا نام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی اپنے کو ملک الملوک اور شہنشاہ کہلائے۔“ [2]

کبر و غرور کی چند عام اور بدنما صورتوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے، مثلاً:

﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ﴾

(۱۷/ بنی اسرآئیل: ۳۷)

”اور زمین میں اکڑ کر نہ چلا کر کیونکہ (اس دھمکے کے ساتھ چلنے سے) تو زمین کو تو پھاڑ نہیں سکے گا اور نہ (تن کر چلنے سے) پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکے گا۔“

﴿ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴾

(۳۱/ لقمان: ۱۸)

”اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین میں اترا کر نہ چل، بے شک اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جس کو گھمنڈ ہو، فخار ہو۔“

گناہگار کی شان یہ بیان کی ہے:

﴿ ثَانِيَ عِطْفِهِ ﴾ (۲۲/ الحج: ۹)

”اینٹھتا ہوا۔“

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خُيَلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللّٰهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) [3]

”جو شخص غرور سے اپنے کپڑے گھسیٹے گا، اللہ اس کی طرف قیامت کے دن نہ دیکھے گا۔“

ایک حدیث میں ہے کہ ”گزشتہ لوگوں میں ایک شخص ایک جوڑا پہن کر اتراتا ہوا نکلا تو اللہ نے زمین کو حکم دیا، جس نے اس کو پکڑ لیا اور اب وہ قیامت تک اس میں دھنسا چلا جا رہا ہے۔“ [4] اس کے برعکس بہت سے افعال ہیں جو تواضع و خاکساری پر دلالت کرتے ہیں اور ان ہی کو اللہ نے اپنی خاص عبودیت کی علامت

---

[1] ابوداود، کتاب الادب، باب الرجل یقوم للرجل: ۵۲۳۰۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الادب: ۶۲۰۵، ۶۲۰۶۔ [3] ابوداود، کتاب اللباس، باب ماجاء فی اسبال الازار: ۴۰۸۵۔

[4] ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ، باب ماجاء فی شدۃ الوعید للمتکبرین: ۲۴۹۱۔

قرار دیا ہے:

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ ﴾

(۲۵/ الفرقان:۶۳)

''اور (خدائے) رحمٰن کے (خاص) بندے تو وہ ہیں، جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں اور جب جاہل ان سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو (ان کو) سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)۔''

رسول اللہ ﷺ دوزانو بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے، ایک بدو بھی اس وقت موجود تھا، اس نے کہا، بیٹھنے کا یہ کیا طریقہ ہے؟ فرمایا: ''اللہ نے مجھ کو شریف بندہ بنایا ہے، متکبر اور سرکش نہیں بنایا ہے''۔ [1]

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے جن کو لوگ مغرور سمجھتے تھے، اسی قسم کے افعال سے اپنے کبر و غرور کی تردید کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں مغرور ہوں، حالانکہ میں گدھے پر سوار ہوتا ہوں، کمبل اوڑھتا ہوں اور بکری کا دودھ دوہتا ہوں اور رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا ہے کہ ''جو شخص یہ سب کام کرتا ہے اس میں غرور نہیں پایا جاتا۔'' [2]

کبر و غرور کے اسباب بہت سے ہیں، لیکن عام طور پر دنیادار لوگ جن چیزوں پر غرور کرتے ہیں، وہ یہ ہیں، حسب و نسب، حسن و جمال، مال و دولت، قوت اور اعوان و انصار کی کثرت، اسلام نے ان میں سے ہر ایک سبب کی نسبت اپنی قطعی رائے ظاہر کر دی اور بتا دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز فخر و غرور کا ذریعہ نہیں۔

عربوں کے فخر و غرور کا سب سے بڑا ذریعہ حسب و نسب کی برتری کا خیال تھا، اس کو یہ کہہ کر مٹا دیا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ ﴾

(۴۹/ الحجرات:۱۳)

''لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد (آدم) اور ایک عورت (حوا) سے پیدا کیا اور (پھر) تمہاری ذاتیں اور برادریاں ٹھہرائیں، تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو۔''

اس کے بعد بتایا کہ شرافت و عظمت کی بنیاد نسب و حسب پر نہیں، بلکہ روحانی فضائل پر ہے:

﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۚ ﴾ (۴۹/ الحجرات:۱۳)

''اللہ کے نزدیک تم میں بڑا اشریف وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے۔''

اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی مزید تشریح کی اور فرمایا کہ ''خداوند تعالیٰ نے تمہارے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا کے اوپر فخر کرنے کے طریقہ کو مٹا دیا، اب صرف دو قسم کے آدمی ہیں، مومن پرہیزگار اور بدکار بدبخت، تم لوگ آدم کے بچے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے، لوگ ایسے لوگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں، جو جہنم کا

[1] ابن ماجه، كتاب الاطعمة، باب الاكل متكئا:٣٢٦٣۔

[2] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الكبر:٢٠٠١۔

کوئلہ ہیں یا اللہ کے نزدیک اس گبریلے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں جو اپنے منہ سے نجاست کو گھسیٹا چلتا ہے۔'' ❶

جہاں تک زیب وزینت اور جسم کی ظاہری آرائش اور پاکیزگی کا تعلق ہے، حسن و جمال کو ایک قابل قدر چیز قرار دیا، چنانچہ ایک خوبرو شخص نے جب آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ مجھ کو یہ پسند ہے کہ میرا کپڑا اور جوتا عمدہ ہو، تو فرمایا کہ ''اللہ حسن کو پسند کرتا ہے۔'' ❷ یعنی اس کا نام غرور نہیں، البتہ جن صورتوں میں حسن و جمال، غرور وتکبر کے اظہار کا ذریعہ بن جاتا ہے، شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے، چنانچہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے چند اخلاقی نصیحتیں کیں جن میں ایک نصیحت یہ تھی کہ ''تہبند کو بہت نیچے نہ لٹکاؤ کیونکہ یہ غرور کی ایک قسم ہے اور اللہ غرور کو نہیں پسند کرتا۔'' ❸ تمدنی اور اجتماعی ضروریات کے لحاظ سے مال و دولت کی اہمیت کو قائم رکھا اور اسی لحاظ سے اس کی تعبیر قوام اور خیر کے لفظ سے کی۔ مال و دولت کے ضائع کرنے کی ممانعت فرمائی اور اس کے تحفظ کو اس قدر ضروری قرار دیا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل کیا جائے، اس کو شہید کا لقب عنایت کیا، لیکن اسی کے ساتھ اگر اس کو فخر وغرور کا ذریعہ بنا لیا جائے تو اس کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ نہیں:

﴿ اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ ﴾

(۵۷/ الحدید: ۲۰)

''(لوگو!) جانے رہو کہ دنیا کی زندگی کھیل اور تماشا اور ظاہری زینت اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور ایک دوسرے سے بڑھ کر مال اور اولاد کا خواستگار رہنا، (بس یہی کچھ ہے)۔''

احادیث میں مال و دولت کی برائی جن اسباب کی بنا پر بیان کی گئی ہے، ان میں ایک سبب یہ ہے کہ وہ فخر وغرور اور باہمی مسابقت کا ذریعہ بن جاتا ہے، حالانکہ اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اس سے اپنی اور دوسروں کی ضروریات پوری کی جائیں، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم کو مال و دولت کی طلب میں باہمی مسابقت نے غافل کر دیا۔ آدم کا بچہ کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال، حالانکہ تیرا مال صرف وہی ہے، جس کو تو نے صدقہ میں دے ڈالا، کھا پی ڈالا اور پہن کر پھاڑ ڈالا۔'' ❹ قوت ایک ایسی چیز ہے، جس کے ذریعہ سے ہر قسم کے تمدنی، مذہبی اور سیاسی کام انجام دیے جا سکتے ہیں، اس لیے اس قسم کے موقعوں پر ایک قابلِ ستائش وصف ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ''قوی امین'' کہا ہے اور حضرت لوط علیہ السلام نے ایک موقع پر یہ حسرت ظاہر کی ہے:

---

❶ ابو داود، کتاب الادب، باب فی التفاخر بالاحساب: ۵۱۱۶۔
❷ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الکبر: ۱۹۹۹۔
❸ ابو داود، کتاب اللباس، باب ماجاء فی اسبال الازار: ۴۰۸۴۔
❹ ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة الھاکم التکاثر: ۳۳۵۴۔

﴿قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ﴾ (۱۱/ هود:۸۰)

''(لوط) بولے کہ اے کاش (آج) مجھ کو تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ جاتا۔''

اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں تمام بنی نوع انسان پر اپنا یہ احسان جتایا ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً﴾ (۳۰/ الروم:۵٤)

''اللہ (ہی) وہ (قادر مطلق) ہے، جس نے تم لوگوں کو کمزور حالت سے (جو ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے، بنا کھڑا کیا، پھر (بچپن کی) کمزوری کے بعد (جوانی کی) توانائی دی۔''

اور مسلمانوں کو طاقتور بننے اور سامان جنگ سے آراستہ رہنے کا حکم دیا ہے:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ﴾ (۸/ الانفال:۶۰)

''اور (مسلمانو!) سپاہیانہ قوت سے اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے جہاں تک تم سے ہو سکے، کافروں کے (مقابلہ کے) لیے ساز و سامان مہیا کیے رہو کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے اور (نیز) ان کے سوا دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے (اور) اللہ ان (کے حال) سے (خوب) واقف ہے۔''

قرآن مجید کے ساتھ احادیث سے بھی قوت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ''طاقتور مسلمان اللہ کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب ہے۔'' [1] اگرچہ متعدد حدیثوں میں ضعف کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے، تاہم غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ ضعف کی فضیلت نہیں، بلکہ تواضع و خاکساری کی فضیلت ہے، جو ایک قابل ستائش وصف ہے۔ اسی بنا پر بعض حدیثوں میں ضعف کا مقابلہ کبر و غرور کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

((الا اخبركم باهل الجنة كل ضعيف متضعف الا اخبركم باهل النار كل عتل، جواظ متكبر)) [2]

''کیا میں تم کو بتاؤں کہ جنتی کون ہے؟ ہر وہ شخص جو کمزور ہو اور لوگ اس کو کمزور سمجھیں، کیا میں تم کو بتاؤں کہ دوزخی کون ہے؟ ہر اکھڑ، بدخو اور مغرور شخص۔''

دوسری حدیث میں ہے:

((احتجت النار والجنة فقالت هذه يد خلني الجبارون المتكبرون وقالت

---

[1] مسلم، كتاب القدر، باب الايمان بالقدر و الاذعان له:٦٧٧٤۔

[2] بخاري، كتاب الادب، باب الكبر:٦٠٧١۔

هذه يد خلني الضعفاء و المساكين)) ❶

''دوزخ اور جنت نے باہم مباحثہ کیا، دوزخ نے کہا: مجھ میں جبار اور متکبر لوگ داخل ہوئے اور جنت نے کہا کہ مجھ میں کمزور اور مسکین لوگ۔''

ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ضعف بجائے خود قابل مدح وصف نہیں ہے، بلکہ اس کو صرف اس لیے فضیلت حاصل ہے کہ وہ تواضع وخاکساری اور اس قسم کے دوسرے اوصاف کا مظہر ہے۔

اعوان وانصار کی کثرت ہمیشہ سے انسان کے لیے ایک مابہ الامتیاز چیز رہی ہے، بالخصوص غیر متمدن قومیں ہمیشہ کثرتِ مال اور کثرتِ اولاد پر فخر وغرور کرتی ہیں اور اس فخر وغرور کے نشہ میں دوسروں کو حقیر سمجھتی ہیں، بلکہ اللہ کو بھلا دیتی ہیں، زمانہ سابق میں اسی قسم کا ایک شخص تھا، جس کو اپنی دولت اور اعوان وانصار کی کثرت پر بڑا ناز تھا اور اس کا خیال تھا کہ یہ تمام چیزیں ہمیشہ قائم رہیں گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی اور اگر آئی بھی تو قیامت میں بھی اس کی یہی شان قائم رہے گی، وہ اس حیثیت سے ایک دوسرے شخص کو حقیر سمجھ کر کہتا ہے:

﴿ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ۝ ﴾ (۱۸/ الکھف: ۳٤)

''میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور (میرا) جتھا (بھی) بڑا زبردست (جتھا) ہے۔''

دوسرا شخص نصیحت آمیز الفاظ میں کہتا ہے کہ ایک حقیر انسان کے لیے اس قدر کبر وغرور جائز نہیں:

﴿ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ۝ ﴾ (۱۸/ الکھف: ۳۷)

''کیا تو اس (پروردگار) کا منکر ہے، جس نے تجھ کو (پہلے) مٹی سے پھر نطفے سے پیدا کیا پھر تجھ کو پورا آدمی بنایا۔''

نتیجہ یہ ہوا کہ عذاب الٰہی نے اس کی دولت کو ملیامیٹ کر دیا اور اس کا جتھا ٹوٹ گیا اور اس کو معلوم ہو گیا کہ ایسی ناپائیدار چیز فخر وغرور کے قابل نہیں، اہلِ عرب کو بھی اس پر بڑا ناز تھا اور وہ قبیلہ کی کثرت پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے اور زندوں سے گزر کر مردوں کی ذات پر بھی فخر کرتے تھے، اس فخر وغرور میں باہم مقابلہ ہوتا تھا اور اس مقابلہ کے لیے ایک خاص لفظ ''تکاثر'' ایجاد ہو گیا تھا، جس نے ان کو دینی امور سے غافل وبے پروا کر دیا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص سورہ میں انسان کو خطاب کر کے اس پر سرزنش کی:

﴿ اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ ﴾ (۱۰۲/ التکاثر: ۱۔۲)

''تم کو مال اور اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے پر بڑھ جانے کی کوشش نے غافل بنا دیا ہے، یہاں تک کہ تم قبروں سے جا ملتے ہو۔''

لیکن اسی کے ساتھ اسلام میں یہ چیز بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں، بلکہ اجتماعی وتمدنی حیثیت

❶ مسلم، کتاب صفات المنافقين واحكامهم، باب النار يدخلها الجبارون: ۷۱۷۲۔

سے نسلی ترقی ایک قابل فخر چیز ہے، بشرطیکہ فخر وغرور کے بجائے اس سے حق کی نصرت کا کام لیا جائے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

((تزوجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الامم)) [1]

''محبت کیش اور بچے جننے والی عورت سے نکاح کرو، کیونکہ کثرت تعداد میں، میں تم پر دوسری قوموں کے مقابل میں فخر کروں گا۔''

آج تعداد کی اسی اقلیت واکثریت کے مسئلہ نے قوموں اور ملکوں کی سیاست کا رخ بدل دیا ہے اور اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہ تھا۔

[1] ابوداود، کتاب النکاح، باب النهی عن تزویج من لم یلد.....: ۲۰۵۰۔

ریا

ریا کے لغوی معنی دکھاوا اور نمائش کے ہیں، انسانی اعمال کی اصل حقیقت ان کی نیت اور غرض پر مبنی ہے، اس لیے اعمال کی راستی و ناراستی اور اچھائی اور برائی کا بہت کچھ مدار غرض و نیت پر ہے، صحیح حدیثوں میں ہے کہ

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)) [1] ''عمل نیت سے ہے۔''

اور ریا اسی نیت یعنی اعمال کی غرض و غایت ہی کی بنیاد کو کھوکھلی کر دیتی ہے، جس سے ساری عمارت ہی بودی اور کمزور ہو جاتی ہے۔ نمائش کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی اچھائی برائی کا اظہار کر کے لوگوں میں اپنی نسبت حسن ظن پیدا کرے اور اپنے کو بڑا کر کے دکھائے، غرور بھی اسی شوق کا جذبہ ہے، کیونکہ اس کا منشا بھی اپنے نفس کی بڑائی اور دکھاوے کے سوا کچھ اور نہیں، اسی لیے قرآن نے ان دونوں کو ایک ساتھ جگہ دی ہے اور ان کی برائی بیان کی ہے، جہاد میں مسلمانوں کو حکم ہوا ہے کہ محض اپنی طاقت کا غرور اور اپنی قوت کی نمائش تمہاری لڑائی کا مقصد نہ ہو، بلکہ حق کی حمایت اور اللہ کی بات کو اونچا کرنا تمہارا مقصد ہو، فرمایا:

﴿ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ ﴾ (۸/ الانفال:۴۷)

''اور ان (کافروں) جیسے نہ بنو، جو مارے شیخی کے اور لوگوں کے دکھانے کے لیے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔''

یہ ریا اور نمائش انسان کے ہر اس عمل میں ظاہر ہوتی ہے، جو خالصۃً لوجہ اللہ نہ کیا جائے، بلکہ اس سے کوئی اور دنیوی غرض مطلوب ہو۔ اسی بنا پر اسلام نے ریا کا نام شرکِ خفی اور شرکِ اصغر رکھا ہے، کیونکہ دنیوی غرض کی آمیزش سے ان اعمال میں اللہ کے ساتھ ایک اور چیز کو شریک کر لیا جاتا ہے، اسی لیے اللہ فرماتا ہے:

﴿ أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۴۳)

''کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا الٰہ بنا لیا ہے۔''

ایک حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرک سے بے نیاز ہوں، تو جو شخص میرے لیے کوئی ایسا عمل کرے جس میں کسی اور کو بھی شریک کرے تو مجھ کو اس سے کوئی تعلق نہیں، وہ اسی کے لیے ہے، جس کو اس میں شریک کر لیا گیا ہے۔'' [2]

ایک صحابی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ''قیامت کے دن جب اللہ اگلوں اور پچھلوں کو جمع کرے گا تو ایک منادی پکارے گا کہ جس شخص نے اپنے اس عمل میں جو اللہ کے لیے کیا گیا ہے کسی اور کو شریک کر لیا ہے، وہ اس کا ثواب اسی سے طلب کرے، کیونکہ اللہ شرک سے بے نیاز ہے۔'' [3]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، کیف کان بدء الوحی:۱، ۵۴۔

[2] سنن ابن ماجه، ابواب الزهد، باب الریا والسمعة:۴۲۰۲۔ [3] ایضًا:۴۲۰۳۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''مجھ کو اپنی امت کی نسبت شرک کا سب سے زیادہ خوف ہے، لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ وہ چاند، سورج اور بتوں کی پرستش کرنے لگیں گے، بلکہ اللہ کے علاوہ اور لوگوں کے لیے یا کسی مخفی خواہش سے عمل کرے گی۔'' [1]

اسلام کے لغت میں کفر کے بعد برائی میں نفاق کا درجہ ہے، نفاق کیا ہے؟ نفاق یہ ہے کہ دل میں کچھ ہو اور زبان سے کچھ کہا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفاق والے کے ایمان اور عملِ خیر کی حقیقت ریا اور نمائش کے سوا کچھ نہیں رہ جاتی ہے، وہ دل سے اللہ کا منکر ہوتا ہے، لیکن خوف وخطر یا دوسرے دنیوی فائدوں کے لیے ظاہری طور پر مذہبی اعمال بجالاتا ہے، اس لیے قدرتی طور پر ان اعمال میں ریاکاری پائی جاتی ہے، اس بنا پر قرآن مجید میں جا بجا اس حیثیت سے منافقین کی برائی بیان کی گئی ہے:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲٦٤)

''مسلمانو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور (سائل کو) طعن دے کر اس شخص کی طرح اکارت مت کرو، جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت کا یقین نہیں رکھتا۔''

منافقوں کے ریاکارانہ اعمال کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ ان کا مقصد ایک جماعت میں شامل رہنے کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا، دوسرے یہ کہ ان کے ذریعہ سے لوگوں پر اثر ڈالنا اور ان کو اپنی طرف مائل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ پہلا مقصد چونکہ اعمال کے سرسری طور پر ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے، اس لیے وہ نہایت بے پروائی، غفلت اور کاہلی کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں، اس کے برعکس دوسرے مقصد کے حاصل کرنے کے لیے مصنوعی خشوع وخضوع، للّٰہیت اور محویت واستغراق کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔

عہدِ رسالت میں منافقین کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ وہ ظاہری طور پر مسلمانوں کی جماعت میں شامل رہیں، اس لیے وہ اسلام کی روزانہ عبادت یعنی نماز کو سرسری طور پر نہایت بے پروائی کے ساتھ ادا کرتے تھے، تاکہ لوگ اس ظاہری نمائش سے ان کو مسلمان سمجھتے رہیں، اسی لیے ایسے شخص کے عمل میں للّٰہیت اور خلوص نہیں پیدا ہو سکتا:

﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:١٤٢)

''منافق، (مسلمانوں کو دھوکا دے کر گویا) اللہ کو دھوکا دیتے ہیں، حالانکہ (حقیقت میں) اللہ

[1] سنن ابن ماجه، ابواب الزهد، باب الرياء والسمعة: ٤٢٠٥۔

ان ہی کو دھوکے میں رکھتا ہے اور (یہ لوگ) جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو الکساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں، (ظاہرداری کر کے) لوگوں کو دکھاتے ہیں اور (دل سے) اللہ کو یاد نہیں کرتے، مگر کچھ یوں ہی سا۔''

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝ ﴾

(۱۰۷/ الماعون:۴۔۶)

''تو ان (منافق) نمازیوں کی (بڑی) تباہی ہے، جو اپنی نماز کی طرف سے غفلت کرتے ہیں اور جو (کوئی نیک عمل کرتے بھی ہیں تو) ریا کرتے ہیں۔''

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک بار صحابہ رضی اللہ عنہم مسیح دجال کا ذکر کررہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ آ نکلے اور فرمایا: ''کیا میں تم کو وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لیے مسیح دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے؟'' صحابہ نے کہا، ہاں۔ فرمایا: ''شرک خفی اور یہ کہ آدمی نماز کے لیے کھڑا ہو اور اس کو زیب وزینت کے ساتھ ادا کرے، اس لیے کہ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کو دوسرا شخص دیکھتا ہے۔'' [1]

چونکہ ریا اور نمائش اعمال کی اصلی شکل وصورت ہی کو بگاڑنا چاہتی ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے اس کے ایک ایک ریشہ کی بیخ کنی ضروری سمجھی اور اپنی امت کو اس کی ہر گھات سے آگاہ فرمایا، چنانچہ انسان کی عام فطرت اور عرب کی مخصوص اخلاقی حالت کے لحاظ سے ریا کاری کی جو صورتیں پیدا ہوسکتی تھیں، رسول اللہ ﷺ نے ان سب کی ممانعت فرمائی، مثلاً: ان میں پہلی چیز تو دادودہش ہے، جو عام طور پر نیک نامی، شہرت اور عزت کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے، بالخصوص عرب کے فضائل اخلاق میں نہایت نمایاں حیثیت رکھتی تھی اور لوگ محض نام و نمود کے لیے اپنا کل سرمایہ لٹا دیتے تھے، اسلام نے صدقہ وخیرات کا حکم دیا تو اس بداخلاقی کے ظاہر ہونے کا بھی خطرہ پیدا ہوا، اس لیے قرآن وحدیث میں باقاعدہ زکوٰۃ کو چھوڑ کر عام صدقہ وخیرات مخفی طور پر کرنے کی فضیلت بیان کی گئی، تاکہ اس میں ریا کاری کی آمیزش نہ ہونے پائے:

﴿ إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۖ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۷۱)

''لوگو! اگر خیرات ظاہر میں دو تو وہ بھی اچھا (کہ اس سے خیرات کے علاوہ دوسروں کو بھی ترغیب ہوتی ہے) اور اگر اس کو چھپاؤ اور حاجت مند کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے (کہ اس میں نام ونمود کا دخل نہیں ہونے پاتا)۔''

ایک حدیث میں ہے کہ ''قیامت کے دن جب کہ اللہ کے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا، اللہ سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا، جن میں ایک شخص وہ ہوگا جس نے صدقہ اس طرح چھپا کر دیا کہ اس کے

[1] ابن ماجه، ابواب الزهد، باب الرياء والسمعة:٤٢٠٤۔

بائیں ہاتھ کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس نے داہنے ہاتھ سے کیا دیا۔'' ❶

عرب کے محاسنِ اخلاق میں سب سے زیادہ نام ونمود کی جو چیز تھی وہ شجاعت تھی اور اسلام نے جہاد کو فرض کر کے مسلمانوں کے لیے اظہارِ شجاعت کا بہترین موقع دیا تھا، اس کے علاوہ جہاد کے ذریعہ سے اور بھی بہت سے ذاتی اور دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں، اس لیے وہ ریاکاری کی نمائش گاہ بن سکتا تھا، لیکن اسلام نے جہاد کو ان تمام اغراض سے پاک کر کے مسلمانوں کو اس کی اصلی حقیقت بتائی۔ چنانچہ ایک بدو نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ایک شخص مالِ غنیمت کے لیے، ایک شخص دولت کے لیے اور ایک شخص اظہار شجاعت کے لیے لڑتا ہے، تو ان میں کس کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے، فرمایا: ''اس شخص کا جو اس لیے لڑتا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔'' ❷

آپ ﷺ سے سوال کیا جاتا ہے کہ ایک شخص اظہار شجاعت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص قومی حمیت سے اور ایک شخص ریا سے جہاد کرتا ہے، تو کس کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے، وہی پہلا جواب ملا۔ ❸

ریاکاری کا ایک بڑا مظہر علمی فضیلت ہے اور یہ فضیلت خاص طور پر اسلام نے پیدا کی تھی، اس لیے اس میں ریاکاری کی جو آمیزش ہو سکتی تھی، اس کے نتائج بد رسول اللہ ﷺ نے نہایت مؤثر طریقے سے بتائے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ''سب سے پہلے قیامت کے دن اس شخص کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا جس نے شہادت حاصل کی، یہ شخص اللہ کے سامنے لایا جائے گا اور اللہ اس پر اپنے احسانات جتا کر پوچھے گا کہ تم نے ان سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا کہ میں تیری راہ میں لڑا اور شہید ہوا، اللہ کہے گا کہ جھوٹ کہتے ہو، تم صرف اس لیے لڑے کہ تم کو بہادر کہا جائے، اس کے بعد اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، پھر وہ شخص لایا جائے گا جس نے علم حاصل کیا، لوگوں کو علم سکھایا اور قرآن پڑھا۔ اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا اور وہ جواب میں کہے گا کہ میں نے علم سیکھا، علم سکھایا اور تیرے لیے قرآن پڑھا، ارشاد ہوگا کہ جھوٹ کہتے ہو، تم نے علم اس لیے حاصل کیا کہ عالم کہے جاؤ، قرآن اس لیے پڑھا کہ قاری کہے جاؤ، پھر اسی طرح وہ گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، اس کے بعد ایک دولت مند شخص لایا جائے گا اور اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا، وہ کہے گا کہ مال خرچ کرنے کے جو طریقے تجھ کو پسند تھے، میں نے سب میں اپنا مال صرف کیا، ارشاد ہوگا جھوٹ بکتے ہو، تم نے یہ سب صرف اس لیے کیا کہ لوگ تم کو فیاض کہیں، پھر اسی طرح اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ ❹

---

❶ بخاری، كتاب الزكوٰة، باب الصدقة باليمين: ۱٤۲۳۔

❷ مسلم، كتاب الامارة، باب من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله: ٤٩١٩۔

❸ ایضًا: ٤٩٢٠۔ ❹ ایضًا، باب من قاتل للرياء والسمعة...... : ٤٩٢٣۔

خود بینی اور خودنمائی

خود بینی، خودنمائی اور خودرائی اپنے نفس سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ ہے، اس میں اور کبر میں یہ فرق ہے کہ کبر ایک اضافی چیز ہے، یعنی متکبر آدمی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتا ہے، لیکن خود بینی کے لیے تنہا انسان کی ذات کافی ہے، یہاں تک کہ اگر ایک انسان تنہا پیدا ہو تب بھی وہ اپنے اوصاف کمالیہ پر غلط ناز کر سکتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کو اپنے اندر جو کمالات اور خوبیاں نظر آتی ہیں، وہ ان پر کبھی ایسا فریفتہ ہو جاتا ہے کہ اپنے سوا ہر چیز اس کو پست اور حقیر معلوم ہوتی ہے اور یہ تمام کمالات اور خوبیاں اس کو ایسی معلوم ہوتی ہیں، گویا وہ خود اس کی اختیاری ہیں اور اسی کی اپنی پیدا کی ہوئی ہیں، اسی کا نام عجب اور خود بینی ہے، اسی سے نفس میں خودنمائی اور خودرائی پیدا ہوتی ہے اور اکثر حالتوں میں وہ کبر و غرور کا سبب بن جاتی ہے۔

حنین کی لڑائی میں مسلمانوں کی تعداد کافروں سے زیادہ تھی، یہ دیکھ کر مسلمانوں میں عجب پیدا ہوا کہ اب کون ہمارا مقابلہ کر سکتا ہے؟ اللہ کو ان کی یہ شان پسند نہ آئی، فوراً شکست کا اثر دکھائی دینے لگا، اب مسلمانوں کا یہ عجب دور ہوا، تب نصرت الٰہی نے ان کے پاؤں تھام لیے اور شکست فتح سے بدل گئی، اللہ نے فرمایا:

﴿ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا ﴾ (۹/ التوبۃ:۲۵)

''اور حنین کے دن جب تمہاری کثرت تعداد نے تم میں خود بینی پیدا کر دی، تو اس کی کثرت نے کچھ کام نہ دیا۔''

اسی لیے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ جب وہ جہاد کو نکلیں تو ان میں جھوٹا غرور اور خود بینی اور نمائش نہ پیدا ہو، بلکہ ان میں سے ہر ایک اخلاص اور ایثار کا پیکر ہو:

﴿ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ ﴾ (۸/ الانفال:۴۸)

''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو دکھاتے نکلے۔''

یہ قریش کا نقشہ ہے جو بدر کے موقع پر صرف اپنی طاقت کے اظہار اور قوت کی نمائش کو نکلے تھے۔

جب کسی قوم میں تمدن کی وسعت، دولت کی بہتات اور خوشحالی عام ہو جاتی ہے تو افراد میں خود غرضی اور خود بینی کا مرض عام ہو جاتا ہے، نہ اللہ کا فرض یاد رہتا ہے اور نہ بندوں کا حق۔ ہر شخص اپنی ہی دولت کے گھمنڈ میں رہتا ہے اور یہی ان کی تباہی کا وقت ہوتا ہے، فرمایا:

﴿ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ۖ ﴾ (۲۸/ القصص:۵۸)

''اور کتنی بستیاں ہم نے برباد کر دیں، جب وہ اپنے گزران میں اترا کر چلیں۔''

یہ تو چند بستیوں کی تباہی کا حال تھا، لیکن ایک وقت آئے گا جب ساری دنیا ایک ساتھ برباد ہو جائے گی، یعنی قیامت آئے گی، تو اس بربادی کے دن کی جو نشانیاں آنحضرت ﷺ نے بتائی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ''جب ہر شخص کو اپنی ہی رائے بھلی معلوم ہو گی اور اسی پر ناز کرے گا اور اترائے گا اور یہی وہ

موقع ہے جس میں ہر شخص کو اپنی فکر کرنی چاہیے۔'' ❶

مذہبی حیثیت سے جن لوگوں کی ظاہر حالت اچھی ہوتی ہے، ان کو اسی عجب وخود بینی کی بنا پر اپنی پرہیز گاری کا بڑا دعویٰ ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی تعلّی کی ممانعت فرمائی ہے:

﴿ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴾ (۵۳/ النجم:۳۲)

''تم (بہت) اپنی پاکیزگی نہ (جتایا) کرو، پرہیزگاروں کو وہی خوب جانتا ہے۔''

قدیم مذہبی اور علمی شرف نے یہود نصاریٰ میں عجب وخود بینی کا اس قدر مادہ پیدا کر دیا تھا ۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کا محبوب اور فرزند سمجھنے لگے تھے:

﴿ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰۗؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ ۭ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۸)

''اور یہود ونصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔''

﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَاۗءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ ﴾ (۶۲/ الجمعۃ:۶)

''(اے پیغمبر ان یہودیوں سے) کہو کہ اے یہودیو! اگر تم کو اس بات کا گھمنڈ ہے کہ اور تمام آدمیوں کو چھوڑ کر تم ہی اللہ کے چہیتے ہو۔''

ان تمام آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عجب وخود بینی ایک فریب کا نام ہے اور جب اس فریب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ نہ تھی، لیکن معاشرتی اور سیاسی حیثیت سے تو یہ پردہ دنیا ہی میں چاک ہو جاتا ہے، مگر مذہبی حیثیت سے آخرت میں چاک ہوگا۔

اس عیب کا مادہ جن ذرائع سے پیدا ہوتا ہے، اسلام نے ان کا پورا انسداد کیا ہے۔ حدیث میں ہے، کہ ایک شخص کسی کی مبالغہ آمیز طریقہ پر تعریف کر رہا تھا، رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ ''تم نے اس کو ہلاک کر دیا''۔ ❷ ایک بار آپ ﷺ کے سامنے کسی کا ذکر آیا تو ایک شخص نے اس کی تعریف کی آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم نے اس کی گردن کاٹ لی اگر کسی کی تعریف ہی کرنا ہے تو یہ کہو کہ میں اس کو ایسا سمجھتا ہوں۔'' ❸ مدح کی یہ ممانعت اس لیے کی گئی ہے، کہ اس سے ممدوح میں عجب وخود بینی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

لیکن اس بیماری کا سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ کوئی اپنی کسی خوبی کو اپنی کوشش کا نتیجہ نہ سمجھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور عطیہ سمجھے۔ اسی لیے بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے ذکر میں بندوں کے سامنے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے، فرمایا:

﴿ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ ﴾ (۵۷/ الحدید:۲۵)

''اللہ نے جو دیا ہے، اس پر اتراؤ نہیں۔''

---

❶ ابوداود، کتاب الملاحم، باب الامر والنهی:۴۳۴۲۔

❷ بخاری، کتاب الادب، باب مایکره من التمادح: ۶۰۶۰۔ ❸ ایضا:۶۰۶۱۔

فضول خرچی

فضول خرچی یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت اور موقع کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرے، چونکہ اسلام عرب میں آیا اور عربوں کی فیاضی فضول خرچی کی حد تک تھی، اس لیے تمام مذہبوں میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے فضول خرچی کو روکا ہے اور انسان کو اپنی حد میں رہ کر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، کیونکہ فضول خرچی کی عادت سے قومی سرمایہ بہت بری طرح برباد ہو کر فنا ہو جاتا ہے اور اس بے موقع خرچ سے جماعت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، نیز فضول خرچی عموماً فخر وغرور اور نمائش کے پردہ میں ظاہر ہوتی ہے اور ان بداخلاقیوں کی برائی چھپی نہیں۔

اہلِ عرب جب جلسوں میں شراب پیتے اور جوا کھیلتے تو جوا میں جو کچھ جیتتے، نشہ کے ترنگ میں اسی وقت لٹا دیتے، جانور ملتے تو اسی وقت بے وجہ ذبح کر ڈالتے، جاہلیت کی شاعری میں اس قسم کے فخریہ اشعار بکثرت ہیں، شہرت طلبی کی ایک صورت یہ تھی کہ دو شخص فیاضی کے اظہار کے لیے اونٹ پر اونٹ ذبح کرتے جاتے تھے، یہاں تک کہ دونوں میں ایک کے تمام اونٹ ختم ہو جاتے تھے، تو وہ اپنے حریف کے مقابل میں مغلوب سمجھا جاتا تھا، اس کو معاقرہ کہتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس ریائی فیاضی کو روک دیا۔ [1]

اہلِ عرب کی فیاضی کی بنیاد اکثر فخر وغرور اور نام ونمود پر قائم تھی اور اس نے ان کی فیاضی میں بے اعتدالی پیدا کر دی تھی، اس کا دینی نتیجہ یہ تھا کہ خلوص کے نہ ہونے سے وہ اللہ کے نزدیک مقبول نہ تھی اور دنیوی حیثیت سے بعض اوقات وہ تمام مال ودولت کو اڑا کر خود مفلس اور قلاش ہو جاتے تھے، پھر اس قسم کی فیاضی کے لیے جائز مال کافی نہیں ہوتا تھا، تو وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے اور نمائش کے موقعوں پر اسی مال کو خرچ کرتے تھے، اس بے اعتدالی کے دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حقوق مقرر فرمائے اور فضول خرچ کو شیطان کے بھائی کا لقب دیا:

﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۲۶-۲۷)

''اور رشتہ دار اور غریب اور مسافر (ہر ایک) کو اس کا حق پہنچاتے رہو اور (دولت کو) بے جا مت اڑاؤ (کیونکہ دولت کے) بے جا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے۔''

آیت کے اخیر ٹکڑے سے ثابت ہوتا ہے کہ فضول خرچی اللہ کی ناشکری ہے، امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''بعض علما کا قول ہے کہ اس آیت کا مفہوم اہل عرب کی عادت کے موافق ہے، کیونکہ وہ لوگ لوٹ

[1] ابوداود، کتاب الضحایا، باب ماجاء فی اکل معاقرۃ الاعراب: ۲۸۲۰۔

مار سے مال جمع کرتے تھے، پھر اس کو فخر و غرور کے حاصل کرنے کے لیے صرف کرتے تھے۔" [1]

آج بھی جو لوگ شادی بیاہ اور خوشی و غم کی تقریبوں میں اس قسم کی فضول خرچیوں کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ قرآن کی اصطلاح میں شیطان کے بھائی کہلائیں گے، یہ تعلیم فیاضی کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ فیاضی بخل و اسراف کے درمیان کا نام ہے اور اسی کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ فضول خرچی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم مفلس اور تہی دست ہو کر کسی کام کے نہیں رہو گے، بلکہ الٹے تمہیں کو لوگ قابل ملامت ٹھہرائیں گے:

﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴾

(۱۷/ بنی اسرآئیل: ۲۹)

"اور اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سکیڑو کہ (گویا) گردن میں بندھا ہے اور نہ بالکل اس کو پھیلا ہی دو (ایسا کرو گے،) تو تم ایسے بیٹھے رہ جاؤ گے کہ لوگ تم کو ملامت بھی کریں گے، (اور) تم تہی دست بھی ہو گے۔"

کیونکہ یہ اعتدال کا وصف خاص اسلام کی اخلاقی تعلیم نے پیدا کیا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسکو مسلمانوں کا امتیازی وصف قرار دیا اور فرمایا:

﴿ وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا ﴾ (۲۵/ الفرقان: ٦٧)

"اور خرچ کرنے لگیں تو فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگی کریں، بلکہ ان کا خرچ افراط اور تفریط کے درمیان بیچ کا ہو۔"

کوئی اس تعلیم کا یہ نتیجہ نہ سمجھے کہ اسلام بدحیثیتی پسند کرتا ہے اور کھانے، پینے، پہننے اور اوڑھنے میں ہر قسم کی کفایت شعاری کا حوصلہ بڑھاتا ہے، بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر شخص کو اپنی چادر کے اندر رہنا چاہیے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ نہیں کرنا چاہیے، مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کی فضول خرچی کا معیار خود اسی کی اپنی ذات ہے، سورۂ اعراف میں اللہ فرماتا ہے:

﴿ وَّكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴾ (۷/ الاعراف: ۳۱)

"اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو، بے شک اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔"

صدقات اور مبرات سے بڑھ کر تو کوئی نیکی کا کام نہیں، مگر اس میں بھی بعض مفسروں کے قول کے مطابق اپنی حیثیت سے بڑھ کر دینا پسندیدہ نہیں۔

﴿ كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ۖ وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴾

(٦/ الانعام: ١٤١)

"درخت کے پھل سے جب وہ پھل تم کھاؤ اور اس کا حق ادا کرو جب فصل کٹے اور حد سے آگے نہ بڑھو، اللہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

---

[1] تفسیر کبیر، بهامشه تفسیر ابی السعود، ج ٥، ص: ٥٧٧۔

حسد

اگر ایک شخص پر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی احسان کرے، مثلاً: اس کو علم وفضل، مال و دولت، عزت وشہرت یا اور کوئی دینی یا دنیوی نعمت عطا فرمائے، تو ان چیزوں کو دیکھ کر اگر کسی دوسرے شخص کے دل میں ان کے حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس کو رشک ومنافست کہتے ہیں اور یہ کوئی بد اخلاقی نہیں، بلکہ دینی امور میں پسندیدہ ہے، لیکن اگر وہ ان چیزوں کو دوسرے کے لیے پسند نہ کرے اور اس کی یہ خواہش ہو کہ اللہ کی نعمتیں اس سے چھین لی جائیں تو اسی کا نام حسد ہے اور قرآن مجید سے بھی یہی تعریف مستنبط ہوتی ہے، کیونکہ عہد رسالت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنا خاص احسان یہ کیا تھا کہ ان کو قرآن وایمان کی دولت عطا فرمائی تھی، جس کو دیکھ کر مسلمانوں کے حاسد یعنی یہود جلے مرتے تھے:

﴿ اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ﴾ (٤/ النسآء:٥٤)

''یا اللہ نے جو اپنے فضل سے لوگوں کو نعمت (قرآن) عطا فرمائی ہے اس پر جلے مرتے ہیں۔''

اور ان کی یہ خواہش تھی کہ یہ دولت مسلمانوں سے چھین لی جائے:

﴿ وَدَّ كَثِیْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ ﴾

(٢/ البقرة:١٠٩)

''(مسلمانو!) اکثر اہل کتاب اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دیں۔''

حسد کی تین قسمیں ہیں:

① یہ کہ ایک شخص کی صرف یہ خواہش ہو کہ دوسرے سے ایک نعمت سلب کر لی جائے، گو وہ اس کو نہ حاصل ہو سکے یا وہ اس کو خود حاصل نہ کرنا چاہے، حسد کی مذموم ترین قسم یہی ہے اور اسی بنا پر منافقین کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان بھی ان کی طرح کافر ہو جائیں:

﴿ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً ﴾ (٤/ النسآء:٨٩)

''ان منافقوں کی خواہش یہ ہے کہ جس طرح خود کافر ہو گئے ہیں، اسی طرح تم (سچے مسلمان) بھی کفر کرنے لگو (اور وہ) اور تم (سب) ایک ہی طرح کے ہو جاؤ۔''

② دوسرے یہ کہ اس کی خواہش یہ ہو کہ وہ نعمت اس کو حاصل ہو جائے، اس صورت میں اس کا مقصود بالذات تو صرف اس نعمت کا حاصل کرنا ہوتا ہے، لیکن چونکہ بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھین نہ لی جائے، اس کو مل نہیں سکتی، اس لیے بالفرض اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے سلب کر لی جائے۔

③ تیسرے یہ کہ ایک شخص خود اسی قسم کی نعمت حاصل کرنا چاہے، لیکن اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ وہ دوسرے

سے سلب کر لی جائے۔

ان میں پہلی صورت حسد کی مذموم ترین قسم ہے، دوسری صورت میں چونکہ زوال نعمت بالذات مقصود نہیں ہوتا، اس لیے اس کو حقیقی معنوں میں حسد تو نہیں کہہ سکتے، تاہم قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ ﴾ (٤/ النسآء:٣٢)

''اور اللہ نے جو تم میں سے ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے، اس کا کچھ ارمان نہ کرو۔''

اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی چیز اگر کسی کو حاصل ہو بعینہ اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہیں ہے، اس لیے یہ بھی مذموم ہے، البتہ اس کے مثل دوسری نعمت کی خواہش کرنا مذموم نہیں، اسی لیے فرمایا:

﴿ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ ﴾ (٤/ النسآء:٣٢)

''اور اللہ سے اس کا فضل مانگو۔''

تیسری صورت بالکل مذموم نہیں بلکہ دینی امور میں مستحسن ہے اور شریعت میں اسی کو مسابقت کہتے ہیں، حسد کے سات اسباب ہیں۔

① بغض و عداوت، کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے نزدیک دشمن کی برائی اور بھلائی دونوں یکساں ہوں، اس لیے ایک دشمن کی طبعی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے دشمن پر مصیبت آئے اور جب یہ مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے، اس کی بجائے اللہ اس پر کوئی احسان کرتا ہے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا اور اسی کا نام حسد ہے۔

کفار اور منافقین کو مسلمانوں کے ساتھ جو عداوت تھی، وہ اسی حسد آمیز طریقہ سے ظاہر ہوتی تھی:

﴿ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ ﴾

(٣/ آل عمران:١١٨)

''چاہتے ہیں کہ تم کو تکلیف پہنچے، دشمنی تو ان کی باتوں سے ظاہر ہو چکی ہے اور (غیظ و غضب) جو ان کے دلوں میں (بھرے) ہیں، وہ (اس سے بھی) بڑھ کر ہیں۔''

﴿ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۫ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ ﴾ (٣/ آل عمران:١٢٠)

''(مسلمانو)! اگر تم کو کوئی فائدہ پہنچے تو ان کو برا لگتا ہے اور اگر تم کو کوئی گزند پہنچے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔''

بغض و عداوت کی وجہ سے جو حسد پیدا ہوتا ہے، اس کے لیے مساوات شرط نہیں، بلکہ ایک ادنیٰ آدمی بھی بڑے سے بڑے شخص کا بدخواہ ہو سکتا ہے۔

② حسد کا دوسرا سبب ذاتی فخر کا غلط خیال ہے، کیونکہ امثال و اقران میں جب ایک شخص کسی بلند منصب پر پہنچ جاتا ہے تو یہ اس کے دوسرے ہم چشموں کو گراں گزرتا ہے اور وہ اس کے اس ترفع کو پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ منصب اس سے چھن جائے، تاکہ وہ ان کے مساوی ہو جائے۔

③ حسد کا تیسرا سبب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو اپنا مطیع ومنقاد بنانا چاہتا ہے، اس لیے جب وہ کسی شرف وامتیاز کی وجہ سے اس کے حلقہ اطاعت سے نکل جاتا ہے، تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا یہ شرف جاتا رہے، تاکہ وہ اس کا مطیع ومنقاد ہو سکے، کفار قریش اسی بنا پر مسلمانوں کی حقیر جماعت کو دیکھ کر کہتے تھے:

﴿ اَهٰۤؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیۡهِمۡ مِّنۡۢ بَیۡنِنَا ؕ ﴾ (٦/ الانعام:٥٣)

''کیا یہی (ذلیل) لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے (اسلام کی توفیق دے کر) اپنا فضل کیا ہے۔''

حسد کا یہ سبب اکابر واشراف سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے لیے کبروغرور اور دوسروں کی تحقیر وتذلیل لازمی ہے۔

④ حسد کا چوتھا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنی پندار میں جس کو معمولی آدمی سمجھتے ہیں اس کو کوئی غیر معمولی شرف حاصل ہو جاتا ہے، تو ان کو تعجب ہوتا ہے اور اسی تعجب کی بنا پر وہ اس کے اس شرف کا انکار کرتے ہیں، کفار اسی وجہ سے پیغمبروں کی رسالت کا انکار کرتے تھے اور تعجب سے کہتے تھے:

﴿ اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوۡلًا ۝ ﴾ (١٧/ بنی اسرآئیل: ٩٤)

''کیا اللہ نے آدمی (کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا ہے۔''

⑤ حسد کا پانچواں سبب یہ ہے کہ جب دو شخصوں کا ایک مقصد ہوتا ہے تو دونوں باہم ایک دوسرے کو رشک وحسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں جب ایک کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو دوسرا قدرتی طور پر اس کا بدخواہ ہو جاتا ہے، ایک شوہر کی متعدد بیویوں اور ایک باپ کے متعدد بیٹوں میں جو رشک وحسد ہوتا ہے، اس کی وجہ یہی ہوتی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے قتل کرنے کی جو سازش کی تھی، اس کا سبب یہی تھا:

﴿ اِذۡ قَالُوۡا لَیُوۡسُفُ وَ اَخُوۡهُ اَحَبُّ اِلٰۤی اَبِیۡنَا مِنَّا وَ نَحۡنُ عُصۡبَةٌ ؕ ﴾ (١٢/ یوسف:٨)

''جب یوسف کے (بے مات) بھائیوں نے (آپس میں) کہا کہ باوجودیکہ ہم (حقیقی) بھائیوں کی بڑی جماعت ہے، تاہم یوسف اور اس کا (حقیقی) بھائی (بن یامین) ہمارے والد کو ہم سے البتہ بہت ہی زیادہ عزیز ہیں۔''

⑥ حسد کا چھٹا سبب جاہ پرستی اور ریاست طلبی ہے، اس لیے جو لوگ اس حیثیت سے یگانۂ روزگار ہونا چاہتے ہیں، جب ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور شخص اس میں ان کا شریک وسہیم ہو گیا ہے، تو یہ ان کو سخت گراں گزرتا ہے اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس شرف وامتیاز سے دوسرا شخص جاہ ومنزلت میں ان کا شریک ہو گیا ہے وہ اس سے چھن جائے۔

مسلمانوں کے ساتھ یہود اسی لیے حسد رکھتے تھے کہ اسلام سے پہلے ان کو علمی اور مذہبی حیثیت سے اہل عرب پر تفوق حاصل تھا، لیکن اسلام کی وجہ سے ان کا یہ تفوق جاتا رہا، اس لیے وہ اسلام ہی کی بیخ کنی پر

آمادہ ہو گئے، منافقین میں عبداللہ بن ابی کو اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے، لیکن اسلام نے اس کی اس شاہانہ ریاست کا خاتمہ کر دیا، اس لیے اس کو یہ سخت ناگوار ہوا اور اسی ناگواری کی وجہ سے ایک مجمع میں وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گستاخانہ پیش آیا۔ [1]

⑦ حسد کا ساتواں سبب خبثِ نفس اور بد طینتی ہے، کیونکہ بعض اشخاص کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جب کسی کو بہتر حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کو ناگوار ہوتا ہے اور جب کسی پر مصیبت آتی ہے تو ان کو مسرت ہوتی ہے، اس صورت میں حسد کے پیدا ہونے کے لیے اشتراک، رابطہ یا کسی اور خواہش کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اس قسم کے خبیث النفس لوگ ہر شخص پر حسد کرتے ہیں۔

حسد کے یہ اسباب زیادہ تر ان لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں کوئی چیز ما بہ الاشتراک ہوتی ہے، اس لیے بیگانوں میں یہ جذبہ نہیں ہوتا، بلکہ صرف ان لوگوں میں پیدا ہوتا ہے جن میں باہم رابطہ واشتراک ہوتا ہے۔ ایک عالم دوسرے عالم پر، ایک عابد دوسرے عابد پر اس لیے حسد کرتا ہے کہ ان میں ایک چیز یعنی علم وعبادت مشترک ہے، اس کے بخلاف ایک عالم یا کسی عابد کو کسی تاجر پر حسد نہیں ہوتا، کیونکہ ان میں کوئی چیز ما بہ الاشتراک نہیں۔

اسلام نے مسلمانوں میں باہم اخوت کا رشتہ قائم کر کے نہایت وسیع اور عالمگیر اشتراک پیدا کر دیا تھا، اس لیے ان میں حسد کا جذبہ نہایت آسانی کے ساتھ پیدا ہو سکتا تھا اور حسد کے جس قدر اسباب ومراتب ہیں وہ سب کے سب اس وسیع برادری میں جمع ہو سکتے تھے، اس لیے اصولاً جو بداخلاقیاں اس اخوت کا شیرازہ برہم کر سکتی تھی، رسول اللہ ﷺ نے ان سب سے مسلمانوں کو بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا:

((ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث ولا تحسسوا ولا تجسسوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا ولا تباغضوا وکونوا عباداللّٰہ اخوانا)) [2]

''بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے، نہ لوگوں کے عیوب کی ٹوہ لگاؤ، نہ باہم حسد کرو، نہ ایک دوسرے سے بے تعلق رہو، نہ باہم بغض رکھو، بلکہ اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ۔''

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی شرح میں قرطبی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

المعنی کونوا کاخوان النسب فی الشفقۃ والرحمۃ والمحبۃ والمواساۃ والمعاونۃ والنصیحۃ۔ [3]

''اس کے معنی یہ ہیں کہ رحم وشفقت، غمخواری، محبت، اعانت اور خیر خواہی میں نسبی بھائیوں کی

---

[1] بخاری، کتاب الاستئذان، باب التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین والمشرکین: ٦٢٥٤۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ماینھی عن التحاسد والتدابر: ٦٠٦٤۔

[3] فتح الباری، کتاب الادب، باب ماینھی عن التحاسد والتدابر، ج ١٠، ص: ٤٠٣۔

طرح ہو جاؤ۔‘‘

لیکن یہ اخوت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے، جب ان تمام بد اخلاقیوں سے احتراز کیا جائے، ورنہ اس کے بجائے دشمنی پیدا ہو جائے گی اور یہ اس قسم کے تمام محاسنِ اخلاق جو اخوت کا لازمی نتیجہ ہیں یا ان سے اخوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے فنا ہو جائیں گے، چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

کانه قال اذاتر کتم هذه المنهیات کنتم اخوانا و مفهومه اذالم تترکوها تصیروا اعداء و معنی کونوا اخوانا اکتسبوا ماتصیرون به اخوانا مما سبق ذکره وغیر ذلك من الامور المقتضیة لذلك نفیا واثباتا۔ ❶

’’گویا رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ جب تم لوگ ان منہیات کو چھوڑ دو گے تو بھائی بھائی ہو جاؤ گے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب ان کو نہ چھوڑو گے تو دشمن ہو جاؤ گے اور بھائی بھائی بننے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اخلاقی خوبیاں حاصل کرو، جن کی وجہ سے بھائی بھائی بن جاؤ اور یہ اخلاقی خوبیاں وہ ہیں، جن کا ذکر اوپر گزرا اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے امور ہیں جو اخوت کو نفیاً یا اثباتاً پیدا کرتے ہیں۔‘‘

ان بداخلاقیوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز حسد ہے، کیونکہ وہ ایک ایسا جذبہ ہے جس سے بمشکل کوئی دل خالی ہو سکتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ’’کوئی شخص شگون، بدگمانی اور حسد سے خالی نہیں ہو سکتا۔‘‘ کہا گیا کہ ان سے نکلنے کی کیا صورت ہے، فرمایا: ’’شگون کا خیال پیدا ہو تو جو کرنا چاہتے ہو، اس کی وجہ سے اس کو مت چھوڑ دو اور جب بدگمانی پیدا ہو تو اس کو سچ مت سمجھو اور جب حسد پیدا ہو تو ظلم پر آمادہ نہ ہو جاؤ‘‘ ❷ لیکن اگر عملی طور پر اس حسد کا اظہار ہوا تو اسلام کے تمام محاسن اخلاق کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہ شرارہ خرمنِ اسلام کو پھونک کر خاکِ سیاہ کر دے گا، اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر حسد سے بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا:

((ایاکم والحسد فان الحسد یاکل الحسنات کما تأکل النار الحطب)) ❸

’’تم لوگ حسد سے بچو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔‘‘

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے حسد نہایت خطرناک چیز ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اور ہر مسلمان کو اس کے خطرہ سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی ہے:

﴿ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝ ﴾ (۱۱۳/ الفلق ۵)

’’اور برا چاہنے والے کی بدی سے جب وہ حسد کرنے لگے۔‘‘

❶ ایضاً۔ ❷ مصنف عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری، کتاب الادب، باب ما ینھی عن التحاسد، ج ۱۰، ص: ۴۰۲ مصر۔ ❸ ابوداود، کتاب الادب، باب فی الحسد: ۴۹۰۳۔

فحش گوئی

فحش گوئی کی مختلف قسمیں ہیں، ایک قسم تو قوتِ شہوانیہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے مرتکب زیادہ تر رند، بے باک، نوجوان اور بے تکلف دوست واحباب ہوتے ہیں، مثلاً: جب اس قسم کی بے تکلفانہ اور رندانہ صحبتیں قائم ہوتی ہیں، تو عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر ہوتا ہے اور اس سلسلے میں اس قسم کے حالات و واقعات بیان کیے جاتے ہیں، جو بعض اوقات شرمناک حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

عربی زبان میں اس قسم کی فحش گوئی کو رفث کہتے ہیں اور قرآن مجید کی اس آیت میں

﴿ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۷)

''حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہیے نہ گناہ کی اور نہ لڑائی کی۔''

اس کی ممانعت کی گئی ہے، لیکن زمانہ حج کی تخصیص اس لیے کی گئی ہے کہ اس زمانہ میں مردوں اور عورتوں کا عام اجتماع ہوتا ہے اور اس سفر میں پردے کی پوری پابندی مشکل ہوتی ہے، اس لیے اس قسم کے چرچے نہایت آزادی کے ساتھ کیے جاسکتے ہیں، حالانکہ یہ زمانہ ذکرِ الٰہی کا ہوتا ہے، ورنہ حج کی کوئی تخصیص نہیں، بلکہ اسلام میں عام طور پر اس قسم کی فحش گوئی ممنوع ہے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور مردوں کے ایک [1] مجمع میں خطبہ دیا اور حمد و ثنا کے بعد مردوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ ''کیا تم میں کوئی آدمی ہے جو اپنی بی بی کے پاس جاتا ہے تو دروازہ بند کر لیتا ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اس طرح اللہ کے پردے میں چھپ جاتا ہے؟'' لوگوں نے کہا: ہاں۔ پھر فرمایا کہ ''اس کے بعد لوگوں کی صحبتوں میں بیٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے یہ کیا، میں نے یہ کیا''۔ اس پر سب لوگ خاموش رہے، پھر عورتوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ ''کیا تم سب اس قسم کے واقعات بیان کرتی ہو؟'' اس پر ایک عورت نے دوزانو بیٹھ کر کہا کہ ہاں مرد اور عورت دونوں اس قسم کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ فرمایا: ''تم لوگ جانتے ہو کہ اس کی کیا مثال ہے؟ اس کی مثال اس چڑیل کی ہے جو گلی میں ایک شیطان سے ملی اور اس نے اس سے مباشرت کی، حالانکہ لوگ اس کو دیکھ رہے تھے۔'' [2] مقصود یہ ہے کہ علانیہ کرنا اور کھول کر بیان کرنا دونوں کی بے شرمی کی صورت یکساں ہے، اس فحش گوئی کی ممانعت کا فلسفہ یہ ہے کہ حدودِ الٰہی کی حرمت کا تخیل ہر حال میں برقرار رہے، ورنہ جب باتیں زبانوں پر آئیں گی تو وہ اپنی اہمیت کھو دیں گی اور قول، عمل کے لیے ایک دن راستہ صاف کر دے گا، یہی سبب ہے کہ اس قسم کی باتوں کے بیان کے لیے جب ناگزیر ضرورتیں پیش آتی ہیں تو مجاز و استعارہ کی زبان میں ان کو ادا کیا جاتا ہے، تاکہ مدعا ظاہر ہو اور شرم کا پردہ بھی ڈھکا رہے،

[1] دونوں کی نشستیں الگ تھیں۔ ''س''

[2] ابوداود، کتاب الطلاق، باب مایکرہ من ذکر الرجل مایکون من اصابتہ اھلہ:۲۱۷۴۔

چنانچہ قرآن مجید میں اس قسم کے واقعات مجاز واستعارہ ہی کے پردہ میں بیان کیے گئے ہیں، مثلاً:

﴿ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ ﴾ (٤/ النسآء:٢١)

''حالانکہ تم ایک دوسرے تک پہنچ چکے (یعنی میاں بی بی، ہم صحبت ہو چکے)۔''

﴿ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ ﴾ (٤/ النسآء:٤٣)

''یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو (یعنی ان سے صحبت کی ہو)۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اللہ شرمیلا اور شریف ہے، اسی لیے اس نے جماع کو کنایۃً لمس (چھونے) کے لفظ سے بیان کیا ہے، اسلام نے اس کے لیے اور جو الفاظ پیدا کیے ہیں، جو فقہی مسائل کی تشریح میں مجبوراً آتے ہیں، گو وہ اب عام استعمال کی وجہ سے تصریح کے درجہ کو پہنچ چکے ہیں، لیکن درحقیقت وہ سب کے سب کنایے اور استعارے ہیں، اسلامی تعلیمات کے مطابق پائخانہ، پیشاب اور دوسرے نفرت انگیز اور شرمناک امراض...... کا ذکر بھی کنایۃً کرنا چاہیے، پائخانہ اور پیشاب کے لیے احادیث میں ''قضائے حاجت'' کا لفظ مستعمل ہے، جو ایک کنایہ ہے، قرآن مجید میں اس کے لیے غائط کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو لغت میں نشیب زمین کو کہتے ہیں۔

﴿ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ ﴾ (٤/ النسآء:٤٣)

''یا تم میں سے کوئی پست زمین سے (ہو کر) آیا ہو۔''

چونکہ عام طور پر لوگ اس مقصد کے لیے پست زمین کو پسند کرتے ہیں، اس لیے استعارۃً اس سے پائخانہ مراد لیا گیا۔

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پائخانہ بھی ایک استعارہ ہے، جس کی اصل پائیں خانہ ہے، چونکہ پائخانے عموماً مکانوں کے کنارے بنائے جاتے ہیں، اس لیے استعارۃً ان کو پائیں خانہ کہا گیا، پھر تخفیف کے اصول کے مطابق پائخانہ ہو گیا اور اب کثرت استعمال سے اس میں استعارہ کی شان باقی نہ رہی، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے برص کی تعبیر سوء کے لفظ سے کی ہے، جس کے معنی برائی یا عیب کے ہیں:

﴿ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴾

(٢٠/ طٰہٰ:٢٢)

''اور اپنے ہاتھ کو سکیڑ کر اپنی بغل میں رکھ لو (اور پھر نکالو) تو وہ بدوں اس کے کسی طرح کا روگ ہو، سفید (براق) نکلے گا (اور یہ) دوسرا معجزہ ہے۔''

فحش گوئی کی دوسری قسم کا تعلق قوت غضبیہ سے ہے، جس کا نام سب وشتم یا گالی گلوچ ہے اور یہ صورت عموماً جنگ وجدل کے موقع پر پیش آتی ہے، زمانہ حج میں چونکہ عام اجتماع ہوتا ہے اور اس حالت میں لڑائی

جھگڑے کا زیادہ امکان ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک عام لفظ ''فسق'' سے اس کی ممانعت کی ہے:

﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۷)

''حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہیے، نہ فسق کی، نہ جھگڑے کی۔''

گالی گلوچ کی مختلف صورتیں ہیں، بعض اوقات انسان ایک شخص کے ماں باپ کو برا بھلا کہتا ہے، اس کے نسب میں عیب نکالتا ہے، کبھی خود اس شخص کے عیوب ظاہر کرتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی نفرت انگیز مرض مثلاً: برص یا جذام میں مبتلا ہو تو اس پر بھی طنز کرتا ہے، بعض حالتوں میں اگر اس نے کوئی برا کام کیا ہے یا اس کے ساتھ کوئی برا برتاؤ کیا گیا ہے، تو اس کا اظہار کرتا ہے۔

قرآن مجید نے اجمالی طور پر ان تمام صورتوں کی ممانعت صرف ایک لفظ سے کی ہے:

﴿لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ﴾ (٤/ النسآء:١٤٨)

''اللہ کو بری بات کا پکار کر کہنا پسند نہیں، مگر جس پر ظلم ہوا ہو، (وہ ظلم کو برملا بیان کر سکتا ہے)۔''

قرآن وحدیث میں جابجا بدزبانی سے بچنے کے حکم ومصالح نہایت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں:

① ایک مصلحت یہ ہے کہ گالی گلوچ میں لوگ عموماً تعدی کرتے ہیں، یعنی اگر ایک شخص ایک گالی نکالتا ہے تو دوسرا دو دیتا ہے۔ اگر ایک شخص کسی کے باپ کو برا کہتا ہے تو دوسرا اس کے باپ ماں دونوں کو اس میں شامل کر لیتا ہے، اس لیے دوسرے کی تعدی سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کو گالی نہ دی جائے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت میں یہی نکتہ بیان کیا ہے:

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾

(٦/ الانعام:١٠٨)

''اور (مسلمانو)! اللہ کے سوا دوسرے جن معبودوں کو یہ پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہو کہ یہ لوگ (بھی) نادانی سے بڑھ کر اللہ کو برا کہہ بیٹھیں گے۔''

اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا کہ ''سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ پر لعنت بھیجے۔'' کہا گیا کہ یارسول اللہ! کوئی اپنے باپ ماں پر کیونکر لعنت بھیج سکتا ہے؟ فرمایا: ''اس طرح کہ جب کوئی کسی کے باپ کو برا بھلا کہے گا تو وہ اس کے باپ ماں دونوں کو برا بھلا کہے گا۔'' [1]

② بدزبان آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے اور لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں اور حدیث میں ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ سے ملنے آیا، آپ ﷺ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ ''اپنے قبیلہ میں یہ نہایت برا آدمی ہے۔'' لیکن جب وہ آپ ﷺ کے پاس بیٹھا تو آپ ﷺ اس سے

[1] بخاري، كتاب الادب، باب لايسب الرجل والديه:٥٩٧٣۔

نہایت خندہ پیشانی سے ملے، جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ جب آپ نے اس کو دیکھا برا کہا، پھر اس سے نہایت لطف و محبت کے ساتھ ملے، فرمایا: ''عائشہ! تم نے مجھ کو بدزبان کب پایا؟ اللہ کے نزدیک قیامت کے دن سب سے برا شخص وہ ہوگا جس کی بدزبانی کے خوف سے لوگ اس کو چھوڑ دیں۔'' ❶

③ بدزبانی دورِ وحشت و جہالت کی یادگار اور تہذیب و شائستگی کے خلاف ہے۔ ایک بار حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے ایک غلام کو ماں کی گالی دی، رسول اللہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا: ''تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے۔'' ❷ امام بخاری نے ادب المفرد میں اس سے نتیجہ نکالا ہے کہ غلاموں یا نوکروں کو برا بھلا کہنا جائز نہیں۔ ❸

④ رفق و ملاطفت اور شرم و حیا شریفانہ اخلاق ہیں اور اسلام نے خاص طور پر ان کی تعلیم دی ہے، لیکن بدزبانی ان کے بالکل مخالف ہے۔ ایک بار کچھ یہود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کے بجائے السام علیکم۔ تم کو موت آئے۔ کہا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں کہا عَلَيْكُمْ وَلَعَنَكُمُ اللّٰهُ وَغَضِبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۔تم کو موت آئے، اللہ تم پر لعنت بھیجے اور تم پر اللہ کا غضب نازل ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ ''اے عائشہ! نرمی اختیار کرو اور سختی اور بدزبانی سے بچو۔'' ❹

⑤ گالی گلوچ کی ممانعت کا ایک نہایت دقیق نکتہ یہ ہے کہ اس میں عموماً بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں کو الفاظ کی صورت میں منہ سے نکالا جاتا ہے اور سنایا جاتا ہے، اس سے سوسائٹی میں ان مکروہ باتوں کے سننے اور سنانے کی جرأت پیدا ہوتی ہے اور بے حیائی کے الفاظ بڑھ کر اعمال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، یہی سبب ہے کہ حدیث میں آنحضرت ﷺ نے بدزبانی کو حیا کے بالمقابل ذکر فرمایا۔ ارشاد ہے کہ ''بدزبانی جس چیز میں شامل ہوتی ہے، اس کو بدنما بنا دیتی ہے اور حیا جس چیز میں شامل ہوتی ہے اس کو زینت دے دیتی ہے۔'' ❺ اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی اور فحش گوئی حیا کے خلاف ہے۔

⑥ گالی گلوچ سے لوگوں کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے، حالانکہ مسلمانوں کو ایذا رسانی سے احتراز کرنا چاہیے اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔'' ❻ مردوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت اسی لیے کی گئی ہے کہ اس سے زندوں یعنی مُردوں کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے۔ ❼

---

❶ بخاری، کتاب الادب، باب لم یکن النبی ﷺ فاحشا ولا ...: ۶۰۳۲۔

❷ بخاری، کتاب الادب، باب ماینھی من السباب واللعن: ۶۰۵۰۔

❸ ادب المفرد، باب سباب العبید: ۱۸۹۔ ❹ بخاری، کتاب الادب، باب لم یکن النبی ﷺ فاحشا ...: ۶۰۳۰۔ ❺ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الفحش ۱۹۷۴۔

❻ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان تفاضل الاسلام: ۱۶۲۔

❼ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الشتم: ۱۹۸۲۔

(۷) گالی گلوچ لڑائی کا پیش خیمہ ہے اور مسلمانوں کے ساتھ لڑنا بھڑنا کفر ہے، اس لیے جو چیز اس کا ذریعہ بنتی ہے، وہ اگر کفر نہیں تو کم از کم فسق تو ضرور ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((سباب المسلم فسوق وقتاله كفر)) ❶

''مسلمان کو برا بھلا کہنا گناہ ہے اور اس کے ساتھ لڑنا کفر۔''

ان تمام مراتب کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بدزبانی اور فحاشی اسلامی تعلیمات اور اسلامی خصوصیات کے منافی ہے، اس لیے جو شخص صحیح اسلامی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، وہ اس بداخلاقی میں مبتلا رہنا پسند نہ کرے گا، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((ليس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذی)) ❷

''جو مسلمان ہے وہ طنز و تشنیع نہیں کرتا، لعنت نہیں بھیجتا، بدزبانی اور فحش کلامی نہیں کرتا۔''

ایک اور حدیث میں بدزبانی کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ ❸

یہ تمام وجوہ تو انسانوں کی باہمی گالی گلوچ اور لعن وطعن سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس قسم کی بدزبانیاں صرف انسانوں تک محدود نہیں ہیں، بلکہ بے جان اور عقل سے خالی چیزوں سے بھی جب نقصان پہنچتا ہے تو لوگ ان کو بھی برا بھلا کہہ بیٹھتے ہیں، مثلاً: جب کوئی شخص حوادثِ زمانہ کا شکار ہوتا ہے تو وہ زمانہ کو برا بھلا کہنے لگتا ہے، یہ نہیں سوچتا کہ اس میں زمانہ کا کیا قصور ہے، یہ جو کچھ ہوا ہے، مشیتِ الٰہی سے ہوا ہے، اس بنا پر اسلام نے ان چیزوں کے برا بھلا کہنے کی ممانعت کی ہے اور اس مفہوم کو رسول اللہ ﷺ نے خود اللہ تعالیٰ کی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے کہ ''اللہ کہتا ہے کہ انسان زمانہ کو برا بھلا کہتا ہے، حالانکہ میں خود زمانہ ہوں اور رات دن میرے ہاتھ میں ہیں۔'' ❹ یعنی زمانہ کو برا بھلا کہنا خود اللہ کو برا بھلا کہنا ہے۔

ایک بار ہوا ایک شخص کی چادر کو ادھر ادھر اڑانے لگی، اس نے ہوا پر لعنت بھیجی، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس پر لعنت نہ بھیجو، وہ تو صرف اللہ کی فرماں بردار ہے۔'' ❺

ایک سفر میں ایک عورت نے اپنی اونٹنی پر لعنت بھیجی، رسول اللہ ﷺ نے اس اونٹنی کو الگ کر دیا، ❻ اور یہ اس عورت کی سزا تھی، تاکہ وہ دوبارہ اس قسم کا کلمہ نہ کہہ سکے۔ اسلام میں گالی گلوچ کے صرف یہی معنی نہیں کہ کسی کو مغلظات سنائے جائیں، بلکہ ہر وہ بات جس سے کسی کی توہین یا دل آزاری ہو گالی ہے، کسی کو فاسق یا

❶ بخاری، كتاب الادب، باب ماينهى من السباب واللعن: ٦٠٤٤۔

❷ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء في اللعنة: ١٩٧٧۔

❸ بخاری، كتاب الايمان، باب علامات المنافق: ٣٤۔

❹ بخاری، كتاب الادب، باب لاتسبوا الدهر: ٦١٨١۔

❺ ابوداود، كتاب الادب، باب في اللعن: ٤٩٠٨۔

❻ ابوداود، كتاب الجهاد، باب النهى عن لعن البهيمة: ٢٥٦١۔

کافر کہنا اگرچہ عرف عام میں گالی نہیں ہے، لیکن اسلام میں وہ ایک سخت گالی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''کوئی شخص اپنے بھائی کو فاسق و کافر نہ کہے، کیونکہ اگر وہ فاسق و کافر نہ ہوگا تو یہ تہمت خود تہمت لگانے والے پر لوٹ آئے گی۔'' [1] اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شخص فاسق یا کافر ہوگا تو اس کا کہنے والا فاسق و کافر نہ ہوگا، تاہم اگر اس کا مقصود محض اس شخص کی تفضیح و تشہیر ہو تو وہ گنہگار ضرور ہوگا۔ [2] بہر حال اسلام نے جان و مال کی طرح ہر مسلمان کی عزت و آبرو کو بھی محفوظ کر دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ایک مقدس دن، ایک مقدس مہینہ اور ایک مقدس شہر میں (یعنی حجۃ الوداع میں) ایک خطبہ میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ اللہ نے تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزت کو اسی طرح حرام کر دیا ہے، جس طرح تمہارا یہ دن، تمہارے اس مہینہ اور تمہارے اس شہر میں محترم ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب ماینهی من السباب واللعن: ٦٠٤٥ ومسلم، کتاب الایمان، باب بیان حال ایمان من قال لاخیه المسلم یاکافر: ٢١٥، ٢١٦۔

[2] فتح الباری، کتاب الادب، ماینهی من السباب واللعن، ج ١٢، ص: ٣٨٨۔

رذائل پر مختصر تبصرہ

گزشتہ صفحوں میں جن رذائل کی تشریح کی گئی ہے، ان کے علاوہ اور بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی بد اخلاقیوں اور بری عادتوں کو گنایا جا سکتا ہے، جن کی ممانعت اسلام میں کی گئی ہے، مگر اصولی حیثیت سے وہ درحقیقت ان ہی مذکورہ بالا رذائل میں سے کسی کے تحت میں ہیں، اس لیے ان کے پورے استقصا کی کوشش نہیں کی گئی ہے اور چونکہ ان رذائل کے اخذ ورد میں خالص فلسفیانہ اصول کی پیروی نہیں کی گئی ہے، اس لیے صرف ان ہی کے بیان پر قناعت نہیں کی گئی جن کو فلسفہ اخلاق کے مصنفوں نے رذائل میں شمار کیا ہے، بلکہ مذہبی تعلیمات کو سامنے رکھ کر اخلاق و عاداتِ ذمیمہ کی یہ فہرست مرتب کی گئی ہے۔ اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بھید کھل جاتا ہے کہ اسلام نے تین اساسی برائیاں قرار دی ہیں اور جس قدر رذائل ہیں ان میں ان ہی تین میں سے کوئی برائی پائی جاتی ہے۔ سب سے پہلی اساسی برائی عدمِ صدق ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ دل اور زبان میں یکسانی نہ ہو۔ جھوٹ، غیبت، خلاف وعدگی، اتہام، بدگمانی، خوشامد، چغل خوری، دورخاپن، جھوٹی قسم وغیرہ اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں۔ دوسری اساسی برائی حبّ مال ہے مقصود دنیا کے مال و دولت سے غیر معمولی محبت ہے، بخالت، حرص وطمع، چوری، غصب، خیانت، غلول، ناپ تول میں کمی وبیشی وغیرہ ایک ہی اصل کی مختلف فروع ہیں۔ تیسری اساسی برائی حبِّ ذات ہے، اس سے مقصود اپنی ذات سے غیر معمولی شغف ہے۔ حسد، تکبر، عجب، فخاری، غیظ وغضب، ظلم، کینہ وغیرہ، ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو شخص ان تینوں اساسی برائیوں سے ہر طرح پاک رہنے کی کوشش کرے گا، وہ ہر قسم کے رذائل سے اپنے کو محفوظ کر لے گا۔ یہ تینوں اساسی برائیاں ہوائے نفس یعنی نفس کی غلط اور بے جا خواہشیں ہیں، جو ان سے اپنا دامن بچائے گا، وہ جنت میں آرام پائے گا:

﴿ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝ ﴾

(۷۹/ النازعات: ٤٠-٤١)

''اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو غلط خواہش سے بچایا، تو جنت اس کی آرام گاہ ہے۔''

آداب

انسانی زندگی کے رات دن کے ضروری مشاغل رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بولنے چالنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، نہانے دھونے کے وہ تمام عمدہ قواعد جو ایک متمدن زندگی کے ضروری جزو ہیں، آداب کہلاتے ہیں۔ ان ہی آداب کی پابندی و عدم پابندی کے بدولت وحشی اور متمدن لوگوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ ان آداب میں خوبی و لطافت ملحوظ رکھنا حسن ادب ہے، اس کی پابندی سے اجتماع اور معاشرتی امور میں خوشگواری پیدا ہوتی ہے اور انسان مہذب، شائستہ اور باوقار بن جاتا ہے۔

یہ آداب درحقیقت اس اصول پر مبنی ہیں کہ ان روزانہ کے کاموں کے بجالانے میں ایسی خوبی ملحوظ رکھی جائے، جس سے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو آرام مل سکے اور ایک کے کام کا طریقہ دوسرے کی تکلیف یا ناگواری کا باعث نہ ہو جائے اور یا یہ کہ وہ کام خوبی، خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ انجام پائے، پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی عملی و قولی ہدایات سے مسلمانوں کے لیے اس کا بہترین نمونہ قائم کر دیا ہے۔

دنیا کی دوسری قومیں مذہب ایک جگہ سے اور اپنے آداب و عوائد یعنی ایٹی کیٹ کسی دوسری جگہ سے لیتی رہی ہیں، عیسائی قوموں نے مذہب انجیل سے اور آداب و آئین یونان اور روم سے حاصل کیا۔ لیکن اسلام میں جو مذہب کا سرچشمہ ہے، وہی اس کے آداب و عوائد کا ماخذ بھی ہے، اس لیے اسلام وحشی سے وحشی قوموں میں صرف قرآن اور اپنے پیغمبر کی سیرت لے کر جاتا ہے اور ان کو چند روز میں مہذب اور شائستہ بنا دیتا ہے۔

ہمارے محدثین کرام ﷭ نے ان آداب کی نوعیت کو مکارمِ اخلاق سے الگ کر دیا ہے اور ان کو کتاب الطھارة، کتاب الاطعمة، کتاب الاشربة، کتاب اللباس، کتاب الاستیذان، کتاب الآداب اور کتاب السلام میں درج کیا ہے، ہم صحاح و سنن کی عام کتابوں اور خصوصاً بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد کے ان ہی ابواب سے اس قسم کی تعلیمات کو الگ کر کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

فطری آداب

اسلام دین فطرت ہے، اس لیے اس کے آداب کا بڑا حصہ بھی فطری ہے۔ یعنی فطرۃً وہ پسندیدہ ہیں اور تمام انبیا علیہم السلام نے ان کی پیروی کی ہے۔ یہ ایسے آداب ہیں جو انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں، انسان کو اپنی برہنگی چھپانی پڑتی ہے، اس کے بال بڑھتے ہیں، ناخن بڑھتے ہیں، بدن گندہ ہوتا ہے، کپڑے میلے ہوتے ہیں، تو ان سب چیزوں کی اصلاح شائستہ اور ناشائستہ انسانوں میں فرق پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ "چار چیزیں تمام پیغمبروں کی سنت ہیں، حیا کرنا، عطر لگانا، مسواک کرنا اور نکاح کرنا۔" ❶ ایک روایت میں ختنہ کو بھی اس میں داخل کیا گیا ہے۔

حیا کرنے کا نتیجہ برہنگی کا چھپانا یعنی سترِ عورت اور ضرورت کے وقت پردہ کرنا ہے، عطر لگانا اور مسواک کرنا، صفائی اور طہارت کی تمام اقسام کو بتاتا ہے اور ختنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی مبارک نسل کی سنت ہے، یہاں تک کہ تورات کے بیان کے مطابق یہ اللہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان عہد کی جسمانی نشانی ہے۔ ❷

حضرت ابراہیم علیہ السلام انسانیت کے سب سے پہلے معلم ہیں، ان کے عہد میں دنیا اس عمر کو پہنچ چکی تھی جب کہ اس کو تہذیب و وقار کے آداب بتائے جائیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جسمانی طہارت و نظافت کے مختلف آداب سکھائے گئے، جن کو خصالِ فطرت کہتے ہیں۔ امام بخاری کی ادب المفرد میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے ختنہ کرایا، مونچھیں ترشوائیں اور ناخن کٹائے۔ ❸ ایک حدیث میں ہے، ایک صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "خصالِ فطرت پانچ ہیں، ختنہ کرانا، موئے زیر ناف اور بغل کے بال صاف کرنا اور ناخن اور مونچھ ترشوانا۔" ❹ ایک دوسری حدیث میں یہ آداب دس تک پہنچ گئے ہیں، مونچھ ترشوانا، ڈاڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن ترشوانا، انگلیوں کے درمیان جو جگہ ہے اس کو دھونا، بغل کے بال صاف کرنا، زیر ناف کو صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا۔ راوی کہتا ہے کہ دسویں بات میں بھول گیا، غالباً کلی کرنا ہوگی۔ ❺

فطرت کے یہ آداب اسلامی طہارت کے اصول بن گئے ہیں، چنانچہ وضو میں مسواک کرنا مستحب اور انگلیوں کا دھونا، ناک میں پانی ڈالنا اور کلی کرنے کو واجب قرار دیا گیا ہے۔ ناخن ترشوانا، بال بنوانا، مونچھیں ترشوانا، صفائی کے ضروری لوازم ہیں، جن کے ناخن بڑے اور مونچھیں بڑی ہوتی ہیں، وہ کھانے پینے کی ہر چیز

---

❶ ترمذی، ابواب النکاح، باب ما جاء فی فضل التزویج والحث علیه: ۱۰۸۰۔ ❷ توراة پیدائش، باب: ۱۷، آیات: ۱۱، ۱۲۔ ❸ ادب المفرد، باب الختان للکبیر: ۱۲۵۰۔ ❹ صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب خصال الفطرة: ۵۹۸۔ ❺ صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب خصال الفطرة: ۶۰۴۔

کو گندہ کر کے کھاتے پیتے ہیں، جس سے نہ صرف دوسروں کو کراہت ہوتی ہے، بلکہ خود ان کو بھی طبی طور پر نقصان پہنچتا ہے، یورپ میں ناخن بڑھانا اور ان کو ریت ریت صاف کرنا اور اسی طرح بعض لوگوں میں بڑی بڑی مونچھیں رکھنا حسن سمجھا گیا ہے، مگر یہ دونوں باتیں صریحاً خلاف فطرت ہیں اور کھانے پینے کی گندگی کا باعث ہیں۔ مونچھوں کے بڑھانے کا فیشن یورپ کا آئینہ بدل جانے سے اب کم ہو رہا ہے، مگر ڈاڑھی بڑھانے کے بجائے اس کے منڈانے کا فیشن ابھی اسی طرح قائم ہے، بلکہ اب تو ڈاڑھی اور مونچھ دونوں کے صاف کرنے کا فیشن ترقی پر ہے۔ یہ تمام باتیں اسلامی شعار کے خلاف ہیں اور اس شعار کے مخالف ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لیے مقرر کیا تھا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجوسیوں کے برخلاف تم مونچھیں ترشواؤ اور ڈاڑھی بڑھاؤ۔'' [1] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مشرکوں کے برخلاف تم مونچھیں باریک ترشواؤ اور ڈاڑھی بڑھاؤ۔'' [2] ان تعلیمات کے مطابق اسلامی صورت کو قائم رکھنا غیرت مند مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے۔ اچھی اور بری معلوم ہونے کا تخیل زمانہ کے رسم و رواج کا واہمہ ہے، جس رنگ کی عینک لگائیے، دنیا اسی رنگ کی نظر آئے گی۔

[1] صحیح مسلم، کتاب الطھارۃ، باب خصال الفطرۃ:٦٠٣۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الطھارۃ، باب خصال الفطرۃ:٦٠٢۔

طہارت اور اس کے آداب

تہذیب و شائستگی کی باتوں میں سب سے اہم چیز طہارت اور پاکی ہے۔گو کہ اسلام ایک ایسے ملک میں ظاہر ہوا جہاں پانی بہت کم تھا۔ پھر بھی اس نے بعض خاص حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا۔ زن و شوہر کی ہم بستری کے بعد جب تک دونوں غسل نہ کر لیں، نماز جو فرض ہے ادا نہیں ہو سکتی۔ فرمایا:

﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ﴾ (۵/ المآئدۃ:٦)

''اور اگر تم ناپاک ہو تو نہا کر پاک ہو۔''

کپڑے شرعی طور سے پاک ہوں۔ فرمایا:

﴿ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۪ۙ﴾ (٧٤/ المدثر:٤)

''اور اپنے کپڑے کو پاک کر۔''

اگر پاکی کے لیے پانی نہ مل سکے یا بیماری کے سبب سے پانی استعمال کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کرنا چاہیے:

﴿ فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا ﴾ (۵/ المآئدۃ:٦)

''تو پاک مٹی کا قصد کرو۔''

جب نماز پڑھنا چاہیں تو پہلے ہاتھ، منہ اور پاؤں دھولیں اور بھیگے ہاتھوں کو سر پر پھیر لیں۔ اس کا نام وضو ہے:

﴿ اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ﴾ (۵/ المآئدۃ:٦)

''جب نماز کا ارادہ کرو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھو لو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں دھوؤ۔''

جمعہ کے دن نماز سے پہلے نہانے کا حکم دیا کہ لوگ پاک صاف اور نہا دھو کر جماعت میں شریک ہوں تاکہ کسی کی گندگی اور بدبو سے دوسرے نمازیوں کو تکلیف نہ ہو اور پورا مجمع پاکی اور صفائی کی تصویر ہو۔ قضائے حاجت اور پیشاب کے بعد استنجا اور عضو خاص و مقامِ خاص سے گندگی کو دور کرنا ضروری ٹھہرایا گیا۔

ان احکام سے معلوم ہو گا کہ اسلام میں طہارت اور صفائی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ وہ اللہ کی محبت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ فرمایا:

﴿ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۲)

''اور (اللہ) طہارت کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

اسی طہارت کی پابندی اور دلوں میں طہارت کا خیال پیدا کرنے کے لیے مختلف سنن اور طریقے سکھائے گئے مثلاً:

① آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی شخص سو کر اٹھے تو جب تک تین بار ہاتھ نہ دھولے، اس کو پانی کے برتن میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ کیوں کہ سونے میں معلوم نہیں کہ اس کا ہاتھ کہاں کہاں پڑا ہے''۔ [1] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہم کو اپنے جسم کے ہر عضو کی طہارت کا سوتے جاگتے ہر حالت میں خیال رکھنا چاہیے۔ سونے میں کسی خواب کی وجہ سے بھی اگر انسان ناپاک ہو جائے تو نہانا ضروری قرار دیا گیا۔ [2] ہاتھ کی صفائی پر اس لیے زور دیا گیا کہ برتن سے پانی نکالنے میں ناپاک ہاتھ پانی میں بھیگ کر پانی کو ناپاک نہ کر دے۔ اس لیے خیال رکھنا چاہیے کہ ہاتھ پانی کے برتن میں اس وقت تک نہ ڈبوئے جائیں جب تک ہاتھوں کی طہارت کا یقین نہ ہو۔

② دانتوں کی صفائی جو بہت سی گندگیوں اور بیماریوں کی جڑ ہے، ضروری بتلائی، مسواک کرنا سنت ٹھہرایا۔ فرمایا: ''اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔'' [3] ایک دفعہ کچھ مسلمان حاضر ہوئے جن کے دانت صاف نہ ہونے کی وجہ سے زرد تھے۔ تو فرمایا: ''تمہارے دانت زرد کیوں دیکھ رہا ہوں۔ مسواک کیا کرو۔'' [4]

③ عام راستوں اور درختوں کے سایہ میں قضائے حاجت نہیں کرنا چاہیے۔ [5] یہ اس لیے کہ راستہ چلنے والوں اور درخت کے سایہ میں بیٹھنے والے مسافروں کو اس نجاست اور گندگی سے تکلیف نہ ہو۔

④ ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کر کے پھر اس میں غسل کرنا جائز نہیں۔ ایسے ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل جنابت بھی نہیں کرنا چاہیے۔ [6] بلکہ مجنب کو چاہیے کہ اس سے پانی لے کر غسل کرے۔ کیوں کہ ہماری تھوڑی سی سہل انگاری سے وہ پانی دوسروں کے لیے ناپاک یا قابلِ کراہت، بلکہ عام حالت میں خود اسی کی طبیعت کے لیے گھن پیدا کرے گا۔

⑤ عام طور سے بے ضرورت کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اس حالت میں یہ خوف ہے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر پڑ جائیں، نیز بے ستری کا بھی امکان ہے اور تہذیب و وقار کے بھی خلاف ہے۔ اگر یہ احتمالات نہ ہوں یا زمین بیٹھنے کے قابل نہ ہو تو جائز ہے۔

⑥ پیشاب نرم زمین پر کرنا چاہیے۔ کیوں کہ سخت زمین سے پیشاب کے چھینٹے اڑ کر جسم پر پڑ سکتے ہیں۔

[1] مسلم، کتاب الطهارة، باب كراهية غمس المتوضي وغيره يده: ٦٤٣۔ [2] ابوداود، كتاب الطهارة، باب في الرجل يجد البلة في منامه: ٢٣٦۔ [3] ايضاً، باب السواك: ٤٦۔ [4] مسند أحمد، ج ١، ص: ٢١٤۔

[5] ابوداود، كتاب الطهارة، باب المواضع التي نهى عن البول فيها: ٢٥، ٢٦۔

[6] ايضاً، باب البول في الماء الراكد: ٦٩، ٧٠۔

⑦ غسل خانہ کی زمین میں پیشاب نہیں کرنا چاہیے۔خصوصاً جب کہ وہ کچی ہو۔کیوں کہ جگہ کی گندگی اور ناپاکی سے پانی کی چھینٹیں گندی اور ناپاک ہو کر اڑیں گی اور بدن کو ناپاک کریں گی یا ناپاک ہونے کا وسوسہ دل میں پیدا کریں گی۔

⑧ بول و براز کے بعد استنجا کرنا چاہیے۔ڈھیلے یا کسی اور پاک و جاذب چیز سے صفائی کے بعد پانی سے دھو لینا اچھا ہے۔استنجا بائیں ہاتھ سے کیا جائے۔اس میں داہنا ہاتھ نہ لگایا جائے۔

⑨ طہارت کے بعد پانی کے علاوہ مٹی سے بھی ہاتھ دھونا چاہیے۔ ❶

⑩ ہفتہ میں ایک روز ہر مسلمان پر غسل کرنا، کپڑے بدلنا عطر اور تیل لگانا مستحسن ہے۔بلکہ بعض فقہا اور محدثین کے نزدیک حدیث کے الفاظ کی بنا پر غسل واجب ہے۔

اسلام نے اس کے لیے جمعہ کا دن مقرر کیا ہے، جو مسلمانوں کے عام اجتماع کا دن ہوتا ہے اور اس کی وجہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بیان کی ہے کہ عرب کے لوگ سخت تنگ دست اور پشمینہ پوش تھے اور محنت مزدوری کرتے تھے۔ان کی مسجد نہایت تنگ اور اس کی چھت نہایت پست تھی جو چھپر کی تھی۔ایک بار گرم دن میں رسول اللہ ﷺ جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے آئے تو لوگوں کو اس پشمینہ میں پسینہ آیا اور اس کی بو کے پھیلنے سے ہر شخص کو تکلیف ہوئی، رسول اللہ ﷺ نے یہ بدبو محسوس کی تو فرمایا: ''لوگو! جب یہ دن آئے تو غسل کر لیا کرو اور ہر شخص کو جو بہترین تیل اور خوشبو میسر ہو سکے لگائے۔'' ❷ جمعہ کے علاوہ معمولاً کسی کو بودار چیز مثلاً: لہسن یا پیاز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت بھی فرمائی۔ ❸

⑪ جمعہ کے علاوہ عام حالات میں بھی انسان کو صاف ستھرا رہنا چاہیے۔چنانچہ ایک بار جب رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں تو فرمایا کہ ''اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟'' ایک دوسرے شخص کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ ''اس کو پانی نہیں ملتا تھا جس سے وہ اپنے کپڑے کو دھو لیتا۔'' ❹

اسی کے ساتھ اسلام نے طہارت و نظافت کی تعلیم میں سادگی اور بے تکلفی کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور ایسی تعلیم نہیں دی ہے جو تشدد، غلو اور وہم و وسوسہ کی حد تک پہنچ جائے۔اس بنا پر اسلام نے بعض ان سختیوں کو دور کیا ہے جو اس معاملہ میں اور مذاہب میں پائی جاتی تھیں۔مثلاً: یہودیوں کے مذہب کی رو سے ناپاکوں کی پاکی کے لیے ضروری تھا کہ نہانے کے بعد بھی اس دن کا آفتاب ڈوب لے تب نہانے والا پاک ہو۔لیکن اسلامی تعلیمات کی رو سے انسان کو اس معاملہ میں صرف اس قدر احتیاط کرنی چاہیے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم یا

❶ یہ تمام مسائل کتب سنن کی کتاب الطہارۃ میں دیکھیے۔ ❷ ابوداود، کتاب الطهارة، باب الرخصة في ترك الغسل يوم الجمعة: ٣٥٣۔ ❸ مسلم، كتاب المساجد، باب النهي من اكل ثوما اوبصلا...... : ١٢٥١، ١٢٥٢۔

❹ ابوداود، كتاب اللباس، باب في الخلقان: ٤٠٦٢۔

کپڑے پر نہ پڑنے پائیں۔ اس سے زیادہ احتیاط تشدد اور غلو کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ شدتِ احتیاط کی وجہ سے شیشی میں پیشاب کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بنو اسرائیل کے جسم پر جب پیشاب لگ جاتا تھا تو اس کو قینچی سے کاٹ ڈالتے تھے۔ لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اس تشدد کو ناپسند فرمایا اور کہا کہ کاش وہ اس قدر سختی نہ کرتے۔ کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو معمولی طور پر استنجا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ [1]

یہودیوں کے یہاں یہ بھی دستور تھا کہ جب کوئی عورت ایام سے ہوتی تھی تو اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے اور اس کو گھر سے بالکل الگ کر دیتے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۖ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۲)

"اور (اے پیغمبر ﷺ! لوگ) تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو (ان کو) سمجھا دو کہ وہ گندگی ہے، تو حیض کے دنوں میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک پاک نہ ہو لیں ان سے مقاربت نہ کرو اور جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس آؤ۔"

اس کے مطابق آپ ﷺ نے حکم دیا کہ وقاع کے علاوہ ان سے سب کام لے سکتے ہو اور خود اپنے طرز عمل سے اس کی مثالیں قائم کر دیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اس حالت میں آپ کے بالوں میں کنگھی کرتی تھی اور آپ کے سر کو دھوتی تھی۔ ایک بار آپ ﷺ نے مجھ سے کوئی چیز اٹھا کر مانگی۔ میں نے معذرت کی تو فرمایا: "یہ ناپاکی تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔" [2] ناپاکی کی حالت میں مقدس مقامات مثلاً: مسجد میں نہیں جا سکتے۔ قرآن مجید کو نہیں چھو سکتے۔ اسی اصول کی بنا پر بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حالتِ جنابت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مصافحہ کرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے اجتناب کیا۔ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مسلمان نجس نہیں ہوتا"۔ [3] یعنی مسلمان جنابت اور حاجتِ غسل سے ایسا نجس نہیں ہو جاتا کہ اس کے چھونے سے کوئی دوسرا آدمی یا چیز ناپاک ہو جائے۔

ایک عورت نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ میں عورت ہوں اور میرے دامن لمبے ہوتے ہیں اور میں گندے مقامات میں چلتی ہوں۔ یعنی زمین میں گھسٹنے کی وجہ سے ممکن ہے کہ دامن میں نجاست لگ جاتی ہو۔ بولیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اس کے بعد کی زمین اس کو پاک کر دیتی ہے۔" [4] یعنی اس

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب المسح علی الخفین: ٦٢٥۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب جو از غسل الحائض رأس زوجها: ٦٨٨ تا ٦٩١۔ [3] ابوداود، کتاب الطهارة، باب فی الجنب یصافح: ٢٣٠، ٢٣١۔ [4] ابوداود، کتاب الطهارة، باب الاذی یصیب الذیل: ٣٨٣۔

کے بعد جو خشک اور پاک زمین آتی ہے وہ اس نجاست کو زائل کر دیتی ہے۔ایک عورت نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ مسجد کی طرف ہمارا جو راستہ جاتا ہے وہ بدبودار ہے۔جب بارش ہو تو ہم کیا کریں۔فرمایا کہ ''اس کے بعد اس سے اچھا راستہ نہیں ہے۔؟''بولیں، ہاں ہے۔فرمایا:''تو وہ اس کی تلافی کر دیتا ہے۔'' [1]
غرض اسلام کا اصول یہ ہے کہ خشک زمین پاک ہے اور وہ پانی کی طرح دوسری چیزوں کو بعض حالات میں پاک کرسکتی ہے۔اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ زمین میرے لیے پاک کر دی گئی ہے اور اسی لیے وہ حالت تیمم میں پانی کی قائم مقام ہو جاتی ہے۔جوتا زمین پر رگڑ لینے سے پاک ہو جاتا ہے۔

اسلام نے اس باب میں سب سے زیادہ جو آسانی پیدا کی وہ یہ تھی کہ تیمم کو غسل اور وضو کا قائم مقام کر دیا [2] اور اس کو تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک برکت سمجھا۔

غسل کا طریقہ یہ سکھایا کہ پہلے دونوں ہاتھ دھو لیے جائیں۔پھر کمر سے دھو کر نجاست دور کر لی جائے۔پھر سارے بدن پر پانی بہایا جائے۔آنحضرت ﷺ ضرورت سے غسل اس طرح فرماتے تھے پہلے دونوں ہاتھ دھوتے، پھر داہنے ہاتھ سے پانی بہا کر بائیں ہاتھ سے کمر کے نیچے دونوں طرف دھوتے۔پھر وضو کرتے۔لیکن پاؤں نہیں دھوتے پھر سر پر تین بار پانی بہا کر بال کی جڑوں کو ملتے۔پھر سارے جسم پر پانی بہاتے اور آخر میں پاؤں دھوتے۔ [3]

اسلام میں ہر روز نہانے کا کوئی حکم نہیں ہے اور نہ عرب جیسے ملک میں یہ ہو سکتا تھا۔لیکن اگر کوئی ایسے ملک میں جہاں پانی کی بہتات ہو اور وہ صفائی کے لیے ہر روز نہا لے تو مباح ہے۔آنحضرت ﷺ پانچوں وقت کی نماز کی تمثیل میں فرماتے ہیں کہ ''اگر کسی کے دروازہ پر نہر بہہ رہی ہو اور اس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہایا کرے تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے۔'' [4]

---

[1] ابوداود، کتاب الطهارة، ایضًا: ۳۸۴۔

[2] بیماری یا پانی نہ ملنے کی صورت میں۔ [3] صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب صفة غسل الجنابة: ۷۱۸۔

[4] صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوة، باب الصلوة الخمس کفارة: ۵۲۸۔

کھانے پینے کے آداب

① کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھو لینا چاہیے۔کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے متعلق اگر چہ کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے،لیکن اگر پیالہ میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہو تو سو کر اٹھنے کے بعد پانی کے برتن میں بے ہاتھ دھوئے ہاتھ ڈالنا جس طرح منع ہے۔اسی طرح بے ہاتھ دھوئے کھانے کے برتن میں ہاتھ ڈالنا اچھا نہیں اور ابوداؤد میں بھی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی ایک ضعیف حدیث موجود ہے۔ [1] ایک حدیث میں ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ میں کھانے کی چکنائی لگی رہ جائے اور وہ سو جائے اور کوئی جانور اس کے ہاتھ کو کاٹ لے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''ایسا اسی کی غلطی سے ہوگا اور اس کو اس تساہلی پر اپنے ہی کو ملامت کرنا چاہیے۔'' اس سے یہ معلوم ہوا کہ ادب کی یہ تعلیم اس کے لیے ہے جس کی انگلیاں کھانے میں ملوث ہوتی ہوں۔

② مسلمانوں کا ہر کام اللہ کے نام سے شروع ہونا چاہیے،جیسا کہ حدیثوں میں مذکور ہے اور دنیا کے سب کاموں میں کھانا جو زندگی کی بقا اور جسم کے قیام کا اصلی ذریعہ ہے کتنا بڑا کام ہے۔یہ کام اللہ کے نام کے بغیر شروع نہ ہونا چاہیے۔اس لیے کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لینی چاہیے۔صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ جب ہم کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا تو جب تک آپ ﷺ کھانا نہ شروع کرتے ہم لوگ کھانے میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔لیکن ایک بار ایک بدو دوڑا ہوا آیا اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔پھر اسی طرح ایک لونڈی آئی اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور فرمایا کہ ''جس کھانے پر اللہ کا نام نہیں لیا جاتا شیطان اس کو اپنے لیے جائز کر لیتا ہے۔'' [2] اور اگر کوئی شروع میں بسم اللہ کہنا بھول جائے تو ((بسم اللّٰہ اولہ و آخرہ)) کہہ لے۔ [3]

③ انسان کو ضرورت کے منشا کے مطابق پاک و ناپاک ہر قسم کے کاموں اور چیزوں میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔صفائی کا اقتضا یہ تھا کہ انسان کے دونوں ہاتھ تقسیم کار کے اصول پر الگ الگ کاموں کے لیے خاص کر دیے جائیں۔چنانچہ سب اچھے کاموں کے لیے داہنے ہاتھ کو اور دفعِ نجاست وغیرہ کے لیے بائیں ہاتھ کو خاص کر دیا گیا ہے۔اس تخصیص میں ایک طبی اور فطری مصلحت بھی ہے۔انسان کے زیادہ تر کام فطرۃً پاک اور مباح ہوتے ہیں اور دفعِ نجاست وغیرہ کے کام کبھی کبھی ہوتے ہیں۔اس لیے زیادہ تر کاموں کے لیے اس پہلو کو خاص کیا گیا ہے،جدھر قلب نہیں ہے۔یعنی ''دایاں پہلو'' تاکہ کام کے ہچکولوں اور جھٹکوں سے قلب کو صدمہ نہ پہنچے۔یہی وجہ ہے کہ سب انسان فطرۃً سب کام داہنے ہاتھ سے کرتے ہیں اور بایاں ہاتھ

---

[1] ابوداود، کتاب الاطعمة، باب فی غسل الید من الطعام: ۳۷۶۱۔

[2] ابوداود، کتاب الاطعمة، باب التسمیة علی الطعام: ۳۷۶۶۔

[3] ایضًا: ۳۷۶۷۔

صرف اس کی مدد کے لیے لگاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ داہنے میں زیادہ پھرتی، چستی اور طاقت ہوتی ہے۔اسی لیے کھانا پینا بھی داہنے ہاتھ سے چاہیے۔ ❶ صرف کھانے پینے ہی کی خصوصیت نہیں، بلکہ شریعت نے اکثر باتوں میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔ایک بار آپ ﷺ کے سامنے دودھ پیش کیا گیا۔مجلس میں آپ کے داہنے جانب ایک بدو بیٹھا تھا اور بائیں جانب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔آپ نے دودھ پی کر بدو کی طرف پیالہ بڑھایا اور فرمایا کہ ''ترتیب میں داہنے جانب کا لحاظ ضروری ہے۔'' ❷

ایک بار آپ ﷺ کے دائیں جانب ایک لڑکا اور بائیں جانب بڑے بوڑھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔آپ ﷺ نے کوئی چیز پی تو لڑکے سے کہا کہ ''اگر تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں۔'' اس نے کہا، میں اپنا حصہ کسی کو نہیں دے سکتا۔مجبوراً آپ نے پہلے اسی کو دیا۔ ❸

④ کھانا برتن کے کنارے سے کھانا چاہیے بیچ سے نہیں کھانا چاہیے۔کیوں کہ اس سے ایک تو کھانے کی وہ مقدار جو کھانے سے بچ جائے گی، گندی نہ ہوگی دوسرے یہ کہ برتن گندا نہ ہوگا اور تیسرے یہ کہ اگر کوئی اس طریق سے نہ کھائے تو اس سے اس کی حرص کا پتہ چلتا ہے اور حریص آدمی کبھی سیر نہیں ہوتا۔اسی کو رسول اللہ ﷺ نے برکت سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا کہ ''برکت کھانے کے بیچ میں نازل ہوتی ہے۔'' ❹

⑤ اپنے ساتھیوں کی اجازت کے بغیر کھجور یا انگور وغیرہ کو ایک ساتھ دو دو کر کے نہیں کھانا چاہیے۔ ❺ کیوں کہ اخلاقی حیثیت سے اس سے حرص اور لالچ کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے والے کا منشا یہ ہے کہ جلدی جلدی اس کو اپنے پیٹ میں پہنچا دے، تاکہ کوئی دوسرا آکر شریک نہ ہو جائے اور اگر وہ چند لوگوں کے ساتھ مل کر اس طرح سے کھا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشا یہ ہے کہ وہ جلدی کر کے اپنے سب ساتھیوں سے زیادہ کھا لے۔یہ جذبہ ایثار کے سراسر منافی اور حرص وطمع پر دلیل ہے۔اسی لیے آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے اور اگر کسی ضرورت سے کسی شریک کو ایسا کرنا پڑے تو اس کو دوسرے شریکوں سے پوچھ لینا چاہیے۔

⑥ کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہیے۔کیوں کہ اس سے گھر والوں میں اور کام کرنے والوں میں بات بات میں عیب نکالنے والے کی طرف سے چڑ اور نفرت پیدا ہوتی ہے اور اس سے گھر کا کام سدھرنے کی جگہ اور بگڑتا ہے۔اس لیے اگر اتفاق سے کھانا بدمزہ پکا ہو تو اگر خواہش ہو تو کھا لینا چاہیے ورنہ چھوڑ دینا چاہیے۔ ❻

⑦ سب کا مل کر ایک ساتھ کام کرنا تمدن کی بنیاد اور حسن معاشرت کا ذریعہ ہے۔اسی لیے آنحضرت ﷺ

---

❶ ابوداود، كتاب الاطعمة، باب الاكل باليمين:٣٧٧٦-٣٧٧٧- ❷ صحيح بخاري، كتاب الاشربة، باب الايمن فالايمن في الشرب:٥٦١٩- ❸ ايضًا:٥٦٢٠- ❹ ترمذي، ابواب الاطعمة، باب ماجاء في كراهية الاكل من وسط الطعام:١٨٠٥- ❺ سنن ترمذي، ابواب الاطعمة، باب في كراهية القران بين التمرتين: ١٨١٤-
❻ بخاري، كتاب الاطعمة، باب ماعاب النبي ﷺ طعاما قط:٥٤٠٩-

نے اس کو پسند فرمایا ہے کہ دوست احباب یا گھر کے لوگ کھانا ایک ساتھ مل کر کھائیں۔ جیسا کہ قرآن پاک (۲۴/النور:۶۱) میں ہے۔ الگ الگ کھانا بھی جائز ہے اور ایک ساتھ بھی۔ لیکن ایک ساتھ مل کر کھانے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ برکت ہوتی ہے۔ اس طرح کھانا زیادہ برباد نہیں ہوتا۔ کوئی تھوڑا کھاتا ہے کوئی زیادہ کھاتا ہے سب مل کر برابر ہو جاتے ہیں اور ہر شخص کو تھوڑی بہت ہر چیز پہنچ جاتی ہے۔ پھر اس سے گھر والوں کا ایثار ثابت ہوتا ہے اور گھر کے مالک کا تشخص اور امتیاز جو غرور کی نشانی ہے، مٹتا ہے۔ اس سے گھر والوں اور عزیزوں اور دوستوں میں محبت ہوتی ہے۔ ایک بار صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم کھاتے ہیں، لیکن آسودہ نہیں ہوتے۔ فرمایا: ''غالباً تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا، ہاں۔ فرمایا کہ ''ایک ساتھ کھاؤ اور بسم اللہ پڑھ لو تو برکت ہوگی۔'' ❶

⑧ کھانا ٹیک لگا کر بیٹھ کر یا منہ کے بل لیٹ کر نہیں کھانا چاہیے۔ ❷ کیوں کہ روحانی کیفیت کے علاوہ یہ طبی حیثیت سے اس لیے مضر ہے کہ اس طرح غذا معدہ میں اچھی طرح سے بآرام نہیں پہنچتی ہے۔ کھانے کے لیے بیٹھنے کی مسنون صورتیں یہ ہیں کہ یا تو ایک پاؤں کھڑا کر کے اور دوسرے پاؤں کو گرا کر اسی پر بیٹھ کر کھایا جائے یا دوزانوں بیٹھ کر اور اگر جگہ کم ہو اور لوگ زیادہ ہوں تو اکڑوں بیٹھ کر۔ ❸ آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا میں بندہ ہوں، غلاموں کی طرح کھاتا ہوں یعنی خاکساری سے۔'' ❹

⑨ کھانا اپنے سامنے سے کھانا چاہیے۔ ادھر ادھر ہاتھ نہیں بڑھانا چاہیے۔ ❺ خصوصاً جب کئی آدمی ایک ہی برتن میں ساتھ ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کھانا ہاتھ سے گندا نہیں ہوتا۔ دوسرے ہر شخص کا اپنا حصہ الگ ہو جاتا ہے اور دوسرے کے کھانے میں کوئی اچھا ٹکڑا اتفاقاً پڑ گیا ہے تو اس کے لیے لالچ سے بچتا ہے اور ایثار سیکھتا ہے۔

⑩ کھانا کھانے کے بعد برتن کو انگلیوں سے اور انگلیوں کو منہ سے اچھی طرح صاف کر لینا چاہیے اور اس کے بعد رومال سے ہاتھ پونچھنا چاہیے۔ ❻

⑪ پانی ٹھہر ٹھہر کر دو تین سانس میں پینا چاہیے۔ ❼ اس طرح پانی پینے سے پوری سیری ہوتی ہے اور ضرورت کے مطابق انسان پانی پیتا ہے اور اندر سے نکلنے والی گندی سانس پانی میں نہیں لگنے پاتی۔

⑫ پانی کے برتن میں سانس نہیں لینی چاہیے۔ ❽ کیوں کہ ممکن ہے کہ منہ یا ناک سے تھوک وغیرہ نکل کر

---

❶ ابوداود، کتاب الاطعمة، باب فی الاجتماع علی الطعام:۳۷٦٤۔ ❷ ابوداود، کتاب الاطعمة فی الاکل متکئا: ۳۷٦۹۔ ❸ ابوداود، کتاب الاطعمة: ۳۷۷۰ وابن ماجه کتاب الاطعمة: ۳۲٦۳ وشرح سفر السعاد فصل فی طعامه، ص: ۸۷ فیروزآبادی للشیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ ❹ ابو داود وابن ماجه مع زرقانی علی السیر ج ٤، ص: ۳۹۸۔ ❺ بخاری، کتاب الاطعمة، باب التسمیة علی الطعام:۵۳۷٦۔ ❻ بخاری، کتاب الاطعمة، باب لعق الاصابع: ۵٤۵٦۔ ❼ بخاری، کتاب الاشربة، باب الشرب بنفسین اوثلاثة:۵٦۳۱ ❽ ابوداود، کتاب الاشربة، باب فی النفخ فی الشراب: ۳۷۲۸۔

برتن میں پڑ جائے اور وہ آدمی کو مکروہ معلوم ہو۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ ہر سانس جو اندر سے باہر آتی ہے وہ بدن کی کثافتوں کو لے کر باہر نکلتی ہے۔ اس لیے اس سانس سے ملی ہوئی چیز کو پھر اندر نہیں کرنا چاہیے۔

⑬ پانی بے ضرورت کھڑے ہو کر نہیں پینا چاہیے۔ [1] کیوں کہ یہ وقار کے خلاف ہے اور طبی حیثیت سے بھی مضر ہے۔ البتہ کبھی کبھی اگر کوئی پی لے تو کچھ حرج نہیں۔ کیوں کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کبھی کھڑے کھڑے پانی پی لیا ہے۔ [2] مگر اس کی عادت نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں کہ پانی پینے میں ضرورت ہے کہ اندر کے پٹھے ذرا ڈھیلے ہو جائیں اور یہ بات بیٹھ کر پانی پینے سے حاصل ہوتی ہے۔ البتہ زمزم کا پانی برکت، دعا اور شاید تعظیم کی خاطر کھڑے ہو کر پینا مسنون ہے۔

⑭ پانی مشکیزہ کے منہ یا پیالہ کے سوراخ سے نہیں پینا چاہیے۔ [3] کیوں کہ اس سے اول تو پانی کی مقدار کا اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنا پی لیا پھر یہ دیکھا نہیں جا سکتا کہ اس کے اندر کوئی مضر چیز تو نہیں۔

⑮ کھانے اور پانی کے برتنوں کو ڈھانک کر رکھنا چاہیے۔ [4] تا کہ اس میں گرد و غبار یا کوئی نجس چیز یا کوئی کیڑا مکوڑا نہ پڑنے پائے یا کوئی جانور پانی نہ پینے پائے۔

⑯ کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے کھلایا اور پلایا۔ اس موقع پر کی مختلف دعائیں حدیثوں میں آتی ہیں۔ جن میں سے ایک مختصر دعا یہ ہے: ((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ)) ''یعنی اس خدا کا شکر ہے جس نے کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا۔'' [5]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب فی الشرب قائما: ٥٢٧٧۔ [2] بخاری، کتاب الاشربة، باب الشرب قائما: ٥٦١٦۔ [3] صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب استحباب تخمیر الاناء……: ٥٢٧٢؛ بخاری، ٥٦٢٩۔ [4] صحیح مسلم، کتاب الاشربة: ٥٢٤٦۔ [3] عمل الیوم واللیلة ابن السنی، باب مایقول اذا اکل: ٤٦٤ نوٹ من المسلمین کے بجائے مسلمین کے الفاظ ہیں۔

آدابِ مجلس

آدابِ مجلس میں اصولی بات یہ ہے کہ مجلس میں تہذیب اور وقار کی شکل پیدا ہو اور شرکائے مجلس میں سے ہر ایک کا حق برابر ہو، تاکہ یہ مجلس شرکا کی باہمی محبت بڑھانے کا سبب ہو۔ ان ہی دو باتوں کو قائم رکھنے کے لیے آنحضرت ﷺ کی شریعت نے نشست و برخاست کے کچھ آداب سکھائے ہیں۔

① مجلس میں انسان کو جہاں بے تکلف پہلے جگہ مل جائے، یعنی جہاں تک نشست کا دائرہ اس کے آنے تک پہنچ چکا ہے، وہیں بیٹھ جانا چاہیے، یہ نہیں کرنا چاہیے کہ مجمع کو چیر کر خواہ مخواہ آگے بیٹھنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اس سے ایک تو پہلے سے آنے والوں اور بیٹھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے اور دوسرے ایسا کرنے والوں میں غرور و نخوت پیدا ہوتی ہے۔ اور اپنے تشخص کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کی مجلسوں میں اسی طریقہ سے بیٹھتے تھے۔ ❶ انتہا یہ ہے کہ مسجدوں میں بعد کے آنے والے نمازیوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ لوگوں کو روندتے ہوئے آگے کی صف میں بیٹھنے کی کوشش کریں۔ جمعہ کی نماز میں یہ خاص طور سے دیکھنے میں آتا ہے۔ اسی لیے تخطی رقاب یعنی دوسروں کی گردنوں کو روند کر اور زیر قدم لا کر آگے بڑھنے کو جمعہ میں خاص طور سے منع کیا گیا ہے۔

② مجلس میں کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ❷ اس سے تفوق پسندی اور خود بینی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرے کے دل میں کدورت پیدا ہوتی ہے۔

③ اگر کوئی شخص مجلس میں ایک جگہ بیٹھ کر کسی ضرورت سے خود اٹھ جائے تو پلٹنے کے بعد وہی اس جگہ کا مستحق ہے۔ ❸ دوسرا اس جگہ نہیں بیٹھ سکتا۔ کیونکہ وہ اس پر پہلے قابض ہو چکا تھا اور اس کا یہ حق عارضی طور سے اٹھ جانے سے چلا نہیں جاتا۔

④ اگر مجلس میں دو شخص باہم مل کر بیٹھے ہوئے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ❹ کیوں کہ اکثر دو شخص اس طرح باہم آپس میں بات چیت کرنے کے لیے یا کسی اور مصلحت باہمی سے بیٹھتے ہیں اور ان دونوں میں موانست اور بے تکلفی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کا الگ کر دینا ان کے تکدر اور وحشت کا باعث ہوتا ہے۔

⑤ اگر کچھ لوگ مجلس میں حلقہ باندھ کر بیٹھے ہوئے ہوں تو کسی کو اس حلقہ کے وسط میں نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ایسے شخص پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت بھیجی ہے۔ ❺ کیوں کہ اس حالت میں کچھ لوگوں کی طرف

---

❶ ادب المفرد، باب یجلس الرجل حیث انتھی: ۱۱۴۱۔

❷ ترمذی، ابواب الاستئذان، باب ماجاء فی کراھیۃ ان یقام الرجل من مجلسه ثم یجلس فیه: ۲۷۴۹، ۲۷۵۰۔

❸ ترمذی، ابواب الاستئذان، باب ما جاء اذا قام الرجل من مجلسه ثم رجع ...... : ۲۷۵۱۔

❹ ترمذی، ابواب الاستئذان، باب ما جاء فی کراھیۃ الجلوس بین الرجلین بغیر ...... : ۲۷۵۲۔

❺ ترمذی، ابواب الاستئذان، باب ماجاء فی کراھیۃ القعود وسط الحلقة: ۲۷۵۳۔

اس کا منہ ہوگا اور کچھ لوگوں کی طرف پیٹھ ہوگی، جو ایک قسم کی بدتمیزی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسخرے لوگ اس طرح بیٹھتے ہوں، تا کہ سب کو ہنسا سکیں اور یہ صورت تہذیب و وقار کے خلاف ہے۔

⑥ مجلس میں کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہیں رہنا چاہیے۔ [1] کیوں کہ یہ عجمیوں کی عادت تھی کہ نوکر چاکر، آقا اور رعایا، بادشاہ کے گرد کھڑی رہتی تھی اور یہ ایک ایسی مبالغہ آمیز تعظیم تھی جس کا ڈانڈا شرک سے مل جاتا تھا۔ اس طرح ایک شخص گویا اللہ بنتا تھا اور دوسرے اس کے آگے اپنی شخصی خودداریوں اور عزتِ نفس کو فنا کر دیتے تھے، جو اسلام جیسے مساوات پسند مذہب میں اچھا نہیں سمجھا جا سکتا۔

⑦ راستہ میں نہیں بیٹھنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ وقار کے خلاف ہے۔ اور ہر آنے والے کو تکنا بداخلاقی ہے۔ لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو ایسے موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''چند اخلاقی باتوں کی پابندی کرنی چاہیے۔ یعنی نگاہ نیچی رکھنا، ضرر رساں چیزوں کو راستہ سے دور کرنا، سلام کا جواب دینا، نیکی کا حکم دینا، بری باتوں سے روکنا، راستہ بھولے ہوؤں کو راستہ دکھانا اور مصیبت میں مارے ہوؤں کی مدد کرنا۔'' [2]

⑧ انسان پر سب سے زیادہ صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ اس لیے اپنے ہم نشینوں کے انتخاب میں اس کا ضرور لحاظ رہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں جن کی صحبت سے اس کو فائدہ پہنچے۔ ہر انسان جس کی صحبت کو پسند کرتا ہے، اس سے خود انسان کی فطری استعداد اور فطری مناسبت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ روحیں ایک مخلوط فوج ہیں۔ جن میں باہم آشنائی ہوتی ہے۔ ان میں الفت و موانست پیدا ہو جاتی ہے اور جن میں بیگانگی ہوتی ہے ان میں تفریق و اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ [3] ایک مشہور مثل ہے کہ ''اگر کسی کے اخلاق کا پتہ لگانا چاہو تو اس کے دوستوں کے اخلاق کا پتہ لگاؤ''۔ اس نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے کہ ''آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے۔'' اس لیے ہر شخص کو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کرتا ہے۔ پھر فرمایا کہ ''اچھے ہم نشین اور برے ہم نشین کی مثال مشک بیچنے والے اور لوہار کی بھٹی کی ہے۔ مشک بیچنے والے سے تم کو کچھ فائدہ ضرور پہنچے گا یا اس کو خرید و گے یا اس کی خوشبو پاؤ گے۔ لیکن لوہار کی بھٹی تمہارا گھر یا کپڑا جلائے گی یا تمہارے دماغ میں اس کی ناگوار بو پہنچے گی۔'' [4]

مجلس میں جو معزز جگہ ہو وہاں بیٹھنے کی از خود کوشش نہ کی جائے۔ کسی دوسرے کے یہاں جائے تو بھی اس کی اجازت کے بغیر اس کی معزز جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہ کرے۔ فرمایا کہ ''اپنے بھائی کی معزز جگہ پر اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہ بیٹھے۔'' [5]

---

[1] ابوداود، کتاب الادب، باب فی قیام الرجل یقوم للرجل من مجلسه: ٤٨٢٧، ٤٨٢٨۔

[2] ابوداود، کتاب الادب، باب فی الجلوس بالطرقات: ٤٨١٥ تا ٤٨١٧۔

[3] ادب المفرد، باب الارواح جنود مجندة: ٩٠٠، ٩٠١۔

[4] بخاری، کتاب البیوع، باب فی العطار وبیع المسك: ٢١٠١۔

[5] ترمذی، ابواب الاستذان، باب حدیث لا یؤم الرجل...... : ٢٧٧٢۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مجلس میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس معزز جگہ میں نہیں تو اس سے جس قدر قریب جگہ ہو اسی میں بیٹھیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صدر نشین کے پاس جگہ بہت تنگ ہو جاتی ہے اور لوگوں کو وہاں سے ذرا سرکنے اور دوسروں کے لیے جگہ بنانے کے لیے کہا جائے تو وہ برا مانتے ہیں۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس ادب کو خود سکھایا۔فرمایا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَإِذَا قِيلَ انْشُزُوا فَانْشُزُوا يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴾ (۵۸/ المجادلة:۱۱)

’’اے مسلمانو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کشادگی کرو تو کشادگی کرو۔اللہ تمہارے لیے کشادگی کرے گا۔اور اگر کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جاؤ اللہ ان کے رتبے اونچے کرے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا اور اللہ تمہارے کاموں کی خبر رکھتا ہے۔‘‘

اسی طرح مجلس میں بیٹھ کر اس طرح آپس میں کانا پھوسی نہیں کرنی چاہیے کہ دوسرے حاضرین کو یہ معلوم ہو کہ آپ ان ہی کی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں۔منافقوں کے اس طرز عمل کی برائی قرآن پاک میں برملا کی ہے:

﴿ إِنَّمَا النَّجْوَىٰ مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ الَّذِينَ آمَنُوا ﴾ (۵۸/ المجادلة:۱۰)

’’یہ جو ہے کانا پھوسی سو شیطان کا کام ہے کہ دل گیر کرے ایمان والوں کو۔‘‘

جہاں چند آدمی بیٹھے ہوں وہاں کوئی دو آدمی آپس میں ایسی سرگوشی کرنے لگتے ہیں تو دوسروں کو یہ برا معلوم ہوتا ہے ایک تو یہ خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے ہم کو اس راز کے قابل نہیں سمجھا، دوسرے یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ وہ شاید ہماری ہی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں۔اسی لیے ارشاد ہوا کہ ’’تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں کہ اس سے تیسرا غمگین ہوگا‘‘۔ [1]

مجلس کی راز کی باتوں کو برملا نہیں بیان کرنا چاہیے کہ ((المجالس بالامانة)) قول نبوی ﷺ ہے۔ [2]

---

[1] ابوداود، کتاب الادب، باب فی التناجی:۴۸۵۱۔ [2] ایضًا، باب فی نقل الحدیث:۴۸۶۹۔

آداب ملاقات

اسلام میں معاشرتی حیثیت سے دوستوں کی ملاقات کے لیے جانا ایک ثواب کا کام ہے۔ایک حدیث میں ہے کہ ''جس شخص نے کسی مریض کی عیادت کی یا اپنے بھائی کی (جس کی اخوت فی اللہ ہو) ملاقات کو گیا تو ایک پکارنے والا اس کو آواز دے گا کہ تم اچھے، تمہارا آنا اچھا اور تم نے جنت میں اپنے لیے ایک مکان بنالیا۔'' [1]

اسلام نے ملاقات کے جو آداب مقرر کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

[1] دوستوں کی ملاقات کے وقت چہرہ سے خوشدلی اور مسرت ظاہر کرنی چاہیے۔اسی لیے فرمایا کہ ''تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا یہ بھی صدقہ ہے''۔ [2] ملاقات کے وقت سب سے پہلے جو کلمہ منہ سے نکلے وہ محبت اور امن وسلامتی کا پیام ہو، جس کو شریعت نے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ (تم پر سلامتی ہو) کے لفظوں میں ترتیب دیا ہے۔چھوٹے بڑے کو، بڑے چھوٹے کو سب سے پہلے یہی پیام دیں۔

دنیا کی تمام قوموں میں ملاقات کے وقت خوشی اور محبت کے ظاہر کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی لفظ یا فقرہ کہنے کا رواج تھا اور ہے۔عرب کے لوگ ملاقات کے وقت انعم اللّٰہُ بكَ عینا ، وانعم اللّٰہ بك صباحا کہتے تھے۔یعنی تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔تمہاری صبح خوشگوار ہو۔امراوسلاطین کے لیے دوسرے الفاظ تھے۔ایرانی ''ہزار سال بزی'' ہزار برس جیو، کا فقرہ کہتے تھے۔یورپ کے لوگوں میں صبح کو ''گڈ مارننگ'' (اچھی صبح) شام کو گڈ ایوننگ (اچھی شام) رات کو گڈ نائٹ (اچھی رات) وغیرہ کہنے کا رواج ہے۔مگر اسلام نے سب کے بجائے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کا لفظ ایجاد کیا اور اس میں حسب ذیل مصلحتیں ملحوظ رکھیں۔

① یہ تمام انبیا علیہم السلام کا متفقہ طریقہ ہے۔جیسا کہ قرآن پاک میں اس کے استعمالات سے جو انبیا علیہم السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں ﴿ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ ﴾ (۱۹/مریم:۳۳) یا ان کے متعلق کہے گئے ہیں ﴿ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ (۳۷/الصافات:۱۸۱) ظاہر ہوتا ہے۔

② اس کی صورت ذکر ودعا کی ہے، دنیوی تمتعات مثلاً: طولِ عمر وغیرہ سے اس کو تعلق نہیں اور نہ محدود و معین اوقات سے مقید ہے، اس میں دائمی اور سرمدی سلامتی کا راز چھپا ہے۔

③ اس میں مذہبی شان زیادہ پائی جاتی ہے، کیونکہ اس سلامتی سے مقصود جس کی طرف اسلام کا الف لام اشارہ کرتا ہے وہ سلامتی ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر نازل ہوتی ہے۔

④ اس میں مبالغہ آمیز تعظیم نہیں پائی جاتی جو بندگی، کورنش، آداب عرض اور دوسرے قسم کے غیر مشروع

---

[1] ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء فی زیارة الاخوان:۲۰۰۸۔

[2] ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی صنائع المعروف:۱۹۵۶۔

طریقوں میں پائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے کہا کہ میں نے حیرہ والوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں، تو آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم لوگ آپ کو سجدہ کریں تو آپ نے اس کی اجازت نہیں دی [1] ایک اور شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! جب ہم میں سے کوئی اپنے بھائی یا دوست سے ملتا ہے تو کیا اس کے لیے جھک جائے، فرمایا: ''نہیں۔'' اس نے کہا: تو کیا اس سے لپٹ جائے اور اس کا بوسہ لے فرمایا: ''نہیں'' (یہ ممانعت اسی موقع سے مخصوص ہے جہاں کوئی شرعی محذور ہو مثلاً: ملنے والا امرد ہو، یا کوئی اور شہوت انگیز صورت ہو) اس نے کہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اس سے مصافحہ کرے؟ فرمایا: ''ہاں۔'' [2]

⑤ دنیا میں انسان کو جو بہتر سے بہتر دعا دی جاسکتی ہے وہ اسی سلامتی کی ہے کہ یہ جان و مال، آل واولاد، دنیا اور آخرت ہر قسم کی سلامتی پر مشتمل ہے۔

⑥ جب دو انسان آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے سے بے گانگی کے سبب سے متوحش اور چوکنے ہوتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں غفلت پا کر دشمنی نہ کرے، اب جب کہ اسلام کے قاعدہ کے مطابق دونوں اس لفظ کو اپنے اپنے منہ سے ادا کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

⑦ اسلام نے اپنے پیرووں کے درمیان اس کو گویا آپس میں پہچان کی علامت اور ''واچ ورڈ'' مقرر کیا ہے، آمنے سامنے جب دو زبانوں سے یہ لفظ نکلتے ہیں تو دونوں اپنے سینوں میں ہزار بے گانگی کے باوجود آشنائی کی ایک لہر پاتے ہیں اور آپس میں محبت کی کشش محسوس کرتے ہیں، یہ بتاتا ہے کہ دونوں ایک ہی ملتِ محمدیہ کے ایمانی فرزند ہیں۔

جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے جو تعلیم دی وہ یہ تھی:

((یاایھاالناس افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنة بسلام)) [3]

''لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ اور جب تمام لوگ سو رہے ہوں تو نماز پڑھو، یہ سب کرو گے تو جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔''

ایک دوسری حدیث میں سلام کی غرض و غایت بھی بیان فرما دی اور فرمایا کہ ''تم لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہوگے جب تک ایمان نہ لے آؤ اور اس وقت تک ایمان نہ لاؤ گے جب تک آپس میں محبت نہ کرو، میں تم کو ایک ایسی بات بتاتا ہوں کہ جب تم اس پر عمل کرو گے تو باہم محبت کرنے لگو گے اور وہ یہ

[1] ابوداود، کتاب النکاح، باب فی حق الزوج علی المرأۃ: ۲۱۴۰۔ [2] ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی المصافحۃ: ۲۷۲۸۔ [3] ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ، حدیث: أفشوا السلام: ۲٤۸۵۔

ہے کہ باہم سلام کو پھیلاؤ۔'' ❶

سلام کرنے کے لیے شناسا وغیر شناسا، جانے اور انجان کی تخصیص نہیں۔ ❷ مرد اور عورت کی تفریق نہیں ❸ بڑے اور بچہ کی تمیز نہیں ❹ البتہ اسلام نے سلام کی ابتدا کرنے کے لیے دو اصول کو ملحوظ رکھا ہے، جو تمام متمدن قوموں میں رائج تھے، ایک یہ کہ چھوٹا ادب و احترام کا لحاظ کرے اور اس اصول کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ چھوٹا بڑے کو، گزرنے والا بیٹھنے والے کو اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے، دوسرا یہ کہ سلام کے ذریعہ سے تواضع وخاکساری کا اظہار ہو، اس اصول کی بنا پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سوار کو پیدل چلنے والے کو سلام کرنا چاہیے۔ ❺

ان مصالح کے لحاظ سے آپ ﷺ نے اپنے اہل وعیال کو بھی گھر میں جانے کے وقت سلام کرنے کا حکم دیا اور اس کو موجب برکت قرار دیا۔ ❻ مجلس سے اٹھ کر جاتے وقت بھی لوگوں کو سلام کرنا چاہیے۔ ❼ سلام میں رحمۃ اللہ وبرکاتہ، کے الفاظ کا اضافہ کرنا اور بھی موجب ثواب ہے، چنانچہ ایک بار ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا ''السلام علیکم'' آپ نے فرمایا: ''اس کو دس نیکیاں ملیں۔'' دوسرا آدمی آیا تو کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' آپ نے فرمایا: ''اس کو بیس نیکیاں ملیں۔'' تیسرا آدمی آیا اور اس نے کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کو تیس نیکیاں ملیں۔'' ❽

جس شخص کو سلام کیا جائے اس کا یہ فرض ہے کہ سلام کا جواب اسی طریق سے بلکہ اس سے بہتر طریقہ سے دے، یعنی سلام کرنے والے نے جو الفاظ کہے ہیں، ان پر دوسرے مناسب الفاظ کا اضافہ کرے، ورنہ کم از کم وہی الفاظ دہرا دے، چنانچہ خود قرآن مجید نے یہ تعلیم دی ہے:

﴿ وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ﴾ (٤/ النسآء:٨٦)

''اور (مسلمانو!) جب تم کو کسی طرح پر سلام کیا جائے تو تم (اس کے جواب میں) اس سے بہتر (طور پر) سلام کرو یا (کم سے کم) ویسا ہی جواب دو۔''

اس سے کم الفاظ میں سلام کا جواب دینا اگرچہ فقہا کے نزدیک جائز ہے، لیکن آیت کا ظاہری مفہوم

❶ ترمذی، كتاب الاستئذان، باب ما جاء فی افشاء السلام: ٢٦٨٨۔
❷ بخاری، كتاب الاستئذان، باب السلام للمعرفة وغير المعرفة: ٦٢٣٦۔
❸ بخاری، كتاب الاستئذان، باب تسليم الرجال على النساء والنساء على الرجال: ٦٢٤٨۔
❹ بخاری، كتاب الاستئذان، باب التسليم على الصبيان: ٦٢٤٧۔
❺ بخاری، كتاب الاستئذان، باب فی يسلم الراكب على الماشی: ٦٢٣٢۔
❻ ترمذی، كتاب الاستئذان، باب ما جاء فی التسليم اذا دخل بيته: ٢٦٩٨۔
❼ ترمذی، كتاب الاستئذان، باب ما جاء فی التسليم عند القيام وعند القعود: ٢٧٠٦۔
❽ ترمذی، كتاب الاستئذان، باب ما ذكر فی فضل السلام: ٢٦٨٩۔

یہی ہے کہ استحساناً یہ نا کافی ہے۔

2 ملاقات کے وقت اظہارِ محبت اور اظہارِ مسرت کا دوسرا ذریعہ مصافحہ ہے اور اس سے سلام کے اغراض کی تکمیل ہوتی ہے، اس لیے اسلام نے اس کو بھی سلام کا ایک جزو قرار دیا اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اسلام کا تکملہ ہاتھ کا پکڑنا یعنی مصافحہ کرنا ہے۔'' 1 مدینہ میں سب سے پہلے یہ تحفہ اہل یمن لائے، 2 اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو قبول کر لیا اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور اتحاد کا ایک ذریعہ قرار دیا۔ بعض حالات میں ملاقات کے وقت معانقہ کرنے یا بوسہ دینے کی جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے ممانعت آئی ہے، لیکن اگر شرعی مجبوری نہ ہو تو اس کی اجازت بھی ہے، چنانچہ ایک بار حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کو گلے سے لگا لیا اور ان کا بوسہ لیا۔ 3

کسی محبوب و محترم شخص کو آتے ہوئے دیکھ کر جوشِ محبت اور جوشِ عقیدت میں کھڑا ہو جانا بھی ممنوع نہیں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آتی تھیں تو آپ کھڑے ہو جاتے تھے، ان کا ہاتھ چومتے تھے اور اپنی جگہ ان کو بٹھاتے تھے اور جب آپ ان کے یہاں آتے تھے تو وہ بھی یہی برتاؤ کرتی تھیں، ایک موقع پر جب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو بیمار اور زخمی تھے، آئے تو آپ نے تمام صحابہ کو حکم دیا کہ اٹھ کر جائیں اور ان کو لے آئیں۔ 4

دوسری قوموں میں ملاقات اور مجلس کے وقت بعض مشرکانہ قسم کے آداب جاری تھے، اسلام نے ان کو یک قلم منسوخ کر دیا، ایک طریقہ یہ تھا کہ لوگ محبت کے بجائے غلامانہ اور بندگی کی ذہنیت سے اپنے امیروں اور بادشاہوں کے لیے کھڑے ہوتے تھے اور اسی طرح کھڑے رہ جاتے تھے، آپ ﷺ نے اس سے منع کیا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے لیے ایسے نہ کھڑے ہوا کرو جیسے عجمی کھڑے ہوتے ہیں۔ 5

اس قسم کے موقعوں پر خوش آمدید کے الفاظ مثلاً: مرحبا کہنے کی مثال بھی شریعت میں موجود ہے۔ 6

3 ملاقات یا کسی اور کام کے لیے کسی کے گھر میں جانے کے لیے صاحبِ خانہ سے اجازت لے لینا ضروری ہے اور اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں دیا ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَدْخُلُواْ بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُواْ وَتُسَلِّمُواْ عَلَىٰٓ أَهْلِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ فَإِن لَّمْ تَجِدُواْ فِيهَآ أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ ۖ

1 ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی المصافحة: ۲۷۳۰۔

2 ابو داود، کتاب الادب، باب فی المصافحة: ۵۲۱۳۔

3 ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ماجاء فی المعانقة والقبلة: ۲۷۳۲۔

4 یہ دونوں واقعے ابو داود، کتاب الادب، باب فی القیام: ۵۲۱۵، ۵۲۱۷ میں ہیں۔

5 ابوداود، کتاب الادب، باب یقوم الرجل یقوم للرجل یعظمه بذلك: ۵۲۳۰۔

6 ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی مرحبا: ۲۷۳٤۔

وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝﴾

(٢٤/ النور:٢٧_٢٨)

''مسلمانو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں گھر والوں سے پوچھے اوران سے سلام علیک کیے بغیر نہ جایا کرو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (یہ حکم تم کو اس غرض سے دیا گیا ہے) کہ (جب ایسا موقع ہو تو) تم (اس کا خیال رکھو) پھر اگر تم کو معلوم ہو کہ گھر میں کوئی آدمی موجود نہیں تو جب تک تمھیں (خاص) اجازت نہ ہو، ان میں نہ جاؤ اور اگر (گھر میں کوئی ہو اور) تم سے کہا جائے کہ (اس وقت موقع نہیں) لوٹ جاؤ تو (بے تامل) لوٹ آؤ، یہ (لوٹ آنا) تمہارے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔''

غیر محرم عورتوں سے ملنے کے لیے ان کے شوہروں سے اجازت لینے کی ضرورت ہے۔ [1]

کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لیے اجازت لینے کے اگرچہ اور بھی بہت سے فائدے ہو سکتے ہیں، لیکن اس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ وہ یہ پسند نہیں کرتا، کہ دوسروں کی نگاہ اس پر پڑے، یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی کے مکان پر جاتے تھے، تو چونکہ اس وقت دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا، [2] اس لیے اجازت لینے سے پہلے دروازہ کے دائیں یا بائیں کھڑے ہوتے تھے، سامنے نہیں کھڑے ہوتے تھے [3] تاکہ اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑے، ایک بار ایک شخص آئے اور آپ کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''دروازہ کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو، کیونکہ اجازت لینے کا حکم اسی لیے دیا گیا ہے کہ گھر کے اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑنے پائے۔'' [4] ایک حدیث میں ہے کہ ''اگر بلا اجازت کوئی شخص کسی کے گھر میں تاک جھانک کرے اور کوئی اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر الزام نہیں۔'' [5] ایک بار کسی نے آپ کے حجرہ میں تاک جھانک کی، آپ اس وقت ایک لوہے کی کنگھی سے سر جھاڑ رہے تھے، فرمایا: ''اگر میں یہ جانتا کہ تم دیکھ رہے ہو تو اس کو تمہاری آنکھوں میں کونچ دیتا۔'' پھر فرمایا:

((انما جعل الاذن من قبل البصر)) یا فرمایا: ((انما جعل الاستئذان من اجل البصر))

---

[1] ترمذی، کتاب الادب، باب ما جاء فی النھی عن الدخول علی النساء الاباذن ازواجھن: ٢٧٧٩۔

[2] ابوداود، کتاب الادب، باب الاستئذان فی العورات الثلاث: ٥١٩٢۔

[3] ادب المفرد، باب کیف یقوم عند الباب: ١٠٧٨۔ [4] ابو داود، کتاب الادب، باب فی الاستئذان: ٥١٧٤۔

[5] ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی الاستئذان قبالة البیت: ٢٧٠٧ وبخاری، کتاب الدیات، باب من اطلع فی بیت قوم ففقئوا عینیه فلادیة له: ٦٩٠١، ٦٩٠٢۔

’’یعنی اجازت کی ضرورت تو اسی لیے ہے کہ اس کو دیکھو نہیں۔‘‘ ❶

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کرکے یہ کہے کہ میں اندر آ سکتا ہوں؟ ❷ تین بار سلام کرنے کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو واپس جانا چاہیے، ❸ البتہ اگر کسی کو خود بلایا جائے تو اس کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں، ❹ اگر کوئی شخص گھر کے دالان میں بیٹھا ہوا ہو اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہو تو اس وقت بھی اجازت لینا غیر ضروری ہے، ❺ دوکانوں میں جانے کے لیے اور اسی قسم کے دوسرے پبلک مقامات میں بھی اجازت لینا ضروری نہیں، ❻ خود اپنے گھر کے اندر بھی سلام کرکے جانا چاہیے، اس سے برکت کے علاوہ یہ فائدہ ہوگا کہ اگر گھر میں عورتیں بے تکلفی کی حالت میں ہوں گی یا گھر میں غیر محرم عورتیں آ گئیں ہیں تو وہ ہوشیار ہو جائیں۔

یہ آداب تو اجنبی اور ناآشنا لوگوں کے لیے تھے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے پردہ کرنا ضروری نہیں اور وہ ہر وقت گھر میں آتے جاتے رہتے ہیں، مثلاً: چھوٹے چھوٹے بچے یا لونڈی غلام، اس لیے اگر ان کے لیے بھی ہر وقت اجازت لینے کی ضرورت ہو تو اس سے بڑی تکلیف ہوگی، البتہ خاص خاص اوقات میں جن میں لوگ اکثر بے پردہ رہتے ہیں، ان کے لیے بھی اذن طلب کرنا ضروری ہے اور خود قرآن مجید نے ان اوقات کی تعیین کر دی ہے، یعنی نمازِ عشاء کے بعد سے نمازِ صبح سے پہلے تک کہ کپڑے اتار کر سونے کا وقت ہے اور دوپہر کو جب قیلولہ کے لیے کوئی لیٹے کہ یہ بھی تخلیہ کا وقت ہے، فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ؕ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ ﴾ (۲٤/ النور:٥٨۔٥٩)

’’مسلمانو! تمہارے ہاتھ کے مال (یعنی لونڈی غلام) اور تم میں سے جو سن بلوغ کو نہیں پہنچے، تین وقتوں میں تمہارے پاس آنے کی تم سے اجازت لے لیا کریں، (ایک تو) نمازِ صبح سے پہلے اور (دوسرے) جب تم دوپہر کو (سونے کے لیے معمول کے مطابق) کپڑے اتار دیا

❶ اس کتاب کے ’’اسلام کا فلسفہ اخلاق‘‘ کے ذیلی عنوان ’’تجسس اور غیبت کی ممانعت‘‘ میں اس حدیث کے لفظ یہ لکھے گئے ہیں: انما الاذن لاجل الرؤية مگر صحیح لفظ یہ ہیں جو یہاں نقل کیے گئے ہیں، دیکھیے صحیح بخاری، كتاب الاستئذان، باب الاستئذان من اجل البصر: ٦٢٤١ وكتاب الديات باب من اطلع فى بيت قوم...: ٦٩٠١۔

❷ ابوداود، كتاب الادب، باب كيف الاستئذان: ٥١٧٧۔ ❸ ابوداود، كتاب الادب، باب كم مرة يسلم الرجل فى الاستئذان ٥١٨٠۔ ❹ ادب المفرد، باب دعاء الرجل اذنه: ١٠٧٤تا١٠٧٦۔ ❺ ادب المفرد، باب مالا يستاذن فيه: ١٠٩٧۔ ❻ ادب المفرد، باب الاستئذان فى حوانيت السوق: ١٠٩٨۔

کرتے ہو اور (تیسرے) نماز عشاء کے بعد (یہ) تین وقت تمہارے پردے کے وقت ہیں، ان (اوقات) کے سوا نہ (تو بے اذن آنے دینے میں) تم پر کچھ گناہ اور نہ (بے اذن چلے آنے میں) ان پر (کچھ گناہ کیونکہ وہ) اکثر تمہارے پاس آتے جاتے ہیں (اور) تم میں سے بعض کو (یعنی لونڈی غلاموں کو) بعض (یعنی تمہارے پاس آنے جانے کی ضرورت لگی ہی رہتی ہے، (تو بار بار اذن مانگنے میں تم لوگوں کو بڑی تکلیف ہوگی) یوں اللہ (اپنے) احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے اور (مسلمانو! جب تمہارے لڑکے حد بلوغ کو پہنچیں تو جس طرح ان سے اگلے (یعنی ان سے بڑی عمر کے گھروں میں آنے کے لیے) اذن مانگا کرتے ہیں، اسی طرح ان کو بھی اذن مانگنا چاہیے۔''

آدابِ گفتگو

آدابِ گفتگو میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نرمی سے گفتگو کریں۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ تو اس سے نرمی کے ساتھ باتیں کرو:

﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا ﴾ (۲/ طٰہٰ: ٤٤)

''تو تم ان سے نرم بات کہنا۔''

پھر جو بات کہی جائے وہ بھی اچھی ہو، فائدہ مند ہو۔ اس کے کہنے میں اپنا یا دوسرے کا نفع ہو، اسی لیے فرمایا:

﴿ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۳)

''اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔''

مجلس میں بیٹھیں تو ایسے فقرے نہ کہیں جن میں کسی پر کوئی طعن چھپا ہو یا کسی کی تحقیر نکلتی ہو۔ یہود آنحضرت ﷺ کی مجلس میں آتے تو اسی قسم کی باتیں کہتے "انظرنا" (ہمارا خیال کیجئے) کی جگہ "راعنا" کہتے، جس میں تخفیف کا چھپا پہلو نکلتا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے باز رکھا، فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۰٤)

''اے ایمان والو! ''راعنا'' نہ کہو، انظرنا'' کہو''۔

اس کی پوری تفصیل سورۂ نساء رکوع ۷ میں ہے۔

باتیں ایسی کرنی چاہییں جو منصفانہ اور درست ہوں، اگر جماعت کے بیشتر افراد اس کا لحاظ رکھیں تو آپس میں لڑائی جھگڑا بہت کم ہو اور لوگوں کے درمیان دشمنی اور عداوت نہ پیدا ہو، فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۙ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۷۰۔۷۱)

''اے ایمان والو! اللہ سے تقویٰ کرو اور بات سیدھی کہو، اللہ تمہارے کاموں کو سنوارے گا اور تمہارے گناہ معاف کرے گا۔''

عورتوں کو جب نامحرم مردوں سے گفتگو کا اتفاق ہو تو بات میں اور لہجہ میں ایسی نزاکت اور لوچ نہ ہو کہ سننے والے کے دل میں بدی کا خیال پیدا ہو، فرمایا:

﴿ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۚ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۳۲)

''تو (اے نبی کی بیویو!) دبی زبان سے بات نہ کیا کرو، ایسا کرو گی تو جس کے دل میں کسی

طرح کا کھوٹ ہے وہ اللہ جانے تم سے کس طرح کے توقعات پیدا کر لے گا اور بات کرو تو معقول بے لاگ۔"

مردوں کو نرم، معقول اور دل جوئی کے ساتھ باتیں کرنے کی تاکید آئی اور اس کا ثواب صدقہ کے برابر بتایا ہے، فرمایا:

﴿ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶۳)

"نیک بات کہنی اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو۔"

بات کی جائے تو آہستگی کے ساتھ، بے موقع چیخ کر باتیں کرنا حماقت کی دلیل ہے، فرمایا:

﴿ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴾ (۳۱/ لقمان:۱۹)

"اور کچھ اپنی آواز پست کر کہ سب آوازوں میں بری آواز گدھوں کی ہے۔"

فضول باتوں سے پرہیز کرنا وقار کی نشانی ہے، مسلمانوں کی صفت یہ ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۳)

"اور جو لغو سے اعراض کرتے ہیں۔"

کیونکہ انسان جو بات بھی منہ سے نکالتا ہے، اس پر اللہ کا فرشتہ گواہ رہتا ہے، اللہ فرماتا ہے:

﴿ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴾ (۵۰/ قٓ:۱۸)

"آدمی کوئی لفظ نہیں بولتا لیکن ایک نگران اس پر حاضر رہتا ہے۔"

اس لیے ہر شخص بات منہ سے نکالنے سے پہلے اس کے ہر پہلو کو سوچ لے۔

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ نیک بات کہے یا چپ رہے۔" [1] اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے کی قید کے ساتھ حضور کا یہ فرمانا ادھر اشارہ کرتا ہے کہ ہم اپنے عمل کی جزا سے غفلت نہ کریں، کیونکہ جب ہم بری بات بولیں گے تو اس کی جزا بھی پائیں گے، ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو مطلب نہ ہو ادھر توجہ نہ دے۔" [2] یہ حدیث ان جوامع الکلم میں سے ہے جو دیکھنے میں تو بہت مختصر ہیں، مگر درحقیقت اس کوزہ میں دریا بند ہے، مسلمان اگر اسی بات کا دھیان رکھیں تو مسلمانوں کے بہت سے کام بن جائیں۔

زبان انسان کو اظہارِ مطلب کے لیے ملی ہے، اسی لیے ضروری ہے کہ پہلے مطلب یعنی گفتگو کا مقصود

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الحث علی اکرام الجار و الضیف: ۱۷۳، ۱۷۴۔

[2] ترمذی، ابواب الزھد، باب من حسن اسلام المرء: ۲۳۱۷، ۲۳۱۸؛ ابن ماجه، کتاب الفتن: ۳۹۷۶۔

معنی درست اور صحیح ہوں، پھر ان کے اظہار کا طریقہ مناسب ہو اور یہ دونوں باتیں اعراض عن اللغو میں داخل ہیں، اگر کوئی مخاطب ایسا ہو جو ان دو باتوں میں سے کسی ایک میں کمی کرے تو اسلام کی ہدایت ہے کہ ایسے جاہل کا جواب بھی تلخ نہ دیا جائے اور اپنی سلامت روی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾ (۲۵/ الفرقان:۶۳)

''اور جب ناسمجھ ان کو خطاب کریں تو وہ جواب میں سلامتی کی بات کہیں۔''

گفتگو بضرورت کرنی چاہیے، احادیث میں ایسے لوگوں کی بہت برائی آئی ہے جو فضول باتیں کرتے ہوں اور بکواس میں مبتلا رہتے ہوں اور فرمایا کہ ''ایسے لوگ امت کے بدترین افراد ہیں۔'' ❶ یہ بھی فرمایا کہ اسی ایک بات سے یا تو اللہ تعالیٰ کی تا قیامت خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے اور یا اس کی تا قیامت ناراضی ہاتھ آتی ہے۔ ❷ یہ حدیث ہم کو اپنی گفتگو کے ہر لفظ کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ دین اور دنیا کے بہت سے کاموں کا رخ صرف زبان کے سبب سے ادھر یا ادھر پھر جاتا ہے، یہی زبان نیکی کا ذریعہ بھی ہے اور یہی برائی کا آلہ بھی ہے، اس سے دین بھی سدھرتا ہے اور دنیا بھی اور اسی سے دونوں کے کام بگڑ بھی جاتے ہیں، اسی لیے آیا ہے کہ ''جو دونوں جبڑوں کے بیچ یعنی زبان پر پورا قابو رکھے گا، وہ جنت میں جائے گا۔'' ❸

مخاطب کو جو بات اچھی طرح سمجھانی ہو اس کو صفائی اور سہولت کے ساتھ کہا جائے، بلکہ اس کو دہرا کر کہا جائے، تا کہ وہ اچھی طرح سمجھ جائے، اسی غرض سے جب رسول اللہ ﷺ کوئی بات کہتے تھے تو تین بار اس کا اعادہ فرماتے تھے ❹ اور گفتگو اتنی جلدی جلدی نہیں کرتے تھے کہ مخاطب ہر لفظ کے مفہوم کو اپنی گرفت میں نہ لا سکے۔ ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بڑی تیزی کے ساتھ حدیث بیان کرنی شروع کی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس پر اعتراض کیا کہ رسول اللہ ﷺ ایسی تیزی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے، بلکہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کے گفتگو کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپ ﷺ کے الفاظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا۔ ❺ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے کلام میں ترتیل و ترسیل پائی جاتی تھی، یعنی ہر لفظ جدا جدا ہوتا تھا اور گفتگو میں عجلت نہیں فرماتے تھے، اسی مفہوم کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس طرح ادا فرماتی ہیں:

كان كلام رسول الله ﷺ كلامًا فصلاً يفهمه كل من سمعه. ❻

''رسول اللہ ﷺ کا کلام ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتا تھا اور جو شخص اس کو سنتا تھا سمجھ

---

❶ ادب المفرد، باب فضول الكلام: ۱۳۰۸۔ ❷ مؤطا امام مالك، كتاب الكلام، باب ما يؤمر به من التحفظ في الكلام: ۱۸۴۸؛ بخاری، كتاب الرقاق: ۶۴۷۷؛ مسلم، كتاب الزهد: ۷۴۸۱، ۷۴۸۲۔

❸ مؤطا امام مالك، كتاب الكلام، باب ما جاء في ما يخاف من اللسان: ۴/ ۱۸۵۔ ❹ ابوداود، كتاب العلم، باب تكرير الحديث: ۳۶۵۳۔ ❺ ابو داود، كتاب العلم، باب في سرد الحديث: ۳۶۵۴۔

❻ ابوداود، كتاب الادب، باب الهدى في الكلام: ۴۸۳۹۔

لیتا تھا۔''

گفتگو نہایت مختصر الفاظ میں کرنی چاہیے، ایک بار ایک شخص نے نہایت طویل گفتگو کی یا طویل خطبہ دیا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے سنا تو فرمایا کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتا تو اس کے لیے بہتر ہوتا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مجھ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں گفتگو میں اختصار کروں، کیونکہ اختصار بہتر ہے۔'' ❶

گفتگو یا تقریر سے بعض اوقات فخر ومباہات اور شہرت مقصود ہوتی ہے، بعض اوقات اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا جاتا ہے، کبھی اس سے صرف تفریح مقصود ہوتی ہے، ان اغراض کے حاصل کرنے کے لیے لوگ نہایت مسجع، مقفی اور تکلف آمیز تقریر کرتے ہیں، گفتگو کو طول دیتے ہیں، چبا چبا کے باتیں کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ان تمام باتوں کی ممانعت کی اور فرمایا کہ ''اللہ اس بلیغ آدمی کو مبغوض رکھتا ہے جو اپنی زبان کو اس طرح توڑتا مروڑتا ہے، جس طرح بیل اپنی زبان کو توڑ مروڑ کے گھاس کھاتا ہے''۔ نیز فرمایا کہ ''جو شخص اسلوب کلام میں اس لیے ادل بدل کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے، ❷ اللہ قیامت کے دن اس کا فدیہ و توبہ نہ قبول کرے گا۔'' ❸

جب چند لوگوں کے سامنے کوئی بات کہی جائے تو التفات ایک ہی طرف نہ رہے، بلکہ ٹھہر ٹھہر کر ہر ایک کی طرف منہ کیا جائے، تاکہ دوسروں کو عدم التفات کی شکایت نہ پیدا ہو جائے۔ ❹

---

❶ ابوداود، کتاب الادب، باب ما جاء فی التشدق فی الکلام: ۵۰۰۸۔

❷ یعنی حق کی تبلیغ نہیں بلکہ اپنی تعریف کرانی مقصود ہو۔

❸ ابوداود، کتاب الادب، باب ما جاء فی التشدق فی الکلام: ۵۰۰۶۔

❹ ادب المفرد، باب اذا احدث الرجل القوم لا یقبل علی واحد: ۱۳۰۴۔

باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب

آدمی کو راستہ میں متانت، سنجیدگی اور خاکساری کے ساتھ قدم اٹھانا چاہیے، اللہ اچھے مسلمانوں کی تعریف میں فرماتا ہے:

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا ﴾ (۲۵/ الفرقان:۶۳)

''اور رحمت والے اللہ کے بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں۔''

اکڑ کر نہیں چلنا چاہیے، یعنی چال میں غرور اور تکبر کے انداز نہ ہوں، فرمایا:

﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآءیل:۳۷)

''اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، (کہ اس طرح چل کر) نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں تک اونچائی میں پہنچ سکتا ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴾ (۳۱/ لقمان:۱۸)

''اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، بے شک اللہ مغرور اور فخار کو پسند نہیں کرتا۔''

عورت کو بجنے والے زیور مثلاً: پازیب، چھڑے یا چھانجھ پہن کر چلنے میں زمین پر زور زور سے پاؤں نہیں رکھنا چاہیے، کیونکہ اس کی آواز سے سننے والوں میں انتشارِ خیال پیدا ہوتا ہے، عرب کی عورتیں مردوں کے سامنے سے گزرتی تھیں تو اپنے پازیب کی آواز سنانے کے لیے زور زور سے زمین پر پاؤں رکھتی تھیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت کی اور فرمایا:

﴿ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۭ ﴾ (۲۴/ النور:۳۱)

''اور (چلنے میں) اپنے پاؤں ایسے زور سے نہ رکھیں کہ (لوگوں کو) ان کے اندرونی زیور کی خبر ہو۔''

شریف عورت جب بضرورت گھر سے باہر نکلے تو کسی بڑی چادر یا برقع سے اپنا سارا جسم سر سے پاؤں تک چھپا لے، جس سے اس کی اصلی پوشاک اور زیب و زینت کی ساری چیزیں چھپ جائیں اور چادر یا نقاب کا کچھ حصہ منہ پر بھی آ جائے، تاکہ ہر مرد کو معلوم ہو جائے کہ یہ شریف خاتون ہے، لونڈی نہیں۔ پھر نگاہیں شرم سے جھکی رہیں:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَاۗءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۭ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵۹)

''اے پیغمبر ﷺ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو کہہ دے کہ نیچے لٹکا لیں

اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں، اس سے لگتا ہے کہ پہچانی پڑیں، ❶ تو کوئی نہ ستائے۔"

﴿ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ ﴾

(۲٤/ النور:۳۱)

"اور اے پیغمبر ﷺ! ایمان والیوں کو کہہ دے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنا ستر چھپائیں اور اپنا سنگار نہ دکھائیں، مگر جو (فطرۃً کھلا رہتا ہے اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں اور اپنا سنگار نہ دکھائیں، لیکن شوہر (وغیرہ محرم) کو۔" (اخیر تک پڑھیے)

اسی اصول پر عورت کو کوئی تیز خوشبو لگا کر باہر نہیں نکلنا چاہیے، ❷ کیونکہ اس سے میلانِ طبع پیدا ہوتا ہے اور عورت کا یہ خیال برملا ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں اور کسی عورت کا ایسا خیال شرافتِ نسوانی کے خلاف ہے۔

راستہ میں مرد اور عورت کو مل جل کر نہیں چلنا چاہیے، اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے کی ممانعت فرمائی ہے، عورتوں کو وسط راہ سے الگ ہو کر راستے کے کنارے سے چلنا چاہیے۔ ایک بار راستہ میں مرد اور عورت باہم مل جل گئے تو آپ ﷺ نے یہ حکم دیا اور اس کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ عورتیں راستہ کی ادھر ادھر کی دیوار سے لگ کر چلنے لگیں۔ ❸

راستہ چلنے میں ادب اور وقار کا پورا خیال رہنا چاہیے، یہاں تک کہ اگر مسجد میں جماعت ہو رہی ہو تو بھی جماعت میں ملنے کے لیے متانت کے خلاف دوڑنا نہیں چاہیے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اگر مسجد میں تکبیر ہو رہی ہو یا نماز کھڑی ہو چکی ہو تو دوڑ کر اس میں شامل نہ ہو، بلکہ تم متانت اور وقار کے ساتھ آ کر جماعت میں ملو۔" ❹

مقدور ہو تو پاؤں کے بچاؤ اور طہارت اور پاکیزگی کے لیے جوتے پہنے جائیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اکثر جوتے پہنا کرو، یعنی جوتے پہن کر چلا کرو کہ جوتا پہننے والا بھی ایک طرح کا سوار ہوتا ہے۔" ❺

جوتے دونوں پاؤں میں پہن کر چلنا چاہیے یا دونوں پاؤں ننگے رہیں، یعنی یہ نہیں کرنا چاہیے کہ ایک پاؤں میں جوتا ہو اور دوسرا پاؤں ننگا ہو۔ ❻ کیونکہ یہ ادب ووقار کے خلاف ہے، ایسے شخص کو لوگ احمق اور سفیہ سمجھیں گے لیکن اگر گھر میں کوئی اس طرح دو چار قدم چل لے تو کوئی حرج نہیں۔ ❼

---

❶ یعنی لوگ جان لیں کہ یہ شریف خواتین ہیں، ان کو کوئی راستہ میں چھیڑے نہیں۔ ❷ ترمذی، ابواب الاستئذان، باب ماجاء فی كراهية خروج المرأة متعطرة:۲۷۸٦۔ ❸ ابوداود، كتاب الادب، باب فی مشی النساء مع الطریق فی الطریق:۵۲۷۲۔ ❹ صحیح مسلم، كتاب المساجد، باب استحباب إتيان الصلوة بوقار: ۱۳٦۰۔

❺ ابو داود، كتاب اللباس، باب الانتعال:٤١٣٣۔ ❻ ایضًا:٤١٣٦۔

❼ ترمذی، كتاب اللباس، باب ماجاء فی الرخصة فی المشی فی النعل الواحدة:۱۷۷۷، ۱۷۷۸۔

آدابِ سفر

آنحضرت ﷺ نے جس زمانہ میں سفر فرمایا، اس وقت زمانہ کے حالات اور سواریوں کے طریقے اور تھے، اس لیے اس کے آداب عرب کی سرزمین، عرب کی آب و ہوا اور عرب کی عام اگلی حالت سے موزونیت و مطابقت رکھتے تھے۔ عرب کی زمین خشک، بنجر اور پتھریلی، پانی کی قلت، ہوا کی گرمی، دھوپ کی تمازت، قتل و غارت گری کی وجہ سے قدم قدم پر جان کا خطرہ، ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر آنحضرت ﷺ نے سفر کے متعلق چند مفید ہدایتیں کی ہیں، جن میں سے بعض کی حالات کے بدل جانے سے اس زمانہ میں پابندی ضروری نہیں، تاہم جہاں اب بھی وہ حالات باقی ہیں، ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، بالخصوص دیہات وقصبات کے لوگ ان سے زیادہ متمتع ہو سکتے ہیں، جن کو زیادہ تر پیدل سفر کرنا پڑتا ہے اور صحرا و بیابان کے راستوں میں ضروریاتِ زندگی کے وہ ساز و سامان میسر نہیں آتے جن کی اسٹیشنوں اور ہوٹلوں میں بہتات ہوتی ہے۔

① سفر کے وقت مسافر کو رخصت کرنا چاہیے اور اس کو خیر و عافیت کی کوئی نیک دعا دینی چاہیے اور ہو سکے تو اس وقت وہ خاص دعا پڑھنا چاہیے، جس کو رسول اللہ ﷺ فوج کے رخصت کرتے وقت پڑھا کرتے تھے: [1]

((اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكُمْ وَاَمَانَتَكُمْ وَخَوَاتِيْمَ اَعْمَالِكُمْ))

''یعنی تمہارے دین، امانت اور خاتمہ عمل اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔''

② سفر صبح کے تڑکے کرنا چاہیے، [2] اس سے انسان کا وقت ضائع نہیں ہوتا، بلکہ پورا دن کام میں آ جاتا ہے اور وہ دھوپ کی شدت اور ہوا کی گرمی سے محفوظ رہتا ہے اور ایک معتد بہ مسافت طے کر کے دوپہر کے وقت آرام کر سکتا ہے۔

③ سفر تنہا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ کم از کم تین آدمی ساتھ ہونے چاہییں۔ [3] اس سے انسان بہت سے خطرات سے محفوظ رہتا ہے اور اسبابِ سفر کی حفاظت و نگرانی میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

④ اگر تین آدمی ایک ساتھ سفر کریں تو ان میں ایک کو اپنا امیر بنا لینا چاہیے۔ [4] اسی شخص کو کاروان سالار کہتے ہیں۔

⑤ سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر میں داخل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ گھر والوں کو تیاری کا تھوڑا موقع دینا چاہیے۔ [5]

---

[1] ابو داود، كتاب الجهاد، باب في الدعاء عند الوداع: ٢٦٠١۔

[2] ابو داود، كتاب الجهاد، باب في الابتكار في السفر: ٢٦٠٦۔

[3] ابو داود، كتاب الجهاد، باب في الرجل يسافر وحدة: ٢٦٠٧۔

[4] ابو داود، كتاب الجهاد، باب في القوم يسافرون يؤمرون احدهم: ٢٦٠٨، ٢٦٠٩۔

[5] ابو داود، كتاب الجهاد، باب في الطروق: ٢٧٧٦۔

⑥ اگر کوئی معزز یا محبوب شخص سفر سے واپس آئے تو اس کا استقبال کرنا چاہیے۔ ❶

⑦ سفر رات کو کرنا چاہیے، حدیث میں اس کی مصلحت یہ بتائی گئی ہے کہ رات کو مسافت خوب طے ہوتی ہے، ❷ اور درحقیقت لو، گرمی اور دھوپ کے نہ ہونے سے اس وقت آدمی نہایت تیزی کے ساتھ چل سکتا ہے، بہرحال عرب کی سرزمین کے لحاظ سے اسلام نے سفر کے لیے دو مناسب وقتوں کا مشورہ دیا ہے، صبح کا وقت اور رات کا وقت۔

⑧ مسافر کو سفر میں سواری کے جانوروں کے آرام وآسائش کا خیال رکھنا چاہیے۔

⑨ رات کو مقام راستہ سے الگ ہو کر کرنا چاہیے، کیونکہ راستہ سے جانور گزرتے رہتے ہیں اور موذی جانوروں کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ ❸

⑩ جب سفر کی ضرورت پوری ہو جائے تو فوراً واپس آ جانا چاہیے، کیونکہ سفر بہرحال تکلیف اور بے اطمینانی کی چیز ہے۔ ❹

---

❶ ابو داود، کتاب الجهاد، باب في التلقي: ۲۷۷۹۔ ❷ ابو داود، کتاب الجهاد، باب في الدلجة: ۲۵۷۱۔

❸ مسلم، کتاب الامارة، باب مراعاة مصلحة الدواب في السير ...... ۴۹۵۹، ۴۹۶۰۔

❹ مسلم، کتاب الامارة، باب السفر قطعة من العذاب: ۴۹۶۱۔

آدابِ خواب

نیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات اور احسانات میں شمار کیا ہے اور فرمایا ہے:

﴿ وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمۡ بِالَّيۡلِ ﴾ (۳۰/ الروم:۲۳)

''اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک تمہارا رات کو سونا ہے۔''

سورۂ فرقان میں فرمایا:

﴿ وَهُوَ الَّذِىۡ جَعَلَ لَـكُمُ الَّيۡلَ لِبَاسًا وَّالنَّوۡمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوۡرًا‏ ﴾

(۲۵/ الفرقان:۴۷)

''اور اسی نے تمہارے لیے رات کو پردہ، نیند کو آرام اور دن اٹھ کھڑے ہونے کو بنایا۔''

سورۂ نبا میں ہے:

﴿ وَّجَعَلۡنَا نَوۡمَكُمۡ سُبَاتًا ۙ‏ وَّجَعَلۡنَا الَّيۡلَ لِبَاسًا ۙ‏ وَّجَعَلۡنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ‏ ﴾

(۷۸/ النبا:۹۔۱۱)

''اور ہم نے نیند کو تمہارے لیے آرام اور رات کو پردہ اور دن کو کاروبار بنایا۔''

ان آیتوں کا اشارہ یہ ہے کہ نیند کے لیے رات کا وقت ہے اور دن کا وقت کاروبار اور محنت کے لیے ہے۔ یعنی دن کا بڑا حصہ محنت اور کام میں گزرے، البتہ دوپہر کو گرمی کے سبب سے کچھ دیر اہلِ عرب آرام کرتے تھے، جس کو قیلولہ کہتے تھے، جس کا ذکر سورۂ نور میں ہے:

﴿ وَحِيۡنَ تَضَعُوۡنَ ثِيَابَكُمۡ مِّنَ الظَّهِيۡرَةِ ﴾ (۲۴/ النور:۵۸)

''اور رات آرام میں گزاری جائے اور ہو سکے تو اس کے کچھ حصوں میں اللہ کی یاد کی جائے۔''

جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے، غرض یہ ہے کہ جو آرام طلب لوگ دن کو رات اور جو عیش پسند لوگ رات کو دن بناتے ہیں، وہ دونوں قدرت کے حکموں کی خلاف ورزی کرتے ہیں، یہاں تک کہ ساری رات عبادتوں میں جاگ جاگ کر کاٹنا بھی پسندیدہ نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے۔'' [1] یہ تو عام افراد کے لیے ہے، لیکن خاصانِ الٰہی ایسے بھی ہو سکتے ہیں، جن کی تعریف اس آیت میں کی گئی ہے:

﴿ كَانُوۡا قَلِيۡلًا مِّنَ الَّيۡلِ مَا يَهۡجَعُوۡنَ‏ ﴾ (۵۱/ الذاریات:۱۷)

''یعنی تھے وہ رات کو تھوڑا سوتے۔''

① سنت نبوی نے سونے اور جاگنے کے طریقے اور اوقات بتا دیے ہیں، نماز عشاء پڑھنے سے پہلے سونا

[1] بخاري، كتاب النكاح، باب لزوجك عليك حق:۵۱۹۹۔

نہیں چاہیے، کیونکہ اس سے پہلے سو جانا غفلت کی نشانی ہے اور نماز عشاء پڑھ کر پھر فضول بات چیت نہیں کرنی چاہیے، بلکہ ضروری کاموں سے اگر کوئی باقی رہ گیا ہو فارغ ہو کر فوراً سو جانا چاہیے۔ [1] یہ اس لیے، تاکہ صبح تڑکے آنکھ کھل جائے اور اخیر رات میں اللہ کی عبادت میں نیند کی کمی کے سبب سے سستی نہ ہو۔

لیکن اگر کوئی ضروری یا مفید کام پیش ہو تو نماز عشاء کے بعد اس کے لیے بات چیت کرنا منع نہیں، چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں نماز عشاء کے بعد بعض ضروری کاموں میں مشورہ کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں اور آپ نے بات چیت فرمائی ہے۔ [2]

② احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لینا چاہیے، پھر داہنی کروٹ لیٹنا چاہیے۔ [3]

③ ایسی چھت پر نہیں سونا چاہیے، جس پر منڈیر یا جالی نہ لگی ہو۔ [4] کیونکہ ایسی حالت میں زمین پر گر پڑنے کا اندیشہ ہے۔

④ پاکی کی حالت میں سونا چاہیے، بلکہ سونے سے پہلے وضو کر لینا اچھا ہے۔ [5]

⑤ پیٹ کے بل نہیں سونا چاہیے۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو اسی طرح سوتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ "سونے کا یہ طریقہ اللہ کو پسند نہیں۔" [6]

⑥ ایک پاؤں کو اٹھا کر اس پر دوسرے پاؤں کو رکھ کر لیٹنا نہیں چاہیے [7] کیونکہ عرب کے لوگ عموماً تہبند باندھتے ہیں، اس لیے اس میں کشف عورت کا احتمال ہے، البتہ اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے۔ کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار خود رسول اللہ ﷺ اس طریقہ سے لیٹے تھے۔ [8]

⑦ سونے کے وقت گھر کا دروازہ بند کر لینا چاہیے۔ کھانے پینے کے برتن کو ڈھانک دینا چاہیے، چراغ کو بجھا دینا چاہیے، کیونکہ بعض اوقات تیل کی خاطر چوہے چراغ کی بتی کو اٹھا لے جاتے ہیں۔ جس سے گھر میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے۔ یہی حال آگ کا بھی ہے۔ ایک بار مدینہ میں رات کو کسی کے گھر میں آگ لگ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "آگ تمہاری دشمن ہے، جب سوؤ تو اس کو بجھا دیا کرو۔" [9]

---

[1] ابوداود، کتاب الادب، باب فی السمر بعد العشاء: ٤٨٤٩۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب اکرام الضیف: ٥٣٦٥۔ [3] ابوداود، کتاب الادب، باب ما یقول عندالنوم: ٥٠٥٠۔

[4] ابوداود، کتاب الادب، باب فی النوم علی السطح: ٥٠٤١۔

[5] ابوداود، کتاب الادب، باب مایقال عند النوم، ٥٠٤٦تا٥٠٤٨ وباب فی النوم علی طهارة: ٥٠٤٢۔

[6] ابوداود، کتاب الادب، باب فی الرجل ینبطح علی بطنه: ٥٠٤٠۔

[7] ترمذی، ابواب الاستئذان، باب ماجاء فی کراهیة فی ذلك: ٢٧٦٦۔

[8] ترمذی، ابواب الاستئذان، باب ما جاء فی وضع احدی الرجل علی الاخری مستلقیا: ٢٧٦٥۔

[9] بخاری، کتاب الاستئذان، باب لاتترك النار فی البیت عند النوم: ٦٢٩٤ وباب غلق الابواب باللیل: ٦٢٩٦ مگر یہ اس حالت کے متعلق ہے جب گھر کی چھتیں پست ہوں اور بتی کا پرانا دیا جلایا جائے۔

⑧ سوتے اور سوکر اٹھتے وقت کوئی مسنون دعا پڑھنی چاہیے، سب سے مختصر دعا یہ ہے کہ سوتے وقت کہے:

((اَللّٰھُمَّ بِاسْمِكَ اَحْیٰی وَاَمُوْتُ))

''اے اللہ! میں تیرے نام سے جیتا اور مرتا ہوں۔''

اور جاگے تو کہے:

((اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ)) [1]

''اس کی حمد ہو جس نے مرنے کے بعد مجھے پھر جلایا اور جس کی طرف اٹھ کر جانا ہے۔''

حدیثوں میں اس موقع کے لیے اور بہت سی مؤثر دعائیں منقول ہیں۔

[1] ابوداود، کتاب الادب، باب مایقول عند النوم:٥٠٤٩۔

آدابِ لباس

لباس سے اصلی مقصد دو ہیں، ایک جسمانی اور دوسرا اخلاقی ۔ جسمانی یہ ہے کہ جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیفوں سے بچایا جائے اور اخلاقی یہ ہے کہ انسان کے بدن کے جن حصوں پر غیروں کی نظر نہیں پڑنی چاہیے وہ چھپے رہیں۔ اسلام کے علاوہ شاید کوئی اور مذہب نہیں جس نے برہنگی کو اعتراض کے قابل سمجھا ہو، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے ستر پوشی کو مذہب کا ایک ضروری جزو ٹھہرایا، یہاں تک کہ بلا مجبوری اس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہو سکتی۔

مردوں کے لیے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ اور شریف آزاد عورتوں کے لیے سر کے بالوں سے لے کر ٹخنوں اور گٹوں تک اور لونڈیوں کے لیے پیٹ اور پیٹھ سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ ستر قرار دیا گیا ہے، [1] جس کا غیر کے سامنے کھولنا جائز نہیں، یہاں تک کہ تنہائی میں بھی ان کا بے وجہ کھولنا پسندیدہ نہیں۔ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ اگر ہم تنہائی میں ہوں یعنی کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو؟ فرمایا: ''اللہ تو دیکھتا ہے، اس سے اور زیادہ حیا کرنا چاہیے۔'' [2] ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کبھی ننگے نہ ہو، کیونکہ تمہارے ساتھ فرشتے رہتے ہیں، جو بضرورت برہنگی کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں، تو ان سے شرم کرو اور ان کا لحاظ رکھو۔'' [3]

حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو بہشت میں جو بہشتی جوڑے ملے تھے، اللہ کی نافرمانی کرنے سے وہ ان کے بدن سے اتر گئے تو وہ فوراً درخت کے پتوں سے اپنی برہنگی چھپانے لگے:

﴿ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ ﴾

(۷/ الاعراف:۲۲)

''تو جب ان دونوں نے درخت کو چکھا، ان کے ستر ان پر کھل گئے، تو اپنے اوپر درخت کے پتوں کو جوڑنے لگے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ستر پوشی اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت بنائی ہے، مگر دنیا میں آ کر یہ فطرت کبھی بگڑ جاتی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وحشی، جنگلی اور صحرائی قومیں ستر کے حدود کو صرف شرم گاہوں تک محدود کر لیتی ہیں، عرب میں بھی یہی حال تھا، بلکہ حج میں انھوں نے یہ دستور بنایا تھا کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے مرد اور عورت خانہ کعبہ کے طواف کے وقت اپنے کپڑے اتار دیتے تھے اور اگر قریش اپنے کپڑے دیتے تو وہ پہن لیتے تھے، [4] ورنہ یوں ہی ننگے پھرا کرتے تھے، وحی الٰہی نے انسانوں کو تہذیب و سلیقہ کا یہ سبق دیا۔

---

[1] عورت کا چہرہ، قدم اور ہتھیلیاں ستر میں داخل نہیں۔ [2] سنن ترمذی، ابواب الادب، باب ما جاء فی حفظ العورۃ: ۲۷۹۴۔ [3] ایضًا، باب ما جاء فی الاستتار: ۲۸۰۰۔ [4] صحیح مسلم، کتاب التفسیر، تفسیر فی قولہ تعالیٰ: خذوا زینتکم: ۷۵۵۱ وطبری، تفسیر آیات ذیل، ج۸، ص:۹۹۔

﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ﴾

(۷/ الاعراف:۲۶)

''اے آدم کے بیٹو! ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمہاری ستر اور زینت کا سامان۔ اور پرہیز گاری کا لباس یہ بہتر ہے۔''

﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ (۷/ الاعراف:۳۱)

''اے آدم کے بیٹو! ہر نماز کے وقت اپنی زینت (یعنی لباس) اختیار کرو۔''

﴿ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ ﴾ (۷/ الاعراف:۳۲)

''کہہ دے کس نے اللہ کی اس زینت کو جس کو اس نے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے، منع کیا ہے۔''

﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ﴾ (۷/ الاعراف:۳۳)

''کہہ دے کہ میرے رب نے تو بے حیائی کی باتوں کو خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی ہوں منع کیا ہے۔''

ان آیتوں میں جس بے حیائی کی طرف اشارہ ہے وہ برہنگی ہے اور جس زینت کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا وہ ستر پوشی ہے۔ ان آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑے سے مقصد ستر پوشی کے علاوہ زیب و زینت بھی ہے، پہلی آیت کے آخر میں لباس کے باب میں اصول کلیہ کی صورت میں ایک بلیغ فقرہ ہے، جو بہت سی جزئیات کو حاوی ہے:

﴿ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ﴾ (۷/ الاعراف:۲۶)

''اور پرہیز گاری کا لباس یہ بہتر ہے۔''

پرہیز گاری کے لباس سے کیا مقصود؟ بعضوں نے مجاز سمجھ کر اس سے ایمان، دوسروں نے اعمال صالحہ یا شرم وحیا مراد لی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجاز سے پہلے خود حقیقت پر غور کرنا چاہیے، اسی لیے کچھ مفسروں نے اس کو حقیقت ہی پر محمول کیا ہے۔ مشہور تابعی مفسر ابن زید نے اس سے مطلق پوشاک مراد لی ہے، کسی نے زرہ اور خود وغیرہ لڑائی کے سامان کو لباس تقویٰ قرار دیا ہے، کسی نے اس سے زہد و ورع کے صوفیانہ کپڑے سمجھے ہیں، [1] لیکن یہ بھی حقیقت سے دور ہونا ہے، صحیح یہ ہے کہ لباس التقویٰ سے تقویٰ اور پرہیز گاری ہی کا لباس مراد ہے، یعنی وہ لباس پہننا چاہیے جو تقویٰ اور پرہیز گاری کا منشا ہے، اس کو آنحضرت ﷺ نے اپنی قولی اور عملی تفسیر سے ظاہر فرما دیا ہے، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اس آیت پر ترجمہ قرآن کے حواشی میں لکھتے

[1] روح المعانی، تفسیر آیت مذکور، ج۸، ص:۹۰۔

ہیں: ''اب وہی لباس پہنو جس میں پرہیز گاری ہو، مرد لباس ریشمی نہ پہنے اور دامن دراز نہ رکھے اور جو منع ہوا ہے سونہ کرے اور عورت باریک نہ پہنے، کہ لوگوں کو نظر آئے اور اپنی زینت نہ دکھائے۔'' (تفسیر سورۂ اعراف آیت مذکور)

اسلام میں لباس و پوشاک کی حد بندی اس کے سوا کچھ اور نہیں کی گئی ہے، اس حد بندی کی تشریح احادیث کے مطابق حسب ذیل ہے:

① مردوں کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خالص ریشم کا بنا ہوا کپڑا انہیں پہننا چاہیے، کیونکہ اس سے زنانہ پن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ اس عیش و تنعم کی زندگی کی یاد دلاتا ہے جو مردوں کی جدوجہد اور محنت کی زندگی کے خلاف ہے۔ ضرورت اور مجبوری کی تشریح یہ ہے کہ لڑائی میں زرہ کے نیچے ریشمی کپڑے پہنتے ہیں، تاکہ لوہے کی کڑیاں بدن میں نہ چبھیں، یا کسی کے بدن میں کھجلی ہو تو سوتی کپڑے کے کھردرا پن سے بدن کے چھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لیے ان دونوں موقعوں پر مرد ریشمی کپڑے پہن سکتے ہیں، اگر کوئی دو چار انگل کی ریشمی دھجی کپڑے میں لگا لے تو اس کی بھی اجازت ہے۔ ❶

② مردوں کے لیے عورتوں کی سی پوشاک اور عورتوں کے لیے مردوں کی سی پوشاک پہننا جائز نہیں، کیونکہ اس سے دونوں کی اخلاقی تنگ دامانی کی کھلی شہادت ملتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان عورتوں پر جو مردوں کے لباس اور طور وطریق کی مشابہت کریں اور ان مردوں پر جو عورتوں کے لباس اور طور وطریق کی نقالی کریں لعنت فرمائی ہے۔ ❷

③ عربوں میں لباس کا دامن اتنا لمبا یا تہبند اتنا نیچے رکھنا کہ وہ زمین پر گھسٹتا ہوا چلے بڑائی کی نشانی سمجھی جاتی تھی، ان کے بڑے بڑے امراء اور رئیس اتنے ہی لمبے دامن رکھتے تھے اور اتنا ہی نیچے تہبند باندھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی اپنا لباس فخر و غرور اور بڑائی کے اظہار کے لیے گھسیٹ کر چلے گا، اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر نہیں اٹھائے گا۔'' ❸ اسی لیے مرد کو پائجامہ کی مہریوں اور تہبند کو اتنا نیچا نہیں کرنا چاہیے کہ ٹخنے چھپ جائیں، بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''پائجامہ اور تہبند نصف ساق تک ورنہ کم از کم ٹخنوں سے اونچا رہے۔'' ❹ فرمایا ''ازار نیچے لٹکانا غرور کی نشانی ہے اور اللہ غرور کو پسند نہیں فرماتا۔'' ❺ البتہ عورتوں کو دامن یا گھیر نیچے تک لٹکانا بلکہ ایک آدھ بالشت نیچے رکھنا درست ہے۔

④ ایسا لباس جس کی طرف بے اختیار لوگوں کی انگلیاں اٹھیں، پہننا ٹھیک نہیں۔ خواہ وہ امیروں کی زرق برق پوشاکیں ہوں یا مولویوں کا نمائشی عبا، جبہ، یا صوفیوں کا گیروا رنگ۔ کیونکہ ایسے کپڑوں کے پہننے والوں کا اصل منشا اپنے کو دوسروں سے ممتاز بنانے کی چھپی خواہش ہوتی ہے اور یہ تفوق و امتیاز کی ہوس نفس کا کھلا غرور ہے۔

---

❶ صحیح مسلم، کتاب اللباس، باب تحریم لبس الحریر: ٥٤٠١ تا ٥٤٢٨۔ ❷ ابو داود، کتاب اللباس، باب فی لباس النساء: ٤٠٩٧۔ ❸ ابو داود، کتاب اللباس، باب فی قدر موضع الازار: ٤٠٩٣۔
❹ ابو داود، کتاب اللباس، باب ماجاء فی اسبال الازار: ٤٠٨٤۔ ❺ ایضًا۔

⑤ مرد ہو یا عورت کوئی ایسے باریک کپڑے نہ پہنے جن سے ستر دکھائی دے، عورتوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ ''کتنی کپڑے پہننے والیاں ہیں جو حقیقت میں ننگی رہتی ہیں۔'' ❶

⑥ ایسا کپڑا پہننا جس سے پوری ستر پوشی نہ ہو۔ یعنی اس سے ستر کے پورے حدود نہ چھپیں، جائز نہیں۔ ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی بہن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کوئی ایسا ہی (یا باریک) کپڑا پہن کر حضور ﷺ کے سامنے آئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے اسماء! جب عورت جوان ہو جائے تو اس کو چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان کے سوا کچھ کھولنا حلال نہیں۔'' ❷

⑦ مرد شوخ رنگ خصوصاً سرخ رنگ کے کپڑے نہ پہنیں، سرخ دھاری کے کپڑے جائز ہیں، ایسی سرخ دھاریوں کی چادر آپ ﷺ نے اوڑھی ہے، زرد رنگ کے کپڑے پہنے جا سکتے ہیں، آپ ﷺ کبھی زرد رنگ کا پورا لباس پہن لیتے تھے۔ البتہ زعفرانی کپڑے درست نہیں اور خوشبو کے لیے بدن پر زعفران کے دھبے ڈالنا جس کا عرب میں رواج تھا، مردوں کے لیے منع ہے۔ سبز رنگ کی چادر بھی آپ ﷺ نے اوڑھی ہے اور اس رنگ کا تہبند بھی آپ ﷺ نے باندھا ہے، سیاہ رنگ کا عمامہ بھی زیب سر فرمایا ہے۔

⑧ مردوں کے لیے عام طور سے سفید رنگ کے کپڑے آپ ﷺ نے پسند فرمائے ہیں۔

⑨ آستین والی پوشاک پہنتے وقت پہلے داہنے ہاتھ میں آستین ڈالنی چاہیے۔

⑩ نیا لباس پہنتے وقت آپ ﷺ دعا پڑھا کرتے تھے، جس میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر اس کا شکر ادا فرماتے تھے، یہ دعا پڑھتے تھے: ❸

((اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ كَسَانِیْ هٰذَا وَرَزَقَنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَقُوَّةٍ)) ❹

''اس اللہ کی حمد جس نے مجھ کو یہ پہنایا اور روزی کیا میری قوت کے بغیر (یعنی محض اپنے فضل سے)۔''

---

❶ صحیح مسلم، کتاب اللباس، باب النسآء الکاسیات: ۵۵۸۲۔

❷ ابو داود، کتاب اللباس، باب فیما تبدی المراۃ من زینتها: ۴۱۰۴۔

❸ اس باب کی یہ ساری حدیثیں صحاح اور سنن کی کتاب اللباس میں ہیں، میرے پیش نظر اس وقت ابوداود اور ترمذی ہیں ان مسائل کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی۔

❹ ابو داود، کتاب اللباس، باب ما یقول اذا لبس ثوبا جدیدا: ۴۰۲۳

نوٹ: ابوداود میں ''هٰذَا الثَّوْبَ'' کے الفاظ ہیں۔

آداب مسرت

انسان کو جن چیزوں پر مسرت حاصل ہوتی ہے ان کی کوئی انتہا نہیں۔ مال و دولت، علم و فضل، عہدہ و منصب، شادی بیاہ، عید اور تہوار، غرض انسان کو اپنی زندگی میں اظہار مسرت کے سینکڑوں مواقع پیش آتے ہیں، لیکن یہ مسرت جب حد اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو اس کی سرحد فخر وغرور سے مل جاتی ہے، قارون نے اپنے مال و دولت کی کثرت پر جب اسی قسم کی فخر آمیز مسرت کا اظہار کیا تو اس کی قوم نے ناگواری سے کہا:

﴿ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ۝ ﴾ (۲۸/ القصص:۷٦)

''جب کہا اس کو اس کی قوم نے اترا مت، اللہ کو نہیں بھاتے اترانے والے۔''

اسلام نے چونکہ تمام جذبات میں اعتدال پیدا کرنا چاہا ہے، اس لیے اس نے اس قسم کی مسرتوں کو انسان کی ایک اخلاقی کمزوری قرار دیا ہے:

﴿ وَلَىِٕنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ۝ وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَاۗءَ بَعْدَ ضَرَّاۗءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ۝ۙ ﴾

(۱۱/ ہود:۹۔۱۰)

''اور اگر ہم چکھادیں آدمی کو اپنی طرف سے مہر پھر وہ چھین لیں اس سے تو وہ ناامید، ناشکر ہوا اور اگر ہم چکھادیں اس کو آرام بعد تکلیف کے جو پہنچے اس کو تو کہنے لگے گئیں برائیاں مجھ سے تو وہ خوشیاں کرتے بڑائیاں کرتا۔''

اور اس کی ممانعت کی ہے:

﴿ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَاۗ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ۝ۙ ﴾ (۵۷/ الحدید:۲۳)

''اور نہ اتراؤ اس پر جو تم کو اس نے دیا اور اللہ نہیں چاہتا ہے کسی اتراتے بڑائی مارتے کو۔''

ساتھ ہی اس کے مسلمانوں میں مردہ دلی نہیں پیدا کی ہے، بلکہ معتدل طریقہ پر اظہارِ مسرت کی اجازت دی ہے اور اس کے معتدل طریقے بتائے ہیں۔

جب مسلمان کو کوئی مسرت حاصل ہو تو اس کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اسی کے فضل و کرم سے اس کو یہ خوشی حاصل ہوئی، اگر کوئی بڑی خوشی حاصل ہو تو سجدہ شکر بجا لانا چاہیے، تاکہ غایت مسرت کی حالت میں دنیوی فخر وغرور کے بجائے انسان کی نیازمندی کا اظہار ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ایسا مسرت آمیز واقعہ پیش آتا تو سجدہ شکر بجالاتے، ایک بار مکہ سے مدینہ جا رہے تھے، جب غروراء کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر پڑے اور تھوڑی دیر تک دعا کی، پھر سجدہ میں گر پڑے، اس کے بعد دیر تک دعا کی پھر سجدہ میں گر پڑے، اسی طرح تیسری بار بھی دعا کی اور سجدہ میں گر پڑے اور فرمایا کہ ''میں نے اللہ سے اپنی

امت کے لیے شفاعت کی دعا کی تو اس نے میری ثلث امت کے لیے شفاعت قبول کر لی، اس لیے میں اپنے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ میں گر پڑا، پھر میں نے سر اٹھا کر اپنی امت کے لیے یہی درخواست کی تو اس نے میری ثلث امت کے لیے اور میری درخواست قبول کی، اس لیے میں اپنے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ میں گر پڑا، پھر میں نے یہی التجا کی تو اس نے میری ثلث امت کے لیے اور میری التجا کو قبول کیا، تو میں اپنے اللہ کے لیے سجدہ میں گر پڑا۔'' ❶

صحابہ کرام کا یہی دستور تھا۔ چنانچہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی توبہ جب قبول ہوئی اور ان کو اس کا مژدہ سنایا گیا تو وہ سجدہ میں گر پڑے۔ اس قسم کے مسرت آمیز موقعوں پر دوسرے مسلمانوں کا اخلاقی فرض بھی یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کو مبارک باد دے کر اس کی مسرت میں شریک ہوں۔ چنانچہ اس موقع پر صحابہ کرام بھی ان کے پاس جوق در جوق آئے اور ان کو مبارک باد دی۔ ❷

سفر سے واپس ہونے کے بعد بھی انسان کو وطن میں پہنچنے کی مسرت ہوتی ہے، اس موقع پر اعزہ و احباب کی دعوت کی جا سکتی ہے کہ وہ بھی اس مسرت میں شریک ہوں، چنانچہ ایک بار رسول اللہ ﷺ سفر سے مدینہ میں آئے تو اونٹ یا گائے ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا، ❸ اس موقع پر دوسروں کا فرض بھی یہ ہے کہ سفر سے واپس آنے والے کا استقبال کریں، تاکہ اس طریقہ سے ان کی مسرت کا اظہار ہو۔ رسول اللہ ﷺ جب غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو لوگوں نے ثنیۃ الوداع تک جا کر آپ ﷺ کا استقبال کیا، جس میں بچے بھی شامل تھے۔ ❹

اجتماعی طور پر اظہار مسرت کا عام موقع شادی بیاہ میں پیش آتا ہے اور اس موقع پر اسلام نے اظہار مسرت کے لیے گانے اور ڈھول بجانے کی اجازت دی ہے، تاکہ خوب اعلان ہو اور سب کو اس نکاح کی خبر ہو جائے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

((فصل مابین الحلال و الحرام الدف و الصوت))

''حلال اور حرام میں دف بجانے اور گانے سے فرق پیدا ہوتا ہے۔'' ❺

یعنی زنا اور نکاح میں فرق یہ ہے کہ دف بجا کر اور راگ گا کر نکاح کا اعلان کیا جاتا ہے، تاکہ عام طور سے سب کو معلوم ہو جائے کہ فلاں مرد اور فلاں عورت نے باہم مل کر ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کیا ہے اور زنا چھپ کر چپکے سے کیا جاتا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔

---

❶ ابو داود، کتاب الجهاد، باب في سجود الشكر:٢٧٧٥۔ ❷ بخاري، كتاب المغازي، حديث كعب بن مالك:٤٤١٨۔ ❸ ابو داود، كتاب الاطعمة، باب الاطعام عند القدوم من السفر:٣٧٤٧۔

❹ ابو داود، كتاب الجهاد، باب في التلقي: ٢٧٧٩۔

❺ ترمذي، كتاب النكاح، باب ما جاء في اعلان النكاح:١٠٨٨۔

حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہا کا نکاح ہوا تو رسول اللہ ﷺ تشریف لا کر ان کے پاس بیٹھے، چند لڑکیاں دف بجا بجا کر حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا کے ان بزرگوں کی تعریف میں اشعار گانے لگیں، جو غزوۂ بدر میں شہید ہوئے تھے، اسی حالت میں ایک نے یہ مصرع گایا:

وَفِينَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَافِي غَدٍ.

''ہم میں ایک پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔''

تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس کو چھوڑ دو اور جو گا رہی تھیں اسی کو گاؤ۔'' ❶

ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک انصاری سے اپنی ایک رشتہ دار عورت کا نکاح کر کے اس کو رخصت کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''عائشہ! تم لوگوں کے ساتھ گیت نہ تھا، حالانکہ انصار کو گیت پسند ہے۔'' ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگوں نے اس کے ساتھ ایک لونڈی کیوں نہیں بھیجی جو دف بجاتی اور گاتی جاتی۔'' ❷

ایک دفعہ شادی کا موقع تھا، قرظہ بن کعب رضی اللہ عنہ اور ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ بیٹھے لڑکیوں کا گانا سن رہے تھے، اتنے میں عامر بن سعد ایک تابعی آ گئے، انھوں نے یہ دیکھا تو اعتراض کیا اور کہا، آپ دو صاحب بدری صحابی ہیں اور آپ کے سامنے یہ ہو رہا ہے، انھوں نے کہا تمہارا جی چاہے تو تم بیٹھ کر سنو، رسول اللہ ﷺ نے شادی بیاہ کے موقع پر ہم کو اس کی اجازت دی ہے۔ ❸ عربوں میں رسم تھی کہ دولہا کو بالرفاء والبنین کہہ کر عیش و آرام اور اولاد نرینہ کی دعا دیتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس کی جگہ یہ دعا سکھائی:

((بارك الله لك وبارك عليك و جمع بينكما في خير))

''تمہارے لیے اللہ مبارک کرے، تم پر برکت اتارے اور تم دونوں میں بھلائی میں میل ملاپ رکھے۔'' ❹

شادی بیاہ میں دوستوں اور عزیزوں کی دعوت مسنون ہے، اس کو ولیمہ کہتے ہیں۔ جس سے جو کچھ ہو سکے اور جتنا ہو سکے عزیزوں اور دوستوں کو اس موقع پر کھلائے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اور کچھ نہیں تو ایک بکری ذبح کر کے کھلا دو۔'' ❺ اور خود کبھی پنیر، گھی اور چھوہارے بھی کھلائے ہیں، ❻ اسی طرح دوست اور عزیز کو اس کی شادی میں تحفہ کے طور پر بھی کچھ بھیج سکتے ہیں۔ ❼

---

❶ بخاری، کتاب النکاح، باب ضرب الدف فی النکاح والولیمة:٥١٤٧۔

❷ بخاری، کتاب النکاح، باب النسوة التی یهدین المرأة الیٰ زوجها ودعاء هن بالبرکة:٥١٦٢۔

❸ نسائی، کتاب النکاح، باب اللهو والغناء عندالعرس:٣٣٨٥۔ ❹ ابوداود، کتاب النکاح، باب ما یقال للمتزوج:٢١٣٠۔ ❺ بخاری، کتاب النکاح، باب الولیمة ولوبشاة:٥١٦٧۔ ❻ نسائی، کتاب النکاح، باب البناء فی السفر:٣٣٨٢۔ ❼ نسائی، کتاب النکاح، باب الهدیة لمن عرس:٣٣٨٩۔

مسلمانوں کے لیے اس سے بھی زیادہ وسیع پیمانے پر اجتماعی اظہار مسرت کا موقع عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن پیش آتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب نے سال میں دو دن مقرر کیے تھے، جن میں وہ خوشیاں مناتے تھے، رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو فرمایا کہ ''تم لوگ پہلے دو دن خوشیاں مناتے تھے، اب اللہ نے ان کو تمہارے لیے ان سے دو بہتر دنوں سے بدل دیا، یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن۔'' [1] خوشی کے ان دو دنوں کی تعیین میں دوسری مشرک قوموں کی طرح فصل وموسم اور دوسرے غیر موحدانہ مشاہد کو یادگار کا ذریعہ نہیں بنایا گیا، بلکہ دین حنیف کے دو عظیم الشان واقعوں کو اظہار مسرت کے لیے پسند کیا گیا، عید الاضحیٰ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی خوشیوں اور خانہ کعبہ کی بنا اور فتح کی اور عید الفطر اسلام کی آمد اور قرآن پاک کے نزول کی یادگار ہے۔ ان دونوں میں اظہار مسرت کے لیے عمدہ لباس پہننا اور خوشبو لگانا مسنون فرمایا، اس کے علاوہ خوشی ومسرت کا گانا اور دوسری قسم کے جائز کھیلوں کو پسند فرمایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ عید کے دن میرے پاس انصار کی دو لونڈیاں جو پیشہ ور گانے والیاں نہ تھیں، وہ اشعار گا رہی تھیں، جو انصار نے بعاث کی لڑائی کے متعلق کہے تھے، اسی حالت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے اور کہا کہ ''شیطان کے مزامیر اور رسول اللہ ﷺ کے گھر میں''۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابوبکر! ہر قوم کے لیے عید کا دن ہوتا ہے اور یہ ہماری عید کا دن ہے۔'' [2] یعنی اس دن گانا مباح ہے۔ [3]

حبشی لوگ عید کے دن فوجی کرتب دکھاتے تھے اور رسول اللہ ﷺ اس کو پسند فرماتے تھے، ایک بار عید کے دن یہ لوگ اسی قسم کا کرتب دکھا رہے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ تماشا دکھایا اور حبشیوں سے کہا کہ ''بان بنوارفدہ''! اس سے آپ کا مقصد ان میں مستعدی اور نشاط پیدا کرنا تھا، یہاں تک کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تھک گئیں تو آپ نے کہا کہ ''بس'' انھوں نے کہا، ہاں۔ ارشاد ہوا: ''تو جاؤ۔'' [4]

مسرت کے اس طریقہ اظہار کا نام ''تقلیس'' تھا، جس کے معنی دف بجانے، گانے اور دلچسپی کے لیے شمشیر بازی، نیزہ بازی وغیرہ کے کھیل تماشے دکھانے کے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ لڑکے اور لڑکیاں راستوں پر کھڑے ہو کر ڈھول بجا کر اچھلیں کودیں، تماشے دکھائیں، عہد رسالت میں عید کے دن اس کا اس قدر رواج تھا کہ جب صحابہ کو کسی جگہ عید کے دن اظہار مسرت کا یہ طریقہ نظر نہیں آتا تھا، تو ان کو تعجب ہوتا تھا، چنانچہ ایک بار حضرت عیاض اشعری رضی اللہ عنہ نے انبار میں عید کی تو فرمایا کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ کے پاس لوگ ''تقلیس'' کیا کرتے تھے، اس طرح تم لوگ کیوں نہیں کرتے۔

[1] نسائي، كتاب صلوة العيدين: ١٥٥٧۔ [2] بخاري، كتاب العيدين، باب سنة العيدين لاهل الاسلام: ٩٥٢۔ [3] بشرطیکہ اس کے مضامین اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے برے نہ ہوں۔

[4] بخاري، كتاب العيدين، باب الحراب والدرق يوم العيد: ٩٥٠۔

حضرت قیس بن سعد فرماتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جو چیزیں تھیں وہ سب میں نے دیکھ لیں، بجز ایک چیز کے کہ عید کے دن رسول اللہ ﷺ کے سامنے ''تقلیس'' ہوتی تھی۔ ❶

عیدین کے دن خوشی و مسرت کے اس طریقہ اظہار کی اجازت کا فلسفہ یہ ہے کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کی زندگی میں سال میں ایک دو موقع ایسے مذہبی و قومی جشن کے آئیں، جن میں لوگ کھل کر خوشی کر سکیں اور متین سے متین آدمی کچھ دیر انبساط خاطر کا اظہار کر لے، اسی لیے ان دنوں میں روزے رکھنے کی ممانعت آئی ہے اور آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''یہ دن کھانے پینے، اہل و عیال سے لطف اٹھانے اور یاد الٰہی کے ہیں۔'' ❷ اسلام نے خوشی میں بھی اس کو یاد رکھا ہے کہ قلب کو اللہ کی یاد سے غفلت نہ ہو، اسی لیے عید کے دونوں موقعوں پر دوگانہ ادا کرنا سنت ٹھہرایا، تکبیر کہتے ہوئے ایک راستہ سے عید گاہ کو جائیں اور دوسرے راستہ سے لوٹیں، تاکہ ہر طرف اسلام کی شان و شوکت کا اظہار ہو اور ﴿ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ﴾ (۲/ البقرة:۱۸۵) کی تعمیل ہو۔

---

❶ ابن ماجه، كتاب الصلوة، باب ماجاء في التقليس يوم العيد:۱۳۰۳۔

❷ شرح معاني الآثار طحاوي، ص: ۴۲۹، یہاں بعال کا ترجمہ اہل و عیال سے لطف اٹھانا کر دیا گیا ہے۔

آدابِ ماتم

خوشی اور غم توأم ہیں، جس طرح انسان خوشی میں بے اعتدالی کرتا ہے، غم کی حالت میں بھی وہ اعتدال سے گزر جاتا ہے، عربوں میں فخر وغرور اور جہالت ووحشت کی وجہ سے تعزیت وماتم کی عجیب عجیب رسمیں قائم ہوگئیں تھیں، فخر کا خیال موت کے بعد بھی نہیں جاتا تھا، اس لیے اظہارِ فخر کے بہت سے طریقے جاری ہوگئے تھے، سب سے مقدم یہ کہ میت جس درجہ کا ہو اسی شان سے اس کا ماتم ہونا چاہیے چنانچہ بڑے بڑے سردار جب مرتے تھے تو وصیت کر جاتے تھے کہ ان کا ماتم ان کی شان کے موافق کیا جائے۔

ایک شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے:

اذا متُّ فابكيني بِمَا انا اَهْلُهُ　　وشقي عَلَيَّ الجيب يا ابنة معبد [1]

جب میں مرجاؤں تو میرے لیے میرے درجہ کے موافق رونا اور میرے لیے گریبان کو چاک کر ڈالنا

منہ پر تھپڑ مارنا، چھاتی کوٹنا، سر کے بال کھول دینا، عام رسم تھی اور شعراء اس کا فخر یہ اظہار کرتے تھے:

من كان مسرورًا بمقتل مالك　　فليأت نسوتنا بوجه نهار

جو شخص مالک کے قتل سے خوش ہوتا تھا　　تو ہماری مستورات کو دن دھاڑے آ کر دیکھے

يَجد النساءَ حواسرًا يندبنه　　يلطمن اوجههن بالاسحار

وہ دیکھے گا کہ عورتیں سر کھول کر نوحہ کر رہی ہیں　　اور صبح کے وقت اپنی گالوں پر طمانچہ مار رہی ہیں

آنحضرت ﷺ نے ان رسوم سے نہایت سختی سے منع کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص گریبان پھاڑتا اور گالوں پر طمانچہ مارتا اور جاہلیت کی طرح چیختا اور چلاتا اور بین کرتا ہے، وہ میری امت میں سے نہیں۔'' [2] یعنی یہ میری امت کے کام نہیں۔

حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے آنحضرت ﷺ کو نہایت محبت تھی، ان کی شہادت کی جب خبر آئی تو ان کے خاندان کی عورتوں نے نوحہ شروع کیا، آپ نے منع کرا بھیجا، وہ باز نہ آئیں، دوبارہ منع فرمایا، جب پھر نہ مانیں تو آپ نے حکم دیا کہ ''ان کے منہ میں خاک بھر دو۔'' [3]

یہ بھی فخر میں داخل تھا کہ میت پر کثرت سے رونے والے ہوں، اس بنا پر دور دور سے عورتیں بلا کر آتی تھیں، رفتہ رفتہ یہ رسم مبادلہ کے طور پر داخل مراسم ہوگئی تھی، یعنی کسی میت کے لیے کسی خاندان کی عورتوں نے

---

[1] شرح المعلقات السبع، طرفة بن العبد، ص:٦١۔

[2] ترمذی، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی النهی عن ضرب الخدود:٩٩٩۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب من جلس عند المصیبة یعرف فیه الحزن: ١٢٩٩۔

نوحہ کیا ہے تو اس میت کے خاندان پر گویا یہ ایک فرض ہوتا تھا جس کا ادا کرنا ضروری تھا۔ ایک دفعہ ایک خاتون نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ”وہ کون سی بات ہے، جس میں ہم کو آپ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ کہ ”نوحہ نہ کرو“۔ وہ بولیں کہ میرے چچا نے جب انتقال کیا تو فلاں خاندان کی عورتیں آ کر روئیں تھیں، ان کا یہ فرض مجھ کو ادا کرنا ہے، آپ نے منع فرمایا، لیکن وہ کسی طرح نہ مانیں، بالآخران کے بار بار اصرار پر اجازت دی، لیکن وہ خاتون آنحضرت ﷺ کا اصلی منشا سمجھ گئیں تھیں، اس لیے پھر کبھی کسی کے نوحہ میں شریک نہیں ہوئیں۔ ❶

دستور تھا کہ جب کوئی مر جاتا تھا تو عام منادی کراتے کہ لوگ کثرت سے آئیں، اس کو عربی میں ”نعی“ کہتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ جب مرنے لگے تو (فرمان نبوی کی اس قدر احتیاط مدنظر تھی کہ) وصیت کی کہ ”میرے مرنے کی کسی کو خبر نہ کرنا، میں نے آنحضرت ﷺ کو اعلان مرگ سے منع کرتے دیکھا ہے اور شاید خبر کرنا بھی اعلان میں داخل ہو۔“ ❷

جنازہ کے ساتھ نوحہ اور ماتم کرنے والے چلتے اور بخوردان جلا کر لے جاتے، ❸ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور راگ نہ لے جائے، راگ سے مقصود کفار ہند کی طرح گانا بجانا بھی ہوسکتا ہے، تب یہ مطلب ہوگا کہ ”جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور باجا نہ لے جائے۔“ ❹

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ ایک جنازہ میں شریک تھے، ایک عورت انگھیٹی لے کر آئی، آپ نے اس کو اس زور سے زجر کیا کہ وہ بھاگ گئی۔ ❺

جنازہ کے پیچھے چلتے تھے تو چادر پھینک دیتے تھے، صرف کرتہ بدن پر رہ جاتا تھا، ایک دفعہ آپ ﷺ نے لوگوں کو اس صورت میں دیکھا تو فرمایا کہ ”جاہلیت کی رسم پر چلتے ہو؟ میرا یہ ارادہ ہوا کہ میں تمہارے حق میں ایسی بددعا کروں کہ تمہاری صورتیں بدل جائیں۔“ لوگوں نے فوراً چادریں اوڑھ لیں اور پھر کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا۔ ❻

آنحضرت ﷺ نے سوگ کی مدت بھی مقرر کر دی اور فرمایا کہ ”کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ تین دنوں سے زیادہ کسی کا سوگ کرے، البتہ بیوہ کو چار مہینے دس دن سوگ کرنے کا حکم دیا، جس میں وہ کوئی رنگین کپڑا نہ پہنے، خوشبو نہ لگائے اور نہ کوئی اور آرائش و زیبائش کرے۔“ ❼ کسی عزیز کی موت پر آنکھوں سے

---

❶ ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ الممتحنۃ: ۳۳۰۷۔ ❷ ترمذی، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی کراھیۃ النعی: ۹۸۶۔ ❸ مسلم، کتاب الایمان: ۳۲۱؛ مسند احمد، ج ٤، ص: ۱۹۹۔
❹ ابو داود، کتاب الجنائز، باب فی اتباع المیت بالنار: ۳۱۷۱۔ ❺ اسد الغابۃ، ج ٤، ص: ۳۹۵۔
❻ ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی النھی عن التسلب مع الجنازۃ: ۱٤۸۵۔
❼ ترمذی، کتاب الطلاق، باب ماجاء فی عدۃ المتوفی عنھا زوجھا: ۱۱۹۵، ۱۱۹٦۔

آنسو نکلنا جو فطرت کا اقتضا ہے، برا نہیں۔ لیکن زور زور سے چیخنا چلانا بین کرنا منع ہے اور اس پر سخت تہدید فرمائی، آنحضرت ﷺ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب وفات پائی تو آنحضرت ﷺ کی آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے نکل آئے اور فرمایا کہ ''اے ابراہیم! ہم تیری جدائی سے مغموم ہیں، لیکن زبان سے وہی نکلے گا جو رب کی مرضی ہے۔'' ❶

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''مردہ پر اس کے اعزہ کے رونے سے عذاب ہوتا ہے''۔ صحابہ اور محدثین کے درمیان اس حدیث کے مطلب میں اختلاف ہے جس بات پر سب کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ عرب میں جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا کہ لوگ فخر وغرور کے لیے حسب حیثیت ماتم کرنے کی وصیت کر جاتے تھے، اس وصیت کے مطابق اس پر رونے سے اس کو عذاب ہوتا ہے۔ ❷ ہمدردی کا تقاضا ہے کہ جب کسی مسلمان کے گھر میں کوئی موت ہو تو مناسب ہے کہ عزیز، دوست، یا محلّہ کے لوگ اس کے ہاں کھانا بھیجیں، کیونکہ غم کے سبب سے اس کے گھر میں کھانا پکانے کا سامان مشکل ہوتا ہے، آنحضرت ﷺ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے موقع پر ان کے گھر کھانا بھجوانے کا حکم دیا تھا اور فرمایا کہ ''ان کے گھر کے لوگوں کو آج کھانا پکانے کا موقع نہ ملے گا۔'' ❸ ایک مسلمان کا فرض مشکلات میں صبر اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہے، صبر اور دعا دفع غم کا وہ نسخہ ہے جس کو قرآن نے مسلمانوں کے لیے تجویز کیا ہے۔ ﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ (۲/ البقرۃ :۴۵) صبر کا موقع حادثہ کے شروع ہی میں ہے، یہ نہیں کہ شروع میں خوب رو پیٹ لیا جائے اور پھر آخر میں مجبوری کا صبر کیا جائے، آنحضرت ﷺ نے ایک عورت کو جو اپنے بچہ کی موت پر رو رہی تھی سمجھایا، مگر وہ نہیں مانی، بعد کو جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ رسول اللہ تھے تو معذرت کرنے آئی اور صبر کا کلمہ ادا کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''صبر صدمہ کے شروع ہی میں کرنا چاہیے۔'' ❹ اللہ فرماتا ہے کہ اچھے مسلمان وہ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پیش آئے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے، ﴿ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۵۶) اسی لیے مسلمانوں میں دستور ہے کہ جب غم کی کوئی خبر سنتے ہیں تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے ہیں اور یہ دستور مستحسن ہے۔ تقدیر کا عقیدہ غم کا چارہ کار ہے، جو کچھ ہوا اللہ کے حکم اور مصلحت سے ہوا، یہ اسلام کی حکیمانہ تعلیم ہے اور اس تعلیم کا فائدہ بھی قرآن نے بتایا ہے:

﴿ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ ﴾ (۵۷/ الحدید:۲۳)

''تاکہ تمہارے ہاتھ سے جو جاتا رہے اس پر غم نہ کرو۔''

---

❶ مسلم، کتاب الفضائل، باب رحمتہ ﷺ الصبیان والعیال:۶۰۲۵۔

❷ فتح الباری، ج۳، ص: ۱۲۲۔ ❸ ابو داود، کتاب الجنائز، باب صنعۃ الطعام لاهل المیت:۳۱۳۲۔

❹ ایضا، باب الصبر عند المصیبۃ:۳۱۲۴۔

متفرق آداب

انسان کی بعض جسمانی حالتیں ادب، تہذیب اور وقار کے خلاف ہوتی ہیں، ان کو دیکھ کرنا گواری پیدا ہوتی ہے، مثلاً: جمائی لینے میں انسان کا منہ کھل جاتا ہے آہ، آہ یا ہاہ ہاہ کی ناگوار آواز منہ سے نکلتی ہے اور چہرے کی قدرتی ہیئت بدل کر مضحکہ انگیز شکل پیدا ہو جاتی ہے، اسی مفہوم کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: ''جمائی شیطان کی جانب سے ہے اور جب کوئی اس حالت میں آہ آہ کہتا ہے، تو شیطان اس کے پیٹ کے اندر سے اس پر ہنستا ہے۔'' [1] بعض حدیثوں میں ہے کہ ''جب تم میں کوئی جمائی لے تو اپنے منہ کو بند کر لے، کیونکہ شیطان اس کے منہ کے اندر گھس جاتا ہے۔'' [2] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اس میں حقیقت و مجاز کی اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ شیطان مکھی یا مچھر کو اڑا کر اس کے منہ کے اندر داخل کر دیتا ہے، [3] اس لیے اسلام نے مختلف طریقوں سے اس بدنمائی کو دور کیا ہے۔

① پہلا حکم تو یہ ہے کہ جمائی روکنے کی چیز ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو اس کو روکنا چاہیے اور ہاہ ہاہ نہیں کہنا چاہیے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو منہ پر ہاتھ رکھ لینا چاہیے۔ [4]

② جمائی کے برخلاف آپ ﷺ نے چھینک کے روکنے کی کوئی ہدایت نہیں کی ہے، بلکہ اس کو اللہ کی جانب سے بتلایا ہے، [5] ہمارے شُراحِ حدیث اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ ''چھینک بدن کے ہلکے پھلکے ہونے، مسامات کے کھلنے اور بہت زیادہ نہ کھانے سے آتی ہے، لیکن جمائی بدن کے ثقل اور کسل و سستی کا نتیجہ ہے، اس لیے چھینک عمل کے لیے نشاط اور جمائی اس کے لیے کسل پیدا کرتی ہے''۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ چھینک سے دماغی ابخرے نکلتے ہیں اور اس طریقہ سے وہ شفا کا ذریعہ بن جاتی ہے، [6] اس بنا پر شریعت نے چھینکنے والے کو حکم دیا ہے کہ وہ اس پر اللہ کا شکر کرے اور ''**الحمدلله**'' کہے، دوسرے لوگ اس کے جواب میں ''**یرحمك الله**'' کہیں۔ [7]

③ تاہم وہ ایک بدنما چیز ہے۔ بعض اوقات اس حالت میں ناک سے بلغم نکل آتا ہے۔ اس لیے چھینکتے وقت منہ کو ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانک لینا چاہیے۔ اور اس طریقہ سے چھینک کی آواز کو پست کرنا چاہیے رسول اللہ ﷺ کا یہی طریقہ تھا۔ [8]

④ انگڑائی اور ڈکار کے متعلق اگرچہ آپ ﷺ نے کوئی خاص حکم نہیں دیا ہے، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عام مجمع میں انگڑائی اور ڈکار لینا تہذیب کے خلاف ہے، خصائص کی بعض کتابوں میں ہے کہ

---

[1] ترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء ان الله یحب العطاس ویکرہ التثاؤب:٢٧٤٦۔ [2] ابو داود، کتاب الادب، باب فی التثاؤب:٥٠٢٦۔ [3] حجة الله البالغة آداب الصحبة، ج٢، ص:١٤٩۔ [4] ترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء ان الله یحب العطاس ویکرہ التثاؤب:٢٧٤٧۔ [5] ایضًا:٢٧٤٦، ٢٧٤٧۔

[6] حجة الله البالغة، باب العطس والتثاؤب، ج٢، ص:١٤٩۔ [7] ترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء کیف یشمت العاطس: ٢٧٤١۔ [8] ابوداود، کتاب الادب، باب فی العطاس: ٥٠٢٩۔

ہو، یا سوتے وقت چراغ کو جلائے رکھنا، اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''چوہے چراغ کی بتی سے گھر میں آگ لگا دیتے ہیں۔''

④ بعض آداب ایسے ہیں جن سے عجمیوں کے مسرفانہ اور عیاشانہ تمدن کی مخالفت مقصود ہے، مثلاً: حریر، تصویر دار کپڑوں اور چاندی سونے کے برتنوں میں کھانے پینے کی ممانعت۔

⑤ بعض چیزیں وقار و تمدن کے منافی ہیں اور انسان کو بالکل وحشیوں اور بدوؤں میں شامل کر دیتی ہیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کی ممانعت فرمائی، تاکہ افراط اور تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کی راہ نکل آئے۔ [1]

اس تفصیل کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کی تمام مہذب قوموں کے اجتماعی و معاشرتی آداب کی بنیاد جن اصولوں پر قائم تھی، اسلام کے احکام میں اور رسول انام ﷺ کے آداب میں وہ سب ملحوظ ہیں اور مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور طبی، غرض ہر قسم کے فوائد و منافع پر مشتمل ہیں، یعنی ان آداب کی پیروی سے اللہ کی رضا، رسول ﷺ کی اتباع، روح و جسم کی پاکیزگی، گھر کی صفائی، اخلاق کی طہارت اور بلندی، معاشرت کی اچھائی، صحت کی حفاظت اور ترقی، بزرگوں کے آزمودہ اصولِ کار اور طریق زندگی کی ہدایت نصیب ہوتی ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام کا خاص تمدن و معاشرت ہے۔

اسلام نے ان آداب میں بڑی لچک رکھی ہے، یعنی ان میں جو اصلی اور بنیادی باتیں ہیں، ان کی تو قرآن پاک اور احادیث نبویہ ﷺ میں پوری تاکید کر دی ہے اور اسی تاکید سے ان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن ان میں بعض ایسے امور ہیں، جو وقتی مصلحت، عرب کی ملکی معاشرت اور زمانہ کے حالات کے بدلنے سے بدل سکتے ہیں، اسی لیے ان کے متعلق کوئی ایسی تاکید نہیں کی جس سے ان کا شعار اسلامی ہونا ظاہر ہو یا ان کے چھوڑنے پر کوئی وعید فرمائی گئی ہو، [2] اور اسی لیے ان کے دنیوی مصالح اور فائدے بھی بتا دیے گئے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان میں کچھ ایسا تغیر کیا جائے جس سے اصل مقصد فوت نہ ہو، بلکہ اس کی خوبی اور زیادہ بڑھ جائے، تو وہ برا نہیں۔ جیسے جہاں ہاتھ دھونے میں اصل مقصد صفائی اور پاکیزگی ہے، وہاں اگر مٹی کی جگہ صابن استعمال کیا جائے، تولیے استعمال میں لائے جائیں، کھانے میں ہاتھ کے بجائے چمچوں سے کھانا نکالا جائے، چھری سے گوشت کاٹا جائے، [3] پلیٹیں بدلی جائیں، یا صفائی اور ستھرائی کے اور دوسرے طریقے اختیار کیے جائیں یا ہر ملک کے رہنے والے اپنے ملکی طریقہ کا جائز لباس پہنیں، حلال کھانا کھائیں، بیٹھنے اور سونے کے مناسب سامان استعمال کریں تو اس کی پوری اجازت ہے، لیکن اس اجازت کے باوجود ایک مرتبہ عشق و محبت کا ہے، جو لوگ اس سے راہِ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا عزم رکھتے ہوں، ان کے لیے زمانہ کچھ ہی بدل جائے، مگر ان کی نظر میں وہی ادائیں محبوب ہیں جو محبوب سے نسبت رکھتی ہیں۔

[1] حجۃ اللہ البالغۃ، ج ۲، ص: ۱۳۳۔ [2] ہمارے فقہا نے اسی کو سنن الہدیٰ اور سنن الزوائد کی اصطلاحوں میں بیان کیا ہے۔

[3] آنحضرت ﷺ نے چھری سے گوشت کاٹ کر کھایا ہے۔

حکمتِ ربانی کا چشمہ نور

﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۲۹)

ناظرین! آپ نے کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھ لیا، اسلام کی اخلاقی تعلیموں اور پیغمبر اسلام ﷺ کی اخلاقی ہدایتوں کا ایک ایک حرف آپ کی نظر کے سامنے آ گیا، آپ نے دیکھا کہ اسلام کا فلسفۂ اخلاق کتنا مکمل، اس کی تعلیم کتنی کامل، اس کے تہذیب وتمدن کے اصول کتنے اعلیٰ اور اس کی اخلاقی تربیت کے نظریے کتنے بلند ہیں اور یہ سب کچھ ایک نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبانِ وحی ترجمان سے ادا ہوا۔ اگر حضور کی صداقت کی کوئی دلیل نہ بھی ہوتی تو یہی ایک چیز کافی تھی کہ جس بلندی تک حکمائے زمانہ، فلاسفہ روزگار اور قوموں کے معلم پہنچنے سے عاجز رہے، ''معلمِ امی ﷺ'' کسی انسانی تعلیم کے سہارے کے بغیر وہاں تک پہنچ گئے۔

اگر چہ یہ بات خود بھی اپنی جگہ پر بہت بڑی ہے، لیکن اس سے بھی بڑی یہ ہے کہ اس قوم کو جو تہذیب وتمدن سے ناآشنا، اخلاقِ عالیہ سے بیگانہ اور سلیقہ وشعور سے عاری تھی، نہ صرف اخلاق وتمدن کے ایسے بلند حکیمانہ اصول اور نظریے سکھائے، بلکہ اپنی تعلیم وتربیت کے صیقل سے ان میں ایسی جلا پیدا کر دی کہ دنیا ان کے اخلاقی جلوؤں کو دیکھ کر ششدر رہ گئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا قبول ہوئی یا یہ کہیے کہ وہ پیشین گوئی پوری ہوئی جو اسماعیل نسل کے خاتم المرسلین ﷺ کی آمد کے لیے کی گئی تھی: ﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ﴾ ''یعنی ایسا نبی جو ان امیوں کو اللہ کے احکام اور اخلاق وحکمت سکھائے اور ان کو اپنی تعلیم وتربیت سے پاک وصاف کر کے نکھار دے''۔ یہ نکھارنے والا آیا اور نکھار کر دنیا کو پر بہار بنا گیا۔ (ﷺ)

امیدوارِ رحمت
سید سلیمان ندوی
۲۹ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ



سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ختم نبوت ﷺ زندہ باد　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈ من کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی و غیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسیج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈ من سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخِ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈ من سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسیج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117　محمد سلمان سلیم

0343-7008883　پاکستان زندہ باد

0333-8033313　راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

محمد رسول اللہ

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

تخریج شدہ ایڈیشن

محسنِ انسانیت ﷺ کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب



سیرۃ النبی ﷺ

تالیف

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ
علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ اسلامیہ

تخریج شدہ ایڈیشن

حصہ ہفتم

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

محسن انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب

اس حصے کا موضوع بحث ''معاملات'' ہے، نیز اسلام میں حکومت کی حیثیت و اہمیت، عہد نبوی ﷺ میں نظام حکومت، سلطنت اور ملکیت کی حقیقت جیسے متفرق مضامین ومباحث بھی شامل ہیں۔

تالیف

علامہ شبلی نعمانی

علامہ سید سلیمان ندوی

مکتبہ اسلامیہ

کتاب ---------------------- سیرۃ النبی ﷺ

تالیف ---------- علامہ شبلی نعمانی ، علامہ سید سلیمان ندوی

ناشر ---------------------- محمد سرور عاصم

اشاعت ---------------------- اکتوبر 2012ء

قیمت ----------------------

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون: 37244973-042 فیکس: 37232369-042

بیسمنٹ سمت بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد۔پاکستان فون: 2034256 ,2631204-041

E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ۔
وَخَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

سیرت النبی ﷺ اب بین الاقوامی اسلامی کتب خانہ (جو صدیوں میں سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بلکہ اسلامیات پر مختلف اسلامی ملکوں اور وہاں بولی جانے والی زبانوں میں تیار ہوا ہے) کی ایسی متاع گرانمایہ اور علمی شاہکار ہے جس کو کسی تعارف اور کسی مدح وتوصیف کی اب ضرورت نہیں، بلکہ اس کی انفرادیت کا اعتراف اور اس سے اپنے تاثر وعقیدت کا اظہار اپنی خوش مذاقی و دیدہ وری کا ثبوت فراہم کرنے کے مرادف ہے:

مادح خورشید مداح خوداست

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ غیر معمولی وصف ہے کہ انہوں نے سیرت کا دائرہ صاحب سیرت علیہ الف الف صلوٰۃ کی سیرت طیبہ، حالات وواقعات اور شمائل وعادات سے آگے بڑھا کر پیغام محمدی ﷺ، تعلیمات نبوی اور شریعت اسلامی کے تمام شعبوں تک وسیع کر دیا ہے، انہوں نے پہلی دو جلدوں کے بعد جن کا اصل ڈھانچہ علامہ شبلی کے قلم اعجاز رقم کا تیار کیا ہوا ہے، دلائل ومعجزات اور منصبِ نبوت (عقائد، عبادات اور اخلاق) کو بھی اپنی تصنیف کے دائرے میں لے لیا اور ان عنوانات پر چار ضخیم جلدیں مرتب فرما کر بعثتِ محمدی ﷺ اور سیرتِ نبوی ﷺ کی وسعت و جامعیت، اس کی بے خطا رہبری و رہنمائی اور ہر عہد میں حیات انسانی ونسل آدم کے لیے ہدایت وسعادت کے اس سامان کو اس طرح علمی انداز میں پیش کیا اور دوسرے مذاہب اور تعلیمات سے تقابلی مطالعہ کا اہتمام کیا کہ یہ کتاب ہر ملک کی نئی تعلیم یافتہ نسل کے لیے رشد وہدایت کا ایک صحیفہ اور ذاتِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے گہرے تعلق کا ایک قوی ذریعہ بن گئی۔

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارادہ اخلاق کے بعد معاملات وسیاسیات پر بھی ایک ضخیم جلد مرتب کرنے کا تھا، اگر ایسا ہو جاتا تو یہ کتاب سیرت وتعلیماتِ نبوی ﷺ پر ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کا درجہ حاصل کر لیتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ ان کو اس موضوع پر چند مضامین ہی کے لکھنے کی نوبت آئی تھی اور وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے تھے کہ ان کی کتابِ زندگی کا آخری ورق الٹ گیا اور وہ اس کتاب کو مکمل نہ کر سکے، لیکن انہوں نے

جس پیمانہ پر اس کام کو اٹھایا تھا اور ان کے سامنے کتاب کا جو خاکہ اور منصوبہ تھا (جس کا اندازہ اس کے مقدمہ ہی سے ہو جاتا ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اگر مکمل ہو جاتی تو نہ صرف سلسلہ سیرت النبی ﷺ کی تکمیل ہو جاتی بلکہ ان کے علمی اور ذہنی کمالات وسعت نظر، جامعیت، اعتدال و توازن، احتیاط و تورع، شریعت اسلامی کی روح و مزاج سے آشنائی، قدیم و جدید کی واقفیت، دین کے اولین و مستند ترین ماخذ سے نہ صرف براہِ راست واقفیت بلکہ ان میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت رکھنے اور اس علمی و فکری پختگی کی بنا پر (جو اس درجہ میں ان کے بہت کم معاصرین کو حاصل ہوگی) جو چیز تیار ہوتی اس میں شریعت اسلامی اور تعلیمات نبوی ﷺ کی بہتر سے بہتر نمائندگی اور ترجمانی ہوتی، افراط و تفریط سے پاک تجدد و آزاد خیالی کے ہر شائبہ سے محفوظ اور اسی کے ساتھ جمود و تنگ نظری سے بھی پوری طرح بری ہوتی اور اس میں ان صدہا سوالات کا جواب بھی ہوتا جو عصرِ حاضر کے ذہن اور حالات و مسائل کے مطابق کسی جامع کتاب کے نہ ہونے سے تشنہ جواب رہتے ہیں، اس عہد کے خاص حالات نے اور مغرب میں جو فلسفے وجود میں آئے اور اجتماعیات و سیاسیات کو جو اہمیت حاصل ہوئی (جس کی نظیر گزشتہ عہدوں میں نہیں ملتی) اس کے پیشِ نظر اس کی سخت ضرورت تھی اور یہ وقت کا ایک نہایت ضروری اور انقلاب انگیز کام ہو جاتا۔

لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو حیات مستعار کی تھوڑی فرصت رہ گئی تھی، قلم میں خطبات مدراس اور سیرت النبی ﷺ کی جلد سوم، چہارم، پنجم و ششم کا زور اور آبشار علم کی روانی باقی نہیں رہی تھی، پھر بعض اسباب کی بنا پر دارالمصنفین کی وہ پرسکون فضا اور اس کے وسیع کتب خانہ سے استفادہ کا ہمہ وقت موقع اور فراغ خاطر باقی نہیں رہا تھا اور اس کتاب کا بڑا حصہ غالبًا ناسازگار اور ناہموار حالات اور صحت کی غیر مستقل و غیر معتدل کیفیت میں لکھا گیا، لیکن ایک مبصر و ماہرفن اور ایک استاد و کہنہ مشق مصنف کی بات ہی الگ ہوتی ہے، وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتا ہے اس میں ایک امتیازی شان پیدا کر لیتا ہے اور اس کے اجمال میں سینکڑوں صفحات کا عطر اور اس کے اشارات میں بیسیوں کتابوں کا خلاصہ اور حاصل مطالعہ ہوتا ہے، جس کی قدر و قیمت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنہوں نے اس موضوع پر بیسیوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہو اور وہ اس راہ کی مشکلات سے واقف ہوں۔ عرصہ سے سیرت النبی ﷺ کے مے خانے کے مے خوار اور سید صاحب کی تحریرات و تحقیقات کے عاشق اس بات کے متمنی تھے کہ معاملات پر سید صاحب کے قلم سے سیرت جلد ہفتم کے لیے جو متفرق مضامین و مباحث نکلے ہیں اور سنا جاتا ہے کہ وہ ان کے پرانے کاغذات میں موجود ہیں، وہ اسی حالت میں کسی طرح زیورِ طبع سے آراستہ ہو جاتے تو ان کو پڑھ کر سیرۃ النبی ﷺ کی چھ جلدوں کے قارئین و عشاق اپنی پیاس بجھاتے اور اپنے قلب و نظر کو روشن کرتے، اللہ کا شکر ہے کہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ناظم دارالمصنفین کو دوسری سعادتوں کے ساتھ اس سعادت کے حصول کا بھی

موقع ملا اور انہوں نے ان مضامین کو یک جا کر کے سیرۃ النبی ﷺ جلد ہفتم کے نام سے ایک مجموعہ میں جمع کر دیا، یہ حصہ اگر چہ (سابقہ جلدوں کے مقابلہ میں) ضخامت میں بہت کم ہے، لیکن اس کی قامت کی کوتاہی کو اس کی قیمت کی بڑائی پورا کرتی ہے اور اس چھوٹی سی کتاب میں بہت سے ایسے نکتے، وسیع مطالعے کا نچوڑ اور فکر و نظر کی پختگی کے نمونے موجود ہیں جو بہت سی ضخیم کتابوں میں نہیں ملیں گے، ان کے زمانے کے متعدد مصنفین اور تحریکوں کے قائد افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے ہیں اور انہوں نے مغربی و مادی فلسفوں کا اثر شعوری و غیر شعوری طریقے سے قبول کر لیا ہے، اس لیے ان کا قلم اس سلسلہ میں اور بھی زیادہ محتاط ہو گیا، اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو خود بھی اس موضوع کی نزاکت اور اس پر قلم اٹھانے کی ذمہ داری کا شدت سے احساس تھا، اس لیے ان کو اس میں عرصہ تک تردد رہا، مقدمہ میں فرماتے ہیں:

"اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال تسکین پا سکے اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں، ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے۔ ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گزرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصاً اس لیے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے علما کی کتابیں نصاً اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے"۔ [1]

آگے بڑھ کر لکھتے ہیں:

"اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مدان کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بار بار قلم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹانا پڑا چنانچہ کام کا آغاز ۷ جمادی الثانی ۱۳۵۸ھ کو کر دیا گیا تھا، لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیا، دو سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کیا اور پھر رک جانا پڑا، ۲۴ شعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا، لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا، اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے، مگر انجام عالم الغیب کو معلوم ہے۔" [2]

اس مختصر کتاب میں بھی بعض ایسے اصولی مسائل آ گئے ہیں جن سے عام طور پر اس موضوع کی کتابیں خالی ہیں اور اس اجمال کو تفصیل میں لے جانے سے بعض اوقات مستقل تصانیف وجود میں آ سکتی ہیں، مثلاً اس کتاب میں "معاملات" کی تعریف اس کے اقسام اور ان کی تاریخ خاصی بصیرت افروز اور معلومات افزا ہے "میزان" کی وسیع اور جامع تعریف قرآن کی آیات کے تتبع اور گہرے مطالعے پر مبنی ہے۔ سید صاحب

---

[1] سیرۃ النبی ﷺ، جلد ۷، مقدمہ ص: ۵۔ [2] ایضاً، ص: ۶۔

کے قلم سے جو اس کتاب کی تالیف کے دوران سلوک کی ارتقائی منزلیں طے کر رہے تھے (جن کا تقاضا عام حالات میں نہ صرف جسمانی گوشہ نشینی و انقطاع بلکہ ذہنی عزلت اور وحدتِ مطلب بھی ہوتا ہے) پھر ان کا جس مرکزِ ارشاد سے تعلق تھا، وہ نہ صرف سیاست وحکومت کے مسائل سے کنارہ کش تھا، بلکہ اس کو اصلاح و تربیت کے لیے بعض اوقات مضر سمجھتا تھا، ایسی صورت میں ان کے قلم سے حکومت کے نعمت ہونے کا تذکرہ نکلنا ان کے ذہنی توازن اور اپنی شخصیت کے فکری ممیّزات کو قائم رکھنے کی دلیل ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت و سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے، یہاں تک کہ کتاب و نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔'' [1]

پھر اس کے ثبوت میں قرآن کی آیات بینات جمع کر دیئے ہیں اور یہ سیرت نبوی ﷺ کے مصنف کا قدیم شیوہ ہے لیکن پھر ان کا عصری مطالعہ اور اسلامی تحریکات نے جو لٹریچر پیدا کیا ہے، اس کی واقفیت ان کا قلم پکڑ لیتا ہے اور ان کے قلم سے حسب ذیل الفاظ نکلتے ہیں اور اس طرح وہ راسخین فی العلم و الدین کے مسلک کی پوری ترجمانی کرتے ہیں:

> ''اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں، جس سے یہ معلوم ہو کہ قیامِ سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقائد و ایمان، شرائع و احکام اور حقوق و فرائض اس کے لیے بمنزلہ تمہید تھے، بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں اور ایک حکومتِ صالحہ کا قیام ان کے لیے وجہ اطمینان اور سکونِ خاطر کا باعث ہے، تاکہ وہ احکامِ الٰہی کی تعمیل با آسانی کر سکیں، اس لیے وہ عرضاً مطلوب ہے''۔ [2]

اور اس کی تائید کے لیے وہ سورۂ نور کی وہ مشہور آیت نقل کرتے ہیں، جس میں اللہ نے ان مسلمانوں سے جو ایمان اور عمل صالح سے متصف ہوں اور توحید اور اجتناب عن الشرک کی شرط پوری کرتے ہوں، خلافت کا وعدہ کیا ہے اور اس کی غرض اور نتیجہ دین مقبول کی پائیداری و استواری اور اس امن وامان کا قیام بیان کیا ہے، جس کے بغیر دین کے احکام اور تقاضوں پر اطمینان سے عمل بھی نہیں ہو سکتا۔

مصنف کی نظر چونکہ مذاہب سابقہ پر بھی گہری اور وسیع ہے اور جدید فلسفے اور نظام بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں، عیسائیت کی تاریخ بھی ان کے سامنے ہے جو تفریقِ دین و سیاست کی قائل تھی اور اس کے متعلق ان کے نامور معاصر اور محبوب دوست اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح کہا ہے:

کلیسا کی بنیاد رہبا نیت تھی سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں کہ وہ سر بلندی ہے یہ سر بزیری

[1] مقدمہ، ص: ۲۳۔ [2] مقدمہ، ص: ٤٧۔

اس لیے خطباتِ مدراس اور رسولِ وحدت کے مصنف کے قلم سے بے اختیار اور کسی قدر جوش کے ساتھ یہ عبارت نکل گئی ہے کہ

''اسلام دین و دنیا اور جنتِ ارضی اور جنتِ سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح اللہ اور قیصر دو نہیں، ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے، جس کے حدودِ حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ، اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے، وہی آسمان پر حکمران ہے وہی زمین پر فرماں روا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ ۚ ﴾ (۴۳/ الزخرف: ۸۴)

''اور وہی ہے جو آسمان میں اللہ اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔'' [1]

چونکہ ان کی مسلمانوں کی تاریخ پر وسیع اور گہری نظر ہے اور انہوں نے دیکھا ہے کہ کس طرح خلافت اسلامی عام دنیاوی حکومت میں تبدیل ہوگئی ہے، نیز وہ موجودہ دور کے قیامِ حکومت کے نعرہ اور اس کے محرکات اور جذبات کو بھی سمجھتے ہیں، اس لیے یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

''اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول نہ خراج کا وصول ہے، نہ غنیمت کی فراوانی نہ دولت کی ارزانی، نہ تجارت کا فروغ نہ جاہ و منصب کا فریب، نہ عیش و عشرت کا دھوکا اور نہ شان و شوکت کا تماشا ہے، بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجاآوری اور اس کے لیے جدوجہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔'' [2]

غرض یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود بہت سے فکر انگیز مضامین اور حقائق پر مشتمل ہے، اگر اس میں سیاسیات اور نظمِ حکومت کا پورا حصہ آ جاتا تو وہ اس عظیم خلا کو بہترین طریقے پر پُر کرتی جو جدید اسلامی لٹریچر میں پایا جاتا ہے اور جس کی اہمیت کا احساس موجودہ حالات میں مغربی فلسفوں کی سحر انگیزی اور اس کے تفوق و قیادت نے اور بڑھا دیا ہے، لیکن جو کچھ بھی ہے وہ اپنے اثر و وزن میں ''نقش سلیمانی'' ہے اور نقش ہمیشہ مختصر اور اکثر آنکھوں سے مستور ہوتا ہے۔

آثارِ قیامت میں سے یہ بات بھی ہے کہ سیرت نگارِ نبوی، متکلمِ اسلام اور نابغہ عصر، استاذ الاساتذہ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرہ آفاق کتاب سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی جلد پر یہ ہیچمدان پیش لفظ لکھے، لیکن کسی قدر اس سے تسکین ہوتی ہے کہ کتاب مکمل نہیں ہے، اس لیے اس پر ایک ''ناقص'' کا کچھ لکھنا محلِ تعجب نہیں کہ

دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ۔ ۲۸ مئی ۱۹۸۰ء ابوالحسن علی ندوی [3] ۱۱ رجب ۱۴۰۰ھ

---

[1] مقدمہ، ص: ۴۹۔ [2] مقدمہ، ص:۔ [3] اس مضمون میں مقدمہ کے حوالہ سے جو صفحات نمبر دیئے گئے ہیں وہ سابقہ ایڈیشن کے ہیں، اس ایڈیشن میں نمبر صفحات تبدیل ہو گئے ہیں۔

اظہار عجز

من و شبہا و بیداری و حیرانی و خاموشی!
کہ محرم نیست خسرو راز ہاں در گفت گوئے تو

دارالمصنفین اعظم گڑھ
۷ جولائی ۱۹۸۰ء، ۲۳ شعبان المعظم ۱۴۰۰ھ

ہیچمدان مور سلیمان
سید صباح الدین عبدالرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى
سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهِ الطَّاهِرِيْنَ

مُقدّمہ

معاملات

ساتویں جلد کا موضوع معاملات

سیرت کی یہ ساتویں جلد معاملات سے متعلق ہے۔

معاملات کے حدود

معاملات کا اطلاق فقہا نے حقوق عباد کے ایک خاص حصہ پر کیا ہے۔ مثلاً: بعض فقہائے شافعیہ نے احکام شرعیہ کی تقسیم یوں کی ہے، یا تو وہ آخرت سے متعلق ہوں گے تو ان کا نام عبادات ہے اور یا امور دنیا سے اس کا تعلق ہوگا تو ان کی تین قسمیں ہیں، اگر ان احکام شرعیہ سے جو امور دین کے متعلق ہیں، اشخاص کی بقا مطلوب ہے تو ان کو معاملات کہتے ہیں (جیسے خرید وفروخت واجارہ ورہن وغیرہ) اور اگر خاندان کی بقا مطلوب ہے تو ان کا نام مناکحات ہے (جیسے نکاح وطلاق وخلع وتفریق وغیرہ) اگر ان کی غرض کسی پوری آبادی (مدینہ) کی بقا ہے تو ان کو عقوبات کہیں گے۔ [1] (جیسے قصاص وسزا وتعزیرات وغیرہ)

امام شاطبی نے موافقات کے شروع میں دین کے ضروری احکام کی، جن پر دین ودنیا کی مصلحتیں موقوف ہیں اور جن کے نہ ہونے سے دین ودنیا میں فساد راہ پائے گا اور انسانی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی، یہ قسمیں کی ہیں:

عبادات جیسے نماز روزہ وغیرہ اور عادات جیسے ماکولات، مشروبات، ملبوسات اور مسکونات کے احکام اور تیسری چیز معاملات ہے، جس سے مقصود نسل ونفس اور مال کی حفاظت ہے اور چوتھی چیز جنایات ہے جس سے مقصود وہ احکام ہیں جن کا اجرا اس شخص پر ہوگا جو احکامِ بالا کو توڑے (جیسے قصاص وحدود وتعزیرات)۔

فقہائے احناف میں سے علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ نے بحر الرائق کے شروع میں امور دین کو پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے، اعتقادات، عبادات، معاملات، مزاجر اور آداب اور ان میں سے معاملات کی تشریح یہ کی ہے کہ یہ حصہ پانچ ابواب پر منقسم ہے، معاوضات مالیہ (بیع وفروخت وغیرہ) مناکحات (نکاح وطلاق وغیرہ) مخاصمات (آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ) امانات اور ترکات (وراثت) اور مزاجر، یعنی جن کاموں پر شریعت

[1] کشاف، اصطلاحات الفنون، احمد تھانوی، مطبوعہ کلکتہ، ج ۱، ص: ۲۳ بحوالہ توضیح وتلویح۔

نے زجر کیا ہے اس کی بھی پانچ قسمیں ہیں، قتلِ نفس پر زجر، کسی کا مال زبردستی لے لینے پر زجر، کسی کی آبرو ریزی پر زجر، کسی کی پردہ دری پر زجر، قطع بیضہ (اسلام کا استیصال اور اس سے انحراف) پر زجر۔

معاملات سے ہماری مراد

لیکن ہم نے اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تینوں تعبیروں سے زیادہ وسیع معنی میں کیا ہے، یعنی ہماری مراد معاملات سے وہ تمام احکامِ شرعیہ ہیں، جن کا تعلق ان تمام حقوقِ عباد سے ہے، جن کی حیثیت قانون کی ہے، جن میں معاملات اور مزاجر دونوں داخل ہیں اور جن کا منشا جان و مال و آبرو کی حفاظت ہے، خواہ وہ اشخاص کی مصلحت سے متعلق ہوں یا خاندان کی، یا پوری آبادی و مملکت (مدینہ) کی۔ آبادی و مملکت جن کا قانونی نام مدینہ ہے، اس کی حفاظت و مصلحت کے قوانین کا نام سیاست ہے۔ لیکن ہمارے قدیم فقہا نے اس کے لیے سیر کی اصطلاح قائم کی ہے، جیسے کتاب السیر امام محمد، اس میں امارت و خلافت اور صلح و جنگ کے مسائل آ جاتے ہیں اور متاخرین نے ان کو احکام سلطانیہ کے نام سے لکھا ہے، جیسے احکام السلطانیہ قاضی ماوردی شافعی المتوفی ۴۵۰ھ اور احکام السلطانیہ قاضی ابویعلیٰ حنبلی المتوفی ۴۵۸ھ، لیکن ان کتابوں میں ضمناً جزیہ و خراج و زکوۃ کی مناسبت سے مالی مسائل بھی زیر بحث آ گئے ہیں اور اسی لیے بعض بزرگوں نے ان مباحث کو الگ کر کے ان کا نام کتاب الاموال، یا کتاب الخراج رکھا ہے، جیسے کتاب الاموال ابوعبید بن سلاّم المتوفی ۲۲۴ھ اور کتاب الخراج قاضی ابویوسف المتوفی ۱۸۲ھ اور کتاب الخراج یحییٰ بن آدم القرشی المتوفی ۲۰۳ھ، اہل سنت کے نزدیک گو امامت اصول عقائد میں سے نہیں ہے، تاہم اس کے ضروری مباحث کتب عقائد کے خاتمہ میں ذکر کر دیے جاتے ہیں، جن میں امامت کے شرائط اور طریق انتخاب، اس کی ضرورت اور حقیقت پر مختصر بحثیں ہوتی ہیں۔ لیکن موجودہ زمانے میں ان مسائل کی ترتیب اور ان کے بیان کا طرز اگلے بزرگوں کے طرزِ بیان سے بالکل مختلف ہوگا اور ان کے لیے اصطلاحیں بھی نئی اختیار کرنی پڑیں گی، اس لیے معاملات کی اس جلد میں قدیم اصطلاحات میں کمی وبیشی اور مباحث میں ردوبدل اور نئی ضرورتوں کے لیے نئے ابواب کا اضافہ ناگزیر ہے۔

اب ہماری نئی اصطلاح میں معاملات سے مقصود مسلمانوں کے وہ تمام انسانی کاروبار ہیں، جن کا تعلق معاشرت مال و دولت اور حکومت کے ضابطوں اور قوانین سے ہے، دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تمام اجتماعی کاروبار کے ضابطوں اور قانونوں پر ہوا ہے، جن سے دو یا دو سے زیادہ افراد پوری جماعت کے قانونی حقوق کی تشریح ہو اور ان ضابطوں اور قانون کی تفصیل ہو۔ ان تمام مسائل کو اگر ہم کسی قدر مسامحت کے ساتھ چند بڑے بڑے عنوانوں کے تحت کرنا چاہیں تو حسب ذیل تین قسمیں ہو سکتی ہیں: معاشریات، اقتصادیات اور سیاسیات اور ان تینوں کے تحت میں اور بہت

سے ضمنی ابواب ہو سکتے ہیں اور انہی تینوں مباحث کے مجموعہ پر معاملات کا اطلاق کیا گیا ہے، معاشریات میں نکاح وطلاق وغیرہ کے قوانین سے بحث ہوگی، اقتصادیات میں تمام مالی وتجارتی کاروبار کا بیان آ جائے گا اور سیاسیات میں حکومت وسلطنت اور اس کے متعلقات مذکور ہوں گے۔

اس کام کا اشکال

یہ احکام قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں، محدثین نے حدیث کی کتابوں میں ان حدیثوں کو مختلف ابواب میں ذکر فرمایا ہے، جن میں یہ احکام مذکور ہیں اور فقہا نے فقہ کے متعدد بابوں میں ان مسائل کا احاطہ کیا ہے، اس لیے ان احکام کو اگر صرف نقل ہی کر دینا ہوتا تو کام آسان تھا، مگر موجودہ زمانے میں کام کی نوعیت اتنی ہی نہیں ہے، بلکہ اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال تسکین پا سکے اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے، ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گزرنا ہوگا، جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصاً اس لیے کہ سیاسیات واقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے قدما کی کتابیں نصًّا اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لیا جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے، مشکلات کا ایک اور سبب یہ ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ کے سیاسیات کے احکام وفرائض کا ماخذ خود ذاتِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ ہے اور حضور انور ﷺ کی ذات مبارک میں امامت کے ساتھ نبوت بھی جمع ہے، جس سے ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناخن کو گوشت سے علیحدہ کرنا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مدان کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بار ہا قدم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹا لینا پڑا، چنانچہ کام کا آغاز گو ۷ جمادی الثانیہ ۱۳۵۸ھ کو کر دیا گیا تھا لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیے، دو سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کر لیا اور پھر رک جانا پڑا، ۲۴؍ شعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا۔ لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا۔ اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے، مگر انجام عالم الغیب کو معلوم۔ ﴿ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۝ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۝ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۲۵ تا ۲۸)

دیگر مذاہب اور معاملات

دنیا کے مذاہب نے معاملات کو اپنی تعلیم کا حصہ بنانے میں مختلف رجحانات ظاہر کیے ہیں، تورات میں وہ مذہبی قوانین کا ضروری اور اہم جزو ہے لیکن عیسائیت نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہندوستانی مذہبوں میں بھی دونوں قسمیں نظر آتی ہیں، عام ہندوؤں میں منوشاستر اور اس کی مختلف تشریحیں انہی معاملات کی شاخیں ہیں، مگر شاید بودھ مت نے اخلاق ہی کو بڑھا کر قانون بنانے کی کوشش کی ہے، تاہم یہ سب قومیں

اپنے قانون کا ماخذ علمِ الٰہی اور علمِ مافوق انسانی کو قرار دیتی ہیں۔

معاملات کے ماخذ

دنیا میں ایسی قومیں بھی ہیں جنھوں نے اپنے قانون کی بنیاد وحی الٰہی کے بجائے عقلِ انسانی پر رکھی ہے اور انسانی تجربہ وقیاس کو اپنے قانون کی اساس بنایا ہے اور کہیں صرف سردار یا بادشاہ کی شخصی خواہش اور میلان طبع قانون کا معیار ہے، کہیں شخص نے جمہوریت کی شکل اختیار کر لی ہے اور افراد کی کثرت اور قلت اور کسی طرف رائے دینے والوں کی تعداد کی کمی اور بیشی کو صحت اور غلطی، صواب اور خطا اور حق و باطل کا معیار بنایا گیا ہے، یہ افراد وارکان مختلف اداروں سے چنے جاتے ہیں اور مختلف فرقوں سے منتخب ہوتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگر ذاتی ہوا وہوس نہ ہو تو بھی فرقہ وارانہ ہوا وہوس اور جماعتی تعصب اور فرقوں کا نفع ونقصان قوانینِ جمہور کی بنیاد قرار پاتا ہے اور جمہوریت کے لباس میں شخصیت اور فرقہ واریت صرف اپنے نفع کی خاطر جمہوریت پر حکم نافذ کرتی ہے اور جمہور کو اس کا پابند بناتی ہے۔

قانون سازوں کی بیچارگی

اگر اسلام کے قانون میں مسلم اور غیر مسلم کا ایک فرق بیچ میں حائل ہے تو جمہوری نظام میں ملکی اور غیر ملکی قوم اور غیر قوم، امیر وغریب، سرمایہ دار اور مزدور، تجارت پیشہ اور زمیندار طبقہ اور غیر طبقہ، پارٹی اور غیر پارٹی کے بیسیوں حجابات اور دیواریں حائل ہیں، جن میں سے ہر ایک اس قدر مضبوط ہے کہ اس کا ہٹانا آسان نہیں، جب کوئی تجویز معرضِ بحث میں آتی ہے تو انسانیت کے نقطہ نظر سے نہیں، بلکہ ملک، قوم، جماعت، طبقہ اور پارٹی کے نقطہ نگاہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور اس کو جمہور کے لیے آیۂ رحمت ثابت کیا جاتا ہے۔

جمہوریت کی ناکامی

اس جوش وخروش اور قوت اور دلیل سے جو تجویز آیۂ رحمت بن کر منظور ہوتی ہے، اس کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ ہر دوسری مجلس میں وہ بیک دفعہ یا چند منزلوں کے بعد بدل جاتی ہے، پھر ایک نئی تجویز اس کی جگہ پر آتی ہے، اس کی عمر بھی چند روز سے زیادہ وفا نہیں کرتی، آخر وہ بھی فنا ہو جاتی ہے اور تیسری اور چوتھی اور پانچویں آتی ہے اور اپنی اپنی راہ سے فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے، ان تمام تغیرات کی تہ میں جو ہاتھ کام کرتا ہے وہ قومی و جماعتی اور شخصی مفاد کا ادل بدل اور تغیر ہے، ایک راہ سے جب کسی جماعت کو فائدہ نہیں پہنچتا ہے یا ایک کو پہنچتا ہے دوسرے کو نہیں، تو وہ دوسری راہ سے اس کو ڈھونڈتی ہے اور جب وہ راہ بھی بند پاتی ہے تو تیسری راہ کی تلاش ہوتی ہے اور یوں ہی پوری عمر آوارہ گردی اور تلاش میں گزر جاتی ہے اور جمہور کو طمانیت کی دولت ہاتھ نہیں آتی۔

صحیح وعادلانہ قانون سازی سے انسانیت کی ناچاری

ان تغیرات کے باوجود جو قانون بنتا ہے، چونکہ وہ صرف ظاہری طاقت پر مبنی ہوتا ہے، اس لیے اس کے

چلانے میں اس کے چلانے والوں کا دل شریک نہیں ہوتا، اس لیے قدم قدم پر اس کے چلانے والوں کے ذاتی مفاد سے ٹکراتا ہے اور بارہا وہ حرص وطمع، غرور تکبر، ہوا وہوس، رشوت اور انتفاعِ ناجائز وخوف وہراس اور مکر وحیلہ کے بیسیوں خلافِ انسانیت جذبات سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتا ہے اور عدل وانصاف کی میزان ہاتھ سے ٹوٹ جاتی ہے۔

قانونِ الٰہی کی ضرورت

اسی سبب سے مصلحت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ عدل وانصاف کی یہ میزان خود دستِ الٰہی میں ہو، وہ جو کسی فرقہ اور کسی پارٹی میں نہیں، کسی کا ایسا نہیں جو دوسرے کا نہیں، وہ سب کا ہے اور سب کے لیے ہے اور تمام نفسانی اغراض سے پاک وبے نیاز ہے، جس کو اپنے لیے اور اپنی غرض کے لیے کچھ نہیں چاہیے، جس کو دنیا اور اس کی فطرت کا ایک ایک راز معلوم ہے اور جو کائنات کے ذرہ ذرہ سے آگاہ اور گوشہ گوشہ سے باخبر ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح دنیا میں عرش سے فرش تک اس نے اپنا تکوینی فرمان جس کو قانون طبعی کہتے ہیں، جاری کر رکھا ہے، اسی طرح زمین پر اپنا تشریعی فرمان جس کو شریعت کہتے ہیں، جاری فرمائے، جو تمام تر عدل وانصاف پر مبنی ہے۔

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۱۷)

''وہ اللہ جس نے حق اور ترازو کے ساتھ اپنی کتاب (قانون) اتاری۔''

﴿ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ ﴾ (۵۷/ الحدید:۲۵)

''اور نبیوں کے ساتھ کتاب (قانون) اور ترازو اتاری۔''

کتاب اور میزان

میزان سے مقصود یہ کاٹھ اور لوہے کی ترازو نہیں، بلکہ فطرت اور عدل وانصاف اور حق کی میزان ہے جس سے سارا نظام کائنات تُل رہا ہے اور سارے انسانی کاروبار اور اعمال تولے جاتے ہیں، چنانچہ تمام معاملات میں انصاف کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں کیا جائے تو یہ ہے کہ عدل کی میزان میں اونچ نیچ نہ آئے۔

﴿ اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝ ﴾ (۵۵/ الرحمٰن:۱۔۹)

''رحمت والا اللہ جس نے قرآن سکھایا، انسان کو بنایا اور اس کو گویائی سکھائی، سورج اور چاند حساب کے ساتھ ہیں اور بے تنے کے درخت اور تنے دار درخت اس کے زیر فرمان ہیں اور اسی نے آسمان کو اونچا کیا اور اسی نے ترازو (میزان) رکھ دی، تا کہ تول میں کمی بیشی نہ کرو اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔''

یہ دنیا کی سب سے بڑی ترازو ہے، اسی سے دنیا میں اعمال اور معاملات تولے جاتے ہیں، اسی کے اعتدال اور اونچ نیچ کا نام حق اور باطل، انصاف اور ظلم، صحیح اور غلط ہے، اس لیے اس پیمانہ اور ترازو کو ہمیشہ سچائی اور انصاف کے کانٹے پر رکھو۔ ان آیتوں میں انسان کا آفتاب، ماہتاب اور نباتات سے پہلے تذکرہ ہے کہ یہ قصد وارادہ سے محروم مخلوقات اللہ تعالیٰ کے تکوینی فرمان کے تحت طبعی طور سے قصد وارادہ کے بغیر کس طرح عدل وانصاف اور اللہ تعالیٰ کے مقررہ طبعی احکام واصول کے مطابق چل رہی ہیں، اسی طرح قصد وارادہ کی دولت ونعمت سے سرفراز مخلوق انسان کو بھی چاہیے کہ وہ ہوائے نفسانی سے بچ کر اپنے قصد وارادہ سے اللہ تعالیٰ کے احکامِ عدل کی پیروی اختیار کرے، قرآن پاک میں بار بار ہے:

﴿ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ ﴾ (٦/ الانعام:١٥٢)

''اور ناپ اور تول کو پورا کرتے رہو۔''

﴿ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ ﴾ (٧/ الاعراف:٨٥)

''تو ناپ اور تول کو پورا رکھو۔''

﴿ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ ﴾ (١١/ هود:٨٥)

''ناپ اور تول کو پورا کرو۔''

﴿ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ ﴾ (١١/ هود:٨٤)

''ناپ اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔''

ان آیتوں میں ناپ اور تول سے معمولی لین دین اور خرید وفروخت کی اشیاء بھی مراد لی جاسکتی ہیں اور لی گئی ہیں، لیکن اس پیمانے کو وسیع کیجیے تو سارے انسانی معاملات اس ترازو اور پیمانہ میں سما جاتے ہیں، [1] ہر انسانی ظلم کا تخم یہ ہے کہ انسان اپنے لیے ایک پیمانہ اور دوسرے کے لیے دوسرا پیمانہ چاہتا ہے، وہ اپنے لیے ایک ترازو سے ناپتا ہے اور دوسروں کے لیے دوسری ترازو سے اس ستم پیشہ پر اللہ کی اور ساری دنیا کی پھٹکار۔

﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ ﴾ (٨٣/ المطففين: ١-٣)

''پھٹکار ہے ان کم کردینے والوں پر جو اپنے لیے لوگوں سے ناپ پوری لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم کردیتے ہیں۔''

معاملات انسانی میں فساد کی پوری فہرست اسی ایک اجمال کی تفصیل اور اسی نکتہ کی تشریح ہے، چنانچہ سورۂ حدید میں زمین میں قیامِ عدل کے تین ذریعے ظاہر فرمائے گئے ہیں:

[1] تفسیر طبری میں آیات میزان سورۂ حدید، ج ٢٧، ص:١٢٢، اور سورۂ رحمٰن، ج ٢٧، ص:٦٢، ٦٣۔

﴿ لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۖ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ﴾ (۵۷/ الحدید:۲۵)

''اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت ہیبت ہے اور لوگوں کے لیے کئی فائدے ہیں۔''

اس آیت پاک میں عدل کے قیام اور ظلم کی روک تھام کے لیے تین چیزیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، ایک کتاب، یعنی احکامِ الٰہی کا مجموعہ، دوسری چیز وہ فطری صحیح دعادلانہ میزان جو ہر صداقت شعار دل میں دھری ہے اور جس پر انسانی قانون کی بنیاد کھڑی ہے اور تیسری چیز تلوار کی طاقت ہے جو ان دنوں کے ماننے پر ان کی گردنیں جھکا دیتی ہے، یعنی جو احکامِ الٰہی کے ماننے سے منکر ہیں اور جو اپنی فطرت کی صحیح میزان عدل کو توڑ چکے ہیں ان کو پھر طاقت کے زور سے قانون کے ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے، یہ آہنی آلہ جس کے ایک ہاتھ میں ہوتا ہے اس کا نام حکومت و ریاست ہے اور اس کے دوسرے ہاتھ میں قانونِ الٰہی کی کتاب بھی ہونی چاہیے جس کے ماننے پر وہ اپنے ماتحتوں کو مجبور کرے۔

قانون الٰہی کی دائمی یکسانی

قانون الٰہی کے نظریہ پر ایک شبہ یہ پیش ہوتا ہے کہ دنیا میں حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، اس لیے انسانی معاشرت کے خاکے بھی بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے، اس لیے قانون کو بھی بدلتا رہنا چاہیے، مگر یہ خیال سراسر فریب ہے، کیونکہ شے نہیں بدلتی، اس کے رنگ، شکل اور پہلو بدلتے رہتے ہیں۔ جس طرح مادیات کے اصول طبعی کبھی نہیں بدلتے (الا ماشاء اللہ) گرم چیز ہمیشہ گرم رہتی ہے اور ٹھنڈی، ٹھنڈی۔ آگ برف نہیں بنتی، برف آگ نہیں، روشنی تاریکی نہیں، تاریکی روشنی نہیں، زمانہ ہمیشہ بدلتا ہے، رات اور دن پے درپے آتے اور جاتے رہتے ہیں، گھنٹے گھڑی، پلک اور لمحے دم بدم بدل رہے ہیں، سال پر سال آتے ہیں مگر چاند اور سورج وہی ہیں، ان کی چال اور گردش وہی ہے اور ان کے قاعدے اور قانون وہی ہیں، جو طبعی قانون آج سے ہزار برس پہلے آب وگل کی دنیا پر حکمران تھا، آج بھی وہی ہے، اس میں نہ پہلی صدی تغیر پیدا کر سکی، نہ چودھویں صدی، پہلے بھی سال کے بارہ شمسی یا قمری دورے تھے اور اب بھی ہیں، کل بھی دن رات کے چوبیس گھنٹے تھے اور اب بھی ہیں۔ یعنی اللہ کی بات جہاں تھی وہیں رہی۔

﴿ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۝ ﴾ (۴۸/ الفتح:۲۳)

''اللہ کے قانون میں تو کوئی ادل بدل نہ پائے گا۔''

فطری حقوق ومعاملات کی یکسانی

ٹھیک اسی اصول پر جو اخلاقی ومعاشرتی قوانین اور انسانی معاملات کے جو اصول فطری ہیں ان میں نہ

کبھی کوئی تغیر ہوا ہے نہ ہوگا۔ نیکی بدی نہیں بنتی، بدی نیکی نہیں، سچ جھوٹ نہیں ہو جاتا، جھوٹ سچ نہیں، ظلم انصاف کا نام نہیں پاتا اور انصاف ظلم کا نہیں، دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا، دوسروں کی چیز ناحق لینا، چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا، دوسروں کی عزت و آبرو کو داغ لگانا، دوسروں کے مال کو ناجائز طریق سے لے لینا۔ حقِ قانون کے بغیر کسی عورت پر تصرف کرنا، کسی کی جائیداد اور ملکیت پر قبضہ کرنا ہمیشہ ناجائز رہا ہے اور رہے گا، لین دین میں طرفین کی رضامندی، لڑائی اور جھگڑے کے اسباب کی روک تھام، اخلاق سوز حرکات کی بندش، فتنہ و فساد کا انسداد، ظالمانہ طریقوں کی ممانعت، ہر عہد میں، ہر قانون کی متفقہ دفعہ رہی ہے، جب کبھی کوئی قانون بنا ہے، یہی فطری دفعات قانون کے ضروری اجزا، رہے ہیں اور اب بھی جب کبھی بنے گا اس کے یہ اجزا برقرار رہیں گے۔ البتہ اس کے جزئیات نئے نئے پیش آئیں گے اور نئی نئی شکلوں میں ان کلیات کے فروع سامنے آتے رہیں گے اور ان کے لیے قانونِ الٰہی کے کلیات سے جزئیات اور احکام سے نظائر ہمیشہ نکلتے اور بنتے رہیں گے۔

قانون کا بنیادی تخیل

ہر مجموعہ قانون کا ایک بنیادی تخیل ہوتا ہے، جس پر اس مجموعہ کے ایک ایک جز کی بنیاد ہوتی ہے، یہ بنیاد کہیں قومی فوقیت، کہیں وطنی افادیت، کہیں نسلی امتیاز اور کہیں تجارتی مفاد قرار پاتی ہے، اس لیے اس مجموعہ قانون میں اسی بنیادی نقطۂ غرض کی لکیریں ابھری نظر آتی ہیں، جہاں قانون کی بنیاد قومی فوقیت ہے، وہاں کالے گورے، یورپین اور نیٹو کے اصول پر کارفرمائی ہے، جہاں وطن قانون کی اساس ہے، وہاں جغرافی اقطاع ارضی قانون کے اختلافات کا باعث ہوتے ہیں اور رومی اور غیر رومی، یونانی اور غیر یونانی، مصری اور غیر مصری، ملکی اور غیر ملکی نزاعات نے انسانی مفاد کے ٹکڑے کر دیے ہیں، یہی جذبہ آگے بڑھ کر ملک میں بھی صوبہ وار اختلاف کا بیج بوتا ہے، ہندوستانی ہونے کے باوجود پنجابی بنگال میں اور بنگالی پنجاب میں بیگانہ ہے، بہاری یوپی میں جگہ نہیں پا سکتا اور یوپی والے پر بہار کی وسعت تنگ ہے، فیشزم اور نازی ازم میں نسل کے دیوتا کی پوجا ہوتی ہے اور موجودہ امپیریلزم میں تجارتی مفاد کی خاطر قومیں غلام بنائی جاتی ہیں۔

قانونِ الٰہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت

اسلام کے قانون کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی اور اطاعت کے لیے زمین سے فتنہ و فساد کا دفع، اس کے بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و اطمینان کا قیام اور معاملات میں لوگوں کے درمیان سے نزاع اور خدع و فریب کی روک تھام ہے۔ [1] چنانچہ اسلام کے قانون میں جتنے حدود و تعزیرات ہیں ان کا مقصد زمین سے فتنہ و فساد کا دفع ہے اور جس قدر معاملات و معاشرت کے اصول اور مسائل ہیں، ان کا مبنیٰ

---

[1] علامہ عزالدین بن عبدالسلام مصری المتوفی ۶۶۰ھ کی کتاب قواعد الاحکام فی مصالح الانام اور شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ابواب معاملات ملاحظہ ہوں۔

بندوں کے درمیان عدل وانصاف اور امن واطمینان کا قیام ہے اور معاملات میں جتنے قانونی ممنوعات اور منہیات ہیں، ان سب کا منشا باہمی نزاع اور خدع وفریب کا استیصال ہے۔

اس اوپر کی تفصیل میں آپ نے دیکھا کہ کہیں رنگ اور نسل کا کوئی اختلاف، زبان اور لغت اور تہذیب وتمدن کا کوئی فرق اور ملک واقلیم کا کوئی امتیاز زیر بحث نہیں آیا ہے، یہ قانون اللہ کا ہے، اللہ کے سارے بندوں کے لیے بنایا گیا ہے، وہ چاہے کالے ہوں یا گورے، آریائی ہوں یا سامی، یورپی ہوں یا ایشیائی، ہندی ہوں یا حجازی، عجمی ہوں یا تاتاری، سب کے لیے یکساں اور سب کے لیے برابر ہیں۔

ایک اصولی فرق

بے شبہ ایک فرق اس میں جائز رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومت ان کی ہوگی جو اس کے اس قانون کو قانونِ الٰہی تسلیم کرتے ہیں، اس بنا پر انسانی افراد کی چار قسمیں ہو جاتی ہیں: ایک وہ جو اس قانون کو قانونِ الٰہی تسلیم کرتے ہیں، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اللہ واحد وبرحق کی طرف سے آخری طور پر آیا ہوا قانون مانتے ہیں، مسلمان ہیں۔ دوسرے وہ جو گو اس خاص قانون الٰہی کو نہیں مانتے، لیکن وہ کسی نہ کسی اگلے قانون الٰہی کو خواہ وہ کیسے ہی غیر محفوظ صورت میں اس وقت ہو، مانتے ہیں، ان کا نام ذمی ہے، لیکن ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کے پاس مانا ہوا قانونِ الٰہی اب بھی ان کے مانے ہوئے صحیفہ الٰہی کے ضمن میں موجود ہے، یہ کتابی ہیں اور دوم وہ جو اپنے قانونِ الٰہی کے صحیفہ کو کھو بیٹھے ہیں، یہ شبہ کتابی ہیں۔ چوتھے وہ ہیں جو سرے سے ہر صحیفہ الٰہی سے ناآشنا اور ہر قانون الٰہی سے محروم ہیں، ان کو مشرک کہتے ہیں۔ اسلامی قانونِ الٰہی میں ان چاروں کے درمیان بے شبہ بعض امتیازات ہیں، جن کی تفصیل اور مصلحتیں اپنی جگہ پر آئیں گی۔

اس تفصیل کے بعد آپ کو اجمالاً یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ معاملات کے حدود کیا ہیں اور اس کی وسعت میں کیا کیا چیزیں داخل ہیں، تاہم اس اجمال کا ایک ہلکا سا خاکہ آپ کے سامنے ہم بھی کھینچ دیتے ہیں۔

باہم انسانوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کے برقرار اور امور معاشرت کی میزان کو درست رکھنے کے لیے ایک عاملانہ طاقت وقوت کا وجود ضروری ہے، جو ہر چیز کو احکام شرع اور نظامِ عدل کے مطابق قائم رکھے، اس بحث کے دو ضروری جزو ہیں۔

1. اس عاملانہ طاقت وقوت کی ضرورت، حقیقت، اس کے شرائط واوصاف اور اس کے شعبے اور ادارے۔
2. معاملاتِ انسانی کے اقسام اور ہر قسم کے علیحدہ علیحدہ احکام اور اس کے اسرار ومصالح۔

اسلام میں حکومت کی حیثیت واہمیت

محمد رسول اللہ ﷺ دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے، آپ ﷺ نے صرف آسمانی بادشاہی کی خوش خبری نہیں سنائی، بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی تاکہ دنیا میں اللہ کی بندگی اور رضا جوئی بے خوف وخطر کی جا سکے اور اس کے لیے اللہ کی بادشاہی اللہ کے قانون کے مطابق دنیا میں قائم ہو:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــــًٔا ۭ ﴾ (۲۴/ النور:۵۵)

''اللہ نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں حاکم بنائے گا، جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا، جو ان سے پہلے تھے اور ان کے لیے ان کے اس دین کو جس کو اس نے ان کے واسطے پسند کیا ہے، جما دے گا اور ان کو ان کی اس بے امنی کے بدلے امن دے گا، میری بندگی کریں گے، میرا کسی کو ساجھی نہ بنائیں گے۔''

اور اس کے لیے اللہ کے نافرمانوں سے لڑائی لڑی جائے، تاکہ سارا حکم اسی ایک اللہ کا ہو جائے:

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ ﴾ (۸/ الانفال:۳۹)

''اور ان سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فساد نہ رہے اور سب حکم اللہ کا ہو جائے۔''

قرآن نے اللہ کے بعض نیک بندوں کی دعا یہ بتائی ہے:

﴿ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۰۱)

''اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔''

آخرت کی بھلائی تو معلوم ہے، لیکن دنیا کی بھلائی ہمارے مفسروں نے یہ بتائی ہے، علم وعبادت، تندرستی روزی، مال ودولت، فتح ونصرت، اولاد صالح، مگر یہ بھی حق تعالیٰ کے اطلاق کی تحدید ہے، دنیا کی بھلائی وہ ہے جو اللہ کی شریعت میں جائز ہے، ایک اور جگہ فرمایا:

﴿ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۭ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ﴾

(۱۶/ النحل:۳۰)

''اور جنہوں نے نیک کام کیے ان کے لیے دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیسا اچھا ہے۔''

مقصود یہ ہے کہ نیکوکاروں کے لیے دنیا کی بھلائی اور عزت بھی ہے اور آخرت کی بھی، لیکن آخرت کی بھلائی دنیا کی بھلائی سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوب ہے۔

جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی، ان کو بشارت ہے:

﴿ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾

(۳/ آل عمران: ۱٤۸)

''تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا اور اللہ نیکی والوں کو چاہتا ہے۔''

دنیا کا ثواب فتح ونصرت، ناموری وعزت، مال ودولت اور حکومت وسلطنت ہے۔

جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، اللہ نے ان کو دونوں جہان کی نعمتیں بخشیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ﴾ (۱٦/ النحل: ٤۱)

''اور جنھوں نے گھر چھوڑا اللہ کے لیے ستائے جانے کے بعد، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور بے شک آخرت کی مزدوری سب سے بڑی ہے۔''

دنیا کا اچھا ٹھکانا دنیا کی ہر جائز نعمت اور سطوت وحکومت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں کی دعا مانگی:

﴿ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ ﴾ (۷/ الاعراف: ۱۵٦)

''اور (اے خدا) ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ اور آخرت میں بھی۔''

ان سب آیتوں میں یہ بات خیال کے قابل ہے کہ ایمان اور نیکی والوں کو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی امید دلائی گئی ہے، مگر ہر جگہ یہ بتا دیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر بھلائی سے آخرت کی بھلائی اونچی، اچھی اور پائیدار ہے، اس لیے دنیا کی بھلائی ہماری زندگی کا اصل مقصد نہیں، بلکہ ضمنی ہو، یعنی آخرت کے کاموں کے صدقہ میں ہو، ورنہ اگر دنیا ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تو دنیا تو مل جائے گی، مگر آخرت ہاتھ نہ آئے گی:

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ڮ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ (۱۱/ ھود: ۱۵۔۱٦)

''جو کوئی دنیاوی زندگی اور اس کی آرائش چاہے تو ہم ان کے عمل ان کو اسی دنیا میں بھر کر دیتے

ہیں اور کمی نہیں کی جاتی، یہ وہ ہیں جن کے لیے آخرت میں دوزخ کے سوا کچھ نہیں اور وہاں جو کیا تھا مٹ گیا اور ان کی کمائی اکارت ہوئی۔"

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ ۖ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ ۝ ﴾ (٤٢/ الشورىٰ:٢٠)

"جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم اس کی کھیتی بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہو تو ہم دنیا میں سے اس کو کچھ دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔"

﴿ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ ۝ ﴾ (٣/ آل عمران: ١٤٥)

"جو دنیا کا ثواب چاہے گا تو اس میں سے ہم اس کو دیں گے اور جو آخرت کا ثواب چاہے گا اس میں سے ہم اس کو دیں گے اور شکر گزاروں کو ہم پورا اجر دیں گے۔"

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا ۝ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ۝ ﴾ (١٧/ بنی اسرآءیل:١٨۔١٩)

"جو کوئی چاہتا ہو دنیائے عاجل کو تو ہم جلد دے دیتے ہیں جس کو جو چاہتے ہیں، پھر ہم نے اس کے لیے دوزخ کو بنایا ہے، وہ اس میں داخل ہوگا برا ہو کر، دھکیلا جا کر اور جو کوئی آخرت چاہے اور اس کی پوری کوشش کرے اور وہ ایمان والا ہو تو وہی ہیں جن کی کوششوں کی قدر کی جائے گی۔"

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ﴾ (٤/ النسآء:١٣٤)

"تو جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو (اس کو معلوم ہو) کہ اللہ کے پاس دنیا و آخرت دونوں کا ثواب ہے۔"

پھر وہ کتنا احمق ہے جو صرف دنیا کے ثواب کا طالب ہے، حالانکہ اللہ کے پاس تو دونوں جہان کے خزانے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ جو تنہا دنیا کا طالب ہے، وہ آخرت سے محروم ہے، لیکن جو آخرت کا طلب گار ہے، اس کے لیے دونوں گھروں کے دروازے کھلے ہیں، لیکن جو اپنی حماقت اور نادانی سے صرف دنیا کے ثواب کا طالب بنے گا تو دنیا تو اس کو مل جائے گی، مگر آخرت کے ثواب کا دروازہ اس کے لیے بند ہو جائے گا۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت اور سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے، یہاں تک کہ کتاب اور نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے:

﴿ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴾

(٤/ النسآء: ٥٤)

''تو ہم نے ابراہیم والوں کو کتاب اور حکمت دی اور بڑی سلطنت بخشی۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں:

﴿ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ﴾

(٥/ المآئدة: ٢٠)

''اے میرے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو۔ جب تم میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ پیشین گوئی جو خبر کی صورت میں ہے، حضرت طالوت بادشاہ اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کے زمانہ میں پوری ہوئی، طالوت کی نسبت خبر دی گئی:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ﴾ (٢/ البقرة:٢٤٧)

''بے شبہ اللہ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا۔''

لوگ اس پر معترض ہوئے تو فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ (٢/ البقرة: ٢٤٧)

''اور اللہ جس کو چاہے اپنی حکومت دے دے۔''

حضرت داؤد علیہ السلام کو خطاب ہوا:

﴿ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ ﴾ (٣٨/ صٓ: ٢٦)

''اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس نعمت میں مزید وسعت کی دعا فرمائی:

﴿ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ﴾ (٣٨/ صٓ: ٣٥)

''اے میرے پروردگار! میری مغفرت کر اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو شایاں نہ ہو۔''

یہ نعمت کسی انسان کے دینے لینے سے نہیں ملتی، اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، وہ جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے:

﴿ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ﴾

(٣/ آل عمران: ٢٦)

''اے اللہ! اے سلطنت کے مالک تو جسے چاہے سلطنت بخشے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔''

وہ دیتا کس کو اور چھینتا کس سے ہے؟ اس کے متعلق اپنا قاعدہ کلیہ بنا دیا ہے:

﴿ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ۝ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ۝ ﴾

(۲۱/ الانبیاء:۱۰۵۔۱۰۶)

''بے شک زمین کے مالک میرے صالح بندے ہوتے ہیں۔اس اعلان میں اللہ کے فرمانبردار لوگوں کے لیے پیام ہے۔''

نعمت ملنے کی بشارت ملی تھی تو ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا کہ یہ نعمت ان کے کن کاموں کا معاوضہ ہے۔فرمایا:

﴿ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ۝ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۝ ﴾

(۲۲/ الحج:۴۰۔۴۱)

''اور البتہ اللہ اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرتا ہے، بے شک اللہ زبردست قوت والا ہے، وہ کہ اگر ہم ان کو زمین میں جما دیں تو وہ نماز کھڑی کریں، زکوۃ دیں، اچھے کاموں کو کہیں اور برے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔''

اور ظاہر ہے کہ جو اچھے کاموں کو کہے گا اور برے کاموں سے روکے گا، وہ پہلے خود اچھا ہوگا اور برے کاموں سے باز رہتا ہوگا۔

اللہ کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے دین حق کی مدد کی جائے، جو لوگ حق کی مدد کے لیے اٹھتے ہیں، اللہ ان کی مدد فرماتا ہے، ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں اللہ کے قانون کے اجرا کی طاقت ہونی چاہیے، چنانچہ اسلام میں سارے حدود و تعزیرات اسی منشا کے مطابق ہیں۔زنا کی حد میں فرمایا:

﴿ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ ﴾

(۲۴/ النور:۲)

''اور تم کو ان دونوں (زانیوں) پر اللہ کی حد جاری کرنے میں کوئی ترس نہ آئے، اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔''

سود کے اسلامی قانون کو جو نہ مانے اسے اللہ اور رسول سے لڑائی کے لیے تیار ہونا چاہیے:

﴿ فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۹)

''تو اے سود کھانے والو! اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے لڑنے کے لیے خبردار ہو جاؤ۔''

اس لیے نجران کے عیسائیوں سے آپ ﷺ نے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا، اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر وہ سودی لین دین کریں گے تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ [1] جو لوگ اسلام کے ملک میں بغاوت کریں، ڈاکہ ڈالیں لوٹ مار کریں، قرآن اس کو اللہ اور رسول سے لڑنا کہتا ہے اور اس کی سزا قتل، پھانسی، قطعِ ید اور قید یا جلا وطنی ہے اور ان کی اس بے کسی و بے بسی کی کیفیت کو عذاب اور دنیاوی رسوائی کہا ہے:

﴿ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۳۳)

''یہ ان کے لیے رسوائی ہے دنیا میں اور آخرت میں برا عذاب ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد جب فرعون نے اپنی شہنشاہی کے غرور میں بنی اسرائیل پر مظالم کے پہاڑ توڑنے شروع کیے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تسلی دی:

﴿ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۲۸)

''اللہ سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو۔ زمین تو اللہ کی ہے (اور) وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اس کا مالک بنا دیتا ہے اور آخر بھلا تو ڈرنے والوں کا ہے۔''

بنی اسرائیل نے اس صبر و تسلی پر جو درحقیقت پیشین گوئی کی بشارت تھی، الٹا اضطراب ظاہر کیا تو پھر فرمایا:

﴿ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۲۹)

''قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور اس کی جگہ تمہیں زمین میں خلیفہ بنائے پھر دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو۔''

آخر جب وعدہ الٰہی کے پورا ہونے کا وقت آیا تو فرعون کی شہنشاہی کا تخت الٹ گیا اور مصر کی وہی غلام اور بے کس قوم خلافتِ الٰہی کے تاج سے سرفراز ہوئی:

﴿ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۥ بِمَا صَبَرُوْا ۭ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۳۷)

''اور ہم نے اس قوم کو جو کمزور سمجھی جاتی تھی اس زمین کے پورب اور پچھم کا وارث بنا دیا، جس میں ہم نے برکت دی ہے اور اللہ کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی ان کے صبر کی وجہ سے۔''

[1] ابوداود، کتاب الخراج والفيء والامارة، باب في اخذ الجزية: ۳۰۴۱۔

یہ نعمت ان کو حق کی راہ میں صبر و استقلال سے ہاتھ آئی اور دنیا کی برکت اور سرفرازی ان کو ملتی رہی، لیکن جب ان کے ہاتھ سے راہ حق میں صبر و استقلال کا دامن چھوٹنے لگا اور پیغمبروں کے ماننے سے منہ پھیرنے لگے، تو دفعتہً عزت کا یہ تاج ان کے سر سے اتر گیا، اللہ نے پیشین گوئی فرمائی:

﴿ وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا۝ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا۝ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا۝ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا۝ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآءیل: ٤۔۷)

’’اور ہم نے بنی اسرائیل کو خبردار کر دیا تھا کہ تم دو دفعہ زمین میں فساد کرو گے اور بڑی سرکشی کرو گے تو جب ان میں سے پہلے وعدہ کا وقت آیا تو ہم نے ان پر اپنے بڑے سخت بندوں کو بھیجا، تو وہ ملک میں گھس گئے اور اللہ کا وعدہ ہو کر رہتا ہے، پھر ہم نے ان پر تم کو پھیرا اور تم کو مال اور اولاد سے مدد کی اور تمہاری تعداد بڑھائی اور کہہ دیا کہ اگر تم نیکی کرو گے تو اپنے لیے اور برا کرو گے تو اپنا، پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو اوروں کو تم پر ابھارا، تاکہ تمہارے منہ بگاڑ دیں اور بیت المقدس میں ویسے ہی گھس جائیں، جیسے (تمہارے پہلے دشمن) پہلی دفعہ اس میں گھس گئے تھے اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے تباہ کر دیں۔‘‘

اہل خبر کو معلوم ہے کہ قرآن پاک میں بنی اسرائیل کے واقعات جہاں اور دوسرے اغراض سے بیان کیے گئے ہیں، وہاں ایک غرض یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے لیے وہ عبرت کا سبق بنیں اور انہیں معلوم ہو کہ اگر وہ بھی اللہ کے عہد کو پورا نہ کریں گے تو ان کے ساتھ بھی اللہ کا وہی برتاؤ ہوگا۔ اوپر کی آیتوں میں تصریح ہے کہ جب بنی اسرائیل کو خلافت ملی تو انہیں پہلے ہی ہوشیار کر دیا گیا تھا کہ یہ خلافت و سلطنت اسی وقت تک ہے جب تک احکام الٰہی کی پیروی کی جائے۔ جب تم ان سے منہ پھیرو گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی تم سے منہ پھیر لے گی، چنانچہ اسلام سے پہلے یہودیوں کی تاریخ میں یہ دونوں موقعے پیش آئے اور دو دفعہ ان کی شامتِ اعمال سے بیت المقدس کو پامال اور ان کو ذلیل و محکوم ہونا پڑا۔ ایک بابل کے بادشاہ بنوکدنذر معروف بہ بخت نصر کے ہاتھوں اور دوسری دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار کے بعد رومیوں کے ہاتھوں سے۔

ان آیتوں سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ مذہبی سلطنت کا مٹ جانا، ظالم بادشاہ کے پنجوں میں گرفتار ہونا اور دوسروں کی محکومی جو خود ہمارے ہی برے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے، دنیا میں اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا سبب ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی آمد کے موقع پر ان کو آخری مہلت دی گئی، چنانچہ اوپر کی آیتوں کے بعد ہی ارشاد ہوا:

﴿ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝ۙ ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل:۸۔۹)

''امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے گا اور اگر تم پھر وہی (حرکتیں) کرو گے، تو ہم بھی وہی (پہلا سا سلوک) کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنا رکھا ہے، یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے اور مومنوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں، بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے اجر عظیم ہے۔''

یہ رحمت کی امید اسی شرط سے مشروط تھی کہ وہ آخری نبی ﷺ پر ایمان لائیں، لیکن وہ جب اس سے محروم رہے تو رحمت الٰہی بھی دور ہوگئی، کیونکہ انہیں سنا دیا گیا:

﴿ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۴۰)

''تم میرا وعدہ پورا کرو تو میں تمہارا وعدہ پورا کروں گا۔''

بقرہ رکوع ۱۰ میں اسی میثاق الٰہی کی بار بار یاد دلائی گئی ہے:

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ۡ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۭ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ۭ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ ﴾

(۲/ البقرۃ:۸۳۔۸۵)

''اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہنا، تو چند شخصوں کے سوا تم سب (اس عہد سے) منہ پھیر بیٹھے اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ آپس میں کشت وخون نہ کرنا اور اپنے کو ان کے وطن سے نہ نکالنا، تو تم نے اقرار کرلیا اور تم (اس بات کے) گواہ ہو، پھر تم وہی ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کر دیتے ہو اور اپنے میں سے بعض لوگوں پر گناہ اور ظلم سے چڑھائی کر کے انہیں وطن سے نکال بھی

دیتے ہو، اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بدلہ دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے ہو، حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم کو حرام تھا (یہ) کیا (بات) کہ تم کتاب (اللہ) کے بعض احکام کو مانتے ہو اور بعض سے انکار کیے دیتے ہو۔‘‘

لیکن ان کے اس عہد کو ہمیشہ کے لیے بھلا دینے پر اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو ہمیشہ کے لیے بھلا دیا اور فرمایا:

﴿ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۵)

’’تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب میں ڈال دیے جائیں۔‘‘

مسجدوں کی ویرانی اور خصوصاً بیت المقدس کی ظاہری و باطنی تباہی کے جرم پر اہل کتاب کو یہ سزا سنائی گئی:

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَاۗىِٕفِيْنَ ڛ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۱٤)

’’اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے، جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے نام کا ذکر کیے جانے کو منع کرے اور ان کی ویرانی میں ساعی ہو، ان لوگوں کو کچھ حق نہیں کہ ان میں داخل ہوں، مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔‘‘

جو لوگ اللہ اور رسول ﷺ سے لڑتے ہوں اور اللہ کی زمین میں فساد اور غارت گری پھیلاتے ہوں، ان کے لیے دنیا کی سزائیں بھی مقرر کی گئیں اور کہا گیا کہ ان کو مار ڈالا جائے، ان کو سولیوں پر لٹکایا جائے، ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں، ان کو ملک سے باہر قید کر دیا جائے:

﴿ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۳۳)

’’یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا (بھاری) عذاب (تیار) ہے۔‘‘

یہود کے رئیسوں اور عالموں کو جنہوں نے کتاب الٰہی کو چھوڑ کر اپنے رسوم و عادات کو اپنی شریعت بنالیا تھا، یہ سزا سنادی گئی:

﴿ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ښ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ (۵/ المآئدۃ:٤۱)

’’دنیا میں بھی ذلت ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔‘‘

اسی طرح وہ لوگ جو کتاب و دلیل کے بغیر اپنے اوہام اور باطل خیالات کی بنا پر دین میں کج بحثی کرتے

ہیں اور دنیاوی جاہ و دولت کے غرور میں حق کی راہ سے منہ پھیرتے ہیں، ان کے لیے بھی آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا کی رسوائی بھی ہے:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ ﴾

(۲۲/ الحج:۷۔۹)

''اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی شان میں بغیر علم (و دانش) کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کتاب روشن کے جھگڑتا ہے اور (تکبر سے) گردن موڑ لیتا ہے، تاکہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے گمراہ کر دے، اس کے لیے دنیا میں ذلت ہے اور قیامت کے دن ہم اسے عذاب (آتش سوزاں) کا مزہ چکھائیں گے۔''

یہود نے جب گائے کے بچھڑے کا بت بنا کر پوجا تو موسیٰ علیہ السلام کو وحی الٰہی نے خبردار کر دیا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵۲)

''(اللہ نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنا لیا ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) اور ہم افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔''

یہی نہیں، بلکہ ہمیشہ کے لیے ذلت، قومی مسکنت اور غضبِ الٰہی کے مستوجب ٹھہرائے گئے، کیونکہ انہوں نے احکام الٰہی سے انحراف کیا، اللہ کے رسولوں کو قتل کرتے اور حدود الٰہی کو توڑتے رہے:

﴿ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۤ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۶۱)

''اور (آخرکار) ذلت (اور رسوائی) اور محتاجی (و بے نوائی) ان سے چمٹا دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے، یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور اس کے نبیوں کو ناحق قتل کر دیتے تھے (یعنی) یہ اس لیے کہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔''

آخرالانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد ان کے لیے مہلت کا آخری موقع تھا، لیکن ان کی سرکشی بدستور قائم رہی، اس پر اللہ نے قیامت تک کے لیے ذلت و مسکنت اور غیروں کی غلامی ان کی قسمت میں لکھ دی:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ (۳/ آل عمران:۱۱۲)

''یہ جہاں نظر آئیں گے، ذلت (کو دیکھو گے کہ) ان سے چمٹ رہی ہے، بجز اس کے کہ یہ اللہ اور (مسلمان) لوگوں کی پناہ میں آ جائیں اور یہ لوگ اللہ کے غضب میں گرفتار ہیں اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے، یہ اس لیے کہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے تھے (اور اس کے) پیغمبروں کو ناحق قتل کر دیتے یہ اس لیے کہ یہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔''

دوسری سورہ میں ہے:

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰي يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ښ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (۷/ الاعراف:۱۶۷)

''اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے (یہود کو) آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر قیامت تک ایسے اشخاص کو مسلط رکھے گا جو ان کو بری بری تکلیفیں دیتے رہیں، بے شک تمہارا پروردگار جلد عذاب کرنے والا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔''

یہود کی پوری تاریخ شروع سے آج تک قرآن پاک کی اس صداقت پر گواہ ہے، تاریخ کا کون سا دور ہے، جب ظالم بادشاہوں اور وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں کے ہاتھوں انہوں نے اپنے کیے کی سزا نہیں پائی ہے اور آج بھی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ ہمارے مفسروں نے اس دنیاوی عذاب، ذلت، نکبت اور مسکنت کی تفسیر جزیہ سے، یعنی ان کی دائمی محکومی اور غلامی سے کی ہے، قرآن پاک کی دعا میں ہے:

﴿اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ﴾ (۳/ آل عمران:۲۶)

''اے اللہ! سلطنت کے مالک! تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔ تیرے ہاتھ میں سارا خیر ہے۔''

ان آیتوں میں لف ونشر مرتب ہے، یعنی ان میں سلطنت کے ملنے کو عزت اور سلطنت کے چھن جانے کو ذلت فرمایا گیا ہے۔

لیکن یہاں ہمارے سمجھنے کے قابل یہ بات ہے کہ یہود پر جو کچھ ہو رہا ہے اور ہوگا اس کا تعلق یہود کی نسل وقومیت سے نہیں، بلکہ ان کے افعال وکردار سے ہے، احکام الٰہی سے انحراف، انبیا ومصلحین امت کا قتل

وتکذیب، حرص وطمع، سودخواری اور تمام دیگر ذمائم وقبائح جن کی تفصیلات مذکور ہیں، وہ اس کے ذمہ دار ہیں کہ وہ زمین کی وراثت اور اللہ کی خلافت کے رتبہ سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیے گئے، پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵۲)

''(اللہ نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنالیا تھا، ان پر پروردگار کا غضب واقع ہو گا اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) ہم افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔''

یہ ذلت کا دنیاوی عذاب صرف گائے کے بچہ کے پجاریوں ہی کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر اس مفتری کے لیے ہے جو توحید کا حامل ہو کر غیر کے آستانے کی جبہ سائی کرے گا اور ارض وسما کے مالک کو چھوڑ کر دنیا کے دوسرے چھوٹے مالکوں کی تلاش وطلب میں در بدر پھرے گا، مگر عزت کا سرمایہ اس کو ہاتھ نہ آئے گا:

﴿ وَمَنْ یُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ ﴾ (۲۲/ الحج:۱۸)

''اور جس کو (اس کے اعمال کے پاداش میں) اللہ رسوا کرے اس کو عزت دینے والا کوئی نہیں۔''

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت　　　بہ ہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

اللہ تعالیٰ کی موعودہ نعمت کے حصول کا ذریعہ صرف اس کی بندگی ہے، اس کی یہ بندگی اس کے احکام کو بہ دل و جان قبول کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے ظاہر ہوتی ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہے اور اسی کی رضا آخرت میں جنت اور دنیا میں طمانیت و برکت کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بہ دل و جان قبول اور زبان سے اس کے اعتراف کا نام شرع میں ایمان اور ان کے مطابق کام کرنے کا نام عمل صالح ہے اور یہی دین اور دنیا کی ہر قسم کی برکتوں کے خزانہ کی کنجی ہے اور اسی طاقت سے آسمان اور زمین سے برکت کا مینہ برستا اور فتوحات کا چشمہ ابلتا ہے، اللہ نے یہود ونصاریٰ سے خطاب کر کے فرمایا:

﴿ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۶۵۔۶۶)

''اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیز گاری کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ محو کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر وہ توراۃ وانجیل کو اور جو (اور کتابیں) ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوئیں، ان کو قائم رکھتے تو (ان پر رزق مینہ کی طرح برستا

کہ) اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔‘‘

لیکن افسوس کہ انہوں نے اس آواز پر کان نہیں رکھا، تو ان کو وہی سزا دی گئی جو دوسری نافرمان قوموں کو دی گئی تھی:

﴿ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۹۶)

’’اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور پرہیزگار ہو جاتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے، مگر انہوں نے تو تکذیب کی، سو ان کے اعمال کی سزا میں ہم نے ان کو پکڑ لیا۔‘‘

پھر خاص مسلمانوں سے بطور وعدہ کے فرمایا گیا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ ﴾ (۲۴/ النور:۵۵)

’’جو لوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔‘‘

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ ﴾ (۴۸/ الفتح:۲۰)

’’اللہ نے تم سے بہت سے غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے، سو اس نے غنیمت کی تمہارے لیے جلدی فرمائی۔‘‘

مجاہدین امت کو بشارت ملی کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں کی بادشاہی تمہارے ہی لیے ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝ۙ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝ۙ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۝ ﴾ (۶۱/ الصف:۱۰۔۱۳)

’’مومنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذابِ الیم سے مخلصی دے (وہ یہ کہ) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کرو، اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو باغ ہائے جنت میں جن میں

نہریں بہہ رہی ہیں اور پاکیزہ مکانات میں جو بہشت ہائے جاودانی میں (تیار) ہیں، داخل کرے گا، یہ بڑی کامیابی ہے اور ایک اور چیز جس کو تم بہت چاہتے (یعنی تمہیں) اللہ کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح عنقریب ہوگی اور مومنوں کو اس کی خوش خبری سنا دو۔''

یہ فتح ونصرت اسی دنیا میں ملنے والی تھی، جس کا مقدمہ ام القریٰ مکہ معظمہ کی فتح تھی اور اس کی انتہا ساری دنیا میں اسلام کی سربلندی اور دینِ الٰہی کی ہر دین پر فوقیت اور غلبہ:

﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ﴾

(۹/ التوبة:۳۳)

''وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا، تاکہ اس دین کو دنیا کے تمام دینوں پر غالب کرے۔''

یہ پیشین گوئی دو دفعہ سورۂ فتح وسورۂ صف میں دہرائی گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ توبہ اور فتح والی پیشین گوئی کفار کے اور سورۂ صف والی اہل کتاب کے مقابلہ میں ہے۔ یہ پیشین گوئی ایک رنگ میں پوری ہو چکی اور ابھی اس کو دوسرے رنگ میں آیندہ پوری ہونا ہے اور یہ مسلمانوں کی دلجمعی اور اطمینان کا باعث ہے، لیکن اس کے پورے ہونے کے لیے مسلمانوں پر سعی وکوشش بھی فرض ہے، بدر وغیرہ غزوات میں فتح کی پیشین گوئی گو مخبر صادق علیہ السلام کی طرف سے دی جا چکی تھی، تاہم مسلمانوں کو اس کے لیے بھی ویسی ہی کوشش کرنی پڑی، جیسا کہ سورۂ فتح کی پیشین گوئی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے:

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ﴾ (۸/ الانفال:۳۹)

''اور لوگوں سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ یعنی کفر کا فساد باقی نہ رہے اور دین سب اللہ ہی کا ہو جائے۔''

سارا حکم اللہ کے لیے ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے سوا دنیا میں کسی روحانی وجسمانی قوت کی اطاعت اور حکم برداری نہ رہے، جس کی بھی اطاعت ہو وہ اللہ کی اطاعت کے ضمن اور تحت میں اس کی اجازت اور اس کی رضا سے ہو کہ وہ بھی اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ مسلمانوں کو فتح ونصرت اور حصولِ غنیمت کی بشارت دی گئی ہے، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ شہروں پر قبضہ اور ملکوں پر بادشاہی کریں گے، دولت کے خزانے ان کے ہاتھ آئیں گے:

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ ....

﴿ وَّاُخْرٰی لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا ۝ ﴾

(٤٨/ الفتح:١٨۔٢٠، ١٢)

’’(اے پیغمبر ﷺ!) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو اللہ ان سے خوش ہوا اور جو صدق وخلوص ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا، تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی، بہت سی غنیمتیں جو انہوں نے حاصل کیں اور اللہ غالب حکمت والا ہے، اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے، تو اس نے غنیمت کی تمہارے لیے جلدی فرمائی...... اور غنیمتیں بھی جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے اور وہ اللہ ہی کی قدرت میں تھیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔‘‘

یہ فتح وغنیمت جس کے بعجلت پانے کی خبر اس آیت میں ہے، وہ خیبر کی فتح ہے، جو بیعت رضوان کے فوراً ہی بعد حاصل ہوئی اور دوسری فتح اس کے بعد حاصل ہونے کی طرف اشارہ ہے، وہ مکہ کی فتح ہے، چنانچہ اسی سفر میں حدیبیہ سے واپسی میں یہ خوش خبری مسلمانوں کو سامعہ نواز ہوئی:

﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۝ ﴾ (٤٨/ الفتح:١)

’’(اے محمد ﷺ!) ہم نے تم کو فتح دی، فتح بھی صریح اور صاف۔‘‘

آنحضرت ﷺ جب دنیا میں نبوت کے فرائض انجام دے چکے اور خانہ کعبہ کے ساتھ سارا عرب بھی بت پرستی کی نجاست سے پاک ہو چکا، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس فتح ونصرت کے وعدے کے پورے ہونے کے بعد عالم آخرت کی طرف متوجہ ہونے کی طرف آمادہ فرمایا:

﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ ﴾ (١١٠/ النصر:١۔٣)

’’جب اللہ کی مدد اور فتح آ چکی اور تم نے دیکھا کہ لوگ اللہ کے دین میں گروہ درگروہ داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت چاہو۔‘‘

اسلام کی دعوت، شرک کی تردید اور توحید کی تعلیم سے شروع ہوئی اور اس کے بعد شرائع اور احکام آہستہ آہستہ بڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی، طاعات اور عبادات کی دعوت، فرائض وحقوق کی ادائی، قلوب و نفوس کی صفائی اور اخلاق کی برتری اور برگزیدگی کی تعلیم وتربیت تدریج کے ساتھ تکمیل کو پہنچتی گئی، ساتھ ہی ساتھ سلطنت کا نظام خود بخود بنتا گیا اور وہ بھی تکمیل کو پہنچ گئی اس موقع پر ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔

اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں، جس سے یہ معلوم ہو کہ قیامِ سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقائد وایمان، شرائع واحکام اور حقوق وفرائض اس کے لیے بمنزلہ تمہید تھے، بلکہ جو

کچھ ثابت ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں اور ایک حکومتِ صالحہ کا قیام ان کے لیے وجہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے، تا کہ وہ احکامِ الٰہی کی تعمیل باآسانی کر سکیں، اس لیے وہ عرضاً مطلوب ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی نکتہ کا ترجمان ہے:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ ﴾ (۲۴/ النور:۵۵)

''جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے۔''

اس آیت میں خلافت کے عطا، خوف کے بعد امن کی بخشش اور کمزوری کے بعد طاقت کے حصول کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ ہر امر میں اللہ کی عبادت اور اطاعت ہو اور شرک دور ہو، اگر واقعہ اس کے خلاف ہوتا تو یوں کہا جاتا کہ عبادتِ الٰہی کی تعلیم اور ردِ شرک کی دعوت اس لیے ہے کہ خلافت کا قیام ہو اور سلطنت کا حصول ہو۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اسلام جس دن سے مذہب بنا اسی دن سے وہ سلطنت بھی ہے۔ اس کی مسجد اس کا دیوان، اس کا منبر اس کا تخت تھا، اسلام کے جن بدگمان دشمنوں نے یہ سمجھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے پہلے مذہب کی دعوت پیش کی، جب وہ کامیاب ہونے لگی اور جنگ جو عربوں کا ایک گروہ ساتھ ہو گیا تو آپ ﷺ کو سلطنت کے قیام کی فکر ہوئی، ان کا یہ خیال سراسر اسلام کی حقیقت سے ناآشنائی پر مبنی ہے، ایسی بادشاہی اور سرداری تو خود قریش کے رئیس آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس شرط کے ساتھ پیش کر رہے تھے کہ وہ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں، لیکن آپ ﷺ نے ان کی اس درخواست کو ہمیشہ ٹھکرا دیا۔ [1] کیونکہ آپ ﷺ کی دعوت کا مقصود محمد رسول اللہ ﷺ کی انسانی پادشاہی نہ تھی، بلکہ روئے زمین پر اللہ واحد و برحق کی بادشاہی کا قیام تھا، اسی لیے اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح اللہ اور قیصر دو نہیں ہیں، ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے، جس کے حدود حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے، وہی آسمان پر حکمران ہے اور وہی زمین پر فرماں رواں ہے۔

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَاۗءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۭ ﴾ (۴۳/ الزخرف:۸۴)

---

[1] سیرۃ ابن ہشام وفد رؤسائے قریش کی گفتگو، ص: ۱۸۰، ۱۸۱ مطبوعہ محمد علی صبیح مصر۔

''اور وہ وہی ہے جو آسمان میں اللہ ہے اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔''

وہ دیویوں اور دیوتاؤں اور نمرودوں اور فرعونوں کو ایک ساتھ ان کے استھانوں اور ایوانوں سے نکالنے کے لیے آیا تھا اور اس بات کی منادی کرتا تھا کہ آسمان ہو یا زمین، دونوں میں ایک ہی اللہ کی حکومت ہوگی، اس کے آسمان میں نہ کوئی دیوی ہوگی، نہ دیوتا ہوگا اور نہ اس کی زمین پر کوئی قیصر ہوگا اور نہ کسریٰ، جو اس دعوت کی راہ کا روڑا بنے گا، اس کو راہ سے ہٹایا جائے گا اور جو اس کو روکنے کے لیے تلوار اٹھائے گا وہ تلوار سے گرایا جائے گا، سورۂ مزمل کے آخر میں جو آغاز وحی کے زمانہ کی سورہ ہے، [1] مسلمانوں کو ہوشیار کیا جاتا ہے:

﴿ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ﴾ (۷۳/ المزمل: ۲۰)

''(اور مسلمانوں میں) وہ لوگ ہوں گے جو زمین میں چلیں گے اللہ کی روزی کی تلاش میں اور وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی راہ میں لڑنے نکلیں گے۔''

یہ جنگ کی پیشین گوئی اس زمانے میں سنائی جا رہی ہے جب کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ کبھی اسلام کے پیغام کو تیغ وسنان کی زبان سے بھی سنانے کی نوبت آئے گی، گویا کہ اسلام کے آغاز ہی میں اس کا انجام معلوم تھا کہ لوگ اس دعوت کے قبول سے انکار کریں گے اور اس کو بزور روکنے کی کوشش کریں گے اور آخر مسلمانوں کو ان منکروں اور مخالفوں کے خلاف سربکف میدان میں آنا ہوگا۔

مکہ میں توحید کا اعلان ہوا تو قریش کے ایک رئیس عتبہ نے دوسرے رئیسوں کے مشورہ سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی، سنو اے میرے بھتیجے! اس نئی دعوت سے تمہارا مقصود اگر مال و دولت ہے تو ہم تمہارے لیے اتنی دولت جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم سب سے زیادہ دولت مند ہو جاؤ اور اگر تمہیں اپنی سرداری کا خیال ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار مان لیتے ہیں کہ تمہارے فیصلہ کے بغیر کوئی کام نہ کریں گے اور اگر تمہیں بادشاہ بننے کی فکر ہے تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں، اس کے جواب میں حضور ﷺ نے سورۂ فصلت کی آیتیں پڑھیں، جن کو سنتے ہی عتبہ حیرت میں آ گیا اور واپس آ کر قریش سے کہا کہ اللہ کی قسم! محمد ﷺ جو کلام پیش کرتے ہیں، وہ نہ شاعری ہے، نہ جادو ہے اور نہ کاہنوں کی سی باتیں ہیں، قریشی بھائیو! میری رائے یہ ہے کہ جو کلام میں نے ان کے منہ سے سنا ہے وہ بے اثر نہیں رہ سکتا، اس لیے تم محمد ﷺ کو اپنا کام کرنے دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آ گئے تو ان کی بادشاہی تمہاری ہی بادشاہی اور ان کی عزت تمہاری ہی عزت ہوگی اور اگر ناکام رہے تو عرب خود ان کا خاتمہ کر دیں گے، تمہیں انگلی ہلانے کی بھی ضرورت نہ ہوگی، لیکن رئیسوں نے یہ کہہ کر کہ محمد ﷺ نے عتبہ پر بھی جادو کر دیا، اس رائے کے ماننے سے بھی انکار کر

[1] بعض روایات میں ہے کہ اس سورہ کے اول وآخر میں ایک سال کا فصل ہے، صحیح مسلم، کتاب صلوة المسافرین، باب جامع صلوة اللیل: ۱۷۳۹ وبیهقی وحاکم واحمد۔

دیا۔ کچھ دنوں کے بعد مکہ کے بڑے بڑے رئیس پھر اکٹھے ہوئے اور اس دفعہ سب نے مل کر آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں عرض کی:

''اے محمد (ﷺ)! عرب کا کوئی آدمی ایسا نہ ہوگا جس نے اپنی قوم کو اس مصیبت میں پھنسایا ہو، جس میں تم نے اپنی قوم کو پھنسایا ہے۔ تم باپ دادوں کو برا کہتے ہو، ہمارے مذہب میں عیب نکالتے ہو، ہمارے دیوتاؤں کو گالی دیتے ہو اور ہم کو نادان اور بے عقل بتاتے ہو، تم نے ایک نئی بات نکال کر ہماری جماعت کے اتحاد میں فرق ڈال دیا، تو اگر اس کام سے تمہارا مقصود دولت کمانا ہے تو ہم تمہارے سامنے دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں، کہ تم ہم سب میں دولت مند بن جاؤ اور اگر سرداری کا خیال ہے تو ہم تم کو سردار مانے لیتے ہیں اور اگر بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں اور اگر تم پر کسی جن کا سایہ پڑ گیا ہے تو ہم تمہارا علاج کرائیں گے۔''

یہ سن کر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ان میں سے کسی بات کی بھی خواہش نہیں، مجھے نہ تو تمہاری دولت چاہیے، نہ تم پر سردار بننا چاہتا ہوں اور نہ تم پر حکومت کرنا میرا مقصد ہے، مجھے تو اللہ نے رسول بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور ایک کتاب مجھ پر اتاری ہے اور مجھے اللہ سے حکم ملا ہے کہ اپنے رب کا پیغام سناؤں اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کروں، اگر تم اس کو مان لو گے تو دنیا اور دین دونوں میں تمہارا بھلا ہوگا اور اگر تم نے نہ مانا تو میں صبر کروں گا، یہاں تک کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ کا فیصلہ آ جائے۔'' ان دونوں تقریروں سے ظاہر ہو گیا کہ اسلام کا مقصد روم وایران اور حیرہ وغسان کی طرح کی شخصی یا قومی شان وشوکت کی بادشاہی نہ تھی، جو صلح وآشتی سے آسانی سے قائم ہو سکتی تھی، اس لیے قریش کی قومی بادشاہی یا حجاز کی وطنی حکومت کی دعوت کا نظریہ پیش کرنا کافی تھا، لیکن معاملہ کی حقیقت اس سے بالکل الگ تھی، یہ دنیا کی اصلاح عالم کا اخلاقی وسیاسی انقلاب اور زندگی کا ایک ایسا نیا نظام تھا، جس کی وسعت میں دین ودنیا کی ہر چیز آ جاتی تھی اور اسی لیے اس کے لیے عرب وعجم بلکہ جن وبشر سے قوت آزمائی کرنی تھی۔ قریش کے سردار آخری دفعہ حضرت ابوطالب کی خدمت میں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ محمد ﷺ سے صلح ہو جائے، ابوطالب بھتیجے سے کہتے تھے: جان عم! یہ قریش کے سردار آئے ہیں، وہ کچھ شرط تم سے لینا چاہتے ہیں اور وہ کچھ تم کو دینا چاہتے ہیں، ارشاد ہوا: ''اے عم بزرگوار! میں صرف ایک بات چاہتا ہوں کہ وہ مان لیں جس سے وہ عرب کے بادشاہ ہو جائیں گے اور عجم ان کے زیرنگیں ہوگا۔'' ابوجہل نے کہا: ہم آپ (ﷺ) کی ایک بات نہیں دس باتیں مانیں گے، ارشاد فرمایا کہ ''یہ مانو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی دوسرا اللہ نہیں اور اللہ کے سوا جن کو پوجتے ہو ان سے دست بردار ہو جاؤ۔'' [1] حج کے موسم میں آنحضرت ﷺ عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جا کر توحید کی

[1] سیرۃ ابن ہشام، ج ۱، ص: ۲۵۲۔

دعوت دیتے ہیں اور اپنی دعوت کو ان لفظوں میں پیش فرماتے ہیں: ''اے لوگو! کہو کہ اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں، تم فلاح پاؤ گے، عرب تمہاری بادشاہی میں ہوگا اور عجم تمہارے تابع فرمان ہوگا اور تم جنت میں بادشاہ بنو گے۔'' ❶

بیعتِ عقبہ میں جب مکہ والوں کے ڈر سے مکہ کی ایک گھاٹی میں رات کو چھپ کر رسول انام ﷺ کے دست مبارک پر چند گنتی کے نفوس جو مدینہ سے آئے تھے، بیعت کر رہے تھے تو انصار میں سے ایک خطیب نے اٹھ کر اپنی ایمانی بصیرت اور فراست سے کہا کہ یہ کیسی عظیم الشان حقیقت کا اظہار ہے، اسعد بن زرارہ انصاری رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے دست مبارک کو پکڑ کر لوگوں سے خطاب کر کے کہا: لوگو! تم کو معلوم ہے کہ تم آج محمد رسول اللہ ﷺ سے کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟ آج تم ان سے اس بات پر بیعت کر رہے ہو کہ تم عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے اس کے لیے لڑنے کو تیار رہو؟ سب نے کہا: ہاں۔ انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! اب آپ ﷺ اپنی شرطیں پیش فرمائیں، ارشاد ہوا: ''اقرار کرو کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور نماز کھڑی کرو گے، زکوۃ دو گے اور میری اطاعت کرو گے اور جو جس کام کا اہل ہوگا اس کو اس سے چھیننے کے لیے جھگڑا نہ کرو گے اور جس سے تم اپنی اور اہل وعیال کی حفاظت کرتے ہو، میری بھی کرو گے۔'' انصار نے ایک آواز سے کہا، ہاں! یا رسول اللہ! آپ ﷺ کی یہ سب باتیں منظور، لیکن ہمیں اس سے کیا ملے گا؟ فرمایا: ''جنت اور فتح ونصرت۔'' ❷

یہ گویا شروع ہی سے معلوم تھا کہ اسلام کا کلمۂ دعوت دین و دنیا کی بادشاہی کی کنجی ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ اسلام جس صلح کے پیغام کو لے کر نکلا ہے، دنیا اس کا مقابلہ جنگ سے کرے گی اور آخر تلوار کو تلوار سے گرانا اور دنیا میں اسلام کے نظام کو قائم کرنے کے لیے عرب و عجم بلکہ جن و بشر میں سے جو راہ کا پتھر بن کر آئے گا اس کو قوت سے توڑنا پڑے گا، یہاں تک کہ اللہ کا دین اپنے ہر معنی میں پورا ہو جائے۔

آنحضرت ﷺ نے ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی دنیاوی طاقت ہنوز دشمنوں سے محصور تھی، مختلف موقعوں پر صحابہ رضی اللہ عنہم کو بڑے بڑے شہروں اور ملکوں کی فتوحات کی خوش خبریاں دیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حضور ﷺ کو ان واقعات کا علم دیا گیا تھا، انہیں معلوم تھا کہ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کریں گے تو وہ اپنا عہد بھی پورا کرے گا اور دنیا کی بادشاہیاں ان کے ہاتھوں میں اور بادشاہوں کے تاج ان کے پاؤں میں ڈال دے گا۔

غزوۂ احزاب میں جو ہجرت کے چوتھے سال پیش آیا، مٹھی بھر مسلمان جو مدینہ کی کھلی آبادی میں تھے، حملہ آور عربوں کے نرغے میں گھر رہے ہیں، دم بہ دم خبریں آ رہی ہیں کہ سارا عرب اپنی پوری متحدہ طاقت سے سیلاب کی طرح مدینہ پر امنڈتا چلا آ رہا ہے، آنحضرت ﷺ اور جان نثار صحابہ رضی اللہ عنہم بھوکے پیاسے

❶ طبقات ابن سعد، ج ١، ص: ١٤٥، لائیڈن۔

❷ طبقات ابن سعد، جزء ثالث بدر یین قسم ثانی، ص: ١٣٩ لائیڈن۔

مدینہ کی حفاظت کی خاطر شہر کے چاروں طرف خندق کھود رہے ہیں کہ ایک بھاری پتھر سامنے آجاتا ہے، جس کو مسلمانوں کے پھاوڑے اور کدالیں راہ سے ہٹانے سے عاجز ہو رہی ہیں، حضور ﷺ تشریف لاتے ہیں اور اس زور سے اس پر تین دفعہ ایسی ضرب کاری لگاتے ہیں کہ پتھر چور چور ہو جاتا ہے اور لوہے اور پتھر کی رگڑ سے ہر ضرب میں چنگاری نکلتی ہے جس کی روشنی میں پہلے کسریٰ کے شہر، پھر قیصر کے شہر اور تیسری دفعہ حبش کے شہر نظر آتے ہیں اور حضور ﷺ ہر دفعہ بلند آواز سے فرماتے ہیں، اللہ کی بات پوری ہوئی۔

اسلام کا آغاز جس بے اطمینانی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا، اس سے کس کو اس وقت خیال ہو سکتا تھا کہ یہ چند نہتے، فاقہ کش، غریب الدیار مسلمانوں کے بازوؤں میں چند ہی سال بعد یہ زور آئے گا کہ وہ قیصر وکسریٰ کے تخت الٹ دیں گے، لیکن مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی وقت خبر دی تھی کہ ''مسلمانو! تم قسطنطنیہ فتح کرو گے۔ مداین تمہارے ہاتھ آئے گا، قیصر وکسریٰ کے خزانے تمہارے تصرف میں آئیں گے، مصر کا تخت تم کو ملے گا، تم سے اور ترکوں سے جن کی آنکھیں چھوٹی اور چہرے چوڑے ہوں گے، جنگ ہوگی، ہندوستان تمہاری فوجوں کا میدان جہاد اور بحرِ روم تمہارے جنگی جہازوں کا جولان گاہ بنے گا، بیت المقدس کی کنجی ایک دن تم کو ملے گی۔'' [1]

لیکن ان خوش خبریوں، بشارتوں اور پیشین گوئیوں کے ہجوم میں یہ بات بھولنا نہ چاہیے کہ یہ حکومت، یہ بادشاہی، یہ تخت، یہ تاج، یہ خزانے اسلام میں مقصود بالذات نہیں، یہ اس لیے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کے بہت سے مواقع کو دور کرنے میں معین ہیں اور اسلام کے حدود اور قانون عدل وانصاف کے اجرا کے ذریعے ہیں، اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو وہ اسلام کی حکومت نہیں، خواہ وہ مسلمانوں کی ہو، دوسری بات یہ ہے کہ اس قوت وطاقت، شان وشوکت اور مال ودولت کو صرف اللہ کی مرضی کے حصول میں صرف کیا جائے، اگر یہ نہ ہو تو یہ سلطنت، یہ عیش وعشرت، یہ دولت وحشمت اور جاہ ومال، سوئے مآل کا موجب ہو جائے گا، اسی لیے ضروری ہے کہ کروفر سے جی نہ لگایا جائے اور نہ دل میں اس کی لو لگنے پائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ یہ دنیا کی سلطنت وحشمت اور مال ودولت دنیا کی نہیں، بلکہ صرف آخرت کی آرائش کے لیے ہے، دنیا آخرت کی کھیتی ہے، یہ کھیتی دنیا کے لیے ہے تو آخرت کے آرام سے محرومی ہوگی اور اگر آخرت کے لیے ہے تو دنیا اور آخرت دونوں ہی کے لیے فوز وفلاح کا موجب ہے:

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ: ٢٠)

''جو شخص آخرت کی کھیتی کا خواستگار ہو، اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا

[1] ان واقعات کے حوالے سیرۃ النبی ﷺ جلد سوم میں پیشین گوئیوں کے بیان میں ہیں۔

خواستگار ہو، اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔''

﴿ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝﴾ (۳/ آل عمران:۱٤٤)

''اور جو شخص دنیا میں اپنے اعمال کا بدلہ چاہے اس کو ہم یہیں بدلہ دے دیں گے اور جو آخرت میں طالب ثواب ہو، اس کو وہاں اجر عطا کریں گے اور ہم شکر گزاروں کو عنقریب بہت اچھا صلہ دیں گے۔''

یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کو ہر قدم پر ہوشیار کیا گیا ہے کہ دولتِ فانی کے پیچھے دولتِ باقی کو مت بھولو، کیونکہ یہاں کی لذت، عیش و عشرت، آرام وراحت اور دولت و سلطنت آخرت کے لذائذ، ثواب اور نعمتوں کے مقابلہ میں ہیچ ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ﴾ (۱٦/ النحل:٤١)

''اور جن لوگوں نے ظلم سہنے کے بعد اللہ کے لیے وطن چھوڑا، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔''

جو لوگ اپنی غلطی سے دنیا کے فانی معاوضہ کو آخرت کے باقی معاوضہ کے مقابلہ میں ترجیح کے قابل سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ان لفظوں میں ہشیار فرمایا:

﴿ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝﴾

(۹/ التوبۃ:۳۸)

''کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے تو دنیا کی زندگی کا فائدہ آخرت میں بہت معمولی ہے۔''

﴿ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ۧ﴾ (۲۸/ القصص:٦٠)

''اور جو چیز تم کو دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ اور اس کی زینت ہے اور جو اللہ کے پاس ہے، وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے، کیا تم نہیں سمجھتے۔''

﴿ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ڮ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ۭ﴾ (۸۷/ الاعلیٰ:۱٦۔۱۷)

''مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو، حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے۔''

﴿ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ (۷/ الاعراف:۱٦۹)

''اور آخرت کا گھر پرہیز گاروں کے لیے بہتر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں۔''

اسی طرح دنیا کی ہر تکلیف سے آخرت کی سزائیں بڑھ کر ہیں:

﴿ فَأَذَاقَهُمُ اللَّهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴾

(۳۹/ الزمر: ۲۶)

''پھر ان کو اللہ نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھادیا اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا ہے کاش یہ سمجھ رکھتے۔''

﴿ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَىٰ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۱۲۷)

''اور آخرت کا عذاب بہت سخت اور بہت دیر رہنے والا ہے۔''

اگر آخرت کا خیال کیے بغیر دنیا کے ذرہ ذرہ پر کوئی حکمرانی بھی کر لے اور دنیا کے مال و دولت سے اپنا گھر بھی بھر لے تو اس کی یہ ساری محنت اکارت اور یہ ساری دولت و حشمت بے سود ہے:

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾

(۱۱/ ہود: ۱۵۔۱۶)

''جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں، ہم ان کے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی، یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں اور جو عمل انہوں نے دنیا میں کیے سب برباد اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب ضائع۔''

دنیا کی ساری بادشاہی آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں پر کاہ سے بھی کمتر ہے:

﴿ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ﴾ (۹/ التوبۃ: ۳۸)

''دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابل بہت ہی کم ہیں۔''

﴿ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ ﴾ (۱۳/ الرعد: ۲۶)

''اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں بہت تھوڑا فائدہ ہے۔''

اگر دنیا کے ساتھ آخرت کی دولت نہ ہو تو یہ دنیا کی لذت فریب اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں:

﴿ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۸۵)۔(۵۷/ الحدید: ۲۰)

''اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔''

اسلام یہ ہے کہ دنیا کو دنیا کے لیے نہیں، بلکہ دنیا کو آخرت کے لیے برتنا چاہیے، جمعہ کے خطبوں میں یہ

اکثر دہرایا جاتا ہے:

إِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَإِنَّكُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ.

''دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔''

قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ گو دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کے لیے ہیں:

﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ (۲/ البقرہ: ۲۹)

''وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لیے پیدا کیں۔''

پھر دوسری جگہ بتایا کہ خود انسان کس لیے بنا:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ (۵۱/ الذاریات: ۵۶)

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔''

دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کو اس لیے ملیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا ذریعہ بنایا جائے دنیا کے کاموں سے آخرت کی نعمتیں ہاتھ آئیں، یہ دنیا کی دولت اسی لیے دی گئی ہے کہ اس سے آخرت کا سودا حاصل کیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قارون کے قصہ میں بنی اسرائیل کے چند مومنوں کی زبان سے اس حقیقت کو یوں ظاہر فرمایا ہے:

﴿ وَابْتَغِ فِيْمَا آتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ﴾

(۲۸/ القصص: ۷۷)

''اور اللہ نے تجھے دنیا میں جو کچھ دیا ہے اس سے آخرت کو ڈھونڈ اور دنیا سے اپنا حصہ مت بھول۔''

انہی معنوں میں (اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ) (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کا فقرہ زبان زد ہے۔ قرآن پاک کی وہی آیتیں جن میں اہل ایمان کو دنیاوی بادشاہی اور فتح و کامرانی کی خوش خبری دی گئی ہے۔ ہمارے مقصد کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں، فرمایا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ وَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ ﴾

(۲۴/ النور: ۵۵۔۵۶)

''جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو

ملک کا حاکم بنادے گا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے، مستحکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد امن بخشے گا وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں اور نماز پڑھتے رہو اور زکوۃ دیتے رہو اور اللہ کے پیغمبر کے فرمان پر چلتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔''

اللہ نے ایمان اور عملِ صالح والوں کو زمین کی سلطنت، تمکین اور امن عطا فرمائے جانے کی غرض بتائی ہے، تاکہ وہ ہر مانع اور مخالف طاقت سے بے پروا ہو کر میری اطاعت، عبادت اور میری احکام کی بجا آوری اور میرے قانون کے اجرا میں لگے رہیں اور اگر اس امن واطمینان اور مانع طاقتوں کے استیصال کے بعد بھی احکامِ الٰہی سے کوئی سرتابی کرے گا تو وہ نافرمان ٹھہرے گا، نماز کا قیام، زکوۃ کا انتظام اور رسول کی اطاعت اللہ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ ﴾ (۲۲/ الحج: ٤١)

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو زمین میں قوت عطا فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ نماز کو جو حقوقِ الٰہی کی بجا آوری کا سرعنوان ہے، قائم کریں اور زکوۃ جو بندوں کے ادائے حقوق کا دوسرا نام ہے ادا کریں اور دنیا میں امورِ خیر کی تعمیل اور امورِ شر کے انسداد کا اہتمام کرسکیں، اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول نہ خراج کا وصول، نہ غنیمت کی فراوانی، نہ دولت کی ارزانی، نہ تجارت کا فروغ، نہ جاہ ومنصب کا فریب، نہ عیش وعشرت کا ڈھوکا اور نہ شان وشوکت کا تماشا ہے، بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لیے جدوجہد اور سعی ومحنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔

عہدِ نبوی ﷺ میں نظامِ حکومت

عام خیال یہ ہے کہ اسلام کو عرب میں ایک عادلانہ نظام حکومت قائم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں، وہ تمام تر اہل عرب کی وحشت، بداوت اور جہالت کا نتیجہ تھیں، لیکن درحقیقت اس سے زیادہ یا اسی کے برابر خود وقت کا تمدن بھی اسلام کے عادلانہ نظام حکومت کا دشمن تھا اور اس کی مخالفت وحشت سے زیادہ اور دیر پا تھی، چنانچہ ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد اگرچہ وحشی عربوں نے اسلام کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں، لیکن وقت کے تمدن کا سر پر غرور اب تک بلند تھا، چنانچہ نامہ اقدس کے جواب میں شہنشاہ ایران کا جواب اور قیصر روم کے حامیوں کے مقابلہ میں غزوۂ موتہ وغیرہ واقعات جو ۹ھ میں پیش آئے اور اس کے بعد خلافتِ راشدہ میں ایرانیوں اور رومیوں سے لڑائیاں اسی سرکشی وتمرد کا نتیجہ تھیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں جو آنحضرت ﷺ کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا زمانہ ہے، دنیا کی تمام سیاسی قوتیں مشرق ومغرب کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیر سایہ تھیں، مشرق کی نمائندگی فارس کے کسریٰ اور مغرب کی قسطنطنیہ کے قیصر کر رہے تھے اور ان دونوں کے ڈانڈے عرب کے عراقی وشامی حدود پر آ کر ملتے تھے، عرب کے وہ قبائل جن میں ذرا بھی تہذیب وتمدن کا نام نہ تھا، وہ انہی دونوں میں سے کسی کے زیر اثر اور تابع تھے، یمن، بحرین، عمان اور عراق ایرانیوں کے اور وسطِ عرب اور حدودِ شام رومیوں کے ماتحت یا زیر اثر تھے۔

چنانچہ لخمی خاندان نے مقام حیرہ میں ایرانیوں کی ماتحتی میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی، جس کے فرمانروا نعمان بن منذر وغیرہ تھے، غسانی خاندان جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ تک قائم رہا، رومیوں کی سرپرستی میں حدود شام پر حکومت کرتا تھا، یمن میں مدت تک خود عرب کی مستقل خاندانی ریاستیں قائم تھیں، لیکن آخر زمانہ میں یمن خود ایرانیوں کے علم کے نیچے آ گیا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں یمن میں باذان نامی ایرانی حاکم موجود تھا، عرب پر ان سلطنتوں کا اس قدر اقتدار قائم ہو چکا تھا کہ خود عربوں کے ذہن میں جب کسی نظامِ سلطنت یا نظامِ تمدن کا خیال آتا تھا تو اسی ایرانی یا رومی نظامِ سلطنت اور نظامِ تمدن کا آتا تھا، ان سے الگ یا ان سے بالاتر کسی نظام زندگی کا تخیل ان کے ذہن کی گرفت سے بالاتر تھا، اس بنا پر اسلام عرب میں جو نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے صرف یہی کافی نہ تھا کہ عرب کی قدیم وحشت کو مٹا کر اسلامی تہذیب وتمدن کی داغ بیل ڈالی جائے۔ بلکہ سب سے مقدم کام یہ تھا کہ عرب کو غیر قوموں کے دماغی تسلط، سیاسی مرعوبیت اور ان کے اخلاقی وتمدنی اثر سے آزاد کرایا جائے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نہ صرف عربوں کو بلکہ سارے عالم کو انسانوں کے خود ساختہ قانون کی غلامی سے نکال کر قانونِ الٰہی کی اطاعت و فرمانبرداری میں دے دیا جائے اور بتایا جائے کہ قانونِ الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے انسانی قوانین کی پابندی شرک

کا دوسرا راستہ ہے، لیکن جیسا کہ اسلام کے تمام فرائض واعمال میں ترتیب وتدریج ملحوظ رہی ہے، اس طرح اسلام کے نظامِ حکومت میں بھی بتدریج ترقی ہوتی گئی، چنانچہ اگرچہ آپ ﷺ ساری دنیا کی اصلاح کے لیے آئے تھے، مگر آپ ﷺ نے اپنا کام عرب سے شروع کیا، تاکہ ایک ایسی صالح جماعت کا ظہور ہو جو حضور ﷺ کے سامنے بھی اور آپ ﷺ کے بعد بھی اس فرض کی تکمیل میں مصروف رہے، قرآن پاک کی یہ آیت اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾

(۲/ البقرۃ:۱۴۳)

''اور اسی طرح اے مسلمانو! ہم نے تم کو بیچ کی امت بنایا، تاکہ تم لوگوں کو بتانے والے بنو اور رسول تمہارا بتانے والا ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اس امتِ مسلمہ کے لیے اور یہ امتِ مسلمہ دوسری قوموں کی ہدایت و راہنمائی اور ان کی تعلیم وتربیت کے لیے بروئے کار لائی گئی ہے۔

لیکن یہی تدریجی ترتیب خود اہلِ عرب کی اصلاح میں بھی ملحوظ تھی، چنانچہ سب سے پہلے آپ ﷺ نے عرب کے اندرونی حصے یعنی تہامہ، حجاز اور نجد کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کیا اور آپ ﷺ کی ۲۳ سالہ زندگی کے تقریباً سولہ سترہ سال انہی قبائل کی اصلاح وہدایت کے نذر ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے نخلستان کی طرح اگرچہ ہجر و یمامہ کے سبزہ زار بھی اسلام کو اپنے دامن میں پناہ دینے کے لیے آمادہ تھے اور قبائل یمن کے ایک بڑے رئیس طفیل دوسی نے آپ ﷺ کو قبیلہ دوس کے ایک عظیم الشان قلعہ کی حفاظت میں لینا چاہا تھا، لیکن آپ ﷺ نے ان متمدن مقامات کو چھوڑ کر مدینہ کی سنگلاخ زمین کو دارالہجرۃ بنایا، وہ اگرچہ منافقین اور یہود کی وجہ سے مکہ سے زیادہ پرخطر تھا اور ابتدا میں مہاجرین رضی اللہ عنہم کے لیے اس کی آب وہوا بھی سازگار نہ تھی، تاہم آپ ﷺ نے اسی کی طرف ہجرت فرمائی۔ لیکن جب رفتہ رفتہ عرب کے اس حصہ میں کافی طور پر نظامِ اسلام قائم ہو گیا اور صلح حدیبیہ نے عرب کے مرکز یعنی مکہ کا راستہ صاف کر دیا اور وہ فتح ہو گیا تو اب عرب کے دوسرے حصوں کی طرف توجہ کا وقت آ گیا۔ اس بنا پر اسلام کے دائرۂ عمل کو وسعت دی گئی اور عرب کے ان حصوں کی طرف توجہ فرمائی گئی۔

عرب کے اندرونی حصوں میں زیادہ تر اسلام کی اشاعت رؤسائے قوم اور سردارانِ قبائل کے ذریعہ سے ہوئی تھی، آنحضرت ﷺ نے ان حصوں میں بھی یہی طریقہ دعوت اختیار فرمایا، چنانچہ سب سے پہلے قرب وجوار کے سلاطین ورؤسا کو اسلام کی دعوت دی کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کا اسلام قبول کر لینا ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو قبولِ اسلام پر آمادہ کر دیتا تھا، چنانچہ روم کے قیصر کو جو نامہ مبارک

آپ ﷺ نے لکھا تھا، اس میں یہ فقرہ تھا کہ اگر تم نے اس کو قبول نہیں کیا تو تمہاری ساری رعایا کے عدمِ قبول اسلام کا گناہ بھی تمہاری ہی گردن پر ہوگا، اس سے اگرچہ خود قیصر کا دل نورِ اسلام سے منور ہو چکا تھا، لیکن وہ اتنا کم تھا کہ تاجِ مرصع اور تختِ زریں کی چمک میں یہ روشنی ماند پڑ گئی، نجاشی بادشاہ حبش نے آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی اور اپنے خاندان کے کچھ افراد کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں روانہ کیا، یمن کے تمام رؤسا نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا، عرب کے حدود میں ایک غسانی سلطنت تھی، آنحضرت ﷺ کے عہدِ مبارک میں اگرچہ پوری طور پر اس کا قلع قمع نہ ہو سکا، تاہم غزوہ تبوک نے آپ ﷺ کے جانشینوں کے لیے اس کا راستہ بھی بہت کچھ ہموار کر دیا تھا اور اب گویا سارا عرب اسلام کے سایہ کے نیچے تھا اور اس کا نظامِ حکومت سارے عرب پر چھا چکا تھا، اب آنحضرت ﷺ کی زندگی کا سب سے آخری فرض تمام دنیا میں اللہ تعالیٰ کی شہنشاہی کا اعلان تھا، چنانچہ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے ان بلیغ الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا:

((إِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ)) [1]

''زمانہ ہر پھر کے اسی مرکز پر آ گیا جس پر وہ اس دن تھا جس دن اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔''

یہ ایک ایسا عظیم الشان انقلاب تھا جس نے تمام خود ساختہ قوانین، سیاسی تکلفات، بدعات اور مظالم سے لبریز شاہانہ نظامہائے سلطنت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا، اس انقلاب نے نہ صرف قصرِ کسریٰ و قیصر کی شخصیتوں کا خاتمہ کر دیا، بلکہ خود کسرویت اور قیصریت کو صفحۂ ہستی سے فنا کر دیا، یہی پیشین گوئی ان الفاظ میں ظاہر ہوئی:

((اِذَا هَلَكَ كِسْرٰى فَلَا كِسْرٰى بَعْدَهُ وَاِذَا هَلَكَ قَيْصَرُ فَلَا قَيْصَرَ بَعْدَهُ)) [2]

''جب کسریٰ ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں اور جب قیصر ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں۔''

اور اس کے بعد ایک ایسی عادلانہ سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی، جس کا قانون اللہ کا قانون، جس کی حکومت اللہ کی حکومت اور جس میں ہر شخص ایک طرح سے خود ہی اپنا حاکم اور خود ہی اپنا محکوم تھا، کیونکہ اسلامی سلطنت بادشاہ اور اس کے خاندان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ ملکیت تو صرف ایک اللہ کی تھی، لیکن اس کی نیابت سارے مسلمانوں کا یکساں حق تھا یا اس کو یوں کہیے کہ نظامِ اسلام میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنی اپنی رعایا کا نگران حاکم ہے، شوہر اپنے اہل و عیال کا، بیوی شوہر کے گھر کی، معلم اپنے شاگردوں کا، آقا اپنے غلاموں کا، غلام اپنے متعلقہ کاموں کا اور آنحضرت ﷺ کے اس ارشادِ مبارک کا کہ ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ)) [3] یعنی ''تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کے زیرِ نگرانی اشخاص (رعیت) کے متعلق سوال ہوگا۔'' یہی مطلب ہے۔ اس سے اسلام کے اصولِ سلطنت کا ایک اساسی نقطہ نظر سامنے آ جاتا ہے۔

[1] أبوداود، كتاب المناسك، باب الأشهر الحرم: ١٩٤٧۔ [2] صحيح بخاري، كتاب المناقب، باب علامات النبوة: ٣٦١٨، ٣٦١٩۔ [3] صحيح بخاري، كتاب الجمعة، باب الجمعة في القرى والمدن: ٨٩٣۔

دنیا میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں یا ہوتی ہیں، ان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک فاتح ایک گروہ کو لے کر اٹھتا ہے اور لاکھوں کو تہ تیغ کر کے اپنی طاقت وقوت سے سارے جتھوں کو توڑ کر ہزاروں گھروں کو ویران کر کے سب کو زیر کر کے اپنی سرداری اور بادشاہی کا اعلان کر دیتا ہے اور ان تمام خونریزیوں کا مقصد یا تو شخصی سرداری یا خاندانی برتری یا قومی عظمت ہوتی ہے، مگر اسلامی جنگ وجہاد اور اسلامی نظامِ حکومت کی جدوجہد میں ان میں سے کوئی چیز بھی مطمحِ نظر نہ تھی، نہ رسول اللہ ﷺ کی شخصی سرداری، نہ خاندانِ قریش کی بادشاہی نہ عربی سلطنت، نہ دنیا کی مالی حرص وہوس، بلکہ اس کا ایک ہی مقصد تھا، صرف ایک شہنشاہِ ارض وسما کی بادشاہی کا اعلان اور ایک فرمانِ الٰہی کے آگے سارے بندگانِ الٰہی کی سرافگندگی۔

دنیا میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد قیام سلطنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، لیکن اسلام جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا، وہ بجائے خود مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے تمام ظالمانہ نظامہائے سلطنت کو مٹا کر جن میں اللہ کے بندوں کو بندوں کا خدا ٹھہرا دیا گیا تھا، اس کی جگہ اللہ کے فرمان کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا مقصود تھا جس میں اللہ کے سوا نہ کسی دوسری ارضی وسماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ کسی دوسرے کا قانون رائج ہو اور جس میں فرمانروا افراد کی شخصیت، قومیت، زبان، نسل، وطن اور رنگ سے اس کو تعلق نہ ہو، بلکہ اس کی جدوجہد کا سارا منشا سلطنت کے قانون، طرزِ سلطنت، طریقِ حکومت اور عدل وانصاف اور احکام کے حق وباطل سے نہ ہو۔

اس مقصد کے لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں میں سے عرب کا انتخاب، ان کی ظاہری ومعنوی خصوصیات کے سبب سے ہوا، ظاہری تو اس لیے کہ وہ ایران اور روم کے درمیان واقع تھے، جو اس وقت کی فاسد دنیاوی طاقت کے مظہر تھے اور جن کو توڑنا اور فنا کرنا ضروری تھا اور اس کے لیے ایسی ہی درمیانی ہمسایہ قوم کی ضرورت تھی اور معنوی یہ کہ ایسی قوم کے انتخاب کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ وقت کے فاسد نظام سلطنت کو مٹانے کے لیے کام میں لائے، کچھ فطری استعداد کی ضرورت تھی اور یہ استعداد ازل ہی سے ان میں ودیعت رکھی گئی تھی، عرب کی فطری شجاعت، کوہ شکن عزم واستقلال، زلزلہ انگیز قوتِ ارادی کا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہ اخلاقی عناصر حکومت اسلامیہ کی تعمیر میں کام آئیں اور ان اوصاف کی جلا اخلاص، للّٰہیت، صبر وتوکل واعتماد علی اللہ وغیرہ اخلاقِ روحانی ہی سے ممکن تھی، اس لیے اولاً ان کو اس طرزِ حکومت سے پاک رکھا گیا، جس کو دنیا کی سلطنتوں نے اپنے شخصی وخاندانی اور قومی جاہ وجلال، رعب واقتدار اور شاہانہ ہیبت کو قائم رکھنے کے لیے اختیار کر رکھا تھا، مذکورہ بالا اخلاق محاسن کے وجود بقا بلکہ ان کی ترقی ونشوونما کی ایک ہی صورت تھی کہ ایک اللہ کے فرستادہ، مامور من اللہ، ایک پاکباز راہنما، ایک مقدس امیر، ایک معصوم امام کے پرتو صحبت اور تعلیم وتربیت سے ان میں ایک ایسا تقویٰ، ایک ایسا پاک احساس، ایک ایسا روشن ضمیر، ایک ایسا نور ایمان پیدا کیا جائے جو بغیر کسی قسم کے جبر واکراہ کے ہر فرد کو

احکامِ الٰہی کے تحت میں سلطنت کے قوانین کی پابندی اور احترام پر خود مجبور کر دے۔

اس اصول پر جو نظامِ سلطنت قائم کیا جائے گا اس کے لیے دو شرطیں لازمی ہیں:

① یہ کہ وہ چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔

② یہ بنیادی اصول صرف خشک انسانی قانون پر مبنی نہ ہوں، بلکہ اس کا اساسِ اولین محض اخلاصِ قلب اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو۔

اسلام کا نظامِ سلطنت انہی اصولوں پر قائم کیا گیا اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ تک قائم رہا اس نظامِ سلطنت کا بڑا نتیجہ یہ تھا کہ اس میں قانون کی رو سے چھوٹے بڑے، اونچے نیچے، کالے گورے اور عربی و عجمی کی تفریق بالکل مٹ گئی، یمن اور بحرین کے ایران نژاد، نجد و حجاز کے عرب، حبش کے حبشی، سب ایک ہی سطح پر آ کھڑے ہو گئے اور بادشاہی و شہنشاہی کے وہ تخت جو مشرق و مغرب میں بچھے تھے، الٹ گئے اور اسلام کی سلطنت کا امام اور دوسرے اہلکار حکام حقوق میں عام مسلمانوں کے برابر کر دیے گئے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام نے قانونی مساوات کی جو سلطنت قائم کی، وہ عرب کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی کیونکہ اہلِ عرب فطرۃً خوددار تھے اور ان کے قبیلوں میں شیوخ کی ریاست قریب قریب اسی پرداز کی تھی، مگر یہ سخت تاریخی غلطی ہے، عرب میں مدت سے تین سلطنتیں قائم تھیں، لخمی، حمیری، غسانی اور یہ سب کی سب اسی طرز کی تھیں، جیسی دنیا میں دوسری شاہانہ حکومتیں تھیں، یمن میں سبا اور حمیر کی سلطنتیں بھی اسی قسم کی تھیں، اسلام سے کچھ ہی پہلے کندہ کی جو ریاست رومیوں کے زیر اثر قائم ہوئی تھی، وہ بھی اسی نقشہ پر تھی، قبائل کے سردار اگرچہ جمہور کی مرضی یا ذاتی کردار مثلاً: شجاعت و فیاضی وغیرہ کی بنا پر انتخاب کیے جاتے تھے، لیکن ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے ممتاز تھے، چنانچہ لڑائیوں میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوتا تھا، اس میں سرداران قبائل کے لیے خاص حقوق مقرر تھے، جن سے اور تمام لوگ محروم تھے، یہی حقوق ہیں جن کو صفیہ، مرباع، نشیطہ اور فضول کہتے ہیں اور اسلام نے انہی کو مٹا کر خمس قائم کیا ہے، عام مجالس میں لوگوں کو سردارن قبائل کے سامنے آزادانہ گفتگو کرنے کا بھی حق حاصل نہ تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر جو مذہبا یہودی تھا، کہتا ہے:

ونـنـكـر ان شـئـنـا عـلـى الـنـاس قـولـهـم و لا يـنـكـرون الـقـول حـيـن نـقـول

''اور اگر ہم چاہیں تو لوگوں کی باتوں کو رد کر دیں اور جب ہم بولیں تو وہ لوگ اس کو رد نہیں کر سکتے۔''

سرداران قبائل اپنے لیے جس چراگاہ کو مخصوص کر لیتے تھے اس میں دوسرے لوگوں کو قدم رکھنے کا بھی اختیار نہ تھا، چنانچہ حرب بسوس اسی بنا پر واقع ہوئی اور آنحضرت ﷺ نے جو یہ فرمایا ہے: ((**لا حمى الا لله و رسوله**)) [1] ''اللہ اور رسول کے سوا کسی شخص کو چراگاہ کے مخصوص کر لینے کا حق حاصل نہیں ہے۔'' اس کا مقصد اسی رسم کا مٹانا تھا۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب اهل الدار یبیتون......: ۳۰۱۲۔

سلاطین شاہانہ شان و تجمل سے اونچے اونچے محلوں اور ایوانوں میں بڑے بڑے قیمتی لباسوں اور سونے چاندی اور زر و جواہر کے زیوروں سے آراستہ ہوکر اونچے اونچے بیش بہا تختوں پر جلوس کرتے تھے، ان کے امرا علی قدر مراتب سونے چاندی کی مرصع کرسیوں پر اور ریشمی گدوں پر بیٹھتے تھے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے یک قلم ان مصنوعی تفرقوں کو مٹا دیا، نشست کے لیے سونے چاندی کا سامان اور ریشمی لباس و فرش حرام کیے گئے، سونے چاندی کے زیورات مردوں کے لیے حرام ٹھہرے، امام وقت اور اس کے حکام کے لیے مسجد اور اس کا صحن ایوان تھا، حاجب و دربان کے پہرے اٹھ گئے، چاؤش و نقیب رخصت کر دیے گئے، طلائی و نقرئی و زمردیں تخت اٹھوا دیے گئے، امام اور اس کے حاکم عام مسلمانوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر نشست کرتے تھے پستی و بلندی کی تفریق باقی نہیں رکھی گئی، چنانچہ وضع لباس کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ اور عام صحابہ رضی اللہ عنہم میں کسی قسم کا فرق مراتب موجود نہ تھا، ایک مرتبہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ ایک شاہی عبا لے کر آئے، چونکہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرب کے مختلف حصوں سے وفود حاضر ہوا کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! آپ اسے خرید لیں تاکہ جب دوسرے شہروں یا ملکوں سے وفود آپ کی خدمت میں آئیں تو آپ ﷺ اس کو زیب تن فرمالیں یا جمعہ کے دن جو گویا مسلمانوں کے دربار عام کا دن ہے، آپ اس کو پہنیں، اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر اسلام کے لیے اس ظاہری جاہ و جلال اور تزک و احتشام پر گئی، جس کے شاہان وقت عادی تھے، لیکن حضور ﷺ نے اشتباہ کے اس پردے کو فوراً چاک کر دیا کہ مسلمانوں کا پیشوا شاہانہ جاہ و جلال کے اظہار کے لیے مبعوث نہیں ہوا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص اس کو پہنتا ہے آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔'' [1]

اسی طرح نشست میں بھی آپ ﷺ نے تفوق و برتری کے امتیاز کو اس قدر مٹایا کہ مجلس کے اندر آپ ﷺ میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ جب صحابہ رضی اللہ عنہم کی مجلس میں بیٹھتے تو باہر سے آنے والوں کو پوچھنا پڑتا کہ تم میں محمد ﷺ کون ہیں؟ لوگ اشارہ سے بتاتے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے چاہا کہ کم از کم ایک چبوترہ ہی بنا دیا جائے، جس پر آپ جلوہ افروز ہوں، مگر اس کو بھی آپ نے پسند نہیں فرمایا۔ [2] اس وقت کی شاہانہ حکومتوں میں بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد قانون کی زد سے مستثنیٰ تھے، مگر یہاں یہ حال تھا کہ ہر قانونِ الٰہی کی تعمیل کا اصل نمونہ اس کا رسول اور اہل بیت رسول تھے اور اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ اگر نعوذ باللہ اہل بیت سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو، تو ان کے لیے دوہری سزا ہے، ایک بار ایک مخزومی خاتون فاطمہ بنت قیس نے چوری کی تو آنحضرت ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، چونکہ وہ معزز خاندان کی بی بی تھیں، صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ گراں گزرا اور انہوں نے آپ کی خدمت میں

[1] بخاري، كتاب الجهاد، باب التجمل للوفد: ٣٠٥٤۔ [2] ابو داود، كتاب السنة، باب القدر: ٤٦٩٨۔ (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے لیے ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا دیا)۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے ذریعہ سے سفارش کرانی چاہی آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معمولی آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو اس کی سزا دے دی جاتی تھی، مگر جب وہی جرم بڑے رتبہ کے لوگ کرتے تھے تو ان کو چھوڑ دیتے تھے، پھر فرمایا کہ اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی یہ جرم کرتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ کاٹتا۔'' ❶

ایک بار آپ ﷺ صحابہ کو مال تقسیم فرما رہے تھے، ایک آدمی آیا اور حرص کے مارے آنحضرت ﷺ کے اوپر ٹوٹ پڑا، آپ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی، آپ نے اس سے کونچ دیا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر زخم آ گیا، آپ نے دیکھا تو اسی وقت فرمایا کہ ''آؤ اور مجھ سے قصاص لو۔'' لیکن اس نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں نے معاف کر دیا۔ ❷

ایک بار آنحضرت ﷺ کے پاس بہت سی لونڈیاں آئیں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے چھالے پڑ گئے تھے، انہوں نے آنحضرت ﷺ کو اپنے ہاتھ دکھائے اور فرمایا کہ گھر کے کام کاج کے لیے ان میں سے ایک لونڈی عنایت فرمائیے، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''بدر کے یتیم تم سے زیادہ اس کے مستحق ہیں۔'' ❸ ابطال سود کا جب حکم آیا تو سب سے پہلے آپ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے تمام سودی معاملات کو باطل قرار دیا، جاہلیت کے انتقام کے مٹانے کا جب قانون عام نافذ ہوا تو سب سے اول اپنے ہی خاندان کا انتقام جو دوسرے قبیلہ پر باقی چلا آتا تھا، معاف فرمایا۔ ❹ اسلامی محاصل زکوۃ وصدقات وعشر وغیرہ کے مستوجب ہونے اور ان کی ادائیگی میں خاندان نبوت بھی بالکل عام مسلمانوں کی طرح شریک تھا۔

اسی طرح بادشاہوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنی عالی نسبی اور بلندی کا یہ تصور پیدا کر دیا تھا کہ وہ گویا ساری مخلوقات سے افضل ہیں، بخلاف اس کے حضور ﷺ نے اپنے لیے جو خاص خطاب اللہ سے پایا، وہ یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، عبدیت کا ملہ ہی آپ کا کمال تھا، اعزاز کے وہ وہی طریقے جن کا سلاطین نے اپنے کو ایک زمانہ سے مستحق قرار دیا تھا، آپ ﷺ نے ان سب کو مٹا دیا، فرمایا: ''اللہ کے نزدیک سب سے برا نام یہ ہے کہ کوئی اپنے کو شاہ شاہاں کہے۔'' ❺ ایک دفعہ آپ ﷺ کو کسی نے سیدنا کہا تو فرمایا: ''یہ تو اللہ کے لیے ہے۔'' ❻ آپ ﷺ کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ لوگ آپ کو دوسرے انبیا علیہم السلام پر فضیلت دیں۔ ❼

ایک بار سورج میں گہن لگا، چونکہ اسی دن آپ ﷺ کے صاحبزادہ ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو چکا تھا

---

❶ یہ حدیث بخاری کے متعدد ابواب میں موجود ہے مثلاً کراهية الشفاعة فی الحدود اذا رفع الی السلطان: ٦٧٨٨۔

❷ ابوداود، کتاب الدیات، باب القود من الضربة وقص الأمير من نفسه: ٤٥٣٦۔

❸ ابوداود، کتاب الخراج والامارة، باب فی بیان مواضع قسم الخمس: ٢٩٨٧۔

❹ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی ﷺ: ٢٩٥٠۔ ❺ صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب ابغض الأسماء: ٦٢٠٥۔ ❻ ابوداود، کتاب الادب، باب کراهية التمادح: ٤٨٠٦۔

❼ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء: ٣٤١٢، ٣٤١٦۔

اور عرب کا خیال تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے، اس لیے لوگوں نے اس واقعہ کو حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی موت کی طرف منسوب کر دیا، لیکن جب آپ ﷺ صلوٰۃ کسوف سے فارغ ہوئے تو ایک خطبہ دیا جس میں اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ ''چاند اور سورج اللہ کی دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت وحیات سے گہن نہیں لگتا۔'' ❶

ایک بار ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پر اس قدر رعب نبوت طاری ہوا کہ جسم میں رعشہ پڑ گیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ڈرو نہیں، میں تو اسی عورت کا لڑکا ہوں جو خشک کیا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔'' ❷

ایک بار آپ ﷺ کی خدمت میں ایک قیدی لایا گیا، اس نے کہا کہ خدایا میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں، محمد ﷺ کی طرف رجوع نہیں کرتا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ حق کس کا تھا۔'' ❸ حالانکہ یہ وہ فقرہ ہے جس پر سلاطین کی عدالت گاہوں سے پھانسی کی سزا تک دی جا سکتی تھی کہ اس سے ان کے نزدیک ذات شاہانہ کی توہین متصور ہوتی ہے۔

ایک بار آپ ﷺ نماز پڑھا رہے تھے، حالت نماز ہی میں ایک بدو نے کہا: اللہ! مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم فرما اور ہم دونوں کے ساتھ کسی پر رحم نہ کر۔ آپ ﷺ نے سلام پھیرنے کے ساتھ ہی بدو کو ٹوکا کہ ''تم نے ایک وسیع چیز یعنی رحمت الٰہی کو محدود کر دیا۔'' ❹ حالانکہ اس نے درباری زبان میں شاہانہ وفاداری کی سب سے بڑی علامت کا اظہار اس فقرہ میں کیا تھا، جس پر سلاطین زمانہ اکرام وانعام کی بارش کرتے تھے۔ سلطنت کے مفتوحات ومحاصل کو دنیا کے بادشاہوں نے ہمیشہ اپنی ذاتی ملک سمجھا اور اپنے ذاتی وخاندانی عیش وآرام کے سوا ان کا کوئی دوسرا مصرف ان کے نزدیک نہ تھا اور اگر وہ اس میں سے دوسروں کو کچھ دیتے تھے تو اس کو اپنا احسان سمجھتے تھے، لیکن جو نظام سلطنت اسلام نے قائم کیا تھا اس میں سلطنت کے سارے محاصل مال اللہ یعنی اللہ کا مال کہلاتے تھے اور وہ صرف بیت المال کی ملکیت تھے اور مسلمانوں ہی کے لیے تھے، زکوٰۃ، صدقہ، خراج اور جزیہ جو کچھ وصول ہوتا تھا وہ اگرچہ بحیثیت امیر سلطنت سب کا سب آنحضرت ﷺ کے ہاتھ میں آتا تھا، لیکن آپ ﷺ نے اس کو اپنا نہیں، بلکہ باختلافِ شرائط عام مسلمانوں کی ملکیت قرار دیا اور کبھی اس کو اپنے شخصی تصرف میں نہیں لائے، زکوٰۃ کی ساری رقم اپنے اور اپنے اہل وعیال اور اپنے خاندانِ ہاشم پر حرام فرما دی اور اس کو بحکمِ الٰہی عام غربا اور اہل حاجت کا حق قرار دیا اور اس کو علانیہ ظاہر فرمایا، ابوداود میں ہے:

((قال ما اوتيكم من شيء وما امنعكم ان انا الاخازن اضع حيث ماامرت)) ❺

---

❶ بخاری، کتاب الکسوف: ۱۰٤۱۔ ❷ ابن ماجه، ابواب الاطعمة، باب القدید: ۳۳۱۲۔

❸ مسند أحمد، ج۳، ص: ٤۳۵۔ ❹ بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ٦٠١٠۔

❺ ابوداود، کتاب الخراج والامارة، باب فيما يلزم الامام من أمر الرعية: ۲۹٤۹۔

’’میں تم کو نہ کچھ دے سکتا ہوں نہ کچھ روک سکتا ہوں، میں صرف خزانچی ہوں، جس موقع پر صرف کرنے کا مجھے حکم دیا جاتا ہے وہاں صرف کرتا ہوں۔‘‘

دوسرے موقع پر فرمایا:

((انما انا قاسم و خازن و اللّٰہ یعطی)) [1]

’’میں تو صرف بانٹنے والا ہوں دینے والا تو اللہ ہے۔‘‘

غنیمت کا مال بھی مجاہدوں ہی کو دے دیا جاتا تھا اور حضور ﷺ کو صرف ایک خمس یعنی پانچویں حصے پر تصرف کا اختیار ہوتا تھا، اس تصرف کے معنی یہ ہیں کہ اس حصہ سے حضور ﷺ اپنے اہلِ بیت کے علاوہ ان نادار اور محتاج مسلمانوں کو دیا کرتے تھے، جن کو جنگ کے قواعد کی رو سے مال غنیمت سے کچھ نہیں مل سکتا تھا، اسی طرح لڑائی کے بغیر جو علاقہ اسلام کے تصرف میں آتا تھا، وہ حضور ﷺ کے تصرف میں گو براہ راست دے دیا جاتا تھا، لیکن اس تصرف کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ حضور ﷺ اس کی آمدنی اپنے صوابدید سے اپنے خانگی ضروریات میں صرف فرمانے کے بعد اسلام کی ضروریات ہی میں صرف فرماتے تھے اور اعلان فرما دیا تھا کہ یہ مسلمانوں کے ضروریات ہی میں صرف ہوگی۔

صحابہ میں سے جو لوگ ایران و روم کے ظاہری جاہ و جلال اور چمک دمک دیکھ چکے تھے، ان کو بھی یہ مغالطہ تھا کہ اسلام کے ظاہری رعب و وقار کے لیے ظاہری شاہانہ تزک و احتشام اور شان و شوکت بھی ضروری ہے، چنانچہ انہیں بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ آنحضرت ﷺ سادگی و تواضع اور زہد و قناعت کے بجائے کاش ایسی ہی عیش و آرام کی زندگی بسر فرماتے، جیسی روم کے قیصر اور ایران کے شہنشاہ بسر کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے اس حجرہ میں حاضر ہوئے جہاں آپ کی ضرورت کی چیزیں رہتی تھیں، دیکھا تو آپ ایک چمڑے کے تکیہ سے جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری ہوئی تھی، ٹیک لگائے ہوئے ایک کھری چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں، حجرہ میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن تین سوکھے چمڑوں کے سوا کوئی دوسرا اثاث البیت نظر نہ آیا، ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے تھے، اس منظر سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سخت متاثر ہوئے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ حضور ﷺ نے رونے کا سبب پوچھا، عرض کی: اے اللہ کے نبی! میں کیوں نہ روؤں، جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ (بستر نہ ہونے سے) چٹائی کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے ہیں اور آپ کا سارا اثاث البیت میرے سامنے ہے ادھر قیصر و کسریٰ ہیں جو باغ و بہار اور عیش و آرام کے مزے لوٹ رہے ہیں اور حضور ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور ان سے بے نیاز ہیں، ارشاد ہوا کہ ’’اے ابن خطاب! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ہم آخرت لیں اور وہ دنیا؟‘‘ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ ہاں! بے شک یا رسول اللہ ﷺ! [2] دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی:

---

[1] بخاری، کتاب الجهاد، باب قول اللّٰہ تعالی: ﴿فان للّٰہ خمسه﴾: ٣١١٧۔ الفاظ قدرے مختلف ہیں۔

[2] بخاری، کتاب النکاح: ٥١٩١ ومسلم، کتاب النکاح، باب الایلاء: ٣٦٩١، ٣٦٩٢۔

یارسول اللہ ﷺ! دعا فرمایے کہ اللہ آپ ﷺ کی امت کو فارغ البال کرے، کیونکہ رومی اور ایرانی باوجودیکہ اللہ کی پرستش نہیں کرتے لیکن اللہ نے ان کو تمام دنیوی ساز وسامان دیے ہیں، آپ ﷺ دفعتاً اٹھ بیٹھے اور فرمایا: ''کیوں ابن خطاب! تم اس خیال میں ہو کہ رومی اور ایرانی تو وہ قوم ہیں کہ ان کو تمام لذائذ دنیا ہی میں دے دیے گئے ہیں''۔ ❶ اس تقریر دلپذیر کی تاثیر دیکھیے کہ وہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو حضور انور ﷺ کے لیے تزک واحتشام اور عیش وآرام کی زندگی کی آرزو ظاہر کر رہے تھے، جب ان کی خلافت کا وقت آیا تو وہ بھی گودڑی اور مرقع ❷ ہی پہن کر اور جھونپڑے میں بیٹھ کر سونے چاندی اور زر وجواہر والے روم کے قیصر اور ایران کے کسریٰ پر حکمرانی کر رہے تھے اور ہر میدان میں ان کو شکست دے رہے تھے۔

قیس رضی اللہ عنہ بن سعد ایک صحابی تھے، وہ حیرہ گئے اور وہاں دیکھا کہ لوگ وہاں کے مرزبان (رئیس) کے آگے سجدہ کرتے ہیں، ان پر اس کا خاص اثر ہوا اور انہوں نے دل میں کہا کہ آنحضرت ﷺ سجدہ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، چنانچہ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خیال ظاہر کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایسا ہرگز نہ کرنا، اگر میں بالفرض کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو بیویوں کو دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔'' اسی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ ''کیا اگر تم میری قبر پر گزرو گے تو سجدہ کرو گے؟'' عرض کی نہیں، تو فرمایا کہ ''تو پھر اب بھی نہیں کرنا چاہیے۔'' ❸

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ صحابی ایک دفعہ شام سے واپس آئے تو حضور ﷺ کو سجدہ کیا۔ آپ ﷺ نے حیرت سے فرمایا: ''معاذ یہ کیا؟'' عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! میں نے رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پیشواؤں اور افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو دل چاہا کہ میں بھی حضور ﷺ کو سجدہ کروں، ارشاد ہوا کہ ''اللہ کے سوا کسی اور کو اگر میں سجدہ کرنے کو کہتا تو بیویوں کو کہتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔'' ❹

ان تمام واقعات میں صاف نظر آتا ہے کہ اہلِ عرب خود اس کے خوگر تھے کہ وہ اپنے بادشاہوں اور پیشواؤں کو اپنے قرب وجوار کے سلاطین کی طرح عیش وآرام اور تزک واحتشام کے ساتھ دیکھیں، مگر آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیم، اپنے تزکیہ اور اپنے فیض اثر اور اپنے نمونہ سے دکھا دیا کہ یہ استکبار وترفع اور اسراف وتبذیر کی زندگی اللہ کو محبوب نہیں اور اسلامی تعلیم کی نظر میں مرغوب نہیں، حیات دنیا کی یہ زینت ورونق سراب کی نمائش اور حباب کی سربلندی سے زائد نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس حقیقت کو بار بار ظاہر فرمایا ہے اور آنحضرت ﷺ نے اس کا کامل نمونہ بن کر دکھا دیا اور آپ ﷺ کے بعد آپ کے خلفائے

---

❶ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورة التحریم: ٤٩١٣؛ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب الایلاء: ٣٦٩٥۔ ❷ یعنی پیوندار کپڑا (معارف جلد ۱۲۲، عدد ۳، ص: ۱۸۱)۔

❸ ابوداود، کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المرأة: ٢١٤٠۔

❹ ابن ماجه، کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المرأة: ١٨٥٣۔

راشدین اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اس کی پیروی کی اور یہی سادگی و تواضع اسلام کا شعار قرار پایا۔ عام سلطنتوں میں محاصل کی عطا و بخشش شاہانہ تقرب اور عیش پسند امرا کے موروثی استحقاق اور سعی و سفارش کی بنا پر ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دولت مندوں کی دولت مندی اور فقرا کی محتاجی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے احکام الٰہی کے تحت جو اسلامی نظام قائم فرمایا اس میں دولت مندی اور تقرب نہیں، بلکہ حاجت اور ضرورت کو معیار قرار دیا گیا، کیونکہ ضعفا کا حق اقویا کے مقابلہ میں زیادہ توجہ کے قابل تھا، عرب میں لونڈیوں اور غلاموں کا کوئی حق نہیں تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے حقوق میں ان کو بھی آزاد لوگوں کے ساتھ حصہ دیا، ابوداؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس ایک تھیلی لائی گئی جس میں کچھ یمنی مہرے تھے، آپ نے ان کو لونڈیوں اور آزاد عورتوں پر تقسیم کر دیا، وظیفے جب تقسیم ہوتے تو آزاد شدہ غلاموں کو سب سے پہلے ان کا حصہ دیا جاتا۔ ❶

سلاطین کی بارگاہ میں بے اجازت لب کشائی بھی جرم تھی اور اجازت بھی ہوتی تو تکلفات وتصنعات اور غلامی و عبودیت کے اظہار کے مختلف اسلوبوں کے بعد کہیں حرفِ مدعا زبان پر آتا تھا۔ اسلام کے نظامِ حکومت کا یہ حال تھا کہ حضورِ انور ﷺ کی عظمت وجلالت اگرچہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو بارگاہِ نبوت میں ایک طائرِ بے جان بنا دیتی تھی، تاہم ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ بے تکلف عرض مدعا کرے، ناآشنا بدو آتا تو یا محمد ﷺ کہہ کر خطاب کرتا اور حضور ﷺ خوشدلی کے ساتھ جواب دیتے اور مسلمان یارسول اللہ کہہ کر مطلب کو شروع کرتا تھا، آپ ﷺ کے احکام کی تعمیل ہر مسلمان کا ایمان تھا، مگر جب اس کو یہ معلوم ہوتا کہ حضور ﷺ کا یہ حکم بطور مشورہ ہے تو بے تکلف اپنا خیال ظاہر کر دیتا تھا اور حضور ﷺ اس کو شفقت سے سنتے تھے اور اس کے قبول پر اس کو مجبور نہ فرماتے۔

اسلام کا قانون ہے کہ اگر کسی لونڈی کا نکاح اس کے مالک نے کسی غلام سے کر دیا تو آزادی کے بعد اس عورت کو حق ہے کہ چاہے اس نکاح کو قائم رکھے یا توڑ دے، حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک لونڈی تھیں، وہ جب آزاد ہوئیں تو انہوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی، ان کے شوہر اس غم میں روتے تھے، آخر آنحضرت ﷺ نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ ''تم ان کو اپنی شوہری میں لے لیتیں تو اچھا تھا۔'' انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے؟ ارشاد ہوا کہ ''نہیں! سفارش ہے۔'' عرض کی: تو قبول سے معذور ہوں، آنحضرت ﷺ نے اس پر ان سے کوئی مواخذہ نہیں فرمایا۔ ❷

غزوۂ بدر میں آنحضرت ﷺ نے ایک مقام پر قیام فرمایا، فن جنگ کے بعض ماہر صحابہ نے عرض کی:

---

❶ یہ دونوں واقعے ابوداود، کتاب الخراج، باب فی قسم الفیء: ۲۹۵۱، ۲۹۵۲ میں ہیں۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، وباب شفاعة النبی ﷺ فی زوج بریرة: ۵۲۸۳ اگر اس لونڈی کا شوہر غلام ہو تو بالاتفاق یہی حکم ہے، اگر آزاد ہو تو اس میں فقہا کا اختلاف ہے۔

یارسول اللہ! آپ ﷺ نے اس مقام کا انتخاب وحی سے فرمایا ہے، یا اپنی رائے سے؟ فرمایا: ''رائے سے۔'' انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام مناسب نہیں ہے، بلکہ ہم کو بدر کے کنوئیں کے پاس آگے بڑھ کر ٹھہرنا چاہیے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بے تامل ان کی رائے پر عمل فرمایا۔ [1] اسی قسم کے تجربی امور کے متعلق آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ

((انتم اعلم بامور دنیاکم)) [2]

''تم اپنے دنیاوی معاملات میں جن کا تعلق تجربات سے ہو، تم زیادہ واقف ہو۔''

آنحضرت ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں لوگوں کو دیکھا کہ نر و مادہ کھجور کے درختوں میں پیوند لگاتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھا تو خیال فرمایا کہ یہ ایسا ٹوٹکے کے لیے کرتے ہوں گے، اس لیے مشورہ دیا کہ تم یہ نہ کرتے تو اچھا تھا، چنانچہ انصار نے اس پر عمل کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ کھجوریں بہت کم اور خراب پیدا ہوئیں، آنحضرت ﷺ کا ادھر گزر ہوا تو دریافت فرمایا، انہوں نے صورت حال عرض کی تو ارشاد ہوا کہ ''میں نے اپنے گمان سے یہ بات کہی تھی، تم اپنے دنیا کے کاموں کو اچھا جانتے ہو، ان تمام امور میں جن کا تعلق وحی سے ہے، میری اتباع ضروری ہے، لیکن دنیاوی کاموں میں جن میں اپنی رائے سے کچھ کہتا ہوں تو میں بھی بشر ہی ہوں تم آزاد ہو۔'' [3]

ان امور کے باب میں جن کا تعلق دنیاوی معاملات کے تجربوں سے ہے، یہ حدیث بڑی اہمیت رکھتی ہے، لیکن جن امور میں آنحضرت ﷺ کو علم بالوحی ہوتا تھا اور وہ گویا مصلحتِ الٰہی پر مبنی ہوتا، جس کی اطلاع حضور ﷺ کو بذریعہ وحی ہوتی تو ان میں پھر کسی کا مشورہ توجہ کے قابل نہیں ہوسکتا تھا، کیونکہ ان کا منشا حکم الٰہی ہوتا تھا، جس کا ماننا ہی ضروری ہے، اس میں بندہ کو دخل نہیں۔

غزوۂ حدیبیہ میں جب آنحضرت ﷺ نے نہایت نرم شرائط پر صلح کرلی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ذاتی طور پر محسوس ہوا کہ یہ صلح دب کر کی گئی ہے، اس لیے وہ جوشِ اسلام سے بے تاب ہوگئے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کی کہ یارسول اللہ! آپ کیا پیغمبرِ برحق نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بے شبہ ہوں۔'' انہوں نے کہا: کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ ارشاد ہوا کہ ''بے شبہ ہیں۔'' انہوں نے کہا: تو پھر ہم دین کے بارہ میں اس قدر کیوں دبتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں اللہ کا پیغمبر ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا، وہ میری مدد کرے گا۔'' انہوں نے کہا کہ کیا آپ نے ہم سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم چل کر خانہ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہاں! لیکن کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اس سال

[1] سیرت ابن ھشام، ج۱، ص:۳۷۸۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قالہ شرعا: ٦١٢٨۔

[3] صحیح مسلم، باب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قالہ شرعا: ٦١٢٧۔

کریں گے؟'' انہوں نے کہا: نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو پھر آؤ گے اور طواف کرو گے۔'' لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس سوال و جواب سے بھی تسکین نہیں ہوئی، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور یہی گفتگو کی، انہوں نے بھی وہی جواب دیے جو رسول اللہ ﷺ نے دیے تھے، آخر میں جب اصل حقیقت ان کی سمجھ میں آ گئی تو انہوں نے خود اپنی اس عرض و معروض کو گستاخی خیال کیا اور اس کے کفارہ میں صدقہ دیا، روزے رکھے اور غلام آزاد کیا۔ ❶ اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گو بہت کچھ عرض و معروض کی، مگر حضور ﷺ نے اپنے فیصلے کو نہیں بدلا، کیونکہ یہ فیصلہ ارادتِ ربانی سے کیا گیا تھا۔

اس طرح اسی واقعہ حدیبیہ میں جب شرائط صلح طے ہو جانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے احرام کھول دینے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا، تو چونکہ ان کے شدتِ شوقِ زیارتِ کعبہ کے خلاف یہ صورت پیش آئی، اس لیے ان کو حزن و ملال ہوا اور اس کے سبب سے مسلمانوں نے تعمیل ارشاد میں تساہل برتا، جس سے ان کی غرض یہ تھی کہ حضور ﷺ یہ دیکھ کر غلاموں پر شفقت فرمائیں گے اور ان کی تمنا کے مطابق اپنی رائے کو بدل دیں گے لیکن جب آپ نے یہ دیکھا کہ لوگ اپنی رائے پر اڑے ہیں اور ان کا اس پر اصرار مصلحتِ ربانی کے خلاف ہے تو یہ امر آنحضرت ﷺ پر شاق گزرا اور مغموم ہو کر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے، ام المومنین نے چہرہ مبارک پر آزردگی کا اثر پا کر سبب دریافت کیا، آپ ﷺ نے واقعہ بیان فرمایا، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے مشورہ کے طور پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں، آپ خود اپنا احرام کھول دیں، چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا، شمعِ نبوت کے پروانوں (صحابہ رضی اللہ عنہم) نے یہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب حضور ﷺ اپنے فیصلہ کو تبدیل نہیں فرمائیں گے، پھر تو یہ عالم ہوا کہ احرام کھولنے اور سر کے بال منڈوانے کے لیے لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ ❷ اس واقعہ میں دونوں قسم کی مثالیں موجود ہیں، حدیبیہ کا فیصلہ چونکہ امرِ الٰہی سے تھا، اس میں کسی کے مشورہ کی کوئی پروا نہیں فرمائی اور احرام کھلوانے کی تدبیر جو ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی وہ ایک انسانی تدبیر تھی، جس کا تعلق علم النفس اور امور تجربیہ سے تھا، اس لیے اس پر بلا تامل عمل فرمایا۔ ❸

بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے جن میں لوگ اپنی کم فہمی، ناعاقبت اندیشی یا اپنی بشری کمزوری کے سبب غصہ میں حضور ﷺ پر اعتراض کر بیٹھے، لیکن حضور ﷺ نے اس پر تحمل فرمایا اور معترض کو اس کی گستاخی

---

❶ بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد ..... ۲۷۳۱، ۲۷۳۲۔ نیز دیکھیں فتح الباری شرح حدیث مذکور۔

❷ صحیح بخاری، ایضا۔ ❸ اس قسم کے واقعات پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ خدانخواستہ علم النفس کا یہ نقطہ آنحضرت ﷺ سے بڑھ کر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو معلوم تھا، بات یہ ہے کہ شاگردوں کے علوم درحقیقت استادوں ہی کے فیض سے ہوتے ہیں، جن سے کبھی ان استادوں کو اس لیے ذہول ہو جاتا ہے کہ وہ ان علوم و مسائل سے بھی زیادہ اہم مسائل میں مصروف ہوتے ہیں اس لیے ادھر ان کی پوری توجہ نہ ہونے سے شاگرد نے اس صورت کو پیش کر دیا جو اس کو خود اسی استاد کے فیض ہی سے حاصل ہوئی تھی۔

کی کوئی سزا نہیں دی۔

ایک دفعہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری صحابی میں آبپاشی کے متعلق نزاع ہوئی، صورت یہ تھی کہ پہلے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا کھیت پڑتا تھا اور اس کے بعد ان انصاری کا، انصاری چاہتے تھے کہ وہ پہلے پانی لیں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ وہ ان کو نہ لینے دیں، آخر معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا، قانون اسلام کا تقاضا یہ تھا کہ جو زمین کنوئیں سے قریب تر ہو اسی کو پانی لینے کا حق ہے، دور کے کھیت والے کو یہ حق نہیں کہ بلا اجازت قریب کے کھیت کو کاٹ کر اپنے کھیت میں پانی لے جائے، لیکن آپ ﷺ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم پہلے آبپاشی کرلو، پھر پانی کو اپنے پڑوسی کے کھیت میں جانے دو، یہ ایک اخلاقی اور منصفانہ فیصلہ تھا۔ لیکن اس فیصلہ پر تقاضائے بشری سے وہ انصاری سخت برہم ہو گئے اور کہا کہ یارسول اللہ! آپ نے یہ فیصلہ صرف اس بنا پر کیا ہے کہ زبیر رضی اللہ عنہ آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں، یہ سن کر آپ ﷺ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، تب آپ نے اخلاقی فیصلے کے بجائے قانونی فیصلہ دیا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ''زبیر! آب پاشی کر کے پانی روک لیں، یہاں تک کہ کھیت کی مینڈ تک پہنچ جائے۔'' [1] یعنی پانی بہہ کر مینڈ کے اوپر سے دوسرے کے کھیتوں میں از خود چلا جائے، یوں نہ جائے۔

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ مالِ غنیمت کی تقسیم فرمارہے تھے، قبیلہ بنو تمیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخویصرہ تھا، آیا اور کہا کہ یارسول اللہ! انصاف فرمائیے! آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں انصاف نہ کروں گا تو کون کرے گا؟'' ذوالخویصرہ کی اس گستاخی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا اور آنحضرت ﷺ سے کہا: اگر آپ اجازت دیجئے تو اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آپ ﷺ نے ان کو روک دیا [2] اور فرمایا کہ ''اس کے کچھ ہمراہی ایسے ہوں گے جن کی عبادتوں کے سامنے تم کو اپنی عبادتیں حقیر معلوم ہوں گی، یہ قرآن پڑھیں گے، لیکن وہ ان کے گلے کے نیچے نہیں اترے گا، یہ مسلمانوں کے تفرقہ کے زمانہ میں اپنی جماعت الگ بنائیں گے۔'' (یہ پیشین گوئی امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خوارج کے ظہور سے پوری ہوئی) یہ دونوں اعتراض اگرچہ عرض واجب کی حد سے گزر کر گستاخی کی حد تک پہنچ گئے تھے اور عجب نہیں کہ ان میں سے بعض نکتہ چین منافق ہوں، تاہم اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی اپنی جہالت اور غلط فہمی سے برے اسلوب سے بھی آپ ﷺ پر اعتراض کرتا تھا تو آنحضرت ﷺ اپنے کرم وشفقت سے اس کا تحمل فرماتے تھے، آنحضرت ﷺ کے اس طرزِ عمل میں آپ کے بعد آنے والے خلفا اور امرائے اسلام کے لیے حق شناسی، حق کوشی، حق گوئی اور حق کی پیروی میں ذاتی جاہ واعزاز اور فخر وغرور کو دخل نہ دینے کی کتنی بڑی تعلیم تھی۔

عمال وحکام درحقیقت خلیفہ یا بادشاہ کے قائم مقام ہوتے ہیں اس لیے ان پر نکتہ چینی کرنا گویا خود خلیفہ

---

[1] ابوداود، کتاب القضاء، باب فی القضاء: ٣٦٣٧۔

[2] بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام: ٣٦١٠۔

پر یا بادشاہ پر نکتہ چینی کرنا ہے، عہد نبوت میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے عمالِ نبوی کی شکایت کی اور آنحضرت ﷺ نے بجائے اس کے کہ قانون کی کسی دفعہ سے ان کو خاموش کر دیا ہو، یا حکام کی حمایت میں معترضین پر کسی قانونی جرم کو عائد فرمایا ہو، اخلاقی طور پر سے دونوں کو سمجھا دیا، حکام و عمال سے فرمایا: ''ہاں! مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا کہ ان کی دعا اور قبول میں کوئی چیز خارج نہیں ہوتی۔'' ❶ اور معترضین سے فرمایا کہ ''تم اپنے عاملوں کو اپنے عمل سے راضی رکھو۔'' ❷ لیکن ان سب سے زیادہ سخت وہ مواقع ہیں جہاں بعض لوگوں نے خود حضورِ انور ﷺ سے درشتی اور سختی کے ساتھ مطالبہ کیا اور آنحضرت ﷺ نے ایسے معترضین کے ساتھ بھی لطف و کرم فرمایا اور عدل و انصاف سے بھی زیادہ ان کو عطا فرمایا۔

ایک بار ایک اعرابی نے آ کر آپ ﷺ کی چادر پکڑ لی اور اس زور سے کھینچی کہ آپ کی گردن سرخ ہوگئی، آپ اس کی طرف پھرے تو اس نے کہا: میرے ان دونوں اونٹوں کو لاد دو، کیونکہ جو لاد دو گے وہ نہ تمہارا مال ہوگا اور نہ تمہارے باپ کا، حضور ﷺ نے تین بار فرمایا: ''نہیں، استغفر اللہ، نہیں استغفر اللہ، نہیں استغفر اللہ۔'' اس کے بعد فرمایا: ''میں اس وقت تک نہیں لا دوں گا، جب تک تم نے جو اس زور سے مجھے کھینچا ہے، اس کا بدلہ نہ دو۔'' مگر وہ اس سے انکار کرتا رہا، پھر آپ ﷺ نے معاف فرما کر حکم دیا کہ اس کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے پر کھجوریں لاد دی جائیں۔ ❸

ایک دن ایک بدو آیا، جس کا کچھ قرض آنحضرت ﷺ پر تھا، بدو عموماً سخت مزاج ہوتے ہیں، اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس گستاخی پر اس کو ڈانٹا اور کہا: تجھ کو خبر ہے کہ تو کس سے ہمکلام ہے؟ بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں، آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا کہ ''تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ اس کا حق ہے۔'' اس کے بعد قرض ادا کرنے کا حکم فرمایا اور اس کو اس کے حق سے زیادہ دلوا دیا۔ ❹

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا، آنحضرت ﷺ کو خیال یہ تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں، آپ ﷺ نے ایک وسق چھوہاروں پر گوشت چکا لیا، گھر میں آ کر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے، باہر تشریف لا کر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا، لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں، اس نے واویلا مچایا کہ ہائے بدمعاملگی، لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ ﷺ بدمعاملگی کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، اس کو چھوڑ دو اس کو کہنے کا حق ہے۔'' پھر قصاب کی طرف خطاب کر کے وہی فقرہ ادا کیا، اس نے پھر وہی لفظ کہے، لوگوں نے پھر روکا، آپ ﷺ نے پھر فرمایا: ''اس کو کہنے دو، اس کو کہنے

❶ بخاري، كتاب الزكاة: ١٤٩٦۔ ❷ صحيح مسلم، كتاب الزكوة، باب ارضاء السعاة: ٢٢٩٨۔

❸ سنن ابي داود، كتاب الادب، باب في الحلم واخلاق النبي ﷺ: ٤٧٧٥۔

❹ ابن ماجه لصاحب الحق سلطان: ٢٤٢٥، ٢٤٢٦۔

کا حق ہے۔'' اور اس جملہ کو کئی بار دہراتے رہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک انصاری کے ہاں اس کو بھجوا دیا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے، جب وہ چھوہارے لے کر پلٹا تو آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس کا دل آپ کے حلم وعفو اور حسنِ معاملہ سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا: ''محمد (ﷺ)! تم کو اللہ جزائے خیر دے، تم نے قیمت پوری دی اور اچھی دی''۔ [1]

بہر حال یہ تو مسلمانوں کے ساتھ کے معاملے تھے، ان سے بڑھ کر وہ واقعات ہیں جو یہودیوں کی بے جا و ناروا بے ہودگیوں کے مقابلہ میں پیش آئے، جن کی حیثیت ایک ذمی رعایا کی ہو چکی تھی۔

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے، لین دین کا کاروبار کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان سے کچھ قرض لیا، میعاد ادائی میں ابھی کچھ دن باقی تھے کہ تقاضے کو آئے اور آنحضرت ﷺ کی چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت وسست کہہ کر کہا کہ ''اے عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصہ سے بے تاب ہو گئے، اس کی طرف منہ کر کے کہا: او اللہ کے دشمن! تو رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے مسکرا کر کہا: ''عمر! مجھ کو تم سے اور کچھ امید تھی، اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ وہ نرمی سے تقاضا کرے اور مجھ سے کہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں۔'' یہ فرما کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کو ارشاد ہوا کہ جاؤ اس کا قرضہ ادا کر کے اس کو بیس صاع کھجور کے اور زیادہ دے دو، یہودی حلم وعفو کے اس پُر اثر منظر کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔ [2]

ایک دفعہ آپ ﷺ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا اور وہ بھی موٹا اور گندہ تھا، پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا، اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجیے، آنحضرت ﷺ نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا، اس گستاخ نے کہا: میں سمجھا مطلب یہ ہے کہ میرا مال یونہی اڑا لیں اور دام نہ دیں، آنحضرت ﷺ نے یہ ناگوار جملے سن کر صرف اس قدر فرمایا کہ ''وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں۔'' [3]

ان واقعات کے ذکر سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضور انور ﷺ، جو پیغمبر ہونے کے علاوہ ایک امیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے، لوگوں نے اس حیثیت سے آپ ﷺ پر جو سخت سے سخت اعتراض کیا، آپ ﷺ نے اس کو کس حلم اور عفو سے سنا اور معاملہ کا فیصلہ کیا یا واقعہ کی تفصیل فرما کر لوگوں کی تسلی کر دی۔ ذرا اسلام کے امیر کو زمانہ کے سلاطین اور امرا کے غرور و تبختر سے ملایئے جو رعایا کی ذرا ذرا سی بے ادبی اور گستاخی پر ان کو سخت سے سخت عبرت ناک سزائیں دیتے ہیں اور ان کا قانون اس کو جائز قرار دیتا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان

---

[1] مسند احمد بن حنبل، ج٦، ص: ٢٦٨۔ [2] یہ روایت دلائل النبوة بیهقی، جماع ابواب اسئلة الیهود، ج٧، ص: ٣٠: ١ بن حبان: ٢٨٨؛ طبرانی فی الکبیر، ج٥، ص: ١٦٥ اور ابونعیم نے روایت کی ہے اور سیوطی نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے (شرح شفاء از شہاب خفاجی، ج٢، ص: ٣١ فصل حلم)۔

[3] جامع ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی الرخصة فی الشراء الی اجل: ١٢١٣۔

کے قانون کی سب سے پہلی دفعہ یہی ہے کہ ذات شاہانہ ہر مواخذہ سے بری اور ہر داروگیر سے برتر ہے، اس سے بھلا برا جو کچھ ہو، وہ قانون کی گرفت سے باہر ہے، لیکن اسلام کے قانون کی نظر میں امیر و مامور، حاکم ومحکوم اور رراعی ورعیت قانون کی داروگیر اور سزا اور مواخذہ میں بالکل یکساں ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ آنحضرت ﷺ معصوم تھے، جن کا ہر قول وفعل جائز حدود سے کبھی باہر نہیں ہوسکتا تھا، بلکہ تمام تر مستحسن ہی ہوتا تھا اور آپ کی خدمت اقدس میں ذراسی گستاخی بھی ایمان سے محروم کر کے واصل جہنم کرسکتی تھی، باایں ہمہ آپ کے ذاتی کاروبار اور حکومت کے معاملات کی نسبت سوال وجواب اور استفسار کی جرأت کو جائز رکھا جانا صرف اس لیے تھا کہ آپ ﷺ کا یہ اسوہ آیندہ امرائے اسلام کی تعلیم کے لیے عملی سبق ہو اور اس کے لیے غایت شفقت سے خود زحمت برداشت فرماتے تھے، تاکہ آیندہ آنے والے امرا اور حکام استفسار و اظہارِ رائے کے دروازے کو امت پر بند نہ کریں۔

عہد نبوت میں جو متمدن سلطنتیں تھی، ان میں ایران نے کبھی ذاتِ شاہانہ پر اس رودررو سوال و جواب استفسار اور اعتراض کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا، یونان اور روم میں کسی زمانے میں سنتے ہیں کہ جمہوری سلطنتیں قائم تھیں لیکن وہ جمہوری سلطنتیں درحقیقت امرا کی تھیں، ان کا تعلق عوام سے نہ تھا اور نہ ان کو امرا کے مقابلے میں یہ حقِ سوال و مواخذہ حاصل تھا اور نہ ان کے امرا و حکام میں اس تواضع، اس خاک ساری، اس عفو و حلم، اس انصاف اور اخلاق کی بلندی کا یہ منظر نظر آیا اور نہ آسکتا تھا، وہ اخلاصِ قلب و صداقت اور پاکیزگی اخلاق کے اس بلند نصب العین کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ وطن ان کا دیوتا تھا اور وہ اس کے پجاری تھے اور وہ اس دیوتا کے لیے سب کچھ کرسکتے تھے اور ان کا وطن چہار دیواری میں محدود تھا، جس کے باہر گویا انسان نہیں بستے تھے، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے امیر کی قانونی حیثیت کی یکسانی کی وہ نظیر پیش کی جس سے دنیا ہنوز ناآشنا تھی، اس حقیقت پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیجیے کہ یہ نفس امیر سے سوال و استفسار کی صورت نہیں ہے، بلکہ اس ذات اقدس ﷺ سے ہے، جس کی خاکِ عقیدت مسلمانوں کی چشمِ ادب کا سرمہ تھی اور جس کی حیثیت محض ایک امیر اور حاکم کی نہ تھی، بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر ایک معصوم رسول اور ایک پاک نبی کی تھی، صلوات اللہ تعالیٰ علیہ۔ اس کے بعد سلطنت و امارت اور حکومت کے کاروبار میں اہل رائے مسلمانوں سے مشورہ لینے کا معاملہ ہے، ظاہر ہے کہ حضور انور ﷺ کے باب میں مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی سے قطع نظر کر کے بھی آپ ﷺ عقل و دانش اور علم و فہم میں تمام لوگوں سے اعلیٰ اور برتر تھے اور ظاہر ہے کہ جو شخص عقل و فہم اور علم و دانش کے اس رتبہ پر ہو اس کو اپنے سے کم تر لوگوں سے معاملات میں مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی، لیکن آپ مشورہ کرتے تھے، ایک تو اس لیے کہ ان سے رائے لینے میں ان کا دل بڑھے اور دوسرے اس لیے کہ چونکہ آپ کا ہر فعل اسلام کی شریعت کا قانون بن جاتا ہے، اس لیے آپ ﷺ کا یہ فعل

یعنی مشورہ کرنا بعد کے آنے والے خلفا و امرا کے لیے مثال و نظیر کا کام دے، آپ ﷺ کو یہ حکم الٰہی ہوا کہ

﴿ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۹)

''اے رسول (ﷺ)! امور سلطنت و جنگ و صلح میں اپنے رفیقوں سے مشورہ لے لیا کیجئے۔''

چنانچہ حضور ﷺ نے اس پر بہ نفس نفیس عمل فرمایا اور مسلمانوں کو بھی عمل فرمانے کی ہدایت فرمائی، انہوں نے عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی اور ان کی خصوصیت ظاہر کی کہ

﴿ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ﴾ (۴۲/ الشوری:۳۸)

''ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے انجام پاتے ہیں۔''

اگرچہ عہد نبوت میں حکومت کے سارے اجزا وجود پذیر نہیں ہوئے تھے اور نہ چنداں ان کی ضرورت تھی، تاہم احادیث کے تتبع و استقرا سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حکومت سے متعلق، متعدد اہم امور کے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا اور ان کی رایوں پر عمل کیا اور اس کا منشا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عام مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے انتظامی امور میں باہم مشورہ کر لینا تاکہ مفید نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو، نہایت مناسب ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ حضورِ انور ﷺ کو اس کی چنداں حاجت نہ تھی۔

مدینہ پہنچ کر جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور نماز باجماعت ادا ہونے لگی تو پہلا مرحلہ یہ پیش آیا کہ تمام لوگوں کو کیونکر ایک مسجد میں جمع کیا جائے، اس کے متعلق ہنوز وحی بھی نہیں آئی تھی، اس لیے آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا، یہود و نصاریٰ کے یہاں ایسے موقع پر بوق و ناقوس بجایا جاتا تھا بعض لوگوں نے اسی کا مشورہ دیا، [1] بعض لوگوں نے نماز کا وقت ہونے پر علم بلند کرنے کی رائے دی، لیکن آپ ﷺ نے ان میں سے کسی رائے کو پسند نہیں فرمایا، آخر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رائے دی کہ ایک آدمی کو بھیج کر نماز کا اعلان کرایا جائے تو آپ ﷺ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا، انہوں نے الصَّلٰوةُ جَامِعَةٌ کہہ کر پکارا، اس کے بعد ایک دن آنحضرت ﷺ کو رؤیا میں اذان کی موجودہ صورت دکھائی گئی [2] اور فیضِ تاثیر سے بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا اور آکر آنحضرت ﷺ سے بیان کیا، چنانچہ آپ ﷺ نے اسی طریقہ کے مطابق حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دینے کا حکم دیا۔ [3]

بدر کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر یا میدان جنگ کے قریب پہنچ کر آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا

---

[1] بخاری، کتاب الاذان، باب بدء الاذان: ۶۰۴ نیز دیکھیں مشکوٰۃ، باب الاذان۔

[2] مصنف عبدالرزاق وطبقات ابن سعد وکتاب المراسیل لابی داود وفتح الباری ابن حجر وروض الانف سہیلی وزرقانی علی المواهب ونووی شرح مسلم باب بدء الاذان۔ نووی میں ہے: فشرعه النبی ﷺ، بعد ذلك اما بوحی واما باجتهادہ ﷺ علی مذهب الجمهور فی جواز الاجتهاد له ﷺ ولیس هو عملاً بمجرد المنام هذا مالا یشك فیه بلاخلاف۔ [3] ابوداود، کتاب الصلوة، باب کیف الاذان: ۴۹۹؛ ترمذی باب بدء الاذان: ۱۸۹۔

کہ دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں؟ باری باری سے ممتاز صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی، یہاں تک کہ ایک رئیس نے اٹھ کر کہا کہ یارسول اللہ! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں جو پیغمبر سے یہ کہہ دیں کہ تم اور تمہارا رب جا کر میدان جنگ میں دشمنوں سے لڑے ہم تو یہیں رہیں گے، اللہ کی قسم! اگر آپ ﷺ سمندر میں بھی جانے کو فرمائیں گے تو ہم چلے جائیں گے **1** اس کے بعد جب آپ ﷺ میدان جنگ کی طرف بڑھے تو ایک مقام پر جا کر پڑاؤ ڈالنا چاہا، ایک تجربہ کار صحابی نے آ کر عرض کی: یارسول اللہ! آپ حسب فرمان الٰہی اس مقام پر لشکر کا پڑاؤ ڈالنا چاہتے ہیں یا حضور کی یہ اپنی رائے ہے؟ ارشاد ہوا کہ ''یہ میری رائے ہے۔'' اس پر انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! ہم کو بدر کے ایسے مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہیے تاکہ پانی اپنے قبضہ میں رہے، آنحضرت ﷺ نے اس رائے کو پسند فرمایا وہیں جا کر قیام فرمایا۔ **2** آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جب بدر کے قیدی پیش کیے گئے تو آپ نے پھر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کون سا طرز عمل اختیار کیا جائے، لوگوں نے مختلف رائیں دیں، آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا۔ **3**

احد کے موقع پر آنحضرت ﷺ کا صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ چاہنا کہ ہم شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں یا شہر کے اندر رہ کر ان کا دفاع کریں، اس پر عبداللہ بن ابی بن سلول منافق مدینہ کا رائے دینا کہ شہر کی گلی کوچوں میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، پھر پرجوش جاں نثار صحابہ رضی اللہ عنہم کا عرض کرنا کہ حضور شہر سے باہر نکل کر ہم کو لڑنا چاہیے اور حضور ﷺ کا صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے کے مطابق شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا امورِ حکومت میں مشورہ کی بہترین مثال ہے۔

غزوۂ حنین میں جب قبیلہ ہوازن کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ہمارا جو مال غنیمت میں آپ کے پاس آیا ہے، واپس کر دیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''قیدی اور مال دونوں واپس نہیں مل سکتے، ان میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہوگا۔'' ان لوگوں نے قیدیوں کو انتخاب کیا اور آپ نے ان کی درخواست قبول کر لی، اگرچہ آنحضرت ﷺ کے حکم سے کسی کو سرتابی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی، پھر بھی آپ نے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ ''تمہارے یہ بھائی کفر سے تائب ہو کر آئے ہیں اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان کے قیدیوں کو واپس کر دوں، اب تم میں جس کے دل میں جو آئے وہ کرے، جس کو مجھ سے اتفاق ہو، وہ میری رائے پر عمل کرے اور جن لوگوں کو میری رائے سے اتفاق نہ ہو، وہ اس وقت قیدیوں کو آزاد کر دیں، جس وقت پہلا مال غنیمت آئے گا، ان کو اس کا معاوضہ دے دیا جائے گا۔'' تمام لوگ یک زبان ہو کر بول اٹھے کہ یارسول اللہ! ہم اس پر راضی ہیں۔ آپ ﷺ نے ان کے اس عاجلانہ اظہار

---

1 سیرت ابن ہشام، ج ١، ص: ٣٧٥۔ **2** سیرت ابن ہشام، ج ١، ص: ٣٧٨۔

3 ترمذی، ابواب التفسیر باب ومن سورۃ الانفال: ٣٠٨٤۔

رائے کو کافی نہیں سمجھا، فرمایا کہ ہر ہر شخص کی رائے معلوم ہونا ضروری ہے کہ کون راضی ہے کون راضی نہیں ہے؟ اس لیے ہر شخص کو اپنا ایک قائم مقام وعریف ہمارے پاس بھیجنا چاہیے، چنانچہ ان قائمقاموں نے تمام لوگوں سے گفتگو کر کے آپ ﷺ کو ان کی رضامندی کی اطلاع دی۔ [1]

احادیث کی کتابوں کا استقصا کیا جائے تو اور بھی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے عہدِ مبارک میں حکومت کے انتظامی امور میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیتے تھے اور ان کے مشوروں کو اگر پسند فرماتے تو ان پر عمل بھی فرماتے تھے۔

قیام سلطنت اور آئینِ سلطنت کے باب میں اسلام کا ایک فیض یہ بھی ہے کہ اس نے سلطنت کو بھی مذہب اور عبادت بنا دیا، اس شعبہ حیات کو جس میں تمام تر درندگی، بہیمیت، مکر وفریب، غل وسازش، ظلم وستم اور جور وتعدی شامل تھی اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سیاست کی راہ میں ہر گناہ ثواب ہے، اسلام کی تعلیم نے اتنا پاک وبلند کیا کہ وہ عرش کا سایہ بن گیا، احادیث میں متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ ((السلطان ظل اللّٰه فی الارض یأوی الیه کل مظلوم من عباداللّٰه)) [2] یعنی ''صالح حکومت زمین میں اللہ کے امن کا سایہ ہے، جس کے دامن میں بندگانِ الٰہی میں سے ہر مظلوم پناہ پاتا ہے''۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ

السلطان العادل المتواضع ظل اللّٰه ورمحه فی الارض. [3]

''عادل اور متواضع حاکم زمین میں اللہ کا سایہ اور اس کا نیزہ ہے۔ خود حضور ﷺ نے فرمایا:

''عادل امام کو قیامت کے دن اللہ کا سایہ نصیب ہوگا۔'' [4]

جو لوگ سلطنت کے کاموں کو اخلاق اور نیکی کے ساتھ انجام دیں، ان کو اپنے اس حسنِ عمل کا ثواب اسی طرح ملے گا، جس طرح دوسری عبادات کا، گویا حکومت کرنا بھی ایک عبادت ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ سلطنت بھی عبادت ہوگئی اور ہر قسم کی بددیانتی، خیانت، فریب، سازش،

---

[1] ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی فداء الاسیر بالمال:۲٦۹۳ وصحیح بخاری، کتاب المغازی:۴۳۱۸، ۴۳۱۹۔

[2] و [3] یہ حدیث اثر کے طور پر باختلاف لفظ بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ابن نجار میں اور بروایت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیہقی اور حاکم میں اور بروایت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ابن ابی شیبہ میں ہے، یہ حضور ﷺ تک مرفوع نہیں بظاہر ان حضرات صحابہ کے اقوال ہیں، تفصیل کے لیے دیکھئے المقاصد الحسنة سخاوی اور کشف الخفاء ومزیل الالباس اسماعیل عجلونی، ج۱، ص: ٤٥٦ مکتبه قدسی: ۱۳۵۱ھ لفظ سلطان۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قدیم عربی میں السلطان کے معنی بادشاہ کے نہیں، بلکہ طاقت وقوت کے ہیں، جو انگریزی لفظ پاور (Power) کے ہم معنی اور گورنمنٹ اور حکومت کے مترادف ہیں، اس لیے اس حدیث کے معنی یہ نہیں کہ بادشاہ زمین میں خدا کا سایہ ہے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ عادلانہ نظام حکومت مخلوقات الٰہی کے آرام وآسائش کے لیے گویا زمین میں رحمتِ الٰہی کا سایہ ہے، ہاں یہ صحیح ہے کہ عمالِ حکومت پر بھی اس مناسبت سے کہ وہ حکومت کے نمائندے ہیں سلطان کا اطلاق ہوتا ہے جیسے حدیث میں ہے ((اَلسُّلْطَانُ وَلِیُّ مَنْ لَّاوَلِیَّ لَهٗ)) یعنی ''جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی سلطان ہے۔'' یہاں سلطان سے مقصود سلطنت ہے، اس لیے اس کا ہر جائز نمائندہ جیسے قاضی اور حاکم اور والی سلطان کہلائے گا، بادشاہ کے معنی میں یہ لفظ غالباً چوتھی صدی میں سلطان محمود کے زمانے سے بولا جانے لگا ہے۔

[4] صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب فضل من ترك الفواحش:٦٨٠٦۔

تعدی وظلم کا اسلامی سیاست سے خاتمہ ہو گیا، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں رومیوں سے ایک مدتِ معینہ کے لیے صلح کر لی تھی، لیکن وہ اس مدت کے اندر اپنی فوج سرحد کے قریب لیے ہوئے اس تاک میں تھے کہ جیسے ہی مدت ختم ہو وہ رومیوں پر حملہ کر بیٹھیں، ایک نامی اور مشہور صحابی نے جو اس فوج میں شریک تھے فوراً ان کی اس حکمت عملی پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ ہمارے پیغمبر ﷺ نے اس کو بدعہدی قرار دیا ہے، جس سے مسلمانوں کو باز رہنا چاہیے، یہ سن کر انہوں نے اپنی فوج ہٹالی۔ [1]

ہر سلطنت کو ٹیکس، مال گزاری اور خراج کے وصول کرنے کے لیے ہمیشہ سختی سے کام لینا پڑتا تھا اور اگر حکام کی طرف سے ذرا سی سہل انگاری اور بے پروائی ظاہر ہو تو دفعتہً سلطنت کا خزانہ خالی ہو جاتا ہے، مجرم جب کسی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا تو اس کو حکام کی غضب آلود نگاہوں میں رحم کی ایک شعاع بھی نظر نہ آئے گی اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ہر قسم کے خدع وفریب، مکر وحیلہ اور دروغ بیانی سے کام لینا اپنا سب سے بڑا فرض خیال کرے گا، اس میں شخصی وجمہوری حکومتوں میں کوئی فرق نہیں ہے، بلکہ دونوں ہی قسم کی سلطنتوں میں یہ نتائج یکساں طور پر ظہور پذیر ہوں گے، یورپ آج ظاہری ونمائشی تمدن وتہذیب میں بہت ترقی کر گیا ہے۔ تمام ملک میں تعلیم عام ہوگئی ہے، ہر فرد رموز سیاست سے واقف ہو گیا ہے اور سلطنت پر جمہور کا حق مسلّم ہو گیا ہے، لیکن بایں ہمہ اگر سلطنت ذرا بھی سہل انگاری سے کام لے تو ایک فرد بھی محاصل سلطنت کو بخوشی ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ مجرموں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ جرم کے ارتکاب کے بعد کبھی روپوش ہو جاتے ہیں، کبھی جرم کے پاداش سے بچنے کے لیے ہزاروں، لاکھوں خرچ کر دیتے ہیں، باوجودیکہ یورپ میں بہ نسبت اور جگہوں کے مجرموں کی حالت نہایت بہتر ہے اور سزا محض اخلاقی اصلاح کے لیے دی جاتی ہے، لیکن بایں ہمہ کوئی یورپین اپنے جرائم کا صداقت سے اعتراف نہیں کرتا، بلکہ اس کی دروغ بیانی میں ندامت اور شرمندگی کی جگہ جرأت ودلیری کا عنصر غالب ہوتا ہے اور اس کو جمہوریت اور حریت کی ایک برکت خیال کیا جاتا ہے، لیکن جب کسی سلطنت کا نظام اخلاقی اصول پر قائم ہوتا ہے تو اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، ہر فرد سلطنت کے تمام احکام کو مذہبی پابندیوں کی طرح موجب عذاب وثواب سمجھتا ہے، اس لیے ان پر بلا جبر واکراہ عمل کرتا ہے اور یہ نتیجہ صرف اخلاق اور روحانیت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے، اسلام کا نظام سلطنت اسی اخلاقی اصول پر قائم تھا اور اس کا ویسا ہی نتیجہ ظاہر بھی ہوتا تھا، صدقہ وزکوٰۃ عرب کے لیے ایک بالکل جدید چیز اور افلاس وغربت کی وجہ سے ان کا ادا کرنا ان کے لیے مشکل تھا، چنانچہ کعب بن اشرف کے قتل میں محمد بن مسلمہ نے اسلام کی جن مشکل باتوں کی بظاہر شکایت کی تھی، ان میں ایک صدقہ وزکوٰۃ کی گراں باری بھی تھی، صدقہ اور زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لیے اگرچہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک ہی میں عمال

---

[1] سنن ابی داود، کتاب الجهاد، باب فی الامام یکون بینه وبین العدو عهد: ۲۷۵۹۔

مقرر کر دیے گئے تھے، تاہم اس کا کوئی باقاعدہ دفتر وسررشتہ اور نظام قائم نہیں ہوا تھا، ایسی حالت میں اگر عرب میں کوئی دنیوی سلطنت جمہوری اصول پر بھی قائم کر دی جاتی تو اس کو صدقہ وزکوٰۃ کے وصول کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتیں، لیکن یہ اسلام کے نظام سلطنت کا اخلاقی اثر تھا کہ ہر فرد اور ہر قبیلہ خود اپنا صدقہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لا کر پیش کرتا تھا اور اس کے صلہ میں آنحضرت ﷺ کی برکت آمیز دعاؤں کی دولت لے کر واپس جاتا تھا، صحیح بخاری میں عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے روایت ہے:

کان رسول اللہ ﷺ اذا اتاہ قوم بصدقتھم قال: ((اللّٰھم صلّ علٰی ال فلان)) فاتاہ ابی بصدقتہ فقال: ((اللّٰھم صلّ علٰی ال ابی اوفٰی)) [1]

''آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں جب کوئی قوم اپنا صدقہ لے کر حاضر ہوتی تھی تو آپ ﷺ فرماتے تھے کہ خداوندا! فلاں کی آل پر رحمت نازل فرما، چنانچہ میرے باپ بھی صدقہ لے کر آئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ خداوندا! ابواوفیٰ کی آل پر رحمت بھیج۔''

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ قبیلہ طے کے سردار تھے اور ان کو تمام قوم کی طرف سے مرباع یعنی چوتھا حصہ ملتا تھا، جو عرب میں اسلام سے پہلے سردارانِ قریش کا خاص حق خیال کیا جاتا تھا، لیکن جب وہ اسلام لائے تو سب سے پہلے انہی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اپنے قبیلے کا صدقہ پیش کیا، صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک بار وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

ان اول صدقۃ بیّضت وجہ رسول اللہ ﷺ و وجوہ اصحابہ صدقۃ طی جئت بھا الی رسول اللہ ﷺ . [2]

''پہلا صدقہ جس کی مسرت سے آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا چہرہ چمک اٹھا، قبیلہ طے کا صدقہ تھا جس کو تم لے کر آئے تھے۔''

قبیلہ بنوتمیم جب اپنا صدقہ لے کر آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((صدقات قومنا)) [3]

''یہ ہماری قوم کا صدقہ ہے۔''

اشخاص کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے صدقہ کا حکم دیا تو ہم لوگ بازاروں میں جا کر بوجھ ڈھوتے تھے اور اس سے جو

[1] صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب صلوۃ الامام ودعاءہ لصاحب الصدقۃ: ١٤٩٧۔
[2] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب فضائل غفار واسلم.....: ٦٤٤٩۔
[3] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فضائل غفار و اسلم.....: ٦٤٥١۔

مزدوری ملتی تھی اس کو لاکر صدقہ میں دیتے تھے۔ [1]

جرائم کی یہ صورت تھی کہ گو وہ مٹ تو نہیں گئے تھے، لیکن اس درجہ کم ہو گئے تھے کہ گویا نہ ہونے کے برابر تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جو لوگ اتفاق سے ان کے مرتکب ہوتے تھے تو جرم کا نشہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ان کے دل نورِ ایمان سے چمک اٹھتے تھے اور اس داغ کو دھونے کے لیے بیتاب ہو جاتے تھے، چنانچہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے بارگاہِ نبوت میں آ کر جس صداقت کے ساتھ اپنے جرائم کا اعتراف کیا ہے اس کی مثال دنیا کی مذہبی تاریخ میں ڈھونڈنا بے سود ہے۔ اسلام میں جرائم کی سزائیں جو نہایت سخت مقرر کی گئی ہیں، مثلاً: چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں، زنا کی سزا میں کوڑے لگائے جاتے ہیں یا سنگسار کیا جاتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور یہی حکمت لوگوں میں اعترافِ جرم کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور مجرم خود حاضر ہوتے تھے اپنے جرموں کا ازخود اعتراف کرتے تھے اور سزا جاری کرنے کی درخواست کرتے تھے۔

ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ ایک صاحب تھے، انہوں نے ایک لونڈی کے ساتھ زنا کیا، جب انہیں ہوش آیا تو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر ازخود اس جرم کا اظہار کیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجئے [2] یا رسول اللہ! مجھ پر حد جاری فرمائی جائے، آپ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا، انہوں نے دوبارہ کہا کہ میں نے زنا کیا ہے مجھ پر حد جاری فرمایئے، اسی طرح وہ بار بار اعترافِ جرم کرتے تھے اور آپ اعراض فرماتے رہے، چوتھی بار آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کیا تم اس کے ساتھ ہم بستر ہوئے؟'' انہوں نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کیا تم نے اس کے ساتھ مباشرت کی؟'' انہوں نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم نے اس کے ساتھ جماع کیا؟'' انہوں نے کہا: ہاں۔ ان تمام مراتب کے بعد آپ نے ان کے سنگسار کرنے کا حکم دیا، جب ان پر پتھر برسنے لگے تو انھوں نے بھاگنا شروع کیا۔ بالآخر ایک صحابی نے بڑھ کر اونٹ کے پاؤں کی ہڈی اٹھا کر ماری اور وہ وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان کو چھوڑ کیوں نہ دیا۔ شاید وہ توبہ کرتے اور اللہ ان کی توبہ کو قبول کر لیتا۔'' [3]

اس واقعہ سے قانونِ سزا میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ ہوا کہ اگر کوئی مجرم اپنے جرم کی خود ذاتی اعتراف کی بنا پر سزا پا رہا ہو اور وہ اثنائے سزا میں بھاگ نکلنا چاہتا ہو تو اس کے فرار کو اقرار سے رجوع سمجھ کر اس کی باقی سزا معاف کر دی جائے گی اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہو جائے گا۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الزکوٰة، باب اتقوا النار ولو بشق تمرة: ١٤١٥، ١٤١٦ وکتاب الاجارة، باب من اجر نفسه ...: ٢٢٧٣۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسه بالزنی: ٤٤٣١۔

[3] ابو داود، کتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالك: ٤٤١٩ وصحیح بخاری، کتاب الحدود، باب الرجم بالمصلی: ٦٨٢٠۔

ایک اور نوجوان کا ذکر ہے جو شدید بیماری کی حالت میں اس گناہ میں مبتلا ہوئے اور کسی نے ان کو نہیں دیکھا، لیکن انہوں نے ازخود اپنے تیمارداروں سے اس کا اقرار کیا اور ان سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے جا کر میری طرف سے عرض کرو اور فتویٰ پوچھو، چنانچہ حضور ﷺ سے عرض کیا گیا، حضور ﷺ نے ان کی شدتِ علالت کے سبب سے ایک معمولی سزا تجویز کی۔ ❶

کعب بن عمرو ایک اور صاحب کا واقعہ ہے جنھوں نے آ کر یہ اقرار کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! میں نے ایک بیگانہ عورت سے اوپر سے لطف اندوزی کی ہے، گو ہم بستر نہیں ہوا، تو یہ گناہگار موجود ہے، اس پر اللہ کا حکم جاری فرمائیے۔ ❷

غزوۂ حنین کے بعد ان اطراف میں اسلام کے اقتدار کا آغاز تھا کہ ایک حبشی نے جس کا نام محلم تھا، قبیلہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر دیا، دونوں کے حامی اور طرف دار رئیس خدمت اقدس میں آئے اور فیصلہ چاہا، آنحضرت ﷺ نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق خون کا معاوضہ ادا کر دینا چاہا، مگر ایک فریق کی طرف سے قصاص پر اصرار اور دوسرے کی طرف سے انکار اس جوش سے ہوا کہ دونوں کی آوازیں بلند ہوگئیں، ایک نے اٹھ کر کہا: یارسول اللہ! ابھی اسلام کے اقتدار کا آغاز ہے، ابھی ایسی نرمی نہ کی جائے کہ بھیڑ پہلے ہی بدک جائے، لیکن حضور ﷺ نے دیت ہی پر زور دیا یہ دیکھ کر قاتل نے آگے بڑھ کر خود اپنے کو پیش کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! مجھ سے یہ گناہ ہوا ہے میری مغفرت کے لیے دعا فرمائیے۔ ❸

یہ واقعات ایک دنیوی سلطنت اور ایک اخلاقی سلطنت میں نمایاں حدِ فاصل قائم کر دیتے ہیں، دنیوی سلطنت میں مجرم اس لیے جرم سے انکار کرتے ہیں کہ ان کو سزا سے نجات مل جائے گی، لیکن ماعز رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس بنا پر جرم کا اعتراف کیا کہ دنیاوی سزا کے اجرا سے وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں گے اور آنحضرت ﷺ کی دعا و استغفار سے ان کے گناہ معاف ہو جائیں گے، دنیوی سلطنت میں جلاد اس بنا پر سزا دیتا ہے کہ وہ اس خدمت پر مامور ہے، لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم نے ماعز پر اس لیے پتھر برسائے کہ انہوں نے حکم الٰہی کی بے محابا تنفیذ کی توفیق پائی، دنیوی سلطنت میں مجرم کا بھاگ نکلنے کی کوشش کرنا ایک دوسرا جرم ہے، لیکن اسلام کے نظامِ سلطنت میں وہ توبہ کا ذریعہ ہے۔

اخلاقی اور دنیوی سلطنتوں کے طرز عمل میں اس موقع پر نمایاں امتیاز قائم ہو جاتا ہے، جہاں کوئی مجرم خود سلطنت کو صدمہ پہنچانے کے لیے کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے، ایک رحم دل دنیوی سلطنت خراج کو معاف کر سکتی ہے، بڑے بڑے جرائم درگزر کر سکتی ہے، رعایا کے ساتھ نہایت رفق و ملاطفت کا برتاؤ کر سکتی ہے، لیکن وہ کسی بدخواہِ سلطنت کے معمولی سے معمولی جرم سے اغماض نہیں برت سکتی، عہد نبوت میں بعض مسلمانوں نے بعض

❶ ابوداود، کتاب الحدود، باب فی اقامة الحد علی المریض: ٤٤٧٢۔

❷ ایضًا، باب فی یصیب الرجل ما دون الجماع: ٤٤٦٨ وصحیح بخاری، کتاب الحدود: ٦٨٢٣۔

❸ ابوداود، کتاب الدیات، باب الامام یأمر بالعفو فی الدم: ٤٥٠٣۔

ایسے کام کیے جن سے بظاہر جنگی وسیاسی امور کو نقصان پہنچ سکتا تھا، مگر چونکہ ان کی نیت صاف تھی اور ان کے دل پاک تھے، اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کے اس جرم سے صرف اس بنا پر چشم پوشی فرمائی کہ انہوں نے اس سے پہلے اسلام کی ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی تھی جس سے ان کے ایمان کی سچائی پوری ظاہر ہو چکی تھی، حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے، انہوں نے کفار قریش کے پاس ایک خط لکھا جس میں ان کو مسلمانوں کے مخفی حالات کی خبر دی تھی، یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ اس نے اللہ، اللہ کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آنحضرت ﷺ نے حاطب سے پوچھا کہ ''تم نے ایسا کیوں کیا؟'' حاطب نے کہا اللہ کی قسم! میرے ایمان میں کوئی خلل نہیں آیا ہے، خط لکھنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں اپنی آل و اولاد کو چھوڑ کر جو مہاجرین چلے آئے ہیں، ان کا خاندان وہاں موجود ہے اور وہ ان کی حفاظت کرتا ہے، لیکن میرے بال بچوں کا وہاں کوئی سہارا نہ تھا، اس لیے میں نے چاہا کہ کفار پر ایک احسان کر دوں جس کے بدلے میں میرے بال بچوں کی حفاظت ہو جائے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''سچ کہتے ہیں، ان کی نسبت صرف اچھے کلمات استعمال کرو، بدگمانی کو راہ نہ دو۔'' لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر کہا کہ اس نے اللہ اور اللہ کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجیے کہ اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا وہ اہل بدر سے نہیں ہیں، کوئی بات تو ہے جس کی بنا پر اللہ نے اہل بدر کے متعلق یہ فرمایا ہے:

((اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ وَجَبَتْ لَكُمُ الْجَنَّةُ))

''جو چاہو کرو، کیونکہ جنت تمہاری قسمت میں لکھی جا چکی ہے۔''

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور کہا کہ اللہ کے رسول کو سب سے زیادہ علم ہے۔ [1]

آنحضرت ﷺ نے حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں جو طرز عمل اختیار فرمایا وہ شرکتِ بدر کی فضیلت پر مبنی تو تھا ہی، اس کے ساتھ ایک ایسے اصول پر بھی مبنی تھا جس کو دنیوی اور اخلاقی سلطنتوں کے درمیان ایک حد فاصل قرار دیا جا سکتا ہے۔ سیاست کا ایک لازمی جزو بدگمانی ہے اور اسی بنا پر وہ بادشاہ سب سے زیادہ مدبر اور دور اندیش خیال کیا جاتا ہے جو سلطنت کے راز کو اپنے عزیز و اقارب تک سے چھپائے، لیکن یہ اصول صرف دنیوی سلطنتوں کا ہے اور اسی وجہ سے ان سلطنتوں میں حاکم و محکوم میں اتحاد اور خلوص نہیں پیدا ہوتا، لیکن اخلاقی اور مذہبی سلطنتوں میں تمام تر دار و مدار اخلاص باللہ، باہمی خلوص اور اعتماد پر ہے اور اسی خلوصِ اعتماد کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے حاطب بن بلتعہ کے جرم سے چشم پوشی کی، آنحضرت ﷺ نے اس اصول کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب فضل من شهد بدرا، ۳۹۸۳۔

((حسن الظن من حسن العبادة)) [1]

''حسن ظن ایک قسم کی عبادت ہے۔''

قرآن مجید نے اس کو اور واضح کر دیا ہے:

﴿ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ﴾ (۴۹/ الحجرات:۱۲)

''بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔''

آنحضرت ﷺ نے سیاسی اصول کے طور پر اس کی تعلیم دی ہے:

((انّ الامیر اذا ابتغی الریبة فی الناس افسدهم)) [2]

''جو امیر لوگوں کے ساتھ بدگمانی کی جستجو کرے گا وہ ان کو برباد کر دے گا۔''

اور عمالِ سلطنت کو اس اصول پر عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے:

عن معاویة قال سمعت رسول اللّٰه ﷺ یقول: ((انك ان اتبعت عورات الناس افسدتهم أو كدت ان تفسدهم)) [3]

''حضرت معاویہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اگر تم لوگوں کے جرائم کی ٹوہ میں رہے تو تم نے یا تو ان کو برباد کر دیا ہے یا عنقریب برباد کر دو گے۔''

چنانچہ جب تک حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور قائم رہا، تمام معاملات میں اسی اصول پر عمل ہوتا رہا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک شرابی پیش کیا گیا اور اس کی نسبت کہا گیا کہ اس کی ڈاڑھی سے شراب ٹپکتی ہے، لیکن چونکہ انہوں نے خود اس کو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، اس لیے فرمایا کہ ہم کو ٹوہ لگانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ البتہ جو جرم علانیہ ہوتا ہے اس پر ہم مواخذہ کرتے ہیں۔ [4]

دُخین حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ صحابی کے منشی تھے، انہوں نے ان سے شکایت کی کہ ہمارے ہمسائے شراب پیتے ہیں، میں نے ان کو منع کیا، وہ لوگ باز نہیں آئے، اب ان کے لیے پولیس کو بلاتا ہوں، حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''درگزر کرو'' دخین نے دوبارہ کہا کہ اب وہ لوگ ترکِ شراب سے انکار کرتے ہیں، میں پولیس کو بلاتا ہوں، حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے پھر فرمایا کہ ''درگزر کرو'' کیونکہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ

((من رای عورة فسترها كان كمن احیٰی موء ودة)) [5]

''جس نے کسی برائی کو دیکھ کر چھپا لیا اس کا درجہ اس شخص کے برابر ہے، جس نے ان لڑکیوں کو موت سے بچا لیا، جو زندہ درگور کر دی جاتی ہیں۔''

---

[1] ابوداود، کتاب الادب، باب فی حسن الظن:۴۹۹۳۔ [2] ابوداود، کتاب الادب، باب فی التجسس: ۴۸۸۹۔ [3] ابوداود، کتاب الادب، باب فی التجسس:۴۸۸۸۔ [4] یہ تمام حدیثیں ابوداود، کتاب الادب، باب فی التجسس: ۴۸۹۰۔ [5] ابوداود، کتاب الادب، باب فی الستر علی المسلم: ۴۸۹۱۔

اخلاقی حیثیت سے اس اصول کی خوبی میں کسی شخص کو کلام نہیں ہوسکتا، لیکن ہم کو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ سیاسی حیثیت سے سلطنت پر اس اصول کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ ابن خلدون نے اس پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ تلوار کی دھار کا تیز کرنا سلطنت کے لیے مضر ہے اور اس کو اکثر برباد کر دیتا ہے، اس مضمون میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تمام تر اسی سیاسی اصول کی شرح ہے جس کا اشارہ قول نبوی میں ملتا ہے، اس لیے ہم اس موقع پر اس اصول کی سیاسی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے اس مضمون کا خلاصہ نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''جاننا چاہیے کہ رعایا کی مصلحت کا تعلق سلطان کی ذات، جسم، حسن، ڈیل ڈول، وسعتِ علم، حسنِ خط اور ذہانت کے ساتھ نہیں ہوتا، ان کی مصلحت کا تعلق صرف سلطان کی ذات کے ساتھ ہوتا ہے، اس لیے ملک اور سلطنت ایک اضافی چیز ہے دو شخصوں کے درمیان ایک قسم کا تعلق ہے، سلطان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ رعایا کا سردار اور ان کا سرپرست اور نگران ہے، اس لیے سلطان وہ ہے جس کے پاس رعایا ہو اور رعایا وہ ہے جس کا کوئی سلطان ہے اس نسبت سے جو صفت مستنبط ہوتی ہے، اسی کا نام بادشاہی ہے، پس جب یہ صفت اور اس کے لوازم ٹھیک ہوتے ہیں تو سلطان کا مقصد کامل طور پر حاصل ہوتا ہے اگر وہ عمدہ ہے تو وہی رعایا کی عین مصلحت ہے اگر وہ بری اور ظالمانہ ہے تو وہ ان کے لیے مضر ہے اور ان کی ہلاکت کا سبب ہے، سلطان کی خوبیوں کا تمام تر دارومدار نرمی پر ہے، کیونکہ سلطان اگر ظالم ہو، سخت گیر ہو، لوگوں کے معائب کی کرید کرے، ان کے جرائم کو ایک ایک کر کے گنے تو رعایا پر خوف و ذلت طاری ہو جاتی ہے اور لوگ ان سے بچنے کے لیے جھوٹ اور مکر وفریب کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہی چیزیں ان کا اخلاق بن جاتی ہیں اور پھر ان کا ضمیر اور نظام اخلاق برباد ہو جاتا ہے، وہ جنگ کے موقعوں پر اس سے پہلو تہی کرتے ہیں اور بسا اوقات ان کے قتل پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس سے خود سلطنت برباد ہو جاتی ہے اور اگر اس قسم کے ظالم سلاطین کی حکومت قائم رہ جائے تو جذبہ محبت بالکل مٹ جاتا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا لیکن اگر سلطان رعایا کے ساتھ نرمی کرے، ان کے گناہوں سے درگزر کرے تو وہ اس کے پہلو میں سو جاتے ہیں اور اس کے دشمنوں کے مقابل میں جان دے دیتے ہیں، پھر ہر پہلو سے سلطنت کا نظام ٹھیک ہو جاتا ہے، سلطنت کی خوبیوں کی اصل حقیقت یہی ہے، لیکن اس کے لوازم وتوابع میں چند چیزیں اور بھی ہیں، مثلاً: ان پر احسان کرنا اور ان کی معاش کا خیال رکھنا کہ یہ بھی ایک قسم کی نرمی ہے اور رعایا کی محبت حاصل کرنے کا سب سے بڑا اصول یہ ہے، جاننا چاہیے کہ یہ لوگ بیدار مغز اور تیز فہم ہوتے ہیں، ان میں نرمی بہت کم پائی جاتی ہے، نرمی اکثر سیدھے سادھے اور بھولے بھالے لوگوں میں پائی جاتی ہے، بیدار مغز لوگوں کی نگاہ چونکہ دور رس ہوتی ہے اور وہ ابتدا ہی سے انجام کار کو پیش نظر رکھتے ہیں، اس لیے لوگوں کو تکلیف مالا یطاق دیتے ہیں

جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تباہ ہو جاتے ہیں، اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ کمزور لوگوں کی روش اختیار کرو اور حاکم کے لیے یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ بہت چالاک نہ ہو، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب زیاد بن سفیان کو معزول کیا تو انہوں نے کہا: کیا میں اس منصب کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ یا میں نے کوئی خیانت کی ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہ کچھ نہیں، میں نے تم کو صرف اسی بنا پر معزول کیا ہے کہ میں رعایا پر تمہاری عقل کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔" 1

ابن خلدون نے ان خطروں میں جو آئین جہاں بانی پیش کیا ہے، اس پر اگرچہ دنیوی سلطنتوں میں بھی عمل کیا جا سکتا ہے، لیکن اس طرز عمل کا جو دوسرا پہلو ہے یعنی یہ کہ اس نرمی کے برتاؤ سے رعایا میں خیرہ سری، جرائم سے بے پروائی اور احکام سلطنت کے عدم تعمیل کا خیال نہ پیدا ہو جائے اور ضعیف حکمرانوں کی نرمی سے یہ باتیں سلطنتوں میں پیدا ہوتی ہیں، مگر اسلام نے جس تخیل پر سلطنت کی بنیاد رکھی ہے، وہ سراسر مذہبی ہے، اس میں امیر کے احکام کی اطاعت اللہ کی خوشنودی کا باعث اور اس کا انکار آخرت کا گناہ بتایا گیا ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو قانونِ شریعت کے اس پہلو یعنی نرمی سے کام لیا جائے۔ جس سے لوگوں میں امن واطمینان پیدا ہو، جرائم کی تحقیق میں شہادت کا اصول اونچا ہو۔ عدل میں صداقت کی خلاف ورزی نہ ہو، امیر وغریب اور اونچ اور نیچ قانون کی نظر میں برابر ہوں، مجرموں کو اس وقت تک سزا نہ دی جائے جب تک شہادت اپنے پورے شرائط کے ساتھ ثابت نہ ہو جائے، اثبات جرم میں شکوک وشبہات کے موقع پر مجرم سے حدود کو ساقط کیا جائے اور قساوت اور سنگدلی کی ان تمام سزاؤں کو جو ظالم و جابر بادشاہوں نے جاری کر رکھی تھیں، ان کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے، چنانچہ فرمایا:

((ان اللّٰہ یعذب الذین یعذبون فی الدنیا)) 2

"بے شبہ اللہ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔"

صحابہ کے آخر دور میں جب خلافت نے سلطنت کی صورت اختیار کر لی اور ظلم وستم کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوئیں تو جن بزرگوں نے آنحضرت ﷺ کا فیضِ صحبت اٹھایا تھا، انہوں نے اسی حدیث کے ذریعہ سے عمال کی دست درازیوں کو روکنا چاہا ایک بار حضرت ہشام بن حکیم بن حزام کا گزر شام میں ہوا تو دیکھا کہ چند نبطی دھوپ میں کھڑے کیے گئے تھے، انہوں نے اس کی وجہ پوچھی، لوگوں نے کہا کہ جزیہ کے بارے میں ان کو یہ سزا دی گئی ہے، انہوں نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ "اللہ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔" دنیوی حکمران لطف ومحبت کا برتاؤ زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے ساتھ کر سکتے ہیں، غیر قوموں کے ساتھ مہذب سے مہذب سلطنت کا برتاؤ بھی کچھ نہ کچھ

1 مقدمہ ابن خلدون فصل فی ان ارھاف الحد مضر بالملك، ص: ۱۵۷، ۱۵۸۔

2 مسلم، کتاب البر والصلة، باب الوعید الشدید لمن عذب الناس بغیر حق: ٦٦٥٧ تا ٦٦٦٠۔

ظالمانہ ہوتا ہے، لیکن ہشام بن حکیم بن حزام نے اس حدیث کو اس موقع پر بیان کیا جب کہ غیر قوموں کے آدمیوں پر ظلم کیا جارہا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا نظام سلطنت کسی خارجی اثر سے اس اصول پر قائم نہیں ہوا تھا، بلکہ لطف و محبت اس کا خمیر تھا اور اس لیے یہ ابر کرم ہر قوم کے سر پر سایہ افگن تھا، معاملاتِ حکومت میں خود آپ ﷺ کا طرز عمل اس قدر فیاضانہ اور آسان تھا کہ لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں جرائم کا اعتراف اس بنا پر کرتے تھے کہ آپ اس میں کوئی تخفیف یا آسانی پیدا کردیں گے، مسلمان تو مسلمان غیر قوموں کو بھی آنحضرت ﷺ کے اس فیاضانہ طرزِ عمل کا اعتراف تھا، چنانچہ یہودیوں میں دو مرد دو عورت نے زنا کیا تو تمام یہودیوں نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ان کو لے چلنا چاہیے کیونکہ وہی ایک ایسے پیغمبر ہیں جو تخفیف کو لے کر مبعوث ہوئے ہیں، [1] یعنی سزا میں نرمی برت سکتے ہیں۔

ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں سزا کا مستحق ہوں، مجھ پر حد جاری فرمائیے، آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا وضو کر کے چلے تھے؟'' اس نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا ''کیا ہمارے ساتھ نماز پڑھی تھی؟'' اس نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جاؤ اللہ نے معاف کردیا۔'' [2] لوگوں کے حوائج اور ضروریات کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ ایک لونڈی بھی جہاں چاہتی آپ ﷺ کو اپنے کام کے لیے ہاتھ پکڑ کر لے جاتی، ایک مخبوط الحواس عورت آئی اور کہا کہ مجھے آپ سے ایک ضرورت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اپنے کام کے لیے مدینہ کی جس گلی میں لے چلو میں چلنے کو تیار ہوں۔'' چنانچہ آپ ﷺ اس کے ساتھ گئے اور اس کے کام کو انجام دے دیا۔ [3] عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ جو مذہباً نصرانی اور طے کے رئیس تھے اور رومی درباروں میں رہ چکے تھے، جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو ان کو شک تھا کہ آیا حضور ﷺ بادشاہ ہیں یا نبی ہیں، لیکن جب ان کی نگاہ کے سامنے سے یہ منظر گزرا تو کہہ اٹھے کہ حضور ﷺ بادشاہ نہیں کیونکہ یہ حسن خلق تو نبی ہی میں پایا جاسکتا ہے اور اس کے بعد فوراً آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لے آئے۔

متعدد واقعات اوپر ایسے گزر چکے ہیں کہ دیہات کے اعرابی آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں آتے تھے اور نہایت بے تکلفی بلکہ بے باکی کے ساتھ سوال و جواب کرتے تھے حضور ﷺ ان کے ساتھ رفق و ملاطفت کا برتاؤ کرتے تھے، ایک بدو نے ایک دفعہ آپ ﷺ کی چادر پکڑ کر کھینچی تو آپ اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے اور اس کو عطیہ دیا، [4] بعض لوگوں سے اس قسم کے گناہ ہو جاتے تھے جن کے لیے ان کو مالی کفارہ

---

[1] ابوداود، کتاب الحدود، باب فی رجم الیهودیین: ٤٤٥٠۔ [2] ابوداود، کتاب الحدود، باب فی الرجل یعترف بحد ولا یسمیه: ٤٣٨١ جو قصور ان سے ہوا تھا وہ حد کے قابل نہیں تھا، اس لیے بحکم ان الحسنات یذهبن السیئات اس قصور کی معافی کی خوش خبری دی گئی۔ [3] مسلم، کتاب الفضائل، باب فی قربه ﷺ من الناس: ٦٠٤٤۔

[4] بخاری، کتاب الادب، باب التبسم والضحك: ٦٠٨٨۔

ادا کرنا ضروری ہوتا تھا، لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنے افلاس اور تنگدستی کے سبب خود کوئی مالی کفارہ ادا نہیں کر سکتے تھے تو آنحضرت ﷺ بیت المال سے ادا فرما دیتے تھے ایک صحابی نے اس ڈر سے کہ روزوں میں ان سے کوئی بے عنوانی نہ ہو جائے۔ اس سے بچنے کی یہ تدبیر کی کہ انہوں نے اپنی بیوی سے رمضان میں ظہار کر لیا، ❶ لیکن آخر ایک ❷ رات کو بے قابو ہو کر بیوی سے مباشرت کر لی، صبح کو گھبرا کر انہوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے چلو، سب نے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو خود تنہا آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر جرم کا اعتراف کیا، آپ ﷺ نے دو بار فرمایا: ''کیا تم نے ایسا کیا؟'' انہوں نے دونوں دفعہ جواب میں عرض کی: ہاں، ہاں، یارسول اللہ! مجھ ہی سے یہ حرکت ہوئی اور اب اللہ کا جو حکم ہو اس کو صبر کے ساتھ انگیز کرنے کو تیار ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو کہا ہے آپ حکم فرمائیں، فرمایا: ''ایک غلام آزاد کر دو۔'' انہوں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار کر کہا کہ یارسول اللہ! اس گردن کے سوا تو میرے قبضہ میں کوئی غلام نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مستقل دو مہینے کے روزے رکھو۔'' عرض کی: یارسول اللہ! جو پیش آیا وہ تو روزے ہی کا نتیجہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو پھر ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق کھجور دو۔'' عرض کی: یارسول اللہ! ہم نے تو خود رات فاقہ سے بسر کی ہے، آپ ﷺ نے ان کی یہ بات سن کر ارشاد فرمایا کہ ''صدقہ بنو زریق کے عامل کے پاس جاؤ، وہ تم کو اس قدر کھجوریں دے دے گا اس میں سے ساٹھ فقیروں کو بھی کھلاؤ اور جو بچ رہے وہ اپنے بچوں کو کھلاؤ۔'' وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے تمہارے یہاں تنگی و بدتدبیری اور رسول اللہ ﷺ کے یہاں وسعت اور مشورہ نیک پایا۔ ❸

مسلمانوں کی طرف سے اخلاص و عقیدت اور حضور اکرم ﷺ کی طرف سے شفقت اور لطف و کرم کے اس دوگونہ جذبے نے رعایا میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ اس قدر شیفتگی پیدا کر دی تھی جس کی جھلک سلاطین دنیوی کے تاج ہائے مرصع اور ان کے لباسہائے فاخرہ میں نظر نہیں آ سکتی، عرب کے بدوؤں کی مطلق العنانی، خودسری اور سرکشی کی جو داستانیں عام طور پر بیان کی جاتی ہیں اور جن کی بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی وجہ سے نہ عرب میں کوئی نظام سلطنت کبھی قائم ہوا ہے اور نہ ہو سکتا تھا، لیکن جب اسلام کا نظام سلطنت قائم ہوا اور اسلامی احکام نافذ کیے گئے تو ان ہی خودسر، سرکش اور مطلق العنان بدوؤں نے ان احکام کو کس سادگی اور جوش عقیدت کے ساتھ قبول کر لیا، اس کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو عہدِ نبوت میں پیش آئے، ایک دفعہ ایک بدو نجد سے چل کر مدینہ آیا، سفر سے پریشان، بال الجھے ہوئے اور اسی حالت میں خدمتِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوا اور شریعت کے احکام پوچھے، فرمایا: ''دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں۔'' عرض کی: کچھ اور

❶ ظہار کے معنی یہ ہیں کہ بیوی کو محرماتِ شرعی سے تشبیہ دے دی جائے، جیسے کوئی یہ کہے آج سے تو میری ماں کے برابر ہے اس صورت میں کفارہ لازم آتا ہے۔ ❷ اس زمانہ میں رمضان میں رات کو مباشرت کی اجازت کا حکم نامہ نازل نہیں ہوا تھا۔

❸ ابوداود، کتاب الطلاق، باب الظہار: ۲۲۱۳۔

نمازیں بھی؟ فرمایا: ''نہیں، لیکن یہ کہ نفل پڑھو۔'' پھر فرمایا: ''اور رمضان کے روزے'' سوال کیا کہ کچھ اور روزے بھی؟ فرمایا: ''نہیں، لیکن یہ کہ نفل رکھو'' پھر زکوۃ کو ذکر فرمایا، اس نے پھر پوچھا کہ اس کے سوا بھی کچھ صدقہ؟ فرمایا: ''نہیں، مگر یہ کہ تم خود اپنی مرضی سے دو'' اتنا سوال و جواب کر کے یہ کہتا ہوا چلا کہ اللہ کی قسم! میں ان میں کمی وبیشی نہ کروں گا، یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا: ''یہ شخص کامیاب ہو گیا اگر سچا نکلا۔'' ❶

ایک اور واقعہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم مجلس میں حاضر تھے کہ ایک بدو نے آ کر کہا: آپ کا قاصد ہمارے پاس آیا اور اس نے ہم سے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور آپ ﷺ کو اللہ نے بھیجا ہے، ارشاد ہوا: ''اس نے سچ کہا'' اس نے کہا: آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے'' اس نے کہا: زمین اور پہاڑ کس نے بنائے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے'' اس نے پھر کہا: ان میں ہمارے فائدے کی چیزیں کس نے بنائی ہیں؟ فرمایا: ''اللہ عزوجل نے'' اس نے کہا: اس اللہ کی قسم! جس نے آسمان کو پیدا کیا اور زمین کو بنایا پہاڑ کو کھڑا کیا ان میں فائدے رکھے، کیا سچ مچ اللہ ہی نے آپ کو بھیجا ہے؟ فرمایا: ''ہاں۔'' اس نے پھر عرض کی کہ آپ کے قاصد کا بیان تھا کہ ہم پر پانچ وقتوں کی نمازیں ہیں اور ہمارے مال میں زکوۃ ہے؟ فرمایا: ''اس نے سچ کہا'' کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو بھیجا، کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟ فرمایا: ''بے شک۔'' پھر کہا: آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ بھی ہے؟ فرمایا: ''ہاں! سچ کہا'' اس نے کہا: قسم ہے اس کی جس نے آپ کو رسول بنایا، کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا: ''ہاں۔'' پھر کہا: آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ قدرت ہو تو خانہ کعبہ کا حج کریں۔ فرمایا: ''ہاں، سچ کہا۔'' عرض کی: اس کی قسم جس نے آپ کو بھیجا، کیا اللہ نے اس کا حکم دیا؟ فرمایا: ''ہاں'' اس نے عرض کی: قسم ہے اس کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں ان احکام کی تعمیل میں کچھ گھٹا بڑھا نہیں کروں گا، ارشاد ہوا: ''اگر یہ سچ کہتا ہے تو جنت میں داخل ہو گا۔'' ❷

ایک اور مجلس میں صحابہ حاضر خدمت تھے اور حضور ﷺ ٹیک لگائے تشریف فرما تھے، اتنے میں ایک شتر سوار آیا اور سوار ہی مسجد میں داخل ہوا، پھر اونٹ سے اترا اور مسجد ہی میں اونٹ کو باندھ دیا، پھر مجمع کے پاس آ کر پوچھنے لگا، تم میں محمد ﷺ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ وہ گورے آدمی جو ٹیک لگائے بیٹھے ہیں، اس نے کہا کہ اے عبدالمطلب کے بیٹے! حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں کہو۔'' اس نے کہا کہ میں تم سے کچھ پوچھوں گا اور سختی سے پوچھوں گا تو تم رنجیدہ نہ ہونا، فرمایا: ''جو چاہو پوچھو۔'' اس نے کہا: میں تمہارے پروردگار اور تم سے پہلوں کے پروردگار کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم کو اللہ نے سب لوگوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے؟

---

❶ بخاري، كتاب الايمان، باب الزكوة من الاسلام:٤٦۔

❷ صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب السؤال عن أركان الإسلام: ١٠٢۔

فرمایا: ''خدایا ہاں۔'' پھر فرمایا: اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے آپ کو حکم دیا ہے کہ پانچ وقتوں کی نماز پڑھیں؟ فرمایا: ''خدایا ہاں۔'' پھر کہا: اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے کہا ہے کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ رکھیں؟ فرمایا: ''خدایا ہاں۔'' پھر کہا: اللہ ہی کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے دولت مندوں سے زکوٰۃ لیں اور ہمارے محتاجوں کو بانٹ دیں؟ فرمایا: ''خدایا ہاں!'' اس نے کہا: میں ایمان لاتا ہوں اس پر جس کو لے کر آپ ﷺ آئے ہیں، اپنے پیچھے والوں کا نائب ہو کر آیا ہوں، میں ضمام بن ثعلبہ ہوں۔ [1]

ذرا اس سادگی، بے تکلفی اور یقین کی دولت کی اس فراوانی کا منظر دیکھئے اور شیفتگی و جان نثاری کا ایک اور واقعہ سنیے۔

خیر! یہ واقعات تو ان بدوؤں کے حضور انور ﷺ کے ساتھ پیش آئے، صحابہ کرام جن کا شرف یہ تھا کہ وہ حضرت ﷺ کے جاں نثار تھے، وہ بھی اگر ان بدوؤں کی طرف سے گزرے تو ان کے ساتھ بھی انہوں نے اسی محبت کا ثبوت دیا، براء بن عازب رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے ان کا اونٹ ایک دفعہ کھو گیا تھا، وہ اس کو ڈھونڈنے نکلے تو بدوؤں میں پہنچ گئے، بدوؤں کو جب معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں تو حضور کے تعلق سے وہ ان پر گھوم گھوم کر نثار ہونے لگے۔ [2]

رعایا کی وفاداری، خلوص، جوشِ عقیدت کا سب سے بڑا امتحان گاہ میدان جنگ ہے، آنحضرت ﷺ کی زندگی کا بڑا حصہ میدان جہاد ہی میں بسر ہوا ہے، صحابہ نے جس جوش کے ساتھ آپ کی حفاظت کی ہے اور جس خلوص کے ساتھ آپ ﷺ پر جانیں نثار کی ہیں اس کی نظیر روم و ایران کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، چنانچہ صلح حدیبیہ کے متعلق جب کفارِ قریش کے نمائندہ عروہ بن مسعود نے آنحضرت ﷺ سے گفتگو شروع کی تو ایک صحابی مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ آپ کی پشت پر مسلح کھڑے ہوئے تھے، عروہ گفتگو کرتے تھے تو عرب کے طریقہ کے موافق آپ کی ڈاڑھی پکڑ لیتے تھے، لیکن جب ان کا ہاتھ آپ کی ریش مبارک کی طرف بڑھتا تھا، مغیرہ تلوار کے قبضہ سے اس پر ٹھوکر مار کر کہتے کہ آپ کی ریش مبارک سے ہاتھ کو الگ رکھو، عروہ نے اس جوشِ عقیدت سے متاثر ہو کر دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ آپ کا لعاب دہن بھی گرتا تھا تو لوگ تبرکاً اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے تھے۔ جب آپ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لیے سبقت کرتا ہے، جب آپ وضو کرتے ہیں تو لوگ وضو کے پانی کو تبرکاً لینے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں جب آپ گفتگو فرماتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ ادب اور تعظیم سے آپ ﷺ کی طرف نگاہ جما کر نہیں دیکھ سکتے، وہ اس منظرِ جاہ وجلال کو دیکھ کر پلٹے تو اپنی قوم سے کہا کہ میں

[1] بخاری، کتاب العلم، باب القراءة والعرض علی المحدث:٦٣۔

[2] ابوداود، کتاب الحدود، باب فی الرجل یزنی بحریمه:٤٤٥٦۔

اکثر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہو چکا ہوں، میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار میں بھی گیا ہوں، لیکن میں نے کسی بادشاہ کے یہاں نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اس کی اس قدر عزت کرتے ہوں، جس قدر محمد کے اصحاب محمد ﷺ کی تعظیم کرتے ہیں، جب وہ تھوکتے ہیں تو لوگ اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں، جب آپ ﷺ ان کو کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لیے پیش دستی کرتا ہے۔ جب آپ ﷺ وضو کرتے ہیں تو ہر شخص وضو کے پانی کے لیے لڑتا ہے۔ جب آپ ﷺ کلام کرتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ تعظیماً آپ ﷺ کی طرف نگاہ جما کر دیکھ نہیں سکتے۔ [1]

غزوۂ بدر کے متعلق جب آپ ﷺ نے انصار سے مشورہ کیا تو اس موقع پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی زبان سے جو فقرے نکلے وہ جوش، خلوص، عقیدت، محبت اور وفاداری کے جذبات سے لبریز تھے، انہوں نے کہا:

ایانا تريد يارسول الله! والذي نفسي بيده لو امرتنا ان نخيضها البحر لاخضناها ولو امرتنا ان نضرب اكبادها الى برك الغماد لفعلنا۔ [2]

”یارسول اللہ ﷺ! کیا آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر آپ کا حکم ہو کہ ہم اس سمندر میں اپنے گھوڑے ڈال دیں تو ہم ڈال دیں گے اور اگر حکم ہو کہ ہم اپنی سواریوں سے برک الغماد [3] پر دھاوا کریں تو ہم کر دیں گے۔“

غزوۂ احد میں جب آپ ﷺ نے کفار کی جمعیت کو ذرا گردن بڑھا کر دیکھنا چاہا تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے جن الفاظ کے ذریعہ سے آپ کو روکا، اس سے زیادہ جوش محبت کی تفسیر کیا ہو سکتی ہے، انہوں نے کہا:

بابي انت وامي لاتشرف يصيبك سهم من سهام القوم نحري دون نحرك۔ [4]

”میرے باپ ماں آپ ﷺ پر قربان، آپ گردن بڑھا کر نہ دیکھئے کہیں آپ کو کوئی تیر نہ لگ جائے، میرا سینہ آپ کے سینہ کے سامنے ہے۔“

خیر یہ تو صحابہ اور حضور انور ﷺ کے درمیان کے واقعات تھے، آنحضرت ﷺ کے صحبت یافتہ یعنی صحابہ غیر قوموں میں گئے تو ان کی محبوبیت کا یہی عالم تھا۔ چنانچہ غیر قوموں کو عمالِ نبوی کی سادگی اور انصاف پسندی کا منظر نظر آتا تھا تو وہ بھی ان کی گرویدہ ہو جاتی تھیں، فتح خیبر کے بعد وہاں کی پیداوار کی تقسیم کے لیے آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا، وہ وہاں گئے اور تخمینہ کر کے ہر کھجور کے درخت

[1] بخاري، كتاب الشروط، باب الشروط في الجهاد والمصالحة: ٢٧٣١، ٢٧٣٢۔

[2] صحيح مسلم، كتاب الجهاد، باب غزوة بدر: ٤٦٢١۔ [3] یمن کی سمت میں ایک مقام کا نام۔

[4] صحيح بخاري، كتاب المغازي، باب غزوة احد: ٤٠٦٤۔

سے ایک خاص مقدار وصول کرنا چاہی، اس پر یہودیوں نے کہا: ''یہ تو بہت ہے''۔ انہوں نے کہا: اچھا! میں تخمینہ کر دیتا ہوں، تم لوگ اس کا نصف لے لینا، اس انصاف پسندی سے یہود اس قدر متاثر ہوئے کہ سب کے سب یک زبان ہو کر پکار اٹھے:

هذا الحق وبه تقوم السّماء والارض قد رضينا ان نأخذه بالذى قلت. ❶

''انصاف اس کا نام ہے اور اسی انصاف سے آسمان و زمین قائم ہیں جو کچھ تم نے کہا ہم اس کے قبول کرنے پر راضی ہیں۔''

فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ یہودیوں نے ان کو رشوت دینا چاہی، لیکن انہوں نے کہا: اے اللہ کے دشمنو! تم مجھ کو حرام کھلانا چاہتے ہو، اللہ کی قسم! میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں، جو محبوب ترین خلائق ہے اور تم کو میں بندروں اور سوروں سے بھی زیادہ مبغوض رکھتا ہوں لیکن تمہاری دشمنی مجھ کو عدل وانصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی، یہ سن کر تمام یہودیوں نے کہا کہ آسمان و زمین اسی انصاف سے قائم ہیں۔ ❷

---

❶ ابوداود، کتاب البیوع، باب فی المساقاة: ۳٤۱۰۔

❷ فتوح البلدان بلاذری مطبوعه یورپ، ص: ۳۱۔

سلطنت اور دین کا تعلق

دنیا میں اس وقت دو قسم کی سلطنتیں ہیں، ایک وہ جس میں سلطنت کو مذہب سے قطعاً علیحدہ رکھا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو اللہ کا ہے وہ اللہ کو دو۔ [1] اس تعلیم میں قیصر اور اللہ دو متقابل ہستیاں فرض کی گئی ہیں، جن میں سے ایک کا حکم دوسرے سے بالکل الگ ہے، اسی پر یورپ کی موجودہ سلطنتیں قائم ہوئی ہیں اور اسی کی بنا پر دین و دنیا کی دو علیحدہ حدیں بنائی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سلطنتیں خدا پرستی، دین داری، صداقت اور اخلاصِ نیت کے ہر منظر سے عاری اور خالی ہو کر رہ گئی ہیں۔

دوسری قسم کی سلطنت وہ ہے جس میں مذہب کو اس سے الگ نہیں رکھا گیا ہے، لیکن مذہب کی لطیف و نازک روح کو سلطنتی قوانین و آئین وضوابط کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ مذہب کی لطافت جاتی رہی اور رسوم و قوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی، یہودیت اور برہمنیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ اصل دینِ الٰہی ایک ہی ہے، ایک ہی رہا ہے اور ازل سے ابد تک ایک ہی رہے گا اور وہ اسلام ہے، ﴿ إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۹) ''اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے۔'' اس دین کی جامعیت کی تشریح مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے اور کی جا سکتی ہے، انہی میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ سلطنت اور دین کا معتدل مجموعہ ہے، وہ ایسی سلطنت ہے جو ہمہ تن دین ہے یا ایسا دین ہے جو سرتاپا سلطنت ہے، مگر سلطنتِ الٰہی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سلطنت الٰہی میں قیصر کا وجود نہیں، اس میں ایک ہی اعلیٰ حاکم و آمر مانا گیا ہے، وہ حاکم علی الاطلاق اور شہنشاہِ قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ ہے، جل شانہ و تعالیٰ اسمہ بادشاہی اسی کی ہے، حکم اسی کا ہے فرمان صرف اسی کا صادر ہوتا ہے۔ دوسرے مجازی حاکموں اور آمروں کا حکم اسی وقت مانا جاتا ہے جب وہ عین حکم الٰہی ہو، یا اس کا مبنی ہو اور کم از کم یہ کہ اس کے مخالف نہ ہو، آنحضرت ﷺ اس دین کے سب سے آخری داعی، نبی اور پیغمبر تھے اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم اور فرمانروا تھے، آپ ﷺ کے احکام کی بجا آوری عین احکامِ الٰہی کی بجا آوری ہے:

﴿ مَّن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ﴾ (٤/ النسآء:٨٠)

''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

آپ ﷺ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آپ ﷺ کے جو جانشین اور خلفا ہوئے، ان میں بھی دین و دنیا کی یہی جامعیت تھی، وہ جس طرح مسلمانوں کے امیر و حاکم اور ان کی سلطنت کے فرمانروا تھے، اسی طرح وہ دین کے پیشوا، امام اور مجتہد تھے اور ان کے احکام کی تعمیل بھی عین اللہ اور رسول کے احکام کی تعمیل تھی اور اب بھی مسلمان بادشاہوں کے وہ احکام جو اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہوں، ہر مسلمان پر واجب

[1] انجیل۔

(۳۸/ ص:۲۴۔۲۶)

''اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے (یعنی اللہ نے) ان کو آزمایا ہے، تو اپنے پروردگار سے انہوں نے معافی چاہی اور رکوع میں گر گئے اور رجوع کیا تو ہم نے ان کو معاف کر دیا اور ان کو ہمارے ہاں قرب کا درجہ اور پھر آنے کی اچھی جگہ حاصل ہے، اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کرو اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دے گا۔''

آگے پیچھے کی آیتوں کے درمیان ربط و نظم سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سلطنت کے فرائض اور مقدمات کے فیصلوں کو چھوڑ کر عبادت خانہ کے دروازہ کو بند کر کے اللہ کی عبادت میں مصروف رہنے لگے، تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی اور بتایا گیا کہ خلیفہ کا فرض یہ ہے کہ حسبِ احکامِ الٰہی فرائضِ خلافت کی ادائیگی میں مصروف رہے۔

جامع ترمذی اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((ما من امام یغلق بابه من ذوی الحاجة و الخلة و المسکنة الا اغلق اللّٰہ ابواب السماء دون خلته و حاجته و مسکنته)) ❶

''جو امام و حاکم ضرورت مندوں سے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کر لے گا۔''

((من ولی من امر المسلمین شیئا فاحتجب دون خلتهم و حاجتهم و فقرهم و فاقتهم احتجب اللّٰہ عزوجل یوم القیامة دون خلته و فاقته و فقره)) ❷

''جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار ہونے کے بعد ان کی ضرورت کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ضرورت و احتیاج کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا۔''

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے ان احکام کی پیروی یہاں تک کی کہ انہوں نے اینٹ اور چونے کی کوئی چہار دیواری بھی اپنے لیے نہیں کھڑی کی اور اپنی حق طلب رعایا کے بیچ میں ان کے لیے اجازت حاصل کرنے والے غلاموں ❸ کے سوا کوئی اوٹ قائم نہیں کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

---

❶ جامع ترمذی، ابواب الاحکام، باب ماجاء فی امام الرعیة:۱۳۳۲۔

❷ مستدرك حاکم، کتاب الاحکام ٤، ص ۹۳، ۹٤۔

❸ چونکہ اسلام میں کسی کے مکان میں داخل ہونے کے لیے اذن کا حکم ہے، اس لیے خود آنحضرت ﷺ نے اور خلفا نے گھروں کے دروازوں پر نوکر متعین کر رکھے تھے، مگر عام پبلک مقامات، مساجد اور عدالت گاہوں میں نہ اس اجازت کی ضرورت ہے اور نہ ایسے پہرہ داروں کی۔

نے جو کوفہ کے والی تھے، اپنے رہنے کے لیے ایک محل بنوایا اور اس میں پھاٹک لگوایا، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر پہنچی تو انہوں نے خاص طور سے مدینہ سے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو اس لیے بھیجا کہ اس پھاٹک میں آگ لگا کر چلے آئیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، وہ سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے وہاں گئے اور پہنچنے کے ساتھ اس پھاٹک میں آگ لگا دی، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنے پاس ٹھہرانا چاہا تو اس کو بھی قبول نہیں کیا اور سیدھے مدینے واپس چلے آئے۔ ❶

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں حملہ آوروں کے خوف سے جب محل میں لوگوں کی آمدورفت پر روک ٹوک قائم کی اور ایک صحابی نے ان کو اس حکم نبوی سے باخبر کیا تو انہوں نے یہ تدبیر کی کہ پھاٹک پر ایک آدمی کو اس غرض سے مقرر کیا جو اہل حاجت پہنچے تو اس کی ضرورت سن کر ان کو مطلع کر دے۔ ❷

قرآن پاک میں بار بار حکام کو عدل وانصاف سے کام لینے اور اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی بجا آوری کی تاکید کی گئی ہے، خصوصیت کے ساتھ ذیل کی آیتیں اپنے معنی کے عموم کے لحاظ سے فرائض حکومت کی پوری توضیح کرتی ہیں:

﴿ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُم بِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:٥٨-٥٩)

''امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو، اللہ تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے، بیشک اللہ سنتا (اور) دیکھتا ہے، مومنو! اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو کوئی تم میں صاحب حکومت ہیں، ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اس میں اللہ اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو، یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے۔''

یہ آیتیں اسلامی سلطنت کے آئین کے باب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں، جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی آیت پاک کا پہلا ٹکڑا اپنے معنی کے لحاظ سے اہل تفسیر کی تصریح کے مطابق اس کا اطلاق حکام پر بھی ہوتا ہے اور یہ بات کہہ کر ہر صاحب حق کو اس کا حق ادا کیا جائے، امانت کا اعلیٰ درجہ اور حکومت کا پہلا فرض ہے۔

﴿ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۝ ﴾ (٥٥/ الرحمٰن:٩)

''اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم کرو اور میزان میں کمی نہ کرو۔''

---

❶ مسند احمد، ج ١، ص:٥٤۔ ❷ ترمذی، ابواب الاحکام:١٣٣٢۔

یہ اور اسی معنی کی اور آیتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں پورا انصاف برتا جائے اور جس پیمانہ سے تم دوسروں کے لیے تولتے ہو، اسی پیمانہ سے اپنے لیے بھی تولو:

﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۝ ﴾ (۸۳/ المطففین:۱۔۳)

''پھٹکار ہو ان تول میں بے ایمانی کرنے والوں پر جو لوگوں سے تول کریں تو پورا پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں۔''

یہ تول میں گھٹانا اور بڑھانا انصاف کے خلاف ہے اور خلافِ انصاف کرنے والا اللہ کی رحمت سے محروم رہے گا، اللہ کی محبت کے مستحق منصف اور عدل پرور ہی ہیں:

﴿ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۲ و ۴۹/ الحجرات:۹)

''اور اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

اس آیت کی وسعت میں ہر طبقہ کے انصاف کرنے والے داخل ہیں۔

اس کے برخلاف کرنے والوں کے متعلق ارشاد ہے:

﴿ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۵۷، ۱۴۰)

''اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

﴿ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۴۰)

''بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔''

ظلم کے معنی کسی دوسرے کے حق کو دبانے کے ہیں، چاہے وہ اپنے ہی نفس کا ہو، یا عام بندوں کا ہو، یا اللہ تعالیٰ کا ہو، ان آیتوں سے مقصود یہ ہے کہ حکومت اور اس کے فرائض اسلام میں دین کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہونا ثواب اور اس میں قصور گناہ ہے اور بحسن وخوبی عہدہ برآ ہونا یہی ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کے تحت ادا ہوں:

﴿ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۷)

''اور جو اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ کریں وہی نافرمان ہیں۔''

احادیث میں بھی اس کی تصریحات ہیں، ارشاد ہے:

((الا ایّھا الناس لا یقبل اللّٰہ صلوٰۃ امام حکم بغیر ماانزل اللّٰہ)) [1]

''ہاں اے لوگو! جو امام، اللہ نے جو قانون اتارا ہے اس کو چھوڑ کر کچھ فیصلہ کرے، اس کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرے گا۔''

---

[1] مستدرک، کتاب الاحکام، ج ۴، ص ۸۹۔

سبب ظاہر ہے کہ نماز بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور انقیاد کی تمثیل ہے، اب جو شخص ایک طرف اس کامل اطاعت اور انقیاد کا اظہار کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی صریح مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے، وہ منافق ہے اور اس لیے اس کی نماز یعنی اظہار اطاعت بارگاہ الٰہی میں بے معنی ہے۔ اسی سلسلہ میں ان حدیثوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت وفرمانروائی بھی ایک مذہبی فریضہ ہے، جو لوگ اس فریضہ سے حسب احکام الٰہی بخوبی عہدہ برآ ہوں، ان کے لیے آخرت میں رحمت الٰہی کا سایہ ہے اور جو اس امتحان میں پورے نہ اتریں ان کے لیے وہ سزائیں ہیں جو دوسری زندگی میں ان کے لیے مقرر کی گئی ہیں، فرمایا:

((الامام الذی علی الناس راع هو مسئول عن رعيّتہٖ)) [1]

''وہ امام جو لوگوں پر مقرر ہے وہ نگران کار ہے، اس سے اس کے زیر نگرانی اشخاص کے متعلق باز پرس ہوگی۔''

اس سے معلوم ہوا کہ امیر اور امام بڑی ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، اسلامی امارت وخلافت تاج وتخت کی بہار اور عیش وعشرت کا گلزار نہیں، ذمہ داریوں کا خارزار ہے، جو اس سے بسلامت گزر گیا، اس کے لیے دنیا کی سعادت اور نیک نامی اور آخرت کا ابدی آرام وآرائش ہے اور جو اس میں الجھ کر رہ گیا، وہ اس دنیا میں بھی ذلیل وبدنام ہوگا اور آخرت میں بھی رسوا وخوار ہوگا۔

((ما من عبد يسترعيه اللّٰه رعية فلم يحطها بنصحهٖ الالم يجد رائحة الجنة)) [2]

''جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے اور وہ اس کی خیر خواہی پوری پوری نہ کرے تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا۔''

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے، ان کے مرض الموت میں بصرہ کا سفاک امیر عبیداللہ بن زیاد ان کی عیادت کو آیا، انہوں نے امیر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج میں تمہیں حضرت رسول اللہ ﷺ کا ایک پیغام سنا دینا چاہتا ہوں، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ سناتا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے:

((ما من عبد يسترعيه اللّٰه رعية يموت يوم يموت وهو غاش لرعيته الاحرّم اللّٰه عليه الجنة)) [3]

''جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے، وہ مرتے دم اس حال میں مرے کہ وہ اپنی رعیت کے ساتھ غداری کرتا تھا تو اللہ اس پر جنت کو حرام کر دے گا۔''

اس سے اندازہ ہوگا کہ امارت وحکومت کی ذمہ داری اسلام کی شریعت میں کتنی بڑی ہے، ایک اور صحابی

---

[1] صحيح بخاری، كتاب الاحكام، باب قول الله تعالىٰ: اطيعوا الله......: ۷۱۳۸۔

[2] ايضًا، باب من استرعی رعية فلم ينصح: ۷۱۵۰۔

[3] صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب فضيلة الامير العادل......: ٤٧٢٩۔

جن کا نام عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ ہے، وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے، عبیداللہ بن زیاد کے دربار میں خود پہنچ جاتے ہیں اور اس کو پیار سے خطاب کر کے کہتے ہیں اے بیٹے! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے:

((ان شر الرعاء الحطمة)) ❶

''سب سے برا راعی (امیر) وہ ہے جو اپنے رعیت کو توڑ ڈالے۔''

تو تو ان میں سے نہ بن، اس نے کہا: آپ محمد ﷺ کے اصحاب میں بھوسی ہیں، فوراً بولے، کیا حضور ﷺ کے اصحاب میں کوئی بھوسی بھی تھا، بھوسی تو اوروں میں تھے اور ان کے بعد والے ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا: ''بنی اسرائیل کی سیاست انبیا فرمایا کرتے تھے، ایک نبی گزر جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، نبوت مجھ پر ختم ہوگئی، البتہ خلفا ہوں گے اور بہت ہوں گے، انہی کے ہاتھ میں امت کی سیاست کی باگ ہوگی۔'' صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! تو ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ فرمایا: ''پہلے کی بیعت کرو، پھر اس کے بعد والے کی، پھر عہد بہ عہد اوروں کی، ان کا حق ان کو ادا کیا کرو۔'' (یعنی اپنے حق کی پرسش اللہ پر چھوڑ دو)

((فَإِنَّ اللّٰهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ)) ❷

''کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے متعلق باز پرس فرمائے گا جن کی نگرانی اس نے ان کے سپرد فرمائی ہے۔''

حضور ﷺ نے اپنی امت کے امرا کے حق میں یہ دعا فرمائی ہے:

((اللهم من ولی من امر امتی شیئا فشق علیهم فاشقق علیه و من ولی من امر امتی شیئا فرفق بهم فارفق به)) ❸

''اے اللہ! جو کوئی میری امت کی کسی بات کا (یا حکومت کے کسی حصہ کا) بھی والی ہو اور وہ ان پر سختی کرے تو تو بھی اس پر سختی کرنا اور جو ان سے مہربانی سے پیش آئے تو تو بھی اس پر مہربانی فرمانا۔''

حضور ﷺ کے ان الفاظ کی وسعت میں بادشاہ سے لے کر ادنیٰ افسر تک شامل ہیں اور ہر ایک پر اپنے اپنے دائرۂ حکومت کی ذمہ داری عائد ہے، ایک اور حدیث پاک میں اس دائرہ کی وسعت اور زیادہ بڑھ گئی ہے:

((الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته والرجل راع علی اهل بیته وهو مسئول عنهم والمرأة راعیة علی بیت بعلها وولده وهی مسئولة عنهم والعبد

❶ صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب فضیلة الامیر العادل: ٤٧٣٣۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل: ٣٤٥٥۔ ❸ صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب فضیلة الامیر العادل: ٤٧٢٢۔

راع علی مال سیدہ و ھو مسئول عنہ الا فکلکم راعٍ و کلکم مسئول عن رعیتہ)) [1]

''ہاں! تم سب نگران کار ہو اور تم سب سے اپنے زیر نگرانی اشخاص و رعایا کی بابت پوچھ ہوگی تو لوگوں کا امیر نگرانِ کار ہے اس کے زیر نگران کے متعلق پرسش ہوگی اور مرد اپنے گھر والوں کا نگرانِ کار ہے اور اس سے اس کے گھر والوں کی پرسش کی جائے گی اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بال بچوں کی نگران ہے، اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگران ہے، اس سے اس کی بابت پوچھا جائے گا، تو ہاں ہوشیار رہو، تم سب نگرانِ کار ہو اور تم سے اس کے زیر نگران کے بابت باز پرس کی جائے گی۔''

لفظ رعیت

اس موقع پر مخصوص لفظ کی تحقیق مناسب معلوم ہوتی ہے، جو ہماری زبان میں عام طور پر رائج ہے اور وہ رعیت ہے اور ذمہ داری کے لحاظ سے وہ اپنی حقیقت سے بالکل خالی ہوگئی ہے، حدیثوں میں لفظ راعی اور رعیت بار بار آئے ہیں، یہ الفاظ لفظ ''رعی'' سے نکلے ہیں، جس کے اصل معنی جانوروں کے چرانے کے ہیں، راعی چرواہا اور رعیۃ وہ ہے جس کو وہ چرائے اور جس کی وہ نگہبانی کرے، اس سے ظاہر ہے کہ کسی کی رعیت وہ ہے، جس کی تربیت و پرورش و نگرانی اور حفاظت کسی راعی و محافظ کے سپرد ہو تو درحقیقت ایک امیر کی حیثیت ایک شفیق و محافظ چرواہے کی ہے، جو اپنے گلے کو سرسبز چراگاہوں میں لے جاتا ہے اور ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے، درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور حادثات سے ان کو بچاتا ہے۔ اس تشریح کے مطابق یہ غور طلب ہے کہ حضورِ انور ﷺ کی زبان مبارک پر لفظ ''رعیت'' کس قدر شفقت آمیز اور پر محبت معنوں میں آیا ہے اور ظالم و سفاک امرا اپنے عمل سے اس کو کتنے ذلیل اور پست معنوں میں عملاً استعمال کر رہے ہیں حالانکہ اسی لفظ میں ان کی ذمہ داریوں کا ایک بڑا دفتر پوشیدہ ہے، جو امامِ عادل اپنے فرائض سے بخوبی عہد برآ ہوں گے، رسول اللہ ﷺ نے ان کی نسبت یہ بشارت دی ہے:

((ان المقسطین عند اللّٰہ علی منابر من نور عن یمین الرحمٰن و کلتا یدیہ یمین الذین یعدلون فی حکمھم و اھلیھم و ما ولوا)) [2]

''بے شک انصاف کرنے والے (حکام و امرا) اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے منبروں پر اس کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلہ میں اپنے اپنے لوگوں میں اور اپنے زیر حکومت امور میں عادل ہوں۔''

[1] صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللہ تعالیٰ: اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول......: ۷۱۳۸؛ صحیح مسلم، ایضًا: ۴۷۲۴۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامیر العادل: ۴۷۲۱۔

اس رفعت اور بلندی سے جو ایسے عادل حاکموں، منصف امیروں اور سلطانوں کو قیامت کے روز حاصل ہوگی، ظاہر ہے کہ عادلانہ حکومت اور منصفانہ سلطنت کتنی بڑی عبادت ہے، جامع ترمذی میں ہے:

((ان احب الناس الی اللّٰہ یوم القیامۃ وادناھم منہ مجلسًا امام عادل وابغض الناس الی اللّٰہ وابعدھم منہ مجلسًا امام جائر)) ❶

''بے شبہ سب لوگوں سے اللہ کو محبوب اور اللہ سے قریب امام عادل ہوگا اور اللہ کے نزدیک سب سے مبغوض اور اللہ سے دور وہ امام ہوگا، جو ظالم ہو۔''

اس کے برخلاف جو امام اور حاکم و امیر عدل و انصاف اور رعایا پروری اور خیر خواہی سے دور ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت سے بھی دور ہوں گے، فرمایا:

((ما من امیر یلی امر المسلمین ثم لا یجھد لھم الالم یدخل معھم الجنۃ)) ❷

''جو امیر مسلمانوں کے کام کا والی ہو، پھر وہ ان کے لیے محنت نہیں کرتا اور ان کا خیر خواہ نہیں، وہ ان کے ساتھ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔''

((ما من وال یلی رعیۃ من المسلمین فیموت و ھو غاش لھم الا حرم اللّٰہ علیہ الجنۃ)) ❸

''کوئی والی جو مسلمانوں کی کسی زیر نگرانی جماعت کا والی ہو، وہ اس حال میں مرے کہ وہ ان مسلمانوں کے ساتھ غداری کا مرتکب ہو، اس پر جنت حرام ہے۔''

((انما الامام جنۃ یقاتل من وراءہ و یتقی بہ فان امر بتقوی اللّٰہ وعدل فان لہ بذالک اجرًا وان امر بغیرہ فان علیہ وزرا)) ❹

''امام ڈھال ہے اس کے پیچھے اس کی پناہ میں لڑا جاتا ہے، تو اگر وہ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے مطابق حکم کرے اور عدل کرے تو اس کو اس کا بڑا انعام ملے گا اور اگر غیر تقویٰ کا حکم کرے اور عدل نہ کرے تو اس کے لیے بڑی سزا ہے۔''

یہ حدیثیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں حکومت و ریاست اور سلطنت و ولایت بھی امورِ دین کا درجہ رکھتی ہیں اور وہ بھی ثواب و عذاب اور جزا و سزا کی اسی طرح موجب ہیں جس طرح دین کے دوسرے امور و اعمال اور وہ بھی ایک مسلمان کے سامنے جنت یا دوزخ کا دروازہ کھولنے میں اعمال و عبادات کے دوسرے

---

❶ ترمذی، ابواب الاحکام، باب ماجاء فی الامام العادل:۱۳۲۹۔

❷ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ:۴۷۳۱۔

❸ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب من استرعی رعیۃ فلم ینصح:۷۱۵۱۔

❹ نسائی، کتاب البیعۃ، باب ذکر مایجب للامام:۴۲۰۱۔

شعبوں سے کم نہیں اور اسلام کی شریعت میں یہ دین ہی کا ایک حصہ ہیں، کیونکہ یہاں دین کے معنی احکام الٰہی ہیں یا قوانینِ الٰہی ہیں۔ یہ احکام الٰہی اور قوانینِ الٰہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں، اس بنا پر سلطنت و ولایت اور حکومت و ریاست کے کاروبار کا نظم و نسق اور اہتمام و انصرام بھی دین ہی کا ایک جزو ہے۔

ایک مدت سے علما کی گوشہ گیری اور صوفیہ کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ قیامِ سلطنت اور امورِ سلطنت میں دخل و تدبیر دنیا کا کام ہے، جس سے اہلِ علم اور اہلِ اتقاء کو کنارہ کش رہنا چاہیے، حافظ شیرازی کا یہ مشہور شعر اسی تصور کا غماز ہے:

گدائے [1] گوشہ نشینی تو حافظا مخروش رموز مملکت خویش خسرواں دانند

''اے حافظ تو گدائے گوشہ نشین ہے، زیادہ شور وغل مت کر کہ اپنی مملکت کے رموز و اسرار بادشاہ ہی جانتے ہیں، تم کو ان سے کیا سروکار۔''

لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں، اس کی نگاہ میں سلطنت احکامِ الٰہی کی تبلیغ اور اجرا کے لیے ہے اور یہ عین دین ہے، اسلام میں جس قتال و جہاد کی دعوت برملا دی گئی ہے اور جس پر اُخروی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں اور جس سے داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ مقدس اور حضراتِ خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیاں سرتاپا معمور ہیں، اس سے مقصود اصلی احکام الٰہی کی تبلیغ تنفیذ اور اجرا ہی تھا، جہاد سے فرار پر غضبِ الٰہی اور جہنم کی وعید ہے اور میدان جہاد کے صبر و ثبات پر صادق قدم اور متقی ہونے کی بشارت ہے، قرآن میں ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَۚ وَمَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ۝ ﴾ (۸/ الانفال:۱۵۔۱۶)

''اے اہل ایمان! جب میدانِ جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سوا لڑائی کے لیے کنارے کنارے چلے (یعنی حکمتِ عملی سے دشمن کو مارے) یا اپنی فوج میں جا ملنا چاہے، ان سے پیٹھ پھیرے گا تو (سمجھو کہ) وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔''

﴿ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِؕ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْاؕ وَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

[1] حافظ رحمہ اللہ کے اس شعر کا یہ محل بھی ہو سکتا ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے اسرار و مصالح کی تلاش نہیں کرنی چاہیے، جب کہ وہ دنیا کے بادشاہ اپنے رموز و مصالح سے غیروں کو آگاہ نہیں کرتے، اگر کوئی بادشاہ کی مرضی کے خلاف ان کے جاننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے بغیر اپنی طرف سے احکامِ الٰہی کے رموز و اسرار کی تلاش وطلب نہیں کرنی چاہیے۔

''اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں، یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔''

یہی سبب ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جہاد وقتال فی سبیل اللہ، انصاف، اقامت دین، تنفیذ حکم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام کاروبار کو جس کا بڑا حصہ امامت وخلافت اور اس کے ماتحت شعبوں اور ضیعفوں سے متعلق ہے، عام عبادات واعمال صالحہ سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس تصور اور عقیدہ کی بنا پر کہ اقامت دین کی راہ میں خون شہادت کا ایک قطرہ بھی مومن کے اعمال نامہ اور گناہوں کے دفتر کو دم کے دم میں دھو دیتا ہے، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ہر وقت جہاد وقتال کے مشتاق اور اس راہ میں شہادت کے طالب رہتے تھے:

﴿ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۹۵)

''تو جو لوگ میرے لیے وطن چھوڑ گئے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور لڑے اور قتل کیے گئے، میں ان کے گناہ دور کردوں گا اور ان کو بہشتوں میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (یہ) اللہ کے ہاں سے بدلہ ہے اور اللہ کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔''

خود لفظ دین قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے، ان میں سے ایک معنی احکام الٰہی کی اطاعت، تنفیذ اور اقامت کے بھی ہیں، سورۂ نور میں ہے:

﴿ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ ﴾ (۲۴/ النور:۲)

''اور ان دونوں مجرموں کے ساتھ اللہ کے دین میں تم کو رحم نہ آئے۔''

کھلی بات ہے کہ اللہ کے دین سے مقصود یہاں احکام الٰہی کی تنفیذ واجرا سے ہے، اسی طرح سورۂ بقرہ کی اس آیت میں:

﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۳)

''اور ان سے اس وقت تک قتال کرتے رہنا کہ فساد نابود ہوجائے۔''

صرف حکم الٰہی کی اطاعت کو ''دین'' فرمایا گیا ہے، سورۂ انفال کی اس آیت میں:

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ ﴾ (۸/ الانفال:۳۹)

''اور ان لوگوں سے قتال کرتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ (کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین سب اللہ ہی کا ہوجائے۔''

بھی حکم وقانون الٰہی کی تسلیم واطاعت ہی کو دین فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی اطاعت کے

لائق ہے اور نہ عبادت کے، اسی کا ایک فیصلہ ہے جو آسمان سے زمین تک جاری ہے۔ ﴿ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ﴾ (٦/ الانعام:٥٧ و ١٢/ یوسف:٤٠) ﴿ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ﴾ (٦/ الانعام:٦٢) ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

﴿ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ﴾ (١٦/ النحل:٥٢)

''اور اسی اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی لازمی اطاعت ہے۔''

یہاں بھی دین کے معنی احکام الٰہی کی اطاعت ہی کے زیادہ موزوں اور نظم قرآنی کے مطابق ہے۔

سلطنت وملکیت کی حقیقت

اب دین کی تشریح کے بعد حکومت وسلطنت و لایت کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے، عام لوگ حکومت وسلطنت کو عیش وتنعم کے ایوانِ زرنگار، تاج اور زمردیں تخت کی روشنی اور زریں کمر بند غلاموں کے جھرمٹ میں تلاش کرتے ہیں، یا جلال و جبروت اور قہر وہیبت کی تلواروں کے سائے میں، لیکن اسلام نے جس حکومت کی تعلیم دی ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس تعلیم کی جو عملی مثال پیش کی ہے وہ ان تمام مناظر سے قطعاً خالی ہے۔

اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیے

سلطنت وحکومت اور ولایت وریاست کا رائج الوقت تخیل اسلام کے قانون میں اصلاً نہیں ہے، بلکہ اسلام نے سلطنت، حکومت اور بادشاہی وشہنشاہی کے الفاظ کو بھی جو ہر زبان میں رائج تھے، قطعاً چھوڑ دیا، سب سے عام لفظ ملک کا تھا اور اس سے اونچا لفظ شہنشاہ کا تھا، ایران کے شہنشاہ کسریٰ اور روم کے امیر قیصر کہلاتے تھے، مگر تعلیم محمدی ﷺ نے ان سب لفظوں سے جو جبر وقہر اور ظلم وستم کے مظہر تھے، پرہیز کیا، الملک کے مادہ میں ملکیت اور مالکیت کا تصور ہے جو اسلامی عقیدہ کے سراسر منافی ہے، اس لیے اس لفظ سے بھی پرہیز کیا، اسلام کی تعلیم میں حقیقی مالک اور حقیقی بادشاہ اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے الملک ہونے کا استحقاق اسی کو ہے، چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ وصف بار بار بیان ہوا ہے:

﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِكِ النَّاسِ ۙ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ ﴾ (١١٤/ الناس:١۔٣)

''کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں، لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی، لوگوں کے معبود برحق کی۔''

﴿ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ ﴾ (٥٩/ الحشر:٢٣)

''بادشاہ حقیقی، پاک ذات (ہر عیب سے) امن وامان والا۔''

﴿ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ﴾ (٢٣/ المؤمنون:١١٦)

''تو خدا جو سچا بادشاہ ہے۔''

﴿ الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ ﴾ (٦٢/ الجمعة:١)

''بادشاہ حقیقی، پاک ذات، زبردست حکمت والا ہے۔''

یہ آیت قرآن پاک میں چھ دفعہ آئی ہے اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ ہی کو ''الملک الحق'' یعنی بادشاہ برحق فرمایا گیا ہے، یہاں ایک نکتہ خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے، ان آیتوں میں کہیں بھی تنہا الملک نہیں آیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت اور اضافت ضرور لگائی گئی ہے، مثلاً اوپر کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کو ملک الناس ''لوگوں کا بادشاہ'' کہا گیا تو ساتھ ہی اس سے پہلے رب الناس ''لوگوں کا پالن ہار'' بھی کہہ دیا گیا ہے تا کہ اس کی ربوبیت کا بھی اظہار ہو، دوسری آیت میں الملک کے ساتھ اول القدوس (مقدس و پاک) اور پھر السلام (امن و امان والا) کہا گیا، تا کہ اس کے ساتھ اس کی پاکی و سلامتی ظاہر ہو جائے، تیسری آیت میں الملک کے ساتھ الحق (برحق) کی صفت آئی ہے، چوتھی آیت میں الملک کے ساتھ القدوس (پاک) العزیز (غالب) الحکیم (حکمت والا) کی صفت آئی ہے ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الملک کے لفظ کے اندر ظلم و سفا کی، قہر و جبر اور بے رحمی و سخت دلی کا ایسا مفہوم ذہن انسانی میں پیدا ہو گیا تھا کہ اس لفظ کے ساتھ کسی نئی صفت کے بڑھائے بغیر اس مفہوم کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں جہاں اپنے لیے اس لفظ کا استعمال کیا ہے اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت ضروری لگا دی ہے۔

لفظ ملک الملوک کی ممانعت

عربی میں ملک الاملاک یا ملک الملوک اور فارسی میں شاہنشاہ یعنی شاہِ شاہاں بولا جاتا تھا اور اس کا تصور بادشاہوں کے تعلق سے ہر زبان میں مبالغہ کے ساتھ پایا جاتا ہے، اسلام میں شاہِ شاہاں، شہنشاہ، ملک الملوک صرف ایک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے، آنحضرت ﷺ نے صاف ارشاد فرمایا:

((اخنع الاسماء عندالله رجل تسمى ملك الاملاك)) [1]

''سب سے بدتر نام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو شہنشاہ کہے۔''

معانی جن الفاظ سے ادا کیے جاتے ہیں، اگر ان کی اصلیت محفوظ ہو تو معلوم ہو گا کہ الفاظ کے اندر بڑی حقیقت چھپی رہتی ہے، اسلام کی زبان میں اپنی طرزِ حکومت کے فرد عامل کا نام خلیفہ اور اس کی حکومت کا نام خلافت ہے، خلیفہ عربی زبان میں قائمقام اور نائب کو کہتے ہیں، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود حاکم و فرمانروا نہیں، بلکہ وہ اس حکومت میں کسی کا نائب اور قائمقام ہے، سوال یہ ہے کہ وہ کس کی نیابت کرتا ہے اور کس کا قائمقام ہے؟

[1] صحيح بخاري، كتاب الادب، باب ابغض الاسماء الى الله: ٦٢٠٦۔

حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ قرآن پاک اور توراۃ دونوں صحیفوں میں مذکور ہے، مگر دونوں کے نتیجے الگ الگ ہیں، تورات میں یہ بیان صرف آدم علیہ السلام کے آغازِ پیدائش کی تاریخ کی حیثیت سے ہے، لیکن قرآن کا یہ بیان اسلام کے دینیات اور سیاسیات کا ایک بنیادی پتھر ہے، اسلام میں ایک طرف تو انسان کا مکلّف ہونا، اس کا اصلی مقام بہشت ہونا، جزا و سزا کا راز، رسالت و نبوت کی ضرورت اور پیغمبروں کے آنے کی مصلحت اس قصہ سے ظاہر ہوتی ہے، دوسری طرف کائنات میں انسان کے اصلی مقام و مرتبہ کی تعیین، دنیا میں اس کے فرائض، احکامِ الٰہی کی بجا آوری کی صورت اور اللہ کی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کے برتاؤ کی حیثیت واضح ہوتی ہے۔ پہلی چیز اسلام کے اساسی عقائد ہیں اور دوسری چیز اسلامی سیاسیات کے بنیادی مبادی ہیں۔ [1]

قرآن پاک میں اس قصہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے:

﴿ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ﴾ (۲/ البقرۃ: ۳۰)

''اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

یہ خلیفہ حضرت آدم علیہ السلام تھے، جو بنی آدم کے قائمقام ہو کر اس شرف سے ممتاز ہوئے، اس لیے دوسرے موقعوں پر آدم علیہ السلام کے بجائے سارے بنی آدم کو اس شرف سے مفتخر اور ممتاز فرمایا گیا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآء یل: ۷۰)

''ہم نے آدم کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں اور ہم نے ان کو اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی۔''

اور اسی شرف و امتیاز کی بنا پر آدم علیہ السلام بنی آدم کے قائمقام تھے، ان کو بنی آدم کے ساتھ ملا کر صیغہ جمع استعمال فرمایا گیا ہے:

﴿ اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۳۸)

''تم سب بہشت سے نیچے اتر جاؤ، اب اگر تم لوگوں کے پاس میری طرف سے کوئی پیغمبرانہ راہنمائی آئے تو جو میری راہنمائی کی پیروی کریں گے، تو ان کو نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غم اٹھائیں گے۔''

سورۂ اعراف میں ارشاد الٰہی ہے:

---

[1] خلافت کی تحریک کے زمانہ میں خاکسار کے خیالات ادھر رجوع ہوئے تو سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۲۰ء کے معارف میں آیت استخلاف کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں اس کی تصریح کی گئی ہے، یہ مضمون آج بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے۔

﴿ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۰۔۱۱)

''اور ہم نے زمین میں تم کو قدرت بخشی اور اس میں تمھارے زندگی بسر کرنے کے معاشی طریقے بنائے، تم بہت کم میرے احسان کی قدر کرتے ہو اور ہم نے تم کو وجود بخشا، پھر تمہاری صورتیں بنائیں، پھر فرشتوں سے ہم نے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے، کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں نہ تھا۔''

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جو عزت اور سرفرازی ملی وہ ان کی وراثت سے تمام بنی آدم کے حصہ میں آئی، اس لیے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین کی خلافت کی جو سعادت عطا ہوئی، وہ پورے بنی نوع آدم کو نصیب ہوئی، سورۂ انعام کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾ (۶/ الانعام:۱۶۵)

''اور وہی (اللہ) وہ ہے جس نے تم (انسانوں) کو زمین میں خلیفہ بنایا اور (تم میں سے) ایک کا دوسرے پر درجہ بڑھایا، تاکہ تم کو جو دیا اس میں تم کو آزمائے بے شک تیرا پروردگار جلد سزا دینے والا ہے اور وہ بے شبہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی آدم کو یہ خلافت یا نیابت کس کی عطا کی گئی ہے؟ قرآن پاک میں ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو نیابت اور جانشینی عطا ہوتی رہی ہے، جیسے عاد کی قوم کو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا جانشین، بنایا:

﴿ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ ﴾ (۷/ الاعراف:۶۹)

''اور یاد کرو کہ اللہ نے تم کو نوح علیہ السلام کے بعد جانشینی بخشی۔''

اور پھر ثمود کو عاد کا جانشین بنایا:

﴿ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ ﴾ (۷/ الاعراف:۷۴)

''اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد نیابت بخشی۔''

حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم عاد کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کی

﴿ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ ﴾ (۱۱/ ہود:۵۷)

''تو میرا رب تمہارے علاوہ کسی اور قوم کو خلافت بخشے گا۔''

حضور انور ﷺ کی زبان مبارک سے ارشاد ہے:

﴿ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴾

(٦/ الانعام:١٣٣)

''اور اللہ چاہے گا تو تم کو لے جائے گا اور تمہارے بعد جس کو چاہے خلافت و نیابت دے جس طرح تم کو دوسرے لوگوں کی نسل سے پیدا کیا۔''

یا مسلمانوں سے وعدہ فرمایا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ (٢٤/ النور:٥٥)

''اللہ نے تم میں سے ان سے، جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وعدہ کیا کہ ان کو زمین میں خلافت بخشے گا۔ جس طرح تم سے پہلوں کو خلافت بخشی۔''

قرآن پاک کی چار آیتوں میں کچھ قوموں کو دوسری قوموں کا خلیفہ اور جانشین ہونا بیان فرمایا گیا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ ﴾ (٦/ الانعام:١٦٥)

''اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں جانشین بنایا۔''

سورۂ یونس میں تصریح ہے:

﴿ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ (١٠/ یونس:١٣۔١٤)

''اور تم سے پہلے ہم کئی امتوں کو، جب انہوں نے ظلم اختیار کیا، ہلاک کر چکے ہیں اور ان کے پاس پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے، مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے ہم گناہگار لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں، پھر ہم نے ان کے بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا، تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔''

اس کے بعد نوح علیہ السلام کی قوم کی تباہی کے بعد ارشاد ہے:

﴿ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ ﴾ (١٠/ یونس:٧٣)

''لیکن ان لوگوں نے ان (نوح علیہ السلام) کی تکذیب کی تو ہم نے ان (نوح علیہ السلام) کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے سب کو طوفان سے بچالیا اور انہیں (زمین میں) خلیفہ بنادیا۔''

سورۂ فاطر میں سارے انسانوں کو خلیفہ اور جانشین فرمایا گیا:

﴿ هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَـٰٓئِفَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ ﴾

(۳۵/ فاطر:۳۹)

''وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا، تو جس نے کفر کیا، اس کے کفر کا ضرر اسی کو ہے۔''

حضرت داؤد علیہ السلام کو خلافت بخشی گئی:

﴿ يَـٰدَاوُۥدُ إِنَّا جَعَلْنَـٰكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ﴾

(۳۸/ ص:۲٦)

''اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں جانشین بنایا ہے، تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو۔''

یہ لفظ خلیفہ خلف سے مشتق ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لیے ایک کی غیر موجودگی میں، خواہ وہ اس کی موت کے سبب سے ہو یا غیبوبت کے سبب سے ہو، آنکھوں سے بظاہر اوجھل ہونے کی صورت میں ہو، اس کی طرف سے اس کے پیچھے جو نمائندہ ہو کر آئے وہ اس کا خلیفہ کہلاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ ﴾ (۱۹/ مریم:۵۹)

''تو ان کے بعد ان کے جانشین آئے۔''

یہ موت کے بعد کی جانشینی کی صورت ہے، دوسری آیت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طور پر جاتے وقت حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمایا:

﴿ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي ﴾ (۷/ الاعراف:۱٤۲)

''میری قوم میں میرے جانشین یا نائب بنو۔''

یہ زندگی ہی میں جانشینی کی ایک شکل ہے۔

﴿ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنكُم مَّلَـٰٓئِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ ۝ ﴾ (٤۳/ الزخرف:٦۰)

''اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو بناتے جو زمین میں خلافت کرتے۔''

اوپر کی تین آیتوں میں خلافت کا لفظ ذرا ذرا سے فرق سے تین معنوں میں آیا ہے، پہلی آیت میں ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، دوسری آیت میں ایک کے کہیں چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں اور تیسری آیت میں خلافت کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو تمہارے جانشین ہوتے، بعض نے کہا کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا اور تیسرا قول یہ ہے کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو زمین میں ایک دوسرے کے

جانشین ہوتے چلے جاتے۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ خلافت کے اصلی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں، لیکن اس نیابت اور قائم مقامی کی تین صورتیں ہیں:

الخلافة النيابة عن الغير اما لغيبة المنوب عنه و اما لموته واما لعجزه واما لتشريف المستخلف۔ [1]

''خلافت کے معنی کسی کے نائب ہونے کے ہیں۔اب یہ نیابت اصل کی عدم موجودگی کے سبب سے ہو یا اس کی موت کے سبب سے ہو یا اس کے اپنے منصب سے عاجز ہونے کے سبب سے ہو، یا نائب کو نیابت کی عزت بخشنے کے لیے ہو۔''

پھر امام راغب نے متعدد آیتیں نقل کی ہیں، جن میں یہ تیسرے معنی ان کے نزدیک مناسب ہیں اور یہی معنی اللہ تعالیٰ کی نیابت کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں، مفتی آلوسی زادہ صاحب روح المعانی تک ہر آیت پر جس میں یہ لفظ آیا ہے، تینوں معنی کے لیے مختلف قول نقل کیے ہیں اور خود کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی ہے، جس سے یہ معلوم ہو کہ کس آیت میں خلافت کے کون سے معنی لینے چاہییں، میرے دل میں یہ بات آتی ہے اور روزمرہ کا یہ عام محاورہ بھی ہے کہ جہاں متکلم یہ ظاہر کر دے کہ یہ شخص فلاں کا جانشین ہے، وہاں تو اسی فلاں کا جانشین ہونا مقصود ہوگا اور جہاں متکلم اس کی تصریح نہ کرے تو اس سے مقصود خود متکلم کی جانشینی اور قائم مقامی ہوگی، اس اصول پر قرآن پاک کی ہر اس آیت میں جس میں اس جانشینی کی تصریح ہے، اس کی جانشینی مراد ہو گی اور جہاں تصریح نہیں ہے، وہاں خود متکلم قرآن یعنی اللہ تعالیٰ کی نیابت اور قائم مقامی ثابت ہوگی، جیسے قرآن پاک میں ایک آیت ہے:

﴿ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۭ ﴾ (۵۷/ الحدید:۷)

''اور خرچ کرو اس (مال) میں سے جس میں تم کو اس نے نائب بنایا ہے۔''

اب اس آیت میں ذکر نہیں کہ کس کا نائب بنایا ہے، اس لیے مفسرین دونوں طرف گئے ہیں، کچھ نے کہا: ایک کے بعد دوسرے کو اس مال کا نائب بنایا، جیسے باپ کے بعد بیٹا نائب ہوتا ہے، کچھ نے کہا کہ مال درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ملک ہے، اس نے جس کے حوالہ اپنے مال و دولت کو کیا ہے اس کو اپنا امین اور نائب بنایا ہے کہ وہ اس کی طرف سے امورِ خیر میں اس کو صرف کرے، میں نے جو اصول اوپر پیش کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں دوسرے معنی صحیح ہیں، کشاف، بیضاوی اور روح المعانی وغیرہ میں بھی اسی معنی کو مقدم رکھا ہے۔کشاف میں ہے:

ان الاموال التي في ايديكم انما هي اموال الله بخلقه وانشاء ه لها وانما مولكم

[1] مفردات، امام راغب اصفہانی، ص: ۱۵۵۔

ایاھا وخولکم للاستمتاع بھا وجعلکم خلفاء فی التصرف فیھا۔ ❶

''وہ مال جو تمہارے قبضے میں ہے (درحقیقت تمہارا نہیں ہے) اللہ تعالیٰ کا ہے، کیونکہ اسی نے اس کو بنایا ہے، اسی نے تمہارے تمتع کے لیے اس کا تم کو مالک بنایا ہے اور تم کو اس کے تصرف کا اختیار بخشا ہے۔''

بیضاوی میں ہے:

من الاموال التی جعلکم اللہ خلفاء فی التصرف فیھا۔ ❷

''وہ مال جس کے تصرف میں اللہ تعالیٰ نے تم کو جانشین بنایا ہے۔''

روح المعانی میں ہے:

جعلکم سبحانہ خلفاء عنہ عز و جل فی التصرف فیہ من غیر ان تملکوہ حقیقۃً۔ ❸

''اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو اپنا اس (مال) کے تصرف میں جانشین بنایا ہے، نہ یہ کہ تم واقعی اس کے مالک ہو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ان مفسرین کے نزدیک اموال کی ملکیت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہے اور بنی آدم ان مملوکات کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اس کے وکیل و نائب ہیں۔

اب ہم اصل آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں، جو اس باب کا سرِ عنوان ہے، یعنی:

﴿ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۳۰)

''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے تعمیم کے ساتھ انہی سابقہ دونوں معنوں کو یکے بعد دیگرے لکھ دیا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ طبری میں یہ دونوں قول ہیں، ایک یہ کہ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کی جانشینی کا ذکر ہے، دوسرا یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ اپنی نیابت کا ذکر فرما رہا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً مِنِّیْ یَخْلُفُنِیْ فِی الْحُکْمِ بَیْنَ خَلْقِیْ۔

''میں اپنی طرف سے زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں جو میرا خلیفہ ہوگا، میری مخلوقات کے درمیان حکم کرنے میں۔''

اس کے اوپر ابن زید کی تفسیر کا مطلب یہ بیان کیا ہے:

---

❶ تفسیر سورۃ حدید، ج ۲، ص: ۱۴۴۸۔ ❷ تفسیر بیضاوی، ج ۲، ص: ۳۴۷۔

❸ روح المعانی، ج ۲۷، ص: ۱۴۶۔

ان اللّٰہ تعالی اخبر الملئکۃ انہٗ جاعل فی الارض خلیفۃ لہ یحکم فیھا بین خلقہٖ بحکمہٖ۔ ❶

’’اللہ تعالیٰ فرشتوں کو خبر دے رہا ہے کہ وہ زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنا رہا ہے جو اس کے حکم کے مطابق اس کی مخلوقات میں فیصلہ یا حکومت کرے گا۔‘‘

اس سلسلہ میں قاضی بیضاوی کی تصریح زیادہ حکیمانہ ہے:

والمراد بہ آدم علیہ السلام لانہ کان خلیفۃ اللّٰہ تعالی فی ارضہٖ وکذلک کل نبی استخلفھم فی عمارۃ الارض و سیاسۃ الناس وتکمیل نفوسھم وتنفیذ امرہٖ فیھم لالحاجۃ بہ تعالی الی من ینوبہ بل لقصور المستخلف علیہ عن قبول فیضہ وتلقی امرہ بغیر وسط۔ ❷

’’اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں، کیونکہ وہ اس کی زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو خلیفہ بنایا زمین کی آبادی اور لوگوں کی نگرانی اور نفوس کی تکمیل اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے میں، اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کا خلیفہ ہو، بلکہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تلقی کسی واسطہ کے بغیر ممکن نہ تھی۔‘‘

لیکن قرآن پاک کی آیتوں سے جو ابھی اوپر گزری ہیں اور جن میں اللہ تعالیٰ نے سارے بنی آدم کو خلفا فرمایا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیا علیہم السلام کے توسط سے اس خلافتِ الٰہی کی سند ان کے متبوعین تک کو عطا ہوئی ہے اور سارے بنی آدم اس شرف سے ممتاز ہیں۔

آیت میں خلافت کی جو تفسیر ابھی بیان ہوئی ہے اس کی ترجیح کے حسب ذیل اسباب ہیں:

① تمام مفسرین نے شروع سے اس مطلب کو لکھا ہے۔

② روایات سے اور قرآن پاک کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کو پیدا کرتا رہا، اس لحاظ سے آدم علیہ السلام کی تخلیق کوئی نئی بات نہ تھی، لیکن جس اہتمام سے، جس شان سے اور جس اہمیت سے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش، اللہ کی نیابت، فرشتوں کے سجدہ کرنے اور جنت کے داخلہ، پھر ان کی عدولِ حکمی اور دنیا میں آباد ہونے اور سلسلہ انبیا قائم کرنے وغیرہ کے خصوصیات وفضائل جو بیان کیے گئے ہیں، ان سے پہلے کی مخلوقات میں کوئی ممتاز نہیں ہوا، یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ نیابت گزشتہ مخلوق کی نہیں، بلکہ خالق کی تھی۔

③ اوپر تفصیل سے تمام آیتوں کو لکھ کر جو اصول ممہد کیا گیا ہے اور جس کا منشا یہ ہے کہ متکلم کے جس کلام میں نیابت کی توضیح مذکور ہوگی، اس میں اسی مذکور کی نیابت سمجھی جائے گی اور جو کلام اس توضیح سے خالی ہوگا

❶ تفسیر طبری، ج ۱، ص: ۱۵٤۔ ❷ تفسیر بیضاوی، ج ۱، ص: ٤٤۔

وہاں لامحالہ اسی متکلم کی نیابت مراد ہوگی، جیسے کسی بادشاہ نے کہا کہ میں نے زید کو نائب بنایا، اب اگر کلام میں اس کی توضیح مذکور ہے، یا سیاق وسباق سے مفہوم ہوتا ہے کہ کس کا نائب بنانا مقصود ہے تو اسی کی نیابت سمجھی جائے گی اور اگر اس توضیح سے کلام کلیتہً خالی ہے تو مقصود خود بادشاہ کا اپنا نائب بنانا ہے، اس اصول پر ظاہر ہے کہ اس آیت میں اور نہ اس سے آگے اور نہ اس کے پیچھے کسی ایسے شخص کی توضیح ہے، جس کا آدم علیہ السلام کو نائب بنانا سمجھا جائے، ایسی حالت میں بلاشبہ خود اپنا نائب بنانا مقصود ہو جائے گا۔

④ اس معنی کی تائید میں اور بھی آیتیں ہیں، جس سے آدم علیہ السلام اور بنی آدم کے شرف و کرامت کا اظہار ہوتا ہے، فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآءیل:۷۰)

''ہم نے آدم علیہ السلام کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں اور ہم نے ان کو اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی۔''

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ (۹۵/ التین:٤)

''ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔''

پھر آسمان سے لے کر زمین تک جو کچھ ہے، سب اس کے لیے بنا ہے اور سب اس کے کام میں لگے ہیں:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ (٤٥/ الجاثیۃ:۱۳)

''اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں، ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے دلائل ہیں، جو سوچتے ہیں۔''

اور یہی نیابت الٰہی کی حقیقت ہے، قرآن میں ایک جگہ نہیں، بیسیوں مقامات میں تمام مخلوقات الٰہی کو انسان کا تابع دار اور مسخر اور اسی کے لیے ان کا پیدا کیا جانا بہ تفصیل مذکور ہے، مزید تشریح کے لیے چند آیتیں اور لکھی جاتی ہیں:

﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ (۲/ البقرۃ:۲۹)

''اس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔''

﴿وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ﴾ (۱٦/ النحل:١٤)

''اور وہی تو ہے جس نے دریا کو (تمہارے) اختیار میں کیا۔''

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ ﴾ (٤٥/ الجاثية:١٢)

''اللہ ہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے قابو میں کر دیا۔''

﴿ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ ﴾ (١٤/ ابراهيم:٣٢)

''اور کشتیوں (جہازوں) کو تمہارے زیر فرمان کر دیا۔''

﴿ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴾ (١٤/ ابراهيم:٣٢)

''اور نہروں کو بھی تمہارے زیر فرمان کیا۔''

ان آیات سے ثابت ہے کہ انسان اس کائنات کا مقصود اصلی ہے اور اسی کو ساری مخلوقات کی سرداری بخشی گئی ہے اور یہی خلافتِ الٰہی کا منشا ہے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴾ (٣٣/ الاحزاب:٧٢)

''ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا، تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا، بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔''

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات میں سے امانت و نیابت الٰہی کے بار کا اٹھانے والا انسان ہی ہے، یہ امانت الٰہی کیا ہے؟ یہ اسی نیابت و خلافت کے بیان کا دوسرا پیرایہ ہے، نائب حقیقت میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک کی طرف سے صرف ایک وکیل اور امین کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف مالک کی امانت ہے، جو اس کو ملی ہے، تاکہ نیابت کے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اس کا علم اور اس کے دوسرے کمالات و محاسن و اوصاف سب اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہیں اور اسی کے خزانے سے اس کو چند روز کے لیے عاریت ملے ہیں، یہ حدیث کہ ((فان اللّٰه خلق اٰدم علی صورته)) [1] ''اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔'' اسی معنی کی طرف مشیر ہے اور مشہور قول ((تخلقوا باخلاق اللّٰه)) ''اللہ کے اخلاق سے متصف ہو۔'' کی تشریح بھی یہی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ اسلام کا نظریہ سلطنت و ریاست ایک ایسے تصور پر مبنی ہے، جو انسانیت کو بلند سے بلند نقطہ تک پہنچاتا ہے اور جس کے اندر مادی و روحانی، سیاسی اور اخلاقی، دنیاوی اور دینی دونوں تصورات باہم دست و گریباں ہیں۔

اب اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ خلق عالم کا مقصود اور مخلوقات کا سردار اپنے اصل مالک کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت اور غلامی کا اقرار کرے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض بتا دی

[1] صحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب النهي عن ضرب الوجه:٦٦٥٥۔

ہے، ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴾ (٥١/ الذاریات:٥٦)

''میں نے انسان اور جن کو اسی لیے بنایا کہ وہ میری بندگی کریں۔''

اس کی حیثیت اس ایجنٹ کی ہے، جس کا فرض صرف اپنے مالک کے احکام کی تنفیذ ہے، اس کے ہاتھ میں شریعتِ الٰہی کا فرمان ہے، اس کے احکام کو خود بجالانا اور ساری دنیا کو اس کے بجالانے پر آمادہ کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے، وہ صرف اپنے مالک کی مرضی کا تابع اور اس کے حکم کا بندہ ہے۔

اُمّتِ مسلمہ کی بعثت

عقیدۂ خلافت کی رو سے اگر چہ سارے بنی آدم اس نیابتِ الٰہی کے شرف کے مستحق ہیں، مگر اہلِ سعادت وہی ہیں جو اس کو مانتے، اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کا ذمہ دار جانتے اور نیابت کی بلندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی اور سرافگندگی کو تسلیم کرتے ہیں، اس نیابت اور عبدیت کے اصل نمائندے تو انبیا علیہم السلام ہیں، مگر ان کی تبعیت میں ان کی امتیں بھی شامل رہی ہیں، لیکن اب جبکہ محمد رسول اللہ ﷺ قیامت تک کے لیے خاتم الانبیا ہو کر تشریف لائے ہیں اور آپ ﷺ کے بعد اب کوئی دوسرا نبی قیامت تک آنے والا نہیں ہے، تو امت محمدیہ بھی اپنے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تبعیت میں نیابتِ الٰہی کی نمائندہ ہے اور دنیا کی آخری امت کی حیثیت سے قیامت تک نمائندہ رہے گی، اسی لیے قرآن پاک اور احادیثِ نبوی ﷺ میں اس کا لقب خاتم الامم اور آخر الامم ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو اخرین کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس کے معنی پچھلوں کے ہیں:

﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ ۝ وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ ۝ ﴾ (۵٦/ الواقعة:۱۳۔۱٤)

''ایک چھوٹا گروہ اگلوں میں اور ایک چھوٹا گروہ پچھلوں میں سے۔''

﴿ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ ۚ ﴾ (٦۲/ الجمعة:۳)

''اور ان سے پچھلوں میں جو ابھی تک ان میں شامل نہیں ہوئے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ امتِ محمدیہ کے بعد کوئی نئی امت پیدا نہ ہوگی کہ کوئی نیا نبی اب قیامت تک آنے والا نہیں ہے، احادیث میں بھی اس کی تصریحات موجود ہیں، صحیح بخاری میں ہے کہ ''انبیا کی ان امتوں کی مثال مزدوروں کی ہے، اللہ تعالیٰ نے پہلے یہود کو مزدوری پر رکھا تو انہوں نے ظہر تک کام کیا، پھر چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ نہ مانے، پھر نصاریٰ کو مزدور مقرر کیا، انہوں نے عصر تک مزدوری کر کے کام چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ کام کرنے پر آمادہ نہ ہوئے، عصر کے بعد مسلمانوں کو مزدوری کا شرف بخشا تو انہوں نے مغرب تک کام کر کے انجام تک پہنچا دیا اور پوری مزدوری پائی۔'' ❶ یہ حدیث بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ بخاری و ترمذی و موطا و حاکم وغیرہ حدیث کی کئی کتابوں میں ہے۔ ❷

اس حدیث میں دن سے مراد زمانہ ہے، اس سے واضح ہے کہ امتِ مسلمہ دنیا کی آخرین امت ہے، صحیح بخاری و مسلم و نسائی میں اوپر کی حدیث کی یہ شرح ہے:

((نحن الآخرون السابقون)) ❸

---

❶ صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلاة، باب من ادرك ركعة من العصر: ۵۵۸۔

❷ کنز العمال، ج٦، ص: ۲۳۰۔

❸ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب النفخ فی المنام: ۷۰۳٦۔

''ہم ہیں سب سے پچھلے لوگ اور سب سے اگلے۔''

یعنی ظہور کے لحاظ سے تو دنیا کی تمام امتوں میں ہم سب سے پیچھے ہیں، لیکن اجر وثواب میں قیامت کے دن ہم سب کے آگے ہوں گے، حدیث کا یہ ٹکڑا مستدرک حاکم، بیہقی اور نسائی میں بھی ہے۔ [1]

ابن ماجہ میں ہے نبی ﷺ نے فرمایا:

((نحن اٰخر الامم)) [2]

''ہم سب سے آخری امت ہیں۔''

غرض ان آیات اور احادیث سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ امتِ محمدیہ دنیا کی آخری امت ہے، کیونکہ وہ آخری نبی کی امت ہے۔

اس امت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ چونکہ آخری امت ہے اور نبوت کی آخری امانت کی حامل ہے، اس لیے قیامت تک اس میں اہل حق کا ایک گروہ ہمیشہ غالب و منصور رہے گا، جو دنیا پر اللہ تعالیٰ کی شہادت کی مہر لگاتا رہے گا اور اہل عذر کی حجت کا قاطع ہوگا۔

اس خصوصیت کا ثبوت قرآن پاک اور احادیث میں تصریح کے ساتھ ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ قرآنِ پاک قیامت تک محفوظ رہے گا، اب ظاہر ہے کہ اس کی حفاظت کرنے والے مسلمان ہی ہوں گے، اللہ تعالیٰ کسی بات کا وعدہ فرماتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ وسائط اور تدابیر کے بغیر ہی اس کو پورا کر دے گا، گو اس کی قدرت کی وسعت میں سب کچھ ہے، مگر عالمِ تدبیر میں اس نے اپنے موعودات کے لیے اسباب وعلل کا واسطہ رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے بندوں کی روزی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا حصول اسباب اور تدابیر پر موقوف رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خلافت کا وعدہ فرمایا تو اس کا حصول بھی مجاہدات پر موقوف رکھا، اس کے بعد پورا فرمایا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک کی حفاظت کا جو وعدہ مایا ہے تو وہ بھی اسباب وتدابیر کے ذریعہ ہی پورا ہوگا، اسی لیے قرآنِ پاک کی بقائے دوام کے لیے حاملینِ قرآن کو بھی تا قیامت دوام بخشے گا اور انہی کے ہاتھوں اور انہی کے سینوں میں محفوظ رکھ کر اس وعدہ کو پورا فرمائے گا اور یہ وعدہ بھی اسی وقت اپنے اصلی معنوں میں پورا ہوگا، جب امت محمدیہ کا ایک گروہ غلبہ اور سطوت کے ساتھ دنیا میں قائم رہے، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِۦ يَعْدِلُونَ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۸۱)

''ہمارے مخلوق بندوں سے ایک امت ہے جو حق کی راہ دکھاتی اور حق کا انصاف کرتی ہے (اور کرتی رہے گی)۔''

---

[1] کنز العمال، ج۶، ص:۲۳۰۔ [2] ابن ماجه، کتاب الزهد: ۴۲۹۰۔

اہلِ تفسیر نے اس کو امتِ محمدیہ کے حق میں سمجھا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ یہ حال و مستقبل دونوں کے لیے ہے، یعنی قیامت تک امتِ محمدیہ کا ایک گروہ حق کے ساتھ قائم رہے گا۔ ❶

قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ﴾ (۳/ ال عمران:۵۵)

''اور تمہارے پیروؤں کو تمہارے نہ ماننے والوں پر قیامت تک غالب رکھوں گا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصلی منکر تو یہود ہیں، گو دوسرے کفار بھی تبعاً اس میں داخل ہیں، اسی طرح ان کے اصلی پیرو تو مسلمان ہیں، ❷ مگر معنی میں یہودیوں کے مقابلہ میں عیسائی بھی پیرو کہے جا سکتے ہیں، گو گمراہ ہوں، ❸ بہرحال اس آیت سے ظاہر ہے کہ اہل اسلام اور ان کے ساتھ عیسائی بھی قیامت تک دنیا میں قائم رہنے والے ہیں اور عجب نہیں کہ حق و باطل کے یہ دو حریف قیامت تک باہم کشمکش میں مبتلا رہیں، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے مسلمانوں کو غلبہ عام حاصل ہو جائے، جیسا کہ نزول مسیح علیہ السلام کی حدیثوں کا منشا بھی ہے۔

قرآن پاک کے ان اشارات النص کی تصریح احادیث نبوی میں استفاضہ کے درجہ تک ہے:

((لا تزال من امتي امة قائمة بامر اللّٰه لا يضرهم من خذلهم ولا من خالفهم حتى يأتيهم امر اللّٰه وهم على ذلك)) ❹

''میری امت کا ایک گروہ اللہ کی شریعت کو لے کر قائم رہے گا، اس کے چھوڑنے والے اور اس کے مخالف اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی بات یعنی قیامت آ جائے گی اور وہ اسی پر قائم رہیں گے۔''

((لايزال ناس من امتي ظاهرين حتى يأتيهم امر اللّٰه وهم ظاهرون)) ❺

''میری امت کے کچھ لوگ ہمیشہ غالب رہیں گے، یہاں تک کہ اللہ کی بات یعنی قیامت آ جائے گی۔''

((لا يزال من امتي قوم ظاهرين على الناس حتى يأتيهم امر اللّٰه)) ❻

''میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ غالب رہے گا، یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی۔''

((لا يزال من امتي امة قائمة بامر اللّٰه لايضرهم من كذبهم ولا من خذلهم

---

❶ تفسیر بغوی، ص: ۳۶۷ و تفسیر خازن تفسیر آیت مذکورہ، ج ۲، ص: ۲۶۳۔ ❷ تفسیر ابن جریر تفسیر آیت مذکورہ، ج ۳، ص: ۱۸۵، ۱۸۶۔ ❸ تفسیر روح المعانی تفسیر آیت مذکورہ، ج ۳، ص: ۱۶۲۔

❹ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ: ۳۶۴۱۔ ❺ ایضاً: ۳۶۴۰۔

❻ ایضاً، کتاب التوحید: ۷۴۵۹۔

حتی یأتی امر اللّٰہ وھم علٰی ذلک)) ❶

”میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ احکام الٰہی کو لے کر قائم رہے گا اس کے جھٹلانے والے اور اس کے چھوڑنے والے اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی۔“

((لا تزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق لا یضرھم من خذلھم حتی یأتیھم امر اللّٰہ وھم کذلک)) ❷

”میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر غلبہ کے ساتھ قائم رہے گی، اس کے مخالف اور اس کے چھوڑنے والے اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی۔“

((لن یبرح ھذا الدین قائمًا یقاتل علیہ عصابۃ من المسلمین حتی تقوم الساعۃ)) ❸

”یہ دین اسلام ہمیشہ قائم رہے گا اس کے لیے مسلمانوں کی ایک جماعت ہمیشہ لڑتی رہے گی، یہاں تک کہ قیامت آ جائے۔“

((لا تزال طائفۃ من امتی یقاتلون علی الحق ظاھرین الٰی یوم القیامۃ)) ❹

”میری امت کا ایک گروہ قیامت تک حق پر لڑتا رہے گا اور اپنے دشمنوں پر غالب رہے گا۔“

((لا تزال طائفۃ من امتی قائمۃ بامر اللّٰہ لا یضرھم من خذلھم او خالفھم حتی یأتی امر اللّٰہ وھم ظاھرون علی الناس)) ❺

”میری امت میں سے کچھ لوگ ہمیشہ احکامِ الٰہی کو لے کر قائم رہیں گے، ان کو چھوڑنے والے اور مخالف کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی۔“

((ولا تزال عصابۃ من المسلمین یقاتلون علی الحق ظاھرین علٰی من ناواھم الٰی یوم القیامۃ)) ❻

”مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر ہمیشہ لڑتی رہے گی اور قیامت تک اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی۔“

((لا تزال عصابۃ من امتی یقاتلون علی امر اللّٰہ قاھرین لعد و ھم لا یضرھم من خالفھم حتی یأتیھم الساعۃ وھم علٰی ذلک)) ❼

”میری امت کی ایک جماعت اللہ کی شریعت کے قائم کرنے پر لڑتی اور اپنے دشمنوں کو دباتی

❶ صحیح بخاری، کتاب التوحید: ۷۴۶۰۔ ❷ مسلم کی تمام روایتیں صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب قولہ ﷺ: ((لاتزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق)): ۴۹۵۰۔ ❸ ایضا: ۴۹۵۳۔ ❹ ایضا: ۴۹۵۴۔ ❺ ایضا: ۴۹۵۵۔ ❻ ایضا: ۴۹۵۶۔ ❼ ایضا: ۴۹۵۷۔

رہے گی، اس کے مخالف اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آ جائے اور وہ اسی غلبہ کی حالت میں رہیں گے۔''

یہ حدیثیں صرف صحیحین کی ہیں، حدیث کی دوسری کتابوں میں جیسے مستدرک حاکم، جامع ترمذی، سنن نسائی، ابو داود، ابن ماجہ، ابن حبان میں بھی اس معنی کی حدیثیں مذکور ہیں۔ [1] اس سے اندازہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے ہماری تسکین کی خاطر کے لیے کس شدت اور کس وضاحت کے ساتھ یہ پیشین گوئی فرما دی ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے ظاہری و باطنی غلبہ اور قوت کے ساتھ قیامت تک قائم رہے گا، تاکہ حق کا پیغام قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آئندہ کسی جدید نبی کی بعثت نہ ہوگی اور یہ فرض جو پہلے انبیا علیہم السلام کے ذریعہ عطا ہوتا تھا، وہ ہر دور میں مسلمانوں کی ایک جماعت انجام دے گی ایک حدیث ہے: ((العلماء ورثة الانبياء)) [2] یعنی امت محمدی کے علماء انبیا کے وارث ہیں، ظاہر ہے کہ یہ وراثت نبوت کے عہدہ اور منصب میں شامل نہیں ہے کہ یہ خاتم النبیین علیہ السلام کی ذات اقدس پر ختم ہو گیا، بلکہ نبوت کے فضائل و کمالات و فرائض سے ان کے حسب استعداد و مرتبہ حصہ ملے گا اور وہ تبلیغ دین، ہدایتِ خلق، دعوتِ حق، اقامتِ دین، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دفعِ شبہات، ابطالِ مبطلین اور ردِ بدعات وغیرہ ہیں اور وہ یہی کام انجام دیں گے۔

علمائے امت کے علاوہ صلحائے امت بھی یہی درجہ رکھتے ہیں، چنانچہ ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قیامت کے دن جب حضورِ انور ﷺ کی شفاعت سے ساری امتوں کے سر سے قیامت کی پہلی مصیبت دور ہوگی، تو یہ امتیں بیک زبان امت محمدیہ کے متعلق یہ شہادت دیں گی۔

كادت هذه الامة ان تكون انبياء كلها. [3]

''قریب ہے کہ اس امت کے سارے افراد انبیا کا مرتبہ پائیں۔''

ایک حدیث میں اس کی تشریح آئی ہے کہ اس امت کو یہ رتبہ اس طرح حاصل ہوا کہ شهداء على الامة یعنی اپنی اپنی امت پر شاہد ہونے کا مرتبہ جس طرح انبیائے کرام صلوٰۃ اللہ علیہم کو حاصل ہوا، اسی طرح اس امت کو شهداء على الناس کا مرتبہ عنایت ہوا ہے، صحیح احادیث میں ہے کہ ''قیامت کے دن ساری امتوں پر شہادت کا کام امت محمدیہ سے لیا جائے گا۔'' [4] یہ شاید اس لیے ہوگا کہ امت محمدیہ ہی وہ امت ہے جو سارے پیغمبروں کی صداقت پر ایمان لائی ہے، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے حکیم ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے:

---

[1] دیکھئے کنز العمال، ج ٦، ص: ٢٣١، ٢٣٥۔ [2] یہ حدیث مسند احمد اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بطرق متعددہ مروی ہے اور محدثین نے اس لیے اس کو معتبر مانا ہے دیکھئے المقاصد الحسنة سخاوی، ص: ١٣٥ وكشف الخفاء عجلونی، ج ٢، ص: ٦٤۔ یہ حدیث شعب الایمان بیهقی: ١٦٥١؛ صحیح ابن حبان: ٨٨؛ مسند الشهاب: ٩٠٨؛ احمد، ٥/ ١٩٦۔ [3] مسند طیالسی، ج ١، ص ٣٥٤، عن ابن عباس ومسند احمد وابو یعلی۔ [4] حافظ ابن کثیر نے قرآن کے دوسرے پارہ میں ﴿لتكونوا شهداء على الناس﴾ کی تفسیر میں ان روایتوں کو یک جا کر دیا ہے۔ ج ١٩٠، ١٩١۔

''اس امت کو ایسی باتیں ملی ہیں جو کسی کو نہیں ملیں، ان میں سے ایک یہ کہ اس امت سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (٤٠/ المؤمن:٦٠)

''مجھے پکارو، میں تمہیں جواب دوں گا، یا مجھ سے مانگو میں دعا قبول کروں گا۔''

حالانکہ یہ مرتبہ پہلے صرف انبیا کو حاصل تھا اور دوسری یہ کہ ان سے کہا گیا:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (٢٢/ الحج:٧٨)

''اللہ تعالیٰ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی۔''

اور یہ بھی صرف انبیا کو کہا گیا تھا اور تیسری یہ کہ ان سے کہا گیا:

﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (٢/ البقرة:١٤٣)

''ہم نے تم کو بیچ کی امت یا شریف و معزز امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر شاہد ہو۔''

یہ بھی پہلے صرف نبیوں سے کہا گیا تھا کہ تم اپنی امت پر شاہد ہو۔ [1] اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اس روایت میں امت محمدیہ کی جو پیغمبرانہ فضیلتیں بیان کی گئی ہیں، وہ درحقیقت قرآنی آیتوں سے مؤید ہیں، قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں یہ مضمون دہرایا گیا ہے کہ امت محمدیہ کو شہادۃ علی الناس اور شہادۃ علی الامم کی فضیلت بخشی گئی ہے۔

''شہید اور شاہد'' کے لغوی معنی ''حاضر'' کے ہیں، کسی شخص کا کسی شخص کے پاس حاضر ہونا یا حاضر رہنا مختلف اغراض سے ہو سکتا ہے، مثلاً: اس کی حمایت اور مدد کے لیے، اس کی ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے کے لیے اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے، اس کے متعلق کسی واقعہ کی گواہی اور اس کے دعویٰ کی تائید کے لیے، اس کو امورِ خیر کی تعلیم اور شر سے بچانے کے لیے، اسی لیے لغت کے اصول سے لفظ شہید اور شاہدان ثانوی معنوں میں حسب سیاق و سباق بولا جاتا ہے، جس کا اندازہ حسب ذیل آیتوں سے ہوگا:

① حمایتی اور مددگار کے معنی میں:

﴿وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ﴾ (٢/ البقرة:٢٣)

''اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بلاؤ (کہ قرآن کا جواب لائیں)۔''

اس معنی کی تائید ایک دوسری آیت سے ہوتی ہے:

﴿وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا﴾ (١٧/ بنی اسرآءیل :٨٨)

''اگرچہ (اس قرآن کے جواب لانے میں) یہ لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔''

② ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے والے کے معنی میں:

[1] تفسیر فتح البیان میں نواب صدیق حسن خان نے اس روایت کا کچھ حصہ نقل کیا ہے۔ دیکھئے، ج ۱، ص:۱۹۴۔

﴿ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾ (۲۲/ الحج:۱۷)

''اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔''

ان معنی کی آیتیں قرآن پاک میں کئی ہیں۔

③ کسی کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے والے کے معنی میں:

﴿ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۱۷)

''(حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں) میں اپنی امت پر، جب تک ان میں رہا، نگران رہا۔''

④ گواہ اور دعویٰ کی تائید کرنے والے کے معنی میں:

﴿ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴾

(۴/ النسآء:۴۱)

''بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے گواہ کو بلائیں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے۔''

⑤ امور خیر کی تعلیم، یا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے والے کے معنی میں:

﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۴۳)

''اور اسی طرح تم کو معتدل امت بنایا، تاکہ تم لوگوں کے بتانے والے ہو اور یہ رسول تمہارا بتانے والا ہو۔''

اسی معنی کی تائید قرآن کی دوسری آیت سے ہوتی ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۱۰)

''قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئی، ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی باتوں کو بتاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو۔''

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ امت محمدیہ جو آخری امت ہے، اس لیے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آخری شاہد کے طور پر اس دنیا میں پیغمبروں کے کاموں کو انجام دے، وہ نبی کے دعویٰ کی شاہد، حمایتی، مددگار اور گواہ ہے، وہ دنیا کی ساری قوموں کی نگران کار بنا کر بھیجی گئی ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ قیامت تک قوموں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے، اب نبیوں کا سلسلہ منقطع ہوگیا کہ دینِ الٰہی کامل ہو چکا پیغامِ الٰہی کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے اور اس کی تبلیغ اور اشاعت کا فرض امت محمدیہ

کے سپرد ہو گیا ہے، اب یہ تنہا اس کے ذمہ ہے کہ قیامت تک تمام دنیا میں کلمہ الٰہی کی بلندی، حق کی اشاعت، دین کی تبلیغ، نظامِ عدل کی برقراری اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے۔ رسول علیہ السلام اس کے امام و پیشوا ہیں اور وہ خود ساری امتوں کی پیشوا و امام ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ ان کی امامت اور پیشوائی کرے، چنانچہ قیامت کے دن اس کی یہی فضیلت تمام انبیا کی امتوں پر شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگی، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام بلائے جائیں گے، وہ حاضر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نے اپنی امت کو تبلیغ کی تھی؟ وہ عرض کریں گے: ہاں میرے رب، پھر اللہ تعالیٰ ان کی امت سے پوچھے گا کہ کیا انہوں نے تم کو تبلیغ کی، وہ انکار کریں گے کہ ہمیں تو کوئی ڈر سنانے والا نہیں آیا، تب اللہ تعالیٰ نوح علیہ السلام سے پوچھے گا، تمہارے دعویٰ کی شہادت کون دیتا ہے؟ وہ عرض کریں گے محمد ﷺ اور ان کی امت، تو یہ نوح علیہ السلام کی شہادت دیں گے۔'' یہ ارشاد فرما کر حضورِ انور ﷺ نے یہ آیت پڑھی ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ﴾ الخ ''یعنی تم کو معتدل و عادل امت بنایا، تا کہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔'' [1]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں مسند احمد و مستدرک حاکم وغیرہ سے اور متعدد حدیثیں نقل کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا نام یہاں مثالاً ہے، ورنہ امتِ محمدیہ کی یہ شہادت دنیا کی ساری امتوں پر ہوگی، اس کا سبب ظاہر ہے کہ دنیا میں یہی ایک امت ہے جو تمام انبیا علیہم السلام اور ان کی کتابوں کی صداقت کی شاہد ہے، اس شہادت کے بغیر کوئی شخص اس امت میں داخل ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ ان کے ایمان کا جزو ہے، یہی ایمان جو شہادت کے ہم معنی ہے، قیامت میں نبیوں کی صداقت کی تائید میں ان کی امتوں کے مقابلہ میں شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

سورۂ حج میں سورۂ بقرہ کی اس آیت کی مزید تائید ہے:

﴿ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ ﴾ (۲۲/ الحج:۷۸)

''اسی اللہ نے (اے امت محمدیہ ﷺ) تم کو (ساری امتوں) میں چنا ہے اور اللہ نے تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی، تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا دین، اسی نے تمہارا نام مسلم پہلے رکھا اور اس قرآن میں بھی، تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر۔''

اوپر کی تین آیتوں میں امت محمدیہ کے تین وصف بیان ہوئے ہیں، اُمَّةً وَّسَطًا، ''عادل و معتدل امت''

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ البقرۃ: ٤٤٨٧۔

خَيْرَ اُمَّةٍ ''سب سے بہتر امت'' هُوَاجْتَبٰكُمْ ''تم کو اللہ نے چنا ہے'' یہ تینوں وصف اس امت کی برگزیدگی، برتری اور فضیلت پر شاہد ہیں، بلکہ وصف اجتبـــاکـــم ''تم کو چنا اور برگزیدہ کیا'' تو ایسا ہے کہ اس کا اطلاق انبیا علیہم السلام پر کیا گیا ہے۔

اس امت محمدیہ کی ساری امتوں پر شہادت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس امت کے شاہد عادل حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، جو قیامت تک کے لیے آخری نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں، اس لیے دنیا کی ساری امتیں خواہ وہ اپنے کو کسی بھی سابق نبی کی طرف منسوب کریں، وہ نبی ﷺ کی امت دعوت ہیں، حضورِ انور ﷺ نے اپنی زندگی میں دعوت کے اس فرض کو انجام دیا، آپ ﷺ کے بعد عہد بعہد قیامت تک اس پیغامِ الٰہی کی دعوت وتبلیغ امتِ محمدیہ کا فرض قرار پایا، جب تک دنیا آباد ہے، ہر ملک میں، ہر قوم میں، دنیا کے ہر گوشے میں اس پیغام الٰہی کی دعوت وتبلیغ تا بہ قیامت امتِ محمدیہ کا فریضہ ہے، یہی بعض علمائے محققین کی اصطلاح میں امت محمدیہ کی بعثت ہے، جس کی تعبیر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ نے حسب ذیل فرمائی ہے:

''تمام انبیا علیہم السلام میں سب سے بڑا رتبہ اس نبی کا ہے جس کو بعثت کی ایک اور دوسری نوع بھی حاصل ہوتی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کو لوگوں کے تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے کا ذریعہ بنائے اور اس کی قوم کو ایک ایسی امت بنایا جائے جو دوسری قوموں کی اصلاح کا ذریعہ بن جائے، تو اس نبی کی بعثتِ اولیٰ اس کی بعثتِ ثانیہ کو بھی شامل ہو جاتی ہے۔'' [1]

شاہ صاحب کا منشا یہ ہے کہ نبی کی بعثتِ اولیٰ اس کی قوم کی اصلاح اور تزکیہ کے بعد اس کو اس نبی کے احکام وتعلیمات وآداب کا سراپا نمونہ بنا دیتی ہے اور پھر وہ قوم اپنے نبی کا پیغام لے کر جو اس کو پہنچا ہے، دنیا کی دوسری قوموں میں پھیل جاتی ہے اور اس سے دنیا کی دوسری قومیں ہدایت پا کر اور قوموں کی طرف مبعوث ہوتی ہیں اور اسی طرح یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نبی کی بعثتِ اولیٰ کی خبر تو اس آیت میں ہے:

﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ (٦٢/ الجمعة:٢)

''وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول ان ہی کے اندر سے بھیجا۔''

اور امت کی بعثت کا بیان اس آیت میں ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ (٣/ آل عمران:١١٠)

''قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں، ان سب میں تم بہتر ہو۔''

اور حدیث صحیح میں اس بعثت کی تصریح ان الفاظ میں ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

---

[1] حجة الله البالغة، باب حقيقة النبوة وخواصها، ج١، ص: ٦٧۔

((فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ)) [1]

”تم لوگ آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو اور دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔“

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمد یہ ایک پیغام حق کی حامل ہے اور اپنے رسول کی طرف سے دعوت وتبلیغ پر مامور ہے، وہ اس لیے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی اصلاح وتزکیہ کی خدمت انجام دے اور اپنے نبی کے پیغام کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلائے، حضور انور ﷺ کا حجۃ الوداع میں اخیر حکم:

((فيبلغ الشاهد الغائب)) [2]

”میرے پیغام کو جو یہاں موجود ہے، وہ اس تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں۔“

صرف حضور انور ﷺ کے عہد مبارک تک کے لیے محدود نہیں، بلکہ قیامت تک کے لیے یہ جاری و ساری ہے، فرمایا گیا کہ ہر حاضر دوسرے غیر حاضر کو اسی طرح پہنچاتا چلا جائے، ذیل کی آیت پاک کا بھی یہی منشا ہے:

﴿ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴾ (۹/ التوبة:۱۲۲)

”تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے، تاکہ دین کا علم سیکھتے اور اس میں سمجھ پیدا کرتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈر سناتے، تاکہ وہ حذر کرتے۔“

داعیوں کی بعثت قیامت تک یوں ہی قائم رہے گی:

اور یہی منشا اس آیت کا بھی ہے جو پہلے بھی گزر چکی ہے، جیسا کہ شاہ صاحب نے فرمایا ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۱۰)

”قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں، ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی باتوں کو بتاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

لیکن اس سے معلوم ہوا کہ امت کا یہ شرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ترک نہ کرے اور ایمان باللہ سے محروم نہ ہو جائے، بلکہ ایمان باللہ سے معمور ہو کر خیر کی اشاعت اور شر کی ممانعت کے لیے سرفروشی کرے اور اسی لیے اس سے چند آیت پہلے یہ حکم بھی وارد ہے:

[1] صحيح بخاري، كتاب الادب، باب قول النبي ﷺ: ((يسروا ولا تعسروا)): ٦١٢٨ وحجة الله البالغة، ج١، ص: ٦٧۔ [2] صحيح بخاري، كتاب العلم: ١٠٤ ومسلم، كتاب الحج: ٣٣٠٤۔

﴿ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۰٤)

''اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ امتِ محمدیہ کی فلاح اس امر معروف اور نہی منکر اور دعوت و تبلیغ میں مضمر تھی، جس سے ہر دور میں نئی نئی قومیں اسلام کی آغوش میں اپنا اپنا خون لے کر آئیں اور اسلام کی صولت و شوکت کو مسلسل قیام و بقا بخشتی رہیں، لیکن جب سے مسلمانوں نے امت کو قوم کے معنی میں سمجھ لیا، امت بانجھ ہوگئی اور دوسری قوموں کا داخلہ اس میں بند ہوگیا، مگر انشاء اللہ یہ وعدہ الٰہی پورا ہو کر رہے گا کہ اگر ایک قوم اپنے فرض سے غافل رہے گی تو دوسری قوم آ کر اس فرض کو ادا کرے گی:

﴿ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا ؕ ﴾

(۹/ التوبة:۳۹)

''اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا اور تمہاری جگہ اور لوگوں کو پیدا کر دے گا (جو اللہ کے پورے فرماں بردار ہوں گے) اور تم اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے۔''

پھر فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ ﴾ (۵/ المآئدة:۵٤)

''اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔''

معلوم ہوا کہ نئی جگہ لینے والی قوم کی صفتیں یہ ہوں گی، اللہ تعالیٰ اس سے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھے گی، اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرے گی، کفار کے مقابلہ میں سخت ہوگی، اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے ہمیشہ آمادہ رہے گی، اظہارِ حق میں کسی ملامت کی پروانہ کرے گی۔ اس بعثت سے مشرف اور قوموں کی شاہد بن کر آنے والی امت کے آثار اور فرائض کی پوری تفصیل سورۂ حج کے آخر کی آیتوں میں ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ۚ

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ ۖ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴾ (۲۲/ الحج:۷۷۔۷۸)

''مومنو! رکوع کرتے اور سجدہ کرتے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو اور نیک کام کرو تاکہ فلاح پاؤ اور اللہ کی (راہ) میں جہاد کرو، جیسا جہاد کرنے کا حق ہے، اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی (اور تمہارے لیے) تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا دین (پسند کیا) اسی سے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا اور اس کتاب میں بھی (وہی نام رکھا ہے) تاکہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں اور تم لوگوں کے مقابلہ میں شاہد ہو اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کے (دین کی رسی) کو پکڑے رہو، وہی تمہارا دوست ہے اور خوب دوست اور خوب مددگار ہے۔''

ان آیتوں سے اس شاہد امم اور مجتبائے عالم امت کے حسب ذیل آثار و علامات ہیں:

1. ادائے نماز کی سختی سے پابندی کرنے والی۔
2. ادائے زکوٰۃ پر عامل۔
3. ایمان باللہ اور توکل علی اللہ سے پوری طرح مضبوط۔
4. رکوع و سجود و عباداتِ الٰہی کی خوگر۔
5. امورِ خیر پر حریص۔
6. راہِ حق میں جہاد اور فدا کاری پر آمادہ رہنے والی۔

امتِ محمدیہ کے جس گروہ میں یہ علامات پائی جائیں گی، وہی ان شاء اللہ تعالیٰ ان پیشین گوئیوں کا مصداق ہوگا، اس کی بقا اور قیام اور غلبہ و شوکت کے متعلق اوپر بیان ہوئی ہیں اور اسی سے حق تعالیٰ کا وعدہ ہے۔

قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ

کسی جماعت کو منظم جماعت بنانے اور اس کی حفاظت کے لیے کسی قانون کو چلانے اور پھیلانے کے لیے ایک قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ کی ضرورت فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے، اسی لیے جب سے انسانیت کی تاریخ معلوم ہے، کوئی ایسی جماعت نہیں بتائی جا سکتی جو کسی سردار کے بغیر وجود میں آئی ہو، انسانی گروہ جب محض ایک خاندان تھا تو خاندان کا بڑا اس کا سردار تھا اور اس کی زبان کا ہر حکم قانون تھا، جب خاندان نے جماعت کا روپ بھرا تو جماعت کا چودھری اس کا حاکم و آمر بنا، پھر جماعت نے آگے بڑھ کر قوم کی صورت اختیار کی تو بادشاہوں اور راجاؤں نے جنم لیا، ان بادشاہوں اور راجاؤں نے اس عزت اور شرف کو اپنی خدمت گزاری کا صلہ سمجھنے کے لیے اپنے غرور و استکبار سے اپنا خاندانی حق سمجھا یا مافوق بشر قویٰ سے اپنے کو متصف قرار دیا، اس خیال کا لازمی نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے کو دیوتاؤں کی اولاد ظاہر کیا، جن کی پوجا ان کی رعایا پر فرض تھی، ان میں سے کوئی سورج بنسی بنا اور کوئی چندر بنسی، یعنی کوئی سورج دیوتا کا نور نظر تھا اور کوئی چاند کا ٹکڑا اور دیوتاؤں کے اوتار اور قوتِ ربانی کے اوتار تو سب ہی تھے۔

عراق کے نمرود جبار بن گئے تھے اور مصر کے فرعون اپنے کو رَعْ یعنی سورج دیوتا کے اوتار کہتے تھے، ان ہی میں ایک فرعون وہ تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ ''میں ہوں تمہارا سب سے بڑا دیوتا'' بننے کا دعویٰ کیا تھا، چین کے بادشاہ اپنے کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے، اسی لیے ایرانیوں نے اپنی زبان میں ان کو بغپور (اللہ کا بیٹا) اور عربوں نے ابن ماء السماء (آسمان کے نطفہ کا پیدا) کا خطاب دے رکھا تھا یونان کی قدیم تاریخ بھی ایسے بادشاہوں سے خالی نہیں جو اپنے کو اللہ کا اوتار کہتے تھے، ہومر کے بادشاہ (مونارک) دیوتاؤں کی اولاد تھے اور ان ہی سے یونان کے سلاطین پیدا ہوئے۔ [1] اس روشنی کے زمانہ میں بھی اس زمین میں جو سورج کا مطلع کہلاتی ہے، یعنی جاپان میں یہ اندھیرا چھایا ہے کہ وہاں کا بادشاہ جاپانی قوم کا اللہ ہے جس کی وہ پوجا کرتی ہے۔

روما کا بانی رولس اور اس کا بھائی دونوں ستارہ مریخ کی اولاد تھے۔ [2] ولادتِ مسیح علیہ السلام کے پہلے سے سلاطین روما عوام کی نگاہوں میں دیوتا سمجھے جاتے تھے اور ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ [3] یہودیوں میں حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے قاضیوں کی حکومت تھی جو اللہ کے کاہن اور اللہ سے الہام پا کر اللہ کے نام پر حکومت کرتے تھے، اس کے بعد زمانہ کی گردش اور حالات کے تقاضے سے مختلف قسم کی حکومتیں دنیا میں قائم ہوتی رہیں، ان ہی سب کے پیشِ نظر اربابِ تاریخ اور علمائے سیاست نے حکومت کی متعدد قسمیں قرار دی ہیں، مثلاً اوتاری، شخصی، زعیمی، امرائی، دستوری، جمہوری۔

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم، مضمون یونان۔ [2] تاریخ روما، ص:۳۰، دارالترجمہ حیدرآباد دکن۔ [3] ایضاً، ص:۴۲۹۔

① اوتاری سے مفہوم تھیا کریسی ہے، یعنی وہ حکومت جس میں صاحبِ حکومت کوئی ایسا شخص ہو جو خود اللہ یا اللہ کا مظہر یا اوتار یا نائب بن کر حکومت کرتا ہو اور اس کی رعایا بھی اس کو اسی نظر سے دیکھتی اور اسی عقیدت سے اس کو مانتی ہے۔

② شخصی وہ حکومت ہے جس میں تنہا ایک شخص صرف اپنی ذاتی طاقت یا خاندانی قوت واثر سے حکومت کرتا ہو اس کی خواہش اس کا قانون اور اس کی زبان اس کا فرمان ہو، دنیا میں اکثر بادشاہ ایسے ہی گزرے ہیں۔

③ اور اگر ملک کے باوقار اور دولت مند افراد مل کر ملک پر حکمرانی کریں تو یہ امرائی حکومت ہے، جیسی کبھی یونان میں تھی۔

④ اگر کوئی شخص اپنی سیاسی طاقت اور وضع قانون کی قوت کو اپنی قوم کے منتخب افراد کے ہاتھ میں دے کر خود کو صرف ظاہری بادشاہ کی حد تک محدود کر دے تو یہ حکومت دستوری ہے، جس طرح انگلستان میں ہے کہ وہاں بادشاہ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

⑤ زعیمی (آمرانہ) وہ طرزِ حکومت ہے جس میں کوئی بھی شخص اپنی ذاتی طاقت سے یا کسی جماعت کا رکن اور روح رواں بن کر اس کے نمائندے کی حیثیت سے ملک پر حکمران ہوتا ہے، مثلاً: جرمنی میں ہٹلر، اٹلی میں مسولینی، گو وہ بادشاہ نہیں تھے، مگر ان کا حکم بادشاہ ہی کے طور پر مانا جاتا تھا، فرق اتنا تھا کہ یہ کسی خاندان کے نہیں بلکہ جماعت کے نمائندہ تھے۔

⑥ اور اگر ملک کے ہر طبقہ کے افراد مل کر خود اپنے لیے کسی مدت معینہ کے لیے اپنا ایک رئیس منتخب کر لیں، جو خاص قواعد کے ماتحت حکومت کرے تو یہ جمہوری ہے، اس کی ایک صورت وہ ہے جو فرانس میں ہے۔ اور دوسری وہ جو امریکہ میں ہے، فرانس کی جمہوریت کا رئیس اسی طرح کم اختیار رکھتا ہے، جس طرح انگلستان کا بادشاہ کم اختیار رکھتا ہے، انگلستان میں حکومت کی ذمہ داری مجلس کی نگرانی میں وزیرِ اعظم پر ہوتی ہے اور امریکہ میں وزیروں کا کوئی سلسلہ نہیں ہے، خود رئیس ایک مجلس کی نگرانی میں حکومت کرتا ہے اور رئیس کے مددگار مختلف شعبوں کے سیکرٹری ہوتے ہیں، اسی جمہوریت کی ایک شکل روس کی جمہوریہ اشتراکیہ شورائیہ بھی ہے جو مزدوروں اور کسانوں کی مختلف انجمنوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔

اوپر کی سطروں میں حکومت کی تقسیم مختلف ملکوں کی حکومتوں کی تاریخ پر اجمالی نظر ڈال کر کی گئی ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ انسانوں نے اپنے سیاسی امراض کے لیے اب تک علاج کے کون کون سے نسخے اور طریقے استعمال کیے ہیں۔

اسلام کے طرزِ حکومت پر جب بھی غور کیا گیا ہے تو اس طرح سے کہ جس زمانہ کے ماحول میں اس پر غور کیا گیا ہے، اسی کے مطابق اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، سیاسیین یورپ نے اسلامی خلافت کو

مذہبی یا اوتاری حکومت کا خطاب دیا، پرانے علما جو شخصی سلطنتوں کے خوگر ہیں، اس کو شخصی بتاتے ہیں، نئے لوگوں نے انگریزوں کے نمونہ کو دیکھ کر اس کو دستوری بتایا، پھر جب جمہوریتوں پر نظر پڑی تو اس کو جمہوریت کہنے میں تامل نہیں کیا، پچھلی جنگ کے بعد جب اشتراکیت نے پاؤں پھیلائے اس کو اشتراکیہ کہنے کی بھی جرأت کی گئی اور اس کے بعد جب موجودہ زعیمی حکومت (ڈکٹیٹرشپ) قوت پکڑ رہی ہے اس کو زعیمی حکومت (ڈکٹیٹرشپ) ثابت کرنے کے لیے میلان پیدا ہو رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام نے اپنے اولین دور میں عملاً جس طرز کی حکومت قائم کی اور جس قسم کی مثالیں اور تعلیمیں اس نے پیش کیں ان کی روشنی میں اسلامی حکومت کا جو تصور قائم ہوتا ہے، اس میں بیک وقت مذہبی، شخصی، دستوری، جمہوری اور زعیمی حکومتوں کی خصوصیات اور مظاہر نظر آتے ہیں، اس لیے اہلِ نظر اپنے اپنے مذاق کے اعتبار سے اس کی تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ ہی کے ذریعہ ظہور میں آیا اور اسلام ہی نے اس کو پیش کیا ہے وہ نہ اوتاری ہے، نہ شخصی ہے، نہ دستوری ہے، نہ جمہوری ہے اور نہ زعیمی ہے، بلکہ ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جس میں ان سب کے خصوصیات و فضائل تو یکجا ہیں، لیکن وہ ان کے قبائح و مثالب سے خالی ہے، اس لیے وہ دیکھنے والوں کو کبھی خدائی، کبھی شخصی، کبھی زعیمی، کبھی دستوری اور کبھی جمہوری بلکہ اشتراکی نظر آتی ہے، لیکن اگر اس کے اصل رخ سے دیکھئے اور اس کے ایک ایک خط وخال کا جائزہ لیجیے تو اس کی شکل سب سے الگ نظر آئے گی۔

اسلام کی سلطنت تمام تر مذہبی احکام پر قائم ہے، مگر اس کا امیر یا خلیفہ نہ اللہ ہے، نہ اللہ کا اوتار ہے، نہ اللہ کا مظہر ہے، نہ اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے، نہ اللہ سے براہِ راست احکام پاتا ہے، نہ اس میں کوئی الٰہی تقدیس ہے، نہ وہ اللہ کی طرف سے مقرر ہوتا ہے، بلکہ وہ انسان ہوتا ہے جس کو مسلمانوں نے اپنی رائے سے یا سابق امیر نے امت کی سرداری اور اللہ کی شریعت کی تنفیذ کے لیے اس کو منتخب کیا ہے، تاہم اسلام کی حکومت کو اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام پر مبنی ہے جو رسول ﷺ کے ذریعہ سے اس کو ملے ہیں، اس کو الٰہی ہی کہا جا سکتا ہے اور اس بنا پر کہ اسلام کی حکومت میں اربابِ شوریٰ اور اہلِ حل وعقد کا گروہ مانا گیا ہے اور شوریٰ اور باہمی مشورہ کی تاکید ہے، اس کو تسامحاً دستوری کہہ دینا ممکن ہے اور اس سبب سے کہ اس کے خلیفہ کا انتخاب افرادِ امت کے جانب سے بھی ہوتا ہے اور اس کو حکومت کے حقوق اور فوائد میں امت کے عام افراد سے ایک ذرہ بھی تفوق حاصل نہیں ہوتا، لوگ جمہوری سمجھ سکتے ہیں اور اس خیال سے کہ خلیفہ کے احکام شرعی کی اطاعت امت پر واجب ہے اور وہ امت کے مشوروں کے ماننے پر قطعاً مجبور نہیں، اس کو شخصی کہہ دینا ممکن ہے اور اس نظر سے کہ خلیفہ کے ہر جائز حکم اور صوابدید پر بے چون و چرا عمل کرنا امت کے لیے ضروری ہے، اس کو زعیم یعنی ڈکٹیٹر سمجھا جا سکتا ہے، لیکن ان مختلف جہتوں کی بنا پر ظاہر ہے کہ مغربی اہلِ سیاست کے بنائے ہوئے

نظریات حکومت میں سے ایک نظریہ بھی اسلامی طریق حکومت پر پوری طرح صادق نہیں آ سکتا۔

اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی اور اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے، اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کا طریقہ، ارباب شوریٰ کی ترتیب اور تعیین ان کے فرائض و حقوق، ان کے انتخاب، اظہار رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں، اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور ان کے ارکان و عمال کا تقویٰ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی و ایمانی احساس اور اس حقیقت کی تلقین ہے کہ حکومت کا کوئی جزو کسی شخصی یا خاندانی ملکیت نہیں، بلکہ وہ اللہ کی ملکیت ہے اور اسی کے حکم یا منشائے حکم کا نفاذ حکومت کا فرض ہے اور اللہ کے بنائے ہوئے اور تعلیم کیے ہوئے احکام و فرائض میں سب مسلمانوں کی حیثیت یکساں ہے اور سب ہی ایک جیسے اس کے بندے اور تابع فرمان ہیں۔

عام سلطنتوں کا اصول یہ ہے کہ وہ سلاطین و حکام اور سلطنت کے عمال کے قول و فعل کو قانون کے سلسلوں سے جکڑ دیتی ہے کہ وہ حق و عدل کے خلاف نہ کر سکیں، لیکن اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اور عاملوں کے دلوں پر اپنا قبضہ بٹھاتی ہے، تاکہ تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کے خوف اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے جذبہ سے حق اور عدل کے خلاف نہ کر سکیں، عام حکومتیں ہر روز اپنے ہر قانون کی لاچاری اور بے اثری کو دیکھ کر دوسرا قانون بناتی ہیں، پھر تیسرا اور چوتھا قانون، پھر اسی طرح ہر قسم کی برائیوں کی روک تھام کے لیے مسلسل قانون بناتی رہتی ہیں اور مجرم اس کو اپنی چالاکی اور ہوشیاری سے برابر توڑتے رہتے ہیں اور سلطنت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا، اس کے برخلاف اسلام کی سلطنت اگر اصول اسلام کے مطابق ہو تو صرف اللہ کا تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کا ڈر ان کے دل کی کجی اور عمل کی ہر برائی کو قطعاً ختم کر دیتا ہے، جس کی بے شمار مثالیں عہد نبوت، زمانہ خلافت اور بعض نیک و عادل سلاطین کی سلطنتوں میں ملتی ہیں، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ امت میں ایمان اور عمل صالح کی دعوت و تبلیغ برابر جاری رہے اور مسلسل تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت کے ذریعہ اس کو ہمیشہ قائم و باقی رکھا جائے، جس طرح آج تمدن اور کلچر کے نام سے یا دوسرے فلسفیانہ سیاسی یا اقتصادی نظریات کی بنا پر مختلف ملکوں میں تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت دی جا رہی ہے اور اسی کے معیار پر ہر سلطنت میں تعلیم و تربیت کا جداگانہ نظام قائم ہے، اسی طرح اس اسلامی نظام حکومت کی برقراری کے لیے بھی سب سے پہلے اسلامی نظام تعلیم و تربیت کے اجرا کی حاجت ہے۔

اسلامی روایات کی دوسری بنیادی اصل

حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے

قال اللہ تعالیٰ: ﴿ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ ﴾ (۱۲/ یوسف:۴۰)

''حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا۔''

آیت بالا میں ارشاد خداوندی ہے کہ حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا ہے، اس لیے اسلام میں حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ لیکن احکام الٰہی کی دو قسمیں ہیں، ایک تشریعی، یعنی وہ احکام جو انبیا علیہم السلام کے ذریعہ سے شریعت بن کر نازل ہوتے ہیں اور دوسرے تکوینی، یعنی وہ احکام جو فطری حیثیت سے مخلوقات عالم میں ودیعت رکھے گئے ہیں، ان دونوں قسموں کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی حاکم ہے اور اسی کا حکم جاری وساری ہے، دنیا میں ایسے بادشاہ گزرے ہیں، جنہوں نے نمرود و فرعون بن کر دعوائے بادشاہی کیا، مگر ان کو بھی تکوینی احکام الٰہی کے آگے سرنگوں ہو کر جان دینی پڑی اور یہ شبہ ان سلاطین عالم کو اس لیے پیش آتا ہے کہ وہ اپنے تشریعی احکام و فرامین کے آگے جب اللہ کے بندوں کو مطیع پاتے ہیں تو غرور سے تکوینی احکام کا آمر بھی اپنے کو جاننے لگتے ہیں، اسلام نے شک وشبہ کے اس رشتہ کو کاٹ ڈالا ہے، اس نے یہ قرار دیا ہے کہ دنیا کے سلاطین نہ تشریعی اختیار رکھتے ہیں اور نہ تکوینی زمین سے آسمان تک ساری بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور امر تکوینی ہو یا تشریعی اس میں اللہ ہی کا فیصلہ، فیصلہ ہے، اسی معنی کی قرآن پاک کی کئی آیتیں ہیں:

﴿ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ ﴾ (۱۲/ یوسف:۶۷)

''حکم نہیں، مگر اللہ کا۔''

﴿ اَلَا لَهُ الۡحُكۡمُ وَهُوَ اَسۡرَعُ الۡحٰسِبِيۡنَ ۝ ﴾ (۶/ الانعام:۶۲)

''ہاں، اسی کے لیے حکم کرنا ہے اور حساب کرنے والوں میں سب سے تیز ہے۔''

﴿ وَلَهُ الۡحُكۡمُ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ۝ ﴾ (۲۸/ القصص:۷۰)

''اسی کا حکم کرنا ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

امر تکوینی وفطری میں تو انسان کی ناچاری ومجبوری ظاہر ہے، وہ زمین، آسمان اور خاک و باد و آب و آتش اور جسم و جان میں ایک ذرہ کی کمی وبیشی بھی نہیں کر سکتا، نہ اشیاء کے خواص کو بدل سکتا ہے، نہ ان کی صفات میں تغیر کر سکتا ہے اور نہ ان کے قواعد وقوانین میں ایک ذرہ کی کمی و اضافہ کر سکتا ہے، خدائی احکام کے آگے سب ہی سرافگندہ اور ناچار ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں ایک بادشاہ نے جب خدائی کا دعویٰ کیا تو آپ نے اس کو اسی دلیل سے خاموش کر دیا۔ فرمایا:

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۵۸)

''تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو تو اس کو پچھم سے نکال، تو وہ کافر لا جواب ہوگیا۔''

حکومت و سلطنت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، دنیا میں بھی جو لوگ حاکم کہلاتے ہیں، وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش سے ہوتے ہیں:

﴿اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ﴾ (۳/ آل عمران:۲۶)

''اے اللہ سلطنت کے مالک تو ہے جس کو چاہے سلطنت دے۔''

اس لیے راہ صواب پر وہی ہیں جو اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکامِ تکوینی کی طرح اس کے احکامِ تشریعی کے بھی تابع سمجھتے ہیں اور جو یہ جانتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اسی لیے دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو دنیا میں اس کی شریعت کے مطابق جاری کریں، اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ احکام کے اجرا اور قوانین کے وضع کا اصلی حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، البتہ اس نے اپنی شریعت میں احکام اور قوانین میں جو کلیات اور قواعد بیان فرما دیے ہیں، ان کے تتبع سے اہلِ علم اور مجتہدینِ دین نئے نئے احکامِ جزئیہ مستنبط کر سکتے ہیں۔

ان احکامِ الٰہی کی نسبت اس حیثیت سے کہ ان میں عقلی مصلحتیں ہوں اور طبعی نفع و ضرر پر مشتمل ہوں، بے شبہ اہل عقل اپنی عقل و فہم سے فیصلہ کر سکتے ہیں، لیکن شریعت میں احکام کا مدار صرف اسی حیثیت پر نہیں ہے، بلکہ اس سے اہم حیثیت یہ ہے کہ ان میں سے کسی بات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا یا عدم رضا شامل ہے، یا یوں کہیے کہ کس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب یا عتاب ترتیب ہوتا ہے، اس کا حال صرف اللہ تعالیٰ کے ارشاد اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان ہی سے معلوم ہوسکتا ہے، اہل عقل اپنی ناقص عقل سے جو کچھ کہتے ہیں، اگر وہ حکم الٰہی کے مطابق نہیں ہے تو گو اس میں کچھ ظاہری مصلحتیں ہوں، مگر حقیقی مصلحتوں کے جاننے کے لیے امر غائب اور مستقبل کا صحیح علم ہونا ضروری ہے اور یہ انسان کے بس سے باہر کی بات ہے اس لیے حقیقی مصلحتیں اسی حکم میں ہیں، جس کو اللہ عالم الغیب نے نازل فرمایا۔

ان تمام مذکورہ بالا امور کے لحاظ سے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ قانون کا حاکم اور امر و نہی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں ادا کیا گیا ہے، عام طور سے فقہا نے اس پر ان دو آیتوں سے استدلال کیا ہے:

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ﴾ (٦/ الانعام:٥٧ و ١٢/ یوسف:٦٧)

''حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔''

﴿ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ ﴾ (۷/ الاعراف: ۵۵)

''ہاں اسی اللہ کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا۔''

یہ دونوں آیتیں جن موقعوں پر وارد ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اور امر تکوینیات اور حوادثِ عالم سے متعلق ہے، پہلی آیت دو جگہ ہے، سورۂ انعام اور سورۂ یوسف میں، سورۂ انعام کا موقع یہ ہے کہ کفار نبی کی صداقت کے ثبوت میں عذاب کا جلد مشاہدہ چاہتے تھے، اس کے جواب میں ہے:

﴿ مَا عِنْدِىْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ۗ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ ۗ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ۝ ﴾

(۶/ الانعام: ۵۷)

''جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو، وہ میرے پاس نہیں، حکم کسی کا نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے، اللہ تعالیٰ واقعی بات بتلا دیتا ہے اور وہی سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔''

دوسری جگہ سورۂ یوسف میں اس موقع پر ہے، جب وہ اپنے بیٹوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ مصر میں مختلف دروازوں سے داخل ہونا کہ کسی آفت میں نہ پھنسو، پھر فرماتے ہیں کہ یہ تو انسانی تدبیر ہے، مگر ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہے:

﴿ وَمَآ أُغْنِىْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَىْءٍ ۗ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ ۗ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ ﴾ (۱۲/ یوسف: ۶۷)

''اور اللہ کے حکم کو میں تم سے ٹال نہیں سکتا حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے (باوجود اس تدبیر ظاہری کے دل سے) اس پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر اور بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔''

دوسری آیت کا موقع یہ ہے:

﴿ إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِىْ سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِأَمْرِهٖ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۗ إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ ﴾

(۷/ الاعراف: ۵۵)

''بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا، چھپا دیتا ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے لے آتی ہے اور سورج اور چاند اور دوسرے سیاروں کو پیدا کیا، ایسے طور پر کہ سب اسی کے حکم کے تابع ہیں، یاد رکھو اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا بڑی خوبیوں کے ساتھ

بھرے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں۔"

صاف ظاہر ہے کہ اس امر کا تعلق خلق وتکوین سے ہے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ لفظ امر اور حکم کی لغوی وسعت کی بنا پر امورِ تشریعی کو بھی کسی درجہ میں شامل ہو جائیں، لیکن قرآن پاک اور احادیث میں جب دوسرے تصریحی دلائل اس دعویٰ پر موجود ہیں تو اس تصریح کو چھوڑ کر اجمالی دلیل پر قناعت کیوں کی جائے۔

عبادت کے معنی صرف کسی کو معبود بنا کر پکارنے ہی کے نہیں ہیں، بلکہ اگر کسی کو زبان سے معبود نہ بھی کہا جائے اور اس کی ظاہری پرستش نہ بھی کی جائے، لیکن اس کے احکام کی مثل اللہ کے حکم کی مستقلاً اطاعت کی جائے تو یہ بھی عبادت ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ادا ہوتا ہے:

﴿ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ ﴾ (١٩/ مريم:٤٤)

"شیطان کی عبادت نہ کر۔"

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ ﴾ (٣٦/ يٰسٓ:٦٠)

"یہ کہ شیطان کی عبادت نہ کرو۔"

اوپر کی آیتوں سے واضح ہوا کہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، یہاں سوال پیدا ہوتا ہے تو پھر اسلام میں انبیا اور ائمہ زمانہ اور خلفا کی اطاعت کا حکم کیونکر صحیح ہوسکتا ہے، جواب یہ ہے کہ بے شبہ اسلام میں اطاعت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، لیکن دوسروں کی اطاعت احکامِ الٰہی کی تبلیغ اجرا اور تنفیذ کے لیے حکم الٰہی کے تحت ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ ﴾ (٤/ النسآء:٥٩)

"اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔"

اولوالامر کی اطاعت، خواہ اس سے مراد علما ہوں یا حکام، اللہ کے حکم کے تحت اسی کے احکام کی تنفیذ اور اجرا میں ہے اور رسول کی اطاعت بھی احکامِ الٰہی کی تنفیذ ہی کی خاطر ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ ﴾ (٤/ النسآء:٨٠)

"جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔"

اس سے پہلے اسی سورہ میں ہے:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ ﴾ (٤/ النسآء:٦٤)

"اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا، لیکن اس لیے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔"

یہود اور نصاریٰ نے احکامِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنے راہبوں اور کاہنوں اور پوپوں کی اطاعت کو دین بنا رکھا تھا اور ان کا حکم حکم الٰہی سے ماخوذ و مستنبط بلکہ مستقل حکم کے طور پر بجالایا جاتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کو شرک کا ملزم قرار دیا ہے اور ان سے جزیہ لینے یا قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ﴾ (۹/ التوبۃ:۲۹)

''اہل کتاب میں سے ان سے لڑو جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے اور نہ جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا، اس کو حرام مانتے ہیں اور نہ دین حق کی اطاعت کرتے ہیں۔''

ان آیات میں اہل کتاب پر اللہ پر ایمان نہ رکھنے کا جو الزام قائم کیا گیا ہے، وہ اسی لحاظ سے ہے کہ وہ صرف حکم الٰہی کے پابند نہیں ہیں، بلکہ یہ مرتبہ انہوں نے اللہ کے بندوں کو بھی دے رکھا ہے، چنانچہ اس کے بعد اس کی تصریح ہے:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ ﴾ (۹/ التوبۃ:۳۱)

''انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو رب بنا رکھا ہے اور مریم کے بیٹے مسیح کو حالانکہ ان کو صرف یہ کہا گیا ہے کہ ایک ہی معبود برحق کی عبادت کریں۔''

عالموں اور راہبوں کو رب بنانا اسی بنا پر ہے کہ وہ ان کے حکموں کو بھی مستقلاً طور پر اللہ کا حکم تسلیم کرتے تھے، کیونکہ ان عالموں اور راہبوں کو یہ دعویٰ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو غیبی طور پر اپنے حکموں اور معاملات کے فیصلوں سے مطلع فرماتا ہے، اسلام نے اہلِ کتاب کو دوسری سورہ میں اسی شرک سے باز رہنے کی دعوت دی:

﴿ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ ﴾ (۳/ آل عمران:٦٤)

''اے کتاب والو! آؤ ایک بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مانی ہوئی ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم ایک اللہ کو چھوڑ کر دوسرے کو رب بنائیں۔''

یہ رب بنانا اطاعت ہی کی بنا پر ہے، ترمذی اور مسند احمد میں ہے کہ جب عدی بن حاتم جو ایک عیسائی عرب امیر تھے، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ نے ان کے سامنے سورۂ توبہ والی آیت مذکور پڑھی تو عدی نے کہا: ''وہ ان کو معبود نہیں بناتے، فرمایا کیوں نہیں، انہوں نے ان کے لیے

حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا اور انہوں نے ان کے احکام کو مانا، یہی ان کا ان کو معبود بنانا ہے، الفاظ یہ ہیں ''فَذَالِكَ عِبَادَتُهُمْ اِيَّاهُمْ۔'' [1] ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہاں وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کہتے تھے تو یہ حلال مان لیتے تھے اور جب حرام کہتے تھے تو یہ حرام سمجھ لیتے تھے، یہی تو شرک ہے۔'' [2]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی شے کو حلال یا حرام ٹھہرانا کسی انسان کا کام نہیں، بلکہ اللہ کا ہے اور اسی کا نام وضعِ حکم ہے، اس تحلیل و تحریم میں کسی کو شریک ٹھہرانا عین شرک ہے، اسی طرح اللہ کے علاوہ یا اللہ کے حکم کے ساتھ بلا وساطتِ حکم الٰہی کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت بھی شرک ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان عرب اور یہود منافقین کو جو قانون الٰہی کی سختی سے بچنے کے لیے یا ایمان کی کمزوری کے سبب سے اپنے مقدمات یہودیوں کی عدالتوں میں لے جاتے تھے، یا ان کے فیصلہ کے لیے عرب کاہنوں کے پاس جاتے تھے، زجر و توبیخ فرمائی اور ان کے اس فعل کو کھلا نفاق اور شرک فرمایا، چنانچہ بعض اصولی احکامِ عدل و انصاف اور طریقِ اطاعتِ احکام کے ذکر کے بعد ارشاد ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ ﴾ (٤/ النسآء: ٦٠)

''کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا، ایمان لا چکے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت کو اپنا حاکم بنائیں، حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں۔''

طاغوت لغت میں ہر اس شے کو کہتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر معبود بنایا جائے ''کل معبود من دون اللّٰہ'' اور اہل تفسیر نے شان نزول کا لحاظ کر کے کبھی اس سے کاہنوں، جادوگروں اور کبھی یہودی حاکموں کو مراد لیا ہے، اس لیے اس کا مشترک مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو قانون کا درجہ دے کر اطاعت کی جائے اور اس کے مطابق فیصلہ چاہا جائے، وہ طاغوت ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ سات جگہوں پر آیا ہے اور ہر جگہ اس سے مراد حاکم باطل اور معبود باطل لیا گیا ہے۔

قوانین الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور فیصلہ چاہنا فسق ہے اور اس کا مرتکب فاسق کہلائے گا:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ ﴾ (٥/ المآئدۃ: ٤٧)

''اور اللہ نے جو اتارا ہے اس کے رو سے جو فیصلہ نہیں کرتے وہی فاسق ہیں۔''

---

[1] تفسیر ابن کثیر، تفسیر آیت سورۃ توبۃ، ج ٢، ص: ٣٤٨۔

[2] ترمذی، ابواب التفسیر ومن سورۃ التوبۃ: ٣٠٩٥۔

اللہ تعالیٰ نے ان احکام کا دوسرا نام حدود ارشاد فرمایا ہے، حدود وہ نشانات ہیں جہاں تک آگے بڑھنے کی انسان کو اجازت ہے اور جس سے تل بھر آگے بڑھنے کی جرأت گناہ اور عصیان ہے اور یہ حدود اللہ تعالیٰ ہی کے بتائے ہوئے ہیں اور ان کا نزول اللہ تعالیٰ ہی کے یہاں سے ہوا ہے قرآن پاک میں سورۂ بقرہ اور نساء اور طلاق میں احکام الٰہی کے بیان کے بعد ارشاد ہے:

﴿ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ﴾ (٦٥/ الطلاق:١)

''یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں۔''

﴿ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ﴾ (٦٥/ الطلاق:١)

''یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں جو ان حدوں سے آگے بڑھے گا، وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔''

سورۂ نساء میں وصیت کے قواعد کی تفصیل بتا کر آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۝ ﴾ (٤/ النسآء:١٣-١٤)

''یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے گا، اس کو وہ دوزخ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے بڑی ذلت کی سزا ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان حدود پر عمل اللہ تعالیٰ و رسول کی اطاعت اور اس کی جزا جنت کی نعمت ہے اور ان سے انحراف اللہ اور رسول کی نافرمانی اور اس کا نتیجہ دوزخ کی سزا اور ذلت کی مار ہے اور رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

قانون وشرع کی حقیقت تحلیل وتحریم ہی ہے اور یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، انسان اگر اپنی طرف سے کسی قانون کو وضع کرلے اور بلاسند الٰہی کسی شے کو حلال یا حرام کرلے تو اس کا نام ''افتراء علی اللہ'' اللہ پر جھوٹ تہمت باندھنا ہے، ارشاد ہوا:

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝ ﴾

(١٦/ النحل:١١٦-١١٧)

’’اور جن چیزوں کو تم اپنی زبان سے (حلال وحرام) بتاتے ہو، ان کی نسبت یہ نہ کہو کہ حلال ہے اور یہ حرام، تا کہ تم اللہ پر جھوٹ تہمت لگاؤ، یہ (دنیا میں) چند روزہ فائدہ ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔‘‘

اس آیت پاک میں نہ صرف یہ کہ اس حلال وحرام کی شریعت کو اپنے لیے مخصوص فرمایا، بلکہ یہ بھی پیشین گوئی فرمادی کہ جو لوگ شریعتِ الٰہی کو چھوڑ کر خود اپنی شریعت بنائیں گے، گو ان کو تھوڑے دن کا فائدہ حاصل ہو جائے، مگر وہ ان کے لیے عذاب ہی ثابت ہوگا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رسول اللہ ﷺ جو شریعتِ الٰہی کے مظہر تھے اور بندوں کو احکامِ الٰہی سے آگاہ فرماتے تھے اور اس حیثیت سے آپ کا ہر حکم حکمِ الٰہی ہے، لیکن حکمِ الٰہی کے بغیر ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ایک چیز کو اپنے لیے حرام قرار دیا تو عتابِ الٰہی آیا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ ﴾ (٦٦/ التحريم:١)

’’اے پیغمبر! تو کیوں اس کو حرام کرتا ہے جس کو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ یہ استحقاق نبی کو بھی حاصل نہیں، حالانکہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مباح چیز کا استعمال اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر ترک کر دے، مگر جب آنحضرت ﷺ نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس حق کے استعمال سے آپ ﷺ کو منع فرما دیا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس سے دو نقصان تھے ایک یہ کہ نبی کا ہر فعل جو اس کے لیے مخصوص نہ ہو، امت کے لیے حکمِ الٰہی کے تحت شرع کا حکم رہتا ہے، اس قاعدہ کی بنا پر آپ ﷺ کے اس ترک سے امت اپنے لیے بھی ایک حلال چیز کو حرام سمجھ لیتی، دوسرے یہ ثابت ہوتا کہ نبی کو بغیر اذنِ الٰہی کے بھی حقِ تشریع ہے، جو صحیح نہ ہوتا، اسی لیے نبی کی تشریعی حیثیت یہی ہے کہ وہ شریعتِ الٰہی کا مبلغ اور قانونِ ربانی کا شارح اور مظہر ہے، قرآن پاک کی اس آیت میں ہے:

﴿ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ﴾ (٩/ التوبة:٢٩)

’’اور (یہود ونصاریٰ) اسے حرام نہیں کرتے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔‘‘

اس آیت میں رسول کی طرف جو تحریم کی نسبت ہے، وہ اسی حیثیت سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مبلغ تھے، رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے، جس طرح احکام میں اولوالامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے، کیونکہ وہ رسول ہی کے لائے ہوئے احکام کو پیش کرتے ہیں۔

اسلام میں علوم کی تدوین کے زمانہ میں یہ مسئلہ کہ حاکم شرع اللہ تعالیٰ ہے، اصول کا مسئلہ بن گیا ہے، چنانچہ علمِ عقائد اور اصولِ فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ پر بحثیں موجود ہیں۔

علمِ اصولِ فقہ میں یہ مسئلہ اس حیثیت سے زیر بحث آیا ہے کہ واضعِ قانون صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اسی

کے امر و نہی سے بندوں نے فرض و واجب اور حرام و حلال کو جانا۔

علامہ آمدی المتوفی ۶۳۱ھ اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں:

اعلم انه لا حاكم سوى الله تعالى ولا حكم الا ماحكم به، و يتفرع عليه ان العقل لا يحسن ولا يقبح ولا يوجب شكر المنعم وانه لا حكم قبل ورود الشرع. [1]

''جاننا چاہیے کہ حکم دینے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں اور حکم وہی ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اور اسی اصل مسئلہ پر یہ مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ عقل نہ کسی چیز کو اچھا کہتی ہے نہ برا اور یہ کہ محسن کا شکر عقلاً نہیں ہے اور یہ کہ شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہیں۔''

مقصود یہ ہے کہ احکامِ شریعت اور قانونِ شرعی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، اسی کا حکم حکم ہے اور اسی کا قانون قانون ہے، اس بنا پر شرع کے نزول سے پہلے تنہا عقل کی رو سے کوئی حکم فرض، واجب، سنت، مستحب یا حرام، ناجائز و مکروہ کی صورت میں جس کے قائل پر ثواب یا عتاب کا حکم عائد کیا جا سکے، نہیں ہو سکتا اور نہ عقل اپنی تنہا کوشش سے کسی بات کو بہ اعتبارِ ثواب یا عذاب کے اچھا یا برا کہہ سکتی ہے۔ علامہ ابن ہمام حنفی المتوفی ۸۶۱ھ تحریر میں لکھتے ہیں:

الحاكم لا خلاف فى انه رب العالمين. [2]

''اس میں اختلاف نہیں کہ حکم کا واضع پروردگارِ عالم ہے۔''

قاضی بیضاوی المتوفی ۶۱۵ھ کی منہاج الاصول کی شرح میں علامہ اسنوی واضح کرتے ہیں:

''حسن و قبح اور شے کے اچھے یا برے ہونے کے ایک معنی یہ ہیں کہ اس شے کو فطرت پسند کرتی ہے یا اس سے نفرت رکھتی ہے، جیسے ڈوبتوں کو پانی سے باہر نکالنا اچھی بات ہے اور کسی کا مال ظلم سے لے لینا برا ہے، اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ایک کمال کی صفت ہے اور دوسری نقص کی، جیسے علم اچھا ہے اور جہل برا ہے، ان دونوں معنوں کے لحاظ سے ان کے اچھے یا برے ہونے کا عقل کی رو سے فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں ہے، اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل پر ثواب اور کسی پر عذاب کے ترتب کا فیصلہ صرف شریعت سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اشاعرہ (اور عام اہلسنت) کے نزدیک حسن و قبح کے یہ دونوں فیصلے شرع پر موقوف نہیں اور معتزلہ کہتے ہیں کہ عقل اس کا فیصلہ کر سکتی ہے اور اس فیصلہ کے لیے حکم الٰہی کے ورود کا انتظار نہیں کیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کے مصالح اور مفاسد کی مراعات (لحاظ کرنا) واجب ہے، شریعت

[1] كتاب الاحكام فى اصول الاحكام، ج ۱، ص:۱۳۔ [2] ج ۲، ص:۸۹ بولاق مصر۔

کے نزول سے عقل کا فیصلہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے''۔ ❶

معتزلہ نے حقیقت میں الٹی بات کہی ہے، یہ کہ شریعت کے فیصلہ سے حکم کی معرفت ہوتی ہے اور عقل سے اس کی مصلحت، قیاس و تجربہ کی بنا پر اہلِ عقل کے نزدیک مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے اور یہی اہلِ سنت میں سے متاخرین ماتریدیہ (حنفیہ) کا مسلک حق ہے، مولانا محبّ اللہ بہاری المتوفی ۱۱۱۹ھ مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں:

''حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کمال و نقص اور دنیاوی غرض و مصلحت موافق یا مخالف ہونے کا فیصلہ عقل سے ہوتا ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل کے کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مدح یا مذمت کا مستحق ہونا عقل کے رو سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یا صرف شرع سے؟ تو اشاعرہ کے نزدیک وہ صرف شرع سے معلوم ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اچھا فرمایا وہ اچھا ہے اور جس کو برا فرمایا وہ برا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اس کے خلاف فرماتا تو وہی اچھا یا برا ہوتا اور ہمارے (یعنی ماتریدیہ) اور معتزلہ کے نزدیک وہ عقل سے معلوم ہو سکتا ہے، لیکن ماتریدیہ اور معتزلہ میں فرق یہ ہے کہ معتزلہ اور امامیہ اور کرامیہ وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے اسی کے مطابق حکم دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے، وہ پہلو اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ حکیم و دانا کا حکم ہے لیکن جب تک اللہ تعالیٰ حکم نہ دے کوئی حکم محض عقل سے نہیں ہو سکتا۔'' ❷

بعض اہل اصول نے معتزلہ کی طرف جو یہ نسبت کی ہے کہ وہ حاکم قانونِ عقل کو سمجھتے ہیں، مولانا بحر العلوم نے شرح مسلم الثبوت میں اسی مسئلہ کی شرح میں اس کی تردید کی ہے، فرماتے ہیں:

''اس مسئلہ پر حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، تمام امت کا اجماع ہے اور ہمارے مشائخ کی بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے اور معتزلہ کے نزدیک واضع قانون و حاکم عقل ہے، یہ غلط ہے کیونکہ ایسا کہنے کی جرأت کسی ایسے شخص کو نہیں ہو سکتی جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، بلکہ معتزلہ یہ کہتے ہیں عقل بعض احکامِ الٰہی کو جان سکتی ہے چاہے شرع اس میں وارد ہو یا نہ ہو اور یہی ہمارے اکابر مشائخ کے نزدیک بھی ثابت ہے''۔

قاضی شوکانی المتوفی ۱۲۲۵ھ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے اختلاف اور اتفاق کے موقع میں حسب ذیل فرق ہے:

''اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ نبی کی بعثت اور اس کی دعوت کے پہنچنے کے بعد حاکم قانون صرف شرع ہے، اختلاف اس زمانہ اور حالت سے متعلق ہے جب نبی کی بعثت نہ ہو، یا اس کی

❶ ج ۱، ص: ۹۰ برحاشیہ تحریر ابن ہمام۔ ❷ مسلم الثبوت، المقالۃ الثانیۃ فی الاحکام۔

دعوت کسی تک نہ پہنچی ہو تو اشاعرہ کے نزدیک اس وقت کسی حکم کا کوئی مکلف نہیں ہے، نہ کفر حرام ہے، نہ ایمان واجب ہے اور معتزلہ کے نزدیک اس وقت بھی عقل کے رو سے جو حکم ہو اس کے ساتھ حکمِ الٰہی کا تعلق سمجھا جائے گا۔ [1]

اب آخر میں ہم حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا وہ قولِ فیصل نقل کرتے ہیں جو ان تمام مباحث کا نچوڑ (خلاصہ) ہے:

''اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم نہیں، اسی کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا اور عقل وغیرہ کسی مخلوق کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی حکم کو ثابت کرے، اللہ تعالیٰ نے وجوب یا استحباب کے ساتھ جس کا حکم دیا وہ درحقیقت حسن (اچھا) ہے، عام اس سے کہ وہ لذاتہ حسن ہے یا اپنے کسی وصف یا اپنے کسی متعلق کی بنا پر، اسی طرح جس سے منع فرمایا وہ قبیح (برا) ہے تو افعال کا حسن و قبح کے ساتھ انصاف، امر و نہی سے پہلے ہی عالم حقیقت میں ہو چکا تھا اسی کی رعایت کر کے اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے، عقل کبھی ان کے حسن و قبح کو معلوم کر لیتی ہے، تو اس موقع پر اس حسن و قبح کو عقلی کہہ دیتے ہیں، لیکن شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہ تھا تو یہ مذکورہ بالا حسن و قبح بندوں کے حق میں صرف شرع الٰہی پر مبنی ہیں۔'' [2]

حضرت مولانا شہید کا یہ رسالہ اصول فقہ درحقیقت اصول فقہ کی تہذیب ہے [3] اس میں فن کے بڑے بڑے مسئلوں کو ایک ایک دو دو فقروں میں طے فرما دیا ہے، اوپر کی عبارت میں مصنف نے جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ ''قانون کا واضع درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے۔'' یہ حق مخلوقات میں سے کسی کے لیے ثابت نہیں ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے، وہ تمام تر حکمت اور بندوں کی مصلحت پر مبنی ہے، عقل کبھی اس حکمت و مصلحت کو پا لیتی ہے تو اس کو عقلی بھی کہہ سکتے ہیں، ورنہ عقلی کہنے کا یہ منشا نہیں کہ عقل اس قانون کی واضع اور آمر ہے۔

اس تفصیل کی ضرورت اس لیے پیش آئی، تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے ماہرین قانون نے شروع سے اخیر تک اس اصول کو مان لیا ہے کہ اسلام میں وضعِ قانون کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، وہی ایک حاکم، آمر اور واضعِ شرع ہے۔

اس موقع پر بعض صاحبوں کو یہ شبہ پیش آئے گا کہ یہ قانونِ شرع تو کسی قدیم زمانہ میں ایک وقت خاص میں نازل ہوا، وہ زمانہ کی ہر ضرورت اور نت نئے حالات کے مناسب قیامت تک کے لیے کیونکر ہو سکتا ہے؟

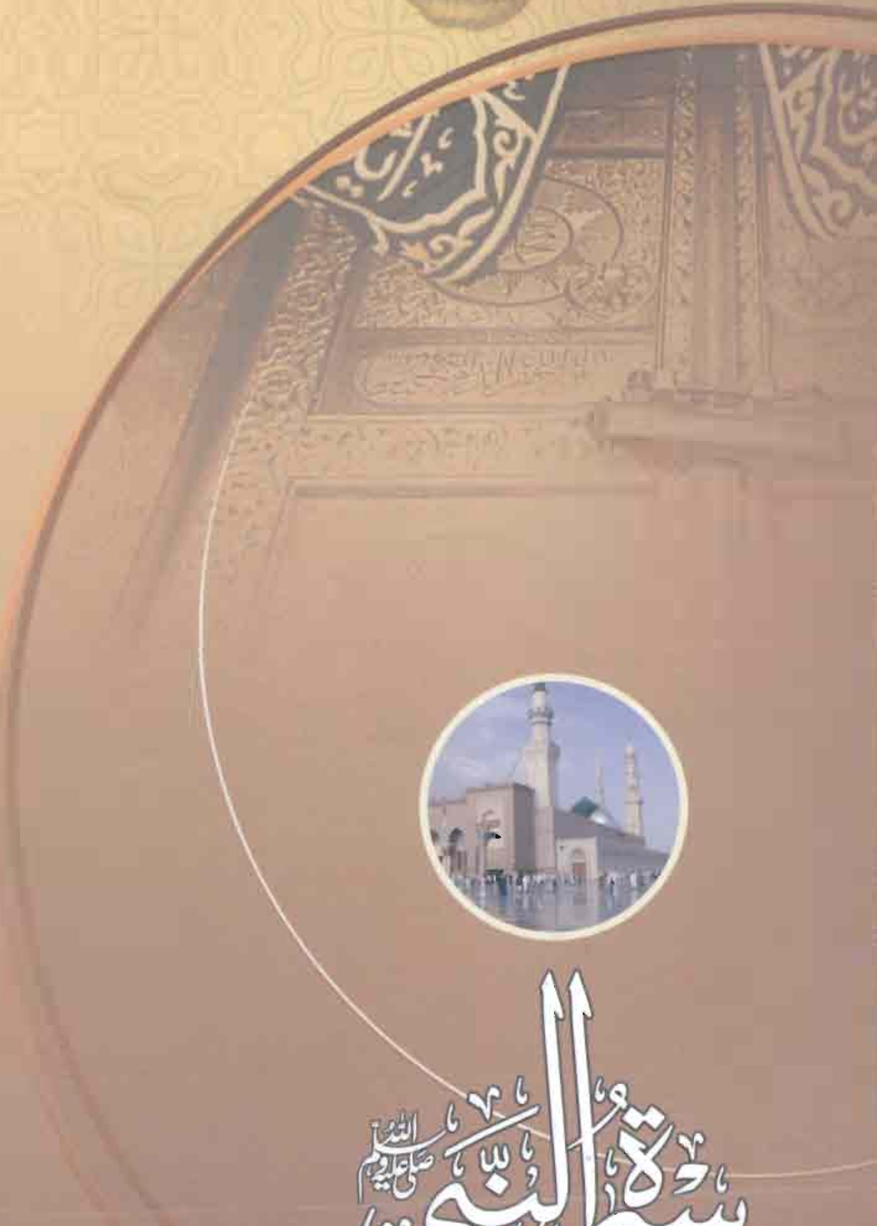
اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہیں قانون کے اصول و کلیات اور دوسرے ہیں اس کے فروع اور جزئیات، دنیا کے ہر قانون کے اصول و کلیات خواہ وہ عقلی اور تجربی ہوں، ہمیشہ یکساں رہتے ہیں، ان میں تغیر و تبدل نہیں

[1] ارشاد الفحول، ص:۱۶۔ [2] اصول الفقه، ص:۱۲۔ [3] ''تہذیب'' منطق میں ایک مختصر متن متین کا نام ہے جس میں بڑے بڑے فیصلوں کو جن پر مباحث کے دفتر ہیں، ایک ایک فقرہ میں ادا کر دیا گیا ہے۔

ہوتا، تغیر وتبدل اور تجدد یعنی نئی نئی صورتوں کا پیش آنا، یہ واقعات اور حوادث میں ہوتا ہے، جوانہی کلیات کے اندر مندرج ہوتے ہیں، جیسے فن طب جب بھی بنا ہو، لیکن اس کے اصول وکلیات پرانے اور غیر مبدل ہیں، اب جو بھی بیماریاں ظاہر ہوں، قدیم اصول کے تحت ان کا بیان طب کی کتابوں میں موجود ہے، مثال کے لیے یوں سمجھئے کہ قتل ناحق کی سزا قصاص، دیت اور کفارہ وغیرہ شرع میں مقرر ہے، اب یہ بات کہ قتل پہلے تیر اور تلوار سے ہوتا تھا اور اب بندوق سے، تپنچہ سے، ریوالور سے، توپ سے، گولہ سے اور مختلف نئے نئے اوزاروں سے ہوتا ہے، لیکن ذرائعِ قتل کا تغیر نفسِ مسئلہ کی صورت میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا، کسی کی سواری سے کسی کو نقصان پہنچ جائے تو اس کا اصولی جواب شرع میں موجود ہے، پہلے یہ سواری جانوروں کی صورت میں محدود تھی اور اب طرح طرح کی گاڑیوں، سائیکلوں، سکوٹروں، موٹروں، ریلوں وغیرہ کی صورت میں ہے، ان سے حادثے پیش آجائیں، یا نقصان پہنچ جائے تو اصول کلیہ میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

دوسرا شبہ یہ پیش آسکتا ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو ہر زمانہ کے مجتہد نئے نئے حالات کے پیش نظر اپنے اجتہاد سے جو حکم دیتے ہیں، کیا وہ نیا حکم نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مجتہد وہ ہیں جو احکام کے اصول وفروع پر پوری نظر رکھتے ہوں، آیات واحادیث سے احکام کے اصولِ کلی اور ان کے علل واسباب اور مصالح ومقاصد کو جانتے ہوں اور ان کے مطابق نئی پیش آنے والی جزئی صورتوں کا فیصلہ کرتے ہوں، اس بنا پر ان کا اجتہاد اور قیاس کسی نئے حکم کا واضع اور مخترع نہیں، بلکہ مظہر ہے، یعنی وہ حکم کا اختراع نہیں کرتے، بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مقررہ احکامِ الٰہی کے تحت اس نئی صورت کا یہ جواب ہے، اہلِ اصول کے اس مسئلے کے قیاس حکم کا صرف مظہر ہے، یہی معنی ہیں کہ وہ بتاتا ہے کہ یہ نیا جزیہ فلاں اصولِ کلی کے ماتحت ہے، انہی اصولوں کی بنا پر ہمارے فقہا نے فتاویٰ کا پورا دفتر مرتب کیا ہے، جس کے مطابق ہر زمانہ میں ہر ضرورت کا جواب دیا جاسکتا ہے اور جس پر دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی عظیم الشان حکومتیں اور عدالتیں قائم ہوئیں اور اب بھی قائم ہیں۔

تمت



سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم